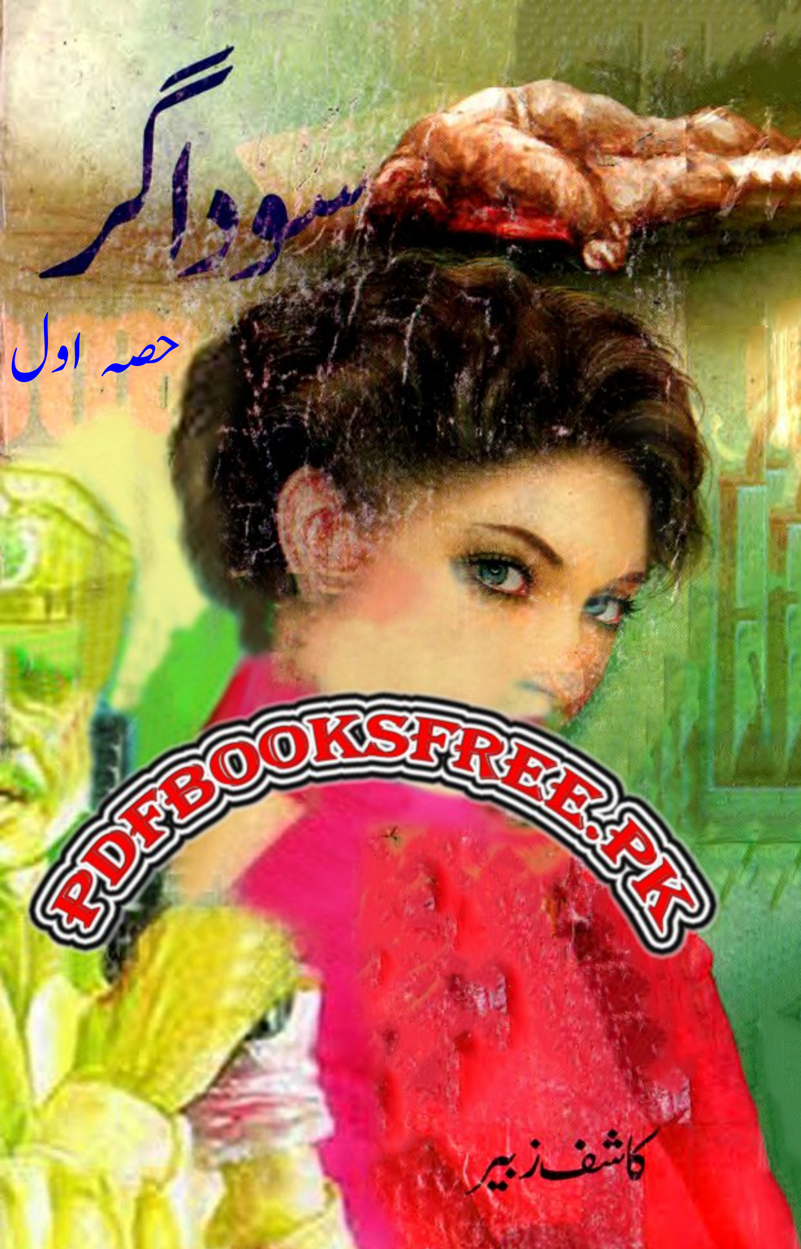


سوداگر
حصہ اول
PDFBOOKSFREE.PK
کاشف زبیر

# پیش رس

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بندے کو وہاں سے روزی دیتے ہیں جہاں روزی پانے کا اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا ہے۔تو کچھ ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کے ساتھ فرمایا۔گریجویشن کے بعد ماسٹرز میں داخلے کا منتظر تھا اور وقت گزاری کے لیے قلم اٹھایا تو آج تک اسے نیچے رکھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔چودہ سال پہلے جاسوسی پبلی کیشنز سے منسلک ہوا اور پہلی تحریر سے محترم معراج رسول صاحب نے ایسی قدر افزائی کی کہ آج تک اس معتبر ادارے کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔

اب تک بے شمار کہانیاں لکھیں ،نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی پھر قسط وار کہانی کا خیال آیا۔سوچا تھا کہ میری ہر تحریر کی طرح اسے بھی جاسوسی پبلی کیشنز کے کسی رسالے میں چھپنے کا اعزاز حاصل ہوگا لیکن قسمت نے ''سوداگر'' کے صفحات محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کے ''نئے افق'' میں مخصوص کر دیئے تھے اور اب اسے کتابی شکل میں لانے کے لیے محترم عبدالغفار بھائی کا شکر گزار ہوں۔

اس کہانی کو میری توقع سے زیادہ پزیرائی ملی۔پڑھنے والوں کی پسندیدگی نے اس کہانی کو طوالت کی طرف گامزن کرایا۔یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل وغارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مقصود تھا چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔انسانی عقل وفہم محدود ہے۔وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔خیر وشر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار ورموز سے آگاہی ممکن نہیں۔

''سوداگر'' کی نئے افق میں پسندیدگی میری توقع سے بڑھ کر رہی اور اسی پسند کی بنا پر اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔امید ہے قارئین اس سے کتابی شکل میں زیادہ محظوظ ہوں گے۔

کاشف زبیر

میری نگاہیں پریشر بتانے والے میٹر کی سوئی پر مرکوز تھیں۔ سوئی خطرے کے سرخ نشان کی آخری حدوں پر تھی اور بوائلر کسی بھی لمحے پھٹنے والا تھا۔ جس کے ساتھ ہی میرے جسم کے پرخچے اُڑ جاتے۔ صورتِ حال نہایت سنگین تھی۔ میرے ساتھ مزید تیس آدمیوں کی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں۔ میں نے ایک نظر پھر میٹر کو دیکھا اور ہتھوڑا سر سے بلند کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''آر یا پار۔''

صرف دس منٹ پہلے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ فاکس نے میرے کیبن کے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر ڈالی۔ میں گہری نیند سے جاگا۔ تو چند لمحے صورتِ حال کو سمجھ نہ سکا۔ کمرا یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آیا ہوا ہو۔ میں نے کیبن کے پورٹ ہول سے باہر دیکھا۔ تاریکی میں سمندر سے اٹھنے والی دیو پیکر لہریں اٹھارہ ہزار ٹن وزنی اور تین سو بارہ فٹ لمبے خلیج کے مضبوط پیکر سے ٹکرا رہی تھیں۔ طوفان زوروں پر تھا۔

''یوسف۔'' باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔ ''جلدی انجن روم میں پہنچو۔ ایمر جنسی ہے۔''

ایمر جنسی کا لفظ سن کر میں چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ طوفان اور ایمر جنسی کو کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جنہوں نے میرے خواب شیریں میں خلل ڈالا تھا۔

''یوسف۔'' باہر سے پھر کوئی چلایا۔ شاید اس بار کپتان کا نائب معاذ خود چلا آیا تھا۔ وہ سیکنڈ آفیسر تھا اور میں تھرڈ آفیسر۔

''آ رہا ہوں۔ کپڑے تو پہن لوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ طوفان کی گرج کے باعث چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔

بُری طرح ڈولتے کیبن میں بہ مشکل میں نے جسم پر وردی چڑھائی۔ دروازہ کھولا سامنے معاذ کھڑا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''اگر خلیج ڈوب گیا تو تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم نے کچھ پہن رکھا ہے یا نہیں۔ فوراً انجن روم میں پہنچو۔ وہاں کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔''

''مجھے فرق پڑے گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کم از کم میں آبی مخلوق کے سامنے بے لباس جانا

پسند نہیں کروں گا۔"

معاذ حسین عراقی تھا اور اس کی حسِ مزاح صدام حسین سے کچھ ہی بہتر تھی۔ لہٰذا میرے جملے پر وہ مجھے غلط نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں انجن روم کی طرف بھاگا۔ ایسی کیا ایمرجنسی تھی کہ انجن روم انجینئر کو سوتے سے اٹھا کر بلایا گیا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی میں آ کر سویا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز رُک گیا تھا۔ انجن روم میں میرا نائب صام بدحواس سا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی چلا کر کہا "سر بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام ہو گئے ہیں اور پریشر بڑھ رہا ہے۔"

"والوز کیسے جام ہو گئے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "کیا انہیں روانگی کے وقت چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی سر! ابھی جب انجن بند کرنے کے بعد دوسرے بوائلرز کے سیفٹی والوز کھولے گئے تو پتا چلا کہ نمبر چار کا سیفٹی والو جام ہے۔ باقی والوز چیک کیے گئے تو وہ بھی جام نکلے۔"

"میرے خدا" میں نے بوائلر نمبر چار پر پریشر میٹر کو دیکھا۔ جس کی سوئی رفتہ رفتہ خطرے کے سرخ نشان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بوائلر کو اگرچہ حرارت کی فراہمی بند کر دی گئی تھی لیکن اس کے اندر کھولتا ہوا پانی موجود تھا جو مسلسل بھاپ بنا رہا تھا۔ بحری جہاز کا انجن عام انجنوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی اسی اصول پر کام کرتا ہے۔ جس پر کار یا ٹرک کا انجن کام کرتا ہے۔ یعنی دباؤ اور خلاء کی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پسٹن کو متحرک کرنا۔ مگر سائز اور دیگر معاملات میں یہ عام انجنوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ اسے نہ تو فوری طور پر چلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی فوری طور پر روکا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کام مرحلہ وار کیے جاتے ہیں۔

اب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ عام حالات میں صرف انجن انجینئر ہی انجن بند کر سکتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں کوئی بھی فرد بہ شمول کپتان کے انجن بند کروانے کا مجاز نہیں ہوتا لیکن بوائلر نمبر چار نے جو خطرناک حالات پیدا کر دیئے تھے اس میں کپتان نے اپنے ہنگامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے انجن بند کروا دیا تھا۔ جو کہ ایک فاش غلطی تھی۔ انجن چلتے رہنے کی صورت میں کچھ نہ کچھ پریشر خارج ہوتا رہتا ہے۔ انجن بند ہوتے ہی خارج ہونے والا پریشر بھی بوائلر میں جمع ہو رہا تھا۔ اگر سیفٹی والو کسی وجہ سے کام نہ کر رہا ہوتا تو اسے فنی خرابی قرار دیا جا سکتا تھا لیکن سارے والوز بیک وقت کیسے جام ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی انسان کا کارنامہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی فرد کا نام آ رہا تھا۔ جسے ہم بارہ گھنٹے پہلے بمبئی میں چھوڑ کر آئے تھے۔

انجن روم کے عملے کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ صرف انجن روم ہی نہیں بلکہ پورا جہاز خطرے میں تھا یہ جگہ چوتھے لیول پر بحری جہاز کے پیندے کے بالکل پاس تھی اگر بوائلر پھٹ جاتا اور اس سے جہاز کی چادر میں کوئی شگاف پڑ جاتا تو اس طوفانی موسم میں خلیج کو ڈوبنے میں دو گھنٹے بھی





نہ لگتے۔ جہاز پر سامان اپنی پوری گنجائش کے مطابق لدا ہوا تھا۔ میں نے بوائلر اٹینڈیڈ گپتا سے کہا۔

"بڑا رینچ پانا لاؤ۔"

گپتا نے پھرتی سے رینچ پانا مجھے تھمایا۔ میں نے ایک والو کے نٹ میں پانا پھنسا کر اسے گھمانے کی کوشش کی لیکن اس نے ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ عام حالات میں یہی والو آرام سے کھل جاتا تھا۔ میں نے اگلی بار پوری طاقت صرف کر دی۔ ایک زمانے میں مجھے باڈی بلڈنگ کا شوق چڑھا تھا اور میں نے جمنازیم میں خاصی جان ماری تھی۔ باڈی بلڈنگ چھوڑے مدت ہو چکی تھی۔ وہ پہلے جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن زور آزمائی میں کوئی عام فرد میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار بھی والو نے حرکت نہیں کی۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ آخر یہ کتنی سختی سے بند تھا جو کھل ہی نہیں رہا تھا۔ پریشر میٹر کی سوئی خطرے کے سرخ نشان تک آ پہنچی تھی اور انجن روم کا عملہ خوف زدہ ہو کر بوائلر سے دور ہٹ گیا تھا۔

"دوسرے بوائلرز کے آرٹریج والوز کھول دو۔" میں نے چلا کر کہا۔

عملہ بھاگ بھاگ کر بوائلرز کے آرٹریج والوز کھولنے لگا۔ سنسناتی بھاپ پائپوں کے ذریعے بحری جہاز کی چمنی سے خارج ہونے لگی۔ یقیناً اس وقت چمنی کے دہانے سے بھاپ کے گہرے بادل اُٹھ رہے ہوں گے۔ بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام ہونے سے جو دھماکا خیز صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ باقی بوائلرز کا پریشر خارج کر دیا جائے۔ تا کہ بوائلر نمبر چار پھٹنے سے بوائلرز متاثر نہ ہوں۔ میں نے میٹر کی طرف دیکھا ذرا سی دیر میں سوئی خطرے کے نشان کی حد سے خاصی آگے جا چکی تھی۔ ایک لمحے کو تو میرے ذہن میں آیا کہ انجن چلانے کا حکم دوں لیکن فوراً ہی میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ انجن چلانے سے بوائلرز کا پریشر استعمال ہونے لگتا لیکن پسٹن کے حرکت میں آنے سے پہلے جب بوائلر نمبر چار کو مزید حرارت ملتی اور وہ زیادہ بھاپ بنانے لگتا تو عین ممکن تھا کہ بوائلر فوراً پھٹ جاتا۔ نہیں اب انجن چلانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ہمیں بوائلر کا دباؤ ہر صورت میں خارج کرنا تھا۔ سوئی خطرے کی حد میں نصف فاصلہ طے کر چکی تھی۔ بوائلر کسی لمحے بھی پھٹ سکتا تھا۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ میں سر پر پیر رکھ کر انجن روم سے نکل بھاگوں۔ مگر بوائلر پھٹنے کی صورت میں جہاز ڈوبنے کا نوے فیصد امکان تھا۔ باہر جس قسم کا طوفان جاری تھا اس میں لائف بوٹس بھی ہماری جان بچانے میں زیادہ مددگار ثابت نہ ہوتیں۔

"صاحب بھاگو۔" گپتا چلایا۔ "بوائلر پھٹنے والا ہے۔"

"ہتھوڑا لاؤ۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ میں نے جھک کر بہ غور دیکھا تھا مجھے اپنے شبہے کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ والو کے کناروں سے کوئی سیاہ سی میلی سی شے جھانک رہی تھی۔ یہ اُس خبیث کا کام تھا اس نے بمبئی میں جہاز سے اُترنے سے پہلے یہ حرکت کی تھی۔ اسے یقین ہو گا جب تک ہم اس کی حرکت سے آگاہ ہوں گے جہاز کھلے سمندر میں خاصا آگے نکل چکا ہو گا۔ جب بوائلر

پھٹے گا اور تباہی پھیلے گی جہاز غرقاب ہو جائے گا اور کوئی اس کی حرکت کے بارے میں نہیں جان سکے گا۔ بلاشبہ اس کے پاس شیطانی ذہانت تھی جس کی مدد سے اس نے شیطانی قسم کا یہ منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا تھا۔ اسے اکتیس آدمیوں کی زندگی کی قطعی پروا نہیں رہی ہوگی۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔

"صاحب ہتھوڑا۔" گپتا نے لرزتے ہاتھوں سے مجھے ہتھوڑا دیا۔ "ابھی بھی وقت ہے صاب۔"

"گپتا چپ رہو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔ رنچ پانا میں پہلے ہی آرٹریج والو میں پھنسا چکا تھا۔ میں نے ہتھوڑا سر سے بلند کیا اور اسے پانے پر دے مارا۔ وہ ذرا سا لرزا لیکن جھکا نہیں تھا۔ ہتھوڑے بازی میں یہ خطرہ تھا کہ نشانہ چوک جائے اور کچھ دیر کا پھٹتا بوائلر فوراً ہی پھٹ جائے۔ میں نے ہتھوڑا پھر بلند کیا۔

"بھاگ چلیں صاب۔" گپتا گھگیایا۔

میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر زیادہ قوت سے ہتھوڑا پانے کے سرے پر مارا۔ اس دفع رنچ پانا لرزنے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا جھکا بھی تھا۔ میرے دل میں امید کی ایک کرن جاگی۔ والو میں ڈالا گیا سلوشن اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے تیسرا وار کیا۔ پانا لرزا تھوڑا سا جھکا۔ پھر ضرب کی قوت نے اسے اُچھالا۔ وہ تیر کی طرح میرے سر کے پاس سے گزرا تھا۔ میں بال بال بچا تھا۔ اگر پانا میرے سر پر لگ جاتا تو میرے سر کے کئی ٹکڑے ہو جاتے اور میں فوراً ہی راہی ملکِ عدم ہوتا۔ رنچ پانا دیوار کے ساتھ گزرتے پائپوں کے نیچے جا گرا تھا۔

"گپتا پانا لاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔ مگر گپتا وہاں کہاں تھا۔ وہ پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ میرے پاس اسے بُرا بھلا کہنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے پانا فولادی پائپوں کے درمیان سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر پائپ اور فرش کے درمیان اتنا خلا نہیں تھا کہ میں ہاتھ ڈال کر پانا نکال سکتا۔

میں نے اوپر دیوار کے ساتھ ہاتھ ڈال کر پانا نکالنا چاہا لیکن وہ اس بار بھی میری دسترس سے دور ثابت ہوا تھا۔ میں نے واپس آ کر ہتھوڑا اٹھایا اور ایک نظر پریشر میٹر کی سوئی پر ڈالی۔ جس کی سوئی اب آخری حد سے کچھ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے ہتھوڑے کے دستے کی مدد سے پانے کو باہر کی طرف سرکایا۔ یہ ایک اور مشکل کام ثابت ہوا۔ کئی بار پانا ذرا سا سرک کر رہ جاتا۔ لمحے میرے ہاتھ سے پھسلے جا رہے تھے کسی بھی لمحے انجام قریب ہو سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے پانا باہر نکلا اور میں اسے لے کر بوائلر کی طرف لپکا۔ اس بار میں نے رنچ پانا پوری قوت سے والو میں پھنسایا تا کہ وہ پھر سلپ نہ کر جائے۔ رنچ پانا افقی انداز سے خاصا اوپر تھا اگر میں اسے افقی پوزیشن میں لے آتا تو امید تھی کہ والو کھل جائے گا۔ میری پہلی ضرب پر پانے نے بہ مشکل پانچ درجے زاویے کا سفر کیا لیکن اگلی ضرب پر پانا زیادہ نیچے آیا تھا اور اس سے اگلی ضرب پر افقی انداز سے بھی نیچے چلا گیا۔ میں نے ہتھوڑا پھینک کر پانے کو زور بازو سے گھمانا شروع کر دیا۔





والو کسی حد تک کھل گیا مگر اس کی چوڑیوں میں ڈالا جانے والا سلوشن زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ خاصی دقت کے ساتھ میں پانے کو ایک بار اوپر سے نیچے لاتا تھا۔ جب کہ والو کو ایک بار چکر دینے کے لیے پانے کو چار بار اوپر سے نیچے کرنا پڑتا تھا۔ جتنی تاخیر ہو رہی تھی خطرہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی کھولتے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوں۔ جو ابھی پھٹ کر میرے وجود کو نابود کر دے گا۔ یہ سوچ کر میں پوری طاقت سے رنچ پانا گھمانے لگا تھا۔

دوسرے چکر کے بعد والو کسی قدر آسانی سے کھلنے لگا اور شاید تھوڑا بہت پریشر خارج ہو رہا تھا۔ مجھے میٹر کی سوئی معمولی سی واپس آتی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ایک نئے عزم کے ساتھ والو گھمانا شروع کر دیا۔ تیسرے چکر کے ساتھ ہی سنسناتی بھاپ کے خارج ہونے کی دل نشین آواز آنے لگی۔ قریب آتی سوئی اب دور جانے لگی تھی پریشر ختم ہو رہا تھا۔ ہر چکر کے ساتھ ہی بھاپ خارج ہونے کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پورا والو کھولنے پر شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا تھا۔ بوائلر میں نہ جانے کتنا پریشر جمع ہو چکا تھا۔ بھاپ کو بوائلر کی مقید فضا سے نکلنے کا موقع ملا تھا تو وہ پورا جوش دکھا رہی تھی۔ بوائلر کی دیواروں نے بلاشبہ سینکڑوں ٹن فی مربع انچ کا دباؤ برداشت کیا تھا اگر بوائلر عام فولاد کی چادر سے بنا ہوتا تو کب کا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوتا مگر یہ بوائلر خاص فولاد سے ڈھالے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں جوڑ نہیں ہوتا اور یہ بے انتہا دباؤ برداشت کر سکتا ہے۔

میری نظر میٹر کی سوئی پر تھی۔ جو رفتہ رفتہ سرخ نشان سے واپس آ رہی تھی اگرچہ اس کی رفتار سُست تھی لیکن بوائلر پھٹنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ بھاپ کے اخراج کے ساتھ ہی دباؤ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ خاصی دیر بعد ایک انجن مین احمد علی نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر اس نے بھاپ نکلنے کا شور سنا اور اندر آ گیا۔ اس کی نظر بھی میٹر پر مرکوز تھی۔

"صاحب! آپ نے ہم سب کو بچا لیا۔" اس نے شدت جذبات سے رندھی آواز میں کہا۔ "اگر بوائلر پھٹ جاتا۔"

"تو ہم تہہ میں ہوتے اور مچھلیوں کی خوراک بن رہے ہوتے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن ایسا نہیں ہوا ہے لہٰذا اس پر دماغ کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

یک لخت مجھے کمزوری کا احساس ہوا۔ چند منٹ کی اس کش مکش نے جیسے میری توانائی نچوڑ لی تھی۔ اکتیس افراد موت کے منہ میں جا کر نکل آئے تھے اور اس کا ذمے دار ایک شخص تھا یعنی جان گرے۔



"خیال رکھنا۔" عرب پرشین شپنگ کمپنی کے کراچی آفس کے ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا۔ "تم جس شخص کے ساتھ کام کرنے جا رہے ہو وہ میرین ٹرن کی دنیا میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔"

''میں نے اس سے پہلے بھی کئی شیطان دیکھے اور بھگتے ہیں۔'' میں مسکرایا۔

''لیکن جان گرے جیسا شیطان شاید ہی دیکھا ہو۔'' ڈائریکٹر نے کہا اور مجھے مختصراً جان گرے کی ہسٹری بتائی۔ اس کا پورا نام جان جیفرسن گرے تھا اور اس کا تعلق امریکہ سے تھا۔ وہ نسلی تفاخر کا مارا ایک گورا تھا جو صرف اس وجہ سے اس ایشیائی کمپنی میں کام کر رہا تھا کہ مغربی ممالک کی تمام میرین لائنز نے اسے بلیک لسٹ کر دیا تھا۔ جو شخص انجن روم میں بھی شراب کے نشے میں دھت رہتا ہو اور اس کے ہاتھ میں ہروقت سلگتا سگار ہو اس کے جہاز کی سلامتی تو ویسے بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ایک ذرا سی بے احتیاطی اور جہاز غرق۔ وہ ایک اچھا انجینئر تھا لیکن اس وقت جب نشے میں نہ ہو اور ایسے مواقع کم ہی آتے تھے جب وہ نشے میں نہ ہو۔ اس کے باوجود اسے عرب پرشین کمپنی سے نہ نکالا جاتا اگر وہ مکا مار کر ایک ایرانی ڈائریکٹر کی ناک نہ توڑ دیتا۔ اس نے جان گرے کو انجن روم میں سگار پیتے دیکھ لیا تھا اور بازپرس پر شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

''کوئی باسٹرڈ مجھے نہیں روک سکتا۔ میرا دل جو چاہے پیوں گا۔''

ممکن ہے کوئی عرب ڈائریکٹر ہوتا تو اس کی بے ہودگی خاموشی سے برداشت کر جاتا لیکن حسن رضا ایک تو ایرانی تھا۔ دوسرے سرپھرا تھا۔ اس نے جان گرے کے منہ سے سگار کھینچ لیا اور اسے گریبان سے پکڑ کر انجن روم سے باہر پھینک دیا۔ اس پر جان گرے نے اسے گھونسا مارا اور اس کی ناک توڑ دی۔ اس پر حسن رضا نے اس کی یادگار قسم کی مرمت لگائی تھی۔ ایک تو وہ جان گرے کے مقابلے میں نوجوان تھا۔ دوسرے جان گرے کو شراب نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ جان گرے کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ہاتھ پیر اس وقت چلانے چاہئیں جب ان میں دم ہو۔ دس منٹ کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تو حسن رضا نے اسے اٹھوا کر اس کے کیبن میں بھجوا دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ استعفیٰ لکھا اور اسے حسن رضا کے سامنے پھینک دیا۔

''خوب مسٹر جان گرے، قواعد کے مطابق تم دو مہینے کا نوٹس دیئے بغیر نوکری نہیں چھوڑ سکتے۔ ورنہ کمپنی تم پر مقدمہ کر دے گی اور ایرانی جیلیں زیادہ آرام دہ نہیں ہوتی ہیں اور اب مجھے اطلاع ملی کہ تم نے انجن روم میں شراب پی ہے یا سگار سلگایا ہے۔ تو میں تمہارے خلاف کارروائی کروں گا اور تمہیں ایک ڈالر دیئے بغیر خارش زدہ کتے کی طرح کمپنی سے نکال دوں گا۔''

جان گرے نے بعد میں حسن رضا کو انگریزی کی بے حد خوف ناک گالیاں دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ جانے سے پہلے کمپنی کی ایسی کی تیسی کر دے گا۔ بدقسمتی سے کمپنی کے اعلیٰ حکام نے اس کی دھمکیوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور وہ اسے صرف دھمکی ہی سمجھے تھے۔ اگر وہ اس کے ریکارڈ کو ذرا غور سے پڑھ لیتے تو ایسی غلطی نہ کرتے۔ جان گرے کو شپنگ کی دنیا میں شیطان اور منحوس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک یونانی آئل ٹینکر پر ملازمت کی۔ اس کی ملازمت کے چوتھے سال ٹینکر نہر سوئز سے نکلتے ہی تباہی کا شکار ہو گیا۔ آگ لگنے سے عملے کے بارہ





افراد مارے گئے تھے۔ کروڑوں ڈالر مالیت کا ٹینکر بھی غرقاب ہوا تھا لیکن تحقیقاتی ٹریبونل جان گرے کے خلاف کوئی ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ البتہ اسے ملازمت سے ضرور نکال دیا گیا۔

اس کے دو سال بعد جان گرے وہیل مچھلی شکار کرنے والے ایک ٹرالر پر ملازم ہو گیا۔ ایک سال بعد انجن روم میں دھماکا ہوا اور دو افراد مارے گئے۔ جان گرے ڈیوٹی پر تھا لیکن اسے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ ایک بار پھر اس کے خلاف کچھ ثابت نہ ہوا۔ حالانکہ ٹرالر کے کپتان کو سو فیصد یقین تھا کہ دھماکے میں جان گرے کا ہاتھ تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ایک ملاح سے جھگڑا کرنے پر کپتان نے اسے سرزنش کی تھی۔ اس بار بھی اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔

تیسرا سانحہ زیادہ اندوہناک ثابت ہوا تھا۔ اسے اس بار ایک کروز رشپ میں ملازمت ملی تھی اور وہ انجن انجینئر تھا۔ یورپ سے جزائر ترپن کی طرف جاتے ہوئے بیچ اوقیانوس میں کروز رشپ کے انجن روم میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بے حد پُراسرار واقعہ تھا کیونکہ نہ کوئی الارم بجا تھا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا آگ کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔ جلد آگ بے قابو ہو کر جہاز کے اکثر حصے کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ مسافروں کو فوری طور پر لائف بوٹس میں اتارا جانے لگا۔ مگر بدقسمتی سے نہ تو کشتیاں مناسب تعداد میں تھیں اور نہ ہی پاس سے کوئی دوسرا بحری جہاز گزر رہا تھا آگ اتنی سرعت سے پھیلی تھی کہ تین گھنٹے کے اندر جہاز جل کر غرقاب ہو گیا۔ کل بارہ سو افراد میں سے نو سو پچاس افراد کی جان بچائی جا سکی تھی۔ باقی افراد آگ یا سمندر کی نذر ہو گئے تھے۔ سانحہ نہایت سنگین تھا۔ اس کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کی گئی تھی لیکن جان گرے ایک بار پھر بری الذمہ قرار پایا۔ لوگوں کے ذہن میں بار بار سوال اٹھتا تھا کہ آخر یہ سارے حادثے وہیں کیوں ہوتے تھے۔ جہاں جان گرے کام کرتا تھا۔ یورپ کی میرین لائنز نے سفید فام ہونے کے ناتے جان گرے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی لیکن اسے آئندہ ملازمت کے لیے بلیک لسٹ قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی اسے یورپ یا امریکہ کی کسی شپنگ کمپنی میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اس کے بعد جان گرے نے یو اے ای کی ایک آئل فیلڈ میں ملازمت کر لی لیکن اس کے ذہن میں کوئی کجی تھی یا اس کے وجود میں خباثت بھری ہوئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا کسی نہ کسی حادثے کا سبب بن جاتا تھا۔ آئل فیلڈ میں ایک رات جو کنواں صفائی کی وجہ سے بند تھا کہ اس میں دھماکا ہو گیا۔ پمپنگ بند ہونے کی وجہ سے آگ تو نہ لگی لیکن کنوئیں کے پاس کام میں مشغول دو کارکن مارے گئے تھے۔ جان گرے کی ڈیوٹی اس کنوئیں پر تھی اور وہ دھماکے کے وقت وہاں نہیں تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ واش روم گیا تھا۔ یہ دھماکے سے ایک منٹ پہلے کی بات تھی۔ کئی افراد زخمی بھی ہوئے تھے لیکن جان گرے پر کوئی الزام نہ لگایا جا سکا۔ ڈیوٹی کے دوران واش روم جانا قابلِ گرفت بات نہیں تھی اور نہ ہی قواعد کے خلاف تھی لہٰذا ایک بار پھر جان گرے کے خلاف کچھ ثابت نہ ہو سکا اور اسے اس ملازمت سے بھی فارغ کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے ان ہی دنوں عرب پرشین کمپنی کو

ایک انجن روم کے انجینئر کی ضرورت درپیش آئی اور جب تک کمپنی کے اعلیٰ حکام کو جان جیفرسن گرے کے کرتوتوں کا علم ہوتا۔ وہ اس کا تقرر بہ طور چیف انجینئر کے بحری جہاز خلیج پر کر چکے تھے۔
یوں تو کمپنی کے پاس کئی ایک بحری جہاز تھے لیکن اس کا اصل کماؤ پوت خلیج ہی تھا۔

جان گرے میری تقرری سے خوش نہیں تھا اور اس نے اپنی نفرت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ان حرامیوں کو میری توہین مہنگی پڑے گی۔'' اس کے چہرے پر حسن رضا کے مکوں کے نشانات اب تک موجود تھے۔ ''اور تم یہ مت سمجھو کہ میری جگہ لے سکو گے۔''

''مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم بھی اپنی گفتگو پیشہ وارانہ امور تک محدود رکھو۔''

یہ شخص مجھے پہلی نظر میں ہی بُرا لگا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی کئی وجوہ تھیں۔ اول تو اس کی کہانیاں جو میرے علم میں آئی تھیں۔ دوم اس کی گفتگو، وہ بے حد بدتمیز آدمی تھا اور تیسری اس کی شخصیت۔ اس کے بل ڈاگ جیسے چہرے پر سؤر جیسی ننھی ننھی آنکھیں تھیں۔ جن سے ہمہ وقت ایک نوع کی کینہ توزی جھانکتی رہتی تھی۔ اس کے پھولے ہوئے چہرے سے عجیب سی خباثت ٹپکتی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا کے خلاف دل میں کینہ لیے بیٹھا ہو۔ البتہ وہ میرے رنگ وروپ سے دھوکا کھا گیا تھا۔

''مسٹر جوزف تمہارا تعلق کسی ویسٹرن کنٹری سے ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام یوسف ہے جوزف نہیں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ نو نو۔'' اس نے ہاتھ لہرایا تو اس کے ہاتھ میں دبے ٹن سے بیئر چھلک گئی تھی۔ ''یہ تو رنگ دار لوگوں کا ملک ہے۔ تم یورپ کے لگتے ہو۔ تمہاری رگوں میں یقیناً کسی سفید فام کا خون ہے کیا تمہاری ماں......''

''مسٹر گرے بہتر ہوگا تم اپنا منہ بند رکھو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔ ''ابھی تمہارے پرانے زخم صحیح طرح سے نہیں بھرے ہیں۔''

وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم میں برداشت کم ہے۔ خیر ہم کچھ تکنیکی نوعیت کی گفتگو کرتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے انجن اور اس کے بارے میں مجھ سے سوالات شروع کیے۔ یہ ایک طرح کا انٹرویو تھا جس کے بعد اس نے مجھے صرف اس لیے پاس کر دیا تھا کہ میرا رنگ سفید تھا۔

''تمہاری جگہ کوئی کالا ڈرٹی ہوتا تو میں اسے انجن روم میں گھسنے بھی نہ دیتا۔''

قواعد کے مطابق جب تک وہ چیف انجینئر تھا اس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص انجن روم میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ کچھ ہی عرصے میں جہاز سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔ اس کی باتیں سن کر پہلی ہی ملاقات میں مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ وہ مجھ سے بھی مار کھاتا اور بحری قوانین کے مطابق اگر کوئی جونیئر اپنے سینئر پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے سنگین جرم میں شمار





کیا جاتا ہے اور اگر یہ جرم کسی ملاح سے سرزد ہو تو اسے بغاوت سے کم نہیں سمجھا جاتا ہے۔

میں نے منیلا سے خلیج کے عملے میں شمولیت اختیار کی تھی۔ خلیج مال بردار بحری جہاز تھا۔ جو خلیج فارس سے لے کر فلپائن اور جاپان کے درمیانی راستوں پر سفر کرتا تھا۔ اسے دنیا کا معروف ترین بحری روٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔ پروگرام کے مطابق جان گرے کو بمبئی سے رخصت ہو جانا تھا۔ کمپنی نے اس کے لیے بمبئی سے نیویارک تک کے فضائی سفر کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے جان گرے کے بارے میں جتنا سنا تھا اسے اس سے بڑھ کر خبیث فطرت پایا۔ اس کے ساتھ کام کرنا کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ وہ اکثر ایسی جگہوں پر بھی تمباکو نوشی کرنے لگتا تھا۔ جہاں ایک چنگاری بھی پورے جہاز کی تباہی کا باعث بن سکتی تھی۔ اس موقع پر انجن روم میں موجود ہر فرد کی جان پر بن آتی تھی۔ عملے کی فکرمندی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ ان بے چاروں کو اپنے کام پر بھی نظر رکھنا ہوتی تھی۔ وہ کہاں تک جان گرے کی نگرانی کرتے۔ میرے آنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میری قبل از وقت تقرری کا مقصد بھی یہی تھا کہ میں جان گرے پر نظر رکھوں اور اسے کوئی خطرناک حرکت نہ کرنے دوں۔

وہ جب بھی انجن روم میں شراب نوشی کرتا تھا یا سگار سلگاتا تو ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا کرتا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اگر مجھے روک سکتے ہو تو روک کر دکھاؤ۔'' میں کئی روز تک اس کی یہ مسکراہٹ برداشت کرتا رہا۔ یہ منیلا سے روانگی کے دوسرے دن کی بات تھی۔ جان گرے نے حسب معمول انجن روم میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ سگار سلگایا اور جلتی تیلی بجھائے بغیر بے پروائی سے فرش پر پھینک دی۔ خوش قسمتی سے تیلی فرش پر گرنے سے پہلے ہی بجھ گئی تھی۔ یہ بتا دوں کہ بحری جہاز کے انجن عام طور سے ڈیزل یا فرنس آئل سے چلتے ہیں اور دونوں کے استعمال سے انجن روم گندہ ہوتا رہتا ہے خاص طور سے فرش اور دیواروں پر تیل جم جاتا ہے اور کسی بھی حادثے کی صورت میں یہ بے حد تیزی سے آگ پکڑتا ہے۔ اگر جلتی تیلی فرش پر گر جاتی تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرش آگ پکڑ لیتا۔

مارے طیش کے میرا خون سر میں جمع ہونے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے سگار جان گرے کے منہ سے کھینچ لیا اور سرد لہجے میں کہا۔ ''مسٹر گرے انجن روم میں آگ جلانا منع ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔''

''ڈیم اِٹ۔'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میرے منہ سے سگار کھینچو۔''

''اگر تمہیں یہ بات بُری لگی ہے تو تم کپتان سے شکایت کر سکتے ہو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''لیکن آئندہ میں انجن روم میں کسی کو آگ جلانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''تم کون ہوتے ہو۔'' اس نے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

"میں۔" میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "ابھی تو میں ڈپٹی چیف انجینئر ہوں اور چند دن بعد چیف انجینئر بن جاؤں گا۔ اس کے علاوہ سیکیورٹی کے لیے بنائے گئے اصولوں پر عمل کرنے کے لیے کوئی انجن مین بھی تمہیں مجبور کر سکتا ہے۔" وہ کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر عملے کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

"کیا دیکھ رہے ہو کتیا کے بچو، اپنا کام کرو۔" اس نے کارکنوں کو چند اور غلیظ گالیوں سے نوازا لیکن وہ بدمزہ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے جان گرے کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ ان کے لیے باعثِ تسکین تھا۔ اس واقعے کے بعد جان گرے کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کوندنے لگی تھی۔ وہ جب میری طرف دیکھتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ نفرت کے ان کوندوں سے جلا کر مجھے خاکستر کر دے گا۔ نفرت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ بچپن سے میں نفرتیں دیکھتا آ رہا تھا بہت کم عمری میں اس لفظ کو اس کے پورے مفہوم سمیت جان گیا تھا۔



جب میں نے پہلی بار بہ حیثیت ڈپٹی چیف انجینئر انجن روم میں قدم رکھا تو پورا عملہ پریشان ہو گیا تھا کہ ابھی ایک خبیث گورے سے جان چھوٹی نہیں تھی کہ دوسرا آ گیا۔ کسی نے فورمین گپتا سین جی سے کہا۔

"جا بھئی سلامی دے ڈپٹی انجینئر صاحب کو۔ یہ معلوم کر کہ یہ کیا پیے گا یہاں، چرس یا ہیروئن۔"

"ویلکم ٹو انجن روم سر۔" گپتا نے شرافت سے انگریزی میں کہا۔ بدمعاشی اس نے اُردو میں کی تھی۔ "ہندوستان سے دفع ہو جانے والے گدھے، تو پھر آ گیا ہے۔" اس نے کہا اور دوبارہ انگریزی میں بولا۔ "مجھے گپتا سین جی کہتے ہیں۔"

"تھینک یو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "باقی کا تعارف بھی کرا دو۔"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے کہا اور ایک چھوٹے قد کے نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ احمد علی ہے فرام ملائشیا۔" وہ بولا پھر اُردو میں کہا۔ "یہ گورے سوروؤں سے بہت چڑتا ہے۔"

"یہ عبدالمنان ہے۔ بنگلہ دیش کا۔" اس نے کہا اور بہ ظاہر عبدالمنان سے بولا۔ "اس اولادِ خر نے مجھے نوکر سمجھ رکھا ہے۔"

"یہ شیخ منصور ہے فرام یمن۔ پکا بنیاد پرست ہے کسی دن تجھے سمندر میں دھکا دے دے گا۔"

"کلا تنا داس فرام سری لنکا۔"

"اور یہ دیوانگ جو ہے چینی نسل کا مگر تھائی لینڈ میں رہتا ہے۔ (اس کا بس چلے تو تمام گوروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر سب سے بڑا ہائیڈروجن بم گرا دے خس کم جہاں پاک)

وہ سب یوں مسکرا رہے تھے جیسے مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہوں لیکن ان کے دانت گپتا کے





ارشادات پر نکلے پڑ رہے تھے۔ میں نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور آخر میں گپتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے پہلے انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُردو میں بولا۔ "تمہاری فارسی بھی اچھی ہے اُردو کے علاوہ۔"

غالباً انجن روم کا فرش پھاڑ کر کوئی شارک سمندر سے نکل آتی تب بھی وہ اتنے حیران نہ ہوتے۔ وہ سب بدحواس ہو گئے تھے لیکن گپتا سین جی کی حالت تو بُری تھی۔ ساری بکواس اس نے کی تھی۔

"آپ...... آپ ہندی جانتے ہیں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"اُردو۔" میں نے تصحیح کی۔ "اور میں گورا بھی نہیں ہوں میرا نام یوسف ہے۔"

"تب تو آپ پٹھان ہوں گے۔" گپتا نے خوش ہو کر کہا۔ "اپنے دلیپ کمار کی طرح اس کا نام بھی یوسف خان ہے۔" پھر اسے خیال آیا کہ وہ ایک افسر کے ساتھ کس درجے کی گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہے تو اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"صاب مجھے معاف کر دو، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اپنے علاقے کے رہنے والے ہو۔"

میں نے ذرا تفریح لینے کے لیے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "معافی تو ممکن نہیں ہے اس طرح ہر خطا کار معافی مانگ کر بچتا رہا تو جہاز چل چکا۔"

گپتا کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "صاب میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"میرے تو وہ بھی نہیں ہیں۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"صاب اگر آپ نے رپورٹ کر دی تو مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ پہلے ہی وہ حرا......"

اسے کہتے کہتے خیال آیا کہ وہ ایک افسر کے سامنے دوسرے افسر کو گالی دے رہا ہے۔ "م...... میرا مطلب ہے کہ جان گرے صاب نے اوپر میری بہت ساری شکایتیں لگائی ہیں۔ صاب میرے ساتھ بہت بُرا ہو گا۔"

اس بار میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ "چلو حساب برابر ہوا۔ میں نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم نے مجھے سنا ڈالیں۔"

"آپ نے مجھے معاف کر دیا صاب۔" گپتا خوش ہو گیا تھا۔

"معاف تو خیر نہیں کیا۔" میں ایک کرسی پر ٹک گیا۔ "لیکن کچھ پینے کو مل جائے تو اس پر غور بھی کیا جا سکتا ہے۔"

گپتا کا منہ اُتر گیا۔ "صاب ہم تو غریب لوگ ہیں۔ پینے پلانے کو کہاں سے لائیں یہ سہولت تو آپ جیسے افسر لوگوں کو ملتی ہے۔"

"احمق میں اس پینے والی شے کا ذکر نہیں کر رہا تم لوگوں نے چائے، کافی کا کوئی بندوبست تو کر رکھا ہے۔"

"کیوں نہیں صاب یہ اپنا منصور شیخ ایسی چائے بناتا ہے کہ بس۔ جا منصور، صاب کے لیے چائے بنا کر لا۔"

اپنی بلا شیخ کے سر ڈالے جانے پر اس نے خونخوار نظروں سے گپتا کی طرف دیکھا لیکن میرے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی لہٰذا اس نے جا کر چائے بنانا زیادہ مناسب سمجھا۔ چائے کے دوران میں نے ان لوگوں سے انٹرویو لیے۔ ذاتی بھی اور کام کے حوالے سے بھی۔ وہ سب نچلے طبقے کے سادہ دل لوگ تھے۔ جو ہر ملک میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ جلد ہی میرا رویہ بھانپ کر مجھ سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ حالانکہ میں جہاز میں سیکنڈ آفیسر تھا۔ بہ لحاظ عہدہ صرف کپتان اور فرسٹ آفیسر معاذ مجھ سے برتر تھے۔ فی الوقت تو جان گرے میرا باس تھا لیکن یہ چند دن کی بات تھی اس کے بعد دوران سفر کپتان اور فرسٹ آفیسر اگر رضائے الٰہی سے انتقال کر جاتے تو کپتانی کا اعزاز میرے حصے میں آتا۔

بحری جہازوں کے عملے میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ جہاز کے افسران اور خاص طور سے انجینئر نچلے عملے سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور اسے اپنی افسری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اپنے طور پر وہ حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور یہ رویہ ان کی تعلیم کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے۔ جب سے جہاز رانی شروع ہوئی ہے یہ اصول چلا آ رہا ہے کہ بحری جہازوں کے نچلے طبقے کو دبا کر رکھو ورنہ وہ تم پر حاوی ہو جائے گا۔ دراصل جہازوں پر کام کرنے والے اکثر ملاح کچھ بدمعاش قسم کے ہوتے ہیں خود جہاز راں کمپنیاں بدمعاشوں کو ملاح رکھنا پسند کرتی ہیں تا کہ کسی ہنگامی موقع اور خاص طور سے بحری قزاقی کی وارداتوں میں کام آئیں۔ شریف قسم کے لوگ عام طور سے خود ہی بحری جہازوں پر کام کرنے سے گھبراتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کپتان اور جہاز کے دوسرے افسران عملے سے میری بے تکلفی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

بات صرف اتنی تھی کہ میرے دماغ میں حاکم طبقے کی وہ خُو بُو نہیں تھی جو فرعون بننے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ اگرچہ دنیا جسے میرا باپ سمجھتی تھی وہ خود حاکم نظر آنے والا اور خود کو حاکم سمجھنے والا شخص تھا۔ وہ براہِ راست بحری جہاز پر سیکنڈ آفیسر بنا تھا اور اس کے بعد جب تک زندہ رہا اپنے بحری جہاز پر کپتان رہا تھا۔ جمشید پیلس میں اس کا رویہ حاکمانہ ہوتا تھا اور بیوی بچے سب اس سے دبا کرتے تھے سوائے ایک ہستی کے۔ یعنی کاجل، اس کے سامنے وہ خود موم ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان شاید یہی بات مشترک تھی۔



اس روز بحری جہاز پر جان گرے کا آخری دن تھا۔ ہمیں بمبئی میں لنگر انداز ہوئے تیسرا دن تھا اور کل صبح خلیج اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا۔ جب جان گرے نے مجھے انجن روم کا چارج دیا تو اس وقت بھی وہ نشے میں دھت تھا اور اس کے ہاتھ میں سلگتا سگار تھا۔ کیونکہ وہ سگار باہر سے لے





کر آیا تھا اور محض ایک منٹ کی بات تھی۔ اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ اس نے بے پروائی سے چارج شیٹ پر سائن کیے اور اس کے بعد وہ حرکت کی کہ ایک لمحے کو ہم سب کے دل رُک گئے تھے۔ اس نے بہ ظاہر غلطی سے لیکن درحقیقت جان بوجھ کر اپنا سگار انجن روم میں فرش کے اس حصے میں گرا دیا جو فرنس آئل سے چکٹ ہو رہا تھا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا اور میں نے تقریباً جست لگاتے ہوئے فرش سے سگار اٹھا لیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو فرش آگ پکڑ لیتا۔ خوش قسمتی سے سگار میں حرارت کم ہوتی ہے اور اسے اگر چند سیکنڈ ہوا نہ ملے تو یہ بجھ جاتا ہے۔ جب میں کھڑا ہوا تو انجن روم کے عملے کا خوف غصے میں ڈھل چکا تھا۔ اب جان گرے ان کا افسر نہیں رہا تھا جس کا وہ احترام کرتے، احمد علی سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ تھا۔ اس نے پائپ بلند کیا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھوڑ دو ہم کو صاحب۔" اس نے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ "آج میں اس کتیا کے بچے کا سر کھول دوں گا۔"

"پاگل ہو گیا، جو اس کے گندے خون سے ہاتھ رنگنا چاہ رہے ہو۔" میں نے چلا کر کہا۔ احمد علی جنون کی کیفیت میں تھا میں جان گرے پر دھاڑا۔ "دفع کیوں نہیں ہو جاتے یہاں سے کیا کتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟"

اس نے اطمینان سے ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور انگلیوں کو ہلاتا انجن روم سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی احمد علی کا جوش بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ وہ چوبیس برس کا ملا ایشین نوجوان تھا۔ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ اسے جان گرے کی موجودگی میں ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ اگر وہ کسی حادثے میں مارا گیا تو اس کے گھر والوں کا کیا بنے گا۔ روانگی سے پہلے جہاز کی ضروری دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ تا کہ راستے میں کوئی مسئلہ درپیش نہ آئے۔ صبح چھ بجے کپتان نے جہاز کے انجن چلانے کا حکم دیا اور اس کے دو گھنٹے بعد ہم بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری اگلی منزل یمن کی بندرگاہ عدن تھی۔ جان گرے کے جانے کے بعد انجن روم کا عملہ ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ جیسے ان کے درمیان سے کوئی زہریلا سانپ چلا گیا ہو، جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ کب کس کو کاٹ لے گا۔

کپتان نے حکم دیا تھا کہ بحری جہاز کی رفتار دس ناٹ فی گھنٹہ رکھی جائے۔ جو معمول کی رفتار سے دو ناٹ کم تھی۔ شاید اس وجہ سے موسمی سیارے نے بحیرہ عرب کی جو رپورٹ دی تھی۔ اس کے مطابق بمبئی سے ڈیڑھ سو میل دور کھلے سمندر میں درمیانے درجے کا طوفان آیا ہوا تھا۔ جو بتدریج مشرق کی طرف سے سرک رہا تھا۔ بحری جہاز کا روٹ اس طوفان سے گزرتا تھا۔ رفتار کم ہونے کی وجہ سے جب تک خلیج سمندر کے اس حصے میں پہنچتا طوفان کا شدت والا حصہ مشرق کی طرف جا چکا ہوتا اور ہمیں طوفان کے کم شدت والے حصے سے واسطہ پڑتا۔

شام چار بجے تک ہم بمبئی سے سو ناٹیکل میل کے فاصلے پر آ گئے تھے۔ میں گزشتہ سولہ گھنٹے سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا اور تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ چار بجے میں نے چارج اپنے نائب صام کو دیا اور سونے کے لیے اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں معاذ مل گیا۔ وہ خاصے خوش گوار موڈ میں تھا۔

"یوسف سونے جا رہے ہو۔ اتنی سہانی شام کو۔"

"ابھی کچھ دیر بعد سمندر زیروزبر ہو جائے گا اور آسمان پر سیاہ بادل چھا جائیں گے۔ تب شام اتنی سہانی نہیں رہے گی۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔"

معاذ ہنسنے لگا۔ "میری بات نوٹ کر لو۔ رات آٹھ بجے کے بعد جہاز پر کوئی مردہ بھی ہوا تو جاگ جائے گا۔ ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

مجھے خیال آیا کہ کافی کا صرف بہانہ تھا۔ ورنہ اس کا مطلب کچھ اور تھا۔ اس سے میرے اس قسم کے تعلقات نہیں تھے کہ وہ مجھے کافی کی دعوت دیتا لیکن میں نے دعوت قبول کر لی۔ تاکہ اس کے قلب میں چھپی بات جان سکوں۔ خلیج کے اگلے حصے میں نچلے عرشے پر جہاز کا میس اور باورچی خانہ تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں جڑے شفاف پلاسٹک سے دور تک پھیلے سمندر اور آسمان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تک طوفان کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے جہاز بے حد معمولی سے ہلکورے لے رہا تھا۔

"طوفان آنے کی صورت میں ہمیں خلیج کا رُخ جنوب مغرب کی طرف کرنا پڑے گا۔" معاذ نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا تعلق نیوی گیشن سے تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کن حالات میں جہاز کو کیسے چلانا چاہیے۔

"یعنی ہم اپنی اصل منزل سے ہٹ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے شانے ہلائے۔ "مجبوری ہے تاخیر سے پہنچنا بہتر ہے کبھی نہ پہنچنے کے مقابلے میں۔"

باورچی نے مستعدی سے مُڑ کر کافی ہمارے سامنے سجائی۔ ایک کپ میں کریم اور ساتھ میں چینی کے کیوب بھی تھے۔ معاذ نے عربوں کی روایت کے مطابق بغیر کریم اور چینی کے کافی لی تھی۔ البتہ اس کڑوے مشروب کو بغیر چینی کے حلق سے اُتارنا میرے لیے محال تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے کپ میں کئی عدد چینی کے کیوب ڈال لیے اور اس کے بعد کپ کو اوپر تک کریم سے بھر لیا۔

"جان گرے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"ظاہر ہے اچھا نہیں ہے اگر میں آج اسے نہ بچاتا تو اس وقت وہ سیل پیک تابوت میں امریکہ جا رہا ہوتا۔" معاذ چونکا۔

"کیا ہوا تھا؟"

اسے انجن روم میں پیش آنے والے اس واقعے کا علم نہیں تھا کیونکہ میں نے کپتان کو اس کی





رپورٹ نہیں کی تھی۔ میں نے تفصیل سے اسے انجن روم کے واقعے اور جان گرے کی شرارت کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔

"یہ جان گرے بہت کمینہ آدمی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میں پریشان ہو گیا ہوں۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟" میں نے بہ غور اسے دیکھا۔

"عجیب بات کہی تھی اس نے۔" معاذ نے سر جھٹکا۔ "اس نے کہا تھا کہ چوتھے سے ہوشیار رہنا۔ ورنہ غرق ہو جاؤ گے۔"

"کون چوتھا؟"

"مجھے نہیں معلوم، لیکن شبہ ہے کہ وہ جاتے جاتے کوئی حرامی پن کر گیا ہے۔ تم نے انجن روم کا معائنہ کیا تھا؟"

یہ بات میرے اور انجن روم کے عملے کے ذہن میں بھی تھی۔ جان گرے کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ شخص بلاوجہ ہی حادثات کے لیے بدنام نہیں ہوا تھا۔ ہم نے روانگی سے پہلے انجن کا بھرپور معائنہ کیا تھا لیکن کوئی گڑبڑ سامنے نہیں آئی تھی۔ انجن اور اس کی مشینری بالکل درست کام کر رہی تھی۔ میں نے معاذ کو بتایا تو وہ بولا۔

"تم اسے نہیں جانتے، فریب کاری کے معاملے میں اس کے پاس شیطان کا دماغ ہے اور پھر انجنوں کے بارے میں وہ اکیلا اتنا جانتا ہے کہ اس بحری جہاز پر موجود تمام لوگ مل کر بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کی بات سے پریشان ہوں۔"

"اس نے تم سے کب یہ بات کہی تھی؟"

"بمبئی میں جہاز سے اُترنے سے کچھ ہی پہلے۔" معاذ نے بتایا۔

میں معاذ حسین کی بات کو صرف وہم قرار نہیں دے سکتا تھا۔ سمندر میں خطرات کا مقابلہ کرنے والے بہت تیز چھٹی حس رکھتے ہیں۔ جو انہیں بہت سے آنے والے حادثات سے پیشگی باخبر کر دیتی ہے۔ معاذ کی بات میں وزن تھا۔ جان گرے جیسا شخص اگر خاموشی سے رخصت ہو جاتا تب بھی خطرہ تھا اور اب تو وہ جاتے جاتے ایک تشویش ناک بات کر گیا تھا۔ چوتھے سے آخر اس کی کیا مراد تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ انجن روم میں کچھ چھپا کر نہیں گیا تھا۔ اس صورت میں وہ چیز عملے کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی۔ معاذ بھی اس چوتھے کی پہیلی نہیں بوجھ سکا تھا۔ جو اس جہاز کو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا اور اس کے عملے کے ایک ایک فرد سے اچھی طرح واقف تھا۔

اس کے باوجود اپنے کیبن میں جانے سے پہلے میں نے انجن روم کا چکر لگا کر عملے کو محتاط رہنے اور انجن کی مشینری پر نظر رکھنے کو کہا اور پھر اپنے کیبن میں آ گیا۔ یہ جہاز کے نچلے عرشے پر کپتان اور جہاز کے دیگر افسران کے کیبنوں والے حصے میں تھا۔ کیبن دس بائی دس کا تھا۔ اس میں

ایک الماری اور ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف مسہری تھی۔ چھت پر ایک سیلنگ فین تھا اور مرکزی ایئر کنڈیشننگ کا نظام اندر ٹھنڈی ہوا پھینکنے اور گرم اور گندی ہوا باہر نکالنے کا کام بہ خوبی کر رہا تھا۔ انجن روم کے پُرتپش ماحول کے مقابلے میں یہ خنک کیبن کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ میرے بستر کے اوپر دیوار میں ایک فٹ قطر کا پورٹ ہول تھا۔ اس میں لگے شیشے سے باہر بپھرتی لہروں کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اگرچہ یہ پانی سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر تھا لیکن جب اونچی لہریں اُٹھ رہی ہوں تو پانی شیشے تک چلا آتا تھا اور بعض اوقات تو پانی کی چادر اس پر اتنی دیر تک تنی رہتی تھی کہ لگتا تھا جہاز زیرآب چلا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ ایک پُرہول نظارہ ہوتا لیکن جہاز پر رہنے والوں کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ میں نے کپڑے اتارے اور تھکن اتنی ہو رہی تھی کہ دوسرے کپڑے چڑھانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ لہٰذا ایسے ہی روشنی بجھا کر لیٹ گیا۔ تاریکی انسان کا پردہ رکھ لیتی ہے۔ میں بہ مشکل دو گھنٹے سو سکا ہوں گا کہ پہلے تو طوفان آ گیا اور اس کے بعد کپتان کا ایمرجنسی بلاوا آ گیا۔ جان گرے کا کیا دھرا سامنے آ گیا تھا اور خلیج ڈوبنے کے خطرے سے دوچار تھا مگر خدا کو ہم سب کی زندگی منظور تھی اس لیے بچ گئے تھے۔



وہ سب باری باری انجن روم میں داخل ہوئے، شرم سار اور مجھ سے نظریں چراتے ہوئے ان کا ضمیر انہیں ملامت کر رہا تھا کہ وہ مشکل گھڑی میں میری مدد کرنے کے بجائے بھاگ گئے تھے لیکن میں انہیں قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ زندہ تو میں بھی رہنا چاہتا تھا لیکن ان پر ان کے علاوہ بھی کتنی ہی جانوں کا قرض تھا۔ ان کے پیروں میں ماں باپ، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں جیسی اَن دیکھی زنجیریں تھیں۔ یہ زنجیریں انہیں خطرے کی حد میں جانے سے روکتی تھیں۔ وہ اپنی جان گنوا کر ان سب کو بے سہارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب شرمندگی کے ساتھ ان کے چہروں پر تحریر تھا۔ میں نے ان کا احساس شرمندگی کم کرنے کے لیے کہا۔

”یارو اس میں منہ لٹکانے کی کیا بات ہے۔ اب تو خطرہ جان گرے کی طرح دفع ہو گیا ہے۔“

گپتا بولا۔ ”صاب مذاق مت کرو موت ہمیں چھو کر گزری ہے ذرا اپنی حالت دیکھیں۔“

اور جب میں نے اپنے لرزتے ہاتھ دیکھے تو حیران رہ گیا تھا۔ مجھے احساس نہیں ہوا تھا لیکن زندگی اور موت کی کش مکش نے میرے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یک دم مجھے شدید تھکن کا احساس ہونے لگا تھا جو شدید اعصابی کشیدگی کے بعد ملنے والے سکون کا قدرتی نتیجہ تھا۔ احمد علی نے مجھے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس دیا تو میرے اعصاب رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتے چلے گئے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ایسی صورتیں مت بناؤ بنانا ہے تو کوئی چائے کافی بناؤ۔“

باہر طوفان اپنے عروج پر تھا۔ اس کی شدت بڑھ گئی تھی لیکن انجن روم والا حصہ ایک تو زیرآب





تھا اور دوسرے یہ بحری جہاز کے تقریباً درمیانی حصے میں تھا۔ لہٰذا یہاں جھٹکے اتنے زیادہ شدید نہیں تھے۔ اس کی ایک مثال گھومتی ہوئی چکی ہوتی ہے۔ جس کا مرکزی حصہ کناروں کی نسبت سُستی سے حرکت کرتا ہے۔ مرکز کے توازن کی وجہ سے انجن روم میں طوفان کے اثرات نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے انٹرکام پر کپتان برج سے رابطہ قائم کیا۔ کپتان صلاح الدین کو معاملے کی نوعیت سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ وہ ایک تجربے کار شخص تھا۔

”مسٹر یوسف میں نیچے آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

کپتان برج اور انجن روم میں اچھا خاصا فاصلہ تھا لیکن کپتان صلاح الدین صرف پانچ منٹ بعد انجن روم میں داخل ہو رہا تھا۔ تمام عملہ کپتان کی آمد پر الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے رپورٹ لی پھر بوائلر اور اس کے والوز کا معائنہ کیا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تباہی کس حد تک قریب آ کر ٹل گئی تھی۔ کم از کم انجن روم کی حد تک۔ اس نے مزید کچھ پوچھنے کے بجائے مجھ سے کہا۔

”تمام والوز کھلوا کر ان کی صفائی کرواؤ۔ دوسر ے بوائلرز بھی چیک کر لو تب تک ہم سمندر میں اس جگہ لنگر انداز رہیں گے اور ہاں اس کے بعد آ کر مجھ سے ملو۔ میرے کیبن میں۔“

میں نے عملے کو ہدایات دیں اور جب وہ اپنے کام میں لگ گئے تو میں انجن روم سے نکلا۔ فولادی سیڑھیاں چڑھتے اور راہداریاں عبور کرتے ہوئے کپتان کے کمرے تک جا پہنچا۔ اس کا پُرتعیش کیبن سائز میں میرے کیبن سے دگنا بڑا تھا۔ اس کی آرائش لاجواب تھی۔ درمیان میں جہازی سائز مسہری تھی۔ جس پر دبیز گدا تھا۔ دیواروں پر لکڑی کے منقش پینل تھے۔ ایک طرف تین پٹ کی الماری تھی۔ دائیں طرف کونے میں مہاگنی کی قیمتی رائٹنگ ٹیبل تھی۔ جس پر تحریر کے لیے اعلیٰ درجے کا سامان موجود تھا۔ مسہری کے عین سامنے ایک دیوار گیر ریک میں بڑے سائز کا ٹی وی تھا۔ جس کے ساتھ وی سی آر منسلک تھا۔ یہ سیٹلائٹ چینلز سے منسلک نظام تھا۔ محض ایک بٹن دبا کر دنیا کا کوئی بھی چینل دیکھا جا سکتا تھا۔ ریک کے نچلے خانوں میں کوئی دو سو کے قریب ویڈیو کیٹس رکھے تھے۔ اس کے پاس ہی بہترین قسم کا میوزک سسٹم نصب تھا۔ جس کے ساتھ لاتعداد کیسٹس بھی تھے۔ یہ پورا سسٹم ایک ہی ریموٹ کنٹرول سے کام کرتا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل کے پاس دو ایزی چیئرز بھی موجود تھیں۔ صلاح الدین نے مجھے ان کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور خود دیوار میں فکس ایک مختصر سے بار سے شیوارز کی بوتل نکالنے لگا۔ اس نے پہلے اپنے لیے جام بھرا۔ جب وہ دوسرا جام ڈالنے لگا تو میں بول اٹھا۔

”معاف کیجیے کیپٹن میں نہیں پیتا۔“

اس نے ایک لفظ کہے بغیر بوتل واپس بار میں رکھ دی اور میری طرف گھوما۔ ”کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔“

''شکریہ کیپٹن۔'' میں بیٹھ گیا۔'' بیٹھنے کے بجائے جام سے چسکیاں لیتے ہوئے ٹہلنے لگا تھا۔ اچانک وہ رکا۔

''تمہارے خیال میں یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔''

''جان گرے کی۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''یہ اس کا کام ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ پھر اسے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح جان گرے نے روانگی کے وقت سیکنڈ آفیسر معاذ کو چار نمبر سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا اور دھمکی تھی کہ ممکن ہے یہ چوتھا جہاز کو غرق کرنے کا سبب بن جائے۔'' اس کی دھمکی درست نکلی جب بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام پائے گئے تھے اور یہ کام جان گرے ہی کر سکتا ہے۔ انجن روم کا چیف انجینئر ہونے کے ناتے اسے والوز جام کرنے کا موقع ہمہ وقت میسر تھا۔ اس نے یہ کام اس وقت کیا ہوگا جب انجن روم کا عملہ پورٹ پر تفریح کے لیے گیا تھا۔ اس جیسے ماہر شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ اس کے سابقہ ریکارڈ کو ذہن میں رکھیں تو اس کے سوا کوئی یہ حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ مجرم ہے کیپٹن۔''

اس نے پُرتحسین نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مسٹر یوسف یو آرے بریومین، تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگر بوائلر پھٹ جاتا تو ہم سب اس وقت سمندر میں ہوتے۔ تم جانتے ہو کہ جس جگہ بوائلر نمبر چار ہے اس جگہ جہاز کے پیندے کی چادر ایک زیرِ آب چٹان سے ٹکرانے کی وجہ سے پھٹ چکی ہے۔ بعد میں اسے ویلڈنگ کر کے جوڑ دیا گیا تھا۔ وہ دو نمبر کام تھا جو کمپنی نے جہاز کے انشورنس کے پریمیم میں اضافے کے خدشے سے چھپ کر کرایا تھا۔ بوائلر کے پھٹنے سے یہ جوڑ کھل جاتا تو اس طوفانی موسم میں بحری جہاز کو ڈوبنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔''

''کیا جان گرے یہ بات جانتا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے کیپٹن کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے چیف انجینئر کی حیثیت سے اس سے یہ بات کیسے چھپائی جا سکتی تھی۔'' کپتان نے جام خالی کر کے میز پر پٹخ دیا۔ ''ہی از اے رئیل باسٹرڈ۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اس نے کوئی کیمیکل سلوشن استعمال کیا تھا۔ اگر اس نے کوئی دھاتی بونڈ ڈالا ہوتا تو والو کھولنا ناممکن ہوتا۔ بوائلر پھٹ جاتا اور پھر نہ جانے خلیج اور اس کے عملے کا کیا ہوتا نہ جانے ہم میں سے کتنے بچتے اور کتنے سمندر کی نذر ہو جاتے۔ یہ یقیناً قتل عام ہوتا کیا ہم جان گرے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے کیپٹن؟''

کپتان صلاح الدین کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''نہیں ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''اس نے خود معاذ کے سامنے اعتراف کیا تھا پھر بوائلر کے والوز میں ڈالا گیا سلوشن، کیا یہ ثبوت کے لیے کافی نہیں ہیں؟''





کپتان صلاح الدین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اس بات سے صاف مکر جائے گا۔ اس نے معاذ سے ایسی کوئی بات کہی تھی اسے کسی نے والوز میں سلوشن ڈالتے نہیں دیکھا۔''

''گویا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ سب کچھ کر کے بھی آرام سے بچ نکلا۔ اگر تقدیر ہمارا ساتھ نہ دیتی تو وہ کامیاب ہو چکا ہوتا۔ ہم کوشش تو کر سکتے ہیں کم از کم اس معاملے کو سب کے سامنے لا سکتے ہیں۔''

کپتان صلاح الدین نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''کمپنی اس کی اجازت نہیں دے گی۔''

''صرف اس لیے کہ وہ ایک امریکی ہے۔'' میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

''تم کہہ سکتے ہو۔'' کپتان صلاح الدین دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ ''اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی بے سود ہی ہوگی۔ اول تو ہمارے پاس کوئی ثبوت و گواہ نہیں ہے۔ دوسرے ہم اسے گرفتار کر بھی لیتے ہیں تو اسے کہاں لے جاتے اور اس پر کس ملک میں مقدمہ چلاتے اور کس قانون کے تحت لاتے۔ کیا امریکی حکومت اپنے ایک شہری کی گرفتاری برداشت کر لیتی۔ اگر ہم جان گرے کو ایران کے حوالے کر دیتے تو امریکہ کمپنی پر پابندی لگا دے گا۔ خود ہمارے حکمران ہمارے خلاف کارروائی کرتے۔'' کپتان صلاح الدین کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

میں دم بہ خود سا سوچ رہا تھا۔ جمہوریت انسانی حقوق اور انسانی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والا یہ ملک اپنے شہریوں کے لیے دہرا معیار رکھتا تھا۔ اپنے مجرموں کو وہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے گرفتار کرنے یا مار ڈالنے کا حق محفوظ رکھتا ہے مگر اپنے ملک کے کسی شہری کی گرفتاری کا حق دوسرے ملک کو نہیں دیتا۔ تیسری دنیا کی ایک آزاد اور خود مختار جہاز راں کمپنی اپنے معاملات میں اس کے سامنے بے بس تھی۔ کیونکہ وہ تیسری دنیا کے ان ملکوں کا بھی حاکم تھا۔ میں نے سر جھٹکا یہ بین الاقوامی سیاست تھی جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ جان گرے جیسا شخص ہم اکتیس افراد کی زندگیوں سے کھیل کر کتنی آسانی سے اپنے ملک چلا گیا تھا اور ہم اسے روکنے کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ موت کتنے قریب سے ہمارے پاس سے گزر گئی تھی۔

کپتان صلاح الدین کے پاس سے میں واپس انجن روم میں آیا۔ جہاں صام کی نگرانی میں بوائلرز کے دوسرے والوز بھی کھول کر ان کی چوڑیوں کی اینٹی سلوشن محلول سے صفائی کی جا رہی تھی۔ میں دوپہر ایک بجے تک اپنی نگرانی میں کام کراتا رہا۔ پھر چارج صام کو دے کر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے کی بے آرامی، طوفان کے جھٹکوں اور سب سے بڑھ کر اعصابی کشیدگی نے میرے جوڑ جوڑ کو دکھا دیا تھا۔ اس روز میرا جسم بُری طرح متاثر ہوا تھا میں نے آ کر گرم پانی سے غسل کیا اور پانی کے ساتھ چار اسپرین لیں۔ باہر جاری طوفان سے جہاز اب بھی بُری طرح ڈول رہا تھا لیکن یہ ہچکولے میرے لیے تھپکیوں کا کام کر رہے تھے۔ پنکھے کی خنک ہوا میرے ذہن کو سلا رہی تھی۔ میں جان گرے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ نیند مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی اور میں گہری

نیند میں ڈوب گیا۔اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ جہاز والوں پر کیا گزری۔



غالب نے کیا خوب کہا ہے، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔تو کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو دنیا کی ایسی کون سی نعمت تھی جو مجھے میسر نہیں تھی۔ رہنے کو عالیشان بنگلہ، جمشید پیلس تھا۔ جس کی دوسری منزل پر ایک وسیع وعریض کمرا صرف میرے لیے مخصوص تھا۔ بڑے ہوکر مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر قائد کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں۔ جہاں اس کمرے جتنی جگہ میں درجن بھر افراد رہتے ہیں۔ وہی ان کا بیڈ روم ہوتا ہے۔ وہی ڈرائنگ روم اور وہی کچن اسی میں وہ پیدا ہوتے ہیں پلتے بڑھتے ہیں۔شادی کرتے اور بچے پیدا کرتے ہیں اور اسی میں مرجاتے ہیں۔

میرے عالیشان بیڈ روم کی آرائش پر کتنی رقم خرچ کی گئی تھی۔اس کا اندازہ لگانا میرے ننھے سے دماغ کے بس سے باہر تھا۔ بلکہ میں نے کبھی اندازہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میری وارڈ روب میں بے شمار کپڑے تھے۔ ہر طرح کے اعلیٰ ترین کپڑے، میں نے شاید ہی کبھی ایک جوڑا تیسری بار پہنا ہو۔ایک بڑی سی الماری صرف کھلونوں کے لیے مخصوص تھی جس میں ہر طرح کے لا تعداد کھلونے تھے۔ جمشید علی جب بھی کسی ٹرپ سے واپس آتے تھے تو میرے لیے بے شمار کھلونے اٹھا کر لاتے تھے۔ میں کراچی کے ایک اعلیٰ ترین سکول میں پڑھتا تھا، وہاں تعلیم کے ساتھ فیس کا معیار بھی اعلیٰ تھا۔ کروڑ پتی تاجروں، صنعت کاروں، جاگیرداروں کے علاوہ صرف اسمگلروں اور رشوت کی اندھی کمائی کرنے والے اعلیٰ سرکاری افسران کے بچے ہی اس سکول میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے سکول لانے لے جانے کے لیے ایک کار اور ڈرائیور مخصوص تھا۔

جمشید پیلس میں میری تربیت اور دیکھ بھال کی ذمے داری ماہ پارہ بیگم کے سپرد تھی۔ وہ بڑی محبت اور محنت کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیا کرتی تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تھیں اور کبھی کبھی وہ بڑے مترنم لہجے میں جو اجنبی الفاظ دہرایا کرتی تھیں وہ دراصل فارسی زبان تھی اور وہ فارسی کے اشعار گنگنایا کرتی تھیں۔ مجھے ماہ پارہ بیگم کا گنگنانا بہت اچھا لگتا تھا اور جب کبھی رات کو نیند مجھ پر مہربان ہونے سے انکار کردیا کرتی تھی تو ان کا یہی ترنم میرے لیے لوری کا کام کیا کرتا تھا۔

تمام تر آسائش میسر ہوتے ہوئے بھی میں تنہائی محسوس کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جمشید پیلس میں کم لوگ بستے تھے۔ اس عالیشان پیلس میں میرے علاوہ جمشید علی کے بیوی بچے بھی رہا کرتے تھے۔ زہرہ بیگم کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا جاوید تھا۔ اس کے بعد جنید تھا اور سب سے چھوٹی کاجل تھی۔ کاجل مجھ سے چار سال چھوٹی تھی اور جس روز وہ پیدا ہوئی تھی اس روز جمشید پیلس میں خاصی چہل پہل تھی۔ نرسیں اور ڈاکٹر اس حصے میں آ جا رہے تھے جہاں زہرہ بیگم موجود تھیں۔ خود جمشید علی بھی موجود تھے۔ دراز قد کے ہمیشہ پُرسکون رہنے والے جمشید علی کو میں نے پہلی





بار کسی قدر مضطرب دیکھا تھا۔ ورنہ ان کے چہرے سے ان کے جذبات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔

یہ بات مجھے عجیب سی لگتی تھی کہ مجھے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے الگ کیوں رکھا جاتا تھا۔ زہرہ بیگم مجھے ایسے پیار کیوں نہیں کرتیں جیسے جاوید، جنید اور کاجل کو کیا کرتی تھیں۔ پیار کرنا تو ایک طرف رہا وہ مجھ سے بات بھی بہت کم کیا کرتی تھیں۔ بلکہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں اور جب مجھ سے مخاطب ہوتی تھیں تو ان کے لہجے میں ایک عجیب سی کڑواہٹ ہوتی تھی۔ جسے میں صاف طور پر محسوس کیا کرتا تھا۔ یہ میں نے بعد میں جانا کہ کڑواہٹ کو عرفِ عام میں نفرت کہتے ہیں۔ زہرہ بیگم مجھ سے شدید ترین نفرت کیا کرتی تھیں۔ میں انہیں اپنی ماں ہی سمجھا کرتا تھا۔ جس طرح جمشید علی کو اپنا باپ سمجھتا تھا۔ اکثر میں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے لان میں شام کو زہرہ بیگم کو جاوید اور جنید کے ساتھ لاڈ پیار کرتے دیکھا کرتا تھا۔ تو میرے اندر سوال اٹھتا تھا کہ وہ مجھ سے اس طرح کا رویہ کیوں نہیں رکھتی ہیں۔ اس موقع پر ماہ پارہ کی کوشش ہوتی کہ وہ میرا دھیان کہیں اور لگا دیں۔ وہ کھڑکی کے پردے برابر کر کے مجھے ٹی وی سے بہلا لیتیں یا میرا کوئی پسندیدہ کھلونا نکال لیا کرتی تھیں۔ وہ میرے دل کے ان زخموں پر مرہم رکھا کرتی تھیں جو زہرہ بیگم کے رویئے سے لگا کرتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ ماہ پارہ کی کوششوں سے ہوں۔ اگرچہ جمشید علی کی توجہ اور دولت نے بھی اہم کردار ادا کیا لیکن میری شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ماہ پارہ بیگم نے ادا کیا تھا۔

زہرہ بیگم کے برعکس جمشید علی کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ ہوتا تھا۔ وہ جب بھی پیلس میں آتے تو سب سے پہلے میرے کمرے میں ہی آتے تھے۔ مجھے پیار کرتے اور وہ کھلونے دیتے جو وہ میرے لیے لاتے تھے۔ وہ مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں کوشش کے باوجود انہیں نہیں بتا پاتا تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ میرا بچگانہ ذہن اس کمی کو پکڑنے میں [illegible]نا کام رہتا تھا۔ جو میں اپنی زندگی میں محسوس کرتا تھا۔ جب میں نے سکول جانا شروع کیا تو جمشید علی باقاعدگی سے میری تعلیمی پروگریس پر نظر رکھا کرتے تھے۔ وہ جب آتے میری رپورٹس اور رزلٹ دیکھا کرتے تھے۔ اچھی رپورٹس پر مجھے شاباش دیتے تھے اور پھر نصیحت کرتے تھے کہ میں دل لگا کر پڑھوں تا کہ بڑا آدمی بن سکوں۔

بچے کے سامنے جو مثال ہوتی ہے وہ وہی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت جمشید علی (جنہیں میں پاپا کہا کرتا تھا) اچھے لگتے تھے۔ ان کی یونیفارم مجھے پسند تھی۔ ان کی چھجے دار ٹوپی اور اس پر بنے نشانات مجھے بے حد اچھے لگتے تھے۔ عجیب بات تھی کہ وہ مجھے جو کھلونے لا کر دیا کرتے تھے وہ بھی زیادہ سمندر سے متعلق ہوتے تھے۔ جیسے موٹر بوٹس، بحری جہازوں کے ماڈل، آبدوزیں اور سی کرافٹس مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی بار ان سے کہا۔

''پاپا میں بھی آپ کی طرح ج[illegible]وں گا۔''

تو جمشید علی نے بے اختیار مجھے گود میں اٹھا کر چوم لیا تھا۔ ’’میں اپنے بیٹے کو کیپٹن بناؤں گا کیپٹن یوسف علی۔‘‘

انہوں نے اپنی کیپ اتار کر میرے سر پر رکھ دی تو میرا رواں رواں مسرت سے جھومنے لگا تھا۔ میرے دل سے ہنسی کی پھوار نکلی تھی۔ جمشید علی جس وقت پیلس میں داخل ہوئے تھے۔ میں لان میں جھولا جھول رہا تھا۔ ہنستے ہوئے میری نظر زہرہ بیگم پر پڑی جو کڑی نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سلگتی نفرت کی تپش محسوس کر کے میں سہم کر خاموش ہو گیا۔ جمشید علی نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ انہوں نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے گود سے اُتار کر جھولے پر بٹھاتے ہوئے بولے۔

’’یوسف بابا آپ کھیلو شاباش۔‘‘

وہ زہرہ بیگم کے پاس پہنچے تو وہ تڑپ کر بولیں۔ ’’آپ پرائے بچے کو......‘‘

مگر جمشید علی نے ان کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا تھا۔ ’’زہرہ بیگم میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس بچے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔‘‘

اس سے آگے ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں لان پر آگے بڑھ گئے تھے۔ میرا ذہن ان دو جملوں سے کوئی نتیجہ نکالنے سے قاصر رہا تھا۔ زہرہ بیگم کی طرح جاوید اور جنید بھی مجھ سے لاتعلق رہا کرتے تھے لیکن نہیں ان سے بھی میرا وہی تعلق تھا جو زہرہ بیگم سے تھا۔ یعنی نفرت کا۔ ان کی نگاہوں میں بھی وہی نفرت تڑپا کرتی تھی جو میں نے زہرہ بیگم کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔ میں ان لوگوں کی اس نفرت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بے شک مجھے جمشید علی کی توجہ حاصل تھی لیکن اسے محبت نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ محبت تو وہ تھی جو جمشید علی، جاوید، جنید اور کاجل سے کیا کرتے تھے۔ میرے حصے میں ہمیشہ توجہ آیا کرتی تھی اور مجھے یہ بھی غنیمت لگا کرتی تھی۔ کم از کم زہرہ بیگم کے رویئے کے بعد۔

اس روز جمشید علی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اپنے بیڈ روم کے سامنے گیلری میں، ماہ پارہ کی نظر بچا کر میں چپکے سے نچلی منزل میں آ گیا اور اب وہاں ہونے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس عورتیں تیزی سے بیڈ روم میں آ جا رہی تھیں۔ کبھی کبھار جمشید علی انہیں روک کر ان سے بات بھی کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا اگر جمشید علی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ مجھے یہاں سے جانے کا حکم دیں گے۔ لہٰذا میں ایک بڑے سے گملے کے عقب میں ہو گیا تھا۔ اس بڑے سے گملے میں پلاسٹک کا بنا خوب صورت پودا تھا۔ جو اتنا بڑا تھا کہ اس نے مجھے بہ خوبی چھپا لیا تھا۔

ءتاً بیڈ روم سے زہرہ بیگم کی فلک شگاف چیخیں سنائی دیں۔ ایک لمحے کو تو میں سہم گیا تھا۔ پھر مجھے خوشی ہونے لگی کیونکہ زہرہ بیگم تکلیف میں تھیں۔ تبھی تو وہ چلا رہی تھیں۔ البتہ میں ان کی تکلیف





کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہرحال یہ چیخیں میرے لیے باعثِ راحت تھیں۔ چیخوں کا یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا اور پھر جس طرح اچانک شروع ہوا تھا اسی طرح اچانک تھم گیا۔ ان چیخوں کی جگہ ایک ننھی سی باریک آواز نے لے لی تھی۔ ایک نیا ذی روح دنیا میں اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ جمشید علی کی بے قراری دیکھنے والی تھی مگر وہ اندر جانے سے گریز کر رہے تھے۔ ظاہر ہے جب تک ڈاکٹرز کی طرف سے انہیں این او سی نہ مل جاتا وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک لیڈی ڈاکٹر اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے بڑا سا اوور آل پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں سفید ربر کے دستانے تھے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

’’مبارک ہو جمشید صاحب بیٹی ہوئی ہے۔‘‘

’’بیٹی۔‘‘ جمشید علی نے آہستہ سے دہرایا پھر بولے۔

’’زہرہ کیسی ہے؟‘‘

’’شی اینڈ ہر چائلڈ از آل رائٹ۔‘‘

’’میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔‘‘ جمشید علی بولے۔ ان کا چہرہ اور آواز معمول کے مطابق سپاٹ تھی۔

’’آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘ لیڈی ڈاکٹر نے کہا اور واپس بیڈ روم میں چلی گئی۔

جمشید علی نے جیسے بادلِ نخواستہ سر ہلایا۔ دس منٹ بعد جب تمام نرسیں اور ڈاکٹر بیڈ روم سے چلے گئے تو جمشید علی اندر گئے۔ جیسے ہی گیلری سنسان ہوئی میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر زہرہ بیگم کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ مجھے اس ننھی سی آواز کے بارے میں تجسس تھا جو میں نے پہلی بار سنی تھی۔ اتفاق سے جمشید علی نے دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔ شاید جلدی میں وہ اسے کھلا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اندر جھانکا۔ جمشید علی بستر کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی اور زہرہ بیگم کی طرف جھکے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر بستر کے پاس ایک چھوٹے سے پالنے میں کلبلاتے وجود نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔

میں خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اگرچہ زہرہ بیگم کا خوف تھا لیکن اس ننھے وجود کو دیکھنے کا جذبہ زیادہ طاقتور تھا۔ جمشید علی کی پشت میری جانب تھی اور زہرہ بیگم بستر پر دراز ہونے کی وجہ سے مجھے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ میں احتیاط سے دبے قدموں پالنے تک گیا تھا۔ اس کی دیواریں فٹ بھر اونچی تھیں۔ میں نے اس کی جالیوں سے اندر جھانکا۔ جہاں ایک ننھا سا وجود لیٹا ہوا ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کی رنگت عجیب سی تھی۔ کسی قدر سانولی اور اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں۔ ان میں اس وقت بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ زہرہ بیگم پر گئی تھی جو کسی قدر سانولے رنگ کی تھیں۔ ان کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد حسین عورت تھیں۔ ورنہ سرخ و سفید اور وجیہہ جمشید علی ان سے شادی نہ کرتے۔ جاوید اور جنید بھی زہرہ بیگم کی طرح سانولے تھے اور اب یہ نیا بچہ

بھی ان کے رنگ و روپ پر گیا تھا۔ وہ عام بچوں سے کسی قدر مختلف تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اس کی بڑی سی آنکھوں میں بھی چمک تھی اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کم از کم اس وقت میں اسے اپنی طرح کا لڑکا ہی سمجھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں جس طرح دبے قدموں آیا تھا۔ اسی طرح دبے قدموں واپس چلا جاتا۔ زہرہ بیگم نے تکیے سے سر اُچکا کر پالنے کی طرف دیکھا تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی تھی۔

''یہ کہاں سے آ گیا؟'' انہوں نے تیز لہجے میں جمشید علی سے کہا۔

جمشید علی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور خلافِ توقع مسکرا دیئے۔ ''شاید اسے بھی بچی کی پیدائش کی خبر ہو گئی اور یہ اسے دیکھنے چلا آیا۔'' وہ بولے۔

میرا خیال تھا کہ زہرہ بیگم مزید ناراض ہو جائیں گی لیکن جمشید علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ مسکرانے لگیں اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے وہ سوال پوچھ لیا جو خاصی دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

''یہ کہاں سے آیا ہے؟''

''کہاں سے آئی ہے؟'' جمشید علی نے تصحیح کی۔ ''یہ لڑکی ہے اور ہماری بیٹی ہے۔''

''جاوید اور جنید کی طرح؟'' میں نے کہا تو وہ دونوں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے لاشعوری طور پر خود کو ان کے بچوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا تھا کچھ دیر بعد جمشید علی نے آہستگی سے سر ہلایا۔

''اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''گوری ہم اسے گوری کہیں گے۔'' زہرہ بیگم نے جواب دیا۔

''مگر یہ تو کالی ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ تو فوراً ہی زہرہ بیگم کے تیور بگڑ گئے۔

''خبردار جو میری بچی کو کچھ کہا تم خود کالے ہو۔''

''آرام سے زہرہ۔'' جمشید علی ملائمت سے بولے۔ ''اس نے وہی کہا ہے جو حقیقت ہے تم کیوں کمپلیکس فیل کرتی ہو۔ کیا دنیا میں کالے بچے نہیں ہوتے۔ افریقہ میں تو سیاہ فام لوگ ہوتے ہیں۔''

''ہوتے ہوں گے۔'' زہرہ بیگم پھٹ پڑی تھیں۔ ''لیکن ان بچوں پر احساسِ کمتری لادنے کے لیے گورے بچے نہیں مسلط کیے جاتے۔ میں پوچھتی ہوں آخر آپ......''

''بی کوائیٹ۔'' جمشید علی نے زہرہ بیگم کے لبوں پر انگلی رکھ دی تھی۔ ''میں تمہیں سب بتا دوں گا لیکن مناسب وقت آنے پر۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے یوسف۔''

کمرے سے باہر آتے ہی میں نے دریافت کیا۔ ''آپ زہرہ بیگم کو کیا بتا دیں گے؟'' شاید یہ





بات عجیب لگے لیکن میں انہیں زہرہ بیگم ہی کہا کرتا تھا۔

''یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔'' جمشید علی نے میرے گال تھپتھپائے۔ ''جاؤ جا کر کھیلو۔''

زہرہ بیگم کو میرا بچی کو کالا کہنا بُرا لگا تھا مگر انہوں نے اپنی بیٹی کا نام کاجل رکھا تھا اور کاجل کالا ہوتا ہے۔ اس پر یہ نام بجتا تھا۔ مجھے وہ اچھی لگتی تھی لیکن نہ جانے کیوں زہرہ بیگم مجھے اس کے پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھیں۔ اگر میں کبھی اس کے پاس چلا جاتا تھا تو ڈانٹ کر بھگا دیا کرتی تھیں میں بھی تاک میں لگا رہتا تھا۔ کب مجھے موقع ملے اور میں اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ایک روز میں لان میں جھولا جھول رہا تھا۔ زہرہ بیگم کاجل کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ جاوید اور جنید بھی وہیں کھیل رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاجل کو جا کر دیکھوں وہ اب چار مہینے کی ہو چکی تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا۔ اندر سے ملازمہ نے آ کر زہرہ بیگم سے کہا۔

''بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے کوئی شہناز بیگم ہیں۔''

''اوہ۔'' زہرہ بیگم جلدی سے اٹھیں۔ ''تم ذرا کاجل کا خیال رکھنا۔''

جیسے ہی زہرہ بیگم اندر گئیں۔ میں جھولے سے اُترا اور لپک کر کاجل کے پاس آ گیا جو ایک باسکٹ نما چیز میں لیٹی ہوئی ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور اپنی سیاہ چمکدار آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے باسکٹ سے جھک کر اسے دیکھا۔ یہ بید کی لکڑی کی بنی خوب صورت باتھ ٹب نما باسکٹ تھی۔ کاجل اس میں نرم بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اب اس قابل تھی کہ اپنا سر اوپر اٹھا سکے۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ کھلکھلاتے ہوئے آواز نکالنے لگی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے پاس ہی گھاس پر بیٹھی ملازمہ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یہ آپ کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ یوسف بابا۔'' وہ بولی پیلس کے تمام ملازمین مجھے یوسف بابا کہتے تھے۔

''کیا میں اسے گود میں لے سکتا ہوں؟''

ملازمہ نوجوان سی لڑکی تھی۔ اس نے شرارت سے مجھے دیکھا۔ ''نہیں ابھی آپ اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ بے بی کو گود میں لے سکیں۔''

''میں اتنا بڑا کب ہوں گا؟'' میں نے سوچ کر کہا۔

ملازمہ پھر شرارت سے بولی۔ ''جب آپ جمشید صاحب جتنے بڑے ہو جائیں گے۔''

''پاپا جتنا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن اس وقت تک تو یہ بھی بڑی ہو جائے گی زہرہ بیگم کی طرح۔''

ملازمہ کو مجھ سے کھیل کر لطف آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو کیا ہوا جب آپ طاقتور مرد بن جاؤ گے تو آرام سے کاجل بے بی کو گود میں اٹھا لو گے۔''

میں نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں میں اسے پھر بھی گود میں نہیں اٹھا سکوں گا۔ کوئی بھی بڑا آدمی کسی بڑی عورت کو گود میں نہیں اٹھاتا۔''

''اٹھاتا ہے۔'' ملازمہ ہنسی۔ ''لیکن سب کے سامنے نہیں بلکہ اکیلے میں۔''

''تمہیں بھی کسی نے اٹھایا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ ساری شرارت بھول گئی اس کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔

''یوسف بابا آپ بہت باتیں کرنے لگے ہیں۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''میں میڈم ماہ پارہ سے آپ کی شکایت کروں گی۔'' کاجل نے اب ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ہمک ہمک کر میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ملازمہ سے پوچھا۔ ''کیا میں اسے پیار کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں یوسف بابا۔'' وہ بولی۔

میں بے اختیار اس کی طرف جھکا۔ جیسے ہی میں نے اس کے نرم سے پھولے ہوئے گال پر پیار کیا اس نے میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ اس کی گرفت کی سختی سے مارے تکلیف کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور جب ملازمہ نے میرے بال چھڑانے کی کوشش کی تو کاجل نے چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ حالانکہ درد مجھے ہو رہا تھا۔ بدقسمتی سے اس لمحے زہرہ بیگم آ گئیں۔ ملازمہ میرے بال چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاجل کی چیخیں سن کر زہرہ بیگم لپک کر آئیں۔ ان کے خیال میں شاید میں کاجل کو کوئی تکلیف دے رہا تھا۔ انہوں نے یہ دیکھے بغیر کہ کاجل کی مٹھی میں میرے بال ہیں مجھے پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکا دیا تھا۔ اس روز کاجل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ میرے بال نہیں چھوڑے گی۔ لہٰذا جب میں دھکے کے زور سے پیچھے گرا تو وہ بھی میرے ساتھ کھنچی چلی آئی تھی۔ اسے باسکٹ سے باہر گرتے دیکھ کر زہرہ بیگم نے دہلا دینے والی چیخ ماری۔

''چھوڑ کمینے میری بچی کو۔''

بوکھلائی ہوئی ملازمہ نے زہرہ بیگم کو بتانا چاہا۔ ''بیگم صاحبہ بال تو کاجل بے بی نے پکڑ رکھے ہیں یوسف بابا کے۔''

اس وقت تک زہرہ بیگم بھی دیکھ چکی تھیں کہ میرے بال کاجل کی مٹھی میں تھے۔ انہوں نے نہایت وحشیانہ طریقے سے میرے بال چھڑائے۔ کچھ بال ٹوٹ کر کاجل کی مٹھی میں رہ گئے تھے اور وہ یوں چلا چلا کر رو رہی تھی جیسے اس کے بال کھینچے گئے ہوں۔ جب زہرہ بیگم نے جھٹکا دے کر میرے بال چھڑائے تو مارے درد کے میری چیخ نکل گئی۔ اس سے پہلے میں نہایت صبر سے تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ اس لمحے ماہ پارہ وہاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے میری چیخ سنی تو لپک کر میری طرف آئیں اس وقت زہرہ بیگم مجھے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا چکی تھیں لیکن ماہ پارہ کو درمیان میں آتے دیکھ کر ان کا ہاتھ رُک گیا تھا۔





''اتنے سے بچے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے بیگم جمشید۔'' انہوں نے بہ ظاہر نرم لہجے میں کہا لیکن ان کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ زہرہ بیگم کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ وہ چند لمحے ماہ پارہ کو گھورتی رہیں پھر چیخ کر ملازمہ سے کہا۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ کاجل کو اندر لے چلو۔'' یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے اندر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ماہ پارہ نے پیار سے میری پلکوں پر آئے آنسو صاف کیے۔ مجھے پیار کیا اور گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں۔ میرا منہ ہاتھ دھلا کر انہوں نے مجھ سے واقعے کے بارے میں پوچھا تو میں نے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ حتیٰ کہ کاجل کو گود میں اٹھانے والی بات اور اس کے حوالے سے ملازمہ سے سوال جواب بھی لفظ بہ لفظ سنا دیئے۔ یہ سن کر ماہ پارہ کا رنگ بھی ذرا دیر کے لیے بدل گیا تھا لیکن انہوں نے مجھے کچھ کہا نہیں۔ سوائے اس کے میں آئندہ جو پوچھنا چاہوں صرف ان ہی سے پوچھوں کسی اور سے ہرگز نہیں اور کیونکہ ماہ پارہ بیگم نے خود ہی اجازت دے دی تھی لہٰذا میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سوال کر لیا۔

''زہرہ بیگم مجھے پیار کیوں نہیں کرتی ہیں؟''

حالانکہ مجھے پوچھنا چاہیے تھا کہ زہرہ بیگم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں۔ مگر مجھے اس وقت اس جذبے کا اتنا شعور نہیں تھا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ زہرہ بیگم مجھے اس طرح پیار کیوں نہیں کرتیں۔ جیسے اپنے بچوں کو کیا کرتی تھیں۔ ماہ پارہ سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ ان کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ آپ سے پیار نہیں کرتیں؟''

''کسی نے نہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے۔''

ماہ پارہ کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ وہ مجھے جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔ زہرہ بیگم کی مجھ سے نفرت ایک ایسی لعنت تھی جس سے جمشید پیلس کا ہر شخص واقف تھا۔ لہٰذا انہوں نے مجھے ٹال دیا اور بات کو گول کرتے ہوئے بولیں۔

''یوسف بابا آپ کے قرآن پاک پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آپ تیار ہو جائیں۔''

مغرب کے وقت ایک مولوی صاحب مجھے قرآن کریم پڑھانے آتے تھے۔ ان کے بعد دو ٹیوٹر مجھے گھر میں ہی مختلف مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں مجھے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا اور میرا ٹائم ٹیبل کچھ اس طرح کا تھا کہ مجھے فرصت کے لمحات کم ہی ملتے تھے۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک میں سکول میں ہوتا تھا۔ وہاں سے واپسی پر دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے ایک گھنٹہ آرام کے لیے ملتا تھا۔ چار سے چھ بجے تک مجھے کھیلنے کی مکمل آزادی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پہلے مولوی صاحب اور پھر دوسرے ٹیوٹر آ جاتے تھے۔ رات آٹھ بجے میں کھانا کھاتا تھا۔ ایک گھنٹہ مجھے ٹی وی

دیکھنے کے لیے ملتا تھا۔ اس دوران میں اپنی پسند کے کارٹون دیکھا کرتا تھا۔ ٹھیک دس بجے میں بستر پر چلا جاتا تھا۔

میں تینوں وقت کا کھانا اوپری منزل کے ڈائننگ ہال میں کھایا کرتا تھا۔ کھانے میں سوائے ماہ پارہ کے اور کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ یہ ڈائننگ ہال گیسٹ ہاؤس سے منسلک تھا۔ لہٰذا جب کوئی ایسا مہمان وہاں آ کر ٹھہرا کرتا تھا جسے جمشید علی خاندان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں کرتے تھے تو مجھے کھانا اپنے کمرے میں کھانا پڑتا تھا دیگر ادب و آداب کے ساتھ کھانے کے طور طریقے بھی مجھے ماہ پارہ بیگم نے سکھائے تھے۔ وہ بھی اوپری منزل میں ہی رہا کرتی تھیں اور ان کا بیڈ روم میرے بیڈ روم کے برابر میں ہی تھا۔ جس کا ایک دروازہ میرے بیڈ روم میں بھی کھلتا تھا۔ اس طرح ہم جب چاہتے ایک دوسرے کے کمرے میں جا سکتے تھے۔ جب میں دس بجے بستر پر جاتا تو وہ بھی کپڑے بدل کر آ جاتی تھیں۔ پھر جب تک مجھے نیند نہیں آ جاتی تھی۔ وہ مجھے کہانیاں سناتیں یا فارسی اشعار گنگنا کر لوری سناتیں۔ جنہیں سنتے سنتے میں نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا تھا۔

لان والے واقعے کے بعد زہرہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ میں کاجل کے قریب بھی نہ پھٹکوں۔ انہوں نے ماہ پارہ کے سامنے مجھ سے پھنکار کر کہا تھا۔ ”اگر میں نے تمہیں کاجل کے پاس دیکھا تو بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔“

”زہرہ بیگم اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو براہِ کرم مجھ سے کہیں۔“ ماہ پارہ نے نرمی سے کہا۔

”تم خاموش رہو۔“ وہ کڑک کر بولیں اور جس طرح بیڈ روم میں آئی تھیں اس طرح واپس چلی گئیں۔

ایک بچے کی فطرت ہوتی ہے۔ اسے جس کام سے منع کیا جاتا ہے وہ اسے کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ میں بھی یہ بچہ فطرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس فکر میں رہتا تھا کہ کب موقع ملے اور آنکھ بچا کر کاجل تک رسائی حاصل کروں اور یہ کام بے حد مشکل ہوتا تھا۔ اول تو زہرہ بیگم ہی اسے اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔ کاجل کی پیدائش سے پہلے وہ خاصی سوشل قسم کی خاتون تھیں لیکن بعد میں انہوں نے پیلس سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا اور اگر وہ کچھ دیر کے لیے کاجل کے پاس سے ہٹ کر بھی جاتی تھیں تو ملازمہ اس کے پاس موجود رہا کرتی تھی لیکن ایک روز مجھے موقع مل ہی گیا۔ زہرہ بیگم نے شام کے وقت ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ وہ شاپنگ کے لیے جا رہی تھیں۔ اتفاق سے میں نے یہ حکم سن لیا۔ ملازمہ جو کاجل کے لیے مخصوص تھی۔ زہرہ بیگم کے جاتے ہی وہ بے فکر ہو کر کمرے سے نکل گئی اور میں فوراً زہرہ بیگم کے بیڈ روم میں جا گھسا۔ ملازمہ کی بے فکری کی وجہ وجہ یہ بھی تھی کہ کاجل سو رہی تھی۔ لہٰذا وہ دوسرے ملازموں سے گپیں لڑا سکتی تھی۔ اس وقت کاجل سات یا آٹھ مہینے کی تھی اور خاصی صحت مند ہو گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کا فراک پہنے سو رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پالنے کی دیواریں خاصی اونچی تھی اور میرا سر بہ مشکل دیواروں کے سرے تک پہنچتا تھا۔ پالنے کی سلاخوں سے کاجل کو





دیکھنا مشکل نہیں تھا لیکن میں اسے گود میں لینا چاہ رہا تھا۔

پہلے میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کوئی چیز تلاش کی جس پر چڑھ کر میں پالنے کے اندر جا سکتا مگر اتفاق سے کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک بھاری بھرکم ہینگنگ چیئر تھی لیکن اسے کھینچنا ایک پانچ سالہ بچے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک ناکامی کے بعد متبادل تدبیروں پر غور کرنے لگا تھا۔ ایک تدبیر تو یہ تھی کہ میں پالنا کھینچ کر بستر تک لے آؤں مگر پالنے کا وزن، میرے لیے اسے ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے واحد قابلِ عمل مگر خطرناک ترین راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

پالنا اوپر سے چوڑا تھا اور اس کا نچلا حصہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس ڈیزائن کی وجہ سے پالنا خوب صورت تو نظر آتا تھا لیکن ساتھ ہی غیر محفوظ بھی ہو گیا تھا۔ ذرا سا زور لگانے پر یہ آرام سے اُلٹ جاتا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود یہ پہلو میری نظر میں تھا اور میں پالنے پر چڑھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مگر کاجل کو چھونے اور اسے گود میں لینے کی خواہش اتنی توانا تھی کہ میں اس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو سکتا تھا۔ اپنے لیے بھی اور کاجل کے لیے بھی۔ میں نے پہلے ایک بار کمرے سے باہر جھانکا کہ کہیں ملازمہ نہ آ رہی ہو۔ پھر میں نے احتیاط سے واپس آ کر اپنے جوتے اتارے۔ پھر دونوں ہاتھ پالنے کی دیواروں پر جما کر میں نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی تھی کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پالنا ایک دم غیر متوازن ہوا اور ایک دم اس طرف اُلٹ گیا۔ جس طرف سے میں اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پالنا پورے وزن کے ساتھ مجھ پر آ گرا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا اور اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا یقیناً میرا سر پھٹ جاتا۔ مگر پالنا گرنا ہی کچھ کم نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے مجھ پر کوئی وزنی چٹان آ گری ہو۔ تکلیف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میری چیخ کے ساتھ ہی کاجل کے رونے کی آواز آئی تھی۔ وہ اس بلائے ناگہانی پر فریاد کناں تھی۔ چند لمحے پہلے وہ سکون سے اپنے پالنے کی دنیا میں سو رہی تھی اور ایک دم ہی اس کی دنیا زیروزبر ہو گئی تھی۔

کاجل کے رونے کی آواز سن کر میں نے پالنے کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پالنا غیر معمولی وزنی تھا۔ خوش قسمتی سے اس لمحے ملازمہ آ گئی تھی۔ غالباً کاجل کے رونے کی آواز سن کر اس نے لپک کر پالنا سیدھا کیا اور جب اس نے کاجل کو دیکھا تو اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ کاجل کی ٹھوڑی خون خون ہو رہی تھی۔ شاید کہ پالنا گرنے کی وجہ سے اس کی ٹھوڑی المونیم کی ریلنگ سے جا ٹکرائی تھی۔ پالنا ہٹنے کے بعد میں بہ مشکل کھڑا ہوا تھا میرے سر اور سینے میں شدید درد ہو رہا تھا مگر فی الوقت میں درد اور کاجل کو بھول گیا تھا اور یہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا کہ زہرہ بیگم وہاں آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں شاپنگ کے ڈبے دبے ہوئے تھے۔ انہوں نے کاجل کے رونے کی آواز سنی تھی اس لیے سیدھی وہاں آئی تھیں اور جب انہوں نے کاجل کا خون آلود چہرہ دیکھا تو ان کے ہاتھ سے ڈبے چھوٹ گئے۔

"کیا ہوا کا جل کو؟" وہ چیختی ہوئی ملازمہ کی طرف جھپٹیں میں موقع پا کر بھاگ نکلا۔ پیچھے ملازمہ ہکلا ہکلا کر انہیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ جو اس گھر میں میری واحد پناہ گاہ تھا مگر ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ ابھی زہرہ بیگم آگ بگولہ ہو کر میرے پیچھے آئیں گی اور پھر میری خیر نہیں ہوگی۔ میں جاتے ہی بستر میں دبک گیا۔ ماہ پارہ بیگم ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ حسبِ توقع زہرہ بیگم فوراً ہی میرے پاس آئی تھیں۔ غصے سے ان کا بُرا حال تھا اور منہ سے جھاگ کے ساتھ میرے لیے مغلظات بھی نکل رہی تھیں۔ انہیں اس طرح غصے میں دیکھ کر میں مزید سہم گیا تھا۔ میں نے وضاحت کی کوشش کی۔

"میرا......میرا کوئی قصور نہیں تھا۔"

نفرت نے زہرہ بیگم کے خوب صورت نقوش یوں مسخ کر دیئے تھے کہ وہ مجھے ایک کامک بک کی چڑیل کے کردار سے ملتی جلتی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گھسیٹ کر بستر سے اُتارا اور پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ طمانچے کی شدت سے میرا منہ گھوم گیا تھا اور گال جیسے سلگنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرا تھپڑ لگائیں ماہ پارہ بیگم نے پیچھے سے آ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" انہوں نے غصے سے کہا۔ انہوں نے میرا نیلا پڑ جانے والا گال دیکھ لیا تھا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ تمہاری جرأت کیسے ہوئی۔" زہرہ بیگم نے گرج کر کہا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میری جرأت کیوں کر ہوئی۔" ماہ پارہ اطمینان سے بولیں۔ انہوں نے زہرہ بیگم کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا جو اب بھی غصے سے لرز رہی تھیں۔ ان کے غصے کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"تم......تم دو ٹکے کی عورت......داشتہ۔"

"بس۔" ماہ پارہ طیش میں آ گئی تھیں۔ "اب آپ کے منہ سے ایک لفظ نکلا تو میں لحاظ نہیں کروں گی۔ میری زبان کھل گئی تو آپ سب کے سامنے تماشہ بن جائیں گی۔"

اس لمحے زہرہ بیگم کا تمام تر طیش سوڈے کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کا چہرہ راکھ جیسا ہو گیا تھا اور وہ ایک لفظ کہے بغیر مڑیں اور میرے بیڈ روم سے چلی گئیں۔ جب ماہ پارہ نے مجھے خود سے لپٹایا تو مجھے اپنے گال میں اٹھنے والی ٹیسوں کا احساس ہوا تھا۔ میں بے اختیار سسک اٹھا تھا۔ شاید تکلیف سے زیادہ اس تذلیل نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا تھا جو زہرہ بیگم نے ماہ پارہ کے سامنے مجھے مار کر کی تھی۔ مگر ماہ پارہ کی محبت بھری آغوش نے مجھے جلد پُرسکون کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ "یوسف بابا آپ نے کیا کیا تھا؟"

میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میں ان سے جھوٹ بول نہیں سکتا تھا۔ میری بات سن کر وہ بولیں۔ "تبھی زہرہ بیگم اتنے غصے میں تھیں۔ غلطی بھی تو تمہاری تھی اگر زہرہ بیگم نے تمہیں تھپڑ نہ





مارا ہوتا تو میں خود تمہیں سزا دیتی۔"

"جی نہیں۔" میں ان کی گود میں مزید دبک گیا۔ "آپ مجھے نہیں ماریں گی آپ تو بہت اچھی ہیں۔"

"اچھا تو مکھن لگا رہے ہو۔" انہوں نے میرے مضروب گال کو چوما پھر اپنے کمرے سے جا کر ایک ٹیوب سے کریم نکال کر میرے گال پر مالش کرنے لگی تھیں۔ نہ جانے یہ مرہم کا اثر تھا یا ماہ پارہ بیگم کی محبت بھری انگلیوں کا اثر تھا کتنی عجیب بات تھی کہ زہرہ بیگم کی طرح میں ماہ پارہ کو بھی ان کے نام سے پکارتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں آنٹی یا اس قسم کے کسی اور لفظ سے نہیں پکارا لیکن جس طرح زہرہ بیگم کا لفظ میرے لیے نفرت کی علامت تھا۔ اسی طرح ماہ پارہ بیگم کا لفظ میرے لیے سراپا محبت تھا۔ میں دونوں کا موازنہ کر دیا تھا تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"زہرہ بیگم گندی ہیں۔"

"اوہوں۔" ماہ پارہ نے فوراً ہی مجھے سرزنش کی۔ "بڑوں کے لیے ایسے نہیں کہتے۔ یاد رکھو ہمیشہ بڑوں کی عزت کیا کرو۔"

"مگر انہوں نے مجھے مارا تھا۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ پھر مجھے زہرہ بیگم کے الفاظ یاد آ گئے۔ انہوں نے آپ کو راتا (داشتہ) بھی کہا تھا۔ یہ گالی ہوتی ہے ناں؟"

ماہ پارہ کا رنگ بدل گیا تھا۔ "ہاں گالی ہوتی ہے اور بہت بُری گالی ہوتی ہے۔ آئندہ تم یہ لفظ زبان پر نہیں لاؤ گے۔" اس وقت میرا ذہن ان باتوں کو سمجھنے کے قابل نہیں تھا مگر مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ زہرہ بیگم اور ماہ پارہ کے درمیان ناپسندیدگی کا کوئی رشتہ موجود تھا۔ اگر زہرہ بیگم سانولی سلونی خوب صورتی رکھتی تھیں تو ماہ پارہ سرخ و سفید رنگ کی حسین ترین عورت تھیں۔ بلکہ وہ مجھے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت لگتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ جمشید پیلس میں وہ واحد ہستی تھیں جو مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ جمشید علی بھی میرے ہمدرد تھے لیکن وہ پیلس میں بہت کم رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ سفر میں رہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ایک بحری جہاز کے کپتان کو بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ بلکہ جب جمشید علی گھر آتے تھے تب بھی وہ زیادہ بیوی بچوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میرے پاس وہ بہت کم آیا کرتے تھے۔ ان حالات میں ماہ پارہ ہی وہ ہستی تھیں جن پر میں مکمل طور پر بھروسہ کر سکتا تھا اور ان کی مکمل توجہ مجھے حاصل تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جمشید علی کی طرف سے میری پرورش کے معاملے میں وہ کلی طور پر خود مختار تھیں۔

اس دن کے بعد کئی روز تک میری ہمت نہ ہو سکی تھی کہ نچلی منزل کی طرف جاؤں یا جا کر لان پر کھیلوں۔ لان پر تمام تر کھیل میں اکیلے ہی کھیلا کرتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی جاوید یا جنید میرے ساتھ کھیلے ہوں۔ ہاں وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ایک بار میں لان پر اپنی فٹ بال سے کھیل رہا تھا جو مجھے جمشید علی نے لا کر دی تھی۔ اکثر وہ اپنے بچوں کے لیے جو

کھلونے لاتے تھے ویسے ہی کھلونے میرے لیے بھی لاتے تھے۔ جاوید اور جنید بھی اسی قسم کی فٹ بال سے کھیل رہے تھے۔ ان کی بال کِک لگنے سے لان کے ایک گوشے میں بنے تالاب میں جا گری تھی۔ اس تالاب میں ننھی منی رنگ برنگ مچھلیاں پلی ہوئی تھیں اور تالاب کی تہہ میں خوشنما پتھر اور پودے تھے۔ تالاب گہرا تو نہیں تھا لیکن رقبے میں خاصا بڑا تھا۔ جاوید اور جنید کی فٹ بال تالاب کے عین وسط میں جا گری تھی۔

اس کی طرف سے مایوس ہو کر ان دونوں نے آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے اور وہ تیزی سے میری طرف آئے میں بال کو ایک خیالی گول میں پھینکنے کی مشق کر رہا تھا۔ جاوید نے قریب آتے ہی مجھے دھکا دیا اور جنید نے میری فٹ بال پر قبضہ کر لیا۔

''ارے یہ میری فٹ بال ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''یہ ہماری فٹ بال ہے۔'' جاوید نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''تمہاری بال وہ رہی۔'' اس نے تالاب میں پڑی فٹ بال کی طرف اشارہ کیا۔ ''جاؤ جا کر اسے نکال لو۔''

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''یہ میری بال ہے۔ تمہاری والی پانی مین پڑی ہے۔''

میں نے جنید سے بال چھیننے کی کوشش کی تو جاوید نے دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں مجھ پر ٹھوکریں برسانے لگے۔ انہوں نے فٹ بال کھیلنے والے جوتے پہن رکھے تھے جن کا اگلا حصہ فولاد کا بنا تھا۔ ان کی ٹھوکروں سے میرے جسم پر کئی زخم آئے تھے۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے جاوید کی ٹانگ پکڑ کر مروڑ دی اور جنید کی رانوں کے درمیان لیٹے لیٹے ایسی لات جمائی کہ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ جب تک لان کے ایک گوشے میں کام کرنے والے مالی نے آ کر ہمیں چھڑایا ہم ایک دوسرے کا حلیہ خراب کر چکے تھے۔ وہ دو تھے لہٰذا زیادہ چوٹیں مجھے آئی تھیں۔ پسلی کے علاوہ ٹھوکر لگنے سے ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون رِس رہا تھا۔ میں زور زور سے ہانپ رہا تھا لیکن وہ دونوں باقاعدہ رو رہے تھے۔ خاص طور سے جنید کا بُرا حال تھا۔ جاوید مجھ سے ایک سال بڑا تھا اور جنید چھ مہینے چھوٹا تھا مگر قد و قامت میں مَیں ان پر حاوی تھا۔ چھ سال کی عمر میں نو دس سال کا لگتا تھا وہ دونوں میرے سامنے دبتے تھے اگر وہ مجھے گرانے میں کامیاب نہ ہو جاتے تو میں اتنی آسانی سے مار نہ کھاتا۔

اتفاق سے جمشید علی پیلس میں موجود تھے۔ اس لیے زہرہ بیگم مجھ پر دانت کچکچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس رات کھانے کے بعد جمشید علی نے ہمیں اپنی اسٹڈی میں طلب کر لیا۔ اسٹڈی ایک طرح سے ان کی عدالت بھی تھی۔ جہاں گھریلو مقدمات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ جمشید علی نے باری باری، ہم سب سے اکیلے میں بیان لیا۔ میں نے اپنی باری پر پورے اعتماد سے ان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا اور میں نے کہاں کہاں چوٹیں کھائی تھیں اور انہیں کہاں کہاں مارا





تھا۔ جاوید اور جنید کے بیانات میں تضاد تھا۔ پھر شاید جمشید پیلس کے ملازمین بھی اُن کو حقیقت حال سے باخبر کر چکے تھے۔ اس لیے جمشید علی نے ان دونوں کو قصوروار ٹھہرایا تھا۔

''جھگڑا تم دونوں نے شروع کیا تھا۔ اب تم دونوں کو سزا ملے گی۔ تم دو دن کھیلو گے نہیں بلکہ اپنے کمرے میں رہو گے۔'' جاوید اور جنید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی نفرت سے بھرپور نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ جمشید دھاڑے۔

''سنا نہیں تم دونوں نے؟''

''یس ڈیڈ۔'' وہ ایک ساتھ بولے۔

''تو پھر جواب کیوں نہیں دیا؟''

''سوری ڈیڈ...... ہم دو دن نہیں کھیلیں گے۔'' جاوید بادلِ نخواستہ بولا۔

جمشید علی نے گہری سانس لی۔ ''او کے سنز۔ اب تم جا سکتے ہو اور ہاں یاد رکھو آئندہ میں تم تینوں کو گنوار بچوں کی طرح لڑتے نہ دیکھوں انڈرسٹینڈ۔''

بادلِ نخواستہ ہم تینوں نے سر ہلایا۔ ہمارے دل میں اس کے برعکس خیالات تھے۔ کم از کم میں نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ انہوں نے مجھے چھیڑا تو انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ چاہے اس کے بعد مجھے سزا کیوں نہ ملے۔ غالباً یہی خیال ان کے ذہنوں میں بھی تھا مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے اُلجھتے میں خود بھی باہر لان پر جانے سے کتراتا تھا کیونکہ وہاں زہرہ بیگم ہوتی تھیں اور وہ مجھے کھا جانے والے انداز میں دیکھا کرتی تھیں۔ ان کی ان نگاہوں سے مجھے خوف کے ساتھ الجھن بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے اس گریز کو ماہ پارہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''یوسف تم کھیلنے کے لیے لان پر کیوں نہیں جاتے؟''

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے لان پر جا کر کھیلنے میں مزہ نہیں آتا۔''

''میری طرف دیکھو۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ''اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ کیا کسی نے تمہیں منع کیا ہے۔''

ماہ پارہ نے مجھے بچپن سے یہی سکھایا تھا کہ ہمیشہ سچ بولو۔ چاہے اس سے نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ جھوٹ بولنا ایک بُری عادت ہے جس سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ موجودہ زمانے میں بچہ ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی جھوٹ کی افادیت محسوس کرنے لگتا ہے جو بے شک وقتی ہوتی ہے۔ پہلے شرما کر اور جھجک کر جھوٹ بولتا ہے پھر رفتہ رفتہ بے حس ہوتا چلا جاتا ہے۔ دھڑلے سے جھوٹ بولنے لگتا ہے اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلاضرورت بھی جھوٹ بول جاتا ہے۔ میں بھی جھوٹ کی افادیت محسوس کرنے لگا تھا اور جھوٹ بولنے بھی لگا تھا لیکن ابھی اتنا پکا نہیں ہوا تھا کہ بولے جانے والے جھوٹ کو ڈھٹائی سے نبھا بھی سکوں لہٰذا جب ماہ پارہ نے مجھے پکڑا

تو مجھے سچ بولنا پڑا تھا۔

"مجھے زہرہ بیگم سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھے پھر ماریں گی۔"

"وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں......" ماہ پارہ کسی قدر طیش سے بولیں پھر جلدی سے خود پر قابو پالیا۔

"اب وہ تمہیں نہیں ماریں گی۔ اس وقت تو وہ غصے میں تھیں اور انسان ہر وقت تھوڑی غصے میں رہتا ہے۔"

"زہرہ بیگم ہر وقت غصے میں رہتی ہیں اور انہیں مجھ پر بہت غصہ آتا ہے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

ماہ پارہ نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ انہوں نے کہا۔ "تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ زہرہ بیگم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔ تم نچلی منزل پر بھی جاؤ گے اور لان پر بھی کھیلو گے۔ چلو میرے ساتھ۔"

ماہ پارہ مجھے نیچے لے گئی تھیں۔ انہوں نے میرے ساتھ فٹ بال کھیلی اور کھیلتے ہوئے خود بھی بچی بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ کمر سے باندھ لیا تھا لیکن دیکھنے والوں کے لیے وہ بچی نہیں بلکہ ایک بھرپور جوان عورت تھیں لہٰذا کچھ دیر بعد جب انہوں نے جابر کو لان پر دیکھا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا انہوں نے جلدی سے دوپٹہ اُتار کر شانوں پر پھیلا لیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ پیلس کے قواعد کے مطابق جب لان میں عورتیں ہوں تو مرد یہاں نہیں آ سکتے۔"

"قانون تو اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "لیکن یہ صرف مالکوں کے لیے ہے ملازموں کے لیے نہیں۔"

جابر گورے رنگ کا لمبا تڑنگا شخص تھا۔ چیچک کے داغوں نے اس کے چہرے کو بدنما بنا دیا تھا لیکن اس کی فطری خباثت نے اسے مکروہ کر دیا تھا۔ وہ پیلس کا منتظم تھا اور جمشید علی کی عدم موجودگی میں ان کے تمام کاروباری معاملات بھی وہی دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوائے جمشید علی کے کسی کو جوابدہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ زہرہ بیگم سے بہت دبتا تھا۔ ان کے آگے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتا پھرتا تھا۔ اس کی سخت گیر فطرت کی وجہ سے پیلس کا کوئی فرد اسے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ ماہ پارہ اس سے نفرت کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے دوسری منزل کے اس حصے میں جابر کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ جہاں میں رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماہ پارہ اس سے نفرت کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ دوسری منزل کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر ماہ پارہ پر پڑتی تھی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ جاتی تھی اور ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔

"تم شاید بے خبر ہو۔" ماہ پارہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں جمشید پیلس میں ملازم نہیں





ہوں اور آئندہ اس طرح میرے سامنے نہ آنا۔ ورنہ مجھے جمشید صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔"

"اگر تمہیں جمشید صاحب سے بات کرنے کا شوق ہے تو ضرور کرو لیکن کبھی کبھی اس خادم سے بھی بات کر لیا کرو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

ماہ پارہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ گھٹی گھٹی سی پُر طیش آواز میں بولیں۔ "تم ایک نہایت گھٹیا شخص ہو۔" پھر مجھ سے بولیں۔ "چلو یوسف بابا اپنے کمرے میں۔"

ماہ پارہ کی بات سن کر جابر کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ "ماہ پارہ بیگم تم میری نرمی کا کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی ہو۔"

"میں تم جیسے شخص سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔" ماہ پارہ بولیں اور میرا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ میں ذرا پیچھے تھا اس لیے میں نے جابر کے الفاظ سن لیے تھے۔ اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا۔

"کتیا تجھے بھی دیکھ لوں گا۔"



اس دفعہ جمشید علی غیر متوقع طور پر اور غیر متوقع انداز میں پیلس آئے تھے۔ وہ بغیر اطلاع دیئے آئے تھے اور ان کے سفید یونیفارم پر خون کے دھبے تھے۔ ایک شخص نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ جمشید علی کو پیلس پہنچاتے ہی وہ پُراسرار شخص واپس چلا گیا تھا۔ پیلس میں رہنے والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ بندرگاہ سے آتے ہوئے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں جمشید علی زخمی ہو گئے تھے۔ حالانکہ کار بالکل شفاف تھی اس پر ایک خراش بھی نہیں آئی تھی مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جمشید علی کو جھٹلا سکتا۔ جمشید علی کی آمد کے بیس منٹ کے اندر ان کا فیملی ڈاکٹر افراتفری میں پیلس میں داخل ہوا۔ اس نے آ کر جمشید علی کی مرہم پٹی کی اور بند کمرے میں یہ مرہم پٹی تین گھنٹے تک جاری رہی تھی۔

اگلے روز جب صفائی کرنے والی خادمہ کمرے میں گئی تو اسے بستر کے نیچے دو خون آلود بلٹ پڑے ملے۔ بدقسمتی سے وہ پیٹ کی ہلکی تھی اس نے سارے ہی ملازمین کو یہ بات بتا دی اور اگلے روز ہی وہ خادمہ اور اس کا شوہر پیلس سے غائب ہو گئے۔ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ رات کو وہ کہاں چلے گئے۔ صبح جب دوسرے سو کر اٹھے تو ان کا کوارٹر خالی تھا اندر سامان کے نام پر ایک تنکا تک نہیں تھا۔

مجھے ماہ پارہ نے جمشید علی کے زخمی ہونے کے بجائے ان کی طبیعت خراب ہونے کا بتایا تھا اور مجھ سے کہا کہ فی الوقت ڈاکٹروں نے سب کو ان سے ملنے سے منع کیا ہوا ہے۔ میں ان کی طبیعت خرابی کا سن کر بے چین ہو گیا تھا۔ میں نے ان کے کمرے میں جانے کی کوشش کی لیکن باہر موجود ملازم نے مجھے روک دیا۔

"یوسف بابا ابھی صاحب نے سب کو اندر آنے سے منع کیا ہے۔"

میں باہر لان پر چلا گیا۔ میں اس معاملے میں ذرا ضدی تھا اگر مجھے کسی کام سے منع کیا جاتا تھا تو میرے اندر اسے کرنے کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی تھی۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح جمشید علی تک پہنچوں۔ میں لان میں زہرہ بیگم کے بیڈروم کے پاس سے گزرا۔ اس کی کھلی کھڑکی سے زہرہ بیگم کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''تم سب نکمے اور نااہل ہو، تمہیں تنخواہ کس بات کی دی جاتی ہے۔ ایک شخص آیا اور جمشید پر گولیاں برسا کر چلا گیا۔ نو ایڈیٹ یہ سراسر تم لوگوں کی نااہلی ہے۔ اگر جمشید کو کچھ ہو جاتا تو بچتے تم لوگ بھی نہیں۔'' میں نے چپکے سے کھڑکی کے چھجے کو پکڑ کر اندر جھانکا۔ فرنچ ونڈو سے زہرہ بیگم فون کا ریسیور رکھتی نظر آئی تھیں۔

میرے ذہن نے یہ گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ جو زہرہ بیگم نے کسی سے فون پر کی تھی اگرچہ ان کی باتوں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میری یادداشت شروع سے اچھی تھی اور مجھے بچپن کی یہ ساری باتیں اب تک اچھی طرح یاد ہیں۔ میں جمشید علی کے کمرے تک جانے کی فکر میں تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک نوکر براجمان تھا۔ وہ مجھے اندر جانے نہ دیتا، کمرے کی کھڑکیاں لان کی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے گھوم کر جا کے دیکھا۔ ایک کھڑکی خوش قسمتی سے کھلی ہوئی تھی لیکن مسئلہ اس تک رسائی کا تھا۔ کھڑکی زمین سے پانچ فٹ اونچی تھی اور میرا کل قد شاید تین فٹ ہوگا۔ ظاہر ہے میں کسی سہارے کے بغیر اوپر تک نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے لان پر کسی چیز کی تلاش کی جس کے ذریعے میں کھڑکی تک پہنچ سکتا۔ میری نظر المونیم کی سیڑھی پر پڑی۔ مالی اسی سیڑھی کی مدد سے نسبتاً اونچے درختوں کی تراش خراش کیا کرتا تھا۔ یہ کھلنے والی دوہری سیڑھی تھی۔ جو کھلنے پر الٹے وی کی شکل اختیار کر جاتی۔ اسے دیوار یا کسی چیز کے ساتھ لٹکا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اگرچہ سیڑھی المونیم کی خاصی ہلکی تھی۔ اس کے باوجود ایک چھ سال کے بچے کے لیے خاصی بھاری تھی۔ میں نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے کھڑکی کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ بہ صد مشکل میں اسے کھڑکی تک کھینچ کر لایا۔ اب اگلا مرحلہ سیڑھی کو دیوار سے ٹکانے کا تھا۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے اسے اوپر اٹھانے لگا۔ نصف سیڑھی تک تو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے بعد توازن خراب ہونے لگا۔ میرے ہاتھوں سے اوپر سیڑھی کا جتنا حصہ آیا تھا۔ اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ خاصی طاقت صرف کر کے میں نے سیڑھی کو عموداً کیا لیکن جب آگے کیا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر دیوار سے جا لگی۔ اس کا اوپری حصہ کھڑکی سے ذرا نیچے تھا۔ آواز خاصی اونچی تھی۔ ایک لمحے کو میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نہیں آیا تھا۔ یعنی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ یا پہنچی بھی تھی تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں تیزی سے سیڑھی چڑھ کر اوپر جا پہنچا۔ جیسے ہی میں نے کھڑکی کے کارنس پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا بستر پر دراز جمشید علی کو اپنی طرف نگران پایا تھا۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چمک دار شے تھی۔ جسے انہوں نے جلدی سے تکیے کے نیچے کر لیا تھا۔ انہیں





جاگتے دیکھ کر میں سہم گیا۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

''یوسف...... تم...... یہاں سے......''

''پاپا میں آپ کو دیکھنے آیا تھا۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

جمشید علی نے سر ہلایا۔ ''اوکے یوسف، اندر آجاؤ۔''

وہ مجھے بیٹا کم ہی کہتے تھے زیادہ تر نام سے پکارا کرتے تھے۔ میں کھڑکی سے کود کر اندر گیا تو انہوں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''یہ کون سا طریقہ ہے تم دروازے سے بھی آ سکتے تھے۔''

''میں آیا تھا، لیکن دروازے پر بیٹھا نوکر مجھے اندر آنے نہیں دے رہا تھا۔'' میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میں کس طرح ان تک رسائی کی کوشش کرتا رہا روانی میں یہ بھی بول گیا کہ زہرہ بیگم فون پر کسی کو ڈانٹ رہی تھیں۔ جمشید علی چونکے۔

''کسے ڈانٹ رہی تھیں؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''اچھا وہ کیا کہہ رہی تھیں؟'' جمشید علی نے اضطراب سے کہا۔

میں نے انہیں لفظ بہ لفظ زہرہ بیگم کی گفتگو سنا دی۔ پہلے تو انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تمہیں یہ سب یاد ہو گیا۔'' اور پھر سوچ میں گم ہو گئے۔ اس لمحے زہرہ بیگم اندر آئیں اور مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ''یہ کیسے اندر آیا؟''

''کیوں کیا تم نے اسے روکنے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہے؟'' جمشید علی طنزیہ لہجے میں بولے۔

زہرہ بیگم ایک لمحے کو بوکھلا گئی تھیں لیکن جلدی سے انہوں نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے اسے روکنے کی آپ کو ڈسٹرب نہ کرنے کی وجہ سے میں نے یہاں سب کا داخلہ منع کر دیا ہے۔''

''حالانکہ ابھی آپ خود آئی ہیں۔'' جمشید علی سرد لہجے میں بولے تو زہرہ بیگم تلملا گئی تھیں۔

''مت بھولیں میں آپ کی بیوی ہوں۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''مجھے یاد ہے شاید اس لیے آپ نے کچھ لوگوں کو میری جان کے تحفظ کا ذمے دار بنا دیا ہے۔''

زہرہ بیگم کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''آپ کو کیسے......''

جمشید علی نے ان کی بات کاٹی۔ ''سنو زہرہ بیگم میں اپنے اردگرد غیر متعلقہ افراد دیکھنا پسند نہیں کرتا اور آئندہ ایسا کوئی فرد نظر آیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ امید ہے تم سمجھ گئی ہو گی۔''

زہرہ بیگم کا چہرہ بے جان سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر مڑیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ جمشید علی اس قسم کی گفتگو بے جھجک میرے سامنے ہی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے

انہوں نے کبھی میرے سامنے اس نوعیت کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ جمشید علی کو کیسے زخم آئے تھے۔ میں نے زہرہ بیگم کے جاتے ہی کہا۔

''پاپا آپ کو چوٹ کیسے لگی؟''

وہ سوچ کر بولے۔''مجھ پر کچھ دشمنوں نے حملہ کیا تھا۔''

''انہوں نے آپ کو مارا۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی جمشید علی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔''

وہ ہنسے۔''تم مارنے سے کیا سمجھتے ہو۔ انہوں نے مجھے پستول سے گولیاں ماری تھیں۔ یہ دیکھو۔'' انہوں نے اپنے شانے سے قمیص ہٹائی جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دوسری گولی بازو میں لگی تھی۔

مجھے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ جنہوں نے جمشید علی پر حملہ کیا تھا۔ میں نے جوش سے کہا۔

''میں ان لوگوں کو ماروں گا پاپا۔''

وہ پھر ہنسے۔''مار لینا لیکن پہلے تم بڑے تو ہو جاؤ۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تبھی تم میرے دشمنوں سے بدلہ لینے کے قابل ہو سکو گے۔''

''میں سیکھوں گا۔'' میں نے کہا تو جمشید علی کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے صحیح والے بازو سے سمیٹ لیا۔''میرا شیر بیٹا۔'' اس لمحے میری برسوں پرانی خواہش پوری ہو گئی تھی کہ جمشید علی ایک بار پیار سے مجھے اپنے سینے سے لگا لیں۔

اسی لمحے ماہ پارہ اندر آ گئی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔''آپ درست نہیں کر رہے ہیں جمشید صاحب۔''

جمشید علی ایک لمحے کو خاموش ہو گئے پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔''آپ اپنے کمرے میں جائیں یوسف۔''

میں باہر جانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ باہر مامور نوکر موجود تھا لیکن وہ غائب تھا۔ غیر ارادی طور پر میں جانے کے بجائے وہیں رک گیا۔ میں نے ماہ پارہ کو کہتے سنا۔''آپ یوسف کو جو کہہ رہے تھے وہ درست نہیں ہے۔''

''ماہ پارہ تم میرے پلان کے بارے میں جانتی ہو پھر بھی تم یہ بات کہہ رہی ہو۔'' جمشید علی بولے ان کا لہجہ روکھا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ ابھی ان باتوں کے لیے اس کی عمر کم ہے۔''

''یہی عمر ہے جب بچے سیکھتے ہیں اور اس عمر میں وہ جو سیکھتے ہیں اسے ساری عمر یاد رکھتے ہیں۔''

''یہ ظلم ہو گا جمشید صاحب۔''





''ماہ پارہ۔'' اچانک جمشید کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔''بہتر ہو گا تم اپنے آپ کو صرف ان امور تک محدود رکھو جو تمہاری ذمے داری ہے۔''

''جو حکم جناب کا۔'' کچھ دیر بعد ماہ پارہ نے کہا۔''لیکن بہتر ہو گا اس صورت میں آپ یوسف کے لیے کسی اور خاتون کو رکھ لیں۔''

''یوسف کے لیے سب سے بہتر تم ہی ہو۔'' جمشید علی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔''یہ بات تم بھی جانتی ہو وہ تم سے بے حد مانوس ہو چکا ہے اور اب اس کو تم سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں اسے اپنے سامنے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' ماہ پارہ روہانسی ہونے لگی تھیں۔

''وہ تباہ نہیں ہو گا۔'' جمشید علی کا لہجہ مزید نرم ہو گیا تھا۔''میں نے اس کے لیے جو سوچا ہے۔ وہ تمہارے ذہن میں نہیں آ سکتا وہ بہت بڑی شخصیت بنے گا۔ وہ میرا جانشین ہو گا۔''

''اس کے لیے آپ کے دو بیٹے بھی تو ہیں۔'' ماہ پارہ آہستہ سے بولیں۔

''میں نے کہا ناں کہ جو میں نے سوچا ہے وہ تمہارے ذہن میں نہیں آئے گا۔'' جمشید علی کا لہجہ دوبارہ روکھا ہو گیا تھا۔

''ٹھیک کہا آپ نے میں آپ کی طرح سوچ بھی نہیں سکتی۔'' ماہ پارہ نے کہا اور دروازے کی طرف آنے لگیں۔

میں نے انہیں آتے دیکھ کر اوپری منزل کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ آج کا دن میرے لیے انکشافات کا تھا۔ جمشید علی مجھے اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اپنے دونوں بیٹوں کو چھوڑ کر۔ اس عمر میں بھی مجھے جانشین کا مفہوم معلوم تھا۔ میرا دل عجیب سے انداز سے دھڑکنے لگا تھا۔ ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ ماہ پارہ، جمشید علی کی مخالفت کر رہی تھیں شاید کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جمشید علی اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر مجھے جانشین بنائیں۔ نہ جانے مستقبل میرے لیے کیا لانے والا تھا۔



مجھے بہت کم عمری میں احساس ہو گیا تھا کہ میں رنگ و روپ کے اعتبار سے ارد گرد کے دیگر افراد سے مختلف ہوں۔ میں سرخ و سفید رنگت رکھتا تھا۔ میرے نقوش کھڑے تھے۔ سر کے بالوں کا رنگ سنہری مائل بھورا تھا اور آنکھیں شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی گورے تھے اور کئی کے بال سنہری مائل بھورے تھے لیکن یہ مقامی نوعیت کے تھے۔ میں ان سے جدا ہی نظر آتا تھا اور نیلی آنکھیں تو کسی کی نہیں تھیں۔ حتیٰ کہ میں جس سکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی کسی کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ حالانکہ سکول میں کئی سو بچے پڑھتے تھے۔ جب جمشید علی مجھے سکول میں داخل کرانے گئے تو پرنسپل نے مجھے دیکھتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔

''مسٹر جمشید کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟''

''نہیں۔'' انہوں نے مختصراً جواب دیا۔''ہی از ایڈاپٹڈ۔''

''او، آئی سی تو یہ فارنر ہے۔''

''آپ کہہ سکتے ہیں لیکن اب یہ میرا بیٹا ہے۔''

میں نہیں جانتا کہ جمشید علی نے سکول ریکارڈ میں میرے والدین کا کیا نام لکھوایا تھا یا لکھوایا بھی تھا کہ نہیں۔ کیونکہ بعد میں مجھے ریکارڈ سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ گارجین کی حیثیت سے جمشید علی صرف اپنا نام بھی لکھوا سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سکول کے بچوں کے لیے میں عجوبہ تھا۔ کچھ عرصے تک وہ مجھے گورا گورا کہہ کر چھیڑتے رہے تھے مگر پھر انہوں نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ میں رنگ وروپ کے اعتبار سے تو ان سے مختلف تھا لیکن ذہن اور زبان کے لحاظ سے بالکل ان جیسا تھا۔ بالکل جیسا ایک پاکستانی بچہ ہوتا ہے۔ میرا نام یوسف علی میرے سرپرست جمشید علی نے رکھا تھا اور مذہب کے خانے میں اسلام لکھوایا تھا۔ میری پرورش ایک مسلمان کے طور پر ہوئی تھی لہٰذا میں ایک مسلمان بنا۔ عین ممکن ہے اگر میری پرورش میرے حقیقی ماں باپ نے کی ہوتی تو میں کچھ اور ہوتا عیسائی یا شاید یہودی، کیونکہ میرے جیسے رنگ وروپ والی اقوام میں یہی دو مذہب پائے جاتے ہیں۔

بچہ پانی کی سی فطرت رکھتا ہے۔ جس سانچے میں ڈالو ویسا ہی ہو جاتا ہے لہٰذا آج میں ایک مسلمان ہوں تو اس لیے کہ میری پرورش پاکستان میں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی۔ میرے آباؤ اجداد کہیں کے بھی ہوں اور میں بہ ظاہر مقامی پاکستانی مسلمانوں سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ ذہنی طور پر میں اتنا ہی پاکستانی اور مسلمان ہوں۔ جتنا کہ مقامی باشندہ ہو سکتا ہے جس کے آباؤ اجداد اس سرزمین پر بستے آئے ہوں۔ مجھے اس دھرتی سے ان جیسا ہی لگاؤ ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو رنگ ونسل کے تمام تر تعصبات مسترد کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ محمد علی اور برطانیہ کا سابقہ پاپ سنگر یوسف اسلام (سابقہ اسٹیونز کیٹس) بھی اتنے ہی مسلمان مانے جاتے ہیں جتنے کہ خادم الحرمین شریفین شاہ فہد۔

جن دنوں میں پانچویں کلاس میں تھا۔ نہ جانے کیسے افواہ پھیل گئی کہ میں درحقیقت عیسائی ماں باپ کا بچہ ہوں جسے اغوا کر کے مسلمان بنایا جا رہا ہے۔ اس پر مقامی عیسائی آبادی میں اشتعال پیدا ہوا اور ایک چرچ نے میٹنگ کر کے یہ قرارداد منظور کی کہ مجھے بہرصورت واپس حاصل کر کے دوبارہ عیسائی بنایا جائے۔ ایک آدھ مظاہرہ ہوا اور اخبارات میں بھی میرے بارے میں کچھ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد چرچ کمیٹی کی قیادت میں عیسائیوں کا ایک وفد جمشید پیلس آیا تھا۔ جمشید علی نے انہیں عزت واحترام سے اندر بلوایا۔ ایک پادری صاحب جنہوں نے چوکورسی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس معاملے میں زیادہ ہی پُرجوش تھے۔ انہوں نے بلاتمہید کہا۔

''جمشید صاحب ہم اس بچے کو لینے آئے ہیں جسے آپ نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔''

''کیوں؟'' جمشید علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔





''کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ عیسائی ماں باپ کا بچہ ہے۔ لہٰذا اسے عیسائیوں کے درمیان ہونا چاہیے۔''

''یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ عیسائی والدین کا بچہ ہے؟'' جمشید علی نے ملائمت سے پوچھا۔

یہ سن کر وفد کے ارکان نے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں۔ ''ہم نے سنا ہے۔'' پادری صاحب بولے۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے گھر میں پرورش پانے والا بچہ یوسف علی قطعی کسی عیسائی کی اولاد نہیں ہے۔ میری اس تردید کے بعد آپ کی تسلی ہو جانی چاہیے۔''

''ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ یوسف کے ماں باپ سفید فام ہیں۔'' پادری صاحب نے کہا۔

''اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یوسف کے ماں باپ عیسائی بھی تھے؟ کیا سفید فاموں میں مسلمان نہیں پائے جاتے۔ آپ بوسنیا میں دیکھ لیں۔ دوسرے آپ سے یہ کس نے کہا کہ یوسف سفید فام ماں باپ کی اولاد ہے۔''

''اس کا رنگ وروپ اس کی گواہی دیتا ہے۔''

''اس قسم کے رنگ وروپ کے افراد تو پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں آپ نے سرحد کے پٹھان دیکھے ہوں گے خاص طور سے آفریدی قبیلہ، اس کے باشندوں کا رنگ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور ان میں نیلی آنکھوں والے بھی ہوتے ہیں۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ بچہ مقامی ہے اور مسلمان ماں باپ کی اولاد ہے؟'' آخر وہ سوال پادری صاحب کی زبان پر آ ہی گیا جس کے لیے وہ یہاں تشریف لائے تھے۔

''ثبوت تو آپ کو دینا چاہیے۔'' جمشید علی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''الزام آپ نے لگایا ہے لہٰذا بارِ ثبوت بھی آپ کے ذمے ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''آئندہ آپ اس وقت تشریف لائیے گا جب آپ کے پاس یوسف کے ماں باپ کا حتمی ثبوت ہو۔ جابر مہمانوں کو خاطر تواضع کے بعد احترام سے رخصت کر دینا۔''

یہ کہہ کر جمشید علی اندر چلے گئے تھے اور کمیٹی کے ارکان بھی ناکامی لے کر لوٹ گئے تھے۔ شاید انہوں نے بعد میں مجھ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہو لیکن میرے گرد سخت پہرہ تھا۔ جو بہ ظاہر نظر نہیں آتا تھا لیکن کسی بھی اجنبی کے لیے مجھ تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ سکول میں کسی غیر متعلقہ فرد کا کسی بچے سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سکول سے واپسی پر کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح محافظ امیر خان بھی ہوتا تھا۔ وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ بلکہ آرمی کا ریٹائرڈ ایس ایس جی تھا۔ اس کی کارکردگی میں نے خود ملاحظہ کی تھی۔ جب چرچ کمیٹی وفد جمشید پیلس آیا تھا یہ اس سے چند مہینے بعد کی بات تھی۔

جمشید پیلس عین ساحل سمندر کے کنارے واقع تھا اور ایک سڑک کے پار ساحل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ سکول سے واپسی پر ہم زیادہ تر سنسان سڑکوں سے گزرا کرتے تھے۔ ان دنوں کلفٹن کا یہ علاقہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ اس روز جب میں سکول سے نکلا تو امیر خان گیٹ پر میرا منتظر تھا۔ جمشید علی کی طرف سے سکول انتظامیہ کو ہدایت تھی کہ مجھے اسی صورت میں چھٹی کے وقت سکول سے جانے دیا جائے جب امیر خان بذاتِ خود مجھے لینے آئے۔ دوسرے نمبر پر ماہ پارہ اس کی مجاز تھیں اور کوئی فرد مجھے سکول سے نہیں لے جا سکتا تھا۔

جیسے ہی میں گیٹ سے نکلا امیر خان نے میرا بیگ لیا اور تیزی سے سڑک پار کر کے کار تک آیا۔ میرے اور امیر خان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار چلا دی تھی لیکن جیسے ہی کار حرکت میں آئی ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار کا پچھلا حصہ بیٹھ گیا۔ ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے کار سے اُتر کر دیکھا اور واپس آ کر امیر خان سے بولا۔

''کسی خانہ خراب نے ٹائر تلے سرے والی کیل لگا دی تھی۔''

''کون کر سکتا ہے یہ حرکت۔'' امیر خان چوکنا ہو گیا تھا۔ ''فوراً ٹائر تبدیل کرو۔''

ٹائر بدلنے میں بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں گے لیکن اس دوران میں سکول کے باہر والی یہ سڑک ویران ہو چکی تھی۔ بیشتر بچے اپنی گاڑیوں پر آتے جاتے تھے۔ باقی بچوں کے لیے سکول بسیں تھیں۔ لہٰذا بیشتر بچے جا چکے تھے اور صرف وہی بچے وہاں تھے جن کی گاڑیاں کسی وجہ سے لیٹ ہو گئی تھیں۔ گرمی کے دن تھے اور کار کے اندر بیٹھے رہنا دشوار تھا۔ لہٰذا میں بھی کار سے اُتر آیا تھا۔ جیسے ہی ڈرائیور نے پہیہ بدلا اور اوزار ڈگی میں رکھ رہا تھا۔ ایک سفید کار آ کر وہاں رُکی اور اس میں سے تین افراد نکلے جو مسلح تھے۔ ایک نے جھکے ہوئے ڈرائیور کے سر پر پستول کا دستہ مارا وہ کراہ کر اسی جگہ ڈھیر ہو گیا تھا۔ ایک امیر خان کی طرف لپکا اور تیسرا میری طرف آیا۔ میں نے صورتِ حال بھانپتے ہی کار میں گھس کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔ دوسرے شخص نے امیر خان کے ساتھ ڈرائیور والا سلوک کرنا چاہا مگر وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے حملہ آور کے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی سے وار کیا۔ حملہ آور کا ہاتھ نیچے آ رہا تھا۔ اسی وجہ سے وار کی شدت دوگنی ہو گئی۔ خشک ٹہنی کے چٹخنے کی سی آواز آئی۔ حملہ آور کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے منہ سے جو آواز نکلی ویسی آواز میں نے جمشید پیلس میں بڑی عید کے موقع پر ذبح کیے جانے والے ایک بکرے کی سنی تھی۔

تیسرا فرد میری طرف لپکا تھا۔ مجھے دروازہ اندر سے لاک کرتے دیکھ کر اس نے پوری قوت سے پستول کا دستہ شیشے پر مارا۔ شیشہ تو نہیں ٹوٹا، ہاں اس کے ہاتھ پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ امیر خان نے اسے اچھل کر لات رسید کی۔ وہ سڑک پر جا گرا۔ حملہ آوروں کی دو تہائی نفری تباہ حال ہو گئی تھی۔ جس نے میری کار کے ڈرائیور کو بے ہوش کیا تھا۔ اس نے ڈگی کے عقب سے امیر خان پر گولی چلائی مگر قضا اس کی آئی تھی جس کی کلائی امیر خان نے




توڑ دی تھی۔ وہ ہاتھ تھامے اب تک زمین پر پڑا تھا۔ اس نے بڑے غلط وقت پر اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ امیر خان پر چلائی گئی گولی اس کے سر میں اُتر گئی۔ اس کی چیخ و پکار یوں رُک گئی جیسے ٹیپ کو آف کر دیا جائے۔ وہ یقیناً گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔

اپنے ہی ساتھی کو ہلاک کرنے والا سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ تو پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ خود ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ سفید کار میں ایک عدد ڈرائیور بھی موجود تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھیوں کو پٹتے دیکھا تو وہ کار سے لوہے کا ایک پائپ لے کر اُترنے لگا۔ امیر خان نے دوسری گولی سے بچتے ہوئے سلپ ہو کر سفید کار کے دروازے کو لات ماری۔ ڈرائیور کی گردن درمیان میں تھی۔ دروازہ پوری قوت سے اس کی گردن پر لگا تو اس کی سانس ہی رُک گئی تھی گردن کی نازک رگیں اور سانس کی نالی پس کر رہ گئی تھی۔ جب تک وہ اپنا سانس بحال کرتا۔ امیر خان نے زمین پر لیٹے لیٹے اپنا پستول نکالا اور ڈگی کے عقب میں موجود دشمن کی ٹانگ پر گولی ماری تھی اس نے چیخ مار کر پستول پھینک دیا اور ٹانگ پکڑ کر ناچنے لگا۔ امیر خان کو نقصان اس کا االس دیکھنے سے ہوا تھا۔

سفید کار کے ڈرائیور نے اپنی سانس بحال کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ امیر خان کے سر پر لوہے کا پائپ مارا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا لیکن اسے چکر آ گیا تھا۔ اس دوران میں جب کار سے باہر جنگ و جدل کے بھرپور مناظر چل رہے تھے میں نے اندر سے کار کے چاروں ڈور لاک کر دیئے تھے۔ لہٰذا جب ڈرائیور نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے مشتعل ہو کر لوہے کا پائپ کھڑکی کے شیشے پر مارا مگر شیشہ اس بار بھی ناقابلِ شکست ثابت ہوا۔ لوہے کا پائپ اس پر پڑ کر اچٹ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ جھنجھنا گیا تھا۔ اس بار وہ اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے ٹانگ پر گولی کھا کر ناچنے والے کا پستول اٹھایا اور عین کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر شیشے پر فائر کر دیا۔ حالانکہ دو ناکامیوں کے بعد اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ شیشے بلٹ پروف ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میں خوف زدہ ہوا تھا۔ آخر بچہ تھا اگرچہ جمشید علی نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا بلکہ عملی تجربہ کر کے بھی دکھا دیا تھا کہ کار کے شیشے بُلٹ پروف تھے ان پر گولی کا کوئی اثر نہیں ہوتا ثبوت کے طور پر انہوں نے مجھے کار کے شیشے پر گولی چلا کر دکھائی تھی شیشے پر بال بھی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''جب تمہیں کسی سے خطرہ محسوس ہو تو کار کے دروازے اندر سے لاک کر لینا کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

میں نے ایسا ہی کیا تھا لیکن ساتھ ہی میں بچہ بھی تھا۔ خوف زدہ ہونا فطری بات تھی۔ احمق ڈرائیور نے بالکل سامنے سے شیشے پر فائر کیا تھا۔ گولی شیشے سے لگ کر اچٹتی ہوئی واپس پلٹی اور اس کے پیٹ میں گھس گئی۔ میں نے اس کی سفید قمیص پر خون کا دھبہ نمودار ہوتے دیکھا اس نے دہشت زدہ نظروں سے اپنے خون کو دیکھا اور چیخ مار کر واپس کار کی طرف بھاگا ہاتھ تڑوانے والا اور پیر میں گولی

کھانے والا پہلے ہی کار میں سوار ہو چکے تھے۔ انہوں نے مرنے والے کو بھی کار میں کھینچ لیا تھا۔ شاید گولی ڈرائیور کو پیٹ میں کسی نازک مقام پر نہیں لگی تھی اس لیے اسے کار وہاں سے نکال کر لے جانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ لوگ جواب تک کونے کھدروں میں چھپے مار دھاڑ سے بھرپور یہ سینما ذوق و شوق سے دیکھ رہے تھے۔ سینہ تان کے باہر نکل آئے تھے۔ کسی نے قبل از وقت مداخلت کر کے فوت ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ امیر خان کسی قدر ہوش میں تھا اور جب اسے پانی وغیرہ پلایا گیا تو وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گیا تھا۔ البتہ ڈگی میں اوندھے منہ پڑے ہوئے ہمارے ڈرائیور کو ہوش میں لانے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے سر کی چوٹ زیادہ ہی گہری لگ رہی تھی۔ اس اثناء میں سکول کے سیکیورٹی گارڈز اور پرنسپل صاحب بھی آ گئے تھے۔ یہ سن کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے کہ ان کے سکول کے ایک بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مجھے فوری طور پر اندر لے جایا گیا جہاں سکول کا ڈاکٹر زخمی ڈرائیور کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے تشویش سے کہا۔

"مجھے چوٹ سنگین لگتی ہے اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا ہوگا۔"

سکول سے پہلے جمشید پیلس فون کر کے وہاں اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔ پھر زخمی ڈرائیور کے لیے ایمبولینس طلب کی گئی۔ تیسرا فون مقامی پولیس اسٹیشن کیا گیا۔ پہلے ایمبولینس آئی۔ اس میں زخمی ڈرائیور کو ہسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔ پھر جابر آیا تھا۔ جمشید علی کی غیر موجودگی میں تمام معاملات کا ذمے دار وہی ہوتا تھا۔ اس نے آتے ہی امیر خان سے حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا اور کرید کرید کر سوالات کرتا رہا۔ کہ وہ کون تھے کیا ان میں سے کوئی پکڑا گیا اور یہ کہ ان کی خاص نشانی علم میں آئی۔ امیر خان نے سارے سوالوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سن کر جابر نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس اثناء میں ایک سب انسپکٹر مقامی تھانے سے آ گیا تھا۔ پہلے تو وہ اس بات پر چیں بہ جبیں تھا کہ پولیس کے آنے سے پہلے زخمی ڈرائیور کو ہسپتال کیوں روانہ کیا گیا لیکن جب اس نے جمشید علی کا نام سنا تو بالکل سیدھا ہو گیا تھا۔

"اچھا جی گاڑی میں جمشید صاحب کا بچہ تھا۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔ "آئی جی صاحب تو ہمارا باجا بجا دیں گے۔"

پہلے وہ امیر خان کو تھانے لے جانے پر مُصر تھا مگر بعد میں وہ خود تابعدار خادموں کی طرح اسے کار تک چھوڑنے آیا تھا۔ جابر نے مجھے اپنی کار میں لے جانا چاہا لیکن امیر خان نے انکار کر دیا۔

"یوسف بابا صرف اپنی کار میں آ جا سکتے ہیں۔"

"میری کار میں کیا خرابی ہے؟" جابر نے غرا کر کہا۔

"آپ کی کار بلٹ پروف نہیں ہے۔ ممکن ہے دشمن کہیں راستے میں گھات لگا کر بیٹھے ہوں۔ آپ جائیں میں یوسف بابا کو لے کر آتا ہوں۔"





"تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ راستے میں کار نہ سنبھال سکے تو حادثہ کر بیٹھو گے۔"

"یہ چوٹیں میرے لیے نئی نہیں ہیں۔" امیر خان نے اعتماد سے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔" جابر کا لہجہ بدستور خراب تھا۔ "ایسا کرو تم میری کار لے جاؤ اور میں یوسف کو لے کر آتا ہوں۔"

امیر خان نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔ "یوسف بابا میری ذمے داری ہیں اور میں ایک ہی صورت میں یہ ذمے داری کسی اور کے سپرد کر سکتا ہوں جب مجھ میں اسے سنبھالنے کی ہمت نہ رہ جائے۔"

اپنی بات رد کیے جانے پر جابر کی آنکھوں میں قہر کی بجلی سی چمکی تھی۔ وہ جمشید علی کا دستِ راست تھا اور امیر خان ایک معمولی محافظ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ امیر خان کو خود جمشید علی نے براہِ راست اپائنٹ کیا تھا اور وہ ان ہی کو جواب دہ تھا۔ جابر نے اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے پوری قوت سے دروازہ بند کیا تھا اور ہماری طرف دیکھے بغیر نکل گیا تھا۔ میں پہلے ہی اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ امیر خان نے اندر بیٹھتے ہوئے کار چلا دی۔ راستے میں اس نے کار ایک غیر متوقع سمت میں موڑ لی تھی۔ میں پریشان نہیں ہوا۔ مجھے امیر خان پر پورا بھروسہ تھا۔ پھر اس نے کار ایک ویران جگہ روک لی اور سامنے رکھا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دو صفحے بھر دیئے تھے۔ پھر اس نے یہ صفحے پھاڑے اور انہیں موڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

"اسے حفاظت سے اپنے بیگ میں رکھیے۔"

"اس میں کیا لکھا ہے۔" میں نے تجسس سے انہیں کھول کر دیکھا۔ اس میں کسی نامانوس رسم الخط میں کچھ تحریر تھا۔ یہ نہ تو اردو تھی اور نہ ہی انگریزی۔ میں ان دونوں زبانوں سے واقف تھا۔ امیر خان نے کار دوبارہ آگے بڑھا دی۔

"یوسف بابا غور سے سنیے اب میں آپ کو جو بات بتاؤں گا۔ وہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ سوائے جمشید صاحب کے، ماہ پارہ بیگم کو بھی نہیں۔ یہ کاغذ جو میں نے آپ کو دیئے ہیں۔ انہیں حفاظت سے کہیں چھپا کر رکھیے گا اور کوئی پوچھے تو صاف انکار کر دیجیے گا کوئی آپ سے زبردستی نہیں پوچھے گا۔ اگر میں مر جاؤں یا غائب ہو جاؤں تو آپ سکول نہیں جائیں گے۔ بلکہ جمشید پیلس سے باہر بھی نہیں جائیں گے۔ اگر کوئی لے جانا چاہے تو صاف انکار کر دیجیے گا۔ جب تک کہ جمشید صاحب واپس نہ آ جائیں۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یوسف بابا کچھ لوگ آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو اغوا کرنا یا مار دینا چاہتے ہیں۔ آج بھی وہ کامیاب ہو جاتے اگر میں نہ ہوتا۔ اب وہ پہلے مجھے راستے سے ہٹائیں گے کیونکہ میں جمشید پیلس میں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتا لیکن خیر یہ باتیں ابھی آپ کی عمر سے زیادہ ہیں لیکن آپ کو

یاد ہوگا کہ جمشید صاحب نے آپ سے کہا تھا کہ مجھ پر اعتماد کریں اور جو میں کہوں وہی کریں۔ آپ میرے کہنے پر عمل کیجیے۔ یہ پرچہ اپنی کسی کتاب میں چھپا لیں اور پیلس میں جاتے ہی اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیں جہاں کوئی اور نہ پہنچ سکے اور یاد رکھیے گا آپ نے جمشید پیلس سے کسی صورت نہیں نکلنا۔ بلکہ اپنے کمرے سے بھی کم نکلئے گا۔''

اسی وقت ہم جمشید پیلس پہنچ گئے۔ جابر پورچ میں پہلے سے موجود تھا۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' اس نے غرا کر پوچھا۔

امیر خان نے گھڑی دیکھی۔ ''ہم تین بج کر پندرہ منٹ پر وہاں سے چلے تھے اور اب پونے چار ہو رہے ہیں۔ ہم روزانہ تقریباً اتنی ہی دیر میں پہنچتے ہیں۔''

جابر اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بیگ لے کر اوپر جاتے ہوئے اتنا ہی دیکھ سکا تھا۔ ماہ پارہ اتنی بے تاب تھیں کہ سیڑھیوں پر ہی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے نہا دھو کر کپڑے بدلنے کو کہا۔ جب تک میں ان کاموں سے فارغ ہوا۔ ماہ پارہ نے ڈائننگ ہال میں کھانا لگوا دیا تھا لیکن میں نے آج جو مار دھاڑ اور خون وکشت دیکھا تھا اس سے میری بھوک اُڑ گئی تھی۔ ماہ پارہ کے اصرار پر میں نے تھوڑا بہت کھایا تھا۔ کھانے کے بعد ہم اندر آ گئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند کر کے انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ''یوسف آج کیا ہوا تھا؟''

میں نے تفصیل سے انہیں ان سنسنی خیز لمحات کی روداد سنائی۔ کس طرح امیر خان نے میری حفاظت کی، نہ جانے وہ لوگ مجھے اغوا کرنے آئے تھے یا مارنے آئے تھے۔ ماہ پارہ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا مگر وہ اچانک ہی بولی تھیں۔ ''تم امیر خان کے ساتھ آئے ہو، کیا اس نے راستے میں تم سے کچھ کہا یا کوئی چیز دی تھی؟''

ایک لمحے کو تو میں ان کے اندازے پر حیران رہ گیا تھا پھر میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں وہ بے چارہ تو اتنی مشکل سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔''

ماہ پارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' میں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ماہ پارہ عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ ''ہاں تم نے آج تک مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ایک بات یاد رکھو کہ اگر امیر خان نے تم سے کچھ کہا ہے یا کچھ دیا ہے تو اسے چھپا کر رکھنا۔ اب تم آرام کرو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں ان کے آخری جملے پر غور کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے ماہ پارہ میرے جھوٹ سے واقف ہو گئی تھی۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا تھا۔ عام طور سے دوپہر کو میں سوتا نہیں تھا۔ اس لیے جب شام کو جاگا تو جسم ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ گرم پانی سے غسل کر کے مجھے کسی قدر سکون ملا تھا۔ رہی سہی کسر کافی نے پوری کر دی تھی۔ شام سات بجے ایک پروفیسر قسم کی





چیز آتے تھے۔ جو سکول کے نصاب سے ہٹ کر مجھے نہ جانے کیا کیا پڑھایا کرتے تھے۔ آج میرا موڈ نہیں تھا لہٰذا جب ماہ پارہ آئیں تو میں نے ان سے طبیعت خراب کا کہہ دیا اور انہوں نے جا کر پروفیسر صاحب سے کہہ دیا کہ آج ان کا شاگرد چھٹی کے موڈ میں ہے۔

اگلی صبح جب میں سکول جانے کے لیے اٹھا تو امیر خان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ عام طور سے سات بجے آ جاتا تھا اور ہم ساڑھے سات بجے سکول کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ نصف گھنٹے کا راستہ تھا۔ جب تک میں نے تیار ہو کر ناشتہ کیا ساڑھے سات بج چکے تھے۔ مگر امیر خان نہیں آیا۔ میں نیچے پورچ میں آیا تو وہاں امیر خان کے بجائے جابر ایک لمبے تڑنگے شخص کے ساتھ موجود تھا۔ جس نے ڈرائیور کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر خشخشی سی داڑھی تھی۔ گال پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ ناک پکوڑہ جیسی تھی اور کان سامنے کے رُخ پر اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے چھلکتی عیاری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' ماہ پارہ نے اسے دیکھا۔

''یہ یوسف بابا کا نیا ڈرائیور ہے۔'' جابر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آج سے یہ اس کے ساتھ سکول جائیں گے۔''

''ڈرائیور تو ہسپتال میں ہے لیکن یہ امیر خان کہاں ہے؟'' ماہ پارہ نے حیرت سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ امیر خان کہاں ہے۔'' جابر نے اسی لہجے میں کہا۔ ''یاسین اچھا ڈرائیور اور محافظ ہے۔ یہ یوسف بابا کی اچھی طرح حفاظت کر سکے گا۔'' اس نے لفظ اچھی طرح پر زور دیا تھا۔

''کیا آپ تیار ہیں یوسف بابا؟''

''سوری۔'' ماہ پارہ نے مجھ سے پہلے کہا۔ ''یوسف آج سکول نہیں جائے گا۔ اس کے لیے کسی بھی نئے شخص کو رکھنے کا اختیار صرف جمشید صاحب کو ہے اور ان کی عدم موجودگی میں مجھے ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے جابر ابھی پھٹ پڑے گا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''چلئے ٹھیک ہے۔ آپ خود ہی یوسف بابا کو سکول لے جائیے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اچانک ہی جابر کے عقب سے امیر خان نمودار ہوا تھا۔ ''میں یوسف بابا کو لے جانے آیا ہوں۔'' جابر اور اس کا ساتھی یاسین بھونچکے سے امیر خان کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ان کی حالت سے لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''تم...... تم کیسے آئے؟'' جابر کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ خود ہی سنبھل کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟''

''میری گاڑی میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا تھا۔ اسی بناء پر ذرا دیر لگ گئی۔'' امیر خان نے اطمینان سے کہا۔ ''کسی نے اس کے اگنیشن کے ساتھ ایک ڈائنا مائٹ اسٹک لگا دی تھی۔ ادھر میں چابی گھماتا اور ادھر میرے ٹکڑے گاڑی سمیت بکھر جاتے، جس نے بھی یہ کام کیا تھا وہ اناڑی تھا اور

آسانی سے پکڑا جائے گا اگر اس نے دستانے نہ پہنے ہوں تو ڈائنا مائٹ کی اسٹک پر اس کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ آپ تیار ہیں یوسف بابا؟''

''میں تیار ہوں امیر خان۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔

جابر اس شخص یاسین کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے دھاڑ کر کہا۔ ''وہ ڈائنا مائٹ اسٹک کہاں ہے؟ مجھے دو میں پتا چلاؤں گا کہ کس کی حرکت ہے؟''

''اسٹک میں نے ایک جگہ نہایت حفاظت سے رکھی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہ پولیس تک پہنچ جائے گی۔'' امیر خان نے کہا۔

جیسے ہی کار جمشید پیلس کے گیٹ سے باہر نکلی اور میں نے منہ کھولا تھا کہ امیر خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے ایک چٹ میری طرف بڑھا دی جس پر لکھا تھا۔

''کل والی بات کے بارے میں کوئی بات مت کیجیے گا۔'' میں نے کاغذ پڑھ کر خاموشی سے اسے واپس کر دیا۔

میں بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ ایک اچھے سکول میں ساتویں کلاس میں تھا۔ سب سے بڑھ کر مجھے جو ماحول اور اس کے حوالے سے جو تربیت مل رہی تھی اس نے مجھے قبل از وقت باشعور کر دیا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ دشمن امیر خان کو مجھ سے جدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے تا کہ میرے حوالے سے ان کے عزائم پورے ہو سکیں۔ مجھے جابر کا طرزِ عمل بھی نہایت مشکوک لگ رہا تھا۔ امیر خان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا تھا اور اس کے انداز میں واضح طور پر مایوسی جھلک رہی تھی اور اس سے زیادہ پریشانی تھی۔

میں نے ایک کاپی نکال کر اس کے صفحے پر لکھا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' اور کاپی امیر خان کے سامنے کر دی تھی۔ اس نے کاپی دیکھ کر سر ہلایا اور اچانک ہی کار کے انجن کو ریس دینے لگا پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔

''لعنت ہو، یہ کیا ہو رہا ہے؟''

دو تین دفعہ ریس دے کر اس نے کار آہستہ کی اور انجن بند کر دیا پھر بولا۔ ''انجن دیکھنا پڑے گا۔''

وہ نیچے اُترا تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ اس وقت ہم ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ ہم کار سے کسی قدر دور آ گئے تھے۔

''تم نے مجھے کار میں بولنے سے منع کیوں کر دیا؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''احتیاطاً یوسف بابا لیکن کیا آپ نے مجھے یہی کہنے کے لیے روکا ہے۔ آپ پہلے ہی سکول سے لیٹ ہو رہے ہیں۔''





''سکول کو گولی مارو اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟ کل مجھ پر حملہ کرنے والے کون تھے؟ جابر کس شخص کو صبح لایا تھا؟ اور تمہاری کار میں بم کس نے لگایا تھا؟''

وہ ہنسا۔ ''آپ ایسی باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بھلا مجھے کیا معلوم کہ جابر صبح کس شخص کو لایا تھا اور مجھے بم لگانے والے کا پتا چل جاتا تو یہ بم اس کے نیچے نہ رکھ دیتا۔''

''جابر کو کیسے معلوم ہوا کہ آج تم نہیں آ رہے ہو؟''

''یوسف بابا ابھی آپ کی عمر ایسی نہیں ہے کہ ان معاملوں میں اُلجھیں۔'' امیر خان نے نرمی سے کہا۔ ''یہ میرے اور جمشید صاحب کے دیکھنے کی باتیں ہیں۔ ابھی آپ صرف تعلیم حاصل کریں اور جو کہا جائے وہ کریں۔''

''امیر خان معاملہ میری زندگی کا ہے۔'' میں نے پیر پٹخ کر کہا۔ ''لہٰذا یہ باتیں میرے علم میں بھی آنی چاہئیں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟''

''ان سوالوں کا جواب آپ کو صرف جمشید صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ آپ ان ہی سے پوچھئے گا۔'' امیر خان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''آیئے آپ کو ویسے بھی سکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ جھنجھلاہٹ میں میں نے زور سے کار کا دروازہ بند کیا تھا۔ امیر خان نے ڈرائیونگ سیٹ پر آنے سے پہلے ایک بار کار کا بونٹ کھول کر زوردار طریقے سے بند کیا۔ یہ میری خوش فہمی تھی کہ تابعدار امیر خان مجھے سب بتا دے گا۔ وہ اپنے آقا کی ہدایات پر مجبور تھا اور مجھے بچہ بھی سمجھ رہا تھا اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔

جان کا خطرہ ایسی چیز ہے کہ ایک دن کا بچہ بھی اسے محسوس کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو صحیح طور پر دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سن سکتا ہے۔ اپنی ماں کو بھی وہ لمس اور اس کی خوشبو سے پہچانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ نامانوس ہاتھوں میں ہو یا اسے جان کا خطرہ محسوس ہو تو وہ رو رو کر اس کا اعلان کرتا ہے کہ اسے کسی طرح خطرے سے بچایا جائے۔ آپ اسے چھٹی حس بھی کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں ایک بارہ سالہ لڑکا جس نے عام بچوں سے کہیں زیادہ دنیا دیکھی ہو اور ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ بھلا خطرے کو کیوں محسوس نہیں کرے گا۔ میں بھی خطرہ محسوس کر رہا تھا اور یہ میرا فطری ردِعمل تھا کہ میں خود کو اس خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میرا جاننا ضروری تھا کہ مجھے خطرہ کس طرف سے تھا اور کیوں تھا۔ میرے محافظوں کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ کسی شخص کو ایک تاریک کمرے میں کسی زہریلے سانپ کے ساتھ چھوڑ دیا جائے اور پھر اصرار کیا جائے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے دوسروں پر انحصار کرے لیکن اس کے ہمدرد نہ تو کمرے میں روشنی کر رہے ہیں اور نہ ہی اسے کمرے سے باہر آنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس کے بجائے وہ تاریکی

میں سانپ کے شکار پر مُصر ہیں۔

سکول میں بھی میرا دل نہیں لگا تھا۔ بجائے پڑھائی کے میں مسلسل اس فکر میں تھا کہ میرے دشمن درحقیقت کون تھے اور وہ میرے پیچھے کیوں پڑے تھے۔ ان کی سازشوں کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے محافظوں کے بھی درپے ہو رہے تھے۔ بہ ظاہر مجھ پر حملہ اور امیر خان کی کار میں بم فٹ کرنے والے ایک ہی تھے۔ جابر، امیر خان کو زندہ دیکھ کر جس بُری طرح چونکا تھا۔ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھی میرے دشمن یا دشمنوں سے ملا ہوا تھا لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ میری زندگی کی ضرورت اصل میں کس کو تھی۔ اچانک ایک نام میرے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا۔ میں اچھلا تو بائیولوجی کی ٹیچر نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ وہ مینڈک کے اندرونی نظام کی ڈایاگرام کی مدد سے وضاحت کر رہی تھیں۔

''اینی پرابلم یوسف؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نو میڈم۔'' میں نے خجالت سے کہا۔

''ممکن ہے انہوں نے کوئی مینڈک دیکھ لیا ہو سچ مچ کا۔'' کسی نے شرارت سے کہا تو پوری کلاس ہنس دی۔ ٹیچر بھی مسکرانے لگی تھیں مگر انہوں نے لیکچر کا سلسلہ نہیں روکا تھا۔ مجھے نہ تو کلاس کے ہنسنے کی پروا تھی اور نہ ٹیچر کی سرزنش کی۔ میں زہرہ بیگم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق پانچ ارب افراد کی اس دنیا میں وہ واحد شخصیت تھیں جو مجھے اس حد تک ناپسند کرتی تھیں کہ قتل کرنے کو تیار ہو جاتیں اور پھر جابر ہمیشہ سے ان کا چمچہ خاص تھا اور اس معاملے میں اس کا کردار بھی مشکوک تھا۔ مجھے اس کاغذ کا خیال آیا جو مجھے امیر خان نے دیا تھا اور میں نے اسے اپنے بیڈ روم میں لگی ایک سینری کے عقب میں چھپا دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ امیر خان سے دو ٹوک بات کروں گا۔ اگر اس نے مجھے اصل بات نہیں بتائی تو میں بھی اس کی ایک نہیں مانوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

تین، چار دن میں امیر خان سے بات کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا۔ سکول آنے اور جانے کے دوران امیر خان بات کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ یہ شاید پانچویں دن کی بات تھی، سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بچے تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ بچے جس طرح بستے سنبھال کر فرار ہو رہے تھے، اس سے یہ حقیقت واضح تھی کہ سکول چاہے ٹاٹ والا سرکاری ہو یا اس جیسا شاندار اور عالیشان، بچے کسی غریب ریڑھی والے کے ہوں یا کسی کروڑ پتی صنعت کار کے، سکول ان کے لیے ایک ایسا قید خانہ ہوتا ہے جہاں سے رہائی کا لمحہ ان کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم کو بچوں اور ان کے والدین کے لیے سزا بنا دیا گیا ہے۔ یہ زوال پذیر معاشرے کی سب سے بڑی نشانی ہے کہ اس کی نئی نسل سکول جانے سے گریزاں ہو اور جائے بھی تو بادلِ نخواستہ۔





سکول کے سامنے سڑک کے پار ایک وسیع و عریض پارک تھا۔ اس سڑک کے ساتھ والے جنگلے کے ساتھ قطار در قطار اونچے اور گھنے درخت لگائے گئے تھے۔ بچوں کو لینے کے لیے آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور ان درختوں کے سائے میں ٹھہر کر چھٹی کا انتظار کرتے تھے۔ میں باہر نکلا تو خلافِ معمول میری کار دروازے پر نہیں تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں نظر دوڑائی، یہ ہلکے نیلے رنگ کی مرسڈیز کار تھی۔ چھوٹی لیکن طاقتور اور سُبک رفتار، جمشید علی نے اس میں کئی ایک تبدیلیاں کر کے اسے چلتے پھرتے قلعے میں بدل دیا تھا۔ بالآخر کار مجھے نظر آ گئی۔ جو کاروں کی ایک طویل قطار میں خاصے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسی اثناء میں گاڑیاں بچوں کو لے کر روانہ ہونے لگی تھیں۔

حملے والے دن کے بعد سے زخمی ڈرائیور کو ہیوی ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اب مجھے لانے اور لے جانے کا فریضہ امیر خان ہی ادا کرتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آج اس نے کار سکول کے سامنے لا کر کیوں نہیں روکی۔ میں بیگ لے کر خود ہی کار کی طرف چل پڑا۔ امیر خان مجھے کار کے باہر بھی نظر نہیں آیا۔ وہ شاید کار میں ہی تھا۔ میں ذرا آگے آیا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ امیر خان کار میں تھا، وہ ڈرائیونگ سیٹ پر سر ٹکائے اور اپنی پی کیپ منہ پر رکھے لیٹا تھا۔ یہ ایک اور تعجب کی بات تھی۔ دو سال کے دوران جب سے امیر خان میرا محافظ مقرر ہوا تھا، میں نے اسے دوران ڈیوٹی کبھی یوں بے پروائی سے سوتے نہیں دیکھا تھا۔ کار کا شیشہ بھی کھلا تھا۔

اسے سوتے دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اپنی جیب سے طوطے کی آواز والی سیٹی نکالی اور گھوم کر امیر خان کے پاس پہنچا۔ سیٹی اس کے کان کے پاس لے جا کر میں نے پوری قوت سے بجائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُچھل پڑے گا مگر وہ ہلا تک نہیں۔ اسی طرح خاموش پڑا رہا۔ یک لخت میرے جسم میں خوف کی سرد لہر داخل ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے امیر خان کے چہرے سے پی کیپ اٹھائی اور میری چیخ نکل گئی۔ اس کی غیر معمولی حد تک کھلی آنکھیں میری طرف نگران تھیں، منہ نیم وا تھا اور ہونٹوں کے گوشوں سے نیلا سا جھاگ نکل کر جم گیا تھا۔ اپنی بارہ سالہ زندگی میں کبھی اتنے پاس سے کوئی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ امیر خان مر چکا تھا۔ اس کی کھلی آنکھوں کی سفیدی بہت بھیانک لگ رہی تھی اور نیم وا ہونٹ ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔

''دیکھا یوسف بابا، آخر آپ کے دشمن کامیاب رہے۔''

وہ شخص اس دن بال بال موت سے بچا تھا، اگر وہ انجن دیکھے بغیر کار سٹارٹ کر دیتا تو فرشتۂ اجل اسے وہیں دبوچ لیتا لیکن نہیں، فرشتۂ اجل کے لیے مقررہ وقت اور جگہ کوئی اور ہی تھے۔ اس وقت ایٹم بم بھی امیر خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور جب وقت آیا تو کوئی نامعلوم شکاری خاموشی سے اسے موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔ میری ذہنی کیفیت خراب ہونے لگی تھی۔ میں نے پی کیپ پھینکی اور چیخ مار کر دوڑا۔ میرا رخ سکول کی جانب تھا اور بدحواسی میں مجھے سامنے سے آتی کار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں کار کے سامنے اتنا اچانک آیا تھا کہ ڈرائیور کو رخ موڑنے کا موقع بھی نہیں ملا

تھا، اس نے بریک ضرور لگائے ہوں گے لیکن اتنے کم فاصلے سے بریک بھی کار کو نہیں روک سکتے تھے، کار میرے دائیں پہلو سے ٹکرائی۔ تصادم کی شدت نے مجھے فضا میں اُچھال دیا تھا۔ میں نے خود کو بلند ہوتے محسوس کیا اور میری یہ حادثاتی پرواز سڑک کے کنارے کھڑی مونگ پھلی کی ایک ریڑھی پر ختم ہوئی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے مونگ پھلی والے کے چلانے کی آواز سنی تھی اور جو آخری خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ دشمن بالآخر امیر خان کے بعد مجھے بھی مارنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کے بعد بلیک آؤٹ ہو گیا۔

بے ہوشی کی حالت میں مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بے وزنی کی کیفیت میں خلا میں تیر رہا تھا۔ میرے چاروں طرف سفید سی روشنی تھی جس میں کبھی کبھی چہرے جھانکنے لگتے تھے، پُرتشویش اور فکر مند چہرے، میں ان کے ہلتے لب تو دیکھتا تھا لیکن میرے کان ان کی آوازیں کیچ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ چہرے میرے دشمنوں کے نہیں بلکہ مہربانوں کے ہیں۔ رفتہ رفتہ میرے اردگرد پھیلی دھند صاف ہونے لگی اور جب میں مکمل طور پر ہوش میں آیا تو میں نے خود کو جمشید پیلس میں اپنے ہی کمرے میں پایا تھا۔ میرا پورا بدن ایک عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا، میری آنکھوں کے گوشوں نے خفیف سی حرکت محسوس کی تھی۔ میں نے سر گھمایا۔ یہ ماہ پارہ تھیں، جو مصلے پر دست بہ دعا بیٹھی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ وہ خدا سے میرے لیے ہی دعا مانگ رہی تھیں اور خدا نے ان کی دعا سن لی تھی۔

میں ایک گاؤن نما لباس میں تھا اور میرے جسم کے دائیں حصے پر گھٹنے سے لے کر کولہے تک سخت بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ بائیں بازو میں کلائی سے بازو تک پلاستر تھا۔ سینے پر بھی پلاستر تھا۔ شاید اس کی وجہ سے بے ہوشی کی کیفیت میں مجھے کبھی کبھی دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے زخم تھے۔ شاید مجھے کوئی مسکن دوا دی گئی تھی جس کے زیر اثر مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ بینڈیج اور پلاستر سے ظاہر تھا کہ میرے جسم میں اچھی خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ میرے سیدھے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور قطرہ قطرہ گلوکوز میری رگوں میں اُتر رہا تھا۔

پہلا احساس جو ہوا وہ پیاس کا تھا۔ نہ جانے کتنے وقتوں سے میری زبان نے پانی کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ میں ایک ٹک ماہ پارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے میری طرف دیکھا، ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں جو اطمینان نمودار ہوا، میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی ہی خوشی تھی جو ایک ماں کو ہوتی ہے، جب اس کا بیٹا موت کے منہ سے نکل آتا ہے۔ وہ لپک کر میری طرف آئیں۔ ”یوسف میرے بچے ......“ انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے مجھے اپنے بوسوں سے نہلا دیا تھا جس میں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ ”تُو ٹھیک ہے تُو نے مجھے پہچانا۔“

”آپ ...... آپ میری ماں ہیں۔“ میں نے تذبذب سے کہا۔

”ہاں ...... میں تمہاری ماں ہوں۔“ انہوں نے یقین کامل سے کہا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا





لیا۔

یہ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ انسان کب ماں اور اس کی ممتا کو محسوس کرتا ہے۔ جب وہ اس کے وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے یا جب وہ اس کے وجود سے باہر آتا ہے۔ میری بھی ایک ماں ہو گی جس نے نو ماہ مجھے اپنے وجود میں رکھا ہو گا اور جب میں پیدا ہوا ہوں گا تو مجھے اپنی ممتا سے بھرپور محبت دی ہو گی۔ یہ ممتا کتنے عرصے میرے نصیب میں رہی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں لیکن یہ مدت ایک سال سے زیادہ نہیں رہی ہو گی کیونکہ ایک سال کی عمر میں مجھے جمشید پیلس لے آیا گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اپنی تصویروں کی البم دیکھ کر ہوتا ہے جس میں روزِ اول سے لے کر اب تک کی میری بے شمار تصاویر تھیں۔ پہلی تصویر میں مَیں سال بھر کا نظر آ رہا تھا۔ پیلس کے ایک پرانے خدمت گار نے تصدیق کی تھی کہ میں جب جمشید پیلس آیا تھا تو میری عمر ایک سال کے آس پاس تھی۔ یہ مجھے اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ میرے اصل ماں باپ کون تھے اور میں جمشید پیلس کیسے آیا۔ جمشید علی نے میرے سوالوں کے جواب میں ہمیشہ ایک ہی بات کہی تھی کہ وقت آنے پر مجھے سب معلوم ہو جائے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ میں اتنی کم عمری میں اپنی ماں سے جدا کر دیا گیا تھا کہ میری یادداشت میں اس کا ہلکا سا سایا بھی نہیں تھا۔ اس کا ایک لمحہ، ایک خوشبو اور ایک احساس تک میرے پاس نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ماں اور اس کی محبت کیا ہوتی ہے لیکن اس روز ماہ پارہ نے مجھے احساس دلایا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے۔ اس کا سایا دنیا کی تپتی دھوپ میں نرم اور سرد ہوتا ہے۔ وہ اس تلخ اور کھردری دنیا میں گداز اور مٹھاس کی علامت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری سگی ماں بھی زندہ ہوتی تو میرے لیے اس سے زیادہ بے قراری اور محبت نہیں دکھا سکتی تھی جو ماہ پارہ نے ظاہر کی تھی۔ میرے وجود میں سکون کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور میں بھول گیا تھا کہ چند لمحے پہلے تک شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اچانک ماہ پارہ مجھ سے الگ ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جذباتی ہو کر میرے زخموں کو نقصان نہ پہنچا رہی ہوں اور مجھے اس سے تکلیف نہ ہو رہی ہو۔ حالانکہ میں رہی سہی تکلیف بھی بھول گیا تھا۔

”یوسف درد تو نہیں ہو رہا ہے میرے بچے؟“ انہوں نے بے قراری سے کہا۔

”نہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن پیاس لگ رہی ہے۔“

ماہ پارہ نے گھنٹی بجا کر ایک نرس کو طلب کیا۔ ”ڈاکٹر کو بلاؤ، یوسف کو ہوش آ گیا ہے۔“

اسی دوران ماہ پارہ ایک شفاف گلاس میں پانی لے کر اس میں گلوکوز گھول رہی تھیں۔ انہوں نے یہ گلوکوز ملا پانی چمچے سے میرے منہ میں ٹپکانا شروع کر دیا۔ ٹھنڈک اور تراوٹ میری رگ و پے میں اُترنے لگی تھی۔ معاً مجھے امیر خان کا خیال آیا میرا دل بے اختیار دُکھ سے بوجھل ہونے لگا تھا۔

”ماں! امیر خان ......“ میں نے کہنا چاہا تو ماہ پارہ نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی، پھر

انہوں نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

"یوسف! آئندہ مجھے ان کمروں میں ماں مت کہنا۔ یاد رکھو یہاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

اسی لمحے ڈاکٹر کمرے میں آ گیا۔ ماہ پارہ پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ مجھ سے کچھ سوالات کیے میرے جواب پر وہ اپنے چارٹ پر کچھ لکھتا رہا، پھر اس نے نرس کو میری ڈرپ میں کچھ دوائیں شامل کرنے کا حکم دیا اور ماہ پارہ سے کہا۔ "ہی از آل رائٹ، لیکن ابھی انہیں ٹھوس کے بجائے رقیق غذا دیں۔"

"ڈاکٹر میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"بہت جلد ینگ بوائے۔" ڈاکٹر نے میرا شانہ تھپکا۔ "ایک ہفتے بعد تم چل پھر سکو گے اور دو ہفتے بعد فٹ بال کھیل سکو گے لیکن تمہارے بازو اور پسلی کی ہڈی ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ تمہیں احتیاط کرنی پڑے گی ورنہ ہڈی میں بال آ گیا تو بڑی پریشانی ہوگی۔ بٹ یو آر اے بریو بوائے۔"

میں مسکرایا تو وہ میرے بازو کو تھپکی دے کر چلا گیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ سے کہا۔ "ما...... ماہ پارہ مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ مسکرائیں کہ میں انہیں ماں کہتے کہتے رُک گیا تھا۔

"تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی جہاں تم نے ایک ہفتے صبر کیا ہے، وہاں دو منٹ اور سہی۔"

"ایک ہفتہ......" میں حیران رہ گیا تھا۔ "میں ایک ہفتہ بے ہوش رہا۔"

"نہیں...... ہوش تو تمہیں اگلے ہی روز آ گیا تھا لیکن تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں نیند کے انجکشن سے سلا کر رکھا گیا تھا ورنہ تم درد سے بے چین رہتے۔ تم جب ہوش میں آنے لگتے تمہیں پھر خواب آور دوا دے دی جاتی تھی اس دوران تمہیں ڈرپ کے ذریعے سے غذا دی جاتی رہی تھی۔"

"کیا میرا علاج پیلس میں ہی ہو رہا ہے؟"

"نہیں...... تم تین دن تک ہسپتال میں داخل رہے تھے پھر جمشید صاحب کی ہدایات پر تمہیں پیلس منتقل کر دیا گیا۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے ایک ڈاکٹر اور ایک نرس ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔"

میں امیر خان کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے تو اب تک دفنا دیا گیا ہوگا، ماہ پارہ نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ وہ بولیں۔

"امیر خان اچھا آدمی تھا، وفادار، پُرجوش، افسوس کہ ہم...... خیر میں نے جمشید صاحب کی ہدایات پر اس کے گھر والوں کو معقول رقم کا ایک چیک بھجوا دیا ہے۔ ویسے تو اس نے بھی بہت کچھ چھوڑا ہوگا۔ جمشید صاحب اسے اچھی تنخواہ دیتے تھے۔"

"اس کے بچے ہیں؟" میں نے پوچھا۔





"ہاں، ایک لڑکا ہے تمہاری عمر کا، لڑکی بڑی ہے۔"

"کیا وہ تمام رقم ان کے باپ کا بدل ہو سکتی ہے، میرا خیال ہے دنیا کی تمام دولت مل کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم ہے پاپا میرے باپ نہیں ہیں لیکن میں انہیں دنیا کی تمام دولت کے بدلے بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔" میرا لہجہ دُکھی ہو گیا تھا پھر میں چونکا۔ "ابھی آپ نے پاپا کی بات کی، کیا وہ واپس آ گئے ہیں؟"

"نہیں...... انہیں شپ پر ٹیلکس بھیج دیا گیا تھا۔ ان کا جوابی ٹیلکس آیا تھا، اب تمہاری حفاظت کے لیے دو نئے محافظ تعینات کیے گئے ہیں۔ فی الوقت تو میں نے انہیں تمہارے کمرے کے باہر لگا رکھا ہے۔"

امیر خان کی موت کا دُکھ تازہ ہو گیا تھا۔ میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "امیر خان کی موت ایسے واقع ہوئی تھی اس کے ہونٹوں سے مٹیالا مائل جھاگ نکل رہا تھا۔"

"اب چھوڑو...... بس اس کی موت آ گئی تھی۔" ماہ پارہ نے بات ٹالی۔ "فی الوقت تم آرام کرو۔"

ظاہر ہے ماہ پارہ مجھے بچہ سمجھ کر بہلا رہی تھیں۔ ماہ پارہ نے پہلے گیلے تولیے سے میرا منہ صاف کیا، پھر نرس ایک ٹرے میں بڑا سا پیالہ لے کر آئی۔ ماہ پارہ اس میں موجود سوپ مجھے چمچ سے پلانے لگی تھیں۔ مجھے اتنی شدت سے بھوک لگ رہی تھی کہ جلد ہی پیالہ ختم ہو گیا تھا۔ میں اور سوپ پینا چاہتا تھا لیکن یک لخت میرے اعصاب پر غنودگی چھانے لگی تھی شاید نرس نے ڈرپ میں جو دوائیں ڈالی تھیں، ان میں کوئی خواب آور دوا بھی شامل تھی۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند سو چکا تھا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو تاریکی چھا چکی تھی۔ بیڈ روم میں ہلکی سی روشنی تھی۔ میرے بستر کے پاس ہی کرسی پر ایک ہیولہ سا بیٹھا تھا جیسے ہی میں نے حرکت کی وہ ہیولہ متحرک ہو گیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ کوئی نرس تھی، شاید اس کی رات کی ڈیوٹی تھی، ورنہ صبح دوسری نرس تھی، یہ والی نرس خاصی کم عمر تھی، شاید حال ہی میں نرسنگ مکمل کی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خوب صورت تھی یا نہیں لیکن میری آنکھوں کو بھلی لگی تھی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے میرے اتنے نزدیک آ کر پوچھا کہ میں اس کی سانسوں کی گرمی اور اس کے بدن کی مہک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میری جسمانی نشوونما خاصی تیز تھی۔ بارہ سال کی عمر میں پندرہ سال کا لگتا تھا اور شاید یہی رفتار میری ذہنی ترقی کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی اور بارہ سالہ لڑکا کسی لڑکی کی قربت کو یوں محسوس کر سکتا تھا یا نہیں۔ بہرحال مجھے اس کی قربت اچھی لگی تھی۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں...... اب کچھ ٹھیک محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے ذرا شرارت سے کہا تو وہ شرما گئی تھی لیکن اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے تھے کہ

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوگئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازے پر کاجل کھڑی تھی اور کڑی نظروں سے نرس کو گھور رہی تھی۔ حسبِ معمول اس کے بے پناہ گھنے بال بکھرے ہوئے تھے اور سیاہ آنکھوں میں غصہ چمک رہا تھا۔ اس نے اندر آ کر نرس سے کہا۔

''گیٹ آؤٹ۔''

نرس دم بخود رہ گئی تھی۔ غالباً اسے ایک بچی سے اس لفظ اور اس لہجے کی امید نہیں تھی۔ وہ ابھی اس حکم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ نرس اس کی بات نہیں مانے گی اور وہ جنونی ہو جائے گی۔ فی الوقت میں اس قابل نہیں تھا کہ اسے روک سکوں۔ اپنے معاملے میں اسے میں نے ایسا ہی جنونی پایا تھا۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تھا تو ماں کی پروا کیے بغیر گھنٹوں میری گود میں چڑھی رہتی تھی اور کسی صورت اُترنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔ اگر میں اسے اس کی مرضی کے خلاف گود سے اُتار دیتا تھا تو وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ مجھے بھی سیاہ چمکتی آنکھوں والی یہ لڑکی اچھی لگتی تھی لیکن جب وہ روتی تھی تو مجھے بے زار کر دیتی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے میں نیچے جانے سے گریز کرتا تھا تو وہ مجھے تلاش کرتی اوپر آ جاتی اور کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ نکالتی تھی۔ ماہ پارہ اسے میری لیلیٰ کہتی تھیں، وہ مجھے چھیڑا کرتی تھیں۔ ''یوسف! ذرا سوچ اگر بڑے ہو کر اس نے کہہ دیا کہ اس نے تم سے شادی کرنی ہے تو......؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں جلدی سے کہتا۔ ''میں اس کالی رونے والی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔''

''کالی کہاں ہے، اتنا پیارا رنگ ہے، تمہیں معلوم ہے گورے اپنی جلد اس رنگ کی کرنے کے لیے گھنٹوں دھوپ سینکتے ہیں۔'' سچی بات تھی کہ بچپن میں جب کاجل نے میرے بال کھینچے تھے، میں اس سے چڑنے لگا تھا۔ وہ زبردستی میرے سر ہو جاتی تھی تو میں زہرہ بیگم کے خوف سے اسے برداشت کر لیتا تھا مگر رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ جیسے شرابی تلخ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پھر میں اس کے جنون سے ڈرنے لگا۔ غصے کے عالم میں وہ اپنے ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ ایک بار اس نے اتنی سی بات پر پیپر ویٹ میرے سر پر کھینچ مارا تھا کہ میں اس کے ساتھ کھیلنے کے بجائے پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا، دوسری بار اس نے ایسی ہی کسی بات پر ناراض ہو کر سوئمنگ پول میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کی عمر صرف چھ سال تھی، خوش قسمتی سے مجھے تیراکی آتی تھی اور اس کے ڈوبنے سے پہلے میں اسے نکال لایا تھا۔ وہ دوبارہ پانی میں کودنے پر کمر بستہ تھی۔ اگر میں اس کی بات نہ مانتا تو وہ پانی میں کود بھی جاتی۔ وہ اتنی ہی ضدی تھی، بعد میں اکثر کسی بات پر میں جل کر اس سے کہتا۔

''اچھا تھا کہ اس روز میں تمہیں سوئمنگ پول سے نہ نکالتا۔''

''تو نہ نکالتے۔'' وہ اطمینان سے کہتی۔ ''میں نے تو نہیں کہا تھا مجھے نکالو۔''

میں بھنا کر کہتا۔ ''اگر نہ نکالتا تو تمہاری والدہ محترمہ الزام لگاتیں کہ میں نے ہی تمہیں دھکا دیا ہے۔''



''تو میں آئندہ سوئمنگ پول میں چھلانگ نہیں لگاؤں گی۔'' اس نے سوچ کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''آئندہ تم نے میری کوئی بات نہیں مانی تو میں مما کی ساری نیند کی گولیاں کھا لوں گی۔'' اس نے گویا تجویز پیش کی۔ ''پھر تو مما تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔''

میں نے سر پکڑ لیا۔ ''خدا کے لیے کاجل کی بچی، تم دھمکیاں دینا نہیں چھوڑو گی۔''

''بالکل نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

وہ صرف آٹھ سال کی تھی اور میرے پاس کسی ایک سالہ بچی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نرس کو میرے قریب دیکھ لیا تھا اور مجھے نرس کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، میں نے جلدی سے نرس سے کہا۔

''سسٹر آپ پلیز باہر جائیے۔''

نرس نے باہر جانے کی درخواست سے زیادہ لفظ ''سسٹر'' کا بُرا منایا تھا۔ کاجل پاس آ کر مجھے گھورنے لگی تھی۔

''یہ نرس کی بچی تمہارے پاس کیا کر رہی تھی؟'' اس نے حاسدانہ لہجے میں کہا۔

''میرا ٹمپریچر لے رہی تھی۔'' میں نے کہا۔ جلدی میں مجھے یہی بہانہ سوجھا تھا۔

''تھرمامیٹر کہاں تھا اس کے پاس؟'' اس نے مشکوک انداز میں مجھے دیکھا۔

''ایسے ہی چیک کر رہی تھی۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''اور تم اب آ رہی ہو مجھے دیکھنے۔''

''میں آئی تھی تم سو رہے تھے۔ ابھی مما نہیں آنے دے رہی تھیں۔'' وہ بلا تکلف میرے بستر پر لیٹ گئی۔ ان دنوں وہ خاصی فربہ ہوا کرتی تھی۔

''موٹی کہیں کی، مجھ پر کہاں چڑھی آ رہی ہو۔ پہلے ہی میری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ایک دو تم اور توڑ دو گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔'' وہ جان بوجھ کر مجھ سے چپک کر بیٹھ گئی۔ ''تم نے پوچھا نہیں کہ اب مما نے مجھے آنے کی اجازت کیسے دی؟''

''تم نے یقیناً کھانا نہیں کھایا ہوگا۔'' میں نے اندازہ لگایا۔ ''لیکن تم نے چھپ کر کچھ نہ کچھ کھایا ہوگا۔''

''جی نہیں۔'' اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ ''میں نے دو دن تک کچھ نہیں کھایا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''تم نے دو دن کچھ نہیں کھایا۔''

''اور سوئی بھی نہیں۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''پھر مما نے اجازت دے دی۔''

میں نے دائیں ہاتھ سے سر تھام لیا۔ ''کاجل تم اتنی ضدی کیوں ہو؟''

''بس ہوں۔'' وہ غصے میں آ گئی۔ ''اور یہ نرس یہاں کیوں ہے، اس سے کہو کہ یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ میں کوئی چیز مار کر اس کا سر توڑ دوں گی۔''

''بابا وہ میرے ساتھ کھیلنے نہیں آئی ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''میں بیمار ہوں، وہ میری دیکھ بھال کر رہی ہے۔''

''دیکھ بھال میں بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ بھال میں بھی کر سکتی ہوں۔'' میں نے اس کی نقل اتاری۔ ''انجکشن لگانا تو ایک طرف رہا، تمہیں تھرما میٹر دیکھنا نہیں آتا۔''

''اچھا تب کوئی دوسری نرس رکھ لو، آنٹی جیسی۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ یہاں نہیں رہے گی۔''

ماہ پارہ کو وہ آنٹی کہتی تھی۔ شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ماہ پارہ کی عمر کی کوئی نرس رکھ لوں لیکن وہ کہہ نہیں سکی تھی۔ آج میں سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ کیا ایک آٹھ سالہ بچی کسی جوان لڑکی کی طرح حسد کر سکتی ہے؟ وہ اپنے محبوب کے پاس کسی دوسری لڑکی کو برداشت نہیں کر سکتی چاہے وہ ایک مہربان نرس ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تمام تر قربتوں کا حق دار صرف خود کو سمجھتی ہے۔ کچھ ایسا ہی رویہ کاجل کا بھی تھا۔ یہ کچھ عرصے بعد کی بات ہے، اس نے مجھے دھمکی دی۔

''اگر تمہارے ساتھ کوئی دوسری لڑکی نظر آئی تو میں اسے مار ڈالوں گی۔''

میں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ ''کیسے مار ڈالو گی۔ چوہیا سی تو ہو۔''

اس کی رات سی کالی آنکھوں میں غصہ دہک اٹھا تھا۔ اس نے پیر پٹخ کر کہا۔ ''بس مار ڈالوں گی۔''

اس رات بھی وہ کچھ ایسے ہی موڈ میں تھی۔ ''سوری کاجل، نرس کو میں نے نہیں رکھا اور نہ ہی میں اسے نکال سکتا ہوں۔''

''میں نکال دوں گی۔'' اس نے کہا۔

''خدا کے لیے کاجل، وہ صرف ایک نرس ہے۔'' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔

''تم اس نرس کو نہیں بھگاؤ گے۔'' اس نے الٹی میٹم دینے والے انداز میں کہا۔

''میں اسے کیسے بھگا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اب وہ اس کمرے میں آئی تو میں اس کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں گی۔'' اس نے بیڈروم کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''احمق لڑکی، یہ کھڑکی زمین سے بہت اونچی ہے، تمہاری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔''

''ہو جائے، لیکن وہ نرس یہاں نہیں رہے گی۔''

میں نے یک دم اسے اپنے صحیح بازو سے دبوچ لیا۔ اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی تھی۔

''کاجل میں تمہیں زہرہ بیگم کے حوالے کر دوں گا اور ان سے کہوں گا کہ تمہیں سنبھال کر رکھیں۔''





''کوئی بات نہیں، اگر ابھی نہیں تو میں بعد میں آ کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں گی۔''

میرا دل چاہا کہ اس لڑکی کا سر توڑ دوں مگر فی الحال میں خود بستر پر پڑا ہوا تھا، اس لمحے نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں رکھے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میرا ڈنر آ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اگر وہ میرے قریب آ جاتی تو کاجل ضرور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتی۔ اگر اسے ابھی موقع نہیں ملتا تو وہ بعد میں یہ کام کر گزرتی۔ میں اس کی ہٹ دھرم طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے دیکھا کہ کاجل کو میرے ساتھ لگے بیٹھے دیکھ کر نرس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے تھے۔ حالانکہ یہ بہت عام سا منظر تھا۔ کاجل بچی تھی، شاید یہ بات سچ ہے کہ انسانوں کے درمیان ایک غیر مرئی رابطہ ہوتا ہے جو انہیں ایک دوسرے کے احساسات سے آگاہ رکھتا ہے۔ کچھ ایسا ہی رابطہ ہم تینوں کے درمیان بھی تھا۔ نرس اسے ایک بچی نہیں سمجھ رہی تھی، بلکہ وہ اسے ایک دوسری عورت کی نظر سے دیکھ رہی تھی جو مجھ پر قابض تھی۔ کچھ ایسا ہی کاجل محسوس کر رہی تھی۔ وہ مجھ پر صرف اپنا حق سمجھتی تھی اور نرس کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ میں اُن کے درمیان سینڈوچ بن گیا تھا۔ نرس میری طرف آنے لگی۔

''اسے وہیں رکھ دو۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''ابھی تم یہاں سے جاؤ۔''

میں نے کاجل کو چھوڑ دیا تھا مگر وہ بدستور میری بغل میں گھسی بیٹھی تھی۔ ''اور اب دوبارہ اس کمرے میں مت آنا۔''

کاجل کی بات پر نرس کے نرم و سبک چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ بہ ظاہر اس نے مسکراتے ہوئے لیکن اصل میں کاٹ کھانے والے لہجے میں کاجل سے کہا۔ ''سنو بے بی، اپنی امی کے پاس جاؤ وہ تمہیں تلاش کر رہی ہیں۔''

''نرس۔'' اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پلیز آپ جائیں، جب آپ کی ضرورت ہو گی آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔''

نرس نے پٹخنے کے انداز میں ٹرے میز پر رکھی اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کاجل سے کہا۔

''بابا تم تو ہٹو، تمہارے دو من بوجھ سے میرا دوسرا بازو بھی ٹوٹا جا رہا ہے۔''

وہ شرارت سے ہنسی۔ اس کے انداز میں فتح کا غرور نمایاں تھا۔ اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور سوپ کی ٹرے اٹھا لائی۔ سلیقے سے نیپکن میرے سینے پر پھیلایا اور چمچے سے سوپ پلانے لگی تھی۔

''تم کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہو۔'' میں نے سوپ نگلتے ہوئے کہا۔ ''احمق اور ضدی لڑکی۔''

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے بُرا بھلا بھی سن سکتی تھی

اور مار بھی کھا سکتی تھی۔ سوئمنگ پول والے واقعے کے بعد میں نے اس کی اچھی خاصی مرمت لگائی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سوپ پلانے کے بعد اس نے میرا منہ صاف کیا اور ٹرے لے کر چلی گئی۔ رات کو ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا، وہ میری صحت یابی کی رفتار سے مطمئن تھا۔ میں نے اسے اب خواب آور دوا دینے سے منع کر دیا۔

''او کے، پین کلر ہی کافی ہیں۔ ان سے ہی آپ کو اچھی نیند آ جائے گی۔'' اس نے کہا۔

کاجل اس کے بعد دوبارہ نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ نرس آئی تھی غالباً یوں بھگائے جانے پر اس نے اپنی توہین محسوس کی تھی اور دوبارہ آنا گوارہ نہیں کیا لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ مسلسل آٹھ دن خواب آور دواؤں کے زیر اثر رہنے کے بعد میرے لیے ازخود سونا مشکل ہو رہا تھا اور جسم بھی نیند طلب نہیں کر رہا تھا لیکن درد کش دواؤں کے زیر اثر میں ہلکی سی غنودگی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات کا کوئی پہر تھا جب میرے حواس نے مجھے خبردار کیا۔ کوئی میرے پاس ہی تھا، میں نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی میں مجھے اس سفید وجود کو دیکھنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی جو میرے بستر کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نرس تھی اور رات کی اس خاموش تاریکی میں خاموشی سے میرے بستر کے پاس ساکت کھڑی تھی، کیوں؟ میں نہیں جانتا تھا۔ تب اس نے حرکت کی اور نرم و نازک سا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا تھا۔ سینے پر اس جگہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ وہ بستر پر کنارے ٹک گئی تھی اور میں اس کے جسم کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ میں اس کے عزائم سے بے خبر تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی قربت سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ ہاتھ رینگتا ہوا میری گردن تک آ گیا۔ اس کا لمس محسوس کر کے میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ پھر نرمی سے اس نے میرے چہرے کو چھوا۔ رفتہ رفتہ اس کا شاخِ گل جیسا بدن لچک کر میری طرف جھکنے لگا۔ مجھے یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی کیونکہ مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

میں اس کی گرم سانس کی مہک اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ سانسیں میرے بے حد قریب آ گئی تھیں۔ معاً میں نے اسے اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لیا تو وہ بُری طرح چونکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں خواب آور دوا کے زیر اثر سو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کو کسمسائی پھر ساکت ہو گئی۔ لمحات میرے لیے رُک گئے تھے اور میری خواہش تھی کہ یہ اس طرح رُکے رہیں۔ یہ نرمی، گرمی اور یہ شیرینی مجھے ہمیشہ ملتی رہے مگر ہر خواہش پوری کہاں ہوتی ہے۔ اچانک مجھے دروازے کی طرف سے آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ یہ آہٹ نرس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ اُچھل کر مجھ سے الگ ہوئی تھی لیکن اسے ذرا دیر ہو چکی تھی۔ میں نے بیڈروم کی فضا میں پرفیوم کی تیز خوشبو پھیلتے محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی ایک ننھا سا شعلہ چمکا۔ لائٹر کاجل کے ہاتھ میں تھا۔

''کتیا......'' اس نے نفرت سے بھرپور لہجے میں کہا اور جلتا لائٹر نرس کے کپڑوں سے لگا دیا۔





ایک دم اس کی قمیص نے آگ پکڑ لی تھی۔ نرس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اس نے دیوانہ وار ہاتھ مار کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی قمیص کے دامن نے پوری طرح آگ پکڑ لی تھی۔ کاجل کے دوسرے ہاتھ میں پرفیوم کی شیشی تھی اس نے ایک ہاتھ سے نرس پر پرفیوم چھڑکا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لائٹر سے آگ لگا دی تھی۔

''کاجل...... اُلو کی پٹھی، یہ کیا کیا۔'' میں نے چلا کر کہا لیکن وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ نرس دیوانہ وار چلا رہی تھی اور اپنی قمیص میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے چلا کر اسے قمیص اُتارنے کو کہا لیکن خوف کے مارے اسے میری بات ہی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ اسی لمحے ماہ پارہ بیڈروم میں آئی۔ انہوں نے ایک نظر جلتی نرس کو دیکھا اور روشنی کر کے فوراً اسے زمین پر گرا کر اپنی چادر اس کی قمیص کے جلتے حصوں پر مارنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے نرس نے چست قمیص نہیں پہن رکھی تھی اس وجہ سے اسے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ صرف پیٹ اور کمر کی کھال معمولی سی جھلسی تھی۔ وہ دہشت زدہ زیادہ تھی، ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی شروع کر دی۔

''یوسف یہ کیا ہوا تھا؟'' اس کے جاتے ہی ماہ پارہ نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔ ''اس کی چیخیں سن کر میری آنکھ کھلی تھی۔''

''اچھا۔'' انہوں نے اپنے رومال سے میرا منہ صاف کیا۔ ''اب تم سو جاؤ۔ میں نرس سے معلوم کرتی ہوں۔''

مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں خوف زدہ نرس بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اگلی صبح ماہ پارہ نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے شبہ ہوتا کہ نرس نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مرہم پٹی کے بعد رات ہی کو نرس کو اس کے گھر بھیج دیا گیا تھا لیکن برسوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ماہ پارہ نے رات ہی ساری کہانی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ انہوں نے رومال سے چہرہ صاف کرنے کے دوران میرے چہرے سے وہ سارے داغ مٹا دیئے تھے جو رات کی اس تاریکی میں آئے تھے۔

جمشید علی ایک ہفتے بعد آ گئے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ اس وقت میں کمرے میں چہل قدمی کرنے کی مشق کر رہا تھا۔ میری سخت بینڈیج اُتر چکی تھی مگر چلنے کے دوران ابھی بھی گھٹنے میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی تھی۔ حسبِ معمول کاجل میرے ساتھ تھی اور ماہ پارہ مجھے سہارا دے کر واک کرا رہی تھیں۔ جمشید علی اچانک آئے تو ہم سب ہی چونک گئے تھے۔ سب سے پہلے کاجل دوڑی اور ''ڈیڈی'' کہہ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ انہوں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا۔

''ناٹی گرل!'' انہوں نے کاجل کی ناک مروڑی۔ ''یہ ہر وقت کیسا حلیہ بنا کر رکھتی ہو۔''

''ڈیڈی، یوسف ٹھیک ہو گیا ہے۔'' جواب میں وہ چہکی۔

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر کاجل کو گود سے اتارا۔ ''چلو اب تم نیچے جاؤ اور جب تک

میں آؤں نہا دھو کر اچھی بچیوں کی طرح تیار ہو جاؤ۔''

بادل نخواستہ کاجل رخصت ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''کیسے ہو یوسف؟'' انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ان کے انداز اور کسی حد تک سرد رویے سے مجھے دھچکا لگا تھا۔ میں شاید کچھ اور ہی توقع کر رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جمشید علی، ماہ پارہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ''ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟''

ماہ پارہ کو بھی ان کا انداز بُرا لگا تھا۔ انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات آپ کو یوسف بھی بتا سکتا ہے۔''

جمشید علی کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا تھا۔ ''واٹ ڈو یو مین، میں نے تم سے پوچھا ہے۔''

میں نے فوراً مداخلت کی۔ ''پاپا، دراصل ما...... ماہ پارہ کو اس بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے علم۔'' ان کی برہمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''سوری سر۔'' ماہ پارہ نے سر جھکا کر کہا تو جمشید علی کے چہرے سے برہمی کے تاثرات معدوم ہونے لگے۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ وہ ماہ پارہ پر کتنا ہی غصے کیوں نہ ہوں، جب وہ سر جھکا کر سوری سر کہتی تھیں تو ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔

''او کے...... او کے۔'' وہ بولے۔ ''پلیز ذرا میرے لیے کافی منگواؤ۔''

ماہ پارہ کے جاتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اس دفعہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ ان کے انداز میں محبت اور اپنائیت شامل ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے میرے زخموں اور چوٹوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب میں نے حادثے کا ذکر کیا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''دیکھ لوں گا ان لوگوں کو۔'' وہ زیرِ لب بولے۔

''کن لوگوں کو پاپا؟''

وہ چونکے۔ ''آں ہاں...... کسی کو نہیں۔ خیر اب تم مجھے شروع سے بتاؤ، میرے بعد یہاں کیا ہوا تھا؟''

میں نے بات سکول کے باہر حملے سے شروع کی، جمشید علی غور سے سنتے رہے۔ جب میں نے امیر خان کے دیئے کاغذ کا ذکر کیا جس پر نامانوس زبان میں کچھ لکھا تھا تو وہ چونکے۔ امیر خان نے وہ کاغذ مجھے اس لیے دیا تھا کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو میں یہ کاغذ جمشید علی کے حوالے کر دوں۔ انہوں نے اضطراب سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ کاغذ؟''

میں نے تصویر کے عقب میں چھپا کاغذ نکال کر انہیں دے دیا۔ انہوں نے کاغذ پر لکھی عبارت پڑھنا شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے لیے یہ رسم الخط اجنبی نہیں تھا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جا رہے تھے، ان کے غصے میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر میں انہوں نے دونوں کاغذ مٹھی میں





دبا کر چرمر کر دیئے تھے۔

''اس میں کیا لکھا ہے پاپا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ چونکے۔ ''تمہیں یقین ہے کہ امیر خان نے ہی کاغذ دیئے تھے تمہیں؟''

''جی پاپا۔'' میں نے سو فیصد یقین سے کہا۔ ''میں نے اسے سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ ماہ پارہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔''

''لیکن اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ امیر خان نے لکھا ہے کہ تمہاری زندگی کو کچھ لوگوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہے اور اب وہ اس کے پیچھے بھی پڑ گئے ہیں۔''

''امیر خان سچا تھا، اس پر دو بار قاتلانہ حملے ہوئے اور دشمنوں نے بالآخر اس کی جان لے لی۔''

جمشید علی ٹہلنے لگے۔ ''اگر وہ کچھ جانتا تھا تو اس نے خط میں کیوں نہیں لکھا اور اگر وہ دشمنوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا تو انہوں نے اس کی جان کیوں لی۔''

''شاید اس لیے کہ پھر وہ مجھ تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

جمشید علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نو سن، میں تمہارے لیے صرف امیر خان پر انحصار نہیں کر سکتا تھا میں نے اس کے علاوہ بھی تمہاری حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں ایک بار پھر فرسٹریشن کا شکار ہونے لگا۔ ''آخر مجھے کن لوگوں سے خطرہ ہے۔''

''جلد تم سب جان جاؤ گے۔'' انہوں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''ابھی کیوں نہیں۔'' میری آواز کسی قدر بلند تھی۔

''ابھی تمہارے لیے کچھ جاننا بے کار ہے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا اپنے ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فی الوقت تم آرام کرو، میں تمہارے لیے ایک نیا محافظ لایا ہوں، وہ کل تم سے ملے گا۔''

''کیا فائدہ، دشمن اسے بھی مار دیں گے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''پھر آپ کو میرے لیے ایک اور محافظ لانا پڑے گا۔''

جمشید علی ہنسے۔ ''فکر مت کرو، وہ لوہے کا چنا ہے دشمنوں کے دانت توڑ دے گا، وہ تمہارا استاد بھی ہو گا۔''

''استاد! کس معاملے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھ لینا۔'' وہ بولے۔ ''خیر اب تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔'' وہ دروازے پر پہنچ کر رکے۔ ''یہ نرس کا کیا چکر ہے؟'' ان کے اچانک پوچھنے پر میں بوکھلا گیا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس واقعے سے بھی باخبر ہوں۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں اتنا ہی بتایا جتنا کہ ماہ پارہ یا

دوسرے افراد کے علم میں تھا۔ وہ خلافِ توقع ہنسے اور پھر معنی خیز انداز میں بولے۔ ''کاجل از اے رئیلی جیلسی گرل۔''

میں سن سارہ گیا تھا تو کیا انہیں اصل بات کا علم ہو گیا تھا لیکن کیسے؟ صرف ایک ہی ذریعہ تھا جس سے ان تک یہ بات پہنچ سکتی تھی یعنی نرس اور جہاں تک میرے علم میں تھا، اس نے بھی اصل واقعہ گول کر دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تاریکی میں وہ سوئچ تلاش نہیں کر پا رہی تھی اور اس نے لائٹر جلایا تھا۔ غلطی سے اس کی قمیص میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ کاجل اور میرا ذکر گول کر گئی تھی۔ اسی میں اس کی بچت بھی تھی ورنہ اس کے لیے وضاحت مشکل ہو جاتی کہ رات کے اس پہر وہ میرے کمرے میں کس لیے آئی تھی، آگ لگنے کے واقعے سے وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ رات کو ہی اصرار کر کے چلی گئی تھی۔ کوئی نئی نرس نہیں رکھی گئی۔ دوائیں مجھے ماہ پارہ استعمال کراتی تھیں۔ دوسرے کاموں کے لیے ملازم تھے۔ ڈاکٹر دن میں دو بار آ کر میرا معائنہ کر جاتا تھا، عام زخم تقریباً بھر چکے تھے۔ پسلی کی حالت بھی ٹھیک تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق اگلے ہفتے میرا سینے پر پلاسٹر کٹ جائے گا۔ البتہ ہاتھ کا پلاسٹر تین مہینے سے پہلے نہیں اُتر سکتا تھا۔ حادثے کے دوران پسلی اور کلائی کی ہڈی مونگ پھلی کی ریڑھی پر گرنے سے ٹوٹی تھی۔ کولہا اور ٹانگ کار کی ٹکر سے متاثر ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے میں مونگ پھلی کے نرم ڈھیر پر گرا تھا، ورنہ اگر پکے فٹ پاتھ پر گرتا تو زخموں کی نوعیت کہیں زیادہ سنگین ہوتی اور اگر میرا سر کسی جگہ ٹکرا جاتا تو میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

امیر خان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کسی نے خاموشی سے اس کی گردن میں سائنائیڈ کا انجکشن لگا دیا تھا۔ یہ مہلک زہر سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں آدمی کی جان لے لیتا ہے۔ امیر خان کو دوسرا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی ہو گی۔ بعد میں ایک دوسری کار کے ڈرائیور نے جو میری کار کے عین پیچھے کھڑی تھی، ایک ملنگ نما شخص کو امیر خان سے بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے بھیک مانگنے کے لیے صرف امیر خان کا انتخاب کیا تھا اور اس کے پاس سے ہٹتے ہی تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ ظاہر ہے فقیر کے بھیس میں قاتل تھا جو پیغام اجل لے کر آیا تھا، اس نے بھکاری کے روپ میں امیر خان کی جان لے لی تھی۔

اس سے قاتلوں کی چالاکی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس بار انہوں نے مانگنے والے کے بھیس میں اپنا آدمی بھیجا تھا۔ مانگنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ قاتل نے آ کر امیر خان سے کہا ہو گا۔ ''اللہ کے نام پر کچھ دے بابا۔'' اور امیر خان نے اسے دھتکار دیا ہو گا۔ وہ فقیروں سے چڑتا تھا۔ اس نے فقیر کی طرف توجہ بھی نہیں دی ہو گی۔ اس کی یہی غلطی اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہو گی۔ موقع پاتے ہی فقیر نے اس کی گردن میں زہریلا انجکشن گھونپ دیا ہو گا۔ اگر وہ ماہر ہو گا تو اس کام میں اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا ہو گا جیسے سانپ پلک جھپکنے میں کاٹ لیتا ہے۔ اتفاق سے کوئی دیکھ بھی رہا ہو گا تو اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ فقیر





دستِ طلب دراز کر رہا ہے۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ امیر خان کی جان طلب کر رہا ہو گا۔ اس نے اطمینان سے اپنا کام کیا ہو گا اور وہاں سے فرار ہو گیا ہو گا۔

اگلے روز سے میں نے سکول جانا شروع کر دیا۔ ڈرائیور بھی سر کی چوٹ سے صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تھا۔ البتہ امیر خان کبھی نہ آنے والے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ جب میں کار کی طرف آیا تو اس کی خالی جگہ دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ میں کار میں بیٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف کار کا دروازہ کھلا اور ایک گورا چٹا اور کسی قدر دبلا نوجوان کار میں آ گیا۔ اس کا رنگ بے حد صاف تھا۔ بال ہلکے براؤن اور آنکھیں سبزی مائل تھیں۔ اس کی شیو دو دن کی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں، جیسے مصوروں کی ہوتی ہیں۔

''کون ہو تم؟'' میں چوکنا ہو گیا۔

''تعارف راستے میں ہو جائے گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا پھر بولا۔ ''ڈرائیور چلو۔''

ڈرائیور نے اس کے حکم کی تعمیل میں کار چلا دی، یعنی وہ اسے جانتا تھا۔ اس کے باوجود میں محتاط رہا۔ کار جمشید پیلس سے نکلی تو اس نے ہلکے سے ہنس کر کہا۔ ''ڈرو مت برخوردار، میں تمہارا نیا محافظ ہوں۔ حسن علی، میرا تعلق ایران سے ہے، میری اور تمہاری عمروں میں خاصا فرق ہے مگر تم چاہو تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو۔ مجھے خوشی ہو گی اگر ہم ایک دوسرے کو دوست سمجھیں۔''

''مسٹر حسن۔'' میں نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا سابق محافظ کہاں ہے؟''

''قبرستان میں۔'' حسن علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ یقیناً اچھا محافظ تھا تبھی قبرستان میں ہے ورنہ اس کی جگہ......'' اس نے بات نامکمل چھوڑ دی لیکن میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ یعنی امیر خان کی جگہ میں قبرستان میں ہوتا۔

''اس کے باوجود آپ......''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''برخوردار اصل خطرہ تو تمہیں ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی خطرہ مول لینے کی۔''

''میں نہیں جانتا کہ مجھے کسی سے خطرہ ہے۔''

''تو اسی سے بچنے کے لیے بھاگ جاؤ۔''

''بھاگ جاؤں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن کہاں؟''

''گویا تم خطرہ محسوس کرتے ہوئے بھی نہیں بھاگ سکتے۔ مجبور ہو، ایسی ہی کچھ مجبوریاں میرے ساتھ ہیں جن کی وجہ سے میں دوسروں کے خطرات اپنے سر لینے پر مجبور ہوں۔''

''سب سے بڑی مجبوری تو پیسہ ہوتا ہے۔'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''پیسہ بھی ہے، لیکن بعض مجبوریاں اس سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ خیر ابھی تم نہیں سمجھو گے۔

وقت تمہیں خود سمجھا دے گا۔ فی الوقت تو یہ بتاؤ کہ تمہارے معمولات کیا ہیں۔ چھوٹی سی بات بھی نظر انداز مت کرو بلکہ بہتر ہوگا مجھے اپنے بارے میں سب بتا دو۔“

”کیا پاپا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”کون پاپا؟“

”جمشید علی میں انہیں پاپا کہتا ہوں۔“

”نہیں انہوں نے صرف اتنا کہا ہے کہ مجھے ایک لڑکے کی حفاظت کرنی ہے، ہر قیمت پر۔“

”اور وہ لڑکا میں ہوں۔“ نہ جانے کیوں میرے اندر تلخی اُترنے لگی تھی۔ جمشید علی نے اس کے سامنے مجھے صرف ایک لڑکا کہا جیسے کوئی اپنی قیمتی ملکیت کا ذکر کرتا ہے، کوئی نایاب ہیرا، جس کی حفاظت کے لیے انہوں نے ایک تربیت یافتہ محافظ رکھا تھا جو شاید بہت زیادہ مہنگا تھا، میں نے پوچھ لیا۔

”آپ کو کیا معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ میرے لیے آنے والے پیغام اجل کو قبول کرنے کا۔“

”برخوردار......“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ مت پوچھو، آنے والا وقت تمہیں خود بتا دے گا۔“

”آنے والا وقت۔“ میں جھلا گیا تھا۔ ”سب یہی کہتے ہیں، نشانہ میں ہوں اور سب سے زیادہ بے خبر بھی مجھے ہی رکھا جا رہا ہے۔“

وہ میری جھلاہٹ پر مسکرایا۔ ”چلو اگر تمہاری تسلی ہو جاتی ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔ مجھے دس ہزار روپے فی ہفتہ معاوضہ دیا جا رہا ہے لیکن معاوضہ میرے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔“

”اور جب میں آپ سے اہمیت کے بارے میں پوچھوں گا تو آپ فرمائیں گے کہ آنے والا وقت مجھے خود سمجھا دے گا۔“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ ہنسا۔

کار رُک گئی۔ ہم سکول پہنچ گئے تھے۔ پہلے حسن علی اُترا، اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا انداز اس چیتے کا سا تھا جو اپنے شکار کی تلاش میں ہو۔ پھر مطمئن ہو کر اس نے مجھے کار سے اُترنے کا اشارا کیا۔ ”فی الوقت تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تمہارے لیے خاص ہدایت یہ ہے کہ چھٹی سے پہلے سکول سے باہر مت آنا۔ یہاں سے کوئی چیز لے کر مت کھانا بلکہ کوشش کرنا کہ گیٹ کے قریب بھی مت آؤ۔“

”ایسا کریں آپ ایک فہرست بنا دیں بلکہ دو فہرستیں بنا دیں ایک ان کاموں کی جو مجھے کرنا ہیں اور دوسرے ان کاموں کی جو مجھے نہیں کرنے۔“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تھا لیکن وہ ہنس دیا۔

”برخوردار آج پہلا دن ہے اس لیے تمہیں سب معاف ہے۔“





”اور کل سے؟“ میں نے پوچھا۔

”کل سے میں تمہارا استاد بن جاؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ ایک اچھا شاگرد کیسے بنتے ہیں۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“

”خبردار کر رہا ہوں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”اب جاؤ سکول لگنے والا ہے۔“



تین مہینے بعد میں اور حسن علی ساحل سمندر پر تھے۔ سورج نکلنے میں کچھ دیر باقی تھی، میرا بازو کا پلاستر اُتر چکا تھا اور میری تمام ہڈیاں بالکل درست طور پر جڑ چکی تھیں۔ پچھلے تین مہینے کے دوران میں حسن علی نے مجھے سچ مچ اپنا فرمانبردار شاگرد بنا لیا تھا۔ اس نے واضح کیا تھا کہ مجھے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہے چوں چرا کیے بغیر۔ ساتھ ہی میں اس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کے لیے آزاد تھا۔ اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی اور میرے جسم پر صرف ایک نیکر اور بنیان تھی۔ حسن علی بھی اسی کاسٹیوم میں تھا اور موسم سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سردی اس پر بے اثر تھی، میں ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ صبح سویرے کسی کو گرم بستر سے نکال کر گھر سے باہر کھڑا کر دیا جائے تو اس موسم میں اس کا کیا حال ہو گا۔ اس کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی یخ بستہ ہوائیں مجھے لرزنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میں اپنی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسن علی نے افسوس ناک انداز میں میری طرف دیکھا۔

”یوسف! اس وقت تم چوہے لگ رہے ہو حالانکہ اتنی سردی میں چوہے بھی نہیں کانپتے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ چوہوں کے پاس موٹی کھال ہوتی ہے۔“ میں نے چھینک مار کر کہا۔ ”اور پھر ان کا استاد حسن نہیں ہوتا۔“

وہ ہنس دیا۔ ”خیر ابھی تم تھوڑی دیر میں سردی وغیرہ کو بھول جاؤ گے۔ اتنا بتاؤ کہ مارشل آرٹ اور سیلف ڈیفنس کی تکنیکوں میں سب سے زیادہ اہمیت کس جسمانی خصوصیت کی ہوتی ہے؟“

”اسٹیمنا کی۔“ میں نے سوچ کر کہا۔

”گڈ، تم نے ٹھیک جواب دیا۔ اسٹیمنا بنانے اور بڑھانے کے لیے دوڑنے سے زیادہ اچھی چیز کوئی نہیں ہوتی لہٰذا آج سے ہم باقاعدہ ٹریننگ کا آغاز دو میل کی جاگنگ سے کریں گے۔“

”دو میل۔“ میری جان نکل گئی۔ ”میں ہرگز اتنا دوڑ نہیں سکتا۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے لیکن آغاز تو کرنا ہے، آج یہ دیکھتے ہیں کہ تم کتنی دور تک بغیر رُکے دوڑ سکتے ہو۔“

مجھے معلوم تھا کہ انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”کس طرف جانا ہے۔“

"مشرق کی طرف۔" حسن علی نے کہا۔ "ریڈی، ون ٹو تھری......"

میں دوڑ پڑا۔ حسن علی نے کہا کہ میں پہلے آہستہ دوڑوں، سُست روی سے، اس سے سانس بنتی ہے اور واپسی میں ایسے آؤں جیسے میرے پیچھے کوئی آدم خور شیر ہو۔ ساحل کی نرم ریت پر دوڑنا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا تھا۔ صرف سو گز بعد میری سانس پھول گئی تھی۔ ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں اور تھکن سے بُرا حال ہو گیا تھا۔ کوئی چار سو گز کے بعد میں گر پڑا۔

حسن علی میرے ساتھ ہی تھا، اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"چچ...... چچ، کس قدر نکما شاگرد ملا ہے۔" اس کا سانس قطعی ہموار تھا جیسے وہ اب تک چہل قدمی کرتا رہا تھا۔

اس کی ایک بات سچ نکلی تھی۔ اب مجھے سردی کا قطعی احساس نہیں تھا۔ میں منہ کھولے زیادہ سے زیادہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانس درست ہوتے ہی ہم آگے روانہ ہو گئے۔ اس سفر کے دوران میں مجموعی طور پر پانچ بار گرا تھا اور جب ہم واپس آئے تو میری حالت خراب تھی اور یہ سوچ کر مزید خراب ہو رہی تھی کہ اگلے روز اور پھر اس اگلے روز مجھے ساحل پر دوڑ لگانی پڑے گی، پورے دو میل تک۔

میں اس دوڑ کو ہی مصیبت سمجھ رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ابھی مشق کے امتحان اور بھی تھے۔ چھ ماہ تک جاگنگ اور ورزش سے میرا اسٹیمنا بہت بہتر ہو گیا تھا۔ اب میں زیادہ تھکے اور رُکے بغیر دو میل کی دوڑ مکمل کر سکتا تھا۔ ایک روز اچانک حسن علی نے مجھے جمشید پیلس کے جمنازیم میں طلب کر لیا۔ جدید ترین مشینوں سے آراستہ یہ جمنازیم پیلس کے تہ خانے میں تھا۔ میں یہاں حسن علی کی زیر نگرانی مختلف اقسام کی ورزشیں کیا کرتا تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ معمول کے لباس میں تھا۔

"کیا کر رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"آرام۔" میں نے کہا۔ "صبح کی ایکسر سائز کے بعد تو مجھ میں ہل کر پانی پینے کی سکت بھی نہیں ہوتی۔"

"گڈ...... گویا میں نے تمہیں ٹھیک وقت پر طلب کیا۔" وہ خوش ہوا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھ پر کوئی نئی مصیبت نازل ہونے والی تھی۔ گزشتہ نو مہینے کے دوران اس کے ساتھ رہ کر میں اس کی عادات اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "فرض کرو کہ کوئی اچانک تم پر حملہ کرے تو تم کیا کرو گے؟"

"کس نوعیت کا حملہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایک شخص جو لڑائی بھڑائی کے عام طریقوں سے تم پر حملہ کرے۔"

"ممکنہ حد تک اس کا مقابلہ کروں گا اور ممکن ہوا تو اسے حملہ کرنے کا مزہ بھی چکھا دوں گا۔"





"بہت خوب۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اب فرض کرو کہ وہ شخص میں ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے مکا جما کر میرے جبڑے پر رسید کیا۔ اس نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا لیکن میں بے خبری کی وجہ سے زمین پر جا گرا۔ ایک لمحے کو تو میری آنکھوں تلے اندھیرا بھی چھا گیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر تھوکا تو تھوک میں خون بھی شامل تھا۔ میں نے برہمی سے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"احمق آدمی، گھونسا کھا کر بھی عقل نہیں آئی۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے اچانک ٹانگ چلائی اور میں پھر زمین بوس ہو گیا۔ وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ "تم سمجھو کہ میں تمہارا دشمن ہوں لیکن جانی دشمن نہیں ہوں، صرف مار پیٹ کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہوں۔ کم آن گیٹ اپ۔"

"میں گیٹ ڈاؤن ہی بھلا۔" میں نے کمر دبائی جہاں لات لگی تھی۔

"چلو اگر تم صرف مار ہی کھانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ آخر آدمی کو مار کھانے کا تجربہ بھی ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ یوں اچھلا جیسے میرے منہ پر ٹھوکر مارنے والا ہو۔ میں بے اختیار پلٹ گیا لیکن اس نے کِک نہیں ماری۔ وہ ہنسا۔

"چلو تم نے اپنی حفاظت تو شروع کی۔" اور ساتھ ہی میری کمر پر ٹھوکر ماری۔ میں بیلن کی طرح لڑھکتا دور تک گیا اور پھر اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس ٹھوکر نے میرا دماغ گھما دیا تھا۔ میں اندھا دھند اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ نتیجے میں اس کے دو گھونسے کھائے پھر گھٹنے پر ایک ٹھوکر وصول کی۔ وہ غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ہی اناڑیوں کی طرح ہاتھ پیر چلائے تھے۔

"لڑائی کا پہلا اصول یہ ہے۔" اس نے میرے کولہے پر ٹھوکر رسید کی۔ "اپنے دماغ کو فریج کی طرح ٹھنڈا رکھو ورنہ کوئی چیونٹی بھی تمہیں شکست دے دے گی۔"

"چیونٹی کی تو خیر ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "تمہارا جرم ہے جرمِ ضعیفی، جس کی سزا ہے مرگِ مفاجات۔"

اس نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر حملہ کیا مگر اس دفعہ میں بچ نکلا اور جوابی کارروائی کے طور پر لات ماری مگر اناڑی پن سے ماری گئی یہ لات ہوا میں گھوم کر رہ گئی۔ اس نے آرام سے میری دوسری ٹانگ پر لات ماری اور میں جو مرغے کی طرح ایک ہی ٹانگ پر کھڑا تھا۔ دھماکے سے زمین بوس ہو گیا، میرا سر خاصے زور سے فرش سے ٹکرایا تھا اور میری آنکھوں تلے تاریکی سی چھا گئی تھی۔ اگلے نصف گھنٹے میں مار کھا کھا کر میرا بُرا حال ہو گیا تھا۔ منہ ناک سے خون جاری تھا، دائیں آنکھ سوج جانے کی وجہ سے تقریباً بند ہو گئی تھی اور اب میں دنیا کو ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ پورا جسم اس طرح دُکھ رہا تھا جیسے مجھے کنکریٹ مکسچر میں ڈال کر گھمایا جاتا رہا ہو۔

حسن علی نے صرف یہ خیال رکھا تھا کہ مجھے کوئی مہلک چوٹ نہ آئے، باقی اس نے دل کھول کر میری مرمت کی تھی۔ اس نے شروع میں مجھے پیش کش کی تھی کہ میں چاہوں تو زمین پر گر کر شکست تسلیم کر سکتا ہوں۔ غالباً اس نے میری انا کو اُبھارنے کی کوشش کی تھی جو کامیاب رہی تھی مار کھا کھا کر بے حال ہونے کے باوجود میں گر گر کر دوبارہ کھڑا ہوتا رہا تھا لیکن ایک بار میں گرا تو مجھ میں کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ غنیمت تھا کہ میں بے ہوش نہیں ہوا حالانکہ مارے درد کے میں فوراً بے ہوش ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے میں نے کاجل کی چیخ سنی۔ وہ تہ خانے میں آ گئی تھی۔ چیخ اس نے میری حالت دیکھ کر ماری تھی۔ وہ مجھ سے آ کر لپٹ گئی۔

''یوسف تمہیں کس نے مارا ہے۔''

میں نے دیکھنے کے لیے دستیاب واحد آنکھ کھول کر اسے دیکھا اور بے ہوش ہو گیا۔ حسن علی آرام سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کاجل کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ میری اس حالت کا ذمے دار وہی تھا۔ مجھے بے ہوش ہوتے دیکھ کر کاجل نے دوسری چیخ ماری اور حسن علی کی طرف لپکی۔ اس نے دیوانہ وار اسے لاتیں ماریں، نوچا کھسوٹا اور ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ وہ بہ مشکل اسے قابو کر سکا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کے ساتھ میرے جیسا سلوک تو نہیں کر سکتا تھا، ایک تو وہ بچی تھی، دوسرے جمشید علی کی اکلوتی بیٹی تھی جو اس کا باس تھا۔ کاجل کو قابو کرنا کسی بپھری ہوئی شیرنی کو قابو کرنے کے برابر تھا۔ غصے میں اس کے نازک سے جسم میں بے پناہ طاقت آ جاتی تھی۔ اس کے لمبے ناخنوں نے حسن علی کے جسم پر متعدد خراشیں ڈالی تھیں اور اس کی ایک انگلی کاجل نے چبا ڈالی تھی لہٰذا جو ڈاکٹر میری مرہم پٹی کے لیے آیا تھا، اسے حسن علی کی مرہم پٹی کرنا پڑی تھی بلکہ اسے وہ انجکشن بھی لگوانا پڑا تھا جو کتے کے کاٹنے کی صورت میں لگوانا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر گوشت خور جانور کے دانتوں میں اس مرض کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو اپنے کمرے میں پایا تھا۔ حسبِ توقع ماہ پارہ اور کاجل میرے سرہانے موجود تھیں۔ ماہ پارہ غصے میں تھیں لیکن کاجل پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ ماہ پارہ سے حسن علی کی شکایت کرتے ہوئے یہ طویل نظم دوہرا رہی تھی جس کے ہر بند کا اختتام ایک ہی مصرع پر ہوتا تھا۔ ''میں اس گندے آدمی کو مار ڈالوں گی۔''

ماہ پارہ اسے رام کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ ''میری جان وہ یوسف کا استاد ہے، اسے لڑنے کی تربیت دے رہا ہے۔''

''یہ کیسی تربیت ہے۔'' کاجل رونے والے لہجے میں بولی۔ ''دیکھیے تو اس کا کیا حال کر دیا ہے۔''

''یوسف مرد ہے اور مرد زخم کھایا ہی کرتے ہیں۔ انہیں نازک مزاج نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی، اگر آئندہ اس نے یوسف پر ہاتھ اٹھایا تو میں ڈیڈی کا ریوالور لے کر





اسے شوٹ کر دوں گی۔''

''اُف میرے خدا۔'' ماہ پارہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اسے تمہارے ڈیڈی نے ہی یوسف کی تربیت پر مقرر کیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے، اسے ڈیڈی کے کہنے پر مارا گیا ہے۔'' کاجل نے میری طرف دیکھا تو میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔

''اور کیا، ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ یوسف پر ہاتھ اٹھاتا۔ یہ جمشید علی کی خواہش تھی کہ یوسف ایک سخت جان شخص بنے اور کوئی شخص مار کھائے بغیر سخت جان نہیں بن سکتا۔'' ماہ پارہ رفتہ رفتہ اس کا غصہ ٹھنڈا کر رہی تھیں۔

''یوسف ٹھیک ہو گا تو میں اسے کہوں گی کہ اسے خوب مارے، جتنا اس نے یوسف کو مارا ہے۔''

میں نے جان بوجھ کر آنکھیں نہیں کھولی تھیں ورنہ وہ آفت کی پرکالہ میرا سر بھی کھانے لگتی اور میرے سر میں ویسے ہی درد ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیچے سے اس کا بلاوا آ گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے ہوش میں آنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں پھر ساکت ہو گیا۔ سوچ کر کہ کاجل واپس آ گئی ہے لیکن خلافِ توقع حسن علی کی آواز آئی تھی۔ وہ ماہ پارہ سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''اس کا یہ حال بنا کر مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' ماہ پارہ نے طنز آمیز غصے سے کہا۔

''تربیت میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔'' حسن علی نے بے پروائی سے کہا۔

''یہ تربیت ہے۔'' ماہ پارہ بھڑک اٹھی تھیں۔ ''تم نے اسے کتنی بے دردی سے مارا ہے، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بن ماں باپ کا یہ بچہ مجھے کتنا عزیز ہے۔ میری اپنی اولاد ہوتی تو میں اسے بھی یوسف سے زیادہ نہیں چاہ سکتی تھی۔''

''سوری، تمہارا دل دُکھا۔'' حسن علی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''اب میں سوچ رہا ہوں کہ اسے لے کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں، یہاں تم سب اس کی تربیت میں حارج ہو رہے ہو۔''

''حسن، تم پہلے تو اتنے سنگ دل نہیں تھے۔'' ماہ پارہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ میں دنگ رہ گیا تھا، کیا ماہ پارہ اور حسن علی پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار شبہ ہوا تھا لیکن اسے ہمیشہ میں نے اپنا وہم سمجھا تھا مگر اب یہ شبہ سچ بن گیا تھا۔ دونوں کا تعلق ایران سے تھا اور عین ممکن تھا کہ ان میں پرانی واقفیت ہو۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید۔'' حسن علی نے کس قدر بدلے لہجے میں کہا۔ ''کبھی میں بھی نرم دل ہوا کرتا تھا۔ مجھے حُسن اور پھول متاثر کرتے تھے۔ زندگی کی تابانیاں اور رنگینیاں مجھے اپنی طرف بلایا کرتی تھیں لیکن یہ اس وقت تک تھا جب میرا گھر اور گھر والے سلامت رہے۔''

"تو کیا وہ بھی......"

حسن علی نے ان کی بات کاٹی۔ "ہاں...... وہ بھی ان لوگوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے جو شاہ سے تعلق رکھنے والے کتے کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ تمہیں تو جمشید علی نکال کر لے گیا تھا کیونکہ تم اس کے دوست کی بیٹی تھیں، میں ان دنوں ترکی میں تھا اور گھر والے تہران میں پھنس گئے تھے۔"

"تو چچا رضا اور باقی سب......" آواز ماہ پارہ کے حلق میں پھنسنے لگی۔

"صرف میرے گھر والے نہیں بلکہ ڈاکٹر فاخر کی فیملی بھی ہماری کوٹھی میں تھی۔ وہی ڈاکٹر فاخر جو کبھی شاہی خاندان کے معالجوں میں شامل ہوا کرتے تھے اور ان دنوں ایک نواحی بستی میں غریبوں کے لیے مفت کلینک چلا رہے تھے۔" حسن علی کی آواز تلخ ہونے لگی تھی۔ "حملہ آوروں نے کسی کو نہیں بخشا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ میرے دو بھائی جان بچانے کے لیے پانی کے ٹینک میں چھپ گئے تھے، ظالموں نے اوپر سے ڈھکن پر پلاسٹر کر دیا تھا۔ ذرا سوچو ماہ پارہ وہ کتنی اذیت سے تڑپ تڑپ کر مرے ہوں گے۔ ہمارا جرم صرف اتنا تھا کہ شاہ نے میرے باپ کی کمپنی میں کچھ سرمایہ لگایا تھا۔ میرے باپ کے اس جرم میں میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔"

"بس کرو، خدا کے لیے" ماہ پارہ رو دی تھیں۔ "مجھ میں اور سننے کی تاب نہیں ہے۔"

حسن علی تلخی سے ہنسا۔ "تم صرف سن کر رو دیں۔ ذرا ان کا سوچو جن پر یہ گزری ہے، ہماری کمپنی کا جنرل منیجر کسی طرح بچ کر ترکی پہنچنے میں کامیاب رہا تھا اس سے مجھے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا تھا۔ میرے ایران جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، میں جاتا بھی کس کے لیے، وہاں میرے تمام پیارے خاک ہو چکے تھے اور تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں انتقام بھی کس سے لیتا، کیا ایک پوری حکومت سے؟ انقلاب تو یونہی خون رنگ ہوا کرتے ہیں، انسان وحشتوں کے دور کا حساب کس سے لے۔"

میں پہلے سے زیادہ دم بخود رہ گیا تھا اور خاصی دیر تک میں نے سانس ہی نہیں لی تھی اور جب زور سے سانس لی تو وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ماہ پارہ جھینپ کر اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔

"استادِ محترم۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "آپ تو چھپے رستم نکلے۔ غالباً رستم بھی ایرانی تھا۔"

حسن علی ہنسا۔ "برخودار! تم ذرا ٹھیک ہو جاؤ پھر میں تمہیں ایران کی پوری ہسٹری سمجھاؤں گا۔"

"خبردار جو تم نے اب اسے ہاتھ بھی لگایا۔" ماہ پارہ نے اسے ڈانٹا۔

"صرف پیروں سے مرمت کروں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا، ماہ پارہ ہنس دی تھیں۔

مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ ان دونوں کے درمیان پسندیدگی کا پرانا تعلق تھا اور وہ اس





تعلق کو اب تک کس وجہ سے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان خاندانی تعلق بھی تھا اور دونوں ہی ستم رسیدہ بھی تھے۔ ان کے گھر والے ایک وقتی وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ میں پانچ سال کا تھا جب ماہ پارہ جمشید پیلس میں آئی تھیں یہ ایرانی انقلاب کے فوراً بعد کی بات تھی۔ ماہ پارہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھیں ان کی ماں بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں اور ان کے باپ ڈاکٹر علی رضا نے انہیں باپ کے ساتھ ماں بن کر بھی پالا تھا۔ وہ تہران کے سب سے بڑے ہسپتال میں میڈیکل چیف تھے اور اسی بنا پر ان کے شاہی خاندان سے روابط تھے۔ یہی روابط ان کی بدقسمتی کا باعث بن گئے تھے۔ انقلاب سے پہلے جب شاہ سے تعلق رکھنے والے اکثر افراد ملک سے فرار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر علی رضا بدستور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انقلابی انہیں ان کے دفتر سے گرفتار کر کے لے گئے تھے اور وہ دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ جمشید علی، ڈاکٹر علی رضا کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اس وقت ماہ پارہ تہران یونیورسٹی کی طالبہ تھیں اور کوئی ان کا پُرسان حال نہیں رہا تھا۔ اس کڑے وقت میں اپنوں نے بھی نگاہیں پھیر لی تھیں۔ وہ باپ کے بغیر ملک سے جانے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن جمشید علی نے بالآخر انہیں قائل کر لیا اور وہ انہیں کراچی لے آئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ زہرہ بیگم، ماہ پارہ کی موجودگی کو کسی صورت برداشت نہ کر پاتیں۔ وہ پہلے ہی جمشید علی کے بارے میں مشکوک رہا کرتی تھیں۔ اس مسئلے کا حل جمشید علی نے یہ نکالا کہ ماہ پارہ کو میری گورنس بنا دیا۔ وہ بھی حالات سے مجبور تھیں ورنہ ان جیسی حسین، پُرکشش اور اعلیٰ خاندان عورت کبھی بھی گورنس بننے پر راضی نہ ہوتی۔ بعد میں وہ سچ مچ مجھے اپنی ذمے داری سمجھ کر میری پرورش اور تربیت کرنے لگی تھیں۔

ایک ہفتے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ حسن علی نے اپنی دھمکی پر عمل نہیں کیا، شاید اس لیے بھی کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے پر سکول کھل گئے تھے۔ اب میں اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ چھ، سات دن بستر پر پڑا رہتا۔ البتہ صبح و شام والی ایکسر سائز جاری تھیں۔ صبح فزیکل تربیت ہوتی اور شام کو سیلف ڈیفنس کی کلاس ہوتی تھی۔ کبھی پیلس کے لان پر اور کبھی ساحلِ سمندر

ماہ پارہ کی کوشش ہوتی تھی کہ سیلف ڈیفنس کی کلاس کے موقع پر وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ حسن علی پھر میری مرمت نہ لگا دے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی، ماہ پارہ اور حسن علی اس موقع کو ملاقات کا ذریعہ بنا لیتے تھے ورنہ دیگر اوقات میں ان کا ملنا جلنا دوسروں کو مشکوک کر سکتا تھا۔ خاص طور سے جب ہم ساحل پر جاتے تھے تو ماہ پارہ ضرور ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔ حسن علی مجھے مشقوں میں لگا کر خود ماہ پارہ سے باتوں میں لگ جاتا تھا اور ظاہر ہے یہ گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی کہ میرا نہ سننا ہی بہتر ہوتا تھا لہٰذا میں جان بوجھ کر ان سے دور نکل جاتا تھا۔

اس روز بھی ماہ پارہ ہمارے ساتھ آئی تھی۔ میں سوئپ کِک کی مشق کر رہا تھا جب میں نے

محسوس کیا کہ ان دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ماہ پارہ کے تاثرات غصے والے تھے البتہ حسن علی کا چہرہ حسبِ معمول سپاٹ تھا۔ سوائے آنکھوں کی ہلکی سی سرخی کے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شاید ماہ پارہ کو کسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے نفی میں ہلتے سر سے ہو رہا تھا۔ اچانک حسن علی نے فضا میں گھونسا چلایا اور پلٹ کر دور جانے لگا۔ ماہ پارہ ریت کو ٹھوکروں سے اُڑاتی میری طرف آنے لگیں۔

''جھگڑا ہو گیا پھر۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں۔'' وہ صاف مکر گئیں۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''کہا تو کسی نے نہیں لیکن بندہ کم عمر ہونے کے باوجود سر میں دماغ اور دماغ میں عقل رکھتا ہے۔ غالباً استادِ محترم آپ کو نکل چلنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔''

''تمہیں کیسے؟'' وہ یک دم خاموش ہو گئیں۔ بات واضح تھی، میرا مذاق سچ نکلا تھا۔ میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''آپ کیوں انکار کر رہی ہیں، میری وجہ سے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... ایک وجہ یہ بھی ہے اور پھر ہم جمشید علی سے کہیں چھپ نہیں سکتے۔''

''آپ نے پاپا کو اتنا ہوّا کیوں بنا رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیں گے، معذرت کے ساتھ۔ آپ کا مجھ سے کتنا ہی قریبی تعلق سہی لیکن دنیا کی نظروں میں آپ میری گورنس ہی ہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''تم ابھی جمشید علی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''تو آپ بتا دیں۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

''میں بھی نہیں سمجھا سکتی۔'' وہ بولیں۔ ''یہ بات تم خود جان جاؤ گے وقت کے ساتھ۔''

میں نے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مجھے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کھلی جیپ تھی، جس کے فٹ بھر چوڑے ٹائر اسے ساحل کی نرم ریت پر بھی یوں دوڑا سکتے تھے جیسے پکی سڑک پر۔ اس کے پچھلے حصے سے تین افراد اُترے، جنہوں نے اپنے منہ پر رومال باندھ رکھے تھے۔ چوتھا نقاب پوش ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، جیپ سے اُترنے والے ہماری طرف لپکے۔ ان کے عزائم بھانپ کر ماہ پارہ مخالف سمت میں بھاگیں، ساتھ ہی انہوں نے چلا کر مجھے بھی بھاگنے کو کہا لیکن خود دو قدم بھاگنے کے بعد اپنے ہی شلوار کے پائنچے میں پھنس کر گر پڑیں۔ ان دنوں چوڑے پائنچوں کا فیشن تھا جو ان کے حق میں بُرا ثابت ہوا تھا۔ ایک رومال پوش نے با آسانی ان کے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر انہیں بے بس کر دیا تھا۔ باقی دو میں سے ایک





مجھ پر جھپٹا، جیسے چیل، چوزے کی طرف جھپٹتی ہے۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا، جیسے ڈر گیا تھا اور زمین پر بیٹھتے ہوئے سوئپ کِک لگائی جس کی کچھ دیر پہلے مشق کر رہا تھا۔ ایک تو رومال پوش کو پندرہ سولہ سال کے لڑکے سے اس مشاقی کی توقع نہیں تھی، دوسرے کِک نے بڑی عمدگی سے کام کیا تھا۔ وہ جس طرح گرا تھا، اگر پختہ فرش ہوتا تو اس کی ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میری بدقسمتی کہ وہ نرم ریت پر گرا اور اس نے لیٹے لیٹے اپنی ستون نما ٹانگ گھما کر مجھے ماری اور میں زمین بوس ہو گیا۔ تیسرا جو ریوالور سنبھالے کھڑا تھا، زور سے ہنسا۔

''گیا سالا......''

''سامنے کی اولاد، اپنا منہ بند کر۔'' گرنے والا اٹھتے ہوئے بولا۔

اس کا خیال تھا کہ اب میں شرافت سے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں گا تو اس کا یہ خیال غلط ثابت کرتے ہوئے میں نے اس کی رانوں کے درمیان پار کی مارا۔ اس کا منہ یوں کھل گیا جیسے فضا میں یک لخت ہوا کی کمی ہو گئی ہو۔ ریوالور والا پھر ہنسا تو اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ اُبلا تھا۔ زیادہ تر حصے دار ریوالور والا تھا، البتہ کچھ گالیاں میرے حصے میں آئی تھیں۔ پھر اس نے میری ٹانگ پکڑ کر یوں مروڑی کہ میں کمر کے بل اُلٹا ہو گیا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا اگر اٹھنے کی کوشش کرتا تھا تو میری ریڑھ کی ہڈی یا ٹانگ میں سے کوئی ایک چیز ضرور ٹوٹ جاتی، ابھی میں اس سے بچنے کی فکر میں تھا کہ اس نے اپنے بھاری جوتے سے میرے سر پر ضرب لگائی۔ محاورے سے قطع نظر مجھے سچ مچ دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ اس کیفیت میں مجھے ماہ پارہ کی چیخ سنائی دی۔ میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی اور اس بدمعاش کی مشکل آسان کر دی جو مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں کھڑا ہوا، اس نے مجھے اٹھا کر جیپ کے فرش پر پھینک دیا۔ فوراً ہی میرے اوپر ماہ پارہ گری تھیں۔ اس دوران میں میری آنکھوں کے سامنے دنیا ایک بار پھر روشن ہو چکی تھی۔ میں نے ماہ پارہ کے نیچے سے جھانکا تو مجھے حسن علی جیپ کی طرف آتا نظر آیا۔ اس وقت وہ بلاشبہ اُڑ رہا تھا۔ ابھی وہ دس بارہ گز دور تھا کہ جیپ دھچکے سے سٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

سورج غروب ہونے والا تھا، اس سے وجہ ساحل پر لوگ نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور جو تھے وہ حیرت اور خاموشی سے اغوا کے اس سنسنی خیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاید بدمعاش ماہ پارہ کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے جب کہ میں جانتا تھا کہ بدمعاش مجھے اٹھانے آئے تھے۔ ماہ پارہ انہیں بونس میں مل گئی تھیں۔ لوگوں نے ڈراموں اور فلموں میں اس قسم کے ڈرامے دیکھے ہوں گے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا منظر پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ بہرحال کسی نے مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ بدمعاش مسلح تھے اور دخل در معقولات کا انعام ایک گولی کی صورت میں ملنے کا پورا امکان تھا لہٰذا کسی نے دخل نہیں دیا۔ جو زیادہ عقل مند تھے وہ فوراً نو دو گیارہ ہو گئے تا کہ بعد میں عدالت اور تھانے کے چکروں سے بچے رہیں۔

حسن علی ذرا آگے نکل گیا تھا لہٰذا جب اس نے ماہ پارہ کی چیخ سنی تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی جیپ چل چکی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور پوری قوت سے جیپ کے پیچھے دوڑتا رہا۔ بدقسمتی سے وُہ غیر مسلح تھا ورنہ اس کا نشانہ اتنا اچھا تھا کہ وہ جیپ کا ٹائر پھاڑ کر بدمعاشوں کو رُکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میں اپنے اوپر پڑی ماہ پارہ کے نیچے سے سب دیکھ رہا تھا۔ اٹھنے سے یوں قاصر تھا کہ ایک خبیث نے میری کمر پر پاؤں رکھا تھا تو دوسرے نے ٹانگ پر اور سر پر ماہ پارہ پڑی ہوئی تھیں۔ میں قطعی بے دست و پا تھا۔ وہ شاید فلمی ولنوں کی طرح میری بے بسی پر قہقہے لگا رہے تھے لیکن نہیں، وہ حسن علی پر قہقہے لگا رہے تھے جو کسی فلمی ہیرو کی طرح اپنی ہیروئن کو بچانے کے لیے ایک طاقتور جیپ سے ریس لگا رہا تھا۔

وہ لوگ حسن علی سے پوری طرح لطف لے رہے تھے۔ شاید اس وجہ سے انہوں نے نہ تو جیپ کی رفتار بڑھائی اور نہ ہی حسن علی کو گولی ماری۔ حسن علی خاصا قریب آ گیا تھا۔ اچانک اس نے ہوا میں لمبی جست لگائی اور زمین پر گرتے گرتے جیپ کا پچھلا جنگلا اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔

”یہ...... تو کتے کی طرح چمٹ گیا ہے۔“ کسی نے گالی دے کر کہا۔ ”اوئے گولی مارا سے۔

”ٹھہرو۔“ دوسرے نے کہا۔ ”ذرا دیکھنے دو یہ کب تک لٹکا رہے گا۔“

”استاد تماشہ بن رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس پیچھے لگ جائے۔“ پہلے والے نے کہا۔

اب جیپ ساحل کے نسبتاً ویران حصے کی طرف جا رہی تھی مگر یہاں بھی لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے اور جیپ کے پیچھے گھسٹتا آدمی ایسا منظر نہیں تھا جسے لوگ نظر انداز کر دیتے۔ یہ بات استاد کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے حسن علی کو گولی مارنے کا فیصلہ کیا۔ گولی چلنے کی آواز سنتے ہی میرا دل رُک گیا تھا۔



”شدید دھند میں پار جانے کا راستہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کاجل کے پاس جانا چاہتا تھا جو کھائی کے دوسری طرف تھی۔ درمیان میں گہرا نالہ تھا۔ اس پر سے ایک سالخوردہ سا جھولتا پل گزرتا تھا۔ کاجل دوسری طرف کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بے پناہ لمبے اور گھنے بال گھٹا کی طرح اس کے چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ میں کتنے عرصے بعد اسے دیکھ رہا تھا اور اب میں اس سے ایک لمحے بھی دور نہیں رہ سکتا تھا۔

”کاجل میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔“ میں نے چلا کر کہا۔

”یوسف آ جاؤ۔“ کاجل بولی۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”لیکن کیسے آؤں؟“ میں نے گہری کھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ ”چاہنے والے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔“

میں نے دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھا۔ بالآخر مجھے یہ جھولتا پل نظر آ گیا تھا۔ اس کی حالت نہایت





خستہ تھی لیکن کاجل تک جانے کے لیے میں پل صراط سے بھی گزرنے کو تیار تھا۔ میں نے پل پر قدم رکھا تو رسوں سے ٹکے اس کے سالخوردہ تختے چرچرانے لگے تھے۔ اسی لمحے تیز ہوا چلنے لگی اور پل ڈولنے لگا۔ میں نے بہ مشکل اسے تھام کر خود کو گرنے سے بچایا، نیچے گہرائی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا لیکن ہر قدم پر ٹوٹے تختوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کی شدت میں اضافے سے پل نے بُری طرح جھولنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سامنے کاجل کی طرف دیکھا، وہ میری منتظر کھڑی تھی۔ اچانک دھند کی شدت میں اضافہ ہونے لگا اور کاجل میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”کاجل۔“ میں نے چلا کر کہا اور بے تابی سے قدم آگے بڑھائے۔ اگلے ہی لمحے میں تاریک خلا میں گر رہا تھا۔

یک دم میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، تو یہ سب خواب تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ معاً مجھے کوئی اجنبی سا احساس ہوا، جیسے کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔ کیبن آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا لیکن کوئی آواز نہیں تھی۔ ہاں آواز...... انجن کی آواز کیوں نہیں آ رہی تھی۔ بحری جہاز کا انجن روکنے کا مجاز نہیں تھا، افراد نہ کوئی کارکن، حتیٰ کہ کپتان کو بھی انجن بند کروانا ہوتا ہے تو چیف انجینئر سے ہی کہتا ہے اس کے باوجود خلیج کا انجن رُکا ہوا تھا۔

ایک بحری جہاز کا انجن اس کے دل کی طرح ہوتا ہے، یہ چلتا ہے تو جہاز چلتا ہے اور جب یہ رُک جاتا ہے تو جہاز بھی مُردہ ہو جاتا ہے۔ انجن ہی جنریٹر کی مدد سے جہاز کی ضرورت کی بجلی فراہم کرتا ہے۔ جہاز کے بہت سارے کل پُرزوں کو اسی کی مدد سے ہائیڈرولک پاور مہیا کی جاتی ہے۔ میں بستر پر لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انجن کیوں بند ہے۔ اگر اسے کسی خرابی کی وجہ سے بند کیا گیا ہے تو مجھے کیوں نہیں خبر دی گئی۔ اگر کوئی حادثہ ہو گیا تھا تو الارم کیوں نہیں بجایا گیا۔ سب سے بڑھ کر اتنا غیر معمولی سکوت کیوں طاری تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی بات ہو چکی تھی۔

بستر پر پڑے ہوئے میں اصل حالات نہیں جان سکتا تھا لہٰذا میں نے اٹھ کر یونیفارم پہنی اور باہر گیلری میں نکل آیا۔ کپتان صلاح الدین کے کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا اور دم بخود رہ گیا۔ پُرآسائش اور عالیشان کمرا اس وقت ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے یہاں کوئی طوفان آ کر گزر گیا ہو۔ کیونکہ میرا کیبن گیلری کے سرے پر تھا۔ اس لیے یہاں ہونے والے ہنگامے کی آوازیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ جہاز پر کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے جا کر اپنے کیبن سے اپنا پستول لیا اور تیزی سے کپتان برج کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں راہ داریوں اور سیڑھیوں پر ایک فرد بھی نہیں ملا تھا۔ حالانکہ دن ہو یا رات، جہاز میں چہل پہل رہتی ہے مگر اس طویل راستے میں نہ تو کوئی فرد ملا اور نہ ہی کوئی آواز آئی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں اس وقت جہاز پر اکیلا ہوں۔ باقی سب کسی وجہ سے جہاز چھوڑ گئے تھے۔ میں

نے اس احمقانہ خیال پر خود کو ڈانٹا۔ جہاز چھوڑ کر کہاں جائیں گے، کھلے سمندر میں؟ گڑبڑ ہونے کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں تقریباً بھاگتے ہوئے کپتان برج میں داخل ہوا۔ وہ بھی خالی پڑا تھا، ایسی تجوری کی طرح کہ چور جس کی صفائی کر گئے ہوں۔ کپتان سمیت عملے کا کوئی فرد وہاں نہیں تھا حتیٰ کہ جہاز کا اسٹیئرنگ وہیل سنبھالنے والا بھی غائب تھا جس کا اپنی ڈیوٹی سے ہٹنا سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا، میں نے جھپٹ کر انٹر کام اٹھایا لیکن وہ بھی بے جان تھا۔ میں نے اسے واپس پٹخ دیا۔

"مجھے عرشے پر جانا چاہیے۔" کسی نے میرے اندر کہا تو میں کپتان برج سے نکل کر عرشے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھلی فضا میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ فضا اور سمندر بالکل پُرسکون تھے۔ کچھ گھنٹے پہلے جاری طوفان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تاروں کی ہلکی روشنی میں سمندر دور تک ہموار نظر آ رہا تھا۔ بائیں درمیانی عرشے کو عبور کرتے ہوئے میری نگاہ سمندر کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں ایک کشتی موجود تھی، بلکہ کشتی کیا اچھا بھلا بحری جہاز تھا مگر خلیج کے مقابلے میں کشتی ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی روشنیاں بند تھیں لیکن خلیج کی روشنیوں میں اس کے عرشے پر حرکت کرتے سائے نظر آ رہے تھے۔

اچانک میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے گھوما اور پھر اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے سامنے ہی جان گرے کھڑا تھا، وہی جان گرے جسے بیس گھنٹے پہلے ہم نے بمبئی میں چھوڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عدد رائفل تھی اور چہرے پر مخصوص خبیثانہ مسکراہٹ، وہ رائفل میری طرف اٹھانے لگا تھا۔ خطرہ سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم۔" میرے منہ سے نکلا تھا۔

جان گرے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے رائفل میری طرف تان لی تھی لیکن اس کا گولی چلانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ناں؟"

میں نے خود کو سنبھال لیا۔ سرسری سے انداز میں بولا۔ "ہاں لیکن زیادہ نہیں آج کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ اس وقت رائفل بدست تم خلیج پر کیا کر رہے ہو؟" اس کی آنکھیں شیطانی انداز میں چمکیں۔

"تم دیکھنا پسند کرو گے؟"

میں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے رائفل سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ چلو لیکن راستے میں کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی مسٹر جوزف۔"

"یوسف۔" میں نے تصحیح کی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔ وہ رائفل لیے عین میرے عقب میں چلا آیا تھا۔




"جہاز کے باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"تم جلد ان سے مل لو گے۔"

"خلیج کے پاس لنگر انداز بوٹ کس کی ہے؟"

"فضول سوال مت کرو۔" اس نے پہلی بار درشت لہجے میں کہا۔ "خاموشی سے چلتے رہو۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ اسے مشتعل کرنے کے بجائے آنے والے حالات کا انتظار کروں۔ جلد مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم جہاز کے اگلے حصے میں واقع کارگو والے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ کیرج چار بڑے ہالز پر مشتمل تھا اور یہاں کنٹینرز سے لے کر چھوٹی پیٹیوں میں بے شمار اقسام کا ہزاروں ٹن سامان تجارت موجود تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے مجھے اس طرف کیوں لایا تھا کیا میرے بقیہ ساتھی بھی یہیں موجود تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب میں نے کپتان سمیت خلیج کے عملے کے تیس افراد کو چار نمبر کے ہال میں پایا اور اس وقت وہ جو کام کر رہے تھے میں نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ مختلف اقسام کے بکس اٹھا کر لوڈر کی مدد سے خلیج کے بڑے کار گو گیٹ کے راستے کے پاس ہی لنگر انداز چھوٹے بحری جہاز تک پہنچا رہے تھے۔ ان میں گپتا سے لے کر خود کپتان صلاح الدین سمیت تمام عملہ شامل تھا۔ ان کے علاوہ ہال میں چھ عدد مسلح افراد موجود تھے جو انہیں جلدی جلدی کام کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ان کا رویہ زمانہ قدیم کے کسی نگران کا سا تھا جو غلاموں سے کام لیتے تھے بس فرق یہ تھا کہ ان کے پاس کوڑے نہیں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید قسم کی خودکار رائفلیں تھیں۔

"تم..... تم لوگ بحری قزاق ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔" جان گرے نے خوش مزاجی سے کہا۔ "اب ذرا تم بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ ہمارے پاس وقت پہلے ہی کم ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے یہ سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

بادل نخواستہ میں نے آگے بڑھ کر ایک پیٹی اٹھانے میں کپتان صلاح الدین کی مدد کی جس میں غالباً آٹو پارٹس تھے۔ پیٹی خاصی بھاری بھرکم تھی۔ میں نے سرگوشی میں کپتان سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے کیپٹن؟"

"خاموش رہو۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "ابھی یہ لوگ چلے جائیں گے۔"

"آپ کو یقین ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ یہ ہمیں مار کر سمندر میں بھی ڈال سکتے ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" کپتان نے پیٹی لوڈر پر رکھی دوسری پیٹیوں پر نظر جماتے ہوئے دھیرے سے کہا اور مجھے مشورہ دیا۔

"بولنے کے بجائے بہتر ہے خاموشی سے کام کرتے رہو۔"

ہم میں سے کچھ افراد سامان لوڈر پر رکھ رہے تھے اور باقی لوڈر کو دھکیل کر دوسرے بحری جہاز تک پہنچا رہے تھے۔ ایک بار ایک نگران نے مجھے لوڈر دھکیلنے کا حکم دیا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا جہاز کے دروازے تک لے گیا۔ چھوٹے بحری جہاز سے ایک فولادی تختہ خلیج تک آ رہا تھا۔ جس پر سے سامان گزار کر بحری جہاز تک پہنچایا جا رہا تھا۔ وہاں بھی کچھ افراد سامان کو جہاز کے نچلے حصے میں پہنچا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں مجھے اس بحری جہاز کا معائنہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ کوئی پچاس میٹر لمبا اور بیس میٹر چوڑا دو منزلہ بحری جہاز تھا۔ جس کا نچلا حصہ کارگو کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے اوپر کچھ ایسا سامان نصب تھا جیسے یہ ماہی گیری کے لیے مخصوص ہو لیکن جہاز پر ماہی گیری کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ خاص طور سے وہ نہیں تھی جو ماہی گیر کشتیوں کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کے بجائے اس جہاز پر کچھ چھوٹی کرینیں اور آلات اسی طرح نصب تھے کہ یہ جہاز بار برداری کے لیے بھی استعمال ہو سکتا تھا۔

اس کے ایک پہلو میں ایک مشینی نظام نصب تھا جس کی مدد سے ایک فولادی تختہ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر کسی بھی دوسرے بحری جہاز سے مل سکتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے کا ان لوگوں سے کیا تعلق تھا۔ مجھے مسلح نگراں اور قزاق مختلف رنگ و نسل کے افراد جہاز پر نظر آتے تھے۔ ان میں افریقی بھی تھے اور عرب بھی۔ مشرق بعید سے تعلق رکھنے والے افراد بھی نظر آتے تھے جبکہ برصغیر کے لوگ بھی ان میں شامل تھے گویا یہ بحری قزاقوں کا کوئی بین الاقوامی قسم کا گروہ تھا۔ ان میں صرف ایک جان گرے ہی سفید فام تھا۔ ان افراد میں کئی نقاب پوش بھی تھے جو اس سارے عمل کی نگرانی کر رہے تھے۔ اگلے دو گھنٹے کے دوران میں نے قزاق جہاز کے کئی چکر لگائے اور ہر بار میں نے خاصی تفصیل سے اس کا معائنہ کیا تھا۔ اپنے جہاز کو چھپانے کے لیے انہوں نے اسے تاریکی میں رکھا تھا۔ شاید مقصد یہ تھا کہ قریب سے گزرتا کوئی بحری جہاز اسے دیکھنے نہ پائے یہ ایک مصروف بین الاقوامی شاہراہ تھی اور یہاں چوبیس گھنٹے بحری جہازوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔

سورج نکلنے ہی والا تھا لہٰذا مسلح نگراں جلدی کا شور مچا رہے تھے۔ انہوں نے گالیاں دینا شروع کر دی تھیں اور ایک کو تو مارا بھی تھا جو سستی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کپتان سمیت وہ اعلیٰ افسران کے ساتھ ایک حد میں رہ کر پیش آ رہے تھے۔ وہ نہ تو انہیں گالیاں دے رہے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ جبکہ نچلے درجے کے عملے کے ساتھ وہ بے حد درشتگی سے پیش آ رہے تھے۔ جان گرے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف مخصوص سامان اٹھا رہے تھے یعنی انہیں پہلے سے اپنے مطلوبہ سامان کے بارے میں معلومات تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جہاز میں بھی ان کا کوئی ایجنٹ تھا ممکن ہے یہ مخبری جان گرے نے کی ہو۔ اس کی قزاقوں کے ساتھ موجودگی ہی کافی تھی۔





مطلوبہ سامان منتقل کرتے ہی جان گرے نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا اور کپتان صلاح الدین سے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم ہمارے جانے کے بعد کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے کیونکہ تمہیں آئندہ بھی اس روٹ پر سفر کرتے رہنا ہے؟ شوق سے اس قزاقی کی رپورٹ لکھوا سکتے ہو لیکن نامعلوم افراد کے خلاف......''

''مسٹر گرے، تم ہمیں سمجھانے کی کوشش مت کرو۔'' کپتان صلاح الدین نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہم اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔ اسی بناء پر اس سمندر میں سفر کر رہے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں لیکن خبردار کرنے میں کیا حرج ہے۔'' جان گرے نے سر ہلایا۔ ''تمہارے جہاز کا ریڈیو ہم نے ناکارہ کر دیا ہے۔ جو تمہارا آپریٹر ٹھیک کر لے گا۔ اسے کچھ دیر لگے گی۔ ہاں فلسڈ ریڈیو سگنل دینے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ہماری ایک گن بوٹ تمہارے آس پاس رہے گی کوئی مدد آنے سے پہلے سب غرق ہو چکے ہوں گے۔''

کپتان نے ناگواری ظاہر کی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ جان گرے جاتے جاتے مڑا، وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے گھوم کر ہمیں دیکھا پھر اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے رائفل ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جوزف اِدھر آؤ۔''

''میرا نام یوسف ہے۔'' میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

''تم نے سنا نہیں اِدھر آؤ۔'' یکلخت وہ غرانے لگا۔ ''تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔''

''مسٹر گرے۔'' صلاح الدین اضطراب سے بولا۔ ''تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس سے ہم سب کے لیے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

''شٹ اَپ کیپٹن۔'' گرے نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ تم رپورٹ کر سکتے ہو کہ چیف انجینئر صاحب نشے میں سمندر میں گر گئے تھے۔''

''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اس کے عزائم بھانپ لیے تھے۔ وہ خلیج کو غرق کرنے کے منصوبے کی ناکامی کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے ہی اس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔

''یہ دیکھ رہے ہو۔'' جان گرے نے رائفل لہرائی۔ ''اس کے ہوتے ہوئے میں تم سے اپنا مطالبہ منوا سکتا ہوں۔'' یکلخت اس نے برسٹ مارا۔ گولیاں عین میرے پیروں کے سامنے آ کر لگی تھیں۔ میں اضطراری طور پر اُچھل پڑا تھا۔ جان گرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ جو ہال میں پھیلنے والی آہنی گونج میں دب گیا تھا۔

''اگلا برسٹ تمہاری ٹانگوں پر پڑے گا اور میں تمہیں اسی طرح لے جاؤں گا۔ اب فیصلہ تم پر ہے۔ اپنے پیروں پر چل کر جانا چاہتے ہو یا نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر رائفل اٹھائی۔

''پلیز مسٹر گرے یہ کیا کر رہے ہو تم، حالات خراب ہو جائیں گے۔'' کپتان صلاح الدین

نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میرے لیے بات چھپانا اور جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تمہارا دردِ سر ہے۔'' جان گرے نے بے نیازی سے کہا اور مجھ سے بولا۔ ''تم چل رہے ہو؟ یس آرنو؟''

اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ حسبِ معمول نشے میں تھا۔ اگر میں نے انکار کیا تو وہ سچ مچ فائرنگ کر کے مجھے اپاہج کر دے گا۔ اس کے تیور ہر گزرتے لمحے خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے رائفل کو معمولی سی حرکت دی تھی میں نے جلدی سے کہا۔ ''او کے میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

وہ چند لمحے سرد نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر مڑتے ہوئے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ عارضی پل کے راستے اپنے جہاز پر جانے لگا۔ اسے اتنا اعتماد تھا کہ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اس لمحے میں چاہتا تو اپنی جیب میں موجود پستول سے اس کی شیطانی کھوپڑی پر ایک فائر کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا ہم ان مسلح قزاقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جان گرے کے بدلے وہ ہم سب کو مار سکتے تھے اور خلیج کو غرق کر سکتے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے اس کے پیچھے چلتا دوسرے بحری جہاز کے عرشے پر جا پہنچا۔ وہاں موجود ایک نقاب پوش نے میری طرف دیکھا۔

''اسے کیوں لے آئے؟'' اس نے جان گرے سے پوچھا۔ اس نے انگریزی میں بات کی تھی اور لہجے سے فرانسیسی لگتا تھا۔ چھ سال لندن میں گزار کر مجھے بہت ساری قوموں کو جاننے کا موقع ملا تھا اور میں لہجے سے بھی پہچان جاتا تھا کہ بولنے والے کا تعلق کس ملک سے ہے گویا نقاب تلے کوئی فرانسیسی تھا۔

''یہ میرا معاملہ ہے۔'' جان گرے نے بے پروائی سے کہا۔ ''صرف کام کی حد تک۔ اس کے علاوہ میں کیا کرتا ہوں اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔'' جان گرے کے انداز میں بے نیازی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اس پر ہم بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ ابھی تو دوسرے امور اہم ہیں۔''

نقاب پوش چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دہاڑ کر روانگی کا حکم دیا۔ دوسرے لمحے عرشے پر نصب ایک آہنی پہیہ گھمانے لگے اور خلیج سے جڑا تختہ واپس جہاز پر آنے لگا۔ یہ عرشے تلے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پورے کا پورا تختہ غائب ہو گیا۔ ان کا نظام بہترین تھا۔ عرشے کے ایک طرف نیچے جانے کے لیے بننے والے دروازے کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اب یہاں کوئی زیرِ عرشہ کسی خفیہ خانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ اس جدید دور میں بھی قزاقی ہوتی ہے اور خاص طور سے ایشیائی خطوں میں قزاق بحری جہازوں سے باقاعدہ بھتہ وغیرہ لیتے ہیں لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح دن دیہاڑے





ایک مصروف ترین بحری شاہراہ پر اس طرح بھی قزاقی ہو سکتی ہے۔

مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ جان گرے جیسا کینہ پرور شخص مجھے کسی نیک ارادے سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اول تو اس کے عزائم واضح تھے اور اگر کوئی غلط فہمی تھی تو ان بحری قزاقوں کو دیکھ کر دور ہو گئی تھی کہ جان گرے جن کا ساتھی تھا پھر جان گرے نے جس انداز میں اپنے باس کا منہ بند کیا تھا اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بحری قزاقوں کے اس گروہ میں وہ اہم مقام رکھتا تھا۔ نقاب پوش کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ قزاقوں کی یہ تنظیم صرف اس جہاز تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ صرف ایک حصہ تھے اس گروہ کا۔ جان گرے کے حکم پر مجھے عقبی عرشے سے نچلے حصے میں واقع ایک سیل میں پہنچا دیا گیا۔ بہ مشکل آٹھ بائی چھ کے اس سیل میں پہلے ہی ایک شخص موجود تھا جو گٹھری بنا سو رہا تھا۔

''آرام کرو۔'' مجھے لانے والے نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''نو بجے ناشتہ ملے گا۔''

وہ دروازہ بند کر کے رخصت ہوا تو میں نے سیل کا معائنہ کیا۔ فرش پر دو عدد بستر تھے جو دیوار کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ان میں اتنی گنجائش تھی کہ آدمی سیدھا لیٹ جائے، ہاتھ پیر پھیلانا ناممکن نہیں تھا۔ ایک طرف ایک ریک پر پانی کی بوتل ہک سے بندھی ہوئی تھی۔ عقبی حصے میں چھت کے ساتھ واقع پورٹ ہول سے طلوع ہوتے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بلب لگا تھا جو فی الوقت بجھا ہوا تھا۔ میں دوسرے بستر پر بیٹھ گیا۔ عجیب بات تھی کہ مجھے صورتِ حال سے کسی قسم کا خوف یا پریشانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں بحری قزاقوں کے قبضے میں تھا اور ان میں جان گرے بھی شامل تھا جو یقیناً میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی تخریب کاری کے بے مثال منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس کے دل میں میرے لیے کئی مضر خیالات ہوں گے۔

''دیکھا جائے گا۔'' میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا اور کچھ دیر میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔



فائر کی آواز سنتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے حسن علی کو خاک و خون میں لتھڑے دیکھا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فائر ہوتے ہی ماہ پارہ نے دل خراش چیخ ماری تھی، اس سے مجھے حسن علی کی جوان مرگی کا مزید یقین ہو گیا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ جسم پر سے بوجھ کم ہوا تھا۔ میں نے تڑپ کر زور لگایا اور اپنی کمر آزاد کرا لی لیکن بائیں ٹانگ بدستور ایک گینڈے کے پاؤں تلے تھی۔ میں نے ماہ پارہ کو اپنے سر سے سرکایا جو دیوانہ وار چیخ رہی تھیں۔ ان کی آواز میں مجھے بدمعاشوں کے چلانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اسی لمحے جیپ کو شدید دھچکا لگا تھا اور وہ یوں رُک گئی تھی جیسے اس کے آگے کوئی ٹھوس رکاوٹ آ گئی ہو۔ دھچکے کے ساتھ ہی میرے پاؤں سے بھی بوجھ ہٹ گیا۔ کیونکہ میری ٹانگ پر کھڑا شخص چلتی جیپ کے اچانک رُک جانے سے لوہے کے پائپ پر سے ہوتا ڈرائیور پر جا گرا تھا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلے حصے میں سوار ایک بدمعاش تو ڈرائیور پر گرا تھا۔ ایک جیپ سے ہی

باہر جا گرا تھا اور تیسرا ماہ پارہ پر گرا تھا۔ جو اسے مار رہی تھیں اگرچہ یہ مار پیٹ اس پر قطعی بے اثر تھی لیکن ایک عورت سے مار کھا کر وہ اشتعال میں آ گیا تھا۔ اس نے یک دم ماہ پارہ کے سر پر اپنے ریوالور کا دستہ مارا وہ بے ہوش ہو گئیں۔

"کتیا کی بچی۔" اس نے غرا کر کہا تھا کہ میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو تھامتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا سر جیپ کے فولادی جنگلے سے ٹکرایا۔ اس کی زبان سے گالی نکلی۔ یہ وہی تھا جس نے مجھے گرفتار کیا۔ دوسری ٹکر پر اس کے کس بل خاصی حد تک نکل گئے تھے تیسری بار میں نے پوری انتقامی قوت سے اس کا سر جنگلے پر مارا تو وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور چھین لیا۔ اس کی نالی سے بُو آ رہی تھی۔ گولی اس سے چلائی گئی تھی گویا حسن علی کا قاتل وہی تھا۔ ایک اشتعال کے عالم میں میں نے ریوالور اس کے سر کی طرف کیا تھا اور شاید میں گولی بھی چلا دیتا اگر میں حسن علی کی آواز نہ سن لیتا۔

"گولی مت چلانا یوسف۔" اس نے للکار کر کہا تھا۔ میں اُچھل ہی پڑا تھا۔ حسن علی زندہ تھا اور اس وقت جیپ سے باہر گرنے والے بدمعاش کی مرمت لگا رہا تھا۔ وہ ایک تیسرے درجے کا غنڈہ تھا جو صرف کمزور اور نہتے لوگوں پر اکڑ کر استاد کہلانے لگا تھا۔ حسن علی کی مہارت کے سامنے اس کی ساری استادی دھری رہ گئی تھی۔ ایک منٹ سے کم وقت میں وہ اپنے کئی دانتوں سے محروم ہو چکا تھا اور اپنی ہنسلی کی ہڈی تڑوا چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور اور اس پر گرنے والے بدمعاش کی طرف دیکھا تو انہیں شرافت سے پڑے پا کر حیران رہ گیا۔ وہ یوں ساکت بیٹھے تھے جیسے ساری بدمعاشی بھول چکے ہوں۔ جلد ان کی شرافت کی وجہ بھی مجھے نظر آ گئی۔ یہ ایک شخص تھا جو ان کے سر پر خودکار رائفل لیے کھڑا تھا۔

جیپ سے آگے ایک دوسری جیپ کھڑی تھی۔ ملٹری ماڈل کی یہ جیپ چھوٹی لیکن بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ اس کے اچانک سامنے آنے کی وجہ سے ہی بدمعاشوں کی جیپ رُکی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے جیپ سے اُترنے والے مسلح افراد نے انہیں کور کر لیا تھا۔ حسن علی سے مقابلہ کرنے والے بدمعاش کا سارا غرور خاک ہو چکا تھا تو اس نے بے ہوش ہونے میں عافیت جانی۔ حسن علی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "خس کم جہاں پاک۔"

میں ماہ پارہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ گھنے بالوں کی وجہ سے ان کا سر تو نہیں پھٹا تھا لیکن سر پر ایک اُبھار نمودار ہو گیا تھا۔ ان کی نبض ذرا سستی سے لیکن باقاعدگی سے چل رہی تھی یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ حسن علی لپک کر آیا تھا۔

"ماہ پارہ کو کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"ہوا تو بہت کچھ ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ بے ہوش کیوں ہے؟" حسن علی نے بھنا کر کہا۔





"اس مردود نے ان کے نازک سر پر یہ ریوالور مارا تھا۔" میں نے ریوالور حسن علی کو تھما دیا۔

"اور یہ کیسے بے ہوش ہوا؟"

"آپ کے اس خادم کے ہاتھوں۔" میں نے انکساری سے کہا۔ "سوال جواب بعد میں ہوتے رہیں گے کیا بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے ہم ماہ پارہ کو پیلس لے چلیں اور ان بدمعاشوں کا کوئی بندوبست کریں۔"

"ان کا بندوبست یہ لوگ کریں گے۔" حسن علی نے کہا اور ڈرائیور اور اس پر تقریباً لدے دوسرے بدمعاش کو جیپ سے باہر پھینک دیا۔ یہی سلوک میں نے تیسرے بدمعاش کے ساتھ کیا تھا۔ "انہیں لے جاؤ بعد میں ان سے بات کریں گے۔"

حسن علی نے رائفل بدست افراد کو حکم دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ماہ پارہ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آہستہ سے ان کے گال تھپتھپانے لگا لیکن ان کی بے ہوشی میں خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ سر پر لگنے والی بہ ظاہر معمولی سی چوٹ بھی بعض اوقات خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ حسن علی نے تیزی سے ڈرائیونگ کی اور ہم چند لمحوں میں جمشید پیلس میں تھے۔ حسن علی نے ماہ پارہ کو بازوؤں میں اٹھایا اور ان کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے پیلس کے ڈاکٹر کو فون کر کے اسے فوراً آنے کو کہا۔

حسن علی ماہ پارہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا اس نے ان کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے تو اس کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا تھا۔ ماہ پارہ کسمسانے اور پھر کراہنے لگیں۔ میں نے چمچ سے ان کے منہ میں پانی ٹپکایا تو وہ ہوش میں آ گئیں۔ انہوں نے ہوش میں آتے ہی روایتی سا سوال کیا تھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"اس دنیا میں۔ اپنے کمرے میں۔ اپنے بستر پر۔" میں نے جواب دیا۔

"طبیعت کیسی ہے تمہاری؟" حسن علی بولا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہیں۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ انہیں اتنا درد نہیں ہو رہا تھا جتنا وہ حسن علی کو اپنے پاس پا کر ظاہر کر رہی تھیں۔ "کمبخت نے اتنی زور سے پستول سر پر مارا تھا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کا بدلہ لے لیا اور اس کا سر تین بار زیادہ زور سے جیپ کے فولادی ڈنڈے پر مارا تھا۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"مجھے یہاں کون لایا؟" وہ بولیں۔ پانی پی کر ان کی حالت کسی قدر سدھر گئی تھی۔

"پیلس تک تو آپ جیپ پر آئی تھیں اور جیپ سے یہاں تک آپ کو۔۔۔" میں نے بات ادھوری چھوڑ کر حسن علی کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔ حسن علی ماہ پارہ کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔

اس لمحے زہرہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ پہلے تو انہوں نے چبھتی نظروں سے حسن علی کو

دیکھا جو فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر ماہ پارہ سے بولیں۔ ''کیا ہوا تھا میں نے سنا ہے یہ لوگ تمہیں بے ہوش لائے تھے۔''

''ہاں انہیں چکر آ گیا تھا۔'' ماہ پارہ سے پہلے حسن علی نے کہا تو میں چونک گیا تھا۔ اس نے زہرہ بیگم سے غلط بیانی کی تھی۔

''اچھا'' ان کی نظروں کی چبھن مزید بڑھ گئی تھی۔ ''خیریت، چکر کیوں آ گیا تھا؟''

''بس اچانک کمزوری کا احساس ہوا اور چکرا کر گر پڑی۔ سر ایک پتھر سے لگا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔'' ماہ پارہ نے سر درد کے باوجود ذہانت سے اپنے سر کی چوٹ کا جواز پیدا کر لیا تھا۔

زہرہ بیگم کی آنکھوں میں شک بدستور موجود تھا۔ انہوں نے حسن علی کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے اب تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں ابھی حسن یہاں سے نہیں جائے گا۔'' یک دم ماہ پارہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''اچھا۔'' زہرہ بیگم نے معنی خیز لہجے میں کہا اور چلی گئیں۔

''تم نے اسے جواب دے کر اچھا نہیں کیا۔'' حسن علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ جمشید علی سے شکایت کرے گی۔''

''تو کرے۔'' ماہ پارہ دوبارہ نیم دراز ہو گئیں۔ انہوں نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔ ''یوسف کیبنٹ سے مجھے کوئی پین کلر دے دو۔''

''پین کلر تو میں دے دوں گا لیکن بہتر ہو گا کہ پہلے ڈاکٹر آپ کو دیکھ لے۔'' میں نے کہا۔ اس وقت ڈاکٹر آ گیا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ماہ پارہ جلدی سے بولیں۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ ان کی باتوں پر قطعی توجہ نہ دیں۔ ویسے بھی چوٹ ان کے سر پر آئی ہے۔'' میں نے کہا تو ڈاکٹر مسکراتے ہوئے ماہ پارہ کا معائنہ کرنے لگا۔ دراصل ماہ پارہ ڈاکٹروں سے گریز کرتی تھیں۔ حالانکہ ان کے والد ڈاکٹر تھے اور ان کا بچپن ہسپتال کے ساتھ ملے بنگلے میں گزرا تھا۔ انہیں انجکشن کی سوئی سے ڈر لگتا تھا۔ اسی بناء پر وہ حتیٰ الامکان ڈاکٹرز سے گریز کیا کرتی تھیں۔

''کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔'' حسبِ معمول ڈاکٹر نے ایک انجکشن برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کبھی متلی یا چکر کی کیفیت محسوس ہو تو فوری طور پر انہیں ہسپتال لے جایئے گا۔ یہ انجکشن دے رہا ہوں۔ اسی سے درد میں کمی ہو گی۔''

''میں ٹیبلٹ کھا لوں گی۔'' ماہ پارہ گھبرا کر بولیں۔

''انجکشن زیادہ زود اثر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے اصرار کیا اور انجکشن ان کے بازو میں گھونپ دیا۔

پھر اس نے ہم سے کہا۔

''اب انہیں آرام کرنے دیں۔''





ڈاکٹر کے ساتھ میں اور حسن علی بھی باہر آ گئے تھے۔ پورچ میں زہرہ بیگم جیپ کا معائنہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''یہ جیپ کس کی ہے؟''

''میرے ایک دوست کی ہے۔'' حسن علی نے کہا۔ ''ادھار لایا تھا۔''

میں اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تو اس نے حیرت سے کہا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''آپ کے ساتھ۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے مجھے گھورا لیکن مزید کچھ کہے بغیر جیپ آگے بڑھا دی۔ باہر نکلتے ہی میں نے پوچھا۔

''وہ لوگ کون تھے جنہوں نے اس جیپ کا راستہ روکا تھا؟''

''ہمارے ہی محافظ ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر کام آتے ہیں۔''

''خاک کام آتے ہیں، مجھے مار مار کر چپٹا کر دیا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''بے چاری ماہ پارہ کے سر پر ایک گومڑ نکل آیا اور آپ تو شہید ہوتے ہوتے رہ گئے۔ آپ نے گولی کو غچہ کیسے دیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''بس قسمت تھی میں نے بروقت اسے ریوالور اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ اگلے لمحے جیپ کا جنگلا چھوڑ دیا۔''

''یعنی مجھے اور ماہ پارہ کو ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

''نہیں مجھے معلوم تھا کہ محافظ کہیں آس پاس ہوں گے۔ وہ تمہیں آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔''

''تو پھر آپ نے وہ عظیم سٹنٹ کیوں دکھایا تھا۔ جیپ کے پیچھے لٹکنے والا۔'' میں نے شرارت سے کہا۔ ''شاید کسی کو متاثر کرنے کے لیے۔''

''بک بک مت کرو۔'' حسن علی نے دوسری طرف منہ کر لیا لیکن میں نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

''ان بدمعاشوں کا کیا ہوا؟'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''ہم وہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ پہنچ گئے۔'' حسن نے جیپ ایک قدر ویران علاقے میں اس اجاڑ سی نظر آنے والی کوٹھی کے سامنے روکی۔ ہارن کی آواز پر فولادی گیٹ میں ایک کھڑکی کھلی۔ کسی نے باہر جھانکا اور حسن علی کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ جیپ احاطے میں جا کر رکی۔ کوٹھی نامکمل تھی۔ کھڑکیاں دروازے لگ گئے تھے لیکن پلاسٹر نہیں ہوا تھا۔ لان پر ریت اڑ رہی تھی۔ ہر طرف تعمیراتی سامان بکھرا ہوا تھا۔

''یہ کس کی کوٹھی ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' حسن علی نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹھی اندر سے خاصی بہتر تھی۔

اندر نہ صرف پلاسٹر ہوا تھا بلکہ بعض جگہوں پر اچھا خاصا سامان بھی موجود تھا۔ حسن علی ایک کمرے میں پہنچا۔ جہاں مختلف الیکٹرونکس آلات رکھے ہوئے تھے۔ دو افراد وہاں موجود تھے۔ حسن علی نے ان سے پوچھا۔

''ان لوگوں نے کچھ بتایا۔''

''بہت کچھ۔'' ایک بولا۔ ''لیکن کام کی بات کوئی نہیں نکلی۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟''

''وہ کہتے ہیں کہ کرائے کے بدمعاش ہیں۔ انہیں ہائر کیا گیا تھا۔ ہائر کرنے والے نے انہیں سامنے آئے بغیر بیس ہزار کی رقم بھجوا دی تھی اور کام کی تکمیل کی صورت میں مزید بیس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''کام کیا تھا؟''

''یوسف بابا کا اغوا اور ان کے ساتھ جو بھی ہوا اسے بھی اٹھا لے جانا تھا۔'' اس شخص نے میری طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا وہ مجھے جانتا تھا۔

''بکواس کرتے ہیں وہ۔'' حسن علی نے کہا۔ ''اس طرح معاہدے نہیں ہوا کرتے۔ آخر انہیں اغوا کرنے والے کو کہیں پہنچانا تھا کیا ہائر کرنے والوں نے انہیں کوئی جگہ نہیں بتائی تھی۔''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اغوا کرانے والے بڑے چالاک ہیں۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ ایک گاڑی اس سڑک پر آگے ان کی منتظر ہوگی۔ جب وہ مطلوب افراد کو لے آئیں گے تو افراد لے کر وہیں ان کا بقیہ معاوضہ دے دیا جائے گا۔''

''رقم کس ذریعے سے ملی تھی؟''

''کسی نے اخبار میں لپیٹ کر استاد کے گھر میں پھینک دی تھی۔''

''گویا ان لوگوں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگوں کے ہاتھ صرف کرائے کے ٹٹو آئے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' حسن علی سوچتے ہوئے بولا۔ ''معلوم کرو کہ یہ جیپ کس کی ہے۔ نمبر پلیٹ تو جعلی لگ رہی ہے مگر انجن نمبر سے سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے جیپ بھی ہائر کرنے والوں نے ہی دی ہوگی۔''

''انجن کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اس شخص نے اعتراف کیا۔

''تو معلوم کرو۔'' حسن علی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

چاروں بدمعاش ایک اُجاڑ سے کمرے میں قید تھے۔ جس کی دیواریں کھردری اور رنگ سے عاری تھیں۔ فرنیچر نام کی کوئی شے نہیں تھی اور وہ چاروں فرش پر پڑے تھے۔ اب باقی دو بھی خستہ حال نظر آ رہے تھے۔ جس سے واضح تھا کہ ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک قسم کی تفتیش کی گئی تھی۔ ان میں





سب سے زیادہ خراب حالت استاد محترم کی تھی یہ چار عدد دانتوں سے محرومی اور ٹوٹی ہوئی ہنسلی ہی کچھ کم نہیں تھی۔ تفتیش کے دوران انہیں اپنے شاگردوں کے سامنے جس بے عزتی سے گزرنا پڑا تھا وہ ان کے چہرے سے واضح تھی۔ حسن علی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اگر تم زحمت سے بچنا چاہتے ہو تو اپنی زبان کھول دو۔''

''ہمیں جو معلوم تھا ہم بتا چکے ہیں۔'' ڈرائیور نے دانت بھینچ کر کہا۔

''ہمیں بے وقوف مت سمجھو۔'' حسن علی نے کہا۔ ''اتنی آسانی سے بتانے والی چیز نہیں ہو تم پر خاصی محنت کرنا پڑے گی۔'' استاد محترم حقارت سے مسکرائے۔

''محنت کر کے تمہارے بندے دیکھ چکے ہیں۔''

''تم اسے محنت کہتے ہو۔ یہ تو ایک ہلکا پھلکا خوف تھا۔ وہ معصوم بندے ہیں اگر میں چاہوں تو یہ لڑکا ہی تمہاری زبان کھلوا لے جسے تم لوگ حلوہ سمجھ کر اغوا کرنے آئے تھے۔''

''دس منٹ کی بات ہے سر جی۔'' میں نے مذاق میں کہا تھا لیکن اس وقت چودہ طبق روشن ہو گئے جب حسن علی نے پوری سنجیدگی سے مجھے یہ کام سونپ دیا۔ وہ باہر جانے لگا تو میں اس کے پیچھے لپکا۔

''یہ کیا غضب کرتے ہیں استاد محترم میں نے تو صرف آپ کی بات نبھائی تھی۔'' میں نے باہر آ کر کہا۔

''اچھا۔'' حسن علی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم سنجیدہ ہو۔ اب اس پٹھے کے سامنے میری ناک تو کٹ جائے گی جس کے سامنے میں نے اتنا بڑا دعویٰ کیا تھا۔''

''استاد جی آپ جانتے ہیں کہ بندہ ابھی پوری طرح بشر نہیں بنا ہے۔ کم سنی کی بناء پر اس قسم کے پُر تشدد کاموں سے بھی ذرا گھبراتا ہے۔ اس کے باوجود محض آپ کی عزت کی خاطر یہ بارِ گراں سر پر اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ از راہِ مہربانی چائنہ ماچس کا ایک پیکٹ منگوا دیجیے۔''

''پٹاخے۔'' حسن علی نے غور کر کے کہا۔ ''ان کا کیا کرو گے؟ یہ پاپی پٹاخوں سے مرنے والے نہیں ہیں۔ ان کے لیے سوا کلو بارود چاہیے جو کچھ پڑھ کر ان کے نیچے رکھا جائے تبھی یہ مریں گے۔''

''پٹاخوں سے مر جانے والوں پر سوا کلو بارود ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم سنجیدہ ہو؟'' حسن علی نے حیرت سے کہا۔

''تقریباً اتنا ہی جتنا کہ آپ ماہ پارہ کے لیے سنجیدہ ہیں۔''

اور حسن علی کو مجھے چائنہ ماچس کا پیکٹ منگوا کر دینا پڑا۔ وہ اسے بھی میرا طفلانہ پن سمجھ رہا تھا۔ عمر کے لحاظ سے تو میں طفل ہی تھا لیکن تجربات کے لحاظ سے اچھا خاصا بالغ ہو چکا تھا۔ پیکٹ آتے

ہی میں اسے لے کر بدمعاشوں والے کمرے میں پہنچا پہلے تو ان سب کو میری ہدایت کے مطابق سر سے پاؤں تک کسی بنڈل کی طرح رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ خاصی دہشت سے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ استاد محترم نے کانپتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟''

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ زبان کھول دے'' حسن علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اب تم شکایت نہیں کر سکتے۔''

''شکایت کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔'' میں نے پٹاخوں کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے لیے خاص رعایت ہے۔ اب بھی تم بتا دو کہ کن لوگوں نے تمہیں موت کے منہ میں جھونکا ہے تو میں اپنا پروگرام ملتوی کر دوں گا۔''

لیکن پٹاخے دیکھ کر ان کی ساری دہشت دور ہو چکی تھی۔ بلکہ استاد محترم میں اتنی ہمت آ گئی کہ انہوں نے بڑھک بھی ماری۔

''اوئے تُو ہم سے کچھ نہیں کہلوا سکتا ابھی بچہ ہے تُو۔''

شب برات کے موقع پر عبادت گنوادی اور سونے والوں کا سکون حرام کرنے کے لیے ہر سال بے تحاشہ پٹاخے اور بم استعمال ہوتے ہیں۔ بلکہ اب تو لوگ آتشیں ہتھیار بھی استعمال کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سب سے معروف چائنہ ماچس ہے۔ سستی ہونے اور زوردار دھماکے کی وجہ سے یہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی ایک اور خاصیت ذرا دیر سے پھٹنا ہوتی ہے۔ یعنی اسے ماچس سے رگڑ کر فرش پر پھینک دیا جائے تو یہ آٹھ سے دس سیکنڈ میں پھٹ جاتا ہے۔ قریب سے اس کا دھماکا خاصا خوف ناک لگتا ہے۔ میں استاد کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم نے دیکھا ہے دستی بم قریب سے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اسّی گز کے اندر کھڑے انسان کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں لیکن یہی دستی بم زیادہ فاصلے پر بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ پٹاخہ بہ ظاہر بے ضرر سی چیز ہے۔ تمہارے پیروں میں پھٹ جائے تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر میں اسے تمہارے کان میں رکھ دوں اس طرح۔''

میں نے پٹاخہ ماچس سے رگڑ کر اس کے کان میں ٹھونس دیا جس نے ماہ پارہ کے سر پر پستول مارا تھا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ چلایا۔ ''نکال اسے ابے تیری تو......'' ناقابلِ اشاعت الفاظ کے ساتھ وہ سر جھٹک کر پٹاخے کو کان سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا جسم فرش سے اُچھل رہا تھا۔ جیسے مرغِ بسمل تڑپتا ہے مگر جب پٹاخہ پھٹا تو وہ بلا مبالغہ فرش سے فٹ بھر اُچھل پڑا تھا۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ بے جان سا ہو گیا۔ استاد محترم پہلے سے کہیں زیادہ دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے افسوس سے کہا۔

''بے چارہ کم سے کم بہرہ تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دھماکے سے دماغ بھی متاثر ہوا





ہو۔ سننے کے ساتھ یہ بولنا بھی بھول جائے یا ساری عمر دیکھ نہ سکے۔ ممکن ہے اس کی یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی متاثر ہوئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جہنم رسید ہو جائے۔''

''بکواس بند کرو۔'' استاد محترم نے چلا کر کہا۔ ''تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔''

''دہشت زدہ کون کر رہا ہے۔ میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ باقی سب تو یہ ہوش میں آئے گا تو پتا چلے گا۔''

اس وقت وہ بدمعاش ہوش میں آ گیا اور ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلانے لگا۔ پٹاخے نے اس کان کے پردے کا حشر نشر کر دیا تھا۔ ''اُف......ارے...... مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ کتے کے بچے۔ تُو نے مجھے مروا دیا۔ (رُوئے سخن استاد محترم تھے) تیری ماں...... ہائے میں بہرہ ہو گیا۔'' اب وہ دہاڑیں مار کر رو رہا تھا۔

''صرف ایک کان سے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ابھی تمہارا دوسرا کان سلامت ہے۔'' پھر استاد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ممکن ہے تمہیں کوئی بات یاد آ گئی ہو؟''

''مم...... مجھے کچھ نہیں یاد۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سب بتا چکا ہوں۔''

''غالباً تمہیں ان معمولی سے پٹاخوں کی اثر انگیزی کا اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اس کے اور بھی مؤثر استعمال ہیں۔ مثلاً اگر میں اسے تمہاری ناک میں لگا دوں۔'' میں نے کہا اور پٹاخہ استاد کے بجائے اس کے اس گرگے کی ناک میں ٹھونس دیا۔ جس نے ماہ پارہ کو پکڑا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ یہ حرکت کر جاؤں گا۔ وہ زور سے اُچھلا اور چلاتے ہوئے پٹاخہ ناک سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی وہ سر جھٹکتا اور کبھی ناک سے زوردار سانس نکالتا لیکن پٹاخہ میں نے اتنی قوت سے ناک میں گھسیڑا تھا کہ اسے آسانی سے نکال دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ چلایا۔

''استاد انہیں بتا دو خدا کے لیے۔''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پٹاخہ پھٹ گیا۔ اس نے پہلے والے سے بھی زیادہ دل خراش چیخ ماری لیکن بے ہوش نہیں ہوا۔ پٹاخے نے اس کی ناک کے اندرونی حساس حصوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حرارت نے اس کی ناک کے گوشت کو جلا دیا تھا اور وہ اس وقت ناقابلِ برداشت اذیت کی وجہ سے خطرے کے الارم کی طرح بجے جا رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار میں کوئی کام کی بات کرنا دشوار تھا۔ مجبوراً حسن علی نے اس کا منہ بند کرنے کا حکم دیا اور اس کے منہ پر چوڑا سا ٹیپ چڑھا دیا تھا۔ ٹیپ چڑھا دیا گیا تو میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔

''تم نے دیکھی۔ اس معمولی سی چیز کی کارکردگی اب فرض کرو میں ذرا بڑا پٹاخہ تمہارے منہ میں ڈال کر اوپر سے ٹیپ لگا دیتا ہوں۔ تو دھماکے کے بعد کیا ہوگا۔ عین ممکن ہے تمہاری زبان جل جائے اور تم ہمیشہ کے لیے اشاروں کی زبان میں بات کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اس قسم کے پٹاخے ہوا

کو بڑی تیزی سے پھیلاتے ہیں اگر تمہارے منہ کے ساتھ ناک بھی بند کر دی جائے تو اندر ہونے والے دھماکے کو جب پھیلنے کے لیے جگہ نہیں ملے گی تو وہ تمہارے سر پر دباؤ ڈالے گا تمہاری آنکھیں باہر نکل آئیں گی اور کان کے پردے پھٹ جائیں گے تم؟''

''خدا کے لیے۔'' استاد نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں میں نے سب بتا دیا تھا۔ بس ایک بات چھپائی تھی ہمیں جیپ شہزاد خان نامی شخص نے دی تھی وہ چاکیواڑہ میں رہتا ہے۔ اس کا پتا رقم کے پیکٹ کے ساتھ ملا تھا اور اس میں ایک پرچہ بھی تھا۔ ہدایت کے مطابق جب ہم نے یہ پرچہ شہزاد خان کو دکھایا تو اس نے ایک گیراج میں لے جا کر یہ جیپ ہمارے حوالے کر دی۔''

''گیراج کہاں ہے؟'' حسن علی نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

''چاکیواڑہ میں، پتا مجھے نہیں معلوم لیکن میں گیراج دکھا سکتا ہوں۔''

''تم شہزاد خان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، میں زندگی میں پہلی بار اس سے ملا تھا۔''

''سوچ لو اگر یہ بات غلط نکلی تو۔'' حسن علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے سب بتا دیا ہے اب تم اعتبار نہ کرو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' استاد نے خاصی بے بسی سے کہا۔

حسن علی ان لوگوں کی مرہم پٹی اور کھلائی پلائی کی ہدایت دے کر باہر آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں یہ پٹاخوں والی ترکیب کیسے سوجھی؟''

''بس جناب آپ کی پیروی میں کبھی کبھی سر استعمال کر لیتے ہیں۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

اس نے مجھے گھورا۔ ''آج کل تم زیادہ ہی بدمعاش ہوتے جا رہے ہو۔''

''یہ بھی آپ کی صحبت کا اثر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ورنہ ذاتی طور پر بندہ بے حد شریف ہے۔''

''لگتا ہے تمہارے لیے نیا تربیتی سیشن شروع کرنا پڑے گا۔''

''اچھا صلہ دے رہے ہیں میری خدمت کا۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''سچ کہا ہے کسی نے نیکی کرنے والے کو ہی لوگ دریا میں ڈال دیتے ہیں۔''

''اب تم پیلس جاؤ۔''

''پیلس پیدل ہی۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''آپ کو اندازہ ہے کہ فاصلہ دو میل سے کم نہیں ہے اور یہاں تو ٹیکسی بھی نہیں ملتی۔''

''تو پیدل چلے جاؤ۔ ویسے بھی صبح تم نے دوڑ نہیں مکمل کی۔''

''ہرگز نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہی واپس جاؤں گا۔ بائی دے وے مجھے ٹہلا کر آپ کہاں جا





رہے ہیں۔ شہزاد خان کی تلاش میں۔'' میں نے اچانک کہا تو حسن علی بھی حیران رہ گیا تھا۔

''تمہیں کیسے......'' پھر جھلا کر کہا۔ ''تم ایک ہی شیطان ہو۔''

''شیطان ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

بادلِ نخواستہ حسن علی نے مجھے اپنے ساتھ لیا۔ اس کے ساتھ ایک شخص تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر کے اس پرانے علاقے کو اس طرح جانتا تھا جیسے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو۔ تاہم اس کا علم جغرافیہ اس کے ہاتھوں کی لکیروں سے زیادہ گمراہ کن ثابت ہوا تھا۔ دو بار بھٹکنے کے بعد حسن علی نے گلی میں کھیلنے والے بچوں اور دروازوں پر زندگی سے بے زار بیٹھے بوڑھوں سے شہزاد کا پتا دریافت کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر بارہویں فرد نے ہماری صحیح رہنمائی کی اور ہمیں اس پانچ منزلہ عمارت تک پہنچا دیا۔ جو اتنی خستہ حال تھی کہ اس میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ ابھی زمین بوس نہ ہو جائے۔ تاہم عمارت گزشتہ سو سال سے ایسے ہی کھڑی تھی اور امکان تھا کہ کوئی زلزلہ نہ آیا یا کسی نے بم سے نہ اڑا دیا تو یہ یونہی مزید پچاس ساٹھ سال کھڑی رہے گی۔

شہزاد خان عمارت کے پانچویں مالے پر رہتا تھا۔ اس علاقے میں فلور کے بجائے مالے کہا جاتا ہے۔ بمبئی کی طرح اس جگہ کا طرزِ معاشرت بھی کسی حد تک پرانے بمبئی سے مشابہ تھا۔ یہاں زیادہ تر گجراتی، میمن اور کچھی برادری کے افراد آباد تھے۔ حسن علی نے اپنے ساتھ آنے والے ماہر جغرافیہ کو نیچے رکنے کو کہا۔ وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں اور حسن علی اوپر پہنچے راستے میں گرد آلود سیڑھیوں پر کچرا بکھرا ہوا تھا۔ اندر سے عمارت کا حال اور بھی بدتر تھا جگہ جگہ سے پلاستر اکھڑ رہا تھا۔ رنگ و روغن تو پاکستان بننے کے بعد کرایا ہی نہیں گیا تھا۔ شہزاد خان کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دینے پر ایک عورت نے اندر سے جھانکا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''ہمیں شہزاد صاحب سے ملنا ہے۔'' حسن علی نے شائستگی سے کہا۔

''وہ تو گھر پر نہیں ہے۔'' عورت نے فوراً کہا اور مجھے لگا کہ اس نے سچ ہی کہا تھا۔

''پھر کہاں ملیں گے شہزاد صاحب؟'' حسن علی نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' عورت نے شک زدہ لہجے میں کہا۔ غالباً اس سے پہلے کسی نے شہزاد خان کو اتنی عزت سے نہیں بلایا تھا۔

''ہمیں اس سے کچھ کام ہے۔'' حسن علی نے اسی لہجے میں کہا۔ ''ان کے فائدے کا۔''

''ظاہر ہے اس کو فائدہ ہونا ہے۔'' عورت نے تلخی سے کہا۔ ''جو کماتا ہے باہر ہی اڑا دیتا ہے۔ وہیں ہوگا اپنے مقبرے میں اپنے گیراج پر۔''

عورت کی باتوں سے ظاہر تھا اس کا شوہر شہزاد خان عیاش طبیعت شخص تھا جسے گھر اور بیوی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ عورت نے اندر سے ایک کاغذ پر گیراج کا پتا لکھ کر لا دیا تھا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے اترے اور ماہر جغرافیہ کو ایک موقع اور دیا کہ وہ اپنی اہلیت ثابت کر سکے اور اس بار اس نے

ہمیں بالکل درست پتے پر پہنچا دیا تھا۔ گیراج ایک پتلی سی گلی کے کونے پر تھا۔ جس کے سامنے والی سڑک پر ٹریفک کا سیل رواں تھا۔ گیراج کے سامنے ہجوم دیکھ کر حسن علی چونکا تھا۔ لوگوں کو دائیں بائیں کرتے ہوئے ہم بہ مشکل گیراج تک پہنچے جہاں دکان کے اندر سے آنے والا خون جم چکا تھا۔

''کیا ہوا بھائی صاحب؟'' حسن علی نے سب سے آگے شتر مرغ کی طرح گردن نکالے ایک صاحب سے پوچھا۔

''مرڈر اپن اپنی اکھا جندگی میں اتنا مرڈر نہیں دیکھا۔'' انہوں نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی بات پر غور کیا اس لمحے پیچھے سے کسی نے مجھے دھکا دیا اور میں بے اختیار دکان کے تقریباً اندر جا پہنچا تھا۔ پھر اندر نظر آنے والے منظر نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ دکان کے اندر ایک پیلا سا بلب روشن تھا جس کی روشنی تاریکی کے خلاف جدوجہد کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ دکان بہ مشکل بارہ بائی دس کی تھی۔ یہ دراصل موٹر سائیکلوں کی ریپئر شاپ تھی اور اس کا وہی حال تھا جو عام طور سے اس قسم کی دکانوں کا ہوتا ہے۔ کالک، میل اور آئل کی چکنائی جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے مرمت طلب پُرزے کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہے تھے لیکن دہشت زدہ کرنے والی چیز تین عدد لاشیں تھیں جو آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے ایک جوان العمر آدمی کی لاش تھی جو غالباً پُرزے دھونے والے سیاہ محلول میں منہ کے بل پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون اور مغز سیاہ محلول میں شامل ہو کر اسے نئی رنگت دے چکا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک نوعمر لڑکے کی لاش تھی۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی اور وہ گٹھری کی طرح دیوار سے لگا ہوا تھا۔ تیسری لاش نسبتاً جوان لڑکے کی تھی اس نے کونے میں موجود پُرزے رکھنے والے ریک کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن قاتل یا قاتلوں نے اسے وہاں بھی نہیں بخشا تھا۔ اسے بھی ایک ہی گولی ماری گئی تھی۔ عین سر کے اوپر اس سے قاتلوں کی پیشہ وارانہ مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔ تینوں کا خون مل کر ایک ندی کی طرح بہتا دکان کے باہر تک آ گیا تھا اور فضا میں اس کی مہک بسی ہوئی تھی۔ ایسی مہک عام طور سے گوشت کی دکانوں پر آتی ہے۔ یکدم مجھے متلی ہونے لگی۔ میں پلٹ کر بھاگا اور ہجوم سے باہر آتے ہی میں نے سڑک کے کنارے اُلٹی کر دی تھی۔ یہ دیکھ کر میری حالت مزید خراب ہو گئی کہ میرا جوتا خون پر چلا گیا تھا۔

اس موقع پر ماہر جغرافیہ نے میری پیٹھ سہلائی اور مجھے قریب ہی دکان سے کولڈ ڈرنک لے کر پیش کی۔ اس سے کلی کر کے اور چند گھونٹ حلق سے اُتار کر مجھے ذرا سکون محسوس ہوا تھا۔ مجھے جوتے سے گھن آ رہی تھی۔ میں نے اسے اُتار پھینکا۔ میں ایک ہی جوتے میں تھا۔ اس لمحے حسن علی مجمع سے باہر نکلا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں نے گاڑی میں اطمینان کا سانس لیا تھا۔ رات کے بارہ بجے بھی اس علاقے میں ہجوم تھا اور دکانیں کھلی تھیں۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔





''قتل۔'' حسن علی نے مختصراً کہا۔

''وہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ قاتل کون تھے؟''

''قاتلوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دو ہیلمٹ پوش اب سے پون گھنٹے پہلے ایک موٹر سائیکل پر آئے، دکان کے اندر گئے اور صرف دو منٹ بعد چلے گئے۔ کسی نے گولیاں چلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے سائلنسر لگے ہتھیار استعمال کیے تھے۔ قتل کے فوراً بعد ایک شخص نے مقتول شہزاد خان کی لاش دیکھ لی تھی لیکن اس کے شور مچانے سے پہلے قاتل دور نکل چکے تھے۔''

''شہزاد خان وہی تھا جو سب سے آگے پڑا تھا؟''

حسن علی نے سر ہلایا۔ ''سب سے پہلے اسے ہی گولی ماری گئی ہوگی۔ قاتل اس کے لیے آئے تھے۔ لڑکے اس وجہ سے مارے گئے کہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات جانتے ہوں اس بناء پر مارے گئے ہوں۔''

''وہ لوگ ان کے سامنے ہی شہزاد خان سے ملنے آئے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ لڑکے بھی ان قاتلوں کی نشاندہی کر سکتے تھے لہٰذا قاتلوں نے انہیں بھی خاموش کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔'' میں نے تبصرہ کیا۔ ''وہ لوگ زیادہ ہی مستعد ہیں۔''

''جب اغوا کرنے والے ان تک نہیں پہنچے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ منصوبہ ناکام ہو گیا ہے اور اب بات ان تک آ سکتی ہے لہٰذا انہوں نے اس واحد راستے کو بند کر دیا۔ جو ان تک رسائی رکھتا تھا۔''

اس لمحے گاڑی پھر اس عمارت کے سامنے رُکی جہاں ہم پہلے بھی آ چکے تھے یعنی شہزاد خان کے فلیٹ پر۔ رات ہونے کے باوجود علاقے کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہم اوپر پہنچے۔ درواہ بجانے پر عورت کے بجائے ایک چھوٹا بچہ دروازے تک آیا تھا۔ ''آپ نے کس سے ملنا ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''آپ کے ابو شہزاد خان ہیں ناں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اپنی امی کو بلائیے۔''

کچھ دیر بعد وہ عورت دروازے پر تھی ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی تھی۔

''کہئے اب کیوں آئے ہیں۔''

میں سمجھ رہا تھا کہ حسن علی عورت کو اطلاع دینے آیا تھا کہ اب وہ سہاگن نہیں رہی بلکہ بیوہ ہو چلی تھی اور عورت کے روکھے لہجے پر اسے اطلاع دے کر اپنی راہ لے گا لیکن اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''محترمہ شہزاد خان ہمیں دکان پر نہیں ملا۔ وہ کسی کے ساتھ چلا گیا تھا اور اب تک نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔''

یہ سنتے ہی عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''اے...... کِک...... کس سے خطرہ ہے۔''

''میرا خیال ہے یہ باتیں اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر نا مناسب نہیں ہیں۔'' حسن علی

نے کہا۔

عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ بات اس کے شوہر کی جان کی تھی۔ اس لیے اس نے بالآخر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ چھوٹا سا یہ فلیٹ حسرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ گھر کی حالت سے ظاہر تھا کہ شہزاد خان سے عورت کا شکوہ بجا تھا۔ ہم معمولی درجے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شہزاد خان کی بیوی نے تشویش سے پوچھا۔ ''کون لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟''

''بہن آپ جانتی ہیں کہ شہزاد خان کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں میں نہیں لیکن دولت کمانے کے لیے ان دنوں وہ خطرناک لوگوں کے ساتھ ہے۔ جو انسانی زندگی کی اتنی پروا بھی نہیں کرتے جتنی آپ یا میں کسی مکھی یا مچھر کی پروا کرتے ہیں۔''

عورت کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''بھائی صاحب اب کیا ہوگا؟ خدا کے لیے کچھ کریں۔''

''کچھ ہم اس وقت کریں گے۔ جب ہمیں معلوم ہوگا کہ شہزاد خان کو لے جانے والے لوگ کون ہیں۔'' حسن علی نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ ہماری مدد کریں تو ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں شہزاد خان سے کون لوگ مل رہے تھے۔ کیا کوئی ایسا شخص یہاں پر بھی آیا تھا جسے آپ نہ جانتی ہوں۔''

''نہیں۔'' عورت کہتے کہتے رُک گئی۔ ''ہاں ایک ہفتے پہلے رات گئے بابو بھائی کے ساتھ ایک شخص آیا تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شہزاد سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہے تھے اس لیے اسے ساتھ لے گئے تھے۔ شہزاد خاصی دیر سے واپس آیا تھا۔''

''یہ بابو بھائی کون ہے؟'' حسن علی نے اسے بہ غور دیکھا۔

''بابو بھائی اس کی مارکیٹ میں آٹو پارٹس کی دکان ہے۔ شہزاد کے گیراج سے دائیں طرف چوتھی دکان ہے۔''

''اور بابو بھائی کیسا آدمی ہے۔''

عورت جیسے پھٹ پڑی تھی۔ ''شہزاد کی تباہی کا ذمے دار یہی شخص ہے۔ اس سے ملنے سے پہلے شہزاد ایک اچھا شوہر اور باپ تھا لیکن اب اسے نہ میری پروا ہے اور نہ بچوں کی۔ وہ شراب پیتا ہے اور ساری کمائی جوئے میں اُڑا دیتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بیسواؤں کے پاس بھی جاتا ہے۔'' عورت کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''اسے بابو بھائی نے اس لائن پر لگایا ہے۔ وہ خود بھی خراب آدمی ہے اور دوسروں کو بھی خراب کرتا ہے۔''

''اس کے ساتھ آنے والا آدمی کیسا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا حلیہ کیا تھا؟''

عورت سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''ذرا بھاری جسامت کا شخص تھا۔ سانولا رنگ، پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے بھورے رنگ کا مسہ تھا اور سر پر سیاہ گھنگھریالے بال تھے۔ جیسے





مکرانیوں کے ہوتے ہیں۔''

عورت کا مشاہدہ اچھا تھا اور اس نے اس شخص کا خاصا واضح حلیہ بتا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہاں سے کھسک لینا چاہیے اس سے پہلے کہ عورت تک اس کے شوہر کے مقتول ہونے کی خبر پہنچے اور ہم بلاوجہ شبے کی زد میں آ جائیں لیکن شاید مجھے تاخیر ہو گئی تھی۔ اس لمحے باہر سیڑھیوں پر شور اٹھا کچھ لوگ اس طرف آ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' میں نے حسن علی کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شور اس نے بھی سن لیا تھا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب بھانڈا پھوٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت دروازے پر کسی نے جان توڑ دستک دی اور چلایا۔ ''بھابی دروازہ کھولو جلدی۔''

''خدا خیر کرے۔'' عورت کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ ''ارے کیا دروازہ ہی توڑ ڈالو گے۔''

دروازے کے باہر چار پانچ افراد افسردہ کھڑے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر عورت کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ''کیا ہوا بھیا خیریت تو ہے۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شہزاد تو خیریت سے ہیں۔''

''نہیں بھابی۔'' ایک شخص نے ہمت کر کے کہا۔ ''شہزاد بھائی کو دکان پر کسی نے گولی مار دی۔ وہ......وہ۔'' آواز اس شخص کے گلے میں پھنسنے لگی تھی۔ عورت سمجھ گئی تھی اس نے منہ سے چیخ نما آواز نکالی اور اس نے گھوم کر ہمیں دیکھا۔

''مار دیا۔ ان لوگوں نے میرے شوہر کو مار دیا۔''

لوگوں کی نظریں ہم پر جم گئی تھیں۔ پھر وہ جارحانہ انداز میں ہماری طرف بڑھنے لگے۔ اس لمحے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔



میں چونکا تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔ جب کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ دوسرا شخص تھا جو پڑا سورہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ یعنی مجھے سوتے ہوئے چار گھنٹے گزرے تھے۔ اسے نیند کے بجائے غنودگی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ چہرے مہرے سے وہ عرب نژاد لگتا تھا۔ وہ خاصا کم عمر تھا مگر اس کے چہرے پر دنیا جہان کا تجربہ تھا۔ رُخساروں پر ہلکی سی داڑھی تھی جیسے ہفتے بھر سے شیو نہ کی ہو۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ اس نے بگڑی ہوئی انگریزی میں دریافت کیا۔

''کون ہوتم؟'' اس کا لہجہ کچھ فرانسیسی تھا۔ ویسے بھی عرب لہجے کے لحاظ سے فرانسیسی لگتے ہیں۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''انسان ہوں اور تم کون ہو؟''

وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت جھلکنے لگے۔ ''انسان تو میں بھی ہوں۔''

''پھر تو ہماری خوب گز ے گی۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے یوسف علی خان کہتے ہیں۔''

''عبید صلاح۔'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''مسلمان ہو؟''

''ظاہر ہے۔'' میں مسکرایا۔

''لیکن تمہارا رنگ روپ تو ان سؤروں جیسا ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے یورپ والوں جیسا۔''

''میرا تعلق پاکستان سے ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا اور پھر سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا تعلق اصل میں کہاں سے تھا۔

''پاکستانی۔'' اس بار اس نے زیادہ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا تعلق امارات سے ہے۔ میرا قبیلہ شام سے آیا تھا۔''

گویا میرا اندازہ درست تھا۔ عربوں میں سب سے خوب صورت نقوش شامی اور فلسطینی





عربوں کے ہوتے ہیں۔ لبنانی بھی ان ہی کی نسل سے ہوتے ہیں اور ایک زمانے میں بیروت مشرق کا پیرس ہوا کرتا تھا۔ جس کی راتیں پری چہروں کے جلوؤں میں جاگا کرتی تھیں۔ عبید صلاح کا تعلق اس سرزمین سے تھا۔ اس کے سبک نقوش اس بات کی گواہی دیتے تھے۔

''تم بھی قیدی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''اپنی خوشی سے کون قید ہوتا ہے۔''

''کس چکر میں پکڑے گئے؟''

''چکر تو بڑا طویل ہے۔'' اس نے طویل سانس لی۔ ''مگر فی الوقت میں ان کے ہاتھ آگیا اس لیے پکڑا گیا۔ یہ لوگ عرصے سے میری تلاش میں تھے۔''

''تمہارا جرم کیا ہے؟''

''جرم تو نہیں تم اسے خواہش کہہ سکتے ہو آزاد رہنے کی خواہش جو اس کے علم برداروں کو برداشت نہیں ہے۔''

''تم فلسطینی حریت پسند ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں صرف حریت پسند ہوں۔''

اس کے بعد کیبن میں خاموشی چھا گئی۔ پورٹ ہول سے سمندر کی آواز آرہی تھی۔ کبھی کبھی انسانوں کی آوازیں بھی آتی تھیں لیکن ان سب پر ایک مدھم مگر مسلسل گونجتی آواز غالب تھی۔ یعنی انجن کی آواز اس بوٹ کا انجن خاصا طاقتور محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی بوٹ کم سے کم بیس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ میں جان گرے اور ان قزاقوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بحیرہ عرب جیسی مصروف تجارتی شاہراہ پر یہ لوگ اتنے بے دھڑک ہو کر قزاقی کر رہے تھے۔ اتنی دیدہ دلیری تو سپر ہائی وے پر ڈاکو حضرات بھی نہیں دکھاتے۔

آج کے دور میں بحری قزاقی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے سدِباب اور بحری شاہراہوں کو محفوظ بنانے کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ کام کرتا ہے جو انٹرپول کا ایک حصہ ہے۔ اسے آپ بحری پولیس بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو مصروف بین الاقوامی سمندری راستوں کی نگرانی کرتی ہے۔ بحری قزاقی کے انسداد کے لیے نہایت سخت قوانین ہیں۔ قزاقوں کے لیے لوٹا جانے والا سامان بھی ٹھکانے لگانا آسان نہیں ہوتا اور بڑے بحری جہازوں کو لوٹنا بھی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ شپنگ کمپنیاں، صنعتی ادارے اور تجارتی ادارے زیادہ تر ملٹی پل کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔ جو عالمی طور پر بے حد اثر ورسوخ رکھتی ہیں۔ اگر قزاق ان کو نقصان پہنچائیں تو یہ اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت نہیں کرتی ہیں۔ ان کے اشارے پر بڑی طاقتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ قزاقوں کا گروہ بے حد طاقتور تھا۔ ان کی طاقت کا اظہار اس بوٹ سے بھی ہوتا تھا۔ اسے بنوانا کسی عام فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس بوٹ پر مہلک

ہتھیار بھی ہوں گے۔ جیسے اینٹی شپ میزائل، یہ گروہ اتنا جرأت مند تھا کہ دھڑلے سے لوٹا ہوا سامان کسی عالمی منڈی میں فروخت کرتا ہوگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ صرف بحری قزاقی تک محدود نہیں تھا۔ اس گروہ میں جان گرے جیسے افراد کی موجودگی بتا رہی تھی کہ اس گروہ کے مقاصد در پردہ اور ہی تھے۔ میں نے گزشتہ چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ صبح جو شخص مجھے یہاں چھوڑنے آیا تھا اس نے نو بجے ناشتہ ملنے کی نوید سنائی تھی لیکن جب ناشتہ آیا ہوگا تو میں سو رہا ہوں گا۔ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ دوپہر ہو چکی تھی لیکن لنچ کا نام و نشان نہیں تھا۔

"یہاں کھانے پینے کا کوئی رواج نہیں ہے۔" میں نے عبید سے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ "ہم قیدی ہیں اور جیل کا مینول قیدی کی مرضی سے نہیں بنتا۔ اگر ان کا موڈ ہوگا تو لنچ آ جائے گا۔ ورنہ رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

دروازے پر کھٹکا ہوا اور دروازہ کھلا۔ اندر آنے والے کے ہاتھ میں ایک عدد ٹرے تھی۔ جس میں رکھے پیالوں میں اُبلے ہوئے چاول تھے۔ ساتھ ہی اُبلی ہوئی مچھلی کے قتلے تھے۔ عبید نے کہا۔

"چلو تمہاری دعا تو پوری ہوئی۔"

وہ صبح ناشتہ کر چکا تھا اور اس نے لنچ میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ بھوک کے باوجود میں نے بدمزہ اُبلے چاول اور مچھلی حلق سے اُتاری تھی اور وہ سب صاف کر گیا تھا۔ اس نے ایک ڈکار لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔ "کمبخت گھٹیا چاول پکاتے ہیں۔"

"ظاہر ہے قیدیوں کو یہ اچھا چاول تو نہیں کھلائیں گے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بوٹ پر راشن میں یہی چاول ہے۔ سب کو یہی ملتا ہے۔ دراصل بوٹ کا باورچی بیمار ہے اور جس شخص کو قائم مقام باورچی بنایا گیا ہے اسے صرف یہی بنانا آتا ہے۔ جب تک باورچی ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ ہم سب کو اس پر گزارا کرنا پڑے گا۔"

"کیا ہمیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے؟"

اس نے کندھے اُچکائے۔ "کم از کم مجھے نہیں ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ میں سمندر میں کود کر فرار نہ ہو جاؤں۔ میں پہلے بھی ایک بار اسی طرح فرار ہو چکا ہوں۔"

"سمندر کے راستے تمہیں کسی شارک نے نہیں کھایا۔"

"ضرور کھا لیا ہوتا اگر میں تیر کر فرار ہوتا۔ میں نے کیا یہ کہ جہاز میں ایک طرف آگ لگائی اور دوسری طرف سے کشتی لے کر فرار ہو گیا۔"

"یعنی تم کامیاب رہے۔"

"کہاں بھائی۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "ایک گھنٹے بعد میری کشتی کا تیل ختم ہو گیا اور انہوں نے مجھے آرام سے آ پکڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشتی میں ایک ایسا آلہ لگا تھا جو سگنل دے کر اپنی





پوزیشن بتاتا تھا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اگر آلہ نہ ہوتا تو یہ مجھے تلاش نہ کر پاتے اور میں بھوکا پیاسا اللہ کو پیارا ہو جاتا۔" وہ کہتے کہتے چونکا۔ "تم کون ہو اور تمہارا قصور کیا ہے۔"

"میں ایک شپ ایس ایس خلیج پر چیف انجینئر ہوں اور قصور میرا خاصا سنگین ہے۔ میں نے ایک حرامی قسم کے گورے کا تخریب کاری کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس بات پر چراغ پا ہوگا۔ اتفاق سے وہ کشتی پر موجود ہے وہی مجھے گرفتار کر کے لایا ہے۔"

"تم جان گرے کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟" اس نے بہ غور مجھے دیکھا۔

میں چونکا۔ "تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "اس کو تو سمندر کی مچھلی مچھلی جانتی ہے۔ اتنا...... آدمی آج تک سینۂ سمندر پر نہیں آیا ہوگا۔" اس نے جان گرے کو ایک ناقابل اشاعت لفظ سے نوازا۔

"اسے ان قزاقوں کے ساتھ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "یا تو تم احمق ہو یا اس فیلڈ میں نئے آئے ہو۔"

"دوسری بات درست ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میں نے سال بھر پہلے ہی میرین انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی ہے۔"

"اسی وجہ سے تم اس خبیث آدمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ سمندر کا شیطان ہے اور قزاقوں سے اس کے روابط خاصے عرصے سے ہیں۔ یہ ان کے لیے مخبری بھی کرتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے قزاق کامیاب چھاپے مار کر بحری جہازوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

میں دنگ رہ گیا۔ "اور اس کے باوجود اسے بین الاقوامی شپنگ کمپنیوں میں کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔"

"یہ بڑی پیچیدہ سیاست ہے۔" اس نے مختصر سے کیبن میں ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے ڈانڈے بین الاقوامی سیاست سے بین الاقوامی تجارتی سیاست سے جا ملتے ہیں۔ تم کچھ عرصے ان کے ساتھ رہو گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ آکٹوپس ہیں جو رفتہ رفتہ اس سمندر میں اپنے بازو پھیلا رہے ہیں۔"

میں نے غور کیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ان کو عالمی طاقتوں کی مدد حاصل ہے۔"

"ظاہر ہے۔" اس نے شانے ہلائے۔ "اس کے بغیر یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی گن بوٹ تمہارے خیال میں کن ممالک کے شپ یارڈ بنا سکتے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی بوٹ نہیں ہے۔ اس میں سمندر کے اوپر اس کے نیچے اور فضا میں کسی کو بھی نشانہ بنانے کی مکمل صلاحیت ہے۔ اس خطے کی کسی بحری طاقت کے پاس اتنی جدید گن بوٹ نہیں ہے۔ ان کے پاس اس سے بھی بڑے بحری جہاز ہیں۔"

"گویا یہ سمندری مافیا ہوئی۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہماری منزل

کہاں ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔"لیکن میں نے سنا ہے کہ بحر ہند میں ان کے اڈے ہیں۔ جہاں سے نکل کر یہ قزاقی کرتے ہیں لیکن یہ اڈے کہاں ہیں کوئی نہیں جانتا اور اگر جانتا بھی ہے تو زبان نہیں کھولتا۔"

"جیسے تم زبان کھولتے ہوئے ڈر رہے ہو۔" میں نے اسے اُکسایا۔

اس نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔"یہ بات تم نے کہی ہے تم مجھے اچھے لگتے ہو ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ عبید صلاح کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرے قبیلے کے لوگ اس لفظ سے ناآشنا ہیں۔"

"سوری۔" میں نے معذرت کرلی۔"تمہارا دل دُکھا۔"

"بزدلی سے بڑھ کر ہمارے ہاں کوئی گالی نہیں ہے۔" اس نے دوبارہ نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔"میرا باپ قبیلے کا بہادر ترین آدمی تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں اس شیخ سعادت صلاح کی اولاد ہوں۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں باقاعدہ دراز ہو کر سو گیا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے عبید صلاح کی نظر بچا کر اپنا پستول گدے کے نیچے رکھ دیا۔ سونے کے دوران اس کے سامنے آ جانے کا خطرہ تھا۔ سونے کے معاملے میں مَیں ہمیشہ خوش قسمت رہا ہوں۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے منٹوں میں نیند آ جاتی تھی۔ اب بھی میں لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ میرا ساتھی خراٹے لے رہا تھا۔ قید میں اس کا سکون قابلِ رشک تھا۔ کیبن کے ساتھ ہی ایک مختصر سا باتھ روم تھا۔ جہاں بہ مشکل ہی ضروریات سے فارغ ہوا جا سکتا تھا مگر ان حالات میں یہ بھی غنیمت لگتا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا تھا کہ دروازہ کھلا میرا خیال تھا کہ رات کا کھانا آیا ہوگا لیکن اس کے بجائے آنے والے نے اشارے سے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ پینتالیس کا پستول تھا اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ میرے باہر آتے ہی اس نے دروازے کو لاک کر دیا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

میں اس کے آگے چلنے لگا۔ دوسری راہداری سے گزر کر ہم ایک گیلری میں آئے۔ یہ بوٹ کا بائیں طرف کا حصہ تھا جہاں قطار سے کیبن بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے کہا۔"یس۔"

اس نے مجھے اندر چلنے کو کہا۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو وہ میرے پیچھے تھا۔ کیبن خاصا پُرتعیش تھا اور یہاں جان گرے شراب و شباب کے لوازمات کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کا جام تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک سانولی سلونی سی حسینہ تھی۔ اس کا تعلق شاید بنگال سے تھا۔ بلاشبہ اس کی سیاہ آنکھوں اور سیاہ زلفوں میں جادو تھا۔ نقوش عام سے تھے۔ مگر اس کے جامے سے





باہر ہوتا شباب زُہد شکن تھا۔ مجھے دیکھ کر جان گرے نے لڑکی کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ خاصے نشے میں تھی اور نشیلی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"جان یہ ہینڈسم کون ہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"ہنی تم ذرا جا کر عرشے پر ہوا کھا آؤ۔" جان گرے نے پیار سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔"میں یہیں رہوں گی۔"

پوری قوت سے مارا جانے والا تھپڑ لڑکی کے ساتھ میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ لڑکی بستر سے اچھل کر نیچے جا گری تھی۔ جان گرے نے دوبارہ اسی لہجے میں اس سے کہا۔"ہنی میرا خیال ہے اب عرشے پر ہوا کھانا تمہاری طبیعت کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔" ہنی نے خوف زدہ ہو کر اپنے ناکافی لباس کو سمیٹا اور کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جان گرے نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔"بیٹھو مسٹر جوزف۔" اس نے میرے نام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے لانے والا شخص پوری طرح چوکس میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کے مہلک پستول کی نال میرے سر سے کچھ ہی دور تھی۔"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے جام والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔"مسٹر یوسف تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں ساتھ کیوں لایا ہوں؟"

"مجھے اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔"میں تمہارا قیدی ہوں اور میرے بارے میں تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔"اس کے برعکس اگر میں کہوں کہ میرے ارادے تمہارے بارے میں نیک ہیں اور خلیج سے لا کر میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے تو؟"

"میں اسے ماننے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مسٹر یوسف۔" یکلخت وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔"درحقیقت میں نے تمہارے ساتھ نیکی ہی کی ہے۔ ورنہ اس وقت تم سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بن رہے ہوتے۔"

"اس بارے میں بھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ بالآخر میرے بارے میں تمہارا پروگرام کیا ہوگا۔"

وہ ہنسا۔ اس نے اپنے برابر میں پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کا رُخ اس ٹرالی کی طرف کیا۔ جس میں ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا۔ ٹی وی کی سکرین روشن ہوگئی۔ اس میں ایک بحری جہاز کا دھندلا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ اچانک میرا دل دھڑک اٹھا میں نے جہاز کو پہچان لیا تھا۔ یہ خلیج تھا۔ کیمرہ قریب ہونے لگا اور جہاز سکرین پر واضح ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے پہلو میں لکھا ایس ایس خلیج بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔ یکلخت جہاز کے مختلف حصوں میں شعلے بھڑک اٹھے تھے اور اس کے ٹکڑے

فضا میں اُڑ رہے تھے۔ اتنی دور سے آواز ریکارڈ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ورنہ خلیج پر ہونے والے دھاکے بھی سنائی دیتے۔ شاید کیمرہ بحری جہاز سے کئی میل کے فاصلے پر تھا۔

''دیکھا تم نے۔'' جان گرے نے شیطانی انداز میں مسکرایا تھا۔ ''میں نے تمہاری جان بچائی ہے ناں؟''

''تم...... ذلیل انسان۔'' میں کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ پستول کی نال میرے سر سے چپک گئی۔ میں ساکت ہو گیا۔ اس وقت مجھے شدت سے افسوس ہوا کہ میں اپنا پستول کیبن میں کیوں بھول آیا تھا۔ ورنہ نتائج کی پروا کیے بغیر کم از کم جان گرے کا سر ضرور اُڑا دیتا۔ چاہے اس کے بعد خود میری کھوپڑی بھی اُڑ جاتی۔ جان گرے تمسخرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تیس افراد کے اس قتل عام پر اس کے چہرے پر ندامت کا ایک داغ بھی نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود کو ٹھنڈا کیا۔ اس وقت کوئی بھی جذباتی قدم مجھے مسائل سے دوچار کر دیتا۔

''تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

''میں اکثر اچھا نہیں کرتا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے اور اس کی پروا بھی نہیں ہو گی۔''

''تم نے تیس بے گناہ افراد کی جان لی ہے۔ تم قاتل ہو۔'' میں نے زور سے کہا۔

اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھ پر دباؤ مت ڈالو۔ میں ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی بہت سارے لوگ میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔''

''یوں بلاوجہ کسی کی جان لینا۔''

''بلاوجہ نہیں۔'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''ان لوگوں نے میری توہین کی تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

''تم [illegible] کے تیس افراد تمہارے مجرم تھے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''جب ہاتھی لڑتے ہیں تو ان کے پیروں تلے چھوٹے موٹے حشرات الارض پس ہی جایا کرتے ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تو میرا خون کھول اٹھا تھا۔

''اور مجھے کیوں بچایا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا مجرم تو میں ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''تمہیں بچانے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اول تو تم میرے ہم نسل ہو۔ دوسرے تم نے اس جہاز کو تباہی سے بچا کر میرے دل میں جگہ بنا لی ہے۔ میں نے جو گریپ لگایا تھا۔ اس کا توڑ تقریباً ناممکن تھا اور اسے ناکام بنانا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ میں ایسے لوگوں کی عزت کرتا ہوں۔''

''بہ شرط کہ وہ تمہارے ہم نسل ہوں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''بائی دی وے تمہیں یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ میں تمہارا ہم نسل ہوں۔''





وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیا جام بنایا۔ بوتل تقریباً ختم ہو چکی تھی اور یہ ابھی ختم ہوئی تھی تو شراب کے معاملے میں جان گرے کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ وہ نشے میں ضرور تھا لیکن اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''مسٹر یوسف بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور تمہارا پس منظر کیا ہے۔ اس وجہ سے میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ہم نسل ہو۔''

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ ''تم میرے بارے میں جانتے ہو؟''

''ہاں میں نے کہا ناں کہ میں تمہارے پس منظر سے پوری طرح واقف ہوں۔''

اس لمحے میں بھول گیا کہ میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں اور اسے اپنے تیس ساتھیوں کا قاتل سمجھتا ہوں۔ مجھے تو بس یہ یاد رہا کہ وہ میرے بارے میں وہ کچھ جانتا تھا جو میں بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''پلیز مجھے بتاؤ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔''

میرا اضطراب دیکھ کر وہ لطف اندوز ہونے لگا۔ ''جلدی کیا ہے مسٹر یوسف ابھی تم میرے ساتھ ہی ہو۔ جلد تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

میں نے اپنی بے تابی پر قابو پانے کی کوشش کی پھر اس سے بولا۔ ''مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تم نے بحری قزاقی شروع کر دی ہے۔''

اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''اسے بحری قزاقی نہ کہو۔ ہمارا مقصد بلند ہے۔''

''اس قسم کے اکثر کام کرنے والے بلند عزائم ہی رکھتے ہیں۔'' میرے لہجے میں استہزاء تھا۔

''تم نہیں سمجھو گے خیر جلد ہی سب کچھ جان جاؤ گے۔'' اس نے خالی جام برابر میں رکھی تپائی پر رکھا۔

''کیا قزاقوں کا یہ گروہ اس علاقے میں سرگرم ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تم زیادہ ہی سمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' وہ اپنی سانپ جیسی چمکیلی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''تم نے یہی سب کچھ دکھانے اور سنانے کے لیے مجھے بلایا تھا؟''

''اس کی تمہارے نزدیک اہمیت نہیں ہے؟''

میں نے شانے اُچکائے۔ ''میں زیادہ تجسس نہیں کرتا۔''

وہ مسکرایا جیسے میری بات پر شک کر رہا ہو۔ ''میں نے کہا ناں زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش
''

''اوکے میں نے مان لیا۔ میں مارے تجسس کے مرا جا رہا ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہاری گردن دبا کر سب کچھ اُگلوا لوں۔ اگر تمہارا یہ پالتو کتا نہ ہوتا تو شاید میں یہی کرتا۔''

میرے خطاب پر پستول بردار کا کان سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے غرا کر میری طرف دیکھا لیکن وہ سچ مچ پالتو تھا۔ اپنے مالک کی مرضی کے بغیر وہ دُم بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ جان گرے نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہوگیا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"یہ مت بھولو کہ تم ایک قیدی ہو۔"

"میں تو نہیں شاید تم یہ بات بھول گئے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"شٹ اَپ۔" جان گرے صبر کھو بیٹھا۔ "اسے لے جاؤ۔" اس نے گارڈ سے کہا۔

گارڈ نے اپنا بدلہ یوں نکالا کہ کیبن میں مجھے دھکا دے کر پہنچایا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسے یہ کام کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرنا پڑی تھی۔ زیر لب بک بک کرتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا دل ان لوگوں کے بارے میں سوچ کر دُکھنے لگا تھا۔ جو ایک جنونی انسان کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئے تھے جان گرے نے کتنی سفاکی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میرے جبڑے بھنچ گئے تھے اور سینے کے اندر کوئی چیز سلگنے لگی تھی۔

"کیا بات ہے دوست۔" عبید صلاح نے بہ غور مجھے دیکھا۔ "کیا کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ اگر میری خدمات چاہئیں تو میں حاضر ہوں اور اگر یہ چاہیے تو......" اس نے میرا ہی پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔

"تم نے میرے جانے کے بعد میرے بستر کی تلاشی لی تھی۔" میں نے اسے گھورا۔

"نہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "جب تم اسے بستر تلے چھپا رہے تھے تب ہی میں نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن میں دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ صرف تجسس کی وجہ سے نکال لیا تھا۔ اس وجہ سے تمہیں واپس کر دیا۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ..."

"کہ میں اس کے ہوتے ہوئے بھی یوں قید کیوں بیٹھا ہوں۔" میں مسکرایا۔

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اگر میرے پاس یہ پستول ہوتا تو میں اب تک کچھ نہ کچھ کر چکا ہوتا۔"

"ایک بات بتاؤ کہ تم نے ہاتھ میں آنے کے باوجود اسے واپس کیوں کر دیا؟"

"میں اپنے زورِ بازو کا قائل ہوں۔" اس نے کہا۔

"اتفاق سے میں بھی اس بات کا قائل ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ساتھ ہی میں دماغ ٹھنڈا بھی رکھتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنا دماغ ٹھنڈا نہیں رکھتا تو اسے کوئی چوہا بھی شکست دے سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے حسن علی یاد آ گیا۔

"ہمارے پاس دماغ ہی نہیں ہوتا۔" عبید صلاح نے بے پروائی سے کہا۔ "ہم تو مارو یا مر جاؤ کے قائل ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے تم نے پستول مجھے واپس کر دیا۔" میں نے بے اختیار کہا۔ "ورنہ تم اپنے





ساتھ مجھے بھی مروا دیتے۔"

"میں کبھی کسی کی پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپتا۔"

"تم نے بتایا نہیں دوست کہ تم کس چکر میں یہاں ہو۔ ان سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "چکر بڑا لمبا ہے لیکن مختصراً اتنا بتا دوں کہ جان گرے میرے باپ کا قاتل ہے۔ یواےای میں جب وہ آئل کمپنی میں کام کر رہا تھا اور اس بدفطرت شخص نے ایک رات ایک کنویں میں آگ لگا دی تھی تو وہاں میرا باپ بھی موجود تھا۔ وہ آگ بجھانے کی کوشش میں جان سے گزر گیا تھا اور یہ کمینہ بچ نکلا تھا۔ اس کے خلاف تحقیقات ہوئی تھیں لیکن یہ عدالت سے بچ نکلا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے باپ کا قاتل یہی ہے اور مجھے جب موقع ملا اسے کتے کی موت مار دوں گا۔"

"جان گرے کی تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی؟"

"کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ایک روز اس نے سب عربوں کو گالی دی تھی۔ اس پر میرے باپ نے مشتعل ہو کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ وہ اس زخم کو نہیں بھولا تھا۔ ایک رات جب تیل کا وہ کنواں جہاں میرا باپ انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ صفائی کے لیے بند تھا۔ یہ کسی بہانے عین دھماکے کے وقت وہاں سے کھسک گیا اور اس کے جاتے ہی کنویں میں دھماکے سے آگ لگ گئی تھی۔ میرا باپ اس وقت تو بچ گیا لیکن واپس آ کر جان گرے نے میرے باپ کو آگ بجھانے کے آلات متحرک کرنے کے لیے کنویں کے پاس بھیج دیا۔ وہ اس سازش کو نہ سمجھ سکا۔ جیسے ہی جلتے کنویں کے پاس پہنچا دوسرے دھماکے نے آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا اور میرا باپ بُری طرح جھلس گیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے مجھے یقین سے بتایا تھا کہ کنویں کو کسی سازش کے تحت تباہ کیا گیا تھا کیونکہ بند کنویں میں اس طرح آگ نہیں لگ سکتی ہے اور یہ سازش جان گرے نے کی تھی۔ اس کا مقصد میرے باپ کو مارنے کے ساتھ کمپنی کا نقصان بھی کرنا تھا۔"

"یہ جان گرے بچ کیسے نکلا؟"

"بس قسمت تھی؟" اس نے سرد آہ بھری۔ "میں نے کوشش کی تھی لیکن گولی اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے بعد جو یہ بزدل بھاگا تو اگلے دو سال تک اس کا کوئی سراغ ہی نہیں ملا مگر میں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ حیرت انگیز طور پر یہ اکثر ساحلی عرب ریاستوں میں نظر آتا تھا اور اس کا ملنا جلنا ان لوگوں سے تھا۔ کئی بار یہ سمندر میں بحری جہازوں اور کشتیوں پر نظر آیا۔ میرا جذبہ تجسس انتقام پر غالب آنے لگا اور میں اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح اس اسرار سے پردہ اٹھاؤں۔"

"اور پھر تم یہاں آ پھنسے؟"

"نہیں...... پھنسا تو میں پہلے تھا۔ میں جان گرے کی تاک میں تھا اور اس کے آدمیوں نے مجھے میرے دو دوستوں سمیت اغوا کر لیا۔ ہمیں عمان میں ایک صحرائی مکان میں قید رکھا گیا تھا۔ جان

گرے وہاں مجھ سے ملنے آ رہا تھا۔ اس مکان میں ہم پر کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ اس مکان میں ایک صحرائی بدو جوان کا ملازم تھا۔ دراصل ان سے منحرف ہو گیا تھا۔ اسے ہم سے ملنے کا موقع ملا تو اس نے بتایا کہ جان گرے کا تعلق ایک مافیا ٹائپ کی تنظیم سے ہے جو علاقے میں مخصوص مفادات کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس کا مقصد مقامی عرب اور مسلمان ریاستوں کو کمزور بنانا ہے۔ پھر اس بدو نے ہمیں وہاں سے نکل بھاگنے میں مدد کی لیکن ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ جان گرے اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ اپنے ساتھ نیم مردہ حالت میں بدو کو بھی لائے تھے۔ اسے انہوں نے ہمارے سامنے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد مقابلے میں میرے دونوں دوست بھی مارے گئے۔ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس حالت میں کہ میرے جسم میں دو گولیاں لگی ہوئی تھیں۔''

''پھر تم بچے کیسے؟'' میں نے کہا۔

''بس خدا کی قدرت کہہ لو۔ اسے میری زندگی مقصود تھی۔ جان گرے اور اس کے ساتھی شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں تھے کہ اچانک صحرائی ٹڈی دل نے حملہ کر دیا۔ یہ کیڑے بادل کی طرح آئے اور ہر طرف چھا گئے۔ جانداروں کے لیے یہ خطرناک نہیں ہوتے۔ ہاں نباتات کو بالکل نہیں چھوڑتے۔ جان گرے اور اس کے بزدل ساتھی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ میرا تعاقب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حالانکہ میں ان سے بہ مشکل سو گز دور ایک ٹیلے کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ خون بہہ جانے سے میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ آگے جانے کے بجائے میں وہیں لیٹ گیا۔ میری خوش قسمتی کہ رات کو اس طرف سے خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گزر رہا تھا۔ ان کے کتوں نے میرے خون کی بُو سونگھ لی۔ قبیلے والے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گولی کے زخموں کا یہ بہت اچھا علاج کرتے ہیں۔ کیونکہ ان جنگ پسند قبیلوں کو آئے دن اس قسم کے زخموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ایک ہفتے بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو انہوں نے مجھے ایک اونٹ اور زادِ راہ دے رخصت کیا تھا۔ تیسرے دن میں واپس اپنے گھر پہنچ گیا تھا جب کہ گھر والے مجھے مردہ تصور کر چکے تھے۔ اس کے بعد سے ہم دونوں میں آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے۔''

''تم اس بوٹ تک کیسے پہنچے؟''

''اس بات کا سراغ بڑی مشکل سے ملا کہ خلیج کے پانیوں میں اکثر نظر آنے والی یہ بوٹ دراصل اس مافیا کی ہے جان گرے جس کے لیے کام کرتا ہے۔ میں اور میرے کچھ ہم خیال دوست اس کے خلاف میدان میں اُتر آئے تھے۔ اگرچہ ہم ان کے مقابلے میں وسائل سے محروم ہی تھے لیکن ہمارے اندر ایک جذبہ تھا۔ میرے ایک دوست نے کسی ذریعے سے معلوم کیا کہ یہ بوٹ اکثر بحری قزاقی میں استعمال ہوتی ہے۔ حکومت سے شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ علاقے میں کسی ملک کی بحریہ سوائے ایران کے اتنی طاقتور نہیں ہے کہ ان قزاقوں کا سدِ باب کر سکے لیکن ایران کو





سوائے اپنی سمندری حدود سے آگے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حالانکہ ایران کے تجارتی جہاز بھی ان کا نشانہ بنتے ہیں۔''

''انٹرپول ان کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔''

''انٹرپول۔'' عبید صلاح ہنسا۔ ''یہ مافیا جن لوگوں کے لیے کام کرتی ہے۔ اتفاق سے انٹرپول بھی ان ہی لوگوں کے لیے کام کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک دوسرے کے مخالف کیسے ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس مصروف سمندر میں انٹرپول کا گشت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کا سارا زور بحرہ روم اور بحرہ اوقیانوس پر ہوتا ہے کیونکہ وہ سمندر مغرب کے تجارتی مفادات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''یعنی یہ گروہ عالمی طاقتوں کے مفاد کے لیے کام کر رہا ہے؟''

عبید صلاح نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ تالا کھلا اور ناشتہ لانے والا رات کا کھانا لے کر اندر آیا۔ یہ دُبلا پتلا گہرے سانولے رنگ کا لڑکا شاید سری لنکن تھا۔ اس نے ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔ مینو وہی تھا۔ یعنی اُبلے ہوئے چاول اور مچھلی، نمک اور مرچ کے بغیر بالکل پھیکے میں نے دوپہر کو بھی یہ چاول اور مچھلی بہ مشکل ہی کھائی تھی پھر کپتان صلاح دین اور عملے کے دیگر افراد کی موت کی خبر نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اس پر میرے حصے کا بھی عبید صلاح چٹ کر گیا تھا۔ اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کمینے لوگ ہیں کبھی دل نہیں کرتا تو پورا پورا دن کھانا نہیں دیتے۔ لہٰذا جب کھانا ملے بلا تکلف کھا لو چاہے جیسا بھی ہو۔''

میں نے عبید صلاح کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ مجھے احمد علی یاد آ رہا تھا جو بھوک کا بہت کچا تھا۔ جس کا بڑا سا کنبہ تھا اور وہ اس کا واحد کفیل تھا۔ اس کی ماں اور بہن بھائی ساری عمر اس کی راہ تکتے رہیں گے۔ مجھے گپتا یاد آ رہا تھا۔ ہنسی مذاق کرنے والا سب کا دوست، اس کی بیوی ایک بار پھر ماں بن رہی تھی اور اس کا بدنصیب بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی یتیم ہو گیا تھا۔ عراقی معاذ حسین جو تنک مزاج اور کھردرا تھا لیکن اسے اپنے شپ سے پیار تھا۔ وہ ہر وقت اس کے لیے فکرمند رہا کرتا تھا۔ غالباً سمندر میں دونوں ساتھ ہی ساتھ تھے۔

کھانا کھا کر عبید صلاح پیر پھیلا کر خراٹے لینے لگا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر پورٹ ہول سے باہر جھانکا۔ سمندر رات کی تاریکی میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے انجن کی گنگناہٹ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس کی رفتار سُست ہو رہی تھی کچھ دیر بعد واضح ہو گیا تھا کہ بوٹ کی رفتار مسلسل سُست ہو رہی تھی۔ کیا کوئی منزل آ گئی تھی؟ میں نے سوچا اور پورٹ ہول سے باہر جھانکنے کی پوری کوشش کی۔ محض چھ انچ کے اس پورٹ ہول سے میں سر بھی باہر نہیں نکال سکتا تھا لیکن بستر پر کھڑے ہو کر میں اس قابل تھا کہ کسی حد تک اس کے دائیں بائیں نظر دوڑا سکوں۔ باہر

عرشے پر بھاگ دوڑ محسوس کی جا سکتی تھی۔ معاً بوٹ ذرا سی ڈگمگائی اور میں نے سمندر میں ذرا دور ایک سیاہ لکیر دیکھی۔ کیا یہ کوئی جزیرہ تھا یا محض میرا واہمہ؟

اب بحری جہاز خاصی سُست روی سے بلکہ پھونک پھونک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے اگلے عرشے پر نصب سرچ لائٹیں آن کر دی گئی تھیں۔ جن کا اجالا منعکس ہو کر یہاں تک آ رہا تھا۔ باہر لہریں بڑی ہو گئی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کسی ساحل کے نزدیک تھے۔ جہاں سمندر کے کنارے چٹانیں تھیں۔ اس قسم کا ساحل جو کسی قدر ہلالی شکل کا ہو وہاں بڑی لہریں اٹھتی ہیں۔ یہاں زیرِ آب چٹانوں کی موجودگی عین ممکن تھی شاید اس بنا پر بحری جہاز کو نہایت احتیاط سے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیا یہاں کوئی ایسی بندرگاہ تھی جو اس چھوٹے بحری جہاز کو سنبھال سکے اس کا وزن کم سے کم پانچ سوٹن تھا۔

ساحل کی لکیر اب مجھے بغیر کسی دقت کے نظر آ رہی تھی میرے اندازے کے عین مطابق یہ طویل فاصلے تک پھیلا ہوا پتھریلا ساحل تھا۔ جس کے کنارے خاصی بلند چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا۔ معاً بحری جہاز نے عجیب سی حرکت کی۔ وہ گھوم گیا جیسے ساحل کے متوازی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب ساحل پوری طرح میرے سامنے تھا۔ اس کا گھماؤ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ شاید یہ جزیرہ تھا۔ بحری جہاز شاید فٹ فٹ کر کے آگے کھسک رہا تھا اور جب وہ دو چٹانوں کے درمیان سے گزرا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ ان چٹانوں کے درمیان اتنا خلا تھا کہ جہاز ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہوتا تو چٹانوں سے ٹکرا جاتا۔ ان کے درمیان سے اس جہاز کو گزارنا بلاشبہ مہارت کا کام تھا۔ اب جہاز ایک مختصری خلیج میں تھا۔ جہاں پانی بالکل پُرسکون تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ باقی سمندر سے الگ تھی۔ شاید چاروں طرف سے گھری ہوئی اور اس میں داخلے کا راستہ صرف وہی تھا جہاں سے بحری جہاز گزر کر اندر داخل ہوا تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ جہاز ایک بار پھر سُست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تاریکی شدید ہو گئی تھی۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر بادل آنے سے تاروں کی معمولی سی روشنی بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں پورٹ ہول سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جہاز کی روشنیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ جہاز تو رُک گیا تھا معاً ایک جھٹکا سا لگا تھا اور اس نے ایک اور غیر معمولی حرکت کی یعنی آگے یا پیچھے جانے کے بجائے دائیں طرف جانے لگا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جہاز اس قسم کی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ چند لمحے بعد میری سمجھ میں آ گیا کہ جہاز کو کسی قسم کے مکینزم کی مدد سے کھینچا جا رہا تھا۔ دنیا کی بعض مختصری بندرگاہوں میں اس قسم کے مکینزم ہوتے ہیں جن کی مدد سے بحری جہازوں کو بندرگاہ لایا یا نکالا جاتا ہے۔

جہاز کیونکہ بائیں سمت میں کھینچا جا رہا تھا۔ اس لیے میں دیکھ نہیں سکا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ اچانک جہاز ایک دھچکے سے رُک گیا۔ تاریکی کا احساس شدید ہو گیا تھا جیسے ہم کسی بند جگہ پر آ





گئے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی باہر چہل پہل کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ساتھ ہی سامان رکھنے اٹھانے اور گھسیٹنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں واپس آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بوٹ نے جنوب مغرب کی سمت کوئی بیس گھنٹے مسلسل سفر کیا تھا اور اس کی رفتار بیس ناٹ فی گھنٹہ رہی تھی گویا ہم کوئی چار سو میل کے فاصلے پر آ چکے تھے۔ جہاں خلیج کو طوفان کے دوران میں لنگر انداز کیا گیا تھا۔ وہ جگہ بمبئی سے کوئی ڈیڑھ سو ناٹ کے فاصلے پر جنوب مغرب میں تھی۔ گویا یہ جگہ سعودی عرب کے شمال مشرقی ساحل کے آس پاس تھی۔ ممکنہ طور پر کوئی جزیرہ تھا اگر یہ ان بحری قزاقوں کا مرکز تھا تو خاصی تعجب کی بات تھی۔ وہ ایک بین الاقوامی بحری شاہراہ کے خاصے نزدیک تھے۔ جو ایران، برصغیر اور عرب ممالک کو افریقہ اور بحیرہ قلزم سے ملاتی تھی۔ ان کی دیدہ دلیری حیرت انگیز تھی۔

رات بھر جاگنے کے بعد مجھے اونگھ آ رہی تھی لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کب کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔ میں چوکنا رہنا چاہتا تھا تا کہ بے خبری میں نہ مارا جاؤں۔ میں نے پستول کو اپنی یونیفارم میں پتلون میں قمیص کے نیچے سے نکال کر دائیں پیر کے موزے میں اڑس لیا تھا۔ تلاشی کے دوران یہاں اس کے چھن جانے کے امکانات کم تھے۔ مجھے یہ بھی تعجب تھا کہ اس بوٹ پر کسی نے میری تلاشی لینے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی اور پستول اب تک میرے پاس تھا اگر موقع ملتا تو میں نو افراد کو جہنم رسید کر سکتا تھا۔ جن میں سرفہرست جان گرے کا نام نامی ہوتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں نو افراد کو مار کر بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو وہ مجھے فرار ہونے ہی نہ دیتے اور اگر کسی طرح میں کشتی سے نکل بھی جاتا تو آگے سمندر میں کہاں جاتا۔ فی الوقت میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔ مستقبل میرے لیے نہ جانے کیا لانے والا تھا۔ مجھے شاید اونگھ آ گئی تھی جب کھٹکے نے مجھے چونکایا تھا۔

دروازے پر رات والا گارڈ کھڑا خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”اٹھ جاؤ۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”تم لوگوں کے فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ اٹھاؤ اس لاٹ صاحب کو۔“

”میں جاگ رہا ہوں۔“ عبید صلاح نے اُچھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کالے منہ والا بندر کیا بکواس کر رہا ہے۔“

اس خطاب پر حبشی گارڈ نے خون خوار نظروں سے اسے دیکھا۔ ”بہت چہک رہے ہو۔ ابھی ساری بکواس نکل جائے گی۔“

”اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے عبید صلاح کو سمجھایا۔ ”میرا خیال ہے یہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔“

اس نے منہ بنایا۔ ”میں انہیں کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جو اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر بھونکتے اور کاٹتے ہیں۔“

سیاہ فام گارڈ نے اپنا لیوگر پسٹل عبید صلاح کی طرف سیدھا کیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”لگتا

ہے تم ابھی مرنا چاہتے ہو۔ مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔"

مجھے اس کے انداز سے لگا کہ وہ سچ مچ گولی چلا دے گا اور عبید صلاح مارا جائے گا جو بے خوفی سے اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔ "خاموش رہو۔ یہ اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہے۔ دنیا میں ہر فرد مجبور ہے۔"

میری بات نے گارڈ کے تنے اعصاب کو کسی قدر ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ قاتل لمحہ گزر گیا۔ جب وہ ٹریگر دبا کر عبید صلاح کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا لیکن اس کے غصے میں کمی نہیں آئی تھی۔ کینہ پروری میں وہ کسی طرح جان گرے سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف جلد کی رنگت کا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا تھا۔ اس نے ہمیں باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ خاص قسم کے لچکدار میٹریل سے بنی یہ ہتھکڑیاں مضبوطی کے معاملے میں فولاد سے کم نہیں تھیں۔ کسی بھی انسان کے لیے انہیں توڑنا تقریباً ناممکن تھا۔

باہر دن نکل چکا تھا۔ ہم عرشے پر آئے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور اس برتھ کی ساخت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ جس کے کنارے کاٹ کر برتھ بنائی گئی تھی۔ یہاں پر پانی اتنا گہرا تھا کہ اتنی بڑی کشتی آرام سے لنگر انداز ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس میں کئی بڑے بحری جہاز آسانی سے آسکتے تھے۔ برتھ اتنی طویل تھی کہ اس پر اس جیسی کئی کشتیاں لنگر انداز ہو سکتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے سامنے پانی اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا کہ کوئی بھی بڑی جسامت کی کشتی از خود لنگر انداز ہو سکتی۔ اس کے لیے میکنزم کا طریقہ اپنایا گیا تھا۔ کوئی بھی بحری جہاز اس کی مدد سے کھینچ کر برتھ تک لایا جا سکتا تھا اور اس میکنزم کی مدد سے اسے باہر بھی نکالا جا سکتا تھا۔ سب سے حیرت انگیز چیز برتھ کے اوپر کی چٹان تھی جو کسی چھجے کی طرح تقریباً بیس پچیس گز اونچی تھی۔ اس چھت نے اس مختصر سی بندرگاہ کو بالکل چھپا دیا تھا۔ فضا سے اس کا دیکھ لیا جانا قطعی ناممکن تھا اور سمندر سے بھی اسے صرف اس وقت دیکھا جا سکتا تھا جب دیکھنے والا خلیج میں موجود ہو۔ کھلے سمندر سے نظارے میں درمیان میں بلند چٹانیں آجاتی تھیں جنہوں نے چاروں طرف سے خلیج کو گھیر رکھا تھا۔

برتھ پر اس جیسی دو اور کشتیاں موجود تھیں اور وہاں خاصی رونق تھی۔ نیلی وردیوں میں ملبوس کارکن مختلف کاموں میں مصروف تھے اور ہر کارکن کے سینے پر ایک کارڈ لگا تھا جس میں اس کی تصویر اور نام وغیرہ تھا۔ غالباً اس کا مقصد کسی اجنبی شخص کو اس جگہ آنے سے روکنا تھا۔ کچھ افراد دیگر رنگ کی وردیوں میں تھے۔ یہ شاید اعلیٰ عہدیدار تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ سارے ہی سفید فام تھے۔ جبکہ نیلی وردی میں اکثر افراد رنگ دار لوگ تھے۔ مسلح گارڈز جو سبز رنگ کی وردیوں میں تھے اور کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ البتہ سفر کے دوران انہوں نے عام کپڑے پہن رکھے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہاں کوئی بھی فرد سادہ لباس میں نہیں تھا۔ میرے اور عبید صلاح کے علاوہ۔

"نیچے اُترو۔" سیاہ فام گارڈ نے کہا۔





قریب سے دیکھنے پر میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ برتھ قدرتی نہیں تھی بلکہ اسے چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا ممکن ہے اوپر بنا قدرتی چھجا اتنا بڑا نہ ہو لیکن برتھ کے لیے چٹانوں کو کاٹنے کے بعد یہ از خود بڑا ہو گیا تھا۔ پتھر کاٹ کر صرف برتھ ہی نہیں بلکہ اندر ہال بھی بنائے گئے تھے جو مختلف کاموں کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ برتھ پر کئی کرینیں نصب تھیں جو سامان اُتارنے چڑھانے کا کام کر رہی تھیں۔ ہم کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ جن سے بُو اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں شراب تھی۔ یہ شاید اِردگرد کے ممالک کو اسمگل کی جاتی ہوگی کیونکہ سوائے بھارت اور سری لنکا کے اس خطے کے کسی ملک میں شراب کی آزادی نہیں تھی۔ لامحالہ یہ سمگل ہو کر وہاں جاتی ہے۔ اس سے ذرا آگے اس سامان کا ڈھیر لگا تھا جو خلیج سے طاقت کے زور پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس سامان کے لیے تیس افراد اپنی جان سے گئے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ جان گرے نے انہیں صرف انتقام لینے کے لیے ہلاک کیا تھا بلکہ خلیج کی تباہی کی اصل وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی قزاقی چھپی رہے۔ کپتان صلاح الدین اور جان گرے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ تاثر بھی ملتا تھا کہ اس خطے میں سفر کرنے والے بحری جہازوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ان قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے رہے تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر لٹنے والے بحری جہاز اور ان کی کمپنیاں ان واقعات کی رپورٹ نہیں کرتی تھیں۔

برتھ سے اُتر کر ہم ایک پکے راستے سے گزرتے ہوئے ایک ہال تک پہنچے۔ یہ سب اس چٹانی سلسلے کے اندر تھا جو کسی بڑی پہاڑی کا ایک حصہ تھا لیکن اس طرف سے اس کی وسعت یا گہرائی کے بارے میں اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان چٹانوں کے عقب میں کیا تھا۔ ہال میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ سب چھوٹی ساخت کی جیپیں تھیں۔ ہر جیپ پر چار افراد سفر کر سکتے تھے۔ مجھے اور عبید صلاح کو ایک جیپ پر سوار ہونے کو کہا گیا۔ جب ہم اس کے عقبی حصے میں بیٹھے تو ہمارے ہاتھ میں لگی ہتھکڑیوں کو جیپ کے لگے ہکوں میں لاک کر دیا گیا۔ غالباً اس بناء پر کہ ہم راستے میں کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ ہال کے دوسرے سرے پر سرنگ جا رہی تھی۔ ابھی ہم روانہ ہو رہے تھے کہ اس سرنگ سے ایسی ہی ایک جیپ نکلی۔ گویا یہ سرنگ ٹریفک کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔

جیپ چھوٹی ہونے کے باوجود طاقتور اور برق رفتار تھی۔ سرنگ چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ دو جیپیں آرام سے پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں۔ اندر ہی دس گز کے فاصلے پر دیواروں کے ساتھ طاقتور لائٹس نصب تھیں۔ ان کی روشنی میں سرنگ کا ایک ایک حصہ واضح نظر آ رہا تھا۔ اندر گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس میں تازہ ہوا کی آمدورفت کا خیال رکھا گیا تھا۔ سرنگ کوئی میل بھر لمبی تھی اور ہم پانچ منٹ بعد اس کے دوسرے سرے تک جا پہنچے تھے۔ یہ کوئی وسیع غار تھا جسے مناسب ردوبدل کے بعد ہال کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہاں نہ صرف جیپوں کی

پارکنگ کا نظام تھا بلکہ ایک طرف ورکشاپ اور پٹرول بھرنے والا پمپ بھی موجود تھا۔

جیپ سے اُتار کر ہمیں پیدل ہال یا غار کے باہر لایا گیا تھا اور میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا پہلی بار مجھے اس خفیہ بندرگاہ نے حیران کیا تھا تو دوسری بار مجھے چٹانوں کے دوسری طرف کے نظاروں نے حیران کر دیا تھا۔ ہم بلند پہاڑی کے اوپری حصے میں کھڑے تھے۔ یہاں مجھے درست طور پر معلوم ہو گیا کہ ہم ایک جزیرے پر ہی تھے کئی سمتوں میں بعید فاصلے پر سمندر اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ ہم سطحِ سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سرنگ اس قدر بلندی پر جا کر نکلے گی۔ یہ شاید سرنگ کی ساخت کا کمال تھا کہ مجھے جیپ کی بلندی کی طرف جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

نیچے کا منظر اتنا سحر انگیز تھا کہ آدمی کھو کر رہ جائے۔ اس طرف بے حد گھنا جنگل تھا۔ جس میں بے شمار اقسام کے بلند و بالا درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان درختوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جنگل کے درمیانی حصے میں ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس طرف پانی کا کوئی ذخیرہ تھا جس سے صبح سویرے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جنگل کے بعد سرسبز پٹی کے ساتھ بے شمار مکانات نظر آ رہے تھے۔ اتنی دور سے یہ کھلونوں جیسے لگ رہے تھے آبادی کا یہ سلسلہ ساحل سے تھوڑا دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا بھلا قصبہ تھا۔ سیاہ فام گارڈ نے کہا۔

"کھڑے کیوں ہو چلو۔"

"پیدل؟" عبید صلاح نے فکر سے کہا۔

"نہیں تمہارے لیے رولز رائس آئے گی۔" گارڈ نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "پیدل چلو لارڈ کی اولاد۔"

"چلو۔" عبید صلاح نے شانے اُچکائے۔ "لیکن راستے میں مَیں بھاگ نکلا تو شکوہ مت کرینا۔"

میں اس بات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اس حالت میں بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا جبکہ اس کے چاروں طرف اس کے خون کے پیاسے دشمن تھے اور نہ بچنے کی کوئی راہ نظر آتی تھی اور نہ فرار کی ترکیب ہم نے اس مختصر سی سڑک پر مارچ شروع کر دیا جس کے کنارے گھنے اور بلند درخت اُگے ہوئے تھے۔ جو جگہ درختوں سے بچ گئی تھی۔ وہاں رنگ برنگ پھولوں کے پودے تھے۔ درختوں پر متعدد پرندے چہک رہے تھے لیکن مجھے کوئی جانور نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک خرگوش نما جانور کے جو بلی سے ذرا ہی بڑا تھا۔ سڑک کے اطراف میں کچی زمین سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ فضا میں کسی قدر حبس اور گرمی تھی۔ اندازہ تھا کہ دن بڑھنے کے ساتھ ساتھ گرمی میں اضافہ ہوگا۔ گویا یہ جزیرہ خطِ استوا کے علاقے میں ہو سکتا تھا لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ سعودی عرب کے شمال مشرقی ساحل کے آس پاس پایا جاتا ہوگا۔ اس خطے میں بھی گرمی اور حبس ہوتا تھا لیکن یہاں بارشوں





کا اوسط کم تھا۔ جب کہ اس جزیرے کے اس ترو تازہ جنگل کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا یہاں باقاعدگی سے بارش ہوتی ہوگی۔ اس قسم کی آب و ہوا، افریقہ میں صومالیہ کے نچلے حصے پائی جاتی تھی۔ اس خطے کی لائن میں سری لنکا اور مالدیپ بھی آتے تھے۔ جہاں سارے سال ہی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ علاقے خطِ استوا سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں میں نے سفر کی سمت کے بارے میں غلط اندازہ تو نہیں لگایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جنوب مغرب کی طرف آئے تھے۔ درحقیقت یہ لوگ جنوب کی طرف سفر کرتے رہے ہوں اور اس وقت ہم بحرِ ہند کے کسی جزیرے میں ہوں۔ کم از کم اس کی آب و ہوا سے یہی محسوس ہوتا تھا بحیرہ عرب میں اس قسم کے سرسبز جزائر نہیں ملتے۔ دوسرے اس احساس سمندر میں قزاقوں کی طرف سے یوں کھلے بندوں [illegible] کر رہنا حیرت انگیز تھا۔ اس کے برعکس وہ بحرِ ہند کی بے حساب وُسعتوں میں آرام سے رُوپوش رہ سکتے تھے۔ اس خطے میں بے شمار ویران جزائر ملتے ہیں۔ جو سمندری راستوں سے ہٹ کر واقع ہیں۔

راستے میں تینوں گارڈ مستقل چوکنا رہے تھے۔ وہ ہمارے دائیں بائیں چل رہے تھے اور ایک عقب میں تھا۔ اچانک ایک طیارہ شور مچاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ یہ درمیانی قسم کا طیارہ تھا۔ جو مسافروں اور سامان دونوں کی بار برداری میں استعمال ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے طیارہ آبادی کے مشرقی سمت میں گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔ غالباً انہوں نے درختوں کے درمیان والی خفیہ ایئر فیلڈ بھی بنا رکھا تھا۔ فضائی رابطے کے بغیر اس دور دراز خطے میں رہنا نہایت دشوار تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ طیارہ آیا کہاں سے ہوگا۔ کیا اس نے کسی قانونی ایئر فیلڈ سے پرواز کی ہوگی یا یہ قزاقوں کے کسی دوسرے اڈے سے آیا ہوگا؟ یہ ممکن تھا کہ طیارے نے کسی پرائیویٹ ایئر فیلڈ سے پرواز لی ہو۔ جہاں اس قسم کے غیر قانونی کاموں میں آسانی رہتی ہے۔

ہم تقریباً نصف گھنٹے بعد نیچے آبادی کے قریب پہنچے تو وہاں مشرقی سمت سے ایک کھلی جیپ میں چند عرب گزرے انہوں نے قیمتی لباس پہن رکھے تھے اور ان کے حلیے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ یہ اس طرف سے آئے تھے جہاں طیارہ اُترا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ طیارے میں عرب آئے ہوں اور ان عربوں کا اس جزیرے پر کیا کام تھا۔ وہ کسی معزز مہمان کی طرح آئے تھے۔ ان کی جیپ کو ایک مقامی کارکن ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے نیلی وردی پہن رکھی تھی۔ عرب بے حد خوش تھے اور ہنستے گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبید صلاح کی آنکھوں میں غصہ چمکنے لگا تھا۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں زمین پر تھوکا۔

"آگے چلو۔" عقب سے گارڈ نے عبید صلاح کی کمر پر رائفل کی نال ماری۔

کچھ دیر بعد ہم خار دار تاروں سے گھرے ایک احاطے میں داخل ہوئے جس کے وسط میں فوجی بیرکس تھیں۔ یہ جگہ کوئی قید خانہ معلوم ہوتی تھی، میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پہلے ہمیں

ایک سفید فام شخص کے سامنے پیش کیا گیا جو جیل کا انچارج ثابت ہوا۔ کثرتِ مے نوشی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور گالوں کا گوشت لٹک آیا تھا۔ وہ حلیے سے کوئی بلڈاگ لگ رہا تھا۔

''کون ہیں یہ؟'' اس نے غرا کر کہا۔

''جان گرے انہیں پکڑ لائے ہیں۔'' سیاہ فام محافظ نے ادب سے کہا۔ ''انہیں اگلے حکم تک یہاں قید رکھنے کو کہا ہے۔''

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ بگڑ کر مزید بدصورت لگنے لگا تھا۔

''اس نے خود مجھ سے کیوں نہیں کہا؟''

''یہ بات تو وہی جانیں جناب۔'' محافظ یک دم خائف نظر آنے لگا تھا۔

''تو تم نے اس خنزیر کی توجہ کیوں نہیں دلائی۔'' جیل انچارج نے اچانک اٹھ کر محافظ کو پوری طاقت سے تھپڑ مارا۔ وہ طاقتور آدمی تھا۔ سیاہ فام وزنی اور مضبوط ہونے کے باوجود لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ مزید تاریک ہو گیا تھا لیکن اس بے عزتی پر اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ عبید صلاح حقارت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں انچارج نے دراصل ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خیال غلط تھا۔ اس کی خباثت سے ابھی ہمیں واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

''سوری ڈیئر ڈان۔'' سیاہ فام محافظ نے کہا۔

وہ مسکرانے لگا۔ ''میں ذرا نئے قیدیوں سے اپنا تعارف کرا دوں۔''

''لیکن گرے صاحب...... '' سیاہ فام نے کہنا چاہا۔

''بھاڑ میں جائے تمہارا گرے صاحب۔'' اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''اور تم بھی دفع ہو جاؤ۔''

سیاہ فام گارڈ اپنے ساتھیوں سمیت دفع ہو گیا۔ انچارج کے گھنٹی بجاتے ہی دو مسلح افراد اندر آ گئے تھے ڈیئر ڈان نے انہیں حکم دیا۔ ''انہیں میدان میں لے چلو۔''

میدان بیرکوں کے عقبی حصے میں تھا۔ وہاں لوہے کے پائپوں سے بنے جھولے نما ساخت کے نمونے کھڑے تھے۔ جن سے لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ''ان کی قمیصیں اُتار دو۔'' ڈیئر ڈان نے اپنے آدمیوں کو حکم جاری کیا۔ تب میری نگاہ اس کے ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھاتے ہنٹر پر پڑی۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ عبید صلاح نے مزاحمت کی تو گارڈز نے اس کی قمیص پھاڑ دی۔ میں نے شرافت سے قمیص اُتار دی تھی کیونکہ نصف درجن اٹھی ہوئی رائفلوں کے سامنے مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمیں ہاتھوں سے زنجیروں میں باندھ دیا گیا تھا۔ عبید صلاح، ڈیئر ڈان کو انگریزی ڈکشنری کے منتخب الفاظ سے نواز رہا تھا۔

''اس جیل کا اصول ہے کہ میں یہاں آنے والے ہر نئے قیدی سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ جس کے بعد اس کے دماغ کے کیڑے جھڑ جاتے ہیں۔'' اس نے ہنٹر کو کھول کر جھٹکا۔ یہ تین فٹ لمبا





اور خاصا موٹا ہنٹر تھا۔ مجھے اپنی کھال کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی تھی لیکن اس نے پہلے عبید صلاح کو اس کی نظم گوئی کا انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہمارے عقب میں آیا۔ اس نے جس طرح گھما کر عبید صلاح کی پشت پر ہنٹر مارا تھا اس سے اس کی مہارت کا ثبوت ملتا تھا۔ عبید صلاح کے جسم نے شدید جھٹکا لیا تھا لیکن اس کے لبوں سے ذرا سی بھی آہ نہیں نکلی تھی۔ اس بات پر مشتعل ہو کر ڈیئر ڈان نے اگلا وار مزید قوت سے کیا تھا۔ تیسری بار بھی وہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلوانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں تین سے زیادہ ضربیں نہیں لگاتا۔ ورنہ آج تمہاری چیخیں پورا کیمپ سنتا۔''

عبید صلاح کے ہونٹوں پر سلگانے والی مسکراہٹ تھی۔ ''چاہو تو آج یہ کام بھی کر کے دیکھ لو۔ میرے ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکلے گی۔''

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر میری طرف نظرِ کرم کی اور مجھے تین بار اپنی پشت پر قیامت سہنا پڑی۔ اس ہنٹر کی ضرب اتنی شدید تھی کہ ایک ہی بار میں کھال ادھیڑ دیتی تھی۔ میں نے دانت بھینچ لیے تھے اور کوشش کی تھی کہ عبید صلاح کی طرح میرے ہونٹوں سے بھی کوئی آواز نہ نکلے۔ تین ضربوں کے بعد میری پشت درد سے تڑخنے لگی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عبید صلاح پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ہمیں کھول دیا گیا اور قمیص پہننے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک بیرک میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ بیرکس پتھر کے بلاکوں کی بنی ہوئی تھی۔ دروازوں کی جگہ لوہے کی سلاخوں والے گیٹ تھے۔ چھت لکڑی کی تھی لیکن اتنی اونچی کہ اس تک رسائی کا سوچا ہی جا سکتا تھا عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ عقبی حصے میں روشندان تھا۔ زمین سے آٹھ فٹ اونچے ان روشن دانوں میں بھی لوہے کی انچ بھر موٹی سلاخیں نصب تھیں۔

ہمیں جس بیرک میں بند کیا گیا تھا اس میں دونوں جانب دس دس کوٹھریاں تھیں یہ کوٹھریاں بہ مشکل سات بائی سات فٹ کی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ دو دو فٹ چوڑائی کے دو بستر لگے تھے۔ فٹ بھر اونچے لوہے کے پائپ سے بنے پلنگ زمین میں نصب تھے۔ ان پر بدرنگ اور بدبو دار کمبل بچھے تھے۔ سرہانے کے لیے اسی قسم کے تکیے تھے ایک بستر سے آگے ایک چھوٹے سے ڈول میں پانی پڑا تھا جس کے ساتھ مگا تھا۔ یہ ہمارا نیا قید خانہ تھا۔ گارڈز کے جاتے ہی عبید نے کہا۔

''حرامی سمجھتا ہے کہ اس طرح ہمیں مرعوب کر لے گا۔'' اس نے واضح کیا کہ وہ اس ڈیئر ڈان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا (اسے ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔) پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میں تو تمہیں نرا ملاح سمجھتا تھا تم تو جی دار آدمی نکلے۔''

''زندگی میں بڑے زخم کھائے ہیں اس لیے عادت ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کچھ یہی حال اپنا بھی ہے۔ زندگی نے سوائے زخموں کے کچھ نہیں دیا۔'' اس نے سرد آہ

دروازے کی سلاخوں سے ایک جوکر نما شخص نے اندر جھانکا۔ وہ دُبلا، پتلا اور چھوٹے سے قد کا سیاہ رو شخص تھا۔ اس کے ننھے سے چہرے پر بھاری بھرکم چشمہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ محافظ نے دروازہ کھولا تو وہ اندر گھس آیا۔ اس کے سفید کوٹ اور ہاتھ میں موجود میڈیکل بکس سے ظاہر تھا کہ وہ ڈاکٹر تھا۔ اس کا میڈیکل بکس بھی اس کی طرح خستہ حال تھا۔ اسے میڈیکو ٹیپ لگا کر کئی جگہ سے جوڑا گیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے بولنا شروع کر دیا۔

''اپن ڈاکٹر واڈیا ہے فرام بمبئی۔'' وہ بطخ کی طرح ہنسا۔ ''لیکن اپن نے بیس سال سے بمبئی نہیں دیکھا۔ تم نیا آیا ہے جو بھی نیا بندہ ادھر آتا ہے اسے اپن کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب بتاؤ پہلے کسے دیکھے۔''

''اسے۔'' میں نے عبید کی طرف اشارہ کیا۔

''اونہوں۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے اسے۔''

''نہیں پہلے اسے۔''

ڈاکٹر واڈیا بے چارہ ہم دونوں کے درمیان گردن گھما رہا تھا۔ آخر اس نے چلا کر کہا۔ ''سٹاپ اٹ اپن دونوں کو دیکھے گا۔ دونوں اپنی قمیص اُتار دو۔''

''پہلے تم۔'' میں نے عبید صلاح کی طرف دیکھا۔

وہ بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''نہیں پہلے تم۔''

''جی نہیں پہلے تم۔''

''تم......''

''ارے میں اپنی قمیص اُتار دیتا ہوں۔'' جوکر ڈاکٹر نے چلا کر کہا اور سچ مچ اپنی قمیص اُتارنے لگا۔ اس نے قمیص اُتار اپنی پشت ہماری طرف کی۔ اس کی پشت پر متعدد لمبی لمبی لکیریں پڑی تھیں۔ جیسے اسے بھی ہنٹر سے مارا گیا ہو۔ گویا کیمپ کا ڈاکٹر بھی بے چارہ قیدی سے کم نہیں تھا۔ ''یہ میری غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے نہیں کی تھیں۔ تم کیوں چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری پیٹھ پر بھی ان لکیروں کا اضافہ ہو جائے۔''

''ان کی تعداد تو خاصی زیادہ ہے۔'' میں نے غور کر کے کہا۔ ''کیا انچارج، قیدی کے ساتھ تمہیں بھی اپنے ہنٹر سے نوازتا ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لو کسی قیدی کی غلطی کی سزا بھی مجھے ہی ملتی ہے۔'' اس نے دردناک لہجے میں کہا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے عبید صلاح کی طرف دیکھا۔

''بھگوان کے لیے اس کا خیال مت پوچھو۔ اپنی قمیص اتارو۔'' اس نے تقریباً گڑگڑا کر کہا تو مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ میں نے قمیص اُتار کر پشت اس کی طرف کر دی اور جب اس نے کوئی [illegible] قسم کی شے میرے زخم پر لگائی تو میرے رحم کے سارے جذبات غائب ہو گئے۔ اتنی تکلیف





ہنٹر کھاتے ہوئے بھی نہیں ہوئی تھی جتنی ان زخموں کے علاج میں ہو رہی تھی۔ اگلے دو تین منٹ تک میں اس قیامت خیز مرحلے سے گزرا۔ خدا خدا کر کے اس نے مرہم پٹی مکمل کی۔

''جاندار آدمی ہے۔'' ڈاکٹر جوکر نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''اتنی مار کسی اور نے کھائی ہوتی اور ایسے زخم ہوتے تو اب تک رو رہا ہوتا تم چہک رہا ہے۔''

''اس کی حالت مجھ سے بھی بُری ہے۔'' میں نے عبید صلاح کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر جوکر نے اس کی پھٹی ہوئی قمیص اُتاری تو بے اختیار سیٹی بجائی۔ ''اپن اپنی ساری زندگی میں اتنا گہرا زخم نہیں دیکھا جو ایک ہی ضرب سے آیا ہو۔''

''ڈاکٹر تمہاری اردو بہت صاف ہے۔''

وہ ذرا جھینپا۔ ''ارے ادھر بدر بھائی کے یتیم خانے میں پرورش پائی ہے، ہے تو مسلمان پر بھگوان ہے۔ اس نے مجھے ڈاکٹری پڑھائی، شادی کرائی، گھر بنا دیا۔''

''اور تم یہاں آ پھنسے۔'' میں نے کہا۔

عبید صلاح نے اسپرٹ کی کاٹ بھی اسی صبر سے برداشت کی تھی۔ اسے ہماری باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ کیونکہ ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔ اس کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر ڈاکٹر واڈیا نے گہری سانس لی۔

''یہ سب اپنے کرموں کا پھل ہے اِدھر انڈیا میں ڈاکٹر بہت ہوتے ہیں اور سالے سب اب بیمار پڑتے ہیں۔ امیر لوگ بیمار ہی نہیں پڑتے یا پڑتے بھی ہیں تو بڑے ڈاکٹر لوگ سے علاج کراتے ہیں اپنے پاس کون آتا ہے۔ ایک شخص نے میرے کو دبئی لے جانے کا لالچ دیا اور......''

''اور یہاں لے آیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں بابا اس نے اپن کو دبئی پہنچا دیا تھا۔ پر اپن کے پاس ویزہ، پاسپورٹ کچھ نہیں تھا۔ چار سال ایک ہوٹل میں ڈش واشنگ کرتا رہا۔ پھر ایک کلینک میں کمپاؤنڈر ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا ڈاکٹر ہی کمپاؤنڈر تھا اور غلط دھندے کرتا تھا۔ کلینک پر چھاپہ پڑ گیا۔ خوش قسمتی سے اپن چھٹی پر تھا۔ وہاں سے بھاگا تو ایک غلط آدمی کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر اسمگل کیا اور اپنے ساتھ ادھر لے آیا۔''

''یہاں آ کر تمہیں معلوم ہوا ہو گا کہ تم ایک چکر سے نکل کر دوسرے چکر میں پھنس گئے ہو۔''

''کاش میں دبئی میں پکڑا جاتا۔'' ڈاکٹر واڈیا نے سرد آہ بھری۔ ''دو تین سال جیل میں گزار کر اپنی رُکمنی کے پاس چلا جاتا۔''

''رُکمنی تمہاری بیوی؟''

''ہاں وہ اپنی بیوی تھی اب نہ جانے کس کی بیوی ہو گی اور کتنے بچوں کی ماں ہو گی۔'' اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ مرہم پٹی مکمل کر لی۔ وہ خاصا دُکھی نظر آنے لگا تھا۔

"ممکن ہے وہ اب تک تمہاری راہ تک رہی ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ایسا صرف بالی ووڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔" اس نے افسوس سے کہا۔ "کتنا دھوکا دیتے ہیں یہ فلم والے۔ بابا اصلی زندگی میں یہ سب کہاں ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر واڈیا رخصت ہوا تو لاتعلقی سے کھڑے گارڈ نے تالا لگا دیا۔ ڈاکٹر جس طرح کھل کر بات کر رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ گارڈ کو اردو نہیں آتی۔ ڈاکٹر جاتے جاتے ہمیں کچھ دوائیاں دے گیا تھا کہ وقفے وقفے سے کھاتے رہیں۔ یعنی جب بھی درد زیادہ محسوس ہو۔ میں نے دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ عبید صلاح نے انہیں ایک طرف ڈال دیا۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک عبید صلاح نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر دلچسپ لیکن مظلوم آدمی ہے۔"

میں اُچھل پڑا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس نے یہ جملہ کہا تھا کہ بلکہ اس لیے کہ اس نے یہ جملہ صاف اردو میں کہا تھا۔

"تمہیں اردو آتی ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میرے ساتھیوں میں چند پاکستانی ہیں۔ میں نے ان سے یہ زبان سیکھی۔ مجھے اردو کے علاوہ فارسی اور افغانستان میں بولی جانے والی زبان دری بھی آتی ہے۔ عربی میری مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور کسی قدر فرانسیسی بھی بول اور سمجھ لیتا ہوں۔"

"بس ایک زبان کی کسر رہ گئی تھی۔ ورنہ تم ہفت زبان کہلاتے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہفت زبان کیا ہوتا ہے۔" اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ سات زبانیں جاننے والے افراد کو ہفت زبان کہا جاتا ہے۔ سندھ میں سچل سرمست شاعر تھے جو سات زبانیں جانتے تھے اور اسی بناء پر شاعرِ ہفت زبان کہلاتے تھے کہ انہوں نے ان تمام زبانوں میں شاعری بھی کی تھی۔

"اگر زندگی نے مہلت دی تو ایک زبان اور سیکھ کر اس کمی کو پورا کرلوں گا۔" اس نے خوش مزاجی سے کہا۔ پھر لیٹتے ہوئے بولا۔ "اس بدبخت نے ہنٹر سے ناشتہ کرا دیا تھا۔ اب کھانے کی توقع فضول ہے۔ لہٰذا بہتر ہے سویا جائے۔"

چند لمحے بعد گارڈ نے آکر پھر دروازہ کھولا اور ایک شخص نے ٹرے اندر سرکا دی۔ جس پر مچھلی کے تلے ہوئے ٹکڑے اور کافی رکھی ہوئی تھی۔ خاصا عجیب سا ناشتہ تھا لیکن جیل میں مرضی کا مینو کہاں ملتا ہے۔

سمندر میں رہنے والے مچھلی کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس آب و ہوا میں مچھلی کا استعمال مفید ہوتا ہے اور سستا بھی۔ کیونکہ سمندر میں رہنے والوں کو اس کا گوشت تازہ اور آسانی سے مل جاتا ہے۔ بہ نسبت جانوروں کے گوشت کے۔ اس طرح اجناس اور سبزیاں بھی بحری جہازوں پر کم استعمال کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر مچھلی ہی کھائی جاتی ہے۔ اس طرح جزائر جو خشکی سے دور پائے



جاتے ہیں وہاں پر بھی مچھلی کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ جزائر پر زراعت کم ہوتی ہے اور دوسرے ممالک سے ڈیری کی مصنوعات، گوشت، پھل اور سبزیاں درآمد کرنا خاصا مہنگا پڑتا ہے۔ بہت ساری اشیاء تو ان جزائر میں پیدا ہی نہیں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اکثر جزائر کی معیشت ماہی گیری کے گرد گھومتی ہے۔ اس سے ان کا اولین مسئلہ یعنی خوراک حل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اس جگہ مجھے ماہی گیری ہوتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ یہ جزیرہ قزاقوں کے ایک بین الاقوامی گروہ کا مرکز نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنی خوراک کی اکثریت ضروریات سمندر سے ہی پوری کرتے ہوں گے تاکہ بیرونی دنیا پر انحصار کم سے کم ہو۔ اس میں خطرات بھی کم تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جزیرے پر کم سے کم چھ سات ہزار نفوس آباد تھے اور اتنی بڑی آبادی کو بیرون ملک سے خوراک مہیا کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بلکہ قزاقوں کے لیے اس میں خطرات بھی پوشیدہ تھے۔ ان کے لیے عافیت اس میں تھی کہ باہر سے کم سے کم رابطہ رکھیں تاکہ دنیا ان کی طرف متوجہ نہ ہو۔

خلافِ توقع مچھلی ذائقے دار ثابت ہوئی تھی اور کافی بھی سیاہ ہونے کے باوجود مزہ دے گئی تھی۔ ناشتہ کر کے میں دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے دوبارہ جگایا گیا تو شام ہو رہی تھی۔ مجھے ڈاکٹر واڈیا کی صورت نظر آئی۔ اس بار خلافِ توقع اس نے خاموشی سے زخموں کی مرہم پٹی کی اور رخصت ہو گیا۔ میں نے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سلور کے مگے سے دروازہ بجایا۔ گارڈ فوراً آموجود ہوا۔

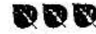
"کیا بات ہے؟" اس نے غرا کر کہا۔

"مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے مخصوص اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک اور آدمی کے ساتھ آیا۔ جو مسلح نہیں تھا۔ اس نے آکر تالا کھولا اور مجھے باہر نکالا اور دوبارہ تالا لگایا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں گارڈ رائفل تانے پوری طرح چوکس تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہا تھا۔ بیرک کے باہر ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ یہ بمشکل تین بائی تین فٹ کا اور چھ فٹ اونچا۔ میں نے ہر بیرک کے سامنے ایسا ہی ایک بیت الخلا دیکھا تھا۔ اندر اگرچہ بدبو تھی لیکن یہ کسی حد تک صاف ستھرا تھا۔ اس میں اندر سے دروازہ بند کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک معمولی سا کھٹکا تھا جو باہر سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔

"تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔" گارڈ کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔

میں باہر نکلا تو انہوں نے اسی طرح مجھے لا کر کوٹھری میں بند کر دیا۔ دو دفعہ مرہم پٹی کے بعد زخموں میں تکلیف خاصی کم ہو گئی تھی۔ اندھیرا چھاتے ہی بیرک کی راہداری میں نصب تیز روشنی والے بلب روشن ہو گئے تھے۔ سیلز میں کوئی بلب نہیں لگا تھا۔ بلکہ سلاخوں سے روشنی گزر کر یہاں اجالا کرتی تھی۔ عام طور سے جیلوں میں بھی بلب اور بجلی کے سوئچ قیدیوں کی رسائی سے دور رکھے

جاتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی مچھلی اور دلیہ نما سی چیز پر مشتمل تھا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سیل کا دروازہ کھلا اور مجھے جان گرے کی صورت نظر آئی جو مجھے باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔



مشتعل افراد اگر ہجوم کی شکل میں ہوں تو تباہ کن قوت بن جاتے ہیں۔ ایسے ہجوم منٹوں میں ہاتھی کی بھی چٹنی بنا سکتے ہیں۔ یہ ہجوم تو نہیں تھا لیکن بیک وقت چھ سات افراد سے مقابلہ کرنا دشوار کام تھا۔ حسن علی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو۔ مسز شہزاد آپ انہیں بتائیں۔''

''رُک جاؤ۔'' عورت چلائی اور وہ چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح رُک گئے۔

حسن علی نے عورت سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے اس کے قاتل وہی لوگ ہیں اور میں ان کو بچ کر جانے کا موقع نہیں دوں گا۔ چلو خان۔'' آخری الفاظ اس نے مجھ سے کہے تھے پھر ہم لوگوں کے درمیان سے نکلتے چلے گئے۔ ہم نے عورت کے صدمے اور لوگوں کے تذبذب سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اگر ان لوگوں کو تھوڑی مہلت اور مل جاتی تو عورت کے سامنے بات کھل جاتی کہ شہزاد کہیں غائب نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے ہی گیراج میں اپنے مکینک لڑکوں کے ساتھ مارا گیا تھا۔ یہ بات کھلتے ہی ہم عورت کی نظروں میں مشکوک ہو جاتے اور عین ممکن تھا کہ وہ ہمیں قاتل یا ان کا ساتھی قرار دے دیتی۔ اس کے بعد وہاں سے نکلنا ہمارے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا۔ بہر حال عورت سے ہمیں ایک کام کی بات معلوم ہوگئی تھی یعنی بابو بھائی کا نام ان نامعلوم افراد کو بابو بھائی ہی شہزاد خان تک لایا تھا۔ اسے دستِ قاتل کی مدد کرنے کا انعام یہ ملا کہ اسے بھی قاتل نے خاموش کر دیا۔ تاکہ اس کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا باقی نہ رہے۔

''مجھے تو بابو بھائی کی خیریت بھی مشکوک لگ رہی ہے۔'' میں نے نیچے آتے ہی کہا۔

''وہ لوگ خاصے تیز جا رہے ہیں۔'' حسن علی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد خان کے گیراج کی طرف چلو۔''

''استادِ محترم۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''آدھی رات سے زیادہ گزر چکی ہے اور میں نے دوپہر سے سوائے مار اور دھکوں کے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

''تین لاشیں دیکھ کر بھی تمہاری بھوک برقرار ہے۔'' حسن علی نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں چوتھی لاش بن جاؤں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

بادل نخواستہ حسن علی نے گاڑی ایک رات بھر کھلے رہنے والے ہوٹل کے سامنے رکوائی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد مجھ پر کہولت طاری ہونے لگی تھی۔ ''کیا خیال ہے باقی کام کل پر نہ چھوڑ دیا جائے۔'' میں نے تجویز پیش کی حسن علی نے مجھے گھورا۔

''کیا فائدہ کل بھی آ کر ایک یا کئی اور لاشوں کا نظارا کرنے کا۔''





''اگر پاپا یہاں ہوتے تو اب تک پولیس ان لوگوں کو گردن سے پکڑ چکی ہوتی۔'' میں نے جماہی لی۔

حسن علی مسکرایا۔ ''میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ ابھی ہم جو کوشش کر رہے ہیں۔ جمشید صاحب شاید اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔''

''بھلا پاپا کیوں نہیں چاہتے کہ مجھ پر حملہ کرنے اور مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے نہ پکڑے جائیں۔''

یک دم حسن علی محتاط نظر آنے لگا۔ اس نے ایک نظر ڈرائیو کرتے ہوئے شخص کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''بھئی پھر جمشید صاحب اس معاملے کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیتے وہ لوگ اب تک پکڑے جا چکے ہوتے۔''

میں نے محسوس کیا کہ حسن علی نے بات بدل دی تھی۔ پہلے اس کا لہجہ کچھ اور تھا اور اب اس کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ حسن علی نے گاڑی مقتول شہزاد خان کے گیراج سے کچھ فاصلے پر رکوائی تھی۔ وہاں اب بھی رونق تھی لیکن لوگوں میں خوف کے اثرات بھی تھے۔ آس پاس کی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان کے آگے لوگ ٹولیوں میں کھڑے تہرے قتل پر سنسنی خیز تبصرے کر رہے تھے۔ ہم ان کے پاس سے گزرے۔ پولیس جائے واردات سے لاشیں اور دیگر شہادتیں لے کر جا چکی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی تھی۔ حالانکہ لاشیں دریافت ہوئے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے تھے اور بعض اوقات تو پولیس جائے واردات پر آنے میں اتنی دیر لگا دیتی ہے۔ گیراج سیل کر دیا گیا تھا اور اس کے آگے ایک سپاہی اپنی بندوق کے ساتھ کرسی پر بیٹھا بھگتنے کے انداز میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔

''لگتا ہے پولیس نے بھگتایا ہے معاملے کو۔'' میں نے سرگوشی میں حسن علی سے کہا۔

''مجھے بھی شبہ ہو رہا ہے۔'' حسن علی نے سر ہلایا۔ ''شاید اوپر سے ڈوریاں ہلائی جا رہی تھیں۔''

ساتھ آنے والے ماہر جغرافیہ کو ہم نے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا اب ہم آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

''کیا پاپا ہوتے تو وہ ہمیں ان لوگوں کو تلاش کرنے سے روک دیتے۔ جنہوں نے مجھے اور ماہ پارہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟''

حسن علی نے سر ہلایا۔ ''میرا یہی اندازہ ہے کہ اس کوشش میں کچھ ایسے افراد ملوث ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا جمشید علی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔''

میں چند لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ ان افراد کا تعلق پیلس سے بھی ہو سکتا ہے۔''

حسن علی نے یوں شانے اُچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ تم جو چاہو سمجھو۔ وہ سڑک کے ساتھ قائم

ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ یہ ایک ایرانی ہوٹل تھا۔ جہاں سوائے چائے اور پیسٹری کے کچھ نہیں ملتا تھا۔ میلی دیواروں پر ایران کے مناظر کی تصاویر لگی تھیں۔ کاؤنٹر کے عقب میں شہنشاہ ایران کی تصویر آویزاں تھی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اس قسم کے گندے اور معمولی درجے کے ہوٹلوں کو ایرانی کیوں کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایران والا ان ہوٹلوں کو دیکھ لے تو پاکستان اور ایران کے برادرانہ تعلقات کو دھچکا لگے بغیر نہ رہے گا۔

ٹیپ پر کوئی ایرانی مغنیہ مترنم لہجے میں گا رہی تھی۔ غالباً جامی کا کلام تھا۔ ماہ پارہ نے مجھے ایرانی ادب سے خاصا رُوشناس کرا دیا تھا۔ بیرے نے پوچھے بغیر ہمارے سامنے دو چائے لا کر رکھ دی تھیں۔ چائے کے بجائے یہ دودھ پتی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ روبوٹ کی طرح چلنے والا ویٹر وہاں سے روانہ ہوتا۔ حسن علی نے اس کے ایک ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ وہ وہیں منجمد ہو گیا۔ ''کیا چاہیے صاحب؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بابو بھائی کہاں ملے گا؟'' حسن علی نے اسی انداز میں دریافت کیا۔

''کون بابو بھائی؟'' بیرے نے معصومیت سے پوچھا۔

''بابو آٹوز والا بابو بھائی۔'' حسن علی نے دوسرا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''اچھا وہ پتا نہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔'' بیرے نے سر کھجایا۔ اس کے ہاتھ سے نوٹ غائب ہو چکے تھے۔ حسن علی نے اسے تیسرا نوٹ تھمایا۔

''اب تو آسان ہو گیا ہے۔''

''آپ نوروز میں دیکھ لیجیے گا۔ ورنہ سینما والی گلی کے تھڑے پر ملے گا۔''

''یہ دونوں جگہیں کہاں ہیں؟''

''اگر آپ مجھے سو روپے دیں تو میں آپ کو ان دونوں جگہوں پر لے جا سکتا ہوں۔'' بیرے نے عیاری سے کہا۔ اس نے جان لیا تھا کہ ہم اس علاقے میں انجانے تھے۔ لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ''بلاوجہ آپ بھٹکتے پھریں گے یا دوسروں سے پوچھنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے تمہیں سو روپے بھی مل جائیں گے۔'' حسن علی بیرے کی عیاری پر مشتعل ہو رہا تھا۔

''صاحب پیسے پہلے دے دیں تو مہربانی ہوگی بعد میں آپ نے ٹھینگا دکھا دیا تو مَیں کیا کروں گا۔'' بیرا مسکرایا۔

اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے حسن علی نے بادل نخواستہ اسے سو روپے دیے۔ نوٹ جیب میں غائب کر کے وہ بولا۔ ''آپ باہر میرا انتظار کریں۔ میں ابھی دس منٹ میں آیا۔''

''سو گز پہلے میری گاڑی کھڑی ہے۔ نیلے رنگ کی نئے ماڈل کی ٹیوٹا کار ہے۔ وہیں آ جانا۔''

''گاڑی کی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ پیدل کا راستہ ہے چند منٹ لگیں گے۔''





بیرے کو خطرہ تھا کہ کار میں بیٹھنا اس کے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے وہ عیار آدمی پیدل چلنے پر اصرار کر رہا تھا حسن علی کو اس کی بات ماننا پڑی تھی اگرچہ اندر سے وہ کھول رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا اس بیرے کی شامت آنے والی تھی جس نے ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ وہ دس کے بجائے پندرہ منٹ بعد باہر آیا تھا۔ رات کے اس پہر بھی ہوٹل کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً کسی بہانے سے کچھ دیر کی چھٹی لے کر ہمارے ساتھ نکلا تھا۔ اس وقت تو میرے طیش کی حد نہ رہی جب صرف دو گلیوں کے بعد اس نے ہمیں گلی کی نکڑ پر روکا۔

''میں نوروز دیکھ کر آتا ہوں۔ وہ کونے پر ہوٹل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ گلی میں گھس گیا۔

''یہ خبیث سزا کا مستحق ہے، استادِ محترم۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''اس نے بے ایمانی کی حد کر دی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ تم دیکھنا تو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔'' حسن علی نے غالباً دانت پیسے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ آتا نظر آیا۔ اس کی کھلی باچھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کامیاب رہا۔ ''تم لوگ جاؤ بابو بھائی وہیں موجود ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم کہاں جاتے ہو؟'' حسن علی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب چل کر بابو بھائی سے ہمارا تعارف بھی کرا دو۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔'' اس نے حسن علی کا ہاتھ جھٹک کر خفگی سے کہا۔ ''کیوں مجھے مروانا چاہتے ہو۔ بابو بھائی کو پتا چل گیا تو وہ میری کھال اُتروا لے گا۔''

''رقم ایسے ہی تو نہیں مل جاتی۔'' حسن علی نے مسکرا کر کہا۔ ''خیر بابو بھائی نے اگر پوچھ لیا تو میں بتا دوں گا کہ تم نے سو روپے بلکہ ایک سو تیس روپے لے کر اس تک ہماری رہنمائی کی تھی۔

''بتا دو...... بتا دو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں صاف مکر جاؤں گا۔'' اس نے کہا اور فرار ہو گیا۔

''یہ کیا؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ نے اسے ایسے ہی جانے دیا۔''

''ایسے ہی کہاں۔'' حسن علی نے اپنی جیب سے ایک عدد بٹوہ نکالا۔ ''ابھی وہ اپنی قسمت کو روتا ہوا واپس آئے گا تو اسے یہاں صرف بٹوا پڑا ملے گا۔'' اس نے بٹوے سے ساری رقم نکال لی۔ بیرے نے آج اچھی خاصی ٹپ حاصل کی تھی۔

''اب آئے گا اسے مزا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا حسن علی نے بٹوہ پھینک دیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

نوروز بھی ایک ایرانی ہوٹل ثابت ہوا لیکن کسی قدر بہتر درجے کا۔ اندر اکثر میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ بیرے سے بابو بھائی کی نشاندہی کرا لینی چاہیے تھی۔ اب ہم اسے کیونکر پہچانتے اندر بے شمار افراد بیٹھے تھے۔ خوش قسمتی سے بابو بھائی نے ہماری مشکل حل کر

دی۔ ایک درمیانی عمر کے چھوٹے قد کے اور نسبتاً بھاری جسم کے شخص نے قہقہہ مارا۔ ''ابے بابو بھائی کو دھوکا دینا آسان کام نہیں۔'' اگر اس نے سینے پر ہاتھ نہ مارا ہوتا تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ وہی بابو بھائی ہے۔

''میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔'' حسن علی نے آہستہ سے کہا۔ ''گاڑی دیکھ کر تم اسے کسی بہانے سے باہر لے آنا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا حسن علی جا چکا تھا۔ میں نے دانت پیسے۔ لگتا تھا کہ آج ساری رات اس جگہ کالی ہوگی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ فٹ پاتھ پر کھڑا رہا تھا اور وہ ترکیب سوچ رہا تھا جس پر عمل کر کے میں بابو بھائی کو باہر لاتا۔ چند منٹ بعد حسن علی کار سمیت آتا نظر آیا۔ اس نے کار ایک خالی دکان کے سامنے روکی جو نوروز کے بالکل برابر میں تھی۔ حسن علی نے مجھے انگوٹھا دکھایا۔ میں بادل نخواستہ اندر داخل ہوا اور سیدھا بابو بھائی کے پاس جا پہنچا۔ سچی بات تھی کہ ابھی تک میری سمجھ میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آئی تھی۔ جس پر عمل کر کے میں بابو بھائی کو ہوٹل سے باہر لے آتا لیکن جب میں اس کے پاس پہنچا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''بابو بھائی تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کون ہے بے تُو، کیسا پیغام کس کا ہے؟''

اس کے ساتھ دو افراد اور بیٹھے تھے۔ وہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک خاتون کا ہے۔ میں سب کے سامنے نہیں بتا سکتا۔''

''ابے چلا جا بابو بھائی باہر جا کر سن لے۔'' اس کے ایک ساتھی نے آنکھ مار کر کہا۔ ''خاتون کا پیغام ہے تیرے لیے روز روز ایسے پیغام کہاں آتے ہیں۔''

بابو بھائی کوئی بات کیے بغیر مجھے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شک تھا۔ میں معصوم سی صورت بنائے کھڑا رہا۔ بالآخر میں نے بیزاری سے کہا۔ ''جناب مجھے جواب لے کر بھی جانا ہے۔''

''عورت کون ہے؟'' اس نے اکھڑ پن سے کہا۔

''مجھے کیا معلوم جناب! مجھے تو پچھلے چوک پر ملی تھی۔ کالی چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن خوب صورت تھی۔'' میں نے چارہ ڈالا۔

''چل بھئی خوب صورت بھی نکل آئی۔'' دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ ''لگتا ہے اب تجھے خود جانا پڑے گا۔ واپس نہیں آئے گا۔''

''بکواس مت کر۔'' بابو بھائی نے اس کی سچ بیانی پر خفگی سے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔ چل میرے ساتھ۔'' وہ مجھ سے بولا۔ میں اسے ہوٹل سے لے کر باہر نکلا تھا۔ میں جان بوجھ کر ذرا آگے تھا۔ ورنہ وہ مجھے ہوٹل کے دروازے پر بھی روک سکتا تھا۔ میں برابر والی بند دکان کی طرف بڑھا۔ جس کے سامنے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ حسن علی اور ڈرائیور غائب تھے۔ ایک





لمحے کو میں چکرا گیا تھا۔ وہ دونوں کہاں چلے گئے تھے۔

اچانک عقب سے بابو بھائی نے میرا بازو سختی سے پکڑ لیا۔ ''جلدی بول چھوکرے کیا بات تھی؟''

''خاتون نے کہا تھا کہ یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہونی چاہیے۔'' میں نے دل میں حسن علی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے کہا۔

''جلدی بول۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہوں میری مشکل حسن علی نے آسان کر دی تھی۔ اس کی آواز سن کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ اس نے بابو بھائی کو آگاہ کیا تھا۔ ''یہ جو چیز تمہاری کمر سے لگی ہے۔ اسے پستول کہتے ہیں۔ کوئی بھی غلط حرکت کی تو ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔''

حسن علی کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ نہ جانے بابو بھائی کا کیا حال ہوا تھا۔ بہرحال جب حسن علی نے اسے کار میں بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ بلا چوں چرا کیے کار میں بیٹھ گیا۔ میں آگے بیٹھا اور گاڑی فوری طور پر روانہ ہو گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا بابو بھائی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''تم نے مجھے دھوکا دیا۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' حسن علی نے اسے جھڑک دیا اور اس دوران وہ اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے پاس سوائے پرس، چابیوں اور رومال کے کچھ نہیں تھا۔ تینوں چیزیں حسن علی نے اپنے قبضے میں کر لیں پھر مجھ سے کہا۔

''دیکھو آگے خانے میں گلاسز رکھے ہیں وہ دو۔''

میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا اندر بڑے شیشوں والے گلاسز تھے جو کچھ اس جسامت کے تھے کہ آنکھوں پر لگانے سے وہ پوری طرح آنکھوں کو ڈھانک لیتے تھے۔ ان کے شیشے تاریک تھے۔ ان کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں نے عینک پیچھے حسن علی کو دی۔ اس نے اسے بابو بھائی کی آنکھوں پر فٹ کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد ہم کلفٹن میں اس کوٹھی میں تھے جہاں ساحل سے پکڑے جانے والے چاروں لفنگے بھی قید تھے۔ ڈرائیور حسن علی کی ہدایت پر اسے اندر لے گیا۔

''اسے الگ رکھنا اور صبح تک خیال رکھنا۔''

اندر جاتے ہی حسن علی نے گاڑی چلا دی تھی کچھ دیر بعد ہم جمشید پیلس میں تھے۔ میں نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتائیے استادِ محترم کہ وہ ماہ پارہ سے کیا کہوں۔ وہ تو غصے میں ہوں گی۔''

''کچھ نہیں تم دبے قدموں جا کر خاموشی سے سو جاؤ۔''

''افسوس کہ میں شوہر نہیں ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''ورنہ اس ترکیب پر عمل کرتا۔ ماہ پارہ کو دھوکا دینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

"تو پھر جا کر اس کے سوالوں میں باقی رات بھی گزار دو۔" یہ کہہ کر حسن علی لمبے قدم بھرتا پیلس کے عقبی حصے میں واقع اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جہاں پیلس کے اعلیٰ سٹاف کے کمرے بھی تھے۔

میں نے حسن علی کے مشورے پر عمل کیا اور دبے قدموں اوپر پہنچا۔ ماہ پارہ کے کمرے میں تاریکی تھی۔ یعنی وہ سو رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے نائٹ بلب جلایا اور ماہ پارہ کو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گہری سانس لی اور تیز روشنی جلا دی۔ وہ ہینگنگ چیئر پر جھولتے ہوئے خاصے غصے میں لگ رہی تھیں۔

"آپ...... جاگ رہی ہیں اتنی رات گئے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"جی اور جناب کہاں سے تشریف لا رہے ہیں، اتنی رات گئے؟" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ آپ حسن سے پوچھیے گا وہی مجھے لے گئے تھے۔" میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"کہاں؟" وہ غصے میں بولیں۔

"اب بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "رات دو بجے تک ہم ایک خاتون کے گھر میں تھے۔"

ماہ پارہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ "یوسف مذاق مت کرو۔"

"آپ کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔"

یک دم ان کے طیش کے ٹمپریچر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ "کون ہے وہ حرافہ جس سے حسن ملنے گیا تھا؟"

"معلوم نہیں میں تو وہاں خاموش بیٹھا رہا تھا۔"

"اور سب دیکھتے رہے بے غیرتی سے۔"

"اس میں بے غیرتی والی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

"مجھے حسن سے یہ امید نہیں تھی۔" ماہ پارہ رو دینے والی ہو رہی تھی۔

"آج جو کچھ میں نے دیکھا اس کی امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا اور انٹرکام اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا۔ "آپ چائے پئیں گی۔"

"میں کسی کا خون پیوں گی۔" وہ دانت کچکچا کر بولیں۔

"او کے۔" میں نے کچن کا نمبر دباتے ہوئے کہا۔ "ایک چائے اوپر لے آؤ۔"

جمشید پیلس میں نائٹ سٹاف بھی تھا۔ جن میں ایک عدد باورچی بھی تھا۔ رات کو اگر کسی کو کھانے یا پینے کی ضرورت پیش آتی تو اسے ہر شے تازہ مل سکتی تھی۔ میں نے ماہ پارہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے افسوس ہونے لگا۔ میں نے ان کے پاس بیٹھ کر اپنا سر ان کے





زانوں پر رکھ دیا۔ "سوری ماما۔"

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولیں۔

اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اُگل دیا کہ میں نے انہیں سچ ہی بتایا تھا لیکن کسی اور پیرائے میں اس اثناء میں چائے آ گئی اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے انہیں اب تک کی روداد سنائی۔ روداد ان کے لیے خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔ پوری بات سن کر انہوں نے میرے بال پکڑ لیے۔ "اچھا تو تم اب مجھے بھی چکر دینے لگے ہو۔"

"خدانہ کرے۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "بس ذہن میں ایک بات آئی اور بے اختیار منہ سے نکل گیا آپ کا ردِعمل دیکھ کر مجھے شرارت سوجھنے لگی۔ اگر آپ کا دل دُکھا ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔"

"بکومت۔" انہوں نے مجھے خود سے لپٹا لیا۔ "بیٹے بھی ماؤں سے معافی مانگتے ہیں؟ میں کبھی تمہاری کسی بات پر ناراض نہیں ہو سکتی سمجھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گھنے درخت کے سائے تلے آ گیا ہوں۔ جمشید پیلس میں دو ہی ہستیاں تھیں جو مجھے سکون دیا کرتی تھیں۔ ایک ماہ پارہ اور دوسری کاجل، ماہ پارہ مجھ سے صرف سولہ سال بڑی تھیں اور دیکھنے میں اپنی عمر سے کہیں کم نظر آتی تھیں۔ ناواقف لوگ انہیں آسانی سے کالج گرل سمجھ سکتے تھے۔ ان کے حُسن میں کوئی کلام نہیں تھا اور وہ بھرپور جوان بھی تھیں اس کے باوجود وہ میرے ساتھ بالکل ماں کی طرح پیش آتی تھیں اور میں نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ وہ میری ماں نہیں ہیں۔ ساری بات سن کر انہوں نے مجھے بستر پر لیٹ کر سونے کا حکم دیا اور لائٹ آف کر کے باہر نکل گئیں۔ چائے پی کر رہی سہی نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ میں ماہ پارہ اور حسن علی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اپنی عمروں کا سنہرا دور گنوا رہے تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ ایک ہو جائیں اور جمشید پیلس سے نکل جائیں۔ جو ان کے لیے کسی قید خانے سے کم نہیں تھا۔ جمشید علی انہیں اس قید خانے تک لائے تھے اور اب انہیں رہا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

رات آنکھوں میں کاٹ کر میں سکول جانے کے لیے اٹھ گیا۔ حالانکہ میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر ایک اہم ٹیسٹ آ گیا تھا۔ یہ ٹیسٹ سالانہ رپورٹس کا ایک حصہ تھا اور تمام تر غیر نصابی سرگرمیوں کے باوجود میں تعلیمی میدان میں اپنے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ البتہ حسن علی بالکل تروتازہ تھا جیسے رات بھر گھوڑے بیچ کر سوتا رہا ہو۔ وہ کار کے پاس میرا منتظر تھا۔ اس نے ماہ پارہ کے گھورنے پر نظریں چرائی تھیں۔

"میں نے یوسف کی تربیت کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کے مطابق یہ رات نو بجے کے بعد پیلس سے باہر نہیں جا سکتا۔" انہوں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"آئندہ میں خیال رکھوں گا۔" حسن علی آہستہ سے بولا۔

"اور تم بھی یوسف۔"

"او کے میڈم۔" میں نے تابعداری سے کہا۔

ہم سکول روانہ ہوئے۔ راستے میں موقع پاتے ہی میں نے حسن سے پوچھا۔ "اس نے کچھ اُگلا۔"

"کچھ نہیں۔" حسن علی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ "لگتا ہے آپ کے آدمیوں نے اس پر صحیح سے محنت نہیں کی۔"

"نہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" حسن علی نے گہری سانس لی۔ "اس سے پہلے ہی بابو بھائی نے خودکشی کرلی۔"

"خودکشی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس لمحے میری نظر ونڈ شیلڈ پر پڑی ایک دیوہیکل ٹرک سیدھا کار کی طرف آرہا تھا۔



"کم آن جوزف۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے؟ میں کیوں باہر آؤں؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

وہ مسکرایا۔ "تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ لہٰذا بہتر ہے جو کہا جائے وہ کرو۔"

"اگر تم کہو کہ میں ہوا میں اُڑنا شروع کردوں تو یہ میرے بس سے باہر ہوگا۔" میں نے متانت سے کہا اور باہر آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مزاحمت کا فائدہ نہیں ہے۔

میرے باہر آتے ہی دروازے پر دوبارہ تالا لگا دیا گیا۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ جان گرے صرف مجھے لینے آیا تھا لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا۔ سوائے انتظار کرنے کے کہ مستقبل میرے لیے اپنی پٹاری سے کیا لاتا ہے۔ کیمپ کے احاطے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ اسی ساخت کی جس پر ہم نے بندرگاہ کی سرنگ میں سفر کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جب جان گرے نے مجھے اپنے برابر والی نشست پر بیٹھنے کو کہا۔ ہمارے ساتھ کوئی گارڈ نہیں تھا۔

"حیرت ہے۔ تم مجھے ایسے ہی لے جارہے ہو کیا تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہورہا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم عقل مند آدمی ہو اور کوئی حماقت نہیں کروگے۔"

"ایک منٹ ذرا جیپ روکو۔" کیمپ سے باہر آنے پر میں نے کہا۔ اس نے جیپ روک لی لیکن ساتھ ہی ایک ہاتھ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شاید اس میں کوئی ہتھیار تھا۔ میں نے زمین پر جیپ کی روشنی میں کوئی چیز تلاش کی اور مجھے ایک لکڑی اپنے کام کی مل گئی تھی۔ یہ دو فٹ لمبی اور تین انچ موٹی خاصی سخت ٹہنی تھی۔ میں نے اسے جان گرے کے سامنے کیا اور پھر یک دم اس پر ہاتھ مار کر



اُسے دو ٹکڑے کردیا۔ "اگر ایسے ہی میں تمہاری گردن پر ہاتھ مار کر توڑ دوں تو؟" میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں ایک لمحے کو چمکی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "تم ایسا کرسکتے ہو لیکن اس کے بعد کیا ہوگا اس جزیرے کا ایک ایک فرد تمہاری تلاش میں لگ جائے گا اور خواہ تم کہیں بھی چھپ جاؤ یہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ابھی تم پر کوئی الزام نہیں ہے لیکن میرے قتل کی سزا تمہیں بہت خوفناک ملے گی۔"

"اگر مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے تو پھر تم نے مجھے قید کیوں رکھا ہے؟"

"احتیاطاً۔" وہ بولا۔ "جب مجھے اندازہ ہوجائے گا کہ تم کوئی غلط حرکت نہیں کروگے تو تمہیں آزادی مل جائے گی۔"

"اس جزیرے سے بھی؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "یہاں سے فرار بھی ممکن نہیں ہے۔ جزیرہ بحیرہ عرب اور بحر ہند کے سنگم پر ہے اور یہاں سے نزدیک ترین سرزمین بھی سات سو میل دور ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف فولادی جال بچھے ہیں جن سے بچ کر کوئی جا نہیں سکتا۔ ان جالوں کے اندر خونخوار شارک مچھلیاں موجود ہیں۔ جال سے باہر ہماری موٹر بوٹس مسلسل گشت کرتی رہتی ہیں۔ جزیرے کے تمام ساحل زیر نگرانی ہیں۔ ان حالات میں یہاں سے فرار صرف دیوانے کا خواب ہوسکتا ہے۔"

اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

میں نے سر ہلایا اور واپس آکر جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ آگے بڑھادی۔ یہ اچھی قسم کی سڑک تھی جس کے دونوں طرف سرو قامت درخت تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ قصبے سے باہر کی طرف جارہی تھی۔ ابھی تک میں نے قصبے کو باہر ہی سے دیکھا تھا۔ جیل آبادی سے ہٹ کر تھی۔ سڑک قصبے سے گھوم کر پہاڑی ڈھلوان پر واقع جنگل کی دوسری طرف جارہی تھی۔ معاً جیپ نے ایک طویل موڑ لیا اور ہم ایک گیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کے دائیں بائیں خاردار تاروں کا طویل سلسلہ جارہا تھا۔ یہ جزیرے کا مشرقی حصہ تھا۔ بلندی کی وجہ سے کچھ فاصلے پر نرم ریت سے سر ٹکراتا سمندر صاف نظر آرہا تھا۔

فولادی گیٹ کے برابر میں پول پر نصب تیز روشنی جل اٹھی۔ ایک گارڈ قریب آیا۔ "آئیڈنٹیٹی پلیز۔" اس نے کہا۔ جان گرے نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھادیا۔ گارڈ نے کارڈ پر لگی تصویر کا جان گرے کی صورت سے موازنہ کیا اور بولا۔

"ویری فائن...... لیکن یہ کون ہے؟"

"یہ میرے ساتھ ہے۔ کارڈ پر میں ایک فرد کو اپنی ذمے داری پر ساتھ لے جاسکتا ہوں۔"

"او کے آپ یہاں سائن کریں اور اس کا نام لکھیں۔" گارڈ نے ایک چھوٹی سی ڈائری نما کاپی اس کی طرف بڑھادی۔

اس مرحلے سے گزر کر ہم آگے بڑھے تو میں نے دریافت کیا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''
''دیکھتے رہو۔'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

اندر سے یہ علاقہ کسی باغ سے مشابہ تھا جا بجا گارڈن لائٹس روشن تھیں ایک جگہ کچھ واٹر لینڈ ٹائپ کی چیز تھی۔ جہاں لوگ پانی میں کھیل رہے تھے یا سوئمنگ کر رہے تھے ان میں ایک بڑی تعداد صنفِ نازک کی تھی جن کے وجود سے اس رات کی رنگینیاں دو آتشہ ہو رہی تھیں۔ ان کے کھنکتے قہقہے یہاں تک آ رہے تھے۔ ''تم نے تو یہاں جنت بسالی ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

''ہاں ہم لوگوں کو جنت یہیں ملے گی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا اور جیپ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے روک دی۔ جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ عمارت کے اندر ایک بھی متنفس نہیں تھا۔ حتیٰ کہ صدر دروازہ بھی تاریکی میں تھا۔ میں جان گرے کے ساتھ دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو یوں لگا جیسے الٰہ دین نے کھل جا سم سم کہہ دیا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی رنگ اور روشنیوں کا ایک سیلاب سا باہر کی طرف نکلا تھا۔ شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ دراصل یہ ایک نائٹ کلب تھا۔ جہاں کان پھاڑ دینے والی موسیقی پر جسم تھرک رہے تھے۔ اندر ایک ایسی بُو تھی جو صرف اس قسم کی جگہوں پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ سگریٹ، سگار، شراب، پرفیوم اور جوان جسموں کی ملی جلی مہک ہوتی ہے۔ ہمارے اندر جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اندر سے پوری عمارت دراصل ایک ہال تھی جس کے ایک گوشے میں بار بنا ہوا تھا۔ سامنے کاؤنٹر کے سامنے سٹول رکھے تھے۔ بار سے ذرا آگے میزیں لگی تھیں اور سامنے کا پورا حصہ ایک بال روم پر مشتمل تھا جہاں رنگ برنگی روشنیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک اسٹیج نما جگہ پر ایک شخص جس نے اپنے سر کے بالوں کو دنیا کے تقریباً ہر روز میں رنگ رکھا تھا۔ وہ جنونیوں کی طرح اپنے سامنے موجود دوشیزہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ بھیانک شور کا منبع اس کے عقب میں رکھے چار عدد قد آدم سپیکر تھے۔ بے پناہ شور میں گلوکار کی آواز سننا تو ایک طرف رہا صحیح سے موسیقی بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بلکہ یہ موسیقی تھی ہی کہاں۔ یہ تو خون کو کھولا دینے والی آوازیں تھیں۔ جنہیں سن کر اچھے بھلے سنجیدہ آدمی کا بھی کچھ کرنے کو دل چاہتا تھا۔ مثلاً اس شخص کا خون جس نے اس قسم کی موسیقی ایجاد کی تھی۔

رہی سہی کسر وہاں ناچنے والوں کی ہذیانی آوازوں نے پوری کر دی تھی۔ میں نے جان گرے سے کہا۔ ''اگر تم مجھے سزا دینے لائے ہو تو تم اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب رہے ہو۔''
''ہمیں یہاں نہیں رُکنا۔'' اس نے کہا تو میں محض ہونٹوں کی جنبش سے سمجھ سکا تھا جیسے اس نے میری بات سمجھی تھی۔

وہ سیدھا بار روم کی طرف گیا اس نے ایک ڈبل پیگ لیا اور اندر والے حصے کی طرف بڑھا۔ ہمیں ناچنے والوں کے درمیان سے گزرنا پڑا تھا۔ وہاں اتنا ہجوم تھا کہ ہمیں بہ مشکل راستہ مل رہا تھا





بلکہ بنانا پڑ رہا تھا۔ گداز دہکتے جسموں کے درمیان سے گزرنا ایک سنسنی خیز تجربہ تھا جب کہ خواتین عملاً جامے سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ چند ایک تو میرے گلے لگ گئیں۔ انہوں نے حلق تک پی رکھی تھی لیکن ناچنے پر مُصر تھیں۔ انہوں نے میرے کان میں چلا کر کہا۔
''ٹام تم کہاں چلے گئے تھے؟''
''میں ہیری ہوں۔'' میں نے اسے ایک طرف دھکیلا۔

ایک اور جگہ دو لڑکیاں شرارت پر آمادہ تھیں۔ وہ جسم سے جسم ملائے موسیقی کی لہروں پر ڈول رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے درمیان سے گزروں۔ خاصی جدوجہد کے بعد میں کامیاب ہو سکا۔ اس پر انہوں نے ایک مشترکہ قہقہہ لگایا تھا۔ جان گرے حسرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''کبھی میں بھی ایسے ہی مزے لیا کرتا تھا۔''

''مجھے شک ہے کہ تم کبھی جوان بھی تھے۔'' میں نے کہا۔ وہ میرے تبصرے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے جیب سے ایک چابی نکالی اور قطار سے بنے دروازوں میں سے ایک دروازے میں لگائی۔ جب دروازہ کھلا تو میری الجھن دور ہو گئی۔ دراصل یہ ایک لفٹ تھی۔ اس نے اندر والی گرل کو ایک طرف کھسکایا۔ لفٹ مختصر سی تھی لیکن بے حد سُبک رفتار اور بے آواز تھی۔ میں نیچے کب پہنچا پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے گرل ایک طرف کھسکا کر دروازہ کھولا اور باہر آ کر اسے دوبارہ لاک کر لیا۔ یہ شاید نجی لفٹ تھی یہاں اوپر سے برعکس قطعی خاموشی تھی اتنی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی آئی۔

''یہ پہلا لیول ہے۔'' جان گرے نے بتایا۔
''کس چیز کا؟'' میں نے احمقانہ انداز میں دریافت کیا۔ وہ مسکرایا تو میں جھینپ گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ نائٹ کلب کئی منزلوں پر مشتمل تھا۔ اس کا اوپری حصہ محض ایک دکھاوا تھا اور اصل کلب اس کے نیچے تھا۔ جیسا کہ عام طور سے غیر قانونی طور پر چلنے والے کلب ہوتے ہیں۔ پردے کی آڑ میں اصل کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اوپر نچلے درجے کے، اور نچلی منزلوں میں اونچے درجے کے کیسنو، قحبہ خانے اور تفریح کے دیگر لوازمات ہوتے ہیں۔ ان جگہوں پر کروڑ پتی ایک رات میں لاکھوں اور ارب پتی کروڑوں لٹا دیتے ہیں۔ مجھے وہ عرب پارٹی یاد آئی جو طیارے سے آئی تھی۔ عین ممکن ہے وہ عیاشی کے لیے اس جزیرے پر آئے ہوں۔ جان گرے اینڈ کمپنی نے اس جزیرے کو ان عیاشوں کی جنت بنا دیا ہو۔ گویا قزاقوں کا یہ گروہ محض قزاقی تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے کئی اور کاروبار بھی کر رکھے تھے اور یہ سب آپس میں مربوط تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ منشیات اور اسلحے کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہوں۔ یہ بے حد منافع بخش کام تھے۔ یہ ہزاروں لگا کر لاکھوں کمانے والی بات تھی۔ جان گرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یہ سب خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ لفٹ سے نکل کر ہم ایک مختصر سی راہداری سے گزرے جس کا اختتام ایک وسیع ہال میں ہوا۔

اس ہال میں قدیم اور جدید انداز کو ملا کر ایسی آرائش کی گئی تھی کہ دیکھنے والا ایک ہی نظر میں مسحور ہو کر رہ جاتا۔ ہال کے وسط میں ایک بلند گول چبوترے سے پانی سیڑھیوں سے پھسلتا نیچے آ رہا تھا ہر سیڑھی مختلف رنگوں میں روشن تھی۔ اس واٹر فال کے اردگرد دانستاً اندھیرا رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ اور نمایاں لگ رہی تھی۔ ہال میں جا بجا پودے گملوں میں اس طرح رکھے تھے کہ ان پر باغ کے تختوں کا گمان ہوتا تھا۔ ایک طرف قدیم یورپی طرز کے کلبوں کے انداز میں بھاری اور تاریک آرائش تھی۔ یہاں پنک اور آبنوس کی لکڑی کے کام کی بہتات تھی۔ اس قسم کا ایک کلب میں نے بیلجیئم میں دیکھا تھا۔ یہاں صرف ارب پتی طبقے کے خاندانی لوگ ہی ممبر بن سکتے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ممبر کے ساتھ کلب میں گیا تھا۔

درمیان میں بار تھا۔ دوسری طرف نسبتاً جدید انداز میں آرائشی نشستوں کا اہتمام تھا۔ یہاں نیلے اور سفید رنگوں کے امتزاج سے ماحول کو روشن رکھا گیا تھا۔ فرنیچر لکڑی اور دھات کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا اور آنکھوں کو بھلے لگنے والے رنگ استعمال ہوئے تھے۔ وہاں روشنی تیز تھی لیکن اس انداز میں کہ اس کا اثر دوسرے حصے پر بالکل نہیں پڑ رہا تھا۔ یہ ہال بلاشبہ ڈیزائننگ اور انٹریئر ڈیکوریشن کا شاہکار تھا۔ اس کی منصوبہ بندی یقیناً کسی بین الاقوامی قسم کی کمپنی نے کی ہو گی۔ یہاں مخصوص سفید یونیفارم میں تربیت یافتہ بیرے اور اٹینڈنٹ تھے جو اتنی خاموشی سے حرکت کر رہے تھے کہ ان پر روبوٹ کا گمان ہوتا تھا۔ ہال میں اکثر جگہوں پر لوگ موجود تھے لیکن یہ اس کی وسعت اور سجاوٹ کا کمال تھا کہ ہال ویران اور سنسان لگ رہا تھا۔ پوشیدہ قسم کے سپیکرز سے اتنی مدھم موسیقی خارج ہو رہی تھی کہ اسے کان لگا کر ہی سنا جا سکتا تھا۔ اس کی دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اوپر بجنے والے میوزک اور اس موسیقی میں وہی فرق تھا جو شیر کی دھاڑ اور کوئل کی کوک میں ہوتا ہے۔

جان گرے مجھے لے کر تاریک حصے کی طرف بڑھا ایک گوشے میں گھوڑے کی نعل کی شکل میں صوفہ سیٹ تھا۔ جس کے درمیان میں نصف دائرہ نما میز تھی۔ میز پر کئی اقسام کی شراب کی بوتلیں۔ بیئر کے ڈبے اور پانی معہ جام پہلے سے موجود تھا۔ اس کے باوجود آپ کو کسی اور شے کی خواہش ہو تو آپ بیرے سے کہہ سکتے تھے میز پر پھلوں سے بھری ایک ٹوکری بھی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ انناس کے کٹے ہوئے نفیس ٹکڑے رکھے تھے۔

"کیا پیو گے؟" جان گرے نے اپنے لیے جام بناتے ہوئے کہا۔

"سادہ پانی۔" میں نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم چاہو تو کافی منگوا لو۔"

اس نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرف ایک ویٹر آ موجود ہوا۔

"یس سر۔"

"ایک کافی لے آؤ۔" جان گرے نے اسے آرڈر دیا۔ ویٹر نے سر جھکایا اور خاموشی سے چلا گیا۔





"مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

اس نے گھونٹ لیا اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو میں تمہیں یہاں سے رُوشناس کرا رہا ہوں۔"

"اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہو گا۔"

"ہاں مقصد تو ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے لیے کام کرو۔"

"یعنی قزاقوں کے لیے۔"

وہ ہنسا۔ "قزاق، یہ تو صرف سامنے کا ایک پہلو ہے۔ ہمارے مقاصد اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہیں۔"

"کیا تم قزاقی کر کے بھوکوں کا پیٹ بھرنے جیسا کوئی کام کر رہے ہو۔ اس قسم کے کردار ہمارے ہاں بھی ملتے تھے۔ ایک ڈاکو تھا۔ سلطانہ وہ بھی ڈاکے مار کر غریبوں کی مدد کیا کرتا تھا۔"

"نہیں۔" وہ ہنسا۔ "ہمارا مقصد اس سے بھی اعلیٰ ہے۔ ہم سرے سے غربت کا خاتمہ چاہ رہے ہیں۔"

"ایسی باتیں تو ہمارے حکمران بھی کرتے ہیں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "غربت کے بجائے غریبوں کا خاتمہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ کہیں تم لوگ اس قسم کے کسی منصوبے پر تو کام نہیں کر رہے ہو۔"

ایک لمحے کو وہ شدت سے سنجیدہ نظر آیا لیکن دوسرے ہی لمحے ہنس دیا تھا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو رفتہ رفتہ ہمارے مقاصد سمجھ جاؤ گے۔"

ان کے مقاصد تو مجھے سمجھے بغیر بھی نیک نظر نہیں آ رہے تھے لیکن یہ بات میں نے منہ سے نہیں کہی۔ میں جانتا ہوں کہ منہ بند رکھ کر انسان بہت سارے مصائب سے بچ سکتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ انسان کو ناقابلِ بیان دشواریوں میں ڈال دیتے ہیں۔

"کیسے سمجھ پاؤں گا میں تو تمہارا قیدی ہوں۔"

"کل سے تم آزاد ہو، میری ضمانت پر لیکن اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں بھی تمہیں سزا سے نہیں بچا سکوں گا۔"

"تمہاری ضمانت۔" میں ہنس دیا۔ "تمہاری ضمانت میری پشت پر تین لکیروں کی صورت میں موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے اسے بتایا کہ ڈیئر ڈان نے جیل میں ہمارا استقبال کیسے کیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا۔ "میں اسے دیکھ لوں گا۔"

"فی الوقت تو وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو بوقت رخصتی بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہو۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک موبائل فون نکال کر نمبر ملائے۔ ''میں جان گرے بات کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے پاس جو آدمی بھیجے تھے تم نے ان پر تشدد کیوں کیا۔'' دوسری طرف یقیناً ڈیئر ڈان تھا۔ ڈیئر ڈان نے کیا جواب دیا میں نہیں سن سکا تھا لیکن اسے سن کر جان گرے کا منہ بالکل ہی لال ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں کونسل کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔ تم نے اختیارات کو چیلنج کیا ہے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے موبائل بند کر دیا۔

''ڈیئر ڈان اچھا شخص نہیں ہے، تمہارے مقابلے میں۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

''یہ خود کو بہت کچھ سمجھنے لگا ہے۔'' جان گرے کے انداز میں حقارت تھی۔ ''میرے سامنے اس کی حیثیت چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے۔ اٹھو میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں۔''

وہ مجھے لے کر ایک بار پھر لفٹ کی طرف آیا۔ بے چارہ ویٹر جو کافی لا رہا تھا۔ ٹرے لے کر اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ لفٹ مزید نیچے گئی تھی۔ ''اس جگہ کتنے لیول ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بے شمار۔'' اس نے کہا اور ہم لفٹ سے باہر آ گئے۔ ''آج ذرا اسپیشل شو ہے۔''

شو کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ نائٹ کلبوں میں اسپیشل شو کے نام پر عام طور پر ابلیس کو شرما دینے والی حرکتیں ہوتی ہیں۔ ان میں اسٹریپ ٹیز سے لے کر لائیو سیکس شو تک سب شامل ہوتے ہیں لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ ہم جس ہال میں داخل ہوئے اس کی وسعت دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ ہال کم از کم بھی پچاس گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کے وسط میں ذرا گہرائی میں بیس گز دائرے کا ایک خالی حصہ تھا۔ جیسا کہ عام طور سے اکھاڑوں میں ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف قطار میں نشستیں لگی تھیں۔ ہم جس جگہ سے داخل ہوئے یہ حصہ وی آئی پی باکس پر مشتمل تھا۔ شیشے کے ایسے باکس تھے جن میں چار پانچ افراد آرام سے بیٹھ سکتے تھے اور ان میں ہر سہولت میسر تھی۔ باقی نشستیں بھی کھلی ہوئی اور آرام دہ تھیں۔ نشستوں والا حصہ وسط کے دائرے سے تقریباً پانچ فٹ بلند تھا۔

''کیا یہ رِنگ ہے؟''

جان گرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہاں مقابلے ہوتے ہیں۔''

''یعنی کشتی وغیرہ؟''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''تم کہہ سکتے ہو ویسے اس حصے کو سیزر ہال کہا جاتا ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ رومی جرنیل سیزر اس قسم کے مقابلے کرانے کا شوقین تھا جس میں انسان، انسانوں اور جانوروں سے لڑا کرتے تھے۔ یہ مقابلے خون ریز ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگ ان اکھاڑوں سے واپس زندہ آیا کرتے تھے۔ جان گرے مجھے لے کر اگلی قطار میں واقع بوتھ میں آیا تھا۔ شیشے کا دروازہ کھول کر ہم اندر آئے۔ جہاں ایئر کنڈیشن کی خنکی کے ساتھ ایئر فریشنر کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اندر صوفہ نما نشستیں تھیں۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ





دو سر تا پا بنی سنوری قیامتیں اندر داخل ہوئیں۔ یہ یورشیئن گرل تھیں۔ جن کے حُسن کے جلوؤں میں یورپ کی خیرگی اور مشرق کی کشش شامل تھی۔

''ہائے جان۔'' ایک لڑکی نے لہک کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

''ہائے ہنی۔'' جان نے اس کی گرم جوشی کا جواب اتنی زیادہ گرم جوشی سے دیا کہ مجھے نظر پھیرنا پڑی اور پھر میں گڑبڑا گیا۔ قیامت نمبر دو قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ہائے سمارٹ۔'' اس نے کہا۔

''ہائے۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ پیش کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرتی جو پہلی قیامت جان کے ساتھ کر رہی تھی۔

''میں جینا ہوں۔''

''میں یوسف۔'' میں مسکرایا۔

''یورپ کے کسی ملک سے ہو یا امریکی ہو؟'' اس نے سرک کر میرے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں بین الاقوامی باشندہ ہوں۔'' میں نے کہا اور یہ سچ بھی تھا۔ بحری جہاز پر کام کرنے والے لوگ بین الاقوامی باشندے ہوتے ہیں۔

''میرا مطلب ہے تمہارا پس منظر؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے اس بار بھی سچ کہا لیکن لڑکی مذاق سمجھی تھی۔ اس نے ہنس کر مجھ پر گرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ نشے میں تھی۔ اس کے منہ سے الکحل کی بُو آ رہی تھی۔ سب سے آخر میں جان گرے تھا اس کے بعد قیامت نمبر ون پھر میں اور آخر میں قیامت نمبر دو تھی۔ گویا میں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ جینا موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ چپکنے کی کوشش کر رہی تھی مجبوراً مجھے جسم کو ذرا سخت کرنا پڑا۔ وہ چیخ اٹھی۔

''اُف تمہاری کہنی...... میرے......'' اس نے بتایا کہ کہنی اسے کہاں چبھی تھی۔

''سوری گرل۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اسی لمحے باہر شور ہوا۔ میں چونکا۔ رِنگ میں ایک طرف سے دیوار کسی سلائیڈنگ ڈور کی طرح ہٹی تھی اور ایک شخص اندر آیا۔ اس نے صرف لمبی سی نیکر پہن رکھی تھی۔ جب رِنگ میں دوسرا شخص بھی نظر آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کسی ایسے دروازے سے آیا ہوگا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی کچھ اس قسم کا تھا پھر ایک تیسرا شخص نظر آنے لگا۔ جس نے ریفری کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ بعد میں وہ اناؤنسر ثابت ہوا تھا۔ وہ مقابلے کی شرائط بیان کر رہا تھا۔ درحقیقت مقابلے کی ایک ہی شرط تھی یعنی زندہ بچنے والا ہی فاتح شمار ہوگا۔ رِنگ کے اندر اپنے مخالف کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر سکتے تھے کیونکہ وہ دونوں کسی ایک ہتھیار پر متفق نہیں ہوئے تھے اس لیے مقابلہ خالی

ہاتھوں ہونا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''یہاں خونی مقابلہ ہوگا؟''

''تم نے درست سنا ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''اگر یہ بکواس ہوتی تو یہ لوگ ہزاروں ڈالرز کے ٹکٹ لے کر یہاں نہ آتے۔ یہاں ان کو سچ مچ خونی مقابلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

''لیکن یہ خلاف قانون ہیں۔''

''کس قانون کے؟'' اس نے سوال کیا تو میں لاجواب ہوگیا۔ واقعی اس جگہ کا کوئی قانون نہیں تھا۔

''اس کے باوجود دو انسانوں کو آپس میں لڑانا یہ تو وحشت ہے۔ قدیم دور کی سفاکی۔''

''کیا باکسنگ اور ریسلنگ کے مقابلے نہیں ہوتے۔ ان میں بھی لوگ مر جاتے ہیں۔'' جان گرے نے کہا۔

''وہ اتفاقی حادثات ہوتے ہیں۔ یہاں تو جان بوجھ کر ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں ہلاک کروایا جا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ کچھ ذہنی مریض اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہزاروں لاکھوں خرچ کرنے کو تیار ہیں۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔ جان گرے کی آنکھوں سے سرخی جھلکنے لگی۔

''تم ابھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ صرف اس جزیرے پر نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی بہت ساری جگہوں پر یہ کھیل ہوتا ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کرتے۔ لوگ اپنی خوشی سے اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اب ان دونوں کو دیکھو امریکہ میں یہ تیسرے درجے کے نمائشی ریسلر ہیں۔ انہیں کشتی لڑنے کے عوض صرف چند ہزار ڈالرز ملتے ہیں۔ یہاں سے زندہ جانے والے فاتح کو ایک لاکھ ڈالرز ملیں گے۔''

''ایک لاکھ ڈالرز۔'' میں نے طنز کیا۔ ''کیا کسی کی جان کا معاوضہ ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''بھوکا آدمی ایک روٹی کے عوض اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو جاتا ہے ہر آدمی کا معاوضہ ہے جس کے بدلے وہ اپنی جان کو دوسرے کے ہاتھ میں دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔''

''ان کا معاوضہ ایک لاکھ ہے۔'' میں نے رنگ میں موجود لڑاکوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں...... ان کی اوقات یہی ہے۔ ورنہ یہ کبھی اتنی رقم کے بدلے اپنی جان داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہ ہوتے۔''

''تمہاری جان کی کیا قیمت ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری جو قیمت ہے وہ میں وصول کر رہا ہوں۔ تمہارے خیال میں کیا میں اپنی جان داؤ پر نہیں لگا رہا۔'' اس نے بیئر کا ٹن منہ سے لگایا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ وہ واقعی بلانوش




تھا۔ ''اب خاموش رہو مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔''

''اس میں کوئی چھوٹ تو ہوگی۔ فرض کرو دونوں ہی بے دم ہو جائیں۔'' میں نے باہر کی طرف دیکھا۔

''تو مقابلہ دوبارہ ہوگا۔''

''اور اگر کوئی مقابلہ سے دست بردار ہو جائے؟''

''اس صورت میں وہ اپنے حریف کے رحم و کرم پر ہوگا۔ وہ چاہے تو اسے مار ڈالے لیکن اس کے لیے اسے دیکھنے والوں کی پسند کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اگر تماشائی اصرار کریں تو فاتح پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے مار ڈالے۔''

اس وقت میرے اندر ایک لاوا سا اُبل رہا تھا۔ یہ لوگ کتنی بے حسی اور سفاکی سے انسانوں کو استعمال کر رہے تھے۔ محض دولت کے لیے لیکن نہیں دولت کے لیے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنے جھگڑے، فساد اور خونریزیاں ہیں سب دولت کی وجہ سے ہیں لیکن ان لوگوں نے تو حد کر دی تھی۔ میں نے سانس کی ایک مشق کی تاکہ اپنے اندر جمع ہونے والے بخارات کو باہر نکال سکوں۔

اس لمحے شور اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک سیاہ فام تھا اور دوسرے کی رگوں میں شاید ریڈ انڈین خون تھا۔ اس کے سیاہ بالوں اور آنکھوں سے ایسا ہی ظاہر تھا۔ اس کا انداز بھی وحشیانہ تھا بالکل کسی لڑاکا ریڈ انڈین کا سا۔ اس نے سینے سے حریف کو جکڑ رکھا تھا اور سر سے ٹکریں مار رہا تھا۔ لمحوں میں سیاہ فام کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ خون آلودہ ہو کر اس کا چہرہ اور بھیانک لگنے لگا تھا۔ اچانک اس نے ریڈ انڈین کی ناک اپنے دانتوں سے پکڑ لی اس نے اتنے کس کر ناک پکڑی کہ اس کی نوک کٹ کر سیاہ فام کے منہ میں آگئی۔ ریڈ انڈین بیل کی طرح ڈکرایا اور سیاہ فام کو چھوڑ کر اپنی ناک پکڑ لی اب حساب برابر ہو چکا تھا۔

زخمی ہونے کے بعد دونوں ہی محتاط ہو گئے تھے۔ وہ اپنی توانائیاں بچا رہے تھے اور تماشائی چیخ چیخ کر انہیں لڑنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ جب وہ خاصی دیر تک ایک دوسرے کے پاس نہیں آئے تو ریفری نے انہیں وارننگ دی۔ اس وارننگ کا مطلب تھا کہ انہیں رنگ سے باہر نکال دیا جائے گا اور انہیں پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ بادلِ نخواستہ وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ خاصی دیر تک ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ جس میں دونوں ہی مزید زخمی ہو گئے امریکہ کے ریسلنگ کے نمائشی مقابلوں میں حصہ لینا اور بات تھی اور یہاں زندگی و موت کا کھیل کھیلنا الگ چیز تھی۔ اس نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ ہار کا مطلب تھا موت اور موت قبول کرتے ہوئے سبھی جھجکتے ہیں۔ ایک لاکھ ڈالرز کی کشش نہ ہوتی تو شاید وہ اس مقابلے کی ہمت ہی نہ کر پاتے۔ دیکھنے میں سیاہ فام زیادہ مضبوط نظر آتا تھا اور ریڈ انڈین زخمی بھی زیادہ تھا لیکن اس نے چالاکی سے کام لیا۔ ایک موقع پر جب اس نے سیاہ فام کو دیوار کے پاس گھیرا تھا۔ اس نے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ چند لمحے کے لیے

چکرایا اور ریڈ انڈین اس پر حاوی ہو گیا۔ اس نے دوسری بار زیادہ قوت سے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔ ریڈ انڈین نے کھڑے ہو کر فاتحانہ انداز میں حلق سے آواز نکالی تھی۔ اس لمحے وہ سیاہ فام کو فراموش کر بیٹھا تھا اور فتح کے نشے میں ہاتھ پیروں سے مجنونانہ قسم کے اشارے کر رہا تھا۔ پھر اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''اسے قتل کرو۔ مار ڈالو، کل ہم......''

تماشائی دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک انسان پڑا تھا اور وہ دوسرے انسان سے اس کے قتل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھتا رہا۔ پھر اکڑتے ہوئے سیاہ فام تک پہنچا۔ چند لمحے پُرغرور نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا۔ سیاہ فام نے تڑپ کر اس کی ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈال دیا۔ ریڈ انڈین کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ اس کی جان سیاہ فام کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔ ریڈ انڈین ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس نے دو تین بار ہاتھ چلائے لیکن سیاہ فام اس کے ہاتھوں کی رسائی سے دور فرش پر پڑا تھا۔ اس نے اپنی ساری قوت ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔ اس نے بازوؤں کو اس طرح اکڑا لیا تھا کہ ریڈ انڈین بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسے داؤ میں پھنس گیا تھا کہ نکلنے کی صورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تین بار اس نے سیاہ فام کو ٹھوکریں مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اتنی پھسپھسی تھی کہ اسے ضرب کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ریڈ انڈین کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

اچانک سیاہ فام نے ہاتھوں کی پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ ایک زخمی درندے کی سی چیخ کے ساتھ ریڈ انڈین دیوار سے ٹکرایا اور نیچے گر پڑا۔ اب اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ سکے۔ اگلے ہی لمحے سیاہ فام اس کی پشت پر تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملا کر ریڈ انڈین کی گردن کے گرد لگائے اور گردن کو پیچھے کی طرف کھینچنے لگا۔ اگر ریڈ انڈین میں دم ہوتا تو وہ اسے اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہونے دیتا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور جسم نزع کی حالت سے تڑپنے لگا۔ سیاہ فام پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ ٹک گیا۔ اس کی اپنی حالت بُری تھی مگر وہ فاتح تھا۔

جیسے ہی اس کی فتح کا اعلان ہوا لوگوں نے چیخ چیخ کر ایک قتل پر اسے مبارک باد دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ خوش نہیں تھا۔ وہ خالی نظروں سے تماشائیوں کو دیکھتا رہا جو رِنگ میں نوٹ اور مختلف اشیاء پھینک رہے تھے۔ ایک شیخ کو میں نے اپنی قیمتی انگوٹھی اُتار کر پھینکتے ہوئے دیکھا۔ جس میں خاصا بڑا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ سیاہ فام اٹھ کر ان چیزوں اور نوٹوں کو جمع کرنے لگا۔ اس نے ناقابلِ یقین انداز میں بازی پلٹ کر لوگوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں لطف اٹھایا تھا۔ رِنگ کے سلائیڈنگ ڈور کھلے۔ ان میں سے کچھ افراد برآمد ہوئے۔ ریفری نے آ کر سیاہ فام کا بازو ہوا میں بلند کیا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا اور لڑکھڑاتا ہوا جس سوراخ سے آیا تھا اس سے واپس چلا گیا۔ اب رِنگ کی صفائی کی جا رہی تھی۔ بعض لوگ اسٹریچر پر ریڈ انڈین کی لاش





لے جا رہے تھے اس کی ٹوٹی ہوئی گردن کے باعث سر بے ڈول طریقے سے حرکت کر رہا تھا۔ دوسرا عملہ رِنگ کی صفائی ستھرائی میں لگ گیا۔ انہوں نے فرش سے خون صاف کیا۔ ایک شخص کو میں نے زمین سے ریڈ انڈین کی کٹی ناک کا حصہ اٹھاتے دیکھا۔ جو سیاہ فام نے دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ بہ مشکل پون گھنٹے میں یہ سارا تماشا ختم ہو گیا۔

''کیا یہ سلسلہ جاری رہے گا ابھی؟'' میں نے خاصی دیر بعد جان گرے کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''ہاں آج دو مقابلے اور ہوں گے۔'' اس نے سر ہلایا اور اپنی ساتھی لڑکی سے بولا۔ ''ہنی کچھ پینے کے لیے لاؤ۔''

ہنی لہراتی بل کھاتی اٹھی اور جان بوجھ کر مجھ سے اپنے نرم و گداز وجود کو ٹکراتی کیبن سے باہر چلی گئی۔ رِنگ میں نئے مقابلے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ معاً میری نگاہ چھت پر لگے کیمروں پر گئی۔ دور سے کنٹرول کیے جانے والے یہ کیمرہ چھ مختلف زاویوں سے رِنگ کو دکھا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رِنگ کی دیواروں اور کچھ مقامات پر بھی کیمرے ہوں گے۔

''تم لوگ ان مقابلوں کی مووی بھی بیچتے ہو؟''

''ہاں۔'' جان گرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کے علاوہ ہم اسے لائیو ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں۔ دنیا کے بے شمار حصوں میں ہمارے مخصوص نائٹ کلبوں میں ان مقابلوں کو دکھایا جاتا ہے۔ لوگ ان پر شرطیں لگاتے ہیں۔''

''بکی تم ہوتے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔ ''طے شدہ فائٹس کراتے ہو۔''

''نہیں کوئی شخص اپنی زندگی کے عوض مقابلہ فکس نہیں کرتا۔'' وہ بولا۔ ''البتہ ہمارے پاس کچھ اور طریقے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم شرطوں میں نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔''

''میرے خدا کیا دنیا والوں کو یہ سب نظر نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ اتنی دلیری سے اتنے انسانیت سوز کام کر رہے ہو۔ انسانیت کے نام نہاد علم بردار کیا کر رہے ہیں؟''

''انسانیت کے علم بردار۔'' جان گرے نے قہقہہ مارا۔ ''یہ کس چڑیا کا نام ہے اور یہ کہاں پائی جاتی ہے۔''

''اسی دنیا میں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''انہیں صرف وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں سیاست میں نہیں پڑتا۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔ ''یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ ہم تو بس لوگوں کو تفریح فراہم کرتے ہیں۔''

''اس قسم کی تفریح۔'' میں نے رِنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔ ''جلد تم دیکھو گے۔ اس جگہ پر

ایک بین الاقوامی قسم کا کیسینو ہے۔ جہاں صرف کروڑ پتی اور ارب پتی افراد ہی کھیلتے ہیں۔ ہم نے اس جزیرے کو جنت بنا دیا ہے۔ یہاں دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کی حسین ترین لڑکیاں ملتی ہیں۔"

"دلالی کے اس کاروبار کو تم تفریح کا نام دیتے ہو۔"

"یہ تو سوچ کا فرق ہے۔ اگر تم مشرق والے ایسی سوچ نہیں رکھو گے تو اسی طرح پسماندہ رہو گے۔ دیکھو جب تک انسان کو اپنی کمائی گئی دولت خرچ کرنے کی آزادی نہیں ملے گی وہ دولت نہیں کمائے گا۔ دنیا کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو آزادی ملے۔"

"جنگل کی سی آزادی۔" میں نے طنز کیا۔ "جہاں طاقتور سب کرنے کے لیے آزاد ہیں اور کمزوروں کو صرف مرنے کی آزادی حاصل ہو۔"

"دنیا کا فلسفہ یہی ہے، ہمیشہ سے۔"

"پھر اتنے مذاہب اور اتنے سماجی مصلح کیوں سامنے آئے۔ آج بھی دنیا کی اکثریت اچھائی پر یقین کیوں رکھتی ہے؟"

وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "اور عملاً دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیا یہاں جنگل کا قانون نہیں ہے۔"

"ایسا صرف چند لوگوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے طاقت کے بل پر دنیا پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو یہ چند لوگ چاہتے ہیں۔"

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ تمام اصول اور قواعد ایک طرف، ہوتا وہی تھا جو بڑی طاقتیں چاہتی تھیں۔ رِنگ میں دوسرا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس بار ایک تھائی کِک باکسر ایک جاپانی جوڈو ماسٹر سے مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں الگ انداز کے لڑاکے تھے لیکن اس رِنگ میں اہمیت لڑنے کے انداز کی نہیں بلکہ فنا و بقا کی رہ جاتی تھی۔ ہار سے بچنے اور فتح کے لیے ہر حربہ جائز تھا۔ جلد ہی دونوں لڑاکے اپنے اصل انداز کو بھول کر ایک وحشیانہ جدوجہد میں اُلجھ گئے تھے۔ میرے ذہن میں ان فلموں کے مناظر روشن ہو گئے جو پُرانے رومن دور پر بنائی گئی تھیں تقریباً ہر فلم میں ان خونی اکھاڑوں کو ضرور دکھایا گیا تھا۔ جہاں انسان اور جانوروں کے درمیان فنا و بقا کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ انسان، انسان سے برسرِ پیکار ہوا کرتے تھے۔ اکھاڑوں کی سرزمین انسانی خون سے لالہ زار ہو جایا کرتی تھی اور وحشی رومن اس سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس پر بھی ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مہذب قوم تھے۔ بالکل اسی طرح دورِ جدید کی مہذب قومیں اپنی تہذیب کی جھلک نت نئے انداز میں دکھایا کرتی ہیں۔ یہ بھی ان کے مہذب ہونے کا ثبوت تھا۔

بالآخر تھائی کِک باکسر، جوڈو ماسٹر کے ایک داؤ پر آ گیا اور اپنا ٹخنہ تڑوا بیٹھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ جوڈو ماسٹر کے لیے آسان تھا۔ ایک اور آدمی زندگی ہار گیا تھا۔ فتح انسان کے نہیں موت کے حصے میں آئی تھی۔ لوگ دیوانے ہو گئے تھے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوتا ہے جو اس خونریزی کا تقاضہ کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس تقاضے کو خود پورا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا





وہ خون بہتا دیکھ کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔ یہاں زیادہ ایسے ہی لوگ تھے، جن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی سے لڑ کر اور اسے شکست دے کر اپنی حیوانی فطرت کی تسکین کرتے۔ لہٰذا وہ رقم خرچ کر کے یہ تسکین حاصل کر رہے تھے۔ یہ بزدل لوگ تھے جو اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے لہٰذا یہ دوسروں کو لڑاتے تھے۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر وحشیانہ تسکین کرنے آئے تھے۔

تماشائیوں میں ہر نسل اور ہر قوم کے افراد نظر آ رہے تھے۔ ان میں عماموں اور عباؤں والے عرب بھی تھے۔ سوٹ پوش مغربی باشندے بھی، سیاہ بھی اور زرد نسل کے لوگ، برصغیر کے بھی کچھ لوگ نظر آ رہے تھے لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہو سکتا تھا لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی وہ بے انتہا دولت رکھتے تھے اور اس کے بل بوتے پر اپنے اندر کے حیوان کو مطمئن کرنے آئے تھے۔ حیران کن بات تھی کہ ہال میں جتنے مرد تھے تقریباً اتنی ہی عورتیں بھی تھیں اور وہ ذوق و شوق سے یہ خون ریز مقابلے دیکھ رہی تھیں۔ جب مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے پر وحشیانہ حملے کرتے تھے تو ان کے منہ سے مسرت بھری چیخیں برآمد ہوتی تھیں۔ اگلی نشستوں پر اکثر عورتیں تھیں۔ خود ہمارے ساتھ جو قیامتیں بیٹھی تھیں۔ وہ مقابلہ شروع ہوتے ہی ہمیں بھول جاتی تھیں۔ مقابلے کے دوران ان کا جوش و خروش قابلِ دید ہوتا تھا۔ قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ اس دوران جینا کم سے کم مجھے بھول جاتی تھی اور میں اس کی دست درازیوں سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

اب آخری مقابلہ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ مقابلہ اہم ترین ہو گا۔ اس قسم کے مقابلے سب سے آخر میں رکھے جاتے تھے۔ سب سے پہلے ایک لمبا تڑنگا سانولے رنگ کا نوجوان رِنگ میں آیا۔ اس کے سر کے بال حبشیوں کی طرح سخت گھنگریالے تھے اس کے نقوش دلکش تھے اور جسم کسرتی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی زندگی جدوجہد و مشقت میں گزری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شمالی افریقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سادہ سی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔

"یہ احمد بربری ہے۔" جان گرے نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ ہمارا مجرم ہے۔"

"مجرم۔" میں چونکا۔ "کیا کیا ہے اس نے؟"

"یہ ایک مستند بین الاقوامی دہشت گرد ہے۔ اس کا تعلق الجزائر کی اسلامی تحریک سے ہے۔ وہاں یہ حکومت کو کئی دہشت گردی کی وارداتوں میں مطلوب ہے۔ یہ الجزائر سے بھاگ کر فرانس چلا گیا اور وہاں دہشت گردی کے ایک بین الاقوامی نیٹ ورک کے لیے کام کرنے لگا۔ بحرہ روم میں اس نے ہمارے مفادات کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ ہمارے ہاتھ آیا۔ ہم نے اس جگہ لا کر اس پر مقدمہ چلایا اور اسے سزائے موت سنا دی۔ اسے ایک موقع دیا ہے کہ وہ یہ

مقابلہ جیت کر سزائے موت سے بچ سکتا ہے مگر یہ بچے گا نہیں۔'' جان گرے کے لہجے میں اس کے لیے نفرت تھی۔

''تم لوگ کسی کو سزائے موت دینے والے کون ہوتے ہو؟''

''ہم طاقتور ہیں، اس لیے ہم یہ اختیار رکھتے ہیں۔'' اس نے غرور سے کہا۔ ''ہم اپنے مجرموں کو......''

''مخالف کہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''چلو مخالف ہی سہی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ان مخالفوں کو ہم نشانِ عبرت بنا دیں گے تاکہ آئندہ کوئی مخالفت کی جرأت نہ کرے۔''

''یہ خوش فہمی ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''جبر کے خلاف مزاحمت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اپنے مخالفوں سے نجات حاصل کر سکتے ہو کہ مخالفین کو ختم کر دو۔''

''وقت آنے پر ہم ایسا بھی کریں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''فی الحال تو اس کا عبرت ناک انجام دیکھو۔''

میں نے احمد بربری کی طرف دیکھا تو میرے اندر سے بے اختیار صدا نکلی کہ اس نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے۔ اتنی خوب صورت جوانی کو مٹی میں نہیں ملنا چاہیے۔ اس لمحے رنگ کے دوسرے دروازے سے ایک دیو نمودار ہوا۔ قد و قامت کے لحاظ سے ایک دیو ہی کہنا چاہیے۔ اس کا قد سات فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ پہاڑ جیسا جسم لیکن سر جسم کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ اس نے چہرے پر مختلف رنگ اس انداز میں کر رکھے تھے کہ اس کا چہرہ شیطان جیسا لگ رہا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے جسامت اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس نے چمڑے کی سیاہ پتلون اور بنیان پہن رکھی تھی جس میں اس کے جاندار پٹھے ظاہر تھے۔ مجھے وہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ جان گرے نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے جھک کر کہا۔

''یہ ایول (شیطان) ہے۔''

''وہ تو شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اب اسے پہچان گیا تھا۔ وہ آج سے تین چار سال پہلے تک امریکن ریسلنگ کا جانا پہچانا نام تھا۔ اس نے کوئی بیلٹ بھی حاصل کی تھی لیکن پھر اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ مقابلے کے دوران اداکاری بھول کر سچ مچ مخالف سے لڑنے لگتا تھا۔ اس نے کئی بار حریف پہلوان کو شدید زخمی کر دیا اور ایک پہلوان کو تو تقریباً مار ہی دیا تھا۔ اس کے بعد اس پر پابندی لگا دی گئی تھی اور وہ منظر سے غائب ہو گیا۔

''ہم نے اسے ہائر کر لیا۔'' جان گرے بولا۔ ''اب یہ ہمارے لیے لڑتا ہے لیکن ہر مقابلے میں شامل نہیں ہوتا بلکہ اسے صرف خاص مقابلوں کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ عام طور سے یہ ہمارے مخالفوں سے مقابلہ کرتا ہے اور انہیں عبرت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔





اب تک اس نے پندرہ مقابلے کیے ہیں اور سب میں فاتح رہا ہے۔''

اس دیو قامت شیطان کو دیکھ کر احمد بربری کے چہرے پر خوف تو ایک طرف فکر کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ وہ سکون سے پاؤں پھیلائے کھڑا تھا۔ اپنے لمبے تڑنگے وجود کے باوجود ایول کے سامنے بچہ لگ رہا تھا۔ جو اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں سے اس گھور رہا تھا۔ ایول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسس پی کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں ہمیشہ سے نسل پرستی کا زور رہا ہے۔ ایول کا خاندان بھی زبردست نسل پرست رہا اور اس کا باپ نسل پرست تنظیم کو کسی کلان کس کا علاقائی لیڈر تھا۔ ٹرپل کے کہلانے والی اس دہشت گرد جماعت کی تاریخ سو سال پر محیط تھی۔ نظریاتی طور پر اس نے اس وقت ہی جنم لے لیا تھا۔ جب امریکی صدر ابراہام لنکن نے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ غلاموں کے خلاف اس تنظیم نے طویل عرصے تک دہشت گردی جاری رکھی تھی۔

ایول کا باپ ایک حملے میں مارا گیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ فاموں کی ایک بستی پر حملہ کرنے گیا تھا۔ جوابی فائرنگ سے وہ اپنے ساتھیوں سمیت جہنم رسید ہوا تھا۔ اس پر چراغ پا نسل پرستوں نے علاقے میں قیامت ڈھا دی تھی۔ ایول بھی اپنے باپ کی موت سے متاثر ہوا تھا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ ہر غیر سفید فام سے اپنے باپ کی موت کا انتقام لیتا رہے گا۔ آوارہ گردی، بدمعاشی اور نسل پرست گروہوں سے ہوتا وہ بالآخر ریسلنگ کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ بالآخر اسے یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

''ایول ہمارا بہترین کارکن ہے۔'' جان گرے نے فخر سے کہا تھا۔

بلاشبہ شیطان کے لیے ایسے ہی کارکن بہترین تھے۔ ایول زبان اور جسم سے اپنے عزائم کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ کس طرح احمد بربری کو موت کے گھاٹ اُتارے گا۔ اس کی لاف گزاف سن کر وہاں موجود لوگوں کے چہرے سفید ہو گئے تھے لیکن احمد بربری کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ وہ مضحکہ اُڑانے والی نظروں سے ایول کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رنگ میں کوئی ایسا بندوبست تھا کہ وہاں ہونے والی معمولی سی آہٹ بھی پورے ہال میں سنائی دیتی تھی۔ ہم بھی ایول کی گفتگو سن رہے تھے جس کا اکثر حصہ صرف بالغان کے لیے تھا۔ آخر میں اس نے حقارت سے احمد بربری کی طرف دیکھا۔

''تو کیا کہتا ہے کیڑے؟''

''صرف اتنا کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے اور بھونکنے والے کتے کاٹ نہیں سکتے۔'' وہ سکون سے بولا۔

تماشائیوں کی طرف سے قہقہے بلند ہوئے تھے۔ اس کے ایک جملے نے فضا بدل دی تھی۔ ایول کے حلق سے بے معنی سی آوازیں نکلیں اور وہ احمد کی طرف بڑھا۔ حالانکہ ابھی گھنٹی نہیں بجی تھی لیکن چالاک منتظمین نے فوراً ہی گھنٹی بجا دی تھی۔ تاکہ ایول کا ٹیمپو برقرار رہے۔ ایول کے حرکت میں آتے

ہی احمد بربری رِنگ میں آہستہ آہستہ اُچھلتے ہوئے چکر لگانے لگا۔

"آ کتے، اگر تمہارے منہ میں دانت ہیں تو مجھے کاٹ کر دکھاؤ۔"

اس جملے نے ایول کو پاگل کر دیا۔ وہ اندھے بیل کی طرح اس کی طرف دوڑا۔ احمد بربری سکون سے کھڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک طرف ہو جائے گا۔ اس کے بجائے اس نے سلپ ہو کر ایول کی ٹانگوں سے ٹانگ پھنسائی اور پیچھے کی طرف رول کر گیا۔ ایول دوگنی رفتار سے منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون کے ساتھ گالیوں کا فوارہ بھی نکلا تھا۔ احمد بربری نے اس پر حملہ نہیں کیا، بلکہ اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ رِنگ میں چکر لگاتے ہوئے اس نے دوبارہ جملہ کسا۔

"میرا خیال ہے تمہاری ماں روسی نسل کی کتیا تھی۔ اس وجہ سے تمہارا سر چھوٹا رہ گیا۔"

ایول اٹھ کر ایک بار پھر اس کی طرف لپکا۔ احمد بربری پیچھے ہٹا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے جیسے اسے ہاتھوں سے روکنا چاہ رہا ہو۔ "مارا جائے گا۔" میں نے دل میں کہا۔ ایک بار اس دیو کے قبضے میں آ گیا تو اس کی بچت ممکن نہ رہتی لیکن اس نے ایک بار پھر حیران کن داؤ آزمایا تھا۔ ایول کی ساری توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف تھی لہٰذا وہ اس کے پاؤں کو اٹھتے اور اپنی ناف کی طرف آتے نہ دیکھ سکا۔ اس کی رفتار نے وار کی قوت دوگنی کر دی تھی۔ وہ دھاڑ کر پیچھے جا گرا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وار بھرپور تھا اور بالکل درست جگہ پر لگا تھا۔ اگر ایول کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید مر جاتا لیکن وہ صرف نام کا شیطان نہیں تھا بلکہ اس کے وجود میں بھی شیطانی قوت بھری تھی۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں احمد بربری نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

"یہ تو ہمارے اندازے سے زیادہ تیز ہے۔" اس نے زیرلب کہا۔

"افسوس کہ تم لوگ ہمیشہ غلط اندازے لگاتے ہو۔" میں نے تبصرہ کیا جس پر اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

میں مسکراتے ہوئے مقابلے کو دیکھ رہا تھا اور میری تشویش خاصی حد تک کم ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایول اب اس نوجوان پر آسانی سے قابو نہ پا سکے گا۔ ایول تیسری بار اندھا دھند حملہ آور ہوا اور احمد بربری نے یہ حملہ بھی با آسانی ناکام بنا دیا تھا۔ اس کے بعد ایول محتاط ہو گیا۔ اب وہ احمد بربری کو گھیرنے کی فکر میں تھا۔ وہ مخصوص انداز میں اُچھلتا ہوا رِنگ کے چکر لگا رہا تھا۔ ایول کی مغلظات کے جواب میں وہ جملے کس کر اسے طیش دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایول غصے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاصا زخمی تھا اور نازک جگہ پر شدید ضرب کھا چکا تھا لیکن یہ چوٹیں اسے زیادہ دیر نہیں روک سکتی تھیں۔ احمد کو اس پر فیصلہ کن ضرب لگانی چاہیے تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے دو بار زمین بوس ایول کو رعایت دی تھی۔ شاید وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ یہ ایک بے اصول مقابلہ تھا۔ جس میں کسی قسم کے اخلاق کی گنجائش نہیں تھی۔ حریف کو ہر قیمت پر کسی بھی طریقے سے




موت کے گھاٹ اُتارنے کا سوال تھا۔ اگر ایول کو موقع مل جاتا تو وہ اسے کسی قسم کی رعایت نہ دیتا اور فی الفور اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کرتا۔

ایول رفتہ رفتہ احمد کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ بہ ظاہر احمد اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بالکل غیر متوقع طور پر وہ حملہ آور ہوا۔ اس نے فلائنگ کِک کے انداز میں اُچھل کر دونوں پیر جوڑ کر اس کے پیٹ میں مارے۔ ابھی وہ پہلی تکلیف سے ہی نہیں سنبھلا تھا کہ یہ دوسری قیامت اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ زمین پر تڑپتا ہوا اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ احمد ایک بار پھر سکون سے کھڑا ہو گیا۔ جان گرے نے کہا۔ "لعنت ہو۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی نشست کے نچلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک لمحے کے لیے گونجنے والی سیٹی نما آواز سنی۔ آواز گونجتے ہی ایول چونک گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اب بھی پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے جان گرے سے پوچھا۔ "یہ آواز کیسی تھی؟"

"کون سی آواز؟" اس نے معصومیت سے کہا۔

"یہی سیٹی جیسی آواز جو ایک لمحے کے لیے گونجی تھی۔"

"معلوم نہیں۔ میں نے تو نہیں سنی۔ شاید ساؤنڈ سسٹم میں کوئی خرابی ہوئی ہو گی۔"

لیکن مجھے یقین تھا کہ ساؤنڈ سسٹم میں کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کوئی نہ کوئی چکر تھا۔ کوئی اشارہ یا پیغام تھا۔ ایول کے لیے۔ ورنہ وہ اس آواز کو سن کر کیوں چونکتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے رِنگ کی دیوار کی طرف سرک رہا تھا۔ شاید وہ کسی داؤ کی فکر میں تھا۔ میرا ذہن سیٹی کی آواز میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس لیے میں نہیں دیکھ سکا کہ کیا ہوا تھا۔ مجھے احمد بربری کی چیخ نے چونکا دیا۔ احمد کے بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا اور ایول کے ہاتھ میں فٹ بھر لمبی نوکدار فولادی سلاخ تھی۔ اس نے اس سے احمد پر حملہ کیا تھا۔ وہ بازو دباتے پیچھے ہٹ رہا تھا کہ ایول نے دوسرا وار کیا اگر احمد پھرتی نہ دکھاتا تو سلاخ اس کے دل میں اُتر جاتی اس کے باوجود اس کی پسلی زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ بے ایمانی ہے۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔ "اس کے پاس سلاخ کہاں سے آئی؟"

"مجھے کیا معلوم۔" جان گرے نے بے پروائی سے کہا۔ "ممکن ہے تماشائیوں میں اس کے کسی ہمدرد نے اسے دے دی ہو۔ اب اس کا کام آسان ہو گیا ہے۔"

"اس کا نہیں تمہارا کام آسان ہو گیا ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "سلاخ اسے رِنگ سے ملی ہے اور اس کا تعلق سیٹی کی آواز سے ہے۔ کسی میکنزم کے ذریعے رِنگ میں کوئی خفیہ خانہ کھل جاتا ہے اور ایول کو معلوم تھا کہ اسے سلاخ کہاں سے حاصل کرنی ہے۔ سیٹی کی آواز اس کے لیے اشارہ تھی تم نے سیٹی کا بٹن دبایا تھا ناں؟"

"ہاں۔" اس نے بے ساختہ کہا پھر گڑبڑا کر بولا۔ "تم جو چاہو سمجھو۔"

میں نے رنگ کی طرف دیکھا۔ ایول کے وار نے احمد کے دوسرے ہاتھ کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ شاید اس نے ہاتھوں سے اس کے وار کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ خون بہنے سے اس کے انداز میں کمزوری آ گئی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر اس شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ اس پر غالب آ جائے گا اور پھر اسے مار ڈالے گا۔ نہیں اسے کسی قیمت پر نہیں مرنا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور جان گرے کی طرف دیکھا جو اب پوری دلچسپی سے رنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے حرکت میں آتے ہوئے جینا کو پیچھے دھکیلا۔ دوسری لڑکی ایک ہی ہاتھ میں بوتھ کے شیشے سے جا ٹکرائی اور بے سدھ ہوگئی۔ میں نے باآسانی جان گرے کو گردن سے قابو کر لیا۔

"اس سے پہلے کہ میں تمہاری گردن توڑ دوں۔" میں نے اس کا دایاں بازو مروڑ کر پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اس شیطان کو روک لو۔ ورنہ احمد بربری سے پہلے موت کا فرشتہ تمہیں لے جائے گا۔"

میری گرفت اس کی گردن پر اتنی سخت تھی کہ وہ سوائے تڑپنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کی تو اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ "تم بھیانک غلطی کر رہے ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں سب بھول جاؤں گا۔"

"لگتا ہے تم موت کو بھول گئے ہو۔" اس بار میں نے دباؤ اتنا بڑھایا کہ اس کی آنکھیں اُبلنے لگی تھیں۔ اس نے پھر جلدی سے سر ہلایا لیکن مجھ سے ایک بنیادی غلطی ہو چکی تھی۔ میں نے جینا کو دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی غلطی میرے لیے مہلک ثابت ہوئی تھی۔ میں نے دوسری بار سر ہلانے پر جان گرے کی گردن پر گرفت ذرا ڈھیلی کی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے بہ مشکل تیس سیکنڈ کے لیے اس کی گردن دبائی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اسے سال بھر بعد سانس لینے کا موقع ملا ہو۔

"جلدی کرو، ورنہ اس بار میں گردن دبانے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی لمحے میرے سر سے کوئی سخت چیز ٹکرائی اور ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں نے دھندلے سائے کی طرح ایول کو سلاخ بلند کرتے دیکھا۔ احمد بربری زمین پر گرا ہوا تھا اور نشانہ اس کا دل تھا۔ میں اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ دوسری ضرب نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔



بچپن میں مَیں نے ایک بار جمشید پیلس میں ملازموں کے بچوں کو عجیب سے کھلونے سے کھیلتا دیکھا تھا۔ انہوں نے ٹین کے ایک ڈبے میں کنکر بھر کر اسے جھنجھنا بنا لیا تھا۔ جب اسے ہلاتے تو بے پناہ شور بلند ہوتا تھا۔ یہ شور ایسا تھا کہ سیدھا دماغ کو جا کر لگتا تھا۔ اس وقت تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا سر ایک جھنجھنا ہو۔ اس میں کنکر بھرے ہوئے ہوں۔ میرے ذرا سے سر ہلانے پر ایسا شور اٹھتا کہ




خدا کی پناہ۔ میں سہم کر ساکت ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ شور میں کمی آنے لگی تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ دراصل درد تھا جو مجھے شور کی صورت میں پریشان کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں لیکن فوراً ہی بلند کر لیں۔ درد کی ایسی ہی لہر اٹھی تھی کیفیت ایسی تھی کہ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

بتدریج درد میں کمی آئی تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ یہ وہی کوٹھری تھی جہاں میں اور عبید صلاح مقیم تھے۔ ہم قید میں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ میرے سر میں درد کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ میرا سر زخمی تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔ رفتہ رفتہ تصویریں اُبھرنے لگیں۔ جان گرے مجھے یہاں سے لے گیا۔ نائٹ کلب...... بار...... ہال اور وہاں موجود بے شمار افراد وسط میں رنگ...... ایک بدصورت دیو اور ایک سجیلا نوجوان۔ مجھے سب یاد آنے لگا۔ بے اختیار میرا دل درد سے بھر گیا۔ وہ سجیلا نوجوان اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ظلم نے اسے مٹا دیا تھا۔ بدی نے نیکی پر غلبہ پا لیا تھا۔ مجھے جان گرے یاد آیا جو میری گرفت میں مچل رہا تھا۔ کاش کہ میں نے اس کی گردن توڑ دی ہوتی۔

کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "اب کیسے ہو؟"

میں چونکا۔ یہ عبید صلاح تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس پانی اور گولیاں تھیں اس نے کہا۔ "یہ کھا لو تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

میں نے اس سے گولیاں لے کر پانی کے ساتھ نگل لیں۔ "کیا ہوا تھا؟"

"معلوم نہیں۔ صبح کے قریب دو افراد تمہیں اٹھا کر لائے تھے۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔ بہرحال میں نے تمہیں زندہ پا کر ہی خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ مجھے تو اس کی امید بھی نہیں تھی۔ کیا انہوں نے تم پر تشدد کیا تھا؟"

"نہیں بلکہ میں نے اس خبیث جان گرے کی گردن دبائی تھی۔ یہ چوٹیں اس کا نتیجہ ہیں۔" میں نے سر ٹٹولا۔

"پوری بات بتاؤ۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

میں نے اسے نائٹ کلب اور رنگ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ احمد بربری کے بارے میں سن کر وہ چونکا۔

"میں نے اسے دیکھا ہے شاندار نوجوان ہے۔"

"تھا کہو میرے دوست۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ایول کو اس کے سینے میں سلاخ گھونپتے دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسی بے بسی کی موت مارا جائے گا۔" عبید صلاح نے کہا۔

"جب موت آتی ہے تو سب بے بسی سے مر جاتے ہیں۔" میں نے حقیقت بیان کی۔ "احمد

بربری بھی ایک انسان تھا۔ افسوس اس کی جوان مرگی کا ہے۔ حالانکہ موت نہ بوڑھا دیکھتی ہے نہ بچہ اور سب سے بڑھ کر وہ بُرے لوگوں کے ہاتھ مارا گیا۔"

احمد بربری کی موت نے ہم دونوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ عبید صلاح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یک دم اس نے سر اٹھایا اور غراتے ہوئے بولا۔ "اگر میں زندہ رہا تو اس کے قاتل میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکیں گے۔"

میرے پاس دعویٰ کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس جسارت کے بعد جان گُرے کا ردِعمل کیا ہوگا لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ میرے حق میں نہیں ہوگا۔ میں جان گرے کی کینہ پرور شخصیت کے بارے میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ صبح کے ناشتے میں ہمارے لیے دلیہ اور مچھلی آئی تھی۔ لگتا تھا کہ مقامی لوگ زیادہ تر مچھلی پر گزارا کرتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں باقاعدگی سے ماہی گیری بھی ہوتی ہوگی۔ اس صورت میں اتنے سارے لوگوں کی خوراک کی ضرورت پوری ہوسکتی تھی اوپری طبقے کے لوگوں کی خوراک بھی یقیناً اچھی ہوگی اور وہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔

عبید صلاح نے مجھے دردکش گولیوں کی ایک شیشی دی تھی جو مجھے لانے والوں نے عبید صلاح کو اس ہدایت کے ساتھ دی تھی کہ اس میں سے چار گولیاں ہر چھ گھنٹے بعد کھلانی ہیں۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ واحد روشن دان سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ دن کتنا چڑھ چکا ہے۔ میں نے اپنا جائزہ لیا۔ تین دن سے پہنی وردی میلی ہو چکی تھی اور پشت کی جانب اس پر خون کے دھبے بھی آ گئے تھے۔ جسم میل زدہ ہو رہا تھا۔ بے تحاشہ پسینہ آنے سے حالت اور بھی خراب لگ رہی تھی۔ شیو بڑھ آئی تھی اور سر پر پٹی بندھی تھی۔ غرض کہ میں اچھا خاصا تباہ حال لگ رہا تھا۔ البتہ دردکش گولیوں نے درد میں خاصی کمی کر دی تھی۔ اب اس کی موجودگی مجھے پریشان نہیں کر رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پستول کا خیال آیا۔ میں نے جھپٹ کر بستر کا کنارہ اٹھایا پستول وہاں سے غائب تھا۔

عبید صلاح نے مسکراتے ہوئے روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔ "میں نے احتیاطاً وہاں رکھ دیا تھا۔" میں نے بستر پر چڑھ کر روشن دان کی دیوار پر رکھا پستول اٹھایا اور اسے فوراً اپنے موزے میں اُڑس لیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہمارے سامنے والی کوٹھری خالی تھی اور پہرے دار بھی نصف گھنٹے کے بعد راؤنڈ لگا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب تک میری تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ تمام اشیاء میری جیب میں تھیں البتہ رات کسی نے میری کلائی کی گھڑی اُتار لی تھی اور عبید صلاح کے پاس گھڑی نہیں تھی لہٰذا ہمیں وقت کا اندازہ نہیں تھا۔

اب تک میں نے خود کو تقدیر کے سہارے چھوڑ رکھا تھا۔ میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر کاربند تھا لیکن احمد بربری کی موت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ خود مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر کوئی ایسا وقت آیا تو میں مرنے والوں میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ بلکہ




میرے ساتھ دو تین اور بھی جائیں گے۔ دوپہر کے وقت دوسری مرتبہ دردکش گولیاں کھا کر میری حالت تقریباً درست ہوگئی تھی۔ سر میں درد ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کھٹکا ہوا تو میں سمجھا کہ شاید کھانے والا آیا ہے لیکن دروازے پر نظر پڑتے ہی میں اُچھل پڑا تھا۔ وہاں جان گرے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم کمینے۔" میرے منہ سے گالیوں کا فوارہ نکلا تھا۔

جان گرے بدستور مسکراتا رہا جیسے میں اس کی مدح سرائی کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کرو وہاں جو ہوا مجھے اس کا افسوس ہے اگر تم......"

"کاش کہ میں پہلے تمہاری گردن توڑ تا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"یہ خواہش دل میں لیے بہت سارے لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔" وہ ہنسا۔ "بہرحال میں کہنے آیا ہوں کہ اب بھی وقت ہے تم سنبھل جاؤ۔ اگر تم ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری ساری خطائیں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ وہ حرام زادہ مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مجھے قزاق بننے کو بول رہا تھا۔ میں نے سرعت سے جھک کر موزے سے پستول نکالا اور جان گرے پر گولی چلا دی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ پیچھے جا گرا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ عبید صلاح نے کہا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"ایک کتے کا کام تمام کر دیا۔" میں نے محسوس کیا کہ میں جنون کا شکار ہو رہا تھا۔ "جو بھی آئے گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔" میں نے چلا کر کہا۔

"ہوش کر یوسف۔" عبید صلاح نے مجھے جھنجھوڑا۔ "وہ زندہ ہے۔"

مجھے جھٹکا سا لگا اور میں ہوش میں آ گیا۔ میرے کانوں نے جان گرے کی آواز سنی جو چیخ چیخ کر آنے والوں کو میرے مسلح ہونے کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے ڈیئر ڈان کی دھاڑ سنی۔

"کل دس باسٹرڈ۔"

میں نے عبید صلاح کو دھکیل کر دروازے کے ساتھ فٹ بھر کی دیوار سے لگا دیا۔ "یہاں سے ہلنا مت۔"

"خبردار۔" مجھے جان گرے کے چلانے کی آواز آئی۔ "اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"خاموش رہو۔" ڈیئر ڈان گرجا۔ "یہاں تمہارا حکم نہیں چلے گا۔"

"اس جزیرے کا ایک انچ بھی میرے حکم سے خالی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" جان گرے نے سرد لہجے میں کہا۔

"دیکھو گرے، میرے کام میں مداخلت مت کرو۔ تم مرتے مرتے بچے ہو۔ اس کے پاس

پستول کہاں سے آیا؟"

"میں نے دیا تھا۔" جان گرے کا لہجہ زہریلا تھا۔ "تاکہ یہ مجھے شوٹ کر سکے۔ اس کیمپ کے ذمے دار تم ہو۔"

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرے آدمی اسے کتے کی موت مار دیں گے۔"

"اسے زندہ پکڑنا ہے۔" جان گرے نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "یوسف پستول پھینک دو، ورنہ ہم اندر آنسو گیس کا گولہ پھینک دیں گے۔ تم دس منٹ میں چوہے کی طرح پکڑے جاؤ گے۔"

"میں ہتھیار نہیں پھینکوں گا۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"جان گرے دفع ہو جاؤ یہاں سے مجھے اس سے نمٹنے دو۔"

لیکن جان گرے دفع ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری اندھا دھند چلائی گولی شاید اسے لگی ہی نہیں تھی یا کسی ایسی جگہ لگی تھی کہ اسے زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ میں پستول سیدھا کیے پوری طرح چوکس تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گولی چلاتے ہوئے جھجکوں گا نہیں۔ عبید صلاح کا حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے پستول پھینکنے کو نہیں کہا تھا۔ اب جان گرے اور ڈیئر ڈان ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ ان کے ڈرامے کا مجھے اس وقت پتا چلا جب کسی نے روشندان سے چلا کر کہا۔ "پستول پھینک دو ورنہ....."

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ روشندان سے ایک نال جھانک رہی تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دو مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور انگلیاں ٹریگروں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔

"یوسف آخری وارننگ۔" جان گرے کی آواز آئی۔ "کیوں اپنے ساتھ دوسرے کو بھی مشکل میں ڈالتے ہو۔"

اس بات نے مجھے ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پستول نیچے کیا۔ اسے نالی سے پکڑا اور نیچے گرا دیا۔ روشندان سے آواز آئی۔ "ٹھوکر سے پستول کو سلاخوں سے باہر کر دو اور تم دونوں درمیان میں سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے لات مار کر پستول کو دروازے کی طرف سرکا دیا۔ عبید صلاح کونے سے نکلا۔ ہم دونوں سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوراً ہی دونوں گارڈز دروازہ کھول کر اندر گھس آئے۔ انہوں نے دھکے دے کر ہمیں کوٹھری سے باہر نکالا۔ جہاں ڈیئر ڈان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگر جان گرے نہ ہوتا تو ہمیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیا ہوتا۔ اس وقت بھی جان گرے نے اسے روک دیا۔ اسی نے گارڈز کو حکم دیا۔

"اس کی تلاشی لو اچھی طرح۔"





گارڈ نے ہماری یوں تلاشی لی کہ ہمارے پاس کوئی سوئی بھی ہوتی تو نہ چھپی رہتی۔

"انہیں باہر لے چلو۔" ڈیئر ڈان نے غرا کر کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا کہ میرے کیمپ میں گڑبڑ کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"تم ان کے ساتھ کچھ نہیں کرو گے۔" جان گرے نے سختی سے کہا۔ "اب ان کا معاملہ کونسل کے سامنے جائے گا۔"

"بھاڑ میں گئی کونسل۔" ڈیئر ڈان نے بھنا کر کہا۔ وہ خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس نے گارڈز کو حکم دیا کہ ہمیں واپس سیل میں بند کر دیا جائے۔ اسی دوران میں گارڈ سیل کے ایک ایک انچ کی تلاشی لے چکے تھے۔

"پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" جان گرے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں جہاز سے ہی ساتھ لایا تھا۔ راستے میں کسی نے تلاشی کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ لہٰذا پستول میرے پاس رہا اور مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ پستول ازخود حوالے کر دیتا۔ افسوس کہ میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔"

"تم نے کوشش تو کی تھی۔" جان گرے تلخی سے بولا۔ "میرا شکریہ ادا کرو کہ میں اب بھی تمہیں بچا رہا ہوں۔"

"شیطان کا کسی حال میں شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے۔" میں نے جواب دیا۔

"بکو مت۔" وہ غرایا۔ "جلد تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔ جب تم کو جزیرے کی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

"میں ایسی کسی عدالت کو نہیں مانتا۔ تم لوگ صرف دہشت گرد ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ کسی پر مقدمہ چلا کر اسے سزا دو۔ اپنے مکروہ عزائم پر خوش نما پردے مت ڈالو۔"

اچانک ڈیئر ڈان نے مجھے گھونسا مارا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے میں دھوکا کھا گیا۔ ہاتھ بے حد جاندار تھا۔ میرا منہ گھوم گیا۔ مجھے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ فوراً ہی دو گارڈز نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا۔ ڈیئر ڈان نے اپنی حسرت نکالنے کے لیے مجھے مزید گھونسے رسید کیے۔ خاص طور سے اس کے سینے پر مارے گئے گھونسوں نے میرے لیے سانس لینا محال کر دیا تھا۔ جان گرے نے مداخلت نہیں کی۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ ڈیئر ڈان کا غصہ بھی کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے۔ اس وقت وہ مجھے بچانا چاہتا تھا لیکن اس کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں میرے لیے ضرور کوئی منصوبہ تھا۔ جو بہرحال میرے مفاد میں نہیں تھا۔

"لے جاؤ ان کتوں کو۔" ڈیئر ڈان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ موٹاپے اور کثرت شراب نوشی نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ "ان کا کھانا اور پانی بند کر دو۔"

گارڈز ہمیں دھکیلتے ہوئے لائے اور سیل کے اندر دھکا دے دیا۔ میں بستر پر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے درد پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ پر شدید نوعیت کی مایوسی طاری تھی۔ اتنی بڑی ناکامی کے بعد یہ مایوسی فطری تھی۔ میں احمد بربری کو مرنے سے نہیں بچا سکا۔ ذرا سی عدم توجہی نے مجھے ناکام کر دیا۔ میں جان گرے کو مارنے میں ناکام رہا تھا۔ جذبات میں آ کر میں نے نہ صرف ایک اچھا موقع گنوا دیا تھا بلکہ اپنے واحد ہتھیار سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ اَب مجھے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ میں نے قزاقوں کے خلاف دو ایسی کارروائیاں کی تھیں جو اس جزیرے پر ان کے اقتدار کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک قیدی کی طرف سے ایسی جسارت کوئی حکومت برداشت نہیں کرتی ہے وہ تو پھر بھی قزاق تھے۔

''کمبخت بچا ہوا پانی بھی لے گئے۔'' عبید صلاح نے خالی ڈبے کی طرف دیکھا۔

''پانی کو چھوڑو یار...... مجھے تو اپنی عافیت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔''

''تم قنوطی ہو رہے ہو۔ ایسا کرو سو جاؤ۔ جب اٹھو گے تو دماغ تازہ ہو گا اور مایوسی کے خیالات غائب ہو چکے ہوں گے۔'' اس نے مشورہ دیا اور خود بھی بستر پر لیٹ گیا۔ ''میرا تجربہ ہے اگر کھانے پینے کو نہ ملے تو انسان کو سو کر وقت گزارنا چاہیے اس طرح بھوک پیاس کا احساس کم ہوتا ہے۔''

''سو کر ہم وہ وقت گنوا دیں گے جو اس مصیبت سے بچنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔''

''دوست مصیبت سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''کم از کم فوری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ پریشان ہونے کے بجائے سو کر وقت گزارو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔''

میں بستر پر دراز ہو گیا۔ عبید صلاح تو کچھ دیر بعد ہی خراٹے لینے لگا تھا۔ سو تو میں بھی سکتا تھا لیکن سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان معاملات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جان گرے کسی خاص وجہ سے مجھے جسمانی طور پر نقصان نہیں پہنچانا چاہتا ہے۔ جب ہم سفر کر رہے تھے تو اس نے مجھے اپنے کیبن میں بلایا تھا اور یہ بات کہی تھی کہ وہ میرے ماضی سے واقف ہے۔ اس نے یہ بات پورے یقین سے کہی تھی آخر اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک بے ماضی شخص تھا۔ میرا پس منظر مایوسی دھند آلود صبحوں جیسا تھا۔ میرے ماضی میں ایسی کیا بات تھی کہ جان گرے جیسا شخص اس میں دلچسپی لے رہا تھا اور میرے خیال میں اس دلچسپی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی یعنی دولت اب مجھے اپنی جذباتیت پر افسوس ہو رہا تھا اگر میں ذرا سی سمجھ سے کام لیتا تو جان گرے سے رعایتیں حاصل کر سکتا تھا۔ میں اس جیل سے نجات پا لیتا۔ میرے لیے ہاتھ پیر ہلانا تو ممکن ہوتا اب میں کوٹھری میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔



میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ ٹرک بالکل کار کی سیدھ میں آ رہا تھا۔ بریک لگانے کا





کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ٹرک تو نہیں رُک سکتا تھا۔ اب تصادم لمحوں کی بات تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس لمحے ڈرائیور نے کار لہرائی، طاقتور مرسڈیز کے انجن نے اسے لمحوں میں فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ میں اُچھل کر بائیں طرف دروازے سے جا ٹکرایا تھا۔ کار نے فٹ پاتھ کے ساتھ اُگی جھاڑیوں کو روند کر رکھ دیا تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو موت آئل ٹینکر کی صورت میں ہمیں چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ڈرائیور نے کار کو دوبارہ فٹ پاتھ سے اُتارا اور مہارت سے بریک لگا کر اسے قابو کر لیا تھا۔ جیسے ہی کار رُکی حسن علی نے جھپٹ کر ڈیش بورڈ کے خانے سے دوربین نکالی اور گھوم کر ٹرک کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے مایوسی سے دوربین پٹخ دی۔

''لعنت ہو۔ پلیٹ ڈھیلی کر دی۔ نمبر پڑھا ہی نہیں جا رہا ہے۔''

''ایک اور کوشش۔'' میں نے ہنس کر کہنا چاہا لیکن میری آواز لرز رہی تھی۔

''ظاہر ہے ٹرک جس انداز سے ہماری طرف آیا تھا اس سے تو یہی لگ رہا ہے۔'' حسن علی فکر مندی سے بولا۔ ''اتنے بڑے ٹرک شہر میں کبھی اس رفتار سے ڈرائیونگ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کی نمبر پلیٹ ڈھیلی ہوتی ہے۔ اگر ڈرائیور فٹ پاتھ پر نہ چڑھاتا تو اس نے ہمیں مار ہی دیا تھا۔''

مجھے ڈرائیور کا خیال آیا جو اسٹیئرنگ پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا بدن ابھی تک لرز رہا تھا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت سے کام لے کر ہمیں بچا لیا تھا لیکن یہ انکشاف اس کے لیے خوفناک تھا کہ کسی نے ہمیں جان بوجھ کر مارنے کی کوشش کی تھی۔ بوکھلاہٹ میں حسن علی کو بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے آئے ہوئے ابھی صرف چھ مہینے ہوئے تھے اور وہ بے چارہ دو ہفتے ہسپتال میں بھی گزار آیا تھا۔ اس کا خوفزدہ ہونا لازمی تھا۔

''چلو یار گاڑی چلاؤ۔'' حسن علی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

''مجھے تو معاف ہی رکھیں صاحب۔'' وہ بولا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میرے بعد میرے بیوی بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اس نوکری سے بھر پایا۔ مجھے نوکری سے فارغ کر دیں جناب۔''

''تو کیا یہیں فارغ کر دیں۔'' حسن نے جھلا کر کہا۔ ''گاڑی چلاؤ۔''

بادلِ نخواستہ ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی تھی۔ زبردست جھٹکوں اور جھاڑیوں کی رگڑ نے کار کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ شاید چند خراشیں آئی تھیں۔ اس کا انجن اسی طرح ہموار تھا لیکن ڈرائیور کا خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ حد یہ کہ اس نے سکول کے باہر مجھے چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ ''لو جی راستے میں کوئی اور ٹرک مل گیا تو میں نے تو مارا جانا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوتا یار۔'' حسن نے اسے تسلی دی۔

''آپ گاڑی لے کر جاؤ۔'' اس نے چابی حسن کو تھما دی۔ ''میں بس میں آ رہا ہوں۔''

"احمق وہاں کوئی بس نہیں جاتی۔"

"تو پیدل آ جاؤں گا۔ بھلے دیر لگے لیکن زندہ تو پہنچوں گا۔ آپ بڑے لوگوں کی لڑائی میں ہم غریب مارے جاتے ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ حسن کو طیش آ رہا تھا اور مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

"چلئے...... اچھی بات ہے۔ ڈرائیور بلاوجہ ہمارے ساتھ آتا تھا۔ اب آپ ہی ڈرائیونگ بھی کرلیا کریں۔"

میرے اس جملے پر حسن بھنا کر بولا تھا۔ "مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔ چاروں طرف دیکھنا پڑتا ہے۔"

"بشرطیکہ ماہ پارہ سامنے نہ ہوں۔" میں نے کہا اور جلدی سے سکول کی طرف بڑھ گیا۔

"برخوردار شام کو جمنازیم میں ملاقات ہوگی۔" حسن نے پیچھے سے پکار کر کہا تھا۔

اس شام حسن اور ماہ پارہ کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں مجھ پر ہونے والے حملوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر غور کیا گیا تھا۔ میں ایک سامع کی حیثیت سے میٹنگ میں شریک تھا لیکن مجھے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ طویل بحث کے بعد طے پایا کہ فی الحال میرا پیلس سے نکلنا بند۔

"جب تک جمشید صاحب نہیں آجاتے۔" ماہ پارہ بولیں۔

"مجھے سکول جانا ہوگا۔" میں نے احتجاج کیا۔ "پاپا نہ جانے کب آئیں۔"

"میں نے اطلاع کر دی ہے۔" ماہ پارہ نے میری طرف دیکھا۔ "وہ جلد آ رہے ہیں۔"

"اور سکول کا کیا ہوگا؟"

"تعلیم اہم ہے لیکن زندگی اس سے زیادہ اہم ہے۔ رہا پڑھنے کا تو تم گھر پر پڑھ سکتے ہو۔ کل سے تمہیں ٹیچر پڑھانے کے لیے پیلس آیا کرے گی۔"

اب میں آگے کیا کہتا میں پیلس میں قید ہو کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ میں پہلے ہی پیلس کی چار دیواری میں گزار چکا تھا۔ اب میں آزاد فضاؤں میں رہنا چاہتا تھا۔ جہاں کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ سکول میرے لیے آزادی کا مفہوم رکھتا تھا۔ عام بچے سکول جانے سے ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ گھر ان کے لیے پیار، تحفظ اور آزادی کا درجہ رکھتا ہے۔ میرے لیے معاملہ برعکس تھا۔ حالانکہ پیلس میں مجھے ہر قسم کی آزادی میسر تھی۔ ہر آسائش میری دسترس میں تھی۔ پیلس کی حد میں تفریح کے بے شمار سامان تھے۔ اس کے باوجود مجھے یہاں گھٹن اور پابندی کا احساس ہوتا تھا۔ میں باہر جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب مجھے سکول میں داخل کرایا گیا تو میں ذوق و شوق سے سکول جانے لگا۔ میں کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ میرا بس چلتا تو چھٹی کے دن بھی سکول چلا جاتا۔ اس کے علاوہ مجھے پیلس سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ پیلس جس علاقے میں تھا وہاں کے مکین ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی ساری دلچسپیاں ان کے گھروں میں انہیں




میسر تھیں۔ وہاں کے بچے بھی بچے نہیں تھے۔ وہاں گلیوں میں شام کے اوقات میں بھی شاذ و نادر ہی بچے نظر آتے تھے اور گلیوں، سڑکوں پر کھیلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پارکوں میں یا تو شیر خوار بچے ہوتے تھے جو اپنی آیاؤں کے ساتھ آتے تھے یا پھر بوڑھے جو چہل قدمی کے لیے نکل آتے تھے۔

پیلس کے دائیں طرف واقع ایک الگ چار دیواری کے اندر ناریل اور تاڑ کے درختوں سے گھرا وسیع و عریض اور حسین سوئمنگ پول تھا۔ یہ شکل میں دو جڑے ہوئے دلوں جیسا تھا۔ اس میں ہمہ وقت شفاف نیلا پانی جھلملاتا رہتا تھا۔ جسے ایک باقاعدہ سسٹم کے تحت صاف کیا جاتا تھا۔ چار دیواری میں ہونے کی وجہ سے پیلس کی خواتین بھی یہاں بے فکری سے سوئمنگ کیا کرتی تھیں۔ زہرہ بیگم اور ماہ پارہ اکثر تیراکی کے لیے سوئمنگ پول میں جاتی تھیں۔ مجھے تیراکی ماہ پارہ نے ہی سکھائی تھی جب میں پانچ سال کا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سوئمنگ پول لے جاتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت میں بچہ ہی تھا اس لیے انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے تیراکی سیکھنے میں حیرت انگیز تیزی دکھائی تھی اور چند مہینے میں پورے اعتماد سے تیراکی کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد جب بھی ماہ پارہ جاتی تھیں میں ان کے ساتھ ہی جاتا تھا۔ سات سال کی عمر تک انہوں نے مجھے اکیلے تیراکی نہیں کرنے دی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ماہ پارہ مجھے لے کر پول میں تیر رہی تھیں کہ اچانک جمشید علی وہاں آ گئے۔ ماہ پارہ کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئے تھے۔ غالباً انہیں علم نہیں تھا کہ پول میں ماہ پارہ تھیں۔ میرے "پاپا" چلانے پر ماہ پارہ چونکیں اور جمشید علی کو وہاں پا کر انہوں نے خود کو جلدی سے پول کی دیوار سے لگا لیا اور برہمی سے بولیں۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"سوری۔" جمشید علی شرمندہ ہو کر پلٹے۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تم ہو۔" وہ آگے بڑھے پھر روش پر رُک کر بولے۔ "ماہ پارہ تم بے حد حسین ہو۔" یہ کہتے ہی وہ وہاں سے چلے گئے اور ماہ پارہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نہ جانے حیا سے یا غصے سے۔ جب میں دس سال کا ہوا تو ماہ پارہ نے مجھ پر بھی پابندی لگا دی کہ میں ان کے ساتھ تیراکی نہیں کر سکتا۔

"لیکن کیوں؟" میں نے احتجاج کیا۔ "مجھے آپ کے ساتھ تیرنا اچھا لگتا ہے۔"

وہ ہنسیں۔ "اس لیے کہ اب تم بڑے ہو رہے ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں احمقانہ انداز میں بولا۔

"پاگل اب مجھے تمہارے سامنے سوئمنگ سوٹ میں شرم آتی ہے۔" ماہ پارہ جھینپ کر بولیں۔ "سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔" میں افسردہ ہو گیا۔ "لیکن آپ تو میری ماں ہیں۔"

"یوسف یاد رکھنا عورت سب سے زیادہ اپنے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کے سامنے شرماتی

ہے۔"

واقعی شرم کے رشتے تو یہی ہیں۔ ورنہ کسی اجنبی سے عورت کیوں شرمانے لگی۔ شرم کا تعلق احساس، جذبات اور تعلق سے ہوتا ہے اور کسی ناواقف سے ان میں سے کوئی چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ یہ احساس اور تعلق ہی ہے جو کسی عورت کو اپنے سے وابستہ کسی مرد سے شرمانے پر مجبور کرتا ہے۔

میری دیکھا دیکھی کاجل بھی سوئمنگ پول پر آنے لگی تھی۔ ایک بار اس نے کسی بات پر ضد میں آ کر پول میں چھلانگ لگا دی تھی اور ڈوبتے ڈوبتے بچی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے تیراکی سکھانا شروع کر دی تھی۔ ضد کی بات اور تھی لیکن اصل میں اسے پانی سے بے حد ڈر لگتا تھا اور میرے اصرار پر اس نے بہ مشکل تیراکی سیکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ کئی دن تک تو وہ صرف ڈوبنے کی مشق کرتی رہی اور شاید تیراکی سے تائب ہی ہو جاتی اگر زہرہ بیگم اس کے تیراکی سیکھنے پر پابندی نہ لگاتیں۔ اس نے خوب ہنگامہ کیا۔ کھانا نہیں کھایا سونے سے انکار کر دیا لیکن زہرہ بیگم بھی ڈٹ گئیں۔

"بے شک بھوکی مر جاؤ لیکن پول میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

لیکن زہرہ بیگم نے نرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر کاجل نے چالاکی سے کام لیا اور بہ ظاہر خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور جیسے ہی جمشید علی اپنے ٹرپ سے واپس آئے اس نے ان سے اجازت لے لی۔ اب زہرہ بیگم کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ سوائے چیخنے چلانے کے لیکن جمشید علی اسے اجازت دے چکے تھے۔ اس روز میں سہ پہر کو تیراکی میں مصروف تھا کہ وہ بڑی شان سے اکڑی ہوئی چلی آئی۔ "اب میں بھی سوئمنگ کروں گی۔" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"سوئمنگ کروں گی۔" میں نے اس کی نقل اُتاری۔ "پہلے اپنی مما سے تو اجازت لے لو۔"

"میں نے پپا سے اجازت لے لی ہے۔"

"مارے گئے۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "یعنی اب تم پھر سے ڈوب کر مرنے کی مشق کرو گی۔"

"میں تمہیں تیر کر دکھاؤں گی۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور پول میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ غوطے کھا رہی تھی۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے اسے سیدھا کیا اور اسے تیرنے کا سبق دینے لگا۔ اس بار اس نے حیرت انگیز کارکردگی دکھائی اور چند دن میں اچھی خاصی تیراکی سیکھ گئی۔ بعد میں وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ اس نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پانی میں مچھلی کی طرح پھرنے لگی تھی۔



پابندی لگنے کے اگلے روز سے ایک نوجوان استاد مجھے پڑھانے کے لیے آنے لگا۔ وہ سارے ہی مضامین میں مہارت رکھتا تھا اور مجھ سے جلد بے تکلف ہو گیا۔ مجھے اس سے پڑھنے میں




مزہ آنے لگا تھا۔ یہ شاید دسویں دن کی بات تھی۔ ماہ پارہ نے مجھے آگاہ کیا کہ آج رات جمشید علی پیلس آ جائیں گے۔ استاد شام کو آتے تھے۔ چھ سے آٹھ بجے تک پڑھانے کا وقت مقرر تھا۔ اس روز استاد شریف الدین آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا۔ یہ پتلا اور چوکور گتے کا ڈبہ تھا۔ جیسا کہ گھڑیوں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈبہ اپنے برابر میں رکھا اور مجھے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بیالوجی کے کچھ ڈائی گرام بنانے کو دیئے اور خود چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں خاموشی سے سر جھکائے کام میں مصروف تھا کہ مجھے ٹک ٹک کی آواز آنے لگی۔ آواز ڈبے سے آ رہی تھی اور شروع سے آ رہی تھی لیکن جب اسٹڈی روم میں خاموشی ہوئی تو یہ آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے کسی قدر تعجب ہوا کیونکہ عام طور سے گھڑیوں کی ٹک ٹک اتنی واضح نہیں ہوتی کہ سیل پیک ڈبے سے بھی صاف سنائی دے۔

"کیا بات ہے صاحبزادے؟" شریف الدین مجھے ڈبے کو گھورتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

"آپ کے اس ڈبے میں گھڑی ہی ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو گھڑی ہی لیکن میں نے اب تک دیکھی نہیں ہے۔ دراصل آج بلکہ ابھی جب تمہیں پڑھانے آ رہا تھا تب ملی تھی۔"

"ملی تھی کس سے اور آپ نے اسے دیکھا تک نہیں۔"

"جابر صاحب نے تحفے میں دی تھی کہہ رہے تھے کہ یہ پیلس کی روایت ہے کہ ہر نئے آنے والے فرد کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ گھڑی دی۔"

"پیلس میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔" میں نے ڈبے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "جابر نے آپ سے غلط کہا ہے۔ بہتر ہے آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔"

"کھول کر دیکھ لوں لیکن کیوں؟"

"مجھے یہ بات گڑبڑ لگ رہی ہے۔" میں بے چین ہو گیا۔ میں نے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پچھلے چند دن میں میرے ساتھ جو ہو رہا تھا اس نے مجھے زیادہ ہی محتاط بنا دیا تھا اور میں ذرا سی خلافِ معمول بات کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

"میاں صاحبزادے بہتر ہو گا کہ آپ اپنے کام کی طرف توجہ دیں۔" شریف الدین نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا لیکن میں ڈبہ اٹھا چکا تھا۔ اس کے وزن نے مجھے چونکا دیا تھا۔ کوئی گھڑی کسی صورت اتنی وزنی نہیں ہو سکتی ڈبے کا وزن ڈھائی تین کلوگرام کے آس پاس تھا اگر اس میں گھڑی نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟ اس میں ٹک ٹک کی آواز کیسی آ رہی تھی۔ یک لخت میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ڈبے میں کوئی چیز تھی میں نے ڈبا اٹھا لیا۔

"میاں اسے رکھو اور اپنا کام کرو۔" شریف الدین بولے۔

لیکن میں ان کی بات پر توجہ دیئے بغیر اسٹڈی سے تقریباً بھاگتا ہوا نکلا تھا۔ شریف الدین چلا

کر میرے پیچھے بھاگے تھے۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد عمارت سے نکل کر کھلے لان میں پہنچ جاؤں۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور کارنس سے چھلانگ لگا کر پاتھ وے پر آیا۔ وہاں سے ایک چھلانگ میں لان پر تھا۔ میں نے ہاتھ گھما کر ڈبہ پوری قوت سے لان کی طرف اُچھال دیا۔ ڈبہ ایک چھوٹے آرائشی درخت کے پیچھے جا گرا تھا۔ اسی لمحے شریف الدین سخت طیش میں وہاں آ پہنچے۔ اگر میں کسی متوسط گھر کا لڑکا ہوتا تو وہ بلا تکلف میری مرمت لگا دیتے لیکن میں جمشید پیلس کا لڑکا تھا مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں بہت کچھ سوچنا پڑتا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ ڈبے میں کوئی خطرناک چیز ہے۔" میں نے انہیں آگاہ کیا۔

"ذرا سے شبے کے پیچھے تم نے اچھی خاصی چیز برباد کر دی۔" وہ جھلا کر بولے اور لان میں آگے بڑھے۔

"سر اس کے پاس مت جائیں۔" میں نے انہیں خبردار کیا۔

لیکن وہ میری سنے بغیر زیرِ لب کچھ کہتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈبہ کسی درخت کے عقب میں جا گرا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چلا کر انہیں خبردار کیا مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں نے انہیں دور ہٹنے کو کہا۔ شریف الدین درخت کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ محض شبہ تو نہیں تھا لیکن جابر نے انہیں تحفہ کہہ کر یہ ڈبہ کیوں دیا تھا۔ اس لمحے سماعت شکن دھماکا ہوا۔ میں بے اختیار زمین پر گر گیا۔ ایک لمحے کو فضا جیسے دھماکے کی آواز سے بھر گئی تھی۔ پھر چیخوں کی اور شیشے ٹوٹنے کی آواز گونجی۔ کوئی شے دھپ سے آ کر میرے پاس ہی گری تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا میرے عین سامنے ہی شریف الدین مجھے گھورتے نظر آئے لیکن یہ سالم نہیں تھے بلکہ صرف ان کا سر تھا جو فضا میں اُڑتا ہوا میرے پاس آ گرا تھا۔ میں نے بے اختیار چیخ ماری اور ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس لمحے اوپر کی منزل سے بکھر جانے والے کھڑکیوں کے شیشے برسنے لگے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر پیچھے بھاگا۔ اس لمحے میں نے پورچ سے نیلی کار کو نکل کر گھر کی طرف پیلس کے مین گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر جابر بیٹھا تھا۔

"اسے روکو۔" میں نے چلا کر کہا لیکن وہاں کسی کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔ ملازموں میں چیخ و پکار مچی تھی۔ پیلس کے گارڈز بدحواسی میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے ایک کو روکا۔

"جابر کو روکو وہ بھاگ رہا ہے۔"

گارڈ نے مجھے دیکھا۔ "یوسف بابا آپ زخمی ہیں آپ اندر چلیں۔"

"جابر کو روکو دھماکا اسی نے کیا تھا۔"

"آپ اندر چلیئے۔" گارڈ مجھے بازو سے کھینچتا ہوا بولا اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

یک دم میں نے جسم ڈھیلا چھوڑا تو گارڈ جو پوری قوت سے مجھے کھینچ رہا تھا۔ سنبھلنے لگا اور مجھے





لیے فرش پر جا گرا۔ میں نے پھرتی سے اس کی رائفل چھینی اور مین گیٹ کی طرف بھاگا۔ پورچ کا راستہ طویل تھا۔ میں لان والا حصہ عبور کر کے بھاگ رہا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ مین گیٹ کے گارڈز اُسے جانے نہ دیں لیکن جب میں لان اور گیٹ وے کے درمیان لگی باڑھ پھلانگ رہا تھا تو اس کی کار گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ "اسے روکو جانے نہ دو۔"

مگر نیلی کار نکل چکی تھی۔ میں گیٹ کی طرف بھاگا۔ گارڈز اسے بند کرنے والا بٹن دبا چکے تھے۔ یہ گیٹ برقی طریقے سے کھولے اور بند کیے جاتے تھے۔ اس سے پہلے کہ گیٹ پوری طرح بند ہوتے میں ان سے باہر نکل گیا۔ گارڈز میرے پیچھے لپکے اور میں مایوسی سے نیلی کار کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی آگے جا چکی تھی کہ اس پر فائر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لمحے کسی نے میرے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ یہ حسن علی تھا۔ اس نے تشویش سے مجھے دیکھا۔

"اندر چلو، تم زخمی ہو۔"

"جابر کو پکڑیں یہ بم اس نے دیا تھا۔"

"اندر چلو۔" حسن علی نے مجھے کھینچا۔ "اندر سکون سے چل کر بات ہوگی۔" اس نے محافظوں کو دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ اگلے نصف گھنٹے میں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ زخم شیشے ٹوٹنے سے آئے تھے۔ گرم دودھ پیتے ہوئے میں نے حسن علی کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس نے جابر کا نام لیا تھا؟" وہ مشکوک انداز میں بولا۔

"میرے یقین کو آپ گولی ماریں۔ یہ بتائیں کہ دھماکہ ہوتے ہی جابر کیوں نکل بھاگا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

حسن علی سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جابر جیسا شخص اتنی احمقانہ حرکت کرے گا۔"

"جب وقت پڑتا ہے تو جابر سے زیادہ عقلمند لوگ اس سے زیادہ احمقانہ حرکتیں کر جاتے ہیں۔ مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"استادِ محترم۔" میں نے طنز کیا۔ "آپ اتنے بھولے نہ بنیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کو بھی اس پر شک ہے مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے۔"

"اس نے اس طرح فرار ہو کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس کے خلاف واحد گواہ یعنی شریف الدین تو اس حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔"

"اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لان میں دھماکا ہونے اور مجھے زندہ پا کر اسے یہی شک ہوگا کہ شریف الدین بھی بچ گئے ہیں اور اس نے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی ہوگی۔"

"اگر اسے معلوم ہو گیا کہ شریف الدین مر چکا ہے تو وہ واپس آ جائے گا۔" حسن علی نے کہا۔

"اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"درست ہے یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ہاں ابھی پولیس تم سے بیان لے گی تو تم اتنا بتاؤ گے کہ تم اپنے استاد کو چھوڑنے باہر تک آئے تھے۔ اس کے بعد وہ لان کی طرف چلے گئے جہاں دھماکا ہو گیا۔ تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے سر ہلایا۔ شریف الدین کی اچانک موت نے مجھے دُکھی کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ میری طرف آنے والی موت کو وصول کرتے رہیں گے۔ پہلے امیر خان اور اب شریف الدین دونوں میری وجہ سے مارے گئے۔ حسن علی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ٹیک اٹ ایزی یوسف اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تقدیر اسے ہی کہتے ہیں۔"

"میری ہی تقدیر ایسی کیوں ہے؟" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے سب کی تقدیر ایسی نہیں ہو سکتی۔" حسن علی نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ایک مشک جیسی توند والے تھانیدار نے آ کر مجھ سے بیان لیا اور اس نے نہ تو اس پر کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی مجھ سے کوئی سوال کیا۔ غالباً اسے پہلے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ طبی عملہ آ کر شریف الدین کی لاش کے ٹکڑے سمیٹ کر لے گیا تھا۔ خوش قسمتی سے کسی اور کو خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ مجھ سمیت بعض لوگ زخمی ہوئے تھے لیکن وہ شیشے ٹوٹنے سے زخمی ہوئے تھے۔ بم کا واحد شکار بدنصیب شریف الدین تھے اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ مجھ پر ہونے والے تمام قاتلانہ حملوں اور اغوا کی کئی کوشش میں جابر ملوث تھا لیکن ایک بات اور مشکوک تھی آخر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا اور یہی شخصیت تھی جس نے جمشید علی کو بھی بے بس کر دیا تھا۔ وہ کھل کر میرا تحفظ کرنے سے قاصر تھے۔ بس کرائے کے محافظ میرے چاروں طرف پھیلا دیئے۔ جو مارے جاتے تو دوسرے آ جاتے۔

"کیا سوچ رہے ہو یوسف؟" ماہ پارہ بولیں۔ نہ جانے وہ کب اندر آئی تھیں۔ وہ میرے سر میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"ماں یہ سب کب تک ہوتا رہے گا؟" میں نے ان کے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹے؟" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"میرا بس چلے تو تجھے لے کر کہیں اور چلی جاؤں۔"

"تو لے چلیں ناں۔"

"تو نہیں جانتا ہمارے چاروں طرف نہ نظر آنے والی دیواریں ہیں۔ ان کو پھلانگ کر ہم کہیں نہیں جا سکتے۔"

"کیسی دیواریں؟"





"میں ان کی وضاحت نہیں کر سکتی ہم کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہیں۔"

"آپ کچھ نہیں کر سکتیں؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"سوائے انتظار کے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

اسی رات جمشید علی واپس آ گئے۔ انہیں تمام حالات کی خبر تھی۔ انہوں نے ماہ پارہ سے کہا کہ اگر جابر اس ملک میں ہے تو چوبیس گھنٹے سے پہلے وہ جمشید پیلس میں ہوگا لیکن جابر پھر کبھی نہیں ملا اور جمشید علی نے مجھے یقین دلایا کہ میں مکمل طور پر بے فکر ہو جاؤں۔ اب کوئی میری طرف ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے گا۔

"یعنی اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بالکل۔" جمشید علی بولے۔

"تو پاپا میں کہیں باہر جاؤں گا۔ میں اب تک اس شہر سے باہر نہیں نکلا۔"

جمشید علی سوچ میں پڑ گئے۔ "ابھی نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "جب تم سکول کی تعلیم مکمل کر لو گے تو میرا وعدہ ہے دنیا میں جہاں کہو گے تمہیں بھجوا دوں گا۔"

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی کیونکہ ابھی مجھے دو سال اور سکول میں پڑھنا تھا۔ بہرحال میں نے بحث نہیں کی۔ میں نے تعلیم اور حسن علی سے تربیت ساتھ ساتھ جاری رکھی تھی۔ اب حسن علی گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ جمشید علی اس سے اچھے طریقے سے پیش آتے تھے۔ کم از کم اس سے وہ سلوک نہیں کرتے تھے جو دوسرے ملازمین کے ساتھ رکھتے تھے۔ زہرہ بیگم نے آج تک مجھے اور ماہ پارہ کو گھر کا فرد تسلیم نہیں کیا تھا تو حسن علی کو کیسے قبول کرتیں۔ ہاں کاجل کے بعد میں اس سے اچھے تعلقات ہو گئے تھے اور کبھی کبھار اس کا موڈ ہوتا تو وہ بھی اس کے سر ہو جاتی کہ اسے لڑنا سکھائے۔

"تمہیں لڑنا سکھانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں اسے چھیڑتا۔ "یہ کام تو تم پیدائشی طور پر اچھی طرح جانتی ہو۔"

وہ مجھے گھورتی۔ "اچھا میں لڑتی ہوں؟"

"نہیں اسے لڑنا نہیں کہتے۔ کیونکہ لڑنے والے صلح بھی کر لیتے ہیں۔"

"آپ سن رہے ہیں حسن۔" وہ رونے والے انداز میں شکایت کرتی۔

"تم فکر ہی نہ کرو بے بی۔ دیکھنا آج میں اسے کیسا سبق دیتا ہوں۔"

"مروا دیا۔" میں ٹھنڈی سانس لیتا۔ "ظالم لڑکی۔"

ایک روز میں پیلس کے تہ خانے میں بنے جمنازیم میں ورزش کر رہا تھا کہ کاجل چلی آئی۔ حسن علی کو کسی کام سے جانا تھا اس لیے وہ چلا گیا تھا۔ کاجل گیارہ سال سے اوپر کی ہو چکی تھی لیکن اب بھی بچیوں کی طرح نیکر اور فراک پہن کر گھوما کرتی تھی۔ مجھے ورزش کرتے دیکھ کر اس نے دیکھا۔ "سنو یوسف میں بھی ورزش کروں گی۔"

میں نے اسے گھورا۔"ورزش کرنا آسان کام نہیں ہے۔"

"تم کر سکتے ہو تو میں بھی کر سکتی ہوں۔"اس نے مخصوص ہٹ دھرمی سے کہا۔

"اچھا۔"میں نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔"ذرا یہ سائیکل تو چلا کر دکھاؤ۔"

اسٹیمنا بنانے کے لیے دوڑ کے بعد سب سے اچھی ورزش سائیکل چلانا ہے۔تقریباً ہر جمنازیم میں سائیکل ضرور ہوتی ہے۔آج کل تو بہت جدید قسم کی ایکسر سائز سائیکلز آ گئی ہیں۔جن پر بچے سے لے کر بوڑھے تک سب ورزش کر سکتے ہیں۔کاجل نے اس کی اونچی نشست پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔میں مسکرایا تو وہ کھسیا کر بولی۔

"سیٹ اتنی اونچی ہے۔"

"میں بٹھا دیتا ہوں۔"میں نے جھک کر اسے بازوؤں میں اٹھایا تو چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔کچھ عرصے پہلے تک کاجل خاصی موٹی تھی۔اس کا جسم نرم ضرور تھا لیکن اس میں وہ گداز اور گرمی نہیں تھی جو میں نے اس لمحے محسوس کی تھی۔آج تک میں اس کے لمس کو ایک بچی کا لمس سمجھتا آ رہا تھا۔پہلی بار مجھے لگا کہ میں نے کسی جوان لڑکی کو چھوا ہو۔اس کے جسم میں نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔میرے ساکت ہو جانے سے کاجل کسی قدر گھبرا گئی تھی۔اس نے آہستہ سے کہا۔"اب بٹھا بھی دو۔"

میں نے چونک کر جلدی سے اسے سیٹ پر بٹھا دیا اور یوں پیچھے ہٹ گیا۔جیسے وہ گوشت پوست کی لڑکی نہیں بلکہ کوئی دہکتا ہوا انگارہ ہو جسے میں نے غلطی سے چھو لیا تھا۔خود کاجل چند لمحے پہلے جتنی طراری دکھا رہی تھی اب مجوب سی نظر آ رہی تھی۔اس نے پیروں پر اپنا فراک درست کیا اور پیڈل چلانے لگی۔میں نے جان بوجھ کر سائیکل کو خاصے سخت گیئر میں ڈال دیا تھا اور اس کے لیے پیڈل گھمانا مشکل ہو رہا تھا۔اس کا نازک بدن اس مشقت سے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف حرکت کر رہا تھا چند لمحوں میں وہ پسینے پسینے ہو گئی۔پھر ایک اور مشکل آن پڑی۔جب وہ پیڈل چلاتی تو اس کی فراک اُلٹ کر اوپر آنے لگتی۔اسے بار بار فراک درست کرنا پڑتی تھی۔ایک طرف فراک کی شرارت سے وہ شرما رہی تھی تو دوسری طرف میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔بالآخر وہ رُک گئی۔

"کون سی چڑیل؟"اس نے دریافت کیا۔

"وہی جو کل تک بال بکھرائے اور فراک پہنے گھوما کرتی تھی۔"

"آنٹی دیکھیں۔"اس نے فوراً ماہ پارہ سے شکایت لگائی۔"یوسف مجھے چڑیل کہہ رہا ہے۔"

"خبردار یوسف۔"انہوں نے مجھے گھورا۔"کاجل میری بیٹی ہے اور دیکھو ان کپڑوں میں کتنی پیاری لگ رہی ہے۔"

دل میں تو میں نے بھی اعتراف کیا مگر منہ سے نہیں بولا۔شلوار سوٹ میں وہ یک دم بڑی بڑی




سی لگنے لگی تھی۔

"یوسف کیا میری بیٹی کو نظر لگاؤ گے۔"ماہ پارہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔

"اسے اور نظر...... یہ تو سرتا پا ٹیکہ ہے اسے کہاں نظر لگے گی۔"

"ہاں میں کالی ہوں۔تم تو گورے ہو ناں۔"اس نے غصے سے کہا۔

"کالی کہاں ہو۔اتنا پیارا سا رنگ ہے۔سچ بتاؤں میں نے ساری عمر میں اتنا پُرکشش رنگ نہیں دیکھا۔"

"ہاں آپ افریقہ چلیں میں آپ کو اس سکیم کے ایک سو ایک کلر دکھا سکتا ہوں۔"میں نے کہا تو کاجل پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ماہ پارہ نے مجھے پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔

"بُری بات یوسف کسی کو اس کی فزک کے حوالے سے ٹیس کرنا بہت گھٹیا بات ہے۔"

"سوری ماں لیکن وہ بھی تو مجھے اتنا تنگ کرتی ہے۔"

"وہ بچی ہے۔"

"وہ بچی ہی تو نہیں ہے۔"میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا مطلب؟"ماہ پارہ چونکیں۔

"مطلب۔"میں گڑبڑا گیا۔"کچھ بھی نہیں ہے۔"

"جا کر اسے مناؤ۔"ماہ پارہ نے کچھ دیر بعد کہا۔"مجھے معلوم ہے وہ اپنے کمرے میں جا کر رو رہی ہوگی۔"

"سوری......اس کی ہٹلر اماں موجود ہوں گی۔"میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"یوسف اب تم بچے نہیں رہے ہو۔مرد بنو ایک عورت سے ڈرنا چھوڑ دو۔"

"عورت ہی تو خطرناک ہوتی ہے۔"

"لیکن مرد کے بغیر نہیں یاد رکھو عورت مرد ہی کو اپنی طاقت بناتی ہے۔"

"میں فلسفے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تو پھر جا کر اسے مناؤ۔"

میں خود بھی کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔وہ واقعی میرے معاملے میں بے حد حساس تھی۔اگر میں اسے جا کر نہ مناتا تو وہ کئی دن تک اسی طرح کمرے میں پڑی روتی رہتی۔میں نے کمر کسی اور روانہ ہو گیا۔کاجل کو منانا کسی بپھری ہوئی شیرنی کو رام کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔میں نے اس کے کمرے پر دستک دی۔دوسری بار دستک دینے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں اندر داخل ہو گیا۔حسب توقع وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ہچکیوں سے اس کا بدن ہل رہا تھا۔

"کاجل۔"میں نے آہستہ سے کہا تو اس کی سسکیوں میں شدت آ گئی تھی۔

"چلے جاؤ۔"اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''آئی ایم سوری کاجل۔''

''چلے جاؤ۔'' اس نے روتی آواز میں کہا۔ ''میں کالی ہوں ناں کسی گوری لڑکی کے پاس جاؤ۔''

اب میں نے ذرا سخت ہونے کا فیصلہ کیا۔ ''کاجل کی بچی سیدھی ہو جاؤ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا تم اب میری بات کا بُرا مانو گی۔''

''ہاں مجھے بُرا لگا۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں تمہاری زبان سے یہ بات نہیں سن سکتی۔''

''اور وہ جو تم اکثر مجھے سرخ منہ والا بندر کہتی ہو۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''میں کبھی روٹھا؟''

''مجھے نہیں پتا۔ تم جاؤ یہاں سے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''کاجل تم اٹھتی ہو یا......'' میں نے اسے دھمکایا۔ میں اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گیا۔

اس کے قریب آتے ہی وہی سنسنی مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔ میری سوچیں بھٹکنے لگی تھیں۔ کاجل گیارہ سال کی تھی لیکن اس کا قد وغیرہ جمشید علی پر گیا تھا۔ وہ لمبے چوڑے تھے۔ شاید اسی وجہ سے کاجل ابھی سے بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔ اس کے نقوش، بال اور رنگت ماں پر گئے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس ہونے سے پہلے اس کشش نے مجھے مسحور کر لیا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو اس کا لرزتا بدن ساکت ہو گیا۔

''اب بھی معاف نہیں کرو گی؟''

''پلیز۔'' وہ کسمسائی۔

''نہیں پہلے معاف کرو۔'' میں نے اصرار کیا۔

وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور مجھ سے دور ہو گئی۔ ''آپ چلے جائیں یہاں سے۔'' اس نے لہجہ بدل کر کہا۔

''ارے اتنی ناراضگی کہ آپ جناب کرنے لگی ہو۔'' میں ہنسا۔

''اب مجھے مت چھونا۔'' اس نے منہ پھیر کر کہا۔

''کاجل کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہم بچپن سے ساتھی ہیں۔''

''لیکن اب ہم بچے نہیں ہیں۔''

''کیوں نہیں ہیں اگر تم روٹھو گی تو میں اسی طرح مناؤں گا۔ جیسے پہلے مناتا تھا۔'' میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

''نہیں۔'' وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ حتیٰ کہ دیوار آ گئی اور میں نے نرمی سے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ''چھوڑو مجھے۔''

''نہیں پہلے کہو کہ معاف کر دیا۔''





''یوسف کوئی آ جائے گا۔''

مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ اس سے پہلے مجھ سے لپٹتے چمٹتے ہوئے کاجل کو کبھی پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو گا۔ آج اس نے پہلی بار ایسی بات کی تھی۔ ''تو کیا ہو گا؟'' میں نے اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

''مم...... مجھے شرم آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''چھوڑو مجھے جنگلی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''تم نے اب تک معاف نہیں کیا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''جب تک معافی نہیں ملے گی چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس کی ضد اب بھی برقرار تھی۔ اس نے کوشش کر کے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میں جب بھی اس سے کچھ منوانا چاہتا تھا اسے اس طرح گرفت میں جکڑ لیتا اور وہ تھک ہار کر مان جاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جلدی مان جائے گی۔ اب تو اس کے احساسات ہی کچھ اور تھے مگر مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دینا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ جب میری گرفت سخت ہونے لگی تو اس نے ہار مان لی۔

''اچھا بابا معاف کر دیا اب چھوڑ دو۔''

''تم سے کوئی بات منوانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔'' میں نے شکوہ کیا۔ ''اس کا کوئی صلہ بھی تو ملنا چاہیے۔''

''کیسا صلہ؟'' اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا۔ اس نے چہرہ پیچھے کیا لیکن ایک حد تک وہ پیچھے کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ فاصلہ ختم ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے لبوں پر ایک نرم اور گداز سا احساس پایا تھا۔ اسی لمحے کھٹکے کی آواز آئی تو کاجل تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔ دروازے پر جمشید علی کھڑے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میرے منہ سے نکلا۔ ''پاپا آپ۔''

کاجل کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جمشید علی برس پڑیں گے کوئی باپ اس قسم کا منظر برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیٹی کسی کی بانہوں میں ہو لیکن جب جمشید علی بولے تو ان کی آواز معمول کے مطابق تھی۔

''یوسف میری اسٹڈی میں آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرتے چلے گئے۔

''یوسف پاپا نے دیکھ لیا۔'' کاجل کی آواز لرز رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''پاپا ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

''یہ اچھا نہیں ہوا۔''

''کاجل میں نے ساری عمر پاپا سے کچھ نہیں مانگا لیکن میں تمہیں ضرور مانگوں گا۔''

وہ ڈر رہی تھی۔ ''تم پاپا کو نہیں جانتے۔'' یک دم وہ مجھ سے لپٹ گئی اس کا بدن سرد ہو رہا تھا۔

چند لمحے پہلے والی گرمی غائب ہو چکی تھی۔ ''وہ سزا ضرور دیں گے۔''

میں نے اس کے لبوں پر انگلی پھیری۔ ''میں نے آج جو پایا ہے اس کے بدلے میں پاپا کی دی ہوئی ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہو گئی۔ ''جاؤ پاپا اسٹڈی میں انتظار کر رہے ہیں۔''

دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر اس ممنوعہ پھل کو چکھوں لیکن دل پر جبر کر کے رہ گیا۔ کاجل میرے لیے محترم ہستی تھی۔ میں اسے اس کی مرضی سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں اس کے کمرے سے نکلا۔ اس کی ہستی کی کشش کے اثر سے نکلتے ہی مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہونے لگا۔ جمشید علی کتنے ہی روشن خیال سہی ایک بیٹی کے باپ تھے اور بیٹی کے باپ ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے وہ دس بائی دس فٹ کی جھونپڑی میں رہتا ہو یا جمشید پیلس میں۔ انہوں نے جو دیکھا تھا اسے انہوں نے برداشت کر لیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں غصہ نہیں آیا ہوگا۔ میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ معاملہ کتنا ہی سنگین اور اشتعال انگیز کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ سکون سے فیصلہ کرتے تھے اور اس پر ٹھنڈے دل سے عمل درآمد کرتے آئے تھے۔

میں نے اسٹڈی کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ''آجاؤ۔''

میں اندر چلا گیا۔ اس اسٹڈی میں کتنی بار میں جمشید علی کے مقابل ہوا تھا لیکن اس روز میری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جمشید علی اپنی نشست پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے۔ وہ تمباکو کے شوقین تھے لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کی توجہ پائپ کی طرف نہیں تھی خاصی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولے تو میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں پاپا۔''

وہ چونکے۔ ''بیٹھ جاؤ یوسف۔''

''پاپا آئی ایم سوری۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نو...... نو......'' انہوں نے ہاتھ لہرایا۔ ''میں جانتا ہوں تم اپنی ذہنی عمر کے لحاظ سے بہت آگے ہو۔ میں تم سے کسی جذباتی قدم کی توقع نہیں کرتا۔ یہ بتاؤ کہ کاجل تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

''بہت اچھی۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور پھر جھینپ گیا۔

''وہ ابھی بچی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولے۔

مجھے تھوڑی دیر پہلے جو تجربہ ہوا تھا میں ان کی بات کی تردید کر سکتا تھا لیکن میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

''شی از اونلی اے چائلڈ۔'' وہ پھر بولے۔ ''لیکن مجھے اندازہ ہے وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ یوسف کیا تم اس سے شادی کرو گے۔''





اس بار میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''پاپا اگر تقدیر نے موقع دیا تو میں صرف کاجل سے شادی کروں گا۔''

انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ''تقدیر کو کیوں درمیان میں لاتے ہو ہم اپنی تقدیر خود بناتے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے پاپا! بہت سارے لوگوں کی تقدیریں صرف چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔''

وہ چونکے۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''کچھ نہیں پاپا۔''

''میں نے سوچا ہے کہ تمہیں مری بھیج دوں۔ تم اپنی بقیہ تعلیم وہیں مکمل کرو گے۔''

''نو پاپا۔'' میں نے بے ساختہ کہا میں کاجل سے دور جانا نہیں چاہتا تھا۔

انہوں نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھتا ہوں بیٹے لیکن یہ تمہارے اور کاجل دونوں کے لیے بہتر ہے۔ ابھی تم لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ بہتر ہے اپنی توجہ اسی طرف رکھو۔ کاجل لڑکی ہے۔ وہ زیادہ نادان ہے۔ تم سمجھدار ہو۔ اس دوری کو نباہ لو گے اور اسے بھی کچھ دن رو دھو کر صبر آجائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ذہن کو بھٹکنے سے محفوظ رکھو۔''

''اوکے پاپا۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ شاید کچھ عرصہ پہلے وہ مجھ سے یہ بات کہتے تو میں بخوبی مان لیتا مگر اب یہ کام بے حد دشوار لگ رہا تھا۔ اس سے دور جانا جو رگِ جاں سے قریب تھی۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میں تو کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لوں گا کاجل ضدی تھی وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کوئی ضد پکڑی تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

''گڈ بوائے۔'' جمشید علی مسکرائے۔ پھر بولے۔ ''اور تم کاجل سے اکیلے میں نہیں ملو گے وعدہ کرو۔''

''پرامس پاپا۔'' میں نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''لیکن کاجل۔''

''اسے سمجھانا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ میرا خیال ہے تم یہ کام کر لو گے۔''

''میں کوشش کروں گا پاپا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''آپ جانتے ہیں وہ کتنی ضدی ہے۔''

''بہتر ہے یہ کام تم کر لو۔'' یک لخت ان کے لہجے میں سرد مہری آگئی تھی۔

''مجھے کب تک جانا ہوگا؟''

''اسی ہفتے کے دوران۔ میں سارے انتظامات کر دوں گا۔''

''ماہ پارہ اور حسن علی؟''

''وہ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ ایبٹ آباد میں میرا ایک بنگلہ ہے تم وہیں ٹھہرو گے۔''

میں نے کسی قدر سکون کا سانس لیا کہ مجھے ماہ پارہ سے جدا نہیں ہونا پڑے گا لیکن کاجل؟

میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ جمشید علی کا یہ فیصلہ میرے اور کاجل کے لیے بہتر تھا۔ ایک دوسرے کا ہونے کے لیے ہمارے پاس ساری عمر پڑی تھی۔ ابھی ہمیں تعلیم حاصل کرنا تھی۔ اپنی شخصیت بنانا تھی اس دنیا میں جینے کے لیے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ جمشید علی نے کتنی مہارت اور سیاست سے مجھے اور کاجل کو الگ کر دیا تھا۔ ہم ریلوے لائن کی پٹریاں بن کر رہ گئے تھے جو ساتھ ساتھ تو چل سکتی ہیں لیکن مل نہیں سکتیں۔

میں نے ماہ پارہ کو آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئی تھیں ''لیکن کیوں اتنا اچانک فیصلہ۔''

''پاپا کے سارے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' میں نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

''یوسف میری طرف دیکھو تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔'' وہ بولیں۔

مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ جمشید علی کے اس فیصلے کی اصل وجہ کیا تھی۔ مجھے بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی لیکن میں ان سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ناراض ہو جائیں گی لیکن خلاف توقع وہ ہنس دیں۔

''یوسف تُو بڑا ہو گیا ہے۔'' میں اور جھینپ گیا۔ ''لیکن کاجل ابھی بچی ہے۔'' انہوں نے وہی بات کی اور فوراً ہی اس کی تردید کر دی۔ ''نہیں لڑکیاں ایسے معاملات میں جلد سمجھدار ہو جاتی ہیں۔''

مجھے کاجل کی شرم اور اس کا سرخ ہونا یاد آ گیا۔ واقعی لڑکیاں معاملاتِ محبت میں جلد سمجھدار ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔

''آپ بھی لڑکی ہیں آپ کو زیادہ بہتر پتا ہو گا۔''

''بکومت۔'' وہ جھینپ گئیں۔ ''میں اب لڑکی نہیں رہی۔''

''کون کہتا ہے۔'' میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ''یقین کریں آپ اب بھی بائیس چوبیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتیں بلکہ پونی باندھ کر تو آپ کالج گرل لگتی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا تو حسن علی سے پوچھ لیجیے۔''

''یوسف اب تم مجھ سے مار کھاؤ گے۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بسم اللہ کیجیے۔ یقین کریں بہت دنوں سے یہ پسندیدہ ڈش نہیں کھائی۔''

''اب تم بڑے ہو گئے ہو اور بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ویسے آپ نے بچے پالنے کی اچھی پریکٹس کر لی ہے۔'' میں شرارت سے بولا تو وہ جھلا کر سچ مچ مجھے مارنے لگیں۔ اسی لمحے حسن علی وہاں آ گیا۔ ماہ پارہ کو میرے اتنے پاس دیکھ کر اس کے چہرے پر سخت تاثرات اُبھر آئے تھے۔







مجھے جس کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ وہ تین افراد پر مشتمل تھی۔ ایک عمر رسیدہ تھا۔ باقی دو نسبتاً جوان تھے۔ تینوں سفید فام ہی تھے۔ عمر رسیدہ نمبر ون تھا اور باقی دو اور تین تھے۔ نمبر دینے کا مقصد ان کی شناخت چھپانا تھا۔ ان کے پتھر کی طرح ساکت چہرے دیکھ کر مجھے شبہ ہونے لگا کہ انہوں نے ماسک میک اپ کر رکھا تھا۔

جان گرے پر حملہ کرنے کی پاداش میں مجھے اور عبید صلاح کو تین دن کھانے اور پانی سے محروم رکھا گیا تھا۔ کھانے کی تو اتنی فکر نہیں تھی لیکن سمندر کی نم آب و ہوا کے باوجود پانی کی کمی نے ہمارے جسموں سے جان نکال لی تھی۔ کم از کم اپنے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اگر مجھے چند گھنٹے اور پانی نہ ملتا تو میں دنیا سے گزر جاتا۔ پہلے مرحلے میں ہمارا کھانا پانی بحال کیا گیا کہیں ایک ہفتے بعد جا کر ہماری حالت سنبھلی تھی۔ بھوک پیاس کے لرزا دینے والے احساسات کی یہ یادیں ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہیں گی۔

یہ دسواں دن تھا۔ جب صبح ناشتے کے بعد ہمیں باہر نکالا گیا۔ ہمیں چمکدار ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بند گاڑی میں کہیں لے جایا گیا۔ جہاں سے ہم باہر نکلے وہاں سرخ پتھروں سے بنی وسیع و عریض عمارت تھی۔ جیسی کہ سٹی کورٹس کی عمارتیں ہوتی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں ہم پر مقدمہ چلایا جائے گا اور جرم ثابت ہونے پر ہمیں سزا دی جائے گی۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ کچھ بین الاقوامی قسم کے مجرم الٹا ہمیں ہی مجرم قرار دے کر مقدمہ چلا کر سزا دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

اندر سے عمارت ایسی ہی تھی جیسا کہ عام سرکاری دفاتر کی ہوتی ہیں اور وہاں کچھ لوگ کام بھی کرتے نظر آ رہے تھے۔ جیسے کہ سرکاری اداروں میں کرتے ہیں لیکن یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ ورنہ ان کے مقاصد میں اور کسی مملکت کے سرکاری دفاتر کے عملے میں وہی فرق تھا جو کسی ملک کی پولیس اور مجرموں کے درمیان ہوتا ہے۔ ہمیں لانے والے گارڈز پولیس جیسی ہی وردی میں تھے لیکن اس سے ان کی اصلیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجرم قانون کی وردی پہن کر سچ مچ قانون کا محافظ نہیں بن جاتا۔ عمارت کے ویٹنگ روم میں ہمیں جان گرے ملا تھا۔

''اب تم لوگوں پر ہمارے قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جائے گا۔'' اس نے کہا۔

اس پر عبید صلاح نے اسے آگاہ کیا کہ اگر اسے ان کے قوانین کا مسودہ مل جائے تو وہ اس پر آب پاشی کرنا پسند کرے گا۔

''بہت بکوس کر رہے ہو۔'' جان گرے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''ساری بکواس بند ہو جائے گی۔''

''بکواس کی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' عبید صلاح نے خوش دلی سے کہا۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک گارڈ نے اس کی پسلیوں میں اپنی رائفل کی نالی ماری تھی۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' اس نے غرا کر کہا۔

"کونسل کے سامنے یہ رویہ رکھا تو اپنی بچت کے راستے خود بند کرلو گے۔" جان گرے نے خبردار کیا۔

"تمہاری کونسل کی ایسی کی تیسی۔" عبید صلاح نے بہ مشکل کہا۔"میں اس پر بھی پیشاب کرنا پسند کروں گا۔"

گارڈ نے پھر نال اس کو مارنی چاہی لیکن میں نے نال کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔"زبان کا جواب ہاتھ سے دینا اچھی بات نہیں ہے۔"

یک دم بقیہ گارڈز نے مجھ پر رائفلیں تان لیں اور میں نے مسکراتے ہوئے رائفل کی نال چھوڑ دی۔ گارڈ نے اس بار مجھ پر وار کرنے کے لیے رائفل اٹھائی تھی کہ جان گرے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"یوسف میرا مشورہ ہے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو تم بہت بڑی مشکل میں پڑ گئے ہو۔"

"اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے رُکھائی سے جواب دیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنا ہی بہتر تھا۔ جیل میں ہنگامہ کر کے میں نے خاص طور سے ڈیئرڈان کو اپنا دشمن بنا لیا تھا جو بے حد متعصب اور کینہ پرور شخص تھا۔ متعصب اور کینہ پرور تو جان گرے بھی تھا لیکن وہ اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے مجھے چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ ورنہ جو شخص ذرا سی لڑائی کی وجہ سے بلا دریغ تیس بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دے اس سے رعایت کی توقع کرنا کسی بیل سے دودھ کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔

بارہ بجے ہمیں کونسل کے سامنے باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے تین ارکان جج بنے معزز نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مجھے ان کے چہروں پر قزاقی کی چھاپ واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ عبید صلاح نے اندر جاتے ہی اعلان کیا۔"میں اس نام نہاد عدالت کو نہیں مانتا۔ تم لوگوں کا جو دل چاہے کرو میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔"

"فضول باتیں مت کرو مسٹر عبید صلاح تم پر دہشت گردی کے سنگین الزامات ہیں۔"

عبید صلاح نے حقارت سے انہیں دیکھا۔"اب وحشت گرد دوسروں کو دہشت گرد قرار دیں گے۔"

"اسے باہر لے جاؤ اس کا مقدمہ بعد میں پیش کیا جائے۔" نمبر ون کی تختی والے نے گارڈز سے کہا۔ اس کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی تھی۔ عبید صلاح کے جانے کے بعد مجھے ان کے سامنے ایک کٹہرے نما جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ میرے عقب میں ایک گارڈ رائفل لیے مستعد کھڑا تھا۔ نمبر ون نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔

"مسٹر یوسف آلی۔" اس نے کہا۔"تم پر سنگین جرائم کے الزامات ہیں پہلے تم نے جزیرے کی ایک معزز شخصیت مسٹر جان گرے پر حملہ کیا اور انہیں یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ تمہارا یہ عمل ایک





مجرم اور سزا یافتہ دہشت گرد کی حمایت میں تھا جو بجائے خود سنگین جرم ہے۔ پھر دوران حراست تم نے اسلحہ رکھا اور اس اسلحے سے مسٹر جان گرے کو جان سے مارنے کی کوشش کی خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہے لیکن اس سے تمہارے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوئی تم اپنی صفائی میں کیا کہنا پسند کرو گے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔"سوائے اس کے کہ تم یہ عدالت کا ڈھکوسلہ ختم کر کے ہمارے خلاف جو تمہارا پروگرام ہے اس پر عمل کرو۔"

"لگتا ہے مسٹر یوسف تمہیں سزا سے بچنے سے کوئی خاصی دلچسپی نہیں ہے۔" نمبر تین بولا۔

"مسٹر یوسف کو یقین ہے کہ ان سے سنگین جرائم سرزد ہوئے ہیں۔" نمبر دو نے کہا۔"اس بناء پر یہ انصاف کے عمل میں شرکت کرنے کے بجائے اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔"

میں ہنسا۔"تم لوگ انصاف، اور عدالت کی اے بی سی سے بھی واقف نہیں ہو۔ اگر تم لوگ انصاف کرنا جانتے تو دنیا اس حال میں نہ ہوتی۔ بہرحال بین الاقوامی سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اپنی ذات سے بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس حد تک ہے کہ میں تمہاری دی ہوئی سزا سے بچنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کروں گا۔"

"ہم سزا دینے کا اختیار اور اس پر عمل درآمد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔"

"گویا مائٹ از رائٹ۔" میں نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔"جب تم لوگ اس اصول پر یقین رکھتے ہو تو یہ عدالت کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم انسانی حقوق کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔" نمبر ون نے پُر وقار لہجے میں ڈھٹائی سے کہا۔"ہم کسی بھی ایسے کام سے گریز کرتے ہیں جس سے انسانی حقوق پر ضرب پڑے۔ اس وجہ سے تم جیسے مجرموں پر عدالت میں مقدمہ چلا رہے ہیں۔"

"انسانی حقوق کا جتنا احترام تم لوگ کرتے ہو اسے دنیا کے بہت سارے علاقوں کے لوگ تا عمر یاد رکھیں گے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بین الاقوامی سیاست پر بات کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ تم اپنی صفائی پیش کرو۔" نمبر تین نے پھر کہا۔

"میں اپنی صفائی میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ مجھے کچھ قزاقوں نے میرے بحری جہاز سے اغوا کیا۔ انہوں نے بم سے جہاز کو اُڑا دیا اور تیس بے گناہ افراد کو قتل کر دیا۔ مجھے حق حاصل ہے کہ ان قزاقوں کی قید سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جو بھی ممکن ہے کر گزروں اور میں نے یہی کیا۔"

"اس جزیرے کے اپنے قوانین ہیں اگر تمہیں کوئی شکایت تھی تو تم کونسل کے روبرو آ سکتے تھے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورتِ حال کچھ دیر اور جاری رہی تو میں اپنا صبر کھو بیٹھوں گا۔ ان کی ڈھٹائی قابلِ تعریف تھی لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کی۔ اس کے بعد وہ اپنے طور پر بولتے رہے لیکن میں نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ تنگ آ کر نمبر ون نے کہا۔ ''مسٹر یوسف تمہیں ایک دن کی مہلت دی جاتی ہے اگر تم نے کل تک اپنی صفائی پیش نہ کی تو......''

''تو تم لوگ مجھے طے شدہ سزا سنا دو گے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اسے لے جاؤ۔'' نمبر دو نے طیش سے کہا اور گارڈز مجھے باہر لے آئے۔

عبید صلاح باہر موجود تھا۔ اسے محافظ لے جانے لگے تو میں نے اس سے کہا۔ ''ان لوگوں کی بکواس خاموشی سے سنتے رہنا یہ اپنی من پسند سزا سنانا چاہتے ہیں۔ تم نے بحث کی تو سزا ابھی سنا دی جائے گی۔ ورنہ ایک دو دن کی مہلت مل جائے گی۔'' میں نے اردو میں کہا تھا اس لیے کوئی اور نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد گارڈز اسے کھینچتے ہوئے لے گئے۔

میں باہر رکھی بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس لمحے جان گرے نمودار ہوا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ خاصا ڈرا ہوا تھا۔ دو مرتبہ قسمت نے اسے میرے ہاتھوں سے بچا لیا تھا۔ وہ تیسرا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے آتے ہی گارڈز بھی میری طرف سے چوکنا ہو گئے تھے۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا جب جان گرے نے اردو میں کہا۔

''یوسف میں تمہیں اس مشکل سے نکال سکتا ہوں۔'' اس کا لب و لہجہ اور الفاظ کی ساخت بگڑی ہوئی تھی۔

''تم اردو جانتے ہو؟''

''تھوڑی بہت۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''یو اے ای میں ایک پاکستانی سپروائزر خاصے عرصے سے میرے ساتھ رہا تھا۔ اس سے یہ زبان سیکھی تھی۔ اس زبان میں دنیا کی موسیقی کا سب سے عظیم ذخیرہ ہے۔''

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس جیسے شخص کے منہ سے موسیقی کا سن کر مجھے تعجب ہی ہوا تھا۔ ''تمہیں ہمارے میوزک سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''موسیقی ساری دنیا کی ملکیت ہوتی ہے۔''

''تم لوگوں نے ساری دنیا کو اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

''تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔''

''نوازش ہو گی آپ کی۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''لیکن اس کے لیے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔ تم نہ صرف یہاں سے رہائی پا لو گے بلکہ میں تمہیں وہ سب بتا دوں گا جس سے تم آج تک بے خبر رہے ہو۔''

''کک...... کیسے حقائق۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ اس نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی۔





وہ مسکرایا۔ ''تمہارے پس منظر کے بارے میں تم کون ہو کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو تمہارے ماں باپ کون تھے اور مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے قاتل کون تھے۔''

میرا جسم کانپنے لگا تھا۔ ''بکواس کرتے ہو تم۔''

''یوسف ایک معصوم بچہ بیک وقت اپنے ماں باپ سے کیسے محروم ہو سکتا ہے کیا کبھی جمشید علی نے تمہیں بتایا کہ تمہارے ماں باپ کون تھے، نہیں وہ ساری عمر تمہیں بہلاتا رہا ہو گا۔''

''تم...... تم یہ...... یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' الفاظ میرے منہ میں ٹوٹ رہے تھے۔

''تم سب جان جاؤ گے۔ بشرطیکہ تم میرے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔''

''کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ نہ صرف تم یہاں سے چھٹکارا پا لو گے بلکہ ایک بڑی رقم بھی حاصل کر سکتے ہو۔''

''کتنی بڑی رقم؟''

اگر میں جان گرے کو بتا دیتا کہ میں اب بھی اس کاروبار کا قانونی مالک ہوں جو سالانہ کروڑوں ڈالرز کا نفع کما رہا تھا تو شاید وہ مجھے ایسی پیش کش نہ کرتا۔ اس کے نزدیک یہ بڑی رقم تھی لیکن میرے لیے نہیں یہ اور بات ہے کہ میں نے کروڑوں ڈالرز کے اس کاروبار سے کبھی عملی واسطہ نہیں رکھا تھا۔ یہ علی میرین لائن کارپوریشن تھی۔ جس کا کاروبار دنیا کے چون بڑے ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ میرین لائن کی دنیا میں یہ ایک معتبر نام تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر سنگاپور میں تھا اور آج کل اس کے ظاہری مالک جاوید اور جنید تھے کاجل کے بھائی زہرہ بیگم اور جمشید علی کے حقیقی بیٹے۔

''یہ رقم زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔'' جان گرے نے گویا ترغیب دی۔ ''اس کے علاوہ تم اپنے خاندان سے واقف ہو جاؤ گے۔ تو اس کا بھی تمہیں مالی فائدہ ہو گا۔''

جان گرے اس تہذیب کا نمائندہ تھا جس کے نزدیک محض مادی مفادات ہی اہم رہ گئے تھے۔ مجھے اس کی ذہنیت پر کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ میں جان گرے پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی بات میں کہیں نہ کہیں سچائی ضرور تھی اسے آزما لینے میں کوئی حرج نہیں تھا پھر وہ مجھے اس جنجال سے بھی نکال سکتا تھا۔ جس میں پھنسانے والا بھی وہی تھا۔

''او کے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''لیکن صرف مجھے ہی نہیں بلکہ عبید صلاح کو بھی تم بچاؤ گے۔''

''یہ ذرا مشکل کام ہے۔'' وہ متفکر ہو گیا۔

''جیسے بھی کرو یہ کام بھی ہونا چاہیے اسے تم میری شرط بھی سمجھ سکتے ہو۔''

''میں کرلوں گا۔'' اس نے کہا۔

''اب کام کے بارے میں بات ہو جائے۔''

''اس کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔'' یک دم وہ محتاط نظر آنے لگا۔

''غالباً جب ہمیں اس نام نہاد عدالت سے سزا سنا کر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا یا ہمیں تفریح طبع کا نشانہ بنا کر رِنگ میں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اعتماد رکھو مجھ پر ایسا نہیں ہوگا۔''

''میں اس شخص پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں جسے مجھ پر اعتبار نہیں۔ ہاں ہم دونوں مجبور ہیں۔''

''تم نے درست کہا لیکن تم زیادہ مجبور ہو تمہارے لیے جان بچانے کا سوال بھی ہے اور اسے صرف میں بچا سکتا ہوں۔''

''تم خدائی کاموں میں دخل دینے کا دعویٰ کر رہے ہو۔'' میں نے ملامت لہجے میں کہا۔

''خدا نے بہت کچھ ہم پر چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''اپنی بات پر قائم رہنا تم نے اب کوئی غلطی کی تو شاید میں بھی تمہیں نہ بچا سکوں۔''

''ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مارنے اور بچانے والی ذات ایک ہی ہے۔''

''بے شک لیکن وہ ذات بھی میرٹ پر فیصلے کرتی ہے۔'' پہلی بار جان گرے نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مسلمان شاید یہ بات بھول گئے ہو۔''

میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ واقعی ہم مسلمانوں نے محض باتوں کو ہی سب سمجھ لیا تھا اور عمل کرنا بھول گئے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے ہیں علم اور عمل کے تضاد نے ہمیں زبوں حالی سے دوچار کر دیا ہے۔ جان گرے چلا گیا تقریباً دو گھنٹے بعد عبید صلاح کمرے سے نکلا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس نے میری بات پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس کی کونسل کے ایک دو تین سے منہ ماری ہو گئی تھی اور شاید اسے سزا سنا دی گئی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''صرف پندرہ دن کی سزائے قید۔''

''پندرہ دن کی؟'' میں دنگ رہ گیا۔ پھر فوراً اس کی بات سمجھ گیا۔ ''تم باز نہیں آئے۔''

''سزا تو ملنی تھی، میں نے سوچا کہ دل کی دل میں کیوں رکھی جائے۔''

''مہلت تو مل سکتی تھی۔''

اس نے شانے ہلائے۔ ''ایک دو دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق پڑ جاتا ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''ایک امید تو نظر آئی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے کہا۔

میں نے اسے جان گرے کی پیش کش سے آگاہ کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''میں جان گرے جیسے شخص پر کسی صورت اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''اعتبار تو مجھے بھی نہیں ہے۔'' میں بولا۔ ''لیکن مجھے لگا ہے کہ وہ بھی پھنسا ہوا ہے اور اسے





میری مدد کی ضرورت ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ کم از کم اس منحوس جگہ سے تو نکلیں۔''

اس نے پُر خیال نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے شیطان بھی کبھی انسان کے کام آ جاتا ہے۔''

''جان گرے کسی شیطان سے کم نہیں ہے لیکن اس وقت وہ ہمارے کام آ رہا ہے۔ دلدل میں گرنے والا یہ پروا نہیں کرتا کہ وہ جس چیز کو پکڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے وہ دراصل سانپ کی دُم ہے۔''

ہم بیک وقت ہنسے تو گارڈز نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''تم کیوں ہنس رہے ہو؟'' ایک نے پوچھا۔

''دراصل میری شادی ہونے والی ہے تمہاری بہن سے۔''

''نہیں اس سے میں شادی کروں گا۔ تمہارا سالا یہ ہے۔'' عبید صلاح نے دوسرے گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں کے ہی چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ وہ غرا کر ہماری طرف بڑھے تھے کہ دوسرے گارڈز نے انہیں روک دیا۔

''ہوشیار رہو ہمیں ان سے محتاط رہنے کو کہا گیا ہے بھونکنے دو انہیں۔''

لیکن مشتعل گارڈز نے راستے میں بدلہ نکال لیا۔ جب انہوں نے بیک وقت مجھے اور عبید صلاح کو کمر پر رائفلوں کے دستے مارے۔ گردوں پر لگنے والی اس چوٹ نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ عبید صلاح کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی لیکن ہم نے درد برداشت کر لیا۔ ایک گارڈ غرایا۔ ''تیز چلو کتے کے بچو ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں لگتے۔''

''خوش قسمتی سے ہماری تم سے کوئی رشتے داری نہیں ہے۔'' عبید صلاح نے کہا تو تکلیف کے باوجود میں ہنس پڑا تھا۔

اپنی کوٹھری میں پہنچ کر یہ خوش گوار انکشاف ہوا کہ غیر حاضری کی بنا پر ہمارا لنچ واپس لے جایا گیا تھا اور اب ہمیں رات تک صبر کرنا پڑے گا۔ یہ سن کر ہم نے بزبان شاعر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ عبید صلاح کا قصیدہ عربی میں تھا جسے ناواقفان تلاوت بھی قرار دے سکتے تھے۔ حالانکہ عربی میں بھی دیگر زبانوں کی طرح ان الفاظ کی بھرمار ہے جو کسی بھی ڈکشنری میں شامل نہیں کیے جاتے۔ پانی کو ہم نے صبر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار لیا تھا۔ ڈیز ڈان ہم پر اتنا مہربان تھا کہ تین دن کے فاقے کے بعد بھی اس نے خیال رکھا تھا کہ ہمارے معدوں میں زیادہ خوراک نہ جانے پائے تاکہ ہم ان عوارض سے محفوظ رہیں جو زیادہ کھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

''کیا جان گرے۔'' عبید صلاح نے کہنا چاہا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ پھر تقریباً اس کے کان پر منہ رکھ کر کہا۔ ''یہاں اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا۔ ممکن ہے ہماری باتیں کہیں سنی جا رہی ہوں۔''

اس وقت یہ صرف خیال تھا۔ جو بعد میں حقیقت ثابت ہوا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں اپنی مختصر سی کوٹھری میں چہل قدمی کر رہا تھا تب گارڈ نے دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

''کیوں کیا بات ہے؟ یہ میرے سونے کا وقت ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''سونے کے بچے انچارج تمہارا انتظار کر رہا ہے اپنے دفتر میں۔'' گارڈ نے کہا۔ ''اس وقت تم اپنی قبر میں بھی سو رہے ہوتے تو ہم تمہیں لے جاتے۔''

''تمہارا تعلق شاید گورکنوں کے خاندان سے ہے۔'' میں نے باہر آتے ہوئے تبصرہ کیا۔

گارڈ نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔ ''بک بک کر لو چند دنوں میں تمہاری یہ قینچی کی طرح چلنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔''

میں ہنس دیا۔ یہ فربہ اندام اور گارڈ کی طرح نظر آنے والا گارڈ خصوصیت سے ہمارا نشانہ بنتا تھا۔ اس بناء پر ہم سے سب سے زیادہ خار بھی کھاتا تھا۔ اس کے ساتھ میں انچارج یعنی ڈیئر ڈان کے کمرے تک پہنچا۔ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا۔ اس کے سامنے گندے برتن پڑے تھے۔ ایک ہاتھ میں جام تھا وہ خاصی دیر سے پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''آؤ مسٹر یوسف۔'' خلافِ توقع اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''بیٹھو۔''

میں شکریہ ادا کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے رویئے سے مجھے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ وہ نشے میں تھا اور عین ممکن تھا کہ اس کے ذہن میں اپنی تفریح کے لیے کوئی منصوبہ ہو۔ طاقت کے نشے میں مبتلا کم ظرف لوگ اکثر بڑی عجیب حرکتیں کر جاتے ہیں۔ مجھے لانے والا گارڈ چوکس ہو کر میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اچانک ڈیئر ڈان نے غرا کر اس سے کہا۔

''دفع ہو جاؤ۔''

''لیکن جناب۔'' گارڈ نے کہنا چاہا۔

''گیٹ آؤٹ۔'' ڈیئر ڈان حلق کے بل دھاڑا تو وہ بوکھلا کر دفتر سے نکل گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ڈیئر ڈان نے اپنی دراز سے چاندی جیسے دستے والا کولٹ نکالا اور چند لمحے اسے یوں اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے اس کا کیا کرنا چاہیے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے جتا رہا تھا کہ وہ نہتا نہیں ہے لہٰذا میں کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ سچ مچ مجھے گولی مارنے پر غور کر رہا ہو۔ میں پوری طرح محتاط تھا لیکن اس نے مجھے شوٹ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ کولٹ واپس دراز میں رکھ دیا۔ البتہ دراز اس نے کھلی رکھی تھی۔

''مسٹر یوسف کچھ پیو گے؟''

''نہیں شکریہ۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''سوال نہیں لڑکے! یہاں کسی قیدی کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے انگلی





اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ آج کونسل میں جان گرے سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟''

میں چونکا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات سے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ''جان گرے کیا کہہ رہا تھا؟ یہ تو تم اسی سے پوچھو تو بہتر ہے گا۔''

''میرے سوال کا جواب دو۔'' یک دم وہ اپنے سابقہ انداز پر لوٹ آیا۔ ''ورنہ ہنٹر سے مار کر کھال اُتار دوں گا۔''

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ''جان گرے مجھے دھمکا رہا تھا۔ مجھے بُرے انجام سے خبردار کر رہا تھا۔''

''بکومت۔ وہ پورے ایک گھنٹے تک تم سے بات کر رہا تھا۔ اتنی دیر تک کوئی کسی کو نہیں دھمکاتا۔''

''میں اور کیا بتاؤں۔'' میں نے اُکتاہٹ ظاہر کی۔ ''اس میں بتانے والی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''وہ تمہیں کسی کام پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بدلے وہ تمہیں سزا سے بچائے گا ہے ناں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بائی دی وے یہ خبر تم تک کس نے پہنچائی؟''

''اس جزیرے پر ہونے والی ہر حرکت کا علم مجھے ضرور ہوتا ہے۔'' اس نے فخر سے سینہ پھیلایا۔ ''میں پورے جزیرے کا سکیورٹی انچارج بھی ہوں۔''

''یہ خبر غلط ہے۔ جس نے بھی دی ہے اس نے تمہیں مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''لگتا ہے تم یوں نہیں مانو گے۔'' اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جو بات میرے علم میں ہی نہ ہو اسے میں کیسے بتا سکتا ہوں۔''

''اس چکر میں نہ رہنا کہ جان گرے تمہیں بچا سکتا ہے۔''

''میرا ایک آدمی تم لوگوں کے ساتھ تھا۔ جب جان گرے تمہیں ترغیب دے رہا تھا۔ وہ تمہاری زبان جانتا ہے۔''

''مروا دیا۔'' میں نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ ''شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ جان گرے مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ تم لوگوں کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بنیاد پر اس نے مجھے معافی دلوانے کی بات کی تھی۔ بقول اس کے تم لوگوں کو مجھ جیسے ہونہار نوجوانوں کی اشد ضرورت ہے۔''

''تم جھوٹ تو نہیں کہہ رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں میں شک تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''یہ بات تم جان گرے سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ مجھے یہاں لانے کا مقصد ہی یہی تھا ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ خلیج کو ڈبو دیا گیا تھا جس پر میں سفر کر رہا

تھا۔راستے میں بھی جان گرے نے مجھے ترغیب دی تھی۔''

میں نے محسوس کیا کہ ڈیئرڈان کا شک کمزور ہو گیا تھا۔ میں احمق جان گرے کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہا تھا اس نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی کہ جس طرح اسے اردو آتی ہے اسی طرح کسی دوسرے سفید فام کو بھی یہ زبان آسکتی ہے اور وہ گارڈ بھی ہوسکتا ہے۔''

''تم لوگ اس زبان میں کیوں بات کر رہے تھے جو سب کونٹی نینٹ میں بولی جاتی ہے۔''

''بس اتفاق تھا۔ جان گرے نے انکشاف کیا کہ اسے اردو آتی ہے اور پھر ہم اسی زبان میں بات کرتے رہے۔''

''اگر اس میں جھوٹ ہوا تو تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے دھمکایا۔''اب تم جا سکتے ہو؟''

''اب کون سا اچھا ہو رہا ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ڈیئرڈان نے گھنٹی بجا کر گارڈ کو طلب کیا۔''اسے لے جا کر کوٹھری میں بند کر دو۔''

عبید صلاح سو گیا تھا لیکن دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔''آ گئے تم کیا بکواس کر رہا تھا وہ منحوس صورت شرابی۔''

''بس پیچھے پڑا ہوا تھا۔'' میں نے منہ بنایا۔''کہہ رہا تھا کہ میں نے جان گرے سے کوئی ڈیلنگ کی ہے۔ وہ میری جان بچانے کے عوض مجھ سے کوئی کام کرنے کو کہہ رہا ہے۔''

عبید صلاح نے قہقہہ لگایا۔''جان گرے اپنے باپ کے کام نہ آئے۔''

''درست لیکن یہ بات اس ڈیئر کے بچے کو کون سمجھائے۔''

''نہ سمجھے ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ ہمیں تو ویسے ہی سزا ہونے والی ہے۔''

''سو جاؤ صبح پھر پیشی ہے۔''

میں نے کہا اور خود بھی بستر پر دراز ہو گیا۔ عبید صلاح تو تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی تھی میرے اور جان گرے کے درمیان ہونے والی بات چیت کا اس کے کانوں میں پڑنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے مشکوک ہو جاتا تو جان گرے کا منصوبہ یعنی ہماری رہائی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے کو تو اس بات کا علم ہے؟ کبھی کبھی آدمی جو سوچتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر درست نکل آتا ہے۔ یک دم کوٹھری کے باہر گیلری میں جلنے والی روشنیاں بجھ گئیں۔ میں ذرا چونکا جب سے میں یہاں آیا تھا۔ بجلی فیل ہونے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ جزیرے کو کہاں سے بجلی مہیا کی جاتی تھی کیا ان لوگوں نے جزیرے پر کوئی بجلی گھر بنا رکھا تھا اور اگر بجلی گھر تھا بھی تو وہ کس ایندھن سے چلتا تھا۔ عام طور سے بجلی گھر روایتی ایندھن یعنی تیل گیس یا کوئلے سے چلتے ہیں۔ اس جزیرے پر آبی برقاب کے لیے ڈیم بنانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔





جیسے ہی روشنی گل ہوئی مجھے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کسی نے تالے میں چابی گھمائی تھی۔ اس لمحے روشنی کی ایک لکیر سی لہرائی اور مجھے جان گرے کی آواز آئی۔''یوسف خاموشی سے باہر آجاؤ۔ آواز مت کرنا۔''

میں اٹھا تو دروازہ ہلکا سا کھل گیا جو میرے باہر آتے ہی بند ہو گیا تھا۔ جان گرے کے ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ تھی۔ اس کے پاس ہی کوئی کھڑا تھا۔ غالباً یہ ہماری بیرک کا گارڈ تھا۔ تالہ اس نے کھولا تھا۔ جان گرے کے اشارے پر میں آگے بڑھنے لگا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کیا اپنے وعدے کے مطابق جان گرے مجھے رہا کرا کے لے جا رہا تھا لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ کچھ دیر بعد ہم کیمپ کے اندر ہی درختوں کے ایک جھنڈ تلے تھے۔

''ڈیئرڈان کو تمہارے منصوبہ کی بھنک پڑ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔''اس لیے میں خطرہ مول لے کر تم تک آیا ہوں۔ یہ گارڈ میرا با اعتماد شخص ہے۔''

''شاید یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔''ڈیئرڈان توقع سے زیادہ چالاک ہے اس کے جاسوس تمہارے اردگرد لگے رہتے ہیں۔ ان ہی سے یہ بات ڈیئرڈان تک پہنچی تھی۔''

''نہیں اس شخص پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔'' جان گرے نے کہا۔''خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ ڈیئرڈان نے تم سے کیا بات کی؟''

''وہ چاہتا تھا کہ میں اسے تمہارے منصوبے کے بارے میں بتا دوں۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے بتا دیا۔''

''کیا؟'' جان گرے حلق سے چیخ پڑا۔''احمق آدمی۔''

میں ہنسا۔''میں نے اسے بتایا کہ جان گرے نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''اوہ۔'' اس نے گہری سانس لی۔''تم اس بات پر اڑے رہنا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''ہاں صرف ہنٹر سے کھال ہی اتار دے گا۔'' میں نے طنز کیا۔''جان گرے اگر تم اتنے ہی با اختیار ہو تو ہمیں اس کی قید سے نکال کیوں نہیں لیتے؟''

''میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔''لیکن اس سے دوسرے چونک جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی میری طرف متوجہ ہو۔ مجھے بہرحال اسی پارٹی میں رہنا ہے۔''

''معقول بات ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کل کونسل کیا فیصلہ کرے گی۔''

''سزائے موت کا تم دونوں کو سزائے موت سنا دی جائے گی۔''

''سزائے موت۔'' میں اچھل پڑا تھا۔''تمہارا دماغ درست ہے مرنے کے بعد میں تمہارے

کس کام آؤں گا۔‘‘

’’احمق مت بنو۔ فیصلے کے بعد تمہیں بچانا میری ذمے داری ہے۔‘‘

’’کہیں تمہارے چکر میں مجھے پھانسی ہی نہ ہو جائے۔‘‘ میں نے طنز کیا۔

’’ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔‘‘ اس نے نرمی سے کہا۔ ’’ڈیز ڈان کے کسی جھانسے میں مت آنا۔ وہ ایک نمبر کا حرامی آدمی ہے۔ ذرا اس معاملے سے نمٹ لوں پھر اسے بھی دیکھ لوں گا۔‘‘

’’حرامی تو تم بھی کم نہیں ہو۔‘‘ میں نے دل میں کہا۔ ’’میں کوشش کروں گا لیکن تشدد کے آگے تو پتھر بھی بول اٹھتے ہیں اگر وہ تشدد پر اُتر آیا تو میں کتنی دیر اپنی زبان بند رکھوں گا آج بھی اس کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔‘‘

’’تم فکر مت کرو۔ وہ اس حد تک نہیں جا سکتا۔ کونسل کے فیصلے کے بعد تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ پھر ڈیز ڈان تم پر تشدد نہیں کر سکے گا۔‘‘

’’صرف میں ہی نہیں بلکہ عبید صلاح بھی۔‘‘ میں نے اسے یاد دلایا۔

’’تم خوامخواہ اس دہشت گرد سے نتھی ہو رہے ہو۔ دفع کرو اسے۔‘‘ اس نے جھلا کر کہا۔

’’یہ ناممکن ہے۔‘‘ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’تمہیں ہم دونوں کو ہی بچانا ہوگا۔ ورنہ میرے تعاون کو بھول جاؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے میری پوری کوشش ہو گی لیکن ایک ہی ڈرامہ دو افراد کے ساتھ ان لوگوں کو شک میں ڈال دے گا۔‘‘

’’کس قسم کا ڈرامہ؟‘‘

’’سزائے موت ہونے کے بعد تمہارے سامنے دو راستے رکھے جائیں گے۔ یا تو سزائے موت قبول کر لو یا رِنگ میں لڑ کر اپنی زندگی جیت لو۔ آج تک کسی نے پہلی تجویز قبول نہیں کی ہے۔‘‘

’’لہٰذا ہم بھی لڑ کر بچنے کی کوشش کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک۔‘‘ اس نے تصحیح کی۔ ’’تمہارے مقابل ایسے لڑاکے بھیجے جائیں گے کہ جن سے لڑ کر جیتنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو۔‘‘

’’ظاہر ہے۔‘‘ میں نے طنز کیا۔ ’’ورنہ تم لوگ اتنے اچھے تو نہیں ہو کہ کسی شخص کو آسانی سے بچ نکلنے کی سہولت دو۔‘‘

’’اپنے مجرموں کو کوئی بچنے کا موقع نہیں دیتا۔‘‘

’’حالانکہ سب سے بڑے مجرم تم لوگ خود ہو۔‘‘ میں نے تلخی سے کہا۔

’’مسٹر یوسف اس قسم کی باتیں کر کے تم آنے والے وقت کو اپنے لیے دشوار بنا رہے ہو۔‘‘ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں نے اب تک آسان زندگی نہیں گزاری۔‘‘ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’میرا خیال ہے کہ تمہاری





بات ختم ہو گئی ہے تو میں یہاں سے جاؤں اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں آ پکڑے۔‘‘

’’کوئی نہیں آئے گا۔‘‘ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ’’یہ شرابی ڈان نام نہاد ہی انچارج ہے۔ اصل میں سارے معاملات میں ہی چلاتا ہوں۔‘‘

’’تم تو بڑے پارسا ہو کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔‘‘ میں ہنسا۔ ’’مجھے یاد ہے۔ انجن روم میں تم ہمہ وقت نشے میں دھت رہا کرتے تھے۔‘‘

’’مجھ پر شراب اثر نہیں کرتی۔‘‘ اس نے فخر سے کہا۔

میں پھر ہنسا۔ ’’ہر شرابی یہی دعویٰ کرتا ہے۔‘‘

’’بکومت۔‘‘ وہ بھنا گیا تھا۔

میں گارڈ کے ساتھ واپس آیا۔ جیسے ہی میں نے کوٹھری میں قدم رکھا اور تالہ بند ہونے کی آواز آئی روشنی آ گئی میں نے دیکھا کہ عبید صلاح متفکر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اگلی صبح آنکھ کھلی تو ناشتے والا دروازہ کھول رہا تھا۔ ازراہِ مہربانی گارڈ نے پہلے حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کی استدعا قبول کر لی۔ آج ناشتہ بھی کسی قدر پُرتکلف تھا۔ مچھلی اور چائے کے ساتھ انڈے بھی تھے۔ سائز تو مرغی کے انڈے کا تھا لیکن ان کی رنگت کچھ زردی مائل تھی۔ بہرحال تھا یہ کسی پرندے کا انڈا تھا کیونکہ رینگنے والے جانوروں کے انڈے اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ کھانے میں بھی ان کا ذائقہ مرغی کے انڈے جیسا تھا۔

’’میرا خیال ہے یہ آخری طعام ہے۔‘‘ عبید صلاح نے خوش دلی سے کہا۔ ’’سزا سنانے کے ساتھ ہی اس پر عملدرآمد کر دیا جائے گا۔‘‘

’’بے شک مغربی اقوام فوری انصاف پر یقین رکھتی ہیں۔‘‘ میں نے اس کی تائید کی۔ ’’خاص طور سے جب معاملہ مسلمانوں کا ہو۔ عرق کی مثال لے لو، کویت کو انصاف کی فراہمی میں کتنی پھرتی دکھائی گئی۔‘‘

’’اسرائیلی بے چارے آج تک اس انصاف سے محروم ہیں جو عراق کے ساتھ کیا گیا تھا۔‘‘ عبید تلخی سے ہنسا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہمیں کوٹھری سے نکالا گیا اور چار گارڈز کی نگرانی میں ہم کونسل کی طرف روانہ ہوئے۔ خلافِ توقع آج ہمیں بند گاڑی کے بجائے کھلی جیپوں میں لے جایا گیا تھا۔ مجھے اور عبید کو الگ الگ جیپوں میں بٹھایا گیا تھا۔ حسبِ معمول ہمارے ہاتھوں میں بندھی ہتھکڑیوں کو بکس کے ساتھ لاک کر دیا گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا انتظام تھا، نہ جانے ہماری پولیس اس پر عمل کیوں نہیں کرتی۔ جس کی تحویل سے آئے دن ملزمان فرار ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً اس سہولت کی عدم فراہمی کی وجہ پولیس کو سہولت دینا ہے۔ ورنہ پولیس مقابلے میں فرار ہونے والے ملزمان کے مارے جانے کے واقعات میں خاصی کمی آ جائے گی۔

جیپیں قصبے سے گزر رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار قریب سے جزیرے کی آبادی کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ یہاں مکانات ایک ترتیب سے بنائے گئے تھے۔ جس سے ٹاؤن پلاننگ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ عجیب بات تھی لوگوں میں ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، افریقی بھی، وسط ایشیائی باشندے بھی تھے اور مشرق بعید کے باشندے بھی تھے۔ ان میں شمالی امریکہ کے سفید فام بھی تھے اور جنوبی افریقہ کے انڈین باشندے بھی نظر آ رہے تھے۔ لازماً ان میں یورپی افراد بھی تھے۔ پورے قصبے میں صرف ایک جگہ ہی بازار نظر آیا۔ جہاں دو درجن کے لگ بھگ دکانیں تھیں۔ جب جیپیں بازار سے گزریں تو دکانوں پر دنیا کا ہر سامان نظر آیا تھا۔

ایک خوب صورت اور صاف ستھرا قصبہ ہونے کے باوجود مجھے اس میں کوئی کمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو یہی کمی سمجھ میں آئی کہ قصبے کی کوئی تہذیب کوئی شناخت نہیں تھی۔ اسے دنیا بھر کے لوگوں کی کھچڑی بنا دیا گیا تھا۔ مجھے لوگوں کے چہرے پر عجیب سی ویرانی اور بے حسی نظر آئی تھی۔ ان کی آنکھیں خالی سی تھیں۔ جیسے ان کے ذہنوں میں کوئی سوچ نہ ہو بالکل کسی روبوٹ کی طرح جو پہلے سے دیئے گئے پروگرام پر ہی عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے سوچنے سے قاصر ہوتا ہے یا کولہو کا بیل جو سدا ایک ہی دائرے میں گردش کرتا ہے۔ اس کی ساری دنیا اس دائرے تک محدود ہوتی ہے۔ مجھے یہ لوگ بھی جیتے جاگتے انسانی روبوٹ لگتے تھے۔

''نیچے اُتر آیئے یور ایکسی لینس۔'' گارڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں چونکا۔ اس نے میری ہتھکڑی ہک سے کھول دی تھی۔ میں نیچے اُترا عبید صلاح بھی اُتر آیا تھا۔ ہمیں کونسل کی عمارت کے اندر لے جایا گیا۔ اگرچہ یہ کوئی باقاعدہ عدالت نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے یہاں عدالت کا سا تاثر پیدا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ تاثر تو دلوں میں ہوتا ہے جب آدمی کو معلوم ہو کہ اس کے ساتھ انصاف کو ایک طرف کر کے کارروائی کی گئی ہے۔ تو وہ اسے عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ یہ تو عدالت اور انصاف کے نام پر دھبہ تھا۔ پہلے میں اندر گیا تھا۔ وہاں ایک دو تین سپاٹ سے چہرے سجائے بیٹھے تھے۔

نمبر ون نے کہا۔ ''مسٹر یوسف آئی کونسل نے تمہیں صفائی کے لیے ایک دن کا موقع دیا۔''

''میں اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر اور دانت صاف کر کے آیا ہوں۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے جو سہولیات دی گئی ہیں ان میں اتنی ہی صفائی ممکن ہے۔''

نمبر دو نے دانت پیسے۔ ''اپنی زندگی کے ساتھ مذاق مت کرو۔''

''میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔''

''تم نے اس الزام پر کوئی صفائی پیش نہیں کی۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس کرتا۔'' میں بے پروائی سے بولا۔

''او کے مسٹر یوسف۔'' نمبر ون نے کہا۔ ''اب تمہیں کونسل کے فیصلے سے کوئی شکایت نہیں





ہونی چاہیے۔ تم نے اپنی صفائی دینے کا موقع خود کھو دیا۔ تم نے جزیرے پر آ کر جو سنگین جرائم کیے اور یہاں کے نظم و نسق میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تم نے جزیرے کی ایک معزز ہستی پر دو بار قاتلانہ حملہ کیا اور جیسا کہ تم نے خود تسلیم کیا کہ تم اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان جرائم کو مدِنظر رکھتے ہوئے کونسل تمہیں سزائے موت سناتی ہے۔ سزا پر سات دن کے اندر عمل درآمد ہو گا۔ تم اس سزا کے خلاف اپیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔''

''مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''مسٹر یوسف کیا تمہیں اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' نمبر تین نے حیرت سے کہا۔

''مجھے اپنی زندگی کی اتنی ہی پروا ہے جتنی کہ تمہیں ہے لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجبور ہوں۔ میرے خیال میں مجھے طے شدہ سزا سنائی گئی ہے۔ میرا صفائی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔''

''تم کونسل کی توہین کر رہے ہو۔'' نمبر ون نے سخت لہجے میں کہا۔

''یور آنر، توہین اس کی ہوتی ہے جس کی کوئی عزت ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔''

میرے باہر آتے ہی گارڈ عبید کو اندر لے گئے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ڈرامہ ہوا۔ البتہ اس نے اپنے دل کی بھڑاس کھل کر نکالی تھی اور جب وہ باہر آیا تب بھی اس کی زبان بلٹ ٹرین کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس پر ایک گارڈ کا صبر جواب دے گیا اور اس نے اچانک عبید صلاح کے سر پر رائفل کا دستہ مارا۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ وہ نیچے گرا تو میں اس کی طرف لپکا ضرب شدید تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے خونخوار نظروں سے گارڈ کی طرف دیکھا اور یک دم اس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اگلے ہی لمحے مجھ پر چاروں طرف سے بٹ پڑنے لگے تھے۔



بنگلہ بے حد خوب صورت تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے اس بنگلے کے بیشتر حصوں پر بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ سرخ کھپریل کی چھت دور سے نمایاں تھی۔ چاروں طرف لان تھا۔ جس میں رنگا رنگ پھولوں کے تختوں کے ساتھ سلیقے سے سرو کے درخت لگے تھے۔ بالکل ایسا منظر تھا جیسا کہ تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ بنگلے کے عقب میں لان ایک گہری کھائی تک جاتا تھا۔ اسے محفوظ بنانے کے لیے کنارے پر سفید لکڑی کا جنگلا لگا دیا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے سے بنگلے کو پانچ فٹ اونچی سفید پتھروں سے بنی دیوار نے گھیر رکھا تھا۔ جس وادی میں یہ بنگلا تھا اسے تین اطراف سے بلند برف پوش پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ وادی کا وسطی حصہ کسی قدر ہموار تھا۔ جہاں کھیتوں میں گندم اور مکئی کاشت کی جاتی تھی۔ بہار کا موسم تھا اور ہر طرف رنگ تھے۔ ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی یہ ایسی فضا تھی کہ مُردہ بھی جی اُٹھے لیکن میرے اندر کی مایوسی تھی کہ دور ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بار بار کاجل کی اشک بہاتی آنکھیں سامنے آ جاتیں۔ اس کی سسکیاں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔

''مت جاؤ یوسف مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

جمشید علی نے نہایت خاموشی سے سارا کام کیا تھا۔ ایک سکول میں میرا داخلہ ہو چکا تھا۔ ایبٹ آباد کا بنگلہ ری فرنش کیا جا چکا تھا اور روانگی کے لیے ایئر ٹکٹس بھی آ چکے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ جانے سے ایک دو دن پہلے کاجل کو بتا دوں گا لیکن اس سے پہلے ہی اسے معلوم ہو گیا۔ کیسے، میں نہیں جانتا ممکن ہے اسے ہمارے معمولات میں تبدیلی کا احساس ہو گیا ہو۔ میں نے سکول جانا ترک کر دیا تھا۔ ماہ پارہ روانگی کے لیے شاپنگ کر رہی تھیں اور سب سے زیادہ خوش حسن علی تھا۔ اس کی یہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کاجل کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا ہو۔ میرے معاملے میں اس کی یہ حس بے حد تیز تھی اور میرے بارے میں بہت ساری باتیں اسے بغیر بتائے معلوم ہو جاتی تھیں۔ ایک بار میں اسٹڈی کر رہا تھا۔ مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے انٹر کام پر کچن سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ نہ جانے سیٹ خراب تھا یا کچن میں ہی کوئی نہیں تھا۔ میں جھلا گیا۔ چائے کے لیے پورا نیچے جا کر کہو۔ میں نے چائے پینے کا ارادہ ترک کر دیا۔





کچھ دیر بعد دیکھا تو کاجل ٹرے میں چائے لیے چلی آ رہی تھی۔

''ارے تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔''

''بس معلوم ہو گیا۔'' اس نے معصومیت سے اپنے چہرے پر آنے والے بال ہٹائے۔ ''میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا تمہارے لیے چائے بناؤں۔ تم پڑھ رہے ہو ناں؟''

''تھینک یو ڈیئر۔'' میں نے اسے پیار کیا تو وہ خوشی سے کھل اُٹھی تھی۔

لیکن اس وقت جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں ساتھ لے جانے کے سوئٹرز اور گرم کوٹ بڑے سوٹ کیس میں رکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے بوکھلا کر سوٹ کیس بند کر دیا۔

''کاجل کیا ہوا تم رو رہی ہو؟''

''مت بات کرو مجھ سے۔'' اس نے کہا۔ ''تم ایک نمبر کے جھوٹے اور کمینے ہو۔''

''اتنے بڑے الزامات کس خوشی میں۔''

''تم پیلس سے جا رہے ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''تت...... تم سے کس نے کہا۔'' میں بوکھلا گیا۔

''فرشتوں نے۔'' اس نے ایک سوئٹر اُٹھا کر مجھے مارا اور پھر اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں آنے والی ہر شے اُٹھا کر مجھ پر پھینکنا شروع کر دی۔ ایک برش، ایک پرفیوم کی شیشی اور پاؤڈر کا ڈبہ کھونے کے بعد میں اسے پکڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ غصے میں اس کے بدن میں جناتی قوت آ جاتی تھی اور مجھے اسے قابو کرنے میں پسینہ آ گیا تھا۔ اس کا بدن کمان کی طرح تن رہا تھا اور بار بار تڑپ کر وہ میرے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ میرے بازو میں دانت گاڑا۔ خوش قسمتی سے دانت گڑنے سے پہلے میں نے اس کا منہ پکڑ لیا تھا۔ اس دوران میں اسے پچکار بھی رہا تھا۔ ''آرام سے کاجل، ڈیئر ایزی۔''

بالآخر میں نے اسے یوں قابو کیا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد اس نے جدوجہد ترک کر دی اور رونا شروع کر دیا۔ میرے لیے اس کا رونا ناقابلِ برداشت تھا۔ ''خدا کے لیے کاجل یہ کیا حرکت ہے۔''

''تم کیوں جا رہے ہو؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''پڑھنے کے لیے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''یہاں پر بھی تم پڑھ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''چھوڑو مجھے۔'' میری نرم گرفت سے وہ چکنے صابن کی طرح پھسل گئی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ میں ذرا پیچھے تھا۔ مجھے اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دوڑ کر پکڑنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جست لگائی اور نرم قالین پر گرتے گرتے اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ وہ بھی دھڑام سے گری تھی۔

میں نے اس کے ٹخنے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے تڑپ کر دوسری لات چلائی جو میرے پیٹ میں لگی تھی۔ اس کا ٹخنہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ درد نے ایک لمحے کو مجھے شل کر دیا تھا۔ کاجل نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا مگر اس کا شلوار کا پائنچہ اُلجھا اور وہ پھر گر گئی۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے اسے چھاپ لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کا دماغ درست کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ اسے دو چار کس کر تھپڑ رسید کیے جائیں۔ امکان تھا کہ اس کا اُبال بیٹھ جائے گا۔ دوسرا طریقہ زیادہ مؤثر تھا اور اسے اکثر ضدی خواتین کے معاملے میں مؤثر پایا ہے۔ جب میں نے اس پر عمل کیا تو اس کا تمام غصہ جنون اور تڑپن میں ختم ہو گیا۔ ان کی جگہ گھبراہٹ اور شرم نے لے لی۔

"چھوڑو مجھے بدتمیز۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ میں نے ایک قہقہہ لگا کر اسے آزاد کر دیا۔

"اب بولو۔"

وہ جھینپ رہی تھی۔ "ابھی کوئی آجاتا تو؟ اس دن بھی پاپا نے دیکھ لیا تھا۔"

"اس ممنوعہ پھل کو کھانے کی پاداش میں جنت سے نکالا جا رہا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ پاپا......"

میں نے سر ہلایا۔ "ظاہر ہے غلطی ہماری ہے۔ تہذیب، اخلاق اور معاشرہ ہمیں اتنے نزدیک آنے کی اجازت نہیں دیتا اسی وجہ سے پاپا مجھے دور بھیج رہے ہیں۔"

"لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس کی آنکھیں دوبارہ برسنے لگیں۔

میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ موتیوں جیسے آنسو صاف کیے۔ "کاجل میری جان یہ ہماری بہتری کے لیے ہے۔"

"مجھے ایسی بہتری نہیں چاہیے۔" اس نے مچل کر کہا۔ "جو مجھے تم سے دور کر دے۔"

"دیکھو ابھی ہماری پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کی عمر ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ان باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے ضد سے کہا۔ "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی اور تم گئے تو میں جان دے دوں گی۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کاجل اب ہم بچے نہیں رہے۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ ضدی پن سے زندگی نہیں گزرتی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

"کیوں سیکھنا ہے؟" وہ چیخ اُٹھی۔ "تعلیم تم یہاں بھی مکمل کر سکتے ہو۔"

"میں اس سکول کے معیارِ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ اب مجھے جس سکول میں داخلہ ملا ہے وہ بین الاقوامی معیار کا ہے۔"





"کراچی مین اور بھی اچھے سکول ہیں۔"

"پلیز کاجل...... سمجھا کرو، یہ پاپا کا حکم بھی ہے۔"

"تم ان سے بات کر سکتے ہو۔"

"کاجل تم ان کی سب سے چہیتی اولاد ہو۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ تمہیں پیار کرتے ہیں اس کے باوجود اگر وہ کوئی فیصلہ سنا دیں تو کیا تم ان کا فیصلہ تبدیل کروا سکتی ہو؟"

اس کا سر جھک گیا۔ "شاید نہیں۔"

"تو پھر میں کیسے کروا سکتا ہوں؟ میں تو ان کی اولاد بھی نہیں ہوں لے پالک ہوں۔"

"نہیں۔" کاجل تڑپ اُٹھی۔ "پاپا تمہیں بالکل بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔"

"بیٹے کی طرح۔" میں ہنسا۔

کاجل کے چہرے پر ایک نرم سا غم آلود تاثر پھیل گیا تھا۔ اس نے اپنی بے پناہ سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "یوسف تم نہیں مانو گے؟"

"میری جان میرے ماننے نہ ماننے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ فی الوقت میں کٹھ پتلی ہوں، دوسروں کے ہاتھ میں لیکن آنے والا وقت میرا ہوگا اور میں جو چاہے کر سکوں گا۔" میں نے یقین سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم بھی میری ہو گی۔"

اس کی آنکھیں پھر جھک گئیں۔ "میں اب بھی......" وہ کہتے کہتے رُک گئی لیکن میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

"کاجل مجھے جانے دو۔ ورنہ میں تم سے دور نہیں رہ پاؤں گا۔ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

"میں...... میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

اچانک وہ اُٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں دوبارہ دراز ہو گیا۔ چھت کو گھورتے ہوئے میں کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کب ماہ پارہ آ گئی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھیں تو میں چونکا۔

"آپ...... کب آئیں؟"

"ابھی تم کہاں گئے ہوئے تھے؟"

"کہیں نہیں یہیں تھا۔" میں اُچھل کر بیٹھ گیا اور دوبارہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا ماما۔"

"کاجل کے بارے میں سوچ سوچ کر۔" وہ ہنسیں۔

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "وہ پاگل لڑکی اگر کچھ کر بیٹھی تو میں کس

سے حساب طلب کروں گا۔ پاپا سے یا خود سے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" وہ یقین سے بولیں۔ "میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"کیسے سمجھائیں گی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ میری بات سننے کو تیار نہیں ہے۔"

"میں اسے اپنے طریقے سے سمجھاؤں گی۔" ماہ پارہ بولیں۔

"مام...... حسن علی خوش ہیں ناں؟"

"معلوم نہیں۔" انہوں نے غیر واضح انداز میں کہا۔

"اب تو وہ مجھ سے بھی جیلس ہونے لگے ہیں۔" میں ہنسا۔ "اس دن دیکھا تھا۔ سنا ہے محترم دو دن خوشامدیں کرتے رہے تھے۔"

"یوسف...... میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی میرے اور تمہارے تعلق کو شک کی نظر سے دیکھے۔ میں شک کرنے والے کا منہ نوچ لوں گی۔" وہ بولیں۔ غصے سے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور حسن علی نے اندر جھانکا۔

"اچھا جی تو لاڈ اُٹھائے جا رہے ہیں۔"

"آیئے استادِ محترم۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ عقل مند لوگوں میں سے ہیں اور کہتے ہیں عقل مند لوگوں کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔"

حسن علی کھسیا گیا تھا۔ "صاحبزادے زیادہ ہی تیز جا رہے ہو۔"

"جناب کی شاگردی میں رہتا ہوں۔" میں نے اُٹھ کر کہا۔

"اچھے شاگرد ہو یار کچھ سفارش ہی کر دو۔" اس نے دزدیدہ نظروں سے ماہ پارہ کی طرف دیکھا جو کسی قدر سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

"انسان اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔" میں نے حسن علی کا قول دہرایا۔

"بکومت بعض معاملات میں اپنی سفارش نہیں چلتی۔" وہ جاتی ہوئی ماہ پارہ کو دیکھ کر بولا۔

"دیکھیں استادِ محترم...... ماہ پارہ میرے لیے ماں جیسی محترم ہیں۔ میں ان کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہوں۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی بیٹا ماں سے اس قسم کی سفارش نہیں کر سکتا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ افسردہ ہو گیا۔ "ماہ پارہ مجھ سے ناراض ہے۔"

"آپ نے بات بھی ناراض کرنے والی تھی۔"

"غلطی آدمی سے ہو جاتی ہے اور خاص طور سے دل کے معاملات میں آدمی بہت غلطیاں کرتا ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"میرا خیال ہے رفتہ رفتہ وہ نارمل ہو جائیں گی۔"

"لیکن اس وقت تک میرا کیا ہوگا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

بے اختیار مجھے چند منٹ پہلے کاجل کے سامنے اپنی کیفیت یاد آ گئی۔ میں اسے دُکھی اور





ناراض کر کے جا رہا تھا اور اس کا دُکھ مجھ سے برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا۔ آدمی بہت ساری جگہوں پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"آپ نے تیاری مکمل کر لی۔" میں نے بات بدلی۔

"ہاں میری کیا تیاری ہے۔ بس ایک سوٹ کیس لینا ہے اور چل پڑنا ہے۔"

"وہاں خاصی سردی ہوتی ہے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "آپ کچھ گرم کپڑے لے لیں۔"

"دیکھ لیں گے۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کاجل کو بتا دیا؟"

"آپ ذرا اِرد گرد نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کاجل نامی طوفان یہاں سے آ کر جا چکا ہے۔" اس نے بکھرے سامان کو دیکھا پھر مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"مجھے تمہارا مستقبل مخدوش نظر آ رہا ہے۔ کاجل سے نمٹنے کے لیے تمہیں اضافی تربیت کی ضرورت پڑے گی۔"

"استادِ محترم اس کی فکر نہ کریں کاجل وہ گھوڑی ہے جو چاہے کتنا ہی اُچھلے کودے بالآخر میں اسے قابو کر ہی لیتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ خفیف نظر آنے لگا۔

دو دن بعد ہماری روانگی تھی اور مجھے کوشش کے باوجود کاجل کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ جس صبح روانگی تھی میں بے چینی سے نیچے کے کئی چکر لگا چکا تھا ماہ پارہ میری کیفیت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جیسے جیسے جانے کا وقت ہو رہا تھا میرے اندر مایوسی اور غصہ بھرتا جا رہا تھا اور میں نے باقاعدہ کاجل کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ ماہ پارہ نے سمجھایا۔ "اینی یوسف...... اگر کاجل نہیں آئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا؟" میں نے چلا کر کہا۔ "اس اُلو کی پٹھی کو معلوم نہیں تھا کہ میں جانے والا ہوں۔ اب تین چار مہینے تک وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔"

"اس سے زیادہ یہ بات کون جانتا ہوگا۔" ماہ پارہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل ساری رات اس کے کمرے کی روشنیاں جلتی رہی تھیں۔"

"ان لڑکیوں کی عقل نہ جانے کہاں ہوتی ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"ان کے دل میں، ورنہ احمق کیوں کہلائیں۔"

میرا غصہ صرف سوڈے کے اُبال کی طرح تھا۔ جو چند لمحوں میں بیٹھ گیا۔ میں نے تقریباً گھگھیا کر ماہ پارہ سے کہا۔ "پلیز اس سے کہیں ایک بار آ کر مجھ سے مل لے۔ اس کے کمرے کے آس پاس زہرہ بیگم منڈلا رہی ہیں۔"

ماہ پارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "یوسف میں تمہیں ڈرپوک نہیں سمجھتی تھی۔ مرد بنو اگر کاجل سے ملنا ہے تو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آہ...... کیا مشکل کام بتا دیا۔" میں نے آہ بھر کر حسن علی کی طرف دیکھا۔ "مرد بننا۔" اس پر

اس نے مجھے گھورا تو میں کان دبا کر کمرے سے نکل گیا۔ دل کڑا کر کے میں نے فیصلہ کیا کہ آج زہرہ بیگم کا خوف بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ میں نیچے پہنچا تو حسبِ توقع زہرہ بیگم گیلری میں موجود تھیں۔ میں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور کاجل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے عقب سے پکارا۔ ''اے کہاں جا رہے ہو؟''

''کاجل سے ملنے۔'' میں نے رُکے اور مڑے بغیر کہا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتی میرے پیچھے آئیں۔

''چلیئے اچھی بات ہے اس کی عیادت بھی کرلوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور فوراً کاجل کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے دروازہ اندر سے لاک کرلیا تھا۔ کاجل بستر پر نہیں تھی بلکہ کھڑکی کے سامنے ہینگنگ چیئر پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔

''کیوں آئے ہو؟'' اس نے خفگی بھری آواز میں کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوں۔'' میں نے اس کے سامنے آکر کہا۔

''مت بات کرو مجھ سے۔'' اس نے منہ پھیر لیا۔

''تو پھر کس سے کروں۔ یہاں تو تم نے کسی لڑکی کو میرے پاس پھٹکنے نہیں دیا اور اب جہاں میں جا رہا ہوں وہاں کو ایجوکیشن ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسی مل جائے کہ پھر تمہاری یاد زیادہ ستائے۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دانت پیس کر بولی۔

''میں قتل کردوں گی تمہیں۔''

''اپنی دھمکی دیکھو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا کسی سے اس طرح دھمکیوں کے ساتھ دوستی کی جاسکتی ہے۔''

''یوسف...... یوسف۔'' وہ کرسی سے اُتر کر میری طرف لپکی۔ پھر ایک دم ٹھہر گئی۔ اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''کہیں تم کسی چکر میں تو نہیں ہو۔''

''کس چکر میں؟''

''کہ میں تمہارے پاس آؤں اور تم پھر بدتمیزی کرو۔'' اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''کس قسم کی بدتمیزی؟'' میں نے بھولپن سے کہا۔

''وہی جو اس دن......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔

میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''تم آئی کیوں نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں آج جا رہا ہوں۔ پھر تم چھ سات مہینے سے پہلے میری صورت نہیں دیکھ پاؤ گی۔''

''مجھے شوق بھی نہیں ہے۔'' اس نے دوسری طرف دیکھ کر کہا۔ کوشش کے باوجود وہ آواز بھرانے سے نہیں روک سکی تھی۔

''کاجل کچھ ہی عرصے کی تو بات ہے۔''





''میرے لیے تو یہ صدیوں کے برابر ہوگا۔''

''سنو۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''جب پاپا مجھ سے ملنے آئیں تو تم بھی ان کے ساتھ آجانا۔ بلکہ کچھ دنوں میں گرمیوں کی چھٹیاں پڑ جائیں گی۔ تم ایبٹ آباد آجانا۔''

''تم کسے بہلا رہے ہو؟'' وہ تلخی سے بولی۔ ''مجھے یا خود کو؟ اگر پاپا کو ہمارا ساتھ گوارہ ہوتا تو وہ تمہیں اتنی دور بھیجتے ہی کیوں؟''

میں خفیف ہوگیا۔ ''چلو میں آجاؤں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا تم پاپا کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتے اور پاپا تمہیں آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ میں سردیوں کی چھٹیوں میں تو آسکتا ہوں۔''

''اگر پاپا نے اجازت دی تو۔'' وہ بولی۔

''کاجل خدا کے لیے اتنی سنگ دلی سے مت کہو پاپا اتنے ظالم نہیں ہوسکتے۔''

''کل تک تو تم پاپا کی حمایت کر رہے تھے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''ان کے فیصلے کو درست قرار دے رہے تھے۔''

''وہ تو میں اب بھی درست کہہ رہا ہوں۔ اگر ہم یونہی پاس پاس رہے تو مجھے یقین ہے کہ ہم کچھ نہیں سیکھ پائیں گے۔ کاجل ہم عام بچوں سے کہیں زیادہ میچور ہیں اور تمہیں اپنی صلاحیتیں ایک ہی سمت میں نہیں صرف کرنی چاہئیں۔''

''میں بھی سمجھتی ہوں لیکن میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ اپنے دل پر بھی اختیار نہیں رکھتی۔''

''اس بنا پر پاپا نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے کا فیصلہ لیا ہے۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی۔ ''یوسف یاد رکھنا تم سے جدا ہو کر میں زندہ نہیں رہوں گی جلد مر جاؤں گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا ایک عالمِ جنون میں اسے خود میں چھپا لیا۔ جیسے موت سچ مچ اسے مجھ سے چھیننے آرہی تھی۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے میری آغوش میں دبکی رہی۔ میں نے اس کی پیشانی چومی اور چپ چاپ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ جب میں جانے کے لیے کار میں بیٹھ رہا تھا تو کاجل کی کھڑکی سے ایک سایہ پردے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ میں اس وقت تک اس سائے کو دیکھتا رہا جب تک کار جمشید پیلس سے نہیں نکل گئی تھی۔

اپنی زندگی میں پہلی بار میں جہاز پر بیٹھا تھا لیکن مجھے اس میں کوئی سنسنی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی مجھے اپنی دیرینہ آرزو یعنی پیلس سے نکل کر دنیا دیکھنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب ہم اسلام آباد میں اُترے۔ جہاں محمود نظامی نامی شخص ہمارا منتظر تھا۔ وہ جمشید علی کے دوستوں میں

سے تھا اور اسلام آباد میں ہمارا قیام اور ایبٹ آباد کی طرف روانگی اسی کے ذمے تھی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ رات ہم اس کے بنگلے پر گزاریں اور صبح سفر پر روانہ ہو جائیں۔ حسن علی نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ مجھے ان باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ میں خاموش رہا خود ماہ پارہ اور حسن علی نے میرے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے مجھے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ رات ہم محمود نظامی کے عالیشان گھر میں رہے۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے ہمارا تعارف کرایا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں جن کی عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔ ایک بیٹا تھا۔ شامی تیرہ سال کا تھا اور بے حد شوخ تھا۔ کھانے کی میز پر بھی وہ سب کو ہنساتا رہا تھا۔

میں کوشش کے باوجود اس کی باتوں سے محظوظ نہ ہو سکا۔ البتہ میں نے محسوس کیا کہ محمود نظامی کی دوسرے نمبر کی بیٹی ماریہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اس کی چوری پکڑی اور اس پر توجہ نہیں دی لیکن جب میں ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں آیا تو وہ بھی بے تکلفی سے کمرے میں چلی آئی۔ بلاشبہ وہ حسین لڑکی تھی۔ سنہری مائل بال جنہیں اس نے باب کٹ سٹائل میں بنا رکھا تھا۔ چھریرہ جسم اور لمبا قد، گلابی رنگت پر اس کی سیاہ آنکھیں یقیناً غضب ڈھاتی تھیں اور مختصر سا دہانہ پُرکشش لگتا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟''

''اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور گھر والے؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''وہ بھی اچھے لگے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''اچھا آپ کافی پئیں گے؟''

میں نے اقرار کر لیا کہ اس بہانے وہ کچھ دیر کے لیے یہاں سے ٹل جائے۔ مگر وہ بہ مشکل پانچ منٹ بعد دوبارہ آن موجود ہوئی۔ شاید کافی پہلے سے تیار تھی۔ وہ دو کپ کے ساتھ کریم اور شوگر الگ سے لائی تھی۔ میں نے شکر کے ساتھ کریم بھی لی۔

''اچھا تو آپ کو سب سے اچھا کون لگا ہمارے گھر میں؟'' کافی پیتے ہوئے اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''شامی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''وہ بے حد خوش مزاج رہا ہے۔''

اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر اسے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی لیکن وہ عورت ہی کیا جو ہار مان جائے۔ اس نے نئے زاویے سے حملہ کیا۔ ''اور ہم بہنوں میں سے کون اچھا لگا؟''

''معلوم نہیں میں نے غور نہیں کیا۔'' میں پہلو بچا گیا۔

اس کی جھلاہٹ لہجے میں اُتر آئی تھی۔ ''آپ صاف صاف جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''آپ پوچھنا کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے پھر سادگی سے کہا۔





''کچھ نہیں۔'' وہ جھلا گئی تھی۔ ''آپ کا موڈ شاید اچھا نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل میں زندگی میں پہلی بار گھر سے دور ہوا ہوں۔ شاید اس وجہ سے۔'' میں نے اس سے معذرت کی۔ ''پلیز بُرا مت منائیے گا۔''

''نو پرابلم۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''پھر بات ہوگی۔''

''میں کل صبح چلا جاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ جاتے جاتے بل کھا کر گھومی۔ ''ہمارا ایبٹ آباد میں بنگلہ ہے اور ان گرمیوں میں ہمارا اس طرف آنے کا پروگرام ہے۔''

''مارے گئے۔'' میں نے دل میں کہا۔ یہ تو کمبل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ خیر اس میں تو کوئی بُرائی نہیں تھی۔ وہ خاصی دلکش لڑکی تھی لیکن یہ خبر کاجل تک جا پہنچی تو وہ سچ مچ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گی۔ مجھے مار دے گی یا خود مر جائے گی۔ میرے کمرے میں فون تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کاجل سے بات کروں ہو سکتا ہے اس کا مزاج کچھ درست ہو گیا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کمرے کے پاس گیلری میں ایک فون تھا میں نے اس کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر کسی نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو۔'' میں بولا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ایک باریک سی آواز آئی۔

''کاجل۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ ''کیسی ہو جان؟''

''میں کاجل کی ماں ہوں۔'' اچانک زہرہ بیگم کی کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے بوکھلا کر فون بند کر دیا۔

ہت تیرے کی یہ کہاں سے آ گئیں دیوار بن کر۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار خاصی دیر تک بیل جاتی رہی جب کسی نے نہیں اُٹھایا تو میں مایوس ہو کر بند کرنے جا رہا تھا کہ ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے کاجل کی مدھم سی آواز آئی۔ ''یوسف۔''

''ہاں کاجل۔'' میں نے کہا تو وہ رونے لگی۔ ''پلیز روؤ مت، ورنہ میں سب کچھ چھوڑ کر بھاگ آؤں گا۔ بے شک پاپا بعد میں مجھے پیلس سے نکال دیں۔''

وہ جلدی سے چپ ہو گئی۔ ''یوسف تم مجھے یاد کر رہے ہو؟''

''اب تک تو تم ہی یاد ہو۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''کیا مطلب؟'' وہ مشکوک ہو گئی۔ ''تم کسی اور لڑکی سے بھی ملے ہو؟''

''تم سے جدا ہونے کے بعد میں کئی لڑکیوں سے مل چکا ہوں۔ سب سے پہلے ایک ایئر ہوسٹس سے ملا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ میرا جہاز سے اُترنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔''

''تو نہ اُترتے۔'' وہ جل کر بولی۔ ''پڑے رہتے جہاز میں۔''

''یعنی تمہاری طرف سے اجازت ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن کم بخت ایئر لائن والے کہاں مانیں گے۔''

''اب دوسری لڑکیوں کے بارے میں بتا دو۔'' وہ کھول رہی تھی۔

''بھئی ہمارے میزبان سبحان اللہ کیا بیٹیاں پائی ہیں انہوں نے، سب ایک سے بڑھ کر ایک، ایک نے تو اپنے دستِ خاص سے مجھے کافی بھی پلائی تھی۔''

''میں بھی پلاؤں گی۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''زہر۔''

''تمہارے دستِ حنا سے میں وہ بھی پی لوں گا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔

''یوسف تم سچ مچ دوسری لڑکیوں سے دوستی کرو گے؟'' اس نے جھجک کر کہا تو میں بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا۔

''تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔ بابا ابھی ایک کو تو بھگت نہیں پایا۔ دوسری سے دوستی کی ہمت کہاں۔''

''یوسف تم دوستی نہیں کرو گے لیکن لڑکیاں تو تمہاری طرف آئیں گی۔ تم کب تک ان سے بچو گے۔'' اس نے کہا۔

''بھلا لڑکیاں میری طرف کیوں آنے لگیں؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ''تم نے شاید خود کو آئینے میں غور سے نہیں دیکھا۔ تم...... تم بہت اچھے لگتے ہو۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''یہ بے ایمانی ہے۔ میں تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔ حالانکہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''کیا؟'' وہ خفا ہو گئی۔ ''مجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے؟''

''تم نے آئینہ دیکھا ہے۔ بکھرے ہوئے بال، پھیلی ہوئی آنکھیں اور نقوش ایسے جیسے ابھی پھاڑ کھاؤ گی۔''

''اگر یہ بات ہے تو مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو؟''

''مجبوری ہے، بچپن سے تمہاری صورت دیکھ دیکھ کر عادت ہو گئی ہے۔ اب کوئی صورت اچھی نہیں لگتی۔'' میں نے شرارت سے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے پھر ملایا۔

''احمق لڑکی اب فون بند کیا تو میں واپس آ کر وہی کروں گا۔''

''کیا؟'' اس نے روانی میں کہا۔

''جو اس دن کیا تھا۔'' میں شوخی سے بولا۔ ''جس کی پاداش میں تم سے ہزار میل دور پھینکا جا رہا ہوں۔''

''یوسف یہ تمہاری غلط فہمی ہے پاپا پہلے ہی تمہیں مجھ سے دور بھیجنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ممی بہت عرصے سے......''





''تو یہ ان کا دباؤ تھا۔ پاپا نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''تم ممی کو جانتے ہو۔'' کاجل بولی۔ اسی لمحے مجھے فون میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی جیسے کسی نے ایکسٹینشن اُٹھا لیا ہو۔ میں نے کہا۔ ''او کے کاجل پھر بات کروں گا۔'' اور جلدی سے فون رکھ دیا۔

کسی نے فون پر ہماری بات سننے کی کوشش کی تھی لیکن کہاں اس بنگلے میں یا جمشید پیلس میں، میں نے فون اُٹھایا تو اس سے ٹون کے بجائے سرسراہٹ آ رہی تھی۔ یعنی اس فون کا ایکسٹینشن کسی نے اُٹھایا ہوا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں یوں مہمانوں کے فون سنے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب چینج کر کے سو جانا چاہیے۔ صبح نو بجے روانہ ہونا تھا۔ میں نے اپنا سلیپنگ سوٹ نکالا باتھ روم گیا۔ دانت واش کر کے اور کپڑے بدل کر باہر نکلا تو ماریہ کو کمرے میں موجود دیکھ کر چونکا وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی شرمندگی دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا فون سننے والی ہستی وہی تھی۔

''خوب آپ کے ہاں بلا اجازت کمرے میں آنے کا رواج بھی ہے۔'' میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سوری۔'' اس نے سر جھکایا۔ تو اس کے تراشے ہوئے بال اس کے چہرے پر چھا گئے۔

''میں اپنی حرکت پر پہلے ہی شرمندہ ہوں مجھ سے یہ غلطی سے ہوا تھا۔ ہاں میں تجسس سے مجبور ہو کر باتیں ضرور سننے لگی تھی۔''

یک دم مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہ نائٹی میں تھی۔ ریشمی نائٹی اس کے تراشے ہوئے بدن پر جیسے ڈھلی جا رہی تھی۔ وہ رات کے اس پہر بلا جھجک میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ مجھے خود پر اعتماد تھا لیکن اگر ماہ پارہ یا حسن علی میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تو میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

''کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے اب تم جا کر سو جاؤ۔''

اس نے سر اُٹھا کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''آپ نے مجھے معاف کر دیا۔''

''ظاہر ہے۔'' میں چڑ گیا۔ ''اتنی سی بات پر میں تم کو سزا دینے سے رہا۔ اب جاؤ یہاں سے مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اس نے پیر پٹخے۔ ''آپ بدتمیز آدمی ہیں۔''

وہ چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا لیکن ابھی میں بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ وہ دوبارہ اندر آ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔

"خاتون کیا آپ مجھے سونے دیں گی۔ کل صبح مجھے طویل سفر کرنا ہے۔"

اس نے کچھ کہنے کے بجائے نائٹ بلب بھی بجھا دیا اور میرے پاس چلی آئی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"ششش...... خاموش رہو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور جب میں نے اس کا جسم محسوس کیا تو وہ بھی لرز رہا تھا۔ پہلے میں اسے کسی اور قسم کی لرزش سمجھا تھا لیکن فوراً ہی اس نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

"باہر لان میں کوئی ہے۔ میں نے جیک کے چلانے کی آواز سنی ہے۔"

"یہ جیک کون صاحب ہیں؟" میں نے ذرا پرے سرک کر کہا۔

"ہمارا کتا ہے۔ جرمن شیپرڈ، پاپا باہر سے لائے تھے۔"

"کتا کہہ دینا کافی ہے۔ یہ بتاؤ کہ لان پر کون ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ پھر مجھ سے چپک گئی۔

مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے ارادے نیک نہیں لگ رہے تھے۔ میں بستر سے اُتر آیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ "یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" میں نے شک سے کہا۔

"یہاں کیسے ہوگا، میں آگے والے لان کی بات کر رہی ہوں۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں اس طرف کھلتی ہیں۔ تم چل کر دیکھو۔"

اس کے انداز میں سادگی تھی لیکن میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ کوئی چکر نہ ہو۔ مجھے لڑکیوں کا زیادہ تجربہ نہیں تھا مگر میں نے جو پڑھا اور سکھا تھا اس صنف پر زیادہ اعتبار بھی مناسب نہیں تھا۔ خاص طور سے جب یہ کس کو گھیرنے کی فکر میں ہوں۔ اچانک وہ مجھ سے ٹکرائی۔ اس نے میرا بازو تھاما۔

"پلیز کیا سوچ رہے ہو۔" اس نے گھگھیا کر کہا۔

"میں...... میں کیا کروں کیا تم لوگوں نے گارڈ نہیں رکھے ہیں؟"

"ایک چوکیدار ہے۔ ڈیڈی کے زمانے کا۔ وہ صرف دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا کام جانتا ہے۔ ڈیڈی سے کئی بار کہا لیکن وہ اسے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ نظامی صاحب کو ایک غریب شخص کا خیال ہے لیکن انہیں حفاظت سے غافل نہیں ہونا چاہیے آج کل نجی محافظ عام مل جاتے ہیں۔"

"اُف یہیں کھڑے رہو گے۔" وہ جھلائی تو میرے دل میں شک بڑھنے لگا۔ آخر وہ پورے گھر کو چھوڑ کر میرے ہی پاس کیوں آئی تھی۔ "پھر کہاں چلیں۔"

"میرے کمرے میں، ان لوگوں کو دیکھو، مجھے لان پر کم سے کم دو افراد نظر آ رہے ہیں۔"

"تو چلو۔" میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو کہیں تمہارے ڈیڈی مجھے مقتول بنانے پر نہ تُل جائیں۔ تمہارا حلیہ بھی بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔"





"فضول باتیں مت کرو۔" اس کی کھسیاتی ہوئی آواز آئی لیکن اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا۔

بادلِ نخواستہ میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ کاریڈور سے گیلری مڑ کر اس کا دوسرا کمرا تھا۔ جو دائیں طرف واقع بنگلے کے بڑے لان کی طرف تھا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں ڈرائیو وے، پورچ اور لان کا مختصر حصہ تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ اس نے اندر گھستے ہی پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں ایک لمحے کو ٹھٹکا اور میں نے خود کو تیار کر لیا اگر اس نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو میں اس کا دماغ درست کر دوں۔ کمرے میں نیلی روشنی کا نائٹ بلب روشن تھا۔ میری توقع کے خلاف وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے بھی بلایا۔ وہ پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے اس کے اوپر سے دیکھا۔ اُجلی چاندنی میں لان صاف نظر آ رہا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم آرام سے بات کر سکتے ہو۔ میرا کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔" اس نے زور سے کہا تو میں اُچھل پڑا۔

"ساؤنڈ پروف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چیخنا شروع کر دو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ویسے اگر تم اپنی مدد کے لیے کسی کو بلانا چاہو تو اس صورت میں بھی کوئی نہیں آئے گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی وہ مجھ سے ذرا دور ہو گئی تھی۔

"مطلب یہ مس کہ اگر میری نیت تم پر خراب ہو جائے اور میں دست درازی پر اُتر آؤں تو تم کیا کرو گی؟"

"میں یہ کروں گی۔" اس نے بڑی پھرتی سے مجھے کھینچا اور اُٹھا کر بستر پر پھینک دیا۔ میں حیران رہ گیا۔ اس نے جوڈو کا داؤ بڑی مہارت سے لگایا تھا۔ اب وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے میرے سر پر چیلنج بنی کھڑی تھی۔

"میں نے ہار مانی۔" میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "میری توبہ کہ تم پر نیت خرابی کا خیال بھی دل میں لاؤں۔"

"دل میں لانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔ "لیکن عمل کے معاملے میں محتاط رہنا۔"

اس نے میرا اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ "بائی دی وے میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھے یا کسی کو مدد کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان لوگوں سے تو تم خود بھی نمٹ سکتی ہو۔"

"احمق مت بنو اس طرح رات گئے کسی کے گھر میں آنے والے مسلح ضرور ہوتے ہیں۔"

"لیکن میں تو خالی ہاتھ بھی نہیں لڑ سکتا۔ ہتھیاروں سے کیسے مقابلہ کروں گا۔"

"تم صرف باتیں کیے جاؤ گے یا کچھ کرو گے بھی۔" اس نے بھنا کر کہا۔

''وہ تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تم ہی نظر آ رہی ہو اگر اجازت ہو تو کچھ کروں کیونکہ اجازت نہ لی تو۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' وہ کہتی ہوئی دوبارہ کھڑکی سے لگ گئی۔ دفعتاً اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''دیکھو وہ دو نظر آ رہے ہیں۔''

میں لپک کر آیا۔ پردے کی مختصر جھری سے شیشے کے پار سنسان لان میں ایک درخت کے سائے میں دو ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مسلح تھے۔ جیسے ہی وہ ذرا چاندنی میں آئے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ایک نے خوف ناک سی A.K47 اٹھا رکھی تھی۔ کلاشنکوف کی یہ سب سے مہلک قسم ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ جسے اس نے بلاوجہ تان رکھا تھا۔ دونوں کے چہرے پر نقاب تھے۔ کلاشنکوف والے نے دائیں اور پھر بائیں دیکھ کر روانہ ہونے کا اشارہ کیا۔ میں فکرمند ہو گیا۔ یعنی آنے والے مسلح افراد کی تعداد کم سے کم چار تھی اور وہ خطرناک طور پر مسلح نظر آ رہے تھے۔

''راستے تو کئی ہیں۔'' وہ فکرمند ہو گئی۔ ''لیکن یہ ہیں کون؟''

''اگر آپ کہیں تو میں جا کر رضاکانہ طور پر ان سے پوچھ آؤں۔'' میں نے طنز کیا۔ اسی لمحے کہیں شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک دم اسے کھینچا۔ ''وہ لوگ اندر گھس آئے ہیں کیا یہاں چھپنے کی کوئی جگہ ہے۔''

میرے ذہن میں تھا کہ آنے والے نیک ارادے سے نہیں آ رہے تھے۔ جلد وہ پورے بنگلے کی تلاشی لیتے اور سب کو ایک ہی جگہ جمع کر لیتے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کا یہ محفوظ اور آسان طریقہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ میرے لیے ہی آئے ہوں اور اس صورت میں میرا ان کے ہاتھ نہ آنا اور بھی ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ ''ایک جگہ ہے تو۔''

''پھر جلدی کرو۔'' میں نے اسے کھینچا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میری نظر دھوبی کے ڈنڈے نما ایک چیز پر پڑی جو بعد میں بیس سال کا بلا ثابت ہوا۔ ہتھیار کے طور پر میں نے اسے اُٹھا لیا۔ بعض اوقات معمولی سی چیز کام دے جاتی ہے۔ ماریہ مجھے تیزی سے میرے کمرے کے بائیں طرف واقع گیلری میں لائی۔ یہاں اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے نچلے خلا میں خانے بنے ہوئے تھے جن میں مختلف آرائشی اشیا رکھی تھیں۔ تمام ہی خانے منقش لکڑی کے بنے تھے۔ جہاں سے سیڑھیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک تین فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ اونچا لکڑی کا ہی بنا ہوا تکون پینل تھا۔ بہ ظاہر یہ دیوار کا حصہ تھا لیکن ماریہ نے جھک کر نہ جانے کس کونے سے کیا دبایا پینل درمیان سے دروازے کی طرح کھل گیا۔ اس کے پیچھے خلا نظر آ رہا تھا۔ اسی لمحے گیلری سے آہٹ سی ہوئی۔ میں نے تیزی سے اسے خلا میں دھکیلا اور خود بھی گھس گیا۔ ہر ممکن تیزی سے میں نے پٹ بند کیے لیکن مجھے خدشہ تھا کہ آنے والوں نے اسے دیکھ لیا ہو گا۔ گیلری میں تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔




''یہاں تو کوئی نہیں ہے تیرے کان بج رہے ہیں۔'' ایک آواز آئی۔

''میں نے خود سنا تھا شوکے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''ایک بندہ اور ایک کڑی بول رہے تھے۔ تُو جانتا ہے میرے کان کتنے تیز ہیں۔''

''ہاں تُو خرگوش کی اولاد ہے۔ تیرے ماں باپ اگلے جھول کی تیاری کر رہے ہوں گے۔'' پہلے والے نے بے ہودہ انداز میں کہا تو میرے کان تپنے لگے تھے۔ میں اس وقت ماریہ پر تقریباً لدا ہوا تھا لیکن حرکت کرنے کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ ذرا سی آواز اس خرگوش کی اولاد کا خطاب پانے والے کو متوجہ کر سکتی تھی اس کے کان غلط نہیں تھے۔ ماریہ صبر اور ہمت سے میرے بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔

''تلاشی لے کمروں کی، جلدی ورنہ استاد نے تیری.....'' آگے پھر بے ہودہ بات تھی۔ میں نے دل میں اسے اس سے بھی زیادہ بے ہودہ بات کہی۔ ان لوگوں نے کمروں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ حالات پر مکمل قابو رکھتے تھے اور انہیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حسن علی نے کیا چپ چاپ ان کی بات مان لی ہوگی۔ وہ اکیلا ہی ان سب کی ایسی کی تیسی کر سکتا تھا لیکن دوسروں کی وجہ سے وہ بے بس ہو سکتا تھا جیسے ہی وہ گیلری سے دفع ہوئے میں نے اپنی پوزیشن بدلی۔ اس تین بائی تین فٹ کے خلا میں ہم فولڈ ہو کر ہی آ سکتے تھے۔ میں نے خاصی کوشش کے بعد ایک موزوں پوزیشن اختیار کی۔ اب میں اور ماریہ برابر برابر بیٹھے تھے۔ ہمارے جسم آپس میں پیوستہ ہوتے جا رہے تھے لیکن یہ صورتِ حال پہلے سے بہتر تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' میں نے اس سے کہا۔

''اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ گندی تو ان لوگوں کی زبان ہے۔''

میں معذرت کر رہا تھا اس دباؤ کی جو اس کے نازک بدن پر پڑ رہا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ میں ان لوگوں کی بکواس پر معذرت کر رہا تھا۔ کمر سے شانوں تک میرا جسم ایک گداز دہکتے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی مہکتی زلفیں میرے شانوں پر پریشان تھیں اور اسے چنداں فکر نہیں تھی لیکن میرا خیال غلط تھا چند لمحوں بعد اس نے شکایت کی۔ ''یہاں کچھ چبھ رہا ہے۔''

''اسے میری کہنی کہتے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''میں تمہاری نہیں دیوار کی بات کر رہی ہوں۔ شاید کیلیں نکلی ہوئی ہیں۔''

''کچھ ایسی ہی یزیں اس طرف بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا جگہ بدلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''پلیز کچھ کرو۔'' اس نے سرگوشی میں التجا کی۔

''ٹھیک ہے بعد میں شکایت نہ کرنا۔'' میں نے گہری سانس لی اور اسے کمر سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

وہ شرمیلے انداز میں ہنسی۔ ''بدتمیز۔''

''اُلو کی پٹھی۔'' میں نے دل میں اسے خطاب دیا۔ اس کے گھر میں مسلح افراد گھس آئے تھے۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی نہ جانے کس حال میں تھے اور اسے اٹکھیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ سچی بات ہے اس کے قرب کی گرمی اور مہک نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے پورے وجود کو متعارف کرانے پر تُلی گئی تھی۔ آخر میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔

''تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتیں۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''ورنہ میں باہر جاتا ہوں۔''

''نہیں۔'' وہ سہم کر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اپنی توجہ باہر کی صورتِ حال پر مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ماہ پارہ اور حسن علی کی فکر تھی دو افراد کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے گھٹیا ذہنیت کے لوگ تھے اگر انہوں نے ماہ پارہ کے ساتھ بدتمیزی کی تو حسن علی اسے برداشت نہیں کرے گا۔ وہ لڑنے کا کتنا ہی ماہر سہی اس کے مقابل افراد کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ وہ ایک ہی برسٹ میں سب کو مار سکتے تھے لیکن ماریہ کی کوشش تھی کہ میری ساری توجہ اس کی طرف رہے۔

باہر خاموشی تھی اور جب خاصی دیر تک کسی قسم کی کوئی آہٹ نہیں سنائی دی سوائے ماریہ کے دھڑکتے دل کی دھک دھک کے جو مجھ سے بے حد نزدیک تھا۔ تو میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

''تم یہیں ٹھہرو گی۔'' میں نے اسے کہا۔

''نہیں میں بھی چلوں گی۔'' اس نے فوراً کہا۔

''میں جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ اس کے لیے ایک آدمی بھی بہت ہے۔ اگر میدان صاف ہوا تو میں تمہیں بھی بلا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے پٹ کھولے اور اسے ایک طرف کرتے ہوئے جسم سکیڑ کر باہر نکل گیا۔ گیلری خالی تھی۔ ماریہ نے پٹ اندر سے بند کر لیے۔ اس کے ساتھ ایک بند جگہ پر چند منٹ گزار کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے اوپر جا کر دیکھا لیکن اوپر کے سارے ہی کمرے خالی تھے۔ میں واپس آیا۔ اس جگہ ایل کی شکل میں دو گیلریاں تھیں اور یہ متوازی تھیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی راہ داری انہیں ملاتی تھی۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ لوگ بنگلے کے اگلے حصے میں جمع ہوں گے لیکن کسی کونے کھدرے میں موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں پوری طرح احتیاط سے کمروں میں دیکھتا پھر رہا تھا۔ سارے کمرے خالی تھے۔ ماہ پارہ اور حسن علی کے کمرے بھی وہ میرے کمرے کے دائیں بائیں مقیم تھے۔ ماہ پارہ کے کمرے میں معمولی سی ابتری نظر آئی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس نیچے گرا ہوا تھا اور بستر کی چادر نصف نیچے لٹک رہی تھی۔ شاید ماہ پارہ کو بزور لے جایا گیا تھا۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میں بلا گھماتے گھماتے رہ گیا۔ یہ





ماریہ تھی میں نے بھنا کر سرگوشی کی۔ ''یہ کیا حماقت ہے ابھی تمہارا سر ٹوٹ جاتا۔''

''مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔'' اس نے منمنا کر کہا۔ ''مما ڈیڈی کا خیال مجھے پریشان کر رہا تھا۔''

''بڑی جلدی خیال آ گیا ان کا۔'' میں نے طنز کیا وہ شرمندہ ہو گئی۔

''ڈرائنگ روم تک جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔''

''ہم گھوم کر جائیں تو انہیں خبر بھی نہیں ہو گی۔''

''لان میں کوئی نہ کوئی ہو گا۔'' میں نے تجویز مسترد کر دی۔ ''کوئی اور راستہ۔''

''ڈیڈی کی اسٹڈی سے ایک راستہ جاتا ہے۔''

''اور اسٹڈی تک کیوں کر جائیں۔ گیلریاں تو دونوں کی نظروں میں ہیں۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ دوسری گیلری سے وہ ایک کمرے میں گھس گئی جو سٹور روم ثابت ہوا۔ وہاں بے شمار پُرانا سامان جمع تھا۔ ''اسی الماری کے پیچھے ایک دروازہ اسٹڈی میں نکلتا ہے۔ اسے ہٹاؤ۔''

''میں ٹارزن نہیں ہوں۔''

''الماری خالی ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''اس کے نیچے پہیے بھی ہیں آرام سے سرک جائے گی۔''

اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ الماری باآسانی سرک گئی اور ایک منٹ بعد ہم اسٹڈی روم میں تھے۔ ماریہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھولا۔ ساری پارٹی ڈرائنگ روم میں جمع تھی۔ ماریہ کے ممی ڈیڈی دونوں بہنیں جو ایک دوسرے سے چمٹی بیٹھی تھیں۔ شامی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ماہ پارہ اور حسن علی ایک صوفے پر برابر برابر بیٹھے تھے اور ماہ پارہ نے تحفظ چاہنے والے انداز میں حسن علی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ اندر سے کھول رہا ہو گا۔ اسے ذرا سا موقع ملا اور وہ آتش فشاں کی طرح ان لوگوں پر پھٹ پڑے گا۔ فی الحال وہ دوسروں کی وجہ سے مجبور تھا۔ مختصر سی جھری سے مجھے ڈرائنگ روم کا وسطی حصہ ہی صاف نظر آ رہا تھا۔ وسط میں ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی اور اوپر قمیص کے ساتھ پیتل کے چمک دار بٹنوں والی واسکٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ بس ایک ہیٹ اور ایک گھوڑے کی کمی تھی ورنہ وہ پورا کاؤبوائے نظر آتا۔

''نظامی صاحب جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے اسے مشکل طریقے سے کیوں کرواتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ میں ایک معمولی سا کاروباری آدمی ہوں۔'' محمود نظامی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مذاق مت کرو۔'' نوجوان ہنسا۔ ''اس عالیشان گھر کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ تم ایک معمولی

کاروباری ہو۔ مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ تم اس شہر کے سب سے بڑے بلیک مارکیٹیے ہو۔ کل ہی تمہارے پاس بہتر لاکھ کی رقم آئی تھی۔ وہ میرے حوالے کر دو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" محمود نظامی کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔

"ورنہ تم دیکھ لو گے۔ تمہاری بیوی ہے۔ تین لڑکیاں ہیں۔ ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ کیا تم گوارہ کر لو گے کہ اس رقم کے بدلے ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے۔"

"نہیں۔" محمود نظامی لرز اُٹھا۔

"اس کی تیسری لڑکی بھی ہے؟" ایک آواز آئی۔ بولنے والا شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تمہاری تیسری بیٹی کہاں ہے؟" نوجوان نے کڑے تیور سے پوچھا۔

"وہ......وہ اپنی دادی کے پاس گئی ہوئی ہے۔" محمود نظامی نے بہ مشکل کہا۔

"اگر یہ جھوٹ ہوا تو؟"

"اس کی دو بیٹیاں تو یہیں ہیں۔" نظر نہ آنے والے شخص نے خباثت بھرے لہجے میں کہا تو دونوں لڑکیاں مارے خوف کے ایک دوسرے سے مزید چمٹ گئیں۔ مجھ سے لگی ماریہ کا بدن لرزنے لگا۔

"محمود تمہیں صرف پانچ منٹ دیتا ہوں۔ رقم میرے حوالے کر دو۔ ورنہ یہاں جو ہوگا اسے تم اور تمہارے یہ مہمان ساری عمر فراموش نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کیا خیال ہے اسے بھی نہ شامل کر لیں۔" خبیث آواز والے نے کہا۔ اس کا اشارہ ماہ پارہ کی طرف تھا۔

"خبردار۔" حسن علی غرایا۔ "عورتوں کو ان معاملات سے دور رکھو۔ اگر مرد ہو تو۔"

"ہم اپنی مردانگی ثابت کر دیں گے۔" نوجوان نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہاں موجود خواتین کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ حسن علی کے چہرے پر طیش کی سرخی چھا گئی تھی۔ محمود نظامی زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی باتوں سے فتنے کی بُو آنے لگی تھی۔ ان کی نیت خراب تھی۔ غالباً وہ رقم بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اور لڑکیوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں تھے۔ یہ بات محمود نظامی اور حسن علی نے بھی محسوس کر لی تھی۔ لہٰذا جب ان کے ہاتھ پیر باندھے جانے لگے تو انہوں نے خاصی مزاحمت کی تھی لیکن خودکار ہتھیاروں کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ اب محمود نظامی نے منت سماجت شروع کر دی تھی۔

"تم لوگ مانتے کیوں نہیں کہ رقم میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آج صبح ہی اسے بینک میں جمع کرا دیا ہے۔"

"بکومت کوئی بلیک منی بینک میں جمع نہیں کراتا۔"

ان لوگوں نے حسن علی، محمود اور شامی کے ساتھ مسز نظامی کو بھی باندھ دیا تھا۔ اب وہاں پانچ





افراد نظر آ رہے تھے۔ جبکہ میرا اندازہ تھا کہ کم از کم ایک فرد باہر بھی تھا تا کہ کسی غیر متوقع صورتِ حال میں انہیں خبردار کر سکے۔ ایک شخص نے محمود نظامی کی بڑی بیٹی کو کھینچ کر صوفے سے کھڑا کر دیا۔ "ذرا بچ کے دکھا سوہنیے۔" اس نے مصطفیٰ قریشی کے انداز میں کہا۔ یہ وہی تھا خبیث آواز والا لڑکی نے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔ محمود نظامی نے تڑپ کر کہا۔

"چھوڑ دو اسے میں رقم دیتا ہوں۔"

"چھوڑ دے اسے۔" نوجوان نے قہقہہ لگایا۔ "بڈھا راضی ہو گیا ہے۔"

"رقم میری اسٹڈی کے خفیہ سیف میں رکھی ہے۔ مجھے کھولو میں رقم نکال کر دیتا ہوں۔"

"سیف کھولنے کا طریقہ بتاؤ۔ رقم خود لے لیں گے۔"

"سیف چابی اور نمبروں سے کھلتا ہے۔ تم میری میز کے عقب میں موجود الماری کو ایک طرف کھسکاؤ سیف اس کے پیچھے ہے، چابی میری جیب میں ہے اور نمبر ایک دو نو گیارہ بیس ہے۔" محمود نظامی مکمل طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا۔

"یہ تو یہیں آ رہے ہیں۔" ماریہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں پہلے ہی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو کھولنے پر باتھ روم ثابت ہوا۔ میں ماریہ سمیت اس میں گھس گیا۔ یہ اس الماری کے بالکل پاس تھا۔ جس کے عقب میں خفیہ تجوری تھی۔ ہمارے باتھ روم میں جاتے ہی دو افراد اندر گھس آئے تھے۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ ایک تو باس نوجوان تھا۔ دوسرا کوئی اور تھا۔ انہوں نے الماری سرکائی اور سیف کھولنے لگے۔ اس کام میں انہیں بہ مشکل ایک منٹ لگا تھا۔

"انہیں روکو۔" ماریہ نے کہنا چاہا تو میں نے اس کا منہ دبا دیا لیکن مجھے تاخیر ہو گئی تھی۔

"یہ آواز کہاں سے آئی۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"ان میں سے کوئی بولا ہوگا۔" نوجوان کا اشارہ کمرے سے باہر موجود افراد کی طرف تھا۔

"نہیں استاد آواز قریب سے آئی ہے۔"

چاپ باتھ روم کی طرف سے آئی۔ میں ماریہ کو لے کر دروازے کے عقب میں دیوار سے چپک گیا۔ اس لمحے دروازہ کھلا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی لمحے بھی روشنی ہو سکتی تھی اور اس کے بعد ہمیں پکڑے جانے میں دیر نہ لگتی۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے روشنی نہیں کی اور نہ ہی اندر جھانکا بلکہ دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت استاد کی آواز آئی۔ "سیف کھل گیا ہے۔"

"اس میں تو خاصا مال ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"سب سمیٹ لو۔" نوجوان نے اضطراب سے کہا۔ "شاد کو بلا لو۔ میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔"

"ابھی تو مزے بھی کرنے ہیں استاد۔" دوسرے نے ہنس کر کہا۔

"ہاں لیکن صبح سے پہلے ہمیں نکلنا ہے۔ اسلام آباد پولیس کا معلوم ہے ناں پکڑے گئے تو مارے جائیں گے۔"

ماریہ کی انگلیاں میرے بازو میں پیوست ہونے لگی تھیں۔ وہ سخت طیش میں تھی۔ اس نے باہر جانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے روک لیا۔ وہ منہ سے آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ بے بسی سے ہانپ کر رہ گئی۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ لوگ سیف خالی کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈرائنگ روم سے ماریہ کی بڑی بہن کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ بھی شور کر رہے تھے۔ پھر ان کا شور تھم گیا۔ شاید کسی طریقے سے ان کے منہ بند کر دیئے گئے تھے۔ خود میرے لیے صبر کرنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ماریہ کا تو بُرا حال تھا۔ اس کا اینٹھتا بدن کہہ رہا تھا کہ وہ باہر نکل کر ان بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی لیکن میں ایسے کسی اقدام کے حق میں نہیں تھا جو ہمیں بھی گرفتارِ بلا کر دے۔

کچھ دیر بعد اسٹڈی میں خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ لوگ چلے گئے تھے۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسٹڈی کا دروازہ بھی بند تھا۔ ماریہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکلتے ہی تیزی سے اسٹڈی کی میز کی طرف لپکی۔ اس نے ایک دراز کھولنے کی کوشش کی۔

"اس میں پاپا کا پستول ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ تمہیں اب یاد آ رہا ہے۔" لڑکی اب رونے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی موقع ہے انہیں قابو کرنے کا، دراز لاک تھی اور چابی نہ جانے کہاں تھی۔ میں نے دوسری درازیں کھولیں۔ اتفاق سے ایک دراز میں تار مل گیا۔ یہ پتری نما تار تھا۔ جو بعض اوقات کتاب میں صفحے اُلٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کی مدد سے دراز کا لاک کھولنے کی کوشش کی۔ مزید خوش قسمتی کہ بالکل اناڑی ہونے کے باوجود لاک کھل گیا۔ میں نے تیزی سے دراز میں اوپر ہی رکھا پستول نکالا۔ یہ کولٹ تھا۔ نیا اور بالکل لوڈڈ میں نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے ماریہ کو اپنا منصوبہ سمجھایا۔

"زیادہ جوش میں آگے مت نکل جانا۔ انہیں اندر لانے کی کوشش کرنا۔"

میں دروازے کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور ماریہ نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا اور چلائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"ارے یہ......یہیں ہے۔" کسی نے گالی کے ساتھ کہا۔ "پکڑو اسے۔"

ماریہ نے یوں دروازہ بند کر دیا جیسے جان بچانے کے لیے واپس بھاگی ہو لیکن دروازہ بند کرتے ہی اس نے کمرے کی روشنی بجھا دی اور بیس بال کا بلا تھام کر تیار ہو گئی۔ حسبِ توقع آنے والا اندھے بیل کی طرح اندر گھسا اور پھر یقیناً دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی ہو گی۔ ماریہ نے پوری قوت سے اس کے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ وہ کم سے کم بے ہوش





ہوا تھا اور اس کے دنیا سے گزر جانے کے روشن امکانات بھی تھے۔ میں نے تیزی سے اس کی تلاشی لی۔ اس دوران ماریہ یوں چیختی چلاتی رہی جیسے اس سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اسے اُٹھا کر میز پر ڈالا اور ایک دل خراش چیخ ماری۔ نسوانی چیخوں کی تو انہیں پروا نہیں تھی لیکن مردانہ چیخ نے انہیں چونکا دیا ہو گا۔ میں ایک بار پھر دروازے کے پیچھے مستعد کھڑا ہو گیا۔ ماریہ میز کے پاس فرش پر گٹھری بن کر لیٹ گئی تھی۔ کولٹ اس کے پاس تھا میں نے سر پر ڈنڈا کھانے والے کا ریوالور لے لیا تھا۔

"ارے کیا ہوا تجھے؟" باہر سے آواز آئی اور جب اندر سے خاطر خواہ جواب نہیں آیا تو بیک وقت دو افراد اندر گھس آئے تھے۔ میں نے ایک کو فوراً ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ دوسرا خطرہ بھانپ کر ایک طرف ہوا اور اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا ہی تھا کہ ماریہ اس پر چیل کی طرح جھپٹی اس نے ایک شاندار کِک مار کر اس کے ہاتھ سے ماؤزر طوطے کی طرح اُڑا دیا تھا۔ اس نے بلبلا کر گالی دی اور گالی ادھوری چھوڑ کر ایک پُرسوز آواز نکالی۔ ماریہ کی دوسری گھومتی لات اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ وہ کورنش بجا لانے کے انداز میں جھکا ہی تھا کہ میں نے اس کا سر بجایا اور وہ اپنے پیروں پر ڈھیر ہو گیا۔

حملہ آور ڈاکوؤں کی نصف نفری بے کار ہو چکی تھی لیکن ساتھ ہی باقی ڈاکوؤں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے تیزی سے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ اس لمحے باہر کوئی دروازے سے ٹکرایا تھا۔ "مکرم جی کیا ہوا؟" وہ چلایا۔

"ایک طرف ہو جاؤ۔" میں نے ماریہ سے کہا۔ جیسے ہی وہ ہٹی باہر سے کسی نے برسٹ مارا اور دروازے سے گزر کر گولیاں سامنے میز اور عقب میں الماری سے لگی تھیں۔ ہم کناروں پر تھے اور باقی زمین پر ڈھیر تھے۔ لہٰذا گولی کسی کو نہیں لگی۔ البتہ میں نے ایک چیخ مارنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ماریہ نے چیخ ماری۔ "یوسف کیا ہوا تمہیں تم ٹھیک ہو ناں؟"

"اُلو کی پٹھی۔" میں نے دل میں کہا اور حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے بس آخری ہچکی ہو۔

دوسرے برسٹ نے دروازے کا لاک توڑ دیا تھا اور کوئی آندھی کی طرح اندر داخل ہوا۔ ماریہ سمجھی کہ مجھے سچ مچ گولی لگ گئی ہے۔ اس نے ایک جنونی انداز میں آنے والے کو گولی مار دی۔ بعد میں یہ استاد ثابت ہوا تھا۔ استاد کی چیخ نے باقی دو کے اوسان خطا کر دیئے تھے اور انہوں نے رقم والا بیگ اُٹھا کر بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ ان کے جاتے ہی میں اسٹڈی سے باہر نکلا۔ میں محتاط تھا یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ڈرائنگ روم کا باہر جانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باقی ڈاکو غائب تھے۔ میں نے باہر جانے کے بجائے سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں تمام دروازے اندر سے بند کر لیے۔ پھر سب سے پہلے بیگم نظامی کو کھولا تا کہ وہ بے ہوش پڑی بیٹی کی ستر پوشی کر سکیں۔ انہوں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے لیکن خدا کا شکر تھا کہ وہ اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب نہیں ہوئے

تھے۔ پھر میں نے حسن علی کو کھولا اور بولا۔

''اسلحے پر قبضہ کرلیں۔ یہ ان باپ بیٹے کے ہاتھ میں نہ آنے پائے۔''

اس فیصلے کی وجہ محمود نظامی اور شامی کا طیش تھا جو ان کے چہروں سے ظاہر تھا۔ اگر ان کے ہاتھ ڈاکوؤں کا کوئی ہتھیار لگ جاتا تو وہ ان کو مار بھی سکتے تھے۔ ماہ پارہ کو بھی باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے انہیں کھولا۔ اس دوران میں حسن علی اسٹڈی میں جا چکا تھا۔ اس کے اندر جاتے ہی ماریہ بھاگتی ہوئی باہر آئی اور بے تابی سے میرا معائنہ کیا۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟'' اس نے میرا بازو تھاما۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے خفیف ہو کر کہا۔ اس کا باپ اور بھائی سامنے کھڑے تھے۔

''اپنی بہن کو دیکھو۔''

آزاد ہوتے ہی محمود نظامی فون کی طرف جھپٹا تھا۔ جیسے ہی اس نے ریسیور اُٹھایا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ ''لائن مُردہ ہے۔''

''ظاہر ہے انہوں نے سب سے پہلے فون کاٹے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ پڑوس سے کوشش کریں۔ ویسے اتنی فائرنگ ہوئی ہے اب تک کسی نے خیریت دریافت نہیں کی۔''

''یہاں بنگلے خاصے فاصلے پر ہیں۔'' محمود نظامی نے کہا۔ ''شاید ہی کسی نے آواز سنی ہو اور سنی بھی ہو تو توجہ نہ دی ہو۔''

''ڈیڈی اوپر کے حصے میں فون ہے۔ جو ہم نے برابر والوں سے لیا تھا۔ اس کا تار بھی درختوں سے آ رہا ہے۔ شاید ان ڈاکوؤں کو نظر نہ آیا ہو میں جا کر دیکھتی ہوں۔ آؤ یوسف۔'' ماریہ نے کہا اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے جانے لگی۔ جب محمود نظامی نے اس کے بجائے اپنی بے ہوش بیٹی پر توجہ دی تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ماریہ مجھے لے کر اوپری منزل میں آئی۔ اس نے ایک کمرا کھولا چابی اس نے کارنس کے اوپر سے اُتاری تھی۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے کسی ایسے ہی اقدام کی توقع دیتی تھی۔ اس کی گرم جوشی نے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس سے پہلے کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''فون تو کرو۔''

اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ ریشمی نائٹی سے جھلکتی اس کی ہیجان خیزی اچھی لگ رہی تھی۔

''ڈاکو تو چلے گئے۔'' وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''اُف تم تو ہیرو ہو، اکیلے ہی سب کو مار گرایا۔'' یہ قربت یہ پیار اور احساس بالکل مختلف تھا جو مجھے کاجل کے قرب میں محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھا جو میرے تن بدن میں آگ لگا رہا تھا۔ کاجل کی قربت میں آگ نہیں بلکہ سکون تھا۔

''پلیز ماریہ۔'' میں نے اسے ایک طرف کیا۔ ''تم پاگل ہو گئی ہو۔''




''ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں دیوانی ہوں تمہاری۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''کیا وہ بھی تمہیں ایسے ہی پیار کرتی ہے؟''

''جہاں تک دل کا تعلق ہے تو اس جیسا پیار مجھ سے کوئی نہیں کر سکتا لیکن اگر تمہاری مراد اس قربت سے ہے جس کا اظہار ابھی تم کر رہی تھیں تو مجھے کاجل کی ایسی قربت نہیں ملی۔ وہ صرف بارہ سال کی ہے۔''

''یعنی بچی ہے۔'' وہ حقارت سے مسکرائی۔ ''وہ تمہیں کیا دے سکتی ہے؟''

''وہ جو کچھ مجھے دیتی ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور ریسیور اُٹھا کر چیک کیا ٹون آ رہی تھی۔

''نمبر بتاؤ پولیس کا۔'' میں نے کہا اور اس کا بتایا ہوا نمبر بتا کر پولیس کو ڈکیتی کی اطلاع دی۔

''پتا بتاؤ جی۔'' دوسری طرف سے کسی آدم بے زار حوالدار نے کہا اور جب میں نے اسے محمود نظامی کی کوٹھی کا پتا بتایا تو وہ اُچھل پڑا تھا۔ اس علاقے کے تمام رہائشی توپ تھے اور یہاں ڈکیتی کا مطلب تھا کہ پولیس کی شامت۔

''ہم نے چار ڈاکو پکڑ لیے ہیں۔ جن میں سے ایک شاید فوت ہو گیا ہے۔''

''موبائل ابھی آتی ہے جی۔'' حولدار نے بوکھلا کر کہا۔ میں نے ریسیور رکھا اور ماریہ کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی برداشت نہیں کرتی کہ وہ جسے پسند کرتی ہے وہ کسی اور کو پسند کرے۔ یہ اس کی توہین ہوتی ہے۔

''کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟'' اس نے حسد سے کہا۔

میں نے کندھے اُچکائے۔ ''معلوم نہیں لیکن مجھے اس کے مقابل دنیا کی کوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔''

مارے طیش کے اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بات پر مجھے قتل کر دے۔ میں اس کا ٹھیک علاج کر رہا تھا۔ شدید محبت اگر منزل نہ پا سکے تو شدید نفرت میں بدل جاتی ہے۔ ماریہ اچھی لڑکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی برباد کرے۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میری محبت کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' اس نے انگلی اٹھائی۔

''میں اسے محبت نہیں کہتا۔ یہ تو بس ایک خواہش تھی۔ عملی اظہار کی۔'' میں نے رُکھائی سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اتنی دیر اندر رہنا ماریہ کے گھر والوں کو شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پیچھے آئی۔

''اتنے سنگ دل نہ بنو۔''

"سنگ دل ہوتا تو تمہاری دیوانگی سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ماریہ تم اچھی لڑکی ہو لیکن تم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

"تم سراب نہیں ہو۔" اس نے میرے سینے پر انگلی ماری۔

"خواہشات اکثر سراب ہی ہوتی ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میرے پاس ان سب باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ابھی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ کیریئر بنانا ہے۔ میری عمر صرف پندرہ سال ہے۔"

اس نے حیرت سے کہا۔ "جھوٹ تم کسی طرح بیس سال سے کم نہیں ہو۔ میں انیس سال کی ہوں۔"

"میں تم سے چار سال چھوٹا ہوں تم میری تاریخ پیدائش دیکھ سکتی ہو میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ پر......"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "محبت ان سب باتوں کو نہیں دیکھتی۔"

"تم اسے محبت کہتی ہو۔" میں نے رُک کر اسے بہ غور دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے دعویٰ کیا۔

"ماریہ بی بی جب میں چلا جاؤں اور ایک ہفتے بعد بھی رات کو تمہیں میری یاد میں نیند نہ آئے تو سمجھ لینا کہ تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے ورنہ صرف لگاؤ ہے۔"

نیچے سب گھر والے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ حسن علی نے آ کر افسردگی سے بتایا کہ ڈاکوؤں نے چوکیدار اور کتے کو مار دیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے خاموش ہتھیار استعمال کیے تھے۔ "کیا جیک کو مار دیا۔" بیگم نظامی رونے لگیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ غریب چوکیدار کی موت پر کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ صرف محمود نظامی کسی قدر افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد پولیس آگئی۔ ضروری کارروائیوں اور بیانات لینے میں انہوں نے صبح کر دی تھی۔

چاروں ڈاکو زندہ سلامت تھے۔ جس کے سر پر ڈنڈا لگا تھا اس کی حالت خراب تھی۔ باقی صرف بے ہوش ہوئے تھے۔ محمود نظامی آنے والے ڈی ایس پی کو ایک طرف لے جا کر خاصی دیر راز و نیاز کرتا رہا تھا۔ شاید لوٹ لی جانے والی رقم کے بارے میں مذاکرات کر رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس رقم کو ڈکیتی میں ظاہر نہیں کرتا اور اگر پولیس یہ رقم برآمد کر لیتی تو وہ ان سے مانگ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی ڈی ایس پی سے بات کر لی۔ جب وہ آئے تو دونوں ہی مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"نظامی صاحب آپ فکر ہی نہ کریں میں اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سب کچھ نکلوا لوں گا۔ اس حرامی کی تو مجھے عرصے سے تلاش تھی۔" ڈی ایس پی کہہ رہا تھا یہ ارشاد زخمی ارشد بلا کے بارے میں تھا۔




بعد میں جو حقائق سامنے آئے اس کے مطابق ارشد بلا نامی ڈاکو کے اس گروہ نے خاصے کارنامے انجام دیئے تھے اور عرصے سے اسلام آباد اور اس کے گرد و نواح میں وارداتیں کرتے آئے تھے ان کا طریقہ کار بڑا سائنٹیفک تھا۔ وہ اندھی واردات کے بجائے پہلے سے پلاننگ کر کے لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ انہوں نے مخبر رکھے ہوئے تھے جو انہیں ٹپ دیا کرتے تھے۔ یہ مخبر عام طور سے گھریلو اور دفتری ملازمین ہوتے تھے جو بھیدی بن کر لنکا ڈھاتے تھے۔ محمود نظامی کے دفتر میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کام کرنے والے ایک مخبر نے ارشد بلا کو اطلاع دی تھی کہ محمود نظامی کے پاس ایک بڑی رقم آئی ہے۔ محمود نظامی نے رقم گننے کے لیے اسے طلب کیا تھا۔ ارشد بلا نے مخبری پر اسے دس ہزار روپے دیئے تھے لیکن پکڑے جانے پر جب پولیس نے اس کی خاطر تواضع کی تو اس نے سب کچھ اُگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس میں مخبر کا نام بھی شامل تھا۔ جس کی پولیس نے خصوصی خاطر تواضع کی ہوگی۔

جس شخص کا سر ماریہ نے بلا مار کر توڑ دیا تھا وہ وہی خبیث آواز والا تھا۔ جو اس کی بہنوں اور ماہ پارہ کے بارے میں مکروہ عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی یہ سن کر کہ اسے اب اپنی زندگی کا بڑا حصہ دماغی شفا خانے میں گزارنا پڑے گا۔ بلے نے اس کے دماغ کو متاثر کیا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ پاگل خانے میں جا کر ہی یہ کسر بھی پوری ہو جائے گی۔

ہم رات بھر جاگے تھے اور خاصے اعصاب شکن مراحل سے گزرے تھے اس لیے صبح روانگی کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ ناشتہ کر کے میں کمرے میں آ کر سو گیا۔ جمشید علی کو اس بارے میں مطلع کرنے کا کام محمود نظامی نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جو میری تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے اور مجھے بوریت ہو رہی تھی کیونکہ ماریہ نہ صرف باپ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی بلکہ شرارتی نظروں سے مجھے بھی دیکھ رہی تھی۔

شام تک میں بے خبر سوتا رہا حتیٰ کہ دروازے پر ہونے والی مستقل دستک نے مجھے جگا دیا۔

"آجاؤ۔" میں نے جماہی لی۔

دروازہ کھلا اور ماریہ مسکراتی ہوئی ٹی ٹرالی کے ساتھ اندر داخل ہوئی میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ "اگر اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگا ہوتا تو مل جاتا۔"

"جھوٹے آدمی۔ اتنی دیر دستک دینے کے بعد اُٹھے ہو میرے ہاتھ درد کرنے لگے تھے۔"

ٹرالی میں چائے کے علاوہ کھانے پینے کا خاصا سامان تھا اور اس وقت مجھے شدید نوعیت کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں بلا تکلف ٹوٹ پڑا وہ مجھے روکتی رہ گئی۔ "ارے منہ ہاتھ تو دھولو۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ "بھوک کے مارے میں باتھ روم میں فوت ہو گیا تو۔"

"خدا نہ کرے۔" اس نے بے ساختہ کہا تو میں چونک گیا۔ میں نے پہلی بار اسے بہ غور

دیکھا۔ وہ خاص اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔ تنگ پاجامے پر اس نے کمر پر سے سمٹا کرتہ پہن رکھا تھا۔ جس کا گریبان بیک وقت نظروں کو شاد کام اور منتشر کرتا تھا۔ مزید کی طلب بھڑکاتا تھا۔ دوپٹہ برائے نام ہی تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا لباس خود اس کے رنگ کی گلابیت سے میل کھا رہا تھا۔ بالوں کی اس نے دو پونیاں بنا کر دائیں بائیں شانوں پر کر لی تھیں اور بلاشبہ نظر لگ جانے کی حد تک پُرکشش لگ رہی تھی میرے اس طرح گھورنے پر اس کا رنگ شہابی ہو گیا۔

''یوں کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''تم اتنی تروتازہ لگ رہی ہو جیسے سارا دن سوتی رہی ہو۔''

''میں کہاں سوئی صبح یونیورسٹی چلی گئی۔ چار بجے وہاں سے آئی تو نہا دھو کر کھانا کھایا پھر تمہارے لیے چائے لے آئی۔''

''اتنی تھکن کے بعد بننے سنورنے کی طاقت صرف لڑکیوں میں ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ پھر سو جاؤں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے روشنیاں جلاتے ہوئے کھڑکیوں کے پردے سمیٹ دیئے۔ شام ہو چکی تھی اور دور مغربی پہاڑیوں کے عقب میں سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ''کل صبح تم چلے جاؤ گے۔'' اس نے پلٹ کر کہا۔ ''تب تک کا وقت میرے نام کر دو۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''تمہارے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تمہارے قبضے میں ہوں۔ جو چاہے کرو۔'' میں نے کہا تو وہ کھل اُٹھی تھی۔

''بس تو جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈنر ہم باہر ہی کریں گے۔''

''تمہاری بہن کی حالت کیسی ہے؟''

''شی از آل رائٹ۔'' وہ بولی۔ ''کچھ صدمے کا اثر ہے چند دن میں وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

اس کی چھوٹی سی کار شوخ سرخ رنگ کی تھی۔ وہ بے حد تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسلام آباد کی سڑکیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں، وہ بے پروائی سے رفتار کم کیے بغیر موڑ کاٹ رہی تھی دس منٹ بعد کار ایک سرسبز درختوں اور لان سے گھری عمارت کے سامنے رُکی۔ جس کی پیشانی پر یوتھ کلب لکھا تھا۔ عمارت جدید انداز کی تھی۔

''میں اس کلب کی ممبر ہوں۔'' اس نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''آؤ اندر چلیں۔''

لاؤنج میں ہی بے شمار لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے اکثر نے ماریہ سے ہیلو ہائے کی۔ یعنی وہ یہاں بے حد مقبول تھی۔ وہ مجھے لیے ایک الگ کمرے میں آئی۔ کمرے میں کارنرز پر صوفے نما کرسیاں تھیں جن کے آگے بید سے بنی میزیں تھیں ان کے ٹاپ شیشے کے تھے۔ ایک کارنر میں ایک نوجوان جوڑا سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ انہوں نے ہماری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا



تھا۔ ''کیا پیو گے؟''

''جو تم چاہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بائی دے وے یہ کلب کس قسم کا ہے۔''

''یہ کلب صرف نوجوانوں کے لیے ہے۔ تیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ اس کے ممبر نہیں بن سکتے اور جیسے ہی کوئی ممبر تیس برس کا ہوتا ہے اسے کلب سے نکال دیا جاتا ہے۔''

''تم باقاعدگی سے یہاں آتی ہو؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''ہفتے میں دو تین بار، دراصل یونیورسٹی میں آنے کے بعد سے زیادہ وقت نہیں ملتا۔''

ماریہ نے لائم جوس منگوایا۔ نہ جانے کیوں یہ جگہ مجھے اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود نہیں بھائی تھی۔ لائم جوس پی کر اس نے مجھے باہر چلنے کو کہا۔ ''سوئمنگ کرو گے؟''

''سوری میں نے آج تک کسی عوامی سوئمنگ پول میں سوئمنگ نہیں کی۔'' میں نے معذرت کر لی۔

''مزہ آئے گا۔ کر کے دیکھو۔''

''میرے پاس لباس بھی نہیں ہے تیراکی کا۔''

''وہ بھی مل جائے گا۔ چلو آؤ پہلے پول دیکھ لو بلیومی پورے پاکستان میں اس سے زیادہ خوب صورت سوئمنگ پول نہیں ہوگا۔'' وہ اُٹھ گئی۔ پول کلب کے پچھلے حصے میں تھا اور تاریکی چھانے کے باوجود آباد تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلوں سے بنا یہ سوئمنگ پول روشنیوں اور روشن جسموں سے جگمگا رہا تھا۔ پول میں اکثریت لڑکیوں کی تھی جو مختصر ترین لباس میں تیراکی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان کے بے باکانہ قہقہے ماحول کو کھنکا رہے تھے۔

''تم بھی یہاں سوئمنگ کرتی ہو؟''

''آف کورس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آئی انجوائے اِٹ۔''

معاً میری نظر پول کے دوسری طرف کرسی پر ساتھ ساتھ بیٹھے ایک جوڑے پر پڑی۔ اچانک لڑکا اپنا رُخ بدلتے ہوئے اپنی ساتھی لڑکی کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سرِعام بے باکی کا اتنا کھلا مظاہرہ بھی ممکن ہے۔ یکلخت مجھے اپنی بے زاری کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ ''یہاں سے چلو۔'' میں نے ماریہ سے کہا اور اس کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آیا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پیچھے آئی تھی۔

''یوسف کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس قسم کا ماحول اچھا نہیں لگتا۔''

''یوسف یو آر رینگ۔'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''ہاں میں نوجوان ہوں لیکن ماریہ ہماری معاشرتی اقدار ہیں۔ تمام تر آزاد خیالی کے باوجود ہم انہیں نہیں چھو سکتے اس قسم کی حرکتیں کرنے والے لوگ میرے نزدیک ذہنی طور پر دیوالیہ ہوتے

ہیں۔"

"یہ ہماری سوسائٹی کا ایک حصہ ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں...... لیکن جس سوسائٹی کی تم بات کر رہی ہو وہ اس ملک کا کتنے فیصد ہے۔ شاید ایک فیصد بھی نہیں تو مس ماریہ میں ننانوے فیصد کے راستے پر کیوں نہ چلوں۔ اِٹ اِز دی موسٹ پارٹ آف سوسائٹی۔ میں ان ایک فیصد لوگوں کا ساتھ کیوں دوں۔ جو غیروں سے مستعار لی ہوئی زندگی جی رہے ہیں۔"

"یوسف میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی قدامت پرست ذہنیت رکھتے ہو گے۔"

میں ہنسا۔ "پروپیگنڈے پر مت جاؤ۔ آج کل اصول، اخلاق اور اقدار قدامت پرستی کی علامت بنا دیئے گئے ہیں۔ دنیا کو ان سے جان چھڑانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔"

"یہ سب تنگ نظری کی باتیں ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ایک بات بتاؤ مس ماریہ...... تم اتنے عرصے سے ان لوگوں کے درمیان ہو، ان میں سے کوئی ایک شخص بھی تمہیں پسند نہیں آیا کیوں؟"

اس نے نظریں چرائیں۔ "یہ تو دل کی بات ہے۔"

"تو مس ماریہ دل بھی کچھ دیکھ کر ہی آتا ہے۔" میں ہنسا۔ "بقول تمہارے میں ایک قدامت پرست شخص ہوں تو آخر تم نے اتنے سارے آزاد خیال نوجوانوں کو چھوڑ کر مجھے ہی کیوں منتخب کیا اپنی محبت سے نوازنے کے لیے؟"

وہ جھلائی۔ "میں نہیں جانتی...... میں......"

"ماریہ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم ایک اچھی لڑکی ہو بائی نیچر۔ ان چکروں سے نکل جاؤ۔ یہ سب ہمارے لیے نہیں ہے۔ باہر سے آیا کوئی پودا اس سرزمین پر جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ چاہے اسے لگانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔"

وہ کار میں جا بیٹھی۔ جیسے ہی میں اس کے برابر میں بیٹھا اس نے اتنی تیزی سے کار پیچھے کی کہ اس کے پہیے چیخ اُٹھے تھے۔ دس پندرہ منٹ اس نے اتنی رف ڈرائیو کی کہ میرا دل حلق میں اٹک رہا تھا۔ اسپیڈ نوے اور سو کے درمیان میں تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے اُبال میں کمی آنے لگی تو رفتار بھی کم ہونے لگی۔ بالآخر اس نے کار ایک سڑک کے کنارے درختوں تلے روک لی یہاں نیم تاریکی تھی۔

"آئی ایم سوری یوسف۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر تمہیں میری بات بُری لگی ہو تو میں......"

"نہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "تم پہلے شخص ہو جس نے مجھے ٹوکا ہے۔ مجھے اچھا لگا۔ ورنہ ڈیڈی اور مما کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ ہماری مصروفیات کے بارے میں جان سکیں اور ہمیں صحیح غلط کے بارے میں بتائیں۔"





"صرف تمہارے ماں باپ نہیں بلکہ اس طبقے کے اکثر گھرانوں کا یہی المیہ ہے۔"

"یوسف۔" وہ اچانک رو دی تھی۔ "تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرو گے ناں؟"

"نہیں کروں گا۔"

"کیا تم مجھے تھوڑی سی محبت بھی نہیں دے سکتے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"مجھ سے وہ چیز مت مانگو جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔

"میں کاجل کا حق نہیں مانگتی۔"

"میں تمہیں دے بھی نہیں سکتا۔ کم آن لیٹس گو۔" میں نے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے ابھی ڈنر بھی کرنا ہے۔"

ایک ہوٹل میں ڈنر کر کے ہم نے لالہ زار کی آئس کریم کھائی اور واپس گھر آ گئے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ میرے ساتھ تھی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ماریہ نے ریسیور اُٹھایا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔

"کاجل ہے۔"

"مارے گئے۔" میں نے دل میں کہا اور بولا۔ "ہیلو کاجل۔"

"اسے تو میرا نام معلوم ہو گیا۔" اس کی سرد آواز آئی۔ "اب ذرا اس کا تعارف بھی کرا دو۔"

"یہ...... یہ ماریہ ہے۔"

"اور تمہارے کمرے میں کیا کر رہی ہے رات کے بارہ بجے۔" کاجل کے لہجے میں کاٹ تھی۔ میں نے ہکلا کر کہا۔ "ہم...... ہم...... با...... باتیں کر رہے ہیں۔"

مجھے ہکلاتے دیکھ کر ماریہ ہنس دی تھی اور بدقسمتی سے وہ میرے بے حد نزدیک تھی۔ اس کی ٹھوڑی میرے شانے پر تھی اور میں اپنی پشت پر اس کا گداز محسوس کر رہا تھا۔ اس چیز نے مجھے اور بوکھلا دیا تھا۔

"یہ ہنس رہی ہے۔" کاجل کی مشتعل آواز آئی۔ "اس سے کہو فوراً تمہارے کمرے سے چلی جائے۔"

"کاجل بی ہیو پلیز۔" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ "تم بھول رہی ہو میں اس کے گھر میں ہوں۔ میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔"

"اگر تم نے نہیں کہا تو میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔" وہ فوراً دھمکیوں پر اُتر آئی۔

"مائی گاڈ تمہارے پاس پستول کہاں سے آیا؟" میں گھبرا گیا۔

"میں نے پاپا کا چرایا ہے تم اسے نکال رہے ہو یا نہیں۔" اس نے وارننگ دی۔

"میرے خدا۔" میں نے کہا پھر ماریہ سے بولا۔ "پلیز تم یہاں سے جاؤ۔"

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔ "تم اس کے کہنے پر مجھے بھگا رہے ہو۔"

"تم نہیں جانتیں کاجل کتنی ضدی ہے وہ جو کہتی ہے اسے کر کے دکھاتی ہے۔ پلیز یو کین گو ناؤ۔"

"تو کرنے دو اسے اچھا ہے تمہاری جان......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میرا ہاتھ اس کے منہ پر لگا اور وہ اُچھل کر پیچھے جا گری۔

"آئندہ کاجل کے بارے میں ایک لفظ مت بُرا کہنا۔ اب تم جاتی ہو یا میں اس گھر سے چلا جاؤں۔" میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھا۔ پھر یک دم ہنس دی۔ تیز اور ہذیانی ہنسی۔ وہ اُٹھی اور اس نے اچانک جھپٹا مار کر مجھ سے فون چھینا۔ میں اسے نہیں روک سکا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں کاجل سے بولی۔ "سنو بے بی میں یوسف سے محبت کرتی ہوں اور یہ تم سے پیار کرتا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوسف نے تمہارے لیے مجھے تھپڑ مارا مجھے بُرا نہیں لگا اپنے محبوب کا دیا ہر ستم مجھے قبول ہے۔ یہ مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس لیے میں جا رہی ہوں۔ ورنہ خدا کی قسم دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے دور نہیں کر سکتی۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور بستر پر پھینکا اور تیز قدموں سے کمرے سے چلی گئی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔

"وہ حرافہ چلی گئی۔" کاجل کی جلی ہوئی آواز آئی۔ "یوسف آئی کل یو۔"

"خدا کے لیے کاجل میں اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ ایک دن کی تو بات تھی کل میں یہاں سے چلا جاتا۔"

"میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی لڑکی کو تمہارے پاس برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ بولی۔ "وہ جا چکی ہے ناں میری قسم کھاؤ۔"

"کاجل مجھ پر اتنا دباؤ تو مت ڈالو۔" میں نے بھنا کر کہا۔

وہ ہنسی۔ "میں جانتی ہوں تم میری جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے کھاؤ قسم۔"

"اچھا بابا تمہاری قسم وہ جا چکی ہے۔ حالانکہ وہ میرے پاس بیٹھی ہے۔"

وہ زور سے ہنسی۔ "اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بائی دی وے شام سے تم کہاں تھے۔ میں نے کوئی درجن بھر کال کی کل رات کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کل رات کیا واقعات پیش آئے تھے۔ جن کی وجہ سے ہماری روانگی ایک دن کے لیے ملتوی ہو گئی۔

"اب تم اسے کمرے میں نہیں بلاؤ گے۔"

"کاجل کیا تم نے مجھے کمزور سمجھ رکھا ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں میں خود کمزور ہوں۔ کسی اور لڑکی کو تمہارے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے اعتراف کیا۔





"ماریہ اچھی لڑکی ہے۔ ذرا راہ سے بھٹکی ہوئی ہے۔ میری کوشش ہے کہ یہ غلط راہوں پر اور آگے نہ بڑھے۔"

"دیکھو کہیں اسے راہ پر لاتے لاتے خود نہ بھٹک جانا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے گہری سانس لی۔ میں کسی قدر جھنجھلاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں نے مجھے سینڈوچ بنا دیا تھا۔ جب خاصی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے اُٹھ کر نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ اس سے خاصا سکون ملا اور بالآخر میں سو گیا۔ اگلی صبح دو ملائم ہاتھوں نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں آنکھیں کھولے بغیر جان گیا کہ یہ ماہ پارہ تھیں۔

"سونے دیں ماں۔"

"ماں کے بچے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔" وہ بولیں۔ "کل سے خوب گھوم رہے ہو۔ کاجل پوچھے گی۔"

"کاجل پوچھ چکی ہے۔" میں نے جھلا کر کہا اور اُٹھ بیٹھا۔ میری آنکھیں بدستور بند تھیں۔

"ہاں کل بار بار اس کا فون آ رہا تھا۔" ماہ پارہ ہنسیں۔

"آپ اسے گولی ماریں۔" میں نے جماہی لی۔ "مجھے بس ایک کپ چائے دے دیں۔ ورنہ میری آنکھ نہیں کھلے گی۔"

"چائے آل ریڈی موجود ہے۔" وہ بولیں تو میں نے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ "لیکن پہلے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔"

"میں اب بچہ نہیں ہوں۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں کل سے دو لڑکیاں پیچھے پڑی ہیں۔" وہ زور سے ہنسیں۔

"اور تیسری آپ آ گئیں صبح صبح۔" میں نے بدتمیزی سے کہا۔

"ہشت۔" وہ جھینپ گئیں۔ "صبح ہی صبح مار کھاؤ گے۔"

"بڑے شوق سے، کیا نرم و نازک ہاتھ ہیں۔ استاد محترم کے پتھر نما ہاتھوں سے بہت بہتر ہیں۔"

"استاد محترم آ جائیں گے۔ اگر تم دس منٹ کے اندر تیار ہو کر ناشتے کی میز پر نہ پہنچے۔"

ناشتے پر سب ہی تھے۔ شامی بدستور چہک رہا تھا۔ باقی سب بھی ہنس مسکرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ماریہ کی بڑی بہن ماریہ بھی بہتر نظر آ رہی تھی۔ ماریہ البتہ کبھی کبھی غمگین نظر آتی لیکن اس لمحاتی دُکھ کو بڑی خوبی سے چھپا لیا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد ملازمین نے ایک چھوٹی جیپ پر ہمارا سامان لادا۔ اس میں آگے پیچھے چار نشستیں تھیں اور عقبی حصے میں سامان رکھنے کے لیے ایک چھوٹا خانہ تھا جو اس وقت سامان سے لبالب بھرا تھا۔ چھت پر بھی سامان رکھا تھا۔ محمود نظامی نے حسن علی سے ہاتھ ملایا۔ پھر مجھے گلے سے لگایا۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ بیٹے رقم گئی کوئی بات نہیں لیکن عزت بچ گئی۔ یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں آپ پاپا کے دوست ہیں۔ اس ناطے میں آپ کو بھی اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا اور سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کی عزت دشمن سے تو بچ گئی تھی لیکن ان کی اولاد جس راستے پر چل رہی تھی کیا وہ اپنی عزت کو محفوظ رکھ پائیں گے۔ ماریہ اور اس کی بہنوں نے بے تکلفی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ بلکہ ماریہ کے انداز میں غیر معمولی گرم جوشی تھی۔ حسن علی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کے برابر میں ماہ پارہ بیٹھی تھیں۔ جب میں پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا تو ماریہ نے مجھے ایک پیک شدہ چوکور ڈبہ دیا۔

"یہ تمہارے لیے گفٹ ہے میری طرف سے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"شکریہ۔" میں نے کہا اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ حسن علی نے جیپ چلا دی۔

اسلام آباد کے خوب صورت راستوں سے گزرتے ہوئے میرا ذہن گزشتہ دو دن کے واقعات میں اُلجھنے لگا۔ جمشید پیلس سے روانگی کے فوراً بعد ہی مجھے حیرت انگیز نوعیت کے تجربات ہوئے تھے۔ ایک لڑکی آناً فاناً میری محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ ایسا صرف قصے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ ڈاکوؤں کے خلاف ایک سنسنی خیز فتح حاصل کی۔ جبکہ میں نہتا تھا۔ ایسا صرف فلموں اور ڈراموں میں دیکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی تنگ ندی سے نکل کر کسی وسیع دریا میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے ماریہ کے جذبوں کا مثبت جواب نہیں دیا تھا۔ میں مجبور تھا اور میں نے اسے اپنی مجبوری بتا دی تھی۔ میں نے بے خیالی میں اس کا تحفہ کھولا۔ اندر سے روایتی تحفہ نکلا جو اکثر لڑکیاں اپنے محبوب کو تحفے میں دیتی ہیں۔ یعنی پرفیوم، ایک لٹو نما شیشی تھی جس میں زردی مائل نیلا سیال ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں اس کا بٹن دبایا۔ اسپرے کی ایک پھوار فضا میں گئی اور فضا آہستہ آہستہ مہکنے لگی۔ بڑی انوکھی مہک تھی اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خوشبو پھیلی تو ماہ پارہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"بڑی پیاری خوشبو دی ہے ماریہ نے۔" وہ بولیں۔ "بڑی پیاری لڑکی ہے۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"دنیا میں بہت ساری لڑکیاں پیاری ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور شیشی کو واپس پیکنگ میں رکھ دیا۔

"لگتا ہے کاجل نے ہوش ٹھکانے لگا دیئے تمہارے، کل سے اُڑے اُڑے پھر رہے تھے۔"

حسن علی ہنسا۔

"لڑکیاں اسی طرح ہوش اُڑاتی اور ٹھکانے لگاتی رہتی ہیں۔" میں بولا تو حسن علی کھسیا گیا تھا۔ ماہ پارہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں تھکاوٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ جب ہلکے سے جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو دوپہر



کے دو بج رہے تھے۔ باہر تیز دھوپ چمک رہی تھی لیکن ہوا کی خنکی بتا رہی تھی کہ ہم سطح سمندر سے خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ جیپ سڑک سے ذرا ہٹ کر نشیب میں درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں کھڑی تھی۔ حسن علی اور ماہ پارہ باہر تھے۔ میں بھی جیپ سے اُتر آیا۔ مسلسل ایک ہی انداز میں رہنے سے جسم جم سا گیا تھا۔ میں نے ذرا ہاتھ پیر چلائے کچھ ہی دور ماہ پارہ ایک چھوٹی سی ندی کے بہتے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھیں۔ حسن علی ان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ دوسری طرف نکل جاؤں۔ سڑک دوسری طرف ذرا بلندی پر تھی۔ میں قریب آیا۔ اسی لمحے ایک سفید ڈاٹسن پک اپ تیزی سے گزری اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے نقوش ارشد بلا سے ملتے تھے لیکن وہ ارشد بلا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ ڈکیتی اور قتل کے الزام میں پولیس کی تحویل میں تھا۔ وہ زخمی بھی تھا۔

میں واپس آیا تو ماہ پارہ جیپ سے سامان نکال کر سامنے ہری بھری گھاس پر بچھے دسترخوان پر سجا رہی تھیں۔ میں نے سرسری سے انداز میں حسن علی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے راستے میں کوئی سفید ڈاٹسن پک اپ دیکھی تھی؟"

وہ ہنسا۔ "بے شمار سڑکوں پر نظر آنے والی ہر تیسری گاڑی ڈاٹسن پک اپ ہی ہوتی ہے۔"

میں نے اسے اپنے مشاہدے سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔"

"ممکن ہے لیکن بہتر ہوگا کہ راستے میں ذرا محتاط رہیں۔ ہم نے ان ڈاکوؤں سے پنگا لیا ہے، جو اسلام آباد جیسی جگہ پر دیدہ دلیری سے وارداتیں کر رہے تھے۔"

"برخوردار جب کوئی صورتِ حال سامنے آئے گی تو دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو کھانے سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ بڑی بھوک لگی ہے۔" وہ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ جس پر گرما گرم ہاٹ پاٹ سے نکالے آلو بھرے پراٹھے، قیمے انڈے کا سالن اور چٹنی اچار کے ساتھ فرنی بھی تھی۔ سفر کے دوران مسلسل دھچکوں نے بھوک چمکا دی تھی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آیا اور آتے ہی حسن علی کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ماہ پارہ ہمیں تمیز سے کھانے کی تلقین کرتی ہی رہ گئیں اور ہم نے سچ مچ دسترخوان صاف کر دیا۔ حالانکہ محمود نظامی کے باورچی نے ہر شے خاصی مقدار میں رکھی تھی کھانے کے بعد سستی طاری ہونے لگی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ دو گھنٹے آرام کے بعد شام ساڑھے چار بجے روانہ ہوں گے۔ اب سفر زیادہ نہیں رہ گیا تھا اگرچہ ہم سب ہی پہلی بار اس علاقے میں آئے تھے لیکن ہمیں یہاں کی وضاحت اتنی اچھی طرح کر دی گئی تھی کہ اب راستہ بالکل آسان لگ رہا تھا۔

پیٹ بھری نیند نے اثر دکھایا۔ میں اور حسن علی تو گھوڑے بیچ کر سوئے۔ خود ماہ پارہ بھی نہ چاہتے ہوئے غافل گئیں۔ ہم وہیں ہری بھری گھاس پر دراز تھے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ جیپ سڑک پر آتے ہی حسن علی نے اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا کہ ماہ پارہ کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے اگر ہم ذرا دیر سے پہنچے تو کوئی آفت نہیں آ جائے گی۔"

"ممکن ہے آ ہی جائے اس علاقے میں موسم کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اول تو تاریکی میں راستے تلاش کرنا ناممکن ہوتا ہے اور اگر بارش وغیرہ ہو گئی تو کوئی راہ بتانے والا بھی نہیں ملے گا۔ ساری رات جیپ میں ٹھٹھرتے گزرے گی۔"

بعض اوقات کارکنان قضا وقدر منتظر ہوتے ہیں کہ ادھر آدمی کے منہ سے کوئی بات نکلے اور اُدھر وہ اسے اُچک کر بابِ قبولیت تک پہنچا دیں۔ میں نے دیکھا کہ دور جنوب مشرق سے سیاہ گھٹائیں اُمڈتی چلی آ رہی تھیں۔ حسن علی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور رفتار بڑھا دی۔ اب ہم ایبٹ آباد شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر تھے اور اس سے دو تین میل پہلے ایک ذیلی سڑک مغرب کی طرف گھوم جاتی تھی جو آگے جا کر ایک وادی میں ختم ہوتی تھی۔ اس وادی میں صاحب ثروت لوگوں نے بنگلے اور کاٹیجز بنا رکھے تھے۔ جس میں وہ گرمیوں میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔

ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بادلوں نے آسمان پر قبضہ کر کے ماحول کو تاریک کر دیا۔ مجبوراً حسن علی کو رفتار کم کرنی پڑی تھی۔ اس نے تشویش سے کہا۔ "اگر بارش ہو گئی تو جیپ چلانا مشکل ہو جائے گا۔"

"خدا نہ کرے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "محترم ذرا اچھی بات منہ سے نکالیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے موسم کا ذکر کیا تھا اور بادل آ دھمکے اب آپ......" میری بات ادھوری رہ گئی۔ بجلی ایسی تڑپ کر چمکی تھی کہ ماہ پارہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ آسمان یوں روشن ہو گیا جیسے فلیش چمکی ہو۔ ایک منٹ بعد ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کا سلسلہ اتنا تیز ہوا کہ کچھ ہی دیر میں سارا ماحول جل تھل ہو گیا۔ پانی کی برستی چادر کی وجہ سے دس گز کے فاصلے پر موجود چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں ڈرائیونگ کرنا بلاوجہ حادثے کو دعوت دینے والی بات تھی۔ لہٰذا حسن علی نے سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چٹان تلے جیپ روک لی۔ یہاں پانی کی بوچھاڑ کم تھی لیکن جیپ میں ہم ویسے ہی محفوظ تھے۔ انجن بند کرنے کے بجائے اسے چلتا رہنے دیا تا کہ بعد میں اسے سٹارٹ کرنے میں کوئی مسئلہ نہ بنے۔ پہاڑی علاقوں میں بارش جتنی تیزی سے شروع ہوتی ہے اتنی ہی تیزی سے بند بھی ہو جاتی ہے۔

دو گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا لیکن رم جھم جاری تھی۔ آسمان پر بدستور تاریک بادل تھے اور ان کے ٹلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ "میرا خیال ہے ہمیں آگے چلنا چاہیے۔" حسن علی بولا۔

"خدا کے لیے تم دیکھ نہیں رہے جابجا ندی نالے جاری ہو گئے ہیں۔ سڑک پر بے انتہا پھسلن ہو گی۔"

"میں کم رفتار سے جیپ چلاؤں گا۔ یہاں رُکے رہے تو سردی سے جم جائیں گے۔"





واقعی ذرا سی دیر میں جیپ کے اندر کا ماحول یخ بستہ ہو گیا تھا۔ باہر کی سردی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ جیپ چلنے کی صورت میں کم سے کم ہیٹر آن ہو جاتا تو سردی کا اتنا احساس نہ رہتا۔ ایندھن کی ہمیں فکر نہیں تھی۔ راستے میں ایک جگہ نہ صرف جیپ کی ٹنکی فل کرائی تھی بلکہ پیٹرول سے بھرے دس دس لیٹر کے دو کین بھی عقبی حصے میں رکھے تھے۔ طے ہوا کہ آگے روانہ ہوا جائے۔ حسن علی احتیاط سے جیپ سڑک پر لے آیا اور مستقل پہلے گیئر میں چلانے لگا۔ سڑک پر واقعی پھسلن ہو گئی تھی۔ ذرا سی ڈھلان آتے ہی جیپ کنارے کی طرف پھسلنے لگتی تھی۔ حسن علی مہارت سے جیپ کو مستقل دس بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھا رہا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے اور ہم ہنوز اپنی منزل سے خاصے دور تھے۔ دوپہر کو ضرورت سے زیادہ کھا لینے کے بعد بھوک کا احساس تو نہیں تھا لیکن کسی گرم شے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد سڑک پر ایک ریسٹورنٹ کا سائن بورڈ نظر آیا۔ ریسٹورنٹ سڑک سے ذرا ہٹ کر تھا اور بہ ظاہر بند ہی نظر آ رہا تھا لیکن حسن علی نے جیپ اس کی طرف گھما لی۔ یہاں سے کوئی گرم چیز پینے کے علاوہ ہم راستہ بھی معلوم کر سکتے تھے۔ رات کی تاریکی میں اندازے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریسٹورنٹ کی پارکنگ تاریک تھی۔ البتہ سامنے والے حصے میں ایک بلب روشن تھا۔ یہاں کوئی نہ کوئی تھا مستقل ہارن دینے پر بالآخر روشنی ہوئی اور دروازے پر ایک نوجوان نمودار ہوا۔ چھتری لے کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

"جی جناب۔" اس نے خوش خلقی سے کہا۔ رات کو جگائے جانے پر بھی اس کے انداز میں ناگواری نہیں تھی۔

"یار دو کام ہیں ایک تو کوئی پینے والی چیز چاہیے۔ کافی چائے بلکہ اس وقت تو جوشاندہ بھی چلے گا۔" حسن علی بولا۔

"مل جائے گی۔" اس نے کہا۔ "اور دوسرا کام؟"

"ہمیں راستہ معلوم کرنا ہے۔"

"یہ ذرا مشکل ہے لیکن میں بابا کو جگاتا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک ایک پتھر سے واقف ہیں آپ اندر آ جائیں۔"

حسن علی نے احتیاطاً انجن چلتا رہنے دیا۔ البتہ اس نے چابی نکال کر دروازے لاک کر دیئے تھے۔ اوپر کے سامان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ سادہ سا تھا۔ مرکزی ہال میں درجن بھر میزیں تھیں۔ عقبی حصے میں دیواروں پر کھڑکیوں کے بجائے شیشے تھے۔ جن سے یقیناً پہاڑوں کا منظر خوب صورت نظر آتا ہو گا مگر اس وقت سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک بوڑھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی رائفل بتا رہی تھی کہ وہ چوکیدار تھا لیکن موسم نے اسے اندر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک اور بچھا بستر ظاہر کر رہا تھا کہ نوجوان یہیں دراز تھا۔ اس جگہ ایک آتش دان بھی تھا

جس میں آگ دہک رہی تھی۔ نوجوان شاید یہاں ملازم تھا۔ اس نے چوکیدار کو اُٹھایا۔ جو خاصی مشکل سے بے دار ہوا تھا۔ نوجوان اسے ہمارے بارے میں بتا کر کچن میں چلا گیا۔ بڑے میاں کو مکمل طور پر بے دار ہونے میں خاصی دیر لگی تھی۔

"جی صاحب ام آپ کی کیا خاطر کرے؟" اس نے کہا۔

حسن علی نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کس مقام تک جانا تھا۔ بوڑھے نے بیڑی نکال کر سلگائی اور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"ام جان گیا۔ ابھی آپ ادر سے نکلے گا، اسی روڈ پر جائے گا۔ ایک چھوٹا پل آئے گا پھر ایک بڑا پل آئے گا۔ پل کے بعد دو میل اور سیدھا ہاتھ پر راستہ نکلے گا۔ آپ اس پر مڑ جائے گا۔ سیدھا وادی تک جائے گا۔ راستے کے شروع میں سفید رنگ کا دیوار ہے جس پر جانے کا اشارہ بنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" حسن علی نے سر ہلایا۔ ماہ پارہ آتش دان کے پاس ہاتھ تاپ رہی تھیں۔

معاً میری توجہ ایک کونے میں رکھی دو ٹوٹی کرسیوں پر پڑی تھی کرسیاں ریسٹورنٹ کی ہی تھیں۔ ان کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہ آج ہی ٹوٹی ہیں میں ان کے پاس ہی میز پر جا بیٹھا۔ آتش دان کے باعث اندر کی فضا میں فرحت بخش حرارت تھی۔ کچھ دیر بعد نوجوان بھاپ اُڑاتی چائے لے آیا۔ حسن علی کی فرمائش پر اس نے ایک کپ کافی بھی بنا دی تھی۔ اس نے بسکٹ اور نمکو کی پیش کش کی تھی لیکن ماہ پارہ نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ آتے ہوئے وہ اس قسم کی ڈھیر ساری چیزیں بھی خرید لائی تھیں۔ ان میں کئی طرح کے بسکٹ، چپس، نمکو، چاکلیٹ اور پیک سینڈوچ تھے جو نوجوان نے ہمیں گرم کر کے لا دیئے۔ ان سے میری اچھی خاصی تسلی ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر گرم چائے کے دو کپوں نے پوری کر دی تھی۔ اب میں اتنی توانائی محسوس کر رہا تھا کہ ساری رات سفر کر سکتا تھا۔ ماہ پارہ اور حسن علی اپنی بات کر رہے تھے نوجوان میرے پاس آ بیٹھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے اسے اپنی منزل کے بارے میں بتایا۔ وہ چونکا۔ "ادھر تو میرا چاچا بھی رہتا ہے۔ اگر کسی قسم کی بھی خدمت ہو تو اس سے ضرور بولیے گا۔" پھر اس کی نظر ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر پڑی تو اس نے زیر لب کہا۔ "داؤس کے بچے۔"

"کیا یہاں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

اس نے منہ بنایا۔ "دو حرامی آئے تھے۔ بدتمیزی کر رہے تھے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے جواب دیا تو انہوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ مالک تھا نہیں وہ واپس آیا تو اس نے بھی مجھے ذمے دار قرار دیا اور کہا کہ سارا نقصان میری تنخواہ سے کاٹے گا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟"





"کسی جیپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ وہ یہاں سے تو نہیں گزری۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم ہم یہاں کام کرتے ہیں سارا دن گاڑیاں تھوڑی دیکھتے رہتے ہیں۔"

"کس جیپ کے بارے میں؟" میری دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔

"ہلکے نیلے رنگ کی جیپ تھی جس کی سائیڈوں پر گہرے نیلے رنگ سے پروں کے نشانات بنے تھے۔"

میں نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔ وہ ہماری جیپ کا ذکر کر رہا تھا۔ "وہ کس گاڑی پر آئے تھے۔"

"کھٹارا سی ڈاٹسن پک اَپ تھی سفید رنگ کی۔"

مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ وہی پک اَپ تھی جسے میں نے دیکھا تھا۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص پر مجھے ارشد بلا کا شبہ ہوا تھا اور وہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ نشیب میں کھڑی ہونے کی وجہ سے اسے ہماری جیپ نظر نہیں آئی تھی اور وہ رُکے بغیر آگے نکل گئے اور بعد میں ہماری جیپ کو تلاش کرتے رہے تھے۔ وہ اس ریسٹورنٹ میں آئے اور نوجوان سے جھگڑے کے بعد انہوں نے بدمعاشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرا شک درست تھا یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ارشد بلا ہی تھا۔ وہ ہماری ہی تلاش میں تھا۔

میں نے نوجوان کے سامنے کچھ نہیں کہا لیکن جیسے ہی وہ باورچی خانے میں گیا میں نے مختصر الفاظ میں حسن علی اور ماہ پارہ کو ساری بات بتائی۔ حسن علی چونکا تھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے اگر ارشد بلا کسی طرح پولیس کی گرفت سے نکل بھی جاتا تب بھی وہ اسی طرح آزادی سے دندناتا نہیں پھر سکتا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے شانے ہلائے۔ "ہماری پولیس گرفتار کرنے پر آئے تو زلزلے کے وائرس کو بھی مرض پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر لے۔ ورنہ ہاتھی ان کے سامنے گنے کا کھیت اُجاڑتا ہے۔"

ماہ پارہ بے اختیار ہنسیں۔ حسن علی نے انہیں گھورا۔ "اگر یوسف کا اندیشہ درست ہے تو یہ بے حد تشویش ناک بات ہے۔ آخر وہ ہمارے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے اس خاکسار کے لیے۔ میں نے نہ صرف ان کے عزائم کو ناکام بنایا بلکہ ان کے چار بندے بھی پولیس کے ہاتھ لگے۔" ماہ پارہ نے میری تائید کی۔

"یوسف صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں مقامی پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"درست اور ہمیں خود بھی محتاط رہنا ہوگا۔" حسن علی نے کہا اس لمحے نوجوان آ گیا۔ اس نے بل دیا حسن علی نے ادائیگی کی۔ میں نے دو سو الگ سے اسے دیئے۔ "یہ اس نقصان کی تلافی کے

لیے۔'' میں نے ٹوٹی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ صاحب۔'' نوجوان خوش ہوگیا۔ ''میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔ تنخواہ کٹ جاتی تو اس مہینے میری بہن کی فیس نہ جاتی۔ وہ میٹرک کر رہی ہے۔''

''تمہارے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں؟'' ماہ پارہ بولیں۔

''جی بیگم صاحبہ! میرا تو بچپن محنت مزدوریوں میں گزر گیا لیکن اپنے بہن بھائیوں کو میں تعلیم دلوا رہا ہوں۔''

ہم باہر آئے تو نوجوان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے پہلی بار غور سے ہماری جیپ کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو اس کی نظریں جیسے جم گئیں پھر اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ''خدا آپ کو ہر آفت اور ہر دشمن سے محفوظ رکھے۔''

''شکریہ دوست۔'' میں نے کہا اور ہم جیپ میں سوار ہوگئے۔ جب تک جیپ سڑک تک نہیں پہنچ گئی نوجوان وہیں کھڑا رہا تھا۔ اس نے واضح طور پر پہچان لیا تھا کہ ان بدمعاشوں کی مطلوبہ جیپ یہی تھی جس میں ہم سوار تھے۔

ہلکی سی بارش اب بھی جاری تھی۔ بجلی کی گرج چمک میں کمی آگئی تھی لیکن بادلوں کے تیور میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ بارش کا سلسلہ غیر معینہ مدت تک جاری رہے گا۔ ممکن ہے اس میں تیزی بھی آجائے۔ تیز بارش کا پانی بہہ چکا تھا اور بہنے والے ندی نالے اپنی جون میں واپس آگئے تھے۔ حسن علی نے جیپ کی رفتار پندرہ بیس میل فی گھنٹہ تک رکھی تھی۔ ٹریفک نہ ہونے سے بھی آسانی ہوگئی تھی۔ بارہ بجے ہم نے چھوٹا پل عبور کر لیا تھا۔ ماہ پارہ پچھلی نشست پر آگئی تھیں اور ہم بوریت دور کرنے کے لیے باتیں کر رہے تھے۔ حسن علی کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ معاً عقبی آئینے میں روشنی سی لہرائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ آسمان صاف تھا۔ بجلی نہیں چمکی تھی پھر یہ روشنی سی کیوں لہرائی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمارے پیچھے کوئی گاڑی آرہی ہے۔'' میں نے حسن علی سے کہا۔

اس نے چونک کر عقب میں دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی ہے۔''

''ممکن ہے کوئی اور ہو۔'' ماہ پارہ بولیں۔

''ہوسکتا ہے کوئی اور ہو۔'' حسن علی نے اس سے اتفاق کیا۔ ''لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''

اس وقت جیپ بڑے پل کو کراس کر چکی تھی۔ نسبتاً بہتر سڑک آنے کے بعد حسن علی نے جیپ کی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ تیس پینتیس کی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ اگرچہ رات اور موسم کو دیکھتے ہوئے یہ رفتار بھی زیادہ تھی لیکن اگر خطرہ پیچھا کر رہا تھا تو جان بچا کر بھاگنا درست ہی تھا۔ چند منٹ بعد ہی مطلوبہ سڑک آگئی جو ہماری منزل مقصود تک جاتی تھی۔ یہ نسبتاً تنگ اور پیچ




دار راستہ تھا جس میں جابجا موڑ تھے۔ یہاں رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ عقب میں اب لہرانے والی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ لوگ شاید پیچھے رہ گئے تھے یا پھر کوئی دوسری گاڑی تھی ریسٹورنٹ کے چوکیدار کے بیان کے مطابق یہ سڑک تقریباً چار پانچ میل لمبی تھی۔ گویا ابھی نصف گھنٹے کی مسافت اور تھی۔

وادی میں داخل ہوتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ منزل آگئی تھی۔ اب کچھ دیر بعد میں گرم بستر میں گہری نیند سو رہا ہوں گا۔ میں نے سوچا دو مرتبہ غلط بنگلوں کے سامنے جا کر بالآخر ہم نے صحیح بنگلہ تلاش کر لیا تھا۔ تاریکی میں اس کے تاریک در و دیوار کسی بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق چوکیدار سوار خان یہیں رہتا تھا لیکن مسلسل ہارن کے جواب میں وہ نمودار نہیں ہوا تو مجبوراً ہمیں نیچے اُترنا پڑا۔ نیچے اُترتے ہی میں لرز اُٹھا تھا۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ غالباً چوکیدار اندر کہیں کھڑکیاں دروازے بند کیے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

''یہ چوکیدار کہاں مر گیا ہے۔'' حسن علی نے [illegible]دی گیٹ کی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ خوش قسمتی سے اندر صرف کنڈا لگا تھا۔ وہ کھولا اور جیپ اندر پورچ میں لے گئے۔ گیراج میں البتہ تالا لگا تھا۔ مرکزی دروازے بھی بند تھے حسن علی پیچھے چکر لگا آیا۔ چوکیدار کا کوارٹر بھی بند پڑا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ مجبوراً ایک شیشہ توڑ کر کھڑکی کو کھولا گیا اور ہم اس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ حسن علی اور میں نے سامان بھی اسی راستے سے اندر پہنچایا تھا۔ جیپ کی چھت پر لدے سوٹ کیس صبح کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ بنگلے کا مین سوئچ عقبی حصے میں تھا۔ اس کو آن کرتے ہی کئی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ وہ کمرا بھی منور ہوگیا تھا جس میں ہم کھڑے تھے۔ دو منزلہ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار کمرے نیچے تھے اور دو کمرے اوپر تھے۔ کچن اور سٹور روم نیچے ہی تھا۔ بنگلے کی صفائی ستھرائی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے حال ہی میں صاف کیا گیا تھا۔ میں نے فون چیک کیا وہ مرا پڑا تھا۔ یعنی ڈیڈ تھا۔ اس موسم میں یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔

ماہ پارہ اوپر والے حصے کا معائنہ کرنے چلی گئی تھیں۔ حسن علی نے چابیوں کا ایک گچھا تلاش کر لیا تھا اور اب اسے گیراج میں لگے تالے پر آزمانے گیا تھا۔ میں نچلے بیڈ روم میں آتش دان سلگا رہا تھا۔ نیچے ڈرائنگ روم کے علاوہ ڈائننگ روم، ایک سٹڈی روم اور ایک بیڈ روم تھا۔ فیصلہ ہوا تھا کہ آج رات سب اس بیڈ روم میں سوئیں گے۔ ڈبل بیڈ تھا۔ اسے ماہ پارہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں اور حسن علی نیچے دبیز قالین پر کمبلوں میں لیٹ کر سو جاتے۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ ماہ پارہ کو اوپر گئے خاصی دیر ہوگئی۔ نہ تو وہ واپس آئی ہیں اور نہ ہی اوپر سے کوئی آواز آرہی تھی۔ میں آتش دان میں رکھی لکڑی کو آگ دکھا چکا تھا۔ لہٰذا میں اوپر کی طرف روانہ ہوا۔ اوپر جانے والی سیڑھیاں ڈائننگ روم سے گزر کر ایک گیلری میں کھلی تھیں۔ جس کے دائیں بائیں دونوں بیڈ روم تھے۔ گیلری کی روشنی بند

تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ یہ گیلری کچھ دیر پہلے روشن کی تھی جب میں ماہ پارہ کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے ایک بیڈ روم میں جھانکا۔ بیڈ روم میں روشنی تھی لیکن وہ خالی پڑا تھا۔ دوسرا بیڈ روم بھی خالی تھا۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ ماہ پارہ کہاں گئیں۔ باتھ روم بھی خالی تھا مجھے پہلے بیڈ روم کے باتھ روم کا خیال آیا۔ میں اس میں داخل ہوا۔ باتھ روم کھولا ہی تھا کہ وہاں فرش پر ماہ پارہ کو بے سدھ پڑے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔



ممکن ہے میری جگہ کوئی عام حالات میں پرورش پانے والا چودہ سال کا لڑکا ہوتا تو سر پر لگنے والی یہ ضرب اس کے لیے کافی ثابت ہوتی اور فوراً انٹاغفیل ہو جاتا لیکن گزشتہ دو سال میں حسن علی نے جس طریقے سے میری تربیت کی تھی اس نے مجھے اور میرے سر دونوں کو خاصا سخت جان بنا دیا تھا۔ اس لیے ضرب لگنے کے باوجود میں فوری طور پر بے ہوش نہیں ہوا۔ ہاں فرش پر ضرور گر گیا اور خود کو یوں بے حس و حرکت بنایا جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ہوں۔ اندر سے میں ذہن پر طاری ہونے والی بے حسی سے لڑ رہا تھا۔

''یہ بھی گیا۔'' میں نے کسی کی آہستہ لیکن کرخت آواز سنی۔ مجھے لگا جیسے یہ آواز پہلے بھی کہیں سن چکا تھا۔

''پہلے اس زنانی کو لے جانا ہے۔'' دوسری آواز نے دریافت کیا۔

''زنانی کی اولاد پہلے اس کی فکر کرو جو نیچے گیا ہے۔'' کرخت آواز والے نے دوسرے کو ڈانٹا۔ ''وہ تم سب کا باپ ہے۔''

''ادھر پٹھو اور سدی ہیں۔'' دوسرے نے غالباً کام ٹالنے کی کوشش کی اس پر کرخت آواز والے نے ماہ پارہ کو اس کی والدہ محترمہ قرار دیا۔

''اس ماں کو چھوڑ اسے بعد میں دیکھتے رہنا نیچے جا۔''

''اچھا استاد۔'' دوسرے نے بادلِ نخواستہ روانگی اختیار کی۔

اس وقت تک میرا ذہن کسی قدر بے دار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں چاہوں تو اُٹھ بھی سکتا ہوں لیکن فی الوقت ایسا کرنا نادانی میں شمار ہوتا۔ میری ذرا سی حرکت سے چوکنا ہو کر استاد معظم مجھے سچ مچ بے ہوش کر دیتے۔ اس لیے میں صبر سکون سے انتظار کرنے لگا کہ میرے اعصاب پوری طرح میرے قابو میں آ جائیں۔ میں اس طرح فرش پر پڑا تھا کہ میرا ایک رُخسار فرس پر تھا اور جسم گول مول سی پوزیشن لیے تھا۔ چہرہ میرا باتھ روم کے اندرونی حصے کی طرف تھا۔ اس لیے میں نے نچلی آنکھ کھول کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ذرا سی جھری سے مجھے فرش پر سچ مچ بے ہوش پڑی ماہ پارہ نظر آئیں۔ وہ نازک سی عورت تھیں لیکن مارنے والے نے بے دردی سے ان کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر پیشانی تک آ رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اتنی وسیع





دنیا میں اگر کسی نے مجھ سے بے غرض محبت کی تھی تو وہ یہی ماہ پارہ تھیں۔ بے شک مجھ سے کاجل بھی محبت کرتی تھی لیکن یہ بے غرض محبت نہیں تھی۔ اس کی محبت مانگتی اور حاکمیت جتاتی محبت تھی۔ جمشید علی بھی مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن ان کی محبت بھی بے غرض نہیں تھی۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت مجھے جمشید پیلس میں لائے تھے اور اب ایک خاص مقصد کے تحت میری پرورش کر رہے تھے۔ مقصد سے میں لاعلم ہی تھا۔ ماہ پارہ کا مجھ سے کوئی مفاد نہیں تھا۔ جمشید پیلس میں وہ میری وجہ سے مقیم تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے زہرہ بیگم کی نفرت اور اس سے بھی بڑھ کر بے جا شک برداشت کیا۔ زہرہ بیگم میں کھلے لفظوں میں کہنے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن ان کے ڈھکے چھپے لفظوں کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ وہ ماہ پارہ کو جمشید علی کی داشتہ سمجھتی ہیں۔

اس وقت ماہ پارہ کو بے بسی کی حالت میں دیکھ کر میری رگوں میں دوڑنے والا خون آگ بن گیا تھا۔ میں نے چھریرے جسم کے ایک شخص کو ماہ پارہ کے نزدیک بیٹھے دیکھا۔ اس نے چمڑے کی سرخ جیکٹ پہن رکھی تھی اور اونی ٹوپی سے اس کے لمبے بال شانوں تک آ رہے تھے۔ چہرہ دوسری طرف تھا۔ پھر نظر آنے والے ہاتھوں سے ظاہر تھا کہ وہ گوری رنگت کا جوان شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ اڑتیس کا شاندار سا پستول تھا۔ وہ اس کی نیلگوں نال ماہ پارہ کے رخسار پر پھیر رہا تھا۔

''ہے تو بھرپور۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے سے چھلکتی خباثت محسوس کر کے میرا خون مزید کھولنے لگا تھا۔

یہ خاصا وسیع و عریض اور جدید طرز کا باتھ روم تھا۔ اس میں باتھ ٹب سے لے کر اسٹیم باتھ تک سارے انتظامات تھے۔ ماہ پارہ ٹب کے پاس پڑی تھیں اور مجھ سے ان کا فاصلہ کوئی دس فٹ تھا۔ وہ خبیث ان کے سر کے پاس بیٹھا تھا۔ اس طرح مجھے اس کا چہرہ تو نہیں لیکن ماہ پارہ دکھائی دے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ پسٹل کی نال چہرے سے پھسل کر نیچے جانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اشتعال کو دباتے ہوئے اپنے خیالات کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے حسن علی کے بارے میں سوچا کہ کیا وہ بھی پکڑا گیا تھا۔ ابھی تک نیچے سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ ایک انگریزی محاورے کے مطابق کسی خبر کا نہ ہونا ہی اچھی خبر ہے۔ نیچے کی نفری کی طرف سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ حسن علی نے ان پر قابو پا لیا تھا اور اب خاموشی سے انہیں ٹھکانے لگانے میں مصروف تھا۔

معاً کپڑا چرنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نچلی آنکھ خفیف سی کھولی اس حرام زادے نے ماہ پارہ کی قمیص سامنے سے پھاڑ دی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ میں اُٹھ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور نتائج کی پروا کیے بغیر اسے جہنم رسید کرنے کی کوشش کروں لیکن حسن علی کی دی ہوئی تربیت میرے کام آئی۔ اس نے مجھے دشمن پر فتح حاصل کرنے کا ایک ہی گُر سکھایا تھا۔ چوٹ اس وقت مارو جب لوہا پوری طرح گرم ہو۔ ورنہ تمہاری کوشش رائیگاں جائے گی۔ دشمن کی پشت میری طرف تھی

اور اگر میں اُٹھ کر اس کی طرف جھپٹتا تو درمیانی فاصلہ اس کوشش کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اسے پلٹ کر مجھے شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ لگتا۔ اپنے اطوار سے وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ اسلحے اور اس کے استعمال سے پوری طرح آشنا، میری اس کوشش کو ایک گولی نہایت آرام سے ناکام بنا دیتی اور پھر وہ ماہ پارہ کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوتا۔ اس کی دست درازی کے باوجود مجھے یقین تھا کہ فی الوقت ماہ پارہ کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی وہاں پر کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے میں ہتھیار کا کام لے سکتا۔ باتھ روم میں اس قسم کی کسی شے کی گنجائش تھی ہی نہیں اور بغیر کسی ہتھیار کے اس پر حملہ کرنا بالآخر خودکشی بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں صبر کو اس کی آخری حد تک آزماتے ہوئے ساکت لیٹا رہا۔ پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا سوہنی تجھ سے کچھ دیر بعد ملیں گے۔'' وہ کھڑا ہوا تو میں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔ میں نے خود کو چونکنے سے بچایا۔ وہ وہی شخص تھا جس کی جھلک مجھے سفید رنگ کی ڈاٹسن میں نظر آئی تھی۔ وہ ارشد بلا سے مشابہہ تھا۔ اس کے نقوش، چھریری جسامت اور رنگت بالکل ارشد بلا جیسی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس کا بھائی یا کوئی قریبی رشتے دار ہو۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے آنکھ بند کر لی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں پہلے سے تیار ہو گیا جب اس نے میری پسلی میں جوتے کی نوک ماری تو میں بے جان انداز میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ اس نے تین چار ناگفتنی کہہ کر باتھ روم سے باہر کا رُخ کیا۔ غالباً میری طرح اسے بھی تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ اس کے کمرے کی طرف جاتے ہی میں نے موقع پا کر پسلی سہلائی۔ شکر ہے میرا رُخ دوسری طرف ہو گیا تھا۔ ورنہ مجھے ماہ پارہ کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کا منظر دیکھنا پڑتا نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں اب کمرے کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ ارشد بلا کا جڑواں بھائی یا کوئی اور رشتے دار اب کمرے کے وسط میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ باتھ روم کی طرف دیکھتا تو ماہ پارہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں ہوس زدہ ہو جاتی تھیں میں نے دل میں سوچا۔

''خبیث مردود ایک بار تُو قابو میں آ جائے تو تیری یہ آنکھیں نکال دوں۔''

کچھ دیر بے قراری سے ٹہلنے کے بعد وہ باہر گیلری میں گیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دوبارہ واپس آ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو آواز نہیں دی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ کہیں حسن علی ابھی تک آزاد ہو اور اس کی آواز سے ہوشیار نہ ہو جائے اس کی بے قراری میں ہر گزرتے لمحے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا اندازہ پنجابی اور اردو کے ان منتخب الفاظ سے بھی ہوتا تھا جو بلا رکاوٹ اس کے منہ سے برآمد ہو رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ یہاں سے دفع ہو جائے تاکہ مجھے ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملے۔ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ کسی قدر تذبذب کے بعد اس نے نیچے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ساتھیوں کے اب تک واپس نہ




آنے اور کوئی جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ تشویش زدہ ہو رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رُکا۔ پھر میری طرف آیا۔ اس کے عزائم بھانپ کر میں نے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس بار اس نے میرے پیٹ میں ٹھوکر ماری تھی۔ ایک بار پھر قیامت سی گزر گئی تھی۔ درد کی شدت نے مجھے تڑپانا چاہا لیکن میں ضبط کر کے رہ گیا۔ میری ذرا سی حرکت میری اب تک کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتی تھی۔

اپنا اطمینان کر کے وہ خبیث النسل شخص باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک منٹ بعد میں چیتے کی طرح اُٹھا لیکن کسی سال خوردہ چیتے کی طرح۔ سرد فرش پر مسلسل بے حس و حرکت رہنے سے میرے سارے رگ و پٹھے زنگ کھائی مشین کی طرح جام ہو چکے تھے۔ بہ مشکل میں کھڑا ہوا۔ اس عمل کے دوران پیٹ پر قیامت بیتتی رہی۔ اس نے نہایت بے دردی سے ٹھوکر ماری تھی۔ احتیاط سے باہر گیلری میں جھانکا۔ پھر سب سے پہلے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کنڈی لگانے کے بعد ان کے لیے اسے کھولنا بے حد مشکل تھا۔ پھر میں نے ماہ پارہ کو دیکھا۔ ان کی نبض کی حالت تسلی بخش تھی لیکن جسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔ ان کی قمیص کے پھٹ جانے والے حصے کی پردہ پوشی میں نے سوئٹر کی زپ چڑھا کر کی اور پھر انہیں اُٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ اوڑھانے کے لیے کوئی شے نہیں تھی مگر بستر باتھ روم کے فرش کے مقابلے میں گرم تھا۔

استاد بھی نیچے جا کر غائب ہو گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ حسن علی نے ان سب کا قلع قمع کر دیا ہو، خاص طور سے اس استاد کے بچے کا، مجھے جب اس کی ماہ پارہ کے ساتھ دست درازی یاد آتی تھی میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ کمرے میں ہتھیار کے نام پر دستیاب ہونے والی واحد شے آتش دان کی راکھ کریدنے والی سلاخ تھی۔ اس دو فٹ لمبی سلاخ سے کام لیا جا سکتا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ بند ہونے کے بعد باہر جانے کا ایک ہی راستہ تھا یعنی بالکونی۔ اس سے کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا۔ میں نے احتیاط سے جا کر نیچے جھانکا۔ یہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا۔ یہاں مختصر سا باغ تھا۔ دراصل یہ بنگلے کے پاس سے شروع ہونے والی پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ جس کا ایک حصہ دیوار کی مدد سے بنگلے کی حدود میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ نیچے حسن علی اور استاد کے آدمیوں کے درمیان کوئی معرکہ ہوا بھی تھا تو اس کا مرکزی اسٹیج بنگلے کے سامنے والا حصہ تھا۔ عقبی حصے میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ بالکونی سطح زمین سے کوئی چودہ فٹ اونچی تھی۔ اگر میں اس کی نچلی ریلنگ پکڑ کر لٹک بھی جاتا تو بھی میرے پیر زمین سے کوئی آٹھ فٹ اونچے ہوتے۔ اگرچہ یہ خاصی بلندی نہیں تھی حسن علی نے مجھے اس سے بھی اونچی جگہوں سے چھلانگ لگانے کی مشقیں کروائی تھیں لیکن اول تو نیچے تاریکی کے باعث زمین کی سطح کا اندازہ نہیں تھا عین ممکن تھا میں کسی نوکدار پتھر پر جا گرتا یا پھر ابھی میں نیچے اُتر ہی رہا ہوتا کہ استاد یا اس کا کوئی گرگا اس طرف آ نکلتا اور مجھے نیچے سے گولی مار دیتا۔ جسم نیچے جاتا اور روح بالکونی سے اوپر کی طرف پرواز کر جاتی بہرحال نیچے جانا تھا۔ احتیاطاً میں نے بستر پر رکھا سفید تکیہ نیچے پھینک دیا اور پھر خود ہی ریلنگ پر سے لٹک کر اس تکیے پر چھلانگ لگا دی۔ خلاف

توقع نیچے نرم زمین تھی۔ اس لیے آواز بھی نہیں ہوئی۔ مزید خوش قسمتی کہ بنگلے کے اس طرف کوئی تھا بھی نہیں۔ استاد اور اس کے گرگے جانے کہاں مر گئے تھے۔ حسن علی بھی ان سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ زمین پر گرتے ہی میں ساکت ہو گیا۔ چند لمحے سن گن لیتا رہا۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو زمین پر لیٹے لیٹے ہی بنگلے کے اگلے حصے کی طرف جانے لگا۔ کہنے کو گرمیوں کا موسم تھا مگر سطح سمندر سے کوئی آٹھ ہزار فٹ بلندی کی وجہ سے موسم بے حد سرد تھا۔ زمین جیسے برف کی بنی تھی اور اس پر لیٹ کر رینگنا خاصا مشکل کام تھا۔ دیوار سے سر نکال کر میں نے دائیں پہلو کی طرف جھانکا۔ اگلے حصے میں پورچ تھا اور اس سے آگے گیراج اس کے ساتھ ایک پتلی سی گلی تھی جو عقبی اور اگلے باغ کو ملاتی تھی۔ اس طرف کچن اور ڈائننگ روم بھی تھا۔

میں نے آگے کی طرف رینگنے کا ارادہ کیا تھا کہ معاً ڈائننگ روم کی کھڑکی تلے لگی گلاب کی جھاڑیوں سے کوئی شے لڑھک کر میرے سامنے آ گئی۔ میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ شے مسلسل ہل رہی تھی اور ناک کے بل کچھ آوازیں بھی خارج کر رہی تھی۔ تاریکی کے باوجود مجھے احساس ہو گیا کہ وہ حسن علی نہیں تھا اگر حسن علی نہیں تھا تو پھر کون تھا۔ استاد یا اس کا کوئی گرگا جسے حسن علی نے باندھ کر ادھر ڈال دیا تھا۔ غالباً بے ہوش بھی کیا تھا اور اب وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ میں نے بلا ارادہ ہاتھ گھمایا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ وار اس کی کنپٹی پر لگا تھا۔ اسے دوبارہ جھاڑیوں کے سپرد کر کے میں نے آگے کی طرف رینگنا شروع کیا ہی تھا کہ بنگلے کے اگلے حصے سے کسی نے دل خراش آواز میں اپنی والدہ محترمہ کو یاد کیا۔ ''ہائے ماں جی۔''

آواز حسن علی کی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اطمینان ہوا کہ مارا جانے والا استاد یا اس کا کوئی ساتھی ہی ہے اور ظاہر ہے وہ حسن علی کا ہی نشانہ بنا ہوگا۔ یعنی وہ خیریت سے تھا۔ گیراج کے عقبی حصے میں پہنچ کر گلی میں گھستے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ میں دیوار سے چپک کر کھڑا تھا۔ اس بار بیل کی آخری ہچکی سے ملتی جلتی آواز آئی۔ یہ آواز بھی حسن علی کی نہیں تھی یعنی کوئی اور اس کا نشانہ بن گیا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ تھی جسے کان لگا کر ہی سنا جا سکتا تھا۔ آتش دان کی سلاخ میں ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ اس لیے آنے والے کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ بس یہ فکر تھی کہ کہیں حسن علی ہی نہ مارا جائے۔ چاپ بتا رہی تھی کہ آنے والا ادھر ہی آ رہا ہے اور اس کی بدقسمتی کہ وہ میری طرف پشت کر کے گلی میں گھسا تھا۔ گرم ٹوپی کے نیچے سے لٹکتے لمبے بالوں کی وجہ سے مجھے شناخت میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس لیے بلا تکلف سلاخ اس کی گدی پر ماری۔ اس نے چیخ ماری اور نیچے گر گیا۔ جلدی میں مجھ سے نشانہ صحیح نہیں لیا گیا تھا۔ وہ تڑپ کر پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں دبے کولٹ پسٹل کا رُخ میری طرف تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ گولی مار کر میری چودہ سالہ زندگی کا اختتام کرتا لیکن خدا نے مجھے مزید زندگی دی تھی۔ تاریکی میں ایک لات آئی اور اس کے ہاتھ سے پسٹل اُڑا دیا۔ اس نے پلٹ کر گالی دی۔ ٹھوکر نے اس کی کلائی بھی توڑ دی تھی۔




دوسری ٹھوکر نے اس کی زبان بند کر دی جو منہ پر پڑی تھی۔

''برخوردار مجھے تم سے اس اناڑی پن کی توقع نہیں تھی۔'' اندھیرے سے حسن علی کی آواز آئی۔ وہ کیونکہ پہلی بار بولا۔ اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ باقی سب پر بھی قابو پا چکا ہے۔

''بس عجلت میں ہاتھ ذرا غلط پڑ گیا۔'' میں نے ندامت سے کہا۔ ''اس حرام زادے نے ماہ پارہ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔''

''اس لیے تم نے احمقانہ انداز میں وار کر کے اسے موقع دیا کہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے۔'' حسن علی نے طنز کیا، میں کھسیا گیا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ جیسے استاد کے ہوتے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

حسن علی نے جھک کر استاد کا معائنہ کیا۔ ''بے ہوش ہو گیا ہے مردود۔ اس کے تین ساتھی اور ہیں ادھر لان میں پڑے ہیں۔''

''آپ نے اکیلے قابو کر لیے۔'' میں نے پُرستائش لہجے میں کہا پھر چونکا۔ ''استاد محترم ایک پٹھا ادھر بھی پڑا ہے۔''

''نہیں مجھے نہیں معلوم۔'' حسن علی اس طرف لپکا۔ ''کہیں بنگلے کا چوکیدار نہ ہو۔''

اس کا خیال درست نکلا تھا۔ یہ بنگلے کا چوکیدار ہی تھا جسے بے ہوش کر کے اور باندھ کے ادھر ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ حسن علی نے اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے پہچانتا تھا۔ اس نے چوکیدار کی مشکیں کھولیں اور اسے کندھے پر لاد کر بنگلے کے لیونگ روم میں لے آیا۔ اسی دوران میں نے اپنی بے وقوفی اور آنے والے کڑے وقت کا سوچ کر پچھتانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ کو جس بیڈ روم میں چھوڑا تھا اس کا دروازہ اندر سے بند تھا اور میں بالکونی کے راستے نیچے اُتر آیا تھا اور اب بالکونی کے راستے ہی اندر جانا پڑتا۔ حسن علی اس بات پر ہفتوں میری جان عذاب میں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''آپ ان سب کو دیکھیں میں ماہ پارہ کو دیکھتا ہوں۔'' میں نے باہر کی طرف رُخ کیا۔

''اس کے لیے باہر کہاں جا رہے ہو ماہ پارہ اوپر ہے۔''

اب مجھے بتانا پڑا۔ ''وہ دراصل میں نے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا اور بالکونی سے باہر آیا تھا۔ اس لیے جانا بھی اس طرف سے ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ حسن علی کوئی نوکیلا جملہ کستا میں باہر نکل آیا۔ چوکیدار نے ایک درخت تلے کام کرنے والے اوزار رکھے تھے۔ ان کے ساتھ رسی بھی تھی۔ میں نے ایک لوہے کے آنکڑے سے رسی باندھی اسے اُچھال کر بالکونی کی ریلنگ میں اٹکایا اور دعا کی کہ یہ میرا ایک سو چالیس پونڈ کا وزن برداشت کر لے اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ ماہ پارہ بستر پر کسمسا رہی تھیں اور ان کے منہ سے کراہنے کی ہلکی ہلکی سی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ میں نے باتھ روم سے گلاس میں پانی لا کر تھوڑا انہیں پلایا اور کچھ

ان کے منہ پر چھڑکا تو وہ ہوش میں آ گئیں جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ مجھ سے چمٹ گئیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

"آرام سے مام، سب ٹھیک ہے، جس خبیث نے آپ کو زخمی کیا تھا اسے حسن نے اپنے طریقے سے بے ہوش کیا ہے۔"

"حسن کہاں ہے؟" وہ نحیف سی آواز میں بولیں۔

"استادِ محترم ان کا بنڈل بنا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان خبیثوں کا جو بنگلے میں گھس آئے تھے۔"

ماہ پارہ نے کراہ کر سر کا زخم چھوا۔ "میں باتھ روم میں گئی ہی تھی کہ کسی نے سر پر کچھ مارا۔" پھر انہیں کچھ محسوس ہوا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی قمیص ٹٹولی میں نے جھینپ کر نگاہیں پھیر لیں۔

"اس خبیث نے بدمعاشی کی تھی۔" میں نے بہ مشکل کہا۔

ماہ پارہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر باتھ روم کی کیبنٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا سامان تھا میں نے پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا۔ پھر اس پر مرہم لگا دیا۔ ٹیپ لگانے کی گنجائش بالوں کی وجہ سے نہیں تھی اوپر سردی تھی اس لیے ہم نیچے آ گئے۔ حسن علی نے ان چاروں کو بھی لیونگ روم میں ڈال دیا تھا اور ان کے ہاتھ پیر ان کی قمیصوں سے باندھ دیے تھے۔ استاد کا حشر تو میرے سامنے ہوا تھا باقی تین بھی اچھی حالت میں نہیں تھے۔ ایک کا جبڑا ٹوٹا تھا۔ بہر حال ان میں سے کوئی سنگین حالت میں نہیں تھا۔

چوکیدار ہوش میں آ گیا تھا یہ مقامی شخص تھا لیکن تربیت یافتہ بھی۔ اس کی زبان صاف اور فوجی انداز کی تھی میرا اندازہ بعد میں درست نکلا۔ وہ سابق ایس ایس جی کمانڈو تھا اس کے باوجود وہ بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔ ایک سفید ڈاٹسن پک اَپ بنگلے کے سامنے رُکی اور اس سے ایک شخص نے اُتر کر گیٹ بجایا۔ وہ کسی کا پتا معلوم کر رہے تھے۔ گل محمد نے انہیں پتا سمجھایا اور جیسے ہی گیٹ سے اندر آیا کسی نے اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عقبی دیوار پھاند کر بنگلے میں گھس آئے گا۔ سوال یہ تھا کہ یہ تھے کون؟

استادِ معظم اس حرام صورت کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ ارشد بلا کا کوئی ناجائز رشتے دار ہے اور اپنی شامت اعمال کی وجہ سے اس کا انتقام لینے کے لیے ہمارے پیچھے آیا ہے۔"

"خوش قسمتی سے مجھے گڑ بڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ورنہ شامت اس وقت ہماری آ رہی ہوتی۔"

حسن علی کا لہجہ سرد تھا۔ "ماہ پارہ کہاں ہے اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" ماہ پارہ لیونگ روم میں آئیں۔ انہوں نے لباس بدل لیا تھا۔ "مجھے کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں پر کچن کہاں ہے۔"

حسن علی نے چوکیدار گل محمد کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "بی بی صاحب آپ بیٹھو میں





کافی بنا کر لاتا ہے۔"

ماہ پارہ آتش دان کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے چاروں کو غور سے دیکھا۔ پھر ارشد بلا سے مشابہ شخص کو دیکھ کر چونک گئیں۔ "یوسف درست کہہ رہا تھا یہ لوگ شروع سے ہمارے پیچھے تھے۔ اگر ہم لنچ کے لیے نہ رُکتے تو شاید ان کے بارے میں پتا بھی نہیں چلتا۔"

"بس جناب یہ استادِ محترم ہی خاکسار کی صلاحیتوں کو نہیں مانتے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"اس میں صلاحیت کہاں سے آ گئی۔" حسن علی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ تو اس نے اتفاقیہ دیکھ لیا تھا۔"

"یہ نا انصافی ہے۔" میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ "سب سے پہلے تو میری دیکھنے کی صلاحیت نے کام کیا اور پھر میرے کمپیوٹر جیسے دماغ نے ارشد بلا سے مشابہہ اس شخص کو بھی تاڑ لیا۔"

"یہ تو ہے۔" ماہ پارہ نے تائید کی۔ "اس نے راستے میں ہی تمہیں آگاہ کر دیا تھا۔"

"او کے خاتون۔" حسن علی نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ "تم اور تمہارا یہ لاڈلا ہی ساری عقل رکھتے ہیں۔"

"محترم آپ کو یہ بات مستقبل قریب میں صدقِ دل سے تسلیم کرنا پڑے گی۔" میں نے شوخی سے کہا تو ماہ پارہ شرما گئی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میں جمشید پیلس سے نکلتے ہوئے جتنا اُداس تھا ماہ پارہ اور حسن علی اتنے ہی خوش تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ پیلس کے قید خانے سے نکل کر آزاد فضا میں آ گئے تھے۔ یہاں کوئی ان پر نگران نہیں تھا۔ وہ جمشید علی کی نگاہوں سے دور تھے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ حسن علی اور ماہ پارہ کی محبت اس مرحلے تک آ پہنچی تھی کہ اب وہ ایک دوسرے سے ذرا دیر کے لیے بھی دور نہیں رہ سکتے تھے اور اس معاملے میں ان کی طرف سے کوئی فیصلہ بھی متوقع تھا۔ ممکن ہے یہ احساس اتنا درست نہ ہو لیکن وہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے جھلکنے والے جذبے کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

گل محمد کافی بنا کر لے آیا۔ کھانا ہم کھا چکے تھے اس لیے اس کی کھانے کی پیش کش مسترد کر دی تھی۔ ایس ایس جی کا یہ سابق کمانڈو ہر فن مولا تھا۔ جمشید علی نے بتایا تھا کہ وہ ڈرائیور اور مالی ہونے کے ساتھ ساتھ باورچی بھی تھا لیکن ہمارے جانے کی صورت میں وہ صرف گارڈ کا فرض ادا کرے گا۔ باقی کاموں کے لیے عارضی ملازم رکھے جائیں گے۔ ان ملازمین کا بندوبست گل محمد کو خود کرنا تھا۔ حسن علی نے اصرار کر کے ماہ پارہ کو کافی کے ساتھ اسپرین دی اور پھر سونے کے لیے بھیج دیا۔

"لعنت بھیجو ان پر۔" ماہ پارہ بولیں۔ "صبح نمٹ لینا ان سے۔"

حسن علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان سے بات کرنا بے حد ضروری ہے ممکن ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں۔"

ماہ پارہ کے جانے کے بعد حسن علی نے گل محمد کو بلا کر اس سے جیپ کے اوپر لدے سوٹ کیس اندر لانے کو کہا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ حسن علی نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں کم سے کم آج رات ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہے۔''

''رات کالی کرنے کے بجائے ان بدبختوں سے کیوں نہ پوچھ لیں۔'' میں نے استاد اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حسن علی نے غور کیا۔ ''یہ بے ہوش ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا اور اچانک استاد کے پیٹ پر ٹھوکر ماری وہ کراہا مگر کیسے پڑا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ ''اب پوچھ لیجیے استاد معظم۔''

حسن علی کو میں اس کی ماہ پارہ کے ساتھ کی جانے والی دست درازی کے بارے میں بتا چکا تھا وہ بے حد سفا کی سے حرکت میں آیا اس نے زخمی استاد کے ٹوٹے ہاتھ پر پاؤں رکھا اور دباؤ ڈالا تو وہ تڑپنے پھڑکنے لگا۔ حسن علی نے کہا۔ ''کون ہو تم کس لیے آئے تھے؟''

''ہم چور ہیں۔'' اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا کے لیے..

حسن علی اس کے ہاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ استاد کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ اس کی چیخیں ماہ پارہ کو ڈسٹرب کرتیں اس لیے میں نے اوپر سے ہٹ کر ٹیپ لا کر اس کے منہ پر چپکا دیا۔ ''تمہیں اس وقت خدا یاد نہ آیا جب ایک بے بس عورت کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔'' حسن علی تلخی سے بولا۔

''ارشد بلا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جواب دو ورنہ یہ شخص ایسا ہے کہ تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ دے گا اور تمہیں مرنے بھی نہیں دے گا۔''

''ایسے۔'' حسن علی نے کہا اور اچانک جھک کر اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑ کر پیچھے کی طرف گھمائی۔ چٹ کی آواز سے انگلی کچی پنسل کی طرح ٹوٹ گئی۔ استاد نے دوبارہ تڑپنا پھڑکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ ناک سے غوں غاں بھی کر رہا تھا۔ میں نے منہ سے ٹیپ ہٹائی تو وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''خدا کے لیے اس شخص کو دور رکھو میں سب بتاتا ہوں۔'' آواز کے ساتھ اس کا جسم بھی لرز رہا تھا۔ میں نے افسوس سے اس شخص کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے ایک بے بس عورت پر دست درازی کرتے ہوئے اسے اپنی اس حالت کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں تھا۔ حسن علی نے اس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑی ہی تھی کہ اس نے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلانا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''کون ہو تم کہاں سے آئے ہو مرنے کے لیے؟''

''میرا نام......مرشد ہے۔'' وہ بولا۔ ''ارشد بلا میرا بھائی ہے۔''



''تم لوگ اس کا بدلہ لینے کے لیے ہمارے پیچھے آئے تھے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔ اس نے جواب دینے میں ذرا سی ہچکچاہٹ دکھائی تو حسن علی نے انگلی پر دباؤ ڈالا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''کوئی نہیں ہے بس ہم چار ہی آئے ہیں۔''

اگلے ہی لمحے حسن علی نے اس کی دوسری چھوٹی انگلی بھی توڑ ڈالی تھی۔ وہ ایک بار پھر تڑپنے پھڑکنے اور مغلظات بکنے لگا۔ اس نے حسن علی کو دیوانہ وار گالیاں دیتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ بے شک اس کے جسم کی ساری ہڈیاں توڑ دے لیکن وہ اسے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ اس اثناء میں مرشد کے دو اور ساتھی ہوش میں آ گئے تھے۔ صرف وہ بے ہوش تھا جس کا جبڑا ٹوٹا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے استاد کا انجام دیکھ رہے تھے۔ میں نے حسن علی سے دریافت کیا۔

''ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''یہ کیا جانتے ہوں گے۔'' اس نے حقارت سے کہا اور پھر اپنے لباس سے پستول نکالنے لگا۔ ''گولی مار کر ان کا قصہ ہی پاک کرتا ہوں۔''

گرگے حسن علی کی سفا کی ملاحظہ فرما چکے تھے۔ ان میں سے ایک کی ہمت جواب دے گئی۔

''خدا کے لیے مجھے مت مارنا میں بتاتا ہوں۔''

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' حسن علی نے اس کے سر کا نشانہ لے کر دریافت کیا۔

''ہمارے ساتھ دو بندے اور ہیں۔ وہ پیچھے کار میں آئے تھے۔'' اس نے یوں جلدی جلدی بتایا ہے جیسے ایک لمحے کی تاخیر پر گولی چل جائے گی۔ ''جب ہم اس گھر میں گھسے تو وہ کار اس سڑک کے آگے کہیں رُکی تھی۔''

''کیسی کار ہے، رنگ اور میک بتاؤ؟''

کار کا رنگ میک معلوم کر کے حسن علی نے گل محمد کو بلا کر اس کے بارے میں بتایا۔ ''اوپر سے نظر رکھو۔ اگر یہ کار یا کوئی مشتبہ شخص نظر آئے تو مجھے مطلع کرنا۔'' حسن علی نے اسے مختصر فاصلے پر کام کرنے والا ایک ہینڈ سیٹ ریڈیو دیا تھا۔ ایسا ہی ایک سیٹ اس کے پاس تھا۔ گل محمد چلا گیا۔

حسن علی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''یہ ارشد بلا گروپ کے لوگ ہیں۔ بہ ظاہر یہ ڈکیت گروپ ہے لیکن میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق یہ کہیں بڑے درجے کے مجرم ہیں۔ انہیں سیاست دانوں اور بعض بڑے سرکاری افسران کی حمایت حاصل ہے۔ اس حمایت کے بل پر یہ اسلام آباد جیسی حساس جگہوں پر کامیابی سے وارداتیں کرتے رہے ہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہماری وجہ سے ان کے چار ساتھی پکڑے گئے ہیں۔''

''اس لیے خاکسار کی گوشمالی کے لیے یہ افراد روانہ کیے گئے۔''

میں نے متفکر ہو کر کہا۔ ''ممکن ہے اگلی بار درجن بھر آئیں اور اس سے اگلی بار دو درجن۔ ہم کب تک ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے؟''

''میرا خیال ہے اس ہزیمت کے بعد وہ اِدھر کا رخ نہیں کریں گے۔'' حسن علی نے خیال ظاہر کیا۔

''اچھا ایسا کریں کہ مجھے تو سونے کی اجازت دیں۔''

''چار گھنٹے کے لیے۔'' حسن علی نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ''صبح چھ بجے اُٹھا دوں گا۔''

میں سر ہلا کر بیڈروم میں چلا آیا۔ حسن علی ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ ماہ پارہ بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔ سارے دن کے سفر اور اوپر سے آتے ہی ہونے والی دھینگا مشتی کی وجہ سے میں بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سر کی ضرب اب اتنی دردناک نہیں رہی تھی۔ کافی کے ساتھ میں نے بھی اسپرین لے لی تھی۔ نیچے دبیز قالین تھا اور آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ کمرے میں ایک خوش گوار حدت پھیلی تھی۔ اس لیے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تھکن اتنی تھی کہ خواب بھی نہیں آئے۔ صبح چھ بجے حسن نے جھنجھوڑ کر مجھے اُٹھایا

''برخوردار چلو تمہاری باری ہے اور ذرا ہوشیاری سے نگرانی کرنا۔ یہ بہت حرامی لوگ ہیں۔ رات میں کافی لینے کچن میں گیا تو ایک نے اپنے ہاتھ کھول لیے تھے۔''

میں نے جماہی لی۔ ''اس سے تو بہتر تھا ان سب کو خواب آور دوا دے کر سلا دیتے اور خود بھی سکون سے سوتے۔''

''باہر ابھی خطرہ ہے۔ روشنی ہونے پر گل محمد پولیس کو لینے جائے گا۔''

''یہاں فون نہیں ہے۔''

''فی الوقت تو نہیں ہے لیکن جمشید علی نے کہا تھا کہ جلد لگ جائے گا۔'' حسن علی وہیں کمبل میں دراز ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک منٹ میں سو جائے گا۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں نیند کے معاملے میں اس کے اعصاب قابلِ رشک تھے۔ جب لیٹتا ایک منٹ میں سو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا ماہ پارہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ واش روم سے آ کر میں نے ان سے کافی کی درخواست کی اور لیونگ روم میں آ گیا۔ گل محمد نگرانی کر رہا تھا۔ وہ رات بھر سے جاگا ہوا تھا اور زخمی بھی تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ استاد اور اس کے گرگے اب ہوش میں تھے اور ظاہر ہے خاصی تکلیف میں تھے۔ گل محمد نے انہیں پانی وغیرہ دے دیا تھا لیکن بس اتنا کہ اخراج کا مسئلہ نہ ہو۔ لیونگ روم کا آتش دان بھی دہکا دیا گیا تھا۔ اس لیے سردی شدت کی نہیں رہی تھی۔ گل محمد نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ چائے یا کافی ماہ پارہ بنا کر لے آئیں۔ میں نے گل محمد سے کہا۔





''تم ذرا باہر نظر رکھو۔'' وہ سر ہلاتا چلا گیا۔

مرشد مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت چھلک رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر سوجن آ گئی تھی۔ خاص طور سے دائیں ہاتھ کا حال بُرا تھا۔ کلائی کے ساتھ اس کی چھوٹی انگلی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ کر آئے تھے اِدھر؟''

''ابھی تم بول سکتے ہو۔ اگر کبھی میرے قابو میں آ گئے تو پوچھوں گا۔''

میں ہنسا۔ ''یہ حسرت پوری تو ہو چکی ہے پہلے ہی کیوں نہیں پوچھ لیا۔''

''اب کیا ارادہ ہے۔'' مرشد نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''دیکھو ہمیں جانے دو میں وعدہ کرتا ہوں اس معاملے کو یہیں ختم کر دوں گا۔''

''تم لوگ کتے کی دُم ہو کبھی سیدھے نہیں ہو گے۔ میرے پیچھے آئے ہی کیوں تھے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم سب وہیں جاؤ گے جہاں راشد بلا ہے یعنی پولیس کے پاس۔''

مرشد تکلیف کے باوجود ہنسا۔ ''پولیس ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ وہ تو خود ہمارے ساتھ ہے۔''

''نہیں تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور میرا تعلق کس شخص سے ہے۔ وہ سب کو کھا جانے والا آدمی ہے۔ مگرمچھ ہے اس دریا کا جس کی تم چھوٹی سی مچھلی ہو۔''

''اپنی اوقات سے زیادہ اونچی باتیں نہ کرو۔'' مرشد کے لہجے میں حقارت تھی۔

''چلو میں اتنی اوقات نہیں رکھتا لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس معمولی سے لڑکے نے ارشد بلا کے تین ساتھی گرفتار کروا دیئے تھے اب وہ جیل میں ہیں۔''

''محض اتفاق تھا۔ ارشد بلا باہر ہو گا اور تم تینوں کو رُوئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔''

''اس قسم کے دعوے کرنے والے اکثر فرعون رُوئے زمین کے تلے جا چکے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

ماہ پارہ کافی کا بھاپ اُڑاتا مگ لے کر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مرشد کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے مشتعل ہو کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ ''کتے اپنی آنکھیں نیچی رکھ۔''

ٹھوکر نے اس کا منہ ادھیڑ دیا تھا اور سامنے کے دو دانت باہر آ پڑے تھے۔ بندھے ہاتھ پیروں سے وہ صرف تڑپ سکتا تھا۔ ماہ پارہ نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ''کافی پیو جب تک میں ناشتہ بناتی ہوں۔''

''یہاں کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

''بہت کچھ فریج میں خاصی چیزیں ہیں۔ دودھ ڈبل روٹی بھی تازہ تازہ ہیں۔''

ماہ پارہ کے جانے کے بعد میں نے مرشد کی گردن پاؤں سے دبائی۔ ''کتے کے بچے یہ میری ماں ہے اور اگر اب تُو نے آنکھ اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو تیری آنکھیں نکال دوں گا۔''

مرشد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کے لوگ سمجھنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ یہ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور ساری عمر کھاتے ہی رہتے ہیں لیکن اپنی اکڑ سے باز نہیں آتے۔
جب تک میں نے کافی ختم کی گل محمد برابر والے بنگلے پر جا کر پولیس اسٹیشن فون کر آیا تھا۔ ''صاحب پولیس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آجائے گی۔''

''اتنی جلدی۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اتنی جلدی تو شہر میں بھی پولیس نہیں آتی۔''

''دراصل تھانہ صرف چھ میل دور ہے۔'' گل محمد نے مسکرا کر کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ ''تب ہی۔''

اب بھوک لگ رہی تھی لیکن ناشتے سے پہلے پولیس آگئی۔ ایک پورٹیبل قسم کا تھانیدار پارٹی کی قیادت کر رہا تھا۔ دُبلا پتلا اور سوا پانچ فٹ قد کا۔ اپنی پارٹی میں وہ بونا ہی لگ رہا تھا۔ جس میں سب ہی چھ فٹ کے آس پاس تھے۔ گل محمد نے ان کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے جا کر حسن علی کو اُٹھا دیا۔ کچی نیند سے جگائے جانے پر اس کی صورت پر جو تاثرات نظر آئے تھے انہوں نے میرا دل باغ باغ کر دیا تھا۔ میں نے مسرت سے اطلاع دی۔ ''پولیس آگئی ہے۔''

اس نے جماہی لی۔ ''اتنی جلدی کس لیے آگئی۔''

''پتا نہیں مجھے بھی حیرت ہے۔''

حسن علی چہرے پر پانی مار کر باہر آیا اور میں کچن کی طرف لپکا۔ ماہ پارہ نے ناشتہ بنا لیا تھا۔ گرم سینکے ہوئے توس، ہاف فرائی انڈا شہد جام اور چائے میں ان کے روکتے روکتے ٹوٹ پڑا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے سارا ناشتہ کیا مجھے سمجھانے میں ناکامی کے بعد چائے دم کر رہی تھیں۔ انہوں نے خفگی سے کہا۔ ''افسوس کہ میری تربیت بھی کام نہیں آئی کتنی بدتمیزی سے ناشتہ کیا ہے تم نے۔''

''خاتون اگر آپ کے گھر پولیس آئی ہو اور آپ نے کھانا وغیرہ نہیں کھایا ہو تو فوراً کھا لینا چاہیے۔ نامعلوم پولیس آپ کو ہی لے جائے اور تھانے میں کھانے کے لیے صرف گالیاں ملتی ہیں۔ اگر پولیس نہ بھی لے کر گئی تو اس بات کا بھی پورا امکان ہے جب پولیس پارٹی رخصت ہو تو گھر میں کھانے کے لیے صرف صبر کا پھل رہ جائے۔''

''بکواس ہی کرتے جاتے ہو۔'' ماہ پارہ مسکراہٹ دبا کر بولیں اور چائے کا کپ تھما دیا۔

میں کپ لے کر باہر لان میں نکل آیا۔ پولیس اندر جو کر رہی تھی اس سے مجھے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ حسن علی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ میری طرف سے بھی وہی بیان دے دے۔ صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی اور یہ وادی اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ عیاں تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ وادی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن پہاڑوں کی ترچھی ڈھلانوں کی وجہ سے رقبہ زیادہ لگتا تھا۔ ڈھلانوں پر چیڑ اور دیودار کے درخت تھے۔ بلندی پر چنار اور برچ کی سرخی و سفیدی عجیب امتزاج پیدا کر رہی تھی۔ بلاشبہ یہ مبہوت کر دینے والا منظر تھا۔ ایک طرف وہ درہ تھا جس سے گزر کر وادی میں داخل ہوا جاتا





تھا۔ یہ سڑک گھومتی ہوئی نیچے وادی کے اکلوتے گاؤں تک جاتی تھی۔ امراء کے زیادہ تر بنگلوز بلندی پر سڑک کے کنارے تھے۔ ان بنگلوز کی تعداد سوا سو سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی وجہ سے وادی میں بجلی اور فون جیسی سہولیات تھیں۔ گیس نہیں تھی۔ اس کی جگہ سلنڈرز استعمال کیے جاتے تھے۔ گرمائش کے لیے بھی بوائلر لکڑی سے گرم کیے جاتے تھے۔ ہمارے بنگلے کے تہہ خانے میں بھی اس قسم کا ایک بوائلر لگا تھا۔

حسن علی نے مجھے بنگلے کی چار دیواری سے باہر جانے سے منع کیا تھا۔ اس لیے میں اندر ہی لان میں ٹہلتا رہا۔ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے چار سو گز کے رقبے پر تھا۔ سامنے لان تھا دیوار کے ساتھ سرو کے درخت لگے تھے۔ دیوار صرف پانچ فٹ اونچی تھی۔ کوئی بھی اسے آرام سے پھلاند سکتا تھا۔ میں نے سوچا جمشید علی نے مجھے اس غیر محفوظ جگہ بھیج دیا تھا۔ جب کہ انہیں معلوم تھا کہ دشمن میرے پیچھے لگے ہیں۔ کیا وہ وار کرنے یہاں نہیں آسکتے تھے۔ یہ جگہ کوئی اتنی بعید بھی نہیں تھی۔ صرف حسن علی اور گل محمد مجھے بچا سکتے تھے۔

میں ٹہلتا رہا اور غور کرتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جمشید علی نے بطور سزا مجھے پیلس کی محفوظ چار دیواری سے نکال کر یہاں بھیج دیا تھا۔ بابر کی حد تک مجھے وہاں خطرہ تھا جو اس کے فرار کے بعد باقی نہیں رہا تھا۔ بابر کا پتا نہیں چلا تھا وہ جمشید علی کے لمبے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر مزید کوئی قاتلانہ حملہ نہیں ہوا تھا لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ مجھ پر حملوں کا مرکزی کردار وہ نہیں تھا۔ وہ شخص ایک ملازم تھا میری موت سے اس کا کوئی مفاد نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی تھا جو بہر صورت مجھے صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے درپے تھا۔ بابر کی حیثیت محض ایک آلہ کار کی سی تھی، اس کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر میں پولیس والے مرشد اور اس کے تین ساتھیوں کو لے کر رُخصت ہو گئے۔ حسن علی آخری وقت میں تھانیدار سے بات کر رہا تھا اور وہ سخت ناخوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے سنا۔ ''جناب آپ بڑے لوگ بلاوجہ تفتیش میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ اس سے مجرموں کو بچ نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔''

''میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں انسپکٹر صاحب کہ ہمیں مزید تنگ نہ کیا جائے۔ میں نے بتایا کہ یہ ان ڈاکوؤں کے ساتھی ہیں جو اسلام آباد میں ہماری وجہ سے گرفتار ہوئے تھے۔ پاگل کے بچے انتقام لینے آئے تھے۔''

''خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے ان کی۔'' انسپکٹر بولا۔ ''معاملہ عدالت تک جائے گا تو وہاں پر آپ کو حاضری دینا ہی پڑے گی۔''

''دیکھ لیں گے یار۔'' حسن علی بے زار سا بولا۔ ''پہلے معاملہ عدالت تک تو لے جاؤ، ان میں سے ایک دھمکیاں دے رہا تھا کہ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس اور عدالت ان کی جیب میں

ہے۔ یہ ٹوٹے ہاتھ والا بکوس کر رہا تھا۔"

پورٹیبل تھانیدار نے کھا جانے والی نظروں سے مرشد کو دیکھا جو جیپ کی عقبی نشست پر مسکین سا بنا بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے پشتو میں اس کے بارے میں ارشادات فرمائے اور ڈرائیور کو روانگی کا حکم صادر فرمایا۔ پولیس کے جانے کے بعد حسن علی بھی باورچی خانے کی طرف لپکا۔ گل محمد پہلے ہی گیٹ کے ساتھ بنی اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں سونے کے لیے جا چکا تھا۔ یہ خاصی خوشنما سی کوٹھری تھی۔ اس کے اندر ایک عدد پلنگ اور ایک الماری تھی۔ اوپر بنگلے کی اوپری منزل کی طرح سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ اس میں باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی تھی جس سے گل محمد دروازہ کھولے بغیر باہر دیکھ سکتا تھا۔

سورج بلند ہونے پر سردی میں خاصی کمی آئی تھی۔ یہ مئی کا مہینہ تھا۔ مجھے جس سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا یہ دراصل آکسفورڈ کی طرزِ تعلیم پر مبنی نصاب پڑھاتا تھا۔ سکول کا سیشن پہلی مارچ سے شروع ہوتا تھا اور سکول تیس نومبر کو تین مہینے کے لیے بند ہو جاتا تھا۔ گویا تلے اوپر نو مہینے تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے میں تین مہینے کی تاخیر سے تعلیمی سیشن جوائن کر رہا تھا لیکن کراچی میں معیاری تعلیم حاصل کی تھی اس کی رپورٹس کی بنیاد پر سکول انتظامیہ نے مجھے خصوصی طور پر داخلہ دے دیا تھا۔ اصولاً مجھے آج کے دن سکول جانا شروع کر دینا تھا لیکن ابھی تک میں غیر نصابی معاملات میں اُلجھا ہوا تھا۔ رات میں صرف چار گھنٹے سویا تھا لیکن اتنی سی نیند اور پھر بھرپور ناشتے نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے اندر جانے کے بجائے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ حسن علی سے اجازت نہیں مانگی کیونکہ وہ اجازت دیتا ہی نہیں۔ عقبی دیوار میں ایک مختصر سا دروازہ تھا اس لیے میں چپکے سے نکلنے میں کامیاب رہا۔ یہ جگہ ڈھلوان کے ساتھ تھی اوپر جنگل تھا۔ فی الوقت میرا بھی کسی کا سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لیے میں اوپر جنگل کی طرف نکل گیا۔ ڈھلوان پر راستہ مشکل تھا۔ جا بجا پتھر تھے اور جو جگہ پتھروں سے بچی تھی وہاں کچھ نہ کچھ اُگا ہوا تھا۔ دیو قامت آسمان سے بات کرتے درختوں تلے گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان پر پھول کھلے تھے۔ چھوٹے پھولدار پودے اور گھاس کی تو بہتات تھی۔ سال کے پانچ مہینے یعنی نومبر سے مارچ تک اس علاقے پر برف چھائی رہتی تھی۔ جبکہ اپریل سے اکتوبر تک سبزے کی بے پناہ بہتات ہوتی تھی۔ یہ سب مجھے گل محمد نے بتایا تھا۔ اس وقت وادی میرے لیے ایک انجانے سیارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں اوپر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک طرف سے آنے والی آوازوں کو سن کر رُک گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ لوگ لڑ رہے ہوں۔ انگریزی اور اردو میں گالیاں دی جا رہی تھیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی بجائے اپنا راستہ لوں لیکن سرشتِ انسانی کا کیا کیا جائے۔ پرائے معاملے میں دلچسپی لیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی ہے۔ میں اس طرف بڑھا جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چند ملے ہوئے درختوں کے پیچھے دو شہری دنبے ایک مقامی لڑکے کو فٹ بال بنائے ہوئے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ شہری دنبے میں نے اس لیے کہا کہ وہ خاصے پلے ہوئے تھے اور ان کے جسموں پر کچھ





بے باک تصویروں والی جیکٹس تھیں۔ ایک نے سر گھٹوایا ہوا تھا اور دوسرے نے مائیکل جیکسن کی تقلید میں زلفیں چھوڑ رکھی تھیں۔ اپنے بیش قیمت لباس اور امارت زدہ تکبر کے ساتھ وہ اس مقامی لڑکے کو بے دردی سے مار رہے تھے۔ وہ چیختے چلاتے ہوئے اپنی زبان میں غالباً رحم کی بھیک مانگ رہا تھا اور وہ کسی رعایت کے موڈ میں نہیں تھے۔ ابھی میں اس خطا کا تعین کر رہا تھا جس کی پاداش میں مقامی لڑکے کی پٹائی ہو رہی تھی۔ اتفاق سے تینوں میرے ہم عمر تھے۔ مقامی لڑکا بھی کمزور نہیں تھا۔ چاہتا تو ان کا مقابلہ کر ہی سکتا تھا لیکن غربت اور کم مائیگی کے احساس نے اس سے دفاع کا حق تک چھین لیا تھا پھر وجہ بھی سامنے آ گئی۔ تو گنجے نظر آنے والے نے لڑکے کی کمر پر ٹھوکر رسید کی۔

"باسٹرڈ تمہیں جرأت کیسے ہوئی اس زمین پر آ کر لکڑی چرانے کی۔"

"یہ وادی ہماری ہے۔" اس بار لڑکے نے اردو میں کہا۔ "ہم ہمیشہ سے یہاں سے لکڑی کاٹتے رہے ہیں۔" لڑکے کے لہجے میں احتجاج کیا۔

"اب یہ جگہ ہماری ملکیت ہے۔" زلفوں والے نے لڑکے کے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی لیکن وہ خود کو بچا گیا تھا۔ لڑکے کی کلہاڑی پاس ہی پڑی تھی۔ وہ چاہتا تو کلہاڑی سے انہیں دھمکا سکتا تھا مگر شاید اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ ان کی مار کے نشانات لڑکے کے منہ اور ہاتھوں پر نمایاں تھے۔ لباس تلے جسم کے زخم دیکھنا ممکن نہیں تھا ورنہ ضرور موجود ہوں گے۔ لڑکا بھاگنا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں اسے مزید پیٹنے کے موڈ میں تھے۔ اس لیے ایک نے اس کے پیروں میں ٹانگ اڑائی وہ منہ کے بل گرا۔ دوسرے نے اس کی کلہاڑی اُٹھالی۔

"تم نے چوری کی ہے اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔" گنجے نے لڑکے کو آگاہ کیا۔

زلفوں والے نے اوندھے منہ پڑے لڑکے کی پشت پر سوار ہو کر اس کا بایاں ہاتھ قابو کر لیا۔ اور اپنے ساتھی سے کہا۔

"یار ماجد آج اسے ٹنڈا کر دے۔ اسے بھی پتا چلے کہ کسی کی چیز بلا اجازت چرانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔" یہ سن کر اس کے تلے دبا لڑکا مچلنے لگا اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔

"میں چور نہیں ہوں۔ میں جنگل سے لکڑی لے رہا تھا۔"

"جنگل تیرے باپ کا ہے۔" گنجے نے کلہاڑی لہرائی۔ "اب یہ ساری زمین ہماری ہے۔"

اگرچہ اپنی باتوں اور انداز سے وہ مجھے مذاق کے موڈ میں لگ رہے تھے لیکن کوئی بھروسہ بھی نہیں تھا مذاق ہی میں مذاق میں وہ لڑکے کو سچ مچ ٹنڈا کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے دخل در معقولات ضروری سمجھا۔ میرے درخت کے عقب سے نکلتے ہی دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے۔ گنجے نے کلہاڑی لہرانا بند کر دی اور غور سے مجھے دیکھا۔ "کون ہو تم؟"

"دیکھنے میں تو تمہارے جیسا نظر آتا ہوں لیکن ہوں انسان۔"

بات ذرا دیر سے اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ کلہاڑی لہراتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ "دفع ہو جا

یہاں سے انسان کی اولاد۔ اب یہ زمین ہمارے خاندان کی ہے۔"

"کیا یہاں پر تمہارا خاندانی قبرستان بنے گا؟" میں نے معصومیت سے دریافت کیا۔

"تیرے باپ کا قبرستان بنے گا۔" اس نے بھڑک کر کہا۔

"ان کے لیے ایک قبر کافی ہے۔" میں نے کہہ دیا پھر میرے اندر کانٹا سا چبھ گیا۔ میرا باپ کون تھا۔ زندہ تھا یا سچ مچ اپنی قبر میں ہی تھا۔ پھر میں چونکا۔ کلہاڑی بردار خطرناک حد تک میرے نزدیک آ گیا تھا۔ اس کی چھوٹی اور کینہ پرور آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

"تم کون ہو؟"

"میں ایک لڑکا ہوں۔ تم اس بے چارے کو کیوں مار رہے تھے۔"

"یہ ہماری زمین سے لکڑی چرا رہا تھا اس لیے ہم اسے سزا دے رہے ہیں۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"اس کا ہاتھ کاٹ کر اور پھر یہ جنگل تمہاری ملکیت کیسے ہو گیا۔ یہ سرکاری زمین ہے یہاں سے کوئی بھی شخص لکڑی کاٹ سکتا ہے۔ تم کسی کو روک نہیں سکتے۔"

"ہم روک سکتے ہیں کیونکہ اب یہ جگہ ہماری ہے۔ یہاں ہم نے شکارگاہ بنائی ہے۔ جلد اس کے گرد باڑھ لگ جائے گی۔ پھر اس جیسے چور اچکے یہاں نہیں آ سکیں گے۔" اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے تم لوگ طاقت کے بل پر اس زمین پر قبضہ کر رہے ہو۔ جبکہ یہ وادی کے لوگوں کی ملکیت ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اس کی قانونی ملکیت نہیں ہوگی۔"

"قانون ہماری جیب میں ہے۔" زلفوں والے نے پہلی بار زبان کھولی۔ "میرے بابا اس علاقے کے بڑے سرداروں میں سے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ظاہر ہے ایک جاگیردار گھرانے کے سپوت اس قسم کے خیالات ہی رکھ سکتے تھے۔ اس ملکیت کو اپنی ملکیت اور عوام کو اپنی رعایا سمجھنے والے۔ میں ان سے اُلجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے درگزر کرنے کے لیے ان سے کہا۔

"چلو یار جانے دو۔ غریب آدمی ہے غلطی سے آ گیا ہوگا۔ اسے کیا پتا کہ یہ جگہ تمہاری ہے۔"

گنجا کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "چلو تمہارے کہنے پر چھوڑ رہے ہیں۔ چل دفع ہو جا ماں کے......" اس نے گالی دی اور لڑکے کی کلہاڑی دور پھینک دی۔ خوفزدہ لڑکا اُٹھا اور کلہاڑی اُٹھا کر بھاگ گیا۔ میں نے ایک بار پھر افسوس سے سر ہلایا اس ملک کے لوگوں کا یہی حال ہو گیا ہے۔ اپنا حق بھی ڈر ڈر کر مانگتے ہیں۔ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو گنجا سامنے آ گیا۔ "مجھ سے دوستی کرو گے میرا نام مراد خان ہے۔ یہ میرا چچازاد بھائی عمر خان ہے۔"

"میرا نام یوسف علی خان ہے اور میں دوستی نہیں چاہتا۔" میں نے بے پروائی سے جواب





ر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ "اس جنگل میں تم لوگوں نے کہاں تک قبضہ کیا ہے۔"

"یہ سارا جنگل ہی ہمارا ہے۔" وہ بولا۔

"میرا خیال ہے تم اپنی حد تک رہو تو بہتر ہے۔ جنگل کا یہ حصہ میرے بنگلے کے عقب میں آتا ہے۔"

اس نے جواب نہیں دیا مضحکہ اُڑانے کے انداز میں ہنس دیا۔ میں شانے اُچکا کر اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ پہاڑی ڈھلان خاصی اونچائی تک گئی تھی۔ بعض جگہیں بے حد دشوار تھیں۔ ایک جگہ گھاس اور پودوں کے درمیان چشمہ بہہ رہا تھا۔ اس کا پانی اتنا سرد اور شیریں تھا کہ اس کے گھونٹ جیسے روح میں اُتر گئے۔ میں نے جی بھر کر پیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا میں ان دونوں دنبوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ راستہ آگے جا کر سڑک سے مل جاتا اور میں گھوم کر سڑک سے ہی بنگلے تک آ سکتا تھا اس طرح علاقے سے بھی واقفیت ہو جاتی۔ میں نیچے اُتر رہا تھا کہ نیچے سے کوئی درجن بھر افراد کا گروہ آتا نظر آیا۔ وہ سب ہی کلہاڑیوں اور دیگر مقامی قسم کے حفاظتی آلات سے مسلح تھے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کوئی تعرض کریں گے مگر جیسے ہی وہ نزدیک آئے انہوں نے آناً فاناً مجھے گھیر لیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایک معمر نظر آنے والے جوان نے آگے بڑھ کر کڑے انداز میں پوچھا۔

"تُو نے ہمارے لڑکے کو مارا ہے۔"

میں نے اس بزدل کو دیکھا جو دونوں شہری دنبوں سے بلا تکلف پٹ رہا تھا اور ان سے مار کھا کر دُم دبا کر بھاگ گیا تھا اور اب یہ جم غفیر لایا تھا۔ میں نے لڑکے کو گھورا۔

"میں نے اسے بچایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ کاٹنے جا رہے تھے لیکن افسوس ہو رہا ہے اسے بچایا ہی کیوں۔"

"تم بھی ان کے ساتھ تھے۔" لڑکے نے ڈھٹائی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا حالانکہ میں نے اسے بچایا تھا اور وہ بے غیرت مجھ پر ہی الزام لگا رہا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ "اب مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں بچایا کیوں۔"

"بکواس نہ کر۔" لڑکے کے ساتھ کھڑے شخص نے اچانک مجھ پر اپنی لاٹھی سے وار کیا تھا۔ میں بروقت نہ جھک جاتا تو میرا سر بھی پھٹ سکتا تھا۔

پہلا وار ہوتے ہی امن و امان کا خاتمہ ہو گیا اور مجھ پر چاروں طرف سے لاٹھیاں اور ڈنڈے برسنے لگے تھے۔ میں وار خالی دے رہا تھا لیکن جب چھ سات افراد آپ کی گوشمالی پر تُلے ہوں تو دو تین چوٹیں تو لگ جاتی ہیں۔ میں خود کو بچاتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ مجبوراً میں نے ایک کا وار بازو پکڑ کر روکا اور طاقت استعمال کرتے ہوئے اسے سامنے والے پر دے مارا۔ جو مجھ پر وار کرنے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا اس نے اپنے ہی

ساتھی کی گدی پر رسید کیا۔ اس لمحے پشت سے لاٹھی پڑی۔ شکر ہے انہوں نے کلہاڑیاں استعمال نہیں کی تھیں۔ غالباً وہ قتل و غارت گری کے موڈ میں نہیں تھے۔ صرف میری مرمت کرنا چاہتے تھے۔ جھنجلا کر میں نے مارشل آرٹ کی تربیت استعمال کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے چار پانچ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے ان میں وہ بدبخت بھی تھا جس نے یہ سارا فساد کھڑا کیا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس چکر میں مجھے کئی ضربیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔

اپنے چار پانچ بندے ناکارہ ہوتے دیکھ کر باقی بپھر گئے تھے۔ انہوں نے اب تک کلہاڑیوں کا استعمال نہیں کیا تھا۔ میری پھرتی اور اپنے آدمیوں کی ہائے وائے سن کر بادلِ نخواستہ انہوں نے کلہاڑیاں استعمال کی تھیں۔ میں نے فرار کا راستہ تلاش کیا لیکن انہوں نے چاروں طرف سے کچھ اس طرح گھیرا ڈال رکھا تھا کہ فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ کلہاڑی پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں بے شک مارشل آرٹ جانتا تھا لیکن پانچ چھ کلہاڑی بردار حملہ آوروں سے بچ نکلنے کا فن شاید بروسلی کو بھی نہیں آتا ہوگا۔ ایک بھی صحیح وار پڑ جاتا تو میں اپنے ہاتھ پیر یا سر سے ہی محروم ہو سکتا تھا۔ حسن علی نے مجھے بتایا تھا کہ تیز پھل والے ہتھیاروں میں کلہاڑی کا وار سب سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندے ریڈ انڈین اس فن کے ماہر تھے۔ وہ تلواروں یا نیزے کی جگہ کلہاڑی استعمال کرتے تھے۔ ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ چار انچ پھل والی کلہاڑی سے مخالف کی گردن اُڑا دیا کرتے تھے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ کلہاڑی کے موضوع پر غور کیا جاتا۔ میری جان خطرے میں تھی اور کوئی جائے ماندن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک وہ سب کلہاڑیاں لہراتے میری طرف لپکے تھے۔ میں نے چاروں طرف سے پڑنے والی ضربوں کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔



میں چاروں طرف سے پڑنے والے بٹوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچتے بچتے بھی کچھ نہ کچھ بٹ پڑ ہی گئے تھے۔ وہ سب تربیت یافتہ نگران تھے اور مار پیٹ کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ میری کوشش تھی کہ میرے سر یا کسی نازک مقام پر کوئی ضرب نہ لگنے پائے ایک بار سر بچاتے ہوئے میں سلپ ہو کر نیچے گرا اور اس گارڈ کی رانوں کے درمیان لات جمائی جو مسلسل میرے سر کو نوازنے کی فکر میں تھا۔ اس کا منہ یوں کھل گیا جیسے دنیا میں یکلخت ہوا کی کمی ہو گئی ہو۔ دوسری لات میں نے اس کی چھاتی پر ماری اور وہ پیچھے جا گرا۔ پھر مشتعل ہو کر اُٹھا اس نے اپنی رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے اس کا رُخ میری طرف کر دیا۔

"سؤر کے بچے۔" اس نے دانت پیس کر کہا اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکا ہے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے میرے چاروں طرف موجود اس کے ساتھی





پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کہیں وہ بھی گولیوں کی زد میں نہ آ جائیں۔ میرا جسم تن گیا تھا۔ شاید آخری لمحہ آن پہنچا تھا۔ اتنے نزدیک سے خودکار رائفل کے برسٹ سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا جان گرے کی گرج دار آواز آئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" اس نے گرے ہوئے گارڈ کی رائفل پر بوٹ رکھ کر زمین کی طرف جھکائی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ قاتل لمحہ گزر گیا تھا جب غضب ناک گارڈ میری جان لے سکتا تھا۔ جان گرے نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اس کے خاندان سے اپنی ناجائز رشتے داری قائم کرتے ہوئے پوچھا۔ "کس کے حکم سے تم اسے مار رہے تھے۔"

گارڈ نے منمنا کر وضاحت کی کہ ہم دونوں نے کس طرح انہیں مشتعل کیا۔ جان گرے زہریلے لہجے میں بولا۔ "اور تم مشتعل ہو گئے۔ اتنے کمزور ہو تم۔ میرا خیال ہے تمہیں اس جاب سے ہٹا کر صفائی کے کام پر لگا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے بھی دیکھا تھا مارنے کے چکر میں تم اس کے اتنے نزدیک آ رہے تھے کہ یہ کوشش کرتا تو رائفل چھین کر ایک ہی برسٹ میں تم سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔"

پھٹکار سن کر ان سب کے منحوس چہرے پھر سے لٹک گئے تھے۔ انہیں جی بھر کر ذلیل کرنے کے بعد اس نے حکم دیا۔ "اسے ہسپتال لے جاؤ اور اسے سیل نمبر چار لے جاؤ۔" اس نے بالترتیب عبید اور میری طرف اشارہ کیا۔ دو گارڈز عبید صلاح کو ایک جیپ میں ڈال کر لے گئے اور باقی دو مجھے لے کر پیدل مارچ کرنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ سیل نمبر چار نزدیک ہی تھا۔ جان گرے نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی دو سو گز مارچ کے بعد گارڈز مجھے ایک چوکور ساخت کی عمارت میں لے آئے۔ یہ جگہ کوئی پولیس اسٹیشن لگ رہا تھا یہاں پر جابجا سبز اور سرمئی رنگوں کی وردیاں پہنے افراد گھوم رہے تھے۔ مجھے جس جگہ لایا تھا وہ حوالات لگ رہا تھا۔ گارڈ نے مجھے وہاں موجود ڈیوٹی انچارج کے حوالے کیا اس نے مجھے سلاخوں سے بنی حوالات کے سپرد کر دیا۔

بٹوں سے جسم پر کئی جگہ ضرب آئی تھی لیکن تکلیف خاص نہیں تھی۔ میں نے سیل کا معائنہ کیا مشکل سے آٹھ بائی چار کے اس سیل میں اوپر تلے دو بستر تھے۔ سامنے کموڈ اور اس کے اوپر چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ سیل میں مَیں اکلوتا قیدی تھا۔ ڈیئر ڈان کی عنایت سے صبح ناشتہ میسر آ گیا تھا لیکن اس کے بعد اب تک کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ میں نے سلاخوں سے جھانک کر اس آفیسر سے پوچھا جس نے مجھے بند کیا۔ "یہاں قیدیوں کو کھانا وغیرہ دینے کا رواج ہے۔"

انچارج شاید جنوبی امریکہ کا کوئی مکس نسل کا شخص تھا اس نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کی۔ "کھانا ملے گا اور نہ بھی ملے تو وہ ہے۔" اس نے اشارے سے کموڈ کا بتایا۔ اس کا مطلب سمجھ کر مجھے

کراہیت آئی تھی۔

''غالباً جب تمہیں کھانا نہیں ملتا تو تم بھی یہی کرتے ہو۔'' میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔

''بہت بھونک رہے ہو کتے، چند دن کی بات ہے پھر تمہاری یہ زبان باہر لٹک رہی ہوگی۔''

میں نے شانے اُچکائے۔''مرنے کے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری زبان باہر نکل آئے یا منہ کہ اندر ہی رہے۔ ابھی تو بھوک لگ رہی ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔''تم نے جان گرے صاحب پر حملہ کیا تھا؟''

''افسوس کہ ناکام رہا۔ ورنہ مرنے کا افسوس بھی نہیں ہوتا۔''

''حماقت تھی۔'' اس نے گویا ترس کھاتے ہوئے کہا۔''جان گرے صاحب اس جزیرے کے بڑوں میں سے ایک ہے اس کی شان میں کی گئی گستاخی کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔ تم نے تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے زبانی طور پر بھی جان گرے کی خدمت میں متعدد گستاخیاں کی تھیں۔ جنہیں وہ شیر مادر کی طرح پی گیا تھا کہ فی الوقت اس کا مجھ سے کوئی مفاد وابستہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مجھے اس جگہ سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کس طرح یہاں سے نکال لے جاتا، اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ ہوگا ہی لیکن بالفرض محال اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہوتا تو کیا میں یونہی خاموشی سے مرجاتا۔ اس جزیرے پر میرے پر کچھ کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ جان گرے نے یہاں کے جیسے حفاظتی انتظامات بتائے تھے ان کے ہوتے کسی فرد کا یہاں سے فرار ہونا بے حد دشوار تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ دو بجے کے قریب قیدیوں کا لنچ آیا۔ اس حوالات میں مشکل سے چار پانچ افراد تھے۔ لنچ میں اُبلے ہوئے چاول اور اُبلی ہوئی مچھلی کا شوربہ تھا۔ دونوں چیزیں بے ذائقہ اور بدمزہ تھیں۔ کسی نہ کسی طرح انہیں حلق سے اُتار لیا۔

کچھ کرنے کو تھا نہیں اس لیے میں لیٹ گیا۔ نیند بھی غائب تھی۔ کاجل یاد آرہی تھی۔ ماہ پارہ اور حسن علی یاد آرہے تھے۔ یہ سب مجھے رو چکے ہوں گے کیونکہ خلیج کی تباہی کی خبر دنیا والوں کو مل چکی ہوگی۔ کاجل کیسی تڑپی ہوگی۔ بھائیوں اور ماں نے اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ میرے مرنے کے بعد اس سے یہ پابندیاں ہٹالی گئی ہوں گی لیکن یہ آزادی اس کے کس کام کی ہوگی۔ کہیں اس پاگل لڑکی نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ میرے لیے وہ اتنی ہی دیوانی تھی یہ خیال اتنا مضطرب ناک تھا کہ میں وحشت کے عالم میں اُٹھ بیٹھا۔ دل چاہا کہ یہاں سے اُڑ کر چلا جاؤں۔ اپنی کاجل کے پاس۔

''کیا بات ہے؟'' میرے اس طرح بھڑک کر اُٹھنے کی وجہ سے مشکوک ہوکر انچارج سلاخوں کے پاس چلا آیا تھا۔

''کچھ نہیں۔ لنچ میں کوئی چیز باسی تھی اب میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' میں نے جواب





دیا۔

''بہتر ہے اپنے پیٹ کے درد کو قابو میں رکھو۔ ورنہ نیچے کی حوالات میں بھیج دیئے جاؤ گے۔'' اس نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔

''ذرا نیچے کے حوالات کے بارے میں بتادو۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

وہ مسکرایا۔''اگر کبھی نیچے جانا ہوا تو دیکھ لینا۔''

''اچھا میرے ساتھی کے بارے میں بتادو۔''

''مجھے اس کے بارے میں نہیں پتا۔'' اس نے ٹکا سا جواب دیا اور جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک رسالہ دیکھ رہا تھا۔ دیکھ ان معنوں میں رہا تھا کہ یہ ایک باتصویر رسالہ تھا۔ نظر نواز اور خون کو گرما دینے والا۔ اس کی تصویر یہاں سے بھی صاف نظر آئی تھی جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اریزینا میں مجھ سے ملی تھی اور مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر اس نے میرے سر پر وار کرکے جان گرے کی جان بچائی تھی۔ ویسے تو اس کے اطوار نے بتا دیا تھا کہ وہ فاحشہ عورت تھی لیکن رسالے کی تصویر نے کھل کر بتا دیا تھا۔ وہ پورنو ماڈل بھی تھی عین ممکن تھا یہ رسالہ اس جزیرے پر تیار ہوا ہو۔



دُھند کے اس پار کاجل صاف نظر آرہی تھی۔ حسب معمول سفید بُراق لباس میں اس کا سراپا جیسے روشنی دے رہا تھا۔ بلندی سے ڈھلکتا لباس اس کے حسین ترین سراپا کو واضح کر رہا تھا۔ میں سحر زدہ رہ گیا تھا۔ کاجل نے بازو پھیلائے تو میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ ماحول اس قدر دھند آلود تھا کہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے بس کاجل نظر آرہی تھی۔ معاً میری نظر اپنے پیروں کی طرف اُٹھی اور میں یوں رُک گیا جیسے کوئی تیز رفتار کار ایک جھٹکے سے بریک لگانے سے رُک جائے۔ محض ایک فٹ آگے زمین میں لامتناہی حد تک گہری کھائی تھی۔ دُھند کی وجہ سے مجھے اس کا فوری احساس نہیں ہوا تھا۔ اگر میں ایک قدم اور اُٹھا لیتا تو نیچے جاگرتا۔

''یوسف۔'' مجھے رُکتے دیکھ کر کاجل بے چین ہوگئی۔''جلدی آؤ نا۔''

میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔''کاجل نہیں آسکتا۔ دیکھو راہ میں یہ گہری کھائی ہے۔''

کاجل رو دی تھی۔''میں نہیں جانتی، بس تم آجاؤ۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔''

''خدانہ کرے۔'' میں تڑپ گیا تھا۔''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔''

میں دیوانہ وار کھائی کے پار جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ جو میرے اور کاجل کے درمیان حائل تھی۔ پھر مجھے دُھند میں ایک جھولتا پُل نظر آگیا۔ رسیوں اور تختوں سے بنا یہ شکستہ حال پُل کھائی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جارہا تھا۔ تیز ہوا اسے جھولا دے رہی تھی۔ رسیوں سے بندھے تختے چرچرانے کی خوفناک آوازیں مجھے خبردار کر رہی تھیں کہ اس شکستہ پُل پر قدم رکھنے کی

حماقت نہ کروں۔ ورنہ تحت الثریٰ ہی میرا مقدر بنے گی لیکن کاجل تک جانے کے لیے یہ پُل کیا اگر پُل صراط بھی ہوتا تو میں بلا جھجک اس پر قدم رکھ دیتا۔ مجھے شکستہ پُل کی طرف آتے دیکھ کر کاجل خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے مجھ سے التجا کی۔ ''یوسف اس پُل پر مت آنا۔ یہ خطرناک ہے۔''

''کتنا ہی خطرناک ہو۔ مجھے دوسری طرف آنے سے نہیں روک سکتا۔'' میں نے ایک عزم سے کہا اور پُل کے چرچراتے تختوں پر پاؤں رکھا۔ پُل بے طرح جھولا۔ سہارا لینے کے لیے میں نے رسہ پکڑ لیا۔ ہوا میں یکلخت تیزی آگئی تھی۔ پُل طوفان کی زد میں آئے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کے شکستہ حصوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پُل کے تختے بکھر جائیں گے اور میں ان تختوں کے ساتھ لامتناہی گہرائی میں جا پڑوں گا۔

''یوسف واپس چلے جاؤ۔'' کاجل نے التجا کی۔

میں نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کاجل اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں تمہاری طرف آؤں گا یا جان دے دوں گا۔''

ہوا کے تند جھونکے جیسے کسی لشکر کی طرح پرے باندھ کر حملے کر رہے تھے۔ ان کی تندی میں ہر گزرتے لمحے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جھولتے، لہراتے اور چرچراتے پُل پر ایک قدم اُٹھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اگر میں نے رسوں کو نہ تھام رکھا ہوتا تو شاید اب تک نیچے جا گرا ہوتا۔ میں اس ہوا سے اور پُل کی شکستہ حالی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ معاً سامنے سے ایک تختہ اُڑا اور ہوا کے جھونکے اسے نہ جانے کہاں لے گئے۔ تختے کی جگہ اب مہیب سیاہ سوراخ تھا۔

''یوسف واپس چلے جاؤ۔'' کاجل چلائی۔

میں نے اسے دیکھا اور قدم آگے بڑھایا۔ اس لمحے ایک تختہ اور رسیوں سے نکل گیا۔ میں پُل کے وسط میں تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہواؤں نے تختوں کو اُڑانا شروع کر دیا۔ ایک ایک کر کے سارے تختے یکے بعد دیگرے ہوا میں غائب ہو رہے تھے۔ پُل کے دونوں اطراف سے یہ تختے غائب ہو رہے تھے۔ دونوں جانب سے نمودار ہونے والا مہیب خلا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ کاجل اب رو رہی تھی اور بے بسی سے موت کو میری طرف آتے دیکھ رہی تھی۔ میں نے رسوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مجھے موت سے ہراس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خوف اس بات کا تھا کہ اب میں کاجل سے بچھڑ جاؤں گا۔ عریاں ہوتا پُل تیزی سے میرے نزدیک آ رہا تھا۔ تاریک خلا کا اژدھا مجھے نگلنے کے لیے بے تاب تھا۔ چند ہی تختے باقی رہ گئے۔ میں نے جسم و جان کی پوری شدت کے ساتھ رسے تھام لیے تھے لیکن جب میرے پیروں تلے سے تختہ غائب ہوا تو اگلے ہی لمحے میں نے خود کو تاریک خلا کی گرفت میں پایا۔ کاجل کی کربناک چیخ میرے کانوں میں گونجی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ جسم پسینے میں تربتر تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ کیونکہ اندر اب تیز روشنیاں





جل رہی تھیں۔ معاً میری نظر سلاخوں والے دروازے پر پڑی میں چونکا۔ وہاں جان گرے کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کس وقت آیا تھا۔ مجھے بے دار دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''مسٹر یوسف...... یہ کاجل کون ہے؟''

''کون کاجل؟'' میں سپاٹ لہجے میں بولا۔ ویسے میں سمجھ گیا کہ وہ کاجل کہہ رہا ہے۔

''وہی کاجل جس کا نام ابھی تم سوتے میں لے رہے تھے۔'' اس نے میرے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ''کیا یہ تمہاری محبوبہ ہے؟''

میں نے دل ہی دل میں اس کی شیطانی ذہانت پر لعنت بھیجی کمبخت نے محض نام سن کر درست اندازہ لگایا تھا۔ میں نے بنا کسی تاثر کے جواب دیا۔ ''ضروری ہے کاجل کسی لڑکی کا نام ہو جو میری محبوب ہو۔ بائی دی وے تم اس وقت یہاں کس لیے آئے ہو۔ میرا ساتھی عبید صلاح کیسا ہے؟ اسے کب تک یہاں لاؤ گے؟''

جان گرے نے منہ بنایا۔ ''سارا مسئلہ اس حرامی کا پیدا کردہ ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ ہسپتال سے فرار ہوگیا ہے۔ اس وقت پورے جزیرے پر ایمرجنسی نافذ کر کے اس کی تلاش جاری ہے۔''

میں اُچھل پڑا تھا۔ ''عبید صلاح فرار ہوگیا مگر کیسے وہ تو بُری طرح زخمی تھا۔''

''مکر کر رہا تھا۔ جیسے ہی ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے لگا اس نے اسے قابو کر لیا اور اس کے کپڑے پہن کر ایمرجنسی یونٹ کے عقبی دروازے سے فرار ہوگیا۔''

میں سلاخوں کے پاس چلا آیا۔ ''جان گرے۔'' میں نے سلاخیں تھامتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ کوئی چکر ہو، کہیں تم مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو۔''

''یہ سچ ہے۔'' جان گرے نے زور دے کر کہا۔ ''اب میں عبید صلاح کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ جزیرے کے محافظوں نے اسے تلاش کر لیا اور اس نے ذرا سی مزاحمت کی تو مارا جائے گا۔''

''اور وہ مارا گیا تو سمجھو ہمارا معاہدہ ختم۔ اس کے بعد تم شوق سے مجھے بھی پھانسی دلوا دینا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' جان گرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس نے اپنی حماقت سے یہ مصیبت مول لی ہے۔ بلکہ میرے کام کو بھی ذرا مشکل کر دیا ہے۔ اب تمہاری خصوصی نگرانی کی جائے گی۔''

''گویا تم دشواری میں پڑ گئے ہو۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارا معاہدہ ہم دونوں کی زندگی سے مشروط ہے ایک کو بھی کچھ ہوا تو معاہدہ ختم۔''

جان گرے جھلایا ہوا نظر آنے لگا۔ ''میں نے اس کی حماقتوں کی ذمے داری قبول نہیں کی تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی۔ اس طرح فرار ہونے کی؟''

''اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور سچی بات ہے خود مجھے بھی تم پر اعتبار نہیں ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ عبید صلاح سچ مچ فرار ہوا ہے۔ کہیں یہ تمہارا کوئی نیا شعبدہ تو نہیں ہے؟''

''تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو میں تمہیں جزیرے کے ٹی وی کی نشریات دکھا سکتا ہوں۔''

جان گرے نے حوالات کے انچارج کی میز کے سامنے رکھا ٹی وی آن کر دیا۔ اس وقت جزیرے کے رہائشیوں کے لیے اپیل نما حکم دیا جا رہا تھا کہ خطرناک دہشت گرد عبید صلاح کی تلاش میں جزیرے کے محافظوں کی مدد کی جائے کوئی شخص جو عبید صلاح کو پائے اور اس سے اپنی جان کا خطرہ پائے تو اسے ہلاک کرنے کا مجاز ہے۔ اپیل کے ساتھ مسلسل عبید صلاح کی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ پھر ٹی وی کا نمائندہ نیلی وردی میں ملبوس ایک شخص کا انٹرویو لینے لگا۔ وہ گارڈز کا فیلڈ انچارج کرنل روبری تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ فرانسیسی ہے۔ میں اس کے نام پر مسکرا دیا۔ روبری کا ایک مطلب چوری یا ڈکیتی بھی ہوتا ہے۔ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کا انچارج تھا۔ اس لیے اس پر یہ نام خوب سجتا تھا اور تکبر آمیز لہجے میں بتا رہا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے فرار ہونے والے اس مسلح دہشت گرد کو گرفتار کر لیا جائے گا یا اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔

''میرے آدمی دو ٹاؤنز کی مکمل تلاشی لے چکے ہیں اور دو ٹاؤنز ابھی باقی ہیں۔'' کرنل روبری نے بتایا۔

''جزیرے کے غیر آباد حصوں میں تلاش کا کام کس طرح کیا جا رہا ہے؟'' نمائندے نے سوال کیا۔

کرنل روبری کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اگر وہ جزیرے کے کسی غیر آباد حصے میں چھپا ہے تو ہمارا کام اور بھی آسان ہو گا۔ میرے آدمی بلڈ ہاؤنڈ کتوں کی مدد سے جزیرے کے غیر آباد حصوں میں اسے تلاش کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے صبح سے پہلے آپ کو کوئی ایسی خبر سننے کو ملے گی۔''

جان گرے نے ٹی وی آف کر دیا۔ ''اب تمہیں یقین آیا۔''

مجھے یقین آ گیا کہ عبید صلاح سچ مچ فرار ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس پاگل نے فرار ہو کر سچ مچ اپنی موت پر مہر ثبت کر دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ عبید صلاح جب ان کے ہاتھ آیا یہ پہلی فرصت میں اسے مار دیں گے۔ احمد بربری کے بعد یہ دوسری موت ہوتی جس کا مجھے بے حد دکھ ہوتا۔ حریت کے جذبات سے سرشار اس نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے تھا لیکن خواہش کرنے سے موت بھلا کہاں رکتی ہے۔ اس نے تو پیغمبروں کو نہیں چھوڑا۔ ایک عام انسان کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں افسردہ ہو کر اپنے بستر پر آن بیٹھا۔ جان گرے سلاخوں کے نزدیک آیا۔

''میں یہی بتانے آیا تھا کہیں تم بھی جذباتی ہو کر کوئی قدم نہ اٹھا لو۔''





''فکر مت کرو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''میں عبید صلاح جتنا نڈر نہیں ہوں۔''

وہ سر ہلاتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد رات کا کھانا آ گیا لیکن میرا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رہ رہ کر عبید صلاح کا خیال آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ بھوکا پیاسا تھا۔ اب تک آزاد تھا یا ان وحشی درندوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ جو انسانیت کے خوشنما ماسک لگائے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ایک گارڈ کھانے کی ٹرے جوں کی توں لے گیا۔ انچارج شاید ڈیوٹی کر کے جا چکا تھا۔ اس کی جگہ ایک عام سا محافظ نگرانی کے لیے دفتر میں براجمان تھا اگرچہ اس کی آنکھیں بھی بے حجاب تصویروں والے ایک رسالے پر ہی مرکوز تھیں مجھے عبید صلاح کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ اس سے ٹی وی چلانے کو کہوں لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں اور نہ ہی اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ غالباً میرے بارے میں اسے خاص ہدایت تھی کہ دور رہے اور مجھ سے گفتگو فرمانے کی کوشش نہ کرے۔ حتیٰ کہ جب میں نے اس کی ولدیت کے بارے میں شبے کا اظہار کیا تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں واپس بستر پر آ لیٹا۔ عبید صلاح کو خدا کے سپرد کیا اور پھر سے خوابِ خرگوش میں مگن ہو گیا۔ یہ مجھ پر خدا کی خاص مہربانی تھی۔ حالات کیسے ہی پریشان کن کیوں نہ ہوں جب سونا چاہتا تو لیٹتے ہی نیند آ جاتی تھی۔

صبح ہوئی، پھر شام ہوئی، کئی دن اس طرح گزر گئے۔ سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے مجھے کھانا پینا اچھا دیا جا رہا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی سہولت نہیں تھی۔ خاص طور سے ایسی کوئی شے مجھے نہیں دی جاتی تھی جسے میں ہتھیار بنا کر کسی پر حملہ کر سکوں یا اس کی مدد سے خودکشی کر سکوں۔ حالانکہ نہ تو میں مایوس تھا اور نہ ہی خودکشی کا خیال تھا مجھے یقین تھا کہ میرا خدا میری رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرے گا چاہے وہ جان گرے کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں، مجھے اس سیل سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن چوتھے دن ایک حجام آیا۔ دو مسلح گارڈز نے باہر نکال کر مجھے ایک کمرے تک پہنچایا۔ یہاں لوہے کی ایک ایسی کرسی تھی جس پر ہاتھ پیر باندھنے کے لیے چمڑے کے تسمے تھے۔ مجھے گن پوائنٹ پر مجبور کر کے اس کرسی پر بٹھایا گیا اور میرے ہاتھ پیر چمڑے کے تسموں سے باندھ دیئے گئے میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''کیا میری تاج پوشی کی جائے گی یا اس کرسی پر میرا روسٹ بنے گا۔''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ شاید مجھ پر تشدد کا کوئی حربہ آزمایا جائے گا۔ اس اثناء میں ایک شخص اندر آیا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے پاس آ کر اپنا بیگ نیچے رکھا اور اس میں سے بالوں کی مرمت کے اوزار نکالنے لگا۔ پہلے اس نے میرے سر پر مشین پھیری اور میرے شاندار گھنے سنہری بالوں کی قربانی دے دی۔ میرے چیخنے چلانے اور گالیاں دینے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے یہی مشین میرے چہرے پر پھیری اور میری کوئی مہینے بھر پرانی داڑھی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد

مشین سے شیو بنانے لگا۔ اس نے استرا استعمال نہیں کیا تھا غالباً اس خوف سے کہ میں اچانک گردن موڑ کر استرے سے اپنی شہ رگ نہ کاٹ لوں۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ میرے جسم پر کچھ اور جگہوں پر بھی بال ہیں براہِ کرم انہیں بھی صاف کر دے۔ اس نے میری درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی جس طرح روبوٹ اسٹائل میں آیا تھا اپنا کام کر کے اسی طرح واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دو نگران اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے کھولا۔ میں نے کپڑوں سے بال جھاڑے۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

''باتھ کے لیے۔'' ایک گارڈ نے پہلی بار زبان کھولی۔

غسل خانہ غالباً اجتماعی نوعیت کا تھا یہاں قیدیوں کو بیک وقت غسل کرایا جاتا تھا۔ اس میں زمین سے کوئی نو فٹ کی بلندی پر شاور لگے تھے۔ ان کے کھولنے اور بند کرنے کا سسٹم باہر کہیں تھا۔ ایک شخص نے مجھے صابن اور تولیہ دیا اور کہا کہ میں کپڑے یہیں اُتار کر جاؤں، بادلِ نخواستہ میں نے کپڑے اُتار کر اسے دیئے اور محض لباس فطرت میں اندر چلا گیا۔ میرے جاتے ہی شاور چل پڑے۔ نہ جانے کتنے دنوں کا میل میرے جسم پر جمع ہو گیا تھا۔ میں جی بھر کر نہایا اور پورے ایک گھنٹے بعد باتھ روم سے تولیہ باندھ کر برآمد ہوا۔ تولیہ اور صابن دینے والے شخص نے مجھے ایک سیاہ سوتی ٹراؤزر اور سفید رنگ کی ٹی شرٹ پہننے کو دی۔ میرا پرس بھی مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔ میرا پاسپورٹ اور دیگر سامان خلیج کے ساتھ ہی تہ نشین ہوا تھا۔ پرس میں معمولی سی رقم، میرا پاکستانی شناختی کارڈ، کچھ اور کاغذات اور ایک تصویر تھی کاجل کی، یہ تصویر اس وقت کی تھی جب میں نے اسے اس کی انیسویں سالگرہ والے دن دیکھا تھا اور اپنے کیمرے سے اس کی تصویر لی تھی۔ اس سے اگلے روز میں لندن کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ تصویر میں کاجل نیلے ہلکے رنگ کی میکسی میں پھولوں کے درمیان میں کھڑی تھی۔ یہ پھول اور بوکیٹ سالگرہ میں آنے والے ہزاروں مہمان اس کے لیے لائے تھے۔ میں نے اصرار کر کے اس سے وہاں تصویر بنائی تھی۔ ویسے تو پورا رول ہی اس کی تصویروں سے بھرا تھا لیکن یہ تصویر خاص طور سے مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے چھوٹے سائز میں پرنٹ کروا کے اپنے بٹوے میں رکھ لیا تھا۔

''یہ موت کی سزا پانے والے قیدیوں کا لباس ہے۔'' مجھے واپس لا کر سیل میں بند کرنے والے ایک گارڈ نے مسکرا کر بتایا تھا۔

''اب تمہیں یہاں سے اس روز نکالا جائے گا جس روز تمہیں موت کی سزا دی جائے گی۔''

''یعنی اب میں باضابطہ سزائے موت کا قیدی ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''یہ بتاؤ کہ آج کھانے میں کیا ملے گا۔ دنیا کے سارے ہی ملکوں میں سزائے موت کے قیدیوں کو ان کا من پسند کھانا دیا جاتا ہے۔''

''یہ ہمیں نہیں معلوم۔ انچارج سے معلوم کرنا۔'' وہ چلے گئے۔





اگرچہ ان کے سامنے میں نے ظاہر یہی کیا کہ مجھے ان کی جانب سے دی جانے والی سزائے موت کی ذرا بھی پروا نہیں ہے لیکن یہ سن کر کہ میں نے سزائے موت کے قیدی کا لباس پہن لیا ہے میرے وجود میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پہلی بار اس یقین پر میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہوا تھا کہ ابھی میری زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں شاید اس خیال میں تھا کہ یہ سب ایک قسم کا مذاق ہے یا پھر میں جان گرے پر تکیہ کر کے بیٹھ گیا تھا کہ وہی مجھے اس آفت سے بچائے گا۔ حالانکہ اس کا سہارا بالکل ہی بودا تھا۔ اس کا نہ جانے کون سا مفاد تھا۔ یہ بھی ممکن تھا اس کا مفاد میرے بغیر ہی نکل آتا اور اسے میری مدد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس صورت میں اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ خود کو خطرے میں ڈال کر مجھے سزا سے بچاتا۔ اب مجھے پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ میں نے جان بچانے کے لیے خود ہاتھ پیر کیوں نہیں چلائے۔ عبید صلاح جو کل تک مجھے بے وقوف لگ رہا تھا اس وقت عقلمند محسوس ہونے لگا تھا اس نے موقع پاتے ہی فرار ہونے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب تک ان کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔ ورنہ جان گرے خاص طور سے اس کے بارے میں مجھے بتانے ضرور آتا۔ حوالات کے انچارج اور نائٹ ڈیوٹی والے سے میں نے کئی بار عبید صلاح کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

ہر آنے والا دن میری وحشت میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ افسوس کہ اب مجھے کوئی موقع میسر نہیں تھا۔ حوالات کی ان سلاخوں کو توڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس کا تالا کچھ اس طرح کا تھا کہ اندر میرا ہاتھ اس تک جاتا ہی نہیں تھا۔ کھانا دینے کے لیے فرش کے پاس ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ کھانا لانے والا کھانے کی ٹرے اس کے نیچے سے اندر سرکا دیا کرتا تھا۔ کھانا کھا کر میں ٹرے اسی کھڑکی کے پاس رکھ دیتا تھا۔ وہ ٹرے اُٹھا کر لے جاتا۔ اگر میں کسی ترکیب سے سلاخوں سے باہر نکل بھی آتا تب بھی اتنے سارے مسلح نگرانوں سے بچ کر نکل جانا ممکن نہیں تھا۔

اس روز میں نے رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے پندرہ منٹ کے اندر میرے پیٹ میں شدید قسم کا درد اُٹھا۔ پہلے تو میں درد کی شدت برداشت کرتا رہا لیکن جب یہ حد سے ہی گزرنے لگا تو میں نے رات کے نگران کو آواز دی۔

''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

''برداشت کرو۔'' اس نے رسالے سے سر اُٹھائے بغیر کہا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ حوالات کے نگرانوں کا کام صرف یہ فحش رسالے دیکھنا رہ گیا تھا۔ وہ ہمہ وقت ان رسالوں میں غرق رہا کرتے تھے اور ان کی میزوں پر اس قسم کے رسالوں کے کئی بنڈل رکھے تھے۔ نہ جانے ان کو دیکھ دیکھ کر دل کیوں نہیں بھرتا تھا۔ میں نے بھنا کر کہا۔

''اتنی دیر سے اور کیا کر رہا ہوں اب نہیں ہوتا کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''ڈاکٹر تمہارا نوکر نہیں ہے جو اتنی رات گئے دوڑا آئے۔ سو جاؤ صبح دیکھیں گے۔''

اچانک پیٹ کے اندر سے جیسے کسی نے نوکدار چیز ماری۔ میری بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔ پھر یہ برچھیاں مستقل پڑنے لگیں ضبط کرتے ہوئے میں پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ چیخ سن کر یہ نوجوان نگران بادلِ نخواستہ سیل تک آیا۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور واپس جا کر میز پر رکھے فون سے کسی سے رابطہ کیا۔ ''سیل نمبر بارہ کے قیدی کی حالت خراب ہے کسی کو بھیجو۔''

میری حالت واقعی خراب تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کھانے میں مَیں نے چھوٹے چھوٹے بم کھا لیے تھے اور اب وہ ایک ایک کر کے اندر پھٹ رہے تھے۔ کھانے کے خیال سے میں چونک گیا۔ یقیناً کھانے میں ایسی کوئی شے تھی جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پتلون کے اندر میرا پیٹ پھولنے لگا ہو۔ واقعی پیٹ تھوڑا اُبھر آیا تھا۔ میں نے احتیاطاً کلمہ شہادت پڑھ لیا کہ دشمنوں نے میری موت کے وقت کا انتظار نہیں کیا۔ قبل از وقت زہر دے کر کام تمام کر دیا۔

ڈاکٹر دس منٹ میں آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح اور مستعد گارڈز تھے۔ نائٹ آفیسر نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر نے اندر آ کر میرا معائنہ کیا پھر میرے پھول جانے والے پیٹ کو تشویش سے دیکھا۔

''اسے ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے نائٹ آفیسر سے کہا۔

''لے جاؤ۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''یہاں سائن کر دو۔''

ڈاکٹر کے کہنے پر گارڈز نے مجھے سیل سے نکالا۔ اس وقت تک میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ بغیر سہارے کے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس لیے دو افراد مجھے بازوؤں سے گھسیٹ کر باہر کھڑی مخصوص جیپ تک لائے۔ اس حالت میں بھی گارڈز نے ذرا سی رعایت نہیں کی۔ میرے دونوں ہاتھ جیپ کے اینگل آئرن سے منسلک ہتھکڑیوں میں جکڑ دیئے۔ میرے ساتھ جانے والے ڈاکٹر نے ناگواری سے انہیں دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ دس منٹ بعد جیپ ایک ایسی عمارت کے سامنے رُکی جس پر ہسپتال کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسٹریچر منگوایا۔ اس پر لٹا کر مجھے اندر لے جایا گیا۔ تکلیف کی شدت ایسی تھی کہ لگ رہا تھا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اندر جاتے ہی ڈاکٹر نے مجھے کئی طرح کے انجکشن لگائے اور میرا معدہ واش کرنے کا حکم دیا۔ صفائی کا عمل بھی کم اذیت ناک نہ تھا لیکن یہ کہ اس کے بعد میرے پیٹ میں جاری گولہ باری رُک گئی اور تکلیف بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''مجھے زہر دیا گیا تھا؟''

اس نے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ''نہیں ینگ مین! معمولی سا پوائزن تھا صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

عبید صلاح کے فرار کے بعد یہ لوگ بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی دونوں مسلح نگران میرے سر پر مسلط تھے جب مجھے طبی امداد دی جا رہی تھی تکلیف میں کمی کے بعد میں غنودگی محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید ڈرپ میں کسی قسم کی خواب آور دوا دی جا رہی تھی۔ رات کے کسی پہر مجھے بازو





سے پکڑ کر جھنجھوڑا گیا۔ بہ مشکل میری آنکھ کھلی۔ سامنے جان گرے کھڑا تھا۔

''غالباً میں خواب دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب کہا۔

''اُٹھ جاؤ میں سچ مچ آیا ہوں۔'' جان گرے بستر کے کنارے ٹک گیا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں نگران غائب تھے۔

''کیا تم میری عیادت کرنے آئے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی رات کے اس پہر۔''

''نہیں دراصل میں نے تمہیں اس طریقے سے یہاں بلوایا ہے۔ وہاں جیل میں بات کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔''

''اچھا تم نے کھانے میں کچھ ڈلوا دیا تھا۔''

''یہی سمجھو بہرحال اب کام کی بات سنو۔ کونسل نے سزائے موت کی توثیق کر دی ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو گیا ہوگا۔ کونسل تمہیں مقابلہ کر کے جان بچانے کے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح کونسل کو راضی کر لیا کہ تمہیں ایک موقع ضرور دے۔ اب تمہیں ایرینا میں مقابلہ کر کے اپنے لیے زندگی حاصل کرنا ہوگی۔''

''میرا مقابلہ ایولی سے ہوگا۔'' مجھے وہ دیوزاد یاد آ گیا۔

''نہیں۔'' جان گرے مختصراً بولا۔ ''وہ ان دنوں زخمی ہے اور ممکن ہے اسے واپس بھیج دیا جائے۔ تمہارا مقابلہ الیکٹرک سے ہوگا۔''

میں ہنسا۔ ''یعنی بجلی۔ کیا مجھے کرنٹ دے کر مارا جائے گا۔''

وہ کرنٹ سے بھی زیادہ خطرناک شخص ہے۔ دیکھنے میں بے ضرر لیکن اسے چھوتے ہی ایسا کرنٹ لگتا ہے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔'' جان گرے متفکر انداز میں بولا۔ ''اس سے مقابلے کے لیے تمہارے پاس صرف چار دن ہیں۔''

''ان چار دنوں میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''قید میں آ کر تمہیں ہاتھ پیر چلانے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ بہتر ہے تم اپنی جسمانی حالت درست کرنے کے لیے ایکسرسائز کرو۔ ورنہ اس مقابلے میں تمہیں بہت پریشانی ہوگی۔''

''تم فکر مت کرو۔ میں اس الیکٹرک کا سرکٹ شارٹ کر دوں گا۔ اس کا فیوز اُڑا دوں گا۔''

جان گرے بدستور فکرمند تھا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ جلد تمہیں اس کے لڑنے کے انداز کی کوئی ویڈیو دکھا دوں۔''

''مہربانی کر کے میری خوراک بھی بدلوا دو۔ میں چاول اور مچھلی کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تو کیا تمہیں تمہاری پسند کے کھانے نہیں دیئے جا رہے۔ سزائے موت کے قیدیوں کو ان کا فرمائش کیا ہوا کھانا دیا جاتا ہے۔''

''فی الوقت تو کھانے میں بغیر فرمائش کے زہر دیا جا رہا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

جان گرے مسکرایا۔ ''وہ زہر نہیں تھا۔ ورنہ اب تک مر چکے ہوتے۔ صبح تک تمہیں لگے گا جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''ایک منٹ پہلے میرے ایک سوال کا جواب تو دے دو۔'' میں نے اسے روکا۔

وہ پہلے ہی میرا سوال بھانپ گیا تھا۔ ''عبید صلاح کا کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ جانے اسے آسمان کھا گیا ہے یا زمین نے نگل لیا ہے۔ دس روز میں گارڈز نے جزیرے کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ فرار ہونے کے لیے سمندر میں اُترا ہو گا اور شارکوں کا شکار ہو گیا۔''

میں نے اطمینان محسوس کیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل جان گرے کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ عبید صلاح جیسے لوگ بے بسی سے مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ یا تو اسے جزیرے میں ہی کوئی پناہ گاہ مل گئی تھی یا وہ کسی اور طریقے سے یہاں سے نکل جانے میں کامیاب رہا تھا۔ جان گرے کے جانے کے بعد میں نے سونے کا سوچا لیکن پھر آنے والے حالات کے پر غور کرنے لگا۔ جان گرے کے اصرار پر جزیرے کی کونسل نے مجھے مقابلہ کر کے زندگی بچانے کا ایک موقع دے دیا تھا اور ساتھ ہی کسی الیکٹرک کو مدِمقابل لا کھڑا کیا تھا۔ جان گرے اس کے بارے میں اتنا فکر مند تھا کہ اس نے خاص طور سے مجھے بتانے کے لیے حوالات سے نکالا اور رات کے اس پہر ہسپتال میں آ کر مجھے بتایا تھا بلکہ اس نے مجھے الیکٹرک کے لڑنے کا اندازہ دکھانے کی بات بھی کی تھی۔

جان گرے کی قید میں آنے کے بعد میں جسمانی طور پر واقعی کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ آؤٹ آف پریکٹس ہونے کی وجہ سے چستی باقی نہیں رہی تھی اور بقول جان گرے کے میرے پاس صرف چار دن تھے اور اس دوران میں مجھے خود کو مقابلے کے قابل بنانا تھا میں جس کوٹھری میں تھا وہاں کسی ورزش یا پریکٹس کی گنجائش کم ہی تھی۔ یہاں ہسپتال کے اس کمرے میں خاصی گنجائش تھی کیونکہ باہر جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ اس لیے گارڈز بے فکری سے باہر موجود تھے۔ میں نے اپنے بازو سے ڈرپ کی سوئی نکالی اور بستر سے نیچے اُتر آیا۔ خلافِ توقع مجھے جسم میں کمزوری کے بجائے توانائی محسوس ہوئی تھی۔ شاید ڈرپ میں مجھے طاقتور دوائیں دی گئی تھیں۔ میں نے آغاز اسکپنگ سے کیا اور پنجوں کے بل اُچھلنے لگا۔ مسلسل دو گھنٹے تک ورزش کر کے میرا جسم پسینے میں تر بتر ہو رہا تھا اور سانس تیزی سے چل رہا تھا میں بستر کی طرف بڑھا تھا کہ فائر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔



فائر نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ یوں رک گئے جیسے چابی سے چلنے والے کھلونے چابی ختم ہوتے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں کے بدلتے تاثرات دیکھ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ذرا





فاصلے پر عمر خان شاٹ گن لیے کھڑا تھا۔ فائر اس نے ہی کیا تھا۔ اس نے غرا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اسے مطلع کیا۔ ''یہ سب تم دونوں کے کیے کی سزا مجھے دینے جا رہے تھے۔ حالانکہ میں نے اس احسان فراموش کو بچایا تھا۔'' میں نے مقامی لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

عمر خان نے منہ بنایا۔ ''ان چھوٹے لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو تو یہ اسی طرح منہ کو آتے ہیں۔ اچھا تھا تم اسے ٹھنڈا ہونے دیتے۔'' پھر اس نے دھاڑ کر ان سے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔ یہ ہماری زمین ہے۔'' اس نے شاٹ گن کا رُخ ان کی طرف کیا تو وہ سب گرتے پڑتے بھاگے۔ ان کا انداز دیکھ کر عمر خان نے قہقہہ لگایا۔ ویسے اس کا نام اس کے حلیے سے میل نہیں کھاتا تھا اس حلیے میں اس کا نام کوئی ٹونی وغیرہ ہونا چاہیے تھا۔

''تمہارا شکریہ کہ تم نے ان لوگوں سے جان چھڑائی۔''

''نو پرابلم۔'' وہ مسکرایا اور مڑ کر واپس چلا گیا۔ پہلی ملاقات میں وہ مجھے ذرا کھلنڈرے قسم کا نوجوان لگا تھا لیکن اس وقت عمر خان کا انداز بالکل مختلف تھا۔ میں دوبارہ نیچے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے مقامی لڑکے کے مردود پن پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے حیران کر دینے والی حرکت کی تھی۔ حالانکہ اس نے دیکھا تھا کہ میں نے اسے بچایا ہے۔ ایک بزرگ نے سانپ کو سردی سے بچایا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور اسے دودھ پلایا۔ ٹھیک ہوتے ہی سانپ نے ان کے ہاتھ پر ڈسا اور چلا گیا۔ لوگوں نے بزرگ کو شرمندہ کیا کہ یہ کیا عقلمندی کی۔ بزرگ نے کہا اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ سانپ نے مجھے ڈسا یہ اس کے شکریہ ادا کرنے کا انداز ہے۔ ممکن ہے اس لڑکے نے بھی اس طرح میرا شکریہ ادا کیا ہو۔

میں گیٹ کے راستے اندر داخل ہوا تو گل محمد نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''چھوٹا صاحب آپ کدھر سے باہر گیا تھا؟''

''عقبی دروازے سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے گل محمد یہ بنگلہ غیر محفوظ ہے۔ کوئی بھی اس میں آسانی سے جا سکتا ہے۔''

''حسن صاحب نے مجھے سب سمجھا دیا ہے کل سے آدمی آ جائیں گے۔'' اس نے گویا مجھے اطمینان دلایا۔

اندر حسن علی اور ماہ پارہ لیونگ روم میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے اور ان کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں میری فکر ہے۔ میں نے دخل اندازی سے گریز کیا اور عقبی لان کی طرف آ گیا۔ بنگلے کا شمال مشرقی حصہ ایک کھائی کے ساتھ لگتا تھا۔ اس جگہ ریلنگ کے بجائے لکڑی کی باڑھ تھی۔ جس پر سفید رنگ کی پالش کی گئی تھی۔ کھائی زیادہ

گہری نہیں تھی اس کی گہرائی بہ مشکل چالیس پچاس فٹ ہوگی۔ سوفٹ چوڑی اور تقریباً چار سوفٹ لمبی اس کھائی کے کنارے کئی بنگلے تھے۔ باڑھ کے نیچے کھائی تقریباً سیدھی دیوار کی صورت میں تھی۔ اس دیوار پر چڑھنا بے حد دشوار ہوتا اگر اس پر جا بجا جھاڑیاں اور پودے نہ اُگے ہوتے۔ ان جھاڑیوں اور پودوں کو پکڑ کر کوئی بھی آسانی سے بنگلے میں داخل ہو سکتا تھا۔ باڑھ اسے نہیں روک سکتی تھی۔ باڑھ کی وجہ سے عقبی لان خوب صورت لگتا تھا۔ اس سے نیچے کھائی میں بھی رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے اور کھائی کی تہہ میں ایک چشمہ تھا جس کا پودوں کے درمیان سے جھلکتا پانی آئینے کی طرح لگتا تھا۔

باڑھ کے پاس ہی ایک کاؤچ رکھی تھی۔ جس پر چڑا منڈھا تھا۔ اس پر لیٹ کر میں دھوپ سینکنے لگا۔ تگڑے ناشتے کے بعد میرا کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ حسن علی نے بھی تین چار دن سے چھوٹ دے رکھی تھی۔ اونگھتے اونگھتے چونک کر دیکھا تو حسن علی کو خطرناک تیوروں کے ساتھ اپنے سر پر کھڑے پایا۔ ”کہاں تھے برخوردار دو گھنٹے سے؟“

”آپ کو کیا؟“ میں نے جل کر کہا۔ ”جب واپس آیا تو جناب اور جنابہ بے فکری سے گپیں مار رہے تھے۔“

حسن علی ہنسا۔ ”برخوردار اب تم بچے نہیں رہے جو ہم تمہاری فکر کریں۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہ ڈسپلن کے خلاف ہے تم نے نہ تو مجھ سے پوچھا اور نہ ہی اطلاع دی۔ حالانکہ خطرے ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔“

”استادِ محترم۔“ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مجھے کب تک آپ کے اشاروں پر ناچنا پڑے گا اور خطرات کب میرے اطراف نہیں منڈلاتے۔“

”جب تک جمشید علی چاہے گا۔“ حسن علی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آج ایکسر سائز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پورے ایک ہفتے کا وقفہ آ چکا ہے۔“

”جی استادِ محترم۔“ میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔ حسن علی نے وہیں مجھے ورزشیں کرائیں اور جب تین گھنٹے بعد میرا بھوک اور تھکن سے انتقال ہونے لگا تب اس نے میری جان چھوڑی تھی۔ میں سیدھا کچن میں پہنچا جہاں ایک شخص کام کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”ام کک اے۔“ اس نے سینہ تان کر کہا۔ اس مختصر سے شخص کی مونچھیں اس کے قد سے کچھ ہی چھوٹی تھیں سر کے بال اس نے تیل میں چپڑ کر جما کر بنائے تھے۔ تیل اس کی مونچھوں میں بھی چمک رہا تھا۔ ”امارا نام چھوٹا خان ہے۔“

”چھوٹا خان اس وقت تم میری جان بچا سکتے ہو۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

”ام آپ کا جان بچائے؟“ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ ”پر کیسے؟“





”کچھ کھلا کر۔ میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں۔“ میں نے کہا تھا کہ ماہ پارہ آ گئیں۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے جا کر نہاؤ۔ پھر کھانا۔“

”اس وقت تک بندہ انتقال کر جائے گا۔“ میں نے فریاد کی لیکن ماہ پارہ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ حسن علی اور ان کے رویئے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے مجھے ٹائٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بادلِ نخواستہ مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا۔ نیچے والا بیڈ روم حسن علی نے لے لیا تھا۔ میرے اور ماہ پارہ کے حصے میں اوپر کے دو بیڈ روم آئے تھے۔ میں نے عقبی سمت والے بیڈ روم کا انتخاب کیا جس کی بالکونی سے میں نے نیچے چھلانگ لگائی تھی۔ ماہ پارہ نے سامنے والا بیڈ روم منتخب کیا۔ گرم پانی سے نہا کر ان چوٹوں کو بھی آرام آ گیا تھا جو لاٹھی برداروں نے لگائی تھیں۔ میں نے حسن علی اور ماہ پارہ کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ جب نہا کر آیا تو ماہ پارہ ٹرے لیے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ٹرے میں چائنیز رول، سموسے تھے۔ بڑا ایک سینڈوچز بھی اور پیزا بھی۔ میں نے مشکل سے دس منٹ میں ساری ٹرے صاف کر دی تھی۔ ماہ پارہ چائے بناتے ہوئے ہنسیں۔

”میرے خدا...... یوسف تم کس قدر پیٹو ہو گئے ہو؟“

میں نے منہ بنایا۔ ”وہ جو آپ کے ہیں نا، حسن علی صاحب۔ وہ مجھ سے ایسی ورزشیں کراتے ہیں جو ہاتھی سے بھی کرائی جائیں تو ہرن بن جائے۔ خدا کا شکر ہے میں غائب نہیں ہوا۔ آپ لوگوں کو نظر تو آتا ہوں۔“

”وہ تمہاری بہتری کے لیے ایسا کرتا ہے۔“ ماہ پارہ نے چائے مجھے تھمائی۔

”اب دیکھیں فزیکل فٹنس کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ تھوڑا بہت دماغ کا فن بھی آنا چاہیے لیکن حسن علی، لگتا ہے مجھے بروسلی یا کمانڈو ٹائپ کی کوئی شے بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ میں ہرگز اس قسم کی کوئی شخصیت نہیں بننا چاہتا۔“

”یہ سب جمشید علی کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح ماہ پارہ نے جمشید علی کی آڑ لی اور یہاں آ کر میں بے بس ہو جاتا تھا۔ مگر اس روز میں نے بھنا کر کہہ دیا۔

”تو پاپا یہ سب جنید اور جاوید کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ مجھ پر نظرِ کرم کیوں۔“

ماہ پارہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی تھی۔ ”یہ تم اپنے پاپا سے پوچھنا۔“

ان کے تاثرات محسوس کر کے میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے مام۔“

انہوں نے سرد آہ بھری۔ ”میں نے تمہیں بتا دیا کہ ہم سب ہی کٹھ پتلیاں ہیں، ہماری ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہیں۔“

”مام یہاں تو آپ آزاد ہیں، چاہیں تو جا سکتی ہیں۔“ میں نے عمداً نہیں کہا کہ **کسی کے ساتھ جا** سکتی ہیں لیکن میرا مطلب جان کر ماہ پارہ کے چہرے پر سرخی سی آئی تھی۔

”میرے بچے میں بھی اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوں۔“

''اگر اشارہ میری طرف ہے تو آپ بالکل پروا نہ کریں۔ یقین کریں آپ کہیں اور جا کر اگر خوش اور مطمئن رہیں گی تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی ہے۔''

ماہ پارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ مجھے معلوم ہے، میری خوشی کی خاطر تُو کبھی میری راہ میں نہیں آئے گا۔ اس کے باوجود میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میرا اشارہ جمشید علی کی طرف ہے۔ اس جگہ بھی کوئی نہ کوئی ہماری نگرانی کے لیے سر پر ہو گا۔ تم جمشید علی کے لمبے ہاتھوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ایرانی حکومت کو بھی مطلوب ہے، اس کے باوجود پوری دلیری سے وہاں جا کر وہ مجھے وہاں سے نکال لایا تھا۔''

''آپ ضرورت سے زیادہ ہی مایوس ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو حسن علی کے ساتھ کہیں چلے جانا چاہیے۔ بے شک پاپا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں لیکن دنیا میں بے شمار ایسی جگہیں ہیں جہاں پاپا کے ہاتھ تو کیا ان کی سوچ بھی نہیں جا سکتی ہے۔''

ماہ پارہ چپ ہو گئیں جیسے اس بارے میں مجھ سے بحث نہ کرنا چاہ رہی ہوں۔ میں بھی خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چائے پی کر میں نے الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کیے۔ ماہ پارہ نے بتایا کہ چھوٹا خان، گل محمد کا کزن ہے، جلد ہی ایک مالی اور صفائی کرنے والی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ''یہ چھوٹا خان بنا تا سب مزے کا ہے۔'' میں نے چٹخارا لیا۔

''ہاں تو تم کیا سمجھتے ہو، بڑا چلتا پرزہ ہے۔ مری کے ہوٹلوں میں کام کرتا رہا ہے۔ ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔'' ماہ پارہ بولیں۔

نیچے لیونگ روم اور ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک کمرا تفریح کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں دیوار کے ساتھ بڑے سائز کا ٹی وی، اسٹیریو سسٹم، مختلف قسم کے پلیئر بمعہ کیسٹ اور سی ڈی استعمال کرتے تھے حالانکہ اس زمانے میں سی ڈی نئی نئی آئی تھی۔ ڈش بھی تھی لیکن اس زمانے میں سیٹلائٹ پر گنے چنے چینلز ہی آتے تھے۔ ریک میں ویڈیو اور آڈیو کے ساتھ سی ڈیز کا خانہ الگ تھا۔ ٹی وی کے ساتھ منسلک کر کے کھیلے جانے والے ویڈیو گیمز تھے۔ بنگلے کے تہہ خانے میں خاصا بڑا جمنازیم اور اس کے ساتھ چھوٹا سا سوئمنگ پول تھا۔ تہہ خانہ تقریباً پورے بنگلے کے برابر تھا گویا یہاں پر ضرورت اور آسائش کی ہر شے تھی۔

اگلے روز میں ڈرائیور، چھوٹا خان اور ماہ پارہ کے ہمراہ سکول گیا۔ جی ہاں ہرفن مولا چھوٹا خان ڈرائیور بھی تھا۔ سکول وسیع رقبے پر پھیلا جدید طرزِ تعلیم اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھا اور کیوں نہ ہوتا، یہاں پر ملک کے گنے چنے افراد کے بچے پڑھتے تھے، جن کی ماہانہ فیس ایک متوسط طبقے کے خاندان کی ماہانہ آمدنی سے بھی زیادہ تھی۔ سالانہ فیس اس کے علاوہ تھی۔ کسی بھی نئے داخلے پر سکول کو بھاری رقم ایڈمیشن فیس بھی دینا پڑتی تھی۔ کیونکہ میرا داخلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس معیار کے سکول میں کاپیوں، کتابوں کا جھنجھٹ والدین کی ذمے داری نہیں ہوتا۔ جوتے سے لے کر یونیفارم سب





سکول مہیا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کام کی وہ کئی گنا رقم وصول کر لیتا ہے۔

پہلا دن میرا تعارف اور یونیفارم کا ناپ وغیرہ دینے میں گزرا۔ سکول صبح آٹھ سے دوپہر تین بجے تک تھا۔ اکثر بچے بلکہ لڑکے لڑکیاں سکول کمپاؤنڈ میں ہی ہوسٹل کی عمارتوں میں رہتے تھے لیکن کچھ امراء کے بچوں کے لیے الگ سے رہائش کا انتظام تھا۔ میرا ایک رسمی سا ٹیسٹ ہوا تھا حالانکہ داخلہ مجھے پہلے ہی مل چکا تھا۔ سکول اصل میں ہائی سکول تھا یعنی یہاں پر انٹرمیڈیٹ کے سارے درجے تک تھے۔ اس حساب سے مجھے مزید تین سال یہاں پڑھنا اور تعلیم حاصل کرنا تھی۔ اتنا عرصہ مجھے کاجل سے دور رہنا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ پاپا مجھے سرما کی چھٹیوں میں بھی واپس نہیں آنے دیں گے۔ وہ کاجل اور میری خطا بھولے نہیں ہوں گے۔ سزا دینا ان کا مسئلہ تھا، اس کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے تھے۔

ایک ہفتے میں بنگلے میں خاصی تبدیلیاں آئی تھیں۔ چاروں طرف دیواریں اونچی کر کے ان پر خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی تھی۔ سارے دروازوں کے تالے بدلے گئے تھے اور جن کھڑکیوں پر گرل نہیں تھی، ان پر گرل لگائی گئی تھیں۔ گل محمد اب کل وقتی محافظ تھا۔ ایک مالی روز آتا تھا، اسی طرح ایک صفائی کرنے اور کپڑے دھونے والی عورت تھی۔ چھوٹا خان صبح آتا تھا اور شام کو سات بجے ڈنر مکمل کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ایبٹ آباد سے جا کر سامان لاتا تھا۔ اس دوران میں حسن علی نے اپنی پسند سے ایک ہنڈا اکارڈ لی تھی۔ جیپ عام کاموں کے لیے اور اور کار صبح مجھے سکول چھوڑنے اور لانے کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں کہیں جانا ہوتا تھا تو یہی کار استعمال کی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں اس سکول میں سیٹ ہونے لگا۔ میرا صبح سے سہ پہر تک کا وقت سکول میں گزرتا تھا۔ معیارِ تعلیم اتنا اچھا تھا کہ سکول سے آ کر مجھے کچھ پڑھنے کی خاص ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ ایک گھنٹہ آرام اور کھانے کے لیے ملتا تھا اور رات ساڑھے دس بجے سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں چلا جاتا تھا۔ صرف ویک اینڈ پر رات بارہ بجے تک جاگنے کی اجازت تھی۔ ظاہر ہے اس سارے معمول میں میرے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا جسے اپنی مرضی سے گزار سکوں۔ اتوار والے دن حسن علی مجھے ہائکنگ کے لیے لے کر جاتا تھا اور یہ اتنا مشکل کام تھا کہ سارے ہفتے کی ایکسرسائز ایک طرف اور اتوار کی ہائکنگ ایک طرف۔

ہمارے آنے کے ایک ہفتے کے اندر فون بھی لگ گیا تھا اور ظاہر ہے اس پر جو پہلی کال آئی وہ کاجل کی ہی تھی۔ دس منٹ تک تو وہ روتی ہی رہی تھی۔ بہ مشکل میں نے اسے چپ کرایا۔ ''پاگل، یہ بہت مہنگی کال ہے۔ اسے رونے دھونے میں ضائع نہ کرو۔ نہ جانے کب تمہاری اماں آ جائیں اور کال ڈس کنیکٹ کرنی پڑے۔''

''مما...... اب مجھے منع نہیں کریں گی۔'' اس نے روتے روتے چپ ہو کر مجھے مطلع کیا۔

"کیوں..... کیا تم نے انہیں پھر کوئی دھمکی دی ہے؟"

"ہاں میں نے مما سے کہا آپ مجھے یوسف سے بات نہیں کرنے دیں گی تو میں آپ سے بھی بات نہیں کروں گی۔"

"پھر کتنے دن بات نہیں کی اپنی مما سے؟" میں نے پوچھا۔

"پورے دس دن۔" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "پھر مما نے مجھے اجازت دے دی۔"

"تم نے بھی نہیں سدھرنا ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"یوسف..... تم کب آؤ گے؟" اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ "میں نے پاپا سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ تم سردیوں میں آؤ گے۔"

"خدا کرے ویسے مجھے پاپا کا ارادہ بلانے کا نہیں لگ رہا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "ورنہ وہ مجھے یہاں بھیجتے ہی کیوں۔ معیارِ تعلیم کراچی کے سکولوں کا بھی اعلیٰ ہی ہے۔"

"میں نے پاپا سے منوالیا ہے تم کراچی ضرور آؤ گے۔" اس نے یقین سے کہا تھا، پھر بولی۔

"تم نے اس لڑکی ماریہ سے تو بات نہیں کی نا؟"

"اسے میرے فون کا نمبر علم ہوگا تو بات کرے گی اور مجھے اس کے نمبر کا علم بھی نہیں ہے۔"

"میں اسے ضرور قتل کر دوں گی۔" کاجل نے یقین سے کہا۔

"کچھ ایسے ہی محبت آمیز جذبات اس کے بھی ہوں گے۔" میں ہنسا۔ "لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا ہم اسے بھول جائیں اور اپنی بات کریں۔ میری اور تمہاری۔"

"یوسف! پاپا کہہ رہے تھے جب تم ایبٹ آباد سے واپس آؤ گے تو تمہیں انجینئرنگ پڑھنے کے لیے لندن بھیجیں گے۔ یوسف میں بھی لندن جاؤں گی۔"

"اگر تمہارے پاپا نے جانے کی اجازت دی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

کاجل نے پورا ایک گھنٹہ مجھ سے بات کی۔ اگر وہ ایک دولت مند باپ کی اولاد نہ ہوتی تو اس کے لیے مجھ سے اتنی لمبی بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب فون کے نرخ بڑھا کرتے تھے ان میں کمی کا رجحان نہیں تھا۔ اس ایک گھنٹے کی گفتگو کے غالباً دو ڈھائی ہزار کا بل بن گیا ہوگا جو اس وقت ایک عام شخص کی ماہانہ آمدنی کے برابر تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ ماریہ کو میرا نمبر نہیں پتہ ہوگا۔ اسی شام جب میں ایکسرسائز کر کے نہانے کے لیے اوپر آیا تو ماہ پارہ نے شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اسی دیوانی کا فون آیا تھا۔"

میں چونکا۔ "کاجل کا..... ابھی سہ پہر کے وقت تو اس سے بات ہوئی ہے۔"

"میں کاجل نہیں..... ماریہ کی بات کر رہی ہوں۔ ابھی پانچ بجے اس کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہاری مصروفیت کا بتایا تو اس نے دس بجے رات فون کرنے کا کہا ہے۔"



"مارے گئے۔ اسے یہاں کا نمبر کیسے مل گیا؟"

ماہ پارہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "یوسف! ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی تلاش کر لیتے ہیں، یہ تو محض ایک فون نمبر ہے۔"

"یہ ساری آفتیں فون لگتے ہی نازل ہونا تھیں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا اور اوپر کی طرف بڑھ گیا۔

"ناشکرے ہو..... محبت مل رہی ہے تو ٹھکرا رہے ہو۔" عقب سے ماہ پارہ نے کہا۔

"ایسی محبتوں سے باز آیا۔" میں نے رُکے بغیر کہا۔

کھانا کھا کر میں اوپر آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک فون نیچے حسن علی کے بیڈروم میں تھا۔ دوسرا اوپر گیلری میں۔ کیونکہ حسن علی اور ماہ پارہ تفریح والے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے، اس لیے میں نے فون ریسیو کرلیا۔ دوسری طرف ماریہ تھی۔

"کیسے ہو یوسف؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ایک دم فٹ فاٹ..... بائی دی وے آپ کون ہیں۔ میں پہچان نہیں سکا۔"

اس نے سرد آہ بھری۔ "گویا تم نے جاتے ہی مجھے بھلا دیا۔"

اس بار میں نے پہچان لیا۔ "ماریہ تم....."

"شکر ہے دوسری کوشش میں پہچان گئے۔ یہ بتاؤ کہ میری یاد نہیں آئی۔"

"آئی تھی۔" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

"پھر مجھے کال کیوں نہیں کی۔" اس نے محبوبانہ ناراضگی سے کہا۔

"فون ہی آج لگا ہے۔" میں نے بہانہ کیا۔

"اور دیکھو..... میں نے آج ہی نمبر بھی حاصل کرلیا۔" وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

مجھے ماہ پارہ کی بات یاد آ گئی۔ وہی دہرا دی۔ "تلاش کرنے والے تو خدا کو ڈھونڈ لیتے ہیں، یہ تو فون نمبر ہے۔"

"یوسف میں نے تمہیں دن رات ایک ایک پل یاد کیا ہے۔" اس نے اپنی بے تابی کا اظہار کیا۔ "مجھے تمہارے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔"

"کیوں..... مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے۔" میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں..... لیکن یوسف تم نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ میں تم سے ملنے آ رہی ہوں۔"

میں بوکھلا گیا۔ "ابھی..... اس وقت۔"

وہ ہنسی۔ "اتنی پاگل نہیں ہوں کہ رات کے اس وقت چل پڑوں۔ کل صبح نکلوں گی، شام تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تمہارے ساتھ رہوں گی..... صبح واپس۔"

"میرے ساتھ۔" میں مزید بوکھلا گیا، پھر تھوک نگل کر بولا۔ "ایسا ممکن نہیں ہے ماہ پارہ بہت

ماریں گی۔''

وہ ہنسی۔ ''بابا تمہارے ساتھ سے مطلب ہے کہ تمہارے گھر میں رہوں گی...... سچ مچ تمہارے بیڈروم میں تھوڑی سوؤں گی۔'' وہ کہتے کہتے شوخ ہوگئی۔ ''ویسے تم چاہو تو یہ بھی ممکن ہے۔''

''ماریہ میرا خیال ہے یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے۔'' میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ''تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے۔''

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ان کی فکر مت کرو، ویسے بھی میں یہی بتا کر آؤں گی کہ میرے ساتھ دو فرینڈز بھی ہوں گی۔''

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ''دیکھو ماریہ...... یہ آسان نہیں ہے۔ شاید...... ماہ پارہ اسے پسند نہ کریں۔''

''میں ان سے بات کر چکی ہوں۔ میرے آنے کا سن کر انہوں نے خوشی سے ویلکم کہا تھا۔''

یعنی وہ ماہ پارہ سے بات کر چکی تھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ ''میں صبح سے شام تک ایک ایک لمحہ مصروف رہتا ہوں۔ سکول سے تین بجے تک آتا ہوں، پھر...... آٹھ بجے تک حسن علی کے قبضے میں ہوتا ہوں، رات دس بجے تک مجھے سو جانے کا حکم ہے۔''

''نو پرابلم...... میں کوشش کروں گی کہ کل ذرا دیر سے آؤں۔ پرسوں اتوار ہے۔ سارا دن تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''اتوار کو حسن علی مجھے ہائکنگ پر لے جائیں گے۔'' میں نے آخری بہانہ کیا۔

اس نے نہایت سکون سے اس حربے کو بھی ناکام بنا دیا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے۔ مجھے بھی ہائکنگ کا شوق ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔''

''اچھا بابا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''آ جاؤ...... لیکن خدا کے لیے...... ماہ پارہ کے سامنے فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔ وہ میرے لیے ماں جیسی ہیں۔''

یوسف مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ماہ پارہ صرف ایک گورنس ہیں لیکن تم ان سے کتنی محبت کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے وہ تم سے جان بھی مانگیں تو تم دے دو گے۔''

''بلاشبہ...... انہوں نے محض گورنس بن کر نہیں پالا بلکہ مجھے سچ مچ ماں کی محبت بھی دی ہے اور وہ باقاعدہ گورنس نہیں ہیں۔ جمشید علی کی درخواست پر انہوں نے یہ ذمے داری سنبھالی تھی۔''

ماریہ نے فوراً معذرت کر لی۔ ''سوری، میرا مقصد ماہ پارہ کی انسلٹ نہیں تھا۔ میں تو خود انہیں پسند کرتی ہوں۔ ویسے ایک بات ہے، یہ جو حسن علی ہیں، یہ ماہ پارہ کو پسند کرتے ہیں۔''

''شاید۔'' میں نے اسے ٹالا۔ ''یہ بتاؤ کہ کل کس وقت تک آ رہی ہو۔ ہو سکتا ہے تمہاری وجہ سے مجھے کل ایکسرسائز سے بھی نجات مل جائے۔''

''اتنا تنگ ہو۔'' وہ ہنسی۔ ''سچ مجھے تو اس قسم کی ایکسرسائز میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میں بھی حسن





علی سے مارشل آرٹس سیکھوں گی۔''

''ہرگز نہیں۔ تم نے جتنا سیکھا ہے اتنا کافی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ڈر گئے۔'' وہ ہنسی۔ ''میں صرف دو دن کے لیے آؤں گی۔ ویسے کبھی نہ کبھی حسن علی سے سیکھوں گی ضرور...... اس روز تم نے جتنی ذہانت اور سکون سے ان ڈاکوؤں پر قابو پایا، میرا خیال ہے اس ملک کا کوئی پندرہ سالہ لڑکا ایسا نہیں کر سکتا ہے۔'' وہ رکی اور پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ''تم واقعی اتنے کم عمر ہو یا مجھ سے بچنے کے لیے بن گئے تھے۔''

''تم ماہ پارہ سے پھر پوچھ لینا۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اور بچا کون کمبخت ہے۔''

''درست کہا...... تو کل میں آ رہی ہوں...... تیار رہنا۔''

''خدا کرے کل راستوں پر لینڈ سلائیڈنگ ہو جائے۔'' میں نے دل میں دعا کی اور منہ سے مرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگی؟''

''تم اچھی لگیں۔'' میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

''کہاں سے...... آئی مین...... کہاں کہاں سے۔'' اس کے لہجے میں سوال بول رہا تھا۔

''یہ تم کس قسم کے سوال کر رہی ہو۔ ہوش میں ہو؟''

''سوری، اگر تمہیں برا لگا۔'' اس نے فوراً معذرت پیش کر دی۔

میں نے دل میں پریشان ہو کر سوچا۔ ''یہ بلا تو گلے ہی پڑ گئی ہے۔ کاجل کو پتا چلا تو میری زندگی عذاب میں آ جائے گی۔ میں جمشید پیلس میں ہی بھلا تھا، باہر آتے ہی دشمنوں کے ساتھ ماریہ جیسے دوست بھی ٹوٹ پڑے تھے۔ ماریہ سے بہ مشکل جان چھڑا کر نیچے آیا۔ ماہ پارہ کو ماریہ کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ بولیں۔

''میں نے بھی اسے دعوت دی تھی، اکیلے بور ہو جاتی ہوں، وہ آ جائے گی تو میں بھی دو دن انجوائے کر سکوں گی۔''

میں جھنجھلا گیا۔ ''وہ آپ کو انجوائے کرانے نہیں...... میرا ناک میں دم کرنے آ رہی ہے۔ آپ کو کاجل کا پتا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا تو میری جان پر بن جائے گی۔''

حسن علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''میں بھی کس بزدل شخص کو تربیت دے رہا ہوں۔ یہ ایک بچی سے ڈرتا ہے۔''

''وہ آفت کا پرکالہ بچی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور عورت اگر بچی بھی ہو تو اسے کم نہیں سمجھنا چاہیے اور جہاں تک بہادری کا تعلق ہے، میں نے بڑے بڑے دلیروں کو عورت کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا ہے۔''

حسن علی جھینپ گیا۔ ''بہت بولنے لگے ہو برخوردار...... ویسے کاجل کو کیسے پتا چلے گا، پھر

ماریہ اچھی لڑکی ہے۔ اس نے جس طرح تمہارے ساتھ مل کر ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا، اس نے مجھے متاثر کیا۔"

"آپ ایسا کریں اسے شاگرد بنالیں۔ ویسے بھی وہ آپ سے سیکھنے کے لیے بے چین ہے۔"

"میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا اگر آپ نے اسے تربیت دینے کے لیے یہاں بلایا۔ پھر آپ جمشید علی کو جواب دیتے رہیے گا۔" میں نے دھمکی دی۔

"بے وقوف یہ صرف ستا رہا ہے تمہیں...... اور کیسے مرد ہو ایک لڑکی کو قابو نہیں کر سکتے۔ لڑکے تو درجن بھر لڑکیوں کو بیک وقت بیوقوف بناتے ہیں۔"

"فی الوقت تو ایک نے مجھے بنا رکھا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ اگر کاجل کو پتا چل بھی گیا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ ماریہ کو میں نے بلایا تھا۔"

"اگر اس نے یقین کیا تو۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ دونوں بھی سو جائیں۔"

ماہ پارہ جھینپ گئی تھیں۔ اگلے روز مجھے وقت پر اُٹھایا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ اکثر رات ایک دو بجے سویا کرتی تھیں، ان کو مطالعے کی عادت تھی۔ اس کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ اس پر بھی صبح فجر کے وقت بے دار ہو جاتی تھیں۔ پیلس میں وہ نماز پڑھ کر اپنے لیے ایک کپ کافی بنوا کر لان پر چلی جاتی تھیں، وہاں اس وقت تک چہل قدمی کیا کرتی تھیں جب تک مجھے اُٹھانے کا وقت نہیں آ جاتا۔ پھر آ کر مجھے اُٹھاتیں اور تیار کرا کے سکول کے لیے روانہ کرتی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر ان کی طرف دیکھا۔

"مام کیا یہاں بھی چہل قدمی کرتی ہیں؟"

انہوں نے جھرجھری لی۔ "باہر غضب کی سردی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہوا میں ایسی تازگی اور مہک ہے، لگتا ہے جیسے یہ دنیا ابھی ابھی وجود میں آئی ہے۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "یوسف! تم بھی صبح کے وقت باہر نکلا کرو۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھیے۔" میں نے باتھ روم کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"استادِ محترم میرے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس کے بعد مجھ میں صبح سویرے اُٹھنے کی قطعی ہمت باقی نہیں رہتی ہے۔ میں سکول جانے کے خیال سے اُٹھ جاتا ہوں۔"

"کاہل کہیں کے۔" ماہ پارہ ہنسیں۔ "جلدی تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ چھوٹا خان نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔"

چھوٹا خان نے میرے پسندیدہ پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بنایا تھا۔ ساتھ ہی نمکین مکھن تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اسی دوران میں حسن علی بھی تیار ہو کر آ گیا تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر ناشتے کا





عادی تھا۔ وہ صرف صبح اور شام کا کھانا لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں میں چار بار ضرور کھاتا تھا۔ بھوک میری کمزوری تھی۔ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حسن علی میرے ساتھ ہی سکول تک جاتا تھا۔ راستے میں میری حفاظت کے لیے وہ پوری طرح مسلح ہو کر جاتا تھا۔ اس کے بغلی ہولسٹر میں دو عدد پسٹل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ برابر والی نشست تلے شارٹ گن بمعہ فاضل کارتوسوں کے موجود رہا کرتی تھی۔ ایک منٹ میں وہ حرکت میں آ کر حملہ کرنے والوں پر آگ و آہن کی بارش کر سکتا تھا۔

"برخوردار میں دیکھ رہا ہوں آج کل تم لڑکیوں پر زیادہ ہی توجہ دے رہے ہو۔" راستے میں حسن علی نے عقبی آئینے میں مجھے دیکھا۔

"میں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "میرا تو خیال ہے لڑکیاں میری طرف زیادہ ہی توجہ دے رہی ہیں۔"

حسن علی مسکرایا۔ "یار...... یہ کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے نیازی ہی سب سے بڑی توجہ ہوتی ہے۔ اگر تمہاری توجہ کاجل اور ماریہ کی طرف نہ ہوتی تو تم ان کی پروا ہی نہ کرتے۔ اپنے حال میں مگن رہتے۔ اب تم ان کے بارے میں فکر مند رہتے ہو، ان کے بارے میں سوچتے، ہو گویا تم ان کی طرف متوجہ ہو۔"

میں نے غور کیا۔ حسن علی نے درست کہا تھا۔ واقعی مجھے اس طرف توجہ نہیں دینی چاہیے تھی کہ ماریہ آ رہی ہے یا وہ مجھ سے کچھ توقعات رکھ رہی ہے۔ کاجل سے میرا دلی تعلق تھا لیکن اس کے لیے بھی اتنی فکر بے جا تھی۔ اگر وہ میرے بارے میں حساس تھی تو مجھے اس فکر میں مر نہیں جانا چاہیے کہ اسے میری کوئی بات بُری لگ جاتی ہے اور وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں اس قسم کی جذباتی باتیں اور حرکتیں کرتی رہتی ہیں۔ مجھے اپنے مقصد پر نظر رکھنا چاہیے۔ مجھے ابھی تعلیم حاصل کرنی تھی، کسی مقام تک پہنچنا تھا۔ مجھے اپنے ماضی کو تلاش کرنا تھا۔ معلوم کرنا تھا کہ میں کون تھا میری جڑیں کہاں تھیں، میرے آباؤ اجداد، ماں باپ کہاں سے تعلق رکھتے تھے۔ میں جمشید علی کے پاس کیوں کر آیا اور وہ کس مقصد کے تحت اتنے شاہانہ انداز میں میری پرورش کر رہے تھے۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھ سے محبت کرنے کے باوجود وہ اللہ واسطے میری پرورش نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کے پس پشت ان کا کوئی گہرا مفاد تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے جانشین بنانے کی بات کی تھی۔

"بندہ اس معاملے میں ناتجربے کار ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "آپ ہی کچھ رہنمائی فرمائیں۔"

"میں بھی اس عمر سے گزرا ہوں۔ ماہ پارہ سے واقفیت اس زمانے سے ہی ہے۔"

میں ہنسا۔ "مدت سے ہے یہ آتش بھڑکی ہوئی۔"

حسن علی جھینپ گیا۔ "ایسا ہی سمجھ لو۔ اس وقت اگر میرے والد محسن علی میری مدد نہ کرتے تو شاید میں اپنا کیریئر تباہ کر لیتا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ان باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔

ابھی مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ تب میں نے سنجیدگی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایم ایس سی کرنے کے لیے میں ترکی گیا ہوا تھا لیکن وہاں حالات ایسے پیش آئے کہ مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دشمنوں سے بچنے کے لیے رُوپوش ہونا پڑا۔ کئی سال دربدری میں بسر ہوئے۔ ایران بھی واپس نہیں جا سکتا تھا کہ یہ طاقتور دشمن میرے ہم وطن ہی تھے، پھر انقلاب آ گیا۔ دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میرے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ میں بچ نکلا۔ انتقام کی آرزو میں سرگرداں رہا اور پھر میں نے ہار مان لی۔ میں انتقام لیتا بھی تو کس سے لیتا۔ اس لیے میں نے پیرس جا کر اپنی بقیہ تعلیم مکمل کی۔'' حسن علی مجھے نصیحت کرتے کرتے بہت دور نکل گیا تھا۔

''اور یہ مارشل آرٹ کی تربیت؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ تو زمانے نے سکھا دیا۔ جب دشمنوں سے بچتا پھر رہا تھا اس دوران میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ باقی کسر میں نے استادوں سے سیکھ کر پوری کر لی۔ کچھ عرصے میں افغانستان میں بھی رہا۔ مجاہدین کے ساتھ مل کر روسیوں سے لڑتا رہا لیکن جب روسی چلے گئے اور مجاہدوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو میں بددل ہو کر وہاں سے نکل آیا۔ ہانگ کانگ کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی۔ وہاں پر فنونِ حرب بھی سیکھے۔ پھر دل اُچاٹ ہو گیا تو ایک بیگ اُٹھا کر جہاں گردی کرنے نکل کھڑا ہوا پھر جمشید علی سے ملاقات ہو گئی۔ اسے تمہارے لیے ایک محافظ اور استاد کی ضرورت تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ماہ پارہ بدستور جمشید علی کے پاس ہے۔''

''آپ پاپا سے پہلے بھی واقف تھے؟''

''اس وقت سے جب وہ بابا جان سے ملنے آتے تھے۔'' حسن علی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ جمشید علی کی بابا جان اور ماہ پارہ کے والد ڈاکٹر عظمت سے یکساں دوستی تھی۔ ان دنوں جمشید علی تہران میں ہی تھے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ جمشید علی ٹرکی میری لائن چلا رہے ہیں۔ ان کے دیگر کاروباروں کے بارے میں ان کے نزدیک ترین دوستوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔''

''دیگر کاروبار...... کیا مطلب؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''جمشید علی کے شاہی خاندان سے بھی گہرے تعلقات تھے۔ کئی ایک شہزادوں سے اس کی اتنی گہری دوستی تھی کہ وہ ان کی شبینہ محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے انہیں بھی انقلاب کی وجہ سے ملک سے بھاگنا پڑا تھا۔ بلکہ جمشید علی بھاگے کہاں تھے، وہ تو پورے اطمینان سے اپنے سارے اثاثے بیچ کر ایران سے اس طرح نکل گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بابا جان اور ڈاکٹر عظمت بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ جمشید علی بیوی کے ساتھ تفریح کرنے نکلے ہیں۔ پھر حالات تیزی سے بگڑے، جمشید علی کے ذرائع نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ انقلاب آنے والا ہے۔ جو نہیں جان سکے وہ میرے اور ماہ پارہ کے گھر والوں کی طرح مارے گئے۔'' حسن علی کے لہجے میں زہر آ گیا تھا۔





''لیکن پاپا نے ماہ پارہ کو تو بچا لیا تھا۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ہاں...... لیکن وہ پہلے سے خبردار کر دیتے تو دونوں خاندان بچ جاتے۔''

''یہ بھی ممکن ہے پاپا نے ایسا چاہا ہو لیکن انہیں موقع نہ مل سکا ہو۔''

''ہاں ایسا بھی ممکن ہے۔'' حسن علی نے آہستہ سے کہا اور پھر چپ ہو گیا تھا۔

حسن علی مجھے سکول سے واپس لے کر آیا تو بنگلے کے پورچ میں ایک عدد نسان سنی کار کھڑی تھی۔ اندر سے ماہ پارہ کے ساتھ کچھ لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا تھا آفت عرف ماریہ آ گئی تھی۔ میں نے جل تُو جلال تُو پڑھی اور دل کڑا کر کے اندر آیا۔ نظر پڑتے ہی ماریہ میری طرف لپکی اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اس کے تیور بتا رہے تھے وہاں اگر لوگ نہ ہوتے تو وہ زیادہ ہی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی جینز پر باریک کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ نیچے مردانہ بنیان ٹائپ کی کوئی شے تھی جس سے باہر اس کے جسم کی گلابی جلد اس باریک قمیص سے یوں جھلک رہی تھی جیسے ارغوانی کے جام سے جھلکتی ہے۔

''کیسی ہو؟'' میں نے اس سے نظریں چرا کر پوچھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف مجھے سنائی دے۔

''اچھی لگ رہی ہو۔ اب میرا ہاتھ چھوڑ دو تا کہ باقی لوگوں سے بھی ملوں۔''

اس نے شرما کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''آؤ میں اپنی فرینڈز سے ملواتی ہوں۔ یہ پونی ٹیل والی ٹینا ہے۔'' اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کا منہ مسلسل چل رہا تھا اور اس کا فربہ ہو جانے والا جسم کپڑوں کی تہ سے آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ کپڑے غالباً اس زمانے کے سائز کے تھے جب وہ موجودہ جسامت سے آدھی ہوا کرتی تھی۔ دوسری صاحبہ سمارینا ثابت ہوئیں جن کے لباس میں ویسے تو کوئی خامی نہیں تھی لیکن اس کا ڈیزائن غالباً افریقی جنگلیوں اور جدید ترین امریکی فیشن کو مکس کر کے تیار کیا گیا تھا۔ ان کا حلیہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ کس قماش کی تھیں اور ماہ پارہ ان سے مل کر یوں خوش تھیں جیسے ان کی ہم مزاج اور ہم ذوق سہیلیاں زمانے کے بعد ملنے آئی ہوں۔

''آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کریں میں ذرا فریش ہو آؤں۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''میں بھی چلوں گی۔ تمہارے کمرے کے لیے ایک چیز لائی ہوں۔'' ماریہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک پیک چیز اُٹھائی جو بظاہر کوئی فریم شدہ تصویر لگ رہی تھی۔

''لاؤ مجھے دے دو۔'' میں نے ہاتھ بڑھایا۔

''میں خود اسے تمہارے کمرے میں لگاؤں گی۔'' ماریہ نے ثابت قدمی سے کہا تو میں سر ہلاتا اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ میرے پیچھے تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت میرا خیال تھا کہ مجھے اس کی پیش قدمی کے لیے تیار رہنا چاہیے لیکن اندر آ کر ماریہ نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔

"واہ...... یوسف کمرا تو بہت شاندار ہے۔ فرنیچر کتنے یونیک ڈیزائن کا ہے۔ کیا خیال ہے اس سینری کو میں اس دیوار پر لگادوں۔" اس نے بستر کے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

میں ذرا خفیف ہوگیا تھا۔ "جہاں مرضی آئے لگادو لیکن پہلے دکھاؤ تو چیز کیا ہے؟"

اس نے تصویر پر لگا کاغذ پھاڑا۔ یہ کسی مصور کی بنائی ہوئی تخیلاتی تصویر تھی۔ ایک حسین پجارن آنکھیں بند کیے دیوتا کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے باریک سا لباس پہن رکھا ہے جس میں اس کے تراشیدہ بدن کے سارے عنصر نمایاں ہورہے تھے۔

"کیسی ہے تصویر؟" ماریہ نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں سمجھ رہا تھا یہ تصویر اس کے جذبات کا اظہار تھا۔

"اچھی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن کیا یہ میری عمر کے لحاظ سے بڑی نہیں ہے۔"

وہ تصویر رکھ کر میرے پاس چلی آئی۔ "جذبات عمر کے لحاظ سے تو نہیں ہوتے۔" اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ "میں تم سے پانچ سال بڑی ہوں۔ تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے جذبات کو سمجھتے ہو لیکن خود تم ایک بارہ سال کی لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ اس محبت کو سمجھتی ہے۔ ہر اس لڑکی سے حسد کرتی ہے جو تمہارے نزدیک آتی ہے، پھر محبت میں عمر کہاں سے آگئی؟"

"میں بات اپنی عمر کی کررہا تھا۔" میں بھنا کر کہا۔ "اس میں محبت کہاں سے آگئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ تصویر کسی بڑی عمر کے شخص کے کمرے میں اچھی لگے گی۔"

"کیوں یہ لڑکی تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہے۔" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

میں نے دل میں کہا۔ "اچھا بی بی تم بھی کیا یاد کرو گی......" اور پھر تصویر کے پاس جا کر بہ غور پجارن کا معائنہ کیا اور خاصی دیر تک کرتا رہا حتیٰ کہ ماریہ بے چین ہوکر خود بھی میرے پاس چلی آئی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ لڑکی واقعی غیر معمولی حُسن رکھتی ہے۔ اس کے خدوخال، نقوش، سراپا...... ایک ایک چیز دیکھنے کے لائق ہے۔" اس کے بعد میں نے لڑکی کے جسمانی محاسن پر سر کے بالوں سے لے کر اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ماریہ کا مارے شرم وغصے کے بُرا حال ہوگیا۔ اس نے کھسیا کر کہا۔

"یہ کیا بک بک کررہے ہو۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔"

"تو اور کیا مطلب تھا تمہارا...... بہرحال تمہارا شکریہ...... تم نے واقعی اچھا تحفہ دیا ہے۔ اسے میں اپنے کمرے میں ضرور لگاؤں گا۔" میں نے باتھ روم میں جاتے ہوئے کہا۔ ماہ پارہ میرے آنے سے پہلے میرے کپڑے واش روم میں رکھ دیتی تھیں اور جب میں کپڑے بدل کر آتا تو نیچے کھانا تیار ہوتا تھا۔ زیادہ تر یہ کھانا اُبلی ہوئی سبزیوں یا پھلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ حسن علی نے میرے کھانے پینے کا شیڈول بھی بنایا تھا اس میں ناشتہ مجھے اپنی مرضی سے کرنے کی اجازت دی۔ دوپہر کا کھانا میں





یہاں کرہی چکا ہوں۔ رات کے کھانے کے علاوہ میرے لیے خاص طور سے خمیری روٹی بنتی تھی۔ گوشت بھی خاص انداز میں بھونا جاتا تھا اس میں کوئی گھی یا تیل نہیں ڈالا جاتا تھا۔ یہ گوشت بے شک ہلکے سے نمک کے ساتھ خاصا بے مزہ ہوتا تھا لیکن چار گھنٹے کی ایکسر سائز اور ویٹ لیفٹنگ کے بعد میرا بھوک سے ایسا بُرا حال ہوتا تھا کہ میں اُبلا ہوا چمڑا کھانے کے لیے بھی تیار ہوجاتا تھا۔

میں کپڑے چینج کررہا تھا کہ کمرے سے چھنا کے کی آواز آئی اور میں مسکرا کر گانے لگا۔

"میرے تن کو لگی...... میرے من کو لگی۔"

"یوسف......" ماریہ کی خفیف سی آواز آئی۔ "سوری مجھ سے فریم ٹوٹ گیا۔"

میں باہر نکلا تو تصویر اس دیوار تلے پڑی تھی جس پر ماریہ نے اسے ٹانگنے کو کہا تھا۔ مزے کی بات ہے فریم گرنے سے شیشے کا ایک ٹکڑا بے چاری پجارن کو چیر گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "کوئی بات نہیں تم مجھے دوسری تصویر لا دینا۔ بلکہ اس میں پجارن اگر لباس وغیرہ کے تکلفات سے آزاد ہو تو میں اس پر زیادہ اچھی طرح سے غور کرسکوں گا۔"

"ضرور۔" ماریہ نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اس نے فریم کے شیشے اُٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالے تصویر بھی پھاڑ کر ڈسٹ بن کی نذر کی۔ پھر آرام سے بستر پر بیٹھ کر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم بہت ظالم آدمی ہو۔ میں تمہارے لیے تحفہ لائی تھی اور تم مجھے بھول کر اس میں مگن ہوگئے۔"

"حماقت تھی نا...... ایک ینگ ہوتے لڑکے کو اس قسم کی اشتعال انگیز تصویر لا کر دی۔ اگر لا کر دیتیں کوئی افسانوی کتاب یا کسی شاعر کا دیوان تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا، بس تمہیں ہی دیکھتا۔"

"جھوٹ مت بولو۔" اس بار آنسو اس کے صبیح رُخساروں تک آ گئے تھے۔ "تمہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ہی ہوں جو تمہارے پیچھے بھاگتی ہوئی یہاں تک آگئی۔" کہتے کہتے اس نے باقاعدہ رونا شروع کردیا اور میں بوکھلا گیا۔

"ارے بابا چپ کر جاؤ۔ ابھی کوئی آ جائے گا۔" میں نے تقریباً ناچتے ہوئے کہا۔

"ام جاتی ہے۔" دروازے سے چھوٹا خان کی آواز آئی۔ وہ میرے لیے لنچ لے کر آیا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "دیکھا...... بدنامی کیسی تیزی سے پھیلتی ہے۔"

"تم اس بچی کی وجہ سے مجھے اگنور کرتے ہو۔" اس نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔ اس کے رونے دھونے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے پہلے دروازہ بند کیا پھر اس کے پاس آ کر بیٹھا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ دیکھو ماریہ...... میں دیکھنے میں بڑا ضرور لگتا ہوں لیکن ابھی میں اپنا مستقبل بنا رہا ہوں۔ مجھے بہت آگے تک جانا ہے۔ ایمان سے بتاؤ...... جس معاملے میں تم مجھے اُلجھانا چاہتی ہو، اس میں لگ کر میں کس حد تک اپنی تعلیم پر توجہ دے سکوں گا۔"

"تم کاجل سے بھی تو محبت کرتے ہو۔" اس نے ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے میری محبت ہی ہے، اس میں کوئی جسمانی تقاضے شامل نہیں ہیں اور یہ محبت بھی اختیاری نہیں ہے بلکہ مسلسل ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے۔ کاجل ابھی بچی ہے اور تم ایک جوان لڑکی ہو جو جوانی کے سارے جذبات رکھتی ہو ذرا غور کرو تم سے محبت کرنے کا مطلب ہے کہ میں تم سے جسمانی طور پر بھی نزدیک آؤں اور میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"بے شک تم میرے پاس نہ آؤ۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "لیکن مجھ سے محبت تو کر سکتے ہو جس طرح کاجل سے کرتے ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں کاجل سے محبت اختیاری نہیں ہے۔ میں نے اسے از خود پسند نہیں کیا ہے۔ یہ تو قدرت کا فیصلہ تھا جو اس نے ہمارے دلوں میں مشترکہ طور پر اُتارا۔ اگر میں تم سے ایسی محبت کرنے کی بات بھی کروں تو جھوٹا ہوں گا۔"

"بے شک جھوٹی سہی لیکن اپنی محبت سے محروم تو نہ کرو۔" اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

"میں اس قسم کی جھوٹی محبت نہیں کر سکتا۔" میں نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔ "بلکہ فی الوقت میں کسی قسم کی محبت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آؤ نیچے چلیں۔"

اس نے مجھے دیکھا اور میرے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر اُٹھ گئی تھی۔ اس نے چہرہ صاف کیا، ہم نیچے آئے۔ اس کی سہیلیاں بدستور بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ ماہ پارہ نے بہ غور ہمیں دیکھا تو میں نے نظریں چرا لیں۔ میرا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے نیچے جمنازیم میں آ گیا جہاں حسن علی ایک بنچ پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اکثر اسے ایکسرسائز کرتے ہی پایا تھا۔ میں نے کپڑے اُتارے، نیچے ورزش کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ حسن علی نے حرکت نہیں کی تھی اس لیے میں نے از خود اپنی طے شدہ ایکسرسائز شروع کر دی۔ حسن علی خاصی دیر بعد اُٹھا۔ میں ہانکنگ کر رہا تھا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے جناب استاد! آج خاصے گہرے مراقبے میں تھے۔"

"تم خاصے آٹو میٹک ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے میری بات اُڑا دی۔

"کل ہائکنگ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہاں سے کوئی چار، پانچ کلو میٹر ایک جگہ ہے۔ وہاں چلیں گے مزہ آئے گا۔"

"ماریہ بھی چلنے کا کہہ رہی ہے۔"

"اسے بھی لے چلیں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذمے داری پر چلے...... ہائکنگ میں حادثات بھی پیش آتے ہیں۔"

"تب اسے نہیں لے جاتے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ خود اسے منع کر دیجیے گا۔"

حسن علی ہنسا۔ "اپنی بلا میرے سر ڈال رہے ہو۔ خیر اس سے بات کروں گا۔"





حسن علی اوپر چلا گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ مجھے کوئی ورزش بتا کر اوپر چلا جاتا۔ اگرچہ اس کے یا ماہ پارہ کے سامنے میں اس بات پر کتنا ہی جھنجھلاتا لیکن حسن علی کی غیر موجودگی میں کبھی ورزش روکتا نہیں تھا۔ البتہ مارشل آرٹس کی مشقیں حسن علی اپنی نگرانی میں کراتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بغیر نگرانی کے یہ مشقیں کرنے سے کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ جب میں بنچ پر لیٹ کر وزن اُٹھا رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ میں سمجھا شاید حسن علی آیا ہے۔ میں نے سانس روک کر کہا۔

"استادِ محترم کیا ہوا...... بلا سے نمٹ نہیں سکے۔"

"بلا خود چلی آئی ہے۔" پاس سے ماریہ کی آواز اُبھری اور میں کراہ کر رہ گیا۔ مارے گئے۔ میں نے سوچا۔

"تم مجھ سے اس طرح جان نہیں چھڑا سکتے۔"

میں نے ویٹ اسٹینڈ پر رکھا اور اُٹھ بیٹھا۔ ماریہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ "دیکھو مس ماریہ...... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر آئی ہو۔ ہائکنگ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کوئی چوٹ لگی تو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر یہاں آئی ہوں اور اپنی ذمے داری پر تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی۔ پھر اس نے پُرشوق نظروں سے مجھے دیکھا۔ "واہ...... تمہارا جسم تو بالکل باڈی بلڈرز جیسا ہو گیا۔"

"حسن علی نے مجھ پر بہت محنت کی ہے ورنہ ایک سال پہلے میں کوئی خاص نہیں تھا۔" میں نے خاص انداز میں فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بھاری ورزش کے بعد سانس قابو کرنے کے لیے یہ ایکسرسائز لازمی تھی۔ ماریہ میرے پاس آ بیٹھی۔ "کیا میں بھی تمہارے ساتھ ایکسرسائز کروں۔"

میں نے مشق ختم کر کے سانس لی۔ "تم صرف دیکھو۔"

ماریہ کھسک کر مزید نزدیک آ گئی۔ "کیوں؟"

"ورزش بغیر کسی نگران کے نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ اتنے نزدیک آ گئی کہ اس کی سانسیں میری گردن اور شانے کو چھونے لگی تھیں۔ "یوسف کیا تمہیں ایکسرسائز کرنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

میں ذرا دور ہو گیا۔ "مجھے ہر قسم کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں لیکن دور دور سے۔"

"کیا میں بھی۔" اس نے منہ لٹکایا۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں اپنا کام توجہ سے نہیں کر پاؤں گا۔" میں نے کہا اور دو بنچوں کو ساتھ رکھ کر ان پر اس طرح لیٹ گیا کہ ایک پر گھٹنے تک پاؤں تھے اور دوسرے پر شانے رکھے تھے۔ درمیانی جسم ہوا میں معلق تھا۔ یہ ایکسرسائز ریڑھ کی ہڈی اور پیٹ کے مسلز کے لیے مثالی لیکن بے حد سخت

ہوتی ہے۔ حسن علی جب اپنی نگرانی میں کراتا تھا تو کبھی کبھی میرے پیٹ پر دس کلو وزن بھی رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت یہ مشق صحیح معنوں میں عذاب بن جاتی تھی۔ شروع میں مجھے بڑی پریشانی ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں عادی ہو گیا۔ ماریہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئی اور اچانک میرے پیٹ پر بیٹھ گئی۔ کمر کو خم کھانے سے روکنے کے لیے مجھے زبردست جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

''یہ...... کیا...... حرکت...... ہے......'' میں نے بہ مشکل کہا۔

وہ شرارت سے ہنسی۔ ''میرا وزن ہی کتنا ہے، پھول جیسا تو ہے۔''

''گوبھی کے پھول سے زیادہ۔'' میں نے جل کر کہا۔

''اپنے الفاظ واپس لو......'' اس نے دھمکی دی۔ ''ورنہ اس بار میں اُچھل کر بیٹھوں گی۔''

''اوکے بابا۔'' میں نے فوراً ہار مان لی۔ وہ ہنستی ہوئی اُٹھی اور اوپر کی طرف چلی گئی۔

رات کے کھانے پر ماہ پارہ نے خاصا اہتمام کروایا ہوا تھا۔ ورنہ عام طور سے دو تین ڈشیں ہی ہوتی تھیں۔ مجھے لگا جیسے یہ سب ماریہ کے اعزاز میں ہو۔ اگرچہ ماہ پارہ آزاد خیال قسم کی لڑکیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھیں لیکن وہ ماریہ سے خوش تھیں اور اسی طرح میرے معاملے میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ مجھے کسی قدر حیرت تھی کہ وہ کاجل کے بارے میں میرے جذبات اور احساسات سے اچھی طرح واقف تھیں اس کے باوجود ماریہ کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ اس کی سہیلیاں اب بور ہو رہی تھیں اور ان کا ارادہ تھا کہ کل تفریح کے لیے ایوبیہ کی طرف جائیں گی۔ ماریہ ہمارے ساتھ ہی رہتی۔ ماریہ اور اس کی سہیلیوں کو اوپر والا اضافی بیڈروم دیا گیا تھا۔ میں حسبِ معمول سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھا ماہ پارہ ہوں گی، وہ اکثر دیکھنے آجاتی تھیں کہ میں سونے جا رہا ہوں یا میں نے دودھ کا کنگ سائز گلاس خالی کر دیا ہے یا نہیں...... لیکن جب دروازہ کھولا تو ماریہ ہوا کے جھونکے کی طرح وارد ہوئی اور پیر تسمہ پا کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے کسمسا کر کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے۔'' لیکن پھر اس کی گرم جوشی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ میں جس عمر میں تھا وہاں فطری طور پر یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میں بے قابو ہو رہا ہوں تو میں نے ماریہ کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے شانے سے تھام کر اسے دور رکھا۔

''پلیز ماریہ یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اسے جگ سے نکال کر پانی پلایا۔ اس کے جذبات میں جو اُبال آیا تھا وہ کسی قدر سرد ہوا اور وہ بستر پر بیٹھ گئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بوکھلا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ ماہ پارہ کا روم سامنے ہے، وہ چلی آئیں گی۔''

اس نے آواز دبا لی لیکن سسکیاں نہیں رُکیں۔ ''میں پاگل ہوں۔ میں کیا کروں، میں نے جان بوجھ کر تو تم سے محبت نہیں کی اور اب مجھے تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرایا تو





میں مر جاؤں گی۔''

میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کو دیکھا جو پاگل بھی تھی۔ وہ بے پناہ حسین بھی اسے کوئی بھی اچھا شخص خوشی سے اپنا سکتا تھا لیکن وہ میری دیوانی تھی۔ خدا کی قسم مجھے اس بات سے ذرا خوشی نہیں تھی کہ ایک اتنی خوب صورت لڑکی میرے پیچھے پاگل ہے بلکہ مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ میں صرف کاجل کا تھا اور اسے دھوکا دینا میرے لیے اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینا۔ وہ روتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس بار ماہ پارہ تھیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھا۔ میں نے شانے اُچکائے اور ماریہ آنسو صاف کرتی ہوئی ماہ پارہ کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماہ پارہ آہستہ سے بولیں۔

''کیا بات ہوئی؟''

''جناب اصرار کر رہی تھیں کہ میں ان کی محبت قبول کر لوں لیکن آپ ہی بتائیے بھلا محبت کی جاتی ہے یا قبول کی جاتی ہے۔''

''پاگل لڑکی...... خیر کل تک کی بات ہے، وہ چلی جائے گی۔''

''اس نے راستہ دیکھ لیا ہے، وہ دوبارہ آجائے گی۔'' میں نے بھنا کر کہا تھا۔

''اتنی فکر مت کرو۔'' ماہ پارہ نے اس بار ڈانٹا۔ ''مرد ہو کر اتنی سی لڑکی سے گھبراتے ہو۔ مرد تو نہ جانے کیا کچھ کر جاتے ہیں، طوفانوں کو قابو کرتے ہیں۔''

''یہ زلزلہ ہے جو نیچے سے آتا ہے، میں اس سے نہیں نمٹ سکتا۔''

ماہ پارہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اچھا اب سو جاؤ۔ صبح سات بجے نکلنا ہے۔'' حسن کہہ رہا تھا۔

میں صبح چھ بجے اُٹھ گیا تھا۔ ہائکنگ کا اولین اصول یہی ہے کہ بالکل صبح سویرے نکلا جائے تاکہ جب تک روشنی پھیلے آپ مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہوں۔ جب میں لباس بدل کر نیچے پہنچا تو ناشتہ تیار تھا۔ خاصا بھاری بھر کم ناشتہ کیا ورنہ مشقت کرنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ چھوٹا خان نے کافی، سینڈوچز اور مالٹے کا جوس تیار کر لیا تھا۔ میں نے یہ سارا سامان اُٹھا کر جیپ میں رکھا۔ ماریہ روانگی سے محض دس منٹ پہلے آئی تھی۔ اس نے کافی لی اور صرف دو توس کھائے۔

''بھوک لگے گی۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''مجھ سے نہیں کھایا جاتا اتنی صبح۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے عادت ہی نہیں ہے۔''

اس نے چست ٹراؤزر کے ساتھ ہاف سلیو کی شرٹ اور اس کے اوپر پیراشوٹ کی بنی ہلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں ہائکنگ کے جوتے تھے یعنی وہ پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ ٹھیک سات بجے ہم روانہ ہو گئے۔ وادی سے نکل کر شمال کی طرف گئے۔ چار، پانچ کلومیٹر کے بعد حسن علی

نے جیپ سڑک سے اُتار دی۔ ناہموار اونچے راستے پر جیپ رینگ رینگ کر چلنے لگی۔ آٹھ بجے جب سورج بلند ہو رہا تھا ہم ایک چٹانی پہاڑیوں والے علاقے میں تھے، یہاں پتھروں کی بہتات تھی اور زندگی کم تھی لیکن جتنی بھی تھی آنکھوں کو تراوٹ دے رہی تھی۔ نیچے چٹانوں میں ایک ندی روانی سے بہہ رہی تھی۔ ہوا میں ایسی تازگی تھی جیسے سیدھی جنت سے آ رہی ہو۔ ماریہ نے اُتر کر ہوا میں گہری سانس لی۔ ''میرے خدا کتنی تازہ ہوا ہے۔''

حسن علی نے ہائکنگ کے لیے سامان اُتارا۔ سب نے اس سامان کو تقسیم کر کے اپنی پشت پر موجود پیکس میں رکھا۔ ماریہ کے حصے میں کھانے کا سامان آیا۔ حسن علی نے ندی کے ذرا اوپر ایک سیدھی بلند ہوتی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''پہاڑ کی چوٹی کوئی پانچ سو میٹر اونچی ہے۔'' میں نے اندازہ لگایا۔ ''تین سے چار گھنٹے لگیں گے۔''

''درست۔'' حسن علی بولا۔ ''لیکن ذرا مشکل ہے، ماریہ تم نیچے سامان کے پاس رہو۔''

''میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ تم دونوں کے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا۔ ''سامان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، یہاں کون چرانے آئے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' حسن علی نے شانے اُچکائے۔ ''لیکن ابتدائی سو میٹرز تک تم آزمائشی طور پر جاؤ گی۔ اگر اس دوران میں تم نے اپنی اہلیت ثابت کر دی تو ٹھیک...... ورنہ واپس بھیج دوں گا..... ڈن؟''

''ڈن۔'' خلافِ توقع ماریہ مان گئی۔ شاید اس لیے کہ حسن علی اس مہم کا ماسٹر تھا۔

سامان لے کر ہم روانہ ہوئے۔ پہلا مرحلہ ندی عبور کرنے کا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے ندی میں خاصا پانی تھا۔ بعض جگہ پتھروں سے پانی پُرشور انداز میں اُچھل اُچھل کر جا رہا تھا۔ ایسی جگہوں سے پتھروں پر پاؤں رکھ کر ندی کو عبور کیا جا سکتا تھا۔ ماریہ نے ایسے ہی پانی میں ہاتھ ڈالا اور یوں واپس کھینچ لیا جیسے اس میں کرنٹ آ رہا ہو۔ اس نے کانپ کر کہا۔ ''پانی برف جیسا سرد ہے۔''

''یہاں پانی ایسا ہی ملتا ہے۔'' حسن علی نے کہا اور چھلانگ لگا کر ایک پتھر پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنی کمر کی بیلٹ سے رسی باندھ رکھی تھی تاکہ سلپ ہو کر پانی میں گرے بھی تو ہم رسی کی مدد سے اسے کھینچ کر باہر نکال سکیں مگر اسے ضرورت نہیں پڑی۔ چند لمبی چھلانگوں نے اسے پار پہنچا دیا تھا۔

''واہ...... کیا اسٹائل ہے۔'' ماریہ نے بے اختیار تالی بجائی۔

''آ جاؤ...... لیکن احتیاط سے۔'' حسن علی نے ندی کے شور میں چلا کر کہا۔ ''ماریہ پہلے تم آؤ۔'' اس نے بیلٹ سے بندھی رسی کھول کر پھینک دی۔ میں نے اسے کھینچ کر ماریہ کی پتلی سی کمر سے بندھی بیلٹ سے منسلک کر دیا۔ اس نے حسن علی کی طرح لمبی چھلانگ لگائی اور سلپ ہوتے ہوتے بچی۔ اس کی پشت پر کوئی دس کلوگرام وزن تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پانی میں گرتی تو کوئی مسئلہ





نہیں تھا لیکن وہ نیچے گرتی جہاں چٹانیں تھیں اس لیے سر پر مہلک چوٹ آ سکتی تھی یا کوئی ہاتھ پیر کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ ''سنبھل کر......'' میں نے چلا کر کہا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اگلا پتھر دو قدم کے فاصلے پر تھا، آرام سے پاؤں بڑھا کر اس پر ٹک سکتی تھی لیکن اس دفعہ بھی اس نے بلاوجہ چھلانگ لگائی اور اس سے اگلے پتھر تک جا پہنچی۔ اس دفعہ معجزہ ہی تھا کہ وہ پانی میں گرنے سے محفوظ رہی۔ میں نے دیکھا حسن علی پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ میں بھی اس بار چپ رہا۔ اگر میں بولتا تو ماریہ مزید خطرناک قسم کے مظاہرے کر کے دکھاتی۔ وہ خیریت سے دوسری طرف پہنچ گئی اور اس طرف جاتے ہی اس نے چالاکی سے حسن علی کے سامنے کان پکڑ لیے اس سے پہلے کہ وہ سرزنش کرتا حسن علی بھی مسکرانے اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ ندی کے شور میں مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے رسی اپنی بیلٹ سے منسلک کی اور نپی تلی چھلانگ لگا کر پہلے پتھر تک پہنچ گیا۔ چند لمحوں میں ہم سب ندی کے پار تھے۔

''میرا خیال ہے سارا اضافی سامان یہیں چھوڑ دیا جائے۔'' حسن علی نے پہاڑی کی طرف دیکھا۔ ''زیادہ وزن مسئلہ کرے گا، صرف ضروری چیزیں لے کر چلو۔''

''اس میں سینڈوچ ضرور ہوں گے۔'' ماریہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے ناشتہ نہیں کیا ہے۔''

حسن علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں تمہیں بھوک برداشت کرنا ہوگی کیونکہ ہائکنگ کے درمیان میں کھانے سے گریز کرنا چاہیے۔''

''اوکے باس۔'' اس نے مُردہ سی آواز میں کہا۔ اس کے بعد حسن علی ہمیں ہائکنگ کے اصول وقواعد سمجھانے لگا۔

''اگر ہائکنگ کے دوران میں کوئی حادثہ پیش آنے لگے تو آدمی کو سب سے پہلے اپنی حفاظت کی طرف توجہ دینی چاہیے تب ہی وہ دوسروں کی مدد کر سکتا ہے اور اگر کسی مقام پر دونوں افراد کی یا زیادہ افراد کی زندگیاں بیک وقت خطرے میں ہوں اور کسی ایک یا دو افراد کے قربانی دینے سے باقی افراد کی جان بچ سکتی ہے تو انہیں اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔''

مجھے حسن علی کئی بار یہ سب باتیں بتا چکا تھا اس وقت وہ ماریہ کو یہ سب سمجھا رہا تھا۔ ''سمجھ گئے تم دونوں؟''

''یس باس۔'' ماریہ نے کہا۔ میں نے بھی سر ہلا دیا۔

''لیٹس گو۔'' حسن علی نے کہا اور ہم اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس بار بھی سب سے آگے حسن علی تھا، اس کے بعد ماریہ اور اس کے پیچھے میں۔ میں خاصی مشکل میں تھا اس لیے نہیں کہ چڑھائی دشوار تھی بلکہ ماریہ کے پیچھے جانا مشکل کام تھا۔ دشوار گزار راستے پر سفر کرتے ہوئے اس کا دلکش بدن کچھ اس طرح سے پیچ و خم کی بہار دکھا رہا تھا کہ میں لاحول پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ابتدائی سو میٹرز کا سفر آسان تھا۔ ہم چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے اوپر

تک آ گئے تھے۔ اس وقت تک دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ سو میٹرز کے بعد راستہ دشوار ہو گیا تھا۔ اب اوزاروں کی مدد لازمی تھی۔ پہلے حسن علی نوک دار کلہاڑیوں کی مدد سے اوپر گیا اور اس نے ایک چٹان سے کلپ کی مدد سے رسی باندھ دی۔ اس رسی سے میں اور ماریہ بھی اوپر پہنچ گئے۔ اب مجھے آگے جانا تھا۔ میں چاروں ہاتھوں، پیروں کی مدد حاصل کرتے ہوئے کسی چھپکلی کی طرح چٹان سے چپک کر اوپر جانے لگا۔ اس چٹان میں ہتھوڑی کے استعمال کی گنجائش نہیں تھی اس لیے مجھے رخنوں میں ہاتھ پیر پھنسا کر اوپر جانا پڑ رہا تھا۔ کام مشکل تھا لیکن مجھے مزہ آ رہا تھا۔ حسن علی کی تربیت نے مجھے جسمانی طور پر فٹ کر دیا تھا اور میں اَن تھک اوپر جا رہا تھا۔ مشکل سے دس منٹ میں، میں تیس فٹ اونچی اس چٹان کے اوپر تھا۔ اوپر کہیں کلپ لگانے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے ایک سوراخ میں لمبی کیل ٹھونکی اور اس سے رسی باندھ کر نیچے پھینکی۔ حسن علی اور ماریہ آرام سے اوپر آ گئے۔ ذرا سی مشقت نے جسم گرم کر دیا تھا اس لیے سب نے اپنی پیراشوٹ سے بنی جیکٹیں اُتار کر کمر سے باندھ لیں۔ ماریہ کو دیکھ کر میں نے ایک بار پھر لاحول پڑھی۔ اس نے جسم سے چپکی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا بدن بے حد نمایاں تھا۔ حسن علی ذرا آگے نکلا تو میں نے ماریہ کے کان میں کہا۔

''اتنی چست ٹی شرٹ پہننے کی کیا تک تھی؟''

وہ مسکرائی۔ ''کیوں اچھی نہیں لگ رہی ہے۔''

میں جز بز ہو کر بولا۔ ''سخت واہیات لگ رہی ہو۔''

اس بار وہ ہنسی۔ ''جناب کو لگ رہی ہے۔''

''آگے چلو۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر دھکیلا۔ ذرا دیر میں پتا چلا کہ اس چٹانی چھجے سے اب جانے کا راستہ تقریباً نایاب تھا جس پر اس وقت ہم کھڑے تھے، سوائے ایک دو اُبھری چٹانوں کے درمیان سے گزرا جائے۔ میں نے حسن علی کو رائے دی کہ ماریہ کا اس راستے سے جانا خطرناک ہو گا۔ اس لیے اسے یہیں چھوڑ دیا جائے۔ وہ تڑخ کر بولی۔

''میں بالکل نہیں رُکوں گی۔''

''اتنا آگے تک آ کر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔'' حسن علی نے خلافِ توقع اس کی تائید کی۔

میں جھنجھلا گیا۔ ''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں استادِ محترم...... ان چٹانوں پر چڑھنے کے لیے تجربہ اور فزیکل فٹنس لازمی ہے۔''

ماریہ بولی۔ ''میرے پاس تجربہ بھی ہے اور فٹنس بھی۔'' پھر اس نے دھمکی دی۔ ''اگر تم مجھے چھوڑ کر گئے تو میں خود آنے کی کوشش کروں گی۔ چاہے اوپر سے گر ہی کیوں نہ جاؤں۔''

''اچھا بس ماریہ۔'' میں چڑ کر بولا۔ ''بعد میں روئیے گا مت۔''

''شرط لگا لو میں نہیں روؤں گی۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔





''اور روئیں تو......'' میں نے ہاتھ تھام لیا۔

''تو جو تم کہو گے وہ مانوں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ڈن۔'' میں بولا تو اس نے سر ہلا دیا۔

حسن علی نے ماریہ کو ایک دس فٹ لمبی رسی کی مدد سے مجھ سے منسلک کر دیا۔ اس چٹان سے اوپر جانے کے لیے ہمیں صرف ہاتھوں، پیروں کا سہارا لینا تھا۔ ان چٹانوں میں کہیں کیل ٹھونکنے کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا رسی بھی نہیں باندھی جا سکتی تھی۔ بعض حصے کچھ اس طرح سے باہر نکلے تھے کہ ان پر سے ہو کر گزرنا ہی ناممکن لگ رہا تھا۔ بہر حال انسان کی فطرت ہوتی ہے وہ اس قسم کے چیلنج قبول کرتا ہی رہتا ہے۔ حسن علی آگے بڑھا۔ راستہ اسے ہی دیکھنا تھا۔ اس کے بعد میں تھا اور ماریہ میرے عقب میں تھی۔ راستہ دشوار ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں۔ حسن علی مشاقی سے دشوار چٹانوں سے ہوتا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ البتہ ماریہ کے لیے یہ سب آسان نہیں تھا۔ بے شک اسے ہائکنگ کا تجربہ تھا اور وہ جسمانی لحاظ سے بھی فٹ تھی، اس کے باوجود اس کے لیے اس قسم کی چٹان پر چڑھنا آسان نہیں تھا جن پر صرف پیشہ ور ہائکرز ہی چڑھ سکتے ہیں۔ وہ خاصی دشواری سے چڑھ رہی تھی اور اس لحاظ سے اس کا حوصلہ قابلِ تعریف تھا کہ اس نے ایک بار بھی مجھ سے مدد نہیں مانگی تھی بلکہ بعض دشوار جگہوں پر جب میں نے اس کو مدد کی پیش کش کی تو اس نے ہنس کر انکار کر دیا۔

''سوری بھئی...... میں چڑھ رہی ہوں...... اور پھر تم کہو گے کہ میں رو رہی ہوں۔''

''شرط تو اس بات پر ہے کہ تم اوپر تک نہیں جا سکو گی۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''میں اپنے بازو پر جانا پسند کروں گی۔'' اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ اس وقت تک ہم نصف راستہ طے کر چکے تھے اور ایک تنگ وارڈ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''لیکن تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ میں شرط جیت گئی تو مجھے کیا ملے گا؟''

''ظاہر ہے میں بھی تمہاری کوئی بات مانوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''کوئی بھی بات۔''

''ہاں کوئی بھی بات۔'' میں نے نظریں چرائیں۔

''اوپر چلو اسی بات پر۔'' اس نے مجھے اوپر دھکیلا۔

آگے چڑھائی بے حد دشوار تھی۔ اُبھری ہوئی چٹانیں، جنہیں ہوا اور بارش نے تراش کر چکنا اور سپاٹ کر دیا تھا۔ ان پر گرفت رکھنا از حد دشوار تھا۔ یہاں عجلت میں بڑھایا ایک قدم آدمی کو واپس نیچے لے جا سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہاں نے ماریہ میں انوکھی ترنگ بھر دی تھی۔ خطرات اس کے نزدیک خطرات نہیں رہے تھے۔ وہ خاصی بے پروائی سے اوپر جا رہی تھی اور میں اسے ٹوکتے

ہوئے ڈر رہا تھا کہ مجھے چڑانے کے لیے وہ زیادہ بے پروائی سے کام لے گی۔ حسن علی خاصا اوپر جا چکا تھا اور اوپری سطح سے کچھ ہی پیچھے تھا۔ میں ماریہ کے عقب میں تھا۔ تنگ دراڑ خاتمے کے قریب تھی۔ اس کے بعد اُبھری چٹانیں تھیں۔ ماریہ نے دراڑ کے ایک اُبھرے حصے پر پاؤں جما کر اُبھری ہوئی چٹان کا کنارہ تھامنے کی کوشش کی۔ کنارہ اس کے ہاتھ سے ذرا اونچا تھا، اس موقع پر ماریہ نے وہ غلطی کی جو اکثر ناتجربے کار ہائکرز کر جاتے ہیں یعنی اپنی حفاظت کو نظر انداز کر کے کوئی مرحلہ سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ماریہ کا ہاتھ کنارے پر صحیح سے نہیں جم سکا تھا اور جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اپنا پاؤں واپس اُبھرے حصے پر جمانے کی کوشش کی لیکن اس کا توازن بگڑ چکا تھا، وہ میری طرف آئی اور اس موقع پر بے حد عقل مندی سرزد ہوئی، اگر میں ماریہ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو یہ حماقت ہم دونوں کو ہی لے ڈوبتی۔ میں نے اس سے بچتے ہوئے اپنی پوری قوت سے دراڑ کے اُبھرے حصوں کو تھام لیا اور اپنا پاؤں ایک رخنے میں پھنسا لیا۔ ماریہ میرے پاس سے گزری۔ اس نے حواس بحال رکھتے ہوئے دراڑ کے اُبھرے حصوں کو تھامنے کی کوشش کی۔ وہ اس حصے کو تو نہ تھام سکی لیکن اس کی کوشش سے گرنے کی رفتار کم ہوگئی اور جب اس کی حد ختم ہوئی تو مجھے اتنا طاقتور جھٹکا نہیں لگا کہ میں بھی گر جاتا۔ ماریہ چٹان کے کنارے سے پانچ فٹ نیچے خلا میں جھول رہی تھی۔ چٹان کا یہ کنارہ خم کھا کر پیچھے کی طرف گیا تھا اس لیے اس پر کہیں پاؤں ٹکانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''یوسف...... گرفت مضبوط رکھنا۔'' اوپر سے حسن علی نے چلا کر کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

میں جسم و جان کی پوری طاقت چٹان سے چپکے رہنے میں صرف کر رہا تھا اور مجھے ماریہ کی فکر بھی تھی۔ ''ماریہ تم ٹھیک ہو نا؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' ماریہ بولی۔ ''میں رسی سے اوپر آ رہی ہوں۔''

''کم سے کم حرکت کرو۔'' میں نے اسے ہدایت دی لیکن شاید اس نے سنا نہیں۔ اس نے اوپر آنے کی کوشش کی۔ اس پر اضافی دباؤ پڑا اور میرے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے میں بھی نیچے جا رہا تھا۔ جسم نے کئی جگہوں سے زبردست رگڑیں کھائیں لیکن اس وقت ذہن صرف اس کام میں مصروف تھا کہ کوئی سہارا ہاتھ آ جائے کیونکہ اس چٹان سے کوئی ستر فٹ کی گہرائی تک کچھ نہیں تھا اور اس سے گر کر جاں بحق ہو جانا لازمی تھا۔ اندھا دھند چلائے جانے والے ہاتھ کام آئے اور میرا دایاں ہاتھ چٹان کے اُبھرے کنارے پر جم گیا تھا۔ جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ میرا اپنا وزن ہی کم نہیں تھا اس وقت میرا وزن ساٹھ کے جی تھا اور ماریہ بھی کم سے کم پچاس کے جی کی تھی۔ اتنا وزن میرے دائیں ہاتھ پر تھا۔

جسمانی قوت نے اس وقت جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس سے زیادہ، موت کے خوف نے کام دکھایا تھا ورنہ شاید میں اتنا بوجھ برداشت نہ کر پاتا۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو



میں نے اس پوزیشن میں خود کو پایا کہ اپنا اور ماریہ کا تمام تر وزن میرے دائیں بازو پر تھا۔ رسی میرے بائیں پہلو سے بندھی تھی اس لیے جسم کا حصہ نیچے تھا۔ میں کوشش کے باوجود بایاں ہاتھ کنارے تک نہیں لے جا سکتا تھا اور صرف ایک ہاتھ سے زیادہ دیر تک لٹکنا ممکن نہیں تھا حسن علی خاصا اوپر جا چکا تھا اس لیے اتنی جلدی نیچے آنا ممکن نہیں تھا۔ دباؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں ایک دو منٹ سے زیادہ اسے نہیں سہار سکتا تھا۔ میرے پٹھے اور رگیں جیسے تڑخ رہے تھے۔

''یوسف......'' ماریہ نے عجیب سے لہجے میں پکارا۔ اتنا عجیب انداز کہ میں ایک لمحے کو صورتِ حال کی سنگینی بھول کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ رنگین تھا اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ پکارا۔ ''یوسف...... رسی کھول دو۔''

اس کی بات کا مطلب کسی قدر تاخیر سے میری سمجھ میں آیا۔ وہ پاگل لڑکی جو میری محبت میں دیوانی ہو کر یہاں تک چلی آئی تھی۔ اب میری جان بچانے کے لیے اپنی قربانی دینے کی بات کر رہی تھی۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔

''بکومت۔''

''یوسف تم اس طرح زیادہ دیر نہیں لٹک سکتے۔'' رسی نکال دو۔'' اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

ہماری کمروں میں جو بیلٹس تھیں ان کے کلپ کچھ اس قسم کے تھے کہ ایک بٹن دبا کر رسی کا ایک ہک کلپ سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ حسن کو دیکھ سکوں وہ کہاں تک آیا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا چٹان کا نکلا کنارہ سارے منظر پر چھایا ہوا تھا۔ اس سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حسن علی کی آواز وقفے وقفے سے اُبھر رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔ پر آواز سے معلوم کرنا دشوار تھا کہ وہ کتنی دور ہے۔ حسن علی کو میں نے ہمیشہ سرد پایا تھا۔ کتنے ہی مشکل حالات ہوں اس کے ظاہر سے اندازہ لگانا دشوار ہوتا تھا کہ وہ کتنا مضطرب ہے۔ اس وقت اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ مضطرب ہے۔ وہ چلا چلا کر مجھے چٹان کا کنارہ تھامے رہنے کو کہہ رہا تھا۔

''یوسف...... تم...... اس طرح زیادہ دیر نہیں لٹک سکتے۔'' ماریہ نے التجا کی۔ ''رسی نکال دو۔''

''چپ رہو خدا کے لیے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''یوسف ہم دونوں مر جائیں گے کیوں نہ ایک مرے پلیز رسی نکال دو۔'' اس کی رٹ جاری تھی۔

''بس...... حسن علی آنے والا ہے۔'' شدید دباؤ نے میرے جسم کی ساری رگیں کھینچ دی تھیں۔ میرے لیے بولنا بھی دشوار تھا۔ ماریہ نے دیکھا کہ میں اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں تو اس نے اپنی بیلٹ کا کلپ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ مجھے احساس ہوا کیونکہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا اسے کلپ کھولنے کی کوشش کرتے دیکھ کر میں چیخا۔

''ماریہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس معاملے میں ناتجربہ کار تھی۔ اصل میں رسی کا دباؤ کلپ کھولنے میں رکاوٹ تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے رسی پکڑ کر یہ دباؤ کم کرتی تو کلپ ایک سیکنڈ میں کھل جاتا۔ میں چلا چلا کر اسے باز رہنے کو کہنے لگا۔ ''ماریہ مت کرو۔ پلیز...... پاگل مر جاؤ گی۔''

''تم تو زندہ رہو گے۔'' اس نے اپنی کوشش ترک کیے بغیر کہا۔

''ماریہ حماقت مت کرو حسن علی آنے والا ہے۔''

''یوسف مجھے معاف کر دینا۔'' اس نے بالآخر کلپ کھول لیا۔ اس کا فولادی ہک کلپ سے نکل گیا اور ماریہ ایک ہاتھ سے رسی تھامے لٹک رہی تھی۔

''مجھ سے محبت کرتے ہو نا۔''

میں اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہاں ماریہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ دیکھو رسی نہ چھوڑنا۔''

''شکریہ...... یوسف آئی لو یو۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور رسی چھوڑ دی۔



فائر نے نائٹ ڈیوٹی انچارج کو بھی چونکا دیا تھا۔ اس نے رسالہ میز پر پھینکا اور اپنے ہولسٹر سے سرکاری پسٹل نکالتا ہوا باہر کی طرف بڑھا۔ اس لمحے پے در پے فائر ہوئے، یہ شاٹ گن کے فائر تھے۔ اس نام نہاد پولیس اسٹیشن میں شاٹ گن گارڈز کے پاس تھی۔ میرے کانوں نے پہلے فائر کو ریوالور یا پسٹل کے فائر کے طور پر شناخت کر لیا تھا۔ پے در پے فائرز کے ساتھ ہی باہر جیسے ہنگامہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کے چلانے اور بھاگ دوڑ کی آواز آ رہی تھیں۔ میں پنجرے میں بند تھا اس لیے کسی قسم کا کردار ادا کرنے سے قاصر تھا۔ اگر تھانے پر کسی نے حملہ کیا تھا تو میرے خیال میں نہایت نیک کام کیا تھا۔ بشرطیکہ وہ مجھے بھی فوت کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ہنگامہ، چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ مشکل سے پانچ منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد سکون ہو گیا تھا۔ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر لگ رہا تھا کہ حالات ان لوگوں کے قابو میں آ گئے تھے۔ تقریباً بیس منٹ بعد نائٹ شفٹ انچارج واپس آ گیا۔ اس نے پسٹل اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے سے تفکر جھلک رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر پوچھا۔ ''کیا دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے؟'' اس نے بدمزگی سے مجھے دیکھا اور کتے کی طرح غرایا جس کی دُم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہو۔ ''شٹ اَپ۔''

میں واپس اپنی جگہ آ گیا۔ وہ چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے میرے سیل کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے فون اُٹھا کر نمبر ملایا اور بولا۔ ''سر میں جیک بول رہا ہوں۔ جرمی نے پاگل پن میں فائر کر کے اپنی ساتھی بروس کو مار دیا ہے۔'' وہ چپ ہو کر سنتا رہا اور غالباً خاصی ناگفتنی سنتا رہا کیونکہ





اس کے چہرے پر پسینہ نمودار ہو گیا تھا۔ ''سس...... سر دوسروں نے جرمی سے ہتھیار رکھوانے چاہے مگر اس نے انکار کیا۔ اس پر انہوں نے اسے مار دیا۔ او کے سر...... یس سر...... رائٹ سر۔'' اس نے فون رکھ کر سر کے قافیے کے ساتھ ایک زبردست گالی ملائی اور کرسی پر گر کر دوبارہ رسالہ اُٹھا لیا لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ رسالے میں موجود سنسنی خیز تصاویر پر اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔

جرمی غالباً اس جزیرے کے مسلح نگرانوں میں سے تھا اور اس نے اپنے ساتھی بروس کو کسی وجہ سے مشتعل ہو کر مار ڈالا تھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے کسی مقتدر شخصیت کو اس واقعے کو رپورٹ کیا تھا۔ اس نے شاید کسی ایسے شخص کو رپورٹ کیا تھا جس کا تعلق پولیس اسٹیشن سے تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جزیرے پر بڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ جان گرے، ڈیئر ڈان اور کونسل کے بڑے۔ ان کے درمیان اختلافات تھے۔ سب کے پاس اپنے پتّے تھے جنہیں وہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کونسل مجھے زندگی کے لیے چانس دینے کے حق میں نہیں تھی۔ کونسل کے نام سے لگتا تھا وہ اس جزیرے کے حکمران تھے لیکن جان گرے جیسا شخص انہیں اپنے من مانے مفاد کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔ اس نے میرے لیے چانس حاصل کر لیا تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ اس طرح میری جان بچا لے گا۔

اگلے دو دن اس طرح گزرے کہ میرا زیادہ تر وقت ورزشوں میں گزرتا تھا۔ میں نے من پسند کھانوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ ان لوگوں کو دے دی تھی۔ اس کے مطابق کھانے ملتے رہتے تھے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ ایسے کھانے منگواؤں جو توانائی بخش ہوں۔ مسلسل ورزشوں سے میرے مسلز چست ہو رہے تھے اور میرا وزن بھی کم ہو رہا تھا۔ اگرچہ کسی بھی مقابلے کے لیے صرف چار دن کم تھے۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں اپنا اسٹیمنا اور فٹنس ستر اسّی فیصد حاصل کر لوں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ الیکٹرک کون تھا اس کا لڑنے کا اندازہ کیا تھا۔ اس سے خاص فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اس سے مقابلہ کرنا تھا اور زندہ رہنے کے لیے جیتنا ضروری تھا اس کے لیے مجھے ہر حربہ استعمال کرنا تھا اور خود کو تیار بھی کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے نہ صرف ان مقابلوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے مجرموں کو ہروانے کے لیے یہ لوگ ہر حربہ استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ احمد بربری کے ساتھ ہوا تھا۔ ایول کو چالاکی سے ہتھیار مہیا کیا گیا تھا اور ایول نے اس نوجوان کو مار ڈالا تھا۔

ایول کے زخمی ہو کر واپس جانے کی خبر خاصی اطمینان بخش تھی اس لیے نہیں کہ اب مجھے ایول سے مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کے خلاف میرے جذبات نفرت کی حد کو پہنچے ہوئے تھے۔ احمد کو میں نے پہلی اور آخری بار اس رِنگ میں ہی دیکھا تھا لیکن وہ نوجوان مجھے بھا گیا تھا۔ اس کا اعتماد اور ان فرعونوں کے سامنے اس کا حوصلہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ بانکا سجیلا نوجوان ایول جیسے دیوزاد کو بچوں کی طرح کھلا رہا تھا اگر ایول کو روایتی مغربی مکاری دکھا کر چھپ کر ہتھیار نہ

مہیا کیا جاتا تو وہ ایول کو ہرا دیتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایول کس طرح زخمی ہوا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ اب وہ کبھی رِنگ میں نہ آ سکے۔ ان لوگوں کا ایک شکاری کتنا ناکارہ ہو جائے۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ مردود ایول میرے ہاتھوں کیوں نہیں انجام کو پہنچا۔ میں اسے باآسانی شکست دے سکتا تھا۔ بلکہ اس کی بھینسے نما گردن توڑ سکتا تھا۔ میں نے اس کے لڑنے کا انداز دیکھا تھا اس کے زیادہ تر وار نمائشی ہوتے تھے۔ اس کا ڈیل ڈول ہی ڈرانے والا تھا۔ اس میں چستی اور پھرتی مفقود تھی۔ وہ اپنے بڑے جثے اور بے پناہ طاقت و وحشت سے اپنے حریف کو زیر کر لیا کرتا تھا۔

جان گرے نے مجھے بتایا تھا کہ مقابلہ شام کے وقت ہوگا یعنی سات بجے کے بعد۔ اس وقت مجھے حوالات سے نکال کر لے جایا جائے گا میرا خیال تھا کہ اب مجھے مقابلے کے وقت ہی یہاں سے نکالا جائے گا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوتا۔ مجھے آرام اور ورزش کا بھرپور موقع ملتا مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میں سویا ہوا تھا کہ رات بارہ بجے کے قریب لاک اپ کا دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے بے دار کر دیا۔ نائٹ ڈیوٹی انچارج سر پر کھڑا تھا۔ ''کھڑے ہو اور باہر آؤ۔''

''کیا ارادے ہیں۔'' میں اُٹھ بیٹھا۔ ''کیا ابھی پھانسی دینی ہے۔''

''میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتا۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تمہاری طلبی ہوئی ہے۔ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

میں نے اُٹھ کر واش بیسن سے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ باہر دو عدد مستعد گارڈ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے میرے ہاتھوں اور پیروں میں نائلون کی مخصوص ہتھکڑیاں ڈالیں میں نے نائٹ انچارج سے پوچھا۔ ''مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''بکومت۔'' اس نے خراب لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''بجا ارشاد۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''مائٹ از رائٹ کے اصول کے تحت سارے حقوق تم لوگوں کے پاس ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ مجھے سامنے والے راستے سے باہر لے جایا جائے گا لیکن گارڈز نے عقبی راستہ اختیار کیا۔ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے میری نگاہ غیر ارادی طور پر دائیں طرف کے فولادی دروازے کے اوپری جالی دار حصے پر پڑی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ رُکتے رُکتے بھی میں دروازے سے آگے نکل گیا تھا۔ رُکنے پر عقب سے گارڈ نے کمر پر اپنی رائفل کی نال ماری۔ ''چلو رکو مت۔''

''اس کمرے میں۔'' میں نے کہنا چاہا تو گارڈ مشتعل ہو گیا۔

''حرکت کرو۔ جلدی۔'' اس نے زیادہ زور سے نال ماری۔ مجھے اپنی کمر میں تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

بادلِ نخواستہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور سوچنے لگا کہ مجھے جو نظر آیا تھا وہ درست تھا۔





اس کمرے میں مجھے دیوار کے ساتھ احمد بربری ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ کیا میں نے ٹھیک دیکھا تھا۔ یا یہ صرف نظر کا دھوکا تھا۔ ممکن ہے وہ احمد بربری سے مشابہہ کوئی شخص ہو۔ اس کے سر پر گھنگھریالے بال تھے۔ ویسا ہی پُرکشش سانولا رنگ اور ویسے ہی کھڑے نقوش۔ احمد خالص بربری النسل نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کی رگوں میں عرب خون کی آمیزش بھی محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ بربری زیادہ سانولے رنگ اور کسی قدر افریقی نقوش کے حامل ہوتے ہیں۔ گزشتہ چودہ سو سال سے عربوں اور بربری قبائل کی ملی جلی آبادی سے موجودہ الجزائر، مراکش اور اس سے ملحقہ علاقوں میں یہی نسل اکثریت میں ہے جس کے نقوش میں بیک وقت عرب اور افریقی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے نقوش میں مصریوں کی سی ملاحت تھی۔ مصری خالص عرب ہیں لیکن صدیوں سے مصر کی آب و ہوا میں رہ کر ان کے نقوش میں مقامی خصوصیات آ گئی تھیں۔ ورنہ عرب بدو جو مصر میں آ کر آباد ہوتے تھے۔ ان کے نقوش موجودہ عربوں کی طرح کھردرے تھے۔ وہ عرب جو بحیرہ روم کے متصل خطوں میں آباد ہیں ان کے نقوش اندرون صحرا میں رہنے والے عربوں سے کہیں زیادہ سُبک اور جاذب نظر ہیں۔ قارئین سے معذرت کہ اصل داستان سے بھٹک کر تحقیق کی طرف جا نکلا۔ احمد بربری کی اس جھلک نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اگرچہ میں نے محض ایک جھلک دیکھی تھی۔ درمیان میں جالی بھی حائل تھی۔ اس کے باوجود مجھے بڑی حد تک یقین تھا کہ میں نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ احمد بربری ہی تھا مگر اسے میں نے آخری بار رِنگ میں زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ لاچاری کی کیفیت میں موت کو ایول کی صورت میں اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ میں جان گرے سے اُلجھ گیا تھا اور میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر جان گرے کی ساتھی لڑکی نے کوئی شے میرے سر پر ماری تھی اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔ اگر یہ احمد ہی تھا تو کسی معجزے کی وجہ سے وہ اس مقابلے کا فاتح رہا تھا تب ہی زندہ تھا ورنہ ایول اسے زندہ کسی صورت نہ چھوڑتا۔ اس کا مشن ہی احمد کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔ اس سے یہ توقع کہ وہ احمد کو شکست دے کر بخش دے گا۔ اتنی ہی محال تھی جتنی...... کہ بیل سے دودھ کی توقع کرنا۔ یا جان گرے جیسے لوگوں سے انسانیت کی توقع کرنا۔

میں سوچوں میں اتنا غلطاں تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب مجھے باہر لا کر اس مخصوص جیپ کے عقبی حصے میں بٹھایا گیا تھا جو جزیرے کے نگرانوں کے زیر استعمال تھی۔ یہ چھوٹی اور طاقتور جیپ جزیرے کے کئی مختصر اور پُرپیچ راستوں پر سفر کرنے کے لیے مثالی تھی۔ اگرچہ جزیرے کا رقبہ خاصا تھا لیکن اس کے ایک چھوٹے سے حصے کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس کا بڑا حصہ اس کے فطری انداز میں برقرار رہنے دیا گیا تھا۔ راستے چھوٹے اور عمارت کو بھی اوپری طرف سے پھیلانے کے لیے ان کی زیادہ منزلیں زیرِ زمین بنائی گئی تھیں۔ جزیرے پر شاذ ہی کوئی عمارت چار منزلہ اونچی ہو۔ ان پر سبز رنگ کیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اوپر سے گزرنے والے طیاروں کو یہ عمارات نظر نہ آئیں۔ رات کو روشنی کی جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی کیا جاتا تھا کہ روشنیاں اوپر سے نظر نہ آئیں گویا یہ لوگ اپنی

قوت اور اختیارات کے باوجود کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتے تھے۔

جیپ نیم روشن راستوں سے گزرتی رہی اور مشکل سے دس منٹ بعد اس نائٹ کلب کے سامنے رُکی جہاں جان گرے مجھے لے کر گیا تھا۔ گارڈ نے جیپ کے اینگل سے میری ہتھکڑی کھولی اور مجھے اندر لے آئے۔ وہاں حسبِ معمول بھیانک میوزک پر کئی جوان جسم بے تحاشہ ناچ رہے تھے۔ غالباً یہ جزیرے کی عام آبادی تھی۔ جو عام کاموں کے لیے مخصوص تھی۔ زیادہ تر چہرے ایشیائی خدوخال کے حامل تھے۔ ناچنے والوں میں لڑکیوں کی اکثریت تھی۔ ان کا حلیہ اور انداز چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ وہ یہاں پر دل لبھانے کے لیے موجود تھیں۔ مردوں میں ایشیائی اور سفید فام نسلوں کے ملے جلے نوجوان تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب ہی جوان تھے ان میں شاید ہی کوئی بوڑھا تھا۔ اکا دُکا ادھیڑ عمر تھے لیکن وہ ایک طرف بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے تھے۔

گارڈز مجھے ناچنے والوں کے درمیان سے لے کر لفٹ تک پہنچے۔ لفٹ نے نہ جانے کون سے فلور پر ہمیں اُتارا۔ یہ وہ فلور نہیں تھا جہاں پر زیرِ زمین کلب تھا۔ جان گرے وہاں باقاعدگی سے جاتا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے خود بتائی تھی۔ یہ ایرینا والا فلور بھی نہیں تھا۔ بلکہ یہاں پر لفٹ سے نکلتے ہی چار طرف گیلریاں تھیں اور ان کے دونوں جانب دروازے تھے۔ اندر غالباً رہائشی کمرے تھے۔ کمروں کے دو دروازوں کا درمیانی فاصلہ بتا رہا تھا کہ خاصے وسیع وعریض کمرے تھے۔ گارڈز نے وسطی گیلری کا رُخ کیا جو لفٹ کے عین سامنے تھا۔ انہوں نے دائیں طرف کے تیسرے دروازے پر دستک دی۔

''یس۔'' فوراً ہی دروازے کے ساتھ لگے سپیکر سے جان گرے کی آواز آئی۔

''سر یوسف علی خان حاضر ہے۔'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔

کمرے شاید ساؤنڈ پروف تھے اس لیے سپیکر و مائیکروفون کی ضرورت پیش آئی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ بھی کسی ریموٹ سے کھلا تھا۔ کیونکہ جان گرے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔

وہ بدستور اس جہازی سائز کے بستر پر دراز تھا۔ جس پر اس کے دائیں بائیں دو عدد قیامتیں تھیں اور جان گرے کا حوصلہ تھا جو انہیں بیک وقت برداشت کر رہا تھا۔ ایک غالباً یوریشین تھی اور دوسری افریقین اس کے گھوڑے کی طرح مضبوط جسم میں بے پناہ کشش تھی۔ اس نے اس کشش کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ یوریشین کسی قدر جامے میں تھی۔ جان گرے کا گاؤن اوپن تھا اور اس کی نیکر نظر آ رہی تھی جس پر امریکی پرچم بنا ہوا تھا۔ یہ فیشن ان دنوں بہت پھیلا ہوا ہے۔ یورپی اقوام کی وطنیت ان کے انڈرویئر سے بھی شناخت کی جا سکتی ہے۔

کمرا کیا تھا ایک عشرت کدہ تھا۔ جس کی ایک ایک چیز قابلِ دید بھی تھی اور قابلِ داد بھی۔ ہر طرف عیش وعشرت اور حرص وہوس کے ایسے سامان تھے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جائے اور شیطان بھی شرما جائے۔ دیواروں پر عجیب سا لہریں لیتا ہلکا ہلکا نیلا رنگ تھا۔ چھت پر برقی آلات کی مدد سے




تیرتی مچھلیوں کا سا تاثر پیدا کیا گیا تھا۔ ان مچھلیوں کے درمیان ایک جل پری تیر رہی تھی۔ جل پری یعنی ایسی مچھلی جس کا اوپری دھڑ کسی حسین عورت کا سا نازک اور بھرپور تھا۔ بستر کے برابر میں ایک تپائی پر بہترین قسم کی وہسکی کی بوتل اور جام رکھے تھے۔ ایک جام جان گرے کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ویلکم مسٹر جوزف۔''

''یوسف۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

''ایک بات نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر میں جوزف ہوتا تو کوئی نام نہاد کونسل مجھے سزائے موت دینے کا فیصلہ نہیں کرتی۔''

اس کا منہ بن گیا لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔ ''خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں بحث کے لیے نہیں بلکہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے بلوایا ہے۔''

''کون سا وعدہ؟'' میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا پھر میرے ساتھ آنے والے دونوں گارڈز سے بولا۔ ''باہر انتظار کرو جب میں بلاؤں تو اندر آنا۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ دونوں بلاچوں چرا کیے باہر چلے گئے۔

سیاہ قیامت زیادہ ہی نشے میں تھی۔ اس لیے اسے اپنی عریانی کا قطعی احساس نہیں تھا۔ اسے ایک طرف دھکیل کر جان گرے نے بستر سے ذرا اُٹھ کر اپنے پاس رکھے ایک ریموٹ کنٹرول نما آلے کا رُخ سامنے والی دیوار کی طرف کر کے ایک بٹن دبایا۔ اس پر سے ایک پتلا سا خانہ ایک طرف سرک گیا اور اس کے عقب سے بڑی سکرین کا ٹی وی نمودار ہوا۔ جان گرے نے دوسرا بٹن دبایا سکرین بے دار ہو گئی۔ اس پر جو منظر نمودار ہوا وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ سکرین پر ایرینا دکھایا تھا۔ جو فی الوقت خالی تھا لیکن بنا آواز کے تماشائیوں کے جوش وخروش سے لگ رہا تھا کہ کوئی مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔ پہلے ایک جاپانی کراٹے ماسٹر آیا۔ ''یہ کیمہ نوچی ہے۔'' جان گرے نے بتایا۔ ''اس کا مقابلہ الیکٹرک سے ہوا تھا۔''

اور کیونکہ الیکٹرک زندہ تھا اس لیے موت کیمہ نوچی کے حصے میں آئی ہوگی۔ کیمہ نوچی جاپانی ہونے کے باوجود دراز قامت تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا قد پونے چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ جان گرے نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ ویسے بھی اس کمرے میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں کھڑا رہا۔ اس بستر پر بیٹھنا مجھے خود بھی گوارا نہیں تھا جو یقیناً میری آمد سے پہلے گناہ کی سیج بنا ہوا تھا۔ مجھے الیکٹرک یعنی بجلی کا انتظار تھا اور جب وہ آیا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا لیکن متناسب جسم کا شخص تھا۔ اس نے گردن سے نیچے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں

سیاہ رنگ کے سپورٹس شوز تھے اور ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے دستانے قد کی مناسبت سے اس کے نقوش بھی لڑکوں جیسے تھے۔ البتہ اس کی سیاہ سرد آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنا بے ضرر نہیں ہے۔ جتنا کہ نظر آتا ہے۔ جان گرے نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ الیکٹرک ہے۔ اس وقت دنیا کا سب سے بہترین اسٹریٹ فائٹر ہے۔''

''ضرور ہوگا۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''اس کی آنکھیں بتاتی ہیں۔''

''اس کا تعلق جرمنی سے ہے۔ لائبریا کا علاقہ ہمیشہ سے بہترین سپاہیوں کے لیے مشہور ہے۔''

''جرمنوں میں کم سے کم کمینگی اور گھٹیا پن نہیں ہوتا۔'' میں نے سکرین کی طرف دیکھا۔ بجلی مقابلے سے پہلے جوتوں کے بل اُچھل رہا تھا۔ وہ خود کو وارم اَپ کر رہا تھا جبکہ جاپانی کراٹے ماسٹر اپنے مخصوص لباس میں اٹاس بنا کر کھڑا تھا۔ اس نے وارم اَپ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ بجلی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حالانکہ یہ کوئی دوستانہ مقابلہ نہیں تھا جس میں ہاتھ ملایا جاتا۔ مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی جب جاپانی ماسٹر نے ہاتھ ملاتے ہی جوڈو کا ایک داؤ آزمایا۔ یہ خونی مقابلہ تھا اس میں ایک شخص کو فاتح ایرینا سے باہر جانا تھا۔ دوسرے کو قبرستان یا ہسپتال کی طرف جانا تھا۔ اس مقابلے کی کوئی اخلاقیات نہیں تھیں۔ اس میں حریف کو موقع ملتے ہی زیر کر لینا تھا۔ ورنہ حریف آپ کو قطعی موقع نہیں دیتا۔ حیرت مجھے اس داؤ کا نتیجہ دیکھ کر ہوئی۔ بجلی کو اُلٹ کر جاپانی ماسٹر کے عقب میں کمر کے بل جا گرنا تھا۔ یہ مہلک داؤ تھا جس میں بعض اوقات حریف کی کمر بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

بجلی نے حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ اس نے جاپانی کراٹے ماسٹر کے داؤ کی قوت استعمال کی۔ اس نے ہوا میں قلابازی کھائی اور جاپانی کے سر سے ہوتا اس کے عقب میں گھٹنوں کے بل زمین پر جا ٹکا۔ وہ چاہتا تو پنجوں کے بل کھڑا بھی ہوسکتا تھا۔ اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جب جاپانی اپنے داؤ کا نتیجہ دیکھنے کے لیے مڑا۔ الیکٹرک پہلے سے مکا بنا چکا تھا۔ جیسے ہی جاپانی اس کی طرف مڑا۔ اس نے گھونسا بجلی کی سی تیزی سے اس کی دونوں رانوں کے درمیان میں مارا۔ کیمرے نے زاویہ بدلا اس پر جاپانی ماسٹر کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس چہرے پر درد و کرب کے ساتھ ایک شے اور نمودار ہوئی تھی اور وہ تھی موت کی سفیدی، اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجمع جیسے پاگل ہوگیا۔ وہ اتنا مختصر سا مقابلہ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن مجمع کا انداز بتا رہا تھا کہ الیکٹرک سے جاپانی کراٹے ماسٹر کے قتل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ الیکٹرک چند لمحے سرد نگاہوں سے تماشائیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر خم کیا اور نپے تلے قدموں سے ایرینا سے رخصت ہوگیا۔ یہ موی ختم ہوئی تو الیکٹرک کی چند پرانی فائٹس کی موی دکھائی گئیں۔ وہ واقعی بجلی کی طرح لڑتا تھا۔ اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہی نہیں تھا۔ جیسے





بجلی ناگہانی طور پر گرتی ہے۔ اس طرح وہ حریف پر ایسے ضرب لگاتا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا تھا۔ ''اتنے سے قامت پر تم قیامت ہو۔''

''جاپانی کیمہ نوچی بچا نہیں تھا۔'' جان گرے نے ٹی وی آف کر دیا۔ ''ایک ہی ضرب نے اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔''

''بچا نہیں تھا یا تم لوگوں نے اسے بچایا نہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''زندہ رہتا تو اسے کچھ نہ کچھ دینا پڑتا۔ علاج پر بھی خرچہ ہوتا اور واپس بھجوانے پر بھی۔ چند ڈالرز کمانے کے لیے ایک جان لے لینا تم لوگوں کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔''

جان گرے کے مجرمانہ تاثرات نے بتایا کہ میری بات درست تھی۔ کیمہ نوچی کو طبی امداد دے کر بچایا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے ایرینا کی روایت کہ یہاں سے ایک ہی شخص زندہ جا سکتا ہے اسے طبی امداد کے بغیر مرنے دیا۔ بے شک الیکٹرک کا وار خطرناک تھا لیکن اسے بہرحال بچایا جا سکتا تھا ٹی وی آف ہوتے ہی خانہ کھسک کر دوبارہ اپنی جگہ آ گیا تھا اور اب لگتا نہیں تھا کہ اس جگہ کوئی ٹی وی جیسی شے تھی۔ کمرے کو الیکٹرانکس کی جادوگری سے ایک جدید قسم کے عشرت کدے میں بدل دیا گیا تھا۔ جہاں ڈیجیٹل آڈیو ویڈیو تھا۔ اس قسم کے آلات اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ دیواروں میں بھی پوشیدہ کیے جا سکتے ہیں۔

''تمہیں بلانے کا مقصد الیکٹرک کے لڑنے کا انداز دکھانا ہے۔ عام طور سے دیو قامت حریف کے نزدیک جانے سے بچنا چاہیے اگر اس کے قابو میں آ گئے تو مارے گئے۔ الیکٹرک کا قد و قامت چھوٹا ہے جسامت بھی خاص نہیں ہے یہ اپنے حریف کو اس دھوکے میں رکھ کر نزدیک بلاتا ہے اور پھر ایسا وار کرتا ہے جس کا توڑ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں الیکٹرک کے نزدیک جانے سے پرہیز کرنا ہوگا۔'' جان گرے نے مشورہ دیا جو درست تھا۔ الیکٹرک کے لڑنے کا انداز دیکھ کر میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''یہ بتاؤ اگر میں جیت گیا تو کیا آزاد ہوں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں تمہیں دی جانے والی موت معاف کر دی جائے گی لیکن آزادی نہیں ملے گی؟''

''تو کیا اسی جزیرے پر رکھا جائے گا؟''

''اس جزیرے پر رکھا جائے گا یا کسی اور مرکز بھیج دیا جائے گا۔ ایک خاص مدت تک تم ہمارے زیرِ نگرانی رہو گے اور ہمارے لیے کام کرو گے۔ جس کا تمہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا اور جب یہ محسوس ہوگیا کہ اب تم ہمارے لیے معاندانہ جذبات نہیں رکھتے یا خطرناک نہیں رہے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

''اور یہ مدت کتنی ہوگی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''کہیں میری مدتِ حیات جتنی تو نہیں۔''

''عام طور سے یہ مدت جرم کی سنگینی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔'' اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ''کیونکہ تمہیں مجھ پر حملہ کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی۔ اس لیے میری سفارش پر تم جلد رہا کر دیئے جاؤ گے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میری سفارش کب ہوگی۔'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں کہہ رہا تھا کہ جب میں اس کا کام کر دوں گا تو وہ مجھے رہا کروا دے گا حالانکہ مجھے شک تھا کہ وہ مجھے زندگی کی قید سے رہا کروا دے گا۔ جان گرے مہربانی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کی فطرت سانپ کی سی تھی۔ ڈسنا اس کا کام تھا۔ میں احمد بربری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ سچ مچ ان لوگوں کی قید میں زندہ تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ جان گرے نے ایک بار بھی اس کے مارے جانے کا ذکر کیا ہو۔ غالباً وہ مجھے اس کے زندہ ہونے کے بارے میں بتا کر خوش ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ جیسے وہ عبید صلاح کا ذکر کرنے سے گریز کرتا تھا۔

''میرا مقابلہ ایول سے کیوں نہیں کرایا جا رہا۔''

جان گرے سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا۔ وہ زخمی ہو کر امریکہ واپس جا چکا ہے۔''

''وہ کس طرح زخمی ہوا؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا جان گرے نے غور سے مجھے دیکھا۔ وہ مکار زمانہ بھانپ گیا تھا کہ میں اس سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے اتفاق سے جیل میں احمد بربری کو دیکھا تھا۔''

وہ بُری طرح چونکا۔ ''تم نے کیسے دیکھ لیا۔ اسے تو سیل فور کے خاص حصے میں رکھا گیا ہے۔''

اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ جو مجھے لائے ہیں غالباً راز داری کے خیال سے اس حصے سے مجھے لائے تھے۔''

جان گرے نے بلا تکلف ان کی ماں بہن ایک کی اور مجھ سے بولا۔ ''اگر وہ بدبخت ابھی زندہ ہے تو زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا اس نے اس خطے میں ہمیں بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ جلد وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا۔'' مارے اشتعال کے جان گرے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔

''میں نے جب اسے دیکھا تو وہ ایول کے مقابلے میں کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ اسے نوکدار سلاخ سے مارنے جا رہا تھا جو تم نے اسے دھوکے سے مہیا کی تھی۔''

اس سچ بیانی پر جان گرے نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ ''وہ حرامی ایول گدھے کی اولاد دھوکا کھا گیا۔ احمد مکاری سے کام لے کر خود کو بے بس ظاہر کر رہا تھا اور پھر اس نے ایول کے ہاتھ میں دبی سلاخ اس کے اپنے پیٹ میں گھونپ دی۔ جب تک ہمارے کیبن میں ہنگامہ ختم ہوتا ادھر ایول بھی گر چکا تھا۔ سلاخ نے اس کی آنتوں کو باہر نکال دیا تھا اگر گارڈز اندر جا کر احمد کو قابو نہ کرتے





''تو وہ ایول کو جان سے مار دیتا۔''

میں نے اسے طنزیہ نظر سے دیکھا۔ ''تم لوگوں کی کوئی اخلاقیات ہے بھی یا نہیں۔ اپنے ہی بنائے اصول توڑ دیتے ہو اتنی ڈھٹائی سے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔''

جان گرے نے پہلو بدلا۔ ''اصول اپنی جگہ لیکن ہم ایول کی موت برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ تم نہیں جانتے اس کا تعلق امریکہ کے ایک با اثر سیاسی خاندان سے ہے۔ جس نے اہم خفیہ ایجنسیوں میں اپنی جڑیں پھیلا رکھی ہیں۔ ایول کی موت ہمیں خاصی مہنگی پڑتی اب بھی اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ فلوریڈا کے آرمی ہسپتال میں زندگی و موت کے درمیان معلق ہے۔''

''چلو ایک تو اپنے انجام کو پہنچا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے خوشی ہوگی وہ امریکی سؤر کتے کی طرح تڑپ کر مر جائے۔''

جان گرے نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ ''دفع کرو اسے۔ بس اتنا یاد رکھو کہ تم نے بہر صورت الیکٹرک کو شکست دینی ہے۔''

''کیا تم اپنے ایک اہم آدمی کی میرے ہاتھوں موت برداشت کر لو گے؟'' میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے غور سے نہیں سنا تم نے اسے صرف شکست دینی ہے موت کے گھاٹ نہیں اُتارنا۔''

میں نے قہقہہ مارا۔ ''جان گرے تم سے اتنی احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی۔ کیا خیال ہے۔ وہ مجھے مارنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور میں اسے صرف شکست دینے کی۔''

''مجھے یقین ہے تم ایسا کر سکتے ہو۔'' جان گرے کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''تمہاری تربیت حسن علی نے کی ہے۔ دشمن ہونے کے باوجود میں اس کی صلاحیتوں کو مانتا ہوں۔ ہمارے پاس اس کے پائے کا ایک آدمی بھی نہیں ہے کاش وہ ہمارے ساتھ ہوتا۔''

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ ''تم اتنا بھی جانتے ہو؟''

''میں تمہارے بارے میں کیا نہیں جانتا۔'' وہ ہنسا۔ ''میں تو وہ بھی جانتا ہوں جو تمہاری پرورش کرنے والا جمشید علی خان بھی نہیں جانتا یقین کرو میرے لیے کام کر کے تم پچھتاؤ گے نہیں۔ میں تمہیں تمہاری اصل منزل کی طرف لے جاؤں گا۔''

''مجھے اپنی اصل منزل کی طرف نہیں جانا۔ یہی میری اصل ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا لیکن ہمیشہ کی طرح جان گرے کے منہ سے اپنے ماضی کے بارے میں سن کر مضطرب ہو گیا تھا۔ وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

''جھوٹ مت بولو۔ میں جانتا ہوں تم اپنے ماضی کو جاننے کے لیے بے تاب ہو۔''

''چلو...... یہی سہی۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''بائی دی وے ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں پوچھو۔'' اس نے کمال فراخ دلی سے اجازت دیتے ہوئے یوریشین قیامت کو جام بھرنے کا اشارہ کیا۔

''نائٹ شفٹ انچارج...... کیا تم اس پر اعتماد کرتے ہو؟''

''ہاں کیوں کیا بات ہے۔'' اس نے غور کیا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''اس نے جیل میں ہونے والے ہنگامے کی خبر کسی شخص کو دی تھی اور اس سے جھاڑ بھی کھائی تھی۔''

جان گرے چونکا۔ ''بکومت ہر معاملے میں دخل مت دو۔'' اس نے لہجہ بدل لیا۔ ''اب تم اتنے بھی اہم نہیں ہو۔'' اس نے ریموٹ کا ایک بٹن دبایا۔ ''کم آن اینڈ گیٹ ہم۔''

فوراً ہی دونوں گارڈز اندر آئے۔ میری ہتھکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں ویسے بھی نہیں کھولی تھیں۔ وہ مجھے ایسے ہی واپس لے گئے۔ پندرہ منٹ بعد میں دوبارہ اپنے سیل میں تھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے مجھے سیل میں دھکا دے کر باہر سے تالا لگایا اور ان دونوں گارڈز کو رُخصت کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی میز پر جا کر عریاں تصاویر والا رسالہ نہیں بلکہ فون اُٹھایا تھا اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''واپس آ گیا ہے جی...... یس سر......'' اس نے کہا۔ اس نے کوشش کی تھی اس کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچنے پائے لیکن میں نے سن لیا تھا۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں میں اسے دیکھ لوں گا۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر غرا کر کہا، اس کا انداز محسوس کر کے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے اُٹھ کر باہر والا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک دیوزاد گارڈ تھا۔ اس نے اندر آ کر سوالیہ نظروں سے شفٹ انچارج کی طرف دیکھا اس نے میرے سیل کی طرف اشارہ کیا وہ دیوزاد میری طرف آیا۔

''اے ادھر آؤ۔'' اس نے سلاخوں کے پاس آ کر کہا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر جواب دیا۔ میرے اندر بجتی گھنٹی کی آواز مزید بڑھ گئی تھی۔

''ادھر آؤ۔'' اس نے غرا کر اپنی بات دہرائی اور اپنی رائفل کی نال سلاخوں سے گزار کر میری طرف کر دی۔ ''اگر تم تین گننے تک یہاں نہیں آئے تو میں گولی مار دوں گا۔'' اس کے لہجے میں یقینی سفا کی تھی۔ بادلِ نخواستہ میں اُٹھا۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ مجھے سیل کے اندر ہی گولی مار کر اسے مقابلہ شو کر سکتے تھے ان کے بڑے بے شک ان کی بات پر یقین نہ کرتے لیکن وہ انہیں سزا بھی نہیں دے سکتے تھے۔ نقصان میں میں ہی رہتا کہ مارا جاتا۔ جیسے ہی میں سلاخوں کے پاس پہنچا دیوزاد گنجے نے رائفل کی نال میرے پیٹ پر رکھ دی۔ ''اپنے دونوں ہاتھ باہر نکالو۔''

''وہ کس خوشی میں۔'' میں نے حکم کی تعمیل کیے بغیر دریافت کیا۔

''ہاتھ باہر نکالو۔'' اس نے رائفل کا دباؤ میرے پیٹ پر بڑھایا تو مجھے ہاتھ باہر نکالنے ہی پڑے تھے۔





شفٹ انچارج نے پھرتی سے میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ جو چند لمحے پہلے ہی اُتاری گئی تھیں۔ خطرہ سامنے آ گیا تھا۔ وہ لوگ میرے ساتھ کوئی غلط حرکت کرنے جا رہے تھے لیکن میں مجبور تھا خود کو بچا نہیں سکتا تھا۔ مجھے قابو میں ہوتے دیکھ کر دیوزاد مسکرایا اس نے رائفل زمین پر رکھ کر اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سرنج نکالی۔ ''اسے پکڑو۔'' اس نے شفٹ انچارج سے کہا۔ شفٹ انچارج نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچے میں نے مزاحمت کی۔ ایک لمحے کے لیے میری توجہ دیوزاد سے ہٹی اور اس نے پھرتی سے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر سرنج میری پسلیوں میں اُتار دی۔ میں تڑپ کر رہ گیا تھا۔ سرنج کی وجہ سے نہیں بلکہ دیوزاد نے سرنج سے جو چیز میرے جسم میں اُتاری تھی اس نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سرنج میں کوئی تیزاب بھرا ہو یا آگ تھی جواب اس مقام پر مجھے جلائے دے رہی تھی۔ جہاں سرنج لگی تھی۔

''یہ کیا ہے۔ کتے کے بچو؟'' میں کرب کی شدت سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

دیوزاد نے قہقہہ لگا کر ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔ خالی سرنج اس نے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ بے قراری سے میرا جسم بل کھا رہا تھا۔ درد اتنا تھا کہ میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ شفٹ انچارج اور دیوزاد دلچسپی سے میری تکلیف کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ پھر دیوزاد نے اشارہ کیا اور شفٹ انچارج نے میری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ کھلتے ہی میں لڑکھڑا کر بستر پر جا لیٹا یوں لگ رہا تھا جیسے اس مقام پر اندر سے کچھ کٹ رہا ہو۔ دیوزاد جا چکا تھا اور شفٹ انچارج میری تکلیف نظر انداز کر کے واپس اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ یہ میرے ساتھ کیا کیا گیا ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال اتنا واضح تھا کہ یہ تکلیف مجھے کل کے مقابلے کے سلسلے میں دی گئی تھی۔

میں پسلی دبائے بستر پر لیٹا رہا۔ شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کوئی میری سنتا ہی نہیں اور میں کہتا بھی کس سے اس جزیرے پر میرا واحد ہمدرد جان گرے تھا اور اس تک یہ بات پہنچانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس حرکت سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ نائٹ شفٹ انچارج جسے جان گرے اپنا وفادار سمجھتا تھا۔ اصل میں کسی اور کا آدمی تھا۔ اس نے وہاں سے ہدایت لے کر میرے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا تاکہ میں الیکٹرک کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ اس تکلیف کے عالم میں میرے لیے لڑنا تو ایک طرف رہا سیدھے کھڑے ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔

میں پہلو دبائے پڑا رہا حتیٰ کہ درد کی شدت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ کسی قدر سکون ملنے پر میں نے اپنی قمیص پسلیوں سے اوپر کی۔ مجھے حیرانگی ہوئی اس جگہ کوئی نشان نہیں تھا۔ جلد بالکل ہموار تھی۔ سوائے سرنج کی سوئی کے معمولی سے نشان کے اور اندر ایسا درد ہو رہا تھا کہ چند منٹ کے لیے قیامت بپا ہو گئی تھی۔ معائنہ کر کے میں واپس بستر پر لیٹ گیا۔ دی جانے والی چادر سے میں نے اس

جگہ کو دبایا اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ تکلیف میں اتنی کمی آئی کہ مجھے نیند آ گئی تھی۔ سوتے وقت میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ کل تک میری یہ تکلیف کم نہ ہوئی تو میرے لیے الیکٹرک سے مقابلہ کرنا محال ہو جائے گا۔ وہ بے حد پھرتیلا فائٹر تھا اور مقابلے میں تو کوئی بھی چوٹ سے محفوظ نہیں رہتا۔ میرے اندر سے کوئی بتا رہا تھا کہ اس مقابلے میں پسلی کا یہ مقام میرے لیے شکست کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔ اس پر ہلکی سی ضرب سوتے ہوئے قیامت خیز درد کو پھر سے جگا دے گی۔

مجھے نیند آ گئی تھی۔ کبھی کبھی پسلی میں ٹیس اُٹھتی تھی مگر میں سوتا رہا۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے پسلی میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ میں تڑپ کر اُٹھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے پھرتی سے اپنی چھڑی سلاخوں سے باہر کھینچ لی۔ اس نے یہ چھڑی میری پسلی میں چبھوئی تھی۔ تکلیف میں وہی شدت تھی جو سرنج لگانے کے بعد میں نے محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس نے صرف چھڑی چبھوتی تھی۔ وہ ہنسا۔

"میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا...... جانے سے پہلے تمہیں جگا دوں۔"

میں نے پسلی دبائی۔ "اگر تم نے اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں پوچھنے کے لیے یہ زحمت کی ہے تو یقین کرو وہ رات میرے ساتھ نہیں تھیں۔"

اس کی ہنسی غائب ہو گئی اور وہ مجھے گھورتا ہوا اپنی میز کی طرف چلا گیا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ دن کی ڈیوٹی دینے والا انچارج آنے ہی والا تھا۔ میں نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ بھی آنے والا تھا۔ جب میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا تو بازوؤں کی حرکت سے پسلی میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کچھ دیر میں ڈے انچارج اور ناشتے والا ساتھ ہی آ گئے۔ جب میں ناشتے کی ٹرے اُٹھا رہا تھا تو ڈے انچارج نے پکار کر کہا۔ "لڑکے آج کے مقابلے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں......" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ناشتہ حسبِ فرمائش تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے حسبِ معمول ایکسرسائز شروع کی ابتدا میں پسلی کا درد اعتدال میں رہا لیکن جیسے ہی میں نے جسم کو زیادہ حرکت دی درد نے پھر شدت اختیار کر لی۔ میں پسلی دبا کر واپس بیٹھ گیا۔ اگر یہی صورت حال رہتی تو میرے لیے مقابلہ کرنا محال ہو جاتا۔ مقابلہ ملتوی بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے میں کیا عذر کرتا میری پسلی پر کوئی شک تک نہیں تھا۔ کوئی نہ مانتا کہ مجھے اس جگہ جان لیوا قسم کا درد ہو رہا ہے۔ جب درد کم ہوا تو دوبارہ ورزش شروع کی اور جب درد بڑھنے لگتا تو روک دیتا۔ یہ سلسلہ سارے دن چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مقابلے کے لیے مجھے سات بجے لے جایا جائے گا۔ اس لیے جانے سے پہلے میں نے دو گھنٹے آرام کیا۔ عام حالات میں مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن پسلی کے درد کی وجہ سے آرام کرنا لازمی تھا تا کہ مقابلے کے آغاز سے پہلے وہ ایک حد میں رہے۔ درد زیادہ ہونے کی صورت میں میرے لیے حرکت کرنا بھی دشوار ہو جاتا۔

ٹھیک سات بجے گارڈز آ گئے۔ انہوں نے مجھے باہر نکال کر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائیں۔





باہر لا کر جیپ کے عقبی حصے میں آئرن اینگل سے باندھا اور کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں کلب کی عمارت کی وسعت کے بارے میں سوچتا تو حیرت ہوئی یہ اتنی وسیع و عریض عمارت زیرِ زمین بنانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے بے پناہ سرمائے کے ساتھ خاصی بڑی افرادی قوت کی ضرورت بھی تھی۔ افرادی قوت بطور لیبر لانا خسارے کا سودا تھا ان لوگوں کے لیے سب سے آسان کام یہ تھا کہ ایشیا سے غلام حاصل کریں اور ان سے بیگار لیں میرا اندازہ تھا اس جزیرے کی جتنی بھی تعمیرات تھیں ان سب کو بیگاریوں نے تیار کیا تھا۔ اس جزیرے پر جا بجا مظلوم انسانوں کا خون پسینہ بکھرا ہوا تھا۔

آج کلب میں معمول سے کہیں زیادہ رش تھا۔ خاص طور سے نائٹ کلب میں لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مجھے لے جانے کے لیے باقاعدہ راستہ بنانا پڑا۔ ایک طرف منڈلی بنائے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کوکین اور ہیروئن کا نشہ کر رہے تھے ان میں سے اکثر ایشیائی تھے۔ میری رگ و پے میں تلخی گھلنے لگی۔ اپنی نوجوان نسل کو ہیروئن اور دوسری منشیات کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے ملکوں پر بم باری کرنے والے ایشیائی اقوام کو کھل کر ہیروئن اور خطرناک منشیات کا عادی بنا رہے تھے۔

لفٹ نے ہمیں براہِ راست ایرینا والے فلور تک پہنچایا۔ پہلے مجھے ایک زیرِ زمین گیلری میں لے جایا گیا۔ جو آگے جا کر نیم دائرے کی صورت میں دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ گیلری ایرینا کے گرد گھوم رہی ہے۔ مکمل خاموشی تھی۔ ایک کمرے میں لا کر جو ڈریسنگ روم لگ رہا تھا میری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دیں۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے بکر ماسنگھے کہتے ہیں۔" اس نے صاف انگریزی میں کہا۔ "میں آپ کا خادم ہوں۔"

گارڈز مجھے چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ بکر ماسنگھے نے میرا لباس اُتارا۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ میری مالش کر کے مجھے وارم اَپ کر سکتا ہے۔ مجھے وارم اَپ کی ضرورت تھی۔ حرکت کر کے وارم اَپ ہونے میں پسلی کا درد پھر سے جاگ اُٹھنے کا ڈر تھا۔ اس لیے میں نے بکر ماسنگھے کی پیش کش قبول کر لی۔ میں نے اس سے ایک عدد مارکر مانگا۔ اس نے کسی قدر حیرت کے ساتھ مجھے مارکر دے دیا۔

میں نے اپنی پسلی پر درد کے مقام پر دائرہ بنایا۔ "اس جگہ انگلی بھی مت لگانا۔"

"اچھا جناب۔" اس نے بلا سوال مان لیا۔ بکر ماسنگھے نام اور نقوش سے سری لنکا کا لگتا تھا لیکن فی الوقت میں اس کے بارے میں جاننے کا خواہشمند نہیں تھا۔ میں اپنی ساری توجہ آنے والے مقابلے پر مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ بکر ماسنگھے نے مجھے اوندھے منہ ایک میز پر لٹایا اور کسی ہلکے سے تیل سے میری مالش شروع کی۔ بلاشبہ وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے سخت ہاتھ لگانے سے گریز کیا اور نرم ہاتھوں سے میرے جسم کے مسلز والے حصوں کی مالش کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ میرا جسم گرم ہونے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"صاحب آپ کا تعلق کس مغربی ملک سے ہے؟"

وہ بے چارہ مجھے مغربی باشندہ سمجھ رہا تھا۔ ''میں یورپ یا امریکہ کا رہنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں۔''

بکرماسنگھ دنگ رہ گیا۔ ''پر آپ دیکھنے میں بالکل گورے صاحب لگتے ہو۔''

میں ہنسا۔ ''لگتا ہوں پر ہوں نہیں۔ میرا نام یوسف ہے۔''

''صاحب آپ کا کیا قصور ہے۔ ان لوگوں نے کیوں پکڑ رکھا ہے آپ کو؟''

''جرم بے گناہی ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے تو سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ اب مقابلہ کر کے میں اس سزا سے بچ سکتا ہوں۔''

''بدھا آپ کو کامیاب کرے۔'' اس نے خلوص سے کہا اور تندہی سے میری مالش کرنے لگا۔ ایک گھنٹے تک لگا تار مالش کر کے اس نے مجھے وارم اَپ کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک جاذب کپڑے سے پورا جسم صاف کیا۔ اس کے بعد لباس کا انتخاب تھا۔ بکرماسنگھے نے دیوار گیر وسیع وعریض الماری کھولی۔ جس میں ہر قسم اور ہر سائز کے کپڑے تھے۔ میں نے ایک ہلکے شارٹ کا انتخاب کیا جو ڈوری سے بندھا تھا۔ یہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تک تھا اوپر کے لیے ایک کسی قدر ڈھیلی ٹی شرٹ کا انتخاب کیا۔ یہ لباس تیزی سے حرکت کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ پیروں میں سخت ربر کے تلے والے جوتے پہنے۔ ان کی چوٹ سخت ہوتی ہے اور یہ حرکت کرنے میں آسانی مہیا کرتے ہیں۔ پسلی میں ابھی تک آرام تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہاں درد کی وجہ پوشیدہ ہے...... بلکہ زہر جو انجکٹ کیا گیا تھا اس کا مقصد مجھے مقابلے کے دوران کمزور کرنا تھا۔

''یوسف صاحب پھلوں کا جوس لے لو۔'' بکرماسنگھے نے مشورہ دیا۔ ''یہ سادہ پانی سے اچھا رہتا ہے۔''

لیکن میں وہاں کچھ پینے یا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا عین ممکن تھا انہوں نے جوس یا پانی میں کچھ ملا دیا ہو۔ ان خبیث فطرت لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ میں نے حوالات سے چلتے ہوئے مناسب مقدار میں پانی پی لیا تھا۔ اس لیے مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ رات کا کھانا مجھے چھ بجے ہی دے دیا گیا تھا۔ نو بجے تک میں مکمل طور پر تیار تھا۔ اچانک ڈریسنگ روم میں ایک اجنبی آواز گونجی۔

''مسٹر یوسف...... تم تیار ہو؟''

''ہاں......'' میں نے اس دیوار کی طرف دیکھا جس میں پوشیدہ سپیکر سے آواز آئی تھی۔

''گڈ...... تمہارا مقابلہ ٹھیک ساڑھے نو بجے ہوگا۔'' آواز نے کہا۔ ''اس وقت تک ایرینا میں پہنچ جانا یاد رکھنا پانچ منٹ کی تاخیر پر تمہیں مقابلے میں شرکت سے روک دیا جائے گا اور تمہارے مخالف کو واک اوور دے دیا جائے گا۔''

''تم فکر مت کرو کہو تو ابھی آ جاؤں۔'' میں نے پیش کش کی لیکن آواز پھر نہیں آئی۔ میں نے بکرماسنگھے سے اور مقابلوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بے بسی سے شانے ہلائے۔ ''صاحب





ہم کو نہیں معلوم ہمیں اس جگہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' جان گرے نے مجھے بتایا تھا کہ ایرینا کے مقابلے ہفتے میں دو دن ہوا کرتے تھے اور ہر دن کئی مقابلے ہوتے تھے اس کا مطلب تھا کہ ہفتے میں کئی افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے لیکن دولت کے لالچ میں اپنی جان داؤ پر لگانے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کیونکہ جیت کی صورت میں انہیں خطیر رقم ملا کرتی تھی۔ ایک مقابلہ جیت کر وہ اتنا کما لیتے تھے کہ سالوں بیٹھ کر کھا سکتے تھے۔ ہارنے کے لیے ان کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ نہیں تھا ان مقابلوں کو دیکھنے کے لیے دنیا کے دولت مند ترین لوگ آتے تھے۔ ان میں خاص طور سے خلیجی ممالک اور جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے دولت مند تھے۔ ایرینا میں ایک عام نشست ہزار ڈالرز کے عوض ملتی تھی۔ جبکہ خاص نشستیں اور وی آئی پی باکس حد سے زیادہ مہنگے تھے۔

بکرماسنگھے نے بتایا۔ ''صاحب سال میں ایک بار اِدھر ٹورنامنٹ بھی ہوتا ہے۔ جس میں تمام دنیا سے لڑنے والے آتے ہیں۔ پورے ایک ہفتے تک مقابلے ہوتے ہیں۔ جو ٹورنامنٹ جیتتا ہے اسے ایک ملین ڈالرز کا انعام اور ہیروں کی بیلٹ دی جاتی ہے۔''

''یعنی تم بہت مصروف ہو جاتے ہو گے۔''

''ہاں صاحب۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''ان دنوں صحیح سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔''

''بکرما تم یہاں کیسے آئے؟''

''قسمت کی بات ہے صاحب...... میرا باپ بھی مساج کرتا تھا۔ وہ علاج بھی کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس پٹھوں اور جوڑوں کا درد نکلوانے آتے تھے۔ اس نے مجھے تربیت دی تھی حالانکہ میری خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ میں باپ کے مساج گھر میں کام کرتا تھا ایک روز ایک گورا صاحب آیا۔ وہ میرے مساج سے بڑا خوش ہوا اس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر میں مڈل ایسٹ آ جاؤں تو مجھے کہیں زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ لالچ میں آ کر میں نے اس کی بات مان لی۔ اپنے باپ کو بھی نہیں بتایا چپکے سے اس انگریز کے ساتھ چلا گیا۔ وہ مجھے پہلے کولمبو لے گیا۔ پھر تاملوں کے علاقے میں لے گیا۔ جہاں سے ایک کشتی میں بٹھا دیا۔ کشتی پر لاتے ہی مجھے پکڑ کر بند کر دیا اور جب ایک ہفتے بعد نکالا تو میں اس جزیرے پر تھا۔''

''کتنا عرصہ ہوا تمہیں یہاں آئے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال اور چار مہینے۔'' اس نے حساب لگایا۔ ''یہ کہتا ہے کہ ہمیں پانچ سال بعد واپس بھیج دیا جائے گا۔ ہمیں اتنی رقم بھی دے گا جس سے ہم واپس جا کر اپنا کاروبار کر سکیں۔''

میں نے اسے بتایا نہیں کہ اب وہ کبھی واپس نہیں جا سکے گا اور اس نے بغاوت کی تو سمندر کی تہہ اس کا مقدر بنے گی۔ میرا اندازہ درست تھا کہ افرادی قوت کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ لوگ بردہ لاتے تھے۔ سستی افرادی قوت جسے صرف دو وقت کی روٹی اور معمولی سی تفریح دینا پڑتی تھی۔ یہ لوگ ان کی باقاعدگی سے نگرانی کرتے تھے جس پر انہیں شک ہوتا کہ وہ آزادی کے لیے کچھ زیادہ ہی

بے تاب ہو رہا ہے یہ اسے زندگی کی قید سے ہی آزاد کرا دیتے تھے۔ باقی جو لوگ زندگی سے عیاشی مانگتے ہیں ان کے لیے انہوں نے خاصا بندوبست کر رکھا ہے۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام کر کے وہ شام کو جانوروں کی ہی طرح مادر پدر آزاد زندگی سے لطف اندوز ہو کر سو جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں نے انہیں نشے کی لت پر بھی لگا رکھا تھا۔ تا کہ وہ اس میں کھو کر آزادی کا مفہوم ہی فراموش کر دیں۔

بکرما سنگھے نے مجھے چونکایا۔ ''صاحب نو بج کر پچیس منٹ ہو گئے ہیں۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ باہر مجھے لانے والے گارڈز مستعد تھے۔ انہوں نے مجھے پھر سے ہتھکڑیاں پہنانا چاہیں۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس کی ضرورت ہے تا کہ مقابلہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ تم سزا یافتہ قیدی ہو اور مقابلہ کر کے اپنی سزا معاف کروانے آئے ہو۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے اُچکائے اور ہتھکڑی پہن لی۔ اس گیلری کے دونوں طرف ڈریسنگ روم تھے جہاں مقابلہ کرنے والے تیار ہوتے تھے۔ جہاں سے گیلری نیم دائرے میں گھوم رہی تھی۔ اس طرف دیوار میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ ان سے ایرینا کا منظر صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایرینا سے باہر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے دائیں طرف کی گیلری والے دروازے سے میں اندر داخل جیسے ہی دروازہ کھلا ایرینا کا شور سنائی دیا۔ گویا اندر کا حصہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔ شور سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آج ایرینا میں خاصی تعداد میں تماشائی آئے تھے۔ گارڈز نے وسط میں لا کر میری ہتھکڑی کھولی اور باہر چلے گئے اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں اس دروازے سے دو ہی صورتوں میں گزر سکتا تھا۔ فاتح بن کر اپنے پیروں پر یا لاش کی صورت میں اسٹریچر پر، ایرینا کا میدان تقریباً تیس فٹ قطر کا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیروں تلے پتلا سا ربڑ تھا۔ یہ بے حد معمولی سا تحفظ دیتا تھا۔ زور سے گرنے کی صورت میں چوٹ لازماً لگتی۔ چاروں طرف دیوار پر بھی ایسا ہی پتلا سا ربڑ چڑھا تھا۔ دیواریں کوئی پانچ فٹ اونچی تھیں اور ذرا ترچھی ڈھلان کی صورت میں تھیں مقصد یہ تھا کہ ایرینا میں بیٹھے ہر فرد کو سب صاف نظر آئے۔

ایرینا میں ساڑھے تین سو افراد تھے۔ یہ سب جنونی افراد تھے جن کی نفسیات خون اور قتل دیکھ کر تسکین حاصل کرتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر امیر ایشیائی ممالک کے امراء تھے کچھ سفید فام ممالک کے باشندے بھی تھے۔ بعض افراد پر مجھے شک ہوا کہ ان کا تعلق پاکستان یا انڈیا سے ہے۔ تقریباً ہر شخص کے ساتھ ایک عورت ضرور تھی۔ میں نے اس گوشے کی طرف دیکھا جہاں سے ایول نے نوکدار سلاخ کا ہتھیار حاصل کیا اور بالآخر اس ہتھیار کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ ایرینا میں خنکی تھی۔ ایئر کنڈیشننگ سسٹم کو تیز رکھا گیا تھا۔ اس لیے میں نے جسم گرم کرنے کے لیے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل اُچھلنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے اپنا دُکھتا پہلو چھوا ہلکی سی ٹیس اُٹھی جو قابلِ برداشت تھی۔





ابھی تک الیکٹرک نے چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ مقابلے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں سکون سے ایرینا کے وسط میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ فضا میں مدھم سی لیکن لہو گرمانے والی دھن بج رہی تھی۔ میری آمد پر جو شور اُٹھا تھا وہ اب تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔

تماشائیوں میں مجھے ڈیئر ڈان نظر آیا۔ اس کی نگاہوں میں ایک زہریلی نفرت تھی۔ وہ میری شکست اور موت کا منظر دیکھنے آیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ کل رات میرے ساتھ جو ہوا تھا وہ ڈیئر ڈان کے اشارے پر ہوا تھا یا وہ بھی اس کام میں ملوث تھا۔ میرے علم میں وہی ایک شخص تھا جو جان گرے کی ٹکر کا تھا اور دونوں کی آپس میں لگتی بھی تھی۔ ڈیئر ڈان نے ایک بار پہلے بھی مجھ سے جان گرے کی دلچسپی کے بارے میں اُگلوانے کی کوشش کی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ جان گرے مجھے بچانے کی کوشش کر رہا ہے جیسے مجھے شبہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر میری موت کا خواہاں ہے۔

انتظار سے تنگ آ کر میں نے بلند آواز اور اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''الیکٹرک کہاں ہے مجھے کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''الیکٹرک حاضر ہے۔'' عقب سے ایک سرد اور بھاری آواز آئی میں نے گھوم کر دیکھا الیکٹرک میرے عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ کب آیا مجھے قطعی پتا نہیں چلا تھا۔ اگر وہ میری بے خبری میں حملہ کر دیتا تو کوئی اسے ملامت نہ کرتا اس ایرینا میں اصول و اخلاق نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ یہاں وحشت اور درندگی آمیز عیاری کا کام تھا۔ الیکٹرک نے متاثر کیا تھا مجھے۔ میں نے خوشدلی سے کہا۔

''دوست بڑی دیر لگا دی۔ ہمارے ہاں ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے لیکن تمہیں میں مہربان نہیں کہہ سکتا۔''

اناؤنسر مقابلے کی شرائط بیان کر رہا تھا۔ بلکہ ایک ہی شرط بیان کر رہا تھا کہ دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتار دینے والا ہی فاتح ہو گا۔ الیکٹرک سرد نگاہوں سے لیکن بہ غور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے اس کے جذبات بھانپنا محال تھا۔ اس کے باوجود مجھے لگا جیسے وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ حسبِ معمول وہ سیاہ رنگ کے ٹراؤزر اور سیاہ ہی پوری آستین کی بند گلے کی ٹی شرٹ میں تھا۔ پیروں میں جوتے اور ہاتھوں میں دستانے بھی تھے۔ اناؤنسمنٹ ختم ہوتے ہی گویا مقابلے کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تماشائی شور مچانے لگے تھے۔ یہاں پر شرطیں بھی لگتی تھیں۔ تقریباً ہر فرد نے شرط لگائی تھی اسی بناء پر تقریباً ہر فرد چیخ چیخ کر اپنے پسندیدہ لڑاکے کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ عربوں کے ایک گروپ کو میں نے اپنا نام پکارتے سنا۔ اگرچہ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ انہوں نے مجھ سے کسی ہمدردی کی بناء پر شرط لگائی تھی۔ ان میں اگر دینی محبت ہوتی تو وہ یہاں ہوتے ہی نہیں۔

زیادہ تر افراد الیکٹرک کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ان میں خاصا

مقبول تھا یقیناً اس سے پہلے بھی اس جگہ پر کئی مقابلے جیتے تھے۔ ایک مقابلہ تو میں نے بھی سکرین پر دیکھا تھا۔ جس میں الیکٹرک نے ایک گھونسے میں اپنے حریف کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے غور سے اس کے ہاتھ دیکھے۔ معمولی قد وقامت سے قطع نظر اس کے ہاتھوں کے پنجے بڑے تھے اور کلائیاں بھی بھاری تھیں۔ یہ اس کا خطرناک ہتھیار تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس کے مکوں سے خاص طور سے بچنا ہے۔ اناؤنسمنٹ ختم ہوتے ہی الیکٹرک نے میرے اردگرد تھرکنا شروع کر دیا اس کا انداز ڈانس کرنے والا تھا۔ اس کے پاؤں خاص طور سے بڑی تیزی سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا ہے کہ حریف کس طرف سے حملہ کرے گا۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا میں نے اس کے جسم کی طرف دیکھنا بند کر کے اپنی ساری توجہ اس کے چہرے اور خاص طور سے آنکھوں کی طرف مبذول کر لی۔ وہ مسکرایا اور یک دم اس نے میری طرف چھلانگ لگائی۔ دو قدم دوڑ کر وہ کسی پرندے کی طرح ہوا میں بلند ہوا اور اس نے لگاتار ککس میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ دیکھنے میں یہ وار بہ ظاہر شاندار اور خطرناک لگتا ہے لیکن اس کی افادیت حریف کو ذرا ڈرانے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ میں نے کلائیوں پر اس کے پیروں کے وار روکے اور وہ زمین پر اُتر گیا۔ میں دفاع کرتے ہوئے پسپا ہوتے ہوتے دیوار تک چلا گیا تھا۔

زمین پر اُترتے ہی اس نے اُچھل کر لات میرے سر پر مارنے کی کوشش کی پیچھے ہٹنے یا نیچے ہو کر اس کے وار سے بچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے یہ وار بھی کلائی پر روکنا پڑا۔ گھومتی ہوئی لات سے وار کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ مجھے شدید قسم کا جھٹکا لگا۔ میں لڑکھڑا کر بائیں طرف گیا۔ پہلو میں سوئے ہوئے درد نے انگڑائی لی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ اسے بجلی کیوں کہا جاتا تھا۔ فرش پر اُترتے ہوئے اس کا رُخ مخالف سمت میں ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر دولتی سی جھاڑی۔ ایک ایڑی عین درد کے مقام پر لگی اور درد کا عفریت دھاڑ کر مجھے اندر سے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ الیکٹرک نے چونک کر میری طرف دیکھا اس کا وار مؤثر تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میری چیخ نکل جاتی۔ میں نے پہلو سے ہاتھ ہٹا کر اپنا کمزور حصہ اس سے چھپانے کی کوشش کی مگر اس نے بھانپ لیا تھا وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

"دوست لگتا ہے تم پہلے بھی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا اور یک دم اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر نہایت صفائی سے بچا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اس کے شانے پر وار کیا وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گیا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ "تم بھی لڑنے کا فن جانتے ہو دوست؟"

میں گہری سانس لے کر درد پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ الیکٹرک پھر پیروں کے بل تھرکنے لگا۔ بہ ظاہر میرے وار کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اگلا حملہ اس نے میرے کمزور پہلو پر ہی





کیا۔ میں اس کی توقع کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے مشین کی طرح برسنے والے گھونسوں سے کامیابی سے دفاع کیا اور اس اثناء میں وہ اصل وار کر گیا۔ اس کی سیدھی لات میرے بائیں گھٹنے پر لگی اور میں زمین بوس ہو گیا۔ درد نے ایک بار پھر قیامت بپا کر دی تھی۔ میں فرش پر قلابازیاں کھا کر الیکٹرک سے دور ہوا ورنہ اس کی لات پسلی پر لگتی تکلیف کی شدت سے میرے لیے سانس بھی لینا محال ہو رہا تھا۔ الیکٹرک نے ایک بار پھر دھوکا دیا۔ اس نے یہ وار بھی نمائشی کیا تھا اور جب میں سدھے ہوئے بندر کی طرح قلابازیاں کھا کر سیدھا ہوا تو اس نے نہایت پھرتی سے اس مقام پر دوبارہ وار کر دیا جوتے کی نوک میری پسلیوں پر لگی۔

ایسا لگا جیسے میرے اندر آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ میری آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ میں نے پہلو کو تھاما تو میرا ہاتھ نم اور گرم شے سے بھر گیا تھا۔ میرے پہلو سے خون بہہ نکلا تھا۔ درد نے ہاتھ پیروں کی جان نکال دی تھی۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں کے بل زمین سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تماشائیوں کے شور نے ایرینا سر پر اُٹھا لیا تھا۔ ان میں زیادہ لوگ میری موت کے خواہاں تھے۔ جان گرے اور چند لوگ جنہوں نے مجھ پر شرط لگائی تھی میری فتح چاہتے تھے لیکن کسی ہمدردی کی بناء پر نہیں بلکہ مالی مفاد کے لیے۔ بے اختیار مجھے کاجل یاد آئی۔ وہی اس دنیا میں ایک ہستی تھی جو مجھ سے محبت کرتی تھی اور میں اس سے محبت کرتا تھا۔ الیکٹرک کسی چیتے کی سی خاموشی اور سرد مزاجی سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا شکار زخمی ہو کر اس کے سامنے بے یار و مددگار پڑا تھا اور وہ اس پر فیصلہ کن وار کرنے پر غور کر رہا تھا۔ مجمع اس سے چیخ چیخ کر میرے قتل کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے گویا فضا میں پرواز کی۔ اس کا دایاں پاؤں وار کا مہلک انداز بناتے ہوئے میری گردن کی طرف آ رہا تھا کوئی لمحہ جاتا تھا کہ یہ وار میری گردن پر لگتا اور یوسف علی خان کی کہانی ختم ہو جاتی۔

درد کے باوجود میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ بازی ابھی ختم نہیں ہوئی......

بے شک میں ناز و نعم سے پلا تھا، دنیا جہاں کی ہر آسائش میں نے دیکھی اور برتی تھی۔ اس کے باوجود بے شمار آزمائشوں اور سختیوں سے گزرا تھا۔ کبھی ان سے ہار نہیں مانی۔ کبھی آزمائشوں سے منہ نہیں موڑا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال کر خود کو موت کے حوالے کر دیتا۔ ایسا کرنا میری تربیت ہی نہیں فطرت کے بھی خلاف تھا۔ عجیب بات تھی کہ یہ خیال آتے ہی میرے درد میں جیسے کمی آنے لگی تھی اور ذہن پر طاری ہونے والی دھند چھٹ رہی تھی۔ الیکٹرک کے دائیں پاؤں کی ایڑی کا ہدف میری گردن تھی۔ اس کی ایڑی کے عقب میں اس کے جسم کی تمام تر طاقت تھی۔ اگر یہ وار کسی بھینسے کی گردن پر پڑتا تو اسے بھی توڑ کر رکھ دیتا۔ میری حیثیت ہی کیا تھی اس کے سامنے۔

میری پوری توجہ اس کی ایڑی کی طرف تھی۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آیا، میں اُٹھنے کے بجائے فرش پر گر گیا۔ پاؤں زن سے میرے پاس سے گزر کر فرش پر لگا۔ الیکٹرک کے دوسرے پاؤں کا گھٹنا

میری پشت پر لگا لیکن اس کی پوزیشن وار کرنے والی نہیں تھی۔ میں نے الیکٹرک کے فرش پر لگنے والے پاؤں کے گرد اپنا بازو حائل کیا اور اُلٹی سمت میں پلٹ گیا۔ وار خالی جانے کی حیرت نے الیکٹرک کو چند لمحے کے لیے سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اس لمحاتی غفلت سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کی پنڈلی کھڑے جسم کے بوجھ اور فرش کی سختی کے درمیان آ گئی اور جب اس پر میرے جسم کا بوجھ پڑا تو الیکٹرک اپنی پنڈلی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے تیزی سے فرش کی طرف گرا لیکن میرے گھومنے کی رفتار کہیں تیز تھی۔ فضا میں سوکھی لکڑی چٹخنے جیسی آواز آئی۔

الیکٹرک کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ اُلٹ کر فرش پر جا گرا۔ اپنا سر اس نے بہرحال بچا لیا تھا ورنہ یہ چوٹ اسے ہلاک نہ بھی کرتی تو ہوش و حواس سے بے گانہ ضرور کر دیتی۔ زمین پر گرتے ہی اس نے تڑپ کر بائیں لات چلائی جو میرے شانے پر لگی لیکن اس وار میں زیادہ دم نہیں تھا۔ اس کے اگلے وار سے پہلے ہی میں نے اس کی دائیں ٹانگ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ پہلی کروٹ سے اُلٹی سمت میں۔

الیکٹرک کے منہ سے اس بار پھر چیخ نکلی تھی۔ پنڈلی کی دونوں ہڈیاں واضح طور پر ٹوٹ گئی تھیں۔ یہ فیصلہ کن داؤ تھا۔ میں اسے چھوڑ کر دور ہو گیا۔ جب میں فرش سے اُٹھا تو الیکٹرک دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹوٹ جانے والی ہڈی پکڑے ہوئے تھا۔ چیخ نکلنے کا عمل بے اختیار تھا لیکن اب اس کے چہرے پر تکلیف کے معمولی سے آثار بھی نہیں تھے۔ میرے دائیں پہلو سے لہو بہہ رہا تھا۔ الیکٹرک کی کِک نے اندر سے گوشت پھاڑ دیا تھا۔ اس کی تکلیف تھی لیکن وہ جو مجھے اندر سے درد کاٹ رہا تھا خاصا کم ہو گیا تھا۔ میں نے ٹی شرٹ اُٹھا کر دیکھا، پھٹے ہوئے زخم سے خون کے ساتھ ایک پیلاہٹ مائل مادہ بھی بہہ رہا تھا۔ شاید یہی وہ زہر تھا جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ کِک لگنے سے گوشت پھٹا اور اس میں پھنسا ہوا زہریلا مواد خون کے ساتھ بہہ گیا۔ شرٹ نیچے کر کے میں نے الیکٹرک کی طرف دیکھا۔ وہ میرا حریف تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی محسن بھی تھا۔ بے شک اس نے انجانے میں میری مدد کی تھی اس کی وجہ سے مجھے درد سے نجات ملی تھی۔ وہ اپنا پیر تھامے فرش پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر حسبِ معمول ایک سپاٹ سا تاثر تھا البتہ آنکھیں جو مجھ پر مرکوز تھیں، سوال کر رہی تھیں کہ اب میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ صرف سوال تھا۔ اس نے رحم کی اپیل نہیں کی تھی، بے اختیار میرے اندر اس کے لیے احترام اُبھرا۔ میں مسکرایا۔

”دوست کیا تم اب بھی مجھ سے مقابلہ کرنے کے خواہشمند ہو۔“

اس نے اپنی ٹوٹی ہڈی کی طرف دیکھا۔ ”اس کے ساتھ میں کیسے لڑوں گا۔ تماشہ بن کر لڑنا مجھے گوارہ نہیں ہے، اگر تم نے مجھے مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو فوری طور پر اس پر عمل کرو۔“

مجمع جواب تک بازی پلٹنے پر دم بخود تھا، اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایک آواز ہو کر الیکٹرک کو قتل کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مجھ پر شرط لگانے والے جیتنے کی خوشی میں سرشار یہ مطالبہ





کر رہے تھے لیکن وہ لوگ جنہوں نے الیکٹرک کی فتح پر شرط لگائی تھی، اپنی ہار کو الیکٹرک کے خون سے رنگنا چاہتے تھے تاکہ ہار کی بے کیفی کچھ کم ہو۔ وہ لوگ مشتعل تھے۔ میں نے انسانی خون کے شائق ان انسان نما درندوں کو حقارت سے دیکھا۔ اس دوران میں اناؤنسر کاؤنٹ ڈاؤن کر رہا تھا۔ جب بارہ تک گننے کے باوجود الیکٹرک اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا تو مجھے اختیار دیا گیا کہ میں چاہوں تو اسے معاف کر دوں یا قتل کر دوں، ساتھ ہی رائے عامہ کے مطالبے کو پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے حقارت سے جواب دیا۔

”میں آب پاشی کرتا ہوں تمہارے اختیار پر اور اس رائے عامہ پر...... میں الیکٹرک کو معاف کرتا ہوں، بے شک یہ ایک بہادر دشمن ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔“

جو لوگ میری بات سن سکے اور انہوں نے اسے سمجھا ان کے چہروں کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ یہ بے لگام مغرور امیر زادے تھے۔ دولت ان کے گھر کی لونڈی تھی اور اس کی طاقت کے بل بوتے پر وہ خود کو خدا سمجھنے لگے تھے۔ ان فرعونوں کو آج تک کسی نے ایسا دندان شکن جواب نہیں دیا تھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور گارڈز جارحانہ انداز میں ایرینا میں داخل ہوئے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ مجھے دوبارہ ہتھکڑی پہنائی گئی۔ جب مجھے دروازے کے اندر لے جایا جا رہا تھا تو دوسرے دروازے سے اسٹریچر اُٹھائے پیرامیڈک ایرینا میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے دروازہ بند ہونے سے پہلے الیکٹرک کو دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ بھی پہلی بار مسکرایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔

اندر آتے ہی گارڈز کا سخت رویہ نرم ہو گیا تھا۔ ایرینا میں غالباً وہ تماشائیوں کو دکھانا چاہ رہے تھے کہ ان کی خواہش نہ ماننے والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے ڈریسنگ روم میں لایا گیا جہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس میرے منتظر تھے۔ ڈاکٹر بھی سری لنکن تھا لیکن نرس جورشین تھی، اس کی رگوں میں کسی سفید فام کے علاوہ مشرق بعید کی کسی نسل کا خون بھی شامل تھا۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی رہا ہے دنیا کی دلکش ترین عورتیں سفید فام اور مشرق بعید کے خون کے ملاپ سے وجود میں آتی ہیں۔ جب امریکی اور فرانسیسی مشرق بعید کے ملکوں میں برسرپیکار تھے تو ایک طرف تو ان کی سپاہ کیمونزم کا نعرہ لگا کر مقامی لڑکوں کا قتلِ عام کر رہی تھیں تو دوسری طرف فوج کے جوان مقامی عورتوں کو ناجائز بچوں کے تحفے دے رہے تھے۔ جنگ ویت نام کے فاتح اور تھائی لینڈ کی معیشت سدھرنے کے بعد اس خطے میں یورشین بچوں کی پیدائش میں خاصی کمی آئی ہے اور اینگلو انڈین کی طرح یہ نسل بھی رفتہ رفتہ ناپید ہو رہی ہے۔

نرس نے پہلے میری قمیص اُتاری، ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کیا اور کسی قدر فکرمند ہو کر سر ہلایا۔ پیلا مادہ اب بھی نکل رہا تھا۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹنے کو کہا پھر روئی سے زخم صاف کر کے اس کا معائنہ کیا۔ ”تم اتنے خوفناک زخم کے ساتھ لڑتے رہے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ زخم تو ابھی لڑائی کے دوران لگا ہے۔''

''میں باہر کے نہیں اندر کے زخم کی بات کر رہا ہوں۔ اس میں زہریلا مواد بن رہا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تمہارا ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔'' اس نے اپنے بیگ سے سرجری کے اوزار نکالے۔

نرس نے اپنے سُبک ہاتھوں سے زخم کو مکمل طور پر صاف کیا۔ ڈاکٹر نے مجھے زخم سن کرنے والا انجکشن لگایا اور اپنے اوزار سنبھال کر زخم پر جھک گیا۔ بکر ماسنگھے بھی موجود تھا اور فی الوقت نرس میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا جو اس کی قربت سے بے نیاز پوری تندہی سے ڈاکٹر کی معاونت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مشکل سے نصف گھنٹے میں آپریشن کر کے اندر رہ جانے والا باقی زہریلا مواد بھی باہر نکال دیا اور زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ ساتھ ہی اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا اندر انفیکشن کے آثار نہیں ملے پھر یہ زہر پیدا کیسے ہوا؟''

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ یہ زہر پیدا نہیں ہوا بلکہ بیرونی ذرائع سے زبردستی میرے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ سرجری کے بعد اس نے ٹانکے لگائے۔ مجھے دو عدد انجکشن مزید لگائے اور زخم کو چار دن پانی سے محفوظ رکھنے کو کہا۔ بکر ماسنگھے نے مجھے اورنج جوس دیا جو میں نے بلا خطر پی لیا۔ پھر رشین نرس نے مجھے لباس پہنانا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔

''شکریہ...... چھ سال کی عمر سے اپنا لباس میں خود تبدیل کر رہا ہوں۔''

میرا اپنا لباس خاصا میلا ہو چکا تھا اس لیے میں نے اس کے بجائے ڈریسنگ روم کی الماری سے ایک عدد ٹراؤزر اور ٹی شرٹ نکال کر پہنی۔ ڈریسنگ روم میں آتے ہی گارڈز نے میری ہتھکڑی اُتار دی تھی۔ آپریشن کے لیے لگائے جانے والے سن کر دینے والے انجکشن سے رہی سہی تکلیف بھی ختم ہو گئی تھی۔ درحقیقت آپریشن اور زخم کی تکلیف بھی اس درد کا پاسنگ نہیں تھی جو ان لوگوں کے لگائے انجکشن سے ہوئی تھی۔ ایسا کرتے وقت وہ بھول گئے تھے کہ فیصلہ کرنے والی ہستی کوئی اور ہے۔ وہ چاہے تو دشمن کی طرف سے کیا جانے والا وار بھی جان بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ الیکٹرک نے اپنے طور پر میرے کمزور پہلو پر وار کیا تھا اس کے جوتے کی سخت ایڑی نے اس جگہ سے گوشت پھاڑ دیا تھا اور اندر جمع ہونے والا زہریلا مواد خون کے ساتھ بہہ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لباس بدل کر میں نے بکر ماسنگھے کو آواز دی۔

''صاحب مجھ کو آپ کے جیتنے کی بے حد خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے بتایا۔ ''آپ کہیں تو میں آپ کی مالش کر دوں۔''

''تمہارا شکریہ بکر ما۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہاری یہ خدمت فراموش نہیں کروں گا۔''

اس نے سرد آہ بھری۔ ''صاحب اپنی زندگی میں بس یہی ایک خوشی رہ گئی ہے۔ آپ جیسے





لوگوں کی خدمت کر کے اور باتیں کر کے دل بہلا لیتے ہیں۔''

میں نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں ڈیڑھ سو ڈالرز پڑے تھے۔ بحری جہاز پر ہمیں ڈالرز کی صورت میں تنخواہ ملتی تھی۔ میں نے یہ ساری رقم بکر ماسنگھے کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ رکھ لو یار۔''

''نہیں صاحب...... میں نے اس لیے آپ کی خدمت نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں دوست...... پر میں بھی معاوضہ نہیں دے رہا۔ میں خوش ہوں اور اپنی خوشی میں تمہیں بھی شریک کر رہا ہوں۔ کاش میرے پاس اس سے زیادہ ہوتے، دیکھو انکار مت کرنا۔''

اس نے بڑی عقیدت سے یہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ ''صاحب اس سے پہلے صاحب لوگوں نے سیکڑوں بار بخشش تو دی پر کسی نے محبت سے کچھ نہیں دیا۔''

''ان لوگوں کے پاس محبت اور انسانیت ہی تو نہیں ہے۔''

گارڈز نے اندر جھانکا۔ ''تم نے اب چلنا ہے ہمارے ساتھ۔''

''چلو...... میں تیار ہوں۔''

لفٹ سے اوپر آئے تو نائٹ کلب کے ہنگاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ دو بجے تھے اور یہ رونقوں کے عروج کا وقت ہوتا ہے۔ ایک گوشے میں چند لڑکیاں اسٹریپ ٹیز کر رہی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ شو صرف گھٹیا طرز کے نائٹ کلبس میں ہوتا تھا، لیکن جب اس نے بے پناہ بزنس شروع کیا، اچھے معیار کے نائٹ کلبس نے بھی اسٹریپ ٹیز شوز شروع کر دیئے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر نائٹ کلب میں اس قسم کے شوز ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کلب جو اپنے باوقار ماحول کے لیے مشہور تھے، انہوں نے بھی کمانے کے لیے عریاں شوز شروع کر دیئے ہیں۔

باہر کھلی فضا میں آ کر میں نے ذرا سکون محسوس کیا۔ اندر اگرچہ تازہ ہوا کی فراہمی کا مکمل انتظام تھا لیکن پھر بھی مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس جزیرے پر دن میں کسی قدر گرمی ہوتی تھی لیکن یہ چبھنے والی...... گرمی نہیں تھی۔ یعنی یہ جزیرہ خطِ استوا سے فاصلے پر تھا۔ رات کو موسم بے حد خوشگوار ہو جاتا تھا۔ گارڈز نے مجھے عقبی حصے میں بٹھایا مگر اس بار میرے ہاتھ جیپ کے اینگل سے نہیں باندھے تھے جیپ فراٹے بھرتی روانہ ہو گئی تھی لیکن خلافِ توقع اس کا رُخ سیل فور کی طرف نہیں تھا۔

''یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔'' میں نے کسی قدر فکرمند ہو کر سوچا۔ پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جیپ اس راستے کی طرف جا رہی تھی جو بندرگاہ کی طرف نکلتا تھا۔ اب سڑک کے دونوں جانب جنگل تھا۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان نیم تاریکی میں صرف جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی جس طرح میرے ذہن میں دور دور تک کسی واقعے کا امکان نہیں تھا، اسی طرح دونوں نگرانوں کو بھی نہیں تھا لیکن ہونے والا واقعہ ہو کر رہتا ہے چاہے انسان اس پر سوچے یا نہ سوچے۔ اچانک جیپ لہرائی، ہلکے سے دھماکے نے بتایا کہ اس کا کوئی پہیہ پنکچر ہو گیا ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نگران نے کمال مہارت سے بریک لگا کر جیپ کو قابو کیا ورنہ وہ جس طرح بے قابو ہوئی

تھی، جھاڑیوں میں بھی گھس سکتی تھی۔ جیپ روک کر اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ ''لعنت ہو۔''

''اب پنکچر بھی لگانا پڑے گا۔'' میرے ساتھ بیٹھے نگران نے سرد آہ بھری۔

اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نگران کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ غیر فطری انداز میں ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی کو اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ نیچے اُتر کر جھک کر پنکچر ہو جانے والے ٹائر کو دیکھ رہا تھا پھر اسے سیدھا ہونا نصیب نہیں ہوا۔ وہ جھکے جھکے ہی نیچے لڑھک گیا اور فوراً ہی ساکت ہو گیا۔ میرے تجربے نے بتایا کہ وہ کسی فائر کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ اول تو گولی جب جسم میں اُترتی ہے تو اس کی آواز آتی ہے اور بے شک گولی براہِ راست دماغ میں بھی اُتر جائے تو انسانی جسم نزع کے عالم میں پھڑکتا ہے جبکہ وہ دونوں اچانک ساکت ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ کوئی بے ہوش کرنے والا بلٹ تھا جو ان دونوں کے جسموں میں اُتار دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کھلی جیپ میں چھپنے کی گنجائش نہیں تھی، دوسرے نگران کے گرنے کے بعد ایک ایسی آواز آئی کہ میں نے زخم کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا کر جیپ سے اُترا اور آواز کی سمت بھاگا۔ ایک ہیولہ جھاڑیوں سے برآمد ہوا تھا کہ میں اس سے لپٹ گیا۔ یہ عبید صلاح تھا، اس نے ہلکے سے میرا نام پکارا تھا۔ وہ بھی گرم جوشی سے مجھ سے پٹ گیا تھا۔ اس نے روایتی عربی انداز میں میرے رُخساروں پر بوسے دیئے۔ ''کہاں تھا میرے یار......''

''احتیاط سے...... تیرا زخم نہ گڑبڑ کر جائے۔'' اس نے مجھے روکا۔

''تمہیں پتا ہے؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''یہ مقابلہ جزیرے کے ٹی وی نیٹ ورک پر دکھایا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے بھی دیکھا تھا۔''

''تم کہاں غائب تھے؟''

اس نے میرا سوال نظر انداز کر دیا۔ ''زیادہ وقت نہیں دوست...... مجھے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔ اول یہ کہ جان گرے پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا۔ وہ حرام زادہ تمہیں اپنے کسی مفاد میں استعمال کرے گا اور پھر مروا دے گا۔''

''اس پر تو میں کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ فی الوقت مجبور ہوں۔''

''دوسرے اس کے ساتھ رہ کر...... یہ دیکھنا کہ وہ تم سے چاہتا کیا ہے۔ اس کا مقصد ہمارے علم میں آ جائے تو اگلی کارروائی ہمارے لیے آسان رہے گی۔''

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس جزیرے پر اتنا بے بس اور لاچار بھی نہیں تھا۔ اس کے حامی اور مددگار موجود تھے۔ ''عبید تم کیا چکر چلا رہے ہو۔ کیا تمہارے مددگار موجود ہیں۔''

وہ مسکرایا تو نیم تاریکی میں بھی اس کے دانت صاف نظر آئے تھے۔ وہ جواب دینے کے





بجائے حرکت میں آیا۔ اس نے بے ہوش ہونے والے نگرانوں کو جیپ کے عقبی حصے میں منتقل کیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ میں اس کے برابر میں آ گیا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''میں انہیں سڑک سے ہٹا رہا ہوں، اس جگہ اکثر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔'' اس نے جیپ سٹارٹ کی۔

کچھ دور جا کر اس نے جیپ کچے میں اُتار دی۔ ''تمہیں پتہ ہے یہ لوگ پاگل کتوں کی طرح تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور تم اس طرح کھلے عام گھوم رہے ہو۔''

وہ ہنسا۔ ''مرد گھروں میں نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر مجھے جان اتنی ہی پیاری ہوتی تو ان لوگوں سے کیوں ٹکراتا اور تم فکر نہ کرو پچھلے دس بارہ دن میں مجھے ان لوگوں کی خاصی خامیاں پتہ چلی ہیں۔ ان لوگوں کا حفاظتی سسٹم اتنا سپر نہیں ہے جتنا یہ ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھ لو میں نہ صرف ان سے محفوظ ہوں بلکہ میں نے اپنے حامی بھی تلاش کر لیے ہیں جو ان لوگوں کی تباہی میں میرا ساتھ دیں گے۔''

''کیا اس جزیرے پر ان کی تباہی اتنی ہی آسان ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''پتہ ہے میں نے جزیرے کا پاور ہاؤس تلاش کر لیا ہے اور اب مجھے وہاں تک رسائی کا راستہ تلاش کرنا ہے۔ جس دن میں نے یہ کام کر لیا اس دن جزیرہ تباہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے یہاں پر ایٹمی بجلی گھر بنا رکھا ہے۔''

''یہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ اتنے دور دراز علاقے میں روایتی بجلی گھر بنانا مشکل بھی ہوتا اور مہنگا بھی...... ایٹمی بجلی گھر چھوٹا اور سستا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بار بار ایندھن لانے کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔''

''یہی ایٹمی بجلی گھر ان کی تباہی کا باعث بنے گا۔'' عبید صلاح نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''کیا جان گرے مجھے کسی مالی مفاد کے سلسلے میں استعمال کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، ان کا دین ایمان ہی پیسہ ہے۔''

''اس صورت میں مجھے واپس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس ہی نہ ٹھہر جاؤں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو وہ میری تلاش میں اتنے سرگرم نہیں ہیں لیکن تم غائب ہو گئے تو تلاش زور و شور سے شروع ہو جائے گی۔ اس سے میری سرگرمیوں میں خلل پڑے گا اور دوسرے ہمیں بھی مالی وسائل کی تلاش ہے، ان لوگوں کے خلاف جنگ کے لیے بہت بڑی مقدار میں زر درکار ہے اس کے لیے ہمارا جان گرے کا ساتھ دینا ضروری ہے اور تم فکر مت کرو، تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جائے گا۔ ہمارا کوئی نہ کوئی ساتھی تمہارے ساتھ موجود رہے گا۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے میری جنگ بھی سمجھو، جان گرے صرف تمہارا ہی نہیں میرا اور پوری انسانیت کا مجرم ہے اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' عبید صلاح خوش ہو گیا۔ ''دوست اب وقت نہیں ہے، میں تمہیں

ان دونوں اور جیپ کے ساتھ پھر اسی جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔"

جیپ پنکچر پہیے کے باوجود آرام سے چل رہی تھی۔ "تم نے یہاں پر کیلیں بچھائی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اب تمہیں جان گرے کے پاس لے جائیں گے اس لیے میرے ساتھی پہلے ہی اس جگہ پر گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ جان گرے ان دنوں بندرگاہ کے معاملات کی نگرانی کر رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ عبید صلاح کسی وجہ سے اپنے مددگاروں کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہا ہے حالانکہ وہ یہاں آس پاس تھے۔ ڈارٹ گن عبید صلاح کے پاس نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ یہ گن کسی اور کے پاس تھی۔ عبید کے پاس ایک اعشاریہ بیالیس کا بریٹا تھا جو اس کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے محسوس تو ہوئی لیکن میں نے عبید سے شکوہ نہیں کیا اس کے پاس اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ تھی۔ پھر اس نے وجہ بتا بھی دی۔ اس نے جیپ مطلوبہ مقام پر روکی اور اُترتے ہوئے بولا۔

"معاف کرنا دوست...... میں فی الوقت تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اس لیے نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ اگر جان گرے نے تم سے اُگلوانے کے لیے کوئی حربہ استعمال کیا بھی تو تم اسے کچھ نہ بتا سکو۔ ان مردودوں کے پاس جدید قسم کے سائنٹیفک طریقے اور دوائیں ہیں جن کی مدد سے یہ آدمی سے اپنے مطلب کی بات اُگلوا لیتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میرے اندر سے خلش نکل گئی تھی۔ عبید صلاح گھوم کر میری طرف آیا۔ سینے سے لگا۔ "اللہ حافظ دوست...... وہ تمہیں اپنی امان میں رکھے...... معاف کرنا۔" اس کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی مجھے گردن میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا اور لمحوں میں میرا ذہن سن ہو گیا تھا۔







میرا ذہن سن ہو گیا تھا۔ ماریہ گرتے ہوئے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے جسم نے چٹان کے ایک نکلے ہوئے حصے سے رگڑ کھائی اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی مجھے ہوش آیا۔ "حسن علی...... وہ گر گئی ہے۔ اس نے اپنی رسی نکال دی تھی۔"

ماریہ کا بوجھ کم ہونے کے بعد میرے لیے دوسرا ہاتھ چھجے کے کنارے پر جمانا آسان ہو گیا تھا۔ چند لمحے میں مَیں اوپر تھا۔ اسی لمحے حسن علی آ گیا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا اور میں بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھا۔ حسن علی نے رسی نکالی اور اسے نیچے کی طرف اُچھال دیا۔ "ہمیں جلدی نیچے جانا ہے۔"

"اب کیا فائدہ......" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ دُکھ کی شدت سے میرا سینہ جل رہا تھا۔ اس محبت کرنے والی نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ حسن علی نے ایک اُبھرے پتھر سے رسی باندھی اور اسے اپنی کمر میں بندھے بیلٹ کلپ سے منسلک کر لیا۔

"پہلے میں نیچے جاتا ہوں۔ جب آواز دوں تو تم بھی آ جانا۔" وہ کہتے کہتے چھجے سے تقریباً کود گیا تھا۔ وہ اتنی تیزی سے نیچے گیا تھا کہ دو منٹ بعد ہی اس کی آواز آئی۔ "یوسف آ جاؤ۔"

اس بار میں نے رسی اپنی بیلٹ کلپ سے گزاری اور اسے تھامتے ہوئے نیچے کود گیا۔ ہوا میں تقریباً تیرتے ہوئے پیر پتھروں اور چٹانوں سے ٹکاتا میں بھی چند منٹ میں نیچے پہنچ گیا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے حسن علی کو آواز دی۔ "آپ کہاں ہیں......"

"یہاں بائیں طرف جھاڑی کے تلے...... ماریہ ادھر ہی گری ہے۔ یہ ابھی زندہ ہے۔"

ماریہ کے زندہ ہونے کی خبر نے میرے اندر جیسے بجلی بھر دی تھی۔ میں چھلانگیں لگاتا لمحوں میں جھاڑی کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ حسن علی ماریہ کو کسی قدر ہموار جگہ پر سیدھا لٹا رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھی، چہرہ خون آلود تھا اور ہولے ہولے ڈوبتا اُبھرتا سینہ اس کی زندگی کی خبر دے رہا تھا۔ حسن علی نے اس کی نبض چیک کی۔ "حالت اچھی نہیں ہے اسے جلد از جلد کسی ہسپتال تک پہنچانا لازمی ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بیک بون کو نقصان ہوا ہے۔"

اس کا باقی جسم بہ ظاہر صحیح سالم نظر آ رہا تھا ورنہ اتنی بلندی سے گرنے والے کی تو ہڈیاں بھی چور چور ہو جاتی ہیں۔ حسن علی نے بتایا۔ ''دراصل یہ اس جھاڑی پر ہی گری تھی اسی وجہ سے فوری مرنے سے بچ گئی۔''

''اس کے بارے میں اتنی بے دردی سے بات نہ کریں، خدا اسے زندگی دے۔''

''اس کے لیے پہلے اسے جیپ تک لے جانا ہوگا۔''

حسن علی کا ذہن زیادہ بہتر طریقے سے کام کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مجھے جا کر جیپ سے ایمرجنسی بیگ لانے کو کہا۔ میں ممکنہ تیزی سے بھاگا۔ اس بیگ میں میڈیکل کٹ بھی تھی۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے یہ ناہموار راستہ اور ندی عبور کی۔ جیپ کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ ایمرجنسی بیگ خاصا بڑا تھا، اسے پشت پر لادا اور تیزی سے واپس آیا۔ محض دس منٹ میں واپس حسن علی اور ماریہ کے پاس تھا۔ حسن علی نے ایمرجنسی بیگ کھولا، سب سے پہلے ایک سخت کالر نکال کر ماریہ کی گردن پر پہنایا تاکہ اس کی گردن کو مزید نقصان نہ ہو۔ ایسا ہی ایک بیک سپورٹر اس کی کمر پر باندھا۔ المونیم کی راڈ جوڑ کر اس پر کینوس چڑھا کر اسٹریچر بنایا اور ماریہ کو اس پر منتقل کر کے اسے بیلٹوں سے باندھ دیا۔ یہ سب اس نے اتنی تیزی اور مہارت سے کیا جیسے عمر بھر یہی کام کرتا رہا ہو۔

''اب اسے اُٹھا کر چلو۔'' اس نے کہا۔

وقت نہیں تھا کہ سامان سمیٹا جاتا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر ہم نے ماریہ کا سٹیچر اُٹھایا۔ جیپ تک جانے کے لیے ندی عبور کرنا مشکل تھا لیکن ہم نے یہ کام بھی کر لیا۔ میں اور حسن علی ایک ایسے مقام سے ندی پار کر آئے جہاں پانی ہماری رانوں تک آ رہا تھا۔ اس تیز رفتار اور یخ بستہ پانی میں توازن ہی قائم رکھنا دشوار تھا اوپر سے وزنی اسٹریچر بھی۔ ماریہ کی جان بچانے کے جنون میں یہ مشکل کام بھی کر گزرے تھے۔ حسن علی نے عقبی نشست بھی نکال پھینکی اس طرح ماریہ اسٹریچر سمیت جیپ کے عقبی حصے میں آ گئی تھی۔ حسن علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں ماریہ کے پاس بیٹھ گیا۔ جب تک جیپ سڑک تک نہیں آئی، جھٹکے لگتے رہے۔ میں ماریہ کو ان جھٹکوں سے بچاتا رہا تھا۔

جیسے ہی جیپ ہموار سڑک پر آئی، میں نے ماریہ کا چہرہ اپنے رومال سے صاف کیا۔ اس کے ماتھے پر بھوؤں کے اوپر کٹ لگا تھا۔ ران اور بازوؤں پر بھی زخم آئے تھے لیکن یہ سب معمولی نوعیت کے تھے۔ اصل چوٹ اسے کمر کے وسط میں ریڑھ کی ہڈی پر آئی تھی۔ یہ چوٹ اسے نیچے گرتے ہوئے اُبھری ہوئی چٹان سے ٹکرانے سے آئی تھی یا جھاڑی پر گرنے سے آئی تھی۔ وہ تقریباً ستر فٹ کی اونچائی سے گری تھی۔ اگر وہ پختہ زمین پر گری ہوتی تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معجزانہ طور پر وہ اس وسیع ڈھلان پر اُگی واحد جھاڑی پر جا گری تھی۔ یہ کسی نرم پودے کی پھیل جانے والی جھاڑی تھی جس کے پتے بڑے اور شاخیں نرم تھیں۔ انہوں نے ماریہ کے تیزی سے گرتے جسم کو نرمی سے سنبھال لیا تھا۔ میں بار بار اس کی نبض دیکھ رہا تھا جو بدستور بے ترتیب تھی۔ اس کا چہرہ





اندرونی تکلیف سے سفید ہو رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کا پاگل پن اور اس کے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے گرنے سے پہلے کہے تھے۔

حسن علی نے اس روز خوفناک حد تک تیز ڈرائیونگ کی تھی۔ جیپ مستقل چالیس، پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جبکہ آتے ہوئے ہم اس سے آدھی رفتار سے آئے تھے۔ تنگ سڑک اور پُر پیچ موڑوں پر یہ رفتار حد سے زیادہ تھی۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق جیپ کو کسی کھائی میں بھی پہنچا سکتا تھا۔ ماریہ کو صحیح معنوں میں طبی امداد ایبٹ آباد کے کسی ہسپتال میں مل سکتی تھی اور ایبٹ آباد کم سے کم ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں پُرتشویش انداز میں ماریہ کو دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ دو تین سال سے جو حالات چل رہے تھے، ان میں زندگی موت کی کشمکش دیکھنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اور میں صرف پندرہ سال کی عمر میں ان معاملات میں خاصا پختہ ہو چکا تھا۔ ماریہ کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اور بس...... لیکن اس وقت جب وقت اس کے لیے پر لگا کر اُڑ رہا تھا زندگی اور موت کی حدِ فاصل میں اس کا فاصلہ موت سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں شدت سے خواہش تھی کہ وہ زندہ رہے اس وقت مجھے لگ رہا تھا اگر وہ مر گئی، میرا ساتھ چھوڑ گئی تو میری زندگی میں ایک خلا آ جائے گا۔

حسن علی کے بارے میں مجھے کم سے کم یہی معلوم تھا کہ وہ بھی میری طرح اس علاقے میں پہلی بار آیا ہے لیکن علاقے کی جغرافیائی پوزیشن اور راستوں کے بارے میں وہ مکمل معلومات رکھتا تھا۔ (یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے سکول چھوڑنے کے بعد حسن علی گھر نہیں جاتا تھا بلکہ کار لے کر ان علاقوں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چند ہفتوں میں اس سارے علاقے اور ایبٹ آباد کے شہر سے مکمل واقفیت حاصل کر لی تھی) اس نے صرف چالیس منٹ میں جیپ ایبٹ آباد کے ایک ہسپتال کے سامنے لے جا کر روکی۔ ویسے تو ایبٹ آباد ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن ایک گرمائی تفریحی مقام اور آس پاس بے شمار ہل اسٹیشن ہونے کی وجہ سے یہاں پر زندگی کی ہر سہولت دستیاب ہے۔ یہ ہسپتال نجی تھا لیکن ایمرجنسی کے لیے تمام سہولیات سے مزین تھا۔ چند لمحے کے اندر ماریہ کو اسٹریچر پر ڈال کر آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔ میں اس کے اسٹریچر کے ساتھ چل رہا تھا لیکن آئی سی یو میں داخلے سے پہلے ہی نرس نے مجھے روک دیا۔

''آپ اندر نہیں جا سکتے۔ ویٹنگ روم میں انتظار کرو۔''

حسن علی غائب تھا۔ غالباً وہ ہسپتال کے کسی اہم ڈاکٹر سے بات کرنے گیا تھا۔ میں ویٹنگ روم میں آ گیا۔ حادثے کے بعد جب تک میں حرکت میں رہا اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن ویٹنگ روم کی پُرسکون فضا میں آتے ہی اعصاب پر بوجھ سا پڑنے لگا۔ کئی طرح کے سوال بھی سامنے آئے۔ اول یہ کہ ہم ماریہ کے گھر والوں اور پھر جمشید پیلس میں اس کی یہاں موجودگی کی کیا وجہ بتائیں گے۔ خاص طور سے کاجل کو مطمئن کرنا میرے لیے مسئلہ بن جائے گا۔ ماریہ کے گھر والوں کا سامنا اور ان کے

سوالوں کے جوابات مزید اعصاب شکن مرحلہ ہوگا۔ ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ ماریہ کو اس حادثے میں کوئی نقصان نہ ہو، اس کی زندگی بچ جائے اور وہ معذوری سے بھی بچ جائے۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کو نقصان ہو تو انسان کا نچلا حصہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ یعنی جس جگہ پر چوٹ لگی ہو اس سے نچلا حصہ ماریہ زندگی اور جوش سے بھرپور لڑکی تھی، کسی قسم کی معذوری اسے مار ڈالتی اس سے جینے کی اُمنگ چھین لیتی۔

پندرہ منٹ بعد حسن علی آ گیا۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔ ''آپ کسی ڈاکٹر سے ملے، وہ ماریہ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ وہ بچ تو جائے گی نا...... اسے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟''

حسن علی مسکرایا۔ ''ایزی بوائے...... میں ڈاکٹر کے پاس نہیں بلکہ فون کرنے گیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ، ماریہ کے گھر اور اس کے باپ کے دفتر فون کر کے حادثے کی اطلاع دے دی ہے۔''

''آپ نے جمشید پیلس تو فون نہیں کیا؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

اس بار وہ ہلکے سے ہنسا۔ ''میں احمق نہیں ہوں برخوردار...... اول تو وہاں فون کرنے کا جواز ہی نہیں تھا۔ جمشید علی ملک سے باہر ہے۔ ماریہ ہمارا اور اپنے ماں باپ کا مسئلہ ہے۔ ویسے اس نے جس طرح یہاں آنے تک سروائیو کیا ہے اس سے مجھے قوی امید ہے وہ بچ جائے گی ورنہ حادثے کے بعد جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے چند لمحوں کی مہمان لگی تھی بہرحال وہ مضبوط اعصاب اور حوصلے والی لڑکی ہے۔''

میں نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ حسن علی، ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن اس کی رائے اہم تھی۔ اس کو دنیا کے تجربات نے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ویٹنگ روم میں وقت گزاری کے لیے رسائل اور اخبارات رکھے تھے۔ میں دل میں اس بات پر مسکرایا تھا جن کے پیارے زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا ہوں بھلا وہ آئی سی یو کے اس ویٹنگ روم میں رسائل اور اخبارات سے دل بہلا سکتے تھے مگر انسانی فطرت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جو گھمبیر ترین حالات میں بھی پڑھ سکتے ہوں گے ایسے ہی لوگوں کے لیے ہسپتال والوں نے یہ رسائل و اخبارات رکھے تھے۔

حسن علی نے وقت پاس کرنے کے لیے بہتر حل نکالا۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں باہر کافی پینے جا رہا ہوں تم چائے یا کافی لینا پسند کرو گے؟''

''کافی کریم کے ساتھ۔'' میں نے سر ہلایا۔ حسن علی چلا گیا۔ ویٹنگ روم کے ایک طرف شیشے کی بند کھڑکیاں تھیں ان کے پار ہسپتال میں داخلے کا دروازہ اور سامنے دور تک پھیلا سرسبز منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کھڑکی بنائی ہی اس مقصد کے لیے گئی تھی کہ یہاں بیٹھنے والے اس منظر سے دل بہلا سکتیں۔ حسن علی چند منٹ میں لوٹ آیا تھا۔ اس نے کافی کا ڈسپوزیبل کپ میری طرف بڑھایا۔ اس پر کریم کی موٹی تہہ تھی۔ کافی بھی اچھی تھی۔ اس اضطراب کے عالم میں اس نے بڑا سہارا دیا تھا۔ ابھی میں نے کافی کا کپ ختم کیا ہی تھا کہ ایک ڈاکٹر اپنے دستانے اُتارتا ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔





اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات دیکھ کر میرا دل ڈوبنے سا لگا تھا۔ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

''مریضہ کے ساتھ آپ دونوں آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آئی مین مس ماریہ کے ساتھ۔''

''ڈاکٹر ہم ہی اسے لائے ہیں۔ اس کی کنڈیشن اب کیسی ہے؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''کنڈیشن سیریس ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کے لیے سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے کہ اسے ابتدائی طبی امداد دے دیں۔ اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرتھوپیڈک سرجن کی ضرورت ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے تین مہرے بُری طرح شکستہ ہو چکے ہیں۔ اگر اس کا بروقت آپریشن نہ ہو سکا تو اس کی معذوری کا امکان بھی ہے۔ ہم نے ایمبولینس کا بندوبست کر دیا ہے جو اسے اسلام آباد لے جائے گی۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' حسن علی نے ممنونیت سے کہا۔ ''آپ کے چارجز؟''

''وہ آپ جانے سے پہلے کاؤنٹر پر ادا کر کے سلپ لے لیں۔ شکریہ اینڈ وِش آف گڈ لک فار دِس بیوٹی گرل۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد حسن علی چونکا۔ ''اوہ...... ماریہ کے گھر والے یہاں کے لیے چل پڑے ہوں گے انہیں روکنا ضروری ہے۔''

ہم ہسپتال کے کاؤنٹر تک گئے۔ حسن علی نے پہلے فون کر کے ماریہ کے گھر اطلاع دی کہ اسے ایمبولینس سے لے کر اسلام آباد آ رہے ہیں مگر اس کے بھائی اور باپ وہاں سے چل پڑے تھے۔ حسن علی نے ہسپتال کے چارجز ادا کیے اس میں ایمبولینس کے ذریعے ماریہ کو اسلام آباد تک لے جانے کا معاوضہ بھی شامل تھا۔ اس دوران میں ماریہ کو ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈرپ کی بوتل اور آکسیجن بھی منسلک تھی تا کہ راستے میں اس کی حالت زیادہ بگڑنے نہ پائے۔

''میں بھی چلوں گا۔'' میں نے حسن علی سے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''تم ایمبولینس میں جاؤ...... میں پیچھے آتا ہوں۔ راستے میں ماریہ کے باپ یا بھائی آتے دکھائی دیئے تو انہیں روک لوں گا۔''

''مناسب رہے گا۔'' میں نے سر ہلایا۔

میں ایمبولینس میں بیٹھ گیا اور وہ فوری طور پر روانہ ہوگئی۔ عقب میں حسن علی جیپ میں آ رہا تھا۔ میں ماریہ کے ساتھ عقبی حصے میں تھا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ ویران اور بے جان سا لگ رہا تھا۔ مجھے پچھتاوا ہوا، کاش میں اس لڑکی سے نہ ملا ہوتا اور نہ یہ اس حال کو پہنچتی مگر اس سے ملنا تو تقدیر تھی۔ اب تک میں ماریہ کی دلچسپی اور محبت کو ایسا سمجھتا آ رہا تھا جیسے سرما کے آغاز سے ہی اہل کراچی نزلے زکام میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور مشکلات کا ایک ڈوز لے کر ان کی اس محبت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے اینٹی

بایوٹک کا زور نزلے زکام کو بھگا دیتا ہے۔

مگر آزمائش کے ان لمحات میں جب ہم دونوں کی جان خطرے میں تھی، ماریہ نے بلا جھجک مجھے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا عزم کر لیا اور یہ ممکن تھا اگر وہ اپنا وزن کم نہ کرتی تو میرے لیے بیک وقت دونوں کا بوجھ سنبھالنا ممکن نہ رہتا۔ میں جسمانی طور پر کتنا ہی مضبوط سہی لیکن دو افراد کا بوجھ محض ایک ہاتھ کے سہارے لامحدود مدت تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایثار پرست ماریہ نے مجھے محفوظ رکھنے کے لیے یقینی موت قبول کر لی تھی۔ یہ تو خدا کی حفاظت تھی جو وہ جھاڑی پر گری اور مرنے سے بچ گئی۔ آرتھو پیڈک سرجن سے رجوع کرنے کا مشورہ سن کر مجھے اپنا خدشہ درست لگنے لگا تھا۔ اس کی اسپائنل کورڈ کو نقصان ہو سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ ساری عمر کے لیے بستر پر لیٹ سکتی تھی۔

ایمبولینس نے دو گھنٹے میں ہمیں اسلام آباد کے ایک جدید ہسپتال پہنچا دیا جہاں نیورولوجی کا شعبہ تھا۔ ماریہ کو فوری طور پر اندر لے جایا گیا۔ میں ایمبولینس کے پاس ہی کھڑا تھا کہ پہلے حسن علی کی جیپ آئی، اس کے عقب میں ماریہ کا باپ اور اس کا چھوٹا بھائی ایک سِنی کار میں تھے۔ ماریہ کے باپ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ کار سے اُتر کر ماریہ کے اسٹریچر کے پیچھے اندر چلا گیا۔ جبکہ حسن علی میرے پاس آ گیا۔ ماریہ کا بھائی شاہینہ نظامی اس کے پیچھے تھا۔ اسے شامی کے نک نیم سے بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا لیکن قد و قامت کے باعث کم ہی لگتا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک قسم کی گمبھیرتا تھی۔

''یوسف...... یہ سب کیسے ہوا؟'' اس نے روکھے لہجے میں پوچھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔ بہن کے ساتھ پیش آنے والے اس سانحے کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا۔ اگرچہ مجھے اس سے ہمدردی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کے لہجے پر غصہ آ گیا۔

''یہ تمہیں حسن بتائیں گے۔'' میں نے اس کے سے لہجے میں کہا اور جا کر نزدیک ہی گراسی لان کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام کے اوقات میں وہاں اِکا دُکا افراد تھے جو شاید مریض ہی تھے اور شام کی تازہ ہوا میں لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے بستروں سے نکل آئے تھے۔ یہ جگہ آرتھو پیڈک ڈیپارٹمنٹ کے سامنے تھی۔ حسن علی اسے بتا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ برہم بلکہ مشتعل نظر آنے لگا ہے۔ اس نے کئی بار میری طرف آنے کی کوشش کی مگر ہر بار حسن علی نے اسے روک لیا۔ بالآخر وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ حسن علی میری طرف آیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

''یہ دونوں باپ بیٹے سمجھ رہے ہیں جیسے ہم نے ماریہ کو وہاں بلا کر پہاڑ سے دھکا دے دیا تھا۔''

''فی الوقت وہ صدمے میں ہیں۔ ماریہ ہوش میں آ کر انہیں خود سب بتا دے گی۔'' میں نے کہا۔

حسن علی کچھ سوچ رہا تھا۔ ''دیکھو یوسف...... بعض اوقات ایسا ہوتا ہے جو ہم نے سوچا نہیں




ہوتا یا ہم نہیں چاہتے۔ خدانخواستہ اگر ماریہ نہ بچ سکی تو ہم ان باپ بیٹے کے سامنے کیا وضاحت پیش کریں گے۔ ممکن ہے وہ پولیس میں چلے جائیں اور ہمارے خلاف ایف آئی آر درج کروا دیں۔ محمود نظامی نے اشاروں میں کہا تھا اگر ماریہ ہوش میں نہ آئی یا اس نے ہمارے بیان کی تصدیق نہ کی تو ہمیں بُرے نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''جب ہم نے کچھ کیا نہیں ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

''بات ڈرنے کی نہیں بلکہ پریشانی میں پڑنے کی ہے۔ میں اطمینان سے تمہاری تربیت کرنا چاہتا ہوں، تمہیں اپنا تعلیمی کیریئر آگے بڑھانا ہے۔ کسی قسم کے تنازع میں پڑنے سے اس میں رخنہ تو آئے گا۔''

میں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''تب آپ بتائیں میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اس مسئلے کو دعوت نہیں دی ہے۔''

''میں جانتا ہوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' حسن علی نے گویا مجھے تسلی دی۔ ''میں تمہیں صرف حالات اور امکانات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ ہمیں ہر مشکل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''ایسا کریں آپ کسی طریقے سے پاپا کو انفارم کریں۔ وہ خود ہی اس مسئلے کو دیکھ لیں گے۔''

''گڈ...... یہ اچھا مشورہ ہے لیکن تمہارے پاپا اس وقت کہیں سی میں ہیں، ان کے دفتر سے ٹیلکس تو کیا جا سکتا ہے لیکن فون کرنا ممکن نہیں ہے۔''

''چلیں اتنا ہی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔ ''چلیں جی مصیبت آ رہی ہے۔''

محمود نظامی ایمرجنسی ڈور سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات خاصے گمبھیر تھے۔ حسن علی نے فوراً اس سے پوچھا۔ ''ماریہ کی حالت اب کیسی ہے؟''

''اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹرز نے کہا ہے وہ بچ جائے گی لیکن اس بات کا امکان ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو جائیں۔''

''خدا نہ کرے۔'' میرے منہ سے نکلا تھا۔

محمود نظامی نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''مجھے بے وقوف مت بناؤ، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ وہ احمق لڑکی شروع سے تمہارے پیچھے پاگل ہو رہی تھی۔ تم نے اسے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں اگر اسے کچھ ہوا۔''

''محترم...... اس وقت آپ جذباتی اور صدمے میں ہیں، بعد میں آپ اس معاملے پر غور کریں گے تو مجھے بے قصور پائیں گے۔ میں نے کبھی ماریہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔''

''بکو مت...... تم اس کے پیچھے پڑے تھے۔ ہائے میری معصوم بچی۔''

میں نے ایک بار پھر خود کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے گہری سانس لی۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ ان کی

معصوم بچی ایک ایسے یوتھ کلب میں جاتی تھی جہاں اعلیٰ سوسائٹی کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مادر پدر اور اخلاق سے آزاد سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ محمود نظامی کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر دوبارہ اندر کی طرف چلا گیا۔ حسن علی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ دونوں اندر غائب ہو گئے۔ میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے ماریہ کی فکر تھی اس کے بارے میں جاننے کے لیے ابھی میں اندر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں سے ایک نرس گزری۔ اس کا رُخ بھی اسی وارڈ کی طرف تھا۔

''ایکسکیوزمی..... پلیز۔''

نرس رُک گئی۔ ''جی فرمائیے۔'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''اندر ایک لڑکی آئی ہے مس ماریہ نظامی مجھے اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔''

''اپنی پرابلم۔'' اس نے پوچھا۔

''اسے حادثے کی وجہ سے بیک بون انجری ہوئی ہے۔ اس کی کنڈیشن خاصی سیریس تھی جب ہم اسے یہاں لائے۔''

نرس نے پھر پوچھا۔ ''یہ بات تو آپ خود جا کر معلوم کر سکتے ہیں۔''

''نہیں کر سکتا۔'' میں نے ممکنہ حد تک منہ لٹکایا۔ ''اندر مس ماریہ کے خونخوار والد بزرگوار ہیں۔''

نرس ہنس پڑی۔ ''اچھا یہ بات ہے۔ آپ بس منٹ ویٹ کریں میں معلوم کر کے خود بتاتی ہوں یا کسی سے کہلوا دوں گی۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''یوسف علی خاں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں انفارم کرتی ہوں۔''

''میں پیشگی شکر گزار ہوں۔''

''آپ یہیں رہیے گا۔'' وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں وہیں گراسی لان پر ٹہل کر انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ بعد ایک کم عمر لڑکا آیا۔ ''تم یوسف علی خان ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے سر ہلایا تو اس نے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ ''ہم عاشق علی خان ہے۔ ہم کو مس روبینہ نے بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے جا کر یوسف علی خان کو بتاؤ کہ لڑکی کی حالت بہتر ہے، شاید اسے ہوش آ جائے۔ رات کو اس کا آپریشن ہوگا۔''

''شکریہ بھائی عاشق۔'' میں نے کہا۔ ''اپنی مس روبینہ کا بھی شکریہ ادا کر دینا۔''

وہ شکریہ پر اتنا خوش نہیں ہوا جتنا اپنی مس روبینہ کہنے پر ہوا تھا۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود عاشق مزاج لگتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے چن کر نام رکھا تھا۔ حسن علی نہیں آیا تھا، اس لیے میں وقت گزاری کے لیے وہیں گھاس پر دراز ہو گیا تھا۔ شام ہونے کو تھی اور میں نے صبح ناشتے کے بعد





سے کچھ نہیں کھایا تھا بھاگ دوڑ میں احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ذرا سکون ملا تھا تو بھوک پیٹ کے اندر شور مچانے لگی تھی۔ میں حسن علی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو ہم کھانے کے لیے نکلیں مگر وہ تھا کہ جیسے اندر ہی رہ گیا تھا۔ مغرب تک میری بھوک کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اپنی جیب میں رکھی نوٹ بک کا ایک صفحہ پھاڑ کر اس پر لکھا۔

''کھانا کھانے جا رہا ہوں۔''

اور یہ کاغذ ونڈ شیلڈ وائپر تلے ٹکا دیا۔ ہسپتال اسلام آباد کی روایات کے مطابق ویران سی جگہ پر تھا۔ خاصی دور جا کر مجھے ایک پان کا کیبن نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یار یہاں کھانے پینے والی کوئی جگہ ہے۔''

''اس سڑک پر آگے چلے جاؤ...... ایک جھگی ہوٹل ہے وہاں پر کھانا اچھا ملتا ہے۔'' پان والے نے پھرتی سے پان پر کتھے چونے کا لیپ کرتے ہوئے بتایا۔ اس نے میرے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ میں کھاتا پیتا بندہ ہوں اس لیے آگے مشورہ بھی دیا۔ ''صاحب آپ ٹیکسی رکشہ پکڑ کر کسی اچھے ریستوران میں کیوں نہیں چلے جاتے۔''

میں نے مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور جھگی ہوٹل میں ہی کھانے کا فیصلہ کیا۔ دور جانے کا مطلب تھا کہ وقت زیادہ لگتا اور اگر تاخیر ہو جاتی تو حسن علی کا مزاج بھی برہم ہو سکتا تھا اس لیے میں جھگی ہوٹل تک ہی گیا۔ شام کا وقت تھا، پکے کھانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ اس میں سب سے نمایاں تنور سے نکلنے والی گرما گرم روٹیوں کی خوشبو تھی۔ میں نے فرائی دال اور روٹی کا آرڈر دیا۔ باہر کا گوشت کھانے کا میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ حسن علی نے مجھ پر بڑا گوشت کھانے کی پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ مجھے صرف بھیڑ یا دیسی مرغ کا گوشت کھانے دیتا تھا۔ دال فرائی بھی مزے کی تھی۔ گرم روٹیوں کے ساتھ ایسا مزہ آیا کہ میں کھاتا چلا گیا۔

اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں چونکا، اردگرد نظر دوڑائی۔ دائیں طرف موجود میز پر ایک شخص چائے پی رہا تھا مگر چائے پینے کے بجائے مجھے گھور رہا تھا جیسے ہی میں نے اسے دیکھا اس نے جلدی سے نظریں پھیر لیں۔ اس کا انداز مشکوک تھا۔ جب تک میں اس کی طرف دیکھتا رہا وہ اپنی چائے کی طرف متوجہ رہا لیکن صاف لگ رہا تھا اس کی دلچسپی مصنوعی نوعیت کی تھی۔ وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کھانا تقریباً کھا چکا تھا۔ پہلے میرا ارادہ چائے پینے کا بھی تھا لیکن اس شخص کو دیکھ کر مجھے بے چینی سی ہو رہی تھی اس لیے میں نے فوری طور پر واپس ہسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ میں پہلے ہی ایک چکر میں تھا، میں نے بل ادا کیا اور واپس ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک جس پر میں جا رہا تھا، اس کے دائیں بائیں جنگل تھا، سلیقے سے اُگائے درخت تھے۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی سے سڑک پر پڑی سوئی بھی نظر آ سکتی تھی۔ جب کوئی میرے تعاقب میں نہیں آیا تو میں نے خاصا سکون محسوس کیا تھا جب میں بل دے کر پلٹا تھا تو چائے پینے والا غائب تھا۔ وہ مجھے

باہر بھی نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا وہم تھا وہ شخص کسی خاص وجہ سے میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اب مجھے حسن علی کی فکر ستا رہی تھی۔ ہسپتال سے غائب ہو کر میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے وہ واپس جانے کے لیے میرا انتظار کر رہا ہو۔

اسی سوچ نے مجھے اپنے اردگرد سے غافل کر دیا تھا اس لیے مجھے اس گاڑی کی آمد کا اس وقت پتہ چلا جب وہ سر پر آ چکی تھی۔ اس کے بریک چرچرائے اور پھر تین افراد اس میں سے اُتر کر میری طرف لپکے۔ دو کے پاس ہاتھوں میں ذرا چھوٹے ڈنڈے تھے جن پر ربر جیسی کوئی شے چڑھی تھی، تیسرے کے پاس ریوالور تھا اس نے مجھے للکارا۔ ''اوئے کھڑا ہو جا...... ہلنا مت...... ورنہ گولی تیری...... میں اتار دوں گا۔''

اس کی دھمکی میں قابلِ غور نا قابلِ اشاعت جگہ نہیں بلکہ اپنی جگہ سے نہ ہلنے کی ہدایت تھی۔ اس کا مقصد تھا اس کے دونوں ساتھی اپنے ڈنڈے سکون سے میرے سر پر آزمائیں لیکن ظاہر ہے میں اس کی ہدایت پر عمل کر کے اپنا سر تڑوانے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس کی نا قابلِ ذکر جگہ گولی مارنے کی دھمکی نظر انداز کر کے میں نے جھکائی دی۔ ایک حملہ آور کا ڈنڈا شائیں کی آواز کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے گزرا۔ اس بدبخت نے اتنی زور سے ہاتھ گھمایا تھا جیسے آن جہانی کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہو۔ دوسرے نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر میرے جھکے ہوئے سر پر ڈنڈا آزمانا چاہا اس دوران میں پہلے والے کو لات رسید کر کے دور پھینک چکا تھا۔ ڈنڈے سے بچنے کے لیے میں دوڑا اور مارنے والے کے پیٹ میں گھس گیا۔ اس نے بہرحال ڈنڈا چلا دیا جو وہیں لگا جہاں ریوالور والا گولی مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ وار تقریباً بے اثر تھا اس لیے مجھ سے زیادہ شور اس نے مچایا۔ میرے سر کی ٹکر نے اس کے پیٹ میں ہل چل مچا دی تھی مگر اس نے ڈنڈا نہیں چھوڑا جیسے ہی میں پیچھے ہٹا اس نے مشتعل ہو کر ہاتھ گھمایا۔ بچتے ہوئے بھی ڈنڈا بائیں بازو پر لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے بازو ناکارہ ہو گیا ہو۔ اسی اثناء میں لات کھانے والا بپھرے ہوئے بیل کی طرح پھنکاریں مارتا آیا۔ اس کا وار میرے دائیں پہلو پر لگا تھا۔ درد سے تڑپ کر میں نے دوبارہ لات چلائی اور اسے دور پھینک دیا۔ پھر جھکائی دے کر وار ناکارہ کیا اور اس کے پیٹ میں اس بار مکا مار کر اسے بھی ناکارہ کر دیا۔ لات کھانے والا زمین پر یوں تڑپ رہا تھا جیسے نزع کے عالم میں ہو۔ پیٹ میں مکا کھانے والا بھی ہمت ہار بیٹھا تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ٹکا ہانپ رہا تھا۔ غالباً یہ پیٹ بھر کر کھانے کا اثر تھا۔ میرے ذہن پر چھائے خمار کی وجہ سے میں تیسرے فرد یعنی ریوالور والے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر چپکے سے میرے سر پر وار کیا۔ اندھیر دنیا یک دم رنگ و نور سے بھر گئی تھی میری آنکھوں تلے رنگ برنگ ستارے سے پھٹے۔ میں نے ریوالور والے کی آواز سنی۔ ''حرامی کہیں کا......'' اس کے ساتھ دوسرا زیادہ سخت وار میری گدی پر پڑا اور مجھے بس اتنا یاد رہا کہ میں منہ کے بل زمین پر گر رہا تھا۔





میں بالکل نہیں جان سکا تھا کہ یہ لوگ کون تھے اور مجھے اس طرح اغوا کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ وہ چاہتے تو گاڑی سے اُترے بغیر مجھے گولی مار سکتے تھے اس طرح حملہ کر کے مجھے قابو کرنے کا مقصد اغوا کر کے لے جانا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے مار کھانا بھی گوارا کیا۔ بے شک اسلام آباد ذرا ویران سا شہر ہے لیکن یہاں پر پولیس کا نظام خاصا اچھا ہے۔ دن دیہاڑے اغوا یا ڈکیتی کی وارداتیں شاذ ہی ہوتی ہیں، صرف ارشد بلا گروپ کے لوگ میرے لیے اتنے بے تاب ہو سکتے تھے کہ سرِ شام ایک روشن شاہراہ سے مجھے اغوا کر کے لے جانے کی کوشش کریں۔ واللہ عالم بالصواب۔ وہ جو کوئی بھی تھے میری لمحاتی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

ہوش میں آنے پر مجھے اپنا سر شانوں پر بھاری پتھر جیسا لگ رہا تھا۔ ظالم نے بڑی بے دردی سے سر پر وار کیا تھا۔ میں کسی سخت جگہ پڑا تھا۔ اپنی پشت تلے مجھے نمی اور سردی محسوس ہو رہی تھی۔ خاصی دیر بعد جا کر میرے اندر اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ آنکھ کھول کر دیکھ سکوں۔ میں نے پہلے ہلکی سی آنکھ کھولی، میں کسی ویران نظر آنے والے کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ بائیں طرف سے روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس طرف دیوار پر پیلے رنگ کا بلب روشن تھا۔ کمرے کی دوسری شے میں خود تھا جو ننگے فرش پر پڑا تھا۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں، گویا کوئی تہہ خانہ تھا۔

کسی کو وہاں نہ پا کر میں نے اُٹھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اپنا سر ٹٹولا، بے دردی سے کیے جانے والے واروں نے کھال کو پھاڑ دیا تھا اور خون بالوں میں جم چکا تھا۔ اُٹھتے ہی مجھے شدت کا چکر آیا۔ میں کھسک کر دیوار تک گیا اور اس سے ٹیک لگا کر گہری سانسیں لینے لگا۔ چند منٹ بعد میری حالت بہتر ہوئی تو میں نے اُٹھ کر سب سے پہلے اس تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہ دس، بیس فٹ کا تہہ خانہ تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جہاں سیڑھیاں ختم ہو رہی تھیں وہاں لوہے کا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا اور دروازہ بند تھا۔ زمین سے کوئی دس فٹ کی اونچائی پر سیڑھیوں سے مخالف سمت والی دیوار پر روشندان تھا۔ اس سے آتی تاریکی کی جھلک بتا رہی تھی کہ باہر رات ہے یا یہ روشندان کسی اور بند جگہ پر کھلتا تھا جہاں باہر کی روشنی نہیں آتی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی، گھڑی کیا میرے پاس سے سوائے ایک پتلون اور قمیص کے سب لے لیا گیا تھا۔ میرا پرس اور جوتے تک غائب تھے۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

''نہایت چھچھورے قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوں، شکر ہے کپڑے نہیں اُتارے۔''

میرے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تہہ خانہ خاصی گہرائی میں تھا اس لیے اس کی زمین اور دیواروں سے سیل آ رہی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے ہوش آتے ہی نمی اور سردی کا احساس ہوا تھا۔ میری پتلون اور قمیص کا جو حصہ زمین سے لگا تھا وہ نم ہو رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر ذرا اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے حسن علی کا خیال آ رہا تھا جب اس نے واپس آ کر جیپ پر لگا رقعہ دیکھا ہو گا تو جھنجلا گیا ہو گا اور پھر جب میں واپس نہیں پہنچا ہوں گا تو اس کی جھنجلاہٹ تشویش میں بدل جائے گی اور اب تک

اس نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ ماہ پارہ کو اطلاع کی ہوگی تو ان کا رو رو کر بُرا حال ہوگا۔ درمیان میں مَیں نے ایک بار اُٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ دروازہ باہر سے بند تو تھا ہی، خاصا مضبوط تھا اور خالی ہاتھ سے اسے کوئی رستم زماں ہی توڑ سکتا تھا۔ میں صبر کر کے واپس بیٹھ گیا۔

گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ نصف رات کے بعد کا وقت تھا۔ گویا میں چار سے پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ مئی کے مہینے میں اسلام آباد میں خاصی گرمی ہوتی ہے۔ تہہ خانے میں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اوپر سیڑھیوں پر گرمی محسوس ہوئی تو میں دوبارہ فرش کے پاس آ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں فرش پر اُتر کر ٹہلنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے کون تھے اور ان کے ذہن میں کیا تھا۔ میرے بارے میں وہ کیا فیصلہ کرتے۔ انتظار کی کیفیت اتنی ظالم ہوتی ہے کہ اگر موت کی ہو تو انسان اس کے بھی جلد آنے کی دعا کرتا ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ میرے نصیب میں جو ہے وہ جلد از جلد سامنے آ جائے لیکن نہ تو موت اور نہ ہی نصیب میں لکھا انسان کی مرضی سے جلدی یا دیر سے آتا ہے۔

تنگ آ کر میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ حسن علی نے ایک بار مجھے یہ بھی سمجھایا تھا کہ اگر کسی چکر میں پھنس جاؤ اور کچھ کرنے کے لیے نہ ہو تو آدمی کو سو جانا چاہیے۔ میں فرش کی نمی اور ٹھنڈک کی پروا کیے بغیر لیٹ گیا بلکہ اب تہہ خانے میں جو گرمی اور گھٹن سی ہو رہی تھی اس میں فرش کی نمی اور ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی۔ سر میں ہونے والا درد کم کرنے کے لیے میں نے یوگا کی ایک مشق کی۔ اس سے ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر میں سوتا رہا پھر خطرے کے احساس نے مجھے چونکایا۔ میں نے تڑپ کر کروٹ لی۔ اس کروٹ نے مجھے اس ٹھوکر سے بچایا جو میرے منہ پر پڑنے والی تھی۔ ایک بھاری بھرکم پشاوری چپل میرے چہرے کے پاس سے گزری۔ دوسری ٹھوکر پڑنے سے پہلے میں لڑھک کر اس شخص سے دور چلا گیا۔

''خبیث کا بچہ۔'' ناکام رہنے والے نے مجھے گالی دی۔

میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں دو افراد کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک تو وہی پٹھان تھا جس نے مجھے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی تھی، اس کا سرخ چہرہ اپنی ناکامی پر مزید سرخ ہو گیا تھا۔ وہ غرا کر میری طرف لپک رہا تھا کہ اس کے پنجابی نظر آنے والے ساتھی نے روک لیا۔ ''آرام سے خان...... یہ بڑی کتی شے ہے۔''

خان نے ناقابلِ اشاعت زبان میں بتایا کہ اس نے کس طرح بڑی کتی اشیاء کو کس طریقے سے درست کیا ہے۔ میں نے سکون سے کہا۔

''غالباً ان اشیاء میں تمہارا خاندان بھی شامل ہوگا۔ تمہیں دیکھ کر اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔''

میرے جملوں نے خان کو بالکل بے قابو کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے روکنے کے باوجود





اَرنے بھینسے کی طرح ڈکراتا میری طرف لپکا۔ میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور جیسے ہی وہ نزدیک آیا میں یک دم ترچھا ہو کر فرش پر گرا۔ اپنے دونوں پاؤں ذرا پھیلائے اور جیسے ہی اس کی ایک ٹانگ میری دونوں پنڈلیوں کے درمیان میں آئی میں نے اسے گرفت میں لے کر آگے کی طرف رول کیا۔ وہ پہلے ہی خاصی تیزی سے آ رہا تھا۔ اوپر سے میں نے اس کی رفتار کو مہمیز دی اور وہ خاصی طاقت سے منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جس منہ سے چند لمحے پہلے تک مغلظات برآمد ہو رہی تھیں اب اس سے خون کی پچکاریوں کے ساتھ کئی عدد دانت بھی نکلے تھے۔ ان سب کے علاوہ کچھ ہائے وائے بھی برآمد ہو رہی تھی۔

''بس اب کوئی حرکت نہ کرنا۔'' دوسرے نے پستول نکال لیا۔ میں رُک گیا۔ پٹھان ایک بار پھر گالیاں دیتا میری طرف آنے لگا۔

''اسے روکو۔'' میں نے پستول والے کو خبردار کیا۔ ''ورنہ منہ کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹیں گی۔''

''خان تمہیں کیا کہا تھا۔'' اس کا ساتھی غرایا۔ ''اب خاموش رہو یا باہر چلے جاؤ۔''

پستول والے کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ نہ تو ان لوگوں میں سے تھا جو مجھے اغوا کرنے آئے تھے اور نہ ہی میں نے اسے پہلے کہیں اور دیکھا تھا۔ ''تم کون ہو اور مجھے اس طرح اغوا کر کے حبس بے جا رکھنے کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ دُبلا لیکن طویل قامت شخص تھا۔ سر کے بال سامنے سے اُڑے ہوئے تھے اور عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ بہ ظاہر کوئی خاص بات نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے اس تنومند پٹھان اور اغوا کرنے والوں سے زیادہ خطرناک لگا تھا۔ اس کی ٹھہری ہوئی سرد آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ کوئی عام آدمی ان آنکھوں ہی کو دیکھ کر ڈر جاتا۔ وہ مسکرایا۔ ''برخوردار...... اتنی جلدی مناسب نہیں ہے سوالات کے لیے...... ابھی تمہیں کچھ عرصہ ہمارے پاس رہنا ہے۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ اس زمانے میں یہ چیز نئی نئی آئی تھی اور خاصی مہنگی ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے صحافی حضرات اسے انٹرویو لینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اب تو خیر جدید ترین ڈیجیٹل وائس ریکارڈر آ گئے ہیں جو گھنٹوں بلا رُکے ریکارڈنگ کر سکتے ہیں جبکہ یہ ٹیپ ریکارڈر ایک گھنٹے سے زیادہ دورانیے کی ریکارڈنگ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اسے دیکھا اور خوشدلی سے بولا۔

''اس کے بجائے تم کوئی بڑا ٹیپ ریکارڈر لے آتے تو اچھا ہوتا۔''

اس نے میری بات سنی ہی نہیں اور ریکارڈر میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''ابھی میں اسے آن کروں گا اور تم اس میں ایک پیغام ریکارڈ کرو گے۔ خان اسے پیغام دو۔''

پٹھان نے نفرت بھرے انداز میں ایک پرچہ میری طرف پھینکا۔ میں نے اُٹھا کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''پاپا...... میں ان لوگوں کے پاس خیریت سے ہوں اور اس وقت تک خیریت سے رہوں

گا جب تک آپ ان کا مطالبہ نہیں مان لیتے۔"

میں نے پرچہ پستول والے کی طرف پھینک دیا۔ "اول تو میں اس قسم کا کوئی پیغام ریکارڈ کراؤں گا ہی نہیں اور کرا بھی دیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پاپا میرے حقیقی باپ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے مجھے پالا ہے۔ میں انہیں جانتا ہوں اگر تم ان کی سگی اولاد کو بھی لے آتے تو ان سے اپنا کوئی مطالبہ نہیں منوا سکتے تھے۔"

"فکر مت کرو۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جتنا تم سے کہا جا رہا ہے اتنا کرو۔"

"اور اگر میں نہ کروں تو؟"

وہ مسکرایا۔ "تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت بھی ریکارڈ چل رہا ہے۔ تمہاری ساری گفتگو ٹیپ ہو چکی ہے۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے نہایت چالاکی سے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ مجھے غافل سمجھ کر خان نے اچانک مجھ پر حملہ کیا۔ غالباً اپنی جھینپ مٹانا چاہتا تھا اس نے اچانک میری کنپٹی پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے آسانی سے اس کا وار خالی گیا اور پھر میرا مکا اس کی ناک پر پڑا۔ یوں اس کے ناک نقشے میں جو کمی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ اس کی ناک سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بیل کی طرح ڈکرایا۔

"احمق۔" پستول والے نے اسے ڈانٹا۔ "کہا تھا اس سے دور رہنا۔"

خان نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میں تمہیں چھوڑے گا نہیں۔"

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے جا کر اپنی مرہم پٹی کراؤ۔ زیادہ خون بہہ گیا تو بعض اوقات جانبر ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے پستول والے سے پوچھا۔ "تمہارا مجھے روکنے کا لمبا چوڑا پروگرام ہے...... کیا میں اس تہہ خانے میں اس طرح رہ سکوں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس کل تک کی پریشانی برداشت کر لو۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہاں رکھا ہے جلد تمہیں ایک بہتر جگہ منتقل کر دیا جائے گا لیکن کوئی حرکت نہ کرنا...... بس کسی وجہ سے تمہیں مستقل اسی جگہ رہنا پڑے گا۔"

"ایک مسئلہ اور ہے۔ یعنی کھانے کے بعد اخراج کا...... کھانے کو تو کچھ نہ کچھ دو گے ہی لیکن اس کے اخراج کا کیا ہوگا۔"

وہ مسکرایا۔ "صبح تک صبر کر سکتے ہو تو کر لو...... ورنہ یہیں کوئی گوشہ استعمال کر لینا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "چلو کھانا اور اخراج کا مسئلہ تو صبح ہوگا لیکن پانی تو دے سکتے ہو۔ میں نے خاصی دیر سے پانی نہیں پیا ہے۔"

"پانی مل جائے گا۔" وہ اُلٹے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ریکارڈر اس نے پہلے ہی جیب





میں رکھ لیا تھا۔ میں اس سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن وہ میری طرف سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ نصف سیڑھیاں چڑھ کر وہ مڑا اور تیزی سے کھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور پانی کی ایک بوتل اور بسکٹ کا ایک ڈبا اندر آیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میں نے اوپر جا کر بوتل اور ڈبہ اُٹھا لیا۔ مجھے اس وقت کسی قسم کی حاجت محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے پانی اور بسکٹ احتیاط سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اخراج کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اگرچہ مجبوری تھی اس کے باوجود اس بند تہہ خانے میں کچھ کرنے کے خیال سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

میں نے تھوڑا سا پانی پیا اور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس دفعہ فوری طور پر نیند نہیں آئی۔ مختلف سوچیں دشمن لشکر کی طرح یکے بعد حملہ آور ہوتی رہیں۔ اپنا بچپن اور موجودہ حالات مجھے رہ رہ کر سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ میری زندگی ایک نارمل لڑکے کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ نہ میں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا اور نہ ہی اپنے خاندان سے واقف تھا۔ ہوش سنبھال کر خود کو جمشید پیلس میں پایا۔ مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ میں وہاں صرف پرورش پا رہا ہوں۔ میرا جمشید علی خان سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بارہ سال کی عمر سے مجھ پر پُراسرار حملے ہونے لگے۔ مجھے اغوا کرنے اور مارنے کی کوششیں کی گئیں۔ میرا ایک محافظ ان کوششوں کی نذر ہو گیا۔ پھر حسن علی آیا اور اس نے نہ صرف اب تک مجھے دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا بلکہ ان سے بچنے کی تربیت بھی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود معمول سے ہٹ کر واقعات میرا تعاقب کر رہے تھے۔

نہ جانے کب نیند آ گئی لیکن یہ کچی اور چونکتی ہوئی نیند تھی۔ صبح جیسے ہی تہہ خانے کا فولادی گیٹ کھلنے کی آواز آئی میں اُٹھ بیٹھا۔ اس وقت شدت کی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ساری رات کچی نیند اور پھر نم فرش پر لیٹنے کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اندر آنے والا میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ صورت سے بدمعاش کے بجائے کسی قدر مظلوم لگ رہا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اس سے ایک کپ بھاپ اُڑاتا صاف نظر آ رہا تھا۔ چائے کے ساتھ ایک عدد بن تھا۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ وہ بے دھڑک میرے پاس چلا آیا۔ غالباً وہ کوئی غیر اہم شخص تھا۔ اگر میں اسے قابو کر بھی لیتا تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یعنی میرے بھاگ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔

"صاحب ناشتہ کر لو پھر اوپر چل کر لیٹرین سے فارغ ہو جانا۔"

میں لیٹرین جانے کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا مگر پہلے بھوک کا مداوا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ بن اور بسکٹ کا ڈبا میری خوراک کے لحاظ سے ناکافی تھے پھر بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس قید کے عالم میں اتنا ہی مل گیا ہے۔ کھا کر اور چائے پی کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "چلو اوپر۔"

"آؤ صاحب۔" اس نے بلاتکلف آمادگی ظاہر کی۔ میرا خیال تھا کہ اوپر کوئی ہتھیار بدست موجود ہوگا۔ مگر تہہ خانے کے اس دروازے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ دروازہ ایک گیلری کے آخری

سرے پر کھل رہا تھا اور اس جگہ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہ کوئی زیرِ تعمیر مکان ہے۔ دیواروں پر پلستر تک نہیں تھا۔ جہاں تہہ خانے کا دروازہ تھا، اس کے ساتھ ہی گیلری کے سرے پر باہر جانے والے راستے پر اسی طرح کا فولادی دروازہ تھا۔ گیلری کے دائیں بائیں جو بغیر چوکھٹوں کے خلا تھے، یہ کمرے تھے جو ابھی پلستر کے محتاج تھے البتہ کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ گویا میرے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اس گیلری کے آخری سرے پر نامکمل واش تھا جہاں صرف پانی اور نکاسی کے سوراخ کے علاوہ کوئی سہولت نہیں تھی۔ میں نے ان ہی دستیاب سہولتوں سے استفادہ کیا۔ واش روم کا دروازہ تک نہیں تھا۔ وہ بے چارہ ایک طرف آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ باہر آ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''پتا نہیں صاحب۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم خود ادھر قید ہے۔''

''یعنی اگر میں تمہیں یرغمال بنالوں......''

وہ مسکرایا۔ ''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، بے شک تم مجھے مار دو۔''

''تم یہاں کیوں قید ہے؟''

''پتہ نہیں صاحب...... ہم تو مزدور ہے، یہ کام کے لیے لایا اور ادھر قید کر دیا۔ چار دن ہوئے اب ہم ان کا خدمت کرتا ہے، چائے بناتا ہے، برتن دھوتا ہے۔''

''کیا یہ جگہ تعمیر شدہ ہے؟'' میں نے تعجب سے اِردگرد دیکھا۔

''بس یہ حصہ ایسے ہی ہے، باقی تو بڑا اچھا کوٹھی ہے۔''

''یہاں کتنے افراد ہیں؟''

''چار آدمی ہیں، اس کے علاوہ دو کتے ہیں جو باہر پہرے دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے دھمکی دیا ہے اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کیا تو یہ ہم کو کتوں کے آگے ڈال دے گا۔''

''کیا فرار کے امکانات بھی نہیں ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوٹھی کے چاروں طرف دس فٹ اونچا دیوار ہے اور دروازہ یہ بٹن دبا کر کھلتا بند کرتا ہے۔''

''اگر میں تہہ خانے میں نہ جاؤں؟''

''تو یہ لوگ باہر سے دروازہ نہیں کھولے گا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''ہم بھی آپ کے ساتھ ادھر ہی بند رہے گا۔''

مجھے ان لوگوں کی حکمتِ عملی کی داد دینا پڑی۔ انہوں نے میرے فرار کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں واپس تہہ خانے میں چلا گیا۔ میں ان کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اب تک انہوں نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی لیکن مجھے اس کی بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ ان لوگوں کا





یہ رویہ ازراہِ انسانیت ہے بلکہ وہ فی الوقت مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانے پر مجبور تھے۔ جمشید علی تک میری آواز کا ریکارڈ پہنچانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان سے کوئی بات منوانا چاہتے تھے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جبکہ میں صحیح سلامت ان کی قید میں موجود رہوں۔ وہ مجھے اپنا مقصد حاصل ہونے تک کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

ان لوگوں کا جمشید علی سے کیا مطالبہ ہو سکتا تھا؟ میں نے سوچا۔ کیا پیسے کا مطالبہ...... وہ لوگ میرا تاوان طلب کرتے، مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہاتھی سے گنا طلب کرے۔ جب وہ جمشید علی کے بارے میں جانتا تھا تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ جمشید علی کس قسم کا شخص تھا۔ وہ اس دریا کا مگرمچھ تھا جس کے وہ پھوے تھے لیکن نہ جانے کیوں یہ بات میرے دل کو نہیں لگی۔ اگرچہ ان کے بارے میں واضح نہیں تھا پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق ارشد بلا کے گروپ سے ہے ورنہ اس شہر میں میرا اور کوئی دشمن نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اندھا دھند نہیں اُٹھایا تھا بلکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ ارشد بلا کا بھائی مرشد بھی ہمارے پیچھے ایبٹ آباد تک آیا تھا۔ گویا وہ لوگ میرے پیچھے تھے۔ میں اس بارے میں محتاط ہی رہتا لیکن ماریہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے اور پھر اس کے باپ بھائی کے رویے نے مجھے ذہنی طور پر اتنا پریشان کیا تھا کہ میں اس نقطے کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس شہر میں میرے خون کے کچھ پیاسے موجود ہیں۔ ارشد بلا گروپ معمولی جرائم پیشہ افراد پر مشتمل نہیں تھا بلکہ یہ اونچے درجے کے بدمعاش تھے جن کے سرپرست اعلیٰ ایوانوں میں بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام آباد کی مستعد پولیس بھی ان پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ جمشید علی سے ٹکر لے سکتے تھے۔ ان کی پہنچ بہت اونچی سطح تک تھی۔ حد یہ تھی وہ جب چاہتے صدر مملکت تک سے مل سکتے تھے۔ سیکرٹری کی سطح کے لوگ ان سے وقت لے کر ملنے آتے تھے۔ جمشید پیلس میں مختلف تقریبات میں سندھ اور ملک بھر کے سیاستدان شریک ہونا اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران جمشید علی سے ایسے ملتے تھے جیسے ان کے مرید ہوں۔

اس کے باوجود میں مقامی سطح پر ارشد بلا کے گروہ کو کمزور نہیں سمجھتا تھا۔ ان کی اتنی پہنچ تھی کہ انہوں نے پولیس کی جانب سے پکڑ دھکڑ کے باوجود ہمارا تعاقب کیا اور ان کے چھ آدمی مجھے خاص طور سے اُٹھانے آئے تھے۔ اگرچہ وہ ناکام رہے تھے لیکن اس سے ان پر حرف نہیں آتا تھا۔ بلاشبہ میرا اس وقت نظر میں آنا ایک اتفاق تھا لیکن انہوں نے جتنی تیزی سے میرے اغوا کی پلاننگ کی اور اس پر عمل درآمد کیا یہ کسی معمولی گروہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ آٹھ اہم افراد کی گرفتاری کے باوجود ارشد بلا گروپ پوری طرح فعال تھا اگر میرے اغوا میں وہی ملوث تھے۔

اوپر روشندان سے اتنی روشنی آ رہی تھی کہ بلب کی روشنی نہ ہونے کے باوجود تہہ خانہ نیم تاریک سا تاریک تھا۔ میں سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے اب انتظار تھا کہ کب مجھے اس تہہ خانے سے نکال کر کہیں اور لے جایا جاتا ہے۔ یہ انتظار اس لیے نہیں تھا کہ مجھے اس تہہ خانے سے نکل کر کسی بہتر جگہ جانے کی

امید تھی بلکہ اس لیے کہ شاید اس دوران میں مجھے فرار کا موقع ملے۔ اس شخص نے مجھے اس جگہ کے جو حالات بتائے تھے اس کی روشنی میں یہاں سے فرار حد سے زیادہ مشکل تھا اور سب سے بڑی بات تھی مجھے کسی جگہ سے فرار کا کوئی بھی تجربہ نہیں تھا۔

جب وہی مظلوم صورت شخص دوپہر کا کھانا بھی لے کر آیا تو مجھے احساس ہوا پستول والے نے اس معاملے میں بھی مجھے بخوبی بے وقوف بنایا تھا۔ غالباً اس کا مقصد مجھے سکون سے رکھنا تھا۔ کھانا دے کر وہ واپس چلا گیا۔ یہ دال اور تنوری روٹی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھی مل رہا ہے۔ ان لوگوں سے مرغ مسلم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بھوک زیادہ نہیں تھی اس کے باوجود میں نے کھا لیا کہ نہ جانے کب ان لوگوں کا رویہ بھی بدل جائے اور مجھ پر کھانا پانی حرام کر دیا جائے۔ برتن ایسے ہی پڑے رہے اس وقت سہ پہر کے اوقات تھے جب روشندان سے آنے والی روشنی مدھم ہوئی تو بلب جل اُٹھا۔ مجھے غائب ہوئے ایک دن ہونے کو آ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حسن علی اور پاپا نے مجھے تلاش کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ناکام رہے ہوں گے ورنہ میں یوں قید میں نہ پڑا ہوتا۔

رفتہ رفتہ دن بالکل ڈھل گیا اور روشندان تاریک ہو گیا۔ رات کو دروازہ کھلا اور حنیف نیچے آیا۔ مظلوم صورت نے مجھے اپنا نام یہی بتایا تھا۔ رات کا کھانا دے کر اور دوپہر کے برتن لے کر وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

''یار کھلائے جا رہے ہو۔ اللہ کے بندے کیا اسے اپنے پیٹ میں رکھوں۔''

وہ میرا مطلب سمجھ کر ہنسا۔ ''صاحب اگر فوری ضرورت ہو تو ابھی لیے چلتا ہوں ورنہ کھانا کھا لیں......بس آدھے گھنٹے بعد آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......پر آ جانا۔'' میں نے آمادگی ظاہر کی اور وہ چلا گیا۔

اس بار کھانے میں آلو گوشت اور وہی تنوری روٹی تھی۔ جب تک میں کھانے سے فارغ ہوا حنیف آ گیا۔ وہ میرے لیے چائے بھی لے کر آیا تھا۔ ''میں نے ان لوگوں کے لیے بنائی تھی آپ کے لیے بھی لے آیا۔''

''شکریہ حنیف بھائی۔'' میں نے حقیقی ممنونیت سے جواب دیا۔

حنیف کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی تھی اور میں غور کر رہا تھا کہ اس ہمدردی کا کس طرح سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اس لیے چائے پینے کے دوران میں بہ ظاہر سرسری انداز میں اور درحقیقت اس سے کرید کرید کر ان لوگوں اور اس کوٹھی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بھولے پن میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ برتن لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے واش روم چلنے کے لیے کہا۔ واش روم سے واپسی پر پہلے اس نے مجھے تہہ خانے میں بند کیا تبھی باہر دروازہ کھلا۔ دراصل جب وہ باہر جانے لگتا تھا تو دروازہ بجاتا اور باہر موجود شخص یہ دیکھ کر اطمینان کرتا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند ہے۔ تب ہی وہ





دروازہ کھول کر اسے باہر آنے دیتا تھا۔

اوپر تقریباً دو کینال پر پھیلی اس کوٹھی کا بیشتر حصہ چاروں طرف سے کھلے صحن کی صورت میں تھا۔ اس حصے کو چھوڑ کر دیگر چار کمرے اور کچن و باتھ روم وغیرہ مکمل تھے۔ پستول والے اور خان سمیت چار افراد تھے۔ پانچواں حنیف تھا لیکن میری طرح وہ بھی قیدی تھا، بس فرق اتنا تھا وہ کمزور اور فطرتاً خوف زدہ شخص تھا اس لیے اسے ڈرانے کے ساتھ کسی قدر آزادی بھی دی ہوئی تھی تاکہ وہ گھر کے کام نمٹا سکے۔ اسے باہر صحن میں جانے کی اجازت تھی لیکن کسی دیوار کے پاس یا مین گیٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان چار میں سے ایک ہمہ وقت مین گیٹ پر رہتا تھا۔ عام طور سے رات میں یہ ڈیوٹی خان کی تھی جس کا نام حنیف نے گل خان بتایا تھا اور دن میں مجیب نامی شخص کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ پستول والا عالمگیر تھا اور ان کے چوتھے ساتھی کا نام مشتاق تھا۔ ان میں سے صرف عالمگیر اور مشتاق ہی باہر جایا کرتے تھے۔ گل خان اور مجیب اندر رہا کرتے تھے۔ بہ ظاہر عالمگیر ان کا باس نظر آتا تھا، ان سب کے پاس اسلحہ تھا، خاص طور سے عالمگیر ہمہ وقت پستول سے مسلح رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس رائفلیں اور بم بھی تھے۔ حنیف کو یہ ساری باتیں ان کے پاس رہنے سے معلوم ہوئی تھیں اس نے بتایا کہ جس کمرے میں عالمگیر رہتا ہے اسے ہر وقت لاک رکھتا تھا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ کوئی ہتھیار حنیف کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ اسے استعمال کرنے کی کوشش کرے۔

میرا ذہن سوچنے میں مصروف تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس قید کے عالم میں میرے پاس سوائے سوچنے کے اور کچھ تھا بھی نہیں۔ دوسرے حنیف سے میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان میں سے کوئی بات میرے ذہن میں چبھ رہی تھی، کوئی ایسی بات جو میرے فائدہ کی تھی۔ میں آزادی حاصل کر سکتا تھا لیکن وہ بات خاصے غور و خوض کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی دماغ کبھی نہیں سوتا۔ یہ مستقل جاگتا رہتا ہے۔ اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ جسمانی مشینری کو فعال رکھتا ہے۔ ان کی خرابیاں درست کرتا ہے۔ بے شمار نفسیاتی مسائل جو شعور حل نہیں کر پاتا لاشعور انہیں سونے کے عالم میں حل کر دیتا ہے۔ میں نے سونے سے پہلے اس معاملے پر اتنا غور کیا تھا کہ سونے کے بعد بھی یہ مسئلہ میرے دماغ پر طاری رہا حتیٰ کہ میں نے اس بارے میں خواب دیکھا۔ خواب میں میں دشمنوں سے لڑ بھڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں انہوں نے مجھے گولی مار دی۔ میں اچانک چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے چند گہری سانسیں لے کر اپنی حالت پر قابو پایا۔ معاً میرے ذہن میں وہ بات آ گئی جو خاصی دیر سے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ حنیف نے بتایا تھا کہ باہر جانے کے لیے دروازہ اس وقت کھولا جاتا ہے جب باہر موجود فرد یہ اطمینان کر

لیتا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے یعنی میں تہہ خانے میں بند ہو چکا ہوں۔ فرض کیا جائے کہ میں تہہ خانے سے باہر ہوتا ہوں اور اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں باہر والا مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیتا اور اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر اس معاملے میں دو باتیں اہم ہیں۔ اول تو حنیف اس کام پر راضی ہوتا، دوسرے اس مختصر سی گیلری میں میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی کیونکہ باہر والا دروازہ لوہے کی عمودی مضبوط پٹیوں سے اس طرح بنا تھا کہ ہر پٹی کے درمیان انچ کا فاصلہ تھا۔ باہر والا اندر کا پورا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ جزوی طور پر گیلری میں موجود کوئی شے اس کی نگاہوں سے محفوظ نہیں تھی۔ اگر یہ مسئلہ کسی طرح حل ہو جاتا اور میرے لیے دروازہ کھل جاتا تب میں آزادی کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔

اس کے بعد میں سویا نہیں۔ خاصی دیر سوچتا رہا کہ حنیف کو کیوں کر راضی کیا جائے۔ اس سے چند ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زندگی سے پیار کرنے والا شخص ہے اور خوف کے سبب کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں سے اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو مگر اسے راضی کیا جا سکتا تھا کہ وہ رہائی کے لیے میرا ساتھ دے اور مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع دے۔ اگرچہ اس بات کا امکان تھا کہ وہ انکار کر دیتا لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

صبح کے وقت میں نے سونے کے بجائے ایکسرسائز کرنا مناسب سمجھا اور جسمانی طور پر فٹ رہنے کے لیے حسن علی نے جو ورزشیں بتائی تھیں ان کے لیے کوئی مشین یا جگہ نہیں درکار تھی میں اس تہہ خانے میں بھی با آسانی یہ ایکسرسائز کر سکتا تھا۔

حنیف صبح روشنی ہونے کے بعد خاصی دیر بعد آیا تھا۔ اس وقت تک میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں متفکر صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے صاحب...... پریشان نظر آ رہے ہو؟'' اس نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''حنیف بھائی...... اپنے لیے کیا پریشان ہونا۔ بچپن سے ایسے حالات دیکھتا آ رہا ہوں لیکن تم......'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔

''کیا صاحب؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''دیکھو میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن اندھیرے میں رکھنا بھی مناسب نہیں ہے۔'' میں نے ناشتے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔ ''کل رات مجھے اوپر گیلری میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا، وہاں دو افراد آپس میں بات کر رہے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا، پتا ہے کیا کہہ رہے تھے؟''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' حنیف میرے انداز سے ہی خوف زدہ ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں خود کو اپنی اداکاری پر مبارکباد دی اور بیان جاری رکھا۔ ''وہ کہہ رہے تھے بس اب اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔'' بھائی میں تو کانپ اُٹھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ میری بات کر





رہے ہیں، پھر دوسرے کی آواز آئی۔ ابھی نہیں یار...... جب تک یہاں ہیں تب تک تو اسے زندہ رکھو، ورنہ گھر کے کام کون کرے گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا...... وہ کس کی بات کر رہے تھے؟''

''آ...... میر...... ی۔'' حنیف نے بہ مشکل کہا۔ محاورتاً اس کی بتیسی بجنے لگی تھی۔

''ہاں بھائی...... وہ تم سے چھٹکارے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے تمہیں خبردار کر دیا۔''

''ہائے...... اب میں کیا کروں...... یہ مجھے مار دیں گے...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

''حنیف بھائی میں تمہارے ساتھ ہمدردی ہی کر سکتا ہوں۔ میں تو خود بے بس اور قید میں ہوں۔ باہر نکل سکتا تو پھر تم دیکھتے کیسے خود کو بھی بچاتا اور تمہیں بھی نکال کر لے جاتا۔'' میں آہستہ آہستہ اسے اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔

''ہائے...... میں مر جاؤں گا۔'' اس نے پھر واویلا کیا۔

''آہستہ۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''کیوں انہیں احساس دلا رہے ہو کہ تم ان کے منصوبے سے واقف ہو گئے ہو۔ ہاں...... اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو میری مدد کرو...... مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ پھر میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔''

''تم کیسے نمٹو گے؟'' اس نے سوال کیا۔

میں ہنسا۔ ''گل خان کی صورت دیکھی ہے۔ اس کا یہ نقشہ میں نے ہی بنایا ہے۔ اگر خالی ہاتھ سے مقابلہ کرنا ہو تو میں اکیلا ہی ان چاروں کے لیے کافی ہوں۔''

''ہاں...... وہ تم کو بہت گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ اگر اسے عالمگیر نے نہ روک رکھا ہوتا تو اب تک وہ تمہیں گولی مار چکا ہوتا۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے دیکھا وہ کتنا بڑا ہے مجھ سے۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''اگر مجھے ایک بار اس جگہ سے نکلنے کا موقع مل جائے تو تم دیکھنا، آزاد ہونا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہو گا۔ بلکہ میں تمہیں اپنے پاپا سے منہ مانگا انعام بھی دلوا دوں گا۔ وہ اس ملک کے سب سے امیر شخص ہیں۔''

حنیف کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ''آپ اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ ان لوگوں نے آپ کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟''

''یہ میرے باپ سے تاوان لینا چاہتے ہیں۔''

''ہاں...... یہی بات ہو گی۔'' وہ فوراً بولا۔ ''صاحب میں نے آپ کو آزاد کر دیا تو مجھے کیا ملے گا۔''

''یہ بدمعاش مجھ سے ایک کروڑ روپے مانگ رہے ہیں۔ پاپا کے لیے یہ رقم کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اگر تمہاری مدد سے آزاد ہوا تو تمہیں جو انعام ملے گا وہ لاکھوں میں ضرور ہو گا۔ پاپا بہت فراخ دل آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے دس پندرہ لاکھ دے ہی دیں۔''

"دس پندرہ لاکھ......" اس نے ایک خواب کی سی کیفیت میں کہا۔ اس وقت لاکھ روپے بھی اتنی بڑی رقم تھی کہ عام آدمی اسے حاصل کرنے کا سوچ کر ہی لرز اُٹھتا تھا۔ افغان جنگ کے نتیجے میں کالی دولت کے سیلاب کا آغاز تھا اس لیے عام طور سے روپے کی قدر تھی۔ لاکھ اور کروڑ بے وقعت نہیں ہوتے تھے۔

"ہاں...... ہوسکتا ہے پاپا خوش ہوکر اس سے زیادہ ہی دے دیں۔" میں نے اسے پکا کرنے کے لیے کہا۔

"دس لاکھ روپے۔" اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں ایک سیدھے سادے شریف آدمی کو اپنی مطلب براری کے لیے بے وقوف بنا رہا تھا اور یہی نہیں بلکہ اسے سبز باغ بھی دکھا رہا تھا۔ میں نے شرمندگی سے سوچا۔ خیر ایک بار میں ان لوگوں کی قید سے نکل جاتا تو جمشید علی سے کہہ کر اسے انعام بھی دلوا سکتا تھا اور کوئی ملازمت بھی۔ فی الوقت مجبوری تھی مجھے بہرصورت ان لوگوں کی قید سے آزاد ہونا تھا۔ ان لوگوں کی نیت درست نہیں تھی، جو مجھے بہلانے کے لیے جھوٹا وعدہ کر سکتے تھے، میں ان لوگوں پر بھروسہ کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

"تمہیں رہائی بھی ملے گی اور انعام بھی۔" میں نے اسے ہلایا۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔ مجھے کوشش کر کے یہاں سے نکالنا ہوگا۔"

اس بار وہ ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اس کا ذہن ان خطرات کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس پر کبھی امید نظر آتی، کبھی مستقبل کے خوابوں کا عکس جھلکتا اور کبھی خوف نظر آتا۔ آخر میں خوف اس پر غالب آ گیا۔

"نہیں صاحب...... اگر ان لوگوں کو میرے ارادے کی بھنک بھی مل گئی تو یہ بے دردی سے مجھے مار ڈالیں گے۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ ایک دن میں نے اتفاق سے ان کی باتیں سن لیں وہ اپنے دو دشمنوں کا ذکر کر رہے تھے جنہیں انہوں نے مار کر اس کوٹھی میں کہیں دفن کر رکھا ہے۔ صاحب یہ مجھے بھی مار کر...... ادھر ہی دفن کر دیں گے۔"

"ابھی تو نہیں لیکن تین، چار دن میں وہ یہی کریں گے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"نہیں صاحب...... میں ان سے معافی مانگ لوں گا ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھ غریب پر رحم کریں گے۔" اس نے جواب دیا اور برتن لے کر کھڑا ہو گیا۔ "صاحب اگر لیٹرین جانا ہے تو میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں اس کے ساتھ لیٹرین تک گیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے تہہ خانے میں جانے سے پہلے ایک بار پھر گیلری کا غور سے معائنہ کیا۔ یہ کوئی پانچ فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی تھی۔ باہر جانے والے دروازے کے ساتھ ہی تہہ خانے کا دروازہ تھا اور دوسرے کمروں کے دروازے کوئی





پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اگر میں ان میں چھپ جاتا تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ گیلری سے باہر جانے والا فولادی دروازہ کوئی چار فٹ چوڑا تھا اس کے دونوں جانب چھ چھ انچ کی دیوار بچتی تھی اور میں اس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو بھی جاتا تب بھی باہر موجود فرد کی نگاہ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر حنیف مجھ سے تعاون پر تیار نہیں تھا۔ ایسے میں کسی کوشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں مایوسی کے عالم میں واپس تہہ خانے میں چلا گیا۔

حنیف دوپہر کا کھانا لے کر آیا تب بھی چپ تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے کئی بار اسے اُکسایا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ برتن کر واپس چلا گیا۔ مجھے قید میں آئے دو دن ہو چکے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ باہر کیا ہو رہا تھا یہ بات یقینی تھی کہ ان لوگوں نے جمشید علی سے رابطہ کر لیا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان میری رہائی کے لیے کیا مذاکرات چل رہے تھے اور ان لوگوں نے جمشید علی سے کیا مطالبہ کیا تھا، میں سب سے بے خبر تھا۔ عین ممکن تھا یہ لوگ جمشید علی سے کوئی ایسا مطالبہ کر دیتے جو ان کے لیے پورا کرنا ممکن نہ ہوتا، اس صورت میں میری رہائی بلکہ زندگی کے امکانات بھی صفر ہو جاتے۔ میں کسی پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ جمشید علی ہی کیوں نہ ہوں۔ حسن علی نے مجھے ہمیشہ یہی کہا۔

"تم اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرو۔ میں یا جمشید علی تمہاری مدد اور رہنمائی ضرور کر سکتے ہیں لیکن زندگی کی جنگ تمہیں خود ہی لڑنا اور جیتنا ہوگی۔"

حسن علی کی اس بات کو میں نے نہ صرف سمجھ لیا تھا بلکہ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا دیا تھا۔ اس جگہ سے فرار کا فیصلہ کر کے میں اس معاملے پر یکسو ہو گیا۔ رات کو بھی حنیف نے مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دفعہ وہ چکن لایا تھا، ساتھ میں پراٹھے تھے۔ "واہ بھائی...... تم تو رحمت کا فرشتہ ثابت ہو رہے ہو۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"میں نے نہیں بنایا ہے۔" اس نے مُردہ سے انداز میں جواب دیا۔ "مجھے کھانا بنانا کہاں آتا ہے۔ یہی لوگ لاتے ہیں۔"

جب سے میں نے اسے ساتھ ملانے کے لیے جھوٹ بولا تھا وہ بے حد خوف زدہ اور چپ سا رہنے لگا تھا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اوپر واش روم تک لے گیا تھا۔ پھر مجھے تہہ خانے میں بند کر کے چلا گیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اب تک لیٹنے کے لیے بستر تو کیا ایک چادر تک نہیں دی تھی۔ جیسے یہ لوگ خوفزدہ تھے۔ مجھے کچھ دیا گیا تو میں اسے ان کے خلاف نہ استعمال کر بیٹھوں۔ میں تیسری رات بھی ننگے اور نم فرش پر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ان تین دنوں میں میرا وجود وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ لباس اور جسم مٹی سے خراب تھا اور بال چیکٹ ہو چکے تھے۔ مجھے خود سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بات طے تھی کہ انسان کو نیند ہر حال میں آ جاتی ہے اس ننگے اور تر فرش پر بھی مجھے اتنی ہی اچھی نیند آتی تھی جتنی کہ اپنے نرم گرم بستر پر۔ کھانا کھا کر میں جلد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات کا نہ

جانے کون سا پہر تھا اچانک مجھے لگا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔



یوں لگا جیسے مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ اپنے چہرے پر مجھے نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ ذہن پر ابھی مدہوشی طاری تھی اور میرا آنکھ کھولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جب آواز کے ساتھ ساز بھی شامل ہو گیا یعنی کسی نے میرے چہرے کو طبلہ سمجھ کر بجانا شروع کر دیا تو مجھے مجبوراً آنکھیں کھولنا ہی پڑیں اور پھر تیز روشنی کی وجہ سے بند بھی کرنا پڑیں۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن قابو میں آنے لگا۔ شعور کی سطح پر تصاویر اُبھرنے لگیں۔ مجھے عبید صلاح یاد آیا۔ اس نے ہمیں روکا تھا، پھر گارڈز بے ہوش کرنے والی گولیوں سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ عبید صلاح نے بہ وقتِ رخصتی میری گردن پر کوئی نوکیلی شے چبھوئی تھی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا، شاید اس نے میری گردن میں ڈارٹ گن کا بلٹ ہاتھ سے چبھو دیا تھا۔

''یوسف تمہیں ہوش آ گیا ہے...... آنکھیں کھولو۔'' میں نے جان گرے کی آواز سنی۔

''ہوش تو آ گیا ہے۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''لیکن پہلے یہ روشنی ہٹاؤ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

''روشنی نہیں ہے، اب آنکھیں کھولو۔''

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ وہ دراصل ٹارچ کی روشنی تھی جو ایک ڈاکٹر نما شخص میری آنکھوں میں ڈال رہا تھا۔ ''اب یہ پوری طرح ہوش میں آ چکا ہے۔'' ڈاکٹر نے غالباً جان گرے کو آگاہ کیا۔

''یوسف تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' جان گرے نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

''پانی۔'' میں نے دردناک انداز میں کراہ کر پکارا۔ درحقیقت مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن اس وقت میرا مقصد جان گرے کو تنگ کرنا تھا۔ ایک نرس نے جلدی سے لا کر مجھے گلوکوز ملا پانی دیا۔ کمرے سے بھی لگ رہا تھا کہ میں کسی ہسپتال میں ہوں۔ نہایت آرام سے یہ پانی میں نے نرس کے ہاتھوں سے پیا اور پھر یوں سر ڈال کر ہانپنے لگا جیسے پانی پینے سے پہلے کنواں کھودا ہو۔

''سر یہ اس وقت کمزور ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ''بہتر ہو گا آپ اسے کچھ وقت دیں۔''

''شٹ اپ......'' جان گرے نے اسے جھاڑ دیا۔ ''تم اسے نہیں جانتے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یوسف تم پوری طرح ہوش میں ہو اور تم جیسا آدمی اتنی آسانی سے کمزور نہیں ہو سکتا۔''

''میں بے انتہا تھکن اور کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

''بکومت...... میں تمہیں جانتا ہوں۔ سیدھی طرح میرے سوال کا جواب دو...... وہاں کیا ہوا تھا؟''

''کہاں...... کیا ہوا تھا؟'' میں نے بھولپن سے دریافت کیا۔





''تم اور تمہارے ساتھ جانے والے دونوں محافظ سڑک پر جیپ میں بے ہوش پائے گئے تھے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، وہاں کیا ہوا تھا؟''

''اوہ اچھا...... چلتے چلتے ہماری جیپ کا ٹائر اچانک پنکچر ہو گیا۔''

''اسے دانستہ پنکچر کیا گیا تھا۔'' جان گرے نے میری بات کاٹی۔ ''اس کے نیچے چوڑے سرے والی کیل تھی۔ وہی کیل ٹائر میں گھس گئی۔''

میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''مجھے کیا پتا...... میں کوئی ٹائر کے ساتھ تو نہیں تھا۔ بہرحال جیپ رُک گئی۔ ایک آدمی اسے دیکھنے کے لیے اُترا۔''

''کون...... وہ جو ڈرائیو کر رہا تھا۔'' اچانک جان گرے نے سوال کیا۔ اس کا سوال عیارانہ تھا کہ میرے بیان میں گڑبڑ پیدا کر سکے۔

''نہیں جو میرے ساتھ بیٹھا تھا، وہ اُتر گیا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پھر ڈرائیور خاموش ہو گیا۔ میرا مطلب ہے ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد ٹائر دیکھنے والا بھی گر گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، میری گردن میں بھی کوئی چیز چبھی اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔''

وہ بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں یقین ہے تم ان دونوں کے فوراً بعد بے ہوش ہو گئے تھے؟''

''ہاں...... ہم تینوں کی بے ہوشی میں ایک منٹ کا وقفہ بھی حائل نہیں تھا۔ کسی نے مہارت سے چھپ کر حملہ کیا تھا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ کسی نے حملہ کیا تھا؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''اگر کسی نے حملہ نہیں کیا تھا تو کیا ہم کسی آسمانی بلا کا شکار ہوئے تھے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم یہ بات کیوں کر رہے ہو کہ کسی نے حملہ ہی کیا تھا؟''

''تو محض تفریحاً بے ہوش کیا تھا؟'' میرا لہجہ پہلے سے زیادہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

''اگر تم ان کے ساتھ ہی بے ہوش ہوئے تھے تو ان کے پورے ایک گھنٹے بعد ہوش میں کیوں آئے؟''

''یہ بات مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو۔'' میں جھنجھلا گیا تھا۔ ''ان ڈاکٹروں سے پوچھو...... ویسے بھی میں زخمی ہوں، شاید اس لیے دیر سے ہوش آیا۔''

جان گرے نے سر ہلایا مگر اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ ہوا کیا تھا؟''

جان گرے بولا۔ ''جب تم بروقت میرے پاس نہیں پہنچے تو میں نے ان دونوں سے رابطہ کرنا چاہا، ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر تم لوگوں کی تلاش شروع ہو گئی۔''

''اس وقت تمہارا خیال ہوگا کہ میں ان گارڈز کو بے بس کر کے فرار ہو گیا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''قدرتی طور پر یہی خیال آیا لیکن غائب ہونے کے ایک گھنٹے بعد تم تینوں بندرگاہ کی طرف آنے والی سڑک پر جیپ میں بے ہوش پائے گئے۔ تمہیں ہسپتال لایا گیا، تم تینوں کے جسموں سے ڈارٹ گن کا بلٹ نکلا تھا جس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی ہے۔''

''گویا کسی نے ہم تینوں پر ہی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس جزیرے پر کون اتنی جرأت کر سکتا ہے؟''

''مجھے شک ہے کہ یہ ہمارے مخالفوں کا کام ہے۔''

''مخالف...... اس جزیرے پر......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''مخالف کہاں نہیں ہوتے۔'' جان گرے نے سر ہلایا۔ ''مجھے عبید صلاح پر بھی شک ہے۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''اس کے بارے میں تو تم نے بتایا تھا کہ وہ شاید سمندر میں فرار ہوتے ہوئے شارکوں کا شکار ہو گیا ہے۔''

''وہ صرف ایک مفروضہ تھا۔'' جان گرے خشک لہجے میں بولا۔ ''اب بعض شواہد سامنے آئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہ صرف جزیرے پر ہے بلکہ اسے کچھ لوگوں کی حمایت اور مدد بھی حاصل ہے۔''

میں مضحکہ اُڑانے کے انداز میں ہنسا۔ ''غالباً تمہیں خواب میں بھی آ کر ڈراتا ہوگا۔''

''بکومت۔'' جان گرے جھلا گیا۔ ''میں اس سے ڈروں گا، ایک بار ہاتھ آ جائے تو مچھر کی طرح مسل دوں۔''

''غالباً یہی دعویٰ وہ تمہارے بارے میں کرے۔ وہ چھپ رہا ہے اور تم محافظوں کے حصار میں ہو۔ صدر امریکہ بھی چھپ کر رہتا ہے۔'' میرا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ ''لیکن موت سے کوئی نہیں چھپ سکتا۔ وہ ہزاروں محافظوں کے جھرمٹ میں آ جاتی ہے۔ ماہر ترین ڈاکٹروں کے حصار سے نکال لے جاتی ہے۔''

جان گرے ذرا چپ ہوا پھر اس نے کہا۔ ''جب تم لوگوں کی تلاش شروع ہوئی تو اس سڑک کی چیکنگ بھی ہوئی تھی۔ اس وقت جیپ سڑک پر نہیں تھی لیکن جب دوسری ٹیم وہاں سے گزری تو اسے جیپ اور تم تینوں مل گئے۔'' جان گرے چپ ہو کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''جب پہلی ٹیم وہاں سے گزری تو جیپ اور تم تینوں کہاں تھے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''میں تو بے ہوش پڑا تھا۔''

جان گرے کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ ''یوسف...... اگر تم نے اس معاملے میں غلط بیانی کی اور یہ غلط بیانی پکڑی گئی تو یاد رکھو تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔''





''اس سے زیادہ بُرا اور کیا ہوگا۔'' میں نے پسلی کے زخم کو چھوا۔ غالباً میری بے ہوشی کے دوران اس کی نئی پٹی کر دی گئی تھی اور کوئی پین کلر انجکشن بھی دیا گیا تھا کیونکہ زخم میں تکلیف قطعی نہیں تھی۔

جان گرے مجھے ڈرا دھمکا کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ابھی مجھے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک نرس نے آ کر مجھے کوئی سوپ نما چیز پلائی بلکہ چمچ سے کھلائی۔ اس میں کوئی تیز زود اثر دوا بھی تھی کیونکہ پیالہ ختم کرتے کرتے مجھے نیند آنے لگی تھی اور سوپ ختم کرنے کے چند منٹ کے اندر میں سو گیا تھا۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی، جس کی وجہ سے مجھے بے ہوش رکھا جاتا۔ ایسا شاید احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا گیا تھا اور ایسی چالا کی جان گرے ہی دکھا سکتا تھا۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ مقابلے سے پہلے مجھے شکست دینے کے لیے کیا دھاندلی کی گئی تھی اور میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میں حالات دیکھ رہا تھا، جس نے بھی میرے ساتھ دشمنی کی تھی، وہ دراصل میں جان گرے کا دشمن تھا اور ایک محاورے کے مطابق دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

رات کا باقاعدہ کھانا تھا اس کے بعد ایک دلکش نرس نے اپنے شیریں ہاتھوں سے کڑوی دوائیں کھلائیں اور ایک بار پھر میرے ساتھ ہاتھ دکھا دیا گیا۔ ان میں کوئی گولی نیند کی تھی جسے کھا کر میں پھر سونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ساری رات نیند میں گزار کر میں صبح بے دار ہوا تو جان گرے کے ہرکارے مجھے لے جانے کے لیے موجود تھے۔ مجھے صرف پٹی کروانے اور کپڑے بدلنے کی اجازت ملی تھی اس وقت تک میں ہسپتال کے کپڑوں میں تھا۔ کپڑوں کے ساتھ میرا پرس اور دوسرا سامان بھی تھا۔ مجھے ناشتہ کرنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی تھی حسبِ سابق ہتھکڑی لگا کر جیپ کے عقبی حصے میں اینگل آئرن سے جکڑ دیا گیا تھا۔ جیپ مجھے لے کر فراٹے بھرتی بندرگاہ کی طرف جانے والی سڑک سے گزری۔ اس وقت میں نے نوٹ کیا کہ اس سڑک پر پیدل نگران بھی گشت کر رہے ہیں۔ گویا حفاظتی انتظامات بڑھا دیئے گئے تھے۔ بندرگاہ کی طرف جانے والا راستہ جو بلندی سے نشیب کی طرف جاتا تھا، دراصل جزیرے کا بیشتر حصہ خاصا بلند تھا اور بندرگاہ پانی کی سطح تک تھی اس لیے اس تک جانے کے لیے خاصی نیچائی تک جانا پڑتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے جان گرے کے دفتر لے جایا جا رہا تھا کیونکہ بندرگاہ پر میں نے دفتری نوعیت کی تعمیرات دیکھی تھیں لیکن جیپ اوپری ہال سے گزری جہاں متعدد اقسام کی جیپیں اور لوڈرز کھڑے تھے۔ اس سے آگے سرنگ تھی۔ بندرگاہ کے پاس سے گزر کر یہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک حصہ بندرگاہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں جس جیپ پر تھا، اس نے دوسرے راستے پر سفر جاری رکھا۔ یہ راستہ چند سو گز کے بعد ایک مختصر ہال پر ختم ہو گیا اس سے آگے پیدل سفر کرنا تھا کیونکہ آگے سیڑھیاں تھیں جن پر جیپ سے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گارڈ نے میری ہتھکڑی اینگل سے

نکالی اور آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا۔ اس ہال میں تین طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں، ہال میں کئی جیپیں اور مختصر کاریں پارک تھیں۔ ان کی تعداد سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آگے بھی خاصا بڑا تعمیر شدہ حصہ تھا۔ ان لوگوں نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے اس جگہ چٹانیں تراش کر پوری بندرگاہ اور نہ جانے کیا کیا بنا رکھا تھا۔

ہم درمیان والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، یہاں پر ممنوع علاقے کی تختی لگی تھی اور ایک مسلح گارڈ نگران تھا اس نے میرے ساتھ آنے والے گارڈز کے کارڈ دیکھے اور سوالات کر کے پھر اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر سرنگوں کا وسیع جال تھا جس میں پتھر تراش کر کمرے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کا رُخ بندرگاہ اور سمندر کی طرف تھا ان کمروں میں کھڑکیاں نکالی گئی تھیں اس کا اندازہ مجھے بعض کھلے کمرے دیکھ کر ہوا تھا۔ بعض کمرے رہائشی تھے اور بعض دفتری کاموں کے لیے مخصوص تھے۔ مجھے عبید صلاح کی بات یاد آئی۔ ان لوگوں کا ایٹمی پاور ہاؤس بھی بندرگاہ کے آس پاس تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان لوگوں نے ساری اہم تنصیبات بمعہ اسلحہ کے گوداموں کے اس جگہ بنا رکھی تھیں۔ اسلحہ کے گودام یوں بھی ضروری تھے کہ یہ نہ صرف بحری قزاق تھے بلکہ اسلحے کے تاجر بھی تھے۔ ایشیا میں جاری جنگوں اور خانہ جنگیوں کو یہی لوگ اسلحہ فراہم کرتے تھے۔ اس سے دوہرے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ ایک تو ان کے اسلحہ سازی کے کارخانے دن رات کام کرتے اور ان کے لیے ڈھیروں نفع کماتے تھے اور دوسرا ایشیا اور افریقہ میں بدامنی کی آگ بھڑکا کر اپنے مفادات حاصل کرتے تھے۔ جنگ نے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں کو پسماندہ کر رکھا ہے اور عالمی امن کے ٹھیکیدار ان خطوں میں جنگ کی آگ بجھانے میں صرف اس وقت دلچسپی لیتے ہیں جب یہ آگ ان کے مفادات تک آ پہنچے۔

اس لحاظ سے یہ اس جزیرے کا اہم ترین حصہ تھا اور یہاں کی حفاظت کے انتظامات بھی اسی لحاظ سے تھے۔ جا بجا گارڈز پھیلے تھے، کئی جگہ میں نے کیمرے دیکھے۔ اس کے علاوہ نگرانی اور حفاظت کے لیے دوسرے انتظامات موجود تھے لیکن ان کی پوشیدگی بھی لازمی تھی۔ دو جگہوں پر مجھے مختلف آلات سے چیک کیا گیا تھا گویا انہیں شک تھا کہ میں کچھ چھپا کر نہ لے جا رہا ہوں۔ ایک طویل سفر کے بعد مجھے ایک لگژری قسم کے اپارٹمنٹ تک پہنچایا گیا جس کے آگے ایک لمبا تڑنگا حبشی پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے گارڈ کی بات سن کر اندر بات کی۔ ”سر...... یہ یوسف علی خان کو لے کر آئے ہیں۔“

اندر جان گرے غالباً ہمیں کیمرے سے دیکھ رہا تھا اس نے آنے کی اجازت دے دی۔ میں اس عالیشان اپارٹمنٹ کو دیکھ کر حیران ہوا تھا اس لیے نہیں کہ اس کی سجاوٹ میرے لیے کوئی نئی شے تھی بلکہ حیرت کی وجہ اس جنگل میں منگل تھا۔ اس جگہ کو ان لوگوں نے ایسا کر دیا تھا جیسا کسی جدید ترین شہر میں ہوتا ہے۔ جان گرے ایک ٹیری نما کاؤچ پر لیٹا ہوا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔





اس نے دھوپ کی رنگین عینک لگا رکھی تھی۔

جسم پر ایک نیکر تھی جس میں اس کی توند نمایاں تھی۔

”آؤ یوسف کیا حال ہیں؟“

”فی الوقت تو اچھے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اصولی طور پر مقابلہ جیتنے کے بعد مجھے آزادی مل جانی چاہیے۔“

”سر ہمارے لیے کیا حکم ہے۔“ میرے ساتھ آئے گارڈز میں سے ایک نے کہا۔

”تم لوگ جا سکتے ہو۔“ جان گرے نے تحکمانہ انداز میں جواب دیا اور دونوں گارڈز خاموشی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جان گرے میری طرف متوجہ ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟“

”شکریہ۔“ میں سامنے رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

جان گرے نے برابر میں رکھی تپائی سے جام اُٹھایا۔ ”تم تو پیتے نہیں ہو...... یہ بتاؤ کہ کافی یا سافٹ ڈرنک چلے گی؟“

”کافی۔“ اس بار بھی میں نے مختصراً کہا۔

جان گرے نے وہاں رکھے واکی ٹاکی پر کسی سے کافی لانے کو کہا پھر مجھ سے بولا۔ ”اصولی طور پر تم مقابلہ جیت کر رہائی کے حق دار ہو لیکن ابھی کونسل کے بڑے تمہاری رہائی کے حق میں نہیں ہیں اس لیے فیصلہ ہونے تک تمہیں میری تحویل میں دیا گیا ہے۔“

”یعنی اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔“ میں نے تلخی سے جواب دیا۔

”یوسف اپنے اندر لچک پیدا کرو۔“ اس نے تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”یہ مت بھولو کہ تم اس وقت میری وجہ سے زندہ ہو۔ اگر میں نہ ہوتا تو تم پھانسی پر لٹک چکے ہوتے۔“

”جیسے عبید صلاح لٹک گیا ہے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تم لوگوں کا یہی فرعون پن ہے۔ طاقت کے زعم میں تم بھول جاتے ہو کہ ایک ہستی ایسی ہے تم اس کے آگے مجبور ہو۔ تم لوگوں نے اس دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانے کی جتنی کوشش کی وہ سب ناکام رہیں۔“

”تقریر مت کرو۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ ”حقائق کو دیکھو۔“

”چلو میں مان لیتا ہوں کہ تم نے کرم کیا مجھے مرنے سے بچایا، تب میں کیا کر سکتا ہوں۔“

وہ مسکرایا۔ ”اب کی نا تم نے کام کی بات...... دیکھو میں تمہیں شروع سے کہتا آیا ہوں کہ تم میرے کام آؤ...... میں تمہارے کام آؤں گا۔“

”یہ بات سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”لیکن تعاون کس صورت میں کیا جائے یہ بات اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔“

”فکر مت کرو...... بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ جیسے ہی تمہیں جزیرے سے جانے کی

اجازت ملی میں تمہیں بتادوں گا کہ تمہیں میرے لیے کیا کرنا ہے۔"

"ضروری نہیں ہے تم جس کام کو میرے لیے ممکن سمجھ رہے ہو وہ میرے لیے ناممکن ہو۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔"تم پہلے بھی اس کام میں ہاتھ ڈال چکے ہو اور اس بار بھی کر سکو گے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کوئی بات میرے ذہن میں سرسرانے لگی لیکن فی الوقت میں نے ان خیالات کا اظہار ضروری نہیں تھا۔ اس کے بجائے میں نے موضوع بدل دیا۔"تم نے کئی بار کہا تم میرے ماضی سے واقف ہو، کیا مجھے اس کے بارے میں بھی نہیں بتاؤ گے۔" میرے لہجے میں نامحسوس سی التجا آ گئی تھی۔

جان گرے ہنسا۔"تم تو کام کرنے سے پہلے ہی معاوضہ مانگ رہے ہو۔ یاد رکھو تمہارے ماضی کے بارے میں تمہیں صرف اس وقت بتاؤں گا جب میرا کام ہو جائے گا۔"

"ایک تم ہی میرے ماضی سے واقف ہو۔" میں نے جل کر کہا۔"اس دنیا میں اور بھی لوگ ہوں گے اس حقیقت سے واقف۔"

وہ مسکرایا۔"یوسف، اس پوری دنیا میں صرف میں ایک شخص ہوں جو تمہارے ماضی سے واقف ہوں، باقی افراد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان میں جمشید علی خان اور اس کا خصوصی نائب بابر خان بھی تھے۔ باقی سب اس کشتی کا عملہ تھا جس پر تم لائے گئے تھے۔ اس کشتی کو پاکستان کوسٹ گارڈز نے مقابلہ کر کے تباہ کر دیا تھا اور عملے کا ہر فرد مارا گیا تھا۔"

"بابر مرا نہیں ہے بلکہ وہ مجھ پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

وہ پھر مسکرایا۔"تمہارے خیال میں بابر فرار ہو کر کہاں گیا تھا۔ کیا اس ملک میں وہ جمشید علی کی نگاہوں سے بچ سکتا تھا، اس نے عقلمندی کی اور فرار ہوتے ہوئے سیدھے ترکی کا رُخ کیا تھا اور وہاں سے یورپ جانے کے لیے ایک بحری جہاز پر سوار ہوا تھا۔ اتفاق سے وہاں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ میں نے اس سے دوستی کی، پھر ایک رات جب ہم پی رہے تھے، بابر نے نشے کی کیفیت میں جمشید علی اور تمہارے بارے میں بتا دیا۔"

"اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ کیوں میرا دشمن ہو رہا تھا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔"میرا اندازہ ہے تم سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ کسی کے اشارے پر ایسا کر رہا تھا۔ بہرحال وہ جمشید علی سے بے انتہا خوفزدہ تھا۔ جمشید علی کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا، جہاز رانی کی دنیا میں وہ ایک قابلِ احترام شخص تصور کیا جاتا تھا لیکن میں ان کم ترین افراد میں سے ہوں جنہیں جمشید علی کی دوہری زندگی کا علم تھا۔ یعنی وہ ایک اسمگلر بھی تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کا مجرم...... جس کے کاروبار کا دائرہ ایشیاء، افریقہ سے لے کر یورپ و امریکہ تک



پھیلا تھا۔ انٹرپول میں اس کے بارے میں ایک چھوٹی سی فائل تھی جس میں اس پر شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ایشیا سے یورپ تک کے روٹ پر منشیات سمگل کرتا ہے۔"

"تم نے بابر کا کیا کیا؟"

"اس کے بارے میں جانتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو میرے قبضے میں ہونا چاہیے۔ جب بحری جہاز جزیرہ کریٹ پر رُکا تو میں نے بابر کو وہاں اُتار لیا۔ یہ کام زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں نے اسے شراب میں ایک دوا دی جس کے اثر سے اس کی حالت خراب ہو گئی اور اسے بحری جہاز سے ہسپتال منتقل کر دیا گیا وہاں سے اسے میرے ساتھی نکال کر لے گئے۔"

میں نے اسے گھورا۔"تمہیں بابر سے کیا دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے تم نے کسی انسانی ہمدردی کے تحت اس کی مدد نہیں کی ہو گی۔ یہ چیز تم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔"

"ہاں...... میں نے ایک وجہ سے اسے پناہ دی تھی۔ جمشید علی نے افغان جنگ کے آغاز کے بعد ہیروئن جنوبی افریقہ اور برازیل کے راستے یورپ اور امریکہ بھیجنا شروع کی تھی۔ اس کے بدلے وہ ہیرے اور سونا حاصل کرتا تھا۔ اس کے پاس نایاب جواہرات کا خاصا بڑا ذخیرہ تھا۔ میں اس ذخیرے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن وہ بدبخت کچھ بتانے سے پہلے مر گیا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے جان گرے کو جام بناتے دیکھ کر دریافت کیا۔

"اس نے یہ شبہ ہونے کے بعد کہ میں اس سے جمشید علی کی خفیہ دولت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں، جس جگہ اسے قید کر رکھا تھا وہاں سے فرار کی کوشش کی۔ وہ صرف ایک منزل کی اونچائی سے کودا تھا مگر بدقسمتی سے اس کا پاؤں ایک تار میں اُلجھا اور وہ سر کے بل زمین پر آ گرا۔ نتیجہ ظاہر ہے اس کا بھیجا باہر آ گیا تھا۔ افسوس کہ وہ اس خفیہ دولت کے بارے میں بتانے سے پہلے مر گیا تھا۔"

"اور اب تم میری مدد سے اس دولت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

"نہیں یوسف...... یہ تو معمولی سی شے ہے۔ میں تمہاری مدد سے وہ کچھ حاصل کروں گا کہ رہتی دنیا تک میرا نام زندہ رہے گا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔"تم جیسے شخص کو بھی اپنے نام کی پروا ہے۔"

"ظاہر ہے...... یہ خواہش کسے نہیں ہوتی کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے۔" اس نے شانے اُچکائے۔

"مجھے کم سے کم تم سے یہ امید نہیں تھی۔" میں ہنسا۔"تمہیں دیکھ کر اپنے ایک بادشاہ کا خیال آتا ہے جس کا تصور تھا دنیا میں جتنے مزے کرنے ہیں کر لو کیونکہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔"

جان گرے ہنسا۔"میں نے سنا ہے...... لیکن میں ایسا نظر آنے کے باوجود ایسی سوچ نہیں

رکھتا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرا موجودہ امیج اچھا نہیں ہے۔ اگر میں کامیاب رہا تو لوگ میری اس شخصیت کو بھول جائیں گے۔ میں اپنے لوگوں کا ہیرو بن جاؤں گا۔''

''وہ تو تم اب بھی ہو...... تمہارے جیسے لوگ آج کل ہیرو ہیں۔''

''میں کل بھی ہیرو ہی رہوں گا۔'' اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔ ''دنیا اس کی ہے جو اپنی بات دوسروں سے منوا سکتا ہے۔ اور یہ طاقت آج ہمارے پاس ہے، کل کیا پتا یہ طاقت کس کے پاس ہو...... درحقیقت تاریخ بنانے کے لیے اور آنے والی نسلوں کو تحفظ دینے کے لیے ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔''

''کیونکہ زوال تیزی سے تم لوگوں کی طرف آ رہا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

جان گرے جوابی طنز کے ساتھ ہنسا۔ ''اور تم لوگ کچھ کیے بغیر اپنے آپ کو یہی سوچ کر تسلی دیتے رہو۔''

میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ مسلمان بحیثیت ایک قوم عمل سے کوسوں دور ماضی کے تابناک دور اور آنے والے مستقبل کی خوش امیدی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ حال کی ہمیں خاص پروا نہیں ہے۔ میں نے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا۔ ''فی الوقت بات تمہارے زوال کی ہو رہی ہے۔ تمام تر ہتھکنڈے استعمال کرنے اور دوسری قوموں کا استحصال کرنے کے باوجود تم لوگوں کے عروج کا دور اتنا مختصر ثابت ہوا ہے اور زوال آنے والا ہے۔''

''فی الوقت ہم نے اسے روکا ہے۔''

''منفی ہتھکنڈوں سے زوال کبھی نہیں رُکتا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر ایسا ہوتا تو رومن سلطنت آج بھی قائم ہوتی۔''

''موجودہ دور کو تم اس کا تسلسل سمجھو۔''

اسی لمحے ایک دُبلی سی سانولی لڑکی نے ٹیرس پر قدم رکھا اس نے کافی کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ یہ مشکل سے چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی جس کا تعلق شاید ساؤتھ انڈیا سے تھا۔ اس کے چہرے اور جسمانی حرکات میں ایک طرح کا خوف رچا ہوا تھا۔ معمولی سی موٹی ساڑھی میں وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنی تھی۔ میں نے طنزیہ انداز میں اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کم سے کم اس لڑکی کو دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے۔''

''کمزور ہمیشہ طاقتور کا غلام ہوتا ہے۔'' جان گرے نے فلسفیانہ انداز میں حقیقت بیان کی۔

لڑکی نے کافی کی ٹرے تپائی پر رکھی اور مگ اُٹھا کر میری طرف دیکھا جیسے چینی یا کریم کا پوچھ رہی ہو۔ میں نے اشارے سے ایک چمچ چینی اور کریم ملانے کو کہا۔ لڑکی یہ کام کرنے کے لیے تپائی کی طرف جھکی تو اس کے بلاؤز کا پلو سرک گیا اور میری نظر نے وہ دیکھ لیا جو اب تک چھپا تھا۔ میری توجہ اس کے نو میدہ شباب نے نہیں بلکہ اس کے سینے پر نظر آنے والے بھنبھوڑے جانے کے نشانوں





نے کھینچی تھی۔ وہ ایک کچی کلی تھی جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا گیا تھا۔ یہ بات جان گرے نے بھی محسوس کی اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

''یہ لڑکی ایک ہفتے پہلے ہی میرے پاس آئی ہے۔ مجھے ایشیائی اور خاص طور سے ساؤتھ ایشین حُسن ہمیشہ سے پسند رہا ہے اس لیے میں نے خاص طور سے اس کی فرمائش کی تھی۔''

میرا دل چاہا کہ اس مردود کی گردن مروڑ کر اسے ٹیرس سے نیچے پھینک دوں اور شاید میں ایسا ہی کرتا اگر میری عبید صلاح سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ اب میرے پیش نظر ایک فرد کی بربادی نہیں بلکہ اس پورے جزیرے کی تباہی تھی جو انسانیت کش جرائم کا مرکز تھا۔ ممکن ہے میں جان گرے کو جہنم رسید کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس صورت میں اس مرکز کی تباہی رہ جاتی۔ مجھے خود پر قابو پانا پڑا۔ جان گرے مجھ سے غافل نہیں تھا۔ وہ بہ غور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے گہری سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب اور جسم کو ڈھیلا چھوڑا تو وہ مسکرا دیا۔

''میرا خیال ہے تم اب خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہو۔'' وہ بولا۔ ''دیکھو یوسف...... ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام سوراتی ہے۔ تمہارے دشمن ملک سے تعلق رکھتی ہے اس ملک نے احمقانہ جذباتیت سے خود کو آزاد کرا لیا ہے اور ایشیائی کلچر اور نام نہاد روایات کی جان چھوڑ کر جدیدیت کی طرف آ رہا ہے اور تم ابھی تک اسی فرسودگی سے چمٹے ہو۔''

''شاید اس لیے کہ سوراتی کا تعلق جس قوم سے ہے وہ ہر طاقتور کے آگے سر جھکانا اپنا ایمان سمجھتی ہے جبکہ ہم مسلمان ایسا نہیں سمجھتے۔'' میں نے کافی اُٹھا لی۔ لڑکی جان گرے کے اشارے پر واپس جا چکی تھی۔

''تبھی تم لوگ اب تک پسماندہ ہو۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ نہ جھکنے کی خاصیت ہی قوموں کو بالآخر عروج پر لے جاتی ہے۔ جو قوم ہر فاتح کے سامنے سر جھکا دے وہ جلد فنا ہو جاتی ہے جیسے اپنے زوال کے دور میں بھی یورپ نے کبھی مسلمانوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا حالانکہ مسلمان اس زمانے کی سپر پاور تھے۔ اگر تمہارے فلسفے یا خیال کے مطابق طاقتور کی اطاعت قبول کر لینا چاہیے تو ذرا سوچو آج یورپ کہاں ہوتا۔ کیا آج تم لوگ سپر پاور ہوتے؟''

جان گرے نے اعتراف کیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ دور دوسرا تھا۔ اس وقت مسلم سلطنتیں کتنی ہی طاقتور رہی ہوں لیکن ان کے پاس قوموں کو مٹانے کی طاقت رکھنے والے ہتھیار نہیں تھے۔ اب ہمارے پاس ایسے ہتھیار ہیں کہ چاہیں تو ہر دشمن کو صفحۂ ہستی سے نابود کر کے رکھ دیں۔''

''یہ اعزاز بھی تم لوگوں کے حصے میں آیا۔ جب سائنس تمہارے ہاتھ لگی تو تم نے اسے تخریب کے لیے مخصوص کر دیا۔ جتنا انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کیا اس سے کہیں زیادہ انسانیت کش مقاصد کے لیے استعمال کیا۔''

''طاقتور بننا سب کا حق ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہم نے اس حق کا استعمال کرلیا۔ خیر یہ بڑا وسیع موضوع ہے اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ فی الوقت تم آرام کرو، بھوک لگی ہو تو سوراتی سے کھانے کا کہہ دینا۔''

اس نے واکی ٹاکی پر سوراتی کو طلب کیا اور مجھے میرا کمرا دکھانے کی ہدایت کی۔ جب میں سوراتی کے ساتھ جانے لگا تو جان گرے نے عقب سے کہا۔ ''یوسف تم اس اپارٹمنٹ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آجا سکتے ہو لیکن اس سے باہر نہیں۔''

''میں خیال رکھوں گا۔'' میں نے بھی مڑے بغیر جواب دیا۔

سوراتی مجھے ایک بیڈ روم میں لے آئی جو دوسرے فلور پر تھا۔ یہ فرانسیسی طرز کا اپارٹمنٹ تھا جس کے کئی فلور تھے۔ یہ کمرا سمندر کے رُخ پر نہیں تھا البتہ اس کا باتھ روم سمندر کے رُخ پر یوں تھا کہ اس باتھ روم میں پانی کے ساتھ غسل آفتابی سے بھی بیک وقت لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا۔ ''صاحب...... آپ نہائیں گے؟''

''پہلے مجھے ناشتہ دو۔'' میں نے اردو میں جواب دیا تو وہ اُچھل پڑی۔

جان گرے اس جزیرے کے بلکہ مافیا کے سرکردہ لوگوں میں سے تھا اس وجہ سے اسے عالیشان اپارٹمنٹ ملا تھا۔ اس میں کئی بیڈ روم تھے۔ سوراتی مجھے ان میں سے ایک میں لے آئی تھی اس کا خیال تھا کہ میں بھی شاید جان گرے کی طرح گورا تھا اس لیے مجھے صاف اردو بولتے سن کر حیران رہ گئی۔ ''صاحب...... آپ کو ہندی آتی ہے؟'' اس نے مسرت سے کہا۔

''اردو۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''میرا نام یوسف علی خان ہے اور میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔''

اس تعارف پر اس کا جوش وخروش ذرا مدھم ہوگیا تھا۔ اس نے ایک الماری کھولی، اس میں بے شمار سوٹ، قمیصیں، پتلون، نائٹ سوٹ اور ضروری استعمال کے دیگر ملبوسات ٹنگے تھے۔ ''آپ کپڑے بدل لیں جب تک میں ناشتہ لاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''تمہاری اردو...... بلکہ ہندی خاصی صاف ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''میں نے حیدر آباد میں پرورش پائی ہے۔ میری ماں اور باپ ایک نواب صاحب کے ہاں ملازم تھے۔ میں ان کی حویلی میں کھیل کر بڑی ہوئی ہوں۔''

وہ بالکل کسی نو عمر لڑکی کی طرح تھی۔ شاید پانچ فٹ کا قد، چھریرا جسم جواب کہیں کہیں سے بھاری ہو رہا تھا اور سُبک نقوش۔ اس نے سیاہ بالوں کی دو چوٹیاں ڈال رکھی تھیں ان کی وجہ سے اس کی کمسنی کے تاثر میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی بھی کم سن نہیں تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک لباس نکالا۔ ہلکا اور ڈھیلا سوتی ٹراؤزر ساتھ میں سفید رنگ کی ٹی شرٹ تھی۔ زخم کی وجہ سے نہا نہیں سکتا تھا اس لیے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا، جب





میں فریش اپ اور لباس کی تبدیلی کے ساتھ باہر آیا تو سوراتی ناشتہ لے آئی تھی۔ ناشتے میں خاصا اہتمام تھا اور میں نے بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ سوراتی اس دوران میں پاس کھڑی رہی۔ میں نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی تھی لیکن وہ کھڑی رہی۔ اسے باقاعدہ تربیت دی گئی تھی اور اس تربیت کا اولین اصول تھا کہ آقا اور غلام کے درمیان فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس فاصلے کو کسی صورت ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے یا زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اپنا ایک ہم زبان ملنے پر اسے فطری طور پر زیادہ بولنا چاہیے تھا۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اُٹھا کر لے گئی۔ گزشتہ دو دن سے میں زیادہ تر بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا اور دواؤں کے اثر سے جسم میں کسل مندی تھی، سر میں ہلکا سا درد تھا۔ میں نے سوراتی کو طلب کرنے کے لیے بٹن دبایا اور وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگئی۔ ''جی صاحب۔''

''مجھے سر درد کی گولی لا دو۔''

''صاحب...... میں تیل لگا کر مالش کر دوں۔'' اس نے مستعدی سے پیش کش کی تو مجھے ماہ پارہ یاد آگئیں جب میں سر درد کی شکایت کرتا تو وہ کوئی گولی دینے کے بجائے تیل سے میرے سر کی مالش کیا کرتی تھیں اس سے سر کا درد غائب ہو جاتا۔

''کیوں نہیں...... یہ تو اور اچھی بات ہے۔''

''میں ابھی لائی صاحب۔'' وہ لپک کر گئی اور تیل کی بوتل لے آئی۔ ''صاحب...... بستر پر اوندھے منہ لیٹ جائیں اور قمیص اتار دیں۔''

میں نے اس کی بات کے مطابق عمل کیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا تولیہ لائی تھی۔ اس نے وہ تولیہ میرے منہ تلے بچھایا پھر تیل سر کے بالوں میں ٹپکا کر انگلیوں سے مالش کرنے لگی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی نرم اور ملائم انگلیوں میں کیسا سرور تھا، میرے سر کا درد جیسے کھینچ کر ان انگلیوں میں جانے لگا۔ میں خواب، نیند بلکہ سکون کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ میرے سونے کے بعد سوراتی نے تولیہ سے سر صاف کیا تا کہ اضافی تیل بستر یا کپڑوں پر نہ لگے۔ میں دیر تک سوتا رہا جب آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی سی تاریکی تھی، نائٹ بلب روشن تھا۔ میں نے انگڑائی لی، کسل مندی کا احساس مٹ گیا تھا اور جسم ہلکا پھلکا ہو رہا تھا میں اٹھ کر باتھ روم میں آیا۔ یہ ایک لگژری قسم کا باتھ روم تھا جس میں نہانے کے لیے ٹب اور سونا باتھ کا انتظام بھی تھا۔ میں نے ٹب میں گرم پانی بھرا اور کپڑے اُتارنے جا رہا تھا کہ سوراتی نے دروازے پر دستک دی۔ میرے اجازت دینے پر وہ اندر آئی۔

''میں فی الحال تو نہانے جا رہا ہوں۔''

''میں آپ کی مدد کروں۔'' وہ آگے بڑھی، میں نے اسے روک دیا۔

''نہیں میں خود غسل کرنے کا عادی ہوں۔ تم جاؤ اور ہاں تقریباً پون گھنٹے بعد چائے لے

آنا۔''

میں نے اپنا زخم دیکھا جو تقریباً خشک ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں اب نہانے میں حرج نہیں تھا۔ گرم پانی کے ٹب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ جب میں جسم خشک کر کے اور تولیہ باندھ کر باہر آیا تو سوراتی کو وہاں پا کر جھینپ گیا۔ وہ کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لپک کر وارڈ روب کھولی۔ ''کون سے کپڑے نکالوں صاحب؟''

''میں خود نکال لوں گا۔'' میں اس چھوٹی سی لڑکی کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کپڑے نکالے۔ وہ بدستور کمرے میں موجود تھی۔ میں اس کے سامنے کپڑے نہیں پہن سکتا تھا۔ اس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی اور خاموشی سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے لباس تبدیل کیا۔ ٹراؤزر پہن کر میں نے پسلی کے زخم پر ہسپتال سے رخصتی کے وقت ڈاکٹر کی دی ہوئی میڈیکیٹڈ پٹی چپکائی۔ شاید یہ دواؤں کا اثر تھا جو تین دن میں زخم پوری طرح بھر گیا تھا۔ بس اب کھال پر نشان باقی رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں سوراتی چائے لے آئی۔ یہ دیسی طرز کی چائے تھی۔ ایک زمانے میں انگریز بڑے اہتمام سے اس قسم کی چائے پیا کرتے تھے مگر دیگر انگریزی روایات کی طرح چائے نوشی کا یہ انداز بھی اب باقی دنیا سے کم ہوتا جا رہا ہے، سوائے برصغیر کے۔ ہم نے انگریزوں کی دیگر برائیوں کی طرح چائے کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے۔

''صاحب...... چائے میں نے خود بنائی ہے۔'' وہ کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔ اس وقت اس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا جو شانے پر محض دو ڈوریوں کے سہارے ٹکا تھا۔ نیچے یہ گھٹنوں تک تھا۔ اس نے بال چوٹیوں کے بجائے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور آج اتنی کم سن نہیں لگ رہی تھی۔ جب تک وہ چائے بناتی رہی میں اس کا معائنہ کرتا رہا۔ اس نے بھی غالباً اس معائنے کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا سانولا رنگ کس قدر سرخی مائل ہو گیا تھا۔ اس نے چائے تیار کر کے میری طرف بڑھائی۔

''سوراتی......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے بے اختیار بات کاٹی۔

''صاحب...... ہمارا نام سوراتی نہیں سرسوتی ہے۔ سوراتی تو جان صاحب کہتا ہے۔''

بات کاٹ کر وہ ذرا سہم گئی تھی۔ میں مسکرایا۔ ''گڈ...... اچھا کیا تم نے مجھے اپنا اصل نام بتایا۔ میں کہہ رہا تھا کہ تم کتنے دنوں سے یہاں ہو؟''

اس نے حساب لگایا۔ ''صاحب یہاں آئے ہمیں تین مہینے ہو گئے ہیں۔''

''اس سے پہلے تم کہاں تھیں؟''

''اپنے گھر...... اپنے گاؤں میں۔''

''تم نے بتایا تھا کہ تم کسی نواب کے محل میں پلی بڑھی ہو۔''

''ہاں...... پر دو سال پہلے نواب کی ملازمت چھوڑ کر باپو مجھے اور ماں کو لے کر گاؤں آ گیا۔





ہم ساحل کے پاس رہتے تھے گاؤں میں مچھیرے تھے۔ باپو بھی مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا۔'' وہ کہتے کہتے اُداس ہو گئی۔

اس سے آگے کی کہانی افسوس ناک تھی لیکن میں جانتا تھا یہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے۔ غربت جہاں پنجے گاڑتی ہے سب سے پہلے عورتوں کا خون پیتی ہے۔ عام غربت کی سب سے زیادہ کمبختی اس صنف پر آتی ہے۔ وہ چپ رہی اور میں چائے پیتا رہا پھر اس نے خود ہی کہا۔ ''میری شادی ہونے والی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا۔ میں باپو کے ساتھ ساحل پر مچھلی صاف کرنے جاتی تھی۔ باپو ذرا دیر کے لیے مجھے چھوڑ کر گیا اور چند آدمیوں نے مجھے اُٹھا لیا وہ مجھے اپنی کشتی پر لے گئے اس وقت مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کیا ہوتے ہیں۔ دو دن ان کے ساتھ کشتی پر رہ کر مجھے ان تعلقات کی ہر قسم کی سمجھ آ گئی تھی۔ جب ان کا دل بھر گیا تو......'' وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گئی پھر بولی۔ ''صاحب مجھے معاف کرنا میں بھول گئی تھی۔'' وہ معاً روتی ہوئی اُٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔ میرا دل اتنا بوجھل ہو گیا کہ میں نے چائے کی پیالی رکھ دی اب دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

جان گرے نے مجھے اپارٹمنٹ کی حد تک گھومنے پھرنے کی آزادی دی تھی۔ میں کمرے سے نکلا اور ٹیرس میں آ گیا۔ جان گرے کے بغیر یہ جگہ اچھی لگ رہی تھی۔ نیچے بندرگاہ نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس میں جاری سرگرمیوں کی آوازیں اوپر تک آ رہی تھیں۔ ایک نسبتاً بڑے ٹرالر کا کنارا بھی نظر آ رہا تھا۔ سامنے وہ چٹانیں تھیں جنھوں نے خلیج کو کھلے سمندر سے جدا کر رکھا تھا۔ ان چٹانوں پر سے نیلگوں سمندر جھلک رہا تھا۔ روشنی کم ہو رہی تھی اور سمندر پر شکار کی تلاش میں منڈلانے والے سی ایگلز واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ جزیرے کی یہ جغرافیائی پوزیشن باقی جزیرے سے مکمل طور پر مختلف تھی۔ دیگر سمتوں میں جزیرہ ہرا بھرا اور ریتیلے ساحل کا تھا جبکہ یہاں پر چٹانیں تھیں یا پانی۔

سرسوتی نے آ کر ٹیرس کی روشنی جلائی۔ میں نے سوچا جس طرح اس جگہ سے کھلا سمندر نظر آ رہا ہے اس طرح کھلے سمندر سے یہ جگہ بھی نظر آتی ہوگی۔ اگر اس وقت سمندر سے کوئی بحری جہاز یا ٹرالر گزر رہا ہو تو اسے ان اپارٹمنٹس کی روشنیاں نظر آ سکتی ہیں۔ ان لوگوں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ انہیں اس طرف سے کسی بحری جہاز کے گزرنے کا خدشہ نہیں ہے۔ غالباً یہ بحری جہازوں کی عام گزرگاہ سے خاصی ہٹ کر تھی۔ میں ٹیرس پر کھڑا تھا یک دم نیچے جاری ہنگامے میں تیزی آ گئی۔ میں نے جھک کر دیکھا چٹانوں کے درمیان ایک خاصے بڑے سائز کا بحری جہاز حرکت کر رہا تھا بلکہ بندرگاہ کی طرف آ رہا تھا جب تک پانی نے اجازت دی بحری جہاز خود حرکت کرتا رہا پھر بندرگاہ کی طرف سے فولادی راڈز نمودار ہوئیں ان کے سرے پر زنجیریں تھیں جب یہ راڈز بحری جہاز کے پہلو تک پہنچیں تو عرشے پر موجود افراد نے زنجیریں پکڑ کر عرشے پر نصب کنڈوں سے باندھ دیں پھر بندرگاہ سے ان

راڈز کو واپس کھینچا گیا اور بحری جہاز بھی ان کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔ گویا یہ میکنزم جس کی مدد سے اس تنگ سی جگہ پر بحری جہازوں کو بندرگاہ کی برتھ تک لایا جاتا تھا۔ ان قزاقوں نے جزیرے پر ایک مکمل سسٹم بنا رکھا تھا۔ یہ بحری جہاز بھی مجھے اس بحری جہاز جیسا لگا جس نے خلیج پر حملہ کر کے لوٹ مار کی تھی اور مجھے پکڑ کر اسی بحری جہاز پر لایا گیا تھا۔ گویا ان بین الاقوامی قزاقوں کے پاس اس قسم کے کئی بحری جہاز تھے۔

''صاحب۔'' عقب سے سرسوتی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ''آپ ڈنر کب کریں گے؟''

صبح کا تگڑا ناشتہ کب کا ہضم ہو چکا تھا اس لیے میں نے جواب دیا۔ ''جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔''

''اور کیا لینا پسند کریں گے صاحب؟''

''مچھلی...... فرائی اور کوئی سے چاول...... سادہ بھی چلیں گے۔''

''صاحب آج میں آپ کے لیے جھینگے والے چاول بناتی ہوں۔ آپ کو پسند آئیں گے۔''

''ضرور...... میں بھی پھیکے...... کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''اس کے لیے میں دیر تک انتظار بھی کر سکتا ہوں۔''

''بس آدھا گھنٹہ۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔ میں نے لاؤنج میں آ کر وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ کیبل ٹی وی سے بے شمار چینلز آ رہے تھے۔ میں نے ایک پاکستانی چینل ٹیون کیا۔ یہ کوئی میوزک چینل تھا جس پر آنے والا سنگر بھی پاکستانی تھا مگر ویڈیو شاید انڈیا یا ہالی ووڈ کی پیروی میں بنائی گئی تھی۔ بور ہو کر میں نے ایک نیوز چینل لگایا جہاں سے فلسطین کے حالات پر تبصرے جاری تھے۔ ان تبصروں میں جھوٹ کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا تھا کہ مارے جانے والے نہتے فلسطینی دہشت گرد اور انہیں مارنے والے یہودی فوجی امن کے علم بردار دکھائی دے رہے تھے۔ طیش میں آ کر میں نے یہ چینل بھی بدل دیا۔ باقی مغربی چینل سے تفریح کے نام پر ایسی خرافات پیش کی جا رہی تھیں کہ اس تفریح سے شیطان بھی شرما جائے۔ حتیٰ کہ ایک ماحولیاتی چینل سے جانوروں کے ازدواجی تعلقات پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی جا رہی تھی۔

سرسوتی نے وعدے کے مطابق سچ مچ آدھے گھنٹے میں کھانا تیار کر دیا۔ وہ ٹرالی میں سجا کر کھانا لے کر آئی اور لاؤنج میں میز پر سجانے لگی۔ فرائی فش کے علاوہ جھینگے والے چاول تھے اور میٹھے میں پڈنگ تھی۔ اس نے کھانا سجا دیا تو میں نے کہا۔ ''آؤ تم بھی میرے ساتھ کھاؤ۔''

اس پیشکش پر پہلے تو وہ ششدر رہ گئی۔ پھر اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسی بات مت کریں...... جان صاحب میری کھال اُتار دیں گے۔ ہم ملازم ہیں، آقا کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے۔''




''بھاڑ میں گئے آقا...... میں آقا نہیں ہوں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''تمہاری طرح ایک بے بس اور مجبور قیدی ہوں۔ ہم دونوں برابر ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ آقا کے مہمان ہیں اس لیے آقا کی طرح ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی صاحب۔''

''تب میں بھی نہیں کھا رہا۔'' میں نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

''بھگوان کے لیے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''آپ کو نہیں معلوم صاحب کہ یہ لوگ کتنے ظالم ہیں...... یہ دیکھیں میری پیٹھ۔'' اس نے دوسری طرف رُخ کر کے اپنے میکسی نما لباس کی ڈوریاں شانے سے گرا دیں۔ اس کا لباس کمر تک اُتر گیا۔ اس کی نازک سی پشت پر بے شمار سیاہ لکیریں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ میں نے نظریں پھیر لیں۔

''پلیز اپنا لباس درست کرو۔''

وہ لباس ٹھیک کر کے میری طرف گھومی۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ پھر ایسا ہی سلوک کیا جائے؟''

''تمہارے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کرے گا۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ اب کھانا کھاؤ اور سب خوف دل سے نکال دو۔''

اس بار وہ جھجکتی ہوئی آ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے کھانا نکالا اور خاموشی سے کھانے لگے۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتی رہی۔ کھانا واقعی لذیذ اور مشرق کے مخصوص ذائقے سے بھرپور تھا۔ میں نے رغبت سے کھایا۔ شروع میں وہ تھوڑی شرماتی رہی پھر اس نے کھل کر کھانا شروع کیا۔ چھوٹے جثے کے باوجود اس کی خوراک اچھی تھی۔ پھر وہ مسکرانے اور باتیں کرنے لگی۔ وہ بھی ایسے ماحول اور برابری کی سطح پر کسی سے بات کرنے کو ترسی ہوئی تھی اس لیے میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے بے حد خوش نظر آ رہی تھی شاید اس لیے بھی کہ اس کا جابر آقا جان گرے اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ وہ کہیں گیا ہوا تھا، باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک بولی۔

''صاحب اس اچھے سمے کے بدلے مجھے موت بھی آ جائے تو ہنسی خوشی قبول کر لوں۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔''

''مجھے جو ملا ہے اس نے مجھے اپنی عمر سے زیادہ کر دیا ہے صاحب۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''ابھی میری عمر اٹھارہ سال ہے لیکن مجھے لگتا ہے میں نے اٹھارہ صدیاں بتا دی ہیں۔''

''تمہارے ساتھ واقعی افسوسناک ہوا ہے مگر اس جزیرے پر تو سب مظلوم ہیں اور جوان کے علاوہ ہیں وہ ظالم ہیں۔''

''آپ دیکھیے گا صاحب۔'' سرسوتی نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''ان ظالموں پر بھگوان کا قہر نازل ہوگا۔''

”سرسوتی یہ لوگ......“ میں کہتے کہتے رُک گیا۔ سرسوتی کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے تھے جیسے اس نے کوئی جیتا جاگتا بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے پلٹ کر اس کی پھٹی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ لیونگ روم کے دروازے پر جان گرے کھڑا سرد نگاہوں سے سرسوتی اور مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ سرسوتی لرزتے بدن کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

”صص......صاحب......میں نہیں......یوسف صاحب نے......خود......“

”میں نے اسے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا تھا۔“ میں نے جان گرے سے کہا۔

”یہ بات اس جزیرے کے اصول کے خلاف ہے کوئی غلام اپنے آقا کی برابری نہیں کرسکتا۔ تم نے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔“ اس نے دوسرا جملہ سرسوتی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ”اب جاؤ اور اپنی سزا کا انتظار کرو۔“

سرسوتی لرزتے بدن کے ساتھ وہاں سے گرتی پڑتی بھاگ نکلی۔ اس کے جانے کے بعد میں جان گرے کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں بھی ایک طرح سے سرسوتی کی سطح کا شخص ہوں اس لیے اس نے میرے ساتھ کھانا کھا کر کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔“

”اس وقت تم میرے مہمان ہو اور میری سطح کے آدمی ہو اس لیے خلاف ورزی ہوئی اور کیونکہ تم بھی اس میں شامل ہو اس لیے کچھ نہ کچھ سزا تمہیں بھی ملے گی۔“

”کیسی سزا؟“ میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کا انداز مجھے شرارت آمیز لگ رہا تھا۔

”اچھی سزا ہے۔ اگر تم اس لڑکی سرسوتی کے ساتھ ایک رات گزارو تو اس کی اور تمہاری خطا معاف کی جاسکتی ہے۔“

”یہ کیسی سزا ہے؟“ میں نے گڑبڑا کر دریافت کیا۔

”مزے کی سزا ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”اب تم انکار کرتے ہو تو تمہیں تو میں واپس ڈیئر ڈان کے پاس بھجوا دوں گا۔“

”سرسوتی کو کیا سزا ملے گی؟“

”اسے......“ اس بار جان گرے کا لہجہ سفاک تھا۔ ”اسے میں سچ مچ خوفناک سزا دوں گا اس نے اپنی تربیت کے بنیادی اصول کو پامال کیا ہے۔ میں اسے ان کے حوالے کر دوں گا جو اسے مرتے دم تک پامال کرتے رہیں گے۔“

”تم ایسا نہیں کرسکتے۔“ میں لرز گیا۔

”میں ایسا نہیں کروں گا بلکہ سرسوتی کو صرف اپنی رپورٹ کے ساتھ اس ادارے میں واپس بھجوا دوں گا جہاں ان لوگوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ وہاں پر اسے سب کے سامنے سزا دی جائے گی اس سے ان زیر تربیت غلاموں کو عبرت ہوگی۔“





میں نے کراہیت سے اسے دیکھا۔ ”اور تم لوگ خود کو مہذب کہتے ہو۔“

”ہر معاشرے کی اقدار ہوتی ہے لیکن اس جگہ کی تہذیب یہی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”مجھے جلدی سے اپنا فیصلہ سناؤ تاکہ میں اپنا فیصلہ سنا سکوں۔“

”میں تیار نہیں ہوں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اور اگر تم نے کہیں رپورٹ کی تو میرے تعاون سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں تمہارے کام آنے کے بجائے مرنے کو ترجیح دوں گا۔“

جان گرے یوں مسکرایا جیسے میرا دعویٰ کسی بچے کی گپ سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ ”یوسف میرا کام تو ہر صورت کرو گے لیکن اس لڑکی کے بارے میں تم نے نہیں سوچا۔ وہ بے چاری تمہاری وجہ سے ماری جائے گی اسے بچانے کے لیے کیا تم اس کے ساتھ ایک رات نہیں گزار سکتے۔“

”لگتا ہے تم صرف اپنی خباثت کی تسکین چاہتے ہو۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ ہنسا۔ ”پھر ایسا ہی سہی۔ مجھے تسلیم ہے مجھ میں اس قسم کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی ہیں گویا میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں پھر معاملہ اصول کا بھی ہے۔ میں صرف تمہاری خاطر اس لڑکی کو اذیت ناک سزا سے بچا سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم مان جاؤ۔“

”اگر میں اس لڑکی کے ساتھ رات گزار بھی لیتا ہوں تو تمہیں اس کا کیا فائدہ ہوگا؟“

”بس مجھے ایک طرح سے تسکین ہوگی۔“ اس نے شانے ہلائے پھر اپنی گھڑی میں دیکھا۔

”تم نے وقت بحث میں گنوا دیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نما آلہ نکالا اور نمبر پنچ کر کے بولا۔ ”ڈینی کو بھیجو ابھی۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔“

جان گرے مسکرایا۔ ”مجھے معلوم تھا۔“ پھر اس نے موبائل پر کہا۔ ”فی الوقت ڈینی کو روک لو۔“

”تم پستی کے آخری درجے سے بھی نیچے ہو۔“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”میں لوگوں کو ایسے ہی مجبور کرتا ہوں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اور جو میری بات مان جاتے ہیں، میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ پھر وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔“

”کیا میں باہر نہیں جاسکتا۔“ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

”فی الوقت نہیں لیکن دو تین دن میں تم میرے ساتھ ایک بھرپور مہم پر چلو گے۔ اس دوران میں تمہیں دکھاؤں گا کہ ہم کتنے طاقتور ہیں۔“

”دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم لوگوں کی فیکٹریاں دن رات اسلحہ بنانے میں مصروف ہیں۔“

”سننے اور خود دیکھنے میں جو فرق ہے وہ تم خود محسوس کرو گے۔“

”اچھا اب مجھے اجازت دو۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں تمہاری صورت مزید نہیں دیکھنا چاہتا۔“

''لڑکی کچھ دیر میں تمہارے کمرے میں آ جائے گی۔''

''شکریہ۔'' میرا لہجہ زہریلا تھا۔

''اور ہاں...... صبح اس کا طبی معائنہ ہوگا اگر تم نے اس کے پاس آنے سے گریز کیا تو تمہیں معلوم ہے پھر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں آ کر اپنے غصے کو قابو کرنے کے لیے ایکسرسائز کرنے لگا۔ جب ذہن ذرا پُرسکون ہوا تو مجھے آنے والے لمحات کی فکر کھانے لگی۔ اول تو میں اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ جنسی تسکین میرے نزدیک ایک معاہدے کے بغیر گناہ سے کم نہیں تھی۔ جس کی نہ تو ہمارا مذہب اجازت دیتا ہے اور نہ ہی معاشرہ، میں کاجل کی محبت کا اسیر تھا جس طرح وہ خود کو میری امانت سمجھتی تھی اسی طرح میں خود کو اس کی امانت سمجھتا تھا۔ اس سے بے وفائی کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں اس امانت کو امانت رکھنے میں کامیاب رہا تھا لیکن آج جان گرے نے میرے اور کاجل کے اس اَن لکھے اور اَن کہے معاہدے کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

میں پنجرے میں بند جانور کی طرح بے تابی سے ٹہل رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آ جاؤ۔'' دروازے پر سرسوتی کھڑی جھجک رہی تھی اور میں اسے اندر بلاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ بالآخر وہ خود ہی اندر آ گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ کھڑی خاموشی سے انگلیاں مروڑتی رہی۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''سرسوتی تمہیں شاید معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری سزا کس شرط پر معاف کی جائے گی۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''جان صاحب نے بتایا تھا۔''

''سرسوتی...... میں تمہیں اختیار دیتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں انگلی بھی نہیں لگاؤں گا۔''

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''صاحب اس معاملے میں میرا اختیار کہاں ہے۔ اگر میں آپ کو منع کروں اور جان صاحب کو پتا چل گیا تو وہ مجھے ان درندوں کے حوالے کر دے گا۔ وہ مجھے نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ اس سے تو بہتر ہے......'' اس کی زبان شرم نے روک دی تھی۔

میں نے سرد آہ بھری...... لگتا تھا کہ کاجل سے بے وفائی کا گناہ میرے مقدر میں رقم کر دیا گیا تھا۔ بے شک سرسوتی سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا وہ میری ہم مذہب اور ہم وطن بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ انسان تھی اور پھر میری وجہ سے وہ سزا پانے جا رہی تھی۔ میرا ضمیر کسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کو میری وجہ سے انسانیت سوز سزا ملے۔ میں نے اس سے کہا۔

''چائے یا کافی ملے گی۔''

''ابھی لائی صاحب۔'' وہ جیسے کھل گئی۔ ''چائے لاؤں یا کافی۔''

''کافی...... سیاہ اور تلخ۔'' میں نے فرمائش کی وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ شاید میرا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ مجھے ذرا اب تعجب ہوا تھا۔ میرے لیے یہ قابلِ سزا بات تھی۔ مجھے





شرمندگی ہو رہی تھی۔ سرسوتی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے خود بتایا کہ وہ اغوا ہوئی اور اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھی، نہ جانے کتنے ہاتھوں سے گزر کر وہ جان گرے کے پاس آئی۔ اور جان گرے کے بھنبھوڑنے کے نشان میں اس کے جسم پر دیکھ چکا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ مرد اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا لیکن وہ مجھ سے اس طرح شرما اور گھبرا رہی تھی جیسے پہلی بار کسی مرد کی خلوت میں آ رہی ہو۔

ذرا دیر میں وہ کافی لے آئی۔ اس بار وہ کسی قدر بااعتماد تھی۔ اتنی کہ اپنے لیے بھی لے آئی تھی۔ حالانکہ اس کی سزا ہی اس جرم میں دی جا رہی تھی کہ اس نے میرے ساتھ کھانا کھانے کی جرأت کیوں کی تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا...... اگر جان گرے کو پتا چل گیا کہ تم میرے ساتھ کافی پی رہی ہو تو وہ تمہیں سزا دے گا۔''

''اب وہ مجھے سزا نہیں دے سکے گا۔'' سرسوتی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور اطمینان سے کافی پینے لگی۔ سپ لے کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اگر وہ آج جیسی سزا ہی دے تو میں ہزار بار آپ کے ساتھ کھانے کا جرم کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا اس کے معصوم چہرے پر سرخی پھیلی تھی۔ پھر اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''صاحب آپ کسی سے محبت کرتے ہو؟''

''ہاں...... لیکن تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''میں صاحب...... پچھلے چند مہینے میں جو لمحے میں نے گزارے ہیں مجھے لگتا ہے مجھے مردوں کے اندر تک جھانکنے کی شکتی مل گئی ہے۔ میں نے آپ کا اندر دیکھ لیا ہے۔ آپ کسی کو ٹوٹ کر چاہتے ہو اور بس اس کے ہی رہنا چاہتے ہو۔''

میں نے اعتراف کیا۔ ''یہ بات درست ہے۔ ایک لڑکی ایسی ہے جو میرے لیے جیتی ہے اور میں اس کے لیے۔''

''وہ بہت خوش نصیب ہے صاحب۔'' سرسوتی کے لہجے میں مسرت تھی۔

''سرسوتی...... تم مجھے صاحب کے بجائے نام سے پکارو۔''

''صاحب...... یوسف ادھر یہ بھی جرم ہے کہ کوئی غلام یا خادمہ اپنے آقا کو نام سے پکارے۔ پر آپ نے کہا ہے تو میں آپ کو نام سے ضرور پکاروں گی۔''

''شکریہ سرسوتی۔'' میں نے کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔

''آپ...... مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتائیں گے یوسف۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اتنا بتا سکتا ہوں۔ جتنا میں اسے جانتا ہوں اتنا خود کو نہیں جانتا وہ ایسی ہے جیسے کوئی خودمختار ملکہ اپنی رعایا پر حکمران ہوتی ہے اس طرح وہ مجھ پر حکمرانی کرتی ہے۔ میرا دل اور میرے احساسات اس کے لیے ہیں۔''

"دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے؟" سرسوتی کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"چمکتا سانولا رنگ جیسے سونے میں لوہے کی آمیزش کر دی جائے۔ ناک نقش نازک سے دوسروں کا نہیں پتا لیکن وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اس کی سیاہ آنکھیں اس کے سیاہ بال اس کا سراپا، اس کی ادائیں اور اس کی باتیں سب میرے لیے ہیں۔"

"وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔"

"محبت!" میں ہنسا۔ "اگر اسے پتا چل جائے کہ میں اس وقت کسی لڑکی سے بات کر رہا ہوں تو اس کا تن بدن جل جائے اور یہاں آ جائے تو میری شامت آ جائے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وہ کرید کرید کر مجھ سے کاجل اور میری گزشتہ زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں جس حد تک ممکن ہوا اسے بتاتا رہا۔ رات بیت رہی تھی۔ رات گیارہ بجے کے قریب اس نے پھر کافی کا پوچھا اور میں نے سر ہلا دیا۔ وہ اُٹھ کر کافی لینے گئی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے۔ ڈریسنگ روم میں نائٹ سوٹ بھی تھے۔ وہ کافی لے کر آئی تو میں بستر پر دراز ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ اس نے ٹرے بستر پر رکھ دی۔ نرمی سے میرے برابر میں آ کر اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا تھا۔ میں نے بازو اس کے گرد حائل کر دیا۔ اس نے ایک کپ اُٹھا کر مجھے دیا اور دوسرا خود اُٹھا لیا۔

"میں ساری زندگی اس لڑکی سے شرمندہ رہوں گی۔" سرسوتی نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے اس کے حق کا ایک چھوٹا سا حصہ حاصل کیا ہے۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ "جیسے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میرا قصور ہے۔ میرا پہلا قصور تو یہی ہے کہ میں ایک کمزور اور غریب لڑکی ہوں۔ میرا اتنا جرم ہی دنیا کے درندوں کے لیے کافی ہے کہ وہ سزا میں مجھے بھنبھوڑ کھائیں۔" اس کے انداز میں کافی کی سی تلخی تھی۔

اس کا جسم دُبلا ہونے کے باوجود اپنے اندر گداز اور دلکشی رکھتا تھا لیکن اس کی گدازی اور گرمی نے میرے جذبات میں اشتعال پیدا نہیں کیا بلکہ کافی پی کر میں اپنے ذہن کو ہلکا محسوس کرنے لگا اور پھر یہ ہلکا پن بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نے چونک کر سرسوتی کو دیکھا اس نے نرمی سے میرے ہاتھ سے کپ لے لیا۔ اپنا کپ جو ابھی بھرا ہوا تھا اس نے ٹرے سمیت اُٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ پھر آ کر مجھے بستر پر لٹایا۔ اس نے میرا چہرہ سہلایا اور سہلاتے ہوئے جھک آئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، ذہن پر غبار چھا رہا تھا۔ میرا آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور نہ جانے کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنی نرم آغوش میں سمیٹ لیا۔ خواب میں مَیں نے کاجل کو اپنے پاس دیکھا لیکن وہ کاجل نہیں وہ سرسوتی تھی یا شاید کاجل ہی تھی پھر خواب ختم ہو گیا۔ میں حقیقت کی دنیا میں آنے لگا۔ شعور رفتہ رفتہ بے دار ہو رہا تھا مجھے محسوس ہوا جیسے میرے بازو کے دہانے میں ایک نرم و نازک جسم ہے لیکن یہ جسم





گرم نہیں تھا بلکہ بے پناہ سرد تھا۔ موت کی طرح۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔



میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ حنیف بڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ میرے سر پر بیٹھا مجھے آہستہ سے آواز دے کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اچانک اُٹھا تو وہ ڈر گیا تھا۔ "صاحب...... میں ہوں حنیف۔"

"تم...... اس وقت۔" میرے منہ سے نکلا کیونکہ روشندان تاریک تھا اور اس کا مطلب تھا ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پھر میرے اندر امید کی کرن جاگی۔ شاید حنیف نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس وجہ سے وہ چپکے سے رات کے اس پہر آیا تھا۔

"صاحب...... انہوں نے مجھے بھی ادھر ڈال دیا ہے۔" اس نے دُکھی لہجے میں بتایا۔

"تمہیں بھی۔" مجھے مایوسی ہوئی۔ "لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں...... یہ سب کہیں جا رہے ہیں۔ اس لیے مجھے بھی ادھر بند کر گئے۔"

میری مایوسی ذرا کم ہوئی تھی۔ "یعنی جب یہ آئیں گے تو تمہیں ادھر سے نکال لیں گے؟"

"ہاں...... گل خان نے یہی کہا تھا۔ وہ لوگ کسی اہم کام سے جا رہے ہیں۔ ہتھیار بھی نکالے تھے۔ وہ بتانے لگا۔ میں سو رہا تھا مجھے جگا کر لائے اور تہہ خانے میں جانے کو کہا۔"

"کیا تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔" میں نے پُرامید نظروں سے اوپر کی طرف دیکھا۔

اس نے سر ہلایا۔ "پر باہر والا بند ہے۔"

"حنیف ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا ہے کہ میرا اور تمہارا وقت قریب ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "جس روز بھی انہوں نے یہ ٹھکانہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا یہ مار کر ہمیں ادھر ہی گاڑھ جائیں گے۔"

"نہیں۔" اس کے حلق سے سہمی ہوئی آواز نکلی۔

"تم دیکھنا یہی ہوگا۔" میں نے اسے مزید ڈرایا۔ "اس وقت شاید تم میرا ساتھ دینا چاہو لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

"میں کیا کروں صاحب؟" اس نے مرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اب بھی وقت ہے میرا ساتھ دو۔ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے اور خدا نے چاہا تو کامیاب بھی رہیں گے۔ ورنہ ان لوگوں سے کسی خیر کی امید نہیں ہے۔ یہ رحم کھانے اور کسی کی جان بخشنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"آپ کس طرح باہر نکلیں گے جبکہ میں جب بھی باہر جاتا ہوں گل خان یا جو کوئی بھی ہوتا ہے وہ تسلی کر کے دروازہ باہر سے کھولتا ہے، اوپر چھپنے کے قابل بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی روشنی ہوئی تو اوپر چل کر دیکھیں

گے۔''

''ان لوگوں کے پاس پستول ہوتا ہے صاحب...... آپ کے ساتھ مجھے بھی گولی مار دیں گے۔'' وہ ابھی تک ڈرا ہوا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں جو منصوبہ بناؤں گا اس میں ناکامی کا امکان کم سے کم ہوگا۔ ورنہ میں پاگل تھوڑا ہوں جو خودکشی کرلوں۔''

اصل میں حنیف کو شبہ تھا کہ میں ان چار مشٹنڈوں پر قابو پا بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس کا مشکوک ہونا بجا تھا لیکن مجھے اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ میں صبح کا انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ روشندان سے سفیدی جھلکنے لگی۔ میں نے حنیف سے پوچھا۔

''کیا کتے آزاد ہیں؟''

''وہ چوبیس گھنٹے دن رات کھلے رہتے ہیں۔''

''انہیں کھانا کون دیتا ہے؟''

''میں ہی دیتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ انہیں کھانے میں کوئی زہر یا سونے کی دوا دے دی جائے۔''

''زہر یا دوا ہوتی تو اب تک انہیں دے چکا ہوتا۔'' حنیف کا اشارہ ان بدمعاشوں کی طرف تھا۔

''تم کوٹھی کے صحن میں دیکھو۔ اکثر جگہوں پر اگر دیکھ بھال نہ کی جائے تو خودرو پودے اُگ آتے ہیں۔ ان میں بعض پودے اور بوٹیاں زہریلی ہی ہوتی ہیں۔''

حنیف چونکا پھر اس نے ذرا پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہاں صاحب...... ایک پودا دیکھا ہے۔ اس کے پتوں سے دودھ جیسی کوئی شے نکلتی ہے، اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ زہر ہوتا ہے۔''

''بس تو وہی کتوں کو رات میں ڈال کر دے دو۔''

''میں ایسا کر کے دیکھوں گا۔ پر انہیں مجھ پر شبہ نہ ہو۔''

''تم پر شبہ کیوں ہوگا اگر کتے مرے یا بیمار پڑے تو کہہ دینا کہ جھاڑیوں سے خود ہی کچھ کھا گئے ہوں گے۔''

اس نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''صاحب تمہارا دماغ خوب چلتا ہے۔''

''کتوں سے نجات مل جائے تو سمجھو کام آدھا ہو جائے گا۔''

''صاحب...... وہ...... آپ نے انعام کی بات کی تھی۔''

''بات نہیں وعدہ کیا تھا۔ انعام بھی ملے گا اور پکی نوکری بھی۔ بلکہ تم کہو تو راولپنڈی کے بجائے تمہیں کراچی میں نوکری دلوا دی جائے گی۔ مستقبل میں بھی تم ان لوگوں کے شر سے محفوظ رہو گے۔''





''ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا صاحب۔'' وہ خوش ہو گیا تھا۔

روشنی خاصی ہو گئی تھی اس لیے ہم اُٹھ کر اوپر آئے، میں نے دروازے کی جھریوں سے باہر دیکھا۔ فی الوقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب بھی حنیف نیچے آتا تھا ان چاروں میں سے کوئی نہ کوئی فرد اوپر رہا کرتا تھا۔ کسی کے نہ ہونے کا مطلب تھا کہ فی الوقت حویلی میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا تھا۔ یہ چابی والا بڑا تالا تھا اور دروازے کے اندر سے اسے کھولنا ناممکن تھا اسے باہر سے ہی کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا کہ اسے کس طرح توڑا جا سکتا ہے لیکن یہ امکان خاصا مشکل تھا۔ اول تو یہاں پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے دروازے کی کنڈی کاٹی جا سکتی اور اگر مل بھی جاتی تو اس سوا انچ موٹی کنڈی کو کاٹنے میں کتنی دیر لگ جاتی۔ میں نے دائیں بائیں موجود کمروں کا جائزہ لیا گیلری کے بائیں طرف بڑے کمرے میں کھڑکی تھی لیکن اس پر بھی بے حد موٹی فولادی گرل تھی اسے کاٹنا اور بھی دشوار بشرطیکہ کوئی کاٹنے والی چیز مل جاتی، کمرے اور گیلری بالکل صاف تھے وہاں انہوں نے معمولی سا تنکا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ واش روم میں بھی سوائے ایک پلاسٹک کے لوٹے کے اور کچھ نہیں تھا۔ حنیف کی مدد حاصل کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن وہ بزدل شخص تھا اور اس کے اوپر مکمل اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں دروازے کا معائنہ کر رہا تھا کہ میری نظر اس کے نچلے حصے پر لگی چار انچ چوڑی افقی پٹی پر پڑی اس کی وجہ سے نیچے کا چھ انچ کا خلا کسی کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ تھا لیکن یہ آڑ بھی بے کار تھی اول تو میں چھ انچ کا نہیں تھا۔ دوسرے باہر کا نگران بیٹھا نہیں ہوتا بلکہ کھڑا ہوتا اور وہ ایک نظر نیچے ڈالتا تو میں اسے صاف نظر آ جاتا۔ یہ تدبیر بھی بے کار تھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے مایوسی سے سوچا۔ حنیف جو میرے ساتھ لگا تھا اس نے مجھے مایوس دیکھا تو خود بھی حوصلہ ہارنے لگا۔

''صاحب...... میں نے کہا تھا نا...... یہ بہت مشکل ہے۔'' میں نے جلدی سے چہرے پر بشاشت طاری کر لی۔

''ارے نہیں یار...... میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس دروازے کو توڑنا ممکن نہیں ہے البتہ تمہاری مدد سے یہاں سے نکلنا عین ممکن ہے۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''میں تمہارے عقب میں کھڑا ہو جاؤں گا اس طرح اسے نظر نہیں آؤں گا جو باہر سے دروازہ کھولے گا۔''

''آپ میرے پیچھے کس طرح چھپو گے؟'' اس نے اپنے مقابلے میں میرا جثہ دیکھا۔ میرا قد اس سے کوئی چار پانچ انچ زیادہ تھا اور وہ میرے مقابلے میں خاصا دُبلا تھا۔

''اگر اندر تاریکی ہو تو باہر سے میں نظر نہیں آؤں گا۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''اور اندر تاریکی کیسے کی جائے۔ بلب بجھا دیا تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے کہ فیوز ہی اُڑ جائے۔'' میں نے اس کا حل پیش کیا۔

''یہاں بیٹھ کر ہم فیوز کیسے اُڑائیں گے؟''

''اُڑا سکتے ہیں۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ پچھلے دنوں میں ابن صفی کی عمران سیریز پڑھ رہا تھا اس میں ابن صفی کا کردار عمران فیوز اُڑانے کے لیے ایک ترکیب استعمال کرتا ہے یعنی سکہ بلب کے ہولڈر میں رکھ کر اوپر سے بلب لگا کر بٹن آن کرتا ہے اور فیوز اُڑ جاتا ہے۔ میں نے حنیف سے کہا۔

''تمہارے پاس چار آنے یا دس پیسے کا سکہ ہوگا۔''

اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''پیسے تو نہیں پر میں حاصل کر لوں گا۔''

''اگر سکہ نہ ملے تو اس سائز کی کوئی گول اور چپٹی دھاتی چیز لے آنا اس سے بھی کام چل جائے گا۔''

جب ہم گیلری کے باہری دروازے کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے تو دو عدد دیو قامت رشین کتے ہانپتے ہوئے وہاں آ گئے۔ رکھوالی کے لیے یہ اچھے کتے ہوتے ہیں بس ان میں ایک خرابی ہوتی ہے اگر یہ کسی ایک کے ہاتھ سے کھانے کے عادی نہ ہوں تو انہیں کوئی بھی کھلا سکتا ہے اور اس طرح ان کتوں کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ انہیں بھوک بھی بے پناہ لگتی ہے۔ یہ ڈالے جانے والے کھانے پر جھپٹنے میں دیر نہیں کرتے۔ اس قسم کے کتوں کی موجودگی نیک فال تھی۔

''تم انہیں با آسانی آک کا دودھ ملا گوشت دے سکتے ہو اور کوشش کرنا کہ دودھ اچھی تعداد میں ملا کر رات انہیں اس وقت دینا جب یہ بھوک سے بالکل بے تاب ہو جائیں۔ ممکن ہے اگر بھوک شدت کی نہ ہو تو یہ زہریلا گوشت کھانے سے گریز کریں۔''

''میں سمجھ گیا صاحب...... آپ فکر مت کریں۔''

حنیف جو کچھ دیر پہلے تک مشکوک ہو چکا تھا اب میری پلاننگ نے اسے مطمئن کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہم اپنے منصوبے پر رات کے وقت عمل کریں گے۔ اب تم نیچے آ کر مجھے زمین پر اس پوری کوٹھی کا نقشہ بنا کر دکھاؤ۔''

ہم نیچے آئے حنیف نے لوہے کے ستونوں کا سریا باندھنے کے لیے استعمال ہونے والی ایک تار تلاش کر لی تھی اس کی مدد سے اس نے تہہ خانے کے کچے فرش پر کوٹھی کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ چار دیواری کے اندر اس عمارت میں کل پانچ کمرے تھے۔ جن میں سے دو تو اس جگہ سے یعنی تہہ خانے کے اوپر اور باقی تین کمرے جو تیار حالت میں تھے اس حصے سے ملے تھے لیکن آنے کا واحد راستہ گیلری کے دروازے سے گزرتا تھا۔ دوسرے حصے کے ساتھ باورچی خانہ اور سٹور ہی تھے۔ ان کے سامنے برآمدہ تھا اور آگے بڑا سا کچن صحن۔ مین گیٹ اس صحن کے دائیں طرف تھا اور یہ اس تہہ خانے سے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ حنیف نے بڑے اچھے انداز میں کوٹھی کی ساخت کی مکمل وضاحت کی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر کے زمین سے مٹا دیا کہ مباداً ان لوگوں میں





سے کوئی آئے اور فرش پر بنا نقشہ دیکھ کر مشکوک ہو جائے۔ اس سے پہلے میں نے حنیف سے دروازوں اور کھڑکیوں کی لوکیشن پوچھ کر ذہن میں محفوظ کر لی تھی۔

چار دن گزر چکے تھے اور ابھی تک ایسا کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ جمشید علی نے ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس صورت میں تو کم از کم گل خان میری گوشمالی پر ضرور ہی تُل جاتا اور اگر جمشید علی نے ان کا مطالبہ مان لیا تھا تو اب تک مجھے رہا کر دینا چاہیے تھا یا تو ان کی نیت میں فتور آ گیا تھا یا مطالبہ پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

''حنیف بھائی...... کیا یہ لوگ اپنی گفتگو میں ارشد بلا یا مرشد نام کے کسی شخص کا ذکر کرتے ہیں۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ ''یہ لوگ بتاتے ہیں کہ ارشد اور مرشد پولیس کے پاس ہیں اور یہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''انہیں بھی میں نے گرفتار کروایا تھا۔'' میں نے فخر سے حنیف کو بتایا پھر اسے ارشد بلا اور اس کے بھائی مرشد کی گرفتاری کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ متاثر ہوا تھا۔

''واہ جی آپ تو جی دار بندے ہو۔ آپ ان لوگوں کو بھی مار لو گے۔''

''ان شاءاللہ...... تم دیکھنا میں ان سے اپنا اور تمہارا بدلہ کیسے لیتا ہوں۔''

''ان کے پاس بڑا مال ہے جی...... میں نے خود دیکھا تھا۔'' حنیف کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا تھا۔ ''ایک بار میں اسلحے والے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پر ٹین کا بڑا سا صندوق رکھا ہے۔ اتفاق سے اس کا دروازہ کھلا تھا اور وہ چاروں اس میں رکھی نوٹوں کی گڈیاں گن رہے تھے۔ جی یہ ڈھیر تھا نوٹوں کا۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''مجھے دیکھ کر ان لوگوں نے ڈانٹا اور دھمکی بھی دی۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔''

''حنیف اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ ساری رقم بھی تمہاری ہوگی۔''

اس نے افسوسناک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آپ نے مجھے ایسا سمجھا ہے جناب...... لعنت بھیجتا ہوں اس حرام کی دولت پر جو نہ جانے کتنے لوگوں کا دل دُکھا کر جمع کی گئی ہوگی۔ بے شک مجھے روپے کا لالچ ہے، پر جی میں بے ضمیر نہیں ہوں۔''

میں شرمندہ ہو گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا حنیف بھائی...... بے شک یہ حرام کی دولت ہے اور کوئی بھی باضمیر شخص اسے قبول نہیں کر سکتا ہے۔ لعنت بھیجو اس پر...... لیکن پاپا کا دیا انعام تو قابلِ قبول ہوگا تمہارے لیے۔''

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ چہکا۔ ''یہ تو حلال ہوگا جان پر کھیل کر اسے لے لوں گا۔''

حنیف ادھم پورہ کی ایک غربا کی بستی مین رہتا تھا۔ اس کے تین بچے تھے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ محنت مزدوری کر کے وہ انہیں کھلا بھی رہا تھا اور پڑھا بھی رہا تھا۔ کچا پکا مکان اپنا تھا۔ اس لیے

روکھی سوکھی کھا کر بھی سکون سے بسر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی بیوی زرینہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کا ذکر اتنی محبت سے کرتا تھا کہ مجھے اس عورت پر رشک آتا۔ خاصی دیر گزر گئی تو میں نے حنیف کو مشورہ دیا۔

"بہتر ہو گا تم اوپر جا کر گیلری میں رہو اور تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دو۔ ایسا تاثر دو جیسے مجھ سے نفرت زدہ ہو۔ اسی طرح انہیں ہمارے تعلق کا شک نہیں ہو گا۔"

حنیف ہنسا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے تہہ خانے میں نہ بھیجیں۔ مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے ایک بار آپ مجھے مارنے کے لیے دوڑے بھی تھے۔"

"آج کے لیے بھی ایسی کوئی سٹوری سنا دینا۔" میں ہنسا۔

"آپ فکر نہ کریں جی۔" اس نے کہا۔

"آؤ ذرا ریہرسل کر لیں۔" میں بھی اُٹھ گیا۔

"کیا جی...... کیا کر لیں؟" وہ سمجھا نہیں۔

"ریہرسل...... یعنی جو کرنا ہے پہلے اس کی مشق کر لیں۔"

"اچھا جی۔" اس نے سر ہلایا۔

اوپر آ کر میں نے اسے کہا۔ "کہ وہ یوں کھڑا ہو جائے جیسے باہر دو دو نگران ہیں دروازہ کھولنے کو کہہ رہے ہو۔ اس دوران میں تم یوں کھڑے ہو جیسے دروازہ کھلتے ہی باہر نکل گئے۔ اس طرح تم قدرتی طور پر کھلنے والی جگہ سے لگ کر کھڑے ہوئے۔ اب تمہارا جسم اور چھ انچ کی دیوار مجھے چھپانے کے لیے کافی ہو گی۔ باہر دروازے کا فرش تقریباً چھ انچ اونچا ہے۔ اگر میں سر بھی جھکا لوں تو گارڈ کے لیے مجھے دیکھنا ممکن نہیں رہے گا۔"

"چلیں جی...... اس نے دروازہ کھول بھی دیا تو آپ کیا کریں گے؟" حنیف نے نقطہ اُٹھایا۔

"خوش قسمتی سے یہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور ہے بھی فولادی۔" میں نے لوہے کے راڈز پر ہاتھ مارا۔ "جیسے ہی وہ اسے کھولے گا۔ میں اور تم اکٹھے دروازہ اتنی قوت سے باہر دھکیلیں گے کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے، دروازہ اسے زخمی نہ بھی کرے تب بھی زمین پر گرا دے گا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے میں باہر نکل کر اس کے ہتھیار پر قبضہ کر لوں گا۔"

"وہ چلا کر سب کو بلا لے گا۔" حنیف نے خبردار کیا۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کا کوئی حل نہیں ہے۔"

"پھر آپ اسے گولی مار دینا جی۔"

"اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ایسا کرنا پڑے گا۔" میں نے واپس تہہ خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے وہ لوگ آنے والے ہوں۔ حنیف بھائی کوشش کرنا کہ یہ کام آج رات ہی ہو جائے۔"





"میں بھی اب یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ میرے کفن دفن کا ارادہ کر کے آئیں۔"

میرے نیچے اُترتے ہی حنیف نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے منصوبے پر غور کیا تو مجھے لگا جیسے میں ضرورت سے زیادہ بلکہ اوقات سے زیادہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔ میں ابھی مشکل سے پندرہ سال کا ناتجربہ کار نوجوان تھا جبکہ میرے مقابلے میں چھٹے ہوئے مجرم تھے اور مسلح بھی تھے حنیف نے ان کے پاس پستول اور رائفل کے علاوہ دستی بم بھی دیکھے تھے یہ خطرناک چیز صرف مستند دہشت گرد قسم کے لوگ رکھتے ہیں۔ ایک فرد پر میں کسی طرح قابو پا بھی لیتا تو باقی تین اور پھر دو عدد خطرناک کتوں پر کیسے قابو حاصل کرتا۔ باہر والا نگران زیادہ سے زیادہ رائفل سے مسلح ہو سکتا تھا اور اس کے پاس گولیاں بھی محدود تعداد میں ہوں گی۔ جبکہ باقی تین کی رسائی خاصے اسلحے تک ہوتی اور ان کو ایمونیشن کی بھی کمی نہیں ہو گی اگر وہ مجھے گھیر لیتے تو میں مارا جاتا۔ کوئی بھی پلان کاغذ پر جتنا آسان ہوتا ہے عملی طور پر اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اوپر شاید وہ لوگ آ چکے تھے کیونکہ میں نے ایک بار کسی گاڑی کے انجن کی نزدیک آنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے علاوہ وقفے وقفے سے آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ سہ پہر کے وقت اوپر سے دروازہ کھلا اور حنیف اندر آتا نظر آیا اس نے حسب معمول کھانے کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی باچھیں بتا رہی تھیں کہ اس نے کوئی خاص بات معلوم کی ہے۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی اور پُر جوش لہجے میں لیکن دھیمی آواز میں بولا۔

"صاحب خوشخبری ہے۔ آج رات کوٹھی میں صرف گل خان اور مشتاق ہوں گے۔"

"وری گڈ۔" میں بھی خوش ہو گیا تھا۔ "اگر تم آج رات ہی ہمت کر گزرو تو ہمارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ باقی دو کہاں جا رہے ہیں؟"

"انہوں نے کسی سے ملاقات کرنی ہے آپ کے معاملے میں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ وہ جمشید علی یا ان کے کسی بااختیار نمائندے سے ملنے جا رہے تھے۔ "کتوں والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"میں نے اُس پودے کا خاصا دودھ نکال لیا ہے۔ باورچی خانے کے پیچھے ہی اُگا ہے۔ اگر یہ لوگ چائے مانگیں گے تو اس میں ڈال کر دے دوں؟" اس نے پوچھا۔ وہ زیادہ ہی پُر جوش ہو رہا تھا۔

"ایسی حماقت مت کرنا اس کی صورت دودھ جیسی ضرور ہوتی ہے لیکن ذائقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تم فوراً پکڑے جاؤ گے۔"

"میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ میں کتوں کو شام سات بجے کھانا ڈالتا ہوں۔ یہ لوگ ہڈی والا گوشت لاتے ہیں ان کے لیے۔ اس میں دودھ ملا کر دے دوں گا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد آپ کے لیے کھانا لاؤں گا۔"

''تم پر کوئی شک تو نہیں ہوا؟''

حنیف ہنسا۔ ''جب اس حرامی گل خان نے آ کر دروازہ کھولا تو میں اس کے سامنے رو پڑا تھا میں نے کہا کہ آئندہ میں اس لڑکے کو کھانا دینے نہیں جاؤں گا۔ وہ حرامی ہنستا رہا اور مجھ سے کہا تیرا تو باپ بھی جائے گا۔''

''گڈ۔'' میں نے اسے داد دی۔ ''کیا خیال ہے رات کے وقت میں حملے کا ڈرامہ نہ کروں۔''

''وہ کیسے جناب؟''

''بھئی پہلے تم چپکے سے باہر دیکھنا کہ وہ کہاں ہے اگر وہ دروازے کے سامنے نہ ہو تو تم زور سے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے گیلری والے دروازے کو بجانا شروع کر دینا۔ اس دوران میں بھی باہر سے تہہ خانے کا دروازہ بجا کر ایسا تاثر دوں گا جیسے اندر سے بجا رہا ہوں تم بدحواس ہو کر بتانا کہ میں نے تم پر حملہ کیا اور سیڑھیوں تک آیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ تہہ خانے کا دروازہ توڑ کر باہر آ جاؤں اس لیے جلدی سے تمہیں نکالا جائے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ جلدی سے دھیان دیئے بغیر دروازہ کھولے گا۔'' حنیف نے تائید کی۔

''لیکن دھیان رکھنا۔ شور اتنا مت کرنا کہ بوکھلا کر دونوں چلے آئیں۔ ایک سے تو آسانی سے نمٹا جا سکتا ہے لیکن بیک وقت دونوں سے نمٹنا مشکل ہو جائے گی۔''

''جی...... میں دھیان رکھوں گا۔'' اس نے سر ہلایا۔ باتیں کرنے کے دوران میں کھانے سے بھی فارغ ہو رہا تھا۔

''سکہ لے کر آئے؟''

''جی...... وہ تو میں بتانا بھول گیا۔ سکہ تو ملا نہیں۔ یہ کولڈ ڈرنک کی بوتل کا ڈھکن ہے اسے میں نے چپٹا کر کے اور پھر کٹر سے کاٹ کر سکے جیسا کر دیا ہے چلے گا۔''

اس نے ٹکڑا میرے سامنے رکھا۔ یہ دس پیسے کے سکے کے سائز کا تھا میں نے اُٹھا کر دیکھا۔ بالکل چلے گا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جو بلب ہے اوپر لگا ہوا اس کا بٹن کس طرف ہے۔''

''باہر لگا ہے کوئی روز شام کو اندر آ کر بٹن دبا دیتا ہے۔ صبح میں بند کر دیتا ہوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ گویا مجھے جلتے بلب کو نکال کر سکہ لگانا پڑے گا۔ بلب تو شام چھ بجے ہی جلا دیا جاتا تھا اگر فیوز وقت سے پہلے اُڑ گیا اور وہ بار بار لگاتے رہے اور بار بار اُڑتا رہا تو عین ممکن تھا وہ مشکوک ہو جاتے۔ یہ کام عین موقع پر کرنا تھا لیکن جلتے بلب کو نکال کر پھر آن بٹن کے ساتھ لوہے کا یہ ٹکڑا ہولڈر میں پھنسانا اور وہ بھی اندھیرے میں بے حد خطرناک کام تھا عین ممکن تھا میں کرنٹ کھا کر جان بحق نہ بھی ہوتا تو نیم جان ضرور ہو جاتا اور سیڑھیوں سے لڑھک کر اپنی ہڈی پسلی بھی تڑوا لیتا۔ ہولڈر اس جگہ لگانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آرام سے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر بلب لگایا یا نکالا جائے۔





کسی قدر غور و خوض کے بعد میں نے تہہ خانے والے ہولڈر کو مسترد کر دیا۔ اس کام کے لیے واش روم والا ہولڈر زیادہ مناسب تھا اول تو اس کا بٹن گیلری میں لگا تھا۔ دوسرے بلب بجھا بھی دیا جاتا تو گیلری کے بلب کی روشنی واش روم تک آتی تھی۔ وہاں مکمل اندھیرا نہیں ہوتا۔ اتنی روشنی ضرور رہتی کہ مجھے بلب نکال کر لوہے کا ٹکڑا لگانے میں آسانی رہتی اور جلتا بلب نکالنے اور آن بٹن میں کام کرنے کا خطرہ بھی نہ مول لینا پڑتا۔ پھر جیسے ہی حرکت میں آنے کا وقت آتا ہم با آسانی بٹن دبا کر فیوز اُڑا دیتے۔

میں نے حنیف کو ساری بات سمجھائی۔ پھر میں نے غور کیا تو مجھے ہنگامے کا تاثر دینے والی بات بھی صحیح نہ لگی۔ اس سے باہر موجود شخص بلاوجہ چوکنا ہو جاتا بہتر یہی تھا کہ فیوز اُڑنے کے بعد حنیف اسی طرح پیش آتا جیسے اس کا معمول تھا۔ یعنی وہ نارمل انداز میں نگران کو دروازہ کھولنے کو کہتا اور یہ کام فیوز اُڑنے کے فوراً بعد کرنا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ نگران فیوز دیکھنے چلا جاتا۔ میں نے حنیف کو بدلے ہوئے پروگرام سے بھی آگاہ کیا اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ ''جیسی آپ کی مرضی جناب۔''

کھانا ختم ہونے تک میں نے اسے بار بار اپنا پلان سمجھایا تاکہ اسے ذہن نشین ہو جائے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ ہر بات پوری طرح سمجھ چکا ہے تو میں نے اس سے کہا۔ ''اب مجھے واش روم تک لے چلو تاکہ میں یہ سکہ وہاں لگاؤں۔''

میں اس کے ساتھ اوپر آیا جیسے ضرورت سے واش روم جا رہا ہوں۔ جالی دار دروازے کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ میں اسے اتنی مختصر سی جھری سے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ مجھے مکمل طور پر دیکھ رہا تھا۔ میں واش روم میں گیا اور حنیف باہر رہا۔ دن کے وقت بلب جلانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے آرام سے اپنا کام کیا۔ بلب اُتار کر سکہ ہولڈر میں فٹ کیا اور بلب اس پر اچھی طرح لگا کر باہر آ گیا۔ میں نے آنکھ سے حنیف کو کام ہو جانے کا اشارہ کیا۔ تہہ خانے میں جانے سے پہلے میں نے باہر کھڑے نگران سے پوچھا۔ ''مجھے کب تک یہاں قید رکھا جائے گا۔ تمہارا استاد کہہ رہا تھا کہ جلد مجھے یہاں سے کسی اچھی جگہ منتقل کیا جائے گا۔''

باہر والا شخص جب بولا تو پتہ چلا وہ گل خان تھا۔ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم فکر مت کرو...... جلد تم کو ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے گا جدھر تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... ادھر تم ہمیشہ رہے گا۔''

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ مجھے مار کر دفنانے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے مستقبل کا فیصلہ کر لیا گیا تھا چاہے جمشید علی ان کا مطالبہ پورا کرے یا نہ کرے۔ یہ لوگ ارشد بلا کے ساتھی تھے۔ ان کا باس نہ صرف میری وجہ سے پکڑا گیا تھا بلکہ ان کے مزید پانچ ساتھی پولیس کے ہاتھ صرف میری وجہ سے آئے تھے۔ ان میں ارشد بلا کا بھائی مرشد تھا اور پولیس نے اپنے طور پر کارروائی کرتے ہوئے ان کے چار مزید ساتھی گرفتار کیے تھے۔ گویا اس مافیائی گروہ کو میری وجہ

سے خاصا دھچکا لگا تھا۔ وہ بھلا مجھے کیسے معاف کر سکتے تھے۔

رفتہ رفتہ دن گزرتا رہا۔ شام ہوئی تو میری بے چینی بڑھنے لگی۔ مختلف خدشات ذہن پر یوں یلغار کرنے لگے جیسے بارش کا چھینٹا پڑتے ہی زمین سے مختلف کیڑے مکوڑے نکل آتے ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ استاد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ جائے یا کسی وجہ سے آج کی ملاقات ہی ملتوی ہو جائے یا آج حنیف کو نیچے آنے ہی نہ دیا جائے کھانا کوئی اور لے کر آئے یا سرے سے نہ آئے۔ میری بھوک پیاس ان لوگوں کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی جو مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم اپنے پلان پر کامیابی سے عمل کر گزرتے لیکن باہر موجود فرد رات کی تاریکی میں حنیف کے لیے دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ کر لیتا۔ جب تک کہ لائٹ نہ آ جاتی یا دروازہ کھول بھی دیتا تو میں اس پر قابو پانے میں ناکام رہتا یا اِس پر قابو پا بھی لیتا لیکن باقی قابو میں نہ آتے۔ خیالات کی اس یلغار سے گھبرا کر میں ورزش کرنے لگا تا کہ جب ایکشن کا وقت آئے میرا جسم پوری طرح تیار و گرم ہو۔ نصف گھنٹے کی ورزش نے مجھے پسینے پسینے کر دیا تھا۔ ویسے بھی جون کے مہینے میں راولپنڈی اور اسلام آباد میں خاصی گرمی ہوتی ہے مگر مجھے خیالات کی یلغار سے بھی نجات مل گئی تھی۔

میں نے سوچا۔ باہر نکلنے کی صورت میں مجھے بے حد تیزی سے حرکت میں آنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا فرد ہوشیار ہو اس پر بھی قابو پا لینا تھا۔ جتنی تاخیر کرتا مجھے اتنا ہی نقصان ہوتا۔ اس وقت مجھے سامنے والے کی زندگی کی پروا بھی نہیں کرنی تھی۔ اسی کوشش کو پہلی اور آخری سمجھ کر سر دھڑ کی بازی لگا دینی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ سات بج رہے تھے کیونکہ سورج کی روشنی غائب ہو چکی تھی اور روشندان کی سفیدی بتدریج مدھم پڑ رہی تھی۔ میں نے کان لگا دیئے کچھ دیر بعد جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی گویا وہ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کتنا مزہ آئے کہ یہ لوگ جمشید علی سے میرے بارے میں مذاکرات کر رہے ہوں اور میں عین اسی وقت انہیں اپنی رہائی کے بارے میں بتا دوں۔

جیپ جانے کے بعد ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ روشندان پر تاریکی غالب آ چکی تھی اور تہہ خانے کا بلب بھی روشن کیا جا چکا تھا۔ اب مجھے انتظار حنیف کا تھا۔ خاصی دیر گزر گئی مجھے یوں لگا جیسے آٹھ کب کے بج چکے ہوں اور اب نو بجے کا وقت ہو۔ میرے اضطراب میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ جانے والے کسی وقت بھی لوٹ سکتے تھے اور وہ لوٹ آئے تو ہمارے لیے مزید مشکل ہو جاتی۔ خاص طور سے عالمگیر سے مجھے خوف تھا، وہ بے حد چالاک اور تیز شخص تھا۔ میری رہائی میں سب سے زیادہ رکاوٹ وہی ڈال سکتا تھا اور میری خوش قسمتی کہ وہ میرے بارے میں مذاکرات کرنے گیا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے اوپر سے آہٹ کی آواز آئی۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور حنیف کی صورت نظر آئی۔ اس نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ میں مارے جوش کے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پاس جا پہنچا اور





آواز دباتے ہوئے کہا۔ ”کہاں تھے اب تک..... کتنا وقت گزر گیا ہے۔“

”نہیں جی میں تو وقت پر آیا ہوں۔“

”ٹائم کیا ہوا ہے..... ساڑھے نو دس بج رہے ہیں اور تم کہتے ہو ٹھیک وقت پر آئے ہو۔“ میرے لہجے میں برہمی تھی۔

”نہیں جناب..... ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔ میں وقت دیکھ کر آیا ہوں۔“ اس نے تردید کی۔

”صرف آٹھ بجے ہیں۔“ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ تو کیا انتظار نے وقت کو کھینچ کر اتنا طویل کر دیا تھا کہ میں نے ایک گھنٹے میں جیسے کئی گھنٹے گزار دیئے تھے۔ ”خیر اسے چھوڑو..... اوپر کون ہے؟“

”مشتاق پہرا دے رہا ہے۔ گل خان گیٹ پر ہے۔“

”اور کتوں کا کیا ہوا؟“

”گوشت میں آک کا دودھ ملا کر دے دیا تھا، اس وقت وہ سو رہے ہیں یا ان پر دودھ کا اثر ہو گیا ہے۔ روزانہ وہ دس بجے تک آرام کرتے ہیں پھر رکھوالی کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔“

”اور اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات ہو تو۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔“ اس نے سر ہلایا۔

میں نے بھی احمقانہ سوال کیا تھا۔ ظاہر ہے رکھوالی کے کتے ہنگامہ سن کر سوئے تو نہیں پڑے رہتے۔ میں نے دعا کی کہ زہر نے انہیں مارا نہ بھی ہو تب بھی بے کار ضرور کر دیا ہو۔ میں نے کھانے کی ٹرے لے کر ایک طرف رکھ دی۔ کھانا دیکھ کر اچانک مجھے خیال آیا کہ حنیف کچن میں کام کرتا تھا، میں اس سے کوئی تیز دھار چھری منگوا لیتا۔ اس صورت میں حریف کو قابو کرنے کا کام آسان ہو جاتا لیکن اب وقت نہیں تھا مجھے جو کرنا تھا خالی ہاتھ سے کرنا تھا۔ میں گل خان کو دیکھ چکا تھا وہ مضبوط لیکن جذباتی ہو جانے والا شخص تھا۔ میں اسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا لیکن مشتاق کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے خالی ہاتھ سے لڑنے کا فن بھی جانتا ہو۔ اس صورت میں اسے زیر کرنا آسان نہ ہوتا۔ اگر وہ دروازے کے پاس ہوتا تو کام اور مشکل ہو جاتا۔ میں اور حنیف سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ حنیف نے دروازے سے باہر دیکھا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ دروازے کے پاس نہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جب اوپر آئے تو زبان سے کوئی آواز نہ نکالے۔ جو کہنا ہو اشارے سے کہے۔ میں نے اشارے میں جواب دیا کہ وہ باہر جا کر پہلے بٹن دبا کر فیوز اُڑا دے، وہ خاموشی سے گیا اور جیسے ہی اس نے گیلری میں لگا بٹن دبایا تو اچانک اندھیرا ہو گیا۔ گیلری اور تہہ خانے کا بلب بھی بجھ گیا تھا۔ میں پھرتی سے تہہ خانے سے نکلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ حنیف تیزی سے دروازے کے پاس آیا۔

”سرکار جی..... دروازہ کھولو۔“ اس نے پکار کر کہا۔ میں اس کے جسم اور چھ انچ کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

''ایک منٹ یار...... پہلے فیوز دیکھ لوں۔'' باہر سے مشتاق کی آواز آئی۔ وہ دور جا رہا تھا۔

مجھے مایوسی ہوئی تھی لیکن اس موقع پر حنیف نے حاضر دماغی دکھائی۔ اس نے پکار کر کہا۔

''سرکار جی...... میں سالن گرم ہونے کے لیے چولہے پر رکھ آیا تھا۔ وہ جل جائے گا تو پھر رات کو کیا کھائیں گے۔''

میں سانس روک کر مشتاق کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ غالباً سوچ رہا تھا کہ پہلے دروازہ کھول کر حنیف کو جانے کی اجازت دے یا پہلے جا کر فیوز دیکھے پھر اس کے قدموں کی چاپ نزدیک آئی۔ چابی کی جھنکار سنائی دی تو میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ میں نے حنیف کے شانے پر ہاتھ مار کر اسے تیار رہنے کو کہا۔ اندر اتنی تاریکی تھی کہ میں دروازے کے سامنے بھی کھڑا ہوتا تو مشتاق کو نظر نہ آتا۔ اس نے تالے میں چابی لگاتے ہوئے پوچھا۔

''اسے اندر بند کر دیا تھا۔ کنڈی صحیح سے لگائی تھی نا۔''

''آپ خود دیکھ لو جی۔'' حنیف نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے تو ٹھیک سے لگائی ہے۔''

اس دوران میں میرے جسم کے رگ و پٹھے آنے والے ایکشن کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ اس نے چابی سے تالا کھول لیا تھا اور اب اسے کنڈی سے نکال کر کنڈی کھولنے جا رہا تھا۔ اندر سے کسی صورت ہاتھ یا انگلی باہر نکال کر کنڈی نہیں کھولی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ احتیاطاً تالا ضرور لگاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب حنیف کھانا لے کر آتا تو اس کے اندر آنے کے بعد وہ باہر سے تالا لگاتے تھے۔ جب تک وہ اندر رہتا تالا لگا رہتا اور جب وہ باہر آنے لگتا تو پہلے تہہ خانے کا بند دروازہ دیکھا جاتا تھا پھر اس کے لیے تالا کھلتا تھا۔ آج پہلی بار اس طے شدہ قاعدے کی خلاف ورزی کی جا رہی تھی اور انہیں اس چیز کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ جیسے ہی کنڈی کھلی، میں نے حنیف کو ایک طرف دھکیلا اور دروازے کو پوری قوت سے اپنے جسم کے ساتھ لیتا باہر نکلا۔ مشتاق جو دروازہ کھول چکا تھا۔ اس بات کو سمجھ نہیں سکا۔ دروازہ شدت سے آ کر اس کے منہ پر لگا۔ اس کے حلق سے ایک اضطراری سی آواز نکلی اور وہ زمین پر جا گرا۔ اس کے شانے سے شاٹ گن لٹک رہی تھی۔ خاصی چوٹ آنے کے باوجود اس کا تربیت یافتہ ہاتھ شاٹ گن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چوٹ نے اسے فی الوقت کروٹ بدلنے سے باز رکھا تھا مگر وہ ایک گھاگ جرائم پیشہ تھا۔ یہ چوٹ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کے حوصلے سے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ذرا سا موقع دینا حماقت ہوگی۔ میں نے باہر آتے ہی پہلی ٹھوکر اس کے مضطرب منہ پر ماری اور دوسری ٹھوکر اس کے اس ہاتھ پر جو شاٹ گن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منہ پر لگنے والی ٹھوکر نے اس کے کئی دانت حلق میں اُتار دیئے تھے۔ بے شک میرے پیروں میں جوتے نہیں تھے مگر میرے پیر ہی کسی جوتے سے کم نہیں تھے۔ کلائی پر لگنے والی کِک نے شاید اس کی ہڈی توڑ دی تھی کیونکہ اس نے تڑپ کر ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے جھک کر شاٹ گن اس کے شانے





سے اُتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے سر پر لگاتار ٹھوکریں مارنے لگا حتیٰ کہ وہ بے دم ہو گیا جب اس میں ہاتھ پیر ہلانے کی سکت بھی نہ رہی تو میں نے اطمینان سے شاٹ گن اس کے شانے سے اُتار کر اس کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا۔ اس تسلی بخش قسم کی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے غافل ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دوران میں کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مشتاق سے نمٹ کر میں نے سب سے پہلے اردگرد کا معائنہ کیا۔ یہ مکان کا بایاں حصہ تھا۔ اسے آپ مشرقی کنارہ سمجھ لیں۔ مغربی کنارے پر باہر جانے والا گیٹ تھا جو یہاں سے کوئی سوفٹ کے فاصلے پر تھا، خوش قسمتی سے گیلری سے باہر آنے والے دروازے کے ساتھ ہی ایک کمرا تھا اس کی دیوار نے گیٹ کو یہاں سے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس جگہ کو بھی گیٹ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ مشتاق سے نمٹنے کے دوران مجھے سب سے زیادہ فکر کتوں کی تھی۔ گل خان کو یہاں ہونے والے واقعات کی خبر ہوتی یا نہ ہوتی اگر کتے ہوش میں ہوتے تو انہیں ضرور ہو جاتی اور وہ اِدھر لپکے آتے لیکن جب میں مشتاق سے نمٹ کر فارغ ہوا اور کتوں کو وہاں نہ پایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب کا مطلب تھا کہ آک کے دودھ نے اثر کیا تھا۔ کتے مرے نہیں بھی تھے تو اس زہر کے اثر سے مدہوش ضرور پڑے تھے ورنہ اب تک نمودار ہو چکے ہوتے۔

حنیف تیزی سے باہر آیا اور پھر زمین پر ساکت پڑے مشتاق کو دیکھ کر اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ مر گیا ہے؟''

''اتنا غیرت مند نہیں ہے۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''سر پر اس کا دستہ مارا تھا، بے ہوش پڑا ہے۔''

''کتے نہیں آئے۔'' وہ ڈرا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہارا نسخہ کام آ گیا۔ دونوں......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے صحن کی طرف دو ہیولے نمودار ہوئے۔ میں بے ساختہ چلایا۔

''بھاگو......'' اور گیلری والے دروازے میں گھس گیا۔ حنیف پیچھے تھا۔ اس نے ذرا تاخیر کی اور ایک کتے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ یوں گرا کہ اس کا آدھا جسم دروازے کے اندر تھا میں نے پلٹ کر کتے کے سر پر شاٹ گن کی نال ماری۔ اس نے ایک کریہہ آواز کے ساتھ حنیف کی ٹانگ چھوڑ دی۔ میں نے اسے اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ دونوں کتے بیک وقت اپنے وزنی جسم لے کر دروازے سے ٹکرائے تو وہ ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ پورے زور و شور سے بھوک رہے تھے۔ ان کی صور نما آواز سن کر قبر سے مردے بھی دوڑے چلے آتے پھر گل خان کو کیسے خبر نہ ہوتی۔ اس نے چلا کر بے ہوش مشتاق سے دریافت کیا۔

''کیا بات ہے کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟''

ظاہر ہے مشتاق جواب دینے سے قاصر تھا اور اس لیے پہلے گل خان خود صلاح احوال کے لیے

ادھر آتا۔ میں نے کتوں کا خاتمہ ضروری سمجھا۔ میں نے شاٹ گن کی نال دروازے کی جھری سے باہر نکالی اور جوش و خروش سے دروازے سے ٹکراتے ایک کتے کے سر پر فائر کیا۔ بھیانک دھماکے کے ساتھ وہ کتا یک دم خاموش ہو کر پیچھے جا گرا۔ جتنی دیر میں مَیں شاٹ گن دوبارہ لوڈ کرتا، دوسرا کتا خطرہ بھانپ کر تیزی سے پسپا ہوتا چلا گیا۔ میں نے حنیف سے کہا۔ ''تم ابھی اندر ہی رہنا۔''

''آپ کہاں جا رہے ہو جناب......؟'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ''ایسا نہ ہو مجھے ادھر ہی چھوڑ کر نکل جاؤ۔''

''میں تمہیں محفوظ رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اسے سمجھایا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ دوسرا کتا مغربی کنارے کی طرف پسپا ہو گیا تھا۔ گل خان بھی اس طرف سے آتا۔ میں بائیں طرف سے گھوم کر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری نظر اوپر جاتی سیڑھی پر پڑی۔ یہ تعمیر کے لیے استعمال کی جانے والی بانس کی سیڑھی تھی۔ ایک لحہ ضائع کیے بغیر میں اس پر چڑھ گیا اوپر سے میں کتے اور گل خان سے زیادہ بہتر طریقے سے نمٹ سکتا تھا۔ چھت پر آتے ہی میں مغربی کنارے کی طرف لپکا۔ اوپر سے میں نے دیکھا یہ نیا آباد ہونے والا علاقہ تھا۔ اس کوٹھی کے چاروں طرف کوئی اور کوٹھی نہیں تھی۔ ایک جانب خانہ بدوشوں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ دو پلاٹ کے بعد ایک زیرِ تعمیر مکان تھا۔ اس طرح دور دور تک مکمل اور نامکمل کوٹھیاں بکھری ہوئی تھیں۔ نصف چاند نکلا تھا جس کی روشنی میں ماحول میں سکون تھا۔ میں نے اوپر سے جا کر احتیاط سے نیچے جھانکا۔ سامنے مین گیٹ تھا لیکن فی الوقت وہ خالی نظر آ رہا تھا۔ گل خان یا کتا ادھر والے صحن میں نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ نیچے نہیں تھے۔ وہ چھت کے اوپر سے نکلے چھجے کے نیچے ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے شاٹ گن کے دھماکے کے بعد گل خان کھلے صحن میں رہنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

اب مجھے اپنی حماقت کا افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اوپر آتے ہوئے ان چھجوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اوپر آنے کے لیے مستقل سیڑھیاں ابھی نہیں بنی تھیں اس لیے بانس کی سیڑھی سے کام لیا جا رہا تھا۔ دوسری عقلمندی یہ کی تھی کہ حنیف کو نیچے چھوڑ آیا تھا حالانکہ اسے نہتا ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔ گل خان یا کتا اس پر حملہ کر کے اسے مار سکتے تھے۔

گل خان یا کتے کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے ایک پتھر اُٹھا کر مین گیٹ پر مارا اس کی چادر کا آہنی جھنکار رات کے سناٹے میں گونجا تھا اس کے ساتھ ہی کوٹھی کی طرف سے دروازے کی سمت ایک فائر ہوا۔ ہوا میں تیرتا شعلہ اس طرف گیا تھا۔ گل خان کسی کمرے میں تھا یا چھجے تلے پناہ لے چکا تھا اور اس کے پاس پستول تھا۔ مجھے گل خان سے زیادہ کتے کی فکر تھی۔ وہ سونگھ کر پتا چلا سکتا تھا کہ میں کہاں تھا اور مجھے گھیرنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ جبکہ گل خان بے خبر تھا کہ اس وقت میں کہاں تھا۔ چھت پر میں ہر ممکن احتیاط سے حرکت کر رہا تھا کہ کوئی آہٹ نیچے تک نہ جائے۔ میں واپس سیڑھیوں کی طرف آیا اور خود کو بہ مشکل فائر کرنے سے روکا۔ ایک سر نمودار ہوا تھا سیڑھیوں کی





جانب سے...... یہ حنیف تھا۔ میں ایک لمحے کی جلد بازی کرتا تو وہ مارا جاتا۔

''احمق آدمی...... تم کیوں نکلے وہاں سے۔ ابھی میرے ہاتھوں مارے جاتے۔'' میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

''مجھے ڈر لگ رہا تھا جی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

اس کی خوش قسمتی کہ گل خان یا کتے کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ بہر حال وہ اوپر آ گیا تھا۔ میں نے اسے سیڑھیوں پر نظر رکھنے کو کہا اور خود چھجے پر لیٹ کر نیچے کی طرف جھانکا۔ مغربی کنارے میں چھجے تلے کوئی نہیں تھا۔ میں چھجے پر ہی چلتا دوسری طرف گیا۔ یہاں مجھے نیچے دیوار کے ساتھ ایک وجود نظر آیا لیکن تاریکی میں یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ انسان ہے یا کتا۔ وہ بالکل دیوار کے ساتھ دبکا ہوا تھا۔ خاصی دیر تک نظر جمانے کے باوجود میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ انسان تھا یا کتا۔ آخر میں نے ٹٹول کر چھت سے ایک کنکر اُٹھایا اور اسے صحن کی طرف اُچھال دیا۔ سناٹا اس قدر شدید تھا کہ معمولی سا کنکر گرنے کی آواز بھی گونجی تھی۔ دیوار کے ساتھ دبکا ہوا ہیولا بھڑکا اور میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ گل خان تھا جو نہ جانے کب سے یہاں دبکا تھا۔ وہ بھی چھٹا ہوا مجرم تھا اتنی آسانی سے زیرِ دام آنے والا نہیں تھا۔ کتوں کا شور اور فائر کی آواز سن کر وہ بھی...... ادھر نہیں آیا تھا اس نے درست فیصلہ کیا تھا اگر مشتاق فائر کرتا تو وہ خود آ کر اسے بتاتا اور فائر مشتاق نے نہیں کیا تو وہ ادھر آ کر میرے ہاتھوں بے موت نہ مرتا۔

میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے شاٹ گن چھجے سے نیچے کی اور گل خان کو وارننگ دی۔ ''ہتھیار پھینک دو...... تم میرے نشانے......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے بھڑک کر فائر کر دیا۔ گولی میرے سامنے سے گزری اور میں نے بے اختیار شاٹ گن کا ٹریگر دبا دیا۔ گل خان نے کرب ناک آواز نکالی اور اُچھل کر کھلے صحن میں آ گرا۔ اس کا جسم ماہیِ بے آب کی طرح پھڑک رہا تھا۔ ہلکی روشنی کے باوجود میں نے اس کے شانے اور گردن سے فوارے کی طرح اُچھلتے خون کو دیکھ لیا تھا۔ شاٹ گن نے اس کے جسم میں کئی انچ بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر رائفل موڑی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ ابھی میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ کتا ایک طرف سے غراتا ہوا جھپٹا۔ اس نے سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کی اور اس کے وزنی جسم نے سیڑھی کا وزن بگاڑ دیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر میرے پیروں تلے سیڑھی ہی نکل رہی تھی۔ خود کو متوازن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہوئے میرا پہلو ٹکرایا تھا اور رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں قلابازی کھا کر اُٹھا تھا کہ کتا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے خون آشام جبڑے سے بچنے کے لیے میں نے اس کی گردن تھام لی۔ کتا زور میں مجھے لے کر فرش پر گرا اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح میری گردن پکڑ لے۔ ایک بار میری گردن اس کے منہ میں آ جاتی تو وہ لمحوں میں میرا نرخرہ ادھیڑ دیتا۔ اس کتے کو انسان پر قاتلانہ حملہ کرنے کی باقاعدہ تربیت دی گئی تھی۔

میری کوشش تھی کہ اپنی گردن اس سے محفوظ رکھتے ہوئے اسے دور پھینک سکوں۔ وہ اپنی وحشیانہ طاقت سے مجھے زیر کرنے کی فکر میں تھا۔ اس کے پنجے میرے جسم پر خراشیں ڈال رہے تھے۔ بہ دقت میں نے اپنے پاؤں سمیٹے اور کتے کے پیٹ پر اپنا گھٹنا مارا۔ اس نے کرب ناک آواز نکالی لیکن مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا اس بار میں نے دونوں پاؤں اس کے جسم سے لگائے اور جھٹکے سے اسے دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں اُچھل کر کھڑا ہوا۔ کتا زمین پر گرتے ہی طاقتور اسپرنگ کی طرح اُچھلا، اس نے زبردست جست لگائی اور ہوا میں اُڑتا ہوا میری طرف آیا۔ اس بار میں نے ہاتھوں کے بجائے پیر سے کام لیا۔ ہوا میں اُچھل کر گھومتے ہوئے میں نے کتے کے سر پر لات ماری۔ خشک لکڑی جیسی چٹخنے کی آواز آئی۔ کتا زمین پر ایک طرف گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس سے ذرا سی دیر کی جنگ نے میرا جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا۔ خوش قسمتی سے لات بالکل درست پڑی اور کتا مارا گیا میں نے رائفل اُٹھالی۔

''صاحب...... آپ ٹھیک ہونا؟'' اوپر سے حنیف کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

''ہاں...... نیچے آجاؤ۔'' میں نے گری ہوئی سیڑھی اُٹھا کر دیوار سے لگائی اور حنیف نیچے اُتر آیا۔

''گل خان کدھر ہے؟''

''اودھر پڑا ہے۔ میں نے اسے گولی ماردی ہے۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا لیکن جب اس طرف دیکھا تو مجھے اپنی بینائی پر شک ہوا۔ گل خان اس جگہ نہیں تھا پھر دو باتیں بیک وقت ہوئیں۔ حنیف اضطراری طور پر سامنے آیا اور ایک کھڑکی سے شعلہ لپکا اور حنیف کے پیٹ میں اُتر گیا۔ اس نے ہلکی سی آواز نکالی۔ وہ نیچے گر گیا تھا۔ گل خان نہ جانے کس طرح کمرے میں چلا گیا تھا حالانکہ اس کی گردن سے جس طرح خون بہہ رہا تھا وہ بالکل آخری سانسوں پر لگ رہا تھا مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کب اس کا وقت آجائے۔ بعض اوقات معمولی نظر آنے والا زخم آدمی کی جان لے لیتا ہے اور کبھی شدید زخمی ہونے والا بھی بچ جاتا ہے۔ اپنی ناتجربے کاری کی وجہ سے میں نے گل خان کو مُردہ تصور کر لیا جبکہ وہ زندہ تھا اور اس نے حنیف کو گولی ماردی۔ وہ کھڑکی کے سہارے کھڑا تھا اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر تقدیر نے اس گولی پر حنیف کا نام لکھ دیا تھا۔

گل خان نے دوبارہ پستول اُٹھانے کی کوشش کی۔ حنیف کو گرتے دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس بار میں نے گل خان کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کے ساتھ ہی اس کا سر جیسے غائب ہو گیا پھر اس کا باقی رہ جانے والا دھڑ آہستہ سے چل کر کھڑکی کے چوکھٹے سے غائب ہو گیا۔ اس بار وہ بلاشبہ مرچکا تھا کیونکہ کوئی شخص بغیر سر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں حنیف کی طرف لپکا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے زمین پر دراز تھا۔ اب تک اس کے منہ سے نہ تو کوئی چیخ نکلی تھی اور نہ ہی وہ تڑپ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر سے کسی نے کہا کہ وہ بچے گا نہیں۔ اس کے چہرے





پر موت کی سفیدی چھا رہی تھی۔ میں نے زخم دیکھا۔ گولی نے اندر جگر اور آنتوں کو نقصان کیا تھا۔ خون نالے کی طرح بہہ رہا تھا۔

''حوصلہ رکھو حنیف بھائی...... میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔''

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''اپنا انعام والا وعدہ یاد رکھنا صاحب۔''

میں زبردستی ہنسا۔ ''تمہیں ابھی بھی انعام کی فکر ہے۔ اللہ کے بندے پہلے صحت یاب ہو جاؤ پھر انعام بھی لے لینا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بچوں گا نہیں...... میرا آخری وقت آگیا ہے اِدھم پورہ کی اس کچی بستی میں میرے بیوی بچے ہیں صاحب...... ان کا خیال رکھنا...... مجھ سے جو وعدہ کیا ہے...... ان سے...... پورا کرنا......'' اچانک اس کی زبان اٹکنے لگی۔ ''ورنہ قیامت...... کے دن...... تیرا دامن...... پک......ڑوں گا......''

وہ ایک دم چپ ہوا تو میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بے اختیار اسے جھنجھوڑ دیا۔

''حنیف...... اٹھو۔'' لیکن وہ میری پکار کی حد سے دور جا چکا تھا۔ میرے جھنجھوڑنے سے اس کے ہاتھ پیٹ سے ہٹ گئے تھے۔ اعشاریہ پینتالیس کی گولی نے اس کے پیٹ میں تین انچ چوڑا سوراخ کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ خون سے بھرے تھے اور ایک نشان میرے بازو پر بھی آگیا تھا۔ یہاں حنیف نے خون آلود ہاتھ رکھا تھا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا پھر میری نگاہ مشتاق پر پڑی، وہ بدستور بے ہوش تھا اس کے پاس ہی کتے کی لاش پڑی تھی۔ ذرا سی دیر میں چار جاندار اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ میں نے مشتاق کو اُٹھا کر گیلری میں ڈالا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر تھی۔ میں نے مشتاق کی تلاشی لی، گھڑی، اس کا بٹوہ اور جوتے اُتار لیے تھے۔ جوتے کسی قدر ڈھیلے تھے لیکن کام چل رہا تھا۔ مجھے ان تینوں چیزوں کی ضرورت تھی۔ جانے سے پہلے میں نے آخری بار حنیف کو دیکھا۔ چند منٹ پہلے وہ جیتا جاگتا شخص تھا۔ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور...... دس منٹ بعد وہ ایک لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔

''مجھے معاف کرنا حنیف بھائی...... تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' میں نے دل میں کہا تھا۔ اس کے احسان کا بدلہ تو نہیں دیا جا سکتا تھا اس نے مجھے آزاد کرایا اور پھر میری طرف آنے والی موت قبول کر لی لیکن اس کے احسان کا کسی قدر بدلہ یوں ادا کیا جا سکتا تھا کہ میں اس کے بیوی بچوں کو مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہونے دوں۔ باپ کا نعم البدل تو کچھ نہیں ہوتا ہے لیکن مالی لحاظ سے اس کے بیوی بچے پُرسکون زندگی گزار سکتے تھے۔ مجھے اس رقم کا خیال آیا جو اندر والے حصے کے کسی کمرے میں رکھی تھی۔ بقول حنیف کے وہ خاصی بڑی رقم تھی اور میرے خیال میں وہ رقم کسی غریب گھر کے کام آتی تو زیادہ بہتر تھا بہ نسبت اس کے کہ یہ ڈاکو اسے اپنی عیاشیوں اور اسلحے کی خریداری پر لگاتے یا ان سے بڑے ڈاکو یعنی پولیس والے اسے شیر مادر سمجھ کر ہضم کر جاتے۔

وقت کم تھا۔ اصولاً مجھے نکل جانا چاہیے۔ استاد اور اس کا ساتھ کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ میں سامنے نظر آنے والے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہ بھی گیلری تھی۔ اس کے بائیں طرف دو کمرے تھے۔ پہلا کمرا کھلا تھا اور اس کے ساتھ والا کمرا باہر سے لاک تھا۔ دائیں طرف ایک کمرا تھا اس کمرے میں کھڑکی سے گل خان نے مجھ پر فائر کیا تھا لیکن قضا حنیف کی آئی تھی۔ اس کمرے میں گل خان کی بے سر کی لاش موجود تھی۔ میں نے پہلے اس کمرے میں دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ دوسرا کمرا بھی سوائے چار پائیوں کے کسی قسم کے فرنیچر سے خالی تھا۔ اتنی دیر میں میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔ پھر...... دوسری طرف آنے سے کھلی کھڑکیوں سے روشنی اندر آ رہی تھیں لیکن تیسرا کمرا اندر کی جانب تھا اور وہاں تک چاند کی روشنی بھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے ذرا آگے جا کر گل خان کی لاش ٹٹولی۔ اس کے ہونٹ بتاتے تھے کہ وہ سگریٹ نوش تھا۔ اس کے پاس لازماً ماچس یا لائٹر ہونا چاہیے تھا۔ میری تلاش بار آور ثابت ہوئی اس کے جیب سے لائٹر نکل آیا۔

کمرے پر خاصا بھاری تالا لگا تھا۔ اسے توڑنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی اس لیے مجھے ایک بار پھر گل خان کے پاس جانا پڑا۔ پستول بد... اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پستول لا کر تالے پر رکھ کر فائر کیا۔ تالا خاصا مضبوط تھا۔ دوسرے فائر میں ٹوٹا۔ میں نے بائیں ہاتھ میں لائٹر سنبھالا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ٹن کا مذکورہ صندوق مجھے چار پائی تلے مل گیا۔ اس پر بھی مضبوط قسم کا تالا لگا تھا۔ ایک گولی مجھے اس پر بھی ضائع کرنا پڑی۔ وہاں متعدد اقسام کے ہتھیار رکھے تھے ان میں عام پستولوں سے لے کر سب مشین گن اور دستی بم تک شامل تھے۔ میں نے احتیاط سے فائر کیا کہ گولی بہک کر کسی بم پر نہ جا لگے۔ میں نے صندوق کھولا۔ اس میں واقعی لاکھوں کی رقم تھی۔ اس زمانے میں پانچ سو یا ہزار کے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ صندوق میں سارے ہی سو سو کے لال نوٹوں والی گڈیاں تھیں۔ یعنی ایک گڈی میں دس ہزار روپے تھے اور صندوق گڈیوں سے لبالب بھرا تھا۔ اس کا وزن اندازاً دس بارہ کلو گرام تھا۔ اس سارے انبار کو لے جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ دس بارہ لاکھ کی رقم تھی۔ میں نے بستر پر پڑے تکیے سے غلاف اُتارا اور اس میں گڈیاں بھرنے لگا۔ غلاف میں مشکل سے دو تہائی گڈیاں آئی تھیں باقی صندوق میں رہ گئی تھیں۔

نہ جانے کیوں اس وقت میں سخت حماقت کے موڈ میں تھا۔ اب تک مجھے ہر چیز پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ مگر میں پہلے رقم کے چکر میں رُک گیا حالانکہ یہ میری جان سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اتنی رقم بلکہ اس سے زیادہ میں جمشید علی سے کہہ کر حنیف کے گھر والوں کو دلوا سکتا تھا بلکہ رقم سے بہتر تو یہ تھا کہ ان کے لیے کوئی مستقل بندوبست کرا دیتا۔ دولت عام طور سے غریب کو ملے تو فتنے کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر مزید حماقت یہ تھی کہ اس کالی کمائی کو ضائع کرنے کا سوچا اور ایک گڈی کو آگ لگا کر صندوق میں ڈال دیا۔ دو تین گڈیوں کو آگ لگی تو کمرا روشن ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں سبھی نوٹوں کو بھی آگ لگ چکی تھی۔ عین اسی لمحے جب میں باہر جانے کے لیے دروازے کی





طرف بڑھا۔ کسی نے چلا کر کہا۔ "اوئے...... یہ اسلحے والے کمرے میں آگ کس نے لگائی ہے۔" میں سن سا رہ گیا تھا۔



میں سن سا رہ گیا تھا۔ سرسوتی کا مجھ سے لپٹا وجود زندگی کی حرارت سے یکسر خالی اور بے جان ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی مگر روح کا پرندہ جسم کے پنجرے سے اُڑ چکا تھا۔ وہ کیسے مری...... یہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ کیوں مری...... اس سوچ نے میرا دل بوجھل کر دیا تھا۔ اتنی سی عمر میں اس نے کتنے مصائب دیکھ لیے اور پھر یوں خاموشی سے مرگئی۔ کیا یہ اس کی زندگی کے ساتھ ناانصافی نہیں تھی۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا مگر نہیں...... اس نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا جو بہت سارے انسان ساری عمر نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ میں نے اسے بستر پر سیدھا لٹایا اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ مجھے ندامت اور گناہ کے داغ سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی۔ میں اس کے لیے مغفرت کی دعا تک نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی پیشانی تو چوم سکتا تھا۔

سرہانے رکھی سائیڈ دراز پر ٹرے میں کافی کے دو خالی کپ تھے۔ ایک کے پیندے میں سفید رنگ کے پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ تھی۔ یہ یقیناً خواب آور دوا تھی جس کے بھاری ڈوز نے سرسوتی کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔ اسی دوا کے ہلکے ڈوز نے مجھے دنیا سے غافل کر دیا تھا۔ غالباً سرسوتی کا مقصد یہ تھا کہ میں اسے بچانے کی کوشش نہ کروں۔ اسے سکون سے مرنے دوں۔ اس نے مرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور جو لوگ مرنے کا فیصلہ کر لیں ان کے لیے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ ایک چادر سے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر میں باہر آیا۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور جان گرے حسبِ معمول ٹیرس پر دھوپ اور شراب نوشی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر نفرت کا جذبہ پھر سے کھولنے لگا تھا۔ میں چپ کھڑا اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ اسے میری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔

"یوسف...... کہو رات کیسی گزری؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ایسی گزری کہ میں اسے ساری عمر فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ ہنسنے لگا۔

"میں جانتا تھا یار آپس کی بات ہے یہ ساؤتھ انڈین عورتیں چاہے کالی یا بدصورت ہوں...... لیکن جو لطف ان کی قربت میں آتا ہے وہ دنیا کی کسی عورت کی قربت میں نہیں آتا۔"

میرا دل چاہا کہ اسے بھی اپنی قربت سے یوں نوازوں کہ پھر اسے فرشتہ اجل ہی لے کر جائے۔ اس کی...... گردن ایسے دباؤں کہ اس کی آنکھیں اور زبان باہر نکل آئیں مگر اس وقت میں اندر سے کھولنے کے باوجود اوپر سے برف کی سِل بنا ہوا تھا۔ سرسوتی کی موت نے میرے احساسات کو منجمد سا کر دیا تھا۔ جان گرے نے بھی میرے تاثرات بھانپ لیے اس نے جام سے ایک گھونٹ لیا۔

"کیا بات ہے تم کچھ روکھے سے لگ رہے ہو...... کیا لڑکی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ ایسی بات ہے تو میں ابھی اسے غلاموں کی تربیت کے ادارے بھجوا دیتا ہوں۔"

"اسے ضرور بھجواؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن کسی تربیت گاہ نہیں بلکہ مُردہ خانے...... اسے مزید کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔"

جان گرے نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا وہ مرگئی؟"

"وہ غالباً اس روز ہی مرگئی تھی جب اسے اس کے گھر سے اغوا کرکے درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔"

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ "براہِ کرم یہ کتابی باتیں مت کرو۔ مجھے واضح لفظوں میں بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے میں ہاتھ مار کر تمہاری گردن توڑ دیتا ہوں تم اوپر جا کر خود سرسوتی سے پوچھ لینا کہ وہ مرچکی ہے یا نہیں۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "شاید تب تمہیں یقین آئے گا۔"

"اپنی حسِ مزاح کو قابو میں رکھو۔" اس نے بہ ظاہر سرد اور تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا لیکن میری چھٹی حس نے بتایا کہ وہ اندر سے خوفزدہ ہوگیا تھا اس نے جلدی سے تپائی پر پڑے موبائل نما آلے کو اُٹھا کر اس کا بٹن دبایا اور کسی سے بولا۔ "مہمان کے کمرے میں آ کر سوراتی کو چیک کرکے مجھے رپورٹ دو۔"

بہ ظاہر اس نے کسی کو ہدایت دی تھی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نے آلے پر لگا ایک اور بٹن بھی دبایا تھا۔ غالباً یہ بٹن اس کے محافظوں کے لیے اشارہ تھا کہ وہ الرٹ ہوجائیں اور اگر اس کی جان کو خطرے میں پائیں تو آ کر اسے بچائیں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ...... کہو تو تمہارے لیے ناشتہ منگواؤں۔"

"میں ساری رات ایک لاش کے ساتھ سوتا رہا ہوں کیا اس وقت مجھے کچھ کھانے کی خواہش ہوسکتی ہے۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جان گرے نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے...... لیکن اس بات کو خود پر طاری کرلینا بھی جذباتی حماقت ہوگی۔ لوگ جیتے ہیں مرتے ہیں...... دنیا کا کام چلتا رہتا ہے...... تمہارے نہ کھانے سے سوراتی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" اس نے رُک کر جام سے ایک گھونٹ لیا۔ "ویسے ہوا کیا تھا؟"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پایا۔ جان گرے کی بات درست تھی میرے جذباتی ہونے سے سرسوتی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میں اس لیے یہ کرسکتا تھا کہ جن لوگوں نے اسے یوں مرنے پر مجبور کیا انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا دوں اور میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ کر ہی یہ کام کرسکتا تھا۔

"پہلے میرے لیے کافی منگوالو......" میں نے کہا تو اس نے فوراً اپنے موبائل نما آلے پر یہ فرمائش نوٹ کرادی۔ میں نے سرسوتی کے بارے میں بتایا۔ "شاید وہ غلامی کی اس زندگی سے تنگ آ چکی





تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کافی میں خاصی مقدار میں خواب آور دوا استعمال کی ہے۔ اس نے مجھے کافی میں یہ دوا دی تھی کیونکہ رات میں نہ چاہنے کے باوجود سوگیا تھا۔

لفظ "نہ چاہنے" پر جان گرے نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ "وجہ کچھ بھی رہی ہو مجھے اس کی موت کا افسوس ہے اتنے عرصے بعد ایک ڈھنگ کی خادمہ ملی تھی۔"

ظاہر ہے جان گرے کسی کی موت پر افسوس بھی اس وقت کرسکتا تھا جب اسے کوئی نقصان ہوا ہو اس کے مرنے سے پہلے ایک ملازم نے کافی لا کر دی پھر ایک ہٹا کٹا شخص آیا۔ اس نے ہاتھ میں چھوٹی سی رائفل تھام رکھی تھی۔

"لڑکی مُردہ حالت میں ہے سر۔" اس کا لہجہ فرانسیسی تھا لیکن نقوش اور رنگت سے وہ کسی دوسری نسل کا لگتا تھا۔ اس کی ماں یا باپ میں سے کوئی افریقی تھا۔ "بہ ظاہر کسی زخم کا نشان نہیں ہے۔"

"اسے ہسپتال بھجوا دو اور پھر وہاں سے جو رپورٹ آئے مجھے اس کے بارے میں بتانا۔"

"اوکے سر۔" اس نے فوجی انداز میں تن کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"اب اس کی لاش کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

جان گرے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ضروری کارروائی کے بعد اسے سمندر کے سپرد کردیا جائے گا۔ اس جزیرے پر مرنے والوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

"کیا ان کے لیے دو گز زمین بھی نہیں دی جاسکتی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جزیرے میں اتنی گنجائش نہیں ہے اس لیے مجبوری ہے۔"

جزیرے میں خاصی گنجائش تھی لیکن انسانوں کو ٹشو پیپرز سمجھنے والے ان لوگوں کے دلوں میں گنجائش نہیں تھی۔ جب کوئی مرجاتا تو یہ اسے بے حسی کے ساتھ سپردِ آب کردیتے تھے۔ نہ کفن کا جھنجھٹ اور نہ دفنانے کی زحمت۔ کل کلاں کو کوئی ان سے حساب لینے والا پیدا ہوجاتا تو لاش کہاں سے ملتی۔ میں نے جان گرے کی بات سے اتفاق کیا۔

"جزیرے میں گنجائش کم ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم لوگوں نے اس کا کم سے کم حصہ استعمال کیا ہے۔"

اس نے فخر سے جواب دیا۔ "کیونکہ ہم جزیرے کے فطری ماحول کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم لوگوں نے جزیرے پر بجلی کی سپلائی کا کیسا انتظام کر رکھا ہے۔ مجھے کہیں کوئی بجلی گھر آلودگی پھیلاتا نظر نہیں آیا۔"

"یہاں پر جو بجلی گھر ہے وہ ذرا سی آلودگی نہیں کرتا کیونکہ وہ ایٹمی بجلی گھر ہے۔ روس کی آبدوزوں کے ناکارہ ہوجانے والے بجلی گھر ہم نے بڑی تعداد میں خرید کر انہیں کارآمد بنالیا ہے۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر مختصر ہونے کے ساتھ کم خرچ بھی ہیں۔ اس جزیرے پر جو دو ری ایکٹرز کام کررہے ہیں وہ کل چالیس میگا واٹس کے ہیں۔ ایک ری ایکٹر اسپئیر میں ہے جب ایک ری ایکٹر کسی وجہ

سے کیا جاتا ہے تو اسے چلا لیتے ہیں۔"

"ان کا ایندھن کہاں سے آتا ہے؟"

"سوویت روس سے حاصل شدہ ایٹمی ردی سے ہم نے ان ری ایکٹرز کے لیے فیول بھی نکالا ہے جو سالوں کے لیے کافی ہے۔" جان گرے نے مجھے بلا جھجک بتایا۔ اس کے خیال میں یہ سب مجھے بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"ری ایکٹرز خطرناک بھی ہو سکتے ہیں...... خاص طور سے روسی ری ایکٹرز جو بعض اوقات پھٹ بھی جاتے ہیں۔ چرنوبل کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔" میں نے معنی خیز لہجہ میں کہا تھا۔

"اول تو یہ ری ایکٹرز ہم نے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بالکل محفوظ بنا لیے ہیں، دوسرے اگر کسی وجہ سے انہیں کوئی حادثہ بھی پیش آتا ہے تو جزیرے کے لوگ اس سے قطعی محفوظ رہیں گے کیونکہ ری ایکٹرز اس پہاڑی میں خاصی گہرائی میں ہیں۔ تاب کاری خارج ہونے کی صورت میں نیچے سے اوپر آنے والے راستے بند کر دیئے جائیں گے اور تاب کاری پھیلنے کا خطرہ باقی نہیں رہے گا۔"

"کیا یہ ری ایکٹرز سمندر کے پانی سے چلتے ہیں؟"

جان گرے نے سر ہلایا۔ "یہی نہیں بلکہ یہ کھارے پانی کو میٹھے پانی میں بھی تبدیل کرتے ہیں۔ اس جزیرے پر میٹھے پانی کے ذرائع محدود ہیں۔ ان کی کمی اس طرح پوری کی جاتی ہے۔"

میرے ذہن میں خیال آیا کہ سمندر کا پانی کسی سرنگ سے ری ایکٹرز تک پہنچایا جاتا ہوگا۔ مجھے سمندری پانی سے ٹھنڈے ہونے والے ری ایکٹرز کی ساخت کا کسی حد تک علم تھا۔ عام ری ایکٹرز میں درجہ حرارت ایک حد میں رکھنے کے لیے بھاری پانی استعمال کیا جاتا ہے لیکن آبدوزوں کے ری ایکٹرز میں یہ کام سمندری پانی سے لیا جاتا ہے۔ بھاری پانی یا سمندری پانی بے قابو نہیں ہو پاتا۔ اس قسم کے ری ایکٹرز کے لیے بھاری تعداد میں سمندری پانی درکار ہوتا ہے۔ اس پانی کی مسلسل فراہمی کے لیے سمندر سے سرنگ نکالی گئی ہوگی۔ ذرا سی محنت سے اس سرنگ کا سراغ لگایا جا سکتا تھا اور اس کے راستے ری ایکٹرز کی تباہی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ جان گرے سے ری ایکٹرز کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرا ذہن یہی سوچ رہا تھا کیا عبید صلاح کو بھی ان سرنگوں کی تلاش ہے؟

"تمہیں اچانک بجلی گھر کا خیال کیوں آ گیا؟" جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بس ایسے ہی۔" میں نے شانے ہلائے۔ "میں نے سوچا جب مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے تو اس دنیا کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔"

"گڈ......" اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میرا نہیں خیال کہ تمہیں اسے جاننے سے کوئی فائدہ ہوگا۔"




"فائدہ اور نقصان تو بعد کی بات ہے۔ پہلے میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ "کیا مجھے جزیرے میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ممکن ہے پہلے تمہیں اجازت مل جاتی۔ مگر ڈارٹ گن کے حملے کے بعد اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سیکیورٹی کے اصول کے خلاف ہوگا۔"

"کیا حملہ کرنے والوں کا کوئی سراغ لگا؟"

"نہیں...... لیکن وہ ہم سے زیادہ دن چھپ نہیں سکیں گے۔" جان گرے کے لہجے میں اعتماد تھا۔ پھر وہ اُٹھ گیا۔ "تم نے ناشتہ کرنا ہے تو کچن میں کہہ دینا باہر جانے کی کوشش مت کرنا۔"

جان گرے مجھے ٹیرس میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے ریلنگ سے نیچے دیکھا۔ یہ اپارٹمنٹ پانی کی سطح سے کوئی پچاس ساٹھ فٹ بلند تھا۔ بندرگاہ پر جاری ہنگاموں کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ میں حیران تھا۔ یہ کتنی بڑی رپورٹ تھی جس پر دن رات کام جاری رہتا ہے۔ مجھے اب بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اندر جا کر کچن میں کام کرنے والے چینی نژاد شخص سے ناشتے کا کہا۔ اس نے جواب دیا۔ "صرف پندرہ منٹ انتظار کریں جناب۔" چینی خاصی صاف انگریزی بول رہا تھا۔

"ناشتہ مجھے ٹیرس میں ہی لا دینا۔" میں نے کہا اور واش روم جانے کے لیے اپنے کمرے میں گیا۔ سرسوتی کی لاش لے جائی جا چکی تھی اور کسی ملازم نے بیڈ شیٹ بھی بدل دی تھی۔ واش روم سے فارغ ہو کر میں واپس ٹیرس میں آ گیا۔ جان گرے اپارٹمنٹ میں تھا یا کہیں جا چکا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے قطعی علم نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے ٹائم میگزین سنبھال لیا۔ اس کے ایک مضمون میں دنیا کی معروف تجارتی بحری شاہراہوں پر بڑھتے ہوئے قزاقی رجحان پر تشویش ظاہر کی گئی تھی۔ میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ یہ آپ ہی چور اور آپ ہی منصف والی کہانی تھی۔ طاقتور اقوام نے جدید دور میں ایک دو رُخی پالیسی اپنائی تھی۔ صبح جس کو مارتے تھے شام کو اس کا مرثیہ بھی پڑھتے تھے۔ ان کی اس دوغلی فطرت نے ساری دنیا کو ایک زنجیر میں جکڑ دیا تھا جس سے نجات کی خواہش بھی تھی اور کوئی راہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ چینی باورچی ناشتہ لے کر آیا۔

"جان گرے...... کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف کچن کے امور تک محدود ہوں جناب۔" اس نے ادب سے جواب دیا تھا۔ "آپ چائے یا کافی میں سے کیا لینا پسند کریں گے۔"

"کافی کریم کے ساتھ۔" میں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔ اس دوران میں حالات و واقعات پر غور کرنے لگا۔ پچھلے چار...... پانچ ہفتوں میں زندگی میرے لیے کچھ زیادہ ہی ہنگامہ خیز ہو گئی تھی۔ دن رات کوئی نہ کوئی چکر ہوتا تھا۔ خلیج پر ملازمت کرنے سے پہلے میں کراچی میں اپنے اپارٹمنٹ میں پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ یہ ملازمت میرے لیے تبدیلی لائی تھی۔ مجھے عبید صلاح کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جان گرے کو کرید کر اس سے ری

ایکٹرز کے بارے میں معلومات حاصل کروں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر مجھے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو میں اس تک یہ بات کیسے پہنچاؤں۔ کیا اس کا کوئی آدمی مجھ تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے جتنی آسانی سے میرے دونوں نگرانوں کو بے ہوش کیا تھا اس سے لگ رہا تھا وہ جزیرے پر خاصے وسائل اور حامی رکھتا ہے لیکن ری ایکٹرز کی تباہی الگ بات تھی۔ اس کی جتنی حفاظت کی جاتی ہو گی اس کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں عبید صلاح اس جزیرے سے نکل جانے کے بجائے اس معاملے میں اُلجھ رہا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ کوئی اندھا دھند قدم اُٹھانے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے یقیناً امکانات دیکھے ہوں گے تبھی جزیرے کی تباہی کے درپے تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کافی کا کپ بنایا۔ تھوڑی دیر میں چینی باورچی برتن لینے آیا۔ وہ مخصوص چینی جسمانی ساخت رکھتا تھا۔ دُبلا اور پھرتیلا۔ اس کی عمر چالیس برس کے آس پاس تھی۔ اس نے آ کر خاموشی سے برتن سمیٹنا شروع کیے۔ میں نے ناشتے کی تعریف کی تو وہ انکساری سے مسکرا دیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”سر میں نے ایک خاص پیزا بنایا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔“

”یار اس وقت تو پیٹ فل ہے۔“ میں نے نفی میں جواب دیا۔

”سر آپ کھا کر تو دیکھیں۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”میں نے ابھی بنایا ہے۔“

”اچھا لے آؤ...... میں چکھ لوں گا۔“

وہ خوش ہو گیا تھا۔ برتن سمیٹ کر وہ چلا گیا۔ میں دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک پلیٹ میں سجا گلابی اور بھورے رنگ کا پیزا لا کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے پلیٹ رکھنے کے بعد نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

”عبید صلاح۔“

میں ساکت رہ گیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے گویا توجہ ہی نہیں دی اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں نے گہری سانس لے کر پیزا کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی۔ پلیٹ میں چھری بھی تھی۔ میں نے چھری سے پیزے کے ٹکڑے کیے۔ اچانک چھری کسی ایسی چیز سے ٹکرائی جو کٹ نہیں سکتی تھی۔ میں نے پیزا ذرا سا کھولا۔ اس میں ایک کاغذ جھانک رہا تھا اور اس پر خاص قسم کی اِنک سے لکھا تھا۔

”اس شخص سے رابطہ رکھو اور کوئی بات ہو تو اس سے کہہ دینا۔“

میں پلیٹ پر نظر جمائے سوچ رہا تھا۔ کیا یہ دھوکا ہے یا سچ مچ عبید صلاح نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ معاً پیچھے سے آہٹ ہوئی اور جان گرے کی آواز آئی۔ ”یوسف کیا سوچ رہے ہو؟“

میرے ہاتھ سے پیزے کی پلیٹ چھوٹ گئی تھی۔ جسم بے اختیار سنسنا اُٹھا تھا۔

میں پلٹا تو عقب میں کھڑا جان گرے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”نیچے کوئی خاص چیز ہے؟“





”نہیں میں بندرگاہ کی مصروفیات دیکھ رہا تھا۔“

وہ ٹہلتے ہوئے ٹیرس کی ریلنگ کی طرف آیا۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا ویسے بھی اس کی کھوپڑی میں کسی پولیس والے کا دماغ فٹ تھا جو ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے آ کر نیچے جھانکا اور سرسری انداز میں کہا۔ ”یہ جگہ پانی سے کوئی سو فٹ بلند ہے۔ اگر تم یہاں سے کود کر فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو میں اسے سو فیصد خودکشی قرار دوں گا۔ اس خلیج میں خاصی خونخوار نسل کی شارک اور دیگر گوشت خور مچھلیاں ہیں اس پانی میں رہنے والا شخص چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”میرا فرار کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے خبردار کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم شوق سے مجھ پر شک کر سکتے ہو۔“

”بُرا مان گئے۔“ وہ ہنسا۔

میں بھنا گیا۔ ”تم میری محبوبہ نہیں ہو جس کی Miss trust پر میں بُرا مناؤں۔“

”او کے...... او کے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں ویسے ہی خبردار کر رہا تھا۔“

”یہ بتاؤ عبید صلاح کا کچھ پتہ چلا۔“

”نہیں...... مگر ہم جلد اس کے بارے میں معلوم کر لیں گے۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”البتہ تمہارے لیے ایک دلچسپ خبر ہے۔ الیکٹرک نے تم سے مقابلہ ری نیو کرنے کو کہا ہے۔“

”وہ کیسے...... اس کی ٹانگ جڑنے میں کم سے کم چھ مہینے لگیں گے اور پھر اسے دوبارہ فارم میں آنے کے لیے وقت درکار ہو گا۔“

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ پُرانے وقتوں کی بات تھی۔ اب جدید ترین طریقے آ گئے ہیں۔ ایسی ادویات ہیں جو صرف دو مہینے میں ہڈی کو مکمل طور پر جوڑ دیتی ہیں۔ آپریشن کرا کے انسان ایک ہفتے میں چلنے پھرنے لگتا ہے۔“

”جب وہ ہار چکا ہے تو مقابلہ دوبارہ کرنے کو کیوں کہہ رہا ہے۔ میں تو اسے اصول پسند انسان سمجھتا تھا۔“ مجھے سچ مچ حیرت تھی۔

”مجھے بھی تعجب ہے۔“ جان گرے بولا۔ ”وہ سخت اصول پسند شخص ہے جس سے ایسی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے مگر اس نے جزیرے کی کونسل کو درخواست دی ہے اور اُمید ہے کہ یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔ الیکٹرک کا تعلق ایک اعلیٰ نسل جرمن خاندان سے ہے جو کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مالک ہے۔ ہماری تنظیم بھی اس کے زیر اثر ہے۔“

”مجھے اس کا اصل نام بتاؤ۔ یہ الیکٹرک چھچھورا اور گھٹیا لگتا ہے اس کی شخصیت پر۔“

”اس کا اصل نام ولف گینگ ملر ہے۔ وہ معروف ملر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“

”وہ ٹھیک ہو کر مجھ سے مقابلہ کرے گا چلو چھ مہینے نہ سہی پھر بھی اسے پوری طرح فٹ ہونے

میں تین مہینے تو لگ جائیں گے کیا میں اتنے عرصے تک اس جزیرے پر رہوں گا۔"

اس نے کسی قدر بے بسی سے شانے اُچکائے۔ "اگر کونسل نے مقابلہ دوبارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو تمہیں جزیرے پر رہنا ہی پڑے گا۔"

اس بار میں ہنسا۔ "یعنی تم اتنے با اختیار نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو۔ دیکھو کیسے معمولی معمولی سے لوگ تمہاری راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔"

اس سچ نے اس کے چہرے کے پہلے سے بگڑے نقوش مزید بگاڑ دیئے تھے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور غرا کر بولا۔ "میں بے بس نہیں ہوں بس کچھ مصلحتوں کی وجہ سے جزیرے کی کونسل سے بگاڑ نہیں چاہتا۔"

میں نے کچھ کہا نہیں بس طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا۔ وہ چڑ کر ٹیرس سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سرسری انداز میں نیچے دیکھا اور یہ دیکھ کر ذرا پریشان ہو گیا کہ سرمئی کاغذ پانی پر تیر رہا تھا اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ جاتا تو...... میں نے سوچا۔ تب بھی کچھ نہ ہوتا لیکن یہ اطلاع جان گرے تک پہنچ جاتی کہ اس کے فلیٹ کی بالکونی تلے پانی سے ایک کاغذ ملا ہے جس پر عبید بن صلاح کا نام تحریر ہے۔ تو وہ میری طرف سے مشکوک ہو جاتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جان گرے کا یہ چینی النسل باورچی عبید صلاح کا ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔

عبید صلاح کا نشانہ جزیرے کو توانائی فراہم کرنے والا ایٹمی بجلی گھر تھا اور میں اسے جلد از جلد ری ایکٹر کو سمندری پانی فراہم کرنے والی سرنگ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ ابھی جان گرے گھر میں تھا اور میں اس کی موجودگی میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر ٹیرس میں رہ کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جہاں سے سرسوتی کی لاش اُٹھائی جا چکی تھی۔ کل رات اس نے کتنے جوش سے میرے ساتھ وقت گزارا تھا۔ ہمارے تعلق کو داغ دار کیے بغیر اور مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے اپنی جان سے گزر گئی تھی۔ حالانکہ میں نے سوچ لیا تھا اسے بچانے کے لیے مجھے گناہ کے راستے سے بھی گزرنا پڑا تو گزر جاؤں گا۔ مگر اس نے مجھے آزمائش سے بچا لیا۔ اپنی زندگی سے وہ پہلے ہی بے زار تھی اس نے موقع جان کر ایک اچھے مقصد کے لیے جان دے دی۔ کافی دیر میں گم صم سا رہا تھا۔ پھر میں نے انٹرکام پر جان گرے سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر مجھے بتایا گیا کہ وہ دفتر چلا گیا ہے۔

موقع آ گیا تھا کہ میں چینی باورچی سے بات کروں۔ مجھے یقین تھا کہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے جان گرے نے اس پورے فلیٹ کو بگڈ کیا ہو گا نہ صرف مائیکروفون بلکہ خفیہ کیمرے بھی لگے ہوں گے۔ میری ذرا ذرا سی حرکت کو ریکارڈ کیا جا رہا ہو گا۔ میں نے سرہانے کی دراز پر رکھے بال پین کو اُٹھا کر بہ ظاہر بے خیالی میں جیب میں رکھ لیا اور کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد باہر ٹیرس میں نکل آیا یہی ایک جگہ تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہاں کیمرے نہیں تھے۔ ریلنگ پر جھک





کر میں نے پین نکالا اور اپنی ہتھیلی پر لکھا۔ میں اے بی ایس سے فوری رابطہ چاہتا ہوں۔"

اپنی ہتھیلی بند کر کے میں نے پین رکھا اور پھر کچن کی طرف آیا۔ چینی باورچی رات کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ایک کپ کافی مل جائے گی۔" اور ساتھ ہی ہتھیلی اس کے سامنے کر دی کہ صرف وہی میرے ہاتھ پر لکھی تحریر پڑھ سکے۔ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔

"کیوں نہیں سر۔" وہ بولا۔ "آپ کافی کہاں لیں گے۔"

"اپنے کمرے میں۔" میں نے ہتھیلی بند کر لی۔

"صرف دس منٹ میں کافی آپ کے پاس ہو گی سر۔" اس نے سر خم کر کے کہا تھا۔

اپنے کمرے کے واش روم میں آ کر ہتھیلی کو رگڑ کر دھو دیا۔ اس پر سے تحریر مٹ گئی تھی۔ اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اتنی جلدی چینی باورچی پر اعتماد کر کے بے وقوفی تو نہیں کی ہے۔ عین ممکن تھا وہ عبید صلاح کا ساتھی ہونے کے بجائے جان گرے کا جاسوس بھی ہو سکتا تھا جو اس کے اشارے اور پلان پر عمل کر کے میرے ساتھ یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر وہ عبید صلاح کا ساتھی نہ بھی ہوتا۔ جان گرے کا جاسوس ہوتا تب بھی مجھے کیا فرق پڑتا۔ اگر جان گرے نے عبید صلاح کو پکڑنے کے لیے یہ چال چلی تھی تو مجھے اس کا پتا معلوم ہی نہیں تھا۔ میں جان گرے کو کیا بتاتا۔ البتہ میں اس سے کہہ سکتا تھا کہ میں عبید صلاح کو سمجھانے کے لیے اس سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر باورچی سچ مچ عبید صلاح کا ساتھی تھا تو میری خوش نصیبی تھی۔

دس منٹ میں چینی باورچی کافی لے آیا تھا۔ "جناب لنچ کب کریں گے؟" اس نے ادب سے پوچھا اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ غلام تھا۔ ان لوگوں نے مکاری سے کام لے کر ایشیا اور افریقہ کے مختلف علاقوں سے ان لوگوں کو اغوا کیا تھا۔ ورنہ وہ سارے غلام برصغیر سے بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ایک ہی خطے سے حاصل کردہ غلام اتحاد کر کے ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتے تھے۔ انہوں نے مختلف قوموں کے افراد کو یہاں رکھا تھا جن میں اتحاد بے حد دشوار تھا۔

"ابھی موڈ نہیں ہے جب ہو گا تو بتا دوں گا۔" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے عبید صلاح کے بارے میں کسی طرح سے بتائے گا مگر وہ خاموشی سے کافی رکھ کر چلا گیا پھر مجھے اپنی بے تابی پر ہنسی آئی۔ وہ ایک مفرور شخص سے فٹافٹ کس طرح رابطہ کر سکتا تھا۔ اسے یقیناً اس کام کے لیے وقت درکار تھا۔ کافی پینے کے ساتھ وقت گزاری کے لیے میں نے ایک میگزین سنبھال لیا۔ تین بجے مجھے بھوک لگی تو کھانا طلب کر لیا پھر سو گیا۔ شام کو آنکھ کھلی۔ میرے پہلو کا زخم تقریباً بھر گیا تھا معمولی سا کھرنڈ باقی رہ گیا تھا۔ ایکسرسائز کر کے میں نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ گزشتہ ایک مہینے سے زیادہ میں نے سخت تکلیف میں گزارے تھے۔ قیدی تو میں اب بھی تھا لیکن یہ خاصی لگژری قسم کی قید تھی اور میں اس سے پورا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔

جان گرے رات تک نہیں آیا تھا۔ کھانا کھا کر میں دس بجے سونے کے لیے دراز ہو گیا۔ حسبِ

معمول نیند سے پہلے کاجل کی یاد آئی۔ وہ پاگل لڑکی نہ جانے کیا کر رہی ہوگی۔ میرے لیے کتنی بے قرار ہوگی اور میرے مرنے پر زہرہ بیگم اور ان کے صاحبزادوں نے باقاعدہ جشن منایا ہوگا۔ اگرچہ میں اس کے کاروبار سے خود ہی دستبردار ہوگیا تھا جو جمشید علی نے میرے نام منتقل کر دیا تھا اور مجھے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ میری حیثیت قربانی کے بکرے سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر کبھی بُرا وقت آتا تو کاروبار کے مالک کی حیثیت سے میری گردن ماری جاتی۔ جمشید علی کی اولاد محفوظ رہتی۔ اس کاروبار کا بیشتر نفع ان خفیہ اکاؤنٹس میں جاتا تھا جنہیں آپریٹ کرنے کا اختیار صرف زہرہ بیگم کو تھا۔ مجھے بھی اس نفع کا ایک حصہ ملتا تھا لیکن جب سے میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس نفع کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کیا تھا اس کے باوجود زہرہ بیگم اور ان کے صاحبزادے سے یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹا کرتے تھے کہ کروڑوں ڈالرز سالانہ کا نفع دینے والی یہ مرغی میرے قابو میں تھی۔ اگر مجھے زہرہ بیگم اور جنید، جاوید کو اپنے دباؤ میں نہ رکھنا ہوتا تو شاید میں یہ کاروبار بھی ان کو دے دیتا مگر کاجل کے معاملے میں وہ اس کاروبار کی وجہ سے میرے آگے مجبور ہو سکتے تھے۔ البتہ میں نے جمشید علی کی چال ان پر لوٹاتے ہوئے جنید اور جاوید کو کاروبار کی محدود پاور آف اٹارنی دے دی تھی جس کے تحت وہ اسے چلانے اور اس کا نفع لینے کے مجاز تھے لیکن وہ اسے نہ تو کسی کو فروخت کر سکتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے نام پر منتقل کرا سکتے تھے۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو میرے ہاتھ صاف تھے۔ پھنستے جنید اور جاوید کیونکہ وہی کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔

مجھے اپنے نفع سے یاد آیا کہ لندن کے ایک بین الاقوامی بینک کے اکاؤنٹ میں میرے بے شمار ڈالرز محفوظ تھے۔ ان کی گنتی کم سے کم بھی کروڑ میں آتی تھی۔ کئی برس سے میں نے اس اکاؤنٹ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر اب وقت آ گیا تھا کہ اس اکاؤنٹ کو استعمال کرتا۔ اگر میں جان گرے کے چنگل سے بچ نکلتا تب بھی مجھے ان بین الاقوامی دہشت گردوں سے محفوظ رہنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ آج کے دور میں دولت ایک ایسی چیز ہے جس کے بل پر آپ بین الاقوامی مارکیٹ سے سب خرید سکتے ہیں۔ جدید ترین ہتھیار بھی جیسے میزائل اور توپ بلکہ ایٹم بم تک اور کرائے کے فوجی بھی۔ فی الوقت میں بے بس تھا لیکن اگر ان لوگوں کی گرفت سے نکل جاتا تو زندہ رہنے کے لیے بے شمار طریقے اختیار کر سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت نیند آ گئی معاً میری آنکھ کھلی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ”کون ہے آ جاؤ۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔ دروازے پر مستعد رہنے والے سیاہ فام گارڈ نے اندر جھانک کر مجھے دیکھا۔

”سر آپ کو دس منٹ میں جان گرے صاحب کے پاس پہنچنا ہے۔“

میں جھنجھلا گیا۔ ”یہ کون سا وقت ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم سر...... آپ کے پاس اب نو منٹ ہیں۔“ اس نے مشینی انداز میں جواب دیا





اور دروازہ بند کر دیا۔ مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ ہر ممکن تیزی سے کپڑے بدل کر میں باہر نکلا۔ وہ مجھے لیونگ روم میں لایا۔ یہاں جان گرے جینز کی پتلون پر ایک ڈھیلی سی شرٹ پہن کر بہ ظاہر کہیں جانے کے لیے تیار تھا اس کے پیروں میں کینوس شوز تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”تم وقت پر آ گئے۔ جلدی چلو ایگل روانہ ہونے والا ہے۔“

”یہ ایگل بدبخت کون ہے اور اسے اتنی رات گئے کہاں جانے کی ضرورت پیش آ گئی؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”فضول باتوں سے گریز کرو۔“ اس نے انگلی اُٹھا کر کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں ایک مہم پر لے جاؤں گا۔ اس کا وقت آ گیا ہے۔“

”میں تمہاری قزاقی کی کسی مہم میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہارے جرائم میں شریک نہیں ہوں گا۔“

”تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“ جان گرے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ”اسے لے چلو اور چوکس رہنا یہ خطرناک شخص ہے۔“

”یس سر۔“ سیاہ فام گارڈ نے مستعدی سے کہا اور اپنی گن کا رُخ میری طرف کر کے بولا۔ ”چلیں سر کسی اور شرارت کا خیال بھی مت ذہن میں لائیے گا۔“

میں سیاہ فام گارڈ کے ساتھ باہر آیا۔ میرا شرارت کا قطعی موڈ نہیں تھا لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر جان گرے نے ایک گارڈ اور بلوا لیا تھا۔ وہ دونوں مجھے نیچے بندرگاہ تک لائے۔ ایک جیٹی پر ویسی ہی گن بوٹ کھڑی تھی جس نے پہلے خلیج پر قزاقی کی تھی اور پھر اسے ڈبو دیا تھا۔ بہ ظاہر یہ گہرے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والا ماہی گیری کا ٹرالر لگتا تھا۔ دونوں گارڈز نے مجھے ٹرالر کے نگران کے حوالے کیا۔ ”اسے جان گرے صاحب نے بھیجا ہے۔“ سیاہ فام گارڈ نے نگران کو بتایا۔ وہ کیپٹن نہیں تھا کیونکہ اس نے محافظوں والی مخصوص نیلی اور سبز وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ”یہ کس درجے کا قیدی ہے۔“ نگران نے سیاہ فام گارڈ سے پوچھا۔

”اے ٹو درجے کا۔“ سیاہ فام نے کوئی کوڈ بتایا۔ اس کا مطلب شاید یہی تھا کہ مجھ پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ نگران نے سر ہلایا اور بوٹ کے عرشے پر مستعد گارڈز کو بلا کر انہیں حکم دیا۔ ”اسے لے جا کر نیچے سیل میں ڈال دو۔“

”چلو۔“ گارڈز مجھے لے کر قید خانے میں آ گئے۔ ایسے ہی ایک قید خانے میں مَیں اس جزیرے کی طرف آتے ہوئے سفر کر چکا تھا۔ مجھے یہاں قید کر کے گارڈز دفع ہوئے تو میں نے اپنی بقیہ نیند پوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے سونے کے دوران میں ہی اسٹیمر حرکت میں آ گیا تھا۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھ کھلی مگر میں دوبارہ سو گیا تھا۔ اگلی بار جگایا گیا۔ ایک سیاہ فام نے سلاخیں بجا کر مجھے ناشتے کے لیے جگایا۔ ٹرے اس نے نیچے سوراخ سے اندر کر دی اور بولا۔ ”مین ناشتہ کر کے

مجھے آواز دے لینا۔"

اس جگہ ضروریات سے فارغ ہونے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ طبیعت پر جبر کر کے میں نے ناشتہ کیا جو معقول اور مناسب مقدار میں تھا۔ تلی ہوئی مچھلی...... چند ڈبل روٹی کے سلائس اور ایک کپ کافی۔ ناشتہ کر کے میں نے ٹرے سے سلاخیں بجائیں۔ سیاہ فام فوراً آ گیا۔ وہ تقریباً چھ فٹ کا مناسب صحت والا نیگرو تھا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق امریکہ سے ہے۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" میں نے انگلی سے مخصوص اشارہ کیا۔

"کچھ دیر انتظار کرو۔ میں کسی گارڈ کو بھیجتا ہوں وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔" وہ ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد ایک سفید فام گارڈ آیا اس نے تالا کھول کر مجھے باہر بلایا۔ "باتھ روم وہ کونے میں ہے۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔"

ان لوگوں کو وقت دینے کا خاصا شوق ہے۔ میں نے اس قید خانے کا جائزہ لیا۔ یہاں پر چار سیل تھے۔ دو دو کر کے دائیں بائیں۔ باہر جانے والا دروازہ بند تھا اور ایک کونے میں واش روم بنا تھا۔ یہ خاصا جدید اور سہولتوں والا باتھ روم تھا۔ میں فارغ ہو کر باہر آیا تو سفید فام گارڈ بے زاری سے ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "جان گرے کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کیبن میں ہیں۔" اس نے خاصی عقیدت سے کہا۔

"اسے کہو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" گارڈ کو تپانے کے لیے میں نے جان بوجھ کر جان گرے کے لیے توہین آمیز لہجہ اپنایا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ سفید فام سدھائے ہوئے کتے کی طرح غرانے لگا۔ "دفع ہو اندر...... جان گرے تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے۔"

"اچھا پھر اپنے باپ کا ہو گا اگر اس کا کوئی ایک باپ ہوا۔" میں نے سیل میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ شاید اسے میرے معاملے میں خاص ہدایت تھی کہ مجھ سے اُلجھنے سے گریز کرے۔ اس لیے اس نے زبانی قصیدہ خوانی پر اکتفا کیا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں جان گرے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے کس مہم پر لے جا رہا ہے اور اس میں شریک کرنے کا مقصد کیا ہے۔ جان گرے دن بہ دن میرے لیے پُراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک موہوم سا اندیشہ تھا کہ جان گرے مجھے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے مگر یہ ابھی اندیشہ تھا عین ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط ہو۔

میں نے ایکسرسائز کی۔ الیکٹرک والے معاملے کے بعد میں اس میں کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جن حالات سے دوچار تھا۔ مجھے کسی وقت بھی جسمانی مقابلے کی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھاگ دوڑ کی صورت میں جسمانی طور پر فٹ ہونا بھی ضروری تھا۔ ایک گھنٹے تک بھرے پیٹ جاری رہنے والی ورزشوں نے مجھے تھکا دیا تھا۔ گن بوٹ ایک متواتر رفتار سے چل رہی تھی اور اب تک ایک سیدھ میں سفر کرتی رہی تھی۔ اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ اس بار شاید وہ کسی خشکی کی طرف جا رہے ہیں۔ انہیں اپنی منزل کا علم ہے۔ کسی متحرک ہدف کا تعاقب کرنے کی صورت میں انہیں بوٹ کی




پوزیشن بدلنا پڑتی۔ بوٹ تقریباً بیس ناٹ کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ یہ خاصی رفتار تھی مگر انجن کے آہنگ سے میں نے اندازہ لگایا کہ بوٹ اس وقت معمول کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ ورنہ اس کا شور خاصا بلند ہوتا۔ ممکن ہے یہ بوٹ پچاس ساٹھ ناٹ میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی چل سکتی ہو۔

جن دنوں میں لندن میں میرین انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر رہا تھا۔ مجھے اس شعبے میں ہونے والی بعض جدید پیش رفتوں کا علم ہوا تھا۔ بعض ساخت کے شپ ایک مخصوص انجن استعمال کر کے بے انتہا تیزی سے سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جاپان نے ایک نئی طرز کا انجن بنایا تھا جو پانی کو اندر کھینچ کر پھر اسے پریشر سے چھوڑتا ہے۔ یہ انجن خاص آبدوز کے لیے تھا اور مستقبل میں اس قسم کے انجن والی آبدوزیں سپر سانک یعنی آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے پانی میں دوڑ رہی تھیں۔ میری یونیورسٹی کے طلباء نے ایک خاص ایٹمی ری ایکٹر تیار کیا تھا۔ بحری جہازوں اور آبدوزوں کے لیے بنایا جانے والا یہ ری ایکٹر سمندری پانی سے ہائیڈروجن اور آکسیجن الگ کرتا تھا اور پھر اس ہائیڈروجن اور آکسیجن کو خاص آمیزہ بنا کر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ خلائی راکٹوں اور خاص طور سے شٹل سے جانے والے راکٹ اس ایندھن سے چلتے ہیں۔ اس طرح کسی بحری جہاز یا آبدوز کو کبھی ایندھن کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور اس کی رفتار انتہا سے زیادہ تیز ہو جائے گی۔

مجھے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف مغرب کے باشندے جنونیوں کی طرح نت نئی ایجادوں اور دریافتوں میں مگن ہیں تو دوسری طرف مشرق اقوام اور خاص طور سے مسلمان اپنے حال میں مست ہیں۔ انہیں حال کی پروا ہے اور نہ آنے والے مستقبل کی۔

مجھے دوپہر کا کھانا دیا گیا اور اس کے بعد رات کا۔ مگر میری طلبی نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں ڈٹ کر سوتا رہا۔ نہ جانے آنے والا وقت کیسی مشکلیں لائے پھر سونے یا آرام کرنے کا موقع ملے بھی یا نہیں۔ صبح بھی وہی معمولات دُہرائے گئے۔ حتیٰ کہ سفید فام گارڈ سے میری پھر منہ ماری ہوئی۔ سیاہ فام خادم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں آرتھر یعنی اس گارڈ کے منہ نہ لگوں۔ وہ بے حد سفاک شخص ہے۔ سیاہ فام جیمس بوٹ پر ایک کنٹریکٹ کے تحت ملازم تھا۔ دو سال بعد وہ اپنے علاقے الابار چلا جاتا۔ الابار امریکہ کی واحد ریاست ہے۔ جہاں سیاہ فام اکثریت میں ہیں۔ مگر مجھے شبہ تھا کہ یہ لوگ جیمس کو واپس جانے کی اجازت شاید ہی دیں۔ وہ ان کے خطرناک جرائم کا عینی گواہ تھا اور وہ اس قسم کے لوگ تھے جو اپنا ہاتھ بچا کر کام کرتے ہیں۔ انسانیت کا نعرہ لگا کر انسان کشی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے گواہ کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خیر یہ جیمس اور ان کا دردِ سر تھا۔ مجھے تو یہ فکر لگی تھی کہ مردود جان گرے مجھے کس معاملے میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس سارے دن بھی بوٹ ایک لمحہ رُکے بغیر چلتی رہی۔ بس اس کا انجن بدل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا بوٹ نے اپنے مستقر سے کوئی ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم جنوب مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ جانے ہماری منزل کون سی سرزمین تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ یہ منزل افریقہ کی سر

زمین پر کہیں واقع تھی۔ آنے والی رات خاصی خنک تھی اور مجھے اپنے پتلے سے بستر کے ایک طرف تہہ کیا رکھا ہلکا سا کمبل اوڑھنا پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم خطِ استوا سے خاصے فاصلے پر آ گئے تھے اور غالباً جنوب کی طرف آئے تھے کیونکہ یہ مئی کا مہینہ تھا اور شمالی نصف کرے میں اس وقت گرمی ہوتی ہے۔ جب کہ جنوب نصف کرے میں سرما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خنکی بتا رہی تھی کہ اس وقت ہم جنوبی نصف کرے میں ہیں۔

اگلے روز سارے دن بھی جب بوٹ کا سفر مستقل جاری رہا تو مجھے حیرانی محسوس ہونے لگی کیا جان گرے انٹارکٹیکا جا رہا تھا۔ بوٹ اس وقت دو ہزار میل سے زیادہ کا سفر طے کر چکی تھی۔ اسے سفر کرتے ہوئے کوئی ساٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ تیسرے دن رات کھانے کے بعد دس بجے کے قریب میری طلبی ہوئی۔ مجھے بوٹ کے اگلے عرشے پر لایا گیا۔ جہاں تقریباً پچاس کے قریب فوجی یونیفارم میں ملبوس افراد اٹینشن کھڑے تھے اور ایک شخص جو کرنل کی وردی میں ملبوس تھا انہیں میگا فون پر ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے جو چند جملے میں نے سنے ایسا لگا جیسے وہ انہیں کسی فوجی مشق کے بارے میں بریفنگ دے رہا ہے۔ اس کا آخری جملہ یہ تھا۔ ''سامنے آنے والے ہر شخص کو قتل کر دو۔''

اس کے ساتھ ہی مجھے عرشے تلے اُتار دیا گیا۔ سیڑھیاں نچلی منزل کی طرف جا رہی تھیں اور ایک کیبن میں مجھے جان گرے کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہ خلافِ معمول سنجیدہ اور ہوش میں نظر آ رہا تھا۔ یعنی اس کے پاس کسی بنت حوا یا بنت...... کا وجود نہیں تھا۔ اس نے بھی فوجی وردی پہن رکھی تھی لیکن وہ کسی قسم کے اسلحے سے لیس نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ آنے والے شخص کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

''یوسف کچھ دیر بعد بوٹ ہمیں ایک ساحل پر اُتارے گی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں اس مشن میں دل و جان سے شامل ہونا ہے۔ اس طرح تم جزیرے کی کونسل کی خوشنودی حاصل کر لو گے۔''

''یہ مشن کیا ہے؟''

''تمہیں ایک حملے میں حصہ لینا ہے۔''

''اور بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''جنگ میں ہمیشہ بے گناہ مارے جاتے ہیں۔'' اس نے فلسفیانہ لہجہ اختیار کیا۔ ''اگر تم اس حملے میں حصہ نہیں لینا چاہتے تب بھی اس میں شامل ضرور ہو جاؤ۔''

''میرے لیے کونسل کی خوشنودی حاصل کرنا کیوں ضروری ہے؟''

''اس طرح تم شاید الیکٹرک سے دوبارہ مقابلہ کرنے سے بچ جاؤ گے اور تمہیں مکمل طور پر میرے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''یعنی کنویں سے نکل کر کھائی میں گر جاؤں۔'' میں نے دل میں سوچا اور منہ سے بولا۔

''تمہاری مرضی...... یہ تمہارا دردِ سر ہے لیکن میں کسی بے ہودہ کام میں حصہ نہیں لوں گا۔''





''پھر بھی تمہیں ساتھ رہنا ہوگا۔'' اس نے گہری سانس لی۔

میں نے اسے طنزیہ انداز میں دیکھا۔ ''کیا تمہیں خوف نہیں ہے کہ میں موقع سے فائدہ اُٹھا کر فرار ہو جاؤں گا۔'' میں چبھتے لہجے میں بولا۔

جان گرے غرور سے مسکرایا۔ ''یوسف کیا ہم تمہیں اتنے ہی احمق نظر آتے ہیں؟''

''قطعی نہیں...... اس کا مطلب ہے تم نے کوئی ایسا بندوبست کیا ہے کہ میں فرار نہ ہو سکوں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے جو بندوبست کیا ہے، تم اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔''

جان گرے نے تالی بجائی اس کا انداز قدیم بادشاہوں جیسا تھا۔ فوراً دو گارڈز اندر آئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ جان گرے نے انہیں کوئی اشارہ کیا تو ایک نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے پکڑ لیے اور دوسرے نے اپنا پستول میرے سر سے لگا دیا۔

''اُمید ہے اب تم مزاحمت نہیں کرو گے۔'' جان گرے مسکرایا۔ اس نے اپنے پاس رکھے ایک دھاتی بکس سے ایک گول بیلٹ نما چیز نکالی لیکن یہ بیلٹ سے چھوٹی اور ساخت میں موٹی سی تھی۔ جان گرے نے اسے لا کر میری گردن کے گرد لپیٹا اور پھر پیچھے سے اس کا ہُک بند کر کے اپنے پاس موجود ریموٹ نما آلے کا ایک بٹن دبایا۔ اس کالر نما شے سے کٹ کی سی آواز آئی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ جان گرے شیطانی انداز میں مسکرایا۔

''تمہیں پتا ہے یہ ایک بارودی بیلٹ ہے اور اگر تم اب مجھ سے سو فٹ سے زیادہ دور گئے تو یہ بیلٹ پھٹ جائے گی۔ نتیجے میں تمہاری گردن جسم سے الگ ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے اب تم فرار کی کوشش کرو گے۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔



میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔ اندر کمرے میں ٹین کے بکس میں آگ بھڑک رہی تھی اور باہر میری جان کے دشمن آ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں ہونے والی روشنی دیکھ لی تھی۔ مگر اندھا دھند اندر آنے سے گریز کیا۔ غالباً وہ باہر لاشیں دیکھ چکے تھے۔ میں نے استاد کی آواز سنی وہ دیوانہ وار گالیاں دے رہا تھا۔ غالباً اس کی سرد مزاجی ہوا ہو چکی تھی۔ ''وہ حرامی اسلحے والے کمرے میں گھسا ہے۔ اس نے وہاں آگ لگا دی ہے۔ سب کچھ اُڑ جائے گا۔''

''استاد رقم والا بکس بھی ادھر ہی ہے۔'' مجیب نے گھبرا کر کہا تھا۔

''رقم گئی...... میں۔'' استاد نے ایک ناقابلِ بیان جگہ کا ذکر کیا۔ ''اب اوپر والوں کو کیا جواب دیں گے۔ ہماری کھال اُتر جائے گی۔ چوہدری صاحب ادھر آنے والے ہیں۔''

اس دوران میں مَیں اسلحے کو جلنے والے صندوق سے دور کر رہا تھا۔ میری حماقت نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اگر آگ قابو سے باہر ہو جاتی تو میرے جسم کے پرزے بھی نہ ملتے۔ وہاں اتنا گولا بارود تھا۔ میں اپنی حماقت کو کوسنے لگا۔ نا تجربہ کاری نے مجھے مروا دیا ورنہ حنیف کے مرتے

ہی ہر شے پر لعنت بھیج کر وہاں سے نکل جاتا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کمرے سے نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا یعنی دروازہ اور اس پر استاد اور گرگا موجود تھا۔ میں باہر قدم بھی رکھتا تو وہ مجھے چھلنی کر دیتے۔

''استاد ادھر سے نکل لو۔'' مجیب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دھماکا ہو گیا تو اس چھوکرے کے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔''

''بکواس مت کر...... اگر ہم یہاں سے گئے تو وہ بھاگ جائے گا اور اس کے بعد کتے ہماری لاشیں نوچیں گے۔ ڈیل آخری مراحل میں ہے اگر یہ بھاگ گیا تو کام خراب ہو جائے گا۔''

''استاد اب بھی سوچ لے۔ دھماکا ہو گیا تو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' مجیب منمنایا۔

ان کی باتیں سننے میں مَیں ایسا مگن ہوا کہ آگ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ چار پائی کی لٹکتی چادر نے آگ پکڑ لی۔ شعلوں کی چمک نے مجھے چونکایا۔ میں نے بدحواسی میں بستر سے چادر اُتار کر زمین پر مار کر بجھانے لگا اور جب یہ کام کر کے فارغ ہوا تو چار پائی کی بان نے آگ پکڑ لی تھی۔ اس کے پاس ہی راکٹ اور دستی بم رکھے تھے۔ میں آگ کی پروا کیے بغیر انہیں اُٹھا کر چار پائی سے دور رکھنے لگا۔ اس دوران میں مَیں نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ دشمن میرے بارے میں جتنا بے خبر رہتا اتنا ہی بہتر تھا۔ راکٹ اور دستی بم میں نے جلتی چار پائی سے دور کر دیئے تھے مگر مجھے خطرہ تھا آگ مزید بے قابو ہو سکتی تھی۔ کمرے میں دھواں بھر رہا تھا۔

''آگ پھیل رہی ہے۔'' مجیب کی آواز لرز رہی تھی۔

''یوسف باہر آ جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' عالمگیر نے مجھے للکارا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں اندر رہتا تو مارا جاتا لیکن باہر نکلنے کی صورت میں بھی میرا انجام اس سے مختلف نہ ہوتا۔ مجھے زندہ رکھنا شاید اب ضروری نہیں تھا کیونکہ میری زندگی کا ثبوت وہ پہلے ہی جمشید علی خان کو دے چکے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی موت نے عالمگیر کو مشتعل کر دیا تھا۔ میرا فرار ہونا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا مارا جانا ان کے لیے زیادہ قابلِ قبول تھا۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ مجھے نکل جانے کا موقع دیں گے۔ عالمگیر خبیث صفت شخص تھا وہ جانتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک کمرے میں نہیں رہ سکوں گا مجھے باہر آنا ہی پڑے گا اور تب وہ مجھے آسانی سے مار کر اپنے بڑوں کے سامنے سرخرو ہو سکیں گے۔

''یوسف اب بھی وقت ہے۔ اگر اسلحے کو آگ لگ گئی تو بچ نکلنے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔ ہم دروازے پر کھڑے ہیں ایک لمحے میں باہر ہوں گے۔ ضد مت کرو باہر آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

میں ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ چار پائی اب پوری طرح آگ پکڑ چکی تھی اور اس کے شعلے پاس رکھی لکڑی کی الماری کی طرف لپک رہے تھے کچھ دیر جاتی تھی کہ کمرا جہنم بن جاتا





اور میرا مقبرہ بھی۔ اچانک میری نظر دستی بموں پر پڑی۔ میرے لیے یہ کوئی اجنبی چیز نہیں تھے۔ حسن علی نے مجھے ان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ میں ان کے استعمال سے واقف تھا ان پر نظر پڑتے ہی مجھے باہر نکلنے کی راہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے دستی بم کا جائزہ لیا۔ یہ روسی ساخت گرینیڈ تھے۔ جن کی پن نکال کر انہیں پھینکا جاتا ہے تو یہ پانچ سیکنڈ کے وقفے سے پھٹ جاتے ہیں۔ ایک بم لے کر میں دروازے کے پاس آیا۔ دستی بم کو بہ غور دیکھا۔ کہیں یہ پانچ کے بجائے تین سکنڈ میں نہ پھٹ جائے اور میں اسے پھینکنے کی حسرت لیے مرحوم ہو جاتا۔ اس اثناء میں شعلے الماری تک پہنچ گئے تھے اور اب اس نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ میرے پاس غور و خوض کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دستی بم کی پن کھینچی اور پانچ تک گن کر اسے راہداری میں ممکن حد تک آگے پھینک دیا۔ مشکل سے ایک لمحہ گزرا تھا کہ اعصاب شکن دھماکا ہوا۔ اس کے بعد ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔

میں نے رائفل شانے پر لٹکائی اور پستول ہاتھ میں لیے زمین پر رینگتا ہوا باہر آ گیا۔ حسبِ توقع وہاں دھواں تھا۔ شکر ہے تاریکی بھی تھی۔ ورنہ دستی بم آگ لگا سکتا تھا۔ میں دوسرے کمرے کے پاس سے گزرا۔ دستی بم اس کے دروازے پر گرا تھا۔ اس میں ان دونوں نے مورچہ لگا رکھا تھا۔ ان کے پاس ہتھیار تھے اچانک میرا ہاتھ کسی نرم سی شے سے ٹکرایا۔ یہ کسی کا ہاتھ تھا میں نے ہڑبڑا کر پستول سیدھا کیا مگر وہ محض ایک ہاتھ تھا۔ جی ہاں ہلکی روشنی میں...... یہ صرف ایک ہاتھ تھا جو کہنی سے ذرا اوپر کٹ گیا تھا۔ اس پر ایک سنہری گھڑی تھی اس ہاتھ کا باقی جسم نہ جانے کہاں تھا۔ جانے یہ کس کا ہاتھ تھا مجیب کا یا عالمگیر کا۔

باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ میں اُٹھ کر باہر کی طرف دوڑا تھا۔ عقب سے عالمگیر کی آواز آئی۔

''بس اب ایک قدم نہ اُٹھانا رُک جاؤ۔''

میں بے اختیار ساکت ہو گیا۔ دروازہ دو قدم آگے تھا لیکن یہ دو قدم اُٹھانے سے پہلے میرے جسم میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر سکتا تھا۔ میں ہاتھ اوپر کرتے ہوئے گھوما۔ عالمگیر نے رائفل میری طرف تان رکھی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے وارننگ دینے کے بجائے میری پشت میں گولی کیوں نہیں اُتار دی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا بے شک اس کے کپڑے خون آلود ہو رہے تھے لیکن اس کے ہاتھ سلامت تھے۔ یعنی بم کا نشانہ اس کا ساتھی مجیب بنا تھا۔ اس نے سفاک سی آواز میں کہا۔

''پستول اور رائفل اُتار کر میری طرف پھینک دو۔''

رائفل کا رُخ میری طرف تھا۔ یہ خودکار برسٹ مارنے والی رائفل تھی۔ ایک انگلی کی جنبش میرے جسم میں کئی روشندان کھول سکتی تھی۔ مجبوراً میں نے پہلے پستول اور پھر رائفل اس کی طرف پھینک دی۔ اس نے رائفل کا رُخ میری طرف رکھا اور احتیاط سے جھک کر میرا پستول اُٹھا لیا اور اس کے اُٹھاتے ہی اس نے اپنی رائفل پھینک دی اور جیپانہ انداز میں ہنسا۔

''تمہارا شکریہ...... ویسے میری رائفل میں میگزین نہیں تھا۔ بم کے دھماکے سے بچنے کے لیے

میں گرا تو رائفل کا میگزین نہ جانے کیسے نکل گیا۔ وقت نہیں تھا اس لیے مجبوراً تمہیں خالی رائفل سے دھمکانا پڑا۔ تم تو خاصے سعادت مند ثابت ہوئے ہو۔''

اپنی اس حماقت پر میرا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔ مگر موت کو سامنے پا کر میرے حواس زیادہ ہی تیزی سے کام کرنے لگے تھے۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تبھی تم نے گولی نہیں ماری۔ اگر رائفل کا میگزین نہ گرا ہوتا تو یقیناً اس وقت میری لاش یہاں پڑی ہوتی۔''

''اب بھی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے پستول میری طرف اُٹھایا۔ وہ سرد مزاج شخص ایک لمحے میں گولی چلا سکتا تھا میں غوطہ کھانے کو بالکل تیار تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ قضا میری نہیں اصل میں اس کی آئی تھی۔ اچانک عقبی کمرے سے آگ کا طوفان برآمد ہوا۔ دھماکے سے پہلے اس کی لہر نے مجھے اُٹھا کر دروازے کے باہر پھینکا۔ زمین پر گرنے سے پہلے میں نے عالمگیر کو شعلوں میں گھر کر دیوانہ وار چلاتے دیکھا تھا۔ پھر میں زمین پر گرا اور لڑھکتے ہوئے صحن میں چلا گیا۔ میرے چاروں طرف جلتے ملبے کی بارش ہو رہی تھی۔ گرنے سے چوٹیں آئی تھیں لیکن میرے حواس بے دار تھے۔ میں اُٹھ کر بھاگا۔ عقب میں لگا تار دھماکے ہو رہے تھے۔ دروازے کے پاس پہنچا تو اتنا شدید دھماکا ہوا کہ میں اُچھل کر گیٹ کے بڑے سے ستون کے سامنے جا گرا اور پھر فوری طور پر اس کے عقب میں ہو گیا۔ چاروں طرف سلگتا ملبہ اور پتھر گر رہے تھے۔ اگر میں ستون کی آڑ میں نہ ہوتا تو یہ ملبہ مجھے سنگسار کر دیتا۔ جب تک ملبہ برستا رہا اور دھماکے ہوتے رہے میں ادھر ہی دبکا رہا۔ اندر موجود گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ اگر یہ سب ایک ساتھ ہی پھٹ جاتا تو مجھے وہاں سے بچ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ میرے بھی چیتھڑے اُڑ جاتے۔ عالمگیر کے انجام کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے خود میں نے شعلوں میں گھرے دیکھا تھا۔ مجیب پہلے ہی دستی بم کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس جگہ پر موجود پانچ انسان اپنی جان ہار چکے تھے۔ بلکہ دو عدد تربیت یافتہ کتے بھی کام آئے تھے۔ عین ممکن ہے مرشد اور ارشد بلا گروپ کے بڑوں کے لیے ان دو کتوں کی موت زیادہ دُکھ کا باعث ہو بہ نسبت ان چار انسانوں کے جو ان کے لیے کام کرتے تھے وہ کچھ اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ تھے۔ اس سارے ہنگامے میں مجھے خاصے زخم آئے تھے۔ چہرے اور ہاتھ پیروں سے کئی جگہوں سے خون رِس رہا تھا۔ اپنے شانے پر مجھے خاصی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ شاید کوئی چیز وہاں لگی تھی۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹولا ہلکی سی سوجن تھی۔

اب دھماکے رُک گئے تھے۔ البتہ فضا میں شعلوں کی لپٹیں اور چیزیں پھٹنے جیسی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ستون سے جھانکا۔ میرا خیال تھا کہ مکان یا کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی ہو گی۔ مگر وہاں سے کوٹھی سرے سے غائب تھی اور اس کا ملبہ کوٹھی کے احاطے میں یوں بکھرا تھا جیسے کسی نے کوٹھی کے پُرزے پُرزے کر کے اس کا ملبہ بکھیر دیا ہو۔ ایک دیوار تک سلامت نہیں تھی۔ تباہی کی شدت دیکھ کر مجھے اپنا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔





اگرچہ یہ علاقہ سنسان تھا اور یہاں پر خاصے فاصلے پر کوٹھیاں بنی تھیں مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ خوفناک دھماکے کسی نے نہ سنے ہوں۔ کچھ ہی دیر میں یہاں پر لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ پولیس بھی آ سکتی تھی۔ حالانکہ ہماری پولیس ایسی جگہوں پر جانے سے ذرا گریز کرتی ہے جہاں دھماکے وغیرہ ہوں۔ اس کے باوجود ممکن تھا کہ کوئی فرض شناس پولیس موبائل ادھر آ ہی نکلتی۔ اس سے پہلے میرا یہاں سے نکل جانا بہتر تھا۔ میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک عدد کھلی جیپ گیٹ کے باہر موجود تھی اور خالی ہی نظر آ رہی تھی۔ مگر عین ممکن تھا واپسی پر دو کے بجائے زیادہ افراد آئے ہوں اور وہ باہر ہی ہوں۔ اس صورت میں میرا گیٹ سے باہر جانا حماقت ہی ہوتی۔

کوٹھی کا عقبی حصہ ایک میدان تھا جس میں زیادہ تر جھاڑیاں اُگی تھیں مگر مسئلہ دس فٹ اونچی دیوار عبور کرنے کا تھا۔ ایک عدد لکڑی کی سیڑھی تھی مگر جب دھماکے میں پوری کوٹھی پُرزے پُرزے ہو گئی تھی تو وہ بے چاری سیڑھی کہاں بچی ہو گی۔ میں نے ایک بار پھر غور سے دیوار کا معائنہ کیا مگر شعلوں کی روشنی کے باوجود وہاں دھواں اتنا تھا کہ کوٹھی کا احاطہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دیوار کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہر طرف ملبہ بکھرا تھا۔ کوٹھی کے چار طرف جو درخت لگے تھے وہ بھی متاثر ہوئے تھے۔ بیری کا ایک درخت دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ سامنے والے لان میں بھی خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے عقبی طرف آیا اور یہ دیکھ کر میری باچھیں کھل گئی تھیں کہ وہاں دیوار میں ایک چھوٹا سا خلا ہو گیا تھا۔ شاید ادھر کوئی بم آ کر لگا تھا مگر معائنہ کرنے پر یہ سوراخ میری جسامت سے کسی قدر تنگ ثابت ہوا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک بڑا پتھر اُٹھا کر سوراخ کے کنارے توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ میں اتنا بڑا سوراخ کر لیا تھا کہ اس سے با آسانی باہر نکل سکوں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں یہاں سے نکلتا مجھے پاس ہی کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ بولنے والا اتنا نزدیک تھا کہ کسی لمحے بھی اس طرف آ سکتا تھا۔ اس سوراخ سے نکلنا اب بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے کچھ وقت لگتا اور اس دوران میں وہ آ جاتے تو مجھے ٹانگ سے پکڑ کر واپس کھینچ لیتے یا گولی مار دیتے۔ میں نے دو افراد کی آوازیں سنی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس جگہ آتے میں ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ یہ ایک پتھر نہیں بلکہ ملبہ گرنے سے ڈھیر سا بن گیا تھا اور دیوار کے ساتھ کچھ اس طرح کی آڑ بن گئی تھی کہ جب تک کوئی سر پر آ کر نہ دیکھتا مجھے نہیں پا سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ لوگ ارد گرد رہنے والے ہوں اور دھماکے سن کر آئے ہوں۔ میں نے ذرا اُمید سے سوچا مگر فوراً ہی میری اُمید پر پانی پھر گیا یہ بد بخت اسی گروہ کے کرگے تھے ایک نے کہا۔ ''وہ حرامی ادھر ہی ہو گا۔''

''تیرا دماغ خراب ہے۔ اس جگہ کی حالت دیکھ رہا ہے۔ وہ بھلا بچا ہو گا۔'' دوسرا بولا۔

''میں ...نے خود اسے گیٹ سے جھانکتے دیکھا تھا۔'' پہلے نے اصرار کیا۔

''وہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ہمارا ساتھی۔''

"ہمارا ساتھی ہوتا تو سامنے کیوں نہیں آیا۔ اوئے...... یہ دیکھ۔ وہ اس سوراخ سے نکل گیا ہو گا۔" پہلے نے سوراخ پالیا تھا۔ "وہ ابھی پچھلے میدان میں ہوگا۔ چل اسے دیکھتے ہیں۔ وہ نہ ملا تو ہماری خیر نہیں ہے۔"

"ہمارا کیا قصور ہے۔ ساری ذمے داری عالمگیر کی ہے۔ وہ مر گیا تو ہمارا کوئی قصور نہیں۔ چل کر قیصر کو اطلاع دیتے ہیں۔ وہ خود اس معاملے کو دیکھ لے گا۔"

"ہر وقت حرام خوری کے چکر میں نہ رہا کر۔" فرض شناس اول نے اسے جھاڑا۔ "تلاش کر اپنے اس باپ کو اس کی وجہ سے پورے گروہ پر آفت آئی ہے۔ پتا ہے وہ جمشید علی کا بیٹا ہے۔ ابھی وہ مجبور ہے اگر اسے پتا چل گیا کہ اس کا بیٹا ہمارے پاس نہیں رہا ہے تو سب کی شامت آئے گی۔ ہم دونوں بھی مارے جائیں گے۔"

"اچھا یار......" حرام خور دوئم نے بادلِ نخواستہ کہا۔ "پر اس سوراخ سے ہم دونوں میں سے کوئی نہیں گزر سکتا۔"

"چل جیپ میں چلتے ہیں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلیں گے۔" اول نے تجویز پیش کی۔

"جلدی کر یار پولیس نہ آجائے۔"

"اوئے پولیس نہیں آئے گی۔" اول ہنسا۔ "اسے اس طرف نہ آنے کا اچھا خاصا حصہ ملتا ہے۔ ادھر آ کر اس نے اپنا بھتہ بند کرانا ہے۔ اپنے چوہدری صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔"

"کون چوہدری...... اپنے امیر علی صاحب۔" دوئم بولا۔

"ہاں وہی...... ایم این اے ہیں اور وزیر بھی۔ بھلا پولیس کی کیا مجال کہ ان کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی اُٹھا سکے۔ وہ ان کی ماں بہن......" ان کی آوازیں معدوم ہوگئی تھیں۔ میں کچھ دیر دبکا رہا اور سوچتا رہا ان لوگوں کے ہاتھ پیر میرے اندازے سے زیادہ بڑے تھے۔ ایم این اے اور وزیر ان کے سرپرستوں میں شامل تھا۔ اسلام آباد کے بعض اعلیٰ بیوروکریٹس کا میں سن ہی چکا تھا جو ارشد بلا گروپ کی سرپرستی فرما رہے تھے۔ یہ لوگ طاقت کے نشے میں چُور میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اگر میں عام لڑکا ہوتا یا جمشید علی جیسے طاقتور سرپرست سے محروم ہوتا تو یہ اب تک مجھے کھا چکے ہوتے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکے ہیں تو میں خاموشی سے اُٹھا اور احاطے کے تاریک حصوں سے ہوتا ہوا مین گیٹ کی طرف جانے لگا۔ اب میرا اس سوراخ سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ جیپ پر سوار ہو کر مجھے عقبی حصے میں تلاش کرتے۔ میں سکون سے مین گیٹ سے نکلا۔ جیپ غائب تھی اور کوٹھی کے سامنے کچھ افراد جمع تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر کسی نے میرے پاس آنے کی کوشش نہیں کی۔

میں کوٹھی سے دور جانے لگا۔ مجھے شدت سے کسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں میں اپنا حلیہ درست کر سکتا اور آگے راستہ دریافت کر سکتا۔ زمین کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ راولپنڈی یا





اسلام آباد کا کوئی نیا آباد ہونے والا پوش علاقہ تھا۔ زمین پر ہریالی تھی اور جابجا اونچے نیچے ٹیلے اور کھائیاں تھیں۔ میں جلد آبادی سے نکل کر ایک صاف ستھری اور چوڑی سڑک پر آ گیا۔ جس کے دونوں طرف جنگل تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ ظاہر ہے رات کے اس پہر تو مصروف ترین سڑکیں بھی ویران ہو جاتی ہیں یہ تو پھر بھی کوئی نواحی سڑک تھی۔ اچانک عقب سے کسی گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور ایک کار زن سے میرے برابر سے گزری۔ پھر اس کے بریک چرچرائے۔ میں بھڑکا تھا۔ کیا کار میں میرے دشمن تھے۔ میں فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو لا حاصل ہی ہوتا۔ میں کار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کار رُکی اور اس سے ایک ادھیڑعمر بگر باوقار نظر آنے والے شخص نے جھانکا۔

"مے آئی ہیلپ یو ینگ مین؟" اس نے صاف لہجے میں کہا۔ "زخمی نظر آ رہے ہو۔"

"یس سر...... اگر آپ مجھے کسی ایسی جگہ تک لفٹ دے سکیں جہاں سے میں ایک کال کر سکوں۔"

"شیور۔" اس نے عقبی دروازہ کھول دیا۔ "بٹ فرسٹ یو نیڈ میڈیکل ایڈ...... ایم آئی رائٹ۔"

"یس سر......" میں کار میں بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ معمولی زخم ہیں پہلے میں اپنے گھر والوں کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ وہ فکرمند ہوں گے۔"

کار میں تاریکی تھی مگر میں نے اگلی نشست پر بیٹھی عورت کو دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے اسی وجہ سے کار کا عقبی دروازہ کھولا تھا۔ "اینی پرابلم نوجوان۔" اس بار اس نے اردو کا ایک لفظ استعمال کیا۔ ویسے وہ عادتاً انگریزی بول رہا تھا۔ وہ کمپلیکس کے مارے لوگوں میں نہیں تھا جو انگریزی جھاڑ کر خود کو اپ ٹو ڈیٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "سوری میں تعارف کرانا بھول گیا۔ خادم کو معروف قریشی کہتے ہیں۔ جی ٹی روڈ پر میرا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ لوہے کے سامان بنانے کا۔"

"میرا نام یوسف علی خان ہے۔ کراچی سے تعلق ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایبٹ آباد کے ایک سکول میں زیرِ تعلیم ہوں۔ بعض وجوہات کی بنا پر اسلام آباد آیا اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔"

"اغوا کر لیا گیا۔" وہ اُچھل پڑا تھا۔ "مونا سنا تم نے...... سوری میں اپنی وائف کا تعارف کرانا بھول ہی گیا۔ یہ ہیں میری بیگم یا نصف بہتر ڈاکٹر مونا قریشی۔ شی ازفزیشن اینڈ جنرل سرجن۔"

"نائس ٹو میٹ یو مسز قریشی۔" میں نے کہا۔

"می ٹو ینگ مین۔ بٹ یو آر انجرڈ۔" وہ بولی اس کی آواز میں نغمگی تھی۔ "پہلے تمہیں فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر مونا پچیس چھبیس کے آس پاس تھی۔ یعنی وہ اپنے شوہر سے خاصی کم عمر تھی۔ وہ تقریباً چالیس بیالیس سال کا تھا۔

"مجھے زیادہ فکر اپنے گھر والوں کی ہے۔" میں نے حتمی مگر نرم لہجے میں کہا۔ "پلیز مجھے کسی ایسی

جگہ اُتار دیں جہاں سے میں کال کرسکوں۔"

اس زمانے میں پی سی او کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا اور یہ ہر جگہ دستیاب بھی نہیں تھے۔

معروف قریشی نے اصرار کیا۔ "ینگ مین ہمارے ساتھ چلو۔ فون ہمارے گھر سے بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ کسی پبلک پلیس پر جا سکو پھر رات کے اس پہر کوئی پی سی او بھی نہیں کھلا ہوگا۔ اسلام آباد کا تمہیں شاید پتہ نہیں ہے یہ سرِشام سو جانے والا شہر ہے۔"

میں نے اس کی پیشکش پر غور کیا۔ اصولاً تو مجھے اس کی مدد کی پیشکش پر کھٹک جانا چاہیے تھا۔ اس وقت حالات ایسے نہیں تھے۔ افغان جنگ کی وجہ سے پورا ملک تخریب کاری کی لپیٹ میں تھا۔ کوئی شخص کسی اجنبی پر اعتبار نہیں کرتا تھا کسی کی مدد کا موقع ہوتا تو لوگ آنکھ بند کر کے گزر جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ معروف اور اس کی بیوی نے نہ صرف مجھے لفٹ دی تھی بلکہ وہ مجھے گھر لے جانے پر بھی مُصر تھے۔ حالانکہ وہ مجھے کسی ایسے مقام پر اُتار کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ پھر بھی میں ان پر شک نہ کر سکا ایک تو یہ کہ معروف قریشی دیکھنے میں سیدھا سا شخص لگتا تھا دوسرے مجھے اس وقت واقعی مدد کی ضرورت تھی۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب لیکن آپ کو زحمت ہوگی۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"کوئی زحمت نہیں ہوگی بلکہ ہمیں خوشی ہوگی۔" ڈاکٹر مونا کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ خوش ہوگئی ہو۔

"ویسے تم اغوا کرنے والوں کے پاس سے فرار کیسے ہوئے؟"

"بس جی موقع مل گیا تھا اور میں وہاں سے بھاگ لیا۔ وہ میرے باپ سے ایک کروڑ روپے کا تاوان مانگنا چاہتے تھے۔"

ڈاکٹر مونا نے سیٹی سی بجائی۔ "اس کا مطلب ہے تم کسی امیر باپ کی اولاد ہو۔"

"بس جی کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے گول مول انداز میں جواب دیا اور فیصلہ کیا کہ ان کے گھر سے فون کر کے فوری طور پر حسن علی کو ان کے ہاں بلوا لوں گا۔ میرا فی الوقت سوال جواب کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر مونا نے مجھ سے کچھ سوال اور کیے اور جب میں نے ہوں ہاں کر کے جواب دیا تو وہ سمجھ گئی کہ میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ معروف قریشی نے کار ایک بستی کی طرف موڑ دی۔ یہ امراء کی پوش لیکن مختصر سی بستی تھی۔ جہاں سارے بنگلے ایک جیسی طرزِ تعمیر کے اہل تھے۔ شاید کسی ایک ہی بلڈر نے یہ بنگلے بنا کر بیچے تھے۔ یہ سب تقریباً نصف کنال پر بنے تھے۔ معروف قریشی نے کار ایک بنگلے کے سامنے روکی۔ ہارن پر چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ اندر پورچ میں ایک چھوٹی سی کار کھڑی تھی۔ معروف قریشی نے اپنی شاندار کرولا اس کے برابر میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

"آؤ یوسف۔" معروف قریشی نے اُترتے ہوئے کہا۔ بنگلہ روشنیوں سے منور تھا۔ میں نے





اُترتے ہوئے مونا کو دیکھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ خاصی حسین اور کم عمر تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد کسی قدر سوجن تھی۔ یہ سوجن قدرتی تھی یا وہ ڈرنک کرتی تھی مگر اس کے موزوں چہرے پر یہ سوجن بھی بُری نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی اور بے حد مختصر سے بلاؤز میں اس کی کمر کا بانکپن نمایاں تھا۔ اس کا جسم چھریرہ اور بعض مقامات پر کسی قدر بھاری تھا۔ اس نے اچانک دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر میرا معائنہ کر لیا ہے تو اندر چلو۔"

میں جھینپ گیا تھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ معروف قریشی خاصا آگے جا چکا تھا۔ ورنہ وہ سن لیتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ بنگلہ اندر سے بھی خوب صورت، کشادہ اور تمام جدید لوازمات سے آراستہ تھا۔ معروف اندر چلا گیا اور مونا مجھے ایک الگ تھلگ سے کمرے میں لے آئی۔ وہاں کے فرنیچر سے لگ رہا تھا کہ مونا اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ چاروں طرف الماریاں تھیں جن میں طبی موضوع پر رسالے اور کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ایک میز تھی جس پر طبی آلات اور بعض فوری ضرورت کی دوائیں رکھی تھیں۔ ایک طرف فرش سے کوئی تین فٹ اونچی ٹارچ تھی۔

"میرا کلینک اسلام آباد بلیو ایریا میں ہے لیکن گھر پر بھی کبھی کبھار کوئی پیشنٹ آ جاتا ہے۔ اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"اُتار دوں۔" میں نے جھجک کر کہا۔ "پھر میں کیا پہنوں گا؟"

اس نے میرا جائزہ لیا۔ "ایک منٹ بیٹھو میں کچھ لے کر آتی ہوں۔" اس نے کہا اور چلی گئی لیکن اس کی واپسی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی اس نے ساڑھی اُتار کر ڈھیلا سا کرتہ شلوار پہن لیا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے عجیب لگا کہ کُرتا نہ صرف باریک کپڑے کا تھا بلکہ گریبان خاصا کشادہ بھی تھا۔ ڈاکٹر عام طور پر مریضوں کے سامنے اس طرح کے گھریلو لباس میں نہیں آتی ہیں۔ اوپر سے اس نے دوپٹے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ میرے لیے اس کی طرف دیکھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک شارٹ میری طرف بڑھا دیا۔

"اسٹینڈ کے پیچھے جا کر اسے پہن لو۔" اس نے اینگلز پر تنے پردوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہسپتال میں اس قسم کے اسٹینڈز پردہ کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میں نے اس کے عقب میں جا کر اپنے پھٹے اور میلے ہو جانے والے کپڑے اُتار دیئے۔ مٹی، پسینے اور میل سے میرا پورا جسم اس طرح چیکٹ ہوا تھا کہ مجھے خود سے گھن آ رہی تھی۔ زخم خاص نہیں تھے صرف خراشیں تھیں۔ میں باہر آیا تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر مونا کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر چمک سی آ گئی۔ میں جلد از جلد فرسٹ ایڈ کے عمل سے گزر جانا چاہتا تھا کہ حسن علی سے رابطہ کر سکوں مگر ڈاکٹر مونا نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کے بجائے تجویز پیش کی۔

"ایسا کرو کہ تم پہلے گرم پانی سے غسل کر لو۔ اس سے زخم بھی صاف ہو جائیں گے۔ بس پھر ان پر پٹی لگانے کی دیر ہوگی۔"

میں نے غور کیا تو اس کی بات دل کو لگی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔''

''نو پرابلم...... یہ ساتھ ہی باتھ روم ہے۔ تم آرام سے باتھ لے سکتے ہو۔ اس میں ٹب بھی ہے اگر چاہو تو گرم پانی کا مساج بھی لے سکتے ہو۔''

باتھ روم واقعی شاندار تھا۔ ٹائلز اور تمام سہولیات کے ساتھ۔ مگر ساتھ ہی وہاں زنانہ استعمال کی بعض اشیاء بھی تھیں گویا یہ باتھ روم ڈاکٹر مونا کے زیرِ استعمال تھا اور اس نے کتنی آسانی سے مجھے یہاں بھیج دیا۔ گرم پانی میں ڈیٹول ملا کر میں اس میں لیٹ گیا۔ پہلی بار مجھے ڈاکٹر مونا اور اس کے شوہر کے غیر منطقی رویے پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عام میاں بیوی ایک اجنبی شخص کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مجھے اصرار کر کے اپنے گھر لائے اس کے بعد معروف قریشی مجھے اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلا گیا جو بے حد حسین ہی نہیں عمر میں اس سے خاصی چھوٹی بھی تھی۔ اور ڈاکٹر مونا میرے سامنے اس قسم کے لباس میں آئی تھی جیسا لباس خواتین عام طور سے غیر مردوں کے سامنے پہننا پسند نہیں کرتی ہیں۔ اب وہ یا تو فطرتاً ایسی تھی یا میرے سامنے کسی خاص وجہ سے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ میں ان سوچوں میں گم آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ اچانک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مونا اندر آئی۔ میں نے بے خیالی میں اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا اور جلدی سے ٹانگیں سکیڑ کر جسم چھپالیا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ڈاکٹر مونا نے کہا۔ ''سوری میں یہ لیکویڈ دینے آئی تھی۔ اسے پانی میں ڈال کر نہاؤ گے تو جسم کا درد دور ہو گا۔'' اس نے بغیر کسی جھجک یا شرم کے ٹب کے پاس آ کر اس بوتل سے کچھ لیکویڈ پانی میں اُنڈیل دیا۔

''آپ مجھے پہلے بھی دے سکتی تھیں۔'' میں نے کسی قدر ناگواری کے ساتھ کہا۔

''سوری میں بھول گئی تھی اور شرماؤ مت میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اس حالت میں تمہارا معائنہ بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''پلیز آپ جائیں۔'' اس بار میں نے لحاظ ایک طرف رکھ کر کہا۔ ''مجھے معائنہ کرانا ہو گا تو کسی میل ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔''

''اوکے۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے شدت سے طیش آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے غسل بھگتایا۔ جسم خشک کیا۔ پہننے کے لیے اس شارٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے اسے پہن کر باہر آ گیا۔ ڈاکٹر مونا کافی لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو چند لمحے کے لیے اس کی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ پھر وہ چونکی۔

''ہاؤ اسمارٹ آر یو۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے تمہاری رگوں میں سفید فام خون بھی ہے۔''

''میرا تعلق ایران سے ہے۔'' میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں مان سکتی۔ خیر چھوڑو آؤ کافی پیو۔ پھر میں تمہاری ڈریسنگ





کرتی ہوں۔''

''پہلے میں فون نہ کر لوں۔'' میں نے کافی کا مگ اُٹھایا۔ اس وقت اس کی شدت سے ہو رہی تھی۔

''چلو فون کر لینا لیکن پہلے کام ختم کر لو۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

میں مگ لے کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے جسم کو والہانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت کی یہ حرکت افسوسناک ہی کہی جا سکتی ہے۔ کافی پیتے ہوئے اچانک مجھے بے چینی محسوس ہوئی اور پھر کمزوری کا احساس ہوا۔ میں نے مگ ایک طرف رکھ کر اُٹھنا چاہا تو چکرا کر گر پڑا۔ کافی میں شامل دوا بے حد زوداثر تھی میں نے ڈاکٹر مونا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بن اور بگڑ رہے تھے کبھی وہ لومڑی جیسی نظر آ رہی تھی اور کبھی چڑیل۔

''تت...... تم...... نے...... کیا...... شا...... مل کیا...... کافی...... میں۔''

وہ ہنسی تو اس کی ہنسی گونجنے کے انداز میں سنائی دی تھی۔ ''یہ ایک دوا ہے اب تم آرام سے سو جاؤ گے۔ فکر مت کرو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''تم...... نے...... کیوں کیا؟'' میرا ذہن چکرا رہا تھا اور آواز و زبان بے قابو ہو رہی تھی۔

''جلد معلوم ہو جائے گا تمہیں۔'' وہ اُٹھ کر میرے پاس آئی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی مگر میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس نازک سی عورت نے مجھے قابو میں کر لیا تھا۔ اور پھر تاریکی چھا گئی۔ ہر احساس فنا ہو گیا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔



حواس رفتہ رفتہ بے دار ہوئے۔ ذہن جیسے شل ہو رہا تھا اور جسم بے جان...... سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ جب ذہن کسی قدر قابو میں آیا تو میں حسن علی کی بتائی ایک سانس کی مشق دُہرانے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرا ذہن تیزی سے صاف ہوتا چلا گیا۔ جلد میں اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا تھا پہلا احساس یہ تھا کہ میرا جسم جکڑا ہے۔ بیلٹ نما چیز سے مجھے بستر کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ میں اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیلٹ شانے سے ذرا نیچے سینے اور بازوؤں کو جکڑے تھی۔ دوسری نے پیٹ پر سے اور کلائیوں سے مجھے گرفت میں لیے رکھا تھا اور تیسری گھٹنوں سے ذرا اوپر رانوں کو جکڑے ہوئے تھی۔ ان بیلٹوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں ذرا سی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ واحد حرکت میں یہ کر سکتا تھا کہ اپنا سر ہلا لوں۔

میں نے اب تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں اور کان کے سہارے اِردگرد کا ماحول محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک کاؤچ نما بستر پر بندھا لیٹا تھا اور میرے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ چند لمحے کو میں بوکھلا گیا تھا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ سوال ایک بار پھر میرے ذہن میں گونجا۔

اس کا جواب ڈاکٹر مونا کی صورت میں اندر آیا۔ وہی میری اس حالت کی ذمے دار تھی۔ اسے دیکھ کر اپنی برہنگی کا احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ مگر میں مجبور تھا خود کو چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت نمایاں تھی۔ میرا دل چاہا اسے ان الفاظ سے نوازوں جن سے میں نے آج تک کسی عورت یا لڑکی کو نہیں نوازا تھا۔ مگر اس پر یہ الفاظ بھی بے اثر ہوتے اس لیے میں خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا۔

''کیا حال ہیں ہیرو۔'' اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ممکن ہے وہ عام حالات میں میرے سینے پر ہاتھ رکھتی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی لیکن اس حال میں مجھے اس سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ غلاظت سے بھرا ہو۔

''پہلے تو مہربانی کر کے اپنا ہاتھ دور رکھو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس نے ہاتھ ہٹا لیا لیکن اس سے بھی زیادہ بُری حرکت کی۔ میں پچھتایا اور اس بار ٹوکنے سے گریز کیا کہ نہ جانے اگلی بار وہ کیا کر گزرے۔ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔ ''اس طرح مجھے باندھ کر رکھنے کا مقصد؟ میرا خیال ہے ہم زندگی میں پہلی بار ملے ہیں۔''

''ہاں..... مگر بعض لوگ پہلی ملاقات میں ایسے لگتے ہیں جیسے ہم ان سے ہمیشہ سے واقف ہوں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''تم مجھے اچھے لگے۔''

''جو لوگ تمہیں اچھے لگتے ہیں کیا ان کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''شخصیت پر منحصر ہے۔ جو زیادہ اچھے لگتے ہیں ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہوں۔'' اس نے کہتے کہتے ایسی حرکت کی کہ میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔ اُلو کی پٹھی، دل میں اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ اس سلوک کی کیا وجہ تھی۔ وہ جنس کی ماری عورت تھی اور شاید اپنے شوہر سے اس کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر منہ مارنے کی عادی تھی۔ میں ملا تو اس نے میرے حالات جان کر مجھے قابو کر لیا تا کہ اپنی ہوس کی آگ بجھا سکے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اب حرکت میں آئے گی اور جو حرکتیں کر رہی تھی ان سے بھی آگے بڑھے گی۔

اس نے غالباً میری سوچ بھانپ لی تھی۔ ''تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں کوئی جنس زدہ عورت ہوں اور تم سے جسمانی تسکین حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے ملائمت سے جواب دیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ تم تو ستی ساوتری ہو اور میری پوجا کے لیے مجھے اس طرح باندھا ہے۔''

''گویا میرا اندازہ ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''تم بھی غلط نہیں سوچ رہے ہو۔ ان حالات میں اس قسم کی سوچیں آتی ہیں لیکن میں کہوں گی کہ تمہارا اندازہ غلط ہے۔ بے شک تمہیں اس طرح جکڑ کر رکھنے میں میرے کچھ مقاصد ہیں مگر وہ نہیں جو تمہارے ذہن میں آ رہے ہیں۔''





''یقیناً تمہارے مقاصد اعلیٰ اور پاکیزہ ہوں گے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

اس نے سر ہلایا اور کچھ کہنے کے بجائے پلٹی اور اس نے پاس رکھی الماری سے ایک انجکشن اور سرنج نکالی پھر کہا۔ ''شاید تمہارے علم میں نہ ہو۔ میں بتا دوں میں گائنا کالوجسٹ ہوں اور اس شہر میں میری بہت حیثیت ہے۔''

''شاید تم وہ کام کرتی ہو جو اس مقدس پیشے پر ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' میں نے اسے نفرت سے دیکھا۔ ''بغیر شادی کے ماں بننے والی لڑکیوں کا ابارشن کرتی ہو اور بچے کی خواہش رکھنے والی عورتوں کے آپریشن کرتی ہو۔''

وہ مسکرائی۔ ''ابھی تم بچے ہو۔ تم نہیں جانتے۔ یہ کام تو اب عام ڈاکٹرز بھی کر لیتی ہیں۔ طب کا پیشہ پیسہ کمانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے اس ملک میں۔ میرا مقصد اس سے بھی اعلیٰ ہے۔'' اس نے میرا بازو اسپرٹ لگی روئی سے صاف کیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو۔'' اسے انجکشن لگانے کی تیاری کرتے دیکھ کر میں کسمسایا۔ مگر اس سے زیادہ ہلنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ''کیسا انجکشن ہے؟''

وہ مجھے بے بس دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی۔ اس نے انجکشن کو سرنج میں بھرا۔ ''ڈرو مت یہ نقصان دہ انجکشن نہیں ہے۔ اسے لگوا کر تم ہواؤں میں اُڑنے لگو گے۔''

''کیا یہ نشے کا انجکشن ہے۔ میں اسے کیوں لگوانے لگا۔'' میں نے آزاد ہونے کی جدوجہد جاری رکھی۔

''ہاں نشے کا ہے مگر اس نشے کا نہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے سرنج کی سوئی میرے بازو میں گھونپ دی اور میرے حرکت کرنے کی پروا نہ کرتے ہوئے سرنج خالی کر دی۔ مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ اس نے سرنج نکال کر دوبارہ روئی سے میرا بازو صاف کیا۔ خالی سرنج پاس میز پر رکھی ٹرے میں رکھی۔

''یوسف..... کچھ دیر بعد تمہیں گرمی محسوس ہو گی اور تم بے اختیار چاہو گے کہ میری قربت حاصل کرو لیکن تمہیں یہ قربت نہیں ملے گی۔ کیونکہ میرا جسم میرے شوہر کی امانت ہے اسے کوئی دوسرا فرد اس انداز میں حاصل نہیں کر سکتا۔ جس کا حق قریشی کو ہے۔'' وہ کہتے کہتے رُکی۔ ''البتہ میں تمہیں اپنی قربت سے ضرور نوازوں گی مگر دوسرے انداز میں۔'' اس نے اپنی قمیص کے بٹن کھولے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا مگر ساتھ ہی اس سے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر شدید حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی ہیٹر آن کر دیا گیا ہو۔ پھر میں نے اس کا عریاں لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''کتیا۔'' میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مجنونانہ انداز میں میرے جذبات برانگیختہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور سچی بات ہے میرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کامیاب ہو رہی تھی۔ میرا ذہن رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے سانس روک لی

اور یوں ساکت ہو گیا جیسے بے ہوش ہو گیا ہوں۔ مجھے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہی ایک طریقہ نظر آیا تھا۔ میں یوگا کے موضوع پر قارئین کو بور نہیں کروں گا مگر اتنا بتا دوں کہ اس مشق نے میرے جسم کے بڑھتے درجہ حرارت کو معتدل کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے جذبات بے قابو کرنے میں ڈاکٹر مونا کے توبہ شکن بدن کے لمس سے زیادہ اس انجکشن کا کمال تھا جو اس نے میرے جسم میں اُتار دیا تھا۔

اس نے بھی محسوس کر لیا کہ اس کی سعی ناکام جا رہی ہے۔ اس نے میری سانس رُکتی دیکھ کر بے تابی سے میری نبض ٹٹولی اور اسے چلتا پا کر میرے منہ پر ہاتھ مارا۔ ''سور کے بچے۔'' اس نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ''سانس لے۔''

اس وقت وہ ایک معزز ڈاکٹر اور عورت کے بجائے ایک تیسرے درجے کی طوائف لگ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے سانس خارج کر کے دوبارہ سانس بھری اور اسے روک لیا۔ میں اپنی ساری توجہ اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے پر مرکوز کر رہا تھا اور بتدریج میری حالت اعتدال پر آتی جا رہی تھی۔ مجھے اس انجکشن کے بارے میں کچھ خاص نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ وہ میرے جذبات میں اُبال لا رہا تھا لیکن اسے ناکام بنا کر مجھے خود پر فخر محسوس ہوا تھا۔ شاید کوئی اور شخص اندر سے اُبھرنے والی حیوانی طلب کو اس طرح سرد نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد ڈاکٹر مونا گھٹیا پن پر اُتر آئی تھی۔ اس نے پاس ٹرے میں رکھی قینچی اُٹھا لی تھی اور اس کی نوک سے مجھے اذیت دے رہی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ سانس کی جو مشق میں کر رہا تھا وہ خنجر گھونپنے کی تکلیف پر بھی قابو پا لیتی تھی۔ مجھے اس کے فعل سے ذرہ برابر تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے بدستور بے حس و حرکت دیکھ کر وہ بالکل بے قابو ہو گئی تھی اور شاید قینچی میرے سینے میں اُتار دیتی لیکن اس سے پہلے اس کا شوہر معروف قریشی کمرے میں آ گیا۔ اس نے مونا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''بے کار ہے۔ اس پر اثر نہیں ہو رہا ہے۔''

''پاگل ہوئے ہو۔ میں نے قینچی سے اسے گود کر رکھ دیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس پر اثر نہیں ہو رہا ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔ چلو کپڑے پہنو۔'' اس نے آرام سے اپنی بیوی سے کہا۔ میرے پاس اس کی بے غیرتی پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ انجکشن کی دوا بدستور میری رگوں میں ہلچل مچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مونا اپنے کپڑے لے کر کمرے سے چلی گئی اور معروف قریشی میرے پاس آیا۔ اس نے شائستہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تم ایک حیرت انگیز نوجوان ہو میں نے کسی کو مونا کے وار سے یوں بچتے نہیں دیکھا۔''

میں نے آہستگی سے سانس چھوڑی اور خشک لہجے میں بولا۔ ''اگر تم میرے جسم پر کوئی کپڑا ڈال دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔''





اس نے پاس اسٹینڈ پر لٹکا تولیہ میرے جسم پر ڈال دیا۔ اتنا تو میں سمجھ چکا تھا کہ ان میاں بیوی کو گالیاں دینا یا بُرا بھلا کہنا بے کار تھا۔ وہ عام اخلاق اور معاشرتی انداز کے قائل نہیں تھے۔ ان کے اپنے معیار تھے ایسے معیار جس میں ایک شوہر اپنی بیوی کو ایک نوجوان سے ناگفتہ بہ حالت میں لپٹے دیکھ کر نارمل رہتا ہے اور بیوی سے اس کے مقاصد میں ناکامی پر افسوس بھی کرتا ہے۔ لہٰذا اسے لعنت ملامت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس مردِ ناداں پر کلام نازک بے اثر تھا۔ لہٰذا میں نے اس سے سیدھے الفاظ میں مقصد دریافت کیا۔

''دوسری مہربانی یہ کرو کہ مجھے اس ساری کارروائی کا مقصد بتا دو۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تم ابھی تک سمجھے نہیں۔ مونا نے کہا تھا کہ وہ تم سے جسمانی تعلق نہیں قائم کرے گی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں اپنے سر کے بال نوچ سکتا۔ پھر اس حیوانی حرکت کا کیا مطلب تھا کیا تمہاری بیوی کسی منفرد مرض میں مبتلا ہے اور اپنی حیوانی تسکین کے لیے یہ حرکت کر رہی تھی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''افسوس کہ تم ہمیں اتنا گرا ہوا سمجھتے ہو۔''

''میں تمہیں اس سے بھی زیادہ گرا ہوا سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے پورے خلوص سے کہا۔ ''بہ شرط کہ تم اس کی وجہ بیان کر دو۔''

''ہمیں تمہارا سیرن چاہیے۔ سیرن سمجھتے ہو نا؟'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''ہاں...... لیکن کیوں؟''

وہ کرسی میرے پاس کھسکا لایا۔ ''دیکھو میں تمہیں یہ سب اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تم اگلی بار مزاحمت نہ کرو۔ دیکھو اس طرح تم ایک طرح سے معاشرے کی خدمت کرو گے۔ ہمیں تم جیسے خوب صورت اور صحت مند جوانوں کا سیرن چاہیے۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''دیکھو ہمارے معاشرے میں بہت سی بے اولاد خواتین ہیں۔ جن کے شوہر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ انہیں ٹیسٹ ٹیوب کی مدد سے بچہ دیتے ہیں۔''

''اور اس کے عوض دونوں ہاتھوں سے دولت کماتے ہو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس میں کیا بُرائی ہے۔'' وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ ''ہم ان کے کام آتے ہیں۔ ان عورتوں کو خاندان اور معاشرے میں اپنا اسٹیٹس برقرار رکھنے کے لیے بچے کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہم ان سے منہ مانگی فیس لیتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔''

''اور معاشرے کو ناجائز بچوں کا تحفہ دیتے ہو۔ تم لوگ تو نسلیں بگاڑ رہے ہو۔''

''یہ سب سمجھ کے اُلٹ پھیر ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بچہ اس شوہر کا نہیں ہے جس کی

بیوی نے پیدا کیا ہے۔ کسی کو کیا معلوم؟''

''کیا اس شوہر کو بھی نہیں۔''

''انہیں پتا ہوتا ہے کیونکہ اس طرح خود ان کے عیب کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مان جاتے ہیں۔ پھر انہیں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ان کی بیوی کو کسی مرد نے نہیں چھوا ہے۔ بچہ تو ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں مرد عورت کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا قطعی ضروری نہیں ہے۔''

کیسا لرزہ خیز انکشاف تھا۔ یہ لوگ معاشرے کو کس رُخ پر لے جا رہے تھے ان کے نزدیک حلال حرام کی ذرہ برابر اہمیت نہیں تھی۔ وہ میرے جسم سے تولیدی مادہ حاصل کر کے بے اولاد عورتوں کو ناجائز بچوں کا تحفہ دینا چاہتے تھے اور اپنے تئیں اسے درست سمجھ رہے تھے۔

''تم لوگوں کو بے شمار رضا کار مل جائیں گے۔ اگر تمہاری بیوی اس حال میں ان کے سامنے آئے جس طرح میرے سامنے آئی تھی تو انہیں انجکشن کی ضرورت بھی نہ ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''یہ ہمارا کام ہے لہٰذا ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ کس طرح کرنا چاہیے۔'' اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

''اس طرح زبردستی باندھ کر۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ اس طرح تم خطرے میں پڑ جاؤ گے۔''

''ہم ہر خطرے کا سدباب کرنا جانتے ہیں۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا لیکن اس کے سرسری سے لہجے کی تہہ میں چھپی سفاکی میں نے بھانپ لی تھی۔ غالباً وہ اس کے بعد مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ میں ایک کے بعد ایک مصیبت میں پڑ رہا تھا۔ جمشید پیلس ناسازگار حالات کے باوجود میرے لیے ایک محفوظ قلعے کی طرح تھا۔ اس سے نکل کر میں مصیبت بلکہ مصیبتوں میں پڑ گیا تھا۔ ان بدبختوں سے نکل کر بھاگا تھا یعنی ارشد بلا اینڈ گروپ کے قبضے سے تو ان معزز نظر آنے والے جرائم پیشہ میاں بیوی کے چنگل میں پھنس گیا تھا جو میرے جسم سے زندگی کشید کر کے اسے منہ مانگے داموں ضرورت مندوں کو بیچنا چاہتے تھے۔

''تم ایک ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بدلے کیا لیتے ہو؟'' میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''خریدار کی جیب کے حساب سے۔ پانچ سے دس لاکھ تک۔ بلکہ سرحد کے ایک سردار نے خوش ہو کر ہمیں بیس لاکھ روپے دیئے تھے۔''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاکھ کی سچ مچ اہمیت ہوا کرتی تھی۔ جس کے پاس اتنی رقم ہوتی تھی اسے دولت مند سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک کیس کا پانچ لاکھ لیتے تھے۔ گویا دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ ''تم اسے محفوظ کس طرح رکھتے ہو؟''

وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''ہم اسے جدید ترین سائنسی طریقے سے محفوظ کرتے ہیں۔ دس سال...... بیس سال جتنے عرصے چاہیں محفوظ کر سکتے ہیں۔ ابھی ہم ملکی سطح پر کام کر رہے ہیں لیکن جلد





اسے بین الاقوامی سطح تک لے جائیں گے۔''

''یعنی بڑے پیمانے پر حرامزادے پیدا کرو گے۔'' میں نے دل میں سوچا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''سنو اگلی بار مزاحمت مت کرنا۔ میں وعدہ کرتا ہوں اپنا کام کر کے ہم تمہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

''اس دنیا سے جانے کی۔'' میں نے پھر دل میں سوچا اور مکاری سے جواب دیا۔ ''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس طرح باندھ کر۔''

''یہ ہماری مجبوری ہے۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور ایک اسٹینڈ لا کر میرے برابر میں رکھ دیا اس پر ایک ڈرپ لٹکی تھی۔ اس نے ڈرپ کی سوئی میرے بازو میں اُتاری اور پھر ڈرپ میں کچھ انجکشن بھی خالی کر دیئے۔ پھر اس نے میرا بازو تھپکا۔ ''اب آرام کرو۔ میں نے نیند کی دوا بھی ڈال دی ہے۔ صبح ملاقات ہو گی۔''

''میں بوکھلا گیا۔'' کیا مطلب پھر رات ہو گئی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس وقت نو بج رہے ہیں۔''

''دیکھو مجھے جانے دو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ تم نہیں جانتے میرا تعلق کن لوگوں سے ہے اور وہ تم تک آ گئے تو تمہیں پناہ نہیں ملے گی۔''

وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اگر ہم تک آئے تو۔'' وہ بولا۔ ''بھلا انہیں کیا معلوم کہ تم کہاں ہو اور کس کے پاس ہو۔''

''ایسا مت کہو۔'' میں نے ذہن پر طاری ہونے والی غنودگی سے لڑتے ہوئے کہا۔ ''موت کب کہاں سے آ جائے انسان کو پتا نہیں چلتا ہے۔ اس لیے تم بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہو۔''

اس نے میرا گال تھپتھپایا۔ ''سو جاؤ بچے...... اور ہاں صبح مونا کے ساتھ تعاون کرنا ورنہ وہ تمہیں ایسے انجکشن بھی دے سکتی ہے کہ تمہارے دماغ کی شریان پھٹ جائے۔ اس عمر میں تم مرنا یا مفلوج ہو کر بستر پر پڑے رہنا پسند کرو گے۔''

میرے بدن میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ کتنے آرام سے مجھے دھمکا رہا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ وہ چلا گیا اور اس کے جاتے ہی مونا آ گئی۔ اس کے انداز میں طیش تھا اور اس کا غصہ کرنا فطری تھا میں نے جس طرح اس کی کوشش ناکام بنائی تھی اس سے پہلے شاید اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور بلی کی طرح غرائی۔

''اب کے میں نے ہلکا انجکشن دیا تھا۔ آئندہ ایسا انجکشن دوں گی کہ تم ہل بھی نہیں سکو گے۔''

''ہلا تو میں اب بھی نہیں تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''میں تمہیں نچوڑ کر رکھ دوں گی۔''

''اگر تم کر سکو مونا ڈارلنگ تو ضرور نچوڑ لینا۔'' میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''ویسے تم اور تمہارے شوہر دونوں منافق ہو۔ تم اس کی وفادار بنتی ہو لیکن مجھے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں جو چمک آئی تھی وہ کسی وفادار بیوی کی آنکھ میں نہیں آ سکتی ہے۔''

''بکومت۔'' وہ غرائی اور پھر مجھ پر جھک کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''تم نے کسی قدر سچ کہا ہے۔ معروف کے بعد تم پہلے شخص ہو جو مجھے اچھے لگے ہو۔ اگر تم میرے کام آؤ تو میں تمہارا دل بھی خوش کر دوں گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''اس سے بہتر ہو گا کہ میں کسی طوائف کی قُربت قبول کر لوں۔ وہ تم سے لاکھ درجے بہتر ہو گی۔ کم سے کم بے ضمیر تو نہیں ہو گی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اس پر ایک بار پھر دورہ پڑ گیا اور اس نے اپنے خونخوار ناخنوں سے میرے چہرے اور سینے پر نشان ڈال دیئے تھے۔ تکلیف کے باوجود میں مسکراتا رہا۔ آخر تنگ کر وہ بکتی جھکتی چلی گئی۔ میں چہرے اور سینے پر سخت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ڈرپ میں شامل کی جانے والی دوا میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی دیکھنے میں مہذب اور شریف نظر آتے تھے مگر بہ باطن بھیڑیئے سے زیادہ سفاک اور گیدڑ کی طرح بے غیرت تھے۔ ان کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی۔ حالانکہ وہ غریب طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ معروف قریشی کا کارخانہ تھا اور مونا بھی ڈاکٹر تھی۔ دونوں اپنے پیشوں میں محنت کرتے تب بھی کامیابی حاصل کرتے اور عزت بھی کماتے مگر انہیں عزت کا مفہوم ہی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ پیسہ کمانے کے معاملے میں جائز اور ناجائز کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ صرف بے ضمیر ہی نہیں مجرم بھی تھے۔ معروف کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی افراد کے ساتھ یہ حرکت کر چکے تھے اور ان کا کیا ہوا؟ غالباً وہی جو میرا ہونا تھا۔ یہ کسی نوجوان کو اس وقت تک نچوڑتے رہتے تھے جب تک وہ مر نہیں جاتا تھا اور اس کے بعد وہ اس کی لاش خاموشی سے کہیں دفنا دیتے تھے۔ اپنے جرائم کو راز میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور جب میں بھی بے کار ہو جاتا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے۔ تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں انہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ انہیں ان کے مقصد میں ناکام بنا دوں گا۔



میں نے جان گرے کو غور سے دیکھا اور دل میں سوچا میں اسے ناکام بنا دوں گا۔ اس کے پاس جو ریموٹ نما شے تھی شاید وہی اس بیلٹ کی نگران تھی۔ جیسے ہی میں اس کے سگنل کی حد سے باہر جاتا بارودی بیلٹ کا سرکٹ اسے اُڑا دیتا۔ اس نے واقعی بڑا پکا بندوبست کیا تھا۔ فرار کے بجائے مجھے یہ فکر رہتی کہ میں اس سے دور نہ چلا جاؤں۔ میری حالت دیکھ کر جان گرے مسکرا دیا تھا۔

''فکر مت کرو۔ یہ بالکل محفوظ ہے۔ بے شک اسے ضرب بھی لگے تب بھی یہ بلاسٹ نہیں کرے گی۔ ہاں...... تم نے دو سو فٹ کی حد سے ایک انچ بھی باہر قدم رکھا تو پچھتانے کی مہلت بھی





نہیں ملے گی۔''

''میں مہلت چاہتا بھی نہیں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''براہِ کرم مجھے کسی مہم پر لے جانے کے بجائے یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں آرام سے سو کر وقت گزار لوں گا۔''

''نہیں میرے بچے...... تمہارا اس مہم میں شریک ہونا بے حد ضروری ہے۔'' وہ شیریں لہجے میں بولا۔ ''کونسل کے سامنے کارکردگی دکھا کر ہی تم اپنے لیے رعایت حاصل کر سکتے ہو۔''

''اچھا...... کم از کم یہ تو بتا دو کہ مہم کیا ہے۔ تاکہ میں ذہنی طور پر خود کو تیار رکھوں۔''

جان گرے کے اشارے پر گارڈ واپس چلے گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے میز پر ایک نقشہ رکھا تھا۔ یہ افریقہ کے جنوب مشرقی ممالک کا نقشہ تھا اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''یہ ملک آج کل ہمارے مفادات کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اس ملک پر ایک زمانے میں برطانیہ عظمیٰ کی حکومت تھی۔ آزادی کے بعد اس کے سیاہ فام صدر نے یہاں پر آباد گوروں کے خلاف نسل پرستانہ اقدامات شروع کر دیئے۔''

''یعنی تم لوگوں کو تمہارے سکوں میں ادائیگی کرنے لگا۔'' میں ہنسا۔

''اس نے انگریز آبادکاروں سے زمینیں چھین کر سیاہ فاموں میں بانٹنا شروع کیں اور جب سفید فاموں نے اس پر احتجاج کیا تو ان پر اپنی خفیہ فورس سے حملہ کر دیا۔ مشرقی حصے میں ہونے والے فسادات میں ایک سو سے زیادہ سفید فام مارے گئے۔''

میں نے ان فسادات کے بارے میں پڑھا تھا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ اصل میں سفید فام آبادکاروں نے کچھ سیاہ فام عورتوں کو اغوا کر کے ان کی آبروریزی کی اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ اس پر فسادات پھوٹ پڑے اور ان میں کچھ سفید فام مارے گئے تھے۔''

''اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کی پالیسیوں کی وجہ سے پورے افریقہ میں سفید فاموں کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔''

''نفرت اس ملک کے صدر کی وجہ سے نہیں بلکہ تم لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''ورنہ تمہیں اسرائیل اور بوسینیا میں ہونے والی نسل پرستی کیوں نظر نہیں آتی۔''

''سیاست پر بات مت کرو۔'' اس نے ناگواری سے کہا تو میں تلخی سے مسکرا دیا۔

''یہی تو سیاست ہے تم لوگوں کی...... جہاں تمہارے مفاد کے خلاف بات ہو یا تمہیں آئینہ دکھا دیا جائے تو تم اسے سیاست قرار دیتے ہو۔''

''غالباً تم اس مہم کے بارے میں بریفنگ لینا چاہتے تھے۔'' اس نے جھنجھلائے انداز میں کہا۔

''اوکے...... اب میں کوئی سچ نہیں بولوں گا۔'' میں نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''ہمارا ہدف ساحل سے تین کلومیٹر آگے ایک فارم اور اس کے پاس قائم آرمی کیمپ ہے۔''

''آرمی کیمپ سے تو سمجھ میں آتا ہے۔ فارم پر حملہ کس خوشی میں کرنا ہے۔''

''اس فارم کے مالکان نے اس علاقے میں سیاہ فاموں کے خلاف ہونے والی کارروائی میں حصہ لیا تھا لہٰذا انہیں بھی سزا ملنی چاہیے۔''

''تم لوگوں کی تیاریوں سے لگ رہا ہے کہ تم قتلِ عام کی نیت سے جا رہے ہو۔''

''مجرموں کو سزا دینے کے لیے سفاکانہ رویہ اپنانا پڑتا ہے۔'' جان گرے کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس کر بولا۔ ''آج رات کے حملے کے بعد اس ملک کے حکمرانوں کو پتا چل جائے گا کہ سفید فاموں کا خون اتنا بھی سستا نہیں ہے۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تم لوگوں کا یہی رویہ دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ خون چاہے سفید فام کا ہو یا کسی رنگدار باشندے کا برابر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ملک سے ذرا ہی دور ایک اور ملک میں نسل پرست سفید فاموں نے سو سال سے زیادہ مقامی لوگوں کو غلام بنا کر رکھا تھا۔ ان کا بے دریغ قتلِ عام کیا تب تم لوگوں کو احساس نہیں ہوا۔''

جان گرے میری بحث سے جھنجھلا رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''فضول بحث کرنے کے بجائے تیاری کرو۔''

''کیا مجھے بھی کوئی اسلحہ دیا جائے گا۔ میں حملے میں حصہ نہیں لوں گا لیکن ممکن ہے مجھے اپنے دفاع کی ضرورت پیش آ جائے۔''

جان گرے نے ایک کولٹ پسٹل نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ کافی رہے گا تمہارے لیے۔''

میں نے پسٹل لے کر دیکھا۔ یہ میگزین سے لوڈ تھا۔ اعشاریہ اڑتیس کا یہ پسٹل کارکردگی میں بے مثال تھا۔ جان گرے نے اس کے چار اضافی میگزین بھی میرے حوالے کیے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ میں سب سے پہلے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کروں گا۔''

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس بیلٹ کے ہوتے ہوئے مجھے اس قسم کا خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے میری گردن میں بندھی بیلٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید تم سمجھ رہے ہو کہ اس کا ایکٹی ویٹ کرنے کا آلہ یہ ریموٹ ہے تو تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ریموٹ نے اسے آن ضرور کیا ہے۔ مگر اس کے ایکٹی ویشن کا تعلق میرے دل کے ساتھ منسلک ایک ڈیوائس سے ہے۔ اگر تم مجھ سے دو سوفٹ زیادہ دور گئے یا میرے دل کی دھڑکن رُک گئی تو یہ بیلٹ بلاسٹ ہو جائے گی۔''

''یعنی تم سے پاس رہنا اور تمہارا زندہ رہنا میرے لیے ضروری ہے۔''

''درست کہا تم نے۔''

''اور اگر تم اس مہم کے دوران کام آ گئے تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔''





جان گرے عیارانہ انداز میں ہنسا۔ ''اس لیے تم میری حفاظت بھی کرو گے۔''

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے سینے میں سچ مچ کوئی ڈیوائس لگی ہے اور اس سے اس بیلٹ کا چارجر منسلک ہے۔''

''ابھی پتہ چل جائے گا جب ہم نیچے اُتریں گے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''میں اس ریموٹ کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔''

جان گرے مجھے لے کر باہر نکلا۔ جہاں اس کا دہشت گرد دستہ مستعد تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بوٹ کس جگہ لنگر انداز تھی۔ آسمان پر تیرتے بادل تھے اور چاروں طرف مکمل تاریکی تھی۔ بوٹس کی لائٹس بھی بند کر دی گئی تھیں۔ عرشے پر ہلکے نیلے رنگ کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی محدود تھی۔ فوجیوں کے پاس جدید اقسام کا اسلحہ تھا۔ ان میں اسنائپرز رائفلیں اور خودکار ساختہ رائفلوں کے علاوہ دستی بم اور پورٹیبل راکٹ لانچر تھے۔ اس کے علاوہ خاموشی سے حملہ کرنے کے لیے ایروشوٹر تھے جو بے آواز تیر پھینکتے تھے۔ مسلح قاتلوں کا یہ دستہ خون بہانے کے لیے کتنا بے تاب تھا۔ اس کا ان کے چہرے کے حیوانی تاثرات سے بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

''دوستو......'' جان گرے نے گونجتی آواز میں کہا۔ ''آج ہمیں اپنے چند بے گناہ ہم نسل افراد کا انتقام لینا ہے۔ جو سامنے آئے اسے بے دریغ قتل کر دو۔ دشمنوں کو ایسا سبق دو کہ وہ ہمارے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں......''

جان گرے کی اس مختصر سی تقریر کے ساتھ ہی وہ لوگ حرکت میں آ گئے اور بوٹ کے کنارے سے لگی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگے۔ اسی وقت ہوا بھری ربر کی موٹر بوٹس پانی میں اُتار دی گئی تھیں۔ ہر کشتی میں بارہ افراد کی گنجائش تھی اور کل پانچ کشتیاں تھیں۔ مجھ سمیت ترپن افراد تھے۔ میں آخر میں موٹر بوٹ میں اُترا تھا۔ جان گرے میرے ساتھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں کشتیاں ایک طرف روانہ ہو گئیں۔ جب ہماری بوٹ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو انجن کی ہلکی سی آواز آئی جو چند گز سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ ان بوٹس میں کوئی ایسا انجن لگایا گیا تھا جو بہت کم آواز دیتا تھا۔ وہ سب سیاہ کپڑوں میں تھے۔ میری پتلون گہرے رنگ کی تھی اور سفید قمیص چھپانے کے لیے مجھے ایک عدد گہرے رنگ کی جیکٹ دے دی گئی تھی۔

مسلح دستے کی قیادت کرنے والا کرنل سب سے اگلی بوٹ میں تھا۔ وہ متوسط قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا صورت سے سخت مزاج نظر آنے والا شخص تھا۔ راستے میں جان گرے نے ایک چھوٹا سا ہیڈ سیٹ میری طرف بڑھایا یہ بے حد مختصر اور محدود فاصلے پر کام کرنے والا واکی ٹاکی تھا۔ اسے کان کے اندرونی حصے میں پھنسایا جاتا تھا اس کی ساخت ایسی تھی کہ جب تک اسے نکالا نہ جاتا یہ از خود نہیں نکل سکتا تھا۔ اس سے ایک نلکی نکل کر نصف رخسار تک آ رہی تھی۔ جان گرے نے مجھے اس کا فنکشن سمجھایا۔ اس کے کان والے حصے پر ہاتھ رکھو گے تو اس کا مائک کام کرنے لگے گا۔ تم جو بولو گے ''

سب کو سنائی دے گا۔ زیادہ دباؤ دینے کی ضرورت نہیں ہے صرف انگلی رکھنے سے بھی یہ کام کرے گا۔''

''مجھے اس کا فنکشن آتا ہے۔'' اس کے چپ ہونے پر میں نے اطمینان سے جواب دیا اور اسے اپنے کان میں فٹ کرلیا۔ اس وقت کرنل اور پچھلے بوٹس کے کمانڈروں کے درمیان میٹنگ چل رہی تھی اور وہ انہیں حملے کے بارے میں بریفنگ دے رہا تھا یا یہ کہنا چاہیے کہ اپنا پلان بتا رہا تھا جس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ سامنے آنے والے ہر سیاہ فام کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے چاہے وہ عام سویلین ہو یا فوجی۔ آپریشن کا کل وقت ایک گھنٹہ تھا اور اس دوران میں سب کو بہرصورت بوٹس تک واپس آ جانا تھا۔ جان گرے نے دوسری چیز مجھے دی وہ ایک گھڑی کے انداز کا قطب نما تھا۔'' یہ راستہ دکھانے کے لیے ہے لیکن تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ہم سے اور خاص طور سے مجھ سے نہ بچھڑو۔''

''مجھے بھی مرنے کا شوق نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔

بظاہر میں بے فکر تھا لیکن درحقیقت مجھے ان کے عزائم پر سخت تشویش تھی۔ یہ نہ جانے کہاں قتل عام کی مہم پر جا رہے تھے اور ظاہر ہے آپ کسی کے گھر حملہ کرنے جاؤ تو وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھا رہے گا، اپنی جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر تو مارے گا۔ فوجی کیمپ پر حملے کا مطلب تھا کہ بھرپور مزاحمت کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے مگر رات کی تاریکی میں شب خون مارنے والے ان بزدلوں سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ انہوں نے کوئی ایسا منصوبہ بنایا ہوتا جس میں فوراً ان کی جان کو خطرہ ہوگا۔ یہ ہر پہلو پر غور کر کے ہی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے اور ان کی سلامتی خاص طور سے جان گرے سے اپنی سلامتی مشروط ہونے کے باوجود میں شدت سے خواہاں تھا کہ ان کی مہم ناکام ہو اور وہ مار کھا کر واپس جائیں۔

''تمہیں یقین ہے کہ یہ مہم کامیاب ہوگی؟'' میں نے دھیمی آواز میں جان گرے سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم صرف پچاس مسلح افراد لے کر حملہ کرنے جا رہے ہو۔ وہ بھی ایک فوجی کیمپ پر۔''

''تم فکر مت کرو...... ہمارے آدمی بہ حفاظت واپس آئیں گے۔ حملہ ناکام نہیں ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا کہ تو اس نے اشارے سے منع کر دیا۔ ''اب خاموش رہو...... ہم ساحل پر پہنچنے والے ہیں وہاں بلاضرورت آواز مت نکالنا۔''

''او کے باس۔'' میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر ایک آواز دار شے کے بارے میں پوچھا۔ ''اگر آئے تو۔'' اس پر جان گرے نے جو مشورہ دیا اسے ناقابل بیان سمجھا جائے۔

دس منٹ بعد کشتی اتنی آہستگی سے ساحل پر پہنچی کہ جب وہ دھچکے سے رُکی تو مجھے پتا چلا کہ ساحل آ گیا ہے۔ شاید یہ کوئی خلیج تھی۔ یہاں پانی ہموار تھا۔ 'مردِ آہن' جان گرے کہتا ہوا کشتی سے اُتر گیا اس نے ایک خاص بڑی سی رائفل اُٹھائی ہوئی تھی اور غالباً خود کو کسی ایکشن امریکی فلم کا کمانڈر تصور کر رہا تھا۔ اس نے ساحل پر اُتر کر ہاتھ ہلایا اور جھکے جھکے آگے جانے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے



تھے کہ وہ آج کے معرکے میں بذات خود حصہ لینا چاہتا ہے اور یہ میرے لیے خطرے کی علامت تھی۔ اس کی زندگی سے میری جان مشروط تھی اسے کچھ ہوتا تو میری گردن میں بندھی بیلٹ پھٹ جاتی اور میں بلاوجہ مارا جاتا۔

ذرا سی دیر میں وہ سب درختوں کی آڑ میں ایک جگہ جمع تھے۔ کرنل نے انہیں دو گروپس میں بانٹا، بڑا گروپ اس کے ساتھ تھا جسے آرمی کیمپ پر حملہ کرنا تھا اس میں چالیس گوریلے تھے۔ باقی دس گوریلے جان گرے کی قیادت میں فارم ہاؤس پر حملہ کرتے۔ ان کے پاس دستی سائز میں آلے سے نقشہ ایک برقی اسکرین پر ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس کی مدد سے دونوں ٹیمیں بھٹکے بغیر اپنے ہدف تک جا سکتی تھیں۔ سب نے اپنی گھڑیاں ملائیں...... ظاہر ہے میں جان گرے والے گروپ میں تھا اور اس کا کام نسبتاً آسان تھا۔ اسے نہتے فارم ہاؤس کے مکینوں پر حملہ کرنا تھا۔ دستی نقشہ جان گرے کے پاس تھا اور وہ آگے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں مَیں تھا اور مجھ سے پیچھے دس مسلح گوریلے۔

بڑی رائفل اُٹھا کر جان گرے کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ کسی ناگہانی کی وجہ سے اس کے اور میرے درمیان دو سو فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں آیا۔ نقشے کے مطابق فارم ہاؤس کوئی ساڑھے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد جان گرے رُکا اور اس نے گوریلوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

''آتے جاؤ...... دیکھو...... پہریدار یا کتے ہوں تو انہیں بے آواز طریقے سے ٹھکانے لگا دو۔''

''یس سر۔'' دستے کے کمانڈر نے جواب دیا اور وہ چاروں طرف پھیل کر آگے جانے لگے میں اور جان گرے درختوں کی آڑ میں ان کے عقب میں تھے۔ جان گرے اس انداز سے آگے جا رہا تھا کہ ایک درخت کی آڑ میں آگے بڑھتا...... چند لمحے رُک کر سن گن لیتا اور پھر دوسرے درخت کی آڑ میں پہنچ جاتا۔ مجھے بلاوجہ افسوس ہوا کہ میں اس کی جان کی فکر کر رہا تھا۔ اسے خود اپنی جان کی فکر مجھ سے کہیں زیادہ تھی اور وہ اس معاملے میں ذرا سا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے خود آگے رہنے کے بجائے گوریلوں کو حملے کے لیے بھیجا تھا ورنہ اس کے پیش قدمی کرنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اکیلے ہی فارم ہاؤس پر دھاوا بول دے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے یہ حماقت نہیں کی ورنہ امکان یہی تھا کہ وہ مارا جاتا اور اس کے ساتھ میں بھی۔

درحقیقت مجھے ان لوگوں کا سارا پلان ہی احمقانہ اور خوش فہمیوں سے بھرپور لگ رہا تھا۔ وہ اندازوں سے ایک اجنبی سرزمین پر اپنے طے شدہ اہداف پر حملہ کرنے جا رہے تھے اور ان کی منصوبہ بندی کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ وہ دشمن کو بے خبری میں جالیں گے اور ایسا نہ ہوتا تو انہیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بہرحال میں مجبور شخص تھا۔ نہ ان کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ انہیں روک سکتا تھا۔ ہاں بازی جاتی تو مفت میں مارا جاتا۔

''کیا آگے جانے کا ارادہ نہیں ہے؟'' میں نے جان گرے سے دریافت کیا۔

''خاموش رہو۔'' وہ غرایا۔

''میرا گانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' میں چپ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ''خاص طور سے تمہارے ہاں جس طرح اوپیرا میں کفن پھاڑ کر گایا جاتا ہے وہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔''

''خدا کے لیے چپ رہو۔'' جان گرے جھلا گیا تھا اور شاید پہلی بار مجھے ساتھ لانے پر پچھتا رہا تھا۔

میں نے اپنا پستول نکال کر اور اسے گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔ بادل ہٹ جانے سے ماحول کسی قدر روشن ہو گیا تھا۔ ''اگر میں اپنا نشانہ آزمانا چاہوں...... بہت دن ہو گئے پسٹل استعمال کیے ایسا نہ ہو کہ میں مار کسی اور کو رہا ہوں اور گولی تمہیں لگ جائے میں بھی بلاوجہ مارا جاؤں۔''

جان گرے نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تمہاری زبان میں خارش ہو رہی ہے۔''

''میرے ہاتھ میں بھی ہو رہی ہے۔'' میں نے پسٹل چاروں طرف یوں گھمایا جیسے موزوں نشانہ تلاش کر رہا ہوں اور پھر اسے لا کر جان گرے کے چہرے کے سامنے روک دیا۔

''کک...... کیا کر رہے ہو۔ چل نہ جائے۔''

''چل جائے گی۔'' میں نے حیرت سے پستول کی طرف دیکھا۔ ''اس کے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔''

اس پر تپ کر جان گرے نے مجھے مطلع کیا کہ پسٹل کے اور بھی بہت سارے اعضا نہیں ہیں۔ میں ہنس دیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔ وہ جان گیا تھا کہ میں اسے چھیڑ رہا ہوں۔ اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر کسی سے پوزیشن دریافت کی۔ فوراً ہی میرے کان میں ایک آواز گونجی۔ ''سر یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہم فارم ہاؤس کے احاطے کے پاس ہیں۔''

''مائی گاڈ!'' اچانک کوئی دوسرا شخص چلایا۔ ''یہ کیا بلا ہے؟''

آواز نہ صرف ہیڈ سیٹ سے بلکہ ویسے بھی میرے کانوں تک آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک برسٹ پڑا اور ساری راز داری ہوا ہو گئی۔ جان گرے بے اختیار گالی دے کر آگے کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ ''ارے...... ارے...... اس عمر میں اتنا تیز دوڑنا بعض اوقات دل کے دورے کا سبب بن جاتا۔''

''شٹ اپ......'' وہ رک کر غرایا۔ ''ہوشیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گولی تمہاری بے لگام زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔''

فارم ہاؤس کی طرف سے سنگل فائر کی آواز آئی۔ فائر رائفل کا تھا اور ان میں سے کسی کے پاس ایسی رائفل نہیں تھی یہ فائر فریق مخالف کی طرف سے کیا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ فائر کے ساتھ ایک کربناک چیخ بھی گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ سیٹ پر زلزلہ آ گیا تھا۔ سب ہی بول رہے تھے۔ پھر





معلوم ہوا کہ نمبر چار کی طرف سے جواب نہیں مل رہا ہے یعنی وہ مرحوم ہو چکا تھا یا کم سے کم جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جان گرے نے چلا کر انہیں فارم ہاؤس پر فائر کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اس حکم کے لیے چلانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی زور و شور سے فارم ہاؤس کی طرف گولیاں برسائی جانے لگیں۔ دوسری طرف سے بھی جواب دیا جا رہا تھا۔ بہرحال شب خون مارنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ اگرچہ فائرز سے پتا چل رہا تھا کہ حملہ آور جدید ترین اور مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ دفاعی فائر ان کے مقابلے میں کمزور تھا۔ جان گرے مسلسل اپنے ساتھیوں کو بڑھاوا دے رہا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں گھس جائیں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

مگر جان گرے کے ساتھی بھی اس کی طرح بزدل تھے۔ جدید اسلحے اور فوجی تربیت سے لیس ہونے کے باوجود ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فارم ہاؤس میں درانہ وار گھس جائیں۔ وہاں سے بے شک کمزور لیکن مسلسل فائرنگ جاری تھی اپنے ایک ساتھی کے مارے جانے سے ان کے جوش و ولولے میں خاصی کمی آئی تھی۔ جان گرے اس وقت فارم ہاؤس سے تقریباً پچاس ساٹھ گز دور ایک بڑے درخت کے عقب میں بیٹھا تھا۔ اور وقفے وقفے سے اپنی رائفل سے فارم ہاؤس پر برشٹ مار رہا تھا۔ اس کی یہ فائرنگ بے سود رہی تھی۔ کیونکہ اول تو فارم ہاؤس درختوں کی آڑ میں تھا اور دوسرے درمیان میں ایک نالے کا اونچا پشتہ بھی حائل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔

''گولیاں ضائع مت کرو۔ ممکن ہے کہ بہتر موقع پر کام آئیں۔''

اس مشورے پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا مگر فائرنگ روک دی تھی۔ اس دوران اس کے ساتھی گوریلے آگے جانے سے ہچکچا رہے تھے حتیٰ کہ جان گرے نے دھاڑ کر انہیں ایڈوانس کرنے کا حکم دیا۔

''سر فائر بہت تیز ہے۔'' کمانڈر نے منمنا کر کہا۔

''ہمارے پاس کیا چڑیا مارنے والی گنیں ہیں۔'' جان گرے غرایا۔ ''ان پر فائرنگ کرو سب کو اڑا کر رکھ دو۔ اگر اندر سے مزاحمت کم ہو تو ان پر راکٹ مارو۔''

''سر میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' کمانڈر خوش ہو گیا۔

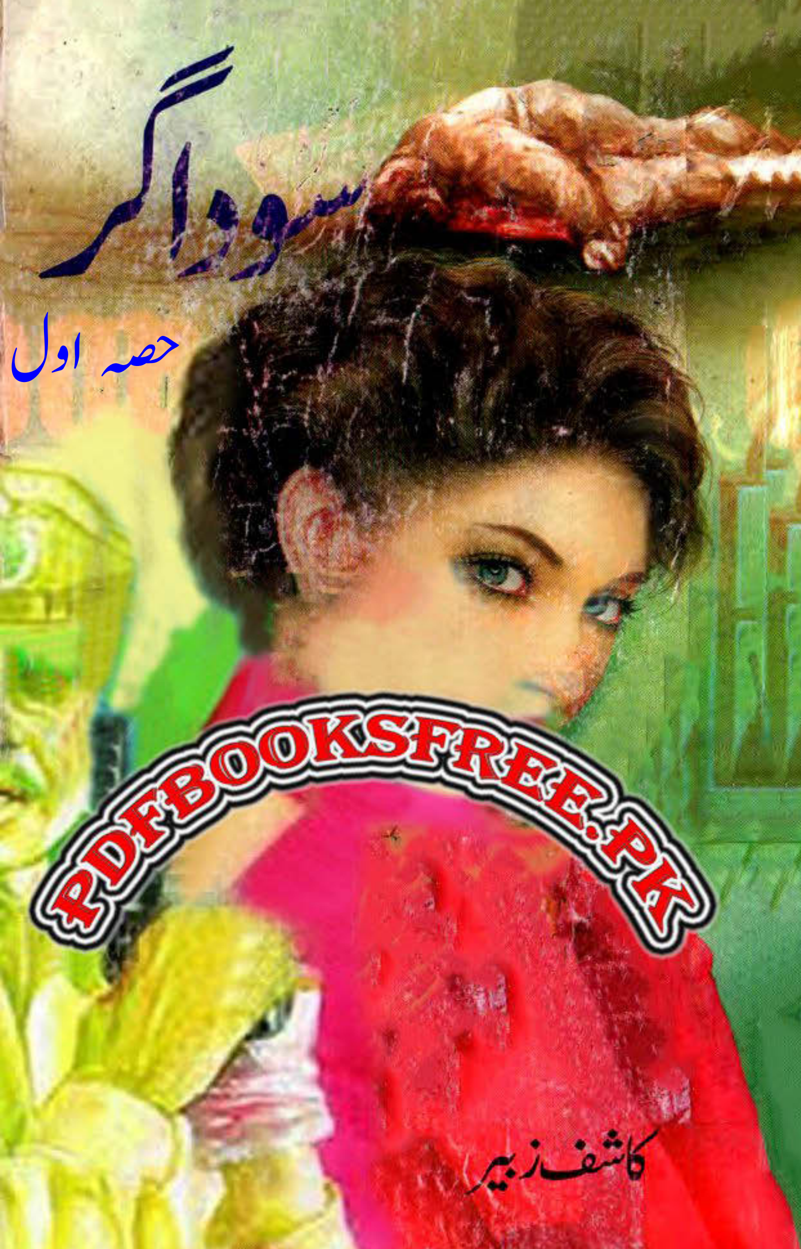
''تمہیں یہاں پکنک منانے نہیں بھیجا ہے مسٹر کمانڈر۔'' جان گرے نے طنز کیا۔ ''اپنی عقل بھی استعمال کرو۔'' اب مجھے فارم ہاؤس والوں کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ آڑ میں ہو کر گولیوں سے تو بچا جا سکتا تھا لیکن راکٹ تو آڑ کو ہی اڑا دیتا۔ اس سے کیسے بچتے۔ چند لمحے بعد ایک شعلہ سا لپک کر فارم ہاؤس کی طرف گیا اور میں نے وہاں سے آگ کا بادل نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ نہایت خطرناک راکٹ تھا اس نے فارم ہاؤس کی عمارت کو اڑا کر رکھ دیا تھا۔ فارم ہاؤس کے جلنے سے روشنی ہوئی تو مجھے پہلی بار اس کے معائنے کا موقع ملا۔ فارم ہاؤس خاصے بڑے رقبے پر پھیلا تھا۔ نالے کے پار کھیت تھے جن میں مکئی کی فصل لگی تھی۔ اس کے پار فصل ذخیرہ کرنے والے گودام

اور مویشی خانے تھے راکٹ گودام کو جا کر لگا تھا اور اس کی لکڑی کی عمارت دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ مکینوں کے لیے رہائشی عمارات ان کے عقب میں تھیں۔ اگلی باری ان کی تھی۔ دوسرے راکٹ کو میں نے مویشی خانے سے ٹکراتے دیکھا یہ بدحواس مویشی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے اور پوری آواز سے چلا رہے تھے۔

''ان جانوروں نے کیا قصور کیا ہے؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''وہ لوگ یہاں سے ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔'' جان گرے سفاکی سے بولا۔''ان سب کا صفایا ضروری ہے۔''

ایک بار پھر میں نے بہ مشکل خود کو جان گرے کی منحوس کھوپڑی میں سیسہ اُتارنے سے روکا۔ یکے بعد دیگرے فارم ہاؤس کی عمارتوں پر راکٹ برسے اور انہیں ملبے کا ڈھیر بناتے رہے اور میں بے بسی سے دیکھتا رہا۔ فارم ہاؤس کے مکینوں کے لیے اس گولہ باری کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کئی افراد کے ٹکڑے فضا میں بلند ہوتے دیکھے۔ ایک فرد شعلوں میں گھرا بھاگتا ہوا میدان کی طرف آیا تھا بیک وقت کئی برسٹ اسے لگے اور وہ زمین پر گرنے سے پہلے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جان گرے یہ سب دیکھ دیکھ کر وفورِ مسرت سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے دھاڑ کر اپنے گوریلوں کو فارم ہاؤس میں گھسنے اور وہاں پر زندہ ہر فرد کو دیکھتے ہی ٹھنڈا کرنے کا حکم دیا۔



سوداگر
حصہ اول
PDFBOOKSFREE.PK
کاشف زبیر

# پیش رس

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بندے کو وہاں سے روزی دیتے ہیں جہاں روزی پانے کا اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا ہے۔تو کچھ ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کے ساتھ فرمایا۔گریجویشن کے بعد ماسٹرز میں داخلے کا منتظر تھا اور وقت گزاری کے لیے قلم اٹھایا تو آج تک اسے نیچے رکھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔چودہ سال پہلے جاسوسی پبلی کیشنز سے منسلک ہوا اور پہلی تحریر سے محترم معراج رسول صاحب نے ایسی قدر افزائی کی کہ آج تک اس معتبر ادارے کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔

اب تک بے شمار کہانیاں لکھیں ،نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی پھر قسط وار کہانی کا خیال آیا۔سوچا تھا کہ میری ہر تحریر کی طرح اسے بھی جاسوسی پبلی کیشنز کے کسی رسالے میں چھپنے کا اعزاز حاصل ہوگا لیکن قسمت نے ''سوداگر'' کے صفحات محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کے ''نئے افق'' میں مخصوص کر دیئے تھے اور اب اسے کتابی شکل میں لانے کے لیے محترم عبدالغفار بھائی کا شکر گزار ہوں۔

اس کہانی کو میری توقع سے زیادہ پزیرائی ملی۔پڑھنے والوں کی پسندیدگی نے اس کہانی کو طوالت کی طرف گامزن کرایا۔یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل وغارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مقصود تھا چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔انسانی عقل وفہم محدود ہے۔وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔خیر وشر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار ورموز سے آگاہی ممکن نہیں۔

''سوداگر'' کی نئے افق میں پسندیدگی میری توقع سے بڑھ کر رہی اور اسی پسند کی بنا پر اسے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔امید ہے قارئین اس سے کتابی شکل میں زیادہ محظوظ ہوں گے۔

کاشف زبیر

میری نگاہیں پریشر بتانے والے میٹر کی سوئی پر مرکوز تھیں۔ سوئی خطرے کے سرخ نشان کی آخری حدوں پر تھی اور بوائلر کسی بھی لمحے پھٹنے والا تھا۔ جس کے ساتھ ہی میرے جسم کے پرخچے اُڑ جاتے۔ صورتِ حال نہایت سنگین تھی۔ میرے ساتھ مزید تیس آدمیوں کی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں۔ میں نے ایک نظر پھر میٹر کو دیکھا اور ہتھوڑا سر سے بلند کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''آر یا پار۔''

صرف دس منٹ پہلے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ فاکس نے میرے کیبن کے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر ڈالی۔ میں گہری نیند سے جاگا۔ تو چند لمحے صورتِ حال کو سمجھ نہ سکا۔ کمرا یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آیا ہوا ہو۔ میں نے کیبن کے پورٹ ہول سے باہر دیکھا۔ تاریکی میں سمندر سے اٹھنے والی دیو پیکر لہریں اٹھارہ ہزار ٹن وزنی اور تین سو بارہ فٹ لمبے خلیج کے مضبوط پیکر سے ٹکرا رہی تھیں۔ طوفان زوروں پر تھا۔

''یوسف۔'' باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔ ''جلدی انجن روم میں پہنچو۔ ایمر جنسی ہے۔''

ایمر جنسی کا لفظ سن کر میں چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ طوفان اور ایمر جنسی کو کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جنہوں نے میرے خواب شیریں میں خلل ڈالا تھا۔

''یوسف۔'' باہر سے پھر کوئی چلایا۔ شاید اس بار کپتان کا نائب معاذ خود چلا آیا تھا۔ وہ سیکنڈ آفیسر تھا اور میں تھرڈ آفیسر۔

''آ رہا ہوں۔ کپڑے تو پہن لوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ طوفان کی گرج کے باعث چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔

بُری طرح ڈولتے کیبن میں بہ مشکل میں نے جسم پر وردی چڑھائی۔ دروازہ کھولا سامنے معاذ کھڑا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''اگر خلیج ڈوب گیا تو تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم نے کچھ پہن رکھا ہے یا نہیں۔ فوراً انجن روم میں پہنچو۔ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''مجھے فرق پڑے گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کم از کم میں آبی مخلوق کے سامنے بے لباس جانا

پسند نہیں کروں گا۔"

معاذ حسین عراقی تھا اور اس کی حسِ مزاح صدام حسین سے کچھ ہی بہتر تھی۔ لہٰذا میرے جملے پر وہ مجھے غلط نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں انجن روم کی طرف بھاگا۔ ایسی کیا ایمرجنسی تھی کہ انجن روم انجینئر کو سوتے سے اٹھا کر بلایا گیا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی میں آ کر سویا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز رُک گیا تھا۔ انجن روم میں میرا نائب صام بدحواس سا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی چلا کر کہا سر بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام ہو گئے ہیں اور پریشر بڑھ رہا ہے۔"

"والوز کیسے جام ہو گئے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "کیا انہیں روانگی کے وقت چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی سر! ابھی جب انجن بند کرنے کے بعد دوسرے بوائلرز کے سیفٹی والوز کھولے گئے تو پتا چلا کہ نمبر چار کا سیفٹی والو جام ہے۔ باقی والوز چیک کیے گئے تو وہ بھی جام نکلے۔"

"میرے خدا۔" میں نے بوائلر نمبر چار پر پریشر میٹر کو دیکھا۔ جس کی سوئی رفتہ رفتہ خطرے کے سرخ نشان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بوائلر کو اگرچہ حرارت کی فراہمی بند کر دی گئی تھی لیکن اس کے اندر کھولتا ہوا پانی موجود تھا جو مسلسل بھاپ بنا رہا تھا۔ بحری جہاز کا انجن عام انجنوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی اسی اصول پر کام کرتا ہے۔ جس پر کار یا ٹرک کا انجن کام کرتا ہے۔ یعنی دباؤ اور خلاء کی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پسٹن کو متحرک کرنا۔ مگر سائز اور دیگر معاملات میں یہ عام انجنوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ اسے نہ تو فوری طور پر چلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی فوری طور پر روکا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کام مرحلہ وار کیے جاتے ہیں۔

اب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ عام حالات میں صرف انجن انجینئر ہی انجن بند کر سکتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں کوئی بھی فرد بہ شمول کپتان کے انجن بند کروانے کا مجاز نہیں ہوتا لیکن بوائلر نمبر چار نے جو خطرناک حالات پیدا کر دیئے تھے اس میں کپتان نے اپنے ہنگامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے انجن بند کروا دیا تھا۔ جو کہ ایک فاش غلطی تھی۔ انجن چلتے رہنے کی صورت میں کچھ نہ کچھ پریشر خارج ہوتا رہتا ہے۔ انجن بند ہوتے ہی خارج ہونے والا پریشر بھی بوائلر میں جمع ہو رہا تھا۔ اگر سیفٹی والو کسی وجہ سے کام نہ کر رہا ہوتا تو اسے فنی خرابی قرار دیا جا سکتا تھا لیکن سارے والوز بیک وقت کیسے جام ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی انسان کا کارنامہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی فرد کا نام آ رہا تھا۔ جسے ہم بارہ گھنٹے پہلے بمبئی میں چھوڑ کر آئے تھے۔

انجن روم کے عملے کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ صرف انجن روم ہی نہیں بلکہ پورا جہاز خطرے میں تھا یہ جگہ چوتھے لیول پر بحری جہاز کے پیندے کے بالکل پاس تھی اگر بوائلر پھٹ جاتا اور اس سے جہاز کی چادر میں کوئی شگاف پڑ جاتا تو اس طوفانی موسم میں خلیج کو ڈوبنے میں دو گھنٹے بھی





نہ لگتے۔ جہاز پر سامان اپنی پوری گنجائش کے مطابق لدا ہوا تھا۔ میں نے بوائلر اٹینڈیڈ گپتا سے کہا۔

"بڑا رینچ پانا لاؤ۔"

گپتا نے پھرتی سے رینچ پانا مجھے تھمایا۔ میں نے ایک والو کے نٹ میں پانا پھنسا کر اسے گھمانے کی کوشش کی لیکن اس نے ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ عام حالات میں یہی والو آرام سے کھل جاتا تھا۔ میں نے اگلی بار پوری طاقت صرف کر دی۔ ایک زمانے میں مجھے باڈی بلڈنگ کا شوق چڑھا تھا اور میں نے جمنازیم میں خاصی جان ماری تھی۔ باڈی بلڈنگ چھوڑے مدت ہو چکی تھی۔ وہ پہلے جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن زور آزمائی میں کوئی عام فرد میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار بھی والو نے حرکت نہیں کی۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ آخر یہ کتنی سختی سے بند تھا جو کھل ہی نہیں رہا تھا۔ پریشر میٹر کی سوئی خطرے کے سرخ نشان تک آ پہنچی تھی اور انجن روم کا عملہ خوف زدہ ہو کر بوائلر سے دور ہٹ گیا تھا۔

"دوسرے بوائلرز کے آرٹریج والوز کھول دو۔" میں نے چلا کر کہا۔

عملہ بھاگ بھاگ کر بوائلرز کے آرٹریج والوز کھولنے لگا۔ سنسناتی بھاپ پائپوں کے ذریعے بحری جہاز کی چمنی سے خارج ہونے لگی۔ یقیناً اس وقت چمنی کے دہانے سے بھاپ کے گہرے بادل اُٹھ رہے ہوں گے۔ بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام ہونے سے جو دھماکا خیز صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ باقی بوائلرز کا پریشر خارج کر دیا جائے۔ تاکہ بوائلر نمبر چار پھٹنے سے بوائلرز متاثر نہ ہوں۔ میں نے میٹر کی طرف دیکھا ذرا سی دیر میں سوئی خطرے کے نشان کی حد سے خاصی آگے جا چکی تھی۔ ایک لمحے کو تو میرے ذہن میں آیا کہ انجن چلانے کا حکم دوں لیکن فوراً ہی میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ انجن چلانے سے بوائلرز کا پریشر استعمال ہونے لگتا لیکن پسٹن کے حرکت میں آنے سے پہلے جب بوائلر نمبر چار کو مزید حرارت ملتی اور وہ زیادہ بھاپ بنانے لگتا تو عین ممکن تھا کہ بوائلر فوراً پھٹ جاتا۔ نہیں اب انجن چلانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ہمیں بوائلر کا دباؤ ہر صورت میں خارج کرنا تھا۔ سوئی خطرے کی حد میں نصف فاصلہ طے کر چکی تھی۔ بوائلر کسی لمحے بھی پھٹ سکتا تھا۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ میں سر پر پیر رکھ کر انجن روم سے نکل بھاگوں۔ مگر بوائلر پھٹنے کی صورت میں جہاز ڈوبنے کا نوے فیصد امکان تھا۔ باہر جس قسم کا طوفان جاری تھا اس میں لائف بوٹس بھی ہماری جان بچانے میں زیادہ مددگار ثابت نہ ہوتیں۔

"صاحب بھاگو۔" گپتا چلایا۔ "بوائلر پھٹنے والا ہے۔"

"ہتھوڑا لاؤ۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ میں نے جھک کر بہ غور دیکھا تھا مجھے اپنے شبہے کی تصدیق ہوتی محسوس ہوئی۔ والو کے کناروں سے کوئی سیاہ سی میلی سی شے جھانک رہی تھی۔ یہ اُس خبیث کا کام تھا اس نے بمبئی میں جہاز سے اُترنے سے پہلے یہ حرکت کی تھی۔ اسے یقین ہو گا جب تک ہم اس کی حرکت سے آگاہ ہوں گے جہاز کھلے سمندر میں خاصا آگے نکل چکا ہو گا۔ جب بوائلر

پھٹے گا اور تباہی پھیلے گی جہاز غرقاب ہو جائے گا اور کوئی اس کی حرکت کے بارے میں نہیں جان سکے گا۔ بلاشبہ اس کے پاس شیطانی ذہانت تھی جس کی مدد سے اس نے شیطانی قسم کا یہ منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا تھا۔ اسے اکتیس آدمیوں کی زندگی کی قطعی پروا نہیں رہی ہوگی۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔

''صاحب ہتھوڑا۔'' گپتا نے لرزتے ہاتھوں سے مجھے ہتھوڑا دیا۔ ''ابھی بھی وقت ہے صاب۔''

''گپتا چپ رہو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔ رنچ پانا میں پہلے ہی آڑ ترچھ والو میں پھنسا چکا تھا۔ میں نے ہتھوڑا سر سے بلند کیا اور اسے پانے پر دے مارا۔ وہ ذرا سا لرزا لیکن جھکا نہیں تھا۔ ہتھوڑے بازی میں یہ خطرہ تھا کہ نشانہ چُوک جائے اور کچھ دیر کا پھٹتا بوائلر فوراً ہی پھٹ جائے۔ میں نے ہتھوڑا پھر بلند کیا۔

''بھاگ چلیں صاب۔'' گپتا گھگیایا۔

میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر زیادہ قوت سے ہتھوڑا پانے کے سرے پر مارا۔ اس دفع رنچ پانا لرزنے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا جھکا بھی تھا۔ میرے دل میں امید کی ایک کرن جاگی۔ والو میں ڈالا گیا سلوشن اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے تیسرا وار کیا۔ پانا لرزا تھوڑا سا جھکا۔ پھر ضرب کی قوت نے اسے اُچھالا۔ وہ تیر کی طرح میرے سر کے پاس سے گزرا تھا۔ میں بال بال بچا تھا۔ اگر پانا میرے سر پر لگ جاتا تو میرے سر کے کئی ٹکڑے ہو جاتے اور میں فوراً ہی راہی ملکِ عدم ہوتا۔ رنچ پانا دیوار کے ساتھ گزرتے پائپوں کے نیچے جا گرا تھا۔

''گپتا پانا لاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔ مگر گپتا وہاں کہاں تھا۔ وہ پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ میرے پاس اسے بُرا بھلا کہنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے پانا فولادی پائپوں کے درمیان سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر پائپ اور فرش کے درمیان اتنا خلا نہیں تھا کہ میں ہاتھ ڈال کر پانا نکال سکتا۔ میں نے اوپر دیوار کے ساتھ ہاتھ ڈال کر پانا نکالنا چاہا لیکن وہ اس بار بھی میری دسترس سے دور ثابت ہوا تھا۔ میں نے واپس آ کر ہتھوڑا اٹھایا اور ایک نظر پریشر میٹر کی سوئی پر ڈالی۔ جس کی سوئی اب آخری حد سے کچھ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے ہتھوڑے کے دستے کی مدد سے پانے کو باہر کی طرف سرکایا۔ یہ ایک اور مشکل کام ثابت ہوا۔ کئی بار پانا ذرا سا سرک کر رہ جاتا۔ لمحے میرے ہاتھ سے پھسلے جا رہے تھے کسی بھی لمحے انجام قریب ہو سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے پانا باہر نکلا اور میں اسے لے کر بوائلر کی طرف لپکا۔ اس بار میں نے رنچ پانا پوری قوت سے والو میں پھنسایا تا کہ وہ پھر سلپ نہ کر جائے۔ رنچ پانا افقی انداز سے خاصا اوپر تھا اگر میں اسے افقی پوزیشن میں لے آتا تو امید تھی کہ والو کھل جائے گا۔ میری پہلی ضرب پر پانے نے یہ مشکل پانچ درجے زاویئے کا سفر کیا لیکن اگلی ضرب پر پانا زیادہ نیچے آیا تھا اور اس سے اگلی ضرب پر افقی انداز سے بھی نیچے چلا گیا۔ میں نے ہتھوڑا پھینک کر پانے کو زور بازو سے گھمانا شروع کر دیا۔




والو کسی حد تک کھل گیا مگر اس کی چوڑیوں میں ڈالا جانے والا سلوشن زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ خاصی دقت کے ساتھ میں پانے کو ایک بار اوپر سے نیچے لاتا تھا۔ جب کہ والو کو ایک بار چکر دینے کے لیے پانے کو چار بار اوپر سے نیچے کرنا پڑتا تھا۔ جتنی تاخیر ہو رہی تھی خطرہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی کھولتے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوں۔ جو ابھی پھٹ کر میرے وجود کو نابود کر دے گا۔ یہ سوچ کر میں پوری طاقت سے رنچ پانا گھمانے لگا تھا۔

دوسرے چکر کے بعد والو کسی قدر آسانی سے کھلنے لگا اور شاید تھوڑا بہت پریشر خارج ہو رہا تھا۔ مجھے میٹر کی سوئی معمولی سی واپس آتی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ایک نئے عزم کے ساتھ والو گھمانا شروع کر دیا۔ تیسرے چکر کے ساتھ ہی سنسناتی بھاپ کے خارج ہونے کی دل نشین آواز آنے لگی۔ قریب آتی سوئی اب دور جانے لگی تھی پریشر ختم ہو رہا تھا۔ ہر چکر کے ساتھ ہی بھاپ خارج ہونے کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پورا والو کھولنے پر شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا تھا۔ بوائلر میں نہ جانے کتنا پریشر جمع ہو چکا تھا۔ بھاپ کو بوائلر کی مقید فضا سے نکلنے کا موقع ملا تھا تو وہ پورا جوش دکھا رہی تھی۔ بوائلر کی دیواروں نے بلاشبہ سینکڑوں ٹن فی مربع انچ کا دباؤ برداشت کیا تھا اگر بوائلر عام فولاد کی چادر سے بنا ہوتا تو کب کا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوتا مگر یہ بوائلر خاص فولاد سے ڈھالے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں جوڑ نہیں ہوتا اور یہ بے انتہا دباؤ برداشت کر سکتا ہے۔

میری نظر میٹر کی سوئی پر تھی۔ جو رفتہ رفتہ سرخ نشان سے واپس آ رہی تھی اگرچہ اس کی رفتار سُست تھی لیکن بوائلر پھٹنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ بھاپ کے اخراج کے ساتھ ہی دباؤ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ خاصی دیر بعد ایک انجن مین احمد علی نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر اس نے بھاپ نکلنے کا شور سنا اور اندر آ گیا۔ اس کی نظر بھی میٹر پر مرکوز تھی۔

''صاحب! آپ نے ہم سب کو بچا لیا۔'' اس نے شدت جذبات سے رندھی آواز میں کہا۔ ''اگر بوائلر پھٹ جاتا۔''

''تو ہم تہہ میں ہوتے اور مچھلیوں کی خوراک بن رہے ہوتے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن ایسا نہیں ہوا ہے لہٰذا اس پر دماغ کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

یک لخت مجھے کمزوری کا احساس ہوا۔ چند منٹ کی اس کش مکش نے جیسے میری توانائی نچوڑ لی تھی۔ اکتیس افراد موت کے منہ میں جا کر نکل آئے تھے اور اس کا ذمے دار ایک شخص تھا یعنی جان گرے۔



''خیال رکھنا۔'' عرب پرشین شپنگ کمپنی کے کراچی آفس کے ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا۔ ''تم جس شخص کے ساتھ کام کرنے جا رہے ہو وہ میرین ٹرن کی دنیا میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔''

"میں نے اس سے پہلے بھی کئی شیطان دیکھے اور بھگتے ہیں۔" میں مسکرایا۔

"لیکن جان گرے جیسا شیطان شاید ہی دیکھا ہو۔" ڈائریکٹر نے کہا اور مجھے مختصراً جان گرے کی ہسٹری بتائی۔ اس کا پورا نام جان جیفرسن گرے تھا اور اس کا تعلق امریکہ سے تھا۔ وہ نسلی تفاخر کا مارا ایک گورا تھا جو صرف اس وجہ سے اس ایشیائی کمپنی میں کام کر رہا تھا کہ مغربی ممالک کی تمام میرین لائنز نے اسے بلیک لسٹ کر دیا تھا۔ جو شخص انجن روم میں بھی شراب کے نشے میں دھت رہتا ہو اور اس کے ہاتھ میں ہر وقت سلگتا سگار ہو اس کے جہاز کی سلامتی تو ویسے بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ایک ذرا سی بے احتیاطی اور جہاز غرق۔ وہ ایک اچھا انجینئر تھا لیکن اس وقت جب نشے میں نہ ہو اور ایسے مواقع کم ہی آتے تھے جب وہ نشے میں نہ ہو۔ اس کے باوجود اسے عرب پرشین کمپنی سے نہ نکالا جاتا اگر وہ مکا مار کر ایک ایرانی ڈائریکٹر کی ناک نہ توڑ دیتا۔ اس نے جان گرے کو انجن روم میں سگار پیتے دیکھ لیا تھا اور باز پرس پر شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

"کوئی باسٹرڈ مجھے نہیں روک سکتا۔ میرا دل جو چاہے پیوں گا۔"

ممکن ہے کوئی عرب ڈائریکٹر ہوتا تو اس کی بے ہودگی خاموشی سے برداشت کر جاتا لیکن حسن رضا ایک تو ایرانی تھا۔ دوسرے سر پھرا تھا۔ اس نے جان گرے کے منہ سے سگار کھینچ لیا اور اسے گریبان سے پکڑ کر انجن روم سے باہر پھینک دیا۔ اس پر جان گرے نے اسے گھونسا مارا اور اس کی ناک توڑ دی۔ اس پر حسن رضا نے اس کی یادگار قسم کی مرمت لگائی تھی۔ ایک تو وہ جان گرے کے مقابلے میں نوجوان تھا۔ دوسرے جان گرے کو شراب نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ جان گرے کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ہاتھ پیر اس وقت چلانے چاہئیں جب ان میں دم ہو۔ دس منٹ کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تو حسن رضا نے اسے اٹھوا کر اس کے کیبن میں بھجوا دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ استعفیٰ لکھا اور اسے حسن رضا کے سامنے پھینک دیا۔

"خوب مسٹر جان گرے، قواعد کے مطابق تم دو مہینے کا نوٹس دیئے بغیر نوکری نہیں چھوڑ سکتے۔ ورنہ کمپنی تم پر مقدمہ کر دے گی اور ایرانی جیلیں زیادہ آرام دہ نہیں ہوتی ہیں اور اب مجھے اطلاع ملی کہ تم نے انجن روم میں شراب پی ہے یا سگار سلگایا ہے۔ تو میں تمہارے خلاف کارروائی کروں گا اور تمہیں ایک ڈالر دیئے بغیر خارش زدہ کتے کی طرح کمپنی سے نکال دوں گا۔"

جان گرے نے بعد میں حسن رضا کو انگریزی کی بے حد خوف ناک گالیاں دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ جانے سے پہلے کمپنی کی ایسی کی تیسی کر دے گا۔ بدقسمتی سے کمپنی کے اعلیٰ حکام نے اس کی دھمکیوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور وہ اسے صرف دھمکی ہی سمجھے تھے۔ اگر وہ اس کے ریکارڈ کو ذرا غور سے پڑھ لیتے تو ایسی غلطی نہ کرتے۔ جان گرے کو شپنگ کی دنیا میں شیطان اور منحوس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک یونانی آئل ٹینکر پر ملازمت کی۔ اس کی ملازمت کے چوتھے سال ٹینکر نہر سوئز سے نکلتے ہی تباہی کا شکار ہو گیا۔ آگ لگنے سے عملے کے بارہ





افراد مارے گئے تھے۔ کروڑوں ڈالر مالیت کا ٹینکر بھی غرقاب ہوا تھا لیکن تحقیقاتی ٹربیونل جان گرے کے خلاف کوئی ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ البتہ اسے ملازمت سے ضرور نکال دیا گیا۔

اس کے دو سال بعد جان گرے وہیل مچھلی شکار کرنے والے ایک ٹرالر پر ملازم ہو گیا۔ ایک سال بعد انجن روم میں دھماکا ہوا اور دو افراد مارے گئے۔ جان گرے ڈیوٹی پر تھا لیکن اسے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ ایک بار پھر اس کے خلاف کچھ ثابت نہ ہوا۔ حالانکہ ٹرالر کے کپتان کو سو فیصد یقین تھا کہ دھماکے میں جان گرے کا ہاتھ تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ایک ملاح سے جھگڑا کرنے پر کپتان نے اسے سرزنش کی تھی۔ اس بار بھی اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔

تیسرا سانحہ زیادہ اندوہناک ثابت ہوا تھا۔ اسے اس بار ایک کروز رشپ میں ملازمت ملی تھی اور وہ انجن انجینئر تھا۔ یورپ سے جزائر ترپن کی طرف جاتے ہوئے بیچ اوقیانوس میں کروز رشپ کے انجن روم میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بے حد پُراسرار واقعہ تھا کیونکہ نہ کوئی الارم بجا تھا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا آگ کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔ جلد آگ بے قابو ہو کر جہاز کے اکثر حصے کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ مسافروں کو فوری طور پر لائف بوٹس میں اتارا جانے لگا۔ مگر بدقسمتی سے نہ تو کشتیاں مناسب تعداد میں تھیں اور نہ ہی پاس سے کوئی دوسرا بحری جہاز گزر رہا تھا آگ اتنی سرعت سے پھیلی تھی کہ تین گھنٹے کے اندر جہاز جل کر غرقاب ہو گیا۔ کل بارہ سو افراد میں سے نو سو پچاس افراد کی جان بچائی جا سکی تھی۔ باقی افراد آگ یا سمندر کی نذر ہو گئے تھے۔ سانحہ نہایت سنگین تھا۔ اس کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کی گئی تھی لیکن جان گرے ایک بار پھر بری الذمہ قرار پایا۔ لوگوں کے ذہن میں بار بار سوال اٹھتا تھا کہ آخر یہ سارے حادثے وہیں کیوں ہوتے تھے۔ جہاں جان گرے کام کرتا تھا۔ یورپ کی میرین لائنز نے سفید فام ہونے کے ناتے جان گرے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی لیکن اسے آئندہ ملازمت کے لیے بلیک لسٹ قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی اسے یورپ یا امریکہ کی کسی شپنگ کمپنی میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اس کے بعد جان گرے نے یو اے ای کی ایک آئل فیلڈ میں ملازمت کر لی لیکن اس کے ذہن میں کوئی کجی تھی یا اس کے وجود میں خباثت بھری ہوئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا کسی نہ کسی حادثے کا سبب بن جاتا تھا۔ آئل فیلڈ میں ایک رات جو کنواں صفائی کی وجہ سے بند تھا کہ اس میں دھماکا ہو گیا۔ پمپنگ بند ہونے کی وجہ سے آگ تو نہ لگی لیکن کنوئیں کے پاس کام میں مشغول دو کارکن مارے گئے تھے۔ جان گرے کی ڈیوٹی اس کنوئیں پر تھی اور وہ دھماکے کے وقت وہاں نہیں تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ واش روم گیا تھا۔ یہ دھماکے سے ایک منٹ پہلے کی بات تھی۔ کئی افراد زخمی بھی ہوئے تھے لیکن جان گرے پر کوئی الزام نہ لگایا جا سکا۔ ڈیوٹی کے دوران واش روم جانا قابلِ گرفت بات نہیں تھی اور نہ ہی قواعد کے خلاف تھی لہٰذا ایک بار پھر جان گرے کے خلاف کچھ ثابت نہ ہو سکا اور اسے اس ملازمت سے بھی فارغ کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے ان ہی دنوں عرب پرشین کمپنی کو

ایک انجن روم کے انجینئر کی ضرورت درپیش آئی اور جب تک کمپنی کے اعلیٰ حکام کو جان جیفرسن گرے کے کرتوتوں کا علم ہوتا۔ وہ اس کا تقرر بہ طور چیف انجینئر کے بحری جہاز خلیج پر کر چکے تھے۔
یوں تو کمپنی کے پاس کئی ایک بحری جہاز تھے لیکن اس کا اصل کماؤ پوت خلیج ہی تھا۔

جان گرے میری تقرری سے خوش نہیں تھا اور اس نے اپنی نفرت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ان حرامیوں کو میری توہین مہنگی پڑے گی۔'' اس کے چہرے پر حسن رضا کے مکوں کے نشانات اب تک موجود تھے۔ ''اور تم یہ مت سمجھو کہ میری جگہ لے سکو گے۔''

''مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم بھی اپنی گفتگو پیشہ وارانہ امور تک محدود رکھو۔''

یہ شخص مجھے پہلی نظر میں ہی بُرا لگا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی کئی وجوہ تھیں۔ اول تو اس کی کہانیاں جو میرے علم میں آئی تھیں۔ دوم اس کی گفتگو، وہ بے حد بدتمیز آدمی تھا اور تیسری اس کی شخصیت۔ اس کے بل ڈاگ جیسے چہرے پر سؤر جیسی ننھی ننھی آنکھیں تھیں۔ جن سے ہمہ وقت ایک نوع کی کینہ توزی جھانکتی رہتی تھی۔ اس کے پھولے ہوئے چہرے سے عجیب سی خباثت ٹپکتی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا کے خلاف دل میں کینہ لیے بیٹھا ہو۔ البتہ وہ میرے رنگ وروپ سے دھوکا کھا گیا تھا۔

''مسٹر جوزف تمہارا تعلق کسی ویسٹرن کنٹری سے ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام یوسف ہے جوزف نہیں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ نو نو۔'' اس نے ہاتھ لہرایا تو اس کے ہاتھ میں دبے ٹن سے بیئر چھلک گئی تھی۔ ''یہ تو رنگ دار لوگوں کا ملک ہے۔ تم یورپ کے لگتے ہو۔ تمہاری رگوں میں یقیناً کسی سفید فام کا خون ہے کیا تمہاری ماں......''

''مسٹر گرے بہتر ہوگا تم اپنا منہ بند رکھو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔ ''ابھی تمہارے پرانے زخم صحیح طرح سے نہیں بھرے ہیں۔''

وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم میں برداشت کم ہے۔ خیر ہم کچھ تکنیکی نوعیت کی گفتگو کرتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے انجن اور اس کے بارے میں مجھ سے سوالات شروع کیے۔ یہ ایک طرح کا انٹرویو تھا جس کے بعد اس نے مجھے صرف اس لیے پاس کر دیا تھا کہ میرا رنگ سفید تھا۔

''تمہاری جگہ کوئی کالا ڈرٹی ہوتا تو میں اسے انجن روم میں گھسنے بھی نہ دیتا۔''

قواعد کے مطابق جب تک وہ چیف انجینئر تھا اس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص انجن روم میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ کچھ ہی عرصے میں جہاز سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔ اس کی باتیں سن کر پہلی ہی ملاقات میں مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ وہ مجھ سے بھی مار کھاتا اور بحری قوانین کے مطابق اگر کوئی جونیئر اپنے سینئر پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے سنگین جرم میں شمار





کیا جاتا ہے اور اگر یہ جرم کسی ملاح سے سرزد ہو تو اسے بغاوت سے کم نہیں سمجھا جاتا ہے۔

میں نے منیلا سے خلیج کے عملے میں شمولیت اختیار کی تھی۔ خلیج مال بردار بحری جہاز تھا۔ جو خلیج فارس سے لے کر فلپائن اور جاپان کے درمیانی راستوں پر سفر کرتا تھا۔ اسے دنیا کا معروف ترین بحری روٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔ پروگرام کے مطابق جان گرے کو بمبئی سے رخصت ہو جانا تھا۔ کمپنی نے اس کے لیے بمبئی سے نیو یارک تک کے فضائی سفر کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے جان گرے کے بارے میں جتنا سنا تھا اسے اس سے بڑھ کر خبیث فطرت پایا۔ اس کے ساتھ کام کرنا کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ وہ اکثر ایسی جگہوں پر بھی تمباکو نوشی کرنے لگتا تھا۔ جہاں ایک چنگاری بھی پورے جہاز کی تباہی کا باعث بن سکتی تھی۔ اس موقع پر انجن روم میں موجود ہر فرد کی جان پر بن آتی تھی۔ عملے کی فکرمندی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ ان بے چاروں کو اپنے کام پر بھی نظر رکھنا ہوتی تھی۔ وہ کہاں تک جان گرے کی نگرانی کرتے۔ میرے آنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میری قبل از وقت تقرری کا مقصد بھی یہی تھا کہ میں جان گرے پر نظر رکھوں اور اسے کوئی خطرناک حرکت نہ کرنے دوں۔

وہ جب بھی انجن روم میں شراب نوشی کرتا تھا یا سگار سلگاتا تو ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا کرتا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اگر مجھے روک سکتے ہو تو روک کر دکھاؤ۔'' میں کئی روز تک اس کی یہ مسکراہٹ برداشت کرتا رہا۔ یہ منیلا سے روانگی کے دوسرے دن کی بات تھی۔ جان گرے نے حسب معمول انجن روم میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ سگار سلگایا اور جلتی تیلی بجھائے بغیر بے پروائی سے فرش پر پھینک دی۔ خوش قسمتی سے تیلی فرش پر گرنے سے پہلے ہی بجھ گئی تھی۔ یہ بتا دوں کہ بحری جہاز کے انجن عام طور سے ڈیزل یا فرنس آئل سے چلتے ہیں اور دونوں کے استعمال سے انجن روم گندہ ہوتا رہتا ہے خاص طور سے فرش اور دیواروں پر تیل جم جاتا ہے اور کسی بھی حادثے کی صورت میں یہ بے حد تیزی سے آگ پکڑتا ہے۔ اگر جلتی تیلی فرش پر گر جاتی تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرش آگ پکڑ لیتا۔

مارے طیش کے میرا خون سر میں جمع ہونے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے سگار جان گرے کے منہ سے کھینچ لیا اور سرد لہجے میں کہا۔ ''مسٹر گرے انجن روم میں آگ جلانا منع ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔''

''ڈیم اِٹ۔'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میرے منہ سے سگار کھینچو۔''

''اگر تمہیں یہ بات بُری لگی ہے تو تم کپتان سے شکایت کر سکتے ہو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''لیکن آئندہ میں انجن روم میں کسی کو آگ جلانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''تم کون ہوتے ہو۔'' اس نے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

''میں۔'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو میں ڈپٹی چیف انجینئر ہوں اور چند دن بعد چیف انجینئر بن جاؤں گا، اس کے علاوہ سیکیورٹی کے لیے بنائے گئے اصولوں پر عمل کرنے کے لیے کوئی انجن مین بھی تمہیں مجبور کر سکتا ہے۔'' وہ کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر عملے کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

''کیا دیکھ رہے ہو کتیا کے بچو، اپنا کام کرو۔'' اس نے کارکنوں کو چند اور غلیظ گالیوں سے نوازا لیکن وہ بدمزہ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے جان گرے کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ ان کے لیے باعثِ تسکین تھا۔ اس واقعے کے بعد جان گرے کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کوندنے لگی تھی۔ وہ جب میری طرف دیکھتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ نفرت کے ان کوندوں سے جلا کر مجھے خاکستر کر دے گا۔ نفرت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ بچپن سے میں نفرتیں دیکھتا آرہا تھا بہت کم عمری میں اس لفظ کو اس کے پورے مفہوم سمیت جان گیا تھا۔



جب میں نے پہلی بار بہ حیثیت ڈپٹی چیف انجینئر انجن روم میں قدم رکھا تو پورا عملہ پریشان ہو گیا تھا کہ ابھی ایک خبیث گورے سے جان چھوٹی نہیں تھی کہ دوسرا آگیا۔ کسی نے فورمین گپتا سین جی سے کہا۔

''جا بھئی سلامی دے ڈپٹی انجینئر صاحب کو۔ یہ معلوم کر کہ یہ کیا پیے گا یہاں، چرس یا ہیروئن۔''

''ویلکم ٹو انجن روم سر۔'' گپتا نے شرافت سے انگریزی میں کہا۔ بدمعاشی اس نے اُردو میں کی تھی۔ ''ہندوستان سے دفع ہو جانے والے گدھے، تُو پھر آ گیا ہے۔'' اس نے کہا اور دوبارہ انگریزی میں بولا۔ ''مجھے گپتا سین جی کہتے ہیں۔''

''تھینک یو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''باقی کا تعارف بھی کرادو۔''

''کیوں نہیں سر۔'' اس نے کہا اور ایک چھوٹے قد کے نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ احمد علی ہے فرام ملائشیا۔'' وہ بولا پھر اُردو میں کہا۔ ''یہ گورے سوروؤں سے بہت چڑتا ہے۔''

''یہ عبدالمنان ہے۔ بنگلہ دیش کا۔'' اس نے کہا اور بہ ظاہر عبدالمنان سے بولا۔ ''اس اولادِ خر نے مجھے نوکر سمجھ رکھا ہے۔''

''یہ شیخ منصور ہے فرام یمن۔ پکا بنیاد پرست ہے کسی دن تجھے سمندر میں دھکا دے دے گا۔''

''کلا تنا داس فرام سری لنکا۔''

''اور یہ دیوانگ جو ہے چینی نسل کا مگر تھائی لینڈ میں رہتا ہے۔ (اس کا بس چلے تو تمام گوروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر سب سے بڑا ہائیڈروجن بم گرا دے خس کم جہاں پاک)

وہ سب یوں مسکرا رہے تھے جیسے مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہوں لیکن ان کے دانت گپتا کے





ارشادات پر نکلے پڑ رہے تھے۔ میں نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور آخر میں گپتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے پہلے انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُردو میں بولا۔ ''تمہاری فارسی بھی اچھی ہے اُردو کے علاوہ۔''

غالباً انجن روم کا فرش پھاڑ کر کوئی شارک سمندر سے نکل آتی تب بھی وہ اتنے حیران نہ ہوتے۔ وہ سب بدحواس ہو گئے تھے لیکن گپتا سین جی کی حالت تو بُری تھی۔ ساری بکواس اس نے کی تھی۔

''آپ...... آپ ہندی جانتے ہیں۔'' اس نے ہکلا کر کہا۔

''اُردو۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''اور میں گورا بھی نہیں ہوں میرا نام یوسف ہے۔''

''تب تو آپ پٹھان ہوں گے۔'' گپتا نے خوش ہو کر کہا۔ ''اپنے دلیپ کمار کی طرح اس کا نام بھی یوسف خان ہے۔'' پھر اسے خیال آیا کہ وہ ایک افسر کے ساتھ کس درجے کی گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہے تو اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''صاب مجھے معاف کر دو، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اپنے علاقے کے رہنے والے ہو۔''

میں نے ذرا تفریح لینے کے لیے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''معافی تو ممکن نہیں ہے اس طرح ہر خطا کار معافی مانگ کر بچتا رہا تو جہاز چل چکا۔''

گپتا کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''صاب میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''میرے تو وہ بھی نہیں ہیں۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''صاب اگر آپ نے رپورٹ کر دی تو مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ پہلے ہی وہ حرا......''

اسے کہتے کہتے خیال آیا کہ وہ ایک افسر کے سامنے دوسرے افسر کو گالی دے رہا ہے۔ ''مم...... میرا مطلب ہے کہ جان گرے صاب نے اوپر میری بہت ساری شکایتیں لگائی ہیں۔ صاب میرے ساتھ بہت بُرا ہو گا۔''

اس بار میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ ''چلو حساب برابر ہوا۔ میں نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم نے مجھے سنا ڈالیں۔''

''آپ نے مجھے معاف کر دیا صاب۔'' گپتا خوش ہو گیا تھا۔

''معاف تو خیر نہیں کیا۔'' میں ایک کرسی پر ٹک گیا۔ ''لیکن کچھ پینے کو مل جائے تو اس پر غور بھی کیا جا سکتا ہے۔''

گپتا کا منہ اُتر گیا۔ ''صاب ہم تو غریب لوگ ہیں۔ پینے پلانے کو کہاں سے لائیں یہ سہولت تو آپ جیسے افسر لوگوں کو ملتی ہے۔''

''احمق میں اس پینے والی شے کا ذکر نہیں کر رہا تم لوگوں نے چائے، کافی کا کوئی بندوبست تو کر رکھا ہے۔''

’’کیوں نہیں صاب یہ اپنا منصور شیخ ایسی چائے بناتا ہے کہ بس۔ جا منصور، صاب کے لیے چائے بنا کر لا۔‘‘

اپنی بلا شیخ کے سرڈالے جانے پر اس نے خونخوار نظروں سے گپتا کی طرف دیکھا لیکن میرے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی لہٰذا اس نے جا کر چائے بنانا زیادہ مناسب سمجھا۔ چائے کے دوران میں نے ان لوگوں سے انٹرویو لیے۔ ذاتی بھی اور کام کے حوالے سے بھی۔ وہ سب نچلے طبقے کے سادہ دل لوگ تھے۔ جو ہر ملک میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ جلد ہی میرا رویہ بھانپ کر مجھ سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ حالانکہ میں جہاز میں سیکنڈ آفیسر تھا۔ بہ لحاظ عہدہ صرف کپتان اور فرسٹ آفیسر معاذ مجھ سے برتر تھے۔ فی الوقت تو جان گرے میرا باس تھا لیکن یہ چند دن کی بات تھی اس کے بعد دوران سفر کپتان اور فرسٹ آفیسر اگر رضائے الٰہی سے انتقال کر جاتے تو کپتانی کا اعزاز میرے حصے میں آتا۔

بحری جہازوں کے عملے میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ جہاز کے افسران اور خاص طور سے انجینئر نچلے عملے سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور اسے اپنی افسری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اپنے طور پر وہ حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور یہ رویہ ان کی تعلیم کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے۔ جب سے جہاز رانی شروع ہوئی ہے یہ اصول چلا آ رہا ہے کہ بحری جہازوں کے نچلے طبقے کو دبا کر رکھو ورنہ وہ تم پر حاوی ہو جائے گا۔ دراصل جہازوں پر کام کرنے والے اکثر ملاح کچھ بدمعاش قسم کے ہوتے ہیں خود جہاز راں کمپنیاں بدمعاشوں کو ملاح رکھنا پسند کرتی ہیں تاکہ کسی ہنگامی موقع اور خاص طور سے بحری قزاقی کی وارداتوں میں کام آئیں۔ شریف قسم کے لوگ عام طور سے خود ہی بحری جہازوں پر کام کرنے سے گھبراتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کپتان اور جہاز کے دوسرے افسران عملے سے میری بے تکلفی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

بات صرف اتنی تھی کہ میرے دماغ میں حاکم طبقے کی وہ خُو بُو نہیں تھی جو فرعون بننے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ اگرچہ دنیا جسے میرا باپ سمجھتی تھی وہ خود حاکم نظر آنے والا اور خود کو حاکم سمجھنے والا شخص تھا۔ وہ براہِ راست بحری جہاز پر سیکنڈ آفیسر بنا تھا اور اس کے بعد جب تک زندہ رہا اپنے بحری جہاز پر کپتان رہا تھا۔ جمشید پیلس میں اس کا رویہ حاکمانہ ہوتا تھا اور بیوی بچے سب اس سے دبا کرتے تھے سوائے ایک ہستی کے۔ یعنی کاجل، اس کے سامنے وہ خود موم ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان شاید یہی بات مشترک تھی۔



اس روز بحری جہاز پر جان گرے کا آخری دن تھا۔ ہمیں بمبئی میں لنگر انداز ہوئے تیسرا دن تھا اور کل صبح خلیج اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا۔ جب جان گرے نے مجھے انجن روم کا چارج دیا تو اس وقت بھی وہ نشے میں دھت تھا اور اس کے ہاتھ میں سلگتا سگار تھا۔ کیونکہ وہ سگار باہر سے لے





کر آیا تھا اور محض ایک منٹ کی بات تھی۔ اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ اس نے بے پروائی سے چارج شیٹ پر سائن کیے اور اس کے بعد وہ حرکت کی کہ ایک لمحے کو ہم سب کے دل رُک گئے تھے۔ اس نے بہ ظاہر غلطی سے لیکن درحقیقت جان بوجھ کر اپنا سگار انجن روم میں فرش کے اس حصے میں گرا دیا جو فرنس آئل سے چکٹ ہو رہا تھا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا اور میں نے تقریباً جست لگاتے ہوئے فرش سے سگار اٹھا لیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو فرش آگ پکڑ لیتا۔ خوش قسمتی سے سگار میں حرارت کم ہوتی ہے اور اسے اگر چند سیکنڈ ہوا نہ ملے تو یہ بجھ جاتا ہے۔ جب میں کھڑا ہوا تو انجن روم کے عملے کا خوف غصے میں ڈھل چکا تھا۔ اب جان گرے ان کا افسر نہیں رہا تھا جس کا وہ احترام کرتے، احمد علی سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ تھا۔ اس نے پائپ بلند کیا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

’’چھوڑ دو ہم کو صاحب۔‘‘ اس نے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ ’’آج میں اس کتیا کے بچے کا سر کھول دوں گا۔‘‘

’’پاگل ہو گیا، جو اس کے گندے خون سے ہاتھ رنگنا چاہ رہے ہو۔‘‘ میں نے چلا کر کہا۔ احمد علی جنون کی کیفیت میں تھا میں جان گرے پر دھاڑا۔ ’’دفع کیوں نہیں ہو جاتے یہاں سے کیا کتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟‘‘

اس نے اطمینان سے ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور انگلیوں کو ہلاتا انجن روم سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی احمد علی کا جوش بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ وہ چوبیس برس کا ملا ایشین نوجوان تھا۔ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ اسے جان گرے کی موجودگی میں ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ اگر وہ کسی حادثے میں مارا گیا تو اس کے گھر والوں کا کیا بنے گا۔ روانگی سے پہلے جہاز کی ضروری دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ تاکہ راستے میں کوئی مسئلہ درپیش نہ آئے۔ صبح چھ بجے کپتان نے جہاز کے انجن چلانے کا حکم دیا اور اس کے دو گھنٹے بعد ہم بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری اگلی منزل یمن کی بندرگاہ عدن تھی۔ جان گرے کے جانے کے بعد انجن روم کا عملہ ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ جیسے ان کے درمیان سے کوئی زہریلا سانپ چلا گیا ہو، جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ کب کس کو کاٹ لے گا۔

کپتان نے حکم دیا تھا کہ بحری جہاز کی رفتار دس ناٹ فی گھنٹہ رکھی جائے۔ جو معمول کی رفتار سے دو ناٹ کم تھی۔ شاید اس وجہ سے موسمی سیارے نے بحیرہ عرب کی جو رپورٹ دی تھی۔ اس کے مطابق بمبئی سے ڈیڑھ سو میل دور کھلے سمندر میں درمیانے درجے کا طوفان آیا ہوا تھا۔ جو بتدریج مشرق کی طرف سے سرک رہا تھا۔ بحری جہاز کا روٹ اس طوفان سے گزرتا تھا۔ رفتار کم ہونے کی وجہ سے جب تک خلیج سمندر کے اس حصے میں پہنچتا طوفان کا شدت والا حصہ مشرق کی طرف جا چکا ہوتا اور ہمیں طوفان کے کم شدت والے حصے سے واسطہ پڑتا۔

شام چار بجے تک ہم بمبئی سے سو ناٹیکل میل کے فاصلے پر آ گئے تھے۔ میں گزشتہ سولہ گھنٹے سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا اور تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ چار بجے میں نے چارج اپنے نائب صام کو دیا اور سونے کے لیے اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں معاذ مل گیا۔ وہ خاصے خوش گوار موڈ میں تھا۔

''یوسف سونے جا رہے ہو۔ اتنی سہانی شام کو۔''

''ابھی کچھ دیر بعد سمندر زیر و زبر ہو جائے گا اور آسمان پر سیاہ بادل چھا جائیں گے۔ تب شام اتنی سہانی نہیں رہے گی۔'' میں نے کہا۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔''

معاذ ہنسنے لگا۔ ''میری بات نوٹ کر لو۔ رات آٹھ بجے کے بعد جہاز پر کوئی مردہ بھی ہوا تو جاگ جائے گا۔ ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

مجھے خیال آیا کہ کافی کا صرف بہانہ تھا۔ ورنہ اس کا مطلب کچھ اور تھا۔ اس سے میرے اس قسم کے تعلقات نہیں تھے کہ وہ مجھے کافی کی دعوت دیتا لیکن میں نے دعوت قبول کر لی۔ تا کہ اس کے قلب میں چھپی بات جان سکوں۔ خلیج کے اگلے حصے میں نچلے عرشے پر جہاز کا میس اور باورچی خانہ تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں جڑے شفاف پلاسٹک سے دور تک پھیلے سمندر اور آسمان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تک طوفان کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے جہاز بے حد معمولی سے ہلکورے لے رہا تھا۔

''طوفان آنے کی صورت میں ہمیں خلیج کا رُخ جنوب مغرب کی طرف کرنا پڑے گا۔'' معاذ نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا تعلق نیوی گیشن سے تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کن حالات میں جہاز کو کیسے چلانا چاہیے۔

''یعنی ہم اپنی اصل منزل سے ہٹ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

اس نے شانے ہلائے۔ ''مجبوری ہے تاخیر سے پہنچنا بہتر ہے کبھی نہ پہنچنے کے مقابلے میں۔''

باورچی نے مستعدی سے مُوکر کافی ہمارے سامنے سجائی۔ ایک کپ میں کریم اور ساتھ میں چینی کے کیوب بھی تھے۔ معاذ نے عربوں کی روایت کے مطابق بغیر کریم اور چینی کے کافی لی تھی۔ البتہ اس کڑوے مشروب کو بغیر چینی کے حلق سے اُتارنا میرے لیے محال تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے کپ میں کئی عدد چینی کے کیوب ڈال لیے اور اس کے بعد کپ کو اوپر تک کریم سے بھر لیا۔

''جان گرے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''ظاہر ہے اچھا نہیں ہے اگر میں آج اسے نہ بچاتا تو اس وقت وہ سیل پیک تابوت میں امریکہ جا رہا ہوتا۔'' معاذ چونکا۔

''کیا ہوا تھا؟''

اسے انجن روم میں پیش آنے والے اس واقعے کا علم نہیں تھا کیونکہ میں نے کپتان کو اس کی





رپورٹ نہیں کی تھی۔ میں نے تفصیل سے اسے انجن روم کے واقعے اور جان گرے کی شرارت کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔

''یہ جان گرے بہت کمینہ آدمی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میں پریشان ہو گیا ہوں۔''

''کیا کہا تھا اس نے؟'' میں نے بغور اسے دیکھا۔

''عجیب بات کہی تھی اس نے۔'' معاذ نے سر جھٹکا۔ ''اس نے کہا تھا کہ چوتھے سے ہوشیار رہنا۔ ورنہ غرق ہو جاؤ گے۔''

''کون چوتھا؟''

''مجھے نہیں معلوم، لیکن شبہ ہے کہ وہ جاتے جاتے کوئی حرامی پن کر گیا ہے۔ تم نے انجن روم کا معائنہ کیا تھا؟''

یہ بات میرے اور انجن روم کے عملے کے ذہن میں بھی تھی۔ جان گرے کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ شخص بلاوجہ ہی حادثات کے لیے بدنام نہیں ہوا تھا۔ ہم نے روانگی سے پہلے انجن کا بھرپور معائنہ کیا تھا لیکن کوئی گڑبڑ سامنے نہیں آئی تھی۔ انجن اور اس کی مشینری بالکل درست کام کر رہی تھی۔ میں نے معاذ کو بتایا تو وہ بولا۔

''تم اسے نہیں جانتے، فریب کاری کے معاملے میں اس کے پاس شیطان کا دماغ ہے اور پھر انجنوں کے بارے میں وہ اکیلا اتنا جانتا ہے کہ اس بحری جہاز پر موجود تمام لوگ مل کر بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کی بات سے پریشان ہوں۔''

''اس نے تم سے کب یہ بات کہی تھی؟''

''بمبئی میں جہاز سے اُترنے سے کچھ ہی پہلے۔'' معاذ نے بتایا۔

میں معاذ حسین کی بات کو صرف وہم قرار نہیں دے سکتا تھا۔ سمندر میں خطرات کا مقابلہ کرنے والے بہت تیز چھٹی حس رکھتے ہیں۔ جو انہیں بہت سے آنے والے حادثات سے پیشگی باخبر کر دیتی ہے۔ معاذ کی بات میں وزن تھا۔ جان گرے جیسا شخص اگر خاموشی سے رخصت ہو جاتا تب بھی خطرہ تھا اور اب تو وہ جاتے جاتے ایک تشویش ناک بات کر گیا تھا۔ چوتھے سے آخر اس کی کیا مراد تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ انجن روم میں کچھ چھپا کر نہیں گیا تھا۔ اس صورت میں وہ چیز عملے کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی۔ معاذ بھی اس چوتھے کی پہیلی نہیں بوجھ سکا تھا۔ جو اس جہاز کو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا اور اس کے عملے کے ایک ایک فرد سے اچھی طرح واقف تھا۔

اس کے باوجود اپنے کیبن میں جانے سے پہلے میں نے انجن روم کا چکر لگا کر عملے کو محتاط رہنے اور انجن کی مشینری پر نظر رکھنے کو کہا اور پھر اپنے کیبن میں آ گیا۔ یہ جہاز کے نچلے عرشے پر کپتان اور جہاز کے دیگر افسران کے کیبنوں والے حصے میں تھا۔ کیبن دس بائی دس کا تھا۔ اس میں

ایک الماری اور ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف مسہری تھی۔ چھت پر ایک سیلنگ فین تھا اور مرکزی ایئر کنڈیشننگ کا نظام اندر ٹھنڈی ہوا پھینکنے اور گرم اور گندی ہوا باہر نکالنے کا کام بہ خوبی کر رہا تھا۔ انجن روم کے پُرتپش ماحول کے مقابلے میں یہ خنک کیبن کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ میرے بستر کے اوپر دیوار میں ایک فٹ قطر کا پورٹ ہول تھا۔ اس میں لگے شیشے سے باہر بپھرتی لہروں کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اگرچہ یہ پانی سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر تھا لیکن جب اونچی لہریں اُٹھ رہی ہوں تو پانی شیشے تک چلا آتا تھا اور بعض اوقات تو پانی کی چادر اس پر اتنی دیر تک تنی رہتی تھی کہ لگتا تھا جہاز زیرِ آب چلا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ ایک پُرہول نظارہ ہوتا لیکن جہاز پر رہنے والوں کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ میں نے کپڑے اتارے اور تھکن اتنی ہو رہی تھی کہ دوسرے کپڑے چڑھانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ لہٰذا ایسے ہی روشنی بجھا کر لیٹ گیا۔ تاریکی انسان کا پردہ رکھ لیتی ہے۔ میں بہ مشکل دو گھنٹے سو سکا ہوں گا کہ پہلے تو طوفان آ گیا اور اس کے بعد کپتان کا ایمرجنسی بلاوا آ گیا۔ جان گرے کا کیا دھرا سامنے آ گیا تھا اور خلیج ڈوبنے کے خطرے سے دوچار تھا مگر خدا کو ہم سب کی زندگی منظور تھی اس لیے بچ گئے تھے۔



وہ سب باری باری انجن روم میں داخل ہوئے، شرم سار اور مجھ سے نظریں چراتے ہوئے ان کا ضمیر انہیں ملامت کر رہا تھا کہ وہ مشکل گھڑی میں میری مدد کرنے کے بجائے بھاگ گئے تھے لیکن میں انہیں قصور وار نہیں سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ زندہ تو میں بھی رہنا چاہتا تھا لیکن ان پر ان کے علاوہ بھی کتنی ہی جانوں کا قرض تھا۔ ان کے پیروں میں ماں باپ، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں جیسی اَن دیکھی زنجیریں تھیں۔ یہ زنجیریں انہیں خطرے کی حد میں جانے سے روکتی تھیں۔ وہ اپنی جان گنوا کر ان سب کو بے سہارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب شرمندگی کے ساتھ ان کے چہروں پر تحریر تھا۔ میں نے ان کا احساسِ شرمندگی کم کرنے کے لیے کہا۔

''یار اس میں منہ لٹکانے کی کیا بات ہے۔ اب تو خطرہ جان گرے کی طرح دفع ہو گیا ہے۔''

گپتا بولا۔ ''صاب مذاق مت کرو موت ہمیں چھو کر گزری ہے ذرا اپنی حالت دیکھیں۔''

اور جب میں نے اپنے لرزتے ہاتھ دیکھے تو حیران رہ گیا تھا۔ مجھے احساس نہیں ہوا تھا لیکن زندگی اور موت کی کش مکش نے میرے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یک دم مجھے شدید تھکن کا احساس ہونے لگا تھا جو شدید اعصابی کشیدگی کے بعد ملنے والے سکون کا قدرتی نتیجہ تھا۔ احمد علی نے مجھے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس دیا تو میرے اعصاب رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتے چلے گئے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''ایسی صورتیں مت بناؤ بنانا ہے تو کوئی چائے کافی بناؤ۔''

باہر طوفان اپنے عروج پر تھا۔ اس کی شدت بڑھ گئی تھی لیکن انجن روم والا حصہ ایک تو زیرِ آب





تھا اور دوسرے یہ بحری جہاز کے تقریباً درمیانی حصے میں تھا۔ لہٰذا یہاں جھٹکے اتنے زیادہ شدید نہیں تھے۔ اس کی ایک مثال گھومتی ہوئی چکی ہوتی ہے۔ جس کا مرکزی حصہ کناروں کی نسبت سُستی سے حرکت کرتا ہے۔ مرکز کے توازن کی وجہ سے انجن روم میں طوفان کے اثرات نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے انٹرکام پر کپتان برج سے رابطہ قائم کیا۔ کپتان صلاح الدین کو معاملے کی نوعیت سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ وہ ایک تجربے کار شخص تھا۔

''مسٹر یوسف میں نیچے آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

کپتان برج اور انجن روم میں اچھا خاصا فاصلہ تھا لیکن کپتان صلاح الدین صرف پانچ منٹ بعد انجن روم میں داخل ہو رہا تھا۔ تمام عملہ کپتان کی آمد پر الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے رپورٹ لی پھر بوائلر اور اس کے والوز کا معائنہ کیا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تباہی کس حد تک قریب آ کر ٹل گئی تھی۔ کم از کم انجن روم کی حد تک۔ اس نے مزید کچھ پوچھنے کے بجائے مجھ سے کہا۔

''تمام والوز کھلوا کر ان کی صفائی کرواؤ۔ دوسرے بوائلرز بھی چیک کر لو تب تک ہم سمندر میں اس جگہ لنگر انداز رہیں گے اور ہاں اس کے بعد آ کر مجھ سے ملو۔ میرے کیبن میں۔''

میں نے عملے کو ہدایات دیں اور جب وہ اپنے کام میں لگ گئے تو میں انجن روم سے نکلا۔ فولادی سیڑھیاں چڑھتے اور راہداریاں عبور کرتے ہوئے کپتان کے کمرے تک جا پہنچا۔ اس کا پُرتعیش کیبن سائز میں میرے کیبن سے دگنا بڑا تھا۔ اس کی آرائش لاجواب تھی۔ درمیان میں جہازی سائز مسہری تھی۔ جس پر دبیز گدا تھا۔ دیواروں پر لکڑی کے منقش پینل تھے۔ ایک طرف تین پٹ کی الماری تھی۔ دائیں طرف کونے میں مہاگنی کی قیمتی رائٹنگ ٹیبل تھی۔ جس پر تحریر کے لیے اعلیٰ درجے کا سامان موجود تھا۔ مسہری کے عین سامنے ایک دیوار گیر ریک میں بڑے سائز کا ٹی وی تھا۔ جس کے ساتھ وی سی آر منسلک تھا۔ یہ سیٹلائٹ چینلز سے منسلک نظام تھا۔ محض ایک بٹن دبا کر دنیا کا کوئی بھی چینل دیکھا جا سکتا تھا۔ ریک کے نچلے خانوں میں کوئی دو سو کے قریب ویڈیو کیسٹس رکھے تھے۔ اس کے پاس ہی بہترین قسم کا میوزک سسٹم نصب تھا۔ جس کے ساتھ لاتعداد کیسٹس بھی تھے۔ یہ پورا سسٹم ایک ہی ریموٹ کنٹرول سے کام کرتا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل کے پاس دو ایزی چیئرز بھی موجود تھیں۔ صلاح الدین نے مجھے ان کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور خود دیوار میں فکس ایک مختصر سے بار سے شیوارز کی بوتل نکالنے لگا۔ اس نے پہلے اپنے لیے جام بھرا۔ جب وہ دوسرا جام ڈالنے لگا تو میں بول اٹھا۔

''معاف کیجیے کیپٹن میں نہیں پیتا۔''

اس نے ایک لفظ کہے بغیر بوتل واپس بار میں رکھ دی اور میری طرف گھوما۔ ''کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔''

''شکریہ کیپٹن۔'' میں بیٹھ گیا۔ ''بیٹھنے کے بجائے جام سے چسکیاں لیتے ہوئے ٹہلنے لگا تھا۔

اچانک وہ رُکا۔

''تمہارے خیال میں یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔''

''جان گرے کی۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''یہ اس کا کام ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ پھر اسے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح جان گرے نے روانگی کے وقت سیکنڈ آفیسر معاذ کو چار نمبر سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا اور دھمکی تھی کہ ممکن ہے یہ چوتھا جہاز کو غرق کرنے کا سبب بن جائے۔'' اس کی دھمکی درست نکلی جب بوائلر نمبر چار کے تمام والوز جام پائے گئے تھے اور یہ کام جان گرے ہی کرسکتا ہے۔ انجن روم کا چیف انجینئر ہونے کے ناتے اسے والوز جام کرنے کا موقع ہمہ وقت میسر تھا۔ اس نے یہ کام اس وقت کیا ہوگا جب انجن روم کا عملہ پورٹ پر تفریح کے لیے گیا تھا۔ اس جیسے ماہر شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ اس کے سابقہ ریکارڈ کو ذہن میں رکھیں تو اس کے سوا کوئی یہ حرکت نہیں کرسکتا۔ وہ مجرم ہے کیپٹن۔''

اس نے پُرتحسین نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مسٹر یوسف یو آرے بریومین، تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگر بوائلر پھٹ جاتا تو ہم سب اس وقت سمندر میں ہوتے۔ تم جانتے ہو کہ جس جگہ بوائلر نمبر چار ہے اس جگہ جہاز کے پیندے کی چادر ایک زیرآب چٹان سے ٹکرانے کی وجہ سے پھٹ چکی ہے۔ بعد میں اسے ویلڈنگ کر کے جوڑ دیا گیا تھا۔ وہ دونمبر کام تھا جو کمپنی نے جہاز کے انشورنس کے پریمیم میں اضافے کے خدشے سے چھپ کر کرایا تھا۔ بوائلر کے پھٹنے سے یہ جوڑ کھل جاتا تو اس طوفانی موسم میں بحری جہاز کو ڈوبنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔''

''کیا جان گرے یہ بات جانتا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے کیپٹن کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے چیف انجینئر کی حیثیت سے اس سے یہ بات کیسے چھپائی جاسکتی تھی۔'' کپتان نے جام خالی کر کے میز پر پٹخ دیا۔ ''ہی از اے رئیل باسٹرڈ۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اس نے کوئی کیمیکل سلوشن استعمال کیا تھا۔ اگر اس نے کوئی دھاتی بونڈ ڈالا ہوتا تو والو کھولنا ناممکن ہوتا۔ بوائلر پھٹ جاتا اور پھر نہ جانے خلیج اور اس کے عملے کا کیا ہوتا نہ جانے ہم میں سے کتنے بچتے اور کتنے سمندر کی نذر ہو جاتے۔ یہ یقیناً قتل عام ہوتا کیا ہم جان گرے کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے کیپٹن؟''

کپتان صلاح الدین کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''نہیں ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''اس نے خود معاذ کے سامنے اعتراف کیا تھا پھر بوائلر کے والوز میں ڈالا گیا سلوشن، کیا یہ ثبوت کے لیے کافی نہیں ہیں؟''





کپتان صلاح الدین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اس بات سے صاف مکر جائے گا۔ اس نے معاذ سے ایسی کوئی بات کہی تھی اسے کسی نے والوز میں سلوشن ڈالتے نہیں دیکھا۔''

''گویا ہم کچھ نہیں کرسکتے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ سب کچھ کر کے بھی آرام سے بچ نکلا۔ اگر تقدیر ہمارا ساتھ نہ دیتی تو وہ کامیاب ہو چکا ہوتا۔ ہم کوشش تو کرسکتے ہیں کم از کم اس معاملے کو سب کے سامنے لاسکتے ہیں۔''

کپتان صلاح الدین نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''کمپنی اس کی اجازت نہیں دے گی۔''

''صرف اس لیے کہ وہ ایک امریکی ہے۔'' میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

''تم کہہ سکتے ہو۔'' کپتان صلاح الدین دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ ''اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی بے سود ہی ہوگی۔ اول تو ہمارے پاس کوئی ثبوت و گواہ نہیں ہے۔ دوسرے ہم اسے گرفتار کر بھی لیتے ہیں تو اسے کہاں لے جاتے اور اس پر کس ملک میں مقدمہ چلاتے اور کس قانون کے تحت لاتے۔ کیا امریکی حکومت اپنے ایک شہری کی گرفتاری برداشت کر لیتی۔ اگر ہم جان گرے کو ایران کے حوالے کر دیتے تو امریکہ کمپنی پر پابندی لگا دے گا۔ خود ہمارے حکمران ہمارے خلاف کارروائی کرتے۔'' کپتان صلاح الدین کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

میں دم بہ خود سا سوچ رہا تھا۔ جمہوریت انسانی حقوق اور انسانی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والا یہ ملک اپنے شہریوں کے لیے دہرا معیار رکھتا تھا۔ اپنے مجرموں کو وہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے گرفتار کرنے یا مار ڈالنے کا حق محفوظ رکھتا ہے مگر اپنے ملک کے کسی شہری کی گرفتاری کا حق دوسرے ملک کو نہیں دیتا۔ تیسری دنیا کی ایک آزاد اور خودمختار جہاز راں کمپنی اپنے معاملات میں اس کے سامنے بے بس تھی۔ کیونکہ وہ تیسری دنیا کے ان ملکوں کا بھی حاکم تھا۔ میں نے سر جھٹکا یہ بین الاقوامی سیاست تھی جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ جان گرے جیسا شخص ہم اکتیس افراد کی زندگیوں سے کھیل کر کتنی آسانی سے اپنے ملک چلا گیا تھا اور ہم اسے روکنے کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ موت کتنے قریب سے ہمارے پاس سے گزر گئی تھی۔

کپتان صلاح الدین کے پاس سے میں واپس انجن روم میں آیا۔ جہاں صام کی نگرانی میں بوائلرز کے دوسرے والوز بھی کھول کر ان کی چوڑیوں کی اینٹی سلوشن محلول سے صفائی کی جا رہی تھی۔ میں دوپہر ایک بجے تک اپنی نگرانی میں کام کراتا رہا۔ پھر چارج صام کو دے کر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے کی بے آرامی، طوفان کے جھٹکوں اور سب سے بڑھ کر اعصابی کشیدگی نے میرے جوڑ جوڑ کو دکھا دیا تھا۔ اس روز میرا جسم بُری طرح متاثر ہوا تھا میں نے آ کر گرم پانی سے غسل کیا اور پانی کے ساتھ چار اسپرین لیں۔ باہر جاری طوفان سے جہاز اب بھی بُری طرح ڈول رہا تھا لیکن یہ ہچکولے میرے لیے تھپکیوں کا کام کر رہے تھے۔ پنکھے کی خنک ہوا میرے ذہن کو سلا رہی تھی۔ میں جان گرے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ نیند مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی اور میں گہری

نیند میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ جہاز والوں پر کیا گزری۔



غالب نے کیا خوب کہا ہے، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ تو کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو دنیا کی ایسی کون سی نعمت تھی جو مجھے میسر نہیں تھی۔ رہنے کو عالیشان بنگلہ، جمشید پیلس تھا۔ جس کی دوسری منزل پر ایک وسیع و عریض کمرا صرف میرے لیے مخصوص تھا۔ بڑے ہو کر مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر قائد کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں۔ جہاں اس کمرے جتنی جگہ میں درجن بھر افراد رہتے ہیں۔ وہی ان کا بیڈروم ہوتا ہے۔ وہی ڈرائنگ روم اور وہی کچن اسی میں وہ پیدا ہوتے ہیں پلتے بڑھتے ہیں۔ شادی کرتے اور بچے پیدا کرتے ہیں اور اسی میں مرجاتے ہیں۔

میرے عالیشان بیڈروم کی آرائش پر کتنی رقم خرچ کی گئی تھی۔ اس کا اندازہ لگانا میرے ننھے سے دماغ کے بس سے باہر تھا۔ بلکہ میں نے کبھی اندازہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میری وارڈ روب میں بے شمار کپڑے تھے۔ ہر طرح کے اعلیٰ ترین کپڑے، میں نے شاید ہی کبھی ایک جوڑا تیسری بار پہنا ہو۔ ایک بڑی سی الماری صرف کھلونوں کے لیے مخصوص تھی جس میں ہر طرح کے لا تعداد کھلونے تھے۔ جمشید علی جب بھی کسی ٹرپ سے واپس آتے تھے تو میرے لیے بے شمار کھلونے اٹھا کر لاتے تھے۔ میں کراچی کے ایک اعلیٰ ترین سکول میں پڑھتا تھا، وہاں تعلیم کے ساتھ فیس کا معیار بھی اعلیٰ تھا۔ کروڑ پتی تاجروں، صنعت کاروں، جاگیرداروں کے علاوہ صرف اسمگلروں اور رشوت کی اندھی کمائی کرنے والے اعلیٰ سرکاری افسران کے بچے ہی اس سکول میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے سکول لانے لے جانے کے لیے ایک کار اور ڈرائیور مخصوص تھا۔

جمشید پیلس میں میری تربیت اور دیکھ بھال کی ذمے داری ماہ پارہ بیگم کے سپرد تھی۔ وہ بڑی محبت اور محنت کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیا کرتی تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تھیں اور کبھی کبھی وہ بڑے مترنم لہجے میں جو اجنبی الفاظ دہرایا کرتی تھیں وہ دراصل فارسی زبان تھی اور وہ فارسی کے اشعار گنگنایا کرتی تھیں۔ مجھے ماہ پارہ بیگم کا گنگنانا بہت اچھا لگتا تھا اور جب کبھی رات کو نیند مجھ پر مہربان ہونے سے انکار کر دیا کرتی تھی تو ان کا یہی ترنم میرے لیے لوری کا کام کیا کرتا تھا۔

تمام تر آسائش میسر ہوتے ہوئے بھی میں تنہائی محسوس کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جمشید پیلس میں کم لوگ بستے تھے۔ اس عالیشان پیلس میں میرے علاوہ جمشید علی کے بیوی بچے بھی رہا کرتے تھے۔ زہرہ بیگم کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا جاوید تھا۔ اس کے بعد جنید تھا اور سب سے چھوٹی کاجل تھی۔ کاجل مجھ سے چار سال چھوٹی تھی اور جس روز وہ پیدا ہوئی تھی اس روز جمشید پیلس میں خاصی چہل پہل تھی۔ نرسیں اور ڈاکٹر اس حصے میں آ جا رہے تھے جہاں زہرہ بیگم موجود تھیں۔ خود جمشید علی بھی موجود تھے۔ دراز قد کے ہمیشہ پُرسکون رہنے والے جمشید علی کو میں نے پہلی





بار کسی قدر مضطرب دیکھا تھا۔ ورنہ ان کے چہرے سے ان کے جذبات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔

یہ بات مجھے عجیب سی لگتی تھی کہ مجھے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے الگ کیوں رکھا جاتا تھا۔ زہرہ بیگم مجھے ایسے پیار کیوں نہیں کرتیں جیسے جاوید، جنید اور کاجل کو کیا کرتی تھیں۔ پیار کرنا تو ایک طرف رہا وہ مجھ سے بات بھی بہت کم کیا کرتی تھیں۔ بلکہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں اور جب مجھ سے مخاطب ہوتی تھیں تو ان کے لہجے میں ایک عجیب سی کڑواہٹ ہوتی تھی۔ جسے میں صاف طور پر محسوس کیا کرتا تھا۔ یہ میں نے بعد میں جانا کہ کڑواہٹ کو عرفِ عام میں نفرت کہتے ہیں۔ زہرہ بیگم مجھ سے شدید ترین نفرت کیا کرتی تھیں۔ میں انہیں اپنی ماں ہی سمجھا کرتا تھا۔ جس طرح جمشید علی کو اپنا باپ سمجھتا تھا۔ اکثر میں اپنے بیڈروم کی کھڑکی سے لان میں شام کو زہرہ بیگم کو جاوید اور جنید کے ساتھ لاڈ پیار کرتے دیکھا کرتا تھا۔ تو میرے اندر سوال اٹھتا تھا کہ وہ مجھ سے اس طرح کا رویہ کیوں نہیں رکھتی ہیں۔ اس موقع پر ماہ پارہ کی کوشش ہوتی کہ وہ میرا دھیان کہیں اور لگا دیں۔ وہ کھڑکی کے پردے برابر کر کے مجھے ٹی وی سے بہلا لیتیں یا میرا کوئی پسندیدہ کھلونا نکال لیا کرتی تھیں۔ وہ میرے دل کے ان زخموں پر مرہم رکھا کرتی تھیں جو زہرہ بیگم کے رویئے سے لگا کرتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ ماہ پارہ کی کوششوں سے ہوں۔ اگرچہ جمشید علی کی توجہ اور دولت نے بھی اہم کردار ادا کیا لیکن میری شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ماہ پارہ بیگم نے ادا کیا تھا۔

زہرہ بیگم کے برعکس جمشید علی کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ ہوتا تھا۔ وہ جب بھی پیلس میں آتے تو سب سے پہلے میرے کمرے میں ہی آتے تھے۔ مجھے پیار کرتے اور وہ کھلونے دیتے جو وہ میرے لیے لاتے تھے۔ وہ مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں کوشش کے باوجود انہیں نہیں بتا پاتا تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ میرا بچگانہ ذہن اس کمی کو پکڑنے میں ناکام رہتا تھا۔ جو میں اپنی زندگی میں محسوس کرتا تھا۔ جب میں نے سکول جانا شروع کیا تو جمشید علی باقاعدگی سے میری تعلیمی پروگریس پر نظر رکھا کرتے تھے۔ وہ جب آتے میری رپورٹس اور رزلٹ دیکھا کرتے تھے۔ اچھی رپورٹس پر مجھے شاباش دیتے تھے اور پھر نصیحت کرتے تھے کہ میں دل لگا کر پڑھوں تا کہ بڑا آدمی بن سکوں۔

بچے کے سامنے جو مثال ہوتی ہے وہ وہی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت جمشید علی (جنہیں میں پاپا کہا کرتا تھا) اچھے لگتے تھے۔ ان کی یونیفارم مجھے پسند تھی۔ ان کی چھجے دار ٹوپی اور اس پر بنے نشانات مجھے بے حد اچھے لگتے تھے۔ عجیب بات تھی کہ وہ مجھے جو کھلونے لا کر دیا کرتے تھے وہ بھی زیادہ سمندر سے متعلق ہوتے تھے۔ جیسے موٹر بوٹس، بحری جہازوں کے ماڈل، آبدوزیں اور سی کرافٹس مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی بار ان سے کہا۔

"پاپا میں بھی آپ کی طرح ج [illegible] وں گا۔"

تو جمشید علی نے بے اختیار مجھے گود میں اٹھا کر چوم لیا تھا۔ ''میں اپنے بیٹے کو کیپٹن بناؤں گا کیپٹن یوسف علی۔''

انہوں نے اپنی کیپ اتار کر میرے سر پر رکھ دی تو میرا رواں رواں مسرت سے جھومنے لگا تھا۔ میرے دل سے ہنسی کی پھوار نکلی تھی۔ جمشید علی جس وقت پیلس میں داخل ہوئے تھے۔ میں لان میں جھولا جھول رہا تھا۔ ہنستے ہوئے میری نظر زہرہ بیگم پر پڑی جو کڑی نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سلگتی نفرت کی تپش محسوس کر کے میں سہم کر خاموش ہو گیا۔ جمشید علی نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ انہوں نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے گود سے اُتار کر جھولے پر بٹھاتے ہوئے بولے۔

''یوسف بابا آپ کھیلو شاباش۔''

وہ زہرہ بیگم کے پاس پہنچے تو وہ تڑپ کر بولیں۔ ''آپ پرائے بچے کو......''

مگر جمشید علی نے ان کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا تھا۔ ''زہرہ بیگم میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس بچے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

اس سے آگے ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں لان پر آگے بڑھ گئے تھے۔ میرا ذہن ان دو جملوں سے کوئی نتیجہ نکالنے سے قاصر رہا تھا۔ زہرہ بیگم کی طرح جاوید اور جنید بھی مجھ سے لاتعلق رہا کرتے تھے لیکن نہیں ان سے بھی میرا وہی تعلق تھا جو زہرہ بیگم سے تھا۔ یعنی نفرت کا۔ ان کی نگاہوں میں بھی وہی نفرت تڑپا کرتی تھی جو میں نے زہرہ بیگم کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔ میں ان لوگوں کی اس نفرت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بے شک مجھے جمشید علی کی توجہ حاصل تھی لیکن اسے محبت نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ محبت تو وہ تھی جو جمشید علی، جاوید، جنید اور کاجل سے کیا کرتے تھے۔ میرے حصے میں ہمیشہ توجہ آیا کرتی تھی اور مجھے یہ بھی غنیمت لگا کرتی تھی۔ کم از کم زہرہ بیگم کے رویئے کے بعد۔

اس روز جمشید علی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اپنے بیڈ روم کے سامنے گیلری میں، ماہ پارہ کی نظر بچا کر میں چپکے سے نچلی منزل میں آ گیا اور اب وہاں ہونے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس عورتیں تیزی سے بیڈ روم میں آ جا رہی تھیں۔ کبھی کبھار جمشید علی انہیں روک کر ان سے بات بھی کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا اگر جمشید علی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ مجھے یہاں سے جانے کا حکم دیں گے۔ لہٰذا میں ایک بڑے سے گملے کے عقب میں ہو گیا تھا۔ اس بڑے سے گملے میں پلاسٹک کا بنا خوب صورت پودا تھا۔ جو اتنا بڑا تھا کہ اس نے مجھے بہ خوبی چھپا لیا تھا۔

دفعتاً بیڈ روم سے زہرہ بیگم کی فلک شگاف چیخیں سنائی دیں۔ ایک لمحے کو تو میں سہم گیا تھا۔ پھر مجھے خوشی ہونے لگی کیونکہ زہرہ بیگم تکلیف میں تھیں۔ تبھی تو وہ چلا رہی تھیں۔ البتہ میں ان کی تکلیف




کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہرحال یہ چیخیں میرے لیے باعثِ راحت تھیں۔ چیخوں کا یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا اور پھر جس طرح اچانک شروع ہوا تھا اسی طرح اچانک تھم گیا۔ ان چیخوں کی جگہ ایک ننھی سی باریک آواز نے لے لی تھی۔ ایک نیا ذی روح دنیا میں اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ جمشید علی کی بے قراری دیکھنے والی تھی مگر وہ اندر جانے سے گریز کر رہے تھے۔ ظاہر ہے جب تک ڈاکٹرز کی طرف سے انہیں این او سی نہ مل جاتا وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک لیڈی ڈاکٹر اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے بڑا سا اوور آل پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں سفید ربر کے دستانے تھے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''مبارک ہو جمشید صاحب بیٹی ہوئی ہے۔''

''بیٹی۔'' جمشید علی نے آہستہ سے دہرایا پھر بولے۔

''زہرہ کیسی ہے؟''

''شی اینڈ ہر چائلڈ از آل رائٹ۔''

''میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔'' جمشید علی بولے۔ ان کا چہرہ اور آواز معمول کے مطابق سپاٹ تھی۔

''آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا اور واپس بیڈ روم میں چلی گئی۔

جمشید علی نے جیسے بادلِ نخواستہ سر ہلایا۔ دس منٹ بعد جب تمام نرسیں اور ڈاکٹر بیڈ روم سے چلے گئے تو جمشید علی اندر گئے۔ جیسے ہی گیلری سنسان ہوئی میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر زہرہ بیگم کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ مجھے اس ننھی سی آواز کے بارے میں تجسس تھا جو میں نے پہلی بار سنی تھی۔ اتفاق سے جمشید علی نے دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔ شاید جلدی میں وہ اسے کھلا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اندر جھانکا۔ جمشید علی بستر کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی اور زہرہ بیگم کی طرف جھکے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر بستر کے پاس ایک چھوٹے سے پالنے میں کلبلاتے وجود نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔

میں خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اگرچہ زہرہ بیگم کا خوف تھا لیکن اس ننھے وجود کو دیکھنے کا جذبہ زیادہ طاقتور تھا۔ جمشید علی کی پشت میری جانب تھی اور زہرہ بیگم بستر پر دراز ہونے کی وجہ سے مجھے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ میں احتیاط سے دبے قدموں پالنے تک گیا تھا۔ اس کی دیواریں فٹ بھر اونچی تھیں۔ میں نے اس کی جالیوں سے اندر جھانکا۔ جہاں ایک ننھا سا وجود لیٹا ہوا ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کی رنگت عجیب سی تھی۔ کسی قدر سانولی اور اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں۔ ان میں اس وقت بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ زہرہ بیگم پر گئی تھی جو کسی قدر سانولے رنگ کی تھیں۔ ان کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد حسین عورت تھیں۔ ورنہ سرخ و سفید اور وجیہہ جمشید علی ان سے شادی نہ کرتے۔ جاوید اور جنید بھی زہرہ بیگم کی طرح سانولے تھے اور اب یہ نیا بچہ

بھی ان کے رنگ و روپ پر گیا تھا۔ وہ عام بچوں سے کسی قدر مختلف تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اس کی بڑی سی آنکھوں میں بھی چمک تھی اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کم از کم اس وقت میں اسے اپنی طرح کا لڑکا ہی سمجھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں جس طرح دبے قدموں آیا تھا۔ اسی طرح دبے قدموں واپس چلا جاتا۔ زہرہ بیگم نے تکیے سے سر اُچکا کر پالنے کی طرف دیکھا تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی تھی۔

''یہ کہاں سے آ گیا؟'' انہوں نے تیز لہجے میں جمشید علی سے کہا۔

جمشید علی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور خلافِ توقع مسکرا دیئے۔ ''شاید اسے بھی بچی کی پیدائش کی خبر ہو گئی اور یہ اسے دیکھنے چلا آیا۔'' وہ بولے۔

میرا خیال تھا کہ زہرہ بیگم مزید ناراض ہو جائیں گی لیکن جمشید علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ مسکرانے لگیں اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے وہ سوال پوچھ لیا جو خاصی دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

''یہ کہاں سے آیا ہے؟''

''کہاں سے آئی ہے؟'' جمشید علی نے تصحیح کی۔ ''یہ لڑکی ہے اور ہماری بیٹی ہے۔''

''جاوید اور جنید کی طرح؟'' میں نے کہا تو وہ دونوں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے لاشعوری طور پر خود کو ان کے بچوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا تھا کچھ دیر بعد جمشید علی نے آہستگی سے سر ہلایا۔

''اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''گوری ہم اسے گوری کہیں گے۔'' زہرہ بیگم نے جواب دیا۔

''مگر یہ تو کالی ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ تو فوراً ہی زہرہ بیگم کے تیور بگڑ گئے۔

''خبردار جو میری بچی کو کچھ کہا تم خود کالے ہو۔''

''آرام سے زہرہ۔'' جمشید علی ملائمت سے بولے۔ ''اس نے وہی کہا ہے جو حقیقت ہے تم کیوں کمپلیکس فِیل کرتی ہو۔ کیا دنیا میں کالے بچے نہیں ہوتے۔ افریقہ میں تو سیاہ فام لوگ ہوتے ہیں۔''

''ہوتے ہوں گے۔'' زہرہ بیگم پھٹ پڑی تھیں۔ ''لیکن ان بچوں پر احساسِ کمتری لادنے کے لیے گورے بچے نہیں مسلط کیے جاتے۔ میں پوچھتی ہوں آخر آپ......''

''بی کوائیٹ۔'' جمشید علی نے زہرہ بیگم کے لبوں پر انگلی رکھ دی تھی۔ ''میں تمہیں سب بتا دوں گا لیکن مناسب وقت آنے پر۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے یوسف۔''

کمرے سے باہر آتے ہی میں نے دریافت کیا۔ ''آپ زہرہ بیگم کو کیا بتا دیں گے؟'' شاید یہ





بات عجیب لگے لیکن میں انہیں زہرہ بیگم ہی کہا کرتا تھا۔

''یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔'' جمشید علی نے میرے گال تھپتھپائے۔ ''جاؤ جا کر کھیلو۔''

زہرہ بیگم کو میرا بچی کو کالا کہنا بُرا لگا تھا مگر انہوں نے اپنی بیٹی کا نام کاجل رکھا تھا اور کاجل کالا ہوتا ہے۔ اس پر یہ نام بجتا تھا۔ مجھے وہ اچھی لگتی تھی لیکن نہ جانے کیوں زہرہ بیگم مجھے اس کے پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھیں۔ اگر میں کبھی اس کے پاس چلا جاتا تھا تو ڈانٹ کر بھگا دیا کرتی تھیں میں بھی تاک میں لگا رہتا تھا۔ کب مجھے موقع ملے اور میں اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ایک روز میں لان میں جھولا جھول رہا تھا۔ زہرہ بیگم کاجل کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ جاوید اور جنید بھی وہیں کھیل رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاجل کو جا کر دیکھوں وہ اب چار مہینے کی ہو چکی تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے موقع گیا۔ اندر سے ملازمہ نے آ کر زہرہ بیگم سے کہا۔

''بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے کوئی شہناز بیگم ہیں۔''

''اوہ۔'' زہرہ بیگم جلدی سے اٹھیں۔ ''تم ذرا کاجل کا خیال رکھنا۔''

جیسے ہی زہرہ بیگم اندر گئیں۔ میں جھولے سے اُترا اور لپک کر کاجل کے پاس آ گیا جو ایک باسکٹ نما چیز میں لیٹی ہوئی ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور اپنی سیاہ چمک دار آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے باسکٹ سے جھک کر اسے دیکھا۔ یہ بید کی لکڑی کی بنی خوب صورت باتھ ٹب نما باسکٹ تھی۔ کاجل اس میں نرم بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اب اس قابل تھی کہ اپنا سر اوپر اٹھا سکے۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ کھلکھلاتے ہوئے آواز نکالنے لگی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے پاس ہی گھاس پر بیٹھی ملازمہ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یہ آپ کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ یوسف بابا۔'' وہ بولی پیلس کے تمام ملازمین مجھے یوسف بابا کہتے تھے۔''

''کیا میں اسے گود میں لے سکتا ہوں؟''

ملازمہ نوجوان سی لڑکی تھی۔ اس نے شرارت سے مجھے دیکھا۔ ''نہیں ابھی آپ اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ بے بی کو گود میں لے سکیں۔''

''میں اتنا بڑا کب ہوں گا؟'' میں نے سوچ کر کہا۔

ملازمہ پھر شرارت سے بولی۔ ''جب آپ جمشید صاحب جتنے بڑے ہو جائیں گے۔''

''پاپا جتنا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن اس وقت تک تو یہ بھی بڑی ہو جائے گی زہرہ بیگم کی طرح۔''

ملازمہ کو مجھ سے کھیل کر لطف آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو کیا ہوا جب آپ طاقتور مرد بن جاؤ گے تو آرام سے کاجل بے بی کو گود میں اٹھا لو گے۔''

میں نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں میں اسے پھر بھی گود میں نہیں اٹھا سکوں گا۔ کوئی بھی بڑا آدمی کسی بڑی عورت کو گود میں نہیں اٹھاتا۔''

''اٹھاتا ہے۔'' ملازمہ ہنسی۔ ''لیکن سب کے سامنے نہیں بلکہ اکیلے میں۔''

''تمہیں بھی کسی نے اٹھایا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ ساری شرارت بھول گئی اس کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔

''یوسف بابا آپ بہت باتیں کرنے لگے ہیں۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''میں میڈم ماہ پارہ سے آپ کی شکایت کروں گی۔'' کاجل نے اب ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ہمک ہمک کر میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ملازمہ سے پوچھا۔ ''کیا میں اسے پیار کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں یوسف بابا۔'' وہ بولی۔

میں بے اختیار اس کی طرف جھکا۔ جیسے ہی میں نے اس کے نرم سے پھولے ہوئے گال پر پیار کیا اُس نے میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ اس کی گرفت کی سختی سے مارے تکلیف کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور جب ملازمہ نے میرے بال چھڑانے کی کوشش کی تو کاجل نے چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ حالانکہ درد مجھے ہو رہا تھا۔ بدقسمتی سے اس لمحے زہرہ بیگم آ گئیں۔ ملازمہ میرے بال چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاجل کی چیخیں سن کر زہرہ بیگم لپک کر آئیں۔ ان کے خیال میں شاید میں کاجل کو کوئی تکلیف دے رہا تھا۔ انہوں نے یہ دیکھے بغیر کہ کاجل کی مٹھی میں میرے بال ہیں مجھے پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکا دیا تھا۔ اس روز کاجل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ میرے بال نہیں چھوڑے گی۔ لہٰذا جب میں دھکے کے زور سے پیچھے گرا تو وہ بھی میرے ساتھ کھنچی چلی آئی تھی۔ اسے باسکٹ سے باہر گرتے دیکھ کر زہرہ بیگم نے دہلا دینے والی چیخ ماری۔

''چھوڑ کمینے میری بچی کو۔''

بوکھلائی ہوئی ملازمہ نے زہرہ بیگم کو بتانا چاہا۔ ''بیگم صاحبہ بال تو کاجل بے بی نے پکڑ رکھے ہیں یوسف بابا کے۔''

اس وقت تک زہرہ بیگم بھی دیکھ چکی تھیں کہ میرے بال کاجل کی مٹھی میں تھے۔ انہوں نے نہایت وحشیانہ طریقے سے میرے بال چھڑائے۔ کچھ بال ٹوٹ کر کاجل کی مٹھی میں رہ گئے تھے اور وہ یوں چلا چلا کر رو رہی تھی جیسے اس کے بال کھینچے گئے ہوں۔ جب زہرہ بیگم نے جھٹکا دے کر میرے بال چھڑائے تو مارے درد کے میری چیخ نکل گئی۔ اس سے پہلے میں نہایت صبر سے تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ اس لمحے ماہ پارہ وہاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے میری چیخ سنی تو لپک کر میری طرف آئیں اس وقت زہرہ بیگم مجھے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا چکی تھیں لیکن ماہ پارہ کو درمیان میں آتے دیکھ کر ان کا ہاتھ رُک گیا تھا۔





''اتنے سے بچے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے بیگم جمشید۔'' انہوں نے بہ ظاہر نرم لہجے میں کہا لیکن ان کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ زہرہ بیگم کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ وہ چند لمحے ماہ پارہ کو گھورتی رہیں پھر چیخ کر ملازمہ سے کہا۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ کاجل کو اندر لے چلو۔'' یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے اندر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ماہ پارہ نے پیار سے میری پلکوں پر آئے آنسو صاف کیے۔ مجھے پیار کیا اور گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں۔ میرا منہ ہاتھ دھلا کر انہوں نے مجھ سے واقعے کے بارے میں پوچھا تو میں نے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ حتیٰ کہ کاجل کو گود میں اٹھانے والی بات اور اس کے حوالے سے ملازمہ سے سوال جواب بھی لفظ بہ لفظ سنا دیئے۔ یہ سن کر ماہ پارہ کا رنگ بھی ذرا دیر کے لیے بدل گیا تھا لیکن انہوں نے مجھے کچھ کہا نہیں۔ سوائے اس کے میں آئندہ جو پوچھنا چاہوں صرف ان ہی سے پوچھوں کسی اور سے ہرگز نہیں اور کیونکہ ماہ پارہ بیگم نے خود ہی اجازت دے دی تھی لہٰذا میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سوال کر لیا۔

''زہرہ بیگم مجھے پیار کیوں نہیں کرتی ہیں؟''

حالانکہ مجھے پوچھنا چاہیے تھا کہ زہرہ بیگم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں۔ مگر مجھے اس وقت اس جذبے کا اتنا شعور نہیں تھا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ زہرہ بیگم مجھے اس طرح پیار کیوں نہیں کرتیں۔ جیسے اپنے بچوں کو کیا کرتی تھیں۔ ماہ پارہ سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ ان کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ آپ سے پیار نہیں کرتیں؟''

''کسی نے نہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے۔''

ماہ پارہ کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ وہ مجھے جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔ زہرہ بیگم کی مجھ سے نفرت ایک ایسی حقیقت تھی جس سے جمشید پیلس کا ہر شخص واقف تھا۔ لہٰذا انہوں نے مجھے ٹال دیا اور بات کو گول کرتے ہوئے بولیں۔

''یوسف بابا آپ کے قرآن پاک پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آپ تیار ہو جائیں۔''

مغرب کے وقت ایک مولوی صاحب مجھے قرآن کریم پڑھانے آتے تھے۔ ان کے بعد دو ٹیوٹر مجھے گھر میں ہی مختلف مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں مجھے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا اور میرا ٹائم ٹیبل کچھ اس طرح کا تھا کہ مجھے فرصت کے لمحات کم ہی ملتے تھے۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک میں سکول میں ہوتا تھا۔ وہاں سے واپسی پر دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے ایک گھنٹہ آرام کے لیے ملتا تھا۔ چار سے چھ بجے تک مجھے کھیلنے کی مکمل آزادی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پہلے مولوی صاحب اور پھر دوسرے ٹیوٹر آ جاتے تھے۔ رات آٹھ بجے میں کھانا کھاتا تھا۔ ایک گھنٹہ مجھے ٹی وی

دیکھنے کے لیے ملتا تھا۔ اس دوران میں اپنی پسند کے کارٹون دیکھا کرتا تھا۔ ٹھیک دس بجے میں بستر پر چلا جاتا تھا۔

میں تینوں وقت کا کھانا اوپری منزل کے ڈائننگ ہال میں کھایا کرتا تھا۔ کھانے میں سوائے ماہ پارہ کے اور کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ یہ ڈائننگ ہال گیسٹ ہاؤس سے منسلک تھا۔ لہٰذا جب کوئی ایسا مہمان وہاں آ کر ٹھہرا کرتا تھا جسے جمشید علی خاندان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں کرتے تھے تو مجھے کھانا اپنے کمرے میں کھانا پڑتا تھا دیگر ادب و آداب کے ساتھ کھانے کے طور طریقے بھی مجھے ماہ پارہ بیگم نے سکھائے تھے۔ وہ بھی اوپری منزل میں ہی رہا کرتی تھیں اور ان کا بیڈروم میرے بیڈ روم کے برابر میں ہی تھا۔ جس کا ایک دروازہ میرے بیڈروم میں بھی کھلتا تھا۔ اس طرح ہم جب چاہتے ایک دوسرے کے کمرے میں جا سکتے تھے۔ جب میں دس بجے بستر پر جاتا تو وہ بھی کپڑے بدل کر آ جاتی تھیں۔ پھر جب تک مجھے نیند نہیں آ جاتی تھی۔ وہ مجھے کہانیاں سناتیں یا فارسی اشعار گنگنا کر لوری سناتیں۔ جنہیں سنتے سنتے میں نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا تھا۔

لان والے واقعے کے بعد زہرہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ میں کاجل کے قریب بھی نہ پھٹکوں۔ انہوں نے ماہ پارہ کے سامنے مجھ سے پھنکار کر کہا تھا۔ ”اگر میں نے تمہیں کاجل کے پاس دیکھا تو بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔“

”زہرہ بیگم اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو براہِ کرم مجھ سے کہیں۔“ ماہ پارہ نے نرمی سے کہا۔

”تم خاموش رہو۔“ وہ کڑک کر بولیں اور جس طرح بیڈروم میں آئی تھیں اس طرح واپس چلی گئیں۔

ایک بچے کی فطرت ہوتی ہے۔ اسے جس کام سے منع کیا جاتا ہے وہ اسے کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ میں بھی یہ بچہ فطرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس فکر میں رہتا تھا کہ کب موقع ملے اور آنکھ بچا کر کاجل تک رسائی حاصل کروں اور یہ کام بے حد مشکل ہوتا تھا۔ اول تو زہرہ بیگم ہی اسے اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔ کاجل کی پیدائش سے پہلے وہ خاصی سوشل قسم کی خاتون تھیں لیکن بعد میں انہوں نے پیلس سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا اور اگر وہ کچھ دیر کے لیے کاجل کے پاس سے ہٹ کر بھی جاتی تھیں تو ملازمہ اس کے پاس موجود رہا کرتی تھی لیکن ایک روز مجھے موقع مل ہی گیا۔ زہرہ بیگم نے شام کے وقت ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ وہ شاپنگ کے لیے جا رہی تھیں۔ اتفاق سے میں نے یہ حکم سن لیا۔ ملازمہ جو کاجل کے لیے مخصوص تھی۔ زہرہ بیگم کے جاتے ہی وہ بے فکر ہو کر کمرے سے نکل گئی اور میں فوراً زہرہ بیگم کے بیڈروم میں جا گھسا۔ ملازمہ کی بے فکری کی وجہ یہ بھی تھی کہ کاجل سو رہی تھی۔ لہٰذا وہ دوسرے ملازموں سے گپیں لڑا سکتی تھی۔ اس وقت کاجل سات یا آٹھ مہینے کی تھی اور خاصی صحت مند ہو گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کا فراک پہنے سو رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پالنے کی دیواریں خاصی اونچی تھیں اور میرا سر بہ مشکل دیواروں کے سرے تک پہنچتا تھا۔ پالنے کی سلاخوں سے کاجل کو





دیکھنا مشکل نہیں تھا لیکن میں اسے گود میں لینا چاہ رہا تھا۔

پہلے میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کوئی چیز تلاش کی جس پر چڑھ کر میں پالنے کے اندر جا سکتا مگر اتفاق سے کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک بھاری بھرکم ہینگنگ چیئر تھی لیکن اسے کھینچنا ایک پانچ سالہ بچے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک ناکامی کے بعد متبادل تدبیروں پر غور کرنے لگا تھا۔ ایک تدبیر تو یہ تھی کہ میں پالنا کھینچ کر بستر تک لے آؤں مگر پالنے کا وزن، میرے لیے اسے ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے واحد قابلِ عمل مگر خطرناک ترین راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

پالنا اوپر سے چوڑا تھا اور اس کا نچلا حصہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس ڈیزائن کی وجہ سے پالنا خوب صورت تو نظر آتا تھا لیکن ساتھ ہی غیر محفوظ بھی ہو گیا تھا۔ ذرا سا زور لگانے پر یہ آرام سے اُلٹ جاتا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود یہ پہلو میری نظر میں تھا اور میں پالنے پر چڑھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مگر کاجل کو چھونے اور اسے گود میں لینے کی خواہش اتنی توانا تھی کہ میں اس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو سکتا تھا۔ اپنے لیے بھی اور کاجل کے لیے بھی۔ میں نے پہلے ایک بار کمرے سے باہر جھانکا کہ کہیں ملازمہ نہ آ رہی ہو۔ پھر میں نے احتیاط سے واپس آ کر اپنے جوتے اتارے۔ پھر دونوں ہاتھ پالنے کی دیواروں پر جما کر میں نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی تھی کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پالنا ایک دم غیر متوازن ہوا اور ایک دم اس طرف اُلٹ گیا۔ جس طرف سے میں اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پالنا پورے وزن کے ساتھ مجھ پر آ گرا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا اور اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا یقیناً میرا سر پھٹ جاتا۔ مگر پالنا گرنا ہی کچھ کم نہیں تھا۔ یوں لگا جیسے مجھ پر کوئی وزنی چٹان آ گری ہو۔ تکلیف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میری چیخ کے ساتھ ہی کاجل کے رونے کی آواز آئی تھی۔ وہ اس بلائے ناگہانی پر فریاد کناں تھی۔ چند لمحے پہلے وہ سکون سے اپنے پالنے کی دنیا میں سو رہی تھی اور ایک دم ہی اس کی دنیا زیروزبر ہو گئی تھی۔

کاجل کے رونے کی آواز سن کر میں نے پالنے کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پالنا غیر معمولی وزنی تھا۔ خوش قسمتی سے اس لمحے ملازمہ آ گئی تھی۔ غالباً کاجل کے رونے کی آواز سن کر اس نے لپک کر پالنا سیدھا کیا اور جب اس نے کاجل کو دیکھا تو اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ کاجل کی ٹھوڑی خون خون ہو رہی تھی۔ شاید کہ پالنا گرنے کی وجہ سے اس کی ٹھوڑی المونیم کی ریلنگ سے جا ٹکرائی تھی۔ پالنا ہٹنے کے بعد میں بہ مشکل کھڑا ہوا تھا میرے سر اور سینے میں شدید درد ہو رہا تھا مگر فی الوقت میں درد اور کاجل کو بھول گیا تھا اور یہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا کہ زہرہ بیگم وہاں آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں شاپنگ کے ڈبے دبے ہوئے تھے۔ انہوں نے کاجل کے رونے کی آواز سنی تھی اس لیے سیدھی وہاں آئی تھیں اور جب انہوں نے کاجل کا خون آلود چہرہ دیکھا تو ان کے ہاتھ سے ڈبے چھوٹ گئے۔

"کیا ہوا کا جل کو؟" وہ چیختی ہوئی ملازمہ کی طرف جھپٹیں میں موقع پا کر بھاگ نکلا۔ پیچھے ملازمہ ہکلا ہکلا کر انہیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ جو اس گھر میں میری واحد پناہ گاہ تھا مگر ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ ابھی زہرہ بیگم آگ بگولہ ہو کر میرے پیچھے آئیں گی اور پھر میری خیر نہیں ہوگی۔ میں جاتے ہی بستر میں دبک گیا۔ ماہ پارہ بیگم ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ حسبِ توقع زہرہ بیگم فوراً ہی میرے پاس آئی تھیں۔ غصے سے ان کا بُرا حال تھا اور منہ سے جھاگ کے ساتھ میرے لیے مغلظات بھی نکل رہی تھیں۔ انہیں اس طرح غصے میں دیکھ کر میں مزید سہم گیا تھا۔ میں نے وضاحت کی کوشش کی۔

"میرا......میرا کوئی قصور نہیں تھا۔"

نفرت نے زہرہ بیگم کے خوب صورت نقوش یوں مسخ کر دیئے تھے کہ وہ مجھے ایک کامک بک کی چڑیل کے کردار سے ملتی جلتی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گھسیٹ کر بستر سے اُتارا اور پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ طمانچے کی شدت سے میرا منہ گھوم گیا تھا اور گال جیسے سلگنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرا تھپڑ لگائیں ماہ پارہ بیگم نے پیچھے سے آ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" انہوں نے غصے سے کہا۔ انہوں نے میرا نیلا پڑ جانے والا گال دیکھ لیا تھا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ تمہاری جرأت کیسے ہوئی۔" زہرہ بیگم نے گرج کر کہا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میری جرأت کیوں کر ہوئی۔" ماہ پارہ اطمینان سے بولیں۔ انہوں نے زہرہ بیگم کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا جو اب بھی غصے سے لرز رہی تھیں۔ ان کے غصے کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"تم......تم دو ٹکے کی عورت......داشتہ۔"

"بس۔" ماہ پارہ طیش میں آ گئی تھیں۔ "اب آپ کے منہ سے ایک لفظ نکلا تو میں لحاظ نہیں کروں گی۔ میری زبان کھل گئی تو آپ سب کے سامنے تماشہ بن جائیں گی۔"

اس لمحے زہرہ بیگم کا تمام تر طیش سوڈے کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کا چہرہ راکھ جیسا ہو گیا تھا اور وہ ایک لفظ کہے بغیر مڑیں اور میرے بیڈ روم سے چلی گئیں۔ جب ماہ پارہ نے مجھے خود سے لپٹایا تو مجھے اپنے گال میں اٹھنے والی ٹیسوں کا احساس ہوا تھا۔ میں بے اختیار سسک اٹھا تھا۔ شاید تکلیف سے زیادہ اس تذلیل نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا تھا جو زہرہ بیگم نے ماہ پارہ کے سامنے مجھے مار کر کی تھی۔ مگر ماہ پارہ کی محبت بھری آغوش نے مجھے جلد پُرسکون کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ "یوسف بابا آپ نے کیا کیا تھا؟"

میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میں ان سے جھوٹ بول نہیں سکتا تھا۔ میری بات سن کر وہ بولیں۔ "تبھی زہرہ بیگم اتنے غصے میں تھیں۔ غلطی بھی تو تمہاری تھی اگر زہرہ بیگم نے تمہیں تھپڑ نہ





مارا ہوتا تو میں خود تمہیں سزا دیتی۔"

"جی نہیں۔" میں ان کی گود میں مزید دبک گیا۔ "آپ مجھے نہیں ماریں گی آپ تو بہت اچھی ہیں۔"

"اچھا تو مکھن لگا رہے ہو۔" انہوں نے میرے مضروب گال کو چوما پھر اپنے کمرے سے جا کر ایک ٹیوب سے کریم نکال کر میرے گال پر مالش کرنے لگی تھیں۔ نہ جانے یہ مرہم کا اثر تھا یا ماہ پارہ بیگم کی محبت بھری انگلیوں کا اثر تھا کتنی عجیب بات تھی کہ زہرہ بیگم کی طرح میں ماہ پارہ کو بھی ان کے نام سے پکارتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں آنٹی یا اس قسم کے کسی اور لفظ سے نہیں پکارا لیکن جس طرح زہرہ بیگم کا لفظ میرے لیے نفرت کی علامت تھا۔ اسی طرح ماہ پارہ بیگم کا لفظ میرے لیے سراپا محبت تھا۔ میں دونوں کا موازنہ کر رہا تھا تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"زہرہ بیگم گندی ہیں۔"

"اوہوں۔" ماہ پارہ نے فوراً ہی مجھے سرزنش کی۔ "بڑوں کے لیے ایسے نہیں کہتے۔ یاد رکھو ہمیشہ بڑوں کی عزت کیا کرو۔"

"مگر انہوں نے مجھے مارا تھا۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ پھر مجھے زہرہ بیگم کے الفاظ یاد آ گئے۔ انہوں نے آپ کو راتا (داشتہ) بھی کہا تھا۔ یہ گالی ہوتی ہے ناں؟"

ماہ پارہ کا رنگ بدل گیا تھا۔ "ہاں گالی ہوتی ہے اور بہت بُری گالی ہوتی ہے۔ آئندہ تم یہ لفظ زبان پر نہیں لاؤ گے۔" اس وقت میرا ذہن ان باتوں کو سمجھنے کے قابل نہیں تھا مگر مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ زہرہ بیگم اور ماہ پارہ کے درمیان ناپسندیدگی کا کوئی رشتہ موجود تھا۔ اگر زہرہ بیگم سانولی سلونی خوب صورتی رکھتی تھیں تو ماہ پارہ سرخ و سفید رنگ کی حسین ترین عورت تھیں۔ بلکہ وہ مجھے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت لگتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ جمشید پیلس میں وہ واحد ہستی تھیں جو مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ جمشید علی بھی میرے ہمدرد تھے لیکن وہ پیلس میں بہت کم رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ سفر میں رہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ایک بحری جہاز کے کپتان کو بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ بلکہ جب جمشید علی گھر آتے تھے تب بھی وہ زیادہ بیوی بچوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میرے پاس وہ بہت کم آیا کرتے تھے۔ ان حالات میں ماہ پارہ ہی وہ ہستی تھیں جن پر میں مکمل طور پر بھروسہ کر سکتا تھا اور ان کی مکمل توجہ مجھے حاصل تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جمشید علی کی طرف سے میری پرورش کے معاملے میں وہ کلی طور پر خود مختار تھیں۔

اس دن کے بعد کئی روز تک میری ہمت نہ ہو سکی تھی کہ نچلی منزل کی طرف جاؤں یا جا کر لان پر کھیلوں۔ لان پر تمام تر کھیل میں اکیلے ہی کھیلا کرتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی جاوید یا جنید میرے ساتھ کھیلے ہوں۔ ہاں وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ایک بار میں لان پر اپنی فٹ بال سے کھیل رہا تھا جو مجھے جمشید علی نے لا کر دی تھی۔ اکثر وہ اپنے بچوں کے لیے جو

کھلونے لاتے تھے ویسے ہی کھلونے میرے لیے بھی لاتے تھے۔ جاوید اور جنید بھی اسی قسم کی فٹ بال سے کھیل رہے تھے۔ ان کی بال کِک لگنے سے لان کے ایک گوشے میں بنے تالاب میں جا گری تھی۔ اس تالاب میں ننھی منی رنگ برنگ مچھلیاں پلی ہوئی تھیں اور تالاب کی تہہ میں خوشنما پتھر اور پودے تھے۔ تالاب گہرا تو نہیں تھا لیکن رقبے میں خاصا بڑا تھا۔ جاوید اور جنید کی فٹ بال تالاب کے عین وسط میں جا گری تھی۔

اس کی طرف سے مایوس ہو کر ان دونوں نے آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے اور وہ تیزی سے میری طرف آئے میں بال کو ایک خیالی گول میں پھینکنے کی مشق کر رہا تھا۔ جاوید نے قریب آتے ہی مجھے دھکا دیا اور جنید نے میری فٹ بال پر قبضہ کر لیا۔

''ارے یہ میری فٹ بال ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''یہ ہماری فٹ بال ہے۔'' جاوید نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''تمہاری بال وہ رہی۔'' اس نے تالاب میں پڑی فٹ بال کی طرف اشارہ کیا۔ ''جاؤ جا کر اسے نکال لو۔''

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''یہ میری بال ہے۔ تمہاری والی پانی مین پڑی ہے۔''

میں نے جنید سے بال چھیننے کی کوشش کی تو جاوید نے دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں مجھ پر ٹھوکریں برسانے لگے۔ انہوں نے فٹ بال کھیلنے والے جوتے پہن رکھے تھے جن کا اگلا حصہ فولاد کا بنا تھا۔ ان کی ٹھوکروں سے میرے جسم پر کئی زخم آئے تھے۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے جاوید کی ٹانگ پکڑ کر مروڑ دی اور جنید کی رانوں کے درمیان لیٹے لیٹے ایسی لات جمائی کہ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ جب تک لان کے ایک گوشے میں کام کرنے والے مالی نے آ کر ہمیں چھڑایا ہم ایک دوسرے کا حلیہ خراب کر چکے تھے۔ وہ دو تھے لہٰذا زیادہ چوٹیں مجھے آئی تھیں۔ پسلی کے علاوہ ٹھوکر لگنے سے ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون رِس رہا تھا۔ میں زور زور سے ہانپ رہا تھا لیکن وہ دونوں باقاعدہ رو رہے تھے۔ خاص طور سے جنید کا بُرا حال تھا۔ جاوید مجھ سے ایک سال بڑا تھا اور جنید چھ مہینے چھوٹا تھا مگر قد و قامت میں مَیں ان پر حاوی تھا۔ چھ سال کی عمر میں نو دس سال کا لگتا تھا وہ دونوں میرے سامنے دبتے تھے اگر وہ مجھے گرانے میں کامیاب نہ ہو جاتے تو میں اتنی آسانی سے مار نہ کھاتا۔

اتفاق سے جمشید علی پیلس میں موجود تھے۔ اس لیے زہرہ بیگم مجھ پر دانت کچکچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس رات کھانے کے بعد جمشید علی نے ہمیں اپنی اسٹڈی میں طلب کر لیا۔ اسٹڈی ایک طرح سے ان کی عدالت بھی تھی۔ جہاں گھریلو مقدمات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ جمشید علی نے باری باری ہم سب سے اکیلے میں بیان لیا۔ مَیں نے اپنی باری پر پورے اعتماد سے ان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا اور میں نے کہاں کہاں چوٹیں کھائی تھیں اور انہیں کہاں کہاں مارا





تھا۔ جاوید اور جنید کے بیانات میں تضاد تھا۔ پھر شاید جمشید پیلس کے ملازمین بھی اُن کو حقیقت حال سے باخبر کر چکے تھے۔ اس لیے جمشید علی نے ان دونوں کو قصوروار ٹھہرایا تھا۔

''جھگڑا تم دونوں نے شروع کیا تھا۔ اب تم دونوں کو سزا ملے گی۔ تم دو دن کھیلو گے نہیں بلکہ اپنے کمرے میں رہو گے۔'' جاوید اور جنید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی نفرت سے بھرپور نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ جمشید دھاڑے۔

''سنا نہیں تم دونوں نے؟''

''یس ڈیڈ۔'' وہ ایک ساتھ بولے۔

''تو پھر جواب کیوں نہیں دیا؟''

''سوری ڈیڈ...... ہم دو دن نہیں کھیلیں گے۔'' جاوید بادلِ نخواستہ بولا۔

جمشید علی نے گہری سانس لی۔ ''او کے سنز۔ اب تم جا سکتے ہو اور ہاں یاد رکھو آئندہ میں تم تینوں کو گنوار بچوں کی طرح لڑتے نہ دیکھوں انڈر اسٹینڈ۔''

بادلِ نخواستہ ہم تینوں نے سر ہلایا۔ ہمارے دل میں اس کے برعکس خیالات تھے۔ کم از کم میں نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ انہوں نے مجھے چھیڑا تو انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ چاہے اس کے بعد مجھے سزا کیوں نہ ملے۔ غالباً یہی خیال ان کے ذہنوں میں بھی تھا مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے اُلجھتے میں خود بھی باہر لان پر جانے سے کتراتا تھا کیونکہ وہاں زہرہ بیگم ہوتی تھیں اور وہ مجھے کھا جانے والے انداز میں دیکھا کرتی تھیں۔ ان کی ان نگاہوں سے مجھے خوف کے ساتھ الجھن بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے اس گریز کو ماہ پارہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''یوسف تم کھیلنے کے لیے لان پر کیوں نہیں جاتے؟''

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے لان پر جا کر کھیلنے میں مزہ نہیں آتا۔''

''میری طرف دیکھو۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ''اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ کیا کسی نے تمہیں منع کیا ہے۔''

ماہ پارہ نے مجھے بچپن سے یہی سکھایا تھا کہ ہمیشہ سچ بولو۔ چاہے اس سے نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ جھوٹ بولنا ایک بُری عادت ہے جس سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ موجودہ زمانے میں بچہ ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی جھوٹ کی افادیت محسوس کرنے لگتا ہے جو بے شک وقتی ہوتی ہے۔ پہلے شرما کر اور جھجک کر جھوٹ بولتا ہے پھر رفتہ رفتہ بے حس ہوتا چلا جاتا ہے۔ دھڑلے سے جھوٹ بولنے لگتا ہے اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلاضرورت بھی جھوٹ بول جاتا ہے۔ میں بھی جھوٹ کی افادیت محسوس کرنے لگا تھا اور جھوٹ بولنے بھی لگا تھا لیکن ابھی اتنا پکا نہیں ہوا تھا کہ بولے جانے والے جھوٹ کو ڈھٹائی سے نبھا بھی سکوں لہٰذا جب ماہ پارہ نے مجھے پکڑا

تو مجھے سچ بولنا پڑا تھا۔

"مجھے زہرہ بیگم سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھے پھر ماریں گی۔"

"وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں......" ماہ پارہ کسی قدر طیش سے بولیں پھر جلدی سے خود پر قابو پا لیا۔

"اب وہ تمہیں نہیں ماریں گی۔ اس وقت تو وہ غصے میں تھیں اور انسان ہر وقت تھوڑی غصے میں رہتا ہے۔"

"زہرہ بیگم ہر وقت غصے میں رہتی ہیں اور انہیں مجھ پر بہت غصہ آتا ہے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

ماہ پارہ نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ انہوں نے کہا۔ "تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ زہرہ بیگم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔ تم نچلی منزل پر بھی جاؤ گے اور لان پر بھی کھیلو گے۔ چلو میرے ساتھ۔"

ماہ پارہ مجھے نیچے لے گئی تھیں۔ انہوں نے میرے ساتھ فٹ بال کھیلی اور کھیلتے ہوئے خود بھی بچی بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ کمر سے باندھ لیا تھا لیکن دیکھنے والوں کے لیے وہ بچی نہیں بلکہ ایک بھرپور جوان عورت تھیں لہٰذا کچھ دیر بعد جب انہوں نے جابر کو لان پر دیکھا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا انہوں نے جلدی سے دوپٹہ اُتار کر شانوں پر پھیلا لیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ پیلس کے قواعد کے مطابق جب لان میں عورتیں ہوں تو مرد یہاں نہیں آ سکتے۔"

"قانون تو اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "لیکن یہ صرف مالکوں کے لیے ہے ملازموں کے لیے نہیں۔"

جابر گورے رنگ کا لمبا تڑنگا شخص تھا۔ چیچک کے داغوں نے اس کے چہرے کو بدنما بنا دیا تھا لیکن اس کی فطری خباثت نے اسے مکروہ کر دیا تھا۔ وہ پیلس کا منتظم تھا اور جمشید علی کی عدم موجودگی میں ان کے تمام کاروباری معاملات بھی وہی دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوائے جمشید علی کے کسی کو جوابدہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ زہرہ بیگم سے بہت دبتا تھا۔ ان کے آگے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتا پھرتا تھا۔ اس کی سخت گیر فطرت کی وجہ سے پیلس کا کوئی فرد اسے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ ماہ پارہ اس سے نفرت کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے دوسری منزل کے اس حصے میں جابر کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ جہاں میں رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماہ پارہ اس سے نفرت کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ دوسری منزل کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر ماہ پارہ پر پڑتی تھی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ جاتی تھی اور ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔

"تم شاید بے خبر ہو۔" ماہ پارہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں جمشید پیلس میں ملازم نہیں





ہوں اور آئندہ اس طرح میرے سامنے نہ آنا۔ ورنہ مجھے جمشید صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔"

"اگر تمہیں جمشید صاحب سے بات کرنے کا شوق ہے تو ضرور کرو لیکن کبھی کبھی اس خادم سے بھی بات کر لیا کرو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

ماہ پارہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ گھٹی گھٹی سی پُر طیش آواز میں بولیں۔ "تم ایک نہایت گھٹیا شخص ہو۔" پھر مجھ سے بولیں۔ "چلو یوسف بابا اپنے کمرے میں۔"

ماہ پارہ کی بات سن کر جابر کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ "ماہ پارہ بیگم تم میری نرمی کا کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی ہو۔"

"میں تم جیسے شخص سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔" ماہ پارہ بولیں اور میرا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ میں ذرا پیچھے تھا اس لیے میں نے جابر کے الفاظ سن لیے تھے۔ اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا۔

"کتیا تجھے بھی دیکھ لوں گا۔"



اس دفعہ جمشید علی غیر متوقع طور پر اور غیر متوقع انداز میں پیلس آئے تھے۔ وہ بغیر اطلاع دیئے آئے تھے اور ان کے سفید یونیفارم پر خون کے دھبے تھے۔ ایک شخص نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ جمشید علی کو پیلس پہنچاتے ہی وہ پُراسرار شخص واپس چلا گیا تھا۔ پیلس میں رہنے والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ بندرگاہ سے آتے ہوئے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں جمشید علی زخمی ہو گئے تھے۔ حالانکہ کار بالکل شفاف تھی اس پر ایک خراش بھی نہیں آئی تھی مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جمشید علی کو جھٹلا سکتا۔ جمشید علی کی آمد کے بیس منٹ کے اندر ان کا فیملی ڈاکٹر افراتفری میں پیلس میں داخل ہوا۔ اس نے آ کر جمشید علی کی مرہم پٹی کی اور بند کمرے میں یہ مرہم پٹی تین گھنٹے تک جاری رہی تھی۔ اگلے روز جب صفائی کرنے والی خادمہ کمرے میں گئی تو اسے بستر کے نیچے دو خون آلود بلٹ پڑے ملے۔ بدقسمتی سے وہ پیٹ کی ہلکی تھی اس نے سارے ہی ملازمین کو یہ بات بتا دی اور اگلے روز ہی وہ خادمہ اور اس کا شوہر پیلس سے غائب ہو گئے۔ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ رات کو وہ کہاں چلے گئے۔ صبح جب دوسرے سو کر اٹھے تو ان کا کوارٹر خالی تھا اندر سامان کے نام پر ایک تنکا تک نہیں تھا۔

مجھے ماہ پارہ نے جمشید علی کے زخمی ہونے کے بجائے ان کی طبیعت خراب ہونے کا بتایا تھا اور مجھ سے کہا کہ فی الوقت ڈاکٹروں نے سب کو ان سے ملنے سے منع کیا ہوا ہے۔ میں ان کی طبیعت خرابی کا سن کر بے چین ہو گیا تھا۔ میں نے ان کے کمرے میں جانے کی کوشش کی لیکن باہر موجود ملازم نے مجھے روک دیا۔

"یوسف بابا ابھی صاحب نے سب کو اندر آنے سے منع کیا ہے۔"

میں باہر لان پر چلا گیا۔ میں اس معاملے میں ذرا ضدی تھا اگر مجھے کسی کام سے منع کیا جاتا تھا تو میرے اندر اسے کرنے کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی تھی۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح جمشید علی تک پہنچوں۔ میں لان میں زہرہ بیگم کے بیڈروم کے پاس سے گزرا۔ اس کی کھلی کھڑکی سے زہرہ بیگم کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''تم سب نکمے اور نا اہل ہو، تمہیں تنخواہ کس بات کی دی جاتی ہے۔ ایک شخص آیا اور جمشید پر گولیاں برسا کر چلا گیا۔ نو ایڈیٹ یہ سراسر تم لوگوں کی نا اہلی ہے۔ اگر جمشید کو کچھ ہو جاتا تو بچتے تم لوگ بھی نہیں۔'' میں نے چپکے سے کھڑکی کے چھجے کو پکڑ کر اندر جھانکا۔ فرنچ ونڈو سے زہرہ بیگم فون کا ریسیور رکھتی نظر آئی تھیں۔

میرے ذہن نے یہ گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ جو زہرہ بیگم نے کسی سے فون پر کی تھی اگرچہ ان کی باتوں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میری یادداشت شروع سے اچھی تھی اور مجھے بچپن کی یہ ساری باتیں اب تک اچھی طرح یاد ہیں۔ میں جمشید علی کے کمرے تک جانے کی فکر میں تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک نوکر براجمان تھا۔ وہ مجھے اندر جانے نہ دیتا، کمرے کی کھڑکیاں لان کی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے گھوم کر جا کے دیکھا۔ ایک کھڑکی خوش قسمتی سے کھلی ہوئی تھی لیکن مسئلہ اس تک رسائی کا تھا۔ کھڑکی زمین سے پانچ فٹ اونچی تھی اور میرا کل قد شاید تین فٹ ہوگا۔ ظاہر ہے میں کسی سہارے کے بغیر اوپر تک نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے لان پر کسی چیز کی تلاش کی جس کے ذریعے میں کھڑکی تک پہنچ سکتا۔ میری نظر المونیم کی سیڑھی پر پڑی۔ مالی اسی سیڑھی کی مدد سے نسبتاً اونچے درختوں کی تراش خراش کیا کرتا تھا۔ یہ کھلنے والی دوہری سیڑھی تھی۔ جو کھلنے پر الٹے وی کی شکل اختیار کر جاتی۔ اسے دیوار یا کسی چیز کے ساتھ لٹکا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اگرچہ سیڑھی المونیم کی خاصی ہلکی تھی۔ اس کے باوجود ایک چھ سال کے بچے کے لیے خاصی بھاری تھی۔ میں نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے کھڑکی کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ بہ صد مشکل میں اسے کھڑکی تک کھینچ کر لایا۔ اب اگلا مرحلہ سیڑھی کو دیوار سے ٹکانے کا تھا۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے اسے اوپر اٹھانے لگا۔ نصف سیڑھی تک تو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے بعد توازن خراب ہونے لگا۔ میرے ہاتھوں سے اوپر سیڑھی کا جتنا حصہ آیا تھا۔ اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ خاصی طاقت صرف کر کے میں نے سیڑھی کو عموداً کیا لیکن جب آگے کیا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر دیوار سے جا لگی۔ اس کا اوپری حصہ کھڑکی سے ذرا نیچے تھا۔ آواز خاصی اونچی تھی۔ ایک لمحے کو میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نہیں آیا تھا۔ یعنی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ یا پہنچی بھی تھی تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں تیزی سے سیڑھی چڑھ کر اوپر جا پہنچا۔ جیسے ہی میں نے کھڑکی کے کارنس پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا بستر پر دراز جمشید علی کو اپنی طرف نگران پایا تھا۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چمک دار شے تھی۔ انہوں نے جلدی سے تکیے کے نیچے کر لیا تھا۔ انہیں





جاگتے دیکھ کر میں سہم گیا۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

''یوسف...... تم...... یہاں سے......''

''پاپا میں آپ کو دیکھنے آیا تھا۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

جمشید علی نے سر ہلایا۔ ''او کے یوسف، اندر آجاؤ۔''

وہ مجھے بیٹا کم ہی کہتے تھے زیادہ تر نام سے پکارا کرتے تھے۔ میں کھڑکی سے کود کر اندر گیا تو انہوں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''یہ کون سا طریقہ ہے تم دروازے سے بھی آسکتے تھے۔''

''میں آیا تھا، لیکن دروازے پر بیٹھا نوکر مجھے اندر آنے نہیں دے رہا تھا۔'' میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میں کس طرح ان تک رسائی کی کوشش کرتا رہا روانی میں یہ بھی بول گیا کہ زہرہ بیگم فون پر کسی کو ڈانٹ رہی تھیں۔ جمشید علی چونکے۔

''کسے ڈانٹ رہی تھیں؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''اچھا وہ کیا کہہ رہی تھیں؟'' جمشید علی نے اضطراب سے کہا۔

میں نے انہیں لفظ بہ لفظ زہرہ بیگم کی گفتگو سنا دی۔ پہلے تو انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''تمہیں یہ سب یاد ہو گیا۔'' اور پھر سوچ میں گم ہو گئے۔ اس لمحے زہرہ بیگم اندر آئیں اور مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ''یہ کیسے اندر آیا؟''

''کیوں کیا تم نے اسے روکنے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہے؟'' جمشید علی طنزیہ لہجے میں بولے۔

زہرہ بیگم ایک لمحے کو بوکھلا گئی تھیں لیکن جلدی سے انہوں نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے اسے روکنے کی آپ کو ڈسٹرب نہ کرنے کی وجہ سے میں نے یہاں سب کا داخلہ منع کر دیا ہے۔''

''حالانکہ ابھی آپ خود آئی ہیں۔'' جمشید علی سرد لہجے میں بولے تو زہرہ بیگم تلملا گئی تھیں۔

''مت بھولیں میں آپ کی بیوی ہوں۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''مجھے یاد ہے شاید اس لیے آپ نے کچھ لوگوں کو میری جان کے تحفظ کا ذمے دار بنا دیا ہے۔''

زہرہ بیگم کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''آپ کو کیسے......''

جمشید علی نے ان کی بات کاٹی۔ ''سنو زہرہ بیگم میں اپنے اردگرد غیر متعلقہ افراد دیکھنا پسند نہیں کرتا اور آئندہ ایسا کوئی فرد نظر آیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔''

زہرہ بیگم کا چہرہ بے جان سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر مڑیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ جمشید علی اس قسم کی [illegible] جھجک میرے سامنے ہی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے

انہوں نے کبھی میرے سامنے اس نوعیت کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ جمشید علی کو کیسے زخم آئے تھے۔ میں نے زہرہ بیگم کے جاتے ہی کہا۔

''پاپا آپ کو چوٹ کیسے لگی؟''

وہ سوچ کر بولے۔ ''مجھ پر کچھ دشمنوں نے حملہ کیا تھا۔''

''انہوں نے آپ کو مارا۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی جمشید علی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔''

وہ ہنسے۔ ''تم مارنے سے کیا سمجھتے ہو۔ انہوں نے مجھے پستول سے گولیاں ماری تھیں۔ یہ دیکھو۔'' انہوں نے اپنے شانے سے قمیص ہٹائی جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دوسری گولی بازو میں لگی تھی۔

مجھے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ جنہوں نے جمشید علی پر حملہ کیا تھا۔ میں نے جوش سے کہا۔

''میں ان لوگوں کو ماروں گا پاپا۔''

وہ پھر ہنسے۔ ''مار لینا لیکن پہلے تم بڑے تو ہو جاؤ۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تبھی تم میرے دشمنوں سے بدلہ لینے کے قابل ہو سکو گے۔''

''میں سیکھوں گا۔'' میں نے کہا تو جمشید علی کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے صحیح والے بازو سے سمیٹ لیا۔ ''میرا شیر بیٹا۔'' اس لمحے میری برسوں پرانی خواہش پوری ہو گئی تھی کہ جمشید علی ایک بار پیار سے مجھے اپنے سینے سے لگا لیں۔

اسی لمحے ماہ پارہ اندر آ گئی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ درست نہیں کر رہے ہیں جمشید صاحب۔''

جمشید علی ایک لمحے کو خاموش ہو گئے پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''آپ اپنے کمرے میں جائیں یوسف۔''

میں باہر جانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ باہر مامور نوکر موجود تھا لیکن وہ غائب تھا۔ غیر ارادی طور پر میں جانے کے بجائے وہیں رُک گیا۔ میں نے ماہ پارہ کو کہتے سنا۔ ''آپ یوسف کو جو کہہ رہے تھے وہ درست نہیں ہے۔''

''ماہ پارہ تم میرے پلان کے بارے میں جانتی ہو پھر بھی تم یہ بات کہہ رہی ہو۔'' جمشید علی بولے ان کا لہجہ روکھا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ ابھی ان باتوں کے لیے اس کی عمر کم ہے۔''

''یہی عمر ہے جب بچے سیکھتے ہیں اور اس عمر میں وہ جو سیکھتے ہیں اسے ساری عمر یاد رکھتے ہیں۔''

''یہ ظلم ہو گا جمشید صاحب۔''





''ماہ پارہ۔'' اچانک جمشید کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ ''بہتر ہو گا تم اپنے آپ کو صرف ان امور تک محدود رکھو جو تمہاری ذمے داری ہے۔''

''جو حکم جناب کا۔'' کچھ دیر بعد ماہ پارہ نے کہا۔ ''لیکن بہتر ہو گا اس صورت میں آپ یوسف کے لیے کسی اور خاتون کو رکھ لیں۔''

''یوسف کے لیے سب سے بہتر تم ہی ہو۔'' جمشید علی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ ''یہ بات تم بھی جانتی ہو وہ تم سے بے حد مانوس ہو چکا ہے اور اب اس کو تم سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں اسے اپنے سامنے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' ماہ پارہ روہانسی ہونے لگی تھیں۔

''وہ تباہ نہیں ہو گا۔'' جمشید علی کا لہجہ مزید نرم ہو گیا تھا۔ ''میں نے اس کے لیے جو سوچا ہے۔ وہ تمہارے ذہن میں نہیں آ سکتا وہ بہت بڑی شخصیت بنے گا۔ وہ میرا جانشین ہو گا۔''

''اس کے لیے آپ کے دو بیٹے بھی تو ہیں۔'' ماہ پارہ آہستہ سے بولیں۔

''میں نے کہا ناں کہ جو میں نے سوچا ہے وہ تمہارے ذہن میں نہیں آئے گا۔'' جمشید علی کا لہجہ دوبارہ روکھا ہو گیا تھا۔

''ٹھیک کہا آپ نے میں آپ کی طرح سوچ بھی نہیں سکتی۔'' ماہ پارہ نے کہا اور دروازے کی طرف آنے لگیں۔

میں نے انہیں آتے دیکھ کر اوپری منزل کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ آج کا دن میرے لیے انکشافات کا تھا۔ جمشید علی مجھے اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اپنے دونوں بیٹوں کو چھوڑ کر۔ اس عمر میں بھی مجھے جانشین کا مفہوم معلوم تھا۔ میرا دل عجیب سے انداز سے دھڑکنے لگا تھا۔ ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ ماہ پارہ، جمشید علی کی مخالفت کر رہی تھیں شاید کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جمشید علی اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر مجھے جانشین بنائیں۔ نہ جانے مستقبل میرے لیے کیا لانے والا تھا۔



مجھے بہت کم عمری میں احساس ہو گیا تھا کہ میں رنگ و روپ کے اعتبار سے ارد گرد کے دیگر افراد سے مختلف ہوں۔ میں سرخ و سفید رنگت رکھتا تھا۔ میرے نقوش کھڑے تھے۔ سر کے بالوں کا رنگ سنہری مائل بھورا تھا اور آنکھیں شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی گورے تھے اور کئی کے بال سنہری مائل بھورے تھے لیکن یہ مقامی نوعیت کے تھے۔ میں ان سے جدا ہی نظر آتا تھا اور نیلی آنکھیں تو کسی کی نہیں تھیں۔ حتیٰ کہ میں جس سکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی کسی کی آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ حالانکہ سکول میں کئی سو بچے پڑھتے تھے۔ جب جمشید علی مجھے سکول میں داخل کرانے گئے تو پرنسپل نے مجھے دیکھتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔

''مسٹر جمشید کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟''

''نہیں۔'' انہوں نے مختصراً جواب دیا۔ ''ہی از ایڈاپڈ۔''

"اوہ آئی سی تو یہ فارنر ہے۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں لیکن اب یہ میرا بیٹا ہے۔"

میں نہیں جانتا کہ جمشید علی نے سکول ریکارڈ میں میرے والدین کا کیا نام لکھوایا تھا یا لکھوایا بھی تھا کہ نہیں۔ کیونکہ بعد میں مجھے ریکارڈ سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ گارجین کی حیثیت سے جمشید علی صرف اپنا نام بھی لکھوا سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سکول کے بچوں کے لیے میں عجوبہ تھا۔ کچھ عرصے تک وہ مجھے گورا گورا کہہ کر چھیڑتے رہے تھے مگر پھر انہوں نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ میں رنگ وروپ کے اعتبار سے تو ان سے مختلف تھا لیکن ذہن اور زبان کے لحاظ سے بالکل ان جیسا تھا۔ بالکل جیسا ایک پاکستانی بچہ ہوتا ہے۔ میرا نام یوسف علی میرے سرپرست جمشید علی نے رکھا تھا اور مذہب کے خانے میں اسلام لکھوایا تھا۔ میری پرورش ایک مسلمان کے طور پر ہوئی تھی لہٰذا میں ایک مسلمان بنا۔ عین ممکن ہے اگر میری پرورش میرے حقیقی ماں باپ نے کی ہوتی تو میں کچھ اور ہوتا عیسائی یا شاید یہودی، کیونکہ میرے جیسے رنگ وروپ والی اقوام میں یہی دو مذہب پائے جاتے ہیں۔

بچہ پانی کی سی فطرت رکھتا ہے۔ جس سانچے میں ڈالو ویسا ہی ہو جاتا ہے لہٰذا آج میں ایک مسلمان ہوں تو اس لیے کہ میری پرورش پاکستان میں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی۔ میرے آباؤ اجداد کہیں کے بھی ہوں اور میں بہ ظاہر مقامی پاکستانی مسلمانوں سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ ذہنی طور پر میں اتنا ہی پاکستانی اور مسلمان ہوں۔ جتنا کہ مقامی باشندہ ہو سکتا ہے جس کے آباؤ اجداد اس سرزمین پر بستے آئے ہوں۔ مجھے اس دھرتی سے ان جیسا ہی لگاؤ ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو رنگ ونسل کے تمام تر تعصبات مسترد کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ محمد علی اور برطانیہ کا سابقہ پاپ سنگر یوسف اسلام (سابقہ اسٹیونز کیٹس) بھی اتنے ہی مسلمان مانے جاتے ہیں جتنے کے خادم الحرمین شریفین شاہ فہد۔

جن دنوں میں پانچویں کلاس میں تھا۔ نہ جانے کیسے افواہ پھیل گئی کہ میں درحقیقت عیسائی ماں باپ کا بچہ ہوں جسے اغوا کر کے مسلمان بنایا جا رہا ہے۔ اس پر مقامی عیسائی آبادی میں اشتعال پیدا ہوا اور ایک چرچ نے میٹنگ کر کے یہ قرارداد منظور کی کہ مجھے بہرصورت واپس حاصل کر کے دوبارہ عیسائی بنایا جائے۔ ایک آدھ مظاہرہ ہوا اور اخبارات میں بھی میرے بارے میں کچھ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد چرچ کمیٹی کی قیادت میں عیسائیوں کا ایک وفد جمشید پیلس آیا تھا۔ جمشید علی نے انہیں عزت و احترام سے اندر بلوایا۔ ایک پادری صاحب جنہوں نے چوکور سی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس معاملے میں زیادہ ہی پُرجوش تھے۔ انہوں نے بلاتمہید کہا۔

"جمشید صاحب ہم اس بچے کو لینے آئے ہیں جسے آپ نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟" جمشید علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔




"کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ عیسائی ماں باپ کا بچہ ہے۔ لہٰذا اسے عیسائیوں کے درمیان ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ عیسائی والدین کا بچہ ہے؟" جمشید علی نے ملائمت سے پوچھا۔ یہ سن کر وفد کے ارکان نے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں۔ "ہم نے سنا ہے۔" پادری صاحب بولے۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے گھر میں پرورش پانے والا بچہ یوسف علی قطعی کسی عیسائی کی اولاد نہیں ہے۔ میری اس تردید کے بعد آپ کی تسلی ہو جانی چاہیے۔"

"ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ یوسف کے ماں باپ سفید فام ہیں۔" پادری صاحب نے کہا۔

"اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یوسف کے ماں باپ عیسائی بھی تھے؟ کیا سفید فاموں میں مسلمان نہیں پائے جاتے۔ آپ بوسنیا میں دیکھ لیں۔ دوسرے آپ سے یہ کس نے کہا کہ یوسف سفید فام ماں باپ کی اولاد ہے۔"

"اس کا رنگ وروپ اس کی گواہی دیتا ہے۔"

"اس قسم کے رنگ وروپ کے افراد تو پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں آپ نے سرحد کے پٹھان دیکھے ہوں گے خاص طور سے آفریدی قبیلہ، اس کے باشندوں کا رنگ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور ان میں نیلی آنکھوں والے بھی ہوتے ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ بچہ مقامی ہے اور مسلمان ماں باپ کی اولاد ہے؟" آخر وہ سوال پادری صاحب کی زبان پر آ ہی گیا جس کے لیے وہ یہاں تشریف لائے تھے۔

"ثبوت تو آپ کو دینا چاہیے۔" جمشید علی نے سرد لہجے میں کہا۔ "الزام آپ نے لگایا ہے لہٰذا بارِ ثبوت بھی آپ کے ذمے ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آئندہ آپ اس وقت تشریف لائیے گا جب آپ کے پاس یوسف کے ماں باپ کا حتمی ثبوت ہو۔ جابر مہمانوں کو خاطر تواضع کے بعد احترام سے رخصت کر دینا۔"

یہ کہہ کر جمشید علی اندر چلے گئے تھے اور کمیٹی کے ارکان بھی ناکامی لے کر لوٹ گئے تھے۔ شاید انہوں نے بعد میں مجھ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہو لیکن میرے گرد سخت پہرہ تھا۔ جو بہ ظاہر نظر نہیں آتا تھا لیکن کسی بھی اجنبی کے لیے مجھ تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ سکول میں کسی غیر متعلقہ فرد کا کسی بچے سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سکول سے واپسی پر کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح محافظ امیر خان بھی ہوتا تھا۔ وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ بلکہ آرمی کا ریٹائرڈ ایس ایس جی تھا۔ اس کی کارکردگی میں نے خود ملاحظہ کی تھی۔ جب چرچ کمیٹی وفد جمشید پیلس آیا تھا یہ اس سے چند مہینے بعد کی بات تھی۔

جمشید پیلس عین ساحل سمندر کے کنارے واقع تھا اور ایک سڑک کے پار ساحل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ سکول سے واپسی پر ہم زیادہ تر سنسان سڑکوں سے گزرا کرتے تھے۔ ان دنوں کلفٹن کا یہ علاقہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ اس روز جب میں سکول سے نکلا تو امیر خان گیٹ پر میرا منتظر تھا۔ جمشید علی کی طرف سے سکول انتظامیہ کو ہدایت تھی کہ مجھے اسی صورت میں چھٹی کے وقت سکول سے جانے دیا جائے جب امیر خان بذات خود مجھے لینے آئے۔ دوسرے نمبر پر ماہ پارہ اس کی مجاز تھیں اور کوئی فرد مجھے سکول سے نہیں لے جا سکتا تھا۔

جیسے ہی میں گیٹ سے نکلا امیر خان نے میرا بیگ لیا اور تیزی سے سڑک پار کر کے کار تک آیا۔ میرے اور امیر خان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار چلا دی تھی لیکن جیسے ہی کار حرکت میں آئی ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار کا پچھلا حصہ بیٹھ گیا۔ ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے کار سے اُتر کر دیکھا اور واپس آ کر امیر خان سے بولا۔

''کسی خانہ خراب نے ٹائر تلے سرے والی کیل لگا دی تھی۔''

''کون کر سکتا ہے یہ حرکت۔'' امیر خان چوکنا ہو گیا تھا۔ ''فوراً ٹائر تبدیل کرو۔''

ٹائر بدلنے میں بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں گے لیکن اس دوران میں سکول کے باہر والی یہ سڑک ویران ہو چکی تھی۔ بیشتر بچے اپنی گاڑیوں پر آتے جاتے تھے۔ باقی بچوں کے لیے سکول بسیں تھیں۔ لہٰذا بیشتر بچے جا چکے تھے اور صرف وہی بچے وہاں تھے جن کی گاڑیاں کسی وجہ سے لیٹ ہو گئی تھیں۔ گرمی کے دن تھے اور کار کے اندر بیٹھے رہنا دشوار تھا۔ لہٰذا میں بھی کار سے اُتر آیا تھا۔ جیسے ہی ڈرائیور نے پہیہ بدلا اور اوزار ڈگی میں رکھ رہا تھا۔ ایک سفید کار آ کر وہاں رُکی اور اس میں سے تین افراد نکلے جو مسلح تھے۔ ایک نے جھکے ہوئے ڈرائیور کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور وہ کراہ کر اسی جگہ ڈھیر ہو گیا تھا۔ ایک امیر خان کی طرف لپکا اور تیسرا میری طرف آیا۔ میں نے صورتِ حال بھانپتے ہی کار میں گھس کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔ دوسرے شخص نے امیر خان کے ساتھ ڈرائیور والا سلوک کرنا چاہا مگر وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے حملہ آور کے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی سے وار کیا۔ حملہ آور کا ہاتھ نیچے آ رہا تھا۔ اسی وجہ سے وار کی شدت دوگنی ہو گئی۔ خشک ٹہنی کے چٹخنے کی سی آواز آئی۔ حملہ آور کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے منہ سے جو آواز نکلی ویسی آواز میں نے جمشید پیلس میں بڑی عید کے موقع پر ذبح کیے جانے والے ایک بکرے کی سنی تھی۔

تیسرا فرد میری طرف لپکا تھا۔ مجھے دروازہ اندر سے لاک کرتے دیکھ کر اس نے پوری قوت سے پستول کا دستہ شیشے پر مارا۔ شیشہ تو نہیں ٹوٹا، ہاں اس کے ہاتھ پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ امیر خان نے اسے اچھل کر لات رسید کی۔ وہ سڑک پر جا گرا۔ حملہ آوروں کی دو تہائی نفری تباہ حال ہو گئی تھی۔ جس نے میری کار کے ڈرائیور کو بے ہوش کیا تھا۔ اس نے ڈگی کے عقب سے امیر خان پر گولی چلائی مگر قضا اس کی آئی تھی جس کی کلائی امیر خان نے





توڑ دی تھی۔ وہ ہاتھ تھامے اب تک زمین پر پڑا تھا۔ اس نے بڑے غلط وقت پر اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ امیر خان پر چلائی گئی گولی اس کے سر میں اُتر گئی۔ اس کی چیخ و پکار یوں رُک گئی جیسے ٹیپ کو آف کر دیا جائے۔ وہ یقیناً گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔

اپنے ہی ساتھی کو ہلاک کرنے والا سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ تو پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ خود ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ سفید کار میں ایک عدد ڈرائیور بھی موجود تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھیوں کو پٹتے دیکھا تو وہ کار سے لوہے کا ایک پائپ لے کر اُترنے لگا۔ امیر خان نے دوسری گولی سے بچتے ہوئے سلپ ہو کر سفید کار کے دروازے کو لات ماری۔ ڈرائیور کی گردن درمیان میں تھی۔ دروازہ پوری قوت سے اس کی گردن پر لگا تو اس کی سانس ہی رُک گئی تھی گردن کی نازک رگیں اور سانس کی نالی پس کر رہ گئی تھی۔ جب تک وہ اپنا سانس بحال کرتا۔ امیر خان نے زمین پر لیٹے لیٹے اپنا پستول نکالا اور ڈگی کے عقب میں موجود دشمن کی ٹانگ پر گولی ماری تھی اس نے چیخ مار کر پستول پھینک دیا اور ٹانگ پکڑ کر ناچنے لگا۔ امیر خان کو نقصان اس کا ڈانس دیکھنے سے ہوا تھا۔

سفید کار کے ڈرائیور نے اپنی سانس بحال کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ امیر خان کے سر پر لوہے کا پائپ مارا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا لیکن اسے چکر آ گیا تھا۔ اس دوران میں جب کار سے باہر جنگ و جدل کے بھرپور مناظر چل رہے تھے میں نے اندر سے کار کے چاروں ڈور لاک کر دیئے تھے۔ لہٰذا جب ڈرائیور نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے مشتعل ہو کر لوہے کا پائپ کھڑکی کے شیشے پر مارا مگر شیشہ اس بار بھی ناقابلِ شکست ثابت ہوا۔ لوہے کا پائپ اس پر ٹکرا کر اچٹ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ جھنجھنا گیا تھا۔ اس بار وہ اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے ٹانگ پر گولی کھا کر ناچنے والے کا پستول اٹھایا اور عین کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر شیشے پر فائر کر دیا۔ حالانکہ دو ناکامیوں کے بعد اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ شیشے بلٹ پروف ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میں خوف زدہ ہوا تھا۔ آخر بچہ تھا اگرچہ جمشید علی نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا بلکہ عملی تجربہ کر کے بھی دکھا دیا تھا کہ کار کے شیشے بُلٹ پروف تھے ان پر گولی کا کوئی اثر نہیں ہوتا ثبوت کے طور پر انہوں نے مجھے کار کے شیشے پر گولی چلا کر دکھائی تھی شیشے پر بال بھی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''جب تمہیں کسی سے خطرہ محسوس ہو تو کار کے دروازے اندر سے لاک کر لینا کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

میں نے ایسا ہی کیا تھا لیکن ساتھ ہی میں بچہ بھی تھا۔ خوفزدہ ہونا فطری بات تھی۔ احمق ڈرائیور نے بالکل سامنے سے شیشے پر فائر کیا تھا۔ گولی شیشے سے لگ کر اچٹتی ہوئی واپس پلٹی اور اس کے پیٹ میں گھس گئی میں نے اس کی سفید قمیص پر خون کا دھبہ نمودار ہوتے دیکھا اس نے دہشت زدہ نظروں سے اپنے خون کو دیکھا اور چیخ مار کر واپس کار کی طرف بھاگا ہاتھ تڑوانے والا اور پیر میں گولی

کھانے والا پہلے ہی کار میں سوار ہو چکے تھے۔ انہوں نے مرنے والے کو بھی کار میں کھینچ لیا تھا۔ شاید گولی ڈرائیور کو پیٹ میں کسی نازک مقام پر نہیں لگی تھی اس لیے اسے کار وہاں سے نکال کر لے جانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ لوگ جواب تک کونے کھدروں میں چھپے مار دھاڑ سے بھرپور یہ سینما ذوق وشوق سے دیکھ رہے تھے۔ سینہ تان کے باہر نکل آئے تھے۔ کسی نے قبل از وقت مداخلت کر کے فوت ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ امیر خان کسی قدر ہوش میں تھا اور جب اسے پانی وغیرہ پلایا گیا تو وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گیا تھا۔ البتہ ڈگی میں اوندھے منہ پڑے ہوئے ہمارے ڈرائیور کو ہوش میں لانے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے سر کی چوٹ زیادہ ہی گہری لگ رہی تھی۔ اس اثناء میں سکول کے سیکیورٹی گارڈز اور پرنسپل صاحب بھی آ گئے تھے۔ یہ سن کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے کہ ان کے سکول کے ایک بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مجھے فوری طور پر اندر لے جایا گیا جہاں سکول کا ڈاکٹر زخمی ڈرائیور کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے تشویش سے کہا۔

''مجھے چوٹ سنگین لگتی ہے اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا ہوگا۔''

سکول سے پہلے جمشید پیلس فون کر کے وہاں اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔ پھر زخمی ڈرائیور کے لیے ایمبولینس طلب کی گئی۔ تیسرا فون مقامی پولیس اسٹیشن کیا گیا۔ پہلے ایمبولینس آئی۔ اس میں زخمی ڈرائیور کو ہسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔ پھر جابر آیا تھا۔ جمشید علی کی غیر موجودگی میں تمام معاملات کا ذمے دار وہی ہوتا تھا۔ اس نے آتے ہی امیر خان سے حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا اور کرید کرید کر سوالات کرتا رہا۔ کہ وہ کون تھے کیا ان میں سے کوئی پکڑا گیا اور یہ کہ ان کی خاص نشانی علم میں آئی۔ امیر خان نے سارے سوالوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سن کر جابر نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس اثناء میں ایک سب انسپکٹر مقامی تھانے سے آ گیا تھا۔ پہلے تو وہ اس بات پر چیں بہ جبیں تھا کہ پولیس کے آنے سے پہلے زخمی ڈرائیور کو ہسپتال کیوں روانہ کیا گیا لیکن جب اس نے جمشید علی کا نام سنا تو بالکل سیدھا ہو گیا تھا۔

''اچھا جی گاڑی میں جمشید صاحب کا بچہ تھا۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ ''آئی جی صاحب تو ہمارا باجا بجا دیں گے۔''

پہلے وہ امیر خان کو تھانے لے جانے پر مُصر تھا مگر بعد میں وہ خود تابعدار خادموں کی طرح اسے کار تک چھوڑنے آیا تھا۔ جابر نے مجھے اپنی کار میں لے جانا چاہا لیکن امیر خان نے انکار کر دیا۔

''یوسف بابا صرف اپنی کار میں آ جا سکتے ہیں۔''

''میری کار میں کیا خرابی ہے؟'' جابر نے غرا کر کہا۔

''آپ کی کار بلٹ پروف نہیں ہے۔ ممکن ہے دشمن کہیں راستے میں گھات لگا کر بیٹھے ہوں۔ آپ جائیں میں یوسف بابا کو لے کر آتا ہوں۔''





''تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ راستے میں کار نہ سنبھال سکے تو حادثہ کر بیٹھو گے۔''

''یہ چوٹیں میرے لیے نئی نہیں ہیں۔'' امیر خان نے اعتماد سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔''

''فکر کیسے نہ کروں۔'' جابر کا لہجہ بدستور خراب تھا۔ ''ایسا کرو تم میری کار لے جاؤ اور میں یوسف کو لے کر آتا ہوں۔''

امیر خان نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''یوسف بابا میری ذمے داری ہیں اور میں ایک ہی صورت میں یہ ذمے داری کسی اور کے سپرد کر سکتا ہوں جب مجھ میں اسے سنبھالنے کی ہمت نہ رہ جائے۔''

اپنی بات رد کیے جانے پر جابر کی آنکھوں میں قہر کی بجلی سی چمکی تھی۔ وہ جمشید علی کا دستِ راست تھا اور امیر خان ایک معمولی محافظ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ امیر خان کو خود جمشید علی نے براہِ راست اپائنٹ کیا تھا اور وہ ان ہی کو جواب دہ تھا۔ جابر نے اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے پوری قوت سے دروازہ بند کیا تھا اور ہماری طرف دیکھے بغیر نکل گیا تھا۔ میں پہلے ہی اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ امیر خان نے اندر بیٹھتے ہوئے کار چلا دی۔ راستے میں اس نے کار ایک غیر متوقع سمت میں موڑ لی تھی۔ میں پریشان نہیں ہوا۔ مجھے امیر خان پر پورا بھروسہ تھا۔ پھر اس نے کار ایک ویران جگہ روک لی اور سامنے رکھا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے دو صفحے بھر دیئے تھے۔ پھر اس نے یہ صفحے پھاڑے اور انہیں موڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

''اسے حفاظت سے اپنے بیگ میں رکھیے۔''

''اس میں کیا لکھا ہے۔'' میں نے تجسس سے انہیں کھول کر دیکھا۔ اس میں کسی نامانوس رسم الخط میں کچھ تحریر تھا۔ یہ نہ تو اردو تھی اور نہ ہی انگریزی۔ میں ان دونوں زبانوں سے واقف تھا۔ امیر خان نے کار دوبارہ آگے بڑھا دی۔

''یوسف بابا غور سے سنیے اب میں آپ کو جو بات بتاؤں گا۔ وہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ علاوہ جمشید صاحب کے، ماہ پارہ بیگم کو بھی نہیں۔ یہ کاغذ جو میں نے آپ کو دیئے ہیں۔ انہیں حفاظت سے کہیں چھپا کر رکھیے گا اور کوئی پوچھے تو صاف انکار کر دیجیے گا کوئی آپ سے زبردستی نہیں پوچھے گا۔ اگر میں مر جاؤں یا غائب ہو جاؤں تو آپ سکول نہیں جائیں گے۔ بلکہ جمشید پیلس سے باہر بھی نہیں جائیں گے۔ اگر کوئی لے جانا چاہے تو صاف انکار کر دیجیے گا۔ جب تک کہ جمشید صاحب واپس نہ آ جائیں۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف بابا کچھ لوگ آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو اغوا کرنا یا مار دینا چاہتے ہیں۔ آج بھی وہ کامیاب ہو جاتے اگر میں نہ ہوتا۔ اب وہ پہلے مجھے راستے سے ہٹائیں گے کیونکہ میں جمشید پیلس میں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتا لیکن خیر یہ باتیں ابھی آپ کی عمر سے زیادہ ہیں لیکن آپ کو

یاد ہوگا کہ جمشید صاحب نے آپ سے کہا تھا کہ مجھ پر اعتماد کریں اور جو میں کہوں وہی کریں۔ آپ میرے کہنے پر عمل کیجیے۔ یہ پرچہ اپنی کسی کتاب میں چھپالیں اور پیلس میں جاتے ہی اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیں جہاں کوئی اور نہ پہنچ سکے اور یاد رکھیے گا آپ نے جمشید پیلس سے کسی صورت نہیں نکلنا۔ بلکہ اپنے کمرے سے بھی کم نکلئے گا۔''

اسی وقت ہم جمشید پیلس پہنچ گئے۔ جابر پورچ میں پہلے سے موجود تھا۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' اس نے غرا کر پوچھا۔

امیر خان نے گھڑی دیکھی۔ ''ہم تین بج کر پندرہ منٹ پر وہاں سے چلے تھے اور اب پونے چار ہو رہے ہیں۔ ہم روزانہ تقریباً اتنی ہی دیر میں پہنچتے ہیں۔''

جابر اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بیگ لے کر اوپر جاتے ہوئے اتنا ہی دیکھ سکا تھا۔ ماہ پارہ اتنی بے تاب تھیں کہ سیڑھیوں پر ہی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے نہا دھو کر کپڑے بدلنے کو کہا۔ جب تک میں ان کاموں سے فارغ ہوا۔ ماہ پارہ نے ڈائننگ ہال میں کھانا لگوا دیا تھا لیکن میں نے آج جو مار دھاڑ اور خون وکشت دیکھا تھا اس سے میری بھوک اُڑ گئی تھی۔ ماہ پارہ کے اصرار پر میں نے تھوڑا بہت کھایا تھا۔ کھانے کے بعد ہم اندر آ گئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند کر کے انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ''یوسف آج کیا ہوا تھا؟''

میں نے تفصیل سے انہیں ان سنسنی خیز لمحات کی روداد سنائی۔ کس طرح امیر خان نے میری حفاظت کی، نہ جانے وہ لوگ مجھے اغوا کرنے آئے تھے یا مارنے آئے تھے۔ ماہ پارہ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا مگر وہ اچانک ہی بولی تھیں۔ ''تم امیر خان کے ساتھ آئے ہو، کیا اس نے راستے میں تم سے کچھ کہا یا کوئی چیز دی تھی؟''

ایک لمحے کو تو میں ان کے اندازے پر حیران رہ گیا تھا پھر میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں وہ بے چارہ تو اتنی مشکل سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔''

ماہ پارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' میں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ماہ پارہ عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ ''ہاں تم نے آج تک مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ایک بات یاد رکھو کہ اگر امیر خان نے تم سے کچھ کہا ہے یا کچھ دیا ہے تو اسے چھپا کر رکھنا۔ اب تم آرام کرو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں ان کے آخری جملے پر غور کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے ماہ پارہ میرے جھوٹ سے واقف ہو گئی تھیں۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا تھا۔ عام طور سے دوپہر کو میں سوتا نہیں تھا۔ اس لیے جب شام کو جاگا تو جسم ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ گرم پانی سے غسل کر کے مجھے کسی قدر سکون ملا تھا۔ رہی سہی کسر کافی نے پوری کر دی تھی۔ شام سات بجے ایک پروفیسر قسم کی



چیز آتے تھے۔ جو سکول کے نصاب سے ہٹ کر مجھے نہ جانے کیا کیا پڑھایا کرتے تھے۔ آج میرا موڈ نہیں تھا لہٰذا جب ماہ پارہ آئیں تو میں نے ان سے طبیعت خراب کا کہہ دیا اور انہوں نے جا کر پروفیسر صاحب سے کہہ دیا کہ آج ان کا شاگرد چھٹی کے موڈ میں ہے۔

اگلی صبح جب میں سکول جانے کے لیے اٹھا تو امیر خان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ عام طور سے سات بجے آ جاتا تھا اور ہم ساڑھے سات بجے سکول کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ نصف گھنٹے کا راستہ تھا۔ جب تک میں نے تیار ہو کر ناشتہ کیا ساڑھے سات بج چکے تھے۔ مگر امیر خان نہیں آیا۔ میں نیچے پورچ میں آیا تو وہاں امیر خان کے بجائے جابر ایک لمبے تڑنگے شخص کے ساتھ موجود تھا۔ جس نے ڈرائیور کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر خشخشی سی داڑھی تھی۔ گال پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ ناک پکوڑہ جیسی تھی اور کان سامنے کے رُخ پر اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے چھلکتی عیاری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' ماہ پارہ نے اسے دیکھا۔

''یہ یوسف بابا کا نیا ڈرائیور ہے۔'' جابر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آج سے یہ اس کے ساتھ سکول جائیں گے۔''

''ڈرائیور تو ہسپتال میں ہے لیکن یہ امیر خان کہاں ہے؟'' ماہ پارہ نے حیرت سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ امیر خان کہاں ہے۔'' جابر نے اسی لہجے میں کہا۔ ''یاسین اچھا ڈرائیور اور محافظ ہے۔ یہ یوسف بابا کی اچھی طرح حفاظت کر سکے گا۔'' اس نے لفظ اچھی طرح پر زور دیا تھا۔ ''کیا آپ تیار ہیں یوسف بابا؟''

''سوری۔'' ماہ پارہ نے مجھ سے پہلے کہا۔ ''یوسف آج سکول نہیں جائے گا۔ اس کے لیے کسی بھی نئے شخص کو رکھنے کا اختیار صرف جمشید صاحب کو ہے اور ان کی عدم موجودگی میں مجھے ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے جابر ابھی پھٹ پڑے گا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''چلئے ٹھیک ہے۔ آپ خود ہی یوسف بابا کو سکول لے جایئے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اچانک ہی جابر کے عقب سے امیر خان نمودار ہوا تھا۔ ''میں یوسف بابا کو لے جانے آیا ہوں۔'' جابر اور اس کا ساتھی یاسین بھونچکے سے امیر خان کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ان کی حالت سے لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''تم...... تم کیسے آئے؟'' جابر کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ خود ہی سنبھل کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟''

''میری گاڑی میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا تھا۔ اسی بناء پر ذرا دیر لگ گئی۔'' امیر خان نے اطمینان سے کہا۔ ''کسی نے اس کے اگنیشن کے ساتھ ایک ڈائنا مائٹ اسٹک لگا دی تھی۔ ادھر میں چابی گھماتا اور ادھر میرے ٹکڑے گاڑی سمیت بکھر جاتے، جس نے بھی یہ کام کیا تھا وہ اناڑی تھا اور

آسانی سے پکڑا جائے گا اگر اس نے دستانے نہ پہنے ہوں تو ڈائنا مائٹ کی اسٹک پر اس کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ آپ تیار ہیں یوسف بابا؟''

''میں تیار ہوں امیر خان۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔

جابر اس شخص یاسین کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے دھاڑ کر کہا۔ ''وہ ڈائنا مائٹ اسٹک کہاں ہے؟ مجھے دو میں پتا چلاؤں گا کہ کس کی حرکت ہے؟''

''اسٹک میں نے ایک جگہ نہایت حفاظت سے رکھی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہ پولیس تک پہنچ جائے گا۔'' امیر خان نے کہا۔

جیسے ہی کار جمشید پیلس کے گیٹ سے باہر نکلی اور میں نے منہ کھولا تھا کہ امیر خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے ایک چٹ میری طرف بڑھا دی جس پر لکھا تھا۔

''کل والی بات کے بارے میں کوئی بات مت کیجیے گا۔'' میں نے کاغذ پڑھ کر خاموشی سے اسے واپس کر دیا۔

میں بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ ایک اچھے سکول میں ساتویں کلاس میں تھا۔ سب سے بڑھ کر مجھے جو ماحول اور اس کے حوالے سے جو تربیت مل رہی تھی اس نے مجھے قبل از وقت باشعور کر دیا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ دشمن امیر خان کو مجھ سے جدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے تاکہ میرے حوالے سے ان کے عزائم پورے ہو سکیں۔ مجھے جابر کا طرزِ عمل بھی نہایت مشکوک لگ رہا تھا۔ امیر خان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا تھا اور اس کے انداز میں واضح طور پر مایوسی جھلک رہی تھی اور اس سے زیادہ پریشانی تھی۔

میں نے ایک کاپی نکال کر اس کے صفحے پر لکھا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' اور کاپی امیر خان کے سامنے کر دی تھی۔ اس نے کاپی دیکھ کر سر ہلایا اور اچانک ہی کار کے انجن کو ریس دینے لگا پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔

''لعنت ہو، یہ کیا ہو رہا ہے؟''

دو تین دفعہ ریس دے کر اس نے کار آہستہ کی اور انجن بند کر دیا پھر بولا۔ ''انجن دیکھنا پڑے گا۔''

وہ نیچے اُترا تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ اس وقت ہم ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ ہم کار سے کسی قدر دور آ گئے تھے۔

''تم نے مجھے کار میں بولنے سے منع کیوں کر دیا؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''احتیاطاً یوسف بابا لیکن کیا آپ نے مجھے یہی کہنے کے لیے روکا ہے۔ آپ پہلے ہی سکول سے لیٹ ہو رہے ہیں۔''





''سکول کو گولی مارو اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟ کل مجھ پر حملہ کرنے والے کون تھے؟ جابر کس شخص کو صبح لایا تھا؟ اور تمہاری کار میں بم کس نے لگایا تھا؟''

وہ ہنسا۔ ''آپ ایسی باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بھلا مجھے کیا معلوم کہ جابر صبح کس شخص کو لایا تھا اور مجھے بم لگانے والے کا پتا چل جاتا تو یہ بم اس کے نیچے نہ رکھ دیتا۔''

''جابر کو کیسے معلوم ہوا کہ آج تم نہیں آ رہے ہو؟''

''یوسف بابا ابھی آپ کی عمر ایسی نہیں ہے کہ ان معاملوں میں الجھیں۔'' امیر خان نے نرمی سے کہا۔ ''یہ میرے اور جمشید صاحب کے دیکھنے کی باتیں ہیں۔ ابھی آپ صرف تعلیم حاصل کریں اور جو کہا جائے وہ کریں۔''

''امیر خان معاملہ میری زندگی کا ہے۔'' میں نے پیر پٹخ کر کہا۔ ''لہٰذا یہ باتیں میرے علم میں بھی آنی چاہئیں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟''

''ان سوالوں کا جواب آپ کو صرف جمشید صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ آپ ان ہی سے پوچھیے گا۔'' امیر خان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''آیئے آپ کو ویسے بھی سکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ جھنجھلاہٹ میں میں نے زور سے کار کا دروازہ بند کیا تھا۔ امیر خان نے ڈرائیونگ سیٹ پر آنے سے پہلے ایک بار کار کا بونٹ کھول کر زوردار طریقے سے بند کیا۔ یہ میری خوش فہمی تھی کہ تابعدار امیر خان مجھے سب بتا دے گا۔ وہ اپنے آقا کی ہدایات پر مجبور تھا اور مجھے بچہ بھی سمجھ رہا تھا اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔

جان کا خطرہ ایسی چیز ہے کہ ایک دن کا بچہ بھی اسے محسوس کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو صحیح طور پر دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سن سکتا ہے۔ اپنی ماں کو بھی وہ لمس اور اس کی خوشبو سے پہچانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ نامانوس ہاتھوں میں ہو یا اسے جان کا خطرہ محسوس ہو تو وہ رو رو کر اس کا اعلان کرتا ہے کہ اسے کسی طرح خطرے سے بچایا جائے۔ آپ اسے چھٹی حِس بھی کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں ایک بارہ سالہ لڑکا جس نے عام بچوں سے کہیں زیادہ دنیا دیکھی ہو اور ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ بھلا خطرے کو کیوں محسوس نہیں کرے گا۔ میں بھی خطرہ محسوس کر رہا تھا اور یہ میرا فطری ردِ عمل تھا کہ میں خود کو اس خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میرا جاننا ضروری تھا کہ مجھے خطرہ کس طرف سے تھا اور کیوں تھا۔ میرے محافظوں کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ کسی شخص کو ایک تاریک کمرے میں کسی زہریلے سانپ کے ساتھ چھوڑ دیا جائے اور پھر اصرار کیا جائے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے دوسروں پر انحصار کرے لیکن اس کے ہمدرد نہ تو کمرے میں روشنی کر رہے ہیں اور نہ ہی اسے کمرے سے باہر آنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس کے بجائے وہ تاریکی

میں سانپ کے شکار پر مُصر ہیں۔

سکول میں بھی میرا دل نہیں لگا تھا۔ بجائے پڑھائی کے میں مسلسل اس فکر میں تھا کہ میرے دشمن درحقیقت کون تھے اور وہ میرے پیچھے کیوں پڑے تھے۔ ان کی سازشوں کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے محافظوں کے بھی درپے ہو رہے تھے۔ بہ ظاہر مجھ پر حملہ اور امیر خان کی کار میں بم فٹ کرنے والے ایک ہی تھے۔ جابر، امیر خان کو زندہ دیکھ کر جس بُری طرح چونکا تھا۔ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھی میرے دشمن یا دشمنوں سے ملا ہوا تھا لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ میری زندگی کی ضرورت اصل میں کس کو تھی۔ اچانک ایک نام میرے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا۔ میں اچھلا تو بائیالوجی کی ٹیچر نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ وہ مینڈک کے اندرونی نظام کی ڈایاگرام کی مدد سے وضاحت کر رہی تھیں۔

''اینی پرابلم یوسف؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نو میڈم۔'' میں نے خجالت سے کہا۔

''ممکن ہے انہوں نے کوئی مینڈک دیکھ لیا ہو سچ مچ کا۔'' کسی نے شرارت سے کہا تو پوری کلاس ہنس دی۔ ٹیچر بھی مسکرانے لگی تھیں مگر انہوں نے لیکچر کا سلسلہ نہیں روکا تھا۔ مجھے نہ تو کلاس کے ہنسنے کی پروا تھی اور نہ ٹیچر کی سرزنش کی۔ میں زہرہ بیگم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق پانچ ارب افراد کی اس دنیا میں وہ واحد شخصیت تھیں جو مجھے اس حد تک ناپسند کرتی تھیں کہ قتل کرنے کو تیار ہو جاتیں اور پھر جابر ہمیشہ سے ان کا چمچہ خاص تھا اور اس معاملے میں اس کا کردار بھی مشکوک تھا۔ مجھے اس کاغذ کا خیال آیا جو مجھے امیر خان نے دیا تھا اور میں نے اسے اپنے بیڈ روم میں لگی ایک سینری کے عقب میں چھپا دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ امیر خان سے دو ٹوک بات کروں گا۔ اگر اس نے مجھے اصل بات نہیں بتائی تو میں بھی اس کی ایک نہیں مانوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

تین، چار دن میں امیر خان سے بات کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا۔ سکول آنے اور جانے کے دوران امیر خان بات کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ یہ شاید پانچویں دن کی بات تھی، سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بچے تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ بچے جس طرح بستے سنبھال کر فرار ہو رہے تھے، اس سے یہ حقیقت واضح تھی کہ سکول چاہے ٹاٹ والا سرکاری ہو یا اس جیسا شاندار اور عالیشان، بچے کسی غریب ریڑھی والے کے ہوں یا کسی کروڑ پتی صنعت کار کے، سکول ان کے لیے ایک ایسا قید خانہ ہوتا ہے جہاں سے رہائی کا لمحہ ان کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم کو بچوں اور ان کے والدین کے لیے سزا بنا دیا گیا ہے۔ یہ زوال پذیر معاشرے کی سب سے بڑی نشانی ہے کہ اس کی نئی نسل سکول جانے سے گریزاں ہو اور جائے بھی تو بادلِ نخواستہ۔





سکول کے سامنے سڑک کے پار ایک وسیع و عریض پارک تھا۔ اس سڑک کے ساتھ والے جنگلے کے ساتھ قطار در قطار اونچے اور گھنے درخت لگائے گئے تھے۔ بچوں کو لینے کے لیے آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور ان درختوں کے سائے میں ٹھہر کر چھٹی کا انتظار کرتے تھے۔ میں باہر نکلا تو خلاف معمول میری کار دروازے پر نہیں تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں نظر دوڑائی، یہ ہلکے نیلے رنگ کی مرسڈیز کار تھی۔ چھوٹی لیکن طاقتور اور سُبک رفتار، جمشید علی نے اس میں کئی ایک تبدیلیاں کر کے اسے چلتے پھرتے قلعے میں بدل دیا تھا۔ بالآخر کار مجھے نظر آ گئی۔ جو کاروں کی ایک طویل قطار میں خاصے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسی اثناء میں گاڑیاں بچوں کو لے کر روانہ ہونے لگی تھیں۔

حملے والے دن کے بعد سے زخمی ڈرائیور کو ہیوی ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اب مجھے لانے اور لے جانے کا فریضہ امیر خان ہی ادا کرتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آج اس نے کار سکول کے سامنے لا کر کیوں نہیں روکی۔ میں بیگ لے کر خود ہی کار کی طرف چل پڑا۔ امیر خان مجھے کار کے باہر بھی نظر نہیں آیا۔ وہ شاید کار میں ہی تھا۔ میں ذرا آگے آیا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ امیر خان کار میں تھا، وہ ڈرائیونگ سیٹ پر سر ٹکائے اور اپنی پی کیپ منہ پر رکھے لیٹا تھا۔ یہ ایک اور تعجب کی بات تھی۔ دو سال کے دوران جب سے امیر خان میرا محافظ مقرر ہوا تھا، میں نے اسے دوران ڈیوٹی کبھی یوں بے پروائی سے سوتے نہیں دیکھا تھا۔ کار کا شیشہ بھی کھلا تھا۔

اسے سوتے دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اپنی جیب سے طوطے کی آواز والی سیٹی نکالی اور گھوم کر امیر خان کے پاس پہنچا۔ سیٹی اس کے کان کے پاس لے جا کر میں نے پوری قوت سے بجائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُچھل پڑے گا مگر وہ ہلا تک نہیں۔ اسی طرح خاموش پڑا رہا۔ یک لخت میرے جسم میں خوف کی سرد لہر داخل ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے امیر خان کے چہرے سے پی کیپ اٹھائی اور میری چیخ نکل گئی۔ اس کی غیر معمولی حد تک کھلی آنکھیں میری طرف نگران تھیں، منہ نیم وا تھا اور ہونٹوں کے گوشوں سے نیلا سا جھاگ نکل کر جم گیا تھا۔ اپنی بارہ سالہ زندگی میں کبھی اتنے پاس سے کوئی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ امیر خان مر چکا تھا اس کی کھلی آنکھوں کی سفیدی بہت بھیانک لگ رہی تھی اور نیم وا ہونٹ ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔

''دیکھا یوسف بابا، آخر آپ کے دشمن کامیاب رہے۔''

وہ شخص اس دن بال بال موت سے بچا تھا، اگر وہ انجن دیکھے بغیر کار سٹارٹ کر دیتا تو فرشتۂ اجل اسے وہیں دبوچ لیتا لیکن نہیں، فرشتۂ اجل کے لیے مقررہ وقت اور جگہ کوئی اور ہی تھے۔ اس وقت ایٹم بم بھی امیر خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور جب وقت آیا تو کوئی نامعلوم شکاری خاموشی سے اسے موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔ میری ذہنی کیفیت خراب ہونے لگی تھی۔ میں نے پی کیپ پھینکی اور چیخ مار کر دوڑا۔ میرا رُخ سکول کی جانب تھا اور بدحواسی میں مجھے سامنے سے آتی کار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں کار کے سامنے اتنا اچانک آیا تھا کہ ڈرائیور کو رُخ موڑنے کا موقع بھی نہیں ملا

تھا، اس نے بریک ضرور لگائے ہوں گے لیکن اتنے کم فاصلے سے بریک بھی کار کو نہیں روک سکتے تھے، کار میرے دائیں پہلو سے ٹکرائی۔ تصادم کی شدت نے مجھے فضا میں اُچھال دیا تھا۔ میں نے خود کو بلند ہوتے محسوس کیا اور میری یہ حادثاتی پرواز سڑک کے کنارے کھڑی مونگ پھلی کی ایک ریڑھی پر ختم ہوئی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے مونگ پھلی والے کے چلانے کی آواز سنی تھی اور جو آخری خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ دشمن بالآخر امیر خان کے بعد مجھے بھی مارنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کے بعد بلیک آؤٹ ہو گیا۔

بے ہوشی کی حالت میں مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بے وزنی کی کیفیت میں خلا میں تیر رہا تھا۔ میرے چاروں طرف سفید سی روشنی تھی جس میں کبھی کبھی چہرے جھانکنے لگتے تھے، پُرتشویش اور فکر مند چہرے، میں ان کے ہلتے لب تو دیکھتا تھا لیکن میرے کان ان کی آوازیں کیچ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ چہرے میرے دشمنوں کے نہیں بلکہ مہربانوں کے ہیں۔ رفتہ رفتہ میرے اردگرد پھیلی دھند صاف ہونے لگی اور جب میں مکمل طور پر ہوش میں آیا تو میں نے خود کو جمشید پیلس میں اپنے ہی کمرے میں پایا تھا۔ میرا پورا بدن ایک عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا، میری آنکھوں کے گوشوں نے خفیف سی حرکت محسوس کی تھی۔ میں نے سر گھمایا۔ یہ ماہ پارہ تھیں، جو مصلے پر دست بہ دعا بیٹھی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ وہ خدا سے میرے لیے ہی دعا مانگ رہی تھیں اور خدا نے ان کی دعا سن لی تھی۔

میں ایک گاؤن نما لباس میں تھا اور میرے جسم کے دائیں حصے پر گھٹنے سے لے کر کولہے تک سخت بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ بائیں بازو میں کلائی سے بازو تک پلاستر تھا۔ سینے پر بھی پلاسٹر تھا۔ شاید اس کی وجہ سے بے ہوشی کی کیفیت میں مجھے کبھی کبھی دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے زخم تھے۔ شاید مجھے کوئی مسکن دوا دی گئی تھی جس کے زیر اثر مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ بینڈیج اور پلاسٹر سے ظاہر تھا کہ میرے جسم میں اچھی خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ میرے سیدھے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور قطرہ قطرہ گلوکوز میری رگوں میں اُتر رہا تھا۔

پہلا احساس جو ہوا وہ پیاس کا تھا۔ نہ جانے کتنے وقتوں سے میری زبان نے پانی کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ میں ایک ٹک ماہ پارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے میری طرف دیکھا، ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں جو اطمینان نمودار ہوا، میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی ہی خوشی تھی جو ایک ماں کو ہوتی ہے، جب اس کا بیٹا موت کے منہ سے نکل آتا ہے۔ وہ لپک کر میری طرف آئیں۔ "یوسف میرے بچے......" انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے مجھے اپنے بوسوں سے نہلا دیا تھا جس میں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ "تو ٹھیک ہے تُو نے مجھے پہچانا۔"

"آپ...... آپ میری ماں ہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں...... میں تمہاری ماں ہوں۔" انہوں نے یقین کامل سے کہا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا





لیا۔

یہ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ انسان کب ماں اور اس کی ممتا کو محسوس کرتا ہے۔ جب وہ اس کے وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے یا جب وہ اس کے وجود سے باہر آتا ہے۔ میری بھی ایک ماں ہو گی جس نے نو ماہ مجھے اپنے وجود میں رکھا ہو گا اور جب میں پیدا ہوا ہوں گا تو مجھے اپنی ممتا سے بھرپور محبت دی ہو گی۔ یہ ممتا کتنے عرصے میرے نصیب میں رہی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں لیکن یہ مدت ایک سال سے زیادہ نہیں رہی ہو گی کیونکہ ایک سال کی عمر میں مجھے جمشید پیلس لے آیا گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اپنی تصویروں کی البم دیکھ کر ہوتا ہے جس میں روزِ اول سے لے کر اب تک کی میری بے شمار تصاویر تھیں۔ پہلی تصویر میں میں سال بھر کا نظر آ رہا تھا۔ پیلس کے ایک پرانے خدمت گار نے تصدیق کی تھی کہ میں جب جمشید پیلس آیا تھا تو میری عمر ایک سال کے آس پاس تھی۔ یہ مجھے اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ میرے اصل ماں باپ کون تھے اور میں جمشید پیلس کیسے آیا۔ جمشید علی نے میرے سوالوں کے جواب میں ہمیشہ ایک ہی بات کہی تھی کہ وقت آنے پر مجھے سب معلوم ہو جائے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ میں اتنی کم عمری میں اپنی ماں سے جدا کر دیا گیا تھا کہ میری یادداشت میں اس کا ہلکا سا سایا بھی نہیں تھا۔ اس کا ایک لمحہ، ایک خوشبو اور ایک احساس تک میرے پاس نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ماں اور اس کی محبت کیا ہوتی ہے لیکن اس روز ماہ پارہ نے مجھے احساس دلایا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے۔ اس کا سایا دنیا کی تپتی دھوپ میں نرم اور سرد ہوتا ہے۔ وہ اس تلخ اور کھردری دنیا میں گداز اور مٹھاس کی علامت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری سگی ماں بھی زندہ ہوتی تو میرے لیے اس سے زیادہ بے قراری اور محبت نہیں دکھا سکتی تھی جو ماہ پارہ نے ظاہر کی تھی۔ میرے وجود میں سکون کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور میں بھول گیا تھا کہ چند لمحے پہلے تک شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اچانک ماہ پارہ مجھ سے الگ ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جذباتی ہو کر میرے زخموں کو نقصان نہ پہنچا رہی ہوں اور مجھے اس سے تکلیف نہ ہو رہی ہو۔ حالانکہ میں رہی سہی تکلیف بھی بھول گیا تھا۔

"یوسف درد تو نہیں ہو رہا ہے میرے بچے؟" انہوں نے بے قراری سے کہا۔

"نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن پیاس لگ رہی ہے۔"

ماہ پارہ نے گھنٹی بجا کر ایک نرس کو طلب کیا۔ "ڈاکٹر کو بلاؤ، یوسف کو ہوش آ گیا ہے۔"

اسی دوران ماہ پارہ ایک شفاف گلاس میں پانی لے کر اس میں گلوکوز گھول رہی تھیں۔ انہوں نے یہ گلوکوز ملا پانی چمچے سے میرے منہ میں ٹپکانا شروع کر دیا۔ ٹھنڈک اور تراوٹ میری رگ و پے میں اُترنے لگی تھی۔ معاً مجھے امیر خان کا خیال آیا میرا دل بے اختیار دُکھ سے بوجھل ہونے لگا تھا۔

"ماں! امیر خان......" میں نے کہنا چاہا تو ماہ پارہ نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی، پھر

انہوں نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

''یوسف! آئندہ مجھے ان کمروں میں ماں مت کہنا۔ یاد رکھو یہاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

اسی لمحے ڈاکٹر کمرے میں آ گیا۔ ماہ پارہ پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ مجھ سے کچھ سوالات کیے میرے جواب پر وہ اپنے چارٹ پر کچھ لکھتا رہا، پھر اس نے نرس کو میری ڈرپ میں کچھ دوائیں شامل کرنے کا حکم دیا اور ماہ پارہ سے کہا۔ ''ہی از آل رائٹ، لیکن ابھی انہیں ٹھوس کے بجائے رقیق غذا دیں۔''

''ڈاکٹر میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''بہت جلد ینگ بوائے۔'' ڈاکٹر نے میرا شانہ تھپکا۔ ''ایک ہفتے بعد تم چل پھر سکو گے اور دو ہفتے بعد فٹ بال کھیل سکو گے لیکن تمہارے بازو اور پسلی کی ہڈی ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ تمہیں احتیاط کرنی پڑے گی ورنہ ہڈی میں بال آ گیا تو بڑی پریشانی ہوگی۔ بٹ یو آر اے بریو بوائے۔''

میں مسکرایا تو وہ میرے بازو کو تھپکی دے کر چلا گیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ سے کہا۔ ''ما...... ماہ پارہ مجھے بھوک لگی ہے۔'' وہ مسکرائیں کہ میں انہیں ماں کہتے کہتے رُک گیا تھا۔

''تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی جہاں تم نے ایک ہفتے صبر کیا ہے، وہاں دو منٹ اور سہی۔''

''ایک ہفتہ......'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''میں ایک ہفتہ بے ہوش رہا۔''

''نہیں...... ہوش تو تمہیں اگلے ہی روز آ گیا تھا لیکن تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں نیند کے انجکشن سے سلا کر رکھا گیا تھا ورنہ تم درد سے بے چین رہتے۔ تم جب ہوش میں آنے لگتے تمہیں پھر خواب آور دوا دے دی جاتی تھی اس دوران تمہیں ڈرپ کے ذریعے سے غذا دی جاتی رہی تھی۔''

''کیا میرا علاج پیلس میں ہی ہو رہا ہے؟''

''نہیں...... تم تین دن تک ہسپتال میں داخل رہے تھے پھر جمشید صاحب کی ہدایات پر تمہیں پیلس منتقل کر دیا گیا۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے ایک ڈاکٹر اور ایک نرس ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔''

میں امیر خان کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے تو اب تک دفنا دیا گیا ہوگا، ماہ پارہ نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ وہ بولیں۔

''امیر خان اچھا آدمی تھا، وفادار، پُر جوش، افسوس کہ ہم...... خیر میں نے جمشید صاحب کی ہدایات پر اس کے گھر والوں کو معقول رقم کا ایک چیک بھجوا دیا ہے۔ ویسے تو اس نے بھی بہت کچھ چھوڑا ہوگا۔ جمشید صاحب اسے اچھی تنخواہ دیتے تھے۔''

''اس کے بچے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔





''ہاں، ایک لڑکا ہے تمہاری عمر کا، لڑکی بڑی ہے۔''

''کیا وہ تمام رقم ان کے باپ کا بدل ہو سکتی ہے، میرا خیال ہے دنیا کی تمام دولت مل کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم ہے پاپا میرے باپ نہیں ہیں لیکن میں انہیں دنیا کی تمام دولت کے بدلے بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔'' میرا لہجہ دُکھی ہو گیا تھا پھر میں چونکا۔ ''ابھی آپ نے پاپا کی بات کی، کیا وہ واپس آ گئے ہیں؟''

''نہیں...... انہیں شپ پر ٹیلکس بھیج دیا گیا تھا۔ ان کا جوابی ٹیلکس آیا تھا، اب تمہاری حفاظت کے لیے دو نئے محافظ تعینات کیے گئے ہیں۔ فی الوقت تو میں نے انہیں تمہارے کمرے کے باہر لگا رکھا ہے۔''

امیر خان کی موت کا دُکھ تازہ ہو گیا تھا۔ میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''امیر خان کی موت ایسے واقع ہوئی تھی اس کے ہونٹوں سے مٹیالا مائل جھاگ نکل رہا تھا۔''

''اب چھوڑو...... بس اس کی موت آ گئی تھی۔'' ماہ پارہ نے بات ٹالی۔ ''فی الوقت تم آرام کرو۔''

ظاہر ہے ماہ پارہ مجھے بچہ سمجھ کر بہلا رہی تھیں۔ ماہ پارہ نے پہلے گیلے تولیے سے میرا منہ صاف کیا، پھر نرس ایک ٹرے میں بڑا سا پیالہ لے کر آئی۔ ماہ پارہ اس میں موجود سوپ مجھے چمچ سے پلانے لگی تھیں۔ مجھے اتنی شدت سے بھوک لگ رہی تھی کہ جلد ہی پیالہ ختم ہو گیا تھا۔ میں اور سوپ پینا چاہتا تھا لیکن یک لخت میرے اعصاب پر غنودگی چھانے لگی تھی شاید نرس نے ڈرپ میں جو دوائیں ڈالی تھیں، ان میں کوئی خواب آور دوا بھی شامل تھی۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند سو چکا تھا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو تاریکی چھا چکی تھی۔ بیڈ روم میں ہلکی سی روشنی تھی۔ میرے بستر کے پاس ہی کرسی پر ایک ہیولہ سا بیٹھا تھا جیسے ہی میں نے حرکت کی وہ ہیولہ متحرک ہو گیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ کوئی نرس تھی، شاید اس کی رات کی ڈیوٹی تھی یقیناً صبح دوسری نرس تھی، یہ والی نرس خاصی کم عمر تھی، شاید حال ہی میں نرسنگ مکمل کی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خوب صورت تھی یا نہیں لیکن میری آنکھوں کو بھلی لگی تھی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے میرے اتنے نزدیک آ کر پوچھا کہ میں اس کی سانسوں کی گرمی اور اس کے بدن کی مہک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میری جسمانی نشوونما خاصی تیز تھی۔ بارہ سال کی عمر میں پندرہ سال کا لگتا تھا اور شاید یہی رفتار میری ذہنی ترقی کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی اور بارہ سالہ لڑکا کسی لڑکی کی قربت کو یوں محسوس کر سکتا تھا یا نہیں۔ بہر حال مجھے اس کی قربت اچھی لگی تھی۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں...... اب کچھ ٹھیک محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے ذرا شرارت سے کہا تو وہ شرما گئی تھی لیکن اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے تھے کہ

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوگئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازے پر کاجل کھڑی تھی اور کڑی نظروں سے نرس کو گھور رہی تھی۔ حسبِ معمول اس کے بے پناہ گھنے بال بکھرے ہوئے تھے اور سیاہ آنکھوں میں غصہ چمک رہا تھا۔ اس نے اندر آ کر نرس سے کہا۔

''گیٹ آؤٹ۔''

نرس دم بخود رہ گئی تھی۔ غالباً اسے ایک بچی سے اس لفظ اور اس لہجے کی امید نہیں تھی۔ وہ ابھی اس حکم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ نرس اس کی بات نہیں مانے گی اور وہ جنونی ہو جائے گی۔ فی الوقت میں اس قابل نہیں تھا کہ اسے روک سکوں۔ اپنے معاملے میں اسے میں نے ایسا ہی جنونی پایا تھا۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تھا تو ماں کی پروا کیے بغیر گھنٹوں میری گود میں چڑھی رہتی تھی اور کسی صورت اُترنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔ اگر میں اسے اس کی مرضی کے خلاف گود سے اُتار دیتا تھا تو وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ مجھے بھی سیاہ چمکتی آنکھوں والی یہ لڑکی اچھی لگتی تھی لیکن جب وہ روتی تھی تو مجھے بے زار کر دیتی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے میں نیچے جانے سے گریز کرتا تھا تو وہ مجھے تلاش کرتی اوپر آ جاتی اور کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ نکالتی تھی۔ ماہ پارہ اسے میری لیلیٰ کہتی تھیں، وہ مجھے چھیڑا کرتی تھیں۔ ''یوسف! ذرا سوچ اگر بڑے ہو کر اس نے کہہ دیا کہ اس نے تم سے شادی کرنی ہے تو......؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں جلدی سے کہتا۔ ''میں اس کالی رونے والی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔''

''کالی کہاں ہے، اتنا پیارا رنگ ہے، تمہیں معلوم ہے گورے اپنی جلد اس رنگ کی کرنے کے لیے گھنٹوں دھوپ سینکتے ہیں۔'' سچی بات تھی کہ بچپن میں جب کاجل نے میرے بال کھینچے تھے، میں اس سے چڑنے لگا تھا۔ وہ زبردستی میرے سر ہو جاتی تھی تو میں زہرہ بیگم کے خوف سے اسے برداشت کر لیتا تھا مگر رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ جیسے شرابی تلخ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پھر میں اس کے جنون سے ڈرنے لگا۔ غصے کے عالم میں وہ اپنے ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ ایک بار اس نے اتنی سی بات پر پیپر ویٹ میرے سر پر کھینچ مارا تھا کہ میں اس کے ساتھ کھیلنے کے بجائے پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا، دوسری بار اس نے ایسی ہی کسی بات پر ناراض ہو کر سوئمنگ پول میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کی عمر صرف چھ سال تھی، خوش قسمتی سے مجھے تیراکی آتی تھی اور اس کے ڈوبنے سے پہلے میں اسے نکال لایا تھا۔ وہ دوبارہ پانی میں کودنے پر کمربستہ تھی۔ اگر میں اس کی بات نہ مانتا تو وہ پانی میں کود بھی جاتی۔ وہ اتنی ہی ضدی تھی، بعد میں اکثر کسی بات پر میں جل کر اس سے کہتا۔

''اچھا تھا کہ اس روز میں تمہیں سوئمنگ پول سے نہ نکالتا۔''

''تو نہ نکالتے۔'' وہ اطمینان سے کہتی۔ ''میں نے تو نہیں کہا تھا مجھے نکالو۔''

میں بھنا کر کہتا۔ ''اگر نہ نکالتا تو تمہاری والدہ محترمہ الزام لگاتیں کہ میں نے ہی تمہیں دھکا دیا ہے۔''



''تو میں آئندہ سوئمنگ پول میں چھلانگ نہیں لگاؤں گی۔'' اس نے سوچ کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''آئندہ تم نے میری کوئی بات نہیں مانی تو میں مما کی ساری نیند کی گولیاں کھا لوں گی۔'' اس نے گویا تجویز پیش کی۔ ''پھر تو مما تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔''

میں نے سر پکڑ لیا۔ ''خدا کے لیے کاجل کی بچی، تم دھمکیاں دینا نہیں چھوڑو گی۔''

''بالکل نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

وہ صرف آٹھ سال کی تھی اور میرے پاس کسی ایک سالہ بچی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نرس کو میرے قریب دیکھ لیا تھا اور مجھے نرس کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، میں نے جلدی سے نرس سے کہا۔

''سسٹر آپ پلیز باہر جائیے۔''

نرس نے باہر جانے کی درخواست سے زیادہ لفظ ''سسٹر'' کا بُرا منایا تھا۔ کاجل پاس آ کر مجھے گھورنے لگی تھی۔

''یہ نرس کی بچی تمہارے پاس کیا کر رہی تھی؟'' اس نے حاسدانہ لہجے میں کہا۔

''میرا ٹمپریچر لے رہی تھی۔'' میں نے کہا۔ جلدی میں مجھے یہی بہانہ سوجھا تھا۔

''تھرمامیٹر کہاں تھا اس کے پاس؟'' اس نے مشکوک انداز میں مجھے دیکھا۔

''ایسے ہی چیک کر رہی تھی۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''اور تم اب آ رہی ہو مجھے دیکھنے۔''

''میں آئی تھی تم سو رہے تھے۔ ابھی مما نہیں آنے دے رہی تھیں۔'' وہ بلاتکلف میرے بستر پر بیٹھ گئی۔ ان دنوں وہ خاصی فربہ ہوا کرتی تھی۔

''موٹی کہیں کی، مجھ پر کہاں چڑھی آ رہی ہو۔ پہلے ہی میری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ایک دو تم اور توڑ دو گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔'' وہ جان بوجھ کر مجھ سے چپک کر بیٹھ گئی۔ ''تم نے پوچھا نہیں کہ اب مما نے مجھے آنے کی اجازت کیسے دی؟''

''تم نے یقیناً کھانا نہیں کھایا ہوگا۔'' میں نے اندازہ لگایا۔ ''لیکن تم نے چھپ کر کچھ نہ کچھ کھایا ہوگا۔''

''جی نہیں۔'' اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ ''میں نے دو دن تک کچھ نہیں کھایا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''تم نے دو دن کچھ نہیں کھایا۔''

''اور سوئی بھی نہیں۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''پھر مما نے اجازت دے دی۔''

میں نے دائیں ہاتھ سے سر تھام لیا۔ ''کاجل تم اتنی ضدی کیوں ہو؟''

''بس ہوں۔'' وہ غصے میں آ گئی۔ ''اور یہ نرس یہاں کیوں ہے، اس سے کہو کہ یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ میں کوئی چیز مار کر اس کا سر توڑ دوں گی۔''

''بابا وہ میرے ساتھ کھیلنے نہیں آئی ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''میں بیمار ہوں، وہ میری دیکھ بھال کر رہی ہے۔''

''دیکھ بھال میں بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ بھال میں بھی کر سکتی ہوں۔'' میں نے اس کی نقل اتاری۔ ''انجکشن لگانا تو ایک طرف رہا، تمہیں تھرمامیٹر دیکھنا نہیں آتا۔''

''اچھا تب کوئی دوسری نرس رکھ لو، آنٹی جیسی۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ یہاں نہیں رہے گی۔''

ماہ پارہ کو وہ آنٹی کہتی تھی۔ شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ماہ پارہ کی عمر کی کوئی نرس رکھ لوں لیکن وہ کہہ نہیں سکی تھی۔ آج میں سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ کیا ایک آٹھ سالہ بچی کسی جوان لڑکی کی طرح حسد کر سکتی ہے؟ وہ اپنے محبوب کے پاس کسی دوسری لڑکی کو برداشت نہیں کر سکتی چاہے وہ ایک مہربان نرس ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تمام تر قربتوں کا حق دار صرف خود کو سمجھتی ہے۔ کچھ ایسا ہی رویہ کاجل کا بھی تھا۔ یہ کچھ عرصے بعد کی بات ہے، اس نے مجھے دھمکی دی۔

''اگر تمہارے ساتھ کوئی دوسری لڑکی نظر آئی تو میں اسے مار ڈالوں گی۔''

میں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ ''کیسے مار ڈالو گی۔ چوہیا سی تو ہو۔''

اس کی رات سی کالی آنکھوں میں غصہ دہک اٹھا تھا۔ اس نے پیر پٹخ کر کہا۔ ''بس مار ڈالوں گی۔''

اس رات بھی وہ کچھ ایسے ہی موڈ میں تھی۔ ''سوری کاجل، نرس کو میں نے نہیں رکھا اور نہ ہی میں اسے نکال سکتا ہوں۔''

''میں نکال دوں گی۔'' اس نے کہا۔

''خدا کے لیے کاجل، وہ صرف ایک نرس ہے۔'' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔

''تم اس نرس کو نہیں بھگاؤ گے۔'' اس نے الٹی میٹم دینے والے انداز میں کہا۔

''میں اسے کیسے بھگا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اب وہ اس کمرے میں آئی تو میں اس کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں گی۔'' اس نے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''احمق لڑکی، یہ کھڑکی زمین سے بہت اونچی ہے، تمہاری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔''

''ہو جائے، لیکن وہ نرس یہاں نہیں رہے گی۔''

میں نے یک دم اسے اپنے صحیح بازو سے دبوچ لیا۔ اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی تھی۔

''کاجل میں تمہیں زہرہ بیگم کے حوالے کر دوں گا اور ان سے کہوں گا کہ تمہیں سنبھال کر رکھیں۔''





''کوئی بات نہیں، اگر ابھی نہیں تو میں بعد میں آ کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں گی۔''

میرا دل چاہا کہ اس لڑکی کا سر توڑ دوں مگر فی الحال میں خود بستر پر پڑا ہوا تھا، اس لمحے نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں رکھے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میرا ڈر آ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اگر وہ میرے قریب آ جاتی تو کاجل ضرور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتی۔ اگر اسے ابھی موقع نہیں ملتا تو وہ بعد میں یہ کام کر گزرتی۔ میں اس کی ہٹ دھرم طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے دیکھا کہ کاجل کو میرے ساتھ لگے بیٹھے دیکھ کر نرس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے تھے۔ حالانکہ یہ بہت عام سا منظر تھا۔ کاجل بچی تھی، شاید یہ بات سچ ہے کہ انسانوں کے درمیان ایک غیر مرئی رابطہ ہوتا ہے جو انہیں ایک دوسرے کے احساسات سے آگاہ رکھتا ہے۔ کچھ ایسا ہی رابطہ ہم تینوں کے درمیان بھی تھا۔ نرس اسے ایک بچی نہیں سمجھ رہی تھی، بلکہ وہ اسے ایک دوسری عورت کی نظر سے دیکھ رہی تھی جو مجھ پر قابض تھی۔ کچھ ایسا ہی کاجل محسوس کر رہی تھی۔ وہ مجھ پر صرف اپنا حق سمجھتی تھی اور نرس کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ میں اُن کے درمیان سینڈوچ بن گیا تھا۔ نرس میری طرف آنے لگی۔

''اسے وہیں رکھ دو۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''ابھی تم یہاں سے جاؤ۔''

میں نے کاجل کو چھوڑ دیا تھا مگر وہ بدستور میری بغل میں گھسی بیٹھی تھی۔ ''اور اب دوبارہ اس کمرے میں مت آنا۔''

کاجل کی بات پر نرس کے نرم و سبک چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ بہ ظاہر اس نے مسکراتے ہوئے لیکن اصل میں کاٹ کھانے والے لہجے میں کاجل سے کہا۔ ''سنو بے بی، اپنی امی کے پاس جاؤ وہ تمہیں تلاش کر رہی ہیں۔''

''نرس۔'' اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پلیز آپ جائیں، جب آپ کی ضرورت ہو گی آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔''

نرس نے پٹخنے کے انداز میں ٹرے میز پر رکھی اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کاجل سے کہا۔

''بابا تم تو ہٹو، تمہارے دو من بوجھ سے میرا دوسرا بازو بھی ٹوٹا جا رہا ہے۔''

وہ شرارت سے ہنسی۔ اس کے انداز میں فتح کا غرور نمایاں تھا۔ اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور سوپ کی ٹرے اٹھا لائی۔ سلیقے سے نیپکن میرے سینے پر پھیلایا اور چمچے سے سوپ پلانے لگی تھی۔

''تم کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہو۔'' میں نے سوپ نگلتے ہوئے کہا۔ ''احمق ادر خندی لڑکی۔''

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے بُرا بھلا بھی سن سکتی تھی

اور مار بھی کھا سکتی تھی۔ سوئمنگ پول والے واقعے کے بعد میں نے اس کی اچھی خاصی مرمت لگائی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سوپ پلانے کے بعد اس نے میرا منہ صاف کیا اور ٹرے لے کر چلی گئی۔ رات کو ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا، وہ میری صحت یابی کی رفتار سے مطمئن تھا۔ میں نے اسے اب خواب آور دوا دینے سے منع کر دیا۔

''او کے، پین کلر ہی کافی ہیں۔ ان سے ہی آپ کو اچھی نیند آ جائے گی۔'' اس نے کہا۔

کاجل اس کے بعد دوبارہ نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ نرس آئی تھی غالباً یوں بھگائے جانے پر اس نے اپنی توہین محسوس کی تھی اور دوبارہ آنا گوارہ نہیں کیا لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ مسلسل آٹھ دن خواب آور دواؤں کے زیر اثر رہنے کے بعد میرے لیے از خود سونا مشکل ہو رہا تھا اور جسم بھی نیند طلب نہیں کر رہا تھا لیکن درد کش دواؤں کے زیر اثر میں ہلکی سی غنودگی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات کا کوئی پہر تھا جب میرے حواس نے مجھے خبردار کیا۔ کوئی میرے پاس ہی تھا، میں نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی میں مجھے اس سفید وجود کو دیکھنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی جو میرے بستر کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نرس تھی اور رات کی اس خاموش تاریکی میں خاموشی سے میرے بستر کے پاس ساکت کھڑی تھی، کیوں؟ میں نہیں جانتا تھا۔ تب اس نے حرکت کی اور نرم و نازک سا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا تھا۔ سینے پر اس جگہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ وہ بستر پر کنارے ٹک گئی تھی اور میں اس کے جسم کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ میں اس کے عزائم سے بے خبر تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی قربت سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ ہاتھ رینگتا ہوا میری گردن تک آ گیا۔ اس کا لمس محسوس کر کے میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ پھر نرمی سے اس نے میرے چہرے کو چھوا۔ رفتہ رفتہ اس کا شاخ گل جیسا بدن لچک کر میری طرف جھکنے لگا۔ مجھے یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی کیونکہ مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

میں اس کی گرم سانس کی مہک اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ سانسیں میرے بے حد قریب آ گئی تھیں۔ معاً میں نے اسے اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لیا تو وہ بُری طرح چونکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں خواب آور دوا کے زیر اثر سو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کو کسمسائی پھر ساکت ہو گئی۔ لمحات میرے لیے رُک گئے تھے اور میری خواہش تھی کہ یہ اس طرح رُکے رہیں۔ یہ نرمی، گرمی اور یہ شیرینی مجھے ہمیشہ ملتی رہے مگر ہر خواہش پوری کہاں ہوتی ہے۔ اچانک مجھے دروازے کی طرف سے آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ یہ آہٹ نرس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ اُچھل کر مجھ سے الگ ہوئی تھی لیکن اسے ذرا دیر ہو چکی تھی۔ میں نے بیڈروم کی فضا میں پرفیوم کی تیز خوشبو پھیلتے محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی ایک ننھا سا شعلہ چمکا۔ لائٹر کاجل کے ہاتھ میں تھا۔

''کتیا.....'' اس نے نفرت سے بھرپور لہجے میں کہا اور جلتا لائٹر نرس کے کپڑوں سے لگا دیا۔





ایک دم اس کی قمیص نے آگ پکڑ لی تھی۔ نرس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اس نے دیوانہ وار ہاتھ مار کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی قمیص کے دامن نے پوری طرح آگ پکڑ لی تھی۔ کاجل کے دوسرے ہاتھ میں پرفیوم کی شیشی تھی اس نے ایک ہاتھ سے نرس پر پرفیوم چھڑکا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لائٹر سے آگ لگا دی تھی۔

''کاجل...... اُلو کی پٹھی، یہ کیا کیا۔'' میں نے چلا کر کہا لیکن وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ نرس دیوانہ وار چلا رہی تھی اور اپنی قمیص میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے چلا کر اسے قمیص اُتارنے کو کہا لیکن خوف کے مارے اسے میری بات ہی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ اسی لمحے ماہ پارہ بیڈروم میں آئی۔ انہوں نے ایک نظر جلتی نرس کو دیکھا اور روشنی کر کے فوراً اسے زمین پر گرا کر اپنی چادر اس کی قمیص کے جلتے حصوں پر مارنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے نرس نے چست قمیص نہیں پہن رکھی تھی اس وجہ سے اسے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ صرف پیٹ اور کمر کی کھال معمولی سی جھلسی تھی۔ وہ دہشت زدہ زیادہ تھی، ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی شروع کر دی۔

''یوسف یہ کیا ہوا تھا؟'' اس کے جاتے ہی ماہ پارہ نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔ ''اس کی چیخیں سن کر میری آنکھ کھلی تھی۔''

''اچھا۔'' انہوں نے اپنے رومال سے میرا منہ صاف کیا۔ ''اب تم سو جاؤ۔ میں نرس سے معلوم کرتی ہوں۔''

مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں خوف زدہ نرس بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اگلی صبح ماہ پارہ نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے شبہ ہوتا کہ نرس نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مرہم پٹی کے بعد رات ہی کو نرس کو اس کے گھر بھیج دیا گیا تھا لیکن برسوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ماہ پارہ نے رات ہی ساری کہانی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ انہوں نے رومال سے چہرہ صاف کرنے کے دوران میرے چہرے سے وہ سارے داغ مٹا دیئے تھے جو رات کی اس تاریکی میں آئے تھے۔

جمشید علی ایک ہفتے بعد آ گئے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ اس وقت میں کمرے میں چہل قدمی کرنے کی مشق کر رہا تھا۔ میری سخت بینڈیج اُتر چکی تھی مگر چلنے کے دوران ابھی بھی گھٹنے میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی تھی۔ حسبِ معمول کاجل میرے ساتھ تھی اور ماہ پارہ مجھے سہارا دے کر واک کرا رہی تھیں۔ جمشید علی اچانک آئے تو ہم سب ہی چونک گئے تھے۔ سب سے پہلے کاجل دوڑی اور ''ڈیڈی'' کہہ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ انہوں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا۔

''ناٹی گرل!'' انہوں نے کاجل کی ناک مروڑی۔ ''یہ ہر وقت کیسا حلیہ بنا کر رکھتی ہو۔''

''ڈیڈی، یوسف ٹھیک ہو گیا ہے۔'' جواب میں وہ چہکی۔

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر کاجل کو گود سے اتارا۔ ''چلو اب تم نیچے جاؤ اور جب تک

میں آؤں نہا دھو کر اچھی بچیوں کی طرح تیار ہو جاؤ۔''

بادل نخواستہ کاجل رخصت ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''کیسے ہو یوسف؟'' انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ان کے انداز اور کسی حد تک سرد رویے سے مجھے دھچکا لگا تھا۔ میں شاید کچھ اور ہی توقع کر رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جمشید علی، ماہ پارہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ''ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟''

ماہ پارہ کو بھی ان کا انداز بُرا لگا تھا۔ انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات آپ کو یوسف بھی بتا سکتا ہے۔''

جمشید علی کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا تھا۔ ''واٹ ڈو یو مین، میں نے تم سے پوچھا ہے۔''

میں نے فوراً مداخلت کی۔ ''پاپا، دراصل ما...... ماہ پارہ کو اس بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے علم۔'' ان کی برہمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''سوری سر۔'' ماہ پارہ نے سر جھکا کر کہا تو جمشید علی کے چہرے سے برہمی کے تاثرات معدوم ہونے لگے۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ وہ ماہ پارہ پر کتنا ہی غصے کیوں نہ ہوں، جب وہ سر جھکا کر سوری سر کہتی تھیں تو ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔

''او کے...... او کے۔'' وہ بولے۔ ''پلیز ذرا میرے لیے کافی منگواؤ۔''

ماہ پارہ کے جاتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اس دفعہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ ان کے انداز میں محبت اور اپنائیت شامل ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے میرے زخموں اور چوٹوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب میں نے حادثے کا ذکر کیا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''دیکھ لوں گا ان لوگوں کو۔'' وہ زیرِ لب بولے۔

''کن لوگوں کو پاپا؟''

وہ چونکے۔ ''آں ہاں...... کسی کو نہیں۔ خیر اب تم مجھے شروع سے بتاؤ، میرے بعد یہاں کیا ہوا تھا؟''

میں نے بات سکول کے باہر حملے سے شروع کی، جمشید علی غور سے سنتے رہے۔ جب میں نے امیر خان کے دیئے کاغذ کا ذکر کیا جس پر نامانوس زبان میں کچھ لکھا تھا تو وہ چونکے۔ امیر خان نے وہ کاغذ مجھے اس لیے دیا تھا کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو میں یہ کاغذ جمشید علی کے حوالے کر دوں۔ انہوں نے اضطراب سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ کاغذ؟''

میں نے تصویر کے عقب میں چھپا کاغذ نکال کر انہیں دے دیا۔ انہوں نے کاغذ پر لکھی عبارت پڑھنا شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے لیے یہ رسم الخط اجنبی نہیں تھا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جا رہے تھے، ان کے غصے میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر میں انہوں نے دونوں کاغذ مٹھی میں





دبا کر چرمر کر دیئے تھے۔

''اس میں کیا لکھا ہے پاپا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ چونکے۔ ''تمہیں یقین ہے کہ امیر خان نے ہی کاغذ دیئے تھے تمہیں؟''

''جی پاپا۔'' میں نے سو فیصد یقین سے کہا۔ ''میں نے اسے سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ ماہ پارہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔''

''لیکن اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ امیر خان نے لکھا ہے کہ تمہاری زندگی کو کچھ لوگوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہے اور اب وہ اس کے پیچھے بھی پڑ گئے ہیں۔''

''امیر خان سچا تھا، اس پر دو بار قاتلانہ حملے ہوئے اور دشمنوں نے بالآخر اس کی جان لے لی۔''

جمشید علی ٹہلنے لگے۔ ''اگر وہ کچھ جانتا تھا تو اس نے خط میں کیوں نہیں لکھا اور اگر وہ دشمنوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا تو انہوں نے اس کی جان کیوں لی۔''

''شاید اس لیے کہ پھر وہ مجھ تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

جمشید علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نو سن، میں تمہارے لیے صرف امیر خان پر انحصار نہیں کر سکتا تھا میں نے اس کے علاوہ بھی تمہاری حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں ایک بار پھر فرسٹریشن کا شکار ہونے لگا۔ ''آخر مجھے کن لوگوں سے خطرہ ہے۔''

''جلد تم سب جان جاؤ گے۔'' انہوں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''ابھی کیوں نہیں۔'' میری آواز کسی قدر بلند تھی۔

''ابھی تمہارے لیے کچھ جاننا بے کار ہے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا اپنے ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فی الوقت تم آرام کرو، میں تمہارے لیے ایک نیا محافظ لایا ہوں، وہ کل تم سے ملے گا۔''

''کیا فائدہ، دشمن اسے بھی مار دیں گے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''پھر آپ کو میرے لیے ایک اور محافظ لانا پڑے گا۔''

جمشید علی ہنسے۔ ''فکر مت کرو، وہ لوہے کا چنا ہے دشمنوں کے دانت توڑ دے گا، وہ تمہارا استاد بھی ہو گا۔''

''استاد! کس معاملے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھ لینا۔'' وہ بولے۔ ''خیر اب تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔'' وہ دروازے پر پہنچ کر رکے۔ ''یہ نرس کا کیا چکر ہے؟'' ان کے اچانک پوچھنے پر میں بوکھلا گیا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس واقعے سے بھی باخبر ہوں۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں اتنا ہی بتایا جتنا کہ ماہ پارہ یا

دوسرے افراد کے علم میں تھا۔ وہ خلافِ توقع ہنسے اور پھر معنی خیز انداز میں بولے۔ ''کاجل از اے رئیلی جیلسی گرل۔''

میں سن سا رہ گیا تھا تو کیا انہیں اصل بات کا علم ہو گیا تھا لیکن کیسے؟ صرف ایک ہی ذریعہ تھا جس سے ان تک یہ بات پہنچ سکتی تھی یعنی نرس اور جہاں تک میرے علم میں تھا، اس نے بھی اصل واقعہ گول کر دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تاریکی میں وہ سوئچ تلاش نہیں کر پا رہی تھی اور اس نے لائٹر جلایا تھا۔ غلطی سے اس کی قمیص میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ کاجل اور میرا ذکر گول کر گئی تھی۔ اسی میں اس کی بچت بھی تھی ورنہ اس کے لیے وضاحت مشکل ہو جاتی کہ رات کے اس پہر وہ میرے کمرے میں کس لیے آئی تھی، آگ لگنے کے واقعے سے وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ رات کو ہی اصرار کر کے چلی گئی تھی۔ کوئی نئی نرس نہیں رکھی گئی۔ دوائیں مجھے ماہ پارہ استعمال کراتی تھیں۔ دوسرے کاموں کے لیے ملازم تھے۔ ڈاکٹر دن میں دو بار آ کر میرا معائنہ کر جاتا تھا، عام زخم تقریباً بھر چکے تھے۔ پسلی کی حالت بھی ٹھیک تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق اگلے ہفتے میرا سینے پر پلاسٹر کٹ جائے گا۔ البتہ ہاتھ کا پلاسٹر تین مہینے سے پہلے نہیں اُتر سکتا تھا۔ حادثے کے دوران پسلی اور کلائی کی ہڈی مونگ پھلی کی ریڑھی پر گرنے سے ٹوٹی تھی۔ کولہا اور ٹانگ کار کی ٹکر سے متاثر ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے میں مونگ پھلی کے نرم ڈھیر پر گرا تھا، ورنہ اگر پکے فٹ پاتھ پر گرتا تو زخموں کی نوعیت کہیں زیادہ سنگین ہوتی اور اگر میرا سر کسی جگہ ٹکرا جاتا تو میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

امیر خان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کسی نے خاموشی سے اس کی گردن میں سائنائیڈ کا انجکشن لگا دیا تھا۔ یہ مہلک زہر سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں آدمی کی جان لے لیتا ہے۔ امیر خان کو دوسرا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی۔ بعد میں ایک دوسری کار کے ڈرائیور نے جو میری کار کے عین پیچھے کھڑی تھی، ایک ملنگ نما شخص کو امیر خان سے بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے بھیک مانگنے کے لیے صرف امیر خان کا انتخاب کیا تھا اور اس کے پاس سے ہٹتے ہی تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ ظاہر ہے فقیر کے بھیس میں قاتل تھا جو پیغام اجل لے کر آیا تھا، اس نے بھکاری کے روپ میں امیر خان کی جان لے لی تھی۔

اس سے قاتلوں کی چالاکی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس بار انہوں نے مانگنے والے کے بھیس میں اپنا آدمی بھیجا تھا۔ مانگنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ قاتل نے آ کر امیر خان سے کہا ہوگا۔ ''اللہ کے نام پر کچھ دے بابا۔'' اور امیر خان نے اسے دھتکار دیا ہوگا۔ وہ فقیروں سے چڑتا تھا۔ اس نے فقیر کی طرف توجہ بھی نہیں دی ہو گی۔ اس کی یہی غلطی اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہوگی۔ موقع پاتے ہی فقیر نے اس کی گردن میں زہریلا انجکشن گھونپ دیا ہوگا۔ اگر وہ ماہر ہوگا تو اس کام میں اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا ہوگا جیسے سانپ پلک جھپکنے میں کاٹ لیتا ہے۔ اتفاق سے کوئی دیکھ بھی رہا ہوگا تو اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ فقیر





دستِ طلب دراز کر رہا ہے۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ امیر خان کی جان طلب کر رہا ہوگا۔ اس نے اطمینان سے اپنا کام کیا ہوگا اور وہاں سے فرار ہو گیا ہوگا۔

اگلے روز سے میں نے سکول جانا شروع کر دیا۔ ڈرائیور بھی سر کی چوٹ سے صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تھا۔ البتہ امیر خان کبھی نہ آنے والے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ جب میں کار کی طرف آیا تو اس کی خالی جگہ دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ میں کار میں بیٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف کار کا دروازہ کھلا اور ایک گورا چٹا اور کسی قدر دبلا نوجوان کار میں آ گیا۔ اس کا رنگ بے حد صاف تھا۔ بال ہلکے براؤن اور آنکھیں سبزی مائل تھیں۔ اس کی شیو دو دن کی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں، جیسے مصوّروں کی ہوتی ہیں۔

''کون ہو تم؟'' میں چوکنا ہو گیا۔

''تعارف راستے میں ہو جائے گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا پھر بولا۔ ''ڈرائیور چلو۔''

ڈرائیور نے اس کے حکم کی تعمیل میں کار چلا دی، یعنی وہ اسے جانتا تھا۔ اس کے باوجود میں محتاط رہا۔ کار جمشید پیلس سے نکلی تو اس نے ہلکے سے ہنس کر کہا۔ ''ڈرو مت برخوردار، میں تمہارا نیا محافظ ہوں۔ حسن علی، میرا تعلق ایران سے ہے، میری اور تمہاری عمروں میں خاصا فرق ہے مگر تم چاہو تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہم ایک دوسرے کو دوست سمجھیں۔''

''مسٹر حسن۔'' میں نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا سابق محافظ کہاں ہے؟''

''قبرستان میں۔'' حسن علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ یقیناً اچھا محافظ تھا تبھی قبرستان میں ہے ورنہ اس کی جگہ......'' اس نے بات نامکمل چھوڑ دی لیکن میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ یعنی امیر خان کی جگہ میں قبرستان میں ہوتا۔

''اس کے باوجود آپ......''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''برخوردار اصل خطرہ تو تمہیں ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی خطرہ مول لینے کی۔''

''میں نہیں جانتا کہ مجھے کسی سے خطرہ ہے۔''

''تو اسی سے بچنے کے لیے بھاگ جاؤ۔''

''بھاگ جاؤں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن کہاں؟''

''گویا تم خطرہ محسوس کرتے ہوئے بھی نہیں بھاگ سکتے۔ مجبور ہو، ایسی ہی کچھ مجبوریاں ے ساتھ ہیں جن کی وجہ سے میں دوسروں کے خطرات اپنے سر لینے پر مجبور ہوں۔''

''سب سے بڑی مجبوری تو پیسہ ہوتا ہے۔'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''پیسہ بھی ہے، لیکن بعض مجبوریاں اس سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ خیر ابھی تم نہیں سمجھو گے۔

وقت تمہیں خود سمجھا دے گا، فی الوقت تو یہ بتاؤ کہ تمہارے معمولات کیا ہیں۔ چھوٹی سی بات بھی نظر انداز مت کرو بلکہ بہتر ہو گا مجھے اپنے بارے میں سب بتا دو۔''

''کیا پاپا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''

''کون پاپا؟''

''جمشید علی میں انہیں پاپا کہتا ہوں۔''

''نہیں انہوں نے صرف اتنا کہا ہے کہ مجھے ایک لڑکے کی حفاظت کرنی ہے، ہر قیمت پر۔''

''اور وہ لڑکا میں ہوں۔'' نہ جانے کیوں میرے اندر تلخی اُترنے لگی تھی۔ جمشید علی نے اس کے سامنے مجھے صرف ایک لڑکا کہا جیسے کوئی اپنی قیمتی ملکیت کا ذکر کرتا ہے، کوئی نایاب ہیرا، جس کی حفاظت کے لیے انہوں نے ایک تربیت یافتہ محافظ رکھا تھا جو شاید بہت زیادہ مہنگا تھا، میں نے پوچھ لیا۔

''آپ کو کیا معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ میرے لیے آنے والے پیغام اجل کو قبول کرنے کا۔''

''برخوردار......'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ مت پوچھو، آنے والا وقت تمہیں خود بتا دے گا۔''

''آنے والا وقت۔'' میں جھلا گیا تھا۔ ''سب یہی کہتے ہیں، نشانہ میں ہوں اور سب سے زیادہ بے خبر بھی مجھے ہی رکھا جا رہا ہے۔''

وہ میری جھلاہٹ پر مسکرایا۔ ''چلو اگر تمہاری تسلی ہو جاتی ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔ مجھے دس ہزار روپے فی ہفتہ معاوضہ دیا جا رہا ہے لیکن معاوضہ میرے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''اور جب میں آپ سے اہمیت کے بارے میں پوچھوں گا تو آپ فرمائیں گے کہ آنے والا وقت مجھے خود سمجھا دے گا۔''

''چلو ایسا ہی سمجھ لو۔'' وہ ہنسا۔

کار رُک گئی۔ ہم سکول پہنچ گئے تھے۔ پہلے حسن علی اُترا، اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا انداز اس چیتے کا سا تھا جو اپنے شکار کی تلاش میں ہو۔ پھر مطمئن ہو کر اس نے مجھے کار سے اُترنے کا اشارا کیا۔ ''فی الوقت تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے لیے خاص ہدایت یہ ہے کہ چھٹی سے پہلے سکول سے باہر مت آنا۔ یہاں سے کوئی چیز لے کر مت کھانا بلکہ کوشش کرنا کہ گیٹ کے قریب بھی مت آؤ۔''

''ایسا کریں آپ ایک فہرست بنا دیں بلکہ دو فہرستیں بنا دیں ایک ان کاموں کی جو مجھے کرنا ہیں اور دوسرے ان کاموں کی جو مجھے نہیں کرنے۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تھا لیکن وہ ہنس دیا۔

''برخوردار آج پہلا دن ہے اس لیے تمہیں سب معاف ہے۔''





''اور کل سے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے میں تمہارا استاد بن جاؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ ایک اچھا شاگرد کیسے بنتے ہیں۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''خبردار کر رہا ہوں۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''اب جاؤ سکول لگنے والا ہے۔''



تین مہینے بعد میں اور حسن علی ساحل سمندر پر تھے۔ سورج نکلنے میں کچھ دیر باقی تھی، میرا بازو کا پلاستر اُتر چکا تھا اور میری تمام ہڈیاں بالکل درست طور پر جڑ چکی تھیں۔ پچھلے تین مہینے کے دوران میں حسن علی نے مجھے سچ مچ اپنا فرمانبردار شاگرد بنا لیا تھا۔ اس نے واضح کیا تھا کہ مجھے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہے چوں چرا کیے بغیر۔ ساتھ ہی میں اس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کے لیے آزاد تھا۔ اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی اور میرے جسم پر صرف ایک نیکر اور بنیان تھی۔ حسن علی بھی اسی کاسٹیوم میں تھا اور موسم سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سردی اس پر بے اثر تھی، میں ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ صبح سویرے کسی کو گرم بستر سے نکال کر گھر سے باہر کھڑا کر دیا جائے تو اس موسم میں اس کا کیا حال ہو گا۔ اس کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی یخ بستہ ہوائیں مجھے لرزنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میں اپنی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسن علی نے افسوس ناک انداز میں میری طرف دیکھا۔

''یوسف! اس وقت تم چوہے لگ رہے ہو حالانکہ اتنی سردی میں چوہے بھی نہیں کانپتے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ چوہوں کے پاس موٹی کھال ہوتی ہے۔'' میں نے چھینک مار کر کہا۔ ''اور پھر ان کا استاد حسن نہیں ہوتا۔''

وہ ہنس دیا۔ ''خیر ابھی تم تھوڑی دیر میں سردی وغیرہ کو بھول جاؤ گے۔ اتنا بتاؤ کہ مارشل آرٹ اور سیلف ڈیفنس کی تکنیکوں میں سب سے زیادہ اہمیت کس جسمانی خصوصیت کی ہوتی ہے؟''

''اسٹیمنا کی۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''گڈ، تم نے ٹھیک جواب دیا۔ اسٹیمنا بنانے اور بڑھانے کے لیے دوڑنے سے زیادہ اچھی چیز کوئی نہیں ہوتی لہٰذا آج سے ہم باقاعدہ ٹریننگ کا آغاز دو میل کی جاگنگ سے کریں گے۔''

''دو میل۔'' میری جان نکل گئی۔ ''میں ہرگز اتنا دوڑ نہیں سکتا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن آغاز تو کرنا ہے، آج یہ دیکھتے ہیں کہ تم کتنی دور تک بغیر رُکے دوڑ سکتے ہو۔''

مجھے معلوم تھا کہ انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''کس طرف جانا ہے۔''

"مشرق کی طرف۔" حسن علی نے کہا۔ "ریڈی، ون ٹو تھری......"

میں دوڑ پڑا۔ حسن علی نے کہا کہ میں پہلے آہستہ دوڑوں، سُست روی سے، اس سے سانس بنتی ہے اور واپسی میں ایسے آؤں جیسے میرے پیچھے کوئی آدم خور شیر ہو۔ ساحل کی نرم ریت پر دوڑنا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا تھا۔ صرف سو گز بعد میری سانس پھول گئی تھی۔ ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں اور تھکن سے بُرا حال ہو گیا تھا۔ کوئی چار سو گز کے بعد میں گر پڑا۔

حسن علی میرے ساتھ ہی تھا، اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"چچ...... چچ، کس قدر نکما شاگرد ملا ہے۔" اس کا سانس قطعی ہموار تھا جیسے وہ اب تک چہل قدمی کرتا رہا تھا۔

اس کی ایک بات سچ نکلی تھی۔ اب مجھے سردی کا قطعی احساس نہیں تھا۔ میں منہ کھولے زیادہ سے زیادہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانس درست ہوتے ہی ہم آگے روانہ ہو گئے۔ اس سفر کے دوران میں مجموعی طور پر پانچ بار گرا تھا اور جب ہم واپس آئے تو میری حالت خراب تھی اور یہ سوچ کر مزید خراب ہو رہی تھی کہ اگلے روز اور پھر اس اگلے روز مجھے ساحل پر دوڑ لگانی پڑے گی، پورے دو میل تک۔

میں اس دوڑ کو ہی مصیبت سمجھ رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ابھی مشق کے امتحان اور بھی تھے۔ چھ ماہ تک جاگنگ اور ورزش سے میرا اسٹیمنا بہت بہتر ہو گیا تھا۔ اب میں زیادہ تھکے اور رُکے بغیر دو میل کی دوڑ مکمل کر سکتا تھا۔ ایک روز اچانک حسن علی نے مجھے جمشید پیلس کے جمنازیم میں طلب کر لیا۔ جدید ترین مشینوں سے آراستہ یہ جمنازیم پیلس کے تہ خانے میں تھا۔ میں یہاں حسن علی کی زیرِ نگرانی مختلف اقسام کی ورزشیں کیا کرتا تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ معمول کے لباس میں تھا۔

"کیا کر رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"آرام۔" میں نے کہا۔ "صبح کی ایکسرسائز کے بعد تو مجھ میں ہل کر پانی پینے کی سکت بھی نہیں ہوتی۔"

"گڈ...... گویا میں نے تمہیں ٹھیک وقت پر طلب کیا۔" وہ خوش ہوا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھ پر کوئی نئی مصیبت نازل ہونے والی تھی۔ گزشتہ نو مہینے کے دوران اس کے ساتھ رہ کر میں اس کی عادات اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "فرض کرو کہ کوئی اچانک تم پر حملہ کرے تو تم کیا کرو گے؟"

"کس نوعیت کا حملہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایک شخص جو لڑائی بھڑائی کے عام طریقوں سے تم پر حملہ کرے۔"

"ممکنہ حد تک اس کا مقابلہ کروں گا اور ممکن ہوا تو اسے حملہ کرنے کا مزہ بھی چکھا دوں گا۔"





"بہت خوب۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اب فرض کرو کہ وہ شخص میں ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے مکا جما کر میرے جبڑے پر رسید کیا۔ اس نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا لیکن میں بے خبری کی وجہ سے زمین پر جا گرا۔ ایک لمحے کو تو میری آنکھوں تلے اندھیرا بھی چھا گیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر تھوکا تو تھوک میں خون بھی شامل تھا۔ میں نے برہمی سے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"احمق آدمی، گھونسا کھا کر بھی عقل نہیں آئی۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے اچانک ٹانگ چلائی اور میں پھر زمین بوس ہو گیا۔ وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ "تم سمجھو کہ میں تمہارا دشمن ہوں لیکن جانی دشمن نہیں ہوں، صرف مار پیٹ کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہوں۔ کم آن گیٹ اپ۔"

"میں گیٹ ڈاؤن ہی بھلا۔" میں نے کمر دبائی جہاں لات لگی تھی۔

"چلو اگر تم صرف مار ہی کھانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ آخر آدمی کو مار کھانے کا تجربہ بھی ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ یوں اچھلا جیسے میرے منہ پر ٹھوکر مارنے والا ہو۔ میں بے اختیار پلٹ گیا لیکن اس نے کِک نہیں ماری۔ وہ ہنسا۔

"چلو تم نے اپنی حفاظت تو شروع کی۔" اور ساتھ ہی میری کمر پر ٹھوکر ماری۔ میں بیلن کی طرح لڑھکتا دور تک گیا اور پھر اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس ٹھوکر نے میرا دماغ گھما دیا تھا۔ میں اندھا دھند اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ نتیجے میں اس کے دو گھونسے کھائے پھر گھٹنے پر ایک ٹھوکر وصول کی۔ وہ غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ہی اناڑیوں کی طرح ہاتھ پیر چلائے تھے۔

"لڑائی کا پہلا اصول یہ ہے۔" اس نے میرے کولہے پر ٹھوکر رسید کی۔ "اپنے دماغ کو فریج کی طرح ٹھنڈا رکھو ورنہ کوئی چیونٹی بھی تمہیں شکست دے دے گی۔"

"چیونٹی کی تو خیر ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "تمہارا جرم ہے جرمِ ضعیفی، جس کی سزا ہے مرگِ مفاجات۔"

اس نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر حملہ کیا مگر اس دفع میں بچ نکلا اور جوابی کارروائی کے طور پر کک ماری مگر اناڑی پن سے ماری گئی یہ لات ہوا میں گھوم کر رہ گئی۔ اس نے آرام سے میری دوسری ٹانگ پر لات ماری اور میں جو مرغے کی طرح ایک ہی ٹانگ پر کھڑا تھا۔ دھماکے سے زمین بوس ہو گیا، میرا سر خاصے زور سے فرش سے ٹکرایا تھا اور میری آنکھوں تلے تاریکی سی چھا گئی تھی۔ نصف گھنٹے میں مار کھا کھا کر میرا بُرا حال ہو گیا تھا۔ منہ ناک سے خون جاری تھا، دائیں آنکھ سوج جانے کی وجہ سے تقریباً بند ہو گئی تھی اور اب میں دنیا کو ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ پورا جسم اس طرح دُکھ رہا تھا جیسے مجھے کنکریٹ مکسچر میں ڈال کر گھمایا جا رہا ہو۔

حسن علی نے صرف یہ خیال رکھا تھا کہ مجھے کوئی مہلک چوٹ نہ آئے، باقی اس نے دل کھول کر میری مرمت کی تھی۔ اس نے شروع میں مجھے پیش کش کی تھی کہ میں چاہوں تو زمین پر گر کر شکست تسلیم کر سکتا ہوں۔ غالباً اس نے میری انا کو اُبھارنے کی کوشش کی تھی جو کامیاب رہی تھی مار کھا کھا کر بے حال ہونے کے باوجود میں گر گر کر دوبارہ کھڑا ہوتا رہا تھا لیکن ایک بار میں گرا تو مجھ میں کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ غنیمت تھا کہ میں بے ہوش نہیں ہوا حالانکہ مارے درد کے میں فوراً بے ہوش ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے میں نے کاجل کی چیخ سنی۔ وہ تہ خانے میں آ گئی تھی۔ چیخ اس نے میری حالت دیکھ کر ماری تھی۔ وہ مجھ سے آ کر لپٹ گئی۔

''یوسف تمہیں کس نے مارا ہے۔''

میں نے دیکھنے کے لیے دستیاب واحد آنکھ کھول کر اسے دیکھا اور بے ہوش ہو گیا۔ حسن علی آرام سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کاجل کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ میری اس حالت کا ذمے دار وہی تھا۔ مجھے بے ہوش ہوتے دیکھ کر کاجل نے دوسری چیخ ماری اور حسن علی کی طرف لپکی۔ اس نے دیوانہ وار اسے لاتیں ماریں، نوچا کھسوٹا اور ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ وہ بہ مشکل اسے قابو کر سکا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کے ساتھ میرے جیسا سلوک تو نہیں کر سکتا تھا، ایک تو وہ بچی تھی، دوسرے جمشید علی کی اکلوتی بیٹی تھی جو اس کا باس تھا۔ کاجل کو قابو کرنا کسی بپھری ہوئی شیرنی کو قابو کرنے کے برابر تھا۔ غصے میں اس کے نازک سے جسم میں بے پناہ طاقت آ جاتی تھی۔ اس کے لمبے ناخنوں نے حسن علی کے جسم پر متعدد خراشیں ڈالی تھیں اور اس کی ایک انگلی کاجل نے چبا ڈالی تھی لہٰذا جو ڈاکٹر میری مرہم پٹی کے لیے آیا تھا، اسے حسن علی کی مرہم پٹی کرنا پڑی تھی بلکہ اسے وہ انجکشن بھی لگوانا پڑا تھا جو کتے کے کاٹنے کی صورت میں لگوانا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر گوشت خور جانور کے دانتوں میں اس مرض کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو اپنے کمرے میں پایا تھا۔ حسبِ توقع ماہ پارہ اور کاجل میرے سرہانے موجود تھیں۔ ماہ پارہ غصے میں تھیں لیکن کاجل پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ ماہ پارہ سے حسن علی کی شکایت کرتے ہوئے یہ طویل نظم دوہرا رہی تھی جس کے ہر بند کا اختتام ایک ہی مصرع پر ہوتا تھا۔ ''میں اس گندے آدمی کو مار ڈالوں گی۔''

ماہ پارہ اسے رام کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ ''میری جان وہ یوسف کا استاد ہے، اسے لڑنے کی تربیت دے رہا ہے۔''

''یہ کیسی تربیت ہے۔'' کاجل رونے والے لہجے میں بولی۔ ''دیکھئے تو اس کا کیا حال کر دیا ہے۔''

''یوسف مرد ہے اور مرد زخم کھایا ہی کرتے ہیں۔ انہیں نازک مزاج نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی، اگر آئندہ اس نے یوسف پر ہاتھ اٹھایا تو میں ڈیڈی کا ریوالور لے کر





اسے شوٹ کر دوں گی۔''

''اُف میرے خدا۔'' ماہ پارہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اسے تمہارے ڈیڈی نے ہی یوسف کی تربیت پر مقرر کیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے، اسے ڈیڈی کے کہنے پر مارا گیا ہے۔'' کاجل نے میری طرف دیکھا تو میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔

''اور کیا، ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ یوسف پر ہاتھ اٹھاتا۔ یہ جمشید علی کی خواہش تھی کہ یوسف ایک سخت جان شخص بنے اور کوئی شخص مار کھائے بغیر سخت جان نہیں بن سکتا۔'' ماہ پارہ رفتہ رفتہ اس کا غصہ ٹھنڈا کر رہی تھیں۔

''یوسف ٹھیک ہو گا تو میں اسے کہوں گی کہ اسے خوب مارے، جتنا اس نے یوسف کو مارا ہے۔''

میں نے جان بوجھ کر آنکھیں نہیں کھولی تھیں ورنہ وہ آفت کی پرکالہ میرا سر بھی کھانے لگتی اور میرے سر میں ویسے ہی درد ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیچے سے اس کا بلاوا آ گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے ہوش میں آنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں پھر ساکت ہو گیا۔ سوچ کر کہ کاجل واپس آ گئی ہے لیکن خلافِ توقع حسن علی کی آواز آئی تھی۔ وہ ماہ پارہ سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''اس کا یہ حال بنا کر مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' ماہ پارہ نے طنز آمیز غصے سے کہا۔

''تربیت میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔'' حسن علی نے بے پروائی سے کہا۔

''یہ تربیت ہے۔'' ماہ پارہ بھڑک اٹھی تھیں۔ ''تم نے اسے کتنی بے دردی سے مارا ہے، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بن ماں باپ کا یہ بچہ مجھے کتنا عزیز ہے۔ میری اپنی اولاد ہوتی تو میں اسے بھی یوسف سے زیادہ نہیں چاہ سکتی تھی۔''

''سوری، تمہارا دل دُکھا۔'' حسن علی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''اب میں سوچ رہا ہوں کہ اسے لے کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں، یہاں تم سب اس کی تربیت میں حارج ہو رہے ہو۔''

''حسن، تم پہلے تو اتنے سنگ دل نہیں تھے۔'' ماہ پارہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ میں ٹھٹک رہ گیا تھا، کیا ماہ پارہ اور حسن علی پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار شبہ ہوا تھا لیکن اسے ہمیشہ میں نے اپنا وہم سمجھا تھا مگر اب یہ شبہ سچ بن گیا تھا۔ دونوں کا تعلق ایران سے تھا اور عین ممکن تھا کہ ان میں پرانی واقفیت ہو۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید۔'' حسن علی نے کس قدر بدلے لہجے میں کہا۔ ''کبھی میں بھی نرم دل ہوا کرتا تھا۔ مجھے حُسن اور پھول متاثر کرتے تھے۔ زندگی کی تابانیاں اور رنگینیاں مجھے اپنی طرف کھینچا کرتی تھیں لیکن یہ اس وقت تک تھا جب میرا گھر اور گھر والے سلامت ور[illegible]''

''تو کیا وہ بھی......''

حسن علی نے ان کی بات کاٹی۔''ہاں......وہ بھی ان لوگوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے جو شاہ سے تعلق رکھنے والے کتے کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ تمہیں تو جمشید علی نکال کر لے گیا تھا کیونکہ تم اس کے دوست کی بیٹی تھیں، میں ان دنوں ترکی میں تھا اور گھر والے تہران میں پھنس گئے تھے۔''

''تو چچا رضا اور باقی سب......'' آواز ماہ پارہ کے حلق میں پھنسنے لگی۔

''صرف میرے گھر والے نہیں بلکہ ڈاکٹر فاخر کی فیملی بھی ہماری کوٹھی میں تھی۔ وہی ڈاکٹر فاخر جو کبھی شاہی خاندان کے معالجوں میں شامل ہوا کرتے تھے اور ان دنوں ایک نواحی بستی میں غریبوں کے لیے مفت کلینک چلا رہے تھے۔'' حسن علی کی آواز تلخ ہونے لگی تھی۔ ''حملہ آوروں نے کسی کو نہیں بخشا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ میرے دو بھائی جان بچانے کے لیے پانی کے ٹینک میں چھپ گئے تھے، ظالموں نے اوپر سے ڈھکن پر پلاسٹر کر دیا تھا۔ ذرا سوچو ماہ پارہ وہ کتنی اذیت سے تڑپ تڑپ کر مرے ہوں گے۔ ہمارا جرم صرف اتنا تھا کہ شاہ نے میرے باپ کی کمپنی میں کچھ سرمایہ لگایا تھا۔ میرے باپ کے اس جرم میں میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔''

''بس کرو، خدا کے لیے۔'' ماہ پارہ رو دی تھیں۔ ''مجھ میں اور سننے کی تاب نہیں ہے۔''

حسن علی تلخی سے ہنسا۔ ''تم صرف سن کر رو دیں۔ ذرا ان کا سوچو جن پر یہ گزری ہے، ہماری کمپنی کا جنرل منیجر کسی طرح بچ کر ترکی پہنچنے میں کامیاب رہا تھا اس سے مجھے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا تھا۔ میرے ایران جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، میں جاتا بھی کس کے لیے، وہاں میرے تمام پیارے خاک ہو چکے تھے اور تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں انتقام بھی کس سے لیتا، کیا ایک پوری حکومت سے؟ انقلاب تو یونہی خون رنگ ہوا کرتے ہیں، انسان وحشتوں کے دور کا حساب کس سے لے۔''

میں پہلے سے زیادہ دم بہ خود رہ گیا تھا اور خاصی دیر تک میں نے سانس ہی نہیں لی تھی اور جب زور سے سانس لی تو وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ماہ پارہ جھینپ کر اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔

''استادِ محترم۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''آپ تو چھپے رستم نکلے۔ غالباً رستم بھی ایرانی تھا۔''

حسن علی ہنسا۔ ''برخودار! تم ذرا ٹھیک ہو جاؤ پھر میں تمہیں ایران کی پوری ہسٹری سمجھاؤں گا۔''

''خبردار جو تم نے اب اسے ہاتھ بھی لگایا۔'' ماہ پارہ نے اسے ڈانٹا۔

''صرف پیروں سے مرمت کروں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا، ماہ پارہ ہنس دی تھیں۔

مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ ان دونوں کے درمیان پسندیدگی کا پرانا تعلق تھا اور وہ اس





تعلق کو اب تک کس وجہ سے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان خاندانی تعلق بھی تھا اور دونوں ہی ستم رسیدہ بھی تھے۔ ان کے گھر والے ایک وقتی وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ میں پانچ سال کا تھا جب ماہ پارہ جمشید پیلس میں آئی تھیں یہ ایرانی انقلاب کے فوراً بعد کی بات تھی۔ ماہ پارہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھیں ان کی ماں بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں اور ان کے باپ ڈاکٹر علی رضا نے انہیں باپ کے ساتھ ماں بن کر بھی پالا تھا۔ وہ تہران کے سب سے بڑے ہسپتال میں میڈیکل چیف تھے اور اسی بنا پر ان کے شاہی خاندان سے روابط تھے۔ یہی روابط ان کی بدقسمتی کا باعث بن گئے تھے۔ انقلاب سے پہلے جب شاہ سے تعلق رکھنے والے اکثر افراد ملک سے فرار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر علی رضا بدستور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انقلابی انہیں ان کے دفتر سے گرفتار کر کے لے گئے تھے اور وہ دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ جمشید علی، ڈاکٹر علی رضا کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اس وقت ماہ پارہ تہران یونیورسٹی کی طالبہ تھیں اور کوئی ان کا پُرسان حال نہیں رہا تھا۔ اس کڑے وقت میں اپنوں نے بھی نگاہیں پھیر لی تھیں۔ وہ باپ کے بغیر ملک سے جانے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن جمشید علی نے بالآخر انہیں قائل کر لیا اور وہ انہیں کراچی لے آئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ زہرہ بیگم، ماہ پارہ کی موجودگی کو کسی صورت برداشت نہ کر پاتیں۔ وہ پہلے ہی جمشید علی کے بارے میں مشکوک رہا کرتی تھیں۔ اس مسئلے کا حل جمشید علی نے یہ نکالا کہ ماہ پارہ کو میری گورنس بنا دیا۔ وہ بھی حالات سے مجبور تھیں ورنہ ان جیسی حسین، پُرکشش اور اعلیٰ خاندان عورت کبھی بھی گورنس بننے پر راضی نہ ہوتی۔ بعد میں وہ سچ مچ مجھے اپنی ذمے داری سمجھ کر میری پرورش اور تربیت کرنے لگی تھیں۔

ایک ہفتے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ حسن علی نے اپنی دھمکی پر عمل نہیں کیا، شاید اس لیے بھی کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے پر سکول کھل گئے تھے۔ اب میں اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ چھ، سات دن بستر پر پڑا رہتا۔ البتہ صبح و شام والی ایکسرسائز جاری تھیں۔ صبح فزیکل تربیت ہوتی اور شام کو سیلف ڈیفنس کی کلاس ہوتی تھی۔ کبھی پیلس کے لان پر اور کبھی ساحلِ سمندر

ماہ پارہ کی کوشش ہوتی تھی کہ سیلف ڈیفنس کی کلاس کے موقع پر وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ حسن علی پھر میری مرمت نہ لگا دے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی، ماہ پارہ اور حسن علی اس موقع کو ملاقات کا ذریعہ بنا لیتے تھے ورنہ دیگر اوقات میں ان کا ملنا جلنا دوسروں کو مشکوک کر سکتا تھا۔ خاص طور سے جب ہم ساحل پر جاتے تھے تو ماہ پارہ ضرور ہمارے ساتھ ہوتی تھیں۔ حسن علی مجھے مشقوں میں لگا کر خود ماہ پارہ سے باتوں میں لگ جاتا تھا اور ظاہر ہے یہ گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی کہ میرا نہ سننا ہی بہتر ہوتا تھا لہٰذا میں جان بوجھ کر ان سے دور نکل جاتا تھا۔

اس روز بھی ماہ پارہ ہمارے ساتھ آئی تھی۔ میں سوئپ کِک کی مشق کر رہا تھا جب میں نے

محسوس کیا کہ ان دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ماہ پارہ کے تاثرات غصے والے تھے البتہ حسن علی کا چہرہ حسبِ معمول سپاٹ تھا۔ سوائے آنکھوں کی ہلکی سی سرخی کے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شاید ماہ پارہ کو کسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے نفی میں ہلتے سر سے ہو رہا تھا۔ اچانک حسن علی نے فضا میں گھونسا چلایا اور پلٹ کر دور جانے لگا۔ ماہ پارہ ریت کو ٹھوکروں سے اُڑاتی میری طرف آنے لگیں۔

''جھگڑا ہو گیا پھر۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں۔'' وہ صاف مکر گئیں۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''کہا تو کسی نے نہیں لیکن بندہ کم عمر ہونے کے باوجود سر میں دماغ اور دماغ میں عقل رکھتا ہے۔ غالباً استادِ محترم آپ کو نکل چلنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔''

''تمہیں کیسے؟'' وہ یک دم خاموش ہو گئیں۔ بات واضح تھی، میرا اندازہ سچ نکلا تھا۔ میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''آپ کیوں انکار کر رہی ہیں، میری وجہ سے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... ایک وجہ یہ بھی ہے اور پھر ہم جمشید علی سے کہیں چھپ نہیں سکتے۔''

''آپ نے پاپا کو اتنا ہوا کیوں بنا رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیں گے، معذرت کے ساتھ۔ آپ کا مجھ سے کتنا ہی قریبی تعلق سہی لیکن دنیا کی نظروں میں آپ میری گورنس ہی ہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''تم ابھی جمشید علی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''تو آپ بتا دیں۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

''میں بھی نہیں سمجھا سکتی۔'' وہ بولیں۔ ''یہ بات تم خود جان جاؤ گے وقت کے ساتھ۔''

میں نے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مجھے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کھلی جیپ تھی، جس کے فٹ بھر چوڑے ٹائر اسے ساحل کی نرم ریت پر بھی یوں دوڑا سکتے تھے جیسے پکی سڑک پر۔ اس کے پچھلے حصے سے تین افراد اُترے، جنہوں نے اپنے منہ پر رومال باندھ رکھے تھے۔ چوتھا نقاب پوش ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، جیپ سے اُترنے والے ہماری طرف لپکے۔ ان کے عزائم بھانپ کر ماہ پارہ مخالف سمت میں بھاگیں، ساتھ ہی انہوں نے چلا کر مجھے بھی بھاگنے کو کہا لیکن خود دو قدم بھاگنے کے بعد اپنے ہی شلوار کے پائنچے میں پھنس کر گر پڑیں۔ ان دنوں چوڑے پائنچوں کا فیشن تھا جو ان کے حق میں بُرا ثابت ہوا تھا۔ ایک رومال پوش نے با آسانی ان کے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر انہیں بے بس کر دیا تھا۔ باقی دو میں سے ایک





مجھ پر جھپٹا، جیسے چیل، چوزے کی طرف جھپٹتی ہے۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا، جیسے ڈر گیا تھا اور زمین پر بیٹھتے ہوئے سوئپ کِک لگائی جس کی کچھ دیر پہلے مشق کر رہا تھا۔ ایک تو رومال پوش کو پندرہ سولہ سال کے لڑکے سے اس مشاقی کی توقع نہیں تھی، دوسرے کِک نے بڑی عمدگی سے کام کیا تھا۔ وہ جس طرح گرا تھا، اگر پختہ فرش ہوتا تو اس کی ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میری بدقسمتی کہ وہ نرم ریت پر گرا اور اس نے لیٹے لیٹے اپنی ستون نما ٹانگ گھما کر مجھے ماری اور میں زمین بوس ہو گیا۔ تیسرا جو ریوالور سنبھالے کھڑا تھا، زور سے ہنسا۔

''گیا سالا......''

''سامنے کی اولاد، اپنا منہ بند کر۔'' گرنے والا اٹھتے ہوئے بولا۔

اس کا خیال تھا کہ اب میں شرافت سے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں گا تو اس کا یہ خیال غلط ثابت کرتے ہوئے میں نے اس کی رانوں کے درمیان پاؤں مارا۔ اس کا منہ یوں کھل گیا جیسے اچانک فضا میں یک لخت ہوا کی کمی ہو گئی ہو۔ ریوالور والا پھر ہنسا تو اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ اُبلا تھا۔ اکثر حصے دار ریوالور والا تھا، البتہ کچھ گالیاں میرے حصے میں آئی تھیں۔ پھر اس نے میری ٹانگ پکڑ کر یوں مروڑی کہ میں کمر کے بل اُلٹا ہو گیا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا اگر اٹھنے کی کوشش کرتا تو میری ریڑھ کی ہڈی یا ٹانگ میں سے کوئی ایک چیز ضرور ٹوٹ جاتی، ابھی میں اس سے بچنے کی فکر میں تھا کہ اس نے اپنے بھاری جوتے سے میرے سر پر ضرب لگائی۔ محاورے سے قطع نظر مجھے سچ مچ دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ اس کیفیت میں مجھے ماہ پارہ کی چیخ سنائی دی۔ میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی اور اس بدمعاش کی مشکل آسان کر دی جو مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں کھڑا ہوا، اس نے مجھے اٹھا کر جیپ کے فرش پر پھینک دیا۔ فوراً ہی میرے اوپر ماہ پارہ گری تھیں۔ اس دوران میں میری آنکھوں کے سامنے دنیا ایک بار پھر روشن ہو چکی تھی۔ میں نے ماہ پارہ کے نیچے سے سر نکالا تو مجھے حسن علی جیپ کی طرف آتا نظر آیا۔ اس وقت وہ بلاشبہ اُڑ رہا تھا۔ ابھی وہ دس بارہ گز دور تھا کہ جیپ دھچکے سے سٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

سورج غروب ہونے والا تھا، اس سے وجہ ساحل پر لوگ نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور جو تھے وہ حیرت اور خاموشی سے اغوا کے اس سنسنی خیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاید بدمعاش ماہ پارہ کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے جب کہ میں جانتا تھا کہ بدمعاش مجھے اٹھانے آئے تھے۔ ماہ پارہ انہیں بونس میں مل گئی تھیں۔ لوگوں نے ڈراموں اور فلموں میں اس قسم کے ڈرامے دیکھے ہوں گے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا منظر پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ بہر حال کسی نے مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ بدمعاش مسلح تھے اور دخل در معقولات کا انعام ایک گولی کی صورت میں ملنے کا پورا امکان تھا لہٰذا کسی نے دخل نہیں دیا۔ جو زیادہ عقل مند تھے وہ فوراً نو دو گیارہ ہو گئے تا کہ بعد میں عدالت اور تھانے کے چکروں سے بچے رہیں۔

حسن علی ذرا آگے نکل گیا تھا لہٰذا جب اس نے ماہ پارہ کی چیخ سنی تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی جیپ چل چکی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور پوری قوت سے جیپ کے پیچھے دوڑتا رہا۔ بدقسمتی سے وُہ غیر مسلح تھا ورنہ اس کا نشانہ اتنا اچھا تھا کہ وہ جیپ کا ٹائر پھاڑ کر بدمعاشوں کو رُکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میں اپنے اوپر پڑی ماہ پارہ کے نیچے سے سب دیکھ رہا تھا۔ اٹھنے سے یوں قاصر تھا کہ ایک خبیث نے میری کمر پر پاؤں رکھا تھا تو دوسرے نے ٹانگ پر اور سر پر ماہ پارہ پڑی ہوئی تھیں۔ میں قطعی بے دست و پا تھا۔ وہ شاید فلمی ولنوں کی طرح میری بے بسی پر قہقہے لگا رہے تھے لیکن نہیں، وہ حسن علی پر قہقہے لگا رہے تھے جو کسی فلمی ہیرو کی طرح اپنی ہیروئن کو بچانے کے لیے ایک طاقتور جیپ سے ریس لگا رہا تھا۔

وہ لوگ حسن علی سے پوری طرح لطف لے رہے تھے۔ شاید اس وجہ سے انہوں نے نہ تو جیپ کی رفتار بڑھائی اور نہ ہی حسن علی کو گولی ماری۔ حسن علی خاصا قریب آ گیا تھا۔ اچانک اس نے ہوا میں لمبی جست لگائی اور زمین پر گرتے گرتے جیپ کا پچھلا جنگلا اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔

''یہ...... تو کتے کی طرح چمٹ گیا ہے۔'' کسی نے گالی دے کر کہا۔ ''اوئے گولی مارا سے۔''

''ٹھہرو۔'' دوسرے نے کہا۔ ''ذرا دیکھنے دو یہ کب تک لٹکا رہے گا۔''

''استاد تماشہ بن رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس پیچھے لگ جائے۔'' پہلے والے نے کہا۔

اب جیپ ساحل کے نسبتاً ویران حصے کی طرف جا رہی تھی مگر یہاں بھی لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے اور جیپ کے پیچھے گھسٹتا آدمی ایسا منظر نہیں تھا جسے لوگ نظر انداز کر دیتے۔ یہ بات استاد کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے حسن علی کو گولی مارنے کا فیصلہ کیا۔ گولی چلنے کی آواز سنتے ہی میرا دل رُک گیا تھا۔



''شدید دھند میں پار جانے کا راستہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کاجل کے پاس جانا چاہتا تھا جو کھائی کے دوسری طرف تھی۔ درمیان میں گہرا نالہ تھا۔ اس پر سے ایک سالخوردہ سا جھولتا پل گزرتا تھا۔ کاجل دوسری طرف کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بے پناہ لمبے اور گھنے بال گھٹا کی طرح اس کے چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ میں کتنے عرصے بعد اسے دیکھ رہا تھا اور اب میں اس سے ایک لمحے بھی دور نہیں رہ سکتا تھا۔

''کاجل میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''یوسف آ جاؤ۔'' کاجل بولی۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''لیکن کیسے آؤں؟'' میں نے گہری کھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''چاہنے والے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔''

میں نے دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھا۔ بالآخر مجھے یہ جھولتا پل نظر آ گیا تھا۔ اس کی حالت نہایت





خستہ تھی لیکن کاجل تک جانے کے لیے میں پل صراط سے بھی گزرنے کو تیار تھا۔ میں نے پل پر قدم رکھا تو رسوں سے ٹکے اس کے سالخوردہ تختے چرچرانے لگے تھے۔ اسی لمحے تیز ہوا چلنے لگی اور پل ڈولنے لگا۔ میں نے بہ مشکل اسے تھام کر خود کو گرنے سے بچایا، نیچے گہرائی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا لیکن ہر قدم پر ٹوٹے تختوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کی شدت میں اضافے سے پل نے بُری طرح جھولنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سامنے کاجل کی طرف دیکھا، وہ میری منتظر کھڑی تھی۔ اچانک دھند کی شدت میں اضافہ ہونے لگا اور کاجل میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''کاجل۔'' میں نے چلا کر کہا اور بے تابی سے قدم آگے بڑھائے۔ اگلے ہی لمحے میں تاریک خلا میں گر رہا تھا۔

یک دم میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، تو یہ سب خواب تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ معاً مجھے کوئی اجنبی سا احساس ہوا، جیسے کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔ کیبن آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا لیکن کوئی آواز نہیں تھی۔ ہاں آواز...... انجن کی آواز کیوں نہیں آ رہی تھی۔ بحری جہاز کا انجن روکنے کا مجاز نہیں تھا، افراد نہ کوئی کارکن، حتیٰ کہ کپتان کو بھی انجن بند کروانا ہوتا ہے تو چیف انجینئر سے ہی کہتا ہے اس کے باوجود خلیج کا انجن رُکا ہوا تھا۔

ایک بحری جہاز کا انجن اس کے دل کی طرح ہوتا ہے، یہ چلتا ہے تو جہاز چلتا ہے اور جب یہ رُک جاتا ہے تو جہاز بھی مُردہ ہو جاتا ہے۔ انجن ہی جنریٹر کی مدد سے جہاز کی ضرورت کی بجلی فراہم کرتا ہے۔ جہاز کے بہت سارے کل پُرزوں کو اسی کی مدد سے ہائیڈرولک پاور مہیا کی جاتی ہے۔

میں بستر پر لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انجن کیوں بند ہے۔ اگر اسے کسی خرابی کی وجہ سے بند کیا گیا ہے تو مجھے کیوں نہیں خبر دی گئی۔ اگر کوئی حادثہ ہو گیا تھا تو الارم کیوں نہیں بجایا گیا۔ سب سے بڑھ کر اتنا غیر معمولی سکوت کیوں طاری تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی بات ہو چکی تھی۔

بستر پر پڑے ہوئے میں اصل حالات نہیں جان سکتا تھا لہٰذا میں نے اٹھ کر یونیفارم پہنی اور باہر گیلری میں نکل آیا۔ کپتان صلاح الدین کے کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا اور دم بخود رہ گیا۔ پُر آسائش اور عالیشان کمرا اس وقت ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے یہاں کوئی طوفان آ کر گزر گیا ہو۔ کیونکہ میرا کیبن گیلری کے سرے پر تھا۔ اس لیے یہاں ہونے والے ہنگامے کی آوازیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ جہاز پر کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے جا کر اپنے کیبن سے اپنا پستول لیا اور تیزی سے کپتان برج کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں راہداریوں اور سیڑھیوں پر ایک فرد بھی نہیں ملا تھا۔ حالانکہ دن ہو یا رات، جہاز میں چہل پہل رہتی ہے مگر اس طویل راستے میں نہ تو کوئی فرد ملا اور نہ ہی کوئی آواز آئی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں اس وقت جہاز پر اکیلا ہوں۔ باقی سب کسی وجہ سے جہاز چھوڑ گئے تھے۔ میں

نے اس احمقانہ خیال پر خود کو ڈانٹا۔ جہاز چھوڑ کر کہاں جائیں گے، کھلے سمندر میں؟ گڑ بڑ ہونے کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں تقریباً بھاگتے ہوئے کپتان برج میں داخل ہوا۔ وہ بھی خالی پڑا تھا، ایسی تجوری کی طرح کہ چور جس کی صفائی کر گئے ہوں۔ کپتان سمیت عملے کا کوئی فرد وہاں نہیں تھا حتیٰ کہ جہاز کا اسٹیئرنگ وہیل سنبھالنے والا بھی غائب تھا جس کا اپنی ڈیوٹی سے ہٹنا سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا، میں نے جھپٹ کر انٹر کام اٹھایا لیکن وہ بھی بے جان تھا۔ میں نے اسے واپس پٹخ دیا۔

"مجھے عرشے پر جانا چاہیے۔" کسی نے میرے اندر کہا تو میں کپتان برج سے نکل کر عرشے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھلی فضا میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ فضا اور سمندر بالکل پُرسکون تھے۔ کچھ گھنٹے پہلے جاری طوفان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تاروں کی ہلکی روشنی میں سمندر دور تک ہموار نظر آ رہا تھا۔ بائیں درمیانی عرشے کو عبور کرتے ہوئے میری نگاہ سمندر کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں ایک کشتی موجود تھی، بلکہ کشتی کیا اچھا بھلا بحری جہاز تھا مگر خلیج کے مقابلے میں کشتی ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی روشنیاں بند تھیں لیکن خلیج کی روشنیوں میں اس کے عرشے پر حرکت کرتے سائے نظر آ رہے تھے۔

اچانک میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے گھوما اور پھر اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے سامنے ہی جان گرے کھڑا تھا، وہی جان گرے جسے بیس گھنٹے پہلے ہم نے بمبئی میں چھوڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عدد رائفل تھی اور چہرے پر مخصوص خبیثانہ مسکراہٹ، وہ رائفل میری طرف اُٹھانے لگا تھا۔ خطرہ سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم۔" میرے منہ سے نکلا تھا۔

جان گرے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے رائفل میری طرف تان لی تھی لیکن اس کا گولی چلانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ناں؟"

میں نے خود کو سنبھال لیا۔ سرسری سے انداز میں بولا۔ "ہاں لیکن زیادہ نہیں آج کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ اس وقت رائفل بدست تم خلیج پر کیا کر رہے ہو؟" اس کی آنکھیں شیطانی انداز میں چمکیں۔

"تم دیکھنا پسند کرو گے؟"

میں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے رائفل سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ چلو لیکن راستے میں کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی مسٹر جوزف۔"

"یوسف۔" میں نے تصحیح کی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔ وہ رائفل لیے عین میرے عقب میں چلا آیا تھا۔




"جہاز کے باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"تم جلد ان سے مل لو گے۔"

"خلیج کے پاس لنگر انداز بوٹ کس کی ہے؟"

"فضول سوال مت کرو۔" اس نے پہلی بار درشت لہجے میں کہا۔ "خاموشی سے چلتے رہو۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ اسے مشتعل کرنے کے بجائے آنے والے حالات کا انتظار کروں۔ جلد مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم جہاز کے اگلے حصے میں واقع کارگو والے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ کیرج چار بڑے ہالز پر مشتمل تھا اور یہاں کنٹینرز سے لے کر چھوٹی پیٹیوں میں بے شمار اقسام کا ہزاروں ٹن سامان تجارت موجود تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے مجھے اس طرف کیوں لایا تھا کیا میرے بقیہ ساتھی بھی یہیں موجود تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب میں نے کپتان سمیت خلیج کے عملے کے تیس افراد کو چار نمبر کے ہال میں پایا اور اس وقت وہ جو کام کر رہے تھے میں نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ مختلف اقسام کے بکس اٹھا کر لوڈر کی مدد سے خلیج کے بڑے کارگو گیٹ کے راستے کے پاس ہی لنگر انداز چھوٹے بحری جہاز تک پہنچا رہے تھے۔ ان میں گپتا سے لے کر خود کپتان صلاح الدین سمیت تمام عملہ شامل تھا۔ ان کے علاوہ ہال میں چھ عدد مسلح افراد موجود تھے جو انہیں جلدی جلدی کام کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ان کا رویہ زمانہ قدیم کے کسی نگران کا سا تھا جو غلاموں سے کام لیتے تھے بس فرق یہ تھا کہ ان کے پاس کوڑے نہیں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید قسم کی خودکار رائفلیں تھیں۔

"تم..... تم لوگ بحری قزاق ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔" جان گرے نے خوش مزاجی سے کہا۔ "اب ذرا تم بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ ہمارے پاس وقت پہلے ہی کم ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے یہ سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

بادلِ نخواستہ میں نے آگے بڑھ کر ایک پیٹی اٹھانے میں کپتان صلاح الدین کی مدد کی جس میں غالباً آٹو پارٹس تھے۔ پیٹی خاصی بھاری بھرکم تھی۔ میں نے سرگوشی میں کپتان سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے کیپٹن؟"

"خاموش رہو۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "ابھی یہ لوگ چلے جائیں گے۔"

"آپ کو یقین ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ یہ ہمیں مار کر سمندر میں بھی ڈال سکتے ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" کپتان نے پیٹی لوڈر پر رکھی دوسری پیٹیوں پر نظر جماتے ہوئے دھیرے سے کہا اور مجھے مشورہ دیا۔

"بولنے کے بجائے بہتر ہے خاموشی سے کام کرتے رہو۔"

ہم میں سے کچھ افراد سامان لوڈر پر رکھ رہے تھے اور باقی لوڈر کو دھکیل کر دوسرے بحری جہاز تک پہنچا رہے تھے۔ ایک بار ایک نگران نے مجھے لوڈر دھکیلنے کا حکم دیا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا جہاز کے دروازے تک لے گیا۔ چھوٹے بحری جہاز سے ایک فولادی تختہ خلیج تک آ رہا تھا۔ جس پر سے سامان گزار کر بحری جہاز تک پہنچایا جا رہا تھا۔ وہاں بھی کچھ افراد سامان کو جہاز کے نچلے حصے میں پہنچا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں مجھے اس بحری جہاز کا معائنہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ کوئی پچاس میٹر لمبا اور بیس میٹر چوڑا دو منزلہ بحری جہاز تھا۔ جس کا نچلا حصہ کارگو کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے اوپر کچھ ایسا سامان نصب تھا جیسے یہ ماہی گیری کے لیے مخصوص ہو لیکن جہاز پر ماہی گیری کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ خاص طور سے وہ نہیں تھی جو ماہی گیر کشتیوں کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کے بجائے اس جہاز پر کچھ چھوٹی کرینیں اور آلات اسی طرح نصب تھے کہ یہ جہاز بار برداری کے لیے بھی استعمال ہو سکتا تھا۔

اس کے ایک پہلو میں ایک مشینی نظام نصب تھا جس کی مدد سے ایک فولادی تختہ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر کسی بھی دوسرے بحری جہاز سے مل سکتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے کا ان لوگوں سے کیا تعلق تھا۔ مجھے مسلح نگراں اور قزاق مختلف رنگ و نسل کے افراد جہاز پر نظر آتے تھے۔ ان میں افریقی بھی تھے اور عرب بھی۔ مشرق بعید سے تعلق رکھنے والے افراد بھی نظر آتے تھے جبکہ برصغیر کے لوگ بھی ان میں شامل تھے گویا یہ بحری قزاقوں کا کوئی بین الاقوامی قسم کا گروہ تھا۔ ان میں صرف ایک جان گرے ہی سفید فام تھا۔ ان افراد میں کئی نقاب پوش بھی تھے جو اس سارے عمل کی نگرانی کر رہے تھے۔ اگلے دو گھنٹے کے دوران میں نے قزاق جہاز کے کئی چکر لگائے اور ہر بار میں نے خاصی تفصیل سے اس کا معائنہ کیا تھا۔ اپنے جہاز کو چھپانے کے لیے انہوں نے اسے تاریکی میں رکھا تھا۔ شاید مقصد یہ تھا کہ قریب سے گزرتا کوئی بحری جہاز اسے دیکھنے نہ پائے یہ ایک مصروف بین الاقوامی شاہراہ تھی اور یہاں چوبیس گھنٹے بحری جہازوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

سورج نکلنے ہی والا تھا لہٰذا مسلح نگراں جلدی کا شور مچا رہے تھے۔ انہوں نے گالیاں دینا شروع کر دی تھیں اور ایک کو تو مارا بھی تھا جو سستی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کپتان سمیت وہ اعلیٰ افسران کے ساتھ ایک حد میں رہ کر پیش آ رہے تھے۔ وہ نہ تو انہیں گالیاں دے رہے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ جبکہ نچلے درجے کے عملے کے ساتھ وہ بے حد درشتگی سے پیش آ رہے تھے۔ جان گرے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف مخصوص سامان اٹھا رہے تھے یعنی انہیں پہلے سے اپنے مطلوبہ سامان کے بارے میں معلومات تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جہاز میں بھی ان کا کوئی ایجنٹ تھا ممکن ہے یہ مخبری جان گرے نے کی ہو۔ اس کی قزاقوں کے ساتھ موجودگی ہی کافی تھی۔





مطلوبہ سامان منتقل کرتے ہی جان گرے نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا اور کپتان صلاح الدین سے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم ہمارے جانے کے بعد کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے کیونکہ تمہیں آئندہ بھی اس روٹ پر سفر کرتے رہنا ہے؟ شوق سے اس قزاقی کی رپورٹ لکھوا سکتے ہو لیکن نامعلوم افراد کے خلاف....."

"مسٹر گرے، تم ہمیں سمجھانے کی کوشش مت کرو۔" کپتان صلاح الدین نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔ اسی بناء پر اس سمندر میں سفر کر رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن خبردار کرنے میں کیا حرج ہے۔" جان گرے نے سر ہلایا۔ "تمہارے جہاز کا ریڈیو ہم نے ناکارہ کر دیا ہے۔ جو تمہارا آپریٹر ٹھیک کر لے گا۔ اسے کچھ دیر لگے گی۔ ہاں فلکسڈ ریڈیو سگنل دینے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ہماری ایک گن بوٹ تمہارے آس پاس رہے گی کوئی مدد آنے سے پہلے سب غرق ہو چکے ہوں گے۔"

کپتان نے ناگواری ظاہر کی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ جان گرے جاتے جاتے مڑا، وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے گھوم کر ہمیں دیکھا پھر اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے رائفل ہلاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جوزف اِدھر آؤ۔"

"میرا نام یوسف ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

"تم نے سنا نہیں اِدھر آؤ۔" یکلخت وہ غرانے لگا۔ "تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

"مسٹر گرے۔" صلاح الدین اضطراب سے بولا۔ "تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس سے ہم سب کے لیے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

"شٹ اَپ کیپٹن۔" گرے نے اسے ڈانٹ دیا۔ "کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ تم رپورٹ کر سکتے ہو کہ چیف انجینئر صاحب نشے میں سمندر میں گر گئے تھے۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔" میں نے اس کے عزائم بھانپ لیے تھے۔ وہ خلیج کو غرق کرنے کے منصوبے کی ناکامی کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے ہی اس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔

"یہ دیکھ رہے ہو۔" جان گرے نے رائفل لہرائی۔ "اس کے ہوتے ہوئے میں تم سے اپنا مطالبہ منوا سکتا ہوں۔" یکلخت اس نے برسٹ مارا۔ گولیاں عین میرے پیروں کے سامنے آ کر لگی تھیں۔ میں اضطراری طور پر اُچھل پڑا تھا۔ جان گرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ جو ہال میں پھیلنے والی آہنی گونج میں دب گیا تھا۔

"اگلا برسٹ تمہاری ٹانگوں پر پڑے گا اور میں تمہیں اسی طرح لے جاؤں گا۔ اب فیصلہ تم پر ہے۔ اپنے پیروں پر چل کر جانا چاہتے ہو یا نہیں۔" اس نے ایک بار پھر رائفل اٹھائی۔

"پلیز مسٹر گرے یہ کیا کر رہے ہو تم، حالات خراب ہو جائیں گے۔" کپتان صلاح الدین

نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میرے لیے بات چھپانا اور جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تمہارا دردِ سر ہے۔'' جان گرے نے بے نیازی سے کہا اور مجھ سے بولا۔ ''تم چل رہے ہو؟ لیس آرنو؟''

اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ حسبِ معمول نشے میں تھا۔ اگر میں نے انکار کیا تو وہ سچ مچ فائرنگ کر کے مجھے اپاہج کر دے گا۔ اس کے تیور ہر گزرتے لمحے خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے رائفل کو معمولی سی حرکت دی تھی میں نے جلدی سے کہا۔ ''اوکے میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

وہ چند لمحے سرد نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر مڑتے ہوئے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ عارضی پل کے راستے اپنے جہاز پر جانے لگا۔ اسے اتنا اعتماد تھا کہ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اس لمحے میں چاہتا تو اپنی جیب میں موجود پستول سے اس کی شیطانی کھوپڑی پر ایک فائر کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا ہم ان مسلح قزاقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جان گرے کے بدلے وہ ہم سب کو مار سکتے تھے اور خلیج کو غرق کر سکتے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے اس کے پیچھے چلتا دوسرے بحری جہاز کے عرشے پر جا پہنچا۔ وہاں موجود ایک نقاب پوش نے میری طرف دیکھا۔

''اسے کیوں لے آئے؟'' اس نے جان گرے سے پوچھا۔ اس نے انگریزی میں بات کی تھی اور لہجے سے فرانسیسی لگتا تھا۔ چھ سال لندن میں گزار کر مجھے بہت ساری قوموں کو جاننے کا موقع ملا تھا اور میں لہجے سے بھی پہچان جاتا تھا کہ بولنے والے کا تعلق کس ملک سے ہے گویا نقاب تلے کوئی فرانسیسی تھا۔

''یہ میرا معاملہ ہے۔'' جان گرے نے بے پروائی سے کہا۔ ''صرف کام کی حد تک۔ اس کے علاوہ میں کیا کرتا ہوں اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔'' جان گرے کے انداز میں بے نیازی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اس پر ہم بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ ابھی تو دوسرے امور اہم ہیں۔''

نقاب پوش چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دہاڑ کر روانگی کا حکم دیا۔ دوسرے لمحے عرشے پر نصب ایک آہنی پہیہ گھمانے لگے اور خلیج سے جڑا تختہ واپس جہاز پر آنے لگا۔ یہ عرشے تلے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پورے کا پورا تختہ غائب ہو گیا۔ ان کا نظام بہترین تھا۔ عرشے کے ایک طرف نیچے جانے کے لیے بننے والے دروازے کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اب یہاں کوئی زیرِ عرشہ کسی خفیہ خانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ اس جدید دور میں بھی قزاقی ہوتی ہے اور خاص طور سے ایشیائی خطوں میں قزاق بحری جہازوں سے باقاعدہ بھتہ وغیرہ لیتے ہیں لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح دن دیہاڑے





ایک مصروف ترین بحری شاہراہ پر اس طرح بھی قزاقی ہو سکتی ہے۔

مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ جان گرے جیسا کینہ پرور شخص مجھے کسی نیک ارادے سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اول تو اس کے عزائم واضح تھے اور اگر کوئی غلط فہمی تھی تو ان بحری قزاقوں کو دیکھ کر دور ہو گئی تھی کہ جان گرے جن کا ساتھی تھا پھر جان گرے نے جس انداز میں اپنے باس کا منہ بند کیا تھا اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بحری قزاقوں کے اس گروہ میں وہ اہم مقام رکھتا تھا۔ نقاب پوش کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ قزاقوں کی یہ تنظیم صرف اس جہاز تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ صرف ایک حصہ تھے اس گروہ کا۔ جان گرے کے حکم پر مجھے عقبی عرشے سے نچلے حصے میں واقع ایک سیل میں پہنچا دیا گیا۔ بہ مشکل آٹھ بائی چھ کے اس سیل میں پہلے ہی ایک شخص موجود تھا جو گٹھری بنا سو رہا تھا۔

''آرام کرو۔'' مجھے لانے والے نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''نو بجے ناشتہ ملے گا۔''

وہ دروازہ بند کر کے رخصت ہوا تو میں نے سیل کا معائنہ کیا۔ فرش پر دو عدد بستر تھے جو دیوار کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ان میں اتنی گنجائش تھی کہ آدمی سیدھا لیٹ جائے، ہاتھ پیر پھیلانا ناممکن نہیں تھا۔ ایک طرف ایک ریک پر پانی کی بوتل ہک سے بندھی ہوئی تھی۔ عقبی حصے میں چھت کے ساتھ واقع پورٹ ہول سے طلوع ہوتے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بلب لگا تھا جو فی الوقت بجھا ہوا تھا۔ میں دوسرے بستر پر بیٹھ گیا۔ عجیب بات تھی کہ مجھے صورتِ حال سے کسی قسم کا خوف یا پریشانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں بحری قزاقوں کے قبضے میں تھا اور ان میں جان گرے بھی شامل تھا جو یقیناً میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی تخریب کاری کے بے مثال منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس کے دل میں میرے لیے کئی مضر خیالات ہوں گے۔

''دیکھا جائے گا۔'' میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا اور کچھ دیر میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔



فائر کی آواز سنتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے حسن علی کو خاک و خون میں لتھڑے دیکھا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فائر ہوتے ہی ماہ پارہ نے دل خراش چیخ ماری تھی، اس سے مجھے حسن علی کی جوان مرگی کا مزید یقین ہو گیا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ جسم پر سے بوجھ کم ہوا تھا۔ میں نے تڑپ کر زور لگایا اور اپنی کمر آزاد کرا لی لیکن بائیں ٹانگ بدستور ایک گینڈے کے پاؤں تلے تھی۔ میں نے ماہ پارہ کو اپنے سر سے سرکایا جو دیوانہ وار چیخ رہی تھیں۔ ان کی آواز میں مجھے بدمعاشوں کے چلانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اسی لمحے جیپ کو شدید دھچکا لگا تھا اور وہ یوں رُک گئی تھی جیسے اس کے آگے کوئی ٹھوس رکاوٹ آ گئی ہو۔ دھچکے کے ساتھ ہی میرے پاؤں سے بھی بوجھ ہٹ گیا۔ کیونکہ میری ٹانگ پر کھڑا شخص چلتی جیپ کے اچانک رُک جانے سے لوہے کے پائپ پر سے ہوتا ڈرائیور پر جا گرا تھا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلے حصے میں سوار ایک بدمعاش تو ڈرائیور پر گرا تھا۔ ایک جیپ سے ہی

باہر جا گرا تھا اور تیسرا ماہ پارہ پر گرا تھا۔ جو اسے مار رہی تھیں اگرچہ یہ مار پیٹ اس پر قطعی بے اثر تھی لیکن ایک عورت سے مار کھا کر وہ اشتعال میں آ گیا تھا۔ اس نے یک دم ماہ پارہ کے سر پر اپنے ریوالور کا دستہ مارا اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

''کتیا کی بچی۔'' اس نے غرا کر کہا تھا کہ میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو تھامتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا سر جیپ کے فولادی جنگلے سے ٹکرایا۔ اس کی زبان سے گالی نکلی۔ یہ وہی تھا جس نے مجھے گرفتار کیا۔ دوسری ٹکر پر اس کے کس بل خاصی حد تک نکل گئے تھے تیسری بار میں نے پوری انتقامی قوت سے اس کا سر جنگلے پر مارا تو وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور چھین لیا۔ اس کی نالی سے بُو آ رہی تھی۔ گولی اس سے چلائی گئی تھی گویا حسن علی کا قاتل وہی تھا۔ ایک اشتعال کے عالم میں میں نے ریوالور اس کے سر کی طرف کیا تھا اور شاید میں گولی بھی چلا دیتا اگر میں حسن علی کی آواز نہ سن لیتا۔

''گولی مت چلانا یوسف۔'' اس نے للکار کر کہا تھا۔ میں اُچھل ہی پڑا تھا۔ حسن علی زندہ تھا اور اس وقت جیپ سے باہر گرنے والے بدمعاش کی مرمت لگا رہا تھا۔ وہ ایک تیسرے درجے کا غنڈہ تھا جو صرف کمزور اور نہتے لوگوں پر اکڑ کر استاد کہلانے لگا تھا۔ حسن علی کی مہارت کے سامنے اس کی ساری استادی دھری رہ گئی تھی۔ ایک منٹ سے کم وقت میں وہ اپنے کئی دانتوں سے محروم ہو چکا تھا اور اپنی ہنسلی کی ہڈی تڑوا چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور اور اس پر گرنے والے بدمعاش کی طرف دیکھا تو انہیں شرافت سے پڑے پا کر حیران رہ گیا۔ وہ یوں ساکت بیٹھے تھے جیسے ساری بدمعاشی بھول چکے ہوں۔ جلد ان کی شرافت کی وجہ بھی مجھے نظر آ گئی۔ یہ ایک شخص تھا جو ان کے سر پر خود کار رائفل لیے کھڑا تھا۔

جیپ سے آگے ایک دوسری جیپ کھڑی تھی۔ ملٹری ماڈل کی یہ جیپ چھوٹی لیکن بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ اس کے اچانک سامنے آنے کی وجہ سے ہی بدمعاشوں کی جیپ رُکی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے جیپ سے اُترنے والے مسلح افراد نے انہیں کور کر لیا تھا۔ حسن علی سے مقابلہ کرنے والے بدمعاش کا سارا غرور خاک ہو چکا تھا تو اس نے بے ہوش ہونے میں عافیت جانی۔ حسن علی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''خس کم جہاں پاک۔''

میں ماہ پارہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ گھنے بالوں کی وجہ سے ان کا سر تو نہیں پھٹا تھا لیکن سر پر ایک اُبھار نمودار ہو گیا تھا۔ ان کی نبض ذرا سستی سے لیکن باقاعدگی سے چل رہی تھی یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ حسن علی لپک کر آیا تھا۔

''ماہ پارہ کو کیا ہوا؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''ہوا تو بہت کچھ ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' حسن علی نے بھنا کر کہا۔





''اس مردود نے ان کے نازک سر پر یہ ریوالور مارا تھا۔'' میں نے ریوالور حسن علی کو تھما دیا۔

''اور یہ کیسے بے ہوش ہوا؟''

''آپ کے اس خادم کے ہاتھوں۔'' میں نے انکساری سے کہا۔ ''سوال جواب بعد میں ہوتے رہیں گے کیا بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے ہم ماہ پارہ کو پیلس لے چلیں اور ان بدمعاشوں کا کوئی بندوبست کریں۔''

''ان کا بندوبست یہ لوگ کریں گے۔'' حسن علی نے کہا اور ڈرائیور اور اس پر تقریباً لدے دوسرے بدمعاش کو جیپ سے باہر پھینک دیا۔ یہی سلوک میں نے تیسرے بدمعاش کے ساتھ کیا تھا۔ ''انہیں لے جاؤ بعد میں ان سے بات کریں گے۔''

حسن علی نے رائفل بدست افراد کو حکم دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ماہ پارہ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آہستہ سے ان کے گال تھپتھپانے لگا لیکن ان کی بے ہوشی میں خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ سر پر لگنے والی بہ ظاہر معمولی سی چوٹ بھی بعض اوقات خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ حسن علی نے تیزی سے ڈرائیونگ کی اور ہم چند لمحوں میں جمشید پیلس میں تھے۔ حسن علی نے ماہ پارہ کو بازوؤں میں اٹھایا اور ان کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے پیلس کے ڈاکٹر کو فون کر کے اسے فوراً آنے کو کہا۔

حسن علی ماہ پارہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا اس نے ان کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے تو اس کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا تھا۔ ماہ پارہ کسمسانے اور پھر کراہنے لگیں۔ میں نے چمچ سے ان کے منہ میں پانی ٹپکایا تو وہ ہوش میں آ گئیں۔ انہوں نے ہوش میں آتے ہی روایتی سا سوال کیا تھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''اس دنیا میں۔ اپنے کمرے میں۔ اپنے بستر پر۔'' میں نے جواب دیا۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' حسن علی بولا۔

''سر میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ کراہیں۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ انہیں اتنا درد نہیں ہو رہا تھا جتنا وہ حسن علی کو اپنے پاس پا کر ظاہر کر رہی تھیں۔ ''کمبخت نے اتنی زور سے پستول سر پر مارا تھا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کا بدلہ لے لیا اور اس کا سر تین بار زیادہ زور سے جیپ کے فولادی ڈنڈے پر مارا تھا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''مجھے یہاں کون لایا؟'' وہ بولیں۔ پانی پی کر ان کی حالت کسی قدر سدھر گئی تھی۔

''پیلس تک تو آپ جیپ پر آئی تھیں اور جیپ سے یہاں تک آپ کو.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر حسن علی کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔ حسن علی ماہ پارہ کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔

اس لمحے زہرہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ پہلے تو انہوں نے چبھتی نظروں سے حسن علی کو

دیکھا جو فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر ماہ پارہ سے بولیں۔ ''کیا ہوا تھا میں نے سنا ہے یہ لوگ تمہیں بے ہوش لائے تھے۔''

''ہاں انہیں چکر آ گیا تھا۔'' ماہ پارہ سے پہلے حسن علی نے کہا تو میں چونک گیا تھا۔ اس نے زہرہ بیگم سے غلط بیانی کی تھی۔

''اچھا'' ان کی نظروں کی چبھن مزید بڑھ گئی تھی۔ ''خیریت، چکر کیوں آ گیا تھا؟''

''بس اچانک کمزوری کا احساس ہوا اور چکرا کر گر پڑی۔ سر ایک پتھر سے لگا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔'' ماہ پارہ نے سر درد کے باوجود ذہانت سے اپنے سر کی چوٹ کا جواز پیدا کر لیا تھا۔

زہرہ بیگم کی آنکھوں میں شک بدستور موجود تھا۔ انہوں نے حسن علی کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے اب تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں ابھی حسن یہاں سے نہیں جائے گا۔'' یک دم ماہ پارہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''اچھا۔'' زہرہ بیگم نے معنی خیز لہجے میں کہا اور چلی گئیں۔

''تم نے اسے جواب دے کر اچھا نہیں کیا۔'' حسن علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ جمشید علی سے شکایت کرے گی۔''

''تو کرے۔'' ماہ پارہ دوبارہ نیم دراز ہو گئیں۔ انہوں نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔ ''یوسف کیبنٹ سے مجھے کوئی پین کلر دے دو۔''

''پین کلر تو میں دے دوں گا لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے ڈاکٹر آپ کو دیکھ لے۔'' میں نے کہا۔ اس وقت ڈاکٹر آ گیا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ماہ پارہ جلدی سے بولیں۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ ان کی باتوں پر قطعی توجہ نہ دیں۔ ویسے بھی چوٹ ان کے سر پر آئی ہے۔'' میں نے کہا تو ڈاکٹر مسکراتے ہوئے ماہ پارہ کا معائنہ کرنے لگا۔ دراصل ماہ پارہ ڈاکٹروں سے گریز کرتی تھیں۔ حالانکہ ان کے والد ڈاکٹر تھے اور ان کا بچپن ہسپتال کے ساتھ ملے بنگلے میں گزرا تھا۔ انہیں انجکشن کی سوئی سے ڈر لگتا تھا۔ اسی بناء پر وہ حتیٰ الامکان ڈاکٹرز سے گریز کیا کرتی تھیں۔

''کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔'' حسبِ معمول ڈاکٹر نے ایک انجکشن برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کبھی متلی یا چکر کی کیفیت محسوس ہو تو فوری طور پر انہیں ہسپتال لے جائیے گا۔ یہ انجکشن دے رہا ہوں۔ اسی سے درد میں کمی ہوگی۔''

''میں ٹیبلٹ کھا لوں گی۔'' ماہ پارہ گھبرا کر بولیں۔

''انجکشن زیادہ زود اثر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے اصرار کیا اور انجکشن ان کے بازو میں گھونپ دیا۔

پھر اس نے ہم سے کہا۔

''اب انہیں آرام کرنے دیں۔''





ڈاکٹر کے ساتھ میں اور حسن علی بھی باہر آ گئے تھے۔ پورچ میں زہرہ بیگم جیپ کا معائنہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''یہ جیپ کس کی ہے؟''

''میرے ایک دوست کی ہے۔'' حسن علی نے کہا۔ ''ادھار لایا تھا۔''

میں اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تو اس نے حیرت سے کہا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''آپ کے ساتھ۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے مجھے گھورا لیکن مزید کچھ کہے بغیر جیپ آگے بڑھا دی۔ باہر نکلتے ہی میں نے پوچھا۔

''وہ لوگ کون تھے جنہوں نے اس جیپ کا راستہ روکا تھا؟''

''ہمارے ہی محافظ ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر کام آتے ہیں۔''

''خاک کام آتے ہیں، مجھے مار مار کر چپٹا کر دیا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''بے چاری ماہ پارہ کے سر پر ایک گومڑ نکل آیا اور آپ تو شہید ہوتے ہوتے رہ گئے۔ آپ نے گولی کو غچہ کیسے دیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''بس قسمت تھی میں نے بروقت اسے ریوالور اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ اگلے لمحے جیپ کا جنگلا چھوڑ دیا۔''

''یعنی مجھے اور ماہ پارہ کو ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

''نہیں مجھے معلوم تھا کہ محافظ کہیں آس پاس ہوں گے۔ وہ تمہیں آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔''

''تو پھر آپ نے وہ عظیم سٹنٹ کیوں دکھایا تھا۔ جیپ کے پیچھے لٹکنے والا۔'' میں نے شرارت سے کہا۔ ''شاید کسی کو متاثر کرنے کے لیے۔''

''بک بک مت کرو۔'' حسن علی نے دوسری طرف منہ کر لیا لیکن میں نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

''ان بدمعاشوں کا کیا ہوا؟'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''ہم وہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ پہنچ گئے۔'' حسن نے جیپ ایک کسی قدر ویران علاقے میں اس اجاڑ سی نظر آنے والی کوٹھی کے سامنے روکی۔ ہارن کی آواز پر فولادی گیٹ میں ایک کھڑکی کھلی۔ کسی نے باہر جھانکا اور حسن علی کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ جیپ احاطے میں جا رکی۔ کوٹھی نامکمل تھی۔ کھڑکیاں دروازے لگ گئے تھے لیکن پلاسٹر نہیں ہوا تھا۔ لان پر ریت اُڑ رہی تھی۔ ہر طرف تعمیراتی سامان بکھرا ہوا تھا۔

''یہ کس کی کوٹھی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' حسن علی نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹھی اندر سے خاصی بہتر تھی۔

اندر نہ صرف پلاسٹر ہوا تھا بلکہ بعض جگہوں پر اچھا خاصا سامان بھی موجود تھا۔ حسن علی ایک کمرے میں پہنچا۔ جہاں مختلف الیکٹرونکس آلات رکھے ہوئے تھے۔ دو افراد وہاں موجود تھے۔ حسن علی نے ان سے پوچھا۔

''ان لوگوں نے کچھ بتایا۔''

''بہت کچھ۔'' ایک بولا۔ ''لیکن کام کی بات کوئی نہیں نکلی۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟''

''وہ کہتے ہیں کہ کرائے کے بدمعاش ہیں۔ انہیں ہائر کیا گیا تھا۔ ہائر کرنے والے نے انہیں سامنے آئے بغیر بیس ہزار کی رقم بھجوا دی تھی اور کام کی تکمیل کی صورت میں مزید بیس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''کام کیا تھا؟''

''یوسف بابا کا اغوا اور ان کے ساتھ جو بھی ہو اسے بھی اٹھا لے جانا تھا۔'' اس شخص نے میری طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا وہ مجھے جانتا تھا۔

''بکواس کرتے ہیں وہ۔'' حسن علی نے کہا۔ ''اس طرح معاہدے نہیں ہوا کرتے۔ آخر انہیں اغوا کرنے والے کو کہیں پہنچانا تھا کیا ہائر کرنے والوں نے انہیں کوئی جگہ نہیں بتائی تھی۔''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اغوا کرانے والے بڑے چالاک ہیں۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ ایک گاڑی اس سڑک پر آگے ان کی منتظر ہوگی۔ جب وہ مطلوب افراد کو لے آئیں گے تو افراد لے کر وہیں ان کا بقیہ معاوضہ دے دیا جائے گا۔''

''رقم کس ذریعے سے ملی تھی؟''

''کسی نے اخبار میں لپیٹ کر استاد کے گھر میں پھینک دی تھی۔''

''گویا ان لوگوں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگوں کے ہاتھ صرف کرائے کے ٹٹو آئے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' حسن علی سوچتے ہوئے بولا۔ ''معلوم کرو کہ یہ جیپ کس کی ہے۔ نمبر پلیٹ تو جعلی لگ رہی ہے مگر انجن نمبر سے سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے جیپ بھی ہائر کرنے والوں نے ہی دی ہوگی۔''

''انجن کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اس شخص نے اعتراف کیا۔

''تو معلوم کرو۔'' حسن علی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

چاروں بدمعاش ایک اُجاڑ سے کمرے میں قید تھے۔ جس کی دیواریں کھردری اور رنگ سے عاری تھیں۔ فرنیچر نام کی کوئی شے نہیں تھی اور وہ چاروں فرش پر پڑے تھے۔ اب باقی دو بھی خستہ حال نظر آ رہے تھے۔ جس سے واضح تھا کہ ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک قسم کی تفتیش کی گئی تھی۔ ان میں





سب سے زیادہ خراب حالت استادِ محترم کی تھی یہ چار عدد دانتوں سے محرومی اور ٹوٹی ہوئی ہنسلی ہی کچھ کم نہیں تھی۔ تفتیش کے دوران انہیں اپنے شاگردوں کے سامنے جس بے عزتی سے گزرنا پڑا تھا وہ ان کے چہرے سے واضح تھی۔ حسن علی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اگر تم زحمت سے بچنا چاہتے ہو تو اپنی زبان کھول دو۔''

''ہمیں جو معلوم تھا ہم بتا چکے ہیں۔'' ڈرائیور نے دانت بھینچ کر کہا۔

''ہمیں بے وقوف مت سمجھو۔'' حسن علی نے کہا۔ ''اتنی آسانی سے بتانے والی چیز نہیں ہو تم پر خاصی محنت کرنا پڑے گی۔'' استادِ محترم حقارت سے مسکرائے۔

''محنت کر کے تمہارے بندے دیکھ چکے ہیں۔''

''تم اسے محنت کہتے ہو۔ یہ تو ایک ہلکا پھلکا خوف تھا۔ وہ معصوم بندے ہیں اگر میں چاہوں تو یہ لڑکا ہی تمہاری زبان کھلوا لے جسے تم لوگ حلوہ سمجھ کر اغوا کرنے آئے تھے۔''

''دس منٹ کی بات ہے سر جی۔'' میں نے مذاق میں کہا تھا لیکن اس وقت چودہ طبق روشن ہو گئے جب حسن علی نے پوری سنجیدگی سے مجھے یہ کام سونپ دیا۔ وہ باہر جانے لگا تو میں اس کے پیچھے لپکا۔

''یہ کیا غضب کرتے ہیں استادِ محترم میں نے تو صرف آپ کی بات نبھائی تھی۔'' میں نے باہر آ کر کہا۔

''اچھا۔'' حسن علی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم سنجیدہ ہو۔ اب اس پٹھے کے سامنے میری ناک تو کٹ جائے گی جس کے سامنے میں نے اتنا بڑا دعویٰ کیا تھا۔''

''استاد جی آپ جانتے ہیں کہ بندہ ابھی پوری طرح بشر نہیں بنا ہے۔ کم سنی کی بناء پر اس قسم کے پُرتشدد کاموں سے بھی ذرا گھبراتا ہے۔ اس کے باوجود محض آپ کی عزت کی خاطر یہ بارِ گراں سر پر اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ از راہِ مہربانی چائنہ ماچس کا ایک پیکٹ منگوا دیجیے۔''

''پٹاخے۔'' حسن علی نے غور کر کے کہا۔ ''ان کا کیا کرو گے؟ یہ پاپی پٹاخوں سے مرنے والے نہیں ہیں۔ ان کے لیے سوا کلو بارود چاہیے جو کچھ پڑھ کر ان کے نیچے رکھا جائے تبھی یہ مریں گے۔''

''پٹاخوں سے مر جانے والوں پر سوا کلو بارود ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم سنجیدہ ہو؟'' حسن علی نے حیرت سے کہا۔

''تقریباً اتنا ہی جتنا کہ آپ ماہ پارہ کے لیے سنجیدہ ہیں۔''

اور حسن علی کو مجھے چائنہ ماچس کا پیکٹ منگوا کر دینا پڑا۔ وہ اسے بھی میرا طفلانہ پن سمجھ رہا تھا۔ عمر کے لحاظ سے تو میں طفل ہی تھا لیکن تجربات کے لحاظ سے اچھا خاصا بالغ ہو چکا تھا۔ پیکٹ آتے

ہی میں اسے لے کر بدمعاشوں والے کمرے میں پہنچا پہلے تو ان سب کو میری ہدایت کے مطابق سر سے پاؤں تک کسی بنڈل کی طرح رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ خاصی دہشت سے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ استاد محترم نے کانپتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟''

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ زبان کھول دو۔'' حسن علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اب تم شکایت نہیں کر سکتے۔''

''شکایت کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔'' میں نے پٹاخوں کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے لیے خاص رعایت ہے۔ اب بھی تم بتا دو کہ کن لوگوں نے تمہیں موت کے منہ میں جھونکا ہے تو میں اپنا پروگرام ملتوی کر دوں گا۔''

لیکن پٹاخے دیکھ کر ان کی ساری دہشت دور ہو چکی تھی۔ بلکہ استاد محترم میں اتنی ہمت آ گئی کہ انہوں نے بڑھک بھی ماری۔

''اوئے تُو ہم سے کچھ نہیں کہلوا سکتا ابھی بچہ ہے تُو۔''

شب برات کے موقع پر عبادت گنوا دی اور سونے والوں کا سکون حرام کرنے کے لیے ہر سال بے تحاشہ پٹاخے اور بم استعمال ہوتے ہیں۔ بلکہ اب تو لوگ آتشیں ہتھیار بھی استعمال کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سب سے معروف چائنہ ماچس ہے۔ سستی ہونے اور زوردار دھماکے کی وجہ سے یہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی ایک اور خاصیت ذرا دیر سے پھٹنا ہوتی ہے۔ یعنی اسے ماچس سے رگڑ کر فرش پر پھینک دیا جائے تو یہ آٹھ سے دس سیکنڈ میں پھٹ جاتا ہے۔ قریب سے اس کا دھماکا خاصا خوف ناک لگتا ہے۔ میں استاد کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم نے دیکھا ہے دستی بم قریب سے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اسّی گز کے اندر کھڑے انسان کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں لیکن یہی دستی بم زیادہ فاصلے پر بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ پٹاخہ بہ ظاہر بے ضرر سی چیز ہے۔ تمہارے پیروں میں پھٹ جائے تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر میں اسے تمہارے کان میں رکھ دوں اس طرح۔''

میں نے پٹاخہ ماچس سے رگڑ کر اس کے کان میں ٹھونس دیا جس نے ماہ پارہ کے سر پر پستول مارا تھا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ چلایا۔ ''نکال اسے ابے تیری تو......'' ناقابلِ اشاعت الفاظ کے ساتھ وہ سر جھٹک کر پٹاخے کو کان سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا جسم فرش سے اُچھل رہا تھا۔ جیسے مرغِ بسمل تڑپتا ہے مگر جب پٹاخہ پھٹا تو وہ بلا مبالغہ فرش سے فٹ بھر اُچھل پڑا تھا۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ بے جان سا ہو گیا۔ استاد محترم پہلے سے کہیں زیادہ دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے افسوس سے کہا۔

''بے چارہ کم سے کم بہرہ تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دھماکے سے دماغ بھی متاثر ہوا




ہو۔ سننے کے ساتھ یہ بولنا بھی بھول جائے یا ساری عمر دیکھ نہ سکے۔ ممکن ہے اس کی یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی متاثر ہوئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جہنم رسید ہو جائے۔''

''بکواس بند کرو۔'' استاد محترم نے چلا کر کہا۔ ''تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔''

''دہشت زدہ کون کر رہا ہے۔ میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ باقی سب تو یہ ہوش میں آئے گا تو پتا چلے گا۔''

اس وقت وہ بدمعاش ہوش میں آ گیا اور ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلانے لگا۔ پٹاخے نے اس کان کے پردے کا حشر نشر کر دیا تھا۔ ''اُف...... ارے...... مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ کتے کے بچے۔ تُو نے مجھے مروا دیا۔ (رُوئے سخن استاد محترم تھے) تیری ماں...... ہائے میں بہرہ ہو گیا۔'' اب وہ دہاڑیں مار کر رو رہا تھا۔

''صرف ایک کان سے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ابھی تمہارا دوسرا کان سلامت ہے۔'' پھر استاد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ممکن ہے تمہیں کوئی بات یاد آ گئی ہو؟''

''مم...... مجھے کچھ نہیں یاد۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سب بتا چکا ہوں۔''

''غالباً تمہیں ان معمولی سے پٹاخوں کی اثر انگیزی کا اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اس کے اور بھی مؤثر استعمال ہیں۔ مثلاً اگر میں اسے تمہاری ناک میں لگا دوں۔'' میں نے کہا اور الٹا استاد کے بجائے اس کے اس گرگے کی ناک میں ٹھونس دیا۔ جس نے ماہ پارہ کو پکڑا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ یہ حرکت کر جاؤں گا۔ وہ زور سے اُچھلا اور چلاتے ہوئے پٹاخہ ناک سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی وہ سر جھٹکتا اور کبھی ناک سے زوردار سانس نکالتا لیکن پٹاخہ میں نے اتنی قوت سے ناک میں گھسیڑا تھا کہ اسے آسانی سے نکال دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ چلایا۔

''استاد انہیں بتا دو خدا کے لیے۔''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پٹاخہ پھٹ گیا۔ اس نے پہلے والے سے بھی زیادہ دل خراش چیخ ماری لیکن بے ہوش نہیں ہوا۔ پٹاخے نے اس کی ناک کے اندرونی حساس حصوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حرارت نے اس کی ناک کے گوشت کو جلا دیا تھا اور وہ اس وقت ناقابلِ برداشت اذیت کی وجہ سے خطرے کے الارم کی طرح بجے جا رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار میں کوئی کام کی بات کرنا دشوار تھا۔ مجبوراً حسن علی نے اس کا منہ بند کرنے کا حکم دیا اور اس کے منہ پر چوڑا سا ٹیپ چڑھا دیا تھا۔ ٹیپ چڑھا دیا گیا تو میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔

''تم نے دیکھی۔ اس معمولی سی چیز کی کارکردگی اب فرض کرو میں ذرا بڑا پٹاخہ تمہارے منہ میں ڈال کر اوپر سے ٹیپ لگا دیتا ہوں۔ تو دھماکے کے بعد کیا ہوگا۔ عین ممکن ہے تمہاری زبان جل جائے اور تم ہمیشہ کے لیے اشاروں کی زبان میں بات کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اس قسم کے پٹاخے ہوا

کو بڑی تیزی سے پھیلاتے ہیں اگر تمہارے منہ کے ساتھ ناک بھی بند کر دی جائے تو اندر ہونے والے دھماکے کو جب پھیلنے کے لیے جگہ نہیں ملے گی تو وہ تمہارے سر پر دباؤ ڈالے گا تمہاری آنکھیں باہر نکل آئیں گی اور کان کے پردے پھٹ جائیں گے تم؟"

"خدا کے لیے۔" استاد نے کانپتے ہوئے کہا۔ "میں بتاتا ہوں میں نے سب بتا دیا تھا۔ بس ایک بات چھپائی تھی ہمیں جیپ شہزاد خان نامی شخص نے دی تھی وہ چاکیواڑہ میں رہتا ہے۔ اس کا پتا رقم کے پیکٹ کے ساتھ ملا تھا اور اس میں ایک پرچہ بھی تھا۔ ہدایت کے مطابق جب ہم نے یہ پرچہ شہزاد خان کو دکھایا تو اس نے ایک گیراج میں لے جا کر یہ جیپ ہمارے حوالے کر دی۔"

"گیراج کہاں ہے؟" حسن علی نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

"چاکیواڑہ میں، پتا مجھے نہیں معلوم لیکن میں گیراج دکھا سکتا ہوں۔"

"تم شہزاد خان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، میں زندگی میں پہلی بار اس سے ملا تھا۔"

"سوچ لو اگر یہ بات غلط نکلی تو۔" حسن علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں نے سب بتا دیا ہے اب تم اعتبار نہ کرو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" استاد نے خاصی بے بسی سے کہا۔

حسن علی ان لوگوں کی مرہم پٹی اور کھلائی پلائی کی ہدایت دے کر باہر آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں یہ پٹاخوں والی ترکیب کیسے سوجھی؟"

"بس جناب آپ کی پیروی میں کبھی کبھی سر استعمال کر لیتے ہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

اس نے مجھے گھورا۔ "آج کل تم زیادہ ہی بدمعاش ہوتے جا رہے ہو۔"

"یہ بھی آپ کی صحبت کا اثر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ورنہ ذاتی طور پر بندہ بے حد شریف ہے۔"

"لگتا ہے تمہارے لیے نیا تربیتی سیشن شروع کرنا پڑے گا۔"

"اچھا صلہ دے رہے ہیں میری خدمت کا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "سچ کہا ہے کسی نے نیکی کرنے والے کو ہی لوگ دریا میں ڈال دیتے ہیں۔"

"اب تم پیلس جاؤ۔"

"پیلس پیدل ہی۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "آپ کو اندازہ ہے کہ فاصلہ دو میل سے کم نہیں ہے اور یہاں تو ٹیکسی بھی نہیں ملتی۔"

"تو پیدل چلے جاؤ۔ ویسے بھی صبح تم نے دوڑ نہیں مکمل کی۔"

"ہرگز نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہی واپس جاؤں گا۔ بائی دے وے مجھے ٹہلا کر آپ کہاں جا





رہے ہیں۔ شہزاد خان کی تلاش میں۔" میں نے اچانک کہا تو حسن علی بھی حیران رہ گیا تھا۔

"تمہیں کیسے......" پھر جھلا کر کہا۔ "تم ایک ہی شیطان ہو۔"

"شیطان ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

بادلِ نخواستہ حسن علی نے مجھے اپنے ساتھ لیا۔ اس کے ساتھ ایک شخص تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر کے اس پرانے علاقے کو اس طرح جانتا تھا جیسے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو۔ تاہم اس کا علم جغرافیہ اس کے ہاتھوں کی لکیروں سے زیادہ گمراہ کن ثابت ہوا تھا۔ دو بار بھٹکنے کے بعد حسن علی نے گلی میں کھیلنے والے بچوں اور دروازوں پر زندگی سے بے زار بیٹھے بوڑھوں سے شہزاد کا پتا دریافت کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر بارہویں فرد نے ہماری صحیح رہنمائی کی اور ہمیں اس پانچ منزلہ عمارت تک پہنچا دیا۔ جو اتنی خستہ حال تھی کہ اس میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ ابھی زمین بوس نہ ہو جائے۔ تاہم عمارت گزشتہ سو سال سے ایسے ہی کھڑی تھی اور امکان تھا کہ کوئی زلزلہ نہ آیا یا کسی نے بم سے نہ اڑا دیا تو یہ یونہی مزید پچاس ساٹھ سال کھڑی رہے گی۔

شہزاد خان عمارت کے پانچویں مالے پر رہتا تھا۔ اس علاقے میں فلور کے بجائے مالے کہا جاتا ہے۔ بمبئی کی طرح اس جگہ کا طرزِ معاشرت بھی کسی حد تک پرانے بمبئی سے مشابہ تھا۔ یہاں زیادہ تر گجراتی، میمن اور کچھی برادری کے افراد آباد تھے۔ حسن علی نے اپنے ساتھ آنے والے ماہر جغرافیہ کو نیچے رکنے کو کہا۔ وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں اور حسن علی اوپر پہنچے راستے میں گرد آلود سیڑھیوں پر کچرا بکھرا ہوا تھا۔ اندر سے عمارت کا حال اور بھی بدتر تھا جگہ جگہ سے پلاستر اکھڑ رہا تھا۔ رنگ و روغن تو پاکستان بننے کے بعد کرایا ہی نہیں گیا تھا۔ شہزاد خان کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دینے پر ایک عورت نے اندر سے جھانکا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

"ہمیں شہزاد صاحب سے ملنا ہے۔" حسن علی نے شائستگی سے کہا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہے۔" عورت نے فوراً کہا اور مجھے لگا کہ اس نے سچ ہی کہا تھا۔

"پھر کہاں ملیں گے شہزاد صاحب؟" حسن علی نے دوبارہ پوچھا۔

"آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" عورت نے شک زدہ لہجے میں کہا۔ غالباً اس سے پہلے کسی نے شہزاد خان کو اتنی عزت سے نہیں بلایا تھا۔

"ہمیں اس سے کچھ کام ہے۔" حسن علی نے اسی لہجے میں کہا۔ "ان کے فائدے کا۔"

"ظاہر ہے اس کو فائدہ ہونا ہے۔" عورت نے تلخی سے کہا۔ "جو کماتا ہے باہر ہی اڑا دیتا ہے۔ وہیں ہوگا اپنے مقبرے میں اپنے گیراج پر۔"

عورت کی باتوں سے ظاہر تھا اس کا شوہر شہزاد خان عیاش طبیعت شخص تھا جسے گھر اور بیوی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ عورت نے اندر سے ایک کاغذ پر گیراج کا پتا لکھ کر لا دیا تھا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے اترے اور ماہر جغرافیہ کو ایک موقع اور دیا کہ وہ اپنی اہلیت ثابت کر سکے اور اس بار اس نے

ہمیں بالکل درست پتے پر پہنچا دیا تھا۔ گیراج ایک تنگ سی گلی کے کونے پر تھا۔ جس کے سامنے والی سڑک پر ٹریفک کا سیل رواں تھا۔ گیراج کے سامنے ہجوم دیکھ کر حسن علی چونکا تھا۔ لوگوں کو دائیں بائیں کرتے ہوئے ہم بہ مشکل گیراج تک پہنچے جہاں دکان کے اندر سے آنے والا خون جم چکا تھا۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟" حسن علی نے سب سے آگے شتر مرغ کی طرح گردن نکالے ایک صاحب سے پوچھا۔

"مرڈر اپن اپنی آنکھا جندگی میں اتنا مرڈر نہیں دیکھا۔" انہوں نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی بات پر غور کیا اس لمحے پیچھے سے کسی نے مجھے دھکا دیا اور میں بے اختیار دکان کے تقریباً اندر جا پہنچا تھا۔ پھر اندر نظر آنے والے منظر نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ دکان کے اندر ایک پیلا سا بلب روشن تھا جس کی روشنی تاریکی کے خلاف جدوجہد کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ دکان بہ مشکل بارہ بائی دس کی تھی۔ یہ دراصل موٹر سائیکلوں کی ریپئر شاپ تھی اور اس کا وہی حال تھا جو عام طور سے اس قسم کی دکانوں کا ہوتا ہے۔ کالک، میل اور آئل کی چکنائی جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے مرمت طلب پُرزے کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہے تھے لیکن دہشت زدہ کرنے والی چیز تین عدد لاشیں تھیں جو آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے ایک جوان العمر آدمی کی لاش تھی جو غالباً پُرزے دھونے والے سیاہ محلول میں منہ کے بل پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون اور مغز سیاہ محلول میں شامل ہو کر اسے نئی رنگت دے چکا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک نوعمر لڑکے کی لاش تھی۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی اور وہ گٹھڑی کی طرح دیوار سے لگا ہوا تھا۔ تیسری لاش نسبتاً جوان لڑکے کی تھی اس نے کونے میں موجود پُرزے رکھنے والے ریک کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن قاتل یا قاتلوں نے اسے وہاں بھی نہیں بخشا تھا۔ اسے بھی ایک ہی گولی ماری گئی تھی۔ عین سر کے اوپر اس سے قاتلوں کی پیشہ وارانہ مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔ تینوں کا خون مل کر ایک ندی کی طرح بہتا دکان کے باہر تک آ گیا تھا اور فضا میں اس کی مہک بسی ہوئی تھی۔ ایسی مہک عام طور سے گوشت کی دکانوں پر آتی ہے۔ یکدم مجھے متلی ہونے لگی۔ میں پلٹ کر بھاگا اور ہجوم سے باہر آتے ہی میں نے سڑک کے کنارے اُلٹی کر دی تھی۔ یہ دیکھ کر میری حالت مزید خراب ہو گئی کہ میرا جوتا خون پر چلا گیا تھا۔

اس موقع پر ماہر جغرافیہ نے میری پیٹھ سہلائی اور مجھے قریب ہی دکان سے کولڈ ڈرنک لے کر پیش کی۔ اس سے کلی کر کے اور چند گھونٹ حلق سے اُتار کر مجھے ذرا سکون محسوس ہوا تھا۔ مجھے جوتے سے گھن آ رہی تھی۔ میں نے اسے اُتار پھینکا۔ میں ایک ہی جوتے میں تھا۔ اس لمحے حسن علی مجمع سے باہر نکلا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں نے گاڑی میں اطمینان کا سانس لیا تھا۔ رات کے بارہ بجے بھی اس علاقے میں ہجوم تھا اور دکانیں کھلی تھیں۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔





"قتل۔" حسن علی نے مختصراً کہا۔

"وہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ قاتل کون تھے؟"

"قاتلوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دو ہیلمٹ پوش اب سے پون گھنٹے پہلے ایک موٹر سائیکل پر آئے، دکان کے اندر گئے اور صرف دو منٹ بعد چلے گئے۔ کسی نے گولیاں چلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے سائلنسر لگے ہتھیار استعمال کیے تھے۔ قتل کے فوراً بعد ایک شخص نے مقتول شہزاد خان کی لاش دیکھ لی تھی لیکن اس کے شور مچانے سے پہلے قاتل دور نکل چکے تھے۔"

"شہزاد خان وہی تھا جو سب سے آگے پڑا تھا؟"

حسن علی نے سر ہلایا۔ "سب سے پہلے اسے ہی گولی ماری گئی ہوگی۔ قاتل اس کے لیے آئے تھے۔ لڑکے اس وجہ سے مارے گئے کہ وہ شور مچا کر کسی کو متوجہ نہ کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات جانتے ہوں اس بناء پر مارے گئے ہوں۔"

"وہ لوگ ان کے سامنے ہی شہزاد خان سے ملنے آئے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ لڑکے بھی ان قاتلوں کی نشاندہی کر سکتے تھے لہٰذا قاتلوں نے انہیں بھی خاموش کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔" میں نے تبصرہ کیا۔ "وہ لوگ زیادہ ہی مستعد ہیں۔"

"جب اغوا کرنے والے ان تک نہیں پہنچے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ منصوبہ ناکام ہو گیا ہے اور اب بات ان تک آ سکتی ہے لہٰذا انہوں نے اس واحد راستے کو بند کر دیا۔ جو ان تک رسائی رکھتا تھا۔"

اس لمحے گاڑی پھر اس عمارت کے سامنے رُکی جہاں ہم پہلے بھی آ چکے تھے یعنی شہزاد خان کے فلیٹ پر۔ رات ہونے کے باوجود علاقے کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہم اوپر پہنچے۔ دروازہ بجانے پر عورت کے بجائے ایک چھوٹا بچہ دروازے تک آیا تھا۔ "آپ نے کس سے ملنا ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"آپ کے ابو شہزاد خان ہیں ناں؟" میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اپنی امی کو بلائیے۔"

کچھ دیر بعد وہ عورت دروازے پر تھی ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی تھی۔

"کہیے اب کیوں آئے ہیں۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ حسن علی عورت کو اطلاع دینے آیا تھا کہ اب وہ سہاگن نہیں رہی بلکہ بیوہ ہو چلی تھی اور عورت کے روکھے لہجے پر اسے اطلاع دے کر اپنی راہ لے گا لیکن اس کے بجائے اس نے کہا۔ "محترمہ شہزاد خان ہمیں دکان پر نہیں ملا۔ وہ کسی کے ساتھ چلا گیا تھا اور اب تک نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔"

یہ سنتے ہی عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ "اے...... کِک...... کس سے خطرہ ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ باتیں اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر کرنا مناسب نہیں ہیں۔" حسن علی

نے کہا۔

عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ بات اس کے شوہر کی جان کی تھی۔ اس لیے اس نے بالآخر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ چھوٹا سا یہ فلیٹ حسرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ گھر کی حالت سے ظاہر تھا کہ شہزاد خان سے عورت کا شکوہ بجا تھا۔ ہم معمولی درجے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شہزاد خان کی بیوی نے تشویش سے پوچھا۔ ''کون لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟''

''بہن آپ جانتی ہیں کہ شہزاد خان کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں میں نہیں لیکن دولت کمانے کے لیے ان دنوں وہ خطرناک لوگوں کے ساتھ ہے۔ جو انسانی زندگی کی اتنی پروا بھی نہیں کرتے جتنی آپ یا میں کسی مکھی یا مچھر کی پروا کرتے ہیں۔''

عورت کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''بھائی صاحب اب کیا ہوگا؟ خدا کے لیے کچھ کریں۔''

''کچھ ہم اس وقت کریں گے۔ جب ہمیں معلوم ہوگا کہ شہزاد خان کو لے جانے والے لوگ کون ہیں۔'' حسن علی نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ ہماری مدد کریں تو ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں شہزاد خان سے کون لوگ مل رہے تھے۔ کیا کوئی ایسا شخص یہاں پر بھی آیا تھا جسے آپ نہ جانتی ہوں۔''

''نہیں۔'' عورت کہتے کہتے رُک گئی۔ ''ہاں ایک ہفتے پہلے رات گئے بابو بھائی کے ساتھ ایک شخص آیا تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شہزاد سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہے تھے اس لیے اسے ساتھ لے گئے تھے۔ شہزاد خاصی دیر سے واپس آیا تھا۔''

''یہ بابو بھائی کون ہے؟'' حسن علی نے اسے بہ غور دیکھا۔

''بابو بھائی اس کی مارکیٹ میں آٹو پارٹس کی دکان ہے۔ شہزاد کے گیراج سے دائیں طرف چوتھی دکان ہے۔''

''اور بابو بھائی کیسا آدمی ہے۔''

عورت جیسے پھٹ پڑی تھی۔ ''شہزاد کی تباہی کا ذمے دار یہی شخص ہے۔ اس سے ملنے سے پہلے شہزاد ایک اچھا شوہر اور باپ تھا لیکن اب اسے نہ میری پروا ہے اور نہ بچوں کی۔ وہ شراب پیتا ہے اور ساری کمائی جوئے میں اُڑا دیتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بیسواؤں کے پاس بھی جاتا ہے۔'' عورت کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ''اسے بابو بھائی نے اس لائن پر لگایا ہے۔ وہ خود بھی خراب آدمی ہے اور دوسروں کو بھی خراب کرتا ہے۔''

''اس کے ساتھ آنے والا آدمی کیسا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا حلیہ کیا تھا؟''

عورت سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''ذرا بھاری جسامت کا شخص تھا۔ سانولا رنگ، پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے بھورے رنگ کا مسہ تھا اور سر پر سیاہ گھنگھریالے بال تھے۔ جیسے





مکرانیوں کے ہوتے ہیں۔''

عورت کا مشاہدہ اچھا تھا اور اس نے اس شخص کا خاصا واضح حلیہ بتا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہاں سے کھسک لینا چاہیے اس سے پہلے کہ عورت تک اس کے شوہر کے مقتول ہونے کی خبر پہنچے اور ہم بلاوجہ شبے کی زد میں آ جائیں لیکن شاید مجھے تاخیر ہوگئی تھی۔ اس لمحے باہر سیڑھیوں پر شور اٹھا کچھ لوگ اس طرف آ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' میں نے حسن علی کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شور اس نے بھی سن لیا تھا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب بھانڈا پھوٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت دروازے پر کسی نے جان توڑ دستک دی اور چلایا۔ ''بھابی دروازہ کھولو جلدی۔''

''خدا خیر کرے۔'' عورت کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ ''ارے کیا دروازہ ہی توڑ ڈالو گے۔''

دروازے کے باہر چار پانچ افراد افسردہ کھڑے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر عورت کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ''کیا ہوا بھیا خیریت تو ہے۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شہزاد تو خیریت سے ہیں۔''

''نہیں بھابی۔'' ایک شخص نے ہمت کر کے کہا۔ ''شہزاد بھائی کو دکان پر کسی نے گولی مار دی۔ وہ......وہ۔'' آواز اس شخص کے گلے میں پھنسنے لگی تھی۔ عورت سمجھ گئی تھی اس نے منہ سے چیخ نما آواز نکالی اور اس نے گھوم کر ہمیں دیکھا۔

''مار دیا۔ ان لوگوں نے میرے شوہر کو مار دیا۔''

لوگوں کی نظریں ہم پر جم گئی تھیں۔ پھر وہ جارحانہ انداز میں ہماری طرف بڑھنے لگے۔ اس لمحے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔



میں چونکا تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جب کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ دوسرا شخص تھا جو پڑا سو رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ یعنی مجھے سوتے ہوئے چار گھنٹے گزرے تھے۔ اسے نیند کے بجائے غنودگی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ چہرے مہرے سے وہ عرب نژاد لگتا تھا۔ وہ خاصا کم عمر تھا مگر اس کے چہرے پر دنیا جہان کا تجربہ تھا۔ رُخساروں پر ہلکی سی داڑھی تھی جیسے ہفتے بھر سے شیو نہ کی ہو۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ اس نے بگڑی ہوئی انگریزی میں دریافت کیا۔

''کون ہو تم؟'' اس کا لہجہ کچھ فرانسیسی تھا۔ ویسے بھی عرب لہجے کے لحاظ سے فرانسیسی لگتے ہیں۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''انسان ہوں اور تم کون ہو؟''

وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت جھلکنے لگے۔ ''انسان تو میں بھی ہوں۔''

''پھر تو ہماری خوب گزرے گی۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے یوسف علی خان کہتے ہیں۔''

''عبید صلاح۔'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''مسلمان ہو؟''

''ظاہر ہے۔'' میں مسکرایا۔

''لیکن تمہارا رنگ روپ تو ان سؤروں جیسا ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے یورپ والوں جیسا۔''

''میرا تعلق پاکستان سے ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا اور پھر سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا تعلق اصل میں کہاں سے تھا۔

''پاکستانی۔'' اس بار اس نے زیادہ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا تعلق امارات سے ہے۔ میرا قبیلہ شام سے آیا تھا۔''

گویا میرا اندازہ درست تھا۔ عربوں میں سب سے خوب صورت نقوش شامی اور فلسطینی





عربوں کے ہوتے ہیں۔ لبنانی بھی ان ہی کی نسل سے ہوتے ہیں اور ایک زمانے میں بیروت مشرق کا پیرس ہوا کرتا تھا۔ جس کی راتیں پری چہروں کے جلوؤں میں جاگا کرتی تھیں۔ عبید صلاح کا تعلق اس سرزمین سے تھا۔ اس کے سبک نقوش اس بات کی گواہی دیتے تھے۔

''تم بھی قیدی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''اپنی خوشی سے کون قید ہوتا ہے۔''

''کس چکر میں پکڑے گئے؟''

''چکر تو بڑا طویل ہے۔'' اس نے طویل سانس لی۔ ''مگر فی الوقت میں ان کے ہاتھ آ گیا اس لیے پکڑا گیا۔ یہ لوگ عرصے سے میری تلاش میں تھے۔''

''تمہارا جرم کیا ہے؟''

''جرم تو نہیں تم اسے خواہش کہہ سکتے ہو آزاد رہنے کی خواہش جو اس کے علم برداروں کو برداشت نہیں ہے۔''

''تم فلسطینی حریت پسند ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں صرف حریت پسند ہوں۔''

اس کے بعد کیبن میں خاموشی چھا گئی۔ پورٹ ہول سے سمندر کی آواز آ رہی تھی۔ کبھی کبھی انسانوں کی آوازیں بھی آتی تھیں لیکن ان سب پر ایک مدھم مگر مسلسل گونجتی آواز غالب تھی۔ یعنی انجن کی آواز اس بوٹ کا انجن خاصا طاقتور محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی بوٹ کم سے کم بیس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ میں جان گرے اور ان قزاقوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بحیرہ عرب جیسی مصروف تجارتی شاہراہ پر یہ لوگ اتنے بے دھڑک ہو کر قزاقی کر رہے تھے۔ اتنی دیدہ دلیری تو سپر ہائی وے پر ڈاکو حضرات بھی نہیں دکھاتے۔

آج کے دور میں بحری قزاقی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے سدِباب اور بحری شاہراہوں کو محفوظ بنانے کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ کام کرتا ہے جو انٹرپول کا ایک حصہ ہے۔ اسے آپ بحری پولیس بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو مصروف بین الاقوامی سمندری راستوں کی نگرانی کرتی ہے۔ بحری قزاقی کے انسداد کے لیے نہایت سخت قوانین ہیں۔ قزاقوں کے لیے لوٹا جانے والا سامان بھی ٹھکانے لگانا آسان نہیں ہوتا اور بڑے بحری جہازوں کو لوٹنا بھی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ شپنگ کمپنیاں، صنعتی ادارے اور تجارتی ادارے زیادہ تر ملٹی پل کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔ جو عالمی طور پر بے حد اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ اگر قزاق ان کو نقصان پہنچائیں تو یہ اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت نہیں کرتی ہیں۔ ان کے اشارے پر بڑی طاقتیں حرکت میں آ جاتی ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ قزاقوں کا گروہ بے حد طاقتور تھا۔ ان کی طاقت کا اظہار اس بوٹ سے بھی ہوتا تھا۔ اسے بنوانا کسی عام فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس بوٹ پر مہلک

ہتھیار بھی ہوں گے۔ جیسے اینٹی شپ میزائل، یہ گروہ اتنا جراُت مند تھا کہ دھڑلے سے لوٹا ہوا سامان کسی عالمی منڈی میں فروخت کرتا ہوگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ صرف بحری قزاقی تک محدود نہیں تھا۔ اس گروہ میں جان گرے جیسے افراد کی موجودگی بتا رہی تھی کہ اس گروہ کے مقاصد در پردہ اور ہی تھے۔ میں نے گزشتہ چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ صبح جو شخص مجھے یہاں چھوڑنے آیا تھا اس نے نو بجے ناشتہ ملنے کی نوید سنائی تھی لیکن جب ناشتہ آیا ہوگا تو میں سو رہا ہوں گا۔ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ دوپہر ہو چکی تھی لیکن لنچ کا نام ونشان نہیں تھا۔

''یہاں کھانے پینے کا کوئی رواج نہیں ہے۔'' میں نے عبید سے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ ''ہم قیدی ہیں اور جیل کا مینول قیدی کی مرضی سے نہیں بنتا۔ اگر ان کا موڈ ہوگا تو لنچ آ جائے گا۔ ورنہ رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

دروازے پر کھٹکا ہوا اور دروازہ کھلا۔ اندر آنے والے کے ہاتھ میں ایک عدد ٹرے تھی۔ جس میں رکھے پیالوں میں اُبلے ہوئے چاول تھے۔ ساتھ ہی اُبلی ہوئی مچھلی کے قتلے تھے۔ عبید نے کہا۔

''چلو تمہاری دعا تو پوری ہوئی۔''

وہ صبح ناشتہ کر چکا تھا اور اس نے لنچ میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ بھوک کے باوجود میں نے بدمزہ اُبلے چاول اور مچھلی حلق سے اُتاری تھی اور وہ سب صاف کر گیا تھا۔ اس نے ایک ڈکار لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ''کمبخت گھٹیا چاول پکاتے ہیں۔''

''ظاہر ہے قیدیوں کو یہ اچھا چاول تو نہیں کھلائیں گے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بوٹ پر راشن میں یہی چاول ہے۔ سب کو یہی ملتا ہے۔ دراصل بوٹ کا باورچی بیمار ہے اور جس شخص کو قائم مقام باورچی بنایا گیا ہے اسے صرف یہی بنانا آتا ہے۔ جب تک باورچی ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ ہم سب کو اس پر گزارا کرنا پڑے گا۔''

''کیا ہمیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے؟''

اس نے کندھے اُچکائے۔ ''کم از کم مجھے نہیں ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ میں سمندر میں کود کر فرار نہ ہو جاؤں۔ میں پہلے بھی ایک بار اسی طرح فرار ہو چکا ہوں۔''

''سمندر کے راستے تمہیں کسی شارک نے نہیں کھایا۔''

''ضرور کھا لیا ہوتا اگر میں تیر کر فرار ہوتا۔ میں نے کیا یہ کہ جہاز میں ایک طرف آگ لگائی اور دوسری طرف سے کشتی لے کر فرار ہو گیا۔''

''یعنی تم کامیاب رہے۔''

''کہاں بھائی۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''ایک گھنٹے بعد میری کشتی کا تیل ختم ہو گیا اور انہوں نے مجھے آرام سے آ پکڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشتی میں ایک ایسا آلہ لگا تھا جو سگنل دے کر اپنی





پوزیشن بتاتا تھا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اگر آلہ نہ ہوتا تو یہ مجھے تلاش نہ کر پاتے اور میں بھوکا پیاسا اللہ کو پیارا ہو جاتا۔'' وہ کہتے کہتے چونکا۔ ''تم کون ہو اور تمہارا قصور کیا ہے۔''

''میں ایک شپ ایس ایس خلیج پر چیف انجینئر ہوں اور قصور میرا خاصا سنگین ہے۔ میں نے ایک حرامی قسم کے گورے کا تخریب کاری کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس بات پر چراغ پا ہوگا۔ اتفاق سے وہ کشتی پر موجود ہے وہی مجھے گرفتار کر کے لایا ہے۔''

''تم جان گرے کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟'' اس نے بہ غور مجھے دیکھا۔

میں چونکا۔ ''تم کیسے جانتے ہو اسے؟''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کو تو سمندر کی مچھلی مچھلی جانتی ہے۔ اتنا...... آدمی آج تک سینۂ سمندر پر نہیں آیا ہوگا۔'' اس نے جان گرے کو ایک ناقابل اشاعت لفظ سے نوازا۔

''اسے ان قزاقوں کے ساتھ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''یا تو تم احمق ہو یا اس فیلڈ میں نئے آئے ہو۔''

''دوسری بات درست ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں نے سال بھر پہلے ہی میرین انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی ہے۔''

''اسی وجہ سے تم اس خبیث آدمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ سمندر کا شیطان ہے اور قزاقوں سے اس کے روابط خاصے عرصے سے ہیں۔ یہ ان کے لیے مخبری بھی کرتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے قزاق کامیاب چھاپے مار کر بحری جہازوں کو لوٹ رہے ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''اور اس کے باوجود اسے بین الاقوامی شپنگ کمپنیوں میں کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔''

''یہ بڑی پیچیدہ سیاست ہے۔'' اس نے مختصر سے کیبن میں ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ڈانڈے بین الاقوامی سیاست سے بین الاقوامی تجارتی سیاست سے جا ملتے ہیں۔ تم کچھ عرصے ان کے ساتھ رہو گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ آکٹوپس ہیں جو رفتہ رفتہ اس سمندر میں اپنے بازو پھیلا رہے ہیں۔''

میں نے غور کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ان کو عالمی طاقتوں کی مدد حاصل ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' اس نے شانے ہلائے۔ ''اس کے بغیر یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی گن بوٹ تمہارے خیال میں کن ممالک کے شپ یارڈ بنا سکتے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی بوٹ نہیں ہے۔ اس میں سمندر کے اوپر اس کے نیچے اور فضا میں کسی کو بھی نشانہ بنانے کی مکمل صلاحیت ہے۔ اس خطے کی کسی بحری طاقت کے پاس اتنی جدید گن بوٹ نہیں ہے۔ ان کے پاس اس سے بھی بڑے بحری جہاز ہیں۔''

''گویا یہ سمندری مافیا ہوئی۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہماری منزل

کہاں ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ بحر ہند میں ان کے اڈے ہیں۔ جہاں سے نکل کر یہ قزاقی کرتے ہیں لیکن یہ اڈے کہاں ہیں کوئی نہیں جانتا اور اگر جانتا بھی ہے تو زبان نہیں کھولتا۔"

"جیسے تم زبان کھولتے ہوئے ڈر رہے ہو۔" میں نے اسے اُکسایا۔

اس نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔ "یہ بات تم نے کہی ہے تم مجھے اچھے لگتے ہو ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ عبید صلاح کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرے قبیلے کے لوگ اس لفظ سے نا آشنا ہیں۔"

"سوری۔" میں نے معذرت کر لی۔ "تمہارا دل دُکھا۔"

"بزدلی سے بڑھ کر ہمارے ہاں کوئی گالی نہیں ہے۔" اس نے دوبارہ نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا باپ قبیلے کا بہادر ترین آدمی تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں اس شیخ سعادت صلاح کی اولاد ہوں۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں باقاعدہ دراز ہو کر سو گیا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے عبید صلاح کی نظر بچا کر اپنا پستول گدے کے نیچے رکھ دیا۔ سونے کے دوران اس کے سامنے آ جانے کا خطرہ تھا۔ سونے کے معاملے میں مَیں ہمیشہ خوش قسمت رہا ہوں۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے منٹوں میں نیند آ جاتی تھی۔ اب بھی میں لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ میرا ساتھی خراٹے لے رہا تھا۔ قید میں اس کا سکون قابلِ رشک تھا۔ کیبن کے ساتھ ہی ایک مختصر سا باتھ روم تھا۔ جہاں بہ مشکل ہی ضروریات سے فارغ ہوا جا سکتا تھا مگر ان حالات میں یہ بھی غنیمت لگتا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا تھا کہ دروازہ کھلا میرا خیال تھا کہ رات کا کھانا آیا ہوگا لیکن اس کے بجائے آنے والے نے اشارے سے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ پینتالیس کا پستول تھا اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ میرے باہر آتے ہی اس نے دروازے کو لاک کر دیا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

میں اس کے آگے چلنے لگا۔ دوسری راہداری سے گزر کر ہم ایک گیلری میں آئے۔ یہ بوٹ کا بائیں طرف کا حصہ تھا جہاں قطار سے کیبن بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے کہا۔ "یس۔"

اس نے مجھے اندر چلنے کو کہا۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو وہ میرے پیچھے تھا۔ کیبن خاصا پُرتعیش تھا اور یہاں جان گرے شراب و شباب کے لوازمات کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کا جام تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک سانولی سلونی سی حسینہ تھی۔ اس کا تعلق شاید بنگال سے تھا۔ بلاشبہ اس کی سیاہ آنکھوں اور سیاہ زلفوں میں جادو تھا۔ نقوش عام سے تھے۔ مگر اس کے جامے سے





ابھرتا شباب زُہد شکن تھا۔ مجھے دیکھ کر جان گرے نے لڑکی کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ خاصے نشے میں تھی اور نشیلی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"جان یہ ہینڈسم کون ہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"ہنی تم ذرا جا کر عرشے پر ہوا کھا آؤ۔" جان گرے نے پیار سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔ "میں یہیں رہوں گی۔"

پوری قوت سے مارا جانے والا تھپڑ لڑکی کے ساتھ میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ لڑکی بستر سے اچھل کر نیچے جا گری تھی۔ جان گرے نے دوبارہ اسی لہجے میں اس سے کہا۔ "ہنی میرا خیال ہے اب عرشے پر ہوا کھانا تمہاری طبیعت کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔" ہنی نے خوف زدہ ہو کر اپنے ناکافی لباس کو سمیٹا اور کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جان گرے نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "بیٹھو مسٹر جوزف۔" اس نے میرے نام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے لانے والا شخص پوری طرح چوکس میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کے مہلک پستول کی نال میرے سر سے کچھ ہی دور تھی۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے جام والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ "مسٹر یوسف تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں ساتھ کیوں لایا ہوں؟"

"مجھے اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں تمہارا قیدی ہوں اور میرے بارے میں تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اس کے برعکس اگر میں کہوں کہ میرے ارادے تمہارے بارے میں نیک ہیں اور خلیج سے لا کر میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے تو؟"

"میں اسے ماننے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مسٹر یوسف۔" یکلخت وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "درحقیقت میں نے تمہارے ساتھ نیکی ہی کی ہے۔ ورنہ اس وقت تم سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بن رہے ہوتے۔"

"اس بارے میں بھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ بالآخر میرے بارے میں تمہارا پروگرام کیا ہوگا۔"

وہ ہنسا۔ اس نے اپنے برابر میں پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کا رُخ اس ٹرالی کی طرف کیا۔ اس میں ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا۔ ٹی وی کی سکرین روشن ہو گئی۔ اس میں ایک بحری جہاز کا دھندلا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ اچانک میرا دل دھڑک اٹھا میں نے جہاز کو پہچان لیا تھا۔ یہ خلیج تھا۔ کیمرہ زوم ہونے لگا اور جہاز سکرین پر واضح ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے پہلو میں لکھا ایس ایس خلیج بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔ یکلخت جہاز کے مختلف حصوں میں شعلے بھڑک اٹھے تھے اور اس کے ٹکڑے

فضا میں اُڑ رہے تھے۔ اتنی دور سے آواز ریکارڈ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ورنہ خلیج پر ہونے والے دھماکے بھی سنائی دیتے۔ شاید کیمرہ بحری جہاز سے کئی میل کے فاصلے پر تھا۔

"دیکھا تم نے۔" جان گرے شیطانی انداز میں مسکرایا تھا۔ "میں نے تمہاری جان بچائی ہے ناں؟"

"تم...... ذلیل انسان۔" میں کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ پستول کی نال میرے سر سے چپک گئی۔ میں ساکت ہو گیا۔ اس وقت مجھے شدت سے افسوس ہوا کہ میں اپنا پستول کیبن میں کیوں بھول آیا تھا۔ ورنہ نتائج کی پروا کیے بغیر کم از کم جان گرے کا سر ضرور اُڑا دیتا۔ چاہے اس کے بعد خود میری کھوپڑی بھی اُڑ جاتی۔ جان گرے تمسخرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تیس افراد کے اس قتل عام پر اس کے چہرے پر ندامت کا ایک داغ بھی نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود کو ٹھنڈا کیا۔ اس وقت کوئی بھی جذباتی قدم مجھے مسائل سے دوچار کر دیتا۔

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"میں اکثر اچھا نہیں کرتا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے اور اس کی پروا بھی نہیں ہو گی۔"

"تم نے تیس بے گناہ افراد کی جان لی ہے۔ تم قاتل ہو۔" میں نے زور سے کہا۔

اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھ پر دباؤ مت ڈالو۔ میں ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی بہت سارے لوگ میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔"

"یوں بلاوجہ کسی کی جان لینا۔"

"بلاوجہ نہیں۔" اس نے حقارت سے کہا۔ "ان لوگوں نے میری توہین کی تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

"تمہارے تیس افراد تمہارے مجرم تھے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"جب ہاتھی لڑتے ہیں تو ان کے پیروں تلے چھوٹے موٹے حشرات الارض پس ہی جایا کرتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو میرا خون کھول اٹھا تھا۔

"اور مجھے کیوں بچایا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا مجرم تو میں ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "تمہیں بچانے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اول تو تم میرے ہم نسل ہو۔ دوسرے تم نے اس جہاز کو تباہی سے بچا کر میرے دل میں جگہ بنا لی ہے۔ میں نے جو گریپ لگایا تھا۔ اس کا توڑ تقریباً ناممکن تھا اور اسے ناکام بنانا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ میں ایسے لوگوں کی عزت کرتا ہوں۔"

"بہ شرط کہ وہ تمہارے ہم نسل ہوں۔" میں نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "بائی دی وے تمہیں یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ میں تمہارا ہم نسل ہوں۔"





وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیا جام بنایا۔ بوتل تقریباً ختم ہو چکی تھی اور یہ ابھی ختم ہوئی تھی تو شراب کے معاملے میں جان گرے کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ وہ نشے میں ضرور تھا لیکن اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"مسٹر یوسف بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور تمہارا پس منظر کیا ہے۔ اس وجہ سے میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ہم نسل ہو۔"

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ "تم میرے بارے میں جانتے ہو؟"

"ہاں میں نے کہا ناں کہ میں تمہارے پس منظر سے پوری طرح واقف ہوں۔"

اس لمحے میں بھول گیا کہ میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں اور اسے اپنے تیس ساتھیوں کا قاتل سمجھتا ہوں۔ مجھے تو بس یہ یاد رہا کہ وہ میرے بارے میں وہ کچھ جانتا تھا جو میں بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ "پلیز مجھے بتاؤ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔"

میرا اضطراب دیکھ کر وہ لطف اندوز ہونے لگا۔ "جلدی کیا ہے مسٹر یوسف ابھی تم میرے ساتھ ہی ہو۔ جلد تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے اپنی بے تابی پر قابو پانے کی کوشش کی پھر اس سے بولا۔ "مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تم نے بحری قزاقی شروع کر دی ہے۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "اسے بحری قزاقی نہ کہو۔ ہمارا مقصد بلند ہے۔"

"اس قسم کے اکثر کام کرنے والے بلند عزائم ہی رکھتے ہیں۔" میرے لہجے میں استہزاء تھا۔

"تم نہیں سمجھو گے خیر جلد ہی سب کچھ جان جاؤ گے۔" اس نے خالی جام برابر میں رکھی تپائی پر رکھا۔

"کیا قزاقوں کا یہ گروہ اس علاقے میں سرگرم ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم زیادہ ہی سمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" وہ اپنی سانپ جیسی چمکیلی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "تم نے یہی سب کچھ دکھانے اور سنانے کے لیے بلایا تھا؟"

"اس کی تمہارے نزدیک اہمیت نہیں ہے؟"

میں نے شانے اُچکائے۔ "میں زیادہ تجسس نہیں کرتا۔"

وہ مسکرایا جیسے میری بات پر شک کر رہا ہو۔ "میں نے کہا ناں زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش
"

"او کے میں نے مان لیا۔ میں مارے تجسس کے مرا جا رہا ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہاری گردن دبا کر سب کچھ اُگلوا لوں۔ اگر تمہارا یہ پالتو کتا نہ ہوتا تو شاید میں یہی کرتا۔"

میرے خطاب پر پستول بردار کا کان سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے غرا کر میری طرف دیکھا لیکن وہ سچ مچ پالتو تھا۔ اپنے مالک کی مرضی کے بغیر وہ دُم بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ جان گرے نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''یہ مت بھولو کہ تم ایک قیدی ہو۔''

''میں تو نہیں شاید تم یہ بات بھول گئے ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''شٹ اَپ۔'' جان گرے صبر کھو بیٹھا۔ ''اسے لے جاؤ۔'' اس نے گارڈ سے کہا۔

گارڈ نے اپنا بدلہ یوں نکالا کہ کیبن میں مجھے دھکا دے کر پہنچایا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسے یہ کام کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرنا پڑی تھی۔ زیرِ لب بک بک کرتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا دل ان لوگوں کے بارے میں سوچ کر دُکھنے لگا تھا۔ جو ایک جنونی انسان کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئے تھے جان گرے نے کتنی سفاکی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میرے جبڑے بھنچ گئے تھے اور سینے کے اندر کوئی چیز سلگنے لگی تھی۔

''کیا بات ہے دوست۔'' عبید صلاح نے بہ غور مجھے دیکھا۔ ''کیا کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ اگر میری خدمات چاہئیں تو میں حاضر ہوں اور اگر یہ چاہیے تو......'' اس نے میرا ہی پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔

''تم نے میرے جانے کے بعد میرے بستر کی تلاشی لی تھی۔'' میں نے اسے گھورا۔

''نہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''جب تم اسے بستر تلے چھپا رہے تھے تب ہی میں نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن میں دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ صرف تجسس کی وجہ سے نکال لیا تھا۔ اس وجہ سے تمہیں واپس کر دیا۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ...''

''کہ میں اس کے ہوتے ہوئے بھی یوں قید کیوں بیٹھا ہوں۔'' میں مسکرایا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اگر میرے پاس یہ پستول ہوتا تو میں اب تک کچھ نہ کچھ کر چکا ہوتا۔''

''ایک بات بتاؤ کہ تم نے ہاتھ میں آنے کے باوجود اسے واپس کیوں کر دیا؟''

''میں اپنے زورِ بازو کا قائل ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اتفاق سے میں بھی اس بات کا قائل ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ساتھ ہی میں دماغ ٹھنڈا بھی رکھتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنا دماغ ٹھنڈا نہیں رکھتا تو اسے کوئی چوہا بھی شکست دے سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے حسن علی یاد آ گیا۔

''ہمارے پاس دماغ ہی نہیں ہوتا۔'' عبید صلاح نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہم تو مارو یا مر جاؤ کے قائل ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے تم نے پستول مجھے واپس کر دیا۔'' میں نے بے اختیار کہا۔ ''ورنہ تم اپنے





ساتھ مجھے بھی مروا دیتے۔''

''میں کبھی کسی کی پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپتا۔''

''تم نے بتایا نہیں دوست کہ تم کس چکر میں یہاں ہو۔ ان سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''چکر بڑا لمبا ہے لیکن مختصراً اتنا بتا دوں کہ جان گرے میرے باپ کا قاتل ہے۔ یو اے ای میں جب وہ آئل کمپنی میں کام کر رہا تھا اور اس بدفطرت شخص نے ایک رات ایک کنویں میں آگ لگا دی تھی تو وہاں میرا باپ بھی موجود تھا۔ وہ آگ بجھانے کی کوشش میں جان سے گزر گیا تھا اور یہ کمینہ بچ نکلا تھا۔ اس کے خلاف تحقیقات ہوئی تھیں لیکن یہ عدالت سے بچ نکلا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے باپ کا قاتل یہی ہے اور مجھے جب موقع ملا اسے کتے کی موت مار دوں گا۔''

''جان گرے کی تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ایک روز اس نے سب عربوں کو گالی دی تھی۔ اس پر میرے باپ نے مشتعل ہو کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ وہ اس زخم کو نہیں بھولا تھا۔ ایک رات جب تیل کا وہ کنواں جہاں میرا باپ انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ صفائی کے لیے بند تھا۔ یہ کسی بہانے عین دھماکے کے وقت وہاں سے کھسک گیا اور اس کے جاتے ہی کنویں میں دھماکے سے آگ لگ گئی تھی۔ میرا باپ اس وقت تو بچ گیا لیکن واپس آ کر جان گرے نے میرے باپ کو آگ بجھانے کے آلات متحرک کرنے کے لیے کنویں کے پاس بھیج دیا۔ وہ اس سازش کو نہ سمجھ سکا۔ جیسے ہی جلتے کنویں کے پاس پہنچا دوسرے دھماکے نے آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا اور میرا باپ بُری طرح جھلس گیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے مجھے یقین سے بتایا تھا کہ کنویں کو کسی سازش کے تحت تباہ کیا گیا تھا کیونکہ بند کنویں میں اس طرح آگ نہیں لگ سکتی ہے اور یہ سازش جان گرے کی تھی۔ اس کا مقصد میرے باپ کو مارنے کے ساتھ کمپنی کا نقصان بھی کرنا تھا۔''

''یہ جان گرے بچ کیسے نکلا؟''

''بس قسمت تھی؟'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''میں نے کوشش کی تھی لیکن گولی اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے بعد جو یہ بزدل بھاگا تو اگلے دو سال تک اس کا کوئی سراغ ہی نہیں ملا مگر میں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ حیرت انگیز طور پر یہ اکثر ساحلی عرب ریاستوں میں نظر آتا تھا اور اس کا ملنا جلنا مشکوک لوگوں سے تھا۔ کئی بار یہ سمندر میں بحری جہازوں اور کشتیوں پر نظر آیا۔ میرا جذبہ تجسس انتقام پر غالب آنے لگا اور میں اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح اس اسرار سے پردہ اٹھاؤں۔''

''اور پھر تم یہاں آ پھنسے؟''

''نہیں...... پھنسا تو میں پہلے تھا۔ میں جان گرے کی تاک میں تھا اور اس کے آدمیوں نے مجھے میرے دو دوستوں سمیت اغوا کر لیا۔ ہمیں عمان میں ایک صحرائی مکان میں قید رکھا گیا تھا۔ جان

گرے وہاں مجھ سے ملنے آ رہا تھا۔ اس مکان میں ہم پر کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ اس مکان میں ایک صحرائی بدو جوان کا ملازم تھا۔ دراصل ان سے منحرف ہو گیا تھا۔ اسے ہم سے ملنے کا موقع ملا تو اس نے بتایا کہ جان گرے کا تعلق ایک مافیا ٹائپ کی تنظیم سے ہے جو علاقے میں مخصوص مفادات کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس کا مقصد مقامی عرب اور مسلمان ریاستوں کو کمزور بنانا ہے۔ پھر اس بدو نے ہمیں وہاں سے نکل بھاگنے میں مدد کی لیکن ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ جان گرے اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ اپنے ساتھ نیم مردہ حالت میں بدو کو بھی لائے تھے۔ اسے انہوں نے ہمارے سامنے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد مقابلے میں میرے دونوں دوست بھی مارے گئے۔ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس حالت میں کہ میرے جسم میں دو گولیاں لگی ہوئی تھیں۔''

''پھر تم بچے کیسے؟'' میں نے کہا۔

''بس خدا کی قدرت کہہ لو۔ اسے میری زندگی مقصود تھی۔ جان گرے اور اس کے ساتھی شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں تھے کہ اچانک صحرائی ٹڈی دل نے حملہ کر دیا۔ یہ کیڑے بادل کی طرح آئے اور ہر طرف چھا گئے۔ جانداروں کے لیے یہ خطرناک نہیں ہوتے۔ ہاں نباتات کو بالکل نہیں چھوڑتے۔ جان گرے اور اس کے بزدل ساتھی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ میرا تعاقب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حالانکہ میں ان سے بہ مشکل سو گز دور ایک ٹیلے کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ خون بہہ جانے سے میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ آگے جانے کے بجائے میں وہیں لیٹ گیا۔ میری خوش قسمتی کہ رات کو اس طرف سے خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گزر رہا تھا۔ ان کے کتوں نے میرے خون کی بُو سونگھ لی۔ قبیلے والے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گولی کے زخموں کا یہ بہت اچھا علاج کرتے ہیں۔ کیونکہ ان جنگ پسند قبیلوں کو آئے دن اس قسم کے زخموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ایک ہفتے بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو انہوں نے مجھے ایک اونٹ اور زادِ راہ دے رخصت کیا تھا۔ تیسرے دن میں واپس اپنے گھر پہنچ گیا تھا جب کہ گھر والے مجھے مردہ تصور کر چکے تھے۔ اس کے بعد سے ہم دونوں میں آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے۔''

''تم اس بوٹ تک کیسے پہنچے؟''

''اس بات کا سراغ بڑی مشکل سے ملا کہ خلیج کے پانیوں میں اکثر نظر آنے والی یہ بوٹ دراصل اس مافیا کی ہے جان گرے جس کے لیے کام کرتا ہے۔ میں اور میرے کچھ ہم خیال دوست اس کے خلاف میدان میں اُتر آئے تھے۔ اگرچہ ہم ان کے مقابلے میں وسائل سے محروم ہی تھے لیکن ہمارے اندر ایک جذبہ تھا۔ میرے ایک دوست نے کسی ذریعے سے معلوم کیا کہ یہ بوٹ اکثر بحری قزاقی میں استعمال ہوتی ہے۔ حکومت سے شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ علاقے میں کسی ملک کی بحریہ سوائے ایران کے اتنی طاقتور نہیں ہے کہ ان قزاقوں کا سدِ باب کر سکے لیکن ایران کو





سوائے اپنی سمندری حدود سے آگے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حالانکہ ایران کے تجارتی جہاز بھی ان کا نشانہ بنتے ہیں۔''

''انٹرپول ان کے خلاف کچھ نہیں کرتی؟''

''انٹرپول۔'' عبید صلاح ہنسا۔ ''یہ مافیا جن لوگوں کے لیے کام کرتی ہے۔ اتفاق سے انٹرپول بھی ان ہی لوگوں کے لیے کام کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک دوسرے کے مخالف کیسے ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس مصروف سمندر میں انٹرپول کا گشت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کا سارا زور بحرہ روم اور بحرہ اوقیانوس پر ہوتا ہے کیونکہ وہ سمندر مغرب کے تجارتی مفادات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''یعنی یہ گروہ عالمی طاقتوں کے مفاد کے لیے کام کر رہا ہے؟''

عبید صلاح نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ تالا کھلا اور ناشتہ لانے والا رات کا کھانا لے کر اندر آیا۔ یہ دبلا پتلا گہرے سانولے رنگ کا لڑکا شاید سری لنکن تھا۔ اس نے ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔ مینو وہی تھا۔ یعنی اُبلے ہوئے چاول اور مچھلی، نمک اور مرچ کے بغیر بالکل پھیکے میں نے دوپہر کو بھی یہ چاول اور مچھلی بہ مشکل ہی کھائی تھی پھر کپتان صلاح دین اور عملے کے دیگر افراد کی موت کی خبر نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اس پر میرے حصے کا بھی عبید صلاح چٹ کر گیا تھا۔ اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کمینے لوگ ہیں کبھی دل نہیں کرتا تو پورا پورا دن کھانا نہیں دیتے۔ لہٰذا جب کھانا ملے بلا تکلف کھا لو چاہے جیسا بھی ہو۔''

میں نے عبید صلاح کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ مجھے احمد علی یاد آ رہا تھا جو بھوک کا بہت کچا تھا۔ جس کا بڑا سا کنبہ تھا اور وہ اس کا واحد کفیل تھا۔ اس کی ماں اور بہن بھائی ساری عمر اس کی راہ تکتے رہیں گے۔ مجھے گپتا یاد آ رہا تھا۔ ہنسی مذاق کرنے والا سب کا دوست، اس کی بیوی ایک بار پھر ماں بن رہی تھی اور اس کا بدنصیب بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی یتیم ہو گیا تھا۔ عراقی معاذ حسین جو تلخ مزاج اور کھردرا تھا لیکن اسے اپنے شپ سے پیار تھا۔ وہ ہر وقت اس کے لیے فکرمند رہا کرتا تھا۔ غالباً سمندر میں دونوں ساتھ ہی ساتھ تھے۔

کھانا کھا کر عبید صلاح پیر پھیلا کر خراٹے لینے لگا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر پورٹ ہول سے باہر جھانکا۔ سمندر رات کی تاریکی میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے انجن کی گنگناہٹ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس کی رفتار سست ہو رہی تھی کچھ دیر بعد واضح ہو گیا تھا کہ بوٹ کی رفتار مسلسل سست ہو رہی تھی۔ کیا کوئی منزل آ گئی تھی؟ میں نے سوچا اور پورٹ ہول سے باہر جھانکنے کی پوری کوشش کی۔ محض چھ انچ کے اس پورٹ ہول سے میں سر بھی باہر نہیں نکال سکتا تھا لیکن بستر پر کھڑے ہو کر میں اس قابل تھا کہ کسی حد تک اس کے دائیں بائیں نظر دوڑا سکوں۔ باہر

عرشے پر بھاگ دوڑ محسوس کی جا سکتی تھی۔ معاً بوٹ ذرا سی ڈگمگائی اور میں نے سمندر میں ذرا دور ایک سیاہ لکیر دیکھی۔ کیا یہ کوئی جزیرہ تھا یا محض میرا وہم؟

اب بحری جہاز خاصی سُست روی سے بلکہ پھونک پھونک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے اگلے عرشے پر نصب سرچ لائٹیں آن کر دی گئی تھیں۔ جن کا اجالا منعکس ہو کر یہاں تک آ رہا تھا۔ باہر لہریں بڑی ہو گئی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کسی ساحل کے نزدیک تھے۔ جہاں سمندر کے کنارے چٹانیں تھیں۔ اس قسم کا ساحل جو کسی قدر ہلالی شکل کا ہو وہاں بڑی لہریں اٹھتی ہیں۔ یہاں زیرِ آب چٹانوں کی موجودگی عین ممکن تھی شاید اس بنا پر بحری جہاز کو نہایت احتیاط سے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیا یہاں کوئی ایسی بندرگاہ تھی جو اس چھوٹے بحری جہاز کو سنبھال سکے اس کا وزن کم سے کم پانچ سو ٹن تھا۔

ساحل کی لکیر اب مجھے بغیر کسی دقت کے نظر آ رہی تھی میرے اندازے کے عین مطابق یہ طویل فاصلے تک پھیلا ہوا پتھریلا ساحل تھا۔ جس کے کنارے خاصی بلند چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا۔ معاً بحری جہاز نے عجیب سی حرکت کی۔ وہ گھوم گیا جیسے ساحل کے متوازی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب ساحل پوری طرح میرے سامنے تھا۔ اس کا گھماؤ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ شاید یہ جزیرہ تھا۔ بحری جہاز شاید فٹ فٹ کر کے آگے کھسک رہا تھا اور جب وہ دو چٹانوں کے درمیان سے گزرا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ ان چٹانوں کے درمیان اتنا خلا تھا کہ جہاز ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہوتا تو چٹانوں سے ٹکرا جاتا۔ ان کے درمیان سے اس جہاز کو گزارنا بلاشبہ مہارت کا کام تھا۔ اب جہاز ایک مختصری خلیج میں تھا۔ جہاں پانی بالکل پُرسکون تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ باقی سمندر سے الگ تھی۔ شاید چاروں طرف سے گھری ہوئی اور اس میں داخلے کا راستہ صرف وہی تھا جہاں سے بحری جہاز گزر کر اندر داخل ہوا تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ جہاز ایک بار پھر سُست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تاریکی شدید ہو گئی تھی۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر بادل آنے سے تاروں کی معمولی سی روشنی بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں پورٹ ہول سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جہاز کی روشنیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ جہاز تو رُک گیا تھا معاً ایک جھٹکا سا لگا تھا اور اس نے ایک اور غیر معمولی حرکت کی یعنی آگے یا پیچھے جانے کے بجائے دائیں طرف جانے لگا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جہاز اس قسم کی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ چند لمحے بعد میری سمجھ میں آ گیا کہ جہاز کو کسی قسم کے میکنزم کی مدد سے کھینچا جا رہا تھا۔ دنیا کی بعض مختصری بندرگاہوں میں اس قسم کے میکنزم ہوتے ہیں جن کی مدد سے بحری جہازوں کو بندرگاہ لایا یا نکالا جاتا ہے۔

جہاز کیونکہ بائیں سمت میں کھینچا جا رہا تھا۔ اس لیے میں دیکھ نہیں سکا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ اچانک جہاز ایک دھچکے سے رُک گیا۔ تاریکی کا احساس شدید ہو گیا تھا جیسے ہم کسی بند جگہ پر آ





گئے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی باہر چہل پہل کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ساتھ ہی سامان رکھنے اٹھانے اور گھسیٹنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں واپس آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بوٹ نے جنوب مغرب کی سمت کوئی بیس گھنٹے مسلسل سفر کیا تھا اور اس کی رفتار بیس ناٹ فی گھنٹہ رہی تھی گویا ہم کوئی چار سو میل کے فاصلے پر آ چکے تھے۔ جہاں خلیج کو طوفان کے دوران میں لنگر انداز کیا گیا تھا۔ وہ جگہ بمبئی سے کوئی ڈیڑھ سو ناٹ کے فاصلے پر جنوب مغرب میں تھی۔ گویا یہ جگہ سعودی عرب کے شمال مشرقی ساحل کے آس پاس تھی۔ ممکنہ طور پر کوئی جزیرہ تھا اگر یہ ان بحری قزاقوں کا مرکز تھا تو خاصی تعجب کی بات تھی۔ وہ ایک بین الاقوامی بحری شاہراہ کے خاصے نزدیک تھے۔ جو ایران، برصغیر اور عرب ممالک کو افریقہ اور بحیرہ قلزم سے ملاتی تھی۔ ان کی دیدہ دلیری حیرت انگیز تھی۔

رات بھر جاگنے کے بعد مجھے اونگھ آ رہی تھی لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کب کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔ میں چوکنا رہنا چاہتا تھا تاکہ بے خبری میں نہ مارا جاؤں۔ میں نے پستول کو اپنی یونیفارم میں پتلون میں قمیص کے نیچے سے نکال کر دائیں پیر کے موزے میں اڑس لیا تھا۔ تلاشی کے دوران یہاں اس کے چھن جانے کے امکانات کم تھے۔ مجھے یہ بھی تعجب تھا کہ اس بوٹ پر کسی نے میری تلاشی لینے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی اور پستول اب تک میرے پاس تھا اگر موقع ملتا تو میں نو افراد کو جہنم رسید کر سکتا تھا۔ جن میں سرِفہرست جان گرے کا نام نامی ہوتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں نو افراد کو مار کر بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو وہ مجھے فرار ہونے ہی نہ دیتے اور اگر کسی طرح میں کشتی سے نکل بھی جاتا تو آگے سمندر میں کہاں جاتا۔ فی الوقت میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔ مستقبل میرے لیے نہ جانے کیا لانے والا تھا۔ مجھے شاید اونگھ آ گئی تھی جب کھٹکے نے مجھے چونکایا تھا۔

دروازے پر رات والا گارڈ کھڑا خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''اٹھ جاؤ۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''تم لوگوں کے فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ اٹھاؤ اس لاٹ صاحب کو۔''

''میں جاگ رہا ہوں۔'' عبید صلاح نے اُچھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کالے منہ والا بندر کیا بکواس کر رہا ہے۔''

اس خطاب پر حبشی گارڈ نے خون خوار نظروں سے اسے دیکھا۔ ''بہت چہک رہے ہو۔ ابھی ساری بکواس نکل جائے گی۔''

''اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے عبید صلاح کو سمجھایا۔ ''میرا خیال ہے یہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''میں انہیں کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جو اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر بھونکتے اور کاٹتے ہیں۔''

سیاہ فام گارڈ نے اپنا لیوگر پسٹل عبید صلاح کی طرف سیدھا کیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''لگتا

ہے تم ابھی مرنا چاہتے ہو۔ مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔''

مجھے اس کے انداز سے لگا کہ وہ سچ مچ گولی چلا دے گا اور عبید صلاح مارا جائے گا جو بے خوفی سے اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''خاموش رہو۔ یہ اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہے۔ دنیا میں ہر فرد مجبور ہے۔''

میری بات نے گارڈ کے تنے اعصاب کو کسی قدر ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ قاتل لمحہ گزر گیا۔ جب وہ ٹریگر دبا کر عبید صلاح کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا لیکن اس کے غصے میں کمی نہیں آئی تھی۔ کینہ پروری میں وہ کسی طرح جان گرے سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف جلد کی رنگت کا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا تھا۔ اس نے ہمیں باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ خاص قسم کے لچکدار میٹریل سے بنی یہ ہتھکڑیاں مضبوطی کے معاملے میں فولاد سے کم نہیں تھیں۔ کسی بھی انسان کے لیے انہیں توڑنا تقریباً ناممکن تھا۔

باہر دن نکل چکا تھا۔ ہم عرشے پر آئے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور اس برتھ کی ساخت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ جس کے کنارے کاٹ کر برتھ بنائی گئی تھی۔ یہاں پر پانی اتنا گہرا تھا کہ اتنی بڑی کشتی آرام سے لنگر انداز ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس میں کئی بڑے بحری جہاز آسانی سے آسکتے تھے۔ برتھ اتنی طویل تھی کہ اس پر اس جیسی کئی کشتیاں لنگر انداز ہو سکتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے سامنے پانی اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا کہ کوئی بھی بڑی جسامت کی کشتی ازخود لنگر انداز ہوسکتی۔ اس کے لیے میکنزم کا طریقہ اپنایا گیا تھا۔ کوئی بھی بحری جہاز اس کی مدد سے کھینچ کر برتھ تک لایا جا سکتا تھا اور اس میکنزم کی مدد سے اسے باہر بھی نکالا جا سکتا تھا۔ سب سے حیرت انگیز چیز برتھ کے اوپر کی چٹان تھی جو کسی چھجے کی طرح تقریباً بیس پچیس گز اونچی تھی۔ اس چھت نے اس مختصر سی بندرگاہ کو بالکل چھپا دیا تھا۔ فضا سے اس کا دیکھ لیا جانا قطعی ناممکن تھا اور سمندر سے بھی اسے صرف اس وقت دیکھا جا سکتا تھا جب دیکھنے والا خلیج میں موجود ہو۔ کھلے سمندر سے نظارے میں درمیان میں بلند چٹانیں آجاتی تھیں جنہوں نے چاروں طرف سے خلیج کو گھیر رکھا تھا۔

برتھ پر اس جیسی دو اور کشتیاں موجود تھیں اور وہاں خاصی رونق تھی۔ نیلی وردیوں میں ملبوس کارکن مختلف کاموں میں مصروف تھے اور ہر کارکن کے سینے پر ایک کارڈ لگا تھا جس میں اس کی تصویر اور نام وغیرہ تھا۔ غالباً اس کا مقصد کسی اجنبی شخص کو اس جگہ آنے سے روکنا تھا۔ کچھ افراد دیگر رنگ کی وردیوں میں تھے۔ یہ شاید اعلیٰ عہدیدار تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ سارے ہی سفید فام تھے۔ جبکہ نیلی وردی میں اکثر افراد رنگ دار لوگ تھے۔ مسلح گارڈز جو سبز رنگ کی وردیوں میں تھے اور کہیں کہیں نظر آ رہے تھے۔ البتہ سفر کے دوران انہوں نے عام کپڑے پہن رکھے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہاں کوئی بھی فرد سادہ لباس میں نہیں تھا۔ میرے اور عبید صلاح کے علاوہ۔

''نیچے اُترو۔'' سیاہ فام گارڈ نے کہا۔





قریب سے دیکھنے پر میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ برتھ قدرتی نہیں تھی بلکہ اسے چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا ممکن ہے اوپر بنا قدرتی چھجا اتنا بڑا نہ ہو لیکن برتھ کے لیے چٹانوں کو کاٹنے کے بعد یہ ازخود بڑا ہوگیا تھا۔ پتھر کاٹ کر صرف برتھ ہی نہیں بلکہ اندر ہال بھی بنائے گئے تھے جو مختلف کاموں کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ برتھ پر کئی کرینیں نصب تھیں جو سامان اُتارنے چڑھانے کا کام کر رہی تھیں۔ ہم کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ جن سے بُو اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں شراب تھی۔ یہ شاید اِردگرد کے ممالک کو اسمگل کی جاتی ہو گی کیونکہ سوائے بھارت اور سری لنکا کے اس خطے کے کسی ملک میں شراب کی آزادی نہیں تھی۔ لامحالہ یہ سمگل ہو کر وہاں جاتی ہے۔ اس سے ذرا آگے اس سامان کا ڈھیر لگا تھا جو خلیج سے طاقت کے زور پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس سامان کے لیے تیس افراد اپنی جان سے گئے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ جان گرے نے انہیں صرف انتقام لینے کے لیے ہلاک کیا تھا بلکہ خلیج کی تباہی کی اصل وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی قزاقی چھپی رہے۔ کپتان صلاح الدین اور جان گرے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ تاثر بھی ملتا تھا کہ اس خطے میں سفر کرنے والے بحری جہازوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ان قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے رہے تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر لٹنے والے بحری جہاز اور ان کی کمپنیاں ان واقعات کی رپورٹ نہیں کرتی تھیں۔

برتھ سے اُتر کر ہم ایک پکے راستے سے گزرتے ہوئے ایک ہال تک پہنچے۔ یہ سب اس چٹانی سلسلے کے اندر تھا جو کسی بڑی پہاڑی کا ایک حصہ تھا لیکن اس طرف سے اس کی وسعت یا گہرائی کے بارے میں اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان چٹانوں کے عقب میں کیا تھا۔ ہال میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ سب چھوٹی ساخت کی جیپیں تھیں۔ ہر جیپ پر چار افراد سفر کر سکتے تھے۔ مجھے اور عبید صلاح کو ایک جیپ پر سوار ہونے کو کہا گیا۔ جب ہم اس کے عقبی حصے میں بیٹھے تو ہمارے ہاتھ میں لگی ہتھکڑیوں کو جیپ کے لگے ہکوں میں لاک کر دیا گیا۔ غالباً اس بناء پر کہ ہم راستے میں کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ ہال کے دوسرے سرے پر سرنگ جا رہی تھی۔ ابھی ہم روانہ ہو رہے تھے کہ اس سرنگ سے ایسی ہی ایک جیپ نکلی۔ گویا یہ سرنگ ٹریفک کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔

جیپ چھوٹی ہونے کے باوجود طاقتور اور برق رفتار تھی۔ سرنگ چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ دو جیپیں آرام سے پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں۔ اندر ہی دس گز کے فاصلے پر دیواروں کے ساتھ طاقتور لائٹس نصب تھیں۔ ان کی روشنی میں سرنگ کا ایک ایک حصہ واضح نظر آ رہا تھا۔ اندر گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس میں تازہ ہوا کی آمد و رفت کا خیال رکھا گیا تھا۔ سرنگ کوئی میل بھر لمبی تھی اور ہم پانچ منٹ بعد اس کے دوسرے سرے تک جا پہنچے تھے۔ یہ کوئی وسیع غار تھا جسے مناسب ردوبدل کے بعد ہال کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہاں نہ صرف جیپوں کی

پارکنگ کا نظام تھا بلکہ ایک طرف ورکشاپ اور پٹرول بھرنے والا پمپ بھی موجود تھا۔

جیپ سے اُتار کر ہمیں پیدل ہال یا غار کے باہر لایا گیا تھا اور میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا پہلی بار مجھے اس خفیہ بندرگاہ نے حیران کیا تھا تو دوسری بار مجھے چٹانوں کے دوسری طرف کے نظاروں نے حیران کر دیا تھا۔ ہم بلند پہاڑی کے اوپری حصے میں کھڑے تھے۔ یہاں مجھے درست طور پر معلوم ہو گیا کہ ہم ایک جزیرے پر ہی تھے کئی سمتوں میں بعید فاصلے پر سمندر اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ ہم سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سرنگ اس قدر بلندی پر جا کر نکلے گی۔ یہ شاید سرنگ کی ساخت کا کمال تھا کہ مجھے جیپ کی بلندی کی طرف جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

نیچے کا منظر اتنا سحر انگیز تھا کہ آدمی کھو کر رہ جائے۔ اس طرف بے حد گھنا جنگل تھا۔ جس میں بے شمار اقسام کے بلند و بالا درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان درختوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جنگل کے درمیانی حصے میں ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس طرف پانی کا کوئی ذخیرہ تھا جس سے صبح سویرے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جنگل کے بعد سرسبز پٹی کے ساتھ بے شمار مکانات نظر آ رہے تھے۔ اتنی دور سے یہ کھلونوں جیسے لگ رہے تھے آبادی کا یہ سلسلہ ساحل سے تھوڑا دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا بھلا قصبہ تھا۔ سیاہ فام گارڈ نے کہا۔

"کھڑے کیوں ہو چلو۔"

"پیدل؟" عبید صلاح نے فکر سے کہا۔

"نہیں تمہارے لیے رولز رائس آئے گی۔" گارڈ نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "پیدل چلو لارڈ کی اولاد۔"

"چلو۔" عبید صلاح نے شانے اُچکائے۔ "لیکن راستے میں مَیں بھاگ نکلا تو شکوہ مت کرینا۔"

میں اس بات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اس حالت میں بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا جبکہ اس کے چاروں طرف اس کے خون کے پیاسے دشمن تھے اور نہ بچنے کی کوئی راہ نظر آتی تھی اور نہ فرار کی ترکیب ہم نے اس مختصر سی سڑک پر مارچ شروع کر دیا جس کے کنارے گھنے اور بلند درخت اُگے ہوئے تھے۔ جو جگہ درختوں سے بچ گئی تھی۔ وہاں رنگ برنگ پھولوں کے پودے تھے۔ درختوں پر متعدد پرندے چہک رہے تھے لیکن مجھے کوئی جانور نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک خرگوش نما جانور کے جو بلی سے ذرا ہی بڑا تھا۔ سڑک کے اطراف میں کچی زمین سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ فضا میں کسی قدر حبس اور گرمی تھی۔ اندازہ تھا کہ دن بڑھنے کے ساتھ ساتھ گرمی میں اضافہ ہو گا۔ گویا یہ جزیرہ خطِ استوا کے علاقے میں ہو سکتا تھا لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ سعودی عرب کے شمال مشرقی ساحل کے آس پاس پایا جاتا ہو گا۔ اس خطے میں بھی گرمی اور حبس ہوتا تھا لیکن یہاں بارشوں





کا اوسط کم تھا۔ جب کہ اس جزیرے کے اس ترو تازہ جنگل کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا یہاں باقاعدگی سے بارش ہوتی ہو گی۔ اس قسم کی آب و ہوا، افریقہ میں صومالیہ کے نچلے حصے پائی جاتی تھی۔ اس خطے کی لائن میں سری لنکا اور مالدیپ بھی آتے تھے۔ جہاں سارے سال ہی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ علاقے خطِ استوا سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں میں نے سفر کی سمت کے بارے میں غلط اندازہ تو نہیں لگایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جنوب مغرب کی طرف آئے تھے۔ درحقیقت یہ لوگ جنوب کی طرف سفر کرتے رہے ہوں اور اس وقت ہم بحر ہند کے کسی جزیرے میں ہوں۔ کم از کم اس کی آب و ہوا سے یہی محسوس ہوتا تھا بحیرہ عرب میں اس قسم کے سرسبز جزائر نہیں ملتے۔ دوسرے اس احساس سمندر میں قزاقوں کی طرف سے یوں کھلے بندوں اڈہ بنا کر رہنا حیرت انگیز تھا۔ اس کے برعکس وہ بحر ہند کی بے حساب وسعتوں میں آرام سے رُوپوش رہ سکتے تھے۔ اس خطے میں بے شمار ویران جزائر ملتے ہیں۔ جو سمندری راستوں سے ہٹ کر واقع ہیں۔

راستے میں تینوں گارڈ مستقل چوکنا رہے تھے۔ وہ ہمارے دائیں بائیں چل رہے تھے اور ایک عقب میں تھا۔ اچانک ایک طیارہ شور مچاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ یہ درمیانی قسم کا طیارہ تھا۔ جو مسافروں اور سامان دونوں کی بار برداری میں استعمال ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے طیارہ آبادی کے مشرقی سمت میں گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔ غالباً انہوں نے درختوں کے درمیان کوئی خفیہ ایئر فیلڈ بھی بنا رکھا تھا۔ فضائی رابطے کے بغیر اس دور دراز خطے میں رہنا نہایت دشوار تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ طیارہ آیا کہاں سے ہو گا۔ کیا اس نے کسی قانونی ایئر فیلڈ سے پرواز کی ہو گی یا یہ قزاقوں کے کسی دوسرے اڈے سے آیا ہو گا؟ یہ ممکن تھا کہ طیارے نے کسی پرائیویٹ ایئر فیلڈ سے پرواز لی ہو۔ جہاں اس قسم کے غیر قانونی کاموں میں آسانی رہتی ہے۔

ہم تقریباً نصف گھنٹے بعد نیچے آبادی کے قریب پہنچے تو وہاں مشرقی سمت سے ایک کھلی جیپ میں چند عرب گزرے انہوں نے قیمتی لباس پہن رکھے تھے اور ان کے حلیے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ یہ اس طرف سے آئے تھے جہاں طیارہ اُترا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ طیارے میں عرب آئے ہوں اور ان عربوں کا اس جزیرے پر کیا کام تھا۔ وہ کسی معزز مہمان کی طرح آئے تھے۔ ان کی جیپ کو ایک مقامی کارکن ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے نیلی وردی پہن رکھی تھی۔ عرب بے حد خوش تھے اور ہنستے [illegible]اتے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبید صلاح کی آنکھوں میں غصہ چمکنے لگا تھا۔ اس نے [illegible] بھرے انداز میں زمین پر تھوکا۔

"آگے چلو۔" عقب سے گارڈ نے عبید صلاح کی کمر پر رائفل کی نال ماری۔

کچھ دیر بعد ہم خار دار تاروں سے گھرے ایک احاطے میں داخل ہوئے جس کے وسط میں [illegible] کی بیرکس تھیں۔ یہ جگہ کوئی قید خانہ معلوم ہوتی تھی، میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پہلے ہمیں

ایک سفید فام شخص کے سامنے پیش کیا گیا جو جیل کا انچارج ثابت ہوا۔ کثرتِ مے نوشی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور گالوں کا گوشت لٹک آیا تھا۔ وہ حلیے سے کوئی بلڈاگ لگ رہا تھا۔

''کون ہیں یہ؟'' اس نے غرا کر کہا۔

''جان گرے انہیں پکڑ لائے ہیں۔'' سیاہ فام محافظ نے ادب سے کہا۔ ''انہیں اگلے حکم تک یہاں قید رکھنے کو کہا ہے۔''

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ بگڑ کر مزید بدصورت لگنے لگا تھا۔

''اس نے خود مجھ سے کیوں نہیں کہا؟''

''یہ بات تو وہی جانیں جناب۔'' محافظ یک دم خائف نظر آنے لگا تھا۔

''تو تم نے اس خنزیر کی توجہ کیوں نہیں دلائی۔'' جیل انچارج نے اچانک اٹھ کر محافظ کو پوری طاقت سے تھپڑ مارا۔ وہ طاقتور آدمی تھا۔ سیاہ فام وزنی اور مضبوط ہونے کے باوجود لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ مزید تاریک ہو گیا تھا لیکن اس بے عزتی پر اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ عبید صلاح حقارت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں انچارج نے دراصل ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خیال غلط تھا۔ اس کی خباثت سے ابھی ہمیں واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

''سوری ڈیئر ڈان۔'' سیاہ فام محافظ نے کہا۔

وہ مسکرانے لگا۔ ''میں ذرا نئے قیدیوں سے اپنا تعارف کرا دوں۔''

''لیکن گرے صاحب......'' سیاہ فام نے کہنا چاہا۔

''بھاڑ میں جائے تمہارا گرے صاحب۔'' اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''اور تم بھی دفع ہو جاؤ۔''

سیاہ فام گارڈ اپنے ساتھیوں سمیت دفع ہو گیا۔ انچارج کے گھنٹی بجاتے ہی دو مسلح افراد اندر آ گئے تھے ڈیئر ڈان نے انہیں حکم دیا۔ ''انہیں میدان میں لے چلو۔''

میدان بیرکوں کے عقبی حصے میں تھا۔ وہاں لوہے کے پائپوں سے بنے جھولے نما ساخت کے نمونے کھڑے تھے۔ جن سے لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ''ان کی قمیصیں اُتار دو۔'' ڈیئر ڈان نے اپنے آدمیوں کو حکم جاری کیا۔ تب میری نگاہ اس کے ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھاتے ہنٹر پر پڑی۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ عبید صلاح نے مزاحمت کی تو گارڈز نے اس کی قمیص پھاڑ دی۔ میں نے شرافت سے قمیص اُتار دی تھی کیونکہ نصف درجن اٹھی ہوئی رائفلوں کے سامنے مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمیں ہاتھوں سے زنجیروں میں باندھ دیا گیا تھا۔ عبید صلاح، ڈیئر ڈان کو انگریزی ڈکشنری کے منتخب الفاظ سے نواز رہا تھا۔

''اس جیل کا اصول ہے کہ میں یہاں آنے والے ہر نئے قیدی سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ جس کے بعد اس کے دماغ کے کیڑے جھڑ جاتے ہیں۔'' اس نے ہنٹر کو کھول کر جھٹکا۔ یہ تین فٹ لمبا





اور خاصا موٹا ہنٹر تھا۔ مجھے اپنی کھال کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی تھی لیکن اس نے پہلے عبید صلاح کو اس کی نظم گوئی کا انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہمارے عقب میں آیا۔ اس نے جس طرح گھما کر عبید صلاح کی پشت پر ہنٹر مارا تھا اس سے اس کی مہارت کا ثبوت ملتا تھا۔ عبید صلاح کے جسم نے شدید جھٹکا لیا تھا لیکن اس کے لبوں سے ذرا سی بھی آہ نہیں نکلی تھی۔ اس بات پر مشتعل ہو کر ڈیئر ڈان نے اگلا وار مزید قوت سے کیا تھا۔ تیسری بار بھی وہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلوانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں تین سے زیادہ ضربیں نہیں لگاتا۔ ورنہ آج تمہاری چیخیں پورا کیمپ سنتا۔''

عبید صلاح کے ہونٹوں پر سلگانے والی مسکراہٹ تھی۔ ''چاہو تو آج یہ کام بھی کر کے دیکھ لو۔ میرے ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکلے گی۔''

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر میری طرف نظرِ کرم کی اور مجھے تین بار اپنی پشت پر قیامت سہنا پڑی۔ اس ہنٹر کی ضرب اتنی شدید تھی کہ ایک ہی بار میں کھال ادھیڑ دیتی تھی۔ میں نے دانت بھینچ لیے تھے اور کوشش کی تھی کہ عبید صلاح کی طرح میرے ہونٹوں سے بھی کوئی آواز نہ نکلے۔ تین ضربوں کے بعد میری پشت درد سے تڑخنے لگی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عبید صلاح پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ہمیں کھول دیا گیا اور قمیص پہننے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک بیرک میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ بیرکس پتھر کے بلاکوں کی بنی ہوئی تھی۔ دروازوں کی جگہ لوہے کی سلاخوں والے گیٹ تھے۔ چھت لکڑی کی تھی لیکن اتنی اونچی کہ اس تک رسائی کا سوچا ہی جا سکتا تھا عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ عقبی حصے میں روشندان تھا۔ زمین سے آٹھ فٹ اونچے ان روشن دانوں میں بھی لوہے کی انچ بھر موٹی سلاخیں نصب تھیں۔

ہمیں جس بیرک میں بند کیا گیا تھا اس میں دونوں جانب دس دس کوٹھریاں تھیں یہ کوٹھریاں بہ مشکل سات بائی سات فٹ کی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ دو دو فٹ چوڑائی کے دو بستر لگے تھے۔ فٹ بھر اونچے لوہے کے پائپ سے بنے پلنگ زمین میں نصب تھے۔ ان پر بدرنگ اور بدبُو دار کمبل بچھے تھے۔ سرہانے کے لیے اسی قسم کے تکیے تھے ایک بستر سے آگے ایک چھوٹے سے ڈول میں پانی پڑا تھا جس کے ساتھ مگا تھا۔ یہ ہمارا نیا قید خانہ تھا۔ گارڈز کے جاتے ہی عبید نے کہا۔

''حرامی سمجھتا ہے کہ اس طرح ہمیں مرعوب کر لے گا۔'' اس نے واضح کیا کہ وہ اس ڈیئر ڈان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا (اسے ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔) پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میں تو تمہیں نرا ملاح سمجھتا تھا تم تو جی دار آدمی نکلے۔''

''زندگی میں بڑے زخم کھائے ہیں اس لیے عادت ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کچھ یہی حال اپنا بھی ہے۔ زندگی نے سوائے زخموں کے کچھ نہیں دیا۔'' اس نے سرد آہ

دروازے کی سلاخوں سے ایک جوکر نما شخص نے اندر جھانکا۔ وہ دُبلا، پتلا اور چھوٹے سے قد کا سیاہ رو شخص تھا۔ اس کے ننھے سے چہرے پر بھاری بھرکم چشمہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ محافظ نے دروازہ کھولا تو وہ اندر گھس آیا۔ اس کے سفید کوٹ اور ہاتھ میں موجود میڈیکل بکس سے ظاہر تھا کہ وہ ڈاکٹر تھا۔ اس کا میڈیکل بکس بھی اس کی طرح خستہ حال تھا۔ اسے میڈیکو ٹیپ لگا کر کئی جگہ سے جوڑا گیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے بولنا شروع کر دیا۔

''اپن ڈاکٹر واڈیا ہے فرام بمبئی۔'' وہ بطخ کی طرح ہنسا۔ ''لیکن اپن نے بیس سال سے بمبئی نہیں دیکھا۔ تم نیا آیا ہے جو بھی نیا بندہ ادھر آتا ہے اسے اپن کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب بتاؤ پہلے کسے دیکھے۔''

''اسے۔'' میں نے عبید کی طرف اشارہ کیا۔

''اونہوں۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے اسے۔''

''نہیں پہلے اسے۔''

ڈاکٹر واڈیا بے چارہ ہم دونوں کے درمیان گردن گھما رہا تھا۔ آخر اس نے چلا کر کہا۔ ''سٹاپ اٹ اپن دونوں کو دیکھے گا۔ دونوں اپنی قمیص اُتار دو۔''

''پہلے تم۔'' میں نے عبید صلاح کی طرف دیکھا۔

وہ بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''نہیں پہلے تم۔''

''جی نہیں پہلے تم۔''

''تم......''

''ارے میں اپنی قمیص اُتار دیتا ہوں۔'' جوکر ڈاکٹر نے چلا کر کہا اور سچ مچ اپنی قمیص اُتارنے لگا۔ اس نے قمیص اُتار اپنی پشت ہماری طرف کی۔ اس کی پشت پر متعدد لمبی لمبی لکیریں پڑی تھیں۔ جیسے اسے بھی ہنٹر سے مارا گیا ہو۔ گویا کیمپ کا ڈاکٹر بھی بے چارہ قیدی سے کم نہیں تھا۔ ''یہ میری غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے نہیں کی تھیں۔ تم کیوں چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری پیٹھ پر بھی ان لکیروں کا اضافہ ہو جائے۔''

''ان کی تعداد تو خاصی زیادہ ہے۔'' میں نے غور کر کے کہا۔ ''کیا انچارج، قیدی کے ساتھ تمہیں بھی اپنے ہنٹر سے نوازتا ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لو کسی قیدی کی غلطی کی سزا بھی مجھے ہی ملتی ہے۔'' اس نے دردناک لہجے میں کہا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے عبید صلاح کی طرف دیکھا۔

''بھگوان کے لیے اس کا خیال مت پوچھو۔ اپنی قمیص اتارو۔'' اس نے تقریباً گڑگڑا کر کہا تو مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ میں نے قمیص اُتار کر پشت اس کی طرف کر دی اور جب اس نے کوئی اسپرٹ قسم کی شے میرے زخم پر لگائی تو میرے رحم کے سارے جذبات غائب ہو گئے۔ اتنی تکلیف





لڑکھڑاتے ہوئے بھی نہیں ہوئی تھی جتنی ان زخموں کے علاج میں ہو رہی تھی۔ اگلے دو تین منٹ تک میں اس قیامت خیز مرحلے سے گزرا۔ خدا خدا کر کے اس نے مرہم پٹی مکمل کی۔

''جاندار آدمی ہے۔'' ڈاکٹر جوکر نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''اتنی مار کسی اور نے کھائی ہوتی اور ایسے زخم ہوتے تو اب تک رو رہا ہوتا تم چہک رہا ہے۔''

''اس کی حالت مجھ سے بھی بُری ہے۔'' میں نے عبید صلاح کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر جوکر نے اس کی پھٹی ہوئی قمیص اُتاری تو بے اختیار سیٹی بجائی۔ ''اپن اپنی ساری زندگی میں اتنا گہرا زخم نہیں دیکھا جو ایک ہی ضرب سے آیا ہو۔''

''ڈاکٹر تمہاری اردو بہت صاف ہے۔''

وہ ذرا جھینپا۔ ''ارے ادھر بدر بھائی کے یتیم خانے میں پرورش پائی ہے، ہے تو مسلمان پر بھگوان ہے۔ اس نے مجھے ڈاکٹری پڑھائی، شادی کرائی، گھر بنا دیا۔''

''اور تم یہاں آ پھنسے۔'' میں نے کہا۔

عبید صلاح نے اسپرٹ کی کاٹ بھی اسی صبر سے برداشت کی تھی۔ اسے ہماری باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ کیونکہ ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔ اس کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر ڈاکٹر واڈیا نے گہری سانس لی۔

''یہ سب اپنے کرموں کا پھل ہے اِدھر انڈیا میں ڈاکٹر بہت ہوتے ہیں اور سالے سب غریب بیمار پڑتے ہیں۔ امیر لوگ بیمار ہی نہیں پڑتے یا پڑتے بھی ہیں تو بڑے ڈاکٹر لوگ سے علاج کراتے ہیں۔ اپنے پاس کون آتا ہے۔ ایک شخص نے میرے کو دبئی لے جانے کا لالچ دیا اور......''

''اور یہاں لے آیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں بابا اس نے اپن کو دبئی پہنچا دیا تھا۔ پر اپن کے پاس ویزہ، پاسپورٹ کچھ نہیں تھا۔ چار سال ایک ہوٹل میں ڈش واشنگ کرتا رہا۔ پھر ایک کلینک میں کمپاؤنڈر ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا ڈاکٹر ہی کمپاؤنڈر تھا اور غلط دھندے کرتا تھا۔ کلینک پر چھاپہ پڑ گیا۔ خوش قسمتی سے اپن چھٹی پر تھا۔ وہاں سے بھاگا تو ایک غلط آدمی کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر اسمگل کیا اور اپنے ساتھ ادھر لے آیا۔''

''یہاں آ کر تمہیں معلوم ہوا ہوگا کہ تم ایک چکر سے نکل کر دوسرے چکر میں پھنس گئے ہو۔''

''کاش میں دبئی میں پکڑا جاتا۔'' ڈاکٹر واڈیا نے سرد آہ بھری۔ ''دو تین سال جیل میں گزار کر اپنی رکمنی کے پاس چلا جاتا۔''

''رکمنی تمہاری بیوی؟''

''ہاں وہ اپنی بیوی تھی اب نہ جانے کس کی بیوی ہوگی اور کتنے بچوں کی ماں ہوگی۔'' اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ مرہم پٹی مکمل کر لی۔ وہ خاصا دُکھی نظر آنے لگا تھا۔

''ممکن ہے وہ اب تک تمہاری راہ تک رہی ہو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''ایسا صرف بالی ووڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔'' اس نے افسوس سے کہا۔ ''کتنا دھوکا دیتے ہیں یہ فلم والے۔ بابا اصلی زندگی میں یہ سب کہاں ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر واڈیا رخصت ہوا تو لاتعلقی سے کھڑے گارڈ نے تالا لگا دیا۔ ڈاکٹر جس طرح کھل کر بات کر رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ گارڈ کو اردو نہیں آتی۔ ڈاکٹر جاتے جاتے ہمیں کچھ دوائیاں دے گیا تھا کہ وقفے وقفے سے کھاتے رہیں۔ یعنی جب بھی درد زیادہ محسوس ہو۔ میں نے دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ عبید صلاح نے انہیں ایک طرف ڈال دیا۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک عبید صلاح نے کہا۔ ''یہ ڈاکٹر دلچسپ لیکن مظلوم آدمی ہے۔''

میں اُچھل پڑا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس نے یہ جملہ کہا تھا کہ بلکہ اس لیے کہ اس نے یہ جملہ صاف اردو میں کہا تھا۔

''تمہیں اردو آتی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرے ساتھیوں میں چند پاکستانی ہیں۔ میں نے ان سے یہ زبان سیکھی۔ مجھے اردو کے علاوہ فارسی اور افغانستان میں بولی جانے والی زبان دری بھی آتی ہے۔ عربی میری مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور کسی قدر فرانسیسی بھی بول اور سمجھ لیتا ہوں۔''

''بس ایک زبان کی کسر رہ گئی تھی۔ ورنہ تم ہفت زبان کہلاتے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہفت زبان کیا ہوتا ہے۔'' اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ سات زبانیں جاننے والے افراد کو ہفت زبان کہا جاتا ہے۔ سندھ میں سچل سرمست شاعر تھے جو سات زبانیں جانتے تھے اور اسی بناء پر شاعرِ ہفت زبان کہلاتے تھے کہ انہوں نے ان تمام زبانوں میں شاعری بھی کی تھی۔

''اگر زندگی نے مہلت دی تو ایک زبان اور سیکھ کر اس کمی کو پورا کر لوں گا۔'' اس نے خوش مزاجی سے کہا۔ پھر لیٹتے ہوئے بولا۔ ''اس بدبخت نے ہنٹر سے ناشتہ کرا دیا تھا۔ اب کھانے کی توقع فضول ہے۔ لہٰذا بہتر ہے سویا جائے۔''

چند لمحے بعد گارڈ نے آ کر پھر دروازہ کھولا اور ایک شخص نے ٹرے اندر سرکا دی۔ جس پر مچھلی کے تلے ہوئے ٹکڑے اور کافی رکھی ہوئی تھی۔ خاصا عجیب سا ناشتہ تھا لیکن جیل میں مرضی کا مینو کہاں ملتا ہے۔

سمندر میں رہنے والے مچھلی کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس آب و ہوا میں مچھلی کا استعمال مفید ہوتا ہے اور سستا بھی۔ کیونکہ سمندر میں رہنے والوں کو اس کا گوشت تازہ اور آسانی سے مل جاتا ہے۔ بہ نسبت جانوروں کے گوشت کے۔ اس طرح اجناس اور سبزیاں بھی بحری جہازوں پر کم استعمال کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر مچھلی ہی کھائی جاتی ہے۔ اس طرح جزائر جو خشکی سے دور پائے





جاتے ہیں وہاں پر بھی مچھلی کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ جزائر پر زراعت کم ہوتی ہے اور دوسرے ممالک سے ڈیری کی مصنوعات، گوشت، پھل اور سبزیاں درآمد کرنا خاصا مہنگا پڑتا ہے۔ بہت ساری اشیاء تو ان جزائر میں پیدا ہی نہیں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اکثر جزائر کی معیشت ماہی گیری کے گرد گھومتی ہے۔ اس سے ان کا اولین مسئلہ یعنی خوراک حل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اس جگہ مجھے ماہی گیری ہوتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ یہ جزیرہ قزاقوں کے ایک بین الاقوامی گروہ کا مرکز نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنی خوراک کی اکثریت ضروریات سمندر سے ہی پوری کرتے ہوں گے تاکہ بیرونی دنیا پر انحصار کم سے کم ہو۔ اس میں خطرات بھی کم تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جزیرے پر کم سے کم چھ سات ہزار نفوس آباد تھے اور اتنی بڑی آبادی کو بیرون ملک سے خوراک مہیا کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بلکہ قزاقوں کے لیے اس میں خطرات بھی پوشیدہ تھے۔ ان کے لیے عافیت اس میں تھی کہ باہر سے کم سے کم رابطہ رکھیں تاکہ دنیا ان کی طرف متوجہ نہ ہو۔

خلافِ توقع مچھلی ذائقے دار ثابت ہوئی تھی اور کافی بھی سیاہ ہونے کے باوجود مزہ دے گئی تھی۔ ناشتہ کر کے میں دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے دوبارہ جگایا گیا تو شام ہو رہی تھی۔ مجھے ڈاکٹر واڈیا کی صورت نظر آئی۔ اس بار خلافِ توقع اس نے خاموشی سے زخموں کی مرہم پٹی کی اور رخصت ہو گیا۔ میں نے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سلور کے مگے سے دروازہ بجایا۔ گارڈ فوراً آ موجود ہوا۔

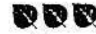
''کیا بات ہے؟'' اس نے غرا کر کہا۔

''مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے مخصوص اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک اور آدمی کے ساتھ آیا۔ جو مسلح نہیں تھا۔ اس نے آ کر تالا کھولا اور مجھے باہر نکالا اور دوبارہ تالا لگایا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں گارڈ رائفل تانے پوری طرح چوکس تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہا تھا۔ بیرک کے باہر ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ بہ مشکل تین والی تین فٹ کا اور چھ فٹ اونچا۔ میں نے ہر بیرک کے سامنے ایسا ہی ایک بیت الخلا دیکھا تھا۔ اندر اگرچہ بدبو تھی لیکن یہ کسی حد تک صاف ستھرا تھا۔ اس میں اندر سے دروازہ بند کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک معمولی سا کھٹکا تھا جو باہر سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔

''تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔'' گارڈ کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔

میں باہر نکلا تو انہوں نے اسی طرح مجھے لا کر کوٹھری میں بند کر دیا۔ دو دفعہ مرہم پٹی کے بعد زخموں میں تکلیف خاصی کم ہو گئی تھی۔ اندھیرا چھاتے ہی بیرک کی راہداری میں نصب تیز روشنی والے بلب روشن ہو گئے تھے۔ سیلز میں کوئی بلب نہیں لگا تھا۔ بلکہ سلاخوں سے روشنی گزر کر یہاں اجالا کرتی تھی۔ عام طور سے جیلوں میں بھی بلب اور بجلی کے سوئچ قیدیوں کی رسائی سے دور رکھے

جاتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی مچھلی اور دلیہ نما سی چیز پر مشتمل تھا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سیل کا دروازہ کھلا اور مجھے جان گرے کی صورت نظر آئی جو مجھے باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔



مشتعل افراد اگر ہجوم کی شکل میں ہوں تو تباہ کن قوت بن جاتے ہیں۔ ایسے ہجوم منٹوں میں ہاتھی کی بھی چٹنی بنا سکتے ہیں۔ یہ ہجوم تو نہیں تھا لیکن بیک وقت چھ سات افراد سے مقابلہ کرنا دشوار کام تھا۔ حسن علی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو۔ مسز شہزاد آپ انہیں بتائیں۔"

"رُک جاؤ" عورت چلائی اور وہ چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح رُک گئے۔

حسن علی نے عورت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے اس کے قاتل وہی لوگ ہیں اور میں ان کو بچ کر جانے کا موقع نہیں دوں گا۔ چلو خان۔" آخری الفاظ اس نے مجھ سے کہے تھے پھر ہم لوگوں کے درمیان سے نکلتے چلے گئے۔ ہم نے عورت کے صدمے اور لوگوں کے تذبذب سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اگر ان لوگوں کو تھوڑی مہلت اور مل جاتی تو عورت کے سامنے بات کھل جاتی کہ شہزاد کہیں غائب نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے ہی گیراج میں اپنے مکینک لڑکوں کے ساتھ مارا گیا تھا۔ یہ بات کھلتے ہی ہم عورت کی نظروں میں مشکوک ہو جاتے اور عین ممکن تھا کہ وہ ہمیں قاتل یا ان کا ساتھی قرار دے دیتی۔ اس کے بعد وہاں سے نکلنا ہمارے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا۔ بہر حال عورت سے ہمیں ایک کام کی بات معلوم ہوگئی تھی یعنی بابو بھائی کا نام ان نامعلوم افراد کو بابو بھائی ہی شہزاد خان تک لایا تھا۔ اسے دستِ قاتل کی مدد کرنے کا انعام یہ ملا کہ اسے بھی قاتل نے خاموش کر دیا۔ تاکہ اس کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا باقی نہ رہے۔

"مجھے تو بابو بھائی کی خیریت بھی مشکوک لگ رہی ہے۔" میں نے نیچے آتے ہی کہا۔

"وہ لوگ خاصے تیز جا رہے ہیں۔" حسن علی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہزاد خان کے گیراج کی طرف چلو۔"

"استادِ محترم۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "آدھی رات سے زیادہ گزر چکی ہے اور میں نے دوپہر سے سوائے مار اور دھکوں کے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

"تین لاشیں دیکھ کر بھی تمہاری بھوک برقرار ہے۔" حسن علی نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں چوتھی لاش بن جاؤں۔" میں نے بھنا کر کہا۔

بادلِ نخواستہ حسن علی نے گاڑی ایک رات بھر کھلے رہنے والے ہوٹل کے سامنے رکوائی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد مجھ پر کہولت طاری ہونے لگی تھی۔ "کیا خیال ہے باقی کام کل پر نہ چھوڑ دیا جائے۔" میں نے تجویز پیش کی حسن علی نے مجھے گھورا۔

"کیا فائدہ کل بھی آ کر ایک یا کئی اور لاشوں کا نظارا کرنے کا۔"





"اگر پاپا یہاں ہوتے تو اب تک پولیس ان لوگوں کو گردن سے پکڑ چکی ہوتی۔" میں نے جماہی لی۔

حسن علی مسکرایا۔ "میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ ابھی ہم جو کوشش کر رہے ہیں۔ جمشید صاحب شاید اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔"

"بھلا پاپا کیوں نہیں چاہتے کہ مجھ پر حملہ کرنے اور مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے نہ پکڑے جائیں۔"

یک دم حسن علی محتاط نظر آنے لگا۔ اس نے ایک نظر ڈرائیو کرتے ہوئے شخص کی طرف دیکھا اور بولا۔ "بھئی پھر جمشید صاحب اس معاملے کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیتے وہ لوگ اب تک پکڑے جا چکے ہوتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ حسن علی نے بات بدلی تھی۔ پہلے اس کا لہجہ کچھ اور تھا اور اب اس کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ حسن علی نے گاڑی مقتول شہزاد خان کے گیراج سے کچھ فاصلے پر رکوائی تھی۔ وہاں اب بھی رونق تھی لیکن لوگوں میں خوف کے اثرات بھی تھے۔ آس پاس کی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان کے آگے لوگ ٹولیوں میں کھڑے تہرے قتل پر سنسنی خیز تبصرے کر رہے تھے۔ ہم ان کے پاس سے گزرے۔ پولیس جائے واردات سے لاشیں اور دیگر شہادتیں لے کر جا چکی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی تھی۔ حالانکہ لاشیں دریافت ہوئے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے تھے اور بعض اوقات تو پولیس جائے واردات پر آنے میں اتنی دیر لگا دیتی ہے۔ گیراج سیل کر دیا گیا تھا اور اس کے آگے ایک سپاہی اپنی بندوق کے ساتھ کرسی پر بیٹھا بھگتنے کے انداز میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔

"لگتا ہے پولیس نے بھگتایا ہے معاملے کو۔" میں نے سرگوشی میں حسن علی سے کہا۔

"مجھے بھی شبہ ہو رہا ہے۔" حسن علی نے سر ہلایا۔ "شاید اوپر سے ڈوریاں ہلائی جا رہی تھیں۔"

ساتھ آنے والے ماہر جغرافیہ کو ہم نے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا اب ہم آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"کیا پاپا ہوتے تو وہ ہمیں ان لوگوں کو تلاش کرنے سے روک دیتے۔ جنہوں نے مجھے اور ماہ پارہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟"

حسن علی نے سر ہلایا۔ "میرا یہی اندازہ ہے کہ اس کوشش میں کچھ ایسے افراد ملوث ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا جمشید علی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔"

میں چند لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ان افراد کا تعلق پیلس سے بھی ہو سکتا ہے۔"

حسن علی نے یوں شانے اُچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ تم جو چاہو سمجھو۔ وہ سڑک کے ساتھ قائم

ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ یہ ایک ایرانی ہوٹل تھا۔ جہاں سوائے چائے اور پیسٹری کے کچھ نہیں ملتا تھا۔ میلی دیواروں پر ایران کے مناظر کی تصاویر لگی تھیں۔ کاؤنٹر کے عقب میں شہنشاہ ایران کی تصویر آویزاں تھی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اس قسم کے گندے اور معمولی درجے کے ہوٹلوں کو ایرانی کیوں کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایران والا ان ہوٹلوں کو دیکھ لے تو پاکستان اور ایران کے برادرانہ تعلقات کو دھچکا لگے بغیر نہ رہے گا۔

ٹیپ پر کوئی ایرانی مغنیہ مترنم لہجے میں گا رہی تھی۔ غالباً جامی کا کلام تھا۔ ماہ پارہ نے مجھے ایرانی ادب سے خاصا رُوشناس کرا دیا تھا۔ بیرے نے پوچھے بغیر ہمارے سامنے دو چائے لا کر رکھ دی تھیں۔ چائے کے بجائے یہ دودھ پتی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ روبوٹ کی طرح چلنے والا ویٹر وہاں سے روانہ ہوتا۔ حسن علی نے اس کے ایک ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ وہ وہیں منجمد ہو گیا۔ ''کیا چاہیے صاحب؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بابو بھائی کہاں ملے گا؟'' حسن علی نے اسی انداز میں دریافت کیا۔

''کون بابو بھائی؟'' بیرے نے معصومیت سے پوچھا۔

''بابو آٹو زوالا بابو بھائی۔'' حسن علی نے دوسرا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''اچھا وہ پتا نہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔'' بیرے نے سر کھجایا۔ اس کے ہاتھ سے نوٹ غائب ہو چکے تھے۔ حسن علی نے اسے تیسرا نوٹ تھمایا۔

''اب تو آسان ہو گیا ہے۔''

''آپ نوروز میں دیکھ لیجیے گا۔ ورنہ سینما والی گلی کے تھڑے پر ملے گا۔''

''یہ دونوں جگہیں کہاں ہیں؟''

''اگر آپ مجھے سو روپے دیں تو میں آپ کو ان دونوں جگہوں پر لے جا سکتا ہوں۔'' بیرے نے عیاری سے کہا۔ اس نے جان لیا تھا کہ ہم اس علاقے میں انجانے تھے۔ لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ''بلاوجہ آپ بھٹکتے پھریں گے یا دوسروں سے پوچھنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے تمہیں سو روپے بھی مل جائیں گے۔'' حسن علی بیرے کی عیاری پر مشتعل ہو رہا تھا۔

''صاحب پیسے پہلے دے دیں تو مہربانی ہوگی بعد میں آپ نے ٹھینگا دکھا دیا تو میں کیا کروں گا۔'' بیرا مسکرایا۔

اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے حسن علی نے بادل نخواستہ اسے سو روپے دیے۔ نوٹ جیب میں غائب کر کے وہ بولا۔ ''آپ باہر میرا انتظار کریں۔ میں ابھی دس منٹ میں آیا۔''

''سو گز پہلے میری گاڑی کھڑی ہے۔ نیلے رنگ کی نئے ماڈل کی ٹیوٹا کار ہے۔ وہیں آ جانا۔''

''گاڑی کی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ پیدل کا راستہ ہے چند منٹ لگیں گے۔''





بیرے کو خطرہ تھا کہ کار میں بیٹھنا اس کے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے وہ عیار آدمی پیدل چلنے پر اصرار کر رہا تھا حسن علی کو اس کی بات ماننا پڑی تھی اگرچہ اندر سے وہ کھول رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا اس بیرے کی شامت آنے والی تھی جس نے ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ وہ دس کے بجائے پندرہ منٹ بعد باہر آیا تھا۔ رات کے اس پہر بھی ہوٹل کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً کسی بہانے سے کچھ دیر کی چھٹی لے کر ہمارے ساتھ نکلا تھا۔ اس وقت تو میرے طیش کی حد نہ رہی جب صرف دو گلیوں کے بعد اس نے ہمیں گلی کی نکڑ پر روکا۔

''میں نوروز دیکھ کر آتا ہوں۔ وہ کونے پر ہوٹل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ گلی میں گھس گیا۔

''یہ خبیث سزا کا مستحق ہے، استادِ محترم۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''اس نے بے ایمانی کی حد کر دی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ تم دیکھنا تو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔'' حسن علی نے غالباً دانت پیسے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ آتا نظر آیا۔ اس کی کھلی باچھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کامیاب رہا۔ ''تم لوگ جاؤ بابو بھائی وہیں موجود ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم کہاں جاتے ہو؟'' حسن علی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب چل کر بابو بھائی سے ہمارا تعارف بھی کرا دو۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔'' اس نے حسن علی کا ہاتھ جھٹک کر خفگی سے کہا۔ ''کیوں مجھے مروانا چاہتے ہو۔ بابو بھائی کو پتا چل گیا تو وہ میری کھال اُتروا لے گا۔''

''رقم ایسے ہی تو نہیں مل جاتی۔'' حسن علی نے مسکرا کر کہا۔ ''خیر بابو بھائی نے اگر پوچھ لیا تو میں بتا دوں گا کہ تم نے سو روپے بلکہ ایک سو تیس روپے لے کر اس تک ہماری رہنمائی کی تھی۔

''بتا دو...... بتا دو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں صاف مکر جاؤں گا۔'' اس نے کہا اور فرار ہو گیا۔

''یہ کیا؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ نے اسے ایسے ہی جانے دیا۔''

''ایسے ہی کہاں۔'' حسن علی نے اپنی جیب سے ایک عدد بٹوہ نکالا۔ ''ابھی وہ اپنی قسمت کو روتا ہوا واپس آئے گا تو اسے یہاں صرف بٹوا پڑا ملے گا۔'' اس نے بٹوے سے ساری رقم نکال لی۔ بیرے نے آج اچھی خاصی ٹپ حاصل کی تھی۔

''اب آئے گا اسے مزا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا حسن علی نے بٹوہ پھینک دیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

نوروز بھی ایک ایرانی ہوٹل ثابت ہوا لیکن کسی قدر بہتر درجے کا۔ اندر اکثر میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ بیرے سے بابو بھائی کی نشاندہی کرا لینی چاہیے تھی۔ اب ہم اسے کیونکر پہچانتے اندر بے شمار افراد بیٹھے تھے۔ خوش قسمتی سے بابو بھائی نے ہماری مشکل حل کر

دی۔ ایک درمیانی عمر کے چھوٹے قد کے اور نسبتاً بھاری جسم کے شخص نے قہقہہ مارا۔ ''ابے بابو بھائی کو دھوکا دینا آسان کام نہیں۔'' اگر اس نے سینے پر ہاتھ نہ مارا ہوتا تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ وہی بابو بھائی ہے۔

''میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔'' حسن علی نے آہستہ سے کہا۔ ''گاڑی دیکھ کر تم اسے کسی بہانے سے باہر لے آنا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا حسن علی جا چکا تھا۔ میں نے دانت پیسے۔ لگتا تھا کہ آج ساری رات اس جگہ کالی ہوگی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ فٹ پاتھ پر کھڑا رہا تھا اور وہ ترکیب سوچ رہا تھا جس پر عمل کر کے میں بابو بھائی کو باہر لاتا۔ چند منٹ بعد حسن علی کار سمیت آتا نظر آیا۔ اس نے کار ایک خالی دکان کے سامنے روکی جو نوروز کے بالکل برابر میں تھی۔ حسن علی نے مجھے انگوٹھا دکھایا۔ میں بادل نخواستہ اندر داخل ہوا اور سیدھا بابو بھائی کے پاس جا پہنچا سچی بات تھی کہ ابھی تک میری سمجھ میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آئی تھی۔ جس پر عمل کر کے میں بابو بھائی کو ہوٹل سے باہر لے آتا لیکن جب میں اس کے پاس پہنچا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''بابو بھائی تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کون ہے بے تُو، کیسا پیغام کس کا ہے؟''

اس کے ساتھ دو افراد اور بیٹھے تھے۔ وہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک خاتون کا ہے۔ میں سب کے سامنے نہیں بتا سکتا۔''

''ابے چلا جا بابو بھائی باہر جا کر سن لے۔'' اس کے ایک ساتھی نے آنکھ مار کر کہا۔ ''خاتون کا پیغام ہے تیرے لیے روز روز ایسے پیغام کہاں آتے ہیں۔''

بابو بھائی کوئی بات کیے بغیر مجھے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شک تھا۔ میں معصوم سی صورت بنائے کھڑا رہا۔ بالآخر میں نے بیزاری سے کہا۔ ''جناب مجھے جواب لے کر بھی جانا ہے۔''

''عورت کون ہے؟'' اس نے اکھڑ پن سے کہا۔

''مجھے کیا معلوم جناب! مجھے تو پچھلے چوک پر ملی تھی۔ کالی چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن خوب صورت تھی۔'' میں نے چارہ ڈالا۔

''چل بھئی خوب صورت بھی نکل آئی۔'' دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ ''لگتا ہے اب تجھے خود جانا پڑے گا۔ واپس نہیں آئے گا۔''

''بکواس مت کر۔'' بابو بھائی نے اس کی سچ بیانی پر خفگی سے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔ چل میرے ساتھ۔'' وہ مجھ سے بولا۔ میں اسے ہوٹل سے لے کر باہر نکلا تھا۔ میں جان بوجھ کر ذرا آگے تھا۔ ورنہ وہ مجھے ہوٹل کے دروازے پر بھی روک سکتا تھا۔ میں برابر والی بند دکان کی طرف بڑھا۔ جس کے سامنے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ حسن علی اور ڈرائیور غائب تھے۔ ایک





لمحے کو میں چکرا گیا تھا۔ وہ دونوں کہاں چلے گئے تھے۔

اچانک عقب سے بابو بھائی نے میرا بازو سختی سے پکڑ لیا۔ ''جلدی بول چھوکرے کیا بات تھی؟''

''خاتون نے کہا تھا کہ یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہونی چاہیے۔'' میں نے دل میں حسن علی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے کہا۔

''جلدی بول۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہوں میری مشکل حسن علی نے آسان کر دی تھی۔ اس کی آواز سن کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ اس نے بابو بھائی کو آگاہ کیا تھا۔ ''یہ جو چیز تمہاری کمر سے لگی ہے۔ اسے پستول کہتے ہیں۔ کوئی بھی غلط حرکت کی تو ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔''

حسن علی کے لہجے میں ایسی سفا کی تھی کہ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ نہ جانے بابو بھائی کا کیا حال ہوا تھا۔ بہرحال جب حسن علی نے اسے کار میں بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ بلا چوں چرا کیے کار میں بیٹھ گیا۔ میں آگے بیٹھا اور گاڑی فوری طور پر روانہ ہو گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا بابو بھائی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''تم نے مجھے دھوکا دیا۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' حسن علی نے اسے جھڑک دیا اور اس دوران وہ اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے پاس سوائے پرس، چابیوں اور رومال کے کچھ نہیں تھا۔ تینوں چیزیں حسن علی نے اپنے قبضے میں کر لیں پھر مجھ سے کہا۔

''دیکھو آگے خانے میں گلاسز رکھے ہیں وہ دو۔''

میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا اندر بڑے بڑے شیشوں والے گلاسز تھے جو کچھ اس جسامت کے تھے کہ آنکھوں پر لگانے سے وہ پوری طرح آنکھوں کو ڈھانک لیتے تھے۔ ان کے شیشے تاریک تھے۔ ان کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں نے عینک پیچھے حسن علی کو دی۔ اس نے اسے بابو بھائی کی آنکھوں پر فٹ کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد ہم کلفٹن میں اس کوٹھی میں تھے جہاں ساحل سے پکڑے جانے والے چاروں لفنگے بھی قید تھے۔ ڈرائیور حسن علی کی ہدایت پر اسے اندر لے گیا۔

''اسے الگ رکھنا اور صبح تک خیال رکھنا۔''

اندر جاتے ہی حسن علی نے گاڑی چلا دی تھی کچھ دیر بعد ہم جمشید پیلس میں تھے۔ میں نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتایئے استادِ محترم کہ وہ ماہ پارہ سے کیا کہوں۔ وہ تو غصے میں ہوں گی۔''

''کچھ نہیں تم دبے قدموں جا کر خاموشی سے سو جاؤ۔''

''افسوس کہ میں شوہر نہیں ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''ورنہ اس ترکیب پر عمل کرتا۔ ماہ پارہ کو دھوکا دینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

"تو پھر جا کر اس کے سوالوں میں باقی رات بھی گزار دو۔" یہ کہہ کر حسن علی لمبے قدم بھرتا پیلس کے عقبی حصے میں واقع اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جہاں پیلس کے اعلیٰ سٹاف کے کمرے بھی تھے۔

میں نے حسن علی کے مشورے پر عمل کیا اور دبے قدموں اوپر پہنچا۔ ماہ پارہ کے کمرے میں تاریکی تھی۔ یعنی وہ سو رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے نائٹ بلب جلایا اور ماہ پارہ کو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گہری سانس لی اور تیز روشنی جلا دی۔ وہ ہینگنگ چیئر پر جھولتے ہوئے خاصے غصے میں لگ رہی تھیں۔

"آپ...... جاگ رہی ہیں اتنی رات گئے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"جی اور جناب کہاں سے تشریف لا رہے ہیں، اتنی رات گئے؟" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ آپ حسن سے پوچھئے گا وہی مجھے لے گئے تھے۔" میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"کہاں؟" وہ غصے میں بولیں۔

"اب بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "رات دو بجے تک ہم ایک خاتون کے گھر میں تھے۔"

ماہ پارہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ "یوسف مذاق مت کرو۔"

"آپ کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔"

یک دم ان کے طیش کے ٹمپریچر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ "کون ہے وہ حرافہ جس سے حسن ملنے گیا تھا۔"

"معلوم نہیں میں تو وہاں خاموش بیٹھا رہا تھا۔"

"اور سب دیکھتے رہے بے غیرتی سے۔"

"اس میں بے غیرتی والی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

"مجھے حسن سے یہ امید نہیں تھی۔" ماہ پارہ رو دینے والی ہو رہی تھی۔

"آج جو کچھ میں نے دیکھا اس کی امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا اور انٹرکام اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا۔ "آپ چائے پئیں گی۔"

"میں کسی کا خون پیوں گی۔" وہ دانت کچکچا کر بولیں۔

"او کے۔" میں نے کچن کا نمبر دباتے ہوئے کہا۔ "ایک چائے اوپر لے آؤ۔"

جمشید پیلس میں نائٹ سٹاف بھی تھا۔ جن میں ایک عدد باورچی بھی تھا۔ رات کو اگر کسی کو کھانے یا پینے کی ضرورت پیش آتی تو اسے ہر شے تازہ مل سکتی تھی۔ میں نے ماہ پارہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے افسوس ہونے لگا۔ میں نے ان کے پاس بیٹھ کر اپنا سر ان کے





زانوں پر رکھ دیا۔ "سوری مام۔"

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولیں۔

اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اُگل دیا کہ میں نے انہیں سچ ہی بتایا تھا لیکن کسی اور پیرائے میں اس اثناء میں چائے آ گئی اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے انہیں اب تک کی روداد سنائی۔ روداد ان کے لیے خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔ پوری بات سن کر انہوں نے میرے بال پکڑ لیے۔ "اچھا تو تم اب مجھے بھی چکر دینے لگے ہو۔"

"خدا نہ کرے۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "بس ذہن میں ایک بات آئی اور بے اختیار منہ سے نکل گیا آپ کا ردِعمل دیکھ کر مجھے شرارت سوجھنے لگی۔ اگر آپ کا دل دُکھا ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔"

"بکومت۔" انہوں نے مجھے خود سے لپٹا لیا۔ "بیٹے بھی ماؤں سے معافی مانگتے ہیں؟ میں کبھی تمہاری کسی بات پر ناراض نہیں ہو سکتی سمجھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گھنے درخت کے سائے تلے آ گیا ہوں۔ جمشید پیلس میں دو ہی ہستیاں تھیں جو مجھے سکون دیا کرتی تھیں۔ ایک ماہ پارہ اور دوسری کاجل، ماہ پارہ مجھ سے صرف سولہ سال بڑی تھیں اور دیکھنے میں اپنی عمر سے کہیں کم نظر آتی تھیں۔ ناواقف لوگ انہیں آسانی سے کالج گرل سمجھ سکتے تھے۔ ان کے حُسن میں کوئی کلام نہیں تھا اور وہ بھرپور جوان بھی تھیں اس کے باوجود وہ میرے ساتھ بالکل ماں کی طرح پیش آتی تھیں اور میں نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ وہ میری ماں نہیں ہیں۔ ساری بات سن کر انہوں نے مجھے بستر پر لیٹ کر سونے کا حکم دیا اور لائٹ آف کر کے باہر نکل گئیں۔ چائے پی کر رہی سہی نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ میں ماہ پارہ اور حسن علی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اپنی عمروں کا سنہرا دور گنوا رہے تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ ایک ہو جائیں اور جمشید پیلس سے نکل جائیں۔ جو ان کے لیے کسی قید خانے سے کم نہیں تھا۔ جمشید علی انہیں اس قید خانے تک لائے تھے اور اب انہیں رہا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

رات آنکھوں میں کاٹ کر میں سکول جانے کے لیے اٹھ گیا۔ حالانکہ میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر ایک اہم ٹیسٹ آ گیا تھا۔ یہ ٹیسٹ سالانہ رپورٹس کا ایک حصہ تھا اور تمام تر غیر نصابی سرگرمیوں کے باوجود میں تعلیمی میدان میں اپنے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ البتہ حسن علی بالکل تر و تازہ تھا جیسے رات بھر گھوڑے بیچ کر سوتا رہا ہو۔ وہ کار کے پاس میرا منتظر تھا۔ اس نے ماہ پارہ کے گھورنے پر نظریں چرائی تھیں۔

"میں نے یوسف کی تربیت کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کے مطابق یہ رات نو بجے کے بعد پیلس سے باہر نہیں جا سکتا۔" انہوں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"آئندہ میں خیال رکھوں گا۔" حسن علی آہستہ سے بولا۔

"اور تم بھی یوسف۔"

"او کے میڈم۔" میں نے تابعداری سے کہا۔

ہم سکول روانہ ہوئے۔ راستے میں موقع پاتے ہی میں نے حسن سے پوچھا۔ "اس نے کچھ اُگلا۔"

"کچھ نہیں۔" حسن علی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ "لگتا ہے آپ کے آدمیوں نے اس پر صحیح سے محنت نہیں کی۔"

"نہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" حسن علی نے گہری سانس لی۔ "اس سے پہلے ہی بابو بھائی نے خودکشی کر لی۔"

"خودکشی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس لمحے میری نظر ونڈ شیلڈ پر پڑی ایک دیوہیکل ٹرک سیدھا کار کی طرف آ رہا تھا۔



"کم آن جوزف۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے؟ میں کیوں باہر آؤں؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

وہ مسکرایا۔ "تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ لہٰذا بہتر ہے جو کہا جائے وہ کرو۔"

"اگر تم کہو کہ میں ہوا میں اُڑنا شروع کر دوں تو یہ میرے بس سے باہر ہوگا۔" میں نے متانت سے کہا اور باہر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مزاحمت کا فائدہ نہیں ہے۔

میرے باہر آتے ہی دروازے پر دوبارہ تالا لگا دیا گیا۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ جان گرے صرف مجھے لینے آیا تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سوائے انتظار کرنے کے کہ مستقبل میرے لیے اپنی پٹاری سے کیا لاتا ہے۔ کیمپ کے احاطے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ اسی ساخت کی جس پر ہم نے بندرگاہ کی سرنگ میں سفر کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جب جان گرے نے مجھے اپنے برابر والی نشست پر بیٹھنے کو کہا۔ ہمارے ساتھ کوئی گارڈ نہیں تھا۔

"حیرت ہے۔ تم مجھے ایسے ہی لے جا رہے ہو کیا تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم عقل مند آدمی ہو اور کوئی حماقت نہیں کرو گے۔"

"ایک منٹ ذرا جیپ روکو۔" کیمپ سے باہر آنے پر میں نے کہا۔ اس نے جیپ روک لی لیکن ساتھ ہی ایک ہاتھ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شاید اس میں کوئی ہتھیار تھا۔ میں نے زمین پر جیپ کی روشنی میں کوئی چیز تلاش کی اور مجھے ایک لکڑی اپنے کام کی مل گئی تھی۔ یہ دو فٹ لمبی اور تین انچ موٹی خاصی سخت ٹہنی تھی۔ میں نے اسے جان گرے کے سامنے کیا اور پھر یک دم اس پر ہاتھ مار کر



اُسے دو ٹکڑے کر دیا۔ "اگر ایسے ہی میں تمہاری گردن پر ہاتھ مار کر توڑ دوں تو؟" میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں ایک لمحے کو چمکی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "تم ایسا کر سکتے ہو لیکن اس کے بعد کیا ہوگا اس جزیرے کا ایک ایک فرد تمہاری تلاش میں لگ جائے گا اور خواہ تم کہیں بھی چھپ جاؤ یہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ابھی تم پر کوئی الزام نہیں ہے لیکن میرے قتل کی سزا تمہیں بہت خوفناک ملے گی۔"

"اگر مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے تو پھر تم نے مجھے قید کیوں رکھا ہے؟"

"احتیاطاً۔" وہ بولا۔ "جب مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے تو تمہیں آزادی مل جائے گی۔"

"اس جزیرے سے بھی؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "یہاں سے فرار بھی ممکن نہیں ہے۔ جزیرہ بحیرہ عرب اور بحر ہند کے سنگم پر ہے اور یہاں سے نزدیک ترین سرزمین بھی سات سو میل دور ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف فولادی جال بچھے ہیں جن سے بچ کر کوئی جا نہیں سکتا۔ ان جالوں کے اندر خونخوار شارک مچھلیاں موجود ہیں۔ جال سے باہر ہماری موٹر بوٹس مسلسل گشت کرتی رہتی ہیں۔ جزیرے کے تمام ساحل زیر نگرانی ہیں۔ ان حالات میں یہاں سے فرار صرف دیوانے کا خواب ہو سکتا ہے۔"

اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

میں نے سر ہلایا اور واپس آ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔ یہ اچھی قسم کی سڑک تھی جس کے دونوں طرف سرو قامت درخت تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ قصبے سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔ ابھی تک میں نے قصبے کو باہر ہی سے دیکھا تھا۔ جیل آبادی سے ہٹ کر تھی۔ سڑک قصبے سے گھوم کر پہاڑی ڈھلوان پر واقع جنگل کی دوسری طرف جا رہی تھی۔ معاً جیپ نے ایک طویل موڑ لیا اور ہم ایک گیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کے دائیں بائیں خاردار تاروں کا طویل سلسلہ جا رہا تھا۔ یہ جزیرے کا مشرقی حصہ تھا۔ بلندی کی وجہ سے کچھ فاصلے پر نرم ریت سے سر ٹکراتا سمندر صاف نظر آ رہا تھا۔

فولادی گیٹ کے برابر میں پول پر نصب تیز روشنی جل اٹھی۔ ایک گارڈ قریب آیا۔ "آئیڈینٹیٹی پلیز۔" اس نے کہا۔ جان گرے نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ گارڈ نے کارڈ پر لگی تصویر کا جان گرے کی صورت سے موازنہ کیا اور بولا۔

"ویری فائن...... لیکن یہ کون ہے؟"

"یہ میرے ساتھ ہے۔ کارڈ پر میں ایک فرد کو اپنی ذمے داری پر ساتھ لے جا سکتا ہوں۔"

"او کے آپ یہاں سائن کریں اور اس کا نام لکھیں۔" گارڈ نے ایک چھوٹی سی ڈائری نما کاپی اس کی طرف بڑھا دی۔

اس مرحلے سے گزر کر ہم آگے بڑھے تو میں نے دریافت کیا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"دیکھتے رہو۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

اندر سے یہ علاقہ کسی باغ سے مشابہ تھا جا بجا گارڈن لائٹس روشن تھیں ایک جگہ کچھ واٹر لینڈ ٹائپ کی چیز تھی۔ جہاں لوگ پانی میں کھیل رہے تھے یا سوئمنگ کر رہے تھے ان میں ایک بڑی تعداد صنفِ نازک کی تھی جن کے وجود سے اس رات کی رنگینیاں دو آتشہ ہو رہی تھیں۔ ان کے کھنکتے قہقہے یہاں تک آ رہے تھے۔ "تم نے تو یہاں جنت بسا لی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"ہاں ہم لوگوں کو جنت یہیں ملے گی۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور جیپ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے روک دی۔ جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ عمارت کے اندر ایک بھی متنفس نہیں تھا۔ حتیٰ کہ صدر دروازہ بھی تاریکی میں تھا۔ میں جان گرے کے ساتھ دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو یوں لگا جیسے الٰہ دین نے کھل جا سم سم کہہ دیا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی رنگ اور روشنیوں کا ایک سیلاب سا باہر کی طرف نکلا تھا۔ شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ دراصل یہ ایک نائٹ کلب تھا۔ جہاں کان پھاڑ دینے والی موسیقی پر جسم تھرک رہے تھے۔ اندر ایک ایسی بُو تھی جو صرف اس قسم کی جگہوں پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ سگریٹ، سگار، شراب، پرفیوم اور جوان جسموں کی ملی جلی مہک ہوتی ہے۔ ہمارے اندر جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اندر سے پوری عمارت دراصل ایک ہال تھی جس کے ایک گوشے میں بار بنا ہوا تھا۔ سامنے کاؤنٹر کے سامنے سٹول رکھے تھے۔ بار سے ذرا آگے میزیں لگی تھیں اور سامنے کا پورا حصہ ایک بال روم پر مشتمل تھا جہاں رنگ برنگی روشنیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک اسٹیج نما جگہ پر ایک شخص جس نے اپنے سر کے بالوں کو دنیا کے تقریباً ہر روز میں رنگ رکھا تھا۔ وہ جنونیوں کی طرح اپنے سامنے موجود دوشیزہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ بھیانک شور کا منبع اس کے عقب میں رکھے چار عدد قد آدم سپیکر تھے۔ بے پناہ شور میں گلوکار کی آواز سننا تو ایک طرف رہا صحیح سے موسیقی بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بلکہ یہ موسیقی تھی ہی کہاں۔ یہ تو خون کو کھولا دینے والی آوازیں تھیں۔ جنہیں سن کر اچھے بھلے سنجیدہ آدمی کا بھی کچھ کرنے کو دل چاہتا تھا۔ مثلاً اس شخص کا خون جس نے اس قسم کی موسیقی ایجاد کی تھی۔

رہی سہی کسر وہاں ناچنے والوں کی ہذیانی آوازوں نے پوری کر دی تھی۔ میں نے جان گرے سے کہا۔ "اگر تم مجھے سزا دینے لائے ہو تو تم اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب رہے ہو۔"

"ہمیں یہاں نہیں رُکنا۔" اس نے کہا تو میں محض ہونٹوں کی جنبش سے سمجھ سکا تھا جیسے اس نے میری بات سمجھی تھی۔

وہ سیدھا بار روم کی طرف گیا اس نے ایک ڈبل پیگ لیا اور اندر والے حصے کی طرف بڑھا۔ ہمیں ناچنے والوں کے درمیان سے گزرنا پڑا تھا۔ وہاں اتنا ہجوم تھا کہ ہمیں بہ مشکل راستہ مل رہا تھا





بلکہ بنانا پڑ رہا تھا۔ گداز دمکتے جسموں کے درمیان سے گزرنا ایک سنسنی خیز تجربہ تھا جب کہ خواتین عملاً جامے سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ چند ایک تو میرے گلے لگ گئیں۔ انہوں نے حلق تک پی رکھی تھی لیکن ناچنے پر مُصر تھیں۔ انہوں نے میرے کان میں چلا کر کہا۔

"ٹام تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں ہیری ہوں۔" میں نے اسے ایک طرف دھکیلا۔

ایک اور جگہ دو لڑکیاں شرارت پر آمادہ تھیں۔ وہ جسم سے جسم ملائے موسیقی کی لہروں پر ڈول رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے درمیان سے گزروں۔ خاصی جدوجہد کے بعد میں کامیاب ہو سکا۔ اس پر انہوں نے ایک مشترکہ قہقہہ لگایا تھا۔ جان گرے حسرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "کبھی میں بھی ایسے ہی مزے لیا کرتا تھا۔"

"مجھے شک ہے کہ تم کبھی جوان بھی تھے۔" میں نے کہا۔ وہ میرے تبصرے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے جیب سے ایک چابی نکالی اور قطار سے بنے دروازوں میں سے ایک دروازے میں لگائی۔ جب دروازہ کھلا تو میری الجھن دور ہو گئی۔ دراصل یہ ایک لفٹ تھی۔ اس نے اندر والی گرل کو ایک طرف کھسکایا۔ لفٹ مختصر سی تھی لیکن بے حد سُبک رفتار اور بے آواز تھی۔ میں نیچے کب پہنچا پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے گرل ایک طرف کھسکا کر دروازہ کھولا اور باہر آ کر اسے دوبارہ لاک کر لیا۔ یہ شاید نجی لفٹ تھی یہاں اوپر سے برعکس قطعی خاموشی تھی اتنی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی آئی۔

"یہ پہلا لیول ہے۔" جان گرے نے بتایا۔

"کس چیز کا؟" میں نے احمقانہ انداز میں دریافت کیا۔ وہ مسکرایا تو میں جھینپ گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ نائٹ کلب کئی منزلوں پر مشتمل تھا۔ اس کا اوپری حصہ محض ایک دکھاوا تھا اور اصل کلب اس کے نیچے تھا۔ جیسا کہ عام طور سے غیر قانونی طور پر چلنے والے کلب ہوتے ہیں۔ پردے کی آڑ میں اصل کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اوپر نچلے درجے کے، اور نچلی منزلوں میں اونچے درجے کے کیسو، قحبہ خانے اور تفریح کے دیگر لوازمات ہوتے ہیں۔ ان جگہوں پر کروڑ پتی ایک رات میں لاکھوں اور ارب پتی کروڑوں لٹا دیتے ہیں۔ مجھے وہ عرب پارٹی یاد آئی جو طیارے سے آئی تھی۔ عین ممکن ہے وہ عیاشی کے لیے اس جزیرے پر آئے ہوں۔ جان گرے اینڈ کمپنی نے اس جزیرے کو ان عیاشوں کی جنت بنا دیا ہو۔ گویا قزاقوں کا یہ گروہ محض قزاقی تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے کئی اور کاروبار بھی کر رکھے تھے اور یہ سب آپس میں مربوط تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ منشیات اور اسلحے کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہوں۔ یہ بے حد منافع بخش کام تھے۔ یہ ہزاروں لگا کر لاکھوں کمانے والی بات تھی۔ جان گرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یہ سب خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ لفٹ سے نکل کر ہم ایک مختصر سی راہداری سے گزرے جس کا اختتام ایک وسیع ہال میں ہوا۔

اس ہال میں قدیم اور جدید انداز کو ملا کر ایسی آرائش کی گئی تھی کہ دیکھنے والا ایک ہی نظر میں مسحور ہو کر رہ جاتا۔ ہال کے وسط میں ایک بلند گول چبوترے سے پانی سیڑھیوں سے پھسلتا نیچے آ رہا تھا ہر سیڑھی مختلف رنگوں میں روشن تھی۔ اس واٹر فال کے اردگرد دانستاً اندھیرا رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ اور نمایاں لگ رہی تھی۔ ہال میں جا بجا پودے گملوں میں اس طرح رکھے تھے کہ ان پر باغ کے تختوں کا گمان ہوتا تھا۔ ایک طرف قدیم یورپی طرز کے کلبوں کے انداز میں بھاری اور تاریک آرائش تھی۔ یہاں پنک اور آبنوس کی لکڑی کے کام کی بہتات تھی۔ اس قسم کا ایک کلب میں نے بیلجیئم میں دیکھا تھا۔ یہاں صرف ارب پتی طبقے کے خاندانی لوگ ہی ممبر بن سکتے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ممبر کے ساتھ کلب میں گیا تھا۔

درمیان میں بار تھا۔ دوسری طرف نسبتاً جدید انداز میں آرائشی نشستوں کا اہتمام تھا۔ یہاں نیلے اور سفید رنگوں کے امتزاج سے ماحول کو روشن رکھا گیا تھا۔ فرنیچر لکڑی اور دھات کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا اور آنکھوں کو بھلے لگنے والے رنگ استعمال ہوئے تھے۔ وہاں روشنی تیز تھی لیکن اس انداز میں کہ اس کا اثر دوسرے حصے پر بالکل نہیں پڑ رہا تھا۔ یہ ہال بلاشبہ ڈیزائننگ اور انٹیریئر ڈیکوریشن کا شاہکار تھا۔ اس کی منصوبہ بندی یقیناً کسی بین الاقوامی قسم کی کمپنی نے کی ہوگی۔ یہاں مخصوص سفید یونیفارم میں تربیت یافتہ بیرے اور اٹینڈنٹ تھے جو انتہائی خاموشی سے حرکت کر رہے تھے کہ ان پر روبوٹ کا گمان ہوتا تھا۔ ہال میں اکثر جگہوں پر لوگ موجود تھے لیکن یہ اس کی وسعت اور سجاوٹ کا کمال تھا کہ ہال ویران اور سنسان لگ رہا تھا۔ پوشیدہ قسم کے سپیکرز سے اتنی مدھم موسیقی خارج ہو رہی تھی کہ اسے کان لگا کر ہی سنا جا سکتا تھا۔ اس کی دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اوپر بجنے والے میوزک اور اس موسیقی میں وہی فرق تھا جو شیر کی دھاڑ اور کوئل کی کوک میں ہوتا ہے۔

جان گرے مجھے لے کر تاریک حصے کی طرف بڑھا ایک گوشے میں گھوڑے کی نعل کی شکل میں صوفہ سیٹ تھا۔ جس کے درمیان میں نصف دائرہ نما میز تھی۔ میز پر کئی اقسام کی شراب کی بوتلیں۔ بیئر کے ڈبے اور پانی معہ جام پہلے سے موجود تھا۔ اس کے باوجود آپ کو کسی اور شے کی خواہش ہو تو آپ بیرے سے کہہ سکتے تھے میز پر پھلوں سے بھری ایک ٹوکری بھی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ اناناس کے کٹے ہوئے نفیس ٹکڑے رکھے تھے۔

''کیا پیو گے؟'' جان گرے نے اپنے لیے جام بناتے ہوئے کہا۔

''سادہ پانی۔'' میں نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم چاہو تو کافی منگوالو۔''

اس نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح ایک ویٹر آ موجود ہوا۔

''یس سر۔''

''ایک کافی لے آؤ۔'' جان گرے نے اسے آرڈر دیا۔ ویٹر نے سر جھکایا اور خاموشی سے چلا گیا۔



''مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

اس نے گھونٹ لیا اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو میں تمہیں یہاں سے روشناس کرا رہا ہوں۔''

''اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔''

''ہاں مقصد تو ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے لیے کام کرو۔''

''یعنی قزاقوں کے لیے۔''

وہ ہنسا۔ ''قزاق، یہ تو صرف سامنے کا ایک پہلو ہے۔ ہمارے مقاصد اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہیں۔''

''کیا تم قزاقی کر کے بھوکوں کا پیٹ بھرنے جیسا کوئی کام کر رہے ہو۔ اس قسم کے کردار ہمارے ہاں بھی ملتے تھے۔ ایک ڈاکو تھا۔ سلطانہ وہ بھی ڈاکے مار کر غریبوں کی مدد کیا کرتا تھا۔''

''نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''ہمارا مقصد اس سے بھی اعلیٰ ہے۔ ہم سرے سے غربت کا خاتمہ چاہ رہے ہیں۔''

''ایسی باتیں تو ہمارے حکمران بھی کرتے ہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''غربت کے بجائے غریبوں کا خاتمہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ کہیں تم لوگ اس قسم کے کسی منصوبے پر تو کام نہیں کر رہے ہو۔''

ایک لمحے کو وہ شدت سے سنجیدہ نظر آیا لیکن دوسرے ہی لمحے ہنس دیا تھا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو رفتہ رفتہ ہمارے مقاصد سمجھ جاؤ گے۔''

ان کے مقاصد تو مجھے سمجھے بغیر بھی نیک نظر نہیں آ رہے تھے لیکن یہ بات میں نے منہ سے نہیں کہی۔ میں جانتا ہوں کہ منہ بند رکھ کر انسان بہت سارے مصائب سے بچ سکتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ انسان کو ناقابلِ بیان دشواریوں میں ڈال دیتے ہیں۔

''کیسے سمجھ پاؤں گا میں تو تمہارا قیدی ہوں۔''

''کل سے تم آزاد ہو، میری ضمانت پر لیکن اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں بھی تمہیں سزا سے نہیں بچا سکوں گا۔''

''تمہاری ضمانت۔'' میں ہنس دیا۔ ''تمہاری ضمانت میری پشت پر تین لکیروں کی صورت میں موجود ہے۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے اسے بتایا کہ ڈیئر ڈان نے جیل میں ہمارا استقبال کیسے کیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا۔ ''میں اسے دیکھ لوں گا۔''

''فی الوقت تو وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو بوقت رخصتی بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہو۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک موبائل فون نکال کر نمبر ملائے۔ ''میں جان گرے بات کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے پاس جو آدمی بھیجے تھے تم نے ان پر تشدد کیوں کیا۔'' دوسری طرف یقیناً ڈیئر ڈان تھا۔ ڈیئر ڈان نے کیا جواب دیا میں نہیں سن سکا تھا لیکن اسے سن کر جان گرے کا منہ بالکل ہی لال ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں کونسل کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔ تم نے اختیارات کو چیلنج کیا ہے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے موبائل بند کر دیا۔

''ڈیئر ڈان اچھا شخص نہیں ہے، تمہارے مقابلے میں۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

''یہ خود کو بہت کچھ سمجھنے لگا ہے۔'' جان گرے کے انداز میں حقارت تھی۔ ''میرے سامنے اس کی حیثیت چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے۔ اٹھو میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں۔''

وہ مجھے لے کر ایک بار پھر لفٹ کی طرف آیا۔ بے چارہ ویٹر جو کافی لا رہا تھا۔ ٹرے لے کر اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ لفٹ مزید نیچے گئی تھی۔ ''اس جگہ کتنے لیول ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بے شمار۔'' اس نے کہا اور ہم لفٹ سے باہر آ گئے۔ ''آج ذرا اسپیشل شو ہے۔''

شو کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ نائٹ کلبوں میں اسپیشل شو کے نام پر عام طور پر ابلیس کو شرما دینے والی حرکتیں ہوتی ہیں۔ ان میں اسٹریپ ٹیز سے لے کر لائیو سیکس شو تک سب شامل ہوتے ہیں لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ ہم جس ہال میں داخل ہوئے اس کی وسعت دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ ہال کم از کم بھی پچاس گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کے وسط میں ذرا گہرائی میں بیس گز دائرے کا ایک خالی حصہ تھا۔ جیسا کہ عام طور سے اکھاڑوں میں ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف قطار میں نشستیں لگی تھیں۔ ہم جس جگہ سے داخل ہوئے یہ حصہ وی آئی پی باکس پر مشتمل تھا۔ شیشے کے ایسے باکس تھے جن میں چار پانچ افراد آرام سے بیٹھ سکتے تھے اور ان میں ہر سہولت میسر تھی۔ باقی نشستیں بھی کھلی ہوئی اور آرام دہ تھیں۔ نشستوں والا حصہ وسط کے دائرے سے تقریباً پانچ فٹ بلند تھا۔

''کیا یہ رِنگ ہے؟''

جان گرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہاں مقابلے ہوتے ہیں۔''

''یعنی کشتی وغیرہ؟''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''تم کہہ سکتے ہو ویسے اس حصے کو سیزر ہال کہا جاتا ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ رومی جرنیل سیزر اس قسم کے مقابلے کرانے کا شوقین تھا جس میں انسان، انسانوں اور جانوروں سے لڑا کرتے تھے۔ یہ مقابلے خون ریز ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگ ان اکھاڑوں سے واپس زندہ آیا کرتے تھے۔ جان گرے مجھے لے کر اگلی قطار میں واقع بوتھ میں آیا تھا۔ شیشے کا دروازہ کھول کر ہم اندر آئے۔ جہاں ایئر کنڈیشن کی خنکی کے ساتھ ایئر فریشنر کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اندر صوفہ نما نشستیں تھیں۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ





دو سرتاپا بنی سنوری قیامتیں اندر داخل ہوئیں۔ یہ یورشیئن گرل تھیں۔ جن کے حُسن کے جلوؤں میں یورپ کی خیرگی اور مشرق کی کشش شامل تھی۔

''ہائے جان۔'' ایک لڑکی نے لہک کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

''ہائے ہنی۔'' جان نے اس کی گرم جوشی کا جواب اتنی زیادہ گرم جوشی سے دیا کہ مجھے نظر پھیرنا پڑی اور پھر میں گڑبڑا گیا۔ قیامت نمبر دو قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ہائے سمارٹ۔'' اس نے کہا۔

''ہائے۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ پیش کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرتی جو پہلی قیامت جان کے ساتھ کر رہی تھی۔

''میں جینا ہوں۔''

''میں یوسف۔'' میں مسکرایا۔

''یورپ کے کسی ملک سے ہو یا امریکی ہو؟'' اس نے سرک کر میرے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں بین الاقوامی باشندہ ہوں۔'' میں نے کہا اور یہ سچ بھی تھا۔ بحری جہاز پر کام کرنے والے لوگ بین الاقوامی باشندے ہوتے ہیں۔

''میرا مطلب ہے تمہارا پس منظر؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے اس بار بھی سچ کہا لیکن لڑکی مذاق سمجھی تھی۔ اس نے ہنس کر مجھ پر گرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ نشے میں تھی۔ اس کے منہ سے الکحل کی بو آ رہی تھی۔ سب سے آخر میں جان گرے تھا اس کے بعد قیامت نمبر ون پھر میں اور آخر میں قیامت نمبر دو تھی۔ گویا میں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ جینا موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ چپکنے کی کوشش کر رہی تھی مجبوراً مجھے جسم کو ذرا سخت کرنا پڑا۔ وہ چیخ اٹھی۔

''اُف تمہاری کہنی...... میرے......'' اس نے بتایا کہ کہنی اسے کہاں چبھی تھی۔

''سوری گرل۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اسی لمحے باہر شور ہوا۔ میں چونکا۔ رِنگ میں ایک طرف سے دیوار کسی سلائیڈنگ ڈور کی طرح ہٹی تھی اور ایک شخص اندر آیا۔ اس نے صرف لمبی سی نیکر پہن رکھی تھی۔ جب رِنگ میں دوسرا شخص بھی نظر آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کسی ایسے دروازے سے آیا ہوگا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی کچھ اس قسم کا تھا پھر ایک تیسرا شخص نظر آنے لگا۔ جس نے ریفری کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ بعد میں وہ اناؤنسر ثابت ہوا تھا۔ وہ مقابلے کی شرائط بیان کر رہا تھا۔ درحقیقت مقابلے کی ایک ہی شرط تھی یعنی زندہ بچنے والا ہی فاتح شمار ہوگا۔ رِنگ کے اندر اپنے مخالف کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر سکتے تھے کیونکہ وہ دونوں کسی ایک ہتھیار پر متفق نہیں ہوئے تھے اس لیے مقابلہ خالی

ہاتھوں ہوتا تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ "یہاں خونی مقابلہ ہوگا؟"

"تم نے درست سنا ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "اگر یہ بکواس ہوتی تو یہ لوگ ہزاروں ڈالرز کے ٹکٹ لے کر یہاں نہ آتے۔ یہاں ان کو سچ مچ خونی مقابلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

"لیکن یہ خلاف قانون ہیں۔"

"کس قانون کے؟" اس نے سوال کیا تو میں لاجواب ہوگیا۔ واقعی اس جگہ کا کوئی قانون نہیں تھا۔

"اس کے باوجود دو انسانوں کو آپس میں لڑانا یہ تو وحشت ہے۔ قدیم دور کی سفاکی۔"

"کیا باکسنگ اور ریسلنگ کے مقابلے نہیں ہوتے۔ ان میں بھی لوگ مر جاتے ہیں۔" جان گرے نے کہا۔

"وہ اتفاقی حادثات ہوتے ہیں۔ یہاں تو جان بوجھ کر ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں ہلاک کروایا جا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ کچھ ذہنی مریض اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہزاروں لاکھوں خرچ کرنے کو تیار ہیں۔" میرے لہجے میں تلخی تھی۔ جان گرے کی آنکھوں سے سرخی جھلکنے لگی۔

"تم ابھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ صرف اس جزیرے پر نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی بہت ساری جگہوں پر یہ کھیل ہوتا ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کرتے۔ لوگ اپنی خوشی سے اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اب ان دونوں کو دیکھ لو امریکہ میں یہ تیسرے درجے کے نمائشی ریسلر ہیں۔ انہیں کشتی لڑنے کے عوض صرف چند ہزار ڈالرز ملتے ہیں۔ یہاں سے زندہ جانے والے فاتح کو ایک لاکھ ڈالرز ملیں گے۔"

"ایک لاکھ ڈالرز۔" میں نے طنز کیا۔ "کیا کسی کی جان کا معاوضہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔ "بھوکا آدمی ایک روٹی کے عوض اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو جاتا ہے ہر آدمی کا معاوضہ ہے جس کے بدلے وہ اپنی جان کو دوسرے کے ہاتھ میں دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔"

"ان کا معاوضہ ایک لاکھ ہے۔" میں نے رِنگ میں موجود لڑاکوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں...... ان کی اوقات یہی ہے۔ ورنہ یہ کبھی اتنی رقم کے بدلے اپنی جان داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہ ہوتے۔"

"تمہاری جان کی کیا قیمت ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میری جو قیمت ہے وہ میں وصول کر رہا ہوں۔ تمہارے خیال میں کیا میں اپنی جان داؤ پر نہیں لگا رہا۔" اس نے بیئر کا ٹن منہ سے لگایا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ وہ واقعی بلانوش





تھا۔ "اب خاموش رہو مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔"

"اس میں کوئی چھوٹ تو ہوگی۔ فرض کرو دونوں ہی بے دم ہو جائیں۔" میں نے باہر کی طرف دیکھا۔

"تو مقابلہ دوبارہ ہوگا۔"

"اور اگر کوئی مقابلہ سے دست بردار ہو جائے؟"

"اس صورت میں وہ اپنے حریف کے رحم و کرم پر ہوگا۔ وہ چاہے تو اسے مار ڈالے لیکن اس کے لیے اسے دیکھنے والوں کی پسند کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اگر تماشائی اصرار کریں تو فاتح پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے مار ڈالے۔"

اس وقت میرے اندر ایک لاوا سا اُبل رہا تھا۔ یہ لوگ کتنی بے حسی اور سفاکی سے انسانوں کو استعمال کر رہے تھے۔ محض دولت کے لیے لیکن نہیں دولت کے لیے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنے جھگڑے، فساد اور خونریزیاں ہیں سب دولت کی وجہ سے ہیں لیکن ان لوگوں نے تو حد کر دی تھی۔ میں نے سانس کی ایک مشق کی تاکہ اپنے اندر جمع ہونے والے بخارات کو باہر نکال سکوں۔

اس لمحے شور اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک سیاہ فام تھا اور دوسرے کی رگوں میں شاید ریڈ انڈین خون تھا۔ اس کے سیاہ بالوں اور آنکھوں سے ایسا ہی ظاہر تھا۔ اس کا انداز بھی وحشیانہ تھا بالکل کسی لڑاکا ریڈ انڈین کا سا۔ اس نے سینے سے حریف کو جکڑ رکھا تھا اور سر سے ٹکریں مار رہا تھا۔ لمحوں میں سیاہ فام کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ خون آلودہ ہو کر اس کا چہرہ اور بھیانک لگنے لگا تھا۔ اچانک اس نے ریڈ انڈین کی ناک اپنے دانتوں سے پکڑ لی اس نے اتنے کس کر ناک پکڑی کہ اس کی نوک کٹ کر سیاہ فام کے منہ میں آگئی۔ ریڈ انڈین بیل کی طرح ڈکرایا اور سیاہ فام کو چھوڑ کر اپنی ناک پکڑ لی اب حساب برابر ہو چکا تھا۔

زخمی ہونے کے بعد دونوں ہی محتاط ہو گئے تھے۔ وہ اپنی توانائیاں بچا رہے تھے اور تماشائی چیخ چیخ کر انہیں لڑنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ جب وہ خاصی دیر تک ایک دوسرے کے پاس نہیں آئے تو ریفری نے انہیں وارننگ دی۔ اس وارننگ کا مطلب تھا کہ انہیں رِنگ سے باہر نکال دیا جائے گا اور انہیں پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ بادلِ نخواستہ وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ خاصی دیر تک ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ جس میں دونوں ہی مزید زخمی ہو گئے امریکہ کے ریسلنگ کے نمائشی مقابلوں میں حصہ لینا اور بات تھی اور یہاں زندگی و موت کا کھیل کھیلنا الگ چیز تھی۔ اس نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ ہار کا مطلب تھا موت اور موت قبول کرتے ہوئے سبھی جھجکتے ہیں۔ ایک لاکھ ڈالرز کی کشش نہ ہوتی تو شاید وہ اس مقابلے کی ہمت ہی نہ کر پاتے۔ دیکھنے میں سیاہ فام زیادہ مضبوط نظر آتا تھا اور ریڈ انڈین زخمی بھی زیادہ تھا لیکن اس نے چالاکی سے کام لیا۔ ایک موقع پر جب اس نے سیاہ فام کو دیوار کے پاس گھیرا تھا۔ اس نے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ چند لمحے کے لیے

چکرایا اور ریڈ انڈین اس پر حاوی ہو گیا۔ اس نے دوسری بار زیادہ قوت سے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔ ریڈ انڈین نے کھڑے ہو کر فاتحانہ انداز میں حلق سے آواز نکالی تھی۔ اس لمحے وہ سیاہ فام کو فراموش کر بیٹھا تھا اور فتح کے نشے میں ہاتھ پیروں سے مجنونانہ قسم کے اشارے کر رہا تھا۔ پھر اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''اسے قتل کرو۔ مار ڈالو، کل ہم......''

تماشائی دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک انسان پڑا تھا اور وہ دوسرے انسان سے اس کے قتل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھتا رہا۔ پھر اکڑتے ہوئے سیاہ فام تک پہنچا۔ چند لمحے پُرغرور نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا۔ سیاہ فام نے تڑپ کر اس کی ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈال دیا۔ ریڈ انڈین کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ اس کی جان سیاہ فام کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔ ریڈ انڈین ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس نے دو تین بار ہاتھ چلائے لیکن سیاہ فام اس کے ہاتھوں کی رسائی سے دور فرش پر پڑا تھا۔ اس نے اپنی ساری قوت ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔ اس نے بازوؤں کو اس طرح اکڑا لیا تھا کہ ریڈ انڈین بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسے داؤ میں پھنس گیا تھا کہ نکلنے کی صورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تین بار اس نے سیاہ فام کو ٹھوکریں مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اتنی پھسپھسی تھی کہ اسے ضرب کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ریڈ انڈین کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

اچانک سیاہ فام نے ہاتھوں کی پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ ایک زخمی درندے کی سی چیخ کے ساتھ ریڈ انڈین دیوار سے ٹکرایا اور نیچے گر پڑا۔ اب اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ سکے۔ اگلے ہی لمحے سیاہ فام اس کی پشت پر تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملا کر ریڈ انڈین کی گردن کے گرد لگائے اور گردن کو پیچھے کی طرف کھینچنے لگا۔ اگر ریڈ انڈین میں دم ہوتا تو وہ اسے اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہونے دیتا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور جسم نزع کی حالت سے تڑپنے لگا۔ سیاہ فام پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ ٹک گیا۔ اس کی اپنی حالت بُری تھی مگر وہ فاتح تھا۔

جیسے ہی اس کی فتح کا اعلان ہوا لوگوں نے چیخ چیخ کر ایک قتل پر اسے مبارک باد دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ خوش نہیں تھا۔ وہ خالی نظروں سے تماشائیوں کو دیکھتا رہا جو رِنگ میں نوٹ اور مختلف اشیاء پھینک رہے تھے۔ ایک شیخ کو میں نے اپنی قیمتی انگوٹھی اُتار کر پھینکتے ہوئے دیکھا۔ جس میں خاصا بڑا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ سیاہ فام اٹھ کر ان چیزوں اور نوٹوں کو جمع کرنے لگا۔ اس نے ناقابلِ یقین انداز میں بازی پلٹ کر لوگوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں لطف اٹھایا تھا۔ رِنگ کے سلائیڈنگ ڈور کھلے۔ ان میں سے کچھ افراد برآمد ہوئے۔ ریفری نے آ کر سیاہ فام کا بازو ہوا میں بلند کیا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا اور لڑکھڑاتا ہوا جس سوراخ سے آیا تھا اس سے واپس چلا گیا۔ اب رِنگ کی صفائی کی جا رہی تھی۔ بعض لوگ اسٹریچر پر ریڈ انڈین کی لاش




لے جا رہے تھے اس کی ٹوٹی ہوئی گردن کے باعث سر بے ڈول طریقے سے حرکت کر رہا تھا۔ دوسرا عملہ رِنگ کی صفائی ستھرائی میں لگ گیا۔ انہوں نے فرش سے خون صاف کیا۔ ایک شخص کو میں نے زمین سے ریڈ انڈین کی کٹی ناک کا حصہ اٹھاتے دیکھا۔ جو سیاہ فام نے دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ بہ مشکل پون گھنٹے میں یہ سارا تماشا ختم ہو گیا۔

''کیا یہ سلسلہ جاری رہے گا ابھی؟'' میں نے خاصی دیر بعد جان گرے کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''ہاں آج دو مقابلے اور ہوں گے۔'' اس نے سر ہلایا اور اپنی ساتھی لڑکی سے بولا۔ ''ہنی کچھ پینے کے لیے لاؤ۔''

ہنی لہراتی بل کھاتی اٹھی اور جان بوجھ کر مجھ سے اپنے نرم و گداز وجود کو ٹکراتی کیبن سے باہر چلی گئی۔ رِنگ میں نئے مقابلے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ معاً میری نگاہ چھت پر لگے کیمروں پر گئی۔ دور سے کنٹرول کیے جانے والے یہ کیمرہ چھ مختلف زاویوں سے رِنگ کو دکھا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رِنگ کی دیواروں اور کچھ مقامات پر بھی کیمرے ہوں گے۔

''تم لوگ ان مقابلوں کی مووی بھی بیچتے ہو؟''

''ہاں۔'' جان گرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کے علاوہ ہم اسے لائیو ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں۔ دنیا کے بے شمار حصوں میں ہمارے مخصوص نائٹ کلبوں میں ان مقابلوں کو دکھایا جاتا ہے۔ لوگ ان پر شرطیں لگاتے ہیں۔''

''بکی تم ہوتے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔ ''طے شدہ فائٹس کراتے ہو۔''

''نہیں کوئی شخص اپنی زندگی کے عوض مقابلہ فکس نہیں کرتا۔'' وہ بولا۔ ''البتہ ہمارے پاس کچھ اور طریقے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم شرطوں میں نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔''

''میرے خدا کیا دنیا والوں کو یہ سب نظر نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ اتنی دلیری سے اتنے انسانیت سوز کام کر رہے ہو۔ انسانیت کے نام نہاد علم بردار کیا کر رہے ہیں؟''

''انسانیت کے علم بردار۔'' جان گرے نے قہقہہ مارا۔ ''یہ کس چڑیا کا نام ہے اور یہ کہاں پائی جاتی ہے۔''

''اسی دنیا میں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''انہیں صرف وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں سیاست میں نہیں پڑتا۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔ ''یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ ہم تو بس لوگوں کو تفریح فراہم کرتے ہیں۔''

''اس قسم کی تفریح۔'' میں نے رِنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔ ''جلد تم دیکھو گے۔ اس جگہ پر

ایک بین الاقوامی قسم کا کیسینو ہے۔ جہاں صرف کروڑ پتی اور ارب پتی افراد ہی کھیلتے ہیں۔ ہم نے اس جزیرے کو جنت بنا دیا ہے۔ یہاں دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کی حسین ترین لڑکیاں ملتی ہیں۔''

''دلالی کے اس کاروبار کو تم تفریح کا نام دیتے ہو۔''

''یہ تو سوچ کا فرق ہے۔ اگر تم مشرق والے ایسی سوچ نہیں رکھو گے تو اسی طرح پسماندہ رہو گے۔ دیکھو جب تک انسان کو اپنی کمائی گئی دولت خرچ کرنے کی آزادی نہیں ملے گی وہ دولت نہیں کمائے گا۔ دنیا کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو آزادی ملے۔''

''جنگل کی سی آزادی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''جہاں طاقتور سب کرنے کے لیے آزاد ہیں اور کمزوروں کو صرف مرنے کی آزادی حاصل ہو۔''

''دنیا کا فلسفہ یہی ہے، ہمیشہ سے۔''

''پھر اتنے مذاہب اور اتنے سماجی مصلح کیوں سامنے آئے۔ آج بھی دنیا کی اکثریت اچھائی پر یقین کیوں رکھتی ہے؟''

وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''اور عملاً دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیا یہاں جنگل کا قانون نہیں ہے۔''

''ایسا صرف چند لوگوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے طاقت کے بل پر دنیا پر قبضہ کر لیا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو یہ چند لوگ چاہتے ہیں۔''

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ تمام اصول اور قواعد ایک طرف، ہوتا وہی تھا جو بڑی طاقتیں چاہتی تھیں۔ رِنگ میں دوسرا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس بار ایک تھائی کِک باکسر ایک جاپانی جوڈو ماسٹر سے مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں الگ انداز کے لڑاکے تھے لیکن اس رِنگ میں اہمیت لڑنے کے انداز کی نہیں بلکہ فنا و بقا کی رہ جاتی تھی۔ ہار سے بچنے اور فتح کے لیے ہر حربہ جائز تھا۔ جلد ہی دونوں لڑاکے اپنے اصل انداز کو بھول کر ایک وحشیانہ جدوجہد میں اُلجھ گئے تھے۔ میرے ذہن میں ان فلموں کے مناظر روشن ہو گئے جو پُرانے رومن دور پر بنائی گئی تھیں تقریباً ہر فلم میں ان خونی اکھاڑوں کو ضرور دکھایا گیا تھا۔ جہاں انسان اور جانوروں کے درمیان فنا و بقا کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ انسان، انسان سے برسرِ پیکار ہوا کرتے تھے۔ اکھاڑوں کی سرزمین انسانی خون سے لالہ زار ہو جایا کرتی تھی اور وحشی رومن اس سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس پر بھی ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مہذب قوم تھے۔ بالکل اسی طرح دورِ جدید کی مہذب قومیں اپنی تہذیب کی جھلک نت نئے انداز میں دکھایا کرتی ہیں۔ یہ بھی ان کے مہذب ہونے کا ثبوت تھا۔

بالآخر تھائی کِک باکسر، جوڈو ماسٹر کے ایک داؤ پر آ گیا اور اپنا ٹخنہ تڑوا بیٹھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ جوڈو ماسٹر کے لیے آسان تھا۔ ایک اور آدمی زندگی ہار گیا تھا۔ فتح انسان کے نہیں موت کے حصے میں آئی تھی۔ لوگ دیوانے ہو گئے تھے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوتا ہے جو اس خونریزی کا تقاضہ کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس تقاضے کو خود پورا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا





وہ خون بہتا دیکھ کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔ یہاں زیادہ ایسے ہی لوگ تھے، جن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی سے لڑ کر اور اسے شکست دے کر اپنی حیوانی فطرت کی تسکین کرتے۔ لہٰذا وہ رقم خرچ کر کے یہ تسکین حاصل کر رہے تھے۔ یہ بزدل لوگ تھے جو اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے لہٰذا یہ دوسروں کو لڑاتے تھے۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر وحشیانہ تسکین کرنے آئے تھے۔

تماشائیوں میں ہر نسل اور ہر قوم کے افراد نظر آ رہے تھے۔ ان میں عماموں اور عباؤں والے عرب بھی تھے۔ سوٹ پوش مغربی باشندے بھی، سیاہ بھی اور زرد نسل کے لوگ، برصغیر کے بھی کچھ لوگ نظر آ رہے تھے لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہو سکتا تھا لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی وہ بے انتہا دولت رکھتے تھے اور اس کے بل بوتے پر اپنے اندر کے حیوان کو مطمئن کرنے آئے تھے۔ حیران کن بات تھی کہ ہال میں جتنے مرد تھے تقریباً اتنی ہی عورتیں بھی تھیں اور وہ ذوق و شوق سے یہ خون ریز مقابلے دیکھ رہی تھیں۔ جب مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے پر وحشیانہ حملے کرتے تھے تو ان کے منہ سے مسرت بھری چیخیں برآمد ہوتی تھیں۔ اگلی نشستوں پر اکثر عورتیں تھیں۔ خود ہمارے ساتھ جو قیامتیں بیٹھی تھیں۔ وہ مقابلہ شروع ہوتے ہی ہمیں بھول جاتی تھیں۔ مقابلے کے دوران ان کا جوش و خروش قابلِ دید ہوتا تھا۔ قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ اس دوران جینا کم سے کم مجھے بھول جاتی تھی اور میں اس کی دست درازیوں سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

اب آخری مقابلہ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ مقابلہ اہم ترین ہوگا۔ اس قسم کے مقابلے سب سے آخر میں رکھے جاتے تھے۔ سب سے پہلے ایک لمبا تڑنگا سانولے رنگ کا نوجوان رِنگ میں آیا۔ اس کے سر کے بال حبشیوں کی طرح سخت گھنگریالے تھے اس کے نقوش دلکش تھے اور جسم کسرتی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی زندگی جدوجہد و مشقت میں گزری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شمالی افریقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سادہ سی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔

''یہ احمد بربری ہے۔'' جان گرے نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ ہمارا مجرم ہے۔''

''مجرم۔'' میں چونکا۔ ''کیا کیا ہے اس نے؟''

''یہ ایک مستند بین الاقوامی دہشت گرد ہے۔ اس کا تعلق الجزائر کی اسلامی تحریک سے ہے۔ وہاں یہ حکومت کو کئی دہشت گردی کی وارداتوں میں مطلوب ہے۔ یہ الجزائر سے بھاگ کر فرانس چلا گیا اور وہاں دہشت گردی کے ایک بین الاقوامی نیٹ ورک کے لیے کام کرنے لگا۔ بحرہ روم میں اس نے ہمارے مفادات کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ ہمارے ہاتھ آیا۔ ہم نے اس جگہ لا کر اس پر مقدمہ چلایا اور اسے سزائے موت سنا دی۔ اسے ایک موقع دیا ہے کہ وہ یہ

مقابلہ جیت کر سزائے موت سے بچ سکتا ہے مگر یہ بچے گا نہیں۔'' جان گرے کے لہجے میں اس کے لیے نفرت تھی۔

''تم لوگ کسی کو سزائے موت دینے والے کون ہوتے ہو؟''

''ہم طاقتور ہیں، اس لیے ہم یہ اختیار رکھتے ہیں۔'' اس نے غرور سے کہا۔ ''ہم اپنے مجرموں کو......''

''مخالف کہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''چلو مخالف ہی سہی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ان مخالفوں کو ہم نشانِ عبرت بنا دیں گے تاکہ آئندہ کوئی مخالفت کی جرأت نہ کرے۔''

''یہ خوش فہمی ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''جبر کے خلاف مزاحمت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اپنے مخالفوں سے نجات حاصل کر سکتے ہو کہ مخالفین کو ختم کر دو۔''

''وقت آنے پر ہم ایسا بھی کریں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''فی الحال تو اس کا عبرت ناک انجام دیکھو۔''

میں نے احمد بربری کی طرف دیکھا تو میرے اندر سے بے اختیار صدا نکلی کہ اس نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے۔ اتنی خوب صورت جوانی کو مٹی میں نہیں ملنا چاہیے۔ اس لمحے رنگ کے دوسرے دروازے سے ایک دیو نمودار ہوا۔ قد و قامت کے لحاظ سے ایک دیو ہی کہنا چاہیے۔ اس کا قد سات فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ پہاڑ جیسا جسم لیکن سر جسم کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ اس نے چہرے پر مختلف رنگ اس انداز میں کر رکھے تھے کہ اس کا چہرہ شیطان جیسا لگ رہا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے جسامت اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس نے چمڑے کی سیاہ پتلون اور بنیان پہن رکھی تھی جس میں اس کے جاندار پٹھے ظاہر تھے۔ مجھے وہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ جان گرے نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے جھک کر کہا۔

''یہ ایول (شیطان) ہے۔''

''وہ تو شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اب اسے پہچان گیا تھا۔ وہ آج سے تین چار سال پہلے تک امریکن ریسلنگ کا جانا پہچانا نام تھا۔ اس نے کوئی بیلٹ بھی حاصل کی تھی لیکن پھر اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ مقابلے کے دوران اداکاری بھول کر سچ مچ مخالف سے لڑنے لگتا تھا۔ اس نے کئی بار حریف پہلوان کو شدید زخمی کر دیا اور ایک پہلوان کو تو تقریباً مار ہی دیا تھا۔ اس کے بعد اس پر پابندی لگا دی گئی تھی اور وہ منظر سے غائب ہو گیا۔

''ہم نے اسے ہائر کر لیا۔'' جان گرے بولا۔ ''اب یہ ہمارے لیے لڑتا ہے لیکن ہر مقابلے میں شامل نہیں ہوتا بلکہ اسے صرف خاص مقابلوں کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ عام طور سے یہ ہمارے مخالفوں سے مقابلہ کرتا ہے اور انہیں عبرت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔





اب تک اس نے پندرہ مقابلے کیے ہیں اور سب میں فاتح رہا ہے۔''

اس دیو قامت شیطان کو دیکھ کر احمد بربری کے چہرے پر خوف تو ایک طرف فکر کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ وہ سکون سے پاؤں پھیلائے کھڑا تھا۔ اپنے لمبے تڑنگے وجود کے باوجود ایول کے سامنے بچہ لگ رہا تھا۔ جو اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں سے اس گھور رہا تھا۔ ایول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسس پی کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں ہمیشہ سے نسل پرستی کا زور رہا ہے۔ ایول کا خاندان بھی زبردست نسل پرست رہا اور اس کا باپ نسل پرست تنظیم کو کسی کلان کس کا علاقائی لیڈر تھا۔ ٹرپل کے کہلانے والی اس دہشت گرد جماعت کی تاریخ سو سال پر محیط تھی۔ نظریاتی طور پر اس نے اس وقت ہی جنم لے لیا تھا۔ جب امریکی صدر ابراہام لنکن نے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ غلاموں کے خلاف اس تنظیم نے طویل عرصے تک دہشت گردی جاری رکھی تھی۔

ایول کا باپ ایک حملے میں مارا گیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ فاموں کی ایک بستی پر حملہ کرنے گیا تھا۔ جوابی فائرنگ سے وہ اپنے ساتھیوں سمیت جہنم رسید ہوا تھا۔ اس پر چراغ پا نسل پرستوں نے علاقے میں قیامت ڈھا دی تھی۔ ایول بھی اپنے باپ کی موت سے متاثر ہوا تھا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ ہر غیر سفید فام سے اپنے باپ کی موت کا انتقام لیتا رہے گا۔ آوارہ گردی، بدمعاشی اور نسل پرست گروہوں سے ہوتا وہ بالآخر ریسلنگ کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ بالآخر اسے یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

''ایول ہمارا بہترین کارکن ہے۔'' جان گرے نے فخر سے کہا تھا۔

بلاشبہ شیطان کے لیے ایسے ہی کارکن بہترین تھے۔ ایول زبان اور جسم سے اپنے عزائم کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ کس طرح احمد بربری کو موت کے گھاٹ اُتارے گا۔ اس کی لاف گزاف سن کر وہاں موجود لوگوں کے چہرے سفید ہو گئے تھے لیکن احمد بربری کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ وہ مضحکہ اُڑانے والی نظروں سے ایول کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رنگ میں کوئی ایسا بندوبست تھا کہ وہاں ہونے والی معمولی سی آہٹ بھی پورے ہال میں سنائی دیتی تھی۔ ہم بھی ایول کی گفتگو سن رہے تھے جس کا اکثر حصہ صرف بالغان کے لیے تھا۔ آخر میں اس نے حقارت سے احمد بربری کی طرف دیکھا۔

''تو کیا کہتا ہے کیڑے؟''

''صرف اتنا کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے اور بھونکنے والے کتے کاٹ نہیں سکتے۔'' وہ سکون سے بولا۔

تماشائیوں کی طرف سے قہقہے بلند ہوئے تھے۔ اس کے ایک جملے نے فضا بدل دی تھی۔ ایول کے حلق سے بے معنی سی آوازیں نکلیں اور وہ احمد کی طرف بڑھا۔ حالانکہ ابھی گھنٹی نہیں بجی تھی لیکن چالاک منتظمین نے فوراً ہی گھنٹی بجا دی تھی۔ تاکہ ایول کا ٹیمپو برقرار رہے۔ ایول کے حرکت میں آتے

ہی احمد بربری رِنگ میں آہستہ آہستہ اُچھلتے ہوئے چکر لگانے لگا۔

''آ کتے، اگر تمہارے منہ میں دانت ہیں تو مجھے کاٹ کر دکھاؤ۔''

اس جملے نے ایول کو پاگل کر دیا۔ وہ اندھے بیل کی طرح اس کی طرف دوڑا۔ احمد بربری سکون سے کھڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک طرف ہو جائے گا۔ اس کے بجائے اس نے سلپ ہو کر ایول کی ٹانگوں سے ٹانگ پھنسائی اور پیچھے کی طرف رول کر گیا۔ ایول دوگنی رفتار سے منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون کے ساتھ گالیوں کا فوارہ بھی نکلا تھا۔ احمد بربری نے اس پر حملہ نہیں کیا، بلکہ اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ رِنگ میں چکر لگاتے ہوئے اس نے دوبارہ جملہ کسا۔

''میرا خیال ہے تمہاری ماں روسی نسل کی کتیا تھی۔ اس وجہ سے تمہارا سر چھوٹا رہ گیا۔''

ایول اٹھ کر ایک بار پھر اس کی طرف لپکا۔ احمد بربری پیچھے ہٹا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے جیسے اسے ہاتھوں سے روکنا چاہ رہا ہو۔ ''مارا جائے گا۔'' میں نے دل میں کہا۔ ایک بار اس دیو کے قبضے میں آ گیا تو اس کی بچت ممکن نہ رہتی لیکن اس نے ایک بار پھر حیران کن داؤ آزمایا تھا۔ ایول کی ساری توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف تھی لہٰذا وہ اس کے پاؤں کو اٹھتے اور اپنی ناف کی طرف آتے نہ دیکھ سکا۔ اس کی رفتار نے وار کی قوت دوگنی کر دی تھی۔ وہ دھاڑ کر پیچھے جا گرا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وار بھرپور تھا اور بالکل درست جگہ پر لگا تھا۔ اگر ایول کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید مر جاتا لیکن وہ صرف نام کا شیطان نہیں تھا بلکہ اس کے وجود میں بھی شیطانی قوت بھری تھی۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں احمد بربری نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

''یہ تو ہمارے اندازے سے زیادہ تیز ہے۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔

''افسوس کہ تم لوگ ہمیشہ غلط اندازے لگاتے ہو۔'' میں نے تبصرہ کیا جس پر اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

میں مسکراتے ہوئے مقابلے کو دیکھ رہا تھا اور میری تشویش خاصی حد تک کم ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایول اب اس نوجوان پر آسانی سے قابو نہ پا سکے گا۔ ایول تیسری بار اندھا دھند حملہ آور ہوا اور احمد بربری نے یہ حملہ بھی با آسانی ناکام بنا دیا تھا۔ اس کے بعد ایول محتاط ہو گیا۔ اب وہ احمد بربری کو گھیرنے کی فکر میں تھا۔ وہ مخصوص انداز میں اُچھلتا ہوا رِنگ کے چکر لگا رہا تھا۔ ایول کی مغلظات کے جواب میں وہ جملے کس کر اسے طیش دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایول غصے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاصا زخمی تھا اور نازک جگہ پر شدید ضرب کھا چکا تھا لیکن یہ چوٹیں اسے زیادہ دیر نہیں روک سکتی تھیں۔ احمد کو اس پر فیصلہ کن ضرب لگانی چاہیے تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے دو بار زمین بوس ایول کو رعایت دی تھی۔ شاید وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ یہ ایک بے اصول مقابلہ تھا۔ جس میں کسی قسم کے اخلاق کی گنجائش نہیں تھی۔ حریف کو ہر قیمت پر کسی بھی طریقے سے





موت کے گھاٹ اُتارنے کا سوال تھا۔ اگر ایول کو موقع مل جاتا تو وہ اسے کسی قسم کی رعایت نہ دیتا اور فی الفور اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کرتا۔

ایول رفتہ رفتہ احمد کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ بہ ظاہر احمد اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بالکل غیر متوقع طور پر وہ حملہ آور ہوا۔ اس نے فلائنگ کِک کے انداز میں اُچھل کر دونوں پیر جوڑ کر اس کے پیٹ میں مارے۔ ابھی وہ پہلی تکلیف سے ہی نہیں سنبھلا تھا کہ یہ دوسری قیامت اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ زمین پر تڑپتا ہوا اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ احمد ایک بار پھر سکون سے کھڑا ہو گیا۔ جان گرے نے کہا۔ ''لعنت ہو۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی نشست کے نچلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک لمحے کے لیے گونجنے والی سیٹی نما آواز سنی۔ آواز گونجتے ہی ایول چونک گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اب بھی پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے جان گرے سے پوچھا۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''کون سی آواز؟'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''یہی سیٹی جیسی آواز جو ایک لمحے کے لیے گونجی تھی۔''

''معلوم نہیں۔ میں نے تو نہیں سنی۔ شاید ساؤنڈ سسٹم میں کوئی خرابی ہوئی ہو گی۔''

لیکن مجھے یقین تھا کہ ساؤنڈ سسٹم میں کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کوئی نہ کوئی چکر تھا۔ کوئی اشارہ یا پیغام تھا۔ ایول کے لیے۔ ورنہ وہ اس آواز کو سن کر کیوں چونکتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے رِنگ کی دیوار کی طرف سرک رہا تھا۔ شاید وہ کسی داؤ کی فکر میں تھا۔ میرا ذہن سیٹی کی آواز میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس لیے میں نہیں دیکھ سکا کہ کیا ہوا تھا۔ مجھے احمد بربری کی چیخ نے چونکا دیا۔ احمد کے بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا اور ایول کے ہاتھ میں فٹ بھر لمبی نوکدار فولادی سلاخ تھی۔ اس نے اس سے احمد پر حملہ کیا تھا۔ وہ بازو دباتے پیچھے ہٹ رہا تھا کہ ایول نے دوسرا وار کیا اگر احمد پھرتی نہ دکھاتا تو سلاخ اس کے دل میں اُتر جاتی اس کے باوجود اس کی پسلی زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ بے ایمانی ہے۔'' میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''اس کے پاس سلاخ کہاں سے آئی؟''

''مجھے کیا معلوم۔'' جان گرے نے بے پروائی سے کہا۔ ''ممکن ہے تماشائیوں میں اس کے کسی ہمدرد نے اسے دے دی ہو۔ اب اس کا کام آسان ہو گیا ہے۔''

''اس کا نہیں تمہارا کام آسان ہو گیا ہے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''سلاخ اسے رِنگ سے ملی ہے اور اس کا تعلق سیٹی کی آواز سے ہے۔ کسی میکنزم کے ذریعے رِنگ میں کوئی خفیہ خانہ کھل جاتا ہے اور ایول کو معلوم تھا کہ اسے سلاخ کہاں سے حاصل کرنی ہے۔ سیٹی کی آواز اس کے لیے اشارہ تھی تم نے سیٹی کا بٹن دبایا تھا ناں؟''

''ہاں۔'' اس نے بے ساختہ کہا پھر گڑبڑا کر بولا۔ ''تم جو چاہو سمجھو۔''

میں نے رِنگ کی طرف دیکھا۔ ایول کے وار نے احمد کے دوسرے ہاتھ کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ شاید اس نے ہاتھوں سے اس کے وار کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ خون بہنے سے اس کے انداز میں کمزوری آ گئی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر اس شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ اس پر غالب آ جائے گا اور پھر اسے مار ڈالے گا۔ نہیں اسے کسی قیمت پر نہیں مرنا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور جان گرے کی طرف دیکھا جو اب پوری دلچسپی سے رِنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے حرکت میں آتے ہوئے جینا کو پیچھے دھکیلا۔ دوسری لڑکی ایک ہی ہاتھ میں بوتھ کے شیشے سے جا ٹکرائی اور بے سدھ ہوگئی۔ میں نے با آسانی جان گرے کو گردن سے قابو کر لیا۔

"اس سے پہلے کہ میں تمہاری گردن توڑ دوں۔" میں نے اس کا دایاں بازو مروڑ کر پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اس شیطان کو روک لو۔ ورنہ احمد بربری سے پہلے موت کا فرشتہ تمہیں لے جائے گا۔"

میری گرفت اس کی گردن پر اتنی سخت تھی کہ وہ سوائے تڑپنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کی تو اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ "تم بھیانک غلطی کر رہے ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں سب بھول جاؤں گا۔"

"لگتا ہے تم موت کو بھول گئے ہو۔" اس بار میں نے دباؤ اتنا بڑھایا کہ اس کی آنکھیں اُبلنے لگی تھیں۔ اس نے پھر جلدی سے سر ہلایا لیکن مجھ سے ایک بنیادی غلطی ہو چکی تھی۔ میں نے جینا کو دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی غلطی میرے لیے مہلک ثابت ہوئی تھی۔ میں نے دوسری بار سر ہلانے پر جان گرے کی گردن پر گرفت ذرا ڈھیلی کی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے بہ مشکل تیس سیکنڈ کے لیے اس کی گردن دبائی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اسے سال بھر بعد سانس لینے کا موقع ملا ہو۔

"جلدی کرو، ورنہ اس بار میں گردن دبانے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی لمحے میرے سر سے کوئی سخت چیز ٹکرائی اور ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں نے دھندلے سائے کی طرح ایول کو سلاخ بلند کرتے دیکھا۔ احمد بربری زمین پر گرا ہوا تھا اور نشانہ اس کا دل تھا۔ میں اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ دوسری ضرب نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔



بچپن میں مَیں نے ایک بار جمشید پیلس میں ملازموں کے بچوں کو عجیب سے کھلونے سے کھیلتا دیکھا تھا۔ انہوں نے ٹین کے ایک ڈبے میں کنکر بھر کر اسے جھنجھنا بنا لیا تھا۔ جب اسے ہلاتے تو بے پناہ شور بلند ہوتا تھا۔ یہ شور ایسا تھا کہ سیدھا دماغ کو جا کر لگتا تھا۔ اس وقت تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا سر ایک جھنجھنا ہو۔ اس میں کنکر بھرے ہوئے ہوں۔ میرے ذرا سے سر ہلانے پر ایسا شور اٹھتا کہ





خدا کی پناہ۔ میں سہم کر ساکت ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ شور میں کمی آنے لگتی تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ دراصل درد تھا جو مجھے شور کی صورت میں پریشان کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں لیکن فوراً ہی بلند کرلیں۔ درد کی ایسی ہی لہر اٹھی تھی کیفیت ایسی تھی کہ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

بتدریج درد میں کمی آئی تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ یہ وہی کوٹھری تھی جہاں میں اور عبید صلاح مقیم تھے۔ ہم قید میں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ میرے سر میں درد کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ میرا سر زخمی تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔ رفتہ رفتہ تصویریں اُبھرنے لگیں۔ جان گرے مجھے یہاں سے لے گیا۔ نائٹ کلب...... بار...... ہال اور وہاں موجود بے شمار افراد وسط میں رِنگ...... ایک بدصورت دیو اور ایک سجیلا نوجوان۔ مجھے سب یاد آنے لگا۔ بے اختیار میرا دل درد سے بھر گیا۔ وہ سجیلا نوجوان اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ظلم نے اسے مٹا دیا تھا۔ بدی نے نیکی پر غلبہ پا لیا تھا۔ مجھے جان گرے یاد آیا جو میری گرفت میں مچل رہا تھا۔ کاش کہ میں نے اس کی گردن توڑ دی ہوتی۔

کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "اب کیسے ہو؟"

میں چونکا۔ یہ عبید صلاح تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس پانی اور گولیاں تھیں اس نے کہا۔

"یہ کھا لو تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

میں نے اس سے گولیاں لے کر پانی کے ساتھ نگل لیں۔ "کیا ہوا تھا؟"

"معلوم نہیں۔ صبح کے قریب دو افراد تمہیں اٹھا کر لائے تھے۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔ بہر حال میں نے تمہیں زندہ پا کر ہی خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ مجھے تو اس کی امید بھی نہیں تھی۔ کیا انہوں نے تم پر تشدد کیا تھا۔"

"نہیں بلکہ میں نے اس خبیث جان گرے کی گردن دبائی تھی۔ یہ چوٹیں اس کا نتیجہ ہیں۔" میں نے سر ٹٹولا۔

"پوری بات بتاؤ۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

میں نے اسے نائٹ کلب اور رِنگ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ احمد بربری کے بارے میں سن کر وہ چونکا۔

"میں نے اسے دیکھا ہے شاندار نوجوان ہے۔"

"تھا کہو میرے دوست۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ایول کو اس کے سینے میں سلاخ گھونپتے دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسی بے بسی کی موت مارا جائے گا۔" عبید صلاح نے کہا۔

"جب موت آتی ہے تو سب بے بسی سے مر جاتے ہیں۔" میں نے حقیقت بیان کی۔ "احمد

بربری بھی ایک انسان تھا۔ افسوس اس کی جوان مرگی کا ہے۔ حالانکہ موت نہ بوڑھا دیکھتی ہے نہ بچہ اور سب سے بڑھ کر وہ بُرے لوگوں کے ہاتھ مارا گیا۔''

احمد بربری کی موت نے ہم دونوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ عبید صلاح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یک دم اس نے سر اٹھایا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں زندہ رہا تو اس کے قاتل میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکیں گے۔''

میرے پاس دعویٰ کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس جسارت کے بعد جان گرے کا ردِعمل کیا ہوگا لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ میرے حق میں نہیں ہوگا۔ میں جان گرے کی کینہ پرور شخصیت کے بارے میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ صبح کے ناشتے میں ہمارے لیے دلیہ اور مچھلی آئی تھی۔ لگتا تھا کہ مقامی لوگ زیادہ تر مچھلی پر گزارا کرتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں باقاعدگی سے ماہی گیری بھی ہوتی ہوگی۔ اس صورت میں اتنے سارے لوگوں کی خوراک کی ضرورت پوری ہوسکتی تھی اوپری طبقے کے لوگوں کی خوراک بھی یقیناً اچھی ہوگی اور وہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔

عبید صلاح نے مجھے دردکش گولیوں کی ایک شیشی دی تھی جو مجھے لانے والوں نے عبید صلاح کو اس ہدایت کے ساتھ دی تھی کہ اس میں سے چار گولیاں ہر چھ گھنٹے بعد کھلانی ہیں۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ واحد روشن دان سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ دن کتنا چڑھ چکا ہے۔ میں نے اپنا جائزہ لیا۔ تین دن سے پہنی وردی میلی ہو چکی تھی اور پشت کی جانب اس پر خون کے دھبے بھی آگئے تھے۔ جسم میل زدہ ہو رہا تھا۔ بے تحاشہ پسینہ آنے سے حالت اور بھی خراب لگ رہی تھی۔ شیو بڑھ آئی تھی اور سر پر پٹی بندھی تھی۔ غرض کہ میں اچھا خاصا تباہ حال لگ رہا تھا۔ البتہ دردکش گولیوں نے درد میں خاصی کمی کر دی تھی۔ اب اس کی موجودگی مجھے پریشان نہیں کر رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پستول کا خیال آیا۔ میں نے جھپٹ کر بستر کا کنارہ اٹھایا پستول وہاں سے غائب تھا۔

عبید صلاح نے مسکراتے ہوئے روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں نے احتیاطاً وہاں رکھ دیا تھا۔'' میں نے بستر پر چڑھ کر روشن دان کی دیوار پر رکھا پستول اٹھایا اور اسے فوراً اپنے موزے میں اُڑس لیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہمارے سامنے والی کوٹھری خالی تھی اور پہرے دار بھی نصف گھنٹے کے بعد راؤنڈ لگا تا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب تک میری تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ تمام اشیاء میری جیب میں تھیں البتہ رات کسی نے میری کلائی کی گھڑی اُتار لی تھی اور عبید صلاح کے پاس گھڑی نہیں تھی لہٰذا ہمیں وقت کا اندازہ نہیں تھا۔

اب تک میں نے خود کو تقدیر کے سہارے چھوڑ رکھا تھا۔ میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر کاربند تھا لیکن احمد بربری کی موت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ خود مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر کوئی ایسا وقت آیا تو میں مرنے والوں میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ بلکہ




میرے ساتھ دو تین اور بھی جائیں گے۔ دوپہر کے وقت دوسری مرتبہ دردکش گولیاں کھا کر میری حالت تقریباً درست ہوگئی تھی۔ سر میں درد ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کھٹکا ہوا تو میں سمجھا کہ شاید کھانے والا آیا ہے لیکن دروازے پر نظر پڑتے ہی میں اُچھل پڑا تھا۔ وہاں جان گرے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''تم کمینے۔'' میرے منہ سے گالیوں کا فوارہ نکلا تھا۔

جان گرے بدستور مسکراتا رہا جیسے میں اس کی مدح سرائی کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس کرو وہاں جو ہوا مجھے اس کا افسوس ہے اگر تم......''

''کاش کہ میں پہلے تمہاری گردن توڑ تا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''یہ خواہش دل میں لیے بہت سارے لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''بہرحال میں کہنے آیا ہوں کہ اب بھی وقت ہے تم سنبھل جاؤ۔ اگر تم ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری ساری خطائیں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ وہ حرام زادہ مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مجھے قزاق بننے کو بول رہا تھا۔ میں نے سرعت سے جھک کر موزے سے پستول نکالا اور جان گرے پر گولی چلا دی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ پیچھے جا گرا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ عبید صلاح نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

''ایک کتے کا کام تمام کر دیا۔'' میں نے محسوس کیا کہ میں جنون کا شکار ہو رہا تھا۔ ''جو بھی آئے گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''ہوش کرو یوسف۔'' عبید صلاح نے مجھے جھنجھوڑا۔ ''وہ زندہ ہے۔''

مجھے جھٹکا سا لگا اور میں ہوش آگیا۔ میرے کانوں نے جان گرے کی آواز سنی جو چیخ چیخ کر آنے والوں کو میرے مسلح ہونے کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے ڈیئر ڈان کی دھاڑ سنی۔

''کِل دِس باسٹرڈ۔''

میں نے عبید صلاح کو دھکیل کر دروازے کے ساتھ فٹ بھر کی دیوار سے لگا دیا۔ ''یہاں سے ہلنا مت۔''

''خبردار۔'' مجھے جان گرے کے چلانے کی آواز آئی۔ ''اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''خاموش رہو۔'' ڈیئر ڈان گرجا۔ ''یہاں تمہارا حکم نہیں چلے گا۔''

''اس جزیرے کا ایک انچ بھی میرے حکم سے خالی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' جان گرے نے سرد لہجے میں کہا۔

''دیکھو گرے، میرے کام میں مداخلت مت کرو۔ تم مرتے مرتے بچے ہو۔ اس کے پاس

پستول کہاں سے آیا؟"

"میں نے دیا تھا۔" جان گرے کا لہجہ زہریلا تھا۔ "تاکہ یہ مجھے شوٹ کر سکے۔ اس کیمپ کے ذمے دار تم ہو۔"

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرے آدمی اسے کتے کی موت مار دیں گے۔"

"اسے زندہ پکڑنا ہے۔" جان گرے نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "یوسف پستول پھینک دو، ورنہ ہم اندر آنسو گیس کا گولہ پھینک دیں گے۔ تم دس منٹ میں چوہے کی طرح پکڑے جاؤ گے۔"

"میں ہتھیار نہیں پھینکوں گا۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"جان گرے دفع ہو جاؤ یہاں سے مجھے اس سے نمٹنے دو۔"

لیکن جان گرے دفع ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری اندھا دھند چلائی گولی شاید اسے لگی ہی نہیں تھی یا کسی ایسی جگہ لگی تھی کہ اسے زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ میں پستول سیدھا کیے پوری طرح چوکس تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گولی چلاتے ہوئے جھجکوں گا نہیں۔ عبید صلاح کا حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے پستول پھینکنے کو نہیں کہا تھا۔ اب جان گرے اور ڈیئر ڈان ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ ان کے ڈرامے کا مجھے اس وقت پتا چلا جب کسی نے روشندان سے چلا کر کہا۔ "پستول پھینک دو ورنہ......"

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ روشندان سے ایک نال جھانک رہی تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دو مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور انگلیاں ٹریگروں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔

"یوسف آخری وارننگ۔" جان گرے کی آواز آئی۔ "کیوں اپنے ساتھ دوسرے کو بھی مشکل میں ڈالتے ہو۔"

اس بات نے مجھے ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پستول نیچے کیا۔ اسے نالی سے پکڑا اور نیچے گرا دیا۔ روشندان سے آواز آئی۔ "ٹھوکر سے پستول کو سلاخوں سے باہر کر دو اور تم دونوں درمیان میں سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے لات مار کر پستول کو دروازے کی طرف سرکا دیا۔ عبید صلاح کونے سے نکلا۔ ہم دونوں سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوراً ہی دونوں گارڈز دروازہ کھول کر اندر گھس آئے۔ انہوں نے دھکے دے کر ہمیں کوٹھری سے باہر نکالا۔ جہاں ڈیئر ڈان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگر جان گرے نہ ہوتا تو ہمیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیا ہوتا۔ اس وقت بھی جان گرے نے اسے روک دیا۔ اسی نے گارڈز کو حکم دیا۔

"اس کی تلاشی لو اچھی طرح۔"





گارڈ نے ہماری یوں تلاشی لی کہ ہمارے پاس کوئی سوئی بھی ہوتی تو نہ چھپی رہتی۔

"انہیں باہر لے چلو۔" ڈیئر ڈان نے غرا کر کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا کہ میرے کیمپ میں گڑبڑ کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"تم ان کے ساتھ کچھ نہیں کرو گے۔" جان گرے نے سختی سے کہا۔ "اب ان کا معاملہ کونسل کے سامنے جائے گا۔"

"بھاڑ میں گئی کونسل۔" ڈیئر ڈان نے بھنا کر کہا۔ وہ خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس نے گارڈز کو حکم دیا کہ ہمیں واپس سیل میں بند کر دیا جائے۔ اسی دوران میں گارڈ سیل کے ایک ایک انچ کی تلاشی لے چکے تھے۔

"پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" جان گرے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں جہاز سے ہی ساتھ لایا تھا۔ راستے میں کسی نے تلاشی کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ لہٰذا پستول میرے پاس رہا اور مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ پستول از خود حوالے کر دیتا۔ افسوس کہ میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔"

"تم نے کوشش تو کی تھی۔" جان گرے تلخی سے بولا۔ "میرا شکریہ ادا کرو کہ میں اب بھی تمہیں بچا رہا ہوں۔"

"شیطان کا کسی حال میں شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے۔" میں نے جواب دیا۔

"بکومت۔" وہ غرایا۔ "جلد تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔ جب تم کو جزیرے کی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

"میں ایسی کسی عدالت کو نہیں مانتا۔ تم لوگ صرف دہشت گرد ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ کسی پر مقدمہ چلا کر اسے سزا دو۔ اپنے مکروہ عزائم پر خوش نما پردے مت ڈالو۔"

اچانک ڈیئر ڈان نے مجھے گھونسا مارا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے میں دھوکا کھا گیا۔ ہاتھ بے حد جاندار تھا۔ میرا منہ گھوم گیا۔ مجھے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ فوراً ہی دو گارڈز نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا۔ ڈیئر ڈان نے اپنی حسرت نکالنے کے لیے مجھے مزید گھونسے رسید کیے۔ خاص طور سے اس کے سینے پر مارے گئے گھونسوں نے میرے لیے سانس لینا محال کر دیا تھا۔ جان گرے نے مداخلت نہیں کی۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ ڈیئر ڈان کا غصہ بھی کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے۔ اس وقت وہ مجھے بچانا چاہتا تھا لیکن اس کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں میرے لیے ضرور کوئی منصوبہ تھا۔ جو بہر حال میرے مفاد میں نہیں تھا۔

"لے جاؤ ان کتوں کو۔" ڈیئر ڈان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ موٹاپے اور کثرت شراب نوشی نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ "ان کا کھانا اور پانی بند کر دو۔"

گارڈز ہمیں دھکیلتے ہوئے لائے اور سیل کے اندر دھکا دے دیا۔ میں بستر پر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے درد پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ پر شدید نوعیت کی مایوسی طاری تھی۔ اتنی بڑی ناکامی کے بعد یہ مایوسی فطری تھی۔ میں احمد بربری کو مرنے سے نہیں بچا سکا۔ ذرا سی عدم توجہی نے مجھے ناکام کر دیا۔ میں جان گرے کو مارنے میں ناکام رہا تھا۔ جذبات میں آ کر میں نے نہ صرف ایک اچھا موقع گنوا دیا تھا بلکہ اپنے واحد ہتھیار سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ اَب مجھے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ میں نے قزاقوں کے خلاف دو ایسی کارروائیاں کی تھیں جو اس جزیرے پر ان کے اقتدار کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک قیدی کی طرف سے ایسی جسارت کوئی حکومت برداشت نہیں کرتی ہے وہ تو پھر بھی قزاق تھے۔

''کمبخت بچا ہوا پانی بھی لے گئے۔'' عبید صلاح نے خالی ڈبے کی طرف دیکھا۔

''پانی کو چھوڑو یار...... مجھے تو اپنی عافیت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔''

''تم قنوطی ہو رہے ہو۔ ایسا کرو سو جاؤ۔ جب اٹھو گے تو دماغ تازہ ہو گا اور مایوسی کے خیالات غائب ہو چکے ہوں گے۔'' اس نے مشورہ دیا اور خود بھی بستر پر لیٹ گیا۔ ''میرا تجربہ ہے اگر کھانے پینے کو نہ ملے تو انسان کو سو کر وقت گزارنا چاہیے اس طرح بھوک پیاس کا احساس کم ہوتا ہے۔''

''سو کر ہم وہ وقت گنوا دیں گے جو اس مصیبت سے بچنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔''

''دوست مصیبت سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''کم از کم فوری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ پریشان ہونے کے بجائے سو کر وقت گزارو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔''

میں بستر پر دراز ہو گیا۔ عبید صلاح تو کچھ دیر بعد ہی خراٹے لینے لگا تھا۔ سو تو میں بھی سکتا تھا لیکن سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان معاملات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جان گرے کسی خاص وجہ سے مجھے جسمانی طور پر نقصان نہیں پہنچانا چاہتا ہے۔ جب ہم سفر کر رہے تھے تو اس نے مجھے اپنے کیبن میں بلایا تھا اور یہ بات کہی تھی کہ وہ میرے ماضی سے واقف ہے۔ اس نے یہ بات پورے یقین سے کہی تھی آخر اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک بے ماضی شخص تھا۔ میرا پس منظر مایوسی دھند آلود صبحوں جیسا تھا۔ میرے ماضی میں ایسی کیا بات تھی کہ جان گرے جیسا شخص اس میں دلچسپی لے رہا تھا اور میرے خیال میں اس دلچسپی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی یعنی دولت اب مجھے اپنی جذباتیت پر افسوس ہو رہا تھا اگر میں ذرا سی سمجھ سے کام لیتا تو جان گرے سے رعایتیں حاصل کر سکتا تھا۔ میں اس جیل سے نجات پا لیتا۔ میرے لیے ہاتھ پیر ہلانا تو ممکن ہوتا اب میں کوٹھری میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔



میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ ٹرک بالکل کار کی سیدھ میں آ رہا تھا۔ بریک لگانے کا





کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ٹرک تو نہیں رُک سکتا تھا۔ اب تصادم لمحوں کی بات تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس لمحے ڈرائیور نے کار لہرائی، طاقتور مرسڈیز کے انجن نے اسے لمحوں میں فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ میں اُچھل کر بائیں طرف دروازے سے جا ٹکرایا تھا۔ کار نے فٹ پاتھ کے ساتھ اُگی جھاڑیوں کو روند کر رکھ دیا تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو موت آئل ٹینکر کی صورت میں ہمیں چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ڈرائیور نے کار کو دوبارہ فٹ پاتھ سے اُتارا اور مہارت سے بریک لگا کر اسے قابو کر لیا تھا۔ جیسے ہی کار رُکی حسن علی نے جھپٹ کر ڈیش بورڈ کے خانے سے دوربین نکالی اور گھوم کر ٹرک کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے مایوسی سے دوربین پٹخ دی۔

''لعنت ہو۔ پلیٹ ڈھیلی کر دی۔ نمبر پڑھا ہی نہیں جا رہا ہے۔''

''ایک اور کوشش۔'' میں نے ہنس کر کہنا چاہا لیکن میری آواز لرز رہی تھی۔

''ظاہر ہے ٹرک جس انداز سے ہماری طرف آیا تھا اس سے تو یہی لگ رہا ہے۔'' حسن علی فکر مندی سے بولا۔ ''اتنے بڑے ٹرک شہر میں کبھی اس رفتار سے ڈرائیونگ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کی نمبر پلیٹ ڈھیلی ہوتی ہے۔ اگر ڈرائیور فٹ پاتھ پر نہ چڑھاتا تو اس نے ہمیں مار ہی دیا تھا۔''

مجھے ڈرائیور کا خیال آیا جو اسٹیئرنگ پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا بدن ابھی تک لرز رہا تھا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت سے کام لے کر ہمیں بچا لیا تھا لیکن یہ انکشاف اس کے لیے خوفناک تھا کہ کسی نے ہمیں جان بوجھ کر مارنے کی کوشش کی تھی۔ بوکھلاہٹ میں حسن علی کو بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے آئے ہوئے ابھی صرف چھ مہینے ہوئے تھے اور وہ بے چارہ دو ہفتے ہسپتال میں بھی گزار آیا تھا۔ اس کا خوفزدہ ہونا لازمی تھا۔

''چلو یار گاڑی چلاؤ۔'' حسن علی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

''مجھے تو معاف ہی رکھیں صاحب۔'' وہ بولا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میرے بعد میرے بیوی بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اس نوکری سے بھر پایا۔ مجھے نوکری سے فارغ کر دیں جناب۔''

''تو کیا یہیں فارغ کر دیں۔'' حسن نے جھلا کر کہا۔ ''گاڑی چلاؤ۔''

بادلِ نخواستہ ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی تھی۔ زبردست جھٹکوں اور جھاڑیوں کی رگڑ نے کار کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ شاید چند خراشیں آئی تھیں۔ اس کا انجن اسی طرح ہموار تھا لیکن ڈرائیور کا خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ حد یہ کہ اس نے سکول کے باہر مجھے چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ ''لو جی راستے میں کوئی اور ٹرک مل گیا تو میں نے تو مارا جانا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوتا یار۔'' حسن نے اسے تسلی دی۔

''آپ گاڑی لے کر جاؤ۔'' اس نے چابی حسن کو تھما دی۔ ''میں بس میں آ رہا ہوں۔''

''احمق وہاں کوئی بس نہیں جاتی۔''

''تو پیدل آجاؤں گا۔ بھلے دیر لگے لیکن زندہ تو پہنچوں گا۔ آپ بڑے لوگوں کی لڑائی میں ہم غریب مارے جاتے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ حسن کو طیش آرہا تھا اور مجھے ہنسی آرہی تھی۔

''چلئے...... اچھی بات ہے۔ ڈرائیور بلاوجہ ہمارے ساتھ آتا تھا۔ اب آپ ہی ڈرائیونگ بھی کرلیا کریں۔''

میرے اس جملے پر حسن بھنا کر بولا تھا۔ ''مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔ چاروں طرف دیکھنا پڑتا ہے۔''

''بشرطیکہ ماہ پارہ سامنے نہ ہوں۔'' میں نے کہا اور جلدی سے سکول کی طرف بڑھ گیا۔

''برخوردار شام کو جمنازیم میں ملاقات ہوگی۔'' حسن نے پیچھے سے پکار کر کہا تھا۔

اس شام حسن اور ماہ پارہ کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں مجھ پر ہونے والے حملوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر غور کیا گیا تھا۔ میں ایک سامع کی حیثیت سے میٹنگ میں شریک تھا لیکن مجھے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ طویل بحث کے بعد طے پایا کہ فی الحال میرا پیلس سے نکلنا بند۔

''جب تک جمشید صاحب نہیں آجاتے۔'' ماہ پارہ بولیں۔

''مجھے سکول جانا ہوگا۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''پاپا نہ جانے کب آئیں۔''

''میں نے اطلاع کردی ہے۔'' ماہ پارہ نے میری طرف دیکھا۔ ''وہ جلد آرہے ہیں۔''

''اور سکول کا کیا ہوگا؟''

''تعلیم اہم ہے لیکن زندگی اس سے زیادہ اہم ہے۔ رہا پڑھنے کا تو تم گھر پر پڑھ سکتے ہو۔ کل سے تمہیں ٹیچر پڑھانے کے لیے پیلس آیا کرے گی۔''

اب میں آگے کیا کہتا میں پیلس میں قید ہوکر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ میں پہلے ہی پیلس کی چار دیواری میں گزار چکا تھا۔ اب میں آزاد فضاؤں میں رہنا چاہتا تھا۔ جہاں کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ سکول میرے لیے آزادی کا مفہوم رکھتا تھا۔ عام بچے سکول جانے سے ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ گھر ان کے لیے پیار، تحفظ اور آزادی کا درجہ رکھتا ہے۔ میرے لیے معاملہ برعکس تھا۔ حالانکہ پیلس میں مجھے ہر قسم کی آزادی میسر تھی۔ ہر آسائش میری دسترس میں تھی۔ پیلس کی حد میں تفریح کے بے شمار سامان تھے۔ اس کے باوجود مجھے یہاں گھٹن اور پابندی کا احساس ہوتا تھا۔ میں باہر جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب مجھے سکول میں داخل کرایا گیا تو میں ذوق وشوق سے سکول جانے لگا۔ میں کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ میرا بس چلتا تو چھٹی کے دن بھی سکول چلا جاتا۔ اس کے علاوہ مجھے پیلس سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ پیلس جس علاقے میں تھا وہاں کے مکین ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی ساری دلچسپیاں ان کے گھروں میں انہیں




میسر تھیں۔ وہاں کے بچے بھی بچے نہیں تھے۔ وہاں گلیوں میں شام کے اوقات میں بھی شاذ و نادر ہی بچے نظر آتے تھے اور گلیوں، سڑکوں پر کھیلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پارکوں میں یا تو شیر خوار بچے ہوتے تھے جو اپنی آیاؤں کے ساتھ آتے تھے یا پھر بوڑھے جو چہل قدمی کے لیے نکل آتے تھے۔

پیلس کے دائیں طرف واقع ایک الگ چار دیواری کے اندر ناریل اور تاڑ کے درختوں سے گھرا وسیع وعریض اور حسین سوئمنگ پول تھا۔ یہ شکل میں دو جڑے ہوئے دلوں جیسا تھا۔ اس میں ہمہ وقت شفاف نیلا پانی جھلملاتا رہتا تھا۔ جسے ایک باقاعدہ سسٹم کے تحت صاف کیا جاتا تھا۔ چار دیواری میں ہونے کی وجہ سے پیلس کی خواتین بھی یہاں بے فکری سے سوئمنگ کیا کرتی تھیں۔ زہرہ بیگم اور ماہ پارہ اکثر تیراکی کے لیے سوئمنگ پول میں جاتی تھیں۔ مجھے تیراکی ماہ پارہ نے ہی سکھائی تھی جب میں پانچ سال کا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سوئمنگ پول لے جاتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت میں بچہ ہی تھا اس لیے انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے تیراکی سیکھنے میں حیرت انگیز تیزی دکھائی تھی اور چند مہینے میں پورے اعتماد سے تیراکی کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد جب بھی ماہ پارہ جاتی تھیں میں ان کے ساتھ ہی جاتا تھا۔ سات سال کی عمر تک انہوں نے مجھے اکیلے تیراکی نہیں کرنے دی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ماہ پارہ مجھے لے کر پول میں تیر رہی تھیں کہ اچانک جمشید علی وہاں آگئے۔ ماہ پارہ کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئے تھے۔ غالباً انہیں علم نہیں تھا کہ پول میں ماہ پارہ تھیں۔ میرے ''پاپا'' چلانے پر ماہ پارہ چونکیں اور جمشید علی کو وہاں پاکر انہوں نے خود کو جلدی سے پول کی دیوار سے لگالیا اور برہمی سے بولیں۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''سوری۔'' جمشید علی شرمندہ ہوکر پلٹے۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تم ہو۔'' وہ آگے بڑھے پھر روش پر رُک کر بولے۔ ''ماہ پارہ تم بے حد حسین ہو۔'' یہ کہتے ہی وہ وہاں سے چلے گئے اور ماہ پارہ کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ نہ جانے حیا سے یا غصے سے۔ جب میں دس سال کا ہوا تو ماہ پارہ نے مجھ پر بھی پابندی لگادی کہ میں ان کے ساتھ تیراکی نہیں کرسکتا۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے احتجاج کیا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ تیرنا اچھا لگتا ہے۔''

وہ ہنسیں۔ ''اس لیے کہ اب تم بڑے ہورہے ہو۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' میں احمقانہ انداز میں بولا۔

''پاگل اب مجھے تمہارے سامنے سوئمنگ سوٹ میں شرم آتی ہے۔'' ماہ پارہ جھینپ کر بولیں۔ ''سمجھے؟''

''سمجھ گیا۔'' میں افسردہ ہوگیا۔ ''لیکن آپ تو میری ماں ہیں۔''

''یوسف یاد رکھنا عورت سب سے زیادہ اپنے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کے سامنے شرماتی

ہے۔"

واقعی شرم کے رشتے تو یہی ہیں۔ ورنہ کسی اجنبی سے عورت کیوں شرمانے لگی۔ شرم کا تعلق احساس، جذبات اور تعلق سے ہوتا ہے اور کسی ناواقف سے ان میں سے کوئی چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ یہ احساس اور تعلق ہی ہے جو کسی عورت کو اپنے سے وابستہ کسی مرد سے شرمانے پر مجبور کرتا ہے۔

میری دیکھا دیکھی کاجل بھی سوئمنگ پول پر آنے لگی تھی۔ ایک بار اس نے کسی بات پر ضد میں آ کر پول میں چھلانگ لگا دی تھی اور ڈوبتے ڈوبتے بچی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے تیراکی سکھانا شروع کر دی تھی۔ ضد کی بات اور تھی لیکن اصل میں اسے پانی سے بے حد ڈر لگتا تھا اور میرے اصرار پر اس نے بہ مشکل تیراکی سیکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ کئی دن تک تو وہ صرف ڈوبنے کی مشق کرتی رہی اور شاید تیراکی سے تائب ہی ہو جاتی اگر زہرہ بیگم اس کے تیراکی سیکھنے پر پابندی نہ لگاتیں۔ اس نے خوب ہنگامہ کیا۔ کھانا نہیں کھایا سونے سے انکار کر دیا لیکن زہرہ بیگم بھی ڈٹ گئیں۔

"بے شک بھوکی مر جاؤ لیکن پول میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

لیکن زہرہ بیگم نے نرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر کاجل نے چالاکی سے کام لیا اور بہ ظاہر خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور جیسے ہی جمشید علی اپنے ٹرپ سے واپس آئے اس نے ان سے اجازت لے لی۔ اب زہرہ بیگم کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ سوائے چیخنے چلانے کے لیکن جمشید علی اسے اجازت دے چکے تھے۔ اس روز میں سہ پہر کو تیراکی میں مصروف تھا کہ وہ بڑی شان سے اکڑی ہوئی چلی آئی۔ "اب میں بھی سوئمنگ کروں گی۔" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"سوئمنگ کروں گی۔" میں نے اس کی نقل اُتاری۔ "پہلے اپنی مما سے تو اجازت لے لو۔"

"میں نے پپا سے اجازت لے لی ہے۔"

"مارے گئے۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "یعنی اب تم پھر سے ڈوب کر مرنے کی مشق کرو گی۔"

"میں تمہیں تیر کر دکھاؤں گی۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور پول میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ غوطے کھا رہی تھی۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے اسے سیدھا کیا اور اسے تیرنے کا سبق دینے لگا۔ اس بار اس نے حیرت انگیز کارکردگی دکھائی اور چند دن میں اچھی خاصی تیراکی سیکھ گئی۔ بعد میں وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ اس نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پانی میں مچھلی کی طرح پھرنے لگی تھی۔



پابندی لگنے کے اگلے روز سے ایک نوجوان استاد مجھے پڑھانے کے لیے آنے لگا۔ وہ سارے ہی مضامین میں مہارت رکھتا تھا اور مجھ سے جلد بے تکلف ہو گیا۔ مجھے اس سے پڑھنے میں




مزہ آنے لگا تھا۔ یہ شاید دسویں دن کی بات تھی۔ ماہ پارہ نے مجھے آگاہ کیا کہ آج رات جمشید علی پیلس آ جائیں گے۔ استاد شام کو آتے تھے۔ چھ سے آٹھ بجے تک پڑھانے کا وقت مقرر تھا۔ اس روز استاد شریف الدین آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا۔ یہ پتلا اور چوکور گتے کا ڈبہ تھا۔ جیسا کہ گھڑیوں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈبہ اپنے برابر میں رکھا اور مجھے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بیالوجی کے کچھ ڈائی گرام بنانے کو دیئے اور خود چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں خاموشی سے سر جھکائے کام میں مصروف تھا کہ مجھے ٹک ٹک کی آواز آنے لگی۔ آواز ڈبے سے آ رہی تھی اور شروع سے آ رہی تھی لیکن جب اسٹڈی روم میں خاموشی ہوئی تو یہ آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے کسی قدر تعجب ہوا کیونکہ عام طور سے گھڑیوں کی ٹک ٹک اتنی واضح نہیں ہوتی کہ سیل پیک ڈبے سے بھی صاف سنائی دے۔

"کیا بات ہے صاحبزادے؟" شریف الدین مجھے ڈبے کو گھورتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

"آپ کے اس ڈبے میں گھڑی ہی ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو گھڑی ہی لیکن میں نے اب تک دیکھی نہیں ہے۔ دراصل آج بلکہ ابھی جب تمہیں پڑھانے آ رہا تھا تب ملی تھی۔"

"ملی تھی کس سے اور آپ نے اسے دیکھا تک نہیں۔"

"جابر صاحب نے تحفے میں دی تھی کہہ رہے تھے کہ یہ پیلس کی روایت ہے کہ ہر نئے آنے والے فرد کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ گھڑی دی۔"

"پیلس میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔" میں نے ڈبے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "جابر نے آپ سے غلط کہا ہے۔ بہتر ہے آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔"

"کھول کر دیکھ لوں لیکن کیوں؟"

"مجھے یہ بات گڑبڑ لگ رہی ہے۔" میں بے چین ہو گیا۔ میں نے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پچھلے چند دن میں میرے ساتھ جو ہو رہا تھا اس نے مجھے زیادہ ہی محتاط بنا دیا تھا اور میں ذرا سی خلافِ معمول بات کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

"میاں صاحبزادے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے کام کی طرف توجہ دیں۔" شریف الدین نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا لیکن میں ڈبہ اٹھا چکا تھا۔ اس کے وزن نے مجھے چونکا دیا تھا۔ کوئی گھڑی کسی صورت اتنی وزنی نہیں ہو سکتی ڈبے کا وزن ڈھائی تین کلوگرام کے آس پاس تھا اگر اس میں گھڑی نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟ اس میں ٹک ٹک کی آواز کیسی آ رہی تھی۔ یک لخت میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ڈبے میں کوئی چیز تھی میں نے ڈبا اٹھالیا۔

"میاں اسے رکھو اور اپنا کام کرو۔" شریف الدین بولے۔

لیکن میں ان کی بات پر توجہ دیئے بغیر اسٹڈی سے تقریباً بھاگتا ہوا نکلا تھا۔ شریف الدین چلا

کر میرے پیچھے بھاگے تھے۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد عمارت سے نکل کر کھلے لان میں پہنچ جاؤں۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور کارنس سے چھلانگ لگا کر پاتھ وے پر آیا۔ وہاں سے ایک چھلانگ میں لان پر تھا۔ میں نے ہاتھ گھما کر ڈبہ پوری قوت سے لان کی طرف اُچھال دیا۔ ڈبہ ایک چھوٹے آرائشی درخت کے پیچھے جا گرا تھا۔ اسی لمحے شریف الدین سخت طیش میں وہاں آپہنچے۔ اگر میں کسی متوسط گھر کا لڑکا ہوتا تو وہ بلا تکلف میری مرمت لگا دیتے لیکن میں جمشید پیلس کا لڑکا تھا مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں بہت کچھ سوچنا پڑتا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ ڈبے میں کوئی خطرناک چیز ہے۔" میں نے انہیں آگاہ کیا۔

"ذرا سے شبے کے پیچھے تم نے اچھی خاصی چیز برباد کر دی۔" وہ جھلا کر بولے اور لان میں آگے بڑھے۔

"سر اس کے پاس مت جائیں۔" میں نے انہیں خبردار کیا۔

لیکن وہ میری سنے بغیر زیر لب کچھ کہتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈبہ کسی درخت کے عقب میں جا گرا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چلا کر انہیں خبردار کیا مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں نے انہیں دور ہٹنے کو کہا۔ شریف الدین درخت کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ محض شبہ تو نہیں تھا لیکن جابر نے انہیں تحفہ کہہ کر یہ ڈبہ کیوں دیا تھا۔ اس لمحے ساعت شکن دھماکا ہوا۔ میں بے اختیار زمین پر گر گیا۔ ایک لمحے کو فضا جیسے دھماکے کی آواز سے بھر گئی تھی۔ پھر چیخوں کی اور شیشے ٹوٹنے کی آواز گونجی۔ کوئی شے دھپ سے آ کر میرے پاس ہی گری تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا میرے عین سامنے ہی شریف الدین مجھے گھورتے نظر آئے لیکن یہ سالم نہیں تھے بلکہ صرف ان کا سر تھا جو فضا میں اُڑتا ہوا میرے پاس آ گرا تھا۔ میں نے بے اختیار چیخ ماری اور ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس لمحے اوپری منزل سے بکھر جانے والے کھڑکیوں کے شیشے برسنے لگے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر پیچھے بھاگا۔ اس لمحے میں نے پورچ سے نیلی کار کو نکل کر گھر کی طرف پیلس کے مین گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر جابر بیٹھا تھا۔

"اسے روکو۔" میں نے چلا کر کہا لیکن وہاں کسی کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔ ملازموں میں چیخ و پکار مچی تھی۔ پیلس کے گارڈز بدحواسی میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے ایک کو روکا۔

"جابر کو روکو وہ بھاگ رہا ہے۔"

گارڈ نے مجھے دیکھا۔ "یوسف بابا آپ زخمی ہیں آپ اندر چلیں۔"

"جابر کو روکو دھماکا اسی نے کیا تھا۔"

"آپ اندر چلئے۔" گارڈ مجھے بازو سے کھینچتا ہوا بولا اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

یک دم میں نے جسم ڈھیلا چھوڑا تو گارڈ جو پوری قوت سے مجھے کھینچ رہا تھا۔ سنبھلنے لگا اور مجھے





لیے فرش پر جا گرا۔ میں نے پھرتی سے اس کی رائفل چھینی اور مین گیٹ کی طرف بھاگا۔ پورچ کا راستہ طویل تھا۔ میں لان والا حصہ عبور کر کے بھاگ رہا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ مین گیٹ کے گارڈز اسے جانے نہ دیں لیکن جب میں لان اور گیٹ وے کے درمیان لگی باڑھ پھلانگ رہا تھا تو اس کی کار گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ "اسے روکو جانے نہ دو۔"

مگر نیلی کار نکل چکی تھی۔ میں گیٹ کی طرف بھاگا۔ گارڈز اسے بند کرنے والا بٹن دبا چکے تھے۔ یہ گیٹ برقی طریقے سے کھولے اور بند کیے جاتے تھے۔ اس سے پہلے کہ گیٹ پوری طرح بند ہوتے میں ان سے باہر نکل گیا۔ گارڈز میرے پیچھے لپکے اور میں مایوسی سے نیلی کار کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی آگے جا چکی تھی کہ اس پر فائر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لمحے کسی نے میرے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ یہ حسن علی تھا۔ اس نے تشویش سے مجھے دیکھا۔

"اندر چلو، تم زخمی ہو۔"

"جابر کو پکڑیں یہ بم اس نے دیا تھا۔"

"اندر چلو۔" حسن علی نے مجھے کھینچا۔ "اندر سکون سے چل کر بات ہوگی۔" اس نے محافظوں کو دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ اگلے نصف گھنٹے میں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ زخم شیشے ٹوٹنے سے آئے تھے۔ گرم دودھ پیتے ہوئے میں نے حسن علی کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس نے جابر کا نام لیا تھا؟" وہ مشکوک انداز میں بولا۔

"میرے یقین کو آپ گولی ماریں۔ یہ بتائیں کہ دھماکہ ہوتے ہی جابر کیوں نکل بھاگا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

حسن علی سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جابر جیسا شخص اتنی احمقانہ حرکت کرے گا۔"

"جب وقت پڑتا ہے تو جابر سے زیادہ عقلمند لوگ اس سے زیادہ احمقانہ حرکتیں کر جاتے ہیں۔ مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"استادِ محترم۔" میں نے طنز کیا۔ "آپ اتنے بھولے نہ بنیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کو بھی اس پر شک ہے مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے۔"

"اس نے اس طرح فرار ہو کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس کے خلاف واحد گواہ یعنی شریف الدین تو اس حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔"

"اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لان میں دھماکا ہونے اور مجھے زندہ پا کر اسے یہی شک ہوگا کہ شریف الدین بھی بچ گئے ہیں اور اس نے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی ہوگی۔"

''اگر اسے معلوم ہو گیا کہ شریف الدین مر چکا ہے تو وہ واپس آ جائے گا۔'' حسن علی نے کہا۔

''اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''درست ہے یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ہاں ابھی پولیس تم سے بیان لے گی تو تم اتنا بتاؤ گے کہ تم اپنے استاد کو چھوڑنے باہر تک آئے تھے۔ اس کے بعد وہ لان کی طرف چلے گئے جہاں دھماکا ہو گیا۔ تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔''

میں نے سر ہلایا۔ شریف الدین کی اچانک موت نے مجھے دکھی کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ میری طرف آنے والی موت کو وصول کرتے رہیں گے۔ پہلے امیر خان اور اب شریف الدین دونوں میری وجہ سے مارے گئے۔ حسن علی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''ٹیک اٹ ایزی یوسف اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تقدیر اسے ہی کہتے ہیں۔''

''میری ہی تقدیر ایسی کیوں ہے؟'' میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے سب کی تقدیر ایسی نہیں ہو سکتی۔'' حسن علی نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ایک مشک جیسی توند والے تھانیدار نے آ کر مجھ سے بیان لیا اور اس نے نہ تو اس پر کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی مجھ سے کوئی سوال کیا۔ غالباً اسے پہلے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ طبی عملہ آ کر شریف الدین کی لاش کے ٹکڑے سمیٹ کر لے گیا تھا۔ خوش قسمتی سے کسی اور کو خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ مجھ سمیت بعض لوگ زخمی ہوئے تھے لیکن وہ شیشے ٹوٹنے سے زخمی ہوئے تھے۔ بم کا واحد شکار بدنصیب شریف الدین تھے اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ مجھ پر ہونے والے تمام قاتلانہ حملوں اور اغوا کی کئی کوشش میں جابر ملوث تھا لیکن ایک بات اور مشکوک تھی آخر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا اور یہی شخصیت تھی جس نے جمشید علی کو بھی بے بس کر دیا تھا۔ وہ کھل کر میرا تحفظ کرنے سے قاصر تھے۔ بس کرائے کے محافظ میرے چاروں طرف پھیلا دیئے۔ جو مارے جاتے تو دوسرے آ جاتے۔

''کیا سوچ رہے ہو یوسف؟'' ماہ پارہ بولیں۔ نہ جانے وہ کب اندر آئی تھیں۔ وہ میرے سر میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

''ماں یہ سب کب تک ہوتا رہے گا؟'' میں نے ان کے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹے؟'' انہوں نے سرد آہ بھری۔

''میرا بس چلے تو تجھے لے کر کہیں اور چلی جاؤں۔''

''تو لے چلیں ناں۔''

''تو نہیں جانتا ہمارے چاروں طرف نہ نظر آنے والی دیواریں ہیں۔ ان کو پھلانگ کر ہم کہیں نہیں جا سکتے۔''

''کیسی دیواریں؟''





''میں ان کی وضاحت نہیں کر سکتی ہم کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہیں۔''

''آپ کچھ نہیں کر سکتیں؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''سوائے انتظار کے۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔

اسی رات جمشید علی واپس آ گئے۔ انہیں تمام حالات کی خبر تھی۔ انہوں نے ماہ پارہ سے کہا کہ اگر جابر اس ملک میں ہے تو چوبیس گھنٹے سے پہلے وہ جمشید پیلس میں ہوگا لیکن جابر پھر کبھی نہیں ملا اور جمشید علی نے مجھے یقین دلایا کہ میں مکمل طور پر بے فکر ہو جاؤں۔ اب کوئی میری طرف ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے گا۔

''یعنی اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بالکل۔'' جمشید علی بولے۔

''تو پاپا میں کہیں باہر جاؤں گا۔ میں اب تک اس شہر سے باہر نہیں نکلا۔''

جمشید علی سوچ میں پڑ گئے۔ ''ابھی نہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب تم سکول کی تعلیم مکمل کر لو گے تو میرا وعدہ ہے دنیا میں جہاں کہو گے تمہیں بھجوا دوں گا۔''

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی کیونکہ ابھی مجھے دو سال اور سکول میں پڑھنا تھا۔ بہرحال میں نے بحث نہیں کی۔ میں نے تعلیم اور حسن علی سے تربیت ساتھ ساتھ جاری رکھی تھی۔ اب حسن علی گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ جمشید علی اس سے اچھے طریقے سے پیش آتے تھے۔ کم از کم اس سے وہ سلوک نہیں کرتے تھے جو دوسرے ملازمین کے ساتھ رکھتے تھے۔ زہرہ بیگم نے آج تک مجھے اور ماہ پارہ کو گھر کا فرد تسلیم نہیں کیا تھا تو حسن علی کو کیسے قبول کرتیں۔ ہاں کاجل کے بعد میں اس سے اچھے تعلقات ہو گئے تھے اور کبھی کبھار اس کا موڈ ہوتا تو وہ بھی اس کے سر ہو جاتی کہ اسے لڑنا سکھائے۔

''تمہیں لڑنا سکھانے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں اسے چھیڑتا۔ ''یہ کام تو تم پیدائشی طور پر اچھی طرح جانتی ہو۔''

وہ مجھے گھورتی۔ ''اچھا میں لڑتی ہوں؟''

''نہیں اسے لڑنا نہیں کہتے۔ کیونکہ لڑنے والے صلح بھی کر لیتے ہیں۔''

''آپ سن رہے ہیں حسن۔'' وہ رونے والے انداز میں شکایت کرتی۔

''تم فکر ہی نہ کرو بے بی۔ دیکھنا آج میں اسے کیسا سبق دیتا ہوں۔''

''مروا دیا۔'' میں ٹھنڈی سانس لیتا۔ ''ظالم لڑکی۔''

ایک روز میں پیلس کے تہ خانے میں بنے جمنازیم میں ورزش کر رہا تھا کہ کاجل چلی آئی۔ حسن علی کو کسی کام سے جانا تھا اس لیے وہ چلا گیا تھا۔ کاجل گیارہ سال سے اوپر کی ہو چکی تھی لیکن اب بھی بچیوں کی طرح نیکر اور فراک پہن کر گھوما کرتی تھی۔ مجھے ورزش کرتے دیکھ کر اس نے دیکھا۔ ''سنو یوسف میں بھی ورزش کروں گی۔''

میں نے اسے گھورا۔ ''ورزش کرنا آسان کام نہیں ہے۔''

''تم کر سکتے ہو تو میں بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے مخصوص ہٹ دھرمی سے کہا۔

''اچھا۔'' میں نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ذرا یہ سائیکل تو چلا کر دکھاؤ۔''

اسٹیمنا بنانے کے لیے دوڑ کے بعد سب سے اچھی ورزش سائیکل چلانا ہے۔ تقریباً ہر جمنازیم میں سائیکل ضرور ہوتی ہے۔ آج کل تو بہت جدید قسم کی ایکسر سائز سائیکلز آ گئی ہیں۔ جن پر بچے سے لے کر بوڑھے تک سب ورزش کر سکتے ہیں۔ کاجل نے اس کی اونچی نشست پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ میں مسکرایا تو وہ کھسیا کر بولی۔

''سیٹ اتنی اونچی ہے۔''

''میں بٹھا دیتا ہوں۔'' میں نے جھک کر اسے بازوؤں میں اٹھایا تو چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک کاجل خاصی موٹی تھی۔ اس کا جسم نرم ضرور تھا لیکن اس میں وہ گداز اور گرمی نہیں تھی جو میں نے اس لمحے محسوس کی تھی۔ آج تک میں اس کے لمس کو ایک بچی کا لمس سمجھتا آ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے لگا کہ میں نے کسی جوان لڑکی کو چھوا ہو۔ اس کے جسم میں نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ میرے ساکت ہو جانے سے کاجل کسی قدر گھبرا گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب بٹھا بھی دو۔''

میں نے چونک کر جلدی سے اسے سیٹ پر بٹھا دیا اور یوں پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے وہ گوشت پوست کی لڑکی نہیں بلکہ کوئی دہکتا ہوا انگارہ ہو جسے میں نے غلطی سے چھو لیا تھا۔ خود کاجل چند لمحے پہلے جتنی طراری دکھا رہی تھی اب محجوب سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے پیروں پر اپنا فراک درست کیا اور پیڈل چلانے لگی۔ میں نے جان بوجھ کر سائیکل کو خاصے سخت گیئر میں ڈال دیا تھا اور اس کے لیے پیڈل گھمانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا نازک بدن اس مشقت سے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف حرکت کر رہا تھا چند لمحوں میں وہ پسینے پسینے ہو گئی۔ پھر ایک اور مشکل آن پڑی۔ جب وہ پیڈل چلاتی تو اس کی فراک اُلٹ کر اوپر آنے لگتی۔ اسے بار بار فراک درست کرنا پڑتی تھی۔ ایک طرف فراک کی شرارت سے وہ شرما رہی تھی تو دوسری طرف میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ رُک گئی۔

''کون سی چڑیل؟'' اس نے دریافت کیا۔

''وہی جو کل تک بال بکھرائے اور فراک پہنے گھوما کرتی تھی۔''

''آنٹی دیکھیں۔'' اس نے فوراً ماہ پارہ سے شکایت لگائی۔ ''یوسف مجھے چڑیل کہہ رہا ہے۔''

''خبردار یوسف۔'' انہوں نے مجھے گھورا۔ ''کاجل میری بیٹی ہے اور دیکھو ان کپڑوں میں کتنی پیاری لگ رہی ہے۔''

دل میں تو میں نے بھی اعتراف کیا مگر منہ سے نہیں بولا۔ شلوار سوٹ میں وہ یک دم بڑی بڑی



سی لگنے لگی تھی۔

''یوسف کیا میری بیٹی کو نظر لگاؤ گے۔'' ماہ پارہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔

''اسے اور نظر...... یہ تو سر تا پا ٹیکہ ہے اسے کہاں نظر لگے گی۔''

''ہاں میں کالی ہوں۔ تم تو گورے ہو ناں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''کالی کہاں ہو۔ اتنا پیارا سا رنگ ہے۔ سچ بتاؤں میں نے ساری عمر میں اتنا پُرکشش رنگ نہیں دیکھا۔''

''ہاں آپ افریقہ چلیں میں آپ کو اس سکیم کے ایک سو ایک کلر دکھا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا تو کاجل پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ماہ پارہ نے مجھے پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔

''بُری بات یوسف کسی کو اس کی فزک کے حوالے سے ٹیس کرنا بہت گھٹیا بات ہے۔''

''سوری ماں لیکن وہ بھی تو مجھے اتنا تنگ کرتی ہے۔''

''وہ بچی ہے۔''

''وہ بچی ہی تو نہیں ہے۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا مطلب؟'' ماہ پارہ چونکیں۔

''مطلب۔'' میں گڑبڑا گیا۔ ''کچھ بھی نہیں ہے۔''

''جا کر اسے مناؤ۔'' ماہ پارہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے معلوم ہے وہ اپنے کمرے میں جا کر رو رہی ہوگی۔''

''سوری...... اس کی ہٹلر اماں موجود ہوں گی۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''یوسف اب تم بچے نہیں رہے ہو۔ مرد بنو ایک عورت سے ڈرنا چھوڑ دو۔''

''عورت ہی تو خطرناک ہوتی ہے۔''

''لیکن مرد کے بغیر نہیں یاد رکھو عورت مرد ہی کو اپنی طاقت بناتی ہے۔''

''میں فلسفے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''تو پھر جا کر اسے مناؤ۔''

میں خود بھی کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ واقعی میرے معاملے میں بے حد حساس تھی۔ اگر میں اسے جا کر نہ مناتا تو وہ کئی دن تک اسی طرح کمرے میں پڑی روتی رہتی۔ میں نے کمر کسی اور روانہ ہو گیا۔ کاجل کو منانا کسی بپھری ہوئی شیرنی کو رام کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ میں نے اس کے کمرے پر دستک دی۔ دوسری بار دستک دینے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ حسبِ توقع وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے اس کا بدن ہل رہا تھا۔

''کاجل۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو اس کی سسکیوں میں شدت آ گئی تھی۔

''چلے جاؤ۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"آئی ایم سوری کاجل۔"

"چلے جاؤ۔" اس نے روتی آواز میں کہا۔"میں کالی ہوں ناں کسی گوری لڑکی کے پاس جاؤ۔"

اب میں نے ذرا سخت ہونے کا فیصلہ کیا۔"کاجل کی بچی سیدھی ہو جاؤ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا تم اب میری بات کا بُرا مانو گی۔"

"ہاں مجھے بُرا لگا۔" اس نے چیخ کر کہا۔"میں تمہاری زبان سے یہ بات نہیں سن سکتی۔"

"اور وہ جو تم اکثر مجھے سرخ منہ والا بندر کہتی ہو۔" میں نے خفگی سے کہا۔"میں کبھی روٹھا؟"

"مجھے نہیں پتا۔تم جاؤ یہاں سے۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"کاجل تم اٹھتی ہو یا......" میں نے اسے دھمکایا۔میں اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گیا۔

اس کے قریب آتے ہی وہی سنسنی مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔میری سوچیں بھٹکنے لگی تھیں۔

کاجل گیارہ سال کی تھی لیکن اس کا قد وغیرہ جمشید علی پر گیا تھا۔وہ لمبے چوڑے تھے۔شاید اسی وجہ سے کاجل ابھی سے بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔اس کے نقوش، بال اور رنگت ماں پر گئے تھے۔اپنی غلطی کا احساس ہونے سے پہلے اس کشش نے مجھے مسحور کر لیا تھا۔میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو اس کا لرزتا بدن ساکت ہو گیا۔

"اب بھی معاف نہیں کرو گی؟"

"پلیز۔" وہ کسمسائی۔

"نہیں پہلے معاف کرو۔" میں نے اصرار کیا۔

وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور مجھ سے دور ہو گئی۔"آپ چلے جائیں یہاں سے۔" اس نے لہجہ بدل کر کہا۔

"ارے اتنی ناراضگی کہ آپ جناب کرنے لگی ہو۔" میں ہنسا۔

"اب مجھے مت چھونا۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔

"کاجل کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ہم بچپن سے ساتھی ہیں۔"

"لیکن اب ہم بچے نہیں ہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں اگر تم روٹھو گی تو میں اسی طرح مناؤں گا۔جیسے پہلے مناتا تھا۔" میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

"نہیں۔" وہ پیچھے ہٹنے لگی۔حتیٰ کہ دیوار آ گئی اور میں نے نرمی سے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔"چھوڑو مجھے۔"

"نہیں پہلے کہو کہ معاف کر دیا۔"





"یوسف کوئی آ جائے گا۔"

مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔اس سے پہلے مجھ سے لپٹتے چمٹتے ہوئے کاجل کو کبھی پروا نہیں رہی تھی کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو گا۔آج اس نے پہلی بار ایسی بات کی تھی۔"تو کیا ہو گا؟" میں نے اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"مم...... مجھے شرم آ رہی ہے۔" وہ بولی۔"چھوڑو مجھے جنگلی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تم نے اب تک معاف نہیں کیا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔"جب تک معافی نہیں ملے گی چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس کی ضد اب بھی برقرار تھی۔اس نے کوشش کر کے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔میں جب بھی اس سے کچھ منوانا چاہتا تھا اسے اس طرح گرفت میں جکڑ لیتا اور وہ تھک ہار کر مان جاتی تھی۔مجھے معلوم تھا کہ وہ جلدی مان جائے گی۔اب تو اس کے احساسات ہی کچھ اور تھے مگر مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دینا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔جب میری گرفت سخت ہونے لگی تو اس نے ہار مان لی۔

"اچھا بابا معاف کر دیا اب چھوڑ دو۔"

"تم سے کوئی بات منوانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔" میں نے شکوہ کیا۔"اس کا کوئی صلہ بھی تو ملنا چاہیے۔"

"کیسا صلہ؟" اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا۔اس نے چہرہ پیچھے کیا لیکن ایک حد تک وہ پیچھے کر سکتی تھی۔حتیٰ کہ فاصلہ ختم ہو گیا۔زندگی میں پہلی بار میں نے لبوں پر ایک نرم اور گداز سا احساس پایا تھا۔اسی لمحے کھٹکے کی آواز آئی تو کاجل تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔دروازے پر جمشید علی کھڑے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔میرے منہ سے نکلا۔"پاپا آپ۔"

کاجل کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا کہ جمشید علی برس پڑیں گے کوئی باپ اس قسم کا منظر برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیٹی کسی کی بانہوں میں ہو لیکن جب جمشید علی بولے تو ان کی آواز معمول کے مطابق تھی۔

"یوسف میری اسٹڈی میں آؤ۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرتے چلے گئے۔

"یوسف پاپا نے دیکھ لیا۔" کاجل کی آواز لرز رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔"پاپا ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"یہ اچھا نہیں ہوا۔"

"کاجل میں نے ساری عمر پاپا سے کچھ نہیں مانگا لیکن میں تمہیں ضرور مانگوں گا۔"

وہ ڈر رہی تھی۔"تم پاپا کو نہیں جانتے۔" یک دم وہ مجھ سے لپٹ گئی اس کا بدن سرد ہو رہا تھا۔

چند لمحے پہلے والی گرمی غائب ہو چکی تھی۔ ''وہ سزا ضرور دیں گے۔''

میں نے اس کے لبوں پر انگلی پھیری۔ ''میں نے آج جو پایا ہے اس کے بدلے میں پاپا کی دی ہوئی ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہو گئی۔ ''جاؤ پاپا اسٹڈی میں انتظار کر رہے ہیں۔''

دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر اس ممنوعہ پھل کو چکھوں لیکن دل پر جبر کر کے رہ گیا۔ کاجل میرے لیے محترم ہستی تھی۔ میں اسے اس کی مرضی سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ با دلِ نخواستہ میں اس کے کمرے سے نکلا۔ اس کی ہستی کی کشش کے اثر سے نکلتے ہی مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہونے لگا۔ جمشید علی کتنے ہی روشن خیال سہی ایک بیٹی کے باپ تھے اور بیٹی کے باپ ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے وہ دس بائی دس فٹ کی جھونپڑی میں رہتا ہو یا جمشید پیلس میں۔ انہوں نے جو دیکھا تھا اسے انہوں نے برداشت کر لیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں غصہ نہیں آیا ہو گا۔ میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ معاملہ کتنا ہی سنگین اور اشتعال انگیز کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ سکون سے فیصلہ کرتے تھے اور اس پر ٹھنڈے دل سے عمل درآمد کرتے آئے تھے۔

میں نے اسٹڈی کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ''آجاؤ۔''

میں اندر چلا گیا۔ اس اسٹڈی میں کتنی بار میں جمشید علی کے مقابل ہوا تھا لیکن اس روز میری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جمشید علی اپنی نشست پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے۔ وہ تمباکو کے شوقین تھے لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کی توجہ پائپ کی طرف نہیں تھی خاصی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولے تو میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں پاپا۔''

وہ چونکے۔ ''بیٹھ جاؤ یوسف۔''

''پاپا آئی ایم سوری۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نو...... نو......'' انہوں نے ہاتھ لہرایا۔ ''میں جانتا ہوں تم اپنی ذہنی عمر کے لحاظ سے بہت آگے ہو۔ میں تم سے کسی جذباتی قدم کی توقع نہیں کرتا۔ یہ بتاؤ کہ کاجل تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

''بہت اچھی۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور پھر جھینپ گیا۔

''وہ ابھی بچی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولے۔

مجھے تھوڑی دیر پہلے جو تجربہ ہوا تھا میں ان کی بات کی تردید کر سکتا تھا لیکن میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

''شی از اونلی اے چائلڈ'' وہ پھر بولے۔ ''لیکن مجھے اندازہ ہے وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ یوسف کیا تم اس سے شادی کرو گے۔''





اس بار میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''پاپا اگر تقدیر نے موقع دیا تو میں صرف کاجل سے شادی کروں گا۔''

انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ''تقدیر کو کیوں درمیان میں لاتے ہو ہم اپنی تقدیر خود بناتے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے پاپا! بہت سارے لوگوں کی تقدیریں صرف چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔''

وہ چونکے۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''کچھ نہیں پاپا۔''

''میں نے سوچا ہے کہ تمہیں مری بھیج دوں۔ تم اپنی بقیہ تعلیم وہیں مکمل کرو گے۔''

''نو پاپا۔'' میں نے بے ساختہ کہا میں کاجل سے دور جانا نہیں چاہتا تھا۔

انہوں نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھتا ہوں بیٹے لیکن یہ تمہارے اور کاجل دونوں کے لیے بہتر ہے۔ ابھی تم لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ بہتر ہے اپنی توجہ اسی طرف رکھو۔ کاجل لڑکی ہے۔ وہ زیادہ نادان ہے۔ تم سمجھدار ہو۔ اس دوری کو نباہ لو گے اور اسے بھی کچھ دن رو دھو کر صبر آ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ذہن کو بھٹکنے سے محفوظ رکھو۔''

''اوکے پاپا۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ شاید کچھ عرصہ پہلے وہ مجھ سے یہ بات کہتے تو میں بخوبی مان لیتا مگر اب یہ کام بے حد دشوار لگ رہا تھا۔ اس سے دور جانا جو رگِ جاں سے قریب تھی۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میں تو کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لوں گا کاجل ضدی تھی وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو گی۔ اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کوئی ضد پکڑی تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

''گڈ بوائے۔'' جمشید علی مسکرائے۔ پھر بولے۔ ''اور تم کاجل سے اکیلے میں نہیں ملو گے وعدہ کرو۔''

''پرامس پاپا۔'' میں نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''لیکن کاجل۔''

''اسے سمجھانا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ میرا خیال ہے تم یہ کام کر لو گے۔''

''میں کوشش کروں گا پاپا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''آپ جانتے ہیں وہ کتنی ضدی ہے۔''

''بہتر ہے یہ کام تم کر لو۔'' یک لخت ان کے لہجے میں سرد مہری آ گئی تھی۔

''مجھے کب تک جانا ہو گا؟''

''اسی ہفتے کے دوران۔ میں سارے انتظامات کر دوں گا۔''

''ماہ پارہ اور حسن علی؟''

''وہ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ ایبٹ آباد میں میرا ایک بنگلہ ہے تم وہیں ٹھہرو گے۔''

میں نے کسی قدر سکون کا سانس لیا کہ مجھے ماہ پارہ سے جدا نہیں ہونا پڑے گا لیکن کاجل؟

میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ جمشید علی کا یہ فیصلہ میرے اور کاجل کے لیے بہتر تھا۔ ایک دوسرے کا ہونے کے لیے ہمارے پاس ساری عمر پڑی تھی۔ ابھی ہمیں تعلیم حاصل کرنا تھی۔ اپنی شخصیت بنانا تھی اس دنیا میں جینے کے لیے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ جمشید علی نے کتنی مہارت اور سیاست سے مجھے اور کاجل کو الگ کر دیا تھا۔ ہم ریلوے لائن کی پٹریاں بن کر رہ گئے تھے جو ساتھ ساتھ تو چل سکتی ہیں لیکن مل نہیں سکتیں۔

میں نے ماہ پارہ کو آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئی تھیں ''لیکن کیوں اتنا اچانک فیصلہ؟''

''پاپا کے سارے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' میں نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

''یوسف میری طرف دیکھو تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔'' وہ بولیں۔

مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ جمشید علی کے اس فیصلے کی اصل وجہ کیا تھی۔ مجھے بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی لیکن میں ان سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ناراض ہو جائیں گی لیکن خلاف توقع وہ ہنس دیں۔

''یوسف تو بڑا ہو گیا ہے۔'' میں اور جھینپ گیا۔ ''لیکن کاجل ابھی بچی ہے۔'' انہوں نے وہی بات کی اور فوراً ہی اس کی تردید کر دی۔ ''نہیں لڑکیاں ایسے معاملات میں جلد سمجھدار ہو جاتی ہیں۔''

مجھے کاجل کی شرم اور اس کا سرخ ہونا یاد آ گیا۔ واقعی لڑکیاں معاملاتِ محبت میں جلد سمجھدار ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔

''آپ بھی لڑکی ہیں آپ کو زیادہ بہتر پتا ہو گا۔''

''بکومت۔'' وہ جھینپ گئیں۔ ''میں اب لڑکی نہیں رہی۔''

''کون کہتا ہے۔'' میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ''یقین کریں آپ اب بھی بائیس چوبیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتیں بلکہ پونی باندھ کر تو آپ کالج گرل لگتی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا تو حسن علی سے پوچھ لیجیے۔''

''یوسف اب تم مجھ سے مار کھاؤ گے۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بسم اللہ کیجیے۔ یقین کریں بہت دنوں سے یہ پسندیدہ ڈش نہیں کھائی۔''

''اب تم بڑے ہو گئے ہو اور بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ویسے آپ نے بچے پالنے کی اچھی پریکٹس کر لی ہے۔'' میں شرارت سے بولا تو وہ جھلا کر سچ مچ مجھے مارنے لگیں۔ اسی لمحے حسن علی وہاں آ گیا۔ ماہ پارہ کو میرے اتنے پاس دیکھ کر اس کے چہرے پر سخت تاثرات اُبھر آئے تھے۔







مجھے جس کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ وہ تین افراد پر مشتمل تھی۔ ایک عمر رسیدہ تھا۔ باقی دونسبتاً جوان تھے۔ تینوں سفید فام ہی تھے۔ عمر رسیدہ نمبر ون تھا اور باقی دو اور تین تھے۔ نمبر دینے کا مقصد ان کی شناخت چھپانا تھا۔ ان کے پتھر کی طرح ساکت چہرے دیکھ کر مجھے شبہ ہونے لگا کہ انہوں نے ماسک میک اپ کر رکھا تھا۔

جان گرے پر حملہ کرنے کی پاداش میں مجھے اور عبید صلاح کو تین دن کھانے اور پانی سے محروم رکھا گیا تھا۔ کھانے کی تو اتنی فکر نہیں تھی لیکن سمندر کی نم آب و ہوا کے باوجود پانی کی کمی نے ہمارے جسموں سے جان نکال لی تھی۔ کم از کم اپنے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اگر مجھے چند گھنٹے اور پانی نہ ملتا تو میں دنیا سے گزر جاتا۔ پہلے مرحلے میں ہمارا کھانا پانی بحال کیا گیا کہیں ایک ہفتے بعد جا کر ہماری حالت سنبھلی تھی۔ بھوک پیاس کے لرزا دینے والے احساسات کی یہ یادیں ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہیں گی۔

یہ دسواں دن تھا۔ جب صبح ناشتے کے بعد ہمیں باہر نکالا گیا۔ ہمیں چکدار ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بند گاڑی میں کہیں لے جایا گیا۔ جہاں سے ہم باہر نکلے وہاں سرخ پتھروں سے بنی وسیع و عریض عمارت تھی۔ جیسی کہ سٹی کورٹس کی عمارتیں ہوتی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں ہم پر مقدمہ چلایا جائے گا اور جرم ثابت ہونے پر ہمیں سزا دی جائے گی۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ کچھ بین الاقوامی قسم کے مجرم الٹا ہمیں ہی مجرم قرار دے کر مقدمہ چلا کر سزا دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

اندر سے عمارت ایسی ہی تھی جیسا کہ عام سرکاری دفاتر کی ہوتی ہیں اور وہاں کچھ لوگ کام بھی کرتے نظر آ رہے تھے۔ جیسے کہ سرکاری اداروں میں کرتے ہیں لیکن یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ ورنہ ان کے مقاصد میں اور کسی مملکت کے سرکاری دفاتر کے عملے میں وہی فرق تھا جو کسی ملک کی پولیس اور مجرموں کے درمیان ہوتا ہے۔ ہمیں لانے والے گارڈز پولیس جیسی ہی وردی میں تھے لیکن اس سے ان کی اصلیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجرم قانون کی وردی پہن کر سچ مچ قانون کا محافظ نہیں بن جاتا۔ عمارت کے ویٹنگ روم میں ہمیں جان گرے ملا تھا۔

''اب تم لوگوں پر ہمارے قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جائے گا۔'' اس نے کہا۔

اس پر عبید صلاح نے اسے آگاہ کیا کہ اگر اسے ان کے قوانین کا مسودہ مل جائے تو وہ اس پر آب پاشی کرنا پسند کرے گا۔

''بہت بکوس کر رہے ہو۔'' جان گرے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''ساری بکواس بند ہو جائے گی۔''

''بکواس کی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' عبید صلاح نے خوش دلی سے کہا۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک گارڈ نے اس کی پسلیوں میں اپنی رائفل کی نالی ماری تھی۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' اس نے غرا کر کہا۔

"کونسل کے سامنے یہ رویہ رکھا تو اپنی بچت کے راستے خود بند کرلو گے۔" جان گرے نے خبردار کیا۔

"تمہاری کونسل کی ایسی کی تیسی۔" عبید صلاح نے بہ مشکل کہا۔ "میں اس پر بھی پیشاب کرنا پسند کروں گا۔"

گارڈ نے پھر نال اس کو مارنی چاہی لیکن میں نے نال کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ "زبان کا جواب ہاتھ سے دینا اچھی بات نہیں ہے۔"

یک دم بقیہ گارڈز نے مجھ پر رائفلیں تان لیں اور میں نے مسکراتے ہوئے رائفل کی نال چھوڑ دی۔ گارڈ نے اس بار مجھ پر وار کرنے کے لیے رائفل اٹھائی تھی کہ جان گرے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"یوسف میرا مشورہ ہے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو تم بہت بڑی مشکل میں پڑ گئے ہو۔"

"اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے رُکھائی سے جواب دیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنا ہی بہتر تھا۔ جیل میں ہنگامہ کر کے میں نے خاص طور سے ڈیئر ڈان کو اپنا دشمن بنالیا تھا جو بے حد متعصب اور کینہ پرور شخص تھا۔ متعصب اور کینہ پرور تو جان گرے بھی تھا لیکن وہ اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے مجھے چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ ورنہ جو شخص ذرا سی لڑائی کی وجہ سے بلا دریغ تیس بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دے اس سے رعایت کی توقع کرنا کسی بیل سے دودھ کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔

بارہ بجے ہمیں کونسل کے سامنے باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے تین ارکان جج بنے معزز نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مجھے ان کے چہروں پر قزاقی کی چھاپ واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ عبید صلاح نے اندر جاتے ہی اعلان کیا۔ "میں اس نام نہاد عدالت کو نہیں مانتا۔ تم لوگوں کا جو دل چاہے کرو میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔"

"فضول باتیں مت کرو مسٹر عبید صلاح تم پر دہشت گردی کے سنگین الزامات ہیں۔"

عبید صلاح نے حقارت سے انہیں دیکھا۔ "اب وحشت گرد دوسروں کو دہشت گرد قرار دیں گے۔"

"اسے باہر لے جاؤ اس کا مقدمہ بعد میں پیش کیا جائے۔" نمبر ون کی تختی والے نے گارڈز سے کہا۔ اس کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی تھی۔ عبید صلاح کے جانے کے بعد مجھے ان کے سامنے ایک کٹہرے نما جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ میرے عقب میں ایک گارڈ رائفل لیے مستعد کھڑا تھا۔ نمبر ون نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔

"مسٹر یوسف آلی۔" اس نے کہا۔ "تم پر سنگین جرائم کے الزامات ہیں پہلے تم نے جزیرے کی ایک معزز شخصیت مسٹر جان گرے پر حملہ کیا اور انہیں یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ تمہارا یہ عمل ایک





مجرم اور سزا یافتہ دہشت گرد کی حمایت میں تھا جو بجائے خود سنگین جرم ہے۔ پھر دوران حراست تم نے اسلحہ رکھا اور اس اسلحے سے مسٹر جان گرے کو جان سے مارنے کی کوشش کی خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہے لیکن اس سے تمہارے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوئی تم اپنی صفائی میں کیا کہنا پسند کرو گے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "سوائے اس کے کہ تم یہ عدالت کا ڈھکوسلہ ختم کر کے ہمارے خلاف جو تمہارا پروگرام ہے اس پر عمل کرو۔"

"لگتا ہے مسٹر یوسف تمہیں سزا سے بچنے سے کوئی خاصی دلچسپی نہیں ہے۔" نمبر تین بولا۔

"مسٹر یوسف کو یقین ہے کہ ان سے سنگین جرائم سرزد ہوئے ہیں۔" نمبر دو نے کہا۔ "اس بناء پر یہ انصاف کے عمل میں شرکت کرنے کے بجائے اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔"

میں ہنسا۔ "تم لوگ انصاف، اور عدالت کی اے بی سی سے بھی واقف نہیں ہو۔ اگر تم لوگ انصاف کرنا جانتے تو دنیا اس حال میں نہ ہوتی۔ بہرحال بین الاقوامی سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اپنی ذات سے بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس حد تک ہے کہ میں تمہاری دی ہوئی سزا سے بچنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کروں گا۔"

"ہم سزا دینے کا اختیار اور اس پر عمل درآمد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔"

"گویا مائٹ از رائٹ۔" میں نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "جب تم لوگ اس اصول پر یقین رکھتے ہو تو یہ عدالت کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم انسانی حقوق کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔" نمبر ون نے پُروقار لہجے میں ڈھٹائی سے کہا۔ "ہم کسی بھی ایسے کام سے گریز کرتے ہیں جس سے انسانی حقوق پر ضرب پڑے۔ اس وجہ سے تم جیسے مجرموں پر عدالت میں مقدمہ چلا رہے ہیں۔"

"انسانی حقوق کا جتنا احترام تم لوگ کرتے ہو اسے دنیا کے بہت سارے علاقوں کے لوگ تاعمر یاد رکھیں گے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بین الاقوامی سیاست پر بات کرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ تم اپنی صفائی پیش کرو۔" نمبر تین نے پھر کہا۔

"میں اپنی صفائی میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ مجھے کچھ قزاقوں نے میرے بحری جہاز سے اغوا کیا۔ انہوں نے بم سے جہاز کو اُڑا دیا اور تیس بے گناہ افراد کو قتل کر دیا۔ مجھے حق حاصل ہے کہ ان قزاقوں کی قید سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جو بھی ممکن ہے کر گزروں اور میں نے یہی کیا۔"

"اس جزیرے کے اپنے قوانین ہیں اگر تمہیں کوئی شکایت تھی تو تم کونسل کے روبرو آ سکتے تھے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورتِ حال کچھ دیر اور جاری رہی تو میں اپنا صبر کھو بیٹھوں گا۔ ان کی ڈھٹائی قابلِ تعریف تھی لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کی۔ اس کے بعد وہ اپنے طور پر بولتے رہے لیکن میں نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ تنگ آ کر نمبر ون نے کہا۔ "مسٹر یوسف تمہیں ایک دن کی مہلت دی جاتی ہے اگر تم نے کل تک اپنی صفائی پیش نہ کی تو......"

"تو تم لوگ مجھے طے شدہ سزا سنا دو گے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اسے لے جاؤ۔" نمبر دو نے طیش سے کہا اور گارڈز مجھے باہر لے آئے۔

عبید صلاح باہر موجود تھا۔ اسے محافظ لے جانے لگے تو میں نے اس سے کہا۔ "ان لوگوں کی بکواس خاموشی سے سنتے رہنا یہ اپنی من پسند سزا سنانا چاہتے ہیں۔ تم نے بحث کی تو سزا ابھی سنا دی جائے گی۔ ورنہ ایک دو دن کی مہلت مل جائے گی۔" میں نے اردو میں کہا تھا اس لیے کوئی اور نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد گارڈز اسے کھینچتے ہوئے لے گئے۔

میں باہر رکھی بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس لمحے جان گرے نمودار ہوا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ خاصا ڈرا ہوا تھا۔ دو مرتبہ قسمت نے اسے میرے ہاتھوں سے بچا لیا تھا۔ وہ تیسرا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے آتے ہی گارڈز بھی میری طرف سے چوکنا ہو گئے تھے۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا جب جان گرے نے اردو میں کہا۔

"یوسف میں تمہیں اس مشکل سے نکال سکتا ہوں۔" اس کا لب و لہجہ اور الفاظ کی ساخت بگڑی ہوئی تھی۔

"تم اردو جانتے ہو؟"

"تھوڑی بہت۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "یو اے ای میں ایک پاکستانی سپروائزر خاصے عرصے سے میرے ساتھ رہا تھا۔ اس سے یہ زبان سیکھی تھی۔ اس زبان میں دنیا کی موسیقی کا سب سے عظیم ذخیرہ ہے۔"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس جیسے شخص کے منہ سے موسیقی کا سن کر مجھے تعجب ہی ہوا تھا۔ "تمہیں ہمارے میوزک سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"موسیقی ساری دنیا کی ملکیت ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں نے ساری دنیا کو اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔"

"نوازش ہوگی آپ کی۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"لیکن اس کے لیے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ تم نہ صرف یہاں سے رہائی پا لو گے بلکہ میں تمہیں وہ سب بتا دوں گا جس سے تم آج تک بے خبر رہے ہو۔"

"کک...... کیسے حقائق۔" میں نے تڑپ کر کہا۔ اس نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی۔





وہ مسکرایا۔ "تمہارے پس منظر کے بارے میں تم کون ہو کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو تمہارے ماں باپ کون تھے اور مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے قاتل کون تھے۔"

میرا جسم کانپنے لگا تھا۔ "بکواس کرتے ہو تم۔"

"یوسف ایک معصوم بچہ بیک وقت اپنے ماں باپ سے کیسے محروم ہو سکتا ہے کیا کبھی جمشید علی نے تمہیں بتایا کہ تمہارے ماں باپ کون تھے، نہیں وہ ساری عمر تمہیں بہلاتا رہا ہوگا۔"

"تم...... تم یہ...... یہ سب کیسے جانتے ہو؟" الفاظ میرے منہ میں ٹوٹ رہے تھے۔

"تم سب جان جاؤ گے۔ بشرطیکہ تم میرے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

"کام کی نوعیت کیا ہے؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ نہ صرف تم یہاں سے چھٹکارا پا لو گے بلکہ ایک بڑی رقم بھی حاصل کر سکتے ہو۔"

"کتنی بڑی رقم؟"

اگر میں جان گرے کو بتا دیتا کہ میں اب بھی اس کاروبار کا قانونی مالک ہوں جو سالانہ کروڑوں ڈالرز کا نفع کما رہا تھا تو شاید وہ مجھے ایسی پیش کش نہ کرتا۔ اس کے نزدیک یہ بڑی رقم تھی لیکن میرے لیے نہیں یہ اور بات ہے کہ میں نے کروڑوں ڈالرز کے اس کاروبار سے کبھی عملی واسطہ نہیں رکھا تھا۔ یہ علی میرین لائن کارپوریشن تھی۔ جس کا کاروبار دنیا کے چون بڑے ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ میرین لائن کی دنیا میں یہ ایک معتبر نام تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر سنگاپور میں تھا اور آج کل اس کے ظاہری مالک جاوید اور جنید تھے کاجل کے بھائی زہرہ بیگم اور جمشید علی کے حقیقی بیٹے۔

"یہ رقم زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔" جان گرے نے گویا ترغیب دی۔ "اس کے علاوہ تم اپنے خاندان سے واقف ہو جاؤ گے۔ تو اس کا بھی تمہیں مالی فائدہ ہوگا۔"

جان گرے اس تہذیب کا نمائندہ تھا جس کے نزدیک محض مادی مفادات ہی اہم رہ گئے تھے۔ مجھے اس کی ذہنیت پر کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ میں جان گرے پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی بات میں کہیں نہ کہیں سچائی ضرور تھی اسے آزما لینے میں کوئی حرج نہیں تھا پھر وہ مجھے اس جنجال سے بھی نکال سکتا تھا۔ جس میں پھنسانے والا بھی وہی تھا۔

"او کے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "لیکن صرف مجھے ہی نہیں بلکہ عبید صلاح کو بھی تم بچاؤ گے۔"

"یہ ذرا مشکل کام ہے۔" وہ متفکر ہو گیا۔

"جیسے بھی کرو یہ کام بھی ہونا چاہیے اسے تم میری شرط بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"میں کرلوں گا۔" اس نے کہا۔

''اب کام کے بارے میں بات ہو جائے۔''

''اس کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔'' یک دم وہ محتاط نظر آنے لگا۔

''غالباً جب ہمیں اس نام نہاد عدالت سے سزا سنا کر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا یا ہمیں تفریح طبع کا نشانہ بنا کر رِنگ میں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اعتماد رکھو مجھ پر ایسا نہیں ہوگا۔''

''میں اس شخص پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں جسے مجھ پر اعتبار نہیں۔ ہاں ہم دونوں مجبور ہیں۔''

''تم نے درست کہا لیکن تم زیادہ مجبور ہو تمہارے لیے جان بچانے کا سوال بھی ہے اور اسے صرف میں بچا سکتا ہوں۔''

''تم خدائی کاموں میں دخل دینے کا دعویٰ کر رہے ہو۔'' میں نے ملامت لہجے میں کہا۔

''خدا نے بہت کچھ ہم پر چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''اپنی بات پر قائم رہنا تم نے اب کوئی غلطی کی تو شاید میں بھی تمہیں نہ بچا سکوں۔''

''ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مارنے اور بچانے والی ذات ایک ہی ہے۔''

''بے شک لیکن وہ ذات بھی میرٹ پر فیصلے کرتی ہے۔'' پہلی بار جان گرے نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مسلمان شاید یہ بات بھول گئے ہو۔''

میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ واقعی ہم مسلمانوں نے محض باتوں کو ہی سب سمجھ لیا تھا اور عمل کرنا بھول گئے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے ہیں علم اور عمل کے تضاد نے ہمیں زبوں حالی سے دوچار کر دیا ہے۔ جان گرے چلا گیا تقریباً دو گھنٹے بعد عبید صلاح کمرے سے نکلا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس نے میری بات پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس کی کونسل کے ایک دو تین سے منہ ماری ہو گئی تھی اور شاید اسے سزا سنا دی گئی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''صرف پندرہ دن کی سزائے قید۔''

''پندرہ دن کی؟'' میں دنگ رہ گیا۔ پھر فوراً اس کی بات سمجھ گیا۔ ''تم باز نہیں آئے۔''

''سزا تو ملنی تھی، میں نے سوچا کہ دل کی دل میں کیوں رکھی جائے۔''

''مہلت تو مل سکتی تھی۔''

اس نے شانے ہلائے۔ ''ایک دو دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق پڑ جاتا ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''ایک امید تو نظر آئی ہے۔''

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے کہا۔

میں نے اسے جان گرے کی پیش کش سے آگاہ کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''میں جان گرے جیسے شخص پر کسی صورت اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''اعتبار تو مجھے بھی نہیں ہے۔'' میں بولا۔ ''لیکن مجھے لگا ہے کہ وہ بھی پھنسا ہوا ہے اور اسے





میری مدد کی ضرورت ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ کم از کم اس منحوس جگہ سے تو نکلیں۔''

اس نے پُر خیال نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تمہارے ہاں ایک کہاوت ہے شیطان بھی کبھی انسان کے کام آ جاتا ہے۔''

''جان گرے کسی شیطان سے کم نہیں ہے لیکن اس وقت وہ ہمارے کام آ رہا ہے۔ دلدل میں گرنے والا یہ پروا نہیں کرتا کہ وہ جس چیز کو پکڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے وہ دراصل سانپ کی دُم ہے۔''

ہم بیک وقت ہنسے تو گارڈز نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''تم کیوں ہنس رہے ہو؟'' ایک نے پوچھا۔

''دراصل میری شادی ہونے والی ہے تمہاری بہن سے۔''

''نہیں اس سے میں شادی کروں گا۔ تمہارا سالا یہ ہے۔'' عبید صلاح نے دوسرے گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں کے ہی چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ وہ غرا کر ہماری طرف بڑھے تھے کہ دوسرے گارڈز نے انہیں روک دیا۔

''ہوشیار رہو ہمیں ان سے محتاط رہنے کو کہا گیا ہے بھونکنے دو انہیں۔''

لیکن مشتعل گارڈز نے راستے میں بدلہ نکال لیا۔ جب انہوں نے بیک وقت مجھے اور عبید صلاح کو کمر پر رائفلوں کے دستے مارے۔ گردوں پر لگنے والی اس چوٹ نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ عبید صلاح کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی لیکن ہم نے درد برداشت کر لیا۔ ایک گارڈ غرایا۔ ''تیز چلو کتے کے بچو ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں لگتے۔''

''خوش قسمتی سے ہماری تم سے کوئی رشتے داری نہیں ہے۔'' عبید صلاح نے کہا تو تکلیف کے باوجود میں ہنس پڑا تھا۔

اپنی کوٹھری میں پہنچ کر یہ خوش گوار انکشاف ہوا کہ غیر حاضری کی بنا پر ہمارا لنچ واپس لے جایا گیا تھا اور اب ہمیں رات تک صبر کرنا پڑے گا۔ یہ سن کر ہم نے بزبان شاعر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ عبید صلاح کا قصیدہ عربی میں تھا جسے ناواقفان تلاوت بھی قرار دے سکتے تھے۔ حالانکہ عربی میں بھی دیگر زبانوں کی طرح ان الفاظ کی بھرمار ہے جو کسی بھی ڈکشنری میں شامل نہیں کیے جاتے۔ پانی کو ہم نے صبر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار لیا تھا۔ ڈیز ڈان ہم پر اتنا مہربان تھا کہ تین دن کے فاقے کے بعد بھی اس نے خیال رکھا تھا کہ ہمارے معدوں میں زیادہ خوراک نہ جانے پائے تاکہ ہم ان عوارض سے محفوظ رہیں جو زیادہ کھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

''کیا جان گرے۔'' عبید صلاح نے کہنا چاہا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ پھر تقریباً اس کے کان پر منہ رکھ کر کہا۔ ''یہاں اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا۔ ممکن ہے ہماری باتیں کہیں سنی جا رہی ہوں۔''

اس وقت یہ صرف خیال تھا۔ جو بعد میں حقیقت ثابت ہوا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں اپنی مختصر سی کوٹھری میں چہل قدمی کر رہا تھا تب گارڈ نے دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

''کیوں کیا بات ہے؟ یہ میرے سونے کا وقت ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''سونے کے بچے انچارج تمہارا انتظار کر رہا ہے اپنے دفتر میں۔'' گارڈ نے کہا۔ ''اس وقت تم اپنی قبر میں بھی سو رہے ہوتے تو ہم تمہیں لے جاتے۔''

''تمہارا تعلق شاید گورکنوں کے خاندان سے ہے۔'' میں نے باہر آتے ہوئے تبصرہ کیا۔

گارڈ نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔ ''بک بک کر لو چند دنوں میں تمہاری یہ قینچی کی طرح چلنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔''

میں ہنس دیا۔ یہ فربہ اندام اور گارڈ کی طرح نظر آنے والا گارڈ خصوصیت سے ہمارا نشانہ بنتا تھا۔ اس بناء پر ہم سے سب سے زیادہ خار بھی کھاتا تھا۔ اس کے ساتھ میں انچارج یعنی ڈیئر ڈان کے کمرے تک پہنچا۔ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا۔ اس کے سامنے گندے برتن پڑے تھے۔ ایک ہاتھ میں جام تھا وہ خاصی دیر سے پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''آؤ مسٹر یوسف۔'' خلافِ توقع اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''بیٹھو۔''

میں شکریہ ادا کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے رویے سے مجھے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ وہ نشے میں تھا اور عین ممکن تھا کہ اس کے ذہن میں اپنی تفریح کے لیے کوئی منصوبہ ہو۔ طاقت کے نشے میں مبتلا کم ظرف لوگ اکثر بڑی عجیب حرکتیں کر جاتے ہیں۔ مجھے لانے والا گارڈ چوکس ہو کر میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اچانک ڈیئر ڈان نے غرا کر اس سے کہا۔

''دفع ہو جاؤ۔''

''لیکن جناب۔'' گارڈ نے کہنا چاہا۔

''گیٹ آؤٹ۔'' ڈیئر ڈان حلق کے بل دھاڑا تو وہ بوکھلا کر دفتر سے نکل گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ڈیئر ڈان نے اپنی دراز سے چاندی جیسے دستے والا کولٹ نکالا اور چند لمحے اسے یوں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے اس کا کیا کرنا چاہیے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے جتا رہا تھا کہ وہ نہتا نہیں ہے لہٰذا میں کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ سچ مچ مجھے گولی مارنے پر غور کر رہا ہو۔ میں پوری طرح محتاط تھا لیکن اس نے مجھے شوٹ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ کولٹ واپس دراز میں رکھ دیا۔ البتہ دراز اس نے کھلی رکھی تھی۔

''مسٹر یوسف کچھ پیو گے؟''

''نہیں شکریہ۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''سوال نہیں لڑکے! یہاں کسی قیدی کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے انگلی




اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ آج کونسل میں جان گرے سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟''

میں چونکا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات سے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ''جان گرے کیا کہہ رہا تھا؟ یہ تو تم اسی سے پوچھو تو بہتر رہے گا۔''

''میرے سوال کا جواب دو۔'' یک دم وہ اپنے سابقہ انداز پر لوٹ آیا۔ ''ورنہ ہنٹر سے مار کر کھال اُتار دوں گا۔''

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ''جان گرے مجھے دھمکا رہا تھا۔ مجھے بُرے انجام سے خبردار کر رہا تھا۔''

''بکومت۔ وہ پورے ایک گھنٹے تک تم سے بات کر رہا تھا۔ اتنی دیر تک کوئی کسی کو نہیں دھمکاتا۔''

''میں اور کیا بتاؤں۔'' میں نے اُکتاہٹ ظاہر کی۔ ''اس میں بتانے والی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''وہ تمہیں کسی کام پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بدلے وہ تمہیں سزا سے بچائے گا ہے ناں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بائی دی وے یہ خبر تم تک کس نے پہنچائی؟''

''اس جزیرے پر ہونے والی ہر حرکت کا علم مجھے ضرور ہوتا ہے۔'' اس نے فخر سے سینہ پھیلایا۔ ''میں پورے جزیرے کا سیکیورٹی انچارج بھی ہوں۔''

''یہ خبر غلط ہے۔ جس نے بھی دی ہے اس نے تمہیں مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''لگتا ہے تم یوں نہیں مانو گے۔'' اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جو بات میرے علم میں ہی نہ ہو اسے میں کیسے بتا سکتا ہوں۔''

''اس چکر میں نہ رہنا کہ جان گرے تمہیں بچا سکتا ہے۔''

''میرا ایک آدمی تم لوگوں کے ساتھ تھا۔ جب جان گرے تمہیں ترغیب دے رہا تھا۔ وہ تمہاری زبان جانتا ہے۔''

''مروا دیا۔'' میں نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ ''شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ جان گرے مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ تم لوگوں کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بنیاد پر اس نے مجھے معافی دلوانے کی بات کی تھی۔ بقول اس کے تم لوگوں کو مجھ جیسے ہونہار نوجوانوں کی اشد ضرورت ہے۔''

''تم جھوٹ تو نہیں کہہ رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں میں شک تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''یہ بات تم جان گرے سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ مجھے یہاں لانے کا مقصد ہی یہی تھا ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ خلیج کو ڈبو دیا گیا تھا جس پر میں سفر کر رہا

تھا۔ راستے میں بھی جان گرے نے مجھے ترغیب دی تھی۔‘‘

میں نے محسوس کیا کہ ڈیئر ڈان کا شک کمزور ہو گیا تھا۔ میں احمق جان گرے کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہا تھا اس نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی کہ جس طرح اسے اردو آتی ہے اسی طرح کسی دوسرے سفید فام کو بھی یہ زبان آسکتی ہے اور وہ گارڈ بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’تم لوگ اس زبان میں کیوں بات کر رہے تھے جو سب کونٹی نینٹ میں بولی جاتی ہے۔‘‘

’’بس اتفاق تھا۔ جان گرے نے انکشاف کیا کہ اسے اردو آتی ہے اور پھر ہم اسی زبان میں بات کرتے رہے۔‘‘

’’اگر اس میں جھوٹ ہوا تو تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔‘‘ اس نے دھمکایا۔ ’’اب تم جا سکتے ہو؟‘‘

’’اب کون سا اچھا ہو رہا ہے۔‘‘ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ڈیئر ڈان نے گھنٹی بجا کر گارڈ کو طلب کیا۔ ’’اسے لے جا کر کوٹھری میں بند کر دو۔‘‘

عبید صلاح سو گیا تھا لیکن دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ اُچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ’’آ گئے تم کیا بکواس کر رہا تھا وہ منحوس صورت شرابی۔‘‘

’’بس پیچھے پڑا ہوا تھا۔‘‘ میں نے منہ بنایا۔ ’’کہہ رہا تھا کہ میں نے جان گرے سے کوئی ڈیلنگ کی ہے۔ وہ میری جان بچانے کے عوض مجھ سے کوئی کام کرنے کو کہہ رہا ہے۔‘‘

عبید صلاح نے قہقہہ لگایا۔ ’’جان گرے اپنے باپ کے کام نہ آئے۔‘‘

’’درست لیکن یہ بات اس ڈیئر کے بچے کو کون سمجھائے۔‘‘

’’نہ سمجھے ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ ہمیں تو ویسے ہی سزا ہونے والی ہے۔‘‘

’’سو جاؤ صبح پھر پیشی ہے۔‘‘

میں نے کہا اور خود بھی بستر پر دراز ہو گیا۔ عبید صلاح تو تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی تھی میرے اور جان گرے کے درمیان ہونے والی بات چیت کا اس کے کانوں میں پڑنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے مشکوک ہو جاتا تو جان گرے کا منصوبہ یعنی ہماری رہائی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جان گرے کو تو اس بات کا علم ہے؟ کبھی کبھی آدمی جو سوچتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر درست نکل آتا ہے۔ یک دم کوٹھری کے باہر گیلری میں جلنے والی روشنیاں بجھ گئیں۔ میں ذرا چونکا جب سے میں یہاں آیا تھا۔ بجلی فیل ہونے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ جزیرے کو کہاں سے بجلی مہیا کی جاتی تھی کیا ان لوگوں نے جزیرے پر کوئی بجلی گھر بنا رکھا تھا اور اگر بجلی گھر تھا بھی تو وہ کس ایندھن سے چلتا تھا۔ عام طور سے بجلی گھر روایتی ایندھن یعنی تیل گیس یا کوئلے سے چلتے ہیں۔ اس جزیرے پر آبی برقاب کے لیے ڈیم بنانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔





جیسے ہی روشنی گل ہوئی مجھے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کسی نے تالے میں چابی گھمائی تھی۔ اس لمحے روشنی کی ایک لکیر سی لہرائی اور مجھے جان گرے کی آواز آئی۔ ’’یوسف خاموشی سے باہر آجاؤ۔ آواز مت کرنا۔‘‘

میں اٹھا تو دروازہ ہلکا سا کھل گیا جو میرے باہر آتے ہی بند ہو گیا تھا۔ جان گرے کے ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ تھی۔ اس کے پاس ہی کوئی کھڑا تھا۔ غالباً یہ ہماری بیرک کا گارڈ تھا۔ تالہ اس نے کھولا تھا۔ جان گرے کے اشارے پر میں آگے بڑھنے لگا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کیا اپنے وعدے کے مطابق جان گرے مجھے رہا کرا کے لے جا رہا تھا لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ کچھ دیر بعد ہم کیمپ کے اندر ہی درختوں کے ایک جھنڈ تلے تھے۔

’’ڈیئر ڈان کو تمہارے منصوبہ کی بھنک پڑ گئی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘ اس نے بے تابی سے کہا۔ ’’اس لیے میں خطرہ مول لے کر تم تک آیا ہوں۔ یہ گارڈ میرا با اعتماد شخص ہے۔‘‘

’’شاید یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہو۔‘‘ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’ڈیئر ڈان توقع سے زیادہ چالاک ہے اس کے جاسوس تمہارے اردگرد لگے رہتے ہیں۔ ان ہی سے یہ بات ڈیئر ڈان تک پہنچی تھی۔‘‘

’’نہیں اس شخص پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔‘‘ جان گرے نے کہا۔ ’’خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ ڈیئر ڈان نے تم سے کیا بات کی؟‘‘

’’وہ چاہتا تھا کہ میں اسے تمہارے منصوبے کے بارے میں بتا دوں۔‘‘

’’پھر تم نے کیا کیا؟‘‘

’’میں نے بتا دیا۔‘‘

’’کیا؟‘‘ جان گرے ہلکے سے چیخ پڑا۔ ’’احمق آدمی۔‘‘

میں ہنسا۔ ’’میں نے اسے بتایا کہ جان گرے نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ اس نے گہری سانس لی۔ ’’تم اس بات پر اڑے رہنا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔‘‘

’’ہاں صرف ہنٹر سے کھال ہی اُتار دے گا۔‘‘ میں نے طنز کیا۔ ’’جان گرے اگر تم اتنے ہی با اختیار ہو تو ہمیں اس کی قید سے نکال کیوں نہیں لیتے؟‘‘

’’میں ایسا کر سکتا ہوں۔‘‘ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ’’لیکن اس سے دوسرے چونک جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی میری طرف متوجہ ہو۔ مجھے بہر حال اسی پارٹی میں رہنا ہے۔‘‘

’’معقول بات ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کل کونسل کیا فیصلہ کرے گی۔‘‘

’’سزائے موت کا تم دونوں کو سزائے موت سنا دی جائے گی۔‘‘

’’سزائے موت۔‘‘ میں اُچھل پڑا تھا۔ ’’تمہارا دماغ درست ہے مرنے کے بعد میں تمہارے

کس کام آؤں گا۔"

"احمق مت بنو۔ فیصلے کے بعد تمہیں بچانا میری ذمے داری ہے۔"

"کہیں تمہارے چکر میں مجھے پھانسی ہی نہ ہو جائے۔" میں نے طنز کیا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "ڈیئر ڈان کے کسی جھانسے میں مت آنا۔ وہ ایک نمبر کا حرامی آدمی ہے۔ ذرا اس معاملے سے نمٹ لوں پھر اسے بھی دیکھ لوں گا۔"

"حرامی تو تم بھی کم نہیں ہو۔" میں نے دل میں کہا۔ "میں کوشش کروں گا لیکن تشدد کے آگے تو پتھر بھی بول اٹھتے ہیں اگر وہ تشدد پر اُتر آیا تو میں کتنی دیر اپنی زبان بند رکھوں گا آج بھی اس کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔"

"تم فکر مت کرو۔ وہ اس حد تک نہیں جا سکتا۔ کونسل کے فیصلے کے بعد تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ پھر ڈیئر ڈان تم پر تشدد نہیں کر سکے گا۔"

"صرف میں ہی نہیں بلکہ عبید صلاح بھی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم خوامخواہ اس دہشت گرد سے نتھی ہو رہے ہو۔ دفع کرو اسے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تمہیں ہم دونوں کو ہی بچانا ہوگا۔ ورنہ میرے تعاون کو بھول جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے میری پوری کوشش ہو گی لیکن ایک ہی ڈرامہ دو افراد کے ساتھ ان لوگوں کو شک میں ڈال دے گا۔"

"کس قسم کا ڈرامہ؟"

"سزائے موت ہونے کے بعد تمہارے سامنے دو راستے رکھے جائیں گے۔ یا تو سزائے موت قبول کر لو یا رِنگ میں لڑ کر اپنی زندگی جیت لو۔ آج تک کسی نے پہلی تجویز قبول نہیں کی ہے۔"

"لہٰذا ہم بھی لڑ کر بچنے کی کوشش کریں گے۔"

"ٹھیک۔" اس نے تصحیح کی۔ "تمہارے مقابل ایسے لڑاکے بھیجے جائیں گے کہ جن سے لڑ کر جیتنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "ورنہ تم لوگ اتنے اچھے تو نہیں ہو کہ کسی شخص کو آسانی سے بچ نکلنے کی سہولت دو۔"

"اپنے مجرموں کو کوئی بچنے کا موقع نہیں دیتا۔"

"حالانکہ سب سے بڑے مجرم تم لوگ خود ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"مسٹر یوسف اس قسم کی باتیں کر کے تم آنے والے وقت کو اپنے لیے دشوار بنا رہے ہو۔" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اب تک آسان زندگی نہیں گزاری۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہاری





بات ختم ہو گئی ہے تو میں یہاں سے جاؤں اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں آ پکڑے۔"

"کوئی نہیں آئے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ شرابی ڈان نام نہاد ہی انچارج ہے۔ اصل میں سارے معاملات میں ہی چلاتا ہوں۔"

"تم تو بڑے پارسا ہو کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" میں ہنسا۔ "مجھے یاد ہے۔ انجن روم میں تم ہمہ وقت نشے میں دھت رہا کرتے تھے۔"

"مجھ پر شراب اثر نہیں کرتی۔" اس نے فخر سے کہا۔

میں پھر ہنسا۔ "ہر شرابی یہی دعویٰ کرتا ہے۔"

"بکو مت۔" وہ بھنا گیا تھا۔

میں گارڈ کے ساتھ واپس آیا۔ جیسے ہی میں نے کوٹھری میں قدم رکھا اور تالہ بند ہونے کی آواز آئی روشنی آ گئی میں نے دیکھا کہ عبید صلاح متفکر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اگلی صبح آنکھ کھلی تو ناشتے والا دروازہ کھول رہا تھا۔ ازراہِ مہربانی گارڈ نے پہلے حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کی استدعا قبول کر لی۔ آج ناشتہ بھی کسی قدر پُر تکلف تھا۔ مچھلی اور چائے کے ساتھ انڈے بھی تھے۔ سائز تو مرغی کے انڈے کا تھا لیکن ان کی رنگت کچھ زردی مائل تھی۔ بہرحال تھا یہ کسی پرندے کا انڈا تھا کیونکہ رینگنے والے جانوروں کے انڈے اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ کھانے میں بھی ان کا ذائقہ مرغی کے انڈے جیسا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ آخری طعام ہے۔" عبید صلاح نے خوش دلی سے کہا۔ "سزا سنانے کے ساتھ ہی اس پر عملدرآمد کر دیا جائے گا۔"

"بے شک مغربی اقوام فوری انصاف پر یقین رکھتی ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "خاص طور سے جب معاملہ مسلمانوں کا ہو۔ عرق کی مثال لے لو، کویت کو انصاف کی فراہمی میں کتنی پھرتی دکھائی گئی۔"

"اسرائیلی بے چارے آج تک اس انصاف سے محروم ہیں جو عراق کے ساتھ کیا گیا تھا۔" عبید تلخی سے ہنسا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہمیں کوٹھری سے نکالا گیا اور چار گارڈز کی نگرانی میں ہم کونسل کی طرف روانہ ہوئے۔ خلافِ توقع آج ہمیں بند گاڑی کے بجائے کھلی جیپوں میں لے جایا گیا تھا۔ مجھے اور عبید کو الگ الگ جیپوں میں بٹھایا گیا تھا۔ حسبِ معمول ہمارے ہاتھوں میں بندھی ہتھکڑیوں کو بکس کے ساتھ لاک کر دیا گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا انتظام تھا، نہ جانے ہماری پولیس اس پر عمل کیوں نہیں کرتی۔ جس کی تحویل سے آئے دن ملزمان فرار ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً اس سہولت کی عدم فراہمی کی وجہ پولیس کو سہولت دینا ہے۔ ورنہ پولیس مقابلے میں فرار ہونے والے ملزمان کے مارے جانے کے واقعات میں خاصی کمی آ جائے گی۔

جیپیں قصبے سے گزر رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار قریب سے جزیرے کی آبادی کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ یہاں مکانات ایک ترتیب سے بنائے گئے تھے۔ جس سے ٹاؤن پلاننگ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ عجیب بات تھی لوگوں میں ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، افریقی بھی، وسط ایشیائی باشندے بھی تھے اور مشرق بعید کے باشندے بھی تھے۔ ان میں شمالی امریکہ کے سفید فام بھی تھے اور جنوبی افریقہ کے انڈین باشندے بھی نظر آ رہے تھے۔ لازماً ان میں یورپی افراد بھی تھے۔ پورے قصبے میں صرف ایک جگہ ہی بازار نظر آیا۔ جہاں دو درجن کے لگ بھگ دکانیں تھیں۔ جب جیپیں بازار سے گزریں تو دکانوں پر دنیا کا ہر سامان نظر آیا تھا۔

ایک خوب صورت اور صاف ستھرا قصبہ ہونے کے باوجود مجھے اس میں کوئی کمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو یہی کمی سمجھ میں آئی کہ قصبے کی کوئی تہذیب کوئی شناخت نہیں تھی۔ اسے دنیا بھر کے لوگوں کی کھچڑی بنا دیا گیا تھا۔ مجھے لوگوں کے چہرے پر عجیب سی ویرانی اور بے حسی نظر آئی تھی۔ ان کی آنکھیں خالی سی تھیں۔ جیسے ان کے ذہنوں میں کوئی سوچ نہ ہو بالکل کسی روبوٹ کی طرح جو پہلے سے دیئے گئے پروگرام پر ہی عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے سوچنے سے قاصر ہوتا ہے یا کولہو کا بیل جو سدا ایک ہی دائرے میں گردش کرتا ہے۔ اس کی ساری دنیا اس دائرے تک محدود ہوتی ہے۔ مجھے یہ لوگ بھی جیتے جاگتے انسانی روبوٹ لگتے تھے۔

''نیچے اُتر آیئے یور ایکسی لینس۔'' گارڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں چونکا۔ اس نے میری ہتھکڑی ہک سے کھول دی تھی۔ میں نیچے اُترا عبید صلاح بھی اُتر آیا تھا۔ ہمیں کونسل کی عمارت کے اندر لے جایا گیا۔ اگرچہ یہ کوئی باقاعدہ عدالت نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے یہاں عدالت کا سا تاثر پیدا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ تاثر تو دلوں میں ہوتا ہے جب آدمی کو معلوم ہو کہ اس کے ساتھ انصاف کو ایک طرف کر کے کارروائی کی گئی ہے۔ تو وہ اسے عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ یہ تو عدالت اور انصاف کے نام پر دھبہ تھا۔ پہلے میں اندر گیا تھا۔ وہاں ایک دو تین سپاٹ سے چہرے سجائے بیٹھے تھے۔

نمبر ون نے کہا۔ ''مسٹر یوسف آئی کونسل نے تمہیں صفائی کے لیے ایک دن کا موقع دیا۔''

''میں اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر اور دانت صاف کر کے آیا ہوں۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے جو سہولیات دی گئی ہیں ان میں اتنی ہی صفائی ممکن ہے۔''

نمبر دو نے دانت پیسے۔ ''اپنی زندگی کے ساتھ مذاق مت کرو۔''

''میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔''

''تم نے اس الزام پر کوئی صفائی پیش نہیں کی۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس کرتا۔'' میں بے پروائی سے بولا۔

''او کے مسٹر یوسف۔'' نمبر ون نے کہا۔ ''اب تمہیں کونسل کے فیصلے سے کوئی شکایت نہیں





ہونی چاہیے۔ تم نے اپنی صفائی دینے کا موقع خود کھو دیا۔ تم نے جزیرے پر آ کر جو سنگین جرائم کیے اور یہاں کے نظم و نسق میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تم نے جزیرے کی ایک معزز ہستی پر دو بار قاتلانہ حملہ کیا اور جیسا کہ تم نے خود تسلیم کیا کہ تم اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان جرائم کو مدِنظر رکھتے ہوئے کونسل تمہیں سزائے موت سناتی ہے۔ سزا پر سات دن کے اندر عمل درآمد ہو گا۔ تم اس سزا کے خلاف اپیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔''

''مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''مسٹر یوسف کیا تمہیں اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' نمبر تین نے حیرت سے کہا۔

''مجھے اپنی زندگی کی اتنی ہی پروا ہے جتنی کہ تمہیں ہے لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجبور ہوں۔ میرے خیال میں مجھے طے شدہ سزا سنائی گئی ہے۔ میرا صفائی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔''

''تم کونسل کی توہین کر رہے ہو۔'' نمبر ون نے سخت لہجے میں کہا۔

''یور آنر، توہین اس کی ہوتی ہے جس کی کوئی عزت ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔''

میرے باہر آتے ہی گارڈ عبید کو اندر لے گئے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ڈرامہ ہوا۔ البتہ اس نے اپنے دل کی بھڑاس کھل کر نکالی تھی اور جب وہ باہر آیا تب بھی اس کی زبان بلٹ ٹرین کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس پر ایک گارڈ کا صبر جواب دے گیا اور اس نے اچانک عبید صلاح کے سر پر رائفل کا دستہ مارا۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ وہ نیچے گرا تو میں اس کی طرف لپکا ضرب شدید تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے خونخوار نظروں سے گارڈ کی طرف دیکھا اور یک دم اس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اگلے ہی لمحے مجھ پر چاروں طرف سے بٹ پڑنے لگے تھے۔



بنگلہ بے حد خوب صورت تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے اس بنگلے کے بیشتر حصوں پر بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ سرخ کھپریل کی چھت دور سے نمایاں تھی۔ چاروں طرف لان تھا۔ جس میں رنگا رنگ پھولوں کے تختوں کے ساتھ سلیقے سے سرو کے درخت لگے تھے۔ بالکل ایسا منظر تھا جیسا کہ تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ بنگلے کے عقب میں لان ایک گہری کھائی تک جاتا تھا۔ اسے محفوظ بنانے کے لیے کنارے پر سفید لکڑی کا جنگلا لگا دیا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے سے بنگلے کو پانچ فٹ اونچی سفید پتھروں سے بنی دیوار نے گھیر رکھا تھا۔ جس وادی میں یہ بنگلا تھا اسے تین اطراف سے بلند برف پوش پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ وادی کا وسطی حصہ کسی قدر ہموار تھا۔ جہاں کھیتوں میں گندم اور مکئی کاشت کی جاتی تھی۔ بہار کا موسم تھا اور ہر طرف رنگ تھے۔ ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی یہ ایسی فضا تھی کہ مُردہ بھی جی اُٹھے لیکن میرے اندر کی مایوسی تھی کہ دور ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بار بار کاجل کی اشک بہاتی آنکھیں سامنے آ جاتیں۔ اس کی سسکیاں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔

''مت جاؤ یوسف مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

جمشید علی نے نہایت خاموشی سے سارا کام کیا تھا۔ ایک سکول میں میرا داخلہ ہو چکا تھا۔ ایبٹ آباد کا بنگلہ ری فرنش کیا جا چکا تھا اور روانگی کے لیے ایئر ٹکٹس بھی آ چکے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ جانے سے ایک دو دن پہلے کاجل کو بتا دوں گا لیکن اس سے پہلے ہی اسے معلوم ہو گیا۔ کیسے، میں نہیں جانتا ممکن ہے اسے ہمارے معمولات میں تبدیلی کا احساس ہو گیا ہو۔ میں نے سکول جانا ترک کر دیا تھا۔ ماہ پارہ روانگی کے لیے شاپنگ کر رہی تھیں اور سب سے زیادہ خوش حسن علی تھا۔ اس کی یہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کاجل کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا ہو۔ میرے معاملے میں اس کی یہ حس بے حد تیز تھی اور میرے بارے میں بہت ساری باتیں اسے بغیر بتائے معلوم ہو جاتی تھیں۔ ایک بار میں اسٹڈی کر رہا تھا۔ مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے انٹر کام پر کچن سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ نہ جانے سیٹ خراب تھا یا کچن میں ہی کوئی نہیں تھا۔ میں جھلا گیا۔ چائے کے لیے پورا نیچے جا کر کہو۔ میں نے چائے پینے کا ارادہ ترک کر دیا۔





کچھ دیر بعد دیکھا تو کاجل ٹرے میں چائے لیے چلی آ رہی تھی۔

''ارے تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔''

''بس معلوم ہو گیا۔'' اس نے معصومیت سے اپنے چہرے پر آنے والے بال ہٹائے۔ ''میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا تمہارے لیے چائے بناؤں۔ تم پڑھ رہے ہو ناں؟''

''تھینک یو ڈیئر۔'' میں نے اسے پیار کیا تو وہ خوشی سے کھل اُٹھی تھی۔

لیکن اس وقت جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں ساتھ لے جانے کے سوئٹرز اور گرم کوٹ بڑے سوٹ کیس میں رکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے بوکھلا کر سوٹ کیس بند کر دیا۔

''کاجل کیا ہوا تم رو رہی ہو؟''

''مت بات کرو مجھ سے۔'' اس نے کہا۔ ''تم ایک نمبر کے جھوٹے اور کمینے ہو۔''

''اتنے بڑے الزامات کس خوشی میں۔''

''تم پیلس سے جا رہے ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''تت...... تم سے کس نے کہا۔'' میں بوکھلا گیا۔

''فرشتوں نے۔'' اس نے ایک سوئٹر اُٹھا کر مجھے مارا اور پھر اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں آنے والی ہر شے اُٹھا کر مجھ پر پھینکنا شروع کر دی۔ ایک برش، ایک پرفیوم کی شیشی اور پاؤڈر کا ڈبہ کھونے کے بعد میں اسے پکڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ غصے میں اس کے بدن میں جناتی قوت آ جاتی تھی اور مجھے اسے قابو کرنے میں پسینہ آ گیا تھا۔ اس کا بدن کمان کی طرح تن رہا تھا اور بار بار تڑپ کر وہ میرے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ میرے بازو میں دانت گاڑا۔ خوش قسمتی سے دانت گڑنے سے پہلے میں نے اس کا منہ پکڑ لیا تھا۔ اس دوران میں اسے پچکار بھی رہا تھا۔ ''آرام سے کاجل، ڈیئر ایزی۔''

بالآخر میں نے اسے یوں قابو کیا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد اس نے جدوجہد ترک کر دی اور رونا شروع کر دیا۔ میرے لیے اس کا رونا ناقابلِ برداشت تھا۔ ''خدا کے لیے کاجل یہ کیا حرکت ہے۔''

''تم کیوں جا رہے ہو؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''پڑھنے کے لیے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''یہاں پر بھی تم پڑھ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''چھوڑو مجھے۔'' میری نرم گرفت سے وہ چکنے صابن کی طرح پھسل گئی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ میں ذرا پیچھے تھا۔ مجھے اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دوڑ کر پکڑنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جست لگائی اور نرم قالین پر گرتے گرتے اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ وہ بھی دھڑام سے گری تھی۔

میں نے اس کے ٹخنے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے تڑپ کر دوسری لات چلائی جو میرے پیٹ میں لگی تھی۔ اس کا ٹخنہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ درد نے ایک لمحے کو مجھے شل کر دیا تھا۔ کاجل نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا مگر اس کا شلوار کا پائنچہ اُلجھا اور وہ پھر گر گئی۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے اسے چھاپ لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کا دماغ درست کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ اسے دو چار کس کر تھپڑ رسید کیے جائیں۔ امکان تھا کہ اس کا اُبال بیٹھ جائے گا۔ دوسرا طریقہ زیادہ مؤثر تھا اور اسے اکثر ضدی خواتین کے معاملے میں مؤثر پایا ہے۔ جب میں نے اس پر عمل کیا تو اس کا تمام غصہ جنون اور تڑپن میں ختم ہو گیا۔ ان کی جگہ گھبراہٹ اور شرم نے لے لی۔

"چھوڑو مجھے بدتمیز۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ میں نے ایک قہقہہ لگا کر اسے آزاد کر دیا۔

"اب بولو۔"

وہ جھینپ رہی تھی۔ "ابھی کوئی آ جاتا تو؟ اس دن بھی پاپا نے دیکھ لیا تھا۔"

"اس ممنوعہ پھل کو کھانے کی پاداش میں جنت سے نکالا جا رہا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ پاپا......"

میں نے سر ہلایا۔ "ظاہر ہے غلطی ہماری ہے۔ تہذیب، اخلاق اور معاشرہ ہمیں اتنے نزدیک آنے کی اجازت نہیں دیتا اسی وجہ سے پاپا مجھے دور بھیج رہے ہیں۔"

"لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس کی آنکھیں دوبارہ برسنے لگیں۔

میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ موتیوں جیسے آنسو صاف کیے۔ "کاجل میری جان یہ ہماری بہتری کے لیے ہے۔"

"مجھے ایسی بہتری نہیں چاہیے۔" اس نے مچل کر کہا۔ "جو مجھے تم سے دور کر دے۔"

"دیکھو ابھی ہماری پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کی عمر ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ان باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے ضد سے کہا۔ "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی اور تم گئے تو میں جان دے دوں گی۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کاجل اب ہم بچے نہیں رہے۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ ضدی پن سے زندگی نہیں گزرتی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

"کیوں سیکھنا ہے؟" وہ چیخ اُٹھی۔ "تعلیم تم یہاں بھی مکمل کر سکتے ہو۔"

"میں اس سکول کے معیارِ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ اب مجھے جس سکول میں داخلہ ملا ہے وہ بین الاقوامی معیار کا ہے۔"





"کراچی مین اور بھی اچھے سکول ہیں۔"

"پلیز کاجل...... سمجھا کرو، یہ پاپا کا حکم بھی ہے۔"

"تم ان سے بات کر سکتے ہو۔"

"کاجل تم ان کی سب سے چہیتی اولاد ہو۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ تمہیں پیار کرتے ہیں اس کے باوجود اگر وہ کوئی فیصلہ سنا دیں تو کیا تم ان کا فیصلہ تبدیل کروا سکتی ہو؟"

اس کا سر جھک گیا۔ "شاید نہیں۔"

"تو پھر میں کیسے کروا سکتا ہوں؟ میں تو ان کی اولاد بھی نہیں ہوں لے پالک ہوں۔"

"نہیں۔" کاجل تڑپ اُٹھی۔ "پاپا تمہیں بالکل بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔"

"بیٹے کی طرح۔" میں ہنسا۔

کاجل کے چہرے پر ایک نرم سا غم آلود تاثر پھیل گیا تھا۔ اس نے اپنی بے پناہ سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "یوسف تم نہیں مانو گے؟"

"میری جان میرے ماننے نہ ماننے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ فی الوقت میں کٹھ پتلی ہوں، دوسروں کے ہاتھ میں لیکن آنے والا وقت میرا ہوگا اور میں جو چاہے کر سکوں گا۔" میں نے یقین سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم بھی میری ہو گی۔"

اس کی آنکھیں پھر جھک گئیں۔ "میں اب بھی......" وہ کہتے کہتے رُک گئی لیکن میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

"کاجل مجھے جانے دو۔ ورنہ میں تم سے دور نہیں رہ پاؤں گا۔ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

"میں...... میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

اچانک وہ اُٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں دوبارہ دراز ہو گیا۔ چھت کو گھورتے ہوئے میں کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کب ماہ پارہ آ گئی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھیں تو میں چونکا۔

"آپ...... کب آئیں؟"

"ابھی۔ تم کہاں گئے ہوئے تھے؟"

"کہیں نہیں یہیں تھا۔" میں اُچھل کر بیٹھ گیا اور دوبارہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا مام۔"

"کاجل کے بارے میں سوچ سوچ کر۔" وہ ہنسیں۔

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "وہ پاگل لڑکی اگر کچھ کر بیٹھی تو میں کس

سے حساب طلب کروں گا۔ پاپا سے یا خود سے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" وہ یقین سے بولیں۔ "میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"کیسے سمجھائیں گی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ میری بات سننے کو تیار نہیں ہے۔"

"میں اسے اپنے طریقے سے سمجھاؤں گی۔" ماہ پارہ بولیں۔

"مام...... حسن علی خوش ہیں ناں؟"

"معلوم نہیں۔" انہوں نے غیر واضح انداز میں کہا۔

"اب تو وہ مجھ سے بھی جیلس ہونے لگے ہیں۔" میں ہنسا۔ "اس دن دیکھا تھا۔ سنا ہے محترم دو دن خوشامدیں کرتے رہے تھے۔"

"یوسف...... میں برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی میرے اور تمہارے تعلق کو شک کی نظر سے دیکھے۔ میں شک کرنے والے کا منہ نوچ لوں گی۔" وہ بولیں۔ غصے سے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس لمحے دروازہ کھلا اور حسن علی نے اندر جھانکا۔

"اچھا جی تو لاڈ اُٹھائے جارہے ہیں۔"

"آیئے استادِ محترم۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ عقل مند لوگوں میں سے ہیں اور کہتے ہیں عقل مند لوگوں کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔"

حسن علی کھسیا گیا تھا۔ "صاحبزادے زیادہ ہی تیز جارہے ہو۔"

"جناب کی شاگردی میں رہتا ہوں۔" میں نے اُٹھ کر کہا۔

"اچھے شاگرد ہو یار کچھ سفارش ہی کردو۔" اس نے دزدیدہ نظروں سے ماہ پارہ کی طرف دیکھا جو کسی قدر سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

"انسان اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔" میں نے حسن علی کا قول دہرایا۔

"بکومت بعض معاملات میں اپنی سفارش نہیں چلتی۔" وہ جاتی ہوئی ماہ پارہ کو دیکھ کر بولا۔

"دیکھیں استادِ محترم...... ماہ پارہ میرے لیے ماں جیسی محترم ہیں۔ میں ان کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہوں۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی بیٹا ماں سے اس قسم کی سفارش نہیں کرسکتا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ افسردہ ہوگیا۔ "ماہ پارہ مجھ سے ناراض ہے۔"

"آپ نے بات بھی ناراض کرنے والی تھی۔"

"غلطی آدمی سے ہوجاتی ہے اور خاص طور سے دل کے معاملات میں آدمی بہت غلطیاں کرتا ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"میرا خیال ہے رفتہ رفتہ وہ نارمل ہوجائیں گی۔"

"لیکن اس وقت تک میرا کیا ہوگا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

بے اختیار مجھے چند منٹ پہلے کاجل کے سامنے اپنی کیفیت یاد آگئی۔ میں اسے دُکھی اور




ناراض کر کے جارہا تھا اور اس کا دُکھ مجھ سے برداشت بھی نہیں ہورہا تھا۔ آدمی بہت ساری جگہوں پر مجبور ہوجاتا ہے۔

"آپ نے تیاری مکمل کرلی۔" میں نے بات بدلی۔

"ہاں میری کیا تیاری ہے۔ بس ایک سوٹ کیس لینا ہے اور چل پڑنا ہے۔"

"وہاں خاصی سردی ہوتی ہے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "آپ کچھ گرم کپڑے لے لیں۔"

"دیکھ لیں گے۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کاجل کو بتادیا؟"

"آپ ذرا اِردگرد نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کاجل نامی طوفان یہاں سے آکر جاچکا ہے۔" اس نے بکھرے سامان کو دیکھا پھر مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"مجھے تمہارا مستقبل مخدوش نظر آرہا ہے۔ کاجل سے نمٹنے کے لیے تمہیں اضافی تربیت کی ضرورت پڑے گی۔"

"استادِ محترم اس کی فکر نہ کریں کاجل وہ گھوڑی ہے جو چاہے کتنا ہی اُچھلے کودے بالآخر میں اسے قابو کر ہی لیتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ خفیف نظر آنے لگا۔

دو دن بعد ہماری روانگی تھی اور مجھے کوشش کے باوجود کاجل کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ جس صبح روانگی تھی میں بے چینی سے نیچے کے کئی چکر لگا چکا تھا ماہ پارہ میری کیفیت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جیسے جیسے جانے کا وقت ہورہا تھا میرے اندر مایوسی اور غصہ بھرتا جارہا تھا اور میں نے باقاعدہ کاجل کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا تھا۔ ماہ پارہ نے سمجھایا۔ "اپنے یوسف...... اگر کاجل نہیں آئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا؟" میں نے چلا کر کہا۔ "اس اُلو کی پٹھی کو معلوم نہیں تھا کہ میں جانے والا ہوں۔ اب تین چار مہینے تک وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔"

"اس سے زیادہ یہ بات کون جانتا ہوگا۔" ماہ پارہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل ساری رات اس کے کمرے کی روشنیاں جلتی رہی تھیں۔"

"ان لڑکیوں کی عقل نہ جانے کہاں ہوتی ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"ان کے دل میں، ورنہ احمق کیوں کہلائیں۔"

میرا غصہ صرف سوڈے کے اُبال کی طرح تھا۔ جو چند لمحوں میں بیٹھ گیا۔ میں نے تقریباً گھگھیا کر ماہ پارہ سے کہا۔ "پلیز اس سے کہیں ایک بار آکر مجھ سے مل لے۔ اس کے کمرے کے آس پاس زہرہ بیگم منڈلا رہی ہیں۔"

ماہ پارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "یوسف میں تمہیں ڈرپوک نہیں سمجھتی تھی۔ مرد بنو اگر کاجل سے ملنا ہے تو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آہ...... کیا مشکل کام بتادیا۔" میں نے آہ بھر کر حسن علی کی طرف دیکھا۔ "مرد بننا۔" اس پر

اس نے مجھے گھورا تو میں کان دبا کر کمرے سے نکل گیا۔ دل کڑا کر کے میں نے فیصلہ کیا کہ آج زہرہ بیگم کا خوف بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ میں نیچے پہنچا تو حسبِ توقع زہرہ بیگم گیلری میں موجود تھیں۔ میں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور کاجل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے عقب سے پکارا۔ ''اے کہاں جا رہے ہو؟''

''کاجل سے ملنے۔'' میں نے رُکے اور مڑے بغیر کہا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتی میرے پیچھے آئیں۔

''چلئے اچھی بات ہے اس کی عیادت بھی کرلوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور فوراً کاجل کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے دروازہ اندر سے لاک کرلیا تھا۔ کاجل بستر پر نہیں تھی بلکہ کھڑکی کے سامنے ہینگنگ چیئر پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔

''کیوں آئے ہو؟'' اس نے خفگی بھری آواز میں کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوں۔'' میں نے اس کے سامنے آ کر کہا۔

''مت بات کرو مجھ سے۔'' اس نے منہ پھیر لیا۔

''تو پھر کس سے کروں۔ یہاں تو تم نے کسی لڑکی کو میرے پاس پھٹکنے نہیں دیا اور اب جہاں میں جا رہا ہوں وہاں کو ایجوکیشن ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسی مل جائے کہ پھر تمہاری یاد زیادہ ستائے۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دانت پیس کر بولی۔

''میں قتل کردوں گی تمہیں۔''

''اپنی دھمکی دیکھو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا کسی سے اس طرح دھمکیوں کے ساتھ دوستی کی جاسکتی ہے۔''

''یوسف...... یوسف۔'' وہ کرسی سے اُتر کر میری طرف لپکی۔ پھر ایک دم ٹھہر گئی۔ اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''کہیں تم کسی چکر میں تو نہیں ہو۔''

''کس چکر میں؟''

''کہ میں تمہارے پاس آؤں اور تم پھر بدتمیزی کرو۔'' اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''کس قسم کی بدتمیزی؟'' میں نے بھولپن سے کہا۔

''وہی جو اس دن......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔

میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''تم آئی کیوں نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں آج جا رہا ہوں۔ پھر تم چھ سات مہینے سے پہلے میری صورت نہیں دیکھ پاؤ گی۔''

''مجھے شوق بھی نہیں ہے۔'' اس نے دوسری طرف دیکھ کر کہا۔ کوشش کے باوجود وہ آواز بھرانے سے نہیں روک سکی تھی۔

''کاجل کچھ ہی عرصے کی تو بات ہے۔''





''میرے لیے تو یہ صدیوں کے برابر ہوگا۔''

''سنو۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''جب پاپا مجھ سے ملنے آئیں تو تم بھی ان کے ساتھ آجانا۔ بلکہ کچھ دنوں میں گرمیوں کی چھٹیاں پڑ جائیں گی۔ تم ایبٹ آباد آجانا۔''

''تم کسے بہلا رہے ہو؟'' وہ تلخی سے بولی۔ ''مجھے یا خود کو؟ اگر پاپا کو ہمارا ساتھ گوارہ ہوتا تو وہ تمہیں اتنی دور بھیجتے ہی کیوں؟''

میں خفیف ہوگیا۔ ''چلو میں آجاؤں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا تم پاپا کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے اور پاپا تمہیں آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں سردیوں کی چھٹیوں میں تو آ سکتا ہوں۔''

''اگر پاپا نے اجازت دی تو۔'' وہ بولی۔

''کاجل خدا کے لیے اتنی سنگ دلی سے مت کہو پاپا اتنے ظالم نہیں ہوسکتے۔''

''کل تک تو تم پاپا کی حمایت کر رہے تھے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''ان کے فیصلے کو درست قرار دے رہے تھے۔''

''وہ تو میں اب بھی درست کہہ رہا ہوں۔ اگر ہم یونہی پاس پاس رہے تو مجھے یقین ہے کہ ہم کچھ نہیں سیکھ پائیں گے۔ کاجل ہم عام بچوں سے کہیں زیادہ میچور ہیں اور تمہیں اپنی صلاحیتیں ایک ہی سمت میں نہیں صرف کرنی چاہئیں۔''

''میں بھی سمجھتی ہوں لیکن میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ اپنے دل پر بھی اختیار نہیں رکھتی۔''

''اس بنا پر پاپا نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے کا فیصلہ لیا ہے۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی۔ ''یوسف یاد رکھنا تم سے جدا ہو کر میں زندہ نہیں رہوں گی جلد مر جاؤں گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا ایک عالمِ جنون میں اسے خود میں چھپا لیا۔ جیسے موت سچ مچ اسے مجھ سے چھیننے آرہی تھی۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے میری آغوش میں دبکی رہی۔ میں نے اس کی پیشانی چومی اور چپ چاپ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ جب میں جانے کے لیے کار میں بیٹھ رہا تھا تو کاجل کی کھڑکی سے ایک سایہ پردے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ میں اس وقت تک اس سائے کو دیکھتا رہا جب تک کار جمشید پیلس سے نہیں نکل گئی تھی۔

اپنی زندگی میں پہلی بار میں جہاز پر بیٹھا تھا لیکن مجھے اس میں کوئی سنسنی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی مجھے اپنی دیرینہ آرزو یعنی پیلس سے نکل کر دنیا دیکھنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب ہم اسلام آباد میں اُترے۔ جہاں محمود نظامی نامی شخص ہمارا منتظر تھا۔ وہ جمشید علی کے دوستوں میں

سے تھا اور اسلام آباد میں ہمارا قیام اور ایبٹ آباد کی طرف روانگی اسی کے ذمے تھی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ رات ہم اس کے بنگلے پر گزاریں اور صبح سفر پر روانہ ہو جائیں۔ حسن علی نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ مجھے ان باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ میں خاموش رہا خود ماہ پارہ اور حسن علی نے میرے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے مجھے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ رات ہم محمود نظامی کے عالیشان گھر میں رہے۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے ہمارا تعارف کرایا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں جن کی عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔ ایک بیٹا تھا۔ شامی تیرہ سال کا تھا اور بے حد شوخ تھا۔ کھانے کی میز پر بھی وہ سب کو ہنساتا رہا تھا۔

میں کوشش کے باوجود اس کی باتوں سے محظوظ نہ ہو سکا۔ البتہ میں نے محسوس کیا کہ محمود نظامی کی دوسرے نمبر کی بیٹی ماریہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اس کی چوری پکڑی اور اس پر توجہ نہیں دی لیکن جب میں ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں آیا تو وہ بھی بے تکلفی سے کمرے میں چلی آئی۔ بلاشبہ وہ حسین لڑکی تھی۔ سنہری مائل بال جنہیں اس نے باب کٹ سٹائل میں بنا رکھا تھا۔ چھریرہ جسم اور لمبا قد، گلابی رنگت پر اس کی سیاہ آنکھیں یقیناً غضب ڈھاتی تھیں اور مختصر سا دھانہ پُرکشش لگتا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟''

''اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور گھر والے؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''وہ بھی اچھے لگے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''اچھا آپ کافی پئیں گے؟''

میں نے اقرار کر لیا کہ اس بہانے وہ کچھ دیر کے لیے یہاں سے ٹل جائے۔ مگر وہ بہ مشکل پانچ منٹ بعد دوبارہ آن موجود ہوئی۔ شاید کافی پہلے سے تیار تھی۔ وہ دو کپ کے ساتھ کریم اور شوگر الگ سے لائی تھی۔ میں نے شکر کے ساتھ کریم بھی لی۔

''اچھا تو آپ کو سب سے اچھا کون لگا ہمارے گھر میں؟'' کافی پیتے ہوئے اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''شامی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''وہ بے حد خوش مزاج لڑکا ہے۔''

اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر اسے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی لیکن وہ عورت ہی کیا جو ہار مان جائے۔ اس نے نئے زاویے سے حملہ کیا۔ ''اور ہم بہنوں میں سے کون اچھا لگا؟''

''معلوم نہیں میں نے غور نہیں کیا۔'' میں پہلو بچا گیا۔

اس کی جھلاہٹ لہجے میں اُتر آئی تھی۔ ''آپ صاف صاف جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''آپ پوچھنا کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے پھر سادگی سے کہا۔





''کچھ نہیں۔'' وہ جھلا گئی تھی۔ ''آپ کا موڈ شاید اچھا نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل میں زندگی میں پہلی بار گھر سے دور ہوا ہوں۔ شاید اس وجہ سے۔'' میں نے اس سے معذرت کی۔ ''پلیز بُرا مت منائیے گا۔''

''نو پرابلم۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''پھر بات ہوگی۔''

''میں کل صبح چلا جاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ جاتے جاتے بل کھا کر گھومی۔ ''ہمارا ایبٹ آباد میں بنگلہ ہے اور ان گرمیوں میں ہمارا اس طرف آنے کا پروگرام ہے۔''

''مارے گئے۔'' میں نے دل میں کہا۔ یہ تو کمبل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ خیر اس میں تو کوئی بُرائی نہیں تھی۔ وہ خاصی دلکش لڑکی تھی لیکن یہ خبر کاجل تک جا پہنچی تو وہ سچ مچ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گی۔ مجھے مار دے گی یا خود مر جائے گی۔ میرے کمرے میں فون تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کاجل سے بات کروں ہو سکتا ہے اس کا مزاج کچھ درست ہو گیا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کمرے کے پاس گیلری میں ایک فون تھا میں نے اس کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر کسی نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو۔'' میں بولا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ایک باریک سی آواز آئی۔

''کاجل۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ ''کیسی ہو جان؟''

''میں کاجل کی ماں ہوں۔'' اچانک زہرہ بیگم کی کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے بوکھلا کر فون بند کر دیا۔

ہت تیرے کی یہ کہاں سے آ گئیں دیوار بن کر۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار خاصی دیر تک بیل جاتی رہی جب کسی نے نہیں اُٹھایا تو میں مایوس ہو کر بند کرنے جا رہا تھا کہ ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے کاجل کی مدھم سی آواز آئی۔ ''یوسف۔''

''ہاں کاجل۔'' میں نے کہا تو وہ رونے لگی۔ ''پلیز روؤ مت، ورنہ میں سب کچھ چھوڑ کر بھاگ آؤں گا۔ بے شک پاپا بعد میں مجھے پیلس سے نکال دیں۔''

وہ جلدی سے چپ ہو گئی۔ ''یوسف تم مجھے یاد کر رہے ہو؟''

''اب تک تو تم ہی یاد ہو۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''کیا مطلب؟'' وہ مشکوک ہو گئی۔ ''تم کسی اور لڑکی سے بھی ملے ہو؟''

''تم سے جدا ہونے کے بعد میں کئی لڑکیوں سے مل چکا ہوں۔ سب سے پہلے ایک ایئر ہوسٹس سے ملا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ میرا جہاز سے اُترنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔''

''تو نہ اُترتے۔'' وہ جل کر بولی۔ ''پڑے رہتے جہاز میں۔''

''یعنی تمہاری طرف سے اجازت ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن کم بخت ایئر لائن والے کہاں مانیں گے۔''

''اب دوسری لڑکیوں کے بارے میں بتا دو۔'' وہ کھول رہی تھی۔

''بھئی ہمارے میزبان سبحان اللہ کیا بیٹیاں پائی ہیں انہوں نے، سب ایک سے بڑھ کر ایک، ایک نے تو اپنے دستِ خاص سے مجھے کافی بھی پلائی تھی۔''

''میں بھی پلاؤں گی۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''زہر۔''

''تمہارے دستِ حنا سے میں وہ بھی پی لوں گا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔

''یوسف تم سچ مچ دوسری لڑکیوں سے دوستی کرو گے؟'' اس نے جھجک کر کہا تو میں بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا۔

''تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔ بابا ابھی ایک کو تو بھگت نہیں پایا۔ دوسری سے دوستی کی ہمت کہاں۔''

''یوسف تم دوستی نہیں کرو گے لیکن لڑکیاں تو تمہاری طرف آئیں گی۔ تم کب تک ان سے بچو گے۔'' اس نے کہا۔

''بھلا لڑکیاں میری طرف کیوں آنے لگیں؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ''تم نے شاید خود کو آئینے میں غور سے نہیں دیکھا۔ تم...... تم بہت اچھے لگتے ہو۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''یہ بے ایمانی ہے۔ میں تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔ حالانکہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''کیا؟'' وہ خفا ہو گئی۔ ''مجھ میں کوئی خاص بات نہیں ہے؟''

''تم نے آئینہ دیکھا ہے۔ بکھرے ہوئے بال، پھیلی ہوئی آنکھیں اور نقوش ایسے جیسے ابھی پھاڑ کھاؤ گی۔''

''اگر یہ بات ہے تو مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو؟''

''مجبوری ہے، بچپن سے تمہاری صورت دیکھ دیکھ کر عادت ہو گئی ہے۔ اب کوئی صورت اچھی نہیں لگتی۔'' میں نے شرارت سے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے پھر ملایا۔

''احمق لڑکی اب فون بند کیا تو میں واپس آ کر وہی کروں گا۔''

''کیا؟'' اس نے روانی میں کہا۔

''جو اس دن کیا تھا۔'' میں شوخی سے بولا۔ ''جس کی پاداش میں تم سے ہزار میل دور پھینکا جا رہا ہوں۔''

''یوسف یہ تمہاری غلط فہمی ہے پاپا پہلے ہی تمہیں مجھ سے دور بھیجنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ممی بہت عرصے سے......''





''تو یہ ان کا دباؤ تھا۔ پاپا نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''تم ممی کو جانتے ہو۔'' کاجل بولی۔ اسی لمحے مجھے فون میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی جیسے کسی نے ایکسٹینشن اُٹھا لیا ہو۔ میں نے کہا۔ ''او کے کاجل پھر بات کروں گا۔'' اور جلدی سے فون رکھ دیا۔

کسی نے فون پر ہماری بات سننے کی کوشش کی تھی لیکن کہاں اس بنگلے میں یا جمشید پیلس میں، میں نے فون اُٹھایا تو اس سے ٹون کے بجائے سرسراہٹ آ رہی تھی۔ یعنی اس فون کا ایکسٹینشن کسی نے اُٹھایا ہوا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں یوں مہمانوں کے فون سنے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب چینج کر کے سو جانا چاہیے۔ صبح نو دس بجے روانہ ہونا تھا۔ میں نے اپنا سلیپنگ سوٹ نکالا باتھ روم گیا۔ دانت واش کر کے اور کپڑے بدل کر باہر نکلا تو ماریہ کو کمرے میں موجود دیکھ کر چونکا وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی شرمندگی دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا فون سننے والی ہستی وہی تھی۔

''خوب آپ کے ہاں بلا اجازت کمرے میں آنے کا رواج بھی ہے۔'' میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سوری۔'' اس نے سر جھکایا۔ تو اس کے تراشے ہوئے بال اس کے چہرے پر چھا گئے۔

''میں اپنی حرکت پر پہلے ہی شرمندہ ہوں مجھ سے یہ غلطی سے ہوا تھا۔ ہاں میں تجسس سے مجبور ہو کر باتیں ضرور سننے لگی تھی۔''

یک دم مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہ نائٹی میں تھی۔ ریشمی نائٹی اس کے تراشے ہوئے بدن پر جیسے ڈھلی جا رہی تھی۔ وہ رات کے اس پہر بلا جھجک میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ مجھے خود پر اعتماد تھا لیکن اگر ماہ پارہ یا حسن علی میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تو میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

''کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے اب تم جا کر سو جاؤ۔''

اس نے سر اُٹھا کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''آپ نے مجھے معاف کر دیا۔''

''ظاہر ہے۔'' میں چڑ گیا۔ ''اتنی سی بات پر میں تم کو سزا دینے سے رہا۔ اب جاؤ یہاں سے مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اس نے پیر پٹخے۔ ''آپ بدتمیز آدمی ہیں۔''

وہ چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا لیکن ابھی میں بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ وہ دوبارہ اندر آ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔

''خاتون کیا آپ مجھے سونے دیں گی۔ کل صبح مجھے طویل سفر کرنا ہے۔''

اس نے کچھ کہنے کے بجائے نائٹ بلب بھی بجھا دیا اور میرے پاس چلی آئی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''شش...... خاموش رہو۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور جب میں نے اس کا جسم محسوس کیا تو وہ بھی لرز رہا تھا۔ پہلے میں اسے کسی اور قسم کی لرزش سمجھا تھا لیکن فوراً ہی اس نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

''باہر لان میں کوئی ہے۔ میں نے جیک کے چلانے کی آواز سنی ہے۔''

''یہ جیک کون صاحب ہیں؟'' میں نے ذرا پرے سرک کر کہا۔

''ہمارا کتا ہے۔ جرمن شیپرڈ، پاپا باہر سے لائے تھے۔''

''کتا کہہ دینا کافی ہے۔ یہ بتاؤ کہ لان پر کون ہے؟''

''پتا نہیں۔'' وہ پھر مجھ سے چپک گئی۔

مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے ارادے نیک نہیں لگ رہے تھے۔ میں بستر سے اُتر آیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' میں نے شک سے کہا۔

''یہاں کیسے ہوگا، میں آگے والے لان کی بات کر رہی ہوں۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں اس طرف کھلتی ہیں۔ تم چل کر دیکھو۔''

اس کے انداز میں سادگی تھی لیکن میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ کوئی چکر نہ ہو۔ مجھے لڑکیوں کا زیادہ تجربہ نہیں تھا مگر میں نے جو پڑھا اور سکھا تھا اس صنف پر زیادہ اعتبار بھی مناسب نہیں تھا۔ خاص طور سے جب یہ کس کو گھیرنے کی فکر میں ہوں۔ اچانک وہ مجھ سے ٹکرائی۔ اس نے میرا بازو تھاما۔

''پلیز کیا سوچ رہے ہو۔'' اس نے گھگھیا کر کہا۔

''میں...... میں کیا کروں کیا تم لوگوں نے گارڈ نہیں رکھے ہیں؟''

''ایک چوکیدار ہے۔ ڈیڈی کے زمانے کا۔ وہ صرف دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا کام جانتا ہے۔ ڈیڈی سے کئی بار کہا لیکن وہ اسے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے کہ نظامی صاحب کو ایک غریب شخص کا خیال ہے لیکن انہیں حفاظت سے غافل نہیں ہونا چاہیے آج کل نجی محافظ عام مل جاتے ہیں۔''

''اُف یہیں کھڑے رہو گے۔'' وہ جھلائی تو میرے دل میں شک بڑھنے لگا۔ آخر وہ پورے گھر کو چھوڑ کر میرے ہی پاس کیوں آئی تھی۔ ''پھر کہاں چلیں۔''

''میرے کمرے میں، ان لوگوں کو دیکھو، مجھے لان پر کم سے کم دو افراد نظر آ رہے ہیں۔''

''تو چلو۔'' میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو کہیں تمہارے ڈیڈی مجھے مقتول بنانے پر نہ تُل جائیں۔ تمہارا حلیہ بھی بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔''





''فضول باتیں مت کرو۔'' اس کی کھسیاتی ہوئی آواز آئی لیکن اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا۔

بادلِ نخواستہ میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ کارنر سے گیلری مڑ کر اس کا دوسرا کمرا تھا۔ جو دائیں طرف واقع بنگلے کے بڑے لان کی طرف تھا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں ڈرائیو وے، پورچ اور لان کا مختصر حصہ تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ اس نے اندر گھستے ہی پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں ایک لمحے کو کھٹکا اور میں نے خود کو تیار کر لیا اگر اس نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو میں اس کا دماغ درست کر دوں۔ کمرے میں نیلی روشنی کا نائٹ بلب روشن تھا۔ میری توقع کے خلاف وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے بھی بلایا۔ وہ پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے اس کے اوپر سے دیکھا۔ اُجلی چاندنی میں لان صاف نظر آ رہا تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''تم آرام سے بات کر سکتے ہو۔ میرا کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔'' اس نے زور سے کہا تو میں اُچھل پڑا۔

''ساؤنڈ پروف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چیخنا شروع کر دو۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''ویسے اگر تم اپنی مدد کے لیے کسی کو بلانا چاہو تو اس صورت میں بھی کوئی نہیں آئے گا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی وہ مجھ سے ذرا دور ہو گئی تھی۔

''مطلب یہ مس کہ اگر میری نیت تم پر خراب ہو جائے اور میں دست درازی پر اُتر آؤں تو تم کیا کرو گی؟''

''میں یہ کروں گی۔'' اس نے بڑی پھرتی سے مجھے کھینچا اور اُٹھا کر بستر پر پھینک دیا۔ میں حیران رہ گیا۔ اس نے جوڈو کا داؤ بڑی مہارت سے لگایا تھا۔ اب وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے میرے سر پر چیلنج بنی کھڑی تھی۔

''میں نے ہار مانی۔'' میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میری توبہ کہ تم پر نیت خرابی کا خیال بھی دل میں لاؤں۔''

''دل میں لانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''لیکن عمل کے معاملے میں محتاط رہنا۔''

اس نے میرا اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''بائی دی وے میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھے یا کسی کو مدد کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان لوگوں سے تو تم خود بھی نمٹ سکتی ہو۔''

''احمق مت بنو اس طرح رات گئے کسی کے گھر میں آنے والے مسلح ضرور ہوتے ہیں۔''

''لیکن میں تو خالی ہاتھ بھی نہیں لڑ سکتا۔ ہتھیاروں سے کیسے مقابلہ کروں گا۔''

''تم صرف باتیں کیے جاؤ گے یا کچھ کرو گے بھی۔'' اس نے بھنا کر کہا۔

''وہ تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تم ہی نظر آ رہی ہو اگر اجازت ہو تو کچھ کروں کیونکہ اجازت نہ لی تو۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' وہ کہتی ہوئی دوبارہ کھڑکی سے لگ گئی۔ دفعتاً اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''دیکھو وہ دو نظر آ رہے ہیں۔''

میں لپک کر آیا۔ پردے کی مختصر جھری سے شیشے کے پار سنسان لان میں ایک درخت کے سائے میں دو ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مسلح تھے۔ جیسے ہی وہ ذرا چاندنی میں آئے میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ ایک نے خوف ناک سی A.K47 اٹھا رکھی تھی۔ کلاشنکوف کی یہ سب سے مہلک قسم ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ جسے اس نے بلاوجہ تان رکھا تھا۔ دونوں کے چہرے پر نقاب تھے۔ کلاشنکوف والے نے دائیں اور پھر بائیں دیکھ کر روانہ ہونے کا اشارہ کیا۔ میں فکرمند ہوگیا۔ یعنی آنے والے مسلح افراد کی تعداد کم سے کم چار تھی اور وہ خطرناک طور پر مسلح نظر آ رہے تھے۔

''راستے تو کئی ہیں۔'' وہ فکرمند ہوگئی۔ ''لیکن یہ ہیں کون؟''

''اگر آپ کہیں تو میں جا کر رضاکارانہ طور پر ان سے پوچھ آؤں۔'' میں نے طنز کیا۔ اس لمحے کہیں شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک دم اسے کھینچا۔ ''وہ لوگ اندر گھس آئے ہیں کیا یہاں چھپنے کی کوئی جگہ ہے۔''

میرے ذہن میں تھا کہ آنے والے نیک ارادے سے نہیں آ رہے تھے۔ جلد وہ پورے بنگلے کی تلاشی لیتے اور سب کو ایک ہی جگہ جمع کر لیتے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کا یہ محفوظ اور آسان طریقہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ میرے لیے ہی آئے ہوں اور اس صورت میں میرا ان کے ہاتھ نہ آنا اور بھی ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ ''ایک جگہ ہے تو۔''

''پھر جلدی کرو۔'' میں نے اسے کھینچا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میری نظر دھوبی کے ڈنڈے نما ایک چیز پر پڑی جو بعد میں بیس سال کا بلا ثابت ہوا۔ ہتھیار کے طور پر میں نے اسے اُٹھا لیا۔ بعض اوقات معمولی سی چیز کام دے جاتی ہے۔ ماریہ مجھے تیزی سے میرے کمرے کے بائیں طرف واقع گیلری میں لائی۔ یہاں اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے نچلے خلا میں خانے بنے ہوئے تھے جن میں مختلف آرائشی اشیا رکھی تھیں۔ تمام ہی خانے منقش لکڑی کے بنے تھے۔ جہاں سے سیڑھیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک تین فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ اونچا لکڑی کا ہی بنا ہوا تکون پینل تھا۔ بہ ظاہر یہ دیوار کا حصہ تھا لیکن ماریہ نے جھک کر نہ جانے کسی کونے سے کیا دبایا پینل درمیان سے دروازے کی طرح کھل گیا۔ اس کے نیچے خلا نظر آ رہا تھا۔ اس لمحے گیلری سے آہٹ سی ہوئی۔ میں نے تیزی سے اسے خلا میں دھکیلا اور خود بھی گھس گیا۔ ہر ممکن تیزی سے میں نے پٹ بند کیے لیکن مجھے خدشہ تھا کہ آنے والوں نے اسے دیکھ لیا ہوگا۔ گیلری میں تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔




''یہاں تو کوئی نہیں ہے تیرے کان بج رہے ہیں۔'' ایک آواز آئی۔

''میں نے خود سنا تھا شو کے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''ایک بندہ اور ایک کڑی بول رہے تھے۔ تُو جانتا ہے میرے کان کتنے تیز ہیں۔''

''ہاں تُو خرگوش کی اولاد ہے۔ تیرے ماں باپ اگلے جھول کی تیاری کر رہے ہوں گے۔'' پہلے والے نے بے ہودہ انداز میں کہا تو میرے کان تپنے لگے تھے۔ میں اس وقت ماریہ پر تقریباً لدا ہوا تھا لیکن حرکت کرنے کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ ذرا سی آواز اس خرگوش کی اولاد کا خطاب پانے والے کو متوجہ کر سکتی تھی اس کے کان غلط نہیں تھے۔ ماریہ صبر اور ہمت سے میرے بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔

''تلاشی لے کمروں کی، جلدی ورنہ استاد نے تیری.....'' آگے پھر بے ہودہ بات تھی۔ میں نے دل میں اسے اس سے بھی زیادہ بے ہودہ بات کہی۔ ان لوگوں نے کمروں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ حالات پر مکمل قابو رکھتے تھے اور انہیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حسن علی نے کیا چپ چاپ ان کی بات مان لی ہوگی۔ وہ اکیلا ہی ان سب کی ایسی کی تیسی کر سکتا تھا لیکن دوسروں کی وجہ سے وہ بے بس ہو سکتا تھا جیسے ہی وہ گیلری سے دفع ہوئے میں نے اپنی پوزیشن بدلی۔ اس تین بائی تین فٹ کے خلا میں ہم فولڈ ہو کر ہی آ سکتے تھے۔ میں نے خاصی کوشش کے بعد ایک موزوں پوزیشن اختیار کی۔ اب میں اور ماریہ برابر برابر بیٹھے تھے۔ ہمارے جسم آپس میں پیوستہ ہوتے جا رہے تھے لیکن یہ صورتِ حال پہلے سے بہتر تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' میں نے اس سے کہا۔

''اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ گندی تو ان لوگوں کی زبان ہے۔''

میں معذرت کر رہا تھا اس دباؤ کی جو اس کے نازک بدن پر پڑ رہا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ میں ان لوگوں کی بکواس پر معذرت کر رہا تھا۔ کمر سے شانوں تک میرا جسم ایک گداز دہکتے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی مہکتی زُلفیں میرے شانوں پر پریشان تھیں اور اسے چنداں فکر نہیں تھی لیکن میرا خیال غلط تھا چند لمحوں بعد اس نے شکایت کی۔ ''یہاں کچھ چبھ رہا ہے۔''

''اسے میری کہنی کہتے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''میں تمہاری نہیں دیوار کی بات کر رہی ہوں۔ شاید کیلیں نکلی ہوئی ہیں۔''

''کچھ ایسی ہی چیزیں اس طرف بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا جگہ بدلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''پلیز کچھ کرو۔'' اس نے سرگوشی میں التجا کی۔

''ٹھیک ہے بعد میں شکایت نہ کرنا۔'' میں نے گہری سانس لی اور اسے کمر سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

وہ شرمیلے انداز میں ہنسی۔ ”بدتمیز۔“

”اُلو کی پٹھی۔“ میں نے دل میں اسے خطاب دیا۔ اس کے گھر میں مسلح افراد گھس آئے تھے۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی نہ جانے کس حال میں تھے اور اسے اٹکھیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ سچی بات ہے اس کے قرب کی گرمی اور مہک نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے پورے وجود کو متعارف کرانے پر تُل گئی تھی۔ آخر میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔

”تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتیں۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”ورنہ میں باہر جاتا ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ سہم کر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اپنی توجہ باہر کی صورتِ حال پر مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ماہ پارہ اور حسن علی کی فکر تھی دو افراد کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے گھٹیا ذہنیت کے لوگ تھے اگر انہوں نے ماہ پارہ کے ساتھ بدتمیزی کی تو حسن علی اسے برداشت نہیں کرے گا۔ وہ لڑنے کا کتنا ہی ماہر سہی اس کے مقابل افراد کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ وہ ایک ہی برسٹ میں سب کو مار سکتے تھے لیکن ماریہ کی کوشش تھی کہ میری ساری توجہ اس کی طرف رہے۔

باہر خاموشی تھی اور جب خاصی دیر تک کسی قسم کی کوئی آہٹ نہیں سنائی دی سوائے ماریہ کے دھڑکتے دل کی دھک دھک کے جو مجھ سے بے حد نزدیک تھا۔ تو میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

”تم یہیں ٹھہرو گی۔“ میں نے اسے کہا۔

”نہیں میں بھی چلوں گی۔“ اس نے فوراً کہا۔

”میں جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ اس کے لیے ایک آدمی بھی بہت ہے۔ اگر میدان صاف ہوا تو میں تمہیں بھی بلا لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے پٹ کھولے اور اسے ایک طرف کرتے ہوئے جسم سکیڑ کر باہر نکل گیا۔ گیلری خالی تھی۔ ماریہ نے پٹ اندر سے بند کر لیے۔ اس کے ساتھ ایک بند جگہ پر چند منٹ گزار کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے اوپر جا کر دیکھا لیکن اوپر کے سارے ہی کمرے خالی تھے۔ میں واپس آیا۔ اس جگہ ایل کی شکل میں دو گیلریاں تھیں اور یہ متوازی تھیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی راہداری انہیں ملاتی تھی۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ لوگ بنگلے کے اگلے حصے میں جمع ہوں گے لیکن کسی کونے کھدرے میں موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں پوری طرح احتیاط سے کمروں میں دیکھتا پھر رہا تھا۔ سارے کمرے خالی تھے۔ ماہ پارہ اور حسن علی کے کمرے بھی وہ میرے کمرے کے دائیں بائیں مقیم تھے۔ ماہ پارہ کے کمرے میں معمولی سی ابتری نظر آئی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس نیچے گرا ہوا تھا اور بستر کی چادر نصف نیچے لٹک رہی تھی۔ شاید ماہ پارہ کو بزور لے جایا گیا تھا۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میں بلا گھماتے گھماتے رہ گیا۔ یہ





ماریہ تھی میں نے بھنا کر سرگوشی کی۔ ”یہ کیا حماقت ہے ابھی تمہارا سر ٹوٹ جاتا۔“

”مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔“ اس نے منمنا کر کہا۔ ”مما ڈیڈی کا خیال مجھے پریشان کر رہا تھا۔“

”بڑی جلدی خیال آ گیا ان کا۔“ میں نے طنز کیا وہ شرمندہ ہو گئی۔

”ڈرائنگ روم تک جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔“

”ہم گھوم کر جائیں تو انہیں خبر بھی نہیں ہو گی۔“

”لان میں کوئی نہ کوئی ہو گا۔“ میں نے تجویز مسترد کر دی۔ ”کوئی اور راستہ۔“

”ڈیڈی کی اُسٹڈی سے ایک راستہ جاتا ہے۔“

”اور اسٹڈی تک کیوں کر جائیں۔ گیلریاں تو دونوں کی نظروں میں ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ دوسری گیلری سے وہ ایک کمرے میں گھس گئی جو سٹور روم ثابت ہوا۔ وہاں بے شمار پُرانا سامان جمع تھا۔ ”اسی الماری کے پیچھے ایک دروازہ اسٹڈی میں نکلتا ہے۔ اسے ہٹاؤ۔“

”میں ٹارزن نہیں ہوں۔“

”الماری خالی ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”اس کے نیچے پہیے بھی ہیں آرام سے سرک جائے گی۔“

اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ الماری با آسانی سرک گئی اور ایک منٹ بعد ہم اسٹڈی روم میں تھے۔ ماریہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھولا۔ ساری پارٹی ڈرائنگ روم میں جمع تھی۔ ماریہ کے ممی ڈیڈی دونوں بہنیں جو ایک دوسرے سے چمٹی بیٹھی تھیں۔ شامی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ماہ پارہ اور حسن علی ایک صوفے پر برابر برابر بیٹھے تھے اور ماہ پارہ نے تحفظ چاہنے والے انداز میں حسن علی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ اندر سے کھول رہا ہو گا۔ اسے ذرا سا موقع ملا اور وہ آتش فشاں کی طرح ان لوگوں پر پھٹ پڑے گا۔ فی الحال وہ دوسروں کی وجہ سے مجبور تھا۔ مختصر سی جھری سے مجھے ڈرائنگ روم کا وسطی حصہ ہی صاف نظر آ رہا تھا۔ وسط میں ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی اور اوپر قمیص کے ساتھ پیتل کے چمک دار بٹنوں والی واسکٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ بس ایک ہیٹ اور ایک گھوڑے کی کمی تھی ورنہ وہ پورا کاؤبوائے نظر آتا۔

”نظامی صاحب جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے اسے مشکل طریقے سے کیوں کرواتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ میں ایک معمولی سا کاروباری آدمی ہوں۔“ محمود نظامی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”مذاق مت کرو۔“ نوجوان ہنسا۔ ”اس عالیشان گھر کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ تم ایک معمولی

کاروباری ہو۔ مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ تم اس شہر کے سب سے بڑے بلیک مارکیٹیے ہو۔ کل ہی تمہارے پاس بہتر لاکھ کی رقم آئی تھی۔ وہ میرے حوالے کر دو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" محمود نظامی کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔

"ورنہ تم دیکھ لو گے۔ تمہاری بیوی ہے۔ تین لڑکیاں ہیں۔ ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ کیا تم گوارہ کر لو گے کہ اس رقم کے بدلے ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے۔"

"نہیں۔" محمود نظامی لرز اُٹھا۔

"اس کی تیسری لڑکی بھی ہے؟" ایک آواز آئی۔ بولنے والا شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تمہاری تیسری بیٹی کہاں ہے؟" نوجوان نے کڑے تیور سے پوچھا۔

"وہ......وہ اپنی دادی کے پاس گئی ہوئی ہے۔" محمود نظامی نے بہ مشکل کہا۔

"اگر یہ جھوٹ ہوا تو؟"

"اس کی دو بیٹیاں تو یہیں ہیں۔" نظر نہ آنے والے شخص نے خباثت بھرے لہجے میں کہا تو دونوں لڑکیاں مارے خوف کے ایک دوسرے سے مزید چمٹ گئیں۔ مجھ سے لگی ماریہ کا بدن لرزنے لگا۔

"محمود تمہیں صرف پانچ منٹ دیتا ہوں۔ رقم میرے حوالے کر دو۔ ورنہ یہاں جو ہوگا اسے تم اور تمہارے یہ مہمان ساری عمر فراموش نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کیا خیال ہے اسے بھی نہ شامل کر لیں۔" خبیث آواز والے نے کہا۔ اس کا اشارہ ماہ پارہ کی طرف تھا۔

"خبردار۔" حسن علی غرایا۔ "عورتوں کو ان معاملات سے دور رکھو۔ اگر مرد ہو تو۔"

"ہم اپنی مردانگی ثابت کر دیں گے۔" نوجوان نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہاں موجود خواتین کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ حسن علی کے چہرے پر طیش کی سرخی چھا گئی تھی۔ محمود نظامی زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی باتوں سے فتنے کی بُو آنے لگی تھی۔ ان کی نیت خراب تھی۔ غالباً وہ رقم بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اور لڑکیوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں تھے۔ یہ بات محمود نظامی اور حسن علی نے بھی محسوس کر لی تھی۔ لہٰذا جب ان کے ہاتھ پیر باندھے جانے لگے تو انہوں نے خاصی مزاحمت کی تھی لیکن خودکار ہتھیاروں کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ اب محمود نظامی نے منت سماجت شروع کر دی تھی۔

"تم لوگ مانتے کیوں نہیں کہ رقم میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آج صبح ہی اسے بینک میں جمع کرا دیا ہے۔"

"بکومت کوئی بلیک منی بینک میں جمع نہیں کراتا۔"

ان لوگوں نے حسن علی، محمود اور شامی کے ساتھ مسز نظامی کو بھی باندھ دیا تھا۔ اب وہاں پانچ





افراد نظر آ رہے تھے۔ جبکہ میرا اندازہ تھا کہ کم از کم ایک فرد باہر بھی تھا تا کہ کسی غیر متوقع صورتِ حال میں انہیں خبردار کر سکے۔ ایک شخص نے محمود نظامی کی بڑی بیٹی کو کھینچ کر صوفے سے کھڑا کر دیا۔ "ذرا نچ کے دکھا سوہنیے۔" اس نے مصطفیٰ قریشی کے انداز میں کہا۔ یہ وہی تھا خبیث آواز والا لڑکی نے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔ محمود نظامی نے تڑپ کر کہا۔

"چھوڑ دو اسے میں رقم دیتا ہوں۔"

"چھوڑ دے اسے۔" نوجوان نے قہقہہ لگایا۔ "بڈھا راضی ہو گیا ہے۔"

"رقم میری اسٹڈی کے خفیہ سیف میں رکھی ہے۔ مجھے کھولو میں رقم نکال کر دیتا ہوں۔"

"سیف کھولنے کا طریقہ بتاؤ۔ رقم خود لے لیں گے۔"

"سیف چابی اور نمبروں سے کھلتا ہے۔ تم میری میز کے عقب میں موجود الماری کو ایک طرف کھسکاؤ سیف اس کے پیچھے ہے، چابی میری جیب میں ہے اور نمبر ایک دو نو گیارہ بیس ہے۔" محمود نظامی مکمل طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا۔

"یہ تو یہیں آ رہے ہیں۔" ماریہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں پہلے ہی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو کھولنے پر باتھ روم ثابت ہوا۔ میں ماریہ سمیت اس میں گھس گیا۔ یہ اس الماری کے بالکل پاس تھا۔ جس کے عقب میں خفیہ تجوری تھی۔ ہمارے باتھ روم میں جاتے ہی دو افراد اندر گھس آئے تھے۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ ایک تو باس نوجوان تھا۔ دوسرا کوئی اور تھا۔ انہوں نے الماری سرکائی اور سیف کھولنے لگے۔ اس کام میں انہیں بہ مشکل ایک منٹ لگا تھا۔

"انہیں روکو۔" ماریہ نے کہنا چاہا تو میں نے اس کا منہ دبا دیا لیکن مجھے تاخیر ہو گئی تھی۔

"یہ آواز کہاں سے آئی۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"ان میں سے کوئی بولا ہوگا۔" نوجوان کا اشارہ کمرے سے باہر موجود افراد کی طرف تھا۔

"نہیں استاد آواز قریب سے آئی ہے۔"

چاپ باتھ روم کی طرف سے آئی۔ میں ماریہ کو لے کر دروازے کے عقب میں دیوار سے چپک گیا۔ اس لمحے دروازہ کھلا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی لمحے بھی روشنی ہو سکتی تھی اور اس کے بعد ہمیں پکڑے جانے میں دیر نہ لگتی۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے روشنی نہیں کی اور نہ ہی اندر جھانکا بلکہ دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت استاد کی آواز آئی۔ "سیف کھل گیا ہے۔"

"اس میں تو خاصا مال ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"سب سمیٹ لو۔" نوجوان نے اضطراب سے کہا۔ "شاد کو بلا لو۔ میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔"

"ابھی تو مزے بھی کرنے ہیں استاد۔" دوسرے نے ہنس کر کہا۔

"ہاں لیکن صبح سے پہلے ہمیں نکلنا ہے۔ اسلام آباد پولیس کا معلوم ہے ناں پکڑے گئے تو مارے جائیں گے۔"

ماریہ کی انگلیاں میرے بازو میں پیوست ہونے لگی تھیں۔ وہ سخت طیش میں تھی۔ اس نے باہر جانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے روک لیا۔ وہ منہ سے آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ بے بسی سے ہانپ کر رہ گئی۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ لوگ سیف خالی کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈرائنگ روم سے ماریہ کی بڑی بہن کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ بھی شور کر رہے تھے۔ پھر ان کا شور تھم گیا۔ شاید کسی طریقے سے ان کے منہ بند کر دیئے گئے تھے۔ خود میرے لیے صبر کرنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ماریہ کا تو بُرا حال تھا۔ اس کا اینٹھتا بدن کہہ رہا تھا کہ وہ باہر نکل کر ان بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی لیکن میں ایسے کسی اقدام کے حق میں ہیں تھا جو ہمیں بھی گرفتارِ بلا کر دے۔

کچھ دیر بعد اسٹڈی میں خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ لوگ چلے گئے تھے۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسٹڈی کا دروازہ بھی بند تھا۔ ماریہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکلتے ہی تیزی سے اسٹڈی کی میز کی طرف لپکی۔ اس نے ایک دراز کھولنے کی کوشش کی۔

"اس میں پاپا کا پستول ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ تمہیں اب یاد آ رہا ہے۔" لڑکی اب رونے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی موقع ہے انہیں قابو کرنے کا، دراز لاک تھی اور چابی نہ جانے کہاں تھی۔ میں نے دوسری درازیں کھولیں۔ اتفاق سے ایک دراز میں تار مل گیا۔ یہ پتری نما تار تھا۔ جو بعض اوقات کتاب میں صفحے اُلٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کی مدد سے دراز کا لاک کھولنے کی کوشش کی۔ مزید خوش قسمتی کہ بالکل اناڑی ہونے کے باوجود لاک کھل گیا۔ میں نے تیزی سے دراز میں اوپر ہی رکھا پستول نکالا۔ یہ کولٹ تھا۔ نیا اور بالکل لوڈڈ میں نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے ماریہ کو اپنا منصوبہ سمجھایا۔

"زیادہ جوش میں آگے مت نکل جانا۔ انہیں اندر لانے کی کوشش کرنا۔"

میں دروازے کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور ماریہ نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا اور چلائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"ارے یہ......یہیں ہے۔" کسی نے گالی کے ساتھ کہا۔ "پکڑو اسے۔"

ماریہ نے یوں دروازہ بند کر دیا جیسے جان بچانے کے لیے واپس بھاگی ہو لیکن دروازہ بند کرتے ہی اس نے کمرے کی روشنی بجھا دی اور بیس بال کا بلا تھام کر تیار ہو گئی۔ حسبِ توقع آنے والا اندھے بیل کی طرح اندر گھسا اور پھر یقیناً دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی ہو گی۔ ماریہ نے پوری قوت سے اس کے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ وہ کم سے کم بے ہوش





ہوا تھا اور اس کے دنیا سے گزر جانے کے روشن امکانات بھی تھے۔ میں نے تیزی سے اس کی تلاشی لی۔ اس دوران ماریہ یوں چیختی چلاتی رہی جیسے اس سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اسے اُٹھا کر میز پر ڈالا اور ایک دل خراش چیخ ماری۔ نسوانی چیخوں کی تو انہیں پروا نہیں تھی لیکن مردانہ چیخ نے انہیں چونکا دیا ہو گا۔ میں ایک بار پھر دروازے کے پیچھے مستعد کھڑا ہو گیا۔ ماریہ میز کے پاس فرش پر گٹھری بن کر لیٹ گئی تھی۔ کولٹ اس کے پاس تھا میں نے سر پر ڈنڈا کھانے والے کا ریوالور لے لیا تھا۔

"ارے کیا ہوا تجھے؟" باہر سے آواز آئی اور جب اندر سے خاطر خواہ جواب نہیں آیا تو بیک وقت دو افراد اندر گھس آئے تھے۔ میں نے ایک کو فوراً ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ دوسرا خطرہ بھانپ کر ایک طرف ہوا اور اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا ہی تھا کہ ماریہ اس پر چیل کی طرح جھپٹی اس نے ایک شاندار کِک مار کر اس کے ہاتھ سے ماؤزر طوطے کی طرح اُڑا دیا تھا۔ اس نے بلبلا کر گالی دی اور گالی ادھوری چھوڑ کر ایک پُرسوز آواز نکالی۔ ماریہ کی دوسری گھومتی لات اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ وہ کورنش بجا لانے کے انداز میں جھکا ہی تھا کہ میں نے اس کا سر بجایا اور وہ اپنے پیروں پر ڈھیر ہو گیا۔

حملہ آور ڈاکوؤں کی نصف نفری بے کار ہو چکی تھی لیکن ساتھ ہی باقی ڈاکوؤں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے تیزی سے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ اس لمحے باہر کوئی دروازے سے ٹکرایا تھا۔ "مکرم جی کیا ہوا؟" وہ چلایا۔

"ایک طرف ہو جاؤ۔" میں نے ماریہ سے کہا۔ جیسے ہی وہ ہٹی باہر سے کسی نے برسٹ مارا اور دروازے سے گزر کر گولیاں سامنے میز اور عقب میں الماری سے لگی تھیں۔ ہم کناروں پر تھے اور باقی زمین پر ڈھیر تھے۔ لہٰذا گولی کسی کو نہیں لگی۔ البتہ میں نے ایک چیخ مارنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ماریہ نے چیخ ماری۔ "یوسف کیا ہوا تمہیں تم ٹھیک ہو ناں؟"

"اُلو کی پٹھی۔" میں نے دل میں کہا اور حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے بس آخری ہچکی ہو۔

دوسرے برسٹ نے دروازے کا لاک توڑ دیا تھا اور کوئی آندھی کی طرح اندر داخل ہوا۔ ماریہ سمجھی کہ مجھے سچ مچ گولی لگ گئی ہے۔ اس نے ایک جنونی انداز میں آنے والے کو گولی مار دی۔ بعد میں یہ استاد ثابت ہوا تھا۔ استاد کی چیخ نے باقی دو کے اوسان خطا کر دیئے تھے اور انہوں نے رقم والا بیگ اُٹھا کر بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ ان کے جاتے ہی میں اسٹڈی سے باہر نکلا۔ میں محتاط تھا یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ڈرائنگ روم کا باہر جانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باقی ڈاکو غائب تھے۔ میں نے باہر جانے کے بجائے سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں تمام دروازے اندر سے بند کر لیے۔ پھر سب سے پہلے بیگم نظامی کو کھولا تا کہ وہ بے ہوش پڑی بیٹی کی ستر پوشی کر سکیں۔ انہوں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے لیکن خدا کا شکر تھا کہ وہ اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب نہیں ہوئے

تھے۔ پھر میں نے حسن علی کو کھولا اور بولا۔

"اسلحے پر قبضہ کر لیں۔ یہ ان باپ بیٹے کے ہاتھ میں نہ آنے پائے۔"

اس فیصلے کی وجہ محمود نظامی اور شامی کا طیش تھا جو ان کے چہروں سے ظاہر تھا۔ اگر ان کے ہاتھ ڈاکوؤں کا کوئی ہتھیار لگ جاتا تو وہ ان کو مار بھی سکتے تھے۔ ماہ پارہ کو بھی باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے انہیں کھولا۔ اس دوران میں حسن علی اسٹڈی میں جا چکا تھا۔ اس کے اندر جاتے ہی ماریہ بھاگتی ہوئی باہر آئی اور بے تابی سے میرا معائنہ کیا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟" اس نے میرا بازو تھاما۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے خفیف ہو کر کہا۔ اس کا باپ اور بھائی سامنے کھڑے تھے۔

"اپنی بہن کو دیکھو۔"

آزاد ہوتے ہی محمود نظامی فون کی طرف جھپٹا تھا۔ جیسے ہی اس نے ریسیور اُٹھایا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ "لائن مُردہ ہے۔"

"ظاہر ہے انہوں نے سب سے پہلے فون کاٹے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ پڑوس سے کوشش کریں۔ ویسے اتنی فائرنگ ہوئی ہے اب تک کسی نے خیریت دریافت نہیں کی۔"

"یہاں بنگلے خاصے فاصلے پر ہیں۔" محمود نظامی نے کہا۔ "شاید ہی کسی نے آواز سنی ہو اور سنی بھی ہو تو توجہ نہ دی ہو۔"

"ڈیڈی اوپر کے حصے میں فون ہے۔ جو ہم نے برابر والوں سے لیا تھا۔ اس کا تار بھی درختوں سے آ رہا ہے۔ شاید ان ڈاکوؤں کو نظر نہ آیا ہو میں جا کر دیکھتی ہوں۔ آؤ یوسف۔" ماریہ نے کہا اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے جانے لگی۔ جب محمود نظامی نے اس کے بجائے اپنی بے ہوش بیٹی پر توجہ دی تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ماریہ مجھے لے کر اوپری منزل میں آئی۔ اس نے ایک کمرا کھولا چابی اس نے کارنس کے اوپر سے اُتاری تھی۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے کسی ایسے ہی اقدام کی توقع دیتی تھی۔ اس کی گرم جوشی نے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس سے پہلے کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"فون تو کرو۔"

اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ ریشمی نائٹی سے جھلکتی اس کی ہیجان خیزی اچھی لگ رہی تھی۔

"ڈاکو تو چلے گئے۔" وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ "اُف تم تو ہیرو ہو، اکیلے ہی سب کو مار گرایا۔"

یہ قربت یہ پیار اور احساس بالکل مختلف تھا جو مجھے کاجل کے قرب میں محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھا جو میرے تن بدن میں آگ لگا رہا تھا۔ کاجل کی قربت میں آگ نہیں بلکہ سکون تھا۔

"پلیز ماریہ۔" میں نے اسے ایک طرف کیا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو۔"




"ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں دیوانی ہوں تمہاری۔" اس نے بلا جھجک کہا۔ "کیا وہ بھی تمہیں ایسے ہی پیار کرتی ہے؟"

"جہاں تک دل کا تعلق ہے تو اس جیسا پیار مجھ سے کوئی نہیں کر سکتا لیکن اگر تمہاری مراد اس قربت سے ہے جس کا اظہار ابھی تم کر رہی تھیں تو مجھے کاجل کی ایسی قربت نہیں ملی۔ وہ صرف بارہ سال کی ہے۔"

"یعنی بچی ہے۔" وہ حقارت سے مسکرائی۔ "وہ تمہیں کیا دے سکتی ہے؟"

"وہ جو کچھ مجھے دیتی ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور ریسیور اُٹھا کر چیک کیا ٹون آ رہی تھی۔

"نمبر بتاؤ پولیس کا۔" میں نے کہا اور اس کا بتایا ہوا نمبر بتا کر پولیس کو ڈکیتی کی اطلاع دی۔

"پتا بتاؤ جی۔" دوسری طرف سے کسی آدم بے زار حوالدار نے کہا اور جب میں نے اسے محمود نظامی کی کوٹھی کا پتا بتایا تو وہ اُچھل پڑا تھا۔ اس علاقے کے تمام رہائشی توپ تھے اور یہاں ڈکیتی کا مطلب تھا کہ پولیس کی شامت۔

"ہم نے چار ڈاکو پکڑ لیے ہیں۔ جن میں سے ایک شاید فوت ہو گیا ہے۔"

"موبائل ابھی آتی ہے جی۔" حولدار نے بوکھلا کر کہا۔ میں نے ریسیور رکھا اور ماریہ کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی برداشت نہیں کرتی کہ وہ جسے پسند کرتی ہے وہ کسی اور کو پسند کرے۔ یہ اس کی توہین ہوتی ہے۔

"کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟" اس نے حسد سے کہا۔

میں نے کندھے اُچکائے۔ "معلوم نہیں لیکن مجھے اس کے مقابل دنیا کی کوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔"

مارے طیش کے اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بات پر مجھے قتل کر دے۔ میں اس کا ٹھیک علاج کر رہا تھا۔ شدید محبت اگر منزل نہ پا سکے تو شدید نفرت میں بدل جاتی ہے۔ ماریہ اچھی لڑکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی برباد کرے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میری محبت کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔" اس نے انگلی اُٹھائی۔

"میں اسے محبت نہیں کہتا۔ یہ تو بس ایک خواہش تھی۔ عملی اظہار کی۔" میں نے رُکھائی سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اتنی دیر اندر رہنا ماریہ کے گھر والوں کو شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پیچھے آئی۔

"اتنے سنگ دل نہ بنو۔"

"سنگ دل ہوتا تو تمہاری دیوانگی سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ماریہ تم اچھی لڑکی ہو لیکن تم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

"تم سراب نہیں ہو۔" اس نے میرے سینے پر انگلی ماری۔

"خواہشات اکثر سراب ہی ہوتی ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میرے پاس ان سب باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ابھی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ کیریئر بنانا ہے۔ میری عمر صرف پندرہ سال ہے۔"

اس نے حیرت سے کہا۔ "جھوٹ تم کسی طرح بیس سال سے کم نہیں ہو۔ میں انیس سال کی ہوں۔"

"میں تم سے چار سال چھوٹا ہوں تم میری تاریخ پیدائش دیکھ سکتی ہو میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ پر......"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "محبت ان سب باتوں کو نہیں دیکھتی۔"

"تم اسے محبت کہتی ہو۔" میں نے رُک کر اسے بہ غور دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے دعویٰ کیا۔

"ماریہ بی بی جب میں چلا جاؤں اور ایک ہفتے بعد بھی رات کو تمہیں میری یاد میں نیند نہ آئے تو سمجھ لینا کہ تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے ورنہ صرف لگاؤ ہے۔"

نیچے سب گھر والے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ حسن علی نے آکر افسردگی سے بتایا کہ ڈاکوؤں نے چوکیدار اور کتے کو مار دیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے خاموش ہتھیار استعمال کیے تھے۔ "کیا جیک کو مار دیا۔" بیگم نظامی رونے لگیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ غریب چوکیدار کی موت پر کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ صرف محمود نظامی کسی قدر افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد پولیس آگئی۔ ضروری کارروائیوں اور بیانات لینے میں انہوں نے صبح کر دی تھی۔ چاروں ڈاکو زندہ سلامت تھے۔ جس کے سر پر ڈنڈا لگا تھا اس کی حالت خراب تھی۔ باقی صرف بے ہوش ہوئے تھے۔ محمود نظامی آنے والے ڈی ایس پی کو ایک طرف لے جا کر خاصی دیر راز و نیاز کرتا رہا تھا۔ شاید لوٹ لی جانے والی رقم کے بارے میں مذاکرات کر رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس رقم کو ڈکیتی میں ظاہر نہیں کرتا اور اگر پولیس یہ رقم برآمد کر لیتی تو وہ ان سے مانگ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی ڈی ایس پی سے بات کر لی۔ جب وہ آئے تو دونوں ہی مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"نظامی صاحب آپ فکر ہی نہ کریں میں اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سب کچھ نکلوا لوں گا۔ اس حرامی کی تو مجھے عرصے سے تلاش تھی۔" ڈی ایس پی کہہ رہا تھا یہ ارشاد زخمی ارشد بلا کے بارے میں تھا۔




بعد میں جو حقائق سامنے آئے اس کے مطابق ارشد بلا نامی ڈاکو کے اس گروہ نے خاصے کارنامے انجام دیئے تھے اور عرصے سے اسلام آباد اور اس کے گردونواح میں وارداتیں کرتے آئے تھے ان کا طریقہ کار بڑا سائنٹیفک تھا۔ وہ اندھی واردات کے بجائے پہلے سے پلاننگ کر کے لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ انہوں نے مخبر رکھے ہوئے تھے جو انہیں ٹپ دیا کرتے تھے۔ یہ مخبر عام طور سے گھریلو اور دفتری ملازمین ہوتے تھے جو بھیدی بن کر لنکا ڈھاتے تھے۔ محمود نظامی کے دفتر میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کام کرنے والے ایک مخبر نے ارشد بلا کو اطلاع دی تھی کہ محمود نظامی کے پاس ایک بڑی رقم آئی ہے۔ محمود نظامی نے رقم گننے کے لیے اسے طلب کیا تھا۔ ارشد بلا نے مخبری پر اسے دس ہزار روپے دیئے تھے لیکن پکڑے جانے پر جب پولیس نے اس کی خاطر تواضع کی تو اس نے سب کچھ اُگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس میں مخبر کا نام بھی شامل تھا۔ جس کی پولیس نے خصوصی خاطر تواضع کی ہوگی۔

جس شخص کا سر ماریہ نے بلا مار کر توڑ دیا تھا وہ وہی خبیث آواز والا تھا۔ جو اس کی بہنوں اور ماہ پارہ کے بارے میں مکروہ عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی یہ سن کر کہ اسے اب اپنی زندگی کا بڑا حصہ دماغی شفا خانے میں گزارنا پڑے گا۔ بلے نے اس کے دماغ کو متاثر کیا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ پاگل خانے میں جا کر ہی یہ کسر بھی پوری ہو جائے گی۔

ہم رات بھر جاگے تھے اور خاصے اعصاب شکن مراحل سے گزرے تھے اس لیے صبح روانگی کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ ناشتہ کر کے میں کمرے میں آکر سو گیا۔ جمشید علی کو اس بارے میں مطلع کرنے کا کام محمود نظامی نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جو میری تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے اور مجھے بوریت ہو رہی تھی کیونکہ ماریہ نہ صرف باپ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی بلکہ شرارتی نظروں سے مجھے بھی دیکھ رہی تھی۔

شام تک میں بے خبر سوتا رہا حتیٰ کہ دروازے پر ہونے والی مستقل دستک نے مجھے جگا دیا۔

"آجاؤ۔" میں نے جماہی لی۔

دروازہ کھلا اور ماریہ مسکراتی ہوئی ٹی ٹرالی کے ساتھ اندر داخل ہوئی میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ "اگر اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگا ہوتا تو مل جاتا۔"

"جھوٹے آدمی۔ اتنی دیر دستک دینے کے بعد اُٹھے ہو میرے ہاتھ درد کرنے لگے تھے۔"

ٹرالی میں چائے کے علاوہ کھانے پینے کا خاصا سامان تھا اور اس وقت مجھے شدید نوعیت کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں بلا تکلف ٹوٹ پڑا وہ مجھے روکتی رہ گئی۔ "ارے منہ ہاتھ تو دھولو۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ "بھوک کے مارے میں باتھ روم میں فوت ہو گیا تو۔"

"خدا نہ کرے۔" اس نے بے ساختہ کہا تو میں چونک گیا۔ میں نے پہلی بار اسے بہ غور

دیکھا۔ وہ خاص اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔ تنگ پاجامے پر اس نے کمر پر سے سمٹا کرتہ پہن رکھا تھا۔ جس کا گریبان بیک وقت نظروں کو شادکام اور منتشر کرتا تھا۔ مزید کی طلب بھڑکاتا تھا۔ دوپٹہ برائے نام ہی تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا لباس خود اس کے رنگ کی گلابیت سے میل کھا رہا تھا۔ بالوں کی اس نے دو پونیاں بنا کر دائیں بائیں شانوں پر کر لی تھیں اور بلاشبہ نظر لگ جانے کی حد تک پُرکشش لگ رہی تھی میرے اس طرح گھورنے پر اس کا رنگ شہابی ہو گیا۔

''یوں کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''تم اتنی تر و تازہ لگ رہی ہو جیسے سارا دن سوتی رہی ہو۔''

''میں کہاں سوئی صبح یونیورسٹی چلی گئی۔ چار بجے وہاں سے آئی تو نہا دھو کر کھانا کھایا پھر تمہارے لیے چائے لے آئی۔''

''اتنی تھکن کے بعد بننے سنورنے کی طاقت صرف لڑکیوں میں ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ پھر سو جاؤں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے روشنیاں جلاتے ہوئے کھڑکیوں کے پردے سمیٹ دیئے۔ شام ہو چکی تھی اور دور مغربی پہاڑیوں کے عقب میں سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ''کل صبح تم چلے جاؤ گے۔'' اس نے پلٹ کر کہا۔ ''تب تک کا وقت میرے نام کر دو۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''تمہارے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تمہارے قبضے میں ہوں۔ جو چاہے کرو۔'' میں نے کہا تو وہ کھل اُٹھی تھی۔

''بس تو جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈنر ہم باہر ہی کریں گے۔''

''تمہاری بہن کی حالت کیسی ہے؟''

''شی از آل رائٹ۔'' وہ بولی۔ ''کچھ صدمے کا اثر ہے چند دن میں وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

اس کی چھوٹی سی کار شوخ سرخ رنگ کی تھی۔ وہ بے حد تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسلام آباد کی سڑکیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں، وہ بے پروائی سے رفتار کم کیے بغیر موڑ کاٹ رہی تھی دس منٹ بعد کار ایک سرسبز درختوں اور لان سے گھری عمارت کے سامنے رُکی۔ جس کی پیشانی پر یوتھ کلب لکھا تھا۔ عمارت جدید انداز کی تھی۔

''میں اس کلب کی ممبر ہوں۔'' اس نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''آؤ اندر چلیں۔''

لاؤنج میں ہی بے شمار لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے اکثر نے ماریہ سے ہیلو ہائے کی۔ یعنی وہ یہاں بے حد مقبول تھی۔ وہ مجھے لیے ایک الگ کمرے میں آئی۔ کمرے میں کارنرز پر صوفے نما کرسیاں تھیں جن کے آگے بید سے بنی میزیں تھیں ان کے ٹاپ شیشے کے تھے۔ ایک کارنر میں ایک نوجوان جوڑا سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ انہوں نے ہماری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا





تھا۔ ''کیا پیو گے؟''

''جو تم چاہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بائی دے وے یہ کلب کس قسم کا ہے۔''

''یہ کلب صرف نوجوانوں کے لیے ہے۔ تیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ اس کے ممبر نہیں بن سکتے اور جیسے ہی کوئی ممبر تیس برس کا ہوتا ہے اسے کلب سے نکال دیا جاتا ہے۔''

''تم باقاعدگی سے یہاں آتی ہو؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''ہفتے میں دو تین بار، دراصل یونیورسٹی میں آنے کے بعد سے زیادہ وقت نہیں ملتا۔''

ماریہ نے لائم جوس منگوایا۔ نہ جانے کیوں یہ جگہ مجھے اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود نہیں بھائی تھی۔ لائم جوس پی کر اس نے مجھے باہر چلنے کو کہا۔ ''سوئمنگ کرو گے؟''

''سوری میں نے آج تک کسی عوامی سوئمنگ پول میں سوئمنگ نہیں کی۔'' میں نے معذرت کر لی۔

''مزہ آئے گا۔ کر کے دیکھو۔''

''میرے پاس لباس بھی نہیں ہے تیراکی کا۔''

''وہ بھی مل جائے گا۔ چلو آؤ پہلے پول دیکھ لو بلیو می پورے پاکستان میں اس سے زیادہ خوب صورت سوئمنگ پول نہیں ہو گا۔'' وہ اُٹھ گئی۔ پول کلب کے پچھلے حصے میں تھا اور تاریکی چھانے کے باوجود آباد تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلوں سے بنا یہ سوئمنگ پول روشنیوں اور روشن جسموں سے جگمگا رہا تھا۔ پول میں اکثریت لڑکیوں کی تھی جو مختصر ترین لباس میں تیراکی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان کے بے باکانہ قہقہے ماحول کو کھنکا رہے تھے۔

''تم بھی یہاں سوئمنگ کرتی ہو؟''

''آف کورس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آئی انجوائے اِٹ۔''

معاً میری نظر پول کے دوسری طرف کرسی پر ساتھ ساتھ بیٹھے ایک جوڑے پر پڑی۔ اچانک لڑکا اپنا رُخ بدلتے ہوئے اپنی ساتھی لڑکی کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سرِعام بے باکی کا اتنا کھلا مظاہرہ بھی ممکن ہے۔ یکلخت مجھے اپنی بے زاری کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ ''یہاں سے چلو۔'' میں نے ماریہ سے کہا اور اس کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آیا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پیچھے آئی تھی۔

''یوسف کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس قسم کا ماحول اچھا نہیں لگتا۔''

''یوسف یو آر ینگ۔'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''ہاں میں نوجوان ہوں لیکن ماریہ ہماری معاشرتی اقدار ہیں۔ تمام تر آزاد خیالی کے باوجود ہم انہیں نہیں چھو سکتے اس قسم کی حرکتیں کرنے والے لوگ میرے نزدیک ذہنی طور پر دیوالیہ ہوتے

ہیں۔"

"یہ ہماری سوسائٹی کا ایک حصہ ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں...... لیکن جس سوسائٹی کی تم بات کر رہی ہو وہ اس ملک کا کتنے فیصد ہے۔ شاید ایک فیصد بھی نہیں تو مس ماریہ میں ننانوے فیصد کے راستے پر کیوں نہ چلوں۔ اِٹ اِز دی موسٹ پارٹ آف سوسائٹی۔ میں ان ایک فیصد لوگوں کا ساتھ کیوں دوں۔ جو غیروں سے مستعار لی ہوئی زندگی جی رہے ہیں۔"

"یوسف میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی قدامت پرست ذہنیت رکھتے ہوگے۔"

میں ہنسا۔ "پروپیگنڈے پر مت جاؤ۔ آج کل اصول، اخلاق اور اقدار قدامت پرستی کی علامت بنا دیئے گئے ہیں۔ دنیا کو ان سے جان چھڑانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔"

"یہ سب تنگ نظری کی باتیں ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ایک بات بتاؤ مس ماریہ...... تم اتنے عرصے سے ان لوگوں کے درمیان ہو، ان میں سے کوئی ایک شخص بھی تمہیں پسند نہیں آیا کیوں؟"

اس نے نظریں چرائیں۔ "یہ تو دل کی بات ہے۔"

"تو مس ماریہ دل بھی کچھ دیکھ کر ہی آتا ہے۔" میں ہنسا۔ "بقول تمہارے میں ایک قدامت پرست شخص ہوں تو آخر تم نے اتنے سارے آزاد خیال نوجوانوں کو چھوڑ کر مجھے ہی کیوں منتخب کیا اپنی محبت سے نوازنے کے لیے؟"

وہ جھلائی۔ "میں نہیں جانتی...... میں......"

"ماریہ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم ایک اچھی لڑکی ہو بائی نیچر۔ ان چکروں سے نکل جاؤ۔ یہ سب ہمارے لیے نہیں ہے۔ باہر سے آیا کوئی پودا اس سرزمین پر جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ چاہے اسے لگانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔"

وہ کار میں جا بیٹھی۔ جیسے ہی میں اس کے برابر میں بیٹھا اس نے اتنی تیزی سے کار پیچھے کی کہ اس کے پہیے چیخ اُٹھے تھے۔ دس پندرہ منٹ اس نے اتنی رف ڈرائیو کی کہ میرا دل حلق میں اٹکا رہا تھا۔ اسپیڈ نوے اور سو کے درمیان میں تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے اُبال میں کمی آنے لگی تو رفتار بھی کم ہونے لگی۔ بالآخر اس نے کار ایک سڑک کے کنارے درختوں تلے روک لی یہاں نیم تاریکی تھی۔

"آئی ایم سوری یوسف۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر تمہیں میری بات بُری لگی ہو تو میں......"

"نہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "تم پہلے شخص ہو جس نے مجھے ٹوکا ہے۔ مجھے اچھا لگا۔ ورنہ ڈیڈی اور مما کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ ہماری مصروفیات کے بارے میں جان سکیں اور ہمیں صحیح غلط کے بارے میں بتائیں۔"





"صرف تمہارے ماں باپ نہیں بلکہ اس طبقے کے اکثر گھرانوں کا یہی المیہ ہے۔"

"یوسف۔" وہ اچانک رو دی تھی۔ "تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرو گے ناں؟"

"نہیں کروں گا۔"

"کیا تم مجھے تھوڑی سی محبت بھی نہیں دے سکتے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"مجھ سے وہ چیز مت مانگو جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔

"میں کاجل کا حق نہیں مانگتی۔"

"میں تمہیں دے بھی نہیں سکتا۔ کم آن لیٹس گو۔" میں نے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے ابھی ڈنر بھی کرنا ہے۔"

ایک ہوٹل میں ڈنر کر کے ہم نے لالہ زار کی آئس کریم کھائی اور واپس گھر آ گئے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ میرے ساتھ تھی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ماریہ نے ریسیور اُٹھایا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔

"کاجل ہے۔"

"مارے گئے۔" میں نے دل میں کہا اور بولا۔ "ہیلو کاجل۔"

"اسے تو میرا نام معلوم ہو گیا۔" اس کی سرد آواز آئی۔ "اب ذرا اس کا تعارف بھی کرا دو۔"

"یہ...... یہ ماریہ ہے۔"

"اور تمہارے کمرے میں کیا کر رہی ہے رات کے بارہ بجے۔" کاجل کے لہجے میں کاٹ تھی۔ میں نے ہکلا کر کہا۔ "ہم...... ہم...... با...... باتیں کر رہے ہیں۔"

مجھے ہکلاتے دیکھ کر ماریہ ہنس دی تھی اور بدقسمتی سے وہ میرے بے حد نزدیک تھی۔ اس کی ٹھوڑی میرے شانے پر تھی اور میں اپنی پشت پر اس کا گداز محسوس کر رہا تھا۔ اس چیز نے مجھے اور بوکھلا دیا تھا۔

"یہ ہنس رہی ہے۔" کاجل کی مشتعل آواز آئی۔ "اس سے کہو فوراً تمہارے کمرے سے چلی جائے۔"

"کاجل بی ہیو پلیز۔" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ "تم بھول رہی ہو میں اس کے گھر میں ہوں۔ میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔"

"اگر تم نے نہیں کہا تو میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔" وہ فوراً دھمکیوں پر اُتر آئی۔

"مائی گاڈ تمہارے پاس پستول کہاں سے آیا؟" میں گھبرا گیا۔

"میں نے پاپا کا چرایا ہے تم اسے نکال رہے ہو یا نہیں۔" اس نے وارننگ دی۔

"میرے خدا۔" میں نے کہا پھر ماریہ سے بولا۔ "پلیز تم یہاں سے جاؤ۔"

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔ "تم اس کے کہنے پر مجھے بھگا رہے ہو۔"

"تم نہیں جانتیں کاجل کتنی ضدی ہے وہ جو کہتی ہے اسے کر کے دکھاتی ہے۔ پلیز یو کین گو ناؤ۔"

"تو کرنے دو اسے اچھا ہے تمہاری جان......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میرا ہاتھ اس کے منہ پر لگا اور وہ اُچھل کر پیچھے جا گری۔

"آئندہ کاجل کے بارے میں ایک لفظ مت بُرا کہنا۔ اب تم جاتی ہو یا میں اس گھر سے چلا جاؤں۔" میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھا۔ پھر یک دم ہنس دی۔ تیز اور ہذیانی ہنسی۔ وہ اٹھی اور اس نے اچانک جھپٹا مار کر مجھ سے فون چھینا۔ میں اسے نہیں روک سکا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں کاجل سے بولی۔ "سنو بے بی میں یوسف سے محبت کرتی ہوں اور یہ تم سے پیار کرتا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوسف نے تمہارے لیے مجھے تھپڑ مارا مجھے بُرا نہیں لگا اپنے محبوب کا دیا ہر ستم مجھے قبول ہے۔ یہ مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس لیے میں جا رہی ہوں۔ ورنہ خدا کی قسم دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے دور نہیں کر سکتی۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور بستر پر پھینکا اور تیز قدموں سے کمرے سے چلی گئی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔

"وہ حرافہ چلی گئی۔" کاجل کی جلی ہوئی آواز آئی۔ "یوسف آئی کل یو۔"

"خدا کے لیے کاجل میں اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ ایک دن کی تو بات تھی کل میں یہاں سے چلا جاتا۔"

"میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی لڑکی کو تمہارے پاس برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ بولی۔ "وہ جا چکی ہے ناں میری قسم کھاؤ۔"

"کاجل مجھ پر اتنا دباؤ تو مت ڈالو۔" میں نے بھنا کر کہا۔

وہ ہنسی۔ "میں جانتی ہوں تم میری جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے کھاؤ قسم۔"

"اچھا بابا تمہاری قسم وہ جا چکی ہے۔ حالانکہ وہ میرے پاس بیٹھی ہے۔"

وہ زور سے ہنسی۔ "اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بائی دی وے شام سے تم کہاں تھے۔ میں نے کوئی درجن بھر کال کی کل رات کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کل رات کیا واقعات پیش آئے تھے۔ جن کی وجہ سے ہماری روانگی ایک دن کے لیے ملتوی ہو گئی۔

"اب تم اسے کمرے میں نہیں بلاؤ گے۔"

"کاجل کیا تم نے مجھے کمزور سمجھ رکھا ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں میں خود کمزور ہوں۔ کسی اور لڑکی کو تمہارے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے اعتراف کیا۔





"ماریہ اچھی لڑکی ہے۔ ذرا راہ سے بھٹکی ہوئی ہے۔ میری کوشش ہے کہ یہ غلط راہوں پر اور آگے نہ بڑھے۔"

"دیکھو کہیں اسے راہ پر لاتے لاتے خود نہ بھٹک جانا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے گہری سانس لی۔ میں کسی قدر جھنجھلاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں نے مجھے سینڈوچ بنا دیا تھا۔ جب خاصی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے اُٹھ کر نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ اس سے خاصا سکون ملا اور بالآخر میں سو گیا۔ اگلی صبح دو ملائم ہاتھوں نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں آنکھیں کھولے بغیر جان گیا کہ یہ ماہ پارہ تھیں۔

"سونے دیں ماں۔"

"ماں کے بچے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔" وہ بولیں۔ "کل سے خوب گھوم رہے ہو۔ کاجل پوچھے گی۔"

"کاجل پوچھ چکی ہے۔" میں نے جھلا کر کہا اور اُٹھ بیٹھا۔ میری آنکھیں بدستور بند تھیں۔

"ہاں کل بار بار اس کا فون آ رہا تھا۔" ماہ پارہ ہنسیں۔

"آپ اسے گولی ماریں۔" میں نے جماہی لی۔ "مجھے بس ایک کپ چائے دے دیں۔ ورنہ میری آنکھ نہیں کھلے گی۔"

"چائے آل ریڈی موجود ہے۔" وہ بولیں تو میں نے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ "لیکن پہلے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔"

"میں اب بچہ نہیں ہوں۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں کل سے دو لڑکیاں پیچھے پڑی ہیں۔" وہ زور سے ہنسیں۔

"اور تیسری آپ آ گئیں صبح صبح۔" میں نے بدتمیزی سے کہا۔

"ہشت۔" وہ جھینپ گئیں۔ "صبح ہی صبح مار کھاؤ گے۔"

"بڑے شوق سے، کیا نرم و نازک ہاتھ ہیں۔ استادِ محترم کے پتھر نما ہاتھوں سے بہت بہتر ہیں۔"

"استادِ محترم آ جائیں گے۔ اگر تم دس منٹ کے اندر تیار ہو کر ناشتے کی میز پر نہ پہنچے۔"

ناشتے پر سب ہی تھے۔ شامی بدستور چہک رہا تھا۔ باقی سب بھی ہنس مسکرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ماریہ کی بڑی بہن ماریہ بھی بہتر نظر آ رہی تھی۔ ماریہ البتہ کبھی کبھی غمگین نظر آتی لیکن اس لمحاتی دُکھ کو بڑی خوبی سے چھپا لیا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد ملازمین نے ایک چھوٹی جیپ پر ہمارا سامان لادا۔ اس میں آگے پیچھے چار نشستیں تھیں اور عقبی حصے میں سامان رکھنے کے لیے ایک چھوٹا خانہ تھا جو اس وقت سامان سے لبالب بھرا تھا۔ چھت پر بھی سامان رکھا تھا۔ محمود نظامی نے حسن علی سے ہاتھ ملایا۔ پھر مجھے گلے سے لگایا۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ بیٹے رقم گئی کوئی بات نہیں لیکن عزت بچ گئی۔ یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں آپ پاپا کے دوست ہیں۔ اس ناطے میں آپ کو بھی اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا اور سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کی عزت دشمن سے تو بچ گئی تھی لیکن ان کی اولاد جس راستے پر چل رہی تھی کیا وہ اپنی عزت کو محفوظ رکھ پائیں گے۔ ماریہ اور اس کی بہنوں نے بے تکلفی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ بلکہ ماریہ کے انداز میں غیر معمولی گرم جوشی تھی۔ حسن علی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کے برابر میں ماہ پارہ بیٹھی تھیں۔ جب میں پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا تو ماریہ نے مجھے ایک پیک شدہ چوکور ڈبہ دیا۔

"یہ تمہارے لیے گفٹ ہے میری طرف سے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"شکریہ۔" میں نے کہا اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ حسن علی نے جیپ چلا دی۔

اسلام آباد کے خوب صورت راستوں سے گزرتے ہوئے میرا ذہن گزشتہ دو دن کے واقعات میں اُلجھنے لگا۔ جمشید پیلس سے روانگی کے فوراً بعد ہی مجھے حیرت انگیز نوعیت کے تجربات ہوئے تھے۔ ایک لڑکی آناً فاناً میری محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ ایسا صرف قصے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ ڈاکوؤں کے خلاف ایک سنسنی خیز فتح حاصل کی۔ جبکہ میں نہتا تھا۔ ایسا صرف فلموں اور ڈراموں میں دیکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی تنگ ندی سے نکل کر کسی وسیع دریا میں داخل ہوگیا تھا۔ میں نے ماریہ کے جذبوں کا مثبت جواب نہیں دیا تھا۔ میں مجبور تھا اور میں نے اسے اپنی مجبوری بتا دی تھی۔ میں نے بے خیالی میں اس کا تحفہ کھولا۔ اندر سے روایتی تحفہ نکلا جو اکثر لڑکیاں اپنے محبوب کو تحفے میں دیتی ہیں۔ یعنی پرفیوم، ایک لٹو نما شیشی تھی جس میں زردی مائل نیلا سیال ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں اس کا بٹن دبایا۔ اسپرے کی ایک پھوار فضا میں گئی اور فضا آہستہ آہستہ مہکنے لگی۔ بڑی انوکھی مہک تھی اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خوشبو پھیلی تو ماہ پارہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"بڑی پیاری خوشبو دی ہے ماریہ نے۔" وہ بولیں۔ "بڑی پیاری لڑکی ہے۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"دنیا میں بہت ساری لڑکیاں پیاری ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور شیشی کو واپس پیکنگ میں رکھ دیا۔

"لگتا ہے کاجل نے ہوش ٹھکانے لگا دیئے تمہارے، کل سے اُڑے اُڑے پھر رہے تھے۔"

حسن علی ہنسا۔

"لڑکیاں اسی طرح ہوش اُڑاتی اور ٹھکانے لگاتی رہتی ہیں۔" میں بولا تو حسن علی کھسیا گیا تھا۔

ماہ پارہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف کرلیا۔ میں تھکاوٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے پچھلی نشست پر نیم دراز ہوگیا۔ جب ہلکے سے جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو دوپہر



کے دو بج رہے تھے۔ باہر تیز دھوپ چمک رہی تھی لیکن ہوا کی خنکی بتا رہی تھی کہ ہم سطح سمندر سے خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ جیپ سڑک سے ذرا ہٹ کر نشیب میں درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں کھڑی تھی۔ حسن علی اور ماہ پارہ باہر تھے۔ میں بھی جیپ سے اُتر آیا۔ مسلسل ایک ہی انداز میں رہنے سے جسم جم سا گیا تھا۔ میں نے ذرا ہاتھ پیر چلائے کچھ ہی دور ماہ پارہ ایک چھوٹی سی ندی کے بہتے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھیں۔ حسن علی ان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ دوسری طرف نکل جاؤں۔ سڑک دوسری طرف ذرا بلندی پر تھی۔ میں قریب آیا۔ اسی لمحے ایک سفید ڈاٹسن پک اپ تیزی سے گزری اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے نقوش ارشد بلا سے ملتے تھے لیکن وہ ارشد بلا کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ ڈکیتی اور قتل کے الزام میں پولیس کی تحویل میں تھا۔ وہ زخمی بھی تھا۔

میں واپس آیا تو ماہ پارہ جیپ سے سامان نکال کر سامنے ہری بھری گھاس پر بچھے دسترخوان پر سجا رہی تھیں۔ میں نے سرسری سے انداز میں حسن علی سے پوچھا۔ "کیا آپ نے راستے میں کوئی سفید ڈاٹسن پک اَپ دیکھی تھی؟"

وہ ہنسا۔ "بے شمار سڑکوں پر نظر آنے والی ہر تیسری گاڑی ڈاٹسن پک اَپ ہی ہوتی ہے۔"

میں نے اسے اپنے مشاہدے سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔"

"ممکن ہے لیکن بہتر ہوگا کہ راستے میں ذرا محتاط رہیں۔ ہم نے ان ڈاکوؤں سے پنگا لیا ہے، جو اسلام آباد جیسی جگہ پر دیدہ دلیری سے وارداتیں کر رہے تھے۔"

"برخوردار جب کوئی صورتِ حال سامنے آئے گی تو دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو کھانے سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ بڑی بھوک لگی ہے۔" وہ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ جس پر گرما گرم ہاٹ پاٹ سے نکالے آلو بھرے پراٹھے، قیمے انڈے کا سالن اور چٹنی اچار کے ساتھ فرنی بھی تھی۔ سفر کے دوران مسلسل دھچکوں نے بھوک چمکا دی تھی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آیا اور آتے ہی حسن علی کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ماہ پارہ ہمیں تمیز سے کھانے کی تلقین کرتی ہی رہ گئیں اور ہم نے سچ مچ دسترخوان صاف کر دیا۔ حالانکہ محمود نظامی کے باورچی نے ہر شے خاصی مقدار میں رکھی تھی کھانے کے بعد سستی طاری ہونے لگی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ دو گھنٹے آرام کے بعد شام ساڑھے چار بجے روانہ ہوں گے۔ اب سفر زیادہ نہیں رہ گیا تھا اگرچہ ہم سب ہی پہلی بار اس علاقے میں آئے تھے لیکن ہمیں یہاں کی وضاحت اتنی اچھی طرح کر دی گئی تھی کہ اب راستہ بالکل آسان لگ رہا تھا۔

پیٹ بھری نیند نے اثر دکھایا۔ میں اور حسن علی تو گھوڑے بیچ کر سوئے۔ خود ماہ پارہ بھی نہ چاہتے ہوئے غافل گئیں۔ ہم وہیں ہری بھری گھاس پر دراز تھے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی جیپ سڑک پر آتے ہی حسن علی نے اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا کہ ماہ پارہ کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے اگر ہم ذرا دیر سے پہنچے تو کوئی آفت نہیں آجائے گی۔"

"ممکن ہے آ ہی جائے اس علاقے میں موسم کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اول تو تاریکی میں راستے تلاش کرنا ناممکن ہوتا ہے اور اگر بارش وغیرہ ہوگئی تو کوئی راہ بتانے والا بھی نہیں ملے گا۔ ساری رات جیپ میں ٹھٹھرتے گزرے گی۔"

بعض اوقات کارکنان قضا و قدر منتظر ہوتے ہیں کہ ادھر آدمی کے منہ سے کوئی بات نکلے اور اُدھر وہ اسے اُچک کر بابِ قبولیت تک پہنچا دیں۔ میں نے دیکھا کہ دور جنوب مشرق سے سیاہ گھٹائیں اُمڈتی چلی آرہی تھیں۔ حسن علی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور رفتار بڑھا دی۔ اب ہم ایبٹ آباد شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر تھے اور اس سے دو تین میل پہلے ایک ذیلی سڑک مغرب کی طرف گھوم جاتی تھی جو آگے جا کر ایک وادی میں ختم ہوتی تھی۔ اس وادی میں صاحبِ ثروت لوگوں نے بنگلے اور کاٹیج بنا رکھے تھے۔ جس میں وہ گرمیوں میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ آکر ٹھہرا کرتے تھے۔

ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بادلوں نے آسمان پر قبضہ کر کے ماحول کو تاریک کر دیا۔ مجبوراً حسن علی کو رفتار کم کرنی پڑی تھی۔ اس نے تشویش سے کہا۔ "اگر بارش ہوگئی تو جیپ چلانا مشکل ہوجائے گا۔"

"خدا نہ کرے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "محترم ذرا اچھی بات منہ سے نکالیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے موسم کا ذکر کیا تھا اور بادل آدھمکے اب آپ......" میری بات ادھوری رہ گئی۔ بجلی ایسی تڑپ کر چمکی تھی کہ ماہ پارہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ آسمان یوں روشن ہوگیا جیسے فلیش چمکی ہو۔ ایک منٹ بعد ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کا سلسلہ اتنا تیز ہوا کہ کچھ ہی دیر میں سارا ماحول جل تھل ہوگیا۔ پانی کی برستی چادر کی وجہ سے دس گز کے فاصلے پر موجود چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ ایسے میں ڈرائیونگ کرنا بلاوجہ حادثے کو دعوت دینے والی بات تھی۔ لہٰذا حسن علی نے سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چٹان تلے جیپ روک لی۔ یہاں پانی کی بوچھاڑ کم تھی لیکن جیپ میں ہم ویسے ہی محفوظ تھے۔ انجن بند کرنے کے بجائے اسے چلتا رہنے دیا تا کہ بعد میں اسے سٹارٹ کرنے میں کوئی مسئلہ نہ بنے۔ پہاڑی علاقوں میں بارش جتنی تیزی سے شروع ہوتی ہے اتنی ہی تیزی سے بند بھی ہوجاتی ہے۔

دو گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا لیکن رم جھم جاری تھی۔ آسمان پر بدستور تاریک بادل تھے اور ان کے ٹلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ "میرا خیال ہے ہمیں آگے چلنا چاہیے۔" حسن علی بولا۔

"خدا کے لیے تم دیکھ نہیں رہے جا بجا ندی نالے جاری ہوگئے ہیں۔ سڑک پر بے انتہا پھسلن ہوگی۔"

"میں کم رفتار سے جیپ چلاؤں گا۔ یہاں رُکے رہے تو سردی سے جم جائیں گے۔"





واقعی ذرا سی دیر میں جیپ کے اندر کا ماحول یخ بستہ ہوگیا تھا۔ باہر کی سردی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ جیپ چلنے کی صورت میں کم سے کم ہیٹر آن ہوجاتا تو سردی کا اتنا احساس نہ رہتا۔ ایندھن کی ہمیں فکر نہیں تھی۔ راستے میں ایک جگہ نہ صرف جیپ کی ٹنکی فل کرائی تھی بلکہ پیٹرول سے بھرے دس دس لیٹر کے دو کین بھی عقبی حصے میں رکھے تھے۔ طے ہوا کہ آگے روانہ ہوا جائے۔ حسن علی احتیاط سے جیپ سڑک پر لے آیا اور مستقل پہلے گیئر میں چلانے لگا۔ سڑک پر واقعی پھسلن ہوگئی تھی۔ ذرا سی ڈھلان آتے ہی جیپ کنارے کی طرف پھسلنے لگتی تھی۔ حسن علی مہارت سے جیپ کو مستقل دس بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھا رہا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے اور ہم ہنوز اپنی منزل سے خاصے دور تھے۔ دوپہر کو ضرورت سے زیادہ کھا لینے کے بعد بھوک کا احساس تو نہیں تھا لیکن کسی گرم شے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد سڑک پر ایک ریسٹورنٹ کا سائن بورڈ نظر آیا۔ ریسٹورنٹ سڑک سے ذرا ہٹ کر تھا اور بہ ظاہر بند ہی نظر آرہا تھا لیکن حسن علی نے جیپ اس کی طرف گھما لی۔ یہاں سے کوئی گرم چیز پینے کے علاوہ ہم راستہ بھی معلوم کر سکتے تھے۔ رات کی تاریکی میں اندازے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریسٹورنٹ کی پارکنگ تاریک تھی۔ البتہ سامنے والے حصے میں ایک بلب روشن تھا۔ یہاں کوئی نہ کوئی تھا مستقل ہارن دینے پر بالآخر روشنی ہوئی اور دروازے پر ایک نوجوان نمودار ہوا۔ چھتری لے کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

"جی جناب۔" اس نے خوش خلقی سے کہا۔ رات کو جگائے جانے پر بھی اس کے انداز میں ناگواری نہیں تھی۔

"یار دو کام ہیں ایک تو کوئی پینے والی چیز چاہیے۔ کافی چائے بلکہ اس وقت تو جوشاندہ بھی چلے گا۔" حسن علی بولا۔

"مل جائے گی۔" اس نے کہا۔ "اور دوسرا کام؟"

"ہمیں راستہ معلوم کرنا ہے۔"

"یہ ذرا مشکل ہے لیکن میں بابا کو جگاتا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک ایک پتھر سے واقف ہیں آپ اندر آجائیں۔"

حسن علی نے احتیاطاً انجن چلتا رہنے دیا۔ البتہ اس نے چابی نکال کر دروازے لاک کر دیئے تھے۔ اوپر کے سامان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ سادہ سا تھا۔ مرکزی ہال میں درجن بھر میزیں تھیں۔ عقبی حصے میں دیواروں پر کھڑکیوں کے بجائے شیشے تھے۔ جن سے یقیناً پہاڑوں کا منظر خوب صورت نظر آتا ہوگا مگر اس وقت سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک بوڑھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی رائفل بتا رہی تھی کہ وہ چوکیدار تھا لیکن موسم نے اسے اندر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک اور بچھا بستر ظاہر کر رہا تھا کہ نوجوان یہیں دراز تھا۔ اس جگہ ایک آتش دان بھی تھا

جس میں آگ دہک رہی تھی۔ نوجوان شاید یہاں ملازم تھا۔ اس نے چوکیدار کو اُٹھایا۔ جو خاصی مشکل سے بے دار ہوا تھا۔ نوجوان اسے ہمارے بارے میں بتا کر کچن میں چلا گیا۔ بڑے میاں کو مکمل طور پر بے دار ہونے میں خاصی دیر لگی تھی۔

''جی صاحب ام آپ کی کیا خاطر کرے؟'' اس نے کہا۔

حسن علی نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کس مقام تک جانا تھا۔ بوڑھے نے بیڑی نکال کر سلگائی اور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''ام جان گیا۔ ابھی آپ ادر سے نکلے گا، اسی روڈ پر جائے گا۔ ایک چھوٹا پُل آئے گا پھر ایک بڑا پُل آئے گا۔ پُل کے بعد دو میل اور سیدھا ہاتھ پر راستہ نکلے گا۔ آپ اس پر مڑ جائے گا۔ سیدھا وادی تک جائے گا۔ راستے کے شروع میں سفید رنگ کا دیوار ہے جس پر جانے کا اشارہ بنا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' حسن علی نے سر ہلایا۔ ماہ پارہ آتش دان کے پاس ہاتھ تاپ رہی تھیں۔

معاً میری توجہ ایک کونے میں رکھی دو ٹوٹی کرسیوں پر پڑی تھی کرسیاں ریسٹورنٹ کی ہی تھیں۔ ان کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہ آج ہی ٹوٹی ہیں میں ان کے پاس ہی میز پر جا بیٹھا۔ آتش دان کے باعث اندر کی فضا میں فرحت بخش حرارت تھی۔ کچھ دیر بعد نوجوان بھاپ اُڑاتی چائے لے آیا۔ حسن علی کی فرمائش پر اس نے ایک کپ کافی بھی بنا دی تھی۔ اس نے بسکٹ اور نمکو کی پیش کش کی تھی لیکن ماہ پارہ نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ آتے ہوئے وہ اس قسم کی ڈھیر ساری چیزیں بھی خرید لائی تھیں۔ ان میں کئی طرح کے بسکٹ، چپس، نمکو، چاکلیٹ اور پیک سینڈوچ تھے جو نوجوان نے ہمیں گرم کر کے لا دیئے۔ ان سے میری اچھی خاصی تسلی ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر گرم چائے کے دو کپوں نے پوری کر دی تھی۔ اب میں اتنی توانائی محسوس کر رہا تھا کہ ساری رات سفر کر سکتا تھا۔ ماہ پارہ اور حسن علی اپنی بات کر رہے تھے نوجوان میرے پاس آ بیٹھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے اسے اپنی منزل کے بارے میں بتایا۔ وہ چونکا۔ ''ادھر تو میرا چاچا بھی رہتا ہے۔ اگر کسی قسم کی بھی خدمت ہو تو اس سے ضرور بولیے گا۔'' پھر اس کی نظر ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر پڑی تو اس نے زیرِ لب کہا۔ ''داؤس کے بچے۔''

''کیا یہاں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟'' میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

اس نے منہ بنایا۔ ''دو حرامی آئے تھے۔ بدتمیزی کر رہے تھے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے جواب دیا تو انہوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ مالک تھا نہیں وہ واپس آیا تو اس نے بھی مجھے ذمے دار قرار دیا اور کہا کہ سارا نقصان میری تنخواہ سے کاٹے گا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔'' اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ؟''





''کسی جیپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ وہ یہاں سے تو نہیں گزری۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم ہم یہاں کام کرتے ہیں سارا دن گاڑیاں تھوڑی دیکھتے رہتے ہیں۔''

''کس جیپ کے بارے میں؟'' میری دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔

''ہلکے نیلے رنگ کی جیپ تھی جس کی سائیڈوں پر گہرے نیلے رنگ سے پروں کے نشانات بنے تھے۔''

میں نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔ وہ ہماری جیپ کا ذکر کر رہا تھا۔ ''وہ کس گاڑی پر آئے تھے۔''

''کھٹارا سی ڈاٹسن پک اَپ تھی سفید رنگ کی۔''

مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ وہی پک اَپ تھی جسے میں نے دیکھا تھا۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص پر مجھے ارشد بلا کا شبہ ہوا تھا اور وہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ نشیب میں کھڑی ہونے کی وجہ سے اسے ہماری جیپ نظر نہیں آئی تھی اور وہ رُکے بغیر آگے نکل گئے اور بعد میں ہماری جیپ کو تلاش کرتے رہے تھے۔ وہ اس ریسٹورنٹ میں آئے اور نوجوان سے جھگڑے کے بعد انہوں نے بدمعاشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرا شک درست تھا یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ارشد بلا ہی تھا۔ وہ ہماری ہی تلاش میں تھا۔

میں نے نوجوان کے سامنے کچھ نہیں کہا لیکن جیسے ہی وہ باورچی خانے میں گیا میں نے مختصر الفاظ میں حسن علی اور ماہ پارہ کو ساری بات بتائی۔ حسن علی چونکا تھا۔

''یہ ممکن نہیں ہے اگر ارشد بلا کسی طرح پولیس کی گرفت سے نکل بھی جاتا تب بھی وہ اسی طرح آزادی سے دندناتا نہیں پھر سکتا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' میں نے شانے ہلائے۔ ''ہماری پولیس گرفتار کرنے پر آئے تو زلزلے کے وائرس کو بھی مرض پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر لے۔ ورنہ ہاتھی ان کے سامنے گنے کا کھیت اُجاڑتا ہے۔''

ماہ پارہ بے اختیار ہنسیں۔ حسن علی نے انہیں گھورا۔ ''اگر یوسف کا اندیشہ درست ہے تو یہ بے حد تشویش ناک بات ہے۔ آخر وہ ہمارے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے اس خاکسار کے لیے۔ میں نے نہ صرف ان کے عزائم کو ناکام بنایا بلکہ ان کے چار بندے بھی پولیس کے ہاتھ لگے۔'' ماہ پارہ نے میری تائید کی۔

''یوسف صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں مقامی پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''درست اور ہمیں خود بھی محتاط رہنا ہوگا۔'' حسن علی نے کہا اس لمحے نوجوان آ گیا۔ اس نے بل دیا حسن علی نے ادائیگی کی۔ میں نے دو سو الگ سے اسے دیئے۔ ''یہ اس نقصان کی تلافی کے

لیے۔'' میں نے ٹوٹی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ صاحب۔'' نوجوان خوش ہوگیا۔ ''میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔ تنخواہ کٹ جاتی تو اس مہینے میری بہن کی فیس نہ جاتی۔ وہ میٹرک کر رہی ہے۔''

''تمہارے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں؟'' ماہ پارہ بولیں۔

''جی بیگم صاحبہ! میرا تو بچپن محنت مزدوریوں میں گزر گیا لیکن اپنے بہن بھائیوں کو میں تعلیم دلوا رہا ہوں۔''

ہم باہر آئے تو نوجوان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے پہلی بار غور سے ہماری جیپ کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو اس کی نظریں جیسے جم گئیں پھر اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ''خدا آپ کو ہر آفت اور ہر دشمن سے محفوظ رکھے۔''

''شکریہ دوست۔'' میں نے کہا اور ہم جیپ میں سوار ہوگئے۔ جب تک جیپ سڑک تک نہیں پہنچ گئی نوجوان وہیں کھڑا رہا تھا۔ اس نے واضح طور پر پہچان لیا تھا کہ ان بدمعاشوں کی مطلوبہ جیپ یہی تھی جس میں ہم سوار تھے۔

ہلکی سی بارش اب بھی جاری تھی۔ بجلی کی گرج چمک میں کمی آ گئی تھی لیکن بادلوں کے تیور میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ بارش کا سلسلہ غیر معینہ مدت تک جاری رہے گا۔ ممکن ہے اس میں تیزی بھی آ جائے۔ تیز بارش کا پانی بہہ چکا تھا اور بہنے والے ندی نالے اپنی جون میں واپس آ گئے تھے۔ حسن علی نے جیپ کی رفتار پندرہ بیس میل فی گھنٹہ تک رکھی تھی۔ ٹریفک نہ ہونے سے بھی آسانی ہوگئی تھی۔ بارہ بجے ہم نے چھوٹا پُل عبور کر لیا تھا۔ ماہ پارہ پچھلی نشست پر آ گئی تھیں اور ہم بوریت دور کرنے کے لیے باتیں کر رہے تھے۔ حسن علی کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ معاً عقبی آئینے میں روشنی سی لہرائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ آسمان صاف تھا۔ بجلی نہیں چمکی تھی پھر یہ روشنی سی کیوں لہرائی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمارے پیچھے کوئی گاڑی آ رہی ہے۔'' میں نے حسن علی سے کہا۔

اس نے چونک کر عقب میں دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی ہے۔''

''ممکن ہے کوئی اور ہو۔'' ماہ پارہ بولیں۔

''ہوسکتا ہے کوئی اور ہو۔'' حسن علی نے اس سے اتفاق کیا۔ ''لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''

اس وقت جیپ بڑے پُل کو کراس کر چکی تھی۔ نسبتاً بہتر سڑک آنے کے بعد حسن علی نے جیپ کی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ تیس پینتیس کی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ اگرچہ رات اور موسم کو دیکھتے ہوئے یہ رفتار بھی زیادہ تھی لیکن اگر خطرہ پیچھا کر رہا تھا تو جان بچا کر بھاگنا درست ہی تھا۔ چند منٹ بعد ہی مطلوبہ سڑک آ گئی جو ہماری منزل مقصود تک جاتی تھی۔ یہ نسبتاً تنگ اور پیچ




دار راستہ تھا جس میں جا بجا موڑ تھے۔ یہاں رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ عقب میں اب لہرانے والی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ لوگ شاید پیچھے رہ گئے تھے یا پھر کوئی دوسری گاڑی تھی ریسٹورنٹ کے چوکیدار کے بیان کے مطابق یہ سڑک تقریباً چار پانچ میل لمبی تھی۔ گویا ابھی نصف گھنٹے کی مسافت اور تھی۔

وادی میں داخل ہوتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ منزل آ گئی تھی۔ اب کچھ دیر بعد میں گرم بستر میں گہری نیند سو رہا ہوں گا۔ میں نے سوچا دو مرتبہ غلط بنگلوں کے سامنے جا کر بالآخر ہم نے صحیح بنگلہ تلاش کر لیا تھا۔ تاریکی میں اس کے تاریک در و دیوار کسی بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق چوکیدار سوار خان یہیں رہتا تھا لیکن مسلسل ہارن کے جواب میں وہ نمودار نہیں ہوا تو مجبوراً ہمیں نیچے اُترنا پڑا۔ نیچے اُترتے ہی میں لرز اُٹھا تھا۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ غالباً چوکیدار اندر کہیں کھڑکیاں دروازے بند کیے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

''یہ چوکیدار کہاں مرگیا ہے۔'' حسن علی نے [illegible] دی گیٹ کی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ خوش قسمتی سے اندر صرف کنڈا لگا تھا۔ وہ کھولا اور جیپ اندر پورچ میں لے گئے۔ گیراج میں البتہ تالا لگا تھا۔ مرکزی دروازے بھی بند تھے حسن علی پیچھے چکر لگا آیا۔ چوکیدار کا کوارٹر بھی بند پڑا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ مجبوراً ایک شیشہ توڑ کر کھڑکی کو کھولا گیا اور ہم اس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ حسن علی اور میں نے سامان بھی اسی راستے سے اندر پہنچایا تھا۔ جیپ کی چھت پر لدے سوٹ کیس صبح کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ بنگلے کا مین سوئچ عقبی حصے میں تھا۔ اس کو آن کرتے ہی کئی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ وہ کمرا بھی منور ہوگیا تھا جس میں ہم کھڑے تھے۔ دو منزلہ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار کمرے نیچے تھے اور دو کمرے اوپر تھے۔ کچن اور سٹور روم نیچے ہی تھا۔ بنگلے کی صفائی ستھرائی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے حال ہی میں صاف کیا گیا تھا۔ میں نے فون چیک کیا وہ مرا پڑا تھا۔ یعنی ڈیڈ تھا۔ اس موسم میں یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔

ماہ پارہ اوپر والے حصے کا معائنہ کرنے چلی گئی تھیں۔ حسن علی نے چابیوں کا ایک گچھا تلاش کر لیا تھا اور اب اسے گیراج میں لگے تالے پر آزمانے گیا تھا۔ میں نچلے بیڈ روم میں آتش دان سلگا رہا تھا۔ نیچے ڈرائنگ روم کے علاوہ ڈائننگ روم، ایک سٹڈی روم اور ایک بیڈ روم تھا۔ فیصلہ ہوا تھا کہ آج رات سب اس بیڈ روم میں سوئیں گے۔ ڈبل بیڈ تھا۔ اسے ماہ پارہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں اور حسن علی نیچے دبیز قالین پر کمبلوں میں لیٹ کر سو جاتے۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ ماہ پارہ کو اوپر گئے خاصی دیر ہوگئی۔ نہ تو وہ واپس آئی ہیں اور نہ ہی اوپر سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ میں آتش دان میں رکھی لکڑی کو آگ دکھا چکا تھا۔ لہٰذا میں اوپر کی طرف روانہ ہوا۔ اوپر جانے والی سیڑھیاں ڈائننگ روم سے گزر کر ایک گیلری میں کھلی تھیں۔ جس کے دائیں بائیں دونوں بیڈ روم تھے۔ گیلری کی روشنی بند

تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ یہ گیلری کچھ دیر پہلے روشن کی تھی جب میں ماہ پارہ کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے ایک بیڈروم میں جھانکا۔ بیڈروم میں روشنی تھی لیکن وہ خالی پڑا تھا۔ دوسرا بیڈ روم بھی خالی تھا۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ ماہ پارہ کہاں گئیں۔ باتھ روم بھی خالی تھا مجھے پہلے بیڈ روم کے باتھ روم کا خیال آیا۔ میں اس میں داخل ہوا۔ باتھ روم کھولا ہی تھا کہ وہاں فرش پر ماہ پارہ کو بے سدھ پڑے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔



ممکن ہے میری جگہ کوئی عام حالات میں پرورش پانے والا چودہ سال کا لڑکا ہوتا تو سر پر لگنے والی یہ ضرب اس کے لیے کافی ثابت ہوتی اور فوراً انٹا غفیل ہو جاتا لیکن گزشتہ دو سال میں حسن علی نے جس طریقے سے میری تربیت کی تھی اس نے مجھے اور میرے سر دونوں کو خاصا سخت جان بنا دیا تھا۔ اس لیے ضرب لگنے کے باوجود میں فوری طور پر بے ہوش نہیں ہوا۔ ہاں فرش پر ضرور گر گیا اور خود کو یوں بے حس و حرکت بنایا جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ہوں۔ اندر سے میں ذہن پر طاری ہونے والی بے حسی سے لڑ رہا تھا۔

''یہ بھی گیا۔'' میں نے کسی کی آہستہ لیکن کرخت آواز سنی۔ مجھے لگا جیسے یہ آواز پہلے بھی کہیں سن چکا تھا۔

''پہلے اس زنانی کو لے جانا ہے۔'' دوسری آواز نے دریافت کیا۔

''زنانی کی اولاد پہلے اس کی فکر کرو جو نیچے گیا ہے۔'' کرخت آواز والے نے دوسرے کو ڈانٹا۔ ''وہ تم سب کا باپ ہے۔''

''ادھر پھٹو اور سدی ہیں۔'' دوسرے نے غالباً کام ٹالنے کی کوشش کی اس پر کرخت آواز والے نے ماہ پارہ کو اس کی والدہ محترمہ قرار دیا۔

''اس ماں کو چھوڑ اسے بعد میں دیکھتے رہنا نیچے جا۔''

''اچھا استاد۔'' دوسرے نے بادلِ نخواستہ روانگی اختیار کی۔

اس وقت تک میرا ذہن کسی قدر بے دار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں چاہوں تو اُٹھ بھی سکتا ہوں لیکن فی الوقت ایسا کرنا نادانی میں شمار ہوتا۔ میری ذرا سی حرکت سے چوکنا ہو کر استاد معظم مجھے سچ مچ بے ہوش کر دیتے۔ اس لیے میں صبر سکون سے انتظار کرنے لگا کہ میرے اعصاب پوری طرح میرے قابو میں آ جائیں۔ میں اس طرح فرش پر پڑا تھا کہ میرا ایک رُخسار فرس پر تھا اور جسم گول مول سی پوزیشن لیے تھا۔ چہرہ میرا باتھ روم کے اندرونی حصے کی طرف تھا۔ اس لیے میں نے نچلی آنکھ کھول کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ذرا سی جھری سے مجھے فرش پر سچ مچ بے ہوش پڑی ماہ پارہ نظر آئیں۔ وہ نازک سی عورت تھیں لیکن مارنے والے نے بے دردی سے ان کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر پیشانی تک آ رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اتنی وسیع





دنیا میں اگر کسی نے مجھ سے بے غرض محبت کی تھی تو وہ یہی ماہ پارہ تھیں۔ بے شک مجھ سے کاجل بھی محبت کرتی تھی لیکن یہ بے غرض محبت نہیں تھی۔ اس کی محبت مانگتی اور حاکمیت جتاتی محبت تھی۔ جمشید علی بھی مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن ان کی محبت بھی بے غرض نہیں تھی۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت مجھے جمشید پیلس میں لائے تھے اور اب ایک خاص مقصد کے تحت میری پرورش کر رہے تھے۔ مقصد سے میں لاعلم ہی تھا۔ ماہ پارہ کا مجھ سے کوئی مفاد نہیں تھا۔ جمشید پیلس میں وہ میری وجہ سے مقیم تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے زہرہ بیگم کی نفرت اور اس سے بھی بڑھ کر بے جا شک برداشت کیا۔ زہرہ بیگم میں کھلے لفظوں میں کہنے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن ان کے ڈھکے چھپے لفظوں کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ وہ ماہ پارہ کو جمشید علی کی داشتہ سمجھتی ہیں۔

اس وقت ماہ پارہ کو بے بسی کی حالت میں دیکھ کر میری رگوں میں دوڑنے والا خون آگ بن گیا تھا۔ میں نے چھریرے جسم کے ایک شخص کو ماہ پارہ کے نزدیک بیٹھے دیکھا۔ اس نے چمڑے کی سرخ جیکٹ پہن رکھی تھی اور پراونی ٹوپی سے اس کے لمبے بال شانوں تک آ رہے تھے۔ چہرہ دوسری طرف تھا۔ پھر نظر آنے والے ہاتھوں سے ظاہر تھا کہ وہ گوری رنگت کا جوان شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ اڑتیس کا شاندار سا پستول تھا۔ وہ اس کی نیلگوں نال ماہ پارہ کے رخسار پر پھیر رہا تھا۔

''ہے تو بھرپور۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے سے چھلکتی خباثت محسوس کر کے میرا خون مزید کھولنے لگا تھا۔

یہ خاصا وسیع و عریض اور جدید طرز کا باتھ روم تھا۔ اس میں باتھ ٹب سے لے کر اسٹیم باتھ تک سارے انتظامات تھے۔ ماہ پارہ ٹب کے پاس پڑی تھیں اور مجھ سے ان کا فاصلہ کوئی دس فٹ تھا۔ وہ خبیث ان کے سر کے پاس بیٹھا تھا۔ اس طرح مجھے اس کا چہرہ تو نہیں لیکن ماہ پارہ دکھائی دے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ پسٹل کی نال چہرے سے پھسل کر نیچے جانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اشتعال کو دباتے ہوئے اپنے خیالات کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے حسن علی کے بارے میں سوچا کہ کیا وہ بھی پکڑا گیا تھا۔ ابھی تک نیچے سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ ایک انگریزی محاورے کے مطابق کسی خبر کا نہ ہونا ہی اچھی خبر ہے۔ نیچے کی نفری کی طرف سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ حسن علی نے ان پر قابو پا لیا تھا اور اب خاموشی سے انہیں ٹھکانے لگانے میں مصروف تھا۔

معاً کپڑا اچرنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نچلی آنکھ خفیف سی کھولی اس حرام زادے نے ماہ پارہ کی قمیص سامنے سے پھاڑ دی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ میں اُٹھ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور نتائج کی پروا کیے بغیر اسے جہنم رسید کرنے کی کوشش کروں لیکن حسن علی کی دی ہوئی تربیت میرے کام آئی۔ اس نے مجھے دشمن پر فتح حاصل کرنے کا ایک ہی گُر سکھایا تھا۔ چوٹ اس وقت مارو جب لوہا پوری طرح گرم ہو۔ ورنہ تمہاری کوشش رائیگاں جائے گی۔ دشمن کی پشت میری طرف تھی

اور اگر میں اُٹھ کر اس کی طرف جھپٹتا تو درمیانی فاصلہ اس کوشش کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اسے پلٹ کر مجھے شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ لگتا۔ اپنے اطوار سے وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ اسلحے اور اس کے استعمال سے پوری طرح آشنا، میری اس کوشش کو ایک گولی نہایت آرام سے ناکام بنا دیتی اور پھر وہ ماہ پارہ کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوتا۔ اس کی دست درازی کے باوجود مجھے یقین تھا کہ فی الوقت ماہ پارہ کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی وہاں پر کوئی ایسے شے نہیں تھی جس سے میں ہتھیار کا کام لے سکتا۔ باتھ روم میں اس قسم کی کسی شے کی گنجائش تھی ہی نہیں اور بغیر کسی ہتھیار کے اس پر حملہ کرنا بالآخر خودکشی بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ اس لیے میں صبر کو اس کی آخری حد تک آزماتے ہوئے ساکت لیٹا رہا۔ پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا سوہنی تجھ سے کچھ دیر بعد ملیں گے۔'' وہ کھڑا ہوا تو میں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔ میں نے خود کو چونکنے سے بچایا۔ وہ وہی شخص تھا جس کی جھلک مجھے سفید رنگ کی ڈاٹسن میں نظر آئی تھی۔ وہ ارشد بلا سے مشابہہ تھا۔ اس کے نقوش، چھریری جسامت اور رنگت بالکل ارشد بلا جیسی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس کا بھائی یا کوئی قریبی رشتے دار ہو۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے آنکھ بند کر لی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں پہلے سے تیار ہو گیا جب اس نے میری پسلی میں جوتے کی نوک ماری تو میں بے جان انداز میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ اس نے تین چار ناگفتن کہہ کر باتھ روم سے باہر کا رُخ کیا۔ غالباً میری طرح اسے بھی تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ اس کے کمرے کی طرف جاتے ہی میں نے موقع پا کر پسلی سہلائی۔ شکر ہے میرا رُخ دوسری طرف ہو گیا تھا۔ ورنہ مجھے ماہ پارہ کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کا منظر دیکھنا پڑتا نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں اب کمرے کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ ارشد بلا کا جڑواں بھائی یا کوئی اور رشتے دار اب کمرے کے وسط میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ باتھ روم کی طرف دیکھتا تو ماہ پارہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں ہوس زدہ ہو جاتی تھیں میں نے دل میں سوچا۔

''خبیث مردود ایک بار تُو قابو میں آجائے تو تیری یہ آنکھیں نکال دوں۔''

کچھ دیر بے قراری سے ٹہلنے کے بعد وہ باہر گیلری میں گیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دوبارہ واپس آ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو آواز نہیں دی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ کہیں حسن علی ابھی تک آزاد ہو اور اس کی آواز سے ہوشیار نہ ہو جائے اس کی بے قراری میں ہر گزرتے لمحے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا اندازہ پنجابی اور اردو کے ان منتخب الفاظ سے بھی ہوتا تھا جو بلا رکاوٹ اس کے منہ سے برآمد ہو رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ یہاں سے دفع ہو جائے تا کہ مجھے ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملے۔ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ کسی قدر تذبذب کے بعد اس نے نیچے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ساتھیوں کے اب تک واپس نہ





آنے اور کوئی جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ تشویش زدہ ہو رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رُکا۔ پھر میری طرف آیا۔ اس کے عزائم بھانپ کر میں نے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس بار اس نے میرے پیٹ میں ٹھوکر ماری تھی۔ ایک بار پھر قیامت سی گزر گئی تھی۔ درد کی شدت نے مجھے تڑپانا چاہا لیکن میں ضبط کر کے رہ گیا۔ میری ذرا سی حرکت میری اب تک کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتی تھی۔

اپنا اطمینان کر کے وہ خبیث النسل شخص باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک منٹ بعد میں چیتے کی طرح اُٹھا لیکن کسی سال خوردہ چیتے کی طرح۔ سرد فرش پر مسلسل بے حس و حرکت رہنے سے میرے سارے رگ و پٹھے زنگ کھائی مشین کی طرح جام ہو چکے تھے۔ بہ مشکل میں کھڑا ہوا۔ اس عمل کے دوران پیٹ پر قیامت بیتتی رہی۔ اس نے نہایت بے دردی سے ٹھوکر ماری تھی۔ احتیاط سے باہر گیلری میں جھانکا۔ پھر سب سے پہلے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کنڈی لگانے کے بعد ان کے لیے اسے کھولنا بے حد مشکل تھا۔ پھر میں نے ماہ پارہ کو دیکھا۔ ان کی نبض کی حالت تسلی بخش تھی لیکن جسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔ ان کی قمیص کے پھٹ جانے والے حصے کی پردہ پوشی میں نے سوئٹر کی زپ چڑھا کر کی اور پھر انہیں اُٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ اوڑھانے کے لیے کوئی شے نہیں تھی مگر بستر باتھ روم کے فرش کے مقابلے میں گرم تھا۔

استاد بھی نیچے جا کر غائب ہو گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ حسن علی نے ان سب کا قلع قمع کر دیا ہو، خاص طور سے اس استاد کے بچے کا، مجھے جب اس کی ماہ پارہ کے ساتھ دست درازی یاد آتی تھی میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ کمرے میں ہتھیار کے نام پر دستیاب ہونے والی واحد شے آتش دان کی راکھ کریدنے والی سلاخ تھی۔ اس دو فٹ لمبی سلاخ سے کام لیا جا سکتا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ بند ہونے کے بعد باہر جانے کا ایک ہی راستہ تھا یعنی بالکونی۔ اس سے کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا۔ میں نے احتیاط سے جا کر نیچے جھانکا۔ یہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا۔ یہاں مختصر سا باغ تھا۔ دراصل یہ بنگلے کے پاس سے شروع ہونے والی پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ جس کا ایک حصہ دیوار کی مدد سے بنگلے کی حدود میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ نیچے حسن علی اور استاد کے آدمیوں کے درمیان کوئی معرکہ ہوا بھی تھا تو اس کا مرکزی اسٹیج بنگلے کے سامنے والا حصہ تھا۔ عقبی حصے میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ بالکونی سطح زمین سے کوئی چودہ فٹ اونچی تھی۔ اگر میں اس کی نچلی ریلنگ پکڑ کر لٹک بھی جاتا تو بھی میرے پیر زمین سے کوئی آٹھ فٹ اونچے ہوتے۔ اگرچہ یہ خاصی بلندی نہیں تھی حسن علی نے مجھے اس سے بھی اونچی جگہوں سے چھلانگ لگانے کی مشقیں کروائی تھیں لیکن اول تو نیچے تاریکی کے باعث زمین کی سطح کا اندازہ نہیں تھا عین ممکن تھا میں کسی نوکدار پتھر پر جا گرتا یا پھر ابھی میں نیچے اُتر ہی رہا ہوتا کہ استاد یا اس کا کوئی گرگا اس طرف آ نکلتا اور مجھے نیچے سے گولی مار دیتا۔ جسم نیچے جاتا اور روح بالکونی سے اوپر کی طرف پرواز کر جاتی بہرحال نیچے جانا تھا۔ احتیاطاً میں نے بستر پر رکھا سفید تکیہ نیچے پھینک دیا اور پھر خود ہی ریلنگ پر سے لٹک کر اس تکیے پر چھلانگ لگا دی۔ خلاف

توقع نیچے نرم زمین تھی۔ اس لیے آواز بھی نہیں ہوئی۔ مزید خوش قسمتی کہ بنگلے کے اس طرف کوئی تھا بھی نہیں۔ استاد اور اس کے گرگے جانے کہاں مر گئے تھے۔ حسن علی بھی ان سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ زمین پر گرتے ہی میں ساکت ہو گیا۔ چند لمحے سن گن لیتا رہا۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو زمین پر لیٹے لیٹے ہی بنگلے کے اگلے حصے کی طرف جانے لگا۔ کہنے کو گرمیوں کا موسم تھا مگر سطح سمندر سے کوئی آٹھ ہزار فٹ بلندی کی وجہ سے موسم بے حد سرد تھا۔ زمین جیسے برف کی بنی تھی اور اس پر لیٹ کر رینگنا خاصا مشکل کام تھا۔ دیوار سے سر نکال کر میں نے دائیں پہلو کی طرف جھانکا۔ اگلے حصے میں پورچ تھا اور اس سے آگے گیراج اس کے ساتھ ایک پتلی سی گلی تھی جو عقبی اور اگلے باغ کو ملاتی تھی۔ اس طرف کچن اور ڈائننگ روم بھی تھا۔

میں نے آگے کی طرف رینگنے کا ارادہ کیا تھا کہ معاً ڈائننگ روم کی کھڑکی تلے لگی گلاب کی جھاڑیوں سے کوئی شے لڑھک کر میرے سامنے آ گئی۔ میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ شے مسلسل ہل رہی تھی اور ناک کے بل کچھ آوازیں بھی خارج کر رہی تھی۔ تاریکی کے باوجود مجھے احساس ہو گیا کہ وہ حسن علی نہیں تھا اگر حسن علی نہیں تھا تو پھر کون تھا۔ استاد یا اس کا کوئی گرگا جسے حسن علی نے باندھ کر ادھر ڈال دیا تھا۔ غالباً بے ہوش بھی کیا تھا اور اب وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ میں نے بلا ارادہ ہاتھ گھمایا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ وار اس کی کنپٹی پر لگا تھا۔ اسے دوبارہ جھاڑیوں کے سپرد کر کے میں نے آگے کی طرف رینگنا شروع کیا ہی تھا کہ بنگلے کے اگلے حصے سے کسی نے دل خراش آواز میں اپنی والدہ محترمہ کو یاد کیا۔ ''ہائے ماں جی۔''

آواز حسن علی کی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اطمینان ہوا کہ مارا جانے والا استاد یا اس کا کوئی ساتھی ہی ہے اور ظاہر ہے وہ حسن علی کا ہی نشانہ بنا ہو گا۔ یعنی وہ خیریت سے تھا۔ گیراج کے عقبی حصے میں پہنچ کر گلی میں گھستے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ میں دیوار سے چپک کر کھڑا تھا۔ اس بار بیل کی آخری ہچکی سے ملتی جلتی آواز آئی۔ یہ آواز بھی حسن علی کی نہیں تھی یعنی کوئی اور اس کا نشانہ بن گیا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ تھی جسے کان لگا کر ہی سنا جا سکتا تھا۔ آتش دان کی سلاخ میں ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ اس لیے آنے والے کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ بس یہ فکر تھی کہ کہیں حسن علی ہی نہ مارا جائے۔ چاپ بتا رہی تھی کہ آنے والا ادھر ہی آ رہا ہے اور اس کی بدقسمتی کہ وہ میری طرف پشت کر کے گلی میں گھسا تھا۔ گرم ٹوپی کے نیچے سے لٹکتے لمبے بالوں کی وجہ سے مجھے شناخت میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس لیے بلا تکلف سلاخ اس کی گدی پر ماری۔ اس نے چیخ ماری اور نیچے گر گیا۔ جلدی میں مجھ سے نشانہ صحیح نہیں لیا گیا تھا۔ وہ تڑپ کر پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں دبے کولٹ پسٹل کا رُخ میری طرف تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ گولی مار کر میری چودہ سالہ زندگی کا اختتام کرتا لیکن خدا نے مجھے مزید زندگی دی تھی۔ تاریکی میں ایک لات آئی اور اس کے ہاتھ سے پسٹل اُڑا دیا۔ اس نے پلٹ کر گالی دی۔ ٹھوکر نے اس کی کلائی بھی توڑ دی تھی۔





دوسری ٹھوکر نے اس کی زبان بند کر دی جو منہ پر پڑی تھی۔

''برخوردار مجھے تم سے اس اناڑی پن کی توقع نہیں تھی۔'' اندھیرے سے حسن علی کی آواز آئی۔ وہ کیونکہ پہلی بار بولا۔ اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ باقی سب پر بھی قابو پا چکا ہے۔

''بس عجلت میں ہاتھ ذرا غلط پڑ گیا۔'' میں نے ندامت سے کہا۔ ''اس حرام زادے نے ماہ پارہ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔''

''اس لیے تم نے احمقانہ انداز میں وار کر کے اسے موقع دیا کہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے۔'' حسن علی نے طنز کیا، میں کھسیا گیا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ جیسے استاد کے ہوتے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

حسن علی نے جھک کر استاد کا معائنہ کیا۔ ''بے ہوش ہو گیا ہے مردود۔ اس کے تین ساتھی اور ہیں ادھر لان میں پڑے ہیں۔''

''آپ نے اکیلے قابو کر لیے۔'' میں نے پُرستائش لہجے میں کہا پھر چونکا۔ ''استاد محترم ایک پٹھا ادھر بھی پڑا ہے۔''

''نہیں مجھے نہیں معلوم۔'' حسن علی اس طرف لپکا۔ ''کہیں بنگلے کا چوکیدار نہ ہو۔''

اس کا خیال درست نکلا تھا۔ یہ بنگلے کا چوکیدار ہی تھا جسے بے ہوش کر کے اور باندھ کے ادھر ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ حسن علی نے اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے پہچانتا تھا۔ اس نے چوکیدار کی مشکیں کھولیں اور اسے کندھے پر لاد کر بنگلے کے لیونگ روم میں لے آیا۔ اسی دوران میں نے اپنی بے وقوفی اور آنے والے کڑے وقت کا سوچ کر پچھتانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ کو جس بیڈ روم میں چھوڑا تھا اس کا دروازہ اندر سے بند تھا اور میں بالکونی کے راستے نیچے اُتر آیا تھا اور اب بالکونی کے راستے ہی اندر جانا پڑتا۔ حسن علی اس بات پر ہفتوں میری جان عذاب میں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''آپ ان سب کو دیکھیں میں ماہ پارہ کو دیکھتا ہوں۔'' میں نے باہر کی طرف رُخ کیا۔

''اس کے لیے باہر کہاں جا رہے ہو ماہ پارہ اوپر ہے۔''

اب مجھے بتانا پڑا۔ ''وہ دراصل میں نے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا اور بالکونی سے باہر آیا تھا۔ اس لیے جانا بھی اس طرف سے ہو گا۔''

اس سے پہلے کہ حسن علی کوئی نوکیلا جملہ کستا میں باہر نکل آیا۔ چوکیدار نے ایک درخت تلے کام کرنے والے اوزار رکھے تھے۔ ان کے ساتھ رسی بھی تھی۔ میں نے ایک لوہے کے آنکڑے سے رسی باندھی اسے اُچھال کر بالکونی کی ریلنگ میں اٹکایا اور دعا کی کہ یہ میرا ایک سو چالیس پونڈ کا وزن برداشت کر لے اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ ماہ پارہ بستر پر کسمسا رہی تھیں اور ان کے منہ سے کراہنے کی ہلکی ہلکی سی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ میں نے باتھ روم سے گلاس میں پانی لا کر تھوڑا انہیں پلایا اور کچھ

ان کے منہ پر چھڑکا تو وہ ہوش میں آ گئیں جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ مجھ سے چمٹ گئیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

"آرام سے مام، سب ٹھیک ہے، جس خبیث نے آپ کو زخمی کیا تھا اسے حسن نے اپنے طریقے سے بے ہوش کیا ہے۔"

"حسن کہاں ہے؟" وہ نحیف سی آواز میں بولیں۔

"استادِ محترم ان کا بنڈل بنا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان خبیثوں کا جو بنگلے میں گھس آئے تھے۔"

ماہ پارہ نے کراہ کر سر کا زخم چھوا۔ "میں باتھ روم میں گئی ہی تھی کہ کسی نے سر پر کچھ مارا۔" پھر انہیں کچھ محسوس ہوا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی قمیص ٹٹولی میں نے جھینپ کر نگاہیں پھیر لیں۔

"اس خبیث نے بدمعاشی کی تھی۔" میں نے بہ مشکل کہا۔

ماہ پارہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر باتھ روم کی کیبنٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا سامان تھا میں نے پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا۔ پھر اس پر مرہم لگا دیا۔ ٹیپ لگانے کی گنجائش بالوں کی وجہ سے نہیں تھی اور پرسری تھی اس لیے ہم نیچے آ گئے۔ حسن علی نے ان چاروں کو بھی لیونگ روم میں ڈال دیا تھا اور ان کے ہاتھ پیر ان کی قمیصوں سے باندھ دیئے تھے۔ استاد کا حشر تو میرے سامنے ہوا تھا باقی تین بھی اچھی حالت میں نہیں تھے۔ ایک کا جبڑا ٹوٹا تھا۔ بہر حال ان میں سے کوئی سنگین حالت میں نہیں تھا۔

چوکیدار ہوش میں آ گیا تھا یہ مقامی شخص تھا لیکن تربیت یافتہ بھی۔ اس کی زبان صاف اور فوجی انداز کی تھی میرا اندازہ بعد میں درست نکلا۔ وہ سابق ایس ایس جی کمانڈو تھا اس کے باوجود وہ بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔ ایک سفید ڈاٹسن پک اَپ بنگلے کے سامنے رُکی اور اس سے ایک شخص نے اُتر کر گیٹ بجایا۔ وہ کسی کا پتا معلوم کر رہے تھے۔ گل محمد نے انہیں پتا سمجھایا اور جیسے ہی گیٹ سے اندر آیا کسی نے اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عقبی دیوار پھاند کر بنگلے میں گھس آئے گا۔ سوال یہ تھا کہ یہ تھے کون؟

استادِ معظم اس حرام صورت کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ ارشد بلا کا کوئی ناجائز رشتے دار ہے اور اپنی شامتِ اعمال کی وجہ سے اس کا انتقام لینے کے لیے ہمارے پیچھے آیا ہے۔"

"خوش قسمتی سے مجھے گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ورنہ شامت اس وقت ہماری آ رہی ہوتی۔"

حسن علی کا لہجہ سرد تھا۔ "ماہ پارہ کہاں ہے اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" ماہ پارہ لیونگ روم میں آ گئیں۔ انہوں نے لباس بدل لیا تھا۔ "مجھے کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں پر کچن کہاں ہے۔"

حسن علی نے چوکیدار گل محمد کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "بی بی صاحب آپ بیٹھو میں




کافی بنا کر لاتا ہے۔"

ماہ پارہ آتش دان کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے چاروں کو غور سے دیکھا۔ پھر ارشد بلا سے مشابہ شخص کو دیکھ کر چونک گئیں۔ "یوسف درست کہہ رہا تھا یہ لوگ شروع سے ہمارے پیچھے تھے۔ اگر ہم لنچ کے لیے نہ رُکتے تو شاید ان کے بارے میں پتا بھی نہیں چلتا۔"

"بس جناب یہ استادِ محترم ہی خاکسار کی صلاحیتوں کو نہیں مانتے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"اس میں صلاحیت کہاں سے آ گئی۔" حسن علی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ تو اس نے اتفاقیہ دیکھ لیا تھا۔"

"یہ ناانصافی ہے۔" میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ "سب سے پہلے تو میری دیکھنے کی صلاحیت نے کام کیا اور پھر میرے کمپیوٹر جیسے دماغ نے ارشد بلا سے مشابہہ اس شخص کو بھی تاڑ لیا۔"

"یہ تو ہے۔" ماہ پارہ نے تائید کی۔ "اس نے راستے میں ہی تمہیں آگاہ کر دیا تھا۔"

"او کے خاتون۔" حسن علی نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ "تم اور تمہارا یہ لاڈلا ہی ساری عقل رکھتے ہیں۔"

"محترم آپ کو یہ بات مستقبل قریب میں صدقِ دل سے تسلیم کرنا پڑے گی۔" میں نے شوخی سے کہا تو ماہ پارہ شرما گئی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میں جمشید پیلس سے نکلتے ہوئے جتنا اُداس تھا ماہ پارہ اور حسن علی اتنے ہی خوش تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ پیلس کے قید خانے سے نکل کر آزاد فضا میں آ گئے تھے۔ یہاں کوئی ان پر نگران نہیں تھا۔ وہ جمشید علی کی نگاہوں سے دور تھے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ حسن علی اور ماہ پارہ کی محبت اس مرحلے تک آ پہنچی تھی کہ اب وہ ایک دوسرے سے ذرا دیر کے لیے بھی دور نہیں رہ سکتے تھے اور اس معاملے میں ان کی طرف سے کوئی فیصلہ بھی متوقع تھا۔ ممکن ہے یہ احساس اتنا درست نہ ہو لیکن وہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے جھلکنے والے جذبے کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

گل محمد کافی بنا کر لے آیا۔ کھانا ہم کھا چکے تھے اس لیے اس کی کھانے کی پیش کش مسترد کر دی تھی۔ ایس ایس جی کا یہ سابق کمانڈو ہرفن مولا تھا۔ جمشید علی نے بتایا تھا کہ وہ ڈرائیور اور مالی ہونے کے ساتھ ساتھ باورچی بھی تھا لیکن ہمارے جانے کی صورت میں وہ صرف گارڈ کا فرض ادا کرے گا۔ باقی کاموں کے لیے عارضی ملازم رکھے جائیں گے۔ ان ملازمین کا بندوبست گل محمد کو خود کرنا تھا۔ حسن علی نے اصرار کر کے ماہ پارہ کو کافی کے ساتھ اسپرین دی اور پھر سونے کے لیے بھیج دیا۔

"لعنت بھیجو ان پر۔" ماہ پارہ بولیں۔ "صبح نمٹ لینا ان سے۔"

حسن علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان سے بات کرنا بے حد ضروری ہے ممکن ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں۔"

ماہ پارہ کے جانے کے بعد حسن علی نے گل محمد کو بلا کر اس سے جیپ کے اوپر لدے سوٹ کیس اندر لانے کو کہا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ حسن علی نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں کم سے کم آج رات ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہے۔''

''رات کالی کرنے کے بجائے ان بدبختوں سے کیوں نہ پوچھ لیں۔'' میں نے استاد اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حسن علی نے غور کیا۔ ''یہ بے ہوش ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا اور اچانک استاد کے پیٹ پر ٹھوکر ماری وہ کراہا مگر بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ ''اب پوچھ لیجیے استاد معظم۔''

حسن علی کو میں اس کی ماہ پارہ کے ساتھ کی جانے والی دست درازی کے بارے میں بتا چکا تھا وہ بے حد سفا کی سے حرکت میں آیا اس نے زخمی استاد کے ٹوٹے ہاتھ پر پاؤں رکھا اور دباؤ ڈالا تو وہ تڑپنے پھڑکنے لگا۔ حسن علی نے کہا۔ ''کون ہو تم کس لیے آئے تھے؟''

''ہم چور ہیں۔'' اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا کے لیے...

حسن علی اس کے ہاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ استاد کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ اس کی چیخیں ماہ پارہ کو ڈسٹرب کرتیں اس لیے میں نے اوپر سے ہٹ کر ٹیپ لا کر اس کے منہ پر چپکا دیا۔ ''تمہیں اس وقت خدا یاد نہ آیا جب ایک بے بس عورت کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔'' حسن علی تلخی سے بولا۔

''ارشد بلا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جواب دو ورنہ یہ شخص ایسا ہے کہ تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ دے گا اور تمہیں مرنے بھی نہیں دے گا۔''

''ایسے۔'' حسن علی نے کہا اور اچانک جھک کر اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑ کر پیچھے کی طرف گھمائی۔ چٹ کی آواز سے انگلی کچی پنسل کی طرح ٹوٹ گئی۔ استاد نے دوبارہ تڑپنا پھڑکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ ناک سے غوں غاں بھی کر رہا تھا۔ میں نے منہ سے ٹیپ ہٹائی تو وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''خدا کے لیے اس شخص کو دور رکھو میں سب بتاتا ہوں۔'' آواز کے ساتھ اس کا جسم بھی لرز رہا تھا۔ میں نے افسوس سے اس شخص کو دیکھا۔ کچھ دیر پہلے ایک بے بس عورت پر دست درازی کرتے ہوئے اسے اپنی اس حالت کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں تھا۔ حسن علی نے اس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑی ہی تھی کہ اس نے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلانا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''کون ہو تم کہاں سے آئے ہو مرنے کے لیے؟''

''میرا نام......مرشد ہے۔'' وہ بولا۔ ''ارشد بلا میرا بھائی ہے۔''





''تم لوگ اس کا بدلہ لینے کے لیے ہمارے پیچھے آئے تھے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔ اس نے جواب دینے میں ذرا سی ہچکچاہٹ دکھائی تو حسن علی نے انگلی پر دباؤ ڈالا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''کوئی نہیں ہے بس ہم چار ہی آئے ہیں۔''

اگلے ہی لمحے حسن علی نے اس کی دوسری چھوٹی انگلی بھی توڑ ڈالی تھی۔ وہ ایک بار پھر تڑپنے پھڑکنے اور مغلظات بکنے لگا۔ اس نے حسن علی کو دیوانہ وار گالیاں دیتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ بے شک اس کے جسم کی ساری ہڈیاں توڑ دے لیکن وہ اسے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ اس اثناء میں مرشد کے دو اور ساتھی ہوش میں آ گئے تھے۔ صرف وہ بے ہوش تھا جس کا جبڑا ٹوٹا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے استاد کا انجام دیکھ رہے تھے۔ میں نے حسن علی سے دریافت کیا۔

''ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''یہ کیا جانتے ہوں گے۔'' اس نے حقارت سے کہا اور پھر اپنے لباس سے پستول نکالنے لگا۔ ''گولی مار کر ان کا قصہ ہی پاک کرتا ہوں۔''

گرگے حسن علی کی سفا کی ملاحظہ فرما چکے تھے۔ ان میں سے ایک کی ہمت جواب دے گئی۔

''خدا کے لیے مجھے مت مارنا میں بتاتا ہوں۔''

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' حسن علی نے اس کے سر کا نشانہ لے کر دریافت کیا۔

''ہمارے ساتھ دو بندے اور ہیں۔ وہ پیچھے کار میں آئے تھے۔'' اس نے یوں جلدی جلدی بتایا جیسے ایک لمحے کی تاخیر پر گولی چل جائے گی۔ ''جب ہم اس گھر میں گھسے تو وہ کار اس سڑک کے آگے کہیں رکی تھی۔''

''کیسی کار ہے، رنگ اور میک بتاؤ؟''

کار کا رنگ میک معلوم کر کے حسن علی نے گل محمد کو بلا کر اس کے بارے میں بتایا۔ ''اوپر سے نظر رکھو۔ اگر یہ کار یا کوئی مشتبہ شخص نظر آئے تو مجھے مطلع کرنا۔'' حسن علی نے اسے مختصر فاصلے پر کام کرنے والا ایک ہینڈ سیٹ ریڈیو دیا تھا۔ ایسا ہی ایک سیٹ اس کے پاس تھا۔ گل محمد چلا گیا۔

حسن علی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''یہ ارشد بلا گروپ کے لوگ ہیں۔ بہ ظاہر یہ ڈکیت گروپ ہے لیکن میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق یہ کہیں بڑے درجے کے مجرم ہیں۔ انہیں سیاست دانوں اور بعض بڑے سرکاری افسران کی حمایت حاصل ہے۔ اس حمایت کے بل پر یہ اسلام آباد جیسی حساس جگہوں پر کامیابی سے وارداتیں کرتے رہے ہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہماری وجہ سے ان کے چار ساتھی پکڑے گئے ہیں۔''

''اس لیے خاکسار کی گوشمالی کے لیے یہ افراد روانہ کیے گئے۔''

میں نے متفکر ہو کر کہا۔ ''ممکن ہے اگلی بار درجن بھر آئیں اور اس سے اگلی بار دو درجن۔ ہم کب تک ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے؟''

''میرا خیال ہے اس ہزیمت کے بعد وہ اِدھر کا رخ نہیں کریں گے۔'' حسن علی نے خیال ظاہر کیا۔

''اچھا ایسا کریں کہ مجھے تو سونے کی اجازت دیں۔''

''چار گھنٹے کے لیے۔'' حسن علی نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ''صبح چھ بجے اُٹھا دوں گا۔''

میں سر ہلا کر بیڈ روم میں چلا آیا۔ حسن علی ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ ماہ پارہ بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔ سارے دن کے سفر اور اوپر سے آتے ہی ہونے والی دھینگا مشتی کی وجہ سے میں بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سر کی ضرب اب اتنی دردناک نہیں رہی تھی۔ کافی کے ساتھ میں نے بھی اسپرین لے لی تھی۔ نیچے دبیز قالین تھا اور آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ کمرے میں ایک خوش گوار حدت پھیلی تھی۔ اس لیے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تھکن اتنی تھی کہ خواب بھی نہیں آئے۔ صبح چھ بجے حسن نے جھنجھوڑ کر مجھے اُٹھایا

''برخوردار چلو تمہاری باری ہے اور ذرا ہوشیاری سے نگرانی کرنا۔ یہ بہت حرامی لوگ ہیں۔ رات میں کافی لینے کچن میں گیا تو ایک نے اپنے ہاتھ کھول لیے تھے۔''

میں نے جماہی لی۔ ''اس سے تو بہتر تھا ان سب کو خواب آور دوا دے کر سلا دیتے اور خود بھی سکون سے سوتے۔''

''باہر ابھی خطرہ ہے۔ روشنی ہونے پر گل محمد پولیس کو لینے جائے گا۔''

''یہاں فون نہیں ہے۔''

''فی الوقت تو نہیں ہے لیکن جمشید علی نے کہا تھا کہ جلد لگ جائے گا۔'' حسن علی وہیں کمبل میں دراز ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک منٹ میں سو جائے گا۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں نیند کے معاملے میں اس کے اعصاب قابلِ رشک تھے۔ جب لیٹتا ایک منٹ میں سو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا ماہ پارہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ واش روم سے آ کر میں نے ان سے کافی کی درخواست کی اور لیونگ روم میں آ گیا۔ گل محمد نگرانی کر رہا تھا۔ وہ رات بھر سے جاگا ہوا تھا اور زخمی بھی تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ استاد اور اس کے گرگے اب ہوش میں تھے اور ظاہر ہے خاصی تکلیف میں تھے۔ گل محمد نے انہیں پانی وغیرہ دے دیا تھا لیکن بس اتنا کہ اخراج کا مسئلہ نہ ہو۔ لیونگ روم کا آتش دان بھی دہکا دیا گیا تھا۔ اس لیے سردی شدت کی نہیں رہی تھی۔ گل محمد نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ چائے یا کافی ماہ پارہ بنا کر لے آئیں۔ میں نے گل محمد سے کہا۔





''تم ذرا باہر نظر رکھو۔'' وہ سر ہلاتا چلا گیا۔

مرشد مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت چھلک رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر سوجن آ گئی تھی۔ خاص طور سے دائیں ہاتھ کا حال بُرا تھا۔ کلائی کے ساتھ اس کی چھوٹی انگلی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ کر آئے تھے اِدھر؟''

''ابھی تم بول سکتے ہو۔ اگر کبھی میرے قابو میں آ گئے تو پوچھوں گا۔''

میں ہنسا۔ ''یہ حسرت پوری تو ہو چکی ہے پہلے ہی کیوں نہیں پوچھ لیا۔''

''اب کیا ارادہ ہے۔'' مرشد نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''دیکھو ہمیں جانے دو میں وعدہ کرتا ہوں اس معاملے کو یہیں ختم کر دوں گا۔''

''تم لوگ کتے کی دُم ہو کبھی سیدھے نہیں ہو گے۔ میرے پیچھے آئے ہی کیوں تھے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم سب وہیں جاؤ گے جہاں راشد بلا ہے یعنی پولیس کے پاس۔''

مرشد تکلیف کے باوجود ہنسا۔ ''پولیس ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ وہ تو خود ہمارے ساتھ ہے۔''

''نہیں تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور میرا تعلق کس شخص سے ہے۔ وہ سب کو کھا جانے والا آدمی ہے۔ مگرمچھ ہے اس دریا کا جس کی تم چھوٹی سی مچھلی ہو۔''

''اپنی اوقات سے زیادہ اونچی باتیں نہ کرو۔'' مرشد کے لہجے میں حقارت تھی۔

''چلو میں اتنی اوقات نہیں رکھتا لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس معمولی سے لڑکے نے ارشد بلا کے تین ساتھی گرفتار کروا دیئے تھے اب وہ جیل میں ہیں۔''

''محض اتفاق تھا۔ ارشد بلا باہر ہو گا اور تم تینوں کو رُوئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔''

''اس قسم کے دعوے کرنے والے اکثر فرعون رُوئے زمین کے تلے جا چکے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

ماہ پارہ کافی کا بھاپ اُڑاتا مگ لے کر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مرشد کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے مشتعل ہو کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ ''کتے اپنی آنکھیں نیچی رکھ۔''

ٹھوکر نے اس کا منہ ادھیڑ دیا تھا اور سامنے کے دو دانت باہر آ پڑے تھے۔ بندھے ہاتھ پیروں سے وہ صرف تڑپ سکتا تھا۔ ماہ پارہ نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ''کافی پیو جب تک میں ناشتہ بناتی ہوں۔''

''یہاں کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

''بہت کچھ فریج میں خاصی چیزیں ہیں۔ دودھ ڈبل روٹی بھی تازہ تازہ ہیں۔''

ماہ پارہ کے جانے کے بعد میں نے مرشد کی گردن پاؤں سے دبائی۔ ''کتے کے بچے یہ میری ماں ہے اور اگر اب تُو نے آنکھ اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو تیری آنکھیں نکال دوں گا۔''

مرشد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کے لوگ سمجھنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ یہ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور ساری عمر کھاتے ہی رہتے ہیں لیکن اپنی اکڑ سے باز نہیں آتے۔ جب تک میں نے کافی ختم کی گل محمد برابر والے بنگلے پر جا کر پولیس اسٹیشن فون کر آیا تھا۔ ''صاحب پولیس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آجائے گی۔''

''اتنی جلدی۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اتنی جلدی تو شہر میں بھی پولیس نہیں آتی۔''

''دراصل تھانہ صرف چھ میل دور ہے۔'' گل محمد نے مسکرا کر کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ ''تب ہی۔''

اب بھوک لگ رہی تھی لیکن ناشتے سے پہلے پولیس آگئی۔ ایک پورٹیبل قسم کا تھانیدار پارٹی کی قیادت کر رہا تھا۔ دُبلا پتلا اور سوا پانچ فٹ قد کا۔ اپنی پارٹی میں وہ بونا ہی لگ رہا تھا۔ جس میں سب ہی چھ فٹ کے آس پاس تھے۔ گل محمد نے ان کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے جا کر حسن علی کو اُٹھا دیا۔ کچی نیند سے جگائے جانے پر اس کی صورت پر جو تاثرات نظر آئے تھے انہوں نے میرا دل باغ باغ کر دیا تھا۔ میں نے مسرت سے اطلاع دی۔ ''پولیس آگئی ہے۔''

اس نے جماہی لی۔ ''اتنی جلدی کس لیے آگئی۔''

''پتا نہیں مجھے بھی حیرت ہے۔''

حسن علی چہرے پر پانی مار کر باہر آیا اور میں کچن کی طرف لپکا۔ ماہ پارہ نے ناشتہ بنا لیا تھا۔ گرم سینکے ہوئے توس، ہاف فرائی انڈا شہد جام اور چائے میں ان کے روکتے روکتے ٹوٹ پڑا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے سارا ناشتہ کیا مجھے سمجھانے میں ناکامی کے بعد چائے دم کر رہی تھیں۔ انہوں نے خفگی سے کہا۔ ''افسوس کہ میری تربیت بھی کام نہیں آئی کتنی بدتمیزی سے ناشتہ کیا ہے تم نے۔''

''خاتون اگر آپ کے گھر پولیس آئی ہو اور آپ نے کھانا وغیرہ نہیں کھایا ہو تو فوراً کھا لینا چاہیے۔ نامعلوم پولیس آپ کو ہی لے جائے اور تھانے میں کھانے کے لیے صرف گالیاں ملتی ہیں۔ اگر پولیس نہ بھی لے کر گئی تو اس بات کا بھی پورا امکان ہے جب پولیس پارٹی رخصت ہو تو گھر میں کھانے کے لیے صرف صبر کا پھل رہ جائے۔''

''بکواس ہی کرتے جاتے ہو۔'' ماہ پارہ مسکراہٹ دبا کر بولیں اور چائے کا کپ تھما دیا۔

میں کپ لے کر باہر لان میں نکل آیا۔ پولیس اندر جو کر رہی تھی اس سے مجھے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ حسن علی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ میری طرف سے بھی وہی بیان دے دے صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی اور یہ وادی اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ عیاں تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ وادی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن پہاڑوں کی ترچھی ڈھلانوں کی وجہ سے رقبہ زیادہ لگتا تھا۔ ڈھلانوں پر چیڑ اور دیودار کے درخت تھے۔ بلندی پر چنار اور برچ کی سرخی و سفیدی عجیب امتزاج پیدا کر رہی تھی۔ بلاشبہ یہ مبہوت کر دینے والا منظر تھا۔ ایک طرف وہ درہ تھا جس سے گزر کر وادی میں داخل ہوا جاتا





تھا۔ یہ سڑک گھومتی ہوئی نیچے وادی کے اکلوتے گاؤں تک جاتی تھی۔ امراء کے زیادہ تر بنگلوز بلندی پر سڑک کے کنارے تھے۔ ان بنگلوز کی تعداد سوسوا سو سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی وجہ سے وادی میں بجلی اور فون جیسی سہولیات تھیں۔ گیس نہیں تھی۔ اس کی جگہ سلنڈرز استعمال کیے جاتے تھے۔ گرمائش کے لیے بھی بوائلر لکڑی سے گرم کیے جاتے تھے۔ ہمارے بنگلے کے تہہ خانے میں بھی اس قسم کا ایک بوائلر لگا تھا۔

حسن علی نے مجھے بنگلے کی چار دیواری سے باہر جانے سے منع کیا تھا۔ اس لیے میں اندر ہی لان میں ٹہلتا رہا۔ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے چار سو گز کے رقبے پر تھا۔ سامنے لان تھا دیوار کے ساتھ سرو کے درخت لگے تھے۔ دیوار صرف پانچ فٹ اونچی تھی۔ کوئی بھی اسے آرام سے پھاند سکتا تھا۔ میں نے سوچا جمشید علی نے مجھے اس غیر محفوظ جگہ بھیج دیا تھا۔ جب کہ انہیں معلوم تھا کہ دشمن میرے پیچھے لگے ہیں۔ کیا وہ وار کرنے یہاں نہیں آسکتے تھے۔ یہ جگہ کوئی اتنی بعید بھی نہیں تھی۔ صرف حسن علی اور گل محمد مجھے بچا سکتے تھے۔

میں ٹہلتا رہا اور غور کرتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جمشید علی نے بطور سزا مجھے پیلس کی محفوظ چار دیواری سے نکال کر یہاں بھیج دیا تھا۔ بابر کی حد تک مجھے وہاں خطرہ تھا جو اس کے فرار کے بعد باقی نہیں رہا تھا۔ بابر کا پتا نہیں چلا تھا وہ جمشید علی کے لمبے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر مزید کوئی قاتلانہ حملہ نہیں ہوا تھا لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ مجھ پر حملوں کا مرکزی کردار وہ نہیں تھا۔ وہ شخص ایک ملازم تھا میری موت سے اس کا کوئی مفاد نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی تھا جو بہر صورت مجھے صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے درپے تھا۔ بابر کی حیثیت محض ایک آلہ کار کی سی تھی، اس کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر میں پولیس والے مرشد اور اس کے تین ساتھیوں کو لے کر رُخصت ہو گئے۔ حسن علی آخری وقت میں تھانیدار سے بات کر رہا تھا اور وہ سخت ناخوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے سنا۔ ''جناب آپ بڑے لوگ بلاوجہ تفتیش میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ اس سے مجرموں کو بچ نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔''

''میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں انسپکٹر صاحب کہ ہمیں مزید تنگ نہ کیا جائے۔ میں نے بتایا کہ یہ ان ڈاکوؤں کے ساتھی ہیں جو اسلام آباد میں ہماری وجہ سے گرفتار ہوئے تھے۔ پاگل کے بچے انتقام لینے آئے تھے۔''

''خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے ان کی۔'' انسپکٹر بولا۔ ''معاملہ عدالت تک جائے گا تو وہاں پر آپ کو حاضری دینا ہی پڑے گی۔''

''دیکھ لیں گے یار۔'' حسن علی بے زار سا بولا۔ ''پہلے معاملہ عدالت تک تو لے جاؤ، ان میں سے ایک دھمکیاں دے رہا تھا کہ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس اور عدالت ان کی جیب میں

ہے۔ یہ ٹوٹے ہاتھ والا بکواس کر رہا تھا۔''

پورٹیبل تھانیدار نے کھا جانے والی نظروں سے مرشد کو دیکھا جو جیپ کی عقبی نشست پر مسکین سا بنا بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے پشتو میں اس کے بارے میں ارشادات فرمائے اور ڈرائیور کو روانگی کا حکم صادر فرمایا۔ پولیس کے جانے کے بعد حسن علی بھی باورچی خانے کی طرف لپکا۔ گل محمد پہلے ہی گیٹ کے ساتھ بنی اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں سونے کے لیے جا چکا تھا۔ یہ خاصی خوشنما سی کوٹھری تھی۔ اس کے اندر ایک عدد پلنگ اور ایک الماری تھی۔ اوپر بنگلے کی اوپری منزل کی طرح سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ اس میں باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی تھی جس سے گل محمد دروازہ کھولے بغیر باہر دیکھ سکتا تھا۔

سورج بلند ہونے پر سردی میں خاصی کمی آئی تھی۔ یہ مئی کا مہینہ تھا۔ مجھے جس سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا یہ دراصل آکسفورڈ کی طرزِ تعلیم پر مبنی نصاب پڑھاتا تھا۔ سکول کا سیشن پہلی مارچ سے شروع ہوتا تھا اور سکول تیس نومبر کو تین مہینے کے لیے بند ہو جاتا تھا۔ گویا تلے اوپر نو مہینے تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے میں تین مہینے کی تاخیر سے تعلیمی سیشن جوائن کر رہا تھا لیکن کراچی میں معیاری تعلیم حاصل کی تھی اس کی رپورٹس کی بنیاد پر سکول انتظامیہ نے مجھے خصوصی طور پر داخلہ دے دیا تھا۔ اصولاً مجھے آج کے دن سکول جانا شروع کر دینا تھا لیکن ابھی تک میں غیر نصابی معاملات میں اُلجھا ہوا تھا۔ رات میں صرف چار گھنٹے سویا تھا لیکن اتنی سی نیند اور پھر بھرپور ناشتے نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے اندر جانے کے بجائے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

حسن علی سے اجازت نہیں مانگی کیونکہ وہ اجازت دیتا ہی نہیں۔ عقبی دیوار میں ایک مختصر سا دروازہ تھا اس لیے میں چپکے سے نکلنے میں کامیاب رہا۔ یہ جگہ ڈھلوان کے ساتھ تھی اوپر جنگل تھا۔ فی الوقت میرا بھی کسی کا سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لیے میں اوپر جنگل کی طرف نکل گیا۔ ڈھلوان پر راستہ مشکل تھا۔ جابجا پتھر تھے اور جو جگہ پتھروں سے بچی تھی وہاں کچھ نہ کچھ اُگا ہوا تھا۔ دیو قامت آسمان سے بات کرتے درختوں تلے گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان پر پھول کھلے تھے۔ چھوٹے پھولدار پودے اور گھاس کی تو بہتات تھی۔ سال کے پانچ مہینے یعنی نومبر سے مارچ تک اس علاقے پر برف چھائی رہتی تھی۔ جبکہ اپریل سے اکتوبر تک سبزے کی بے پناہ بہتات ہوتی تھی۔ یہ سب مجھے گل محمد نے بتایا تھا۔ اس وقت وادی میرے لیے ایک انجانے سیارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں اوپر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک طرف سے آنے والی آوازوں کو سن کر رک گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ لوگ لڑ رہے ہوں۔ انگریزی اور اردو میں گالیاں دی جا رہی تھیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی بجائے اپنا راستہ لوں لیکن سرشتِ انسانی کا کیا کیا جائے۔ پرائے معاملے میں دلچسپی لیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی ہے۔ میں اس طرف بڑھا جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چند ملے ہوئے درختوں کے پیچھے دو شہری دبنے ایک مقامی لڑکے کو فٹ بال بنائے ہوئے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ شہری دبنے میں نے اس لیے کہا کہ وہ خاصے پلے ہوئے تھے اور ان کے جسموں پر کچھ





بے باک تصویروں والی جیکٹس تھیں۔ ایک نے سر گھٹوایا ہوا تھا اور دوسرے نے مائیکل جیکسن کی تقلید میں زلفیں چھوڑ رکھی تھیں۔ اپنے بیش قیمت لباس اور امارت زدہ تکبر کے ساتھ وہ اس مقامی لڑکے کو بے دردی سے مار رہے تھے۔ وہ چیختے چلاتے ہوئے اپنی زبان میں غالباً رحم کی بھیک مانگ رہا تھا اور وہ کسی رعایت کے موڈ میں نہیں تھے۔ ابھی میں اس خطا کا تعین کر رہا تھا جس کی پاداش میں مقامی لڑکے کی پٹائی ہو رہی تھی۔ اتفاق سے تینوں میرے ہم عمر تھے۔ مقامی لڑکا بھی کمزور نہیں تھا۔ چاہتا تو ان کا مقابلہ کر ہی سکتا تھا لیکن غربت اور کم مائیگی کے احساس نے اس سے دفاع کا حق تک چھین لیا تھا پھر وجہ بھی سامنے آ گئی۔ تو گنجے نظر آنے والے نے لڑکے کی کمر پر ٹھوکر رسید کی۔

''باسٹرڈ تمہیں جرأت کیسے ہوئی اس زمین پر آ کر لکڑی چرانے کی۔''

''یہ وادی ہماری ہے۔'' اس بار لڑکے نے اردو میں کہا۔ ''ہم ہمیشہ سے یہاں سے لکڑی کاٹتے رہے ہیں۔'' لڑکے کے لہجے میں احتجاج کیا۔

''اب یہ جگہ ہماری ملکیت ہے۔'' زلفوں والے نے لڑکے کے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی لیکن وہ خود کو بچا گیا تھا۔ لڑکے کی کلہاڑی پاس ہی پڑی تھی۔ وہ چاہتا تو کلہاڑی سے انہیں دھمکا سکتا تھا مگر شاید اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ ان کی مار کے نشانات لڑکے کے منہ اور ہاتھوں پر نمایاں تھے۔ لباس تلے جسم کے زخم دیکھنا ممکن نہیں تھا ورنہ ضرور موجود ہوں گے۔ لڑکا بھاگنا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں اسے مزید پیٹنے کے موڈ میں تھے۔ اس لیے ایک نے اس کے پیروں میں ٹانگ اڑائی وہ منہ کے بل گرا۔ دوسرے نے اس کی کلہاڑی اُٹھالی۔

''تم نے چوری کی ہے اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔'' گنجے نے لڑکے کو آگاہ کیا۔

زلفوں والے نے اوندھے منہ پڑے لڑکے کی پشت پر سوار ہو کر اس کا بایاں ہاتھ قابو کر لیا۔ اور اپنے ساتھی سے کہا۔

''یار ماجد آج اسے ٹنڈا کر دے۔ اسے بھی پتا چلے کہ کسی کی چیز بلا اجازت چرانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' یہ سن کر اس کے تلے دبا لڑکا مچلنے لگا اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔

''میں چور نہیں ہوں۔ میں جنگل سے لکڑی لے رہا تھا۔''

''جنگل تیرے باپ کا ہے۔'' گنجے نے کلہاڑی لہرائی۔ ''اب یہ ساری زمین ہماری ہے۔''

اگرچہ اپنی باتوں اور انداز سے وہ مجھے مذاق کے موڈ میں لگ رہے تھے لیکن کوئی بھروسہ بھی نہیں تھا مذاق ہی میں مذاق میں وہ لڑکے کو سچ مچ ٹنڈا کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے دخل در معقولات ضروری سمجھا۔ میرے درخت کے عقب سے نکلتے ہی دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے۔ گنجے نے کلہاڑی لہرانا بند کر دی اور غور سے مجھے دیکھا۔ ''کون ہو تم؟''

''دیکھنے میں تو تمہارے جیسا نظر آتا ہوں لیکن ہوں انسان۔''

بات ذرا دیر سے اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ کلہاڑی لہراتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ ''دفع ہو جا

یہاں سے انسان کی اولاد۔ اب یہ زمین ہمارے خاندان کی ہے۔‘‘

’’کیا یہاں پر تمہارا خاندانی قبرستان بنے گا؟‘‘ میں نے معصومیت سے دریافت کیا۔

’’تیرے باپ کا قبرستان بنے گا۔‘‘ اس نے بھڑک کر کہا۔

’’ان کے لیے ایک قبر کافی ہے۔‘‘ میں نے کہہ دیا پھر میرے اندر کانٹا سا چبھ گیا۔ میرا باپ کون تھا۔ زندہ تھا یا سچ مچ اپنی قبر میں ہی تھا۔ پھر میں چونکا۔ کلہاڑی بردار خطرناک حد تک میرے نزدیک آ گیا تھا۔ اس کی چھوٹی اور کینہ پرور آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

’’تم کون ہو؟‘‘

’’میں ایک لڑکا ہوں۔ تم اس بے چارے کو کیوں مار رہے تھے۔‘‘

’’یہ ہماری زمین سے لکڑی چرا رہا تھا اس لیے ہم اسے سزا دے رہے ہیں۔‘‘ اس نے اکڑ کر کہا۔

’’اس کا ہاتھ کاٹ کر اور پھر یہ جنگل تمہاری ملکیت کیسے ہو گیا۔ یہ سرکاری زمین ہے یہاں سے کوئی بھی شخص لکڑی کاٹ سکتا ہے۔ تم کسی کو روک نہیں سکتے۔‘‘

’’ہم روک سکتے ہیں کیونکہ اب یہ جگہ ہماری ہے۔ یہاں ہم نے شکارگاہ بنائی ہے۔ جلد اس کے گرد باڑھ لگ جائے گی۔ پھر اس جیسے چور اچکے یہاں نہیں آ سکیں گے۔‘‘ اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

’’میرا خیال ہے تم لوگ طاقت کے بل پر اس زمین پر قبضہ کر رہے ہو۔ جبکہ یہ وادی کے لوگوں کی ملکیت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہارے پاس اس کی قانونی ملکیت نہیں ہو گی۔‘‘

’’قانون ہماری جیب میں ہے۔‘‘ زلفوں والے نے پہلی بار زبان کھولی۔ ’’میرے بابا اس علاقے کے بڑے سرداروں میں سے ہیں۔‘‘

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ظاہر ہے ایک جاگیردار گھرانے کے سپوت اس قسم کے خیالات ہی رکھ سکتے تھے۔ اس ملکیت کو اپنی ملکیت اور عوام کو اپنی رعایا سمجھنے والے۔ میں ان سے اُلجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے درگزر کرنے کے لیے ان سے کہا۔

’’چلو یار جانے دو۔ غریب آدمی ہے غلطی سے آ گیا ہو گا۔ اسے کیا پتا کہ یہ جگہ تمہاری ہے۔‘‘

گنجا کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ’’چلو تمہارے کہنے پر چھوڑ رہے ہیں۔ چل دفع ہو جا ماں کے.....‘‘ اس نے گالی دی اور لڑکے کی کلہاڑی دور پھینک دی۔ خوفزدہ لڑکا اُٹھا اور کلہاڑی اُٹھا کر بھاگ گیا۔ میں نے ایک بار پھر افسوس سے سر ہلایا اس ملک کے لوگوں کا یہی حال ہو گیا ہے۔ اپنا حق بھی ڈر ڈر کر مانگتے ہیں۔ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو گنجا سامنے آ گیا۔ ’’مجھ سے دوستی کرو گے میرا نام مراد خان ہے۔ یہ میرا چچا زاد بھائی عمر خان ہے۔‘‘

’’میرا نام یوسف علی خان ہے اور میں دوستی نہیں چاہتا۔‘‘ میں نے بے پروائی سے جواب





دیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ ’’اس جنگل میں تم لوگوں نے کہاں تک قبضہ کیا ہے۔‘‘

’’یہ سارا جنگل ہی ہمارا ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’میرا خیال ہے تم اپنی حد تک رہو تو بہتر ہے۔ جنگل کا یہ حصہ میرے بنگلے کے عقب میں آتا ہے۔‘‘

اس نے جواب نہیں دیا مضحکہ اُڑانے کے انداز میں ہنس دیا۔ میں شانے اُچکا کر اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ پہاڑی ڈھلان خاصی اونچائی تک گئی تھی۔ بعض جگہیں بے حد دشوار تھیں۔ ایک جگہ گھاس اور پودوں کے درمیان چشمہ بہہ رہا تھا۔ اس کا پانی اتنا سرد اور شیریں تھا کہ اس کے گھونٹ جیسے روح میں اُتر گئے۔ میں نے جی بھر کر پیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا میں ان دونوں دنبوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ راستہ آگے جا کر سڑک سے مل جاتا اور میں گھوم کر سڑک سے ہی بنگلے تک آ سکتا تھا اس طرح علاقے سے بھی واقفیت ہو جاتی۔ میں نیچے اُتر رہا تھا کہ نیچے سے کوئی درجن بھر افراد کا گروہ آتا نظر آیا۔ وہ سب ہی کلہاڑیوں اور دیگر مقامی قسم کے حفاظتی آلات سے مسلح تھے میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کوئی تعرض کریں گے مگر جیسے ہی وہ نزدیک آئے انہوں نے آناً فاناً مجھے گھیر لیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایک معمر نظر آنے والے جوان نے آگے بڑھ کر کڑے انداز میں پوچھا۔

’’تُو نے ہمارے لڑکے کو مارا ہے۔‘‘

میں نے اس بزدل کو دیکھا جو دونوں شہری دنبوں سے بلا تکلف پٹ رہا تھا اور ان سے مار کھا کر دُم دبا کر بھاگ گیا تھا اور اب یہ جم غفیر لایا تھا۔ میں نے لڑکے کو گھورا۔

’’میں نے اسے بچایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ کاٹنے جا رہے تھے لیکن افسوس ہو رہا ہے اسے بچایا ہی کیوں۔‘‘

’’تم بھی ان کے ساتھ تھے۔‘‘ لڑکے نے ڈھٹائی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا حالانکہ میں نے اسے بچایا تھا اور وہ بے غیرت مجھ پر ہی الزام لگا رہا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ ’’اب مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں بچایا کیوں۔‘‘

’’بکواس نہ کر۔‘‘ لڑکے کے ساتھ کھڑے شخص نے اچانک مجھ پر اپنی لاٹھی سے وار کیا تھا۔ میں بروقت نہ جھک جاتا تو میرا سر بھی پھٹ سکتا تھا۔

پہلا وار ہوتے ہی امن وامان کا خاتمہ ہو گیا اور مجھ پر چاروں طرف سے لاٹھیاں اور ڈنڈے برسنے لگے تھے۔ میں وار خالی دے رہا تھا لیکن جب چھ سات افراد آپ کی گوشمالی پر تلے ہوں تو دو تین چوٹیں تو لگ جاتی ہیں۔ میں خود کو بچاتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ مجبوراً میں نے ایک کا وار بازو پکڑ کر روکا اور طاقت استعمال کرتے ہوئے اسے سامنے والے پر دے مارا۔ جو مجھ پر وار کرنے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا اس نے اپنے ہی

ساتھی کی گدی پر رسید کیا۔ اس لمحے پشت سے لاٹھی پڑی۔ شکر ہے انہوں نے کلہاڑیاں استعمال نہیں کی تھیں۔ غالباً وہ قتل و غارت گری کے موڈ میں نہیں تھے۔ صرف میری مرمت کرنا چاہتے تھے۔ جھنجھلا کر میں نے مارشل آرٹ کی تربیت استعمال کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے چار پانچ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے ان میں وہ بدبخت بھی تھا جس نے یہ سارا فساد کھڑا کیا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس چکر میں مجھے کئی ضربیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔

اپنے چار پانچ بندے ناکارہ ہوتے دیکھ کر باقی بپھر گئے تھے۔ انہوں نے اب تک کلہاڑیوں کا استعمال نہیں کیا تھا۔ میری پھرتی اور اپنے آدمیوں کی ہائے وائے سن کر بادلِ نخواستہ انہوں نے کلہاڑیاں استعمال کی تھیں۔ میں نے فرار کا راستہ تلاش کیا لیکن انہوں نے چاروں طرف سے کچھ اس طرح گھیرا ڈال رکھا تھا کہ فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ کلہاڑی پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں بے شک مارشل آرٹ جانتا تھا لیکن پانچ چھ کلہاڑی بردار حملہ آوروں سے بچ نکلنے کا فن شاید بروسلی کو بھی نہیں آتا ہوگا۔ ایک بھی صحیح وار پڑ جاتا تو میں اپنے ہاتھ پیر یا سر سے ہی محروم ہو سکتا تھا۔ حسن علی نے مجھے بتایا تھا کہ تیز پھل والے ہتھیاروں میں کلہاڑی کا وار سب سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندے ریڈ انڈین اس فن کے ماہر تھے۔ وہ تلواروں یا نیزے کی جگہ کلہاڑی استعمال کرتے تھے۔ ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ چار انچ پھل والی کلہاڑی سے مخالف کی گردن اُڑا دیا کرتے تھے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ کلہاڑی کے موضوع پر غور کیا جاتا۔ میری جان خطرے میں تھی اور کوئی جائے ماندن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک وہ سب کلہاڑیاں لہراتے میری طرف لپکے تھے۔ میں نے چاروں طرف سے پڑنے والی ضربوں کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔



میں چاروں طرف سے پڑنے والے بٹوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچتے بچتے بھی کچھ نہ کچھ بٹ پڑ ہی گئے تھے۔ وہ سب تربیت یافتہ نگران تھے اور مار پیٹ کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ میری کوشش تھی کہ میرے سر یا کسی نازک مقام پر کوئی ضرب نہ لگنے پائے ایک بار سر بچاتے ہوئے میں سلپ ہو کر نیچے گرا اور اس گارڈ کی رانوں کے درمیان لات جمائی جو مسلسل میرے سر کو نوازنے کی فکر میں تھا۔ اس کا منہ یوں کھل گیا جیسے دنیا میں یکلخت ہوا کی کمی ہو گئی ہو۔ دوسری لات میں نے اس کی چھاتی پر ماری اور وہ پیچھے جا گرا۔ پھر مشتعل ہو کر اُٹھا اس نے اپنی رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے اس کا رُخ میری طرف کر دیا۔

''سؤر کے بچے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکا ہے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے میرے چاروں طرف موجود اس کے ساتھی





پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کہیں وہ بھی گولیوں کی زد میں نہ آ جائیں۔ میرا جسم تن گیا تھا۔ شاید آخری لمحہ آن پہنچا تھا۔ اتنے نزدیک سے خودکار رائفل کے برسٹ سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا جان گرے کی گرج دار آواز آئی۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' اس نے گرے ہوئے گارڈ کی رائفل پر بوٹ رکھ کر زمین کی طرف جھکائی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ قاتل لمحہ گزر گیا تھا جب غضب ناک گارڈ میری جان لے سکتا تھا۔ جان گرے نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اس کے خاندان سے اپنی ناجائز رشتے داری قائم کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کس کے حکم سے تم اسے مار رہے تھے۔''

گارڈ نے منمنا کر وضاحت کی کہ ہم دونوں نے کس طرح انہیں مشتعل کیا۔ جان گرے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اور تم مشتعل ہو گئے۔ اتنے کمزور ہو تم۔ میرا خیال ہے تمہیں اس جاب سے ہٹا کر صفائی کے کام پر لگا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے بھی دیکھا تھا مارنے کے چکر میں تم اس کے اتنے نزدیک آ رہے تھے کہ یہ کوشش کرتا تو رائفل چھین کر ایک ہی برسٹ میں تم سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔''

پھنکار سن کر ان سب کے منحوس چہرے پھر سے لٹک گئے تھے۔ انہیں جی بھر کر ذلیل کرنے کے بعد اس نے حکم دیا۔ ''اسے ہسپتال لے جاؤ اور اسے سیل نمبر چار لے جاؤ۔'' اس نے بالترتیب عبید اور میری طرف اشارہ کیا۔ دو گارڈز عبید صلاح کو ایک جیپ میں ڈال کر لے گئے اور باقی دو مجھے لے کر پیدل مارچ کرنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ سیل نمبر چار نزدیک ہی تھا۔ جان گرے نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی دو سو گز مارچ کے بعد گارڈز مجھے ایک چوکور ساخت کی عمارت میں لے آئے۔ یہ جگہ کوئی پولیس اسٹیشن لگ رہا تھا یہاں پر جابجا سبز اور سرمئی رنگوں کی وردیاں پہنے افراد گھوم رہے تھے۔ مجھے جس جگہ لایا تھا وہ حوالات لگ رہا تھا۔ گارڈ نے مجھے وہاں موجود ڈیوٹی انچارج کے حوالے کیا اس نے مجھے سلاخوں سے بنی حوالات کے سپرد کر دیا۔

بٹوں سے جسم پر کئی جگہ ضرب آئی تھی لیکن تکلیف خاص نہیں تھی۔ میں نے سیل کا معائنہ کیا مشکل سے آٹھ بائی چار کے اس سیل میں اوپر تلے دو بستر تھے۔ سامنے کموڈ اور اس کے اوپر چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ سیل میں مَیں اکلوتا قیدی تھا۔ ڈیئر ڈان کی عنایت سے صبح ناشتہ میسر آ گیا تھا لیکن اس کے بعد اب تک کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ میں نے سلاخوں سے جھانک کر اس آفیسر سے پوچھا جس نے مجھے بند کیا۔ ''یہاں قیدیوں کو کھانا وغیرہ دینے کا رواج ہے۔''

انچارج شاید جنوبی امریکہ کا کوئی مکس نسل کا شخص تھا اس نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کی۔ ''کھانا ملے گا اور نہ بھی ملے تو وہ ہے۔'' اس نے اشارے سے کموڈ کا بتایا۔ اس کا مطلب سمجھ کر مجھے

کراہیت آئی تھی۔

''غالباً جب تمہیں کھانا نہیں ملتا تو تم بھی یہی کرتے ہو۔'' میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔

''بہت بھونک رہے ہو کتے، چند دن کی بات ہے پھر تمہاری یہ زبان باہر لٹک رہی ہوگی۔''

میں نے شانے اُچکائے۔''مرنے کے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری زبان باہر نکل آئے یا منہ کے اندر ہی رہے۔ ابھی تو بھوک لگ رہی ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔''تم نے جان گرے صاحب پر حملہ کیا تھا؟''

''افسوس کہ ناکام رہا۔ ورنہ مرنے کا افسوس بھی نہیں ہوتا۔''

''حماقت تھی۔'' اس نے گویا ترس کھاتے ہوئے کہا۔''جان گرے صاحب اس جزیرے کے بڑوں میں سے ایک ہے اس کی شان میں کی گئی گستاخی کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔ تم نے تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے زبانی طور پر بھی جان گرے کی خدمت میں متعدد گستاخیاں کی تھیں۔ جنہیں وہ شیر مادر کی طرح پی گیا تھا کہ فی الوقت اس کا مجھ سے کوئی مفاد وابستہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مجھے اس جگہ سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کس طرح یہاں سے نکال لے جاتا، اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ ہوگا ہی لیکن بالفرض محال اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہوتا تو کیا میں یونہی خاموشی سے مرجاتا۔ اس جزیرے پر میرے پاس کچھ کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ جان گرے نے یہاں کے جیسے حفاظتی انتظامات بتائے تھے ان کے ہوتے کسی فرد کا یہاں سے فرار ہونا بے حد دشوار تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ دو بجے کے قریب قیدیوں کا لنچ آیا۔ اس حوالات میں مشکل سے چار پانچ افراد تھے۔ لنچ میں اُبلے ہوئے چاول اور اُبلی ہوئی مچھلی کا شوربہ تھا۔ دونوں چیزیں بے ذائقہ اور بدمزہ تھیں۔ کسی نہ کسی طرح انہیں حلق سے اُتار لیا۔

کچھ کرنے کو تھا نہیں اس لیے میں لیٹ گیا۔ نیند بھی غائب تھی۔ کاجل یاد آرہی تھی۔ ماہ پارہ اور حسن علی یاد آرہے تھے۔ یہ سب مجھے رو چکے ہوں گے کیونکہ خلیج کی تباہی کی خبر دنیا والوں کو مل چکی ہوگی۔ کاجل کیسی تڑپی ہوگی۔ بھائیوں اور ماں نے اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ میرے مرنے کے بعد اس سے یہ پابندیاں ہٹالی گئی ہوں گی لیکن یہ آزادی اس کے کس کام کی ہوگی۔ کہیں اس پاگل لڑکی نے خودکشی نہ کرلی ہو۔ میرے لیے وہ اتنی ہی دیوانی تھی یہ خیال اتنا مضطرب ناک تھا کہ میں وحشت کے عالم میں اُٹھ بیٹھا۔ دل چاہا کہ یہاں سے اُڑ کر چلا جاؤں۔ اپنی کاجل کے پاس۔

''کیا بات ہے؟'' میرے اس طرح بھڑک کر اُٹھنے کی وجہ سے مشکوک ہوکر انچارج سلاخوں کے پاس چلا آیا تھا۔

''کچھ نہیں۔ لنچ میں کوئی چیز باسی تھی اب میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' میں نے جواب



دیا۔

''بہتر ہے اپنے پیٹ کے درد کو قابو میں رکھو۔ ورنہ نیچے کی حوالات میں بھیج دیے جاؤ گے۔'' اس نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔

''ذرا نیچے کے حوالات کے بارے میں بتادو۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

وہ مسکرایا۔''اگر کبھی نیچے جانا ہوا تو دیکھ لینا۔''

''اچھا میرے ساتھی کے بارے میں بتادو۔''

''مجھے اس کے بارے میں نہیں پتا۔'' اس نے ٹکا سا جواب دیا اور جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک رسالہ دیکھ رہا تھا۔ دیکھ ان معنوں میں رہا تھا کہ یہ ایک باتصویر رسالہ تھا۔ نظر نواز اور خون کو گرما دینے والا۔ اس کی تصویر یہاں سے بھی صاف نظر آئی تھی جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ارینا میں مجھ سے ملی تھی اور مجھ سے فری ہونے کی کوشش کررہی تھی اور پھر اس نے میرے سر پر وار کرکے جان گرے کی جان بچائی تھی۔ ویسے تو اس کے اطوار نے بتادیا تھا کہ وہ فاحشہ عورت تھی لیکن رسالے کی تصویر نے کھل کر بتادیا تھا۔ وہ پورنو ماڈل بھی تھی عین ممکن تھا یہ رسالہ اس جزیرے پر تیار ہوا ہو۔



دُھند کے اس پار کاجل صاف نظر آرہی تھی۔ حسب معمول سفید بُراق لباس میں اس کا سراپا جیسے روشنی دے رہا تھا۔ بلندی سے ڈھلکتا لباس اس کے حسین ترین سراپا کو واضح کررہا تھا۔ میں سحر زدہ رہ گیا تھا۔ کاجل نے بازو پھیلائے تو میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ ماحول اس قدر دھند آلود تھا کہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے بس کاجل نظر آرہی تھی۔ معاً میری نظر اپنے پیروں کی طرف اُٹھی اور میں یوں رُک گیا جیسے کوئی تیز رفتار کار ایک جھٹکے سے بریک لگانے سے رُک جائے۔ محض ایک فٹ آگے زمین میں لامتناہی حد تک گہری کھائی تھی۔ دُھند کی وجہ سے مجھے اس کا فوری احساس نہیں ہوا تھا۔ اگر میں ایک قدم اور اُٹھا لیتا تو نیچے جاگرتا۔

''یوسف۔'' مجھے رُکتے دیکھ کر کاجل بے چین ہوگئی۔''جلدی آؤ نا۔''

میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔''کاجل نہیں آسکتا۔ دیکھو راہ میں یہ گہری کھائی ہے۔''

کاجل رو دی تھی۔''میں نہیں جانتی، بس تم آجاؤ۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں تڑپ گیا تھا۔''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔''

میں دیوانہ وار کھائی کے پار جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ جو میرے اور کاجل کے درمیان حائل تھی۔ پھر مجھے دُھند میں ایک جھولتا پُل نظر آگیا۔ رسیوں اور تختوں سے بنا یہ شکستہ حال پُل کھائی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا رہا تھا۔ تیز ہوا اسے جھولا دے رہی تھی۔ رسیوں سے بندھے تختے چرچرانے کی خوفناک آوازیں مجھے خبردار کررہی تھیں کہ اس شکستہ پُل پر قدم رکھنے کی

حماقت نہ کروں۔ ورنہ تحت الثریٰ ہی میرا مقدر بنے گی لیکن کاجل تک جانے کے لیے یہ پُل کیا اگر پُل صراط بھی ہوتا تو میں بلا جھجک اس پر قدم رکھ دیتا۔ مجھے شکستہ پُل کی طرف آتے دیکھ کر کاجل خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے مجھ سے التجا کی۔ ''یوسف اس پُل پر مت آنا۔ یہ خطرناک ہے۔''

''کتنا ہی خطرناک ہو۔ مجھے دوسری طرف آنے سے نہیں روک سکتا۔'' میں نے ایک عزم سے کہا اور پُل کے چرچراتے تختوں پر پاؤں رکھا۔ پُل بے طرح جھولا۔ سہارا لینے کے لیے میں نے رسہ پکڑ لیا۔ ہوا میں یکلخت تیزی آگئی تھی۔ پُل طوفان کی زد میں آئے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کے شکستہ حصوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پُل کے تختے بکھر جائیں گے اور میں ان تختوں کے ساتھ لامتناہی گہرائی میں جا پڑوں گا۔

''یوسف واپس چلے جاؤ۔'' کاجل نے التجا کی۔

میں نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کاجل اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں تمہاری طرف آؤں گا یا جان دے دوں گا۔''

ہوا کے تند جھونکے جیسے کسی لشکر کی طرح پرے باندھ کر حملے کر رہے تھے۔ ان کی تندی میں ہر گزرتے لمحے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جھولتے، لہراتے اور چرچراتے پُل پر ایک قدم اُٹھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اگر میں نے رسوں کو نہ تھام رکھا ہوتا تو شاید اب تک نیچے جا گرا ہوتا۔ میں اس ہوا سے اور پُل کی شکستہ حالی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ معاً سامنے سے ایک تختہ اُڑا اور ہوا کے جھونکے اسے نہ جانے کہاں لے گئے۔ تختے کی جگہ اب مہیب سیاہ سوراخ تھا۔

''یوسف واپس چلے جاؤ۔'' کاجل چلائی۔

میں نے اسے دیکھا اور قدم آگے بڑھایا۔ اس لمحے ایک تختہ اور رسیوں سے نکل گیا۔ میں پُل کے وسط میں تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہواؤں نے تختوں کو اُڑانا شروع کر دیا۔ ایک ایک کر کے سارے تختے یکے بعد دیگرے ہوا میں غائب ہو رہے تھے۔ پُل کے دونوں اطراف سے یہ تختے غائب ہو رہے تھے۔ دونوں جانب سے نمودار ہونے والا مہیب خلا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ کاجل اب رو رہی تھی اور بے بسی سے موت کو میری طرف آتے دیکھ رہی تھی۔ میں نے رسوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مجھے موت سے ہراس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خوف اس بات کا تھا کہ اب میں کاجل سے بچھڑ جاؤں گا۔ عریاں ہوتا پُل تیزی سے میرے نزدیک آ رہا تھا۔ تاریک خلا کا اژدھا مجھے نگلنے کے لیے بے تاب تھا۔ چند ہی تختے باقی رہ گئے۔ میں نے جسم و جان کی پوری شدت کے ساتھ رسے تھام لیے تھے لیکن جب میرے پیروں تلے سے تختہ غائب ہوا تو اگلے ہی لمحے میں نے خود کو تاریک خلا کی گرفت میں پایا۔ کاجل کی کرب ناک چیخ میرے کانوں میں گونجی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ جسم پسینے میں تربتر تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ کیونکہ اندر اب تیز روشنیاں





جل رہی تھیں۔ معاً میری نظر سلاخوں والے دروازے پر پڑی میں چونکا۔ وہاں جان گرے کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کس وقت آیا تھا۔ مجھے بے دار دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''مسٹر یوسف...... یہ کھاجل کون ہے؟''

''کون کھاجل؟'' میں سپاٹ لہجے میں بولا۔ ویسے میں سمجھ گیا کہ وہ کاجل کہہ رہا ہے۔

''وہی کھاجل جس کا نام ابھی تم سوتے میں لے رہے تھے۔'' اس نے میرے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ''کیا یہ تمہاری محبوبہ ہے؟''

میں نے دل ہی دل میں اس کی شیطانی ذہانت پر لعنت بھیجی کمبخت نے محض نام سن کر درست اندازہ لگایا تھا۔ میں نے بنا کسی تاثر کے جواب دیا۔ ''ضروری ہے کاجل کسی لڑکی کا نام ہو جو میری محبوب ہو۔ بائی دی وے تم اس وقت یہاں کس لیے آئے ہو۔ میرا ساتھی عبید صلاح کیسا ہے؟ اسے کب تک یہاں لاؤ گے؟''

جان گرے نے منہ بنایا۔ ''سارا مسئلہ اس حرامی کا پیدا کردہ ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ ہسپتال سے فرار ہوگیا ہے۔ اس وقت پورے جزیرے پر ایمرجنسی نافذ کر کے اس کی تلاش جاری ہے۔''

میں اُچھل پڑا تھا۔ ''عبید صلاح فرار ہوگیا مگر کیسے وہ تو بُری طرح زخمی تھا۔''

''مکر کر رہا تھا۔ جیسے ہی ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے لگا اس نے اسے قابو کر لیا اور اس کے کپڑے پہن کر ایمرجنسی یونٹ کے عقبی دروازے سے فرار ہوگیا۔''

میں سلاخوں کے پاس چلا آیا۔ ''جان گرے۔'' میں نے سلاخیں تھامتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ کوئی چکر ہو، کہیں تم مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو۔''

''یہ سچ ہے۔'' جان گرے نے زور دے کر کہا۔ ''اب میں عبید صلاح کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ جزیرے کے محافظوں نے اسے تلاش کر لیا اور اس نے ذرا سی مزاحمت کی تو مارا جائے گا۔''

''اور وہ مارا گیا تو سمجھو ہمارا معاہدہ ختم۔ اس کے بعد تم شوق سے مجھے بھی پھانسی دلوا دینا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' جان گرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس نے اپنی حماقت سے یہ مصیبت مول لی ہے۔ بلکہ میرے کام کو بھی ذرا مشکل کر دیا ہے۔ اب تمہاری خصوصی نگرانی کی جائے گی۔''

''گویا تم دشواری میں پڑ گئے ہو۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارا معاہدہ ہم دونوں کی زندگی سے مشروط ہے ایک کو بھی کچھ ہوا تو معاہدہ ختم۔''

جان گرے جھلایا ہوا نظر آنے لگا۔ ''میں نے اس کی حماقتوں کی ذمے داری قبول نہیں کی تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی۔ اس طرح فرار ہونے کی؟''

"اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور سچی بات ہے خود مجھے بھی تم پر اعتبار نہیں ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ عبید صلاح سچ مچ فرار ہوا ہے۔ کہیں یہ تمہارا کوئی نیا شعبدہ تو نہیں ہے؟"

"تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو میں تمہیں جزیرے کے ٹی وی کی نشریات دکھا سکتا ہوں۔"

جان گرے نے حوالات کے انچارج کی میز کے سامنے رکھا ٹی وی آن کر دیا۔ اس وقت جزیرے کے رہائشیوں کے لیے اپیل نما حکم دیا جا رہا تھا کہ خطرناک دہشت گرد عبید صلاح کی تلاش میں جزیرے کے محافظوں کی مدد کی جائے کوئی شخص جو عبید صلاح کو پائے اور اس سے اپنی جان کا خطرہ پائے تو اسے ہلاک کرنے کا مجاز ہے۔ اپیل کے ساتھ مسلسل عبید صلاح کی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ پھر ٹی وی کا نمائندہ نیلی وردی میں ملبوس ایک شخص کا انٹرویو لینے لگا۔ وہ گارڈز کا فیلڈ انچارج کرنل روبری تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ فرانسیسی ہے۔ میں اس کے نام پر مسکرا دیا۔ روبری کا ایک مطلب چوری یا ڈکیتی بھی ہوتا ہے۔ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کا انچارج تھا۔ اس لیے اس پر یہ نام خوب سجتا تھا اور تکبر آمیز لہجے میں بتا رہا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے فرار ہونے والے اس مسلح دہشت گرد کو گرفتار کر لیا جائے گا یا اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔

"میرے آدمی دو ٹاؤنز کی مکمل تلاشی لے چکے ہیں اور دو ٹاؤنز ابھی باقی ہیں۔" کرنل روبری نے بتایا۔

"جزیرے کے غیر آباد حصوں میں تلاش کا کام کس طرح کیا جا رہا ہے؟" نمائندے نے سوال کیا۔

کرنل روبری کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اگر وہ جزیرے کے کسی غیر آباد حصے میں چھپا ہے تو ہمارا کام اور بھی آسان ہو گا۔ میرے آدمی بلڈ ہاؤنڈ کتوں کی مدد سے جزیرے کے غیر آباد حصوں میں اسے تلاش کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے صبح سے پہلے آپ کو کوئی ایسی خبر سننے کو ملے گی۔"

جان گرے نے ٹی وی آف کر دیا۔ "اب تمہیں یقین آیا۔"

مجھے یقین آ گیا کہ عبید صلاح سچ مچ فرار ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس پاگل نے فرار ہو کر سچ مچ اپنی موت پر مہر ثبت کر دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ عبید صلاح جب ان کے ہاتھ آیا یہ پہلی فرصت میں اسے مار دیں گے۔ احمد بربری کے بعد یہ دوسری موت ہوتی جس کا مجھے بے حد دکھ ہوتا۔ حریت کے جذبات سے سرشار اس نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے تھا لیکن خواہش کرنے سے موت بھلا کہاں رکتی ہے۔ اس نے تو پیغمبروں کو نہیں چھوڑا۔ ایک عام انسان کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں افسردہ ہو کر اپنے بستر پر آن بیٹھا۔ جان گرے سلاخوں کے نزدیک آیا۔

"میں یہی بتانے آیا تھا کہیں تم بھی جذباتی ہو کر کوئی قدم نہ اٹھا لو۔"





"فکر مت کرو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں عبید صلاح جتنا نڈر نہیں ہوں۔"

وہ سر ہلاتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد رات کا کھانا آ گیا لیکن میرا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رہ رہ کر عبید صلاح کا خیال آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ بھوکا پیاسا تھا۔ اب تک آزاد تھا یا ان وحشی درندوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ جو انسانیت کے خوشنما ماسک لگائے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ایک گارڈ کھانے کی ٹرے جوں کی توں لے گیا۔ انچارج شاید ڈیوٹی کر کے جا چکا تھا۔ اس کی جگہ ایک عام سا محافظ نگرانی کے لیے دفتر میں براجمان تھا اگرچہ اس کی آنکھیں بھی بے حجاب تصویروں والے ایک رسالے پر ہی مرکوز تھیں مجھے عبید صلاح کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ اس سے ٹی وی چلانے کو کہوں لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں اور نہ ہی اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ غالباً میرے بارے میں اسے خاص ہدایت تھی کہ دور رہے اور مجھ سے گفتگو فرمانے کی کوشش نہ کرے۔ حتیٰ کہ جب میں نے اس کی ولدیت کے بارے میں شبہے کا اظہار کیا تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں واپس بستر پر آ لیٹا۔ عبید صلاح کو خدا کے سپرد کیا اور پھر سے خوابِ خرگوش میں مگن ہو گیا۔ یہ مجھ پر خدا کی خاص مہربانی تھی۔ حالات کیسے ہی پریشان کن کیوں نہ ہوں جب سونا چاہتا تو لیٹتے ہی نیند آ جاتی تھی۔

صبح ہوئی، پھر شام ہوئی، کئی دن اس طرح گزر گئے۔ سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے مجھے کھانا پینا اچھا دیا جا رہا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی سہولت نہیں تھی۔ خاص طور سے ایسی کوئی شے مجھے نہیں دی جاتی تھی جسے میں ہتھیار بنا کر کسی پر حملہ کر سکوں یا اس کی مدد سے خودکشی کر سکوں۔ حالانکہ نہ تو میں مایوس تھا اور نہ ہی خودکشی کا خیال تھا مجھے یقین تھا کہ میرا خدا میری رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرے گا چاہے وہ جان گرے کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں، مجھے اس سیل سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن چوتھے دن ایک حجام آیا۔ دو مسلح گارڈز نے باہر نکال کر مجھے ایک کمرے تک پہنچایا۔ یہاں لوہے کی ایک ایسی کرسی تھی جس پر ہاتھ پیر باندھنے کے لیے چمڑے کے تسمے تھے۔ مجھے گن پوائنٹ پر مجبور کر کے اس کرسی پر بٹھایا گیا اور میرے ہاتھ پیر چمڑے کے تسموں سے باندھ دیئے گئے میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا میری تاج پوشی کی جائے گی یا اس کرسی پر میرا روسٹ بنے گا۔"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ شاید مجھ پر تشدد کا کوئی حربہ آزمایا جائے گا۔ اس اثناء میں ایک شخص اندر آیا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے پاس آ کر اپنا بیگ نیچے رکھا اور اس میں سے بالوں کی مرمت کے اوزار نکالنے لگا۔ پہلے اس نے میرے سر پر مشین پھیری اور میرے شاندار گھنے سنہری بالوں کی قربانی دے دی۔ میرے چیخنے چلانے اور گالیاں دینے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے یہی مشین میرے چہرے پر پھیری اور میری کوئی مہینے بھر پرانی داڑھی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد

مشین سے شیو بنانے لگا۔ اس نے استرا استعمال نہیں کیا تھا غالباً اس خوف سے کہ میں اچانک گردن موڑ کر استرے سے اپنی شہ رگ نہ کاٹ لوں۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ میرے جسم پر کچھ اور جگہوں پر بھی بال ہیں براہِ کرم انہیں بھی صاف کر دے۔ اس نے میری درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی جس طرح روبوٹ اسٹائل میں آیا تھا اپنا کام کر کے اسی طرح واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دو نگران اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے کھولا۔ میں نے کپڑوں سے بال جھاڑے۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

''باتھ کے لیے۔'' ایک گارڈ نے پہلی بار زبان کھولی۔

غسل خانہ غالباً اجتماعی نوعیت کا تھا یہاں قیدیوں کو بیک وقت غسل کرایا جاتا تھا۔ اس میں زمین سے کوئی نو فٹ کی بلندی پر شاور لگے تھے۔ ان کے کھولنے اور بند کرنے کا سسٹم باہر کہیں تھا۔ ایک شخص نے مجھے صابن اور تولیہ دیا اور کہا کہ میں کپڑے یہیں اُتار کر جاؤں، بادلِ نخواستہ میں نے کپڑے اُتار کر اسے دیئے اور محض لباس فطرت میں اندر چلا گیا۔ میرے جاتے ہی شاور چل پڑے۔ نہ جانے کتنے دنوں کا میل میرے جسم پر جمع ہو گیا تھا۔ میں جی بھر کر نہایا اور پورے ایک گھنٹے بعد باتھ روم سے تولیہ باندھ کر برآمد ہوا۔ تولیہ اور صابن دینے والے شخص نے مجھے ایک سیاہ سوتی ٹراؤزر اور سفید رنگ کی ٹی شرٹ پہننے کو دی۔ میرا پرس بھی مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔ میرا پاسپورٹ اور دیگر سامان خلیج کے ساتھ ہی تہ نشین ہوا تھا۔ پرس میں معمولی سی رقم، میرا پاکستانی شناختی کارڈ، کچھ اور کاغذات اور ایک تصویر تھی کاجل کی، یہ تصویر اس وقت کی تھی جب میں نے اسے اس کی انیسویں سالگرہ والے دن دیکھا تھا اور اپنے کیمرے سے اس کی تصویر لی تھی۔ اس سے اگلے روز میں لندن کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ تصویر میں کاجل نیلے ہلکے رنگ کی میکسی میں پھولوں کے درمیان میں کھڑی تھی۔ یہ پھول اور بوکیٹ سالگرہ میں آنے والے ہزاروں مہمان اس کے لیے لائے تھے۔ میں نے اصرار کر کے اس سے وہاں تصویر بنائی تھی۔ ویسے تو پورا رول ہی اس کی تصویروں سے بھرا تھا لیکن یہ تصویر خاص طور سے مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے چھوٹے سائز میں پرنٹ کروا کے اپنے بٹوے میں رکھ لیا تھا۔

''یہ موت کی سزا پانے والے قیدیوں کا لباس ہے۔'' مجھے واپس لا کر سیل میں بند کرنے والے ایک گارڈ نے مسکرا کر بتایا تھا۔

''اب تمہیں یہاں سے اس روز نکالا جائے گا جس روز تمہیں موت کی سزا دی جائے گی۔''

''یعنی اب میں باضابطہ سزائے موت کا قیدی ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''یہ بتاؤ کہ آج کھانے میں کیا ملے گا۔ دنیا کے سارے ہی ملکوں میں سزائے موت کے قیدیوں کو ان کا من پسند کھانا دیا جاتا ہے۔''

''یہ ہمیں نہیں معلوم۔ انچارج سے معلوم کرنا۔'' وہ چلے گئے۔





اگرچہ ان کے سامنے میں نے ظاہر یہی کیا کہ مجھے ان کی جانب سے دی جانے والی سزائے موت کی ذرا بھی پروا نہیں ہے لیکن یہ سن کر کہ میں نے سزائے موت کے قیدی کا لباس پہن لیا ہے میرے وجود میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پہلی بار اس یقین پر میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہوا تھا کہ ابھی میری زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں شاید اس خیال میں تھا کہ یہ سب ایک قسم کا مذاق ہے یا پھر میں جان گرے پر تکیہ کر کے بیٹھ گیا تھا کہ وہی مجھے اس آفت سے بچائے گا۔ حالانکہ اس کا سہارا بالکل ہی بودا تھا۔ اس کا نہ جانے کون سا مفاد تھا۔ یہ بھی ممکن تھا اس کا مفاد میرے بغیر ہی نکل آتا اور اسے میری مدد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس صورت میں اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ خود کو خطرے میں ڈال کر مجھے سزا سے بچاتا۔ اب مجھے پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ میں نے جان بچانے کے لیے خود ہاتھ پیر کیوں نہیں چلائے۔ عبید صلاح جو کل تک مجھے بے وقوف لگ رہا تھا اس وقت عقلمند محسوس ہونے لگا تھا اس نے موقع پاتے ہی فرار ہونے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب تک ان کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔ ورنہ جان گرے خاص طور سے اس کے بارے میں مجھے بتانے ضرور آتا۔ حوالات کے انچارج اور نائٹ ڈیوٹی والے سے میں نے کئی بار عبید صلاح کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

ہر آنے والا دن میری وحشت میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ افسوس کہ اب مجھے کوئی موقع میسر نہیں تھا۔ حوالات کی ان سلاخوں کو توڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس کا تالا کچھ اس طرح کا تھا کہ اندر میرا ہاتھ اس تک جاتا ہی نہیں تھا۔ کھانا دینے کے لیے فرش کے پاس ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ کھانا لانے والا کھانے کی ٹرے اس کے نیچے سے اندر سرکا دیا کرتا تھا۔ کھانا کھا کر میں ٹرے اسی کھڑکی کے پاس رکھ دیتا تھا۔ وہ ٹرے اُٹھا کر لے جاتا۔ اگر میں کسی ترکیب سے سلاخوں سے باہر نکل بھی آتا تب بھی اتنے سارے مسلح نگرانوں سے بچ کر نکل جانا ممکن نہیں تھا۔

اس روز میں نے رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے پندرہ منٹ کے اندر میرے پیٹ میں شدید قسم کا درد اُٹھا۔ پہلے تو میں درد کی شدت برداشت کرتا رہا لیکن جب یہ حد سے ہی گزرنے لگا تو میں نے رات کے نگران کو آواز دی۔

''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

''برداشت کرو۔'' اس نے رسالے سے سر اُٹھائے بغیر کہا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ حوالات کے نگرانوں کا کام صرف یہ فحش رسالے دیکھنا رہ گیا تھا۔ وہ ہمہ وقت ان رسالوں میں غرق رہا کرتے تھے اور ان کی میزوں پر اس قسم کے رسالوں کے کئی بنڈل رکھے تھے۔ نہ جانے ان کو دیکھ دیکھ کر دل کیوں نہیں بھرتا تھا۔ میں نے بھنا کر کہا۔

''اتنی دیر سے اور کیا کر رہا ہوں اب نہیں ہوتا کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''ڈاکٹر تمہارا نوکر نہیں ہے جو اتنی رات گئے دوڑا آئے۔ سو جاؤ صبح دیکھیں گے۔''

اچانک پیٹ کے اندر سے جیسے کسی نے نوکدار چیز ماری۔ میری بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔ پھر یہ برچھیاں مستقل پڑنے لگیں ضبط کرتے ہوئے میں پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ چیخ سن کر یہ نوجوان نگران بادلِ نخواستہ سیل تک آیا۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور واپس جا کر میز پر رکھے فون سے کسی سے رابطہ کیا۔ ”سیل نمبر بارہ کے قیدی کی حالت خراب ہے کسی کو بھیجو۔“

میری حالت واقعی خراب تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کھانے میں مَیں نے چھوٹے چھوٹے بم کھا لیے تھے اور اب وہ ایک ایک کر کے اندر پھٹ رہے تھے۔ کھانے کے خیال سے میں چونک گیا۔ یقیناً کھانے میں ایسی کوئی شے تھی جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پتلون کے اندر میرا پیٹ پھولنے لگا ہو۔ واقعی پیٹ تھوڑا اُبھر آیا تھا۔ میں نے احتیاطاً کلمہ شہادت پڑھ لیا کہ دشمنوں نے میری موت کے وقت کا انتظار نہیں کیا۔ قبل از وقت زہر دے کر کام تمام کر دیا۔

ڈاکٹر دس منٹ میں آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح اور مستعد گارڈز تھے۔ نائٹ آفیسر نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر نے اندر آ کر میرا معائنہ کیا پھر میرے پھول جانے والے پیٹ کو تشویش سے دیکھا۔

”اسے ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے نائٹ آفیسر سے کہا۔

”لے جاؤ۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”یہاں سائن کر دو۔“

ڈاکٹر کے کہنے پر گارڈز نے مجھے سیل سے نکالا۔ اس وقت تک میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ بغیر سہارے کے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس لیے دو افراد مجھے بازوؤں سے گھسیٹ کر باہر کھڑی مخصوص جیپ تک لائے۔ اس حالت میں بھی گارڈز نے ذرا سی رعایت نہیں کی۔ میرے دونوں ہاتھ جیپ کے اینگل آئرن سے منسلک ہتھکڑیوں میں جکڑ دیے۔ میرے ساتھ جانے والے ڈاکٹر نے ناگواری سے انہیں دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ دس منٹ بعد جیپ ایک ایسی عمارت کے سامنے رُکی جس پر ہسپتال کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسٹریچر منگوایا۔ اس پر لٹا کر مجھے اندر لے جایا گیا۔ تکلیف کی شدت ایسی تھی کہ لگ رہا تھا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اندر جاتے ہی ڈاکٹر نے مجھے کئی طرح کے انجکشن لگائے اور میرا معدہ واش کرنے کا حکم دیا۔ صفائی کا عمل بھی کم اذیت ناک نہ تھا لیکن یہ کہ اس کے بعد میرے پیٹ میں جاری گولہ باری رُک گئی اور تکلیف بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”مجھے زہر دیا گیا تھا؟“

اس نے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”نہیں ینگ مین! معمولی سا پوائزن تھا صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

عبید صلاح کے فرار کے بعد یہ لوگ بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی دونوں مسلح نگران میرے سر پر مسلط تھے جب مجھے طبی امداد دی جا رہی تھی تکلیف میں کمی کے بعد میں غنودگی محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید ڈرپ میں کسی قسم کی خواب آور دوا دی جا رہی تھی۔ رات کے کسی پہر مجھے بازو





سے پکڑ کر جھنجھوڑا گیا۔ بہ مشکل میری آنکھ کھلی۔ سامنے جان گرے کھڑا تھا۔

”غالباً میں خواب دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے زیرِ لب کہا۔

”اُٹھ جاؤ میں سچ مچ آیا ہوں۔“ جان گرے بستر کے کنارے ٹک گیا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں نگران غائب تھے۔

”کیا تم میری عیادت کرنے آئے ہو؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ بھی رات کے اس پہر۔“

”نہیں دراصل میں نے تمہیں اس طریقے سے یہاں بلوایا ہے۔ وہاں جیل میں بات کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔“

”اچھا تم نے کھانے میں کچھ ڈلوا دیا تھا۔“

”یہی سمجھو بہرحال اب کام کی بات سنو۔ کونسل نے سزائے موت کی توثیق کر دی ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو گیا ہو گا۔ کونسل تمہیں مقابلہ کر کے جان بچانے کے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح کونسل کو راضی کر لیا کہ تمہیں ایک موقع ضرور دے۔ اب تمہیں ایرینا میں مقابلہ کر کے اپنے لیے زندگی حاصل کرنا ہو گی۔“

”میرا مقابلہ ایولی سے ہو گا۔“ مجھے وہ دیوزاد یاد آ گیا۔

”نہیں۔“ جان گرے مختصراً بولا۔ ”وہ ان دنوں زخمی ہے اور ممکن ہے اسے واپس بھیج دیا جائے۔ تمہارا مقابلہ الیکٹرک سے ہو گا۔“

میں ہنسا۔ ”یعنی بجلی۔ کیا مجھے کرنٹ دے کر مارا جائے گا۔“

وہ کرنٹ سے بھی زیادہ خطرناک شخص ہے۔ دیکھنے میں بے ضرر لیکن اسے چھوتے ہی ایسا کرنٹ لگتا ہے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔“ جان گرے متفکر انداز میں بولا۔ ”اس سے مقابلے کے لیے تمہارے پاس صرف چار دن ہیں۔“

”ان چار دنوں میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”قید میں آ کر تمہیں ہاتھ پیر چلانے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ بہتر ہے تم اپنی جسمانی حالت درست کرنے کے لیے ایکسرسائز کرو۔ ورنہ اس مقابلے میں تمہیں بہت پریشانی ہو گی۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں اس الیکٹرک کا سرکٹ شارٹ کر دوں گا۔ اس کا فیوز اُڑا دوں گا۔“

جان گرے بدستور فکرمند تھا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ جلد تمہیں اس کے لڑنے کے انداز کی کوئی ویڈیو دکھا دوں۔“

”مہربانی کر کے میری خوراک بھی بدلوا دو۔ میں چاول اور مچھلی کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تو کیا تمہیں تمہاری پسند کے کھانے نہیں دیئے جا رہے۔ سزائے موت کے قیدیوں کو ان کا فرمائش کیا ہوا کھانا دیا جاتا ہے۔''

''فی الوقت تو کھانے میں بغیر فرمائش کے زہر دیا جا رہا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

جان گرے مسکرایا۔ ''وہ زہر نہیں تھا۔ ورنہ اب تک مر چکے ہوتے۔ صبح تک تمہیں لگے گا جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''ایک منٹ پہلے میرے ایک سوال کا جواب تو دے دو۔'' میں نے اسے روکا۔

وہ پہلے ہی میرا سوال بھانپ گیا تھا۔ ''عبید صلاح کا کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ جانے اسے آسمان کھا گیا ہے یا زمین نے نگل لیا ہے۔ دس روز میں گارڈز نے جزیرے کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ فرار ہونے کے لیے سمندر میں اُترا ہو گا اور شارکوں کا شکار ہو گیا۔''

میں نے اطمینان محسوس کیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل جان گرے کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ عبید صلاح جیسے لوگ بے بسی سے مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ یا تو اسے جزیرے میں ہی کوئی پناہ گاہ مل گئی تھی یا وہ کسی اور طریقے سے یہاں سے نکل جانے میں کامیاب رہا تھا۔ جان گرے کے جانے کے بعد میں نے سونے کا سوچا لیکن پھر آنے والے حالات کے پر غور کرنے لگا۔ جان گرے کے اصرار پر جزیرے کی کونسل نے مجھے مقابلہ کر کے زندگی بچانے کا ایک موقع دے دیا تھا اور ساتھ ہی کسی الیکٹرک کو مدِ مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ جان گرے اس کے بارے میں اتنا فکر مند تھا کہ اس نے خاص طور سے مجھے بتانے کے لیے حوالات سے نکالا اور رات کے اس پہر ہسپتال میں آ کر مجھے بتایا تھا بلکہ اس نے مجھے الیکٹرک کے لڑنے کا اندازہ دکھانے کی بات بھی کی تھی۔

جان گرے کی قید میں آنے کے بعد میں جسمانی طور پر واقعی کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ آؤٹ آف پریکٹس ہونے کی وجہ سے چستی باقی نہیں رہی تھی اور بقول جان گرے کے میرے پاس صرف چار دن تھے اور اس دوران میں مجھے خود کو مقابلے کے قابل بنانا تھا میں جس کوٹھری میں تھا وہاں کسی ورزش یا پریکٹس کی گنجائش کم ہی تھی۔ یہاں ہسپتال کے اس کمرے میں خاصی گنجائش تھی کیونکہ باہر جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ اس لیے گارڈز بے فکری سے باہر موجود تھے۔ میں نے اپنے بازو سے ڈرپ کی سوئی نکالی اور بستر سے نیچے اُتر آیا۔ خلافِ توقع مجھے جسم میں کمزوری کے بجائے توانائی محسوس ہوئی تھی۔ شاید ڈرپ میں مجھے طاقتور دوائیں دی گئی تھیں۔ میں نے آغاز اسکپنگ سے کیا اور پنجوں کے بل اُچھلنے لگا۔ مسلسل دو گھنٹے تک ورزش کر کے میرا جسم پسینے میں تر بتر ہو رہا تھا اور سانس تیزی سے چل رہا تھا میں بستر کی طرف بڑھا تھا کہ فائر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔



فائر نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ یوں رُک گئے جیسے چابی سے چلنے والے کھلونے چابی ختم ہوتے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں کے بدلتے تاثرات دیکھ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ذرا





فاصلے پر عمر خان شاٹ گن لیے کھڑا تھا۔ فائر اس نے ہی کیا تھا۔ اس نے غرا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اسے مطلع کیا۔ ''یہ سب تم دونوں کے کیے کی سزا مجھے دینے جا رہے تھے۔ حالانکہ میں نے اس احسان فراموش کو بچایا تھا۔'' میں نے مقامی لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

عمر خان نے منہ بنایا۔ ''ان چھوٹے لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو تو یہ اسی طرح منہ کو آتے ہیں۔ اچھا تھا تم اسے ٹھنڈا ہونے دیتے۔'' پھر اس نے دھاڑ کر ان سے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔ یہ ہماری زمین ہے۔'' اس نے شاٹ گن کا رُخ ان کی طرف کیا تو وہ سب گرتے پڑتے بھاگے۔ ان کا انداز دیکھ کر عمر خان نے قہقہہ لگایا۔ ویسے اس کا نام اس کے حلیے سے میل نہیں کھاتا تھا اس حلیے میں اس کا نام کوئی ٹونی وغیرہ ہونا چاہیے تھا۔

''تمہارا شکریہ کہ تم نے ان لوگوں سے جان چھڑائی۔''

''نو پرابلم۔'' وہ مسکرایا اور مڑ کر واپس چلا گیا۔ پہلی ملاقات میں وہ مجھے ذرا کھلنڈرے قسم کا نوجوان لگا تھا لیکن اس وقت عمر خان کا انداز بالکل مختلف تھا۔ میں دوبارہ نیچے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے مقامی لڑکے کے مردود پن پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے حیران کر دینے والی حرکت کی تھی۔ حالانکہ اس نے دیکھا تھا کہ میں نے اسے بچایا ہے۔ ایک بزرگ نے سانپ کو سردی سے بچایا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور اسے دودھ پلایا۔ ٹھیک ہوتے ہی سانپ نے ان کے ہاتھ پر ڈسا اور چلا گیا۔ لوگوں نے بزرگ کو شرمندہ کیا کہ یہ کیا عقلمندی کی۔ بزرگ نے کہا اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ سانپ نے مجھے ڈسا یہ اس کے شکریہ ادا کرنے کا انداز ہے۔ ممکن ہے اس لڑکے نے بھی اس طرح میرا شکریہ ادا کیا ہو۔

میں گیٹ کے راستے اندر داخل ہوا تو گل محمد نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''چھوٹا صاحب آپ کدھر سے باہر گیا تھا؟''

''عقبی دروازے سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے گل محمد یہ بنگلہ غیر محفوظ ہے۔ کوئی بھی اس میں آسانی سے جا سکتا ہے۔''

''حسن صاحب نے مجھے سب سمجھا دیا ہے کل سے آدمی آ جائیں گے۔'' اس نے گویا مجھے اطمینان دلایا۔

اندر حسن علی اور ماہ پارہ لیونگ روم میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے اور ان کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں میری فکر ہے۔ میں نے دخل اندازی سے گریز کیا اور عقبی لان کی طرف آ گیا۔ بنگلے کا شمال مشرقی حصہ ایک کھائی کے ساتھ لگتا تھا۔ اس جگہ ریلنگ کے بجائے لکڑی کی باڑھ تھی۔ جس پر سفید رنگ کی پالش کی گئی تھی۔ کھائی زیادہ

گہری نہیں تھی اس کی گہرائی بہ مشکل چالیس پچاس فٹ ہوگی۔ سوفٹ چوڑی اور تقریباً چار سوفٹ لمبی اس کھائی کے کنارے کئی بنگلے تھے۔ باڑھ کے نیچے کھائی تقریباً سیدھی دیوار کی صورت میں تھی۔ اس دیوار پر چڑھنا بے حد دشوار ہوتا اگر اس پر جا بجا جھاڑیاں اور پودے نہ اُگے ہوتے۔ ان جھاڑیوں اور پودوں کو پکڑ کر کوئی بھی آسانی سے بنگلے میں داخل ہوسکتا تھا۔ باڑھ اسے نہیں روک سکتی تھی۔ باڑھ کی وجہ سے عقبی لان خوب صورت لگتا تھا۔ اس سے نیچے کھائی میں بھی رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے اور کھائی کی تہہ میں ایک چشمہ تھا جس کا پودوں کے درمیان سے جھلکتا پانی آئینے کی طرح لگتا تھا۔

باڑھ کے پاس ہی ایک کاؤچ رکھی تھی۔ جس پر چڑا منڈھا تھا۔ اس پر لیٹ کر میں دھوپ سینکنے لگا۔ تگڑے ناشتے کے بعد میرا کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ حسن علی نے بھی تین چار دن سے چھوٹ دے رکھی تھی۔ اونگھتے اونگھتے چونک کر دیکھا تو حسن علی کو خطرناک تیوروں کے ساتھ اپنے سر پر کھڑے پایا۔ ”کہاں تھے برخوردار دو گھنٹے سے؟“

”آپ کو کیا؟“ میں نے جل کر کہا۔ ”جب واپس آیا تو جناب اور جنابہ بے فکری سے گپیں مار رہے تھے۔“

حسن علی ہنسا۔ ”برخوردار اب تم بچے نہیں رہے جو ہم تمہاری فکر کریں۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہ ڈسپلن کے خلاف ہے تم نے نہ تو مجھ سے پوچھا اور نہ ہی اطلاع دی۔ حالانکہ خطرے ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔“

”استادِ محترم۔“ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مجھے کب تک آپ کے اشاروں پر ناچنا پڑے گا اور خطرات کب میرے اطراف نہیں منڈلاتے۔“

”جب تک جمشید علی چاہے گا۔“ حسن علی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آج ایکسرسائز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پورے ایک ہفتے کا وقفہ آچکا ہے۔“

”جی استادِ محترم۔“ میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔ حسن علی نے وہیں مجھے ورزشیں کرائیں اور جب تین گھنٹے بعد میرا بھوک اور تھکن سے انتقال ہونے لگا تب اس نے میری جان چھوڑی تھی۔ میں سیدھا کچن میں پہنچا جہاں ایک شخص کام کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”ام کک اے۔“ اس نے سینہ تان کر کہا۔ اس مختصر سے شخص کی مونچھیں اس کے قد سے کچھ ہی چھوٹی تھیں سر کے بال اس نے تیل میں چپڑ کر جما کر بنائے تھے۔ تیل اس کی مونچھوں میں بھی چمک رہا تھا۔ ”امارا نام چھوٹا خان ہے۔“

”چھوٹا خان اس وقت تم میری جان بچا سکتے ہو۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

”ام آپ کا جان بچائے؟“ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ ”پر کیسے؟“





”کچھ کھلا کر۔ میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں۔“ میں نے کہا تھا کہ ماہ پارہ آگئیں۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے جا کر نہاؤ۔ پھر کھانا۔“

”اس وقت تک بندہ انتقال کر جائے گا۔“ میں نے فریاد کی لیکن ماہ پارہ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ حسن علی اور ان کے رویئے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے مجھے ٹائٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بادلِ نخواستہ مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا۔ نیچے والا بیڈ روم حسن علی نے لے لیا تھا۔ میرے اور ماہ پارہ کے حصے میں اوپر کے دو بیڈ روم آئے تھے۔ میں نے عقبی سمت والے بیڈ روم کا انتخاب کیا جس کی بالکونی سے میں نے نیچے چھلانگ لگائی تھی۔ ماہ پارہ نے سامنے والا بیڈ روم منتخب کیا۔ گرم پانی سے نہا کر ان چوٹوں کو بھی آرام آ گیا تھا جو لاٹھی برداروں نے لگائی تھیں۔ میں نے حسن علی اور ماہ پارہ کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ جب نہا کر آیا تو ماہ پارہ ٹرے لیے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ٹرے میں چائنیز رول، سموسے تھے۔ بڑا ایک سینڈوچز بھی اور پیزا بھی۔ میں نے مشکل سے دس منٹ میں ساری ٹرے صاف کر دی تھی۔ ماہ پارہ چائے بناتے ہوئے ہنسیں۔

”میرے خدا...... یوسف تم کس قدر پیٹو ہو گئے ہو؟“

میں نے منہ بنایا۔ ”وہ جو آپ کے ہیں نا، حسن علی صاحب۔ وہ مجھ سے ایسی ورزشیں کراتے ہیں جو ہاتھی سے بھی کرائی جائیں تو ہرن بن جائے۔ خدا کا شکر ہے میں غائب نہیں ہوا۔ آپ لوگوں کو نظر تو آتا ہوں۔“

”وہ تمہاری بہتری کے لیے ایسا کرتا ہے۔“ ماہ پارہ نے چائے مجھے تھمائی۔

”اب دیکھیں فزیکل فٹنس کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ تھوڑا بہت دماغ کا فن بھی آنا چاہیے لیکن حسن علی، لگتا ہے مجھے بروسلی یا کمانڈو ٹائپ کی کوئی شے بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ میں ہرگز اس قسم کی کوئی شخصیت نہیں بننا چاہتا۔“

”یہ سب جمشید علی کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح ماہ پارہ نے جمشید علی کی آڑ لی اور یہاں آ کر میں بے بس ہو جاتا تھا۔ مگر اس روز میں نے بھنا کر کہہ دیا۔

”تو پاپا یہ سب جنید اور جاوید کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ مجھ پر نظرِ کرم کیوں۔“

ماہ پارہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی تھی۔ ”یہ تم اپنے پاپا سے پوچھنا۔“

ان کے تاثرات محسوس کر کے میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے مام۔“

انہوں نے سرد آہ بھری۔ ”میں نے تمہیں بتا دیا کہ ہم سب ہی کٹھ پتلیاں ہیں، ہماری ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہیں۔“

”مام یہاں تو آپ آزاد ہیں، چاہیں تو جا سکتی ہیں۔“ میں نے عمداً نہیں کہا کہ کسی کے ساتھ جا سکتی ہیں لیکن میرا مطلب جان کر ماہ پارہ کے چہرے پر سرخی سی آئی تھی۔

”میرے بچے میں بھی اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوں۔“

"اگر اشارہ میری طرف ہے تو آپ بالکل پروا نہ کریں۔ یقین کریں آپ کہیں اور جا کر اگر خوش اور مطمئن رہیں گی تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی ہے۔"

ماہ پارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے، میری خوشی کی خاطر تو کبھی میری راہ میں نہیں آئے گا۔ اس کے باوجود میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میرا اشارہ جمشید علی کی طرف ہے۔ اس جگہ بھی کوئی نہ کوئی ہماری نگرانی کے لیے سر پر ہو گا۔ تم جمشید علی کے لمبے ہاتھوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ایرانی حکومت کو بھی مطلوب ہے، اس کے باوجود پوری دلیری سے وہاں جا کر وہ مجھے وہاں سے نکال لایا تھا۔"

"آپ ضرورت سے زیادہ ہی مایوس ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو حسن علی کے ساتھ کہیں چلے جانا چاہیے۔ بے شک پاپا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں لیکن دنیا میں بے شمار ایسی جگہیں ہیں جہاں پاپا کے ہاتھ تو کیا ان کی سوچ بھی نہیں جا سکتی ہے۔"

ماہ پارہ چپ ہو گئیں جیسے اس بارے میں مجھ سے بحث نہ کرنا چاہ رہی ہوں۔ میں بھی خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چائے پی کر میں نے الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کیے۔ ماہ پارہ نے بتایا کہ چھوٹا خان، گل محمد کا کزن ہے، جلد ہی ایک مالی اور صفائی کرنے والی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ "یہ چھوٹا خان بناتا سب مزے کا ہے۔" میں نے چٹخارا لیا۔

"ہاں تو تم کیا سمجھتے ہو، بڑا چلتا پرزہ ہے۔ مری کے ہوٹلوں میں کام کرتا رہا ہے۔ ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔" ماہ پارہ بولیں۔

نیچے لیونگ روم اور ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک کمرا تفریح کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں دیوار کے ساتھ بڑے سائز کا ٹی وی، اسٹیریو سسٹم، مختلف قسم کے پلیئر بمعہ کیسٹ اور سی ڈی استعمال کرتے تھے حالانکہ اس زمانے میں سی ڈی نئی نئی آئی تھی۔ ڈش بھی تھی لیکن اس زمانے میں سیٹلائٹ پر گنے چنے چینلز ہی آتے تھے۔ ریک میں ویڈیو اور آڈیو کے ساتھ سی ڈیز کا خانہ الگ تھا۔ ٹی وی کے ساتھ منسلک کر کے کھیلے جانے والے ویڈیو گیمز تھے۔ بنگلے کے تہہ خانے میں خاصا بڑا جمنازیم اور اس کے ساتھ چھوٹا سا سوئمنگ پول تھا۔ تہہ خانہ تقریباً پورے بنگلے کے برابر تھا گویا یہاں پر ضرورت اور آسائش کی ہر شے تھی۔

اگلے روز میں ڈرائیور، چھوٹا خان اور ماہ پارہ کے ہمراہ سکول گیا۔ جی ہاں ہر فن مولا چھوٹا خان ڈرائیور بھی تھا۔ سکول وسیع رقبے پر پھیلا جدید طرزِ تعلیم اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھا اور کیوں نہ ہوتا، یہاں پر ملک کے گنے چنے افراد کے بچے پڑھتے تھے، جن کی ماہانہ فیس ایک متوسط طبقے کے خاندان کی ماہانہ آمدنی سے بھی زیادہ تھی۔ سالانہ فیس اس کے علاوہ تھی۔ کسی بھی نئے داخلے پر سکول کو بھاری رقم ایڈمیشن فیس بھی دینا پڑتی تھی۔ کیونکہ میرا داخلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس معیار کے سکول میں کاپیوں، کتابوں کا جھنجھٹ والدین کی ذمے داری نہیں ہوتا۔ جوتے سے لے کر یونیفارم سب





سکول مہیا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کام کی وہ کئی گنا رقم وصول کر لیتا ہے۔

پہلا دن میرا تعارف اور یونیفارم کا ناپ وغیرہ دینے میں گزرا۔ سکول صبح آٹھ سے دوپہر تین بجے تک تھا۔ اکثر بچے بلکہ لڑکے لڑکیاں سکول کمپاؤنڈ میں ہی ہوسٹل کی عمارتوں میں رہتے تھے لیکن کچھ امراء کے بچوں کے لیے الگ سے رہائش کا انتظام تھا۔ میرا ایک رسمی سا ٹیسٹ ہوا تھا حالانکہ داخلہ مجھے پہلے ہی مل چکا تھا۔ سکول اصل میں ہائی سکول تھا یعنی یہاں پر انٹرمیڈیٹ کے سارے درجے تک تھے۔ اس حساب سے مجھے مزید تین سال یہاں پڑھنا اور تعلیم حاصل کرنا تھی۔ اتنا عرصہ مجھے کاجل سے دور رہنا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ پاپا مجھے سرما کی چھٹیوں میں بھی واپس نہیں آنے دیں گے۔ وہ کاجل اور میری خطا بھولے نہیں ہوں گے۔ سزا دینا ان کا مسئلہ تھا، اس کے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے تھے۔

ایک ہفتے میں بنگلے میں خاصی تبدیلیاں آئی تھیں۔ چاروں طرف دیواریں اونچی کر کے ان پر خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی تھی۔ سارے دروازوں کے تالے بدلے گئے تھے اور جن کھڑکیوں پر گرل نہیں تھی، ان پر گرل لگائی گئی تھیں۔ گل محمد اب کل وقتی محافظ تھا۔ ایک مالی روز آتا تھا، اسی طرح ایک صفائی کرنے اور کپڑے دھونے والی عورت تھی۔ چھوٹا خان صبح آتا تھا اور شام کو سات بجے ڈنر مکمل کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ایبٹ آباد سے جا کر سامان لاتا تھا۔ اس دوران میں حسن علی نے اپنی پسند سے ایک ہنڈا اکارڈ لی تھی۔ جیپ عام کاموں کے لیے اور اور کار صبح مجھے سکول چھوڑنے اور لانے کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں کہیں جانا ہوتا تھا تو یہی کار استعمال کی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں اس سکول میں سیٹ ہونے لگا۔ میرا صبح سے سہ پہر تک کا وقت سکول میں گزرتا تھا۔ معیارِ تعلیم اتنا اچھا تھا کہ سکول سے آ کر مجھے کچھ پڑھنے کی خاص ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ ایک گھنٹہ آرام اور کھانے کے لیے ملتا تھا اور رات ساڑھے دس بجے سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں چلا جاتا تھا۔ صرف ویک اینڈ پر رات بارہ بجے تک جاگنے کی اجازت تھی۔ ظاہر ہے اس سارے معمول میں میرے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا جسے اپنی مرضی سے گزار سکوں۔ اتوار والے دن حسن علی مجھے ہائکنگ کے لیے لے کر جاتا تھا اور یہ اتنا مشکل کام تھا کہ سارے ہفتے کی ایکسرسائز ایک طرف اور اتوار کی ہائکنگ ایک طرف۔

ہمارے آنے کے ایک ہفتے کے اندر فون بھی لگ گیا تھا اور ظاہر ہے اس پر جو پہلی کال آئی وہ کاجل کی ہی تھی۔ دس منٹ تک تو وہ روتی ہی رہی تھی۔ بہ مشکل میں نے اسے چپ کرایا۔ "پاگل، یہ بہت مہنگی کال ہے۔ اسے رونے دھونے میں ضائع نہ کرو۔ نہ جانے کب تمہاری اماں آ جائیں اور کال ڈس کنیکٹ کرنی پڑے۔"

"مما...... اب مجھے منع نہیں کریں گی۔" اس نے روتے روتے چپ ہو کر مجھے مطلع کیا۔

"کیوں..... کیا تم نے انہیں پھر کوئی دھمکی دی ہے؟"

"ہاں میں نے مما سے کہا آپ مجھے یوسف سے بات نہیں کرنے دیں گی تو میں آپ سے بھی بات نہیں کروں گی۔"

"پھر کتنے دن بات نہیں کی اپنی مما سے؟" میں نے پوچھا۔

"پورے دس دن۔" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "پھر مما نے مجھے اجازت دے دی۔"

"تم نے بھی نہیں سدھرنا ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"یوسف..... تم کب آؤ گے؟" اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ "میں نے پاپا سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ تم سردیوں میں آؤ گے۔"

"خدا کرے ویسے مجھے پاپا کا ارادہ بلانے کا نہیں لگ رہا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "ورنہ وہ مجھے یہاں بھیجتے ہی کیوں۔ معیارِ تعلیم کراچی کے سکولوں کا بھی اعلیٰ ہی ہے۔"

"میں نے پاپا سے منوا لیا ہے تم کراچی ضرور آؤ گے۔" اس نے یقین سے کہا تھا، پھر بولی۔

"تم نے اس لڑکی ماریہ سے تو بات نہیں کی نا؟"

"اسے میرے فون کا نمبر علم ہوگا تو بات کرے گی اور مجھے اس کے نمبر کا علم بھی نہیں ہے۔"

"میں اسے ضرور قتل کر دوں گی۔" کاجل نے یقین سے کہا۔

"کچھ ایسے ہی محبت آمیز جذبات اس کے بھی ہوں گے۔" میں ہنسا۔ "لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا ہم اسے بھول جائیں اور اپنی بات کریں۔ میری اور تمہاری۔"

"یوسف! پاپا کہہ رہے تھے جب تم ایبٹ آباد سے واپس آؤ گے تو تمہیں انجینئرنگ پڑھنے کے لیے لندن بھیجیں گے۔ یوسف میں بھی لندن جاؤں گی۔"

"اگر تمہارے پاپا نے جانے کی اجازت دی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

کاجل نے پورا ایک گھنٹہ مجھ سے بات کی۔ اگر وہ ایک دولت مند باپ کی اولاد نہ ہوتی تو اس کے لیے مجھ سے اتنی لمبی بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب فون کے نرخ بڑھا کرتے تھے ان میں کمی کا رجحان نہیں تھا۔ اس ایک گھنٹے کی گفتگو کے غالباً دو ڈھائی ہزار کا بل بن گیا ہوگا جو اس وقت ایک عام شخص کی ماہانہ آمدنی کے برابر تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ ماریہ کو میرا نمبر نہیں پتہ ہوگا۔ اسی شام جب میں ایکسرسائز کر کے نہانے کے لیے اوپر آیا تو ماہ پارہ نے شریری سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اسی دیوانی کا فون آیا تھا۔"

میں چونکا۔ "کاجل کا..... ابھی سہ پہر کے وقت تو اس سے بات ہوئی ہے۔"

"میں کاجل نہیں..... ماریہ کی بات کر رہی ہوں۔ ابھی پانچ بجے اس کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہاری مصروفیت کا بتایا تو اس نے دس بجے رات فون کرنے کا کہا ہے۔"





"مارے گئے۔ اسے یہاں کا نمبر کیسے مل گیا؟"

ماہ پارہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "یوسف! ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی تلاش کر لیتے ہیں، یہ تو محض ایک فون نمبر ہے۔"

"یہ ساری آفتیں فون لگتے ہی نازل ہونا تھیں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا اور اوپر کی طرف بڑھ گیا۔

"ناشکرے ہو..... محبت مل رہی ہے تو ٹھکرا رہے ہو۔" عقب سے ماہ پارہ نے کہا۔

"ایسی محبتوں سے باز آیا۔" میں نے رُکے بغیر کہا۔

کھانا کھا کر میں اوپر آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک فون نیچے حسن علی کے بیڈروم میں تھا۔ دوسرا اوپر گیلری میں۔ کیونکہ حسن علی اور ماہ پارہ تفریح والے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے تھے، اس لیے میں نے فون ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف ماریہ تھی۔

"کیسے ہو یوسف؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ایک دم فٹ فاٹ..... بائی دی وے آپ کون ہیں۔ میں پہچان نہیں سکا۔"

اس نے سرد آہ بھری۔ "گویا تم نے جاتے ہی مجھے بھلا دیا۔"

اس بار میں نے پہچان لیا۔ "ماریہ تم....."

"شکر ہے دوسری کوشش میں پہچان گئے۔ یہ بتاؤ کہ میری یاد نہیں آئی۔"

"آئی تھی۔" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

"پھر مجھے کال کیوں نہیں کی۔" اس نے محبوبانہ ناراضگی سے کہا۔

"فون ہی آج لگا ہے۔" میں نے بہانہ کیا۔

"اور دیکھو..... میں نے آج ہی نمبر بھی حاصل کر لیا۔" وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

مجھے ماہ پارہ کی بات یاد آ گئی۔ وہی دہرا دی۔ "تلاش کرنے والے تو خدا کو ڈھونڈ لیتے ہیں، یہ تو فون نمبر ہے۔"

"یوسف میں نے تمہیں دن رات ایک ایک پل یاد کیا ہے۔" اس نے اپنی بے تابی کا اظہار کیا۔ "مجھے تمہارے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔"

"کیوں..... مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے۔" میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں..... لیکن یوسف تم نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ میں تم سے ملنے آ رہی ہوں۔"

میں بوکھلا گیا۔ "ابھی..... اس وقت۔"

وہ ہنسی۔ "اتنی پاگل نہیں ہوں کہ رات کے اس وقت چل پڑوں۔ کل صبح نکلوں گی، شام تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تمہارے ساتھ رہوں گی..... صبح واپس۔"

"میرے ساتھ۔" میں مزید بوکھلا گیا، پھر تھوک نگل کر بولا۔ "ایسا ممکن نہیں ہے ماہ پارہ بہت

ماریں گی۔''

وہ ہنسی۔ ''بابا تمہارے ساتھ سے مطلب ہے کہ تمہارے گھر میں رہوں گی...... سچ مچ تمہارے بیڈروم میں تھوڑی سوؤں گی۔'' وہ کہتے کہتے شوخ ہوگئی۔ ''ویسے تم چاہو تو یہ بھی ممکن ہے۔''

''ماریہ میرا خیال ہے یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے۔'' میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ''تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے۔''

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ان کی فکر مت کرو، ویسے بھی میں یہی بتا کر آؤں گی کہ میرے ساتھ دو فرینڈز بھی ہوں گی۔''

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ''دیکھو ماریہ...... یہ آسان نہیں ہے۔ شاید...... ماہ پارہ اسے پسند نہ کریں۔''

''میں ان سے بات کر چکی ہوں۔ میرے آنے کا سن کر انہوں نے خوشی سے ویلکم کہا تھا۔''

یعنی وہ ماہ پارہ سے بات کر چکی تھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ ''میں صبح سے شام تک ایک ایک لمحہ مصروف رہتا ہوں۔ سکول سے تین بجے تک آتا ہوں، پھر...... آٹھ بجے تک حسن علی کے قبضے میں ہوتا ہوں، رات دس بجے تک مجھے سو جانے کا حکم ہے۔''

''نو پرابلم...... میں کوشش کروں گی کہ کل ذرا دیر سے آؤں۔ پرسوں اتوار ہے۔ سارا دن تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''اتوار کو حسن علی مجھے ہائکنگ پر لے جائیں گے۔'' میں نے آخری بہانہ کیا۔

اس نے نہایت سکون سے اس حربے کو بھی ناکام بنا دیا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے۔ مجھے بھی ہائکنگ کا شوق ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔''

''اچھا بابا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''آ جاؤ...... لیکن خدا کے لیے...... ماہ پارہ کے سامنے فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔ وہ میرے لیے ماں جیسی ہیں۔''

یوسف مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ماہ پارہ صرف ایک گورنس ہیں لیکن تم ان سے کتنی محبت کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے وہ تم سے جان بھی مانگیں تو تم دے دو گے۔''

''بلاشبہ...... انہوں نے محض گورنس بن کر نہیں پالا بلکہ مجھے سچ مچ ماں کی محبت بھی دی ہے اور وہ باقاعدہ گورنس نہیں ہیں۔ جمشید علی کی درخواست پر انہوں نے یہ ذمے داری سنبھالی تھی۔''

ماریہ نے فوراً معذرت کر لی۔ ''سوری، میرا مقصد ماہ پارہ کی انسلٹ نہیں تھا۔ میں تو خود انہیں پسند کرتی ہوں۔ ویسے ایک بات ہے، یہ جو حسن علی ہیں، یہ ماہ پارہ کو پسند کرتے ہیں۔''

''شاید۔'' میں نے اسے ٹالا۔ ''یہ بتاؤ کہ کل کس وقت تک آ رہی ہو۔ ہو سکتا ہے تمہاری وجہ سے مجھے کل ایکسرسائز سے بھی نجات مل جائے۔''

''اتنا تنگ ہو۔'' وہ ہنسی۔ ''سچ مجھے تو اس قسم کی ایکسرسائز میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میں بھی حسن





علی سے مارشل آرٹس سیکھوں گی۔''

''ہرگز نہیں۔ تم نے جتنا سیکھا ہے اتنا کافی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ڈر گئے۔'' وہ ہنسی۔ ''میں صرف دو دن کے لیے آؤں گی۔ ویسے کبھی نہ کبھی حسن علی سے سیکھوں گی ضرور...... اس روز تم نے جتنی ذہانت اور سکون سے ان ڈاکوؤں پر قابو پایا، میرا خیال ہے اس ملک کا کوئی پندرہ سالہ لڑکا ایسا نہیں کر سکتا ہے۔'' وہ رُکی اور پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ''تم واقعی اتنے کم عمر ہو یا مجھ سے بچنے کے لیے بن گئے تھے۔''

''تم ماہ پارہ سے پھر پوچھ لینا۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اور بچا کون کمبخت ہے۔''

''درست کہا...... تو کل میں آ رہی ہوں...... تیار رہنا۔''

''خدا کرے کل راستوں پر لینڈ سلائیڈنگ ہو جائے۔'' میں نے دل میں دعا کی اور منہ سے مرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگی؟''

''تم اچھی لگیں۔'' میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

''کہاں سے...... آئی مین...... کہاں کہاں سے۔'' اس کے لہجے میں سوال بول رہا تھا۔

''یہ تم کس قسم کے سوال کر رہی ہو۔ ہوش میں ہو؟''

''سوری، اگر تمہیں بُرا لگا۔'' اس نے فوراً معذرت پیش کر دی۔

میں نے دل میں پریشان ہو کر سوچا۔ ''یہ بلا تو گلے ہی پڑ گئی ہے۔ کاجل کو پتا چلا تو میری زندگی عذاب میں آ جائے گی۔ میں جمشید پیلس میں ہی بھلا تھا، باہر آتے ہی دشمنوں کے ساتھ ماریہ جیسے دوست بھی ٹوٹ پڑے تھے۔ ماریہ سے بہ مشکل جان چھڑا کر نیچے آیا۔ ماہ پارہ کو ماریہ کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ بولیں۔

''میں نے بھی اسے دعوت دی تھی، اکیلے بور ہو جاتی ہوں، وہ آ جائے گی تو میں بھی دو دن انجوائے کر سکوں گی۔''

میں جھنجھلا گیا۔ ''وہ آپ کو انجوائے کرانے نہیں...... میرا ناک میں دم کرنے آ رہی ہے۔ آپ کو کاجل کا پتا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا تو میری جان پر بن جائے گی۔''

حسن علی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''میں بھی کس بزدل شخص کو تربیت دے رہا ہوں۔ یہ ایک بچی سے ڈرتا ہے۔''

''وہ آفت کا پرکالہ بچی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور عورت اگر بچی بھی ہو تو اسے کم نہیں سمجھنا چاہیے اور جہاں تک بہادری کا تعلق ہے، میں نے بڑے بڑے دلیروں کو عورت کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا ہے۔''

حسن علی جھینپ گیا۔ ''بہت بولنے لگے ہو برخوردار...... ویسے کاجل کو کیسے پتا چلے گا، پھر

ماریہ اچھی لڑکی ہے۔ اس نے جس طرح تمہارے ساتھ مل کر ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا، اس نے مجھے متاثر کیا۔''

''آپ ایسا کریں اسے شاگرد بنالیں۔ ویسے بھی وہ آپ سے سیکھنے کے لیے بے چین ہے۔''

''میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا اگر آپ نے اسے تربیت دینے کے لیے یہاں بلایا۔ پھر آپ جمشید علی کو جواب دیتے رہیے گا۔'' میں نے دھمکی دی۔

''بے وقوف یہ صرف ستا رہا ہے تمہیں...... اور کیسے مرد ہو ایک لڑکی کو قابو نہیں کر سکتے۔ لڑکے تو درجن بھر لڑکیوں کو بیک وقت بیوقوف بناتے ہیں۔''

''فی الوقت تو ایک نے مجھے بنا رکھا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ اگر کاجل کو پتا چل بھی گیا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ ماریہ کو میں نے بلایا تھا۔''

''اگر اس نے یقین کیا تو۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ دونوں بھی سو جائیں۔''

ماہ پارہ جھینپ گئی تھیں۔ اگلے روز مجھے وقت پر اُٹھایا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ اکثر رات ایک دو بجے سویا کرتی تھیں، ان کو مطالعے کی عادت تھی۔ اس کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ اس پر بھی صبح فجر کے وقت بے دار ہو جاتی تھیں۔ پیلس میں وہ نماز پڑھ کر اپنے لیے ایک کپ کافی بنوا کر لان پر چلی جاتی تھیں، وہاں اس وقت تک چہل قدمی کیا کرتی تھیں جب تک مجھے اُٹھانے کا وقت نہیں آ جاتا۔ پھر آ کر مجھے اُٹھاتیں اور تیار کرا کے سکول کے لیے روانہ کرتی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ماما کیا یہاں بھی چہل قدمی کرتی ہیں؟''

انہوں نے جھرجھری لی۔ ''باہر غضب کی سردی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہوا میں ایسی تازگی اور مہک ہے، لگتا ہے جیسے یہ دنیا ابھی ابھی وجود میں آئی ہے۔'' انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''یوسف! تم بھی صبح کے وقت باہر نکلا کرو۔''

''مجھے تو معاف ہی رکھیے۔'' میں نے باتھ روم کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''استادِ محترم میرے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس کے بعد مجھ میں صبح سویرے اُٹھنے کی قطعی ہمت باقی نہیں رہتی ہے۔ میں سکول جانے کے خیال سے اُٹھ جاتا ہوں۔''

''کاہل کہیں کے۔'' ماہ پارہ ہنسیں۔ ''جلدی تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ چھوٹا خان نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔''

چھوٹا خان نے میرے پسندیدہ پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بنایا تھا۔ ساتھ ہی نمکین مکھن تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اسی دوران میں حسن علی بھی تیار ہو کر آ گیا تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر ناشتے کا





عادی تھا۔ وہ صرف صبح اور شام کا کھانا لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں میں چار بار ضرور کھاتا تھا۔ بھوک میری کمزوری تھی۔ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حسن علی میرے ساتھ ہی سکول تک جاتا تھا۔ راستے میں میری حفاظت کے لیے وہ پوری طرح مسلح ہو کر جاتا تھا۔ اس کے بغلی ہولسٹر میں دو عدد پسٹل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ برابر والی نشست تلے شارٹ گن بمعہ فاضل کارتوسوں کے موجود رہا کرتی تھی۔ ایک منٹ میں وہ حرکت میں آ کر حملہ کرنے والوں پر آگ و آہن کی بارش کر سکتا تھا۔

''برخوردار میں دیکھ رہا ہوں آج کل تم لڑکیوں پر زیادہ ہی توجہ دے رہے ہو۔'' راستے میں حسن علی نے عقبی آئینے میں مجھے دیکھا۔

''میں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے لڑکیاں میری طرف زیادہ ہی توجہ دے رہی ہیں۔''

حسن علی مسکرایا۔ ''یار...... یہ کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے نیازی ہی سب سے بڑی توجہ ہوتی ہے۔ اگر تمہاری توجہ کاجل اور ماریہ کی طرف نہ ہوتی تو تم ان کی پروا ہی نہ کرتے۔ اپنے حال میں مگن رہتے۔ اب تم ان کے بارے میں فکرمند رہتے ہو، ان کے بارے میں سوچتے، ہو گویا تم ان کی طرف متوجہ ہو۔''

میں نے غور کیا۔ حسن علی نے درست کہا تھا۔ واقعی مجھے اس طرف توجہ نہیں دینی چاہیے تھی کہ ماریہ آ رہی ہے یا وہ مجھ سے کچھ توقعات رکھ رہی ہے۔ کاجل سے میرا دلی تعلق تھا لیکن اس کے لیے بھی اتنی فکر بے جا تھی۔ اگر وہ میرے بارے میں حساس تھی تو مجھے اس فکر میں مر نہیں جانا چاہیے کہ اسے میری کوئی بات بُری لگ جاتی ہے اور وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں اس قسم کی جذباتی باتیں اور حرکتیں کرتی رہتی ہیں۔ مجھے اپنے مقصد پر نظر رکھنا چاہیے۔ مجھے ابھی تعلیم حاصل کرنی تھی، کسی مقام تک پہنچنا تھا۔ مجھے اپنے ماضی کو تلاش کرنا تھا۔ معلوم کرنا تھا کہ میں کون تھا میری جڑیں کہاں تھیں، میرے آباؤ اجداد، ماں باپ کہاں سے تعلق رکھتے تھے۔ میں جمشید علی کے پاس کیوں کر آیا اور وہ کس مقصد کے تحت اتنے شاہانہ انداز میں میری پرورش کر رہے تھے۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھ سے محبت کرنے کے باوجود وہ اللہ واسطے میری پرورش نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کے پس پشت ان کا کوئی گہرا مفاد تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے جانشین بنانے کی بات کی تھی۔

''بندہ اس معاملے میں ناتجربے کار ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''آپ ہی کچھ رہنمائی فرمائیں۔''

''میں بھی اس عمر سے گزرا ہوں۔ ماہ پارہ سے واقفیت اس زمانے سے ہی ہے۔''

میں ہنسا۔ ''مدت سے ہے یہ آتش بھڑکی ہوئی۔''

حسن علی جھینپ گیا۔ ''ایسا ہی سمجھ لو۔ اس وقت اگر میرے والد محسن علی میری مدد نہ کرتے تو شاید میں اپنا کیریئر تباہ کر لیتا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ان باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔''

ابھی مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ تب میں نے سنجیدگی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایم ایس سی کرنے کے لیے میں ترکی گیا ہوا تھا لیکن وہاں حالات ایسے پیش آئے کہ مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دشمنوں سے بچنے کے لیے رُوپوش ہونا پڑا۔ کئی سال دربدری میں بسر ہوئے۔ ایران بھی واپس نہیں جا سکتا تھا کہ یہ طاقتور دشمن میرے ہم وطن ہی تھے، پھر انقلاب آ گیا۔ دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میرے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ میں بچ نکلا۔ انتقام کی آرزو میں سرگرداں رہا اور پھر میں نے ہار مان لی۔ میں انتقام لیتا بھی تو کس سے لیتا۔ اس لیے میں نے پیرس جا کر اپنی بقیہ تعلیم مکمل کی۔'' حسن علی مجھے نصیحت کرتے کرتے دور نکل گیا تھا۔

''اور یہ مارشل آرٹ کی تربیت؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ تو زمانے نے سکھا دیا۔ جب دشمنوں سے بچتا پھر رہا تھا اس دوران میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ باقی کسر میں نے استادوں سے سیکھ کر پوری کر لی۔ کچھ عرصے میں افغانستان میں بھی رہا۔ مجاہدین کے ساتھ مل کر روسیوں سے لڑتا رہا لیکن جب روسی چلے گئے اور مجاہدوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو میں بددل ہو کر وہاں سے نکل آیا۔ ہانگ کانگ کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی۔ وہاں پر فنونِ حرب بھی سیکھے۔ پھر دل اُچاٹ ہو گیا تو ایک بیگ اُٹھا کر جہاں گردی کرنے نکل کھڑا ہوا پھر جمشید علی سے ملاقات ہو گئی۔ اسے تمہارے لیے ایک محافظ اور استاد کی ضرورت تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ماہ پارہ بدستور جمشید علی کے پاس ہے۔''

''آپ پاپا سے پہلے بھی واقف تھے؟''

''اس وقت سے جب وہ بابا جان سے ملنے آتے تھے۔'' حسن علی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ جمشید علی کی بابا جان اور ماہ پارہ کے والد ڈاکٹر عظمت سے یکساں دوستی تھی۔ ان دنوں جمشید علی تہران میں ہی تھے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ جمشید علی ٹرکی میری لائن چلا رہے ہیں۔ ان کے دیگر کاروباروں کے بارے میں ان کے نزدیک ترین دوستوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔''

''دیگر کاروبار...... کیا مطلب؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''جمشید علی کے شاہی خاندان سے بھی گہرے تعلقات تھے۔ کئی ایک شہزادوں سے اس کی اتنی گہری دوستی تھی کہ وہ ان کی شبینہ محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے انہیں بھی انقلاب کی وجہ سے ملک سے بھاگنا پڑا تھا۔ بلکہ جمشید علی بھاگے کہاں تھے، وہ تو پورے اطمینان سے اپنے سارے اثاثے بیچ کر ایران سے اس طرح نکل گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بابا جان اور ڈاکٹر عظمت بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ جمشید علی بیوی کے ساتھ تفریح کرنے نکلے ہیں۔ پھر حالات تیزی سے بگڑے، جمشید علی کے ذرائع نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ انقلاب آنے والا ہے۔ جو نہیں جان سکے وہ میرے اور ماہ پارہ کے گھر والوں کی طرح مارے گئے۔'' حسن علی کے لہجے میں زہر آ گیا تھا۔





''لیکن پاپا نے ماہ پارہ کو تو بچا لیا تھا۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ہاں...... لیکن وہ پہلے سے خبردار کر دیتے تو دونوں خاندان بچ جاتے۔''

''یہ بھی ممکن ہے پاپا نے ایسا چاہا ہو لیکن انہیں موقع نہ مل سکا ہو۔''

''ہاں ایسا بھی ممکن ہے۔'' حسن علی نے آہستہ سے کہا اور پھر چپ ہو گیا تھا۔

حسن علی مجھے سکول سے واپس لے کر آیا تو بنگلے کے پورچ میں ایک عدد نسان سنی کار کھڑی تھی۔ اندر سے ماہ پارہ کے ساتھ کچھ لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا آفت عرف ماریہ آ گئی تھی۔ میں نے جل تُو جلال تُو پڑھی اور دل کڑا کر کے اندر آیا۔ نظر پڑتے ہی ماریہ میری طرف لپکی اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اس کے تیور بتا رہے تھے وہاں اگر لوگ نہ ہوتے تو وہ زیادہ ہی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی جینز پر باریک کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ نیچے مردانہ بنیان ٹائپ کی کوئی شے تھی جس سے باہر اس کے جسم کی گلابی جلد اس باریک قمیص سے یوں جھلک رہی تھی جیسے ارغوانی کے جام سے چھلکتی ہے۔

''کیسی ہو؟'' میں نے اس سے نظریں چرا کر پوچھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف مجھے سنائی دے۔

''اچھی لگ رہی ہو۔ اب میرا ہاتھ چھوڑو تا کہ باقی لوگوں سے بھی ملوں۔''

اس نے شرما کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''آؤ میں اپنی فرینڈز سے ملواتی ہوں۔ یہ پونی ٹیل والی ٹینا ہے۔'' اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کا منہ مسلسل چل رہا تھا اور اس کا فربہ ہو جانے والا جسم کپڑوں کی تہ سے آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ کپڑے غالباً اس زمانے کے سائز کے تھے جب وہ موجودہ جسامت سے آدھی ہوا کرتی تھی۔ دوسری صاحبہ سمارینا ثابت ہوئیں جن کے لباس میں ویسے تو کوئی خامی نہیں تھی لیکن اس کا ڈیزائن غالباً افریقی جنگلیوں اور جدید ترین امریکی فیشن کو مکس کر کے تیار کیا گیا تھا۔ ان کا حلیہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ کس قماش کی تھیں اور ماہ پارہ ان سے مل کر یوں خوش تھیں جیسے ان کی ہم مزاج اور ہم ذوق سہیلیاں زمانے کے بعد ملنے آئی ہوں۔

''آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کریں میں ذرا فریش ہو آؤں۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''میں بھی چلوں گی۔ تمہارے کمرے کے لیے ایک چیز لائی ہوں۔'' ماریہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک پیک چیز اُٹھائی جو بظاہر کوئی فریم شدہ تصویر لگ رہی تھی۔

''لاؤ مجھے دے دو۔'' میں نے ہاتھ بڑھایا۔

''میں خود اسے تمہارے کمرے میں لگاؤں گی۔'' ماریہ نے ثابت قدمی سے کہا تو میں سر ہلاتا اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ میرے پیچھے تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت میرا خیال تھا کہ مجھے اس کی پیش قدمی کے لیے تیار رہنا چاہیے لیکن اندر آ کر ماریہ نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔

”واہ...... یوسف کمرا تو بہت شاندار ہے۔ فرنیچر کتنے یونیک ڈیزائن کا ہے۔ کیا خیال ہے اس سینری کو میں اس دیوار پر لگا دوں۔“ اس نے بستر کے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

میں ذرا خفیف ہو گیا تھا۔ ”جہاں مرضی آئے لگا دو لیکن پہلے دکھاؤ تو چیز کیا ہے؟“

اس نے تصویر پر لگا کاغذ پھاڑا۔ یہ کسی مصور کی بنائی ہوئی تخیلاتی تصویر تھی۔ ایک حسین پجارن آنکھیں بند کیے دیوتا کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے باریک سا لباس پہن رکھا ہے جس میں اس کے تراشیدہ بدن کے سارے عنصر نمایاں ہو رہے تھے۔

”کیسی ہے تصویر؟“ ماریہ نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں سمجھ رہا تھا یہ تصویر اس کے جذبات کا اظہار تھا۔

”اچھی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن کیا یہ میری عمر کے لحاظ سے بڑی نہیں ہے۔“

وہ تصویر رکھ کر میرے پاس چلی آئی۔ ”جذبات عمر کے لحاظ سے تو نہیں ہوتے۔“ اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ ”میں تم سے پانچ سال بڑی ہوں۔ تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے جذبات کو سمجھتے ہو لیکن خود تم ایک بارہ سال کی لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ اس محبت کو سمجھتی ہے۔ ہر اس لڑکی سے حسد کرتی ہے جو تمہارے نزدیک آتی ہے، پھر محبت میں عمر کہاں سے آ گئی؟“

”میں بات اپنی عمر کی کر رہا تھا۔“ میں بھنا کر کہا۔ ”اس میں محبت کہاں سے آ گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ تصویر کسی بڑی عمر کے شخص کے کمرے میں اچھی لگے گی۔“

”کیوں یہ لڑکی تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہے۔“ اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

میں نے دل میں کہا۔ ”اچھا بی بی تم بھی کیا یاد کرو گی......“ اور پھر تصویر کے پاس جا کر بہ غور پجارن کا معائنہ کیا اور خاصی دیر تک کرتا رہا حتیٰ کہ ماریہ بے چین ہو کر خود بھی میرے پاس چلی آئی۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ لڑکی واقعی غیر معمولی حُسن رکھتی ہے۔ اس کے خدوخال، نقوش، سراپا...... ایک ایک چیز دیکھنے کے لائق ہے۔“ اس کے بعد میں نے لڑکی کے جسمانی محاسن پر سر کے بالوں سے لے کر اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ماریہ کا مارے شرم و غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ اس نے کھسیا کر کہا۔

”یہ کیا بک بک کر رہے ہو۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔“

”تو اور کیا مطلب تھا تمہارا...... بہرحال تمہارا شکریہ...... تم نے واقعی اچھا تحفہ دیا ہے۔ اسے میں اپنے کمرے میں ضرور لگاؤں گا۔“ میں نے باتھ روم میں جاتے ہوئے کہا۔ ماہ پارہ میرے آنے سے پہلے میرے کپڑے واش روم میں رکھ دیتی تھیں اور جب میں کپڑے بدل کر آتا تو نیچے کھانا تیار ہوتا تھا۔ زیادہ تر یہ کھانا اُبلی ہوئی سبزیوں یا پھلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ حسن علی نے میرے کھانے پینے کا شیڈول بھی بنایا تھا اس میں ناشتہ مجھے اپنی مرضی سے کرنے کی اجازت دی۔ دوپہر کا کھانا میں




یہاں کر ہی چکا ہوں۔ رات کے کھانے کے علاوہ میرے لیے خاص طور سے خمیری روٹی بنتی تھی۔ گوشت بھی خاص انداز میں بھونا جاتا تھا اس میں کوئی گھی یا تیل نہیں ڈالا جاتا تھا۔ یہ گوشت بے شک ہلکے سے نمک کے ساتھ خاصا بے مزہ ہوتا تھا لیکن چار گھنٹے کی ایکسرسائز اور ویٹ لیفٹنگ کے بعد میرا بھوک سے ایسا بُرا حال ہوتا تھا کہ میں اُبلا ہوا چمڑا کھانے کے لیے بھی تیار ہو جاتا تھا۔

میں کپڑے چینج کر رہا تھا کہ کمرے سے چھناکے کی آواز آئی اور میں مسکرا کر گانے لگا۔

”میرے تن کو لگی...... میرے من کو لگی۔“

”یوسف......“ ماریہ کی خفیف سی آواز آئی۔ ”سوری مجھ سے فریم ٹوٹ گیا۔“

میں باہر نکلا تو تصویر اس دیوار تلے پڑی تھی جس پر ماریہ نے اسے ٹانگنے کو کہا تھا۔ مزے کی بات ہے فریم گرنے سے شیشے کا ایک ٹکڑا بے چاری پجارن کو چیر گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”کوئی بات نہیں تم مجھے دوسری تصویر لا دینا۔ بلکہ اس میں پجارن اگر لباس وغیرہ کے تکلفات سے آزاد ہو تو میں اس پر زیادہ اچھی طرح سے غور کر سکوں گا۔“

”ضرور۔“ ماریہ نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اس نے فریم کے شیشے اُٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالے تصویر بھی پھاڑ کر ڈسٹ بن کی نذر کی۔ پھر آرام سے بستر پر بیٹھ کر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تم بہت ظالم آدمی ہو۔ میں تمہارے لیے تحفہ لائی تھی اور تم مجھے بھول کر اس میں مگن ہو گئے۔“

”حماقت تھی نا...... ایک ینگ ہوتے لڑکے کو اس قسم کی اشتعال انگیز تصویر لا کر دی۔ اگر لا کر دیتیں کوئی افسانوی کتاب یا کسی شاعر کا دیوان تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا، بس تمہیں ہی دیکھتا۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ اس بار آنسو اس کے صبیح رُخساروں تک آئے تھے۔ ”تمہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ہی ہوں جو تمہارے پیچھے بھاگتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔“ کہتے کہتے اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا اور میں بوکھلا گیا۔

”ارے بابا چپ کر جاؤ۔ ابھی کوئی آ جائے گا۔“ میں نے تقریباً ناچتے ہوئے کہا۔

”ام جاتی ہے۔“ دروازے سے چھوٹا خان کی آواز آئی۔ وہ میرے لیے لنچ لے کر آیا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”دیکھا...... بدنامی کیسی تیزی سے پھیلتی ہے۔“

”تم اس بچی کی وجہ سے مجھے اگنور کرتے ہو۔“ اس نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔ اس کے رونے دھونے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے پہلے دروازہ بند کیا پھر اس کے پاس آ کر بیٹھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ دیکھو ماریہ...... میں دیکھنے میں بڑا ضرور لگتا ہوں لیکن ابھی میں اپنا مستقبل بنا رہا ہوں۔ مجھے بہت آگے تک جانا ہے۔ ایمان سے بتاؤ...... جس معاملے میں تم مجھے اُلجھانا چاہتی ہو، اس میں لگ کر میں کس حد تک اپنی تعلیم پر توجہ دے سکوں گا۔“

"تم کاجل سے بھی تو محبت کرتے ہو۔" اس نے ناک سے شوں شوں کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے میری محبت ہی ہے، اس میں کوئی جسمانی تقاضے شامل نہیں ہیں اور یہ محبت بھی اختیاری نہیں ہے بلکہ مسلسل ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے۔ کاجل ابھی بچی ہے اور تم ایک جوان لڑکی ہو جو جوانی کے سارے جذبات رکھتی ہو ذرا غور کرو تم سے محبت کرنے کا مطلب ہے کہ میں تم سے جسمانی طور پر بھی نزدیک آؤں اور میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"بے شک تم میرے پاس نہ آؤ۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "لیکن مجھ سے محبت تو کر سکتے ہو جس طرح کاجل سے کرتے ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں کاجل سے محبت اختیاری نہیں ہے۔ میں نے اسے از خود پسند نہیں کیا ہے۔ یہ تو قدرت کا فیصلہ تھا جو اس نے ہمارے دلوں میں مشترکہ طور پر اُتارا۔ اگر میں تم سے ایسی محبت کرنے کی بات بھی کروں تو جھوٹا ہوں گا۔"

"بے شک جھوٹی سہی لیکن اپنی محبت سے محروم تو نہ کرو۔" اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

"میں اس قسم کی جھوٹی محبت نہیں کر سکتا۔" میں نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔ "بلکہ فی الوقت میں کسی قسم کی محبت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آؤ نیچے چلیں۔"

اس نے مجھے دیکھا اور میرے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر اُٹھ گئی تھی۔ اس نے چہرہ صاف کیا، ہم نیچے آئے۔ اس کی سہیلیاں بدستور بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ ماہ پارہ نے بہ غور ہمیں دیکھا تو میں نے نظریں چرا لیں۔ میرا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے نیچے جمنازیم میں آ گیا جہاں حسن علی ایک بنچ پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اکثر اسے ایکسرسائز کرتے ہی پایا تھا۔ میں نے کپڑے اُتارے، نیچے ورزش کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ حسن علی نے حرکت نہیں کی تھی اس لیے میں نے از خود اپنی طے شدہ ایکسرسائز شروع کر دی۔ حسن علی خاصی دیر بعد اُٹھا۔ میں بائکنگ کر رہا تھا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے جناب استاد! آج خاصے گہرے مراقبے میں تھے۔"

"تم خاصے آٹومیٹک ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے میری بات اُڑا دی۔

"کل ہائکنگ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہاں سے کوئی چار، پانچ کلومیٹر ایک جگہ ہے۔ وہاں چلیں گے مزہ آئے گا۔"

"ماریہ بھی چلنے کا کہہ رہی ہے۔"

"اسے بھی لے چلیں گے۔ بشرط کہ وہ اپنی ذمے داری پر چلے...... ہائکنگ میں حادثات بھی پیش آتے ہیں۔"

"تب اسے نہیں لے جاتے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ خود اسے منع کر دیجیے گا۔"

حسن علی ہنسا۔ "اپنی بلا میرے سر ڈال رہے ہو۔ خیر اس سے بات کروں گا۔"





حسن علی اوپر چلا گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ مجھے کوئی ورزش بتا کر اوپر چلا جاتا۔ اگرچہ اس کے یا ماہ پارہ کے سامنے میں اس بات پر کتنا ہی جھنجھلاتا لیکن حسن علی کی غیر موجودگی میں کبھی ورزش روکتا نہیں تھا۔ البتہ مارشل آرٹس کی مشقیں حسن علی اپنی نگرانی میں کراتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بغیر نگرانی کے یہ مشقیں کرنے سے کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ جب میں بنچ پر لیٹ کر وزن اُٹھا رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ میں سمجھا شاید حسن علی آیا ہے۔ میں نے سانس روک کر کہا۔

"استادِ محترم کیا ہوا...... بلا سے نمٹ نہیں سکے۔"

"بلا خود چلی آئی ہے۔" پاس سے ماریہ کی آواز اُبھری اور میں کراہ کر رہ گیا۔ مارے گئے۔ میں نے سوچا۔

"تم مجھ سے اس طرح جان نہیں چھڑا سکتے۔"

میں نے ویٹ اسٹینڈ پر رکھا اور اُٹھ بیٹھا۔ ماریہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ "دیکھو مس ماریہ...... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر آئی ہو۔ ہائکنگ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کوئی چوٹ لگی تو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر یہاں آئی ہوں اور اپنی ذمے داری پر تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی۔ پھر اس نے پُرشوق نظروں سے مجھے دیکھا۔ "واہ...... تمہارا جسم تو بالکل باڈی بلڈرز جیسا ہو گیا۔"

"حسن علی نے مجھ پر بہت محنت کی ہے ورنہ ایک سال پہلے میں کوئی خاص نہیں تھا۔" میں نے خاص انداز میں فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بھاری ورزش کے بعد سانس قابو کرنے کے لیے یہ ایکسرسائز لازمی تھی۔ ماریہ میرے پاس آ بیٹھی۔ "کیا میں بھی تمہارے ساتھ ایکسرسائز کروں۔"

میں نے مشق ختم کر کے سانس لی۔ "تم صرف دیکھو۔"

ماریہ کھسک کر مزید نزدیک آ گئی۔ "کیوں؟"

"ورزش بغیر کسی نگران کے نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ اتنے نزدیک آ گئی کہ اس کی سانسیں میری گردن اور شانے کو چھونے لگی تھیں۔ "یوسف کیا تمہیں ایکسرسائز کرنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

میں ذرا دور ہو گیا۔ "مجھے ہر قسم کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں لیکن دور دور سے۔"

"کیا میں بھی۔" اس نے منہ لٹکایا۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں اپنا کام توجہ سے نہیں کر پاؤں گا۔" میں نے کہا اور وہ بنچوں کو ساتھ رکھ کر ان پر اس طرح لیٹ گیا کہ ایک پر گھٹنے تک پاؤں تھے اور دوسرے پر شانے رکھے تھے۔ درمیانی جسم ہوا میں معلق تھا۔ یہ ایکسرسائز ریڑھ کی ہڈی اور پیٹ کے مسلز کے لیے مثالی لیکن بے حد سخت

ہوتی ہے۔ حسن علی جب اپنی نگرانی میں کراتا تھا تو کبھی کبھی میرے پیٹ پر دس کلو وزن بھی رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت یہ مشق صحیح معنوں میں عذاب بن جاتی تھی۔ شروع میں مجھے بڑی پریشانی ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں عادی ہو گیا۔ ماریہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئی اور اچانک میرے پیٹ پر بیٹھ گئی۔ کمر کو خم کھانے سے روکنے کے لیے مجھے زبردست جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

''یہ......کیا......حرکت...... ہے......'' میں نے بہ مشکل کہا۔

وہ شرارت سے ہنسی۔ ''میرا وزن ہی کتنا ہے، پھول جیسا تو ہے۔''

''گوبھی کے پھول سے زیادہ۔'' میں نے جل کر کہا۔

''اپنے الفاظ واپس لو......'' اس نے دھمکی دی۔ ''ورنہ اس بار میں اُچھل کر بیٹھوں گی۔''

''او کے بابا۔'' میں نے فوراً ہار مان لی۔ وہ ہنستی ہوئی اُٹھی اور اوپر کی طرف چلی گئی۔

رات کے کھانے پر ماہ پارہ نے خاصا اہتمام کروایا ہوا تھا۔ ورنہ عام طور سے دو تین ڈشیں ہی ہوتی تھیں۔ مجھے لگا جیسے یہ سب ماریہ کے اعزاز میں ہو۔ اگرچہ ماہ پارہ آزاد خیال قسم کی لڑکیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھیں لیکن وہ ماریہ سے خوش تھیں اور اسی طرح میرے معاملے میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ مجھے کسی قدر حیرت تھی کہ وہ کاجل کے بارے میں میرے جذبات اور احساسات سے اچھی طرح واقف تھیں اس کے باوجود ماریہ کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ اس کی سہیلیاں اب بور ہو رہی تھیں اور ان کا ارادہ تھا کہ کل تفریح کے لیے ایوبیہ کی طرف جائیں گی۔ ماریہ ہمارے ساتھ ہی رہتی۔ ماریہ اور اس کی سہیلیوں کو اوپر والا اضافی بیڈ روم دیا گیا تھا۔ میں حسبِ معمول سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھا ماہ پارہ ہوں گی، وہ اکثر دیکھنے آجاتی تھیں کہ میں سونے جا رہا ہوں یا میں نے دودھ کا کنگ سائز گلاس خالی کر دیا ہے یا نہیں...... لیکن جب دروازہ کھولا تو ماریہ ہوا کے جھونکے کی طرح وارد ہوئی اور پیر تسمہ پا کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے کسمسا کر کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے۔'' لیکن پھر اس کی گرم جوشی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ میں جس عمر میں تھا وہاں فطری طور پر یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میں بے قابو ہو رہا ہوں تو میں نے ماریہ کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے شانے سے تھام کر اسے دور رکھا۔

''پلیز ماریہ یہ اچھا نہیں ہو گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اسے جگ سے نکال کر پانی پلایا۔ اس کے جذبات میں جو اُبال آیا تھا وہ کسی قدر سرد ہوا اور وہ بستر پر بیٹھ گئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بوکھلا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ ماہ پارہ کا روم سامنے ہے، وہ چلی آئیں گی۔''

اس نے آواز دبا لی لیکن سسکیاں نہیں رُکیں۔ ''میں پاگل ہوں۔ میں کیا کروں، میں نے جان بوجھ کر تو تم سے محبت نہیں کی اور اب مجھے تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرایا تو




میں مر جاؤں گی۔''

میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کو دیکھا جو پاگل بھی تھی۔ وہ بے پناہ حسین بھی اسے کوئی بھی اچھا شخص خوشی سے اپنا سکتا تھا لیکن وہ میری دیوانی تھی۔ خدا کی قسم مجھے اس بات سے ذرا خوشی نہیں تھی کہ ایک اتنی خوب صورت لڑکی میرے پیچھے پاگل ہے بلکہ مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ میں صرف کاجل کا تھا اور اسے دھوکا دینا میرے لیے اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینا۔ وہ روتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس بار ماہ پارہ تھیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھا۔ میں نے شانے اُچکائے اور ماریہ آنسو صاف کرتی ہوئی ماہ پارہ کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماہ پارہ آہستہ سے بولیں۔

''کیا بات ہوئی؟''

''جناب اصرار کر رہی تھیں کہ میں ان کی محبت قبول کر لوں لیکن آپ ہی بتایئے بھلا محبت کی جاتی ہے یا قبول کی جاتی ہے۔''

''پاگل لڑکی...... خیر کل تک کی بات ہے، وہ چلی جائے گی۔''

''اس نے راستہ دیکھ لیا ہے، وہ دوبارہ آجائے گی۔'' میں نے بھنا کر کہا تھا۔

''اتنی فکر مت کرو۔'' ماہ پارہ نے اس بار ڈانٹا۔ ''مرد ہو کر اتنی سی لڑکی سے گھبراتے ہو۔ مرد تو نہ جانے کیا کچھ کر جاتے ہیں، طوفانوں کو قابو کرتے ہیں۔''

''یہ زلزلہ ہے جو نیچے سے آتا ہے، میں اس سے نہیں نمٹ سکتا۔''

ماہ پارہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اچھا اب سو جاؤ۔ صبح سات بجے نکلنا ہے۔'' حسن کہہ رہا تھا۔

میں صبح چھ بجے اُٹھ گیا تھا۔ ہائکنگ کا اولین اصول یہی ہے کہ بالکل صبح سویرے نکلا جائے تاکہ جب تک روشنی پھیلے آپ مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہوں۔ جب میں لباس بدل کر نیچے پہنچا تو ناشتہ تیار تھا۔ خاصا بھاری بھرکم ناشتہ کیا ورنہ مشقت کرنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ چھوٹا خان نے کافی، سینڈوچز اور مالٹے کا جوس تیار کر لیا تھا۔ میں نے یہ سارا سامان اُٹھا کر جیپ میں رکھا۔ ماریہ روانگی سے محض دس منٹ پہلے آئی تھی۔ اس نے کافی لی اور صرف دو توس کھائے۔

''بھوک لگے گی۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''مجھ سے نہیں کھایا جاتا اتنی صبح۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے عادت ہی نہیں ہے۔''

اس نے چست ٹراؤزر کے ساتھ ہاف سلیو کی شرٹ اور اس کے اوپر پیرا شوٹ کی بنی ہلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں ہائکنگ کے جوتے تھے یعنی وہ پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ ٹھیک سات بجے ہم روانہ ہو گئے۔ وادی سے نکل کر شمال کی طرف گئے۔ چار، پانچ کلومیٹر کے بعد حسن علی

نے جیپ سڑک سے اُتار دی۔ ناہموار اونچے راستے پر جیپ رینگ رینگ کر چلنے لگی۔ آٹھ بجے جب سورج بلند ہو رہا تھا ہم ایک چٹانی پہاڑیوں والے علاقے میں تھے، یہاں پتھروں کی بہتات تھی اور زندگی کم تھی لیکن جتنی بھی تھی آنکھوں کو تراوٹ دے رہی تھی۔ نیچے چٹانوں میں ایک ندی روانی سے بہہ رہی تھی۔ ہوا میں ایسی تازگی تھی جیسے سیدھی جنت سے آ رہی ہو۔ ماریہ نے اُتر کر ہوا میں گہری سانس لی۔ ''میرے خدا کتنی تازہ ہوا ہے۔''

حسن علی نے ہائکنگ کے لیے سامان اُتارا۔ سب نے اس سامان کو تقسیم کر کے اپنی پشت پر موجود پیکس میں رکھا۔ ماریہ کے حصے میں کھانے کا سامان آیا۔ حسن علی نے ندی کے ذرا اوپر ایک سیدھی بلند ہوتی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''پہاڑ کی چوٹی کوئی پانچ سو میٹر اونچی ہے۔'' میں نے اندازہ لگایا۔ ''تین سے چار گھنٹے لگیں گے۔''

''درست۔'' حسن علی بولا۔ ''لیکن ذرا مشکل ہے، ماریہ تم نیچے سامان کے پاس رہو۔''

''میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ تم دونوں کے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا۔

''سامان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، یہاں کون چرانے آئے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' حسن علی نے شانے اُچکائے۔ ''لیکن ابتدائی سو میٹرز تک تم آزمائشی طور پر جاؤ گی۔ اگر اس دوران میں تم نے اپنی اہلیت ثابت کر دی تو ٹھیک...... ورنہ واپس بھیج دوں گا...... ڈن؟''

''ڈن۔'' خلافِ توقع ماریہ مان گئی۔ شاید اس لیے کہ حسن علی اس مہم کا ماسٹر تھا۔

سامان لے کر ہم روانہ ہوئے۔ پہلا مرحلہ ندی عبور کرنے کا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے ندی میں خاصا پانی تھا۔ بعض جگہ پتھروں سے پانی پُرشور انداز میں اُچھل اُچھل کر جا رہا تھا۔ ایسی جگہوں سے پتھروں پر پاؤں رکھ کر ندی کو عبور کیا جا سکتا تھا۔ ماریہ نے ایسے ہی پانی میں ہاتھ ڈالا اور یوں واپس کھینچ لیا جیسے اس میں کرنٹ آ رہا ہو۔ اس نے کانپ کر کہا۔ ''پانی برف جیسا سرد ہے۔''

''یہاں پانی ایسا ہی ملتا ہے۔'' حسن علی نے کہا اور چھلانگ لگا کر ایک پتھر پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنی کمر کی بیلٹ سے رسی باندھ رکھی تھی تاکہ سلپ ہو کر پانی میں گرے بھی تو ہم رسی کی مدد سے اسے کھینچ کر باہر نکال سکیں مگر اسے ضرورت نہیں پڑی۔ چند لمبی چھلانگوں نے اسے پار پہنچا دیا تھا۔

''واہ...... کیا اسٹائل ہے۔'' ماریہ نے بے اختیار تالی بجائی۔

''آ جاؤ...... لیکن احتیاط سے۔'' حسن علی نے ندی کے شور میں چلا کر کہا۔ ''ماریہ پہلے تم آؤ۔'' اس نے بیلٹ سے بندھی رسی کھول کر پھینک دی۔ میں نے اسے کھینچ کر ماریہ کی پتلی سی کمر سے بندھی بیلٹ سے منسلک کر دیا۔ اس نے حسن علی کی طرح لمبی چھلانگ لگائی اور سلپ ہوتے ہوتے بچی۔ اس کی پشت پر کوئی دس کلوگرام وزن تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پانی میں گرتی تو کوئی مسئلہ





نہیں تھا لیکن وہ نیچے گرتی جہاں چٹانیں تھیں اس لیے سر پر مہلک چوٹ آ سکتی تھی یا کوئی ہاتھ پیر کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ ''سنبھل کر......'' میں نے چلا کر کہا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اگلا پتھر دو قدم کے فاصلے پر تھا، آرام سے پاؤں بڑھا کر اس پر ٹک سکتی تھی لیکن اس دفعہ بھی اس نے بلاوجہ چھلانگ لگائی اور اس سے اگلے پتھر تک جا پہنچی۔ اس دفعہ معجزہ ہی تھا کہ وہ پانی میں گرنے سے محفوظ رہی۔ میں نے دیکھا حسن علی پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ میں بھی اس بار چپ رہا۔ اگر میں بولتا تو ماریہ مزید خطرناک قسم کے مظاہرے کر کے دکھاتی۔ وہ خیریت سے دوسری طرف پہنچ گئی اور اس طرف جاتے ہی اس نے چالاکی سے حسن علی کے سامنے کان پکڑ لیے اس سے پہلے کہ وہ سرزنش کرتا حسن علی بھی مسکرانے اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ ندی کے شور میں مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے رسی اپنی بیلٹ سے منسلک کی اور نپی تلی چھلانگ لگا کر پہلے پتھر تک پہنچ گیا۔ چند لمحوں میں ہم سب ندی کے پار تھے۔

''میرا خیال ہے سارا اضافی سامان یہیں چھوڑ دیا جائے۔'' حسن علی نے پہاڑی کی طرف دیکھا۔ ''زیادہ وزن مسئلہ کرے گا، صرف ضروری چیزیں لے کر چلو۔''

''اس میں سینڈوچز ضرور ہوں گے۔'' ماریہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے ناشتہ نہیں کیا ہے۔''

حسن علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں تمہیں بھوک برداشت کرنا ہوگی کیونکہ ہائکنگ کے درمیان میں کھانے سے گریز کرنا چاہیے۔''

''اوکے باس۔'' اس نے مُردہ سی آواز میں کہا۔ اس کے بعد حسن علی ہمیں ہائکنگ کے اصول و قواعد سمجھانے لگا۔

''اگر ہائکنگ کے دوران میں کوئی حادثہ پیش آنے لگے تو آدمی کو سب سے پہلے اپنی حفاظت کی طرف توجہ دینی چاہیے تب ہی وہ دوسروں کی مدد کر سکتا ہے اور اگر کسی مقام پر دونوں افراد کی یا زیادہ افراد کی زندگیاں بیک وقت خطرے میں ہوں اور کسی ایک یا دو افراد کے قربانی دینے سے باقی افراد کی جان بچ سکتی ہے تو انہیں اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔''

مجھے حسن علی کئی بار یہ سب باتیں بتا چکا تھا اس وقت وہ ماریہ کو یہ سب سمجھا رہا تھا۔ ''سمجھ گئے تم دونوں؟''

''یس باس۔'' ماریہ نے کہا۔ میں نے بھی سر ہلا دیا۔

''لیٹس گو۔'' حسن علی نے کہا اور ہم اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس بار بھی سب سے آگے حسن علی تھا، اس کے بعد ماریہ اور اس کے پیچھے میں۔ میں خاصی مشکل میں تھا اس لیے نہیں کہ چڑھائی دشوار تھی بلکہ ماریہ کے پیچھے جانا مشکل کام تھا۔ دشوار گزار راستے پر سفر کرتے ہوئے اس کا دلکش بدن کچھ اس طرح سے پیچ و خم کی بہار دکھا رہا تھا کہ میں لاحول پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ابتدائی سو میٹرز کا سفر آسان تھا۔ ہم چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے اوپر

تک آ گئے تھے۔ اس وقت تک دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ سو میٹرز کے بعد راستہ دشوار ہو گیا تھا۔ اب اوزاروں کی مدد لازمی تھی۔ پہلے حسن علی نوک دار کلہاڑیوں کی مدد سے اوپر گیا اور اس نے ایک چٹان سے کلپ کی مدد سے رسی باندھ دی۔ اس رسی سے میں اور ماریہ بھی اوپر پہنچ گئے۔ اب مجھے آگے جانا تھا۔ میں چاروں ہاتھوں، پیروں کی مدد حاصل کرتے ہوئے کسی چھپکلی کی طرح چٹان سے چپک کر اوپر جانے لگا۔ اس چٹان میں ہتھوڑی کے استعمال کی گنجائش نہیں تھی اس لیے مجھے رخنوں میں ہاتھ پیر پھنسا کر اوپر جانا پڑ رہا تھا۔ کام مشکل تھا لیکن مجھے مزہ آ رہا تھا۔ حسن علی کی تربیت نے مجھے جسمانی طور پر فٹ کر دیا تھا اور میں اَن تھک اوپر جا رہا تھا۔ مشکل سے دس منٹ میں، میں تیس فٹ اونچی اس چٹان کے اوپر تھا۔ اوپر کہیں کلپ لگانے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے ایک سوراخ میں لمبی کیل ٹھونکی اور اس سے رسی باندھ کر نیچے پھینکی۔ حسن علی اور ماریہ آرام سے اوپر آ گئے۔ ذرا سی مشقت نے جسم گرم کر دیا تھا اس لیے سب نے اپنی پیراشوٹ سے بنی جیکٹیں اُتار کر کمر سے باندھ لیں۔ ماریہ کو دیکھ کر میں نے ایک بار پھر لاحول پڑھی۔ اس نے جسم سے چپکی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا بدن بے حد نمایاں تھا۔ حسن علی ذرا آگے نکلا تو میں نے ماریہ کے کان میں کہا۔

''اتنی چست ٹی شرٹ پہننے کی کیا تک تھی؟''

وہ مسکرائی۔ ''کیوں اچھی نہیں لگ رہی ہے۔''

میں جز بز ہو کر بولا۔ ''سخت واہیات لگ رہی ہو۔''

اس بار وہ ہنسی۔ ''جناب کو لگ رہی ہے۔''

''آگے چلو۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر دھکیلا۔ ذرا دیر میں پتا چلا کہ اس چٹانی چھجے سے اب جانے کا راستہ تقریباً نایاب تھا جس پر اس وقت ہم کھڑے تھے، سوائے ایک دو اُبھری چٹانوں کے درمیان سے گزرا جائے۔ میں نے حسن علی کو رائے دی کہ ماریہ کا اس راستے سے جانا خطرناک ہو گا۔ اس لیے اسے یہیں چھوڑ دیا جائے۔ وہ تڑخ کر بولی۔

''میں بالکل نہیں رُکوں گی۔''

''اتنا آگے تک آ کر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔'' حسن علی نے خلافِ توقع اس کی تائید کی۔

میں جھنجلا گیا۔ ''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں استادِ محترم...... ان چٹانوں پر چڑھنے کے لیے تجربہ اور فزیکل فٹنس لازمی ہے۔''

ماریہ بولی۔ ''میرے پاس تجربہ بھی ہے اور فٹنس بھی۔'' پھر اس نے دھمکی دی۔ ''اگر تم مجھے چھوڑ کر گئے تو میں خود آنے کی کوشش کروں گی۔ چاہے اوپر سے گر ہی کیوں نہ جاؤں۔''

''اچھا بس ماریہ۔'' میں چڑ کر بولا۔ ''بعد میں رویئے گا مت۔''

''شرط لگا لو میں نہیں روؤں گی۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔





''اور روئیں تو......'' میں نے ہاتھ تھام لیا۔

''تو جو تم کہو گے وہ مانوں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ڈن۔'' میں بولا تو اس نے سر ہلا دیا۔

حسن علی نے ماریہ کو ایک دس فٹ لمبی رسی کی مدد سے مجھ سے منسلک کر دیا۔ اس چٹان سے اوپر جانے کے لیے ہمیں صرف ہاتھوں، پیروں کا سہارا لینا تھا۔ ان چٹانوں میں کہیں کیل ٹھونکنے کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا رسی بھی نہیں باندھی جا سکتی تھی۔ بعض حصے کچھ اس طرح سے باہر نکلے تھے کہ ان پر سے ہو کر گزرنا ہی ناممکن لگ رہا تھا۔ بہر حال انسان کی فطرت ہوتی ہے وہ اس قسم کے چیلنج قبول کرتا ہی رہتا ہے۔ حسن علی آگے بڑھا۔ راستہ اسے ہی دیکھنا تھا۔ اس کے بعد میں تھا اور ماریہ میرے عقب میں تھی۔ راستہ دشوار ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں۔ حسن علی مشاقی سے دشوار چٹانوں سے ہوتا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ البتہ ماریہ کے لیے یہ سب آسان نہیں تھا۔ بے شک اسے ہائکنگ کا تجربہ تھا اور وہ جسمانی لحاظ سے بھی فٹ تھی، اس کے باوجود اس کے لیے اس قسم کی چٹان پر چڑھنا آسان نہیں تھا جن پر صرف پیشہ ور ہائکرز ہی چڑھ سکتے ہیں۔ وہ خاصی دشواری سے چڑھ رہی تھی اور اس لحاظ سے اس کا حوصلہ قابلِ تعریف تھا کہ اس نے ایک بار بھی مجھ سے مدد نہیں مانگی تھی بلکہ بعض دشوار جگہوں پر جب میں نے اس کو مدد کی پیش کش کی تو اس نے ہنس کر انکار کر دیا۔

''سوری بھئی...... میں چڑھ رہی ہوں...... اور پھر تم کہو گے کہ میں رو رہی ہوں۔''

''شرط تو اس بات پر ہے کہ تم اوپر تک نہیں جا سکو گی۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''میں اپنے بازو پر جانا پسند کروں گی۔'' اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ اس وقت تک ہم نصف راستہ طے کر چکے تھے اور ایک تنگ وارڈ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''لیکن تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ میں شرط جیت گئی تو مجھے کیا ملے گا؟''

''ظاہر ہے میں بھی تمہاری کوئی بات مانوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''کوئی بھی بات۔''

''ہاں کوئی بھی بات۔'' میں نے نظریں چرائیں۔

''اوپر چلو اسی بات پر۔'' اس نے مجھے اوپر دھکیلا۔

آگے چڑھائی بے حد دشوار تھی۔ اُبھری ہوئی چٹانیں، جنہیں ہوا اور بارش نے تراش کر چکنا اور سپاٹ کر دیا تھا۔ ان پر گرفت رکھنا از حد دشوار تھا۔ یہاں عجلت میں بڑھایا ایک قدم آدمی کو واپس نیچے لے جا سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہاں نے ماریہ میں انوکھی ترنگ بھر دی تھی۔ خطرات اس کے نزدیک خطرات نہیں رہے تھے۔ وہ خاصی بے پروائی سے اوپر جا رہی تھی اور میں اسے ٹوکتے

ہوئے ڈر رہا تھا کہ مجھے چڑانے کے لیے وہ زیادہ بے پروائی سے کام لے گی۔ حسن علی خاصا اوپر جا چکا تھا اور اوپری سطح سے کچھ ہی پیچھے تھا۔ میں ماریہ کے عقب میں تھا۔ تنگ دراڑ خاتمے کے قریب تھی۔ اس کے بعد اُبھری چٹانیں تھیں۔ ماریہ نے دراڑ کے ایک اُبھرے حصے پر پاؤں جما کر اُبھری ہوئی چٹان کا کنارہ تھامنے کی کوشش کی۔ کنارہ اس کے ہاتھ سے ذرا اونچا تھا، اس موقع پر ماریہ نے وہ غلطی کی جو اکثر ناتجربے کار ہائکرز کر جاتے ہیں یعنی اپنی حفاظت کو نظر انداز کر کے کوئی مرحلہ سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ماریہ کا ہاتھ کنارے پر صحیح سے نہیں جم سکا تھا اور جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اپنا پاؤں واپس اُبھرے حصے پر جمانے کی کوشش کی لیکن اس کا توازن بگڑ چکا تھا، وہ میری طرف آئی اور اس موقع پر بے حد عقل مندی سرزد ہوئی، اگر میں ماریہ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو یہ حماقت ہم دونوں کو ہی لے ڈوبتی۔ میں نے اس سے بچتے ہوئے اپنی پوری قوت سے دراڑ کے اُبھرے حصوں کو تھام لیا اور اپنا پاؤں ایک رخنے میں پھنسا لیا۔ ماریہ میرے پاس سے گزری۔ اس نے حواس بحال رکھتے ہوئے دراڑ کے اُبھرے حصوں کو تھامنے کی کوشش کی۔ وہ اس حصے کو تو نہ تھام سکی لیکن اس کی کوشش سے گرنے کی رفتار کم ہوگئی اور جب اس کی حد ختم ہوئی تو مجھے اتنا طاقتور جھٹکا نہیں لگا کہ میں بھی گر جاتا۔ ماریہ چٹان کے کنارے سے پانچ فٹ نیچے خلا میں جھول رہی تھی۔ چٹان کا یہ کنارہ خم کھا کر پیچھے کی طرف گیا تھا اس لیے اس پر کہیں پاؤں لٹکانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''یوسف.....گرفت مضبوط رکھنا۔'' اوپر سے حسن علی نے چلا کر کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

میں جسم و جان کی پوری طاقت چٹان سے چپکے رہنے میں صرف کر رہا تھا اور مجھے ماریہ کی فکر بھی تھی۔ ''ماریہ تم ٹھیک ہو نا؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' ماریہ بولی۔ ''میں رسی سے اوپر آ رہی ہوں۔''

''کم سے کم حرکت کرو۔'' میں نے اسے ہدایت دی لیکن شاید اس نے سنا نہیں۔ اس نے اوپر آنے کی کوشش کی۔ اس پر اضافی دباؤ پڑا اور میرے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے میں بھی نیچے جا رہا تھا۔ جسم نے کئی جگہوں سے زبردست رگڑیں کھائیں لیکن اس وقت ذہن صرف اس کام میں مصروف تھا کہ کوئی سہارا ہاتھ آ جائے کیونکہ اس چٹان سے کوئی ستر فٹ کی گہرائی تک کچھ نہیں تھا اور اس سے گر کر جاں بحق ہو جانا لازمی تھا۔ اندھا دھند چلائے جانے والے ہاتھ کام آئے اور میرا دایاں ہاتھ چٹان کے اُبھرے کنارے پر جم گیا تھا۔ جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ میرا اپنا وزن ہی کم نہیں تھا اس وقت میرا وزن ساٹھ کے جی تھا اور ماریہ بھی کم سے کم پچاس کے جی کی تھی۔ اتنا وزن میرے دائیں ہاتھ پر تھا۔

جسمانی قوت نے اس وقت جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس سے زیادہ، موت کے خوف نے کام دکھایا تھا ورنہ شاید میں اتنا بوجھ برداشت نہ کر پاتا۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو



میں نے اس پوزیشن میں خود کو پایا کہ اپنا اور ماریہ کا تمام تر وزن میرے دائیں بازو پر تھا۔ رسی میرے بائیں پہلو سے بندھی تھی اس لیے جسم کا حصہ نیچے تھا۔ میں کوشش کے باوجود بایاں ہاتھ کنارے تک نہیں لے جا سکتا تھا اور صرف ایک ہاتھ سے زیادہ دیر تک لٹکنا ممکن نہیں تھا حسن علی خاصا اوپر جا چکا تھا اس لیے اتنی جلدی نیچے آنا ممکن نہیں تھا۔ دباؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں ایک دو منٹ سے زیادہ اسے نہیں سہار سکتا تھا۔ میرے پٹھے اور رگیں جیسے تڑخ رہے تھے۔

''یوسف.....'' ماریہ نے عجیب سے لہجے میں پکارا۔ اتنا عجیب انداز کہ میں ایک لمحے کو صورتِ حال کی سنگینی بھول کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ رنگین تھا اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ پکارا۔ ''یوسف..... رسی کھول دو۔''

اس کی بات کا مطلب کسی قدر تاخیر سے میری سمجھ میں آیا۔ وہ پاگل لڑکی جو میری محبت میں دیوانی ہو کر یہاں تک چلی آئی تھی۔ اب میری جان بچانے کے لیے اپنی قربانی دینے کی بات کر رہی تھی۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔

''بکومت۔''

''یوسف تم اس طرح زیادہ دیر نہیں لٹک سکتے۔'' رسی نکال دو۔'' اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

ہماری کمروں میں جو بیلٹس تھیں ان کے کلپ کچھ اس قسم کے تھے کہ ایک بٹن دبا کر رسی کا ایک ہک کلپ سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ حسن کو دیکھ سکوں وہ کہاں تک آیا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا چٹان کا نکلا کنارہ سارے منظر پر چھایا ہوا تھا۔ اس سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حسن علی کی آواز وقفے وقفے سے اُبھر رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔ پر آواز سے معلوم کرنا دشوار تھا کہ وہ کتنی دور ہے۔ حسن علی کو میں نے ہمیشہ سرد پایا تھا۔ کتنے ہی مشکل حالات ہوں اس کے ظاہر سے اندازہ لگانا دشوار ہوتا تھا کہ وہ کتنا مضطرب ہے۔ اس وقت اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ مضطرب ہے۔ وہ چلا چلا کر مجھے چٹان کا کنارہ تھامے رہنے کو کہہ رہا تھا۔

''یوسف.....تم.....اس طرح زیادہ دیر نہیں لٹک سکتے۔'' ماریہ نے التجا کی۔ ''رسی نکال دو۔''

''چپ رہو خدا کے لیے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''یوسف ہم دونوں مر جائیں گے کیوں نہ ایک مرے پلیز رسی نکال دو۔'' اس کی رٹ جاری تھی۔

''بس.....حسن علی آنے والا ہے۔'' شدید دباؤ نے میرے جسم کی ساری رگیں کھینچ دی تھیں۔ میرے لیے بولنا بھی دشوار تھا۔ ماریہ نے دیکھا کہ میں اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں تو اس نے اپنی بیلٹ کا کلپ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ مجھے احساس ہوا کیونکہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا اسے کلپ کھولنے کی کوشش کرتے دیکھ کر میں چیخا۔

''ماریہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس معاملے میں ناتجربہ کار تھی۔ اصل میں رسی کا دباؤ کلپ کھولنے میں رکاوٹ تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے رسی پکڑ کر یہ دباؤ کم کرتی تو کلپ ایک سیکنڈ میں کھل جاتا۔ میں چلا چلا کر اسے باز رہنے کو کہنے لگا۔ ''ماریہ مت کرو۔ پلیز...... پاگل مر جاؤ گی۔''

''تم تو زندہ رہو گے۔'' اس نے اپنی کوشش ترک کیے بغیر کہا۔

''ماریہ حماقت مت کرو حسن علی آنے والا ہے۔''

''یوسف مجھے معاف کر دینا'' اس نے بالآخر کلپ کھول لیا۔ اس کا فولادی ہک کلپ سے نکل گیا اور ماریہ ایک ہاتھ سے رسی تھامے لٹک رہی تھی۔

''مجھ سے محبت کرتے ہو نا۔''

میں اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہاں ماریہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ دیکھو رسی نہ چھوڑنا۔''

''شکریہ...... یوسف آئی لو یو'' اس نے مسکرا کر کہا اور رسی چھوڑ دی۔



فائر نے نائٹ ڈیوٹی انچارج کو بھی چونکا دیا تھا۔ اس نے رسالہ میز پر پھینکا اور اپنے ہولسٹر سے سرکاری پسٹل نکالتا ہوا باہر کی طرف بڑھا۔ اس لمحے پے در پے فائر ہوئے، یہ شاٹ گن کے فائر تھے۔ اس نام نہاد پولیس اسٹیشن میں شاٹ گن گارڈز کے پاس تھی۔ میرے کانوں نے پہلے فائر کو ریوالور یا پسٹل کے فائر کے طور پر شناخت کر لیا تھا۔ پے در پے فائرز کے ساتھ ہی باہر جیسے ہنگامہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کے چلانے اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں پنجرے میں بند تھا اس لیے کسی قسم کا کردار ادا کرنے سے قاصر تھا۔ اگر تھانے پر کسی نے حملہ کیا تھا تو میرے خیال میں نہایت نیک کام کیا تھا۔ بشرطیکہ وہ مجھے بھی فوت کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ہنگامہ، چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ مشکل سے پانچ منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد سکون ہو گیا تھا۔ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر لگ رہا تھا کہ حالات ان لوگوں کے قابو میں آ گئے تھے۔ تقریباً بیس منٹ بعد نائٹ شفٹ انچارج واپس آ گیا۔ اس نے پسٹل اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے سے تفکر جھلک رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر پوچھا۔ ''کیا دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے؟'' اس نے بدمزگی سے مجھے دیکھا اور کتے کی طرح غرایا جس کی دُم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہو۔ ''شٹ اَپ۔''

میں واپس اپنی جگہ آ گیا۔ وہ چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے میرے سیل کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے فون اُٹھا کر نمبر ملایا اور بولا۔ ''سر میں جیک بول رہا ہوں۔ جرمی نے پاگل پن میں فائر کر کے اپنے ساتھی بروس کو مار دیا ہے۔'' وہ چپ ہو کر سنتا رہا اور غالباً خاصی ناگفتنی سنتا رہا کیونکہ





اس کے چہرے پر پسینہ نمودار ہو گیا تھا۔ ''یس...... سر دوسروں نے جرمی سے ہتھیار رکھوانے چاہے مگر اس نے انکار کیا۔ اس پر انہوں نے اسے مار دیا۔ او کے سر...... یس سر...... رائٹ سر۔'' اس نے فون رکھ کر سر کے قافیے کے ساتھ ایک زبردست گالی ملائی اور کرسی پر گر کر دوبارہ رسالہ اُٹھا لیا لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ رسالے میں موجود سنسنی خیز تصاویر پر اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔

جرمی غالباً اس جزیرے کے مسلح نگرانوں میں سے تھا اور اس نے اپنے ساتھی بروس کو کسی وجہ سے مشتعل ہو کر مار ڈالا تھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے کسی مقتدر شخصیت کو اس واقعے کو رپورٹ کیا تھا۔ اس نے شاید کسی ایسے شخص کو رپورٹ کیا تھا جس کا تعلق پولیس اسٹیشن سے تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جزیرے پر بڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ جان گرے، ڈیئر ڈان اور کونسل کے بڑے۔ ان کے درمیان اختلافات تھے۔ سب کے پاس اپنے پتّے تھے جنہیں وہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کونسل مجھے زندگی کے لیے چانس دینے کے حق میں نہیں تھی۔ کونسل کے نام سے لگتا تھا وہ اس جزیرے کے حکمران تھے لیکن جان گرے جیسا شخص انہیں اپنے من مانے مفاد کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔ اس نے میرے لیے چانس حاصل کر لیا تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ اس طرح میری جان بچا لے گا۔

اگلے دو دن اس طرح گزرے کہ میرا زیادہ تر وقت ورزشوں میں گزرتا تھا۔ میں نے من پسند کھانوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ ان لوگوں کو دے دی تھی۔ اس کے مطابق کھانے ملتے رہتے تھے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ ایسے کھانے منگواؤں جو توانائی بخش ہوں۔ مسلسل ورزشوں سے میرے مسلز چست ہو رہے تھے اور میرا وزن بھی کم ہو رہا تھا۔ اگرچہ کسی بھی مقابلے کے لیے صرف چار دن کم تھے۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں اپنا اسٹیمنا اور فٹنس ستر اسّی فیصد حاصل کر لوں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ الیکٹرک کون تھا اس کا لڑنے کا انداز کیا تھا۔ اس سے خاص فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اس سے مقابلہ کرنا تھا اور زندہ رہنے کے لیے جتنا ضروری تھا اس کے لیے مجھے ہر حربہ استعمال کرنا تھا اور خود کو تیار بھی کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے نہ صرف ان مقابلوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے مجرموں کو ہروانے کے لیے یہ لوگ ہر حربہ استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ احمد بربری کے ساتھ ہوا تھا۔ ایول کو چالاکی سے ہتھیار مہیا کیا گیا تھا اور ایول نے اس نوجوان کو مار ڈالا تھا۔

ایول کے زخمی ہو کر واپس جانے کی خبر خاصی اطمینان بخش تھی اس لیے نہیں کہ اب مجھے ایول سے مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کے خلاف میرے جذبات نفرت کی حد کو پہنچے ہوئے تھے۔ احمد کو میں نے پہلی اور آخری بار اس رِنگ میں ہی دیکھا تھا لیکن وہ نوجوان مجھے بھا گیا تھا۔ اس کا اعتماد اور ان فرعونوں کے سامنے اس کا حوصلہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ بانکا سجیلا نوجوان ایول جیسے دیوزاد کو بچوں کی طرح کھلا رہا تھا اگر ایول کو روایتی مغربی مکاری دکھا کر چھپ کر ہتھیار نہ

مہیا کیا جاتا تو وہ ایول کو ہرا دیتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایول کس طرح زخمی ہوا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ اب وہ کبھی رِنگ میں نہ آ سکے۔ ان لوگوں کا ایک شکاری کتا ناکارہ ہو جائے۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ مردود ایول میرے ہاتھوں کیوں نہیں انجام کو پہنچا۔ میں اسے با آسانی شکست دے سکتا تھا۔ بلکہ اس کی بھینسے نما گردن توڑ سکتا تھا۔ میں نے اس کے لڑنے کا انداز دیکھا تھا اس کے زیادہ تر وار نمائشی ہوتے تھے۔ اس کا ڈیل ڈول ہی ڈرانے والا تھا۔ اس میں چستی اور پھرتی مفقود تھی۔ وہ اپنے بڑے جثے اور بے پناہ طاقت و وحشت سے اپنے حریف کو زیر کر لیا کرتا تھا۔

جان گرے نے مجھے بتایا تھا کہ مقابلہ شام کے وقت ہوگا یعنی سات بجے کے بعد۔ اس وقت مجھے حوالات سے نکال کر لے جایا جائے گا میرا خیال تھا کہ اب مجھے مقابلے کے وقت ہی یہاں سے نکالا جائے گا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوتا۔ مجھے آرام اور ورزش کا بھرپور موقع ملتا مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میں سویا ہوا تھا کہ رات بارہ بجے کے قریب لاک اَپ کا دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے بے دار کر دیا۔ نائٹ ڈیوٹی انچارج سر پر کھڑا تھا۔ ''کھڑے ہو اور باہر آؤ۔''

''کیا ارادے ہیں۔'' میں اُٹھ بیٹھا۔ ''کیا ابھی پھانسی دینی ہے۔''

''میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتا۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تمہاری طلبی ہوئی ہے۔ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

میں نے اُٹھ کر واش بیسن سے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ باہر دو عدد مستعد گارڈ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے میرے ہاتھوں اور پیروں میں نائلون کی مخصوص ہتھکڑیاں ڈالیں میں نے نائٹ انچارج سے پوچھا۔ ''مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''بکومت۔'' اس نے خراب لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''بجا ارشاد۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''مائٹ از رائٹ کے اصول کے تحت سارے حقوق تم لوگوں کے پاس ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ مجھے سامنے والے راستے سے باہر لے جایا جائے گا لیکن گارڈز نے عقبی راستہ اختیار کیا۔ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے میری نگاہ غیر ارادی طور پر دائیں طرف کے فولادی دروازے کے اوپری جالی دار حصے پر پڑی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ رُکتے رُکتے بھی میں دروازے سے آگے نکل گیا تھا۔ رُکنے پر عقب سے گارڈ نے کمر پر اپنی رائفل کی نال ماری۔ ''چلو رکو مت۔''

''اس کمرے میں۔'' میں نے کہنا چاہا تو گارڈ مشتعل ہو گیا۔

''حرکت کرو۔ جلدی۔'' اس نے زیادہ زور سے نال ماری۔ مجھے اپنی کمر میں تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

بادلِ نخواستہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور سوچنے لگا کہ مجھے جو نظر آیا تھا وہ درست تھا۔





اس کمرے میں مجھے دیوار کے ساتھ احمد بربری ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ کیا میں نے ٹھیک دیکھا تھا۔ یا یہ صرف نظر کا دھوکا تھا۔ ممکن ہے وہ احمد بربری سے مشابہہ کوئی شخص ہو۔ اس کے سر پر گھنگھریالے بال تھے۔ ویسا ہی پُرکشش سانولا رنگ اور ویسے ہی کھڑے نقوش۔ احمد خالص بربری النسل نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کی رگوں میں عرب خون کی آمیزش بھی محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ بربری زیادہ سانولے رنگ اور کسی قدر افریقی نقوش کے حامل ہوتے ہیں۔ گزشتہ چودہ سو سال سے عربوں اور بربری قبائل کی ملی جلی آبادی سے موجودہ الجزائر، مراکش اور اس سے ملحقہ علاقوں میں یہی نسل اکثریت میں ہے جس کے نقوش میں بیک وقت عرب اور افریقی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے نقوش میں مصریوں کی سی ملاحت تھی۔ مصری خالص عرب ہیں لیکن صدیوں سے مصر کی آب و ہوا میں رہ کر ان کے نقوش میں مقامی خصوصیات آ گئی تھیں۔ ورنہ عرب بدو جو مصر میں آ کر آباد ہوتے تھے۔ ان کے نقوش موجودہ عربوں کی طرح کھردرے تھے۔ وہ عرب جو بحیرہ روم کے متصل خطوں میں آباد ہیں ان کے نقوش اندرون صحرا میں رہنے والے عربوں سے کہیں زیادہ سُبک اور جاذب نظر ہیں۔ قارئین سے معذرت کہ اصل داستان سے بھٹک کر تحقیق کی طرف جا نکلا۔ احمد بربری کی اس جھلک نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اگرچہ میں نے محض ایک جھلک دیکھی تھی۔ درمیان میں جالی بھی حائل تھی۔ اس کے باوجود مجھے بڑی حد تک یقین تھا کہ میں نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ احمد بربری ہی تھا مگر اسے میں نے آخری بار رِنگ میں زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ لاچاری کی کیفیت میں موت کو ایول کی صورت میں اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ میں جان گرے سے اُلجھ گیا تھا اور میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر جان گرے کی ساتھی لڑکی نے کوئی شے میرے سر پر ماری تھی اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔ اگر یہ احمد ہی تھا تو کسی معجزے کی وجہ سے وہ اس مقابلے کا فاتح رہا تھا تب ہی زندہ تھا ورنہ ایول اسے زندہ کسی صورت نہ چھوڑتا۔ اس کا مشن ہی احمد کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔ اس سے یہ توقع کہ وہ احمد کو شکست دے کر بخش دے گا۔ اتنی ہی محال تھی جتنی...... کہ بیل سے دودھ کی توقع کرنا۔ یا جان گرے جیسے لوگوں سے انسانیت کی توقع کرنا۔

میں سوچوں میں اتنا غلطاں تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب مجھے باہر لا کر اس مخصوص جیپ کے عقبی حصے میں بٹھایا گیا تھا جو جزیرے کے نگرانوں کے زیرِ استعمال تھی۔ یہ چھوٹی اور طاقتور جیپ جزیرے کے کئی مختصر اور پُر پیچ راستوں پر سفر کرنے کے لیے مثالی تھی۔ اگرچہ جزیرے کا رقبہ خاصا تھا لیکن اس کے ایک چھوٹے سے حصے کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس کا بڑا حصہ اس کے فطری انداز میں برقرار رہنے دیا گیا تھا۔ راستے چھوٹے اور عمارت کو بھی اوپری طرف سے پھیلانے کے لیے ان کی زیادہ منزلیں زیرِ زمین بنائی گئی تھیں۔ جزیرے پر شاذ ہی کوئی عمارت چار منزلہ اونچی ہو۔ ان پر سبز رنگ کیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اوپر سے گزرنے والے طیاروں کو یہ عمارات نظر نہ آئیں۔ رات کو روشنی کی جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی کیا جاتا تھا کہ روشنیاں اوپر سے نظر نہ آئیں گویا یہ لوگ اپنی

قوت اور اختیارات کے باوجود کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتے تھے۔

جیپ نیم روشن راستوں سے گزرتی رہی اور مشکل سے دس منٹ بعد اس نائٹ کلب کے سامنے رُکی جہاں جان گرے مجھے لے کر گیا تھا۔ گارڈ نے جیپ کے اینگل سے میری ہتھکڑی کھولی اور مجھے اندر لے آئے۔ وہاں حسبِ معمول بھیانک میوزک پر کئی جوان جسم بے تحاشہ ناچ رہے تھے۔ غالباً یہ جزیرے کی عام آبادی تھی۔ جو عام کاموں کے لیے مخصوص تھی۔ زیادہ تر چہرے ایشیائی خدوخال کے حامل تھے۔ ناچنے والوں میں لڑکیوں کی اکثریت تھی۔ ان کا حلیہ اور انداز چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ وہ یہاں پر دل لبھانے کے لیے موجود تھیں۔ مردوں میں ایشیائی اور سفید فام نسلوں کے ملے جلے نوجوان تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب ہی جوان تھے ان میں شاید ہی کوئی بوڑھا تھا۔ اکا دُکا ادھیڑ عمر تھے لیکن وہ ایک طرف بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے تھے۔

گارڈز مجھے ناچنے والوں کے درمیان سے لے کر لفٹ تک پہنچے۔ لفٹ نے نہ جانے کون سے فلور پر ہمیں اُتارا۔ یہ وہ فلور نہیں تھا جہاں پر زیرِ زمین کلب تھا۔ جان گرے وہاں باقاعدگی سے جاتا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے خود بتائی تھی۔ یہ ایرینا والا فلور بھی نہیں تھا۔ بلکہ یہاں پر لفٹ سے نکلتے ہی چار طرف گیلریاں تھیں اور ان کے دونوں جانب دروازے تھے۔ اندر غالباً رہائشی کمرے تھے۔ کمروں کے دو دروازوں کا درمیانی فاصلہ بتا رہا تھا کہ خاصے وسیع وعریض کمرے تھے۔ گارڈز نے وسطی گیلری کا رُخ کیا جو لفٹ کے عین سامنے تھا۔ انہوں نے دائیں طرف کے تیسرے دروازے پر دستک دی۔

''یس۔'' فوراً ہی دروازے کے ساتھ لگے سپیکر سے جان گرے کی آواز آئی۔

''سر یوسف علی خان حاضر ہے۔'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔

کمرے شاید ساؤنڈ پروف تھے اس لیے سپیکر و مائیکروفون کی ضرورت پیش آئی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ بھی کسی ریموٹ سے کھلا تھا۔ کیونکہ جان گرے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ وہ بدستور اس جہازی سائز کے بستر پر دراز تھا۔ جس پر اس کے دائیں بائیں دو عدد قیامتیں تھیں اور جان گرے کا حوصلہ تھا جو انہیں بیک وقت برداشت کر رہا تھا۔ ایک غالباً یوریشین تھی اور دوسری افریقین اس کے گھوڑے کی طرح مضبوط جسم میں بے پناہ کشش تھی۔ اس نے اس کشش کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ یوریشین کسی قدر جامے میں تھی۔ جان گرے کا گاؤن اوپن تھا اور اس کی نیکر نظر آ رہی تھی جس پر امریکی پرچم بنا ہوا تھا۔ یہ فیشن ان دنوں بہت پھیلا ہوا ہے۔ یورپی اقوام کی وطنیت ان کے انڈر ویئر سے بھی شناخت کی جا سکتی ہے۔

کمرا کیا تھا ایک عشرت کدہ تھا۔ جس کی ایک ایک چیز قابلِ دید بھی تھی اور قابلِ داد بھی۔ ہر طرف عیش وعشرت اور حرص وہوس کے ایسے سامان تھے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جائے اور شیطان بھی شرما جائے۔ دیواروں پر عجیب سا لہریں لیتا ہلکا نیلا رنگ تھا۔ چھت پر برقی آلات کی مدد سے




تیرتی مچھلیوں کا سا تاثر پیدا کیا گیا تھا۔ ان مچھلیوں کے درمیان ایک جل پری تیر رہی تھی۔ جل پری یوہی ایسی مچھلی جس کا اوپری دھڑ کسی حسین عورت کا سا نازک اور بھرپور تھا۔ بستر کے برابر میں ایک تپائی پر بہترین قسم کی وہسکی کی بوتل اور جام رکھے تھے۔ ایک جام جان گرے کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ویلکم مسٹر جوزف۔''

''یوسف۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

''ایک بات نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر میں جوزف ہوتا تو کوئی نام نہاد کونسل مجھے سزائے موت دینے کا فیصلہ نہیں کرتی۔''

اس کا منہ بن گیا لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔ ''خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں بحث کے لیے نہیں بلکہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے بلوایا ہے۔''

''کون سا وعدہ؟'' میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا پھر میرے ساتھ آنے والے دونوں گارڈز سے بولا۔ ''باہر انتظار کرو جب میں بلاؤں تو اندر آنا۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ دونوں بلا چوں چرا کیے باہر چلے گئے۔

سیاہ قیامت زیادہ ہی نشے میں تھی۔ اس لیے اسے اپنی عریانی کا قطعی احساس نہیں تھا۔ اسے ایک طرف دھکیل کر جان گرے نے بستر سے ذرا اُٹھ کر اپنے پاس رکھے ایک ریموٹ کنٹرول نما آلے کا رُخ سامنے والی دیوار کی طرف کر کے ایک بٹن دبایا۔ اس پر سے ایک پتلا سا خانہ ایک طرف سرک گیا اور اس کے عقب سے بڑی سکرین کا ٹی وی نمودار ہوا۔ جان گرے نے دوسرا بٹن دبایا سکرین بے دار ہو گئی۔ اس پر جو منظر نمودار ہوا وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ سکرین پر ایرینا دکھایا تھا۔ جو فی الوقت خالی تھا لیکن بنا آواز کے تماشائیوں کے جوش وخروش سے لگ رہا تھا کہ کوئی مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔ پہلے ایک جاپانی کراٹے ماسٹر آیا۔ ''یہ کیمہ نوچی ہے۔'' جان گرے نے بتایا۔ ''اس کا مقابلہ الیکٹرک سے ہوا تھا۔''

اور کیونکہ الیکٹرک زندہ تھا اس لیے موت کیمہ نوچی کے حصے میں آئی ہوگی۔ کیمہ نوچی جاپانی ہونے کے باوجود دراز قامت تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا قد پونے چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ جان گرے نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ ویسے بھی اس کمرے میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں کھڑا رہا۔ اس بستر پر بیٹھنا مجھے خود بھی گوارا نہیں تھا جو یقیناً میری آمد سے پہلے گناہ کی سیج بنا ہوا تھا۔ مجھے الیکٹرک یعنی بجلی کا انتظار تھا اور جب وہ آیا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا لیکن متناسب جسم کا شخص تھا۔ اس نے گردن سے نیچے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں

سیاہ رنگ کے سپورٹس شوز تھے اور ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے دستانے قد کی مناسبت سے اس کے نقوش بھی لڑکوں جیسے تھے۔ البتہ اس کی سیاہ سرد آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنا بے ضرر نہیں ہے۔ جتنا کہ نظر آتا ہے۔ جان گرے نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ الیکٹرک ہے۔ اس وقت دنیا کا سب سے بہترین اسٹریٹ فائٹر ہے۔''

''ضرور ہوگا۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''اس کی آنکھیں بتاتی ہیں۔''

''اس کا تعلق جرمنی سے ہے۔ لائبریا کا علاقہ ہمیشہ سے بہترین سپاہیوں کے لیے مشہور ہے۔''

''جرمنوں میں کم سے کم کمینگی اور گھٹیا پن نہیں ہوتا۔'' میں نے سکرین کی طرف دیکھا۔ بجلی مقابلے سے پہلے جوتوں کے بل اُچھل رہا تھا۔ وہ خود کو وارم اَپ کر رہا تھا جبکہ جاپانی کراٹے ماسٹر اپنے مخصوص لباس میں اٹناس بنا کر کھڑا تھا۔ اس نے وارم اَپ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ بجلی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حالانکہ یہ کوئی دوستانہ مقابلہ نہیں تھا جس میں ہاتھ ملایا جاتا۔ مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی جب جاپانی ماسٹر نے ہاتھ ملاتے ہی جوڈو کا ایک داؤ آزمایا۔ یہ خونی مقابلہ تھا اس میں ایک شخص کو فاتح ایرینا سے باہر جانا تھا۔ دوسرے کو قبرستان یا ہسپتال کی طرف جانا تھا۔ اس مقابلے کی کوئی اخلاقیات نہیں تھیں۔ اس میں حریف کو موقع ملتے ہی زیر کر لینا تھا۔ ورنہ حریف آپ کو قطعی موقع نہیں دیتا۔ حیرت مجھے اس داؤ کا نتیجہ دیکھ کر ہوئی۔ بجلی کو اُلٹ کر جاپانی ماسٹر کے عقب میں کمر کے بل جا گرنا تھا۔ یہ مہلک داؤ تھا جس میں بعض اوقات حریف کی کمر بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

بجلی نے حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ اس نے جاپانی کراٹے ماسٹر کے داؤ کی قوت استعمال کی۔ اس نے ہوا میں قلابازی کھائی اور جاپانی کے سر سے ہوتا اس کے عقب میں گھٹنوں کے بل زمین پر جا ٹکا۔ وہ چاہتا تو پنجوں کے بل کھڑا بھی ہوسکتا تھا۔ اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جب جاپانی اپنے داؤ کا نتیجہ دیکھنے کے لیے مڑا۔ الیکٹرک پہلے سے مکا بنا چکا تھا۔ جیسے ہی جاپانی اس کی طرف مڑا۔ اس نے گھونسا بجلی کی سی تیزی سے اس کی دونوں رانوں کے درمیان میں مارا۔ کیمرے نے زاویہ بدلا اس پر جاپانی ماسٹر کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس چہرے پر درد و کرب کے ساتھ ایک شے اور نمودار ہوئی تھی اور وہ تھی موت کی سفیدی، اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجمع جیسے پاگل ہوگیا۔ وہ اتنا مختصر سا مقابلہ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن مجمع کا انداز بتا رہا تھا کہ الیکٹرک سے جاپانی کراٹے ماسٹر کے قتل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ الیکٹرک چند لمحے سرد نگاہوں سے تماشائیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر خم کیا اور نپے تلے قدموں سے ایرینا سے رخصت ہوگیا۔ یہ مووی ختم ہوئی تو الیکٹرک کی چند پُرانی فائٹس کی مووی دکھائی گئیں۔ وہ واقعی بجلی کی طرح لڑتا تھا۔ اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہی نہیں تھا۔ جیسے




بجلی ناگہانی طور پر گرتی ہے۔ اس طرح وہ حریف پر ایسے ضرب لگاتا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا تھا۔ ''اتنے سے قامت پر تم قیامت ہو۔''

''جاپانی کیمہ نوچی بچا نہیں تھا۔'' جان گرے نے ٹی وی آف کر دیا۔ ''ایک ہی ضرب نے اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔''

''بچا نہیں تھا یا تم لوگوں نے اسے بچایا نہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''زندہ رہتا تو اسے کچھ نہ کچھ دینا پڑتا۔ علاج پر بھی خرچہ ہوتا اور واپس بھجوانے پر بھی۔ چند ڈالرز کمانے کے لیے ایک جان لے لینا تم لوگوں کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔''

جان گرے کے مجرمانہ تاثرات نے بتایا کہ میری بات درست تھی۔ کیمہ نوچی کو طبی امداد دے کر بچایا جا سکتا تھا لیکن انہوں نے ایرینا کی روایت کہ یہاں سے ایک ہی شخص زندہ جا سکتا ہے اسے طبی امداد کے بغیر مرنے دیا۔ بے شک الیکٹرک کا وار خطرناک تھا لیکن اسے بہرحال بچایا جا سکتا تھا ٹی وی آف ہوتے ہی خانہ کھسک کر دوبارہ اپنی جگہ آ گیا تھا اور اب لگتا نہیں تھا کہ اس جگہ کوئی ٹی وی جیسی شے تھی۔ کمرے کو الیکٹرانکس کی جادوگری سے ایک جدید قسم کے عشرت کدے میں بدل دیا گیا تھا۔ جہاں ڈیجیٹل آڈیو ویڈیو تھا۔ اس قسم کے آلات اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ دیواروں میں بھی پوشیدہ کیے جا سکتے ہیں۔

''تمہیں بلانے کا مقصد الیکٹرک کے لڑنے کا انداز دکھانا ہے۔ عام طور سے دیو قامت حریف کے نزدیک جانے سے بچنا چاہیے اگر اس کے قابو میں آ گئے تو مارے گئے۔ الیکٹرک کا قد و قامت چھوٹا ہے جسامت بھی خاص نہیں ہے یہ اپنے حریف کو اس دھوکے میں رکھ کر نزدیک بلاتا ہے اور پھر ایسا وار کرتا ہے جس کا توڑ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں الیکٹرک کے نزدیک جانے سے پرہیز کرنا ہوگا۔'' جان گرے نے مشورہ دیا جو درست تھا۔ الیکٹرک کے لڑنے کا انداز دیکھ کر میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''یہ بتاؤ اگر میں جیت گیا تو کیا آزاد ہوں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں تمہیں دی جانے والی موت معاف کر دی جائے گی لیکن آزادی نہیں ملے گی؟''

''تو کیا اسی جزیرے پر رکھا جائے گا؟''

''اس جزیرے پر رکھا جائے گا یا کسی اور مرکز بھیج دیا جائے گا۔ ایک خاص مدت تک تم ہمارے زیرِ نگرانی رہو گے اور ہمارے لیے کام کرو گے۔ جس کا تمہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا اور جب یہ محسوس ہوگیا کہ اب تم ہمارے لیے معاندانہ جذبات نہیں رکھتے یا خطرناک نہیں رہے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

"اور یہ مدت کتنی ہوگی۔" میں نے طنز کیا۔ "کہیں میری مدتِ حیات جتنی تو نہیں۔"

"عام طور سے یہ مدت جرم کی سنگینی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔" اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "کیونکہ تمہیں مجھ پر حملہ کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی۔ اس لیے میری سفارش پر تم جلد رہا کر دیئے جاؤ گے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میری سفارش کب ہوگی۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں کہہ رہا تھا کہ جب میں اس کا کام کر دوں گا تو وہ مجھے رہا کروا دے گا حالانکہ مجھے شک تھا کہ وہ مجھے زندگی کی قید سے رہا کروا دے گا۔ جان گرے مہربانی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کی فطرت سانپ کی سی تھی۔ ڈسنا اس کا کام تھا۔ میں احمد بربری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ سچ مچ ان لوگوں کی قید میں زندہ تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ جان گرے نے ایک بار بھی اس کے مارے جانے کا ذکر کیا ہو۔ غالباً وہ مجھے اس کے زندہ ہونے کے بارے میں بتا کر خوش ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ جیسے وہ عبید صلاح کا ذکر کرنے سے گریز کرتا تھا۔

"میرا مقابلہ ایول سے کیوں نہیں کرایا جا رہا۔"

جان گرے سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا۔ وہ زخمی ہو کر امریکہ واپس جا چکا ہے۔"

"وہ کس طرح زخمی ہوا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا جان گرے نے غور سے مجھے دیکھا۔ وہ مکار زمانہ بھانپ گیا تھا کہ میں اس سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اتفاق سے جیل میں احمد بربری کو دیکھا تھا۔"

وہ بُری طرح چونکا۔ "تم نے کیسے دیکھ لیا۔ اسے تو سیل فور کے خاص حصے میں رکھا گیا ہے۔"

اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جو مجھے لائے ہیں غالباً راز داری کے خیال سے اس حصے سے مجھے لائے تھے۔"

جان گرے نے بلا تکلف ان کی ماں بہن ایک کی اور مجھ سے بولا۔ "اگر وہ بدبخت ابھی زندہ ہے تو زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا اس نے اس خطے میں ہمیں بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ جلد وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا۔" مارے اشتعال کے جان گرے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔

"میں نے جب اسے دیکھا تو وہ ایول کے مقابلے میں کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ اسے نوکدار سلاخ سے مارنے جا رہا تھا جو تم نے اسے دھوکے سے مہیا کی تھی۔"

اس سچ بیانی پر جان گرے نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ "وہ حرامی ایول گدھے کی اولاد دھوکا کھا گیا۔ احمد مکاری سے کام لے کر خود کو بے بس ظاہر کر رہا تھا اور پھر اس نے ایول کے ہاتھ میں دبی سلاخ اس کے اپنے پیٹ میں گھونپ دی۔ جب تک ہمارے کیبن میں ہنگامہ ختم ہوتا ادھر ایول بھی گر چکا تھا۔ سلاخ نے اس کی آنتوں کو باہر نکال دیا تھا اگر گارڈز اندر جا کر احمد کو قابو نہ کرتے





تو وہ ایول کو جان سے مار دیتا۔"

میں نے اسے طنزیہ نظر سے دیکھا۔ "تم لوگوں کی کوئی اخلاقیات ہے بھی یا نہیں۔ اپنے ہی بنائے اصول توڑ دیتے ہو اتنی ڈھٹائی سے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔"

جان گرے نے پہلو بدلا۔ "اصول اپنی جگہ لیکن ہم ایول کی موت برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ تم نہیں جانتے اس کا تعلق امریکہ کے ایک با اثر سیاسی خاندان سے ہے۔ جس نے اہم خفیہ ایجنسیوں میں اپنی جڑیں پھیلا رکھی ہیں۔ ایول کی موت ہمیں خاصی مہنگی پڑتی اب بھی اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ فلوریڈا کے آرمی ہسپتال میں زندگی و موت کے درمیان معلق ہے۔"

"چلو ایک تو اپنے انجام کو پہنچا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے خوشی ہوگی وہ امریکی سؤر کتے کی طرح تڑپ کر مر جائے۔"

جان گرے نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ "دفع کرو اسے۔ بس اتنا یاد رکھو کہ تم نے بہر صورت الیکٹرک کو شکست دینی ہے۔"

"کیا تم اپنے ایک اہم آدمی کی میرے ہاتھوں موت برداشت کر لو گے؟" میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے غور سے نہیں سنا تم نے اسے صرف شکست دینی ہے موت کے گھاٹ نہیں اُتارنا۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "جان گرے تم سے اتنی احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی۔ کیا خیال ہے۔ وہ مجھے مارنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور میں اسے صرف شکست دینے کی۔"

"مجھے یقین ہے تم ایسا کر سکتے ہو۔" جان گرے کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تمہاری تربیت حسن علی نے کی ہے۔ دشمن ہونے کے باوجود میں اس کی صلاحیتوں کو مانتا ہوں۔ ہمارے پاس اس کے پائے کا ایک آدمی بھی نہیں ہے کاش وہ ہمارے ساتھ ہوتا۔"

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ "تم اتنا بھی جانتے ہو؟"

"میں تمہارے بارے میں کیا نہیں جانتا۔" وہ ہنسا۔ "میں تو وہ بھی جانتا ہوں جو تمہاری پرورش کرنے والا جمشید علی خان بھی نہیں جانتا یقین کرو میرے لیے کام کر کے تم پچھتاؤ گے نہیں۔ میں تمہیں تمہاری اصل منزل کی طرف لے جاؤں گا۔"

"مجھے اپنی اصل منزل کی طرف نہیں جانا۔ یہی میری اصل ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا لیکن ہمیشہ کی طرح جان گرے کے منہ سے اپنے ماضی کے بارے میں سن کر مضطرب ہو گیا تھا۔ وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتا ہوں تم اپنے ماضی کو جاننے کے لیے بے تاب ہو۔"

"چلو...... یہی سہی۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "بائی دی وے ایک سوال کر سکتا ہوں؟"

''ہاں پوچھو۔'' اس نے کمال فراخ دلی سے اجازت دیتے ہوئے یوریشین قیامت کو جام بھرنے کا اشارہ کیا۔

''نائٹ شفٹ انچارج...... کیا تم اس پر اعتماد کرتے ہو؟''

''ہاں کیوں کیا بات ہے۔'' اس نے غور کیا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''اس نے جیل میں ہونے والے ہنگامے کی خبر کسی شخص کو دی تھی اور اس سے جھاڑ بھی کھائی تھی۔''

جان گرے چونکا۔ ''بکومت ہر معاملے میں دخل مت دو۔'' اس نے لہجہ بدل لیا۔ ''اب تم اتنے بھی اہم نہیں ہو۔'' اس نے ریموٹ کا ایک بٹن دبایا۔ ''کم آن اینڈ گیٹ ہم۔''

فوراً ہی دونوں گارڈز اندر آئے۔ میری ہتھکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں ویسے بھی نہیں کھولی تھیں۔ وہ مجھے ایسے ہی واپس لے گئے۔ پندرہ منٹ بعد میں دوبارہ اپنے سیل میں تھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے مجھے سیل میں دھکا دے کر باہر سے تالا لگایا اور ان دونوں گارڈز کو رُخصت کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی میز پر جا کر عریاں تصاویر والا رسالہ نہیں بلکہ فون اُٹھایا تھا اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''واپس آ گیا ہے جی...... یس سر......'' اس نے کہا۔ اس نے کوشش کی تھی اس کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچنے پائے لیکن میں نے سن لیا تھا۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں میں اسے دیکھ لوں گا۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر غرا کر کہا، اس کا انداز محسوس کر کے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے اُٹھ کر باہر والا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک دیوزاد گارڈ تھا۔ اس نے اندر آ کر سوالیہ نظروں سے شفٹ انچارج کی طرف دیکھا اس نے میرے سیل کی طرف اشارہ کیا وہ دیوزاد میری طرف آیا۔

''اے ادھر آؤ۔'' اس نے سلاخوں کے پاس آ کر کہا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر جواب دیا۔ میرے اندر بجتی گھنٹی کی آواز مزید بڑھ گئی تھی۔

''ادھر آؤ۔'' اس نے غرا کر اپنی بات دہرائی اور اپنی رائفل کی نال سلاخوں سے گزار کر میری طرف کر دی۔ ''اگر تم تین گننے تک یہاں نہیں آئے تو میں گولی مار دوں گا۔'' اس کے لہجے میں یقینی سفا کی تھی۔ بادلِ نخواستہ میں اُٹھا۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ مجھے سیل کے اندر ہی گولی مار کر اسے مقابلہ شو کر سکتے تھے ان کے بڑے بے شک ان کی بات پر یقین نہ کرتے لیکن وہ انہیں سزا بھی نہیں دے سکتے تھے۔ نقصان میں میں ہی رہتا کہ مارا جاتا۔ جیسے ہی میں سلاخوں کے پاس پہنچا دیوزاد گنجے نے رائفل کی نال میرے پیٹ پر رکھ دی۔ ''اپنے دونوں ہاتھ باہر نکالو۔''

''وہ کس خوشی میں۔'' میں نے حکم کی تعمیل کیے بغیر دریافت کیا۔

''ہاتھ باہر نکالو۔'' اس نے رائفل کا دباؤ میرے پیٹ پر بڑھایا تو مجھے ہاتھ باہر نکالنے ہی





پڑے تھے۔

شفٹ انچارج نے پھرتی سے میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ جو چند لمحے پہلے ہی اُتاری گئی تھیں۔ خطرہ سامنے آ گیا تھا۔ وہ لوگ میرے ساتھ کوئی غلط حرکت کرنے جا رہے تھے لیکن میں مجبور تھا خود کو بچا نہیں سکتا تھا۔ مجھے قابو میں ہوتے دیکھ کر دیوزاد مسکرایا اس نے رائفل زمین پر رکھ کر اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سرنج نکالی۔ ''اسے پکڑو۔'' اس نے شفٹ انچارج سے کہا۔ شفٹ انچارج نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچے میں نے مزاحمت کی۔ ایک لمحے کے لیے میری توجہ دیوزاد سے ہٹی اور اس نے پھرتی سے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر سرنج میری پسلیوں میں اُتار دی۔ میں تڑپ کر رہ گیا تھا۔ سرنج کی وجہ سے نہیں بلکہ دیوزاد نے سرنج سے جو چیز میرے جسم میں اُتاری تھی اس نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سرنج میں کوئی تیزاب بھرا ہو یا آگ تھی جواب اس مقام پر مجھے جلائے دے رہی تھی۔ جہاں سرنج لگی تھی۔

''یہ کیا ہے۔ کتے کے بچو؟'' میں کرب کی شدت سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

دیوزاد نے قہقہہ لگا کر ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔ خالی سرنج اس نے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ بے قراری سے میرا جسم بل کھا رہا تھا۔ درد اتنا تھا کہ میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ شفٹ انچارج اور دیوزاد دلچسپی سے میری تکلیف کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ پھر دیوزاد نے اشارہ کیا اور شفٹ انچارج نے میری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ کھلتے ہی میں لڑکھڑا کر بستر پر جا لیٹا یوں لگ رہا تھا جیسے اس مقام پر اندر سے کچھ کٹ رہا ہو۔ دیوزاد جا چکا تھا اور شفٹ انچارج میری تکلیف نظر انداز کر کے واپس اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ یہ میرے ساتھ کیا کیا گیا ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال اتنا واضح تھا کہ یہ تکلیف مجھے کل کے مقابلے کے سلسلے میں دی گئی تھی۔

میں پسلی دبائے بستر پر لیٹا رہا۔ شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کوئی میری سنتا ہی نہیں اور میں کہتا بھی کس سے اس جزیرے پر میرا واحد ہمدرد جان گرے تھا اور اس تک یہ بات پہنچانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس حرکت سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ نائٹ شفٹ انچارج جسے جان گرے اپنا وفادار سمجھتا تھا۔ اصل میں کسی اور کا آدمی تھا۔ اس نے وہاں سے ہدایت لے کر میرے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا تا کہ میں الیکٹرک کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ اس تکلیف کے عالم میں میرے لیے لڑنا تو ایک طرف رہا سیدھے کھڑے ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔

میں پہلو دبائے پڑا رہا حتیٰ کہ درد کی شدت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ کسی قدر سکون ملنے پر میں نے اپنی قمیص پسلیوں سے اوپر کی۔ مجھے حیرانگی ہوئی اس جگہ کوئی نشان نہیں تھا۔ جلد بالکل ہموار تھی۔ سوائے سرنج کی سوئی کے معمولی سے نشان کے اور اندر ایسا درد ہو رہا تھا کہ چند منٹ کے لیے قیامت بپا ہو گئی تھی۔ معائنہ کر کے میں واپس بستر پر لیٹ گیا۔ دی جانے والی چادر سے میں نے اس

جگہ کو دبایا اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ تکلیف میں اتنی کمی آئی کہ مجھے نیند آ گئی تھی۔ سوتے وقت میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ کل تک میری یہ تکلیف کم نہ ہوئی تو میرے لیے الیکٹرک سے مقابلہ کرنا محال ہو جائے گا۔ وہ بے حد پھرتیلا فائٹر تھا اور مقابلے میں تو کوئی بھی چوٹ سے محفوظ نہیں رہتا۔ میرے اندر سے کوئی بتا رہا تھا کہ اس مقابلے میں پسلی کا یہ مقام میرے لیے شکست کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔ اس پر ہلکی سی ضرب سوتے ہوئے قیامت خیز درد کو پھر سے جگا دے گی۔

مجھے نیند آ گئی تھی۔ کبھی کبھی پسلی میں ٹیس اُٹھتی تھی مگر میں سوتا رہا۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے پسلی میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ میں تڑپ کر اُٹھا۔ نائٹ شفٹ انچارج نے پھرتی سے اپنی چھڑی سلاخوں سے باہر کھینچ لی۔ اس نے یہ چھڑی میری پسلی میں چبھوئی تھی۔ تکلیف میں وہی شدت تھی جو سرنج لگانے کے بعد میں نے محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس نے صرف چھڑی چبھوتی تھی۔ وہ ہنسا۔

''میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا...... جانے سے پہلے تمہیں جگا دوں۔''

میں نے پسلی دبائی۔ ''اگر تم نے اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں پوچھنے کے لیے یہ زحمت کی ہے تو یقین کرو وہ رات میرے ساتھ نہیں تھیں۔''

اس کی ہنسی غائب ہو گئی اور وہ مجھے گھورتا ہوا اپنی میز کی طرف چلا گیا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ دن کی ڈیوٹی دینے والا انچارج آنے ہی والا تھا۔ میں نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ بھی آنے والا تھا۔ جب میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا تو بازوؤں کی حرکت سے پسلی میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کچھ دیر میں ڈے انچارج اور ناشتے والا ساتھ ہی آ گئے۔ جب میں ناشتے کی ٹرے اُٹھا رہا تھا تو ڈے انچارج نے پکار کر کہا۔ ''لڑکے آج کے مقابلے کے لیے تیار ہو؟''

''ہاں......'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ناشتہ حسبِ فرمائش تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے حسبِ معمول ایکسرسائز شروع کی ابتدا میں پسلی کا درد اعتدال میں رہا لیکن جیسے ہی میں نے جسم کو زیادہ حرکت دی درد نے پھر شدت اختیار کر لی۔ میں پسلی دبا کر واپس بیٹھ گیا۔ اگر یہی صورت حال رہتی تو میرے لیے مقابلہ کرنا محال ہو جاتا۔ مقابلہ ملتوی بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے میں کیا عذر کرتا میری پسلی پر کوئی شک تک نہیں تھا۔ کوئی مانتا کہ مجھے اس جگہ جان لیوا قسم کا درد ہو رہا ہے۔ جب درد کم ہوا تو دوبارہ ورزش شروع کی اور جب درد بڑھنے لگتا تو روک دیتا۔ یہ سلسلہ سارے دن چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مقابلے کے لیے مجھے سات بجے لے جایا جائے گا۔ اس لیے جانے سے پہلے میں نے دو گھنٹے آرام کیا۔ عام حالات میں مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن پسلی کے درد کی وجہ سے آرام کرنا لازمی تھا تا کہ مقابلے کے آغاز سے پہلے وہ ایک حد میں رہے۔ درد زیادہ ہونے کی صورت میں میرے لیے حرکت کرنا بھی دشوار ہو جاتا۔

ٹھیک سات بجے گارڈز آ گئے۔ انہوں نے مجھے باہر نکال کر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائیں۔





باہر لا کر جیپ کے عقبی حصے میں آئرن اینگل سے باندھا اور کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں کلب کی عمارت کی وسعت کے بارے میں سوچتا تو حیرت ہوئی یہ اتنی وسیع و عریض عمارت زیرِ زمین بنانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے بے پناہ سرمائے کے ساتھ خاصی بڑی افرادی قوت کی ضرورت بھی تھی۔ افرادی قوت بطور لیبر لانا خسارے کا سودا تھا ان لوگوں کے لیے سب سے آسان کام یہ تھا کہ ایشیا سے غلام حاصل کریں اور ان سے بیگار لیں میرا اندازہ تھا اس جزیرے کی جتنی بھی تعمیرات تھیں ان سب کو بیگاریوں نے تیار کیا تھا۔ اس جزیرے پر جابجا مظلوم انسانوں کا خون پسینہ بکھرا ہوا تھا۔

آج کلب میں معمول سے کہیں زیادہ رَش تھا۔ خاص طور سے نائٹ کلب میں لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مجھے لے جانے کے لیے باقاعدہ راستہ بنانا پڑا۔ ایک طرف منڈلی بنائے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کوکین اور ہیروئن کا نشہ کر رہے تھے ان میں سے اکثر ایشیائی تھے۔ میری رگ و پے میں تلخی گھلنے لگی۔ اپنی نوجوان نسل کو ہیروئن اور دوسری منشیات کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے ملکوں پر بم باری کرنے والے ایشیائی اقوام کو کھل کر ہیروئن اور خطرناک منشیات کا عادی بنا رہے تھے۔

لفٹ نے ہمیں براہِ راست ایرینا والے فلور تک پہنچایا۔ پہلے مجھے ایک زیرِ زمین گیلری میں لے جایا گیا۔ جو آگے جا کر نیم دائرے کی صورت میں دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ گیلری ایرینا کے گرد گھوم رہی ہے۔ مکمل خاموشی تھی۔ ایک کمرے میں لا کر جو ڈریسنگ روم لگ رہا تھا میری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دیں۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے اپنا تعارف کرایا۔

''مجھے بکرما سنگھے کہتے ہیں۔'' اس نے صاف انگریزی میں کہا۔ ''میں آپ کا خادم ہوں۔''

گارڈز مجھے چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ بکرما سنگھے نے میرا لباس اُتارا۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ میری مالش کر کے مجھے وارم اَپ کر سکتا ہے۔ مجھے وارم اَپ کی ضرورت تھی۔ حرکت کر کے وارم اَپ ہونے میں پسلی کا درد پھر سے جاگ اُٹھنے کا ڈر تھا۔ اس لیے میں نے بکرما سنگھے کی پیش کش قبول کر لی۔ میں نے اس سے ایک عدد مارکر مانگا۔ اس نے کسی قدر حیرت کے ساتھ مجھے مارکر دے دیا۔

میں نے اپنی پسلی پر درد کے مقام پر دائرہ بنایا۔ ''اس جگہ انگلی بھی مت لگانا۔''

''اچھا جناب۔'' اس نے بلا سوال مان لیا۔ بکرما سنگھے نام اور نقوش سے سری لنکا کا لگتا تھا لیکن فی الوقت میں اس کے بارے میں جاننے کا خواہشمند نہیں تھا۔ میں اپنی ساری توجہ آنے والے مقابلے پر مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ بکرما سنگھے نے مجھے اوندھے منہ ایک میز پر لٹایا اور کسی ہلکے سے تیل سے میری مالش شروع کی۔ بلاشبہ وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے سخت ہاتھ لگانے سے گریز کیا اور نرم ہاتھوں سے میرے جسم کے مسلز والے حصوں کی مالش کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ میرا جسم گرم ہونے لگا۔ اس نے پوچھا۔

''صاحب آپ کا تعلق کس مغربی ملک سے ہے۔''

وہ بے چارہ مجھے مغربی باشندہ سمجھ رہا تھا۔ ''میں یورپ یا امریکہ کا رہنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں۔''

بکر ماسنگھ دنگ رہ گیا۔ ''پر آپ دیکھنے میں بالکل گورے صاحب لگتے ہو۔''

میں ہنسا۔ ''لگتا ہوں پر ہوں نہیں۔ میرا نام یوسف ہے۔''

''صاحب آپ کا کیا قصور ہے۔ ان لوگوں نے کیوں پکڑ رکھا ہے آپ کو؟''

''جرم بے گناہی ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے تو سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ اب مقابلہ کر کے میں اس سزا سے بچ سکتا ہوں۔''

''بدھا آپ کو کامیاب کرے۔'' اس نے خلوص سے کہا اور تندہی سے میری مالش کرنے لگا۔

ایک گھنٹے تک لگاتار مالش کر کے اس نے مجھے وارم اَپ کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک جاذب کپڑے سے پورا جسم صاف کیا۔ اس کے بعد لباس کا انتخاب تھا۔ بکر ماسنگھے نے دیوار گیر وسیع وعریض الماری کھولی۔ جس میں ہر قسم اور ہر سائز کے کپڑے تھے۔ میں نے ایک ہلکے شارٹ کا انتخاب کیا جو ڈوری سے بندھا تھا۔ یہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تک تھا اوپر کے لیے ایک کسی قدر ڈھیلی ٹی شرٹ کا انتخاب کیا۔ یہ لباس تیزی سے حرکت کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ پیروں میں سخت ربر کے تلے والے جوتے پہنے۔ ان کی چوٹ سخت ہوتی ہے اور یہ حرکت کرنے میں آسانی مہیا کرتے ہیں۔ پسلی میں ابھی تک آرام تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہاں درد کی وجہ پوشیدہ ہے...... بلکہ زہر جو انجکٹ کیا گیا تھا اس کا مقصد مجھے مقابلے کے دوران کمزور کرنا تھا۔

''یوسف صاحب پھلوں کا جوس لے لو۔'' بکر ماسنگھے نے مشورہ دیا۔ ''یہ سادہ پانی سے اچھا رہتا ہے۔''

لیکن میں وہاں کچھ پینے یا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا عین ممکن تھا انہوں نے جوس یا پانی میں کچھ ملا دیا ہو۔ ان خبیث فطرت لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ میں نے حوالات سے چلتے ہوئے مناسب مقدار میں پانی پی لیا تھا۔ اس لیے مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ رات کا کھانا مجھے چھ بجے ہی دے دیا گیا تھا۔ نو بجے تک میں مکمل طور پر تیار تھا۔ اچانک ڈریسنگ روم میں ایک اجنبی آواز گونجی۔

''مسٹر یوسف...... تم تیار ہو؟''

''ہاں......'' میں نے اس دیوار کی طرف دیکھا جس میں پوشیدہ سپیکر سے آواز آئی تھی۔

''گڈ...... تمہارا مقابلہ ٹھیک ساڑھے نو بجے ہوگا۔'' آواز نے کہا۔ ''اس وقت تک ایرینا میں پہنچ جانا یاد رکھنا پانچ منٹ کی تاخیر پر تمہیں مقابلے میں شرکت سے روک دیا جائے گا اور تمہارے مخالف کو واک اوور دے دیا جائے گا۔''

''تم فکر مت کرو کہو تو ابھی آ جاؤں۔'' میں نے پیش کش کی لیکن آواز پھر نہیں آئی۔ میں نے بکر ماسنگھے سے اور مقابلوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بے بسی سے شانے ہلائے۔ ''صاحب





ہم کو نہیں معلوم ہمیں اس جگہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' جان گرے نے مجھے بتایا تھا کہ ایرینا کے مقابلے ہفتے میں دو دن ہوا کرتے تھے اور ہر دن کئی مقابلے ہوتے تھے اس کا مطلب تھا کہ ہفتے میں کئی افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے لیکن دولت کے لالچ میں اپنی جان داؤ پر لگانے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کیونکہ جیت کی صورت میں انہیں خطیر رقم ملا کرتی تھی۔ ایک مقابلہ جیت کر وہ اتنا کما لیتے تھے کہ سالوں بیٹھ کر کھا سکتے تھے۔ ہارنے کے لیے ان کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ نہیں تھا ان مقابلوں کو دیکھنے کے لیے دنیا کے دولت مند ترین لوگ آتے تھے۔ ان میں خاص طور سے خلیجی ممالک اور جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے دولت مند تھے۔ ایرینا میں ایک عام نشست ہزار ڈالرز کے عوض ملتی تھی۔ جبکہ خاص نشستیں اور وی آئی پی پاس حد سے زیادہ مہنگے تھے۔

بکر ماسنگھے نے بتایا۔ ''صاحب سال میں ایک بار اِدھر ٹورنامنٹ بھی ہوتا ہے۔ جس میں تمام دنیا سے لڑنے والے آتے ہیں۔ پورے ایک ہفتے تک مقابلے ہوتے ہیں۔ جو ٹورنامنٹ جیتتا ہے اسے ایک ملین ڈالرز کا انعام اور ہیروں کی بیلٹ دی جاتی ہے۔''

''یعنی تم بہت مصروف ہو جاتے ہوگے۔''

''ہاں صاحب۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''ان دنوں صحیح سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔''

''بکر ماتم یہاں کیسے آئے؟''

''قسمت کی بات ہے صاحب...... میرا باپ بھی مساج کرتا تھا۔ وہ علاج بھی کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس پٹھوں اور جوڑوں کا درد نکلوانے آتے تھے۔ اس نے مجھے تربیت دی تھی حالانکہ میری خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ میں باپ کے مساج گھر میں کام کرتا تھا ایک روز ایک گورا صاحب آیا۔ وہ میرے مساج سے بڑا خوش ہوا اس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر میں مڈل ایسٹ آ جاؤں تو مجھے کہیں زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ لالچ میں آ کر میں نے اس کی بات مان لی۔ اپنے باپ کو بھی نہیں بتایا چپکے سے اس انگریز کے ساتھ چلا گیا۔ وہ مجھے پہلے کولمبو لے گیا۔ پھر تاملوں کے علاقے میں لے گیا۔ جہاں سے ایک کشتی میں بٹھا دیا۔ کشتی پر لاتے ہی مجھے پکڑ کر بند کر دیا اور جب ایک ہفتے بعد نکالا تو میں اس جزیرے پر تھا۔''

''کتنا عرصہ ہوا تمہیں یہاں آئے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال اور چار مہینے۔'' اس نے حساب لگایا۔ ''یہ کہتا ہے کہ ہمیں پانچ سال بعد واپس بھیج دیا جائے گا۔ ہمیں اتنی رقم بھی دے گا جس سے ہم واپس جا کر اپنا کاروبار کر سکیں۔''

میں نے اسے بتایا نہیں کہ اب وہ کبھی واپس نہیں جا سکے گا اور اس نے بغاوت کی تو سمندر کی تہہ اس کا مقدر بنے گی۔ میرا اندازہ درست تھا کہ افرادی قوت کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ لوگ بردہ لاتے تھے۔ سستی افرادی قوت جسے صرف دو وقت کی روٹی اور معمولی سی تفریح دینا پڑتی تھی۔ یہ لوگ ان کی باقاعدگی سے نگرانی کرتے تھے جس پر انہیں شک ہوتا کہ وہ آزادی کے لیے کچھ زیادہ ہی

بے تاب ہو رہا ہے یہ اسے زندگی کی قید سے ہی آزاد کرا دیتے تھے۔ باقی جو لوگ زندگی سے عیاشی مانگتے ہیں ان کے لیے انہوں نے خاصا بندوبست کر رکھا ہے۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام کر کے وہ شام کو جانوروں کی ہی طرح مادر پدر آزاد زندگی سے لطف اندوز ہو کر سو جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں نے انہیں نشے کی لت پر بھی لگا رکھا تھا۔ تاکہ وہ اس میں کھو کر آزادی کا مفہوم ہی فراموش کر دیں۔

بکرما سنگھے نے مجھے چونکایا۔ ''صاحب نو بج کر پچیس منٹ ہو گئے ہیں۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ باہر مجھے لانے والے گارڈز مستعد تھے۔ انہوں نے مجھے پھر سے ہتھکڑیاں پہنانا چاہیں۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس کی ضرورت ہے تاکہ مقابلہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ تم سزا یافتہ قیدی ہو اور مقابلہ کر کے اپنی سزا معاف کروانے آئے ہو۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے اُچکائے اور ہتھکڑی پہن لی۔ اس گیلری کے دونوں طرف ڈریسنگ روم تھے جہاں مقابلہ کرنے والے تیار ہوتے تھے۔ جہاں سے گیلری نیم دائرے میں گھوم رہی تھی۔ اس طرف دیوار میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ ان سے ایرینا کا منظر صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایرینا سے باہر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے دائیں طرف کی گیلری والے دروازے سے میں اندر داخل جیسے ہی دروازہ کھلا ایرینا کا شور سنائی دیا۔ گویا اندر کا حصہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔ شور سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آج ایرینا میں خاصی تعداد میں تماشائی آئے تھے۔

گارڈز نے وسط میں لا کر میری ہتھکڑی کھولی اور باہر چلے گئے اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں اس دروازے سے دو ہی صورتوں میں گزر سکتا تھا۔ فاتح بن کر اپنے پیروں پر یا لاش کی صورت میں اسٹریچر پر، ایرینا کا میدان تقریباً تیس فٹ قطر کا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیروں تلے پتلا سا ربڑ تھا۔ یہ بے حد معمولی سا تحفظ دیتا تھا۔ زور سے گرنے کی صورت میں چوٹ لازماً لگتی۔ چاروں طرف دیوار پر بھی ایسا ہی پتلا سا ربڑ چڑھا تھا۔ دیواریں کوئی پانچ فٹ اونچی تھیں اور ذرا ترچھی ڈھلان کی صورت میں تھیں مقصد یہ تھا کہ ایرینا میں بیٹھے ہر فرد کو سب صاف نظر آئے۔

ایرینا میں ساڑھے تین سو افراد تھے۔ یہ سب جنونی افراد تھے جن کی نفسیات خون اور قتل دیکھ کر تسکین حاصل کرتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر امیر ایشیائی ممالک کے امراء تھے کچھ سفید فام ممالک کے باشندے بھی تھے۔ بعض افراد پر مجھے شک ہوا کہ ان کا تعلق پاکستان یا انڈیا سے ہے۔ تقریباً ہر شخص کے ساتھ ایک عورت ضرور تھی۔ میں نے اس گوشے کی طرف دیکھا جہاں سے ایول نے نوکدار سلاخ کا ہتھیار حاصل کیا اور بالآخر اس ہتھیار کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ ایرینا میں خنکی تھی۔ ایئر کنڈیشننگ سسٹم کو تیز رکھا گیا تھا۔ اس لیے میں نے جسم گرم کرنے کے لیے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل اُچھلنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے اپنا دُکھتا پہلو چھوا ہلکی سی ٹیسیں اُٹھی جو قابلِ برداشت تھی۔





ابھی تک الیکٹرک نے چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ مقابلے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں سکون سے ایرینا کے وسط میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ فضا میں مدھم سی لیکن لہو گرمانے والی دھن بج رہی تھی۔ میری آمد پر جو شور اُٹھا تھا وہ اب تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔

تماشائیوں میں مجھے ڈیئر ڈان نظر آیا۔ اس کی نگاہوں میں ایک زہریلی نفرت تھی۔ وہ میری شکست اور موت کا منظر دیکھنے آیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ کل رات میرے ساتھ جو ہوا تھا وہ ڈیئر ڈان کے اشارے پر ہوا تھا یا وہ بھی اس کام میں ملوث تھا۔ میرے علم میں وہی ایک شخص تھا جو جان گرے کی ٹکر کا تھا اور دونوں کی آپس میں لگتی بھی تھی۔ ڈیئر ڈان نے ایک بار پہلے بھی مجھ سے جان گرے کی دلچسپی کے بارے میں اُگلوانے کی کوشش کی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ جان گرے مجھے بچانے کی کوشش کر رہا ہے جیسے مجھے شبہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر میری موت کا خواہاں ہے۔

انتظار سے تنگ آ کر میں نے بلند آواز اور اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''الیکٹرک کہاں ہے مجھے کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''الیکٹرک حاضر ہے۔'' عقب سے ایک سرد اور بھاری آواز آئی میں نے گھوم کر دیکھا الیکٹرک میرے عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ کب آیا مجھے قطعی پتا نہیں چلا تھا۔ اگر وہ میری بے خبری میں حملہ کر دیتا تو کوئی اسے ملامت نہ کرتا اس ایرینا میں اصول و اخلاق نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ یہاں وحشت اور درندگی آمیز عیاری کا کام تھا۔ الیکٹرک نے متاثر کیا تھا مجھے۔ میں نے خوشدلی سے کہا۔

''دوست بڑی دیر لگا دی۔ ہمارے ہاں ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے لیکن تمہیں میں مہربان نہیں کہہ سکتا۔''

اناؤنسر مقابلے کی شرائط بیان کر رہا تھا۔ بلکہ ایک ہی شرط بیان کر رہا تھا کہ دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتار دینے والا ہی فاتح ہو گا۔ الیکٹرک سرد نگاہوں سے لیکن بہ غور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے اس کے جذبات بھانپنا محال تھا۔ اس کے باوجود مجھے لگا جیسے وہ ستائش نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ حسبِ معمول وہ سیاہ رنگ کے ٹراؤزر اور سیاہ ہی پوری آستین کی بند گلے کی ٹی شرٹ میں تھا۔ پیروں میں جوتے اور ہاتھوں میں دستانے بھی تھے۔ اناؤنسمنٹ ختم ہوتے ہی گویا مقابلے کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تماشائی شور مچانے لگے تھے۔ یہاں پر شرطیں بھی لگتی تھیں۔ تقریباً ہر فرد نے شرط لگائی تھی اسی بناء پر تقریباً ہر فرد چیخ چیخ کر اپنے پسندیدہ لڑاکے کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ عربوں کے ایک گروپ کو میں نے اپنا نام پکارتے سنا۔ اگرچہ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ انہوں نے مجھ سے کسی ہمدردی کی بناء پر شرط لگائی تھی۔ ان میں اگر دینی محبت ہوتی تو وہ یہاں ہوتے ہی نہیں۔

زیادہ تر افراد الیکٹرک کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ان میں خاصا

مقبول تھا یقیناً اس سے پہلے بھی اس جگہ پر کئی مقابلے جیتے تھے۔ ایک مقابلہ تو میں نے بھی سکرین پر دیکھا تھا۔ جس میں الیکٹرک نے ایک گھونسے میں اپنے حریف کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے غور سے اس کے ہاتھ دیکھے۔ معمولی قدوقامت سے قطع نظر اس کے ہاتھوں کے پنجے بڑے تھے اور کلائیاں بھی بھاری تھیں۔ یہ اس کا خطرناک ہتھیار تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس کے مکوں سے خاص طور سے بچنا ہے۔ اناؤنسمنٹ ختم ہوتے ہی الیکٹرک نے میرے اردگرد تھرکنا شروع کر دیا اس کا انداز ڈانس کرنے والا تھا۔ اس کے پاؤں خاص طور سے بڑی تیزی سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا ہے کہ حریف کس طرف سے حملہ کرے گا۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا میں نے اس کے جسم کی طرف دیکھنا بند کر کے اپنی ساری توجہ اس کے چہرے اور خاص طور سے آنکھوں کی طرف مبذول کر لی۔ وہ مسکرایا اور یک دم اس نے میری طرف چھلانگ لگائی۔ دو قدم دوڑ کر وہ کسی پرندے کی طرح ہوا میں بلند ہوا اور اس نے لگاتار ککس میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ دیکھنے میں یہ وار بہ ظاہر شاندار اور خطرناک لگتا ہے لیکن اس کی افادیت حریف کو ذرا ڈرانے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ میں نے کلائیوں پر اس کے پیروں کے وار روکے اور وہ زمین پر اُتر گیا۔ میں دفاع کرتے ہوئے پسپا ہوتے ہوتے دیوار تک چلا گیا تھا۔

زمین پر اُترتے ہی اس نے اُچھل کر لات میرے سر پر مارنے کی کوشش کی پیچھے ہٹنے یا نیچے ہو کر اس کے وار سے بچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے یہ وار بھی کلائی پر روکنا پڑا۔ گھومتی ہوئی لات سے وار کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ مجھے شدید قسم کا جھٹکا لگا۔ میں لڑکھڑا کر بائیں طرف گیا۔ پہلو میں سوئے ہوئے درد نے انگڑائی لی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ اسے بجلی کیوں کہا جاتا تھا۔ فرش پر اُترتے ہوئے اس کا رُخ مخالف سمت میں ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر دولتی سی جھاڑی۔ ایک ایڑی عین درد کے مقام پر لگی اور درد کا عفریت دھاڑ کر مجھے اندر سے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ الیکٹرک نے چونک کر میری طرف دیکھا اس کا وار مؤثر تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میری چیخ نکل جاتی۔ میں نے پہلو سے ہاتھ ہٹا کر اپنا کمزور حصہ اس سے چھپانے کی کوشش کی مگر اس نے بھانپ لیا تھا وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

''دوست لگتا ہے تم پہلے بھی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور یک دم اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر نہایت صفائی سے بچا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اس کے شانے پر وار کیا وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گیا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ ''تم بھی لڑنے کا فن جانتے ہو دوست؟''

میں گہری سانس لے کر درد پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ الیکٹرک پھر پیروں کے بل تھرکنے لگا۔ بہ ظاہر میرے وار کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اگلا حملہ اس نے میرے کمزور پہلو پر ہی





کیا۔ میں اس کی توقع کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے مشین کی طرح برسنے والے گھونسوں سے کامیابی سے دفاع کیا اور اس اثناء میں وہ اصل وار کر گیا۔ اس کی سیدھی لات میرے بائیں گھٹنے پر لگی اور میں زمین بوس ہو گیا۔ درد نے ایک بار پھر قیامت بپا کر دی تھی۔ میں فرش پر قلابازیاں کھا کر الیکٹرک سے دور ہوا ورنہ اس کی لات پسلی پر لگتی تکلیف کی شدت سے میرے لیے سانس بھی لینا محال ہو رہا تھا۔ الیکٹرک نے ایک بار پھر دھوکا دیا۔ اس نے یہ وار بھی نمائشی کیا تھا اور جب میں سدھے ہوئے بندر کی طرح قلابازیاں کھا کر سیدھا ہوا تو اس نے نہایت پھرتی سے اس مقام پر دوبارہ وار کر دیا جوتے کی نوک میری پسلیوں پر لگی۔

ایسا لگا جیسے میرے اندر آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ میری آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ میں نے پہلو کو تھاما تو میرا ہاتھ نم اور گرم شے سے بھر گیا تھا۔ میرے پہلو سے خون بہہ نکلا تھا۔ درد نے ہاتھ پیروں کی جان نکال دی تھی۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں کے بل زمین سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تماشائیوں کے شور نے ایرینا سر پر اُٹھا لیا تھا۔ ان میں زیادہ لوگ میری موت کے خواہاں تھے۔ جان گرے اور چند لوگ جنھوں نے مجھ پر شرط لگائی تھی میری فتح چاہتے تھے لیکن کسی ہمدردی کی بناء پر نہیں بلکہ مالی مفاد کے لیے۔ بے اختیار مجھے کاجل یاد آئی۔ وہی اس دنیا میں ایک ہستی تھی جو مجھ سے محبت کرتی تھی اور میں اس سے محبت کرتا تھا۔ الیکٹرک کسی چیتے کی سی خاموشی اور سرد مزاجی سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا شکار زخمی ہو کر اس کے سامنے بے یارومددگار پڑا تھا اور وہ اس پر فیصلہ کن وار کرنے پر غور کر رہا تھا۔ مجمع اس سے چیخ چیخ کر میرے قتل کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے گویا فضا میں پرواز کی۔ اس کا دایاں پاؤں وار کا مہلک انداز بناتے ہوئے میری گردن کی طرف آ رہا تھا کوئی لمحہ جاتا تھا کہ یہ وار میری گردن پر لگتا اور یوسف علی خان کی کہانی ختم ہو جاتی۔

درد کے باوجود میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ بازی ابھی ختم نہیں ہوئی......

بے شک میں نازونعم سے پلا تھا، دنیا جہاں کی ہر آسائش میں نے دیکھی اور برتی تھی۔ اس کے باوجود بے شمار آزمائشوں اور سختیوں سے گزرا تھا۔ کبھی ان سے ہار نہیں مانی۔ کبھی آزمائشوں سے منہ نہیں موڑا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال کر خود کو موت کے حوالے کر دیتا۔ ایسا کرنا میری تربیت ہی نہیں فطرت کے بھی خلاف تھا۔ عجیب بات تھی کہ یہ خیال آتے ہی میرے درد میں جیسے کمی آنے لگی تھی اور ذہن پر طاری ہونے والی دھند چھٹ رہی تھی۔ الیکٹرک کے دائیں پاؤں کی ایڑی کا ہدف میری گردن تھی۔ اس کی ایڑی کے عقب میں اس کے جسم کی تمام تر طاقت تھی۔ اگر یہ وار کسی بھینسے کی گردن پر پڑتا تو اسے بھی توڑ کر رکھ دیتا۔ میری حیثیت ہی کیا تھی اس کے سامنے۔

میری پوری توجہ اس کی ایڑی کی طرف تھی۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آیا، میں اُٹھنے کے بجائے فرش پر گر گیا۔ پاؤں زن سے میرے پاس سے گزر کر فرش پر لگا۔ الیکٹرک کے دوسرے پاؤں کا گھٹنا

میری پشت پر لگا لیکن اس کی پوزیشن وار کرنے والی نہیں تھی۔ میں نے الیکٹرک کے فرش پر لگنے والے پاؤں کے گرد اپنا بازو حائل کیا اور اُلٹی سمت میں پلٹ گیا۔ وار خالی جانے کی حیرت نے الیکٹرک کو چند لمحے کے لیے سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اس لمحاتی غفلت سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کی پنڈلی کھڑے جسم کے بوجھ اور فرش کی سختی کے درمیان آ گئی اور جب اس پر میرے جسم کا بوجھ پڑا تو الیکٹرک اپنی پنڈلی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے تیزی سے فرش کی طرف گرا لیکن میرے گھومنے کی رفتار کہیں تیز تھی۔ فضا میں سوکھی لکڑی چٹخنے جیسی آواز آئی۔

الیکٹرک کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ اُلٹ کر فرش پر جا گرا۔ اپنا سر اس نے بہر حال بچا لیا تھا ورنہ یہ چوٹ اسے ہلاک نہ بھی کرتی تو ہوش و حواس سے بے گانہ ضرور کر دیتی۔ زمین پر گرتے ہی اس نے تڑپ کر بائیں لات چلائی جو میرے شانے پر لگی لیکن اس وار میں زیادہ دم نہیں تھا۔ اس کے اگلے وار سے پہلے ہی میں نے اس کی دائیں ٹانگ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ پہلی کروٹ سے اُلٹی سمت میں۔

الیکٹرک کے منہ سے اس بار پھر چیخ نکلی تھی۔ پنڈلی کی دونوں ہڈیاں واضح طور پر ٹوٹ گئی تھیں۔ یہ فیصلہ کن داؤ تھا۔ میں اسے چھوڑ کر دور ہو گیا۔ جب میں فرش سے اُٹھا تو الیکٹرک دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹوٹ جانے والی ہڈی پکڑے ہوئے تھا۔ چیخ نکلنے کا عمل بے اختیار تھا لیکن اب اس کے چہرے پر تکلیف کے معمولی سے آثار بھی نہیں تھے۔ میرے دائیں پہلو سے لہو بہہ رہا تھا۔ الیکٹرک کی کِک نے اندر سے گوشت پھاڑ دیا تھا۔ اس کی تکلیف تھی لیکن وہ جو مجھے اندر سے درد کاٹ رہا تھا خاصا کم ہو گیا تھا۔ میں نے ٹی شرٹ اُٹھا کر دیکھا، پھٹے ہوئے زخم سے خون کے ساتھ ایک پیلاہٹ مائل مادہ بھی بہہ رہا تھا۔ شاید یہی وہ زہر تھا جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ کِک لگنے سے گوشت پھٹا اور اس میں پھنسا ہوا زہریلا مواد خون کے ساتھ بہہ گیا۔ شرٹ نیچے کر کے میں نے الیکٹرک کی طرف دیکھا۔ وہ میرا حریف تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی محسن بھی تھا۔ بے شک اس نے انجانے میں میری مدد کی تھی اس کی وجہ سے مجھے درد سے نجات ملی تھی۔ وہ اپنا پیر تھامے فرش پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر حسبِ معمول ایک سپاٹ سا تاثر تھا البتہ آنکھیں جو مجھ پر مرکوز تھیں، سوال کر رہی تھیں کہ اب میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ صرف سوال تھا۔ اس نے رحم کی اپیل نہیں کی تھی، بے اختیار میرے اندر اس کے لیے احترام اُبھرا۔ میں مسکرایا۔

''دوست کیا تم اب بھی مجھ سے مقابلہ کرنے کے خواہشمند ہو۔''

اس نے اپنی ٹوٹی ہڈی کی طرف دیکھا۔ ''اس کے ساتھ میں کیسے لڑوں گا۔ تماشہ بن کر لڑنا مجھے گوارہ نہیں ہے، اگر تم نے مجھے مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو فوری طور پر اس پر عمل کرو۔''

مجمع جواب تک بازی پلٹنے پر دم بخود تھا، اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایک آواز ہو کر الیکٹرک کو قتل کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مجھ پر شرط لگانے والے جیتنے کی خوشی میں سرشار یہ مطالبہ





کر رہے تھے لیکن وہ لوگ جنہوں نے الیکٹرک کی فتح پر شرط لگائی تھی، اپنی ہار کو الیکٹرک کے خون سے رنگنا چاہتے تھے تاکہ ہار کی بے کیفی کچھ کم ہو۔ وہ لوگ مشتعل تھے۔ میں نے انسانی خون کے شائق ان انسان نما درندوں کو حقارت سے دیکھا۔ اس دوران میں اناؤنسر کاؤنٹ ڈاؤن کر رہا تھا۔ جب بارہ تک گننے کے باوجود الیکٹرک اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا تو مجھے اختیار دیا گیا کہ میں چاہوں تو اسے معاف کر دوں یا قتل کر دوں، ساتھ ہی رائے عامہ کے مطالبے کو پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے حقارت سے جواب دیا۔

''میں آب پاشی کرتا ہوں تمہارے اختیار پر اور اس رائے عامہ پر...... میں الیکٹرک کو معاف کرتا ہوں، بے شک یہ ایک بہادر دشمن ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔''

جو لوگ میری بات سن سکے اور انہوں نے اسے سمجھا ان کے چہروں کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ یہ بے لگام مغرور امیر زادے تھے۔ دولت ان کے گھر کی لونڈی تھی اور اس کی طاقت کے بل بوتے پر وہ خود کو خدا سمجھنے لگے تھے۔ ان فرعونوں کو آج تک کسی نے ایسا دندان شکن جواب نہیں دیا تھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور گارڈز جارحانہ انداز میں ایرینا میں داخل ہوئے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ مجھے دوبارہ ہتھکڑی پہنائی گئی۔ جب مجھے دروازے کے اندر لے جایا جا رہا تھا تو دوسرے دروازے سے اسٹریچر اُٹھائے پیرامیڈک ایرینا میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے دروازہ بند ہونے سے پہلے الیکٹرک کو دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ بھی پہلی بار مسکرایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔

اندر آتے ہی گارڈز کا سخت رویہ نرم ہو گیا تھا۔ ایرینا میں غالباً وہ تماشائیوں کو دکھانا چاہ رہے تھے کہ ان کی خواہش نہ ماننے والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے ڈریسنگ روم میں لایا گیا جہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس میرے منتظر تھے۔ ڈاکٹر بھی سری لنکن تھا لیکن نرس یورشین تھی، اس کی رگوں میں کسی سفید فام کے علاوہ مشرق بعید کی کسی نسل کا خون بھی شامل تھا۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی رہا ہے دنیا کی دلکش ترین عورتیں سفید فام اور مشرق بعید کے خون کے ملاپ سے وجود میں آتی ہیں۔ جب امریکی اور فرانسیسی مشرق بعید کے ملکوں میں برسرِ پیکار تھے تو ایک طرف تو ان کی سپاہ کیمونزم کا نعرہ لگا کر مقامی لڑکوں کا قتلِ عام کر رہی تھیں تو دوسری طرف فوج کے جوان مقامی عورتوں کو ناجائز بچوں کے تحفے دے رہے تھے۔ جنگ ویت نام کے فاتح اور تھائی لینڈ کی معیشت سدھرنے کے بعد اس خطے میں یورشین بچوں کی پیدائش میں خاصی کمی آئی ہے اور اینگلو انڈین کی طرح یہ نسل بھی رفتہ رفتہ ناپید ہو رہی ہے۔

نرس نے پہلے میری قمیص اُتاری، ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کیا اور کسی قدر فکر مند ہو کر سر ہلایا۔ پیلا مادہ اب بھی نکل رہا تھا۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹنے کو کہا پھر روئی سے زخم صاف کر کے اس کا معائنہ کیا۔ ''تم اتنے خوفناک زخم کے ساتھ لڑتے رہے۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ زخم تو ابھی لڑائی کے دوران لگا ہے۔"

"میں باہر کے نہیں اندر کے زخم کی بات کر رہا ہوں۔ اس میں زہریلا مواد بن رہا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تمہارا ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔" اس نے اپنے بیگ سے سرجری کے اوزار نکالے۔

نرس نے اپنے سبک ہاتھوں سے زخم کو مکمل طور پر صاف کیا۔ ڈاکٹر نے مجھے زخم سن کرنے والا انجکشن لگایا اور اپنے اوزار سنبھال کر زخم پر جھک گیا۔ بکر ماسنگھے بھی موجود تھا اور فی الوقت نرس میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا جو اس کی قربت سے بے نیاز پوری تندہی سے ڈاکٹر کی معاونت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مشکل سے نصف گھنٹے میں آپریشن کر کے اندر رہ جانے والا باقی زہریلا مواد بھی باہر نکال دیا اور زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ ساتھ ہی اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا اندر انفیکشن کے آثار نہیں ملے پھر یہ زہر پیدا کیسے ہوا؟"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ یہ زہر پیدا نہیں ہوا بلکہ بیرونی ذرائع سے زبردستی میرے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ سرجری کے بعد اس نے ٹانکے لگائے۔ مجھے دو عدد انجکشن مزید لگائے اور زخم کو چار دن پانی سے محفوظ رکھنے کو کہا۔ بکر ماسنگھے نے مجھے اورنج جوس دیا جو میں نے بلا خطر پی لیا۔ پھر رشین نرس نے مجھے لباس پہنانا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔

"شکریہ...... چھ سال کی عمر سے اپنا لباس میں خود تبدیل کر رہا ہوں۔"

میرا اپنا لباس خاصا میلا ہو چکا تھا اس لیے میں نے اس کے بجائے ڈریسنگ روم کی الماری سے ایک عدد ٹراؤزر اور ٹی شرٹ نکال کر پہنی۔ ڈریسنگ روم میں آتے ہی گارڈز نے میری ہتھکڑی اُتار دی تھی۔ آپریشن کے لیے لگائے جانے والے سن کر دینے والے انجکشن سے رہی سہی تکلیف بھی ختم ہو گئی تھی۔ درحقیقت آپریشن اور زخم کی تکلیف بھی اس درد کا پاسنگ نہیں تھی جو ان لوگوں کے لگائے انجکشن سے ہوئی تھی۔ ایسا کرتے وقت وہ بھول گئے تھے کہ فیصلہ کرنے والی ہستی کوئی اور ہے۔ وہ چاہے تو دشمن کی طرف سے کیا جانے والا وار بھی جان بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ الیکٹرک نے اپنے طور پر میرے کمزور پہلو پر وار کیا تھا اس کے جوتے کی سخت ایڑی نے اس جگہ سے گوشت پھاڑ دیا تھا اور اندر جمع ہونے والا زہریلا مواد خون کے ساتھ بہہ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لباس بدل کر میں نے بکر ماسنگھے کو آواز دی۔

"صاحب مجھ کو آپ کے جیتنے کی بے حد خوشی ہوئی ہے۔" اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے بتایا۔ "آپ کہیں تو میں آپ کی مالش کر دوں۔"

"تمہارا شکریہ بکر ما۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمہاری یہ خدمت فراموش نہیں کروں گا۔"

اس نے سرد آہ بھری۔ "صاحب اپنی زندگی میں بس یہی ایک خوشی رہ گئی ہے۔ آپ جیسے





لوگوں کی خدمت کر کے اور باتیں کر کے دل بہلا لیتے ہیں۔"

میں نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں ڈیڑھ سو ڈالرز پڑے تھے۔ بحری جہاز پر ہمیں ڈالرز کی صورت میں تنخواہ ملتی تھی۔ میں نے یہ ساری رقم بکر ماسنگھے کی طرف بڑھا دی۔ "یہ رکھ لو یار۔"

"نہیں صاحب...... میں نے اس لیے آپ کی خدمت نہیں کی۔"

"میں جانتا ہوں دوست...... پر میں بھی معاوضہ نہیں دے رہا۔ میں خوش ہوں اور اپنی خوشی میں تمہیں بھی شریک کر رہا ہوں۔ کاش میرے پاس اس سے زیادہ ہوتے، دیکھو انکار مت کرنا۔"

اس نے بڑی عقیدت سے یہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ "صاحب اس سے پہلے صاحب لوگوں نے سیکڑوں بار بخشش تو دی پر کسی نے محبت سے کچھ نہیں دیا۔"

"ان لوگوں کے پاس محبت اور انسانیت ہی تو نہیں ہے۔"

گارڈز نے اندر جھانکا۔ "تم نے اب چلنا ہے ہمارے ساتھ۔"

"چلو...... میں تیار ہوں۔"

لفٹ سے اوپر آئے تو نائٹ کلب کے ہنگاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ دو بجے تھے اور یہ رونقوں کے عروج کا وقت ہوتا ہے۔ ایک گوشے میں چند لڑکیاں اسٹریپ ٹیز کر رہی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ شو صرف گھٹیا طرز کے نائٹ کلبس میں ہوتا تھا، لیکن جب اس نے بے پناہ بزنس شروع کیا، اچھے معیار کے نائٹ کلبس نے بھی اسٹریپ ٹیز شوز شروع کر دیئے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر نائٹ کلب میں اس قسم کے شوز ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کلب جو اپنے باوقار ماحول کے لیے مشہور تھے، انہوں نے بھی کمانے کے لیے عریاں شوز شروع کر دیئے ہیں۔

باہر کھلی فضا میں آ کر میں نے ذرا سکون محسوس کیا۔ اندر اگرچہ تازہ ہوا کی فراہمی کا مکمل انتظام تھا لیکن پھر بھی مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس جزیرے پر دن میں کسی قدر گرمی ہوتی تھی لیکن یہ چبھنے والی...... گرمی نہیں تھی۔ یعنی یہ جزیرہ خطِ استوا سے فاصلے پر تھا۔ رات کو موسم بے حد خوشگوار ہو جاتا تھا۔ گارڈز نے مجھے عقبی حصے میں بٹھایا مگر اس بار میرے ہاتھ جیپ کے اینگل سے نہیں باندھے تھے۔ جیپ فراٹے بھرتی روانہ ہو گئی تھی لیکن خلافِ توقع اس کا رُخ سیل فور کی طرف نہیں تھا۔

"یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔" میں نے کسی قدر فکر مند ہو کر سوچا۔ پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جیپ اس راستے کی طرف جا رہی تھی جو بندرگاہ کی طرف نکلتا تھا۔ اب سڑک کے دونوں جانب جنگل تھا۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان نیم تاریکی میں صرف جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی جس طرح میرے ذہن میں دور دور تک کسی واقعے کا امکان نہیں تھا، اسی طرح دونوں نگرانوں کو بھی نہیں تھا لیکن ہونے والا واقعہ ہو کر رہتا ہے چاہے انسان اس پر سوچے یا نہ سوچے۔ اچانک جیپ لہرائی، ہلکے سے دھماکے نے بتایا کہ اس کا کوئی پہیہ پنکچر ہو گیا ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نگران نے کمال مہارت سے بریک لگا کر جیپ کو قابو کیا ورنہ وہ جس طرح بے قابو ہوئی

تھی، جھاڑیوں میں بھی گھس سکتی تھی۔ جیپ روک کر اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ ”لعنت ہو۔“

”اب پنکچر بھی لگانا پڑے گا۔“ میرے ساتھ بیٹھے نگران نے سرد آہ بھری۔

اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نگران کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ غیر فطری انداز میں ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی کو اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ نیچے اُتر کر جھک کر پنکچر ہو جانے والے ٹائر کو دیکھ رہا تھا پھر اسے سیدھا ہونا نصیب نہیں ہوا۔ وہ جھکے جھکے ہی نیچے لڑھک گیا اور فوراً ہی ساکت ہو گیا۔ میرے تجربے نے بتایا کہ وہ کسی فائر کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ اول تو گولی جب جسم میں اُترتی ہے تو اس کی آواز آتی ہے اور بے شک گولی براہِ راست دماغ میں بھی اُتر جائے تو انسانی جسم نزع کے عالم میں پھڑکتا ہے جبکہ وہ دونوں اچانک ساکت ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ کوئی بے ہوش کرنے والا بلٹ تھا جو ان دونوں کے جسموں میں اُتار دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کھلی جیپ میں چھپنے کی گنجائش نہیں تھی، دوسرے نگران کے گرنے کے بعد ایک ایسی آواز آئی کہ میں زخم کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا کر جیپ سے اُترا اور آواز کی سمت بھاگا۔ ایک ہیولہ جھاڑیوں سے برآمد ہوا تھا کہ میں اس سے لپٹ گیا۔ یہ عبید صلاح تھا، اس نے ہلکے سے میرا نام پکارا تھا۔ وہ بھی گرم جوشی سے مجھ سے پٹ گیا تھا۔ اس نے روایتی عربی انداز میں میرے رُخساروں پر بوسے دیئے۔ ”کہاں تھا میرے یار......“

”احتیاط سے...... تیرا زخم نہ گڑبڑ کر جائے۔“ اس نے مجھے روکا۔

”تمہیں پتا ہے؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”یہ مقابلہ جزیرے کے ٹی وی نیٹ ورک پر دکھایا گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے بھی دیکھا تھا۔“

”تم کہاں غائب تھے؟“

اس نے میرا سوال نظر انداز کر دیا۔ ”زیادہ وقت نہیں دوست...... مجھے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔ اول یہ کہ جان گرے پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا۔ وہ حرام زادہ تمہیں اپنے کسی مفاد میں استعمال کرے گا اور پھر مروا دے گا۔“

”اس پر تو میں کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ فی الوقت مجبور ہوں۔“

”دوسرے اس کے ساتھ رہ کر...... یہ دیکھنا کہ وہ تم سے چاہتا کیا ہے۔ اس کا مقصد ہمارے علم میں آ جائے تو اگلی کارروائی ہمارے لیے آسان رہے گی۔“

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس جزیرے پر اتنا بے بس اور لاچار بھی نہیں تھا۔ اس کے حامی اور مددگار موجود تھے۔ ”عبید تم کیا چکر چلا رہے ہو۔ کیا تمہارے مددگار موجود ہیں۔“

وہ مسکرایا تو نیم تاریکی میں بھی اس کے دانت صاف نظر آئے تھے۔ وہ جواب دینے کے




بجائے حرکت میں آیا۔ اس نے بے ہوش ہونے والے نگرانوں کو جیپ کے عقبی حصے میں منتقل کیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ میں اس کے برابر میں آ گیا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”میں انہیں سڑک سے ہٹا رہا ہوں، اس جگہ اکثر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔“ اس نے جیپ سٹارٹ کی۔

کچھ دور جا کر اس نے جیپ کچے میں اُتار دی۔ ”تمہیں پتہ ہے یہ لوگ پاگل کتوں کی طرح تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور تم اس طرح کھلے عام گھوم رہے ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”مرد گھروں میں نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر مجھے جان اتنی ہی پیاری ہوتی تو ان لوگوں سے کیوں ٹکراتا اور تم فکر نہ کرو پچھلے دس بارہ دن میں مجھے ان لوگوں کی خاصی خامیاں پتہ چلی ہیں۔ ان لوگوں کا حفاظتی سسٹم اتنا سپر نہیں ہے جتنا یہ ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھ لو میں نہ صرف ان سے محفوظ ہوں بلکہ میں نے اپنے حامی بھی تلاش کر لیے ہیں جو ان لوگوں کی تباہی میں میرا ساتھ دیں گے۔“

”کیا اس جزیرے پر ان کی تباہی اتنی ہی آسان ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”پتہ ہے میں نے جزیرے کا پاور ہاؤس تلاش کر لیا ہے اور اب مجھے وہاں تک رسائی کا راستہ تلاش کرنا ہے جس دن میں نے یہ کام کر لیا اس دن جزیرہ تباہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے یہاں پر ایٹمی بجلی گھر بنا رکھا ہے۔“

”یہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ اتنے دور دراز علاقے میں روایتی بجلی گھر بنانا مشکل بھی ہوتا اور مہنگا بھی...... ایٹمی بجلی گھر چھوٹا اور سستا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بار بار ایندھن لانے کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔“

”یہی ایٹمی بجلی گھر ان کی تباہی کا باعث بنے گا۔“ عبید صلاح نے پُریقین لہجے میں کہا۔

”کیا جان گرے مجھے کسی مالی مفاد کے سلسلے میں استعمال کرنا چاہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے، ان کا دین ایمان ہی پیسہ ہے۔“

”اس صورت میں مجھے واپس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس ہی نہ ٹھہر جاؤں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی تو وہ میری تلاش میں اتنے سرگرم نہیں ہیں لیکن تم غائب ہو گئے تو تلاش زور و شور سے شروع ہو جائے گی۔ اس سے میری سرگرمیوں میں خلل پڑے گا اور دوسرے ہمیں بھی مالی وسائل کی تلاش ہے، ان لوگوں کے خلاف جنگ کے لیے بہت بڑی مقدار میں زر درکار ہے اس کے لیے ہمارا جان گرے کا ساتھ دینا ضروری ہے اور تم فکر مت کرو، تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جائے گا۔ ہمارا کوئی نہ کوئی ساتھی تمہارے ساتھ موجود رہے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے میری جنگ بھی سمجھو، جان گرے صرف تمہارا ہی نہیں میرا اور پوری انسانیت کا مجرم ہے اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ عبید صلاح خوش ہو گیا۔ ”دوست اب وقت نہیں ہے، میں تمہیں

ان دونوں اور جیپ کے ساتھ پھر اسی جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔“

جیپ پنکچر پہیے کے باوجود آرام سے چل رہی تھی۔ ”تم نے یہاں پر کیلیں بچھائی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں...... مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اب تمہیں جان گرے کے پاس لے جائیں گے اس لیے میرے ساتھی پہلے ہی اس جگہ پر گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ جان گرے ان دنوں بندرگاہ کے معاملات کی نگرانی کر رہا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ عبید صلاح کسی وجہ سے اپنے مددگاروں کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہا ہے حالانکہ وہ یہاں آس پاس تھے۔ ڈارٹ گن عبید صلاح کے پاس نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ یہ گن کسی اور کے پاس تھی۔ عبید کے پاس ایک اعشاریہ بیالیس کا بریٹا تھا جو اس کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے محسوس تو ہوئی لیکن میں نے عبید سے شکوہ نہیں کیا اس کے پاس اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ تھی۔ پھر اس نے وجہ بتا بھی دی۔ اس نے جیپ مطلوبہ مقام پر روکی اور اُترتے ہوئے بولا۔

”معاف کرنا دوست...... میں فی الوقت تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اس لیے نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ اگر جان گرے نے تم سے اُگلوانے کے لیے کوئی حربہ استعمال کیا بھی تو تم اسے کچھ نہ بتا سکو۔ ان مردودوں کے پاس جدید قسم کے سائنٹیفک طریقے اور دوائیں ہیں جن کی مدد سے یہ آدمی سے اپنے مطلب کی بات اُگلوا لیتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میرے اندر سے خلش نکل گئی تھی۔ عبید صلاح گھوم کر میری طرف آیا۔ سینے سے لگا۔ ”اللہ حافظ دوست...... وہ تمہیں اپنی امان میں رکھے...... معاف کرنا۔“ اس کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی مجھے گردن میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا اور لمحوں میں میرا ذہن سن ہو گیا تھا۔







میرا ذہن سن ہو گیا تھا۔ ماریہ گرتے ہوئے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے جسم نے چٹان کے ایک نکلے ہوئے حصے سے رگڑ کھائی اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی مجھے ہوش آیا۔ ”حسن علی...... وہ گر گئی ہے۔ اس نے اپنی رسی نکال دی تھی۔“

ماریہ کا بوجھ کم ہونے کے بعد میرے لیے دوسرا ہاتھ چھجے کے کنارے پر جمانا آسان ہو گیا تھا۔ چند لمحے میں مَیں اوپر تھا۔ اسی لمحے حسن علی آ گیا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا اور میں بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھا۔ حسن علی نے رسی نکالی اور اسے نیچے کی طرف اُچھال دیا۔ ”ہمیں جلدی نیچے جانا ہے۔“

”اب کیا فائدہ......“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ دُکھ کی شدت سے میرا سینہ جل رہا تھا۔ اس محبت کرنے والی نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ حسن علی نے ایک اُبھرے پتھر سے رسی باندھی اور اسے اپنی کمر میں بندھے بیلٹ کلپ سے منسلک کر لیا۔

”پہلے میں نیچے جاتا ہوں۔ جب آواز دوں تو تم بھی آ جانا۔“ وہ کہتے کہتے چھجے سے تقریباً کود گیا تھا۔ وہ اتنی تیزی سے نیچے گیا تھا کہ دو منٹ بعد ہی اس کی آواز آئی۔ ”یوسف آ جاؤ۔“

اس بار میں نے رسی اپنی بیلٹ کلپ سے گزاری اور اسے تھامتے ہوئے نیچے کود گیا۔ ہوا میں تقریباً تیرتے ہوئے پیر پتھروں اور چٹانوں سے ٹکاتا میں بھی چند منٹ میں نیچے پہنچ گیا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے حسن علی کو آواز دی۔ ”آپ کہاں ہیں......“

”یہاں بائیں طرف جھاڑی کے تلے...... ماریہ ادھر ہی گری ہے۔ یہ ابھی زندہ ہے۔“

ماریہ کے زندہ ہونے کی خبر نے میرے اندر جیسے بجلی بھر دی تھی۔ میں چھلانگیں لگاتا لمحوں میں جھاڑی کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ حسن علی ماریہ کو کسی قدر ہموار جگہ پر سیدھا لٹا رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھی، چہرہ خون آلود تھا اور ہولے ہولے ڈوبتا اُبھرتا سینہ اس کی زندگی کی خبر دے رہا تھا۔ حسن علی نے اس کی نبض چیک کی۔ ”حالت اچھی نہیں ہے اسے جلد از جلد کسی ہسپتال تک پہنچانا لازمی ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بیک بون کو نقصان ہوا ہے۔“

اس کا باقی جسم بہ ظاہر صحیح سالم نظر آ رہا تھا ورنہ اتنی بلندی سے گرنے والے کی تو ہڈیاں بھی چور چور ہو جاتی ہیں۔ حسن علی نے بتایا۔ ''دراصل یہ اس جھاڑی پر ہی گری تھی اسی وجہ سے فوری مرنے سے بچ گئی۔''

''اس کے بارے میں اتنی بے دردی سے بات نہ کریں، خدا اسے زندگی دے۔''

''اس کے لیے پہلے اسے جیپ تک لے جانا ہوگا۔''

حسن علی کا ذہن زیادہ بہتر طریقے سے کام کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مجھے جا کر جیپ سے ایمرجنسی بیگ لانے کو کہا۔ میں ممکنہ تیزی سے بھاگا۔ اس بیگ میں میڈیکل کٹ بھی تھی۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے یہ ناہموار راستہ اور ندی عبور کی۔ جیپ کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ ایمرجنسی بیگ خاصا بڑا تھا، اسے پشت پر لادا اور تیزی سے واپس آیا۔ محض دس منٹ میں واپس حسن علی اور ماریہ کے پاس تھا۔ حسن علی نے ایمرجنسی بیگ کھولا، سب سے پہلے ایک سخت کالر نکال کر ماریہ کی گردن پر پہنایا تاکہ اس کی گردن کو مزید نقصان نہ ہو۔ ایسا ہی ایک بیک سپورٹر اس کی کمر پر باندھا۔ المونیم کی راڈ جوڑ کر اس پر کینوس چڑھا کر اسٹریچر بنایا اور ماریہ کو اس پر منتقل کر کے اسے بیلٹوں سے باندھ دیا۔ یہ سب اس نے اتنی تیزی اور مہارت سے کیا جیسے عمر بھر یہی کام کرتا رہا ہو۔

''اب اسے اُٹھا کر چلو۔'' اس نے کہا۔

وقت نہیں تھا کہ سامان سمیٹا جاتا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر ہم نے ماریہ کا سٹیچر اُٹھایا۔ جیپ تک جانے کے لیے ندی عبور کرنا مشکل تھا لیکن ہم نے یہ کام بھی کر لیا۔ میں اور حسن علی ایک ایسے مقام سے ندی پار کر آئے جہاں پانی ہماری رانوں تک آ رہا تھا۔ اس تیز رفتار اور یخ بستہ پانی میں توازن ہی قائم رکھنا دشوار تھا اوپر سے وزنی اسٹریچر بھی۔ ماریہ کی جان بچانے کے جنون میں یہ مشکل کام بھی کر گزرے تھے۔ حسن علی نے عقبی نشست بھی نکال پھینکی اس طرح ماریہ اسٹریچر سمیت جیپ کے عقبی حصے میں آ گئی تھی۔ حسن علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں ماریہ کے پاس بیٹھ گیا۔ جب تک جیپ سڑک تک نہیں آئی، جھٹکے لگتے رہے۔ میں ماریہ کو ان جھٹکوں سے بچاتا رہا تھا۔

جیسے ہی جیپ ہموار سڑک پر آئی، میں نے ماریہ کا چہرہ اپنے رومال سے صاف کیا۔ اس کے ماتھے پر بھوؤں کے اوپر کٹ لگا تھا۔ ران اور بازوؤں پر بھی زخم آئے تھے لیکن یہ سب معمولی نوعیت کے تھے۔ اصل چوٹ اسے کمر کے وسط میں ریڑھ کی ہڈی پر آئی تھی۔ یہ چوٹ اسے نیچے گرتے ہوئے اُبھری ہوئی چٹان سے ٹکرانے سے آئی تھی یا جھاڑی پر گرنے سے آئی تھی۔ وہ تقریباً ستر فٹ کی اونچائی سے گری تھی۔ اگر وہ پختہ زمین پر گری ہوتی تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معجزانہ طور پر وہ اس وسیع ڈھلان پر اُگی واحد جھاڑی پر جا گری تھی۔ یہ کسی نرم پودے کی پھیل جانے والی جھاڑی تھی جس کے پتے بڑے اور شاخیں نرم تھیں۔ انہوں نے ماریہ کے تیزی سے گرتے جسم کو نرمی سے سنبھال لیا تھا۔ میں بار بار اس کی نبض دیکھ رہا تھا جو بدستور بے ترتیب تھی۔ اس کا چہرہ





اندرونی تکلیف سے سفید ہو رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کا پاگل پن اور اس کے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے گرنے سے پہلے کہے تھے۔

حسن علی نے اس روز خوفناک حد تک تیز ڈرائیونگ کی تھی۔ جیپ مستقل چالیس، پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جبکہ آتے ہوئے ہم اس سے آدھی رفتار سے آئے تھے۔ تنگ سڑک اور پُر پیچ موڑوں پر یہ رفتار حد سے زیادہ تھی۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق جیپ کو کسی کھائی میں بھی پہنچا سکتا تھا۔ ماریہ کو صحیح معنوں میں طبی امداد ایبٹ آباد کے کسی ہسپتال میں مل سکتی تھی اور ایبٹ آباد کم سے کم ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں پُرتشویش انداز میں ماریہ کو دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ دو تین سال سے جو حالات چل رہے تھے، ان میں زندگی موت کی کشمکش دیکھنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اور میں صرف پندرہ سال کی عمر میں ان معاملات میں خاصا پختہ ہو چکا تھا۔ ماریہ کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اور بس......لیکن اس وقت جب وقت اس کے لیے پر لگا کر اُڑ رہا تھا زندگی اور موت کی حدِ فاصل میں اس کا فاصلہ موت سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں شدت سے خواہش تھی کہ وہ زندہ رہے اس وقت مجھے لگ رہا تھا اگر وہ مر گئی، میرا ساتھ چھوڑ گئی تو میری زندگی میں ایک خلا آ جائے گا۔

حسن علی کے بارے میں مجھے کم سے کم یہی معلوم تھا کہ وہ بھی میری طرح اس علاقے میں پہلی بار آیا ہے لیکن علاقے کی جغرافیائی پوزیشن اور راستوں کے بارے میں وہ مکمل معلومات رکھتا تھا۔ (یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے سکول چھوڑنے کے بعد حسن علی گھر نہیں جاتا تھا بلکہ کار لے کر ان علاقوں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چند ہفتوں میں اس سارے علاقے اور ایبٹ آباد کے شہر سے مکمل واقفیت حاصل کر لی تھی) اس نے صرف چالیس منٹ میں جیپ ایبٹ آباد کے ایک ہسپتال کے سامنے لے جا کر روکی۔ ویسے تو ایبٹ آباد ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن ایک گرمائی تفریحی مقام اور آس پاس بے شمار ہل اسٹیشن ہونے کی وجہ سے یہاں پر زندگی کی ہر سہولت دستیاب ہے۔ یہ ہسپتال نجی تھا لیکن ایمرجنسی کے لیے تمام سہولیات سے مزین تھا۔ چند لمحے کے اندر ماریہ کو اسٹریچر پر ڈال کر آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔ میں اس کے اسٹریچر کے ساتھ چل رہا تھا لیکن آئی سی یو میں داخلے سے پہلے ہی نرس نے مجھے روک دیا۔

''آپ اندر نہیں جا سکتے۔ ویٹنگ روم میں انتظار کرو۔''

حسن علی غائب تھا۔ غالباً وہ ہسپتال کے کسی اہم ڈاکٹر سے بات کرنے گیا تھا۔ میں ویٹنگ روم میں آ گیا۔ حادثے کے بعد جب تک میں حرکت میں رہا اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن ویٹنگ روم کی پُرسکون فضا میں آتے ہی اعصاب پر بوجھ سا پڑنے لگا۔ کئی طرح کے سوال بھی سامنے آئے۔ اول یہ کہ ہم ماریہ کے گھر والوں اور پھر جمشید پیلس میں اس کی یہاں موجودگی کی کیا وجہ بتائیں گے۔ خاص طور سے کاجل کو مطمئن کرنا میرے لیے مسئلہ بن جائے گا۔ ماریہ کے گھر والوں کا سامنا اور ان کے

سوالوں کے جوابات مزید اعصاب شکن مرحلہ ہوگا۔ ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ ماریہ کو اس حادثے میں کوئی نقصان نہ ہو، اس کی زندگی بچ جائے اور وہ معذوری سے بھی بچ جائے۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کو نقصان ہو تو انسان کا نچلا حصہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ یعنی جس جگہ پر چوٹ لگی ہو اس سے نچلا حصہ ماریہ زندگی اور جوش سے بھرپور لڑکی تھی، کسی قسم کی معذوری اسے مار ڈالتی اس سے جینے کی اُمنگ چھین لیتی۔

پندرہ منٹ بعد حسن علی آ گیا۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔ ''آپ کسی ڈاکٹر سے ملے، وہ ماریہ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ وہ بچ تو جائے گی نا...... اسے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟''

حسن علی مسکرایا۔ ''ایزی بوائے...... میں ڈاکٹر کے پاس نہیں بلکہ فون کرنے گیا تھا۔ میں نے ماہ پارہ، ماریہ کے گھر اور اس کے باپ کے دفتر فون کر کے حادثے کی اطلاع دے دی ہے۔''

''آپ نے جمشید پیلس تو فون نہیں کیا؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

اس بار وہ ہلکے سے ہنسا۔ ''میں احمق نہیں ہوں برخوردار...... اول تو وہاں فون کرنے کا جواز ہی نہیں تھا۔ جمشید علی ملک سے باہر ہے۔ ماریہ ہمارا اور اپنے ماں باپ کا مسئلہ ہے۔ ویسے اس نے جس طرح یہاں آنے تک سروائیو کیا ہے اس سے مجھے قوی امید ہے وہ بچ جائے گی ورنہ حادثے کے بعد جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے چند لمحوں کی مہمان لگی تھی بہرحال وہ مضبوط اعصاب اور حوصلے والی لڑکی ہے۔''

میں نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ حسن علی، ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن اس کی رائے اہم تھی۔ اس کو دنیا کے تجربات نے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ویٹنگ روم میں وقت گزاری کے لیے رسائل اور اخبارات رکھے تھے۔ میں دل میں اس بات پر مسکرایا تھا جن کے پیارے زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا ہوں بھلا وہ آئی سی یو کے اس ویٹنگ روم میں رسائل اور اخبارات سے دل بہلا سکتے تھے مگر انسانی فطرت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جو گمبھیر ترین حالات میں بھی پڑھ سکتے ہوں گے ایسے ہی لوگوں کے لیے ہسپتال والوں نے یہ رسائل و اخبارات رکھے تھے۔

حسن علی نے وقت پاس کرنے کے لیے بہتر حل نکالا۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں باہر کافی پینے جا رہا ہوں تم چائے یا کافی لینا پسند کرو گے؟''

''کافی کریم کے ساتھ۔'' میں نے سر ہلایا۔ حسن علی چلا گیا۔ ویٹنگ روم کے ایک طرف شیشے کی بند کھڑکیاں تھیں ان کے پار ہسپتال میں داخلے کا دروازہ اور سامنے دور تک پھیلا سرسبز منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کھڑکی بنائی ہی اس مقصد کے لیے گئی تھی کہ یہاں بیٹھنے والے اس منظر سے دل بہلا سکتیں۔ حسن علی چند منٹ میں لوٹ آیا تھا۔ اس نے کافی کا ڈسپوزیبل کپ میری طرف بڑھایا۔ اس پر کریم کی موٹی تہہ تھی۔ کافی بھی اچھی تھی۔ اس اضطراب کے عالم میں اس نے بڑا سہارا دیا تھا۔ ابھی میں نے کافی کا کپ ختم کیا ہی تھا کہ ایک ڈاکٹر اپنے دستانے اُتارتا ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔





اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات دیکھ کر میرا دل ڈوبنے سا لگا تھا۔ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

''مریضہ کے ساتھ آپ دونوں آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آئی مین مس ماریہ کے ساتھ۔''

''ڈاکٹر ہم ہی اسے لائے ہیں۔ اس کی کنڈیشن اب کیسی ہے؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''کنڈیشن سیریس ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کے لیے سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے کہ اسے ابتدائی طبی امداد دے دیں۔ اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرتھوپیڈک سرجن کی ضرورت ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے تین مہرے بُری طرح شکستہ ہو چکے ہیں۔ اگر اس کا بروقت آپریشن نہ ہو سکا تو اس کی معذوری کا امکان بھی ہے۔ ہم نے ایمبولینس کا بندوبست کر دیا ہے جو اسے اسلام آباد لے جائے گی۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' حسن علی نے ممنونیت سے کہا۔ ''آپ کے چارجز؟''

''وہ آپ جانے سے پہلے کاؤنٹر پر ادا کر کے سلپ لے لیں۔ شکریہ اینڈ وش آف گڈ لک فار دس بیوٹی گرل۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد حسن علی چونکا۔ ''اوہ...... ماریہ کے گھر والے یہاں کے لیے چل پڑے ہوں گے انہیں روکنا ضروری ہے۔''

ہم ہسپتال کے کاؤنٹر تک گئے۔ حسن علی نے پہلے فون کر کے ماریہ کے گھر اطلاع دی کہ اسے ایمبولینس سے لے کر اسلام آباد آ رہے ہیں مگر اس کے بھائی اور باپ وہاں سے چل پڑے تھے۔ حسن علی نے ہسپتال کے چارجز ادا کیے اس میں ایمبولینس کے ذریعے ماریہ کو اسلام آباد تک لے جانے کا معاوضہ بھی شامل تھا۔ اس دوران میں ماریہ کو ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈرپ کی بوتل اور آکسیجن بھی منسلک تھی تاکہ راستے میں اس کی حالت زیادہ بگڑنے نہ پائے۔

''میں بھی چلوں گا۔'' میں نے حسن علی سے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''تم ایمبولینس میں جاؤ...... میں پیچھے آتا ہوں۔ راستے میں ماریہ کے باپ یا بھائی آتے دکھائی دیئے تو انہیں روک لوں گا۔''

''مناسب رہے گا۔'' میں نے سر ہلایا،

میں ایمبولینس میں بیٹھ گیا اور وہ فوری طور پر روانہ ہو گئی۔ عقب میں حسن علی جیپ میں آ رہا تھا۔ میں ماریہ کے ساتھ عقبی حصے میں تھا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ ویران اور بے جان سا لگ رہا تھا۔ مجھے پچھتاوا ہوا، کاش میں اس لڑکی سے نہ ملا ہوتا اور نہ یہ اس حال کو پہنچتی مگر اس سے ملنا تو تقدیر تھی۔ اب تک میں ماریہ کی دلچسپی اور محبت کو ایسا سمجھتا آ رہا تھا جیسے سرما کے آغاز سے ہی اہل کراچی نزلے زکام میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور مشکلات کا ایک ڈوز لے کر ان کی اس محبت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے اینٹی

بایوٹک کا زور نزلے زکام کو بھگا دیتا ہے۔

مگر آزمائش کے ان لمحات میں جب ہم دونوں کی جان خطرے میں تھی، ماریہ نے بلا جھجک مجھے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا عزم کر لیا اور یہ ممکن تھا اگر وہ اپنا وزن کم نہ کرتی تو میرے لیے بیک وقت دونوں کا بوجھ سنبھالنا ممکن نہ رہتا۔ میں جسمانی طور پر کتنا ہی مضبوط سہی لیکن دو افراد کا بوجھ محض ایک ہاتھ کے سہارے لامحدود مدت تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایثار پرست ماریہ نے مجھے محفوظ رکھنے کے لیے یقینی موت قبول کر لی تھی۔ یہ تو خدا کی حفاظت تھی جو وہ جھاڑی پر گری اور مرنے سے بچ گئی۔ آرتھو پیڈک سرجن سے رجوع کرنے کا مشورہ سن کر مجھے اپنا خدشہ درست لگنے لگا تھا۔ اس کی اسپائنل کورڈ کو نقصان ہو سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ ساری عمر کے لیے بستر پر لیٹ سکتی تھی۔

ایمبولینس نے دو گھنٹے میں ہمیں اسلام آباد کے ایک جدید ہسپتال پہنچا دیا جہاں نیورولوجی کا شعبہ تھا۔ ماریہ کو فوری طور پر اندر لے جایا گیا۔ میں ایمبولینس کے پاس ہی کھڑا تھا کہ پہلے حسن علی کی جیپ آئی، اس کے عقب میں ماریہ کا باپ اور اس کا چھوٹا بھائی ایک سی کار میں تھے۔ ماریہ کے باپ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ کار سے اُتر کر ماریہ کے اسٹریچر کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ جبکہ حسن علی میرے پاس آ گیا۔ ماریہ کا بھائی شاہینہ نظامی اس کے پیچھے تھا۔ اسے شامی کے نک نیم سے بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا لیکن قد و قامت کے باعث کم ہی لگتا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک قسم کی گمبھیرتا تھی۔

"یوسف...... یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے روکھے لہجے میں پوچھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔ بہن کے ساتھ پیش آنے والے اس سانحے کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا۔ اگرچہ مجھے اس سے ہمدردی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کے لہجے پر غصہ آ گیا۔

"یہ تمہیں حسن بتائیں گے۔" میں نے اس کے سے لہجے میں کہا اور جا کر نزدیک ہی گراسی لان کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام کے اوقات میں وہاں اِکا دُکا افراد تھے جو شاید مریض ہی تھے اور شام کی تازہ ہوا میں لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے بستروں سے نکل آئے تھے۔ یہ جگہ آرتھو پیڈک ڈیپارٹمنٹ کے سامنے تھی۔ حسن علی اسے بتا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ برہم بلکہ مشتعل نظر آنے لگا ہے۔ اس نے کئی بار میری طرف آنے کی کوشش کی مگر ہر بار حسن علی نے اسے روک لیا۔ بالآخر وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ حسن علی میری طرف آیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"یہ دونوں باپ بیٹے سمجھ رہے ہیں جیسے ہم نے ماریہ کو وہاں بلا کر پہاڑ سے دھکا دے دیا تھا۔"

"فی الوقت وہ صدمے میں ہیں۔ ماریہ ہوش میں آ کر انہیں خود سب بتا دے گی۔" میں نے کہا۔

حسن علی کچھ سوچ رہا تھا۔ "دیکھو یوسف...... بعض اوقات ایسا ہوتا ہے جو ہم نے سوچا نہیں





ہوتا یا ہم نہیں چاہتے۔ خدانخواستہ اگر ماریہ نہ بچ سکی تو ہم ان باپ بیٹے کے سامنے کیا وضاحت پیش کریں گے۔ ممکن ہے وہ پولیس میں چلے جائیں اور ہمارے خلاف ایف آئی آر درج کروا دیں۔ محمود نظامی نے اشاروں میں کہا تھا اگر ماریہ ہوش میں نہ آئی یا اس نے ہمارے بیان کی تصدیق نہ کی تو ہمیں بُرے نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"جب ہم نے کچھ کیا نہیں ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"بات ڈرنے کی نہیں بلکہ پریشانی میں پڑنے کی ہے۔ میں اطمینان سے تمہاری تربیت کرنا چاہتا ہوں، تمہیں اپنا تعلیمی کیریئر آگے بڑھانا ہے۔ کسی قسم کے تنازع میں پڑنے سے اس میں رخنہ تو آئے گا۔"

میں نے بے بسی سے جواب دیا۔ "تب آپ بتائیں میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اس مسئلے کو دعوت نہیں دی ہے۔"

"میں جانتا ہوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔" حسن علی نے گویا مجھے تسلی دی۔ "میں تمہیں صرف حالات اور امکانات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ ہمیں ہر مشکل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"ایسا کریں آپ کسی طریقے سے پاپا کو انفارم کریں۔ وہ خود ہی اس مسئلے کو دیکھ لیں گے۔"

"گڈ...... یہ اچھا مشورہ ہے لیکن تمہارے پاپا اس وقت کہیں سی میں ہیں، ان کے دفتر سے ٹیلکس تو کیا جا سکتا ہے لیکن فون کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"چلیں اتنا ہی ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "چلیں جی مصیبت آ رہی ہے۔"

محمود نظامی ایمرجنسی ڈور سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات خاصے گمبھیر تھے۔ حسن علی نے فوراً اس سے پوچھا۔ "ماریہ کی حالت اب کیسی ہے؟"

"اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹرز نے کہا ہے وہ بچ جائے گی لیکن اس بات کا امکان ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو جائیں۔"

"خدا نہ کرے۔" میرے منہ سے نکلا تھا۔

محمود نظامی نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "مجھے بے وقوف مت بناؤ، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ وہ احمق لڑکی شروع سے تمہارے پیچھے پاگل ہو رہی تھی۔ تم نے اسے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں اگر اسے کچھ ہوا۔"

"محترم...... اس وقت آپ جذباتی اور صدمے میں ہیں، بعد میں آپ اس معاملے پر غور کریں گے تو مجھے بے قصور پائیں گے۔ میں نے کبھی ماریہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔"

"بکومت...... تم اس کے پیچھے پڑے تھے۔ ہائے میری معصوم بچی۔"

میں نے ایک بار پھر خود کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے گہری سانس لی۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ ان کی

معصوم بچی ایک ایسے یوتھ کلب میں جاتی تھی جہاں اعلیٰ سوسائٹی کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مادر پدر اور اخلاق سے آزاد سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ محمود نظامی کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر دوبارہ اندر کی طرف چلا گیا۔ حسن علی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ دونوں اندر غائب ہو گئے۔ میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے ماریہ کی فکر تھی اس کے بارے میں جاننے کے لیے ابھی میں اندر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں سے ایک نرس گزری۔ اس کا رُخ بھی اسی وارڈ کی طرف تھا۔

"ایکسکیوزمی..... پلیز۔"

نرس رُک گئی۔ "جی فرمائیے۔" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اندر ایک لڑکی آئی ہے مس ماریہ نظامی مجھے اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"اینی پرابلم۔" اس نے پوچھا۔

"اسے حادثے کی وجہ سے بیک بون انجری ہوئی ہے۔ اس کی کنڈیشن خاصی سیریس تھی جب ہم اسے یہاں لائے۔"

نرس نے پھر پوچھا۔ "یہ بات تو آپ خود جا کر معلوم کر سکتے ہیں۔"

"نہیں کر سکتا۔" میں نے ممکنہ حد تک منہ لٹکایا۔ "اندر مس ماریہ کے خونخوار والد بزرگوار ہیں۔"

نرس ہنس پڑی۔ "اچھا یہ بات ہے۔ آپ بس منٹ ویٹ کریں میں معلوم کر کے خود بتاتی ہوں یا کسی سے کہلوا دوں گی۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"یوسف علی خاں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں انفارم کرتی ہوں۔"

"میں پیشگی شکر گزار ہوں۔"

"آپ یہیں رہیے گا۔" وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں وہیں گراسی لان پر ٹہل کر انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ بعد ایک کم عمر لڑکا آیا۔ "تم یوسف علی خان ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے سر ہلایا تو اس نے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ "ہم عاشق علی خان ہے۔ ہم کو مس روبینہ نے بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے جا کر یوسف علی خان کو بتاؤ کہ لڑکی کی حالت بہتر ہے، شاید اسے ہوش آ جائے۔ رات کو اس کا آپریشن ہوگا۔"

"شکریہ بھائی عاشق۔" میں نے کہا۔ "اپنی مس روبینہ کا بھی شکریہ ادا کر دینا۔"

وہ شکریہ پر اتنا خوش نہیں ہوا جتنا اپنی مس روبینہ کہنے پر ہوا تھا۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود عاشق مزاج لگتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے چن کر نام رکھا تھا۔ حسن علی نہیں آیا تھا، اس لیے میں وقت گزاری کے لیے وہیں گھاس پر دراز ہو گیا تھا۔ شام ہونے کو تھی اور میں نے صبح ناشتے کے بعد




سے کچھ نہیں کھایا تھا بھاگ دوڑ میں احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ذرا سکون ملا تھا تو بھوک پیٹ کے اندر شور مچانے لگی تھی۔ میں حسن علی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آ جائے تو ہم کھانے کے لیے نکلیں مگر وہ تھا کہ جیسے اندر ہی رہ گیا تھا۔ مغرب تک میری بھوک کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اپنی جیب میں رکھی نوٹ بک کا ایک صفحہ پھاڑ کر اس پر لکھا۔

"کھانا کھانے جا رہا ہوں۔"

اور یہ کاغذ ونڈ شیلڈ وائپر تلے ٹکا دیا۔ ہسپتال اسلام آباد کی روایات کے مطابق ویران سی جگہ پر تھا۔ خاصی دور جا کر مجھے ایک پان کا کیبن نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یار یہاں کھانے پینے والی کوئی جگہ ہے۔"

"اس سڑک پر آگے چلے جاؤ...... ایک جھگی ہوٹل ہے وہاں پر کھانا اچھا ملتا ہے۔" پان والے نے پھرتی سے پان پر کتھے چونے کا لیپ کرتے ہوئے بتایا۔ اس نے میرے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ میں کھاتا پیتا بندہ ہوں اس لیے آگے مشورہ بھی دیا۔ "صاحب آپ ٹیکسی رکشہ پکڑ کر کسی اچھے ریستوران میں کیوں نہیں چلے جاتے۔"

میں نے مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور جھگی ہوٹل میں ہی کھانے کا فیصلہ کیا۔ دور جانے کا مطلب تھا کہ وقت زیادہ لگتا اور اگر تاخیر ہو جاتی تو حسن علی کا مزاج بھی برہم ہو سکتا تھا اس لیے میں جھگی ہوٹل تک ہی گیا۔ شام کا وقت تھا، پکے کھانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ اس میں سب سے نمایاں تنور سے نکلنے والی گرما گرم روٹیوں کی خوشبو تھی۔ میں نے فرائی دال اور روٹی کا آرڈر دیا۔ باہر کا گوشت کھانے کا میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ حسن علی نے مجھ پر بڑا گوشت کھانے کی پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ مجھے صرف بھیڑ یا دیسی مرغ کا گوشت کھانے دیتا تھا۔ دال فرائی بھی مزے کی تھی۔ گرم روٹیوں کے ساتھ ایسا مزہ آیا کہ میں کھاتا چلا گیا۔

اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں چونکا، اردگرد نظر دوڑائی۔ دائیں طرف موجود میز پر ایک شخص چائے پی رہا تھا مگر چائے پینے کے بجائے مجھے گھور رہا تھا جیسے ہی میں نے اسے دیکھا اس نے جلدی سے نظریں پھیر لیں۔ اس کا انداز مشکوک تھا۔ جب تک میں اس کی طرف دیکھتا رہا وہ اپنی چائے کی طرف متوجہ رہا لیکن صاف لگ رہا تھا اس کی دلچسپی مصنوعی نوعیت کی تھی۔ وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کھانا تقریباً کھا چکا تھا۔ پہلے میرا ارادہ چائے پینے کا بھی تھا لیکن اس شخص کو دیکھ کر مجھے بے چینی سی ہو رہی تھی اس لیے میں نے فوری طور پر واپس ہسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ میں پہلے ہی ایک چکر میں تھا، میں نے بل ادا کیا اور واپس ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک جس پر میں جا رہا تھا، اس کے دائیں بائیں جنگل تھا، سلیقے سے اُگائے درخت تھے۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی سے سڑک پر پڑی سوئی بھی نظر آ سکتی تھی۔ جب کوئی میرے تعاقب میں نہیں آیا تو میں نے خاصا سکون محسوس کیا تھا جب میں بل دے کر پلٹا تھا تو چائے پینے والا غائب تھا۔ وہ مجھے

باہر بھی نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا وہم تھا وہ شخص کسی خاص وجہ سے میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اب مجھے حسن علی کی فکر ستا رہی تھی۔ ہسپتال سے غائب ہو کر میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے وہ واپس جانے کے لیے میرا انتظار کر رہا ہو۔

اسی سوچ نے مجھے اپنے اردگرد سے غافل کر دیا تھا اس لیے مجھے اس گاڑی کی آمد کا اس وقت پتہ چلا جب وہ سر پر آ چکی تھی۔ اس کے بریک چرچرائے اور پھر تین افراد اس میں سے اُتر کر میری طرف لپکے۔ دو کے پاس ہاتھوں میں ذرا چھوٹے ڈنڈے تھے جن پر ربر جیسی کوئی شے چڑھی تھی، تیسرے کے پاس ریوالور تھا اس نے مجھے للکارا۔ ''اوئے کھڑا ہو جا...... ہلنا مت...... ورنہ گولی تیری...... میں اتار دوں گا۔''

اس کی دھمکی میں قابلِ غور ناقابلِ اشاعت جگہ نہیں بلکہ اپنی جگہ سے نہ ہلنے کی ہدایت تھی۔ اس کا مقصد تھا اس کے دونوں ساتھی اپنے ڈنڈے سکون سے میرے سر پر آزمائیں لیکن ظاہر ہے میں اس کی ہدایت پر عمل کر کے اپنا سر تڑوانے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس کی ناقابلِ ذکر جگہ گولی مارنے کی دھمکی نظر انداز کر کے میں نے جھکا دیا۔ ایک حملہ آور کا ڈنڈا شائیں کی آواز کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے گزرا۔ اس بدبخت نے اتنی زور سے ہاتھ گھمایا تھا جیسے آن جہانی کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہو۔ دوسرے نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر میرے جھکے ہوئے سر پر ڈنڈا آزمانا چاہا اس دوران میں پہلے والے کو لات رسید کر کے دور پھینک چکا تھا۔ ڈنڈے سے بچنے کے لیے میں دوڑا اور مارنے والے کے پیٹ میں گھس گیا۔ اس نے بہرحال ڈنڈا چلا دیا جو وہیں لگا جہاں ریوالور والا گولی مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ وار تقریباً بے اثر تھا اس لیے مجھ سے زیادہ شور اس نے مچایا۔ میرے سر کی ٹکر نے اس کے پیٹ میں ہل چل مچا دی تھی مگر اس نے ڈنڈا نہیں چھوڑا جیسے ہی میں پیچھے ہٹا اس نے مشتعل ہو کر ہاتھ گھمایا۔ بچتے ہوئے بھی ڈنڈا بائیں بازو پر لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے بازو ناکارہ ہو گیا ہو۔ اسی اثناء میں لات کھانے والا بپھرے ہوئے بیل کی طرح پھنکاریں مارتا آیا۔ اس کا وار میرے دائیں پہلو پر لگا تھا۔ درد سے تڑپ کر میں نے دوبارہ لات چلائی اور اسے دور پھینک دیا۔ پھر جھکائی دے کر وار ناکارہ کیا اور اس کے پیٹ میں اس بار مکا مار کر اسے بھی ناکارہ کر دیا۔ لات کھانے والا زمین پر یوں تڑپ رہا تھا جیسے نزع کے عالم میں ہو۔ پیٹ میں مکا کھانے والا بھی ہمت ہار بیٹھا تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ٹکا ہانپ رہا تھا۔ غالباً یہ پیٹ بھر کر کھانے کا اثر تھا۔ میرے ذہن پر چھائے خمار کی وجہ سے میں تیسرے فرد یعنی ریوالور والے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر چپکے سے میرے سر پر وار کیا۔ اندھیر دنیا یک دم رنگ و نور سے بھر گئی تھی میری آنکھوں تلے رنگ برنگ ستارے سے پھٹے۔ میں نے ریوالور والے کی آواز سنی۔ ''حرامی کہیں کا......'' اس کے ساتھ دوسرا زیادہ سخت وار میری گدی پر پڑا اور مجھے بس اتنا یاد رہا کہ میں منہ کے بل زمین پر گر رہا تھا۔





میں بالکل نہیں جان سکا تھا کہ یہ لوگ کون تھے اور مجھے اس طرح اغوا کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ وہ چاہتے تو گاڑی سے اُترے بغیر مجھے گولی مار سکتے تھے اس طرح حملہ کر کے مجھے قابو کرنے کا مقصد اغوا کر کے لے جانا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے مار کھانا بھی گوارا کیا۔ بے شک اسلام آباد ذرا ویران سا شہر ہے لیکن یہاں پر پولیس کا نظام خاصا اچھا ہے۔ دن دیہاڑے اغوا یا ڈکیتی کی وارداتیں شاذ ہی ہوتی ہیں، صرف ارشد بلا گروپ کے لوگ میرے لیے اتنے بے تاب ہو سکتے تھے کہ سرِ شام ایک روشن شاہراہ سے مجھے اغوا کر کے لے جانے کی کوشش کریں۔ واللہ عالم بالصواب۔ وہ جو کوئی بھی تھے میری لمحاتی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

ہوش میں آنے پر مجھے اپنا سر شانوں پر بھاری پتھر جیسا لگ رہا تھا۔ ظالم نے بڑی بے دردی سے سر پر وار کیا تھا۔ میں کسی سخت جگہ پڑا تھا۔ اپنی پشت تلے مجھے نمی اور سردی محسوس ہو رہی تھی۔ خاصی دیر بعد جا کر میرے اندر اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ آنکھ کھول کر دیکھ سکوں۔ میں نے پہلے ہلکی سی آنکھ کھولی، میں کسی ویران نظر آنے والے کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ بائیں طرف سے روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس طرف دیوار پر پیلے رنگ کا بلب روشن تھا۔ کمرے کی دوسری شے میں خود تھا جو ننگے فرش پر پڑا تھا۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں، گویا کوئی تہہ خانہ تھا۔

کسی کو وہاں نہ پا کر میں نے اُٹھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اپنا سر ٹٹولا، بے دردی سے کیے جانے والے واروں نے کھال کو پھاڑ دیا تھا اور خون بالوں میں جم چکا تھا۔ اُٹھتے ہی مجھے شدت کا چکر آیا۔ میں کھسک کر دیوار تک گیا اور اس سے ٹیک لگا کر گہری سانسیں لینے لگا۔ چند منٹ بعد میری حالت بہتر ہوئی تو میں نے اُٹھ کو سب سے پہلے اس تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہ دس، بیس فٹ کا تہہ خانہ تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جہاں سیڑھیاں ختم ہو رہی تھیں وہاں لوہے کا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا اور دروازہ بند تھا۔ زمین سے کوئی دس فٹ کی اونچائی پر سیڑھیوں سے مخالف سمت والی دیوار پر روشندان تھا۔ اس سے آتی تاریکی کی جھلک بتا رہی تھی کہ باہر رات ہے یا یہ روشندان کسی اور بند جگہ پر کھلتا تھا جہاں باہر کی روشنی نہیں آتی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی، گھڑی کیا میرے پاس سے سوائے ایک پتلون اور قمیص کے سب لے لیا گیا تھا۔ میرا پرس اور جوتے تک غائب تھے۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

''نہایت چھچھورے قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوں، شکر ہے کپڑے نہیں اُتارے۔''

میرے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تہہ خانہ خاصی گہرائی میں تھا اس لیے اس کی زمین اور دیواروں سے سیل آ رہی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے ہوش آتے ہی نمی اور سردی کا احساس ہوا تھا۔ میری پتلون اور قمیص کا جو حصہ زمین سے لگا تھا وہ نم ہو رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر ذرا اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے حسن علی کا خیال آ رہا تھا جب اس نے واپس آ کر جیپ پر لگا رقعہ دیکھا ہو گا تو جھنجھلا گیا ہو گا اور پھر جب میں واپس نہیں پہنچا ہوں گا تو اس کی جھنجھلاہٹ تشویش میں بدل جائے گی اور اب تک

اس نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ ماہ پارہ کو اطلاع کی ہوگی تو ان کا رو رو کر بُرا حال ہوگا۔ درمیان میں مَیں نے ایک بار اُٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ دروازہ باہر سے بند تو تھا ہی، خاصا مضبوط تھا اور خالی ہاتھ سے اسے کوئی رستم زماں ہی توڑ سکتا تھا۔ میں صبر کر کے واپس بیٹھ گیا۔

گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ نصف رات کے بعد کا وقت تھا۔ گویا میں چار سے پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ مئی کے مہینے میں اسلام آباد میں خاصی گرمی ہوتی ہے۔ تہہ خانے میں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اوپر سیڑھیوں پر گرمی محسوس ہوئی تو میں دوبارہ فرش کے پاس آ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں فرش پر اُتر کر ٹہلنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے کون تھے اور ان کے ذہن میں کیا تھا۔ میرے بارے میں وہ کیا فیصلہ کرتے۔ انتظار کی کیفیت اتنی ظالم ہوتی ہے کہ اگر موت کی ہو تو انسان اس کے بھی جلد آنے کی دعا کرتا ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ میرے نصیب میں جو ہے وہ جلد از جلد سامنے آ جائے لیکن نہ تو موت اور نہ ہی نصیب میں لکھا انسان کی مرضی سے جلدی یا دیر سے آتا ہے۔

تنگ آ کر میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ حسن علی نے ایک بار مجھے یہ بھی سمجھایا تھا کہ اگر کسی چکر میں پھنس جاؤ اور کچھ کرنے کے لیے نہ ہو تو آدمی کو سو جانا چاہیے۔ میں فرش کی نمی اور ٹھنڈک کی پروا کیے بغیر لیٹ گیا بلکہ اب تہہ خانے میں جو گرمی اور گھٹن سی ہو رہی تھی اس میں فرش کی نمی اور ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی۔ سر میں ہونے والا درد کم کرنے کے لیے میں نے یوگا کی ایک مشق کی۔ اس سے ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر میں سوتا رہا پھر خطرے کے احساس نے مجھے چونکایا۔ میں نے تڑپ کر کروٹ لی۔ اس کروٹ نے مجھے اس ٹھوکر سے بچایا جو میرے منہ پر پڑنے والی تھی۔ ایک بھاری بھرکم پشاوری چپل میرے چہرے کے پاس سے گزری۔ دوسری ٹھوکر پڑنے سے پہلے میں لڑھک کر اس شخص سے دور چلا گیا۔

"خبیث کا بچہ۔" ناکام رہنے والے نے مجھے گالی دی۔

میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں دو افراد کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک تو وہی پٹھان تھا جس نے مجھے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی تھی، اس کا سرخ چہرہ اپنی ناکامی پر مزید سرخ ہو گیا تھا۔ وہ غرا کر میری طرف لپک رہا تھا کہ اس کے پنجابی نظر آنے والے ساتھی نے روک لیا۔ "آرام سے خان...... یہ بڑی کتی شے ہے۔"

خان نے ناقابلِ اشاعت زبان میں بتایا کہ اس نے کس طرح بڑی کتی اشیاء کو کس طریقے سے درست کیا ہے۔ میں نے سکون سے کہا۔

"غالباً ان اشیاء میں تمہارا خاندان بھی شامل ہوگا۔ تمہیں دیکھ کر اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

میرے جملوں نے خان کو بالکل بے قابو کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے روکنے کے باوجود





اَرنے بھینسے کی طرح ڈکراتا میری طرف لپکا۔ میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور جیسے ہی وہ نزدیک آیا میں یک دم ترچھا ہو کر فرش پر گرا۔ اپنے دونوں پاؤں ذرا پھیلائے اور جیسے ہی اس کی ایک ٹانگ میری دونوں پنڈلیوں کے درمیان میں آئی میں نے اسے گرفت میں لے کر آگے کی طرف رول کیا۔ وہ پہلے ہی خاصی تیزی سے آ رہا تھا۔ اوپر سے میں نے اس کی رفتار کو مہمیز دی اور وہ خاصی طاقت سے منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جس منہ سے چند لمحے پہلے تک مغلظات برآمد ہو رہی تھیں اب اس سے خون کی پچکاریوں کے ساتھ کئی عدد دانت بھی نکلے تھے۔ ان سب کے علاوہ کچھ ہائے وائے بھی برآمد ہو رہی تھی۔

"بس اب کوئی حرکت نہ کرنا۔" دوسرے نے پستول نکال لیا۔ میں رُک گیا۔ پٹھان ایک بار پھر گالیاں دیتا میری طرف آنے لگا۔

"اسے روکو۔" میں نے پستول والے کو خبردار کیا۔ "ورنہ منہ کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹیں گی۔"

"خان تمہیں کیا کہا تھا۔" اس کا ساتھی غرایا۔ "اب خاموش رہو یا باہر چلے جاؤ۔"

پستول والے کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ نہ تو ان لوگوں میں سے تھا جو مجھے اغوا کرنے آئے تھے اور نہ ہی میں نے اسے پہلے کہیں اور دیکھا تھا۔ "تم کون ہو اور مجھے اس طرح اغوا کر کے حبس بے جا رکھنے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ دُبلا لیکن طویل قامت شخص تھا۔ سر کے بال سامنے سے اُڑے ہوئے تھے اور عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ بہ ظاہر کوئی خاص بات نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے اس تنومند پٹھان اور اغوا کرنے والوں سے زیادہ خطرناک لگا تھا۔ اس کی ٹھہری ہوئی سرد آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ کوئی عام آدمی ان آنکھوں ہی کو دیکھ کر ڈر جاتا۔ وہ مسکرایا۔ "برخوردار...... اتنی جلدی مناسب نہیں ہے سوالات کے لیے...... ابھی تمہیں کچھ عرصہ ہمارے پاس رہنا ہے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ اس زمانے میں یہ چیز نئی نئی آئی تھی اور خاصی مہنگی ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے صحافی حضرات اسے انٹرویو لینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اب تو خیر جدید ترین ڈیجیٹل وائس ریکارڈر آ گئے ہیں جو گھنٹوں بلا رُکے ریکارڈنگ کر سکتے ہیں جبکہ یہ ٹیپ ریکارڈر ایک گھنٹے سے زیادہ دورانیے کی ریکارڈنگ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اسے دیکھا اور خوشدلی سے بولا۔

"اس کے بجائے تم کوئی بڑا ٹیپ ریکارڈر لے آتے تو اچھا ہوتا۔"

اس نے میری بات سنی ہی نہیں اور ریکارڈر میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "ابھی میں اسے آن کروں گا اور تم اس میں ایک پیغام ریکارڈ کرو گے۔ خان اسے پیغام دو۔"

پٹھان نے نفرت بھرے انداز میں ایک پرچہ میری طرف پھینکا۔ میں نے اُٹھا کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "پاپا...... میں ان لوگوں کے پاس خیریت سے ہوں اور اس وقت تک خیریت سے رہوں

گا جب تک آپ ان کا مطالبہ نہیں مان لیتے۔"

میں نے پرچہ پستول والے کی طرف پھینک دیا۔ "اول تو میں اس قسم کا کوئی پیغام ریکارڈ کراؤں گا ہی نہیں اور کرا بھی دیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پاپا میرے حقیقی باپ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے مجھے پالا ہے۔ میں انہیں جانتا ہوں اگر تم ان کی سگی اولاد کو بھی لے آتے تو ان سے اپنا کوئی مطالبہ نہیں منوا سکتے تھے۔"

"فکر مت کرو۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جتنا تم سے کہا جا رہا ہے اتنا کرو۔"

"اور اگر میں نہ کروں تو؟"

وہ مسکرایا۔ "تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت بھی ریکارڈ چل رہا ہے۔ تمہاری ساری گفتگو ٹیپ ہو چکی ہے۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے نہایت چالاکی سے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ مجھے غافل سمجھ کر خان نے اچانک مجھ پر حملہ کیا۔ غالباً اپنی جھینپ مٹانا چاہتا تھا اس نے اچانک میری کنپٹی پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے آسانی سے اس کا وار خالی گیا اور پھر میرا مکا اس کی ناک پر پڑا۔ یوں اس کے ناک نقشے میں جو کمی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ اس کی ناک سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بیل کی طرح ڈکرایا۔

"احمق۔" پستول والے نے اسے ڈانٹا۔ "کہا تھا اس سے دور رہنا۔"

خان نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میں تمہیں چھوڑے گا نہیں۔"

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے جا کر اپنی مرہم پٹی کراؤ۔ زیادہ خون بہہ گیا تو بعض اوقات جانبر ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے پستول والے سے پوچھا۔ "تمہارا مجھے روکنے کا لمبا چوڑا پروگرام ہے..... کیا میں اس تہہ خانے میں اس طرح رہ سکوں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس کل تک کی پریشانی برداشت کر لو۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہاں رکھا ہے جلد تمہیں ایک بہتر جگہ منتقل کر دیا جائے گا لیکن کوئی حرکت نہ کرنا..... بس کسی وجہ سے تمہیں مستقل اسی جگہ رہنا پڑے گا۔"

"ایک مسئلہ اور ہے۔ یعنی کھانے کے بعد اخراج کا..... کھانے کو تو کچھ نہ کچھ دو گے ہی لیکن اس کے اخراج کا کیا ہوگا۔"

وہ مسکرایا۔ "صبح تک صبر کر سکتے ہو تو کر لو..... ورنہ یہیں کوئی گوشہ استعمال کر لینا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "چلو کھانا اور اخراج کا مسئلہ تو صبح ہوگا لیکن پانی تو دے سکتے ہو۔ میں نے خاصی دیر سے پانی نہیں پیا ہے۔"

"پانی مل جائے گا۔" وہ اُلٹے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ریکارڈر اس نے پہلے ہی جیب





میں رکھ لیا تھا۔ میں اس سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن وہ میری طرف سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ نصف سیڑھیاں چڑھ کر وہ مڑا اور تیزی سے کھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور پانی کی ایک بوتل اور بسکٹ کا ایک ڈبا اندر آیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میں نے اوپر جا کر بوتل اور ڈبہ اُٹھا لیا۔ مجھے اس وقت کسی قسم کی حاجت محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے پانی اور بسکٹ احتیاط سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اخراج کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اگرچہ مجبوری تھی اس کے باوجود اس بند تہہ خانے میں کچھ کرنے کے خیال سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

میں نے تھوڑا سا پانی پیا اور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس دفعہ فوری طور پر نیند نہیں آئی۔ مختلف سوچیں دشمن لشکر کی طرح یکے بعد حملہ آور ہوتی رہیں۔ اپنا بچپن اور موجودہ حالات مجھے رہ رہ کر سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ میری زندگی ایک نارمل لڑکے کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ نہ میں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا اور نہ ہی اپنے خاندان سے واقف تھا۔ ہوش سنبھال کر خود کو جمشید پیلس میں پایا۔ مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ میں وہاں صرف پرورش پا رہا ہوں۔ میرا جمشید علی خان سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بارہ سال کی عمر سے مجھ پر پُراسرار حملے ہونے لگے۔ مجھے اغوا کرنے اور مارنے کی کوششیں کی گئیں۔ میرا ایک محافظ ان کوششوں کی نذر ہو گیا۔ پھر حسن علی آیا اور اس نے نہ صرف اب تک مجھے دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا بلکہ ان سے بچنے کی تربیت بھی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود معمول سے ہٹ کر واقعات میرا تعاقب کر رہے تھے۔

نہ جانے کب نیند آ گئی لیکن یہ کچی اور چونکتی ہوئی نیند تھی۔ صبح جیسے ہی تہہ خانے کا فولادی گیٹ کھلنے کی آواز آئی میں اُٹھ بیٹھا۔ اس وقت شدت کی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ساری رات کچی نیند اور پھر نم فرش پر لیٹنے کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اندر آنے والا میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ صورت سے بدمعاش کے بجائے کسی قدر مظلوم لگ رہا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اس سے ایک کپ بھاپ اُڑاتا صاف نظر آ رہا تھا۔ چائے کے ساتھ ایک عدد بن تھا۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ وہ بے دھڑک میرے پاس چلا آیا۔ غالباً وہ کوئی غیر اہم شخص تھا۔ اگر میں اسے قابو کر بھی لیتا تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یعنی میرے بھاگ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔

"صاحب ناشتہ کر لو پھر اوپر چل کر لیٹرین سے فارغ ہو جانا۔"

میں لیٹرین جانے کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا مگر پہلے بھوک کا مداوا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ بن اور بسکٹ کا ڈبا میری خوراک کے لحاظ سے ناکافی تھے پھر بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس قید کے عالم میں اتنا ہی مل گیا ہے۔ کھا کر اور چائے پی کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "چلو اوپر۔"

"آؤ صاحب۔" اس نے بلا تکلف آمادگی ظاہر کی۔ میرا خیال تھا کہ اوپر کوئی ہتھیار بدست موجود ہوگا۔ مگر تہہ خانے کے اس دروازے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ دروازہ ایک گیلری کے آخری

سرے پر کھل رہا تھا اور اس جگہ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہ کوئی زیرِ تعمیر مکان ہے۔ دیواروں پر پلستر تک نہیں تھا۔ جہاں تہہ خانے کا دروازہ تھا، اس کے ساتھ ہی گیلری کے سرے پر باہر جانے والے راستے پر اسی طرح کا فولادی دروازہ تھا۔ گیلری کے دائیں بائیں جو بغیر چوکھٹوں کے خلا تھے، یہ کمرے تھے جو ابھی پلستر کے محتاج تھے البتہ کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ گویا میرے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اس گیلری کے آخری سرے پر نامکمل واش تھا جہاں صرف پانی اور نکاسی کے سوراخ کے علاوہ کوئی سہولت نہیں تھی۔ میں نے ان ہی دستیاب سہولتوں سے استفادہ کیا۔ واش روم کا دروازہ تک نہیں تھا۔ وہ بے چارہ ایک طرف آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ باہر آ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''پتا نہیں صاحب۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم خود ادھر قید ہے۔''

''یعنی اگر میں تمہیں یرغمال بنالوں......''

وہ مسکرایا۔ ''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، بے شک تم مجھے مار دو۔''

''تم یہاں کیوں قید ہے؟''

''پتہ نہیں صاحب...... ہم تو مزدور ہے، یہ کام کے لیے لایا اور ادھر قید کر دیا۔ چار دن ہوئے اب ہم ان کا خدمت کرتا ہے، چائے بناتا ہے، برتن دھوتا ہے۔''

''کیا یہ جگہ تعمیر شدہ ہے؟'' میں نے تعجب سے اِردگرد دیکھا۔

''بس یہ حصہ ایسے ہی ہے، باقی تو بڑا اچھا کوٹھی ہے۔''

''یہاں کتنے افراد ہیں؟''

''چار آدمی ہیں، اس کے علاوہ دو کتے ہیں جو باہر پہرے دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے دھمکی دیا ہے اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کیا تو یہ ہم کو کتوں کے آگے ڈال دے گا۔''

''کیا فرار کے امکانات بھی نہیں ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوٹھی کے چاروں طرف دس فٹ اونچا دیوار ہے اور دروازہ یہ بٹن دبا کر کھولتا بند کرتا ہے۔''

''اگر میں تہہ خانے میں نہ جاؤں؟''

''تو یہ لوگ باہر سے دروازہ نہیں کھولے گا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''ہم بھی آپ کے ساتھ ادھر ہی بند رہے گا۔''

مجھے ان لوگوں کی حکمتِ عملی کی داد دینا پڑی۔ انہوں نے میرے فرار کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں واپس تہہ خانے میں چلا گیا۔ میں ان کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اب تک انہوں نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی لیکن مجھے اس کی بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ ان لوگوں کا





یہ رویہ ازراہِ انسانیت ہے بلکہ وہ فی الوقت مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانے پر مجبور تھے۔ جمشید علی تک میری آواز کا ریکارڈ پہنچانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان سے کوئی بات منوانا چاہتے تھے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جبکہ میں صحیح سلامت ان کی قید میں موجود رہوں۔ وہ مجھے اپنا مقصد حاصل ہونے تک کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

ان لوگوں کا جمشید علی سے کیا مطالبہ ہو سکتا تھا؟ میں نے سوچا۔ کیا پیسے کا مطالبہ...... وہ لوگ میرا تاوان طلب کرتے، مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہاتھی سے گنا طلب کرے۔ جب وہ جمشید علی کے بارے میں جانتا تھا تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ جمشید علی کس قسم کا شخص تھا۔ وہ اس دریا کا مگرمچھ تھا جس کے وہ پچھوے تھے لیکن نہ جانے کیوں یہ بات میرے دل کو نہیں لگی۔ اگرچہ ان کے بارے میں واضح نہیں تھا پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق ارشد بلا کے گروپ سے ہے ورنہ اس شہر میں میرا اور کوئی دشمن نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اندھا دھند نہیں اُٹھایا تھا بلکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ ارشد بلا کا بھائی مرشد بھی ہمارے پیچھے ایبٹ آباد تک آیا تھا۔ گویا وہ لوگ میرے پیچھے تھے۔ میں اس بارے میں محتاط ہی رہتا لیکن ماریہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے اور پھر اس کے باپ بھائی کے رویے نے مجھے ذہنی طور پر اتنا پریشان کیا تھا کہ میں اس نقطے کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس شہر میں میرے خون کے کچھ پیاسے موجود ہیں۔ ارشد بلا گروپ معمولی جرائم پیشہ افراد پر مشتمل نہیں تھا بلکہ یہ اونچے درجے کے بدمعاش تھے جن کے سرپرست اعلیٰ ایوانوں میں بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام آباد کی مستعد پولیس بھی ان پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ جمشید علی سے ٹکر لے سکتے تھے۔ ان کی پہنچ بہت اونچی سطح تک تھی۔ حد یہ تھی وہ جب چاہتے صدر مملکت تک سے مل سکتے تھے۔ سیکرٹری کی سطح کے لوگ ان سے وقت لے کر ملنے آتے تھے۔ جمشید پیلس میں مختلف تقریبات میں سندھ اور ملک بھر کے سیاستدان شریک ہونا اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران جمشید علی سے ایسے ملتے تھے جیسے ان کے مرید ہوں۔

اس کے باوجود میں مقامی سطح پر ارشد بلا کے گروہ کو کمزور نہیں سمجھتا تھا۔ ان کی اتنی پہنچ تھی کہ انہوں نے پولیس کی جانب سے پکڑ دھکڑ کے باوجود ہمارا تعاقب کیا اور ان کے چھ آدمی مجھے خاص طور سے اُٹھانے آئے تھے۔ اگرچہ وہ ناکام رہے تھے لیکن اس سے ان پر حرف نہیں آتا تھا۔ بلاشبہ میرا اس وقت نظر میں آنا ایک اتفاق تھا لیکن انہوں نے جتنی تیزی سے میرے اغوا کی پلاننگ کی اور اس پر عمل درآمد کیا یہ کسی معمولی گروہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ آٹھ اہم افراد کی گرفتاری کے باوجود ارشد بلا گروپ پوری طرح فعال تھا اگر میرے اغوا میں وہی ملوث تھے۔

اوپر روشندان سے اتنی روشنی آ رہی تھی کہ بلب کی روشنی نہ ہونے کے باوجود تہہ خانہ بس ہلکا سا تاریک تھا۔ میں سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے اب انتظار تھا کہ کب مجھے اس تہہ خانے سے نکال کر کہیں اور لے جایا جاتا ہے۔ یہ انتظار اس لیے نہیں تھا کہ مجھے اس تہہ خانے سے نکل کر کسی بہتر جگہ جانے کی

امید تھی بلکہ اس لیے کہ شاید اس دوران میں مجھے فرار کا موقع ملے۔ اس شخص نے مجھے اس جگہ کے جو حالات بتائے تھے اس کی روشنی میں یہاں سے فرار حد سے زیادہ مشکل تھا اور سب سے بڑی بات تھی مجھے کسی جگہ سے فرار کا کوئی بھی تجربہ نہیں تھا۔

جب وہی مظلوم صورت شخص دوپہر کا کھانا بھی لے کر آیا تو مجھے احساس ہوا پستول والے نے اس معاملے میں بھی مجھے بخوبی بے وقوف بنایا تھا۔ غالباً اس کا مقصد مجھے سکون سے رکھنا تھا۔ کھانا دے کر وہ واپس چلا گیا۔ یہ دال اور تنوری روٹی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھی مل رہا ہے۔ ان لوگوں سے مرغ مسلم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بھوک زیادہ نہیں تھی اس کے باوجود میں نے کھا لیا کہ نہ جانے کب ان لوگوں کا رویہ بھی بدل جائے اور مجھ پر کھانا پانی حرام کر دیا جائے۔ برتن ایسے ہی پڑے رہے اس وقت سہ پہر کے اوقات تھے جب روشندان سے آنے والی روشنی مدھم ہوئی تو بلب جل اُٹھا۔ مجھے غائب ہوئے ایک دن ہونے کو آ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حسن علی اور پاپا نے مجھے تلاش کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ناکام رہے ہوں گے ورنہ میں یوں قید میں نہ پڑا ہوتا۔

رفتہ رفتہ دن بالکل ڈھل گیا اور روشندان تاریک ہو گیا۔ رات کو دروازہ کھلا اور حنیف نیچے آیا۔ مظلوم صورت نے مجھے اپنا نام یہی بتایا تھا۔ رات کا کھانا دے کر اور دوپہر کے برتن لے کر وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

''یار کھلائے جا رہے ہو۔ اللہ کے بندے کیا اسے اپنے پیٹ میں رکھوں۔''

وہ میرا مطلب سمجھ کر ہنسا۔ ''صاحب اگر فوری ضرورت ہو تو ابھی لیے چلتا ہوں ورنہ کھانا کھا لیں...... بس آدھے گھنٹے بعد آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... پر آ جانا۔'' میں نے آمادگی ظاہر کی اور وہ چلا گیا۔

اس بار کھانے میں آلو گوشت اور وہی تنوری روٹی تھی۔ جب تک میں کھانے سے فارغ ہوا حنیف آ گیا۔ وہ میرے لیے چائے بھی لے کر آیا تھا۔ ''میں نے ان لوگوں کے لیے بنائی تھی آپ کے لیے بھی لے آیا۔''

''شکریہ حنیف بھائی۔'' میں نے حقیقی ممنونیت سے جواب دیا۔

حنیف کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی تھی اور میں غور کر رہا تھا کہ اس ہمدردی کا کس طرح سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اس لیے چائے پینے کے دوران میں بہ ظاہر سرسری انداز میں اور درحقیقت اس سے کرید کرید کر ان لوگوں اور اس کوٹھی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بھولے پن میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ برتن لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے واش روم چلنے کے لیے کہا۔ واش روم سے واپسی پر پہلے اس نے مجھے تہہ خانے میں بند کیا تبھی باہر دروازہ کھلا۔ دراصل جب وہ باہر جانے لگتا تھا تو دروازہ بجاتا اور باہر موجود شخص یہ دیکھ کر اطمینان کرتا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند ہے۔ تب ہی وہ





دروازہ کھول کر اسے باہر آنے دیتا تھا۔

اوپر تقریباً دو کینال پر پھیلی اس کوٹھی کا بیشتر حصہ چاروں طرف سے کھلے صحن کی صورت میں تھا۔ اس حصے کو چھوڑ کر دیگر چار کمرے اور کچن و باتھ روم وغیرہ مکمل تھے۔ پستول والے اور خان سمیت چار افراد تھے۔ پانچواں حنیف تھا لیکن میری طرح وہ بھی قیدی تھا، بس فرق اتنا تھا وہ کمزور اور فطرتاً خوف زدہ شخص تھا اس لیے اسے ڈرانے کے ساتھ کسی قدر آزادی بھی دی ہوئی تھی تاکہ وہ گھر کے کام نمٹا سکے۔ اسے باہر صحن میں جانے کی اجازت تھی لیکن کسی دیوار کے پاس یا مین گیٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان چار میں سے ایک ہمہ وقت مین گیٹ پر رہتا تھا۔ عام طور سے رات میں یہ ڈیوٹی خان کی تھی جس کا نام حنیف نے گل خان بتایا تھا اور دن میں مجیب نامی شخص کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ پستول والا عالمگیر تھا اور ان کے چوتھے ساتھی کا نام مشتاق تھا۔ ان میں سے صرف عالمگیر اور مشتاق ہی باہر جایا کرتے تھے۔ گل خان اور مجیب اندر رہا کرتے تھے۔ بہ ظاہر عالمگیر ان کا باس نظر آتا تھا، ان سب کے پاس اسلحہ تھا، خاص طور سے عالمگیر ہمہ وقت پستول سے مسلح رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس رائفلیں اور بم بھی تھے۔ حنیف کو یہ ساری باتیں ان کے پاس رہنے سے معلوم ہوئی تھیں اس نے بتایا کہ جس کمرے میں عالمگیر رہتا ہے اسے ہر وقت لاک رکھتا تھا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ کوئی ہتھیار حنیف کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ اسے استعمال کرنے کی کوشش کرے۔

میرا ذہن سوچنے میں مصروف تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس قید کے عالم میں میرے پاس سوائے سوچنے کے اور کچھ تھا بھی نہیں۔ دوسرے حنیف سے میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان میں سے کوئی بات میرے ذہن میں چبھ رہی تھی، کوئی ایسی بات جو میرے فائدہ کی تھی۔ میں آزادی حاصل کر سکتا تھا لیکن وہ بات خاصے غور و خوض کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی دماغ کبھی نہیں سوتا۔ یہ مستقل جاگتا رہتا ہے۔ اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ جسمانی مشینری کو فعال رکھتا ہے۔ ان کی خرابیاں درست کرتا ہے۔ بے شمار نفسیاتی مسائل جو شعور حل نہیں کر پاتا لاشعور انہیں سونے کے عالم میں حل کر دیتا ہے۔ میں نے سونے سے پہلے اس معاملے پر اتنا غور کیا تھا کہ سونے کے بعد بھی یہ مسئلہ میرے دماغ پر طاری رہا حتیٰ کہ میں نے اس بارے میں خواب دیکھا۔ خواب میں میں دشمنوں سے لڑ بھڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں انہوں نے مجھے گولی مار دی۔ میں اچانک چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے چند گہری سانسیں لے کر اپنی حالت پر قابو پایا۔ معاً میرے ذہن میں وہ بات آ گئی جو خاصی دیر سے دماغ [illegible]ی۔ حنیف نے بتایا تھا کہ باہر جانے کے لیے دروازہ اس وقت کھولا جاتا ہے جب باہر موجود فرد یہ اطمینان کر

لیتا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے یعنی میں تہہ خانے میں بند ہو چکا ہوں۔ فرض کیا جائے کہ میں تہہ خانے سے باہر ہوتا ہوں اور اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں باہر والا مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیتا اور اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر اس معاملے میں دو باتیں اہم ہیں۔ اول تو حنیف اس کام پر راضی ہوتا، دوسرے اس مختصر سی گیلری میں میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی کیونکہ باہر والا دروازہ لوہے کی عمودی مضبوط پٹیوں سے اس طرح بنا تھا کہ ہر پٹی کے درمیان انچ کا فاصلہ تھا۔ باہر والا اندر کا پورا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ جزوی طور پر گیلری میں موجود کوئی شے اس کی نگاہوں سے محفوظ نہیں تھی۔ اگر یہ مسئلہ کسی طرح حل ہو جاتا اور میرے لیے دروازہ کھل جاتا تب میں آزادی کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔

اس کے بعد میں سویا نہیں۔ خاصی دیر سوچتا رہا کہ حنیف کو کیوں کر راضی کیا جائے۔ اس سے چند ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زندگی سے پیار کرنے والا شخص ہے اور خوف کے سبب کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں سے اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو مگر اسے راضی کیا جا سکتا تھا کہ وہ رہائی کے لیے میرا ساتھ دے اور مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع دے۔ اگرچہ اس بات کا امکان تھا کہ وہ انکار کر دیتا لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ صبح کے وقت میں نے سونے کے بجائے ایکسر سائز کرنا مناسب سمجھا اور جسمانی طور پر فٹ رہنے کے لیے حسن علی نے جو ورزشیں بتائی تھیں ان کے لیے کوئی مشین یا جگہ نہیں درکار تھی میں اس تہہ خانے میں بھی با آسانی یہ ایکسر سائز کر سکتا تھا۔

حنیف صبح روشنی ہونے کے بعد خاصی دیر بعد آیا تھا۔ اس وقت تک میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں متفکر صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے صاحب...... پریشان نظر آ رہے ہو؟“ اس نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”حنیف بھائی...... اپنے لیے کیا پریشان ہونا۔ بچپن سے ایسے حالات دیکھتا آ رہا ہوں لیکن تم......“ میں کہتے کہتے رُک گیا۔

”کیا صاحب؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”دیکھو میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن اندھیرے میں رکھنا بھی مناسب نہیں ہے۔“ میں نے ناشتے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔ ”کل رات مجھے اوپر گیلری میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا، وہاں دو افراد آپس میں بات کر رہے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا، پتا ہے کیا کہہ رہے تھے؟“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ حنیف میرے انداز سے ہی خوف زدہ ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں خود کو اپنی اداکاری پر مبارکباد دی اور بیان جاری رکھا۔ ”وہ کہہ رہے تھے بس اب اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔“ بھائی میں تو کانپ اُٹھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ میری بات کر





رہے ہیں، پھر دوسرے کی آواز آئی۔ ابھی نہیں یار...... جب تک یہاں ہیں تب تک تو اسے زندہ رکھو، ورنہ گھر کے کام کون کرے گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا...... وہ کس کی بات کر رہے تھے؟“

”آ...... میر...... ی۔“ حنیف نے بہ مشکل کہا۔ محاورتاً اس کی بتیسی بجنے لگی تھی۔

”ہاں بھائی...... وہ تم سے چھٹکارے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے تمہیں خبردار کر دیا۔“

”ہائے...... اب میں کیا کروں...... یہ مجھے مار دیں گے...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

”حنیف بھائی میں تمہارے ساتھ ہمدردی ہی کر سکتا ہوں۔ میں تو خود بے بس اور قید میں ہوں۔ باہر نکل سکتا تو پھر تم دیکھتے کیسے خود کو بھی بچاتا اور تمہیں بھی نکال کر لے جاتا۔“ میں آہستہ آہستہ اسے اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔

”ہائے...... میں مر جاؤں گا۔“ اس نے پھر واویلا کیا۔

”آہستہ۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”کیوں انہیں احساس دلا رہے ہو کہ تم ان کے منصوبے سے واقف ہو گئے ہو۔ ہاں...... اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو میری مدد کرو...... مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ پھر میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔“

”تم کیسے نمٹو گے؟“ اس نے سوال کیا۔

میں ہنسا۔ ”گل خان کی صورت دیکھی ہے۔ اس کا یہ نقشہ میں نے ہی بنایا ہے۔ اگر خالی ہاتھ سے مقابلہ کرنا ہو تو میں اکیلا ہی ان چاروں کے لیے کافی ہوں۔“

”ہاں...... وہ تم کو بہت گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ اگر اسے عالمگیر نے نہ روک رکھا ہوتا تو اب تک وہ تمہیں گولی مار چکا ہوتا۔“ اس نے بتایا۔

”تم نے دیکھا وہ کتنا بڑا ہے مجھ سے۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔ ”اگر مجھے ایک بار اس جگہ سے نکلنے کا موقع مل جائے تو تم دیکھنا، آزاد ہونا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہو گا۔ بلکہ میں تمہیں اپنے پاپا سے منہ مانگا انعام بھی دلوا دوں گا۔ وہ اس ملک کے سب سے امیر شخص ہیں۔“

حنیف کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ”آپ اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ ان لوگوں نے آپ کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟“

”یہ میرے باپ سے تاوان لینا چاہتے ہیں۔“

”ہاں...... یہی بات ہو گی۔“ وہ فوراً بولا۔ ”صاحب میں نے آپ کو آزاد کر دیا تو مجھے کیا ملے گا۔“

”یہ بدمعاش مجھ سے ایک کروڑ روپے مانگ رہے ہیں۔ پاپا کے لیے یہ رقم کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اگر تمہاری مدد سے آزاد ہوا تو تمہیں جو انعام ملے گا وہ لاکھوں میں ضرور ہو گا۔ پاپا بہت فراخ دل آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے دس پندرہ لاکھ دے ہی دیں۔“

''دس پندرہ لاکھ......'' اس نے ایک خواب کی سی کیفیت میں کہا۔ اس وقت لاکھ روپے بھی اتنی بڑی رقم تھی کہ عام آدمی اسے حاصل کرنے کا سوچ کر ہی لرز اُٹھتا تھا۔ افغان جنگ کے نتیجے میں کالی دولت کے سیلاب کا آغاز تھا اس لیے عام طور سے روپے کی قدر تھی۔ لاکھ اور کروڑ بے وقعت نہیں ہوتے تھے۔

''ہاں...... ہوسکتا ہے پاپا خوش ہوکر اس سے زیادہ ہی دے دیں۔'' میں نے اسے پکا کرنے کے لیے کہا۔

''دس لاکھ روپے۔'' اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں ایک سیدھے سادے شریف آدمی کو اپنی مطلب براری کے لیے بے وقوف بنا رہا تھا اور یہی نہیں بلکہ اسے سبز باغ بھی دکھا رہا تھا۔ میں نے شرمندگی سے سوچا۔ خیر ایک بار میں ان لوگوں کی قید سے نکل جاتا تو جمشید علی سے کہہ کر اسے انعام بھی دلوا سکتا تھا اور کوئی ملازمت بھی۔ فی الوقت مجبوری تھی مجھے بہر صورت ان لوگوں کی قید سے آزاد ہونا تھا۔ ان لوگوں کی نیت درست نہیں تھی، جو مجھے بہلانے کے لیے جھوٹا وعدہ کر سکتے تھے، میں ان لوگوں پر بھروسہ کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''تمہیں رہائی بھی ملے گی اور انعام بھی۔'' میں نے اسے ہلایا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔ مجھے کوشش کر کے یہاں سے نکالنا ہوگا۔''

اس بار وہ ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اس کا ذہن ان خطرات کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس پر کبھی امید نظر آتی، کبھی مستقبل کے خوابوں کا عکس جھلکتا اور کبھی خوف نظر آتا۔ آخر میں خوف اس پر غالب آ گیا۔

''نہیں صاحب...... اگر ان لوگوں کو میرے ارادے کی بھنک بھی مل گئی تو یہ بے دردی سے مجھے مار ڈالیں گے۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ ایک دن میں نے اتفاق سے ان کی باتیں سن لیں وہ اپنے دو دشمنوں کا ذکر کر رہے تھے جنہیں انہوں نے مار کر اس کوٹھی میں کہیں دفن کر رکھا ہے۔ صاحب یہ مجھے بھی مار کر...... ادھر ہی دفن کر دیں گے۔''

''ابھی تو نہیں لیکن تین، چار دن میں وہ یہی کریں گے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''نہیں صاحب...... میں ان سے معافی مانگ لوں گا ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھ غریب پر رحم کریں گے۔'' اس نے جواب دیا اور برتن لے کر کھڑا ہو گیا۔ ''صاحب اگر لیٹرین جانا ہے تو میرے ساتھ آ جاؤ۔''

میں اس کے ساتھ لیٹرین تک گیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے تہہ خانے میں جانے سے پہلے ایک بار پھر گیلری کا غور سے معائنہ کیا۔ یہ کوئی پانچ فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی تھی۔ باہر جانے والے دروازے کے ساتھ ہی تہہ خانے کا دروازہ تھا اور دوسرے کمروں کے دروازے کوئی





پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اگر میں ان میں چھپ جاتا تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ گیلری سے باہر جانے والا فولادی دروازہ کوئی چار فٹ چوڑا تھا اس کے دونوں جانب چھ چھ انچ کی دیوار بچتی تھی اور میں اس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو بھی جاتا تب بھی باہر موجود فرد کی نگاہ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر حنیف مجھ سے تعاون پر تیار نہیں تھا۔ ایسے میں کسی کوشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں مایوسی کے عالم میں واپس تہہ خانے میں چلا گیا۔

حنیف دوپہر کا کھانا لے کر آیا تب بھی چپ تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے کئی بار اسے اُکسایا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ برتن کر واپس چلا گیا۔ مجھے قید میں آئے دو دن ہو چکے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ باہر کیا ہو رہا تھا یہ بات یقینی تھی کہ ان لوگوں نے جمشید علی سے رابطہ کر لیا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان میری رہائی کے لیے کیا مذاکرات چل رہے تھے اور ان لوگوں نے جمشید علی سے کیا مطالبہ کیا تھا، میں سب سے بے خبر تھا۔ عین ممکن تھا یہ لوگ جمشید علی سے کوئی ایسا مطالبہ کر دیتے جو ان کے لیے پورا کرنا ممکن نہ ہوتا، اس صورت میں میری رہائی بلکہ زندگی کے امکانات بھی صفر ہو جاتے۔ میں کسی پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ جمشید علی ہی کیوں نہ ہوں۔ حسن علی نے مجھے ہمیشہ یہی کہا۔

''تم اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرو۔ میں یا جمشید علی تمہاری مدد اور رہنمائی ضرور کر سکتے ہیں لیکن زندگی کی جنگ تمہیں خود ہی لڑنا اور جیتنا ہوگی۔''

حسن علی کی اس بات کو میں نے نہ صرف سمجھ لیا تھا بلکہ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا دیا تھا۔ اس جگہ سے فرار کا فیصلہ کر کے میں اس معاملے پر یکسو ہو گیا۔ رات کو بھی حنیف نے مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دفعہ وہ چکن لایا تھا، ساتھ میں پراٹھے تھے۔ ''واہ بھائی...... تم تو رحمت کا فرشتہ ثابت ہو رہے ہو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''میں نے نہیں بنایا ہے۔'' اس نے مُردہ سے انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے کھانا بنانا کہاں آتا ہے۔ یہی لوگ لاتے ہیں۔''

جب سے میں نے اسے ساتھ ملانے کے لیے جھوٹ بولا تھا وہ بے حد خوف زدہ اور چپ سا رہنے لگا تھا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اوپر واش روم تک لے گیا تھا۔ پھر مجھے تہہ خانے میں بند کر کے چلا گیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اب تک لیٹنے کے لیے بستر تو کیا ایک چادر تک نہیں دی تھی۔ جیسے یہ لوگ خوفزدہ تھے۔ مجھے کچھ دیا گیا تو میں اسے ان کے خلاف نہ استعمال کر بیٹھوں۔ میں تیسری رات بھی ننگے اور نم فرش پر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ان تین دنوں میں میرا وجود وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ لباس اور جسم مٹی سے خراب تھا اور بال چیکٹ ہو چکے تھے۔ مجھے خود سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بات طے تھی کہ انسان کو نیند ہر حال میں آ جاتی ہے اس ننگے اور تم فرش پر بھی مجھے اتنی ہی اچھی نیند آتی تھی جتنی کہ اپنے نرم گرم بستر پر۔ کھانا کھا کر میں جلد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات کا نہ

جانے کون سا پہر تھا اچانک مجھے لگا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔



یوں لگا جیسے مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ اپنے چہرے پر مجھے نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ ذہن پر ابھی مدہوشی طاری تھی اور میرا آنکھ کھولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جب آواز کے ساتھ ساز بھی شامل ہو گیا یعنی کسی نے میرے چہرے کو طبلہ سمجھ کر بجانا شروع کر دیا تو مجھے مجبوراً آنکھیں کھولنا ہی پڑیں اور پھر تیز روشنی کی وجہ سے بند بھی کرنا پڑیں۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن قابو میں آنے لگا۔ شعور کی سطح پر تصاویر اُبھرنے لگیں۔ مجھے عبید صلاح یاد آیا۔ اس نے ہمیں روکا تھا، پھر گارڈز بے ہوش کرنے والی گولیوں سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ عبید صلاح نے بہ وقتِ رخصتی میری گردن پر کوئی نوکیلی شے چبھوئی تھی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا، شاید اس نے میری گردن میں ڈارٹ گن کا بلٹ ہاتھ سے چبھو دیا تھا۔

''یوسف تمہیں ہوش آ گیا ہے...... آنکھیں کھولو۔'' میں نے جان گرے کی آواز سنی۔

''ہوش تو آ گیا ہے۔'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''لیکن پہلے یہ روشنی ہٹاؤ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

''روشنی نہیں ہے، اب آنکھیں کھولو۔''

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ وہ دراصل ٹارچ کی روشنی تھی جو ایک ڈاکٹر نما شخص میری آنکھوں میں ڈال رہا تھا۔ ''اب یہ پوری طرح ہوش میں آ چکا ہے۔'' ڈاکٹر نے غالباً جان گرے کو آگاہ کیا۔

''یوسف تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' جان گرے نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

''پانی۔'' میں نے دردناک انداز میں کراہ کر پکارا۔ درحقیقت مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن اس وقت میرا مقصد جان گرے کو تنگ کرنا تھا۔ ایک نرس نے جلدی سے لا کر مجھے گلوکوز ملا پانی دیا۔ کمرے سے بھی لگ رہا تھا کہ میں کسی ہسپتال میں ہوں۔ نہایت آرام سے یہ پانی میں نے نرس کے ہاتھوں سے پیا اور پھر یوں سر ڈال کر ہانپنے لگا جیسے پانی پینے سے پہلے کنواں کھودا ہو۔

''سر یہ اس وقت کمزور ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ''بہتر ہو گا آپ اسے کچھ وقت دیں۔''

''شٹ اپ......'' جان گرے نے اسے جھاڑ دیا۔ ''تم اسے نہیں جانتے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یوسف تم پوری طرح ہوش میں ہو اور تم جیسا آدمی اتنی آسانی سے کمزور نہیں ہو سکتا۔''

''میں بے انتہا تھکن اور کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

''بکومت...... میں تمہیں جانتا ہوں۔ سیدھی طرح میرے سوال کا جواب دو...... وہاں کیا ہوا تھا؟''

''کہاں...... کیا ہوا تھا؟'' میں نے بھولپن سے دریافت کیا۔





''تم اور تمہارے ساتھ جانے والے دونوں محافظ سڑک پر جیپ میں بے ہوش پائے گئے تھے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، وہاں کیا ہوا تھا؟''

''اوہ اچھا...... چلتے چلتے ہماری جیپ کا ٹائر اچانک پنکچر ہو گیا۔''

''اسے دانستہ پنکچر کیا گیا تھا۔'' جان گرے نے میری بات کاٹی۔ ''اس کے نیچے جوڑے سرے والی کیل تھی۔ وہی کیل ٹائر میں گھس گئی۔''

میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''مجھے کیا پتا...... میں کوئی ٹائر کے ساتھ تو نہیں تھا۔ بہر حال جیپ رُک گئی۔ ایک آدمی اسے دیکھنے کے لیے اُترا۔''

''کون...... وہ جو ڈرائیو کر رہا تھا۔'' اچانک جان گرے نے سوال کیا۔ اس کا سوال عیارانہ تھا کہ میرے بیان میں گڑبڑ پیدا کر سکے۔

''نہیں جو میرے ساتھ بیٹھا تھا، وہ اُتر گیا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پھر ڈرائیور خاموش ہو گیا۔ میرا مطلب ہے ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد ٹائر دیکھنے والا بھی گر گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، میری گردن میں بھی کوئی چیز چبھی اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔''

وہ بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں یقین ہے تم ان دونوں کے فوراً بعد بے ہوش ہو گئے تھے؟''

''ہاں...... ہم تینوں کی بے ہوشی میں ایک منٹ کا وقفہ بھی حائل نہیں تھا۔ کسی نے مہارت سے چھپ کر حملہ کیا تھا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ کسی نے حملہ کیا تھا؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''اگر کسی نے حملہ نہیں کیا تھا تو کیا ہم کسی آسمانی بلا کا شکار ہوئے تھے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم یہ بات کیوں کر رہے ہو کہ کسی نے حملہ ہی کیا تھا؟''

''تو محض تفریحاً بے ہوش کیا تھا؟'' میرا لہجہ پہلے سے زیادہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

''اگر تم ان کے ساتھ ہی بے ہوش ہوئے تھے تو ان کے پورے ایک گھنٹے بعد ہوش میں کیوں آئے؟''

''یہ بات مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو۔'' میں جھنجھلا گیا تھا۔ ''ان ڈاکٹروں سے پوچھو...... ویسے بھی میں زخمی ہوں، شاید اس لیے دیر سے ہوش آیا۔''

جان گرے نے سر ہلایا مگر اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ ہوا کیا تھا؟''

جان گرے بولا۔ ''جب تم بروقت میرے پاس نہیں پہنچے تو میں نے ان دونوں سے رابطہ کرنا چاہا، ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر تم لوگوں کی تلاش شروع ہو گئی۔''

"اس وقت تمہارا خیال ہوگا کہ میں ان گارڈز کو بے بس کر کے فرار ہو گیا ہوں۔" میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ "قدرتی طور پر یہی خیال آیا لیکن غائب ہونے کے ایک گھنٹے بعد تم تینوں بندرگاہ کی طرف آنے والی سڑک پر جیپ میں بے ہوش پائے گئے۔ تمہیں ہسپتال لایا گیا، تم تینوں کے جسموں سے ڈارٹ گن کا بلٹ نکلا تھا جس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی ہے۔"

"گویا کسی نے ہم تینوں پر ہی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس جزیرے پر کون اتنی جرأت کر سکتا ہے؟"

"مجھے شک ہے کہ یہ ہمارے مخالفوں کا کام ہے۔"

"مخالف...... اس جزیرے پر......؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"مخالف کہاں نہیں ہوتے۔" جان گرے نے سر ہلایا۔ "مجھے عبید صلاح پر بھی شک ہے۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "اس کے بارے میں تو تم نے بتایا تھا کہ وہ شاید سمندر میں فرار ہوتے ہوئے شارکوں کا شکار ہو گیا ہے۔"

"وہ صرف ایک مفروضہ تھا۔" جان گرے خشک لہجے میں بولا۔ "اب بعض شواہد سامنے آئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہ صرف جزیرے پر ہے بلکہ اسے کچھ لوگوں کی حمایت اور مدد بھی حاصل ہے۔"

میں مضحکہ اُڑانے کے انداز میں ہنسا۔ "غالباً تمہیں خواب میں بھی آ کر ڈراتا ہوگا۔"

"بکومت۔" جان گرے جھلا گیا۔ "میں اس سے ڈروں گا، ایک بار ہاتھ آ جائے تو مچھر کی طرح مسل دوں۔"

"غالباً یہی دعویٰ وہ تمہارے بارے میں کرے۔ وہ چھپ رہا ہے اور تم محافظوں کے حصار میں ہو۔ صدر امریکہ بھی چھپ کر رہتا ہے۔" میرا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ "لیکن موت سے کوئی نہیں چھپ سکتا۔ وہ ہزاروں محافظوں کے جھرمٹ میں آ جاتی ہے۔ ماہر ترین ڈاکٹروں کے حصار سے نکال لے جاتی ہے۔"

جان گرے ذرا چپ ہوا پھر اس نے کہا۔ "جب تم لوگوں کی تلاش شروع ہوئی تو اس سڑک کی چیکنگ بھی ہوئی تھی۔ اس وقت جیپ سڑک پر نہیں تھی لیکن جب دوسری ٹیم وہاں سے گزری تو اسے جیپ اور تم تینوں مل گئے۔" جان گرے چپ ہو کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "جب پہلی ٹیم وہاں سے گزری تو جیپ اور تم تینوں کہاں تھے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "میں تو بے ہوش پڑا تھا۔"

جان گرے کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ "یوسف...... اگر تم نے اس معاملے میں غلط بیانی کی اور یہ غلط بیانی پکڑی گئی تو یاد رکھو تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔"





"اس سے زیادہ بُرا اور کیا ہوگا۔" میں نے پسلی کے زخم کو چھوا۔ غالباً میری بے ہوشی کے دوران اس کی نئی پٹی کر دی گئی تھی اور کوئی پین کلر انجکشن بھی دیا گیا تھا کیونکہ زخم میں تکلیف قطعی نہیں تھی۔

جان گرے مجھے ڈرا دھمکا کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ابھی مجھے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک نرس نے آ کر مجھے کوئی سوپ نما چیز پلائی بلکہ چمچ سے کھلائی۔ اس میں کوئی تیز زود اثر دوا بھی تھی کیونکہ پیالہ ختم کرتے کرتے مجھے نیند آنے لگی تھی اور سوپ ختم کرنے کے چند منٹ کے اندر میں سو گیا تھا۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی، جس کی وجہ سے مجھے بے ہوش رکھا جاتا۔ ایسا شاید احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا گیا تھا اور ایسی چالاکی جان گرے ہی دکھا سکتا تھا۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ مقابلے سے پہلے مجھے شکست دینے کے لیے کیا دھاندلی کی گئی تھی اور میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میں حالات دیکھ رہا تھا، جس نے بھی میرے ساتھ دشمنی کی تھی، وہ دراصل میں جان گرے کا دشمن تھا اور ایک محاورے کے مطابق دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

رات کا باقاعدہ کھانا تھا اس کے بعد ایک دلکش نرس نے اپنے شیریں ہاتھوں سے کڑوی دوائیں کھلائیں اور ایک بار پھر میرے ساتھ ہاتھ دکھا دیا گیا۔ ان میں کوئی گولی نیند کی تھی جسے کھا کر میں پھر سونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ساری رات نیند میں گزار کر میں صبح بے دار ہوا تو جان گرے کے ہرکارے مجھے لے جانے کے لیے موجود تھے۔ مجھے صرف پٹی کروانے اور کپڑے بدلنے کی اجازت ملی تھی اس وقت تک میں ہسپتال کے کپڑوں میں تھا۔ کپڑوں کے ساتھ میرا پرس اور دوسرا سامان بھی تھا۔ مجھے ناشتہ کرنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی تھی حسب سابق ہتھکڑی لگا کر جیپ کے عقبی حصے میں اینگل آئرن سے جکڑ دیا گیا تھا۔ جیپ مجھے لے کر فراٹے بھرتی بندرگاہ کی طرف جانے والی سڑک سے گزری۔ اس وقت میں نے نوٹ کیا کہ اس سڑک پر پیدل نگران بھی گشت کر رہے ہیں۔ گویا حفاظتی انتظامات بڑھا دیئے گئے تھے۔ بندرگاہ کی طرف جانے والا راستہ جو بلندی سے نشیب کی طرف جاتا تھا، دراصل جزیرے کا بیشتر حصہ خاصا بلند تھا اور بندرگاہ پانی کی سطح تک تھی اس لیے اس تک جانے کے لیے خاصی نیچائی تک جانا پڑتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے جان گرے کے دفتر لے جایا جا رہا تھا کیونکہ بندرگاہ پر میں نے دفتری نوعیت کی تعمیرات دیکھی تھیں لیکن جیپ اوپری ہال سے گزری جہاں متعدد اقسام کی جیپیں اور لوڈرز کھڑے تھے۔ اس سے آگے سرنگ تھی۔ بندرگاہ کے پاس سے گزر کر یہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک حصہ بندرگاہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں جس جیپ پر تھا، اس نے دوسرے راستے پر سفر جاری رکھا۔ یہ راستہ چند سو گز کے بعد ایک مختصر ہال پر ختم ہو گیا اس سے آگے پیدل سفر کرنا تھا کیونکہ آگے سیڑھیاں تھیں جن پر جیپ سے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گارڈ نے میری ہتھکڑی اینگل سے

نکالی اور آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا۔ اس ہال میں تین طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں، ہال میں کئی جیپیں اور مختصر کاریں پارک تھیں۔ ان کی تعداد سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آگے بھی خاصا بڑا تعمیر شدہ حصہ تھا۔ ان لوگوں نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے اس جگہ چٹانیں تراش کر پوری بندرگاہ اور نہ جانے کیا کیا بنا رکھا تھا۔

ہم درمیان والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، یہاں پر ممنوع علاقے کی تختی لگی تھی اور ایک مسلح گارڈ نگران تھا اس نے میرے ساتھ آنے والے گارڈز کے کارڈ دیکھے اور سوالات کر کے پھر اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر سرنگوں کا وسیع جال تھا جس میں پتھر تراش کر کمرے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کا رُخ بندرگاہ اور سمندر کی طرف تھا ان کمروں میں کھڑکیاں نکالی گئی تھیں اس کا اندازہ مجھے بعض کھلے کمرے دیکھ کر ہوا تھا۔ بعض کمرے رہائشی تھے اور بعض دفتری کاموں کے لیے مخصوص تھے۔ مجھے عبید صلاح کی بات یاد آئی۔ ان لوگوں کا ایٹمی پاور ہاؤس بھی بندرگاہ کے آس پاس تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان لوگوں نے ساری اہم تنصیبات بمعہ اسلحہ کے گوداموں کے اس جگہ بنا رکھی تھیں۔ اسلحہ کے گودام یوں بھی ضروری تھے کہ یہ نہ صرف بحری قزاق تھے بلکہ اسلحے کے تاجر بھی تھے۔ ایشیا میں جاری جنگوں اور خانہ جنگیوں کو یہی لوگ اسلحہ فراہم کرتے تھے۔ اس سے دوہرے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ ایک تو ان کے اسلحہ سازی کے کارخانے دن رات کام کرتے اور ان کے لیے ڈھیروں نفع کماتے تھے اور دوسرا ایشیا اور افریقہ میں بدامنی کی آگ بھڑکا کر اپنے مفادات حاصل کرتے تھے۔ جنگ نے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں کو پسماندہ کر رکھا ہے اور عالمی امن کے ٹھیکیداران خطوں میں جنگ کی آگ بجھانے میں صرف اس وقت دلچسپی لیتے ہیں جب یہ آگ ان کے مفادات تک آ پہنچے۔

اس لحاظ سے یہ اس جزیرے کا اہم ترین حصہ تھا اور یہاں کی حفاظت کے انتظامات بھی اسی لحاظ سے تھے۔ جا بجا گارڈز پھیلے تھے، کئی جگہ میں نے کیمرے دیکھے۔ اس کے علاوہ نگرانی اور حفاظت کے لیے دوسرے انتظامات موجود تھے لیکن ان کی پوشیدگی بھی لازمی تھی۔ دو جگہوں پر مجھے مختلف آلات سے چیک کیا گیا تھا گویا انہیں شک تھا کہ میں کچھ چھپا کر نہ لے جا رہا ہوں۔ ایک طویل سفر کے بعد مجھے ایک لگژری قسم کے اپارٹمنٹ تک پہنچایا گیا جس کے آگے ایک لمبا تڑنگا حبشی پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے گارڈ کی بات سن کر اندر بات کی۔ ''سر...... یہ یوسف علی خان کو لے کر آئے ہیں۔''

اندر جان گرے غالباً ہمیں کیمرے سے دیکھ رہا تھا اس نے آنے کی اجازت دے دی۔ میں اس عالیشان اپارٹمنٹ کو دیکھ کر حیران ہوا تھا اس لیے نہیں کہ اس کی سجاوٹ میرے لیے کوئی نئی شے تھی بلکہ حیرت کی وجہ اس جنگل میں منگل تھا۔ اس جگہ کو ان لوگوں نے ایسا کر دیا تھا جیسا کسی جدید ترین شہر میں ہوتا ہے۔ جان گرے ایک ٹیری نما کاؤچ پر لیٹا ہوا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔





اس نے دھوپ کی رنگین عینک لگا رکھی تھی۔

جسم پر ایک نیکر تھی جس میں اس کی توند نمایاں تھی۔

''آؤ یوسف کیا حال ہیں؟''

''فی الوقت تو اچھے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اصولی طور پر مقابلہ جیتنے کے بعد مجھے آزادی مل جانی چاہیے۔''

''سر ہمارے لیے کیا حکم ہے۔'' میرے ساتھ آئے گارڈز میں سے ایک نے کہا۔

''تم لوگ جا سکتے ہو۔'' جان گرے نے تحکمانہ انداز میں جواب دیا اور دونوں گارڈز خاموشی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جان گرے میری طرف متوجہ ہوا۔ ''بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟''

''شکریہ۔'' میں سامنے رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

جان گرے نے برابر میں رکھی تپائی سے جام اُٹھایا۔ ''تم تو پیتے نہیں ہو...... یہ بتاؤ کہ کافی یا سافٹ ڈرنک چلے گی؟''

''کافی۔'' اس بار بھی میں نے مختصراً کہا۔

جان گرے نے وہاں رکھے واکی ٹاکی پر کسی سے کافی لانے کو کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''اصولی طور پر تم مقابلہ جیت کر رہائی کے حق دار ہو لیکن ابھی کونسل کے بڑے تمہاری رہائی کے حق میں نہیں ہیں اس لیے فیصلہ ہونے تک تمہیں میری تحویل میں دیا گیا ہے۔''

''یعنی اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔'' میں نے تلخی سے جواب دیا۔

''یوسف اپنے اندر لچک پیدا کرو۔'' اس نے تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''یہ مت بھولو کہ تم اس وقت میری وجہ سے زندہ ہو۔ اگر میں نہ ہوتا تو تم پھانسی پر لٹک چکے ہوتے۔''

''جیسے عبید صلاح لٹک گیا ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں کا یہی فرعون پن ہے۔ طاقت کے زعم میں تم بھول جاتے ہو کہ ایک ہستی ایسی ہے تم اس کے آگے مجبور ہو۔ تم لوگوں نے اس دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانے کی جتنی کوشش کی وہ سب ناکام رہیں۔''

''تقریر مت کرو۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''حقائق کو دیکھو۔''

''چلو میں مان لیتا ہوں کہ تم نے کرم کیا مجھے مرنے سے بچایا، تب میں کیا کر سکتا ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''اب کی نا تم نے کام کی بات...... دیکھو میں تمہیں شروع سے کہتا آیا ہوں کہ تم میرے کام آؤ...... میں تمہارے کام آؤں گا۔''

''یہ بات سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''لیکن تعاون کس صورت میں کیا جائے یہ بات اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔''

''فکر مت کرو...... بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ جیسے ہی تمہیں جزیرے سے جانے کی

اجازت ملی میں تمہیں بتادوں گا کہ تمہیں میرے لیے کیا کرنا ہے۔"

"ضروری نہیں ہے تم جس کام کو میرے لیے ممکن سمجھ رہے ہو وہ میرے لیے ناممکن ہو۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "تم پہلے بھی اس کام میں ہاتھ ڈال چکے ہو اور اس بار بھی کر سکو گے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کوئی بات میرے ذہن میں سرسرانے لگی لیکن فی الوقت میں نے ان خیالات کا اظہار ضروری نہیں تھا۔ اس کے بجائے میں نے موضوع بدل دیا۔ "تم نے کئی بار کہا تم میرے ماضی سے واقف ہو، کیا مجھے اس کے بارے میں بھی نہیں بتاؤ گے۔" میرے لہجے میں نامحسوس سی التجا آ گئی تھی۔

جان گرے ہنسا۔ "تم تو کام کرنے سے پہلے ہی معاوضہ مانگ رہے ہو۔ یاد رکھو تمہارے ماضی کے بارے میں تمہیں صرف اس وقت بتاؤں گا جب میرا کام ہو جائے گا۔"

"ایک تم ہی میرے ماضی سے واقف ہو۔" میں نے جل کر کہا۔ "اس دنیا میں اور بھی لوگ ہوں گے اس حقیقت سے واقف۔"

وہ مسکرایا۔ "یوسف، اس پوری دنیا میں صرف میں ایک شخص ہوں جو تمہارے ماضی سے واقف ہوں، باقی افراد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان میں جمشید علی خان اور اس کا خصوصی نائب بابر خان بھی تھے۔ باقی سب اس کشتی کا عملہ تھا جس پر تم لائے گئے تھے۔ اس کشتی کو پاکستان کوسٹ گارڈز نے مقابلہ کر کے تباہ کر دیا تھا اور عملے کا ہر فرد مارا گیا تھا۔"

"بابر مرا نہیں ہے بلکہ وہ مجھ پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

وہ پھر مسکرایا۔ "تمہارے خیال میں بابر فرار ہو کر کہاں گیا تھا۔ کیا اس ملک میں وہ جمشید علی کی نگاہوں سے بچ سکتا تھا، اس نے عقلمندی کی اور فرار ہوتے ہوئے سیدھے ترکی کا رُخ کیا تھا اور وہاں سے یورپ جانے کے لیے ایک بحری جہاز پر سوار ہوا تھا۔ اتفاق سے وہاں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ میں نے اس سے دوستی کی، پھر ایک رات جب ہم پی رہے تھے، بابر نے نشے کی کیفیت میں جمشید علی اور تمہارے بارے میں بتا دیا۔"

"اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ کیوں میرا دشمن ہو رہا تھا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا اندازہ ہے تم سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ کسی کے اشارے پر ایسا کر رہا تھا۔ بہرحال وہ جمشید علی سے بے انتہا خوفزدہ تھا۔ جمشید علی کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا، جہازرانی کی دنیا میں وہ ایک قابلِ احترام شخص تصور کیا جاتا تھا لیکن میں ان کم ترین افراد میں سے ہوں جنہیں جمشید علی کی دوہری زندگی کا علم تھا۔ یعنی وہ ایک اسمگلر بھی تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کا مجرم...... جس کے کاروبار کا دائرہ ایشیاء، افریقہ سے لے کر یورپ و امریکہ تک



پھیلا تھا۔ انٹرپول میں اس کے بارے میں ایک چھوٹی سی فائل تھی جس میں اس پر شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ایشیا سے یورپ تک کے روٹ پر منشیات سمگل کرتا ہے۔"

"تم نے بابر کا کیا کیا؟"

"اس کے بارے میں جانتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو میرے قبضے میں ہونا چاہیے۔ جب بحری جہاز جزیرہ کریٹ پر رُکا تو میں نے بابر کو وہاں اُتار لیا۔ یہ کام زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں نے اسے شراب میں ایک دوا دی جس کے اثر سے اس کی حالت خراب ہو گئی اور اسے بحری جہاز سے ہسپتال منتقل کر دیا گیا وہاں سے اسے میرے ساتھی نکال کر لے گئے۔"

میں نے اسے گھورا۔ "تمہیں بابر سے کیا دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے تم نے کسی انسانی ہمدردی کے تحت اس کی مدد نہیں کی ہوگی۔ یہ چیز تم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔"

"ہاں...... میں نے ایک وجہ سے اسے پناہ دی تھی۔ جمشید علی نے افغان جنگ کے آغاز کے بعد ہیروئن جنوبی افریقہ اور برازیل کے راستے یورپ اور امریکہ بھیجنا شروع کی تھی۔ اس کے بدلے وہ ہیرے اور سونا حاصل کرتا تھا۔ اس کے پاس نایاب جواہرات کا خاصا بڑا ذخیرہ تھا۔ میں اس ذخیرے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن وہ بدبخت کچھ بتانے سے پہلے مر گیا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے جان گرے کو جام بناتے دیکھ کر دریافت کیا۔

"اس نے یہ شبہ ہونے کے بعد کہ میں اس سے جمشید علی کی خفیہ دولت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں، جس جگہ اسے قید کر رکھا تھا وہاں سے فرار کی کوشش کی۔ وہ صرف ایک منزل کی اونچائی سے کودا تھا مگر بدقسمتی سے اس کا پاؤں ایک تار میں اُلجھا اور وہ سر کے بل زمین پر آ گرا۔ نتیجہ ظاہر ہے اس کا بھیجا باہر آ گیا تھا۔ افسوس کہ وہ اس خفیہ دولت کے بارے میں بتانے سے پہلے مر گیا تھا۔"

"اور اب تم میری مدد سے اس دولت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

"نہیں یوسف...... یہ تو معمولی سی شے ہے۔ میں تمہاری مدد سے وہ کچھ حاصل کروں گا کہ رہتی دنیا تک میرا نام زندہ رہے گا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم جیسے شخص کو بھی اپنے نام کی پروا ہے۔"

"ظاہر ہے...... یہ خواہش کسے نہیں ہوتی کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے۔" اس نے شانے اُچکائے۔

"مجھے کم سے کم تم سے یہ امید نہیں تھی۔" میں ہنسا۔ "تمہیں دیکھ کر اپنے ایک بادشاہ کا خیال آتا ہے جس کا تصور تھا دنیا میں جتنے مزے کرنے ہیں کر لو کیونکہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔"

جان گرے ہنسا۔ "میں نے سنا ہے...... لیکن میں ایسا نظر آنے کے باوجود ایسی سوچ نہیں

رکھتا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرا موجودہ امیج اچھا نہیں ہے۔ اگر میں کامیاب رہا تو لوگ میری اس شخصیت کو بھول جائیں گے۔ میں اپنے لوگوں کا ہیرو بن جاؤں گا۔''

''وہ تو تم اب بھی ہو......تمہارے جیسے لوگ آج کل ہیرو ہیں۔''

''میں کل بھی ہیرو ہی رہوں گا۔'' اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔ ''دنیا اس کی ہے جو اپنی بات دوسروں سے منوا سکتا ہے۔ اور یہ طاقت آج ہمارے پاس ہے، کل کیا پتا یہ طاقت کس کے پاس ہو......درحقیقت تاریخ بنانے کے لیے اور آنے والی نسلوں کو تحفظ دینے کے لیے ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔''

''کیونکہ زوال تیزی سے تم لوگوں کی طرف آ رہا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

جان گرے جوابی طنز کے ساتھ ہنسا۔ ''اور تم لوگ کچھ کیے بغیر اپنے آپ کو یہی سوچ کر تسلی دیتے رہو۔''

میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ مسلمان بحیثیت ایک قوم عمل سے کوسوں دور ماضی کے تابناک دور اور آنے والے مستقبل کی خوش امیدی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ حال کی ہمیں خاص پروا نہیں ہے۔ میں نے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا۔ ''فی الوقت بات تمہارے زوال کی ہو رہی ہے۔ تمام تر ہتھکنڈے استعمال کرنے اور دوسری قوموں کا استحصال کرنے کے باوجود تم لوگوں کے عروج کا دور اتنا مختصر ثابت ہوا ہے اور زوال آنے والا ہے۔''

''فی الوقت ہم نے اسے روکا ہے۔''

''منفی ہتھکنڈوں سے زوال کبھی نہیں رُکتا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر ایسا ہوتا تو رومن سلطنت آج بھی قائم ہوتی۔''

''موجودہ دور کو تم اس کا تسلسل سمجھو۔''

اسی لمحے ایک دُبلی سی سانولی لڑکی نے ٹیرس پر قدم رکھا اس نے کافی کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ یہ مشکل سے چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی جس کا تعلق شاید ساؤتھ انڈیا سے تھا۔ اس کے چہرے اور جسمانی حرکات میں ایک طرح کا خوف رچا ہوا تھا۔ معمولی سی موٹی ساڑھی میں وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنی تھی۔ میں نے طنزیہ انداز میں اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کم سے کم اس لڑکی کو دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے۔''

''کمزور ہمیشہ طاقتور کا غلام ہوتا ہے۔'' جان گرے نے فلسفیانہ انداز میں حقیقت بیان کی۔

لڑکی نے کافی کی ٹرے تپائی پر رکھی اور مگ اُٹھا کر میری طرف دیکھا جیسے چینی یا کریم کا پوچھ رہی ہو۔ میں نے اشارے سے ایک چمچ چینی اور کریم ملانے کو کہا۔ لڑکی یہ کام کرنے کے لیے تپائی کی طرف جھکی تو اس کے بلاؤز کا پلو سرک گیا اور میری نظر نے وہ دیکھ لیا جو اب تک چھپا تھا۔ میری توجہ اس کے نومیدہ شباب نے نہیں بلکہ اس کے سینے پر نظر آنے والے بھنبھوڑے جانے کے نشانوں



نے کھینچی تھی۔ وہ ایک کچی کلی تھی جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا گیا تھا۔ یہ بات جان گرے نے بھی محسوس کی اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

''یہ لڑکی ایک ہفتے پہلے ہی میرے پاس آئی ہے۔ مجھے ایشیائی اور خاص طور سے ساؤتھ ایشین حُسن ہمیشہ سے پسند رہا ہے اس لیے میں نے خاص طور سے اس کی فرمائش کی تھی۔''

میرا دل چاہا کہ اس مردود کی گردن مروڑ کر اسے ٹیرس سے نیچے پھینک دوں اور شاید میں ایسا ہی کرتا اگر میری عبید صلاح سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ اب میرے پیشِ نظر ایک فرد کی بربادی نہیں بلکہ اس پورے جزیرے کی تباہی تھی جو انسانیت کش جرائم کا مرکز تھا۔ ممکن ہے میں جان گرے کو جہنم رسید کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس صورت میں اس مرکز کی تباہی رہ جاتی۔ مجھے خود پر قابو پانا پڑا۔ جان گرے مجھ سے غافل نہیں تھا۔ وہ بہ غور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے گہری سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب اور جسم کو ڈھیلا چھوڑا تو وہ مسکرا دیا۔

''میرا خیال ہے تم اب خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہو۔'' وہ بولا۔ ''دیکھو یوسف......ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام سوراتی ہے۔ تمہارے دشمن ملک سے تعلق رکھتی ہے اس ملک نے احمقانہ جذباتیت سے خود کو آزاد کرا لیا ہے اور ایشیائی کلچر اور نام نہاد روایات کی جان چھوڑ کر جدیدیت کی طرف آ رہا ہے اور تم ابھی تک اسی فرسودگی سے چمٹے ہو۔''

''شاید اس لیے کہ سوراتی کا تعلق جس قوم سے ہے وہ ہر طاقتور کے آگے سر جھکانا اپنا ایمان سمجھتی ہے جبکہ ہم مسلمان ایسا نہیں سمجھتے۔'' میں نے کافی اُٹھا لی۔ لڑکی جان گرے کے اشارے پر واپس جا چکی تھی۔

''تبھی تم لوگ اب تک پسماندہ ہو۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ نہ جھکنے کی خاصیت ہی قوموں کو بالآخر عروج پر لے جاتی ہے۔ جو قوم ہر فاتح کے سامنے سر جھکا دے وہ جلد فنا ہو جاتی ہے جیسے اپنے زوال کے دور میں بھی یورپ نے کبھی مسلمانوں کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا حالانکہ مسلمان اس زمانے کی سپر پاور تھے۔ اگر تمہارے فلسفے یا خیال کے مطابق طاقتور کی اطاعت قبول کر لینا چاہیے تو ذرا سوچو آج یورپ کہاں ہوتا۔ کیا آج تم لوگ سپر پاور ہوتے؟''

جان گرے نے اعتراف کیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ دور دوسرا تھا۔ اس وقت مسلم سلطنتیں کتنی ہی طاقتور رہی ہوں لیکن ان کے پاس قوموں کو مٹانے کی طاقت رکھنے والے ہتھیار نہیں تھے۔ اب ہمارے پاس ایسے ہتھیار ہیں کہ چاہیں تو ہر دشمن کو صفحۂ ہستی سے نابود کر کے رکھ دیں۔''

''یہ اعزاز بھی تم لوگوں کے حصے میں آیا۔ جب سائنس تمہارے ہاتھ لگی تو تم نے اسے تخریب کے لیے مخصوص کر دیا۔ جتنا انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کیا اس سے کہیں زیادہ انسانیت کش مقاصد کے لیے استعمال کیا۔''

''طاقتور بنا سب کا حق ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہم نے اس حق کا استعمال کر لیا۔ خیر یہ بڑا وسیع موضوع ہے اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ فی الوقت تم آرام کرو، بھوک لگی ہو تو سوراتی سے کھانے کا کہہ دینا۔''

اس نے واکی ٹاکی پر سوراتی کو طلب کیا اور مجھے میرا کمرا دکھانے کی ہدایت کی۔ جب میں سوراتی کے ساتھ جانے لگا تو جان گرے نے عقب سے کہا۔ ''یوسف تم اس اپارٹمنٹ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آ جا سکتے ہو لیکن اس سے باہر نہیں۔''

''میں خیال رکھوں گا۔'' میں نے بھی مڑے بغیر جواب دیا۔

سوراتی مجھے ایک بیڈ روم میں لے آئی جو دوسرے فلور پر تھا۔ یہ فرانسیسی طرز کا اپارٹمنٹ تھا جس کے کئی فلور تھے۔ یہ کمرا سمندر کے رُخ پر نہیں تھا البتہ اس کا باتھ روم سمندر کے رُخ پر یوں تھا کہ اس باتھ روم میں پانی کے ساتھ غسل آفتابی سے بھی بیک وقت لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا۔ ''صاحب...... آپ نہائیں گے؟''

''پہلے مجھے ناشتہ دو۔'' میں نے اردو میں جواب دیا تو وہ اُچھل پڑی۔

جان گرے اس جزیرے کے بلکہ مافیا کے سرکردہ لوگوں میں سے تھا اس وجہ سے اسے عالیشان اپارٹمنٹ ملا تھا۔ اس میں کئی بیڈ روم تھے۔ سوراتی مجھے ان میں سے ایک میں لے آئی تھی اس کا خیال تھا کہ میں بھی شاید جان گرے کی طرح گورا تھا اس لیے مجھے صاف اردو بولتے سن کر حیران رہ گئی۔ ''صاحب...... آپ کو ہندی آتی ہے؟'' اس نے مسرت سے کہا۔

''اردو۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''میرا نام یوسف علی خان ہے اور میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔''

اس تعارف پر اس کا جوش وخروش ذرا مدھم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک الماری کھولی، اس میں بے شمار سوٹ، قمیصیں، پتلون، نائٹ سوٹ اور ضروری استعمال کے دیگر ملبوسات ٹنگے تھے۔ ''آپ کپڑے بدل لیں جب تک میں ناشتہ لاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''تمہاری اردو...... بلکہ ہندی خاصی صاف ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''میں نے حیدر آباد میں پرورش پائی ہے۔ میری ماں اور باپ ایک نواب صاحب کے ہاں ملازم تھے۔ میں ان کی حویلی میں کھیل کر بڑی ہوئی ہوں۔''

وہ بالکل کسی نوعمر لڑکی کی طرح تھی۔ شاید پانچ فٹ کا قد، چھریرا جسم جو اب کہیں کہیں سے بھاری ہو رہا تھا اور سُبک نقوش۔ اس نے سیاہ بالوں کی دو چوٹیاں ڈال رکھی تھیں ان کی وجہ سے اس کی کمسنی کے تاثر میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی بھی کم سن نہیں تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک لباس نکالا۔ ہلکا اور ڈھیلا سوتی ٹراؤزر ساتھ میں سفید رنگ کی ٹی شرٹ تھی۔ زخم کی وجہ سے نہا نہیں سکتا تھا اس لیے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا، جب



میں فریش اپ اور لباس کی تبدیلی کے ساتھ باہر آیا تو سوراتی ناشتہ لے آئی تھی۔ ناشتے میں خاصا اہتمام تھا اور میں نے بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ سوراتی اس دوران میں پاس کھڑی رہی۔ میں نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی تھی لیکن وہ کھڑی رہی۔ اسے با قاعدہ تربیت دی گئی تھی اور اس تربیت کا اولین اصول تھا کہ آقا اور غلام کے درمیان فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس فاصلے کو کسی صورت ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے یا زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اپنا ایک ہم زبان ملنے پر اسے فطری طور پر زیادہ بولنا چاہیے تھا۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اُٹھا کر لے گئی۔ گزشتہ دو دن سے میں زیادہ تر بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا اور دواؤں کے اثر سے جسم میں کسل مندی تھی، سر میں ہلکا سا درد تھا۔ میں نے سوراتی کو طلب کرنے کے لیے بٹن دبایا اور وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ ''جی صاحب۔''

''مجھے سر درد کی گولی لا دو۔''

''صاحب...... میں تیل لگا کر مالش کر دوں۔'' اس نے مستعدی سے پیش کش کی تو مجھے ماہ پارہ یاد آ گئیں جب میں سر درد کی شکایت کرتا تو وہ کوئی گولی دینے کے بجائے تیل سے میرے سر کی مالش کیا کرتی تھیں اس سے سر کا درد غائب ہو جاتا۔

''کیوں نہیں...... یہ تو اور اچھی بات ہے۔''

''میں ابھی لائی صاحب۔'' وہ لپک کر گئی اور تیل کی بوتل لے آئی۔ ''صاحب...... بستر پر اوندھے منہ لیٹ جائیں اور قمیص اتار دیں۔''

میں نے اس کی بات کے مطابق عمل کیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا تولیہ لائی تھی۔ اس نے وہ تولیہ میرے منہ تلے بچھایا پھر تیل سر کے بالوں میں ٹپکا کر انگلیوں سے مالش کرنے لگی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی نرم اور ملائم انگلیوں میں کیسا سرور تھا، میرے سر کا درد جیسے کھینچ کر ان انگلیوں میں جانے لگا۔ میں خواب، نیند بلکہ سکون کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ میرے سونے کے بعد سوراتی نے تولیہ سے سر صاف کیا تا کہ اضافی تیل بستر یا کپڑوں پر نہ لگے۔ میں دیر تک سوتا رہا جب آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی سی تاریکی تھی، نائٹ بلب روشن تھا۔ میں نے انگڑائی لی، کسل مندی کا احساس مٹ گیا تھا اور جسم ہلکا پھلکا ہو رہا تھا میں اٹھ کر باتھ روم میں آیا۔ یہ ایک لگژری قسم کا باتھ روم تھا جس میں نہانے کے لیے ٹب اور سونا باتھ کا انتظام بھی تھا۔ میں نے ٹب میں گرم پانی بھرا اور کپڑے اُتارنے جا رہا تھا کہ سوراتی نے دروازے پر دستک دی۔ میرے اجازت دینے پر وہ اندر آ گئی۔

''میں فی الحال تو نہانے جا رہا ہوں۔''

''میں آپ کی مدد کروں۔'' وہ آگے بڑھی، میں نے اسے روک دیا۔

''نہیں میں خود غسل کرنے کا عادی ہوں۔ تم جاؤ اور ہاں تقریباً پون گھنٹے بعد چائے لے

آنا۔"

میں نے اپنا زخم دیکھا جو تقریباً خشک ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں اب نہانے میں حرج نہیں تھا۔ گرم پانی کے ٹب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ جب میں جسم خشک کر کے اور تولیہ باندھ کر باہر آیا تو سوراتی کو وہاں پا کر جھینپ گیا۔ وہ کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لپک کر وارڈ روب کھولی۔ "کون سے کپڑے نکالوں صاحب؟"

"میں خود نکال لوں گا۔" میں اس چھوٹی سی لڑکی کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کپڑے نکالے۔ وہ بدستور کمرے میں موجود تھی۔ میں اس کے سامنے کپڑے نہیں پہن سکتا تھا۔ اس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی اور خاموشی سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے لباس تبدیل کیا۔ ٹراؤزر پہن کر میں نے پسلی کے زخم پر ہسپتال سے رخصتی کے وقت ڈاکٹر کی دی ہوئی میڈیکیٹڈ پٹی چپکائی۔ شاید یہ دواؤں کا اثر تھا جو تین دن میں زخم پوری طرح بھر گیا تھا۔ بس اب کھال پر نشان باقی رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں سوراتی چائے لے آئی۔ یہ دیسی طرز کی چائے تھی۔ ایک زمانے میں انگریز بڑے اہتمام سے اس قسم کی چائے پیا کرتے تھے مگر دیگر انگریزی روایات کی طرح چائے نوشی کا یہ انداز بھی اب باقی دنیا سے کم ہوتا جا رہا ہے، سوائے برصغیر کے۔ ہم نے انگریزوں کی دیگر برائیوں کی طرح چائے کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے۔

"صاحب...... چائے میں نے خود بنائی ہے۔" وہ کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔ اس وقت اس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا جو شانے پر محض دو ڈوریوں کے سہارے ٹکا تھا۔ نیچے یہ گھٹنوں تک تھا۔ اس نے بال چوٹیوں کے بجائے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور آج اتنی کم سن نہیں لگ رہی تھی۔ جب تک وہ چائے بناتی رہی میں اس کا معائنہ کرتا رہا۔ اس نے بھی غالباً اس معائنے کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا سانولا رنگ کس قدر سرخی مائل ہو گیا تھا۔ اس نے چائے تیار کر کے میری طرف بڑھائی۔

"سوراتی......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے بے اختیار بات کاٹی۔

"صاحب...... ہمارا نام سوراتی نہیں سرسوتی ہے۔ سوراتی تو جان صاحب کہتا ہے۔"

بات کاٹ کر وہ ذرا سہم گئی تھی۔ میں مسکرایا۔ "گڈ...... اچھا کیا تم نے مجھے اپنا اصل نام بتایا۔ میں کہہ رہا تھا کہ تم کتنے دنوں سے یہاں ہو؟"

اس نے حساب لگایا۔ "صاحب یہاں آئے ہمیں تین مہینے ہو گئے ہیں۔"

"اس سے پہلے تم کہاں تھیں؟"

"اپنے گھر...... اپنے گاؤں میں۔"

"تم نے بتایا تھا کہ تم کسی نواب کے محل میں پلی بڑھی ہو۔"

"ہاں...... پر دو سال پہلے نواب کی ملازمت چھوڑ کر باپو مجھے اور ماں کو لے کر گاؤں آ گیا۔





ہم ساحل کے پاس رہتے تھے گاؤں میں مچھیرے تھے۔ باپو بھی مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا۔" وہ کہتے کہتے اُداس ہو گئی۔

اس سے آگے کی کہانی افسوس ناک تھی لیکن میں جانتا تھا یہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے۔ غربت جہاں پنجے گاڑتی ہے سب سے پہلے عورتوں کا خون پیتی ہے۔ عام غربت کی سب سے زیادہ کمبختی اس صنف پر آتی ہے۔ وہ چپ رہی اور میں چائے پیتا رہا پھر اس نے خود ہی کہا۔ "میری شادی ہونے والی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا۔ میں باپو کے ساتھ ساحل پر مچھلی صاف کرنے جاتی تھی۔ باپو ذرا دیر کے لیے مجھے چھوڑ کر گیا اور چند آدمیوں نے مجھے اُٹھا لیا وہ مجھے اپنی کشتی پر لے گئے اس وقت مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کیا ہوتے ہیں۔ دو دن ان کے ساتھ کشتی پر رہ کر مجھے ان تعلقات کی ہر قسم کی سمجھ آ گئی تھی۔ جب ان کا دل بھر گیا تو......" وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گئی پھر بولی۔ "صاحب مجھے معاف کرنا میں بھول گئی تھی۔" وہ معاً روتی ہوئی اُٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔ میرا دل اتنا بوجھل ہو گیا کہ میں نے چائے کی پیالی رکھ دی اب دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

جان گرے نے مجھے اپارٹمنٹ کی حد تک گھومنے پھرنے کی آزادی دی تھی۔ میں کمرے سے نکلا اور ٹیرس میں آ گیا۔ جان گرے کے بغیر یہ جگہ اچھی لگ رہی تھی۔ نیچے بندرگاہ نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس میں جاری سرگرمیوں کی آوازیں اوپر تک آ رہی تھیں۔ ایک نسبتاً بڑے ٹرالر کا کنارا بھی نظر آ رہا تھا۔ سامنے وہ چٹانیں تھیں جنھوں نے خلیج کو کھلے سمندر سے جدا کر رکھا تھا۔ ان چٹانوں پر سے نیلگوں سمندر جھلک رہا تھا۔ روشنی کم ہو رہی تھی اور سمندر پر شکار کی تلاش میں منڈلانے والے سی ایگلز واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ جزیرے کی یہ جغرافیائی پوزیشن باقی جزیرے سے مکمل طور پر مختلف تھی۔ دیگر سمتوں میں جزیرہ ہرا بھرا اور ریتیلے ساحل کا تھا جبکہ یہاں پر چٹانیں تھیں یا پانی۔

سرسوتی نے آ کر ٹیرس کی روشنی جلائی۔ میں نے سوچا جس طرح اس جگہ سے کھلا سمندر نظر آ رہا ہے اس طرح کھلے سمندر سے یہ جگہ بھی نظر آتی ہوگی۔ اگر اس وقت سمندر سے کوئی بحری جہاز یا ٹرالر گزر رہا ہو تو اسے ان اپارٹمنٹس کی روشنیاں نظر آ سکتی ہیں۔ ان لوگوں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ انہیں اس طرف سے کسی بحری جہاز کے گزرنے کا خدشہ نہیں ہے۔ غالباً یہ بحری جہازوں کی عام گزرگاہ سے خاصی ہٹ کر تھی۔ میں ٹیرس پر کھڑا تھا یک دم نیچے جاری ہنگامے میں تیزی آ گئی۔ میں نے جھک کر دیکھا چٹانوں کے درمیان ایک خاصے بڑے سائز کا بحری جہاز حرکت کر رہا تھا بلکہ بندرگاہ کی طرف آ رہا تھا جب تک پانی نے اجازت دی بحری جہاز خود حرکت کرتا رہا پھر بندرگاہ کی طرف سے فولادی راڈز نمودار ہوئیں ان کے سرے پر زنجیریں تھیں جب یہ راڈز بحری جہاز کے پہلو تک پہنچیں تو عرشے پر موجود افراد نے زنجیریں پکڑ کر عرشے پر نصب کنڈوں سے باندھ دیں پھر بندرگاہ سے ان

راڈز کو واپس کھینچا گیا اور بحری جہاز بھی ان کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔ گویا یہ میکنزم جس کی مدد سے اس تنگ سی جگہ پر بحری جہازوں کو بندرگاہ کی برتھ تک لایا جاتا تھا۔ ان قزاقوں نے جزیرے پر ایک مکمل سسٹم بنا رکھا تھا۔ یہ بحری جہاز بھی مجھے اس بحری جہاز جیسا لگا جس نے خلیج پر حملہ کر کے لوٹ مار کی تھی اور مجھے پکڑ کر اسی بحری جہاز پر لایا گیا تھا۔ گویا ان بین الاقوامی قزاقوں کے پاس اس قسم کے کئی بحری جہاز تھے۔

''صاحب۔'' عقب سے سرسوتی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ''آپ ڈنر کب کریں گے؟''

صبح کا تگڑا ناشتہ کب کا ہضم ہو چکا تھا اس لیے میں نے جواب دیا۔ ''جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔''

''اور کیا لینا پسند کریں گے صاحب؟''

''مچھلی...... فرائی اور کوئی سے چاول...... سادہ بھی چلیں گے۔''

''صاحب آج میں آپ کے لیے جھینگے والے چاول بناتی ہوں۔ آپ کو پسند آئیں گے۔''

''ضرور...... میں بھی پھیکے...... کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''اس کے لیے میں دیر تک انتظار بھی کر سکتا ہوں۔''

''بس آدھا گھنٹہ۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔ میں نے لاؤنج میں آ کر وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ کیبل ٹی وی سے بے شمار چینلز آ رہے تھے۔ میں نے ایک پاکستانی چینل ٹیون کیا۔ یہ کوئی میوزک چینل تھا جس پر آنے والا سنگر بھی پاکستانی تھا مگر ویڈیو شاید انڈیا یا ہالی وڈ کی پیروی میں بنائی گئی تھی۔ بور ہو کر میں نے ایک نیوز چینل لگایا جہاں سے فلسطین کے حالات پر تبصرے جاری تھے۔ ان تبصروں میں جھوٹ کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا تھا کہ مارے جانے والے نہتے فلسطینی دہشت گرد اور انہیں مارنے والے یہودی فوجی امن کے علم بردار دکھائی دے رہے تھے۔ طیش میں آ کر میں نے یہ چینل بھی بدل دیا۔ باقی مغربی چینل سے تفریح کے نام پر ایسی خرافات پیش کی جا رہی تھیں کہ اس تفریح سے شیطان بھی شرما جائے۔ حتیٰ کہ ایک ماحولیاتی چینل سے جانوروں کے ازدواجی تعلقات پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی جا رہی تھی۔

سرسوتی نے وعدے کے مطابق سچ مچ آدھے گھنٹے میں کھانا تیار کر دیا۔ وہ ٹرالی میں سجا کر کھانا لے کر آئی اور لاؤنج میں میز پر سجانے لگی۔ فرائی فش کے علاوہ جھینگے والے چاول تھے اور میٹھے میں پڈنگ تھی۔ اس نے کھانا سجا دیا تو میں نے کہا۔ ''آؤ تم بھی میرے ساتھ کھاؤ۔''

اس پیشکش پر پہلے تو وہ ششدر رہ گئی۔ پھر اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسی بات مت کریں...... جان صاحب میری کھال اُتار دیں گے۔ ہم ملازم ہیں، آقا کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے۔''




''بھاڑ میں گئے آقا...... میں آقا نہیں ہوں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''تمہاری طرح ایک بے بس اور مجبور قیدی ہوں۔ ہم دونوں برابر ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ آقا کے مہمان ہیں اس لیے آقا کی طرح ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی صاحب۔''

''تب میں بھی نہیں کھا رہا۔'' میں نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

''بھگوان کے لیے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''آپ کو نہیں معلوم صاحب کہ یہ لوگ کتنے ظالم ہیں...... یہ دیکھیں میری پیٹھ۔'' اس نے دوسری طرف رُخ کر کے اپنے میکسی نما لباس کی ڈوریاں شانے سے گرا دیں۔ اس کا لباس کمر تک اُتر گیا۔ اس کی نازک سی پشت پر بے شمار سیاہ لکیریں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ میں نے نظریں پھیر لیں۔

''پلیز اپنا لباس درست کرو۔''

وہ لباس ٹھیک کر کے میری طرف گھومی۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ پھر ایسا ہی سلوک کیا جائے؟''

''تمہارے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کرے گا۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ اب کھانا کھاؤ اور سب خوف دل سے نکال دو۔''

اس بار وہ جھجکتی ہوئی آ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے کھانا نکالا اور خاموشی سے کھانے لگے۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتی رہی۔ کھانا واقعی لذیذ اور مشرق کے مخصوص ذائقے سے بھرپور تھا۔ میں نے رغبت سے کھایا۔ شروع میں وہ تھوڑی شرماتی رہی پھر اس نے کھل کر کھانا شروع کیا۔ چھوٹے جثے کے باوجود اس کی خوراک اچھی تھی۔ پھر وہ مسکرانے اور باتیں کرنے لگی۔ وہ بھی ایسے ماحول اور برابری کی سطح پر کسی سے بات کرنے کو ترسی ہوئی تھی اس لیے میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے بے حد خوش نظر آ رہی تھی شاید اس لیے بھی کہ اس کا جابر آقا جان گرے اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ وہ کہیں گیا ہوا تھا، باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک بولی۔

''صاحب اس اچھے سمے کے بدلے مجھے موت بھی آ جائے تو ہنسی خوشی قبول کر لوں۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔''

''مجھے جو ملا ہے اس نے مجھے اپنی عمر سے زیادہ کر دیا ہے صاحب۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''ابھی میری عمر اٹھارہ سال ہے لیکن مجھے لگتا ہے میں نے اٹھارہ صدیاں بتا دی ہیں۔''

''تمہارے ساتھ واقعی افسوسناک ہوا ہے مگر اس جزیرے پر تو سب مظلوم ہیں اور جو ان کے علاوہ ہیں وہ ظالم ہیں۔''

''آپ دیکھیے گا صاحب۔'' سرسوتی نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''ان ظالموں پر بھگوان کا قہر نازل ہوگا۔''

''سرسوتی یہ لوگ......'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔ سرسوتی کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے تھے جیسے اس نے کوئی جیتا جاگتا بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے پلٹ کر اس کی پھٹی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ لیونگ روم کے دروازے پر جان گرے کھڑا سرد نگاہوں سے سرسوتی اور مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ سرسوتی لرزتے بدن کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''صص......صاحب......میں نہیں......یوسف صاحب نے......خود......''

''میں نے اسے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا تھا۔'' میں نے جان گرے سے کہا۔

''یہ بات اس جزیرے کے اصول کے خلاف ہے کوئی غلام اپنے آقا کی برابری نہیں کرسکتا۔ تم نے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔'' اس نے دوسرا جملہ سرسوتی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ''اب جاؤ اور اپنی سزا کا انتظار کرو۔''

سرسوتی لرزتے بدن کے ساتھ وہاں سے گرتی پڑتی بھاگ نکلی۔ اس کے جانے کے بعد میں جان گرے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں بھی ایک طرح سے سرسوتی کی سطح کا شخص ہوں اس لیے اس نے میرے ساتھ کھانا کھا کر کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔''

''اس وقت تم میرے مہمان ہو اور میری سطح کے آدمی ہو اس لیے خلاف ورزی ہوئی اور کیونکہ تم بھی اس میں شامل ہو اس لیے کچھ نہ کچھ سزا تمہیں بھی ملے گی۔''

''کیسی سزا؟'' میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کا انداز مجھے شرارت آمیز لگ رہا تھا۔

''اچھی سزا ہے۔ اگر تم اس لڑکی سرسوتی کے ساتھ ایک رات گزارو تو اس کی اور تمہاری خطا معاف کی جاسکتی ہے۔''

''یہ کیسی سزا ہے؟'' میں نے گڑبڑا کر دریافت کیا۔

''مزے کی سزا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''اب تم انکار کرتے ہو تو تمہیں تو میں واپس ڈیئر ڈان کے پاس بھجوا دوں گا۔''

''سرسوتی کو کیا سزا ملے گی؟''

''اسے......'' اس بار جان گرے کا لہجہ سفاک تھا۔ ''اسے میں سچ مچ خوفناک سزا دوں گا اس نے اپنی تربیت کے بنیادی اصول کو پامال کیا ہے۔ میں اسے ان کے حوالے کردوں گا جو اسے مرتے دم تک پامال کرتے رہیں گے۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' میں لرز گیا۔

''میں ایسا نہیں کروں گا بلکہ سرسوتی کو صرف اپنی رپورٹ کے ساتھ اس ادارے میں واپس بھجوا دوں گا جہاں ان لوگوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ وہاں پر اسے سب کے سامنے سزا دی جائے گی اس سے ان زیر تربیت غلاموں کو عبرت ہوگی۔''





میں نے کراہیت سے اسے دیکھا۔ ''اور تم لوگ خود کو مہذب کہتے ہو۔''

''ہر معاشرے کی اقدار ہوتی ہے لیکن اس جگہ کی تہذیب یہی ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے جلدی سے اپنا فیصلہ سناؤ تاکہ میں اپنا فیصلہ سنا سکوں۔''

''میں تیار نہیں ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور اگر تم نے کہیں رپورٹ کی تو میرے تعاون سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں تمہارے کام آنے کے بجائے مرنے کو ترجیح دوں گا۔''

جان گرے یوں مسکرایا جیسے میرا دعویٰ کسی بچے کی گپ سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ ''یوسف میرا کام تو ہر صورت کرو گے لیکن اس لڑکی کے بارے میں تم نے نہیں سوچا۔ وہ بے چاری تمہاری وجہ سے ماری جائے گی اسے بچانے کے لیے کیا تم اس کے ساتھ ایک رات نہیں گزار سکتے۔''

''لگتا ہے تم صرف اپنی خباثت کی تسکین چاہتے ہو۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ ہنسا۔ ''پھر ایسا ہی سہی۔ مجھے تسلیم ہے مجھ میں اس قسم کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی ہیں گویا میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں پھر معاملہ اصول کا بھی ہے۔ میں صرف تمہاری خاطر اس لڑکی کو اذیت ناک سزا سے بچا سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم مان جاؤ۔''

''اگر میں اس لڑکی کے ساتھ رات گزار بھی لیتا ہوں تو تمہیں اس کا کیا فائدہ ہوگا؟''

''بس مجھے ایک طرح سے تسکین ہوگی۔'' اس نے شانے ہلائے پھر اپنی گھڑی میں دیکھا۔

''تم نے وقت بحث میں گنوا دیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نما آلہ نکالا اور نمبر پنچ کر کے بولا۔ ''ڈینی کو بھیجو ابھی۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔''

جان گرے مسکرایا۔ ''مجھے معلوم تھا۔'' پھر اس نے موبائل پر کہا۔ ''فی الوقت ڈینی کو روک لو۔''

''تم پستی کے آخری درجے سے بھی نیچے ہو۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

''میں لوگوں کو ایسے ہی مجبور کرتا ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اور جو میری بات مان جاتے ہیں، میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ پھر وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔''

''کیا میں باہر نہیں جا سکتا۔'' میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

''فی الوقت نہیں لیکن دو تین دن میں تم میرے ساتھ ایک بھرپور مہم پر چلو گے۔ اس دوران میں تمہیں دکھاؤں گا کہ ہم کتنے طاقتور ہیں۔''

''دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم لوگوں کی فیکٹریاں دن رات اسلحہ بنانے میں مصروف ہیں۔''

''سننے اور خود دیکھنے میں جو فرق ہے وہ تم خود محسوس کرو گے۔''

''اچھا اب مجھے اجازت دو۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں تمہاری صورت مزید نہیں دیکھنا چاہتا۔''

"لڑکی کچھ دیر میں تمہارے کمرے میں آ جائے گی۔"

"شکریہ۔" میرا لہجہ زہریلا تھا۔

"اور ہاں...... صبح اس کا طبی معائنہ ہوگا اگر تم نے اس کے پاس آنے سے گریز کیا تو تمہیں معلوم ہے پھر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں آ کر اپنے غصے کو قابو کرنے کے لیے ایکسر سائز کرنے لگا۔ جب ذہن ذرا پُرسکون ہوا تو مجھے آنے والے لمحات کی فکر کھانے لگی۔ اول تو میں اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ جنسی تسکین میرے نزدیک ایک معاہدے کے بغیر گناہ سے کم نہیں تھی۔ جس کی نہ تو ہمارا مذہب اجازت دیتا ہے اور نہ ہی معاشرہ، میں کاجل کی محبت کا اسیر تھا جس طرح وہ خود کو میری امانت سمجھتی تھی اسی طرح میں خود کو اس کی امانت سمجھتا تھا۔ اس سے بے وفائی کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں اس امانت کو امانت رکھنے میں کامیاب رہا تھا لیکن آج جان گرے نے میرے اور کاجل کے اس اَن لکھے اور اَن کہے معاہدے کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

میں پنجرے میں بند جانور کی طرح بے تابی سے ٹہل رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "آ جاؤ۔" دروازے پر سرسوتی کھڑی جھجک رہی تھی اور میں اسے اندر بلاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ بالآخر وہ خود ہی اندر آ گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ کھڑی خاموشی سے انگلیاں مروڑتی رہی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "سرسوتی تمہیں شاید معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری سزا کس شرط پر معاف کی جائے گی۔"

اس نے سر ہلایا۔ "جان صاحب نے بتایا تھا۔"

"سرسوتی...... میں تمہیں اختیار دیتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں انگلی بھی نہیں لگاؤں گا۔"

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "صاحب اس معاملے میں میرا اختیار کہاں ہے۔ اگر میں آپ کو منع کروں اور جان صاحب کو پتا چل گیا تو وہ مجھے ان درندوں کے حوالے کر دے گا۔ وہ مجھے نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ اس سے تو بہتر ہے......" اس کی زبان شرم نے روک دی تھی۔

میں نے سرد آہ بھری...... لگتا تھا کہ کاجل سے بے وفائی کا گناہ میرے مقدر میں رقم کر دیا گیا تھا۔ بے شک سرسوتی سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا وہ میری ہم مذہب اور ہم وطن بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ انسان تھی اور پھر میری وجہ سے وہ سزا پانے جا رہی تھی۔ میرا ضمیر کسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کو میری وجہ سے انسانیت سوز سزا ملے۔ میں نے اس سے کہا۔

"چائے یا کافی ملے گی۔"

"ابھی لائی صاحب۔" وہ جیسے کھل گئی۔ "چائے لاؤں یا کافی۔"

"کافی...... سیاہ اور تلخ۔" میں نے فرمائش کی وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ شاید میرا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ مجھے ذرا اب تعجب ہوا تھا۔ میرے لیے یہ قابلِ سزا بات تھی۔ مجھے





شرمندگی ہو رہی تھی۔ سرسوتی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے خود بتایا کہ وہ اغوا ہوئی اور اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھی، نہ جانے کتنے ہاتھوں سے گزر کر وہ جان گرے کے پاس آئی۔ اور جان گرے کے بھنبھوڑنے کے نشان میں اس کے جسم پر دیکھ چکا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ مرد اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا لیکن وہ مجھ سے اس طرح شرما اور گھبرا رہی تھی جیسے پہلی بار کسی مرد کی خلوت میں آ رہی ہو۔

ذرا دیر میں وہ کافی لے آئی۔ اس بار وہ کسی قدر بااعتماد تھی۔ اتنی کہ اپنے لیے بھی لے آئی تھی۔ حالانکہ اس کی سزا ہی اس جرم میں دی جا رہی تھی کہ اس نے میرے ساتھ کھانا کھانے کی جرأت کیوں کی تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا...... اگر جان گرے کو پتا چل گیا کہ تم میرے ساتھ کافی پی رہی ہو تو وہ تمہیں سزا دے گا۔"

"اب وہ مجھے سزا نہیں دے سکے گا۔" سرسوتی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور اطمینان سے کافی پینے لگی۔ سپ لے کر اس نے میری طرف دیکھا۔ "اگر وہ آج جیسی سزا ہی دے تو میں ہزار بار آپ کے ساتھ کھانے کا جرم کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا اس کے معصوم چہرے پر سرخی پھیلی تھی۔ پھر اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ "صاحب آپ کسی سے محبت کرتے ہو؟"

"ہاں...... لیکن تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"میں صاحب...... پچھلے چند مہینے میں جو لمحے میں نے گزارے ہیں مجھے لگتا ہے مجھے مردوں کے اندر تک جھانکنے کی شکتی مل گئی ہے۔ میں نے آپ کا اندر دیکھ لیا ہے۔ آپ کسی کو ٹوٹ کر چاہتے ہو اور بس اس کے ہی رہنا چاہتے ہو۔"

میں نے اعتراف کیا۔ "یہ بات درست ہے۔ ایک لڑکی ایسی ہے جو میرے لیے جیتی ہے اور میں اس کے لیے۔"

"وہ بہت خوش نصیب ہے صاحب۔" سرسوتی کے لہجے میں مسرت تھی۔

"سرسوتی...... تم مجھے صاحب کے بجائے نام سے پکارو۔"

"صاحب...... یوسف ادھر یہ بھی جرم ہے کہ کوئی غلام یا خادمہ اپنے آقا کو نام سے پکارے۔ پر آپ نے کہا ہے تو میں آپ کو نام سے ضرور پکاروں گی۔"

"شکریہ سرسوتی۔" میں نے کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔

"آپ...... مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتائیں گے یوسف۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "اتنا بتا سکتا ہوں۔ جتنا میں اسے جانتا ہوں اتنا خود کو نہیں جانتا وہ ایسی ہے جیسے کوئی خود مختار ملکہ اپنی رعایا پر حکمران ہوتی ہے اس طرح وہ مجھ پر حکمرانی کرتی ہے۔ میرا دل اور میرے احساسات اس کے لیے ہیں۔"

"دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے؟" سرسوتی کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"چمکتا سانولا رنگ جیسے سونے میں لوہے کی آمیزش کر دی جائے۔ ناک نقش نازک سے دوسروں کا نہیں پتا لیکن وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اس کی سیاہ آنکھیں اس کے سیاہ بال اس کا سراپا، اس کی ادائیں اور اس کی باتیں سب میرے لیے ہیں۔"

"وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔"

"محبت!" میں ہنسا۔ "اگر اسے پتا چل جائے کہ میں اس وقت کسی لڑکی سے بات کر رہا ہوں تو اس کا تن بدن جل جائے اور یہاں آ جائے تو میری شامت آ جائے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وہ کرید کرید کر مجھ سے کاجل اور میری گزشتہ زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں جس حد تک ممکن ہوا اسے بتاتا رہا۔ رات بیت رہی تھی۔ رات گیارہ بجے کے قریب اس نے پھر کافی کا پوچھا اور میں نے سر ہلا دیا۔ وہ اُٹھ کر کافی لینے گئی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے۔ ڈریسنگ روم میں نائٹ سوٹ بھی تھے۔ وہ کافی لے کر آئی تو میں بستر پر دراز ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ اس نے ٹرے بستر پر رکھ دی۔ نرمی سے میرے برابر میں آ کر اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا تھا۔ میں نے بازو اس کے گرد حائل کر دیا۔ اس نے ایک کپ اُٹھا کر مجھے دیا اور دوسرا خود اُٹھا لیا۔

"میں ساری زندگی اس لڑکی سے شرمندہ رہوں گی۔" سرسوتی نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے اس کے حق کا ایک چھوٹا سا حصہ حاصل کیا ہے۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ "جیسے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میرا قصور ہے۔ میرا پہلا قصور تو یہی ہے کہ میں ایک کمزور اور غریب لڑکی ہوں۔ میرا اتنا جرم ہی دنیا کے درندوں کے لیے کافی ہے کہ وہ سزا میں مجھے بھنبھوڑ کھائیں۔" اس کے انداز میں کافی کی سی تلخی تھی۔

اس کا جسم دُبلا ہونے کے باوجود اپنے اندر گداز اور دلکشی رکھتا تھا لیکن اس کی گدازی اور گرمی نے میرے جذبات میں اشتعال پیدا نہیں کیا بلکہ کافی پی کر میں اپنے ذہن کو ہلکا محسوس کرنے لگا اور پھر یہ ہلکا پن بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نے چونک کر سرسوتی کو دیکھا اس نے نرمی سے میرے ہاتھ سے کپ لے لیا۔ اپنا کپ جو ابھی بھرا ہوا تھا اس نے ٹرے سمیت اُٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ پھر آ کر مجھے بستر پر لٹایا۔ اس نے میرا چہرہ سہلایا اور سہلاتے ہوئے جھک آئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، ذہن پر غبار چھا رہا تھا۔ میرا آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور نہ جانے کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنی نرم آغوش میں سمیٹ لیا۔ خواب میں مَیں نے کاجل کو اپنے پاس دیکھا لیکن وہ کاجل نہیں وہ سرسوتی تھی یا شاید کاجل ہی تھی پھر خواب ختم ہو گیا۔ میں حقیقت کی دنیا میں آنے لگا۔ شعور رفتہ رفتہ بے دار ہو رہا تھا مجھے محسوس ہوا جیسے میرے بازو کے دہانے میں ایک نرم و نازک جسم ہے لیکن یہ جسم





گرم نہیں تھا بلکہ بے پناہ سرد تھا۔ موت کی طرح۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔



میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ حنیف بڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ میرے سر پر بیٹھا مجھے آہستہ سے آواز دے کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اچانک اُٹھا تو وہ ڈر گیا تھا۔ "صاحب...... میں ہوں حنیف۔"

"تم...... اس وقت۔" میرے منہ سے نکلا کیونکہ روشندان تاریک تھا اور اس کا مطلب تھا ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پھر میرے اندر امید کی کرن جاگی۔ شاید حنیف نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس وجہ سے وہ چپکے سے رات کے اس پہر آیا تھا۔

"صاحب...... انہوں نے مجھے بھی ادھر ڈال دیا ہے۔" اس نے دُکھی لہجے میں بتایا۔

"تمہیں بھی۔" مجھے مایوسی ہوئی۔ "لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں...... یہ سب کہیں جا رہے ہیں۔ اس لیے مجھے بھی ادھر بند کر گئے۔"

میری مایوسی ذرا کم ہوئی تھی۔ "یعنی جب یہ آئیں گے تو تمہیں ادھر سے نکال لیں گے؟"

"ہاں...... گل خان نے یہی کہا تھا۔ وہ لوگ کسی اہم کام سے جا رہے ہیں۔ ہتھیار بھی نکالے تھے۔ وہ بتانے لگا۔ میں سو رہا تھا مجھے جگا کر لائے اور تہہ خانے میں جانے کو کہا۔"

"کیا تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔" میں نے پُر امید نظروں سے اوپر کی طرف دیکھا۔

اس نے سر ہلایا۔ "پر باہر والا بند ہے۔"

"حنیف ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا ہے کہ میرا اور تمہارا وقت قریب ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "جس روز بھی انہوں نے یہ ٹھکانہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا یہ مار کر ہمیں ادھر ہی گاڑ جائیں گے۔"

"نہیں۔" اس کے حلق سے سہمی ہوئی آواز نکلی۔

"تم دیکھنا یہی ہوگا۔" میں نے اسے مزید ڈرایا۔ "اس وقت شاید تم میرا ساتھ دینا چاہو لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

"میں کیا کروں صاحب؟" اس نے مرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اب بھی وقت ہے میرا ساتھ دو۔ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے اور خدا نے چاہا تو کامیاب بھی رہیں گے۔ ورنہ ان لوگوں سے کسی خیر کی امید نہیں ہے۔ یہ رحم کھانے اور کسی کی جان بخشنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"آپ کس طرح باہر نکلیں گے جبکہ میں جب بھی باہر جاتا ہوں گل خان یا جو کوئی بھی ہوتا ہے وہ تسلی کر کے دروازہ باہر سے کھولتا ہے، اوپر چھپنے کے قابل بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی روشنی ہوئی تو اوپر چل کر دیکھیں

گے۔''

''ان لوگوں کے پاس پستول ہوتا ہے صاحب...... آپ کے ساتھ مجھے بھی گولی مار دیں گے۔'' وہ ابھی تک ڈرا ہوا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں جو منصوبہ بناؤں گا اس میں ناکامی کا امکان کم سے کم ہوگا۔ ورنہ میں پاگل تھوڑا ہوں جو خودکشی کرلوں۔''

اصل میں حنیف کو شبہ تھا کہ میں ان چار مشٹنڈوں پر قابو پا بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس کا مشکوک ہونا بجا تھا لیکن مجھے اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ میں صبح کا انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ روشندان سے سفیدی جھلکنے لگی۔ میں نے حنیف سے پوچھا۔

''کیا کتے آزاد ہیں؟''

''وہ چوبیس گھنٹے دن رات کھلے رہتے ہیں۔''

''انہیں کھانا کون دیتا ہے؟''

''میں ہی دیتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ انہیں کھانے میں کوئی زہر یا سونے کی دوا دے دی جائے۔''

''زہر یا دوا ہوتی تو اب تک انہیں دے چکا ہوتا۔'' حنیف کا اشارہ ان بدمعاشوں کی طرف تھا۔

''تم کوٹھی کے صحن میں دیکھو۔ اکثر جگہوں پر اگر دیکھ بھال نہ کی جائے تو خودرو پودے اُگ آتے ہیں۔ ان میں بعض پودے اور بوٹیاں زہریلی ہی ہوتی ہیں۔''

حنیف چونکا پھر اس نے ذرا پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہاں صاحب...... ایک پودا دیکھا ہے۔ اس کے پتوں سے دودھ جیسی کوئی شے نکلتی ہے، اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ زہر ہوتا ہے۔''

''بس تو وہی کتوں کو رات میں ڈال کر دے دو۔''

''میں ایسا کر کے دیکھوں گا۔ پر انہیں مجھ پر شبہ نہ ہو۔''

''تم پر شبہ کیوں ہوگا اگر کتے مرے یا بیمار پڑے تو کہہ دینا کہ جھاڑیوں سے خود ہی کچھ کھا گئے ہوں گے۔''

اس نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''صاحب تمہارا دماغ خوب چلتا ہے۔''

''کتوں سے نجات مل جائے تو سمجھو کام آدھا ہوجائے گا۔''

''صاحب...... وہ...... آپ نے انعام کی بات کی تھی۔''

''بات نہیں وعدہ کیا تھا۔ انعام بھی ملے گا اور پکی نوکری بھی۔ بلکہ تم کہو تو راولپنڈی کے بجائے تمہیں کراچی میں نوکری دلوا دی جائے گی۔ مستقبل میں بھی تم ان لوگوں کے شر سے محفوظ رہو گے۔''





''ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا صاحب۔'' وہ خوش ہوگیا تھا۔

روشنی خاصی ہوگئی تھی اس لیے ہم اُٹھ کر اوپر آئے، میں نے دروازے کی جھریوں سے باہر دیکھا۔ فی الوقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب بھی حنیف نیچے آتا تھا ان چاروں میں سے کوئی نہ کوئی فرد اوپر رہا کرتا تھا۔ کسی کے نہ ہونے کا مطلب تھا کہ فی الوقت حویلی میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا تھا۔ یہ چابی والا بڑا تالا تھا اور دروازے کے اندر سے اسے کھولنا ناممکن تھا اسے باہر سے ہی کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا کہ اسے کس طرح توڑا جا سکتا ہے لیکن یہ امکان خاصا مشکل تھا۔ اول تو یہاں پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے دروازے کی کنڈی کاٹی جا سکتی اور اگر مل بھی جاتی تو اس سوا انچ موٹی کنڈی کو کاٹنے میں کتنی دیر لگ جاتی۔ میں نے دائیں بائیں موجود کمروں کا جائزہ لیا گیلری کے بائیں طرف بڑے کمرے میں کھڑکی تھی لیکن اس پر بھی بے حد موٹی فولادی گرل تھی اسے کاٹنا اور بھی دشوار بشرطیکہ کوئی کاٹنے والی چیز مل جاتی، کمرے اور گیلری بالکل صاف تھے وہاں انہوں نے معمولی سا تنکا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ واش روم میں بھی سوائے ایک پلاسٹک کے لوٹے کے اور کچھ نہیں تھا۔ حنیف کی مدد حاصل کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن وہ بزدل شخص تھا اور اس کے اوپر مکمل اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں دروازے کا معائنہ کر رہا تھا کہ میری نظر اس کے نچلے حصے پر لگی چار انچ چوڑی افقی پٹی پر پڑی اس کی وجہ سے نیچے کا چھ انچ کا خلا کسی کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ تھا لیکن یہ آڑ بھی بے کار تھی اول تو میں چھ انچ کا نہیں تھا۔ دوسرے باہر کا نگران بیٹھا نہیں ہوتا بلکہ کھڑا ہوتا اور وہ ایک نظر نیچے ڈالتا تو میں اسے صاف نظر آ جاتا۔ یہ تدبیر بھی بے کار تھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے مایوسی سے سوچا۔ حنیف جو میرے ساتھ لگا تھا اس نے مجھے مایوس دیکھا تو خود بھی حوصلہ ہارنے لگا۔

''صاحب...... میں نے کہا تھا نا...... یہ بہت مشکل ہے۔'' میں نے جلدی سے چہرے پر بشاشت طاری کر لی۔

''ارے نہیں یار...... میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس دروازے کو توڑنا ممکن نہیں ہے البتہ تمہاری مدد سے یہاں سے نکلنا عین ممکن ہے۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''میں تمہارے عقب میں کھڑا ہو جاؤں گا اس طرح اسے نظر نہیں آؤں گا جو باہر سے دروازہ کھولے گا۔''

''آپ میرے پیچھے کس طرح چھپو گے؟'' اس نے اپنے مقابلے میں میرا جثہ دیکھا۔ میرا قد اس سے کوئی چار پانچ انچ زیادہ تھا اور وہ میرے مقابلے میں خاصا دُبلا تھا۔

''اگر اندر تاریکی ہو تو باہر سے میں نظر نہیں آؤں گا۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''اور اندر تاریکی کیسے کی جائے۔ بلب بجھا دیا تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے کہ فیوز ہی اُڑ جائے۔'' میں نے اس کا حل پیش کیا۔

''یہاں بیٹھ کر ہم فیوز کیسے اُڑائیں گے؟''

''اُڑا سکتے ہیں۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ پچھلے دنوں میں ابن صفی کی عمران سیریز پڑھ رہا تھا اس میں ابن صفی کا کردار عمران فیوز اُڑانے کے لیے ایک ترکیب استعمال کرتا ہے یعنی سکہ بلب کے ہولڈر میں رکھ کر اوپر سے بلب لگا کر بٹن آن کرتا ہے اور فیوز اُڑ جاتا ہے۔ میں نے حنیف سے کہا۔ ''تمہارے پاس چار آنے یا دس پیسے کا سکہ ہوگا۔''

اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''پیسے تو نہیں پر میں حاصل کر لوں گا۔''

''اگر سکہ نہ ملے تو اس سائز کی کوئی گول اور چپٹی دھاتی چیز لے آنا اس سے بھی کام چل جائے گا۔''

جب ہم گیلری کے باہری دروازے کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے تو دو عدد دیو قامت رشین کتے ہانپتے ہوئے وہاں آ گئے۔ رکھوالی کے لیے یہ اچھے کتے ہوتے ہیں بس ان میں ایک خرابی ہوتی ہے اگر یہ کسی ایک کے ہاتھ سے کھانے کے عادی نہ ہوں تو انہیں کوئی بھی کھلا سکتا ہے اور اس طرح ان کتوں کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ انہیں بھوک بھی بے پناہ لگتی ہے۔ یہ ڈالے جانے والے کھانے پر جھپٹنے میں دیر نہیں کرتے۔ اس قسم کے کتوں کی موجودگی نیک فال تھی۔

''تم انہیں با آسانی آک کا دودھ ملا گوشت دے سکتے ہو اور کوشش کرنا کہ دودھ اچھی تعداد میں ملا کر رات انہیں اس وقت دینا جب یہ بھوک سے بالکل بے تاب ہو جائیں۔ ممکن ہے اگر بھوک شدت کی نہ ہو تو یہ زہریلا گوشت کھانے سے گریز کریں۔''

''میں سمجھ گیا صاحب...... آپ فکر مت کریں۔''

حنیف جو کچھ دیر پہلے تک مشکوک ہو چکا تھا اب میری پلاننگ نے اسے مطمئن کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہم اپنے منصوبے پر رات کے وقت عمل کریں گے۔ اب تم نیچے آ کر مجھے زمین پر اس پوری کوٹھی کا نقشہ بنا کر دکھاؤ۔''

ہم نیچے آئے حنیف نے لوہے کے ستونوں کا سریا باندھنے کے لیے استعمال ہونے والی ایک تار تلاش کر لی تھی اس کی مدد سے اس نے تہہ خانے کے کچے فرش پر کوٹھی کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ چار دیواری کے اندر اس عمارت میں کل پانچ کمرے تھے۔ جن میں سے دو تو اس جگہ سے یعنی تہہ خانے کے اوپر اور باقی تین کمرے جو تیار حالت میں تھے اس حصے سے ملے تھے لیکن آنے کا واحد راستہ گیلری کے دروازے سے گزرتا تھا۔ دوسرے حصے کے ساتھ باورچی خانہ اور سٹور ہی تھے۔ ان کے سامنے برآمدہ تھا اور آگے بڑا سا کچن صحن۔ مین گیٹ اس صحن کے دائیں طرف تھا اور یہ اس تہہ خانے سے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ حنیف نے بڑے اچھے انداز میں کوٹھی کی ساخت کی مکمل وضاحت کی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر کے زمین سے مٹا دیا کہ مبادا ان لوگوں میں





سے کوئی آئے اور فرش پر بنا نقشہ دیکھ کر مشکوک ہو جائے۔ اس سے پہلے میں نے حنیف سے دروازوں اور کھڑکیوں کی لوکیشن پوچھ کر ذہن میں محفوظ کر لی تھی۔

چار دن گزر چکے تھے اور ابھی تک ایسا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ جمشید علی نے ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس صورت میں تو کم از کم گل خان میری گوشمالی پر ضرور ہی تُل جاتا اور اگر جمشید علی نے ان کا مطالبہ مان لیا تھا تو اب تک مجھے رہا کر دینا چاہیے تھا یا تو ان کی نیت میں فتور آ گیا تھا یا مطالبہ پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

''حنیف بھائی...... کیا یہ لوگ اپنی گفتگو میں ارشد بلا یا مرشد نام کے کسی شخص کا ذکر کرتے ہیں۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ ''یہ لوگ بتاتے ہیں کہ ارشد اور مرشد پولیس کے پاس ہیں اور یہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''انہیں بھی میں نے گرفتار کروایا تھا۔'' میں نے فخر سے حنیف کو بتایا پھر اسے ارشد بلا اور اس کے بھائی مرشد کی گرفتاری کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ متاثر ہوا تھا۔

''واہ جی آپ تو جی دار بندے ہو۔ آپ ان لوگوں کو بھی مار لو گے۔''

''ان شاء اللہ...... تم دیکھنا میں ان سے اپنا اور تمہارا بدلہ کیسے لیتا ہوں۔''

''ان کے پاس بڑا مال ہے جی...... میں نے خود دیکھا تھا۔'' حنیف کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا تھا۔ ''ایک بار میں اسلحے والے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پر ٹین کا بڑا سا صندوق رکھا ہے۔ اتفاق سے اس کا دروازہ کھلا تھا اور وہ چاروں اس میں رکھی نوٹوں کی گڈیاں گن رہے تھے۔ جی یہ ڈھیر تھا نوٹوں کا۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''مجھے دیکھ کر ان لوگوں نے ڈانٹا اور دھمکی بھی دی۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔''

''حنیف اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ ساری رقم بھی تمہاری ہوگی۔''

اس نے افسوسناک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آپ نے مجھے ایسا سمجھا ہے جناب...... لعنت بھیجتا ہوں اس حرام کی دولت پر جو نہ جانے کتنے لوگوں کا دل دُکھا کر جمع کی گئی ہوگی۔ بے شک مجھے روپے کا لالچ ہے، پر جی میں بے ضمیر نہیں ہوں۔''

میں شرمندہ ہو گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا حنیف بھائی...... بے شک یہ حرام کی دولت ہے اور کوئی بھی باضمیر شخص اسے قبول نہیں کر سکتا ہے۔ لعنت بھیجو اس پر...... لیکن پاپا کا دیا انعام تو قابلِ قبول ہوگا تمہارے لیے۔''

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ چہکا۔ ''یہ تو حلال ہوگا جان پر کھیل کر اسے لے لوں گا۔''

حنیف ادھم پورہ کی ایک غربا کی بستی مین رہتا تھا۔ اس کے تین بچے تھے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ محنت مزدوری کر کے وہ انہیں کھلا بھی رہا تھا اور پڑھا بھی رہا تھا۔ کچا پکا مکان اپنا تھا۔ اس لیے

روکھی سوکھی کھا کر بھی سکون سے بسر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی بیوی زرینہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کا ذکر اتنی محبت سے کرتا تھا کہ مجھے اس عورت پر رشک آتا۔ خاصی دیر گزر گئی تو میں نے حنیف کو مشورہ دیا۔

"بہتر ہوگا تم اوپر جا کر گیلری میں رہو اور تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دو۔ ایسا تاثر دو جیسے مجھ سے نفرت زدہ ہو۔ اسی طرح انہیں ہمارے تعلق کا شک نہیں ہوگا۔"

حنیف ہنسا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے تہہ خانے میں نہ بھیجیں۔ مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے ایک بار آپ مجھے مارنے کے لیے دوڑے بھی تھے۔"

"آج کے لیے بھی ایسی کوئی سٹوری سنا دینا۔" میں ہنسا۔

"آپ فکر نہ کریں جی۔" اس نے کہا۔

"آؤ ذرا ریہرسل کر لیں۔" میں بھی اُٹھ گیا۔

"کیا جی...... کیا کر لیں؟" وہ سمجھا نہیں۔

"ریہرسل...... یعنی جو کرنا ہے پہلے اس کی مشق کر لیں۔"

"اچھا جی۔" اس نے سر ہلایا۔

اوپر آ کر میں نے اسے کہا۔ "کہ وہ یوں کھڑا ہو جائے جیسے باہر دو دو نگران ہیں دروازہ کھولنے کو کہہ رہے ہو۔ اس دوران میں تم یوں کھڑے ہو جیسے دروازہ کھلتے ہی باہر نکل گئے۔ اس طرح تم قدرتی طور پر کھلنے والی جگہ سے لگ کر کھڑے ہوئے۔ اب تمہارا جسم اور چھ انچ کی دیوار مجھے چھپانے کے لیے کافی ہوگی۔ باہر دروازے کا فرش تقریباً چھ انچ اونچا ہے۔ اگر میں سر بھی جھکا لوں تو گارڈ کے لیے مجھے دیکھنا ممکن نہیں رہے گا۔"

"چلیں جی...... اس نے دروازہ کھول بھی دیا تو آپ کیا کریں گے؟" حنیف نے نقطہ اُٹھایا۔

"خوش قسمتی سے یہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور ہے بھی فولادی۔" میں نے لوہے کے راڈز پر ہاتھ مارا۔ "جیسے ہی وہ اسے کھولے گا۔ میں اور تم اکٹھے دروازہ اتنی قوت سے باہر دھکیلیں گے کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے، دروازہ اسے زخمی نہ بھی کرے تب بھی زمین پر گرا دے گا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے میں باہر نکل کر اس کے ہتھیار پر قبضہ کر لوں گا۔"

"وہ چلا کر سب کو بلا لے گا۔" حنیف نے خبردار کیا۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کا کوئی حل نہیں ہے۔"

"پھر آپ اسے گولی مار دینا جی۔"

"اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ایسا کرنا پڑے گا۔" میں نے واپس تہہ خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے وہ لوگ آنے والے ہوں۔ حنیف بھائی کوشش کرنا کہ یہ کام آج رات ہی ہو جائے۔"





"میں بھی اب یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ میرے کفن دفن کا ارادہ کر کے آئیں۔"

میرے نیچے اُترتے ہی حنیف نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے منصوبے پر غور کیا تو مجھے لگا جیسے میں ضرورت سے زیادہ بلکہ اوقات سے زیادہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔ میں ابھی مشکل سے پندرہ سال کا ناتجربہ کار نوجوان تھا جبکہ میرے مقابلے میں چھٹے ہوئے مجرم تھے اور مسلح بھی تھے حنیف نے ان کے پاس پستول اور رائفل کے علاوہ دستی بم بھی دیکھے تھے یہ خطرناک چیز صرف مستند دہشت گرد قسم کے لوگ رکھتے ہیں۔ ایک فرد پر میں کسی طرح قابو پا بھی لیتا تو باقی تین اور پھر دو عدد خطرناک کتوں پر کیسے قابو حاصل کرتا۔ باہر والا نگران زیادہ سے زیادہ رائفل سے مسلح ہو سکتا تھا اور اس کے پاس گولیاں بھی محدود تعداد میں ہوں گی۔ جبکہ باقی تین کی رسائی خاصے اسلحے تک ہوتی اور ان کو ایمونیشن کی بھی کمی نہیں ہوگی اگر وہ مجھے گھیر لیتے تو میں مارا جاتا۔ کوئی بھی پلان کاغذ پر جتنا آسان ہوتا ہے عملی طور پر اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اوپر شاید وہ لوگ آ چکے تھے کیونکہ میں نے ایک بار کسی گاڑی کے انجن کی نزدیک آنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے علاوہ وقفے وقفے سے آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ سہ پہر کے وقت اوپر سے دروازہ کھلا اور حنیف اندر آتا نظر آیا اس نے حسبِ معمول کھانے کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی باچھیں بتا رہی تھیں کہ اس نے کوئی خاص بات معلوم کی ہے۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی اور پُر جوش لہجے میں لیکن دھیمی آواز میں بولا۔

"صاحب خوشخبری ہے۔ آج رات کوٹھی میں صرف گل خان اور مشتاق ہوں گے۔"

"ویری گڈ۔" میں بھی خوش ہو گیا تھا۔ "اگر تم آج رات ہی ہمت کر گزرو تو ہمارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ باقی دو کہاں جا رہے ہیں؟"

"انہوں نے کسی سے ملاقات کرنی ہے آپ کے معاملے میں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ وہ جمشید علی یا ان کے کسی با اختیار نمائندے سے ملنے جا رہے تھے۔ "کتوں والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"میں نے اُس پودے کا خاصا دودھ نکال لیا ہے۔ باورچی خانے کے پیچھے ہی اُگا ہے۔ اگر یہ لوگ چائے مانگیں گے تو اس میں ڈال کر دے دوں؟" اس نے پوچھا۔ وہ زیادہ ہی پُر جوش ہو رہا تھا۔

"ایسی حماقت مت کرنا اس کی صورت دودھ جیسی ضرور ہوتی ہے لیکن ذائقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تم فوراً پکڑے جاؤ گے۔"

"میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ میں کتوں کو شام سات بجے کھانا ڈالتا ہوں۔ یہ لوگ ہڈی والا گوشت لاتے ہیں ان کے لیے۔ اس میں دودھ ملا کر دے دوں گا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد آپ کے لیے کھانا لاؤں گا۔"

''تم پر کوئی شک تو نہیں ہوا؟''

حنیف ہنسا۔ ''جب اس حرامی گل خان نے آ کر دروازہ کھولا تو میں اس کے سامنے رو پڑا تھا میں نے کہا کہ آئندہ میں اس لڑکے کو کھانا دینے نہیں جاؤں گا۔ وہ حرامی ہنستا رہا اور مجھ سے کہا تیرا تو باپ بھی جائے گا۔''

''گڈ۔'' میں نے اسے داد دی۔ ''کیا خیال ہے رات کے وقت میں حملے کا ڈرامہ نہ کروں۔''

''وہ کیسے جناب؟''

''بھئی پہلے تم چپکے سے باہر دیکھنا کہ وہ کہاں ہے اگر وہ دروازے کے سامنے نہ ہو تو تم زور سے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے گیلری والے دروازے کو بجانا شروع کر دینا۔ اس دوران میں بھی باہر سے تہہ خانے کا دروازہ بجا کر ایسا تاثر دوں گا جیسے اندر سے بجا رہا ہوں تم بدحواس ہو کر بتانا کہ میں نے تم پر حملہ کیا اور سیڑھیوں تک آیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ تہہ خانے کا دروازہ توڑ کر باہر آ جاؤں اس لیے جلدی سے تمہیں نکالا جائے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ جلدی سے دھیان دیئے بغیر دروازہ کھولے گا۔'' حنیف نے تائید کی۔

''لیکن دھیان رکھنا۔ شور اتنا مت کرنا کہ بوکھلا کر دونوں چلے آئیں۔ ایک سے تو آسانی سے نمٹا جا سکتا ہے لیکن بیک وقت دونوں سے نمٹنا مشکل ہو جائے گی۔''

''جی...... میں دھیان رکھوں گا۔'' اس نے سر ہلایا۔ باتیں کرنے کے دوران میں کھانے سے بھی فارغ ہو رہا تھا۔

''سکہ لے کر آئے؟''

''جی...... وہ تو میں بتانا بھول گیا۔ سکہ تو ملا نہیں۔ یہ کولڈ ڈرنک کی بوتل کا ڈھکن ہے اسے میں نے چپٹا کر کے اور پھر کٹر سے کاٹ کر سکے جیسا کر دیا ہے چلے گا۔''

اس نے ٹکڑا میرے سامنے رکھا۔ یہ دس پیسے کے سکے کے سائز کا تھا میں نے اُٹھا کر دیکھا۔ بالکل چلے گا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جو بلب ہے اوپر لگا ہوا اس کا بٹن کس طرف ہے۔''

''باہر لگا ہے کوئی روز شام کو اندر آ کر بٹن دبا دیتا ہے۔ صبح میں بند کر دیتا ہوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ گویا مجھے جلتے بلب کو نکال کر سکہ لگانا پڑے گا۔ بلب تو شام چھ بجے ہی جلا دیا جاتا تھا اگر فیوز وقت سے پہلے اُڑ گیا اور وہ بار بار لگاتے رہے اور بار بار اُڑتا رہا تو عین ممکن تھا وہ مشکوک ہو جاتے۔ یہ کام عین موقع پر کرنا تھا لیکن جلتے بلب کو نکال کر پھر آن بٹن کے ساتھ لوہے کا یہ ٹکڑا ہولڈر میں پھنسانا اور وہ بھی اندھیرے میں بے حد خطرناک کام تھا عین ممکن تھا میں کرنٹ کھا کر جان بحق نہ بھی ہوتا تو نیم جان ضرور ہو جاتا اور سیڑھیوں سے لڑھک کر اپنی ہڈی پسلی بھی تڑوا لیتا۔ ہولڈر اس جگہ لگانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آرام سے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر بلب لگایا یا نکالا جائے۔





کسی قدر غور و خوض کے بعد میں نے تہہ خانے والے ہولڈر کو مسترد کر دیا۔ اس کام کے لیے واش روم والا ہولڈر زیادہ مناسب تھا اول تو اس کا بٹن گیلری میں لگا تھا۔ دوسرے بلب بجھا بھی دیا جاتا تو گیلری کے بلب کی روشنی واش روم تک آتی تھی۔ وہاں مکمل اندھیرا نہیں ہوتا۔ اتنی روشنی ضرور رہتی کہ مجھے بلب نکال کر لوہے کا ٹکڑا لگانے میں آسانی رہتی اور جلتا بلب نکالنے اور آن بٹن میں کام کرنے کا خطرہ بھی نہ مول لینا پڑتا۔ پھر جیسے ہی حرکت میں آنے کا وقت آتا ہم با آسانی بٹن دبا کر فیوز اُڑا دیتے۔

میں نے حنیف کو ساری بات سمجھائی۔ پھر میں نے غور کیا تو مجھے ہنگامے کا تاثر دینے والی بات بھی صحیح نہ لگی۔ اس سے باہر موجود شخص بلاوجہ چوکنا ہو جاتا بہتر یہی تھا کہ فیوز اُڑنے کے بعد حنیف اسی طرح پیش آتا جیسے اس کا معمول تھا۔ یعنی وہ نارمل انداز میں نگران کو دروازہ کھولنے کو کہتا اور یہ کام فیوز اُڑنے کے فوراً بعد کرنا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ نگران فیوز دیکھنے چلا جاتا۔ میں نے حنیف کو بدلے ہوئے پروگرام سے بھی آگاہ کیا اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ ''جیسی آپ کی مرضی جناب۔''

کھانا ختم ہونے تک میں نے اسے بار بار اپنا پلان سمجھایا تا کہ اسے ذہن نشین ہو جائے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ ہر بات پوری طرح سمجھ چکا ہے تو میں نے اس سے کہا۔ ''اب مجھے واش روم تک لے چلو تا کہ میں یہ سکہ وہاں لگاؤں۔''

میں اس کے ساتھ اوپر آیا جیسے ضرورت سے واش روم جا رہا ہوں۔ جالی دار دروازے کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ میں اسے اتنی مختصر سی جھری سے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ مجھے مکمل طور پر دیکھ رہا تھا۔ میں واش روم میں گیا اور حنیف باہر رہا۔ دن کے وقت بلب جلانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے آرام سے اپنا کام کیا۔ بلب اُتار کر سکہ ہولڈر میں فٹ کیا اور بلب اس پر اچھی طرح لگا کر باہر آ گیا۔ میں نے آنکھ سے حنیف کو کام ہو جانے کا اشارہ کیا۔ تہہ خانے میں جانے سے پہلے میں نے باہر کھڑے نگران سے پوچھا۔ ''مجھے کب تک یہاں قید رکھا جائے گا۔ تمہارا استاد کہہ رہا تھا کہ جلد مجھے یہاں سے کسی اچھی جگہ منتقل کیا جائے گا۔''

باہر والا شخص جب بولا تو پتہ چلا وہ گل خان تھا۔ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم فکر مت کرو...... جلد تم کو ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے گا جدھر تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... ادھر تم ہمیشہ رہے گا۔''

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ مجھے مار کر دفنانے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے مستقبل کا فیصلہ کر لیا گیا تھا چاہے جمشید علی ان کا مطالبہ پورا کرے یا نہ کرے۔ یہ لوگ ارشد بلا کے ساتھی تھے۔ ان کا باس نہ صرف میری وجہ سے پکڑا گیا تھا بلکہ ان کے مزید پانچ ساتھی پولیس کے ہاتھ صرف میری وجہ سے آئے تھے۔ ان میں ارشد بلا کا بھائی مرشد تھا اور پولیس نے اپنے طور پر کارروائی کرتے ہوئے ان کے چار مزید ساتھی گرفتار کیے تھے۔ گویا اس مافیائی گروہ کو میری وجہ

سے خاصا دھچکا لگا تھا۔ وہ بھلا مجھے کیسے معاف کر سکتے تھے۔

رفتہ رفتہ دن گزرتا رہا۔ شام ہوئی تو میری بے چینی بڑھنے لگی۔ مختلف خدشات ذہن پر یوں یلغار کرنے لگے جیسے بارش کا چھینٹا پڑتے ہی زمین سے مختلف کیڑے مکوڑے نکل آتے ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ استاد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ جائے یا کسی وجہ سے آج کی ملاقات ہی ملتوی ہو جائے یا آج حنیف کو نیچے آنے ہی نہ دیا جائے کھانا کوئی اور لے کر آئے یا سرے سے نہ آئے۔ میری بھوک پیاس ان لوگوں کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی جو مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم اپنے پلان پر کامیابی سے عمل کر گزرتے لیکن باہر موجود فرد رات کی تاریکی میں حنیف کے لیے دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ کر لیتا۔ جب تک کہ لائٹ نہ آ جاتی یا دروازہ کھول بھی دیتا تو میں اس پر قابو پانے میں ناکام رہتا یا اِس پر قابو پا بھی لیتا لیکن باقی قابو میں نہ آتے۔ خیالات کی اس یلغار سے گھبرا کر میں ورزش کرنے لگا تا کہ جب ایکشن کا وقت آئے میرا جسم پوری طرح تیار و گرم ہو۔ نصف گھنٹے کی ورزش نے مجھے پسینے پسینے کر دیا تھا۔ ویسے بھی جون کے مہینے میں راولپنڈی اور اسلام آباد میں خاصی گرمی ہوتی ہے مگر مجھے خیالات کی یلغار سے بھی نجات مل گئی تھی۔

میں نے سوچا۔ باہر نکلنے کی صورت میں مجھے بے حد تیزی سے حرکت میں آنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا فرد ہوشیار ہو اس پر بھی قابو پا لینا تھا۔ جتنی تاخیر کرتا مجھے اتنا ہی نقصان ہوتا۔ اس وقت مجھے سامنے والے کی زندگی کی پروا بھی نہیں کرنی تھی۔ اسی کوشش کو پہلی اور آخری سمجھ کر سر دھڑ کی بازی لگا دینی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ سات بج رہے تھے کیونکہ سورج کی روشنی غائب ہو چکی تھی اور روشندان کی سفیدی بتدریج مدھم پڑ رہی تھی۔ میں نے کان لگا دیئے کچھ دیر بعد جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی گویا وہ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کتنا مزہ آئے کہ یہ لوگ جمشید علی سے میرے بارے میں مذاکرات کر رہے ہوں اور میں عین اسی وقت انہیں اپنی رہائی کے بارے میں بتا دوں۔

جیپ جانے کے بعد ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ روشندان پر تاریکی غالب آ چکی تھی اور تہہ خانے کا بلب بھی روشن کیا جا چکا تھا۔ اب مجھے انتظار حنیف کا تھا۔ خاصی دیر گزر گئی مجھے یوں لگا جیسے آٹھ کب کے بج چکے ہوں اور اب نو بجے کا وقت ہو۔ میرے اضطراب میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ جانے والے کسی وقت بھی لوٹ سکتے تھے اور وہ لوٹ آئے تو ہمارے لیے مزید مشکل ہو جاتی۔ خاص طور سے عالمگیر سے مجھے خوف تھا، وہ بے حد چالاک اور تیز شخص تھا۔ میری رہائی میں سب سے زیادہ رکاوٹ وہی ڈال سکتا تھا اور میری خوش قسمتی کہ وہ میرے بارے میں مذاکرات کرنے گیا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے اوپر سے آہٹ کی آواز آئی۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور حنیف کی صورت نظر آئی۔ اس نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ میں مارے جوش کے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پاس جا پہنچا اور





آواز دباتے ہوئے کہا۔ ''کہاں تھے اب تک..... کتنا وقت گزر گیا ہے۔''

''نہیں جی میں تو وقت پر آیا ہوں۔''

''ٹائم کیا ہوا ہے..... ساڑھے نو دس بج رہے ہیں اور تم کہتے ہو ٹھیک وقت پر آئے ہو۔'' میرے لہجے میں برہمی تھی۔

''نہیں جناب..... ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔ میں وقت دیکھ کر آیا ہوں۔'' اس نے تردید کی۔

''صرف آٹھ بجے ہیں۔'' میں دم بخود رہ گیا تھا۔ تو کیا انتظار نے وقت کو کھینچ کر اتنا طویل کر دیا تھا کہ میں نے ایک گھنٹے میں جیسے کئی گھنٹے گزار دیئے تھے۔ ''خیر اسے چھوڑو..... اوپر کون ہے؟''

''مشتاق پہرا دے رہا ہے۔ گل خان گیٹ پر ہے۔''

''اور کتوں کا کیا ہوا؟''

''گوشت میں آک کا دودھ ملا کر دے دیا تھا، اس وقت وہ سو رہے ہیں یا ان پر دودھ کا اثر ہو گیا ہے۔ روزانہ وہ دس بجے تک آرام کرتے ہیں پھر رکھوالی کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔''

''اور اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات ہو تو۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔'' اس نے سر ہلایا۔

میں نے بھی احمقانہ سوال کیا تھا۔ ظاہر ہے رکھوالی کے کتے ہنگامہ سن کر سوئے تو نہیں پڑے رہتے۔ میں نے دعا کی کہ زہر نے انہیں مارا نہ بھی ہو تب بھی بے کار ضرور کر دیا ہو۔ میں نے کھانے کی ٹرے لے کر ایک طرف رکھ دی۔ کھانا دیکھ کر اچانک مجھے خیال آیا کہ حنیف کچن میں کام کرتا تھا، میں اس سے کوئی تیز دھار چھری منگوا لیتا۔ اس صورت میں حریف کو قابو کرنے کا کام آسان ہو جاتا لیکن اب وقت نہیں تھا مجھے جو کرنا تھا خالی ہاتھ سے کرنا تھا۔ میں گل خان کو دیکھ چکا تھا وہ مضبوط لیکن جذباتی ہو جانے والا شخص تھا۔ میں اسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا لیکن مشتاق کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے خالی ہاتھ سے لڑنے کا فن بھی جانتا ہو۔ اس صورت میں اسے زیر کرنا آسان نہ ہوتا۔ اگر وہ دروازے کے پاس ہوتا تو کام اور مشکل ہو جاتا۔ میں اور حنیف سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ حنیف نے دروازے سے باہر دیکھا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ دروازے کے پاس نہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جب اوپر آئے تو زبان سے کوئی آواز نہ نکالے۔ جو کہنا ہو اشارے سے کہے۔ میں نے اشارے میں جواب دیا کہ وہ باہر جا کر پہلے بٹن دبا کر فیوز اُڑا دے، وہ خاموشی سے گیا اور جیسے ہی اس نے گیلری میں لگا بٹن دبایا تو اچانک اندھیرا ہو گیا۔ گیلری اور تہہ خانے کا بلب بھی بجھ گیا تھا۔ میں پھرتی سے تہہ خانے سے نکلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ حنیف تیزی سے دروازے کے پاس آیا۔

''سرکار جی..... دروازہ کھولو۔'' اس نے پکار کر کہا۔ میں اس کے جسم اور چھ انچ کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

''ایک منٹ یار...... پہلے فیوز دیکھ لوں۔'' باہر سے مشتاق کی آواز آئی۔ وہ دور جارہا تھا۔

مجھے مایوسی ہوئی تھی لیکن اس موقع پر حنیف نے حاضر دماغی دکھائی۔ اس نے پکار کر کہا۔

''سرکار جی...... میں سالن گرم ہونے کے لیے چولہے پر رکھ آیا تھا۔ وہ جل جائے گا تو پھر رات کو کیا کھائیں گے۔''

میں سانس روک کر مشتاق کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ غالباً سوچ رہا تھا کہ پہلے دروازہ کھول کر حنیف کو جانے کی اجازت دے یا پہلے جا کر فیوز دیکھے پھر اس کے قدموں کی چاپ نزدیک آئی۔ چابی کی جھنکار سنائی دی تو میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ میں نے حنیف کے شانے پر ہاتھ مار کر اسے تیار رہنے کو کہا۔ اندر اتنی تاریکی تھی کہ میں دروازے کے سامنے بھی کھڑا ہوتا تو مشتاق کو نظر نہ آتا۔ اس نے تالے میں چابی لگاتے ہوئے پوچھا۔

''اسے اندر بند کر دیا تھا۔ کنڈی صحیح سے لگائی تھی نا۔''

''آپ خود دیکھ لو جی۔'' حنیف نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے تو ٹھیک سے لگائی ہے۔''

اس دوران میں میرے جسم کے رگ و پٹھے آنے والے ایکشن کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ اس نے چابی سے تالا کھول لیا تھا اور اب اسے کنڈی سے نکال کر کنڈی کھولنے جا رہا تھا۔ اندر سے کسی صورت ہاتھ یا انگلی باہر نکال کر کنڈی نہیں کھولی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ احتیاطاً تالا ضرور لگاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب حنیف کھانا لے کر آتا تو اس کے اندر آنے کے بعد وہ باہر سے تالا لگاتے تھے۔ جب تک وہ اندر رہتا تالا لگا رہتا اور جب وہ باہر آنے لگتا تو پہلے تہہ خانے کا بند دروازہ دیکھا جاتا تھا پھر اس کے لیے تالا کھلتا تھا۔ آج پہلی بار اس طے شدہ قاعدے کی خلاف ورزی کی جا رہی تھی اور انہیں اس چیز کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ جیسے ہی کنڈی کھلی، میں نے حنیف کو ایک طرف دھکیلا اور دروازے کو پوری قوت سے اپنے جسم کے ساتھ لیتا باہر نکلا۔ مشتاق جو دروازہ کھول چکا تھا۔ اس بات کو سمجھ نہیں سکا۔ دروازہ شدت سے آ کر اس کے منہ پر لگا۔ اس کے حلق سے ایک اضطراری سی آواز نکلی اور وہ زمین پر جا گرا۔ اس کے شانے سے شاٹ گن لٹک رہی تھی۔ خاصی چوٹ آنے کے باوجود اس کا تربیت یافتہ ہاتھ شاٹ گن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چوٹ نے اسے فی الوقت کروٹ بدلنے سے باز رکھا تھا مگر وہ ایک گھاگ جرائم پیشہ تھا۔ یہ چوٹ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کے حوصلے سے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ذرا سا موقع دینا حماقت ہوگی۔ میں نے باہر آتے ہی پہلی ٹھوکر اس کے مضطرب منہ پر ماری اور دوسری ٹھوکر اس کے اس ہاتھ پر جو شاٹ گن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منہ پر لگنے والی ٹھوکر نے اس کے کئی دانت حلق میں اُتار دیئے تھے۔ بے شک میرے پیروں میں جوتے نہیں تھے مگر میرے پیر ہی کسی جوتے سے کم نہیں تھے۔ کلائی پر لگنے والی کک نے شاید اس کی ہڈی توڑ دی تھی کیونکہ اس نے تڑپ کر ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے جھک کر شاٹ گن اس کے شانے





سے اُتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے سر پر لگا تار ٹھوکریں مارنے لگا حتیٰ کہ وہ بے دم ہو گیا جب اس میں ہاتھ پیر ہلانے کی سکت بھی نہ رہی تو میں نے اطمینان سے شاٹ گن اس کے شانے سے اُتار کر اس کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا۔ اس تسلی بخش قسم کی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے غافل ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دوران میں کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مشتاق سے نمٹ کر میں نے سب سے پہلے ارد گرد کا معائنہ کیا۔ یہ مکان کا بایاں حصہ تھا۔ اسے آپ مشرقی کنارہ سمجھ لیں۔ مغربی کنارے پر باہر جانے والا گیٹ تھا جو یہاں سے کوئی سوفٹ کے فاصلے پر تھا، خوش قسمتی سے گیلری سے باہر آنے والے دروازے کے ساتھ ہی ایک کمرا تھا اس کی دیوار نے گیٹ کو یہاں سے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس جگہ کو بھی گیٹ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ مشتاق سے نمٹنے کے دوران مجھے سب سے زیادہ فکر کتوں کی تھی۔ گل خان کو یہاں ہونے والے واقعات کی خبر ہوتی یا نہ ہوتی اگر کتے ہوش میں ہوتے تو انہیں ضرور ہو جاتی اور وہ اِدھر لپکے آتے لیکن جب میں مشتاق سے نمٹ کر فارغ ہوا اور کتوں کو وہاں نہ پایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب کا مطلب تھا کہ آک کے دودھ نے اثر کیا تھا۔ کتے مرے نہیں بھی تھے تو اس زہر کے اثر سے مدہوش ضرور پڑے تھے ورنہ اب تک نمودار ہو چکے ہوتے۔

حنیف تیزی سے باہر آیا اور پھر زمین پر ساکت پڑے مشتاق کو دیکھ کر اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ مر گیا ہے؟''

''اتنا غیرت مند نہیں ہے۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''سر پر اس کا دستہ مارا تھا، بے ہوش پڑا ہے۔''

''کتے نہیں آئے۔'' وہ ڈرا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہارا نسخہ کام آ گیا۔ دونوں......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے صحن کی طرف دو ہیولے نمودار ہوئے۔ میں بے ساختہ چلایا۔

''بھاگو......'' اور گیلری والے دروازے میں گھس گیا۔ حنیف پیچھے تھا۔ اس نے ذرا تاخیر کی اور ایک کتے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ یوں گرا کہ اس کا آدھا جسم دروازے کے اندر تھا میں نے پلٹ کر کتے کے سر پر شاٹ گن کی نال ماری۔ اس نے ایک کریہہ آواز کے ساتھ حنیف کی ٹانگ چھوڑ دی۔ میں نے اسے اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ دونوں کتے بیک وقت اپنے وزنی جسم لے کر دروازے سے ٹکرائے تو وہ ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ پورے زور و شور سے بھوک رہے تھے۔ ان کی صور نما آواز سن کر قبر سے مردے بھی دوڑے چلے آتے پھر گل خان کو کیسے خبر نہ ہوتی۔ اس نے چلا کر بے ہوش مشتاق سے دریافت کیا۔

''کیا بات ہے کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟''

ظاہر ہے مشتاق جواب دینے سے قاصر تھا اور اس لیے پہلے گل خان خود صلاح احوال کے لیے

ادھر آتا، میں نے کتوں کا خاتمہ ضروری سمجھا۔ میں نے شاٹ گن کی نال دروازے کی جھری سے باہر نکالی اور جوش وخروش سے دروازے سے ٹکراتے ایک کتے کے سر پر فائر کیا۔ بھیانک دھماکے کے ساتھ وہ کتا یک دم خاموش ہو کر پیچھے جا گرا۔ جتنی دیر میں مَیں شاٹ گن دوبارہ لوڈ کرتا، دوسرا کتا خطرہ بھانپ کر تیزی سے پسپا ہوتا چلا گیا۔ میں نے حنیف سے کہا۔ ''تم ابھی اندر ہی رہنا۔''

''آپ کہاں جا رہے ہو جناب......؟'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ''ایسا نہ ہو مجھے ادھر ہی چھوڑ کر نکل جاؤ۔''

''میں تمہیں محفوظ رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اسے سمجھایا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ دوسرا کتا مغربی کنارے کی طرف پسپا ہو گیا تھا۔ گل خان بھی اس طرف سے آتا۔ میں بائیں طرف سے گھوم کر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری نظر اوپر جاتی سیڑھی پر پڑی۔ یہ تعمیر کے لیے استعمال کی جانے والی بانس کی سیڑھی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں اس پر چڑھ گیا اوپر سے میں کتے اور گل خان سے زیادہ بہتر طریقے سے نمٹ سکتا تھا۔ چھت پر آتے ہی میں مغربی کنارے کی طرف لپکا۔ اوپر سے میں نے دیکھا یہ نیا آباد ہونے والا علاقہ تھا۔ اس کوٹھی کے چاروں طرف کوئی اور کوٹھی نہیں تھی۔ ایک جانب خانہ بدوشوں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ دو پلاٹ کے بعد ایک زیرِ تعمیر مکان تھا۔ اس طرح دور دور تک مکمل اور نامکمل کوٹھیاں بکھری ہوئی تھیں۔ نصف چاند نکلا تھا جس کی روشنی میں ماحول میں سکون تھا۔ میں نے اوپر سے جا کر احتیاط سے نیچے جھانکا۔ سامنے مین گیٹ تھا لیکن فی الوقت وہ خالی نظر آ رہا تھا۔ گل خان یا کتا ادھر والے صحن میں نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ نیچے نہیں تھے۔ وہ چھت کے اوپر سے نکلے چھجے کے نیچے ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے شاٹ گن کے دھماکے کے بعد گل خان کھلے صحن میں رہنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے اپنی حماقت کا افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اوپر آتے ہوئے ان چھجوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اوپر آنے کے لیے مستقل سیڑھیاں ابھی نہیں بنی تھیں اس لیے بانس کی سیڑھی سے کام لیا جا رہا تھا۔ دوسری عقلمندی یہ کی تھی کہ حنیف کو نیچے چھوڑ آیا تھا حالانکہ اسے نہتا ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔ گل خان یا کتا اس پر حملہ کر کے اسے مار سکتے تھے۔

گل خان یا کتے کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے ایک پتھر اُٹھا کر مین گیٹ پر مارا اس کی چادر کا آہنی جھنکار رات کے سناٹے میں گونجا تھا اس کے ساتھ ہی کوٹھی کی طرف سے دروازے کی سمت ایک فائر ہوا۔ ہوا میں تیرتا شعلہ اس طرف گیا تھا۔ گل خان کسی کمرے میں تھا یا چھجے تلے پناہ لے چکا تھا اور اس کے پاس پستول تھا۔ مجھے گل خان سے زیادہ کتے کی فکر تھی۔ وہ سونگھ کر پتا چلا سکتا تھا کہ میں کہاں تھا اور مجھے گھیرنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ جبکہ گل خان بے خبر تھا کہ اس وقت میں کہاں تھا۔ چھت پر میں ہر ممکن احتیاط سے حرکت کر رہا تھا کہ کوئی آہٹ نیچے تک نہ جائے۔ میں واپس سیڑھیوں کی طرف آیا اور خود کو بہ مشکل فائر کرنے سے روکا۔ ایک سر نمودار ہوا تھا سیڑھیوں کی





جانب سے...... یہ حنیف تھا۔ میں ایک لمحے کی جلد بازی کرتا تو وہ مارا جاتا۔

''احمق آدمی...... تم کیوں نکلے وہاں سے۔ ابھی میرے ہاتھوں مارے جاتے۔'' میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

''مجھے ڈر لگ رہا تھا جی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

اس کی خوش قسمتی کہ گل خان یا کتے کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ بہر حال وہ اوپر آ گیا تھا۔ میں نے اسے سیڑھیوں پر نظر رکھنے کو کہا اور خود چھجے پر لیٹ کر نیچے کی طرف جھانکا۔ مغربی کنارے میں چھجے تلے کوئی نہیں تھا۔ میں چھجے پر ہی چلتا دوسری طرف گیا۔ یہاں مجھے نیچے دیوار کے ساتھ ایک وجود نظر آیا لیکن تاریکی میں یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ انسان ہے یا کتا۔ وہ بالکل دیوار کے ساتھ دبکا ہوا تھا۔ خاصی دیر تک نظر جمانے کے باوجود میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ انسان تھا یا کتا۔ آخر میں نے ٹٹول کر چھت سے ایک کنکر اُٹھایا اور اسے صحن کی طرف اُچھال دیا۔ سناٹا اس قدر شدید تھا کہ معمولی سا کنکر گرنے کی آواز بھی گونجی تھی۔ دیوار کے ساتھ دبکا ہوا ہیولا بھڑکا اور میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ گل خان تھا جو نہ جانے کب سے یہاں دبکا تھا۔ وہ بھی چھٹا ہوا مجرم تھا اتنی آسانی سے زیرِ دام آنے والا نہیں تھا۔ کتوں کا شور اور فائر کی آواز سن کر وہ بھی...... ادھر نہیں آیا تھا اس نے درست فیصلہ کیا تھا اگر مشتاق فائر کرتا تو وہ خود آ کر اسے بتاتا اور فائر مشتاق نے نہیں کیا تو وہ ادھر آ کر میرے ہاتھوں بے موت نہ مرتا۔

میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے شاٹ گن چھجے سے نیچے کی اور گل خان کو وارننگ دی۔ ''ہتھیار پھینک دو...... تم میرے نشانے......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے بھڑک کر فائر کر دیا۔ گولی میرے سامنے سے گزری اور میں نے بے اختیار شاٹ گن کا ٹریگر دبا دیا۔ گل خان نے کربناک آواز نکالی اور اُچھل کر کھلے صحن میں آ گرا۔ اس کا جسم ماہیِ بے آب کی طرح پھڑک رہا تھا۔ ہلکی روشنی کے باوجود میں نے اس کے شانے اور گردن سے فوارے کی طرح اُچھلتے خون کو دیکھ لیا تھا۔ شاٹ گن نے اس کے جسم میں کئی انچ بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر رائفل موڑی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ ابھی میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ کتا ایک طرف سے غراتا ہوا جھپٹا۔ اس نے سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کی اور اس کے وزنی جسم نے سیڑھی کا وزن بگاڑ دیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر میرے پیروں تلے سیڑھی ہی نکل رہی تھی۔ خود کو متوازن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہوئے میرا پہلو ٹکرایا تھا اور رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں قلابازی کھا کر اُٹھا تھا کہ کتا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے خون آشام جبڑے سے بچنے کے لیے میں نے اس کی گردن تھام لی۔ کتا زور میں مجھے لے کر فرش پر گرا اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح میری گردن پکڑ لے۔ ایک بار میری گردن اس کے منہ میں آ جاتی تو وہ لمحوں میں میرا نرخرہ ادھیڑ دیتا۔ اس کتے کو انسان پر قاتلانہ حملہ کرنے کی باقاعدہ تربیت دی گئی تھی۔

میری کوشش تھی کہ اپنی گردن اس سے محفوظ رکھتے ہوئے اسے دور پھینک سکوں۔ وہ اپنی وحشیانہ طاقت سے مجھے زیر کرنے کی فکر میں تھا۔ اس کے پنجے میرے جسم پر خراشیں ڈال رہے تھے۔ بہ دقت میں نے اپنے پاؤں سمیٹے اور کتے کے پیٹ پر اپنا گھٹنا مارا۔ اس نے کرب ناک آواز نکالی لیکن مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا اس بار میں نے دونوں پاؤں اس کے جسم سے لگائے اور جھٹکے سے اسے دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں اُچھل کر کھڑا ہوا۔ کتا زمین پر گرتے ہی طاقتور اسپرنگ کی طرح اُچھلا، اس نے زبردست جست لگائی اور ہوا میں اُڑتا ہوا میری طرف آیا۔ اس بار میں نے ہاتھوں کے بجائے پیر سے کام لیا۔ ہوا میں اُچھل کر گھومتے ہوئے میں نے کتے کے سر پر لات ماری۔ خشک لکڑی جیسی چٹخنے کی آواز آئی۔ کتا زمین پر ایک طرف گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس سے ذرا سی دیر کی جنگ نے میرا جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا۔ خوش قسمتی سے لات بالکل درست پڑی اور کتا مارا گیا میں نے رائفل اُٹھالی۔

"صاحب...... آپ ٹھیک ہونا؟" اوپر سے حنیف کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"ہاں...... نیچے آجاؤ۔" میں نے گری ہوئی سیڑھی اُٹھا کر دیوار سے لگائی اور حنیف نیچے اُتر آیا۔

"گل خان کدھر ہے؟"

"اُدھر پڑا ہے۔ میں نے اسے گولی ماردی ہے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا لیکن جب اس طرف دیکھا تو مجھے اپنی بینائی پر شک ہوا۔ گل خان اس جگہ نہیں تھا پھر دو باتیں بیک وقت ہوئیں۔ حنیف اضطراری طور پر سامنے آیا اور ایک کھڑکی سے شعلہ لپکا اور حنیف کے پیٹ میں اُتر گیا۔ اس نے ہلکی سی آواز نکالی۔ وہ نیچے گر گیا تھا۔ گل خان نہ جانے کس طرح کمرے میں چلا گیا تھا حالانکہ اس کی گردن سے جس طرح خون بہہ رہا تھا وہ بالکل آخری سانسوں پر لگ رہا تھا مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کب اس کا وقت آجائے۔ بعض اوقات معمولی نظر آنے والا زخم آدمی کی جان لے لیتا ہے اور کبھی شدید زخمی ہونے والا بھی بچ جاتا ہے۔ اپنی ناتجربے کاری کی وجہ سے میں نے گل خان کو مُردہ تصور کر لیا جبکہ وہ زندہ تھا اور اس نے حنیف کو گولی ماردی۔ وہ کھڑکی کے سہارے کھڑا تھا اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر تقدیر نے اس گولی پر حنیف کا نام لکھ دیا تھا۔

گل خان نے دوبارہ پستول اُٹھانے کی کوشش کی۔ حنیف کو گرتے دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس بار میں نے گل خان کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کے ساتھ ہی اس کا سر جیسے غائب ہو گیا پھر اس کا باقی رہ جانے والا دھڑ آہستہ سے چل کر کھڑکی کے چوکھٹے سے غائب ہو گیا۔ اس بار وہ بلاشبہ مر چکا تھا کیونکہ کوئی شخص بغیر سر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں حنیف کی طرف لپکا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے زمین پر دراز تھا۔ اب تک اس کے منہ سے نہ تو کوئی چیخ نکلی تھی اور نہ ہی وہ تڑپ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر سے کسی نے کہا کہ وہ بچے گا نہیں۔ اس کے چہرے





پر موت کی سفیدی چھا رہی تھی۔ میں نے زخم دیکھا۔ گولی نے اندر جگر اور آنتوں کو نقصان کیا تھا۔ خون نالے کی طرح بہہ رہا تھا۔

"حوصلہ رکھو حنیف بھائی...... میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔"

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "اپنا انعام والا وعدہ یاد رکھنا صاحب۔"

میں زبردستی ہنسا۔ "تمہیں ابھی بھی انعام کی فکر ہے۔ اللہ کے بندے پہلے صحت یاب ہو جاؤ پھر انعام بھی لے لینا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں بچوں گا نہیں...... میرا آخری وقت آگیا ہے اُدھم پورہ کی اس کچی بستی میں میرے بیوی بچے ہیں صاحب...... ان کا خیال رکھنا...... مجھ سے جو وعدہ کیا ہے...... ان سے...... پورا کرنا......" اچانک اس کی زبان اٹکنے لگی۔ "ورنہ قیامت...... کے دن...... تیرا دامن...... پک...... ڑوں گا......"

وہ ایک دم چپ ہوا تو میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بے اختیار اسے جھنجھوڑ دیا۔

"حنیف...... اٹھو۔" لیکن وہ میری پکار کی حد سے دور جا چکا تھا۔ میرے جھنجھوڑنے سے اس کے ہاتھ پیٹ سے ہٹ گئے تھے۔ اعشاریہ پینتالیس کی گولی نے اس کے پیٹ میں تین انچ چوڑا سوراخ کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ خون سے بھرے تھے اور ایک نشان میرے بازو پر بھی آگیا تھا۔ یہاں حنیف نے خون آلود ہاتھ رکھا تھا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا پھر میری نگاہ مشتاق پر پڑی، وہ بدستور بے ہوش تھا اس کے پاس ہی کتے کی لاش پڑی تھی۔ ذرا سی دیر میں چار جاندار اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ میں نے مشتاق کو اُٹھا کر گیلری میں ڈالا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر تھی۔ میں نے مشتاق کی تلاشی لی، گھڑی، اس کا بٹوہ اور جوتے اُتار لیے تھے۔ جوتے کسی قدر ڈھیلے تھے لیکن کام چل رہا تھا۔ مجھے ان تینوں چیزوں کی ضرورت تھی۔ جانے سے پہلے میں نے آخری بار حنیف کو دیکھا۔ چند منٹ پہلے وہ جیتا جاگتا شخص تھا۔ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور...... دس منٹ بعد وہ ایک لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔

"مجھے معاف کرنا حنیف بھائی...... تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔" میں نے دل میں کہا تھا۔ اس کے احسان کا بدلہ تو نہیں دیا جا سکتا تھا اس نے مجھے آزاد کرایا اور پھر میری طرف آنے والی موت قبول کر لی لیکن اس کے احسان کا کسی قدر بدلہ یوں ادا کیا جا سکتا تھا کہ میں اس کے بیوی بچوں کو مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہونے دوں۔ باپ کا نعم البدل تو کچھ نہیں ہوتا ہے لیکن مالی لحاظ سے اس کے بیوی بچے پُرسکون زندگی گزار سکتے تھے۔ مجھے اس رقم کا خیال آیا جو اندر والے حصے کے کسی کمرے میں رکھی تھی۔ بقول حنیف کے وہ خاصی بڑی رقم تھی اور میرے خیال میں وہ رقم کسی غریب گھر کے کام آتی تو زیادہ بہتر تھا بہ نسبت اس کے کہ یہ ڈاکو اسے اپنی عیاشیوں اور اسلحے کی خریداری پر لگاتے یا ان سے بڑے ڈاکو یعنی پولیس والے اسے شیر مادر سمجھ کر ہضم کر جاتے۔

وقت کم تھا۔ اصولاً مجھے نکل جانا چاہیے۔ استاد اور اس کا ساتھ کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ میں سامنے نظر آنے والے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہ بھی گیلری تھی۔ اس کے بائیں طرف دو کمرے تھے۔ پہلا کمرا کھلا تھا اور اس کے ساتھ والا کمرا باہر سے لاک تھا۔ دائیں طرف ایک کمرا تھا اس کمرے میں کھڑکی سے گل خان نے مجھ پر فائر کیا تھا لیکن قضا حنیف کی آئی تھی۔ اس کمرے میں گل خان کی بے سر کی لاش موجود تھی۔ میں نے پہلے اس کمرے میں دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ دوسرا کمرا بھی سوائے چارپائیوں کے کسی قسم کے فرنیچر سے خالی تھا۔ اتنی دیر میں میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔ پھر...... دوسری طرف آنے سے کھلی کھڑکیوں سے روشنی اندر آرہی تھیں لیکن تیسرا کمرا اندر کی جانب تھا اور وہاں تک چاند کی روشنی بھی نہیں جارہی تھی۔ میں نے ذرا آگے جاکر گل خان کی لاش ٹٹولی۔ اس کے ہونٹ بتاتے تھے کہ وہ سگریٹ نوش تھا۔ اس کے پاس لازماً ماچس یا لائٹر ہونا چاہیے تھا۔ میری تلاش بار آور ثابت ہوئی اس کے جیب سے لائٹر نکل آیا۔

کمرے پر خاصا بھاری تالا لگا تھا۔ اسے توڑنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی اس لیے مجھے ایک بار پھر گل خان کے پاس جانا پڑا۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پستول لاکر تالے پر رکھ کر فائر کیا۔ تالا خاصا مضبوط تھا۔ دوسرے فائر میں ٹوٹا۔ میں نے بائیں ہاتھ میں لائٹر سنبھالا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ٹن کا مذکورہ صندوق مجھے چارپائی تلے ملا۔ اس پر بھی مضبوط قسم کا تالا لگا تھا۔ ایک گولی مجھے اس پر بھی ضائع کرنا پڑی۔ وہاں متعدد اقسام کے ہتھیار رکھے تھے ان میں عام پستولوں سے لے کر سب مشین گن اور دستی بم تک شامل تھے۔ میں نے احتیاط سے فائر کیا کہ گولی بھٹک کر کسی بم پر نہ جالگے۔ میں نے صندوق کھولا۔ اس میں واقعی لاکھوں کی رقم تھی۔ اس زمانے میں پانچ سو یا ہزار کے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ صندوق میں سارے ہی سو سو کے لال نوٹوں والی گڈیاں تھیں۔ یعنی ایک گڈی میں دس ہزار روپے تھے اور صندوق گڈیوں سے لبالب بھرا تھا۔ اس کا وزن اندازاً دس بارہ کلوگرام تھا۔ اس سارے انبار کو لے جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ دس بارہ لاکھ کی رقم تھی۔ میں نے بستر پر پڑے تکیے سے غلاف اُتارا اور اس میں گڈیاں بھرنے لگا۔ غلاف میں مشکل سے دو تہائی گڈیاں آئی تھیں باقی صندوق میں رہ گئی تھیں۔

نہ جانے کیوں اس وقت میں سخت حماقت کے موڈ میں تھا۔ اب تک مجھے ہر چیز پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ مگر میں پہلے رقم کے چکر میں رک گیا حالانکہ یہ میری جان سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اتنی رقم بلکہ اس سے زیادہ میں جمشید علی سے کہہ کر حنیف کے گھر والوں کو دلوا سکتا تھا بلکہ رقم سے بہتر تو یہ تھا کہ ان کے لیے کوئی مستقل بندوبست کرا دیتا۔ دولت عام طور سے غریب کو ملے تو فتنے کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر مزید حماقت یہ تھی کہ اس کالی کمائی کو ضائع کرنے کا سوچا اور ایک گڈی کو آگ لگا کر صندوق میں ڈال دیا۔ دو تین گڈیوں کو آگ لگی تو کمرا روشن ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں سبھی نوٹوں کو بھی آگ لگ چکی تھی۔ عین اسی لمحے جب میں باہر جانے کے لیے دروازے کی





طرف بڑھا۔ کسی نے چلا کر کہا۔ ''اوئے...... یہ اسلحے والے کمرے میں آگ کس نے لگائی ہے۔'' میں سن سا رہ گیا تھا۔



میں سن سا رہ گیا تھا۔ سرسوتی کا مجھ سے لپٹا وجود زندگی کی حرارت سے یکسر خالی اور بے جان ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی مگر روح کا پرندہ جسم کے پنجرے سے اُڑ چکا تھا۔ وہ کیسے مری...... یہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ کیوں مری...... اس سوچ نے میرا دل بوجھل کر دیا تھا۔ اتنی سی عمر میں اس نے کتنے مصائب دیکھ لیے اور پھر یوں خاموشی سے مرگئی۔ کیا یہ اس کی زندگی کے ساتھ ناانصافی نہیں تھی۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا مگر نہیں...... اس نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا جو بہت سارے انسان ساری عمر نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ میں نے اسے بستر پر سیدھا لٹایا اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ مجھے ندامت اور گناہ کے داغ سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی۔ میں اس کے لیے مغفرت کی دعا تک نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی پیشانی تو چوم سکتا تھا۔

سرہانے رکھی سائیڈ دراز پر ٹرے میں کافی کے دو خالی کپ تھے۔ ایک کے پیندے میں سفید رنگ کے پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ تھی۔ یہ یقیناً خواب آور دوا تھی جس کے بھاری ڈوز نے سرسوتی کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔ اسی دوا کے ہلکے ڈوز نے مجھے دنیا سے غافل کر دیا تھا۔ غالباً سرسوتی کا مقصد یہ تھا کہ میں اسے بچانے کی کوشش نہ کروں۔ اسے سکون سے مرنے دوں۔ اس نے مرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور جو لوگ مرنے کا فیصلہ کرلیں ان کے لیے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ ایک چادر سے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر میں باہر آیا۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور جان گرے حسبِ معمول ٹیرس پر دھوپ اور شراب نوشی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر نفرت کا جذبہ پھر سے کھولنے لگا تھا۔ میں چپ کھڑا اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ اسے میری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔

''یوسف...... کہو رات کیسی گزری؟'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ایسی گزری کہ میں اسے ساری عمر فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کرسکتا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ ہنسنے لگا۔

''میں جانتا تھا یار آپس کی بات ہے یہ ساؤتھ انڈین عورتیں چاہے کالی یا بدصورت ہوں...... لیکن جو لطف ان کی قربت میں آتا ہے وہ دنیا کی کسی عورت کی قربت میں نہیں آتا۔''

میرا دل چاہا کہ اسے بھی اپنی قربت سے یوں نوازوں کہ پھر اسے فرشتہ اجل ہی لے کر جائے۔ اس کی...... گردن ایسے دباؤں کہ اس کی آنکھیں اور زبان باہر نکل آئیں مگر اس وقت میں اندر سے کھولنے کے باوجود اوپر سے برف کی سل بنا ہوا تھا۔ سرسوتی کی موت نے میرے احساسات کو منجمد سا کر دیا تھا۔ جان گرے نے بھی میرے تاثرات بھانپ لیے اس نے جام سے ایک گھونٹ لیا۔

"کیا بات ہے تم کچھ روکھے سے لگ رہے ہو...... کیا لڑکی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ ایسی بات ہے تو میں ابھی اسے غلاموں کی تربیت کے ادارے بھجوادیتا ہوں۔"

"اسے ضرور بھجواؤ" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن کسی تربیت گاہ نہیں بلکہ مُردہ خانے...... اسے مزید کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔"

جان گرے نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا وہ مرگئی؟"

"وہ غالباً اس روز ہی مرگئی تھی جب اسے اس کے گھر سے اغوا کرکے درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔"

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ "براہِ کرم یہ کتابی باتیں مت کرو۔ مجھے واضح لفظوں میں بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے میں ہاتھ مار کر تمہاری گردن توڑ دیتا ہوں تم اوپر جاکر خود سرسوتی سے پوچھ لینا کہ وہ مرچکی ہے یا نہیں۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "شاید تب تمہیں یقین آئے گا۔"

"اپنی حسِ مزاح کو قابو میں رکھو۔" اس نے بہ ظاہر سرد اور تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا لیکن میری چھٹی حس نے بتایا کہ وہ اندر سے خوفزدہ ہوگیا تھا اس نے جلدی سے تپائی پر پڑے موبائل نما آلے کو اُٹھا کر اس کا بٹن دبایا اور کسی سے بولا۔ "مہمان کے کمرے میں آکر سوراتی کو چیک کرکے مجھے رپورٹ دو۔"

بہ ظاہر اس نے کسی کو ہدایت دی تھی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نے آلے پر لگا ایک اور بٹن بھی دبایا تھا۔ غالباً یہ بٹن اس کے محافظوں کے لیے اشارہ تھا کہ وہ الرٹ ہوجائیں اور اگر اس کی جان کو خطرے میں پائیں تو آکر اسے بچائیں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ...... کہو تو تمہارے لیے ناشتہ منگواؤں۔"

"میں ساری رات ایک لاش کے ساتھ سوتا رہا ہوں کیا اس وقت مجھے کچھ کھانے کی خواہش ہوسکتی ہے۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جان گرے نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے...... لیکن اس بات کو خود پر طاری کرلینا بھی جذباتی حماقت ہوگی۔ لوگ جیتے ہیں مرتے ہیں...... دنیا کا کام چلتا رہتا ہے...... تمہارے نہ کھانے سے سوراتی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" اس نے رُک کر جام سے ایک گھونٹ لیا۔ "ویسے ہوا کیا تھا؟"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پایا۔ جان گرے کی بات درست تھی میرے جذباتی ہونے سے سرسوتی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میں اس لیے یہ کرسکتا تھا کہ جن لوگوں نے اسے یوں مرنے پر مجبور کیا انہیں کیفرکردار تک پہنچادوں اور میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ کر ہی یہ کام کرسکتا تھا۔

"پہلے میرے لیے کافی منگوالو......" میں نے کہا تو اس نے فوراً اپنے موبائل نما آلے پر یہ فرمائش نوٹ کرادی۔ میں نے سرسوتی کے بارے میں بتایا۔ "شاید وہ غلامی کی اس زندگی سے تنگ آچکی





تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کافی میں خاصی مقدار میں خواب آور دوا استعمال کی ہے۔ اس نے مجھے کافی میں یہ دوا دی تھی کیونکہ رات میں نہ چاہنے کے باوجود سوگیا تھا۔

لفظ "نہ چاہنے" پر جان گرے نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ "وجہ کچھ بھی رہی ہو مجھے اس کی موت کا افسوس ہے اتنے عرصے بعد ایک ڈھنگ کی خادمہ ملی تھی۔"

ظاہر ہے جان گرے کسی کی موت پر افسوس بھی اس وقت کرسکتا تھا جب اسے کوئی نقصان ہوا ہو اس کے مرنے سے پہلے ایک ملازم نے کافی لاکر دی پھر ایک ہٹا کٹا شخص آیا۔ اس نے ہاتھ میں چھوٹی سی رائفل تھام رکھی تھی۔

"لڑکی مُردہ حالت میں ہے سر۔" اس کا لہجہ فرانسیسی تھا لیکن نقوش اور رنگت سے وہ کسی دوسری نسل کا لگتا تھا۔ اس کی ماں یا باپ میں سے کوئی افریقی تھا۔ "بہ ظاہر کسی زخم کا نشان نہیں ہے۔"

"اسے ہسپتال بھجوادو اور پھر وہاں سے جو رپورٹ آئے مجھے اس کے بارے میں بتانا۔"

"اوکے سر۔" اس نے فوجی انداز میں تن کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"اب اس کی لاش کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

جان گرے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ضروری کارروائی کے بعد اسے سمندر کے سپرد کردیا جائے گا۔ اس جزیرے پر مرنے والوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

"کیا ان کے لیے دو گز زمین بھی نہیں دی جاسکتی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جزیرے میں اتنی گنجائش نہیں ہے اس لیے مجبوری ہے۔"

جزیرے میں خاصی گنجائش تھی لیکن انسانوں کو ٹشو پیپرز سمجھنے والے ان لوگوں کے دلوں میں گنجائش نہیں تھی۔ جب کوئی مرجاتا تو یہ اسے بے حسی کے ساتھ سپردِ آب کردیتے تھے۔ نہ کفن کا جھنجھٹ اور نہ دفنانے کی زحمت۔ کل کلاں کو کوئی ان سے حساب لینے والا پیدا ہوجاتا تو لاش کہاں سے ملتی۔ میں نے جان گرے کی بات سے اتفاق کیا۔

"جزیرے میں گنجائش کم ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم لوگوں نے اس کا کم سے کم حصہ استعمال کیا ہے۔"

اس نے فخر سے جواب دیا۔ "کیونکہ ہم جزیرے کے فطری ماحول کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم لوگوں نے جزیرے پر بجلی کی سپلائی کا کیسا انتظام کررکھا ہے۔ مجھے کہیں کوئی بجلی گھر آلودگی پھیلاتا نظر نہیں آیا۔"

"یہاں پر جو بجلی گھر ہے وہ ذرا سی آلودگی نہیں کرتا کیونکہ وہ ایٹمی بجلی گھر ہے۔ روس کی آبدوزوں کے ناکارہ ہوجانے والے بجلی گھر ہم نے بڑی تعداد میں خرید کرانہیں کارآمد بنالیا ہے۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر مختصر ہونے کے ساتھ کم خرچ بھی ہیں۔ اس جزیرے پر جو دوری ایکٹرز کام کررہے ہیں وہ کام چالیس میگاواٹس کے ہیں۔ ایک ری ایکٹر اسپئیر میں ہے جب ایک ری ایکٹر کسی وجہ

سے کیا جاتا ہے تو اسے چلا لیتے ہیں۔"

"ان کا ایندھن کہاں سے آتا ہے؟"

"سوویت روس سے حاصل شدہ ایٹمی ردی سے ہم نے ان ری ایکٹرز کے لیے فیول بھی نکالا ہے جو سالوں کے لیے کافی ہے۔" جان گرے نے مجھے بلا جھجک بتایا۔ اس کے خیال میں یہ سب مجھے بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"ری ایکٹرز خطرناک بھی ہو سکتے ہیں...... خاص طور سے روسی ری ایکٹرز جو بعض اوقات پھٹ بھی جاتے ہیں۔ چرنوبل کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔" میں نے معنی خیز لہجہ میں کہا تھا۔

"اول تو یہ ری ایکٹرز ہم نے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بالکل محفوظ بنا لیے ہیں، دوسرے اگر کسی وجہ سے انہیں کوئی حادثہ بھی پیش آتا ہے تو جزیرے کے لوگ اس سے قطعی محفوظ رہیں گے کیونکہ ری ایکٹرز اس پہاڑی میں خاصی گہرائی میں ہیں۔ تاب کاری خارج ہونے کی صورت میں نیچے سے اوپر آنے والے راستے بند کر دیئے جائیں گے اور تاب کاری پھیلنے کا خطرہ باقی نہیں رہے گا۔"

"کیا یہ ری ایکٹرز سمندر کے پانی سے چلتے ہیں؟"

جان گرے نے سر ہلایا۔ "یہی نہیں بلکہ یہ کھارے پانی کو میٹھے پانی میں بھی تبدیل کرتے ہیں۔ اس جزیرے پر میٹھے پانی کے ذرائع محدود ہیں۔ ان کی کمی اس طرح پوری کی جاتی ہے۔"

میرے ذہن میں خیال آیا کہ سمندر کا پانی کسی سرنگ سے ری ایکٹرز تک پہنچایا جاتا ہوگا۔ مجھے سمندری پانی سے ٹھنڈے ہونے والے ری ایکٹرز کی ساخت کا کسی حد تک علم تھا۔ عام ری ایکٹرز میں درجہ حرارت ایک حد میں رکھنے کے لیے بھاری پانی استعمال کیا جاتا ہے لیکن آبدوزوں کے ری ایکٹرز میں یہ کام سمندری پانی سے لیا جاتا ہے۔ بھاری پانی یا سمندری پانی بے قابو نہیں ہو پاتا۔ اس قسم کے ری ایکٹرز کے لیے بھاری تعداد میں سمندری پانی درکار ہوتا ہے۔ اس پانی کی مسلسل فراہمی کے لیے سمندر سے سرنگ نکالی گئی ہوگی۔ ذرا سی محنت سے اس سرنگ کا سراغ لگایا جا سکتا تھا اور اس کے راستے ری ایکٹرز کی تباہی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ جان گرے سے ری ایکٹرز کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرا ذہن یہی سوچ رہا تھا کیا عبید صلاح کو بھی ان سرنگوں کی تلاش ہے؟

"تمہیں اچانک بجلی گھر کا خیال کیوں آ گیا؟" جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بس ایسے ہی۔" میں نے شانے ہلائے۔ "میں نے سوچا جب مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے تو اس دنیا کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔"

"گڈ......" اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میرا نہیں خیال کہ تمہیں اسے جاننے سے کوئی فائدہ ہوگا۔"





"فائدہ اور نقصان تو بعد کی بات ہے۔ پہلے میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ "کیا مجھے جزیرے میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ممکن ہے پہلے تمہیں اجازت مل جاتی۔ مگر ڈارٹ گن کے حملے کے بعد اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سیکیورٹی کے اصول کے خلاف ہوگا۔"

"کیا حملہ کرنے والوں کا کوئی سراغ لگا؟"

"نہیں...... لیکن وہ ہم سے زیادہ دن چھپ نہیں سکیں گے۔" جان گرے کے لہجے میں اعتماد تھا۔ پھر وہ اُٹھ گیا۔ "تم نے ناشتہ کرنا ہے تو کچن میں کہہ دینا باہر جانے کی کوشش مت کرنا۔"

جان گرے مجھے ٹیرس میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے ریلنگ سے نیچے دیکھا۔ یہ اپارٹمنٹ پانی کی سطح سے کوئی پچاس ساٹھ فٹ بلند تھا۔ بندرگاہ پر جاری ہنگاموں کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ میں حیران تھا۔ یہ کتنی بڑی پورٹ تھی جس پر دن رات کام جاری رہتا ہے۔ مجھے اب بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اندر جا کر کچن میں کام کرنے والے چینی نژاد شخص سے ناشتے کا کہا۔ اس نے جواب دیا۔ "صرف پندرہ منٹ انتظار کریں جناب۔" چینی خاصی صاف انگریزی بول رہا تھا۔

"ناشتہ مجھے ٹیرس میں ہی لا دینا۔" میں نے کہا اور واش روم جانے کے لیے اپنے کمرے میں گیا۔ سرسوتی کی لاش لے جائی جا چکی تھی اور کسی ملازم نے بیڈ شیٹ بھی بدل دی تھی۔ واش روم سے فارغ ہو کر میں واپس ٹیرس میں آ گیا۔ جان گرے اپارٹمنٹ میں تھا یا کہیں جا چکا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے قطعی علم نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے ٹائم میگزین سنبھال لیا۔ اس کے ایک مضمون میں دنیا کی معروف تجارتی بحری شاہراہوں پر بڑھتے ہوئے قزاقی رجحان پر تشویش ظاہر کی گئی تھی۔ میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ یہ آپ ہی چور اور آپ ہی منصف والی کہانی تھی۔ طاقتور اقوام نے جدید دور میں ایک دورُخی پالیسی اپنائی تھی۔ صبح جس کو مارتے تھے شام کو اس کا مرثیہ بھی پڑھتے تھے۔ ان کی اس دوغلی فطرت نے ساری دنیا کو ایک زنجیر میں جکڑ دیا تھا جس سے نجات کی خواہش بھی تھی اور کوئی راہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ چینی باورچی ناشتہ لے کر آیا۔

"جان گرے...... کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف کچن کے امور تک محدود ہوں جناب۔" اس نے ادب سے جواب دیا تھا۔ "آپ چائے یا کافی میں سے کیا لینا پسند کریں گے۔"

"کافی کریم کے ساتھ۔" میں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔ اس دوران میں حالات و واقعات پر غور کرنے لگا۔ پچھلے چار...... پانچ ہفتوں میں زندگی میرے لیے کچھ زیادہ ہی ہنگامہ خیز ہو گئی تھی۔ دن رات کوئی نہ کوئی چکر ہوتا تھا۔ خلیج پر ملازمت کرنے سے پہلے میں کراچی میں اپنے اپارٹمنٹ میں پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ یہ ملازمت میرے لیے تبدیلی لائی تھی۔

مجھے عبید صلاح کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جان گرے کو کرید کر اس سے ری

ایکٹرز کے بارے میں معلومات حاصل کروں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر مجھے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو میں اس تک یہ بات کیسے پہنچاؤں۔ کیا اس کا کوئی آدمی مجھ تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے جتنی آسانی سے میرے دونوں نگرانوں کو بے ہوش کیا تھا اس سے لگ رہا تھا وہ جزیرے پر خاصے وسائل اور حامی رکھتا ہے لیکن ری ایکٹرز کی تباہی الگ بات تھی۔ اس کی جتنی حفاظت کی جاتی ہو گی اس کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں عبید صلاح اس جزیرے سے نکل جانے کے بجائے اس معاملے میں اُلجھ رہا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ کوئی اندھا دھند قدم اُٹھانے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے یقیناً امکانات دیکھے ہوں گے تبھی جزیرے کی تباہی کے درپے تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کافی کا کپ بنایا۔ تھوڑی دیر میں چینی باورچی برتن لینے آیا۔ وہ مخصوص چینی جسمانی ساخت رکھتا تھا۔ دُبلا اور پھرتیلا۔ اس کی عمر چالیس برس کے آس پاس تھی۔ اس نے آ کر خاموشی سے برتن سمیٹنا شروع کیے۔ میں نے ناشتے کی تعریف کی تو وہ انکساری سے مسکرا دیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''سر میں نے ایک خاص پیزا بنایا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔''

''یار اس وقت تو پیٹ فل ہے۔'' میں نے نفی میں جواب دیا۔

''سر آپ کھا کر تو دیکھیں۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''میں نے ابھی بنایا ہے۔''

''اچھا لے آؤ...... میں چکھ لوں گا۔''

وہ خوش ہو گیا تھا۔ برتن سمیٹ کر وہ چلا گیا۔ میں دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک پلیٹ میں سجا گلابی اور بھورے رنگ کا پیزا لا کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے پلیٹ رکھنے کے بعد نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

''عبید صلاح۔''

میں ساکت رہ گیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے گویا توجہ ہی نہیں دی اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں نے گہری سانس لے کر پیزا کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی۔ پلیٹ میں چھری بھی تھی۔ میں نے چھری سے پیزے کے ٹکڑے کیے۔ اچانک چھری کسی ایسی چیز سے ٹکرائی جو کٹ نہیں سکتی تھی۔ میں نے پیزا ذرا سا کھولا۔ اس میں ایک کاغذ جھانک رہا تھا اور اس پر خاص قسم کی اِنک سے لکھا تھا۔

''اس شخص سے رابطہ رکھو اور کوئی بات ہو تو اس سے کہہ دینا۔''

میں پلیٹ پر نظر جمائے سوچ رہا تھا۔ کیا یہ دھوکا ہے یا سچ مچ عبید صلاح نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ معاً پیچھے سے آہٹ ہوئی اور جان گرے کی آواز آئی۔ ''یوسف کیا سوچ رہے ہو؟''

میرے ہاتھ سے پیزے کی پلیٹ چھوٹ گئی تھی۔ جسم بے اختیار سنسنا اُٹھا تھا۔

میں پلٹا تو عقب میں کھڑا جان گرے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''نیچے کوئی خاص چیز ہے؟''





''نہیں میں بندرگاہ کی مصروفیات دیکھ رہا تھا۔''

وہ ٹہلتے ہوئے ٹیرس کی ریلنگ کی طرف آیا۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا ویسے بھی اس کی کھوپڑی میں کسی پولیس والے کا دماغ فٹ تھا جو ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے آ کر نیچے جھانکا اور سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ جگہ پانی سے کوئی سو فٹ بلند ہے۔ اگر تم یہاں سے کود کر فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو میں اسے سو فیصد خودکشی قرار دوں گا۔ اس خلیج میں خاصی خونخوار نسل کی شارک اور دیگر گوشت خور مچھلیاں ہیں اس پانی میں رہنے والا شخص چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''میرا فرار کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے خبردار کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم شوق سے مجھ پر شک کر سکتے ہو۔''

''بُرا مان گئے۔'' وہ ہنسا۔

میں بھنا گیا۔ ''تم میری محبوبہ نہیں ہو جس کی Miss trust پر میں بُرا مناؤں۔''

''او کے...... او کے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں ویسے ہی خبردار کر رہا تھا۔''

''یہ بتاؤ عبید صلاح کا کچھ پتہ چلا۔''

''نہیں...... مگر ہم جلد اس کے بارے میں معلوم کر لیں گے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''البتہ تمہارے لیے ایک دلچسپ خبر ہے۔ الیکٹرک نے تم سے مقابلہ ری نیو کرنے کو کہا ہے۔''

''وہ کیسے...... اس کی ٹانگ جڑنے میں کم سے کم چھ مہینے لگیں گے اور پھر اسے دوبارہ فارم میں آنے کے لیے وقت درکار ہو گا۔''

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ پُرانے وقتوں کی بات تھی۔ اب جدید ترین طریقے آ گئے ہیں۔ ایسی ادویات ہیں جو صرف دو مہینے میں ہڈی کو مکمل طور پر جوڑ دیتی ہیں۔ آپریشن کرا کے انسان ایک ہفتے میں چلنے پھرنے لگتا ہے۔''

''جب وہ ہار چکا ہے تو مقابلہ دوبارہ کرنے کو کیوں کہہ رہا ہے۔ میں تو اسے اصول پسند انسان سمجھتا تھا۔'' مجھے سچ مچ حیرت تھی۔

''مجھے بھی تعجب ہے۔'' جان گرے بولا۔ ''وہ سخت اصول پسند شخص ہے جس سے ایسی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے مگر اس نے جزیرے کی کونسل کو درخواست دی ہے اور اُمید ہے کہ یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔ الیکٹرک کا تعلق ایک اعلیٰ نسل جرمن خاندان سے ہے جو کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مالک ہے۔ ہماری تنظیم بھی اس کے زیرِ اثر ہے۔''

''مجھے اس کا اصل نام بتاؤ۔ یہ الیکٹرک چھچھورا اور گھٹیا لگتا ہے اس کی شخصیت پر۔''

''اس کا اصل نام ولف گینگ ملر ہے۔ وہ معروف ملر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔''

''وہ ٹھیک ہو کر مجھ سے مقابلہ کرے گا چلو چھ مہینے نہ سہی پھر بھی اسے پوری طرح فٹ ہونے

میں تین مہینے تو لگ جائیں گے کیا میں اتنے عرصے تک اس جزیرے پر رہوں گا۔''

اس نے کسی قدر بے بسی سے شانے اُچکائے۔ ''اگر کونسل نے مقابلہ دوبارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو تمہیں جزیرے پر رہنا ہی پڑے گا۔''

اس بار میں ہنسا۔ ''یعنی تم اتنے بااختیار نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو۔ دیکھو کیسے معمولی معمولی سے لوگ تمہاری راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔''

اس بچ نے اس کے چہرے کے پہلے سے بگڑے نقوش مزید بگاڑ دیئے تھے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''میں بے بس نہیں ہوں بس کچھ مصلحتوں کی وجہ سے جزیرے کی کونسل سے بگاڑ نہیں چاہتا۔''

میں نے کچھ کہا نہیں بس طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا۔ وہ چڑ کر ٹیرس سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سرسری انداز میں نیچے دیکھا اور یہ دیکھ کر ذرا پریشان ہو گیا کہ سرمئی کاغذ پانی پر تیر رہا تھا اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ جاتا تو...... میں نے سوچا۔ تب بھی کچھ نہ ہوتا لیکن یہ اطلاع جان گرے تک پہنچ جاتی کہ اس کے فلیٹ کی بالکونی تلے پانی سے ایک کاغذ ملا ہے جس پر عبید بن صلاح کا نام تحریر ہے۔ تو وہ میری طرف سے مشکوک ہو جاتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جان گرے کا یہ چینی النسل باورچی عبید صلاح کا ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔

عبید صلاح کا نشانہ جزیرے کو توانائی فراہم کرنے والا ایٹمی بجلی گھر تھا اور میں اسے جلد از جلد ری ایکٹر کو سمندری پانی فراہم کرنے والی سرنگ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ ابھی جان گرے گھر میں تھا اور میں اس کی موجودگی میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر ٹیرس میں رہ کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جہاں سے سرسوتی کی لاش اُٹھائی جا چکی تھی۔ کل رات اس نے کتنے جوش سے میرے ساتھ وقت گزارا تھا۔ ہمارے تعلق کو داغ دار کیے بغیر اور مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے اپنی جان سے گزر گئی تھی۔ حالانکہ میں نے سوچ لیا تھا اسے بچانے کے لیے مجھے گناہ کے راستے سے بھی گزرنا پڑا تو گزر جاؤں گا۔ مگر اس نے مجھے آزمائش سے بچا لیا۔ اپنی زندگی سے وہ پہلے ہی بےزار تھی اس نے موقع جان کر ایک اچھے مقصد کے لیے جان دے دی۔ کافی دیر میں گم صم سا رہا تھا۔ پھر میں نے انٹرکام پر جان گرے سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر مجھے بتایا گیا کہ وہ دفتر چلا گیا ہے۔

موقع آ گیا تھا کہ میں چینی باورچی سے بات کروں۔ مجھے یقین تھا کہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے جان گرے نے اس پورے فلیٹ کو بگڈ کیا ہو گا نہ صرف مائیکروفون بلکہ خفیہ کیمرے بھی لگے ہوں گے۔ میری ذرا ذرا سی حرکت کو ریکارڈ کیا جا رہا ہو گا۔ میں نے سرہانے کی دراز پر رکھے بال پین کو اُٹھا کر بہ ظاہر بے خیالی میں جیب میں رکھ لیا اور کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد باہر ٹیرس میں نکل آیا یہی ایک جگہ تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہاں کیمرے نہیں تھے۔ ریلنگ پر جھک




کر میں نے پین نکالا اور اپنی ہتھیلی پر لکھا۔ میں اے بی ایس سے فوری رابطہ چاہتا ہوں۔''

اپنی ہتھیلی بند کر کے میں نے پین رکھا اور پھر کچن کی طرف آیا۔ چینی باورچی رات کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ایک کپ کافی مل جائے گی۔'' اور ساتھ ہی ہتھیلی اس کے سامنے کر دی کہ صرف وہی میرے ہاتھ پر لکھی تحریر پڑھ سکے۔ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔

''کیوں نہیں سر۔'' وہ بولا۔ ''آپ کافی کہاں لیں گے۔''

''اپنے کمرے میں۔'' میں نے ہتھیلی بند کر لی۔

''صرف دس منٹ میں کافی آپ کے پاس ہو گی سر۔'' اس نے سر خم کر کے کہا تھا۔

اپنے کمرے کے واش روم میں آ کر ہتھیلی کو رگڑ کر دھو دیا۔ اس پر سے تحریر مٹ گئی تھی۔ اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اتنی جلدی چینی باورچی پر اعتماد کر کے بے وقوفی تو نہیں کی ہے۔ عین ممکن تھا وہ عبید صلاح کا ساتھی ہونے کے بجائے جان گرے کا جاسوس بھی ہو سکتا تھا جو اس کے اشارے اور پلان پر عمل کر کے میرے ساتھ یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر وہ عبید صلاح کا ساتھی نہ بھی ہوتا۔ جان گرے کا جاسوس ہوتا تب بھی مجھے کیا فرق پڑتا۔ اگر جان گرے نے عبید صلاح کو پکڑنے کے لیے یہ چال چلی تھی تو مجھے اس کا پتا معلوم ہی نہیں تھا۔ میں جان گرے کو کیا بتاتا۔ البتہ میں اس سے کہہ سکتا تھا کہ میں عبید صلاح کو سمجھانے کے لیے اس سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر باورچی سچ مچ عبید صلاح کا ساتھی تھا تو میری خوش نصیبی تھی۔

دس منٹ میں چینی باورچی کافی لے آیا تھا۔ ''جناب لنچ کب کریں گے؟'' اس نے ادب سے پوچھا اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ غلام تھا۔ ان لوگوں نے مکاری سے کام لے کر ایشیا اور افریقہ کے مختلف علاقوں سے ان لوگوں کو اغوا کیا تھا۔ ورنہ وہ سارے غلام برصغیر سے بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ایک ہی خطے سے حاصل کردہ غلام اتحاد کر کے ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتے تھے۔ انہوں نے مختلف قوموں کے افراد کو یہاں رکھا تھا جن میں اتحاد بے حد دشوار تھا۔

''ابھی موڈ نہیں ہے جب ہو گا تو بتا دوں گا۔'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے عبید صلاح کے بارے میں کسی طرح سے بتائے گا مگر وہ خاموشی سے کافی رکھ کر چلا گیا پھر مجھے اپنی بے تابی پر ہنسی آئی۔ وہ ایک مفرور شخص سے فٹافٹ کس طرح رابطہ کر سکتا تھا۔ اسے یقیناً اس کام کے لیے وقت درکار تھا۔ کافی پینے کے ساتھ وقت گزاری کے لیے میں نے ایک میگزین سنبھال لیا۔ تین بجے مجھے بھوک لگی تو کھانا طلب کر لیا پھر سو گیا۔ شام کو آنکھ کھلی۔ میرے پہلو کا زخم تقریباً بھر گیا تھا معمولی سا کھرنڈ باقی رہ گیا تھا۔ ایکسر سائز کر کے میں نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ گزشتہ ایک مہینے سے زیادہ میں نے سخت تکلیف میں گزارے تھے۔ قیدی تو میں اب بھی تھا لیکن یہ خاصی لگژری قسم کی قید تھی اور میں اس سے پورا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔

جان گرے رات تک نہیں آیا تھا۔ کھانا کھا کر میں دس بجے سونے کے لیے دراز ہو گیا۔ حسب

معمول نیند سے پہلے کاجل کی یاد آئی۔ وہ پاگل لڑکی نہ جانے کیا کر رہی ہوگی۔ میرے لیے کتنی بے قرار ہوگی اور میرے مرنے پر زہرہ بیگم اور ان کے صاحبزادوں نے باقاعدہ جشن منایا ہوگا۔ اگرچہ میں اس کے کاروبار سے خود ہی دستبردار ہوگیا تھا جو جمشید علی نے میرے نام منتقل کر دیا تھا اور مجھے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ میری حیثیت قربانی کے بکرے سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر کبھی بُرا وقت آتا تو کاروبار کے مالک کی حیثیت سے میری گردن ماری جاتی۔ جمشید علی کی اولاد محفوظ رہتی۔ اس کاروبار کا بیشتر نفع ان خفیہ اکاؤنٹس میں جاتا تھا جنہیں آپریٹ کرنے کا اختیار صرف زہرہ بیگم کو تھا۔ مجھے بھی اس نفع کا ایک حصہ ملتا تھا لیکن جب سے میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس نفع کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کیا تھا اس کے باوجود زہرہ بیگم اور ان کے صاحبزادے سے یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹا کرتے تھے کہ کروڑوں ڈالرز سالانہ کا نفع دینے والی یہ مرغی میرے قابو میں تھی۔ اگر مجھے زہرہ بیگم اور جنید، جاوید کو اپنے دباؤ میں نہ رکھنا ہوتا تو شاید میں یہ کاروبار بھی ان کو دے دیتا مگر کاجل کے معاملے میں وہ اس کاروبار کی وجہ سے میرے آگے مجبور ہو سکتے تھے۔ البتہ میں نے جمشید علی کی چال ان پر لوٹاتے ہوئے جنید اور جاوید کو کاروبار کی محدود پاور آف اٹارنی دے دی تھی جس کے تحت وہ اسے چلانے اور اس کا نفع لینے کے مجاز تھے لیکن وہ اسے نہ تو کسی کو فروخت کر سکتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے نام پر منتقل کرا سکتے تھے۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو میرے ہاتھ صاف تھے۔ پھنستے جنید اور جاوید کیونکہ وہی کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔

مجھے اپنے نفع سے یاد آیا کہ لندن کے ایک بین الاقوامی بینک کے اکاؤنٹ میں میرے بے شمار ڈالرز محفوظ تھے۔ ان کی گنتی کم سے کم بھی کروڑ میں آتی تھی۔ کئی برس سے میں نے اس اکاؤنٹ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر اب وقت آ گیا تھا کہ اس اکاؤنٹ کو استعمال کرتا۔ اگر میں جان گرے کے چنگل سے بچ نکلتا تب بھی مجھے ان بین الاقوامی دہشت گردوں سے محفوظ رہنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ آج کے دور میں دولت ایک ایسی چیز ہے جس کے بل پر آپ بین الاقوامی مارکیٹ سے سب خرید سکتے ہیں۔ جدید ترین ہتھیار بھی جیسے میزائل اور توپ بلکہ ایٹم بم تک اور کرائے کے فوجی بھی۔ فی الوقت میں بے بس تھا لیکن اگر ان لوگوں کی گرفت سے نکل جاتا تو زندہ رہنے کے لیے بے شمار طریقے اختیار کر سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت نیند آ گئی معاً میری آنکھ کھلی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ”کون ہے آ جاؤ۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔ دروازے پر مستعد رہنے والے سیاہ فام گارڈ نے اندر جھانک کر مجھے دیکھا۔

”سر آپ کو دس منٹ میں جان گرے صاحب کے پاس پہنچنا ہے۔“

میں جھنجھلا گیا۔ ”یہ کون سا وقت ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم سر...... آپ کے پاس اب نو منٹ ہیں۔“ اس نے مشینی انداز میں جواب دیا





اور دروازہ بند کر دیا۔ مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ ہر ممکن تیزی سے کپڑے بدل کر میں باہر نکلا۔ وہ مجھے لیونگ روم میں لایا۔ یہاں جان گرے جینز کی پتلون پر ایک ڈھیلی سی شرٹ پہن کر بہ ظاہر کہیں جانے کے لیے تیار تھا اس کے پیروں میں کینوس شوز تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”تم وقت پر آ گئے۔ جلدی چلو ایگل روانہ ہونے والا ہے۔“

”یہ ایگل بد بخت کون ہے اور اسے اتنی رات گئے کہاں جانے کی ضرورت پیش آ گئی؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”فضول باتوں سے گریز کرو۔“ اس نے انگلی اُٹھا کر کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں ایک مہم پر لے جاؤں گا۔ اس کا وقت آ گیا ہے۔“

”میں تمہاری قزاقی کی کسی مہم میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہارے جرائم میں شریک نہیں ہوں گا۔“

”تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“ جان گرے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ”اسے لے چلو اور چوکس رہنا یہ خطرناک شخص ہے۔“

”یس سر۔“ سیاہ فام گارڈ نے مستعدی سے کہا اور اپنی گن کا رُخ میری طرف کر کے بولا۔ ”چلیں سر کسی اور شرارت کا خیال بھی مت ذہن میں لائیے گا۔“

میں سیاہ فام گارڈ کے ساتھ باہر آیا۔ میرا شرارت کا قطعی موڈ نہیں تھا لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر جان گرے نے ایک گارڈ اور بلوا لیا تھا۔ وہ دونوں مجھے نیچے بندرگاہ تک لائے۔ ایک جیٹی پر وہی گن بوٹ کھڑی تھی جس نے پہلے خلیج پر قزاقی کی تھی اور پھر اسے ڈبو دیا تھا۔ بہ ظاہر یہ گہرے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والا ماہی گیری کا ٹرالر لگتا تھا۔ دونوں گارڈز نے مجھے ٹرالر کے نگران کے حوالے کیا۔ ”اسے جان گرے صاحب نے بھیجا ہے۔“ سیاہ فام گارڈ نے نگران کو بتایا۔ وہ کیپٹن نہیں تھا کیونکہ اس نے محافظوں والی مخصوص نیلی اور سبز وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ”یہ کس درجے کا قیدی ہے۔“ نگران نے سیاہ فام گارڈ سے پوچھا۔

”اے ٹو درجے کا۔“ سیاہ فام نے کوئی کوڈ بتایا۔ اس کا مطلب شاید یہی تھا کہ مجھ پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ نگران نے سر ہلایا اور بوٹ کے عرشے پر مستعد گارڈز کو بلا کر انہیں حکم دیا۔ ”اسے لے جا کر نیچے سیل میں ڈال دو۔“

”چلو۔“ گارڈز مجھے لے کر قید خانے میں آ گئے۔ ایسے ہی ایک قید خانے میں مَیں اس جزیرے کی طرف آتے ہوئے سفر کر چکا تھا۔ مجھے یہاں قید کر کے گارڈز دفع ہوئے تو میں نے اپنی بقیہ نیند پوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے سونے کے دوران میں ہی اسٹیمر حرکت میں آ گیا تھا۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھ کھلی مگر میں دوبارہ سو گیا تھا۔ اگلی بار جگایا گیا۔ ایک سیاہ فام نے سلاخیں بجا کر مجھے ناشتے کے لیے جگایا۔ ٹرے اس نے نیچے سوراخ سے اندر کر دی اور بولا۔ ”مین ناشتہ کر کے

مجھے آواز دے لینا۔"

اس جگہ ضروریات سے فارغ ہونے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ طبیعت پر جبر کر کے میں نے ناشتہ کیا جو معقول اور مناسب مقدار میں تھا۔ تلی ہوئی مچھلی...... چند ڈبل روٹی کے سلائس اور ایک کپ کافی۔ ناشتہ کر کے میں نے ٹرے سے سلاخیں بجائیں۔ سیاہ فام فوراً آ گیا۔ وہ تقریباً چھ فٹ کا مناسب صحت والا نیگرو تھا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق امریکہ سے ہے۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" میں نے انگلی سے مخصوص اشارہ کیا۔

"کچھ دیر انتظار کرو۔ میں کسی گارڈ کو بھیجتا ہوں وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔" وہ ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد ایک سفید فام گارڈ آیا اس نے تالا کھول کر مجھے باہر بلایا۔ "باتھ روم وہ کونے میں ہے۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔"

ان لوگوں کو وقت دینے کا خاصا شوق ہے۔ میں نے اس قید خانے کا جائزہ لیا۔ یہاں پر چار سیل تھے۔ دو دو کر کے دائیں بائیں۔ باہر جانے والا دروازہ بند تھا اور ایک کونے میں واش روم بنا تھا۔ یہ خاصا جدید اور سہولتوں والا باتھ روم تھا۔ میں فارغ ہو کر باہر آیا تو سفید فام گارڈ بے زاری سے ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "جان گرے کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کیبن میں ہیں۔" اس نے خاصی عقیدت سے کہا۔

"اسے کہو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" گارڈ کو تپانے کے لیے میں نے جان بوجھ کر جان گرے کے لیے توہین آمیز لہجہ اپنایا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ سفید فام سدھائے ہوئے کتے کی طرح غرانے لگا۔ "دفع ہو اندر...... جان گرے تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے۔"

"اچھا پھر اپنے باپ کا ہو گا اگر اس کا کوئی ایک باپ ہوا۔" میں نے سیل میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ شاید اسے میرے معاملے میں خاص ہدایت تھی کہ مجھ سے اُلجھنے سے گریز کرے۔ اس لیے اس نے زبانی قصیدہ خوانی پر اکتفا کیا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں جان گرے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے کس مہم پر لے جا رہا ہے اور اس میں شریک کرنے کا مقصد کیا ہے۔ جان گرے دن بہ دن میرے لیے پُراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک موہوم سا اندیشہ تھا کہ جان گرے مجھے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے مگر یہ ابھی اندیشہ تھا عین ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط ہو۔

میں نے ایکسرسائز کی۔ الیکٹرک والے معاملے کے بعد میں اس میں کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جن حالات سے دوچار تھا۔ مجھے کسی وقت بھی جسمانی مقابلے کی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھاگ دوڑ کی صورت میں جسمانی طور پر فٹ ہونا بھی ضروری تھا۔ ایک گھنٹے تک بھرے پیٹ جاری رہنے والی ورزشوں نے مجھے تھکا دیا تھا۔ گن بوٹ ایک متواتر رفتار سے چل رہی تھی اور اب تک ایک سیدھ میں سفر کرتی رہی تھی۔ اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ اس بار شاید وہ کسی خشکی کی طرف جا رہے ہیں۔ انہیں اپنی منزل کا علم ہے۔ کسی متحرک ہدف کا تعاقب کرنے کی صورت میں انہیں بوٹ کی





پوزیشن بدلنا پڑتی۔ بوٹ تقریباً بیس ناٹ کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ یہ خاصی رفتار تھی مگر انجن کے آہنگ سے میں نے اندازہ لگایا کہ بوٹ اس وقت معمول کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ ورنہ اس کا شور خاصا بلند ہوتا۔ ممکن ہے یہ بوٹ پچاس ساٹھ ناٹ میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی چل سکتی ہو۔

جن دنوں میں لندن میں میرین انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر رہا تھا۔ مجھے اس شعبے میں ہونے والی بعض جدید پیش رفتوں کا علم ہوا تھا۔ بعض ساخت کے شپ ایک مخصوص انجن استعمال کر کے بے انتہا تیزی سے سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جاپان نے ایک نئی طرز کا انجن بنایا تھا جو پانی کو اندر کھینچ کر پھر اسے پریشر سے چھوڑتا ہے۔ یہ انجن خاص آبدوز کے لیے تھا اور مستقبل میں اس قسم کے انجن والی آبدوزیں سپر سانک یعنی آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے پانی میں دوڑ رہی تھیں۔

میری یونیورسٹی کے طلباء نے ایک خاص ایٹمی ری ایکٹر تیار کیا تھا۔ بحری جہازوں اور آبدوزوں کے لیے بنایا جانے والا یہ ری ایکٹر سمندری پانی سے ہائیڈروجن اور آکسیجن الگ کرتا تھا اور پھر اس ہائیڈروجن اور آکسیجن کو خاص آمیزہ بنا کر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ خلائی راکٹوں اور خاص طور سے شٹل سے جانے والے راکٹ اس ایندھن سے چلتے ہیں۔ اس طرح کسی بحری جہاز یا آبدوز کو کبھی ایندھن کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور اس کی رفتار انتہا سے زیادہ تیز ہو جائے گی۔

مجھے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف مغرب کے باشندے جنونیوں کی طرح نت نئی ایجادوں اور دریافتوں میں مگن ہیں تو دوسری طرف مشرق اقوام اور خاص طور سے مسلمان اپنے حال میں مست ہیں۔ انہیں حال کی پروا ہے اور نہ آنے والے مستقبل کی۔

مجھے دوپہر کا کھانا دیا گیا اور اس کے بعد رات کا۔ مگر میری طلبی نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں ڈٹ کر سوتا رہا۔ نہ جانے آنے والا وقت کیسی مشکلیں لائے پھر سونے یا آرام کرنے کا موقع ملے بھی یا نہیں۔ صبح بھی وہی معمولات دُہرائے گئے۔ حتیٰ کہ سفید فام گارڈ سے میری پھر مُنہ ماری ہوئی۔ سیاہ فام خادم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں آرتھر یعنی اس گارڈ کے مُنہ نہ لگوں۔ وہ بے حد سفاک شخص ہے۔ سیاہ فام جیمس بوٹ پر ایک کنٹریکٹ کے تحت ملازم تھا۔ دو سال بعد وہ اپنے علاقے الابار چلا جاتا۔ الابار امریکہ کی واحد ریاست ہے۔ جہاں سیاہ فام اکثریت میں ہیں۔ مگر مجھے شبہ تھا کہ یہ لوگ جیمس کو واپس جانے کی اجازت شاید ہی دیں۔ وہ ان کے خطرناک جرائم کا عینی گواہ تھا اور وہ اس قسم کے لوگ تھے جو اپنا ہاتھ بچا کر کام کرتے ہیں۔ انسانیت کا نعرہ لگا کر انسان کشی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے گواہ کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خیر یہ جیمس اور ان کا دردِ سر تھا۔ مجھے تو یہ فکر لگی تھی کہ مردود جان گرے مجھے کس معاملے میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس سارے دن بھی بوٹ ایک لمحہ رُکے بغیر چلتی رہی۔ بس اس کا انجن بدل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا بوٹ نے اپنے مستقر سے کوئی ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم جنوب مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ جانے ہماری منزل کون سی سرزمین تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ یہ منزل افریقہ کی سر

زمین پر کہیں واقع تھی۔ آنے والی رات خاصی خنک تھی اور مجھے اپنے پتلے سے بستر کے ایک طرف تہہ کیا رکھا ہلکا سا کمبل اوڑھنا پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم خطِ استوا سے خاصے فاصلے پر آ گئے تھے اور غالباً جنوب کی طرف آئے تھے کیونکہ یہ مئی کا مہینہ تھا اور شمالی نصف کرے میں اس وقت گرمی ہوتی ہے۔ جب کہ جنوب نصف کرے میں سرما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خنکی بتا رہی تھی کہ اس وقت ہم جنوبی نصف کرے میں ہیں۔

اگلے روز سارے دن بھی جب بوٹ کا سفر مستقل جاری رہا تو مجھے حیرانی محسوس ہونے لگی کیا جان گرے انٹارکٹیکا جا رہا تھا۔ بوٹ اس وقت دو ہزار میل سے زیادہ کا سفر طے کر چکی تھی۔ اسے سفر کرتے ہوئے کوئی ساٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ تیسرے دن رات کھانے کے بعد دس بجے کے قریب میری طلبی ہوئی۔ مجھے بوٹ کے اگلے عرشے پر لایا گیا۔ جہاں تقریباً پچاس کے قریب فوجی یونیفارم میں ملبوس افراد اٹینشن کھڑے تھے اور ایک شخص جو کرنل کی وردی میں ملبوس تھا انہیں میگا فون پر ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے جو چند جملے میں نے سنے ایسا لگا جیسے وہ انہیں کسی فوجی مشق کے بارے میں بریفنگ دے رہا ہے۔ اس کا آخری جملہ یہ تھا۔ ''سامنے آنے والے ہر شخص کو قتل کر دو۔''

اس کے ساتھ ہی مجھے عرشے تلے اُتار دیا گیا۔ سیڑھیاں نچلی منزل کی طرف جا رہی تھیں اور ایک کیبن میں مجھے جان گرے کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہ خلافِ معمول سنجیدہ اور ہوش میں نظر آ رہا تھا۔ یعنی اس کے پاس کسی بنت حوا یا بنت...... کا وجود نہیں تھا۔ اس نے بھی فوجی وردی پہن رکھی تھی لیکن وہ کسی قسم کے اسلحے سے لیس نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ آنے والے شخص کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

''یوسف کچھ دیر بعد بوٹ ہمیں ایک ساحل پر اُتارے گی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں اس مشن میں دل و جان سے شامل ہونا ہے۔ اس طرح تم جزیرے کی کونسل کی خوشنودگی حاصل کر لو گے۔''

''یہ مشن کیا ہے؟''

''تمہیں ایک حملے میں حصہ لینا ہے۔''

''اور بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''جنگ میں ہمیشہ بے گناہ مارے جاتے ہیں۔'' اس نے فلسفیانہ لہجہ اختیار کیا۔ ''اگر تم اس حملے میں حصہ نہیں لینا چاہتے تب بھی اس میں شامل ضرور ہو جاؤ۔''

''میرے لیے کونسل کی خوشنودی حاصل کرنا کیوں ضروری ہے؟''

''اس طرح تم شاید الیکٹرک سے دوبارہ مقابلہ کرنے سے بچ جاؤ گے اور تمہیں مکمل طور پر میرے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''یعنی کنویں سے نکل کر کھائی میں گر جاؤں۔'' میں نے دل میں سوچا اور منہ سے بولا۔

''تمہاری مرضی...... یہ تمہارا دردِ سر ہے لیکن میں کسی بے ہودہ کام میں حصہ نہیں لوں گا۔''





''پھر بھی تمہیں ساتھ رہنا ہوگا۔'' اس نے گہری سانس لی۔

میں نے اسے طنزیہ انداز میں دیکھا۔ ''کیا تمہیں خوف نہیں ہے کہ میں موقع سے فائدہ اُٹھا کر فرار ہو جاؤں گا۔'' میں چبھتے لہجے میں بولا۔

جان گرے غرور سے مسکرایا۔ ''یوسف کیا ہم تمہیں اتنے ہی احمق نظر آتے ہیں؟''

''قطعی نہیں...... اس کا مطلب ہے تم نے کوئی ایسا بندوبست کیا ہے کہ میں فرار نہ ہو سکوں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے جو بندوبست کیا ہے، تم اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔''

جان گرے نے تالی بجائی اس کا انداز قدیم بادشاہوں جیسا تھا۔ فوراً دو گارڈز اندر آئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ جان گرے نے انہیں کوئی اشارہ کیا تو ایک نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے پکڑ لیے اور دوسرے نے اپنا پستول میرے سر سے لگا دیا۔

''اُمید ہے اب تم مزاحمت نہیں کرو گے۔'' جان گرے مسکرایا۔ اس نے اپنے پاس رکھے ایک دھاتی بکس سے ایک گول بیلٹ نما چیز نکالی لیکن یہ بیلٹ سے چھوٹی اور ساخت میں موٹی سی تھی۔ جان گرے نے اسے لا کر میری گردن کے گرد لپیٹا اور پھر پیچھے سے اس کا ہک بند کر کے اپنے پاس موجود ریموٹ نما آلے کا ایک بٹن دبایا۔ اس کالر نما شے سے کٹ کی سی آواز آئی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ جان گرے شیطانی انداز میں مسکرایا۔

''تمہیں پتا ہے یہ ایک بارودی بیلٹ ہے اور اگر تم اب مجھ سے سو فٹ سے زیادہ دور گئے تو یہ بیلٹ پھٹ جائے گی۔ نتیجے میں تمہاری گردن جسم سے الگ ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے اب تم فرار کی کوشش کرو گے۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔



میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔ اندر کمرے میں ٹین کے بکس میں آگ بھڑک رہی تھی اور باہر میری جان کے دشمن آ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں ہونے والی روشنی دیکھ لی تھی۔ مگر اندھا دھند اندر آنے سے گریز کیا۔ غالباً وہ باہر لاشیں دیکھ چکے تھے۔ میں نے استاد کی آواز سنی وہ دیوانہ وار گالیاں دے رہا تھا۔ غالباً اس کی سرد مزاجی ہوا ہو چکی تھی۔ ''وہ حرامی اسلحے والے کمرے میں گھسا ہے۔ اس نے وہاں آگ لگا دی ہے۔ سب کچھ اُڑ جائے گا۔''

''استاد رقم والا بکس بھی ادھر ہی ہے۔'' مجیب نے گھبرا کر کہا تھا۔

''رقم گئی...... میں۔'' استاد نے ایک ناقابلِ بیان جگہ کا ذکر کیا۔ ''اب اوپر والوں کو کیا جواب دیں گے۔ ہماری کھال اُتر جائے گی۔ چوہدری صاحب ادھر آنے والے ہیں۔''

اس دوران میں مَیں اسلحے کو جلنے والے صندوق سے دور کر رہا تھا۔ میری حماقت نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اگر آگ قابو سے باہر ہو جاتی تو میرے جسم کے پرزے بھی نہ ملتے۔ وہاں اتنا گولا بارود تھا۔ میں اپنی حماقت کو کوسنے لگا۔ ناتجربہ کاری نے مجھے مروا دیا ورنہ حنیف کے مرتے

ہی ہر شے پر لعنت بھیج کر وہاں سے نکل جاتا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کمرے سے نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا یعنی دروازہ اور اس پر استاد اور گرگا موجود تھا۔ میں باہر قدم بھی رکھتا تو وہ مجھے چھلنی کر دیتے۔

''استاد ادھر سے نکل لو۔'' مجیب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دھماکا ہو گیا تو اس چھوکرے کے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔''

''بکواس مت کر...... اگر ہم یہاں سے گئے تو وہ بھاگ جائے گا اور اس کے بعد کتے ہماری لاشیں نوچیں گے۔ ڈیل آخری مراحل میں ہے اگر یہ بھاگ گیا تو کام خراب ہو جائے گا۔''

''استاد اب بھی سوچ لے۔ دھماکا ہو گیا تو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' مجیب منمنایا۔

ان کی باتیں سننے میں مَیں ایسا مگن ہوا کہ آگ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ چارپائی کی لٹکتی چادر نے آگ پکڑ لی۔ شعلوں کی چمک نے مجھے چونکایا۔ میں نے بدحواسی میں بستر سے چادر اُتار کر زمین پر مار کر بجھانے لگا اور جب یہ کام کر کے فارغ ہوا تو چارپائی کی بان نے آگ پکڑ لی تھی۔ اس کے پاس ہی راکٹ اور دستی بم رکھے تھے۔ میں آگ کی پروا کیے بغیر انہیں اُٹھا کر چارپائی سے دور رکھنے لگا۔ اس دوران میں مَیں نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ دشمن میرے بارے میں جتنا بے خبر رہتا اتنا ہی بہتر تھا۔ راکٹ اور دستی بم میں نے جلتی چارپائی سے دور کر دیے تھے مگر مجھے خطرہ تھا آگ مزید بے قابو ہو سکتی تھی۔ کمرے میں دھواں بھر رہا تھا۔

''آگ پھیل رہی ہے۔'' مجیب کی آواز لرز رہی تھی۔

''یوسف باہر آ جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' عالمگیر نے مجھے للکارا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں اندر رہتا تو مارا جاتا لیکن باہر نکلنے کی صورت میں بھی میرا انجام اس سے مختلف نہ ہوتا۔ مجھے زندہ رکھنا شاید اب ضروری نہیں تھا کیونکہ میری زندگی کا ثبوت وہ پہلے ہی جمشید علی خان کو دے چکے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی موت نے عالمگیر کو مشتعل کر دیا تھا۔ میرا فرار ہونا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا مارا جانا ان کے لیے زیادہ قابلِ قبول تھا۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ مجھے نکل جانے کا موقع دیں گے۔ عالمگیر خبیث صفت شخص تھا وہ جانتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک کمرے میں نہیں رہ سکوں گا مجھے باہر آنا ہی پڑے گا اور تب وہ مجھے آسانی سے مار کر اپنے بڑوں کے سامنے سرخرو ہو سکیں گے۔

''یوسف اب بھی وقت ہے۔ اگر اسلحے کو آگ لگ گئی تو بچ نکلنے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔ ہم دروازے پر کھڑے ہیں ایک لمحے میں باہر ہوں گے۔ ضد مت کرو باہر آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

میں ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ چارپائی اب پوری طرح آگ پکڑ چکی تھی اور اس کے شعلے پاس رکھی لکڑی کی الماری کی طرف لپک رہے تھے کچھ دیر جاتی تھی کہ کمرا جہنم بن جاتا





اور میرا مقبرہ بھی۔ اچانک میری نظر دستی بموں پر پڑی۔ میرے لیے یہ کوئی اجنبی چیز نہیں تھے۔ حسن علی نے مجھے ان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ میں ان کے استعمال سے واقف تھا ان پر نظر پڑتے ہی مجھے باہر نکلنے کی راہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے دستی بم کا جائزہ لیا۔ یہ روسی ساخت گرینیڈ تھے۔ جن کی پن نکال کر انہیں پھینکا جاتا ہے تو یہ پانچ سیکنڈ کے وقفے سے پھٹ جاتے ہیں۔ ایک بم لے کر میں دروازے کے پاس آیا۔ دستی بم کو بہ غور دیکھا۔ کہیں یہ پانچ کے بجائے تین سکنڈ میں نہ پھٹ جائے اور میں اسے پھینکنے کی حسرت لیے مرحوم ہو جاتا۔ اس اثناء میں شعلے الماری تک پہنچ گئے تھے اور اب اس نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ میرے پاس غور و خوض کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دستی بم کی پن کھینچی اور پانچ تک گن کر اسے راہداری میں ممکن حد تک آگے پھینک دیا۔ مشکل سے ایک لحہ گزرا تھا کہ اعصاب شکن دھماکا ہوا۔ اس کے بعد ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔

میں نے رائفل شانے پر لٹکائی اور پستول ہاتھ میں لیے زمین پر رینگتا ہوا باہر آ گیا۔ حسبِ توقع وہاں دھواں تھا۔ شکر ہے تاریکی بھی تھی۔ ورنہ دستی بم آگ لگا سکتا تھا۔ میں دوسرے کمرے کے پاس سے گزرا۔ دستی بم اس کے دروازے پر گرا تھا۔ اس میں ان دونوں نے مورچہ لگا رکھا تھا۔ ان کے پاس ہتھیار تھے اچانک میرا ہاتھ کسی نرم سی شے سے ٹکرایا۔ یہ کسی کا ہاتھ تھا میں نے ہڑبڑا کر پستول سیدھا کیا مگر وہ محض ایک ہاتھ تھا۔ جی ہاں ہلکی روشنی میں...... یہ صرف ایک ہاتھ تھا جو کہنی سے ذرا اوپر کٹ گیا تھا۔ اس پر ایک سنہری گھڑی تھی اس ہاتھ کا باقی جسم نہ جانے کہاں تھا۔ جانے یہ کس کا ہاتھ تھا مجیب کا یا عالمگیر کا۔

باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ میں اُٹھ کر باہر کی طرف دوڑا تھا۔ عقب سے عالمگیر کی آواز آئی۔

''بس اب ایک قدم نہ اُٹھانا رُک جاؤ۔''

میں بے اختیار ساکت ہو گیا۔ دروازہ دو قدم آگے تھا لیکن یہ دو قدم اُٹھانے سے پہلے میرے جسم میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر سکتا تھا۔ میں ہاتھ اوپر کرتے ہوئے گھوما۔ عالمگیر نے رائفل میری طرف تان رکھی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے وارننگ دینے کے بجائے میری پشت میں گولی کیوں نہیں اُتار دی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا بے شک اس کے کپڑے خون آلود ہو رہے تھے لیکن اس کے ہاتھ سلامت تھے۔ یعنی بم کا نشانہ اس کا ساتھی مجیب بنا تھا۔ اس نے سفاک سی آواز میں کہا۔

''پستول اور رائفل اُتار کر میری طرف پھینک دو۔''

رائفل کا رُخ میری طرف تھا۔ یہ خودکار برسٹ مارنے والی رائفل تھی۔ ایک انگلی کی جنبش میرے جسم میں کئی روشندان کھول سکتی تھی۔ مجبوراً میں نے پہلے پستول اور پھر رائفل اس کی طرف پھینک دی۔ اس نے رائفل کا رُخ میری طرف رکھا اور احتیاط سے جھک کر میرا پستول اُٹھا لیا اور اس کے اُٹھاتے ہی اس نے اپنی رائفل پھینک دی اور خبیثانہ انداز میں ہنسا۔

''تمہارا شکریہ...... ویسے میری رائفل میں میگزین نہیں تھا۔ بم کے دھماکے سے بچنے کے لیے

میں گرا تو رائفل کا میگزین نہ جانے کیسے نکل گیا۔ وقت نہیں تھا اس لیے مجبوراً تمہیں خالی رائفل سے دھمکانا پڑا۔ تم تو خاصے سعادت مند ثابت ہوئے ہو۔‘‘

اپنی اس حماقت پر میرا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔ مگر موت کو سامنے پا کر میرے حواس زیادہ ہی تیزی سے کام کرنے لگے تھے۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ’’تبھی تم نے گولی نہیں ماری۔ اگر رائفل کا میگزین نہ گرا ہوتا تو یقیناً اس وقت میری لاش یہاں پڑی ہوتی۔‘‘

’’اب بھی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔‘‘ اس نے پستول میری طرف اُٹھایا۔ وہ سرد مزاج شخص ایک لمحے میں گولی چلا سکتا تھا میں غوطہ کھانے کو بالکل تیار تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ قضا میری نہیں اصل میں اس کی آئی تھی۔ اچانک عقبی کمرے سے آگ کا طوفان برآمد ہوا۔ دھماکے سے پہلے اس کی لہر نے مجھے اُٹھا کر دروازے کے باہر پھینکا۔ زمین پر گرنے سے پہلے میں نے عالمگیر کو شعلوں میں گھر کر دیوانہ وار چلاتے دیکھا تھا۔ پھر میں زمین پر گرا اور لڑھکتے ہوئے صحن میں چلا گیا۔ میرے چاروں طرف جلتے ملبے کی بارش ہو رہی تھی۔ گرنے سے چوٹیں آئی تھیں لیکن میرے حواس بے دار تھے۔ میں اُٹھ کر بھاگا۔ عقب میں لگاتار دھماکے ہو رہے تھے۔ دروازے کے پاس پہنچا تو اتنا شدید دھماکا ہوا کہ میں اُچھل کر گیٹ کے بڑے سے ستون کے سامنے جا گرا اور پھر فوری طور پر اس کے عقب میں ہو گیا۔ چاروں طرف سلگتا ملبہ اور پتھر گر رہے تھے۔ اگر میں ستون کی آڑ میں نہ ہوتا تو یہ ملبہ مجھے سنگسار کر دیتا۔ جب تک ملبہ برستا رہا اور دھماکے ہوتے رہے میں ادھر ہی دبکا رہا۔ اندر موجود گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ اگر یہ سب ایک ساتھ ہی پھٹ جاتا تو مجھے وہاں سے بچ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ میرے بھی چیتھڑے اُڑ جاتے۔ عالمگیر کے انجام کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے خود میں نے شعلوں میں گھرے دیکھا تھا۔ عجیب پہلے ہی دستی بم کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس جگہ پر موجود پانچ انسان اپنی جان ہار چکے تھے۔ بلکہ دو عدد تربیت یافتہ کتے بھی کام آئے تھے۔ عین ممکن ہے مرشد اور ارشد بلا گروپ کے بڑوں کے لیے ان دو کتوں کی موت زیادہ دُکھ کا باعث ہو بہ نسبت ان چار انسانوں کے جو ان کے لیے کام کرتے تھے وہ کچھ اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ تھے۔ اس سارے ہنگامے میں مجھے خاصے زخم آئے تھے۔ چہرے اور ہاتھ پیروں سے کئی جگہوں سے خون رِس رہا تھا۔ اپنے شانے پر مجھے خاصی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ شاید کوئی چیز وہاں لگی تھی۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹولا ہلکی سی سوجن تھی۔

اب دھماکے رُک گئے تھے۔ البتہ فضا میں شعلوں کی لپٹیں اور چیزیں پھٹنے جیسی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ستون سے جھانکا۔ میرا خیال تھا کہ مکان یا کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی ہو گی۔ مگر وہاں سے کوٹھی سرے سے غائب تھی اور اس کا ملبہ کوٹھی کے احاطے میں یوں بکھرا تھا جیسے کسی نے کوٹھی کے پُرزے پُرزے کر کے اس کا ملبہ بکھیر دیا ہو۔ ایک دیوار تک سلامت نہیں تھی۔ تباہی کی شدت دیکھ کر مجھے اپنا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔





اگرچہ یہ علاقہ سنسان تھا اور یہاں پر خاصے فاصلے پر کوٹھیاں بنی تھیں مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ خوفناک دھماکے کسی نے نہ سنے ہوں۔ کچھ ہی دیر میں یہاں پر لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ پولیس بھی آ سکتی تھی۔ حالانکہ ہماری پولیس ایسی جگہوں پر جانے سے ذرا گریز کرتی ہے جہاں دھماکے وغیرہ ہوں۔ اس کے باوجود ممکن تھا کہ کوئی فرض شناس پولیس موبائل ادھر آ ہی نکلتی۔ اس سے پہلے میرا یہاں سے نکل جانا بہتر تھا۔ میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک عدد کھلی جیپ گیٹ کے باہر موجود تھی اور خالی ہی نظر آ رہی تھی۔ مگر عین ممکن تھا واپسی پر دو کے بجائے زیادہ افراد آئے ہوں اور وہ باہر ہی ہوں۔ اس صورت میں میرا گیٹ سے باہر جانا حماقت ہی ہوتی۔

کوٹھی کا عقبی حصہ ایک میدان تھا جس میں زیادہ تر جھاڑیاں اُگی تھیں مگر مسئلہ دس فٹ اونچی دیوار عبور کرنے کا تھا۔ ایک عدد لکڑی کی سیڑھی تھی مگر جب دھماکے میں پوری کوٹھی پُرزے پُرزے ہو گئی تھی تو وہ بے چاری سیڑھی کہاں بچی ہو گی۔ میں نے ایک بار پھر غور سے دیوار کا معائنہ کیا مگر شعلوں کی روشنی کے باوجود وہاں دھواں اتنا تھا کہ کوٹھی کا احاطہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دیوار کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہر طرف ملبہ بکھرا تھا۔ کوٹھی کے چار طرف جو درخت لگے تھے وہ بھی متاثر ہوئے تھے۔ بیری کا ایک درخت دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ سامنے والے لان میں بھی خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے عقبی طرف آیا اور یہ دیکھ کر میری باچھیں کھل گئی تھیں کہ وہاں دیوار میں ایک چھوٹا سا خلا ہو گیا تھا۔ شاید ادھر کوئی بم آ کر لگا تھا مگر معائنہ کرنے پر یہ سوراخ میری جسامت سے کسی قدر تنگ ثابت ہوا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک بڑا پتھر اُٹھا کر سوراخ کے کنارے توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ میں اتنا بڑا سوراخ کر لیا تھا کہ اس سے با آسانی باہر نکل سکوں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں یہاں سے نکلتا مجھے پاس ہی کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ بولنے والا اتنا نزدیک تھا کہ کسی لمحے بھی اس طرف آ سکتا تھا۔ اس سوراخ سے نکلنا اب بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے کچھ وقت لگتا اور اس دوران میں وہ آ جاتے تو مجھے ٹانگ سے پکڑ کر واپس کھینچ لیتے یا گولی مار دیتے۔ میں نے دو افراد کی آوازیں سنی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس جگہ آتے میں ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ یہ ایک پتھر نہیں بلکہ ملبہ گرنے سے ڈھیر سا بن گیا تھا اور دیوار کے ساتھ کچھ اس طرح کی آڑ بن گئی تھی کہ جب تک کوئی سر پر آ کر نہ دیکھتا مجھے نہیں پا سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ لوگ اردگرد رہنے والے ہوں اور دھماکے سن کر آئے ہوں۔ میں نے ذرا اُمید سے سوچا مگر فوراً ہی میری اُمید پر پانی پھر گیا یہ بدبخت اسی گروہ کے گرگے تھے ایک نے کہا۔ ’’وہ حرامی ادھر ہی ہو گا۔‘‘

’’تیرا دماغ خراب ہے۔ اس جگہ کی حالت دیکھ رہا ہے۔ وہ بھلا بچا ہو گا۔‘‘ دوسرا بولا۔

’’میں ...نے خود اسے گیٹ سے جھانکتے دیکھا تھا۔‘‘ پہلے نے اصرار کیا۔

’’وہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ہمارا ساتھی۔‘‘

''ہمارا ساتھی ہوتا تو سامنے کیوں نہیں آیا۔ اوئے...... یہ دیکھ۔ وہ اس سوراخ سے نکل گیا ہو گا۔'' پہلے نے سوراخ پالیا تھا۔ ''وہ ابھی پچھلے میدان میں ہوگا۔ چل اسے دیکھتے ہیں۔ وہ نہ ملا تو ہماری خیر نہیں ہے۔''

''ہمارا کیا قصور ہے۔ ساری ذمے داری عالمگیر کی ہے۔ وہ مر گیا تو ہمارا کوئی قصور نہیں۔ چل کر قیصر کو اطلاع دیتے ہیں۔ وہ خود اس معاملے کو دیکھ لے گا۔''

''ہر وقت حرام خوری کے چکر میں نہ رہا کر۔'' فرض شناس اول نے اسے جھاڑا۔ ''تلاش کر اپنے اس باپ کو اس کی وجہ سے پورے گروہ پر آفت آنی ہے۔ پتا ہے وہ جمشید علی کا بیٹا ہے۔ ابھی وہ مجبور ہے اگر اسے پتا چل گیا کہ اس کا بیٹا ہمارے پاس نہیں رہا ہے تو سب کی شامت آئے گی۔ ہم دونوں بھی مارے جائیں گے۔''

''اچھا یار......'' حرام خور دوئم نے بادلِ نخواستہ کہا۔ ''پر اس سوراخ سے ہم دونوں میں سے کوئی نہیں گزر سکتا۔''

''چل جیپ میں چلتے ہیں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلیں گے۔'' اول نے تجویز پیش کی۔

''جلدی کر یار پولیس نہ آجائے۔''

''اوئے پولیس نہیں آئے گی۔'' اول ہنسا۔ ''اسے اس طرف نہ آنے کا اچھا خاصا حصہ ملتا ہے۔ ادھر آ کر اس نے اپنا بھتہ بند کرانا ہے۔ اپنے چوہدری صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔''

''کون چوہدری...... اپنے امیر علی صاحب۔'' دوئم بولا۔

''ہاں وہی...... ایم این اے ہیں اور وزیر بھی۔ بھلا پولیس کی کیا مجال کہ ان کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی اُٹھا سکے۔ وہ ان کی ماں بہن......'' ان کی آوازیں معدوم ہوگئی تھیں۔ میں کچھ دیر دبکا رہا اور سوچتا رہا ان لوگوں کے ہاتھ پیر میرے اندازے سے زیادہ بڑے تھے۔ ایم این اے اور وزیر ان کے سرپرستوں میں شامل تھا۔ اسلام آباد کے بعض اعلیٰ بیوروکریٹس کا میں سن ہی چکا تھا جو ارشد بلا گروپ کی سرپرستی فرما رہے تھے۔ یہ لوگ طاقت کے نشے میں چُور میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اگر میں عام لڑکا ہوتا یا جمشید علی جیسے طاقتور سرپرست سے محروم ہوتا تو یہ اب تک مجھے کھا چکے ہوتے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکے ہیں تو میں خاموشی سے اُٹھا اور احاطے کے تاریک حصوں سے ہوتا ہوا مین گیٹ کی طرف جانے لگا۔ اب میرا اس سوراخ سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ جیپ پر سوار ہو کر مجھے عقبی حصے میں تلاش کرتے۔ میں سکون سے مین گیٹ سے نکلا۔ جیپ غائب تھی اور کوٹھی کے سامنے کچھ افراد جمع تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر کسی نے میرے پاس آنے کی کوشش نہیں کی۔

میں کوٹھی سے دور جانے لگا۔ مجھے شدت سے کسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں میں اپنا حلیہ درست کر سکتا اور آگے راستہ دریافت کر سکتا۔ زمین کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ راولپنڈی یا





اسلام آباد کا کوئی نیا آباد ہونے والا پوش علاقہ تھا۔ زمین پر ہریالی تھی اور جابجا اونچے نیچے ٹیلے اور کھائیاں تھیں۔ میں جلد آبادی سے نکل کر ایک صاف ستھری اور چوڑی سڑک پر آگیا۔ جس کے دونوں طرف جنگل تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ ظاہر ہے رات کے اس پہر تو مصروف ترین سڑکیں بھی ویران ہو جاتی ہیں یہ تو پھر بھی کوئی نواحی سڑک تھی۔ اچانک عقب سے کسی گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور ایک کار زن سے میرے برابر سے گزری۔ پھر اس کے بریک چرچرائے۔ میں بھڑکا تھا۔ کیا کار میں میرے دشمن تھے۔ میں فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو لا حاصل ہی ہوتا۔ میں کار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کار رُکی اور اس سے ایک ادھیڑ عمر بگر باوقار نظر آنے والے شخص نے جھانکا۔

''مے آئی ہیلپ یو ینگ مین؟'' اس نے صاف لہجے میں کہا۔ ''زخمی نظر آرہے ہو۔''

''یس سر...... اگر آپ مجھے کسی ایسی جگہ تک لفٹ دے سکیں جہاں سے میں ایک کال کر سکوں۔''

''شیور۔'' اس نے عقبی دروازہ کھول دیا۔ ''بٹ فرسٹ یونیڈ میڈیکل ایڈ...... ایم آئی رائٹ۔''

''یس سر......'' میں کار میں بیٹھ گیا۔ ''لیکن یہ معمولی زخم ہیں پہلے میں اپنے گھر والوں کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ وہ فکرمند ہوں گے۔''

کار میں تاریکی تھی مگر میں نے اگلی نشست پر بیٹھی عورت کو دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے اسی وجہ سے کار کا عقبی دروازہ کھولا تھا۔ ''اینی پرابلم نوجوان۔'' اس بار اس نے اردو کا ایک لفظ استعمال کیا۔ ویسے وہ عادتاً انگریزی بول رہا تھا۔ وہ کمپلیکس کے مارے لوگوں میں نہیں تھا جو انگریزی جھاڑ کر خود کو اپ ٹو ڈیٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''سوری میں تعارف کرانا بھول گیا۔ خادم کو معروف قریشی کہتے ہیں۔ جی ٹی روڈ پر میرا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ لوہے کے سامان بنانے کا۔''

''میرا نام یوسف علی خان ہے۔ کراچی سے تعلق ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایبٹ آباد کے ایک سکول میں زیرِ تعلیم ہوں۔ بعض وجوہات کی بنا پر اسلام آباد آیا اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔''

''اغوا کر لیا گیا۔'' وہ اُچھل پڑا تھا۔ ''مونا سنا تم نے...... سوری میں اپنی وائف کا تعارف کرانا بھول ہی گیا۔ یہ ہیں میری بیگم یا نصف بہتر ڈاکٹر مونا قریشی۔ شی از فزیشن اینڈ جنرل سرجن۔''

''نائس ٹو میٹ یو مسز قریشی۔'' میں نے کہا۔

''می ٹو ینگ مین۔ بٹ یو آر انجرڈ۔'' وہ بولی اس کی آواز میں نغمگی تھی۔ ''پہلے تمہیں فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر مونا پچیس چھبیس کے آس پاس تھی۔ یعنی وہ اپنے شوہر سے خاصی کم عمر تھی۔ وہ تقریباً چالیس بیالیس سال کا تھا۔

''مجھے زیادہ فکر اپنے گھر والوں کی ہے۔'' میں نے حتمی مگر نرم لہجے میں کہا۔ ''پلیز مجھے کسی ایسی

جگہ اُتار دیں جہاں سے میں کال کرسکوں۔''

اس زمانے میں پی سی او کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا اور یہ ہر جگہ دستیاب بھی نہیں تھے۔

معروف قریشی نے اصرار کیا۔''ینگ مین ہمارے ساتھ چلو۔فون ہمارے گھر سے بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ کسی پبلک پلیس پر جاسکو پھر رات کے اس پہر کوئی پی سی او بھی نہیں کھلا ہوگا۔اسلام آباد کا تمہیں شاید پتہ نہیں ہے یہ سرِشام سو جانے والا شہر ہے۔''

میں نے اس کی پیشکش پر غور کیا۔اصولاً تو مجھے اس کی مدد کی پیشکش پر کھٹک جانا چاہیے تھا۔ اس وقت حالات ایسے نہیں تھے۔افغان جنگ کی وجہ سے پورا ملک تخریب کاری کی لپیٹ میں تھا۔ کوئی شخص کسی اجنبی پر اعتبار نہیں کرتا تھا کسی کی مدد کا موقع ہوتا تو لوگ آنکھ بند کر کے گزر جانے کو ترجیح دیتے تھے۔معروف اور اس کی بیوی نے نہ صرف مجھے لفٹ دی تھی بلکہ وہ مجھے گھر لے جانے پر بھی مُصر تھے۔حالانکہ وہ مجھے کسی ایسے مقام پر اُتار کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔پھر بھی میں ان پر شک نہ کر سکا ایک تو یہ کہ معروف قریشی دیکھنے میں سیدھا سا شخص لگتا تھا دوسرے مجھے اس وقت واقعی مدد کی ضرورت تھی۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب لیکن آپ کو زحمت ہوگی۔''میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''کوئی زحمت نہیں ہوگی بلکہ ہمیں خوشی ہوگی۔''ڈاکٹر مونا کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ خوش ہوگئی ہو۔

''ویسے تم اغوا کرنے والوں کے پاس سے فرار کیسے ہوئے؟''

''بس جی موقع مل گیا تھا اور میں وہاں سے بھاگ لیا۔وہ میرے باپ سے ایک کروڑ روپے کا تاوان مانگنا چاہتے تھے۔''

ڈاکٹر مونا نے سیٹی سی بجائی۔''اس کا مطلب ہے تم کسی امیر باپ کی اولاد ہو۔''

''بس جی کچھ ایسی ہی بات ہے۔''میں نے گول مول انداز میں جواب دیا اور فیصلہ کیا کہ ان کے گھر سے فون کر کے فوری طور پر حسن علی کو ان کے ہاں بلوا لوں گا۔میرا فی الوقت سوال جواب کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر مونا نے مجھ سے کچھ سوال اور کیے اور جب میں نے ہوں ہاں کر کے جواب دیا تو وہ سمجھ گئی کہ میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔معروف قریشی نے کار ایک بستی کی طرف موڑ دی۔یہ امراء کی پوش لیکن مختصر سی بستی تھی۔جہاں سارے بنگلے ایک جیسی طرزِ تعمیر کے اہل تھے۔شاید کسی ایک ہی بلڈر نے یہ بنگلے بنا کر بیچے تھے۔یہ سب تقریباً نصف کنال پر بنے تھے۔معروف قریشی نے کار ایک بنگلے کے سامنے روکی۔ہارن پر چوکیدار نے گیٹ کھولا۔اندر پورچ میں ایک چھوٹی سی کار کھڑی تھی۔ معروف قریشی نے اپنی شاندار کرولا اس کے برابر میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

''آؤ یوسف۔''معروف قریشی نے اُترتے ہوئے کہا۔بنگلہ روشنیوں سے منور تھا۔میں نے





اُترتے ہوئے مونا کو دیکھا۔میرے اندازے کے عین مطابق وہ خاصی حسین اور کم عمر تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد کسی قدر سوجن تھی۔یہ سوجن قدرتی تھی یا وہ ڈرنک کرتی تھی مگر اس کے موزوں چہرے پر یہ سوجن بھی بُری نہیں لگ رہی تھی۔اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی اور بے حد مختصر سے بلاؤز میں اس کی کمر کا بانکپن نمایاں تھا۔اس کا جسم چھریرہ اور بعض مقامات پر کسی قدر بھاری تھا۔اس نے اچانک دھیمے لہجے میں کہا۔''اگر میرا معائنہ کرلیا ہے تو اندر چلو۔''

میں جھینپ گیا تھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ معروف قریشی خاصا آگے جا چکا تھا۔ورنہ وہ سن لیتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔بنگلہ اندر سے بھی خوب صورت، کشادہ اور تمام جدید لوازمات سے آراستہ تھا۔ معروف اندر چلا گیا اور مونا مجھے ایک الگ تھلگ سے کمرے میں لے آئی۔وہاں کے فرنیچر سے لگ رہا تھا کہ مونا اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔چاروں طرف الماریاں تھیں جن میں طبی موضوع پر رسالے اور کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ایک میز تھی جس پر طبی آلات اور بعض فوری ضرورت کی دوائیں رکھی تھیں۔ایک طرف فرش سے کوئی تین فٹ اونچی ٹارچ تھی۔

''میرا کلینک اسلام آباد بلیو ایریا میں ہے لیکن گھر پر بھی کبھی کبھار کوئی پیشنٹ آجاتا ہے۔ اپنے کپڑے اُتار دو۔''

''اُتار دوں۔''میں نے جھجک کر کہا۔''پھر میں کیا پہنوں گا؟''

اس نے میرا جائزہ لیا۔''ایک منٹ بیٹھو میں کچھ لے کر آتی ہوں۔''اس نے کہا اور چلی گئی لیکن اس کی واپسی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی اس نے ساڑھی اُتار کر ڈھیلا سا کرتہ شلوار پہن لیا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے عجیب لگا کہ کُرتا نہ صرف باریک کپڑے کا تھا بلکہ گریبان خاصا کشادہ بھی تھا۔ڈاکٹر عام طور پر مریضوں کے سامنے اس طرح کے گھریلو لباس میں نہیں آتی ہیں۔اوپر سے اس نے دوپٹے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔میرے لیے اس کی طرف دیکھنا محال ہو رہا تھا۔اس نے ایک شارٹ میری طرف بڑھا دیا۔

''اسٹینڈ کے پیچھے جا کر اسے پہن لو۔''اس نے اینگلز پر تنے پردوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہسپتال میں اس قسم کے اسٹینڈز پردہ کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔میں نے اس کے عقب میں جا کر اپنے پھٹے اور میلے ہو جانے والے کپڑے اُتار دیئے۔مٹی، پسینے اور میل سے میرا پورا جسم اس طرح چیکٹ ہوا تھا کہ مجھے خود سے گھن آ رہی تھی۔زخم خاص نہیں تھے صرف خراشیں تھیں۔ میں باہر آیا تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر مونا کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر چمک سی آ گئی۔میں جلد از جلد فرسٹ ایڈ کے عمل سے گزر جانا چاہتا تھا کہ حسن علی سے رابطہ کر سکوں مگر ڈاکٹر مونا نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کے بجائے تجویز پیش کی۔

''ایسا کرو کہ تم پہلے گرم پانی سے غسل کرلو۔اس سے زخم بھی صاف ہو جائیں گے۔بس پھر ان پر پٹی لگانے کی دیر ہوگی۔''

میں نے غور کیا تو اس کی بات دل کو لگی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔''

''نو پرابلم...... یہ ساتھ ہی باتھ روم ہے۔ تم آرام سے باتھ لے سکتے ہو۔ اس میں ٹب بھی ہے اگر چاہو تو گرم پانی کا مساج بھی لے سکتے ہو۔''

باتھ روم واقعی شاندار تھا۔ ٹائلز اور تمام سہولیات کے ساتھ۔ مگر ساتھ ہی وہاں زنانہ استعمال کی بعض اشیاء بھی تھیں گویا یہ باتھ روم ڈاکٹر مونا کے زیرِ استعمال تھا اور اس نے کتنی آسانی سے مجھے یہاں بھیج دیا۔ گرم پانی میں ڈیٹول ملا کر میں اس میں لیٹ گیا۔ پہلی بار مجھے ڈاکٹر مونا اور اس کے شوہر کے غیر منطقی رویے پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عام میاں بیوی ایک اجنبی شخص کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مجھے اصرار کر کے اپنے گھر لائے اس کے بعد معروف قریشی مجھے اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلا گیا جو بے حد حسین ہی نہیں عمر میں اس سے خاصی چھوٹی بھی تھی۔ اور ڈاکٹر مونا میرے سامنے اس قسم کے لباس میں آئی تھی جیسا لباس خواتین عام طور سے غیر مردوں کے سامنے پہننا پسند نہیں کرتی ہیں۔ اب وہ یا تو فطرتاً ایسی تھی یا میرے سامنے کسی خاص وجہ سے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ میں ان سوچوں میں گم آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ اچانک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مونا اندر آئی۔ میں نے بے خیالی میں اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا اور جلدی سے ٹانگیں سکیڑ کر جسم چھپالیا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ڈاکٹر مونا نے کہا۔ ''سوری میں یہ لیکوئیڈ دینے آئی تھی۔ اسے پانی میں ڈال کر نہاؤ گے تو جسم کا درد دور ہو گا۔'' اس نے بغیر کسی جھجک یا شرم کے ٹب کے پاس آ کر اس بوتل سے کچھ لیکوئیڈ پانی میں اُنڈیل دیا۔

''آپ مجھے پہلے بھی دے سکتی تھیں۔'' میں نے کسی قدر ناگواری کے ساتھ کہا۔

''سوری میں بھول گئی تھی اور شرماؤ مت میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اس حالت میں تمہارا معائنہ بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''پلیز آپ جائیں۔'' اس بار میں نے لحاظ ایک طرف رکھ کر کہا۔ ''مجھے معائنہ کرانا ہوگا تو کسی میل ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔''

''اوکے۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے شدت سے طیش آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے غسل بھگتایا۔ جسم خشک کیا۔ پہننے کے لیے اس شارٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے اسے پہن کر باہر آ گیا۔ ڈاکٹر مونا کافی لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو چند لمحے کے لیے اس کی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ پھر وہ چونکی۔

''ہاؤ اسمارٹ آر یو۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے تمہاری رگوں میں سفید فام خون بھی ہے۔''

''میرا تعلق ایران سے ہے۔'' میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں مان سکتی۔ خیر چھوڑو آؤ کافی پیو۔ پھر میں تمہاری ڈریسنگ





کرتی ہوں۔''

''پہلے میں فون نہ کرلوں۔'' میں نے کافی کا مگ اُٹھایا۔ اس وقت اس کی شدت سے ہورہی تھی۔

''چلو فون کر لینا لیکن پہلے کام ختم کر لو۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

میں مگ لے کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے جسم کو والہانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت کی یہ حرکت افسوسناک ہی کہی جا سکتی ہے۔ کافی پیتے ہوئے اچانک مجھے بے چینی محسوس ہوئی اور پھر کمزوری کا احساس ہوا۔ میں نے مگ ایک طرف رکھ کر اُٹھنا چاہا تو چکرا کر گر پڑا۔ کافی میں شامل دوا بے حد زود اثر تھی میں نے ڈاکٹر مونا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بن اور بگڑ رہے تھے کبھی وہ لومڑی جیسی نظر آ رہی تھی اور کبھی چڑیل۔

''تت...... تم...... نے...... کیا...... شا...... مل کیا...... کافی...... میں۔''

وہ ہنسی تو اس کی ہنسی گونجنے کے انداز میں سنائی دی تھی۔ ''یہ ایک دوا ہے اب تم آرام سے سو جاؤ گے۔ فکر مت کرو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''تم...... نے...... کیوں کیا؟'' میرا ذہن چکرا رہا تھا اور آواز و زبان بے قابو ہو رہی تھی۔

''جلد معلوم ہو جائے گا تمہیں۔'' وہ اُٹھ کر میرے پاس آئی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی مگر میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس نازک سی عورت نے مجھے قابو میں کر لیا تھا۔ اور پھر تاریکی چھا گئی۔ ہر احساس فنا ہو گیا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔



حواس رفتہ رفتہ بے دار ہوئے۔ ذہن جیسے شل ہو رہا تھا اور جسم بے جان...... سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ جب ذہن کسی قدر قابو میں آیا تو میں حسن علی کی بتائی ایک سانس کی مشق دُہرانے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرا ذہن تیزی سے صاف ہوتا چلا گیا۔ جلد میں اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا تھا پہلا احساس یہ تھا کہ میرا جسم جکڑا ہے۔ بیلٹ نما چیز سے مجھے بستر کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ میں اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیلٹ شانے سے ذرا نیچے سینے اور بازوؤں کو جکڑے تھی۔ دوسری نے پیٹ پر سے اور کلائیوں سے مجھے گرفت میں لیے رکھا تھا اور تیسری گھٹنوں سے ذرا اوپر رانوں کو جکڑے ہوئے تھی۔ ان بیلٹوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں ذرا سی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ واحد حرکت میں یہ کر سکتا تھا کہ اپنا سر ہلا لوں۔

میں نے اب تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں اور کان کے سہارے اِردگرد کا ماحول محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں کھول لیں۔ میں ایک کاؤچ نما بستر پر بندھا لیٹا تھا اور میرے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ چند لمحے کو میں بوکھلا گیا تھا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ سوال ایک بار پھر میرے ذہن میں گونجا۔

اس کا جواب ڈاکٹر مونا کی صورت میں اندر آیا۔ وہی میری اس حالت کی ذمے دار تھی۔ اسے دیکھ کر اپنی برہنگی کا احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ مگر میں مجبور تھا خود کو چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت نمایاں تھی۔ میرا دل چاہا اسے ان الفاظ سے نوازوں جن سے میں نے آج تک کسی عورت یا لڑکی کو نہیں نوازا تھا۔ مگر اس پر یہ الفاظ بھی بے اثر ہوتے اس لیے میں خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا۔

''کیا حال ہیں ہیرو۔'' اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ممکن ہے وہ عام حالات میں میرے سینے پر ہاتھ رکھتی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی لیکن اس حال میں مجھے اس سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ غلاظت سے بھرا ہو۔

''پہلے تو مہربانی کر کے اپنا ہاتھ دور رکھو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس نے ہاتھ ہٹا لیا لیکن اس سے بھی زیادہ بُری حرکت کی۔ میں پچھتایا اور اس بار ٹوکنے سے گریز کیا کہ نہ جانے اگلی بار وہ کیا کر گزرے۔ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔ ''اس طرح مجھے باندھ کر رکھنے کا مقصد؟ میرا خیال ہے ہم زندگی میں پہلی بار ملے ہیں۔''

''ہاں..... مگر بعض لوگ پہلی ملاقات میں ایسے لگتے ہیں جیسے ہم ان سے ہمیشہ سے واقف ہوں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''تم مجھے اچھے لگے۔''

''جو لوگ تمہیں اچھے لگتے ہیں کیا ان کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''شخصیت پر منحصر ہے۔ جو زیادہ اچھے لگتے ہیں ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہوں۔'' اس نے کہتے کہتے ایسی حرکت کی کہ میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔ اُلو کی پٹھی، دل میں اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ اس سلوک کی کیا وجہ تھی۔ وہ جنس کی ماری عورت تھی اور شاید اپنے شوہر سے اس کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر منہ مارنے کی عادی تھی۔ میں ملا تو اس نے میرے حالات جان کر مجھے قابو کر لیا تا کہ اپنی ہوس کی آگ بجھا سکے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اب حرکت میں آئے گی اور جو حرکتیں کر رہی تھی ان سے بھی آگے بڑھے گی۔

اس نے غالباً میری سوچ بھانپ لی تھی۔ ''تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں کوئی جنس زدہ عورت ہوں اور تم سے جسمانی تسکین حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے ملائمت سے جواب دیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ تم تو ستی ساوتری ہو اور میری پوجا کے لیے مجھے اس طرح باندھا ہے۔''

''گویا میرا اندازہ ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''تم بھی غلط نہیں سوچ رہے ہو۔ ان حالات میں اس قسم کی سوچیں آتی ہیں لیکن میں کہوں گی کہ تمہارا اندازہ غلط ہے۔ بے شک تمہیں اس طرح جکڑ کر رکھنے میں میرے کچھ مقاصد ہیں مگر وہ نہیں جو تمہارے ذہن میں آ رہے ہیں۔''





''یقیناً تمہارے مقاصد اعلیٰ اور پاکیزہ ہوں گے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

اس نے سر ہلایا اور کچھ کہنے کے بجائے پلٹی اور اس نے پاس رکھی الماری سے ایک انجکشن اور سرنج نکالی پھر کہا۔ ''شاید تمہارے علم میں نہ ہو۔ میں بتا دوں میں گائناکالوجسٹ ہوں اور اس شہر میں میری بہت حیثیت ہے۔''

''شاید تم وہ کام کرتی ہو جو اس مقدس پیشے پر ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' میں نے اسے نفرت سے دیکھا۔ ''بغیر شادی کے ماں بننے والی لڑکیوں کا ابارشن کرتی ہو اور بچے کی خواہش رکھنے والی عورتوں کے آپریشن کرتی ہو۔''

وہ مسکرائی۔ ''ابھی تم بچے ہو۔ تم نہیں جانتے۔ یہ کام تو اب عام ڈاکٹرز بھی کر لیتی ہیں۔ طب کا پیشہ پیسہ کمانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے اس ملک میں۔ میرا مقصد اس سے بھی اعلیٰ ہے۔'' اس نے میرا بازو اسپرٹ لگی روئی سے صاف کیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو۔'' اسے انجکشن لگانے کی تیاری کرتے دیکھ کر میں کسمسایا۔ مگر اس سے زیادہ ہلنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ''کیسا انجکشن ہے؟''

وہ مجھے بے بس دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی۔ اس نے انجکشن کو سرنج میں بھرا۔ ''ڈرو مت یہ نقصان دہ انجکشن نہیں ہے۔ اسے لگوا کر تم ہواؤں میں اُڑنے لگو گے۔''

''کیا یہ نشے کا انجکشن ہے۔ میں اسے کیوں لگوانے لگا۔'' میں نے آزاد ہونے کی جدوجہد جاری رکھی۔

''ہاں نشے کا ہے مگر اس نشے کا نہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے سرنج کی سوئی میرے بازو میں گھونپ دی اور میرے حرکت کرنے کی پروا نہ کرتے ہوئے سرنج خالی کر دی۔ مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ اس نے سرنج نکال کر دوبارہ روئی سے میرا بازو صاف کیا۔ خالی سرنج پاس میز پر رکھی ٹرے میں رکھی۔

''یوسف..... کچھ دیر بعد تمہیں گرمی محسوس ہو گی اور تم بے اختیار چاہو گے کہ میری قربت حاصل کرو لیکن تمہیں یہ قربت نہیں ملے گی۔ کیونکہ میرا جسم میرے شوہر کی امانت ہے اسے کوئی دوسرا فرد اس انداز میں حاصل نہیں کر سکتا۔ جس کا حق قریشی کو ہے۔'' وہ کہتے کہتے رُکی۔ ''البتہ میں تمہیں اپنی قربت سے ضرور نوازوں گی مگر دوسرے انداز میں۔'' اس نے اپنی قمیص کے بٹن کھولے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا مگر ساتھ ہی اس سے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر شدید حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی ہیٹر آن کر دیا گیا ہو۔ پھر میں نے اس کا عریاں لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''کتیا۔'' میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مجنونانہ انداز میں میرے جذبات برانگیختہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور سچی بات ہے میرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کامیاب ہو رہی تھی۔ میرا ذہن رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے سانس روک لی

اور یوں ساکت ہو گیا جیسے بے ہوش ہو گیا ہوں۔ مجھے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہی ایک طریقہ نظر آیا تھا۔ میں یوگا کے موضوع پر قارئین کو بور نہیں کروں گا مگر اتنا بتا دوں کہ اس مشق نے میرے جسم کے بڑھتے درجہ حرارت کو معتدل کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے جذبات بے قابو کرنے میں ڈاکٹر مونا کے توبہ شکن بدن کے لمس سے زیادہ اس انجکشن کا کمال تھا جو اس نے میرے جسم میں اُتار دیا تھا۔

اس نے بھی محسوس کر لیا کہ اس کی سعی ناکام جا رہی ہے۔ اس نے میری سانس رُکتی دیکھ کر بے تابی سے میری نبض ٹٹولی اور اسے چلتا پا کر میرے منہ پر ہاتھ مارا۔ ”سور کے بچے۔“ اس نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ”سانس لے۔“

اس وقت وہ ایک معزز ڈاکٹر اور عورت کے بجائے ایک تیسرے درجے کی طوائف لگ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے سانس خارج کر کے دوبارہ سانس بھری اور اسے روک لیا۔ میں اپنی ساری توجہ اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے پر مرکوز کر رہا تھا اور بتدریج میری حالت اعتدال پر آتی جا رہی تھی۔ مجھے اس انجکشن کے بارے میں کچھ خاص نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ وہ میرے جذبات میں اُبال لا رہا تھا لیکن اسے ناکام بنا کر مجھے خود پر فخر محسوس ہوا تھا۔ شاید کوئی اور شخص اندر سے اُبھرنے والی حیوانی طلب کو اس طرح سرد نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد ڈاکٹر مونا گھٹیا پن پر اُتر آئی تھی۔ اس نے پاس ٹرے میں رکھی قینچی اُٹھالی تھی اور اس کی نوک سے مجھے اذیت دے رہی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ سانس کی جو مشق میں کر رہا تھا وہ خنجر گھونپنے کی تکلیف پر بھی قابو پالیتی تھی۔ مجھے اس کے فعل سے ذرہ برابر تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے بدستور بے حس و حرکت دیکھ کر وہ بالکل بے قابو ہو گئی تھی اور شاید قینچی میرے سینے میں اُتار دیتی لیکن اس سے پہلے اس کا شوہر معروف قریشی کمرے میں آ گیا۔ اس نے مونا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”بے کار ہے۔ اس پر اثر نہیں ہو رہا ہے۔“

”پاگل ہوئے ہو۔ میں نے قینچی سے اسے گود کر رکھ دیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس پر اثر نہیں ہو رہا ہے۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔ چلو کپڑے پہنو۔“ اس نے آرام سے اپنی بیوی سے کہا۔ میرے پاس اس کی بے غیرتی پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ انجکشن کی دوا بدستور میری رگوں میں ہلچل مچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مونا اپنے کپڑے لے کر کمرے سے چلی گئی اور معروف قریشی میرے پاس آیا۔ اس نے شائستہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم ایک حیرت انگیز نوجوان ہو میں نے کسی کو مونا کے وار سے یوں بچتے نہیں دیکھا۔“

میں نے آہستگی سے سانس چھوڑی اور خشک لہجے میں بولا۔ ”اگر تم میرے جسم پر کوئی کپڑا ڈال دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔“





اس نے پاس اسٹینڈ پر لٹکا تولیہ میرے جسم پر ڈال دیا۔ اتنا تو میں سمجھ چکا تھا کہ ان میاں بیوی کو گالیاں دینا یا بُرا بھلا کہنا بے کار تھا۔ وہ عام اخلاق اور معاشرتی انداز کے قائل نہیں تھے۔ ان کے اپنے معیار تھے ایسے معیار جس میں ایک شوہر اپنی بیوی کو ایک نوجوان سے ناگفتہ بہ حالت میں لپٹے دیکھ کر نارمل رہتا ہے اور بیوی سے اس کے مقاصد میں ناکامی پر افسوس بھی کرتا ہے۔ لہٰذا اسے لعنت ملامت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس مردِ ناداں پر کلامِ نازک بے اثر تھا۔ لہٰذا میں نے اس سے سیدھے الفاظ میں مقصد دریافت کیا۔

”دوسری مہربانی یہ کرو کہ مجھے اس ساری کارروائی کا مقصد بتا دو۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”تم ابھی تک سمجھے نہیں۔ مونا نے کہا تھا کہ وہ تم سے جسمانی تعلق نہیں قائم کرے گی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں اپنے سر کے بال نوچ سکتا۔ پھر اس حیوانی حرکت کا کیا مطلب تھا کیا تمہاری بیوی کسی منفرد مرض میں مبتلا ہے اور اپنی حیوانی تسکین کے لیے یہ حرکت کر رہی تھی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”افسوس کہ تم ہمیں اتنا گرا ہوا سمجھتے ہو۔“

”میں تمہیں اس سے بھی زیادہ گرا ہوا سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے پورے خلوص سے کہا۔ ”بہ شرط کہ تم اس کی وجہ بیان کر دو۔“

”ہمیں تمہارا سیرن چاہیے۔ سیرن سمجھتے ہو نا؟“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”ہاں...... لیکن کیوں؟“

وہ کرسی میرے پاس کھسکا لایا۔ ”دیکھو میں تمہیں یہ سب اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تم اگلی بار مزاحمت نہ کرو۔ دیکھو اس طرح تم ایک طرح سے معاشرے کی خدمت کرو گے۔ ہمیں تم جیسے خوب صورت اور صحت مند جوانوں کا سیرن چاہیے۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

”دیکھو ہمارے معاشرے میں بہت سی بے اولاد خواتین ہیں۔ جن کے شوہر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ انہیں ٹیسٹ ٹیوب کی مدد سے بچہ دیتے ہیں۔“

”اور اس کے عوض دونوں ہاتھوں سے دولت کماتے ہو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”اس میں کیا بُرائی ہے۔“ وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ ”ہم ان کے کام آتے ہیں۔ ان عورتوں کو خاندان اور معاشرے میں اپنا اسٹیٹس برقرار رکھنے کے لیے بچے کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہم ان سے منہ مانگی فیس لیتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔“

”اور معاشرے کو ناجائز بچوں کا تحفہ دیتے ہو۔ تم لوگ تو نسلیں بگاڑ رہے ہو۔“

”یہ سب سمجھ کے اُلٹ پھیر ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بچہ اس شوہر کا نہیں ہے جس کی

بیوی نے پیدا کیا ہے۔ کسی کو کیا معلوم؟''

''کیا اس شوہر کو بھی نہیں؟''

''انہیں پتا ہوتا ہے کیونکہ اس طرح خود ان کے عیب کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مان جاتے ہیں۔ پھر انہیں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ان کی بیوی کو کسی مرد نے نہیں چھوا ہے۔ بچہ تو ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں مرد عورت کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا قطعی ضروری نہیں ہے۔''

کیسا لرزہ خیز انکشاف تھا۔ یہ لوگ معاشرے کو کس رُخ پر لے جا رہے تھے ان کے نزدیک حلال حرام کی ذرہ برابر اہمیت نہیں تھی۔ وہ میرے جسم سے تولیدی مادہ حاصل کر کے بے اولاد عورتوں کو ناجائز بچوں کا تحفہ دینا چاہتے تھے اور اپنے تئیں اسے درست سمجھ رہے تھے۔

''تم لوگوں کو بے شمار رضا کار مل جائیں گے۔ اگر تمہاری بیوی اس حال میں ان کے سامنے آئے جس طرح میرے سامنے آئی تھی تو انہیں انجکشن کی ضرورت بھی نہ ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''یہ ہمارا کام ہے لہٰذا ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ کس طرح کرنا چاہیے۔'' اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

''اس طرح زبردستی باندھ کر۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ اس طرح تم خطرے میں پڑ جاؤ گے۔''

''ہم ہر خطرے کا سدباب کرنا جانتے ہیں۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا لیکن اس کے سرسری سے لہجے کی تہہ میں چھپی سفاکی میں نے بھانپ لی تھی۔ غالباً وہ اس کے بعد مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ میں ایک کے بعد ایک مصیبت میں پڑ رہا تھا۔ جمشید پیلس ناسازگار حالات کے باوجود میرے لیے ایک محفوظ قلعے کی طرح تھا۔ اس سے نکل کر میں مصیبت بلکہ مصیبتوں میں پڑ گیا تھا۔ ان بدبختوں سے نکل کر بھاگا تھا یعنی ارشد بلا اینڈ گروپ کے قبضے سے تو ان معزز نظر آنے والے جرائم پیشہ میاں بیوی کے چنگل میں پھنس گیا تھا جو میرے جسم سے زندگی کشید کر کے اسے منہ مانگے داموں ضرورت مندوں کو بیچنا چاہتے تھے۔

''تم ایک ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بدلے کیا لیتے ہو؟'' میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''خریدار کی جیب کے حساب سے۔ پانچ سے دس لاکھ تک۔ بلکہ سرحد کے ایک سردار نے خوش ہو کر ہمیں بیس لاکھ روپے دیئے تھے۔''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاکھ کی سچ مچ اہمیت ہوا کرتی تھی۔ جس کے پاس اتنی رقم ہوتی تھی اسے دولت مند سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک کیس کا پانچ لاکھ لیتے تھے۔ گویا دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ ''تم اسے محفوظ کس طرح رکھتے ہو؟''

وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''ہم اسے جدید ترین سائنسی طریقے سے محفوظ کرتے ہیں۔ دس سال...... بیس سال جتنے عرصے چاہیں محفوظ کر سکتے ہیں۔ ابھی ہم ملکی سطح پر کام کر رہے ہیں لیکن جلد





اسے بین الاقوامی سطح تک لے جائیں گے۔''

''یعنی بڑے پیمانے پر حرامزادے پیدا کرو گے۔'' میں نے دل میں سوچا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''سنو اگلی بار مزاحمت مت کرنا۔ میں وعدہ کرتا ہوں اپنا کام کر کے ہم تمہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

''اس دنیا سے جانے کی۔'' میں نے پھر دل میں سوچا اور مکاری سے جواب دیا۔ ''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس طرح باندھ کر۔''

''یہ ہماری مجبوری ہے۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور ایک اسٹینڈ لا کر میرے برابر میں رکھ دیا اس پر ایک ڈرپ لٹکی تھی۔ اس نے ڈرپ کی سوئی میرے بازو میں اُتاری اور پھر ڈرپ میں کچھ انجکشن بھی خالی کر دیئے۔ پھر اس نے میرا بازو تھپکا۔ ''اب آرام کرو۔ میں نے نیند کی دوا بھی ڈال دی ہے۔ صبح ملاقات ہو گی۔''

''میں بوکھلا گیا۔ ''کیا مطلب پھر رات ہو گئی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس وقت نو بج رہے ہیں۔''

''دیکھو مجھے جانے دو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ تم نہیں جانتے میرا تعلق کن لوگوں سے ہے اور وہ تم تک آ گئے تو تمہیں پناہ نہیں ملے گی۔''

وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اگر ہم تک آئے تو۔'' وہ بولا۔ ''بھلا انہیں کیا معلوم کہ تم کہاں ہو اور کس کے پاس ہو۔''

''ایسا مت کہو۔'' میں نے ذہن پر طاری ہونے والی غنودگی سے لڑتے ہوئے کہا۔ ''موت کب کہاں سے آ جائے انسان کو پتا نہیں چلتا ہے۔ اس لیے تم بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہو۔''

اس نے میرا گال تھپتھپایا۔ ''سو جاؤ بچے...... اور ہاں صبح مونا کے ساتھ تعاون کرنا ورنہ وہ تمہیں ایسے انجکشن بھی دے سکتی ہے کہ تمہارے دماغ کی شریان پھٹ جائے۔ اس عمر میں تم مرنا یا مفلوج ہو کر بستر پر پڑے رہنا پسند کرو گے۔''

میرے بدن میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ کتنے آرام سے مجھے دھمکا رہا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ وہ چلا گیا اور اس کے جاتے ہی مونا آ گئی۔ اس کے انداز میں طیش تھا اور اس کا غصہ کرنا فطری تھا میں نے جس طرح اس کی کوشش ناکام بنائی تھی اس سے پہلے شاید اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور بلی کی طرح غرائی۔

''اب کے میں نے ہلکا انجکشن دیا تھا۔ آئندہ ایسا انجکشن دوں گی کہ تم ہل بھی نہیں سکو گے۔''

''ہلا تو میں اب بھی نہیں تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''میں تمہیں نچوڑ کر رکھ دوں گی۔''

''اگر تم کر سکو مونا ڈارلنگ تو ضرور نچوڑ لینا۔'' میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''ویسے تم اور تمہارے شوہر دونوں منافق ہو۔ تم اس کی وفادار بنتی ہو لیکن مجھے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں جو چمک آئی تھی وہ کسی وفادار بیوی کی آنکھ میں نہیں آ سکتی ہے۔''

''بکومت۔'' وہ غرائی اور پھر مجھ پر جھک کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''تم نے کسی قدر سچ کہا ہے۔ معروف کے بعد تم پہلے شخص ہو جو مجھے اچھے لگے ہو۔ اگر تم میرے کام آؤ تو میں تمہارا دل بھی خوش کر دوں گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

''اس سے بہتر ہو گا کہ میں کسی طوائف کی قربت قبول کر لوں۔ وہ تم سے لاکھ درجے بہتر ہو گی۔ کم سے کم بے ضمیر تو نہیں ہو گی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اس پر ایک بار پھر دورہ پڑ گیا اور اس نے اپنے خونخوار ناخنوں سے میرے چہرے اور سینے پر نشان ڈال دیئے تھے۔ تکلیف کے باوجود میں مسکراتا رہا۔ آخر تنگ کر وہ بکتی جھکتی چلی گئی۔ میں چہرے اور سینے پر سخت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ڈرپ میں شامل کی جانے والی دوا میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی دیکھنے میں مہذب اور شریف نظر آتے تھے مگر بہ باطن بھیڑیئے سے زیادہ سفاک اور گیدڑ کی طرح بے غیرت تھے۔ ان کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی۔ حالانکہ وہ غریب طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ معروف قریشی کا کارخانہ تھا اور مونا بھی ڈاکٹر تھی۔ دونوں اپنے پیشوں میں محنت کرتے تب بھی کامیابی حاصل کرتے اور عزت بھی کماتے مگر انہیں عزت کا مفہوم ہی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ پیسہ کمانے کے معاملے میں جائز اور ناجائز کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ صرف بے ضمیر ہی نہیں مجرم بھی تھے۔ معروف کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی افراد کے ساتھ یہ حرکت کر چکے تھے اور ان کا کیا ہوا؟ غالباً وہی جو میرا ہونا تھا۔ یہ کسی نوجوان کو اس وقت تک نچوڑتے رہتے تھے جب تک وہ مر نہیں جاتا تھا اور اس کے بعد وہ اس کی لاش خاموشی سے کہیں دفنا دیتے تھے۔ اپنے جرائم کو راز میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور جب میں بھی بے کار ہو جاتا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے۔ تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں انہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ انہیں ان کے مقصد میں ناکام بنا دوں گا۔



میں نے جان گرے کو غور سے دیکھا اور دل میں سوچا میں اسے ناکام بنا دوں گا۔ اس کے پاس جو ریموٹ نما شے تھی شاید وہی اس بیلٹ کی نگران تھی۔ جیسے ہی میں اس کے سگنل کی حد سے باہر جاتا بارودی بیلٹ کا سرکٹ اسے اُڑا دیتا۔ اس نے واقعی بڑا پکا بندوبست کیا تھا۔ فرار کے بجائے مجھے یہ فکر رہتی کہ میں اس سے دور نہ چلا جاؤں۔ میری حالت دیکھ کر جان گرے مسکرا دیا تھا۔

''فکر مت کرو۔ یہ بالکل محفوظ ہے۔ بے شک اسے ضرب بھی لگے تب بھی یہ بلاسٹ نہیں کرے گی۔ ہاں...... تم نے دو سو فٹ کی حد سے ایک انچ بھی باہر قدم رکھا تو پچھتانے کی مہلت بھی





نہیں ملے گی۔''

''میں مہلت چاہتا بھی نہیں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''براہِ کرم مجھے کسی مہم پر لے جانے کے بجائے یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں آرام سے سو کر وقت گزار لوں گا۔''

''نہیں میرے بچے...... تمہارا اس مہم میں شریک ہونا بے حد ضروری ہے۔'' وہ شیریں لہجے میں بولا۔ ''کونسل کے سامنے کارکردگی دکھا کر ہی تم اپنے لیے رعایت حاصل کر سکتے ہو۔''

''اچھا...... کم از کم یہ تو بتا دو کہ مہم کیا ہے۔ تاکہ میں ذہنی طور پر خود کو تیار رکھوں۔''

جان گرے کے اشارے پر گارڈ واپس چلے گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے میز پر ایک نقشہ رکھا تھا۔ یہ افریقہ کے جنوب مشرقی ممالک کا نقشہ تھا اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''یہ ملک آج کل ہمارے مفادات کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اس ملک پر ایک زمانے میں برطانیہ عظمیٰ کی حکومت تھی۔ آزادی کے بعد اس کے سیاہ فام صدر نے یہاں پر آباد گوروں کے خلاف نسل پرستانہ اقدامات شروع کر دیئے۔''

''یعنی تم لوگوں کو تمہارے سکوں میں ادائیگی کرنے لگا۔'' میں ہنسا۔

''اس نے انگریز آباد کاروں سے زمینیں چھین کر سیاہ فاموں میں بانٹنا شروع کیں اور جب سفید فاموں نے اس پر احتجاج کیا تو ان پر اپنی خفیہ فورس سے حملہ کر دیا۔ مشرقی حصے میں ہونے والے فسادات میں ایک سو سے زیادہ سفید فام مارے گئے۔''

میں نے ان فسادات کے بارے میں پڑھا تھا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ اصل میں سفید فام آباد کاروں نے کچھ سیاہ فام عورتوں کو اغوا کر کے ان کی آبروریزی کی اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ اس پر فسادات پھوٹ پڑے اور ان میں کچھ سفید فام مارے گئے تھے۔''

''اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کی پالیسیوں کی وجہ سے پورے افریقہ میں سفید فاموں کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔''

''نفرت اس ملک کے صدر کی وجہ سے نہیں بلکہ تم لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''ورنہ تمہیں اسرائیل اور بوسنیا میں ہونے والی نسل پرستی کیوں نظر نہیں آتی۔''

''سیاست پر بات مت کرو۔'' اس نے ناگواری سے کہا تو میں تلخی سے مسکرا دیا۔

''یہی تو سیاست ہے تم لوگوں کی...... جہاں تمہارے مفاد کے خلاف بات ہو یا تمہیں آئینہ دکھا دیا جائے تو تم اسے سیاست قرار دیتے ہو۔''

''غالباً تم اس مہم کے بارے میں بریفنگ لینا چاہتے تھے۔'' اس نے جھنجھلائے انداز میں کہا۔

''او کے...... اب میں کوئی سچ نہیں بولوں گا۔'' میں نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"ہمارا ہدف ساحل سے تین کلومیٹر آگے ایک فارم اور اس کے پاس قائم آرمی کیمپ ہے۔"

"آرمی کیمپ سے تو سمجھ میں آتا ہے۔ فارم پر حملہ کس خوشی میں کرنا ہے۔"

"اس فارم کے مالکان نے اس علاقے میں سیاہ فاموں کے خلاف ہونے والی کارروائی میں حصہ لیا تھا لہٰذا انہیں بھی سزا ملنی چاہیے۔"

"تم لوگوں کی تیاریوں سے لگ رہا ہے کہ تم قتلِ عام کی نیت سے جا رہے ہو۔"

"مجرموں کو سزا دینے کے لیے سفاکانہ رویہ اپنانا پڑتا ہے۔" جان گرے کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس کر بولا۔ "آج رات کے حملے کے بعد اس ملک کے حکمرانوں کو پتا چل جائے گا کہ سفید فاموں کا خون اتنا بھی سستا نہیں ہے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم لوگوں کا یہی رویہ دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ خون چاہے سفید فام کا ہو یا کسی رنگدار باشندے کا برابر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ملک سے ذرا ہی دور ایک اور ملک میں نسل پرست سفید فاموں نے سو سال سے زیادہ مقامی لوگوں کو غلام بنا کر رکھا تھا۔ ان کا بے دریغ قتلِ عام کیا تب تم لوگوں کو احساس نہیں ہوا۔"

جان گرے میری بحث سے جھنجلا رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "فضول بحث کرنے کے بجائے تیاری کرو۔"

"کیا مجھے بھی کوئی اسلحہ دیا جائے گا۔ میں حملے میں حصہ نہیں لوں گا لیکن ممکن ہے مجھے اپنے دفاع کی ضرورت پیش آ جائے۔"

جان گرے نے ایک کولٹ پسٹل نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "یہ کافی رہے گا تمہارے لیے۔"

میں نے پسٹل لے کر دیکھا۔ یہ میگزین سے لوڈ تھا۔ اعشاریہ اڑتیس کا یہ پسٹل کارکردگی میں بے مثال تھا۔ جان گرے نے اس کے چار اضافی میگزین بھی میرے حوالے کیے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ میں سب سے پہلے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کروں گا۔"

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس بیلٹ کے ہوتے ہوئے مجھے اس قسم کا خطرہ نہیں ہے۔" اس نے میری گردن میں بندھی بیلٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید تم سمجھ رہے ہو کہ اس کا ایکٹی ویٹ کرنے کا آلہ یہ ریموٹ ہے تو تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ریموٹ نے اسے آن ضرور کیا ہے۔ مگر اس کے ایکٹی ویشن کا تعلق میرے دل کے ساتھ منسلک ایک ڈیوائس سے ہے۔ اگر تم مجھ سے دو سو فٹ زیادہ دور گئے یا میرے دل کی دھڑکن رُک گئی تو یہ بیلٹ بلاسٹ ہو جائے گی۔"

"یعنی تم سے پاس رہنا اور تمہارا زندہ رہنا میرے لیے ضروری ہے۔"

"درست کہا تم نے۔"

"اور اگر تم اس مہم کے دوران کام آ گئے تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔"





جان گرے عیارانہ انداز میں ہنسا۔ "اس لیے تم میری حفاظت بھی کرو گے۔"

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے سینے میں سچ مچ کوئی ڈیوائس لگی ہے اور اس سے اس بیلٹ کا چارجر منسلک ہے۔"

"ابھی پتہ چل جائے گا جب ہم نیچے اُتریں گے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"میں اس ریموٹ کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔"

جان گرے مجھے لے کر باہر نکلا۔ جہاں اس کا دہشت گرد دستہ مستعد تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بوٹ کس جگہ لنگر انداز تھی۔ آسمان پر تیرتے بادل تھے اور چاروں طرف مکمل تاریکی تھی۔ بوٹس کی لائٹس بھی بند کر دی گئی تھیں۔ عرشے پر ہلکے نیلے رنگ کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی محدود تھی۔ فوجیوں کے پاس جدید اقسام کا اسلحہ تھا۔ ان میں اسنائپرز رائفلیں اور خودکار ساختہ رائفلوں کے علاوہ دستی بم اور پورٹیبل راکٹ لانچر تھے۔ اس کے علاوہ خاموشی سے حملہ کرنے کے لیے ایروشوٹر تھے جو بے آواز تیر پھینکتے تھے۔ مسلح قاتلوں کا یہ دستہ خون بہانے کے لیے کتنا بے تاب تھا۔ اس کا ان کے چہرے کے حیوانی تاثرات سے بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

"دوستو......" جان گرے نے گونجتی آواز میں کہا۔ "آج ہمیں اپنے چند بے گناہ ہم نسل افراد کا انتقام لینا ہے۔ جو سامنے آئے اسے بے دریغ قتل کر دو۔ دشمنوں کو ایسا سبق دو کہ وہ ہمارے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں......"

جان گرے کی اس مختصر سی تقریر کے ساتھ ہی وہ لوگ حرکت میں آ گئے اور بوٹ کے کنارے سے لگی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگے۔ اسی وقت ہوا بھری ربر کی موٹر بوٹیں پانی میں اُتار دی گئی تھیں۔ ہر کشتی میں بارہ افراد کی گنجائش تھی اور کل پانچ کشتیاں تھیں۔ مجھ سمیت تریپن افراد تھے۔ میں آخر میں موٹر بوٹ میں اُترا تھا۔ جان گرے میرے ساتھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں کشتیاں ایک طرف روانہ ہو گئیں۔ جب ہماری بوٹ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو انجن کی ہلکی سی آواز آئی جو چند گز سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ ان بوٹس میں کوئی ایسا انجن لگایا گیا تھا جو بہت کم آواز دیتا تھا۔ وہ سب سیاہ کپڑوں میں تھے۔ میری پتلون گہرے رنگ کی تھی اور سفید قمیص چھپانے کے لیے مجھے ایک عدد گہرے رنگ کی جیکٹ دے دی گئی تھی۔

مسلح دستے کی قیادت کرنے والا کرنل سب سے اگلی بوٹ میں تھا۔ وہ متوسط قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا صورت سے سخت مزاج نظر آنے والا شخص تھا۔ راستے میں جان گرے نے ایک چھوٹا سا ہیڈ سیٹ میری طرف بڑھایا یہ بے حد مختصر اور محدود فاصلے پر کام کرنے والا واکی ٹاکی تھا۔ اسے کان کے اندرونی حصے میں پھنسایا جاتا تھا اس کی ساخت ایسی تھی کہ جب تک اسے نکالا نہ جاتا یہ از خود نہیں نکل سکتا تھا۔ اس سے ایک نلکی نکل کر نصف رخسار تک آ رہی تھی۔ جان گرے نے مجھے اس کا فنکشن سمجھایا۔ اس کے کان والے حصے پر ہاتھ رکھو گے تو اس کا مائک کام کرنے لگے گا۔ تم جو بولو گے

سب کو سنائی دے گا۔ زیادہ دباؤ دینے کی ضرورت نہیں ہے صرف انگلی رکھنے سے بھی یہ کام کرے گا۔"

"مجھے اس کا فنکشن آتا ہے۔" اس کے چپ ہونے پر میں نے اطمینان سے جواب دیا اور اسے اپنے کان میں فٹ کرلیا۔ اس وقت کرنل اور پچھلے بوٹس کے کمانڈروں کے درمیان میٹنگ چل رہی تھی اور وہ انہیں حملے کے بارے میں بریفنگ دے رہا تھا یا یہ کہنا چاہیے کہ اپنا پلان بتا رہا تھا جس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ سامنے آنے والے ہر سیاہ فام کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے چاہے وہ عام سویلین ہو یا فوجی۔ آپریشن کا کل وقت ایک گھنٹہ تھا اور اس دوران میں سب کو بہرصورت بوٹس تک واپس آجانا تھا۔ جان گرے نے دوسری چیز مجھے دی وہ ایک گھڑی کے انداز کا قطب نما تھا۔ "یہ راستہ دکھانے کے لیے ہے لیکن تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ہم سے اور خاص طور سے مجھ سے نہ بچھڑو۔"

"مجھے بھی مرنے کا شوق نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا تھا۔

یہ ظاہر میں بے فکر تھا لیکن درحقیقت مجھے ان کے عزائم پر سخت تشویش تھی۔ یہ نہ جانے کہاں قتل عام کی مہم پر جا رہے تھے اور ظاہر ہے آپ کسی کے گھر حملہ کرنے جاؤ تو وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھا رہے گا، اپنی جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر تو مارے گا۔ فوجی کیمپ پر حملے کا مطلب تھا کہ بھرپور مزاحمت کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے مگر رات کی تاریکی میں شب خون مارنے والے ان بزدلوں سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ انہوں نے کوئی ایسا منصوبہ بنایا ہوتا جس میں فوراً ان کی جان کو خطرہ ہوگا۔ یہ ہر پہلو پر غور کرکے ہی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے اور ان کی سلامتی خاص طور سے جان گرے سے اپنی سلامتی مشروط ہونے کے باوجود میں شدت سے خواہاں تھا کہ ان کی مہم ناکام ہو اور وہ مار کھا کر واپس جائیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ مہم کامیاب ہوگی؟" میں نے دھیمی آواز میں جان گرے سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے تم صرف پچاس مسلح افراد لے کر حملہ کرنے جا رہے ہو۔ وہ بھی ایک فوجی کیمپ پر۔"

"تم فکر مت کرو...... ہمارے آدمی بہ حفاظت واپس آئیں گے۔ حملہ ناکام نہیں ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا کہ تو اس نے اشارے سے منع کردیا۔ "اب خاموش رہو...... ہم ساحل پر پہنچنے والے ہیں وہاں بلاضرورت آواز مت نکالنا۔"

"اوکے باس۔" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر ایک آواز دار شے کے بارے میں پوچھا۔ "اگر آئے تو۔" اس پر جان گرے نے جو مشورہ دیا اسے ناقابل بیان سمجھا جائے۔

دس منٹ بعد کشتی اتنی آہستگی سے ساحل پر پہنچی کہ جب وہ دھچکے سے رُکی تو مجھے پتا چلا کہ ساحل آگیا ہے۔ شاید یہ کوئی خلیج تھی۔ یہاں پانی ہموار تھا۔ 'مردِ آہن' جان گرے کہتا ہوا کشتی سے اُتر گیا اس نے ایک خاص بڑی سی رائفل اُٹھائی ہوئی تھی اور غالباً خود کو کسی ایکشن امریکی فلم کا کمانڈر تصور کر رہا تھا۔ اس نے ساحل پر اُتر کر ہاتھ ہلایا اور جھکے جھکے آگے جانے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے





تھے کہ وہ آج کے معرکے میں بذاتِ خود حصہ لینا چاہتا ہے اور یہ میرے لیے خطرے کی علامت تھی۔ اس کی زندگی سے میری جان مشروط تھی اسے کچھ ہوتا تو میری گردن میں بندھی بیلٹ پھٹ جاتی اور میں بلاوجہ مارا جاتا۔

ذرا سی دیر میں وہ سب درختوں کی آڑ میں ایک جگہ جمع تھے۔ کرنل نے انہیں دو گروپس میں بانٹا، بڑا گروپ اس کے ساتھ تھا جسے آرمی کیمپ پر حملہ کرنا تھا اس میں چالیس گوریلے تھے۔ باقی دس گوریلے جان گرے کی قیادت میں فارم ہاؤس پر حملہ کرتے۔ ان کے پاس دستی سائز میں آلے سے نقشہ ایک برقی اسکرین پر ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس کی مدد سے دونوں ٹیمیں بھٹکے بغیر اپنے ہدف تک جا سکتی تھیں۔ سب نے اپنی گھڑیاں ملائیں...... ظاہر ہے میں جان گرے والے گروپ میں تھا اور اس کا کام نسبتاً آسان تھا۔ اسے نہتے فارم ہاؤس کے مکینوں پر حملہ کرنا تھا۔ دستی نقشہ جان گرے کے پاس تھا اور وہ آگے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں مَیں تھا اور مجھ سے پیچھے دس مسلح گوریلے۔

بڑی رائفل اُٹھا کر جان گرے کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ کسی ناگہانی کی وجہ سے اس کے اور میرے درمیان دو سو فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں آیا۔ نقشے کے مطابق فارم ہاؤس کوئی ساڑھے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد جان گرے رُکا اور اس نے گوریلوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"آگے جاؤ...... دیکھو...... پہریدار یا کتے ہوں تو انہیں بے آواز طریقے سے ٹھکانے لگا دو۔"

"یس سر۔" دستے کے کمانڈر نے جواب دیا اور وہ چاروں طرف پھیل کر آگے جانے لگے میں اور جان گرے درختوں کی آڑ میں ان کے عقب میں تھے۔ جان گرے اس انداز سے آگے جا رہا تھا کہ ایک درخت کی آڑ میں آگے بڑھتا...... چند لمحے رُک کر سن گن لیتا اور پھر دوسرے درخت کی آڑ میں پہنچ جاتا۔ مجھے بلاوجہ افسوس ہوا کہ میں اس کی جان کی فکر کر رہا تھا۔ اسے خود اپنی جان کی فکر مجھ سے کہیں زیادہ تھی اور وہ اس معاملے میں ذرا سا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے خود آگے رہنے کے بجائے گوریلوں کو حملے کے لیے بھیجا تھا ورنہ اس کے پیش قدمی کرنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اکیلے ہی فارم ہاؤس پر دھاوا بول دے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے یہ حماقت نہیں کی ورنہ امکان یہی تھا کہ وہ مارا جاتا اور اس کے ساتھ میں بھی۔

درحقیقت مجھے ان لوگوں کا سارا پلان ہی احمقانہ اور خوش فہمیوں سے بھرپور لگ رہا تھا۔ وہ اندازوں سے ایک اجنبی سرزمین پر اپنے طے شدہ اہداف پر حملہ کرنے جا رہے تھے اور ان کی منصوبہ بندی کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ وہ دشمن کو بے خبری میں جالیں گے اور ایسا نہ ہوتا تو انہیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بہرحال میں مجبور شخص تھا۔ نہ ان کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ انہیں روک سکتا تھا۔ ہاں بازی جاتی تو مفت میں مارا جاتا۔

”کیا آگے جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ میں نے جان گرے سے دریافت کیا۔

”خاموش رہو۔“ وہ غرایا۔

”میرا گانے کو دل چاہ رہا ہے۔“ میں چپ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ”خاص طور سے تمہارے ہاں جس طرح اوپیرا میں کفن پھاڑ کر گایا جاتا ہے وہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔“

”خدا کے لیے چپ رہو۔“ جان گرے جھلا گیا تھا اور شاید پہلی بار مجھے ساتھ لانے پر پچھتا رہا تھا۔

میں نے اپنا پستول نکال کر اور اسے گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔ بادل ہٹ جانے سے ماحول کسی قدر روشن ہو گیا تھا۔ ”اگر میں اپنا نشانہ آزمانا چاہوں...... بہت دن ہو گئے پسٹل استعمال کیے ایسا نہ ہو کہ میں مار کسی اور کو رہا ہوں اور گولی تمہیں لگ جائے میں بھی بلاوجہ مارا جاؤں۔“

جان گرے نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہاری زبان میں خارش ہو رہی ہے۔“

”میرے ہاتھ میں بھی ہو رہی ہے۔“ میں نے پسٹل چاروں طرف یوں گھمایا جیسے موزوں نشانہ تلاش کر رہا ہوں اور پھر اسے لا کر جان گرے کے چہرے کے سامنے روک دیا۔

”کک...... کیا کر رہے ہو۔ چل نہ جائے۔“

”چل جائے گی۔“ میں نے حیرت سے پستول کی طرف دیکھا۔ ”اس کے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔“

اس پر تپ کر جان گرے نے مجھے مطلع کیا کہ پسٹل کے اور بھی بہت سارے اعضا نہیں ہیں۔ میں ہنس دیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔ وہ جان گیا تھا کہ میں اسے چھیڑ رہا ہوں۔ اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر کسی سے پوزیشن دریافت کی۔ فوراً ہی میرے کان میں ایک آواز گونجی۔ ”سر یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہم فارم ہاؤس کے احاطے کے پاس ہیں۔“

”مائی گاڈ!“ اچانک کوئی دوسرا شخص چلایا۔ ”یہ کیا بلا ہے؟“

آواز نہ صرف ہیڈ سیٹ سے بلکہ ویسے بھی میرے کانوں تک آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک برسٹ پڑا اور ساری راز داری ہوا ہو گئی۔ جان گرے بے اختیار گالی دے کر آگے کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ ”ارے...... ارے...... اس عمر میں اتنا تیز دوڑنا بعض اوقات دل کے دورے کا سبب بن جاتا۔“

”شٹ اَپ......“ وہ رُک کر غرایا۔ ”ہوشیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گولی تمہاری بے لگام زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔“

فارم ہاؤس کی طرف سے سنگل فائر کی آواز آئی۔ فائر رائفل کا تھا اور ان میں سے کسی کے پاس ایسی رائفل نہیں تھی یہ فائر فریق مخالف کی طرف سے کیا گیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ فائر کے ساتھ ایک کربناک چیخ بھی گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ سیٹ پر زلزلہ آ گیا تھا۔ سب ہی بول رہے تھے۔ پھر





معلوم ہوا کہ نمبر چار کی طرف سے جواب نہیں مل رہا ہے یعنی وہ مرحوم ہو چکا تھا یا کم سے کم جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جان گرے نے چلا کر انہیں فارم ہاؤس پر فائر کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اس حکم کے لیے چلانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی زور و شور سے فارم ہاؤس کی طرف گولیاں برسائی جانے لگیں۔ دوسری طرف سے بھی جواب دیا جا رہا تھا۔ بہر حال شب خون مارنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ اگرچہ فائرز سے پتا چل رہا تھا کہ حملہ آور جدید ترین اور مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ دفاعی فائر ان کے مقابلے میں کمزور تھا۔ جان گرے مسلسل اپنے ساتھیوں کو بڑھاوا دے رہا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں گھس جائیں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

مگر جان گرے کے ساتھی بھی اس کی طرح بزدل تھے۔ جدید اسلحے اور فوجی تربیت سے لیس ہونے کے باوجود ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فارم ہاؤس میں درانہ وار گھس جائیں۔ وہاں سے بے شک کمزور لیکن مسلسل فائرنگ جاری تھی اپنے ایک ساتھی کے مارے جانے سے ان کے جوش و ولولے میں خاصی کمی آئی تھی۔ جان گرے اس وقت فارم ہاؤس سے تقریباً پچاس ساٹھ گز دور ایک بڑے درخت کے عقب میں بیٹھا تھا۔ اور وقفے وقفے سے اپنی رائفل سے فارم ہاؤس پر برشٹ مار رہا تھا۔ اس کی یہ فائرنگ بے سود رہی تھی۔ کیونکہ اول تو فارم ہاؤس درختوں کی آڑ میں تھا اور دوسرے درمیان میں ایک نالے کا اونچا پشتہ بھی حائل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”گولیاں ضائع مت کرو۔ ممکن ہے کہ بہتر موقع پر کام آئیں۔“

اس مشورے پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا مگر فائرنگ روک دی تھی۔ اس دوران اس کے ساتھی گوریلے آگے جانے سے ہچکچا رہے تھے حتیٰ کہ جان گرے نے دھاڑ کر انہیں ایڈوانس کرنے کا حکم دیا۔

”سر فائر بہت تیز ہے۔“ کمانڈر نے منمنا کر کہا۔

”ہمارے پاس کیا چڑیا مارنے والی گنیں ہیں۔“ جان گرے غرایا۔ ”ان پر فائرنگ کر و سب کو اُڑا کر رکھ دو۔ اگر اندر سے مزاحمت کم ہو تو ان پر راکٹ مارو۔“

”سر میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ کمانڈر خوش ہو گیا۔

”تمہیں یہاں پکنک منانے نہیں بھیجا ہے مسٹر کمانڈر۔“ جان گرے نے طنز کیا۔ ”اپنی عقل بھی استعمال کرو۔“ اب مجھے فارم ہاؤس والوں کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ آڑ میں ہو کر گولیوں سے تو بچا جا سکتا تھا لیکن راکٹ تو آڑ کو ہی اُڑا دیتا۔ اس سے کیسے بچتے۔ چند لمحے بعد ایک شعلہ سا لپک کر فارم ہاؤس کی طرف گیا اور میں نے وہاں سے آگ کا بادل نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ نہایت خطرناک راکٹ تھا اس نے فارم ہاؤس کی عمارت کو اُڑا کر رکھ دیا تھا۔ فارم ہاؤس کے جلنے سے روشنی ہوئی تو مجھے پہلی بار اس کے معائنے کا موقع ملا۔ فارم ہاؤس خاصے بڑے رقبے پر پھیلا تھا۔ نالے کے پار کھیت تھے جن میں مکئی کی فصل لگی تھی۔ اس کے پار فصل ذخیرہ کرنے والے گودام

اور مویشی خانے تھے راکٹ گودام کو جا کر لگا تھا اور اس کی لکڑی کی عمارت دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ مکینوں کے لیے رہائشی عمارات ان کے عقب میں تھیں۔ اگلی باری ان کی تھی۔ دوسرے راکٹ کو میں نے مویشی خانے سے ٹکراتے دیکھا یہ بدحواس مویشی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے اور پوری آواز سے چلا رہے تھے۔

''ان جانوروں نے کیا قصور کیا ہے؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''وہ لوگ یہاں سے ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔'' جان گرے سفاکی سے بولا۔ ''ان سب کا صفایا ضروری ہے۔''

ایک بار پھر میں نے بہ مشکل خود کو جان گرے کی منحوس کھوپڑی میں سیسہ اُتارنے سے روکا۔ یکے بعد دیگرے فارم ہاؤس کی عمارتوں پر راکٹ برسے اور انہیں ملبے کا ڈھیر بناتے رہے اور میں بے بسی سے دیکھتا رہا۔ فارم ہاؤس کے مکینوں کے لیے اس گولہ باری کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کئی افراد کے ٹکڑے فضا میں بلند ہوتے دیکھے۔ ایک فرد شعلوں میں گھرا بھاگتا ہوا میدان کی طرف آیا تھا بیک وقت کئی برسٹ اسے لگے اور وہ زمین پر گرنے سے پہلے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جان گرے یہ سب دیکھ دیکھ کر وفورِ مسرت سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے دھاڑ کر اپنے گوریلوں کو فارم ہاؤس میں گھسنے اور وہاں پر زندہ ہر فرد کو دیکھتے ہی ٹھنڈا کرنے کا حکم دیا۔



# سوداگر



کاشف زبیر

جونا تھن رینڈ کی کار ایک عالیشان گیٹ کے سامنے پہنچی۔ جس کے دونوں طرف سرخ پتھروں سے بنی چار دیواری تھی۔ احاطہ تا حدِ نگاہ پھیلا تھا اور اندر تاریکی تھی۔ پھاٹک کھلنے کے بعد کار نے احاطے کے اندر شروع کیا۔ چکر کھاتی روشوں سے گزرتی کوئی ایک فرلانگ کے بعد کار ایک سفید عمارت کے سامنے رُکی۔ جس کا طرزِ تعمیر ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت تھا۔ پوری عمارت اس طرح روشنی میں نہائی تھی کہ ایک بھی بلب نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پوری عمارت روشن تھی جیسے اس کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

بوڑھا کار سے خود اُترا اور اس نے جھپٹ کر آنے والے سے کہا۔ ''انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ اور ڈاکٹر کو کال کرو۔ فوراً۔''

''سر۔'' آنے والے بٹلر نے سر جھکا کر کہا اور ہم سے بولا۔ ''آیئے معزز سر اور لیڈی صاحبہ۔''

''فی الوقت یہ لیڈی نہیں ہیں۔'' میں نے اسے مطلع کیا تو وہ سراپا معذرت بن گیا بلاشبہ وہ بہترین تربیت یافتہ بٹلر تھا۔ وہ ہمیں عمارت میں لے گیا اور ایک عالیشان قسم کے کمرے میں ٹھہرایا۔ ''آپ رُکیں ابھی ڈاکٹر آتا ہے۔''

''اس دوران میں آپ کافی یا جو ڈرنک مناسب سمجھیں۔''

''وسکی لے آؤ۔'' مورنا بول اُٹھی۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ غالباً درد بڑھ گیا تھا۔

''لیکن میرے لیے کافی۔'' میں نے کہا تو وہ سر خم کر کے چلا گیا۔

ایک منٹ بعد ہی ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اس نے قینچی سے آستین کاٹ کر مورنا کا معائنہ کیا۔ اس کے عقب میں نرس گرم پانی اور مرہم پٹی کا دوسرا سامان لے آئی تھی۔ اس نے صفائی کر کے پٹی کی اور مورنا کو دو انجکشن لگا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ کرسی پر ہی سو گئی۔ میں نے اضطراب سے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

ڈاکٹر نے تسلی دی۔ ''فکر نہ کریں میں نے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ تکلیف بڑھ گئی تھی اب سو کر

تم سے مکمل تعاون کرے گا۔ وہاں میرا ایک فلیٹ ہے میری آمد تک تم وہاں رہ سکتی ہو۔ جاوید یا کوئی اور تمہیں وہاں پریشان نہیں کر سکتا اور نہ وہاں تمہارے ساتھ زبردستی کی جا سکتی ہے۔''

''لیکن یوسف مما! میں ان سے چھپ کر شادی نہیں کر سکتی۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''کاجل...... پاگل نہ بنو...... گھر میں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ نکالنا ورنہ تم قید کر دی جاؤ گی اور کبھی لندن نہیں آسکو گی۔ بعد میں وہ ہمارا رشتہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''او کے۔'' اس نے اپنی حالت پر قابو پا کر کہا۔ ''میں آؤں گی یوسف...... تمہارے لیے...... مجھے کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

''جان میں وقت نہیں بتا سکتا، زندہ رہا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے تمہارے پاس آنے سے نہیں روک سکے گی۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''یوسف پاپا کا بزنس......'' کاجل نے آہستہ سے پوچھا۔ ''تم اس کا کیا کرو گے؟''

''اگر تمہارے بھائیوں نے خوش دلی سے ہماری شادی کو تسلیم کر لیا تو میں یہ کاروبار ان کے حوالے کر دوں گا میں حرام کھانے کی نسبت فاقے کرنا پسند کروں گا۔ ویسے تم فکر نہ کرو میرے بازوؤں میں اتنا زور ہے کہ تمہیں آرام سے رکھ سکوں۔''

''سچ۔'' کاجل کھل گئی تھی۔ ''یوسف تم بہت اچھے ہو۔ یقین کرو میں تمہارے ساتھ اس جھونپڑی میں خوش رہ سکتی ہوں جو تم نے حلال کی کمائی سے بنائی ہو مگر حرام سے کھڑے کیے محل میں نہیں رہ سکتی۔ میرا تو یہاں بھی دم گھٹتا ہے۔''

''بس تم وہاں سے نکلنے کی کرو اور سارا معاملہ حد سے زیادہ خفیہ رکھنا۔ مجھے جاوید اور جنید سے معمولی سی امید بھی نہیں ہے انہیں بھنک پڑ گئی تو وہ تمہیں غائب کر دیں گے ہمیشہ کے لیے۔''

''تت...... تمہارا مطلب ہے وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' کاجل سہم کر بولی۔

''میں ان سے ایسی ہی توقع رکھتا ہوں۔'' میں نے تلخی سے کہا تھا۔ ''معاف کرنا کاجل وہ تمہارے بھائی ہیں لیکن وہ حد درجے خود غرض اور مفاد کے لیے سفاک لوگ ہیں۔''

''میں جانتی ہوں کیا کروں میرے بھائی ہیں بچپن کی محبت ختم تو نہیں ہو سکتی پھر ان سے خون کا رشتہ بھی تو ہے۔'' وہ بولی۔

''رشتہ کون ختم کر سکتا ہے اور بے شک ان سے محبت بھی کرو، ان پر اعتبار مت کرنا۔ کیا تمہارے پاس پاسپورٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہے۔ ابھی حال ہی میں نیا بنوایا ہے۔''

''بس تو خاموشی سے برطانیہ کا ویزہ لگواؤ میرا خیال ہے تمہیں آسانی سے امیگرینٹ ویزہ مل جائے گا۔ ورنہ کسی بھی قسم کا ویزہ لے کر چلی جانا۔ باقی معاملات وہاں روڈنی سنبھال لے گا۔ تمہارے پاس رقم ہے؟''





''یہ کیسا سوال کر رہے ہو؟'' وہ خفگی سے بولی۔ ''یاد ہے پاپا نے میرے پیدا ہوتے ہی میرے نام سے ایک بینک اکاؤنٹ کھول دیا تھا۔ اس میں ہر مہینے ایک لاکھ روپے جمع کراتے تھے۔ خود حساب لگا لو کہ پاپا نے اٹھارہ سالوں میں کتنا پیسہ جمع کرایا ہو گا۔ اس کا نفع ہی میرے گزارے کے لیے کافی ہے دو تین بار کے علاوہ اس سے پیسہ نکلوایا ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے لاکھ ہو گا۔''

''لاکھ نہیں کروڑ میں بات کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بس تو پہلی فرصت میں لندن جانے کی تیاری شروع کر دو اور خدا کے لیے اپنے سوٹ نہ پیک کرنا شروع کر دینا۔ گھر میں بالکل بھی نہ ظاہر ہو کہ تم کہیں جا رہی ہو۔''

''اتنی عقل میرے پاس بھی ہے تم فکر نہ کرو میں صرف پہنے ہوئے کپڑوں اور اپنی چند ضروری چیزوں کے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

''گڈ گرل۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال غیر قانونی طور پر جنوبی افریقہ میں ہوں۔''

''میرے خدا اگر تمہیں گرفتار کر لیا گیا۔'' کاجل خوف زدہ ہو گئی تھی۔

''تب بھی کچھ نہیں۔ اگر میرے چند دشمن حکومت میں نہ ہوتے تو میں خود کو حکومت کے حوالے کر چکا ہوتا۔''

''یوسف تمہارے پاس اتنے آدمی ہیں، وہ تمہارے ایک اشارے پر ساری دنیا میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تم ان سے مدد کیوں نہیں لیتے۔''

''تم بھول رہی ہو، اب وہ جاوید اور جنید کے ساتھ ہیں اور میں کسی ایسے آدمی پر اعتماد نہیں کر سکتا جو ان کے ساتھ رہا ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں بھی میرے ہمدرد کم نہیں ہیں اور کاجل تم بھی محتاط رہا کرو۔ ممکن ہے میرے دشمن مجھے مجبور کرنے کے لیے تمہارے خلاف کچھ کر گزریں۔''

''یہاں پاکستان میں؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''وہ بین الاقوامی قسم کے غنڈے ہیں جنہیں سپر طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان ہی لوگوں نے مجھے اغوا کر کے خلیج تباہ کر دیا تھا۔''

''خدا کے لیے ان لمحات کا ذکر نہ کرو۔ تم نہیں جانتے یہ خبر سننے کے بعد میں نے شب و روز کیسے مر مر کر اور جی کر گزارے ہیں۔ میں اس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔''

''کاجل...... بس کچھ دن اور مجھے یقین ہے قدرت ہماری ساری تکلیفوں کا ازالہ کر دے گی۔''

''مجھے یقین ہے یوسف! جب سے تمہارے زندہ ہونے کی خبر سنی ہے۔ خدا پر میرا ایمان لوٹ آیا ہے۔ وہ ضرور ہمارے ساتھ انصاف......'' اچانک کاجل کی آواز آنا بند ہو گئی اور موبائل سکرین پر بیٹری ختم ہونے کا اشارہ آیا۔ میں نے دوبارہ کال ملانے کی کوشش کی کیونکہ میں نے کاجل کو ابھی

تک کوڈ نہیں بتایا تھا۔ اس کوڈ کے بغیر روڈنی اس کی کوئی مدد نہیں کرتا اور وہ لندن میں بے یار و مددگار رہ جاتی مگر موبائل کی بیٹری اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ رابطہ نہ ہو سکا۔ جھنجھلا کر میں نے موبائل پھینک دیا۔ اس گھر میں فون لازمی تھے لیکن اس کمرے میں کوئی فون نہیں تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے غسل کا فیصلہ کیا۔ گرد مٹی اور جسم پر جا بجا جالے چپکے تھے۔ نہا دھو کر میں نے سلیپنگ سوٹ پہنا، اسلحہ سے ہاتھ کے نشانات صاف کر کے الماری میں کپڑوں کے عقب میں چھپا دیا تھا۔ احتیاطاً ایسا کیا تھا ورنہ اس کا فائدہ نہیں تھا۔ اگر جوناتھن مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا تو اس کی سنی جاتی میری نہیں۔ تھکن سے بُرا حال تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ خاص طور سے گرم پانی سے غسل کے بعد بھوک کھل گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ بٹلر کی بات مان لیتا۔ بہر حال صبح دیکھی جائے گی۔

میری آنکھ کسی الارم سے کھلی۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا پھر سرہانے رکھے انٹر کام پر نظر پڑی۔ اس کی بیل بج رہی تھی۔ میں نے اس کا ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف بٹلر تھا۔ ''سر نو بج رہے ہیں۔ سر جوناتھن ناشتے کی میز پر آپ کے منتظر ہیں۔''

''میں دس منٹ میں آیا۔'' ناشتے کے نام پر میں اُچھل پڑا تھا کیونکہ پیٹ میں دوڑتے چوہے بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے۔ میں نے عجلت میں منہ ہاتھ دھویا پھر اسلحے والے بیگ سے پسٹل اور اس کے فاضل کلپ نکال کر نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور باہر نکل آیا۔ بٹلر دروازے کے عین سامنے استادہ تھا۔ مجھے دیکھ کر سر خم کیا۔ ''آئیے سر ڈائننگ ہال کی طرف۔''

''پہلے میں ایک نظر اپنی ساتھی کو دیکھوں گا۔''

''وہ اس وقت سکون سے سو رہی ہیں۔ انہیں صبح ناشتہ کرا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ابھی انہیں اٹینڈ کر کے گیا ہے۔'' مورنا سچ مچ سکون سے سو رہی تھی۔ رات کے برعکس اس کا حلیہ بھی اچھا تھا اور اس کے جسم پر صاف ستھرا مگر ڈھیلا سا لباس تھا۔ اسے دیکھ کر بٹلر کی رہنمائی میں ڈائننگ ہال پہنچا۔ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس شاندار محل کے شایانِ شان تھا۔ اس جگہ دو طرح کی ٹیبلز تھیں۔ ایک بڑے سائز کی پارٹی ٹیبل اور ایک چھوٹی فیملی ٹیبل۔ اس پر کوئی ڈیڑھ درجن کرسیاں تھیں۔ جوناتھن اور اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا موجود تھے۔ ''آؤ جوان...... اب بھوک برداشت نہیں ہوتی۔'' جوناتھن نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے معذرت کی۔ ''سوری سر! میں ذرا اپنی ساتھی کو دیکھنے کے لیے رُک گیا تھا۔ اس کی حالت اب بہتر لگ رہی تھی۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ ناشتہ کرو۔ میرا اندازہ ہے تم بھی بھوکے ہو۔ رات کی بھاگ دوڑ میں شاید کھانا نصیب نہیں ہوا ہوگا۔'' اس نے کہا تو میں چونک گیا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے نیپکن سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

ناشتہ خاموشی سے کیا گیا تھا۔ میں نے اس نوعمر لڑکے کا جائزہ لیا۔ چہرے مہرے اور اپنے با





اعتماد انداز سے وہ جوناتھن کا کوئی رشتے دار لگ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد جوناتھن نے مجھ سے کہا۔

''میں عام طور سے چائے ٹیرس پر لیتا ہوں، تم پسند کرو تو یہاں منگوا لوں؟''

''نہیں میں بھی ٹیرس پر ہی چائے لے لوں گا آپ میری فکر نہ کریں۔''

''گرینڈ پا، کیا یہ مناسب ہے؟'' لڑکے نے پہلی بار کچھ کہا۔

''قطعی جیری...... تم فکر نہ کرو اور آج تم نے ریان کے پاس جانا ہے۔''

''اوکے گرینڈ پا۔'' لڑکا نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا اُٹھ گیا۔

ٹیرس محل کے عقبی حصے میں تھا۔ اس کی سنہری ریلنگ کے پار دور تک پھیلا لان اور اس سے پرے جنگل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ سب اس محل کے احاطے میں تھا۔ بٹلر نے چائے میز پر لگا دی۔ صبح کی نکھری نکھری دھوپ ہر شے کو واضح کر رہی تھی۔ بٹلر نے چائے بنا کر سرو کی۔ اس کے بعد جوناتھن نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی جوناتھن یک دم سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم اس وقت جنوبی افریقہ کی حکومت کو مطلوب ترین شخص ہو اور تم پر بارہ افراد کو قتل کرنے کے الزامات ہیں۔''

میں نے چائے کا سپ لیا۔ ''آپ بہت اچھا بلینڈ استعمال کرتے ہیں چائے کا۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''یقیناً اس کے سوا کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے لیکن ایک سوال ہے آپ کو اس بات کا کب اور کیسے علم ہوا؟''

''سوال غیر ضروری ہے۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ تم کون ہو؟'' جوناتھن نے چائے کا کپ اُٹھا لیا۔ ''نوجوان کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے ممکن ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

میں نے پیالی رکھ دی۔ ''ایک ایسے شخص کی جس پر بارہ افراد کے قتل کا الزام ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کا لہجہ اب بھی پُرسکون تھا۔ ''تم پر صرف الزام ہے۔ عدالت نے سزا نہیں سنائی ہے۔ اس لیے تم اس بات کو بھول جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''مجھے تسلیم ہے کہ میں وہی جوزف ہوں جس کی پولیس کو تلاش ہے۔''

''تب تم مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔'' اس نے ذرا آگے جھک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یقین کرو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں سنجیدگی اور سنگینی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ میرے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا میں نے ایک گہری سانس لی اور

اسے تفصیل سے سب بتانے لگا۔ یعنی میں جنوبی افریقہ میں کیسے داخل ہوا اور یہاں کن حالات سے گزرا۔ میں نے سب ہاتھ پاؤں بچا کر بیان کیا۔ اگرچہ ہم کھلی جگہ پر تھے لیکن اس بات کا خاصا امکان تھا کہ میرا کہا گیا ایک ایک لفظ کہیں ریکارڈ ہو رہا ہو۔ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں جنوبی افریقہ میں کیسے اور کن حالات سے گزر کر آیا تھا۔ میں نے جان گرے اور اس کی تنظیم کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ جان گرے کا ذکر کرنل بوگارڈ کے ساتھی کے طور پر کیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ میرے بیان کا ایک ایک لفظ اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کر رہا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ بیان میں معمولی سی غلطی بھی پکڑ لے گا۔ اس لیے میں حتیٰ الامکان سچ بول رہا تھا۔

اس دوران بٹلر نے ایک بار اور چائے سرو کی۔ یہ ایسی خوش ذائقہ اور خوشبودار چائے تھی کہ میں نے اتنی نفیس قسم کی چائے کم ہی پی تھی۔ جوناتھن کا ذوق اس معاملے میں بہت اعلیٰ تھا۔ وہ خاموشی سے سن رہا تھا جب میں نے لنڈسے کا ذکر کیا وہ کسی قدر مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی چائے کی پیالی رکھ دی اور کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا تھا۔ میں رُک گیا۔ حتیٰ کہ اس نے اشارہ کیا۔ ''اپنی بات جاری رکھو۔''

جوہانسبرگ میں پیش آنے والے واقعات میں مَیں نے کینی مین کے دشمنوں سے ہونے والی جھڑپوں میں مارے جانے والے افراد کا تذکرہ بھی گول کر دیا کیونکہ ان سب میں خاصے افراد مارے گئے تھے جن کا الزام بھی میرے سر آ سکتا تھا۔

میرے چپ ہونے کے بعد بھی وہ خاموش رہا تھا خاصی دیر بعد اس نے سر اُٹھایا۔ ''لنڈسے تم سے ملی تھی۔''

''ہاں...... وہ ایک مہربان عورت تھی۔''

''مسٹر جوزف کیا تم بتا سکتے ہو وہ تم پر اتنی مہربان کیوں تھی؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے اس سنسنی خیز داستان میں سب چھوڑ کر لنڈسے کے بارے میں سوال کیوں کیا تھا۔ ''اس لیے وہ ایک اچھی اور انسانیت پر یقین رکھنے والی عورت تھی۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے چبھتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''سو فیصد۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

''مجھے افسوس ہے جوزف تم نے سچ نہیں کہا ہے۔'' جوناتھن نے اپنے کوٹ سے ایک لفافہ برآمد کیا اور میرے سامنے ڈال دیا۔ ''اس میں کچھ تصویریں ہیں جو تمہارے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیں گی۔''

میں نے لفافہ کھولا اس میں سے دو تصویریں پھسل کر میز پر آ گری تھیں۔ چھ بائی آٹھ کی تصاویر، میں نے انہیں اُٹھایا۔ دونوں تصاویر میری تھیں۔ ایک تو یقینی طور پر لنڈسے کے فارم پر لی گئی





تھی۔ کیونکہ پس منظر میں اس کا مکان نظر آ رہا تھا۔ دوسری...... میں نے اسے بہ غور دیکھا مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی اوور کوٹ اور فلنٹ ہیٹ میں تصویر کھنچوائی ہو۔ یہ میری تصویر نہیں تھی لیکن اس میں نظر آنے والا چہرہ میرا ہی تھا میں نے غور سے اسے دیکھا، تب مجھے لگا یہ شخص مجھ سے حیرت ناک حد تک مشابہہ ضرور تھا لیکن یہ میں نہیں تھا اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کس کی تصویر تھی۔ یہ لنڈسے کے بھائی کی تصویر تھی جس سے میری مشابہت کی بنا پر وہ مجھ پر اتنی مہربان تھی کہ اپنی جان قربان کر دی۔

میں نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ ''یہ تصویریں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟''

''یہ مجھے لنڈسے نے بھیجی تھیں۔''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی جیسے کوئی سنسنی خیز انکشاف سامنے آنے والا ہے۔ ''آپ کون ہیں؟'' میں نے بہ مشکل پوچھا تھا۔

''میں جونی والٹر ہوں۔ لنڈسے کا باپ۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا جو ممکن طور پر پُراسرار تھا۔ جھریوں بھرے چہرے اور چمکتی آنکھوں میں مجھے جذبات کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہیں آئی لیکن اس کے باوجود اندر سے مجھے یقین تھا کہ وہ میرے اور اپنے رشتے اور میرے متعلق دوسرے حقائق سے آگاہ ہے۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''لگتا ہے کہ آپ سب جانتے ہیں......''

''کسی حد تک۔ میں نے خاصے عرصے تک اپنے پوتے کی تلاش جاری رکھی تھی کیونکہ وہ اس کشتی میں نہیں ملا تھا جس سے اس کے ماں باپ کی لاشیں ملی تھیں۔''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ میں وہی بچہ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''محض شباہت سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔''

''مجھے بھی شک ہے۔'' بوڑھے نے سر ہلایا۔ ''لیکن یہ سچ بھی ہے تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔''

''آپ کے لیے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''آپ اس شخص کو اپنے خاندان سے نکال چکے تھے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔''

جونی والٹر کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ ''مذہب کو درمیان میں نہ لانا۔ تمہارا معاملہ الگ ہے۔ اگر تم میرے پوتے ثابت ہوتے تو بھی تب بھی میں تمہارے لیے خاندان میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا اور نہ تمہیں میری طرف سے کسی مالی فائدے کی امید رکھنی چاہیے۔''

''مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں اپنے زورِ بازو پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''جس شخص نے میری پرورش کی تھی اس نے میرے لیے کروڑوں ڈالرز سالانہ کا کاروبار چھوڑا ہے۔''

غالباً اسے میری بے نیازی اچھی نہیں لگی تھی۔ ''والٹر گروپ کا ایک نام ہے۔ اس ملک کی معیشت پر تمہارا قبضہ ہے۔ اس میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔'' میں بولا۔ ''میں جلد از جلد اس ملک سے چلے جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ کام آسان نہیں ہے۔'' جونی والٹر نے کہا۔ ''لیکن میں کوشش کروں گا۔''

''کیا ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت ہے؟''

''ہاں......تم پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اپنی ساتھی کے ٹھیک ہونے تک تم اسی جگہ رہو؟'' اس نے مشورہ دیا۔

''میرا میزبان جو اس لڑکی کا باس بھی رہ چکا ہے۔ وہ ہمارے لیے پریشان ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک دو دن پریشان ہوگا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' جونی والٹر نے بے پروائی سے کہا۔ ''بہرحال تم اس جگہ بالکل محفوظ ہو۔''

''مسٹر والٹر! آپ مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں بتائیں گے؟''

جونی نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''میں تمہیں ایک فائل بھیجوں گا، وہ پڑھ لینا۔ مجھے امید ہے اس سے تمہاری تشنگی خاصی حد تک کم ہو جائے گی۔''

''فائل کب ملے گی؟'' میں نے اپنی بے تابی دباتے ہوئے پوچھا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ، میں بھجواتا ہوں۔''

''کیا میں کسی کو کال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں......لیکن کسی کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کہاں ہو؟'' جونی والٹر کھڑا ہو گیا۔ ''میں فائل بھجواتا ہوں۔''

واپسی میں مورنا کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھی یا شاید بے ہوشی میں اس کا زخم اتنا تکلیف نہیں دے رہا تھا کہ اسے مسلسل بے ہوش رکھا جاتا۔ درد دبانے کے لیے پین کلرز بھی دی جا سکتی تھیں۔ ایک بار پھر مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ جونی والٹر بہرصورت ہمیں بلکہ مجھے اپنے محل میں رکھنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اگر میں محل سے باہر جانے کی کوشش کرتا تو اس کی طرف سے لگائی گئی پابندی نکل کر سامنے آ جاتی لیکن فی الحال میں خود بھی یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کینی مین پر میرا اعتماد ڈول گیا تھا۔ دوسرے میں جونی والٹر کی اس فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔

اپنے کمرے میں آئے مجھے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ کسی کی دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

ایک سیاہ لڑکا فائل فولڈر اٹھائے اندر آیا۔ ''یہ آپ کے لیے مسٹر والٹر نے بھجوائی ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میز پر رکھ دو۔''





سیاہ فام لڑکے نے اسے میز پر رکھ دیا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے فولڈر اُٹھایا۔ اندر کمپیوٹر سے نکالے ہوئے صفحے تھے لیکن یہ ٹائپ شدہ نہیں تھے بلکہ کسی کی بہت خوب صورت لکھائی کو سکین کر کے کمپیوٹر میں اس کے پرنٹ نکالے گئے تھے۔ صفحے پلٹنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تحریر کسی ڈائری کی تھی اور اس میں سے منتخب شدہ حصے ہی نکالے گئے تھے یعنی جونی والٹر کے پاس اصل ڈائری تھی اور اس نے مجھے اس کے صرف وہی حصے دیئے تھے جو اس نے مناسب سمجھے گویا اس ڈائری میں بہت کچھ ایسا تھا جو مجھے پڑھنے کے لیے نہیں دیا گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا پہلا صفحہ کھول لیا۔

21 اکتوبر 1979ء آج میں نے پاپا سے بات کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے کمپنی کھولنے کی اجازت مل جائے گی۔ آج کل جیولری کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں تیل کے بحران کے بعد اکثر لوگ اپنی بچتیں سونے اور جواہرات میں منتقل کر رہے ہیں۔

23 اکتوبر 1979ء پاپا نے کمپنی کھولنے کی اجازت دی ہے۔ اس میں چالیس فیصد شیئرز ان کے ہوں گے جبکہ ساٹھ فیصد کے مالک میں اور سارہ ہوں گے۔ پاپا نے کمپنی مینجمنٹ مکمل طور پر ہمارے سپرد کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اور سارہ مل کر اس کمپنی کو جلد جنوبی افریقہ کی ٹاپ جیم کٹنگ کمپنیوں میں لے آئیں گے۔ ہمارے پاس ہنر ہے سارہ نے ایسے ڈیزائن بنا رکھے ہیں۔

2 نومبر 1979ء میں گل خان کے پاس گیا تھا۔ اس کے طرز زندگی نے مجھے متاثر کیا۔ وہ دولت مند نہیں ہے لیکن جیسی خوشی اور اطمینان مجھے اس کے اس پُرانے سے گھر میں نظر آیا وہ اپنے محل نما گھر میں بھی نہیں ملتا۔ گل خان کے چار بچے ہیں اور اس کی بیوی پھر امید سے ہے۔ گل خان مسلمان ہے لیکن جواہرات کے معاملے میں اس کی نظر حیران کن ہے۔ وہ ہماری کمپنی کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوگا۔

17 جنوری 1980ء میں اور گل خان آج پہلی بار سمندر میں گئے۔ ایک بیرونی پارٹی سے بعض اچھے پتھروں کی مناسب قیمت پر بات ہوئی ہے۔ امید ہے اس سے اچھا نفع ملے گا۔ گل خان نے ایک ہفتے میں کئی جواہرات اور پتھر خریدے ہیں۔ اس نے اپنی ڈیل کی ہے۔

28 جنوری، ہمیں ایک ایسا چانس ملا ہے۔ گل خان نے بعض اعلیٰ درجے کے ناتراشیدہ جواہرات خریدے ہیں۔ ان سے بہترین درجے کے جواہرات نکلنے کی امید ہے۔ گل خان جیسا دوست مشکل سے ملے گا۔ مجھے اس پر مکمل اعتبار ہے۔ اگرچہ پاپا اور خاندان کے دوسرے لوگ اسے پسند نہیں کرتے کہ میں ایک مسلمان سے تعلق رکھوں اور اسے دوست کا درجہ دوں لیکن گل خان کے لیے میں ہر مخالفت برداشت کر سکتا ہوں۔

27 فروری، آج ہم نے پہلی بار بین الاقوامی منڈی میں جواہرات کی ڈیل کی ہے۔ ہمیں گولڈ بانڈ کی صورت میں ادائیگی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سودے سے ہمیں ایک ملین رینڈ

(جنوبی، افریقی کرنسی) کا نفع ہوگا اور میں نے گل خان کو خصوصی بونس دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سودے کی کامیابی میں اس کا ہاتھ ہے۔ گاہک بھی اس نے تلاش کیا ہے۔ جمشید علی خان ایرانی ہے لیکن پکا کاروباری ہے۔ اس نے آئندہ کے لیے بھی بزنس جاری رکھنے کی بات کی ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ گل خان اسے پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ وہی اس کو لایا ہے اور اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان کوئی بات ہے۔

گل خان کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں اس سے اتنا ہی متاثر ہوتا ہوں۔ وہ ایک اچھے انسان کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے گھر جا کر مجھے رشک آتا ہے۔ سارہ بھی اس سے مل چکی ہے۔
جب میں نے گل خان کو بونس دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔

"میں کام کا معاوضہ دیتا ہوں اور اچھا معاوضہ دیتا ہوں اس لیے وہ اس بونس کا حق دار نہیں ہے میرے اصرار کے باوجود اس نے بونس قبول نہیں کیا۔ عجیب آدمی ہے۔ اتنا قناعت پسند تو میں نے کسی یہودی ربی کو بھی نہیں پایا بلکہ ان میں سے اکثر یہودی دولت کی ہوس میں عام یہودیوں سے آگے ہی ہوتے ہیں۔

4 مارچ، گل خان سے ملنے کی وجہ سے مجھے اسلام سے آگاہی ہو رہی ہے۔ گل خان نے مجھے بتایا کہ وہ صرف اسی لیے اچھا انسان ہے کہ وہ اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے عبادت کرتا ہے۔ دن میں پانچ بار وہ اسے نماز کہتا ہے۔ مجھے اس کا طریقہ عبادت اچھا لگتا ہے اور میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنی آمدنی سے زکوۃ دیتا ہے۔ ایک یتیم خانہ ہے جہاں وہ باقاعدہ رقم دیتا ہے، اس بات نے مجھے اور حیران کر دیا۔ صرف ساڑھے سات تولے سونا رکھنے والا مسلمان زکوۃ ادا کرتا ہے۔ میرے پاس ذاتی ملکیت میں کئی ملین ڈالرز ہیں۔ میرے خاندان کا کوئی بھی فرد کروڑ پتی سے کم نہیں ہے لیکن ہمیں کسی کی بھی مدد کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

17 اپریل، آج ہماری دوسری ڈیل تھی۔ جمشید علی خان نے اس بار ہم سے بارہ ملین رینڈز مالیت کے تراشیدہ جواہرات خریدے ہیں۔ گل خان روز بروز میرے لیے ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے وہ آنے والے دنوں میں میری زندگی کا رُخ بدل دے۔

2 مئی، آج میں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے گل خان کے گھر میں اسے گواہ بنا کر اسلام قبول کر لیا ہے اور اس نے میرا اسلامی نام یوسف رکھا ہے۔ وہ مجھے اسلامی تعلیمات اور عبادات سے آگاہ کر رہا ہے ساتھ ہی اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ ابھی میں اپنے اسلام کا اعلان نہ کروں اور پہلے سارہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کروں اور میں اس کوشش کا آج سے آغاز کر رہا ہوں۔

12 مئی، خدا کا شکر ہے سارہ پر میری کوششوں کا اثر ہو رہا ہے اور اس نے اسلام میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ میں نے اسے گل خان کے گھر لے جانا شروع کر دیا ہے۔ یہاں اسے اسلام





کے بارے میں درست طور پر بتا سکتا ہوں۔

16 مئی، آج میرے لیے خوشی کا دن ہے۔ سارہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ گل خان نے اس کا یہی نام پسند کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جلیل القدر پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا بھی یہی نام تھا۔ مجھے یہ جان کر بے حد حیرانی ہوئی کہ مسلمان تمام نبیوں کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ وہ تمام بنی اسرائیل پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ ان کی مقدس کتاب قرآن میں سب سے زیادہ جس پیغمبر کا ذکر آیا ہے وہ حضرت موسیٰ ہیں۔ میں جیسے جیسے اسلام کے بارے میں جانتا جا رہا ہوں میرے اندر روشنی سی بھرتی جا رہی ہے۔

15 مئی، میں نے اور سارہ نے سارے خاندان والوں کو ایک تقریب میں جمع کر کے اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا۔ خاندان والوں کا ردِعمل ہماری توقع کے مطابق تھا۔ نصف خاندان والے تو اسی وقت ہمیں لعن طعن کرتے چلے گئے باقی نصف قریبی رشتے دار ہمیں سمجھانے لگے کہ ہم نے خسارے کا سودا کیا ہے۔ اسلام قبول کر کے ہم باقی خاندان سے کٹ جائیں گے۔ میں نے اور سارہ نے کہا کہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا ہے اور اس کے لیے ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بعض رشتے داروں نے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ ہم نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو شاید ہمیں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔ پاپا نے ہمیں کچھ کہا نہیں لیکن ان کے انداز سے لگ رہا ہے کہ انہیں ہمارا یہ فیصلہ ناگوار گزرا ہے۔ جب سارے خاندان والے اور میرے بھائی چلے گئے تو پاپا نے مجھے سمجھایا کہ اول تو مجھے یہ "حماقت" نہیں کرنی چاہیے تھی اور اگر میں نے کر لی تھی تو اس سے بڑی حماقت یعنی اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پاپا نے مجھ سے کہا۔ تمہیں اس فیصلے کو واپس لینا ہوگا ورنہ سارا خاندان ہمارا دشمن ہو جائے گا۔

"مگر کیوں پاپا؟ اس ملک میں لاکھوں مسلمان بستے ہیں۔ ایک میرے اسلام قبول کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"مسلمانوں کو تو نہیں، ہم یہودیوں کو پڑے گا۔ والٹر خاندان اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا کوئی فرد مسلمان ہو جائے تو ان کے لیے اس سے زیادہ باعثِ شرم بات کوئی اور نہیں ہے۔"

"مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اور میں نے اپنے لیے اسلام پسند کیا ہے۔ اگر آپ یا دوسرے خاندان والے اسے پسند نہیں کرتے تو میں آپ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ مجھے مذہب کے معاملے میں مجبور کیا جائے۔"

پاپا نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "تم نہیں جانتے میرے بچے اس معاملے میں والٹر خاندان ہی نہیں، ساری جیوش کمیونٹی تمہاری مخالف ہو جائے گی۔"

''پاپا! بے شک سارا ملک یا ساری دنیا مخالف ہو جائے تب بھی میں اسلام نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تمہاری جان کو خطرہ ہوگا۔ اگر جیوش کونسل نے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرلیا تو میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔'' پاپا نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میں مسلم ہوں اور مسلمان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرے نصیب میں زندگی ہے تو ساری دنیا کے یہودی مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر موت میرا نصیب ہے تو آپ بھی مجھے نہیں بچا سکتے ہیں۔''

پاپا نے مجھے اور سارہ کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

16 جولائی، خاندان والوں نے میرا دوبارہ بائیکاٹ کر دیا ہے۔ ہماری فرم کے ساتھ ہر قسم کا بزنس ختم کر دیا گیا ہے۔ دکانوں نے ہمیں جیم کی فراہمی کا معاہدہ معطل کر دیا ہے۔ گل خان نے کوشش کر کے کچھ اور جگہوں سے ناتراشیدہ جیم حاصل کرنے کا بندوبست کیا لیکن فرم کا مستقبل مخدوش ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جنوبی افریقہ اور اسلامی دنیا میں اس کاروبار پر یہودیوں کی اجارہ داری ہے اور وہ اس کاروبار میں کسی بھی شخص کو تنگ کر سکتے ہیں اور ہمیں تباہ کرنے اور مالی لحاظ سے نمونہ عبرت بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

21 جولائی، گل خان نے ایک کان خریدنے کا منصوبہ بنایا ہے لیکن اس کے لیے مطلوب وسائل ہمارے پاس نہیں ہیں۔ چند بنکوں سے بات چل رہی ہے اور ان سے قرض ملنے کی امید کم ہی ہے کیونکہ ان بنکوں پر بھی یہودیوں کا اثر و رسوخ ہے۔ گل خان کا کہنا ہے کہ اگر کسی بنک نے قرض نہ دیا تو وہ کسی عرب سرمایہ کار کو راضی کرے گا۔

2 اگست، نہ جانے کس طرح گل خان نے اعلیٰ درجے کے ناتراشیدہ ہیروں کی ایک بڑی تعداد حاصل کر لی ہے اور یہ لاٹ ہمیں خاصی سستی پڑی ہے۔ ان میں سے بعض پتھر ایسے ہیں جن سے اعلیٰ ترین معیار کے ہیرے حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں نے سارہ کے ساتھ مل کر ان کی تراش خراش اور پالش کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جمشید علی خان ان ہیروں کو اچھی قیمت میں خرید لے گا اور اس سے ہمیں اتنی رقم مل جائے گی کہ ہم کوئی کان خرید کر اپنے لیے مزید ہیرے نکال سکیں۔

28 اگست، ہیروں کی اس لاٹ سے اچھی کوالٹی کے دو درجن ہیرے تراشے گئے ہیں۔ ان کی مالیت بین الاقوامی مارکیٹ میں کئی ملین ڈالرز ہو سکتی ہے۔

1 ستمبر، آج میری زندگی کا بہت ہی اندوہناک دن ہے۔ میرے دوست اور بھائی گل خان کا سارا خاندان ختم ہو گیا۔ رات کسی وقت اس کے گھر میں آگ بھڑک اٹھی اور کسی کو باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سب ختم ہو گئے۔ خدا اسے اور اس کے بیوی بچوں کو اپنے قرب میں جگہ دے۔ نہ جانے یہ کیا ہوا ہے۔





3 دسمبر، مجھے شک ہے کہ گل خان اور اس کے خاندان کو پیش آنے والا سانحہ فطری نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت کسی کا ہاتھ ہے۔ پولیس نے کیس کی تفتیش درست طریقے سے نہیں کی ہے اور کئی اہم پہلو نظر انداز کر دیئے ہیں۔ جب فائر بریگیڈ آگ بجھانے پہنچے تو مکان ابھی مکمل طور پر نہیں جلا تھا۔ اس کے باوجود گل خان اور اس کے بیوی بچوں کی لاشیں کوئلہ ہو گئی تھیں جیسے سب سے پہلے انہیں آگ لگی ہو۔

5 ستمبر، آج گل خان کی پڑوسن میری بیوی سارہ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے اسے (آگے جو تحریر تھا اسے صاف کر دیا تھا اور اس کے بعد کے صفحے خالی تھے) فولڈر کے صرف ابتدائی چند صفحے پر ساری روداد تھی۔

یہ سب پڑھ کر میری تشنگی بجھنے کے بجائے مزید بڑھ گئی تھی۔ اس پوری ڈائری میں اس بچے کے بارے میں ایک لفظ نہیں تھا جسے جونی والٹر نے اپنا پوتا قرار دیا تھا۔ کیا یہ ڈائری لکھنے تک یوسف کا کوئی بچہ تھا۔ گل خان کے خاندان کو پیش آنے والے سانحے کے کتنے عرصے بعد یوسف اور اس کی بیوی سارہ کشتی میں مارے گئے کیونکہ ان تاریخوں کے چند مہینے کے اندر میں جمشید پیلس میں تھا۔ جونی والٹر نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ دل بہلانے کے لیے مجھے ایک فائل اور سنسر شدہ ڈائری کے چند اوراق پڑھنے کے لیے دے دیئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ اس سے جواب طلب کروں اور شاید طیش میں آ کر میں ایسا ہی کرتا مگر پھر عقل نے میری لگام تھام لی۔ میں نے خود کو پھٹکارا۔

''تمہیں اس سے کیا کہ ماضی میں کیا ہوا تھا؟ مستقبل کی طرف دیکھو جہاں کا جل تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

کا جل کا خیال آتے ہی مجھے موبائل فون کا خیال آیا تھا۔ اس کی بیٹری بالکل خاتمے کے قریب تھی۔ میں نے بیل کا بٹن دبا کر سیاہ فام ملازم کو طلب کیا اور موبائل دکھا کر اس کا چارجر لانے کو کہا۔

''میں تلاش کرتا ہوں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟''

''نہیں فی الحال چارجر لے آؤ یہی کافی ہے۔''

اس نے پندرہ منٹ بعد ایک چارجر لا دیا۔ میں نے اسے موبائل سے لگایا تو وہ چارج ہونے لگا۔ چارجر اور موبائل میں ایسے آپشن بھی تھے کہ اس موبائل کو براہ راست اس کی بیٹری کی مدد سے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اس لیے میں نے کا جل کا نمبر ملایا۔ یہ اس کے موبائل کا نمبر تھا۔ دوسری بیل پر اس نے کال ریسیو کی۔ اس کی پھولی سانس بتا رہی تھی کہ وہ دوڑتی ہوئی آئی ہے۔

''یوسف کہاں تھے تم...... میں نے اتنی بار یہ نمبر ملایا۔''

''فون کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ اب بھی چارجر لگا کر بات کر رہا ہوں۔''

''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔''

"یوسف۔" کاجل نے دھیمی آواز میں کہا۔"میں نے آج برطانوی ویزے کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔ پتا اپنی ایک سہیلی کا دیا ہے۔ لیٹر اس کے گھر آئے گا۔ ڈیسک پر بیٹھی عورت مجھے جانتی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ ترجیحی بنیاد پر مجھے ویزہ دے دیا جائے گا۔"

"کتنا وقت لگے گا؟"

"شاید ایک ہفتہ، ویزہ لگتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

"اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہاں تم کیا کر رہے ہو؟"

"کاجل! میں اپنے ماضی کی کھوج میں ہوں بلکہ شاید ماضی میری تلاش میں ہے۔ تم جانتی ہو مجھے اپنے ماضی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی ہے لیکن اس ملک میں آنے کے بعد مجھے بعض ایسے واقعات سے واسطہ پڑا کہ مجھے لگنے لگا ہے کہ میرا ماضی اس ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں پر ایک دولت مند یہودی خاندان ہے۔ اس کے ایک شخص ریان والٹر سے میری صورت حد سے زیادہ مشابہ ہے۔ اس کے جمشید علی سے کاروباری تعلقات تھے۔ وہ ایک بحری سفر میں مارا گیا اور اس کا بیٹا غائب ہو گیا۔ اسی طرح جمشید علی کو بھی میں ایک کشتی سے ملا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔"

"سچ! کتنا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ کیا تم سچ مچ اس ریان نامی شخص کے بیٹے ہو۔"

"یہ بات حتمی طور پر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن کاجل میرے لیے اس بات کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ میں ایک مسلمان ماں باپ کا بیٹا ہو سکتا ہوں کیونکہ ریان والٹر نے اپنے ایک دوست گل خان کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعد میں اس کی بیوی سارہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ گل خان اور اس کے سارے خاندان کو بطور سزا زندہ جلا دیا گیا تھا بعد میں ریان جس کا نام میرے نام پر یوسف تھا اور اس کی بیوی سارہ کو کشتی میں قتل کر دیا گیا، ریان کے یہودی باپ جونی والٹر نے اپنے پوتے کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن نہ تو اس کے پوتے کا سراغ ملا اور نہ ہی اس کے بیٹے اور بہو کے قاتلوں کا۔"

"میرے خدا! کیسی سنسنی خیز کہانی ہے۔" کاجل بے ساختہ بولی۔"یوسف! مجھے لگ رہا ہے کہ تم یقیناً اس نومسلم یوسف کے بیٹے ہو۔ تمہاری اس سے مشابہت بھی ہے اور پھر واقعات بھی اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔"

"میرے لیے اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔"

"یوسف تم کہاں ہو؟" کاجل نے اچانک پوچھا۔

"میں والٹر خاندان کے......" میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اچانک فون بند ہو گیا تھا۔ ہلکا سا جھٹکا محسوس کر کے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک نوجوان شخص کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سیاہ بال پیچھے کر کے بنے تھے۔ اس نے ایڈاپٹر ساکٹ سے نکال لیا تھا اور سرد




نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"اس حرکت کا مطلب؟" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں منع کیا گیا تھا کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ تم کہاں ہو؟"

"میں نے کسی کو نہیں بتایا۔" میں نے غلط بیانی کی۔"میں کاجل سے اردو میں بات کر رہا تھا۔"

"تم نے ابھی والٹرز کا نام لیا تھا۔"

"چلو لیا بھی تھا تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میں اپنی جائے رہائش کا بتا رہا تھا اور تم کون ہو؟"

"میں مائیکل والٹر ہوں۔ جونی کا ایک اور پوتا۔ مجھے تمہارے بارے میں ابھی معلوم ہوا ہے کہ تم بھی جونی کا پوتا ہونے کے دعوے دار ہو؟"

"بکواس! میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔"

"موبائل میرے حوالے کر دو۔" اس نے مطالبہ کیا۔

"میں یہ کسی کو نہیں دے سکتا۔" میں نے موبائل جیب میں رکھ لیا۔"اس میں میرے پرسنل کنٹیکٹس ہیں۔"

"میں نے تم سے مانگا نہیں ہے۔" مائیکل سرد لہجے میں بولا۔ شاید اس کا انداز یہی تھا۔"میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔"

میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ میرے اندر چھٹی حس شور مچانے لگی۔ اس کی نیت درست نہیں تھی۔ وہ مسلح ہوتا تو مجھے مجبور کر سکتا تھا۔ میں نے موبائل نکالا۔ اس میں کاجل کا نمبر محفوظ تھا اور اگر مائیکل یا جونی میرے دشمن ثابت ہوتے تو ان تک یہ نمبر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے میں نے موبائل زمین پر پھینک کر اس پر جوتا رکھ دیا۔ وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ مائیکل نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" اس نے پسٹل نکال لیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مائیکل؟" اچانک جونی والٹر کمرے میں آیا تھا۔

"آپ اس معاملے میں چپ رہیں پاپا۔" مائیکل نے بدتمیزی سے کہا تھا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" جونی نے متاثر ہوئے بغیر کہا اور اس سے پسٹل بھی لے لیا۔"یاد رکھو...... عجلت میں کیا گیا کوئی فیصلہ بعد میں پچھتانے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے اگر یہ انکل ریان کا بیٹا ثابت ہوا تو آپ اسے قبول کر لیں گے۔ آپ بھول جائیں گے کہ انکل ریان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ اس شخص کا بیٹا ہو سکتا ہے۔"

"اسلام ریان نے قبول کیا تھا اس نے نہیں۔" جونی نے سپاٹ سے انداز میں کہا۔

مائیکل کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ غالباً اسے جونی کی دولت وکاروبار میں ایک نیا امیدوار پسند نہیں آیا تھا۔

''اوکے پاپا! لیکن یہ شخص یہاں سے باہر نہیں جا سکتا۔ یہ شخص جیوش کونسل کو مطلوب ہے۔ آنٹی لنڈسے کے قتل میں بھی یہی ملوث ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ مسز لنڈسے کے قتل میں وہ لوگ ملوث ہیں جنہیں اس کا میرے ساتھ سلوک پسند نہیں آیا تھا اور اسے اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ مجھے لے کر جوہانسبرگ مسٹر جونی والٹر کے پاس آ رہی تھی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے اس سرزمین پر اپنی اس واحد ہمدرد کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے تم بھول رہے ہو کہ اس حملے میں ملوث لوگ بھی مارے گئے تھے۔''

''پلیز...... آپس میں جنگ مت کرو۔'' جونی والٹر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

مائیکل نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔ ''پاپا! کیا یہ میرے درجے کا آدمی ہے جو میں اس سے جنگ کروں گا۔''

''بہتر ہو گا آپ اسے کھیلنے کے لیے ذرا کم خطرناک کھلونے دیں۔ پستول اس کے لیے خطرناک ہو گا۔'' میں نے مضحکہ اُڑانے کے انداز میں کہا۔ اس پر مائیکل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ جونی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے بوڑھے دادا کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے پہلا وار کسی ماہر باکسر کی طرح کیا تھا۔ میں نے سر جھکا کر وار خالی کیا اور دوسرا وار اپنے پیٹ پر آنے سے روکا ورنہ مجھے خاصی تکلیف اُٹھانا پڑتی۔ اس نے تیسرا مکا میری گدی پر رسید کر دیا تھا لیکن وہ زوردار نہیں تھا۔ میں نے جھکے جھکے سر سے اس کے پیٹ پر ٹکر رسید کی اور وہ پیچھے جا گرا۔ جونی والٹر ایک طرف ہو گیا۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا ضدی پوتا فساد کیے بغیر نہیں جائے گا۔

مائیکل فرش سے اُٹھ کر بھرے سانڈ کی طرح میری طرف لپکا۔ اس نے مجھے مدافعت کی مہلت دیے بغیر بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے زور سے بستر پر گرا دیا اور پھر ہم دونوں لڑھک کر فرش پر آ رہے۔ اس نے اپنی ٹانگیں میری ٹانگوں سے اُلجھا دی تھیں اور ہاتھوں سے گھونسے برسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اچھا بھلا مہذب نظر آنے والا نوجوان اچانک سڑک چھاپ لفنگوں والی حرکت پر اُتر آئے گا۔ میں کچھ دیر دفاع کرتا رہا۔ بہرحال میں جونی والٹر کے سامنے اس کے عزیز از جاں پوتے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور اس کی بدتمیزیاں بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے دھکیل دیا۔ اس کے دائیں پاؤں کو اپنی پنڈلیوں میں دباتے ہوئے میں نے قلابازی کھائی تو وہ بھی چیخ مار کر اُلٹ گیا۔ اس نے اپنی ٹانگ تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ تو میرے پیروں میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں دوبارہ سیدھا ہو گیا اس بار مائیکل کی پنڈلی کی ہڈی





واضح طور پر چٹخی تھی۔ میں اسے تڑپتا چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ اس وقت وہ بڑے قابلِ رحم انداز میں زمین پر لوٹ رہا تھا اور مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے جونی والٹر سے کہا۔

''مسٹر والٹر! اپنے پوتے کو سمجھائیے۔ یہ اپنی دوسری ٹانگ بھی نہیں تڑوانا چاہتا تو اپنی زبان بند رکھے۔''

''پاپا! اس کتے کو یہاں سے لے جائیں۔ اسے گولی مار دیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''نکومت! میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔'' جونی والٹر نے اسے ڈانٹا۔ ''لیکن تم سمجھتے نہیں ہو۔''

مائیکل اب درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے اچانک جونی سے پستول چھین لیا۔ پستول کی جھلک دیکھتے ہی میں نے دائیں طرف چھلانگ لگائی اور بستر کے دوسری طرف جا گرا۔ گولی نے دیوار پر لگا آرائشی فریم برباد کر دیا تھا۔ جونی والٹر دھاڑتے ہوئے اس سے پستول چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک ایک گولی چلی اور میں نے جونی والٹر کی کراہ سنی۔

وہ زمین پر اُلٹ گیا تھا۔ میں نے فرش سے اُٹھتے ہوئے برابر رکھی تپائی پر سے ایش ٹرے اُٹھا کر مائیکل کے اوپر کھینچ ماری۔ وہ جتنی دیر میں ایش ٹرے سے بچتا، میں نے بستر سے چھلانگ لگا کر اس کے پستول والے ہاتھ پر پاؤں مارا اور پستول دور جا گرا۔ جونی والٹر کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر مائیکل کے سر پر ایک گھونسا رسید کیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''جوزف! تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ذرا جلدی، میں تمہیں لے جانے آیا تھا۔ اپنی ساتھی کی فکر مت کرو۔''

''اگر آپ اس کے ڈر سے کہہ رہے ہیں تو فکر مت کریں۔ اب یہ ایک گھنٹے سے پہلے اپنے حواسوں میں نہیں آئے گا۔''

''میں اس کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔ مائیکل نے جیوش کونسل کا حوالہ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں یہاں تمہاری موجودگی کا علم ہے اور وہ تمہیں لینے کے لیے آ رہے ہوں گے۔ جوزف میں ان کے آگے مجبور ہوں اس لیے چلے جاؤ۔''

''میں چلا جاؤں گا لیکن مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے مجھے ریان والٹر سوری یوسف کی ڈائری پڑھنے کے لیے کیوں دی تھی؟''

''اس کا جواب میں تمہیں بعد میں دوں گا۔'' جونی والٹر مضطرب تھا۔ ''مائیکل نے یہ جھگڑا بلاوجہ شروع نہیں کیا تھا۔ وہ تمہیں اُلجھانا چاہتا تھا۔''

''میں آپ سے رابطہ کیسے کروں گا؟''

''تمہیں میسن جہاں لے جائے اس کے ساتھ چلے جانا وہیں میں تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر تم

کوئی خطرہ محسوس کرو تو سٹی اور بگ چلے جانا لیکن اب جاؤ خدا کے لیے۔''

''اوکے مسٹر جونی والٹر۔'' میں کھڑا ہو گیا۔میسن سیاہ فام لڑکے کا نام لیا۔

''میسن! اسے خفیہ راستے سے لے جاؤ اور پندرہ نمبر پر لے جا کر مجھے رپورٹ کرنا۔'' جونی والٹر نے اسے حکم دیا۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' اس سیاہ فام نوجوان نے مجھے اشارہ کیا۔

وہ مجھے لے کر محل کے عقبی حصے میں آیا۔ اس طرف تہہ خانہ صاف تھا۔ نیچے اُتر کر اس نے اندرونی جمنازیم کے ایک شاور روم کا ہینڈل گھمایا تو دیوار سرک گئی۔ اندر خاصی کشادہ اور صاف ستھری سرنگ تھی۔ اندر آ کر اس نے دیوار پر لگا لٹو گھمایا تو دیوار دوبارہ برابر ہو گئی تھی۔ مجھے تعجب نہیں ہوا۔ اس قسم کے کئی تماشے میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے جمشید پیلس میں بھی ایک خفیہ راستہ دیکھا تھا۔ جمشید علی نے مجھے خود دکھایا تھا اور کہا تھا کہ اگر کوئی آفت آئے یا کوئی پیلس پر حملہ کر دے تو ہم اس خفیہ راستے سے فرار ہو سکتے ہیں۔ غالباً ہر بڑا آدمی اس قسم کے خفیہ راستے ضرور رکھتا ہے۔ سرنگ تقریباً دو سو گز کے بعد ایک جگہ پہنچ کر ختم ہو گئی۔ یہاں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ دروازہ کھول کر ہم باہر آئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ویران مکان تھا۔ میسن نے اس کے گیراج میں کھڑی کار نکالی۔

''اب ہم نے کہاں جانا ہے؟''

''نمبر پندرہ جناب! ذرا دور ہے۔'' میسن نے جواب دیا۔ اس نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں برابر میں بیٹھ گیا۔ کار کے شیشے اس قسم کے تھے کہ باہر سے اندر موجود افراد کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میسن نے ایک ریموٹ اُٹھا کر بٹن دبایا تو گیراج کا دروازہ فوراً کھل گیا۔ کار کے باہر آتے ہی دروازہ بھی بند ہو گیا۔ میسن نے کار دوڑا دی تھی۔ اس کا انجن طاقتور تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اس جگہ سے کافی دور نکل گئے تھے۔ تقریباً بیس منٹ سفر کرنے کے بعد میسن نے کار ایک جنگل کی طرف موڑ دی۔ ایک کلومیٹر تک کچی سڑک سے گزر کر ہم ایک جھونپڑے تک آئے۔ بہ ظاہر یہ جھونپڑا ہی لگ رہا تھا۔ میسن نے اس کا تالا کھولا۔ اندر سے جھونپڑا صاف ستھرا اور تمام ضروری سامان سے آراستہ تھا۔

''اب آپ کو یہاں رہنا ہو گا۔'' میسن نے کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ اس نے الماری کھول کر اندر سے ایک وائرلیس فون نکالا۔ اسے بیٹری سے منسلک کر کے نمبر ملائے۔

''جناب! میں پہنچ گیا ہوں۔''

وہ غالباً جونی والٹر کو فون کر رہا تھا پھر اس نے فون بند کر دیا۔ ''مجھے واپس جانا ہو گا۔''

''میں اکیلا رہوں گا۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن مجھے اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار چاہیے۔''

''اس الماری میں آپ کو ایک ریوالور اور اس کی فاضل گولیاں مل جائیں گی۔ میں گاڑی





چھوڑے جا رہا ہوں۔''

''تم کیسے جاؤ گے؟''

وہ مسکرایا تو اس کے بے حد سفید دانت جھلکنے لگے۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔ یہاں بجلی نہیں ہے۔ رات کو جلانے کے لیے لیمپ ہے۔ الماری میں ہی ٹن پیک خوراک ہے۔ اسے گرم کرنے کے لیے تیل سے جلنے والا برنر ہے۔ ہاں ایک چیز اور۔'' اس نے ایک کونے سے لکڑی کا تختہ فرش سے اُٹھایا۔ ''اگر باہر خطرہ ہو تو آپ اس راستے سے نکل سکتے ہیں۔''

لڑکے نے مجھے ممکن حد تک کیبن اور اس کے اردگرد کے بارے میں بتایا اور رخصت ہو گیا۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ لڑکے کے جانے کے بعد میں نے سب سے پہلے الماری سے ریوالور نکالا۔ شاندار قسم کا سیاہ دھات کا بنا ہوا ریوالور تھا۔ اس کے ساتھ گولیوں کا ڈبہ تھا جس میں تقریباً سو گولیاں تھیں۔ میں نے گولیاں ریوالور میں بھریں اور پھر کیبن کا جائزہ لیا اور اس کے دو حصے تھے ایک میں ایک چھوٹا سا بیڈ روم تھا اس کے ساتھ باتھ تھا۔ بڑے حصے میں نشست گاہ اور کچن تھا میں نے برنر جلا کر اپنے لیے کافی بنائی۔ ناشتہ کیے خاصا وقت گزر چکا تھا لیکن مجھے بھوک نہیں تھی۔ میں نے خفیہ تختے کا معائنہ کیا۔ کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا اور کوئی دو فٹ اونچا ایک پلیٹ فارم پر بنایا گیا تھا۔ شاید بارش کے دنوں میں اس زمین پر پانی آ جاتا تھا یا شاید سانپ اور دوسرے خطرناک کیڑوں سے بچاؤ کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔ کیبن کے نیچے سوکھی گھاس اُگی ہوئی تھی۔

چائے لے کر میں لکڑی کی میز پر آ بیٹھا اور پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا لیکن کینی مین کا رویہ میرے ساتھ مبہم تھا۔ اب تک میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ میرے ساتھ مخلص تھا یا میرے ذریعے اپنے دشمنوں کو سامنے لا کر انہیں ٹھکانے لگا رہا تھا۔ دوسری طرف جونی والٹر کا اس طرح بروقت مدد کے لیے پہنچ جانا معنی خیز لگ رہا تھا۔ کیا اسے میرے بارے میں الہام ہوا تھا لیکن اسے میرے بارے میں کون بتا سکتا تھا۔ یہ بات ذرا اُلجھا دینے والی تھی۔ اچانک میں چونکا، مورنا، وہ شروع سے میرے ساتھ تھی۔ وہی ایک ہستی تھی جو میرے بارے میں جونی والٹر کو آگاہ کر سکتی تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز تھی جس سے وہ جونی والٹر سے رابطہ رکھے ہوئے تھی۔ اسی وجہ سے وہ بروقت ہماری مدد کو آ گیا لیکن کینی مین کی معتمد ساتھی ایک یہودی کی آلہ کار کیوں کر ہو سکتی تھی جبکہ کینی مین یہودیوں کے خلاف تھا تو کیا مورنا ڈبل ایجنٹ تھی درحقیقت وہ جونی والٹر کے لیے کام کر رہی تھی۔ اب مجھے جونی والٹر کا کردار بھی مشکوک لگنے لگا تھا۔ وہ محض ایک بزنس مین نہیں تھا بلکہ اس کی آڑ میں کوئی ایسا کوئی کام کر رہا تھا جس کے لیے اُسے مورنا جیسے ڈبل ایجنٹ رکھنے پڑتے تھے۔ جیوش کونسل کی دہشت گرد کارروائیاں میں خود دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے مقامی قانون کو پامال کرتے ہوئے مجھے مارنے کی کوشش کی اور اس دوران میں متعدد غیر متعلق لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

یہودیوں کے بارے میں مختصر بتا دوں کہ اسرائیل کے قیام سے پہلے یہ ایک مسکین اور سر جھکا کر ظلم برداشت کرنے والی قوم تھی مگر اسرائیل کا ناجائز وجود روئے زمین پر اُبھرتے ہی اس کے تیور بدلنے لگے۔ اس سے پہلے یہ حیلے بہانوں سے دوسروں کا مال کھاتی تھی مگر اب جبراً دھونس پر اُتر آئی تھی۔ جن ممالک میں یہودی آباد ہیں وہاں کی زیر زمین مافیا سے یہودیوں نے خصوصی تعلقات قائم کیے اور رفتہ رفتہ ان مافیاؤں میں دخیل ہوتے چلے گئے۔ ان کی خاص دلچسپی منشیات اور اسلحے کی بین الاقوامی تجارت ہے۔ بعض مغربی رسائل نے نشان دہی کی ہے کہ اسرائیل کی کل آمدنی کا نصف منشیات اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کاروبار کا الزام بھی یہودیوں پر نہیں لگایا گیا۔ اس طرح انہوں نے سالانہ ایک کھرب ڈالرز کی اس غیر قانونی تجارت کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔

جونی والٹر اگر ایک بڑے بزنس ایمپائر کا سربراہ تھا تو لازماً اس کے روابط زیر زمین دنیا سے ہونے چاہیے تھے پھر جیوش کونسل تھی جس کے اپنے مسلح دہشت گرد تھے۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ کہیں اس کیبن تک مجھے پہنچانے کا یہ مقصد تو نہیں کہ میرے دشمنوں کو موقع دیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں مضطرب ہو گیا تھا۔ میں نے کیبن کی آگے پیچھے کی کھڑکیوں سے دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے فرش میں موجود خفیہ خانے کا تختہ اوپر کیا۔ اس کے نیچے گھاس نظر آ رہی تھی۔ میں نے راستہ پتہ کرنے کے لیے پاؤں نیچے رکھے اور اگلے ہی لمحے مجھے خود کو اس تاریک کنوئیں میں گرنے سے بچانے کے لیے زبردست جدوجہد کرنا پڑی جو گھاس تلے سے نمودار ہوا تھا۔ اگر میں تہہ خانے کے کنارے نہ تھام لیتا تو یقیناً اس میں گر جاتا۔ بہ مشکل میں نے خود کو اوپر کھینچا۔ میرے جسم میں سردی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

جونی والٹر کی چال بازی سامنے آ رہی تھی۔ اس نے ہمدرد بن کر مجھے اپنے مکان سے چلتا کیا۔ جس وقت میں اس کے پوتے کو ہلاک کر سکتا تھا اور حالات میرے قابو میں تھے اور اس ہمدردی کی آڑ میں اس نے میری ہلاکت کا شاندار انتظام کر رکھا تھا۔ میں اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جاتا یا گر کر نہ بھی مرتا تو بھوک پیاس سے مر جاتا۔ میں نے کیبن کے ایک کونے میں صفائی کے لیے رکھی ڈنڈے والی جھاڑو اور ٹارچ لی۔ میں نے جھک کر ڈنڈے سے اس مصنوعی گھاس کو ہٹایا اور ٹارچ سے روشنی کی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ کنواں تقریباً تیس فٹ گہرا تھا۔ چار فٹ قطر کے اس کنوئیں کی دیواریں چکنی تھیں اور وہ باقاعدہ پلاسٹر شدہ لگ رہی تھی۔ گھاس اس طرح سے کناروں سے نکلی تھی کہ وہ کنوئیں کے اوپر اُگی لگ رہی تھی اور دیکھنے میں بالکل حقیقی لگتی تھی۔ رونگٹے کھڑے ہونے کی وجہ کنوئیں کی گہرائی نہیں بلکہ اس کی تہہ میں پڑی ہڈیاں تھیں۔ یہ انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں انبار کی صورت میں اوپر تلے جمع تھیں۔ یہاں سزائے موت کے مستحقین کو بھیجا جاتا ہو گا۔ میں ڈنڈے سے گھاس ہٹا ہٹا کر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف کنوئیں کا کنارا ذرا نزدیک تھا اور میں کوشش کرتا





تو اس طرف سے نکل سکتا تھا۔ ان اطراف میں سچ مچ کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ فی الوقت مجھے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ میں نے کنواں بند کر کے چیزیں اپنی جگہ رکھیں۔ مجھے جونی والٹر پر افسوس تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے لیکن وہ روایتی مکار یہودی ثابت ہوا تھا میں نے تلے ہوئے آلو اور مٹر کے ٹن نکالے اور انہیں کھا رہا تھا کہ الماری میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون ریسیو کیا۔

''جوزف تم ٹھیک ہونا؟'' جونی کی آواز آئی۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے دشمن تمہارے پیچھے ہیں۔ اگر وہ کیبن تک آ جائیں تو فرار ہو جانا۔ میسن نے تمہیں خفیہ راستہ دکھا دیا تھا۔''

''فکر نہ کرو جونی والٹر! مجھے تمہارے اصل منصوبے کا علم ہو گیا ہے۔'' میں نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ '' آپ فکر نہ کریں مسٹر والٹر! میں نے خفیہ راستہ دیکھ لیا ہے۔ اگر کسی نے کیبن کا محاصرہ کیا تو میں فوراً یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔''

جونی والٹر نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ''تم نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری زندگی کی کتنی فکر ہے۔''

''یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں میری جان بچانے کی نہیں بلکہ لینے کی فکر ہے مکار یہودی۔'' میں نے ایک بار پھر دل میں کہا اور بولا۔ ''میں اس فکر پر آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر والٹر! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے ڈائری کے ان صفحات کے بارے میں بتائیں گے جن سے میں واقف نہیں۔''

اس موقع پر جونی والٹر نے مجھے کچھ دیر کا مہمان سمجھتے ہوئے وہ راز فاش کر دیا جس کے بارے میں سوالات نہ جانے کب سے میرے اندر بار بار سر اُٹھاتے رہے تھے کہ میں کون تھا اور میرا اصل ماں باپ کون تھے۔ جونی والٹر نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''جوزف! آج میں تمہارے سامنے وہ بات کہہ رہا ہوں وہ میرے خاندان میں بھی سوائے میرے کسی کو نہیں معلوم ہے۔ میرے خاندان کے تمام لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جس بچے کو وہ ریان اور سارہ کی اولاد سمجھتے تھے وہ دراصل اس کے دوست گل خان کی اولاد تھا۔ سارہ امید سے ہوئی تھی اور ریان اسے یورپ لے گیا تھا لیکن وہاں اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ واپسی پر گل خان کے ساتھ یہ سانحہ پیش آ چکا تھا اس کا پورا خاندان مکان میں لگنے والی آگ میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا سوائے اس نومولود بچے کے۔ جس کی طبیعت خراب تھی اور وہ ہسپتال میں داخل تھا۔ وہ بچ گیا تھا۔ بعد میں اسے سارہ نے گود لے لیا تھا۔

''آپ کا مطلب...... میں...... میں...... میرا مطلب ہے وہ بچہ جو کشتی سے غائب ہوا تھا وہ یوسف اور سارہ کا نہیں بلکہ گل خان کا تھا؟'' میری آواز لرزنے لگی تھی۔

''ہاں...... وہ گل خان کا بچہ تھا۔ اسے ریان نے اڈاپٹ کر لیا تھا اور اس۔لیے مجھے بھی وہ دل و

جان سے قبول تھا۔ جوزف اگر تم ہی وہ بچے ہو تو مجھے اپنے پوتے کی طرح عزیز ہو۔‘‘

میں اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ اس مکار کی مکاری بھی بھول گیا۔ ’’آپ...... آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں...... میں گل خان کی اولاد ہوں ناں......‘‘

’’موت کی دہلیز پر کھڑا آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے۔‘‘ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں ہوش میں آ گیا تھا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’بھئی میں بوڑھا ہوں۔ کل کا پتا نہیں موت کی دہلیز پر ہوا تاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، خدائے واحد کی قسم...... یہ سچ ہے؟‘‘

اس بار میرا ریشہ ریشہ کانپنے لگا تھا۔ میں گل خان کی اولاد تھا۔ جو ایک سچا انسان و مسلمان تھا۔ اس کے کردار نے ایک یہودی اور اس کی بیوی کو مسلمان کر دیا تھا پھر اس نَومسلم جوڑے نے مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ کسی یہودی کی اولاد نہیں تھا اور نہ ہی کسی یہودی نے میری پرورش کی تھی۔

’’تم چپ کیوں ہو گئے جوزف!‘‘ جونی والٹر نے پکارا تو میں چونک گیا تھا۔

’’سوری سر! میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔ مسٹر والٹر! میں ساری عمر آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ آپ نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا جس کے لیے میں کب سے تجسس میں تھا۔‘‘

’’اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ اس نے پُرشفقت لہجے میں کہا۔ ’’تم بھی میرے بچے ہو۔‘‘

بھیڑیا مجھے بھیڑ سمجھ کر بہلا رہا تھا کہ میں اس کے بچھائے جال میں پھنس جاؤں۔ ’’آپ کی محبت ہے جناب!‘‘

’’صرف چند دن کی بات ہے۔ میں تمہیں اس ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔‘‘

’’تم نے مجھے دنیا سے بھجوانے کا انتظام کر لیا ہے۔‘‘ یہ بات بھی میں نے دل میں کہی تھی۔

’’مورنا کیسی ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے تمہیں یاد کر رہی تھی وہ ذرا بہتر ہو تو اسے بھی تمہارے پاس بھجوا دوں گا۔‘‘

غالباً مورنا کے بارے میں اس کی نیت درست نہیں تھی اور وہ اسے بھی اگلی دنیا روانہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

’’نہیں اس کی طبیعت بہتر ہو تو اسے کینی مین کے پاس بھجوا دیجیے گا۔ کینی مین ان دنوں کسی اہم منصوبے پر کام کر رہا ہے، اس نے مجھے یا مورنا کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔‘‘

جونی والٹر چونکا تھا۔ ’’کس قسم کے منصوبے پر کام کر رہے؟‘‘

’’اس نے واضح نہیں بتایا تھا۔ شاید نسل پرستی کا کوئی چکر ہے۔‘‘





’’ہوں...... اچھا۔‘‘ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ’’میں دیکھوں گا مورنا کو فی الوقت بھیجنا ممکن نہیں ہے۔‘‘

’’وہ آپ کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔‘‘ میں نے ترغیب دی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ مورنا کو زندہ رکھے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اگر بات اس کے دل کو لگتی تو۔

’’تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھوں گا۔‘‘ اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ’’اپنا خیال رکھنا۔‘‘

’’ضرور آپ بھی فکر نہ کریں۔‘‘

فون بند کر کے میں نے کھانا مکمل کیا اور اپنے لیے چائے بنا کر کیبن سے باہر آ گیا۔ موسم خاصا سرد ہو چکا تھا۔ مجھے دن میں دھوپ ہونے کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔ میرے جسم پر معمول کا لباس تھا۔ چار بجے کے قریب سورج مغرب کی طرف خاصا جھک گیا تھا اور شاید پانچ بجے تک وہاں اندھیرا ہو جاتا۔ سردیوں میں دن ویسے بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔ ٹہل کر میں واپس آیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے کوئی گرم کپڑا تلاش کیا۔ اتفاق سے الماری کے نچلے حصے میں ایک خاصا موٹا گرم سوئٹر مل گیا تھا۔ کیبن میں آتش دان بھی تھا لیکن میں نے اسے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یقین تھا کہ رات کی نوبت نہیں آئے گی۔ جو ہونا ہے اس سے پہلے ہی ہو جائے گا۔ میں نے سوئٹر پہن کر گولیوں کے ڈبے سے ساری گولیاں اپنی جیبوں میں منتقل کر لیں اور وہاں موجود ہینگنگ چیئر پر جھولنے لگا۔ اس کے ہلنے سے کیبن کے تختے ہل رہے تھے اور خاصی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

ممکن ہے یہ بات احمقانہ لگے کہ میں یہاں سے فوری فرار کے بجائے سکون سے بیٹھ کر کچھ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ حالانکہ میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ مجھے یقین تھا کہ انہوں نے مجھے بغیر نگرانی کے نہیں چھوڑا ہو گا اور اس جنگل میں میری نگرانی کا کوئی نہ کوئی انتظام ہو گا۔ اگر میں نے فرار کی کوشش کی تو کوئی نہ کوئی مجھے روکے گا۔ عین ممکن ہے کہ مجھے شوٹ کر دیا جائے۔ میں بلی کے تھیلے سے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کوئی میرے ہاتھ آتا تو میں اس سے بہت کچھ اُگلوا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا جونی والٹر خود آ جاتا۔

پانچ بجے تک باہر اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے لیمپ جلا دیئے تھے۔ اپنی کرسی اس طرح رکھ لی تھی کہ باہر سے نہ دیکھا جا سکے لیکن وہ دونوں کھڑکیاں میری نگاہ میں تھیں۔ میں کرسی پر جھولتے ہوئے آرام کر کے وقت گزار رہا تھا۔ چھ بجے کے قریب باہر سے کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی میں جانے کی حماقت نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے دونوں لیمپ بجھا دیئے تھے۔ اندر مکمل تاریکی چھا گئی تھی۔ میں فرش پر لیٹ گیا۔ اچانک ایک پتھر آ کر کھڑکی کے شیشے پر لگا۔ شیشہ بکھر کر اندر آ گرا۔ میں نے ایک بار پھر اُٹھنے سے گریز کیا۔ باہر سے کسی نے للکارا۔

’’جوزف! باہر آؤ۔ اب تم بھاگ نہیں سکتے۔ ہم نے کیبن کو گھیر لیا ہے۔ دس تک گن کر ہم

اندر بم پھینک دیں گے اور تمہارے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔" بولنے والا تھیٹریکل انداز میں بول رہا تھا۔

فرش پر رینگتے ہوئے میں اس تختے تک پہنچا جس کے نیچے موت کا کنواں تھا۔ تختہ ہٹا کر میں نے نیچے جھانکا۔ اردگرد کوئی روشنی نہیں تھی۔ ویسے میں دن کی روشنی میں پہلے ہی اطمینان کر چکا تھا کہ بڑھی ہوئی گھاس کی وجہ سے یہ جگہ کیبن کے باہر کہیں سے نظر نہیں آتی ہے پھر بھی میں نے اطمینان کر لیا۔ ممکن ہے کوئی نگرانی کر رہا ہوتا کہ میں سچ مچ کنویں میں گرا ہوں یا نہیں۔ بولنے والا گنتی شروع کر چکا تھا اور مجھے اُکسانے کے لیے خاصی تیزی سے گن رہا تھا۔ میں نے تختے پر ہاتھ جماتے ہوئے پاؤں ٹخنوں کے متوازی کرتے ہوئے پاؤں اس جگہ ٹکائے۔ یہاں سے کنواں کی دیوار میرے گھٹنوں سے اوپر آ رہی تھی۔ سر نیچے کرتے ہوئے میں نے بازوؤں کے بل پر جسم کو آگے بڑھایا اور پھر ایک لرزہ خیز چیخ مارتے ہوئے کنویں کی طرف سے نکل کر کیبن تلے آ گیا۔ فوراً ہی باہر کی جانب سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ کسی نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

"گر گیا وہ۔"

"پہلے چیک کر لو۔" ایک ٹھہری ہوئی سرد آواز آئی۔ میں نے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ مائیکل تھا۔ اوپر سے کیبن کا دروازہ توڑا جانے لگا۔

کنڈی پہلے ہی سطحی سی تھی۔ چند ٹھوکروں میں دروازہ کھل گیا۔ قدموں کی دھمک سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم تین افراد تھے۔ میں دم سادھے گھاس میں لیٹا رہا کیونکہ اس جگہ گھاس اتنی خشک تھی کہ میری ذرا سی حرکت سے بلند آواز سے چرچرانے لگتی اور اوپر والے ہوشیار ہو جاتے۔

اچانک مجھے اپنے بازو پر کوئی شے رینگتی محسوس ہوئی۔ میں نے بے اختیار ہاتھ مارا اور اس نے میرے ہاتھ پر منہ مارا۔ میں نے بہ مشکل اپنی کراہ روکی۔ یہ سانپ تھا۔ وہ خاصا موٹا تھا۔ مجھے بازو میں ہلکی سی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی سے سانپ کا سر والا حصہ قابو میں آیا تھا۔ وہ مجھ پر مزید اپنے دانت آزمانے سے محروم تھا۔ میں نے اسے گھاس سے کھینچ کر آگے کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا نچلا حصہ تھام لیا ورنہ وہ میرا بازو جکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لمحے کسی نے اوپر سے جھانکا۔

وہ ڈنڈے سے کنویں کے اوپر لگی مصنوعی گھاس ہٹا رہا تھا اور میں نے اس پر سانپ پھینک دیا جو پہلے ہی تلملایا ہوا تھا۔ اس نے اس شخص کے چہرے پر اپنے دانت گاڑھ دیے۔ اس نے بھیانک چیخ ماری اور دونوں ہاتھ سے سانپ کو اپنے چہرے سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ ظاہر ہے اس کا توازن بگڑا اور کنویں میں گرتے ہوئے اس کی چیخ زیادہ دہشت ناک تھی۔

اس کے ساتھی نے اضطراری طور پر اسے پکڑنے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ محض ہوا میں لہرا کر رہ گئے تھے۔ یہ موقع تھا میں چاہتا تو اسے بھی بازو سے پکڑ کر نیچے دھکیل سکتا تھا لیکن اوپر ایک اور تیسرا فرد بھی تھا۔ غالباً مائیکل تھا اور وہ مسلح ہی ہوتا۔ وہ اوپر سے فائرنگ کر کے مجھے نیچے ہی چھلنی کر





دیتا۔ میں نے ایک بار پھر خود کو روکا۔ میرے بازو میں ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ شاید سانپ زہریلا تھا۔ اس کا زہر میرے دوران خون میں سرایت کر رہا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور اسے بازو پر ذرا بلندی پر باندھنے لگا۔ مجھے مائیکل کے چلانے کی آواز آئی۔

"اسے دیکھو حرام زادے!"

"باس ڈنڈا بھی اس کے ساتھ گر گیا ہے۔ میں کیسے دیکھوں؟"

"نیچے جھک کر گھاس ہٹاؤ۔" مائیکل دیوانہ وار گالیاں دے رہا تھا۔

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ مائیکل کا ہرکارہ ہاتھ سے گھاس ہٹاتا تو اس کا سر لازماً تہہ خانے سے نیچے آتا اور عین ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھ لیتا۔ میں گھاس کو زیادہ ہلائے بغیر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس لمحے ایک ہاتھ نیچے آیا۔ دوسرا شخص ہاتھ نیچے کر کے گھاس کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ کام ایک ہاتھ سے ممکن نہیں تھا۔ مائیکل نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس نے گھگھیائی آواز نکالی لیکن وہ گرا نہیں تھا۔ غالباً مائیکل نے اسے عقب سے پکڑ لیا تھا۔ اس کے بازو اور شانوں تک اس کا سر تہہ خانے کے اندر تھا۔ بدقسمتی سے اس کا سر آیا بھی اس زاویے پر تھا کہ اس کا چہرہ میری طرف تھا اور اس کی نظر سب سے پہلے مجھ پر پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آواز نکالتا میں نے ریوالور اس کی طرف کرتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایک دم ساکت ہو گیا۔ مائیکل نے اسے اوپر سے پھنکارا۔

"کیری تمہارا انتقال ہو گیا ہے کیا؟ نیچے دیکھو۔ یہ ٹارچ پکڑو۔"

اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے ٹارچ لینے کو کہا۔ اس نے ٹارچ لے لی اور مصنوعی گھاس کی تہہ ہٹانے لگا۔ اس نے اب تک کوئی حرکت نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ موت کے دہانے پر ہے۔ اگر میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو فوری موت نصیب ہو گی اور اگر مائیکل کو میری موجودگی کے بارے میں شبہ بھی ہو جاتا تو وہ فوراً اسے چھوڑ دیتا اور وہ کنویں میں گر کر خاصی مشکل سے مرتا۔ اس نے اس سے پوچھا۔

"روزن زندہ ہے۔"

"نہیں باس! مر گیا ہے۔ اس کے سر میں ایک ہڈی گھسی ہے۔"

"اور جوزف!"

اس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ کنویں میں میری موجودگی کی تصدیق کرے۔ اس نے بادل نخواستہ مائیکل کو بتایا۔

"ہاں باس وہ بھی نیچے پڑا ہے اور ساکت نظر آ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم بھی جاؤ۔" مائیکل نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں باس۔" اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا مگر مائیکل اسے دھکیل چکا تھا۔ اس کی

چیخ باہر تک گئی۔ دھپ سے وہ اندر گرا اور چلانے لگا۔

"باس مجھے نکالو میں یہاں مرجاؤں گا۔ پلیز باس۔" وہ شاید لاش پر گرا تھا اس لیے کسی شدید چوٹ سے محفوظ رہا تھا اور واویلا مچا رہا تھا۔ مائیکل نے نیچے جھانکا۔ "یہی میں چاہتا ہوں۔ اس بات کا آخری گواہ بھی ختم ہوا۔"

"باس ابھی میں مرا نہیں ہوں اور تمہیں خطرے سے بچا سکتا ہوں۔"

"کیا خطرہ۔" مائیکل مضطرب ہوگیا تھا۔

میرا بھانڈا پھوٹنے والا تھا اس لیے میں اب گھاس چرچرانے کی پروا کیے بغیر تیزی سے کیبن کے عقبی حصے کی طرف سے باہر جانے لگا۔

"یہ کون ہے؟" مائیکل چلایا۔

"جوزف۔" کنویں میں گرا شخص چلایا۔ میں نے مشین گن کے برسٹ کی آواز سنی۔ کنویں میں گرنے والے کی آخری چیخ بڑی دردناک تھی۔ مائیکل نے اسے گولی ماردی تھی کہ اس نے پہلے اس سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ میں تیزی سے رینگتا کیبن کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ مائیکل نے گھاس چرچرانے کی آواز پر برسٹ بھی مارا تھا اور گولیاں فرش سے گزر کر ذرا فاصلے پر زمین پر لگی تھیں۔ باہر نکلتے ہی میں کیبن کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ مائیکل اندر چیزوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ روشنی کے لیے کچھ لائے تھے۔ ایک ٹارچ، دوسرے نمبر کا غنڈہ اپنے ساتھ کنویں میں لے گیا تھا۔ دوسری کوئی تیز روشنی والی فلیش لائٹ تھی۔ وہ مائیکل نے بند کردی تھی اور اب دیوانہ وار کیبن سے نکل کر بھاگنے کی فکر میں تھا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا اور اس جگہ کو خالی پا کر دیوار کے ساتھ ساتھ لگا کیبن کے سامنے والے حصے کی طرف جانے لگا۔ مجھ سے حماقت ہوئی تھی۔ مجھے سامنے کی طرف ہی جانا چاہیے تھا اور میں پیچھے ہی نیچے سے مائیکل کو گولی مار سکتا تھا۔ اب وہ باہر نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا ہیولہ دیکھتے ہی میں زمین پر گر گیا۔ برسٹ میرے اوپر سے گزر گیا۔ اس سے پہلے وہ دوسرا برسٹ چلاتا، میں لڑھک کر کیبن کے نیچے چلا گیا۔ اندر گھسنے کے بجائے میں نے سیدھے ہوکر اس کے پیروں کو نشانہ بنایا۔ فرار کا مطلب بڑی بے بسی کی موت مرنا تھا۔ میں نے اندازے سے ریوالور میں موجود چند گولیاں چلادیں۔ پانچویں یا چھٹی گولی پر اس کی چیخ سنائی دی اور وہ دھپ سے زمین پر گرا تھا۔ میں تیزی سے کیبن کو سہارا دینے والے ایک ستون کے پیچھے ہوگیا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے گرتے ہی کیبن کے نیچے مجنونانہ انداز میں فائرنگ شروع کردی۔ میں ستون کے پیچھے کسی حد تک محفوظ تھا۔ یہ فٹ بھر قطرہ کا ٹھوس تنا تھا۔ کئی گولیاں اس پر بھی لگی تھیں اور میں بال بال بچا تھا۔ اس نے اس وقت تک فائرنگ جاری رکھی جب تک مشین گن کا میگزین ختم نہیں ہوگیا۔ جیسے ہی میگزین ختم ہوا اور شیٹ ریٹ کی آواز کے بجائے خالی مشین گن چلنے کی آواز آئی تو میں





جھپٹ کر کیبن کے نیچے سے نکلا۔ وہ مشین گن میں دوسرا میگزین ڈالنے کے لیے اپنے کوٹ سے نکال چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری اور مشین گن اُچھل کر تاریکی میں غائب ہوگئی۔ مائیکل کی بلبلاہٹ سنائی دی اور اس نے اس ہاتھ سے جیب سے کچھ نکالنے کی کوشش کی۔ اس بار میری ٹھوکر سے اس کے ہاتھ سے پستول ہی اُڑ گیا اور اس کی کلائی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ کراہا تھا۔

میں نے اسے جھٹکے سے سیدھا کرکے اس کی مکمل تلاشی لی۔ اس مکار کے پاس کسی اور ہتھیار کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس کی ران سے بندھا ایک چھوٹا پستول برآمد ہوا۔ کوٹ کی جیبوں میں کئی اقسام کے میگزینز تھے۔ وہ اچھا خاصا چلتا پھرتا اسلحہ خانہ تھا۔ ان دنوں میٹرکس نامی فلم نئی نئی آئی تھی اور بے پناہ مقبول تھی۔ اس میں ہیرو کا جو حلیہ تھا وہی حلیہ مائیکل نے بنا رکھا تھا۔ چست لباس کے اوپر اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے ننھا سا پستول اس کی کمر سے لگایا تو وہ سہم کر خاموش اور ساکت ہوگیا۔

"دھوکے باز خاندان کی دھوکے باز اولاد اور کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ۔"

"بس یہی دو آئے تھے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بکومت! تم اتنے دلیر نہیں ہو کہ صرف دو آدمیوں کے ساتھ چلے آؤ۔" میں نے خونخوار انداز میں کہا۔

"میں قسم کھاتا ہوں۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ "خود سوچو اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو اتنی فائرنگ سن کر نہ آتا۔"

"عین ممکن ہے وہ کہیں چھپا ہو۔ خیر اگر اس نے کوئی حرکت کی تو پہلے تم مروگے۔ اُٹھو اپنے پیروں پر کھڑے ہوجاؤ۔"

"میں نہیں کھڑا ہوسکتا۔ تمہاری چلائی گئی گولی میرے پاؤں میں لگی ہے۔"

"شکر کرو سر میں نہیں لگی۔" میں نے بے رحمی سے کھینچ کر اسے کھڑا کردیا۔ اس نے چیخ ماری تھی۔ میں پروا کیے بغیر اسے کھینچتا کیبن تک لایا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کا اب مزید کوئی ساتھی باقی نہیں رہا ہے اس لیے میں نے اسے اپنی ڈھال بنایا ہوا تھا۔ کیبن کے اندر آکر اسے دھکیلا۔

"مجھے معلوم تھا کہ لیمپ کہاں ہیں۔ لیمپ کے پاس ہی ماچس تھی۔ میں نے لیمپ جلایا۔ مائیکل فرش پر پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ سفاک بننے کی کوشش کرنے والا اس وقت کسی بچے کی طرح قابلِ رحم لگ رہا تھا لیکن اس پر رحم کھانا کسی زہریلے سانپ پر رحم کھانے کے مترادف تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ رومال ہٹانے پر سانپ کے کاٹے کا نشان نظر آیا تھا۔ میں نے اسے دبایا تو اس سے سیاہی مائل خون کی بوندیں نکلی تھیں۔ تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سانپ خطرناک نہیں تھا ورنہ اس کے کاٹے سے مجھے نیند آنے لگتی اور سانس لینا

دشوار ہو جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ دوسری نوعیت کا زہر تھا۔ کیبن کے کچن والے حصے سے ایک نوک دار چاقو اُٹھا کر میں نے اس کی نوک لیمپ کے شعلے پر رکھی اور ذرا گرم ہونے پر اس کی نوک زخم میں داخل کر دی۔ سیاہ خون کا فوارہ سا چھوٹا تھا۔

میں نے خون بہنے دیا۔ بتدریج خون بہنے کی رفتار سُست پڑنے لگی۔ خون کا رنگ بھی سرخ ہونے لگا۔ سانپ کو زیادہ زہر اُتارنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اسے کھینچ لیا تھا۔ جیسے جیسے خون بہہ رہا تھا میرے بازو کی تکلیف بھی کم ہو رہی تھی۔ بالآخر خون تقریباً رُک گیا۔ میں نے کیبن میں لگے واش بیسن کے سرد پانی سے ہاتھ دھویا تو خون بالکل رُک گیا۔ میڈیکل کٹ مجھے الماری میں رکھی نظر آئی۔ اسے نکال کر جراثیم کش دوا سے زخم صاف کیا پھر اس پر دوا لگا کر اوپر سے چپکانے والی پٹی لگا لی۔ قمیص اور سویٹر کی آستینیں نیچے کر کے میں نے مائیکل کی طرف توجہ دی۔ وہ کراہ کر بولا۔

''پلیز مجھے ہسپتال لے چلو۔ میں تکلیف سے مر رہا ہوں۔''

''ضرور میں تمہیں اس ہسپتال لے جاؤں گا جہاں تم مجھے بھیج رہے تھے۔''

''نہیں۔'' میرا مطلب سمجھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتا؟'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑا اور اسے کھینچ کر کھلے خانے تک لایا۔ جس کے نیچے موت کا کنواں تھا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلانے لگا تھا۔ میں نے دھکا دے کر اس کا اوپری جسم خانے کے اندر گرا دیا اور اس کی کمر پر پاؤں رکھ دیا۔ اس نے عجیب گھگھیائی آواز نکالی۔ ''پلیز...... پلیز......''

''تمہارے گرینڈ پا کے علاوہ اور کسے علم ہے کہ تم یہاں ہو۔'' میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔ ''یاد رکھنا جھوٹ میں پکڑ لوں گا اور تمہیں پچھتانے کے لیے مرنے سے پہلے کنویں میں خاصا وقت ملے گا۔''

''صرف پاپا کو علم ہے۔''

''او کے...... اسے کال کرو اور بتاؤ کہ تم نے کام کر لیا ہے۔ میری لاش کنویں میں پڑی ہے۔''

''مجھے اُٹھاؤ تب ہی میں بات کر سکوں گا۔''

''اتنی جلدی کی نہیں ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کے کمر پر زور دیا۔ ''یہ بتاؤ کہ تمہارے چچا نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کا قتل کس کی سازش تھی۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ سب پاپا کو معلوم ہے۔''

''اچھا یوسف کے دوست گل خان کے خاندان کو کس نے موت کے منہ میں دھکیلا تھا۔''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے پھر کہا۔

''تب تمہارا کیا فائدہ۔'' میں نے پاؤں کا زور ذرا کم کیا۔ ''تم بھی جہنم میں جاؤ۔''





''نہیں...... نہیں......'' وہ چلایا۔ ''گل خان کا خاندان کونسل کے حکم سے مارا گیا تھا۔ ریان انکل کے بارے میں میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''جونی والٹر کا جیوش کونسل میں کیا کردار ہے؟''

''وہ مرکزی کمیٹی کا سیکرٹری جنرل ہے۔'' مائیکل فرفر بول رہا تھا کیونکہ وہ کنویں کے بالکل اوپر تھا۔ اس کے ہاتھ مصنوعی گھاس کو پکڑے ہوئے تھے لیکن یہ اسے گرنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ میں ذرا سا بوجھ کم کرتا اور وہ اندر گر جاتا۔ گل خان اور اس کے خاندان کی موت کا سن کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مائیکل کے اعتراف سے واضح تھا کہ جس آگ نے میرے خاندان کو چاٹ لیا تھا وہ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی بلکہ خبیث فطرت یہودیوں کی بھڑکائی ہوئی تھی اور اس کا ذمے دار جونی والٹر تھا۔ اپنے بیٹے اور بہو کے اسلام قبول کرنے کا انتقام اس نے گل خان سے لیا تھا۔ میں نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ جونی والٹر کی طرف سے کیے جانے والے ظلم کی ایک بڑی قسط میں ابھی ادا کر سکتا تھا۔ بس پاؤں کی ایک جنبش کی ضرورت تھی اور وہ کنویں میں جا گرتا۔

''نہیں جوزف۔'' اچانک کیبن کے دروازے کی طرف سے آواز آئی تھی۔ بوڑھا جونی والٹر روشنی میں نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دبے پستول کا رُخ میری طرف تھا۔

''اگر تم نے یہ حماقت کی تو پچھتانے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

''جیسے میرے ماں باپ اور بہن بھائی زندہ نہیں رہے تھے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''میں اپنے بچوں کو گمراہ کرنے والوں کو کیسے معاف کر سکتا تھا۔''

''اور میں اپنے ماں باپ کے قاتل کے بچوں کو کیسے معاف کر دوں؟'' میں نے مائیکل کی کمر سے بوجھ ذرا کم کیا تھا کہ وہ اندر گیا۔ اس کے حلق سے ایک اضطراری چیخ نکلی تھی مگر میں نے اسے گرنے نہیں دیا تھا۔ ''جونی والٹر پستول پھینک دو۔ اگر مائیکل کی زندگی چاہتے ہو۔''

مگر اس کے انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ''جوزف اسے پیچھے کرو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''میرے مرتے ہی یہ بھی کنویں میں گر جائے گا۔''

''لیکن یہ مرے گا نہیں۔ میں اسے نکلوا لوں گا۔''

''اچھا یعنی تم اس خوش فہمی میں ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کنویں میں ایک بے حد زہریلا سانپ بھی ہے جس کا کاٹا دس منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ تمہارا ایک آدمی اس کا شکار ہو چکا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' جونی والٹر نے بے یقینی سے کہا۔ ''اس کا بایاں بازو ایک پٹی سے گلے میں لٹکا تھا یعنی اس کے بازو کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔''

''پاپا! یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' مائیکل چلایا۔ ''کنویں میں سانپ ہے۔ پلیز پاپا مجھے بچا لو۔ یہ جو

کہتا ہے مان لو۔"

"بکومت! تمہاری وجہ سے یہ ہوا ہے۔" جونی والٹر نے اسے ڈانٹا۔ "میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا۔"

"اس وقت یہ خود کو کسی ویسٹرن فلم کا جنگجو ہیرو محسوس کر رہا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جوزف! اسے واپس کھینچو۔" جونی والٹر نے مجھ پر پستول تان لیا۔ اس کے عزائم اس کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے۔ وہ مجھے بہرصورت مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ہتھیار ڈالنے کی صورت میں بھی میں اسے اور مائیکل کو معاف نہیں کروں گا۔ وہ میرے خاندان کا قاتل تھا۔ اس نے ہتھیار پھینکنے کے بجائے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے پوتے کی زندگی کا رسک لینے کو بھی تیار تھا۔ اس عمر میں بھی اسے زندگی سے اتنا پیار تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید پستول پھینک دیتا۔

"اوکے۔" میں نے گہری سانس لی۔ میرا دایاں بازو اس کی نظروں سے اوجھل تھا کیونکہ میں ترچھا کھڑا تھا اور مائیکل سے چھینا چھوٹا سا پستول اس طرف پتلون کی جیب میں تھا اور میرا اپنا ریوالور پتلون میں اڑسا ہوا تھا۔ انسان بعض اوقات اپنی موت کا سامان ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ پستول مائیکل لایا تھا۔ میں بہ ظاہر اسے کھینچنے کے لیے جھکا اور آہستگی سے پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اچانک مائیکل پر گرتے ہوئے جونی والٹر پر فائر کیا۔ اس عمر میں اس کے ریفلیکشن اتنے تیز نہیں رہے تھے۔ گولی اس کے بائیں شانے پر لگی تھی جس ہاتھ میں اس نے پستول تھام رکھا تھا۔

وہ جھٹکے سے پیچھے گرا تھا۔ مائیکل چلانے لگا۔ یہ سوچ کر کہ میں اسے کنویں میں پھینک رہا ہوں حالانکہ اس نازک موقع پر بھی میں اسے گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ جونی والٹر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے دونوں ہاتھ ناکارہ ہو چکے تھے۔ اس سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے کنویں میں تقریباً لٹکے مائیکل کو اوپر کھینچ لیا۔ مجھے اس کے تقریباً ستر کلوگرام وزنی جسم کو کھینچنے میں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔

اس کی پتلون کی بیلٹ کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ فرش پر آ گرا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ میں نے پستول اس کی طرف کیا اور سرد لہجے میں بولا۔

"چپ چاپ پڑے رہنا ورنہ مجھے تمہاری کھوپڑی میں گولی اُتار کر بڑی خوشی ہوگی۔"

"نہیں میں بالکل نہیں ہلوں گا۔" اس نے تقریباً گھگھیا کر کہا تھا۔

میں نے قریب جا کر جونی والٹر کا جائزہ لیا۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی اور اس نے ہڈی توڑ دی تھی۔ بوڑھا حوصلہ مند تھا۔ گولی لگنے کے بعد بھی میں نے ہلکی سی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ اس وقت بھی وہ ہوش میں تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو مارے تکلیف کے بے ہوش ہو جاتا۔ میں اس طرح اس کے نزدیک بیٹھا تھا کہ کیبن کا دروازہ اور مائیکل دونوں میری نظروں کے سامنے رہیں۔





"جونی والٹر کیا خیال ہے؟ میں اپنے خاندان کے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔"

"مجھے تم سے کسی رحم کی کوئی امید نہیں ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم مجھے بھی مار سکتے ہو اور مائیکل کو بھی لیکن یاد رکھنا بچو گے تم بھی نہیں۔ جنوبی افریقہ کے یہودی تمہارے پیچھے ہیں اور جلد تم بین الاقوامی دہشت گرد قرار پاؤ گے۔ انٹرپول تمہیں تلاش کرے گی اور کوئی ملک تمہیں پناہ نہیں دے گا۔"

"اگر تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو تو بے کار ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ میری موت خدا کے لکھے وقت سے پہلے نہیں آئے گی۔ ایک گھنٹہ پہلے تک تم سوچ سکتے تھے کہ اس حال میں بے بس میرے سامنے پڑے ہوگے۔"

"اب تم بڑا بول بول رہے ہو۔" وہ بولا۔

"میں تکبر نہیں کر رہا صرف حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے قطعی علم نہیں ہے کہ خدا نے ہم میں سے کس کی موت پہلے لکھی ہے۔ اگرچہ یہ ہتھیار اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"صرف اتنا جونی والٹر کہ تم مجھے کسی بھی حوالے سے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہیں مارنے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کی کوشش ضرور کروں گا۔ میری کامیابی یا ناکامی خدا کی مرضی سے مشروط ہے۔"

"تم مجھے مارو گے۔" اس کی آنکھوں میں پہلی بار خوف نظر آیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "البتہ مائیکل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ہے سوائے اس کے کہ اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ بھی اس کا قصور نہیں تھا۔" جونی والٹر جلدی سے بولا۔ "اسے میں نے حکم دیا تھا۔"

"بہرحال فیزیکلی کوشش تو اس نے کی۔ خیر میں ایک شرط پر اس کو معاف کر سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے کچھ سوالوں کے درست درست جواب دے دو۔"

"ہر چند میں جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"تم کس کے ساتھ آئے ہو۔ اس حالت میں کہ تم گاڑی اکیلے ڈرائیو نہیں کر سکتے۔"

"میرا ڈرائیور ہے لیکن کار یہاں سے کوئی تین سو گز پیچھے کھڑی ہے۔ اسے اس ہنگامے کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔"

میں نے کیبن کا دروازہ بند کر کے میز اس کے سامنے کر دی۔ "اب اگر وہ باہر ہے بھی تو تمہاری مدد کے لیے نہیں آ سکتا۔ کیا خیال ہے؟"

جونی والٹر کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ گویا اسے امید تھی کہ ڈرائیور ان کی مدد کر سکے گا۔

''میں نے اسے کار میں رُکنے کا حکم دیا۔ وہ اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کرسکتا ہے۔''

''اس بحث میں پڑنا بے کار ہے لیکن یاد رکھو اگر اس نے مداخلت کی تو اس کا خمیازہ مائیکل کو بھگتنا پڑے گا۔''

''نہیں...... نہیں پلیز ایسا مت کرنا میں اسے روک دوں گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

''میرے پاس اس سے رابطہ کا ذریعہ ہے۔'' وہ بولا اور آہستہ سے جیب سے ایک چھوٹا سا آلہ نکال کر اس کا بٹن دبایا۔

''ایڈورڈ! اس وقت تم جاؤ اور جب تک میں دوبارہ کال نہ کروں۔ مت آنا سیدھے والٹر ہاؤس جانا۔''

''یس باس۔'' آلے سے مدھم سی آواز آئی۔ ''کار لے جاؤں۔''

''ظاہر ہے۔'' جونی والٹر غرایا۔ ''میں اسے ڈرائیو نہیں کرسکتا۔ اب جاؤ۔''

اس نے آلہ بند کردیا اس سے پہلے کہ وہ اسے جیب میں رکھتا۔ میں نے اس سے یہ آلہ لے لیا۔

''اور کیا ہے تمہارے پاس؟''

''اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''چلو میں نے مان لیا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں تمہارے بیٹے یوسف کے بجائے گل خان کی اولاد ہوں۔''

''سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں نے تمہیں مارنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی اپنی اولاد کو نہیں مار سکتا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے۔''

''تم یہودیوں کے نزدیک مسلمان ہونا اتنا بڑا جرم ہے اگر تمہاری اولاد مسلمان ہوجائے تو تم اسے بھی قتل کردو۔ آخر یوسف اور سارہ کو کس نے قتل کیا۔''

''ربِ موسیٰ کی قسم! میں نے یہ کام نہیں کیا۔'' اس نے لرزتی آواز میں احتجاج کیا۔

''تب تمہارے خاندان والوں کا کام ہے۔ جیوش کونسل بھی یہ کام کرسکتی ہے۔''

''اگر کونسل نے یہ کام کیا ہے تو میں اس سے لاعلم ہوں ورنہ میں کبھی انہیں ایسا نہیں کرنے دیتا۔''

''میں نے اپنے گل خان کے بیٹے ہونے کا ثبوت مانگا تھا۔ تم نے درست جواب نہیں دیا اور مجھے ٹرخانے کی کوشش کی ہے اس لیے اس کی سزا مائیکل کو ملے گی۔'' میں نے پستول کا رخ مائیکل کی طرف کیا تو وہ چلانے لگا۔

''پاپا! مجھے بچالو اسے رحیم شاہ کے بارے میں بتاؤ۔''





''یہ رحیم شاہ کون ہے؟'' میں نے والٹر سے پوچھا۔

''گل خان کا ایک نزدیکی دوست تھا۔ تمہیں اس کی بیوی نے لاکر سارہ کے حوالے کیا تھا۔''

معاً مجھے ڈائری کی فوٹو کاپی کا وہ حصہ یاد آ گیا جس میں یوسف نے گل خان کی ایک پڑوسن کے آنے کا ذکر کیا تھا اور اس جگہ سے ڈائری کا حصہ صاف کیا ہوا لگ رہا تھا۔

''تم نے جان بوجھ کر مجھ سے یہ بات چھپائی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''ورنہ تمہارے جرائم کا پردہ چاک ہوجاتا تو وہ اب بھی ہوکر رہا مسٹر جونی والٹر۔''

''اگر میں تمہیں رحیم شاہ کے پتے سے آگاہ کردوں تو کیا تم مجھے معاف کردو گے؟''

''تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''وہ بھی مسلمان ہے اور انڈیا سے آیا تھا۔ بعد میں اس کے رشتے دار پاکستان چلے گئے۔''

''مجھ سے شرط مت منواؤ۔'' میں نے انکار کردیا۔

''اچھا مائیکل کو معاف کردو یہ ابھی بچہ ہے۔''

میں نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ ''اس نے تمہارے ساتھ جس ناخلفی کا مظاہرہ کیا تھا اس کو مر جانا چاہیے۔ مجھے بزرگوں سے بدتمیزی کرنے والا بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

''خدا کے لیے۔'' اس بار جونی اپنی انا بالائے طاق رکھ کر گڑگڑایا۔ ''یہ نادان ہے۔''

''میرے نزدیک تمہاری پوری قوم نادان ہے۔ جو انسانوں کو اپنی غلامی میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ بہر حال میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ اب ایک آخری سوال ہے کرنل بوگارڈ مجھے کہاں ملے گا؟''

جونی والٹر بُری طرح چونکا۔ ''کرنل بوگارڈ اس کے بارے میں مجھے کیا پتا؟''

''جونی والٹر تمہیں اس کے بارے میں لازماً پتا ہونا چاہیے کیونکہ جیوش کونسل کے دہشت گرد جس طرح میرے پیچھے آزادی سے دندنا رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ موجودہ حکومت سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے ایک کرنل بوگارڈ ہے انتظامیہ میں جو تم لوگوں کی کھل کر مدد کرسکتا ہے اور جیوش کونسل کے سربراہ تم ہو۔''

''میرا کرنل سے رابطہ ضرور ہے اور ہم ایک دوسرے کے کام بھی آسکتے ہیں لیکن وہ کہاں ہے؟ اس بات کا مجھے علم سوائے اس کے چند آدمیوں کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ اسے اپنے دشمنوں سے ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔ نسل پرست حکومت کے دور میں اس نے ہزاروں سیاہ فام مروائے تھے۔ ان کے رشتے دار اور عزیز و اقارب اس کے خون کے پیاسے ہورہے ہیں...... تمہیں معلوم ہے کہ نسل پرست حکومت نے سیاہ فاموں کو جن شرائط پر اقتدار منتقل کیا تھا ان میں ایک شرط کرنل بوگارڈ کی سلامتی اور فوج میں اس کی بحالی کی تھی۔ ان شرائط کو سیاہ فاموں کی حکومت نے نبھایا۔ آج بھی کرنل بوگارڈ سرکاری مشینری کا طاقتور مہرہ ہے۔''

"اس کی مدح سرائی مت کرو...... مجھے اس کے بارے میں بتاؤ وہ منحوس آدمی کہاں پایا جاتا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔"ورنہ اپنے پوتے کی موت دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"نہیں......نہیں......" جونی والٹر چلایا۔"میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے اس کا پتا نہیں معلوم لیکن شاید ایک ذریعہ ہو سکتا ہے اس تک پہنچنے کا، جو ہانسبرگ میں ڈاؤن ٹارن کے علاقے میں اس کی محبوبہ رہتی ہے اس کا نام ریٹا شیکر ہے۔"

میں نے یہ لفظ دہرایا اور جونی والٹر کی طرف دیکھا۔"اگر اس میں ذرا بھی جھوٹ ہوا تو تمہارا پوتا جو میرے ساتھ جائے گا اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔"

"میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا ہے اور میرا کیا ہو گا؟"

"جونی والٹر تمہیں وہی سزا ملے گی جو میرے خاندان نے سہی تھی، حالانکہ وہ بے گناہ تھے اور تمہاری نفرت کی بھینٹ چڑھے تھے میرا مذہب مجھے اجازت دیتا ہے کہ دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ آگ کے بدلے آگ مگر ساتھ ہی مجھے انتقام میں حد سے بڑھنے سے روکتا ہے۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ مائیکل کو بھی اس کیبن میں چھوڑ جاتا۔" میں نے کیروسین لیمپ کی بوتل میں جمع مٹی کا تیل کیبن میں چھڑکنا شروع کر دیا۔

"نہیں......تت......تم ایسا نہیں کر سکتے۔" جونی والٹر لرز گیا تھا۔

"جونی والٹر تم سے پہلے میرے ماں باپ اور بہن بھائی جلائے گئے تھے۔ یہاں پہلے کیبن جلے گا اور اس کے بعد تم......"

"پلیز......مجھ سے جو چاہے لے لو......میں تمہاری ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں۔" وہ جلدی جلدی سے کہہ رہا تھا۔ میں نے مشتعل ہو کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

"خدا کے بندے مجھے سوائے تمہاری جان کے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میرا خیال ہے ایک دہشت گرد ادارے کے سربراہ کے طور پر تم نے بے شمار لوگوں کی موت کا فیصلہ سنایا ہو گا۔ اب میں تمہاری موت کا فیصلہ سنا رہا ہوں۔" میں نے اسے کھینچ کر دیوار والے حصے کے ساتھ کیا اور الماری سے رسّی لا کر اسے باندھنے لگا۔ وہ اس حالت میں فرار بھی ہو سکتا تھا۔ اب کے جونی والٹر نے گھگھیانا شروع کر دیا۔ میں نے افسوس سے اس فرعون صفت آدمی کو دیکھا۔ جب دوسروں کی باری تھی تو وہ پوری صفائی سے فیصلے سناتا تھا اور اپنی موت سامنے نظر آئی تو اس نے رونا شروع کر دیا تھا، اس کے ابتدائی حوصلے نے مجھے متاثر کیا تھا۔

"والٹر اگر تم مجھے اپنی ساری دولت کی پیش کش کر دو تب بھی میرا ارادہ نہیں بدلے گا۔"

اسے رسّی سے میں نے لکڑی کے ستون کے گرد باندھا۔ مائیکل اس دوران میں دم سادھے پڑا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اپنے دادا کو معافی دینے کی بات نہیں کی تھی اول تو اسے معلوم تھا کہ میں جونی والٹر کو کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتا لیکن درحقیقت وہ اس لیے خاموش تھا کہ اسے خدشہ تھا





میں اسے بھی سزائے موت نہ سنا دوں۔ وہ میرے اشتعال کو ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے جب میں نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ سعادت مندی سے پاؤں کی تکلیف کا واویلا کیے بغیر اٹھ گیا۔ اس کے پاؤں میں زخم تھا لیکن ہڈی محفوظ تھی۔ اس لیے وہ لنگڑا کر ہی لیکن چل رہا تھا۔ جونی والٹر نے دیکھا کہ جب اس کی التجاؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے پھٹی پھٹی آواز میں مائیکل سے کہا۔

"مائیکل مجھے بچا لو۔"

مائیکل نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور بادل نخواستہ بولا۔

"مسٹر جوزف......"

"میرا نام یوسف ہے۔ یہ بات تم دونوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔"

"او کے مسٹر یوسف کیا تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ یو نو اس کی عمر پچھتر برس سے زیادہ ہے اور قانون بھی اس عمر کے شخص کو سزائے موت......" میں نے اس کے منہ پر مکا مارا۔

"تم لوگوں کے منہ سے قانون کی بات اچھی نہیں لگتی ہے۔"

وہ منہ دبا کر چپ ہو گیا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر جونی والٹر دل کی بھڑاس نکالنے لگا تھا اس نے دیوانہ وار گالیاں دیتے ہوئے مجھے برے انجام کی دھمکیاں دیں۔ میں ہنس دیا۔"مسٹر والٹر! تم سے پہلے بھی اس سرزمین پر خاصے فرعون گزرے ہیں اور وہ سب اب زمین تلے جا چکے ہیں۔"

میں نے لیمپ اٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔ شیشہ بکھر گیا تھا اور اس کا تیل پھیلنے سے فرش سے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔ میں نے مائیکل کو دروازے کی طرف دھکیلا۔ پھر ایک طرف ہٹا کر اسے آگے کیا۔ جونی والٹر نے اگرچہ اپنے ڈرائیور کو واپس جانے کا حکم دے دیا تھا لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کسی خفیہ اشارے سے اس نے ڈرائیور کو خطرے کا اشارہ دے دیا ہو اور وہ باہر مورچہ بند میری گھات میں ہو۔ اس خدشے کی وجہ سے میں نے مائیکل کو آگے رکھا تھا۔ اس وقت تک کیبن میں خاصا دھواں بھر گیا تھا۔ میں نے مائیکل کو آگے دھکیلا اور خود زمین پر لیٹتے ہوئے رینگ کر باہر آنے لگا۔

"گڈ بائی مسٹر والٹر امید ہے دوسری دنیا میں تمہارا وقت اب اچھا گزرے گا۔" میں نے واویلا مچاتے جونی سے کہا۔ اس لمحے میں نے فائر کی آوازیں۔ گولیاں تواتر سے چلی تھیں اور مائیکل کیبن سے اترا تھا۔ میں پھرتی سے واپس ہوا۔ مائیکل کے سینے سے خون ابل رہا تھا اور جونی چپ ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مکار شخص، دیکھ اپنی مکاری کا انجام۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔"میں نے مائیکل کو نہیں مارا اسے تیری عیاری نے مار دیا۔"

"مائیکل...... مائیکل۔" اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ باہر ایک مسلح دشمن نہ جانے کہاں رُوپوش تھا۔ آگ جونی والٹر کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس نے کیبن کے دروازے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اب کوئی شخص دروازے سے باہر نہیں جا سکتا تھا، اس طرح اندر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جونی والٹر کو بائے بائے کہا اور تہہ خانے سے کیبن کے نیچے اُتر گیا۔ اگرچہ میں عقبی کھڑکی کے راستے بھی باہر جا سکتا تھا لیکن نہ جانے باہر جونی والٹر کے کتنے آدمی تھے اور کہاں کہاں تھے؟ آگ کی تپش کیبن کے نیچے بھی محسوس کی جا سکتی تھی میں تیزی سے رینگتا دائیں طرف والے حصے کی طرف نکلا۔ اس طرف درخت ذرا نزدیک تھے اور میں ایک بار ان تک پہنچ جاتا تو جونی والٹر کے ڈرائیور سے محفوظ رہتا، کیبن کے اندر سے جونی والٹر کی کرب ناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ آگ اس تک پہنچ گئی تھی اور وہ اپنے کیے کی سزا فی الوقت دنیا میں پا رہا تھا۔ دوسری دنیا میں اسے کیا سزا ملتی۔ یہ خدا ہی جانتا تھا۔

میں نے گھاس ہٹا کر دیکھا۔ تاریکی میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن کوئی تھا ضرور جس نے مائیکل کو میرے دھوکے میں ہلاک کر دیا تھا۔ اگر جونی والٹر زندہ بچ جاتا تو اسے اس حماقت کی سزا بڑی سخت دیتا۔ اس طرح مین درحقیقت اس کا محسن تھا۔ جونی والٹر کو کیفر کردار تک پہنچا کر میں نے اسے سزا سے بچا لیا تھا۔

اوپر کیبن کا بڑا حصہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اچانک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں چونکا۔ کیا باہر موجود فرد کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو کر جونی والٹر کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ سامنے سے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ میں زمین پر رینگتے ہوئے عقبی حصے کی طرف آیا۔

ایک لمحے مجھے کسی کے جوتے دکھائی دیئے اگلے ہی لمحے وہ شخص اوپر چڑھ گیا اور غالباً کیبن میں کھڑکی کے راستے کود گیا۔ اس طرف ابھی تک آگ نے رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ٹوٹی کھڑکی سے آگ کی چمک نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا اور اس جگہ رُکا رہا، مجھے معلوم تھا کہ اندر جانے والا زیادہ دیر اندر نہیں رہ سکے گا اور جونی والٹر مر چکا تھا تو وہ اکیلا آئے گا۔ ورنہ اسے لے کر ہی آئے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ جب میں نے پہلے اسے نیچے کودتے دیکھا۔ اس نے پھر جونی کو اُتار کر نیچے لٹایا۔ قریب سے میں اس کا جھلسا وجود دیکھ سکتا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اتفاق سے اس کا چہرہ میری جانب تھا۔ دائیں طرف سے وہ اتنی بُری طرح سے جھلسا تھا کہ چہرے کی چربی تک نکل آئی تھی۔ مجھے یہ اس کی سخت جانی سے زیادہ زندگی سے چمٹے رہنے کی خواہش لگی۔ پھر وہ اتنی بُری حالت میں بھی زندہ تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور اس کی آنکھوں سے نفرت اور عداوت کا شعلہ لپکا تھا۔

"باس میں ابھی کار لاتا ہوں تمہیں ہسپتال لے چلتا ہوں۔" ایڈورڈ نامی ڈرائیور نے اسے تسلی دی۔





جونی والٹر نے اسے میرے بارے میں بتانے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ڈرائیور جا چکا تھا۔ میں باہر نکل آیا۔ "ہیلو جونی والٹر میرا خیال ہے تمہارے نصیب میں آسان موت نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے منہ سے عجیب سی آواز نکالی۔ پھر اس نے منہ کھولا تو کیبن سے آتی روشنی میں اس کا اندر سے جلا منہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے نہ جانے کیسے اس کا منہ اندر سے جل گیا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "نہیں میں اب تمہیں ماروں گا نہیں۔ البتہ تمہارے ڈرائیور نے مجھے گاڑی دینے سے انکار کیا تو وہ ضرور مارا جائے گا۔"

اس لمحے میں نے گاڑی کی آواز سنی اور پھرتی سے کیبن کے نیچے گھس گیا۔ ڈرائیور جونی کی بجائے مائیکل کی جیپ سے آیا تھا اور اس کی آواز نے مجھے بروقت ہوشیار کر دیا۔ ورنہ اندر کیبن میں آگ سے لکڑی چٹخنے کا اتنا شور تھا کہ جونی والٹر کی کار شاید میرے سر پر آ جاتی تب بھی مجھے اس کی آواز نہ آتی۔ جیپ سے اُتر کر ڈرائیور نے جیپ کا عقبی دروازہ کھولا اور جونی والٹر کو اُٹھانے کے لیے جھکا تھا۔ اس موقع پر جونی والٹر نے وہ حماقت کی تھی جس نے شاید اس کی موت پر مہر ثبت کر دی تھی۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر میری طرف اشارہ کر دیا۔ ڈرائیور نے کیبن کے نیچے جھانکا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی پھرتی سے مشین پسٹل نکال لیا۔ یہ قریب سے خاصا خطرناک ہتھیار تھا کیونکہ برسٹ بھی مارتا تھا۔ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کے عین دل کو لگی اور وہ ہلکی سی کراہ سے مر گیا۔ اس کی لاش اُلٹ کر ذرا پیچھے جا گری تھی۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈرائیور سے گاڑی نہیں لوں گا اور والٹر کو ہسپتال جانے دوں گا۔ اگر اس کی قسمت میں ہو گا تو اس حالت میں بھی بچ جائے گا لیکن اس نے خود ڈرائیور کو بھی مروا دیا۔ میں نے اسے کہا۔

"جونی والٹر زندگی کے معاملے میں شاید تم خوش قسمت ہو لیکن مرتے وقت بہت بدقسمت ثابت ہو رہے ہو۔ تمہارا پوتا تمہارے سامنے مارا گیا اور اپنے بچنے کی راہ تم نے خود ختم کی۔" میں نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔ "ممکن ہے ہسپتال میں طبی امداد ملنے کے باوجود تم مر جاتے لیکن وہاں کم سے کم سکون سے تو مرتے یہاں اب تم اذیت سے مرو گے اور پتا نہیں کب موت آئے گی۔"

جونی والٹر نے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کے الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔ "جونی والٹر اب تم اپنی بے کار بچی کھچی توانائی ضائع نہ کرو۔ میں پھر بھی تمہارا شکرگزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے اپنے خاندان کا پتا چلا اور اس کے قاتل کا بھی۔"

میں نے ڈرائیور کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے چابی کے ساتھ پرس بھی نکلا تھا۔ پرس میں نوٹوں کی خاصی تعداد تھی جو میں نے اپنی جیب میں منتقل کر کے پرس اندر آگ میں اُچھال دیا۔ مائیکل کا چھوٹا پستول بھی نشانات صاف کر کے کیبن میں پھینک دیا۔ اپنے پاس میں نے ریوالور اور

ڈرائیور کے پاس سے ملنے والا مشین پسٹل رکھ لیا۔ یہ چھوٹا سا تھا اور اس کے دو عدد فاضل میگزین بھی تھے۔ چابی جیپ میں تھی۔ جیپ سٹارٹ کر کے میں نے آخری بار زمین پر بے بس پڑے جونی والٹر کو دیکھا۔ اس ملک کی سب سے دولت مند بزنس ایمپائر کا سربراہ تھا۔ وہ اس وقت تک زندہ تھا، ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ اسے ایک گولی مار کر اس تکلیف وہ حالت سے نجات دلا دوں لیکن پھر میں نے اس کے خون سے ہاتھ رنگنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ویسے بھی قریب المرگ تھا۔

واپسی کا راستہ صاف تھا۔ جونی والٹر کی لگژری قسم کی کار ریچ کیبن سے خاصے فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھنے درختوں سے گھرے ہونے کی وجہ سے نصف کلو میٹر بعد ہی کیبن کے شعلے نظر آنا بند ہو گئے تھے۔ ہائی وے سے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی خاص طور سے اس طرف جاتا تو صبح تک کیبن کی راکھ رہ جاتی۔ ہائی وے پر میں نے شہر کا رُخ کیا۔ میں رفتار کے معاملے میں محتاط تھا۔ کیونکہ ایک بار پولیس مجھے روک لیتی تو میرے پاس اسے دکھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

مجھے شہر کا راستہ درست طور پر معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اندازے سے ایک سڑک پر جیپ موڑ دی۔ اس پر نائٹ کلب اور ہوٹلز تھے، میں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور مجھے خاصی بھوک لگ رہی تھی لیکن میرا لباس اس قابل نہیں تھا کہ میں کسی ریستوران میں جا سکتا، سارے کپڑے مٹی سے اَٹے تھے، اس حالت میں ریستوران میں جاتا تو پولیس ہی بلائی جا سکتی تھی۔ ورنہ میرا حلیہ سب کو یاد رہتا اور بعد میں کسی موقع پر میں پھنس سکتا تھا۔ میں نے ایک جگہ جیپ روک کر سوئٹر اُتار کر اس سے ہی اپنی پتلون صاف کی تھی، رومال سے چہرہ صاف کیا، بازو جہاں سانپ نے کاٹا تھا اب معمولی سی جلن رہ گئی تھی اور اس کے زہر کے اثرات بھی نہیں محسوس ہو رہے تھے۔ بس میں نے ممکن حد تک حلیہ معقول بنا لیا اور ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے رُک گیا۔ وہاں سے میں نے ایک جیکٹ لی کھانے کے لیے بسکٹ کے ڈبے اور ڈبہ بند دودھ کے پیکٹ لیے۔ اس طرح میں کسی ریستوران میں جانے کا خطرہ مول لیے بغیر اپنا پیٹ بھر سکتا تھا، واپس آ کر میں نے جیپ ایک نسبتاً ویران نظر آنے والی سڑک کے کنارے روک دی۔ اپنا پیٹ بھرا اور عقبی سیٹ پر لیٹ گیا۔ اس طرف ایک جانب پارک تھا اور دوسری جانب بنگلوز تھے۔ سڑک کے کنارے بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ کوئی خاص طور سے جیپ کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ میں صبح تک اس جیپ میں رہنا چاہتا تھا۔ رات کے وقت میرا گھومنا پھرنا اتنا ہی خطرناک ہو سکتا تھا جتنا کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح تک پولیس کے ساتھ جیوش کونسل کے دہشت گرد بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ جیپ میں خطرہ اس لیے بھی کم تھا کہ اس کے شیشے تاریک تھے، اگر کوئی پولیس کار اس کا معائنہ کرتی تو انہیں کم سے کم میں نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ جیپ اردگرد کے کسی فرد کی سمجھ کر پتہ کرنے کی زحمت ہی نہ کرتے لیکن صبح تک یہ جیپ میرے لیے خطرناک ہو جاتی۔ اس کی رپورٹ ہو جاتی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ ساری رات ایک محدود جگہ پر لیٹے لیٹے اور سردی





سے میرا جسم اکڑ گیا تھا، میں نے اُٹھ کر حرکت کی تو خاصی مشکل ہوئی تھی۔ رات درجہ حرارت خاصا گر گیا تھا۔ شاید صفر کے نزدیک تھا، میں نے جیپ کا اندرونی حصہ صاف کیا، جہاں جہاں میری انگلیوں کے نشان ممکن تھے، رات جس سٹور سے میں نے جیکٹ لی تھی اس سے دستانے بھی لے لیے تھے۔ ایڈورڈ کے پرس سے خاصی رقم نکلی تھی۔ اندر کے بعد میں نے جیپ کے بیرونی حصے بھی صاف کیے۔ مشین پسٹل جیکٹ میں با آسانی سما گیا تھا اور ریوالور میں نے پتلون کی جیب میں رکھا تھا۔

پارک عبور کر کے میں دوسری طرف واقع کمرشل سٹریٹ پہنچا۔ ریستوران کھلے تھے اور لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بھی ایک ریستوران میں چلا گیا۔ کسی نے خاص طور سے مجھ پر توجہ نہیں دی، میز پُر ہونے کی وجہ سے میں کاؤنٹر پر جا بیٹھا اور ویٹرس کو ایک سینڈوچز اور کافی کا کہا، سامنے اونچے ریک پر ٹی وی چل رہا تھا، اچانک سکرین پر جانا پہچانا منظر نمودار ہوا یہ کیبن تھا جواب صرف راکھ کا ڈھیر تھا۔ میں نے اردگرد کے منظر سے پہچانا۔ پھر میں نے دیکھا۔ ایمبولینس میں لاشیں رکھی جا رہی تھیں۔ رپورٹر کے مطابق جلے ہوئے کیبن کے آس پاس سے دو لاشیں ملی تھیں۔ ایک لاش جلی ہوئی تھی جو کہ جونی والٹر نامی ایک بزنس مین کی ثابت ہوئی دوسرا اس کا ڈرائیور ایڈورڈ گون تھا، اسے دل پر گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ رپورٹر نے کنویں میں مائیکل کی لاش کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید دونوں اب تک ملبے تلے رُوپوش تھے۔

ویٹرس نے سینڈوچز اور کافی لا کر میرے سامنے رکھی اور آہستہ سے بولی۔ ''تمہیں پہلی بار اس کیفے میں دیکھا ہے کہیں اور سے آئے ہو۔''

''دوسرے شہر سے۔'' میں نے کھانے کا آغاز کیا۔

''اوہ کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟''

''نہیں رات ایک کزن کے ہاں گزاری تھی اب مجھے ڈاؤن ٹاؤن جانا ہے خوب صورت لڑکی کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہاں تک میں کیسے جا سکتا ہوں۔''

''ایکس پندرہ بس میں چلے جاؤ۔'' وہ تمہیں سیدھی ڈاؤن ٹاؤن میں اُتارے گی۔''

''نہ جانے اس شہر کو کیا ہو گیا ہے۔'' ایک شخص نے ٹی وی کی خبر پر ذرا بلند آواز میں تبصرہ کیا۔ ''ہر روز قتل و غارت ہونے لگی ہے۔''

''اس خبر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ویٹرس نے ذرا جھک کر مجھ سے کہا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا لیکن نہ تو اس کے تاثرات اور نہ ہی اس کا لہجہ غیر معمولی تھا۔ وہ شاید بات کرنے کے موڈ میں تھی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں ویسے واقعی ان دنوں جوہانسبرگ میں قتل وغیرہ زیادہ ہونے لگے ہیں، پچھلے دنوں بھی کوئی لڑکی اور اس کا ساتھی مارا گیا تھا۔''

''ہاں...... لیکن اس کا مقامی حالات سے تعلق نہیں ہے کچھ غیر ملکی دہشت گرد کہیں سے آئے

ہیں، وہی یہ سب کچھ کرتے پھر رہے ہیں۔“

”یہ سب سے آسان حل ہے اپنے اندرونی مسائل کا۔“ میں نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ”اگر باہر سے کوئی آیا بھی ہے تو اسے چیک کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔“

”درست کہا...... کافی اور دوں؟“

”بالکل اس وقت کافی کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

میں ناشتہ کر چکا تھا دوسرا کپ پی کر میں نے بل ادا کیا اور لڑکی کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔ مطلوبہ بس مجھے اس سڑک کے آخر میں مل گئی تھی۔ مغربی معیار کے مطابق بہترین اور آرام دہ تھی۔ اندر ہیٹر آن ہونے سے باہر والی سردی کی رمق بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں ایک الگ تھلگ نشست پر بیٹھ گیا، ڈاؤن ٹاؤن جانے والی یہ بس تقریباً خالی تھی، ظاہر ہے اس وقت رش کام کی جگہوں پر جانے والی بسوں میں ہوتا ہے، تقریباً پون گھنٹے بعد بس نے مجھے ڈاؤن ٹاؤن پر اُتار دیا، مجھے سیور نامی اس عمارت کی تلاش تھی جس میں ریٹا نامی عورت رہتی تھی جو کرنل بوگارڈ کی منظورِ نظر تھی، لیکن اس سے پہلے مجھے ایک کام کرنا تھا، میں نے فون بوتھ سے کینی مین کا نمبر ملایا۔ میری آواز سنتے ہی وہ تیز لہجے میں بولا۔

”کہاں ہو اور مورنا کہاں ہے؟“

”میں ابھی نہیں بتا سکتا ہوں کہ کہاں ہوں اور مورنا کو بھول جاؤ، وہ ڈبل ایجنٹ نکلی، ویسے اس کے بارے میں بتا دوں کہ وہ جونی والٹر کے گھر میں ہے۔“

کینی مین چونکا تھا۔ ”کون جونی والٹر وہ جس کا کل مرڈر ہوا ہے؟“

”یہ سب فون پر کرنے کی باتیں نہیں ہیں، میں ملوں گا تو تمام تفصیل سے بتاؤں گا۔ ابھی میں نے ایک کام سے فون کیا ہے، مجھے رحیم شاہ نامی شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں، آج سے کوئی تیس سال پہلے جوہانسبرگ میں گل خان نامی شخص اور اپنے بیوی بچوں کے اپنے مکان میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کا ایک نومولود بیٹا ان دنوں بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھا۔ ہسپتال سے رحیم شاہ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ ممکن ہے اس کا نام رحیم شاہ ہو۔ وہ مسلمان ہے۔“

”کیا معلوم کرنا چاہتے ہو، اس کے بارے میں؟“

”یہی کہ وہ ان دنوں میں کہاں ہے؟ رحیم شاہ نسلاً برصغیر کا رہنے والا ہے۔“

”میں شام تک معلوم کر کے بتاؤں گا لیکن میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس واپس آ جاؤ۔ اس طرح پھرتے رہنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”اوکے میں شام کو فون کروں گا۔“ میں نے اس کی بات اَن سنی کر کے فون بند کر دیا۔

کسی دکان دار سے پوچھنا درست نہیں تھا اسے میں یاد رہ جاتا، اس لیے میں نے راہ چلتے لوگوں سے اس بارے میں پوچھنا شروع کر دیا اور بالآخر دس بجے میں سیور نامی اس عمارت کے





سامنے کھڑا تھا۔ یہ تقریباً بارہ منزلہ رہائشی عمارت تھی اس کا نچلا حصہ یعنی لوئر گراؤنڈ فلور اور اپر گراؤنڈ فلور پارکنگ اور سروس کے لیے مخصوص تھا۔



عمارت خاصی لگژری قسم کی تھی۔ اس کے طرزِ تعمیر اور اردگرد کے ماحول سے لگ رہا تھا کہ یہاں پر پوش طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ میں نے نیچے گراس ایریا میں بکس دیکھے۔ ریٹا کے نام کے آگے 12-C لکھا تھا یعنی وہ بارہویں فلور کے C اپارٹمنٹ میں تھی۔ اتفاق سے اس جگہ کوئی نہیں تھا اس لیے کسی نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر آگے کی طرف بڑھ گیا۔ اس طرف سے مجھے امید تھی کہ کسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور سچ مچ کسی کا سامنا کیے بغیر میں بارہویں فلور تک جا پہنچا اوپر ہر فلور پر چار اپارٹمنٹ تھے۔ میں نے سی کا بٹن دبا دیا۔ اندر سے کسی عورت نے انٹر کام پر پوچھا۔

”کون ہے؟“

”مجھے مس ریٹا سے ملنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہو میں ہی ریٹا ہوں۔“

”مس! بہتر ہوتا آپ مجھ سے آمنے سامنے بات کریں۔ میں کرنل بوگارڈ کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ نہیں ملنا چاہتی ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں لیکن اس صورت میں آپ بھی میری طرح نقصان میں رہیں گی۔“

”کیسا نقصان؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”کرنل بوگارڈ میری محبوبہ کو ہتھیانے کی فکر میں ہے۔ وہ اسے سہانے خواب دکھا رہا ہے۔“ میں نے کسی تلخ عاشق کی طرح کہا۔ میں نے رسک لیا تھا۔ ہر عورت کی طرح ریٹا کی بھی یہ کمزوری تھی کہ اسے چاہنے والا بس اس کا رہے۔ وہ کسی صورت اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ چند لمحے میں تذبذب میں رہا کہ اگر وہ دروازہ نہیں کھولتی تو میں کیا کرتا۔ جب میں اس کی طرف سے مایوس ہونے والا تھا تو اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

”مسٹر......؟“ اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”راسٹر۔“ میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام اسے بتا دیا۔ یہ میرے دشمن کا نام تھا۔

”مسٹر راسٹر! مجھ سے ملنے کیوں مصر ہو؟“ اس نے اب بھی لہجے میں سختی برقرار رکھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید دروازے تک آنے کے بعد مجھے اندر آنے کی اجازت نہ دے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور کھلے دروازے میں اپنا جوتا اڑاتے ہوئے مشین پسٹل نکال کر اس کے چہرے کے سامنے کر دیا۔

”حرکت مت کرنا ورنہ یہ دروازہ تمہیں گولی سے نہیں بچا سکتا۔ زنجیر ہٹا دو۔“

ریٹا خاصی حسین عورت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ کرنل بوگارڈ جیسے صاحب اقتدار کی بیوی تھی لیکن اس وقت اس کے حسین نقوش خوف سے مسخ ہو گئے تھے۔ اس نے کم سے کم حرکت کیے بغیر زنجیر ہٹا دی۔ میں اسے نرمی سے دھکیل کر اندر گھس گیا اور عقب میں دروازہ بند کر لیا۔

''اندر اور کون ہے؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے۔'' وہ بہ مشکل بولی۔ ''میں اکیلی ہوں۔''

میں نے اسے خبردار کیا کہ میں کسی غلط ارادے سے نہیں آیا ہوں لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں خون کی ہولی کھیلنے سے دریغ نہیں کروں گا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ ہولی کسے کہتے ہیں؟''

''خون کی برسات۔'' میں نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے وضاحت کی۔ ''مس ریٹا! اگر تم نے میرے ساتھ تعاون کیا تو تم مجھے ایک شریف اور مہذب شخص پاؤ گی۔''

میں نے پورے اپارٹمنٹ کا معائنہ کیا۔ یہ پانچ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل لگژری اپارٹمنٹ تھا جو آسائش اور عیاشی کے قیمتی سامان سے سجا تھا مگر وہاں سچ مچ کوئی نہیں تھا۔ اس دوران میں مَیں نے ریٹا کو اپنے پاس رکھا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ موقع پا کر کوئی کام نہ دکھا جائے۔ آج کل پاکستان میں بھی ایسے سسٹم آ گئے ہیں کہ ان کا سرکٹ بریک ہوتے ہی تھانے یا کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کے دفتر میں الارم بجنے لگتا ہے۔ اگر دخل انداز بغیر الارم کو چھیڑے گھر میں داخل ہو جائے تب بھی اہل خانہ کے پاس بٹن کی سہولت ہوتی ہے جسے دبا کر وہ الارم بجا سکتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس جگہ بھی ایسا ہی کوئی الارم ہے۔ عام طور پر اس قسم کے الارم فون لائن کی مدد سے کام کرتے ہیں اور ان کا آسان سا توڑ ہے کہ فون لائن منقطع کر دی جائے۔ اب مجھے فون لائن کا پتہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس مسئلے کا سادہ سا حل نکالا اور فون کا ریسیور ہٹا کر اسے انگیج کر دیا۔ اب نہ تو کال آ سکتی تھی اور نہ جا سکتی تھی۔ میں نے دیکھا فون انگیج کرتے ہی ریٹا کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ گویا میرا اندازہ درست تھا۔

''صوفے پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اشارہ کیا۔

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''تت...... تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''وہ نہیں چاہتا جو کرنل بوگارڈ چاہتا ہے۔'' میں ہنسا۔

''میرے پاس کچھ رقم اور زیور ہے وہ تم......''

میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف کرنل بوگارڈ کا پتہ درکار ہے۔''

''وہ جوہانسبرگ سے باہر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ ان دنوں وہ اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر جوہانسبرگ آیا ہوا ہے، حتیٰ





کہ اس کے پاس تمہارے لیے بھی وقت نہیں ہے۔''

وہ ہچکچائی۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا۔''

میں مسکرایا۔ ''میں ہی وہ شخص ہوں جس کی تلاش کرنل بوگارڈ کو ہے۔''

''یعنی تم نے وہ جو لڑکی والی بات کی تھی وہ......''

''غلط تھی لیکن ممکن ہے وہ کسی عورت کے چکر میں ہو، ایسے لوگ کسی ایک عورت پر قناعت نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں تھی جو بہ مشکل اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا وہ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔ ''تم مجھے اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسی کوشش نہیں کر رہا ہوں محترم خاتون! لیکن میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تمہیں کرنل بوگارڈ کے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتاتا ہے...... مجھے بھی اس سے زیادہ نہیں بتاتا جتنا ضروری سمجھتا ہے۔ اکثر مجھے اس کی آمد کے بارے میں ایک دو گھنٹے پہلے پتہ چلتا ہے اور کبھی کبھی وہ بغیر اطلاع کے چلا آتا ہے۔''

اگرچہ عقل اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن دل کہہ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ پھر بھی میں نے عقل کی بات مانی۔ جذبات بعض اوقات غلط بھی دکھاتے ہیں۔ میں نے مشین پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا۔

''خاتون! میں صرف ایک منٹ انتظار کروں گا۔ اگر تم نے مجھے کرنل بوگارڈ کے بارے میں نہیں بتایا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ''پلیز نہیں! میری بات کا یقین کرو۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''تم جیسی چاہو میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں اور مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا۔''

''اگر تمہیں اس سے فوری رابطہ کرنا ہو تو تم کیا کرتی ہو؟''

وہ کسی قدر ہچکچائی پھر فوری مشین پسٹل کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''میرے پاس اس کا موبائل نمبر ہے۔ وہ کہیں پر بھی ہو میں اس سے رابطہ کر سکتی ہوں لیکن وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا ہے۔ ایک دو بار میں نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے بعد میں میرے ساتھ سخت سلوک کیا تھا۔''

''وہ تم پر تشدد کرتا ہے؟''

اس نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے میں اس کی زرخرید ہوں۔ اس نے مجھے عالیشان اپارٹمنٹ لے کر دیا ہے۔ زندگی کی ہر آسائش دی ہے۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں رینڈز ہیں۔ میرے پاس اس کی دی ہوئی شاندار کار ہے۔ ان سب چیزوں کے بدلے اسے حق حاصل ہے کہ میرے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔''

"اس کے ساتھ خوش نہیں ہو؟"

"نہیں میں خوش ہوں۔ مجھے ان سب چیزوں کی خواہش تھی وہ میں نے حاصل کر لیں۔ کرنل بوگارڈ ہر دوسرے تیسرے مہینے پندرہ دن کے لیے میرے پاس آتا ہے تو یہ سودا بُرا نہیں ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "تم اتنے عرصے اکیلی رہتی ہو تو کیا بوگارڈ کو تم پر پورا اعتماد ہے۔ اس نے تمہاری نگرانی کے لیے کسی نہ کسی کو رکھا ہوگا۔"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم...... اگر کوئی میری نگرانی کرتا بھی ہے تو مجھے نہیں معلوم۔"

"تم باہر جاتی ہو؟"

"بہت کم...... ہر تیسرے چوتھے دن، کبھی شاپنگ کے لیے اور کبھی تفریحاً نائٹ کلب چلی جاتی ہوں لیکن ان تین برسوں میں مَیں نے کسی اور مرد سے تعلقات نہیں بڑھائے ہیں۔ مجھے سچ مچ بوگارڈ کا خوف ہے۔ وہ بے رحم آدمی ہے۔ اسے یقین آگیا کہ میں نے کسی اور سے تعلق استوار نہیں کیے اگر میں نے ایسا کیا تو وہ میری کھال اُتار دے گا۔ اس نے مجھے آغاز میں ہی اس کی دھمکی دے دی تھی۔" وہ بولتے بولتے لرز گئی تھی اور اس کی جلد کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ "اس نے مجھے کس طرح دھمکی دی تھی۔ اس نے مجھے ایک ویڈیو دکھائی جس میں ایک سیاہ فام لڑکی کی کھال اُتاری جا رہی تھی۔ وہ زندہ تھی اور کھال اُتارنے کے دوران وہ بُری طرح سسک تڑپ رہی تھی۔ اسے یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب میرے جذبات بے قابو ہونے لگتے ہیں تو میں اس لڑکی کی حالت کا سوچ لیتی ہوں پھر سارے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اس لڑکی کا قصور اتنا تھا کہ اس نے بوگارڈ کا قرب حاصل کیا اور پھر کسی اور کے پاس چلی گئی تھی۔"

"بوگارڈ جیسے جنونی سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "بہر حال تم اسے فون کرو اور اس سے یہاں آنے کی فرمائش کرو۔"

"کیا؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "نہیں...... نہیں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ غضب ناک ہو جائے گا۔ بعد میں مجھے مارے گا۔"

"مس ریٹا مار کھانا مرنے کے مقابلے میں بہتر ہے۔"

وہ چونکی۔ "پلیز! کیا تم مجھے مار دو گے؟"

میں ہنسا۔ "مس ریٹا غالباً تم میری شریفانہ صورت سے دھوکہ کھا رہی ہو یا میں نے تم سے ابھی تک کوئی بُرا سلوک نہیں کیا ہے اسی لیے تم شاید میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہو۔ مس ریٹا! میں تمہیں گولی مار کر بھی اسی طرح پُرسکون رہ سکتا ہوں۔ گزشتہ ایک مہینے میں کم سے کم ایک درجن افراد میرے ہاتھ سے مارے جا چکے ہیں۔"

"پلیز...... مجھے اس معاملے میں ملوث نہ کرو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔





میں نے مشین پسٹل رکھ کر کمر سے لگا پستول نکال لیا۔

"مس ریٹا! اب تم فیصلہ کر لو ہاں یا نہیں۔"

اس نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں اپنے فیصلے میں پختہ ہوں۔ اس نے سر ہلایا۔

"اوکے...... گولی مت چلانا۔ میں تیار ہوں لیکن اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ وہ آئے گا کیونکہ اس سے پہلے میں نے اسے جب فون کیا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔"

"تم اپنی سی کوشش کرو اور کوئی غلطی یا اشارہ مت کرنا۔ یہ گفتگو میں بھی سنوں گا۔"

اس نے فون کا ریسیور رکھا اور پھر اسے اُٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ نمبر ملتے ہی میں نے سپیکر فون کا بٹن دبا دیا تھا۔ دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی اور میں نے کرنل بوگارڈ کی غراتی ہوئی آواز سنی۔

"ریٹا! کیا بات ہے؟ کیوں فون کیا ہے؟"

"میں اکیلی ہوں۔ بور ہوتی ہوں۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" ریٹا نے ناز بھری آواز میں کہا۔ "مجھے پتہ تھا کہ تم ناراض ہو گے۔ جب آؤ گے تو مجھے مارو گے لیکن میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ تمہاری مار بھی میرے لیے اس تنہائی سے بہتر ہے۔"

عورت واقعی ہی ایسی چیز ہوتی ہے کہ ہیرا بھی اس کے آگے نرم پڑ جائے۔ "تم فکر نہ کرو۔" اس بار بوگارڈ کی آواز نرم پڑ گئی تھی۔ "میں ایک کام میں اُلجھا ہوا ہوں۔ اس سے نمٹتے ہی تمہارے پاس آؤں گا۔"

"تم جوہانسبرگ میں ہو؟"

کرنل بوگارڈ چونکا تھا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"بس مجھے احساس ہے۔ ان دنوں جوہانسبرگ میں ہنگامے زیادہ ہو رہے ہیں اور تمہارا تعلق سیکیورٹی سے ہے اس لیے مجھے خیال آیا تھا کہ تم بھی یہاں ہو گے۔"

"ہاں...... میں یہاں ہوں لیکن غیر سرکاری طور پر اس لیے میں کھلے عام تم سے ملنے نہیں آ سکتا۔"

"اچھا میں تو تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔" ریٹا نے التجا کی۔ "صرف تھوڑی دیر کے لیے پھر میں واپس چلی جاؤں گی۔" ریٹا کے لہجے میں موجود لوچ نے کرنل بوگارڈ کو مزید نرم کر دیا تھا۔

"اوکے...... میں دیکھتا ہوں۔ میں کسی آدمی کو بھیجوں گا تو تم اس کے ساتھ آ جانا۔"

"سچ!" ریٹا نے کھلنے کا تاثر دیا لیکن نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے مجھے لگا جیسے وہ مایوس ہوئی ہے۔

"تم یہاں نہیں آ سکتے۔ میں نے سوچا تھا تمہارے لیے خود کھانا بناؤں گی پھر ہمارا بیڈروم ہو گا۔"

"نہیں...... میں نے کہا نا میں نے اپنی آمد خفیہ رکھی ہے اور تمہاری طرف آیا تو کوئی نہ کوئی

دیکھ لے گا۔"

"تمہارا آدمی کب آئے گا۔ اس کے آنے سے کم سے کم دو گھنٹے پہلے مجھے پتہ چلنا چاہیے۔ میں نے تیار بھی ہونا ہوگا۔"

"اس کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ جب میرا آدمی آئے گا تو وہ کچھ دیر رک جائے گا اور پھر تم اس کے ساتھ چلی آنا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ میں سو رہی ہوئی یا نہا رہی ہوئی تو؟" ریٹا نے جھنجھلا کر کہا۔

"بے بی! میں نے نہیں تم نے ملنے کی خواہش کی ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "تم نے اچھی طرح ہینڈل کیا ہے۔ وہ شاید یہاں آتا بھی نہیں۔"

"تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"میں بوگارڈ سے کچھ حساب کتاب صاف کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے گول مول سے انداز میں کہا۔

"تم اس کی جان لینا چاہتے ہو۔"

"تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"کیونکہ بوگارڈ جس مقام پر ہے اس سے کوئی پُرانا حساب نہیں لے سکتا۔ ہاں اسے قتل کر سکتا ہے کیونکہ وہ بھی ایک انسان ہے۔"

"تم عقل مند عورت ہو اور ہونا بھی چاہیے۔ جس عورت نے بوگارڈ جیسے آدمی کو قابو کر رکھا ہے اسے بے وقوف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میرے دل میں بوگارڈ کے لیے اتنی آگ ہے جو صرف اس کے خون سے ہی سرد ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے میں اسے قتل کر دوں یا پھر اس کے ہاتھوں مارا جاؤں۔"

"میں تم سے اس کی وجہ نہیں پوچھوں گی۔ بوگارڈ ظالم آدمی ہے۔ ہزاروں افراد اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اگر انہیں موقع مل جائے تو وہ اسے قتل کر دیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں بتا دوں اس ملک کے سربراہ سے کہیں زیادہ حفاظت کرنل بوگارڈ کی کی جاتی ہے۔ وہ اس ملک میں نسل پرست سفید فاموں کی آخری امید بھی ہے۔ وہ انہیں دوبارہ اقتدار دلا سکتا ہے۔"

"حیرت ہے سفید فام اب بھی اس فکر میں ہیں۔"

ریٹا نے سر ہلایا۔ "ان کی خوش قسمتی ہے کہ سیاہ فام قیادت نے دنیا کی نظر میں اچھا بننے کے لیے سفید فاموں سے نہ تو کچھ چھینا ہے اور نہ ہی انہوں نے سفید فاموں سے ان کے جرائم کا حساب طلب کیا۔ اسی معافی سے بوگارڈ جیسے لوگوں کو فائدہ ہوا جنہوں نے اپنے دور میں سیاہ فاموں پر بے





پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ اس سے ان نسل پرستوں کو حوصلہ ملا اور انہوں نے اس ملک پر پھر سے اقتدار کا سوچنا شروع کر دیا ہے۔"

"لگتا ہے تم سفید فاموں کے اقتدار کی حامی نہیں ہو۔"

"ہاں...... کیونکہ میری ماں ایک رنگدار عورت تھی۔ اس کا باپ سیاہ فام اور ماں سفید فام تھی۔ اس جرم میں ان دونوں کو جنگل میں جانوروں کی طرح دوڑا دوڑا کر مارا گیا تھا۔ میری ماں نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی۔ اس نے بھی ماں باپ والی غلطی کی تھی۔ اس نے ایک سفید فام سے محبت کی شادی کی اور دونوں معاشرے میں دھتکار دیئے گئے تھے۔ میرا باپ ڈاکٹر تھا۔ اسے نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ مجبوراً اسے ایک چیرٹی ہسپتال میں معمولی تنخواہ پر نوکری کرنا پڑی تھی۔ میری ماں کو کینسر ہو گیا تو وہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس کا علاج نہیں کرا سکا تھا۔ وہ سسک سسک کر مر گئی تھی۔ میں اس طرح کی نفرت انگیز زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ گوروں نے ہمیں دھتکار دیا تھا۔ کالے بھی ہمیں منہ لگانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم غریبوں کی ایک بستی میں رہتے تھے۔ یہاں پر ہر فرد دوسرے سے لاتعلق تھا۔ خوش قسمتی سے میری رنگت آنکھیں اور بال سفید فاموں جیسے تھے اس لیے جب میں نے جوہانسبرگ میں آ کر رہائش اختیار کی تو کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوا کہ میری رگوں میں غیر سفید فام خون بھی ہے۔"

"مجھے بھی ابھی تک شک نہیں ہوا۔" میں نے اعتراف کیا۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کرنل بوگارڈ کے آدمی کا انتظار۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے ساتھ نہیں بلکہ تم میرے ساتھ کرنل بوگارڈ کے پاس جاؤ گی؟"

"پلیز...... تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ کرنل بوگارڈ اکیلا نہیں ہوتا کہ تم جاؤ اور اسے مار دو۔ اس کے درجنوں ذاتی محافظ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جہاں ہوگا وہ جگہ بھی بہت محفوظ ہوگی۔ کرنل بوگارڈ ظالم ہی نہیں بزدل بھی ہے۔ اسے اپنی جان سب سے پیاری ہے۔"

"ہر ظالم شخص بزدل ہوتا ہے اور اسے اپنی جان پیاری ہوتی ہے لیکن اسے ایک نہ ایک دن جان دینی ہی پڑتی ہے۔"

"تم اکیلے اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"مس ریٹا! مجھے خوفزدہ مت کرو۔ جان مجھے بھی پیاری ہے اور میں کرنل بوگارڈ کو خودکشی کر کے نہیں ماروں گا۔ اگر مجھے لگا کہ میں اسے آسانی سے نہیں مار سکتا تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔"

اس نے شک سے مجھے دیکھا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو نا۔ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے دو افراد کو بوگارڈ کو قتل کرنے کی کوشش میں مرتے دیکھا ہے۔ ایک بار تو مجھے بوگارڈ کے ساتھ اپنی موت کا بھی یقین آ گیا تھا۔ ہم سمندر کے کنارے سن باتھ لے رہے تھے کہ وہ شخص غوطہ خوروں

والے لباس میں سمندر سے نکلا اور ایک چھوٹی تلوار لہراتا ہماری طرف دوڑا۔ اس وقت دور دور تک بوگارڈ کا کوئی محافظ نہیں آ رہا تھا مگر بوگارڈ سکون سے تولیے میں لپٹا اسے پاس آتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ ''خدا کے لیے کچھ کرو۔ یہ پاگل لگ رہا ہے۔''

''فکر مت کرو۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

حملے کے لیے آنے والا سیاہ فام ہم سے کوئی دس فٹ دور تھا کہ اچانک نہ جانے کہاں سے گولی چلی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا اور پھر میں نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا تھا لیکن حملہ آور کو مارنے والا مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ بوگارڈ کے محافظ ایسے ہی ہیں اور تم یقین کرو گے جب تک ہم وہاں رہے حملہ آور کی لاش بھی پڑی رہی۔ میں نے بوگارڈ سے چلنے یا لاش اُٹھانے کو کہا تو اس نے جواب دیا کہ تفریح کا صحیح لطف اب آ رہا ہے۔''

''وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تم اس تک رسائی بھی حاصل کر لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ اتنا قلعہ بند ہوتا ہے کہ کوئی چیونٹی بھی اس کے آدمیوں کی نگاہ سے چھپ کر اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔''

''گڑیا! یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔'' میں نے اُکتا کر کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس فلیٹ میں تمہارے علاوہ اور کون رہتا ہے۔ غلط مت بولنا۔''

''کوئی بھی نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ سیکیورٹی کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

''حالانکہ تم کرنل بوگارڈ جیسے شخص کی محبوبہ ہو جس کے لاتعداد دشمن ہیں مجھے حیرت ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح غیر محفوظ چھوڑا ہے۔''

''اسے پروا صرف اپنی ذات کی ہے لیکن ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میری حفاظت کرے گا۔''

''غالباً یہاں پر الارم سسٹم ہے۔ اگر کوئی زبردستی اندر گھسے تو ایک بٹن دبانے سے کہیں الارم بجنے لگے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اس قسم کا سسٹم ہے لیکن تم نے فون انگیج کر کے اسے ناکارہ کر دیا چالاک آدمی۔'' اس کے اپنائیت بھرے لہجے پر میرے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور ابھی مجھے شاید ایک دو دن اس جگہ رہنا تھا۔ پہلے میں نے سخت ہونے کا سوچا لیکن یہ سوچ کر فیصلہ ملتوی کر دیا کہ اگر وہ سچ مچ میرے لیے نرم گوشہ رکھ رہی تھی تو میرے رویے سے بدک جاتی۔

''مس ریٹا! میں ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی چالاکی کا مطلب ناگہانی وفات بھی ہوسکتا ہے۔''





''مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں تم سے پورا تعاون کر رہی ہوں ورنہ میرے لیے بوگارڈ کو مطلع کرنا مشکل نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''مطلب یہ کہ۔'' اس نے صوفے کا کشن ہٹا کر نیچے سے ایک چھوٹا سا اور جدید ترین موبائل فون نکالا۔ ''بس اس کا ایک بٹن دبانے کی دیر ہوتی اور ہماری یہاں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ نشر ہو جاتا۔''

میں نے موبائل فون لے کر اس کا معائنہ کیا۔ ''ممکن ہے تم نے کال کر دی ہو۔''

''تم بہت شکی مزاج شخص ہو۔'' وہ جھنجھلا گئی۔ ''میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔''

''بات یہ ہے مس ریٹا کہ میں نے اپنی جان داؤ پر لگا کر تم تک رسائی حاصل کی ہے اور ایسے شخص کو کسی پر بھی شک کرنے کا حق ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں کرنل بوگارڈ نے اس فلیٹ میں کچھ ایسے انتظامات کرا دیے ہوں کہ تمہاری بے خبری میں وہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہو۔''

ریٹا کا چہرہ گلابی سے سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ''نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا مس ریٹا! اس نے کچھ نہ کچھ تو انتظام کیا ہوگا ورنہ کیا اسے الہام ہوگا کہ تم پر کوئی افتاد آ پڑی ہے۔''

''وہ...... وہ...... اس نے مجھے تسلی دی تھی۔'' ریٹا کا لہجہ کھوکھلا تھا پھر وہ گڑبڑائی۔ ''پلیز...... ایسی بات نہ کرو کہ دہشت سے میرا دم نکل جائے۔ تم ابھی بھی نہیں جانتے کہ وہ کس قدر سفاک شخص ہے۔ اسے میرے بارے میں ذرا سا شبہ ہو گیا تو وہ مجھے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ میں نے تم سے جو باتیں کی ہیں اگر وہ کرنل بوگارڈ تک پہنچ گئی ہیں تو مجھے عبرتناک انجام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔''

'ڈرو مت۔ میں نے صرف ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ ممکن ہے یہ محض خدشہ ہو ورنہ اب تک کوئی نہ کوئی آ چکا ہوتا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس نے سکون کا سانس لیا۔ ''ہاں یہ تو ہے۔ پلیز...... اب مذاق میں بھی مجھ سے ایسی خوفناک بات نہ کرنا۔''

میں غور کر رہا تھا کہ اگر مجھے چند دن یہاں رکنا پڑا تو مجھے کن احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا پڑے گا۔ میں نے اسے کہا۔

''مجھے پورا گھر دکھاؤ۔ کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔''

اس نے خاصی ناگواری سے مجھے گھر دکھایا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر وہ ننھا سا پستول بھی میرے حوالے کر دیا جو اس نے بیڈ کی سائیڈ دراز میں رکھا تھا۔

''آج تک اسے چلانے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی امید ہے کہ میں اس سے کسی انسان پر فائر

کر سکوں گی چاہے وہ کرنل بوگارڈ ہی کیوں نہ ہو؟''

میں نے پستول اَن لوڈ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ آخر میں وہ مجھے کچن میں لے کر آئی اور بے حد طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اب کہو تو یہاں کی کیبنٹس بھی کھول کر دکھا دوں۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مجھے شدت کی بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ جو بھنا کر سچ مچ کیبنٹس کھولنے جا رہی تھی، کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ میں نے صبح صرف ایک کافی لی تھی۔ کیا کھاؤ گے؟''

''اگر مچھلی ہے تو ورنہ ایک سینڈوچ بنا دو۔ میں گوشت نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی میں دودھ یا اس سے بنی کوئی شے استعمال کروں گا۔''

''یعنی تمہیں پورک سے پرہیز ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔ ''کہیں تم یہودی یا مسلمان تو نہیں ہو۔ وہی سور نہیں کھاتے ہیں۔''

''مسلمان ہوں۔'' میں کچن کے ایک طرف ٹیرس کے ساتھ رکھی میز پر ٹک گیا۔ سلائیڈنگ ڈور ہٹانے پر یہ کھلا ہوا ٹیرس بن جاتا۔ ریٹا نے فریج سے مچھلی اور غالباً اپنے لیے گائے کے گوشت کے پارچے نکالے۔ مچھلی اور گوشت کے ٹکڑے فرائی کرنے کے لیے رکھ کر اس نے ڈبل روٹی نکالی پھر کچھ ہی دیر میں ہم کھانے کی ٹیبل پر تھے۔

''یہ کھاؤ...... جب تک میں مچھلی اور گوشت فرائی کر لوں۔''

''شکریہ۔''

ہم نے سکون سے اپنا اپنا کھانا ختم کیا۔ دبلی جسامت اور چھریرے جسم سے قطع نظر اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ اس نے لنچ میں کوئی ایک پونڈ گوشت اور چار عدد سینڈوچز کھائے تھے۔ کھانے کے بعد میں نے برتن سمیٹنے میں اس کی مدد کی اور جب تک اس نے برتن دھوئے میں نے تازہ کافی بنائی۔ کافی لے کر ہم لاؤنج میں واپس آ گئے۔ اگرچہ ریٹا نے ٹیرس میں بیٹھنے پر اصرار کیا لیکن میں کسی ایسی جگہ جانے کے لیے تیار نہیں تھا جو دور سے سہی لیکن باہر سے نظر آئے۔ ریٹا کو میری بات ماننا پڑی تھی۔ میں نے لاؤنج میں رکھا ٹی وی چلا دیا اور مقامی خبریں دکھانے والا چینل لگا دیا۔ حسبِ توقع چینل سے جونی والٹر کے مرڈر کی رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔ پولیس نے ملبے سے اس کے پوتے کی لاش بھی تلاش کر لی تھی البتہ ان کے پاس سے ملنے والے اسلحے کی تفصیل گول کر دی گئی تھی۔ رپورٹر نے صرف اتنا بتایا کہ جائے وقوعہ سے کچھ اسلحہ بھی ملا تھا۔ اسی طرح کیبن تلے موجود کنویں اور اس میں موجود دو عدد تازہ لاشوں کا کوئی ذکر نہیں تھا یعنی یہودی اپنے ذرائع بروئے کار لا کر ان سب باتوں کو چھپانے میں کامیاب رہے تھے۔ کہانی کچھ اس طرح سے بنائی گئی تھی کہ جونی والٹر اور اس کا پوتا اس کیبن تک گئے تھے۔ یہ کیبن ان کی تفریح گاہ بھی تھا۔ یہاں پر نامعلوم افراد





نے حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔ شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ حملہ بھی اس قتل و غارت گری کی ایک کڑی ہے جو گزشتہ چند ہفتے سے جوہانسبرگ میں جاری تھی اور اس کا مرکزی کردار جوزف نامی شخص تھا جو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے جنوبی افریقہ میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی شبہ تھا کہ وہ درحقیقت مسلمان ہے اور اپنی شناخت چھپا کر دہشت گردنہ کارروائیوں میں مصروف ہے۔

''یہ تمہارے بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' ریٹا نے اچانک پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' میرے لہجے میں بے ساختہ تلخی آ گئی تھی۔ ''آج کل کے دور میں مسلمان اور دہشت گردی ہم معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ مغربی دنیا کا رویہ ہے اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ کا دہشت گرد ہونا عین قرین قیاس ہے۔''

''لیکن سب ایسا نہیں سمجھتے۔'' اس نے گویا جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتی۔''

''میں تمہاری یا عام لوگوں کی طرف اشارہ کر بھی نہیں رہا ہوں۔ میری مراد ایک خاص طبقے سے ہے جو مغرب کی سیادت، قیادت، فوج اور میڈیا پر چھایا ہوا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو اپنا حریف قرار دے چکے ہیں اور عوام کو بھی یہ باور کروا رہے ہیں۔''

''لیکن اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔'' ریٹا نے مجھے تسلی دی۔ ''ہم تعلیم یافتہ ہیں اور شعور رکھتے ہیں مگر اس طبقے نے ہمیں بھی جکڑ رکھا ہے۔ ہمیں روزگار اور آسائشوں کے حصول کے نہ ختم ہونے والے چکر میں ڈال دیا ہے۔ ہم بھی بے بس ہیں۔ اس نظام سے فرار ہو کر کہیں جا بھی نہیں سکتے اس لیے مجبوراً اس کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے اور ان لوگوں کو سب سے بڑا خطرہ یہی ہے کہ اسلام کہیں ایک بہتر متبادل نظام کے طور پر سامنے نہ آ جائے اس لیے یہ اس کی تعلیمات اور خوبیوں کو مسخ کر کے خاص طور سے مغرب کے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں تاکہ مغرب کے عوام اس مذہب اور اُس کے ماننے والوں سے متنفر ہو جائیں اور اس کی طرف توجہ نہ دیں۔''

''یہاں مجھے تم سے اتفاق ہے۔'' ریٹا بولی۔ ''لیکن ساتھ ہی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے اس تاثر کی تردید کی اتنی کوشش نہیں کی جا رہی ہے جتنی اس کی ضرورت ہے۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ میڈیا بھی مغرب کے قبضے میں ہے۔ وہ مسلمانوں کی وضاحت کو یا تو جگہ نہیں دیتے ہیں یا دیتے ہیں تو اسے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔''

''مسلمان اپنا میڈیا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔''

''ہاں...... لیکن اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو افغانستان میں الجزیرہ ٹی وی کے دفتر کے ساتھ ہوا یعنی اسے سمارٹ بموں سے تباہ کر دیا۔ ایک صحافی کے ساتھ ناروا سلوک پر مغربی میڈیا

آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ انسانی حقوق کی اس کھلی خلاف ورزی پر کہیں سے آواز نہیں اُٹھی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں یا ان کے اداروں کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوئی ہے تب بھی مغرب اسے جائز سمجھتا ہے۔ یہی رویہ ان اقوام کے درمیان خلیج بڑھا دیتا ہے۔'' میں جوش سے بولتے بولتے یک دم خاموش ہو گیا پھر خجل ہو کر اسے دیکھا۔ ''معاف کرنا میں بھول گیا تھا۔ یہ سب تمہیں کہنا بے کار ہے۔''

''میں تمہاری بات پوری طرح نہیں سمجھ سکتی لیکن میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہی ہوں۔''

''اتنا ہی بہت ہے۔'' میں نے کافی ختم کر کے مگ رکھ دیا۔ ریٹا صوفے پر پاؤں سمیٹ کر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خمار جھلکنے لگا تھا، تاہم یہ جذبات کا نہیں بلکہ نیند کا خمار تھا۔

''اگر تم اجازت دو تو میں تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ خود میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں گزشتہ پینتیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا لیکن میں ریٹا پر اعتماد کر کے سونے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ ریٹا نے بھانپ لیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم کیوں نہیں سو جاتے۔ تمہیں بھی نیند آ رہی ہے۔''

''معاف کرنا میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا تو وہ جھینپ گئی تھی پھر اس نے سوچ کر کہا۔

''ایک تجویز ہے۔ میرے پاس ایک ہتھکڑی ہے۔ تم وہ اپنے اور میرے ہاتھ میں باندھ دو۔ اپنا اسلحہ اور چابی مجھ سے دور رکھ دو۔'' اس نے جتنی سادگی سے کہا تھا۔ تجویز اتنی سادہ نہیں تھی۔

معاً میری نظر لاؤنج کے ایک کونے میں لگے آرائشی فولادی ستون پر پڑی۔ یہ فرش سے نکل کر چھت تک جا رہا تھا۔ میں نے ریٹا سے پوچھا۔

''ہتھکڑی کہاں ہے؟''

اس نے پاس رکھی میز کی دراز سے ہتھکڑی نکالی۔ ''یہ بوگارڈ لایا تھا خاص مقصد کے لیے۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''وہ نت نئے طریقوں سے مجھ سے تسکین حاصل کرتا رہا ہے۔''

میں نے ہتھکڑی اس کی کلائی میں ڈالی اور اسے لے جا کر ستون سے جکڑ دیا۔ میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ وہ ہتھکڑی کلائی یا ستون سے نہیں نکال سکتی تھی۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم جب میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہوں تو تم......''

''معاف کرنا ریٹا! میرے خیال میں عورت پر اعتبار کرنا شرافت ہے لیکن اس پر مکمل اعتبار کرنا حماقت ہے اس لیے ایک بار پھر سوری اب تم آرام کرو۔''

''میں کہاں آرام کروں؟'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔

''اس پر۔'' میں نے صوفہ گھسیٹ کر اس کے نزدیک کر دیا۔





وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر جھٹکے سے صوفے پر لیٹ گئی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں ایسی کوئی شے نہیں تھی جس سے وہ فائدہ اُٹھا کر خود کو آزاد کر سکتی یا کسی سے رابطہ کر سکتی۔ اچانک میں نے جھک کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے بوکھلا کر کہا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ مجھے اس کی تلاش تھی۔'' میں نے اس کے بالوں سے دو عدد پنیں نکال لی تھیں۔ یہ با آسانی ہتھکڑی کھولنے کے کام آ سکتی تھیں بشرطیکہ ریٹا کو ان کا استعمال آتا ہو۔ عین ممکن ہے وہ نہیں کھول سکتی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر بُرا مانا تھا مگر منہ سے کچھ بولی نہیں۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے سب سے پہلے اس کے شاندار اور خوشبوؤں سے مہکتے باتھ روم میں غسل کیا۔ گزشتہ کئی دن کی میل اور مٹی کی تہہ کے ساتھ تھکن بھی اُتر گئی تھی۔ اپارٹمنٹ سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا اس لیے باہر والی سردی کا نام و نشان نہیں تھا۔ نہا کر میں نے اس کے بیڈ سے تکیہ اور چادر لی اور لاؤنج میں اس سے ذرا فاصلے پر دوسرے صوفے پر دراز ہو گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

پھر میری آنکھ ریٹا کے پکارنے سے کھلی تھی۔ وہ دبی زبان میں پکار رہی تھی۔ میں چونک کر اُٹھا وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔

''سوری! میں تمہیں نہیں جگاتی لیکن مجھے واش روم جانا ہے۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے یعنی مجھے سوتے ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے اُٹھ کر اسے کھولا اور اس کے ساتھ باتھ روم تک آیا۔

ذرا جلدی آنا، پھر مجھے جانا ہے۔''

اسے واپس لا کر دوبارہ ستون سے جکڑ کر میں نے باتھ روم کی راہ لی۔ واپسی پر اسے کھولا۔

''اگر کھانے کے لیے ایک بار پھر زحمت کر لو۔''

''سوری۔'' اس نے رُکھائی سے کہا۔ ''تم نے کھانا ہے تو خود زحمت کرو۔''

''لگتا ہے تم ناراض ہو۔''

''میں ناراض نہیں ہوں۔ ایک قیدی ہوں اور تم سے تعاون کرنا میرا حق نہیں، البتہ تم زبردستی مجبور کرو تو الگ بات ہے۔''

''میں تم سے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں لیکن مس ریٹا! گزشتہ چند مہینے میں مَیں نے اتنے دھوکے کھائے ہیں کہ اب میں کسی کی صورت دیکھ کر اعتبار نہیں کرتا۔ تم نے بھی ٹھیک کہا تم مجھ سے تعاون کی پابند نہیں ہو۔ خیر میں دیکھتا ہوں، تمہارے لیے کیا لاؤں؟''

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''سوری! میں جذباتی ہو گئی تھی۔ مجھے کھولو میں کھانا بناتی ہوں۔ تم کیا کھانا پسند کرو گے؟''

میں نے اس کی ہتھکڑی کھول دی۔ ''وہی دوپہر والی شرائط کے ساتھ تم کچھ بھی کھلا دو۔ تمہارے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔ شکر ہے مجھے اپنا بنایا نہیں کھانا پڑا۔''

کچن میں وہ چند منٹ میں موڈ میں آ گئی تھی۔ چہکنے اور اپنے بارے میں بتانے لگی۔ وہ بچپن میں زبردست کھلاڑی تھی اور جوانی میں اس نے سوئمنگ مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ کسی حد تک جمناسٹک سے بھی واقف بھی تھی۔

''تب ہی تمہارا جسم اتنا مناسب ہے۔'' میں نے کہا تو وہ سرخ ہو گئی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''سنو میں باتھ لینا چاہتی ہوں۔''

''شوق سے لو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔''

اس نے الماری سے ایک دوسرا لباس نکالا اور واش روم میں چلی گئی۔ میں بیڈ روم میں رہا تھا۔ اس پر اس حد تک اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ شاہانہ انداز میں سجا بیڈ روم تھا جس میں نسوانی لطافتوں کا مکمل خیال رکھا گیا تھا۔ کرنل بوگارڈ اپنی محبوبہ پر کھل کر خرچ کر رہا تھا۔ وہ تیس منٹ میں نہا کر نکل آئی تھی۔ اس نے چھوٹے سے فریج سے اپنے لیے وہسکی نکالی اور میری طرف دیکھا۔

''میں نہیں پیتا۔'' میں نے کہا۔

''مسلمان ہونے کی وجہ سے۔''

''اس وجہ سے بھی اور اس لیے بھی کہ شراب کو ذاتی طور پر کوئی اچھی چیز نہیں سمجھتا ہوں۔''

وہ بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس نے ہلکے سرخ رنگ کا کسی قدر مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ اوپر سے یہ محض دو عدد ڈوریوں کے سہارے اس کے مرمریں شانوں سے ٹکا تھا اور نیچے...... گھٹنوں سے اوپر ہی تھا۔ وہ دلکش لگ رہی تھی لیکن میں ایسے نظاروں کا عادی ہو چکا تھا۔ دوسرے پیگ کے بعد اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا تھا اور یہ نیند کا خمار نہیں تھا۔ وہ میرے نزدیک کھسک آئی۔

''کیا تم کسی سے محبت کرتے ہو؟''

یہ حرف آغاز تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب اسی طرف آئے اس لیے میں نے پوری سنجیدگی سے اقرار کر لیا۔

''ہاں...... میں ایک لڑکی سے شدید محبت کرتا ہوں۔ صرف اس کے لیے جینا چاہتا ہوں۔''

وہ بجھ گئی تھی۔ ''کیا وہ بہت خوب صورت ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔''

''اس کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن اس کے مقابلے میں مجھے کوئی دوسری خوب صورت نہیں لگتی ہے۔''

وہ مزید بجھ گئی اور مجھ سے دور ہو گئی تھی۔ ''میرا نہیں خیال کہ کوئی مرد کسی عورت کا اس حد تک وفادار ہو سکتا ہے۔''





''اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مرد نہیں دیکھا بلکہ جانور دیکھے ہیں اور انسان جب جانوروں کی سطح پر اُتر آئے تو اس سے وفاداری نہیں ہوتی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے اب تم سو جاؤ۔''

''اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو تم مجھے دوبارہ باندھ سکتے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے میرا ڈانس کرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔'' وہ اُٹھ کر میوزک پلیئر تک گئی اور اس کا بٹن دبا دیا۔ فضا موسیقی سے گونجنے لگی تھی۔ وہ ہولے ہولے اس موسیقی پر ڈولنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کا رقص اشتعال انگیز ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے جذبات اُبھارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس پر رقص جنوں طاری ہو گیا۔ اس کا بدن کسی پارے کی طرح مچل رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ماہر رقاصہ تھی۔ رقص کرتے کرتے وہ تیزی سے میری طرف آئی اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، وہ مجھ پر ڈھیر ہو چکی تھی۔ اس نے بازوؤں سے مجھے جکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''پلیز...... مجھے مایوس نہ کرنا۔ میں سچے پیار کو ترسی ہوئی ہوں۔''

''احمق عورت! اسے سچا پیار نہیں صرف جسمانی ہوس کہتے ہیں۔'' میں نے جھٹکے سے اسے دور کر دیا اور پھر اُٹھ کر اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لاؤنج تک لایا۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دینے کے ساتھ سسکتی رہی۔ اسے صوفے پر دھکیل کر میں نے اسے ہتھکڑی سے باندھ دیا۔

''ذلیل! کمینے۔''

''تم نشے میں ہو اور جذبات کی ماری ہو اس لیے معاف کر رہا ہوں۔'' میں نے سرد انداز میں خبردار کیا۔

''مارو مجھے۔''

''میں بلاوجہ کسی کو قتل نہیں کرتا۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی جس سے میری جان خطرے میں پڑی تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔''

بیڈ روم سے تکیہ اور چادر لا کر اس کے پاس رکھی۔ وہ بدستور رو رہی تھی البتہ گالیاں دینا بند کر دی تھیں۔ میں نے ایک بار پورے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ تمام کھڑکیوں کے شیشے بند تھے اور ان پر پردے بھی تھے۔ باہر کا دروازہ اندر سے لاک کیا۔ میں نے کنڈی اور حفاظتی زنجیر بھی چڑھا دی۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور میں کرنل بوگارڈ کے کسی گرگے کی آمد سے پہلے تازہ دم ہو جانا چاہتا تھا۔ میں آ کر لاؤنج میں لیٹ گیا۔ اپنا اسلحہ پاس ہی رکھا تھا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔

رات کے دو بجے کال بیل بجی تو میں اُچھل گیا تھا۔ میں نے ریٹا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ گئی تھی اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''بوگارڈ کا آدمی مجھے لینے آ گیا ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے جلدی سے اس کی ہتھکڑی کھولی۔ ''اسے اندر بلاؤ۔''

''تت...... تم اسے قتل کر دو گے۔'' وہ ہکلائی۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں اس سے کرنل بوگارڈ کا پتہ معلوم کروں گا۔ چلو دروازہ کھول کر اسے اندر بلاؤ اور یاد رکھنا کوئی حماقت مت کرنا ورنہ میں مرا یا زندہ رہا تم ضرور ماری جاؤ گی۔''

سونے سے اس کا نشہ اُتر گیا تھا اور وہ اس وقت پوری طرح حواس میں تھی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف چل دی۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی، میں دروازے کے عقب میں پوزیشن لے چکا تھا۔ اس نے دروازہ اَن لاک کر کے باہر جھانکا اور پھر بُری طرح چونکی تھی۔

''بوگارڈ؟''

''ہاں ڈیئر۔'' بوگارڈ کی کڑک دار آواز آئی تو میرے جسم میں بھی سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بوگارڈ خود چلا آئے گا۔

''دروازہ کھولو...... تم نے سپیکر سے کیوں نہیں پوچھا۔''

''وہ صحیح نہیں ہے۔ مسئلہ کر رہا ہے۔'' ریٹا نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا تھا۔ غالباً خطرے کے احساس نے اس کے اعصاب زیادہ ہی متحرک کر دیے تھے۔ ''تمہارے ساتھ یہ کون ہیں؟''

''میرے محافظ۔'' بوگارڈ کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ ''تم دروازہ کھولنے کے بجائے سوال کیوں کر رہی ہو؟''

''سوری بوگارڈ! یہ اندر نہیں آئیں گے۔ تم آؤ گے صرف، ہمیشہ کی طرح۔''

اس پر بوگارڈ نے غرا کر کہا۔ ''دروازہ کھول کتیا!''

''نہیں کھولوں گی۔ میں اتنے عرصے سے تم سے اکیلے میں ملنے کے لیے ترس رہی تھی اور تم اپنے ساتھ یہ کتے لے آئے۔ کیا یہ بیڈ روم میں بھی ہوں گے؟''

''بکواس نہ کر، یہ باہر ہی رُکیں گے۔'' بوگارڈ بھنا گیا تھا۔ ''میں نے کب کہا کہ یہ اندر آئیں گے۔''

''سوری ڈارلنگ!'' ریٹا نے دروازہ کھولا اور اس کے گلے لگ گئی۔ میں نے کچھ اور آوازیں بھی سنیں۔ بوگارڈ کچھ زیادہ ہی بے تاب تھا۔ ریٹا نے حیران کن عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے بوگارڈ کے آدمیوں کو باہر ہی روک دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے بوگارڈ کو اس طرح اندر کھینچا کہ اس کی پشت میری جانب تھی اور اُس نے ہاتھ سے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے عقب سے پستول کی نال بوگارڈ کی گردن پر رکھ دی۔

''حرکت نہ کرنا اور نہ آواز نکالنا۔ ممکن ہے یہ تمہاری آخری حرکت یا آواز ہو۔'' میں نے





سرگوشی کی تو وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے ہاتھ مار کر اس کا پستول نکال لیا۔ سردی کی وجہ سے اس نے ہلکا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور اس میں اسلحہ چھپانے کی خاصی گنجائش تھی۔ تفصیلی تلاشی کا کام میں نے ملتوی کر دیا اور اسے مشین پسٹل کے زور پر دھکیل کر بیڈ روم تک لایا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے اسے زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر دونوں ہاتھ گدی پر رکھنے کا حکم دیا۔ وہ کٹکھنے کتے کی طرح غرایا۔

''تم اپنے حق میں بُرا کر رہے ہو۔''

''بوگارڈ! میرا کہنا مانو ورنہ مر جاؤ گے۔ مجھے تم سے زیادہ کسی شخص سے نفرت نہیں ہے۔ تم نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ میں بھی نہیں بھول سکتا۔ اگر مجھے تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کرنا پڑے تب بھی میری تسکین نہیں ہو گی۔'' میرے لہجے میں آگ تھی جسے محسوس کر کے بوگارڈ نے اپنے ہاتھ گدی پر رکھ لیے تھے۔

ریٹا میرے اس روپ سے سہم کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے بوگارڈ کی تلاشی لی اور پھر اس کا اوورکوٹ اُتار دیا۔ اس نے معمولی سی مزاحمت کی پھر اس کے بغلی ہولسٹر سے ایک ریوالور اور نکالا اور اس کی گھڑی اُتار کر ایک طرف ڈال دی۔ اس کی قمیص کھینچی تو اس نے بھنا کر کہا۔

''کیا میری پتلون بھی اُتارو گے؟''

''آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔ کھڑے ہو کر کپڑے اُتار دو سوائے انڈرویئر کے اگر تم نے پہنی ہے تو۔''

وہ کھڑا ہوا اور خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا مگر میری صورت دیکھ کر اس نے بادلِ نخواستہ اپنے کپڑے اُتارنے شروع کیے۔ دراصل مجھے خطرہ تھا کہ اس کے پاس ایسا کوئی آلہ نہ ہو جس سے وہ اپنے آدمیوں کو سگنل دے دے۔ سوائے انڈرویئر کے اس نے سارے کپڑے اُتار دیے تب اس کی پنڈلی سے بندھا چمڑے کا چھوٹا سا ہولسٹر سامنے آیا جس میں ننھا اور چپٹا پستول رکھا تھا۔ میں نے وہ پستول بھی لے لیا۔ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے اتنا مسلح ہو کر آتا تھا تو کسی خطرناک مہم پر جاتے وقت کتنا مسلح ہوتا ہو گا۔

''اب بھی وقت ہے اس ساری فضول جدوجہد کو ترک کر دو۔'' اس نے انڈرویئر میں ہوتے ہوئے مجھے یوں مشورہ دیا جیسے ہم کسی میٹنگ میں ہوں۔ ''تم جانتے ہو ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے ورنہ اب تک اس دنیا سے تمہارا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔''

''مگر ایسا نہیں ہو سکا تو اسے میں تمہاری نہیں بلکہ خدا کی مہربانی قرار دیتا ہوں۔''

بوگارڈ بہ ظاہر گٹھے ہوئے لیکن درحقیقت پلپلے جسم کا مالک تھا۔ اس کی توند بیلٹ کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی تھلتھلانے لگی تھی اور وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

"کچھ نہیں...... تم سے کچھ سوالات کروں گا اور پھر تمہیں کچھ لوگوں کے حوالے کردوں گا۔"

"کن لوگوں کے؟" وہ چوکنا ہوگیا تھا۔

"جو اس خطے میں نسل پرستی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ "تم مجھے حکومت کے حوالے کرو گے؟"

"میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں۔" میں نے دریافت کیا۔ "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ جان گرے کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن وہ جنوبی افریقہ میں ہے۔ فون پر وہ روز ہی میرا دماغ کھاتا ہے کہ میں تمہیں تلاش کروں۔"

"جان گرے سے تمہارے تعلقات کی نوعیت؟"

وہ مسکرایا۔ "ظاہر ہے میں اس کے لیے کام کررہا ہوں۔"

"اس کے لیے یا بین الاقوامی استعماری طاقتوں کے لیے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تمہیں یاد ہے جب تم نے اپنے دہشت گردوں کے ہمراہ مرفی کے فارم پر حملہ کیا تھا۔"

"وہ میرے ساتھی تھے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیاہ فام گوریلے کب سے تمہارے ساتھی ہوگئے؟"

"کک...... کیا مطلب؟" وہ بُری طرح چونکا تھا۔

"مطلب یہ کہ جب تم نے مرفی کے فارم پر حملہ کیا تھا تو اس حملے میں تم نے سیاہ فام استعمال کیے تھے۔ یہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ وہ سیاہ فام نسل پرست تحریک کے گوریلے تھے۔"

اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آئے تھے مگر ایک لمحے کے لیے وہ جلد سنبھل گیا۔

"تمہیں یہ بات کیسے پتہ چلی؟"

"جیسے یہ بات کہ مرفی کے فارم پر حملہ تم نے کیا تھا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"وہ کرائے کے آدمی تھے۔" بوگارڈ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اس خطے میں جنگجو سیاہ فام صرف نسل پرست یا حریت پسند تحریکوں کے پاس ہیں۔ افریقہ کے حریت پسند کسی صورت تم جیسے متعصب سفید فام سے تعاون نہیں کر سکتے لیکن اس خطے میں چلنے والی سیاہ فام تحریکیں مجھے عالمی سامراجی طاقتوں کے مقاصد پورے کرتی نظر آرہی ہیں۔"

"تم یہاں کیا کررہے ہو۔ تمہیں تو کسی تھنک ٹینک میں ہونا چاہیے تھا۔" بوگارڈ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔"





"تو تم یوں نہیں مانو گے۔" میں نے گہری سانس لی اور اچانک اس کی رانوں کے درمیان ٹھوکر ماری۔

"اوغ......" وہ دوہرا ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر پستول کی بھاری نال ماری اور وہ آواز نکالے بغیر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

ریٹا نے اضطراری آواز نکالی۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

"دیکھتی رہو۔" میں نے کہا۔ "اس کے کپڑے ہیں یہاں پر خاص طور سے ٹائز؟"

"یہاں وارڈ روب میں اس کے کپڑے بھی ہیں۔" اس نے اُٹھ کر الماری سے ایک عدد ٹائی نکال کر مجھے دی۔ ایک ٹائی اس کے اُتارے کپڑوں میں تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کس کر باندھ دیئے پھر باتھ روم میں میڈیکل بکس میں رکھا چوڑا میڈیکو ٹیپ لا کر اس کے منہ پر لگا دیا۔

"فریج سے سرد پانی نکالو۔"

"سنو...... اگر تم اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو بے کار ہے۔ یہ کچھ بتانے کے بجائے مر جانا پسند کرے گا۔"

"بے بی! ابھی تم بہت کچھ دیکھوگی۔ یہ فر فر بولے گا۔"

آدھا گلاس سرد پانی حلق سے اتروا کر اور آدھا گلاس پانی چہرے پر چھڑک کے جانے کے بعد اسے ہوش میں آنا پڑا تھا۔ پانی پلانے کے لیے میں نے ٹیپ اُتار دیا تھا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی کراہ کر آنکھیں کھولیں اور پھر اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ اُبلا ہی تھا کہ میں نے اس کا منہ ہتھیلی تلے دبا دیا۔ ناف پر زور پڑا تو وہ بلبلا گیا تھا۔

"سنو بوگارڈ! اگر تم اس فکر میں ہو کہ تمہارے آدمی تمہیں بچا لیں گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے میں کتنے ہی تربیت یافتہ لوگ میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اس کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہے اس لیے اب محتاط رہ کر بات کرنا۔"

میں نے اس کا منہ اتنی سختی سے بند کیا تھا کہ اس کے ہونٹ چھل گئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس نے دوبارہ بکواس سے گریز کیا۔

"بوگارڈ! مجھے بتاؤ کہ یہاں سیاہ فاموں سے تمہارا کیا تعلق ہے اور تم نے اندرون ملک کہاں کہاں دہشت گردوں کے اڈے بنا رکھے ہیں؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ ان سب چیزوں سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔"

"تم تعلق کی فکر نہ کرو۔ بس میرے سوال کا جواب دو۔"

"ان تحریکوں کے لیڈرز سے میرے تعلقات ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں یہ تو آتا ہے کہ سفید فام پھر سے اپنی حکومت لانے کی کوشش کررہے ہیں لیکن سیاہ فام نسل پرست لیڈرز کس لیے تمہارا ساتھ دے رہے ہیں؟"

بوگارڈ مسکرایا۔ ''ہم نے ان کی نفسیات سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ اس خطے میں اپنی حکومت نہیں بلکہ اپنے قبیلے کی برتری چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے انہیں اسلحہ درکار ہے جو انہیں ہم فراہم کر سکتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اس طرح تم افریقہ پر غلبہ پالو گے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''نہیں بلکہ تم اپنے لیے مستقبل کے تربیت یافتہ دشمن پیدا کر رہے ہو۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ممکن ہے ایک دن افریقہ میں بھی سفید فاموں کا غلبہ ہو جیسے کسی زمانے میں امریکہ میں ہوا تھا۔''

''اتنے اونچے خواب مت دیکھو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''یہ بتاؤ کہ مرفی کے فارم پر اس قتل و غارت گری کی وجہ کیا تھی۔ ظاہر ہے مجھے تم زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔''

''مرفی اور اس کی بھتیجی...... سفید فاموں کے بجائے سیاہ فاموں کی حمایت کرتے تھے۔ اس حملے سے ہم نے دو مقاصد حاصل کیے۔ ایک تو مرفی اور اس کی بھتیجی کو سزا دے دی۔ دوسرے علاقے میں سیاہ فاموں کے ہمدردوں کو پیغام دیا کہ ان کا بھی یہ حشر ہو سکتا ہے اس لیے وہ باز رہیں۔ سیاہ فام گوریلے استعمال کر کے ہم نے یہ مقصد بھی حاصل کیا کہ علاقے کے سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے درمیان یکجہتی کا خاتمہ کر دیا۔'' وہ بلا جھجک مجھے بتا رہا تھا شاید اس وجہ سے میں اسے نہ مارنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا پھر اس نے نفرت سے ریٹا کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ کتیا تمہارے ساتھ مل گئی ہے۔''

میں نے بوگارڈ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ''اس کا نام عزت سے لو۔ میں نے اسے مجبور کیا تھا جیسے تم نے مجبور کیا تھا۔ بے چاری عورت ہمیشہ مجبور ہوتی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں یہاں سے غائب ہوا تو ریٹا بچ جائے گی۔ سب سے پہلے یہ پکڑی جائے گی اور وہ لوگ اسے بُری طرح ادھیڑ کر رکھ دیں۔''

''تو میں کیا کروں۔ یہ اس کی قسمت ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''مسٹر بوگارڈ! اب میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کروں گا جو تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ نہ جانے وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ ممکن ہے تمہیں مار دیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے تمہیں معاف کر دیں اس لیے میں اپنی طرف سے تمہیں ایک سزا دوں گا۔ اس سزا کو سزا سے زیادہ مستقبل میں اس خطے کو خانہ جنگی کی آگ سے بچانے کی کوشش سمجھنا۔ میرے بس میں ہو تو تمہیں ہزار بار قتل کروں لیکن افسوس میں فطرتاً قاتل نہیں ہوں۔''

''تم...... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ ''کچھ کرنے سے پہلے سوچ لینا میرا انتقام بہت سخت ہوگا۔''

''اگر مجھے یقین ہوتا کہ بعد میں تم مجھ پر قابو پالو گے اور بھیانک انتقام لو گے تب بھی تمہیں نہ





بخشتا۔'' میں نے کہتے ہوئے اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ یہ اتنا سخت ٹیپ تھا کہ کسی صورت نہیں اُتر سکتا تھا۔

''تم اس کے ساتھ کیا کرو گے؟'' ریٹا نے پوچھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہا تو وہ اُٹھ کر باہر آ گئی۔ میں نے اسے پھر سے ستون سے منسلک ہتھکڑی سے باندھ دیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ مجھے کیوں باندھ رہے ہو؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''ریٹا! میں تمہارے حق میں بہتر کر رہا ہوں۔ بعد میں جب تم بوگارڈ کے آدمیوں کو اس حالت میں ملو گی تو وہ تم پر زیادہ شک نہیں کریں گے۔''

''پلیز میں......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ میں نے اس کے سر پر گھونسا مارا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے دھیرے سے صوفے پر لٹا دیا۔ ''سوری بے بی۔''

کچن سے میں نے ایک نوک دار چھری لی اور واپس بیڈ روم میں آیا۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر کرنل بوگارڈ مچلنے لگا۔ وہ چھری سے زیادہ میرے چہرے کے تاثرات سے دہشت زدہ ہوا تھا۔ اس نے کروٹ لی لیکن اس جگہ اس کے بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی حالت اس وجہ سے زیادہ عبرت ناک لگ رہی تھی کہ ذرا فاصلے پر اس کے دو مسلح محافظ اپارٹمنٹ کے باہر موجود تھے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''بوگارڈ! اگر اس وقت تمہارا منہ کھلا ہوتا تو یقیناً تم اپنی جان کی پروا کیے بغیر اپنے محافظوں کو آواز دینے کی کوشش کرتے۔ بائی دی وے تم کتنے محافظ اپنے ساتھ لائے ہو۔ دو، چار۔''

اس نے سر ہلایا لیکن اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ مجھے جواب درکار بھی نہیں تھا۔ میں اس سے باتیں کر کے اپنے اندر حوصلہ جمع کر رہا تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ وہ کرنے جا رہا تھا جو اس سے پہلے کسی انسان کے ساتھ نہیں کیا تھا۔

''بوگارڈ! جانتے ہو انسان کا سب سے بڑا ذریعہ معلومات کیا ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کے نزدیک آ کر کہا اور اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کہتے ہیں اگر کسی جوان اور باشعور شخص کو اس کی آنکھوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنی...... معلومات کے حصول سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔''

میری بات سن کر بوگارڈ سر پٹخنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر معافی کی التجائیں پھیل رہی تھیں۔

''نہیں کرنل! ایسے مت دیکھو۔ میں بہت حوصلہ کر کے یہ کام کرنے جا رہا ہوں۔ تم جیسے شخص کے لیے معافی ان بے شمار لوگوں کے ساتھ ظلم ہوگا جو تمہارے ظلم کا شکار ہو چکے ہیں۔ تم نے ان پر ترس نہیں کھایا اس لیے اب تم پر بھی ترس نہیں کھایا جا سکتا ہے۔''

میں نے اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر اس کا سر پکڑا۔ وہ اتنی قوت سے مچل رہا تھا کہ مجھے اس

کام میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ احتیاطاً میں نے چھری کی نوک انچ بھر اوپر سے پکڑی اور پھر اسے بے دردی سے بوگارڈ کی بائیں آنکھ میں اُتار دیا۔ وہ بُری طرح اُچھلا تھا۔ اگر میں نے چھری دستے تک تھام نہ رکھی ہوتی تو وہ خاصی اندر تک اُتر جاتی اور عین ممکن تھا کہ وہ دماغ میں لگنے سے مر جاتا۔ اس کی آنکھ سے خون بہہ نکلا تھا۔ دردناک غرغرانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا تھا کہ کوئی متوقع آواز ریٹا تک نہ جا سکے۔

"بوگارڈ! یہ اس لڑکی کے نام پر جو انسانوں کا درد رکھتی تھی اور اس نے ابھی زندگی کی کئی بہاریں دیکھنا تھیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کا سر پکڑا۔ اس بار اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مزاحمت سے مزید تکلیف ہوگی مگر اس بار بھی وہ بُری طرح اُچھلا تھا اور میں نے احتیاط نہ کی ہوتی تو اس بار اس نے کامیاب خودکشی کر لی ہوتی۔ شاید اس نے کوشش بھی اسی چیز کی تھی۔ میں نے اس کے تڑپنے کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کی دونوں آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ تیز نوک نے لینس اور اندرونی پردے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ کوئی ماہر ترین سرجن بھی اسے ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ اندرونی پردے کے باہر ہونے سے عدسے کی تبدیلی بھی بوگارڈ کی بینائی واپس نہیں لا سکتی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا۔ وہ ناک سے رونے کے ساتھ سر پٹخ کر اپنی تکلیف کا اظہار کر رہا تھا۔ اگر اس کا منہ کھلا ہوتا تو وہ فلک شگاف چیخوں سے اپنے محافظوں کیا پوری عمارت کو اکٹھا کر لیتا۔

میں نے کچن میں جا کر چھری اور ہاتھوں سے خون صاف کیا اور پھر چھری سے اپنی انگلیوں کے نشانات بھی صاف کر دیئے تھے۔ واپسی پر بوگارڈ کو دیکھ کر میں نے لاؤنج میں آ کر کینی مین کا نمبر ملانے کا سوچا لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ فون انڈر آبزرویشن بھی ہو سکتے ہیں۔ ریٹا کا موبائل میرے پاس تھا۔ میں نے اس پر کینی مین کا نمبر ملایا۔ اس نے فوری طور پر فون ریسیو کیا۔ میں نے کہا۔

"میں بول رہا ہوں تمہارا مفرور مہمان، نام مت لینا۔"

"تم کہاں ہو؟"

میں نے اسے پتہ بتایا۔ "اپنے آدمی فوری طور پر روانہ کرو۔ تمہارا سب سے بڑا دشمن بے بسی کی حالت میں میرے پاس ہے۔ باہر اس کے چار محافظ ہیں۔ ان سے نمٹنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے اپارٹمنٹ کے باہر۔"

"تمہارا مطلب ہے کرنل......"

"پلیز...... نام لینا مناسب نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس وقت کم ہے۔ اگر اس کے محافظوں کو شک ہو گیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔ پولیس اس طرف متوجہ ہو جائے گی اور مجھے اس کو چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔"

"تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے میرے دوست!" کینی مین کی آواز مارے خوشی کے





لرز رہی تھی۔ "میں ابھی اپنے آدمی روانہ کرتا ہوں۔"

"جتنی جلدی ہو گی خطرہ اتنا ہی کم ہوگا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ کرنل بوگارڈ کو کینی مین کے حوالے کر کے میرا دردِ سر کم ہوتا اور کینی مین اس سے معلومات حاصل کر کے اس خطے میں نسل پرستوں پر کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس میں شبہ تھا۔ اس کے آدمی اب تک غدار ثابت ہوتے آئے تھے یا بکتے رہے تھے۔ اس کے دشمنوں کو تمام تر ضربات میں نے ہی لگائی تھیں لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چوائس بھی نہیں تھی۔ بوگارڈ کو کینی مین کے حوالے کر کے میں اتنا استحقاق تو حاصل کر سکتا تھا کہ وہ مجھے اس ملک سے نکل جانے اور لندن جانے میں مدد دیتا۔ میں نے فون ریٹا کے سامنے کیا تھا۔ وہ ہتھکڑی سے بندھی بے ہوش پڑی تھی اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اس نے میری گفتگو سنی ہوگی۔ ایک بار میں دروازے تک گیا اور کی ہول سے باہر دیکھا۔ بوگارڈ کا ایک محافظ سامنے والی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اسے یا اس کے ساتھیوں کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ اندر ان کے آقا پر کیا گزر رہی تھی۔ اپنے خیال میں وہ بوگارڈ کو ریٹا کے ساتھ خوش فعلیوں میں مصروف سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ کسی وجہ سے خبردار بھی ہو جاتے تب بھی میں ان سے نمٹ سکتا تھا لیکن اس صورت میں ہنگامہ ہوتا اور میں کرنل بوگارڈ کو یہاں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس صورت میں بوگارڈ کو مار دینا مناسب ہوگا بہ نسبت اسے زندہ چھوڑ کر جانے کے۔

میں نے سامنے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا ہلکا سا پردہ ہٹا کر نیچے دیکھا۔ بڑی سی سڑک کے پار بے شمار گاڑیاں پارک تھیں۔ ان میں سے بوگارڈ کس گاڑی میں آیا تھا یہ کہنا دشوار تھا۔ عمارت کے اندر پارکنگ صرف وہاں کے رہائشیوں کے لیے مخصوص تھی۔ وہاں باہر سے کوئی گاڑی لا کر پارک نہیں کر سکتا تھا لیکن اس بارے میں کہنا دشوار تھا۔ ممکن ہے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت بوگارڈ نے گاڑی اندر پارک کی ہو۔ مجھے کینی مین کے آدمیوں کا انتظار تھا۔ عین ممکن تھا ان کی آمد پر ہنگامہ ہوتا اور ہمارا جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا ضروری تھا۔ میں نے کوٹ پہن کر اپنا اور بوگارڈ سے حاصل شدہ اسلحہ اس کی جیبوں میں رکھ لیا تھا۔

ایک بار میں نے جا کر بوگارڈ کو دیکھا۔ وہ نیم غشی میں تھا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والا خون کسی قدر جم گیا تھا۔ اپنی اہم ترین حس سے ہاتھ دھونے کے باوجود اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے جا کر کافی بنائی اور فریج سے پائن ایپل کا ٹن نکال کر اس سے پائن ایپل کے ٹکڑے کھائے۔ کافی تیار ہوئی تو اس کا مگ لے کر میں واپس کھڑکی تک آیا۔ نیچے دیکھتے ہوئے کافی پینے لگا۔ مگ خالی کر کے میں واپس جانے کے لیے ہلا ہی تھا کہ سامنے سے آتی روشنیوں کی قطار نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کئی گاڑیاں تھیں۔ وہ بے ترتیبی سے پاس آ کر عمارت کے سامنے رُک گئیں۔ ان میں سے لوگ نکل کر اوپری طرف آنے کے لیے دوڑے۔ حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے کپ رکھا اور باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ اس ننھے پستول کی

آواز زیادہ نہیں ہوتی۔ بوگارڈ کے ساتھی با آسانی مارے جاتے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس جگہ فائرنگ کا شور گونجے مگر دروازے کے قریب آ کر رُک گیا۔ باہر موجود لوگ بے شک بوگارڈ کے ساتھی تھے لیکن وہ میرے ذاتی دشمن نہیں تھے جنہیں میں بے دریغ مار دیتا۔ میں نے سوچا اور اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ کینی مین کے آدمی ان سے جس طرح مناسب سمجھتے نمٹتے۔ میں دروازے پر ہی رُک گیا۔ باہر دونوں محافظ بے حد دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک بولا۔

''اے......رُکو......کون ہو؟''

اگلے ہی لمحے باہر سے گھٹی گھٹی سی آوازیں آئیں۔ آنے والوں نے بے آواز ہتھیاروں سے فائرنگ کی تھی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھولا۔

''کون ہے باہر؟''

''اگر ہمارا مہمان تمہارے پاس ہے تو دروازہ کھول دو۔'' باہر سے کسی نے سیاہ فاموں والے لہجے میں کہا۔

''سامنے آ کر شناخت کراؤ۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

ایک سیاہ فام سامنے آیا۔ اس نے ہاتھ میں مشین گن اُٹھا رکھی تھی۔ اسرائیلی ساخت کی اس مشین گن پر سائلنسر بھی لگ جاتا ہے۔ اسی سے بے آواز فائرنگ کر کے سیاہ فام نے بوگارڈ کے دونوں محافظوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

''میں نے تمہیں کینی مین کے پاس دیکھا تھا۔ اب دیر نہ کرو۔ ہمیں پانچ منٹ کے اندر یہاں سے نکلنا ہے۔''

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ''کرنل بوگارڈ اندر پڑا ہے۔''

سیاہ فام نے چونک کر کہا۔ ''ہمیں اسے لینے بھیجا ہے جیسی......''

''ہاں......اور اسے جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچانا ہے جہاں حکومت کی ساری مشینری بھی اسے تلاش نہ کر سکے۔''

''یہ جن تمہارے قابو میں کیسے آ گیا۔'' سیاہ فام اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو لفنگے نظر آنے والے سیاہ فام تھے۔ میں نے انہیں دیکھا۔ یہ نمونے ساتھ لا کر اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا کام کیا تھا۔ شاید عجلت میں اسے یہی ملے تھے۔ وہ مخصوص انداز میں ہلتے جلتے اندر آئے۔ اندر سے سیاہ فام کی تحیر انگیز آواز آئی۔

''جیسی! یہ کیا کیا تم نے اس کے ساتھ۔''

میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ان دونوں نمونوں سے کہا۔ ''کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ تمہاری انگلیوں کے نشان رہ جائیں گے یہاں۔''





ایک نے مجھے گھور کر دیکھا اور دوسرے نے شیلف پر رکھا سنہری کپ اُٹھا کر اپنی پتلون کی ڈھیلی سی جیب میں ڈال لیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر اندر آیا جہاں سیاہ فام بوگارڈ کا معائنہ کر رہا تھا۔

''میں نے اس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں۔''

سیاہ فام نے جھرجھری لی۔ ''مگر کیوں؟''

''تم نے باہر موجود دو افراد کو کیوں مارا؟''

اس نے لاجواب ہو کر دونوں نمونوں کو اندر بلایا اور بوگارڈ کو نیچے لے جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے ڈھیلے سے انداز میں بوگارڈ کو اُٹھایا اور سوالیہ نظروں سے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

''اسے نیچے لے جاؤ۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ میں نے بوگارڈ کو ان سے لے کر اپنے شانے پر لاد لیا۔

وہ بوگارڈ کو پرائیویٹ لفٹ کے ذریعے نیچے لائے۔ پارکنگ میں سیاہ فام نے ایک سیاہ لینڈ کروزر دور کھڑی کی ہوئی تھی۔ میں نے بوگارڈ کو اس کے عقبی حصے میں ڈال کر اسے وہاں پڑی ترپال سے ڈھک دیا تھا۔ جب میں آگے بیٹھنے لگا تو یہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا کہ وہ دونمونے بے ہوش ریٹا کو بھی لا رہے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''

''لڑکی۔'' ایک نے بڑے سادہ سے انداز میں کہا۔

''کیا یہ تمہاری والدہ ہے جسے تم لیے چلے آ رہے ہو۔'' میں غرایا۔ ''اسے یہیں کہیں ڈال دو۔''

نمونے نے اپنے باس کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر ریٹا کو پارکنگ کی طرف ڈال دیا۔

اس کے بعد ان کے بیٹھتے ہی سیاہ فام نے گاڑی چلا دی تھی۔

''ہمیں کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال مجھے کینی مین سے اس بارے میں ہدایت لینی پڑے گی۔'' اس نے کہا اور موبائل فون پر رابطہ کرنے لگا۔

''فادر! ہم نے اسے حاصل کر لیا ہے۔ اب کہاں لے جائیں۔ یہ مصیبت ہے۔'' وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے سنتا رہا۔

''او کے فادر! اسے لے جاتے ہیں۔'' اس نے فون جیب میں رکھ کر رفتار مزید بڑھا دی۔

اس نے دس منٹ بعد گاڑی ایک ہائی وے کی طرف گھما دی۔

''رفتار قابو میں رکھو...... پولیس پیچھے لگ گئی تو......'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''ان کی عقل مندی کی وجہ سے یہ معاملہ زیادہ دیر چھپا نہیں رہے گا۔ جیسے ہی کسی نے پارکنگ میں ریٹا کو دریافت کیا تو بات کھل جائے گی۔ ان دونوں محافظوں کی لاشیں کہاں ہیں؟''

"ہم نے اپارٹمنٹ میں ڈال دی تھیں۔" ایک نمونے نے بگڑے لہجے میں کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے کینی مین کی مدد سے لندن کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ عین ممکن تھا کہ اس کے ساتھیوں کی وجہ سے میں مارا جاؤں۔ اب تک میں کئی بار بال بال بچ چکا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ لوگ بوگارڈ سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے۔ اچانک گاڑی نے جھٹکا لیا اور اس کی رفتار کم ہونے لگی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

"پتہ نہیں...... شاید گیس ختم ہو گئی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بس اسی کی کمی رہ گئی تھی۔ باقی گاڑیاں کہاں ہیں؟"

"انہیں میں نے واپس بھیج دیا تھا۔" سیاہ فام متفکر لہجے میں بولا۔

میرا دل چاہا کہ گدھے کی بولی بولوں۔ میں ایسے گدھوں میں پھنس گیا تھا جنہیں اپنے گدھے پن کا احساس تک نہیں تھا۔

"اب کیا کریں گے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اے دری! تم نے گیس کیوں نہیں ڈلوائی؟" سیاہ فام نے اس نمونے سے دریافت کیا جس نے نشہ ٹوٹنے کی شکایت کی تھی۔

"میں بھول گیا تھا باس۔" اس نے جمائی لے کر کہا۔

چیک کرنے پر اضافی کین بھی خالی ثابت ہوئے۔ میں نے کینی مین سے رابطہ کیا اور اس کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑا تھا۔

"یہ تم نے کن احمقوں کو بھیج دیا ہے؟"

"کیا ہوا؟"

"بس کچھ دیر بعد ہم پولیس کے قبضے میں ہوں گے اور تم ہمیں چھڑانے کے بجائے خود چھپتے پھر رہے ہو گے کیونکہ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ پکڑے جاتے ہی تمہارا نام لے لیں۔" میں نے کہہ کر موبائل بند کر دیا۔

"باس! اسے بکواس کرنے سے روکو۔" ایک نمونے نے سیاہ فام سے درخواست کی۔

"بکومت! تم دونوں نے کام بگاڑا ہے۔" سیاہ فام نے اسے ڈانٹا۔ "ذرا کسی جگہ پر پہنچنے دو پھر دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔" اس نے دھمکی دے کر اپنا موبائل نکالا اور کسی سے رابطہ کر کے اسے گاڑی اس ہائی وے پر لانے کو کہا۔ اس نے گاڑی رُکنے سے پہلے روک کر کنارے کر لی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی پولیس کار ان کی طرف ضرور متوجہ ہو گی اور اس موقع پر میرا کار میں پایا جانا مناسب نہیں ہو گا کیونکہ میرے پاس کوئی کاغذ نہیں تھا اور سیاہ فاموں کے ساتھ میرا ہونا پولیس کو خاص طور سے میری طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ میں نے سیاہ فام سے کہا۔



"سنو! اپنا اسلحہ چھپا دو۔ میں تمہاری گاڑی سے ذرا فاصلے پر رہوں گا لیکن اگر میں تم سے بچھڑ جاؤں تو بھی رُکنا مت چلے جانا۔ اب اپنا موبائل نمبر بتاؤ۔"

سیاہ فام نے سر ہلایا۔ "تم درست کہہ رہے ہو۔" اس نے مجھے موبائل نمبر دیا جو میں نے ریٹا کے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا اور جیپ سے اُتر کر ہائی وے کے ساتھ اُگی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ آسمان پر بادل تھے۔ میں دعا کر رہا تھا کہ بارش نہ ہو جائے ورنہ میں مارا جاتا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے ہائی وے کی طرف دیکھا۔ اس کی روشنیوں میں جیپ صاف نظر آ رہی تھی۔ صبح کے چھ بجے کے قریب ٹریفک بہت کم تھا لیکن وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جاتا اور کسی مسئلے میں پڑنے کا امکان بڑھ جاتا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب میں نے ایک پولیس کار کو جیپ کے پاس رُکتے دیکھا اور مایوسی سے سوچا کہ کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے بوگارڈ کو قابو کرنے اور اسے کینی مین کے پاس پہنچانے کے لیے جو محنت کی تھی وہ رائیگاں جاتی نظر آ رہی تھی۔ پولیس کار سے دو آفیسر اُتر کر جیپ کی طرف بڑھے۔ جیپ سے کوئی نہیں اُترا تھا۔ پولیس آفیسر کو شیشہ بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا تھا۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پولیس کو جیپ کے نزدیک نہ آنے دیتے۔ وہ خود بھی جیپ سے اُتر سکتے تھے۔ پولیس والے ترپال کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے بلکہ اب وہ ایسا نہ کرتے تو مجھے حیرت ہوتی۔

پولیس آفیسر نے عقبی دروازہ کھول کر ایک نمونے کو نیچے کھینچ لیا۔ غالباً وہ قانون سے زبان درازی کر رہا تھا۔ اس کے بعد دوسرے نمونے کی باری آئی اور سیاہ فام خود نیچے اُتر آیا۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں اسلحہ نہیں تھا البتہ پولیس والوں نے اپنے پستول نکال لیے تھے۔ میں جھاڑیوں میں سرکتا ممکنہ حد تک نزدیک آیا۔ ایک افسر جیپ کے اندر جھانک رہا تھا۔ اچانک اس نے بلند آواز میں کہا۔

"میرے خدا! یہ لاش ہے۔ نہیں یہ زندہ ہے۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں۔"

ایک سفید فام کی کسمپرسی نے پولیس افسر کو مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے اپنا رُخ ایک نمونے کی طرف کیا۔

"اسے کس نے اس حالت میں پہنچایا ہے۔ کہاں لے جا رہے تھے اسے؟"

"ہے آدمی! ہمیں کچھ نہیں معلوم۔" نمونے نے گھبرا کر کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ مشتعل سفید فام پولیس والا اسے گولی مارنے کا سوچ رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے اس کا ہاتھ کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر دوسرا والا اس کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ سیاہ فام نے اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور پھر اس لپٹ گیا۔ نمونوں نے زخمی ہونے والے پولیس آفیسر کو سنبھال لیا۔ جب تک میں نکل کر ان تک چا دوسرا پولیس افسر بھی سیاہ فام کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اس نے کنگ فو کا داؤ آزمایا تھا اور

پولیس والے کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ پہلے والے کو نمونوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ ایک نے اسے قابو کر رکھا تھا اور دوسرا اس کا گلا دبا رہا تھا۔ میں نے چھڑایا تو وہ اسے بھی مار کر اُٹھے۔ اس اثناء میں بڑی چیخنے کی آواز آئی تو میں نے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔ پولیس آفیسر اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو پولیس آفیسر زمین پر گر کر نزع کے عالم میں ہاتھ پیر چلانے لگا۔ میں نے ناگواری سے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

''اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تو کیا اس سے کشتی کرتا رہتا۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ان کی لاشیں فوری طور پر جھاڑیوں میں لے جاؤ۔ تم میں سے ایک پولیس کار بھی جھاڑیوں میں لے جائے۔ ایسا نہ ہو کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے۔''

اس بار نمونے پھرتی سے حرکت میں آئے۔ انہوں نے ایک ایک پولیس آفیسر سنبھال لیا اور انہیں جھاڑیوں کی طرف لے گئے۔ سیاہ فام نے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ ایک کین لے کر پولیس کار میں بیٹھ کر اسے جھاڑیوں میں لے گیا۔ دس منٹ بعد وہ وہاں سے پیٹرول سے بھرا کین لے کر نمودار ہوا اور جیپ کے ٹینک میں ڈال دیا۔

''چلو گیس کا انتظام ہو گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''باس...... اب فوراً نکل چلو۔'' ایک نمونہ بولا جس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ ''ورنہ مجھے چھینکیں آنے لگیں گی۔''

''خدا کے لیے نہیں۔'' سیاہ فام نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے جیپ سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ خوش قسمتی سے اس دوران میں وہاں سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی اس لیے کسی نے کچھ نہیں دیکھا پھر پولیس کار اور افسران کی گمشدگی زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے سوچا کن پاگلوں میں پھنس گیا ہوں۔ ایک کو فکر ہے کہ اسے چھینکیں نہ آنے لگیں اور اس کا باس حالات کے بجائے اس کی چھینکوں کے خوف سے جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جیپ ذرا دیر بعد ایک پسماندہ نظر آنے والے علاقے کی طرف مڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ سیاہ فاموں کی آبادی تھی۔ اگرچہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام حکومت سیاہ فاموں کو مساوی سطح پر لانے کے لیے کام کر رہی ہے لیکن اس کی کوشش تھی کہ سیاہ فام یہ مقام اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کریں نہ کہ انہیں سفید فاموں سے چھین کر دیا جائے جیسا کہ سفید فاموں نے کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیاہ فاموں کو آزادی حاصل کیے ایک عشرے سے زیادہ ہونے کو آیا تھا لیکن ابھی ان کی اور سفید فاموں کی معاشی اور معاشرتی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

اس آبادی میں جا بجا گندی گلیاں تھیں جہاں کچرا بکھرا تھا۔ در و دیوار نعروں اور تصویروں سے اَٹے تھے۔ مخصوص کالے کلچر کی چھاپ نمایاں تھی۔ جیپ ایک عمارت کی عقبی گلی میں داخل ہوئی اور





اس کے سرے پر پہنچ کر رک گئی۔ سیاہ فام نے اُتر کر سامنے نظر آنے والا نیلا دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر کسی کو آواز دی میں بھی نیچے اُتر آیا تھا۔ نمونے البتہ جیپ میں براجمان رہے تھے۔ اندر سے دو دیو قامت سیاہ فام آئے جو اس موسم میں بھی صرف پتلون میں تھے اور ان کے اوپری کسرتی بدن نمایاں تھے۔ وہ بوگارڈ کو اندر لے گئے۔ سیاہ فام باہر آیا اور اس نے جیپ کی چابی نمونوں کے حوالے کی۔

''یہ جیپ لے کر دفع ہو جاؤ اور کم سے کم ایک ہفتے تک اس شہر کی طرف مت آنا۔''

''لیکن باس ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

سیاہ فام نے دانت پیس کے کچھ نوٹ انہیں دیئے۔ ''یہ لو اور اب جاؤ۔ کوئی گڑ بڑ ہوئی تو تمہاری کھال اُتار دوں گا۔''

''باس میرا نشہ......'' منحوس صورت نے جمائی لے کر کہا تھا کہ سیاہ فام نے گن نکال لی۔ دونوں اُچھل کر بھاگ گئے تھے۔ ذرا دیر میں جیپ وہاں سے جا چکی تھی۔ میں نے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

''دوست...... اگر یہ پکڑے گئے تو پولیس کو یہاں آنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمارا مسئلہ ہے۔''

''جس میں مَیں مفت میں مارا جاؤں گا۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ ''براہِ کرم مجھے کینی مین کے پاس پہنچا دو یا اس کا پتہ بتاؤ۔ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اندر چلے جاؤ۔ فادر اندر ہے۔''

''پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔'' میں اندر کی طرف لپکا۔ حسبِ معمول کینی مین لفنگوں اور کیڑوں سے باہر لڑکیوں میں گھرا بوگارڈ کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک سفید فام کو دیوانہ وار اندر گھستے دیکھ کر ان میں سے کئی نے ہتھیار نکال لیے تھے مگر کینی مین نے انہیں اشارے سے روکا اور مجھے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔

''تم نے جنوبی افریقہ کی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''مجھے اتنا مت چڑھاؤ۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب اس کا کیا کرنا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دو جہاں پولیس یا بوگارڈ کے آدمیوں کا خیال بھی نہ جا سکے۔ یہ جگہ مجھے بالکل محفوظ نہیں لگ رہی ہے۔''

''فکر مت کرو۔ کسی کا خیال اس طرف نہیں آئے گا۔'' کینی مین بے حد خوش تھا۔ ''لیکن تم نے اسے اندھا کیوں کر دیا؟''

''اس لیے کہ مجھے ڈر ہے یا تو تم اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ گے یا پھر اسے اپنی قید میں نہیں [illegible] گے اس لیے میں نے پہلے ہی اسے ناکارہ کر دیا۔ اب یہ زندہ بھی رہا تو کسی کام کا نہیں ہو گا۔''

''اسے زندہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' کینی مین نے کہا۔ ''یہ کتنے ہی بے گناہ لوگوں کا قاتل ہے جن میں ہمارے سیکڑوں ساتھی بھی شامل ہیں۔''

''ظاہر ہے لیکن قدرت ایک الگ شے ہے۔ اس کے فیصلے بھی الگ ہی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ابھی اس کی موت کا وقت نہ آیا ہو۔ بہر حال یہ شخص تمہیں بتائے گا کہ جنوبی افریقہ اور باقی افریقہ میں استعماری طاقتیں نسل پرستی کے مرض کو کس طرح استعمال کر رہی ہیں۔ یہ تمہیں خفیہ ٹریننگ کیمپس اور دہشت گردی کے اڈوں کے بارے میں بتائے گا۔ ان معلومات سے تم فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔''

''ہم ایسا ہی کریں گے۔'' کینی مین نے پُرعزم لہجے میں کہا اور چیخ کر بولا۔ ''کیا ہجوم لگا رکھا ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس کی دھاڑ سنتے ہی سب منتشر ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں مَیں وہاں کینی مین اور میز پر پڑے بوگارڈ کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ کینی مین نے ایک الماری کھول کر اس کے اندر نہ جانے کیا کیا تھا کہ میز ایک چوکور مربع کی صورت میں فرش میں دھنسنے لگی۔

''آ جاؤ۔'' کینی مین نے مجھ سے کہا اور اُچھل کر میز پر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ ذرا سی دیر میں میز تقریباً پچیس فٹ کی گہرائی میں سطح سے لگی۔ اس کے چاروں طرف وسیع و عریض تہہ خانے تھے جس میں جدید آلات تھے۔ کمپیوٹرز اور مواصلات کے آلات سے یہ جگہ کنٹرول روم لگ رہی تھی۔ کینی مین نے بوگارڈ کو میز سے اُٹھا کر ایک کرسی پر ڈالا اور اس کے ہاتھ پیر اس پر جکڑ دیئے۔ وہ کسی قدر ہوش میں تھا لیکن اتنی ہمت نہیں تھی کہ مزاحمت کرتا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''اس کی زبان کھولنے کی تیاری۔'' کینی مین کے لہجے میں سفاکی تھی۔

کینی مین کی یہ بات مجھے پسند آئی تھی کہ اس نے اس معاملے میں کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ بوگارڈ کی زبان جلد از جلد کھلوا لینا ہی بہتر تھا۔ تاخیر کی صورت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کینی مین نے سب سے پہلے اس کا چہرہ سرد پانی سے صاف کیا۔ اس سے اسے پوری طرح ہوش آ گیا تھا۔ کینی مین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں لڑکے! تمہاری وجہ سے مجھے برسوں پُرانا حساب برابر کرنے کا موقع ملا ہے۔''

''کیسا حساب؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے پشت سے اپنی چست جرسی اوپر کی۔ اس کی پوری پیٹھ زخموں اور جلائے جانے کے نشانات سے بھری ہوئی تھی۔

''یہ آج سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ فوج کے ایک سارجنٹ نے محض اتنی سی بات پر مجھ پر تشدد کیا تھا کہ میں نے اپنی کار اس کی کار کے ساتھ پارک کرنے کی جرأت کیسے کی تھی۔ جب میں نے اس کا جواب دیا تو وہ مجھے پولیس کی مدد سے گرفتار کر کے نزدیکی پولیس اسٹیشن لے گیا جہاں اس





نے رات بھر مجھ پر بہیمانہ تشدد کیا تھا۔ کئی بار تو ایسا لگا جیسے میری جان نکل رہی ہو لیکن ڈھیٹ آدمی تھا۔ اپنے وکیل کے آنے تک زندہ رہا تھا پھر اس نے ضمانت پر میری رہائی کروائی تھی۔ مزے کی بات ہے اس تشدد پر سزا بھی مجھے ہی ملی تھی۔ عدالت کے گورے جج نے میرے زخم نظر انداز کر کے مجھے سات مہینے کی سزا سنائی دی کہ میں نے سرِعام ایک گورے فوجی پر حملہ کیا تھا۔ کیا خیال ہے تمہارا وہ گورا فوجی کون ہو سکتا ہے؟'' کینی مین نے مجھ سے پوچھا۔

جب میں نے بوگارڈ کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے۔ اس وقت بوگارڈ فوج میں نیا نیا آیا تھا اور چند برسوں میں اس نے متعصب سفید فام کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تھی جو سیاہ فام حریت پسندوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کا بیان ریکارڈ پر ہے کہ اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا جب تک وہ کسی سیاہ فام حریت پسند کی لاش نہیں دیکھ لیتا تھا۔ یہ تحریک کے تیس ہزار افراد کا قاتل ہے۔''

''بوگارڈ نے اپنے ہاتھ سے مارے تھے؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔

''نہیں لیکن اس کی سربراہی میں ہونے والے آپریشن میں اتنی ہی تعداد میں حریت پسند یا سیاہ فام مارے گئے تھے۔ اس کے سیاہ کارناموں میں جنوبی افریقہ میں دو گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹانا بھی شامل ہے۔ بوگارڈ نے محض اس شبے میں کہ ان دیہاتوں میں حریت پسند رُوپوش ہیں، راتوں کو گن شپس بھیج کر ان دیہاتوں پر بمباری کروائی اور اس کے نتیجے میں یہ دونوں گاؤں مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ ان میں بسنے والے پندرہ سو افراد میں سے بیشتر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔'' کینی مین ے طیش کے لرز رہا تھا۔ اس نے جھک کر بوگارڈ کے چھدرے بال پکڑ کر جھنجھوڑے۔

''سنے تم نے اپنے کرتوت۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' خلافِ توقع بوگارڈ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''البتہ تم نے مجھے اغوا اور پھر اندھا کر کے سنگین جرم کیے ہیں اور تمہیں ان کی سزا بھگتنا پڑے گی۔''

''میں اپنی سزا بہت پہلے بھگت چکا ہوں۔'' کینی مین نے تلخی سے کہا۔ ''اب تمہاری باری ہے مجرم بوگارڈ۔''

''اس سے زیادہ تم کیا کرو گے؟'' بوگارڈ مایوسی سے بولا۔ ''تم نے میری آنکھیں چھین کر مجھ سے سب چھین لیا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔ ابھی تمہارے پاس بہت کچھ ہے چھیننے کے لیے۔'' کینی مین کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''یہ ہاتھ، یہ بازو، یہ کان، یہ ناک اور یہ جان۔''

پہلی بار بوگارڈ اس کے لہجے سے خوفزدہ ہوا تھا۔

''تت..... تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ڈرا کر میری زبان کھلوا لو گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔''

''نہیں بوگارڈ! مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہیں ہے اور در حقیقت تم نے صرف ڈر کر زبان کھول دی

تو مجھے بہت مایوسی اور دکھ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی کھال کھنچوا کر اور ہڈیاں تڑوا کر اپنی زبان کھولو۔" کینی مین نے خونخوار لہجے میں کہا تھا۔ اس نے ایک پلاس نما آلہ اُٹھا رکھا تھا۔ اس نے بوگارڈ کا ہاتھ تھاما اور اچانک اس کے انگوٹھے کا ناخن پلاس سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ بوگارڈ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کینی مین اتنی جلدی اپنے کہے پر عمل کرے گا۔ اس کی لرزہ خیز چیخ سے تہہ خانہ لرز اُٹھا۔ کینی مین نے اس کے واویلے کی پروا کیے بغیر اس کا دوسرا ناخن بھی کھینچ لیا۔ اس بوڑھے میں بڑی آگ بھری تھی۔ اس نے بوگارڈ پر ذرا بھی رحم نہیں کھایا تھا جو بُری طرح چیخ رہا تھا۔ کینی مین نے پلاس ایک طرف رکھا اور ایک کونے میں رکھے کافی پاٹ سے کافی نکالی اور میری طرف دیکھا۔

"تم بھی پیو گے؟"

"مجھے معاف رکھو۔ میں اتنا دل گردہ نہیں رکھتا۔"

"میں بھی ایسا شخص نہیں ہوں۔ بعض دفعہ جب ہم سے جھڑپوں میں کوئی سفید فام مارا جاتا تھا تو مجھے اس کا بھی دکھ ہوتا تھا لیکن بوگارڈ کی تکلیف پر میرا دل چاہ رہا ہے کہ جشن مناؤں۔ افسوس کہ میں نے پینا تیس سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا اس لیے بس کافی چلے گی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس سے کوئی سوال کرنے سے پہلے اس کا کم سے کم ایک کان یا ناک کاٹ دوں۔"

"خدا کے لیے نہیں۔" بوگارڈ کراہا۔ "اس سے بہتر ہے کہ مجھے مار ڈالو۔"

"یہ آخری مرحلہ ہوگا لیکن میں کوشش کروں گا کہ تم زیادہ سے زیادہ دیر زندہ رہو اور زیادہ سے زیادہ تکلیف برداشت کرتے رہو۔" کینی مین جسمانی اذیت کے ساتھ ساتھ اسے ذہنی اذیت بھی دے رہا تھا۔

"بوگارڈ۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہے اس کی بات مان لو ورنہ یہ شخص تمہیں بے پناہ اذیت دے گا اور مرنے بھی نہیں دے گا۔ تم دیکھ نہیں سکتے ورنہ دیکھتے اس جگہ اذیت دینے کے کیسے کیسے آلات ہیں۔ بوگارڈ! اگر تم پتھر کے بھی ہوتے تو بول جاتے۔ ضد کر کے تم صرف اپنی تکلیف میں اضافہ کرو گے۔ زبان تو تمہیں کھولنا پڑے گی۔"

"اس سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نشتر مجھے پکڑاؤ۔" کینی مین نے مگ رکھ کر ایک طرف رکھا چاقو اُٹھایا۔ زبان سے کہنے کا مقصد بوگارڈ کو خوفزدہ کرنا تھا۔ اس کی اس سفاکی کا مقصد بوگارڈ کو جلد از جلد زبان کھولنے پر آمادہ کرنا تھا ورنہ شروع میں مجھے لگا تھا جیسے وہ سچ مچ اپنے انتقام کی تسکین کر رہا تھا۔ بوگارڈ نشتر کا سن کر بلبلا گیا تھا۔

"خدا کے لیے یوسف اسے روکو۔"

"سوری بوگارڈ! اول تو مجھے تم سے اتنی ہمدردی نہیں ہے۔ بس تم سے زیادہ سے زیادہ اتنی ہمدردی کر سکتا ہوں کہ تمہارے سر میں گولی مار کر اس عذاب کا خاتمہ کر دوں پھر یہاں کا انچارج کینی مین ہے۔"





"کینی مین! کیا تم مجھ پر رحم کرو گے؟"

"بشرطیکہ تم اپنی زبان کھول دو۔" کینی مین نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے اس ملک میں کام کرنے والی انتہا پسند تنظیموں کے روابط اور ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ۔ دوسرے انہیں اسلحہ اور مالیات کس ذریعے سے ملتی ہے۔ تیسرے اپنی اس خفیہ فورس کے بارے میں بتاؤ جو سفید فام افراد کو نسل پرستی پر اُبھار رہی ہے۔"

"میں ان سوالوں کے جواب آسانی سے نہیں دے سکتا۔ بہت ساری تفصیلات مجھے زبانی یاد بھی نہیں ہیں۔ یہ سب میرے لیپ ٹاپ کمپیوٹر میں محفوظ ہے۔"

"تم جتنا جانتے ہو بتاتے جاؤ اور میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔ اگر تم نے غلط بیانی کی تو میں اسے پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

کینی مین ایک ڈی جیٹل ریکارڈر لے آیا تھا جو لامحدود مدت تک وائس ریکارڈنگ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے بوگارڈ کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ وہ بولنے لگا۔ کینی مین اس سے سوال کر رہا تھا اور وہ اس کا جواب دے رہا تھا۔ درمیان میں اس نے اپنی انگلیوں کی مرہم پٹی کی درخواست کی جو کینی مین نے مسترد کر دی۔ اس نے کہا کہ جب تک بوگارڈ اس کی تسلی نہیں کر دیتا اسے کسی قسم کی طبی امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجبوراً بوگارڈ بولتا رہا۔ اس نے خاصے اہم انکشافات کیے تھے اگر یہ سچ تھے ورنہ میں قطعی نہیں جان سکا تھا کہ اس کے بیان اور گفتگو میں سچ کس حد تک ہے۔ بور ہو کر میں نے کافی پاٹ سے کافی نکالی۔ صبح نمودار ہو چکی تھی لیکن اس تہہ خانے میں اس کا کیا پتہ چلتا۔ میں نے اوپر ریستورانوں، ہوٹلوں، گھروں اور دکانوں پر کھانے پینے کے سامان کا تصور کیا تو میرے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ نہ جانے کچھ عرصہ سے میرے مقدر میں تہہ خانے اور ڈھنگ کے کھانوں کے بجائے دھکے رہ گئے تھے۔

• آٹھ بجے میں نے اشارے سے کینی مین سے کھانے کا پوچھا۔ اس نے ایک کونے میں رکھے فریج کی طرف اشارہ کیا جس میں دودھ، بوتل ڈبل روٹی اور انڈے تھے۔ میں نے انڈے نکال کر بوائل ہونے کے لیے رکھے اور توس سینکنے کے لیے ٹوسٹر میں ڈالے۔ دودھ ایک الگ برتن میں نکال کر گرم ہونے کے لیے رکھا۔ دس منٹ میں ناشتہ تیار تھا۔ ناشتہ کر کے میں نے باقی کینی مین کے لیے رکھ دیا۔ اب یہ اس کی مرضی تھی کہ وہ خود ناشتہ کرتا یا بوگارڈ کو یہ ناشتہ کراتا۔ میں ایک طرف کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ مجھے کینی مین اور بوگارڈ کے جوابات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ لندن جانے کے لیے تیار تھی۔ اگر ویزا لگ جاتا تو وہ چند دن میں وہاں پہنچ جاتی اور کینی مین میری مدد کرتا تو میں بھی اتنی ہی مدت میں لندن جا پہنچتا۔ اس کے بعد میں اور کاجل اس سارے چکر سے نجات حاصل کر کے دنیا میں کہیں بھی جا سکتے تھے۔ اچانک اوپر والا

خانہ کھلا اور فرش.....سمیت اوپر چلا گیا تھا، تیزی سے نیچے آیا اور اس سے وہی سیاہ فام کودا۔

"فادر! مسئلہ ہوگیا ہے۔ پولیس اس علاقے کو گھیرے میں لینے والی ہے۔"

میرے ساتھ کینی مین بھی اُچھل پڑا تھا اور بوگارڈ کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی تھی جسے اضطراری کہا جا سکتا تھا۔

"کینی مین! مخبری ہوئی ہے۔ بوگارڈ کو یہاں سے نکالو۔"

"اسے لے جاؤ۔" کینی مین نے بوگارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ سیاہ فام نے جھپٹ کر بوگارڈ کو اُٹھایا اور شانے پر لاد لیا۔ ہم اس میز والی لفٹ کے ذریعے اوپر آئے۔ کینی مین نے سیاہ فام سے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"پولیس میں ہمارے جو آدمی ہیں ان کی اطلاع ہے۔ وہ کرنل بوگارڈ کے لیے ہی ادھر آرہے ہیں۔" سیاہ فام نے بتایا۔

"اسے چار نمبر لے جاؤ اور وین استعمال کرنا ایمبولینس والی۔"

"میں سمجھتا ہوں فادر! میں نے پہلے ہی ایمبولیس بلوالی ہے۔"

کینی مین ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔ "تم اسے لے جاؤ۔ معاملات سنبھالنے کے لیے مجھے یہاں رہنا ہوگا۔"

"میں مسٹر جوزف کو ساتھ لے جاتا ہوں۔" سیاہ فام نے میری طرف دیکھا۔

"سوری۔" میں نے انکار کیا۔ "اب میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔"

"پلیز مسٹر جوزف!" کینی مین نے کہا۔ "اگر تم چلے گئے تو مجھے اطمینان رہے گا۔ دوسرے پولیس یہاں آئی تو ممکن ہے ہماری خفیہ جگہوں تک بھی پہنچ جائے۔ اس صورت میں بوگارڈ ملے نہ ملے تم ضرور پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گے۔"

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بادلِ نخواستہ سر ہلایا۔

"اوکے.....لیکن جلدی نکلو۔"

اس پتلی سی گلی میں ایمبولینس آگئی تھی۔ بوگارڈ کو اس کے عقبی حصے میں ڈال دیا گیا۔ ویسے اس کی حالت ایمبولینس میں لے جائے جانے والی ہو رہی تھی۔

"بائے فادر۔" سیاہ فام نے کہا اور عقبی دروازہ بند کر دیا۔

میرا مشین پسٹل اندر ہی رہ گیا تھا لیکن ریوالور تھا میرے پاس۔ سیاہ فام نے اسلحے کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے ریوالور دکھایا۔

"ٹھیک ہے۔ حالات سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار رہنا۔"

"اگر پولیس نے راستے میں روک لیا تو؟"





"انفرادی طور پر فرار کی کوشش کرنا۔"

"کرنل کا کیا ہوگا؟"

سیاہ فام نے سفاکی سے اسے دیکھا۔

"اس صورت میں پولیس کو اس کی لاش ملے گی۔" اس نے کہا اور آگے بیٹھے ڈرائیور سے بولا۔

"جلدی چلو۔ راستہ پتہ ہے نا؟"

"ہاں پتہ ہے۔" ڈرائیور نے کہا اور ایمبولینس کا سائرن آن کرتے ہوئے اسے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ ایمبولینس اندر سے خاصی وسیع تھی۔ بوگارڈ کو مریض یا زخمی لے جانے والے مخصوص اسٹریچر پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ ہوش میں تھا، کراہ کر بولا۔

"تم لوگ بچو گے نہیں۔ پولیس والے مجھے تلاش کرلیں گے۔"

"اگر انہوں نے ہمیں تلاش کر بھی لیا تب بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے بارے میں سن چکے ہو۔ اگر ہم پولیس کے گھیرے میں آئے تو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

"تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔ اس اذیت سے تو چھٹکارا ملے۔"

"اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی کرنل! ابھی تمہاری آنکھیں چھینی ہیں۔ دنیا میں لوگ اس سے بھی زیادہ گنوا کر زندہ رہتے ہیں۔"

"وہ عام لوگ ہوتے ہیں۔" بوگارڈ نے تلخی سے کہا۔ "کرنل بوگارڈ جیسے لوگ یوں بے بسی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ وہ پورے اختیار کے ساتھ رہتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ موت تمہیں بھی آئے گی لیکن کب یہ بات صرف خدا جانتا ہے اس لیے صبر سے اس کا انتظار کرو۔"

ایمبولینس ہائی وے کی طرف آگئی تھی۔ سیاہ فام چوکنا نظروں سے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کینی مین کے خاص آدمیوں میں سے تھا ورنہ وہ اس پر اتنا اعتبار کیوں کرتا کہ اس کا دعویٰ بغیر کسی تصدیق کے تسلیم کر لیتا۔

میں مطمئن تھا۔ اچانک سیاہ فام نے ڈرائیور سے ایمبولینس ہائی وے سے ایک ذیلی سڑک پر موڑنے کو کہا۔

"ہم نے اس طرف تو نہیں جانا ہے۔" ڈرائیور کے انداز میں حیرت تھی۔

"بحث مت کرو۔" سیاہ فام سخت لہجے میں بولا۔ "میں نے پلان بدل دیا ہے۔ ممکن ہے چار نمبر بھی پولیس کی نظروں میں ہو۔ اب میں اسے ایسی جگہ لے جاؤں گا جو بالکل محفوظ ہے۔"

ڈرائیور نے شانے ہلائے۔ اس نے ایمبولینس ہائی وے سے ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس طرف زیادہ تر کھلا علاقہ تھا۔ یہاں کہیں کہیں ناراہاری قسم کے مکان بنے نظر آرہے تھے۔ مجموعی طور

پر یہاں جھاڑ جھنکار زیادہ تھا۔ مکانوں کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی متروکہ علاقہ تھا جہاں کے بیشتر مکین نقل مکانی کر کے کسی اور علاقے میں جا بسے تھے۔ سڑک کی حالت بھی خستہ تھی۔ ایمبولینس کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

''باس...... مجھے نہیں یاد کہ اس طرف بھی ہمارا کوئی ٹھکانہ ہے۔'' ڈرائیور بولا۔ اس کے ساتھ بیٹھا شخص قطعی خاموش تھا۔ میں نے اسے ایک بار بھی بولتے نہیں سنا تھا۔ سیاہ فام مسکرایا۔

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ہماری تنظیم کے راز ہر ایک کے علم میں نہیں ہیں۔ فادر سب جانتا ہے یا وہ جسے چاہے بتا دیتا ہے۔ میں اس کے نزدیک ہوں اس لیے مجھے بہت ساری ایسی باتوں کا علم ہے جن کے بارے میں دوسرے نہیں جانتے۔''

سڑک جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ سے گھومتی جا رہی تھی۔ معاً مجھے فضا میں نمی کی مہک محسوس ہوئی۔ آس پاس کہیں دریا یا جھیل تھی کیونکہ سمندری مہلک الگ ہوئی ہے۔ سیاہ فام نے ایک کچے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''اس پر موڑ لو۔ آہستہ چلانا، راستہ بہت خراب ہے۔''

ڈرائیور نے رفتار کم کرتے ہوئے ایمبولینس اس طرف موڑ لی تھی۔ راستہ واقعی بہت خراب تھا۔ سیلن زدہ اور ناہموار، اس پر کیچڑ بھی کھڑی تھی۔ ایمبولینس کبھی بائیں طرف جھکتی تھی اور کبھی دائیں طرف۔ جھٹکوں سے بچنے کے لیے میں نے چھت سے لٹکتا کنڈا تھام لیا تھا۔ راستہ بعض جگہ سے اتنا تنگ تھا کہ اردگرد کی جھاڑیاں ایمبولینس کی باڈی سے رگڑ کھا رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے راستہ ختم ہوا اور ایمبولینس گھاس کے ایک میدان میں آنکلی جس سے ذرا فاصلے پر نیلے پانی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ کوئی جھیل تھی۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

''اب کس طرف جانا ہے؟''

''جھیل کے ساتھ ساتھ چلو۔ ذرا آگے ہی ایک کیبن ہے۔ ہمیں وہاں تک جانا ہے۔''

اس وقت بھی میں مطمئن تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ذرا دیر بعد ایمبولینس لکڑی سے بنے ایک وسیع کاٹیج کے سامنے رُکی۔ ڈرائیور نے سیاہ فام کی ہدایت پر مخصوص انداز میں ہارن دیا تو اندر سے دو افراد نمودار ہوئے۔ وہ مسلح تھے۔ سیاہ فام نے اُتر کر ان سے بوگارڈ کو اندر لے جانے کو کہا۔

''احتیاط سے وہ زخمی ہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' آنے والوں میں سے ایک نے سپاٹ سے لہجے میں کہا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

''ان دونوں کو عقبی طرف سے اندر لے جاؤ۔'' اس کا اشارہ میرے اور سیاہ فام کی طرف تھا پھر اس نے ڈرائیور اور اس کے ساتھی سے کہا۔





''تم دونوں بوگارڈ کو اندر لے چلو۔''

میں اس کے لہجے میں کرنل بوگارڈ کے لیے موجود احترام سے چونکا تھا مگر سیاہ فام مطمئن تھا اس لیے میرے شک کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم دونوں کیبن کے عقبی حصے کی طرف بڑھے تو اندر سے آنے والا ایک مسلح شخص ہمارے پیچھے تھا۔ اس کے انداز سے میری چھٹی حس بول اُٹھی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میں کچھ کرنے کا سوچتا۔ کاش کہ میں سوچتا۔

ہم عقبی حصے میں پہنچے تو ذرا فاصلے پر ایک شخص جھیل کی طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے جیسے اس صورتِ حال سے لاعلم ہو۔ اس لمحے مجھے یقین ہونے لگا کہ ہم یا کم سے کم میں پھنس گیا ہوں۔

''سر! یہ آ گئے ہیں۔'' ہمارے عقب میں آنے والے شخص نے بلند آواز میں کہا۔

وہ شخص پلٹا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ جان گرے تھا۔ میرا بدترین دشمن۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''خوش آمدید یوسف۔''

''تت...... تم؟''

''ہاں میں...... کیوں نہیں ہو سکتا؟'' اس نے اطمینان سے کہا اور اچانک ہمارے عقب میں موجود شخص کو حکم دیا۔

''شوٹ ہم۔''

اگلے ہی لمحے فضا فائرنگ کے شور سے گونج اُٹھی۔

فائرنگ کا قیامت خیز شور گونجا تو جھیل کے کنارے درختوں پر پرندے چیخنے چلانے لگے۔ کوؤں کی ایک ٹولی نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ فائر اتنے نزدیک سے ہوئے تھے کہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بے اختیار کلمہ پڑھ لیا۔ جب تک میرے عقب میں موجود شخص کے ہاتھ میں مشین گن سے تڑتڑاہٹ کی آواز آتی رہی میں منتظر رہا کہ کب دہکتے انگارے میرے جسم میں گھستے ہیں۔ فائرنگ شاید دو تین سیکنڈ جاری رہی تھی لیکن مجھے لگا جیسے نہ جانے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں صحیح سالم کھڑا تھا۔ اچانک میرے ساتھ کھڑا سیاہ فام کینی مین کا دستِ راست لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی پشت پر کئی خون آلود سوراخ تھے جن سے تازہ خون اُبلنے کا عمل ابھی جاری تھا۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا تو وہ مسکرایا۔

''غداروں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ جو اپنی قوم کا نہیں وہ کسی کا نہیں ہوتا ہے۔''

''تم نے اسے لالچ دیا ہوگا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب میرے لیے کیا ارادہ ہے؟''

''فکر نہ کرو یوسف تم میرے دوست ہو۔''

"براہِ مہربانی اتنی بڑی گالی نہ دو۔" میرا لہجہ کاٹ دار تھا۔ "ہماری زبان میں ایک شعر ہے۔ ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو۔ یہ تم جیسے لوگوں کے بارے میں ہی کہا گیا ہے۔"

"شٹ اَپ!" جان گرے کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ گرے رنگ کی پتلون اور سبز رنگ کی جیکٹ میں وہ خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس ایک مہینے میں اس نے اپنا وزن خاصا کم کیا تھا اور خاص طور سے اس کی توند اندر چلی گئی تھی۔ چہرہ بھی پہلے جیسا بھاری نہیں رہا تھا۔

جان گرے نے رائفل بردار کو حکم دیا۔ "اسے ٹھکانے لگواؤ اور چیک کرو کسی نے تعاقب تو نہیں کیا۔"

رائفل بردار نے غالباً کسی آپریٹس کی مدد سے جان گرے کا حکم آگے پارسل کر دیا۔ "یوسف ہاتھ اوپر کرو۔ میں تمہاری تلاشی لوں گا۔" جان گرے نے حکم دیا۔

"میں شاید تمہارا دوست ہوں۔" میں نے مسکرا کر ہاتھ اوپر کر دیئے۔ اس نے تلاشی لے کر غیر مسلح کر دیا حتیٰ کہ کیپٹن مین کے کیبن سے لیا شکاری چاقو بھی اس نے میری ران کے ساتھ بندھے نیام سے نکال لیا تھا۔ میرا پستول اور خنجر اس نے رائفل بردار کی طرف اُچھال دیا تھا۔ اس لمحے اسے آپریٹس پر اشارہ ملا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ یہ مختصر سا موبائل فون نما آلہ تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف کی سنتا رہا۔ پھر اس نے سرد نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "او کے میں آ رہا ہوں۔"

"غالباً کرنل بوگارڈ کے بارے میں پتا چلا ہوگا۔" میں نے اندازہ لگایا۔

"یوسف تمہیں اندازہ نہیں ہے تم نے کرنل بوگارڈ کے ساتھ یہ سلوک کر کے اپنے آپ کو شدید خطرے میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے وہ ہمارے لیے کس قدر اہم آدمی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "ورنہ عین ممکن ہے میں اس کے ساتھ مزید کچھ اور کرتا۔ مثلاً اس کے دونوں ہاتھ ناکارہ بنا دیتا یا اس کے پاؤں توڑ دیتا۔"

"لے جاؤ اسے۔" جان گرے پاؤں پٹخ کر دھاڑا تھا۔ "لے جا کر بند کر دو۔"

"چلو۔" رائفل بردار غرایا۔ میرے پاس تعمیل کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ مجھے کیبن کے ساتھ لکڑی سے بنے ایک مختصر سے کمرے تک لایا اور اندر دھکا دے کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ یہ لکڑی کے موٹے بھدے اور مضبوط تختوں سے بنایا گیا کمرا تھا جس کی دیواروں میں بے شمار رخنے تھے۔ اس کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ مجھے بند کر کے جانے کے بجائے رائفل بردار اس جگہ کھڑا ہو گیا تھا۔ جس کیبن میں کرنل بوگارڈ کو لے جایا گیا تھا۔ وہ بڑا اور نسبتاً صفائی سے بنا ہوا تھا۔

مجھے بند ہوئے مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک طبی مقاصد کے لیے مخصوص ہیلی کاپٹر کیبن کے سامنے میدان میں اُترا۔ اس سے ڈاکٹر اور ایک نرس برآمد ہو کر اندر کی طرف چلے گئے۔ وہ یقیناً کرنل بوگارڈ کا معائنہ کرنے آئے تھے۔

بہ ظاہر میں نے جان گرے کے سامنے اپنا رویہ برقرار رکھا تھا لیکن اندر سے میں بے حد مایوس





تھا میں نے کیپٹن مین پر اعتماد کر کے بڑی غلطی کی تھی۔ بوگارڈ کو اس کے حوالے کر کے مجھے اپنی راہ لینی چاہیے تھی۔ مگر میں بلا وجہ رُک گیا۔ کم سے کم مجھے بوگارڈ کے ساتھ دوبارہ سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اب تک ایک دائرے میں بھاگتا رہا تھا۔ اتنی کوشش اور جدوجہد کے بعد میں پھر اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا۔ یعنی پھر سے جان گرے کے قبضے میں تھا۔

مگر نہیں اس دائرے کے سفر میں مجھے بہت کچھ ملا تھا۔ ورنیلا، انکل، مَیری، لنڈسے اور کیپٹن مین جیسے اچھے لوگ ملے تھے۔ میں نے بوگارڈ جیسے عفریت کو تقریباً ناکارہ کر دیا تھا۔ سب سے بڑھ کر مجھے اپنے ماضی کا پتہ چل گیا تھا۔ میرا خاندان تھا اور میں مسلمان ماں باپ کی اولاد تھا۔ میں نے اپنے خاندان کے قاتلوں سے بدلہ لیا تھا۔ انہیں خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ کامیابیاں بھی کم نہیں تھیں۔ اس کے بعد بھی میں جان گرے کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو اس میں فکر کی خاص بات نہیں تھی۔ میں پہلے بھی فرار ہو چکا تھا۔ پھر فرار ہو سکتا تھا۔ موت کا وقت آنے تک جدوجہد کرتے رہنا میرا ایمان تھا۔

اگر چہ یہ ثابت تھا کہ میں گل خان کی اولاد تھا اور گل خان یوسف کا دوست تھا اس کی وجہ سے ہی یوسف اور اس کی بیوی نے اسلام قبول کیا تھا۔ کتنی حیرت انگیز بات تھی۔ گل خان نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کا بیٹا نہ صرف یوسف سے حیرت انگیز طور پر مشابہہ ہوگا بلکہ اسے نام بھی یوسف کا ملے گا۔ میں رحیم شاہ سے ملنا اور وہ سب جاننا چاہتا تھا جو میرے خاندان پر گزری تھی۔ رحیم شاہ مجھے حتمی ثبوت فراہم کرتا کہ میں گل خان کی اولاد ہوں۔ گل خان اور اس کے سارے خاندان کے مارے جانے کے بعد رحیم شاہ نے مجھے گل خان کی وصیت کے مطابق یوسف اور اس کی بیوی سارہ کے حوالے کر دیا۔ میں مشکل سے چند مہینے ان کے پاس رہا تھا۔ پھر ایک بحری سفر میں یوسف اور اس کی بیوی مارے گئے اور مجھے جمشید علی اپنے ساتھ لے گیا۔ کیا ان لوگوں کا قاتل جمشید علی تھا لیکن اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب وہ اور اس کے آدمی ڈیل کرنے یوسف کی کشتی تک پہنچے تو قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ سارہ نے مرنے سے پہلے مجھے کپڑوں کے ایک ڈھیر میں چھپا دیا تھا اس وجہ سے میں قاتلوں سے محفوظ رہا۔ یہ سارا عمل و غارت گری ان نایاب اور قیمتی جواہرات کے لیے کی گئی تھی جن کا سودا کرنے کے لیے جمشید علی آ رہا تھا۔ اس کے مطابق جواہرات بھی کشتی سے غائب تھے۔

کئی بار مجھے شبہ ہوا تھا کہ جان گرے ان جواہرات کے چکر میں ہے اور کبھی ایسا لگتا تھا کہ وہ اس سے بھی بڑے کسی چکر میں ہے۔ بہرحال ان جواہرات کی اپنی اہمیت تھی۔ ان کی وجہ سے میرے باپ کا عزیز ترین دوست مارا گیا تھا اور قاتل جواہرات لے اُڑے تھے۔ اگر ان جواہرات کا سراغ ملتا تو یوسف اور سارہ کے قاتلوں تک رسائی بھی ممکن تھی مگر فی الحال مسئلہ جان گرے سے جان چھڑانے کا تھا۔ کچھ دیر بعد کیبن سے دو افراد بوگارڈ کو سہارا دیئے ہیلی کاپٹر کی طرف جاتے نظر آئے۔ ڈاکٹر اور نرس ان کے پیچھے تھے۔ بوگارڈ کو تفصیلی معائنہ کے لیے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

ڈاکٹرز اور جدید مشینوں کے بغیر اس کا صحیح سے معائنہ ممکن نہیں تھا مگر مجھے اطمینان تھا۔ چاقو کی نوک نے اس کی آنکھوں کے لینس اور پردے کو اس طرح سے چاک کیا تھا کہ اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ چاہے اسے دنیا کا کوئی بھی سرجن کسی بھی طریقہ علاج سے صحیح کرنے کی کوشش کرے۔

بوگارڈ کے سوار ہوتے ہی ہیلی کاپٹر کے پنکھے گردش کرنے لگے تھے۔ چند لمحے بعد ہیلی کاپٹر بلند ہو رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی بوگارڈ کو سہارا دے کر لانے والے افراد نے میرے قید خانے کا رُخ کیا۔ میں نے کسی کو کہتے سنا۔ ''اسے طلب کیا ہے؟''

''کس نے؟'' رائفل بردار نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''اندر ہم سب کا ایک ہی باپ بیٹھا ہے۔'' دوسرے نے ہنس کر کہا۔ ''اس نے حکم دیا ہے۔''

''وہ مجھے براہِ راست بھی کہہ سکتا ہے۔'' رائفل بردار نے کہا۔

''افسوس کہ باس کے ذہن میں ایسا نادر خیال نہیں آیا اور اُس نے ہمیں بھیج دیا۔'' بولنے والا طنزیہ انداز میں بولا۔ ''بہرحال اسے نکالو اور لے کر اندر آؤ۔''

رائفل والے نے ان دونوں کے اندر جانے کے بعد ایک گندی سی گالی دی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ''باہر آؤ اور کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ......'' اس نے دھمکی آمیز انداز میں رائفل کو حرکت دی تھی۔ میں شرافت سے باہر آ گیا۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہو گیا کہ میری طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہی مجھے گولی مار سکے۔ اس کے اشارے پر میں کیبن کی طرف گیا۔ کیبن اندر سے خاصا صاف ستھرا اور پُرتعیش ثابت ہوا تھا۔ جان گرے ایک نشست گاہ میں صوفے پر دراز تھا مگر خلافِ معمول نہ تو اس کے ہاتھ میں جام تھا اور نہ ہی بغل میں کوئی لڑکی۔ اس کے بجائے وہ لمکا جوس پی رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اس میں تبدیلی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''بیٹھو۔'' اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جان گرے چند لمحے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ ''یوسف تم نے اپنے لیے ہی نہیں، میرے لیے بھی خاصی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ تم بوگارڈ کو نہیں جانتے۔ وہ اس ملک کا اتنا طاقتور شخص ہے کہ اس کے اشارے پر تینوں مسلح افواج کے یونٹس حرکت میں آ جاتے ہیں۔''

''میں نہیں جانتا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کل رات یہ شخص میرے رحم و کرم پر گڑگڑا رہا تھا۔ نہایت بزدلی سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میرے نزدیک کرنل بوگارڈ بہت چھوٹا آدمی ثابت ہوا۔''

''اس سے اس کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' جان گرے کا لہجہ سرد تھا۔ ''ابھی جانے سے پہلے اس نے جو دھمکیاں دی ہیں انہیں میں بہت سنجیدگی سے لے رہا ہوں۔''

''لیتے رہو۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''میری حفاظت اب تمہاری ذمے داری ہے۔ اگر تم مجھے بوگارڈ سے بچانے کی طاقت نہیں رکھتے تو مجھے جانے دو میں اب تک اپنی حفاظت خود کرتا آیا





ہوں۔''

''ایسا مت کہو۔'' جان گرے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''جب تم ہسپتال سے فرار ہوئے تھے تب سے میں تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا تھا اور میں نے بہت کچھ جان بھی لیا ہے۔''

''تو کیا اس کے بارے میں تمہیں مبارک باد پیش کروں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں مددگار ملتے رہے خوش قسمتی سے اور مرتے رہے۔ ورنیلا، ہیری اور پھر لنڈسے۔''

''او کے میں نے مان لیا۔'' میں نے ہاتھ اُٹھائے۔ ''تم کچھ زیادہ ہی باخبر ہو۔''

''اصل بات تو میں نے بتائی ہی نہیں۔'' جان گرے مسکرایا۔ ''تم جونی والٹر تک جا پہنچے تھے اور تم نے جان لیا کہ اس خاندان سے تمہارا کیا تعلق ہے۔''

میں اندازہ نہیں کر پایا کہ جان گرے پوری بات سے باخبر ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ گل خان کے بارے میں لاعلم ہو۔ ''ہاں...... میں نے جان لیا تھا۔ جونی والٹر میرے ماں باپ کا قاتل تھا اس لیے میں نے اس سے رشتے کا لحاظ بھی نہیں کیا۔''

''کیا واقعی؟'' جان گرے کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''یوسف تم نے جونی والٹر اور اس کے پوتے کو مارا تھا۔''

''میں نے کسی کو نہیں مارا۔ وہ سب اپنی حرکتوں کا شکار ہوئے ہیں۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''مسٹر جان گرے کیا تم نہیں جانتے کہ جونی والٹر جیو کونسل کا سربراہ تھا اور اس کے دہشت گرد جنوبی افریقہ کی حکومت کو بائی پاس کر کے من مانی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ جونی والٹر نے بذاتِ خود بے شمار لوگوں کے قتل کے احکام جاری کیے تھے۔ اس کے پوتے مائیکل نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔''

''تم اس کیبن میں کیا کر رہے تھے؟''

''کس کیبن میں؟'' میں نے صفائی سے انکار کر دیا۔

''ڈرو مت یہاں کوئی ریکارڈنگ نہیں ہو رہی ہے۔''

''مجھے تم پر اعتبار ہے مسٹر جان گرے۔'' میں نے دانت نکالے۔ ''لیکن براہِ کرم مجھ سے ایسی کوئی بات نہ پوچھو جس کا میرے پاس جواب نہ ہو۔''

''کیبن کے نیچے سے ایک کنواں برآمد ہوا تھا۔ جس میں دو عدد تازہ لاشوں کے ساتھ کم سے کم درجن افراد کے پنجر بھی ملے تھے۔''

''جب تمہیں اس بات کا بھی علم ہے جس سے پولیس لاعلم ہے تب یہ بھی معلوم ہوگا کہ کیبن اصل میں کس کا تھا اور اس کنویں میں پائے جانے والے پنجر کن معتوبین کے تھے۔''

جان گرے نے سر ہلایا۔ ''یہودیوں نے زبردست اثر و رسوخ استعمال کر کے معاملے کو دبا دیا

ہے۔"

"یہ قوم ہر حال میں اپنا مفاد دیکھتی ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

یہ سب ان کے اتحاد اور حکمت عملی کا ثمر ہے۔ یہ ہر میدان میں سب سے آگے ہیں۔" جان گرے نے طنز کیا۔ "تم ایک مسلمان کی حیثیت سے اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "جان گرے اس بار تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔ ممکن ہے عام مسلمان صرف فلسطین کے تنازعے کی وجہ سے یہودیوں سے نفرت کرتے ہوں لیکن میں یہودیوں کو صرف اس وجہ سے ناپسند نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ میں انہیں انسانیت کا مجرم سمجھتا ہوں۔ گزشتہ سو سال میں دنیا کو جن بڑی تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں اکثر یہودیوں کا ہاتھ تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگوں سے کس نے فائدہ اُٹھایا پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کا ہاتھ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے مگر سارا الزام جرمنی کے سر جاتا ہے اور یہودی کروڑوں انسانوں کی ہلاکت کے بعد مظلوم بن جاتے ہیں۔"

"جنگ عظیم دوم میں ساٹھ لاکھ یہودی بھی مارے گئے۔" جان گرے نے گویا مجھے یاد دلایا۔

"اگرچہ میں اس میں مبالغہ سمجھتا ہوں۔ یہودی مارے گئے مگر اس میں صیہونی کونسل اور یورپ کی ان طاقتوں کا ہاتھ تھا جو یہودیوں کو یورپ سے نکال کر فلسطین میں آباد کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ دونوں کے الگ مقاصد تھے مگر اس کے لیے انہوں نے یہودیوں کا قتل عام کرانا ضروری سمجھا۔ تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر فلسطین کی طرف چلے جائیں۔ امریکہ جو ان یہودیوں کا سب سے بڑا مربی ہے اس نے بھی یورپ کے یہودیوں کو امریکہ میں جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جان گرے! تاریخ کی اس سب سے بڑی سازش میں یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" جان گرے چونکا۔

"سیدھی سی بات ہے عیسائی ہمیشہ سے یہودیوں کے درپے رہے ہیں۔ یورپ میں بے شمار باران کا قتلِ عام ہوا۔ تازہ قتل عام یعنی جنگ عظیم کو نازیوں کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے لیکن میں اسے بھی عیسائیوں کا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اسرائیل بنا کر انہوں نے یہودیوں کی بڑی تعداد کو وہاں بھیج دیا اس طرح نئی صلیبی جنگ اپنے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر چھیڑ دی۔ اسرائیل میں مسلمان مارے جا رہے ہیں تو اب تک ہزاروں یہودی بھی مارے جا چکے ہیں۔ دوسری طرف یہودیوں نے اپنی دولت اور حکمتِ عملی سے امریکہ کو قابو میں کیا اور اس کی فوجی طاقت کو مسلم ممالک کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔"

جان گرے چند لمحے سوچتا رہا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ تم ان معاملات میں بھی گہری نظر رکھتے ہو۔"





"لندن میں دورانِ تعلیم میرا یہودیوں سے گہرا تعلق رہا ہے اور میں نے ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہیں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بحیثیت قوم بدفطرت ہیں۔ ان کا مقصد دنیا پر قبضہ کرنا ہے چاہے اس کے لیے کتنی بڑی تباہی نازل کرنا پڑے۔ جنگِ عظیم اول، دوم اس کی ایک مثال ہیں۔ جس دن بھی ان کو احساس ہو گیا کہ وہ مغرب کی مدد کے بغیر بھی اسرائیل کی حفاظت کر سکتے ہیں اس دن تیسری جنگ عظیم کا آغاز سمجھو۔ جس میں بیشتر عیسائی دنیا کا وجود مٹ جائے گا اور پھر دنیا میں واحد سپر پاور اسرائیل رہ جائے گا۔ بچے کھچے لوگ ان کے غلام ہوں گے۔"

"میرے خدا تم ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔" جان گرے بڑبڑایا۔

"اسے تم علم سے زیادہ وجدان کہہ سکتے ہو۔ یہودی اعلیٰ نسل کے زعم میں نفسیاتی مریض بن چکے ہیں اور ایک نفسیاتی مریض سے تم ہر بات کی توقع کر سکتے ہو۔"

جان گرے نے سر ہلایا۔ "میں تم سے اس معاملے میں متفق ہوں لیکن بدقسمتی سے ہمارے بیشتر لیڈرز کی آنکھوں پر یہودی عینکیں ہیں انہیں وہی نظر آتا ہے جو انہیں یہودی دکھاتے ہیں۔"

"خیر یہ وسیع موضوع ہے۔ اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ اب کیا ارادہ ہے؟"

"پوائنٹ تھری کی طرف واپس۔"

"یعنی اس جزیرے کی طرف جہاں سے ہم نکلے تھے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کچھ دیر بعد ایک ہیلی کاپٹر ہمیں لینے آئے گا۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ میں جان گرے سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس چکر سے میری جان کب چھوٹے گی۔ ظاہر ہے مجھے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا اور کچھ کرنے کے لیے موقع لازمی تھا۔ اس وقت تک مجھے صبر کرنا تھا۔ معاً ہیلی کاپٹر کی آواز آئی۔ جان گرے چونکا۔ "شاید وہ آ گیا۔" اس کے لہجے سے لگا جیسے اسے پختہ یقین تھا کہ آنے والا ہیلی کاپٹر اس کے لیے ہی آیا تھا۔ اس کے آپریٹس نے سگنل دیا اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے جو کہا گیا اسے سن کر اس کی بھنویں تن گئی تھیں۔ "کیا بکواس ہے۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی؟ میں دیکھ لوں گا انہیں۔" اس نے آپریٹس بند کیا اور کمر سے بندھا پستول نکالتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "اس کا خیال رکھنا۔" جان گرے نے رائفل والے سے کہا۔ اشارہ میری طرف تھا۔ جان گرے دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ جن کے استقبال کے لیے جا رہا تھا وہ خود اندر آ گئے۔ نیلے رنگ کی وردیوں میں ملبوس ان دو افراد نے بلٹ پروف جیکٹ اور وائزر پہن رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں خودکار رائفلیں تھیں۔ جان گرے اور رائفل والے کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھتے ہی انہوں نے نشست باندھ لی تھی۔ "اپنے ہاتھ اوپر کرو۔ ہتھیار پھینک دو۔"

"کون ہو تم؟" جان نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟"

"ہم کسی کو نہیں جانتے۔ ہم اسے لینے آئے ہیں۔ پلیز میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اپنے

ہتھیار پھینک دو۔'' جان گرے نے صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور اپنے ساتھی کو رائفل پھینکنے کا اشارہ کیا مگر اپنا پستول پھینکنے کے بجائے بیلٹ میں اُڑس لیا۔ وردی والے نے للکارا۔ ''میں نے پھینکنے کو کہا ہے سر۔''

''بکومت۔'' جان گرے نے دانت پیسے۔ ''میں تم جیسے معمولی لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا ہوں۔ بوگارڈ جو کر رہا ہے اسے اس کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔''

وردیوں والے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بادلِ نخواستہ سر ہلایا۔ رائفل والے نے اپنی رائفل پھینک دی تھی اور ہاتھ اوپر کر چکے تھے۔ ایک وردی والے نے اس کی تلاشی لے کر اس کے قبضے سے ایک پستول بھی برآمد کر لیا۔ جان گرے نے کچھ دیر پہلے مجھ سے جس خطرے کا ذکر کیا تھا خود اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ کرنل بوگارڈ نے بڑی پھرتی دکھائی تھی اور یہ اس کے آدمی تھے۔ رائفل والے کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر میری تلاشی بھی لی گئی اور پھر مجھے باہر چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔

''تم اسے نہیں لے جا سکتے۔'' جان گرے غرایا۔

''مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے سر۔'' وردی والے نے سپاٹ سے لہجے میں کہا اور مجھے باہر کی طرف دھکیلا۔ ''چلو...... بدمعاش۔''

مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ کرنل بوگارڈ نے مجھے کس لیے طلب کیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد وہ سو مرتبہ مجھے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا تب بھی اس کی تسکین نہ ہوتی۔ وہ مرنے سے پہلے مجھے ہر ممکن اذیت دینے کی کوشش کرتا۔ اس کے عزائم کا تصور کر کے میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی تھی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ ہاتھ پیر ڈالنے کے بجائے کچھ کر گزروں۔ جب وردی والے نے مجھے دھکیلا تو میرا رخ اس کے ساتھی کی طرف تھا۔ اور میں کوشش کرتا تو اس سے گن چھین سکتا تھا مگر یہ صریحاً خودکشی ہوتی۔ عقب سے مجھے با آسانی گولی ماری جا سکتی تھی۔ جان گرے یا اس کے آدمی سے یہ امید محال تھی کہ وہ میری جان بچانے کے لیے اس وردی پوش سے اُلجھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ لمحہ آ کر گزر گیا اور میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے خدا پر پختہ بھروسہ تھا کہ اگر میری زندگی ہے تو بوگارڈ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

''اگر تم اسے لے کر جا رہے ہو تو میں بھی چلوں گا۔'' اچانک جان گرے سامنے آ گیا۔ ''ورنہ کرنل سے میری بات کراؤ۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''سوری سر...... کرنل سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔ اس وقت ان کا آپریشن جاری ہے۔ البتہ تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔'' وردی والے نے جان گرے کی بات مان لی۔

''تم لوگوں کا تعلق ایس ایف ایف سے ہے؟'' جان گرے نے پوچھا۔

''یس سر! اب چلیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔'' وردی والے نے کھردرے لہجے میں





کہا۔

باہر ایک بڑے سائز کا جنگی ہیلی کاپٹر تھا۔ یہ بیک وقت سپاہی لے جانے اور جنگی کارروائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پروں تلے راکٹ لانچر اور میزائل والے مخصوص حصے تھے اور کاک پٹ کے عین نیچے دو عدد چھ نالی والی مشین گنیں لگی تھیں۔ پائلٹ کی سیٹ پر ایک شخص موجود تھا اور ہیلی کاپٹر کے پنکھے گردش کر رہے تھے۔ باہر دو عدد نیلی وردی والے اور بھی تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے تھے۔ گویا وہاں کل پانچ آدمی تھے۔ پائلٹ کا کیبن الگ تھا۔ کوئی نشست نہیں تھی سب فرش پر بیٹھے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا۔ یہاں پر جان گرے سے اس کا پستول لے لیا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا تھا مگر وہ کچھ سوچ کر ہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔ شاید وہ کرنل بوگارڈ کو اپنی قزاق تنظیم سے ذرا دھمکا کر میری جان بچانے کی کوشش کرتا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ کرنل بوگارڈ مجھے کسی صورت معاف کرے گا۔ عین ممکن تھا وہ جان گرے کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنا دیتا۔ اس کے اندھے ہونے میں جان گرے کا ہاتھ بھی تھا۔ کیونکہ اسی نے بوگارڈ کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ مگر جان گرے کے ذہن میں کچھ اور تھا کیبن بند ہونے کے باوجود انجنوں کی گونج سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور پاس بیٹھے لوگ بھی حلق پھاڑ پھاڑ کر آپس میں بات کر رہے تھے۔ اچانک جان گرے نے مجھے کہنی ماری جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے جھک کر میرے کان میں کہا۔ ''سانس روک لو۔ فوراً۔''

جیسے ہی اس نے کہا میں نے سانس روک لی۔ خوش قسمتی سے اس وقت میں نے سانس اندر کھینچی تھی اور میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن کی خاصی مقدار تھی اور اس کے ساتھ میں چار پانچ منٹ تک آسانی سے سانس روک سکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے جان گرے کے برابر والے شخص کو سامنے کی طرف جھکتے دیکھا۔ پھر تو سب ہی چکرانے لگے۔ ایک چلایا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی گیس ہے۔'' اپنا جملہ مکمل کرتے ہی وہ گر گیا تھا۔ چار میں سے دو گرے تو کمانڈر نے خطرہ بھانپ کر گن جان گرے کی طرف کی۔ ''کیا کیا ہے تم نے حرامی؟''

مگر جان گرے مکاری سے خود بھی لڑھک گیا تھا اور میں نے بھی خود کو ہوش میں ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ میں نے سر گھٹنوں سے ٹکایا۔ کمانڈر نے جان گرے کی طرف سے جواب نہ پا کر ہیلی کاپٹر کا سلائیڈنگ ڈور کھولنے کی کوشش کی۔ گیس نے اس کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا مگر پھر اس نے بھی سانس روک لی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سلائیڈنگ ڈور کھولا ہی تھا کہ میں نے جان گرے کو اس پر جھپٹتے دیکھا۔ اس نے کمانڈر کو کھل جانے والے دروازے سے دھکا دیا اور وہ چیخ مار کر نیچے گر گیا۔ تیسرا شخص جو کسی قدر ہوش میں تھا اپنی رائفل اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر گیس نے اس پر زیادہ اثر کیا تھا۔ میں نے با آسانی اس سے رائفل چھین لی اور اپنی طرف کا سلائیڈنگ ڈور بھی سرکا دیا تا کہ رہی سہی گیس بھی نکل جائے۔ اس لمحے میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا تو

نیم بے ہوش ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی تھی اور جان گرے نے اسے شوٹ کر دیا تھا۔ گولی اس کی گردن پر لگی تھی۔ خون بہہ کر اس کی زرہ بکتر جیکٹ کو تر کر رہا تھا۔ چند لمحے اس کا جسم نزع کے عالم میں لرزتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔

''انہیں چیک کرو۔'' جان گرے نے مجھ سے چلا کر کہا۔ انجن کے شور کے ساتھ اب ہیلی کاپٹر کے پنکھے سے پیدا ہونے والی طوفانی ہواؤں کی وجہ سے سننا ناممکن ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اندازے سے جان گرے کی بات سمجھی۔ وہ پائلٹ کے کیبن کی کھڑکی کھول رہا تھا۔ میں نے باقی دو افراد کو چیک کیا اور باری باری ان کا اسلحہ ہیلی کاپٹر سے باہر اُچھال دیا۔ نیچے گھنا جنگل تھا اس لیے امید تھی کہ یہ اسلحہ کسی انسان کے سر پر نہیں گرے گا ہاں کوئی جنگلی جانور ہو تو الگ بات تھی۔ ان کی تلاشی لے کر میں نے خودکار رائفل کے فاضل میگزین اپنے قبضے میں لے لیے۔ ایک رائفل جان گرے کے پاس تھی اور میں نے بھی رائفل لی تھی ایک عدد پستول بھی ہتھیا لیا تھا۔ جان گرے کھڑکی کے راستے پائلٹ کو حکم دے رہا تھا اور خودکار رائفل کی زد میں اس کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جان گرے نے میرے مسلح ہونے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یعنی اسے فی الوقت کوئی اعتراض نہیں تھا اور ساتھ ہی اتنا اعتماد تھا کہ میں یہ اسلحہ اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکوں گا۔ ورنہ وہ مجھے گیس کے بارے میں نہ بتاتا اور میں بھی بے ہوش ہو جاتا۔ غالباً اس لیے بھی کہ یہ مہلک گیس تھی اور انسان کی جان بھی لے سکتی تھی۔ میں نے بے ہوش ہونے والے ایک فرد کو جھٹکے لیتے دیکھا۔ سلائیڈنگ ڈور بند کرنے سے ہوا کا شور ختم ہو گیا تھا۔ میں نے جان گرے سے کہا۔

''یہ مر رہا ہے۔''

''تو کیا میں اس کے لیے دعا کروں؟'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں بھنا گیا تھا۔ ''تم نے اتنی مہلک گیس استعمال کی ہے۔ ہم دونوں بھی مر سکتے تھے۔''

''لیکن مرے نہیں۔'' جان گرے مڑے بغیر بولا۔ اس نے اپنی ساری توجہ پائلٹ کی طرف لگا رکھی تھی۔ جانے اس نے یہ مہلک گیس کس طرح استعمال کی تھی۔ جھٹکے لینے والے کا جسم بھی ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے وائزر کا شیشہ ہٹایا۔ اس کے منہ سے پیلے رنگ کا مادہ آ رہا تھا۔ تیسرا ابھی صرف بے ہوش تھا۔ نہ جانے کب موت اسے بھی دبوچ لیتی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ جان گرے نے مجھے بچانے کے لیے اپنے ساتھ میری زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہیلی کاپٹر کا رُخ بدل رہا تھا۔ پائلٹ اب جان گرے کی ہدایت کے مطابق پرواز کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہم اس ننھی سی کھڑکی کے کاک پٹ میں نہیں جا سکتے تھے ورنہ براہِ راست پائلٹ پر نظر رکھ سکتے تھے۔

''اگر اس نے کسی کو اشارہ دے دیا تو؟'' میں نے جان گرے کے کان میں کہا۔ اس نے ہیڈ فون کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف پڑا تھا۔ چند منٹ کے اندر ہیلی کاپٹر سطح زمین سے تین چار سو





فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ اس کا مقصد ریڈار سے بچنا تھا ریڈیو پر کسی براؤن کو پکارا جانے لگا۔ اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دے رہا ہے اور اس کا ہیلی کاپٹر ریڈار سے غائب کیوں ہو گیا ہے۔

ظاہر ہے پائلٹ کو جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ ہیلی کاپٹر اُڑاتا رہا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم چار ہر طرح سے مسلح اور تربیت یافتہ افراد پر اتنی آسانی سے قابو پا لیں گے وہ مرعوب بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔ میں نے جان گرے سے پوچھا۔ ''تم نے گیس کس طرح استعمال کی؟''

''ابھی نہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''ایک ایسی جگہ جہاں بوگارڈ ہمیں نہیں پا سکے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں واپس فرش پر بیٹھ گیا جس کے حلق پر گولی لگی تھی اس کے خون سے فرش تر تھا اور مجھے کپڑے بچانے کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ نصف گھنٹے بعد جان گرے نے مجھے بلایا۔

''اب اس پر نظر رکھو۔ یہ رُخ بدلنے کی کوشش نہ کرے۔''

''اگر اس نے رُخ بدلا تو مجھے کیسے معلوم ہوگا؟''

''وہ سرخ پلیٹ والا پینل دیکھ رہے ہو اس پر بائیں طرف والا ڈائل اصل میں قطب نما ہے اس وقت ہیلی کاپٹر کا رُخ شمال مغرب کی طرف ہے اگر سوئی کے رُخ میں تبدیلی ہو تو تم سمجھ جاؤ گے یہ شرارت پر آمادہ ہے۔''

''او کے۔'' میں نے سر ہلایا اور پائلٹ کی نگرانی کرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہیلی کاپٹر ایک ناہموار علاقے پر پرواز کرنے لگا تھا۔ نیچے ٹیلوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے کھیت اور افریقہ کے مخصوص دیہات نظر آ رہے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے لوگ دھوپ سینکنے کے لیے ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ ہیلی کاپٹر ان کے اوپر سے گزرتا تو وہ اُٹھ اُٹھ کر ہاتھ ہلانے لگتے تھے۔ یہ سب مجھے پائلٹ کیبن کے شیشے کے فرش سے نظر آ رہا تھا۔ ابھی ہماری منزل کتنی دور تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر جان گرے سے پوچھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میرے سر سے کوئی ٹھوس شے ٹکرائی اور میں تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



جان گرے نے مکاری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے ایسا تاثر دیا جیسے وہ مجھ پر اعتماد کرنے پر مجبور ہے اور موقع پاتے ہی اس نے وار کر دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کے باوجود پائلٹ پر نظر رکھنے کے چکر میں مارا گیا۔ میرے لیے زیادہ خطرناک دشمن بوگارڈ تھا اور میں کسی صورت اس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ میں اس معاملے میں جان گرے سے غفلت کر گیا تھا اور اس نے وار کر دیا نہ جانے کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا لیکن جب آنکھ کھلی رات ہو چکی تھی اس کا اندازہ مجھے اس مختصر سے کمرے میں جلنے والے کیروسین لیمپ سے ہوا تھا۔

لکڑی سے بنا یہ کمرا مختصر لیکن صاف ستھرا تھا۔ میرے سر کی پٹی کر دی گئی تھی۔ بازو میں ہلکی سی چبھن بتا رہی تھی کہ مجھے انجکشن دیا گیا تھا۔ غالباً پین کلر۔ کیونکہ سر میں معمولی سی دکھن کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا ایک آرام دہ کھاٹ پر پڑا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ میرے جسم پر ہلکی سی چادر پڑی تھی۔ اندر کا درجہ حرارت معمول کے مطابق تھا۔ یعنی یہ کمرا کسی عمارت کے اندرونی حصے میں تھا۔ برابر میں مختصر سی تپائی پر سیبوں سے بھری ٹوکری اور پانی کی بوتل رکھی تھی۔ میں نے پہلے پانی پیا اور پھر سیب کھانے لگا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی کیونکہ آخری بار میں نے کینی مین کے خفیہ تہہ خانے میں ناشتہ کیا تھا۔ کینی مین پر مجھے خیال آیا کہ اب وہ بوگارڈ کے عتاب سے بچنے کے لیے چھپتا پھر رہا ہوگا۔

میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو حسبِ توقع اسے باہر سے بند پایا۔ اس کمرے میں بھی ایک ہی مختصر سا دروازہ تھا۔ چھت مسطح تھی یعنی اس کے اوپر کوئی فلور بھی تھا ورنہ عام طور سے لکڑی کے مکانوں پر ڈھلوان چھتیں بنائی جاتی ہیں۔ میں نے سر پر بندھی پٹی پر ہاتھ پھیرا گومڑ سا نکل آیا تھا۔ میں نے زیرِ لب کہا۔ ''او کے مسٹر جان گرے! تمہارا یہ تحفہ بھی ادھار رہا۔''

سیبوں سے بھوک کا مداوا ہو گیا تھا۔ پانی پی کر میں دوبارہ لیٹ گیا۔ نیند کی طلب نہیں ہو رہی تھی۔ یعنی میں اپنی نیند پوری کر چکا تھا۔ میرا لباس بھی بدل دیا گیا تھا۔ اب میں ایک اونی پاجامے اور اونی ہی ڈھیلے سے کرتے میں تھا۔ یہ لباس اندر کے ماحول کے لحاظ سے خاصا گرم تھا لیکن باہر





جاتے وقت مجھے اوپر سے کچھ نہ کچھ درکار ہوتا۔ میرا تمام اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ اس موقع پر مجھے پنجابی زبان کا محاورہ یاد آیا۔ ''جتھے دی کھوتی...... اوتھے آن کھلوتی۔'' یہ محاورہ میرے حالات پر خاصی حد تک موزوں تھا۔ میں جان گرے کے پاس سے فرار ہوا اور اس سے بچنے کی سعی کرتا رہا۔ بالآخر ایک بار پھر اس کے قبضے میں تھا۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور جان گرے کافی کی مہک اُڑاتے دو کپ لے کر اندر آیا۔ میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ''یہ کیا حرکت تھی تم نے میرا سر پھاڑ دیا۔ میں کون سا بھاگا جا رہا تھا۔''

''معاف کرنا پیارے۔'' جان گرے سراپا معذرت بن کر بولا۔ ''مجھے بھی یقین تھا کہ تم اب دل و جان سے میرے ساتھ ہو۔ بس پتا نہیں کیسے ہاتھ گھوم گیا۔'' اس کے لہجے میں مکاری تھی۔ ''لو غصہ تھوک دو اور کافی پیو۔''

''شکریہ۔'' میں نے کپ لے کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''اس میں بھی تو غلطی سے کچھ ملا تو نہیں دیا ہے۔''

''اگر تمہیں شک ہے تو بے شک کپ بدل لو۔'' اس نے فوراً پیش کش کی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم مجھ سے مخلص ہو اور میرے بھلے کے لیے یہ سب کیا۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''طنز کر رہے ہو؟''

میں نے کافی کا سپ لیا۔ ''حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اس دوران جب میں نے محسوس کیا کہ تم بُرے آدمی نہیں ہو۔ شاید حالات نے تمہیں آگ و خون کے اس کھیل میں دھکیلا ہے۔ جیسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کرتا رہا جس کی تفصیل تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم نے بارہا میری حمایت میں اپنے لوگوں کو نقصان پہنچایا۔ میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو لیکن تم مجھ سے جو کام بھی لینا چاہتے ہو میں اس کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔''

''تم...... تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن میری بھی کچھ شرائط ہیں۔''

''ہاں کہو۔'' اس بار اس کے لہجے میں ذرا بے تابی تھی۔

''جب میں تمہارا کام کر دوں تو تم نہ صرف ان سارے چکروں سے نجات دلاؤ گے بلکہ میرے خلاف جنوبی افریقہ بلکہ کسی بھی ملک میں بننے والے مقدمے ختم کراؤ گے۔ ساتھ ہی مجھے برطانیہ کی شہریت بھی چاہیے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''جنوبی افریقہ میں اپنے خلاف مقدمات کو ختم سمجھو۔''

''اسے اتنا آسان مت لو۔ کرنل بوگارڈ تو ہے میرے خون کا پیاسا۔ یہودیوں کو اس سے پیچھے نہ سمجھو۔''

"ان سب کو مجھ پر چھوڑ دو۔" جان گرے نے اعتماد سے کہا۔"چند دن میں یہ کام ہو جائے گا۔اس کے بعد تم اعلانیہ میرے ساتھ جنوبی افریقہ سے روانہ ہو گے۔"

"او کے میں تمہارا اعتبار کرتا ہوں لیکن تمہاری آرگنائزیشن مجھے سزائے موت سنا چکی ہے اور مجھے اس سے بچنے کے لیے ایک بار پھر الیکٹرک کا مقابلہ کرنا ہوگا۔اس سے کیسے نجات ملے گی۔ دوسرے تمہاری تنظیم میرا پیچھا چھوڑے گی، جبکہ میں اس کے بہت سارے رازوں سے واقف ہوں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ایک فرد کے طور پر تم کسی صورت ہمارے لیے مسئلہ نہیں بن سکتے اور اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی بھی تو اب تم اچھی طرح جان گئے ہو کہ اس دنیا کا کوئی فرد ہماری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔"

"اور لندن کی شہریت۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔میری ایک فون کال پر ملکہ برطانیہ خود تمہیں خاص شہریت سے نواز سکتی ہیں۔یوسف یقین کرو میرا کام کر کے تم بے پناہ فائدے میں رہو گے۔صرف دولت نہیں شہرت اور عزت بھی تمہارا مقدر ہوگی۔مغربی دنیا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔"

"شکریہ مجھے دولت اور شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔دولت میرے پاس بھی خاصی ہے۔بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ کوئی میری زندگی میں مداخلت نہ کرے اور میں سکون سے اپنا وقت گزار سکوں۔"

"اگر تم سکون پسند ہو تو بحر الکاہل یا بحر اوقیانوس میں جدید سہولیات سے مزین کوئی جزیرہ بھی تمہارے نام کیا جا سکتا ہے۔یقین کرو وہ جنت ہوگا۔"

"ایسا ممکن ہے کیا؟" میں نے حیرانی و بے تابی ظاہر کی۔"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔"

"بالکل ممکن ہے۔دنیا بھر کے سمندر میں ہزاروں کی تعداد میں ویران جزائر ہمارے پاس ہیں۔تمہیں تمہاری پسند کا جزیرہ دیا جائے گا جہاں تم ہمیشہ سکون سے رہو گے۔"

"غالباً اپنی قبر میں۔" میں نے دل میں سوچا۔"جان گرے مجھے اپنے ساتھ شامل سمجھو۔"

اس نے ہاتھ ملایا۔"ڈن۔"

"ڈن۔" میں نے اتنی ہی مخلصانہ مکاری سے کہا۔ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے اور شاید اس دھوکے سے واقف بھی تھے۔"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"ایک مشن چرچ کی عمارت ہے۔یہاں پر مقامی قبائلیوں کے لیے کام ہوتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔جس ادارے سے جان گرے کا تعلق ہو وہ انسان کی بھلائی کے لیے کتنا کام کر سکتا ہے یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا مگر میں نے طنز کرنے یا کوئی ردِ عمل ظاہر کرنے سے گریز کیا۔"وہ ہیلی کاپٹر کہاں گیا۔کیا اسے......"





"نہیں......وہ فورس کا ہیلی کاپٹر تھا۔میں نے پائلٹ کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔"

"تو کیا وہ جاتے ہی اس جگہ کی نشاندہی نہیں کر دے گا۔"

جان گرے مسکرایا۔"اگر اس نے نشان دہی کی ہوتی تو کیا تم سات گھنٹے گزرنے کے بعد بھی آزاد ہوتے۔میں نے جس جگہ ہیلی کاپٹر اُتروایا تھا وہ اس مقام سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر ہے۔دوسرے بوگارڈ کو اب تک اوپر سے وارننگ مل چکی ہوگی۔"

"اور تیسرے اسے فورس سے نکال دیا جائے گا اب وہ تمہارے لیے ایک بے کار شخص ہے۔"

"ظاہر ہے ایک اندھا آدمی وہ فرائض انجام نہیں دے سکتا جو بوگارڈ کی جاب کا تقاضہ تھے۔" جان گرے نے سرد لہجے میں کہا۔"زیادہ سے زیادہ آج رات تک اسے اس کے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔"

"یعنی وہ یقینی طور پر آنکھیں کھو چکا ہے۔مجھے خوشی ہے میں نے کچا کام نہیں کیا۔ویسے اب تم لوگ اس کا کیا کرو گے؟"

"ہم نے کیا کرنا ہے۔" جان گرے نے شانے اچکائے۔"اس نے خود فیصلہ کرنا ہے ممکن ہے وہ نٹال چلا جائے وہاں اس کی وسیع و عریض جاگیر ہے۔"

"جہاں اس کے خون کے پیاسے سیاہ فام اسے کتے کی موت مار دیں گے۔اپنے آدمی کی وفاداری کا تم اچھا صلہ دے رہے ہو۔"

"وہ ہمارا وفادار نہیں تھا۔" جان گرے نے سرد لہجے میں کہا۔"معاوضے پر ہمارے لیے کام کرتا تھا اور منہ مانگا معاوضہ لیتا تھا۔لہٰذا ناکارہ ہو جانے کے بعد اس کی حفاظت ہمارا فرض نہیں ہے۔جہاں تک ہمارے آدمی ہونے کا تعلق ہے تو معذوری یا ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں بہترین سہولیات دی جاتی ہیں اور تاحیات ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔تم جزیرے پر دیکھ لو گے۔وہاں ایک حصہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔"

"دیکھ بھال یا کڑی نگرانی۔" میں نے دل میں سوچا۔مجھے جان گرے کی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔مخصوص مفادات کے تحت کام کرنے والا یہ ٹولہ کسی کی بھلائی کے لیے کچھ کرے، بات میرے حلق سے نہیں اُتر رہی تھی۔

"شاید تمہیں یقین نہیں آ رہا۔" جان گرے نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا۔"مگر میں تمہیں دکھاؤں گا۔"

"او کے......اب یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اور بوگارڈ کینی مین کے پاس ہیں۔"

جان گرے مسکرایا۔"ممکن ہے میں کسی اور کو یہ بات کبھی نہ بتاتا مگر تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ہمارے پاس تمہاری آواز محفوظ ہے اور ہر ملک کا موبائل نیٹ ورک ہماری دسترس میں ہے۔ان نیٹ

ورک کی نگرانی کرنے والے ہر کمپیوٹر میں تمہاری آواز فیڈ کر دی گئی۔ ان نے کئی بار تمہاری کالز کی نشان دہی کی لیکن بدقسمتی سے تاخیر کے سبب ہم وہاں نہیں پہنچ سکے۔ جہاں سے تم کال کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے آخری بار تم نے کینی مین کے موبائل پر کال کی اور ہم نے اس کا موبائل ڈی ٹیکٹ کر لیا۔ کینی مین کے پاس کام کرنے والے کئی افراد ہمارے پیرول پر بھی تھے۔ ان پر کیا جانے والا خرچ وصول ہوا۔ مارے جانے والے سیاہ فام نے ہم سے رابطہ کر کے کرنل بوگارڈ کے بارے میں بتایا۔ وہ تمہاری اہمیت سے بے خبر تھا اس لیے تمہارا ذکر نہیں کیا مگر جب وہ بوگارڈ کو لے کر ہمارے پاس آیا تو تم بھی تھے۔''

''تم نے اس کے کارنامے کا صلہ گولی کی صورت میں دیا۔''

''یہ میرا اصول ہے۔ ڈبل ایجنٹ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے ہیں۔ کام نکلتے ہی میں انہیں ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔''

''کینی مین کا کیا ہوا؟''

''کیا ہوا...... وہ مزے سے ہے۔ سیاسی لیڈر ہونے کے یہی تو فائدے ہیں۔ اسے ہاتھ لگانے کا مطلب ہے اس کے پیروکار پورے ملک میں آگ لگا دیں۔''

''کینی مین اتنا طاقتور ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے تو وہ اتنا مضبوط نظر نہیں آیا۔ اس کے اکثر آدمی یا تو ڈبل ایجنٹ نکلے یا ناکارہ تھے۔''

''یہ صرف اس کا پردہ ہے کینی مین کی اصل طاقت دیہی علاقوں میں ہے۔ سنا ہے نسل پرستوں کے خلاف اسے حکومت کی مدد بھی حاصل ہے۔'' جان گرے نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ میں ہنس دیا۔

''یہ ان بے چاروں کا حق ہے۔ آخر نسل پرست گورے بھی تو ساری دنیا سے مدد لیتے ہیں۔''

''بہر حال کینی مین جیسے لوگوں کو زیادہ دن برداشت نہیں کیا جائے گا وہ ہماری راہ کی رکاوٹ ہیں۔'' جان گرے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''حکومت اسے کچھ نہیں کہے گی بلکہ اس کام پر وہ اسے شاباش ہی دے گی مگر آرگنائزیشن والے اس سے بوگارڈ کا انتقام ضرور لیں گے۔''

''ہم کب تک چلیں گے یہاں سے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ دن لگیں گے۔ ان سارے معاملات کی گرد بیٹھ جائے۔ ابھی ہمیں بوگارڈ کا متبادل تلاش کرنا ہے۔ رک جانے والے منصوبوں پر پھر سے کام کرنا ہے۔ آرگنائزیشن کی جانب سے مجھ پر دباؤ ہے کہ میں یہاں رک کر ان تمام معاملات کو ہینڈل کر دوں۔''

''تو رک جاؤ۔''

''تم احمقانہ باتیں مت کرو۔'' وہ ایک دم جھنجھلا گیا۔ ''میں جلد از جلد ان سارے چکروں سے جان چھڑا کر یہاں سے جانا چاہتا ہوں اور تم کہہ رہے ہو یہاں رہ جاؤں۔''





اس کا انداز مجھے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کام کے لیے بے تاب تھا جو وہ مجھ سے لینا چاہتا تھا۔

''وقت کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صبح کے چار بج رہے ہیں۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''یہ بتاؤ کہ تم نے بوگارڈ کو قابو کیسے کیا؟''

اس کے اس سوال پر میرے دل میں پھانس سی چبھ گئی تھی۔ مجھے ریٹا کا خیال آیا۔ وہ خطرے میں تھی یا عین ممکن تھا کہ اب تک تمام خطروں سے بے نیاز ہو چکی ہو۔ بوگارڈ کا عتاب اس کا رُخ کرنے والا تھا اسے اندھا کرنے میں ریٹا کا تعاون بھی رہا تھا۔ نہ جانے بوگارڈ اس نازک سی عورت کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا یا کر چکا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر جان گرے کو اس کے بارے میں بتایا۔ ''پلیز اسے بوگارڈ کے انتقام سے بچاؤ۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اس کے خلاف میرے حکم کی تعمیل کرتی رہی تھی۔''

جان گرے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''بہت بے چین ہو اس کے لیے۔''

''ہاں...... کیونکہ وہ ایک انسان ہے۔'' میں نے تلخی سے جواب دیا۔ ''صرف ایک عورت نہیں ہے۔''

''اوکے میں دیکھتا ہوں مگر یہ بوگارڈ کے ذاتی معاملے میں مداخلت ہوگی۔ وہ بوگارڈ کی بیوی ہے اور وہ اس کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کر سکتا ہے۔''

''اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔''

''ان لکھا قانون بوگارڈ جیسے طاقتور لوگوں کو اس کا حق بھی دیتا ہے۔''

''لعنت ہو اس قانون پر۔'' میں چلایا۔ ''اسے بچاؤ جان گرے...... ورنہ......''

''اوکے...... میں دیکھتا ہوں۔ بوگارڈ نے تمہارے معاملے میں جتنی پھرتی دکھائی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں ریٹا کے بارے میں زیادہ پُر امید نہیں ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''جان گرے تم سن لو اگر بوگارڈ نے اسے قتل کر دیا تو میں اسے جہنم رسید کیے بغیر اس ملک سے نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اسے عقب سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور دوسرے ہی لمحے کمرے سے باہر تھا۔ میں نے دروازہ لاک ہونے کی آواز سنی اور مسکرایا۔ جان گرے مجھ پر اس حد تک اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ کمرا کھلا چھوڑ دیتا۔ اس جگہ اس نے یقیناً کچھ اور حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے تبھی وہ اتنی آزادی سے میرے پاس آیا تھا۔ جان گرے نے بتایا تھا کہ یہ ایک چرچ کی عمارت ہے۔ درحقیقت مغربی استعمار کے سب سے بڑے اڈے تیسری دنیا میں پھیلے ہوئے مشنری ادارے ہی ہیں جو بہ ظاہر مقامی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں لیکن اصل میں مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مرکزی کردار ادا کرتے

ہیں۔ان مشنری اداروں کے گھناؤنے روپ کی تصویر مشرقی تیمور اور ایتھوپیا میں نظر آتی ہے جہاں انہوں نے عیسائی مسلم فسادات کرا کے مسلم ممالک کے حصے کاٹنے کا اہتمام کیا۔اب ان مشنری اداروں کا سب سے بڑا ہدف سوڈان ہے جس کے جنوبی صوبوں میں عیسائی اکثریت میں ہیں اور وہ سوڈان کی مسلم حکومت کے خلاف مسلح جنگ کرنے میں مصروف ہیں۔ساری دنیا کے عیسائی ان کی بے دریغ مدد کر رہے ہیں۔اور مسلمانوں پر کشمیری اور فلسطینی حریت پسندوں کی مدد کرنے پر پابندی ہے۔ان حریت پسندوں کو مغرب دہشت گرد قرار دیتا ہے۔“

سر کی تکلیف پین کلر کا اثر ختم ہونے سے بڑھ رہی تھی۔اس لیے میں چاہنے کے باوجود نہ سو سکا۔جب میرے اندازے سے صبح ہوگئی تو میں نے اُٹھ کر دروازہ بجایا۔فوراً ہی کسی نے باہر سے پوچھا۔”یس سر۔“

”مجھے باتھ روم جانا ہے۔“

”ایک منٹ سر۔“ باہر والے نے مؤدب لہجے میں کہا میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی تعلیم یافتہ سیاہ فام تھا۔میرا اندازہ درست نکلا جب دروازہ کھلنے پر مجھے سیاہ فام نوجوان کی صورت نظر آئی۔

”اس طرف آیئے سر۔“

”تم کون ہو؟“

”میں مسایا ہوں سر! باتھ روم اس طرف ہے۔“ اس نے گیلری کے کونے کی طرف اشارہ کیا۔اس گیلری میں چند دروازے اور نظر آ رہے تھے۔جو بہ ظاہر مقفل تھے۔باتھ روم چھوٹا لیکن صاف ستھرا ثابت ہوا تھا۔پانی گرم تھا اس لیے میں نے منہ ہاتھ دھو کر دانت بھی صاف کر لیے تھے۔باہر آیا تو مسایا میرا منتظر تھا۔

”مسایا! میں باہر جانا چاہتا ہوں۔“

”اس موسم میں یہ مناسب نہیں ہوگا جناب! ابھی باہر بہت سردی ہے اور آپ کے پاس مناسب لباس بھی نہیں ہے۔آپ کے لیے گرم کپڑے منگوائے ہیں سر۔“

”اتنی سردی تو نہیں ہے باہر۔“

”اس جگہ ہے سر! آیئے میں آپ کو دکھاؤں۔“ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا۔اس نے باہر کی طرف کھلنے والا ایک چھوٹا سا روشن دان کھولا تو باہر سے یخ بستہ ہوا کا جھونکا آیا تھا۔مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باہر خاصی برف پڑی تھی۔مجھے یاد تھا ہم جس طرف سفر کر رہے تھے وہاں برف نہیں تھی۔شاید ہیلی کاپٹر کسی بلند جگہ آیا تھا۔افریقہ کے شمال میں تو شاید ہی کہیں برف باری ہوتی ہے۔سوائے الجزائر اور مراکش کے چند بلند پہاڑی سلسلوں کے لیکن جنوبی افریقہ میں جبکہ موسم سرد ہو تو خاصی برف باری ہوتی ہے جو حصے افریقہ سے جتنے نزدیک ہوتے ہیں وہاں اتنی ہی زیادہ برف پڑتی ہے۔





”سر اب آپ کمرے میں جائیں۔“ مسایا نے مجھ سے درخواست کی۔میں روشن دان سے نظر آنے والے منظر کا جائزہ لے رہا تھا۔سامنے برف سے ڈھکا میدان تھا اس کے بعد یوکلپٹس کے بلند درخت تھے جن پر برف جمی تھی۔اس میدان میں نہ تو کوئی انسان تھا اور نہ کوئی اور شے۔”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”ہم اسے سومبو لینڈ کہتے ہیں۔“ مسایا نے بتایا۔”سومبو ہمارے ایک قدیم دیوتا کا نام ہے۔“

”کیا تم دیوتاؤں کو مانتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔”یسوع کسی مذہب کے دیوتا کو بُرا نہیں کہتے، وہ سب کی عزت کرتے ہیں۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔”یہ یسوع نے کہا ہے تمہیں کس نے بتایا؟“

”فادر بیری نے...... ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنے پُرانے دیوتاؤں کی عبادت بھی کرتے رہیں تو اس سے ہمارے اچھے عیسائی ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

میں مسایا کے ساتھ واپس اپنے کمرے کی طرف آیا۔”اس علاقے میں کتنی آبادی ہے؟“

”کل بارہ سو افراد ہیں۔ان میں سے آٹھ سو عیسائی بن چکے ہیں۔“

”فادر بیری کیا کرتے ہیں۔ان سے ملنے کے لیے باہر سے لوگ آتے ہیں۔“

مسایا نے سر ہلایا۔”اکثر آتے ہیں وہ ہیلی کاپٹر کی مدد سے آتے ہیں اور یہاں کئی کئی دن قیام کرتے ہیں۔بعض اوقات تو فادر بیری کے پاس ایسے لوگ بھی لاتے ہیں جن پر بدروحوں کا سایہ ہوتا ہے۔فادر بیری ان کا علاج کرتے ہیں۔“

”فادر بدروحوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔“

”ان لوگوں کا جن پر بدروحوں کا سایہ ہو۔“ مسایا نے بتایا۔”ان لوگوں کو باندھ کر رکھا جاتا ہے اور باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔فادر کا کہنا ہے اگر سائے والا شخص کسی مقامی آبادی میں چلا جائے تو اس پر مسلط بدروح دوسروں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

میں ان لوگوں کی مکاری پر دنگ رہ گیا تھا۔فادر بیری نے جدید دنیا اور عیسائی عقائد سے بے خبر ان لوگوں کو کس قدر بے وقوف بنا رکھا تھا۔وہ نہ صرف انہیں عیسائیت کی غلط تعلیم دے رہا تھا۔بلکہ اس نے ان لوگوں کے قدیم اوہام سے فائدہ اُٹھا کر انہیں بدروحوں سے خوف زدہ کر دیا تھا۔جن بے چاروں پر بدروحوں کا سایہ بتایا جاتا تھا وہ یقیناً ان کے قیدی ہوتے تھے جیسے کہ میں بھی قیدی تھا۔میں نے مسکرا کر مسایا کی طرف دیکھا۔”اور میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہے تمہیں؟“

”آپ۔“ وہ ہچکچایا۔”آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ بیمار ہیں اور آپ کا باہر جانا مناسب نہیں ہے۔“

”تم فکر مت کرو میں خود بھی باہر جانا نہیں چاہتا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔”دراصل مجھ پر

جس بدروح کا سایہ ہے وہ جھیل ٹانگانیکا کی تہہ میں رہنے والی ایک پری ہے۔ اگر میں باہر گیا تو اسے پتا چل جائے گا کہ میں کہاں ہوں اور وہ مجھے اغوا کر کے جھیل کی تہہ میں لے جائے گی۔"

مسایا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور اس نے لرزنا شروع کر دیا تھا۔ "میں نے آپ کو باہر کا منظر دکھا دیا ہے۔"

"اس سے فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میرا کھلی فضا میں جانا شرط ہے۔"

"جناب! یہ بدروح آپ پر حاوی ہو کر آپ کو باہر تو نہیں لے جائے گی۔"

"لے جا سکتی ہے لیکن اس کا بھی ایک علاج ہے میرے پاس۔ جب وہ مجھ پر حاوی ہونے لگتی ہے تو میں خود کو چاقو سے ہلکا سا چرکا لگا لیتا ہوں۔ جیسے ہی میرے جسم سے خون نکلتا ہے۔ اس کا تسلط ختم ہو جاتا ہے۔"

"آپ کے پاس چاقو ہے جناب؟"

"نہیں...... لیکن اگر تم مجھے کوئی چھوٹا سا چاقو لا دو تو میں اس سے محفوظ رہ سکوں گا۔"

"میں ابھی لاتا ہوں جناب۔" وہ فوراً راضی ہو گیا۔

"مگر سنو کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے بات میرے اور تمہارے درمیان میں رہے۔ اگر کسی تیسرے کو اس کی خبر ہو گئی تو پری پر چاقو والا حربہ بھی بے کار ہو جائے گا اور وہ مجھے زبردستی کھلے آسمان تلے لے جائے گی اس کے بعد جو تباہی آئے گی اس کا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"میں سمجھتا ہوں ان معاملات کو جناب۔" اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔"

اس معصوم سے نوجوان کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا تھا۔ میں نے اس کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ آخر فادر بیری بھی یہ کارِ خیر پہلے سے انجام دے رہا ہے اور اس ایک نوجوان کو نہیں بلکہ پورے علاقے کو بے وقوف بنا رہا ہے اور جنگ میں ویسے بھی سب جائز ہوتا ہے۔ ذرا دیر بعد مسایا نے مجھے ایک چھوٹا سا بند ہو جانے والا چاقو لا کر دیا۔ اس کا پھل بٹن دبانے سے باہر آ جاتا تھا۔ ان حالات میں یہ ننھا سا چاقو میرے لیے کسی مہلک ہتھیار سے کم نہیں تھا۔ میں نے چاقو اپنے اونی پاجامے کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ "جناب آپ ناشتے میں کیا لینا پسند کریں گے۔ کچن میں کارن فلیکس، انڈے، ڈبل روٹی، پنیر اور شہد موجود ہے۔"

"سب لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"سب۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میرا مطلب ہے ہر شے تھوڑی تھوڑی لے آؤ۔ میرے کھانے میں ٹانگانیکا جھیل کی تہہ میں رہنے والی پری کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ اگر میں اس کا حصہ نہ کھاؤں تو وہ میرے معدے میں اُچھل کود مچاتی ہے۔"





"بالکل یہی میرے دادا کے ساتھ ہوتا تھا۔ انہیں نصف بکرا کھائے بغیر سکون نہیں آتا تھا۔"

مسایا نے نہایت خلوص سے میری بکواس پر اپنے دادا جان کی تصدیقی مہر ثبت کی۔ "میں ابھی ناشتہ لاتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ "کہاں جائیں تیرے یہ سادہ دل بندے۔ انہیں تُو نے کن عیاروں کے حوالے کر دیا ہے؟" نہ جانے کیوں میرا دل بوجھل ہو گیا۔ اس دنیا کے اکثر لوگ سادہ دل اور معصوم ہیں۔ عیار ان کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان معصوموں کی حفاظت اللہ کے پاس ہے۔ ورنہ یہ عیار اس دنیا کو ویران کر چکے ہوتے۔ میں سوچ میں گم تھا جب مسایا ناشتے کی ٹرے لایا۔ میں نے ہر شے تھوڑی منگوائی تھی مگر وہ ٹانگانیکا جھیل کی تہہ میں رہنے والی پری کے خیال سے سب زیادہ ہی لے آیا تھا۔ چار عدد اُبلے انڈے، ایک پوری ڈبل روٹی کے توس سینکے ہوئے۔ بڑے سے پیالے میں دودھ میں بھیگے کارن فلیکس ایک کٹوری میں شہد اور دوسرے میں کوئی پاؤ بھر پنیر اور ایک کنگ سائز گلاس میں دودھ۔ ظاہر ہے میں اتنا سب نہیں کھا سکتا تھا مگر مسایا کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اس حد تک کھایا کہ میرا پیٹ پھٹنے لگا تھا۔ سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ مسایا ہمدردی سے میرا جائزہ لے رہا تھا اور مجھے زیادہ کھانے پر اُکساتے ہوئے اپنے دادا کی سٹوری سنا رہا تھا۔ جو حد سے زیادہ بسیار خور تھا۔ وِچ ڈاکٹر نے اس کے معدے میں بدروح تشخیص کی تھی اور اس کے گھر والوں سے کہا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ کھلاتے رہیں ورنہ بدروح اس کا معدہ کھا جائے گی یا کلیجہ چبا جائے گی۔ ظاہر ہے مسایا کے دادا کو بسیار خوری کا مرض تھا۔

"پھر تمہارے دادا کا کیا ہوا؟" میں نے بادلِ نخواستہ کنگ سائز گلاس کے دودھ کو معدے میں اُنڈیلنا شروع کیا۔

"وہ مر گیا۔" مسایا نے آگاہ کیا۔ "ایک دن ناشتے میں وہ بارہواں انڈا کھا رہا تھا کہ انڈا سالم اس کے حلق میں اُتر گیا اور وہ دم گھٹ کر مر گیا۔"

میں نے فوراً بقیہ دودھ چھوڑ دیا۔ "میں تمہارے دادا کی سی موت نہیں مرنا چاہتا اس لیے یہ سب لے جاؤ اور میرے لیے کافی لے آؤ۔"

مسایا نے افسوس سے ٹرے کی طرف دیکھا۔ "جناب آپ نے پنیر اور شہد کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دودھ بھی پورا نہیں پیا ہے ٹانگانیکا......"

"تمہیں تمہارے دیوتاؤں کا واسطہ اب مجھ سے مزید کھانے کے لیے مت کہنا۔" میں نے سخت پچھتاوے کے ساتھ کہا اور دل ہی دل میں اس احمقانہ بکواس پر خود کو ملامت کی تھی۔ مسایا ٹرے لے گیا اور میں اس مختصر سے کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا کہ پیٹ کا بھاری پن ذرا کم ہو۔ کافی پی کر میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ مسایا اب مجھے بتا رہا تھا کہ وہ دوپہر میں میرے لیے بھنی ہوئی بطخ بنائے گا۔ میں نے فوری طور پر بطخ کو ناپسند کر دیا۔ اس پر اس نے بکرے کی ران تجویز کی۔ میں بھولو

پہلوان کے خاندان سے نہیں تھا کہ اتنا کھا سکتا تھا جبکہ پہلے ہی ناشتہ حلق تک بھر کے کر چکا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔ ''اور بدروح کی فکر نہ کرو اسے بھی اتنا مل گیا ہے کہ اسے بدہضمی ہوگئی ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ جان گرے کہاں ہے؟''

''کون جان گرے جناب؟''

''وہ جو ذرا پستہ قد اور بھاری جسم کا ہے۔ بال سرمئی رنگ کے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔ فادر بیری انہیں جونی صاحب کہتے ہیں۔ میں ابھی انہیں آپ کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

مسایا کے جانے کے نصف گھنٹے بعد جان گرے آیا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر میرا دل کہہ اُٹھا کہ اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ ''کیا ریٹا......''

''وہ بچ گئی ہے لیکن اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ پولیس نے اسے بوگارڈ کی قید سے چھڑایا ہے اس نے ریٹا پر بے حد تشدد کیا ہے۔''

''بوگارڈ۔'' میں نے دانت پیسے۔ ''کاش میں نے آنکھوں کے بجائے اس کی جان لے لی ہوتی۔''

''تم بھول رہے ہو جان لینا خدا کا کام ہے۔''

میں چونکا۔ ''تم...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''بوگارڈ کی فکر نہ کرو۔ اس نے ریٹا کے ساتھ جو کیا ہے اب اس کی ساری عمر جیل میں ہی گزرے گی۔ ریٹا کا ایک بیان کافی ہوگا۔''

رفتہ رفتہ میرا غصہ سرد ہونے لگا۔ ''جان گرے! کیا مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''جب تک تمہارے خلاف مقدمات ختم نہیں ہو جاتے باہر نکلنا اور لوگوں کی نظر میں آنا مناسب نہیں ہوگا۔ جانے کون سرکاری ایجنٹ ہو، تم صحیح کہہ رہے تھے۔ یہودی تمہارے خلاف مقدمات کے سلسلے میں زیادہ ہی سرگرم ہیں۔''

''تم کہہ رہے تھے کہ انہیں سنبھال لوگے؟'' میں نے طنز کیا۔

''ہاں...... اس میں شبہ مت کرو۔ میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔''

''دوسرے میں کھلی فضا میں جانا چاہتا ہوں۔ اس جگہ تو میں ایکسر سائز بھی نہیں کر سکتا۔''

''شام تک تمہیں باہر جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ تمہارے لیے گرم کپڑے منگوائے ہیں۔ ایکسر سائز کے لیے یہاں پر چھوٹا سا جمنازیم ہے۔''

''فادر بیری کون ہے؟''

جان گرے اس سوال پر چونکا۔ ''تمہیں مسایا نے بتایا ہوگا۔ وہ اس مشن چرچ کا سربراہ




''اس عمارت میں زیادہ ہی خاموشی نہیں ہے۔ کیا چرچ میں لوگ نہیں آتے۔''

''یہ چرچ کی عمارت نہیں ہے۔ اس سے ملحق ایک عمارت ہے جو رہائش کے لیے مخصوص ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میں شام کو تمہیں لینے آؤں گا۔''

جان گرے کے جانے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ زیادہ کھا لینے کی وجہ سے سُستی طاری ہو رہی تھی۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ''آ جاؤ......'' میں نے جماہی لے کر کہا۔ مسایا اندر آیا۔

''جونی صاحب نے آپ کو طلب کیا ہے۔'' وہ بولا۔ اس نے سفید رنگ کا ڈھیلا سا اونی جبہ پہن رکھا تھا۔

''چلو...... لیکن پہلے میں باتھ روم جاؤں گا۔''

باتھ روم سے فارغ ہو کر میں مسایا کے ہمراہ اس عمارت کی مختلف راہ داریوں سے گزرتا ایک کشادہ ہال نما کمرے میں پہنچا۔ جہاں جان گرے ایک بوڑھے پادری کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی لیکن اس کا جسم مضبوط تھا۔ جان گرے نے تعارف کرایا۔ ''جوزف! یہ فادر بیری ہیں۔ اس چرچ کے سربراہ۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا تو اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نظر آئے تھے۔ ''تم تعظیم بھی دے سکتے تھے میرے بچے۔''

''معاف کیجیے گا فادر! میں کسی شخص کو اس کے عہدے کی وجہ سے لائق تعظیم نہیں سمجھتا۔ میرے لیے کسی شخص کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے۔'' میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور جان گرے سے پوچھا۔ ''وہ جمنازیم کہاں ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔''

''یہی جگہ ہے۔ اگر ایکسر سائز کے لیے کوئی چیز درکار ہے تو مسایا سے کہہ دو۔'' جان گرے نے کہا اور فادر بیری کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ میں نے مسایا کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ خوف زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ میرے پاس آ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''جناب آپ نے فادر بیری کو ناراض کر دیا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ مجھ پر کوئی آسمانی عتاب نازل نہیں ہوگا۔ ایسا کرو اگر پانچ کے جی کے ڈمبل ہوں تو لے آؤ۔'' میں نے پنجوں کے بل اُچھلنا شروع کر دیا۔ مسایا سر ہلا کر چلا گیا۔ میں فادر بیری کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ شخص مجھے پہلی نظر میں بُرا لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی زہریلے سانپ نے انسان کا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے سانپ کی سرد مہری جھلکتی تھی۔ مسایا ڈمبل لے آیا۔ اس ہال نما کمرے کے ایک طرف کھڑکیاں تھیں جن پر بلائنڈر پڑے تھے۔ مسایا مجھ سے پندرہ منٹ کا کہہ کر چلا گیا تھا۔ ایک ایکسر سائز سے فارغ ہو کر میں سانس درست کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ بلائنڈر سرکایا تو اس کے عقب میں مجھے عیسائیوں کا قبرستان نظر آیا تھا۔ قبروں پر صلیبیں لگی تھیں۔ اچانک مجھے ایک قبر کے آگے مسایا نظر آیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا

تھا۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اس نے قبر کے اوپر انگلی سے دائرہ سا بنایا۔ تین بار انگلی دائرے میں گھما کر اس نے سر اُٹھایا۔ آسمان کی طرف دیکھا اور قبر کے پاس سے اُٹھ گیا وہ عمارت کی طرف آ رہا تھا۔ میں واپس آ کر پھر ایکسرسائز کرنے لگا۔ بہ ظاہر یہ عام سی بات تھی لیکن نہ جانے کیوں میرا ذہن اٹک کر رہ گیا تھا۔ مسایا کس کی قبر پر گیا تھا اور اس نے وہ دائرہ بنانے والی حرکت کیوں کی تھی کیونکہ میرے علم میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا کہ عیسائی اپنے لوگوں کی قبروں پر اس طرح انگلی سے دائرے بناتے ہوں۔ مسایا اندر آ کر چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا تھا اس کے چہرے پر غم آلود سے تاثرات تھے۔ میں ایکسرسائز مکمل کر کے اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

"مسایا! ابھی تم قبرستان میں کس کی قبر کے سامنے بیٹھے تھے۔"

میرے سوال پر وہ چونکا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا جناب!"

"اتفاق سے میں نے اس کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔"

"وہ قبر میری بہن کی ہے۔ چند مہینے پہلے نامعلوم درندے نے اسے کچی کلی کی طرح مسل کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"اوہ...... مجھے افسوس ہوا سن کر۔ کیا اس کے قاتل کو تلاش نہیں کیا گیا۔"

"میں اس کی تلاش میں ہوں جناب! مرتے دم تک اسے ڈھونڈتا رہوں گا۔"

"تمہیں اپنی بہن سے محبت تھی؟"

"وہ میری ایک ہی بہن تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد میں نے ہی اسے پالا تھا۔ ماں اسے جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ وہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی۔"

"دس سال۔ یعنی بارہ تیرہ سال کی؟"

"چودہ سال کی۔ میں چوبیس سال کا ہوں جناب۔"

"اس کا قتل کہاں ہوا تھا؟"

"وہ مرنے سے پہلے غائب ہو گئی تھی۔ سنڈے کی چرچ سروس کے بعد جب گاؤں کی عورتیں واپس آئیں تو وہ ان میں نہیں تھی۔ وہ سمجھیں کہ نتالی، یہ میری بہن کا نام ہے۔ وہ میرے پاس چرچ میں رُک گئی ہے اور میں سمجھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ جا چکی ہے۔ دوپہر کے وقت میرا ایک پڑوسی اتفاق سے اِدھر آیا تو میں نے اس سے نتالی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ نتالی تو سروس کے بعد گاؤں پہنچی ہی نہیں یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ اگر نتالی گاؤں نہیں پہنچی تو پھر کہاں گئی۔ میں نے پہلے اسے چرچ اور اس کے آس پاس تلاش کیا اس کے بعد گاؤں کے مردوں کے ساتھ ٹولیاں بنا کر اسے جنگل میں تلاش کرنے لگا۔ ہمارے علاقے میں شیر چیتے نہیں پائے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار کوئی شیر یا چیتا اس طرف آ نکلتا ہے۔ مگر نتالی کا جنگل میں بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"اس کی لاش کہاں پائی گئی تھی؟"





"چرچ کے قبرستان سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تلے سے مگر اسے قاتل یا قاتلوں نے وہاں ڈالا تھا۔ اسے مارا اور مارنے سے پہلے بے آبرو کہیں اور کیا گیا تھا۔" شدتِ غم سے مسایا کی آواز بھرانے لگی۔ "اس کی لاش پر اتنے زخم تھے کہ شاید کوئی درندہ بھی اتنے زخم نہیں لگا سکتا تھا۔ اسے ہر ہر طرح سے اذیت دی گئی تھی۔ میں لاش دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اگر لوگ مجھے قابو میں نہ رکھتے تو شاید درختوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتا۔"

"مسایا مجھے بے حد افسوس ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ وہ قاتل مل جائے۔"

"وہ ملے گا۔" مسایا نے یقین سے کہا۔ "میں نے دیوتا سے نذر مانی ہے اپنی جان کی نذر...... دیوتا ایک بار مجھے میری بہن کے قاتل تک پہنچا دے اس کے بعد وہ میری جان بھی مانگے تو میں خوشی سے دے دوں گا۔"

"دوست زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی ہے کہ کسی کے مانگنے پر دے دی جائے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم قاتل کی جان لینے کا عزم رکھو اپنی جان دینے کا نہیں۔"

"اس کا تو میں ریشہ ریشہ اپنے دانتوں سے ادھیڑوں گا۔"

"ایک بات بتاؤ۔ یہ فادر بیری جو بدروحوں سے نجات دلاتا ہے کیا قاتل کے معاملے میں تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے فادر سے کہا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ یسوع نے جو صلاحیتیں انہیں دی ہیں وہ اسے کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ نتالی جیسی معصوم اور کمسن لڑکی کا قاتل ہی کیوں نہ ہو۔"

مسایا سپاٹ لہجے سے بولا تھا لیکن اس کی تہہ میں ہلکی سی تلخی محسوس کی جا سکتی تھی۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ فادر بیری بدروحوں کے نام پر ان معصوم لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ یہاں پر جان گرے کی آرگنائزیشن کے قیدی لائے جاتے تھے اور انہیں قید میں رکھا جاتا تھا۔ غالباً مسایا کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسایا نے تصدیق کی کہ میں پہلا شخص تھا جس کے پاس آنے اور اس سے بات کرنے کی مسایا کو اجازت ملی تھی۔ جان گرے کو اعتماد تھا کہ میں مسایا کو اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کروں گا۔

"یہاں فادر بیری کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں۔"

مسایا نے سر ہلایا۔ "آٹھ سفید فام ہیں اور مسلح رہتے ہیں بقول فادر وہ چرچ کے محافظ ہیں تا کہ سیاہ فام گوریلے اس جگہ حملہ نہ کر سکیں۔ چرچ اور قبرستان کے گرد بہت بڑے احاطے کو خاردار تاریں لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔"

محافظوں کا مقصد سیاہ فام گوریلوں سے نمٹنا نہیں بلکہ اس جگہ قیدی بنا کر لائے جانے والے افراد کی نگرانی کرنا اور انہیں فرار سے روکنا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا جان گرے نے مجھے اس طرح

کھلا کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ آٹھ محافظوں کے ہوتے میں یہاں سے فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ انہوں نے اور بھی حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے جیسے کتے اور جدید ترین الیکٹرانک لیزرز۔ میں خاردار تاروں کے ذکر پر چونکا۔

"مسایا! کیا نتالی کی لاش ان تاروں کے اندر ملی تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے بتایا قبرستان سے کچھ ہی دور......"

"تب تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے قاتل کا تعلق اس چرچ سے بھی ہوسکتا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "قاتل باہر سے آیا تھا۔ اس روز محافظوں کو خاردار باڑھ ایک جگہ سے کٹی ہوئی ملی تھی۔ قاتل نتالی کی لاش یہاں ڈال کر چلا گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے اور دو مردوں نے وہ جگہ بھی دیکھی تھی۔"

میں نے اصرار نہیں کیا ورنہ خاردار تاروں کی باڑھ مس گائیڈ کرنے کے لیے بھی از خود کاٹی جا سکتی تھی اس چرچ کی آڑ میں جو کھیل کھیلا جارہا تھا عین ممکن تھا قاتل یا قاتلوں کا تعلق اس جگہ سے ہو۔ فادر بیری پہلے ہی مشکوک تھا۔ اس کا جان گرے کی دہشت گرد آرگنائزیشن سے تعلق تھا۔ ظاہر ہے وہ یا اس کے آدمی سچ مچ شریف یا مذہبی ہونے سے رہے اور ایسے لوگوں سے نتالی کے سفاکانہ اور انسانیت سوز قتل کی توقع کی جاسکتی تھی۔ گاؤں والوں کو گمراہ کرنے کے لیے خاردار تاروں کی باڑھ کاٹنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا ورنہ کوئی اور کاٹتا تو ان کا بے خبر رہنا تعجب انگیز ضرور ہوتا کیونکہ آج کل ایسے لیزرز عام ہیں جو کسی تار سے منسلک کردیے جائیں تو تار کٹتے ہی الارم بجادیتے ہیں۔ ان لوگوں سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ محض سادہ باڑھ لگا کر مطمئن ہوجائیں۔

"کیا تمہاری بہن سے پہلے بھی کسی کی گمشدگی کا واقعہ پیش آیا ہے یا کسی کی لاش ملی ہو۔"

مسایا چونکا تھا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا۔ گزشتہ دو سال میں چار بار ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ ایک شخص کا سرے سے پتا نہیں چلا، وہ ہمارے گاؤں کا وچ ڈاکٹر تھا اور باقی تین افراد کی لاشیں مختلف جگہوں پر ملی تھیں۔ انہیں بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔"

"وچ ڈاکٹر نے چرچ فادر بیری کی مخالفت کی تھی۔"

مسایا نے سر ہلایا۔ "وہ ہمیں دھمکاتا تھا اگر ہم نے چرچ جانا نہیں چھوڑا تو آسمان سے ہم پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوگا۔"

"مگر دیوتاؤں کا عذاب وچ ڈاکٹر پر نازل ہوا اور وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہوگیا۔"

"فادر بیری یہی کہتے ہیں۔"

"اور باقی تین افراد۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ چرچ کے حامی تھے اس کی سرگرمیوں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔"

"کیا ایک ساتھ قتل ہوئے یا الگ الگ وقت میں؟"





"آپ تو بالکل پولیس والوں کی طرح سوالات کر رہے ہیں جناب؟" وہ مسکرایا۔ "وہ تینوں الگ الگ مرے۔ مجھے یاد ہے ایک وچ ڈاکٹر کے غائب ہونے کے چند دن بعد مرا تھا۔ اس کی لاش جنگل سے ملی تھی اور لگتا تھا کسی درندے نے اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہے لیکن فادر بیری نے بتایا وہ کسی بدروح کا شکار ہوا تھا اس نے مقامی لوگوں کو جنگل میں جانے سے منع کردیا تھا۔ دوسرا آدمی اس کے کوئی سات مہینے بعد مارا گیا تھا اور تیسرا آدمی نتالی کے قتل سے ایک مہینہ پہلے قتل ہوا۔ ان دونوں کی لاشیں بھی جنگل سے ملی تھیں۔"

"فادر بیری نے ان کے بارے میں کیا ارشاد کیا تھا؟"

"یہی کہ وہ بھی جنگل کی بدروح کا شکار ہوئے ہیں۔" مسایا نے سادگی سے بتایا۔

"اور تم لوگوں نے یقین کرلیا۔"

"ظاہر ہے فادر بیری نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو اس بدروح سے بچانے کے لیے جنگل میں جانے پر پابندی لگادی ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "وہ جنگل کس طرف ہے۔"

"چرچ اور اس عمارت کے عین پیچھے۔" اس نے بتایا۔ "خاردار تاروں کی وجہ سے براہِ راست اس طرف نہیں جاسکتے۔"

مجھے ان لوگوں کی سادہ لوحی اور لاعلمی سے زیادہ ان کے اندھے اعتماد پر افسوس ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں پر آنکھ بند کرکے اعتماد کر رہے تھے جو بین الاقوامی نسل پرست تھے اور جو صرف اپنے مفادات کے لیے افریقہ میں سرگرم تھے۔ ان کی وجہ سے پورا افریقہ خون میں سرخ ہورہا تھا۔ تقریباً ہر برس کہیں نہ کہیں افریقیوں کے قتل عام میں لاکھوں افراد مارے جاتے تھے۔ قحط اور ایڈز جیسی وبائیں مرض افریقی ملکوں کی نصف آبادی نگل چکی ہیں۔ وسطی اور مغربی افریقہ میں موت رقص کرتی تھی اور اس رقص کے لیے توانائی یہ لوگ فراہم کر رہے تھے جن کے خیال میں وہی دنیا کے اصل وارث ہیں اور باقی لوگ ان کی غلامی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ بے دریغ ہر وہ کام کر رہے ہیں جس سے افریقہ اور اس کے وسائل پر ان کا تسلط قائم ہوجائے چاہے اس کے لیے افریقیوں کے منہ سے نوالہ چھیننا پڑے یا ان میں ایڈز جیسا لاعلاج مرض پھیلایا جائے۔ جہاں بھی افریقی ذرا اُبھرے ان کا قتل عام کرایا گیا۔ اس کے لیے متحارب قبائل کو وسیع پیمانے پر اسلحہ فراہم کیا گیا۔ وسطی افریقہ جو دنیا کا دشوار ترین علاقہ ہے وہاں محض لنگوٹی پوش قبائلیوں کے پاس بیش قیمت اسلحہ فراوانی سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس یہ اسلحہ حاصل کرنے کے لیے رقم کہاں سے آئی۔ راونڈا اور برونڈی کے قتلِ عام کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جس میں کم و بیش بیس پچیس لاکھ افراد مارے گئے تھے۔

"جناب! آپ کو اپنے کمرے میں جانا ہوگا۔" مسایا نے گھڑی دیکھی۔ "فادر بیری کا حکم ہے

کہ شام سات بجے کے بعد کوئی باہر کا آدمی اپنے کمرے سے نہ نکلے۔''

''کیوں؟'' میں نے سادہ سے انداز میں پوچھا۔

''فادر نے اس کی وجہ نہیں بتائی ہے مگر میرا خیال ہے رات کے وقت بدروحوں کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور ان کے شکار افراد کو اس وقت باہر نہیں نکلنا چاہیے۔''

اس بے چارے کی جتنی سوچ اور معلومات تھیں وہ ان کے مطابق فیصلہ کر کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اس سارے چکر کے پُراسرار پہلوؤں پر سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ میں اس کے ساتھ کمرے تک آیا۔ ''کیا تم رات بھر اس جگہ رہتے ہو؟''

''میں اب گھر جاؤں گا۔ ویسے میں رات اس جگہ بھی رُکتا ہوں لیکن آج میری چچی نے میری دعوت کی ہے۔''

''اگر مجھے رات کو باتھ روم جانا ہو۔''

''آپ جاسکتے ہیں جناب! آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا رہے گا لیکن آپ اس گیلری سے باہر نہیں جاسکتے اور نہ کسی اور کمرے میں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟''

''وہ آپ تک پہنچ جائے گا جناب!'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں نے دروازہ چیک کیا وہ کھلا تھا۔ میں گیلری میں نہیں گیا۔ عین ممکن تھا میری نقل و حرکت پر کسی کیمرے سے نظر رکھی جا رہی ہو۔ میں نے بلاوجہ حرکت کی تو کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے میں کمرے میں ہی رہا۔ اس طرح صبر سے وقت گزارنا میرے لیے مسئلہ نہیں تھا میں پہلے بھی بارہا اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ایک سفید فام کھانا لایا تھا۔ اس نے دروازہ بجایا اور اندر آ کر ٹرے بستر پر رکھ دی۔ ''برتن صبح لڑکا آ کر لے جائے گا۔'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''بلا ضرورت باہر مت نکلنا۔''

''مجھے آوارہ گردی کا شوق نہیں ہے۔'' میں نے کھانے کی ٹرے کا جائزہ لیا۔ خاصی اشیاء تھیں اور معقول مقدار میں تھیں۔ ''ہاں کھانے کے بعد میں کافی ضرور پیتا ہوں۔''

''اچھا مائی لارڈ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میں لاتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرے اپنی طرف کھینچ لی۔ ''پندرہ منٹ بعد لانا۔''

وہ سچ مچ پندرہ منٹ بعد کافی لے آیا۔ ''کیا جان گرے سے ملاقات ہوسکتی ہے۔''

''کون جان گرے؟''

مجھے یاد آیا مسایا اسے جونی صاحب کہہ رہا تھا۔ ''میرا مطلب جونی سے...... ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اس وقت نہیں ہے کل آئے گا۔''





''اور فادر بیری۔''

''وہ رات کے وقت کسی سے نہیں ملتے۔''

''تب تم جاسکتے ہو۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ وہ ٹرے اُٹھا کر نکل گیا کافی پی کر میں نے ایک بار گیلری میں جھانکا وہاں کوئی نہیں تھا اور باہر جانے والا دروازہ بند تھا۔ جان گرے یہاں نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ سنہری موقع تھا۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ میں لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹ گیا اور خاموشی سے اردگرد کی سن گن لینے لگا مگر چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ یہ کمرا عمارت کے اتنے اندرونی حصے میں تھا کہ باہر کی کوئی آواز یہاں تک نہیں آتی تھی۔ دو گھنٹے گزارنے کے بعد میں باتھ روم کی طرف گیا۔ باتھ روم چاروں طرف سے بند تھا اور کیونکہ عمارت کے اندرونی حصے میں تھا اس لیے روشندان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ خراب ہوا کے اخراج کے لیے ایک پائپ تھا جو اوپری حصے میں تھا۔ اپنی مطلوبہ چیز مجھے کمرے سے مل گئی تھی یہ نرم دھاتی تار کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جسے میں نے گول مول کر کے لچھے کی صورت دے دی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھلا چھوڑ کر میں نے اپنی قمیص اُتاری اور باتھ روم کا بلب اُتار لیا۔ وہ گرم ہو رہا تھا لیکن موٹی قمیص کی وجہ سے میرا ہاتھ محفوظ تھا۔ بلب کے ہولڈر میں تار کا لچھا داخل کر کے میں نے بلب اس میں گھسا دیا۔ جیسے ہی تار کے لچھے نے اندر کی دو راڈز کو چھوا۔ بجلی غائب ہوگئی۔ راہ داری میں روشن بلب بھی بجھ گئے تھے۔ میں نے عمارت یا کم سے کم اس حصے کا فیوز اُڑا دیا تھا۔ بلب لگا کر میں نے جلدی سے قمیص پہنی اور چلتا ہوا راہ داری کے دوسرے سرے تک آیا۔ باہر جانے والا دروازہ حسبِ معمول باہر سے بند تھا۔ میں واپس چلتا ہوا آیا اور راہداری کے دونوں جانب موجود دروازے ٹٹولنے لگا۔ معاً ایک دروازہ کھل گیا۔ یہ میرے کمرے کے دوسری سمت میں تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے اس کمرے کے چھوٹے سے کھڑکی نما روشن دان سے روشنی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ مسایا مجھے اس کمرے میں لایا تھا۔ میں نے روشن دان سے باہر دیکھنا چاہا لیکن سردی کی وجہ سے شیشے پر اوس جمی تھی۔ میں نے ٹٹول کر چھوٹی سی کھڑکی کھولی باہر سے بے پناہ یخ ہوا اندر آئی تھی ساتھ ہی میں نے کسی کی آواز سنی جو کسی دوسرے کو بے دریغ لتاڑ رہی تھی۔ غور کرنے پر یہ فادر بیری کی آواز ثابت ہوئی تھی۔

''حرام زادے! یہ عین موقع پر پاور کیوں فیل ہوئی۔''

''فادر! اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' کسی نے دبی زبان میں کہا۔ اس پر فادر نے معتوبین میں اس کے خاندان کی عورتوں کو بھی شامل کرتے ہوئے اسے فوری طور پر پاور بحال کرنے کا حکم دیا۔

''فادر! اگر بجلی درست نہ ہوئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔ یہ کھیپ آج ہی جانی ہے۔ پیٹیاں اوپر لانے کے لیے لفٹ چلانی ہوگی۔''

''ایسا کرو سب کو بلا لو۔ پیٹیاں ہاتھ سے بھی اُٹھائی جاسکتی ہیں۔''

"فادر! ہم سے پہلے بھی کئی بار یہ حماقت ہو چکی ہے۔" اس شخص نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور اس نتیجے میں ہمیں کئی افراد کی جان لینا پڑی۔ اب نگرانی کرنے والوں کو ان کا کام کرنے دیا جائے تو بہتر ہے۔"

"اور پیٹیاں کیسے اوپر آئیں گی؟" فادر بیری نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"یہ تمہاری ذمے داری ہے۔" اس شخص کا لہجہ سرد تھا۔ "تمہیں انچارج ہی اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے دو۔"

"اپنی باتوں سے تو تم یہاں کے انچارج لگ رہے ہو۔"

"گارڈز میرے چارج میں ہیں اور میں انہیں ان کی ذمے داری سے ہٹا کر کسی کام پر نہیں لگا سکتا۔"

"پلیز صورتِ حال کو سمجھو۔"

اسی اثناء میں فادر کے ہاتھوں اپنی خواتین کی درگت بنوانے والا ہانپتا کانپتا آیا۔ "فادر فیوز اُڑ گیا تھا میں نے لگایا تو پھر اُڑ گیا۔ تیسری بار لگایا تو پھر لگاتے ہی اُڑ گیا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" فادر بیری جھنجھلا گیا تھا۔

"کہیں سے وائرنگ شارٹ ہو رہی ہے۔" گارڈز انچارج نے مداخلت کی۔ "یہ سو بار بھی لگائے گا تو فیوز اُڑ رہا ہے گا۔"

"تب میں کیا کروں۔ اتنی بڑی عمارت میں شارٹ سرکٹ کا کیسے پتا چلایا جائے۔" فادر بیری غرایا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سارے کٹ آؤٹ نکال دو۔ صرف تہہ خانے والا کٹ آؤٹ لگا رہنے دو اور پھر فیوز لگاؤ۔ اگر مسئلہ تہہ خانے کی وائرنگ میں نہیں ہے تو ابھی بجلی آ جائے گی۔"

"یہ آپ نے اچھا مشورہ دیا ہے جناب۔" فیوز لگانے والا خوش ہو کر بولا۔

"اب دفع ہو اور کام کرو جا کر۔"

"فادر بیری! یہ شخص جو جان گرے کے ساتھ آیا ہے یہ مجھے خطرناک لگتا ہے۔ اسے جلد از جلد یہاں سے چلتا کرنا چاہیے۔"

"جان گرے ابھی اسے کچھ عرصے یہاں رکھنا چاہتا ہے۔"

"جان گرے کون ہوتا ہے۔"

"وہ ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتے۔ آرگنائزیشن میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ وہ چاہے تو اس جگہ کا انچارج بن سکتا ہے۔"

"کیا اسے اندازہ ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟"

"نہیں اگر اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو ہم یہاں نہ ہوتے۔ کہیں قبروں میں پڑے ہوتے۔"




"فادر! وہ لڑکی یاد آتی ہے۔" اچانک اس شخص نے چٹخارے لے کر کہا۔ "کاش تمہیں اس سے پوچھ گچھ کی اتنی جلدی نہ ہوتی تو ہم دو تین دن اور......"

"وہ تم لوگوں کی زیادتی سے مری تھی۔ زخموں کی وجہ سے نہیں۔ اس کا بھائی پاگل ہو رہا تھا اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ اس کی بہن تہہ خانے میں ہے تو وہ نہ جانے کیا کر گزرتا۔"

"اسے تہہ خانے کا علم ہے۔" گارڈز انچارج چونکا تھا۔

"کسی حد تک لیکن اس کے دروازے کا علم نہیں ہے۔"

"کیوں جب اس کی بہن دروازہ دیکھ سکتی تھی تو اسے کیوں علم نہیں ہوگا۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو۔ میں دروازے کو آپریٹ کرتے وقت اسے اس طرف نہیں آنے دیتا تھا اور اس لڑکی نے بھی اتفاق سے دیکھ لیا تھا۔ خیر یہ راز اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔"

"خیر چھوڑو ان معاملات کو یہ بتاؤ کہ اس کھیپ میں ہمیں کیا ملے گا۔"

"وہی پچیس ہزار ڈالر۔ سوئیس بانڈز کی صورت میں۔"

"بس ایک سال اور...... پھر میں یہ لعنتی کام چھوڑ کر اسپین چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی دیہاتی علاقے میں زمین لے کر اس پر جاگیر بناؤں گا اور ساری زندگی سکون سے گزاروں گا۔ جاگیردارانہ زندگی کے لیے اسپین سے بہتر ملک یورپ میں نہیں ملے گا۔ فادر وہاں کی لڑکیوں کے گداز جسم دیکھ کر تم اس عمر میں بھی پاگل......"

"براہِ کرم اپنی گفتگو خود تک محدود رکھو۔" فادر بیری نے سرد لہجے میں کہا۔

"فادر! تہہ خانے کی بجلی بحال ہو گئی ہے۔" سرکٹ چیک کرنے والے نے آکر اطلاع دی اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ ان تینوں کی گفتگو نے میرے کئی اندازوں کی تصدیق کر دی تھی۔ اول تو یہ کہ اس چرچ کی آڑ میں نہ صرف مقامی لوگوں کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا بلکہ کوئی غیر قانونی کام بھی ہو رہا تھا۔ چرچ تلے تہہ خانہ تھا۔ جہاں کسی شے کو پیٹیوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا اور آج رات ان پیٹیوں کو کہیں منتقل کیا جا رہا تھا۔ شاید ان میں اسلحہ تھا اس کو چھپانے کے لیے انہوں نے تہہ خانے کو بھی راز رکھا تھا۔

دوسرا شبہ مجھے مسایا کی بہن نتالی کے بارے میں تھا کہ وہ ان لوگوں کا شکار ہوئی ہے اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ وہ بے چاری نادانستگی میں تہہ خانے کا راز جان گئی تھی۔ اس کی سزا میں اسے نہ صرف اپنی جان سے محروم ہونا پڑا بلکہ مارنے سے پہلے اس کے کومل جسم کو ان درندوں نے دل بھر کر روندا تھا۔ ایک شبہ یہ بھی تھا کہ چرچ مشن اسلحے کی غیر قانونی تجارت کا ایک پڑاؤ تھا۔ اسلحہ باہر سے یہاں آتا تھا اور آگے جنگجو قبائل کو فراہم کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس تجارت سے اپنا کوئی مفاد بھی حاصل کر رہے تھے۔ پچیس ہزار ڈالرز کے سوئیس بانڈز کا ذکر تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک ٹرک کو جنگل کی طرف سے آتے دیکھا اور وہ چرچ کی عمارت کی طرف چلا گیا۔

آوازوں سے لگ رہا تھا کہ اس پر پیٹیاں بار کی جا رہی ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ٹرک واپس چلا گیا تھا۔ اس طرف بھی کوئی خفیہ راستہ تھا کیونکہ مسایا نے بتایا تھا کہ عقبی جنگل کی طرف خاردار تاروں میں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اتنا بڑا ٹرک بغیر راستے کے کس طرح آ سکتا تھا۔ ٹرک کے جاتے ہی میں تیزی سے واپس باتھ روم پہنچا اور بلب نکال کر ہولڈر سے تار کا لچھا نکال لیا۔ بلب دوبارہ ہولڈر میں لگا کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ چند منٹ بعد لائٹ آئی تو میں بہ ظاہر سو رہا تھا۔ انہوں نے کٹ آؤٹ لگا کر چیک کرنا شروع کر دیا تھا کہ فیوز کس حصے میں خرابی کی وجہ سے اُڑ رہا تھا۔ اگر میرے کمرے والے حصے کا کٹ آؤٹ لگانے سے فیوز اُڑتا تو مجھ پر بھی شبہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے بروقت ہولڈر سے تار کا لچھا نکال لیا تھا۔



''تم کہاں گئے تھے کل؟'' میں نے جان گرے سے پوچھا۔ وہ ناشتے کے فوراً بعد آیا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' وہ چونکا۔

''کل رات کھانا لانے والے شخص نے بتایا تھا۔ سنو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی بات۔'' اس نے غور سے دیکھا۔

''یہاں نہیں۔ کسی کھلی جگہ چلو جہاں کوئی ہماری بات نہ سن سکے۔''

جان گرے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''او کے...... آؤ میرے ساتھ۔''

میں اور جان گرے اس ہال نما کمرے تک پہنچے وہاں فادر بیری اور ایک مسلح شخص موجود تھے ان کے انداز سے لگا جیسے وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ''اسے کہاں لے جا رہے ہو جونی؟'' فادر بیری نے پوچھا۔

''میں اسے ذرا باہر لے جا رہا ہوں۔''

مسلح شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی قیدی صرف اس صورت میں اس عمارت سے باہر جا سکتا ہے جب اسے یہاں سے لے جایا جا رہا ہو ورنہ نہیں۔'' میں نے آواز سے اسے پہچانا۔ وہ گارڈز کا انچارج تھا۔

جان غرایا۔ ''تم...... تم مجھے کہہ رہے ہو یہ سب؟''

''جونی! غصہ مت کرو۔ یہ رول کا معاملہ ہے۔'' فادر بیری نے کہا۔ ''اور میں نے سوچا کہ اب اس شخص کو سیل میں بھیج دیا جائے۔ یہ خطرناک ہے۔''

''فادر بیری! تم بھول رہے ہو یہ آرگنائزیشن کا نہیں میرا ذاتی قیدی ہے۔''

''تب بھی اس پر یہاں کے رول اپلائی ہوں گے۔''

جان گرے نے اسے غور سے دیکھا۔ ''فادر بیری کھل کر بات کرو۔ تم جانتے ہو مجھے۔''

''جونی! مجھے شبہ ہے یہ شخص یہاں کے کچھ خاص رازوں سے واقف ہو گیا ہے۔ جن سے کسی





اجنبی کو واقف نہیں ہونا چاہیے۔'' بیری نے میری طرف دیکھا۔

''یہ شخص بکواس کر رہا ہے۔ میں یہاں کے کسی راز سے کیسے واقف ہو سکتا ہوں۔''

''کل رات اچانک پاور فیل ہو گئی تھی۔ اس شخص نے کچھ کیا تھا۔ سامنے والے ایک کمرے کی چھوٹی کھڑکی بھی کھلی پائی گئی تھی۔'' فادر بیری نے کہا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رات میں کھڑکی بند کرنا بھول گیا تھا۔ کسی نے اسے چیک کر لیا تھا۔ ''مجھے شبہ ہے اس نے کل رات کا آپریشن دیکھ لیا تھا۔''

''میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا میں کسی شے سے واقف نہیں ہوں۔''

''یہ درست کہہ رہا ہے۔ جب یہ باہر نہیں آ سکتا تھا تو آپریشن سے کیسے واقف ہوا؟'' جان گرے بولا۔

''اس نے کھڑکی سے دیکھا ہے۔ آپ اسے میرے حوالے کریں یہ ابھی اقرار کرے گا۔''

جان گرے نے گارڈز انچارج کو گھورا۔ ''تمہاری ڈیوٹی اس عمارت سے باہر ہے۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔''

انچارج نے فادر بیری کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کو جنبش دی تو وہ بادلِ نخواستہ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جان گرے نے تیور بدل کر فادر بیری سے پوچھا۔ ''بیری یہ کیا چکر ہے۔ اس شخص کی اتنی جرأت کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کرے۔''

''معاف کیجیے گا جناب وہ براہِ راست ہیڈ کوارٹر سے آیا ہے اس لیے تمہارے مرتبے سے واقف نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ ذرا خودسر شخص ہے اپنے کام کے سلسلے میں میری مداخلت بھی قبول نہیں کرتا ہے۔'' فادر بیری عیاری سے بولا۔

''کیا تم بھی مجھ سے ناواقف ہو۔'' جان گرے کے انداز میں سرد مہری تھی۔ ''تمہیں اس رویے کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

''میں جواب دے لوں گا۔ تم اوپر شکایت کر سکتے ہو۔'' اس بار وہ بھی لاپروائی سے بولا۔ ''یہ جگہ میرے انڈر ہے اور یہاں کی سیکیورٹی کا انچارج میں ہوں۔ مجھے اس شخص پر شبہ ہے۔''

''میں اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔'' جان گرے نے انکار کیا۔ ''اور جہاں تک تمہارے انچارج ہونے کی بات ہے میری طرف سے صرف ایک کال کی دیر ہے۔ تم سبکدوش کر کے واپس بھیج دیئے جاؤ گے۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔ فی الوقت میں اس شخص سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہوں گا۔'' فادر بیری نے اچانک اپنے لبادے سے ایک مہیب صورت پستول نکال لیا تھا۔ ''تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔''

''غدار۔'' جان گرے نے دانت پیسے لیکن اس نے ہاتھ اوپر نہیں کیے تھے۔ ''تم اپنی بربادی

کوآواز دے رہے ہو۔''

فادر بیری مسکرایا۔''میرا خیال ہے بربادی تمہاری آنے والی ہے جان گرے۔''

''اگر میرا بال بھی خراب ہوا تو تمہاری موت عبرت ناک ہوگی۔''

''مسٹر جان گرے! افسوس کہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ تم کہاں گئے۔ میری طرف سے اوپر بتایا جائے گا کہ تم اس شخص کو لے کر چلے گئے تھے۔ قبرستان میں بہت جگہ ہے۔''

''مگر تمہیں قبر نصیب نہیں ہوگی۔'' جان گرے زہریلے انداز میں بولا۔

اسی لمحے گارڈز انچارج اندر آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔''مجھے امید تھی بالآخر تم یہی فیصلہ کرو گے۔ یہ دونوں ہمارے لیے خطرناک ہو چکے ہیں۔ ان سے چھٹکارا لازمی ہے۔ میں نے تمام غیر متعلقہ افراد احاطے سے ہٹا دیئے ہیں۔''

جان گرے کو بھی احساس تھا کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے۔ غالباً انہوں نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ اس نے نرمی سے کہا۔''مسٹر بیری دیکھو مجھے اس چرچ کے معاملات سے سروکار نہیں ہے یہاں جو بھی ہو رہا ہے وہ تمہاری ذمے داری ہے۔ میں تمہارے معاملے میں مداخلت نہیں کر رہا ہوں۔''

''سوری مسٹر جان گرے! تم نے تاخیر کر دی ہے۔'' انچارج نے اپنی رائفل ہماری طرف سیدھی کی۔ مگر فادر بیری نے اسے روک دیا۔''اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام رات کو آرام سے کیا جا سکتا ہے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔ میرے خیال میں تو ان سے جلد از جلد چھٹکارا مناسب ہے۔''

''فی الوقت انہیں تہہ خانے میں قید کر دو۔''

وہ مجھے اور جان گرے کو اسلحے کی زد پر باہر لائے۔ میں نے پہلی بار اس جگہ کھلا آسمان دیکھا۔ گزشتہ دنوں پڑنے والی بیشتر برف پگھل گئی تھی۔ مگر سردی اب بھی بلا کی تھی۔ مجھے ان گرم کپڑوں میں بھی سردی لگ رہی تھی باقی افراد نے موسم کی مناسبت سے گرم لباس پہن رکھے تھے۔ ہم عقبی حصے میں آئے۔ فادر بیری نے چرچ کی عمارت کے گرد لگی لکڑی کی نوک دار باڑھ کے ساتھ کچھ چھیڑ کی اور باڑھ کا ایک پورا حصہ یوں اوپر اُٹھ گیا جیسے کسی گاڑی کی ڈگی کھلتی ہے۔ اس سے نیچے زینے نظر آئے۔ چند زینے اُتر کر ایک چھوٹی سی راہ داری نظر آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لفٹ نظر آئے گی جس کا کل رات ذکر ہو رہا تھا مگر یہ راہ داری ڈھلان کی صورت میں نیچے جا رہی تھی۔ میں نے اور جان گرے نے ہاتھ سروں پر رکھے اور جان گرے سے اس کا پستول لے لیا تھا۔ وہ دبی زبان میں کسی کا نام لیے بغیر گالیاں دے رہا تھا۔ ہمیں ایک ہال نما کمرے میں پہنچایا گیا۔ جہاں چاروں طرف پیٹیاں پڑی تھیں۔ ہمیں وسط میں زمین سے منسلک زنجیروں کے سروں پر بنی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔




''اب تم دونوں اپنا آخری وقت آنے تک اس جگہ آرام کرو گے۔'' فادر بیری مسکرایا تھا۔

''بیری...... کیا تم لوگ کوئی کام آرگنائزیشن سے ہٹ کر کر رہے ہو۔''

''مجھ سے پوچھو۔'' میں نے جان گرے سے کہا۔''یہ لوگ آرگنائزیشن کی طرف آنے والے اسلحے میں سے خرد برد کر کے اسے فروخت کر رہے ہیں۔''

''یہ شخص سب جانتا ہے۔'' انچارج نے بیری کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارے باپ کا نام نہیں جانتا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔''شاید تم بھی نہیں جانتے۔''

''بکومت۔'' وہ گرجا اس نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ مگر فادر بیری نے پھر مداخلت کی۔

''حماقت مت کرو۔ بھونکنے دو اسے۔ رات کو اس کی زبان آرام سے بند کر دیں گے۔''

وہ کینہ توز نظروں سے ہمیں گھورتے چلے گئے۔ میں نے طنزیہ نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھا۔''کیوں جناب اب کیا کریں گے ان سے جان بچانے کے لیے۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ فادر غداری کر رہا ہوگا۔''

''جان گرے! آج کی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے چکر میں لگا ہے۔ بے چارے فادر نے کیا قصور کیا ہے۔''

''وہ آرگنائزیشن سے غداری کر رہا ہے۔''

''ظاہر ہے یہ سوچو کہ ان سے جان کیسے بچے گی؟''

جان گرے چپ ہو گیا۔''اگر میں غائب ہوا تو اس سے حساب لیا جائے گا۔''

''اس سے قبروں میں ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔''کیا تمہارے پاس ایسی کوئی شے ہے جس سے اس ہتھکڑی کو کھولا جا سکے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔''اتفاق سے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''وہ حربہ جس کی مدد سے تم نے ہیلی کاپٹر میں کرنل بوگارڈ کے آدمیوں پر قابو پایا تھا؟''

اس نے سرد آہ بھری۔''وہ بھی خرچ ہو چکا ہے۔''

''یعنی ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔'' میں نے جوابی سرد آہ بھری۔''یہ بتاؤ کہ تم کس چکر میں یہاں ٹھہرے ہو۔''

''میں چاہ رہا تھا کہ جزیرے پر جانے سے پہلے تمہیں معافی مل جائے۔''

''چلو معافی مل گئی پھر؟''

''تب تمہیں الیکٹرک سے مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا۔ اسے معمولی مت سمجھو۔ اس دن اس کی شکست میں اتفاق کا بھی دخل تھا۔''

''میں نے کبھی اپنے کسی حریف کو معمولی نہیں سمجھا۔'' میں نے اردگرد کا جائزہ لیا زمین میں گڑی زنجیر صرف چار فٹ لمبی تھی اور میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ گیارہ فٹ دور تک اپنا پاؤں

پہنچا سکتا تھا۔ مگر اس گیارہ فٹ کی حد میں کوئی شے نہیں تھی اس جگہ کے عین اوپر تیز روشنی والا بلب تھا۔ دیواروں پر بھی جا بجا بلب لگے تھے یعنی اس جگہ روشنی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیوار کے ساتھ سلیقے سے پیٹیاں لگی تھیں اور ظاہر ہے ان میں اسلحہ تھا۔ جان گرے حسرت سے ان پیٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کاش کہ ایک پیٹی ہماری رسائی میں ہوتی تو میں اس فادر بیری کو دیکھ لیتا۔“

”ان پیٹیوں میں کس قسم کا اسلحہ ہے۔“

”ہر قسم کا...... خودکار رائفلیں ہیں، راکٹ لانچر، گرینیڈ، مارٹر، طیارہ شکن میزائل ہیں۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ”اتنا بڑا اسلحہ، کیا افریقہ میں جنگ ہو رہی ہے؟“

”خانہ جنگیاں جاری ہیں۔ بہت ساری جنگوں کی خبریں باہر آتی ہی نہیں ہیں جن میں روزانہ سینکڑوں لوگ مارے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ جنگیں اسلحہ سے لڑی جاتی ہیں۔“

میں نے نفرت سے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے خیال میں کیا تم اس طرح ان لوگوں کو ختم کر دو گے۔“

”یہ میرا نہیں ان لوگوں کا خیال ہے جو اس سارے معاملے کی ڈوریں ہلا رہے ہیں جن کے کارخانوں سے یہ مہلک اسلحہ بن کر آتا ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں ان کی بساط کا ایک مہرہ ہوں۔“

وہ درست کہہ رہا تھا اگر اسے یہ کام ناپسند ہوتا تو بساط کے لیے مہروں کی کوئی کمی نہیں تھی اس کی جگہ کوئی اور مہرا آتا کھیل یونہی جاری رہتا۔ بلکہ عین ممکن تھا دو چار دن بعد جان گرے کے بڑوں کو اس کا متبادل تلاش کرنا ہی پڑے۔ آج رات وہ اور میں اس صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتے۔ جان گرے کی کلائی پر گھڑی سے ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔

سات بجے میرے اندازے سے باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ اور موت کے فرشتے کسی وقت بھی نازل ہو سکتے تھے اس وقت میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ مجھے اضطراب بھی تھا اور عجیب سا سکون بھی، وقت گزرتا رہا نو بجے تک کسی نے ہماری خبر نہیں لی تھی۔ جان گرے خاصی دیر سے چپ تھا۔ ایک موقع پر وہ فرش پر لیٹ کر سو بھی گیا تھا۔ گویا اسے بھی سچویشن کی اتنی پروا نہیں تھی۔ دس بجے کے قریب آہٹ ہوئی، کوئی ہال کی طرف آ رہا تھا۔

”تیار ہو جاؤ مرنے کے لیے۔“ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔

آنے والا فادر بیری تھا اور اکیلا تھا البتہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ہم سے محفوظ فاصلے پر رُک گیا۔ ”جان گرے میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں۔“

”میں تم جیسے معمولی شخص سے کوئی ڈیل نہیں کر سکتا۔“ جان گرے نے فوراً انکار کر دیا۔ ”تم زیادہ سے زیادہ مجھے مار سکتے ہو۔“

”مرنے اور اذیت سے مرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اس نے سفاکی سے کہا تھا۔ ”میری





بات مان لو میں تمہیں آسان موت دوں گا۔ دوسری صورت میں ممکن ہے تم کئی دن سسک کر زندہ رہو اور پھر میری بھی بات مان کر اس طرح مرو تو یہ خسارے کا سودا ہو گا۔“

”مجھے پتا ہے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ جان گرے کے لہجے میں حقارت تھی۔ ”تمہیں ہو تو قبائل کے لیے جانے والی شپ منٹ کا کوڈ چاہیے۔“

فادر بیری ایک لمحے کے لیے حیران ہوا لیکن پھر جلدی سے خود کو سنبھال لیا۔ ”تم واقعی ذہین آدمی ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”مجھے اس شپ منٹ کا کوڈ دے کر تم سکون سے اور فوری موت مر سکتے ہو لیکن میری ڈیل اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔“

”کیا کرو گے تم؟“

”میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ پھر ایک بار رقم میرے ہاتھ آ گئی تو میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”ان لوگوں سے کیسے بچو گے جن کا یہ اسلحہ اور رقم ہے۔ وہ تمہیں قبر سے بھی نکال لیں گے اور تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں گے کہ جہنم میں بھی تمہاری روح بلبلاتی رہے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے تم اپنی بات کرو کیا تم زندہ نہیں رہنا چاہتے۔“

”احمقانہ باتیں مت کرو۔ کون زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ جان گرے نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے کیا ضمانت ہے کہ کوڈ لے کر بھی مجھے زندہ رہنے دو گے۔“

”اس معاملے میں تمہیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا پڑے گا۔ ورنہ کولن کو تم جانتے ہو کس قدر درندہ صفت آدمی ہے۔ اگر میں تمہیں نتالی کی لاش دکھاتا تو کئی راتوں تک تمہیں نیند نہ آتی۔“

”بکومت میں کولن جیسے لوگوں سے ڈروں گا جو صرف عورتوں پر تشدد کرنا جانتے ہیں۔“ جان گرے حقارت سے بولا۔ ”میں ایک شرط پر تمہارے لیے کام کر سکتا ہوں۔ سارے معاملات میں طے کروں گا جب رقم اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی تو ہم آپس میں اسے بانٹ لیں گے۔“

”میں تمہیں صرف ایک چیز دے سکتا ہوں۔ رقم یا زندگی اور تم کسی معاملے میں شریک نہیں ہو گے بس کوڈ بتاؤ۔“

”تب تمہارا جو دل چاہے کرو۔“ جان گرے لاپروائی سے بولا۔

”میں نے کہا تھا یہ اس طرح نہیں مانے گا۔“ کولن سامنے آیا۔ ”انہیں ٹارچ چیمبر میں لے چلو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں یہ کوڈ بتا دے گا۔“

”لگ رہا ہے اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ فادر بیری سرد لہجے میں بولا۔

”کھولو انہیں اور لے کر چلو۔“ کولن نے رائفل ہماری طرف کر دی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ فادر بیری نے میری طرف اشارہ کیا۔

"تب قصہ پاک کرتا ہوں۔" کولن نے رائفل میری طرف سیدھی کی۔

"یہاں گندمت کرو۔ ایک ساتھ ہی دونوں کو دفنا دیں گے۔" فادر بیری بے زاری سے بولا تو بات کولن کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مجھے اور جان گرے کو ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا اور جب ہم نے تعمیل کی تو فادر بیری نے آ کر جان گرے کی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ جان گرے کو لے گئے میں مزاحمت بھی نہیں کر سکتا تھا اور میرے اختیار میں ہوتا تب بھی شاید میں اسے نہ بچاتا۔ بہرحال جان گرے میرا دشمن تھا، ایسا دشمن جس کے ساتھ کچھ عرصہ گزار کر ذرا انسیت سی ہو گئی تھی لیکن یہ انسیت دشمنی کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ زیر زمین ہونے کی وجہ سے تہہ خانہ کسی قدر گرم تھا مگر موسم کی شدت اس کے ماحول پر اثر انداز ہوئی تھی اور میں خاصے گرم لباس میں بھی سردی محسوس کر رہا تھا۔ جان گرے بے شک سخت جان سہی لیکن تشدد کے آگے تو پتھر بھی جواب دے جاتا ہے۔ خود میں نے بارہا ایسے لوگوں کو زبان کھولنے پر مجبور کیا تھا جو بہ ظاہر بہت سخت جان نظر آتے تھے۔ جان گرے کے بارے میں مَیں جانتا تھا اندر سے وہ بزدل آدمی تھا اور صرف جان کی فکر اسے زبان کھولنے سے روک سکتی تھی۔

میں سکڑ سمٹ کر بیٹھا تھا۔ آہٹ پر میں نے سر اُٹھایا کہ شاید فادر بیری یا کولن میں سے کوئی آیا ہے لیکن مسایا کو دیکھ کر حیرت سے زیادہ مجھے صدمہ ہوا تھا۔ وہ ان کے ساتھ شامل تھا کیا اپنی بہن کے قاتلوں کے ساتھ، مگر نہیں...... اس کے تاثرات کچھ اور تھے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور تیزی سے میرے نزدیک آیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ زندہ ہیں ورنہ میں سمجھ رہا تھا......"

"تمہیں اس تہہ خانے کا علم کیسے ہوا؟"

"شک مجھے عرصے سے تھا لیکن آج میں نے ان لوگوں کو آپ دونوں کو اندر لے جاتے دیکھا تھا۔"

"تم اندر کیسے آئے۔ کولن بتا رہا تھا کہ اس نے تمام مقامی افراد کو باہر نکال دیا ہے۔"

"میں نے ایک راستہ تلاش کر لیا تھا اس سے میں جب چاہے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں آ سکتا ہوں۔"

"مسایا...... کولن اور اس کے ساتھی گارڈز نتالی کے قاتل ہیں۔ فادر بیری نے اسے خفیہ راستے کا راز پاتے دیکھ کر پکڑ لیا تھا۔"

"میں...... میں جانتا ہوں مجھے ان لوگوں پر شک تھا۔" مسایا کی آواز بھرا گئی تھی۔ "اب میں ان کتوں سے انتقام لوں گا لیکن پہلے میں آپ کو کھول دوں۔"

"اور مجھے تجھ پر شک تھا" اچانک کولن پیٹیوں کے عقب سے نکل آیا۔ "کالے کتے...... تجھے بھی تیری بہن کے پاس پہنچاتا ہوں۔ افسوس کہ وقت نہیں ہے ورنہ تجھے بھی سسکا سسکا کر مارتا۔"




"حرام زادے......" مسایا دھاڑ کر اس کی طرف لپکا اور کولن کو فائر کرتے دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

تہہ خانے کی محدود فضا میں بارودی جھنکار کچھ زیادہ ہی شدت سے گونجی تھی۔ مسایا کی کربناک چیخ اس میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کولن وحشیانہ انداز میں مسکرا رہا تھا اور مسایا فرش پر ساکت پڑا تھا۔ اس کے پیٹ اور سینے پر کئی سوراخ تھے جن سے خون اُبل رہا تھا۔ اس وقت میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس شخص کی گردن دانتوں سے چبا ڈالتا۔ میں آگے بڑھا لیکن زنجیر نے مجھے روک لیا۔ میں نے سلگتی نگاہوں سے کولن کو دیکھا تو وہ ہنسا۔ "ایسے مت دیکھو ڈر کے مارے میرا دم نکل جائے گا۔"

"اس وقت سے ڈرو جب تم میرے قابو میں ہو گے اور میں اس کے خون کا حساب لوں گا۔" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے احمقانہ انداز میں دھمکی دی۔ محض جذباتی دھمکی۔

"میں ڈر جاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "اب تم اسے دیکھتے رہو۔ تمہارا انجام اس سے مختلف نہیں ہوگا۔"

"کس کا کیا انجام ہوگا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔"

"ابھی میں جونی کو دیکھ لوں اس کے بعد تمہاری لمبی زبان بھی تراشوں گا۔ تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے مسایا کی طرف اشارہ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں اپنا غصہ ضبط کرنے لگا۔ میرے سینے میں جیسے کچھ جل رہا تھا۔ چند لمحے پہلے یہ نوجوان اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے پُرجوش تھا اور اب خود ان قاتلوں کا شکار بن گیا تھا۔ مسایا اتنے فاصلے پر تھا کہ میں اسے ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتا تھا۔ میں اس کی مغفرت کی دعا نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے غمزدہ ضرور تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "مسایا! اگر میں زندہ رہا تو یہ میرا وعدہ ہے تمہارے قاتل زندہ نہیں رہیں گے۔"

اس وقت اس نے جان پر کھیل کر ہماری مدد کرنا چاہی تھی لیکن جان ہارنے کے باوجود ہماری مدد نہ کر سکا تھا اس میں کسی حد تک غلطی میری بھی تھی۔ مجھے باتوں میں لگنے کی بجائے سب سے پہلے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ باتوں میں پتا نہیں چلا کہ کب عیار دشمن سر پر آ گیا ہے اور اس نے نوجوان مسایا کو اس کے لہو میں نہلا دیا تھا۔ میں نے دُکھ سے سر جھکا لیا۔ گزشتہ چند مہینوں میں مَیں نے سینکڑوں افراد کو مرتے دیکھا تھا۔ درجنوں خود میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مگر ان میں سے چند اموات ایسی تھیں جن پر مجھے شدت سے دُکھ ہوا تھا۔ مسایا ان میں سے ایک تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ کراہنے کی آواز آئی۔ میں چونکا۔ مسایا حرکت کر رہا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ "مسایا۔" میں نے خوشی سے پکارا تو اس نے کروٹ لی۔ اس کی آنکھیں بے جان ہو رہی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ سینے اور پیٹ پر تقریباً نصف درجن گولیاں کھانے کے باوجود زندہ تھا۔ اس کی قوتِ ارادی بے

مثال تھی۔

''صاحب!'' وہ بازوؤں پر زور دے کر اُٹھا اور کھسک کر میرے پاس آنے لگا۔

''شاباش مسایا! آؤ میرے پاس آؤ۔''

وہ اپنی رہی سہی جسمانی قوت استعمال کر کے نزدیک آ رہا تھا۔ اپنے ہی خون سے بنے تالاب سے گزر کر رفتہ رفتہ وہ اتنے نزدیک آیا کہ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کا سر اپنے زانوں پر رکھا تو اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ''صاحب میری جیب میں ایک میجک شاپ ہے۔ اس سے اپنا تالا کھولنے کی کوشش کرو۔ جلدی کرو وہ پھر نہ آ جائے۔''

میں نے اس کی جیب سے یہ آلہ نکالا۔ دراصل یہ مختلف طرح کے چاقوؤں، ریتی، پیچ کس اور ٹن اوپنر رکھنے والا آلہ تھا۔ میں نے نوک والا ننھا سا چاقو منتخب کر کے اسے ہتھکڑی کے تالے میں ڈالا۔ تالا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ایک منٹ سے پہلے کھل گیا۔ ہتھکڑی سے نجات پاتے ہی میں نے سب سے پہلے مسایا کو اُٹھایا اور پیٹیوں کے درمیان ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں ہم فوری طور پر کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ تھے۔ مسایا حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''میری...... بہن کے قاتل۔''

''وہ اب نہیں بچیں گے۔'' میں نے اس سے وعدہ کیا۔ ''مسایا میں انہیں ختم کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا جو جلدی ابدی سکوت میں بدل گیا۔ یہ اس کی خواہش تھی جس نے اسے اب تک زندہ رکھا تھا۔ وہ بہر صورت اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ مسایا کا لہو میرے کپڑوں پر بھی لگ گیا تھا۔ ملٹی پرپز آلے کی مدد سے میں نے ایک پیٹی کھول کر دیکھی اس میں راکٹ بھرے تھے۔ دوسرے میں دستی بم تھے۔ میں نے ان میں سے چند بم نکال لیے۔ مطلوبہ ہتھیار مجھے کئی پیٹیاں کھنگالنے کے بعد ملے۔ ان میں یوزی مشین گن اور اس کے کلپس تھے۔ ایک پیٹی میں روسی ساخت اے کے چوہتر رائفل تھی لیکن ٹکڑوں کی صورت میں تھی۔ بالآخر ایک پیٹی سے ٹائم بم بھی نکل آئے۔ میں نے چند ٹائم بم اس ہال کے مختلف حصوں میں لگا دیئے اور وقت بیس منٹ بعد کا سیٹ کیا تھا۔

ہال کی طرف جو راستہ آتا تھا۔ وہ دائیں طرف تھا۔ بائیں طرف بھی ایک گیلری تھی اور مجھے یاد تھا ہم دائیں طرف سے ہی آئے تھے۔ جیسے ہی میں نے اس راستے پر قدم رکھا سامنے سے دو افراد آتے نظر آئے اور میں نے بلا جھجک انہیں شوٹ کر دیا۔ ورنہ وہ حیرت کے جھٹکے سے نکل کر مجھے مار دیتے۔ اور وہ نہتے بھی ہوتے تب بھی میں ان کے ساتھ یہی سلوک کرتا۔ یوزی مشین گن زیادہ آواز نہیں کرتی ہے مگر پھر بھی اتنا شور ضرور ہوا کہ تہہ خانے یا اس کے آس پاس دوسرے لوگوں نے اسے سن لیا تھا۔ میں نے کولن کے چلانے کی آواز سنی۔ ''فائرنگ کون کر رہا ہے۔'' آواز بائیں طرف سے





آئی تھی۔ میں اس طرف لپکا۔ ایک کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور فادر بیری کے ساتھ کولن نمودار ہوا۔ وہ بلاشبہ پھرتیلا آدمی تھا۔ میرے عزائم بھانپتے ہی اس نے فادر بیری کو میرے سامنے دھکیل دیا اور خود پھرتی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ فادر بیری کا ہاتھ اپنے چوغے کی جیب کی طرف گیا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگوں پر برسٹ مارا۔ وہ چیخ مار کر گرا اور کربناک انداز میں ہاتھ پٹخنے لگا۔ میں نے اس کی جیب سے پستول نکال کر بند دروازے کے لاک پر لگاتار فائر کیے۔ اندر سے کولن چلایا۔

''خبردار! میں اسے گولی مار دوں گا۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''تو اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ البتہ تم باہر نہ آئے تو میں اندر دستی بم پھینک دوں گا۔ بس صرف تین تک گنوں گا۔''

''یوسف میں بھی مارا جاؤں گا۔'' جان گرے چلایا۔

''مجھے افسوس ہے جان گرے لیکن میں اس شخص کو معاف نہیں کر سکتا اور سنو اگر یہ باہر نہ آیا تو بھی مارا جائے گا۔ میں نے اسلحے کے ذخیرے میں ٹائم بم لگا دیئے ہیں۔ ان کے پھٹنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔''

یہ سنتے ہی فادر بیری تڑپنا بھول گیا تھا اور کولن دیوانہ وار گالیاں دینے لگا تھا۔ ''بکواس کرتا ہے تو۔''

''او کے...... میں جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو انہیں تلاش کر کے ناکارہ بنا دو ورنہ مرو گے تو خود یقین آ جائے گا۔''

''بکواس کرتے ہو تم...... تمہیں کوئی بم نہیں ملا ہے۔'' کولن کی آواز لرز رہی تھی۔

''اب کیا میں ان کی ساخت بتاؤں۔'' میں نے طنزیہ کہا۔ ''سیاہ رنگ اور چوکور ساخت کے یہ بم مجھے ایک پیٹی سے ملے ہیں۔''

''کولن یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' فادر بیری کراہ کر بولا۔ ''با...... ہر آ جاؤ ورنہ ہم سب مر جائیں گے۔''

''باہر آ جاؤں تا کہ یہ مجھے فوراً گولی مار دے۔'' کولن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جب مجھے مرنا ہی ہے تو میں اکیلا کیوں مروں۔ سب کو ساتھ لے کر کیوں نہ مروں۔''

''میرے بارے میں تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ میں باہر جانے کے لیے آزاد ہوں۔ بلکہ چاہوں تو ابھی تم اس کمرے کے ملبے تلے دفن ہو جاؤ گے۔ اگر تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔''

اس نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔ ''بکواس بند کرو۔''

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور نہ جانے کتنی دیر باقی رہ گئی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔

اگر وقت گزرنے کے بارے میں میرا اندازہ غلط ہو جاتا تو میں بھی اس تہہ خانے میں دفن ہو کر رہ جاتا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا پھر میری نظر فادر بیری پر پڑی وہ بے ہوش ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو چغے کے کالر سے پکڑ کر اُٹھایا اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری تھی۔ گولیوں نے اس کے پیروں کا قیمہ کر دیا تھا۔ میں نے بے دردی سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ انسانیت کے ان مجرموں کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا کولن نے فائر کیے اور ساری گولیاں فادر بیری کے کشادہ سینے میں سما گئیں۔ کولن کمرے میں ایک میز کے عقب میں دبکا تھا۔ فادر بیری فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی کولن نے فائرنگ روکی میں نے فادر بیری کی لاش اُٹھا کر اس پر پھینک دی اور جب تک وہ سنبھلتا اس کے سر پر مشین گن کی نال لگا دی۔ ''حرکت مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔''

وہ ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی رائفل فرش پر گرا دی۔ میں نے میز کے عقب سے اسے کھینچ کر مخالف سمت دیوار پر دے مارا۔ میرے انداز میں وحشت اور نفرت کی ساری شدت تھی۔ وہ پٹ سے دیوار سے ٹکرایا اور مُردہ مچھلی کی طرح نیچے گر گیا۔ وہ بے ہوشی کی اداکاری کر رہا تھا لیکن جب میں نے اس کے پیروں کی طرف زمین پر برسٹ مارا تو وہ بے ساختہ اُچھل پڑا تھا۔ جان گرے ایک طرف کرسی پر بندھا بیٹھا تھا اور اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہوں نے کوڈ معلوم کرنے کے لیے اس پر خاصی طبع آزمائی کی تھی۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور ناک سے خون نکل کر جم گیا تھا۔ میں نے کولن کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اوپر اور کتنے لوگ ہیں؟''

''آٹھ افراد اور ہیں۔''

''ان سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''فادر کے پاس آپریٹس ہے۔ میرا اوپر ہی رہ گیا ہے۔''

مگر فادر کی جیب سے نکلنے والا آپریٹس ایک گولی سے تباہ ہو گیا تھا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ان سے میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ اب اسے کھولو۔'' میں نے اسے جان گرے کی طرف دھکیلا۔ اس نے جلدی سے جان گرے کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہوتے ہی جان گرے نے اس کی رانوں کے درمیان ٹھوکر ماری اور جب وہ جھکا تو اس کے بال تھام کر اسے دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ کولن کی ساری اکڑ فوں ہوا ہو چکی تھی۔ اس نے پوری سعادت مندی سے دیوار کو ٹکر ماری اور اس بار سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔ جان گرے نے لپک کر اس کی رائفل اُٹھائی اور اس سے پہلے میں اسے روکتا اس نے بے ہوش کولن کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں عالم بالا کو سدھار گیا۔ جان گرے نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے واقعی ٹائم بم لگا دیئے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا تو واقعی کچھ ایسا ہی ہے۔''





''احمق آدمی بھاگو۔ یہاں اتنا گولہ بارود ہے کہ سب تباہ ہو جائے گا۔'' وہ اُچھل کر بھاگا۔ پھر واپس آ کر کولن کے لباس سے رائفل کے اضافی میگزین اُتار لیے۔ ہم باہر کی طرف لپکے۔ راستے میں دو لاشیں دیکھ کر جان گرے کی رفتار کم ہوئی تھی مگر وہ رُکا نہیں۔ ذرا سی دیر میں ہم اوپر جانے والی ڈھلان پر تھے مگر جب دروازے کے سامنے پہنچے تو اسے کھولنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہاں ایسی کوئی شے بھی نہیں جس سے خفیہ راستہ کھولا جا سکتا۔ لفٹ والا راستہ نہ جانے کہاں تھا۔ جان گرے ناچتا پھر رہا تھا۔

''باہر کیسے جائیں؟''

''اس طرف آؤ۔'' میں نے دستی بم نکالتے ہوئے کہا اور اس کی پن نکال کر اسے دروازے کے پاس رکھ کر میں نیچے کی طرف بھاگا۔ ڈھلان کے آخری حصے پر تھے جب دھماکے نے ہمیں زمین بوس کر دیا۔ وہاں سے بھاگ کر ہم نے عقلمندی کی تھی کیونکہ طاقتور گرینیڈ نے سرنگ کی چھت بھی گرا دی تھی۔ وہاں دھواں اور گرد کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی باہر تاریکی تھی۔ میں اور جان گرے راستہ ٹٹولتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں پر کوئی اور بھی تھا میں بے ساختہ زمین پر گر گیا اور رینگتا ہوا چرچ کی عمارت سے دور جانے لگا۔ کوئی میرے نزدیک سے گزرا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے اور میرے درمیان میں پھولدار جھاڑی تھی۔ اس وجہ سے میں اس کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہا۔ کم سے کم چار افراد میرے سامنے مختلف جگہوں سے آ کر تہہ خانے کی طرف گئے جہاں موت ان کی منتظر تھی۔ جان گرے نہ جانے کہاں تھا اور مجھے اس کی خاص فکر بھی نہیں تھی۔ میں دھماکوں سے پہلے چرچ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اچانک زمین لرزی اور بغیر کسی خاص آواز کے چرچ کا اوپری حصہ یوں کھل گیا جیسے آتش فشاں پھٹتا ہے اور اس سے آگ کا فوارہ سا بلند ہوا تھا۔ اس کے بعد پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ میں نے احتیاط بالائے طاق رکھی اور اُٹھ کر بھاگا۔ اس جگہ نہ جانے کس قسم کا گولہ بارود ذخیرہ تھا اور اس کی حد ضرب کتنی تھی۔ میں چرچ سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا کہ شوں کی آواز کے ساتھ ایک مارٹر گولہ میرے اوپر سے گزر کر سامنے درختوں میں جا گرا۔ دھماکے کے بعد درختوں میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے راستہ بدل دیا۔ درختوں کے درمیان سے گزرنا زیادہ محفوظ تھا۔ عقب سے دھماکوں کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے میں باڑھ تک آیا لیکن اس کے دوسری طرف جانے کے لیے راستہ بنانا ضروری تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر درخت کے عقب میں جا کر دستی بم باڑھ کی طرف اُچھال دیا۔ دھماکے کے بعد میں نے جھانکا تو باڑھ کا بڑا حصہ غائب تھا۔ میں با آسانی اس سے گزر گیا۔

''یوسف۔'' عقب سے جان گرے کی آواز آئی اور میں گہری سانس لے کر رُک گیا۔ مڑ کر دیکھا جان گرے میرے پیچھے بے تابانہ بھاگا چلا آ رہا تھا۔ لگتا تھا قدرت نے مجھے اس سے نتھی کر دیا

ہے۔اس سے چھٹکارے کے لیے اس کا یا میرا مرنا ضروری تھا ورنہ لوٹ پھر کر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے تھے۔میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کیا اور چلایا۔''نیچے ہو جاؤ۔''اس کے ساتھ ہی میں نے برسٹ مارا جان گرے نے غوطہ لگایا اور اس کے عقب میں نمودار ہونے والا مسلح شخص ہاتھ لہراتا بالکل فلمی انداز میں زمین پر گر گیا۔غالباً اس نے زندگی میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کی موت گولی کھا کر واقع ہوئی تو وہ اس سلسلے میں معروف فلمی سٹائل کی پیروی کرے گا۔

''شکریہ!''جان گرے ہانپتے ہوئے بولا۔''یہ تم میرے بغیر کہاں جا رہے تھے؟''

''فی الوقت تو میں بھاگ رہا ہوں۔''میں نے اسے آگاہ کیا۔اسی لمحے ایک راکٹ آ کر کچھ دور گرا اور ہم دونوں بے اختیار زمین پر گر گئے اسی وجہ سے بچت ہو گئی ورنہ راکٹ کے ٹکڑے ہمیں زخمی ضرور کر دیتے۔جان گرے زمین سے اُٹھا اور مجھ سے آگے بھاگا۔چرچ کی آگ نے اردگرد کا ماحول روشن کر دیا تھا۔سامنے تاریک جنگل تھا۔ہمیں وہاں پناہ مل سکتی تھی۔میں اور جان گرے جنگل میں گھستے چلے گئے۔عقب میں دھماکے جاری تھے۔جنگل کے وسط تک پہنچ کر ہم رُک گئے۔یہاں تاریکی تھی اوپر سے چاند کی روشنی چھن رہی تھی جس میں ہم ایک دوسرے کے ہیولے ہی دیکھ سکتے تھے۔جان گرے ہانپتے ہوئے بولا۔''وہ سب مارے گئے۔تین کو تو میں نے مارا تھا۔''

''اور تین ہی میرے ہاتھوں مارے گئے۔باقی چرچ میں مر گئے۔''

''یہاں سے نکل چلو۔اس سے پہلے کہ یہاں کے لوگ جمع ہوں وہ سمجھیں گے کہ اس تباہی کے ذمے دار ہم ہیں۔''

''وہ تو ہیں اور تمہاری تجویز بھی اچھی ہے کہ یہاں سے نکل چلنا چاہیے لیکن ایک ساتھ نہیں بلکہ الگ الگ یہاں سے ہمارے راستے جدا ہیں۔''

''نہیں تم میرے ساتھ جاؤ گے۔''

''ابھی میں مجبور نہیں ہوں۔''میں نے مشین گن اس کی طرف سیدھی کی تو وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

''یوسف تم مجبور ہو اور رہو گے۔''

''وہ کس طرح؟''میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''میرے بغیر تم آرگنائزیشن سے چھٹکارا نہیں پا سکتے اور نہ ہی جنوبی افریقہ میں اپنے خلاف مقدمے ختم کرا سکتے ہو۔بتاؤ یہ کام کر سکتے ہو میرے بغیر؟''

میں نے غور کیا۔''نہیں مگر میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔''

''کب تک یوسف یہ لوگ جان چھوڑنے والے نہیں ہیں۔نہ آرگنائزیشن والے اور مقدموں میں مطلوب ہونے کی وجہ سے تمہیں انٹرپول کے ذریعے تلاش کیا جائے گا۔اس کا مطلب ہے تم دنیا میں کہیں سکون سے نہیں رہ سکو گے۔تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا ہے۔وہ کبھی نہیں ہو





سکے گا۔''

''اور تم مجھے ان سارے چکروں سے نجات دلا دو گے؟''میں نے طنزاً کہا۔

''ہاں......''اس نے سینہ تان کر کہا۔''اگر ایسا نہ کر سکا تو بے شک تم میرا کام کرنے سے انکار کر دینا۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔میں جس چکر میں تھا اس سے نکلنا آسان نہیں تھا۔اگر میں جان گرے کی قزاق تنظیم سے کسی طرح بچ بھی جاتا تب بھی جنوبی افریقہ میں دہشت گردانہ مقدمات میں ملوث ہونے کی وجہ سے مجھے انٹرپول کی مدد سے تلاش کیا جاتا اور میں ہر ملک میں اشتہاری قرار پاتا۔کہیں سکون سے نہیں رہ سکتا تھا۔جان گرے کا اثر و رسوخ تھا اور وہ چاہتا تو ان چکروں سے مجھے بچا سکتا تھا۔مجھے اس کے وعدے پر بھروسہ کرنا ہی تھا پھر اسے بھی مجھ سے کام تھا۔تبھی وہ مجھے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔میری وجہ سے اس نے فادر بیری سے مخاصمت قبول کی۔اگرچہ اندرون خانہ ان لوگوں کی نیت جان گرے پر بھی خراب تھی لیکن اس سے پہلے وہ صرف مجھے اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔یہ اس کا احسان نہیں تھا بلکہ میری اشد ضرورت تھی۔جس کی وجہ سے وہ کسی صورت مجھ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

''او کے!''میں نے گہری سانس لی۔''اب ہمیں کیا کرنا ہے۔میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''گڈ!''جان گرے نے گرم جوشی سے میرا بازو تھپتھپایا۔''میرے ساتھ آؤ۔''

باہر کا موسم بے پناہ سرد تھا اور درجہ حرارت شاید نقطہ انجماد کے آس پاس تھا اور میں ٹھٹھر رہا تھا۔چلنے کی وجہ سے جسم کچھ گرم ہو رہا تھا ورنہ شاید میں منجمد ہو کر رہ جاتا۔جان گرے نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس سے اسے خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا مگر میرا بُرا حال تھا۔ایک گھنٹے بعد میری ہمت جواب دینے لگی۔''اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا ہے۔پلیز رُک کر الاؤ جلاؤ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔''

''بس کچھ دور اور ایک غار ہے اس میں ہم زیادہ بہتر طور پر رات گزار سکیں گے۔''

برف پگھل گئی تھی اور شکر ہے ہوا نہیں چل رہی تھی ورنہ سردی قیامت خیز ہو جاتی۔''تمہیں اس غار کا علم کیسے ہوا؟''میں نے شاخیں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''میں اس علاقے میں پھرتا رہا ہوں اس لیے اتفاق سے یہ غار نظر میں آ گیا۔میں نے وہاں کچھ سامان بھی رکھا تھا۔''

میں چونکا۔''یعنی تمہارے ذہن میں پہلے سے کچھ تھا۔''

''ہاں......دیکھو ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ان کا کچھ بھروسہ نہیں ہے جب تک بوگارڈ کا اثر و رسوخ مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتا ہے تب تک ہم محفوظ نہیں ہیں۔''

''یعنی جب تک بوگارڈ ختم نہیں ہو جاتا ہے۔''

''میں نے اس کے بارے میں بھی رپورٹ کی ہے۔امید ہے جلد اس سے چھٹکارے کا حکم آ

جائے گا۔"

"یہ فادر بیری اور کولن کیا چکر چلا رہے تھے مجھے ان کی دیدہ دلیری پر حیرت ہے۔"

"جب حالات خراب ہوں تو اپنے کتے بھی منہ کو آنے لگتے ہیں۔" جان گرے تلخی سے بولا۔

"اب تم ان کے بارے میں کیا رپورٹ کرو گے؟"

"جو میں جانتا ہوں باقی انکوائری اوپر والے خود کرالیں گے۔"

"تم پر الزام نہ آئے۔"

"تم فکر نہ کرو مجھ پر یا تم پر الزام نہیں آئے گا۔ اب چپ ہو جاؤ۔ ہم غار کے نزدیک ہیں۔ کہیں یہاں بھی کوئی چھپا نہ ہو۔ مجھے اب ہر بات پر شک ہوتا ہے۔" مجھے چپ رہنے کی تلقین کر کے وہ خود مسلسل بولے جا رہا تھا۔

گزشتہ چند مہینے سے ہم دونوں مشترکہ طور پر جن اعصاب شکن لمحات سے گزرتے رہے تھے۔ قتل و غارت گری کے کھیل میں بے شمار انسان ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے تو کتنی بار ہم بھی موت کے منہ میں جا کے واپس آئے تھے۔ ان سب حالات اور واقعات کا اثر لازمی تھا میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ میں کسی وحشی جانور کی طرح بھڑکا رہنے لگا تھا۔ ہر چیز اور ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ ممکن ہے میں نے حسن علی جیسے شخص سے تربیت نہ پائی ہوتی تو یہ واقعات مجھے پاگل کر دیتے۔ انسانی خون کبھی ہضم نہیں ہوتا۔ قاتل کے اعصاب کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں قتل اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی کی جان لینے والا بھی کسی نہ کسی حد تک ضمیر کی خلش کا شکار ہوتا ہے۔

کچھ دیر پہلے چرچ میں جو واقعات پیش آئے۔ جان گرے کی موت سامنے آنے لگی پھر وہ غیر متوقع طور پر بچ نکلا اور اس کے دشمن مارے گئے۔ ایک کو اس نے خود میرے سامنے مارا تھا دو اور بھی جان گرے کا شکار ہوئے تھے۔ اوپر سے قیامت خیز دھاکے۔ جان گرے جیسے شخص کے بھی اعصاب ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ وہ شعوری طور پر کچھ ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ جنگل کے پار ایک چوڑی پگڈنڈی ڈھلان پر اوپر جا رہی تھی۔ یہاں پر جنگل چھدرا ہونے سے روشنی کسی قدر بہتر تھی۔ میں نے ہانپتے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "غار اور کتنی دور ہے؟"

"بس ذرا اوپر ہے۔" وہ بولا۔

نہ جانے کیوں مجھے اپنے اعصاب بے قابو ہوتے لگ رہے تھے۔ ذہن پر دھندسی چھا رہی تھی اور توانائی جیسے ہر گزرتے لمحے کم ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں یاد ہم کب غار میں پہنچے۔ بس اتنا یاد ہے کہ غار میں داخل ہوتے ہی میں چکرا کر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد مجھے بس دھندلا سا یاد ہے کوئی نرم ہاتھوں سے میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ کاجل کا ہاتھ ہو۔ "کاجل" میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن سب دھند میں گم ہو کر رہ گیا۔ میں کاجل کو پکارتا رہ گیا تھا۔ میں دھند





میں چکراتا اسے تلاش کرتا رہا۔ اچانک دھند کم ہونے لگی اور مجھے ایک ہیولہ سا نزدیک آتا نظر آیا۔ وہ...... وہ کاجل تھی۔ میں بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

"کاجل! تم کہاں تھیں؟"

"میں تو یہیں تھی، تم کہاں تھے یوسف؟" کاجل کے لہجے میں درد تھا۔ "میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا۔ کیا تم مجھے بھول گئے تھے۔ کیوں میرے پاس نہیں آئے۔"

"ایسا مت کہو۔" میں تڑپ گیا تھا۔ "کاجل میں سانس لینا بھول سکتا ہوں لیکن تمہیں نہیں بھول سکتا۔" میں نے اس کا نازک اور سرد ہاتھ تھام لیا۔

"اب تم مجھ سے دور تو نہیں جاؤ گے۔ اگر گئے تو میں مر جاؤں گی۔"

"کبھی نہیں...... ہرگز نہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ مگر نہ جانے کیسے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اسے دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی۔ "کاجل" وہ نہ جانے کہاں چلی گئی اور میں ہاتھ ہوا میں لہراتا رہ گیا۔ اچانک میں اُٹھ بیٹھا۔ یہ جان گرے تھا جو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"اُٹھو یوسف! ہوش میں آؤ۔ کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ہوش کے بچے۔" میں نے غرا کر کہا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ "میں تجھے مار ڈالوں گا حرام زادے۔"

"یوسف ہوش کرو میں جان گرے ہوں۔" اس نے گردن چھڑانے کی کوشش کی۔

"میں بھی تمہیں جان گرے سمجھ کر مار رہا ہوں۔ تُو نے کاجل کو غائب کر دیا۔"

"کاجل۔" اس الزام پر جان گرے اتنا دم بخود ہوا کہ مزاحمت کرنا بھی بھول گیا۔ "یہ کاجل کون ہے؟"

تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے خواب دیکھا تھا اور اپنی حماقت سے اب کاجل کا نام لے رہا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ غار میں آگ جلنے سے کسی قدر گرمی تھی۔ "مجھے کیا ہوا تھا؟" میں نے اس کا سوال گول کر دیا۔

"بس تم غار میں آتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔ تمہیں تیز بخار ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہاں دوائیں بھی ہیں۔ میں نے پہلے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ کر تمہارا بخار کم کیا اور اس کے بعد ایک انجکشن دیا جس سے تمہارا بخار اُتر گیا مگر پھر کاجل نام کا دورہ پڑ گیا۔ تم نے کم سے کم سو بار یہ نام لیا ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے بھی تم سوتے میں کئی بار یہ نام لے چکے ہو۔ آخر یہ کاجل ہے کون؟"

"کوئی بھی ہو تم اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور ایک طرف رکھی منرل واٹر کی بوتل ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

"کھانے کو کچھ ہے؟"

''بہت کچھ ہے لیکن بہتر ہے تم آلو کے قتلے لے لو۔'' اس نے ٹن پیک آلو کے قتلے میری طرف بڑھائے۔ آگ پر ہلکا سا گرم کر کے میں نے یہ بدمزہ قتلے کسی نہ کسی طرح حلق سے اُتار لیے۔ غار خاصا اندر کر کے تھا مجھے اس سے باہر کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''یہ غار کہاں ہے؟''

''غار نہیں بلکہ یہ زمین کے نیچے پھیلی گپھا ہے۔ نہ جانے کہاں تک پھیلی ہے میں نے صرف اتنا حصہ استعمال کیا ہے۔ سامان میں نے دو دن پہلے ہی لا کر ڈالا تھا۔''

سامان میں بہت کچھ تھا خشک اور ڈبہ بند خوراک، موم بتیاں، پانی کی بوتلیں، گرم کمبل، جلانے کے لیے خشک لکڑی کا ڈھیر، بیٹریاں، چند آلات اور مختلف قسم کا ایمرجنسی میں کام آنے والا سامان۔ میں ایک نرم گدے پر لیٹا تھا اور اوپر گرم کمبل تھا۔ جان گرے نے ایک جیکٹ میری طرف بڑھا دی۔

''یہ پہن لو۔ ابھی تم بخار سے اُٹھے ہو۔ پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

میں نے جیکٹ لے کر پہن لی۔ ''کیا تم نے اپنے بڑوں کو چرچ کی تباہی کی اطلاع دے دی ہے۔''

''چرچ نہیں۔ اس میں رکھے اسلحے کی تباہی کی خبر۔'' جان گرے کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' میں ہنسا۔ ''تم لوگوں نے چرچ کو ہی اسلحہ گاہ بنا لیا ہے۔ کیا دنیا نہیں جانتی بوسینا میں مسلمانوں کے قتل عام کے منصوبے اصل میں وہاں کے گرجا گھروں میں تیار ہوئے تھے۔ سرب درندوں کو ان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔''

''میں سیاست پر بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''حالانکہ تم لوگ سوائے گندی سیاست کے اور کچھ نہیں کر رہے ہو۔ دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے اسے ڈیموکریسی کا خوب صورت نام دے دیا ہے۔''

جان گرے کچھ دیر چپ رہا۔ ''یوسف کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تمہارے اندر کسی انتہا پسند مسلمان......''

''یہی تو سیاست ہے۔ تم لوگ مسلمانوں کو دباتے ہو اور جب وہ احتجاج کرتے ہیں تو انہیں انتہا پسند قرار دیتے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔ ہم سب دہشت گردوں سے ایک سا سلوک کرتے ہیں۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تم لوگوں کا یہی رویہ ہے جو دنیا کو بڑی تیزی سے ایک بڑے تصادم کی طرف لے جا رہا ہے۔'' میں نے افسوس سے کہا۔

جان گرے چپ رہا۔ اس نے میری بے ہوشی کے دوران میری مشین گن اور اس کے کلپ لے لیے تھے۔ اب نہ تو وہ مشین گن اور نہ ہی جان گرے کے پاس موجود رائفل وہاں نظر آ رہی تھی۔




میں نے ان ہتھیاروں کے بارے میں پوچھا تو اس نے گول مول سے انداز میں جواب دیا۔ ''ان کی فکر نہ کرو وہ محفوظ ہیں۔''

''محفوظ ہیں یا تم نے میری دسترس سے دور کر دیئے ہیں۔'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''تمہاری مرضی جو چاہے سمجھو۔'' اس نے اُکتا کر کہا۔

''جان گرے احمقانہ رویہ ترک کر دو۔ اچانک کوئی دشمن سر پر آ گیا تو کیا وہ تمہیں ہتھیار نکال لانے کی مہلت دے گا۔ کہاں رکھے ہیں وہ ہتھیار۔''

''اب ہمارا یہاں کوئی دشمن نہیں ہے۔''

''اس صورت میں مَیں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

جان گرے عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''ضرور جاؤ لیکن کہاں جاؤ گے کیا تمہیں پتا ہے باہر جانے والا راستہ کون سا ہے۔ یہاں سے چھ سات راستے مختلف جگہوں پر جا رہے ہیں اور صرف مجھے پتا ہے کہ گپھا سے باہر کون سا راستہ جاتا ہے۔ یوسف ان میں سے صرف ایک راستہ زندگی کی طرف جاتا ہے باقی چھ راستے نامعلوم سمتوں میں جاتے ہیں کیا تم ان میں سے ایک کا انتخاب کر سکو گے؟'' اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''راستہ کھلا ہے باہر دیکھ لو۔'' اس نے اشارہ کیا۔

میں نے وہاں رکھی ایک ٹارچ اُٹھائی۔ جان گرے نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے اس جگہ سے باہر جھانکا تو ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا تھا۔ واقعی اس طرف سے چھ سات راستے نکل رہے تھے جو ہر طرف جاتے تھے اور سارے ایک جیسے تاریک اور وحشت ناک لگ رہے تھے۔ میں چند لمحے تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر پلٹ آیا۔ ''تمہارے خیال میں کیا تم مجھے ہمیشہ اس جگہ رکھ سکو گے۔''

''میں نے ایسی احمقانہ بات سوچی بھی نہیں ہے۔ بس چند دن کی بات ہے، مجھے جس کام کے لیے اس علاقے میں بھیجا گیا وہ ہو جائے پھر ہم جزیرے کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور اس کارنامے کے صلے میں مَیں تمہارے لیے معافی نامہ بھی حاصل کر سکوں گا اور جنوبی افریقہ میں تمہارے خلاف مقدمے بھی ختم کرا سکوں گا۔''

''اور اگر تم ناکام رہے......''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''بس چند دن اس جگہ رہو اور آرام کرتے رہو۔''

''اگر میں مسلسل کوشش کروں تو باہر جانے کا راستہ تلاش کر سکتا ہوں۔''

''باہر جا کے تم کیا کرو گے۔ تم بار بار یہ بات کیوں بھول جاتے ہو کہ تم جنوبی افریقہ میں اس

وقت سب سے مطلوب شخص ہو۔ پولیس اور ایجنسیوں کے علاوہ جیو کونسل کے لوگ اور بوگارڈ کے حامی بھی تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ میں کس طرح تمہیں ان سب سے بچائے ہوئے ہوں یہ میں ہی جانتا ہوں۔"

"تھینک یو مسٹر جان گرے! مگر تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس سارے چکر میں مجھے تم نے ہی پھنسایا ہے۔ تم مجھے خلیج سے اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"اس پر میرا شکر ادا کرو اگر میں تمہیں خلیج سے نہ لے جاتا تو اب تک تمہاری ہڈیاں بھی مچھلیاں ہضم کر چکی ہوتیں۔"

"تم کچھ بھی کہو یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ میرے تمام تر مسائل کی وجہ تم ہو جان گرے صرف تم۔"

اس نے کافی کے لیے پانی کیتلی میں ڈال کر آگ پر چڑھایا تھا۔ "یوسف...... آخر میں تم فائدے میں......"

"مجھے نہیں چاہیے تم سے کوئی فائدہ۔" میں پھٹ پڑا تھا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تم سے حاصل ہونے والے فائدے پر...... مجھے جانے دو۔"

"تو چلے جاؤ۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے گریبان سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ "جان گرے مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے اپنی جیکٹ سے پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔ "تم اس سے مجھے شوٹ کر کے اپنے سارے مسائل سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ اگر تمہارے لیے یہ تمہارے مسئلوں کا حل ہے۔"

میں نے پستول لے کر اس کے ماتھے سے لگا دیا اور اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا گولی چلانے کے لیے ہمت کرتا رہا لیکن میری انگلی اس حد تک نہیں دبی کہ گولی چل جاتی۔ میں اسے نہیں مار سکتا تھا۔ یہ کوئی مروت یا انسانیت نہیں تھی اور نہ میں جان گرے کے طرزِ عمل سے موم ہوا تھا۔ میں اسے قتل کرنے میں پوری طرح سنجیدہ تھا اس کے باوجود میں اسے قتل نہ کر سکا۔ میرا ہاتھ خود بخود جھک گیا۔ نہ جانے کیوں شاید اس لیے کہ کاتب تقدیر نے اس کی موت کے لیے جو وقت لکھا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ جان گرے نے آنکھ کھول کر مجھ سے پستول لے لیا پھر اس نے کافی بنائی اور اس کا مگ میری طرف بڑھا دیا۔

"لو پیو اور ریلیکس ہو جاؤ۔"

میں نے مگ لے لیا۔ "جان گرے ہر بار تم اتنے خوش قسمت نہیں ہو گے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ آلتی پالتی مار کر اس نے مگ لبوں سے لگایا اور چسکی





لے کر بولا۔ "یوسف! شاید تمہیں عجیب لگے ایک دشمن کے منہ سے ایسی بات سن کر لیکن یہ حقیقت ہے گزشتہ چند مہینے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تم نے زندگی کے بارے میں میرا اندازِ فکر بدل دیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے میں بہت بزدل آدمی ہوں۔ موت سے ڈرتا تھا مگر تم سے ملنے کے بعد اب مجھے اس شے سے اتنا ڈر نہیں لگتا ہے۔ میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ جلد یا بدیر یہ شے مجھ تک آ پہنچے گی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "جان گرے! میں تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں کر سکتا۔ تم فطری طور پر دھوکے باز ہو۔"

"مجھے اس کا بھی اعتراف ہے اور میں تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ میرا دل چاہ رہا ہے ضروری نہیں ہے کہ تم میری بات کا اعتبار بھی کرو۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"پھر یہ اعتراف کس خوشی میں۔"

"میں تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں کہ اب تم مجھے موت سے ڈرا کر مجبور نہیں کر سکتے ہو کیا سمجھے۔"

اس نے سرد لہجے میں کہا اور اُٹھ کر سامان کی طرف چلا گیا۔ اس نے سگار نکال کر سلگایا تھا غار کی فضا تمباکو کی خوشبو سے مہکنے لگی۔

میں آہستہ آہستہ کافی کی چسکیاں لے رہا تھا اور میرے ذہن پر غنودگی چھا رہی تھی۔ اچانک میں چونکا۔ "یہ مجھے کیا ہو رہا ہے جان گرے۔"

وہ میرے پاس آیا اور مگ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ "کچھ نہیں ہلکی سی نیند کی دوا اس میں شامل کر دی تھی تا کہ تم بلاوجہ ٹینشن لینے کے بجائے سو جاؤ۔"

"کمینے۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ من بھر کا ہو گیا ہو۔ اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی حال باقی جسم کا بھی تھا۔ جان گرے نے دھکا دے کر مجھے بستر پر لٹا دیا۔ میرے بے جان سے ہاتھ پیر سیدھے کیے اور کمبل اُڑا دیا۔ "سو جاؤ بوائے ابھی مجھے خاصے کام کرنے ہیں۔"

اور میں جان گرے کے لیے ذہن میں موجود تمام گالیوں کی گردان کرتا سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ذہن بالکل تر و تازہ ہو رہا تھا اور پیٹ میں مچلنے والی ہل چل بتا رہی تھی کہ مجھے جلد فراغت کے لیے کوئی گوشہ عافیت تلاش کرنا تھا۔ میں اُٹھا، جان گرے غائب تھا۔ میں نے دبی زبان میں اسے پکارا۔ غار کی فضا نے بازگشت کی صورت میں جواب دیا مگر جان گرے کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ اس غار میں نہیں تھا۔ میں پانی اور ایک ٹارچ اُٹھا کر ایک غار کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پیٹ کا بوجھ ہلکا کر کے میں نے راستے کا جائزہ لیا۔ جہاں تک ٹارچ کی روشنی کام کرتی تھی۔ غار پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی راستے دیکھے لیکن وہ سب آگے جا کر مزید شاخوں میں بٹ گئے تھے اور بنا سوچے سمجھے ان میں جانا بھٹک جانے کے مترادف تھا۔ میں واپس آ گیا۔ الاؤ بجھ

گیا تھا میں نے اس کی راکھ کرید کر انگارے نکالے اور ان پر مزید لکڑیاں ڈال کر ذرا پھونکیں ماریں تو آگ دوبارہ بھڑک اُٹھی تھی۔ جان گرے میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر باہر گیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ غار میں گھٹن نہیں ہے۔ اس میں تازہ ہوا پاس ہونے کا کوئی نہ کوئی راستہ تھا۔ معاً مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے موم بتی اُٹھائی اور چھ سات راستوں والی جگہ پر آیا میں نے ہر راستے کے سامنے موم بتی کی۔ ایک راستے کے سامنے آتے ہی موم بتی کی لَو جھلملانے لگی۔ ہوا اس طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے واپس آ کر ٹارچ لی اور ماچس کا پیکٹ اُٹھایا اس راستے کے دہانے پر ایک تیلی رکھی اور پھر اندر چلنے لگا۔ تقریباً سو گز کے بعد دہانہ دو شاخوں میں بٹ گیا۔ میں نے ایک بار پھر موم بتی کی مدد لی اور نشانی کے طور پر ماچس کی تیلیاں رکھ دیں۔ جس دہانے سے ہوا آ رہی تھی اس میں چلنے لگا اور پھر چلتا ہی چلا گیا۔ غار تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں یقین آنے لگا کہ یہ راستہ باہر نہیں جاتا ہے۔ اچانک غار ایک عظیم الشان قسم کے کنویں پر ختم ہو گیا۔ جس کے عین اوپر چھت پر سوراخ تھا اور اس سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی مگر اس سوراخ تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ میں مایوس ہو کر واپسی کے لیے مڑا اچانک ایک پتھر میرے پاؤں سے ٹکرا کر نیچے کنویں میں گیا۔ اس کے اندر گرنے کی آواز گونجی اور فوراً ہی عجیب سی آواز کنویں سے آنے لگی۔ میں نے مارے تجسس کے ذرا آگے آ کر غار میں جھانکا۔ کنویں کی دیواروں سے کچھ چپکا ہوا تھا پھر ان چپکی چیزوں میں سے ایک الگ ہو کر پھڑ پھڑائی اور عجیب سی آواز نکالتی اوپر آنے لگی۔ میرے خدا یہ چمگادڑ تھی اور خاصی بڑی تھی۔ میں پلٹ کر بھاگا۔ میرے عقب میں گونجنے والا شور بڑھنے لگا۔ پتھر نے چمگادڑوں کی نیند خراب کی تھی اور اب وہ اس کا انتقام لینے میرے پیچھے آ رہی تھیں۔

مجھے چمگادڑوں کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ یہ چھوٹے موٹے جانور اور کیڑے مکوڑے کھا کر اور بڑے جانوروں کا خون پی کر گزارہ کرتی ہیں۔ عام چمگادڑ زیادہ خطرناک نہیں ہوتی ہیں لیکن ان کی ایک خاص قسم ویمپائر چمگادڑ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ یہ کسی ڈریکولا کی طرح اپنے شکار کی رگ میں دانت گاڑھ کر خون پی جاتی ہے گھریلو مویشی خاص طور سے اس کا نشانہ بنتے ہیں اگر یہ زیادہ تعداد میں حملہ کرے تو جانور کا اتنا خون پی جاتی ہیں کہ وہ مر جاتا ہے۔ میرے پیچھے آنے والی ویمپائر چمگادڑیں لگ رہی تھیں۔ ان کے دانتوں میں کوئی خاص چیز ہوتی ہے یہ جس جگہ دانت مارتی ہیں وہاں سے خون نہیں رُکتا ہے۔ اس وجہ سے زیادہ تعداد میں کاٹ لیں تو جاندار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

میں اپنے عقب میں ان کا شور سنتا پوری جان لگا کر بھاگ رہا تھا۔ ابھی میں نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ ایک چمگادڑ میری پشت سے ٹکرائی۔ وہ مجھ تک آ گئی تھی۔ ان کی بے تاب چیخیں واضح کر رہی تھیں کہ وہ بھوکی ہیں اور انہیں خوراک کی ضرورت ہے۔ اچانک مجھے اپنے شانے میں کوئی تیز چیز چبھتی محسوس ہوئی۔ میں نے بے ساختہ ہاتھ مارا اور میرے شانے میں دانت گاڑھنے والی چمگادڑ





غار کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ میں ہر ممکن تیزی سے دوڑنے لگا۔ چند چمگادڑیں میرے پاس آ گئی تھیں اور وہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کا سائز خاصا بڑا تھا۔ ایک چمگادڑ مجھ سے آگے نکلی اس کے پروں کا پھیلاؤ کسی طرح دو فٹ سے کم نہیں تھا۔

پہلا غار ختم ہوا تو میں دوسرے غار میں داخل ہوا مگر کچھ دور تک جانے کے بعد احساس ہوا کہ میں غلط غار میں گھس گیا تھا اور یہ نہ جانے کہاں جا کر ختم ہوتا۔ بھاگتے بھاگتے مجھے دائیں طرف ایک خلا نظر آیا اور میں بلا ہچکچاہٹ اس میں دبک گیا۔ زیادہ تر چمگادڑیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ بس چند ایک میرا تعاقب کر رہی تھیں وہ میرے دبک جانے کے بعد غار کی تاریکی میں پھڑ پھڑاتی رہیں۔ میں نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ ورنہ اس کی روشنی ان کی رہنمائی کرتی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ سکوت چھاتا چلا گیا تھا۔ چمگادڑیں واپس چلی گئی تھیں۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ٹارچ روشن کر کے اس طرف جانے لگا جس طرف سے آیا تھا۔ میں اندازے چلا جا رہا تھا مگر وہ دہانہ نہیں آیا جہاں سے میں اپنے غار والے حصے کی طرف جا سکتا تھا۔ کچھ دیر چکرانے کے بعد یہ واضح ہو گیا تھا کہ میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔ میں سمتوں کا احساس بھی کھو چکا تھا۔ میں نے بھاگ دوڑ کرنے کے بجائے ایک جگہ رُک کر ذرا غور کیا۔ میں جس دہانے میں چمگادڑوں سے بچنے کے لیے داخل ہوا اس میں مزید کوئی شاخ نہیں تھی لیکن واپس آتے ہوئے مجھے اس کی دو شاخیں ملی تھیں اور میں اس جگہ سے بھٹکا تھا۔

میرے پاس ایک ٹارچ اور ایک موم بتی تھی۔ یہ بڑی والی موم بتی تھی جو کئی گھنٹے تک جل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹارچ بھی چار بڑے سیلوں والی بگ لائٹ تھی اور یہ بھی یقیناً کئی گھنٹے تک کارآمد رہ سکتی تھی لیکن اس کے بارے میں مجھے یقین سے نہیں معلوم تھا کہ اس کے سیل کس قدر استعمال ہو چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اسے ہنگامی حالات کے لیے مخصوص کر کے موم بتی جلا لی۔ ایک بار پھر میں تیلیوں کی مدد سے نشانیاں لگاتا چلنے لگا۔ تاکہ ایک جگہ سے دوبارہ نہ گزروں۔ واپس آ کر میں دو شاخے کے دوسرے حصے میں گیا مگر کئی سو گز تک سفر کرنے کے بعد بھی اس کا دہانہ نظر نہیں آیا تھا۔ میں واپس آیا اس طرف سے راستہ نہیں تھا۔ ذرا آگے جا کر مجھے ایک اور دو شاخہ ملا تھا۔ میں اس میں سے دائیں طرف والے میں گیا لیکن آگے جا کر یہ مزید تین شاخوں میں بٹ گیا۔ لہٰذا میں پھر پلٹ آیا اور اس بار بائیں طرف والے شاخے میں گیا۔ ذرا آگے جا کر راستہ مجھے جانا پہچانا لگنے لگا اور چند سو قدم چلنے کے بعد وہ حصہ آ گیا جہاں سے گزر کر میں چمگادڑوں والے کنویں تک گیا تھا۔ میں اس کے دوسری طرف جانے لگا اور جب مجھے فرش پر پڑی ماچس کی تیلیاں نظر آئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ چند منٹ بعد میں غار میں تھا اور وہاں جان گرے بیٹھا موم بتی کی روشنی میں کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر خشک لہجے میں کہا۔

''اپنا شوق پورا کر آئے۔''

''میں ذرا گھومنے پھرنے گیا تھا۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

"اور بھٹک گئے تھے۔شکر کرو کہ واپس آ گئے؟"

میں بستر پر بیٹھ گیا۔"اگر میں واپس نہ آتا تو تم کیا کرتے؟"

"کچھ نہیں اپنے آدمیوں کو بلانا پڑتا تمہیں تلاش کرنے کے لیے۔جبکہ میں ابھی نہیں چاہتا کہ ہماری اس پناہ گاہ کا کسی کو علم ہو۔"

"یہ کس قسم کے کاغذات ہیں۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

"اسلحے کی اس کھیپ کے کاغذات ہیں جو دوروز بعد یہاں سے گزر کر ہوتو قبائل کے ہاتھ میں جانے والی ہے۔"

"جس کے بعد جوابی انتقام لیا جائے گا اور لاکھوں افراد پھر خاک وخون میں لوٹ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور سرد آہ بھری۔"ہاں ایسا ہی ہوگا۔" اس کے لہجے میں مجھے پہلی بار کسی غیر سفید فام کے لیے دکھ محسوس ہوا تھا۔"میں یا کوئی اسے روک نہیں سکتا۔شاید تمہارا معاملہ نہ ہوتا تو میں اس کام کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔"

"یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہے۔" میں نے طنز کیا۔"میری جان بچانے کے لیے لاکھوں افراد کی موت کا سامان کر رہے ہو مسٹر جان گرے۔"

"یہ میں تم پر نہیں خود پر احسان کر رہا ہوں۔" اس نے سرد مہری سے کہا اور کاغذات آگ میں ڈال دیئے۔

"ارے......یہ کیا؟" میرے منہ سے نکلا۔

"بے کار تھے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔"تم کھانا کھالو۔میں سو رہا ہوں۔تھک گیا ہوں۔اگر تین چار گھنٹے تک جاگ سکو تو میں نیند لے لوں۔"

"تم اطمینان سے سو سکتے ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔"میں پہرہ دوں گا۔"

"اور خدا کے لیے اب کہیں مت جانا۔بس دو تین دن سکون سے اس جگہ گزار لو۔" وہ بولتا ہوا بستر پر دراز ہو گیا اور کمبل اوڑھ کر ایک منٹ میں خراٹے لینے لگا۔میں نے ٹن بند بدمزہ مچھلی کھائی، البتہ مٹر کسی قدر بہتر تھے۔اس کی تلافی نیس کیف کی مہک نے کر دی۔ایک بڑا مگ پی کر میں خود کو کسی قدر بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔میں آگ کے نزدیک بیٹھ گیا۔سامان میں اب وہ جدید آلات نظر نہیں آ رہے تھے جو میرے خیال میں مواصلات کے لیے تھے۔شاید جان گرے نے انہیں کہیں چھپا دیا تھا۔

اس جگہ مجھے کسی خطرے کا احساس نہیں تھا اس لیے میں اونگھتا اونگھتا نہ جانے کس وقت سو گیا تھا پھر مجھے جان گرے نے اُٹھایا۔اس کا چہرہ موم بتی کی روشنی میں موم بتی کی طرح سفید لگ رہا تھا۔

"جلدی کرو۔میرا خیال ہے کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔"





"کیا مطلب......کون لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔مگر میرے لیے اجنبی ہیں۔اب چلو یہاں سے۔اس سے پہلے کہ وہ یہاں تک آئیں کھانے پینے کا کچھ سامان لے لو۔اس تھیلے میں بھر لو۔"

میں نے اُٹھ کر ٹن بند کھانوں کے پیکٹ اور پانی کی بوتلیں اس تھیلے میں ڈالیں۔جان گرے اپنا سامان ایک بیگ میں جمع کر رہا تھا۔"تمہیں کیسے پتا چلا کہ کچھ لوگ آ رہے ہیں اور ضروری ہے وہ ہمارے دشمن ہوں۔"

"میں نے خود دیکھا تھا۔اس وقت وہ غار میں اُترنے کی تیاری کر رہے تھے۔وہ سب مسلح ہیں۔آرگنائزیشن میں میرے دشمنوں کی کمی نہیں ہے اور وہ مجھے بے بس جان کر بدلہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن میں انہیں بتا دوں گا جان گرے کمزور نہیں ہے۔"

اس نے رائفلیں بھی نکال لی تھیں۔جو اس نے پہلے چھپا رکھی تھیں۔ایک رائفل اس نے میری طرف اُچھال دی۔میں نے اسے کیچ کرتے ہوئے کہا۔"جان گرے پہلے مجھے یہ سارا چکر سمجھاؤ۔میں اس طرح بے خبری میں مارا جانا پسند نہیں کروں گا اور تم نے نہیں بتایا تو میں اس جگہ سے ہلوں گا بھی نہیں۔"

"یہ سارا اسی لعنتی اسلحے کی کھیپ کا چکر ہے۔اس کی مالیت دس کروڑ ڈالرز ہے۔اور اس کی قیمت مجھے گولڈ بانڈ کی صورت میں ملے گی۔کچھ دوسرے اس رقم کے چکر میں لگ گئے ہیں اگر میں کسی کے ہاتھ میں آ گیا تو وہ مجھ سے اس کا کوڈ معلوم کر کے رقم خود بھی ہڑپ کر سکتا ہے۔"

"جیسا کہ فادر بیری نے کوشش کی تھی۔"

"وہ خبیث عرصے سے اسلحے میں خرد برد کر کے بیچ رہا تھا اس طرح اس نے خاصی دولت کمالی تھی لیکن اس کے کسی کام نہیں آئی۔" جان گرے حقارت سے بولا۔پھر اس نے بقیہ سامان کو اس طرح رکھا جیسے وہ کہیں گیا ہو اور اس نے ایک چپٹی سی چیز نکال کر اس پر ایک ڈبہ رکھ دیا۔کلک کی آواز آئی۔"یہ کیا ہے؟"

"بارودی سرنگ......اب جو یہ ڈبہ اُٹھائے گا اس کے اور آس پاس موجود تمام افراد کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے ممکن ہے سارے مارے جائیں۔"

"دشمن احمق نہیں ہوتا ہے۔"

"بس اب چلو۔میرا خیال ہے وہ غار میں اُتر گئے ہوں گے۔"

"اگر وہ غار میں اُتر گئے ہیں تو ہم کس طرف سے جا سکتے ہیں کیا باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔"

"نہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس غار میں ان سے نمٹ لیں گے۔" وہ میری بات گول کر کے بولا۔وہ ایک طرف چل پڑا۔اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس نے ان گپھاؤں کا

اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ ہم اپنے قیام والی جگہ سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ جان گرے نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ بعض سرنگوں سے گزرتے ہوئے مجھے لگا جیسے میں بھی ان جگہوں سے گزر چکا تھا۔ "دیکھ کر بھٹک نہ جانا۔" میں نے اسے خبردار کیا۔

"فکر مت کرو میں کسی انجانے راستے پر نہیں جا رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ ذرا دیر بعد اس نے ایک جگہ رُک کر ٹارچ کا رُخ اوپر کی طرف کیا تو مجھے سرنگ کی چھت پر ایک سرنگ اور نظر آئی۔ "ہمیں اس میں جانا ہے۔"

"کیسے...... کیا پرواز کر کے جائیں۔"

"دیکھو۔" اس نے اپنی چھڑی اوپر کر کے کوئی شے گھسیٹی۔ یہ رسّی کی ایک سیڑھی تھی۔ جان گرے کے اشارے پر پہلے میں اوپر چڑھا اس کے بعد اس نے سامان اوپر بھیجا اور آخر میں خود اوپر آ گیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس جگہ کا معائنہ کیا۔ یہ دو چھتی نما ایک خاصا بڑا سا کمرا تھا جو چاروں طرف سے بند تھا۔ آمدورفت کے لیے بس یہی ایک سوراخ تھا جس پر پتھر سے بندھی رسے والی سیڑھی تھی۔ اس سیڑھی نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"لگتا ہے یہ جگہ خاصے عرصے سے تمہارے استعمال میں ہے۔"

"ہاں...... میں پہلی بار یہاں نہیں آیا ہوں۔" اس نے موم بتی جلا کر ایک طرف رکھ دی اس کی روشنی دو چھتی کو محدود پیمانے پر روشن کر رہی تھی۔ "کیسی پناہ گاہ ہے؟"

"پناہ گاہ تو اچھی ہے لیکن دشمن نے سراغ لگا لیا تو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔"

"وہ اسے تلاش نہیں کر سکتا۔" جان گرے بولا۔

ہم وہیں فروکش ہو گئے۔ یہاں جلانے کے لیے کچھ نہیں تھا لیکن سردی بھی خاص نہیں تھی۔ میں پتھر سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگ گیا۔ کھانا پانی اتنا تھا کہ آرام سے دو تین دن گزر سکتے تھے۔ جان گرے زمین پر دراز ہو کر دوبارہ سو گیا تھا۔ میں بھی غنودگی میں تھا کہ کسی ہلکے سے دھماکے نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ جان گرے بھی جاگ گیا تھا۔ "لگتا ہے وہ اندر آ گئے ہیں۔" اس نے کہا اور جیب سے ایک آپریٹس نکال کر اسے آن کر دیا۔ اس سے عجیب سے شور کے ساتھ کچھ لوگوں کے چلانے کی آواز بھی آ رہی تھیں۔

"بورڈ...... کیا ہوا...... نمبر تین...... سر دھماکہ ہوا ہے۔ چار...... سات اور نو اس کے پاس کوئی نہیں بچا۔ میں بھی زخمی ہوں۔" جان گرے نے مسرور سا قہقہہ مارا۔ "تین تو ایسے ہی کم ہو گئے۔"

"باقی کو ہم جہنم رسید کر سکتے ہیں۔"

جان گرے چونکا۔ "بالکل نہیں۔ صرف تین مرے ہیں۔ ان کی تعداد درجن سے بھی زیادہ ہے۔ ابھی ہمیں اس جگہ رُکنا ہوگا۔"

"نمبر تین...... میرے ساتھ گیارہ اور بارہ بھی زخمی ہیں۔ بارہ کے زخم خطرناک ہیں۔"





"گدھے کے بچو! کیا تم لوگ عقل باہر ہی چھوڑ گئے تھے۔" وہ تین نمبر پر برس پڑا۔ شاید ان کا باس تھا۔

ذرا دیر میں واضح تھا کہ اندر اُترنے والے بارہ میں سے چھ افراد ناکارہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے تین مارے گئے تھے اور تین زخمی ہیں۔ "اب بچے چھ......" میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔

"انہیں کم خطرناک مت سمجھو۔ یہ خاصے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔"

"ہمیں کب تک یہاں رُکنا پڑے گا۔"

"کم سے کم ایک دن اور...... کل تک یہ واپس چلے جائیں گے۔"

"اتنے یقین سے کہنے کی وجہ؟"

"کیونکہ یہ اس ٹیم کا حصہ ہیں جو اسلحے کی حفاظت کے لیے آئی ہے۔"

"تمہاری تنظیم میں کسی قسم کی سیاست چل رہی ہے۔"

"ہر وہ جگہ جہاں مفادات کی جنگ چل رہی ہو۔ ایسی ہی سیاست ہوتی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

اگلے چوبیس گھنٹے تک ہم اس مقام پر رہے۔ جان گرے وقفے وقفے سے آپریٹس آن کر کے آنے والوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ زخمیوں کو بھیج کر دوسرے تازہ افراد منگوا لیے گئے تھے۔ وہ غار کو کھنگال رہے تھے۔ ایک موقع پر وہ چمگادڑوں والے کنویں تک چلے گئے تھے اور چمگادڑوں کے حملے نے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے بے تحاشہ فائرنگ کر کے بے شمار چمگادڑیں ماردی تھیں۔ جان گرے یوں مطمئن تھا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے یہاں بھی بیشتر وقت سو کر گزارہ تھا۔ اس بار بھی جان گرے نے مجھے سوتے سے اُٹھایا تھا۔

"چلو روانگی کا وقت آ گیا ہے۔"

میں نے آنکھیں ملیں۔ "اور وہ باہر جو تمہارے رشتے دار بیٹھے ہیں؟"

"ان کی فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

"اگر راستے میں کوئی آیا تو؟"

"تمہارے پاس رائفل کس لیے ہوگی۔ شوٹ دیم۔"

"سوری جان گرے! میں اس بلاوجہ کی قتل و غارت گری سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب کسی اور کو قتل نہیں کروں گا۔"

"مرضی تمہاری...... اگر تم نہیں مارو گے تو وہ تمہیں مار دیں گے۔" جان گرے نیچے اُتر گیا۔

میں اس کے پیچھے تھا۔ سارا سامان وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے پاس صرف اسلحہ تھا جان گرے کے پاس بیگ میں اس کا کچھ خاص سامان۔ حسب معمول جان گرے رہنمائی کر رہا تھا۔ اس بار اس نے ایک نیا راستہ اختیار کیا ہم مختلف سرنگوں سے گزرتے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ بعض

مقامات سے سرنگ کی چھت سے لٹکتی ہوئی پودوں اور درختوں کی جڑیں نظر آئیں۔ یعنی ہم سطح زمین سے خاصے قریب تھے۔ ایک جگہ رُک کر جان گرے نے دیوار کو ٹٹولا اور پھر ایک رسہ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی مٹی کا ایک بڑا سا تودا گرا اور باہر کی روشنی جھلکنے لگی۔ میں دو دن بعد کھلی فضاء محسوس کر رہا تھا لیکن خوشی ایسی تھی جیسے نہ جانے کتنے عرصے بعد کھلی فضا کو دیکھا ہو۔

میں باہر نکلا تو مجھے حیرت ہوئی ہم خاصی بلندی پر تھے اور یہ پوری ڈھلان اونچے اور گھنے درختوں سے پٹی تھی۔ بعض مقامات پر اتنے قریب درخت تھے کہ ان کے نیچے سورج کی روشنی بھی نہیں آ رہی تھی۔ جان گرے باہر آیا۔ ''وہ لوگ نیچے ہیں اور اپنے خیال میں گپھا میں جانے والے واحد راستے کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے جان گرے۔'' کسی نے کہا تو ہم اُچھل پڑے تھے۔ جان گرے کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

''اپنے ہتھیار پھینک دو۔ تم اس وقت کم سے کم تین رائفلوں کی زد میں ہو۔'' آواز دوبارہ آئی۔

میں نے جان گرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس کا سر جھک گیا تھا۔ ''میں دھوکہ کھا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے تیز نکلیں گے۔''

میں نے رائفل پھینک دی۔ ''جان گرے یہ تمہاری جنگ ہے۔''

''جان گرے تم بھی عقل مندی کا ثبوت دو۔'' آواز نے اسے مشورہ دیا۔

بادلِ نخواستہ اس نے بھی رائفل پھینک دی۔ فوراً ہی ایک دُبلا اور لمبے چہرے والا شخص سامنے آیا۔ اس نے ہاف جیکٹ پر پی کیپ لگا رکھی تھی۔

''روبن! کیا تم جانتے ہو میں تنظیم کی طرف سے مشن پر ہوں اور اس میں مداخلت کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟'' جان گرے بولا۔

''میں ہی نہیں سب جانتے ہیں لیکن تین چار پارٹیاں اس چکر میں ہیں۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے اس کیمپ کا محافظ بنا دیا گیا۔''

''تمہارے خیال میں ہیڈ کوارٹر اس بات سے بے خبر ہو گا۔'' جان گرے بولا۔

''ممکن ہے واقف ہو لیکن سو ملین ڈالرز کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ میں چین چلا جاؤں گا وہاں آرگنائزیشن والے پر بھی نہیں مار سکتے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ آرگنائزیشن کی پہنچ ہر جگہ ہے۔''

روبن چند لمحے جان گرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے نرمی سے کہا۔ ''جان...... کیا خیال ہے ہم دونوں مل کر یہ کام نہیں کر سکتے۔ دیکھو پچاس ملین ڈالرز بھی کم نہیں ہوتے۔''

''اول تو میں غدار نہیں ہوں۔ دوسرے میرے ذہن میں ایسا خیال آتا بھی تو میں اسے مسترد





کر دیتا۔ یہ پچاس یا سو ملین ڈالرز شاید اکاؤنٹ میں پڑے رہ جاتے اور میں دوسری دنیا میں جا چکا ہوتا۔''

''تو تم نہیں مانو گے۔'' روبن کے پتلے سے چہرے پر درشت تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

''جان گرے مجھے وہ کوڈ چاہیے۔''

''کوڈ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ عین وقت پر مجھے بتایا جائے گا۔ کوڈ میسج آئے گا۔ یقین نہیں آ رہا تو میرے بیگ میں کوڈ پیغام موصول کرنے والی مشین ہے اسے دیکھ لو۔''

''اس کی تلاشی لو۔'' روبن نے بلند آواز سے کہا تو درختوں کے عقب سے ایک نوجوان سامنے آیا۔ اس نے جان گرے کی پشت سے بیگ اُتار کر روبن کے حوالے کیا اور جان گرے کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک عدد پستول بھی برآمد ہوا تھا اور میرے پاس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ بیگ سے ایک مشین نکال کر روبن نے اس کا معائنہ کیا اور مایوسی سے بولا۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''یہی نہیں بلکہ آنے والا میسج بھی تم نہیں پڑھ سکتے۔ اسے صرف میں ڈی کوڈ کر سکتا ہوں۔''

''بکواس میں بھی اسے استعمال کرنا جانتا ہوں۔''

''تو کر کے دکھاؤ۔'' جان گرے نے اسے چیلنج کیا۔

اس نے مشین آن کی اور اس کے بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ کئی منٹ تک وہ لگا رہا لیکن شاید کام نہیں ہوا۔ اس نے مایوس ہو کر مشین بند کر دی۔ ''لگتا ہے تم نے اس کا کوڈ اپنی مرضی سے ترتیب دیا ہے۔''

''یہی بات ہے۔ اسے میرے سوا کوئی نہیں کھول سکتا۔''

روبن نے زہریلی نظروں سے جان گرے کو دیکھا۔ ''میرے ساتھ چلو میں تمہیں کھول کر دیکھ لوں گا۔''

وہ ہمیں نیچے لانے لگے۔ میں نے ذرا رُک کر پوچھا۔ ''تمہیں اس خفیہ راستے کا علم کیسے ہوا؟''

روبن ہنسا۔ ''میرے ایک آدمی نے اسے اس جگہ سے اندر جاتے دیکھا تھا لیکن وہ راستے کی صحیح نشان دہی نہ کر سکا۔ میں نے اس جگہ کی نگرانی شروع کرا دی اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔''

''یہ شخص تمہیں کوڈ نہیں دے گا۔'' میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔

''کوڈ نہیں دے گا تو جان دے گا مجھے جان لے کر بھی اتنی ہی خوشی ہو گی۔ یہ شخص میرے بھائی کا قاتل ہے۔''

''کیا تمہارے ساتھیوں کو بھی جان گرے کی جان لینے سے بھی اتنی ہی خوشی ہو گی آخر ان کا بھی حصہ ہو گا۔''

"ان کے حصے کی تم فکر نہ کرو۔"

اس کے تینوں ساتھی کچھ بولے نہیں تھے مگر جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں فکر مندی نظر آئی تھی۔ میں اور جان گرے پاس پاس تھے۔ میں نے اسے سرگوشی کی۔

"گیس۔"

اس نے غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا جان گرے اتنا فکر مند نہیں تھا جتنا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ ہم تقریباً نصف گھنٹے بعد ڈھلان کے نچلے حصے میں پہنچے جہاں روبن کے مزید تین عدد ساتھی غار میں جانے والے راستے کی نگرانی کر رہے تھے۔ روبن نے دھکا دے کر جان گرے کو زمین پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔ "اب تم مجھے بتاؤ گے کہ کوڈ کیا ہے ورنہ تم جانتے ہو میں جلاد کے نام سے مشہور ہوں۔"

"تم صرف ایک مسخرے ہو جو اپنی زندگی کا مذاق اُڑا رہے ہو۔" جان گرے نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اپنے کپڑے اُتار دو۔ آج میں تم پر اپنی چابک کی تیزی آزماؤں گا۔"

"مسٹر روبن!" اچانک اس کے آدمیوں میں سے ایک سامنے آیا۔ "کیا اس پر تشدد کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ مر گیا تو ہم بہت بڑی دولت سے محروم ہو جائیں گے۔"

"یہ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔"

"مسٹر گرے ضدی ہونے کے ساتھ دل کے مریض بھی ہیں۔" میں نے جلدی سے خبردار کیا۔ "کوئی بھی شاک ان کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔"

"دوستو مجھے دولت کی تقسیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" جان گرے نے زمین پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "بات اتنی ہے کہ مجھے اس شخص پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ کوڈ لے کر بھی مجھے ہلاک کر دے گا۔"

"ہم اس کی ضمانت دیتے ہیں مسٹر جان گرے۔" اس شخص نے جلدی سے کہا۔

"جب تک یہ شخص تم لوگوں کا باس ہے میرے لیے اس طرح کی ہزار ضمانتیں بھی بے کار ہیں۔"

"اب یہ ہمارا باس نہیں ہے جناب۔" وہ شخص بولا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" روبن بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس کا ہاتھ اپنے شانے پر ٹنگی رائفل کی طرف گیا مگر اس سے پہلے ہی اس شخص کی رائفل گرجی اور روبن حیرت کے عالم میں عالم بالا کو رخصت ہوا۔ اس کی لاش جمع شدہ پتوں پر گری تھی۔ رائفل بردار نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ "اب آپ کو اطمینان ہے جناب۔"

"ہاں...... لیکن ایک بات بتاؤ تم سب کو کتنی رقم کی توقع تھی؟"

"اس نے ہمیں پچاس لاکھ فی کس دینے کا وعدہ کیا تھا۔"





"اور اس وقت تمہیں کیا مل رہا ہے؟"

"ہمیں ڈھائی لاکھ ڈالرز سالانہ تنخواہ مل رہی ہے۔"

"اتنے ہی آسائشوں، عیاشیوں اور دوسری سہولیات کے لگا لو۔ گویا تم پانچ لاکھ ڈالرز سالانہ کما رہے ہو۔ اگر پانچ سال کے کنٹریکٹ پر ہو تو کم سے کم ایک ملین ڈالرز اس کے کھاتے پر ملیں گے اور کفایت شعاری سے کام لو تو اتنے ہی بچا بھی سکتے ہو۔ دو ملین ڈالرز کے ساتھ اپنے وطن یا شہر واپس جا کر ایک معزز زندگی کا آغاز کرنا بہتر ہے یا پانچ ملین ڈالرز لے کر دنیا بھر میں چھپتے پھرنا۔ یہ بات تو تم لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے کہ آرگنائزیشن سے چھپنا ممکن نہیں ہے۔"

"جناب! ہم بھی مسٹر روبن سے متفق نہیں تھے مگر ان کے چارج میں تھے۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ حکم حکم ہوتا ہے۔ ہم ان کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھے اب مسٹر روبن اپنے کیے کی سزا پا چکے ہیں اس لیے آپ باس ہیں۔"

"میرے ساتھ کام کرو۔ میں روبن کی طرح لالچ نہیں دوں گا البتہ انعام کا وعدہ کرتا ہوں۔ تم سب اس سے زیادہ پیسہ لے کر جاؤ گے جتنا تم نے سوچا تھا اور اپنی زندگی بنا کسی خوف کے آزادی سے گزارو گے۔"

"ہم مطمئن ہیں جناب۔" وہ بیک آواز بولے۔

"او کے...... سب سے پہلے اس کی لاش ادھر رکھوا سے بعد میں دیکھیں گے اس کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔"

ذرا دیر بعد ہم سب خاصی تیز رفتاری سے جان گرے کے پیچھے جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر جان گرے نے جھاڑیوں میں چھپی مختصر سی جیپ نکالی اور سب کسی نہ کسی طرح اس پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ جان گرے نے سنبھال لی۔ کیونکہ اسے ہی علم تھا کہاں جانا ہے۔ میں اس کایا پلٹ پر اب تک دم بخود تھا۔ روبن نے ہمیں کتنی آسانی سے گرفتار کر لیا تھا اور خود کتنی آسانی سے مارا گیا تھا اس کے ساتھی جیسے جان گرے کی اطاعت کے لیے دل و جان سے تیار بیٹھے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک شاہراہ تک پہنچے تھے۔ جان گرے کی ہدایت پر سب نے اپنا اسلحہ چھپا لیا تھا۔ جان گرے نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر جان گرے سے پوچھا۔

"یہاں کھانے کو کچھ ملے گا۔"

"عقبی نشست پر سیٹ کے نیچے پانی اور پروٹین والے بسکٹ ہیں۔ ایک دو کھالو بھوک مٹ جائے گی۔"

سب ہی بھوک محسوس کر رہے تھے اس لیے یہ خاص غذائیت سے بھرپور بسکٹ کھائے۔ ان کے کھانے کے فوراً بعد جسم میں حیرت انگیز توانائی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ بسکٹ فوجیوں کے لیے

تیار ہوتے ہیں۔ جنگوں کے دوران جب ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا ہے تو وہ اس سے گزارہ کرتے ہیں۔ جان گرے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آپریٹس نکال کر اس پر کسی کو کال کی۔

''جے جی کالنگ......کیا پوزیشن ہے؟''

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے آپریٹس بند کر دیا اور چیخ کر بولا۔

''تیار ہو جاؤ۔ قافلہ آنے والا ہے۔''

ذرا دیر بعد سڑک پر ایک طرف سے ٹرکس نمودار ہوئے۔ ان کی تعداد کسی طرح پندرہ سے کم نہیں تھی۔ ان کے عقبی حصے ترپالوں سے ڈھک کر رسوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ ٹرکوں کے ساتھ ایک جیپ بھی تھی اس سے سادہ لباس میں ایک شخص اُترا اور نزدیک آ کر جان گرے کو سلوٹ کیا۔

''جے وائم سر۔''

''جے جی......'' جان گرے نے جواب دیا۔ ''کوڈ پلیز۔''

وائم نے حیرانگی سے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''سر کوڈ آپ نے دینا ہے۔''

جان گرے نے اپنا آپریٹس آن کر کے اس کے چند بٹن دبائے اور اس کی سکرین وائم کی طرف کر دی اس نے اپنے آپریٹس کی سکرین پر کوڈ چیک کیا اور سر ہلایا۔ ''ویری نائس سر! اب یہ آپ کے ہینڈ اوور ہے سر!'' اس نے باقاعدہ سلوٹ کیا تھا۔

''کیا تمہارے پاس روٹ پلان ہے۔''

''نو سر! ہمیں بتایا گیا تھا یہ بھی آپ کی ذمے داری ہے۔''

''اوکے! میرے ساتھ آؤ۔'' جان گرے جیپ کی طرف بڑھا اور اس پر سوار چھ محافظوں کو ٹرکوں کی طرف بھیج دیا۔ میں نے نوٹ کیا ہر ٹرک میں دو افراد تھے یعنی دو درجن سے زیادہ افراد صرف ٹرکوں پر تھے اور چار افراد وائم والی جیپ پر سوار تھے اور آٹھ افراد ہم تھے یعنی کل بیالیس افراد تھے۔ میرے خیال میں اسلحہ کی اتنی بڑی کھیپ کی محافظت کے لیے اس سے زیادہ افراد ہونا چاہیے تھے۔ افریقہ کوئی محفوظ سرزمین نہیں ہے۔ نصف گھنٹے بعد جان گرے نے جیپ کچے میں اُتار دی۔ تاریکی میں اس ناہموار راستے پر شدید نوعیت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے جان گرے سے پوچھا۔

''زیمبیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے خدا! تم لوگ وسط افریقہ میں ہو تو قبائل تک اسلحہ پہنچانے کے لیے اتنا طویل روٹ اختیار کر رہے ہو۔ کئی ملکوں سے گزر کر یہ اسلحہ کس طرح ان تک پہنچے گا۔''

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمیں زیمبیا کی سرحد تک یہ اسلحہ پہنچانا ہے۔ آگے یہ جن





لوگوں کے حوالے کیا جائے گا، ان کی ذمے داری ہے۔''

دو گھنٹے بعد قافلہ ایک میدان میں رُک گیا۔ ٹرکوں کو ایک جگہ کر کے ان کے گرد پہرہ لگا دیا گیا تھا چند افراد خیمے نصب کر رہے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا ٹرکوں کی طرف گیا۔ اس کے پاس کھڑا محافظ چوکنا ہو گیا۔

''کون ہو تم اس طرف کیوں آئے ہو؟''

''بھڑک کیوں رہے ہو یار! میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''ویسے کیا تمہیں معلوم ہے ان ٹرکوں پر کیا لدا ہے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ اپنی جگہ جاؤ۔''

''تمہاری مرضی۔ شاید تم سمجھ رہے ہو کہ ان پر اسلحہ ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''حالانکہ ان میں تابکار مادہ بھرا ہے جسے دہشت گردوں سے بچا کر ٹھکانے لگانے کے لیے افریقہ بھیجا گیا ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا جیپ والا کوئی فرد اس طرف آنا پسند نہیں کرتا ہے۔''

''تابکار مادہ۔'' اس نے تشویش سے کہا۔ ''تم سے کس نے کہا۔''

''میں جانتا ہوں۔ یہ زیادہ خطرناک نہیں ہے لیکن جو لوگ زیادہ دیر اس کے نزدیک رہتے ہیں ان کو خون اور ہڈیوں کے کینسر کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔''

''کینسر۔'' اس کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

''زیادہ خطرناک نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بس زیادہ نزدیک مت جانا اور تم جانتے ہو کینسر آج کل قابلِ علاج ہے بہ شرط کہ اسے شروع میں پکڑ لیا جائے۔''

اس کے منہ سے نہ جانے کس کے لیے ناشائستہ کلمات نکلے تھے۔ میں نے اسے دوسرے محافظ کی طرف جاتے دیکھا اور مسکراتا ہوا واپس کیمپ کی طرف آ گیا۔ چار عدد کشادہ خیمے لگ گئے تھے اور کچھ افراد آرام کر رہے تھے۔ دس منٹ کے اندر پہرہ دینے والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں خیمے میں لیٹا باہر ہونے والے ہنگامے کی آوازیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد جان گرے غراتا ہوا اندر آیا۔

''یہ کیا بکواس کر کے آئے ہو تم باہر؟''

''میں نے کیا کیا؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم نے محافظ سے کہا کہ ٹرک میں اسلحے کے بجائے تابکار مادہ بھرا ہے۔ اب کوئی ٹرکوں کے نزدیک جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''افسوس......میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اگر اس ٹرک میں اسلحے کے بجائے تابکار مادہ بھرا ہوتا تو تمہیں اس سے ایک مخصوص فاصلے پر ہونا چاہیے تھا۔ ورنہ تمہیں کینسر بھی ہو سکتا ہے۔''

''بکومت! تم نے میرے لیے پریشانی کھڑی کر دی ہے۔''

''اس میں کیا مسئلہ ہے۔ تم کسی ایک ٹرک کا سامان کھول کر انہیں دکھا دو کہ ٹرکوں میں اسلحہ ہی

ہے۔‘‘

’’یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ آخر تمہاری زبان میں خارش کیوں رہتی ہے۔‘‘

’’بس رہتی ہے۔ اب کیا کرسکتا ہوں میں، کہو تو ان سے بات کروں۔‘‘

’’وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔‘‘

جان گرے پھر باہر چلا گیا اور میں کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ یہاں بھی وہی ٹین بند کھانا تھا۔ کافی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ صبح مجھے بے دار کیا گیا تو ناشتہ اور قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ ایک پیالہ حلق سے اُتار کر اور کافی پی کر میں جلدی سے جیپ میں جا بیٹھا۔ سڑکوں کے کئی محافظ مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جان گرے جیپ کے بونٹ پر ایک نقشہ پھیلائے وائم کے ساتھ ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ راستے کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آخر کسی ایک بات پر متفق ہو کر وہ الگ ہوئے۔ جان گرے نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

’’یوسف! تم اوور ہو جاتے ہو۔‘‘ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

’’جب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو میں ایسے ہی اوور ہو جاتا ہوں۔‘‘ میں نے شانے ہلائے۔ ’’یہ بتاؤ کہ ابھی اور کتنے دن سفر کرنا ہے۔‘‘

’’بس آج رات ہم زیمبیا کی سرحد تک پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’اتنی جلدی؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’ہم جنوبی افریقہ کے شمال مغربی علاقے میں ہیں۔‘‘ جان گرے نے سر ہلایا۔ ’’سرحد یہاں سے تین سو میل دور ہے۔‘‘

’’سنو...... مجھے نہیں معلوم کہ آگے کیا خطرات پیش آئیں گے لیکن تم مجھے بھی اسلحہ دو۔‘‘

’’جیپ کی عقبی نشست تلے تمہیں ہتھیار مل جائیں گے لیکن وہ صرف ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔‘‘

’’میں ہنگامی حالات کا انتظار نہیں کرسکتا۔‘‘ میں نے کہا اور اُچک کر عقبی نشست پر چلا گیا۔

ایک نشست تلے جان گرے اچھا خاصا اسلحہ خانہ لیے پھر رہا تھا۔ اس میں عام مشین پسٹل سے لے کر طویل فاصلے پر مار کرنے والی اسنائپر رائفلیں تک تھیں۔ میں نے ایک ایم سولہ رائفل کا انتخاب کیا۔ جی تھری جو جرمن ساخت تھی اور کلاشنکوف کے ساتھ اس کا شمار دنیا کی تین بہترین اسالٹ رائفلوں میں ہوتا ہے۔ میں خانہ بند کر رہا تھا کہ میری توجہ ایک اور چیز نے مبذول کرالی۔ چند لمحے بعد میں دوبارہ جان گرے کے پاس آ بیٹھا تھا۔ پانچ گھنٹے مسلسل سفر کے دوران بعض جگہوں پر انسانی آبادیوں کے نشانات نظر آئے تھے۔ اِکا دُکا لوگ بھی نظر آئے مگر زیادہ تر سفر جنگلات کے علاقے میں تھا۔ میں نے ببر شیر سے لے کر ہاتھی اور زرافے تک دیکھے۔ ایک موقع پر گھاس سے افریقی گینڈا نکلا اور ’’خوں خوں‘‘ کرتا دوسری طرف گھاس میں غائب ہو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد ہم آرام





کے لیے رُکے تو سب کا تھکن سے بُرا حال تھا۔ جھٹکوں نے جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔

’’اب آگے سفر کی ہمت نہیں ہے۔‘‘ میں کنارے پر اُگی نرم گھاس پر دراز ہو گیا۔ اس علاقے میں سردی کا اثر نسبتاً کم تھا۔ ’’مجھے تین گھنٹے سے پہلے مت اُٹھانا۔‘‘

’’اے مسٹر یہ کیا کر رہے ہو۔‘‘ وائم ہماری طرف دوڑا۔ ’’ادھر سانپ ہوتے ہیں۔‘‘

’’سانپ۔‘‘ میں بوکھلا کر اُٹھ گیا تھا اور اتفاق سے اسی وقت گھاس سے ایک عجیب چپٹا سا سبز رنگ کا سانپ تلملاتا ہوا نکلا اور جیپ تلے گھس گیا۔ جان گرے کی حالت خراب نظر آنے لگی۔ وہ چلایا۔ ’’اسے نکالو۔‘‘ کئی محافظ دوڑے مگر سانپ نہ جانے جیپ کے کس حصے میں گھس گیا تھا۔ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ ’’میرا خیال ہے وہ دوسری طرف نکل گیا ہے۔‘‘ میں نے رائے دی۔

’’نہیں نکلا ہے۔ میں اس طرف تھا۔‘‘ جان گرے بولا۔

’’یہ بہت زہریلا اور پھرتیلا سانپ ہے۔ آدمی کو ایسے......‘‘ وائم کی بات ادھوری رہ گئی تھی کسی نے بھیانک چیخ ماری۔ ہم سب نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ ایک محافظ اپنی کلائی سے اس سبز رنگ کے سانپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وائم چھرا سنبھال کر اس کی طرف دوڑا۔ مگر وہ جب تک محافظ کے نزدیک پہنچتا وہ تڑ سے زمین پر گر چکا تھا اور اس کی رنگت نیلگوں پڑنے لگی تھی۔ سانپ اس کی کلائی سے اُتر کر مخصوص تلملاتے انداز میں گھاس کی طرف لپکا۔ بہرحال وہ گولی سے زیادہ پھرتیلا ثابت نہیں ہوا تھا۔ ایک برسٹ نے اس کے چیتھڑے اُڑا دیئے تھے۔ وائم مار گزیدہ محافظ کو دیکھتے ہوئے میڈیکل کٹ لانے کے لیے دھاڑا مگر طبی امداد دینے سے پہلے ہی اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور اس نے دم توڑ دیا تھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا اس قدر زہریلا سانپ تھا۔ کنگ کوبرا بھی کسی کو کاٹ لے تو وہ مرنے میں بیس منٹ لگاتا ہے لیکن اس سانپ کے زہر نے ایک منٹ میں اس محافظ کی جان لے لی تھی۔ اس کے ساتھی افسردہ تھے مگر زندگی اور موت کا یہ کھیل ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی کی لاش نزدیکی گڑھے میں ڈال کر اسے مٹی اور پتھروں سے بھر دیا تھا۔ ممکن ہے وہ اسے بعد میں آکر نکالتے مگر فی الوقت اس کا لے جانا ممکن نہیں تھا اس افسردہ ماحول میں کسی سے کچھ کھایا بھی نہیں گیا تھا۔ اس لیے دو گھنٹے بعد قافلہ دوبارہ روانہ ہوا۔ شام کو ایک جگہ رُک کر سب نے چائے کافی پی۔ کچھ کھانے کو لیا اور دوبارہ آگے روانہ ہو گئے۔ اب تک ہم باقاعدہ راستوں پر سفر کر رہے تھے جو کچے ہونے کے باوجود سفر کے قابل تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی تیزی سے تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ قافلے نے کچا راستہ چھوڑ کر ناہموار اور اَن چھوا راستہ پکڑا جو اس سارے سفر کا حاصل تھا۔ ایسے شاندار جھٹکے لگ رہے تھے کہ لگتا تھا ابھی ہر ہڈی اپنے جوڑ سے نکل جائے گی۔ ٹرک بالکل رینگتی رفتار سے چل رہے تھے۔ غالباً خطرہ تھا کہ کوئی ڈیٹونیٹر جھٹکے سے چل جائے اور سب کے چیتھڑے اُڑ جائیں ایک مخصوص مقام تک قافلہ رینگتا رہا پھر جان گرے نے جیپ روک کر کسی سے وائرلیس پر بات کی۔ سب جسم کھولنے کے لیے نیچے

اُترے لیکن جیسے ہی جان گرے نے چلنے کا اشارہ کیا سب اپنے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

"اب کتنی دور اور چلنا ہے۔"

"دو گھنٹے کا سفر ہے۔ زیادہ طویل تو نہیں ہے لیکن خطرناک ضرور ہے۔ سیاہ فام حکومت آنے کے بعد زیمبیا کی سرحد سے فوجی کم کر دیئے گئے ہیں مگر ابھی بھی کوئی گشتی دستہ اس طرف آ نکلتا ہے۔ ممکن ہے ہمیں روشنیاں بجھانی پڑیں۔"

"اس صورت میں کوئی ٹرک کسی گڑھے میں جا گرا تو۔"

"میرا خیال ہے ہمیں یہ رسک لینا ہی پڑے گا۔" جان گرے کے لہجے میں تشویش تھی۔

قافلہ ایک بار پھر رینگنے لگا۔ ایک مقام پر جہاں سرحد نزدیک تھی جان گرے کے اشارے پر تمام روشنیاں بجھا دی گئیں اور ہر گاڑی کے آگے ایک آدمی رہنمائی کے لیے چلنے لگا۔ اچانک جان گرے کے آپریٹس پر اشارہ ہوا۔ "یس ہم نزدیک ہیں رہنمائی کرو۔" اس نے کہا۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ جان گرے نے آپریٹس پر دیکھ کر اسے لوکیشن بتائی۔ فوراً ہی دائیں طرف سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ٹارچ جلنے بجھنے لگی۔ کم سے کم اتنے فاصلے سے یہ ٹارچ ہی نظر آ رہی تھی۔

"ہم نے دیکھ لیا۔ دس سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ فلیش کرتے رہو۔" جان گرے بولا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ ٹرک ہمارے عقب میں تھے اور وائم کی جیپ سب سے عقب میں تھی۔ وقفے وقفے سے روشنی جل بجھ کر قافلے کی رہنمائی کر رہی تھی۔ فاصلہ میرے اندازے سے زیادہ اور دشوار ثابت ہوا تھا۔ ہم کوئی پون گھنٹے بعد اس جگہ پہنچے تھے۔ فوراً تاریکی سے چند ہیولے برآمد ہوئے۔ جان گرے اور ان میں سے ایک شخص کے درمیان مخصوص الفاظ کا تبادلہ ہوا۔ جو میرے پلے نہیں پڑے کیونکہ کسی افریقی زبان میں تھے۔ اس شخص نے جان گرے کو ایک لفافہ دیا اور جان گرے نے ٹرک اس کے حوالے کر دیئے۔ ان کے سارے محافظ اور ڈرائیور بھی ان کے ساتھ جاتے۔ میں جان گرے کے ساتھ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ جان گرے نے وائم کو بلا کر اسے چند ہدایات دیں وہ سر ہلاتا رہا۔ "او کے باس! آپ کی ہدایت پر پورا عمل ہوگا۔"

ٹرک ایک ایک کر کے ہمارے پاس سے گزرنے لگے۔ ان کی روشنیاں اب بھی بجھی تھیں اس لیے چلنے کی رفتار ایک آدمی کے پیدل چلنے کی رفتار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں کبھی کبھی ٹرک کی باڈی پر ہاتھ مار دیتا۔ تاریکی سے آنے والے تاریکی میں رُوپوش ہو گئے تھے۔ ایک ایک کر کے تمام ٹرک اور آخر میں وائم کی جیپ بھی ہمارے پاس سے گزر گئی۔ چند لمحے بعد سب تاریکی میں رُوپوش ہو چکا تھا۔

"اب چلو۔" جان گرے نے کہا۔ "ڈرائیونگ تم کرو گے۔"

"یس باس۔" میں نے ڈرائیونگ نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا واپس چلنا ہے۔"

"ہاں...... لیکن اس راستے سے نہیں دوسرے راستے وہ میں بتاؤں گا۔" جان گرے میرے





برابر میں بیٹھ گیا۔

"اب یہ کھیپ کس کے ہینڈ اوور ہے؟"

"جس نے خریدی ہے لیکن ہمارے آدمی منزل تک جائیں گے۔"

میں نے جیپ کی روشنیاں جلالی تھیں۔ جان گرے نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک دو بار مڑ کر دیکھا۔ ہم خاصا آگے نکل آئے تھے۔ میں نے مایوسی کی سانس لی تھی کہ زمین ایک زوردار دھماکے سے گونج اُٹھی تھی۔ جیپ اُچھلی تھی۔ جان گرے بوکھلا کر مڑا تھا۔ عقب میں جہاں اس وقت قافلے کو ہونا چاہیے تھا۔ وہاں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ سرخ و سیاہ شعلے دم بہ دم پھیل رہے تھے۔

■■■

"یہ کیا ہو گیا...... یسوع...... یسوع۔" جان گرے کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

"میرا خیال ہے اسلحے کا ذخیرہ تباہ ہو گیا ہے۔"

"بکواس نہ کرو۔" جان گرے چلایا۔ "میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"اگر ایسا ہونا ہے تو......"

جان گرے نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ "ذلیل آدمی تم مسکرا کیوں رہے ہو؟"

"چھوڑو مجھے۔" میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ذرا پیچھے گیا اور جب پلٹا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا اس نے پستول میری طرف کر دیا۔

"میں تجھے جان سے مار دوں گا۔" اس کے انداز میں دیوانگی تھی۔

"کس جرم میں؟" میں نے سکون سے پوچھا۔ ویسے میری نظر اس کی ٹریگر پر جمی انگلی پر مرکوز تھی۔

"تم نے یہ اسلحہ تباہ کیا ہے یوسف۔" اس نے کہا۔ اس بار اس کے لہجے میں دیوانگی کا عنصر کم تھا۔ "تم نے مجھے تباہ کر دیا ہے، یوسف اب میں قیدی کی حیثیت سے جزیرے پر بلایا جاؤں گا۔"

"یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے براہِ کرم مجھے الزام مت دو۔" میں نے اس کا پستول سامنے سے ہٹا دیا۔ "ممکن ہے یہ کوئی سائن بلاسٹ ہو۔"

"نہیں...... یہ اسلحہ ہی تباہ ہوا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "کیسے...... یہ مجھے نہیں معلوم۔ پر میں جو مقام دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا وہ ممکن نہیں رہا ہے۔"

"جان گرے میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتا۔ تم نے خلیج پر قزاقی جیسا بڑا کام کیا تھا۔"

"میرا ماضی شاندار ہے لیکن میرا حال......" اس نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ "جب سے میں نے افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھا ہے ناکامیاں میرا مقدر بن گئی ہیں۔"

"اس کی وجہ بہرحال میں نہیں ہوں۔" میں نے جیپ کو جھاڑیوں سے گزارتے ہوئے کہا۔

"میں تو خود تمہارا بے بس قیدی رہا ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ جب آدمی پر مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔ میں نے تمہاری امیدیں اس مشن کی کامیابی سے لگا رکھی تھیں۔ کروڑوں ڈالرز کا اسلحہ تباہ ہو گیا وہ اتنی اہم بات نہیں ہے لیکن آرگنائزیشن کا مقصد پورا نہیں ہو سکا اس کا عتاب مجھ پر ضرور نازل ہو گا۔"

"یعنی مزید کئی لاکھ سیاہ فاموں کا قتل عام۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم جو بھی کہہ لو۔ یوسف یاد رکھو میرے ساتھ تم بھی مشکل میں گھر گئے ہو۔ اگر مجھ پر عتاب آیا تو تم بھی اس میں حصے دار بنو گے۔ میں تو ممکن ہے بچ جاؤں لیکن تم کسی صورت سزا سے نہیں بچ سکو گے۔"

"معاف کرنا۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمہارا قیدی ہوں آگے جو قدرت کو میرے بارے میں منظور ہو۔"

"تم کچھ زیادہ ہی مطمئن لگ رہے ہو۔" جان گرے کے لہجے میں شک تھا۔

"اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ خدا پر میرا ایمان پختہ ہے۔ وہ جو چاہے گا وہی ہو گا۔ اگر میری موت کا وقت آ گیا ہے تو ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں ٹال سکتی۔ ورنہ تمہاری آرگنائزیشن بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"کاش یہ پختگی میرے پاس بھی ہوتی۔" جان گرے نے گہری سانس لی۔

"اب بتاؤ کہاں جانا ہے۔" میں نے ایک دوراہے پر جیپ روک دی۔ عقب میں نظر آنے والی آگ کے شعلے خاصے پیچھے رہ گئے تھے اور اب دھماکے بھی سنائی نہیں دے رہے تھے۔ جان گرے بے خبر تھا کہ اس کے جیپ کے عقبی نشست تلے موجود اسلحہ خانے سے ایک ہینڈ گرینیڈ غائب تھا۔ یہ گرینیڈ میں نے گولہ بارود سے بھرے ٹرک کے پیٹرول ٹینک تلے اس طرح پھنسایا تھا کہ اس کی چابی سے ایک ڈوری لٹک رہی تھی۔ چابی میں پہلے ہی نصف نکال چکا تھا۔ ڈوری کسی بھی جھاڑی میں ذرا سا پھنستی تو چابی نکل جاتی اور گرینیڈ پھٹ جاتا۔ جیسا کہ ہوا۔ میں نے ایک چانس لیا تھا عین ممکن تھا کہ ٹرک کو لگنے والے دھچکوں کی وجہ سے گرینیڈ نیچے گر جاتا، یا ڈوری سرے سے کہیں پھنستی ہی نہیں اور اسلحہ اپنے مقام پر پہنچ کر نا جانے کتنے آدمیوں کی موت کا باعث بنتا۔ اس وقت بھی کم سے کم تین درجن افراد مارے گئے تھے لیکن یہ قاتل اور دہشت گرد تھے۔ زمین کا کیچڑ ان کا صاف ہو جانا ہی اچھا تھا۔ جان گرے کی جان پر بن گئی تھی۔ ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اسے مستقبل کے اندیشے کھا رہے تھے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟"

اس لمحے اس کے پاس ایک بپ اُبھری، اس نے جیپ میں ہاتھ ڈال کر ایک موبائل فون نما آلہ نکالا۔ اس پر روشنی فلیش کر رہی تھی۔ اس نے ایک بٹن دبا کر کال ریسیو کی۔ "یس سر...... اِٹ اِز




جے جی۔"

آواز خاصی تیز تھی اور مجھ تک واضح آ رہی تھی۔ "جے جی...... انڈیکیشن رُک گئی ہے کیا معاملہ ہے؟"

"سوری سر...... میں اس بارے میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ میں ڈیلیوری کرتے ہی واپس ہو گیا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"انڈیکیشن پندرہ منٹ پہلے ختم ہوئی ہے اور اتنی دیر میں تم کتنی دور جا سکتے ہو۔ مجھے شبہ ہے اسلحہ تباہ ہو گیا ہے۔"

"میں نے کوئی علامت نہیں دیکھی ہے۔" جان گرے نے سفید جھوٹ بولا کیونکہ اسلحے کی تباہی سے بھڑکنے والی آگ کے شعلوں سے اُفق روشن تھا۔ "ویسے بھی میں اس وقت گھنے جنگل میں سفر کر رہا ہوں۔"

"انڈیکیٹر بے حد محفوظ آلہ ہے اور جب تک ٹرک نہ تباہ ہو جائے اسے نقصان نہیں ہو سکتا۔" دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔

"سر ڈیلیوری کے بعد میری ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔" جان گرے نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اب آگے اسلحہ ان لوگوں کی ذمے داری ہے۔ انڈیکیٹر نے اتنا تو بتایا ہو گا کہ اسلحہ سرحد پار کر گیا ہے۔ لہٰذا تم اب ان لوگوں سے رابطہ کرو۔"

"میں نے ان سے رابطہ کیا تھا۔" مشینی آواز میں جھنجھلاہٹ شامل ہو گئی تھی۔ "مگر کسی سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ اسی سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ اسلحہ تباہ ہو گیا ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں سر۔" جان گرے نے پوچھا۔ "میں اس وقت واپس جانے کی پوزیشن میں ہوں۔"

"جے جی سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ اتنا اہم کام ہے کہ اس میں فرو کی اہمیت نہیں ہے۔ اگر معاملہ خراب ہوا تو تمہارے ساتھ میں بھی لپیٹ میں آؤں گا۔"

"سر...... اگر کوئی گڑ بڑ ہو چکی ہے تو ہم سب اس میں لپیٹے جائیں گے۔"

"یہ میرا حکم ہے تم واپس جا کر انسپکشن کرو اور مجھے رپورٹ کرو۔"

"سوری سر...... اب میرا واپس جانا بے حد خطرناک ہو گا اگر اسلحے میں کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے تو اس جگہ پڑوسی ملک کی آرمی پہنچ چکی ہو گی۔"

"اتنی جلدی نہیں آ سکتے وہ۔" باس کے لہجے میں حقارت تھی۔ "ابھی یہ اتنے تیز نہیں ہوئے ہیں۔"

"سر میرا مشورہ ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنی غلط فہمی دور کر لیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں مَیں نے ان لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ یہ ہماری توقع سے زیادہ ہوشیار ہیں۔"

"اپنی نا اہلی کا الزام ان لوگوں کی ہوشیاری کو مت دو۔"

"میری نا اہلی اگر ثابت کر سکو تو ضرور کرو۔" جان گرے نے بھنا کر کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم حکم عدولی کرو گے؟"

"میں تمہارا حکم نہیں مان سکتا اس سے براہِ راست میری جان اور آزادی کو خطرہ لاحق ہے۔"

جان گرے نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ "یہ کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرف چلو۔" جان گرے نے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا اور میں نے جیپ اس طرف بڑھا دی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"یوسف۔" جان گرے نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے اسلحے کی کھیپ کے ساتھ کوئی گڑ بڑ کی ہے تو......"

"تم بلاوجہ مجھے الزام دے رہے ہو۔ میں مستقل تمہارے سامنے رہا تھا میں بھلا کسی کی نظر میں آئے بغیر کیسے گڑ بڑ کر سکتا تھا۔"

"او کے......مگر وہ کتے کا بچہ اس کا ملبہ میرے سر ڈالے گا۔"

جان گرے نے کتے کے بچے کے بارے میں وضاحت نہیں کی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی ہدایات کے مطابق ڈرائیونگ کرتا رہا۔ سخت سردی تھی اور کھلی جیپ پر زیادہ ہی لگ رہی تھی۔ اگر ہم نے گرم کپڑے نہ پہن رکھے ہوتے تو سردی سے بُرا حال ہو جاتا۔ جان گرے وقفے وقفے سے برانڈی کی چپٹی بوتل سے چسکیاں لے رہا تھا اور مجھے شدت سے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ ہم صبح تک سفر ہی کرتے رہیں گے۔ تین بجے کے قریب اچانک ہوا میں نمی محسوس ہونے لگی اور چند منٹ بعد ہلکی بونداباندی شروع ہوگئی۔ "مارے گئے۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "کل ہماری لاشیں جیپ کی سیٹوں پر مسکراتی ہوئی ملیں گی۔"

"اس طرف چلو۔ آگے ایک عمارت ہے شاید وہاں ہمیں پناہ مل جائے۔"

میں نے جان گرے کے بتائے راستے پر جیپ دوڑا دی۔ اس وقت ہم کسی قدر ہموار جنگل سے گزر رہے تھے۔ یہاں پر درخت سلیقے سے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی انسانی ہاتھوں سے اُگایا جنگل ہے۔ جان گرے نے تصدیق کی۔ "یہ جنگل یہاں رہنے والی راہبہ مدر این نے اُگایا ہے۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے یہاں رہ رہی ہے۔"

میں ہنسا۔ "تم لوگ بھی خوب ہو۔ ایک طرف انسانوں کو ایک دوسرے کو مارنے کے لیے اسلحہ دیتے ہو دوسری طرف طبی وفد بھیج کر ان کے زخموں کا علاج کرتے ہو۔ ان کے معدنی وسائل





شیر مادر سمجھ کر پی جاتے ہو اور ان کے جنگلوں کو بھی بچاتے ہو۔"

"کیونکہ بالآخر یہ ہمارے کام آئیں گے۔" جان گرے نے سادہ سی حقیقت بیان کر دی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو انسانوں سے زیادہ جانوروں اور ماحول کا خیال رہتا ہے۔ بشرطیکہ انسان غیر سفید فام ہو۔"

جان گرے چپ رہا ذرا دیر بعد ہم ایک چوبی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ برآمدے میں جا کر ہم بارش سے محفوظ ہو گئے تھے لیکن سردی یہاں بھی بلا کی تھی۔ جان گرے وہاں لٹکی ایک زنجیر کھینچی اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ "جان گرے یہ بڑی بی اعتماد کے قابل ہے۔ کیونکہ اب تک میں تمہارے جن دوستوں سے ملتا آیا ہوں انہوں نے وقت پڑنے پر تمہارے پیٹ میں خنجر گھونپنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔"

"بکومت مدر این بہت اچھی عورت ہے۔ اس سے میری خاصے عرصے سے جان پہچان ہے۔"

"اب تو میرا شبہ اور بڑھ گیا ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ اس پر جان گرے نے مجھے خون خوار نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں کیونکہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک سیاہ فام بوڑھے نے باہر جھانک کر پوچھا۔

"کون ہے؟" وہ سامنے دیکھ رہا تھا مگر ہم ایک طرف کھڑے تھے۔

"ماذن میں ہوں جان گرے۔" جان گرے نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ...... ماسٹر گرے۔ کتنے عرصے بعد آئے ہو تم۔" بوڑھے سیاہ فام نے مسرت سے کہا۔

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو پورے دو سال اور چھ مہینے کے بعد آئے ہو۔"

"تمہاری یادداشت مثالی ہے۔" جان گرے نے اس کا شانہ تھپکا۔ "کیا مدر این آرام کر رہی ہیں۔"

"بے شک......لیکن ان کا یہ خادم ان کے مہمانوں کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتا ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے ماسٹر۔"

اتنی دیر میں مجھے اس کے نابینا ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ اس کی یادداشت ہی نہیں سننے کی صلاحیت بھی خاصی تیز تھی۔ اس نے میری سانسوں کی معمولی سی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں جان گرے کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ "یہ میرا ایک دوست ہے۔"

"ویلکم ماسٹر۔" وہ ذرا پیچھے ہو گیا۔ "میں بھی کتنا احمق ہوں۔ اتنی دیر سے آپ کو یہاں سردی میں کھڑا کر رکھا ہے۔ اندر آؤ ماسٹر۔ اپنے دوست کو بھی لاؤ۔ مدر کے شیدائیوں کے لیے ماذن کی جان بھی حاضر ہے۔"

عمومی سیاہ فاموں کی طرح یہ بڈھا بھی بلا کا باتونی لگتا تھا۔ راستہ ملتے ہی ہم اندر گھس گئے۔

باہر بلا کی سردی کے مقابلے میں عمارت اندر سے خاصی گرم تھی اور راہ داری میں ہی ہمیں سکون ملا تھا۔ ماذن ہم لوگوں کی رہنمائی کرنے لگا۔ باہر سے عام نظر آنے والی یہ چوبی عمارت اندر سے خاصی بڑی ثابت ہوئی تھی۔ ماذن ہمیں ایک راہ داری سے گزار کر ایک بڑے سے کمرے میں لایا۔ جو نشست گاہ لگ رہا تھا۔ وہاں ایک طرف الگ سے انگیٹھی نما کوئی شے روشن تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا سا بام ہو لیکن اس کے اوپر سلگتے ہوئے کوئلے تھے اور اس کے عین اوپر ایک کیف اور اس سے منسلک تین چار انچ قطر کا پائپ تھا تا کہ دھواں وغیرہ بالکل نکل جائے۔ کمرا اتنا گرم تھا کہ میں نے جیکٹ کی زپ کھول دی۔ وہاں آرام دہ صوفے تھے۔

"ماسٹر کھانے یا پینے کے لیے کچھ حاضر کروں؟" ماذن نے ادب سے کہا۔

"نہیں بھوک نہیں ہے۔ ہاں کافی لے آؤ" جان گرے نے کہا۔ "اس کے بعد ہم آرام کریں گے۔"

"تب آپ کو پہلے میں کمرے دکھا دوں اس کے بعد کافی بھی سرو کر دوں گا۔"

"یہ اچھا رہے گا۔" جان گرے خوش ہو گیا۔ "ہمیں رات کے لیے سلیپنگ سوٹ چاہئیں۔"

"ماسٹر سب مل جائے گا تم چلو۔"

ماذن ہمیں عقبی طرف واقع کمروں کی طرف لایا۔ یہ عمارت اس سے خاصی ملتی تھی جہاں میں قید رہا تھا اور پھر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ فادر بیلی کے چرچ کی طرح مدراین کا یہ گھر بھی دراصل آرگنائزیشن کا ایک اڈہ تھا۔ ماذن نے برابر کے دو کمرے کھولے تھے۔ وہ نابینا تھا لیکن اس عمارت کے ایک ایک حصے سے پوری طرح واقف تھا۔ میں نے اسے کسی مقام پر ایک لمحے کے لیے بھی جھجکتے نہیں دیکھا تھا اس نے کافی کے لیے جانے سے پہلے میرے کمرے میں موجود الماری میں سلیپنگ سوٹ کی نشاندہی کی مگر میرا ان کپڑوں میں رہنے کا ارادہ تھا کہ نہ جانے کس وقت کیا حالات ہوں ہمیں پھر سے بھاگنا پڑے۔ اس کے جاتے ہی میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا تو خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ اندر اتنی حرارت تھی کہ میں نے جیکٹ اُتار دی اور جوتے موزے اُتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ گزشتہ دو دن سے سکون کے لمحات کم ملے تھے اس لیے اس وقت بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ماذن مشکل سے پندرہ منٹ میں کافی لے آیا۔

"شکریہ ماذن۔"

"ویلکم سر! تم مزید کیا لینا پسند کرو گے؟"

"فی الحال کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا اور مہکتی گرم کافی کی چسکی لی۔ "ماذن کافی اچھی ہے۔"

"شکریہ جناب۔" وہ خوش ہو گیا تھا۔ "میں خاص طریقے سے بناتا ہوں۔ مدراین کے مہمان خاص طور سے فرمائش کر کے مجھ سے کافی بنواتے ہیں۔"




"بس تو میں جب تک یہاں ہوں تم مجھے کافی پلاتے رہنا۔" میں نے اسے مکھن لگایا۔ "کیا یہ کوئی چرچ یا مشن ہے؟"

"نہیں جناب! مدراین کا تعلق کسی چرچ یا مشن سے نہیں ہے وہ اس علاقے کے جنگلات کو بچانے کے لیے ایک این جی او چلا رہی ہیں۔ وہ پچاس سال پہلے یہاں آئی تھیں۔ تب ان کا تعلق ایک مشن سے تھا۔ پھر انہوں نے مشن چھوڑ کر یہ این جی او بنائی۔ ان کی کوششوں سے یہاں کے جنگلات پھر سے ہرے بھرے ہو گئے ہیں اور یہ مقامی لوگوں پر مدراین کا احسان ہے۔"

"مدراین مقامی تو نہیں ہیں۔ شاید یورپ سے آئی ہیں۔" میں نے اندازہ لگایا۔

"نہیں جناب ان کا تعلق کینیڈا سے ہے بلکہ تھا، وہ جب یہاں آئی تھیں تبھی سے واپس کینیڈا نہیں گئیں۔ انہیں اس سرزمین اور اس کے باسیوں سے پیار ہے۔"

"یہ علاقہ پڑوس ملک کی سرحد سے خاصا قریب ہے۔"

"ہاں...... لیکن اس سے مدراین کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔" ماذن نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے کافی کا خالی مگ اس کے حوالے کیا۔ "جناب آپ صبح کا ناشتہ کس وقت کرنا پسند کریں گے اور ناشتے میں کیا لینا پسند فرمائیں گے۔"

"جو بھی ہو لیکن گوشت یا سور سے بنی کوئی شے نہ ہو۔"

وہ چونکا۔ "آپ یہودی یا مسلمان تو نہیں ہیں جناب۔"

"اس چیز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے کسی قدر رکھائی سے جواب دیا۔

"سوری...... سر...... سوری۔" وہ معذرت کرتا رخصت ہو گیا۔

صبح ماذن کے بجائے جان گرے نے مجھے بے دار کیا۔ "اب اُٹھ جاؤ ناشتہ کر کے ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

"کس طرف۔" میں نے اُٹھتے ہوئے جماہی لی۔ چھ سات گھنٹے کے آرام سے تھکن خاصی حد تک اُتر گئی تھی۔ صرف کسل مندی تھی۔ "کیا تمہارا جزیرے کی طرف جانے کا ارادہ بدل گیا ہے۔"

"فی الوقت اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ کیا اوپر والے تم سے ناراض ہیں۔"

"کل میری جس سے بات ہوئی تھی وہ خاص آدمی نہیں ہے اس مشن کی حد تک وہ میرا باس تھا۔ میں نے اس کے بارے میں رپورٹ کر دی ہے۔"

"مجھے تمہارے ستارے گردش میں نظر آ رہے ہیں جان گرے۔" میں جست لگا کر بستر سے اُترا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ شاور میں گرم پانی آ رہا تھا اس لیے میں نے کئی دن بعد دل بھر کر

گرم پانی سے غسل کیا۔ میں باہر نکلا تو جان گرے جا چکا تھا۔ ماذن بھی نظر نہیں آیا اس لیے میں خود ہی نشست گاہ کی طرف چلا آیا۔ وہاں ناشتے کی میز پر جان گرے ایک بے حد بوڑھی عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی عمر کسی طرح ستر برس سے کم نہیں تھی۔ اعضاء کسی حد تک سکڑ گئے تھے اور چہرے کے نقوش جھریوں نے مسخ کر دیئے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے روشنی اور توانائی جھلک رہی تھی۔ جان گرے نے مجھے دیکھ کر اس عورت سے کہا۔

''اور یہ ہے جوزف۔''

''اوہ......'' اس نے بہ غور مجھے دیکھا۔ ''یہ تو ینگ اتج ہے۔''

جان گرے مسکرایا۔ ''دوستی کے لیے کوئی عمر نہیں ہوتی۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جوزف یہ مدر این ہے۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی مدر۔''

''مجھے بھی نوجوان! آؤ ناشتہ کرو۔''

ناشتے میں توس تھے، جو اچھی طرح سکے تھے۔ ہاف فرائی اور ہاف بوائل انڈے تھے۔ شہد کے ساتھ کیک بھی تھا۔ میں نے بلا تکلف ناشتے پر ہاتھ صاف کیا۔ جان گرے اور مدر این ناشتہ کر چکے تھے۔ اس لیے کافی کے کپ پر جنگلات کی بہتری کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ مجھے حیرت ہوئی اس شعبے میں جان گرے کی معلومات بھی خاصی تھیں اس نے مدر این کو چند بیماریوں کے بارے میں بتایا جو اس علاقے میں درختوں کو لگ رہی تھیں۔ مدر این نے اس سے اتفاق کیا۔ ''ہم ان درختوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ناشتہ کر کے میں نے کافی اور مدر این نے ماذن کو چائے لانے کا حکم دیا تھا۔ مجھے اب تک وہاں ماذن کے علاوہ اور کوئی شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سارے کام وہی کرتا تھا۔

''مدر کیا ناشتہ بھی ماذن بناتا ہے؟'' جان گرے نے گویا میرے منہ کا سوال چھین لیا تھا۔

''نہیں ناشتہ جینا بناتی ہے میری بھتیجی ہے۔ گزشتہ چار سال سے میرے ساتھ ہے۔''

''اوہ۔'' جان گرے کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ ''جب میں پچھلی بار آیا تھا تو وہ یہاں نہیں تھی۔''

''ہاں...... ان دنوں وہ میری طرف سے ایک کانفرنس میں شرکت کرنے گئی تھی۔ میری طبیعت ان دنوں خراب تھی اس لیے میں نہیں جا سکی تھی۔''

''مدر کیا تمہاری بھتیجی سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔'' جان گرے نے اشتیاق کیا۔

''کیوں نہیں۔'' مدر این نے کہا۔ ''وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر یہیں آئے گی۔''

جان گرے سراپا انتظار بن گیا تھا۔ میں اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ ہمیں ناشتے کے بعد جانا تھا۔ دس منٹ بعد ایک جوان عورت اندر آئی۔ اس نے پھولدار ریشمی





اسکرٹ کے ساتھ چھوٹا سا سویٹر پہن رکھا تھا جو اس کے صحت مند بدن پر جچ رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ دلکش عورت تھی۔ جان گرے نے جلدی سے اُٹھ کر اس کے سامنے سر خم کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''مس...... مجھے جان گرے کہتے ہیں۔''

''جینا بین جی۔'' وہ مسکرائی تو اس کے ہموار سفید دانت جھلکنے لگے تھے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا جو جان گرے نے نزاکت سے چھو کر چھوڑ دیا۔ میں نے سر کے اشارے سے ہیلو کو کافی سمجھا۔ جان گرے نے بادلِ نخواستہ میرا تعارف کرایا کیونکہ وہ خاصی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''جوزف...... میرا دوست۔''

محض جان گرے کو چڑانے کے لیے میں نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے خود چھوڑ دیا۔ ''نائس ٹو میٹ یو۔'' وہ پھر مسکرائی۔

''مدر این نے تمہارا ذکر کیا تھا۔'' وہ بے دلی سے بولی۔ ''ماذن میرا ناشتہ لے آؤ۔''

میں نے اُٹھ کر بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ موسم سرمئی ہو رہا تھا۔ مدر این نے جان گرے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آج تم رُک جاؤ۔ طوفان آنے کی پیش گوئی ہے۔''

جان گرے ہچکچایا۔ ''مدر ہمارا جانا ضروری ہے۔''

اس موقع پر جینا نے اچانک التفات سے اپنا ہاتھ جان گرے کے شانے پر رکھا۔ ''مسٹر جان گرے تم رُک جاؤ۔ اس موسم میں سفر کرنا درست نہیں ہوگا اور پھر میں بھی کچھ دیر کے لیے انجوائے کر سکوں گی۔''

''ہاں...... میں اسے کمپنی نہیں دے سکتی۔'' مدر این مسکرائی۔ ''یہ نوجوان آدمیوں کا کام ہے۔''

جان گرے کو اب ملک الموت بھی لے جانا چاہتا تو وہ نہ جاتا۔ جینا نے اس انداز میں رُکنے کو کہا تھا۔ میں خطرے کی بُو سونگھنے لگا۔ آخر یہ ہمیں روکنے کے لیے اس قسم کے حربے کیوں استعمال کر رہی تھیں۔ جینا چند لمحے پہلے تک جان گرے سے لاتعلق نظر آ رہی تھی اور اس نے اچانک ہی انداز بدل لیا تھا۔ اس کے لہجے میں درخواست سے زیادہ انداز محبوبی تھا اور جان گرے فوری طور پر ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔ اس نے سابقہ بیان تبدیل کرتے ہوئے اپنے جانے کو غیر اہم قرار دیا۔ ''مدر میں بھی سوچ رہا ہوں کہ موسم بہتر ہونے کے بعد ہی نکلیں۔''

میں نے کھنکار کر کہا۔ ''شاید تم بھول رہے ہو۔ ہمارا جانا ضروری ہے۔''

''اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ خراب موسم میں کہیں پھنس گئے تو یہ پریشانی کی بات ہوگی۔''

''ہمارے پاس سامان اور کپڑے بھی نہیں ہیں۔''

''ینگ مین۔'' جینا نے اسی لگاوٹ سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہاری زندگی ہر کام سے قیمتی ہے۔ موسم بہتر ہو تو چلے جانا۔''

''فیصلہ مجھے کرنا ہے۔'' جان گرے جز بز ہو کر بولا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم موسم بہتر ہونے تک نہیں جائیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے اچکائے۔

جان گرے نے فاتحانہ نظروں سے جینا کی طرف دیکھا جیسے مجھ سے بات منوا کر اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ اس وقت اس کا رویہ کسی نوجوان لڑکے کا سا ہو رہا تھا۔ جس نے اپنی گرل فرینڈ کے سامنے اس کے دوسرے امیدوار کو مات دے دی ہو۔ جینا پھر مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بلاشبہ خوب صورت تھی اور وہ اس کا استعمال بھی جانتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اپنی بے داغ جلد اور متناسب بدن کے باوجود وہ کم سے کم پینتیس برس کی تھی۔

''تم دونوں کو بلیئرڈ سے دلچسپی ہے؟'' جینا نے پوچھا۔

جان گرے نے سر ہلایا۔ ''میں مونٹی کارلو میں کئی اعزازات حاصل کر چکا ہوں۔''

''میں نے کم کھیلا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرے ساتھ آؤ میں بھی بس دلچسپی کی وجہ سے کھیلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ ہمیں ایک بڑے کمرے میں لائی۔ جہاں وسط میں سنوکر کی ٹیبل لگی تھی۔ پہلا میچ جان گرے اور جینا کے درمیان طے پایا اور جان گرے اس طرح اس کام میں مشغول ہو گیا جیسے اس سے زیادہ ضروری کام نہ ہو۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اگر دشمن یعنی آرگنائزیشن والے ہماری لوکیشن سے واقف ہو گئے تو وہ ہمیں گھیر لیں گے۔ یہ جگہ سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی اور ان کا خیال اس طرف آ سکتا تھا۔ ہماری جیپ باہر موجود تھی۔ ایک بار جان گرے اپنی باری کر کے میری طرف آیا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''جان گرے...... باہر ہماری جیپ ہے وہ ہمیں پھنسوا دے گی۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اسے عقبی حصے میں واقع گیراج میں رکھوا دیا ہے۔''

''اس میں اسلحہ بھی ہے۔''

''وہ خانے اب کسی سے نہیں کھلیں گے۔'' جان گرے نے مجھے تسلی دی۔ ''اور فکر مت کرو اول تو میری تلاش نہیں کی جائے گی اور کسی نے کی بھی تو اس طرف کا خیال نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو مازن ہمارا پتا نہیں بتائے گا۔ وقت آنے پر ہم یہاں پر روپوش بھی ہو سکتے ہیں۔''

''کسی تیسرے کی موجودگی میں سرگوشیاں کرنا اچھی بات نہیں ہے۔'' جینا نے کیو پر ضرب لگاتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

''سوری......'' جان گرے سراپا معذرت بن گیا۔ ''میرا ساتھی اس کام کے سلسلے میں پریشان ہے جو ہمارے نہ جانے سے ادھورا رہ جائے گا۔''

''کام تو ہوتے رہتے ہیں۔'' جینا لاپروائی سے بولی۔ ''دوپہر کے کھانے سے پہلے سوئمنگ




کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہاں نیچے تہہ خانے میں ایک گرم سوئمنگ پول بھی ہے۔ میرا زیادہ وقت وہیں گزرتا ہے۔''

جان گرے کی باچھیں کھل گئی تھیں اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''شاید اس وجہ سے تمہارے فگرز متناسب ہیں۔''

''ہاں...... میں باقاعدگی سے سوئمنگ اور ایکسر سائز کرتی ہوں۔'' وہ برا مانے بغیر بولی۔ ویسے بھی وہ جس معاشرے سے تعلق رکھتی تھی اس میں یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

''کیا یہاں جمنازیم ہے۔'' اس بار میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں نیچے تہہ خانے میں ہی ہے کیا تم سوئمنگ کرو گے۔'' اس نے شوق سے میری طرف دیکھا۔

''میں جمنازیم کو ترجیح دوں گا۔'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

درحقیقت مجھے ورزش سے بھی دلچسپی نہیں تھی مگر میں جان گرے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہ رہا تھا۔ میری چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی۔ جان گرے نے میرے سوئمنگ نہ کرنے کا سن کر اطمینان کا سانس لیا تھا اور میں اس کی عقل کو رو کر رہ گیا تھا۔ وہ مجھ سے بہتر جانتا تھا کہ ہم کس قسم کے خطرات میں گھرے ہیں اس کے باوجود اسے اٹھکیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ میرے پاس پستول تھا۔ البتہ جان گرے مجھے نہتا لگ رہا تھا اس نے پتلون اور قمیص کے اوپر بٹنوں والی واسکٹ پہن رکھی تھی اور اس کے لباس میں کہیں بھی کسی ہتھیار کا ابھار نظر نہیں آ رہا تھا البتہ اس نے اندر کہیں چھپا رکھا ہو تو مجھے علم نہیں تھا لیکن کچھ دیر بعد اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ نہتا تھا۔ انہوں نے عجلت میں کھیل ختم کیا۔ جان گرے کی بے تابی کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اس گلبدن کا بدن دیکھنے کے لیے مرا جا رہا تھا لیکن جینا کی بے تابی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

کچھ دیر بعد ہم عمارت کے تہہ خانے میں تھے۔ اس کا فرش اور دیواریں پتھر سے تعمیر شدہ تھیں۔ جبکہ اوپر کا سارا حصہ لکڑی کا بنا تھا۔ عمارت کو سہارا دینے والے درختوں کے موٹے اور مضبوط تنوں کے ستون تہہ خانے کے فرش میں پیوست تھے۔ ایک طرف بارہ بائی پندرہ کا سوئمنگ پول تھا جس کے گرم پانی سے ہلکی سی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ دوسری طرف جمنازیم تھا جس میں ورزش کرنے کی جدید ترین مشینیں نصب تھیں۔ جان گرے نے اشتیاق سے جینا کی طرف دیکھا۔ ''چینج کہاں کرنا ہے؟''

''وہاں لاکر روم ہے۔'' جینا نے اشارہ کیا اور جان گرے کے جانے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''تم بھی آؤ ہم نیکڈ سوئمنگ کریں گے۔''

میں چونکا تھا۔ ''سوری...... مجھے سرے سے سوئمنگ سے دلچسپی نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے سخت کوفت ہوئی تھی۔ دیکھنے میں وہ اچھی خاصی باوقار عورت لگتی تھی لیکن اس وقت ہمارے ساتھ

اس کا رویہ کسی تھرڈ کلاس طوائف جیسا تھا جو ہر قیمت پر ہمیں رجھانا چاہتی تھی اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ جان گرے نیکر میں ملبوس باہر آیا تو وہ مسکراتی ہوئی لاکر روم کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے جان گرے کا شانہ دبوچ لیا۔

''پیارے مجھے خطرے کی بُو آ رہی ہے۔ یہ عورت کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہی ہے۔ ابھی اس نے مجھے دعوت دی ہے کہ اس کے ساتھ نیکڈ سوئمنگ کریں۔''

''تمہیں آفر دی ہے۔'' جان گرے فکرمند ہو گیا۔

میں بھنا گیا تھا۔ ''احمق آدمی وہ اس طرح زیادہ سے زیادہ دیر ہمیں روکنا چاہ رہی ہے۔''

جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں مدراین پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور یہ اس کی بھتیجی ہے۔''

''جو خوش قسمتی سے ایک خوب صورت عورت بھی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جان گرے تم عمر کے اس دور سے گزر چکے ہو جب حسین چہرے چاند نظر آتے ہیں۔''

''پلیز میری تفریح غارت مت کرو اتنے عرصے بعد تو کوئی ڈھنگ کی عورت ملی ہے جو مہربان بھی ہے۔''

''مرضی تمہاری...... اب تم آنکھ بند کر کے تفریح کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی ورنہ اس کا رویہ شروع میں جیسا تھا تم نے وہ بھی دیکھا۔ آخر یہ تم پر اس قدر مہربان کیوں ہو گئی ہے؟''

جان گرے مسکرایا۔ ''پہلے اس کی مہربانی سے فیض یاب ہو جاؤں پھر اس پر سوچوں گا۔''

''بہ شرط اس وقت تک تم جہنم رسید نہ ہو گئے ہو۔''

جان گرے نے سنا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اسی لمحے جینا لاکر روم سے نکلی اس نے ایک باتھ گاؤن پہن رکھا تھا جو اس کی رانوں تک آ رہا تھا۔ جان گرے باچھیں پھیلاتا اس کی طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ جینا نے باتھ گاؤن کے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا لیکن پول کے پاس آ کر اس نے گاؤن اُتارا تو نیچے ایک پیس کا سوئمنگ سوٹ تھا۔ اس نے پول میں چھلانگ لگائی تو جان گرے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا اس کے پیچھے پول میں کود گیا۔ میں مسکرا دیا تھا۔ میں نے جیکٹ اُتار کر پاس ہی رکھی اور جاگنگ مشین چلا دی۔ ایک گھنٹے تک میں مختلف ورزشیں کرتا رہا اور درحقیقت انتظار کرتا رہا کہ کب جان گرے اپنی شوخیوں سے فارغ ہوتا ہے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جینا کی قربت کے دل کھول کر فائدے اُٹھا رہا تھا۔ وہ بھی کوئی اعتراض نہیں کر رہی تھی۔ آخر وہ سوئمنگ پول سے نکل آئی اور بال جھٹکتی میری طرف آئی۔

''اب تیراکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہی جو پہلے تھا۔'' میں نے تولیہ سے پسینہ خشک کیا۔

وہ ذرا آگے آ کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگ رہی۔ تم نے مجھے اس




کے حوالے کر دیا ہے۔''

''میں نے کسی کو کسی کے حوالے نہیں کیا۔'' میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔ ''تم خود جان گرے کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''مجھے اس بوڑھے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ خود زبردستی مجھ سے چپکا جا رہا ہے۔''

''یہ بھی تمہارا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''مجھے تم میں دلچسپی ہے اور میں نے اس وجہ سے تم لوگوں کے رُکنے پر اصرار کیا۔'' اس بار اس نے کھل کر کہا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ یہ فریفتہ ہو جائے گا۔''

''جان گرے اس قدر بُرا آدمی بھی نہیں ہے۔''

''وہ جیسا بھی ہو مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تمہاری کمپنی چاہتی ہوں۔'' وہ بے باکی سے بولی۔ ''اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے بیڈروم میں آ جاؤں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جان گرے......''

''اس کتے کا نام نہ لو میرے سامنے۔'' وہ غضب ناک ہو گئی تھی۔ ''وہ میرا جسم دیکھنے کے لیے مرا جا رہا ہے بار بار منت کر رہا تھا کہ میں سوئمنگ سوٹ اُتار دوں۔''

''تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے ہی تو مجھے اس بارے میں کہا تھا۔''

''اور تم نے اسے بتا دیا۔''

''کیا تمہیں ڈر نہیں ہے کہ میں یہ ساری باتیں اسے بتا دوں گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''تم نہیں بتا سکتے کیونکہ وہ شیخی میں آ کر مجھے بتا چکا ہے کہ تم اصل میں اس کے قیدی ہو کیا یہ بات سچ ہے؟''

''درست ہے۔'' میں نے اقرار کیا۔ ''میں جان گرے کا قیدی ہوں۔''

''تم اس کے قیدی ہو۔'' وہ دنگ رہ گئی تھی۔ ''مگر کیسے...... تم بھاگ کیوں نہیں جاتے۔''

''کیونکہ میری بعض کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں گا تو مجھے زیادہ نقصان ہو گا۔''

''کیا میں تمہاری مدد کروں؟'' اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ بہتر ہے اس سے الگ رہو۔ جان گرے کے ظاہر پر مت جاؤ۔ وہ خطرناک آدمی ہے اپنی راہ میں آنے والوں کو بڑی بے دردی سے ہٹا دیتا ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ میں بہ ظاہر آزاد ہوں اور چاہوں تو فرار بھی ہو سکتا ہوں لیکن جان نے میرے اردگرد اَن دیکھی دیواریں کھڑی کر دی ہیں میں ایسی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتی ہیں۔''

جینا نے بے یقینی سے جان گرے کی طرف دیکھا جو پول کی سطح پر چت اور ساکت پڑا تھا۔

"شاید تم مبالغہ آرائی کر رہے ہو۔"

"مبالغہ آرائی۔" میں تلخی سے مسکرایا۔ "مس جینا اس نے ایک ایسی پھول جیسی لڑکی کو مرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے مالک کے مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔"

"نہیں۔" اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"یہ صرف ایک مثال ہے۔ مس جینا اس شخص اور اس کے معاملات سے جتنا دور رہو، تمہارے لیے اتنا بہتر ہے۔ بلکہ ہمیں جانے دو۔"

"نہیں...... میں کم سے کم آج رات تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ "اور اب میں اس کے سامنے تم سے چہلیں کروں گی۔"

"سوری مس جینا...... مجھے افسوس ہے۔"

"کیا تم اس سے ڈرتے ہو۔" اس نے چیلنج کیا۔

میں مسکرایا۔ "نہیں میں تمہارے لیے ڈرتا ہوں۔ وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، لیکن دوسروں کو بہر حال اس سے ڈرنا چاہیے مس جینا آگے تمہاری مرضی۔"

اسی لمحے جان گرے پول سے نکل کر ہماری طرف آیا۔ "بڑی لمبی بات ہو رہی ہے۔" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"میں مس جینا کو تمہارے بارے میں بتا رہا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم نے بھی مس جینا کو میرے بارے میں کچھ بتایا ہے۔"

جان گرے ذرا گڑبڑایا تھا پھر اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "مس جینا میں نے مذاق کیا تھا تم سچ سمجھیں۔"

"لیکن میں نے مذاق نہیں کیا تھا۔"

"تت...... تمہارا مطلب ہے تم نے سب درست بتایا ہے۔" جینا نے خوف زدہ نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھا۔

"اس نے بھی درست بتایا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پلیز...... یو...... جوزف......" جان گرے تقریباً گھگھیایا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں اچانک ہنس دیا۔ "میں ذرا طویل مذاق کر رہا تھا۔ مس جینا انجوائے کرو۔"

جینا کا اُڑا ہوا رنگ بحال ہونے لگا اور جان گرے نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے جیکٹ پہنی۔ "دوپہر کے کھانے میں کیا ہے؟"

"میں نے چکن سوپ بنایا ہے۔ بس اسے فائنل ٹچ دینا ہے۔ ویسے تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو میں سینڈوچ بھی بنا دوں گی۔"




"اگر ایک سینڈوچ ہوں تو بہتر ہے۔"

"اور میرے لیے اسٹیک بنا دینا۔" جان گرے نے مداخلت کی۔

"او کے۔" جینا نے سرد لہجے میں کہا اور گاؤن لے کر لاکر روم کی طرف چلی گئی۔

"تم میرا کام خراب کر رہے ہو۔" جان گرے غرایا۔

"تم اپنا کام خود خراب کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری یہ بچکانہ حرکتیں کھل رہی ہیں۔ ہمیں فوراً سے بیشتر یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"جان گرے خدا کے لیے سنجیدہ ہو کیا تم نے اس سے پہلے کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ جزیرے میں جینا سے کہیں زیادہ حسین عورتیں تمہارے پاس ہوتی تھیں۔"

"مگر اس جگہ جینا کے علاوہ کوئی اور محال ہے۔"

"اس جگہ تمہارے لیے دشمن بھی ہیں۔ وہی کافی ہوں گے۔"

"اوپر چل کر اس نازنین کے ہاتھ کا بنا کھانا کھاتے ہیں۔"

"کہیں وہ تمہارا آخری طعام نہ ہو۔" میں نے جل کر کہا تھا۔

جان گرے جیسے گھاگ شخص سے مجھے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ کتنی آسانی سے اس عورت کے ہاتھ اُلو بننے پر تیار تھا۔ کیا وہ واقعی دشمنوں کی ایجنٹ تھی۔ یا مدراین...... میں سوچتا ہوا اوپر آیا تو باہر سچ مچ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جن کے ساتھ برف کے گالے بھی اُڑ رہے تھے۔ جان گرے نے سرزنش بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"دیکھا تم نے...... انہوں نے درست کہا تھا۔"

"موسم دیکھ کر طوفان کی پیش گوئی کوئی بچہ بھی کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری مہربانی کے لیے اس قدر کمربستہ کیوں ہیں۔"

"مدراین میری اچھی واقف کار ہے۔"

"مگر جینا تو تم سے پہلی بار ملی ہے اور کیا مدراین نے اس سے پہلے کبھی اپنی کسی بھتیجی کا ذکر کیا؟"

"نہیں۔" جان گرے نے غور کیا۔ "لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اپنی کسی بھتیجی کا ذکر کرتی۔"

"آخری بار جب تم مدراین سے ملے تو اس کی حالت کیسی تھی؟"

"بظاہر تو ٹھیک تھی۔"

"اور جینا نے کیا عذر پیش کیا تھا اپنی یہاں پر غیر موجودگی کا۔"

"بھئی انسان کی طبیعت خراب بھی ہو جاتی ہے۔" جان گرے نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ اسی

لمحے میری نظر ماذن پر پڑی جو نہ جانے کب خاموشی سے نشست گاہ میں آ گیا۔ جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ ہم چپ ہو گئے ہیں اس نے کمال ہوشیاری سے بات بنائی۔ ''ماسٹر...... آپ لنچ کس وقت پسند کریں گے؟''

جان گرے نے میری طرف دیکھا۔ ''دس منٹ بعد لے آؤ۔''

ماذن سر جھکا کر چلا گیا۔ ''دیکھا اس نے چپکے سے ہماری ساری باتیں سن لی ہیں۔''

''اب یہ جا کر جینا یا مدراین کو بتا دے گا۔'' جان گرے فکر مند ہو گیا۔

''جان اب بھی وقت ہے یہاں سے نکل چلو۔ جانے کیوں مجھ لگ رہا ہے اگر ہم کچھ دیر اور یہاں ٹھہرے تو پھر کبھی نہیں جا سکیں گے۔''

''اگر کوئی خطرہ بھی ہے تو تم اسے زیادہ شدت سے محسوس کر رہے ہو۔ اس موسم میں کوئی اس طرف نہیں آئے گا جیسے ہم کہیں اور نہیں جا سکتے ہیں۔''

''ہم جا سکتے ہیں۔ یہ معمول کا برفانی طوفان ہے۔ لندن میں اس سے کہیں زیادہ شدید طوفان میں مَیں نے معمول کی زندگی کو جاری رکھا ہے۔''

''لیکن وہ لندن ہوتا ہے۔'' جینا اندر داخل ہوئی اس نے ٹرے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر رکھی۔ ''مگر اس علاقے میں یہ معمولی سا طوفان بھی خطرناک ہے۔ راستے برف سے ڈھک جاتے ہیں۔ گڑھوں کی سطح پر جمی برف دھوکا دے جاتی ہے اور آدمی انجانے حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔''

''لگتا ہے تم ہماری باتیں سن رہی تھیں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہیں بس آتے ہوئے اتفاق سے سن لیا۔ آؤ لنچ کریں۔''

جان گرے فوراً ٹیبل پر جا پہنچا۔ ''مدراین لنچ نہیں کریں گی؟''

''نہیں...... انہوں نے دوپہر کا کھانا ترک کر دیا ہے۔'' جینا نے بتایا۔

ہم نے اپنے لیے کھانا نکالا اور خاموشی سے کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد جینا نے کہا۔ ''لگتا ہے تم ہماری طرف سے کسی شک میں مبتلا ہو۔'' اس کا رُخ میری طرف تھا۔

''ہاں......'' میں نے صاف گوئی سے اعتراف کر لیا۔ ''تمہارا رویہ مشکوک ہے آخر تم ہمیں روکنے پر اتنی مصر کیوں ہو؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول تو باہر اس وقت طوفان آیا ہے اور دوسرے میں اس مقام پر اچھے لوگوں کی قربت کو ترسی ہوئی ہوں۔''

''یہی تو میں بھی اس سے کہہ رہا ہوں۔'' جان گرے جلدی سے بولا۔

''یعنی تم نے صرف ان وجوہات کی بنا پر ہمیں روکا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں صرف یہی بات ہے۔''

''یعنی میں اور جان گرے لنچ کے بعد یہاں سے جانا چاہیں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو





گا؟''

''ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' اس نے شانے ہلائے۔

''لیکن مجھے ہے۔'' ماذن اچانک اندر آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ اس وقت وہ بالکل بھی نابینا نہیں لگ رہا تھا۔ ''میں تم دونوں کو جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''ماذن۔'' جینا چلا اُٹھی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

''سوری میم...... لیکن یہ دونوں کہیں نہیں جا سکتے۔'' اس نے مشین گن کو جنبش دی۔ یہ خاصی مختصر لیکن مہلک مشین گن تھی۔

جینا مارے حیرت کے گُنگ رہ گئی تھی۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جینا یہ شاید وہ نہیں ہے جو تم اسے سمجھ رہی تھیں بلکہ اندھا بھی نہیں ہے۔''

''میں اندھا تھا لیکن میرے آقاؤں نے مجھے بینائی دی۔ اب میں ان کے لیے کام کرتا ہوں۔''

''آقا...... کون آقا؟'' جینا بہ مشکل بولی۔

''ماسٹر جان گرے جانتے ہیں، یہ بھی میرے آقاؤں میں سے ہیں مگر فی الوقت معتوب ہیں۔ انہیں لینے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ اس وقت تک ان دونوں کا یہاں رُکنا ضروری ہے۔''

''غدار۔'' جینا غرائی تھی۔ ''تیری یہ جرأت۔''

''آں...... ہاں مس صاحبہ...... حرکت مت کرنا ورنہ میں مروت نہیں کروں گا۔''

جان گرے کی رنگت سفید ہو رہی تھی اس نے جینا کی طرف دیکھا۔ ''تو تم اس لیے ہمیں روک رہی تھیں۔''

''پلیز...... میری طرف سے بدگمان مت ہو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ کتا ہم سے غداری کر جائے گا۔''

''ماذن یہ کیا ہو رہا ہے۔'' دروازے پر مدراین نمودار ہوئی تھیں۔ ماذن بے ساختہ اس کی طرف گھوما اور اس نے مشین گن چلا دی۔ مدراین کا جسم لمحوں میں چھلنی ہو گیا تھا۔ جینا کے حلق سے چیخیں اُبلنے لگیں۔ میں فرش پر گرتے ہوئے اپنا پستول نکال چکا تھا۔ ماذن مشین گن کا رُخ ہماری طرف کر رہا تھا کہ میں نے اس کے پیروں پر لگاتار فائر کیے اس نے اذیت بھری آواز نکالی اور زمین پر گر گیا۔ مشین گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے فرش سے جست لگائی اور مشین گن پر قبضہ کر لیا۔ میری چلائی دو گولیاں اس کے بائیں گھٹنے کو چکنا چور کر گئی تھیں۔ تیسری گولی اس کی دائیں ران میں دھنسی تھی۔ خون بے حد تیزی سے بہہ رہا تھا لیکن ابتدائی چیخ کے بعد اس کے منہ سے کوئی اور آواز نہیں نکلی تھی اس عالم میں بھی وہ اپنے لباس سے کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے اس کے سر پر مشین گن کی نال رکھی۔

"بس اب حرکت مت کرنا ماذن۔ ہمیں لینے کون آ رہا ہے؟"

وہ اذیت سے مسکرایا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ جینا مدراین کی طرف لپکی تھی اور فرش پر اس کے پاس بیٹھ کر رو رہی تھی۔ مدراین ہر درد سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ برسٹ نے اس کے سینے اور پیٹ کو اس طرح چھلنی کیا تھا کہ اس کے سارے ہی اعضا شدید متاثر ہوئے تھے۔ جان گرے نے اشتعال کے عالم میں ماذن کو لات رسید کی۔ میں نے اسے روک دیا۔ "پلیز اس سے بات کرنے دو۔ ہاں...... تو ماذن ہمیں لینے کون آ رہا ہے۔"

وہ چپ رہا۔ جان گرے نے مجھ سے مشین گن لینے کی کوشش کی۔ "یہ ایسے نہیں بتائے گا میں اس کی......"

اسی لمحے میں نے ماذن کو جیب سے کچھ نکالتے دیکھا۔ جو اس نے بڑی عجلت میں منہ میں ڈال لیا۔ اس نے وہ چیز نگلی اور اگلے ہی لمحے اس کا جسم چند جھٹکے لے کر ساکت ہو گیا۔ اس کی کڑوی بُو بتا رہی تھی کہ اس نے سائنائیڈ کھایا تھا۔ اس مہلک ترین زہر نے لمحوں میں اس کی جان لے لی تھی۔ "یہ مر گیا ہے۔" جان گرے نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔ اچانک میں چونکا۔ ایک بھاری مشینی گنگناہٹ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ "جان گرے کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہاں سے نکلو۔ اس سے پہلے کہ گھیر لیے جائیں۔"

جینا مدراین کا سر گود میں لیے رو رہی تھی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "جینا یہاں سے نکلو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ چلائی۔

"پاگل مت بنو۔ نہ جانے آنے والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں۔" جان گرے بولا۔

میں نے جینا کا کوٹ اس کے شانوں پر ڈالا۔ اس نے پاؤں میں جوتے پہن رکھے تھے۔ باہر کی بے پناہ سردی کے مقابلے میں یہ ناکافی تھے مگر مسئلہ فی الوقت جان بچانے کا تھا۔ میں نے اسے زبردستی کھڑا کیا۔ "چلو یہاں سے۔ مدراین ہر ضرورت سے بے نیاز ہو چکی ہے۔"

وہ سسکیاں لیتی اور گھسٹتی ہمارے ساتھ مکان کے عقبی حصے میں آئی۔ جہاں ایک چھوٹے سے گیراج میں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ مگر جب جان گرے نے اسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجن ساکت رہا۔ میں نے بونٹ اُٹھا کر دیکھا ڈسٹری بیوٹر کیپ غائب تھی۔ میں نے جان گرے کو آگاہ کیا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ "یہ اسی حرامی کا کارنامہ ہے۔"

"اسے کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہاں سے نکلنے کی سوچو۔" میں نے کہا۔ "مس جینا یہ بتاؤ کہ عقبی طرف سے نکلنے کا کوئی محفوظ راستہ ہے۔"

اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "جنگل کی طرف جا سکتے ہیں لیکن یہ جیپ نہیں جا سکے گی۔"




"یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم پناہ لے سکیں۔ خطرناک قاتل ہمارے پیچھے ہیں۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" جینا نے خود کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ اس نے گیراج کا عقبی دروازہ کھولا۔ طوفانی ہوا کا جھکڑ ڈھیر ساری برف کے ساتھ اندر آیا۔ لمحوں میں گیراج کا درجہ حرارت صفر سے نیچے چلا گیا تھا۔ جان گرے اسلحہ اور خوراک والے خانے کھول رہا تھا جب اس نے اسلحے کا خانہ کھولا تو ایک بار پھر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا تھا۔ سارا اسلحہ غائب تھا۔ البتہ خوراک والے خانے میں خاصی چیزیں تھیں۔ جان گرے نے انہیں ایک تھیلے میں ڈال لیا۔ اس نے پانی کی دو بوتلیں مجھے اور جینا کو تھما دی تھیں۔ "ان کے بجائے نکلنے کی فکر کرو۔"

ہم باہر نکلے تو ہواؤں کی شدت اور برف کے سفوف کی وجہ سے آنکھیں کھلی رکھنا محال ہو رہا تھا۔ ہم سر جھکائے عقبی حصے میں واقع جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ جینا نے آنکھوں پر سن گلاس لگا رکھا تھا اور اسی وجہ سے وہ بہتر طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ سب سے آگے تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا رہی تھی مگر اس کے پیچھے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اچانک گولیاں ہمارے اوپر سے گزرنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دو مسلح افراد گولیاں برساتے ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔

"بھاگو۔" جان گرے چلایا اور ہم گرتے پڑتے درختوں میں گھس گئے۔ درختوں کی پناہ میں آتے ہی میں نے پلٹ کر جوابی برسٹ مارا۔ ان میں سے ایک جوش میں زیادہ ہی آگے آ گیا تھا۔ شاید اس کی قضا آئی تھی۔ میں نے نشانہ لیے بغیر فائر کیے تھے اور وہ مر گیا۔ اس کا ساتھی پلٹ کر آڑ کی تلاش میں بھاگا اور میں جینا اور جان گرے کے پیچھے لپکا تھا۔ جینا کے پیروں کو فائرنگ کی آواز سنتے ہی پَر لگ گئے تھے۔ اور ہم بہ مشکل اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ درختوں کے درمیان وہ اس جگہ کے چپے چپے سے واقف تھی۔ جبکہ ہم درختوں سے بچتے جا رہے تھے۔ جان گرے دو بار لڑکھڑا کر گرا تھا اور ایک بار میں اس سے ٹکرا کر گرا تھا۔ میرا جوتا اس کے گول سے سر پر لگا تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔ "کیا دیکھ کر نہیں بھاگ رہے۔"

"سوری...... اپنا سر تم خود درمیان میں لائے تھے۔" میں نے کہا اور اُٹھ کر پھر دوڑ لگائی۔ مجھے خدشہ تھا کہ جینا میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اس جگہ وہی ہماری راہنما تھی اس کے بغیر ہم بھٹکتے رہ جاتے۔ یا آنے والے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتے۔ انہوں نے ہم پر جتنی بے دردی سے فائرنگ کی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں گرفتار کرنے نہیں بلکہ مارنے آئے تھے۔ جینا کسی چست گلہری کی طرح درختوں کے درمیان دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دور نکل گئی تھی۔ میں بہ مشکل اس کے نزدیک پہنچا۔ "خدا کے لیے...... کیا تم اولمپک رنر ہو؟" میں نے ہانپتے ہوئے چلا کر کہا۔ طوفانی ہواؤں کے شور میں قرب کی آواز بھی مشکل سے آ رہی تھی جینا رُک گئی۔

"جلدی کرو پناہ گاہ قریب ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو جان گرے عقب میں نہیں تھا۔ "یہ کہاں رہ گیا۔" میں نے سوچا۔

"جان گرے کہاں ہے؟"

"پتا نہیں میرے عقب میں آرہا تھا۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ اپنی جان بچاؤ۔ دشمن نزدیک ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اگر دشمن نزدیک آجاتا تو ہمارے پاس فرار کی گنجائش بھی نہ رہتی۔ میں اور جینا پھر دوڑے۔ ذرا آگے جا کر جینا ایک نالے میں اُتر گئی۔ یہ مشکل سے دس بارہ فٹ چوڑا اور چار پانچ فٹ گہرا تھا۔ اس میں خاصی برف پڑی تھی۔ اگر طوفانی ہوائیں ہمارے نقش پا نہ مٹا رہی ہوتیں تو دشمن با آسانی ہمارے پیچھے آسکتا تھا۔ تقریباً دس منٹ تک اس نالے میں سفر کے بعد ہم ایک آبشار کے سامنے جا نکلے۔ مگر آبشار اس وقت خشک تھی اور اس کے تلے پتھر صاف تھے۔

"ادھر آؤ۔" جینا نے مجھے آبشار کے ایک طرف اُگی جھاڑیوں کی طرف کھینچا اور بلا تذبذب اس میں گھستی چلی گئی۔ اندر تاریکی تھی۔ مگر جینا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس جگہ کے چپے چپے سے واقف ہے۔ "یہ کہاں لے آئیں؟"

"چپ رہو۔" وہ رُک گئی تھی۔ گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر لگ رہا تھا کہ ہم کسی غار میں ہیں۔ طوفانی ہواؤں کا شور خاصا دور رہ گیا تھا۔ اچانک روشنی چمکی۔ جینا نے دیا سلائی جلائی تھی اور اس سے ایک کیروسین لیمپ روشن کر رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں تاریکی ہلکی سی روشنی میں بدل گئی تھی۔ یہ کسی طویل غار کا آخری سرا تھا۔ یہاں پر کسی قدر حبس تھا مگر سردی کی شدت بھی نہ ہونے کے برابر تھی اس جگہ ایک بستر لگا تھا۔ چند کتابیں اور کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ پانی کا ایک کین تھا دو عدد کیروسینی لیمپ اور ایک گیلن مٹی کا تیل تھا۔

"یہ میری خفیہ رہائش ہے۔" جینا مسکرائی۔ "شاید تم اسے بچپنا کہو، مجھے شروع سے اس قسم کے خفیہ ٹھکانوں کا شوق تھا۔ کینیڈا میں بھی میں نے اپنے مکان کے پاس اس قسم کا ایک غار دریافت کر کے وہاں ٹھکانہ بنایا تھا۔"

"رومینٹک ہے۔" میں نے ارد گرد دیکھا۔ "اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔"

"سچ مجھے بہت مزہ آتا ہے یہ سوچ کر کہ اس دنیا میں ایک جگہ ایسی ہے جس سے صرف میں واقف ہوں۔"

"فی الحال خوابوں کی دنیا سے باہر آؤ اور یہ بتاؤ یہ سارا معاملہ کیا ہے؟"

"میں تم سے زیادہ نہیں جانتی۔ بلکہ لگتا ہے تم حملہ کرنے والوں سے واقف ہو۔"

"جان گرے کا تعلق ایک بین الاقوامی آرگنائزیشن سے ہے جو سفید فاموں کا تسلط قائم رکھنا چاہتی ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے کمال بھول پن سے کہا۔

"اس سے یہ ہوتا ہے کہ تمہاری مدر این جیسے بے شمار بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ سفید فاموں





کا تسلط قائم کرنے کے لیے غیر سفید فاموں کا خون بہانے سے دریغ بھی نہیں کرتے ہیں۔"

جینا نے جھرجھری لی۔ "وہ لوگ کس طرح بے دریغ فائرنگ کر رہے تھے میرا خیال ہے جان گرے ان کا نشانہ بن گیا ہے ورنہ ہمارے پیچھے ضرور آتا۔"

"نہیں۔" اس نے سسکی لی۔ "میرے خداوہ بھی مارا گیا ہے۔"

"تم نے اس پر لعنت بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم نے کب بتایا تھا کہ وہ مارا بھی جا سکتا ہے۔"

"میڈم ہمارا پیچھا کرنے والے پھول نہیں پھینک رہے تھے۔" میں نے طنز کیا۔ "یہ بات سوچنے کی ہے یہ زحمت تم نے اس وقت نہیں کی تھی۔"

جینا چپ رہی اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ بنیادی طور پر وہ اچھی عورت تھی۔ جو جان گرے کی متوقع وفات پر دکھی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے چڑتی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔"

"فکر نہ کرو اس طرف کوئی نہیں آسکتا۔ وہ جھاڑیاں دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں ہے کہ ان کے عقب میں غار بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی اتفاقیہ دریافت کیا تھا۔"

"وہ غار کا نہیں لیکن جھاڑیوں کے پیچھے ہمارے ہونے کا تو سوچ سکتے ہیں۔ دوسرے مجھے جان گرے کی فکر ہے۔ وہ اس طرف آیا تو اسے غار نہیں مل سکے گا۔"

میں جھاڑیاں ہٹا کر باہر آیا۔ طوفان شدت سے جاری تھا لیکن آبشار کے تین طرف اونچی چٹانیں ہونے کی وجہ سے ہواؤں کا زور یہاں پر کم تھا۔ برف باری اور تیز ہوا نے ہمارے قدموں کے نشان مٹا دیئے تھے۔ دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار واپس جانے کے بارے میں سوچا لیکن یہ آبیل مجھے مار کہنے والی بات ہوتی۔ اگر جان گرے ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا یا مارا گیا تھا تو اب اس کے بعد ہماری باری تھی۔ اس جگہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ آرام سے ہماری تلاش جاری رکھ سکتے تھے۔ عقب میں آہٹ محسوس کر کے میں تیزی سے گھوما۔ وہ جینا تھی۔ "آئندہ اس طرح خاموشی سے میرے عقب میں مت آنا۔"

"سوری...... مجھے اندر اکیلے وحشت ہو رہی تھی۔" وہ میرے شانے سے لگ گئی۔ "پلیز اندر چلو یہاں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں اس کے ڈر کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ اس سنگین صورتِ حال میں بھی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں تھی۔

"تم اندر آجاؤ میں آتا ہوں۔" میں نے کسی قدر سختی سے کہا تو وہ منہ بنا کر اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں جھاڑیوں سے نکل آیا تھا۔ میرے پاس ایک عدد سب مشین گن تھی۔ جس کا دو تہائی میگزین باقی تھا اور ایک عدد بھرا ہوا پستول تھا۔ اگر مجھے لڑنا ہی پڑتا تو میں آسانی سے ہتھیار نہ ڈالتا۔

اور مرنے کا وقت آتا تو تین چار کو ساتھ لے کر ہی جاتا۔ نالے کے ساتھ ساتھ میں چلتا درختوں کی طرف آیا۔ درحقیقت اسے جنگل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بھی مدر این کی این جی او نے لگایا تھا۔ درخت ترتیب میں تھے۔ اور ان کے درمیان مناسب جگہ تھی۔ طوفان کی وجہ سے فضا پہلے ہی نیم تاریک تھی اور درختوں تلے تو اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تاریک جگہوں سے گزروں اگر اس طرف کوئی ہو بھی تو نظر میں آنے سے محفوظ رہ سکوں۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس جنگل میں کوئی نہیں تھا۔ مگر نہیں ہواؤں کے شور میں میں نے کسی کی آواز سنی تھی۔ جو چند درختوں کے عقب سے آ رہی تھی۔ میں محتاط قدموں سے وہاں تک پہنچا۔ درختوں سے جھانکا تو جان گرے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ تین مسلح افراد نے اسے تین طرف سے گھیر رکھا تھا اور چوتھا ایک کاغذ ہاتھ میں تھامے جان گرے کو اس کی فرد جرم سنا رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی۔

"مسٹر جان ایف گرے! تم نے آرگنائزیشن کے رولز کی خلاف ورزی کی اپنے سینئر کا حکم ماننے سے انکار کیا اور رُوپوش ہو گئے۔ ان سنگین جرائم کی وجہ سے تمہیں سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔ کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہو گے۔"

"بکواس۔" جان گرے غرایا۔ "تم کو یا کسی کو بھی مجھے سزائے موت دینے کا اختیار نہیں ہے۔ میرے رینک کے فرد کے لیے یہ اختیار صرف ایگزیکٹو کونسل کے پاس ہے۔"

"لیکن ایک شک اور بھی ہے اگر مجرم عام ٹرائل قبول کرے تو اسے فوری سزا دی جا سکتی ہے۔ تم اس کاغذ پر ابھی دستخط کرو گے۔"

"کرا سکتے ہو تو کرا لو۔"

"جان گرے تمہیں مرنا تو ہے ہی تو آسان موت قبول کر لو کیوں اذیت کے ساتھ مرنا چاہتے ہو۔"

"جب مرنا ہی ہے تو کیا آسان اور کیا مشکل لیکن میں اپنے دشمنوں کو اپنی موت کا جواز فراہم نہیں کروں گا تم لوگوں کو اس کا حساب دینا پڑے گا۔ پھر سچ کی عدالت لگے گی اور وہاں کئی افراد سزائے موت پائیں گے۔" جان گرے کے لہجے میں حوصلہ تھا۔

"کوئی بات نہیں اس صورت میں تمہاری موت کو ہم حادثہ بھی دکھا سکتے ہیں۔ وہ کیا نام ہے تمہارے اس دُم چھلے کا۔ جوزف ہم نے تمہیں اس کی قید سے چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ تم کو مار کر بھاگ گیا۔"

"تمہاری جو مرضی آئے کرو۔ میں ان کاغذوں پر دستخط نہیں کروں گا۔"

"تمہاری جان بخشی کی ایک صورت اور ہو سکتی ہے مجھے وہ سوئس اکاؤنٹ نمبر دے دو جس میں ملنے والی رقم گئی ہے۔"





"اوہ تو یہ کہو تمہیں اس رقم کی فکر ہے۔" جان گرے نے طنز کیا۔

"تم ڈیل کر کے اپنی جان بچا سکتے ہو۔"

جواب میں جان گرے نے ڈیل پر آب پاشی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ "جہنم میں جاؤ تم سب۔"

عقب میں کھڑے ایک مسلح شخص نے جان گرے کو مارنے کے لیے رائفل کی نال بلند کی تھی کہ میں نے اس کے بازو کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ تین چار گولیوں کے برسٹ نے اس کا بازو قیمہ کر دیا تھا وہ چکرا کر زمین پر گرا۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "بس اب کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں اتنی احتیاط سے فائرنگ نہیں کروں گا۔" کاغذ والا بوکھلا گیا تھا۔

"ہم اسے گولی مار دیں گے۔" اس نے جان گرے کے لیے دھمکی دی۔

"شوق سے...... اس کے بعد تم خود کو جہنم میں اس کا ہم نشین پاؤ گے۔ میں صرف تین گن کر فائرنگ شروع کر دوں گا۔ اگر جان گرے کی اسی طرح قضا آ گئی ہے تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ ایک...... دو......"

دونوں مسلح افراد نے اپنی رائفلیں پھینک دیں۔ جان گرے نے پھرتی سے ایک رائفل پر قبضہ کیا اور اس سے پہلے میں اسے روکتا اس نے کاغذ والے کو شوٹ کر دیا۔ دونوں نہتے گھگھیانے لگے تھے۔ "فکر نہ کرو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا تم لوگ صرف حکم کی تعمیل کرنے والے ہو۔"

"یہی بات ہے جناب! ہم گیزر کے چارج میں دیئے گئے اور اس کا ہر حکم ماننا ہمارا فرض تھا۔" ایک جلدی سے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں اور کیونکہ یہ بدبخت جہنم رسید ہو چکا ہے اس لیے تم لوگ اس کے حکم سے آزاد ہو۔ تمہارے اور کتنے ساتھی ہیں؟"

"چار جناب...... ایک زخمی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ زخمی زمین پر پڑا نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔

"باقی تین کہاں ہیں؟"

"گاڑی میں جناب۔" اس نے جواب دیا۔ اسی لمحے میں نے آہٹ محسوس کی اگر مجھے جگہ بدلنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہوتی تو برسٹ مجھے چھلنی کر چکا ہوتا۔ شاید قسمت تھی کہ حملہ آور کے پاؤں تلے آ کر کوئی شاخ ٹوٹی تھی۔ گولیاں درخت کے تنے پر لگیں۔ وہ مستقل ٹریگر دبائے ہوئے تھا اور جو گولیاں درخت سے بچ رہی تھیں وہ مجھ سے انچ بھر کے فاصلے سے گزر رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس کی رائفل کا میگزین ختم ہوا۔ میں نے درخت کی اوٹ سے ہلکا سا برسٹ مارا اور وہ فوت ہو گیا اب میری پشت جان گرے کی جانب تھی جیسے ہی میں نے فائر کیا عقب سے بھی فائرنگ ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا تو جان گرے ان تینوں کو بھی ختم کر چکا تھا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

''انہوں نے موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔'' جان گرے نے دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کا اسلحہ سمیٹو۔'' میں نے خالی ہو جانے والی مشین گن پھینک کر ایک رائفل اُٹھا لی۔ مرنے والے کے پاس سے اس کے چار عدد اضافی میگزین اور دو عدد دستی بم بھی برآمد ہوئے تھے۔ ان کے پاس خاصا اسلحہ تھا۔ کاغذ والے یعنی گیزر کے پاس سے مختصر سا خودکار پسٹل نکلا تھا۔ جب تک جان گرے اسلحہ بٹورتا رہا میں چاروں طرف نگران رہا ان کے دو ساتھی باقی تھے۔ اسلحہ سمیٹتے ہی ہم تیزی سے روانہ ہو گئے۔ نالے کے راستے ہم غار کے پاس پہنچے۔

''جینا کہاں ہے؟'' جان گرے کو ان لمحات میں بھی اس کی فکر تھی۔

''اس نے ایک پناہ گاہ بنا رکھی ہے۔ طوفان تھمنے تک وہی ہمارے کام آئے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔'' میں اسے لے کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اندر جینا بے تابی سے میری منتظر تھی اور جان گرے کو دیکھتے ہی اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ ''یہ...... یہ بچ گیا۔''

''ہاں...... تمہاری دعائیں قبول ہوئیں۔'' میں مسکرایا تھا۔

جان گرے اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ''لگتا ہے تمہیں میرے بچنے کی خاص خوشی نہیں ہوئی ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے مسٹر گرے۔'' خلافِ توقع جینا نے خشک سا جواب دیا۔ ''میرا تم سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس پر میں کوئی جذباتی ردِعمل محسوس کروں۔''

''اپنے ابتدائی رویے کو تم کیا کہو گی؟'' جان گرے کے لہجے میں چبھن تھی۔

''کچھ نہیں...... بور ہو کر آدمی بعض اوقات اس طرح کے رویے بھی دکھا دیتا ہے۔ اس سے تمہیں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اور میرے بارے میں کیا حکم ہے مس جینا۔'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

اس نے لگاوٹ سے مجھے دیکھا اور ایک بار پھر بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ ''ہینڈسم دل شروع سے تمہاری طرف کھنچ رہا ہے۔'' میں نے طنزیہ نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھا۔ کیروسین لیمپ کی ہلکی روشنی میں مجھے اس کی آنکھیں خطرناک انداز میں سرخ ہوتی نظر آئیں۔ مجھے جینا کی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ جان گرے فطرتاً درندہ تھا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کا خون اس کی گردن پر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دو چار افراد کو مار چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ جینا سے کچھ کہتا میں نے کہا۔ ''مس جینا بات یہ ہے کہ ہم آگ و خون سے کھیلنے والے لوگ ہیں۔ حُسن و عشق کے کھیل ہمیں راس نہیں آتے۔ دشمن ہمارے پیچھے ہے۔ ابھی ہم نے پانچ دشمن جہنم رسید کیے ہیں لیکن وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''




جینا کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ وہ ہکلائی۔ ''تت...... تم سچ کہہ رہے ہو۔''

''سو فیصد...... مس جینا تم بھی ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔ ہمیں اس علاقے سے نکلنا ہے۔ برف باری رُکتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''مجھے چھوڑ کر۔'' وہ بلبلا گئی تھی۔

''ظاہر ہے ہم نے تمہاری پرورش کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔'' جان گرے سرد لہجے میں بولا۔ ''بلکہ میں سوچ رہا ہوں تم ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہو اور میں خطرے پالنے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس نے اپنا پستول جینا کی طرف کیا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے اپنی رائفل جان گرے کی طرف کر دی۔ ''گولی مت چلانا ورنہ مارے جانے والوں میں تم بھی ہو گے۔''

''تت...... تم اس کی خاطر مجھے مار دو گے۔'' جان گرے کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس کی خاطر نہیں...... میں تمہیں کسی بے گناہ کی جان لینے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''یہ ہمارے لیے خطرہ ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''جس وقت میرا خیال تھا یہ خطرہ ہے اس وقت تم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور اب جبکہ یہ بے گناہ ثابت ہو چکی ہے یہی نہیں بلکہ ہماری محسن بھی ثابت ہوئی ہے اس کی وجہ سے ماذن کھل کر سامنے آیا اور اس کی وجہ سے ہم اس جگہ دشمنوں کی نگاہوں سے اوجھل بیٹھے ہیں اور تم اسے مارنے پر اصرار کر رہے ہو۔ اس کی وجہ بتاؤ گے؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''میں بتاتی ہوں یہ کینہ پرور شخص اس وجہ سے مجھے مارنا چاہتا ہے کہ میں نے اس کی ناپاک خواہشات کا احترام نہیں کیا۔''

جان گرے بھنا گیا تھا۔ ''اور تم جو اس پر مری جا رہی تھیں تو کیا پاکیزہ خواہشات رکھتی تھیں؟''

''کہہ تو یہ ٹھیک رہا ہے۔'' میں نے جینا کو کھسیاتے دیکھ کر کہا۔

''اس کے بارے میں کیا کہو گے؟'' جینا نے جان گرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا یہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے میری جان نہیں لینا چاہتا۔ یہ مجھے حاصل نہیں کر سکا۔ اس لیے تمہیں بھی حاصل نہیں کرنے دے گا۔''

''خدا کے لیے مجھے اس معاملے میں مت گھسیٹو۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''جان گرے پستول میری طرف بڑھا دو۔''

''اور اگر میں نہ دوں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''تو میں یونہی مستعد رہوں گا تم دیکھ رہے ہو رائفل کے ٹریگر پر میری انگلی سخت ہے۔ اگر غلطی سے چند ملی میٹر انگلی مزید دب گئی تو تم بلاوجہ ہی مارے جاؤ گے۔''

جان گرے نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر پستول میری طرف اُچھال دیا۔ ''کیا باقی

ہتھیار بھی پیش کروں؟" اس نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے وہ پہلے ہی ایک طرف پڑے ہیں۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو خود بھگتو گے۔"

جینا نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن وہ جان گرے کی طرف سے مطمئن نہیں تھی۔ "جوزف میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتی پلیز تم سارا اسلحہ اس سے دور رکھو۔"

"یہ جوزف نہیں ہے یوسف ہے۔" جان گرے نے گھٹیا انداز میں انکشاف کیا۔ "یہ مسلمان ہے۔"

جینا ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر اس نے شانے اُچکائے۔ "مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ مسلمان ہے کہ کچھ اور۔"

"ہاں...... تم جیسی کتیا کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تمہیں......" جان گرے کی بات اتنی فحش تھی کہ جینا کے ساتھ میرے کان کی لوئیں بھی سرخ پڑ گئی تھیں۔

"ذلیل آدمی۔" جینا پھنکار کر اس کی طرف لپکی لیکن میں نے بازو سے پکڑ کر اسے روک لیا۔

"جان گرے یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "وقت کی نزاکت کا احساس کرو۔ اس وقت تمہارے خون کے پیاسے تمہارے پیچھے ہیں۔"

"یہ کتے کی موت مرے گا۔" جینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ مارے طیش کے اس کا بُرا حال تھا۔

"فکر نہ کرو میرے ساتھ یہ بھی مرے گا۔" جان گرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"خدا کے لیے تم دونوں میری جان چھوڑ دو۔" میں کراہا۔ "اگر لڑنا ہی ہے تو براہِ راست لڑو۔"

جان گرے میری طرف آیا۔ "مجھے شبہ ہے یہ عورت بھی ماذن کی ساتھی ہے۔"

"اس صورت میں یہ ہمیں اس پناہ گاہ تک نہ لاتی۔"

"یہ جگہ ہماری قبر بھی بن سکتی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر یہ ان کی مخبر ہوتی تو وہ سیدھے یہیں آتے۔"

"میں اس جگہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ورنہ اگر میں یہاں ہوتا تو وہ لوگ اس طرف بھی آتے۔"

"کیا یہ اپنی جان پر کھیل کر ہمیں گرفتار کرائے گی؟"

"بکواس کرتا ہے۔" جینا چلائی۔ "میں کسی کی ایجنٹ نہیں ہوں۔"

"تب ماذن نے اسے کیوں نہیں مارا۔ مدراین کو کیوں مارا؟" جان گرے کے لہجے میں سوال تھا۔

اس کی بات دل کو لگی تھی میں نے سوالیہ نظروں سے جینا کی طرف دیکھا تو وہ ہکلانے لگی۔





"یہ...... یہ بکواس کرتا ہے۔ بھونکتا ہے کتا۔"

"مس جینا بے شک یہ کبھی کبھی بھونکتا ہے مگر کبھی کام کی بات کر جاتا ہے۔ براہِ کرم اپنے ہاتھ اوپر کر لو اگر اس کی بات غلط نکلی تو میں تم سے دست بستہ معافی مانگ لوں گا۔"

جینا کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدلا تھا۔ اس نے بادلِ نخواستہ ہاتھ اوپر کیے۔ جان گرے نے میرے اشارے پر اس کی تلاشی لی اور خاصی بے دردی سے لی۔ جینا کے منہ سے کراہ نکل گئی تھی۔ جان گرے نے اس کے اسکرٹ کے نچلے حصے پر ہاتھ مارا اس نے اپنی ٹانگیں دبائیں مگر جان گرے نے اندر ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا آلہ نکال لیا۔ میں نے ایک نظر میں اسے شناخت کر لیا۔ یہ ننھا سا ٹرانسمیٹر تھا جو مختصر فاصلے پر مواصلات کے کام آتا تھا۔ جان گرے نے اسے تھپڑ مارا۔ "یہ کیا ہے کتیا؟"

میں نے جان گرے سے آلہ لے کر اس کا معائنہ کیا۔ وہ آف تھا۔ جینا منہ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ "مس جینا مجھے افسوس ہے لیکن جان گرے کا اندازہ درست نکلا۔"

"اس کتیا کو میرے حوالے کر دو۔ یہ ابھی اور بھی انکشافات کرے گی۔"

"جینا کیا وہ لوگ واقف ہیں کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کیونکہ جان گرے ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ میں سمجھی یہ پکڑا گیا ہے۔"

"او کے میں مان لیتا ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا ہم سے پہلے تم مرو گی لہٰذا کسی معاملے میں جھوٹ مت بولنا۔ کیا اس پناہ گاہ کا ان لوگوں کو علم ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں وہ جانتے ہیں۔"

"تب فوری طور پر ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ مس جینا تم آگے رہو گی اگر کچھ ہوا تو پہلے تم ماری جاؤ گی۔"

"ایک منٹ مجھے بھی اس سے کچھ پوچھنا ہے۔" جان گرے نے کہا۔ "مس جینا...... یہ سارے چکر کے پیچھے کون ہے؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔ ہاں...... اگر تم پکڑے گئے تو خود دیکھ لو گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔" جان گرے بولا اور اسے بازو سے پکڑ کر آگے دھکیلا۔

جینا لرزتے قدموں سے آگے جانے لگی۔ میں اس کے عقب میں تھا اور میرے پیچھے جان گرے اسلحے سے لدا پھندا آ رہا تھا۔ جینا جھاڑیاں ہٹاتی باہر نکلی۔ میں نے اس کے عقب میں جھانکا۔ مگر فی الحال کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر کہیں چھپے ہوں تو الگ بات تھی۔ بہرحال ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ہم باہر آئے۔ اس جگہ سے نکلنے کے لیے نالے سے گزرنا ضروری تھا۔ جینا کو

دھکیلنا پڑ رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک مقام پر میں نے دائیں طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہم مدراین کے مکان سے زیادہ فاصلے تک جا سکتے تھے۔ مگر جینا نے اوپر جانے سے انکار کر دیا۔ ''میں اس سے آگے نہیں جاؤں گی بے شک تم مجھے گولی مار دو۔''

''بکومت...... اوپر چلو۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''تم میری نرمی سے ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ۔ اوپر چلو۔'' میں نے اُس بار سختی سے اسے دھکا دیا۔ جان گرے آگے آ گیا۔

''اگر یہ جانے سے انکار کرے تو اس کے دونوں پیر چھلنی کر کے یہیں پھینک جاؤ۔ بچ گئی تو ساری عمر بستر پر گزرے گی۔ ورنہ سسک سسک کر یہیں مر جائے گی۔'' جان گرے کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ جینا لرز اُٹھی اور جلدی سے نالے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ میں اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس کے پیچھے رہا البتہ جان گرے کسی قدر مایوس نظر آیا اس کا خیال تھا کہ جینا اپنی بات پر اڑی رہے گی اور اسے اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جائے گا۔

اس طرف جنگل بے ترتیب اور گھنا تھا۔ یعنی اس کی پرورش میں مدراین کی این جی او کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ہم درختوں تلے سے گزر رہے تھے۔ طوفان کا اثر جنگل میں کم تھا۔ پھر بھی تند ہوائیں درختوں اور شاخوں کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ معاً مجھے اپنی جیب میں رکھے آلے میں تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ جو آلہ جینا کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے اسے جیب سے نکالا۔ اس کے اوپر ایک لائٹ فلیش کر رہی تھی۔ میں نے جینا سے پوچھا۔

''اس کا مطلب کیا ہے؟''

اس نے آلہ دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''کال آ رہی ہے۔ اگر تم سرخ بٹن دباؤ گے تو کال ریسیو ہو جائے گی اگر گرین بٹن دباؤ گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ تم ابھی بات نہیں کرنا چاہ رہے ہو۔''

''کیا یہ آلہ لوکیشن بھی بتاتا ہے؟''

وہ کسی قدر ہچکچائی۔ ''ہاں بشرطیکہ کال ریسیو کر لی جائے۔''

جان گرے بھی ہمارے پاس چلا آیا تھا۔ دو رائفلیں اس کے شانوں پر تھیں اور دو اس کے ہاتھوں میں۔ ان کے میگزینز اس کی مختلف جیبوں میں بھرے تھے۔ یہ سب ایک ہی ساخت کی رائفلیں تھیں۔ اس نے آلہ دیکھا اور مجھے خبردار کیا۔ ''اس کا کوئی بٹن مت دبانا۔ ورنہ یہ ہماری لوکیشن بتا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی بات میں مت آنا ممکن ہے کال ریسیو کیے بغیر ہی یہ ہماری نشان دہی کر دے۔ بہتر ہے اسے آف کر کے اس کی بیٹری نکال لو یا تباہ کر دو۔''

''بیٹری نکال لینا بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا اور ذرا سی کوشش سے اس کی بیٹری نکال لی۔

''اس کے آف ہونے کا انہیں علم ہو جائے گا۔'' جینا نے آگاہ کیا۔

''شکریہ۔'' میں نے جواب دیا اور جان گرے سے کہا۔ ''تم یہ اضافی رائفلیں میگزینز نکال کر





پھینک دو کیوں بلاوجہ بوجھ اُٹھا کر گھوم رہے ہو۔''

''یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا۔'' اس نے تین رائفلیں میگزینز نکال کر پھینک دیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہاں واقعی چھ افراد تھے؟''

''نہیں...... میرا خیال ہے زیادہ ہوں گے۔ اس قسم کے فیلڈ یونٹ میں دس سے بارہ افراد ہوتے ہیں لیکن ان کا انچارج گیزر تھا جو مارا گیا۔''

''تمہاری آرگنائزیشن میں بھی سیاست چلتی ہے۔ ایک دوسرے کی کاٹ کرتے رہتے ہو۔''

''سیاست نام ہی ایک دوسرے کی کاٹ کرنے کا ہے۔'' جان گرے مفکرانہ انداز میں بولا۔

''آگے ایک دریا آنے والا ہے۔ اس موسم میں ہم اسے عبور نہیں کر سکتے۔'' جینا نے بتایا۔

''اگر کوئی کشتی مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی چار میل شمال کی طرف پُل ملے گا۔''

میں جان گرے کو ذرا فاصلے پر لے گیا۔ ''تم کیا کہتے ہو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم سکون سے کچھ وقت گزار سکیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کم سے کم اس جگہ نہیں ہے ہمیں کسی بڑے شہر تک پہنچنا پڑے گا۔''

''جان گرے میرا خیال ہے اب تمہاری کوئی حیثیت آرگنائزیشن میں باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا اس طرف کا رُخ کرنا آ بیل مجھے مار کہنے کے مترادف ہوگا۔''

''فی الحال صورتِ حال یہی ہے۔'' جان گرے بولا۔ ''لیکن ایک بار میں نے ایگزیکٹو کونسل سے رابطہ کر لیا تو بازی میرے دشمنوں پر پلٹ جائے گی۔ انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''فی الوقت تو وہ ہمارا شکاری کتوں کی طرح تعاقب کر رہے ہیں۔ یعنی تمہارے پاس جان بچانے کے لیے کوئی واضح پلان نہیں ہے۔ اس صورت میں تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔''

''آئی ایم آن یور ڈی پنڈینٹ۔'' اس نے شانے اُچکائے۔

میں جینا کی طرف آیا۔ ''تم اس علاقے میں خاصے عرصے سے ہو۔ کیا کوئی اور ایسی جگہ ہے جہاں ہم پناہ لے سکیں۔ کوئی قدرتی پناہ گاہ۔ ہم آبادی میں نہیں جائیں گے۔''

جینا نے سوچا۔ ''نیچے دریا کے پاس شاید مل جائے اس طرف شکاریوں کے کیبن ہیں ان میں کوئی بھی پناہ لے سکتا ہے۔ اس طرف کسی کا شک بھی نہیں جائے گا۔''

''ایسی بات نہ کرو۔ شک کرنے والے ہر جگہ شک کرتے ہیں لیکن فی الحال ہمیں پناہ کی ضرورت ہے چلو۔''

یہ جنگل کسی قدر ڈھلان پر تھا اور ہم نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ طوفان کے زور میں اضافہ ہوا تھا اور درخت اتنی شدت سے جھوم رہے تھے کہ لگتا تھا ابھی جڑوں سمیت ٹوٹ کر گر جائیں گے اور بیچ بیچ درخت گر رہے تھے۔ دو مرتبہ درخت ہمارے راستے میں گرے۔ خوش قسمتی سے ہم اس وقت درختوں تلے سے نہیں گزر رہے تھے۔ ورنہ حادثے کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔

جنگل چھدرا ہونے لگا اور زمین پر اب زیادہ تر سوکھی جھاڑیاں یا جلی ہوئی گھاس تھی جن پر برف جمتی جا رہی تھی۔ کھلے میں آتے ہی ہواؤں کی شدت اور اُڑتی برف میں بے پناہ شدت آ گئی تھی۔ ہوا میں ایسی سرد ترین کاٹ تھی کہ ہاتھ پیر سن ہوئے جا رہے تھے۔ جینا کی حالت بُری تھی۔ اس کے جسم پر صرف اوور کوٹ تھا لیکن یہ بھی سردی کی شدت روکنے میں ناکام تھا۔ نیچے اس نے معمولی سا لباس پہن رکھا تھا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک کھلی تھیں اور پاؤں میں ہلکے جوتے تھے۔ میں اور جان گرے گرم کپڑوں میں تھے اور اس پر بھی سردی سے بُرا حال تھا۔ جینا کی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اچانک جینا چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے اسے اُٹھانے کی کوشش کی۔

"مجھ سے...... اب نہیں چلا جاتا۔" اس نے بُری طرح ہانپتے ہوئے کہا۔ "میرے ہاتھ پیر بے جان ہو رہے ہیں۔"

"یوسف ادھر ایک کاٹیج نظر آ رہا ہے۔" جان گرے نے کہا پھر جینا کی طرف دیکھا۔ "اسے کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جینا کو اُٹھا کر شانے پر لاد لیا۔ "رہنمائی کرو۔"

جان گرے کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ "تم اس پر بڑے مہربان ہو رہے ہو۔"

"میں تو تم جیسے شخص پر بھی مہربان ہوں جسے پہلی فرصت میں قتل کر دینا چاہیے۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ کھسیا گیا۔

کیبن کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر دریا سے چند سو فٹ دور تھا۔ اس کا اگلا حصہ لکڑی کے ستونوں پر ٹکا تھا اور اس جگہ کی ڈھلان بتا رہی تھی کہ دریا بارش کے دنوں میں چوڑا ہو کر کاٹیج کے پاس آ جاتا تھا۔ کاٹیج کا عقبی حصہ ایک چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ لاک نہیں تھا۔ اندر گھستے ہی سب سے پہلے میں نے جینا کو فرش پر ڈال دیا۔ اس کا وزن خاصا تھا اور میں بہ مشکل اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ طوفانی یخ بستہ ہواؤں سے نجات ملتے ہی سکون محسوس ہوا تھا۔ جان گرے رائفل میز پر رکھ کر آتش دان کی طرف لپکا۔ وہاں لکڑیاں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں۔ اس نے ان پر تیل اُنڈیلا اور ماچس سے آگ دکھا دی۔ سب کچھ وہیں رکھا تھا۔ لمحوں میں آگ بھڑک اُٹھی تھی۔

میں نے جینا کو سہارا دے کر آتش دان کے پاس بٹھا دیا۔ جان گرے نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ شاید وہ اسے حرارت میں حصے دار بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہاں ایک عدد دھاتی مگ تھا۔ کیبن میں پانی نہیں تھا میں باہر سے مگ میں برف بھر کر لایا۔ آتش دان میں گرم کر کے اسے پانی میں تبدیل کیا اور یہ کسی قدر گرم پانی جینا کو پلایا تو اس کی حالت تیزی سے سدھرتی چلی گئی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے مگ کا آخری قطرہ پی کر کہا۔ "تم نے میرے لیے بہت زحمت کی۔"





اس دوران میں جان گرے ایک طرف کافی بنانے کا سامان تلاش کر چکا تھا اور اس کی مدد سے کافی معرضِ وجود میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک عدد برتن جتن کر کے آتش دان کے شعلوں پر لٹکایا تھا اور اس میں باہر سے لائی برف بھر دی۔ پانی پگھلا تو اس نے کافی پاؤڈر ڈالا یہ فوری حل ہو جانے والی کافی تھی۔ کریم کا ڈبہ بھی تھا اور شکر بھی۔ ہم بے تابی سے کافی تیار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ جینا بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے آگے کا کام سنبھال لیا تھا اور جب اس نے بھاپ اُڑاتی مہکتی کافی کا مگ مجھے تھمایا تو میں چند لمحے کے لیے یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ہمیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کیبن میں ایک طرف کشن اور ہلکے کمبل بھی رکھے تھے۔ جینا نے فرش پر کشن بچھائے، کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ آتش دان نے دس پندرہ منٹ میں پورے کیبن کو گرم کر دیا تھا۔ جان گرے کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہ کہ اگر دشمن اس طرف آئے تو اسے اس کیبن کی چمنی سے نکلتا دھواں نظر آ سکتا ہے۔"

میں اُچھل پڑا۔ "تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے عجلت میں برف ڈال کر بہ مشکل آگ بجھائی تھی۔ اس سے کچھ دیر دھواں اُٹھتا رہا تھا۔ ایک بار میں نے احتیاطاً باہر جا کر دیکھا۔ چمنی سے ہلکا سا دھواں نکل رہا تھا جو کچھ دیر میں بند ہو جاتا۔ میں اندر آیا تو جینا جان گرے سے جھگڑ رہی تھی کہ اس نے آتش دان کیوں بجھا دیا ہے۔ "اگر اوپر چمنی سے دھواں نظر آتا تو ہمیں تلاش کرنے والے اس کیبن کا رُخ ضرور کرتے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ شام کی تاریکی اتنی تیزی سے پھیلی تھی کہ چند منٹ کے اندر دن رات میں بدل گیا تھا۔ طوفان کے زور و شور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دوپہر کا ہلکا پھلکا لنچ کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ کیبن میں خشک شکر قندی تھی لیکن اسے اُبالنے یا بھوننے کے لیے آگ جلانا لازمی تھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی اور پھر طوفان کی وجہ سے باہر سے چمنی کا دھواں نظر آنا محال تھا مگر جان گرے نے پھر بروقت خبردار کیا۔ "تلاش کرنے والوں کے پاس انفرا ریڈ چشمے اور دوربین ہوگی اگر ہم نے آگ جلائی تو انہیں دن سے بھی زیادہ صاف نظر آ جائے گا۔"

"چاہے میں سردی سے مر جاؤں۔" جینا چلائی۔

"اتنی آسانی سے نہیں مرو گی تم۔"

کیبن میں ایک جانب لوہے کا تسلہ نما برتن بھی رکھا تھا۔ میں نے جان گرے سے کہا۔ "اگر ہم اس میں آگ جلا لیں۔"

"تب بھی حرارت کی لہریں با آسانی باہر سے دیکھی جا سکیں گی۔"

"لگتا ہے یہ شکر قندی کچی ہی کھانی پڑے گی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میں ہرگز نہیں کھا سکتی۔"

اس پر جان گرے نے پھر ایک نازیبا سا مشورہ دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جان گرے عورتوں کا احترام کرنا سیکھو۔ اگر کسی تیسری دنیا کے ملک میں عورت کے ساتھ زیادتی ہو جائے تو تمہارے معاشرے میں انسانی حقوق کے علم برداروں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور تم لوگ عورتوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے ہو تو انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔''

''مغرب کا پورا معاشرہ اس قسم کی منافقتوں سے بھرا پڑا ہے۔'' جینا نے کمبل میں دبکے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں ان مہذب بننے والے لوگوں کی تہذیب کا حال۔ اس کے نشان تمہیں اپنے بدن پر دکھاتی۔ آرگنائزیشن کا ہر فرد اپنی ماتحت عورتوں کو بھنبھوڑنا اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' جان گرے نے غرا کر کہا اور ایک طرف جا کر لیٹ گیا۔

کمبلوں کی وجہ سے سردی کا اثر کم ہو گیا تھا۔ کشن جینا نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے اس لیے مجھے اور جان گرے کو صرف کمبلوں پر گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسلحہ ہم نے اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ جینا کی طرف سے پوری طرح محتاط تھے۔ کھڑکیوں پر پردے تھے۔ وقفے وقفے سے میں باہر دیکھ رہا تھا مگر کوئی ایسی علامت نظر نہیں آئی جس سے کسی فرد کے آنے کا پتا چلتا۔ یہ کیبن مدرا ین کے گھر سے مشکل سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور تلاش کرنے والوں کو اس طرف بھی آنا چاہیے تھا۔ بہر حال وہ ہمیں گھیر بھی لیتے تو یہ کیبن اچھا مورچہ ثابت ہو سکتا تھا بہ شرط کہ حملہ آور صرف فائرنگ کرتے اگر وہ دستی بم یا راکٹ کے استعمال پر اُتر آتے تو ہمارے پاس سوائے وفات پا جانے کے اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

رات دو بجے میں نے جان گرے کو جگایا۔ ''پہرہ دو اور ہوشیار رہنا۔''

''ہوشیار رہنے کا فائدہ اگر انہوں نے ہمیں تلاش کر لیا تو فوراً مار ڈالیں گے۔''

''اتنے مایوس مت بنو۔ ابھی چند گھنٹے پہلے بھی تم قبر کے کنارے تھے مگر قدرت کو تمہاری موت منظور نہیں ہے اس لیے بچ گئے۔''

وہ کراہنے کے انداز میں ہنسا۔ ''یہ اچھی چیز بنالی ہے تم مسلمانوں نے۔''

''قائل تو تم بھی ہو لیکن منہ سے اقرار کرنا اپنی کمزوری سمجھتے ہو۔'' میں اس کی جگہ لیٹ گیا۔

''اور جینا کے ساتھ کوئی حرکت مت کرنا۔ ممکن ہے وہ بعد میں ہمارے کام آئے۔''

''فکر مت کرو میں اس کی عزت پر حملہ نہیں کروں گا۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ اگر وہ راضی خوشی ہو تو بے شک تم حملہ کر سکتے ہو میرا مطلب ہے اسے قتل وغیرہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''ابھی میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ اس وقت ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔'' جان گرے نے خفا ہو کر کہا۔

''جب سے تم نے مس جینا کو دیکھا ہے عقل سے کم ہی کام لے رہے ہو۔ اس کی جگہ جذبات





کا استعمال زیادہ ہے۔'' جان گرے اُٹھ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ روشنی کے لیے ہم نے ایک کیروسین لیمپ جلا کر اسے میز کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ اس کی روشنی کم سے کم پھیلے۔ کھڑکیوں پر پردے تھے۔ اس کے باوجود ہم احتیاط کر رہے تھے۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے جلد نیند آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ گزشتہ کچھ عرصے سے میں سونے کے معاملے میں پہلے جیسا نہیں رہا تھا کہ جب چاہا سو گیا۔ اب مجھے ذرا مشکل سے نیند آتی تھی۔ اور خواب بھی پریشان کرتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ جان گرے کے دشمن کیبن تک آ گئے ہیں اور ہمیں باہر آنے کا حکم دے رہے ہیں۔ معاً جینا جان گرے سے اس کی رائفل چھین کر اسے شوٹ کر دیتی ہے اور جان گرے ایک حسرت بھری ہچکی لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا اور اب جینا مجھے وارننگ دے رہی تھی کہ اگر میں نے اس کے التفات کا جواب نہیں دیا تو وہ مجھے بھی جان گرے کے پاس بھیج دے گی۔ میں پُرعزم لہجے میں کہتا ہوں کہ وہ بے شک مجھے گولی مار دے لیکن میں کاجل کے لیے مخصوص محبت کا ایک ذرا سا حصہ بھی کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ اس پر فوت شدہ جان گرے نے آنکھ کھول کر دریافت کیا۔ ''یہ کاجل کون ہے؟''

میں اس مضحکہ خیز سچویشن پر حیران تھا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ''یہ کاجل کون ہے؟''

''کون ہے؟'' میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ جان گرے تھا۔

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کاجل کون ہے جس کا نام تم اتنے زور و شور سے لے رہے تھے۔''

جان گرے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ کسے دھوکا دے رہے ہو برخوردار...... اس نے کہا۔ ''جینا وہ رہی۔ ہم میں صلح ہو گئی ہے۔''

میں نے جینا کی طرف دیکھا تو صلح کی نوعیت بھی سمجھ میں آ گئی۔ روشنی کم تھی مگر اس کی اُڑی اُڑی رنگت اور کھلی زلفیں رات کا جو افسانہ سنا رہی تھیں وہ میں بخوبی جان گیا تھا۔ جان گرے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ مغرور حسیناؤں کا سر جھکانا اسے اچھی طرح آتا ہے۔ جینا کے لبوں پر جھینپی ہوئی مفتوح سی مسکراہٹ تھی۔ میں انگڑائی لے کر اُٹھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے لیکن باہر روشنی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ طوفان کا زور کم ہوا تھا مگر سرمئی بادل ماحول کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ بھوک ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے شکر قندی کچی کھانے کی کوشش کی لیکن کھائی نہ گئی۔

جان گرے بولا۔

''اب روشنی کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اگر انہوں نے آنا ہوتا تو آ چکے ہوتے۔'' اس کا بقیہ جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ ایک کھڑکی کے تمام شیشے بیک وقت ٹوٹ گئے۔ گولیاں عقبی دیوار میں سوراخ کرتی نکل گئیں۔ میں اور جان گرے بیک وقت زمین پر گرے۔ جینا پہلے ہی فرش پر دراز تھی۔ میری رائفل میرے پاس تھی اور جان گرے کی میز پر رکھی تھی۔ وہ رینگتا ہوا اسے اُٹھانے جا رہا تھا۔ اسی

لمحے باہر سے جیسے محاذ کھل گیا۔

کئی خودکار ہتھیاروں نے منہ کھول دیئے تھے۔ جینا چیخیں مار رہی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''زمین سے اُٹھنا مت۔'' گولیاں دیواروں سے گزر کر محض فٹ بھر کی اونچائی سے جا رہی تھیں۔ میں نے جان گرے سے پوچھا۔ ''عقبی راستے سے نکلا جا سکتا ہے۔''

''پیچھے تو دریا ہے۔''

''بہرحال دریا میں بچنے کے چانس ہیں۔''

''انہوں نے عقبی حصہ خالی نہیں چھوڑا ہوگا۔'' جان گرے نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہم مارے جائیں گے۔'' جینا چلائی۔ ''خدا کے لیے ہتھیار پھینک دو۔''

''یہ ہمیں مارنے ہی آئے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''کسی خوش فہمی میں مت رہنا اب یہ تمہیں بھی مار دیں گے کیونکہ تم دشمن کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔''

''تب یہاں سے نکلو۔'' وہ بلبلائی۔ ''کیا موت کا انتظار کر رہے ہو؟''

عقبی دروازے سے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ اس طرف سے فائرنگ نہیں ہو رہی تھی لیکن یہ دھوکہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم سامنے کی فائرنگ سے بدحواس ہو کر عقبی حصے سے نکلنے کی کوشش کریں اور وہاں پہلے سے گھات میں موجود قاتل ہمیں فوت کر دیں۔ مگر زیادہ دیر یہاں رُکنا بھی ممکن نہیں تھا۔ گولیاں بعض اوقات تو ہمارے جسموں سے انچ بھر اوپر سے گزر رہی تھیں۔ معاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے گولیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اُٹھ کر دریا کی سمت والے حصے میں فرش کے تختوں پر رائفل سے برسٹ مارنے شروع کر دیئے۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' جان گرے نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

''چپ چاپ پڑے رہو۔'' میں نے غرا کر کہا۔ اس لمحے جان گرے کے منہ سے کراہ نکلی تھی اور اس نے اپنی ٹانگ تھام لی تھی۔ اسے گولی لگی تھی لیکن وقت اسے دیکھنے کا نہیں تھا۔ میں نے چھ انچ چوڑے تختوں پر دو دو فٹ کے فاصلے سے لائن میں برسٹ مارے۔ گولیاں ان میں سوراخ کرتی گزر گئیں۔ دوسرے میگزین نے تختوں کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ جب میں نے جوتا مارا تو وہ اُکھڑ کر نیچے جا گرے۔ میں نے نیچے دیکھا۔ ہلکی سی روشنی میں کوئی چھ فٹ نیچے زمین نظر آئی۔ میں نیچے کود گیا۔ ''اس طرف آؤ تم دونوں۔''

''میں نہیں آ سکتا میرے پاؤں میں گولی لگی ہے۔'' جان گرے کراہ کر بولا۔

جینا یہ سنتے ہی لپک کر آئی تھی۔ اسے میں نے سنبھال لیا۔ ''بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اندھا دھند فائرنگ میں ماری جاؤ گی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا اور واپس خلا میں سے کیبن میں داخل ہو گیا۔ جان گرے پہلو کے بل گرا تھا اسے بازو سے تھام کر میں نے پیچھے کھینچا اور اسے خلا سے نیچے اُتار دیا۔ جان گرے کسی قدر کوشش کے بعد کھڑا ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاؤں کی





ہڈی سلامت تھی۔ میں نیچے آیا تو جینا نے سرگوشی کی۔ ''مجھے دریا کے کنارے دو تین افراد نظر آئے ہیں۔''

''میری رائفل لے لو اس پر رات کو دیکھنے والی دوربین ہے۔'' جان گرے نے اپنی رائفل میری طرف بڑھا دی۔ اپنی رائفل اسے دے کر میں نے ساحل کی طرف دیکھا۔ دوربین سے چار سبز رنگ کے ہیولے نظر آئے تھے۔ وہ زمین پر دراز تھے اور ظاہر ہے ہمارے منتظر تھے۔ میں نے ایک کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ تڑپ کر اُچھلا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ساتھی سنبھلتا میں نے اسے بھی شوٹ کر دیا۔ دوسرا تو فوراً ہی ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کے سر کے وائزر کے ٹکڑے اُڑتے نظر آئے تھے البتہ دوسرا تڑپ رہا تھا۔ انہیں چھوڑ کر میں نے باقی دو افراد کی طرف دوربین گھمائی تو انہیں اپنی جگہ سے غائب پایا۔ اِدھر اُدھر تلاش کرنے پر وہ مجھے دائیں طرف بھاگتے نظر آئے۔ اپنے ساتھیوں کے انجام سے باخبر ہونے کے بعد انہوں نے وہاں رُکنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ ''نکلو یہاں سے اچھا موقع ہے۔ وہ بھاگ گئے ہیں۔'' میں نے جان گرے سے کہا۔ وہ اپنی ران پر رومال باندھ رہا تھا۔

''میں چل سکوں گا لیکن بھاگنا ممکن نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''تم چلو تو۔'' میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''اس سے پہلے کہ وہ کیبن کو ہی اُڑا دیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' میں جان گرے کو دائیں طرف سے سہارا دیئے باہر نکلا۔ سرد موسم کی وجہ سے جان گرے اپنے زخم میں اتنی تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنی رائفل بائیں شانے پر ٹانگ رکھی تھی۔ جینا ذرا فاصلے پر بے پروائی سے چل رہی تھی اس نے جان گرے کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے دریا کا رُخ کیا تھا کیونکہ کسی اور طرف جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ بھاگنے والے کچھ دیر بعد زیادہ کمک لے کر آئیں گے۔ دریا کا پاٹ مشکل سے چالیس گز چوڑا تھا اور اس کی سطح پر برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہمیں اس دریا کو عبور کرنا تھا۔ جینا نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں اتنے سرد پانی میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''تب تم یہیں رُک کر موت کا انتظار کرو۔'' میں نے کہا اور جان گرے سمیت پانی کی طرف بڑھا۔

''یوسف ایک بار پھر سوچ لو۔ پانی بہت سرد ہے۔'' جان گرے کی آواز لرز رہی تھی۔ ''ہم اس سے ہی مر جائیں گے۔''

''جان گرے اگر تم نہیں جانا چاہتے تو تمہاری مرضی لیکن میں چوہوں کی طرح نہیں مر سکتا۔ جدوجہد کرتے ہوئے موت آئے تو مجھے ہنسی خوشی قبول ہے۔''

اسی لمحے دائیں طرف سے مسلح افراد نمودار ہوئے۔ وہ فائرنگ کر رہے تھے مگر ہم ان کی زد سے باہر ہی تھے۔ ''میں بھی چلوں گا۔'' جان گرے نے فوری فیصلہ کیا۔ اور ہم ایک ساتھ پانی میں کود

گئے۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے میرا جسم ہی غائب ہو گیا۔ اس قدر سرد پانی تھا مگر میں نے رُکنے کے بجائے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیئے۔ جان گرے بھی تیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بھی سہارا دیا۔ ہمارے پاس دس کلوگرام وزنی اسلحے کا بوجھ بھی تھا۔ اس کے ساتھ عام حالات میں تیرنا بھی مشکل کام تھا چہ جائیکہ اس پر برفیلے دریا میں تیرنا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں روکے تو انہیں دوبارہ حرکت نہیں دے سکوں گا۔ جان گرے کراہنے لگا۔ ''اب مجھ سے نہیں تیرا جا رہا ہے۔''

''حوصلہ کرو۔ ہم نصف فاصلہ طے کر چکے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بس تھوڑا اور رہ گیا ہے۔''

جینا ہمارے پانی میں کودنے کے بعد چند لمحے متذبذب کھڑی رہی پھر ایک دم آنے والے مسلح افراد کی طرف دوڑی۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے مدد مدد چلا رہی تھی مگر انہوں نے اس پر بھی فائرنگ کر دی۔ وہ بال بال بچی تھی۔ گولیاں اس کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے ہر جگہ سے گزر رہی تھیں مگر اسے نہیں لگیں۔ وہ ایک لمحے کو تو ششدر رہ گئی یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے اسے شناخت نہ کیا ہو اس کے باوجود اس پر فائر کر رہے تھے۔ قسمت نہ ہوتی تو اب تک دریا کی ریت پر اس کی لاش پڑی ہوتی۔ وہ پلٹ کر بھاگی اور بے اختیار دریا میں کود گئی۔ اس وقت مجھے اپنی اور جان گرے کی فکر لگی تھی اس پر توجہ کہاں دیتا۔ یہ سب اس نے مجھے بعد میں بتایا۔

''میں نہیں جا سکتا میں مر رہا ہوں۔'' جان گرے نے فریاد کی۔ ''میرا جسم شل ہو گیا ہے۔''

''وہ تو میرا بھی ہو گیا ہے۔'' میں نے دانت بجاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن رُکے تو ڈوب جائیں گے۔''

جان گرے نے تیرنے کی کوشش ترک کر دی تھی اور اس کا بوجھ بھی مجھے اُٹھانا پڑ رہا تھا۔ ایک لمحے کو میرے دل میں آئی کہ اس پر لعنت بھیج کر اپنی جان بچانے کی کوشش کروں لیکن پھر مجھے اس پر رحم آ گیا۔ خوش قسمتی سے اسی لمحے میرے پیروں نے زمین محسوس کر لی تھی اور اب میں نسبتاً آسانی سے کنارے تک لے جا سکتا تھا۔ چند لمحے بعد ہم ریت پر تھے لیکن ابھی جان بچانے کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہماری جان کے گاہک کسی وقت بھی دریا کے دوسرے کنارے تک آ سکتے تھے جو وہاں سے صرف چالیس گز کے فاصلے پر تھا اور اتنے فاصلے سے ہمیں گولیوں سے بھوننے میں انہیں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔

''اٹھو اب چلنے کی کوشش کرو۔ تمہارے دوست قریب آ رہے ہیں۔'' میں نے جان گرے کو جھنجھوڑا وہ سردی سے بُری طرح لرز رہا تھا۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ جان گرے مشکل سے اُٹھا۔ اسے ران پر گولی لگنے کی تکلیف شاید یاد بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے بجائے اسے سرد پانی نے مار دیا تھا۔ اسی لمحے عقب سے جینا کی چلانے کی آواز آئی۔




''رُکو...... مجھے چھوڑ کر مت جانا۔''

''یہ...... یہ کتیا یہاں بھی۔'' جان گرے نے غرانے کی کوشش کی۔

جان کے خوف سے جینا نے سرد پانی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے حیرت انگیز پھرتی سے دریا عبور کیا تھا۔ ویسے بھی اس پر کوئی بوجھ نہیں تھا سوائے اوور کوٹ کے اور وہ تیراکی میں ماہر بھی تھی۔ ریت پر آتے ہی اس نے لپک کر جان گرے کا بازو دوسری طرف سے پکڑا۔ ''اب چلو...... اس سے پہلے وہ کنارے تک آ جائیں۔''

اس قسم کے موسم میں حرکت میں ہی برکت تھی اس لیے ہم چل پڑے۔ چل کیا پڑے۔ شرابیوں کی طرح ڈول رہے تھے۔ قدم رکھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ جان گرے مجھ پر اور جینا پر لدا تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ ''اگر تم نے اپنے پیروں پر چلنے کی کوشش نہیں کی تو تمہیں اس جگہ پھینک جائیں گے۔''

''یہ مصیبت تمہاری وجہ سے یوسف کے پیچھے لگی ہے۔'' جینا نے میری تائید کی۔

''اور تم جیسے بہت معصوم ہو۔'' جان گرے اس حالت میں بھی جواب دینے سے باز نہیں آیا تھا۔ ''مخبری کس نے کی تھی۔''

''وہ میرا فرض تھا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا یہ حرام زادے...... ماں...... کے بعد میری جان لینے کی کوشش کریں گے۔'' اسی لمحے عقب سے گولیاں چلیں جو ہمارے اوپر خاصی بلندی سے گزر گئیں۔ حملہ آور دریا کے کنارے تک آ گئے تھے اور اب ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلی آڑ میسر آتے ہی میں نے پلٹ کر جوابی برسٹ مارا اور وہ لوگ کنارے سے بھاگے کیونکہ اس طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ یہاں ریت کا چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ جان گرے اور جینا اس کے عقب میں تھے۔ جیسے ہی حملہ آور کنارے سے دور ہوئے میں نے جان گرے کو کھڑا کر دیا اور ہم کنارے سے ذرا فاصلے پر واقع جھاڑیوں کی طرف بھاگے۔ پانی سے باہر آنے پر سردی تو بہت لگی تھی لیکن ساتھ ہی جسم میں چستی بھی آ گئی تھی۔

ہمیں بھاگتے دیکھ کر حملہ آور ایک بار پھر دریا کے کنارے آنے لگے۔ وہ ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور ہم جیسے جیسے دریا سے دور جا رہے تھے ان کی زد سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ معاً مجھے اپنی پیٹھ پر بائیں جانب پسلیوں سے ذرا اوپر کوئی دہکتا انگارہ گھستا محسوس ہوا۔ میں لڑکھڑا گیا تھا۔ جان گرے کو اپنا ہوش نہیں تھا لیکن جینا نے میری لڑکھڑاہٹ محسوس کر لی تھی۔ اس نے بے تابی سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''شاید پشت میں گولی لگی ہے۔'' میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خدا۔'' اس کے منہ سے نکلا تھا۔ جان گرے نے سر اُٹھایا تھا مگر کچھ کہا نہیں۔

جھاڑیوں تک پہنچتے پہنچتے میری ہمت جواب دینے لگی۔ جان گرے کو لٹا کر میں زمین پر بیٹھ گیا۔ تکلیف کی وجہ سے میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ جینا نے میری پشت پر دیکھا۔ ''خون بہہ رہا ہے۔''

''گولی ہی لگی ہے۔''

''یہ دل کے مقام پر ہے۔'' جینا کے لہجے میں تشویش تھی۔

''دیکھو...... اگر گولی نزدیک ہے تو اسے چاقو سے نکالنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اسے جیبی چاقو دیا۔ ''براہِ کرم اسے میری پشت میں مت گھونپ دینا۔''

اس نے جیکٹ اُتارنے میں میری مدد کی اور جرسی اوپر کی تو اس کے منہ سے تحیّر انگیز آواز نکلی۔

''میرے خدا یہ گولی تو بالکل اوپر رکھی ہے۔ یہ لو اتنے آرام سے نکل آئی۔ بس ذرا سی کھال پھٹ گئی ہے۔ ایک منٹ رُکو۔'' اس نے زمین سے برف اُٹھا کر زخم پر رکھی کہ خون بہنا بند ہو جائے۔ ایک منٹ بعد اس نے جرسی نیچے کر دی اور مجھے سیسے کی چپٹی ہو جانے والی گولی تھما دی۔ گولی ہٹتے ہی تکلیف بھی حیران کن تیزی سے کم ہوئی تھی اور میں خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ جیکٹ اور جرسی بلکہ سارے ہی کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن انہیں اُتارنے سے زیادہ سردی لگ رہی تھی۔ میں نے جینا سے چاقو لیا۔ ''تمہیں رائفل چلانی آتی ہے۔''

''ظاہر ہے میں جن لوگوں سے تعلق رکھتی ہوں ان کا اوڑھنا بچھونا ہی ہتھیار ہیں۔ میں ہتھیاروں سے کیسے ناواقف ہو سکتی ہوں۔''

میں نے جان گرے والی رائفل اسے تھما دی۔ ''دریا کی طرف دیکھو اور ان میں سے کوئی دریا عبور کرنے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دینا۔''

''فکر نہ کرو ان میں سے کوئی اتنا جرأت مند نہیں ہے۔ یہ صرف کمزوروں پر شیر ہونے والے لوگ ہیں لیکن اگر کسی نے حماقت کی تو میں اسے دیکھ لوں گی۔'' جینا کے لہجے میں اعتماد تھا۔

میں نے جان گرے کو سیدھا کیا وہ سرگوشی میں کراہا۔ ''تم نے حماقت کی ہے۔''

''میں صرف اسے آزما رہا ہوں۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا اور اس کی ران سے بندھے رومال کو کھولنے لگا۔ گولی خاصی اندر تک تھی۔ میں نے انگلی سوراخ میں ڈالی تو جان گرے نے چلا کر گالی دی تھی۔ گولی کوئی انچ بھر کی گہرائی میں تھی۔ اگر میرے پاس چمٹی ہوتی تو میں با آسانی اسے نکال سکتا تھا۔ مگر اس چاقو سے زخم بڑا کر کے ہی یہ کام کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی نوک سوراخ پر رکھ کر دبائی تو جان گرے تڑپ گیا تھا۔ اس نے ایک عدد فلک شگاف چیخ ماری۔ ''یوسف...... یہ کیا کر رہا ہے؟''

میں نے اسے دبا لیا اور بے رحمی سے چاقو اس کے زخم میں داخل کر دیا۔ میری گرفت میں وہ ہل نہیں سکتا تھا اس لیے باقی جسم سے تڑپتا اور گالیاں دیتا رہا۔ میں نے چاقو کی نوک سے گولی نکالی تو





اس نے ایک فلک شگاف چیخ اور ماری تھی۔ میں نے زمین سے برف اُٹھا کر اس کے زخم میں بھری۔ کئی دفعہ برف بھرنے سے اس کا خون رُک گیا۔ میں نے زیادہ برف لگانے سے گریز کیا کہ کہیں اس کا زخم گینگرین کا شکار نہ ہو جائے۔ خون رُک جانے پر میں نے رومال دوبارہ اس کے زخم پر باندھ دیا تھا۔ جان گرے کا چہرہ اس موسم میں بھی پسینے سے تر تھا۔

''اب اچھا محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ جب تک گولی اندر تھی مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی انگارہ اندر موجود ہو۔''

''اب اُٹھ جاؤ۔ وہ زیادہ دیر دریا کے دوسری طرف نہیں رہیں گے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

جینا دوڑتی ہوئی آئی۔ ''وہ لوگ ربر کی کشتی لا رہے ہیں۔ بس ایک منٹ میں اس طرف ہوں گے۔''

میں نے متفکر نظروں سے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''گولی نکالنے سے اسے آرام ضرور ملا تھا لیکن اس حالت میں ہم اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے۔ ہمارے تعاقب میں جو شکاری کتے تھے وہ تازہ دم تھے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ ہمیں پکڑ لیں۔ برف باری اور ہوا کے رُک جانے کے بعد برف پر ہمارے قدموں کے نشان تادیر تازہ رہ سکتے تھے۔ اور ان پر وہ با آسانی ہمارا تعاقب کر سکتے تھے۔ کشتی کا سن کر میرے ذہن میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ اچانک ہی اس کی وجہ بھی نزول کر گئی۔ اس جگہ سے فرار کے لیے ہمیں کسی ٹرانسپورٹ کی ضرورت تھی اور کشتی کی مدد سے ہم با آسانی یہاں سے دور جا سکتے تھے۔ جینا نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا۔

''یہ ناممکن ہے وہ پانچ چھ ہیں۔''

''ہم ایسے پانچ چھ سے کئی بار نمٹ چکے ہیں۔'' میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور ذرا آگے جا کر جھاڑیوں سے جھانکا۔ وہ لوگ دوسرے کنارے پر ربر کی کشتی کو پیک سے نکال رہے تھے۔ اس میں انجن بھی لگا تھا۔ حالانکہ اتنا سا دریا عبور کرنے کے لیے چپو کافی تھے۔ شاید ان کے پاس چپو نہیں تھے۔ ایک نے گیس سلینڈر کی چابی کھینچی تو مشکل سے تین سیکنڈ میں کشتی میں ہوا بھر گئی۔ یہ خاصی بڑی کشتی تھی۔ تقریباً سات بائی چار فٹ کی۔ اس کے عقب میں چھوٹا سا پیٹرول انجن تھا۔ ایک نے انجن کی ڈوری کھینچ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ میں تیزی سے واپس آیا۔ ''تیار ہو جاؤ۔ جان گرے تم اسی جگہ سے فائر کرو گے۔ جینا تم دائیں طرف جاؤ۔ میں بائیں طرف جاتا ہوں۔ جیسے ہی میں فائر کروں تم دونوں بھی فائر کرنا۔ کوئی بچ کر نہ جائے۔ یاد رکھنا ہمیں کشتی چاہیے اس لیے اسے بچا کر فائر کرنا ورنہ اس جدوجہد کا مقصد فوت ہو جائے گا بمعہ ہمارے۔''

''اوکے باس۔'' جینا نے کہا اور دائیں طرف چلی گئی۔ میں جان گرے کو سہارا دے کر جھاڑیوں کے آخری حصے تک لایا۔ جہاں سے دریا کا کنارہ نظر آ رہا تھا۔ موٹر بوٹ کی آواز بتا رہی تھی

کہ وہ لوگ اس کنارے کی طرف آ رہے ہیں۔ میں رائفل جان گرے کو دے کر خود پستول سمیت بائیں طرف چلا گیا۔ یہاں سے کنارے کسی قدر نزدیک تھا مجھے امید تھی کہ پستول اتنے فاصلے سے بخوبی کام کرے گا۔ وہ لوگ کنارے سے ذرہ دور تھے چار آگے رائفلیں تانے مستعد بیٹھے تھے۔ پانچواں کشتی چلا رہا تھا۔ جیسے ہی کشتی کنارے لگی۔ وہ چاروں کود کر ریت پر اوندھے منہ لیٹ گئے۔ اب ان کے جسم معمولی سے نظر آ رہے تھے۔ پانچواں فوری طور پر کشتی واپس لے گیا تھا۔ میں دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ وہ لوگ میرے اندازے سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے۔ یہ بات ان کے ذہن میں بھی تھی کہ میں اُلٹا ان کی کشتی لے کر نہ بھاگ لوں۔ وہ چاروں خاصی دیر تک ساکت پڑے رہے میں دعا کر رہا تھا کہ میرے ساتھی کوئی حماقت نہ کر جائیں۔ وہ چار تھے پوری طرح مسلح اور تربیت یافتہ اور اگر انہیں ہمارے بارے میں بھنک بھی مل جاتی تو یہ جھاڑیاں ہمیں نہیں بچا سکتی تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک اُٹھ کر بھاگا اور جینا نے اس پر پورا برسٹ چلا دیا۔ وہ اُلٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا گرا۔ اس کا جسم چھلنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باقی تین نے جینا کی طرف بے تحاشہ فائرنگ شروع کر دی تھی جان گرے یا میں نے فائرنگ کرنے سے گریز کیا تھا۔ میں جس بات سے ڈر رہا تھا وہی ہوا۔ ان لوگوں کی نسبت ہم غیر محفوظ تھے۔ مجھے دستی بم کا خیال آیا۔ موجودہ حالات میں اس سے بہتر ہتھیار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بم نکال کر اس کی پن کھینچی۔ یہ عام طور سے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا تھا۔ اس لیے میں نے چار تک گن کر بم ان تینوں کی طرف اُچھا دیا۔ بم گرتے ہی پھٹا تھا میں سر نیچے کر چکا تھا۔ ان کی چیخیں دھماکے میں دب سی گئی تھیں۔ جیسے ہی گونج ختم ہوئی میں پستول لے کر اس طرف دوڑا اور مرتے مرتے بچا میں کشتی والے کو بھول گیا تھا۔ اس نے دوسرے کنارے سے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ تین میں سے دو ختم ہو چکے تھے اور تیسرا بُری طرح زخمی تھا۔ میں نے زمین پر گرتے ہوئے ایک مرنے والے کی رائفل اُٹھا لی اور کشتی والے کی طرف فائرنگ کر دی۔ وہ مجھ پر اور میں اس پر فائرنگ کر رہا تھا۔ مگر ہم دونوں کی قسمت اچھی تھی۔ ہماری رائفلیں خالی ہوئیں تو پستول نکال لیے۔ میں اُٹھ کر کنارے کی طرف دوڑا اور وہ بھی جوش میں پانی میں اُتر آیا تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ دو گولیاں میرے سر سے گزریں اور میری ایک گولی اس کے بازو میں لگی اس نے اپنا بازو تھام لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے پستول سنبھالنے کی کوشش کی مگر دوسری گولی سینے پر لگنے سے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اور وہ اوندھے منہ پانی میں گر گیا۔ رواں پانی اسے بہا کر لے جانے لگا۔

نہ جانے کب جینا اور جان گرے میرے عقب میں آئے۔ جب جان گرے نے جان کنی میں پھنسے شخص کو گولی مار کر تکلیف سے نجات دلائی تو میں چونکا تھا۔ "کشتی تو اب بھی دوسرے کنارے پر ہے۔"

میں مسکرایا۔ "جب ہم اس کنارے سے اس طرف آ سکتے ہیں تو اس طرف بھی جا سکتے ہیں۔ تم




ان لوگوں کا اسلحہ اور جیکٹیں اُتارو۔" میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر پھینک دی اور دوڑ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میں کوئی پانچ چھ گز آگے گرا اور جلدی جلدی یخ بستہ پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتا دوسری طرف جانے لگا۔ پہلے تجربے کے مقابلے میں پانی اس قدر سرد نہیں لگ رہا تھا۔ میں چند منٹ میں دوسری طرف جا پہنچا۔ کشتی ریت سے ٹکی کھڑی تھی۔ میں نے ڈور کھینچ کر اس کا انجن سٹارٹ کیا اور اسے دوسرے کنارے کی طرف لانے لگا۔ اس دوران میں جینا اور جان گرے نے مرنے والوں کا اسلحہ جمع کر لیا تھا۔ ان کی خشک جیکٹیں اُتار لی تھیں لیکن ان سب پر خون لگا تھا جسے جینا نے پانی سے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلے جینا نے ایک چھوٹے قد کے مقتول کی پتلون پہنی جب ہم نے اس کی طرف دیکھا تو بے اختیار ہنس دیئے۔ یہ پتلون بھی خاصی بڑی تھی اور پھولی پھولی سی ہو رہی تھی۔ میں نے اور جان گرے نے لباس بدلے اس دوران میں جینا منہ پھیر کر کھڑی رہی تھی۔ چار عدد رائفلیں اور خاصی مقدار میں ایمونیشن ہمارے ہاتھ لگا تھا۔

"اس سے پہلے وہ اور آئیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" جینا بولی۔

"ان کے پاس سے کھانے کو کچھ نکلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب نکلا ہے۔" جینا نے میرے سامنے ایک ڈھیر ڈال دیا۔ اس میں سگریٹ، لائٹر، چاکلیٹ، ٹافیاں، چیونگم اور اسی طرح کی چیزیں تھیں۔

"یہ سب اُٹھا کر کشتی میں ڈالو۔ جب تک کھانے کو کچھ نہ ملے ان سے دل بہلائیں گے۔" میں نے کہا۔

سامان رکھ کر ہم خود بھی کشتی میں سوار ہوئے۔ جان گرے نے انجن سنبھال لیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پیٹرول کی مقدار چیک کی۔ "خاصا کم ہے اس کے سہارے کشتی ایک گھنٹہ بھی نہیں چل سکتی۔"

"فی الوقت یہاں سے نکلو۔ آگے چل کر انجن بند کر دینا۔ دریا میں خاصی روانی ہے۔"

"ہمارے پاس چپو نہیں ہیں۔" جان گرے نے کشتی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کشتی کیسے قابو کریں گے۔"

"دیکھو...... کہیں کنارے پر کوئی کشتی نظر آئی تو اس سے پار کر لیں گے۔" میں مسکرایا۔

خشک کپڑے پہن کر خاصا سکون ملا تھا۔ جینا ایک طرف نیم دراز چپ بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے اب تک جو وقت گزارا تھا وہ ایک عورت کی ہمت سے زیادہ ہی تھا۔ میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ ایک باحوصلہ اور دلیر عورت تھی۔ مجھے تعجب تھا کہ جان گرے نے اسے کس طرح زیر کر لیا۔ میں ذرا کھسک کر جان گرے کے قریب آیا۔ "کل رات تم نے کیا چکر چلایا تھا۔"

وہ مسکرایا۔ "تجربہ...... برخوردار...... عورتوں میں خدا نے بعض ایسی رگیں دی ہیں جنہیں دباتے ہی یہ بالکل موم ہو جاتی ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "ویسے ایک بات ہے آج تک جتنی

عورتوں کے قریب آیا ہوں یہ ان سے مختلف ہے۔"

"میں نے سنا ہے تمام عورتیں مختلف ہوتی ہیں۔"

"ٹی وی کے مختلف برانڈز کی طرح۔ درحقیقت اندر سے سب ایک سی ہوتی ہیں۔ ایک ہی فنکشن پر کام کرتی ہیں اور ایک جیسی تفریح دیتی ہیں۔"

"عورتیں چیز نہیں ہوتی ہیں۔" میں نے تردید کی۔ "وہ بھی ہماری طرح انسان ہوتی ہیں۔"

"چلو ایسا ہی سہی لیکن دنیا میں ان کی حیثیت آرائش سے زیادہ نہیں ہے۔"

"یہ تم لوگوں کی متعصبانہ سوچ ہے۔ ورنہ مشرق میں عورت کو نسلوں کی تعمیر کرنے والی سمجھا جاتا ہے۔"

"عورتوں کے سب سے زیادہ حقوق مشرق میں غصب کیے جاتے ہیں۔" وہ بدمزگی سے بولا۔

"حالانکہ حقوق تم لوگوں نے غصب کیے ہیں عورت کو اس کے بنیادی مقام سے محروم کر کے اسے اپنی تفریح کا ذریعہ بنا لیا ہے۔"

"بلاوجہ کی بحث مت کرو۔" جینا غصیلے لہجے میں بولی۔ "مشرق ہو یا مغرب مرد نے اکثر عورت کا استحصال ہی کیا ہے۔ ایک دوسرے کو الزام مت دو۔"

"تم درست کہہ رہی ہو۔ مرد نے اکثر عورت کو دبایا ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "لیکن اس میں قصور عورت کا بھی ہے جس نے اپنا اصل مقام فراموش کر دیا ہے۔"

ہم تینوں کی حالت خستہ تھی۔ جان گرے کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ میری پشت پر بھی گولی کا زخم تھا۔ جینا تھکی ہوئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ شاید یہ پانی میں بھیگنے کا اثر تھا جو برف سے زیادہ سرد تھا۔ وہ ایک کونے میں سکڑ کر کانپنے لگی تھی۔ "کیا ہوا؟"

"مجھے...... سس...... سردی لگ رہی ہے۔" وہ لرزتے لہجے میں بولی۔

"سردی تو سب کو لگ رہی ہے۔" میں نے اسے تسلی دی مگر مجھے خدشہ ہوا کہ شاید اسے ہائپو فوبیا ہو رہا ہے۔ اس کیفیت میں جسم رفتہ رفتہ اپنی حرارت کھونے لگتا ہے۔ نوے درجے فارن ہائٹ پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور اگر درجہ حرارت ستاسی درجے فارن ہائٹ سے گر جائے تو دل رک جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے انسان وفات پا جاتا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ جو برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی گیلی جیکٹ اوپر سے اس پر ڈال دی لیکن اس کا لرزنا کم نہیں ہوا۔ جان گرے بھی پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے کشتی سنبھالنے کو کہا اور خود اس کے پاس چلا گیا اس نے جینا کو خود سے لپٹا لیا۔ اس طرح وہ اسے حرارت پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دریا نشیب و فراز سے گزر رہا تھا جہاں گزرگاہ ذرا تنگ ہوتی تھی۔ وہاں دریا بپھر جاتا تھا۔ میں کشتی کو زیرِ آب چٹانوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دریا رفتہ رفتہ نیچے جا رہا تھا۔ دائیں بائیں




جہاں تک نظر جاتی تھی برف پڑی تھی۔ جنگلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے بعض جگہوں پر زمین اور بہتا پانی نظر آیا اس کے سوا برفانی طوفان نے ہر جگہ برف کی تہہ جما دی تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا اور کشتی کا انجن بند کرتے ہوئے اسے کنارے سے لگا دیا۔ اور خشکی پر کود کر کشتی کو ذرا اوپر کھینچ لیا۔

"تم لوگ رکو میں جنگل سے لکڑی تلاش کر کے لاتا ہوں۔"

میں نے سوچا تھا کہ چپو کا کام ہم لکڑی سے بھی لے سکتے تھے۔ جان گرے نے مجھے روکا۔

"رکو...... اسے حرارت کی ضرورت ہے ورنہ یہ مر جائے گی۔"

میں مسکرایا۔ "اب تمہیں اس کی زندگی کی فکر ہے۔"

"اسے جنگل میں لے چلو۔ ہم وہاں آگ جلا کر اسے حرارت دے سکتے ہیں۔"

"اور کوئی تلاش کرتا آ گیا تو۔" میں نے کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے کہاں چھپائیں گے۔"

جان گرے نے اردگرد دیکھا اور پھر ذرا آگے واقع جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں چھپا سکتے ہیں۔"

"ہم کشتی کو چھپا سکتے ہیں لیکن برف پر اسے گھسیٹے جانے کے نشانات کیسے چھپائیں گے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ اسے بچانا اہم ہے۔ کوئی بھی آ جائے۔ میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ اپنی جان سے زیادہ اہم اسے بچانا ہے۔ کاش تم ہر شخص کے بارے میں ایسا ہی سوچتے۔"

"میرے لیے جینا اہم ہے، پلیز اسے بچاؤ۔"

میں نے جینا کو بازوؤں پر اٹھا لیا۔ "تم کوشش کر کے کشتی کو آگے لاؤ۔ کہیں پانی سے اسے بہا نہ لے جائے۔"

درختوں کے اندر سردی کی شدت کھلی فضا اور دریا کی سطح کی نسبت کم تھی لیکن اتنی بھی کم نہیں تھی کہ جینا کو اس سے حرارت ملتی۔ اسے حرارت پہنچانے کے لیے آگ جلانا اشد ضروری تھا۔ میں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر اسے لٹا دیا۔ جان گرے جتن کر کے کشتی کو اوپر کھینچ لایا تھا۔ میں نے اس کی مدد کی اور کشتی کو جھاڑیوں کے عقب میں پہنچا دیا۔ اسلحہ اس پر چھوڑ کر ہم نے صرف اپنی رائفلیں لی تھیں۔ میں نے جھاڑیوں کا معائنہ کیا۔ ان کی شاخیں موٹی اور خشک تھیں۔ جان گرے کو گھاس جمع کرنے کو کہہ کر میں نے چاقو سے جھاڑی کی خشک شاخیں کاٹنے لگا جب تک میں نے ایک ڈھیر جمع کیا۔ جان گرے اِدھر اُدھر سے خشک گھاس جمع کر چکا تھا۔ اسے جمع کر کے ان پر جھاڑیوں کی شاخیں جمائیں۔ لائٹر سے آگ دکھانے پر ذرا دیر میں شاخیں دھوئیں کے ساتھ جلنے لگیں۔ میں نے سہارا

دے کر جینا کو ان کے قریب کر دیا۔ حرارت سے اسے سکون ملا تھا لیکن اس کا لرزنا کم نہیں ہوا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد اس کا لرزنا پھر سے بڑھ گیا تھا۔ بیرونی حرارت بھی اسے فائدہ پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔ سردی اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جان گرے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے کہا۔

''یوسف......تم یہاں سے جاؤ۔''

''کیوں؟'' میں چونکا تھا۔

اس نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ ''میں...... میں اسے حرارت پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

اس کا مطلب سمجھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ''او کے۔''

''جب تک میں آواز نہ دوں ادھر مت آنا۔'' جان گرے نے کہا۔

میں ان کے پاس سے اُٹھ کر کشتی کے پاس آ گیا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے مزید خشک گھاس جمع کی اس پر جھاڑی سے شاخیں کاٹ کر ڈالیں اور لائٹر سے آگ دکھا دی۔ ذرا دیر میں مَیں اس کی حرارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ بھی آگ پر خشک کر لی۔ پھر اسے پہن کر اپنی جرسی خشک کی۔ خون آلود جیکٹ پھینک دی تھی۔ گزشتہ تین چار گھنٹے میں پہلی بار سکون ملا تھا۔ ورنہ سردی اور خاص طور سے یخ پانی نے ہاتھ پیروں کی حرارت چھین لی تھی۔ کوئی پون گھنٹے بعد مجھے جان گرے کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہا تھا لہجے کی چہکار سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ میں درختوں تلے پہنچا تو جان گرے حرارت تاپ رہا تھا اور جینا اپنے بال باندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال تمتما گئے تھے۔ اس نے لرزنا بند کر دیا تھا۔ چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی چمک بحال ہو گئی تھی۔

''اب کیسی ہے طبیعت؟''

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے پیار سے جان گرے کی طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی پتلون زخم والی جگہ سے پھر سے سرخ ہو رہی تھی۔ یعنی خون رسنے لگا تھا۔ مگر وہ اس سے لاپروا لگ رہا تھا۔ جینا اس کے پاس آ بیٹھی تھی اس سے لگ کر حرارت تاپنے لگی۔ میں نے مشورہ دیا۔ ''اپنے اپنے کپڑے اور جوتے خشک کر لو۔''

انہوں نے لباس کے گیلے حصے اور جوتے اُتار کر آگ پر خشک کیے۔ جھاڑی کی شاخیں حیرت انگیز طور پر حرارت بخش ثابت ہوئی تھیں۔ ہمیں اس جگہ رُکے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اب دوبارہ چلنے کا سوچ رہے تھے کہ اوپر سے ہیلی کاپٹر کی گرج سنائی دی۔ وہ دریا کے اوپر سے گزرا تھا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ کیا یہ ہیلی کاپٹر ہماری تلاش میں تھا، ورنہ اس موسم میں اس علاقے میں کاپٹر اُڑانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ کشتی جھاڑیوں کے درمیان محفوظ تھی۔ میں اُٹھ کر باہر آیا۔ ہیلی کاپٹر مخالف سمت میں دریا کے اوپر ہی پرواز




کرتا جا رہا تھا۔ وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ اس کی ساخت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ میں واپس آیا۔ میرے مقابلے میں جینا اور جان گرے اتنے فکر مند نہیں تھے وہ ایک دوسرے میں خاصے مگن نظر آ رہے تھے۔ جینا بی بی نے جان گرے کے معاملے میں یوٹرن لیا تھا اور اب وہ اس سے والہانہ انداز میں چپکی تھی۔

''میرا اندازہ ہے یہ ان لوگوں کا کاپٹر ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جان گرے نے سر ہلایا۔ ''اس لیے ہمیں کچھ دیر اور یہاں رُکنا چاہیے۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' جینا منمنا کر بولی۔

''ہمیں کھانے کے لیے کچھ تلاش کرنا ہوگا۔'' جان گرے نے میری طرف دیکھا۔

''یعنی مجھے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''کوئی پھل یا سبزی تو ملنے سے رہی۔ ممکن ہے کوئی جانور مل جائے۔''

''پستول لے جانا رائفل سے آواز گونجے گی۔'' جان گرے نے مشورہ دیا۔

''مجھے بھی پتا ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا اور اُٹھ کر درختوں سے آگے بڑھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی خرگوش مل جائے گا لیکن خاصی دور نکلنے کے بعد بھی کوئی خرگوش تو کیا چوہا یا گلہری تک نظر نہیں آئے۔ جنگل بالکل خالی تھا یا جانور اپنے ٹھکانوں پر دبکے ہوئے تھے۔ راستہ بھٹک جانے کے خیال سے میں واپس آنے لگا تھا کہ ایک جھاڑی میں ہلچل ہوئی اور اس میں سے ایک چھوٹا سا بارہ سنگھا نکل کر بھاگا۔ میں نے بے اختیار اس پر فائر کیا۔ گولی اس کی عقبی ٹانگ پر لگی وہ گرا اور دوبارہ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اس بار میں نے اس کی دوسری ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹھنڈا پڑتا میں نے اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن پر چھری چلا دی۔ یہ بچہ تھا۔ مگر ہمارے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ جب میں اسے اُٹھا کر واپس پہنچا تو جینا اور جان گرے ہڑبڑا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

''وہ ہمیں پتا نہیں چلا کہ تم کب آئے؟'' جان گرے خفت سے بولا۔

''دشمن آ جاتا تو اس کے سامنے بھی یہی عذر پیش کرتے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''تم ہنی مون پر نہیں آئے ہو۔''

جان گرے چپ رہا لیکن جینا چیخ کر بولی۔ ''تم جیلس ہو رہے ہو۔''

میں ہنس دیا۔ ''جان گرے تمہیں بتائے گا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔''

میں بارہ سنگھے کی کھال اُتارنے لگا۔ ظاہر ہے میں اس کام میں اناڑی تھا۔ جان گرے نے دوسرا چاقو لے کر میری مدد کی۔ ہم نے گوشت اُتارا اور شاخوں میں پرو کر اسے آگ پر بھوننے لگے۔ یہ کام جینا کر رہی تھی۔ گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تو سب کا موڈ ہی خوشگوار ہو گیا تھا جب ہم سادہ

سے تکے کھا رہے تھے تو ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی آواز آئی۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا اس بار وہ اس سمت جا رہا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ گویا اسے ناکامی پر واپس بلوا لیا گیا تھا۔ ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ دن کے بجائے رات میں سفر کریں گے۔ تب تک اس جگہ رُکیں گے۔ جان گرے نے الاؤ میں مزید لکڑی ڈالی اور ہم آرام کرنے لگے۔

''تم تھکے ہوئے ہو سو جاؤ۔ میں اور جینا پہرہ دیں گے۔'' جان گرے نے پیش کش کی۔

''پہرہ ہی دینا...... کہیں......'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ دونوں جھینپ گئے تھے۔ میں نے الاؤ کے قریب لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور ذرا دیر میں سو گیا۔ ایک اور مار دھاڑ اور خون وگشت سے عبارت دن ڈھل گیا تھا۔ جب جان گرے نے مجھے جگایا۔ جینا ایک طرف بے خبر سو رہی تھی اس نے مرنے والے حملہ آور کی اضافی جیکٹ اوڑھ رکھی تھی۔ جان گرے کی آنکھیں بھی بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید زخم کی تکلیف سے اسے بخار ہو گیا تھا۔ ''چار گھنٹے بعد مجھے جگا دینا۔ ہم روانہ ہوں گے۔''

میں نے اُٹھ کر الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈالیں۔ شاید جان گرے اور جینا مزید لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پتھروں کی مدد سے دریا کی سمت ایک دیوار سی بنائی تھی تا کہ الاؤ کی روشنی براہِ راست اس طرف سے نظر نہ آئے۔ گوشت کم رہ گیا تھا۔ یعنی یہ نیا نیا عاشق جوڑا دیگر مشاغل کے ساتھ طعام میں بھی مصروف رہا تھا۔ میں نے بارہ سنگھے کے ڈھانچے سے بچا کچا گوشت بھی نکال لیا۔ اس میں سے کچھ کھایا اور باقی اس کی کھال کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر محفوظ کر لیا۔ بھرپور آرام کر کے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ جان گرے نے مجھے سات گھنٹے سونے دیا تھا۔ یقیناً اسے میری ہمدردی نہیں تھی۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے اور جینا کے رومانس میں مخل نہ ہوں۔ جب وہ بالکل تھک گئے تھے تب جان گرے نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے اُٹھ کر کشتی میں موجود اسلحے کا جائزہ لیا۔ یہ اتنی مقدار میں تھا کہ ہم کسی چھوٹی موٹی فوج کا مورچہ بند ہو کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ میں نے رائفلیں صاف کیں۔ جن کے میگزین میں گولیاں کم تھیں ان میں نئے میگزین لگائے جو میگزین نکالے تھے ان کی گولیاں نکال کر انہیں پھینک دیا کہ بلاوجہ بوجھ اُٹھانے کا کیا فائدہ۔

جینا نے مرنے والوں کی جیب سے پیسے بھی نکال لیے تھے۔ یہ مجموعی طور پر کئی ہزار پونڈز تھے۔ جو ہمارے کام آ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جان گرے کے پاس بھی رقم تھی اگر ہم کسی آبادی تک پہنچ جاتے تو ہمیں مالی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں نے ایک بوتل نکالی اور دریا پر جا کر اس کا یخ بستہ پانی پیا۔ رات کے وقت ٹھنڈ زیادہ تھی اگر الاؤ نہ ہوتا تو ہم درختوں تلے بھی منجمد ہو کر رہ جاتے۔ جان گرے نے مجھے آٹھ بجے اُٹھایا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بارہ بجے سفر کیا جائے جبکہ میرے خیال میں ہمیں اندھیرا ہوتے ہی روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ جان گرے نے اپنی خرمستیوں میں خاصا وقت ضائع کیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تھکا ہوا سو رہا تھا اور میں اسے وقت سے پہلے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔





بارہ بجے میں نے اسے اور جینا کو اُٹھایا۔ ''چلنے کا وقت آ گیا ہے۔''

جان گرے کو بخار ہو رہا تھا۔ میں نے رومال ہٹا کر اس کا زخم دیکھا۔ وہ خراب تو نہیں تھا مگر اس میں پھر بھی کچھ نہ کچھ انفکشن ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اور اس سے زیادہ زخم کی طرف سے بے پروا رومانی سرگرمیوں کی وجہ سے جان گرے کو بخار ہوا تھا۔ میں نے جینا کے ساتھ کشتی پانی میں اُتاری۔ اسے وہیں چھوڑ کر سامان کو کشتی میں منتقل کیا اور آخر میں جان گرے کو لے جا کر لٹایا۔ دو عدد چپٹی لکڑیاں چپو کے طور پر رکھ لی تھیں۔ اس مقام پر دریا کا پاٹ وسیع تھا اور بہاؤ بھی تیز تھا مجھے امید تھی اگر راستے میں کوئی مسئلہ نہ ہوا تو صبح تک ہم اس جگہ سے سو سوا سو میل دور نکل جائیں گے۔ میں نے بہاؤ میں آتے ہی چپو سنبھال لیے تھے۔ جینا کو چھوٹی سی ٹارچ دے دی تھی جو ایک حملہ آور کے پاس سے ملی تھی۔ اس کا کام تھا وقفے وقفے سے ٹارچ روشن کر کے مجھے راستہ دکھاتی رہے تا کہ میں بے خبری میں کسی چٹان پر کشتی نہ چڑھا دوں یا کسی آبشار میں نہ جا گریں۔ مگر دریا میں ڈھلان اتنی تیزی سے آئی کہ میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ جینا ایک ایک منٹ کے وقفے سے پانچ سیکنڈ کے لیے لائٹ روشن کر رہی تھی۔ اس نے جب دوبارہ ٹارچ روشن کی تو ڈھلان شروع ہو چکی تھی جس پر پانی بے پناہ تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ میں نے چلا کر جینا کو ٹارچ روشن رکھنے کو کہا اور لکڑی کے چپوؤں کی مدد سے کشتی کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس جگہ دریا میں بڑی بڑی چٹانیں بھی تھیں۔ کشتی ان سے رگڑ کھاتی اور ٹکراتی تیز دھارے پر بہہ رہی تھی۔ میں کشتی کے اگلے حصے میں آ گیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا ہک تھاما اور دوسرے ہاتھ سے لکڑی کی مدد سے کشتی کو چٹانوں سے دور رکھنے لگا۔ جیسے ہی کوئی چٹان نزدیک آتی میں اس پر لکڑی ٹکا کر کشتی کا رُخ دوسری سمت کر دیتا۔ جینا میرے عقب میں کھڑی روشنی دکھا رہی تھی۔ جان گرے جاگ گیا تھا اور اپنا توازن برقرار رکھنے کے ساتھ اسلحے کو بھی دریا بُرد ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی دو رائفلیں جھٹکوں کی وجہ سے دریا میں جا گری تھیں۔ اس جگہ پانی کا اُچھال، اتنا زیادہ تھا کہ ہم بہ مشکل خود کو کشتی میں قائم رکھے ہوئے تھے۔ میں آج بھی سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے اس رات نہ جانے کیسے ہم دریا میں جانے سے محفوظ رہے تھے۔ حالانکہ ہمارے پاس چپو تک نہیں تھے۔ کشتی بے شمار بار چٹانوں سے ٹکرائی۔ ان کے اوپر سے گزرتے ہوئے اس کے پیندے سے رگڑ لگی مگر وہ سوراخ سے محفوظ رہی۔

ڈھلان جیسے اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ختم بھی ہو گئی اور کشتی ایک بار پھر پُرسکون دریا میں بہنے لگی تھی۔ مجھے اور جینا کو کچھ دیر یقین نہیں آیا۔ ہم جھانک جھانک کر دریا کی سطح کو گھورتے رہے اور جب یقین ہو گیا کہ خطرناک حصہ گزر چکا ہے تو ہم بے جان سے ہو کر کشتی میں گر گئے۔ مشکل سے دس پندرہ منٹ کی اس زور آزمائی نے کم سے کم میری ساری جان کھینچ لی تھی۔ جینا کا حال مجھ سے بھی بُرا تھا۔ وہ گٹھری سی بنی کشتی کے فرش پر گری تھی۔ میں نے جان گرے سے کہا۔ ''تم ٹارچ لے کر ذرا سامنے نظر رکھو کہیں پھر کوئی خطرناک حصہ نہ آ جائے۔''

جان گرے جینا سے ٹارچ لے کر آگے چلا گیا۔ میں نے اپنی خوراک کے ذخیرے کا جائزہ لیا اور اسے محفوظ پا کر سکھ کا سانس لیا۔ اس ویرانے میں وہ ہماری واحد خوراک تھی۔ البتہ اسلحے میں سے کئی رائفلیں اور میگزینز کم نظر آرہے تھے۔ بہرحال ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ اصل چیز اپنی جان تھی اور وہ بچ گئی تھی۔ چند منٹ بعد میری حالت سنبھل گئی تھی۔ جان گرے کو آرام کرنے کے لیے بھیج کر میں نے ٹارچ بھی خود سنبھال لی تھی۔ اس کے سیل خاصے طاقتور تھے جواب تک چل رہے تھے۔ کشتی کے فرش پر پانی اُچھل اُچھل کر جمع ہوا تھا اسے نکاس کے راستے سے نکالا، ایک بار پھر نمی اور سردی نے حملہ کیا تھا۔ جینا اور جان گرے لرز رہے تھے۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاؤ۔" میں نے مشورہ دیا تو جینا اس سے لپٹ گئی۔ ان کے اوپر میں نے اضافی جیکٹ ڈال دی۔ دریا نہ جانے کس طرف جا رہا تھا۔ بہرحال امید تھی کہ یہ کسی نہ کسی شہر یا قصبے سے ضرور گزرے گا۔ اگلے چار گھنٹے تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی صبح سات بجے ہلکی سی روشنی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب ہمیں کوئی ٹھکانہ تلاش کر لینا چاہیے تھا جہاں کشتی بھی چھپائی جا سکے۔ دشمن صبح ہوتے ہی ہماری تلاش شروع کر دیتا مگر دشمن زیادہ چالاک تھا اس نے مکمل صبح کا انتظار نہیں کیا۔ ہیلی کاپٹر اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ میں نے آواز سن کر پلٹ کر دیکھا اور چیخ کر جان گرے اور جینا کو ہوشیار کیا۔ "دشمن سر پر آگیا ہے۔"

جان گرے کی حالت رات بھر کے آرام سے زیادہ جینا کی قربت نے بہتر بنائی تھی۔ اس نے جلدی سے ایک رائفل اُٹھائی۔ جینا بھی ہڑبڑا کر اُٹھ گئی تھی۔ میں نے انجن کی ڈوری کھینچتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "تمہیں کشتی چلانی آتی ہے؟"

"میں سنبھال لوں گی۔"

"ہوشیار وہ حملہ کرنے والے ہیں۔" جان گرے چلایا۔

"کشتی کو لہراتے ہوئے چلاؤ اور دریا کے کنارے چھپنے کے لیے کوئی موزوں جگہ بھی تلاش کرو۔" جینا کو سمجھا کر میں بھی رائفل لے کر جان گرے کے پاس آگیا۔ کاپٹر سے بچ مچ حملے کی تیاری کی جا رہی تھی اس کی بلندی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے بائیں پہلو کو سامنے آتے دیکھا۔ اس میں ایک سیاہ وردی پوش ایل ایم جی ساخت کی گن لیے بیٹھا تھا۔ گن کسی جگہ فکس تھی۔ اس نے ہینڈل گھماتے ہوئے اس کا رخ کشتی کی طرف کیا۔ جینا میری ہدایت کے مطابق اسے لہرا رہی تھی۔ اس وجہ سے گولیوں کی پہلی بوچھاڑ خاصے فاصلے پر دریا میں گری۔ بتدریج کاپٹر ہمارے نزدیک آرہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ دریا کے دونوں جانب جھاڑیاں تھیں اور کہیں اُترنے کی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم پانی میں چھلانگ لگا کر بھی نہیں بچ سکتے تھے اوپر منڈلاتے قاتلوں سے بچ بھی جاتے تب بھی دریا کا پانی جان لیوا حد تک سرد تھا۔

دوسرا برسٹ ہمارے اوپر سے گزر کر دریا میں ذرا آگے گرا۔ اس کے بعد تو اس نے مسلسل ہی





فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہمیں جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ واپس جا کر ناشتہ کر سکے۔ جینا مہارت سے کشتی لہرا رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر ہماری رائفلوں کی حد سے باہر ہی تھا لیکن پھر بھی ہم نے کئی بار جوابی فائرنگ کی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کاپٹر ہمارے زیادہ نزدیک نہیں آیا تھا اور دور سے اس کی گولیاں ہم سے دور ہی سے گزر رہی تھیں۔ پھر شاید جھنجھلاہٹ میں پائلٹ نے کاپٹر نزدیک لانا شروع کر دیا۔ جینا بولی۔ "ذرا آگے ایک جگہ نظر آرہی ہے ہم وہاں اُتر سکتے ہیں۔"

یہ بات شاید ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے بھی بھانپ لی تھی۔ اس لیے وہ تیزی سے ہمارے نزدیک آرہا تھا۔ گولیاں بھی نزدیک سے گزر رہی تھیں۔ کاپٹر کی مشین گن میں یقیناً بیلٹ باکس میگزین تھا اس لیے گنر بے فکر ہو کر فائر کر رہا تھا۔ میں نے رائفل سنگل لوڈ پر کی اور جینا سے کہا۔ "کشتی سیدھی چلاؤ۔"

"کیا کہہ رہے ہو وہ ہمیں بھون دے گا۔" جان گرے بوکھلا کر بولا۔

"صرف پانچ سیکنڈ کے لیے۔ جیسے ہی میں ون کہوں بوٹ سیدھی کر کے سپیڈ بند کر دینا۔"

میں نے رائفل سیدھی کی اور گنر کا نشانہ لینے لگا۔ لہرانے سے نشانہ درست نہیں ہو پا رہا تھا پھر میں نے جیسے ہی ون کہا۔ جینا نے کشتی لہرانا بند کر کے انجن کی ریس صفر کر دی تھی۔ کشتی یک دم رُک سی گئی اور کاپٹر تیزی سے نزدیک آنے لگا۔ اس کا پائلٹ اور گنر ہماری اس حرکت سے بوکھلا گئے تھے۔ جیسے ہی میں نے محسوس کیا گنر نشانے پر ہے۔ سانس روک کر فائر کر دیا۔ میں نے گنر کو جھٹکا کھا کر پیچھے جاتے دیکھا لیکن اس سے پہلے وہ ایک برسٹ مار چکا تھا۔ جان گرے نے بھی کاپٹر کو نزدیک آتے دیکھ کر فائر کھول دیا تھا۔ میں نے بھی برسٹ پر لا کر پورا میگزین ہی خالی کر دیا۔ اچانک کاپٹر کے پہلو سے دھواں سا نکلنے لگا تھا۔ میں نے نعرہ لگایا۔ ہماری کوئی گولی کارگر ہوئی تھی۔ خطرہ بھانپتے ہی کاپٹر تیزی سے پسپا ہونے لگا۔ گنر کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مرا نہیں تب بھی زخمی ضرور ہوا ہوگا۔ کاپٹر بھی زخمی ہوا تھا اور عارضی طور پر دشمن سے نجات مل گئی تھی۔ اچانک میرے پیروں تلے کشتی ڈگمگائی۔ میں گرتے گرتے بچا۔ جینا چلائی۔ "میرے خدا اس میں سوراخ ہو گیا ہے۔"

کاپٹر سے چلائی ایک گولی کارگر ہوئی تھی۔ اس نے کشتی کے وسطی حصے میں دائیں جانب سوراخ کر دیا تھا۔ کشتی کی ہوا خارج ہو رہی تھی۔ "رفتار تیز کرو۔" میں نے سوراخ پر ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ "جلد از جلد کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

میرے ہاتھ سے دبانے کے باوجود ہوا نکلنے کی رفتار برقرار رہی تھی۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا تو سارا ہی پہلو چھلنی نظر آیا۔ کاپٹر کے گنر کا چلایا آخری برسٹ کام کر گیا تھا۔ کشتی کی ہوا برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان نظر آنے والا ساحل کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جینا نے انجن کو پوری ریس دے رکھی تھی مگر ہوا خارج ہونے کی وجہ سے کشتی کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

"میرے خدا لگتا ہے ہمیں پھر پانی میں تیرنا پڑے گا۔" جینا دہشت زدہ ہو کر بولی۔

مجھے اس کا خیال درست لگ رہا تھا۔ کشتی پر سے بوجھ کم کرنے کے لیے ہم نے سوائے تین رائفلوں کے باقی سارا اسلحہ پانی میں پھینک دیا اور جب کشتی میں پانی بھرنے لگا تو یہ رائفلیں اور باقی میگزین بھی پھینک دیئے۔ کنارہ ابھی بھی پچاس گز دور تھا۔ ہم نرم پڑتے ربر پر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک انجن والا حصہ پانی میں بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے انجن الگ کر کے پانی میں چھوڑ دیا۔ اب ربر کا یہ نرم پڑتا تھیلا دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کنارے سے دور ہی تھا۔ میں نے پستول اور گوشت اپنی جیکٹ میں رکھا۔ ''جیسے ہی کشتی کنارے کے سامنے پہنچے کود جانا۔''

کنارا ابھی چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ جان گرے نے فریاد کی۔ ''مجھ میں طاقت نہیں ہے میں ڈوب جاؤں گا۔''

''فکر نہ کرو تمہیں ہم سنبھال لیں گے۔'' جینا نے اسے تسلی دی۔

کشتی کا بیشتر حصہ پانی تلے جا چکا تھا اور ہمارے جوتے پانی میں تھے۔ ہم لہروں پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک جینا کا توازن بگڑا اور وہ پانی میں جا گری۔ جب جان گرے لڑھکا تو میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔ یخ بستہ پانی پاگل کتے کی طرح کاٹنے لگا تھا۔ میں نے اوسان برقرار رکھتے ہوئے جان گرے کو سنبھالا دوسری طرف سے اسے جینا نے پکڑا اور ہم کنارے کی طرف جانے لگے۔ اس حصے میں دریا کا بہاؤ تیز تھا اور وہ ہمیں کھینچ کر کنارے سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جینا کوشش تیز کرو۔ ورنہ دریا ہمیں بہا لے جائے گا۔ جان ہمت کرو ہاتھ پاؤں چلاؤ۔''

جان گرے غنودگی سے چونکا اور پاؤں چلانے لگا۔ کنارہ اب بیس گز دور اور ذرا آگے تھا ہم اس کے پاس سے گزرتے جا رہے تھے اگر کنارہ نکل جاتا تو اس کے بعد دور تک جھاڑیاں تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر پانی میں رہنا پڑتا اور پانی کی یخ جتنی تیزی سے ہماری توانائی سلب کر رہی تھی چند منٹ سے زیادہ تیرنا محال لگ رہا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ پاؤں تلے زمین آ جائے۔ اس کے بعد کا کام آسان ہو جاتا مگر دریا یہاں پر گہرا بھی تھا۔ ''میری ہمت جواب دے رہی تھی۔'' جینا ہانپتے ہوئے بولی۔

''تم اسے چھوڑو آگے جاؤ میں جان کو سنبھال لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... اس طرح تم دونوں ڈوب جاؤ گے۔'' وہ تیرتے ہوئے بولی۔

ہم کنارے کے عین سامنے تھے اور وہ اب بھی بارہ تیرہ گز کے فاصلے پر تھا۔ اگر ہم دریا کے بہاؤ کے ساتھ اس سے آگے نکل جاتے تو واپس پلٹنا محال تھا۔ دریا کے ساتھ بہنے میں ہی ساری توانائی صرف ہو گئی تھی۔ جینا اپنی ہمت سے بڑھ کر کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''جینا بس آخری کوشش کرو ابھی یا کبھی نہیں اگر ہم کنارے تک نہیں پہنچ سکے تو پھر کبھی نہیں پہنچیں





گے۔''

اس نے سر ہلایا اس وقت بولنے کے لیے بھی طاقت نہیں تھی۔ میں نے سن رکھا ہے کہ انسانی جسم میں قدرت نے توانائی کے اضافی ذخائر رکھے ہیں جب عام طاقت جواب دے جاتی ہے تو توانائی کے یہ ذخیرے اس کے کام آتے ہیں۔ شاید اس روز ہم نے توانائی کے ان پوشیدہ ذخائر کی مدد سے موت پر فتح پائی تھی۔ ایک ناقابلِ بیان جدوجہد کر کے ہم کنارے تک جا پہنچے تھے۔ مجھے صحیح سے یاد نہیں کہ ہم کس طرح کنارے پر چڑھے اور اس وقت تک اس کی ریت پر بے سدھ پڑے رہے جب تک سورج کی نرم اور بے حرارت کرنوں نے ہمارے چہرے نہیں سہلائے تھے۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو مجھے لگا جیسے زمین کی کشش کئی گناہ بڑھ گئی ہو۔ بہ مشکل تمام میں اُٹھا۔ جان گرے بے ہوش تھا یا اس میں آنکھیں کھولنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ البتہ جینا چت لیٹی آنکھیں کھولے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مر چکی ہے لیکن اس کے جیکٹ تلے ڈوبتے اُبھرتے سینے کو دیکھ کر اس کے زندہ ہونے کا یقین آ گیا۔

البتہ جان گرے کی حالت خراب تھی۔ اس کا سانس پُرشور اور اُکھڑا اُکھڑا تھا۔ سرد پانی کی وجہ سے شاید اسے نمونیہ کا حملہ ہوا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ہلایا جلایا مگر وہ بے سدھ ہی رہا۔ میں مشکل سے کھڑا ہوا۔ ذرا چلا پھرا تو جسم کھلنے لگا۔ میں نے جینا سے کہا۔ ''کنارے سے ہٹ جاؤ ممکن ہے وہ پھر پلٹ کر آئیں۔''

''اب آ ہی جائیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''اتنی مصیبتیں برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی مر جائے۔ ایک بار ہی چھٹکارا مل جائے۔''

''زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی ہے۔'' میں نے اردگرد دیکھا۔ ''تم یہیں رُکو میں دیکھ کر آتا ہوں ممکن ہے یہاں پر پاس آبادی ہو ہمیں مدد مل جائے۔''

''جاؤ تم نے کہاں جانا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

اس ساحل کے بعد جھاڑیاں تھیں۔ دراصل یہ ریتیلا قطعہ تھا جو کسی وجہ سے جھاڑیوں سے بچ گیا تھا۔ میں ایک طرف کی جھاڑیاں ہٹاتا آگے بڑھنے لگا اور جب جھاڑیاں ختم ہوئیں تو ایک ناقابلِ یقین منظر سامنے آیا۔ میں ایک فارم ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے وسیع احاطے میں کوئی فرلانگ بھر دور چند عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کم سے کم ایک واضح طور پر رہائشی تھی۔ اس کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایک عمارت کے سامنے ٹریکٹر شیڈ تلے کھڑا تھا۔ ساخت سے وہ چارہ اور اناج ذخیرہ کرنے والا گودام لگ رہا تھا۔ دوسری عمارت طویل اور نیچی چھت تھی۔ یہ جانوروں کا باڑہ لگتا تھا۔ برطانیہ میں اس طرز کی عمارتیں دیکھی تھیں۔ فارم کے چاروں طرف اونچی اور گھنی خاردار باڑھ لگی تھی۔ جس سے کوئی انسان تو کیا کسی خرگوش کا گزرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں سے نکل کر باڑھ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ عمارتیں فارم کے دائیں طرف والے حصے میں تھیں اس

لیے میرا اندازہ تھا کہ داخلی راستہ بھی اس طرح ہی ہوگا۔ درختوں کے نیچے سے گزرتا میں ایک نیم پختہ سڑک تک پہنچا۔ یہ سڑک گھوم کر فارم کے اندر جارہی تھی۔ داخلی راستہ دو بڑے فولادی پٹوں پر مشتمل تھا۔ جس پر جالی لگی تھی۔ ستون پر ایک طرف کال بیل کا بٹن تھا۔ میں نے بٹن دبایا تو چند لمحے بعد کسی عورت نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ ہماری کشتی دریا میں ڈوب گئی ہے اور میرے ساتھیوں کی حالت خراب ہے۔''

''ایک منٹ رُکو۔'' عورت نے کہا۔

دو منٹ بعد مجھے اندر سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ اس کی فرنٹ سیٹوں پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ جیپ آ کر رُکی اور مرد نے اُتر کر گیٹ کھولا۔ ''مسٹر کون ہو تم؟'' مرد نے پوچھا وہ چالیس برس کا اور مضبوط جسم والا شخص تھا۔ پتلون کی جیب کا اُبھار بتا رہا تھا کہ اس کے پاس ہتھیار بھی ہے۔

''میرا نام جوزف ہے جناب! ہماری کشتی دریا میں ڈوب گئی ہے اور ہم مشکل سے تیر کر ساحل تک پہنچے ہیں۔ وہ لوگ ساحل پر ہی ہیں۔ مجھے شبہ ہے میرے ایک ساتھی کو ہائپوتھریا ہو گیا ہے۔ اس کی ران میں گولی بھی لگی ہوئی ہے۔''

''گولی۔'' مرد نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''گولی کیسے لگی؟''

''ہم شکاری ہیں جناب! اس دوران میں غلطی سے اسے گولی لگ گئی۔'' میں نے بات بنائی۔

اس دوران میں جبکہ مرد مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ عورت خاموشی سے جیپ میں بیٹھی رہی تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی اور چہرے سے جفاکش نظر آنے والی عورت تھی۔ اس نے جینز کے اوپر لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بالآخر مرد میری مدد کرنے پر آمادہ نظر آنے لگا۔ اس نے جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''آؤ بیٹھو اور اس جگہ تک میری رہنمائی کرو۔''

پانچ منٹ بعد میں اسے لے کر جان گرے اور جینا تک پہنچ گیا تھا۔ جان گرے کی حالت بدستور خراب تھی۔ مرد جس کا نام اسٹین تھا۔ اس نے تشویش سے جان گرے کو دیکھا۔ ''اس کی حالت واقعی خراب ہے۔ اسے اُٹھا کر جیپ تک لاؤ۔'' جان گرے کو اُٹھا کر ہم بہ مشکل جیپ تک لائے تھے۔ عورت نے جینا کو چادر دے دی تھی۔ ہم جیپ پر لد کر فارم ہاؤس تک آئے۔ یہ خاصا شاندار لکڑی اور پتھر کا بنا مکان تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ عورت یعنی مسز اسٹین نرس بھی تھی اور اس نے جان گرے کا علاج کیا۔ اسٹین اسے اندر لے گیا تھا جبکہ میں اور جینا نشست گاہ میں آتش دان کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں جینا سے کہا کہ وہ خود کو جان گرے کی بیوی اور ہمیں شکاری بتائے۔

''جان کو کہاں لے گئے ہیں یہ؟'' اس نے سرگوشی میں ہی پوچھا۔




''پتا نہیں......شاید اس کا علاج کر رہے ہیں۔''

آدھے گھنٹے میں مرد نے آ کر ہمیں نہانے اور کپڑے بدلنے کو کہا۔ ''میں نے تم دونوں کے لیے نئے کپڑے نکال دیئے ہیں آؤ میرے ساتھ۔''

''مسٹر اسٹین ہمارے ساتھی کی حالت کیسی ہے یہ اس کی بیوی ہے۔'' میں نے کہا۔

''شارمین اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔'' اسٹین پہلی بار مسکرایا۔ ''اپنے ساتھی کی فکر نہ کرو۔ شارمین تربیت یافتہ نرس ہے اگر ضرورت پڑی تو اسے ہسپتال بھی لے جائیں گے۔ فی الحال تم دونوں بھی نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے تم بھوکے بھی ہو۔''

''ہم نے رات شکار کا گوشت کھایا تھا لیکن آج صبح کچھ نہیں کھایا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں ناشتے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

اگلے ایک گھنٹے میں ہم نہا دھو کر ناشتے کی میز پر تھے۔ یہ فارم اسٹین کا ہی تھا۔ وہ کاشت کار تھا اور جانور بھی پالتا تھا لیکن دریا کے نزدیک یہ فارم ہاؤس کسی آبادی سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس مکان اور اس کے سامان سے لگ رہا تھا کہ اسٹین خاصا خوشحال قسم کا فارمر تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کی ایک ہی اولاد تھی جو ہاسٹل میں تھا۔ اس پورے گھر میں جا بجا اس کی تصاویر لگی تھیں۔ بارہ تیرہ سال کے اس لڑکے کی صورت اسٹین سے ملتی تھی۔ ناشتے کے دوران ہی شارمین بھی آ گئی۔ اس نے بتایا۔ ''تمہارے ساتھی کی حالت بہتر ہے۔ اس کا زخم ہلکا سا انفیکٹڈ ہے اس وجہ سے اسے بخار ہو گیا تھا۔ اسے سردی لگی ہے لیکن ہائپوتھریا نہیں ہے۔ میں نے ڈریسنگ کر دی ہے اور دوا بھی دے دی ہے۔''

''میڈم وہ بھوکا بھی ہے۔'' جینا بولی۔

''میں نے اسے دودھ دے دیا تھا۔ فی الوقت وہ سو رہا ہے۔ جاگے گا تو کھانا بھی کھا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے تم دونوں کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

اسٹین نے بیوی کی تائید کی۔ ''تمہاری کہانی ہم بعد میں سنیں گے۔''

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ باتھ روم میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ اپنی پیٹھ کے زخم کو جراثیم کش دوا سے صاف کر کے میں نے اوپر سے میڈی کیٹڈ پٹی چپکا لی تھی۔ مجھے اور جینا کو ساتھ ساتھ کمرے ملے تھے۔ مکان خاصا بڑا اور دو منزلہ تھا۔ اگرچہ اسٹین یا شارمین نے ہم پر شک نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی میں نے اپنا پستول چھپا لیا تھا۔ ہتھیاروں اور دوسرے سامان کے بارے میں انہیں یہی بتایا کہ وہ کشتی کے ساتھ ہی دریا بُرد ہو گیا تھا۔ جینا نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے کہا۔ ''ان لوگوں کا رویہ عجیب ہے۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اس موسم میں کوئی شکار کے لیے نہیں نکلتا ہے۔''

''میں نے بتایا کہ ہم لومڑی کے شکار پر نکلے ہیں۔''

''احمقانہ باتیں نہ کرو۔'' وہ بولی۔ ''اس موسم میں کسی قسم کا شکار ممکن نہیں ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب تو میں نے خود کو شکاری بتا دیا ہے۔ بہرحال یہ ہم پر شک کر سکتے ہیں۔''

''اور انہوں نے پولیس کو بلا لیا تو......''

''تب بھی پولیس کیا کرے گی۔ کیا کسی حادثے کا شکار ہونا جرم ہے۔''

''پولیس سے اطلاع ہمارے دشمنوں کو مل جائے گی۔'' جینا نے دانت پیسے۔

میں ذرا متفکر ہو گیا تھا۔ ''بہرحال میرا اندازہ ہے یہ ہم سے پوچھ گچھ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھائیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ورنہ یہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا۔''

''آمین۔'' میں نے کہا اور کمرے میں گھس گیا۔

اب مجھے ان سارے چکروں سے بے زاری محسوس ہونے لگی تھی۔ بے مقصد مار دھاڑ اپنی جان بچانے کے لیے قتل و غارت گری، جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میں اس دلدل میں زیادہ سے زیادہ دھنستا جا رہا تھا اور نجات کی کوئی راہ نہیں نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں کیوں خود کو جان گرے سے نتھی کیے ہوئے ہوں۔ میں اتنا بے وسیلہ تو نہیں تھا کہ اس کی مدد کے بغیر اس ملک سے نہ نکل پاتا۔ مجھے کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اللہ کوئی راستہ نکال دیتا۔ تب مجھے رحیم شاہ کا خیال آیا۔ وہ شخص جس نے میرے گھر والوں کے سفاکانہ قتل کے بعد مجھے یوسف تک پہنچایا تھا۔ جس کا مجھے نام ہی نہیں ملا تھا بلکہ قدرت نے مجھے اس سے اس حد تک مشابہہ بھی کر دیا تھا کہ اس کی بہن بھی دھوکہ کھا گئی تھی اور مجھے اپنے بھائی کا بیٹا سمجھ بیٹھی تھی۔

میں فیصلہ کر کے سو گیا کہ اب جان گرے کو اس کے حال پر چھوڑ کر مجھے از خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ میں جاگا تو شام کے سات بج رہے تھے اور میں خود کو اتنا تازہ دم محسوس کر رہا تھا کہ آج صبح تک جاری دربدری مجھے خواب لگنے لگی تھی۔ اسٹین نے مجھے گرم اونی پاجامہ اور اسی کپڑے کی بنی ڈھیلی سی شرٹ دی تھی۔ گھر کے اندر کا درجہ حرارت معمول کے مطابق تھا اس لیے یہ کپڑے ہی کافی تھے۔ میں باہر نکلا۔ اسٹین مجھے نشست گاہ میں آتش دان کے سامنے آرام کرسی پر جھولتا نظر آیا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''بہتر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا ساتھی کیسا ہے؟''

''وہ جاگ گیا تھا۔ شارمین نے اسے کھانا دے دیا تھا۔ وہ کھا کر پھر سو گیا ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے دیکھ لو، کافی کی یا کچھ کھانے کی خواہش ہے تو کچن میں چلے جاؤ۔ وہاں شارمین ہے۔''

''شکریہ...... میں کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہاں ایسا کوئی سسٹم ہے کہ میں اپنے کپڑے دھو سکوں۔''





''تمہارے بلکہ سب کے کپڑے شارمین نے دھو دیئے ہیں۔ اس سے لے لینا۔''

میں کچن کی طرف چلا آیا جو ڈائننگ روم کے ساتھ ہی تھا۔ وہاں شارمین شاید رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے میزبانی اور کپڑے دھونے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکرائی۔ ''بات یہ ہے کہ سردیوں میں باہر جانا بند ہی ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرصت ملتی ہے یہ کوئی خاص کام نہیں تھا اگر تمہیں اپنے کپڑے چاہئیں تو میں کمرے میں پہنچا دوں گی۔'' اس نے مجھے کافی کا مگ تھما دیا۔

''تم لوگوں کا رہن سہن اچھا ہے کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے۔''

''اول تو اس علاقے میں ملازمین ہیں ہی نہیں۔ جن لوگوں نے رکھے ہیں انہیں بھی خاصی رقم خرچ کر کے دوسرے علاقے سے منگوانے پڑتے تھے۔ دوسرے اسٹین ملازم رکھنے کے خلاف ہے۔ یہ فارم اس کے باپ نے بنایا ہے جسے اس کا ملازم قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔ تب سے اسٹین ملازم رکھنے کے سخت خلاف ہو گیا ہے۔ یقین کرو اس گھر اور فارم کا سارا کام ہم دونوں ہی کرتے ہیں۔''

''تم لوگوں کی ہمت ہے جو اتنے بڑے فارم اور گھر کو مل کر سنبھالتے ہو۔'' میں نے کافی کا سپ لیا۔ ''ویسے یہ علاقہ کون سا ہے؟''

''تم نہیں جانتے۔ یہ ایسٹ لندن سے کوئی تین سو کلومیٹر شمال مغرب میں ہے۔'' شارمین نے تعجب سے کہا تھا۔

''دراصل ہم بارہ گھنٹے سے زیادہ دریا پر سفر کرتے رہے ہیں اس لیے یہ نہیں معلوم کہ ہم کس علاقے میں آ نکلے ہیں۔''

''اگر تم اس دریا میں ہی سفر کرتے رہتے تو ایسٹ لندن کے قریب سمندر میں جا گرتے۔''

''ایسٹ لندن۔'' میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''وہاں تک جانے کے لیے سڑک کہاں پر ہے۔''

''یہاں سے چودہ کلومیٹر کے فاصلے سے ہائی وے گزرتی ہے وہاں سے تمہیں ایسٹ لندن جانے والی بس مل جائے گی۔ مگر تم ایسٹ لندن کیوں جانا چاہتے ہو۔ تم دوسری طرف سے آئے ہو۔''

''ہم ایسٹ لندن کے پاس ہی ایک قصبے سے آئے ہیں ایک سفاری ایجنسی نے ہمیں مس گائیڈ کیا اور ہم لومڑی کا شکار کرنے اس موسم میں چلے آئے۔ پرسوں آنے والے طوفان نے ہمارا کیمپ تہس نہس کر دیا۔ اور اسی دن ہمارا ساتھی بھی رائفل چل جانے سے زخمی ہو گیا۔'' میں نے بتایا وہ خاموشی سے سنتی اور کھانا بناتی رہی۔

''تم کوئی خاص چیز کھانا پسند کرو گے؟''

''میں گوشت نہیں کھاتا۔ باقی جو چاہے بنا لو۔'' میں نے کہا اور سٹین کے پاس نشست گاہ میں

چلا آیا۔ اس سے بات کرتا رہا اور اس کے سوالوں کے محتاط جواب دیتا رہا۔ اس دوران میں جینا بھی وہاں چلی آئی۔ مجھے یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ اس نے اپنا جامہ اُتار دیا تھا اور قمیص کے ساتھ ایک معمولی سی نیکر میں تھی۔ قمیص مشکل سے اس کی اوپری رانوں تک آ رہی تھی۔ اسٹین کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر چمک نمودار ہوئی تھی۔ ''مسز جان گرے تم ایک خوب صورت عورت ہو۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی۔ ''کیا میں اپنے شوہر کو دیکھ سکتی ہوں۔''

''کیوں نہیں۔'' اسٹین ہنسا۔ ''عورت کو اپنے شوہر کے پاس جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔'' اسٹین کا معنی خیز لہجہ محسوس کر کے جینا جھینپ گئی تھی۔ ''آؤ میں تمہیں تمہارے شوہر سے ملواتا ہوں۔''

''میں بھی چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں مسٹر جوزف! میاں بیوی کی ملاقات میں کسی تیسرے فرد کی موجودگی اچھی نہیں ہوتی ہے۔'' وہ ہنسا اور جینا کے ساتھ چلا گیا۔ مجھے اس کی اپنی نیت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ شارمین عام سی شکل وصورت کی عورت تھی۔ اس کے مقابلے میں جینا ہزار گنا زیادہ خوب صورت تھی۔ اس کی ٹانگیں دیکھ کر اسٹین کی آنکھوں میں پُر ہوس چمک نمودار ہوئی تھی۔ میں جز بز ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہونے والا ہے۔ ہمیں کہیں بھی سکون نہیں تھا۔ جینا اس کے ساتھ گئی تو میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے پورچ میں ایک جیپ کے علاوہ ایک بڑے سائز کی وین بھی کھڑی تھی۔ یقیناً اس وین کو سامان لانے لے جانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اگر میں رات کے وقت چپکے سے وین لے کر نکل جاتا تو صبح ان لوگوں کے بے دار ہونے سے پہلے ایسٹ لندن پہنچ سکتا تھا۔

''میں تم دونوں میاں بیوی کا شکر گزار ہوں۔'' مجھے جان گرے کی آواز آئی۔ ''اگر تم میری دیکھ بھال نہ کرتے تو شاید میرا آج آخری دن ہوتا۔''

''یہ ہمارا فرض ہے۔'' اسٹین کی گمبھیر سی آواز آئی۔ وہ تینوں ایک ساتھ نشست گاہ میں آئے۔

''لیکن تمہیں کم سے کم ایک ہفتے آرام کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر تمہاری حالت بہتر ہوگی۔''

''میں تو اس وقت بھی خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' جان گرے بولا۔

''مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' جینا نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''مجھے بھی۔'' اسٹین نے اس کو بھوکی نظروں سے دیکھا۔ اور جان گرے انجان بن گیا۔

ڈنر خاصا شاندار تھا۔ شارمین نے بیف کے ساتھ مچھلی فرائی بھی بنائی تھی۔ میرے لیے خاص طور سے پنیر ایگ سینڈوچ اور سلاد بنائی تھی۔ کھانے کے دوران اسٹین چہکتا رہا اور خاص طور سے جینا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ شارمین بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموشی سے کھاتی رہی۔ جان گرے نے بھی اپنی توجہ کھانے پر مرکوز رکھی تھی۔ اسٹین نے کہا تھا کہ جان گرے ابھی کچھ دن نہیں




جا سکتا تھا جبکہ مجھے وہ مکمل طور پر ٹھیک لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ چلتے ہوئے اس کے پاؤں میں لنگڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ شارمین نے اس کا اچھے طریقے سے علاج کیا تھا اور اسے زود اثر دوائیں دی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اتنی جلدی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں نشست گاہ میں چلے گئے اور میں شارمین کا ہاتھ بٹانے کے لیے رُک گیا۔ باتوں باتوں میں مَیں اس سے اردگرد کے علاقے کے بارے میں پوچھتا رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور جینا اب اسٹین سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہی صوفے پر اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی۔ شارمین کے چہرے پر یہ دیکھ کر سایہ آیا تھا مگر پھر وہ مسکرانے لگی تھی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جان گرے سے اس معاملے کے بارے میں پوچھا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

کافی نوشی کے دوران اسٹین اپنی رومانی فتوحات اور شکار کے قصے سناتا رہا۔ ایک بار اس نے جینا کی ران پر ہاتھ مارا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو اسٹین نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس بار شارمین برداشت نہ کر سکی اور وہاں سے اُٹھ گئی۔ ''مجھے کچن صاف کرنا ہے۔ جو کافی پی لے مگ مجھے وہاں پہنچا دے۔''

میں نے پُر ملامت نظروں سے جینا کی طرف دیکھا تو وہ مجھے نظر انداز کر کے اسٹین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں جھنجھلا گیا تھا۔ ''اب میں آرام کروں گا۔'' میں نے اعلان کیا۔

''ارے بیٹھو۔'' اسٹین نے رسمی انداز میں کہا۔ ''آرام تو مسٹر گرے کو کرنا چاہیے۔''

''اوہ ہاں تم نے ٹھیک کہا۔'' جان گرے اُٹھتا ہوا بولا۔ ''مجھے دوا بھی کھانی ہے۔''

ہم ساتھ ہی مہمانوں والے حصے کی طرف آئے۔ ''جان گرے یہ کیا حرکت ہے مس جینا نے اسٹین پر دھاوا کیوں بول دیا ہے۔ شارمین ایک سادہ سی عورت ہے اس کا دل دُکھا کر تم لوگوں کو کیا ملے گا۔''

''یہ جگہ محفوظ ہے۔ اگر ہم مسٹر اسٹین کی مہربانی سے ہفتہ دس دن یہاں چھپے رہیں تو کیا بُرا ہے۔''

''اس کے لیے تم بے حد گھٹیا حربہ استعمال کر رہے ہو۔''

''ہم مغرب والوں کا معیار ذرا مختلف ہوتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''دوسرے یہ جگہ اس مقام سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر تلاش کرنے والوں نے چھان پھٹک کی تو انہیں ہمیں تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں آئے گی۔''

''ان کے خیال میں ہم دریا بُرد ہو چکے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کاپٹر کے پائلٹ نے ہمیں ڈوبتے نہیں دیکھا تھا اس نے اپنے بیس پر ہمارے بچ جانے کی رپورٹ کی ہوگی۔''

جان گرے متفکر ہوگیا۔''تب ہم کیا کریں۔ یہاں سے نکل کر کہاں جائیں۔''

''میرا خیال ہے ہمیں جوہانسبرگ پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر جب تک میرے پاؤں کا زخم اچھا نہیں ہو جاتا میں زیادہ سفر نہیں کر سکتا اور بھاگ دوڑ تو بالکل نہیں کر سکتا ہوں۔''

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ چلو ہم دو تین دن یہاں رہ سکتے ہیں لیکن کوئی پوچھنے آ گیا تو ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔''

''اس وجہ سے میں نے جینا کو اس حرام زادے کے پیچھے لگایا ہے۔''

''سوچ لو یہ اس کا گھر ہے وہ موقع پا کر جینا کے ساتھ کوئی غلط حرکت بھی کر سکتا ہے۔''

''جینا بچی نہیں ہے بڑی تجربہ کار عورت ہے اسٹین جیسے آدمیوں کو انگلی پر نچا سکتی ہے۔'' جان گرے نے میرا شانہ تھپکا۔''جا کر سو جاؤ میں بھی دوا کھا کر سوؤں گا۔ زخم میں درد محسوس ہو رہا ہے۔''

''جاؤ بیٹے ذرا لمبی تان کر سونا۔'' میں نے دل میں کہا اور جان گرے کو جینا والے کمرے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

میرے کپڑے صاف ستھرے طے شدہ حالت میں بستر کے پاس رکھے تھے۔ میں نے جوتے بھی خشک کر کے صاف کر لیے تھے۔ شارمین نے ازراہِ عنایت مجھے اونی موزوں کی ایک جوڑی اور ایک کن ٹوپ دیا تھا جو سر کو کانوں تک ڈھانپ کر سردی سے بچاتا تھا۔ میرے پاس کوئی ساڑھے چار ہزار رینڈ زاور ایک عدد پستول زادِراہ کے طور پر تھا۔ میں نے اس کے دو کلپ بھی اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ پستول والے کلپ میں بارہ میں سے چار گولیاں استعمال ہو چکی تھیں۔ یعنی میرے پاس کل تیس گولیاں تھیں۔ میں بستر پر لیٹ کر انتظار کرنے لگا کہ کب جینا واپس آتی ہے۔ وہ بارہ بجے کے قریب واپس آئی تھی۔ میں نے دروازہ کھلنے اور جینا کی آواز سنی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی لائیٹ بجھا کر زیرو کا بلب جلا لیا تھا۔ اسٹین کو اس دور دراز خطے میں بھی بجلی اور فون کی سہولت میسر تھی۔ پندرہ منٹ میں مَیں نے کپڑے بدلے اور یہ اضافی کپڑے بھی ساتھ لے لیے۔ جوتے پہن کر میں چپکے سے باہر نکلا۔ مکان کی بیشتر روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ میں نشست گاہ تک آیا۔ باہر کا دروازہ اس سے آگے ہی تھا۔







مکان سے باہر آتے ہی بے پناہ یخ ہوا نے میرا استقبال کیا تھا۔ گرم کپڑوں اور جیکٹ کے باوجود میں لرز کر رہ گیا تھا۔ وین اور جیپ ایک شیڈ تلے کھڑے تھے۔ میں نے وین کا دروازہ کھولا جو حسبِ توقع غیر مقفل تھا۔ چابی اگنیشن میں لگی تھی۔ میں نے پہلے ڈیش بورڈ کا جائزہ لیا اس میں وین کے کاغذات تھے۔ البتہ میں ڈرائیونگ لائسنس بلکہ کسی قسم کے کاغذات سے محروم تھا۔ وین سٹارٹ کی تو اس کا انجن دھیمی آواز میں سرسرانے لگا۔ فیول کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ دوتہائی ٹینک بھرا ہے۔ ہیڈ لائٹ آف کر کے میں وین باہر جانے والے راستے پر لے کر آیا۔ مین گیٹ کے قریب آ کر میں نے اُتر کر گیٹ کھولا۔ باہر آ کر دوبارہ گیٹ بند کیا اور سڑک پر کچھ آگے جا کر میں نے ہیڈ لائٹس جلائی تھیں۔ وین کے اندر ہیٹر لگا تھا اس لیے چند منٹ کے اندر ماحول خوشگوار حد تک گرم ہو گیا تھا۔ میں نے سڑک پر سفر جاری رکھا اور جب سڑک دو حصوں میں بٹی تو میں دائیں طرف مڑ گیا۔ یہی راستہ ہائی وے کی طرف جاتا تھا۔ میں نے رفتار نارمل رکھی تھی تا کہ کسی پولیس کار سے ٹکراؤ ہو جائے تو وہ مجھے روکیں نہیں۔

نصف گھنٹے بعد میں ہائی وے پر تھا۔ کنارے پر لگے اشاروں کی مدد سے مجھے ایسٹ لندن کی سمت جانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی تھی۔ یہ دراصل کئی رویہ موٹروے تھی۔ اس کی آگے متعدد شاخیں تھیں جن کے کنارے نقشے بنے ہوئے تھے جن کی مدد سے کوئی ناواقف شخص بھی با آسانی اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ دو گھنٹے بعد میں نے ایک پیٹرول پمپ سے گیس بھروائی۔ رقم کی وجہ سے مجھے ادائیگی میں آسانی رہی تھی۔ صبح چھ بجے میں ایسٹ لندن میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے لیکن جنوبی افریقہ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں کہیں قدیم شہر ہے۔ یہاں سب سے پہلے پرتگالیوں نے قبضہ کر کے ایک قلعہ بنایا تھا۔ راس امیہ کے گرد چکر لگا کر مشرقی افریقہ اور ایشیا جانے والے یورپی بحری جہاز اس جگہ رُکتے تھے۔ پرتگیز منہ مانگا معاوضہ لیتے تھے۔ اس لیے بعد میں فرانس اور انگلینڈ نے بھی اپنے قلعے بنا لیے تھے۔ بعد میں برٹش افواج پورے جنوبی افریقہ پر مسلط ہو گئی تھیں۔

پورا شہر سمندر کی طرف آنے والی دھند میں چھپا تھا۔ لوگ اپنی گاڑیوں کی روشنیاں جلا کر ہائی وے پر رینگ رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ ایک طرف ایک عمارت میں وسیع پارکنگ نظر آئی۔ یہ عمارت شاید پارکنگ کے لیے ہی مخصوص تھی۔ میں نے ہائی وے سے ذیلی سڑک پر آتے ہوئے وین اس عمارت کی طرف گھما دی۔ اگر عمارت ہائی وے کے عین ساتھ نہ ہوتی تو شاید مجھے نظر بھی نہ آتی۔ میں نے وین اس کی دوسری منزل پر چھوڑی اور نیچے اُتر کر گیٹ کیپر سے کسی ریستوران کا پتہ پوچھا جہاں میں ناشتہ کر سکوں۔ اس نے مجھے نصف کلو میٹر آگے واقع ایک ریستوران کا پتا بتایا۔ میں نے احتیاطاً وین پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے تھے۔

ریستوران گرم اور لوگوں سے بھرا تھا۔ رگبی میچ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ میچ آسٹریلیا سے براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیا اور اس دوران میں ریستوران کے باتھ روم سے ہو آیا۔ ناشتہ کر کے میں نے باہر نکل کر ایک راہ گیر سے جوہانسبرگ جانے والی بس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گیارہ بجے مین ٹرمینل سے روانہ ہوتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سے اپنی زلفوں کی حجامت بنوائی اور داڑھی کو فرنچ کٹ صورت دے دی۔ اس سے میرے حلیے میں خاطر خواہ تبدیلی آئی تھی۔ مستقل کھلے رہنے والے ایک سٹور سے چھوٹا بیگ، دستانے اور ہلکے سرمئی رنگ کے شیشوں کی عینک لی۔ سردی کی وجہ سے میرے ہاتھ اکڑے جا رہے تھے۔

ایک بس نے مجھے بس ٹرمینل پہنچایا۔ وہاں سے جوہانسبرگ جانے والی بس کا ٹکٹ لے کر روانگی کا وقت کافی اور مقامی اخبار سے گزارنے لگا۔ جیسے ہی بس کی روانگی کا اعلان ہوا میں نے کافی کا کپ ڈسٹ بن میں ڈالا اور بس میں سوار ہو گیا۔ یہ خاصی بڑی اور لگژری قسم کی کوچ تھی جس کی نشستیں جہازی سیٹوں کی طرح آرام دہ اور پھیل جانے والی تھیں۔ بس مکمل طور پر سنٹرل ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ باہر درجہ حرارت منفی میں تھا تو اندر خوش گوار حد تک گرم۔ میں نے اپنی جیکٹ کی زپ کھول دی اور دستانے اُتار دیئے۔ بس گیارہ بجے روانہ ہو گئی تھی۔ ایک خوب صورت ہوسٹس نے سب کو چائے کافی، بیئر وغیرہ سرو کی۔ کیونکہ جنوبی افریقہ میں مشروبات کے معاملے میں برٹش طریقے رائج ہیں۔ اس لیے میں نے چائے منگوالی۔ جو خلافِ توقع اچھی بھی تھی۔

دو بجے بس ایک سروس ایریا میں رُکی۔ جہاں مسافروں نے لنچ کیا۔ میں نے چکن برگر پر اکتفا کیا اور راستے کے لیے بسکٹ کا ڈبہ لے لیا۔ تین بجے بس دوبارہ روانہ ہوئی تو میں نشست پھیلا کر سو گیا۔ بس ہوسٹس نے مجھے ایک تکیہ لا دیا۔ پُرسکون ماحول میں ایسا سویا کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بس جوہانسبرگ پہنچ گئی۔ بس ہوسٹس نے شائستگی سے مجھے بے دار کیا۔ ''سر......ٹرمینل آنے والا ہے۔ ہم جوہانسبرگ میں ہیں۔''

''شکریہ۔'' میں اٹھ گیا۔ سیٹ بے شک آرام دہ تھی لیکن ایک ہی پوزیشن میں لیٹے لیٹے جسم




اکڑ گیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر حرکت دی۔ چند منٹ بعد بس ٹرمینل میں داخل ہو رہی تھی۔ رُکتے ہی مسافر سامان اُٹھا کر اُترنے لگے۔ میں بھی نیچے آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رحیم شاہ کا پتا کیسے حاصل کروں۔ مجھے فون ڈائریکٹری کا خیال آیا۔ ٹرمینل میں کئی درجن فون بوتھ تھے جن میں سکے ڈال کر کال کی جا سکتی تھی۔ میں نے ایک جگہ سے چینج لیا اور ایک فون بوتھ میں گھس کر ڈائریکٹری اُٹھا لی۔ اس کی کئی موٹی جلدیں تھیں۔ میں نے آر اور ایس والی جگہ نکالی کیونکہ عام طور سے مغرب میں آخری نام پہلے نام کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا نام بوتھ ویل ہے تو ڈبل یعنی ڈبلیو والے حصے میں اس کا نام ہوتا۔ بی والے حصے میں نہیں۔

شاہ والی فہرست خاصی طویل تھی اور اس میں بلا مبالغہ ہزاروں نام تھے۔ ان میں رحیم شاہ کو تلاش کرنا بھوسے میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ بہرحال میں خاصی دیر کوشش کرتا رہا مگر مسئلہ یہ تھا کہ مجھے شاہ کے درست اسپیلنگ کا علم نہیں تھا۔ آیا یہ Shah ہے Sha، میں نے دونوں کو دیکھا مگر مجھے خاصی ورق گردانی کے بعد بھی کسی شاہ کے آگے رحیم لکھا نظر نہیں آیا۔ مایوس ہو کر میں باہر آیا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سردی اور بھوک دونوں شباب پر تھے۔ میں نے ایک سٹال سے کنگ سائز ویجی ٹیبل برگر لیا اور اس سے شکم سیری کرتا ہوا سڑک پر چلنے لگا۔ یہ جوہانسبرگ کا مرکزی علاقہ تھا اور اس سردی میں بھی خاصا بارونق تھا۔ میں بے پروائی سے جا رہا تھا کہ ایک درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک سایہ درخت سے جدا ہوا۔

''ہے......'' لڑکی نے نیگرو لہجے میں پوچھا۔ میں رُک گیا۔ وہ نزدیک آئی روشنی میں اس کی سرخی مائل تانبے جیسی رنگت نمایاں ہونے لگی تھی۔ لڑکی تیکھے نقوش کی حامل تھی اور اس نے اس قیامت کی سردی میں بھی نہ ہونے کے برابر لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی مجبوری واضح تھی۔ میں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

''میں ابھی دو گھنٹے پہلے اس شہر میں آیا ہوں اور تم پہلی فرد ہو جس نے کوئی آفر کی ہے۔''

''سردی کی وجہ سے بیشتر بزنس سرِشام ہو جاتا ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے میرے کالر کو تھام لیا۔ ''اگر تمہیں کسی جگہ کی تلاش ہے تو ایک خرچ میں دونوں کام ہو سکتے ہیں۔''

میں نے اس کے بھرپور جسم کو دیکھا جو مختصر سے لباس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ ''مجھے منظور ہے لیکن پہلے میں ایک کال کروں گا۔''

''بوتھ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔'' لڑکی نے بتایا اور احتیاطاً میرے ساتھ روانہ ہو گئی۔

''بائی دی وے تمہارا چارج کیا ہے؟''

''میں گھنٹے کے حساب سے لیتی ہوں لیکن تم سے صبح آٹھ بجے تک کے صرف چار سو رینڈ لوں گی۔ اس میں تمہیں ناشتہ بھی ملے گا۔ ڈنر تم کر چکے ہو۔ اگر شراب پیتے ہو تو اپنا برانڈ لے لو۔''

''فکر نہ کرو میرا برانڈ تمہارے گھر مل جائے گا۔''

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"سادہ پانی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اور فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" میں خاصا زور سے بولا تھا مگر وہ بے تاثر کھڑی رہی تھی۔ میں نے اطمینان سے کینی مین کا نمبر ملایا۔ وہ لائن پر نہیں تھا۔ کسی نمونے نے فون اُٹھایا اور بگڑے ہوئے لہجے میں مجھے آگاہ کیا کہ فادر پیشاب کرنے گیا ہے۔"

"میں ہولڈ کروں گا۔" میں نے اصرار کیا۔ "فادر کو شوگر تو نہیں ہے۔"

"نہیں وہ میٹھا شوق سے نہیں کھاتا ہے۔" نمونے نے جواب دیا۔

کینی مین کے انتظار میں مجھے کئی سکے فون بکس میں ڈالنے پڑے تھے۔ ورنہ مشینی آواز کال منقطع کرنے کی دھمکی سناتی تھی۔ بالآخر کینی مین لائن پر آیا۔ "کون ہے؟"

"تمہارا ایک پُرانا زخم خوردہ جس نے جب بھی تمہارے آدمیوں پر بھروسہ کیا دھوکہ کھایا۔ نام مت لینا۔"

"تم کہاں ہو؟"

"یہ مت پوچھو۔ میں نے تمہیں ایک کام کہا تھا۔ مجھے اس رحیم شاہ کا پتا چاہیے جو جونی والٹر کے بیٹے کے منیجر گل خان کا دوست تھا۔ جب گل خان کا خاندان آتش زدگی میں مر گیا تھا تو اس نے اس کے بچ جانے والے واحد بیٹے کی دیکھ بھال کی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن جس بندے کو میں نے اس کام پر لگایا تھا وہ کل صبح تک میرے پاس آئے گا۔"

"تب میں صبح دس بجے فون کروں گا۔ مجھے رحیم شاہ کا پتا بہر صورت درکار ہے۔"

"رحیم شاہ تمہارا......" کینی مین نے کہنا چاہا لیکن میں فون رکھ چکا تھا۔

لڑکی دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے کھڑی تھی۔ میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ انیس برس کی تھی اور اس نے کمائی کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک کا ایک بھیانک روپ یہ لڑکیاں بھی تھیں جو ہر بڑے مغربی شہر میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ "تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟"

"آؤ میرے ساتھ زیادہ دور نہیں ہے۔" وہ قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم سچ مچ سادہ پانی کے علاوہ کچھ نہیں پیتے؟"

"یہ سچ ہے لیکن شراب کی حد تک ورنہ چائے، کافی سافٹ ڈرنک اور جوس سب پی لیتا ہوں۔"

لڑکی نے مجھ سے چار سو رینڈ مانگے تھے جبکہ اس سے نصف میں کسی بھی مناسب ہوٹل میں کمرا مل سکتا تھا لیکن میں دکھانے کے لیے کاغذات کہاں سے لاتا۔ یہ لڑکی جہاں لے جا رہی تھی وہ جگہ بھی




رات گزارنے کے لیے غنیمت تھی۔ ورنہ اس سردی کے عالم میں کسی کھلی جگہ رات گزارتا تو صبح میری اکڑی ہوئی لاش ملتی۔ "دیکھو میں پہلے بتا دوں کوئی جھگڑا نہ ہو۔ میں پولیس کے چکر سے بچتا ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ وہ ہم جیسی لڑکیوں کا ہاسٹل ہے۔ جسے ایک عورت چلاتی ہے۔ وہ کسی بھی جھگڑے سے گریز کرتی ہے۔ ہم لڑکیاں بھی جھگڑالو مردوں کو لانے سے گریز کرتی ہیں۔"

"کیا میرے چہرے پر لکھا ہے کہ میں شریف ہوں۔"

"میں نے اس دھندے میں ایک چیز سیکھ لی ہے۔ ایک نظر میں مرد کا ٹائپ بھانپ جاتی ہوں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اتنی خود اعتمادی اچھی نہیں ہوتی ہے۔"

"ہاں......لیکن میں اچھے بُرے کا سوچنا بہت پہلے ترک کر چکی ہوں۔"

وہ مجھے ایک چھوٹی عمارت تک لائی۔ عمارت تو خاصی بڑی تھی مگر اردگرد کی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے درمیان چھوٹی لگ رہی تھی۔ چار منزلہ عمارت میں لڑکی کا کمرا آخری منزل پر تھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے اس سے نام پوچھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ "تم مجھے میری کہہ سکتے ہو۔"

میں اندر آیا۔ "گڈ میری بات یہ ہے کہ میں فی الحال چند گھنٹے سونا چاہتا ہوں۔"

وہ ذرا مایوس ہوئی تھی۔ "سو جاؤ میں بھی تھکن دور کر لوں گی۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ مجھے بے دار مت کرنا ورنہ میرا موڈ خراب ہو جائے گا۔ میں خود ہی اُٹھ جاؤں گا۔"

اس کا موڈ ابھی سے خراب ہو گیا تھا۔ "لگتا ہے تم صرف سونے کے لیے آئے ہو۔"

یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک بیڈ روم اور ایک نشست گاہ جہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے ایک تکیہ اور چادر دے دو میں یہیں لیٹ جاؤں گا۔"

"میرے پاس بیڈ بڑے سائز کا ہے تم بھی آرام سے سو سکتے ہو۔"

"سوری میں سوتے میں ہاتھ پیر بہت چلاتا ہوں۔ تمہیں پریشانی ہو گی اس لیے...... مجھے یہیں سونے دو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ راضی ہو گئی اس نے مجھے تکیہ اور چادر لا دی۔ "اگر کہو تو چائے بنا دوں۔"

"کیوں نہیں۔" میں خوش ہو گیا تھا۔ "نیکی پوچھ کر نہیں کرتے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب چھوڑو بس چائے بنا لاؤ۔" میں نے جیکٹ اُتار کر ایک طرف ڈال دی۔ یہ عمارت سینٹرل ہیٹڈ تھی۔ اندر سے درجہ حرارت ایسا تھا کہ آدمی عام سے کپڑوں میں بھی رہ سکتا تھا۔ اندر آتے ہی میری نے اپنی وگ اور چمڑے کے لونگ شوز اُتار دیئے تھے۔ ان کے علاوہ اس نے مختصر سی بنیان اور شاید چھ سات انچ لمبا اسکرٹ پہن لیا تھا۔ وہ بلاشبہ بے پناہ جسمانی حسن رکھتی تھی۔ واش روم

سے آ کر اس نے چائے کا پانی رکھا۔ مختصر سا کچن اس کمرے کے سامنے ہی تھا۔ دس منٹ میں وہ چائے کپ میں ڈال کر لے آئی۔ شکر اور خشک دودھ الگ سے تھا۔ میں نے شکر اور دودھ ڈالا وہ ایسے ہی پینے لگی۔ ”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”مجھے لگتا ہے تمہیں جنس کی طلب یہاں نہیں لائی ہے۔“

”یہ بات سچ ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”میں صرف ایک رات یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”چار سو رینڈ دے کر۔“ اس کے لہجے میں چبھن تھی۔ ”اس سے آدھی رقم میں تم کسی ہوٹل میں رات گزار سکتے تھے۔“

”اگر تم ایسا چاہتی ہو تو میں ہوٹل میں رات گزار لیتا ہوں۔“ میں نے کپ رکھ کر جیکٹ اُٹھا لی۔ اس نے جلدی سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں صرف تعجب کر رہی ہوں۔“

”اگر تمہیں اس پر تعجب ہے تو تم مجھ سے چار سو رینڈ کے لیے کیوں تیار ہوئیں۔“

”رقم آتی کسے بُری لگتی ہے۔“

”تو بس پھل کھاؤ۔ درخت مت گنو۔“ میں نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

وہ چائے کے کپ اُٹھا کر لے گئی اور میں تکیہ رکھ کر دراز ہو گیا۔ ضرورت نہیں تھی پھر بھی میں نے چادر اوڑھ لی۔ میری بہ ظاہر سادہ نظر آ رہی تھی لیکن وہ جس پیشے سے وابستہ تھی اس میں کوئی عورت سادہ یا معصوم نہیں ہوتی ہے۔ بے شک صورت سے کیوں نہ نظر آئے۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ سوتے میں میری جیب پر ہاتھ نہ صاف کر دے۔ اس کے بعد میں اس سے کسی طرح رقم وصول نہیں کر سکتا تھا اور اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا تو اس کے حمایتی بدمعاش آن موجود ہوتے۔ اگرچہ میں کسی بدمعاش سے نہیں ڈرتا تھا مگر ہنگامہ آرائی کی صورت میں معاملہ پولیس تک جاتا تو میں مشکل میں پڑ جاتا۔ اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے چادر کو اس طرح اپنے گرد لپیٹا کہ وہ کوشش کے باوجود میری جیب تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

تھکن کی وجہ سے چند منٹ میں نیند آ گئی تھی۔ میں رات کو نارمل سویا گیا لیکن جب صبح اُٹھا تو میرا جسم اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے ملیریا بخار میں ٹوٹتا ہے اور جسم پر ویسا ہی لرزہ بھی طاری تھا۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو مارے نقاہت کے اُٹھا ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے یاد ہے بارہ سال کی عمر میں ایک بار مجھے ملیریا ہوا تھا اور اس وقت بھی میری ایسی ہی حالت ہوئی تھی لیکن بہر حال اتنی بُری نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ شاید گزشتہ چند مہینوں کی مسلسل بھاگ دوڑ اور بے آرامی رنگ لائی تھی۔ دریا جنگلوں سے گزرتے ہوئے مجھے ملیریا پھیلانے والے مچھر نے کاٹا تھا اور اب ملیریا نے حملہ کیا تھا۔





میرا حلق بُری طرح خشک ہو رہا تھا۔ پردے کے عقب سے جھلکتی ہلکی سی روشنی بتا رہی تھی کہ صبح ہو گئی ہے۔

”میری۔“ میں نے آواز دی اور جو آواز میرے منہ سے نکلی وہ بکری کے بچے کی ”میں مَیں“ سے بھی کم تھی۔ اسی لمحے میری بالوں پر تولیہ باندھے وہاں آئی۔ ”ارے تم ابھی تک سو رہے تھے۔ جلدی سے اُٹھ جاؤ۔ مجھے جانا بھی ہے۔ تمہارا ناشتہ تیار ہے۔“

”میری مجھ سے اُٹھا نہیں جا رہا ہے۔ میرا پورا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ شاید مجھے ملیریا ہو گیا ہے۔“

”ملیریا۔“ وہ تشویش سے بولی۔ پاس آ کر اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تمہیں تو خاصا تیز بخار ہو رہا ہے۔“

”میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔“ میں نے ضبط کر کے کہا۔ ”مجھے پانی دو۔ شاید میری حالت سدھر جائے۔“

اس نے پانی لا کر مجھے سر اُٹھا کر پلایا۔ پانی سے پیاس تو بجھی لیکن اور جسمانی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ میں نے ساری زندگی میں کبھی اس طرح کی کمزوری اور تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔ میری نے مجھے کافی بھی بنا کر دی مگر کوئی بہتری نہیں آئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔ مگر کیا تم اس کی فیس ادا کر سکتے ہو؟“

”ہاں میرے پاس رقم ہے۔“ میں نے کہا۔

میری چلی گئی اور میں لیٹا ہانپتا رہا۔ وہ نصف گھنٹے بعد ڈاکٹر کے ساتھ آئی اس نے میرا معائنہ کیا۔ مجھے ایک انجکشن لگایا اور دو گولیاں کھانے کو دیں۔ ”تین سو رینڈز دو۔“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

”اتنے سے کام کے تین سو رینڈز۔“ میں حیران ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے اگلی بار تم کسی خیراتی ہسپتال چلے جانا۔ ابھی تو میری فیس دو۔“ وہ رُکھائی سے بولا۔

صاف لگ رہا تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ بادلِ نخواستہ میں نے تین سو رینڈز اسے دیئے اور وہ اپنا بیگ سنبھال کر رخصت ہو گیا۔ ”یہ تم کسے لے آئی تھیں؟“

”یہاں پر آنے کے لیے ہر ڈاکٹر تیار نہیں ہوتا۔ ہمیں کوئی بھی مسئلہ ہو تو یہی آتا ہے اور ایک وزٹ کے تین سو رینڈز ہی لیتا ہے۔“

میری نے مجھے دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر کھلائی۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ میں از خود باتھ روم بھی نہیں جا سکتا جا سکتا تھا۔ میری مجھے سہارا دے کر لے کر گئی تھی۔ کھا کر میں بے سدھ ہو گیا۔ شام کو جاگا تو حالت کسی قدر بہتر تھی لیکن نقاہت بڑھ گئی تھی۔ میرا سر لیٹے لیٹے چکرا رہا تھا۔ میری نہیں تھی۔ وہ خاصی دیر بعد اسی ڈاکٹر کے ساتھ آئی۔ اس نے ایک انجکشن لگایا اور دو گولیاں

دیں۔اس کے بعد از راہ عنایت اپنی فیس میں تخفیف کر کے مجھ سے ڈھائی سو رینڈز لے کر رخصت ہو گیا۔اس کے انجکشن یا کسی گولی میں تاثیر نہیں تھی۔ میں سو گیا اور اگلی صبح آنکھ کھلی تو حالت وہی ایک دن پہلے والی تھی۔حسبِ معمول میری نے مجھے تمام معمولات سے فارغ کرایا جب وہ ناشتہ کرا رہی تھی تو میں نے جھنجھلا کر کہا۔''یہ کیسا ڈاکٹر ہے۔اس کی دوا سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔تم کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' اتنی سی بات کر کے میں ہانپنے لگا تھا۔

اس نے ہمدردی سے مجھے دیکھا۔''اس عمارت میں کوئی اور ڈاکٹر آنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔اگر تم کہو تو میں ہسپتال فون کر کے ایمبولینس بلوالوں۔وہاں تمہارا صحیح سے علاج ہو سکے گا۔''

ہسپتال جانے کا مطلب تھا کہ مجھ سے شناخت طلب کی جائے گی اور میں ہسپتال والوں کو مطمئن نہ کر سکا تو پولیس بلالی جائے گی۔میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں...... میں ہسپتال نہیں جاؤں گا۔وہاں کے ماحول سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''تب اس ڈاکٹر سے ہی علاج کرانا پڑے گا۔''

ناشتے کے بعد وہ جا کر ڈاکٹر کو لے آئی۔میں نے اس سے کہا۔''تم کیا کر رہے ہو۔میں ابھی تک خود کو بہتر محسوس نہیں کر رہا ہوں۔''

''اس تکلیف میں فوری آرام نہیں آتا۔بلکہ دو تین دن لگتے ہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''آج شام تک تم خود کو بہتر محسوس کرو گے۔''

میں پھر سو گیا اور شام کو بھی کوئی خاص بہتری نہیں آئی تھی۔میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میری اور ڈاکٹر مل کر میری کیفیت سے فائدہ اُٹھا رہے تھے وہ جان بوجھ کر مجھے ایسی دوائیاں دے رہے تھے جن سے میرا مرض ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔غالباً وہ بھانپ گئے تھے کہ میں ہسپتال نہیں جاؤں گا۔اس طرح وہ مجھے لوٹ رہے تھے۔شام کو بھی ڈاکٹر انجکشن اور گولیوں کے ساتھ مجھے تسلی دے کر اور فیس لے کر رخصت ہو گیا۔اس نے مجھ سے مجموعی طور پر اب تک ہزار سے زیادہ رینڈز وصول کر لیے تھے اور میری بھی مجھ سے ان دو اضافی دنوں کا خاصا معاوضہ چاہتی۔تیسری صبح میری حالت کسی قدر بہتر تھی۔اس لیے میں نے ڈاکٹر کا علاج قبول کرنے سے انکار کر دیا اور میری سے ایک گلاس دودھ اور دو اُبلے انڈوں کی فرمائش کی۔اس نے ناگواری سے کہا۔''علاج نہیں کراؤ گے تو ٹھیک کیسے ہو گے؟''

''جس قسم کا میرا علاج ہو رہا ہے اس سے لگتا ہے میں کبھی ٹھیک نہیں ہوں گا۔''

''مرضی تمہاری......اور ہاں میرے ان تین دنوں کے چارجز ادا کر دینا بارہ سو رینڈز۔''

میں نے سر ہلایا۔''گویا میرا اندازہ درست تھا۔تم دونوں مل کر مجھے اس طرح لوٹ رہے تھے۔

یکا یک اس کے چہرے سے نقاب اُتر گیا تھا۔وہ پھنکار کر بولی۔''تم جو چاہے سمجھو لیکن میری





فیس تمہیں دینا ہو گی۔''

''چلو ٹھیک ہے لیکن اب بات بتاؤ کہ میں سچ مچ بیمار ہوا تھا یا تم نے کوئی گڑبڑ کی تھی۔''

''تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''او کے...... مجھے کچھ ثابت کرنا بھی نہیں ہے۔تم نے ناشتے کا وعدہ کیا تھا اس لیے مجھے ناشتہ دو۔''

کچھ دیر بعد اس نے دودھ کا گلاس اور دو اُبلے ہوئے انڈے لا کر میرے سامنے پٹخے۔''یہ کھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

میں نے انڈے کھا کر دودھ کا گلاس پیا اور اپنی جیکٹ اُٹھا کر جانے کے لیے تیار ہوا تو میری اُچھل کر سامنے آئی۔''میری رقم دیئے بغیر تم نہیں جا سکتے۔''

''اگر میں جانا چاہوں تو اس حالت میں بھی تمہارے بدمعاش مجھے نہیں روک سکتے لیکن میں الفاظ کا پاس رکھنے والا شخص ہوں۔'' میں نے اسے بارہ سو رینڈز نکال کر دیئے۔اب میرے پاس مشکل سے پندرہ سو رینڈز بچے تھے۔بہرحال یہ رقم جیسے آئی تھی ویسے ہی جا رہی تھی۔چار منزل سے اُترنا میرے لیے ذرا مسئلہ ہوا تھا۔جسم ابھی تک دکھ رہا تھا۔مگر کھلی فضا میں آتے ہی میری حالت بہتر ہونے لگی ایک جنرل سٹور سے میں نے کافی کی مشین سے کافی نکالی اور اس سے ہی ڈسپرین لے کر کھائی۔اس سے میری حالت چند منٹ میں بہتر ہوئی تھی پھر میں نے ایک فون بوتھ سے کینی مین کا نمبر ملایا۔دوسری طرف کسی اور نے کال ریسیو کی۔اس نے بتایا کہ کینی مین دوپہر دو بجے اس نمبر پر دستیاب ہو گا۔

دو بجے تک کا وقت میں نے نزدیکی پارک میں بینچ پر دھوپ سینکتے اور اورنج جوس پیتے گزارا۔ایک برگر کھا کر بھوک مٹائی۔دو بجے میں نے دوبارہ کال کی۔اس بار کینی مین نے ہی کال ریسیو کی۔میری آواز سنتے ہی بولا۔''میرا مشورہ ہے میرے پاس آ جاؤ کیوں خود کو مشکل میں ڈال رہے ہو۔''

''مشکل میں تو میں ہمیشہ تمہارے پاس آ کر پڑا ہوں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔''تمہارے آدمیوں میں غدار زیادہ ہیں۔''

''میں نے سب کی اسکریننگ کر دی ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''براہِ کرم تم نے رحیم شاہ کا پتا حاصل کر لیا ہے تو مجھے بتاؤ ورنہ...... میں کوئی اور راستہ دیکھتا ہوں۔''

''او کے...... ناراض مت ہو۔تم نے اس جن کو قابو کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے بعد میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔''

''جن (کرنل بوگارڈ...... جو اب ریٹائرڈ کرنل تھا) کے بارے میں کیا خبر ہے۔''

کینی مین ہنسا۔''اپنی جاگیر میں چوہوں کی طرح چھپا ہے سنا ہے اس پر دو حملے ہو چکے ہیں

اور اب وہ مارے خوف کے باہر ہی نہیں آتا ہے۔"

"ہر ظالم ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پتا بتاؤ۔"

اس نے مجھے پتا بتایا جو میں نے بوتھ میں رکھے نوٹ پیڈ پر لکھ لیا اور کینی مین کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ یہ شہر کے کسی نواحی علاقے کا پتا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی روک کر اس کے ڈرائیور کو پتے کے بارے میں بتایا۔ "آجاؤ۔" اس نے کہا۔ میں عقبی نشست پر آ گیا۔ ٹیکسی چکنی سڑک پر پھسلنے لگی۔ اور میں رحیم شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ مجھے پہچانے گا اور وہ میری مدد پر آمادہ ہو جائے گا۔ مجھے جنوبی افریقہ سے غیر قانونی طور پر باہر جانا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا پتا نہیں رحیم شاہ کس قسم کا آدمی نکلے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس دنیا میں ہی نہ ہو۔ آخر انتیس برس ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اچانک ٹیکسی دھچکے سے رُکی اور میں خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔

"سر...... تمہاری منزل آ گئی ہے۔" ڈرائیور نے سرسبز لان کے بعد نظر آنے والی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے سامنے لوہے کے چھوٹے سے پھاٹک پر وہ پتا لکھا تھا جو کینی مین نے مجھے دیا تھا۔ تختی پر رحیم شاہ کا نام بھی لکھا تھا۔ میں نے اُتر کر کرایہ دیا اور اپنا بیگ سنبھالے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ یہ پُرسکون پوش سی آبادی تھی جہاں زیادہ تر بڑے گھر تھے جن کے گرد وسیع و عریض لان تھے۔ اس عمارت کے سامنے ڈرائیو وے میں دو عدد کاریں بھی کھڑی تھیں ایک کیڈی لک اور ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا تھی۔ رحیم شاہ کھاتا پیتا شخص لگ رہا تھا۔ میں نے عمارت کے بڑے سے چوبی دروازے پر لگی کال بیل بجائی۔ کچھ دیر انتظار کر کے میں نے دوبارہ بیل بجائی۔ دراصل میں بے چین ہو رہا تھا۔ ورنہ اتنے بڑے مکان میں کسی کو دروازے تک آنے میں کچھ وقت تو لگتا۔ دوسری بار بیل بجا کر میں نے زیادہ دیر انتظار کیا۔ اس بار بھی کوئی نہیں آیا تو میں نے لگاتار کئی سیکنڈ تک بیل بجائی۔

مجھے دروازے پر کھڑے ہوئے دس منٹ ہونے کو آئے تھے۔ مکان کتنا ہی بڑا سہی دروازے تک آنے کے لیے یہ وقت کافی سے زیادہ تھا۔ اس بار میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور گھر میں کوئی نہیں تھا۔ یک لخت میرے اندر کوئی "خطرہ خطرہ" چلانے لگا۔ کیا اندر میرے لیے کوئی جال تھا۔ میرے یہاں آنے کا صرف کینی مین اندازہ کر سکتا تھا اور اس سے توقع نہیں تھی کیا اس کی پھر جاسوسی ہو رہی تھی اور میرے دشمن مجھ سے پہلے آ چکے تھے۔ دونوں صورتوں میں میرے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پستول نکالا اور ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ یہ وسیع و عریض ڈرائنگ روم کا سامنے کا حصہ تھا جو دو طرف سے آرائشی ستونوں سے گھرا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسی چیز تھی جس سے مجھے خطرے کا احساس ہوتا لیکن میری چھٹی حس مسلسل شور مچا رہی تھی۔ ستونوں سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں۔ میں اُتر کر دائیں طرف والے حصے کی طرف آیا۔ اچانک میری توجہ اس طرف وسط میں رکھی




گلاس ٹاپ ٹیبل پر پڑی۔ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ میز پر پانچ انسانی سر سجا کر رکھے گئے تھے اور ان سے نکلنے والا خون میز پر جمع ہو کر نیچے جا رہا تھا۔ دو عورتوں کے سر تھے اور تین مردوں کے ان میں ایک کی سفید داڑھی تھی۔ معاً مجھے اپنے عقب سے آہٹ سی محسوس ہوئی اور اس سے پہلے کہ میں مڑتا کوئی سخت چیز میرے سر سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔ میں منہ کے بل گرتا چلا گیا۔



ایک لمحے کو ایسا لگا کہ کوئی بلٹ میرے سر میں اُتر گیا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی فرش پر گرتا چلا گیا۔ میرا ذہن چکرا رہا تھا اور میں تاریکی سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے گولی نہیں بلکہ کوئی اور چیز لگی تھی۔ گولی لگتی تو میں اب تک مر چکا ہوتا۔ قالین پر میرا چہرہ اس میز کی طرف تھا جس پر پانچ انسانوں کے سر سجے تھے۔ ان میں ایک سفید داڑھی والا شخص تھا جس کے نقوش پاک و ہند کے لوگوں جیسے تھے۔ کیا وہ رحیم شاہ تھا اور اسے مجھ سے تعلق کی سزا خاندان سمیت ملی تھی۔ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ یک لخت مجھ پر چھا گئی تھی۔

ہوش میں آتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے پاس ہی کوئی سیگل (بحری پرندہ) چیخ رہا ہے۔ ایک سیلر کے کان اس پرندے کی آواز سے نا آشنا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ خلیج پر میرے کیبن کے پورٹ ہول کے پاس سیگل منڈلا رہا ہے۔ میں نے اسے ہنکارہ کہ مجھے سونے دے مگر وہ چیختا رہا اور پورٹ ہول کے شیشے سے ٹکراتا رہا۔ میں نے آنکھ کھولی۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے کے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے ایک طرف مختصر سی کھڑکی تھی اور سیگل اس سے ہی ٹکرا رہا تھا۔ میں سمندر کے پاس تھا۔ میں اُٹھا تو سر میں درد کا احساس جاگا۔ میں نے عقبی حصے میں اُبھرنے والے گومڑ کو ہاتھ لگایا۔ سر پھٹا نہیں تھا چکناہٹ سے لگ رہا تھا کہ گومڑ پر کوئی دوائی لگائی گئی ہے۔ اس وجہ سے درد کم تھا۔ ورنہ ایسی صورتِ حال میں اکثر ہوش میں آنے کے بعد مجھے بدترین حالت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور خزاں رسیدہ جھاڑیوں والی ڈھلان کے بعد سردی سے سرمئی ہو جانے والا سمندر نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی پر شیشہ تھا اس کے باوجود سیگل اتنی زور و شور سے چلا رہا تھا کہ اس کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔ اچانک ایک فائر کی آواز آئی اور سیگل غائب ہو گیا۔ اس کا خون شیشے پر آیا تھا۔ میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ایک اور خون دیکھنا پڑے گا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ خوفناک منظر تازہ ہو گیا تھا میں لرز کر رہ گیا۔ میرے دشمنوں نے ان بے گناہ لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

رفتہ رفتہ غم و غصہ میرے وجود پر قبضہ جمانے لگا۔ یقیناً بوگارڈ یا یہودیوں کے آدمی کینی مین کا نمبر ٹیپ کر رہے تھے اور جب اس نے مجھے رحیم شاہ کا نمبر بتایا تو انہوں نے فوری کارروائی کی اور مجھ سے پہلے رحیم شاہ کے گھر جا پہنچے۔ اسے اس کے اہل خانہ سمیت سفاکی سے قتل کر دیا۔ مجھ سے ذرا

سے تعلق کے شبہے میں اتنی سفاکانہ کارروائی بوگارڈ یا یہودی کر سکتے تھے۔ بوگارڈ کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس میں اتنا دم خم باقی نہیں رہا ہے البتہ یہودی جونی والٹر اور اس کے پوتے کے مارے جانے سے پہلے ہی میرے پیچھے تھے۔ اس کے بعد تو وہ مزید سرگرمی سے میرا پیچھا کرنے لگے۔ کینی مین سے میرا تعلق واضح تھا لہٰذا وہ اس کی نگرانی کرتے رہے اور بالآخر میرا سراغ پالیا۔ گویا میں اس وقت یہودیوں کی قید میں تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا اس میں سادہ سا بستر تھا اور بس ایک طرف دروازہ تھا اور دوسری طرف کھڑکی۔ کمرہ بارہ بائی دس فٹ کا تھا۔ میں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ میرا پختہ خیال تھا کہ دروازہ بند ہوگا لیکن میں اسے کھلا پا کر دنگ رہ گیا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ یعنی میں یہودیوں کی قید میں نہیں تھا۔ اول تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے اور کسی وجہ سے زندہ رکھتے تب بھی سات پہروں میں رکھتے۔

میں نے باہر جھانکا، یہ کھلی جگہ تھی۔ سامنے ٹیرس تھا، جہاں دھوپ بکھری تھی۔ فضا میں قابلِ برداشت خنکی تھی اس سے مجھے خیال آیا کہ میں جنوبی خطے سے دور تھا۔ گویا اپنی بے ہوشی کے دوران میں نے خاصا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ کیا میں اب جنوبی افریقہ میں نہیں رہا تھا۔ میں باہر آیا، یہ کمرا اور ٹیرس کسی مکان کے بلند ترین حصے پر تھا۔ ٹیرس سے ایک طرف سنگی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ میرے جسم پر صاف ستھرا گرم لباس تھا۔ اس لیے مجھے یہ خنکی بھی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے اُترنے سے پہلے نیچے جھانکا۔ ٹیرس کے تین طرف کی چھتیں نکلی تھیں اور چوتھی طرف کمرا تھا۔ تین طرف کے منظر سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں کسی جزیرے پر تھا۔ تین طرف سے یہ کوئی نصف مربع میل کا جزیرہ لگ رہا تھا۔ سرسبز اور شاداب۔

میں سنگی سیڑھیوں سے اُترا تو اس طرف کھپریل تلے مغرب کے رُخ پر ایک اور ٹیرس تھا اور وہاں جان گرے موجود تھا جب میں نے کمرے کا دروازہ کھلا پایا تھا تب ہی مجھے لگ رہا تھا عنقریب میرا سامنا جان گرے سے ہونے والا ہے اس لیے اسے دیکھ کر زیادہ تعجب نہیں ہوا تھا۔ اگر میں جان گرے کے پاس تھا تو رحیم شاہ اور اس کے خاندان کے ساتھ اس وحشیانہ سفاکی کا مظاہرہ کس نے کیا تھا؟ کیا جان گرے نے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ خاصے عرصے بعد وہ اپنے مخصوص عیاشانہ انداز میں نظر آیا تھا۔ یعنی اس کے سامنے تپائی پر شراب و جام تھے اور نزدیکی کاؤچ پر ایک حسین عورت اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کے جسم پر ایک معمولی سی نیکر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ سن باتھ لے رہی تھی جان گرے میرے تاثرات سے بھانپ گیا تھا۔

"شاید تم یقین نہ کرو وہ میرا یا میرے ساتھیوں کا کام نہیں تھا۔ ہمیں پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوئی ورنہ ہم تمہارے ساتھ انہیں بھی بچا لیتے۔"

"کیا تم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ اس سفاکی میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے۔" میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔





"بتا نہیں رہا۔ حقیقت یہی ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "رحیم شاہ کے گھر قتل و غارت گری مقامی جیو کونسل کے ایجنٹس نے مچائی تھی۔ وہی اس قتل عام کے ذمے دار ہیں۔ جس وقت تمہیں بے ہوش کیا گیا تھا اسی وقت ہم وہاں پہنچے تھے۔ تمہارے سر پر رائفل کا دستہ مارنے والے کو میں نے خود شوٹ کیا تھا۔"

مجھے یاد آیا کہ بے ہوش ہوتے وقت میں نے فائر کی آواز بھی سنی تھی۔ "اور اس کے بعد مجھے یہاں لے آئے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"جنوبی افریقہ کی سمندری حدود میں شمال کی جانب ایک جزیرہ ہے۔" جان گرے نے جواب دیا۔ "بیٹھ جاؤ میں تمہیں ساری کہانی سناتا ہوں۔ جب تم چپکے سے نکل بھاگے تھے، مجھے معلوم تھا تم رحیم شاہ کی تلاش میں جاؤ گے۔"

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ "یعنی تم میری اصل کہانی سے واقف ہو؟"

"پہلے نہیں تھا تم سے دوبارہ ملنے کے بعد جب میں نے چھان بین کرائی تب یہ بات سامنے آئی۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ "مجھے رحیم شاہ کے مرنے کا افسوس ہے۔ یہودی ہمیشہ سے درندے رہے ہیں۔ اس جنگ سے ان معصوم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"مجھے بھی افسوس ہے اور یہودیوں کے بارے میں مَیں تمہارے خیالات سے متفق ہوں۔"

"براہِ کرم مجھے خوش کرنے کے لیے جھوٹ نہ بولو۔ ان درندوں کی پشت پناہی تم لوگ ہی کرتے ہو۔"

"سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔" جان گرے نے جام سے ایک گھونٹ لیا۔ اس کی کھلی ران پر گولی لگنے والی جگہ ایک معمولی سی پٹی چپکی تھی۔ یعنی اس کا زخم تقریباً مندمل ہوگیا تھا۔ "کچھ پیو گے؟ پیچھے کمرے میں فریج میں سافٹ ڈرنک اور جوس ہے۔"

میں اُٹھ کر کمرے کے فریج سے ایک اورنج جوس کا ڈبہ لے آیا۔ اس جگہ بجلی تھی اور اس ٹیرس سے بھی مجھے یہ جزیرہ لگا جو شاید اس ایک عمارت کو چھوڑ کر غیر آباد تھا۔ میرے دل نے جان گرے کی وضاحت قبول کر لی تھی۔ پھر بھی میں نے اس سے بحث کی۔ "کہاں تم لاچاری کے عالم میں اسٹین کے گھر پڑے تھے اور کہاں اتنی قوت سے رحیم شاہ کے گھر جا پہنچے کہ وہاں حملہ کرنے والے یہودی قاتلوں سے مجھے بچا لائے۔"

"میں جنوبی افریقہ میں بے یار و مددگار نہیں ہوں۔ یہ جزیرہ میرے اس دوست کا ہے جس کی مدد سے میں نے تمہیں بچایا تھا۔"

"ایسا دوست اچانک کہاں سے پیدا ہوا؟"

"پیدا تو خاصے عرصے پہلے ہوگیا تھا۔ مگر اسے میرے حالات کا پتا نہیں تھا۔ بہرحال میں نے

اسٹین کے گھر سے کال کی تو وہ بارہ گھنٹے کے اندر مجھے وہاں سے نکال لایا۔"

"گویا تم آرگنائزیشن سے ابھی تک دور ہو۔"

"ہاں...... میرے واقف کار اور ہمدرد ایگزیکٹو کونسل کو میرے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے جلد مجھے سابقہ مقام مل جائے گا۔"

"ورنہ ایک عدد خوب صورت تابوت۔"

جان گرے مسکرایا۔ "ہم جیسے لوگ مرنے کے بعد کے معاملات پر غور نہیں کرتے۔"

"تمہارا دوست کون ہے۔ ظاہر ہے دولت مند آدمی ہے۔ ورنہ اس قسم کے جزیروں میں آبادی سے دور رہنا آسان نہیں ہے۔"

"بے پناہ دولت مند ہے۔ اس کا باپ اس کے لیے سونے کی کانیں چھوڑ کر مرا تھا۔ یہ جزیرہ بھی اس کی ملکیت ہے۔ اس جزیرے پر اس نے اپنا شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے جانور اور پرندے پال رکھے ہیں۔ سمندر میں وہ خونخوار شارک مچھلیوں کا شکار کرتا ہے۔ ڈیوک کو دنیا میں دو ہی شوق ہیں، دولت کمانا اور شکار کرنا۔"

مجھے مارا جانے والا سیگل یاد آ گیا۔ "شاید تمہارے دوست نے اس سیگل کو اپنی رائفل کا نشانہ بنایا تھا جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر شور مچا رہا تھا۔"

"اس کا نشانہ بھی غضب کا ہے۔ اس وقت وہ اپنی اس حویلی سے فرلانگ بھر دور ہے۔ وہیں سے اس نے سیگل کو نشانہ بنایا ہوگا۔"

"فرلانگ دور سے اُڑتے سیگل کو...... ناممکن۔"

"وہ ایسے ہی ناممکن کو ممکن کر دکھانے والا شخص ہے۔ رات کھانے پر تم اس سے ملو گے۔"

میں نے ایک نظر عریاں لڑکی کو دیکھا اس کے بال اخروٹی رنگ کے تھے۔ "تم کہہ رہے ہو کہ یہ جزیرہ جنوبی افریقہ کی سمندری حدود میں ہے لیکن یہاں معمولی سی سردی ہے۔"

"یہ درست ہے۔ دراصل اس جزیرے کے اردگرد سے گرم پانی کی خلیجی رو گزرتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس جزیرے پر معتدل سی سردی پڑتی ہے۔ ورنہ اس سے صرف سو میل دور ساحل پر اس وقت درجہ حرارت صفر کے آس پاس ہے۔"

"جبکہ یہاں بیس درجے سینٹی گریڈ سے زیادہ ہی ہے۔"

"اس سے ملو جینا۔" جان گرے نے آواز دی تو میں دنگ رہ گیا۔ جینا کے بال سنہری مائل تھے۔ اس نے سر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خمار جھلک رہا تھا۔ "ہیلو ہینڈسم...... تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

"آدمی اپنی قسمت سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "بائی دی وے چند دن پہلے تمہیں ہائپوتھرمیا ہو گیا تھا اس لیے احتیاط کرو۔"




"یہاں تو بہت شاندار موسم ہے۔" اس نے جان بوجھ کر کروٹ لی اور کاؤچ پر چت لیٹ گئی۔ میں بے اختیار اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ "کپڑے پہنو...... نہ پہنو فرق نہیں پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے مس جینا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اسٹین جیسے لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میرا محافظ جان گرے ہے۔" اس کے انداز میں فخر نمایاں تھا۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ "میں کتنی دیر بے ہوش رہا؟"

"بارہ گھنٹے سے زیادہ...... آج صبح تم یہاں لائے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے تکلیف کے پیش نظر تمہیں نیند کا انجکشن دے دیا تھا۔ اس وجہ سے تم سوتے رہے۔ توانائی بحال رکھنے کے لیے ڈرپ کے ذریعے گلوکوز اور طاقت کی دوائیں بھی دی گئی تھیں۔"

"تبھی میں خود کو معمول کے مطابق محسوس کر رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر آنے والا ہوگا۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "تمہارا معائنہ بھی کرے گا۔"

چند منٹ بعد ایک دُبلا پتلا اور طویل قامت سیاہ فام اوپر آیا۔ اس نے مخصوص میڈیکل بکس اُٹھا رکھا تھا۔

"ہیلو ماسٹر۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "گڈ آفٹر نون۔"

جان گرے نے منہ بنایا۔ "اپنا کام کرو۔" اس نے اپنی دائیں ران سیاہ فام کے سامنے پھیلا دی۔ ڈاکٹر نے اس کے زخم سے پٹی اُتاری۔ نیچے زخم کے گرد مخصوص کھرنڈ نمودار ہو رہا تھا۔ اس نے خشک پاؤڈر چھڑک کر زخم پر دوبارہ پٹی چپکا دی۔ "بس ماسٹر دو دفعہ اور پٹی کرانی ہوگی اس کے بعد آپ کا زخم بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اسے چیک کرو اور دفع ہو جاؤ۔" جان گرے غرایا۔ وہ اپنے پہلے والے موڈ میں آ گیا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے البتہ کھانے کے لیے کچھ منگوا سکتے ہو تو منگوا لو۔" میں نے انکار کیا۔

جان گرے نے تپائی پر رکھا چھوٹا سا واکی ٹاکی اُٹھایا۔ "کیا کھاؤ گے؟"

"کچھ بھی مل جائے۔ اگر تلی ہوئی مچھلی اور ٹماٹو ساس کے ساتھ آلو کے قتلے مل جائیں تو کیا بات ہوگی۔"

اس نے واکی ٹاکی پر کسی کو آرڈر دیا۔ "دونوں چیزیں بیس منٹ میں پہنچ جائیں اور اس کے بعد کافی۔"

جینا ابھی تک اسی نمایاں انداز میں لیٹی تھی۔ اس نے جان گرے سے شکوہ کیا۔ "کیا بات ہے۔ تمہارا دوست میری طرف دیکھتا کیوں نہیں ہے۔ کیا میں اسے خوب صورت نہیں لگتی۔"

جان گرے نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ "بہتر ہے یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے یوسف سے

کچھ بات کرنی ہے۔ ویسے بھی یہ پکا مسلمان ہے۔ اسے جیسے شراب سے دلچسپی نہیں ہے اسی طرح شباب سے بھی نہیں ہے۔''

جینا نے اس سے زیادہ بُرا منہ بنایا اور پاس پڑا گاؤن پہن کر اندر جانے لگی۔ ''جہنم میں جاؤ۔'' اس نے کہا تھا۔

''تم نے اس سے شادی تو نہیں کر لی ہے؟'' میں نے جان گرے سے پوچھا۔

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''تمہیں یہ شبہ کیسے ہوا؟''

''اس کے انداز سے...... وہ بالکل بیوی کے انداز میں بول رہی تھی۔''

''یاد رکھنا۔ ایسی حماقت اگر میں نے کی بھی تو وہ میری زندگی کی آخری حماقت ہوگی۔''

''تب یہ تمہاری قائم مقام محبوبہ ہے۔ جب تک کہ اصلی محبوبہ نہیں مل جاتی۔''

اس نے پھر قہقہہ مارا۔ ''یہ تم نے خوب کہی۔ اس امید پر میں کپڑوں کی طرح عورتیں بدلتا ہوں۔''

جینا نے اندر سے کہا۔ ''اگر تم نے میرے معاملے میں بھی ایسا کرنے کا سوچا تو میں تمہاری زندگی کی آخری عورت بھی ہوسکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''یہ ایسا کرسکتی ہے۔'' میں نے جان گرے کو اُکسایا۔

''جان گرے کو بھی ہرنی کے بجائے شیرنی پسند ہے۔'' وہ بولا۔ ''بہرحال اس موضوع پر بعد میں بات کریں ابھی میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اگر مجھے ایگزیکٹو کونسل سے اجازت مل گئی تو تمہارا معاملہ سلجھانے میں مجھے ایک دو مہینے لگیں گے۔ اس دوران میں تمہیں صبر سے کام لینا پڑے گا۔''

''اگر تم مجھے اس معاملے میں مجبور کرسکو تو کرلو۔ ورنہ موقع ملتے ہی میں پھر فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں اب اپنی حفاظت کے لیے تم پر انحصار نہیں کرسکتا۔''

''میں تمہیں اس کے لیے مجبور بھی نہیں کررہا۔ بس میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ رہو۔ ہاں تم محسوس کرو کہ میں تمہاری حفاظت کرنے میں ناکام رہا ہوں تو تم کوئی بھی قدم اُٹھانے کے لیے آزاد ہوگے۔''

''مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے جان گرے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔''

''دیکھو یوسف۔'' اس نے نیا جام بنایا۔ ''تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ میرے ساتھ رہو۔ تم بین الاقوامی سیاست کی جن پیچیدگیوں میں پھنس چکے ہو ان سے تمہیں صرف میں نکال سکتا ہوں۔''

''تم سے پہلے بھی بہت سارے لوگوں نے اس قسم کے فرعونی دعوے کیے لیکن میں تم پر نہیں خدا پر بھروسہ کرتا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''او کے...... میں تم سے ڈیل کرتا ہوں۔ دیکھو اب ان سارے معاملات سے میرا دل بھی




اُکتا چکا ہے۔ آرگنائزیشن نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ میں اس سے جان چھڑا کر اپنی باقی زندگی ایسے ہی کسی خوب صورت سے جزیرے پر گزارنا چاہتا ہوں۔''

''تم نے خود کہا تھا آرگنائزیشن سے صرف مر کر نجات ملتی ہے۔''

''یہ اصول عام لوگوں کے لیے ہے۔''

میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''اچھا تم میں کیا خاص بات ہے۔ کیا تم پیدا نہیں ہوئے...... مرو گے نہیں یا تمہاری ایک عدد دُم ہے۔''

''مذاق مت کرو۔ میں عام کیڑے مکوڑوں سے بہت بلند ہوں۔''

''میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ پوری طرح سنجیدہ ہوں۔''

''او کے...... میں تم سے بحث نہیں کروں گا لیکن میں تمہیں خبردار کروں گا مجھ سے الگ ہوکر تم صرف اپنے لیے مشکل کھڑی کروگے۔''

ایک باوردی شخص ٹرے میں تلی ہوئی مچھلی آلو کے قتلے اور تین چار طرح کے ساس لے آیا۔ مچھلی لذیذ تھی اور آلو کے قتلوں نے بھی مزہ دیا تھا۔ اس ماحول میں اس قسم کا لنچ کرنا واقعی تعیش تھا۔ جب تک میں کھاتا رہا۔ وہ شخص وہاں موجود رہا۔ وہ میرے لیے لائم جوس بھی لایا تھا۔ لنچ ختم کرتے ہی کافی آ گئی تھی۔ اپنے لنچ اور کافی نے میرا موڈ خوشگوار کردیا تھا۔ جان گرے اپنا شغل جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس قسم کی لگژری زندگی پیسہ مانگتی ہے۔''

''میں نے پیسے کی کبھی ضرورت سے زیادہ پروا نہیں کی۔''

''یوسف میرے کام آکر تم بے انداز دولت کما سکتے ہو۔''

''بے انداز دولت کمانے کے میرے پاس بہت ذرائع تھے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''میں نے جس بحری جہاز پر سات سو ڈالرز ماہانہ پر نوکری کی تھی، میں اس جیسے دس جہاز خرید سکتا تھا۔ اگر میں اپنے ایمان کا سودا کرلیتا۔ جان گرے اس وقت بھی میرے نام پر جو کاروبار ہے اس کی سالانہ آمدنی کروڑوں ڈالرز ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ اگر تم چاہو تو میں جمشید علی کے بیٹوں سے نہ صرف یہ کاروبار بلکہ کاجل بھی تمہیں دلوا سکتا ہوں۔'' میں چونکا۔

''تم کاجل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''سب۔'' اس نے چسکی لی۔ ''یہ بھی کہ تم اس کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہو۔ کسی کی جان لے سکتے ہو اور اپنی جان دے بھی سکتے ہو۔''

میرا دل لرزنے لگا تھا۔ میں جو بات جان گرے سے چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ بالآخر اس نے جان لی تھی۔ جان گرے نے میری طرف دیکھا۔ ''فکر مت کرو یہ بات مجھ تک محدود ہے۔ آرگنائزیشن والے تمہارے بارے میں چھان بین کرتے وقت اتنی گہرائی میں نہیں گئے تھے۔''

''اب تم مجھے کاجل کے حوالے سے بلیک میل کرو گے؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں ایسی حماقت نہیں کروں گا۔'' اس نے جام خالی کر کے ٹیبل پر پٹخ دیا۔ ''یوسف جب میں تمہاری طرف سے مکمل طور پر مایوس ہو جاؤں گا تب سوچوں گا کہ مجھے اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔''

اس کی دھمکی واضح تھی۔ میرا سارا خوشگوار موڈ غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ جان گرے نے واکی ٹاکی پر کسی کو کال کیا۔ ''مہمان یوسف علی خان کو اس کا کمرا دکھا دو اور اسے کسی قسم کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔''

جان گرے جس طرح ڈیوک کے ملازموں پر حکم چلا رہا تھا اس سے اس گھر میں اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ جان گرے کھڑا ہو گیا۔ ''یوسف جا کر آرام کرو۔ چاہو تو جزیرے کی سیر کرو لیکن یہ بتا دوں کہ یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''میں بھی فی الحال فرار کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن مسٹر جان گرے اگر آدمی فرار ہونے کا فیصلہ کر لے تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔''

''مگر مجھے یقین ہے تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے۔'' اس نے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

میں ذرا آگے جا کر جزیرے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیوک کا یہ محل یقیناً جزیرے کے سب سے بلند حصے پر تھا اسی وجہ سے یہاں سے پورے جزیرے کا معائنہ کیا جا سکتا تھا۔ سامنے اور بائیں طرف گھنا جنگل تھا جس کے پار ریتیلے ساحل کی چمک نظر آ رہی تھی۔ دائیں جانب نسبتاً اونچی سطح تھی اور سمندر یہاں سے خاصا دور نظر آتا تھا۔ عقب میں دیکھ نہیں سکتا تھا میں نے کمرے کی کھڑکی سے صرف ایک جھلک دیکھی تھی اس طرف زیادہ خشک جھاڑیاں تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جزیرے کی جیٹی کس طرف تھی لیکن اس کی موجودگی یقینی تھی۔

''سر یوسف علی خان۔'' عقب سے آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک ایشیائی نقوش کا حامل شخص کھڑا تھا۔ وہ شاید برمی یا نیپالی تھا۔ ''میرے ساتھ آئیں جناب میں آپ کو آپ کا کمرا دکھاتا ہوں۔'' وہ ستعلیق قسم کی انگلش بول رہا تھا۔ سیڑھیوں سے اُتر کر ہم ایک کھلے لان کی طرف آئے۔ ایک طرف سے سیڑھیاں عمارت کے اندر کی طرف بھی جا رہی تھیں۔ مگر ملازم مجھے باہر کی طرف سے اس وسیع و عریض محل کے ایک حصے میں لایا۔ میں نے راستے میں کئی ملازم دیکھے جو مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ ایک ملازم ڈرائیو وے میں کھڑی کھلی جیپ کی صفائی کر رہا تھا۔ وہاں ایک شاندار لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی۔ اس قسم کی گاڑیاں امرا سفاری کی مہمات میں استعمال کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا اتنے سے جزیرے پر اس قسم کی گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔

مہمان خانہ محل کے مطابق ہی تھا۔ ملازم نے مجھے ایک لگژری قسم کے سوٹ میں پہنچایا۔ جس میں دو بیڈ رومز اور ایک پُر آسائش نشست گاہ تھی۔ یہ پورا سوئٹ بہترین فرنیچر اور سامان سے مزین





تھا۔ ماسٹر بیڈ روم میں بڑی سی وارڈ روب تھی۔ اٹیچ باتھ شاہانہ قسم کا تھا اس میں عام غسل سے لے کر ترکش باتھ تک تمام سہولیات میسر تھیں۔ ڈیوک نے اس محل کی تعمیر اور یہاں آسائشیں مہیا کرنے پر نہ جانے کتنی دولت صرف کی تھی۔ یہ سب اس براعظم میں ہو رہا تھا جس میں لاکھوں افراد ہر سال بھوک سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے ایک ملک میں مٹھی بھر افراد سارے براعظم کی باقی دولت پر قابض تھے۔

''میں جزیرے پر گھومنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس ملازم سے کہا۔

''سر اگر آپ گھوڑا چاہتے ہیں تو وہ بھی، ورنہ یہاں پر سیر کرنے کے لیے خاص قسم کے کارٹ ہیں۔ ایک راہنما بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔''

''شکریہ...... مجھے کسی راہنما کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھے کارٹ دکھاؤ۔''

کارٹ خاص قسم کی چھوٹی گاڑیوں کو کہتے ہیں جو خاص علاقوں میں چلنے کے لیے بنائی جاتی ہیں جیسے گالف کورس میں چلنے والی چوڑے پہیوں والی کھلی گاڑی یا صحرا میں سفر کرنے کے لیے فور وہیل ڈرائیو۔ ملازم جس کا نام نورنگا تھا مجھے ڈرائیو وے سے متصل شیڈ تک لے گیا جہاں کئی چار پہیوں والی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں انہیں خاص طور سے ناہموار راستوں پر سفر کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مجھے انہیں چلانے کا تجربہ تھا۔ میں نے ایک کار رسٹارٹ کی اور اسے گھما کر شیڈ سے باہر لے آیا۔ نورنگا نے جو برمی تھا مجھے ایک کارڈ دیا۔ ''آپ اسے دکھا کر باہر جا سکتے ہیں اور واپسی پر بھی آپ کو یہ کارڈ دکھانا پڑے گا۔''

''اور اگر میں کارڈ نہ دکھاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''تب آپ کو گارڈ اندر آنے نہیں دیں گے جب تک آپ کسی کا حوالہ نہ دیں اور وہ آ کر آپ کی تصدیق نہ کر دے۔'' نورنگا نے خبردار کیا تھا۔ یہ پلاسٹک کا گہرے نیلے رنگ کا کارڈ تھا۔ جس کے وسط میں زرد سورج نما دائرہ بنا تھا۔ میں موٹر سائیکل دوڑاتا مین گیٹ تک لایا۔ محل کے گرد اونچی قلعہ نما چار دیواری تھی جس پر جا بجا حفاظتی برج تھے۔ سیاہ وردی میں ملبوس چوکس گارڈ کو کارڈ دیا۔ اس نے چوکی میں موجود شخص کے حوالے کیا۔ اس نے کارڈ ایک مشین گن سے گزارا اور مطمئن ہو کر واپس کر دیا۔

''جانے دو۔'' اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

میں موٹر سائیکل لے کر باہر نکلا۔ جزیرے کے مختلف حصوں میں جانے کے لیے پتھر سے بنی باقاعدہ پختہ سڑک تھی۔ میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل سے گزرتی یہ سڑک نشیب میں جا رہی تھی۔ دائیں طرف جو اونچا حصہ تھا یہ اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ پہلے ساحل کی جھلک نظر آئی اور میں اچانک ڈاک کے سامنے جا نکلا اس پر دو جیٹی تھیں جن پر چھوٹی بڑی کئی لانچیں اور ایک عدد بڑا ٹرالر تھا۔ ایک ذرا لگژری قسم کی لانچ ڈاک سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ ڈاک کی تنصیبات کے علاوہ مجھے

ایک طرف عمارتیں بھی نظر آئی تھیں۔ ان کی نوعیت رہائشی لگ رہی تھی۔ ڈاک کے اردگرد جنگلا تھا اور گزرنے کے واحد راستے پر حفاظت کے لیے دو مسلح افراد تھے۔ اس طرف سے ایک سڑک گھوم کر ساحل کی طرف جاتی تھی۔ میں ڈاک کی طرف جانے کے بجائے اس طرف گھوم گیا۔ ذرا دیر بعد یہ سڑک ریت کے خوب صورت ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ جس پر پام اور ناریل کے جھنڈ تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ساحل پر خاصی رونق تھی۔ جامے سے باہر کوئی درجن بھر خواتین وحضرات سن باتھ کے مزے لے رہے تھے۔ یہ سب سفید فام تھے۔ میں نے موٹر سائیکل روکی تو ایک لڑکی میری طرف آئی۔ ''ہائے...... میں انجیلا ہوں، تم کون ہو؟''

''یوسف...... میں ڈیوک کا مہمان ہوں۔''

''اوہ معاف کیجیے گا جناب۔'' یہ لڑکی بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''میں ناواقف تھی، بتائیے آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

''کچھ نہیں...... شکریہ...... ہاں تو کیا تم سب ڈیوک کے ملازم ہو؟''

''جی جناب...... آج ہماری چھٹی کا دن ہے۔ اس لیے ہم تفریح کر رہے ہیں۔''

''جب مجھے یہاں آنے کی دعوت دی گئی تو میں نے سوچا نہیں تھا یہ جزیرہ اتنا بڑا اور آباد ہو گا۔''

''جناب صرف ملازمین کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔'' لڑکی نے نخرے سے کہا۔ ''جزیرے کو بجلی اور تازہ پانی مہیا کرنے کے لیے اپنا ایٹمی بجلی گھر ہے۔'' لڑکی نے فخر سے کہا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈیوک اس حد تک بارسوخ ہوگا کہ نجی طور پر ایٹمی بجلی گھر حاصل کرے گا۔ ''اچھا مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہ بجلی گھر کہاں ہے؟''

''جزیرے کے انتہائی شمال میں انسانوں سے دور تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آ بھی جائے تو انسان محفوظ رہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اگر آپ فرمائیں تو آپ کے لیے ڈرنک لاؤں۔ ویسے میں بھی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

''نہیں مجھے ڈرنک یا کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی۔ ''جا کر مزے کرو۔''

''شکریہ جناب۔'' لڑکی نے کہا اور دوڑتی ہوئی اپنے ساتھیوں کی طرف چلی گئی۔

میں نے اس سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ یہ ساحل اور کبھی کبھی جزیرے کے اندرونی حصوں سے گزرتی شمال کی طرف جا رہی تھی۔ ایک جگہ مجھے وارننگ بورڈ نظر آیا۔ ''آگے حساس علاقہ ہے جانے سے گریز کریں۔'' میں نے بورڈ کو نظر انداز کر کے اپنا سفر جاری رکھا۔ اچانک ایک مسلح شخص راستے میں حائل ہو گیا۔ وہ مجھے رُکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ ''کیا بات ہے مجھے کیوں روکا ہے؟''




''آگے حساس علاقہ ہے کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اپنی شناخت کراؤ۔''

''میں ڈیوک کا مہمان ہوں اور اس کا ایٹمی بجلی گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ اس حوالے سے بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ ''سر اپنا شناخت نامہ دکھائیں۔''

''میرے پاس کوئی شناخت نامہ نہیں ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کو شناخت نامے کے بغیر باہر کیسے آنے دیا؟''

تب مجھے اس کارڈ کا خیال آیا۔ میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''شاید تم یہ مانگ رہے ہو۔'' اس نے کارڈ دیکھا اور مطمئن نظر آنے لگا۔ ''ٹھیک ہے سر لیکن آپ کو یہاں سے واپس جانا ہوگا۔ آپ پورے جزیرے میں گھوم پھر سکتے ہیں سوائے اس علاقے کے۔ ایٹمی بجلی گھر کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ شکریہ سر۔''

اس نے مہذب انداز میں کہہ دیا تھا کہ میں یہاں سے جا سکتا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل موڑی اور واپسی کا سفر کرنے لگا لیکن ساحل کی طرف جانے کے بجائے میں نے جزیرے کے وسطی حصے کی طرف جانے والی سڑک منتخب کی۔ یہاں راستہ تنگ اور کسی قدر ناہموار تھا۔ اچانک ایک جھاڑی سے سؤر برآمد ہوا اور خوں خوں کرتا سڑک پار کر کے دوسری طرف جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ یہ بڑے کٹاری نما دانتوں والا خطرناک سور تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس جزیرے پر اس قسم کے جانور بھی رکھے جا رہے ہیں۔ یقیناً سور باہر سے لایا گیا تھا۔ راستہ دوبارہ بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا، شاید میں دوبارہ محل کی طرف جا رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ جب اونچے جنگل سے باہر آتے ہی مجھے محل کے اوپری حصے کی جھلک نظر آئی۔ کچھ دیر بعد میں محل کے پھاٹک پر تھا۔ ضروری کارروائی سے گزر کر میں اندر پہنچا۔ شیڈ میں موٹر سائیکل کھڑی کی اور مہمان خانے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک طرف سے گھوڑے پر سوار ایک ادھیڑ عمر سفید فام نمودار ہوا۔ اس نے سفید برجس کی پتلون اور اوپر نیلی قمیص پہن رکھی تھی۔ چڑھی ہوئی مونچھیں اور بھاری قلموں کے ساتھ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی رکن لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے خیال آیا وہ ڈیوک تھا۔ سفید رنگ کے گھوڑے کو دلکی چال چلاتا میرے پاس آیا۔ اس نے گھوڑا روک کر مجھے دیکھا اور صرف ہونٹوں سے مسکرایا۔ ''مسٹر یوسف علی خان اب تم کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔ غالباً تم ڈیوک ہو۔''

اس نے سر ہلایا اور گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ فوراً ہی ایک طرف سے ملازم نمودار ہوا اور گھوڑے کی لگام تھام کر اسے لے گیا۔ ڈیوک نے اپنے دستانے اُتارے۔ ''مجھے جان گرے نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ میں تم سے متاثر ہوا ہوں نوجوان۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ جان گرے نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہے لیکن میں ایک عام سا

آدمی ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "الیکٹرک کو شکست دینے والا شخص معمولی نہیں ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے لڑتے دیکھا ہے۔ اگر تم اس کی ٹانگ نہ توڑتے تو اس برس وہ اسٹریٹ فائٹرز کی عالمی چمپئن شپ میں حصہ لینے کی تیاری کررہا تھا۔"

"وہ درحقیقت بہت اچھا لڑتا ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ میرے داؤ میں آ گیا۔"

"میں نے اس فائٹ کی مووی دیکھی ہے۔ تم نے زخمی اور تکلیف میں ہونے کے باوجود بہادری سے اس کا مقابلہ کیا۔ کوئی اور ہوتا تو مقابلے سے پہلے ہی ہمت ہار جاتا۔ میں نے سنا ہے الیکٹرک نے ایک بار پھر تم سے لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔"

"ممکن ہے کیا ہو، میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

ڈیوک مجھے لے کر ایک طرف لان پر رکھی چیئرز کی طرف آیا۔ اس کے آتے ہی ملازمین نے شام کی چائے اور دوسرے لوازمات میز پر لگا دیئے۔ ایک نازک اور حسین سی لڑکی نے چائے سرو کی۔ چائے کے دوران ڈیوک اپنے مشاغل کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر اس نے سٹریٹ فائٹنگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ آخر وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔

"میرے پاس ایک ملازم ہے۔ جیوریل گمانا سے اس کا تعلق ہے۔ یہ پورا قبیلہ لڑنے اور پہلوانی کے لیے مشہور ہے۔ جب سے جیوریل نے تمہارے آنے کا سنا ہے تم سے ملنے کی فکر میں ہے۔"

"کیا وہ مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"مجھے افسوس ہے میں نے آج تک کسی کی تفریح کے لیے لڑائی نہیں کی ہمیشہ اپنے دفاع میں لڑا ہوں۔ الیکٹرک سے مقابلے کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس سے نہ لڑنے کی صورت میں مجھے یقینی موت کا سامنا تھا۔"

"اوکے...... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ فوراً مان گیا۔

کچھ دیر بعد وہ معذرت کر کے چلا گیا۔ میں بھی اپنے مہمان خانے میں آ گیا۔ رات کا کھانا میں نے اپنے سوئٹ میں ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد مجھے کافی سرو کی گئی تھی جس کے دو گھونٹ لیتے ہی میرا سر چکرانے لگا تھا اور میں صوفے پر ہی لڑھک گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں کسی سخت جگہ چت پڑا تھا ارد گرد خاصا شور تھا۔ میرا ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ میں نے غور سے سنا بے شمار لوگ آپس میں بول رہے تھے۔ کئی کسی مقابلے پر شرطیں لگا رہے تھے۔ بالآخر میں نے اُٹھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ میرے ساتھ کوئی چکر چلایا جا رہا تھا۔ چکر اُٹھنے پر ہی سامنے آتا۔ جیسے ہی میں اُٹھا، ایرَ بناتے چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے لوگ بے پناہ شور وغل مچانے لگے تھے۔ میں گھوم کر دیکھنے لگا مجھے کہیں ڈیوک یا جان گرے نظر نہیں آیا ایک طرف وی آئی پی قسم کے کچھ باکس تھے۔ چند




ایک ذرا اچھی قسم کی نشستیں تھیں جن پر معزز قسم کے خواتین وحضرات تھے اور باقی پبلک تھی۔ ایرینا دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ کیا ڈرامہ کیا جارہا ہے۔ مجھے مقابلے پر مجبور کیا جارہا تھا اور مقابلہ غالباً جیوریل سے تھا۔ اسی لمحے مجھے جان گرے، جینا اور ڈیوک ایرینا میں داخل ہوتے نظر آئے۔ جان گرے کے چہرے پر کشیدگی تھی اور ڈیوک مسکرا رہا تھا۔

میں وی آئی پی باکس کے قریب پہنچا۔ "مسٹر ڈیوک اس حرکت کا مقصد؟"

"میں تمہیں روبرو لڑتے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"غالباً تم اپنے مہمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہو۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں کسی سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں مقابلے کا اعلان کر چکا ہوں۔ اگر تم نہیں لڑو گے تو جیوریل کو فاتح قرار دے دیا جائے گا اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ ایرینا میں فاتح مفتوح کے ساتھ ہر سلوک کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔"

"گویا مجھے اس مقابلے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ مسٹر ڈیوک اگر اس مقابلے میں تمہارا یہ غلام ضائع ہو گیا تو۔"

"تو تم پر کوئی الزام نہیں ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔ "ایرینا میں ہونے والے خون کا کسی سے حساب نہیں لیا جاتا ہے۔"

"کیا یہ کوئی باقاعدہ مقابلہ ہے؟"

"باقاعدہ مقابلہ ہے۔" وہ بولا۔ "لڑنے والا صرف اپنے ہاتھ پیروں سے لڑے گا۔"

"تم لوگ کسی اصول کے پابند نہیں ہو۔ تم ایک فرد ہو۔ میں نے آرگنائزیشن کے تحت ہونے والے مقابلوں میں دھاندلی ہوتے دیکھی ہے۔ تو مسٹر ڈیوک میں کس طرح یقین کرلوں کہ یہ مقابلہ بھی فیئر ہو گا۔"

ڈیوک کا چہرہ چند لمحے کے لیے سرخ ہوا تھا۔ جان گرے نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے منع کیا تھا کہ میں ڈیوک سے بحث نہ کروں۔ مگر میں اس وقت جان گرے کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں بدستور ڈیوک کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ "یہ ڈیوک کا وعدہ ہے۔ مقابلہ صاف ہو گا۔"

میں استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے ایرینا کے درمیان میں واپس آ گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایرینا کسی اِن ڈور جمنازیم میں بنایا گیا تھا۔ یہ لکڑی کی مدد سے بنایا گیا تھا کوئی تین فٹ اونچا دائرہ تھا جس کے باہر نشستیں لگائی گئی تھیں۔ ایرینا کوئی پچیس فٹ قطر کا تھا اور اس کا فرش بھی لکڑی کا بنا تھا۔ اس لمحے ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام ہال میں داخل ہوا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم کسی سیمنٹ کی بوری کی طرح ٹھوس تھا۔ اس نے محض ایک پاجامہ پہن رکھا تھا اور

اوپری جسم پر کھال تلے پٹھے تھے۔ اس کی چال اور چہرے کا سکوت بتا رہا تھا کہ وہ ایک اچھا لڑاکا ہے۔ وہ سکون سے تین فٹ اونچی دیوار کود کر ارینا میں آ گیا۔ وہ قامت اور جسامت میں مجھ سے زیادہ تھا۔ میں نے اسی طرز کا نرم سوتی پاجامہ اور اوپر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یہ لباس مجھے بے ہوشی کے دوران پہنایا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے دوسرا لباس پہن رکھا تھا۔

جیوریل نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور عربی سے ملتی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے معذرت کی۔ ''دوست میں سوائے انگریزی، اردو اور فارسی کے کوئی اور زبان نہیں بول سکتا۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔

جیوریل مسکرایا۔ ''میں نے کہا تھا۔ مجھے تم سے لڑ کر خوشی ہوگی۔ میں تمہارا سر اپنے جھونپڑے میں سجاؤں گا۔''

''افسوس کہ ہماری طرف ایسی کوئی روایت نہیں پائی جاتی ہے۔ ہم مُردہ دشمن کو عزت و احترام سے دفن کر دیتے ہیں۔''

اس کے چوڑے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ایک ریفری نما شخص مقابلے کی شرائط کا اعلان کر رہا تھا۔

اس میں صرف ایک شرط تھی۔ یعنی کسی بیرونی مدد کے بغیر مقابلہ جیتنے والا اپنے مفتوح کے لیے ہر قسم کا حق رکھتا تھا۔

''میں نے جیتنے کی صورت میں اپنا ارادہ بتا دیا ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟'' جیوریل نے پوچھا۔

''میں اتنی دور کی نہیں سوچتا۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''ایک کام نمٹا لوں پھر دوسرے کی طرف توجہ دیتا ہوں۔'' ایک گھنٹی بجائی گئی۔ یعنی مقابلے کا وقت ہو گیا تھا۔ جیوریل کی آنکھیں یک لخت سرخ ہوگئی تھیں اور چہرے سے وحشیانہ تاثرات جھلکنے لگے تھے۔ وہ انگلیاں جھٹکتا تھرکنے لگا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ باتوں کے دوران مجھے جسم گرما لینا چاہیے تھا۔ میں بھی اسکیپنگ (پنجوں کے بل اُچھلنا) کرنے لگا۔ جیوریل نے مجھے موقع دیا۔ جیسے ہی میں ساکت ہوا وہ ارنا بھینسے کی طرح میری طرف لپکا۔ میں نے اسے نزدیک آنے دیا اور سینہ ترچھا کرتے ہوئے اس کا سر بغل سے پکڑ لیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری کمر کے گرد حائل کیے اور بے پناہ قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اُٹھا لیا۔ وہ مجھے لے کر دے مارنے کے لیے لکڑی کی دیواریں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر میں نے اس کے پیر میں پیر پھنسا کر اسے گرا دیا۔ ظاہر ہے وہ میرے اوپر گرا تھا یوں لگا جیسے کوئی چٹان مجھ پر آ گری ہو۔ میں نے گھٹنے موڑ کر سینے سے لگا لیے کیونکہ وہ میری کمر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا جسم ترچھا تھا اس لیے وہ اپنے سر سے میرے چہرے پر ضرب لگانے سے قاصر تھا۔ وہ اپنا گول چکنا سر میرے شانے سے ٹکرانے لگا۔ شانہ اکڑانے سے میرے شانے کو نقصان ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں ضربیں برداشت کرتا رہا۔ ایک بار اس نے زور سے سر مارنے کے




لیے زیادہ ہی پیچھے کیا اور جیسے ہی اس نے سر شانے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں نے شانے سکیڑ کر نیچے کیے اور اس کی اوپری ہڈی آگے کر کے اس کے منہ سے ٹکرا دی۔ اس کا سر بھی پوری رفتار سے آ رہا تھا اس لیے تصادم کی رفتار دوگنی ہوگئی تھی۔ شانے کی ہڈی اس کی آنکھوں کے درمیان ناک کے اوپری حصے میں لگی۔ اس کے منہ سے ادھوری سی دھاڑ نکلی تھی اور جیسے ہی اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی میں نے دونوں پاؤں زور لگا کر مارے اور وہ اُچھل کر دور جا گرا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے اُٹھا تب تک میں فرش پر بیٹھا رہا۔ اس کی ناک سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے غرا کر اپنی زبان میں کچھ کہا اور وحشیانہ انداز میں میری طرف لپکا۔ جیسے ہی وہ میری زد میں آیا میں نے لات گھمائی مگر وہ حیرت انگیز پھرتی سے اُچھل کر میرے شانے پر ٹھوکر مارتا دوسری طرف چلا گیا۔ شدید تکلیف کے باوجود میں آگے لڑھک گیا ورنہ اس کی عقب سے آتی لات میری گردن بھی توڑ سکتی تھی۔ کم سے کم ڈھائی سو پونڈز وزنی ہونے کے باوجود وہ بے حد پھرتیلا تھا۔ اپنا شانہ سہلا کر میں فرش سے اُٹھا، اتنے پھرتیلے مقابل کے سامنے ذرا سی سستی بھی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

''حساب برابر ہو گیا۔'' وہ مسکرایا۔ ناک میں تکلیف کی وجہ سے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کسی نہ کسی کا حساب رہ ہی جائے گا۔'' میں اُچھلنے لگا۔ ساتھ ہی شانہ بھی ہلا رہا تھا۔ تکلیف کے باوجود وہ صحیح کام کر رہا تھا۔ ''تمہارا یا میرا۔''

اس بار اس نے کھلے بازوؤں کا سا انداز بنایا اور جھکائیاں دیتا میری طرف آیا میں نے اس کے ہاتھوں پر نظر جمائے رکھی۔ اس دوران اس نے میرے گھٹنے پر ٹھوکر ماری، پاؤں موڑنے کی وجہ سے وہ ران پر لگی، میں لڑکھڑایا تو اس کا لیفٹ ہک قیامت خیز انداز میں میرے جبڑے پر پڑا اور میں تقریباً اُڑ کر فرش پر جا گرا۔ ایسا لگا کہ جبڑا ٹوٹ گیا ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا تھا۔ خطرے کا احساس کرتے ہوئے میں نے تیزی سے خود کو سنبھالا، جیوریل نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دوران میں مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ میں اُٹھا اور سر جھٹک کر منہ چلایا۔ جبڑا سلامت تھا۔ جان گرے متفکر ہو کر چلایا تھا۔ ''یوسف ہوشیاری سے۔''

''یوسف۔'' جیوریل چونکا۔ ''تم یہودی ہو۔''

''خدا نہ کرے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ''میں مسلمان ہوں۔''

''مگر مجھے تو تمہارا نام جوزف بتایا گیا ہے۔''

''بتانے والے تمہیں کچھ بھی بتا سکتے ہیں۔''

اس نے ہاتھ نیچے کر لیے۔ ''اگر تم مسلمان ہو تو میں اب تم پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔ میں بھی مسلمان ہوں۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیوں کیا مسلمان مسلمان سے نہیں لڑتے۔''

''اس وجہ سے تو ان حالوں کو پہنچے ہیں۔ میں نے جوانی میں عہد کر لیا تھا کہ کسی مسلمان سے

نہیں لڑوں گا۔ اس وجہ سے میں نے سٹریٹ فائٹس بھی چھوڑ دیں۔ کیونکہ ان مقابلوں میں بھی مسلمان آتے ہیں۔"

ڈیوک یہ سب سن رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے۔ آخر وہ کھڑا ہو گیا۔

"جیوریل میں نے تمہیں اس سے لڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے مذہب دریافت کرنے کا نہیں۔" وہ کرخت انداز میں بولا۔ جیوریل نے اس کی طرف دیکھا۔ "معافی چاہوں گا آقا...... لیکن میں اپنی قسم سے مجبور ہوں، میں کسی مسلمان سے نہیں لڑ سکتا۔"

"جیوریل تمہیں لڑنا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"آقا میں آپ کے حکم پر پاگل ہاتھی سے بھی لڑ سکتا ہوں لیکن کسی مسلمان سے نہیں۔ آپ کی ملازمت کرتے وقت میں نے جو معاہدہ کیا تھا اس میں درج ہے کہ آپ میرے مذہبی معاملات کا احترام کریں گے۔"

"اس معاہدے میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں تمہیں حکم عدولی پر سزائے موت دے سکتا ہوں۔" ڈیوک نے دانت پیسے۔

"آپ آقا ہیں، میری جان لے سکتے ہیں۔" جیوریل نے پُرسکون لہجے میں کہا تھا۔

"گارڈز۔" ڈیوڈ چیخا۔ "اسے لے جاؤ۔"

"ایک منٹ۔" میں نے مداخلت کی۔ "مسٹر ڈیوک مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں مقابلہ جاری رکھنا چاہوں گا۔" جیوریل نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تم مجھ سے لڑو گے۔"

"میں تم سے لڑ رہا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے شاید محسوس کر لیا کہ تم اس مقابلے میں مجھ سے جیت نہیں سکتے اس لیے اب اس بہانے سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔"

جیوریل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "تم مجھے بزدل کہہ رہے ہو؟"

"میں نہیں کہہ رہا تم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم بزدل نہیں ہو تو میرا مقابلہ کرو۔"

وہ غرا کر بولا۔ "اگر میں نے قسم نہ کھائی ہوتی تو......"

"قسم کا بہانہ مت کرو۔ مجھ سے لڑو یا ہار مان لو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے ہار مانتا ہوں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"مسٹر ڈیوک! مقابلے کے اصول کی رو سے فاتح ہارنے والے پر ہر طرح کا استحقاق رکھتا ہے۔"

"یہ درست ہے۔" ڈیوک نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"تب جیوریل آج سے میرا غلام ہے۔ اس کی جان اور مال پر میرا حق ہے۔"




ڈیوک چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ جان گرے کود کر ایرینا میں آیا۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی ہے۔ ڈیوک کو ناراض کر دیا۔"

میں مسکرانے لگا۔ "باقی اور کون مجھ سے خوش ہے مسٹر گرے۔"

"تم نہیں جانتے اسے۔ وہ سخت کینہ پرور شخص ہے۔" جان گرے نے سرگوشی میں کہا تھا۔

"مجھے بھی اس سے کسی اعلیٰ ظرفی کی امید نہیں ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ اس شخص سے دست بردار ہو جاؤ۔"

"مسٹر جان گرے زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں اس شخص کی جان بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ جو ایک اصول کے لیے جان دینے کو تیار ہو گیا تھا۔"

"تم اسے نہیں بچا سکتے۔" جان گرے نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ ایرینا سے باقی تماشائی بھی مایوسی کے عالم میں رخصت ہو چکے تھے۔ جیوریل ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے میرے آقا؟"

"تم میرے غلام نہیں ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال آؤ میرے ساتھ۔"

ایرینا کہاں تھا یہ مجھے علم نہیں تھا لیکن جب میں جیوریل کے ساتھ باہر نکلا تو معلوم ہوا ہم محل کے ہی ایک حصے میں تھے۔ یہ ہال جو بائیں طرف کے لان کے پار فصیل کے ساتھ تھا شاید اس قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ جیسے ہی ہم کھلے حصے میں آئے، جیوریل نے مجھے روک لیا۔ "آقا میرا مشورہ ہے آپ مجھ سے دست بردار ہو جائیں۔ ورنہ یہ شخص آپ پر بھی کوئی عتاب نازل کرے گا۔"

"دیکھو جیوریل اول تو ایک بات یاد رکھو۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا آقا صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو آقا کہنا درست نہیں ہوگا۔ دوسرے جس طرح تم اصول پسند ہو اور اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار ہو، جانتے ہو اسی طرح میں بھی اصول پسند کرتا ہوں اور محض زندگی کے خوف سے کوئی اصول ترک نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری شکست تسلیم کے بعد اپنی مرضی کا فیصلہ سنایا اور اب تمہاری جان و مال کا تحفظ کرنے کی کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑ جائے۔"

"میں اتنا اہم آدمی نہیں ہوں جس کے لیے آپ اپنی جان دیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔ تم ان سب سے زیادہ اہم ہو۔ کیونکہ اصول پسند ہو۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "ڈیوک سفاک آدمی ہے اس کے لیے اپنی انا سب سے اہم ہے۔ آپ نے اسے سب کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ وہ آپ کو میرے ذریعے مروانا چاہتا تھا کیونکہ آپ نے اس کے کسی پسندیدہ فائٹر کو شکست دی تھی اور اب آپ نے اس کے عزائم کو خاک میں ملا

دیا ہے۔ وہ زخمی سانپ بن گیا ہے۔"

"جانور جو بھی زخمی ہو اسے مار دینا چاہیے۔ بہرحال اب تم میرے ساتھ رہو گے۔"

میں جیوریل کو اپنے ساتھ مہمان خانے میں لایا۔ "معاف کیجیے گا۔ یہاں کوئی ملازم مہمان خانے میں نہیں ٹھہر سکتا ہے۔" نورنگا نے مجھے دیکھتے ہی آگاہ کیا تھا۔

"یہ شخص اب ڈیوک کا نہیں میرا ملازم ہے۔ اس لیے میرے ساتھ ہی ٹھہرے گا۔"

نورنگا نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ مہمان خانہ صرف ڈیوک کے مہمانوں کے لیے ہے۔ مہمانوں کے ملازمین کے لیے دوسری جگہ رہائش کا انتظام ہے۔"

"میرا ملازم میرے پاس رہے گا۔ اگر یہ یہاں نہیں رہ سکتا تو میں بھی اس جگہ نہیں رہوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اسی جگہ کھڑا رہا۔ "بہتر ہے تم مسٹر جان گرے سے بات کرو۔ اگر وہ اس بات پر رضامند نہیں ہوتا تو میں اپنے ملازم سمیت جزیرے سے چلا جاؤں گا۔"

نورنگا اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ جیوریل نے مایوس مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"جناب آپ ناکام کوشش کر رہے ہیں۔"

"جب تک کوشش کا نتیجہ سامنے نہ آئے، اسے کامیاب یا ناکام نہیں کہا جا سکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"جناب میں ایک بار پھر درخواست کروں گا۔" جیوریل نے کمرے میں آ کر کہا۔

"تم اس معاملے میں زیادہ فکر نہ کرو، آرام کرو، بلکہ جا کر اپنی ناک دھو۔ اس میں خون جم جائے گا۔"

جیوریل باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ آیا تو فریش لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سامنے صورے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی قدر جھجک کر بیٹھ گیا۔ "مجھے اپنے بارے میں بتاؤ جیوریل۔"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "ہمارے قبیلے میں بیٹے کو پیدا ہوتے ہی جنگجو بنانے کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بارہ سال کی عمر تک میں تمام ہتھیار چلانا سیکھ چکا تھا۔ ہمارے مرد جنگجو کے طور پر اپنی خدمات بیچ کر روزگار کماتے ہیں۔ یہی ہمارا ذریعہ روزگار ہے۔ میں پہلے ایک گوریلا فورس میں تھا لیکن جب اس نے دشمن کے بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام کیا تو میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں سٹریٹ فائٹر بن گیا۔ فورس چھوڑتے وقت میں نے عہد کیا تھا کہ کسی مسلمان پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ اس وجہ سے سٹریٹ فائٹنگ بھی چھوڑ دی۔ گزشتہ دس سال سے ڈیوک کے ساتھ ہوں۔ کبھی کبھی ڈیوک تفریح کے لیے یہاں پر مقابلے کراتا ہے۔ اس میں باہر سے آنے والے فائٹر مجھ سے لڑتے تھے اور میں نے ہمیشہ انہیں شکست دی مگر ایسی فرمائش اس نے کبھی نہیں کی۔"





میں نے اسے انگلی ہونٹ پر رکھ کر خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ "تم نے شادی کی ہے یا اب تک غیروں سے ہی لڑتے رہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی اپنی بیوی ہو تو آدمی اس سے لڑے۔"

وہ مسکرایا۔ "جی ماسٹر...... ایک بار کی تھی شادی مگر بیوی دوسرے سال سانپ کے کاٹنے سے مر گئی۔ ہمارے علاقے میں سب سے آسان شے مرنا ہے۔"

"تیسری دنیا کے ہر ملک کا یہی المیہ ہے۔ موت ان کے لیے آسان اور زندگی مشکل کر دی گئی ہے۔"

اسی لمحے نورنگا دو مسلح افراد کے ساتھ اندر گھس آیا۔ میں نے گرج کر کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے تم تینوں بغیر اجازت کے اندر کیسے آئے؟"

"ماسٹر...... ہمیں اس شخص کو گرفتار کرنے کا حکم ملا ہے۔" نورنگا نے جیوریل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ شخص میرا ملازم ہے اور کسی کو اسے گرفتار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اگر اسے زبردستی گرفتار کرنے کی کوشش کی تو میں مزاحمت کروں گا اور اس دوران میں کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

"سوری ماسٹر...... میں بہرصورت ڈیوک کا حکم بجا لاؤں گا۔ گرفتار کر لو اسے۔" نورنگا نے مسلح افراد کو حکم دیا۔ وہ رائفلیں تانے جیوریل کی طرف بڑھے تھے کہ میں نے ایک پر چھلانگ لگا دی۔ میرا سر اس کے سینے پر لگا اور اس کی رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کا ساتھی بوکھلا کر میری طرف مڑا تھا کہ جیوریل نے اسے قابو کر لیا۔ اس کا ایک ہاتھ کھا کر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل نورنگا اور گرے ہوئے شخص کی طرف سیدھی کی۔ "تم ہمیں گرفتار نہیں کر سکتے۔"

نورنگا نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے رائفل اس کے منہ میں ٹھونس دی تھی اور اشارے سے اسے بولنے سے منع کیا۔ "ماسٹر یہ مجھے ہتھکڑی پہنا رہا ہے۔" جیوریل نے میرا مطلب سمجھ کر واویلا کیا۔ "آپ نے کہا تھا کہ مجھے بچائیں گے۔"

"جیوریل مزاحمت مت کرو۔ میں جان گرے سے بات کروں گا۔"

جیوریل نے دوسرے کی گردن دبا کر اسے بھی بے ہوش کر دیا تھا اور نورنگا کے منہ میں رائفل کی نال تھی۔ میں نے رائفل جیوریل کو تھمائی اور ایک کاغذ پر لکھا۔ "نورنگا یہاں سے باہر جانے کا کوئی ایسا راستہ بتاؤ جہاں کوئی نگرانی نہ ہو، کیمرے اور مائک نہ ہوں۔" کاغذ میں نے نورنگا کے سامنے کیا تو اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ میں نے دوسرا سوال لکھا۔ کنٹرول روم کہاں ہے تم مجھے وہاں تک لے چلو۔"

اس سوال کو پڑھ کر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا لیکن اس کے چہرے پر دہشت کے تاثرات

نمایاں ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں وہاں تک لے جا سکتا تھا۔ میں نے بے ہوش افراد کی تلاشی لی۔ ایک کے پاس سے ریوالور نکلا تھا۔ میں نے نورنگا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”مجھے کنٹرول روم تک لے چلو ورنہ یہیں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اس دوران میں جیوریل عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ”مفروضہ“ گرفتاری پر شور مچا رہا تھا۔ میں نے جیوریل کو اس جگہ رُکنے کا اشارہ کیا اور نورنگا کی کمر سے ریوالور لگا کر اسے باہر لایا۔ راہداری میں مَیں نے آہستہ سے کہا۔ ”ایسی جگہ سے چلنا جہاں کیمرہ نہ ہو ورنہ یاد رکھو سب سے پہلے تم مرو گے آقا کے وفادار کتے۔“

”میں کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ پلیز مجھے مارنا مت۔“

”کنٹرول روم کہاں ہے؟“

”جمنازیم ہال کے اوپر جہاں مقابلے ہوتے ہیں۔“

”اور جیوریل کو گرفتار کر کے کہاں لے جاتے؟“

”کنٹرول روم کے نیچے لوگوں کو قید رکھنے کی جگہ ہے۔ جیوریل کو بھی وہیں رکھا جاتا۔“

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھلی فضا میں آ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن فضا سرمئی بادلوں سے ڈھکی تھی اور خنکی بڑھ گئی تھی۔ ”کنٹرول روم اور اس کے آس پاس کتنے محافظ ہوتے ہیں؟“

”تین...... دو کنٹرول روم میں ہوتے ہیں اور ایک باہر۔“ اس نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں چلتا میں جمنازیم تک آیا۔ ہال کے بائیں طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ کنٹرول روم وہیں تھا۔ سیڑھیوں کے پاس ایک مسلح شخص ٹہل رہا تھا۔ ہم درختوں کی آڑ میں تھے میں نے ایک تنے کے پیچھے ہوتے ہوئے نورنگا سے کہا۔ ”سامنے آ کر اسے بلاؤ۔ خبردار اگر فوت ہونے کا ارادہ نہ ہو تو اسے کسی قسم کا اشارہ مت کرنا۔“

”اچھا۔“ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ پھر درخت کے عقب سے نکل کر مسلح شخص کو آواز دی۔ اسے بلایا۔ نورنگا محل کے ملازموں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے مسلح شخص اس کے بلاوے پر لپک کر آیا۔ جیسے ہی وہ درخت کے تنے کے پاس سے گزرا میں نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر مارا۔ وہ کراہ کر گرا، اور دوسری ضرب پر ساکت ہو گیا۔ اس کی رائفل نورنگا کے پاؤں میں جا گری تھی۔ مگر وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے رائفل اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کی رائفل بھی اُٹھا لی اور اس کے پاس سے ایک فاضل کلپ بھی لے لیا۔ ”اب کنٹرول روم کی طرف چلو۔ ایسے ہی تعاون کرتے رہو گے تو زندہ رہو گے۔“

اس بار میں اس سے یوں چپک کر چل رہا تھا کہ اس کے اور میرے جسم کے درمیان رائفل چھپی رہے۔ گارڈ کو میں نے دو درختوں کے درمیان اس طرح ڈال دیا تھا کہ وہ آسانی سے نظر نہ آئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک شیشے کے دروازے کے سامنے پہنچے جہاں دو افراد وردیوں میں کوئی




درجن سے زیادہ سکرینوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلنے پر گھنٹی بجی تو انہوں نے چونک کر دیکھا۔ نورنگا کی صورت انہیں مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی مگر جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی وہ تیزی سے اُٹھے ان کے ہاتھ ہولسٹروں میں ریوالور کی طرف گئے مگر میں نے زیادہ تیزی دکھائی ایک کے بازو پر گولی لگی اور دوسرے کے پیٹ میں دونوں گر گئے۔ ریوالور کی آواز زیادہ نہیں تھی اور کمرے کی ساخت سے لگ رہا تھا یہ ساؤنڈ پروف تھا مجھے امید تھی آواز باہر کسی کے کانوں تک نہیں گئی ہو گی۔ نورنگا کی گھگھی بندھ گئی تھی اور وہ انگریزی بھول کر اپنی مادری زبان پر اُتر آیا تھا۔ میں نے دونوں نگرانوں کے سروں پر ضرب لگا کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ اس کی طرف سے اطمینان کر کے میں نے نورنگا کو واپسی کا حکم دیا۔

”اب بھی وقت ہے مجھے باہر جانے کا کوئی محفوظ راستہ بتا دو۔“

”سب سے محفوظ راستہ یہی ہے کہ آپ مین گیٹ سے کارڈ دکھا کر گزر جاؤ۔ ابھی تک دوسروں کو علم نہیں ہے کہ جیوریل کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا ہے۔“

”یہ کی نا کام کی بات لیکن جیوریل کا پاس۔“

”اسے کسی پاس کی ضرورت نہیں ہے۔ پاس تو یہاں آنے والے اجنبیوں کو دیا جاتا ہے۔“

”اب واپس چلو۔“ میں نے دونوں افراد کے ریوالوروں پر قبضہ کیا۔ نورنگا میرے ساتھ یوں مہمان خانے کی طرف آیا جیسے بکری قصائی کے ہمراہ ذبح خانے آتی ہے۔ اپنے سوٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کے سر پر بھی دستہ بجا کر اسے اس کے ساتھیوں کے پاس لٹا دیا۔ جیوریل نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کو کہا ممکن ہے کنٹرول روم کے علاوہ بھی ہماری آواز کہیں اور سنی جا رہی ہو۔ میں نے اسے ریوالور دیا اور رائفل وہیں پھینکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ محل سے بہ حفاظت نکلنا ذرا مشکل ہو سکتا تھا اگر مین گیٹ کے محافظ مشکوک ہو کر روک لیتے تو ہم دشواری میں پڑ جاتے۔ باہر آتے ہی جیوریل نے پوچھا۔ ”کیا ارادہ ہے ماسٹر؟“

”فی الوقت یہاں سے نکلنا ہے۔ ڈیوک نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا اور میرا نام یوسف ہے ماسٹر نہیں۔“

اس نے دانت نکالے۔ ”چلو یہی سہی لیکن پھر میں برادر کہوں گا۔“

میں نے ایک ریوالور اور فالتو راؤنڈز اس کے حوالے کیا اور باقی دو اپنے پاس رکھے۔ ذاتی طور پر مجھے بھی ریوالور اس لحاظ سے اچھے لگتے ہیں کہ انہیں ری لوڈ کرنا آسان ہوتا ہے۔ گولیاں ختم ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

”ذرا جلدی کرو۔ ہم موٹر سائیکلیں لے کر نکلیں گے۔ ایسا نہ ہو ڈیوک بے تاب ہو کر کسی کو پڑتال کے لیے بھیج دے۔“ میں نے قدم اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ذرا سی دیر میں ہم شیڈ کے پاس تھے وہاں نصف درجن کے قریب موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ جیوریل نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا اور

موٹر سائیکلوں کے ٹائروں میں چاقو گھونپنے لگا۔ یہ چاقو اس نے سوٹ سے اُٹھایا تھا۔ پھل تراشنے کے کام آتا تھا۔ چار موٹر سائیکلوں کے سولہ ٹائر اس نے صرف دو منٹ میں ناکارہ کر دیئے۔ اب کم سے کم کوئی ان پر ہمارے تعاقب میں نہیں آئے گا۔"

میں اُچھل کر ایک موٹر سائیکل پر بیٹھا۔ مین گیٹ پر گارڈز کا رویہ معمول کے مطابق تھا۔ انہوں نے میرا پاس لے کر چیک کیا اور جیوریل کو ایسے ہی جانے دیا۔ ہم صاف نکلتے چلے گئے۔ ڈیوک سے غلطی ہوئی تھی اگر اس نے جیوریل کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اسے سارے محل والوں کو اس سے مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ ذرا دور جا کر میں نے موٹر سائیکل روک دی۔ "اس جزیرے پر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم ڈیوک کے مسلح افراد کا بہتر طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔"

"اب میرے پیچھے آؤ برادر۔" اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ اس نے جنگل کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے کچھ دور جا کر سڑک چھوڑ کر کچا راستہ اختیار کیا۔ ایک جگہ جہاں سے اوپر کی طرف ڈھلان جا رہی تھی۔ "یہاں سے پیدل چلنا ہوگا۔"

"دیکھو برادر...... یہ جزیرہ شکل سے پون مربع کا ہے اور تقریباً سو افراد اگر ہمیں کھنگالنا شروع کریں تو زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھنٹے میں تلاش کر لیں گے۔"

وہ رُک گیا۔ "تب آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"یہاں سے فرار ہونا ہم زیادہ سے زیادہ ایک دن چھپ سکتے ہیں۔"

"فرار تو مشکل ہے۔" وہ سوچ کر بولا۔ "ڈاک پر صرف وہی جا سکتا ہے جس کے پاس پرمیشن ہو۔ وہاں کی حفاظت بھی زیادہ کی جاتی ہے۔"

"تب بھی فرار تو ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ مارے جائیں گے۔"

"اب بھی وقت ہے برادر تم اپنی جان بچا سکتے ہو۔"

"میں ایسا سوچنے پر بھی مرنے کو ترجیح دوں گا اوپر چلو۔" میں نے اسے دھکیلا، ذرا سی دیر میں ہم ایک بلند جگہ پر تھے یہاں سے محل کی فصیل صاف نظر آ رہی تھی۔ "لگتا ہے انہیں ابھی تک ہمارے فرار کا علم نہیں ہوا۔"

"ایک منٹ رُکو۔" اس نے کہا اور بندروں کی پھرتی سے ایک بلند درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے اوپر سے کمنٹری شروع کر دی۔ "محل کا مین گیٹ کھل رہا ہے۔ وہ لوگ جیپ اور موٹر سائیکلوں پر نکل رہے ہیں۔ کتے بھی ہیں۔"

"مارے گئے۔ ان کا تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔" میں کراہا۔ جیوریل اوپر سے کودا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر دوڑنے لگا۔ ہم بے حد تیزی سے فصیل کی طرف جا رہے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ جیوریل کا دماغ اُلٹ گیا ہے اور وہ خودکشی کرنے کا جا رہا ہے۔ مگر کتوں کے بھونکنے کی آواز آتے ہی میں اس کا مقصد جان کر میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ تم کتے اور





میں ان کے محافظ۔" جیوریل نے کہا۔ میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"پہلے کتے...... وہ آگے ہوں گے۔"

ایک جھاڑی کے عقب سے کتے لپکتے نظر آئے ان کی تعداد چھ تھی۔ یہ بلڈ ہاؤنڈ نسل کے خطرناک کتے تھے جو میلوں دور سے اپنے شکار کی بُو سونگھ لیتے ہیں۔ میں اور جیوریل جھاڑیوں سے پیچھے ہٹ کر دو موٹے تنے والے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ جھاڑیوں سے کتے اچانک ہی نکلے تھے۔ اگر ہم انجان ہوتے تو شاید بوکھلا جاتے مگر ہم نے دائیں بائیں کے حساب سے کتوں کو گولیاں مارنا شروع کیں۔ میں نے تین گولیوں میں تین کتے مار دیئے اور اتنی ہی گولیوں سے جیوریل نے باقی تین کتوں کا کام تمام کر دیا تھا۔ وہ دردناک آوازیں نکالتے ہوئے ختم ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جھاڑیوں کے دوسری طرف سے تین چار خودکار رائفلیں گولیاں برسانے لگی تھیں۔ اگر ہم تنوں کی آڑ میں نہ ہوتے تو مارے جاتے۔ ہم نے دوبارہ ریوالورز لوڈ کر لیے۔ گارڈز جیسے اپنے میگزینز خالی کرنے پر تُل گئے تھے۔ جب ان کے میگزینز ختم ہوئے تو وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہمارے بارے میں بتانے لگے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جھاڑیوں میں گھستے۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا اور جیوریل کو بھاگنے کا اشارہ کیا۔ وہ دبے قدموں بھاگا اور چند گز آگے جا کر ایک تنے کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کے عقب میں مَیں بھی اسی طرح پیچھے ہٹا۔ ذرا سی دیر میں ہم خاصی دور جا چکے تھے۔ جیوریل کی حاضر دماغی کی وجہ سے ہم کتوں کے خطرے سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ جو بذات خود تو اتنے خطرناک نہیں تھے مگر جزیرے پر وہ ہماری نشاندہی باآسانی کر سکتے تھے۔

"ڈیوک کے پاس تلاش کرنے والے بس یہی کتے تھے؟" میں نے ایک جگہ رُک کر پوچھا۔

"ہاں...... ڈیوک کو کتوں سے صرف شکار کی حد تک دلچسپی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس فی الحال یہی چھ کتے تھے۔ اس نے اور بھی منگوائے تھے لیکن وہ سمندری آب و ہوا برداشت نہ کر سکے۔"

"ہمیں اس طرح اندھا دھند نہیں بھاگنا چاہیے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "سب سے پہلے تو ہمیں باخبر ہونا چاہیے کہ ڈیوک کے آدمی کہاں ہیں۔"

جیوریل نے ذرا غور کیا۔ "وہ ہمیں تین طرف سے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ چوتھی طرف ایٹمی بجلی گھر ہے۔ تین طرف میں سے وسطی حصہ زیادہ مشکل ہے۔ وہاں گھنی جھاڑیاں ہیں۔ مشرقی اور مغربی طرف سے نسبتاً آسان ہے۔ ہمیں وسط کی طرف جانا چاہیے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس طرف جھاڑیاں ہیں اور انہوں نے ہمیں تلاش کرنے کے بجائے برسٹ مارنے شروع کر دیئے تو ہم کس طرح بچیں گے۔ یہ بتاؤ کہ قلعے کی فصیل کے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں چھپا جا سکے۔"

اس نے سوچا۔ "مشکل ہے۔ ہمیں اس بلند حصے کے دوسری طرف اُترنا پڑے گا۔ اس طرف

ڈھلان خطرناک ہے لیکن اس راستے سے ہم محل کے عین نیچے جانکلیں گے اور وہاں پر موجود گھنے درخت ہمیں چھپا سکتے ہیں۔''

''تو بس پھر وہیں چلو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

جزیرے پر کئی اونچی جگہیں تھیں۔ سب سے اونچی جگہ پر محل تھا جو جزیرے کی باقی سطح سے کوئی ڈیڑھ سوفٹ بلند تھا اس کے بعد دوسری بلند سطح یہ ڈھلان تھی جس پر ہم چڑھ رہے تھے۔ یہ بتدریج مغرب کی طرف بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا کنارہ طویل اور کٹا ہوا تھا دوسری طرف کی ڈھلان بے حد خطرناک تھی اس سے اُترنے کے لیے ازحد احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے پاؤں پھسلتا، آدمی سیدھا سمندر کے اوپر چٹانوں پر جا گرتا۔ پانی ان چٹانوں کے درمیان شور مچا رہا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ ڈھلان سے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک جیوریل کا پاؤں پھسلا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ورنہ وہ نیچے جا گرتا۔

''شکریہ برادر۔'' وہ مسکرایا۔ ''اس طرف جانے کی خاص وجہ؟''

''اس طرف سے ہم محل میں گھسنے کا راستہ تلاش کریں گے۔''

اس کا منہ کھل گیا۔ ''محل میں گھسنے کا راستہ؟''

میں نے ایک جگہ پاؤں جمائے۔ ''ہاں...... وہاں جائے بغیر ہمارا کام نہیں بنے گا۔''

''برادر تب تو ہمیں وہاں سے فرار نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاں لیکن عقل باہر آ کر آئی۔ ہمیں ڈیوک کو یرغمال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس سے سارے بند راستے خود کھل جاتے۔''

جیوریل اُچھل پڑا تھا۔ ''واقعی...... یہ سامنے کی بات تھی۔ بھلا جزیرے پر نکل کر ہم کیا کر سکتے۔''

یہاں سے محل کا وہ حصہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں سب سے اوپر کے حصے میں وہ چھوٹا سا کمرا تھا۔ جس میں مجھے ہوش آیا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی سے میں نے یہی ڈھلان دیکھی تھی جس پر ہم سفر کر رہے تھے۔ اس کے اوپری حصے میں اونچے درخت اور نچلے حصے میں گھنی خزاں رسیدہ جھاڑیاں تھیں۔ قریب سے دیکھنے پر پتا چلا کہ جھاڑیاں خزاں رسیدہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان پر گچھوں کی صورت میں سفیدی مائل سرمئی پھول آتے تھے۔ جن کی وجہ سے جھاڑیاں بے رنگ سی نظر آتی تھیں۔ ان پھولوں سے ایک انوکھی مہک اُٹھ رہی تھی۔ ایک بار میں نے محل کی طرف دیکھا۔ اس کی تہہ در تہہ ڈھلان پر وہی ایک کمرا نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی اس کی کھڑکی سے جھانکتا تو ہمیں با آسانی دیکھ سکتا تھا لیکن اس وقت کسی کے ذہن میں نہیں تھا کہ ہم جزیرے کے اندرونی حصے میں چھپنے کے بجائے محل کی طرف آ رہے ہوں گے۔ میں نے جیوریل سے پوچھا۔ ''اس جزیرے میں سیکیورٹی گارڈز کی تعداد کیا ہو گی؟''




''زیادہ نہیں ہے۔ شاید پچاس کے قریب ہوں گے۔ بیس افراد ایٹمی بجلی گھر کی سیکیورٹی کرتے ہیں۔ پندرہ افراد ڈاک پر ہوتے ہیں اور اتنے ہی محل میں ہوتے ہیں۔''

''ظاہر ہے ڈیوک سارے کے سارے ہماری تلاش پر نہیں لگا سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایک بات یقینی ہے محل کے سارے سیکیورٹی والے اس وقت ہماری تلاش میں ہوں گے۔''

جیوریل نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''یعنی اگر ہم محل میں داخل ہو جائیں تو ہمیں خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

ہم محل کے عین نیچے تھے۔ اس طرف ڈھلان اتنی ترچھی اور خطرناک تھی کہ اس طرف کسی کے آنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے محل کی جانب سے اس طرف کوئی دروازہ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ ڈھلان سے کوئی تیس فٹ کی بلندی پر محل کی ایک دیوار تھی نہ جانے اس طرف بالکونیز کیوں نہیں نکالی گئی تھیں۔ اس طرف صرف دیوار تھی یا چھجے۔ جن کے تلے اگر کھڑکیاں تھیں تو اس جگہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جیوریل نے اوپر دیکھا۔

''برادر اس طرف سے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''راستہ ضرور ہو گا۔ بس اسے تلاش کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں مغرب کی طرف جاتی ڈھلان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس طرف ڈھلان بے پناہ ترچھی تھی لیکن اس طرف دیوار بھی محض دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ جیوریل نے میرا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ ''یہ بہت مشکل ہے۔''

''ناممکن نہیں ہے۔'' میں نے مغرب کی طرف جاتے سورج کی طرف دیکھا۔ دس پندرہ منٹ میں سورج ڈوب جاتا اور مشکل سے نصف گھنٹے بعد اندھیرا چھا جاتا۔ ''ہمیں جو کرنا ہے تاریکی چھانے سے پہلے کرنا ہے۔''

''میرا خیال ہے تاریکی کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''تاریکی ہوتے ہی تلاش کرنے والے سیکیورٹی گارڈ کو واپس بلا لیا جائے گا اور پھر ہمارے لیے محل میں داخل ہونے کا موقع کم ہو جائے گا۔ ایک منٹ...... پہلے میں جاتا ہوں اگر کوئی چانس ہوا تو میں تمہیں بھی بلا لوں گا۔''

میں نے ریوالور اور فاضل گولیاں جیوریل کے حوالے کر دیں کیونکہ ان کے گر جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے چاروں ہاتھ پیروں سے کام لینا تھا۔ میں ڈھلان سے چپک کر اس طرف بڑھنے لگا۔ یہاں محل کی دیوار دائرے میں گھوم رہی تھی۔ ذرا آگے جا کر ڈھلان خطرناک ہو گئی تھی۔ اب بالکل نیچے چٹانیں تھیں جن پر گرنے کا مطلب اپنی ہڈی پسلی ایک کروا لینا تھا۔ میں ڈھلان سے چھپکلی کی طرح چپٹ کر آگے جا رہا تھا۔ جیوریل نے عقب سے آواز دی۔

''برادر احتیاط سے۔''

دیوار کا حصہ رفتہ رفتہ نزدیک آ رہا تھا۔ یہاں سے پہلی دیوار کا چھجا کوئی بیس فٹ اونچا تھا۔

جب اس طرف کھڑکی نہیں تھی تو بلاوجہ تین چار چھجے نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال ممکن تھا اس کا مقصد تعمیراتی حسن پیدا کرنا ہو۔ یا اس طرف سے کسی کا اوپر کی طرف جانا مزید مشکل بنانا۔ چھجے ترچھے اور کھپریل کے بنے تھے۔ ان پر چڑھنا ناممکن حد تک دشوار نظر آ رہا تھا۔ بہر حال مجھے کسی اور راستے کی تلاش تھی۔ میں بتدریج گھومتی ڈھلان پر آگے جا رہا تھا۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا اور جیوریل میری نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہاں ڈھلان تین درجے سے زیادہ تھی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دیوار صرف دس فٹ اوپر سے شروع ہو رہی تھی لیکن بدستور ناقابلِ سر تھی۔ مجھے مزید آگے جانا تھا۔ میں رینگتا رہا۔ حتیٰ کہ محل کا تعمیراتی حصہ ختم ہونے لگا اس کی فصیل شروع ہو گئی۔

تب میں نے وہ جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے ہم ممکنہ طور پر محل میں داخل ہو سکتے تھے۔ اس جگہ فصیل کی تعمیر میں ترچھے پتھر استعمال ہوئے تھے اور فصیل بھی ترچھی تھی۔ اگرچہ اس پر چڑھنا بے حد خطرناک تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ میں نے ذرا غور کیا اور واپس آنے لگا۔ جیسے ہی جیوریل نظر آیا میں نے اسے اشارے سے آنے کو کہا۔ اس نے تینوں ریوالور اور گولیاں اپنی قمیص تلے بنیان میں ڈال لیں اور میری طرف آنے لگا۔ اسے آتے دیکھ کر میں پھر سے آگے جانے لگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور روشنی تیزی سے معدوم ہو رہی تھی۔ ہمیں تاریکی چھانے سے پہلے ہی فصیل عبور کر کے محل میں پہنچ جانا تھا۔ ورنہ سیکیورٹی والے واپس آ جاتے۔

چار فٹ کی ڈھلان کے بعد فصیل تھی اور اس سے نیچے کوئی سو فٹ نیچے شور مچاتے سمندر پر چٹانیں تھیں اور نیچے گرنے کے بعد بچنے کا مطلب فوت ہونا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اوپر فصیل تک پہنچا۔ پتھر اُبھرے تھے اور فصیل بھی کسی قدر ترچھی تھی۔ پھر بھی اس پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ میں جیوریل کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے سہارا دیتا تو میں آسانی سے اوپر چڑھ سکتا تھا۔ جیوریل چند منٹ بعد آ گیا تھا۔ محل کی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ فصیل پر بھی وقفے وقفے سے بلب روشن تھے۔ مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ اتنی روشنی میں کوئی بھی ہمیں باآسانی دیکھ سکتا تھا۔

"جیوریل مجھے اوپر جانے میں مدد دو۔"

اس نے اوپر دیکھا۔ "اتنی روشنی میں اندر سے دیکھ لیے جانے کا امکان ہے۔"

"ہاں..... لیکن چانس تو لینا ہے۔ ہم یہاں نہیں رُک سکتے۔"

جیوریل نے دو مناسب جگہوں پر اپنے پاؤں جمائے اور ہاتھوں سے دیوار کی جڑیں اُبھرے پتھر کو پکڑ لیا۔ میں نے اس کے شانے پر پاؤں رکھا اور خود کو اوپر اُٹھاتے ہوئے اُبھرے پتھروں پر ہاتھ جمائے۔ ابھی بھی دیوار کا سرا میرے ہاتھ سے دو فٹ اوپر تھا۔ جیوریل آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگا۔ میں فصیل کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے ہاتھ فصیل کے کنارے پر جم گئے۔ میں نے ایک پتھر پر پاؤں جماتے ہوئے خود کو اوپر کیا۔ فصیل اوپر سے دو فٹ سے زیادہ چوڑی تھی۔ میں اوپر چڑھتے ہی لیٹ گیا۔ یہ عقبی باغ کا ایک حصہ تھا۔ فصیل کے ساتھ چند پھیلے ہوئے گھنے درخت تھے جو




خوب صورتی کے لحاظ سے تو ٹھیک تھے لیکن حفاظتی نقطہ نظر سے درست نہیں تھے۔ ان کی وجہ سے نہ صرف فصیل اندر والوں کی نظروں سے اوجھل تھی بلکہ کوئی بھی ان درختوں کے سہارے اندر سے فصیل پر چڑھ سکتا تھا۔ بلکہ اندر اُتر بھی سکتا تھا۔ واحد خطرہ محل کے اس طرف والے حصے کی کھڑکیوں اور ایک عدد بالکونی سے تھا۔ وہاں سے کوئی بھی باآسانی مجھے دیکھ سکتا تھا۔

میں نے نیچے جھانکا۔ "جیوریل اوپر آ جاؤ۔" میں نے ہاتھ نیچے کیا۔ اس نے اُچک کر ہاتھ تھام لیا اور پتھروں پر پاؤں جماتا اوپر آ گیا۔ اسے زیادہ مشکل نہیں پیش آئی تھی۔ میں نے سرک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"برادر اب اس سے پہلے کہ کسی کی نظر پڑے نیچے اُتر جاؤ۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ذرا صبر کرو۔ ہم نہیں جانتے کہ ان درختوں تلے کوئی ہے یا نہیں۔" میں نے جوابی سرگوشی کی۔ "اس جگہ کو یونہی چھوڑ دینا مجھے معنی خیز لگ رہا ہے۔"

"اس طرف کوئی نہیں ہوتا ہے۔" جیوریل نے بتایا۔ "اسے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔"

"اوکے...... مجھے ریوالور دو۔" میں نے کہا۔ جیوریل نے دو عدد ریوالور، گولیاں میرے حوالے کیں۔ "لیکن یاد رہے کہ اشد ضرورت کے بغیر فائر نہیں کرنا۔ اب مجھے بتاؤ کہ ڈیوک اس وقت کہاں ہو گا۔"

"اس قسم کے حالات میں ڈیوک اپنے سوٹ سے متصل آفس میں منتقل ہو جاتا ہے۔ وہیں سے ساری صورتِ حال پر نظر رکھتا ہے۔"

"تمہیں کیمروں کی پوزیشن پتا ہے؟"

"کسی حد تک۔"

"ڈیوک اپنے دفتر میں کیمروں سے حاصل شدہ مووی دیکھ سکتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "دیکھ سکتا ہے۔"

میری نظر درختوں تلے کسی امکانی حرکت کی کھوج میں تھی مگر وہاں مکمل سکوت تھا۔ میں نے نزدیک شاخ کی طرف دیکھا۔ وہ فصیل سے محض دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے ایک پاؤں اس پر ٹکایا اور گھوم کر اس سے اوپر والی شاخ تھام لی۔ دونوں لچک دار شاخیں تھیں۔ میرا بوجھ مشترکہ طور پر برداشت کر لیا۔ جب تک میں درخت سے اُترتا جیوریل ایک اور درخت کے سہارے نیچے اُتر چکا تھا۔ اس نے عقبی حصے میں برآمدے کے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم اس دروازے کے سہارے براہِ راست ڈیوک کے دفتر تک جا سکتے ہیں لیکن اس کا تالا بند ہوتا ہے۔ اس الیکٹرانک لاک کو صرف ڈیوک کھول سکتا ہے۔ اس کا کوڈ اس کے پاس ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی راستہ ہے؟"

"راستے تو بہت ہیں لیکن سب پر کسی نہ کسی سے ٹکراؤ کا امکان ہو گا۔ ہم زبردستی کیے بغیر اندر

نہیں جا سکتے۔" اس لمحے ایک گارڈ اس طرف آتا نظر آیا اور ہم تنوں سے چپک گئے۔ "جیوریل اسے قابو کرنا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" جیوریل نے اپنا ریوالور نکال کر خالی کیا۔ گارڈ اس طرف آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ درختوں کے پاس آیا۔ جیوریل نے ریوالور پھینک کر دیوار پر مارا۔ کھٹاک کی آواز نے گارڈ کو چونکا دیا تھا۔ اس نے اپنی رائفل شانے سے اُتاری اور محتاط انداز میں فصیل کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ جیوریل کے پاس سے گزرا اس نے ایک ہاتھ سے ان کی گردن دبوچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس سے رائفل چھین کر میری طرف اُچھال دی۔ گارڈ نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن جیوریل نے اس کا سر درخت کے تنے سے ٹکرایا۔ تیسری بار ٹکرانے پر وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

"اس کی وردی اُتارو۔" میں نے اپنی قمیص اُتارتے ہوئے کہا۔

جیوریل نے اس کی وردی اُتار کر مجھے دی۔ میں نے وہ پہن لی۔ اور اپنے کپڑے جیوریل کو دیئے۔ "ان سے اسے درخت کے اوپر باندھ دو۔"

جیوریل اوپر چڑھا اور میں نے اسے بے ہوش گارڈ اُٹھا کر دیا۔ رائفل اپنے شانے پر لٹکائی اور پی کیپ ممکنہ حد تک چہرے پر جھکاتے ہوئے میں محل کی طرف چل دیا۔ میرا مقصد راؤنڈ لگا کر حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اس طرف یعنی محل کے سامنے والے حصے میں بے پناہ روشنی تھی مگر کوئی سیکیورٹی گارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ مجھے ایک ملازم دکھائی دیا جو اندر سے نکل کر عجلت میں مین گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور خود ایک درخت تلے کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے میری طرف دیکھا اور بادلِ نخواستہ آیا۔ "کیا ہے...... ماسٹر نے مجھے مین گیٹ بھیجا ہے۔"

میں نے ریوالور نکال کر اس کے پیٹ سے لگا دیا۔ "میں وہی ہوں جس کی تلاش کی جا رہی ہے۔ میرے ساتھ چلو ورنہ یہیں گولی مار دوں گا۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ ملازم بھی نورنگا کی طرف ایشیائی تھا۔ "میں...... میں چلتا ہوں۔"

"شاباش...... مجھ سے چار فٹ آگے چلتے رہو لیکن بھاگنے کی کوشش مت کرنا اور نہ آواز نکالنا ورنہ کسی کے آنے سے پہلے مر چکے ہو گے۔"

میں اسے بھی درختوں تلے لایا۔ اوپر سے جیوریل کود کر آیا تو اس ملازم کی حالت خراب ہو گئی۔

جیوریل نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔ "ڈیوک کہاں ہے؟"

"اپنے...... اپنے دفتر میں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اندر کتنے گارڈز ہیں؟"

"کوئی نہیں...... پورے محل میں دس سے زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ گارڈز سارے تم لوگوں کی تلاش میں نکلے ہیں۔"





"بکواس مت کرو۔ میں نے جس شخص کی وردی پہنی ہے وہ اندر ہی تھا۔"

"مجھے نہیں پتا...... لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے خود ڈیوک کو حکم دیتے سنا تھا کہ سارے گارڈز تم لوگوں کو تلاش کرنے جزیرے میں جائیں۔"

جیوریل نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور اچانک اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

"یہ موقع اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اندر گھس جانا چاہیے۔"

جیوریل نے خبردار کیا۔ "اگر کوئی فائر ہوا تو ڈیوک غائب ہو جائے گا۔ اس محل میں ایسے خفیہ راستے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہے۔"

اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ "یعنی مجھے اکیلے ہی اندر جانا ہو گا۔ تم آسانی سے پہچان لیے جاؤ گے اور ڈیوک تمہیں کیمرے سے دیکھ لے گا۔"

"ان حالات میں یہی بہتر ہے۔" جیوریل نے کہا اور اوپر چڑھ کر بے ہوش ملازم کو بھی درخت پر لے گیا۔ میں رائفل سنبھال کر دوبارہ محل کی طرف روانہ ہوا۔ جیوریل نے مجھے دفتر کا محلِ وقوع سمجھا دیا تھا اور مجھے امید تھی کہ میں با آسانی وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔ محل کے سامنے والے حصے سے میں شاہانہ انداز میں سجی گیلری میں داخل ہوا۔ اس کے اختتام پر سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اسی منزل پر دائیں طرف ڈیوک کا سوٹ اور دفتر تھا۔ دفتر کے دروازے پر شیر کے سر کا نشان بنا تھا یہ ڈیوک کا نشان بھی تھا۔ ایسے نشانات میں نے اس محل میں جا بجا دیکھے تھے۔ دروازے سے پہلے مجھے ایک لمبا تڑنگا شخص مل گیا۔

"کون ہو تم...... اس حصے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"جناب مجھے ایک اطلاع فوری طور پر ڈیوک کو دینی ہے۔"

"ڈیوک۔" اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تمہاری جرأت کیسے......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ میں نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا تھا۔ میں ڈیوک کے دفتر کی طرف دوڑا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی نہ کسی کیمرے نے مجھے دیکھا ہو گا لیکن جب میں آندھی طوفان کی طرح ڈیوک کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ محل کے بجائے جزیرے کے مختلف مناظر دیکھ رہا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ جن دو آدمیوں کے پیچھے اس نے انسانوں اور کتوں کو روانہ کیا تھا وہ اس کے محل میں تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ میں نے لات مار کر عقب میں دروازہ بند کیا اور اس کا ہاتھ میز کے نیچے جاتے دیکھ کر رائفل سے برسٹ مارا۔ اس کے بائیں طرف موجود تینوں مانیٹر چکنا چور ہو گئے تھے اور ان سے شارٹ سرکٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"ڈیوک کھڑے ہو جاؤ۔ دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر۔" میری آواز میں ایسی سختی تھی کہ وہ لرز کر کھڑا ہو گیا۔

"سامنے آؤ ڈیوک......کوئی شرارت مت کرنا۔ ورنہ کتے کی موت مر جاؤ گے۔ اپنے کتوں کی طرح۔"

اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ میں احتیاطاً ایک کونے میں ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا ڈیوک نے یہاں بھی اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست کر رکھا ہو۔ میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ "پاس آؤ میرے پاس آؤ۔" میں غرایا۔

"ڈیوک کسی کا حکم ماننے پر مرنے کو ترجیح دے گا۔" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

میں نے پھر برسٹ مارا اور اس کے سامنے میز میں متعدد سوراخ ہو گئے۔ "ڈیوک میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا لیکن تم نے مجبور کیا تو میں ایسا بھی کر گزروں گا۔"

اس بار اس کا رویہ بدلا تھا اور وہ شرافت سے سامنے آیا۔ میں نے ریوالور نکال کر اس کے سر پر لگا دیا۔ "اپنے فون سسٹم پر اعلان کراؤ کہ تم میرے قبضے میں ہو اور کسی کی غلط حرکت تمہاری جان لے سکتی ہے۔"

"یہ دیوار میں بٹن لگا ہے خود اعلان کر دو۔"

میں نے اس کی ران کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ بلٹ ذرا سا گوشت ادھیڑ کر نکل گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ "جو کہا ہے وہ کرو۔"

بادل نخواستہ اس نے بٹن دبا کر اعلان کیا کہ وہ میرے قبضے میں ہے اور گارڈز کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ ورنہ وہ مارا جائے گا۔ اس کے بعد میں نے بٹن دبا کر جیوریل کو مخاطب کیا۔ "تم ڈیوک کے دفتر پہنچ جاؤ اور اگر کسی نے جیوریل کو روکنے کی کوشش کی تو اس کا خمیازہ ڈیوک کو بھگتنا پڑے گا۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو؟" اس نے ہاتھ سے ران کا زخم دباتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے بڑا اچھا کیا تھا۔" میں نے اسے گھورا۔ "مسٹر ڈیوک یاد رکھو تمہاری سلامتی ہماری سلامتی سے مشروط ہے۔ اگر ہم پر آنچ آئی تو تم یقینی طور پر خود کو مُردہ سمجھو۔"

"مجھے بار بار مرنے کی دھمکی مت دو۔ یہ کھیل میرے لیے نیا نہیں ہے۔"

"اچھا۔" میں نے ریوالور اس کے سر سے لگا دیا۔ "تو مسٹر ڈیوک اگر تم کہو تو میں ٹریگر دبا دوں۔ صرف ایک بار کہو تو خدا کی قسم ٹریگر دبا دوں۔"

اس کے منہ سے پھر آواز نہیں نکلی۔ میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ریوالور پیچھے کر لیا تھا۔

دس منٹ بعد جیوریل آ گیا تھا۔ ڈیوک کو بے بس دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ "آج شیر پنجرے میں آیا ہے۔"

"یہ صرف پیپر ٹائیگر ہے جو ڈرا سکتا ہے۔" میں ہنسا۔

"اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ڈیوک نے شکستہ خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھے مار کر بھی تم نہیں بچ سکتے۔"




"تمہیں مارنا کون چاہتا ہے۔" جیوریل ہنسا۔ "بات اتنی ہے کہ ہم بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں اس جزیرے سے باہر تم ہمیں پہنچاؤ گے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" ڈیوک بولا۔

"بالکل ممکن ہے۔ تمہارا ہیلی کاپٹر جزیرے میں ہے۔ ہم جیپ میں وہاں تک جائیں گے اور پھر کاپٹر ہمیں جنوبی افریقہ لے جائے گا لیکن مسٹر ڈیوک ہم سوز بین جانا پسند کریں گے۔"

"اس کے لیے اجازت نامے کی ضرورت پڑے گی۔"

"مسٹر ڈیوک مجھے دست درازی پر مجبور مت کرو۔ میرے سابقہ آقا تم میرا ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکے ہو۔" جیوریل نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تمہارے پاس سوز بین کی سرحد عبور کرنے کا اجازت نامہ ہے۔"

"تم جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" ڈیوک نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"تم ہمیں نہ صرف سوز بین تک پہنچاؤ گے بلکہ تم نے معاہدے کی جو خلاف ورزی کی ہے اس پر ایک ملین ڈالرز کا ہرجانہ بھی ادا کرو گے۔"

"میں ہرجانہ نہیں دوں گا۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ "ہاں......تم زبردستی لے جاؤ تو اور بات ہے۔"

"پیارے اسے زبردستی ہی سمجھو۔" میں ہنسا۔

ہمارے دباؤ پر ڈیوک نے اپنی تجوری کھولی تو اس میں بے شمار ملکوں کی کرنسی کے ڈھیر لگے تھے۔ سونے کی سلاخیں اور اینٹیں تھیں۔ ایک خانے میں مختلف اقسام کے جواہرات رکھے تھے۔ یہ بلاشبہ کروڑوں ڈالرز مالیت کی اشیاء تھیں۔ مگر جیوریل نے اس میں سے صرف ایک ملین ڈالرز مختلف کرنسیوں کی صورت میں لے لیے۔ اس سے زیادہ اس نے ایک ڈالر بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈیوک کو اس پر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے تجوری بند کی تو میں نے کہا۔ "مسٹر ڈیوک اپنے پائلٹ کو حکم دو کہ کاپٹر طویل پرواز کے لیے تیار کرے۔"

"میرے پاس رات کے وقت پرواز کا اجازت نامہ نہیں ہے۔"

"کیوں بلاوجہ جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر رات کو تمہیں ہارٹ اٹیک یا کوئی سنگین حادثہ پیش آ جائے تو ہیلی کاپٹر صبح کا انتظار کرے گا۔" میں نے کہا۔ اس نے ایک بار پھر بادل نخواستہ اپنے واکی ٹاکی سیٹ پر کسی سے کاپٹر تیار کرنے کو کہا۔ میں نے اسے دوبارہ وارننگ دی۔ "ڈیوک اپنے آدمیوں کو خبردار کر دو۔ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے تمہاری جان کو خطرہ ہو۔"

اس نے ایک بار پھر مائیکروفون سسٹم پر اپنے آدمیوں کو خبردار کیا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ میں نے جیوریل سے کہا۔ "اسے باہر لے جانا ہے۔ کون سا راستہ اختیار کریں۔"

"یہ خود بتائے گا۔" جیوریل مسکرایا۔ "کیوں مسٹر ڈیوک اگر تمہیں کسی کی نظروں میں آئے بغیر

اپنی کار پارکنگ میں پہنچنا ہو تو کیا کرو گے؟"

"وہاں تک جانے کا کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔"

"تب ایسے ہی چلو۔" میں نے ریوالور اس کی پشت سے لگا دیا۔ "ڈیوک...... مجھے ٹریگر دبانے میں صرف سیکنڈ کا دسواں حصہ لگے گا۔"

ہم ڈیوک کو لے کر باہر آئے۔ جہاں سارے ملازمین اور گارڈز محل کے سامنے والے حصے میں جمع تھے۔ میں ڈیوک کے عین پیچھے تھا اور جیوریل میرے عقب میں۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ ڈیوک کو ڈھال بنانے کے باوجود اس بات کا پورا خطرہ تھا کہ کوئی نشانچی مجھے یا جیوریل کو شوٹ کرنے کی کوشش کرے۔ اس لمحے مجھے جان گرے تیز قدموں سے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ وہ یقیناً ناصح بن کر آیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"یوسف تم حماقت در حماقت کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو اس طرح تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہو گے۔"

"مجھے نہیں پتا کہ مجھے کامیابی ہوگی یا ناکامی...... لیکن ایک بات یاد رکھو جان گرے...... میری ناکامی کا مطلب مسٹر ڈیوک کی یقینی موت ہوگی۔"

"یوسف...... پلیز اتنا بڑا قدم مت اُٹھاؤ۔" جان گرے کا لہجہ التجائیہ تھا۔ "میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں تمہاری جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

"اچھا۔" میرا لہجہ طنزیہ تھا۔ "اگر تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو جیوریل اسے باآسانی رفع کر سکتا ہے۔"

"مسٹر ڈیوک نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں مقابلے کے دوران برادر یوسف کو قتل کرنے کی کوشش کروں۔" اس نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے یہ۔" ڈیوک تلملا کر بولا۔

"تب تم نے کس بات پر جیوریل کو سزا دینے کی کوشش کی؟"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"اوکے...... ہمارے دماغ مشترکہ طور پر خراب ہو گئے ہیں اور پاگلوں کو مرنا چاہیے۔"

میں نے ریوالور اس کی پشت پر دبایا۔

"چلو آگے۔"

"یوسف...... دیکھو معاملہ مت اُلجھاؤ۔" جان گرے نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں لیکن اس شخص پر نہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ ہمیں دشمنوں سے بچنے کے لیے اس گھٹیا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"




"جان گرے۔" ڈیوک کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ "میں اس بات کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ تمہیں بھی اس کا حساب دینا پڑے گا۔ اس شخص کو تم لائے تھے۔"

"میں کیوں دوں گا حساب۔" جان گرے نے منہ بنایا۔ "جب تمہیں معلوم ہے یہ شخص میرا ساتھی ہے تو تم نے اسے قتل کروانے کی کوشش کیوں کی۔ اس کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے تو مجھے الزام دے رہے ہو اور مجھے دھمکی دینے سے پہلے یہ سوچ لو کہ میں صرف عارضی طور پر پریشان ہوں۔ کل کو میری پوزیشن بحال ہوگی تو میں بھی تمہاری اس دھمکی کو یاد رکھوں گا۔"

"تم لوگ بعد میں مذاکرات کرتے رہنا، جب مسٹر ڈیوک واپس آ جائیں۔" میں نے جان گرے کو مشورہ دیا اور ڈیوک کو دھکیل کر باہر لے آیا۔ ڈرائیو وے میں کھڑی جیپ کی چابی ڈرائیور سے لے کر جیوریل نے اس کا معائنہ کیا اور اس کے بعض سسٹم آف کر دیئے۔

"مسٹر ڈیوک ابھی بھی وقت ہے بتا دو اگر اس جیپ میں کوئی گھپلا ہے، یقین کرو میں تمہیں کاپٹر واپس کر دوں گا۔"

"اس میں ایک سسٹم اور ہے اگر اسے آف نہ کیا گیا تو جیپ میں گیس بھر جاتی ہے۔ ڈیوک نے مجبوری کے عالم میں بتا دیا۔ میں اس سمیت جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہوا۔ جیوریل نے اس کی نشاندہی پر گیس کا سسٹم بھی آف کر دیا۔ جیوریل نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ میں پوری طرح چوکس تھا لیکن کچھ نہیں ہوا ہم باآسانی باہر نکل آئے۔

"تم لوگ اندر کیسے آئے؟" ڈیوک نے دریافت کیا۔

"بہت آسانی سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس سلیمانی ٹوپی ہے اسے پہن کر آدمی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہم باری باری اس ٹوپی کو پہن کر آ گئے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ ایک ہی ٹوپی پہن کر ہم اندر کیسے آئے۔ اس قسم کے فکشن میں اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔"

"برادر تم ایک غلطی کر رہے ہو۔" جیوریل بولا۔ "اس کی تلاشی تو لی ہی نہیں۔"

"واقعی...... یہ تو خیال ہی نہیں آیا۔" میں نے اعتراف کیا اور اس کی سر سے پاؤں تک تلاشی لینا شروع کر دی اس کی جیبوں سے مختلف اشیاء نکلی تھیں لیکن اہم چیزوں میں ایک عدد موبائل فون اور ایک عدد ننھا سا پستول نکلا تھا جو اس کی پنڈلی سے بندھے ہوئے ہولسٹر میں تھا۔ جیوریل نے بروقت توجہ دلائی تھی ورنہ عین ممکن تھا وہ موقع پا کر ہمیں اس پستول سے مار دیتا۔ پستول چھن جانے کے بعد اس کی حالت بُری ہونے لگی تھی۔ میں نے ساری چیزیں معہ پستول کے جیپ سے باہر پھینک دیں۔

"یہ بے حد مکار شخص ہے۔" جیوریل نے کہا۔ "اس پر ایک لمحے کے لیے بھی بھروسہ مت کرنا برادر ورنہ دھوکہ کھاؤ گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ایسے سانپوں سے میں ہمیشہ ہوشیار رہتا ہوں۔"

جیوریل جانتا تھا کہ ہیلی پیڈ کہاں ہے اس لیے وہ بغیر ہچکچاہٹ کے اس کی طرف جا رہا تھا۔

جزیرے پر رات پوری طرح مسلط ہو چکی تھی۔ میں نے ریوالور ڈیوک کے سر سے لگا رکھا تھا۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد ہم ہیلی پیڈ پر تھے۔ یہ ایک چٹان کے اوپری حصے پر تھا جو سمندر کے کنارے تھی نہ جانے ڈیوک نے محل سے دور اس جگہ کیوں ہیلی پیڈ بنوایا جبکہ اس کے محل میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں با آسانی ہیلی پیڈ بن سکتا تھا اوپر ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا اور اس کے پاس ایک شخص جمپ سوٹ پہنے کھڑا تھا۔ وہ یقیناً پائلٹ تھا ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ اسی لمحے مجھے جزیرے کے دو اطراف سے تیز روشنیاں حرکت کرتی نظر آئیں اور ان کا رُخ ہیلی کاپٹر کی طرف ہی تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔

''ڈیوک یہ کیا ہے؟ یہ روشنیاں کیسی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

جیوریل بھی چونک کر مڑا اور لپک کر ڈیوک کے پاس آیا اس نے رائفل بلند کی لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''ایک منٹ اتنی عجلت مت دکھاؤ۔ وہ لوگ دور ہیں جا کر پائلٹ سے کہو کہ کاپٹر سٹارٹ کرے اور اگر وہ دیر کرے تو اسے شوٹ کر دو۔''

یہ سنتے ہی پائلٹ لپک کر اپنی نشست پر جا بیٹھا اور کاپٹر کا انجن چلا دیا۔ میں نے ڈیوک سے دوبارہ پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''تم نے خود بھی دیکھا ہے جزیرے پر صرف دو گاڑیاں ہیں جن میں سے ایک نیچے کھڑی ہے اور دوسری محل میں۔ یہ تو پانچ چھ گاڑیاں ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے اسے کاپٹر کی طرف دھکیلا۔ ''بیٹھو اس میں...... یہ چالاکی تمہاری ہے۔''

ڈیوک چپ چاپ کاپٹر میں بیٹھ گیا۔ اس کے پنکھے تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ جیوریل نے کچھ کہا لیکن انجن کے شور میں سنائی نہیں دیا۔ دروازے بند ہوتے ہی کاپٹر تیزی سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ میں نے بلندی سے دیکھا۔ یہ پانچ چھ گاڑیاں تھیں جو تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف آ رہی تھیں۔ میں بھی اُلجھن میں تھا۔ یہ جزیرے پر اتنی گاڑیاں کہاں سے آئیں۔ ممکن ہے یہ گاڑیاں ایٹمی پلانٹ میں ہوں۔ بہرحال اب ان کا آنا بے سود تھا۔ کیونکہ کاپٹر خاصی بلندی پر آ چکا تھا اور اسے نیچے اُتارنا ہمارے اختیار میں تھا مگر اس موقع پر وہ ہوا جو میں نے یا کاپٹر میں سوار کسی دوسرے شخص کے گمان میں نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر کے انسٹرومنٹ پینل پر اچانک ہی ایک سرخ لائٹ روشن ہو گئی اور تیز بپ گونجنے لگی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟'' ڈیوک نے چلا کر کہا۔

پائلٹ بدحواس ہونے لگا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''سر...... ہمارے کاپٹر پر میزائل لاک کیا جا رہا ہے۔''

''کیا؟'' ہم سب بیک وقت بولے تھے۔ اسی لمحے زمین کی طرف سے ایک شعلہ چمکا تھا۔





''میزائل۔'' پائلٹ کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ اس نے دیوانہ وار کاپٹر کو سمندر کی طرف گھمایا۔

''لگتا ہے تمہارے آدمیوں کو اب تمہاری پروا بھی نہیں ہے۔'' میں نے ڈیوک کو جھنجھوڑ دیا۔

اس کے منہ سے مارے خوف کے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ جیوریل کھڑکی سے باہر میزائل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پائلٹ پاگلوں کی طرح ہیلی کاپٹر کو دائیں بائیں چکر دے رہا تھا۔ مگر میزائل اٹل موت کی طرح جھپٹ رہا تھا۔ اس بے کراں آسمان میں اس سے بچاؤ کی کوئی راہ نہیں تھی۔ مجھے ایک شعلہ سا یاد ہے جو پاس آ گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اعصاب شکن دھماکہ ہوا اور احساس کی ہر حس فنا ہو گئی۔



مجھے لگ رہا تھا جیسے میں مائع بن کر کسی جگہ پھیل گیا ہوں۔ درد ایسا تھا کہ ہر ریشہ درد کر رہا تھا اور یہی درد مجھے بتا رہا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ ورنہ مرنے کے بعد تکلیف کا کیا سوال لیکن چاروں طرف تاریکی تھی جس میں کبھی کبھی روشنی کی ہلکی سی جھلک اُبھرتی تھی۔ آوازیں سماعت سے ٹکراتیں لیکن جلد تاریکی ان پر حاوی ہو جاتی تھی۔ نہ جانے کب تک یہ تاریکی میرا مقدر بنی رہی تھی۔ پھر ایک بار آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سفید دیواروں والے کمرے میں پایا۔ میرے تلے نرم بستر تھا اور اس پر میرا جسم...... میں نے اسے حرکت دینے کی کوشش کی میرا ہاتھ اُٹھا اور پھر گر گیا۔ میں نے بے پناہ نقاہت محسوس کی تھی۔ آنکھیں کھلی رکھنے میں بھی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ میں دیر تک ہانپتا رہا گہری سانسیں لیتا رہا۔ حتیٰ کہ اتنی ہمت محسوس کی کہ سر اُٹھا کر اپنا جائزہ لے سکوں اپنے جسم کو صحیح سالم اور پٹیوں سے آزاد پا کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ میں کاپٹر میں تھا۔ جیوریل، ڈیوک اور پائلٹ بھی تھے ایک میزائل نے کاپٹر کو ہٹ کیا تھا۔ ایک دھماکہ ہوا تھا اس کے بعد مجھے نہیں یاد کہ کیا ہوا تھا۔ میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید کیا، یقیناً اور اگر موت آتی تو میں بھلا اس کمرے میں کیسے جاگتا۔ دروازہ کھلا اور ایک نرم چہرے نے اندر جھانکا مجھے ہوش میں دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ جھپٹ کر اندر آیا۔ ''میرے خدا تمہیں کب ہوش آیا؟''

''شاید چند منٹ ہوئے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ میں کہاں ہوں؟''

''تم ہسپتال میں ہو۔''

''یہ ہسپتال کہاں ہے اور مجھے یہاں کون لایا تھا؟''

''یہ جواب میں نہیں دے سکتا میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں، مجھے تمہاری فزیکل کنڈیشن کا علم ہے۔''

''اوکے...... مجھے بتاؤ کہ میری کیا حالت ہے۔ میں بچ کیسے گیا۔''

''یہ بات تو میرے لیے بھی ایک معمہ ہے۔ جب تمہیں ہسپتال لایا گیا تو تمہاری حالت بہت

خراب تھی۔ بہ ظاہر تم ٹھیک تھے، نہ تو کوئی فریکچر ہوا تھا اور نہ ہی کوئی خطرناک زخم تھا لیکن شدید ترین دھچکے نے تمہارے ٹشوز کو زخمی کر دیا تھا اور تم کوما میں تھے۔''

''اوہ۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں کب سے یہاں ہوں۔''

''دو ہفتے سے۔ تین دن پہلے تک تم آئی سی یو میں تھے پھر جب تمہاری حالت بہتر ہوئی تو تمہیں یہاں منتقل کر دیا گیا لیکن مجھ سمیت کسی کو یقین نہیں تھا کہ تمہیں جلدی ہوش آ جائے گا۔''

''میں اپنے بارے میں مزید کس سے معلوم کروں؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے میرے بستر کے سرہانے لگا بٹن دبایا۔ ذرا دیر بعد میرا کمرا لوگوں سے بھر گیا تھا یہ سب پیرامیڈک تھے۔ مشینیں لائی گئیں جو میرے جسم سے منسلک کی جانے لگیں۔ مختلف انجکشن لگنے لگے۔ ڈرپ لگائی گئی اور شاید اس میں کوئی نیند کی دوا بھی شامل تھی میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔ اور میں سو گیا۔ اگلی بار میں جاگا تو درد کا نام ونشان نہیں تھا۔ میرے بازو سے ڈرپ لگی تھی۔ اور قطرہ قطرہ غذا میرے خون میں شامل ہو رہی تھی۔ میں شاید چوبیس گھنٹے سوتا رہا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی اور با آسانی اُٹھ گیا۔ نہ تو سر چکرایا اور نہ ہی کمزوری محسوس ہوئی تھی۔ میں نے نہ جانے کب سے ٹھوس غذائیں کھائی تھیں لیکن مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ مجھے باقاعدگی سے خون میں غذا دی جاتی رہی تھی۔ میں نے سرہانے لگا بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ بعد وہی نرم چہرے والا نوجوان ڈاکٹر میرے سامنے تھا۔ اس نے میری نبض دیکھی۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''فائن...... میں نے پچھلی بار تم سے کچھ سوال کیے تھے؟''

اس نے شانے اچکائے۔ ''اس کا جواب وہی دے گا جو تمہیں یہاں لایا تھا اور میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''اچھا...... یہ تو بتا دو کہ میں کس ملک میں ہوں؟''

''کوئی ملک نہیں ہے یہ ایک جزیرہ ہے۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''سنو جان گرے کو پیغام بھیجو۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں کسی جان گرے کو نہیں جانتا۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ ''یہاں تمہارا انچارج کون ہے۔ چلو اس سے معلوم کریں۔''

''فی الحال تو اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ ابھی تمہاری صحت کے بارے میں حتمی رپورٹ آنی ہے۔''

''رپورٹ کا بہانہ کیوں کرتے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں قیدی ہوں۔'' میں تلخی سے بولا۔

''تم جذباتی ہو رہے ہو دوست۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ابھی تم آرام کرو۔ تم




پر گزرنے والا حادثہ بہت بڑا تھا اور تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔ ٹشوز کے زخم آسانی سے نہیں بھرتے۔''

''لیکن اب مجھے درد نہیں ہو رہا ہے۔''

''تمہیں ایسی دوائیاں دی جا رہی ہیں جن کی وجہ سے درد نہیں محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان دواؤں کا اثر زائل ہو گیا تو تم یقیناً تکلیف محسوس کرو گے۔''

میں بستر پر بیٹھ گیا۔ ''میں نے نہ جانے کب سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ پانی نہیں پیا ہے لیکن نہ تو مجھے بھوک لگ رہی ہے اور نہ پیاس۔''

وہ مسکرایا۔ ''بے ہوشی کے دوران ڈرپ کے ذریعے غذا تمہارے جسم تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح پانی بھی دیا جاتا تھا اور تمہاری فزیوتھراپی بھی کی جاتی تھی تاکہ ہوش میں آنے کے بعد تمہیں اپنے جسم کو حرکت دینے میں دشواری نہ ہو۔''

''شکریہ...... براہِ کرم تم اپنے انچارج کو میرا پیغام پہنچا دو۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

ہاتھ پر لگی ڈرپ کی وجہ سے میں آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسٹینڈ سے ڈرپ کی تھیلی اُتاری اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن حسبِ توقع وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے کمرے میں نظر آنے والا دوسرا دروازہ کھولا۔ یہ باتھ روم تھا۔ میں نے اندر جا کر واش بیسن کے اوپر لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ میرے چہرے سے گھنی ہو جانے والی داڑھی صاف کر دی گئی تھی۔ شاید گزشتہ نیند کے دوران ہی شیو بنائی گئی تھی۔ کیونکہ رُخسار بالکل صاف ہو رہے تھے۔ سر کے بال بھی مختصر کر دیے گئے تھے۔ میں نے منہ دھویا اور واپس آ گیا۔

کاپٹر کریش ہونے کے بعد مجھے اس سے کس طرح نکالا گیا تھا اور پھر کس طرح یہاں تک لایا گیا تھا۔ کاپٹر پر میزائل فائر کرنے والے کون تھے اور میرے ہمراہیوں میں سے کون کون بچا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ ان سوالوں کا جواب مجھے وقت ہی دے سکتا تھا۔ تب تک مجھے صبر کرنا ہی تھا۔ شاید ایک گھنٹے بعد ایک نرس اندر آئی اس نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ ''پلیز آپ لیٹ جائیں میں کھانا کھلاؤں گی۔''

''میں خود کھا سکتا ہوں۔'' میں نے انکار کیا۔

''اوکے...... جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ ایک پیالے میں گرم سوپ تھا اور اس کے ساتھ ہی دو پیس سلائس تھے۔ یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی لیکن دو ہفتے سے کھانا پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ اس لیے آغاز ہلکی غذا سے کرنا تھا۔ میں نے سوپ پیا اور سلائس کھا لیے۔ نرس جس کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے تھا اس دوران میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھی رہی۔ جب میں نے کھانا ختم کیا تو اس نے مجھے تین عدد گولیاں پیش کیں اور واش روم

تمہیں پہلے جیسی آزادی نہیں دلا سکتا۔ البتہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تم لوگوں پر سے جلد از جلد پہرہ اُٹھا لیا جائے۔''

''گویا میں اسی منحوس جزیرے پر ہوں۔'' میں نے خود سے کہا تھا۔

جان گرے نے سر ہلایا۔ اور پھر اشاروں سے مجھے منع کیا کہ میں زبان سے کوئی غلط بات نہ نکالوں۔ اس نے منہ سے کہا۔ ''وہ پُرانی غلط فہمیاں تھیں اب جبکہ تم ہم سے متفق ہو تو دیکھنا یہ جزیرہ تمہارے لیے جنت بن جائے گا۔''

''میں نے تمہارے کہنے میں آپ کر اپنا دل صاف کر لیا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی مجھے پہلے کی طرح مروانے کی سازش نہیں کرے گا۔ الیکٹرک سے مقابلے سے پہلے مجھے زہر انجکٹ کیا گیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ الیکٹرک کی ضرب نے اس جگہ سے گوشت پھاڑ دیا اور زہر خارج ہو گیا تھا۔''

''اس کے تمام ذمے داروں کو فارغ کر دیا گیا ہے اس جیل کے انچارج اور اس کے ساتھی کو سزا بھی ملی ہے۔''

''کیا سزا ملی ہے۔ اگر ان کی سازش کامیاب ہو جاتی تو میں تو مارا جاتا۔ ان پر اقدام قتل کا مقدمہ بننا چاہیے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ انہیں اس سے بھی سخت سزا ملی ہے۔ انہیں قید کر دیا گیا ہے۔ اسی جیل میں اور جیسے ہی ان کی سزا کی معیاد پوری ہو گی انہیں ان کے سارے واجبات ضبط کر کے صرف تن کے کپڑوں میں ان کے ملک پہنچا دیا جائے گا۔''

''میں اب بہتر ہوں۔ کیا مجھے کہیں اور نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ دراصل ہسپتال کے ماحول سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ دل گھبراتا ہے۔''

''یہ تو ڈاکٹروں پر منحصر ہے۔ وہ کب تمہیں ریلیز کرتے ہیں۔'' جان گرے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ویسے یہاں کی نرسیں خاصی حسین ہیں۔ کہو تو میں کسی کو بھیج دوں۔''

میں مسکرا دیا۔ ''تم جانتے ہو۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔''

جان گرے کھڑا ہو گیا۔ ''بہرحال میں دیکھتا ہوں کے تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''ڈیوک کہاں ہے۔''

''وہ بھی اسی ہسپتال میں ہے۔ وہ زیادہ زخمی ہے۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ امکان ہے کہ اس کی باقی عمر بستر پر گزرے گی۔ اگر بچ گیا تو۔''

مجھے خوشی ہوئی تھی۔ خود کو فرعون سمجھنے والے اس شخص کو قدرت نے مثالی سزا دی تھی۔ اپنی تمام تر دولت اور غرور کے باوجود اس کی باقی عمر لاچاری سے گزرتی۔ ''جان گرے براہ کرم ڈاکٹروں کو منع کر دو اب مجھے نیند کی دوا نہ دیں۔ میں مزید مصنوعی نیند نہیں سونا چاہتا۔''



سے پانی لا کر دیا۔ میں نے گولیاں پانی سے لے لیں اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ ان میں کوئی نیند کی دوا بھی تھی لیکن کھانا مجبوری تھی۔ حسبِ توقع چند منٹ میں مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو پاس کرسی پر جان گرے کو بیٹھے دیکھ کر قطعی تعجب نہیں ہوا تھا۔ مجھے پہلے ہی محسوس ہو رہا تھا کہ جلد یا بدیر جان گرے سے میرا سامنا ہو گا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔ ''کیسے ہو یوسف؟''

وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولا۔ میں نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''پھر بچ گیا۔ سخت ڈھیٹ ہوں۔''

اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ''یہ معجزہ ہے۔ جب تمہیں یہاں لایا گیا تو تمہاری حالت بہت خراب تھی۔''

''اس لیے تم فکر میں پڑ گئے ہو گے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟''

''آرگنائزیشن والے جزیرے پر چڑھ دوڑے تھے۔ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ کمینہ ڈیوک ان سے میرے لیے سودے بازی کر رہا تھا اور اس دوران میں آرگنائزیشن نے ریڈ کر دیا۔''

''وہ آرگنائزیشن والے تھے۔ تبھی ڈیوک پریشان ہو رہا تھا۔''

''وہ سمجھ رہے تھے کہ ڈیوک فرار ہو رہا ہے اور مجھے اس وقت پتا چلا جب میزائل فائر کر دیا گیا تھا۔ میزائل نے کاپٹر کو ہٹ کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے پائلٹ اسے ساحل سے نزدیک لے آیا تھا۔ اس لیے کاپٹر اتھلے پانی میں کریش ہوا ورنہ سب ڈوب جاتے۔''

''کیا باقی بھی بچ گئے؟''

جان گرے نے سر ہلایا۔ ''ڈیوک اور جیوریل بچ گئے ہیں۔ پائلٹ البتہ مارا گیا۔ تمہاری جان بچانے میں جیوریل کا ہاتھ تھا۔ وہ خود زخمی ہوا تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح تمہیں کاپٹر سے نکال لیا تھا اور ساحل پر لے آیا۔''

''جیوریل اب کیسا ہے؟''

''بہتر ہے۔ اس کے چہرے کی ہڈی کئی جگہ سے فریکچر ہو گئی تھی۔ اگر تم چاہو تو اس سے مل سکتے ہو۔ تمہارے کمرے کے برابر والے کمرے میں ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' میں اضطراب سے اُٹھ بیٹھا۔

جان گرے مجھے جیوریل کے پاس لے گیا۔ مگر وہ سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ پٹیوں سے لپٹا تھا۔ وہ جیوریل ہی تھا۔ اس کے سینے پر ٹیڑھے سے شیر کا سر بنا تھا۔ میں واپس آ گیا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں ہسپتال والوں سے کہہ دوں گا جیسے ہی وہ جاگے گا تمہیں اس سے ملوا دیا جائے۔''

''یہ لوگ مجھے کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔''

''یوسف صورتِ حال کو سمجھو۔ اس وقت تم براہِ راست ایگزیکٹو کونسل کی تحویل میں ہو۔ میں

"اگرچہ وہ بہتر سمجھتے ہیں لیکن میں پھر بھی کہہ دوں گا۔"

ڈرپ ہٹا دی گئی تھی اس لیے اب میں آزادی سے حرکت کر سکتا تھا۔ میں نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اگرچہ جسم صاف تھا لیکن میرا دل نہانے کو چاہ رہا تھا۔ میں باہر آیا تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک مسلح شخص اندر آیا۔

"چلو تمہیں مسٹر جیوریل سے ملنا ہے۔"

میں اس کے ساتھ جیوریل کے کمرے میں آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی۔ پٹیوں کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھا لیکن اس کی اندرونی گرم جوشی اس کے ہاتھ کے لمس سے مجھ تک آ رہی تھی۔ میں نے جھک کر کہا۔

"جیوریل...... برادر بہت بہت شکریہ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔ "میں نے بھی اپنا فرض ادا کیا تھا۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

وہ بول نہیں سکتا تھا اس لیے میں کچھ دیر بعد واپس آ گیا۔ میں دو دن اور ہسپتال میں رہا۔ تیسرے دن سویرے سے میرے مختلف اقسام کے ٹیسٹ شروع کر دیئے گئے۔ دوپہر تک مجھے ریلیز کر دیا تھا۔ ہسپتال سے مسلح نگراں مجھے ایک عمارت میں لائے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ گویا میں اب باضابطہ حراست میں تھا۔ یہاں بھی میں کوئی تین دن رہا اور پھر مجھے ایک نام نہاد عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں تین افراد نے مجھ سے سوال جواب کیے۔ میں نے حتیٰ الامکان اپنا ہاتھ پیر بچا کر ان کے جواب دیئے۔ مجھ پر سب سے سنگین الزام کرنل بوگارڈ کے اغوا اور اسے اندھا کرنے کا تھا۔ میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کرنل بوگارڈ والے معاملے سے لاتعلقی ظاہر کی۔ میں نے اس کا سارا ملبہ کینی مین پر ڈال دیا۔

"میں اس کی تحویل میں تھا اور کرنل بوگارڈ کے ساتھ جو بھی ہوا اس نے کیا۔"

"ہمارے پاس تمہارے خلاف کچھ شہادتیں ہیں۔" ایک شخص نے مجھے دھمکایا۔ "اگر تم اقرار جرم کر لو تو تمہارے معاملے پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔"

"اگر میرے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا تو مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نوجوان زیادہ بڑبولا پن مت دکھاؤ۔ افریقہ میں تمہاری خدمات کی وجہ سے تمہاری سابقہ غلطیاں معاف کر دی گئی ہیں لیکن زبان درازی پر تمہیں سزا مل سکتی ہے۔"

میں چپ رہا۔ نہ جانے افریقہ میں ان کے لیے میری کون سی خدمات تھیں، کم سے کم میں نے اس معاملے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ شاید جان گرے نے بڑھا چڑھا کر کوئی کارنامہ بیان کیا تھا۔ میں نے چند مواقعوں پر اس کی جان ضرور بچائی تھی۔ بہر حال دو تین گھنٹے میرا دماغ کھانے کے بعد انہوں نے مجھے آبزرویشن پر رہائی دے دی تھی۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ اگر میں نے کوئی غلط




حرکت کی تو سابقہ کھاتے پھر کھل جائیں گے۔

عدالت کے باہر جان گرے میرا منتظر تھا۔ کئی ہفتے بعد میں کھلی فضا میں نکلا تھا۔ میں نے جان گرے سے کہا۔

"اب مجھے آزادی مل گئی ہے تو تم تو میرے سر پر مسلط نہ ہو۔ مجھے ذرا سی آزادی کو انجوائے کرنے دو۔"

"ضرور کرو لیکن پہلے میرے ساتھ چل کر اپنا کارڈ بنواؤ۔ ورنہ کسی جگہ داخل نہیں ہو سکو گے۔ اس کے بعد گھومتے پھرنا۔ ویسے تمہاری رہائش میرے ساتھ ہی ہے۔"

"اس سمندر کے کنارے والے فلیٹ میں؟"

اس نے سر ہلایا۔ مجھے وہ چینی باورچی یاد آ گیا جس نے مجھے عبید بن صلاح کا پیغام دیا تھا۔ نہ جانے عبید بن صلاح کہاں تھا اور احمد بربری کا کیا بنا تھا۔ جب میں یہاں سے گیا تھا تو احمد بربری اور عبید بن صلاح اسی جزیرے پر تھے۔ میں نے جان گرے سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ "احمد بربری فرار کے بعد پھر پکڑا گیا تھا البتہ عبید صلاح لاپتا ہے۔ خیال ہے کہ وہ فرار ہوتے ہوئے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ ہماری ایک کشتی غائب تھی جو ایک دن بعد جزیرے سے کئی میل دور اُلٹی حالت میں پائی گئی۔"

میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ عبید بن صلاح مر گیا ہے یہ سوچنا بھی میرے لیے باعثِ تکلیف تھا۔ جان گرے میرے چہرے سے بھانپ گیا تھا۔ "تمہیں اس خبر سے دکھ ہوا ہے۔ یوسف میرا مشورہ ہے ان دہشت گردوں کے چکر میں نہ پڑو۔ زندگی کو انجوائے کرو۔"

"یہی مشورہ میں بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم کس لیے پُرلطف زندگی ترک کر کے ان عالمی دہشت گردوں کے عزائم پورے کرنے کے لیے افریقہ میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ کتنی بار تم مرتے مرتے بچے ذرا حساب تو لگانا۔"

جان گرے کھسیا گیا تھا۔ "وہ میرا فرض تھا۔"

"میں اسے اپنا فرض نہیں کہہ سکتا۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "ہم مسلمان اپنا فرض فراموش کر چکے ہیں۔"

"اسی وجہ سے کہہ رہا ہوں جب دوسرے بے فکر ہیں تو تم کیوں اپنی جان گھلاتے ہو۔ اسرائیل کو دن رات گالیاں دینے والے عرب ان کے کیسینو اور قحبہ خانوں میں جا کر عیاشی کرتے ہیں۔ یہودیوں کے بنکوں میں اپنا پیسہ رکھواتے ہیں۔ نائن الیون کا واقعہ ہو تو کھل کر مدد دیتے ہیں اور کسی مسلم ملک پر آفت آ جائے تو اسے صرف صدقہ خیرات دیتے ہیں۔"

میں اسے کیا جواب دیتا کہ وہ خاصی حد تک سچ کہہ رہا تھا لیکن وہ یہ غلطی کر رہا تھا کہ عربوں کو اسلام کا ہم معنی سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ اسلام الگ ہے اور عرب الگ ہیں۔ وہ جن لوگوں کا حوالہ دے رہا

تھا اسلام سے ان کا نمائشی تعلق واضح تھا۔ میں یہ بات اسے سمجھا نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے ایسا تاثر دیا کہ میں اس کی بات سے متاثر ہوا ہوں۔ ’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو جان گرے۔‘‘

وہ مجھے ایک دفتر میں لے گیا جہاں میرا ریکارڈ درج ہوا۔ میرے ہاتھوں کے نشانات لیے گئے اور تصویر لے کر چند منٹ میں میرا کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ تیار کر دیا گیا۔ جان گرے نے مجھے باہر لا کر چھوڑ دیا۔ ’’تم چاہو تو گھومو پھرو۔ یہاں کھانے یا خریداری کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ کارڈ دکھا دینا۔ تمہیں مطلوبہ چیز مل جائے گی۔‘‘

’’کیا میں جزیرے پر ہر جگہ جا سکتا ہوں؟‘‘

’’سمندری علاقوں میں نہیں جا سکتے اور غیر آباد جگہوں پر جانے سے خود گریز کرو۔ جب میرے پاس آنا ہو تو کسی بھی گاڑی والے سے کہہ دینا کہ ایگزیکٹو لاجز پہنچا دے۔ وہاں آ کر میرے اپارٹمنٹ کا کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔‘‘ جان گرے اپنی جیپ نما گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔

یہاں پر زیادہ تر برقی گاڑیاں تھیں سوائے محافظوں کے پاس موجود گاڑیوں کے۔ ان میں صرف دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ یہ بیٹری سے چلتی تھیں اور بیٹریوں کو چارج کیا جاتا تھا۔ مگر یہ گاڑیاں صرف اعلیٰ عہدیداروں کے پاس تھیں۔ عام افراد اور ورکرز کو میں نے ہمیشہ سائیکلوں پر ہی دیکھا تھا۔ پورے جزیرے پر آنے جانے کے لیے عمدہ قسم کی کشادہ اور ہموار سڑکیں بنائی گئی تھیں۔

میں نے ایک ریستوران میں کارڈ دکھا کر عمدہ قسم کا لنچ کیا۔ اس کے بعد پیدل اس علاقے کی سیر کرنے لگا۔ شاپنگ ایریا میں درجنوں کے حساب سے دکانیں تھیں جہاں پر دنیا جہان کا سامان مل رہا تھا۔ خریداری کرنے والوں میں عرب اور ایشیائی نمایاں تھے۔ ظاہر ہے یہ سب کروڑ اور ارب پتی تھے۔ جزیرے والوں نے انہیں شاپنگ کی سہولت مہیا کر کے کمائی کا ایک اور طریقہ نکالا تھا۔ مجھے یقین تھا یہاں پر بکنے والا زیادہ تر سامان بحری جہازوں سے قزاقی کر کے حاصل کیا گیا تھا اور اسے ان ہی لوگوں کے ہاتھ فروخت کر کے ایک تیر سے دو شکار کر رہے تھے۔ میں نے ایک دکان سے چند سوٹ لیے۔ جوتے اور ذاتی ضرورت کا دوسرا سامان خریدا۔ خریدا ان معنوں میں کہ میں نے صرف اپنا کارڈ دکھایا اور دکان والے نے مجھے بتایا کہ میں چار سو ڈالرز مالیت کی خریداری کر سکتا ہوں۔ ایک لباس میں نے وہیں ٹرائی روم میں بدل لیا آرام دہ جوتے اور ایک سن گلاس حاصل کیا۔ لباس میں ٹراؤزر اور ٹی شرٹ لی تھی کیونکہ جزیرے کا موسم کسی قدر معتدل تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جزیرہ بھی جنوبی نصف کرے میں تھا۔ ورنہ شمالی نصف کرے میں اس وقت گرمی کا موسم تھا اور جب ہم یہاں سے افریقہ کے لیے روانہ ہوئے تھے تو یہاں خاصی گرمی تھی، مگر موسم میں شدت نہیں تھی۔ نہ گرمی عذاب ناک تھی اور نہ ہی یہ سردی پریشان کر رہی تھی۔

میں نے دکان والے سے ہی پوچھا۔ ’’یہاں کہیں سے سائیکل مل سکتی ہے۔‘‘

’’ذرا آگے ایک رینٹ اے کار ہے۔ اس کے پاس سے سائیکلیں بھی ملتی ہیں۔‘‘




میں رینٹ اے کار پر پہنچا۔ اس نے میرے کارڈ پر کار دینے سے انکار کیا البتہ ایک عدد سائیکل ضرور دے دی جس میں چھوٹا سا انجن بھی لگا تھا۔ ہینڈل پر ایک بٹن تھا جسے دبا کر پیڈل چلائے جاتے تو انجن چل جاتا تھا۔ اگرچہ جان گرے نے مجھے غیر آباد حصوں کی طرف جانے سے منع کیا تھا مگر گھومنے پھرنے کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ ایک گہرے سانولے رنگ کا چھوٹا سا شخص مستقل میرے پیچھے ہے۔ میں سائیکل پر سوار ہوا تو میں نے اسے بھی رینٹ اے سائیکل والے کی طرف لپکتے دیکھا اور سائیکل پوری رفتار سے چلاتا آبادی سے باہر لے جانے لگا۔ اس کا انجن خاصا طاقتور تھا اور سائیکل کو بیس پچیس کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلا رہا تھا لیکن چند منٹ بعد میں نے عقبی آئینے میں اس شخص کو ایک دوسری سائیکل پر اپنے عقب میں آتے دیکھا۔

’’اچھا بیٹا...... ابھی دیکھتا ہوں تمہیں۔‘‘ میں نے خود سے کہا۔

آنے والا حیرت انگیز رفتار سے سائیکل چلاتا آیا تھا کیونکہ وہ پیڈل مار کر چلا رہا تھا۔ میں نے سائیکل ایک طویل نظر آنے والی سڑک پر ڈال دی۔ جس کے دونوں طرف جھاڑیاں اور درخت تھے۔ یہ سڑک شاید بندرگاہ کی طرف جاتی تھی۔ جان گرے کی رہائش بھی اس طرف تھی۔ راستے میں مجھے ایک جگہ دو سیکیورٹی گارڈ گشت کرتے نظر آئے تھے۔ میں نے ان سے سڑک کی منزل کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن پھر نظر انداز کر کے گزر گیا۔ مجھے خدشہ تھا اس طرح وہ شخص میرے نزدیک آ جائے گا۔ وہ اب تک ثابت قدمی سے میرا تعاقب کر رہا تھا لیکن میرے پاس آنے میں ناکام رہا تھا اس کی واحد کامیابی یہ تھی کہ اس نے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس بات کی مجھے بھی توقع تھی کہ جزیرے پر مجھے ایسے ہی نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ سخت نگرانی کی جائے گی۔

آگے جا کر سڑک دائیں طرف گھوم رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں شرارت آئی تھی۔ جیسے ہی سڑک مڑی اور میں پیچھے آنے والے کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ میں نے بریک لگاتے ہوئے سائیکل کچے میں اُتاری اور اسے جھاڑیوں میں لے گیا۔ سائیکل رُکتے ہی انجن خود بخود بند ہو گیا تھا۔ میں جھاڑیوں میں اتنا اندر چلا گیا کہ سڑک سے نظر نہ آؤں ذرا دیر بعد تعاقب کرنے والا ہانپتا اور پیڈل مارتا میرے سامنے سے گزرا تھا۔ نہ جانے اس نے کیوں انجن والی سائیکل نہیں لی تھی۔ میں اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ اس جگہ سناٹا تھا اور ذرا سی آواز اسے خبردار کر سکتی تھی۔ اس کے گزرنے کے کوئی ایک منٹ بعد میں اُٹھا۔ میرا ارادہ واپس قصبے کی طرف جانے کا تھا۔ سیاہ فام اور پستہ قد شخص خود ہی واپس آ جاتا۔ وہ میری رپورٹ بھی کرتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ میں بعض فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر سڑک سے اُتر گیا تھا۔

لیکن اُٹھنے سے پہلے ہی رسّی کا ایک حلقہ میرے گلے میں آن پڑا اور اتنی سرعت سے تنگ ہوا کہ میں اسے کسنے سے نہ روک سکا۔ میں نے تڑپ کر اسے ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر رسّی ڈالنے

والے نے میری پشت سے اپنا گھٹنا ٹیک کر رسّی پر زور لگانا شروع کر دیا۔ رسّی اتنی سخت ہو گئی تھی کہ میری انگلیاں اس میں نہ جا سکیں اور میرا دم گھٹنے لگا۔ پھندا لگانے والے نے یہ کام مہارت اور طاقت سے کیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہا تھا۔ میرا یہ چھپا دشمن کون تھا۔ اگر یہ جزیرے پر عبید بن صلاح کے ہمدردوں میں سے تھا تو اسے یہ کام کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جزیرے پر میرے دشمنوں کی کمی نہیں تھی۔ بہت سارے ایسے تھے جو میرے بڑبولے پن کی وجہ سے میرے دشمن تھے۔ کونسل نے مجھے سزائے موت دی تھی اور میں نے الیکٹرک سے مقابلے میں زندگی جیت لی تھی لیکن اس مقابلے کے دوران مجھے جس طرح سے ہرانے کی کوشش کی گئی تھی اس سے میرا نادیدہ دشمنوں کا عناد ظاہر ہوتا تھا۔

رسّی سے نجات پانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ حادثے میں بچ جانے کے بعد میں کتنا کمزور ہو گیا تھا۔ ایک رسّی بھی اپنے گلے سے نہیں نکال پا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ موت کا فرشتہ پر پھڑپھڑانے لگا تھا لیکن اس سے پہلے وہ آ کر مجھے اپنے ساتھ لے جاتا، اچانک میرے گلے سے رسّی نکل گئی۔ اور میں منہ کے بل زمین پر گر کر گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ پھیپھڑے جو ہوا کے لیے تڑپ رہے تھے لمحوں میں ساری دنیا کی ہوا اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آکسیجن ملی تو بے ہوش ہونے والی حسیات پھر سے جی اُٹھی تھیں۔ میرے کانوں نے کسی کو بولتے سنا۔ مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوا تھا۔ کیا میں نے ابھی عبید بن صلاح کی آواز سنی تھی۔ پھر کسی نے مجھے سہارا دیا۔ لمس نے لمحوں میں پہچان کے سارے فاصلے طے کر لیے تھے اور میں دیوانہ وار اس سے لپٹ گیا تھا۔ وہ عبید بن صلاح ہی تھا۔ ہم دونوں ہی رو رہے تھے۔ اس نے اپنی مخصوص انگریزی میں کہا۔

"کہاں تھا میرے یار؟"

"میں نہ جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔" میں رُک کر کھانسا۔ گلے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ "لیکن خدا گواہ ہے تمہارا اور احمد بربری کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی دل سے نہیں نکلا تھا۔"

"مجھے اطلاع نہیں ملی تھی کہ تم آ چکے ہو۔ تمہیں براہِ راست ہسپتال سے لے جایا گیا تھا۔"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں افریقہ میں کیا کرتا رہا اور کس طرح حادثے کے بعد یہاں لایا گیا تھا۔ "جان گرے کے اثر و رسوخ کی وجہ سے فی الحال مجھے معافی مل گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہے میرے دشمن میری تاک میں ہیں۔"

"میری ان پر بھی نظر ہے۔ فکر نہ کرو۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔" عبید بن صلاح نے مجھے تسلی دی۔ اس کی داڑھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ "جان گرے اگرچہ میرا ذاتی دشمن ہے لیکن مجھے لگتا ہے یہ ہمارے مقصد میں کسی حد تک کام آ سکتا ہے۔"

میں چونکا تھا۔ "عبید خدا کی قسم یہی بات میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ وہ کسی خاص چکر میں ہے





اور جب سے اس کے خلاف کارروائی ہوئی ہے وہ آرگنائزیشن سے بھی بددل ہو گیا ہے۔ افریقہ میں مَیں نے اس میں خاصی تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔"

"کتے کی دُم سیدھی کہاں ہوتی ہے۔" عبید نے تبصرہ کیا۔ "بہرحال اگر تم اس کی ضرورت ہو تو اس چیز سے فائدہ اُٹھاؤ۔ ہمیں بہرصورت برائی کے اس اڈے کو تباہ کرنا ہے۔"

مجھے اس موقع پر چینی باورچی یاد آیا۔ "جان گرے کی رہائش پر تمہارا ایک حامی تھا۔"

عبید نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وہ پکڑا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے ہمارے بارے میں کچھ اُگلواتے اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"اوہ......" مجھے بھی افسوس ہوا تھا۔ "اب مجھے ضرورت پڑے گی تو میں تم سے کس طرح رابطہ کروں۔"

"اب تم شاپنگ ایریا میں تمباکو کی دکان پر جاؤ گے۔ اس کا مالک مارشیس کا افریقی ہے۔ سوزبانہ تم اس کے توسط سے مجھے پیغام بھیج سکتے ہو۔"

"کیا تم نے اس ری ایکٹر تک رسائی حاصل کر لی ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "نہ صرف ہم نے اس کا درست مقام معلوم کر لیا ہے بلکہ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہاں پیدا ہونے والا پلوٹونیم اسرائیل بھیجا جاتا ہے۔ اس سے ایٹم بم بنایا جاتا ہے۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "یعنی عالمی طاقتوں کی طرح اس آرگنائزیشن کا مقصد بھی دراصل اسرائیل کی پرورش کرنا ہے۔"

"سامنے کی بات ہے۔ اسلحے، منشیات اور جواہرات کی عالمی تجارت پر یہودی قبضہ ہے اور اس کا تمام تر فائدہ بھی وہی اُٹھا رہے ہیں۔ یہ لوگ ساری دنیا کو رفتہ رفتہ تباہی کے ایسے کنارے کی طرف لے جا رہے ہیں جہاں دنیا کے پاس یہودیوں کی ذہنی اور جسمانی غلامی قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔"

"یہ طویل موضوع ہے مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تمہارے ذمے بہت اہم ذمے داری ہے۔ ہمیں سی فورس کے ایک بڑے کنٹینر کی ضرورت ہے۔ سی فور ایک خطرناک دھماکہ خیز مادہ ہے۔ سی فورس اس کی زیادہ تباہ کن صورت ہے۔ ری ایکٹر کی تباہی کے لیے ہمیں کم سے کم دس کلوگرام سی فورس کی ضرورت ہے۔"

"اور یہ کہاں سے ملے گا؟"

"شاید تمہیں علم نہیں ہے۔ جزیرے پر کھلونا بم بنانے والی ایک فیکٹری ہے جہاں سی فورس استعمال ہوتا ہے۔"

"اس فیکٹری سے سی فورس کا حصول ممکن ہے؟"

"اگر ہمیں اس کا سیکیورٹی پلان مل جائے تو عین ممکن ہے اور سیکیورٹی پلان، جزیرے کے

سیکیورٹی سربراہ میجر ایڈم کے پاس ہے۔" عبید صلاح معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "میجر ایڈم کرنل شیفرڈ کے بعد سیکیورٹی چیف بنا ہے اور یہ جان گرے کے نزدیکی لوگوں میں سے ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیا جان گرے اس جزیرے کی تباہی پر آمادہ ہو جائے گا؟"

"یہ کہنا مشکل ہے لیکن اسے اُکسایا جا سکتا ہے۔ دراصل جزیرہ آرگنائزیشن کی آمدنی اور بدمعاشی کا سب سے بڑا اڈہ ہے۔ اس کی تباہی کے بعد بحیرہ عرب اور بحر ہند بڑی حد تک ان لوگوں سے پاک ہو جائے گا۔ اب یہ بات جان گرے جیسے لوگ بھی جان گئے ہیں کہ آرگنائزیشن سراسر یہودیوں کے مفادی کام کر رہی ہے۔ تم اس پوائنٹ کو استعمال کر سکتے ہو۔"

"جان گرے بھی یہودیوں سے نفرت کرتا ہے۔"

"یہودیوں سے سوائے یہودیوں کے سب نفرت کرتے ہیں لیکن انہوں نے دنیا کو اس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ کوئی ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا ہے۔"

"عبید تم اب تک ان سے بچے کیسے رہے؟"

اس سوال پر وہ مسکرایا۔ "اس جزیرے پر صرف پانچ فیصد سفید فام ہیں۔ پچانوے فیصد دوسرے لوگ ہیں۔ ہمیں ان کی حمایت حاصل ہے۔"

"احمد بربری کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"اسے مرکزی جیل کے تہہ خانے میں رکھا گیا ہے۔ کرنل شیفرڈ نے اس پر سخت تشدد کیا تھا لیکن اب وہ آرام سے ہے۔ سنا ہے اس کا مقابلہ الیکٹرک سے ہوگا۔"

"نہیں۔" میں بے ساختہ بول اُٹھا۔ "الیکٹرک خطرناک ہے۔"

"ہم سب اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے برادر...... بہت ساری جگہوں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم احمد بربری کو چھڑا سکتے ہیں لیکن اس صورت میں جزیرے کی انتظامیہ چوکس ہو کر ہمارے خلاف نکل آئے گی۔ اس سے ہمارے اصل منصوبوں پر اثر پڑے گا۔ بہرحال ہماری طرح اس کا بھی اللہ مالک ہے۔"

"پھر بھی ہمیں احمد کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مقابلہ کب ہے؟"

"سنا ہے تین ہفتے بعد جزیرے پر کوئی بڑا میلہ لگنے والا ہے۔ دنیا بھر سے دولت مند آئیں گے۔ ایک چیمپئن شپ بھی ہوگی۔ احمد اور الیکٹرک کا مقابلہ اس میں ہی ہوگا۔"

"دوست ہمیں احمد کو بچانا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں اس نوجوان کو ایسے نہیں مرنے دوں گا۔"

"احمد اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

"میں نے اسے لڑتے دیکھا ہے اس نے زخمی ہونے کے باوجود اویل جیسے دیو کو جس طرح زیر کیا تھا وہ قابلِ تعریف ہے لیکن وہ الیکٹرک کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ




مشاق فائٹر ہے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں خود الیکٹرک سے مقابلہ کروں گا۔"

"تم پوری طرح صحت یاب نہیں ہو۔" عبید کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اچھا دوست میں چلتا ہوں۔ میرے پیچھے ایک جاسوس بھی تھا۔ وہ آگے گیا ہے اس سے پہلے کہ وہ زیادہ مشکوک ہو جائے مجھے قصبہ واپس پہنچ جانا چاہیے۔" میں گرم جوشی سے عبید سے گلے ملا۔ اس کا وہ ساتھی ایک طرف نادم کھڑا تھا جس نے میرے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ صورت سے وہ انڈونیشیائی لگتا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں مجھ سے معذرت کی اور میں نے اس کا شانہ تھپک کر اسے یقین دلایا کہ میرے دل میں اس کے خلاف غبار نہیں ہے۔ جب وہ اور عبید بن صلاح جھاڑیوں میں غائب ہو رہے تھے تو میں نے سائیکل اُٹھائی اور سڑک پر آ کر قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو منٹ بعد میں وہی سیاہ فام پستہ قد مجھے کوئی دو سو گز آگے پیڈل مارتا جاتا نظر آیا۔ میں اطمینان سے اس کے پیچھے لگا رہا حتیٰ کہ ہم قصبے میں رینٹ اے کار جا پہنچے اور وہ مجھے اپنے پیچھے پا کر بھونچکا رہ گیا تھا۔

"تم کدھر تھا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا اور جب میں نے توجہ نہیں دی تو کھسیا کر دکان سے چلا گیا۔ میں نے دکان والے سے پوچھا۔ "اگر میں سائیکل مستقل اپنے پاس رکھنا چاہوں تو۔"

"تب تمہیں دو دن بعد لازمی اسے سروس کے لیے لانا پڑے گا۔"

"میں لے آؤں گا۔" میں فوراً مان گیا۔

"اگر تم دو دن بعد سائیکل نہیں لائے تو آئندہ تمہیں سائیکل نہیں ملے گی۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور کاغذ پر سائن کر کے نکل گیا۔ میں نے سائیکل پر ہی جان گرے کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک شخص نے مجھے وہاں جانے کے راستے کے بارے میں اتنی دیر سمجھایا جتنی دیر مجھے جانے میں لگتی۔ اب کے میں نے انجن چلانے کے بجائے خود سائیکل چلانے کو ترجیح دی۔ کتنے عرصے سے میری ورزش نہیں ہوئی تھی اس طرح یہ بھی ہو جاتی۔ درحقیقت میں نے سائیکل لی ہی اس مقصد کے لیے تھی۔ جزیرے کی سطح اونچی نیچی تھی اور اس پر سائیکل چلانا آسان نہیں تھا۔ سیاہ فام اور پستہ قد جاسوس ہانپنے میں حق بجانب تھے۔ ایگزیکٹو لاجز پہنچتے پہنچتے میری حالت اس سے بھی زیادہ بُری ہو گئی تھی۔ پارکنگ میں مجھے کارڈ دیکھ کر جانے دیا گیا تھا۔ سائیکل سائیکلوں کے لیے مخصوص پارکنگ میں چھوڑی اس کا نمبر ذہن نشین کیا اور راستہ پوچھتا جان گرے کے اپارٹمنٹ تک جا پہنچا۔ جب ایک انڈین لڑکی نے مجھے جان گرے کے پاس بالکونی میں پہنچایا تو مجھے لگا کہ تین مہینوں میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جان گرے اپنے مخصوص سٹائل میں دھوپ سینکتے ہوئے مے نوشی میں مصروف تھا۔ اس نے دوبارہ ایک انڈین لڑکی حاصل کر لی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے انڈین عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"ہر شے دائرے میں سفر کرتی ہے اور اپنے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔"

"زندگی کا سفر بھی دائرہ ہے، نامعلوم سے شروع ہو کر نامعلوم پر ختم ہو جاتا ہے۔"

اس نے جام بلند کیا۔ "جو چیز نامعلوم ہے اس کے بارے میں زیادہ سوچنا لاحاصل ہوتا ہے۔"

"حالانکہ اسے ہی سوچنا چاہیے۔ ایک بات بتاؤ جب تم سفر کرتے ہو تو کیا اپنی منزل کے بارے میں نہیں سوچتے؟"

"کیوں نہیں سوچتا...... سب ہی سوچتے ہیں۔"

"تب اس سفر کے خاتمے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے کہ ہماری منزل کیا ہوگی۔"

"لگتا ہے آج تم پر تصوف کا دورہ پڑا ہے۔"

"ایسی باتیں تصوف کے بجائے حقیقت کے طور پر لی جائیں تو آدمی کی زندگی آسان ہو جائے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "جب میں ریٹائر ہو کر کسی گوشہ تنہائی میں جا پڑوں گا تب اس موضوع پر پڑھوں گا۔"

"حالانکہ اس وقت پڑھنے کا فائدہ کیا ہوگا۔ اب سمجھ گئے تو شاید کچھ فائدہ بھی اُٹھا لو۔" میں نے ریلنگ سے ٹک کر غروب ہوتے سورج کی طرف دیکھا۔ "جیسے غروب ہوتے سورج کی روشنی ذرا دیر کی ہوتی ہے۔"

"یار مزہ نہ خراب کرو۔" جان گرے نے اس بار اردو میں کہا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "جان گرے...... تم میرے دوست نہیں ہو۔ میرے پسندیدہ بھی نہیں ہو لیکن مجھے اعتراف ہے میں نے تم جیسے لوگ کم دیکھے ہیں کاش کہ تم اپنی زندگی ان منفی کاموں میں گزارنے کے بجائے کسی مثبت کام میں گزارتے۔"

"کبھی کبھی میں بھی یہی سوچتا ہوں۔" اس نے خلافِ توقع کہا۔ "لیکن میں اس راستے پر اتنا آگے نکل گیا ہوں کہ واپس کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"یہ صرف خیال ہے۔ واپسی کا راستہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہ راستہ اپنے ہاتھ سے بند کر چکا ہوں۔ اگر میں کوئی عام کارکن ہوتا تو اپنے معاہدے کی مدت مکمل کر کے آزاد ہو جاتا لیکن اب میں آرگنائزیشن کے بڑوں میں شامل ہوں اور بڑے مرتے دن تک آرگنائزیشن کے اسیر رہتے ہیں۔ وہ ہر لمحے ان کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔"

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ تم ریٹائرمنٹ لے لو گے۔"

"ہاں...... مگر ریٹائرمنٹ کا مطلب ہوگا آرگنائزیشن کی مقرر کردہ حدود میں زندگی گزارنا۔





مجھے کسی دور دراز جزیرے پر بھیج دیا جائے گا۔ جہاں آرگنائزیشن کے جاسوس چوبیس گھنٹے میری نگرانی کریں گے، میں نے جتنا کمایا ہوگا وہ سب آرگنائزیشن کی تحویل میں ہوگا جب آرگنائزیشن کے پاس میرا کھاتہ ختم ہو جائے گا تو مجھے عالمِ بالا کی طرف روانہ کر دیا جائے گا اور میری جگہ اپنے آخری ایام جزیرے پر گزارنے کے لیے کوئی اور بڑا آ جائے گا۔ اس لیے ہم میں سے کوئی مرتے دم تک آرگنائزیشن سے ریٹائر ہونے کی بات نہیں کرتا۔"

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ "تب اس ساری جدوجہد کا فائدہ؟"

جان گرے تلخی سے مسکرایا۔ "اختیارات اور اقتدار کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ آدمی ایک دن کی بادشاہت کے بدلے اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔"

مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا۔ "یعنی تم لوگ جو اتنے گناہ کرتے ہو اتنے بے گناہوں کا لہو اپنے سر لیتے ہو اس کا دنیا میں کوئی صلہ نہیں ملتا پھر کیوں یہ سب کرتے ہو۔"

"پتا نہیں...... کم سے کم میں نے ایک بھی ایسا شخص نہیں دیکھا جو آرگنائزیشن سے ریٹائر ہو کر خوش اور مطمئن زندگی گزار رہا ہو۔" اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "میں اکثر تمہیں کہتا ہوں کہ میں ریٹائر ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزاروں گا تو یہ میں خود کو دھوکہ دیتا ہوں ورنہ مجھے معلوم ہے میں زندگی کے آخری لمحے تک آرگنائزیشن کے لیے کام کرتا رہوں گا۔ میرا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔"

"تب پھر کون ہے جو ان سارے دھندوں سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"

جان گرے نے جام خالی کر کے ریلنگ پر دے مارا لیکن وہ ریلنگ پر لگنے کے بجائے نیچے چلا گیا۔ "کون ہیں جو ساری دنیا کو عذاب میں جھونک کر فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ "تم اتنا کھل کر بول رہے ہو اس کا مطلب ہے ہماری یہ گفتگو کہیں اور نہیں سنی جا رہی ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "اس تپائی پر جو آلہ دیکھ رہے ہو یہ نہ صرف کسی بھی جگہ ڈیوائس کی نشاندہی کر سکتا ہے بلکہ اسے ناکارہ بھی بنا سکتا ہے۔"

"جب تم اور تمہارے بڑے جانتے ہیں کہ فائدہ صرف یہودی اُٹھا رہے ہیں، تب وہ اس دھندے کو کیوں جاری رکھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان جب تک گلے تلے تک نہ دھنس جائے اسے علم نہ ہوگا اور جب اسے علم ہوتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے لیکن یوسف، مزے کی بات بتاؤں میں نے کسی یہودی کو بھی خوش نہیں دیکھا، بے انتہا دولت اور دنیا پر خدائی اثر و رسوخ (نعوذ باللہ) رکھنے والے یہودی بھی کسی نہ کسی عذاب یا پریشانی کا شکار ہیں ہر وقت جلتے کڑھتے رہتے ہیں۔ راتوں کو نیند نہیں آتی ہے۔ اپنی پریشانیاں نشے اور جنس میں ڈبوتے ہیں۔ خوش کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے جان گرے! میں نے خوش لوگ بھی دیکھے ہیں۔ ایبٹ آباد پاکستان کے ایک چھوٹے سے گھر مولوی سعد اللہ جان اپنی بیوی اور تین بچوں ساتھ بے حد خوش ہے اور ایک ڈرائیور تھا ہمارا جمشید پیلس میں وہ ہمہ وقت ہنستا مسکراتا اور گاتا رہتا تھا۔ میں نے کبھی اسے سنجیدہ یا پریشان نہیں دیکھا۔"

اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ "یہی تو بات ہے۔ جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہی سب سے مطمئن ہے۔ اسے کچھ چھن جانے کا خوف بھی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے جان گرے! کراچی کا ایک عالم ہے۔ دس بائی دس کی کوٹھری میں اس نے ساری زندگی گزار دی۔ اس نے ایسا ادارہ قائم کیا جہاں ہزاروں بچے پڑھتے ہیں۔ جس کا سالانہ خرچ کروڑوں روپے ہے۔ سپر ہائی وے پر اس عالم کی اربوں روپے کی زمین ہے جو اس نے ادارے کے نام کر دی۔ کبھی حکیم محمد سعید کا نام سنا ہے۔"

جان گرے نے سر ہلایا۔ "تم لوگوں کی خوش قسمتی کہ ایسا شخص تمہارے ہاں پیدا ہوا۔"

"اور ہماری بدقسمتی دیکھو ہم نے اسے مار دیا۔" میں نے تلخی سے کہا تھا۔

"یہی تو تم لوگوں کی حماقت ہے۔" جان گرے سوچ کر بولا۔ "تمہارے ملک کو اعلیٰ دماغوں سے محروم کرنے کا منصوبہ مقامی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی ہے۔ اس کا مقصد ہے ہر ایسے شخص کو راہ سے ہٹا دو جو مقامی اور بین الاقوامی مفاد پرستوں کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث ہو۔"

"جان گرے...... کیا تم نے کبھی سوچا کہ تم اس آرگنائزیشن سے جان چھڑاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"سب ممکن ہے۔" میں نے اسے ترغیب دی۔ "جان گرے تم خود کہتے ہو کہ دولت کی تمہارے پاس کمی نہیں ہے۔ کیا تم اتنی بڑی دنیا میں خود کو کہیں چھپا نہیں سکتے۔ اپنی باقی زندگی اپنی مرضی سے نہیں گزار سکتے؟"

"شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے سر ہلایا۔ "جان گرے...... تم مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہو میں اس کے لیے راضی ہوں۔ دل و جان سے راضی ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔"

اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔ "یوسف کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"بے شک تم مجھ سے کیسی قسم لے لو۔ حالانکہ اتنا عرصہ میرے ساتھ رہ کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں جو بات کہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔"

"او کے...... لیکن تمہیں کس قسم کا تعاون درکار ہے۔"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ "سب سے پہلے تم مجھے میجر ایڈم کے بارے میں بتاؤ۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تم اس کے بارے میں کیا جانتے




ہو؟"

"یہی کہ وہ جزیرے کا سیکیورٹی چیف ہے اور کرنل شیفرڈ کے برعکس تمہارا دوست ہے۔"

جان گرے غور کرتا رہا۔ "آج رات وہ ڈنر کرنے یہاں آئے گا۔" اس نے کہا۔ پھر مجھے میجر ایڈم کے بارے میں بتانے لگا اس کا تعلق چیکوسلواکیہ سے ہے۔ سوویت دور میں وہ آرمی سے فرار ہو کر فرانس آیا تھا اس نے دس سال پہلے آرگنائزیشن جوائن کی تھی اور اب اس اہم ترین مرکز کا سیکیورٹی چیف تھا۔ جان گرے نے مجھے خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے فرائض کو اولیت دینے والا شخص ہے، جو اپنے باپ کو بھی قربان کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر غور کیا۔ کیا میں نے جان گرے سے زیادہ ہی کھل کر بات نہیں کر لی تھی۔ نہا کر میں واپس آیا تو بالکونی میں جان گرے کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا۔ دونوں وہسکی سے شغل کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ جان گرے نے مجھے دیکھا۔ "آؤ یوسف...... میجر ایڈم سے ملو یہ ایک عظیم شخص ہے۔"

سخت چہرے اور عام سے نقوش والے میجر ایڈم میں مجھے عظیم شخصیت والی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ممکن ہے وہ اپنے کام کے لحاظ سے عظیم ہو۔ ایک میجر ہوتے ہوئے اتنے اہم مرکز کا سیکیورٹی چیف بن جانا معمولی نہیں تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ جان گرے نے اسے صرف میرا نام بتایا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"میں نے تمہارا شجرہ سنا ہے۔ تم نے الیکٹرک کو شکست دی تھی۔"

میں مسکرا دیا۔ "وہ پرانی بات ہو چکی ہے۔"

"اب یہ ہمارا ساتھی ہے۔" جان گرے نے جلدی سے کہا۔

"آج ہی اوپر سے اس کی سیکیورٹی کلیئرنس آئی ہے۔"

"لیکن آج دن بھر ایک شخص میرا تعاقب کرتا رہا۔" میں نے شکوہ کیا۔

"اچھا۔" وہ مصنوعی حیرت کے ساتھ بولا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو اب اسے اپنے علم میں لے آؤ میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ کوئی میرا تعاقب کرے۔"

اس نے ہنس کر یقین دلایا کہ وہ آئندہ اس کا خیال رکھے گا۔ "تم فکر مت کرو۔"

ڈنر کے دوران جان گرے اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ آپس میں خاصے بے تکلف ہیں۔ جان گرے نے اس سے کہا کہ وہ ہفتے میں ایک بار ڈنر اس کے ساتھ کیا کرے۔ "مجھے منظور ہے لیکن کس رات ڈنر یہاں کروں گا۔ ابھی سے نہیں بتا سکتا۔ آج کل مصروفیات زیادہ ہیں۔"

"فیسٹول کی وجہ سے؟"

"ہاں...... تقریباً ایک ہزار وی آئی پی آئیں گے۔ ان کی سیکیورٹی بھی دیکھنی ہے۔ اس کے لیے پلان کر رہا ہوں۔"

''ٹوائے بنانے والی فیکٹری کی سیکیورٹی بھی تم نے تیار کی ہے نا، میں نے اس کی بہت تعریف سنی ہے۔''

''ہاں...... لیکن یہ سب میری جاب کا حصہ ہے۔ فیکٹری میں سب سے اہم چیز وہاں دھماکہ خیز مواد کی موجودگی ہے اسے الگ سے کہیں نہیں رکھا گیا ہے۔''

''یہ تو خطرناک ہے۔'' جان گرے بولا۔ ''اس کے لیے کوئی الگ جگہ ہونی چاہیے۔''

''میں نے ایک جگہ رکھا ہے۔ کیونکہ ذرا سی لاپروائی سے پوری فیکٹری تباہ ہوسکتی ہے۔''

اس وقت میں نشست گاہ میں ایک طرف بیٹھا بہ ظاہر رسالہ دیکھ رہا تھا۔ دیکھ یوں رہا تھا کہ اس رسالے میں صرف دیکھنے والی اشیاء تھیں مگر میری ساری توجہ ان دونوں کی گفتگو پر مرکوز تھی۔ جان گرے نے اعتراض کیا۔

''مگر جزیرے پر اور کون سی محفوظ جگہ ہے اگر کسی کو اس کے بارے میں پتا چل گیا۔''

''کیسے پتا چلے گا۔ اس جگہ سے صرف میں واقف ہوں۔ سی فورس آتے ہی میں اسے اپنی تحویل میں لے لیتا ہوں اور جب اس کی ضرورت ہوتی ہے تو مطلوبہ مقدار میں فیکٹری کو مہیا کرتا ہوں۔''

جان گرے آہستہ سے بولا۔ ''ایڈم کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ یہ دھماکہ خیز مادے والے کھلونے کہاں استعمال ہوتے ہیں اور ان کا شکار کون ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں صرف اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔''

''لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔'' جان گرے نے کہا۔

''مت سوچا کرو۔''

''کیوں نہیں سوچوں۔'' جان گرے یکدم جذباتی ہوگیا تھا۔ ''میجر تم نے دیکھا کہ یہ سارا ظلم ہم کرتے ہیں اور اس کا فائدہ دوسرے اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے حصے میں صرف ذمے داریاں ہیں اور دوسرے ہماری محنت پر عیاشی کررہے ہیں۔ ہم اپنے گھروں سے اور پیاروں سے دور پڑے ہیں۔''

''یہ تو ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس سسٹم سے فرار تو نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جو کام ہے وہ کرتے رہو۔ سوچو مت، جان گرے تم میرے دوست ہو اس لیے مشورہ ہے اس قسم کی باتیں کسی اور کے سامنے ہرگز مت کرنا۔''

نشے میں شاید انہیں احساس بھی نہیں تھا کہ میں ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ اس لیے وہ کھل کر بات کرتے رہے۔ البتہ میجر ایڈم کو پھر بھی اتنا ہوش تھا کہ اس نے اس جگہ کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا جہاں وہ دھماکہ خیز مادہ ذخیرہ کرتا تھا۔ اگلے روز میں صبح نکلا۔ سائیکل پر قصبے تک گیا۔ حسبِ معمول سیاہ رُو پستہ قد شخص میرے پیچھے تھا۔ جاسوسی کے لیے وہ نااہل اور ناموزوں شخص تھا۔ کیونکہ وہ نمایاں ہو جاتا تھا۔ تمباکو والی دکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی میں نے اندر جا





کر جان گرے کے پسندیدہ کیوبن سگار طلب کیے وہ مجھے نکال کر دکھانے لگا۔ میں نے دو ڈبے پسند کیے اور اپنا کارڈ نکال کر اسے پیش کیا۔ اس نے نمبر دیکھ کر اندراج کرلیا۔

''مجھے عبید صلاح کے لیے ایک پیغام بھجوانا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا اس وقت دکان میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے میرا جملہ سنا ہی نہ ہو۔ وہ ڈبے اُٹھا کر واپس شیلف میں رکھنے لگا اور میں منتظر رہا کہ وہ مجھ سے پیغام پوچھے۔ وہ واپس آیا اور آہستہ سے کہا۔ ''کیا پیغام ہے؟''

''اسے کہنا کہ اسے جس شے کی تلاش ہے اسے میجر ایڈم اپنی ذاتی تحویل میں کسی نامعلوم مقام پر رکھتا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''پیغام پہنچ جائے گا۔ آئندہ کوئی پیغام ہو تو شام کے وقت آنا۔''

میں ڈبے اُٹھا کر دکان سے نکل گیا۔ دوپہر کے کھانے تک میں قصبے میں رہا۔ پھر سائیکل والی دکان پر گیا۔ اس نے سائیکل کا معائنہ کر کے مزید دو دن کے لیے میرے حوالے کی۔ میں نے ایک چکر قصبے سے باہر ساحل کی طرف جانے والی سڑک کا لگایا اور ساحل سے لاحول پڑھتا واپس آیا۔ یہ قصبے کا نیوڈ بیچ تھا۔ اپارٹمنٹ آکر میں نے سگار کے ڈبے جان گرے کے حوالے کیے تو وہ خوش نظر آنے لگا۔ ''یہ تم میرے لیے لائے ہو؟''

''ظاہر ہے فی الحال یہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس کے لیے میں باہر سے کچھ لاسکوں۔''

''شکریہ اور تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ ممکن ہے تمہیں آنے والے فیسٹول میں کوئی ذمے داری [illegible]پی جائے۔''

''ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔''

میں نے دو روز بعد قصبے کا چکر لگایا۔ تمباکو والی دکان کے سامنے سے گزرا لیکن اندر نہیں گیا۔ آج سیاہ رُو پستہ قد میرے پیچھے نہیں تھا لیکن کوئی نہ کوئی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے ایک چکر جمنازیم کا لگایا ہلکی ایکسرسائز کی۔ ایک جمنازیم اور سوئمنگ پول ایگزیکٹو لاجز میں تھا لیکن وہاں صرف جان گرے جیسے رتبے کے آدمی جا سکتے تھے۔ جان گرے سے بات کرنے کے بعد میں نے باقاعدگی سے جمنازیم جانے کا فیصلہ کیا۔ نہ جانے مجھ پر کون سی ذمے داری ڈال دی جاتی۔ دوسرے مجھے الیکٹرک اور احمد بربری کے مقابلے کا بھی خیال تھا۔ اگرچہ میں اس مقابلے کے لیے بالکل بھی فٹ نہیں تھا۔ الیکٹرک کیا، میں شاید کسی عام فائٹر سے بھی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ پہلے ہی دن جمنازیم میں ایکسرسائز کر کے میری حالت خراب ہونے لگی تھی۔ مگر دوسرے تیسرے دن نسبتاً آسانی سے ورزش کرنے لگا۔ ایک ہفتے بعد میں قصبے گیا۔ سائیکل والے کو اطمینان کرایا اور پھر تمباکو والے کی دکان پر آیا۔

"تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔"

"کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پیغام ہے، ملاقات کے لیے اسی جگہ پہنچ جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ عبید بن صلاح مجھے ملاقات کے لیے اسی جگہ بلوا رہا ہے۔ جہاں پہلی بار ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ "کس وقت؟"

"اسی وقت اور اسی دن۔" اس نے جواب دیا۔

یعنی دو دن بعد میں نے سوچا اور دکان سے باہر آ گیا۔ میں سائیکل پر سڑک سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے جان گرے جیپ میں آتا دکھائی دیا۔ اس نے جیپ روک دی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں...... سوچا ہے ذرا سوئمنگ کر لوں اس کے بعد لنچ کروں گا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔"

"اور یہ سائیکل؟" میں نے پوچھا۔

"دفع کرو اسے یہیں چھوڑ دو۔" وہ بے زاری سے بولا۔

میں نے سائیکل فٹ پاتھ سے ٹکا کر کھڑی کی اور جیپ میں آ بیٹھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"آج تمہارے ایک پُرانے دوست کے مقدر کا فیصلہ ہونا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میرا دل دھڑک اُٹھا تھا۔

"وہی جس کے لیے تم نے میری گردن دبائی تھی۔" اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

"احمد بربری۔" میں بے ساختہ بولا۔

اس نے سر ہلایا۔ "اس نے فرار کی کوشش کی تھی مگر پھر پکڑا گیا۔"

"جینوا کونشن اسے یہ حق دیتا ہے۔"

"بکومت وہ کوئی جنگی قیدی نہیں ہے ایک مجرم ہے۔"

"اسے حریت پسند کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"آؤ دیکھتے ہیں تمہارے حریت پسند کو۔" اس نے جیپ ایک عمارت کی پارکنگ میں روکی۔

ہم اندر گئے۔ ایک سفید فام معمر شخص نے جان گرے کا استقبال کیا۔ "جان کینڈی آ گیا ہے؟" جان گرے نے اس سے پوچھا۔

"آزیبل جج آ چکے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

جان گرے مجھے لے کر ایک چھوٹے سے کورٹ نما کمرے میں پہنچا۔ وہاں پر جج کی کرسی پر جان کینڈی بیٹھا تھا۔ اس کے نام کی تختی بھی لکھی تھی۔ جان گرے نے اسے تعظیم دی اور عقبی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں دریافت کیا۔ "اس نام نہاد عدالت کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ تم لوگ احمد بربری کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"




"انصاف کے تقاضے پورے کرنا ضروری ہے۔"

اس بات پر میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ "تم لوگ اس لفظ کے مفہوم سے بھی ناواقف ہو۔" میں نے دل میں کہا۔

اسی لمحے ملزم احمد بربری کی آمد کا اعلان ہوا۔ وہ زنجیروں میں جکڑا دو گارڈز کے ہمراہ آیا تھا۔ وہ بہتر صحت اور تروتازہ چہرے کی وجہ سے پہلے سے بہتر لگ رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا اور شناسا سا انداز میں مسکرایا تھا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کیونکہ میں نے احمد بربر کو دو تین بار سرسری دیکھا تھا لیکن اس نے مجھے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے لے جا کر ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے انداز میں ایک مخصوص لاپروائی تھی جب جج نے اسے فرد جرم پڑھ کر سنائی تو وہ ناخن سے اپنے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس وقت بھی نہیں جب اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ البتہ سزائے موت سنائے جانے کے بعد اس نے حقارت سے فرش پر تھوک دیا۔ جان کینڈی کے چہرے پر غیض وغضب کے آثار نمودار ہوئے تھے مگر وہ اس سے زیادہ اس کے ساتھ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے چلا کر گارڈز سے کہا۔

"اسے لے جاؤ اور سزائے موت کی تکمیل تک اسے قید تنہائی میں رکھو۔"

احمد بربر نے ایک بار پھر جج کا رُخ کر کے فرش پر تھوکا اور کٹہرے سے نکل آیا۔ گارڈز اسے درشتی سے کھینچ کر لے جانے لگے۔ میں اور جان گرے بھی اٹھ کر باہر آ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "جب یہ بات طے ہے کہ اسے سزائے موت دی جانی ہے تو تم لوگ اسے عدالت میں کیوں لائے۔ تم نے دیکھا وہ تمہاری عدالت کو ذرا برابر اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" جان گرے لاپروائی سے بولا۔

"کیونکہ ہونا وہی ہے جو تم لوگ چاہتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

"تم چاہو تو ایسا ہی کہہ لو۔ ویسے میں ذاتی طور پر اب ایسا نہیں سمجھتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "پچھلے دنوں تم نے کہا تھا تم میرا تعاون چاہتے ہو اس سے تمہاری کیا مُراد تھی۔"

"جان گرے تم احمد بربر کو بچانے کی کوشش کرو۔"

"یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تب اس معاملے میں میری مدد کرو۔"

"وہ کس طرح؟"

"دیکھو احمد بربری میجر ایڈم کی تحویل میں ہے۔ وہ چاہے تو اسے فرار کرا سکتا ہے۔"

"ایڈم کبھی اس پر رضامند نہیں ہوگا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ہم اسے مجبور کر سکتے ہیں۔"

جان گرے چونکا۔ "وہ کس طرح؟"

''میجر ایڈم کے پاس دھماکہ خیز مادے کا ذخیرہ ہے۔ اگر یہ ذخیرہ اس کی تحویل سے غائب ہو جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟''

''بہت بُرا......اسے فوراً برطرف کر دیا جائے گا لیکن تم کیسے جانتے ہو؟''

''میں نے تم دونوں کی باتیں سنی تھیں اگر ہم اس ذخیرے کو وہاں سے اُڑا لیں جہاں اس نے رکھا ہے تو وہ ہماری ہر بات ماننے پر مجبور ہوگا۔''

''یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہوتا جان گرے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ ''لیکن تم ایک بار پھر سوچ لو۔''

جان گرے نے جیپ روک دی۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''اتنا سنجیدہ میں افریقہ میں بعض اوقات موت کا سامنا کرتے ہوئے بھی نہیں رہا تھا۔ اگر تمہیں میرا تعاون چاہیے تو احمد بربری کو بچانا ہوگا۔''

جان گرے جھنجھلا گیا تھا۔ ''یہ کیا شرط ہے۔ اب تم مجھ سے ساری دنیا میں سزائے موت پانے والے افراد کی رہائی کی شرط رکھو گے۔''

''میں احمق نہیں ہوں۔ تم سے وہی شرط منواؤں گا جو تم پوری کر سکتے ہو۔ میں نے طریقہ بھی بتا دیا ہے۔''

اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم واقعی احمد بربری کو رہا کرانا چاہتے ہو یا کوئی اور مقصد بھی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' میں سنبھل کر بیٹھا۔

''دیکھو یوسف......اگر تمہارے علم میں کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھ سے نہ چھپاؤ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تم کو دھوکہ نہیں دوں گا۔''

''بھلا اس کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''جان گرے میں قسم کھاتا ہوں اس کے بعد تم سے اور کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر بعد وہ جگہ آئی جہاں میں نے سائیکل چھوڑی دی۔ اس نے سائیکل جیپ کے عقبی حصے میں رکھنے کو کہا۔ میں نے سائیکل رکھ دی۔ اس نے جیپ قصبے سے باہر جانے والی ایک سڑک پر گھما دی۔ پندرہ منٹ بعد ہم ایک پتھریلے ساحل کے پاس تھے۔ یہاں سمندر کی موجیں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ اس نے جیپ سے اُتر کر میری طرف دیکھا۔ ''یوسف فرض کرو ہم اس جگہ کا پتا چلا لیتے ہیں؟''

''یعنی تم راضی ہو۔''

''میں نے ابھی فرض کرنے کو کہا ہے۔ اگر پتا چلا بھی لیا تو ہم کیا کر سکیں گے۔ ایڈم نے اس





جگہ کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر رکھا ہوگا۔''

''اگر اس کا سراغ مل جائے تو حفاظتی انتظامات بھی توڑے جا سکتے ہیں۔''

''چلو......اس جگہ سے فورس چرا لیا تو اسے رکھیں گے کہاں؟''

''اس جزیرے پر بہت ساری جگہیں ہیں، کہیں پر بھی چھپا سکتے ہیں۔ جب میجر ایڈم کسی بھی طریقے سے احمد بربری کو فرار کروا دے گا تو ہم اسے دھماکہ خیز مواد واپس کر دیں گے۔''

''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔''

''آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کما کر کھانا بھی نہیں۔ اس کے باوجود دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ حلال کی روزی کھا رہا ہے۔''

''میں سوچوں گا۔'' جان گرے جیپ کی ڈرائیونگ نشست پر آ گیا۔ ''یہ معاملہ اتنا بھی سادہ نہیں ہے جتنا تم اسے بنا کر پیش کر رہے ہو۔ یہ بتاؤ احمد فرار ہو گیا اور ہم نے اسے بچا لیا تب بھی اسے رکھیں گے کہاں اور جزیرے سے باہر کس طرح نکالیں گے۔''

''یہ بعد کے مسئلے ہیں۔ پہلا کام اسے بچانا ہے اس پر توجہ رکھو۔''

مجھے قصبے میں چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ لنچ کا وقت قریب تھا میں نے ریستوران میں جا کر لنچ کیا اور ایکسر سائز اور سوئمنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے واپس جان گرے کے اپارٹمنٹ آ گیا۔ وہاں ایک کمرا مستقل طور پر میرے لیے مخصوص تھا۔ بندرگاہ کی طرف سے دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بندرگاہ اور سمندر کے درمیان میں حائل چٹانوں کو ڈائنا مائیٹ کی مدد سے توڑا جا رہا تھا تاکہ بڑے بحری جہاز بھی آ سکیں۔ ساتھ ساتھ بندرگاہ کی گنجائش میں بھی اضافہ ہو۔

جان گرے سوچنے میں مصروف تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ میری بات مان جائے گا۔ تیسرے دن میں صبح سویرے قصبے تک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر جان گرے نے مجھے روک دیا۔ ''آج تم میرے ساتھ میجر ایڈم کے دفتر چلو گے۔''

''خیریت؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ شدت سے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''اس نے ہم دونوں کو بلایا ہے۔ سیکیورٹی چیف کی حیثیت سے۔''

''اوہ......کیا اسے ہم پر کسی قسم کا شک ہے؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تیاری کرو ہمیں گیارہ بجے تک اس کے دفتر پہنچنا ہے۔''

''تب تم ایسا کرو قصبے پہنچ کر مجھے ریستوران کے سامنے سے پک کر لینا۔ میں ابھی سائیکل پر جا رہا ہوں۔ مجھے قصبے میں کچھ کام اور بھی ہیں۔''

''میں پونے گیارہ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔'' جان گرے نے مجھے اجازت دے دی۔

اس تبدیلی نے مجھے کسی قدر پریشان کر دیا تھا۔ کیا میجر ایڈم کو میرے اور عبید بن صلاح کے تعلق کا پتا چل گیا تھا یا جان گرے نے احمد بربر کے فرار کی سکیم اس تک پہنچا دی تھی۔ اور میں میجر

ایڈم کے دفتر سے واپس ہی نہ آتا۔ میں نے سب سے پہلے شاپنگ ایریا میں ایک دکان سے موزے لیے مزید چھوٹی موٹی خریداری کرتا، تمبا کو والی دکان پر پہنچا اور دکان دار کو موقع پا کر آج کی ملاقات منسوخ کرنے کے لیے کہہ دیا۔ ''یہ ملاقات کل اسی وقت ہوگی اور یہ بھی بتا دینا، مجھے آج دن گیارہ بجے ایس سی کے دفتر بلایا گیا ہے۔ معاملہ نامعلوم ہے۔''

''پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرف سے ایک پیغام اور ہے۔ ایگزیکٹو لاجز میں بھی بارہ اپارٹمنٹ میں ایک بنگالی مسلمان عبدالقیوم ہے وہ بھی رابطے کا ذریعہ ہے۔''

میں نے یہ ذہن نشین کیا اور باہر نکل گیا۔ پونے گیارہ بجنے میں چند منٹ تھے اس لیے میں نے ریستوران کا رُخ کیا۔ جان گرے ٹھیک پونے گیارہ بجے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھے وہاں سے لیا۔ گیارہ بجے ہم میجر ایڈم کے دفتر میں اس کے سامنے تھے۔ اس وقت وہ سرد مزاج افسر لگ رہا تھا۔ اس نے رسمی استقبال بھی نہیں کیا۔ اس کے سامنے ایک فائل رکھی تھی وہ اس کی ورق گردانی کرتا رہا پھر اس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''مسٹر یوسف آج سے دو ہفتے پہلے تم قصبے سے ایک سائیکل لے کر ڈاک کی طرف روانہ ہوئے لیکن تم ڈاک کے علاقے میں داخل نہیں ہوئے تقریباً دو گھنٹے بعد تم قصبے واپس آئے اور سائیکل مستقل اپنے نام جاری کروالی۔''

''درست ہے۔''

''بات مت کاٹو۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا سوال یہ ہے کہ اس دوران میں تم کہاں رہے تھے؟''

''کہیں نہیں میں ذرا کھلی ہوا میں گھومتا رہا تھا اور پھر قصبے واپس آ گیا تھا۔''

''جو سڑک قصبے سے ڈاک کی طرف جاتی ہے اس پر کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آدمی انجوائے کر سکے۔''

''مسٹر ایڈم میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے تو یہ پورا جزیرہ ہی پُر فضا محسوس ہوا ہے اور اس سڑک کے دونوں طرف اچھی جگہیں ہیں۔''

''اگر تم نے انجوائے کرنا تھا تو ساحل کی طرف کیوں نہیں چلے گئے؟''

''میں فطرت کا شائق ہوں۔ فطرت کی طرف جانے والوں کا نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بہرحال مسٹر ایڈم اگر تم مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہو تو کھل کر کہو۔''

''تمہاری باقاعدہ نگرانی کی جاتی ہے تم پہلے دن دو گھنٹے کے لیے نگرانی کرنے والے کی نظروں سے اوجھل رہے تھے۔ اس کا کہنا ہے تم نے جان بوجھ کر اسے ڈاج دیا تھا اور سڑک کے موڑ پر پہنچ کر سڑک سے اُتر گئے تھے۔''

''میں نے یقیناً ایسا کیا تھا لیکن کسی کو ڈاج دینے کے لیے نہیں بلکہ میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان گھومنا چاہتا تھا میں نے تو سائیکل بھی سڑک کے پاس ہی چھوڑ دی تھی، پیدل گھومتا رہا





تھا۔''

ایڈم چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ ''تمہارے لیے وارننگ ہے مسٹر یوسف! آئندہ تم نگرانی کرنے والے کی نظروں سے غائب ہوئے تو تمہاری گھومنے پھرنے کی آزادی ختم کر دی جائے گی۔''

''میں خیال رکھوں گا مسٹر ایڈم!'' میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ اس نے تمبا کو فروش کی بات نہیں کی تھی لیکن ابھی میں نے پوری طرح سانس بھی نہیں لیا تھا کہ اس نے کہا۔

''مسٹر یوسف میری اطلاع کے مطابق تمہیں تمبا کو نوشی یا کسی قسم کے نشے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن تم اب تک چار بار قصبے کی تمبا کو کی دکان پر جا چکے ہو۔''

''وہ میں جان گرے کے لیے سگار لینے جاتا ہوں۔''

''سگار جان گرے خود بھی منگوا سکتا ہے۔'' اس نے تنبیہہ کی۔ ''تم آئندہ غیر ضروری جگہوں پر جانے سے گریز کرو گے۔''

''او کے مسٹر ایڈم۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' ایڈم کا لہجہ سخت تھا۔ ''چند دنوں بعد جزیرے پر فیسٹول شروع ہو رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر کوئی گڑبڑ ہو۔''

''میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''مسٹر جان گرے، مسٹر یوسف کی ضمانت تم نے لی ہے اور اگر یہ کسی غلط حرکت میں ملوث پایا گیا تو اس کی پوری ذمے داری تم پر بھی عائد ہوگی۔''

''میں ضمانت لینے کے اصول سے واقف ہوں مسٹر ایڈم۔'' جان گرے کا لہجہ سپاٹ سا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس میں تلخی کی آمیزش محسوس ہوئی تھی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی اسے دوست کہنے والا شخص اس قدر روکھا رویہ بھی اپنا سکتا ہے اس کے لیے۔ ''اگر ملاقات کا مقصد پورا ہو چکا ہے تو ہم جائیں۔''

''نہیں مسٹر یوسف کی طلبی کا اصل مقصد اسے ایک ذمے داری سونپنا تھا۔ ایک ہفتے بعد فائٹرز آنا شروع ہو جائیں گے۔ جو ٹورنامنٹ سے پہلے پریکٹس کریں گے۔ مسٹر یوسف اس دوران میں ان کی نگرانی کرے گا اور پریکٹس کے ماحول کو دوستانہ رکھے گا۔ جمنازیم کے معاملات سے آگاہی کے لیے تم کل سے اپنی ذمے داریاں سنبھالو گے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''او کے مسٹر ایڈم۔'' میں نے فکرمندی ظاہر کیے بغیر کہا۔ ورنہ اس کے اس حکم نے مجھے تشویش زدہ کر دیا تھا۔ کہیں پر بھی ذمے داری نبھانے کا مطلب تھا کہ میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ پھر عبید سے ملاقات ممکن نہیں تھی اور نہ ہی میں اب اسے پیغام بھیج سکتا تھا۔ کم سے کم تمبا کو والی دکان سے یہ ناممکن ہو سکتا تھا۔ اگر میں ایڈم کی واضح ہدایت کے باوجود وہاں جاتا تو یہ بات اسے مشکوک کر سکتی

تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آخری ملاقات میں تمبا کو فروش نے مجھے بنگالی مسلمان عبدالقیوم کا حوالہ دے دیا تھا ورنہ میرے لیے خاصی مشکل ہو جاتی۔

''ایک بات اور مسٹر یوسف، جمنازیم میں تمہاری ڈیوٹی صبح نو سے شام چھ بجے تک ہے۔ گاڑی تمہیں ایگزیکٹو لاجز سے لائے گی اور لے جائے گی۔ اس کے بعد تمہیں وہاں سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔''

''[illegible] پابندی رہ گئی ہے تو وہ بھی لگا دو۔'' میں نے تلخی سے کہا اور جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''اتنی پابندیاں تو [illegible] وقت بھی نہیں تھیں جب میں یہاں مجرم تھا۔''

[illegible] ''مسٹر یوسف تم جانتے ہو سب سے زیادہ نگرانی پیرول پر رہا ہونے والے شخص کی [illegible]

میں نے سر ہلایا اور جان گرے کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اب ہم چلیں گے مسٹر ایڈم۔'' وہ بولا۔ ''آئندہ اگر مجھے یا یوسف کو طلب کرنا ہو تو ہماری ذمے داریوں کے اوقات کا خیال رکھنا۔''

''کوئی ایمر جنسی نہ ہوئی تو میں ضرور خیال رکھوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جان گرے اس معاملے میں فکر مند تھا۔ اس نے دفتر سے باہر آ کر کہا۔

''یوسف مجھے دال میں کالا لگ رہا ہے۔ ایڈم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس نے براہِ راست نہیں لیکن تم پر شبہ ظاہر کر دیا ہے اور اب تمہاری سخت نگرانی ہوگی۔''

''لیکن تمہاری نگرانی نہیں ہوگی۔ اس لیے تم آزاد ہو۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''نہیں یوسف ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔''

''مشکل ہو یا آسان بہر حال کام کرنا ہے اور ابھی ہمارے پاس خاصا وقت ہے۔ جان گرے یہاں تمہارے ساتھی بھی ہیں ان کی مدد لو۔ یہ سب ممکن ہے۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے معاملہ ہی ایسا ہے۔ اگر ایگزیکٹو کونسل کے بڑوں تک یہ بات پہنچ گئی تو مجھے مجرم قرار دے دیا جائے گا اور شاید سزائے موت دی جائے۔''

''اس کا صرف امکان ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس سڑک کو پار کرتے ہوئے کوئی گاڑی تم پر چڑھ جائے لیکن اس وجہ سے تم سڑک پار کرنے سے گریز نہیں کرو گے۔ خطرہ تو ہر جگہ ہے۔''

اس نے زچ ہو کر مجھے دیکھا۔ ''ایڈم نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے اوپر سے تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔''

''تو مت ہو پریشان میں بھی سکون سے رہتا ہوں لیکن اس کے بعد مجھ سے کسی تعاون کی امید مت رکھنا۔''





''میں انکار نہیں کر رہا لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی اس سے منع نہیں کر رہا لیکن نیت ضرور کر لو۔ اس کے بعد راہیں خود آسان ہو جائیں گی۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے تمہاری بات مان کر میں سب گنوا دوں گا۔ جو میں نے اب تک کمایا ہے وہ بھی اور اپنی زندگی بھی۔''

''دنیا کی چیزوں میں زندگی سب سے اہم ہے۔ یہ ہے تو سب ہے اور اس وقت میرا بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ صبح ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔''

اس نے گھڑی دیکھی۔ ''اس وقت تو ریستوران میں کچھ نہیں ملے گا۔ ایک گھنٹے بعد چلیں گے۔ البتہ برگر مل جائے گا۔''

''وہ گوشت والا ہوتا ہے۔'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ ''ایک گھنٹے بعد ہی چلیں گے۔ آؤ جب تک کافی لیں۔''

درختوں کی چھاؤں تلے ایک کیفے تھا۔ ہم وہاں جا بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دیا۔ میں نے ویٹر کے جانے کے بعد آہستہ سے کہا۔

''جان گرے...... ہر شخص کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے کوئی ایسا کام جس کے لیے وہ جان تک دے سکتا ہے کیا تمہارے پاس ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''کیوں نہیں ہے۔ اس کے لیے تو میں تمہاری مدد کا خواہاں ہوں لیکن تمہاری شرائط مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ موجودہ حالات میرے لیے بھی اچھے نہیں ہیں۔ میرے مخالفین سرگرم ہیں۔ میں نے اپنی پوزیشن بحال کر لی ہے لیکن وہ کسی نئے زاویے سے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ انہیں ذرا سے بہانے کی ضرورت ہے۔ افریقہ والا مشن ناکام ہونے سے میری ساکھ متاثر ہوئی ہے۔''

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے مخالفین سے دب جاؤ۔ اگر تم اس طرح رہتے ہو تو وہ دبائے جائیں گے۔'' اس نے جواب نہیں دیا۔ ویٹر کافی لے کر آ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جان گرے نے کافی میں شکر ملاتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ جب تک آدمی کی پشت مضبوط ہو وہ کھل کر فیصلے کر سکتا ہے۔''

''پشت کی مضبوطی آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کامیاب وہی ہوتے ہیں جو کھل کر فیصلے کرتے ہیں۔ تم ایک بار فیصلہ تو کرو۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔''

اس نے مجھے گھورا۔ ''یوسف میں کبھی سخت جان تھا اب نہیں رہا۔ مجھے تم نے نرم کر دیا ہے۔''

''اپنی کوتاہی کا الزام مجھے نہ دو۔''

کافی پی کر ہم اُٹھ کر سڑک پر چلنے لگے۔ اس روز نکھری دھوپ نکلی تھی۔ سائے میں اچھا لگ

رہا تھا۔ ''یہ کام ہم اکیلے نہیں کر سکتے۔ اس میں لازمی طور پر کچھ افراد کی مدد درکار ہوگی۔''

''اس کا فیصلہ تم کر سکتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مشن کی کامیابی کے لیے تم میری جان بھی مانگو تو حاضر ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے مجھے اپنے ساتھ تمہارا بچاؤ بھی کرنا ہے۔ تم نہیں سمجھتے کہ اس وقت کتنے نازک وقت سے گزر رہے ہو۔ تمہاری ذرا سی غلطی تمہیں اس کٹہرے میں کھڑا کر دے گی جہاں تم نے احمد کو دیکھا تھا۔''

''میں نے کبھی اپنی پروا نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں۔ تم بہادر آدمی ہو لیکن مجھے تو تمہاری پرواہ ہے۔ تمہاری زندگی میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ میں تمہیں گنوانا برداشت نہیں کر سکتا۔''

''ظاہر ہے یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے لیکن میں خود کو اتنا قیمتی نہیں سمجھتا۔ زندہ رہنے کے لیے میں سمجھوتوں کا قائل ہوں لیکن ایک حد تک۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی داؤ پر نہ لگاؤں تو میری مدد کرو۔ جو تم کر سکتے ہو۔''

''میں کر سکتا ہوں۔'' جان گرے نے دہرایا۔ ''او کے یوسف تم پھر جیت گئے۔ میں وہی کروں گا جو تم چاہو گے لیکن پھر تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گا۔''

''ڈن۔'' میں نے ہاتھ آگے کیا۔



میں اس چھوٹے اور گہرے سانولے رنگ کے نوجوان کے پیچھے جا رہا تھا۔ جاذب نظر نقوش اور سیاہ چمکتی آنکھوں کی وجہ سے وہ کمسن لگتا تھا لیکن میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر کم سے کم پچیس برس تھی۔ سر کے بال مختصر تھے اور چہرے پر داڑھی کے آثار مفقود تھے۔ یعنی اسے قدرتی طور پر رواں نہیں آتا تھا۔ بارہ بی دو لیول اوپر کا ایک اپارٹمنٹ تھا جو ایڈمنٹ نامی کسی بحری کپتان کے پاس تھا۔ عبدالقیوم وہاں پر باورچی کے طور پر کام کرتا تھا میں نے ساری روداد مبہم الفاظ میں اور ہینڈ رائٹنگ بدل کر لکھی تھی اور اب اسے عبید صلاح تک پہنچانے کے لیے میں عبدالقیوم کے پیچھے تھا۔ شناختی کارڈ کی وجہ سے میرے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ میں نے ڈوری کے ساتھ اسے گلے میں باندھ لیا تھا تا کہ گارڈ روکے نہیں۔

تیسری کوشش میں مجھے بارہ بی سے ایک بنگالی نژاد نوجوان نکلتا نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور وہ ایگزیکٹو لاجز سے باہر جا رہا تھا۔ میں نے پارکنگ میں اسے جا لیا جہاں سے وہ اپنی سائیکل نکال رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ ''عبدالقیوم۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں تم کون ہو؟'' وہ کسی قدر رواں انگریزی بول رہا تھا۔

''یوسف علی خان۔'' میں نے سینے پر لگے شناختی کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دائیں




بائیں دیکھا اور اچانک میرے سینے سے لگ گیا۔ ''السلام علیکم برادر۔ تمہارا بہت نام سنا ہے۔'' اس بار اس نے صاف اردو میں کہا اور پھر مجھے حیران دیکھ کر بولا۔ ''میں نے پاکستان کے ایک مدرسے میں پڑھا ہے لیکن زیادہ بات نہیں کرنی ہے۔''

''کیا ثبوت ہے کہ تم عبدالقیوم ہو؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے جلدی سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دیا۔

میں نے مطمئن ہو کر کاغذ کا چھوٹا سا تہہ کیا ہوا پرچا مصافحہ کرنے کے دوران اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''برادر اسے جلد از جلد عرب برادر تک پہنچا دو۔''

اس نے کاغذ مٹھی میں دبا لیا۔ ''آئندہ پیغام زبانی دینا۔ میں لفظ بہ لفظ یاد کر سکتا ہوں۔ میں حافظ بھی ہوں۔''

''یہ اچھی بات ہے لکھ کر دینا مجھے خود بھی خطرناک لگ رہا ہے۔''

''کل شام سات بجے میں ادھر پارکنگ میں آؤں گا۔'' وہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

میں نے اطمینان کر لیا تھا۔ ایگزیکٹو لاج میں میری نگرانی نہیں ہو رہی تھی اور یہاں میں آسانی سے کسی سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے میں نے جمنازیم میں اپنی ذمے داری سنبھالنے سے دو دن کے لیے معذرت کر لی تھی۔ کل سے مجھے جانا تھا اور جانے سے پہلے میں بہر صورت عبید بن صلاح تک تبدیل شدہ حالات اور جان گرے کی جانب سے تعاون کا بتانا چاہتا تھا۔ خط عبدالقیوم کے حوالے کر کے میں مطمئن تھا۔ اب تک میں نے جان گرے کو اصل معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی بلکہ احمد بربری کی رہائی کی آڑ لی تھی۔ میں اس کے لیے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو جاتا وہ شاید اس جزیرے کی تباہی کے لیے راضی نہ ہوتا۔ آرگنائزیشن سے اس کی وفاداری تھی۔ میں نے اس حوالے سے اس میں کمزوری نہیں پائی تھی۔ ایک طرح سے میرے بلا اجازت اور خود سے ایگزیکٹو لاجز سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ گاڑی مجھے لے کر قصبے کے جمنازیم تک آئی۔ ڈرائیور ایک نیلی وردی والا گارڈ تھا۔ اس نے مجھے جمنازیم کی پارکنگ میں اُتارتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ڈیوٹی کے دوران جمنازیم سے باہر جانے پر پابندی ہے۔''

''کیا کوئی اور پابندی بھی باقی رہ گئی ہے۔'' میں بھنا کر بولا۔

''مجھے جو بتایا گیا تھا وہ میں نے بتا دیا۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''اور مجھے کسی وجہ سے فوری طور پر واپس جانا پڑے؟''

''تب مجھے کال کر سکتے ہو۔ میرا نمبر بارہ ہے۔ کال کے لیے کال سینٹر کا پیغام دینا۔ وہ اسے میرے لیے ٹرانسفر کر دیں گے۔''

''اور کال سینٹر تک کیسے رسائی ہو گی؟''

"فون پر زیرو ون ڈائل کر کے۔"

جمنازیم کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ عام افراد کے لیے تھا اور دوسرا خاص افراد یعنی فائٹرز کے لیے تھا اور اسے ان دنوں میں کھولا جاتا تھا جب جزیرے پر کوئی فائٹنگ چمپئن شپ ہوتی تھی اور کیونکہ فائٹرز آنے والے تھے اس لیے اسے کھولا گیا تھا۔ وہاں پر جدید ترین مشینیں لگی تھیں۔ اس کے علاوہ علاج اور مساج کی ایسی سہولتیں تھیں کہ مقابلے میں زخمی ہونے والے فائٹرز چند دن میں پہلے کی طرح فٹ ہو جاتے تھے۔ اس مقصد کے لیے خاص ڈاکٹرز آتے تھے۔ عالمی شہرت یافتہ فزیو تھراپسٹ آتے تھے۔ وہ سب اسی جگہ اپنا کام کرتے تھے۔ پہلا دن صفائی کروانے اور مشین نکال کر چیک کروانے میں گزر گیا۔ مجھے باہر جانے تو کیا سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ حتیٰ کہ لنچ بھی میں نے کھڑے کھڑے کیا تھا۔ واپس پر ڈرائیور نے مجھے زیرِ حراست قیدی کی طرح ایگزیکٹو لاجز تک پہنچایا تھا۔ مین چوکی سے اندر کر کے گیا تھا۔

میں جان گرے کے اپارٹمنٹ میں جانے کے بجائے وہیں پارکنگ میں ٹہلنے لگا تھا۔ مجھے عبدالقیوم کا انتظار تھا۔ وہ ٹھیک سات بجے اوپر سے آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ شاید وہ کچن کا سامان لینے کے بہانے باہر آیا تھا۔ بے شک اس پر پابندی نہیں تھی مگر غلاموں کو زیادہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ عبدالقیوم تربیت یافتہ غلام ہی تھا۔ وہ پارکنگ کی طرف آیا تو میں بھی ٹہلتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ بلاوجہ سائیکل کی ہوا اور پھر چین چیک کرنے لگا۔ میں اس کے پاس رُکا اور بہ ظاہر اس کی مدد کرنے لگا۔ "پیغام کا کیا ہوا؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"برادر کو مل گیا ہے۔ اس نے جوابی پیغام دیا ہے۔ خاص شے کی جگہ جلد از جلد معلوم کی جائے اور کام کے لیے مہلت کم رہ گئی ہے۔"

میں سمجھ گیا تھا۔ "برادر کو پیغام دینا۔ میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"برادر تمہارے پاس اسلحہ ہے۔"

"نہیں...... میں زیرِ نگرانی ہوں۔ اسلحہ نہیں رکھ سکتا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں ایک پسٹل لا دوں گا۔ تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا مسلح کارروائی کا امکان ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے چین سے ہاتھ ہٹا کر صاف کیے۔ "لیکن سب مسلح ہو رہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "بعض اوقات آدمی مرنا بھی تو چاہتا ہے۔ ں وقت ہتھیار کام آتا ہے۔"

میرے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس کا مفہوم واضح تھا گویا وہ مرحلہ آ گیا تھا جب کسی ایک آدمی کے زبان کھولنے سے سب تباہ ہو سکتا تھا۔ "ٹھیک ہے، کب لا کر دو گے؟"

"میں جب بھی لایا خود ہی پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"




"تم اپارٹمنٹ میں مت آنا۔ میں روز صبح ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے جاتا ہوں اور ساڑھے نو بجے آتا ہوں۔ تم اس دوران میں مجھے اشارہ کر سکتے ہو۔ بلکہ وہ بھی دے سکتے ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "براہِ راست دینا خطرناک ہوگا۔ ہمارے فلور پر گارڈز کے لیے ایک باتھ روم ہے۔ ایک روز وہاں سنک صحیح کرتے ہوئے میں نے اس کے نیچے سوراخ دیکھا تھا۔ دائیں طرف سے دوسرا سنک ہے، اس کے نیچے دیکھ سکتے ہو۔ میں پسٹل اور راؤنڈز وہاں رکھ دوں گا۔"

میں اوپر آیا تو جان گرے نے مجھے طلب کیا۔ "آج تم نے دیر کر دی۔"

"ہاں ذرا گھوم رہا تھا اور پھر ایک آدمی کی مدد کرنے رُک گیا تھا۔" میں نے کسی حد تک سچ بولا۔

"کوشش کرو کہ جلد آ جایا کرو۔ کل ایڈم نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہاری واپسی کا وقت نوٹ کیا کروں۔"

"یہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔" میں نے دانت پیسے۔ "تم بتاؤ تم نے اب تک کیا کیا ہے؟"

"میں آہستہ آہستہ کام کر رہا ہوں۔"

"ایسا نہ ہو تمہارے کام کرنے کے دوران میں احمد کی سزائے موت کا وقت آ جائے۔"

"تمہیں یہاں کا رُول پتا ہے۔ احمد کو پہلے کی طرح ایک موقع ملے گا۔ وہ کسی سے لڑے گا۔"

"اور جیت جائے گا تو اسے پھر کسی بہانے سزائے موت دے دی جائے گی۔ کیا وہ ساری عمر لڑتا ہی رہے گا۔" میں نے طنز کیا۔ "یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں تم فکر نہ کرو۔" اس نے میرا شانہ تھپکا۔

اگلے تین چار دن وہی معمول چلتے رہے۔ صبح جاتا اور شام کو واپس آتا۔ عبدالقیوم سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

جان گرے بھی مصروف رہا تھا۔ وہ عام طور سے رات گئے آتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا وہ کسی اہم کام میں لگا ہے۔ جب سے وہ جزیرے پر آیا تھا میں نے اسے پیتے دیکھا تھا لیکن اس نے عورتوں سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ جینا اس کے ساتھ آئی تھی لیکن دوسرے دن واپس چلی گئی تھی اور وہ اسے یاد کر کے آہیں بھرتا تھا۔ شاید اسے زندگی میں پہلی بار محبت ہوگئی تھی۔ چوتھے دن میں شام کے وقت واپس آ رہا تھا کہ مجھے پارکنگ میں عبدالقیوم نظر آیا۔ وہ لاپروائی سے میری طرف بڑھا اور پاس سے گزرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں نے پستول رکھ دیا ہے۔"

میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اوپر آ کر میں نے کپڑے بدلے اور لاؤنج میں آ کر انڈین ملازمہ تلسی سے چائے طلب کی۔ اگرچہ اس آب و ہوا میں کافی زیادہ مفید تھی لیکن شام کو میں چائے لیا کرتا تھا۔ اس وقت مجھے ماہ پارہ یاد آ جاتی تھیں جو شام کی چائے بہت اہتمام سے پیتی تھیں۔ ایرانی چائے

کے شوقین ہوتے ہیں لیکن حسن اس سے خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ جان گرے نہیں آیا تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں اپارٹمنٹ سے نکلا۔ پہلے میں نے لفٹ سے جانے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ لفٹ میں گارڈ تھا ممکن ہے وہ اس بات کو نوٹ کر لیتا۔ میں نے سیڑھیوں کو ترجیح دی۔ دو لیول اوپر جانا تھا۔ بارہ بی جس راہ داری میں تھا۔ کامن باتھ روم اس کے آخر میں تھا۔ میں لاپروائی سے اس طرف بڑھتا چلا گیا لیکن جب اندر گھسا تو چار میں سے دو باتھ روم مصروف تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کی موجودگی میں مَیں پسٹل نہیں نکال سکتا تھا۔ میں تیسرے باتھ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پٹ زمین سے فٹ بھر اونچے تھے اور پانچ فٹ اونچے تھے یعنی کوئی اوپر سے جھانکتا تو کموڈ پر بیٹھے شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ میں انتظار کرنے لگا کہ باقی دو افراد چلے جائیں مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ برسوں بعد باتھ روم آئے تھے۔ فارغ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک نکل کر گیا تو دوسرا اتنی دیر میں اُٹھا کہ ایک شخص مزید آ گیا۔ میں نے دانت پیسے۔

"لگتا ہے یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا جب تک تیسرا شخص جاتا مزید دو افراد آ چکے تھے۔ مجھے عبدالقیوم پر تاؤ آنے لگا آخر اسے پسٹل ایسی عوامی جگہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں باہر نکلا اور ان دونوں افراد کی پوزیشن کا اندازہ لگاتے ہوئے دوسرے سنک کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ مجھے کوئی خلا نہیں ملا۔ مجبوراً مجھے جھک کر دیکھنا پڑا۔ خلا سنک کے اوپری حصے میں خاصا آگے تھا۔ مجھے سر نیچے کرنا پڑتا تب کہیں میرا ہاتھ جاتا۔ میں نے سر نیچے کر کے خلا میں ہاتھ ڈالا جو آگے جاتا ہی گیا۔ خلا کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ پسٹل نہ جانے کہاں تھا۔ اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ ایک شخص باہر آ رہا تھا۔ میں جلدی سے اوپر ہو کر ہاتھ دھونے لگا اور اتنی دل جمعی سے ہاتھ دھوئے کہ وہ ہاتھ کے ساتھ منہ بھی دھو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے وقت ضائع کیے بغیر نیچے گھس کر ہر ممکن تیزی سے خلا میں ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ ایک پلاسٹک شاپر سے ٹکرایا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس میں چوکور سا ڈبہ تھا۔ یقیناً اس کے اندر ہی پسٹل تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ڈبہ وہسکی کی جیبی بوتل کی گتے کی پیکنگ تھی۔

میں تیزی سے واپس ہوا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ جان گرے نہ آیا ہو۔ ممکن ہے وہ پستول والا ڈبہ دیکھ لیتا اور اس کے بارے میں پوچھ کچھ شروع کر دیتا۔ میں سیڑھیاں اُتر کر اپارٹمنٹ تک آیا۔ دروازہ انڈین ملازمہ نے کھولا۔ میں نے اس سے جان گرے کا پوچھا۔ "صاحب تو نہیں آیا تمہارا۔"

"نہیں صاحب۔" اس نے کہا۔ میں اندر جانے لگا۔ "پر صاحب کے......"

میں اس کا جملہ مکمل نہیں سن سکا۔ میں نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ جہاں میجر ایڈم کمر پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے چبھتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کہاں گئے تھے تم اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اس کی نظر شاپر پر جم گئی تھی۔ مجھے لگا میرا جسم سن ہو گیا ہو۔







میجر ایڈم کی چبھتی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں اس کے سوال کے عقب میں موجود لہجے کو جانچ رہا تھا۔ کیا اسے معلوم ہو گیا تھا اور وہ ڈرامائی انداز میں مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے موجود تھا۔ مجھ سے حماقت ہوئی، مجھے لفافہ باتھ روم میں ہی لباس میں چھپا لینا چاہیے تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کس نیت سے آیا تھا۔ میں نے نارمل انداز میں کہا۔ "کچھ ٹول ہیں، ایک پڑوسی مانگ کر لے گیا تھا جان گرے سے۔ ابھی میں آ رہا تھا تو اس نے مجھے تھما دیے۔ چاہو تو چیک کر لو۔" میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا مگر ہاتھ اس سے دور ہی رکھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟" اس نے لفافہ نظر انداز کر دیا تھا۔

"بوریت ہو رہی تھی اس لیے ذرا ٹہلنے گیا تھا مگر میں کمپلیکس کے اندر ہی رہا تھا باہر نہیں گیا تھا۔"

وہ چند لمحے مجھے اسی طرح دیکھتا رہا۔ "یوسف احتیاط کرو، جزیرے کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ کوشش کرو اپنے کام کی جگہ اور فلیٹ سے باہر مت جاؤ ورنہ کسی مشکل میں پڑ گئے تو جان گرے بھی مدد نہیں کر سکے گا۔" اس کی دھمکی واضح تھی۔

"یس میجر۔" میں نے آہستہ سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شکر ہے اس وقت جان گرے یہاں نہیں تھا ورنہ میرے جھوٹ کا پول فوراً ہی کھل جاتا۔ پسٹل چھپانے کے لیے سب سے موزوں جگہ میرا جسم تھا۔ میں نے پستول نکال کر پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا اور اس کے دو عدد فاضل میگزینز کپڑے کی الماری میں کپڑوں کے پیچھے رکھ دیے۔ یہ کام میں نے اس طرح کیے کہ کمرے میں موجود کیمرہ میری ان حرکات کو نوٹ نہ کر سکے۔ یہ کام کر کے میں باہر آیا اسی لمحے جان گرے آ گیا تھا۔ اس نے میجر ایڈم سے ہاتھ ملایا۔

"اور سناؤ میجر کیا حال ہیں ایڈی بوائے؟"

"ٹھیک ہیں یوسف نے اپنی ذمے داریاں سنبھال لی ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا اور اچانک جان گرے سے پوچھا۔

"کیا تم نے کسی کو اوزار دیے تھے؟"

"آں ہاں۔" اس نے اپنے لیے گلاس میں شراب نکالتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ "اور سناؤ ایڈی بوائے میں نے سنا ہے میلے کے لیے سیکیورٹی کے خاص انتظامات کیے جا رہے ہیں۔"

میجر ایڈم نے بھی اپنے لیے جام تھاما۔ "ہاں...... اس بار سیکیورٹی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ارب کھرب پتی افراد آ رہے ہیں۔"

"تفریح کے لیے اور جگہیں کم نہیں ہیں۔ ہیڈ کوارٹر میں اس قسم کے میلے سیکیورٹی کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہیں کسی بھی حادثے کی صورت میں یہ جزیرہ توجہ کا مرکز بن جائے گا۔"

''اس کی پروا کون کرے گا۔'' میجر ایڈم حقارت سے بولا۔ ''اس خطے میں کسی حکومت میں اتنی طاقت ہے کہ ہم سے سوال جواب کر سکے۔''

''ایسا مت کہو۔ چین بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔'' جان گرے نے دو گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا اور اب دوسرا جام بنا رہا تھا۔ ''انڈیا بھی بڑی تیزی سے ہاتھ پیر پھیلا رہا ہے۔''

''فی الحال ہمارے لیے خطرے کی بات نہیں ہے۔'' میجر ایڈم کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

میرا خیال تھا کہ ایڈم رات کا کھانا کھا کر دفع ہو گا مگر وہ نصف گھنٹے بعد چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی جان گرے مجھے بالکونی میں لایا۔ ''یہ اوزاروں کی کیا بات کر رہا تھا۔''

''مجھے کیا پتہ کیوں پوچھ رہا تھا۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''یوسف مجھ سے چھپاؤ مت اس نے یہ سوال تمہاری وجہ سے کیا تھا۔''

''یہ اس سے جا کر پوچھ لو۔ مگر تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔''

''لگتا ہے مجھے اس سے پوچھنا ہی پڑے گا۔'' اس نے مجھے گھورا۔

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ احمد کے لیے تم نے کیا کیا ہے؟''

''اس کے اوپر پہرہ دینے والے گارڈز میں سے ایک شخص میرا وفادار ہے اس سے میں نے احمد کو کھانا اور بعض طاقت کی دوائیں بھیجی ہیں تا کہ وہ مقابلے کے وقت فٹ رہے۔ ایک خبر سنی ہے، الیکٹرک نے احمد سے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ تم سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔''

''چشم ما روشن دل ما شاد۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی فارسی تو تم بھی سمجھتے ہو گے۔ تو اب احمد کا مقابلہ کس سے ہو گا۔''

''تم نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔'' جان گرے مسکرایا۔ ''اس سے ایول مقابلہ کرے گا۔''

''ایول...... میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ قریب المرگ ہے۔'' میں چونکا۔

''ہاں...... لیکن بچ گیا تھا اب وہ ٹھیک ہے اور سنا ہے صرف احمد بربری کو شکست دینے کے لیے اس نے خاص طور سے تربیت لی ہے۔''

''گویا تم لوگ احمد کو اس کے ہاتھوں مروانے کا فیصلہ کر چکے ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تم سے کیا چھپانا۔ یہ طے ہو چکا ہے احمد بربری اس مقابلے میں رِنگ سے زندہ نہیں آئے گا۔''

''جان گرے...... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''تم فکر نہ کرو۔ اس مقابلے کی نوبت نہیں آئے گی، اس سے پہلے ایول کو کوئی حادثہ پیش آ جائے گا یا وہ اتنا بیمار ہو جائے گا کہ ایرینا میں اُتر ہی نہیں سکے گا۔''

''دن کم رہ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر آہستہ سے پوچھا۔ ''جان گرے ایک بات بتاؤ اگر کسی وجہ سے یہ جزیرہ تباہ ہو جائے تو یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو گی۔''




اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔ ''تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟''

''ایسے ہی...... کیونکہ یہ جزیرہ کسی اور خشکی سے دور ہے۔''

''اس کی فکر نہ کرو...... جزیرے پر کئی طیارے اور ہیلی کاپٹر ہیں اس کے علاوہ بندرگاہ پر بے شمار ٹرالرز اور کشتیاں ہیں۔''

''میں نے سنا ہے ایٹمی بجلی گھر بندرگاہ کے پاس ہے اگر وہ تباہ ہو گیا اور اس کی وجہ سے بندرگاہ بھی تباہ ہو گئی تب یہ کشتیاں اور ٹرالرز کہاں باقی رہیں گے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''یوسف تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں تمام امکانات پر نظر رکھنا چاہیے۔''

وہ مجھے گھورتا اندر چلا گیا اور میں بالکونی سے نیچے جھک کر بار بار کی رونقیں دیکھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ جان گرے فکرمند ہے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ''میجر ایڈم کیوں آیا تھا آج وہ کھانے پر نہیں رُکا۔''

''ایسے ہی آیا تھا۔'' جان گرے نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

کھانے کے بعد وہ بالکونی کی طرف گیا، انڈین ملازمہ نے شراب اور اس کے لوازمات بالکونی میں پہنچا دیئے تھے اور شاید ساقی گری کے فرائض انجام دینے کے لیے اس نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس لیے جب جان گرے نے اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا تو وہ مایوس سی چلی گئی۔ لڑکی کے جاتے ہی میں نے جان گرے سے پوچھا۔ ''تم نے دھماکہ خیز مادے کے سٹور کا پتا چلانے کے لیے کیا کیا ہے؟''

اس نے مے نوشی کا آغاز کر دیا تھا۔ ''میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ ایک دو دن میں نتیجہ نکل آئے گا۔''

''مقابلوں میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔''

''مجھے بھی خیال ہے مگر یوسف یہ بہت خطرناک کام ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے کام چوپٹ ہو جائے گا بلکہ ہم بھی پکڑے جائیں گے۔''

''مگر اتنی تاخیر بھی نہیں ہونی چاہیے کہ مقصد ہی فوت ہو جائے۔'' میں نے کہا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ ''جان گرے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میجر ایڈم نے دھماکہ خیز مادہ اپنے اپارٹمنٹ میں رکھا ہو۔''

''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رہائشی علاقے میں اس قسم کی چیز نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ میجر نے اسے کہیں اور رکھا ہو گا۔''

''تم نے کوئی نہ کوئی پلان بنایا ہو گا؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

"میں بم بنانے والی فیکٹری کی طرف سے آرڈر کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"اس کا تمہیں کیسے پتا چلے گا۔ آرڈر میجر ایڈم کے پاس آئے گا۔"

"ہاں...... لیکن میں اپنے عہدے کی وجہ سے اس قسم کے معاملات سے آگاہ رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "پچھلی بار دس دن پہلے سی فورس حاصل کیا گیا تھا۔ عام طور سے دس بارہ دن بعد اس کی طلب کی جاتی ہے۔ امید ہے کل پرسوں تک طلب کا آرڈر آ جائے گا۔"

"اس کے بعد تم کیا کرو گے؟"

"میں نے ایک ڈیوائس حاصل کر لی ہے۔ یہ مونیٹر ہے اس کا ایک سگنل دینے والا پُرزہ لگا دیا ہے لیکن وہ میری طرف سے اشارہ ملنے پر ایکٹیویٹ ہوگا۔ جیسے ہی میجر ایڈم دھماکہ خیز مادہ لینے روانہ ہوگا میں اسے آن کر دوں گا اس طرح مجھے پتا چلتا رہے گا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ جزیرے کے نقشے پر میں اس کا ٹھکانہ دیکھ لوں گا۔"

"اس کے بعد ہم وہاں سے جا کر دھماکہ خیز مادہ حاصل کر لیں گے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جان گرے کیا تم نے سوچا کہ میجر نے وہاں کیا حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے اس جگہ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہوگا۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "تب میں کیا کروں؟"

میں ذرا آگے ہو کر اسے بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ دنگ رہ گیا۔ "یہ بہت مشکل ہے۔" اس نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ "خطرناک بھی ہے اور ایڈم میرا دوست ہے۔"

"اگر تم مجھ سے تعاون چاہتے ہو تو تمہیں ان سب باتوں کو بھلانا ہوگا اور جب ایڈم اپنے فرض کی خاطر تمہاری پروا نہیں کر سکتا تو تمہیں اس کی پروا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

جان گرے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سرد آہ بھری۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"ویسے بھی اس کا شک سب سے پہلے ہم پر جائے گا۔" میں بولا۔ "اور اس نے گہرائی میں کر تفتیش کی تو ہم پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ اس لیے میری تجویز مناسب ہے جان گرے۔"

اس نے بادلِ نخواستہ اثبات میں سر ہلایا تھا۔ "اوکے...... میں ایسا ہی کروں گا۔"

"جیوریل کہاں ہے؟"

"وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ ان دنوں ایک جگہ ہے جہاں جزیرے پر آنے والے عام افراد کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ تم اس کے بارے میں فکر نہ کرو وہ وہاں آرام سے ہے۔"

"یہ جگہ کہاں پر ہے؟"

"جہاں جمنازیم ہے اس سے تھوڑے فاصلے پر نارنجی پٹیریوں والی ایک عمارت ہے۔ جیوریل اس میں ٹھہرا ہے لیکن تم اس سے رابطہ کرنے کے مجاز نہیں ہو۔"





"ظاہر ہے جب مجھے جمنازیم سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے تو کہیں اور جانے کی کیا اجازت ہوگی۔"

اب مجھے عبید صلاح تک یہ بات پہنچانی تھی کہ سی فورس کے حصول کا ایک راستہ نظر آیا ہے۔ وہ اس معاملے میں ہوشیار رہے اگر ہم سی فورس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ فوری طور پر اسے حاصل کر کے کہیں چھپا دے۔ میں صبح مقررہ وقت پر نکلا تو عبدالقیوم راستے میں میرے ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ میرے ذرا پیچھے چلنے لگا۔ میں نے اسے آگاہ کیا۔ "بڑے آدمی کو بتا دو مطلوبہ شے کے حصول کا امکان ہوا ہے وہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار رہے۔"

"میں بتا دوں گا۔" عبدالقیوم میری بات سمجھ کر بولا۔ "اس کی طرف سے پیغام ہے اصل مقصد کے بارے میں جان گرے پر اعتماد نہ کیا جائے۔"

"فکر نہ کرو میں نے اسے اصل معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے۔" میں نے بتایا۔ "دوسرے...... میں احمد کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر میں اس میں کامیاب رہا تو اسے چھپانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"میں پیغام پہنچا دوں گا۔" عبدالقیوم نے کہا اور پارکنگ میں اس سمت چلا گیا جہاں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ مجھے لے جانے والی جیپ آ چکی تھی۔ آج گارڈ بدل گیا تھا۔ اس نے مجھے جمنازیم کے سامنے اُتارا۔ "میں لنچ کے لیے ایک بجے تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے اس سے کہا۔

"آپ پر سے گھومنے پھرنے کی پابندی ہٹالی گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن آپ اپنی ڈیوٹی کے دوران کہیں نہیں جا سکتے ہیں۔"

"اور ڈیوٹی کے بعد؟" میں خوش ہو گیا تھا۔

"آپ قصبے میں جا سکتے ہیں لیکن اس سے باہر صرف میرے ساتھ جا سکتے ہیں۔"

یہ بھی بہت تھا۔ پابندی ہٹنے کا مطلب تھا میں جیوریل سے مل سکتا تھا۔ اسٹریٹ فائٹنگ چیمپئن شپ میں حصہ لینے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک سے فائٹر آ گئے تھے اور وہ صبح سے شام تک جمنازیم میں پریکٹس کرتے تھے۔ ان کے لیے رات کو بھی جمنازیم کھلتا تھا اور اس شفٹ کا انچارج کوئی اور ہوتا تھا۔ دوپہر کے وقت لنچ کا وقفہ کر کے میں باہر نکلا اور نارنجی پٹیریوں والی عمارت تلاش کرنے لگا جو مجھے ذرا فاصلے پر مل گئی۔ استقبالیہ پر میں نے جیوریل سے ملنے کی فرمائش کی۔ اس فلپائنی عورت نے مجھے دوسری منزل پر کمرا نمبر بائیس کی طرف بھیج دیا۔ دستک دینے پر جیوریل کی آواز آئی۔ "آ جاؤ۔" میں اندر داخل ہوا تو وہ بستر سے اُچھل گیا تھا اس نے لپک کر مجھے دبوچ لیا۔ "برادر میں تم سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔"

"بابا...... برادر پر رحم کرو۔ م... بچا ہوں۔"

"اللہ کا... درنہ جیوریل اپنی جان دے کر بھی

"تمہیں بچائے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے کئی بار تمہارے بارے میں پوچھا لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا۔"

"میں یہاں اتنا معروف نہیں ہوں۔ دوسرے میں بھی قیدی ہوں۔ آج ہی مجھ پر سے گھومنے پھرنے کی پابندی ہٹی ہے۔ ورنہ میں تم سے ملنے نہیں آ سکتا تھا۔"

"تمہاری ان لوگوں سے کیا دشمنی ہے؟"

"کوئی نہیں۔ بس بعض غلط فہمیاں تھیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جائیں گی۔" میں نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا اس نے بھی سر ہلا کر کہا۔

"برادر یہ لوگ اچھے ہیں میرا علاج کرایا اور اب مجھے اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے۔ برادر میں نے ٹی وی پر دیکھا تھا یہاں کوئی مقابلہ ہونے والا ہے۔ سٹریٹ فائٹر کا۔"

"ہاں...... ایک زمانے میں تم بھی ان مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ اب شاید چھوڑ دیئے ہیں۔"

"ہاں...... مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ دوسروں کی تفریح طبع کے لیے ایسے لوگوں سے لڑوں جن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"میں لنچ کرنے جا رہا ہوں، اگر تم نے لنچ کرنا ہے تو چلو۔"

جیوریل مان گیا۔ ہم باہر آئے تھے۔ قصبے کی حد تک اس کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی جیسے ہی ہم سڑک پر آئے اس نے پوچھا۔ "برادر یہ کیا چکر ہے۔"

"یہ لوگ ڈیوک کے بھی باپ ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "دہشت گردوں کی بین الاقوامی آرگنائزیشن ہے جس کا مقصد ایشیا کو اور خاص طور سے مسلمان ممالک کو غیر مستحکم کرنا ہے۔ یہ جزیرہ ان کا ہیڈ کوارٹر ہے میں اور چند دوسرے افراد ان کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔"

جیوریل سوال کرتا رہا اور میں اسے جواب دیتا رہا۔ اسے جان گرے کے بارے میں بتایا کہ احمد بربری اور عبید بن صلاح کا ذکر کیا۔ وہ پُرجوش ہو گیا۔ "اب یہ میری لڑائی بھی ہے۔"

"ہاں...... لیکن تم نہ تو ایسی کوئی حرکت کرو گے اور نہ کوئی بات۔ یاد رکھنا...... یہاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مفت کی روٹیاں یہ اپنے باپ کو بھی نہ دیں، ممکن ہے صحت یاب ہوتے ہی کسی کام پر لگا دیئے جاؤ تو چوں چراں مت کرنا ورنہ جیل میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ ایسا ظاہر کرنا جیسے جزیرہ اور اس کا طرزِ زندگی تمہیں بہت پسند آیا ہو اور تم دل و جان سے ان کے ساتھ ہو۔"

"فکر نہ کرو۔ ایسا دھوکہ دوں گا کہ شیطان بھی چکرا جائے۔" جیوریل بولا۔

ریستوران میں ہم نے لنچ کیا۔ وہاں باتوں سے پرہیز کیا واپسی پر میں نے جیوریل سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ دن رات میں کسی وقت باہر نکلنے پر پابندی تو نہیں لگتی ہے؟"

"نہیں میں جس وقت چاہوں باہر آ جا سکتا ہوں۔"





"تب یہ بات ذہن میں رکھنا کہ مجھے کسی وقت بھی تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"برادر تم ایک اشارے پر جیوریل کو تیار پاؤ گے۔" اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "مگر معاملہ کیا ہے کوئی مار دھاڑ ہو گی۔"

"ایسا ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔

جیوریل اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے لگا تو میں نے اسے جمنازیم دکھایا۔ "میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ ایک طرح سے انچارج سمجھ لو۔"

"اوہ......" اس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ "کیا میں بھی جمنازیم میں آ سکتا ہوں۔"

"عام لوگوں کا داخلہ بند ہے لیکن میرا خیال ہے اگر میں تمہاری اپنی ذمے داری پر لے جاؤں تو کوئی نہیں روکے گا۔" میں نے کہا۔ "تجربہ کر کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

جیوریل میرے ساتھ جمنازیم میں آ گیا۔ گیٹ پر موجود گارڈ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جمنازیم میں آ کر جیوریل خوش نظر آنے لگا تھا ایک طرف چند فائٹرز ایکسرسائز میں لگے تھے۔ کیونکہ فائٹرز کو لڑائی سے پہلے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی وہ دوسروں پر اپنے خاص داؤ ظاہر کرنا چاہتے تھے اس لیے جمنازیم میں صرف ایکسرسائز ہوا کرتی تھی فائٹرز ایک دوسرے کے سامنے لڑنے کی ٹیکنیکس استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ جیوریل کچھ دیر بعد آیا۔

"برادر مجھے یہیں لگا لو۔ میرے مطلب کا کام ہے۔"

"او کے...... میں ابھی سے تمہیں اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ تمہارا کام ایکسرسائز کے سیشن کی نگرانی کرنا اور فائٹرز کو مطلوبہ سہولتیں مہیا کرنا ہو گا۔"

جیوریل نے اپنا کام سنبھال لیا۔ میں نے کسی سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے انچارج بنایا گیا تو مجھے کم سے کم اتنا اختیار تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں جان گرے نے اپنا کام کیا یا نہیں۔ اگر آج فیکٹری سے دھماکہ خیز مادے کی طلب ہوئی ہو گی تو جان گرے کو لازماً اپنا کام کر دکھانا ہو گا ورنہ یہ موقع پھر دس بارہ دن بعد آئے گا۔ اگرچہ احمد بربری کو بچانا اصل سے زیادہ بہانہ تھا مجھے تو دھماکہ خیز مادہ عبید صلاح تک پہنچانا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے احمد کو بھی بچانا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اس کا مقابلہ ایول سے ہو گا جسے وہ پہلے بھی ایک بار شکست دے چکا تھا۔

شام میں ہسپتال گیا کیونکہ میرا چیک اپ تھا۔ کئی صبر آزما گھنٹے وہاں گزارے، ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے تیس فیصد زخمی ٹشو ابھی باقی تھے گویا میں ستر فیصد صحت یاب ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر میری صحت یابی کی رفتار پر حیران تھا۔ "میں نے کسی کو اتنی تیزی سے ریکوری کرتے نہیں دیکھا۔ تم جس حد تک زخمی تھے اس میں لوگ مہینوں بستر پر پڑے رہتے ہیں لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کوئی حد سے زیادہ مشقت والا کام نہ کرنا ورنہ ٹشوز کے زخم پھر بگڑ جائیں گے۔"

"میں نارمل ایکسرسائز کر رہا ہوں مگر یہ پرہیز کتنے دن جاری رہے گا۔"

''کم سے کم دو ہفتے۔'' اس نے کہا۔

میں واپس اپارٹمنٹ آیا تو جان گرے ابھی تک نہیں آیا تھا۔ عبدالقیوم سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ جان گرے ایک گھنٹے بعد آیا تھا میں نے آنکھوں کے اشارے سے اس سے کام کا پوچھا تھا۔ حسبِ معمول اس نے سب سے پہلے جام بنایا اور بالکونی کی طرف آیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ اس بار میں نے لفظوں میں پوچھا۔ ''کیا ہوا جان گرے؟''

''آرڈر آ گیا ہے لیکن ایڈم آج سارا دن اپنے دفتر سے نہیں نکلا۔''

''میرا خیال ہے وہ رات کے وقت جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جان گرے بولا۔ ''میں نے آلہ اس کی گاڑی سے لگا دیا ہے۔''

''اگر اس نے کوئی دوسری گاڑی استعمال کی تو؟''

''ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیدل چلا جائے۔'' جان گرے بے زاری سے بولا۔

''کتنا مادہ طلب کیا ہے؟''

''ایک کنٹینر۔'' اس نے جواب دیا۔

''ایک کنٹینر میں کتنی مقدار ہوتی ہے۔''

''آٹھ کلوگرام۔'' جان گرے نے بتایا۔

''اگر وہ رات کو لائے گا تو کیا رات ہی کو فیکٹری بھجوا دے گا؟''

''نہیں...... ساری کارروائی دفتری اوقات میں ہوتی ہے۔ اس کا اس جگہ اندراج کیا جائے گا۔'' جان گرے نے نفی میں جواب دیا۔ ''کیا بات ہے یوسف...... تم اس بارے میں زیادہ ہی پُرجوش نہیں ہو رہے ہو۔''

''ہاں...... میں ہر قیمت پر مقابلے سے پہلے احمد بربری کو ان لوگوں کے چنگل سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''سوال یہ ہے کہ تم اسے رکھو گے کہاں؟''

''وہ بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے لاپروائی سے کہا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ جان گرے میری جانب سے مشکوک ہوتا جا رہا ہے۔ ''پہلے اسے چھڑا تو لیں۔''

''نہیں...... اس طرح تو وہ دوبارہ پکڑا جائے گا۔ عبید صلاح اور کچھ دوسرے افراد کے فرار کے بعد جزیرے کے ویران حصوں کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ اب کوئی وہاں نہیں چھپ سکتا ہے۔''

میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ یہ لوگ خود کو جتنا مستعد ظاہر کرتے تھے اتنے تھے نہیں۔ ان ہی ویران حصوں میں عبید صلاح نہ جانے کب سے رُوپوش تھا اور اب اس کے ساتھ کئی اور افراد بھی تھے۔ اس کے جاسوس ہر جگہ تھے اور اس نے اپنے ساتھیوں کو مسلح بھی کر دیا تھا۔ عبید صلاح نے اگرچہ دس کلوگرام مقدار مانگی تھی لیکن میرے خیال میں آٹھ کلوگرام سے بھی کام چل سکتا تھا۔ جان




گرے سے تمہارا وہ ٹریکنگ کرنے والا آلہ کہاں ہے کیا یہاں بھی استعمال کر سکتے ہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر جا کر اپنا نوٹ بک پی سی اور ایک چھوٹا سا آلہ لے آیا۔ اس نے آلہ نوٹ بک کے ساتھ لگایا اور پی سی آن کر دیا۔ ''اس میں ایک خاص سافٹ ویئر ہے جس کی مدد سے یہ آلہ مجھے بتائے گا کہ سگنل دینے والی ڈیوائس کہاں ہے۔'' جان گرے نے مجھے بتایا۔ اس نے کی بورڈ پر کام کیا چند لمحے بعد سکرین پر ایک نقشہ اُبھر آیا۔ یہ جزیرے کا مکمل نقشہ تھا۔ ایک بٹن دباتے ہی نقشے پر ایک جگہ سرخ رنگ کا ننھا سا نقطہ جلنے بجھنے لگا تھا۔ ''یہ ہے جہاں ایڈم کی کار کھڑی ہے۔''

''تم نے پی سی ابھی آن کیا ہے اگر اس دوران میں اس نے کوئی حرکت کی ہو تو؟''

''وہ بھی اس آلے میں ریکارڈ ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھو میں سابقہ ریکارڈ چیک کرتا ہوں۔'' اس نے انگلیاں چلائیں، سکرین پر ایک نیا خانہ نمودار ہوا ایک طرف وقت آ رہا تھا پھر اس نے کچھ کیا تو وقت کی رفتار تیز ہو گئی اور چند منٹ میں ہم نے گزشتہ ایک گھنٹے کا ریکارڈ چیک کر لیا تھا۔ نقطہ اسی جگہ رہا تھا یعنی پچھلے ایک گھنٹے میں میجر ایڈم نے کم سے کم جیپ استعمال نہیں کی تھی۔ ''وہ ابھی دفتر میں ہے۔'' جان گرے بولا۔

''یہ جگہ پارکنگ ہے۔''

ہم مزید ایک گھنٹے تک کمپیوٹر سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے رہے مگر نقطے نے حرکت نہیں کی تھی۔

''اگر یہ اس دوران میں کسی اور ذریعے سے جا کر سی فورس لے آیا تو۔'' میں نے مایوسی سے کہا تھا۔

''اس سلسلے میں ہم مجبور ہیں۔''

''لیکن میں مجبور نہیں ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اس صورت میں مَیں راست اقدام کروں گا۔''

''پلیز۔'' جان گرے نے آہستہ سے کہا۔ ''کوئی جذباتی قدم مت اُٹھانا۔''

اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ سکرین پر جلتا بجھتا نقطہ حرکت کر رہا ہے۔ میں نے جان گرے کی توجہ اس طرف دلائی تو اس نے سکرین کو بڑا کیا۔ اب نقطہ واضح ہو رہا تھا اور اس کی حرکت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''یہ قصبے سے باہر جا رہا ہے۔'' جان گرے بولا اس نے سکرین کو مزید نمایاں کیا تھا۔ نقطہ ایک سڑک پر حرکت کر رہا تھا۔ اس نے وہ سڑک پکڑی جو بندرگاہ کی طرف آتی تھی اور یہیں ایگزیکٹو لاجز میں اس کی رہائش تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔ ''یہ تو اپنی رہائش کی طرف آ رہا ہے۔''

''برخوردار اتنی عجلت مت کرو۔ میں نے کہا نا شاید یہ رات کو اپنا کام کرے۔''

نقطہ نصف گھنٹے میں وہ لاجز کی پارکنگ میں تھا۔ جان گرے نے پی سی بند کر کے ڈیوائس نکال لی تھی۔ ''میرا خیال ہے وہ شاید پہلے میرے پاس آئے گا۔''

جان گرے کا انداز درست نکلا تھا۔ انڈین ملازمہ نے میجر ایڈم کے آنے کی اطلاع دی۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ایڈم کھانے کے لیے وہیں رُکا تھا۔ اس کے بعد مے نوشی کی محفل سجائی گئی مگر میں نے محسوس کیا کہ ایڈم بہت احتیاط سے پی رہا تھا۔ یعنی اتنی لے رہا تھا کہ نشے میں نہ آئے۔ اس کے برخلاف جان گرے کھل کر پی رہا تھا۔ ایک بار جان گرے اس کے لیے انڈیلنے لگا تو ایڈم نے اسے روک دیا۔ ''نہیں میں اتنی نہیں پیوں گا۔ ابھی مجھے کام کرنا ہے۔''

''کیا کام کرنا ہے؟'' جان گرے نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''بس ایک ہے۔'' وہ بے زاری سے بولا۔

کچھ دیر بعد ایڈم چلا گیا تھا۔ میں اور جان گرے فوراً اپنے سیٹنگ ایریا یعنی بالکونی کی طرف آئے۔ جان گرے نے پھرتی سے پی سی سے وہ ڈیوائس لگا کر اسے آن کر دیا۔ ''جان گرے یہ اچھا موقع ہے ہمیں اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔''

''نہیں...... اس صورت میں شک ہم پر ہی جائے گا کیونکہ ہماری روانگی ریکارڈ ہوگی۔''

''خدا کرے وہ دھماکہ خیز مادہ یہاں لے آئے۔'' میں نے پی سی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بتایا تھا...... یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے وہ دفتر لے جائے۔ وہاں سے صبح فیکٹری والے لے جائیں گے۔''

پارکنگ سے میجر ایڈم کی جیپ حرکت میں آ گئی تھی۔ اس کا رُخ قصبے کی طرف تھا مگر اس نے جیپ قصبے میں نہیں روکی تھی۔ وہ ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ جان گرے نے نقشے کو ممکن حد تک واضح کر لیا تھا۔ ایک مقام پر نقطہ رُک گیا۔ جان گرے نے سر ہلایا۔ ''اس طرف ساحلی کاٹیجز ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بارہ نمبر کاٹیج کے سامنے ہے۔''

''یہ کس کے کاٹیجز ہیں؟''

''کسی کے بھی نہیں۔ جزیرے پر موجود ہر شے کی طرح یہ بھی آرگنائزیشن کی ملکیت ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میجر ایڈم سی فورس اس کاٹیج میں چھپاتا ہے۔ کیا یہ بات کسی اور کے علم میں نہیں ہو گی۔''

''ممکن ہے ہو لیکن مجھے نہیں پتا۔''

میرے لیے اپنا ہیجان چھپانا مشکل ہو رہا تھا اگر یہ کاٹیج ہی تھا تو عبید صلاح یا اس کے ساتھی خود یہاں سے دھماکہ خیز مادہ حاصل کر سکتے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد نقطہ دوبارہ حرکت میں آیا اس کا رُخ قصبے کی طرف تھا۔ قصبے میں نقطہ میجر ایڈم کے دفتر کے سامنے رُکا۔ گویا وہ سی فورس وہاں رکھ رہا تھا لیکن وہاں سے اسے حاصل کرنا بے حد دشوار ہوتا کیونکہ اس کے دفتر میں حفاظتی انتظامات سخت




ہوتے۔ دو گھنٹے بعد میجر ایڈم واپس لاجز آ چکا تھا۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''ان کاٹیجز میں کسی قسم کے حفاظتی انتظامات ہیں؟''

''خاص نہیں بس عام سے تالے لگے ہیں ممکن ہے یہاں دھماکہ خیز مادہ رکھنے کی وجہ سے ایڈم نے خاص حفاظتی نظام لگایا ہو یا جو کسی بھی مداخلت کی صورت میں اسے خبردار کر سکتا ہے۔''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو شک سے دور رکھنے کے لیے ایڈم نے کوئی حفاظتی انتظام نہ کیا ہو۔''

''سب ممکن ہے۔'' جان گرے نے پی سی آف کر کے آلہ نکال لیا تھا۔ ''باقی کل دیکھیں گے۔''

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات کا کھانا کھا کر میں جلدی سو گیا۔ ان دنوں میں آرام، خوراک اور ورزش پر خاصی توجہ دے رہا تھا۔ مقابلوں تک میں فٹ ہو جانا چاہتا تھا اور اگر عبید صلاح کامیاب ہو جاتا تو اس جزیرے سے فرار ہونا تھا اس مارا ماری میں میرا فٹ ہونا ضروری تھا۔ ہر دو صورت میں میری کوشش تھی کہ میری صحت جلد از جلد بحال ہو جائے۔ صبح میں جلدی اُٹھا تھا۔ مجھے عبدالقیوم سے مل کر مطلوبہ معلومات اسے دینی تھیں۔ اس لیے مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی میں باہر نکل آیا مگر پارکنگ تک جاتے ہوئے مجھے کہیں بھی عبدالقیوم نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ اگر وہ نہیں ملتا تو میں عبید صلاح تک مطلوبہ معلومات کیسے پہنچا سکتا تھا۔ پارکنگ میں پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد میں واپس اوپر آیا۔ چھٹے فلور پر عبدالقیوم جس فلیٹ میں تھا وہ میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی بیل بجائی اور دروازہ عبدالقیوم نے کھولا تھا مجھے دیکھ کر اس کا منہ بھی کھل گیا تھا۔

''پارکنگ...... ایمرجنسی۔'' میں نے بے حد دھیمی آواز میں کہا اور فوراً وہاں سے چل دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ عبدالقیوم ضرور آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ دس منٹ بعد پارکنگ کی طرف آتا نظر آیا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ''کیا بات ہے برادر میں بڑی مشکل سے آیا ہوں۔''

''ایمرجنسی میں عبید بن صلاح تک پیغام پہنچانا ہے۔'' میں نے کہا اور اسے پیغام دیا تو اس کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔ ''برادر یہ کیا ہے تم نے کام...... میں فوراً یہ پیغام پہنچاتا ہوں۔''

عبدالقیوم اپنی سائیکل پر بیٹھ کر رخصت ہو گیا اور میں اس طرف بڑھ گیا جہاں مجھے لے جانے والی گاڑی آتی تھی۔ گارڈ موجود تھا اور انتظار کرنے پر خاصا بے زار نظر آ رہا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے جیپ چلا دی تھی۔ جیوریل جمنازیم میں پہلے ہی موجود تھا اور اس کے سینے پر اس کا کارڈ آویزاں تھا۔ میں نے سلام دعا کے بعد کارڈ کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کب بنا؟''

''کل جب میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو کچھ دیر بعد ایک نیلی وردی والا شخص آ کر مجھے

ایک دفتر میں لے گیا اور وہاں یہ کارڈ بنا کر مجھے دے دیا۔''

''مبارک ہو اب تم آرگنائزیشن کے باقاعدہ ملازم ہو۔ اس کارڈ سے تمہیں بہت ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ یہ دکھا کر تم کھانا کھا سکتے ہو۔ شاپنگ کر سکتے ہو، کچھ بھی لے سکتے ہو جو اس کارڈ کی حد میں ہو۔''

''سچ برادر۔'' اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھے باضابطہ طور پر جمنازیم میں تمہارا نائب بنا دیا ہے۔''

''مزے کرو۔'' میں اس کے شانے پر ہاتھ مار کر آگے بڑھ گیا۔ اپنا کام کرتے ہوئے میرے ذہن میں بار بار عبید صلاح کا خیال آ رہا تھا۔ نہ جانے اس تک پیغام پہنچا ہو گا یا نہیں۔ ایک گھنٹے بعد میں نے دو مسلح گارڈز کی نگرانی میں احمد بربری کو جمنازیم میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور سوالیہ نظروں سے گارڈز کی طرف دیکھا۔ ''یہ قیدی ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''اسے ایکسرسائز کے لیے لائے ہیں، یہ اپنی موت کی سزا سے بچنے کے لیے لڑے گا۔''

''خوش آمدید احمد۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''تم مجھے جانتے ہو۔'' اس نے میرا ہاتھ نظر انداز کر کے کہا۔ تب اس کی نظر میرے کارڈ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ''برادر یوسف!'' اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آج میری سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی ہے۔''

''اس کی ہتھکڑی کھول دو۔'' میں نے گارڈز سے کہا۔ ایک نے چابی سے احمد کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑے قفل کھول دیئے تھے۔ ''اور اب تم لوگ باہر جاؤ۔ جب اسے جانا ہو گا تو تمہیں بتا دیا جائے گا۔''

وہ ہچکچائے اور پھر چلے گئے۔ میں احمد کو ایک طرف لایا۔ ''تم نے سزائے موت کے مقابلے میں فائٹ قبول کر لی ہے۔ کس سے مقابلہ ہے تمہارا؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے ہاتھ ہلائے۔ ''میں اتنے آرام سے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''ابھی تم ایکسرسائز کرو۔ کیا روز آنے کی اجازت ملی ہے۔''

''یہ سب مجھے نہیں پتا۔ یہ مجھے لے آئے ہیں۔ مجھ سے پوچھا یا بتایا نہیں ہے۔''

''او کے میں معلوم کر لوں گا۔'' میں نے کہا پھر اس کے لیے ایک شیڈول بنایا اور وہ اس کے مطابق ایکسرسائز کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد جیوریل اس طرف آیا تو میں نے اس سے احمد کا تعارف کرایا۔ دونوں گرم جوشی سے ملے تھے۔ جیوریل کو اس کی معاونت کے لیے چھوڑ کر میں دوسرے کام دیکھنے لگا۔ چمپئن شپ میں حصہ لینے کے لیے سو سے زیادہ فائٹرز آئے تھے۔ اس لیے جمنازیم میں گہما گہمی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ نظر آئے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہونے کے باوجود اندر کا ماحول بعض اوقات اتنی بری طرح مہکنے لگتا تھا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ لنچ کے وقت میں اور جیوریل




باہر نکلے، احمد کو گارڈز لے جا چکے تھے۔ جیوریل مجھے اس کے بارے میں بتانے لگا۔ احمد کا تعلق الجزائر کے مشہور بربر قبیلے سے تھا۔ اس نے بچپن سے ایک مذہبی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور جب الجزائر میں مذہبی جماعتوں پر پابندی کے بعد قتل و غارت گری کا طوفان سا کھڑا کر دیا گیا تھا تو احمد اور اس کے ساتھی زیرِ زمین چلے گئے اور رفتہ رفتہ سامراجیت کے خلاف تحریک، تاریخ کا حصہ بن گئے۔ الجزائر کی حکومت کو مغرب کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس لیے احمد اور اس کے ساتھیوں کی اصل لڑائی ان سے ہی تھی۔ اس کے بعد احمد نے کچھ ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ کئی مغربی ممالک کی نظروں میں نار بن کر کھٹکنے لگا تھا۔ اس کے پیچھے کئی مغربی ایجنسیاں پڑی تھیں اور بالآخر اسے گرفتار کر لیا۔ کسی عدالت میں پیش کرنے کے بجائے اسے اس جزیرے پر بھیج دیا تاکہ اسے من مانی سزا دے سکیں۔ مگر احمد اب تک ان کے عزائم ناکام بنائے ہوئے تھا۔ میں نے جیوریل کو اس کے ساتھ مقابلے کے بارے میں بتایا۔

''احمد ایک بار پہلے بھی مقابلہ کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ دھاندلی کی گئی تھی اس سے لڑنے والے امریکی ریسلر کو لوہے کی نوک دار سلاخ دی گئی تھی جس سے اس نے احمد کو زخمی بھی کر دیا اس کے باوجود اس نے ایول سے سلاخ چھین کر اسے مار دیا لیکن ان لوگوں نے مداخلت کر کے ایول کو بچا لیا۔

''ایول...... یہ نام جانا پہچانا لگ رہا ہے۔'' جیوریل بولا۔ ''کہیں یہ امریکہ کے مشہور ریسلر خاندان سے تو نہیں ہے۔''

''ہاں یہ اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ جو احمد کے ہاتھوں بچتے بچتے بچا تھا۔ وہ ایک بار پھر احمد کے مقابلے پر آ رہا ہے۔''

''ایول۔'' جیوریل چونکا۔

''ہاں...... اور وہ اسے فاتح بنانے کے لیے ہر بے ایمانی کر گزریں گے۔''

''کیا ہم انہیں نہیں روک سکتے؟'' جیوریل نے بے تابی سے پوچھا۔

''مشکل ہے برادر۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اس جزیرے پر ہم ان کے قبضے میں ہیں۔ اپنی مرضی سے کچھ کرنا آسان نہیں ہے۔ شاید احمد کو ایک بار پھر ایول سے لڑنا ہی پڑے گا۔''

چمپئن شپ تین دن بعد تھی۔ باہر سے مہمان آنے سے قصبے کی گہما گہمی اور رونقوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ آنے والوں میں دنیا بھر کے دولت مند ترین افراد تھے۔ ان میں چپٹے ناک والے مشرق بعید کے باشندے تھے۔ سانولے رنگ اور موزوں نقشے والے برصغیر کے لوگ، عرب، وسط ایشیا کے باشندے، افریقی اور سفید فام سب تھے۔ ان میں ہندو، مسلمان، بدھسٹ، عیسائی اور یہودی سب شامل تھے۔ یہ سب مختلف ہونے کے باوجود ایک تھے کیونکہ ان کی اساس مشترک تھی یعنی دولت، جزیرے پر ان کے لیے لگژری قسم کی سہولیات مہیا کی گئی تھیں۔ شراب، شباب، کباب

اور دوسری تفریحات اعلیٰ پیمانے پر تھیں۔ میلے کے نزدیک آتے ہی رنگ و نور و خوشبو کا ایک طوفان سا آ گیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے بھانت بھانت کی حسینائیں چلی آئی تھیں۔ چمپئن شپ میں عورتوں کے مقابلے بھی تھے لیکن ان کی رہائش اور جمنازیم کی سہولتیں الگ تھیں۔ مگر دلچسپی کی اصل چیز مردانہ چمپئن شپ تھی جس میں خون بہتا اور لوگ مرتے، زندہ بچنے والے فاتح ہوتے، لوگ ہزاروں لاکھوں خرچ کر کے ہی دیکھنے آ رہے تھے۔

مجھے لگ رہا تھا کہ عبید صلاح اور اس کے ساتھی میلے کی رونق سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ مگر وہ کیا کریں گے فی الحال میں اس سے بے خبر تھا۔ سی فورس دھماکہ خیز مادے کی اصل جگہ پتا چل جانے کے بعد کام ختم ہو گیا تھا۔ مگر میں جان گرے پر دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ احمد بربری کو بچانے کے لیے کچھ کرے اور وہ یہی کہتا رہا کہ وہ کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ شام کو عبدالقیوم مجھے پارکنگ میں انتظار کرتا نظر آیا۔ اس نے نزدیک آنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کی لمبی چوڑی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے کامیابی ہوئی ہے۔

جمنازیم میں کام کرنے کا مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ میں خود بھی موقع ملنے پر ایکسر سائز کرتا رہتا تھا اور ہر دن خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرتا تھا۔ خاص طور سے واپسی سے پہلے ایک گھنٹہ سوئمنگ کرتا تھا اس سے میرا اسٹیمنا پہلے سے بہت بہتر ہوا تھا۔ میرے احساسات کہہ رہے تھے کہ فیصلہ کن معرکہ قریب ہے۔ واقعات سمٹ کر ایک واضح صورت اختیار کر رہے تھے۔ دوسرے دن عبدالقیوم مجھ سے پارکنگ میں ملا تھا۔ ''بڑے کی طرف سے پیغام ہے...... آخری مشن ہمیں انجام دینا ہے۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''ہمیں ری ایکٹر کو سمندری پانی مہیا کرنے والی سرنگ کے اندر جا کر بم لگانے ہیں۔'' اس نے واضح الفاظ میں کہا۔

''لیکن وہ سرنگ کہاں ہے اور ہم یہ کام کیسے کریں گے۔'' میں نے خوف تو نہیں محسوس کیا تھا لیکن میرے دل کی دھڑکن ضرور تیز ہو گئی تھی۔

''اس کی تفصیل میں تمہیں کل بتاؤں گا لیکن یہ بتاؤ تم تیراکی جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح۔'' میں نے کہا۔ ''غوطہ بھی لگا سکتا ہوں۔''

''میں نے آکسیجن اور لباس کا بندوبست کر لیا ہے اور شاید یہ کام ہمیں رات کو کرنا پڑے مگر ابھی بپ نہیں ملا ہے۔ وہ پلان کے ساتھ ملے گا۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عبید صلاح اتنا اہم کام میرے ذمے لگا دے گا۔ یہ کام آسان نہیں تھا اس میں زندہ سلامت واپسی کا امکان بہت کم تھا لیکن عبید صلاح نے مجھ پر اعتماد کیا تھا اور میں خود بھی اس کام سے انکار کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ خاصے عرصے بعد مجھے کاجل کا خیال آنے لگا۔ وہ




شاید لندن جا چکی تھی اور وہاں میرا انتظار کر رہی تھی اور میں یہاں پر ایک ایسے مشن پر جانے والا تھا جس سے زندہ واپسی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ عبدالقیوم غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''برادر نے ایک بات اور کہی تھی اگر تم چاہو تو اس مشن پر جانے سے انکار کر سکتے ہو۔ برادر نے اس لیے تمہارا انتخاب کیا ہے کہ تم سے بہتر شخص اور کوئی نہیں ہے اس کام کے لیے۔''

''نہیں...... نہیں...... میں انکار کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ برادر کے حکم پر میں آگ کے دریا میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں۔''

''کیا میں اسے تمہاری رضامندی سے آگاہ کر دوں۔''

''ہاں...... اور ساتھ ہی یہ بھی کہنا کہ مجھے ری ایکٹر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات بھیجے۔''

''میں کہہ دوں گا۔ اس مشن پر میں تمہارا ساتھ دوں گا۔'' اس نے کہا۔

میں چونکا۔ ''تمہیں تیراکی اور غوطہ خوری آتی ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''برادر ہمارا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ وہاں بچہ بچہ تیراکی اور غوطہ خوری جانتا ہے۔''

''میں بھول گیا تھا۔'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''حالانکہ کبھی ہم بھائی ساتھ ہی رہتے تھے۔''

''ہمارے دل اب بھی ساتھ ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

عبدالقیوم پڑھا لکھا آدمی تھا اور وہ بھی تقدیر کے ستم کا شکار ہو کر یہاں آیا ہو گا۔ خوشی سے غلامی کون قبول کرتا ہے لیکن اس سے تفصیلی گفتگو ممکن نہیں تھی۔ اس سارے دن میں اس مشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اب تک جو کیا تھا وہ اپنی بقاء کے لیے کیا تھا۔ پہلی بار میں کوئی ایسا کام کرنے جا رہا تھا جس میں سوچ سمجھ کر اور بقائمی ہوش و حواس جان داؤ پر لگانا تھی۔ اگلے روز سے چمپئن شپ شروع ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ احمد کا ایول سے مقابلہ کب ہو گا۔ میں نے اس معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ جیوریل نے تاڑ لیا تھا کہ میں کسی اُلجھن میں ہوں اس نے کہا۔ ''برادر مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

اس وقت ہم لنچ کے لیے جا رہے تھے۔ اس قسم کی ساری باتیں راستے میں کرتے تھے۔ میں نے جواب دیا۔ ''مجھے احمد کی فکر ہے نہ جانے ایول اور اس کے ساتھی احمد کے خلاف کون سا حربہ استعمال کریں۔''

''برادر تم کہو تو میں ایول کو اس قابل ہی نہ رہنے دوں کہ وہ احمد سے مقابلہ کر سکے۔ میں کسی بہانے اس سے لڑ جاؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ اگر احمد کا مقابلہ ایول سے نہیں ہوا تو کسی اور سے ہو جائے گا۔ ممکن ہے الیکٹرک سے ہو جائے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ڈیوک اس کا بہت بڑا فین ہے اس کی شکست پر تلملا کر اس نے تم سے انتقام لینے کے لیے مجھ سے مقابلہ کرایا تھا۔ وہ تو خوش قسمتی سے مجھے پتا چل گیا کہ تم مسلمان ہو۔ ورنہ ہم میں سے ایک ضرور مارا جاتا۔ اگر مجھے بعد میں پتا چلتا تو شاید میں خود کو ختم کر لیتا۔''

میں اُلجھتا رہا۔ سوچتا رہا، لیکن احمد کو بچانے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شام کو میں آف ہو کر دھڑکتے دل کے ساتھ لاجز کی طرف روانہ ہوا تھا۔ گارڈ مجھے پارکنگ ایریا میں اُتار کر واپس چلا گیا۔ میں نے سائیکلوں والی جگہ پر دیکھا لیکن عبدالقیوم نظر نہیں آیا۔ مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی۔ شاید عبید نے آج پلان اسے نہیں دیا تھا مگر جب میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو وہ مجھے اوپر سے آتا نظر آیا میں فوراً پلٹ گیا۔ عبدالقیوم میرے پیچھے آنے لگا۔ میں سائیکلوں والی جگہ رُک گیا۔ عبدالقیوم بھی آ گیا اس کے گہرے سانولے چہرے پر جوش کی دبی دبی چمک تھی۔ ''برادر حکم مل گیا ہے ہمیں تین دن بعد رات کے وقت کارروائی کرنی ہے۔ مجھے تفصیلی پلان مل گیا ہے۔''

''ہم باہر کیسے نکلیں گے؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ یہ میرا کام ہے۔ تم نے رات بارہ بجے مجھے نیچے پارکنگ میں ملنا ہے۔''

''میں فلیٹ سے کیسے نکلوں گا۔ ہر فلور کا گارڈ ہوتا ہے۔ جان گرے اور انڈین ملازمہ سے کیسے نمٹوں گا؟''

عبدالقیوم نے ایک چھوٹی سی سپرے بوتل مجھے دی۔ ''یہ جان گرے اور ملازمہ کے لیے۔ ایک ایک سپرے ناک پر انہیں سلانے کے لیے کافی ہوگا۔ صبح سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔''

''اور گارڈز؟'' میں نے پوچھا۔

''ان سے بھی نمٹ لیں گے برادر...... بس ذہن میں یہ خیال رہے کہ ہمیں ہر قیمت پر یہ کام کرنا ہے۔ ممکن ہے ہماری واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔''

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ ''سامان کہاں ہے؟''

''وہ مجھے کل ملے گا۔ میں نے اسے چھپانے کے لیے جگہ بھی دیکھ لی ہے لیکن دھماکہ خیز مادہ اس میں نہیں ہوگا وہ ہمیں اس جگہ سے نکلنے کے بعد حاصل کرنا ہوگا۔''

ظاہر ہے لاجز میں کسی صورت دھماکہ خیز مادہ نہیں لایا جا سکتا تھا۔ یہاں جگہ جگہ ڈی ٹیکٹر لگے تھے۔ وہ مین گیٹ پر ہی پکڑ لیا جاتا۔ ''برادر کو پیغام دینا...... یوسف اپنی جان کی قیمت پر بھی یہ کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ کامیاب رہے گا ورنہ پھر مر جائے گا۔''

''ہمارے لیے بھی ابھی یا کبھی نہیں والی بات ہے۔ اگر ری ایکٹر تباہ نہ بھی ہوا تب بھی جزیرے پر بغاوت ہوگی اب اس کا انجام جو بھی ہو۔'' عبدالقیوم بولتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو خلافِ معمول جان گرے موجود تھا اور بڑے موڈ میں تھا۔ اس کا اندازہ مجھے انڈین ملازمہ کی تیاریوں سے ہو رہا تھا۔ ''آؤ یوسف...... تم نہیں پیتے اس لیے تمہاری





طرف سے بھی میں پی لیتا ہوں۔'' اس نے جام لہرایا۔

''کیا بات ہے بہت خوش نظر آ رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں موڈ میں ہوں۔ خیر یہ بتاؤ کل مقابلوں کے پہلے روز چلو گے؟''

''اگر اجازت مل گئی تو ضرور چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی فکر مت کرو۔ مقابلے رات آٹھ بجے شروع ہوں گے۔''

''احمد کے بارے میں پتا چلا اس کا اول سے کب مقابلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید پرسوں...... لیکن تم اس چکر میں نہ پڑو۔ احمد اس سے خود نبٹ لے گا۔ چیمپئن شپ ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی دھاندلی نہیں ہوگی۔''

میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''تم دھاندلی کا مطلب سمجھتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''احمد نے پچھلی بار بھی سب کے سامنے مقابلہ کیا تھا۔''

''مگر اب صورتِ حال دوسری ہے۔ آنے والوں میں عرب شیخوں کی تعداد زیادہ ہے۔ احمد کے ساتھ بے ایمانی کا مطلب ہوگا ہم مستقبل کے بہت سارے کسٹمرز کھو دیں گے۔''

''خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میلے میں شرکت کے لیے کتنے افراد باہر سے آ رہے ہیں۔''

''تقریباً دو ہزار مہمان ہیں اور ان کی تفریح کے لیے تین ہزار دوسرے افراد آ رہے ہیں ان میں بیشتر حسین عورتیں ہیں۔ میلے کے دنوں میں جزیرہ سچ مچ جنت کا ٹکڑا لگنے لگتا ہے۔'' جان گرے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''تم دیکھنا یوسف......''

''مجھے ان چیزوں میں اتنی دلچسپی نہیں ہے یہ بتاؤ کہ اتنے سارے لوگوں کے ساتھ جزیرے پر کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو لوگوں کو بچانے اور یہاں سے نکالنے کا کیا انتظام ہے۔''

جان گرے چونکا۔ ''یہ سوال کیوں آیا تمہارے ذہن میں؟'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''بس ایسے ہی آیا ہے۔ دنیا کے اتنے اہم لوگ آ رہے ہیں۔ ان کی سیکیورٹی اور کسی حادثاتی صورتِ حال میں حفاظت کا کچھ انتظام تو کیا ہوگا۔''

''ہاں ہوتا ہے لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔''

''اچھا یہ علم تو ہوگا کہ اگر کسی وجہ سے بیرونی مدد کی ضرورت پڑ جائے تو مدد کتنی دیر میں آ سکتی ہے۔''

''بیرونی مدد آنے میں کم سے کم پانچ چھ گھنٹے لگیں گے۔'' جان گرے نے غور کر کے کہا۔ ''خشکی کا کوئی دوسرا آباد ٹکڑا یہاں سے اتنے فاصلے پر ہے۔''

اس وقت ہم نشست گاہ میں تھے اس لیے میں نے جان گرے سے اس کی ٹریکنگ ڈیوائس کے بارے میں پوچھنے سے گریز کیا تھا کہ اس نے میجر ایڈم کی جیب سے وہ آلہ نکالا یا نہیں۔ عین ممکن

تھانہ نکالنے کی صورت میں میجرا سے پکڑ لیتا۔ اگر چہ اس کا شک جان گرے کی طرف نہیں جاتا لیکن وہ مشکوک ہو کر اپنا سیکیورٹی پلان بدل سکتا تھا یا سی فورس کی حفاظت کے انتظامات سخت کر دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سی فورس موجود مقام سے ہٹا دیتا۔ یہ بات معلوم کرنا ضروری تھا۔ میں نے ٹشو پیپر لے کر پین سے اس پر اپنا سوال لکھا اور جان گرے کے سامنے کر دیا اس نے سوال پڑھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اس کا مطلب تھا کہ جان گرے نے ایڈم کی جیب سے آلہ نکال لیا تھا۔

''تمہاری کنڈیشن کیسی ہے؟'' جان گرے نے سوال کیا۔

''ڈاکٹر نے ستر فیصد فٹ قرار دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کل پھر جانا ہے چیک اَپ کے لیے۔''

''فی الحال ڈاکٹر مقابلے کے لیے تمہیں اَن فٹ قرار دے رہے ہیں لیکن بڑوں کی خواہش ہے کہ جلد از جلد الیکٹرک سے تمہارا مقابلہ کرا دیا جائے۔''

''اگر بڑوں کی یہی خواہش ہے تو میں اس حال میں بھی الیکٹرک سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے نیاز مندی سے کہا۔ ''میرے لیے تم لوگوں کی خوشنودی اہم ہوگئی ہے۔''

''کاش کہ یہ بات تم پہلے سمجھ جاتے۔'' جان گرے نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن ہمارا سسٹم کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ جب تک ڈاکٹر تمہیں کلیئر قرار نہیں دیں گے الیکٹرک سے تمہارا مقابلہ نہیں ہوگا۔''

''یہ بھی تم لوگوں کی اعلیٰ ظرفی ہے۔'' میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ یہ دراصل میں احمد کے بارے میں بے احتیاطی سے کی جانے والی گفتگو کا ازالہ کر رہا تھا۔ جان گرے بتا چکا تھا کہ جزیرے پر کہیں بھی کی جانے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جاتا تھا اور ممکن تھا میرا گھومنے پھرنے والا اجازت نامہ منسوخ کر کے مجھے پھر سے پابند کر دیا جاتا۔ اس اثناء میں انڈین ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ جان گرے اس کے جانے کے بعد بولا۔ ''مجھے کبھی کبھی ساوتری یاد آتی ہے۔''

''مجھے بھی۔'' میرے اندر ٹیس سی اُٹھی تھی۔ ''اس معصوم سی لڑکی نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے جان دے دی تھی۔''

''مجھے بھی بعد میں اپنی سختی پر افسوس ہوا تھا۔'' جان گرے کھڑا ہو گیا۔

''لیکن اس پشیمانی کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' میں نے اس کی تقلید کی۔ ''کل میں جمنازیم سے سیدھا ایرینا کی طرف جاؤں گا۔ تم مجھے کہاں ملو گے؟''

''ایرینا میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں اندر کیسے جاؤں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنا کارڈ دکھا کر تم اندر جا سکتے ہو۔''

◆◆◆




مقابلوں کا پہلا دن تھا اس لیے فائٹرز ایکسر سائز میں جان مار رہے تھے۔ البتہ جن کے آج مقابلے تھے وہ آرام کر رہے تھے۔ جمنازیم میں جزیرے کے کیبل ٹی وی پر چمپئن شپ کی تفصیلات آ رہی تھیں۔ ڈراز اس طرح تھے کہ پچاس ٹاپ رینکنگ کے فائٹرز براہِ راست کوالیفائی کر گئے تھے۔ باقی چودہ افراد کا انتخاب ہونا تھا جو پھر ناک آؤٹ مرحلے تک جاتے۔ چمپئن شپ ایک ہفتہ جاری رہتی یعنی آج سے ساتویں دن فائنل تھا اور فائنل والے دن ہی نمائش اور خاص مقابلے تھے جیسے احمد اور ایول کا مقابلہ۔

جیوریل بہت پُر جوش ہو رہا تھا۔ ''برادر میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ اپنا عہد توڑ دوں۔ ویسے بھی اس میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہے۔''

''اگر تم سمجھتے ہو کہ مقابلوں میں حصہ لے سکتے ہو تو لو۔'' میں نے مشورہ دیا اور آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔

''نہیں برادر میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ لنچ کے لیے جاتے ہوئے میں نے غیر واضح انداز میں اسے بتایا کہ جزیرے پر چند دن میں بغاوت متوقع ہے اور جیوریل کو اس میں حصہ لینا تھا۔ ''ممکن ہے کوئی تم سے رابطہ کرے اور تمہیں اسلحہ دے۔''

''برادر لگتا ہے تم مجھے پوری بات نہیں بتا رہے ہو۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''یہ درست ہے لیکن خود مجھے بھی بہت ساری باتوں کا علم نہیں ہے۔ تم مجھ پر اعتماد رکھو۔ غیر ضروری تفصیلات میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بس تم اس پر نظر رکھو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس قسم کے کاموں میں ہر شخص کو اپنی ذمے داریوں تک محدود رہنا چاہیے۔''

''تم سے رابطہ کرنے والے اسلحہ دیں گے اور گائیڈ لائن بھی لیکن میرے خیال میں تمہیں قبل از وقت پلان میں شامل کرنا چاہیے۔ اس طرح تم بہتر طور پر کام کر سکو گے۔''

''میں اپنی جان لڑا دوں گا۔'' جیوریل نے وعدہ کرنے کے انداز میں کہا تھا۔

''بس تم ہوشیار رہنا اور جب ہنگامہ ہو تو اپنے ارد گرد موجود افراد کو بھی اُکسانا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہوں تاکہ انتظامیہ کو قابو پانے میں دشواری ہو۔''

''تم فکر نہ کرو برادر۔''

شام کو جمنازیم سے میں براہِ راست ایرینا والے حصے کی طرف گیا اوپر سے یہ سادہ سی نظر آنے والی عمارت زیرِ زمین نہ جانے کتنی منزلوں تک پھیلی تھی۔ اس میں کلب، لگژری قسم کی تعیش گاہیں اور ایرینا سب کچھ شامل تھا۔ اس کی تعمیر میں نہ جانے کتنے غلاموں کا خون پسینہ شامل ہوا تھا۔ جان گرے نے بتایا تھا کہ اس پورے جزیرے پر جتنی تعمیرات تھیں ان سب کی تعمیر میں مزدور کی حیثیت سے یہاں غلام بنا کر لائے جانے والے افراد کو استعمال کیا گیا تھا۔ ان میں سے جو افراد مر

جاتے تھے انہیں سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ویسے بھی جزیرے پر دفنانے کا رواج نہیں تھا۔ مرنے والے افراد کی آخری آرام گاہ جزیرے کے آس پاس کا سمندر ہی ہوتا تھا۔ چیمپئن شپ میں جو مارے جاتے ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا۔

اپنے کارڈ کی وجہ سے مجھے اندر جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جب میں پہلی بار جان گرے کے ہمراہ یہاں آیا تھا تو کچھ فلموں میں دکھائی جانے والی خفیہ جگہوں کا سا ماحول تھا لیکن اس وقت لوگ بے فکری سے آ جا رہے تھے اور کوئی خاص چیکنگ نہیں تھی۔ میں نے پہلے تیسرے فلور کے ریستوران پر جا کر کھانا کھایا اور اس کے بعد ایرینا پہنچ گیا جو سب سے نچلے فلور پر تھا۔ ایرینا میں توسیع کا کام کیا گیا تھا۔ اب یہ اچھا خاصا منی اسٹیڈیم بن گیا تھا۔ جس میں چار ہزار کے قریب افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایک طرف وی آئی پی باکسز تھے ان میں سے ایک باکس میں مَیں نے جان گرے کے ہمراہ احمد کوایول کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ لڑتے دیکھا تھا۔ میں اوپر سے گھوم کر باکسز کی طرف جانے لگا۔ اس کے داخلی راستے پر ایک گارڈ نے مجھے روک دیا۔

''یہ مخصوص ایریا ہے یہاں داخل نہیں ہو سکتے۔''

''مجھے جان گرے نے اپنے باکس میں بلایا ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''اسے میرے بارے میں مطلع کر دو۔''

''سوری یہ میرا کام نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''اگر کوئی کسی کو اندر بلانا چاہتا ہے تو وہ پہلے سیکیورٹی کو مطلع کرتا ہے تمہارے بارے میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں ملی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں پلٹ آیا۔ یں مقابلہ دیکھنے آیا تھا۔ وہ کہیں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ باکسز بہت مخصوص افراد کے لیے تھے۔ ان سے کم تر درجے کے افراد کے لیے خاص نشستیں تھیں اور عام افراد کے لیے عام نشستیں تھیں۔ میں ایک عام سی نشست پر بیٹھ گیا۔ بیشتر نشستیں پُر ہو چکی تھیں لیکن تماشائی ابھی آ رہے تھے۔ ان میں خاصی تعداد عورتوں کی بھی تھی۔ جو اپنے اپنے مردوں کے ساتھ تھیں۔ ان کے ناز و انداز اور لباس بتا رہے تھے کہ وہ خاص طور سے دل بہلانے کے لیے لائی گئی تھیں۔

اس اثناء میں ایرینا میں دو فائٹر داخل ہوئے۔ ریفری نے مقابلے کی شرائط کا اعلان کیا اور وہ ایک دوسرے کے مقابل آ گئے تھے۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی تماشائی ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایرینا شور سے گونجنے لگا۔ شور میں خواتین کی سریلی چیخیں نمایاں تھیں۔ مقابلہ مختصر ثابت ہوا۔ چینی لڑکے نے اس یورپی پہلوان کو آسانی سے ہرا دیا تھا۔ کیونکہ یہ ناک آؤٹ مرحلہ نہیں تھا اس لیے حریف پر محض اپنی برتری ثابت کرنا تھی اسے کسی قسم کا ارادی نقصان پہنچانا منع تھا۔ ہاں لڑائی میں کوئی چوٹ لگ جائے تو اس پر اعتراض نہیں تھا۔

کیونکہ خون ریزی نہیں ہو رہی تھی اس لیے جلد تماشائیوں کا جوش و خروش سرد پڑنے لگا۔ اکثر





باکسز والے وی آئی پی آئے ہی نہیں تھے۔ میں بھی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے میرا ذہن عبدالقیوم میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے آج موقع ملے۔ سب میلے میں نکلے ہوں گے۔ میں عبدالقیوم سے مل سکتا تھا۔ اس سے مشن پر بات کر سکتا تھا میں اُٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا میرے عقب میں بیٹھے شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور ذرا آگے کی طرف جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''عبید صلاح۔''

میں سن سا ہو گیا تھا پھر میں نے بتدریج سر گھما کر دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ عبید بن صلاح ہی تھا اس نے ایک عرب شیخ کا روپ دھار رکھا تھا۔ خدوخال بھی عربی تھے۔ اس لیے وہ آسانی سے اس حلیے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے کلین شیو چہرے پر نفاست سے بنی عربی طرز کی فرنچ داڑھی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا اور یہاں بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے اوپر تک آنے کے بعد عبید بن صلاح بھی اپنی نشست سے اُٹھ کر اوپر آنے لگا۔ میں لفٹس اور سیڑھیوں کی طرف جانے والی گیلری میں سُست روی سے جا رہا تھا کہ عبید بن صلاح میرے برابر میں آ گیا۔ مگر اس انداز سے جیسے مجھ سے الگ ہو۔ ہم ایک ساتھ اور لاتعلق سے انداز میں لفٹ میں داخل ہوئے تھے۔ اتفاق سے ہمارے سوا کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔ اس لیے عبید بن صلاح نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے کہ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔ ذرا دیر میں لفٹ ٹاپ فلور پر رُکی اور ہم باہر نکل آئے۔ عبید بن صلاح میرے برابر سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''سپر سٹور کے سامنے والے اوپن ایئر ریستوران میں آ جاؤ۔''

عبید صلاح آگے نکلا تو میں نے فٹ پاتھ تبدیل کیا اور دوسرے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ ذرا دیر بعد میں ریستوران میں تھا۔ میری نظریں عبید صلاح کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اچانک ایک پستہ قد ایشیائی ویٹر میری طرف آیا اور اس طرح بولا جیسے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے آرڈر کا پوچھ رہا ہو۔ مگر اس نے کہا تھا۔ ''جناب ریستوران کے عقبی حصے میں چلے جائیں۔''

''نہیں شکریہ۔'' میں نے بلند آواز سے کہا اور گارڈن والے حصے کی طرف سے گھومتا ہوا ریستوران کی مختصر سی عمارت کے عقب میں جانے لگا۔ وہاں تاریکی تھی اور اچانک ہی ایک سائے نے میرا راستہ روک لیا۔ میں دفاعی پوزیشن میں چلا گیا تھا مگر عبید صلاح کی آواز سن کر میرا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ''یوسف یہ میں ہوں۔'' وہ میرے نزدیک آ گیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور اب اس کے چہرے پر فرنچ بھی نہیں تھی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ جگہ محفوظ ہے۔ ان لوگوں نے جگہ جگہ لوگوں کی باتیں سننے کے لیے مائیک لگا رکھے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''یہ حصہ ہم نے بالکل محفوظ بنا دیا ہے۔ یوسف مجھے تم سے

بہت اہم بات کرنی ہے۔عمل کا وقت آ گیا ہے۔ہمیں لازماً اس میلے کے دوران یہ جزیرہ تباہ کر کے یہاں سے نکل جانا ہے اگر بندرگاہ تباہ ہو جائے تو جزیرے کی افادیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اگر ان چٹانوں تلے موجود ری ایکٹر کو تباہ کر دیا جائے تو بندرگاہ بھی ختم ہو جائے گی۔یہ روسی ساختہ ری ایکٹر ہے۔اگر اسے دھماکے سے تباہ کیا جائے تو اسے چھوٹا سا ایٹمی دھماکہ سمجھ لو۔یہ پوری چٹان کو اُڑا کر رکھ دے گا۔"

"میں پہلے ہی اس مشن پر جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"عبدالقیوم نے بتایا تھا۔" وہ بولا۔"اب میں تمہیں اس ری ایکٹر کے بارے میں تفصیلی طور پر بتاؤں گا۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ اور ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔کاغذ پر ہاتھ سے بنا نقشہ تھا۔عبید صلاح نے ٹارچ سے اس پر روشنی ڈالی۔"یہ وہ چٹان ہے۔جس میں ایگزیکٹو لاجز ہیں۔اس کے نیچے ہاربر ہے اور یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ اس چٹان تلے ایٹمی بجلی گھر بھی ہے۔اس کو سمندری پانی مہیا کرنے والی سرنگ بندرگاہ کے عین نیچے ہے۔"

"کیا ان لوگوں نے ری ایکٹر کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا ہے؟"

"کیا ہے لیکن بہت معمولی......دراصل ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس جزیرے پر کوئی اس حد تک ان کے خلاف جا سکتا ہے کہ ری ایکٹر کو تباہ کرے،سرنگ کے دہانے پر جالی دار ڈھکن ہے مگر اسے کھولا جا سکتا ہے۔اس کے بعد اوپر تک کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔مگر خیال رہے سرنگ سے پانی سکشن پمپ سے کھینچا جاتا ہے۔اگر تم نے خود کو نہ سنبھالا تو پمپوں کے پنکھوں سے جا ٹکراؤ گے۔"

عبید بن صلاح نقشے پر واضح کرنے لگا کہ مجھے اور عبدالقیوم کو بم کہاں لگانے ہیں۔یہ جگہ بہت خطرناک تھی کیونکہ ری ایکٹر سے چند میٹر کے فاصلے پر تھی۔بموں کا وقت چوبیس گھنٹے بعد کا رات بارہ بجے مقرر کیا گیا تھا۔میں نے اتنی تاخیر کی وجہ پوچھی۔اس نے بتایا۔"کیونکہ یہ کام ہونے کے بعد ہی ہم مسلح بغاوت کر سکیں گے۔بجلی فیل ہوتے ہی تمام حفاظتی نظام ختم ہو جائے گا اور تاریکی میں ہمارے لیے اپنے ہدف پر حملہ کرنا آسان ہو گا۔سب سے بڑھ کر ری ایکٹر اور بندرگاہ کی تباہی ان لوگوں کے حوصلے پست کر دے گی۔"

"تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں برادر؟" میں نے پوچھا۔

"چالیس ہیں لیکن بغاوت ہوتے ہی دوسرے بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔جزیرے پر پانچ سو کے قریب محافظ ہیں۔جن میں سے نصف بندرگاہ،لاجز اور ری ایکٹرز کے پاس ہوتے ہیں۔باقی ڈھائی سو سے ہم یہاں نبٹ لیں گے۔" عبید بن صلاح کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا جیسے وہ دو ڈھائی سو محافظوں کی نہیں بلکہ ڈھائی سو بھیڑوں کی بات کر رہا تھا۔





"برادر،ری ایکٹر میں بم نصب کرنے کے بعد اگر میں اور عبدالقیوم بچ نکلے تو ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

"عبدالقیوم تو غائب ہو جائے گا اور اگر تم اپنے لیے خطرہ محسوس کرو تو تم بھی اس کے ساتھ چلے آنا ورنہ کوشش کرنا کہ اپنی جگہ پر رہو۔تمہارے غائب ہونے سے ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے۔اگر یہ وقت سے پہلے ہوشیار ہو گئے تو ہمیں مشکل ہو گی۔"

"میں سمجھ گیا برادر۔"

اس نے مجھے گلے لگا لیا۔"یوسف!تم جو کرو گے اس کا اجر تمہیں صرف اللہ دے گا۔یہ بُرائی کا مرکز ختم ہو گیا تو کتنے انسان سکھ کا سانس لیں گے۔یہ بات مجھ سے بہتر تم جانتے ہو۔"

"یہ کام کرنا میرے لیے سعادت ہے۔" میں نے کہا۔"برادر اب تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔اگر میں اس مشن میں کام آ گیا تو تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"ضرور برادر......اگر میں خود بھی زندہ رہا۔"

"لندن میں ایک وکیل ہے پاکستانی مسلمان ہے۔شاہد کریم میرے دوستوں میں سے ہے۔اس کے پاس ایک لڑکی ہو گی کاجل،اسے پیغام دینا کہ اب میں اس دنیا میں نہیں رہا اور وہ میرا انتظار نہ کرے۔"

عبید بن صلاح کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔"میں یہ پیغام دوں گا لیکن خدا نہ کرے اس کی ضرورت پڑے۔" ہم دونوں چشم نم کے ساتھ جدا ہوئے۔میں واپس ایرینا کی طرف آیا۔بارہ بجنے والے تھے یعنی مقابلوں کا وقت ختم ہو رہا تھا۔مجھے جان گرے کا انتظار تھا۔بارہ بجے کے قریب وہ ایرینا والی لفٹ سے نکلتا آیا۔ایک نوعمر سی یوروشین لڑکی نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔واضح طور پر جان گرے ضرورت سے زیادہ ہی پی گیا تھا۔میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔"جیپ کہاں ہے تمہاری؟"

"پارکنگ میں۔" اس نے مخمور لہجے میں کہا اور لڑکی کی طرف دیکھا۔"یہ لیزا ہے۔"

"ہائے۔" لڑکی مسکرائی۔وہ بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔"ہینڈسم مین۔"

"اے......تم میرے دوست کو بہکانے کی کوشش مت کرو۔" جان گرے غرایا۔"یہ پارسا شخص ہے۔"

لڑکی زور سے ہنسی تھی۔"اس جگہ میں نے اس نام کی کوئی شے نہیں دیکھی۔"

"میرا خیال ہے مجھ پر بحث گھر چل کر بھی کی جا سکتی ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

جان گرے پارکنگ میں اپنی جیپ بھول گیا تھا بڑی مشکل سے اسے تلاش کیا۔جان گرے عقبی نشست پر ڈھیر ہو گیا اور فوراً ہی خراٹے لینے لگا تھا۔لڑکی میرے برابر آ بیٹھی تھی۔اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔"یو آر لکنگ گڈ۔"

"میں بس دیکھنے کی چیز ہوں۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "تمہارے مزید کسی کام نہیں آسکوں گا۔"

"فکر نہ کرو میں تمہیں کام کا آدمی بنا دوں گی۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "سگریٹ ہے تمہارے پاس۔"

"سوری۔" میں نے معذرت کی۔

"جیپ روکنا میں مسٹر گرے کی جیب سے نکال لوں۔" وہ بولی۔ میں نے جیپ روک دی۔ لڑکی نے پیچھے جاکر جان گرے کی جیب سے سگریٹ نکالی اور اسے سلگا کر واپس آئی۔ "میں کہہ رہی تھی میں تمہیں کام کا آدمی بنا دوں گی۔ اس کام کا مجھے بچپن سے تجربہ ہے۔ میں ایسے ایسے برہم چاروں کو......"

"پلیز۔" میں نے اس کی گفتگو کو ناقابلِ بیان حدود میں جانے سے روکا۔ "اگر تم اپنا منہ بند رکھو تو مجھے ڈرائیونگ میں آسانی رہے گی۔"

"مجھے گرمی لگ رہی ہے۔" وہ بولی اور نصف رہ جانے والی سگریٹ سڑک پر اُچھال کر اس نے بلاؤز نما مختصری شے اُتار دی تھی۔ یہ اتنی مختصر شے تھی کہ اس کے نیچے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں تھی اور کوئی چیز تھی بھی نہیں۔ اس نے مجھے کام کا آدمی بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ ابھی وہ ہاتھ اُٹھا کر ایک قیامت خیز انگڑائی لے کر چمکتی چاندنی میں اپنے چاندنی جیسے وجود کو نمایاں کر رہی تھی کہ میں نے جیپ روک کر اسے باہر دھکیل دیا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر جا گری تھی اور اس سے پہلے کہ اُٹھتی میں جیپ آگے بڑھا چکا تھا۔ عقب میں اسے اُٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ اس کی گالیاں یہاں تک آ رہی تھیں۔ کوئی سوگز دور جا کر میں نے جیپ روک دی۔ یہ دیکھ کر وہ پوری رفتار سے لپکی تھی۔ جیسے ہی وہ دس گیارہ گز کے فاصلے پر رہ گئی میں نے جیپ دوبارہ آگے بڑھادی اور پھر سوگز کے بعد لے جا کر روک دی۔ اس بار وہ ناقابلِ اشاعت الفاظ کہتی جیپ تک آئی تھی۔ لہٰذا میں نے پھر جیپ آگے بڑھادی۔ اس بار وہ چپ چاپ سُست قدموں سے اور ڈرتے ڈرتے جیپ تک آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ایک بار پھر جیپ بھگا لے جاؤں گا مگر میں نے اسے آکر جیپ میں بیٹھنے کا موقع دیا اور وہ بیٹھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

"امید ہے اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں سخت ناقابلِ اصلاح قسم کا شخص ہوں۔"

وہ روتی رہی اور دبی زبان میں نسبتاً بے ضرر گالیاں دیتی رہی اچانک عقب سے جان گرے کی آواز آئی۔ "اگر اس کتیا نے بھونکنا اور رونا بند نہ کیا تو اسے چلتی جیپ سے دھکا دے دینا۔"

وہ فوراً خاموش ہوگئی تھی۔ "تم ہوش میں ہو؟"

"تم نے کبھی مجھے مدہوش دیکھا ہے۔ وہ تو تھکن کی وجہ سے نیند آ گئی تھی۔ ابھی جا کر اس سے بھی ملاقات کرنی ہے۔" جان گرے کا اشارہ لڑکی کی طرف تھا۔ میں نے لیزا سے پوچھا۔ "تم کہاں




سے آئی ہو؟"

"ویت نام سے۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "یوروشین ہوں۔ میری ماں فرانسیسی فوجیوں کے جبر کا نشانہ بنی تھی۔ میں اس جبر کی یادگار ہوں۔"

"تمہاری ماں تو جبر کا شکار ہوئی تھی تم کس خوشی میں اس پیشے میں آئی ہو۔"

"پیشہ ور ماں کی بیٹی بھی پیشہ ور ہی نکلتی ہے۔" اس نے تلخی سے کہا تو میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"تو یہ کہو نا کہ فرانسیسی فوجیوں نے بلا معاوضہ استعمال کیا تھا۔"

اس نے غضب ناک نظر مجھ پر ڈالی اور چپ ہوگئی۔ البتہ جان گرے نے قہقہہ مارا تھا۔ لیزا نے زیرِلب اسے گالی دی جو صرف مجھے سنائی دی تھی۔ لاجز میں داخل ہو کر ہم نے اپارٹمنٹ کا رُخ کیا میری توقع کے عین مطابق وہاں ویرانی تھی اس دور دراز جزیرے پر پھیکی زندگی گزارنے والوں کے لیے یہ میلہ غنیمت تھا اور وہ سب تفریحات میں مگن تھے حتیٰ کہ مجھے محافظ بھی کم نظر آئے تھے۔ دو فلور کے نگران سرے سے غائب تھے اور یہ میرے لیے خاصی تسلی بخش صورتِ حال تھی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ انڈین ملازمہ نے کھولا تھا اور جان گرے کے ساتھ اس جامے سے باہر لڑکی کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر اردو میں لیزا اور جان گرے کو ناقابلِ بیان جملوں سے نوازا تھا۔ ظاہر ہے اسے نہیں معلوم تھا کہ جان گرے بھی اردو جانتا ہے اور جب اس نے اردو میں ہی کہا۔ "اس وقت میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا۔ تم سے صبح نمٹوں گا۔"

یہ سن کر انڈین ملازمہ کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ وہ گھگھیائے ہوئے جان گرے کے قدموں میں گر گئی تھی اور وہ اسے ٹھوکر مارتا اندر چلا گیا۔ میں نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے ساوتری یاد تھی جسے محض اتنی سی بات کی سزا ملی تھی کہ اس نے آقا کے مہمان (زبردستی) کے ساتھ کھانا کھالیا تھا۔ اس کی مجھے عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ بہرحال میں اس کے لیے کیا کرسکتا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر اردو میں ہی کہا۔

"مجھ سے سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جان گرے اپنی سی کرنے والا آدمی ہے اور میں اس کا قیدی ہوں۔"

"صاحب ایک بار معافی دلوا دو۔ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔"

"معافی بھی اس سے مانگنا ممکن ہے صبح تک وہ سب بھول چکا ہو۔"

"صاحب بہت جالم ہے۔ پیار میں بھی ایسی ایسی تکلیف دیتا ہے تو غصے میں تو مار ہی ڈالے گا۔"

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اچانک اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے کھینچ کر بالکونی میں لے آیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح میری گرفت میں ساکت تھی۔ بالکونی

میں آتے ہی اس نے مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے کسی اور نیت سے لایا تھا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور سرگوشی میں کہا۔ ''ہوش میں رہو۔ میں تمہیں اس لیے یہاں نہیں لایا ہوں اور آہستہ سے بولنا۔''

''پھر کس لیے لائے ہو صاحب۔'' وہ خوفزدہ سی سرگوشی میں بولی۔ ''ہم تمہاری ہر کھدمت کریں گے۔''

''مجھے تمہارے وجود کی ضرورت نہیں ہے البتہ میں ایک شرط پر تمہاری جان بچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔''

''سچ صاحب...... ہمیں ہر شرط بھی منجور ہے۔''

''میں جو کہوں وہ کسی کے علم میں لائے بغیر کرنا ہوگا۔''

''میں کروں گی صاحب! اپنی کھال اُتار کر آپ کے پیروں میں ڈال دوں گی۔''

''مجھے تمہاری کھال کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اب آ کر میرے کمرے میں سو جاؤ۔''

''صاحب میں تمہاری ہر کھدمت کروں گی۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''مجھے تمہاری خدمت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ میں تمہارے تحفظ کے لیے کر رہا ہوں۔ اگر جان گرے کا دماغ رات کو خراب ہوا تو وہ سوتے میں تمہارا گلا دبا دے گا۔''

وہ ''کھدمت'' کا خیال بھول کر ایک بار پھر سہم گئی تھی۔ ''صاحب وہ ایسا ہی جالم ہے۔''

''ایک بات اور یاد رکھنا سوائے اس بالکونی کے کہیں مجھ سے یہ ساری باتیں مت کرنا جو بھی کی ہیں۔ ہماری باتیں اور جگہوں پر سنی جاتی ہیں۔''

''میں کھیال رکھوں گی صاحب۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے تعجب سے دیکھا۔ ''تم میرا نام نہیں جانتے صاحب...... سمترا نام ہے ہمارا۔''

سمترا کا تعلق شاید شمالی انڈیا سے تھا۔ پُرکشش گندمی رنگت تھی، بڑی بڑی آنکھوں اور متناسب جسم کے ساتھ وہ دلکش لڑکی تھی اور اسے گھریلو کاموں کے ساتھ مردوں کا دل بہلانے کی تربیت دی گئی تھی۔ جان گرے کو انڈین عورتیں پسند تھیں اس نے پہلے ساوتری کو رکھا تھا اور اس یہاں آتے ہی سمترا کو رکھ لیا تھا۔ وہ بھی جان گرے کے ساتھ خوش تھی۔ شاید وہ اس سے اچھی طرح پیش آتا تھا۔ مگر اب اس کی جان پر بنی تھی۔ صبح کے خیال سے اس پر لرزہ طاری تھا کمرے میں آنے کے بعد اس نے ایک دو بار کوشش کی کہ میں اسے اپنی ''کھدمت'' کا موقع دوں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کے بچنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ جب میں نے اسے کمرے سے نکالنے کی دھمکی دی تو وہ بادلِ نخواستہ جا کر قالین پر دراز ہو گئی تھی۔ غالباً جان گرے کے استقبال کے لیے اس نے ایک توبہ شکن قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ یہ لباس بدل لے لیکن اس نے




جان گرے کے خوف کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''ہم کو ڈر ہے...... صاحب وہاں آ کر گلا دبا دے گا ہمارا۔''

مجبوراً مجھے اجازت دینی پڑی کہ وہ اس حلیے میں سو جائے۔ صبح میں جاگا تو وہ بدستور سو رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی تھی۔ مارے خوف کے وہ رات کے بیشتر حصے میں جاگتی رہی تھی اس لیے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے سہمے انداز میں پوچھا۔ ''کیا صاحب آیا تھا؟''

''آنے والا ہو گا جا کر اس کے لیے ناشتہ بناؤ۔''

''وہ مجھے مار دے گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' آواز کے ساتھ وہ خود بھی لرزنے لگی تھی۔

''اس نے مارنے کا فیصلہ کر لیا تو میں یہاں بھی تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔ بہتر ہے باہر نکل کر حالات کا مقابلہ کرو کوشش کرو کہ جان گرے کا غصہ کم ہو جائے۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں۔''

بہ مشکل وہ کمرے سے نکلنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ جان گرے اپنی نئی محبوبہ کے ساتھ سو رہا تھا۔ میں ایکسرسائز کرنے بالکونی میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد جان گرے بھی گاؤن کی ڈوریاں کستا وہاں آیا۔

''وہ حرافہ کہاں ہے۔ رات میں نے اسے دیکھا تھا اپنے کمرے میں نہیں تھی۔''

''میرا اندازہ درست تھا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''میں نے اس وجہ سے اسے اپنے کمرے میں پناہ دی تھی کہ تم رات کو طیش میں آ کر اسے مار نہ دو۔''

جان گرے مسکرایا۔ ''اتنی مشکل سے تو ایک اچھی چیز ہاتھ لگی ہے میں اسے اتنی سی بات پر کیوں مارنے لگا۔ رات تو میں اسے بیڈروم میں لے جانے کے لیے تلاش کر رہا تھا کہ مزہ دوبالا کر سکوں۔'' اس نے آنکھ ماری۔ ''یہ لڑکی تو فرانسیسی عورتوں کی طرح رونے دھونے والی نکلی تھی۔'' اس کے بعد جان گرے خاصی تفصیل سے بتانے لگا تھا کہ انڈین عورتوں میں کتنی قوتِ برداشت ہوتی ہے۔ میں نے اسے ٹوک دیا۔

''خدا کے لیے ہمارے ہاں پہلے ہی اس موضوع پر خاصا مواد موجود ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم اسے سزا نہیں دو گے۔''

''سزا تو میں اسے دوں گا۔'' جان گرے پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''ویسے تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں...... میں بھلا کیا چاہنے لگا۔ تمہاری مرضی ہے۔'' اسے معافی پر آمادہ پا کر میں نے دامن بچا لیا۔

جان گرے مسکرایا۔ ''ویسے میں نے تمہیں اسے دبوچ کر بالکونی کی طرف لے جاتے دیکھا تھا اور رات بھی وہ تمہارے کمرے میں رہی تھی۔ اگر تمہیں زیادہ......''

''میں نے بتایا نا کہ صرف اس وجہ سے اسے اپنے کمرے میں برداشت کیا تھا اسے تمہاری طرف سے خطرہ تھا۔''

جان گرے شرارت سے ہنسا۔ ''اچھا ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔''

میں بھنا گیا تھا۔ ''سنو تم میرے والد صاحب نہیں ہو خدانخواستہ۔ جو میں تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کروں اور نہ تم میرے نگراں ہو۔''

''او کے...... او کے غصہ مت کرو۔ میں نے کب تم پر شک کیا ہے۔ میرے فرشتے۔'' اس نے طنز کیا۔ ''وہ کتیا کیا کر رہی ہے، اب تک تمہارے کمرے میں پڑی ہے۔''

''ناشتہ بنا رہی ہے اور شاید ڈر کے مارے مری جا رہی ہے۔''

''میں اسے معاف کر دوں گا لیکن اسے ذرا کر...... زبان دراز عورتیں مجھے اچھی نہیں لگتی ہیں۔''

''زبان دراز عورتیں کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تقدیر انہیں منہ میں زبان دے کر پیدا کرتی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔

سمترا نے ناشتہ بنایا۔ اس کی حالت صبح کی نسبت بہتر تھی۔ جیسے اس نے خود کو حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میں نے آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ جان گرے البتہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ناشتے کے بعد وہ تیار ہونے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی سمترا لپک کر آئی۔ ''موڈ کیسا ہے صاحب کا؟''

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دیکھو...... لیکن امید بھی رکھو۔ ہو سکتا ہے اس کے دل میں رحم آ جائے۔''

اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ ''نہیں صاحب مجھے بدترین سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ صاحب لوگ کہاں کسی کو معاف کرتے ہیں۔''

میں نے آواز نکالے بغیر اسے بتانے کی کوشش کی کہ صاحب نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بات سمجھ گئی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ کر تیار ہوا۔ جان گرے مجھ سے پہلے روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپارٹمنٹ سے نکلا۔ حسبِ معمول عبدالقیوم راستے میں مل گیا۔ اس نے پارکنگ میں آ کر مجھے بتایا۔

''آج سامان مل جائے گا۔ میں اسے گھر کے سودے میں چھپا کر لے آؤں گا۔'' اس کا اشارہ بموں کی طرف تھا۔

''مجھے کل بڑا بھائی ملا تھا۔ اس نے مجھے تفصیل سے سمجھا دیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ عبدالقیوم یہ بتاؤ کہ غوطہ خوری کا سامان کہاں سے لاؤ گے۔''

''وہ لانے کی کیا ضرورت ہے میرا صاحب تیراکی کا شوقین ہے اس کے پاس سب ہے کئی آکسیجن سیلنڈر اور سوٹ ہیں پر ایک مسئلہ ہے اپنے فلور کے محافظ کے علم میں لائے بغیر میں اسے مطلوبہ جگہ کیسے پہنچاؤں۔''




''صرف چھٹے فلور کے گارڈ کو ہٹانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟''

''ہاں...... کیونکہ مجھے چٹان کے اوپری راستے سے جانا ہے اس راستے پر واحد محافظ ہوتا ہے ممکن ہے مجھے اس کو ہلاک کرنا پڑے۔''

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس محافظ کو کتنی دیر کے لیے ہٹانا پڑے گا۔''

''صرف چند منٹ کے لیے کیونکہ میں اسے سامان نہیں دکھانا چاہتا ورنہ اس کے سامنے بے شمار بار اوپر جا چکا ہوں، بہانہ یہی ہوتا ہے کہ نیند نہیں آ رہی ہے اس لیے کھلی فضا میں ٹہلنے جا رہا ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو میں محافظ کو وہاں سے ہٹانے کا بندوبست کر دوں گا لیکن اس نے واپسی میں تمہیں دیکھ لیا تو شک نہیں کرے گا۔''

''نہیں...... کیونکہ آتے وقت میں خالی ہاتھ ہوں گا۔ بلکہ وہ میری رپورٹ ہی نہیں کرے گا کیونکہ میرے جاتے وقت وہ مجھے چیک نہیں کرے گا۔''

''اسے کتنے بجے ہٹانا ہو گا۔'' میں نے پوچھا۔

''بارہ بجے۔ میں اس وقت نکل کر اسے چیک کروں گا۔ اگر وہ موجود نہ ہوا تو سامان لے جاؤں گا۔''

''بس وہ بارہ بجے اپنی جگہ پر نہیں ہو گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور کوئی بات کہنی ہے۔''

''نہیں۔'' عبدالقیوم اپنی سائیکل پر بیٹھ کر رخصت ہو گیا اور میں واپس اپارٹمنٹ میں لوٹ آیا۔ بیل بجانے پر سمترا نے دروازہ کھولا اور میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھتا اندر گھس گیا۔ اسے بالکونی تک لایا۔

''وقت کم ہے۔ مجھے واپس جانا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے جھوٹ بول کر تمہاری جان بچالی ہے کہ رات تم نشے میں تھیں اب وعدے کے مطابق تمہیں میرا کام کرنا ہے۔''

''صاحب تم حکم کرو۔ میں ہر کام کے لیے تیار ہوں۔'' اس کے لہجے کی شوخی بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح کے کام کے لیے تیار ہے۔ بہرحال میں نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''آج رات تم میرے کمرے میں رہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''میں جان گرے کو بھی کہہ دوں گا۔''

وہ کھل گئی تھی۔ ''جیسا حکم صاحب۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے بول رہی ہو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔

"اور یہ بات پہلے سے بولنے کی ضرورت نہیں ہے جب میں واپس آ کر تمہیں اپنے کمرے میں لے جانے کی بات کروں تو بالکل انجان بن کر آنا۔"

"آپ فکر نہ کریں صاحب! میری اداکاری دیکھنا۔" وہ لہک کر بولی۔

مجھے خدشہ تھا وہ اپنی کسی حماقت سے جان گرے کو شک میں مبتلا نہ کر دے مگر فی الحال میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نیچے آیا تو مجھے لے جانے والا نگران بے زار بیٹھا تھا۔

"میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"تو لاٹ صاحب نہ کرتے۔" میں نے غرا کر کہا۔ "کیا میں نے تمہیں اس کام کے لیے کہا۔"

"اب چلو مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔" وہ خون کے گھونٹ پی کر بولا۔

"تم نے کہیں نہیں جانا مجھے پتا چلا ہے تم سارا دن میرے پے رول ہوتے ہو اور تم مجھے چھوڑ کر سارا دن کے لیے غائب ہو جاتے ہو میں تمہاری شکایت کروں گا۔"

"سوری جناب میں اب ہر وقت ڈیوٹی پر رہا کروں گا۔" اس نے خون کے مزید گھونٹ پی کر کہا۔

دوپہر کے وقت جب میں اور جیوریل لنچ کے لیے نکلے تو وہ وہیں تھا۔ میں نے کمال فراخدلی سے اسے چھٹی دے دی۔ "جاؤ لنچ کر کے آجاؤ۔"

میں جیوریل سے بات کرنے کا موقع کیسے گنوا سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بغاوت کرنے والوں تک اس کا نام پہنچا دیا تھا اور جس روز مسلح کارروائی ہو گی اسے بھی اسلحہ دیا جائے گا۔ اس دوران وہ اپنے اردگرد موجود افراد کو احتیاط سے جانچے کہ ضرورت پڑنے پر ان میں سے کون کون بغاوت میں حصہ لے گا۔ جیوریل نے کہا۔ "تم ان کی فکر مت کرو برادر...... ان میں ہر ایک حصہ لے گا جو پیچھے ہٹا اسے میں خود گولی مار دوں گا۔"

"یہی رویہ مناسب رہے گا۔ ورنہ عین ممکن ہے یہی لوگ ہمیں مروادیں۔ عملی طور پر حصہ لینے والے بے شک کم ہوں مگر بغاوت کا تاثر اتنا بھرپور ہونا چاہیے کہ جزیرے کے گارڈز بوکھلا کر ہتھیار ڈال دیں۔"

میں سارا دن بے چینی سے واپسی کے وقت کا انتظار کرتا رہا تھا۔ جان گرے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ گھر جانے کی زحمت نہیں کرے گا۔ دفتر سے کلب چلا جائے گا اور مقابلے دیکھ کر واپس آئے گا۔ لیزا اس کے ساتھ چلی گئی تھی ممکن تھا آج اسے کوئی نئی حسینہ مل جاتی کیونکہ لیزا نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ ایک خطرہ تھا کہ اسے کوئی لڑکی نہ ملتی تو وہ جلدی گھر آ جاتا سمترا کے چکر میں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ سمترا آج رات اس کے پاس رہے۔ چھ بجتے ہی میں جمنازیم سے نکل گیا تھا۔ ڈرائیور نما نگران نے مجھے لاجز کی پارکنگ میں چھوڑا۔ میں اوپر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ عبدالقیوم بم کس طرح اندر لائے گا۔ جبکہ داخلی دروازے پر بم کا سراغ لگانے والا آلہ لگا تھا یقیناً اس




کے دماغ میں اس کا کوئی نہ کوئی حل ہو گا۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو سمترا بن سنور کر میرے استقبال کے لیے تیار تھی۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں پھولوں کی لڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میں نے شکر ادا کیا کہ جان گرے مجھ سے پہلے نہیں آ گیا ورنہ وہ کلب اور ایرینا کے مقابلے وغیرہ سب بھول جاتا۔ "یہ اتنی تیاری کس خوشی میں؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ پاس آ کر شوخی سے بولی۔ اس نے کوئی اچھا سا پرفیوم بھی لگا رکھا تھا۔

"اوکے...... میرے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔" میں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا تو وہ بجھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کروں گا۔ وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ میں نہایا دھویا کپڑے بدلے اور باہر آیا تو اس نے چائے معہ لوازمات کے تیار کر رکھی تھی۔

"بالکونی میں لے آؤ۔" میں اسے ہدایت دے کر بالکونی میں چلا آیا۔ مغربی چٹانوں کے پار کھلے سمندر میں سورج کا شفق رنگ گولا ڈوب رہا تھا۔ سمترا میرے لیے چائے لے آئی۔

"میں نے آپ کے لیے پکوڑے اور چٹنی بنائی ہے۔" اس نے پلیٹ آگے کی۔

"یہ کیا ہے نا تم نے کام۔" میں نے خوش ہو کر پلیٹ لے لی۔

"صاحب کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگی۔"

"کیوں نہیں...... تم اچھی ہو۔" میں نے پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔ کتنے عرصے بعد اپنے علاقے کی کوئی چیز کھانے کو ملی تھی ورنہ پھیکے میٹھے کھانے کھا کر زبان اپنے کھانوں کا ذائقہ بھولتی جا رہی تھی۔ پکوڑے تھے بھی مزے کے۔ میں نے تعریف کی تو وہ کھل گئی۔ پھر ذرا ناز سے کہا۔

"صاحب ابھی کیسی لگ رہی ہوں؟"

"اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے بے دھیانی سے کہا تو وہ تپ کر چلی گئی کچھ دیر بعد برتن اٹھانے آئی تو میں نے کہا۔ "سنو یہ لباس بدل لو اور ذرا بے حال سا حلیہ بنا لو۔ ایسا نہ ہو کہ جان گرے آ جائے اور تم پر فریفتہ ہو جائے میں منہ دیکھتا رہ جاؤں۔"

"اچھا۔" وہ پھر سے کھل گئی تھی۔ "اس لیے میرا بننا سنورنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"میں چاہتا ہوں آج رات تم میرے پاس رہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تھا تو وہ شرما کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ احمق عورت نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی۔ بہر حال جو بھی سمجھ رہی تھی مجھے کیا، خیریت گزری کہ جان گرے نہیں آیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے سمترا سے کہا۔ "کاموں سے نبٹ کر میرے کمرے میں آجاؤ۔"

لیکن کمرے کے بجائے میں بالکونی کی طرف چلا گیا۔ سمترا کو جو سمجھانا تھا وہ کمرے میں ممکن نہیں تھا وہ کچھ دیر بعد آئی۔ "صاحب کمرے میں نہیں چلنا؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔

"سمترا میری بات غور سے سنو۔ مجھے تم سے جو کام ہے وہ کمرے کا نہیں ہے بلکہ باہر کا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں صاحب؟" اس نے اُلجھ کر کہا۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشیوں سے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ ڈر گئی۔ "لیکن کیوں صاحب آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"سمترا! میں نے جان گُرے سے تمہیں بچایا ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے لیے اچھا کام کیا ہے تو میرے کام آؤ اور اگر تم نہیں کرنا چاہتیں تو انکار کر دو۔ مگر کوئی سوال مت کرو۔"

"صاحب وہ مان جائے گا۔"

"سمترا تمہارے حُسن میں وہ قوت ہے کہ کوئی بھی کھنچا چلا آئے گا۔"

"تم پر تو اثر نہیں ہوا صاحب۔" وہ اُداس ہو گئی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے سمترا...... اچھی چیز تو سب کو اچھی لگتی ہے اگر میں کہوں کہ تمہارے حُسن نے مجھے متاثر نہیں کیا ہے تو یہ جھوٹ ہوگا مگر بات اتنی سی ہے کہ میں جسم کا پجاری نہیں ہوں۔ اگر مجھے پھول اچھا لگے گا تو میں اسے ٹہنی سے نوچنے کے بجائے اسے دیکھ کر اور اس کی خوشبو محسوس کر کے خوش ہوں گا۔"

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ "صاحب اگر دنیا کے آدھے انسان بھی ایسی سوچ رکھ لیں تو کوئی سمترا اس گندگی میں نہ پڑے اپنے اپنے گھر میں خوش رہے۔"

"تم شادی شدہ ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میرے دو بچے بھی تھے جب مجھے اغوا کیا گیا۔ اغوا کرنے والے میرے شوہر کے دوست تھے۔ پہلے انہوں نے پیسہ دکھا کر مجھے رام کرنے کی کوشش کی پھر جب میں نے انکار کیا تو مجھے اُٹھا لیا۔ ایک مہینہ اپنے پاس رکھا جب ان دو راکھشسوں کا دل بھر گیا تو مجھے پیشہ کرنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ مختلف لوگوں کے پاس سے ہوتی ہوئی یہاں آئی۔ پہلے ایک صاحب کے پاس تھی لیکن اس کا دل بھر گیا تو مجھے واپس کر دیا۔ اس کے بعد یہ صاحب لے آیا۔"

میں اسے کیا کہتا۔ میں یہی تسلی دے سکتا تھا کہ ظلم کے یہ دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ خدا نے چاہا جلد بُرائی کا یہ اڈہ نیست و نابود ہو جائے گا مگر میں اسے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر اس سے بات آگے نکل جاتی تو سب کچھ تباہ ہو جاتا میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے سمترا۔"

اس نے آنسو صاف کیے۔ "صاحب میں آپ کے لیے یہ کام کروں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"سمترا تمہاری اس قربانی کی قدر میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اب جا کر کوئی نائٹی ٹائپ کا لباس پہن کر آ جاؤ۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف گئی تھی۔ اس وقت دس بج رہے تھے اور دو گھنٹے باقی تھے۔ میں جان گُرے کے بارے میں فکرمند تھا کہ وہ وقت سے پہلے آئے یا بارہ بجے کے بعد آئے۔ عین وقت پر آ





گیا تو مسئلہ ہوگا۔ وہ شک کر سکتا تھا۔ سمترا لباس بدل کر آ گئی تھی اس نے ایسی نائٹی پہنی تھی جس میں اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔ "سمترا کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ اپنے گھر والے یا بچوں کے پاس واپس جاؤ۔"

"کیوں نہیں چاہتا۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "ایک سال سے جیادہ ہو گیا ہے۔ ان کی صورتوں کو دیکھے۔"

میں نے کمرے میں رکھا سی ڈی پلیئر آن کر دیا تھا تا کہ اس کی چیختی چنگھاڑتی موسیقی میں ہماری آواز باہر نہ جائے۔ ساڑھے گیارہ بجے میں نے سمترا کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے اس نے شراب کا ڈبل پیگ لیا تھا تا کہ نشے کی بہتر اداکاری کر سکے ہم فلور گارڈز کی نظروں سے بچتے بچاتے چھٹے فلور تک پہنچے۔ آج بھی لاجز میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ بیشتر مکین اور گارڈز میلے کی رونقوں اور مقابلوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ چھٹے فلور کا گارڈ البتہ ڈیوٹی پر تھا۔ میں گیلری کے کونے پر رُک گیا اور سمترا لڑکھڑاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ وہ لباس سے بے حال اور نشے میں دھت خوب صورت عورت کو دیکھ کر پریشان بھی ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ہوس بھرے تاثرات بھی نمودار ہوئے تھے۔ سمترا کو اسے آمادہ کرنے میں مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے اور وہ اسے لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے عبدالقیوم کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا تھا۔ دستک کے جواب میں وہی آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے حرکت میں آیا۔ دو بڑے بیگز میں سامان اس نے تیار رکھا تھا۔ ایک بیگ مجھے دیا اور دوسرا خود لے لیا۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر چٹان کے اوپری حصے تک جا پہنچے تھے۔ یہ جگہ سطحِ سمندر سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ اونچی تھی۔

"اس طرف۔" عبدالقیوم نے نشیب کی طرف جاتے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

چٹان کی اُترائی مشکل اور خطرناک تھی۔ پاؤں کی ذرا سی لغزش ہمیں براہِ راست نیچے پہنچا سکتی تھی۔ ہانپتے ہوئے نیچے پہنچے۔ چٹان ایک بار پھر پانی تک آ گئی تھی۔ اصل میں اس کے دو طرف پانی تھا۔ سامنے والے حصے میں بندرگاہ تھی اور اس طرف ساحل تھا۔ عبدالقیوم نے دونوں بیگ چٹانوں کے درمیان میں چھپا دیئے۔ میں نے اس جگہ کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ "عبدالقیوم اس طرف سے بندرگاہ کی جانب کیسے جائیں گے۔"

"راستہ ہے برادر۔" اس نے جواب دیا۔ "اب واپس چلو۔ پہلے تم جانا، میں بعد میں آؤں گا۔ ویسے تم نے گارڈ کو کس طرح ہٹایا۔"

"میں ساری عمر اس بات پر شرمندہ رہوں گا۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔ اسے سمترا کے بارے میں بتایا۔

عبدالقیوم متاثر ہوا تھا۔ "اس لڑکی کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔"

''ان شاء اللہ!'' میں نے چٹان پر چڑھتے ہوئے کہا اور اوپر آتے ہی میں نے سیڑھیوں کا رُخ کیا تھا۔ گارڈ ابھی تک غائب تھا۔ وہ سمترا کو نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے واپس اپارٹمنٹ کی طرف آ گیا تھا۔ جیسے ہی میں اندر آیا مجھے احساس ہوا کہ جان گرے آ گیا ہے اس کے کمرے میں روشنی تھی۔ میرے کمرے کا سی ڈی پلیئر بدستور چل رہا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہم دروازہ کھلا ہی چھوڑ گئے تھے اور جان گرے نے بھی اسے اندر سے بند نہیں کیا تھا تو کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ ہم اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ میں دبے قدموں اپنے کمرے میں آ گیا۔ سی ڈی پلیئر بند کیا۔ اب مجھے سمترا کا انتظار تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں آ جائے گی۔ کیونکہ گارڈ زیادہ دیر اپنی ڈیوٹی سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر ایک بج گیا اور وہ نہیں آئی۔ میں فکر کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ جان گرے آج بھی کسی عورت کے ساتھ آیا تھا کیونکہ اندر سے ایک دو بار کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آئی تھی۔

دو بج گئے اور پھر تین بج گئے جب میں سمترا کی تلاش میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلتے ہی گرنے کے انداز میں اندر آئی تھی۔ اس کا حلیہ اور جسم کے نشان بتا رہے تھے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر اندر لایا۔ فریج سے اورنج جوس لا کر اسے دیا۔ اسے پی کر اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ ''سمترا اتنی دیر کیوں لگائی۔'' میں نے پوچھا اور اس کی شکوہ کناں نظروں سے میں شرمندہ ہو گیا تھا۔

''وہ تین حرام زادے تھے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے جانے نہیں دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے آئی ہوں۔''

''سمترا تم آرام کرو۔'' میں نے زبردستی اسے اپنے بستر پر لٹا دیا اور خود ایک طرف قالین پر دراز ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ پوچھ کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہی تھی۔ صبح جان گرے کا رویہ نارمل تھا۔ اس نے نہیں پوچھا کہ رات میں اور سمترا کہاں گئے تھے۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا اگر وہ پوچھتا بھی تو میں یہی بتاتا کہ ہم اوپر ٹہلنے لگے تھے۔ اس روز وہ جلدی چلا گیا تھا۔







میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر میجر ایڈم جان گرے کے ساتھ آ گیا۔ جان گرے نے آتے ہی سمترا کو ڈنر تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ڈنر کی تیاری کا مطلب تھا کہ ایڈم دیر تک یہاں رُکے گا اور اس کی موجودگی میں میرا نکلنا مشکل تھا جبکہ مجھے بہرصورت بارہ بجے تک اس جگہ پہنچ جانا تھا جہاں عبدالقیوم نے غوطہ خوری کا سامان چھپایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''اور یوسف کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں جناب۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''جان...... آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔'' اس نے جان گرے کو بتایا۔ ''مجھے سن گن ملی ہے۔ جزیرے میں بعض لوگ ہمارے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ وہ مسلح بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں۔''

یہ سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ ایڈم نے یہ بات کہتے ہوئے بہ غور میری طرف دیکھا تھا۔ مگر میں نے چہرے کے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جان گرے چونکا۔ ''ایسا کون کر سکتا ہے اس جزیرے پر ہمارے سوا اور کون سی طاقت ہے۔''

''طاقت ہے...... اس وقت غلام بنا کر لائے جانے والے افراد کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے اور انتظامیہ کے پاس صرف پانچ سو گارڈز ہیں۔ کسی ہنگامے کی صورت میں بڑے پیمانے پر خون وکشت کیے بغیر ہم ان پر قابو نہیں پا سکتے۔''

''ان لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ہمارے خلاف بغاوت کر سکیں۔'' جان گرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ دبے اور کچلے لوگ ہیں بھلا ان کی کیا مجال...... کہ سر بھی اُٹھا سکیں۔''

''بغاوت ہمیشہ چھوٹے لوگ کرتے ہیں۔'' ایڈم نے اپنے لیے جام بنایا تھا۔ ''کیوں یوسف؟''

''بجا ارشاد فرمایا کیونکہ بڑے لوگ جبر کرتے ہیں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ویسے میں مسٹر جان گرے سے اتفاق کروں گا۔ اس جزیرے پر تم لوگوں کے خلاف بغاوت ممکن نہیں ہے۔''

"اس کا امکان ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے میلے کے بعد جزیرے کی آبادی کے بارے میں تفصیلی چھان بین کی جائے گی اور جس کے بارے میں شبہ ہوا اسے جزیرے سے نکال دیں گے۔"

"جناب مجھے اجازت دیں۔" میں نے ان دونوں سے کہا۔ "میں آرام کروں گا۔ آج کل کام زیادہ ہورہا ہے۔"

"آج مقابلے دیکھنے نہیں جاؤ گے۔" جان گرے بولا۔ "آج سے ناک آؤٹ مقابلے شروع ہوگئے ہیں۔"

"مجھے ان مقابلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"سنا ہے الیکٹرک تمہیں چیلنج کرنے والا ہے۔" ایڈم بولا۔ "تم اس سے لڑو گے؟"

"اگر مجھے مجبور کیا گیا تو ضرور لڑوں گا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں محض تفریح کے نام پر کسی سے لڑنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں الیکٹرک کو پہلے بھی شکست دے چکا ہوں جناب۔"

"وہ پرانی بات تھی۔" ایڈم لاپروائی سے بولا۔ "الیکٹرک اپنی ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے مقابلہ جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ بہرحال تم کل ایرینا ضرور آنا۔ وہاں تمہیں ایک دلچسپ مقابلہ دیکھنے کو ملے گا۔"

"کس کا مقابلہ؟"

"احمد بربری کا مقابلہ ایول سے۔" ایڈم نے جواب دیا۔

"میں آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جان گرے اور ایڈم اندرونی نشست گاہ میں تھے۔ نو بجے کھانا لگ گیا تھا۔ میں نے سمترا سے کہہ کر اپنے لیے کھانا کمرے میں منگوالیا۔ میں نے ہاتھ روک کر کھایا تھا کچھ دیر بعد مجھے ایک اہم اور پُرمشقت مشن پر جانا تھا بھرے پیٹ کے ساتھ مسئلہ ہوسکتا تھا۔ کھانا کھا کر میں لیٹ گیا اور ذہن میں عبید بن صلاح کی بتائی ہوئی تفصیلات کو تازہ کرنے لگا۔ گیارہ بجے میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ جان گرے اور ایڈم ناؤنوش کی محفل سجائے بیٹھے تھے۔ میں نے اشارے سے سمترا کو سمجھایا کہ میں باہر جارہا ہوں۔ میری واپسی کا انتظار کرے اور وہ لوگ میرے بارے میں پوچھیں تو انہیں یہی بتایا جائے کہ میں سو رہا ہوں۔" سمترا نے سرہلا کر رضامندی ظاہر کی اور میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

ٹہلنے کے انداز میں مَیں چھٹے فلور کے گارڈز کے پاس سے گزر گیا۔ چٹان کا اوپری حصہ خالی تھا۔ شاید عبدالقیوم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہم میں طے ہوا تھا کہ جو بھی پہلے آئے وہ چٹانوں کے پاس رُک کر دوسرے کا انتظار کرے۔ میں احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ آج رات کا مشن بہت اہم تھا اور میں ذرا سی غفلت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں نیچے پہنچا تو عبدالقیوم کو پہلے ہی وہاں موجود پایا۔ وہ گرم جوشی سے میرے گلے لگا تھا۔ "برادر کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟"





"مشکل بیٹھی ہے۔ میجر ایڈم جزیرے کا سیکیورٹی چیف جان گرے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میں چپکے سے نکل آیا ہوں۔ جو بھی ہوگا واپسی میں دیکھا جائے گا۔"

عبدالقیوم فکرمند ہوگیا تھا۔ "اسے شک نہ ہوجائے اگر......"

"فکر نہ کرو۔ میں زبان کھولنے والا نہیں ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اگر اسے شک ہوا تو وہ ری ایکٹر کو چیک کرا سکتا ہے۔"

"اپنا کام کرو یار...... باقی سب اوپر والے پر چھوڑ دو۔"

عبدالقیوم نے چٹانوں کے درمیان میں چھپائے گئے بیگ نکالے۔ اس میں سے ڈائیونگ سوٹ، پیروں میں پہننے والے فلیپرز اور آکسیجن سلنڈر نکالے۔ "ایک سلنڈر میں ایک گھنٹہ دس منٹ کی آکسیجن ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہمیں اس سے پہلے واپس آنا ہوگا۔"

میں نے کپڑے اُتار کر ڈائیونگ سوٹ پہنا۔ پیروں میں فلیپرز پہنے پھر ہم نے ایک دوسرے کو آکسیجن سلنڈر باندھے۔ سامان میں زیرِآب کام کرنے والی ٹارچیں اور گھڑیاں تھیں۔ تاکہ ہمیں وقت کا اندازہ رہے۔ ٹارچیں ہم نے کمر کے ساتھ ڈوری سے باندھ لی تھیں۔ "بم کہاں ہیں؟"

"وہ ادھر نہیں ہیں۔" عبدالقیوم بولا۔ "بم ہمیں بندرگاہ کے پاس سے ملیں گے۔"

"بندرگاہ کی طرف جانا خطرناک ہوسکتا ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ بم جہاں ہیں وہاں سے لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

اپنے کپڑے بیگوں میں ڈال کر انہیں دوبارہ چھپا دیا تھا۔ جانے سے پہلے عبدالقیوم نے میری طرف دیکھا۔ "برادر اس مشن کی اہمیت جانتے ہو، اسے جان کی قیمت پر پورا کرنا ہے۔"

"عبدالقیوم جب ایسا وقت آئے گا تو تم مجھے خود سے پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

ہم نے اپنے ماؤتھ والے حصے لگائے اور پانی میں اُتر گئے۔ احتیاطاً ابھی سلنڈر کو بند رکھا تھا۔ عبدالقیوم آگے تیر رہا تھا۔ آج چاند تھا لیکن ساتھ میں بادل بھی تھے۔ اس لیے کبھی روشنی ہوجاتی تھی اور کبھی تاریکی چھا جاتی تھی۔ عبدالقیوم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ راستہ اس کے لیے جانا پہچانا ہے۔ ذرا دیر بعد ہم چٹان کے پاس تھے اور بہ ظاہر اس سے دوسری طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ عبدالقیوم نے گیس کھولنے کا اشارہ کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ زیرِآب آتے ہی اس نے ٹارچ روشن کرلی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ روشنی میں دیوار دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ ایک سوراخ میں گھستا چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے رہا۔ یہ تین چار فٹ قطر کی سرنگ تھی جو پانی کے نیچے ہی نیچے چلی جارہی تھی۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم چٹان کے دوسری طرف بندرگاہ والے حصے میں تھے۔ آکسیجن بند کرکے ہم سطح پر آگئے۔ رات کے اس پہر بندرگاہ کی معمولی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔

"برادر تم رُکو۔ میں آتا ہوں۔" عبدالقیوم نے کہا اور تاریکی میں ایک طرف تیر گیا اس نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ یہاں پر روشنی کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں دیوار سے ذرا نیچے رُک کر

عبدالقیوم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ یقیناً بم لینے گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے شانے پر ایک بیگ تھا اور خاصا وزنی لگ رہا تھا۔ میں نے عبدالقیوم سے بیگ لے لیا۔ اس کی کمر سے ایک تھیلا اور لٹک رہا تھا۔ ہم نے سٹاپ واچ چلائی اور پانی میں غوطہ لگایا۔ دس بارہ فٹ کی گہرائی میں جا کر ٹارچیں روشن کیں۔ اب مجھے بندرگاہ کے نیچے وہ سرنگ تلاش کرنا تھی جس کے ذریعے پانی ایٹمی بجلی گھر کو فراہم کیا جاتا تھا۔ ہماری ٹارچیں دائیں بائیں لہرا رہی تھیں۔ چٹان کے نیچے پانی کی گہرائی تیس چالیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ نچلی سطح بھی پتھریلی تھی اس کے علاوہ وہاں خاصا ملبہ پڑا تھا۔ جو اوپر سے پھینکا جاتا رہتا تھا۔ چٹان کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہم سرنگ تلاش کر رہے تھے۔ اچانک عبدالقیوم نے اشارہ کیا اور ایک دم ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا تو جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایک سفید اور سرمئی دھاریوں والی شارک ہماری طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا، جان گرے نے بتایا تھا کہ بندرگاہ اور جزیرے کے آس پاس کے سمندروں میں باقاعدہ شارک چھوڑی گئی ہیں جنہیں انسانی گوشت کا عادی بھی بنایا گیا تھا۔ جزیرے سے سمندر میں جو لاشیں پھینکی جاتی تھیں۔ وہ شارکوں کی شکم سیری کے کام آتی تھیں۔ ری ایکٹر تک رسائی کا منصوبہ بناتے وقت یہ خیال نہ تو عبید صلاح کو آیا تھا اور نہ ہی مجھے یہ بات یاد آئی۔

شارک خاصی طویل تھی۔ وہ سُست خرامی سے تیرتی ہماری طرف آ رہی تھی اس کے انداز میں جارحیت نہیں تھی مگر اسے جارحانہ ہونے میں زیادہ دیر بھی نہ لگتی۔ شارک قریب آئی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی سرد ٹھہری ہوئی نظریں ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہم آہستگی سے دیوار کی طرف ہٹ رہے تھے۔ اچانک عبدالقیوم نے روشنی براہِ راست شارک کی آنکھوں میں ڈالی اور وہ ساکت ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیگ سے ایک ٹارچ نما آلہ نکالا اور شارک کے نزدیک جانے لگا روشنی نے شارک کو کنفیوز کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک جا کر عبدالقیوم نے آلہ شارک کے سر پر رکھا اور اس کا بٹن دبایا۔ نیلی بجلی چمکی۔ ربر سوٹ میں ہونے کے باوجود مجھے جھٹکا لگا تھا۔ عبدالقیوم کو نزدیک ہونے کی وجہ سے خطرناک جھٹکا لگا تھا۔ وہ بے جان سا ہو کر گرنے لگا، میں نے لپک کر پہلے بجلی کا جھٹکا مارنے والا آلہ پکڑا اور پھر عبدالقیوم کو سنبھالا۔ شارک کا کام ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے گلپھڑے ہلنا بند ہو گئے تھے اور وہ بھی بے جان سی نیچے جا رہی تھی۔ میں نے عبدالقیوم کے آکسیجن سلنڈر سے سپلائی تیز کی تو اسے ہوش آ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ پیر چلائے اور نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی میں اس کی پروا کرنے کے بجائے اصل کام کی طرف توجہ دوں۔

سرنگ کا دہانہ نیچے ہونا چاہیے تھا۔ میں اور عبدالقیوم ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی میں دیوار کو دیکھنے لگے۔ مجھے دہانہ نظر آ گیا۔ میں نے ٹارچ سے عبدالقیوم کو اشارہ کیا۔ ہم تیرتے ہوئے لوہے کی سلاخوں کے جنگلے کے پاس پہنچے۔ اسے سرنگ کے دہانے پر فکس کر دیا گیا تھا مگر جنگلہ اس طرح کا تھا کہ دو سلاخیں کاٹنے سے وہ کھل جاتا۔ عبدالقیوم نے اس بار اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا گیس کٹر





نکالا۔ اس میں آئر ٹلین گیس بھری ہوئی تھی۔ اس نے بٹن دبایا تو نلکی سے شعلہ نکلنے لگا اس کا رنگ تیز سفید تھا۔ میں روشنی دکھانے لگا اور عبدالقیوم سلاخ کو شعلے سے کاٹنے لگا۔ پانچ منٹ میں دونوں سلاخیں کٹ گئی تھیں اور جنگلہ دہانے سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سرنگ میں پانی کھینچ رہا ہے۔ میں نے اشارے سے عبدالقیوم کو ایگزاسٹ فین کے بارے میں بتا کر ہوشیار رہنے کا کہا۔ اس نے سر ہلایا۔ بم ہمیں اندر جا کر ری ایکٹر کے پاس نصب کرنا تھے۔

میرے پاس جو بیگ تھا اس کا وزن کم سے کم بھی پندرہ کلوگرام تھا۔ یعنی اس میں دس کلوگرام سے زیادہ ہی دھماکہ خیز مادہ موجود تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میجر ایڈم کو ابھی تک دھماکہ خیز مادے کی چوری کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مادہ چوری کرنے والوں نے اتنی مہارت سے کام کیا تھا کہ ایڈم اس چوری کا پتا ہی نہیں چلا سکا تھا۔ میں آگے تھا۔ سرنگ میں داخل ہوتے ہی جسم ازخود آگے کی طرف جانے لگا تھا۔ میں فوراً واپس آ گیا میں نے اشارے سے عبدالقیوم سے کہا کہ اس طرح جانا ممکن نہیں ہے اس نے سر ہلا کر اپنے بیگ سے رسّی کا پھانکا اور اس کا ایک سرا اُتارے جانے والے جنگلے سے باندھ دیا۔ اب کہ وہ آگے تھا اور میں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ رسّی کی وجہ سے اس بات کا امکان نہیں رہا تھا کہ ہم بے قابو ہو کر ایگزاسٹ کے پنکھوں میں جا گھسیں۔ عبدالقیوم رسّی کو چھوڑتا جا رہا تھا اور میں عقب میں رسّی پکڑ کر پھسل رہا تھا۔ پانی کا ریلا ہمیں بھی اپنے ساتھ کھینچے لیے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے آگے جا رہے تھے کھینچنے کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ یہ تین فٹ قطر کی سرنگ تھی اس میں ہاتھ پاؤں مارنے کی گنجائش کم تھی۔ اگر پانی نہ کھینچ رہا ہوتا تو ہمارے لیے تیرنا آسان نہ ہوتا۔ ہم دونوں نے ٹارچیں روشن کر رکھی تھیں۔ ایک ہاتھ سے رسّی تھام رکھی تھی۔ اچانک میری نظر کلائی کی گھڑی پر پڑی۔ ہمیں زیرِ آب آئے چالیس منٹ ہو چکے تھے اور اب صرف تیس منٹ کی آکسیجن باقی تھی۔ ہمیں اس دوران میں کام کر کے نکل جانا تھا۔ چند منٹ کی تاخیر ہمیں ہر ضرورت سے بے نیاز کر دیتی۔

ایگزاسٹ فین نزدیک آ گیا تھا۔ پانی کا دباؤ اتنا تھا کہ ہمیں خود کو روکنے کے لیے رسّی مضبوطی سے پکڑنا پڑ رہی تھی۔ میرے ذہن میں سرنگ کا نقشہ تھا۔ ایگزاسٹ فین کے پنکھے کے دائیں بائیں سرنگ دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ یہ سرنگیں ایٹمی ری ایکٹر کو اس طرح گھیرے ہوئے تھیں کہ پانی ان کے درجہ حرارت کو قابو میں رکھتا تھا۔ ان سرنگوں سے پانی پائپوں کی مدد سے ری ایکٹر کی اضافی حرارت جذب کرتا گزر جاتا تھا۔ ہمیں اصل میں ان ہی سرنگوں میں بم نصب کرنا تھے۔ ایگزاسٹ سامنے آ گیا تھا۔ چھ فٹ قطر کے پنکھے کے آہنی بلیڈ تیزی سے گھومتے ہوئے پانی آگے پھینک رہے تھے۔ اگر ہم نے رسّی نہ تھام رکھی ہوتی تو یہ بلیڈ ہمیں کھینچ کر ٹکڑے کر چکے ہوتے اب بھی پانی کے دباؤ سے ہم حقیر تنکے کی طرح اس کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔ عبدالقیوم نے دائیں سرنگ کی طرف اشارہ کیا۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایگزاسٹ کے سامنے سے کیوں کر گزرا جائے۔ میں نے معائنہ کیا اور بموں والا تھیلا کسی طرح اُتار کر عبدالقیوم کے حوالے کیا۔ اس نے اسے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ میں اس سے آگے نکلا اور اس کو چھوڑتا ایگزاسٹ کی طرف جانے لگا۔ میں بے حد احتیاط کر رہا تھا میرے پاؤں پنکھوں کی طرف تھے اور رسّی پر ذرا سی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میرے پاؤں ان بے رحم پنکھوں میں چلے جاتے۔ پنکھے باہر آنے والی سرنگ سے ذرا ہٹ کر تھے۔ میں رفتہ رفتہ اتنا نزدیک ہو گیا تھا کہ دیوار کے کنارے پر پاؤں رکھ سکوں۔ اس کام کے لیے مجھے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ مگر میں کامیاب رہا تھا۔ پھر دیوار میں دائیں سرنگ میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں دباؤ سے محفوظ تھا مگر مجھے پانی میں تپش محسوس ہوئی۔ ری ایکٹر یہاں سے چند میٹرز کے فاصلے پر تھا اور اس کی تپش قدرتی طور پر کام کر رہی تھی۔

میں نے عبدالقیوم کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہ رسّی کے سہارے سرنگ میں داخل ہو گیا۔ میں نے اس سے بموں والا بیگ لیا اس میں چھوٹے سائز میں پلاسٹک کورز میں بند بم تھے۔ ان پر وقت مقرر تھا۔ بٹن دباتے ہی ان کا ٹائم چل پڑتا اور چوبیس گھنٹے بعد بم بلاسٹ ہو جاتا۔ عبدالقیوم نے ڈبے کے ایک طرف لگا جالی نما ٹکڑا نکال کر بم ایک دیوار سے چپکا کر اس کا بٹن دبا دیا۔ یکے بعد دیگرے ہم نے پانچ بم اس طرح اس سرنگ میں لگائے یہاں پانی بہت گرم تھا۔ چہرے اور ہاتھوں کے کھلے حصوں پر یہ اتنا لگ رہا تھا کہ جلنے جیسی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اب ہمیں ایک بار پھر ری ایکٹر کے پنکھے کے سامنے سے گزرنا تھا اس مہم کا سب سے مشکل مرحلہ یہی تھا۔ درحقیقت مجھے شارک کے سامنے بھی وہ خوف محسوس نہیں ہوا تھا جو پنکھے کے سامنے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔ ہم دیوار پر قدم رکھتے ہوئے دوسری طرف جانے لگے۔ پنکھے کے اوپر نیچے دو دو فٹ دیوار بچی تھی اس سے گزر کر دوسری طرف جایا جا سکتا تھا لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ایگزاسٹ فین سے ٹکرا جاتا تو ہمارا مشن یہیں فیل ہو جاتا۔ کیونکہ اس کی لاش کے ٹکڑے اوپر برآمد ہوتے اور سب کو فوراً اس بات کی فکر لگ جاتی کہ کوئی سرنگ تک پہنچا کیسے ممکن ہے فین بند کر کے سرنگ کی تلاشی لی جاتی تو بم برآمد ہوتے جن کے پھٹنے میں ابھی چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ رسّی کو مضبوطی سے تھامے خود کو بچاتے ہوئے ہم سرنگ کے سامنے سے گزر گئے جس سے پانی کا ریلا نکل کر پنکھوں کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

جب دوسری سرنگ میں بھی بم لگا کر فارغ ہوئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی دس منٹ باقی تھے۔ ہم نے فوری طور پر سارا سامان سمیٹا، خود سے باندھا اور آگے پیچھے رسّی تھام کر باہر جانے لگے۔ اگر رسّی نہ ہوتی تو پانی کے دھارے کے خلاف شاید ہم کبھی بھی اس سرنگ سے نہ نکل پاتے۔ رسّی نے یہ کام آسان کر دیا تھا۔ باہر نکلتے ہی ہم نے سلاخوں والا ڈھکن اُٹھا کر اس طرح ٹکا دیا کہ بہ ظاہر وہ دہانے پر جما ہوا نظر آئے۔ ممکن ہے اس کی انسپکشن کی جاتی او،




کل کر لی جاتی تو بھانڈا پھوٹنے میں دیر نہ لگتی۔ ڈھکنا لگا کر میں نے عبدالقیوم کی طرف دیکھا اور اسے انگوٹھے سے اشارے سے اوکے کیا جواب میں اس نے بھی انگوٹھا دکھایا تھا اسی لمحے میں نے تاریکی میں اس کے پیچھے کسی شے کو حرکت کرتے دیکھا اور اس سے پہلے میں اس حرکت کا مطلب سمجھتا یا عبدالقیوم کو خبردار کرتا۔ شارک کا کھلا ہوا خونی جبڑا نمودار ہوا اور اس نے عبدالقیوم کو کمر سے گرفت میں لے لیا۔ حملہ اتنا بھرپور اور مکمل تھا کہ لمحوں میں عبدالقیوم کا جسم چرمرا گیا اور اس سے خون کی دھاریں پھوٹنے لگیں۔ شارک نے سر جھٹکا تو عبدالقیوم دہرا ہو کر اس کے منہ میں جانے لگا۔ نہایت دہشت ناک منظر تھا۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے وہ مسکرا رہا تھا اور ابھی اس عفریت کے منہ میں اپنی زندگی ہار چکا تھا۔ شارک پیچھے ہٹی اور اپنے شکار سمیت دوسری طرف جانے لگی۔ تب میں نے دیکھا یہ وہی شارک تھی جسے ہم مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ وہ مری نہیں تھی۔ البتہ عبدالقیوم کی موت بن کر آئی تھی۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اس سرنگ کی طرف بڑھا جس سے گزر کر ہم یہاں آئے تھے۔ مجھے معلوم تھا شارک ابھی شکار کے غضب ناک موڈ میں ہے۔ وہ ایک انسان پر اکتفا نہیں کرے گی دوسرے کے لیے ضرور آئے گی۔ میں ہر ممکن تیزی سے اس جگہ جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے میں پلٹ کر روشنی بھی ڈالتا تھا کہ شارک عقب سے نہ آ رہی ہو۔ چٹانی دیوار کے پاس پہنچ کر میں دیوانہ وار اس سوراخ کو تلاش کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں نے بے ساختہ قلا بازی کھائی اور شارک میرے نیچے سے نکل گئی۔ وہ اتنی تیزی سے آئی تھی کہ گزوں آگے نکل گئی۔ میں دیوار کی طرف لپکا۔ وہیں میں شارک کے حملے سے کسی قدر محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں اسے تلاش کر رہا تھا اور ساتھ ہی کرنٹ مارنے والا آلہ بھی نکال لیا تھا۔ اس کی جھلک مجھے آخری لمحوں میں نظر آئی جب وہ نزدیک آ چکی تھی۔ ٹارچ والا ہاتھ اس کی ناک پر رکھ کر میں نے خود کو اس کے مہلک دانتوں سے بچایا اور کرنٹ مارنے والا آلہ شارک کی کھلی آنکھ پر رکھ کر اس کا بٹن دبا دیا۔ مجھے بھی کرنٹ کا شدید جھٹکا لگا تھا مگر میں نے بٹن سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ مجھے معلوم ہے کہ آنکھ دراصل دماغ کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس بار شارک کو دماغ پر کرنٹ لگا تھا اور شاید وہ سچ مچ مر گئی تھی کیونکہ ایک بار تڑپ کر وہ ساکت ہو گئی تھی اور میری حالت بُری ہو رہی تھی اور دل ڈوب سا رہا تھا۔ ممکن ہے مشن کی ناکامی کا خیال نہ ہوتا تو اس روز میں زندگی کی جنگ ہار گیا ہوتا۔ میں نے بے پناہ قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو سنبھالا۔ مجھے احساس تھا اگر شارک مر کر کل سطح پر آ گئی اور اسے سمندر سے نکال کر اس کی چیر پھاڑ کی تو اس کے اندر سے عبدالقیوم کی لاش معہ ڈائیونگ سوٹ اور دوسری اشیاء کے نکل آئے گی۔ میں نے شارک کی دُم سے رسّی باندھی اور دوسری طرف اسے دیوار کے ساتھ ایک اُبھرے پتھر سے اس طرح باندھ دیا کہ رسّی کسی صورت نہ نکلے اسی لمحے مجھے جھٹکا لگا اور منہ میں ہوا آنا بند ہو گئی۔ سلنڈر خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بھی کمر سے کھول دیا اور خود تیرتا اوپر کی طرف بڑھا۔ سطح پر نکل کر میں نے چند گہرے سانس لیے اور دوبارہ نیچے آ کر سرنگ تلاش

کرنے لگا۔ مجھے بہرصورت سرنگ کے پار جانا تھا کیونکہ اس حلیے میں ڈاک پر قدم رکھتے ہی میر نگرانوں کی نہ سہی کیمروں کی زد میں ضرور آجاتا۔ چندمنٹ کے اندر مجھے گرفتار کرلیا جاتا۔

دوسری بار سانس لے کر غوطہ لگانے پر مجھے سرنگ کا دہانہ مل گیا تھا۔ میں اس کے عین اوپر پانی سے نکلا اور زیادہ سے زیادہ آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں سمونے لگا۔ اچھی طرح سانس سینے میں بھر کر میں نے غوطہ لگایا اور ہرممکن تیزی سے سرنگ کی طرف بڑھا اور بلا جھجک اس کے دہانے میں داخل ہوگیا۔ ایک ہاتھ سے ٹارچ تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے سرنگ کی دیوار تھام کر خود کو آگے بڑھا دیا تھا۔ اس طرح رفتار تیز تھی مگر ساتھ ہی پھیپھڑوں میں موجود ہوا سے آکسیجن کا عنصر خارج ہو رہا تھا اور اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ بھر رہی تھی۔ جب دباؤ ناقابل برداشت ہونے لگتا تو میں منہ سے تھوڑی ہوا خارج کر دیتا۔ رفتہ رفتہ ساری ہی ہوا منہ سے نکل گئی تھی اور اب خالی پھیپھڑے آکسیجن کے لیے تڑپ رہے تھے۔ میں اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں مکمل طور پر فٹ نہیں تھا۔ آخری بار چیک اپ میں ڈاکٹر نے نوے فیصد صحت یاب قرار دیا تھا۔ پھر مجھے دوبار کرنٹ لگا تھا اور سب سے بڑھ کر آکسیجن کی کمی۔ مجھے اب یاد آتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ میں نے اس وقت کس طرح اپنے حواس برقرار رکھے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ کس وقت سرنگ ختم ہوئی اور میں پانی کی سطح کی طرف لپکا تھا۔ بس مجھے اتنا یاد تھا کہ میں ہوا میں دیوانہ وار سانس لے رہا تھا۔ نہ جانے کب میرے حواس پوری طرح بحال ہوئے اور میں ہمت کر کے کنارے تک آیا۔ دیر تک چٹانوں کے درمیان پڑا ریس جیتنے والے گھوڑے کی طرح ہانپتا رہا۔ پھر میں نے وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ یعنی ہماری مہم کو دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ عبدالقیوم کا خیال آتے ہی میرے دل میں نشتر سا چبھ گیا تھا۔ موت عین اس وقت اسے جھپٹ کر لے گئی تھی جب وہ خود کو کامیاب تصور کر رہا تھا۔

میں اُٹھا بیگ تلاش کر کے اس میں سے اپنے کپڑے نکال کر پہنے، باقی سارا سامان بیگوں میں ڈالا، کلائی کی گھڑی بھی اور بیگوں میں پتھر ڈال کر انہیں سمندر کی طرف اُچھال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈوب گئے تھے۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چٹان کے اوپر جاتے ہوئے میں بے انتہا تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو گارڈ سامنے آگیا۔ ''کہاں تھے تم اب تک؟''

''سوری..... مجھے اوپر نیند آگئی تھی۔ کھلی فضا میں سونے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔''

''اوپر جانے کی اجازت ہے سونے کی نہیں۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔

دروازہ ہلکی سی دستک سے ہی کھل گیا تھا۔ اندر جاتے ہی سمترا گلے کا ہار بن گئی تھی۔ ''کہاں تھے آپ صاحب جی، میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔''




''بس دل گھبرا رہا تھا اس لیے کھلی فضا میں چلا گیا تھا۔ وہیں آنکھ کھل گئی۔'' میں نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ وہ سمجھ گئی۔ ''کیا چائے کافی بنا کر لاؤں آپ کے لیے؟''

''نہیں شکریہ..... میں اب سوؤں گا۔'' میں کمرے کی طرف بڑھا، وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ اس نے اشارے سے بالکونی کی طرف چلنے کو کہا۔ میں بالکونی میں آیا تو وہ سرگوشی کرنے کے بہانے مجھ سے چپک گئی۔ ''صاحب کا جو مہمان آیا تھا وہ آپ پر شک کر رہا تھا پر صاحب نے اسے یقین دلایا آپ اچھے آدمی ہو۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' میں نے پوچھا سمترا یقیناً میجرایڈم کا ذکر کر رہی تھی۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ایسے لوگوں سے تعلقات ہیں جو اس جزیرے پر ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''صاحب کیا سچ مچ؟''

''بکواس کرتا ہے وہ۔'' میں نے کہا۔

''تب صاحب آپ نے اس آدمی کو میرے سے وہاں سے کیوں ہٹایا تھا۔ وہ حرامی مجھے ایک کمرے میں لے گیا تھا۔ ادھر تین اور تھے وہ چار گھنٹے تک میری بوٹیاں نوچتے رہے۔'' اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''سمترا مجھے اس کا افسوس ہے لیکن یقین کرو تم نے بہت بڑا کام کیا ہے اور ان لوگوں سے تمہارا بدلہ بھی جلد لیا جائے گا۔ نہ صرف تمہارا بلکہ اور مظلوم عورتوں کا بھی۔''

''سچ صاحب۔'' وہ کھل گئی تھی۔ ''مجھے ان سب سے نفرت ہے۔''

''اب تم جا کر سو جاؤ۔'' میں نے نرمی سے اسے الگ کیا۔ ''مجھے بھی نیند آرہی ہے۔''

''صاحب میری کسی سیوا کی جرورت۔''

''سمترا میں کہہ چکا ہوں مجھے پھول کی خوشبو اچھی لگتی ہے اسے شاخ سے نوچنا پسند نہیں ہے۔'' میں کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے رہ رہ کر عبدالقیوم کا خیال آرہا تھا پھر ایک خیال اور آیا جب عبدالقیوم واپس نہیں آئے گا تو اس کا آقا اس کے بارے میں رپورٹ کرے گا اور رپورٹ میں یہ ذکر بھی ہوگا کہ ڈائیونگ کا سامان بھی غائب ہے۔ ممکن ہے اس سے کسی کا خیال ری ایکٹر والی سرنگ کی طرف چلا جائے۔ اس سوچ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں سوائے تقدیر پر بھروسہ کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن ہے عبدالقیوم کے صاحب کو ڈائیونگ کے سامان کا خیال نہ آئے اور وہ صرف اس کے غائب ہونے کی رپورٹ کرے۔

صبح معمول کے مطابق آنکھ کھلی طبیعت ذرا گری ہوئی لگ رہی تھی۔ تازہ اورنج جوس لے کر میں بالکونی میں آگیا۔ جہاں جان گرے سمندر کی جانب سے آتی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں جوس پی کر ایکسرسائز کرنے لگا۔ جان گرے نے میری طرف دیکھا۔ ''رات کو کہاں تھے؟''

میں چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

"اگر مجھے اتنی اتنی سی باتیں بھی نہ پتا چلیں تو میں جان گرے کہلانے کا مستحق نہیں ہوں گا۔"

"تب تمہیں پتا ہوگا کہ میں کہاں تھا؟"

"ہاں...... لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہ رہا ہوں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو میرا دل دھڑک اُٹھا تھا۔

"میں چٹان کے اوپر والے حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تم گئے ضرور تھے مگر چھت پر نہیں...... کہیں اور گئے تھے۔" اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "یوسف کس چکر میں ہو تم...... مجھ سے مت چھپاؤ...... ورنہ نقصان میں رہو گے۔"

"میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔" میں نے لاپروائی سے ایکسرسائز جاری رکھی۔ "یہ محض وہم ہے تمہارا۔"

"جزیرے پر اندرون خانہ جاری سرگرمیوں کی رپورٹ میجر ایڈم کے پاس ہے وہ بھی تم پر شبہ کر رہا تھا۔"

"وہ صرف شبہ کر سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی ثبوت ہوتا تو وہ اب تک مجھے اندر کر چکا ہوتا۔"

"وہ مجھے خبردار کر کے گیا ہے کہ تمہاری آج سے کڑی نگرانی کی جائے گی۔"

"شوق سے کرے۔" میں جھک کر ایکسرسائز میں لگ گیا اور پھر اندر آ کر نہایا، سمترا نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ میری پسند کے مطابق دودھ کارن فلیکس، اُبلے ہوئے انڈے اور سیب کا جوس تھا۔ جان گرے حسبِ معمول بھنے ہوئے گردے اور چانپیں کھا رہا تھا۔ اس کا جسم جو افریقہ میں چھریرا ہو گیا تھا ایک بار پھر موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ وہ اپنے پُرانے معمول یعنی شراب شباب اور کباب پر واپس آ گیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ دفتر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد میں نے سمترا سے کہا۔ "آج شام کو تیار رہنا میں تمہیں سیر کرانے اور مقابلہ دکھانے لے جاؤں گا، کیا خیال ہے۔"

"سچ......" وہ کھل گئی تھی۔ "میں تیار رہوں گی۔ کیا پہنوں صاحب؟"

"تم ہر لباس میں اچھی لگتی ہو اور دوسرے میرا نام یوسف ہے۔"

"یوسف...... وہ دلیپ کمار والا۔"

"ہاں وہی یوسف! تم چھ بجے تک تیار رہنا۔ کھانا بھی ہم باہر کھائیں گے۔"

"پر میں نے گرے صاحب سے اجازت نہیں لی ہے۔" وہ فکر مند ہو گئی۔ "رات کو گھر آئے اور مجھے نہ پایا تو ناراج ہوں گے۔ مجھے بس جانے دیں۔"

"فکر نہ کرو، وہ آج رات اس طرف نہیں آئیں گے۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

اگرچہ میرا جان گرے کو خبردار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میرے اندر کہیں دبی دبی سی





خواہش تھی کہ اس طرف نہ آئے۔ جمنازیم پہنچ کر میں نے جبوریل کو تلاش کیا اور اسے ایک طرف لے جا کر اشاروں میں پوچھا کہ کیا اسے آج رات کے لیے ہدایات مل گئی ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر اشارے سے بتایا کہ اسے ہدایات بھی مل گئی ہیں اور اسلحہ بھی، مطمئن ہو کر میں اپنے کام میں لگ گیا۔ ایڈم نے مجھے بتایا تھا کہ آج رات ایول کا مقابلہ احمد بربری سے ہوگا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ یہ مقابلہ بارہ بجے تک ہو کیونکہ اس کے بعد ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی اور احمد کے خلاف کی جانے والی سازش ناکام رہتی۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ احمد کے خلاف سازش ہو گی اور اسے ایول کے ہاتھوں مروانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

لنچ کے وقفے میں جبوریل نے ریسٹوران کی طرف جاتے ہوئے مجھے نسبتاً تفصیل سے بتایا۔ اس نے چار افراد اور تلاش کر لیے تھے وہ سب کالے تھے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ میں نے جبوریل کو خبردار کیا۔ بے شک وہ تمہارے ہم نسل ہیں لیکن اس بارے میں انہیں ایک لفظ بھی مت بتانا اور نہ ہی انہیں اسلحہ دینا۔ تم نے کس سے رابطہ کیا تھا۔ اسلحے میں کیا دیا ہے؟"

"دو عدد خودکار رائفلیں اور ان کے میگزینز ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اس کے علاوہ ایک ری پیٹر اور چند عدد بم ہیں۔ ہنگامہ ہوتے ہی سب سے پہلے اسلحہ خانے پر حملہ ہوگا تاکہ اسلحہ حاصل کیا جا سکے۔ میں بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر اس طرف جاؤں گا۔"

"میں شاید ایرینا کے آس پاس ہوں۔ کوشش کرنا کہ صرف اس جزیرے کے کرتا دھرتا مارے جائیں۔ عام لوگوں کو نقصان نہ ہو۔"

"بگ برادر کی طرف سے بھی یہی ہدایت ہے۔" جبوریل نے سر ہلایا۔

لنچ کر کے میں آیا تو احمد ایکسرسائز کر رہا تھا میں اس کے پاس پہنچا۔ "میں نے سنا ہے آج رات تمہارا ایول سے مقابلہ ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "پچھلی بار وہ بچ گیا تھا۔ میں نے صرف اس کا پیٹ پھاڑنے پر اکتفا کیا۔ اس بار میں وہ غلطی نہیں دہراؤں گا۔ مرنے سے پہلے زمین کے سینے سے ایک بُرائی کم کر کے جاؤں گا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "احمد میرا دل کہتا ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"برادر میں تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں لیکن میں جانتا ہوں یہ لوگ مجھے مار ڈالنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے اس مقابلے کا سہارا لے رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

میں اس کا شانہ تھپک کر وہاں سے چلا گیا۔ شام پانچ بجے جمنازیم بند ہو جاتا تھا۔ میں نے لاجز کا رُخ کیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ جان گرے پہلے سے وہاں موجود نہ ہو اور سمترا کو میرے ساتھ جانے سے روک دے۔ مگر وہ نہیں آیا تھا۔ سمترا تیار تھی۔ اس نے بنگالی انداز میں ساڑھی باندھی تھی یعنی اوپری جسم پر سوائے ساڑھی کے پلو کے اور کچھ نہیں تھا۔ میک اَپ اور جُوڑا بنا کر وہ غضب کی

حسین لگ رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے تو میں بھی مسحور رہ گیا تھا۔ میری نظریں محسوس کر کے وہ بالکل پاکباز اور باکردار عورت کی طرح شرما گئی تھی۔

''ایسے کا دیکھ رہے ہو صاحب؟''

''سمترا آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

وہ نہ جانے کیوں اُداس ہوگئی۔ ''صاحب کتنی ہی اچھی لگوں، رہوں گی تو طوائف...... بے آبرو عورت۔''

''نہیں...... تم بے آبرو نہیں...... مجبور ہو...... بے آبرو تو وہ عورتیں ہوتی ہیں جو پیسے اور آسائشوں کے عوض خود کو بیچ دیتی ہیں۔''

''تم مجھے اچھی عورت سمجھتے ہونا صاحب۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''سمترا تم میری نظر میں اتنی ہی اچھی عورت ہو جتنی کہ کوئی ایسی عورت ہو سکتی ہے جسے کسی اور مرد نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔''

وہ میرے گلے سے لگ گئی تھی۔ اس کے آنسو میری قمیص بھگونے لگے تھے۔ یہ لمحات بہت مشکل تھے۔ مجھے اسے چپ کرانے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہ مشکل تمام وہ چپ ہوئی۔

''میں بھی کیسی احمق ہوں۔ آپ کو تنگ کر دیا۔'' اس نے آنسو صاف کیے۔ ''آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھولو...... میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''نہیں میں کپڑے بدل کر آ رہا ہوں۔ بس چلیں گے۔ میں نے ڈرائیور کو روک لیا ہے۔ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔''

''میں میک اَپ ٹھیک کر کے آتی ہوں۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میں جان گرے یا میجر ایڈم کے آنے سے پہلے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ورنہ کم سے کم سمترا کا نکلنا مشکل ہو جاتا اور میں اسے مرنے کے لیے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے عجلت میں کپڑے بدلے۔ وہ میک اَپ کر کے آ چکی تھی۔ ہم فوری طور پر اپارٹمنٹ سے نکل گئے تھے۔ میں عبدالقیوم کا دیا پستول اور اس کے میگزین لینا نہیں بھولا تھا۔ اس کے حوالے سے اب تک کوئی سرگرمی میرے علم میں نہیں آئی تھی لاجز میں سب کچھ معمول کے مطابق جاری تھا لگتا تھا کہ اس کے آقا کو اب تک اس کی گمشدگی کا علم نہیں تھا یا اس نے اب تک رپورٹ ہی نہیں کی تھی۔ دونوں صورتیں تعجب خیز تھیں۔ جیپ کے ڈرائیور نے للچائی نظروں سے سمترا کے عریاں بازو اور شانے کی طرف دیکھا۔

''ڈرائیو میں کروں گا تم پیچھے جاؤ۔'' میں نے اسے حکم دیا۔ بادلِ نخواستہ وہ اپنی نشست چھوڑ کر جیپ کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ سمترا ادائے دلیری کے ساتھ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔ جب میں نے جیپ آگے بڑھائی تو اس نے پاس سرک کر اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ ''صاحب اس وقت تم نے مجھے جو مان دیا ہے اس کے بدلے میری جندگی بھی مانگو تو کھشی سے دے دوں۔'' سمترا





صاف اردو بولتی تھی لیکن ز، ض، خ، پر اٹک جاتی تھی۔

''میں تمہاری زندگی کیوں مانگوں گا مجھے تم زندہ سلامت اچھی لگتی ہو۔''

''صاحب ایک بات پوچھوں، اگر کبھی ایسا موقع آئے کہ آپ کو مجھے عورت کے طور پر قبول کرنا پڑے تو کر لو گے؟''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''ہاں...... کیونکہ بُرائی تم میں نہیں ہے۔''

قصبے میں پہنچ کر میں نے گارڈ کو فارغ کر دیا۔ ''اب تم جاؤ یہ جیپ کل تک میرے پاس رہے گی۔''

وہ پریشان ہوگیا۔ ''جناب مجھے اس کا حکم نہیں ہے۔''

''فکر نہ کرو، حکم بھی مل جائے گا اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں تمہیں فارغ کرتا ہوں۔''

وہ مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ مَیں نے سب سے پہلے ریستوران کا رُخ کیا۔ وہاں ہم نے چائے کے ساتھ بسکٹس اور پیٹیس لیے تھے۔ سمترا بے حد خوش تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ بارہ بجے کے قریب اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں گا مجھے عبید صلاح اور اس کے ساتھیوں کا ساتھ دینا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سمترا مقابلے دیکھنے چلو گی؟''

''کیسے مقابلے صاحب؟'' وہ اس طرح کھلی جگہ پر نروس سی تھی۔

''انسانوں کے انسانوں سے مقابلے، لڑائی کے۔''

''نہ جی...... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''میں ساتھ ہوں اور پھر ہمیں کوئی کچھ کہے گا تھوڑی۔''

''جیسی آپ کی مرجی صاحب۔'' اس نے سر ہلا دیا۔ اس نے میرے لیے جو لباس پہنا تھا وہی اس کے لیے مصیب بن گیا تھا۔ سب اسے کھا جانے والے انداز میں گھور رہے تھے۔

''جہاں مقابلے ہوتے ہیں وہاں تمہاری طرف کوئی توجہ بھی نہیں دے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''سب کی توجہ لڑائی پر ہوگی۔''

یہ سن کر وہ راضی ہوگئی۔ اس کے پاس کارڈ نہیں تھا مگر گارڈز نے اسے روکا نہیں وہ اسے بھی ان، ہزاروں عورتوں میں سے ایک سمجھے تھے جو یہاں آنے والے عیاشوں کا دل بہلانے کے لیے لائی گئی تھیں اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی کارڈ نہیں تھا۔ میں نے سمترا کو پہلے کلب دکھایا جس کی آرائش اور خوب صورتی دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں اس نے میرا بازو تھام کر حسرت بھرے انداز میں کہا۔ ''صاحب جب یہ اس جمین پر ہی سورگ بنا سکتے ہیں تو ہم غریبوں کی جندگی کیوں نرکھ کرتے ہیں۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ یہ جنتیں ان کے خون پسینے سے تعمیر کی گئی تھیں۔ دنیا میں کسی ایک کی جنت کئی افراد کے لیے دوزخ کی قیمت پر بنتی ہے۔ شائقین کا رُخ ایرینا کی طرف تھا۔ میلے میں شرکت

کے لیے آنے والے اکثر افراد ان مقابلوں کو دیکھنے آئے تھے۔ اس قسم کے آزادانہ لڑائی کے مقابلے اب دنیا کے کئی ملکوں میں ہونے لگے ہیں مگر وہاں پر ان مقابلوں کو حد میں رکھا جاتا۔ ان جزائر جیسی غیر قانونی مملکتوں میں یہ مقابلے ہر اصول و شرط سے ماورا ہو کر وحشیانہ رومن مقابلوں میں بدل جاتے تھے جن میں عام طور سے ایک فرد زندہ سلامت رِنگ سے باہر آتا تھا، اس چمپئن شپ کے دوران اب تک چار افراد رِنگ میں اپنی زندگی ہار چکے تھے۔

ایرینا پہلے روز کے مقابلے میں ہاؤس فل کا منظر پیش کر رہا تھا لیکن لیڈیز والے حصے میں جگہ مل گئی۔ دراصل اس جگہ صرف جوڑے بیٹھ سکتے تھے۔ اکیلے مرد یا عورت کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ سمترا پہلی بار اس جگہ آئی تھی۔ اس لیے ذرا گھبرائی ہوئی تھی۔ بے شمار ستائشی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں۔ ایک شخص نے جو قدرے نشے میں تھا سمترا سے کہا۔ ”ہے لیڈی کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی میں اس سے زیادہ معاوضہ دوں گا۔“

”یہ میری ساتھی ہے۔“ میں نے نرمی سے اس شخص کو سمجھایا اور وہ فوراً سمجھ گیا تھا۔

رِنگ میں ایک سیاہ فام اور ایک سفید فام فائٹر تھے۔ ظاہر ہے مجمعے میں سے بیشتر کی ہمدردیاں سفید فام کے ساتھ تھیں۔ مقابلے کے شروع میں سیاہ فام حاوی رہا تھا لیکن جلد سفید فام نے اسے زیر کر لیا۔ اس کے مکوں نے سیاہ فام کو لہولہان کر دیا۔ مگر وہ ہمت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ زمین پر گر گیا۔ سفید فام نے ہاتھ بلند کر دیئے تھے۔ مجمع چیخ چیخ کر اس سے سیاہ فام کے قتل کی فرمائش کر رہا تھا۔ سمترا یہ آوازیں سن کر سہمی جا رہی تھی۔ اسے اتنی انگریزی آتی تھی۔ سفید فام نے مجمع کی فرمائش مان لی اور سیاہ فام کی طرف آیا وہ زمین پر بے حال پڑا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس نے ہمت کر کے آخری بازی لگائی۔ جیسے ہی سفید اس کے نزدیک آیا اس نے اچانک اس کے پاؤں میں پاؤں پھنسا کر اسے گرایا اور اس کی پشت پر سوار ہو کر اس کی گردن میں ہاتھ پھنسا کر اسے اوپر کھینچنے لگا تھا۔ وہ فتح کے نشے میں سرشار تھا اور اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ دوسری طرف موت نے سیاہ فام میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سفید فام کی گردن پر پورا زور ڈال دیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ سیاہ فام اُچھل کر اس کی پشت سے اُتر گیا تھا۔ سفید فام نزع کے عالم میں پھڑکنے لگا تھا اور ایرینا پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر سیاہ فام کے حامی افراد شور مچانے لگے۔ سیاہ فام ہاتھ اُٹھا کر ان سے داد لینے لگا۔

سمترا ابھی بے اختیار تالیاں بجانے لگی تھی۔ سفید فاموں کے خلاف ایک دبا دبا سا غصہ ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے۔ سفید فام دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ سیاہ فام اس کی لاش پر تھوک کر ایرینا سے باہر چلا گیا۔ سفید فام کے حامی اسے بلند آواز سے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ پھر مقابلے ہوتے رہے۔ دس بجے کے قریب میں اور سمترا رنگ کے پاس سے اُٹھ گئے تھے اوپر آ کر ہم نے کھانا کھایا اب تک احمد اور ایول کا مقابلہ نہیں شروع ہوا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے سمترا سے کہا۔





”سنو...... تم کچھ دیر ایرینا میں اکیلے رہ لوگی۔“

”کیوں آپ کہاں جاؤ گے صاحب۔“

”لیکن نہیں۔“ میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر سمترا سے کہا۔ ”اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے تو اس باغ میں آ کر چھپ جانا یاد رکھو گی نا اسے۔“

”پر کیوں صاحب؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”سمترا بحث مت کرو میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی اس قسم کے میلوں میں ہنگامے بھی ہو جاتے ہیں لیکن نہیں باغ میں تم غیر محفوظ ہو گی، آؤ میرے ساتھ۔“

میں سمترا کو لے کر جیوریل کی رہائش والی عمارت کی طرف چل پڑا۔ اگرچہ مجھ پر اس عورت کی ذمے داری نہ تھی لیکن پھر بھی میرا ضمیر نہیں مان رہا تھا کہ اسے آنے والے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ میں اسے لے کر جیوریل کے پاس پہنچا تو دستک کے جواب میں میری آواز سن کر اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر سمترا کو دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے سمترا کے بارے میں چپ رہنے کو کہا۔ سمترا کو پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اس نے عمارت کے اندر ایک لفظ منہ سے نہیں نکالنا۔ جیوریل کے کمرے میں اسلحہ بکھرا تھا اور اس کے ساتھ مزید چار سیاہ فام موجود تھے۔ سمترا کے اندر آتے ہی انہوں نے بے غیرتی سے اسے گھورنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اشارے سے جیوریل سے ان چاروں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساتھی تھے مگر مجھے وہ قطعی پسند نہیں آئے تھے۔ سمترا کو گھورنے سے پتا چل رہا تھا کہ ان کی ذہنیت اوباشانہ اور کج روتھی۔ ایسے لوگ صرف مطلب پرست اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں خدشہ تھا کہ اگر بغاوت میں ہم کمزور پڑے تو یہ پٹری بدل کر جزیرہ والوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ مگر اب وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ میں اس بارے میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے میں چلتے ٹی وی پر ایرینا میں ہونے والے مقابلے دکھائے جا رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ٹی وی پر احمد نمودار ہوا تھا، اسے زنجیروں میں باندھ کر لایا جا رہا تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔ ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا اور اس دوران میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں احمد کی موت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اشارے سے جیوریل کو بتایا کہ اس نے سمترا کی حفاظت کرنی ہے اور دو سیاہ فاموں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ جیوریل کے سمجھانے پر وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

”تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“ باہر آتے ہی ان میں سے ایک نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”بکواس مت کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”تم میری کمانڈ میں ہو جو کہوں بلا چوں و چرا کرو ورنہ محاذ جنگ پر حکم عدولی کی سزا جانتے ہو۔“

اس نے شانے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ میری طرف سے جہنم میں جاؤ، میرے پاس پوتو!

تھا اور وہ خالی ہاتھ تھے۔ ایرینا کے پاس پہنچ کر میں ہچکچایا۔ اس وقت میں کنفیوژ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ اندر جانے سے پہلے میں نے ان دونوں سے کہا۔

''ہمیں اس احمد بربری نامی نوجوان کو بچانا ہے۔ جزیرے کی انتظامیہ اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔''

''اس سے ہمارا کیا تعلق ہے؟'' دوسرے سیاہ فام نے منہ بنایا۔

''تعلق ہے...... وہ ہمارا ساتھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ایرینا میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رِنگ میں احمد اور ایول ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا ایول اسے اپنے بھاری جثے تلے روندنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک احمد نے اسے اپنے پیروں پر رکھتے ہوئے دور اُچھال دیا۔ محض بیس منٹ میں دونوں سر سے پاؤں تک لہو میں نہا گئے تھے۔ یہ شاید اب تک کا سب سے سنسنی خیز مقابلہ تھا۔ لوگ بے خبر تھے کہ یہ مقابلہ نہیں تھا۔ احمد کو سزائے موت سنائی گئی تھی اور اس کی اس طرح تعمیل ہو رہی تھی۔ اگر ایول اسے مارنے میں ناکام رہتا تو اسے کسی اور طریقے سے مار دیا جاتا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس کے خلاف کیا حربہ استعمال کرتے، میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی دس منٹ باقی تھے۔ اس دوران میں کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ یہ مقابلہ اس طرح جاری رہے یہ اور بات تھی کہ سب کچھ میری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ احمد بربری حسبِ سابق ایول سے بچوں کی طرح کھیل رہا تھا۔ ایول پہلے سے زیادہ چست و چالاک نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی احمد اس پر حاوی تھا۔ اچانک میں نے احمد کو لڑکھڑاتے اور اپنی گردن پر ہاتھ مارتے دیکھا۔ اس نے گردن سے کوئی شے نکالی اور اسے غور سے دیکھ کر چاروں طرف دیکھا، میرا دل کہنے لگا کہ اس کے ساتھ کوئی چال ہو گئی تھی۔ شاید اس پر کوئی شے فائر کی گئی تھی۔ شاید کوئی زہریلی سوئی، وہ لڑکھڑایا تو میرا دل رُک سا گیا۔ ایول مسکرانے لگا تھا۔ پھر وہ وحشیانہ انداز میں احمد کی طرف جھپٹا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار پستول کی طرف گیا تھا مگر میں نے احمد کو ابتدائی لڑکھڑانے کے بعد برق کی تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا تھا اس نے جھکائی دے کر ایول کی گردن پر ہاتھ مارا مگر ایسے جیسے اس کی گردن میں کوئی شے گھونپ رہا ہو۔ ایرینا میں شور کے باوجود ایول کی دھاڑ صاف سنائی دی تھی۔ میں نے احمد کو اُچھل کر اس کی کمر پر لات مارتے دیکھا اور ایول ایرینا کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔

پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ لمحاتی برق رفتاری کے بعد احمد پر سُستی طاری ہو رہی تھی، سوئی کا زہر اس پر اثر کر رہا تھا لیکن جب میں نے ایول کو بھی اسی انداز میں سُست پڑتے دیکھا تو میری سمجھ میں آیا احمد نے ایک بار پھر ان کا داؤ ان پر پلٹ دیا تھا۔ اس نے سوئی ایول کی گردن میں اُتار دی تھی اور شاید پوری ہی اندر کر دی تھی، کیونکہ ایول بار بار اپنی گردن پکڑ کر چنگھاڑ رہا تھا۔ وہ ریفری کی طرف رُخ کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ تب میں نے اوپری گیلری سے ایک شخص کو ایک لمبی سی کیمرہ نما شے





احمد کی طرف کرتے دیکھا۔ وہ تصویر لے رہا تھا لیکن وہ شے فلیش نہیں کر رہی تھی اچانک ہی میں نے احمد کو لڑکھڑاتے دیکھا اس بار اس نے اپنے شانے پر ہاتھ مارا تھا۔ دوسری سوئی اس کے شانے میں لگی تھی اور اس بار اس کی ہمت جواب دے گئی تھی وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف کسی نے ایول کو باہر سے کوئی چیز پھینک کر دی، جسے اس نے منہ میں ڈال لیا اور اسے حلق سے اُتار کر وہ احمد کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز قاتلانہ تھا۔ گویا اب احمد کو ہرانے اور سزا دینے کے لیے اس طرح دھاندلی کی جا رہی تھی۔

ایول نے احمد کے سینے پر ٹھوکر ماری۔ وہ اُلٹ کر دور جا گرا۔ پھر ایول نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایرینا کے ایک کونے کی طرف گیا تھا۔ وہاں دیوار کے ساتھ کچھ ٹٹولتا رہا پھر وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایسی ہی نوک دار سلاخ تھی جیسی اسے پہلے بھی مہیا کی گئی تھی۔ تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ بارہ بجنے میں دو منٹ رہ گئے۔ ایول سلاخ لے کر احمد کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے عزائم بتا رہے تھے کہ وہ احمد کو پہلے وار میں قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے پستول نکالا اور ایول کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ایول لہرا کر گرا اور اسی لمحے بجلی غائب ہو گئی۔ میں نے دل میں بے ساختہ نعرہ مارا تھا۔ بجلی گھر تباہ ہو گیا تھا۔ میں ایرینا سے اُتر کر رِنگ میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر فائر کے بعد تاریکی نے لوگوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور کچلتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پہلے شرافت سے راستہ بنانے کی کوشش کی اور پھر دھکیل دھکیل کر راستہ بنانے لگا۔ اس اثناء میں ہلکی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ یہ کوئی اسٹینڈ بائی سسٹم تھا۔ روشنی ہوتے ہی مجھے فرش پر اوندھے منہ پڑا احمد نظر آ گیا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایول اپنے ہی خون اور مغز میں غلطاں پڑا تھا۔ دو نیلی وردی والے مسلح گارڈز احمد کی طرف لپک رہے تھے میں نے یکے بعد دیگرے انہیں بھی شوٹ کر دیا دو مزید فائرز نے ہال کی سراسیمگی میں اضافہ کر دیا تھا۔ لوگ دیوانہ وار چلاتے دھاڑتے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے لپک کر ایک گارڈ کی رائفل اور فاضل میگزینز اُٹھا لیے۔ اور احمد کو دیکھا وہ بے ہوش تھا۔ میں نے ایک شانے پر رائفل ٹانگی اور اسے دوسرے شانے پر لاد کر ایرینا سے باہر نکلنے والے راستے کی طرف بڑھا۔ کہیں سے گولی چلی اور میرے سر کے اوپر سے گزر کر اس موٹے جاپانی کی کمر میں لگی جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک گارڈ نے میرے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کی اور مجھے مارنے کی خواہش لیے جہنم رسید ہو گیا۔ وہ دو خبیث غائب تھے جنہیں میں ساتھ لایا تھا۔

ایک عبرت ناک غلطی کے بعد مجھ پر فائر کرنے والے گارڈ نے دوبارہ فائر نہیں کیا کیونکہ میرے چاروں طرف بے شمار لوگ تھے۔ ان کے ریلے میں بہتا میں ایرینا سے باہر نکل گیا۔ بجلی جانے کے بعد لفٹس بند ہو گئی تھیں اور لوگ سیڑھیوں کے راستے اوپر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اگر لفٹس ٹھیک ہوتیں تب بھی میں ان میں جانے کی کوشش نہ کرتا۔ اگر لفٹ کہیں درمیان میں رُک جاتی تو میں چوہے کی طرح گھیر لیا جاتا۔ سیڑھیوں سے ہوتے میں نے دوفلور کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ بجلی بند ہونے سے ہوا فراہم کرنے والے نظام نے کام کرنا بھی بند کر دیا تھا۔ حبس اور گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں ہر ممکن تیزی سے اوپر جا رہا تھا جتنی دیر ہوتی میرے پھنسنے کے اتنے زیادہ امکان ہوتے۔ احمد اگرچہ چھریرے جسم کا تھا لیکن اس کا وزن بھی خاصا تھا۔ کسی طرح ستر کلوگرام سے کم نہیں تھا۔

سیڑھیوں پر ایک اور گارڈ میرا نشانہ بنا۔ ہجوم میں وہ مجھے تلاش نہیں کر پاتے تھے اور میں ان کی نیلی وردیوں کی وجہ سے پہلے ہی دیکھ لیتا تھا۔ ایک مزید فائر نے لوگوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ خاص طور سے خواتین نے ایسی سریلی چیخیں ماریں کہ باہر نکلنے کے باوجود دیر تک میرے کان سائیں سائیں کرتے رہے تھے۔ میں اَن تھک سیڑھیاں چڑھتا چلا جا رہا تھا اور سیڑھیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے کلب کی صورت نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اوپری حصہ اب کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔ اب میں محتاط تھا۔ میں نے پستول رکھ کر رائفل سنبھال لی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ داخلی دروازے پر کافی تعداد میں گارڈز مجھے روکنے کے لیے ہوں گے۔ ابھی میں کچھ ہی دور تھا کہ اوپر سے شدید قسم کی فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ یقیناً عبید صلاح کے ساتھی آ گئے تھے۔ میں نے احمد کو ایک بڑے سائز کے گملے کی آڑ میں لٹایا اور دبے قدموں داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس طرف شیشے لگے تھے اور چھ سات گارڈ باہر سے اندر گھسنے کی کوشش کرنے والے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ ان میں سے کم سے کم چار میرے نشانے پر تھے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر رائفل سیدھی کر کے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ان میں سے تین تو فوراً مارے گئے تھے اور چوتھا زخمی ہو کر ایک صوفے کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ اگر میں فوراً ہی ایک ستون کے پیچھے نہ ہو جاتا تو باقی تین مجھے چھلنی کر چکے تھے۔ ان کا نشانہ اب میں تھا اور ستون کے آس پاس گولیاں در و دیوار کو چھلنی کر رہی تھیں۔ میری طرف توجہ دینے کا نقصان انہیں یہ ہوا کہ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کو موقع مل گیا۔ دو افراد دیوانہ وار اندر آئے اور ایک فوراً ہی فوت ہو گیا۔ صوفے کی آڑ میں دبکے زخمی گارڈ نے اسے شوٹ کر دیا تھا دوسرا البتہ بچ گیا اس نے میرے ساتھ مل کر باقی تینوں کا صفایا کر دیا۔ وہ مختصر سا سری لنکن تھا اور اتنا پُر جوش ہو رہا تھا کہ میں بھی اس کے ہاتھوں مارے جانے سے بال بال بچا اس نے رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے ستون کی آڑ میں ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں عبید صلاح کا ساتھی ہوں۔ ان چار گارڈز کو میں نے مارا ہے۔“

”تومارا نام یوشیف ہے۔“ اس نے بگڑی اردو میں پوچھا۔

”یوسف۔“ میں نے سامنے آ کر تصدیق کی اور گملے کی آڑ سے بے ہوش احمد کو اُٹھایا اس





دوران میں کئی حملہ آور اندر آ چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اندر مت جانا۔ وہاں نہ جانے کس قسم کے جال ہوں۔ اس عمارت کی باہر سے نگرانی کرو، کوئی نکل کر نہ جانے پائے اور تم لوگ عام آدمیوں پر گولی چلانے سے گریز کرنا۔ صرف گارڈز اور آرگنائزیشن کے لوگوں کو مارنا۔“

احمد کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ باہر کھڑی ایک جیپ میں اسے لے کر میں دو افراد کے ہمراہ ہسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر جزیرے کی ساری ہی غلام آبادی بغاوت پر اُتر آئی تھی۔ جا بجا توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کے مناظر تھے ایک جگہ میں نے چار کمسن ایشیائی اور افریقی لڑکیوں کو لوہے کے پائپوں سے ایک سفید فام کو مارتے دیکھا۔ اس کے جسم پر گارڈ کی وردی نہیں تھی لیکن وہ ان میں سے ہی تھا ہسپتال کا عملہ فرار تھا۔ بہ مشکل ایک کمرے میں چھپے ایک چینی ڈاکٹر کو تلاش کر کے اسے احمد کو دیکھنے کو کہا۔ اس نے احمد کا معائنہ کیا اور اسے دو انجکشن دیئے۔

”یہ ابھی ہوش میں آ جائے گا۔“ اس نے بتایا۔

”ہسپتال کے باقی افراد کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ فرار ہو گئے ہیں۔ ایئر فیلڈ کی طرف گئے ہیں۔“ چینی ڈاکٹر نے بتایا۔ ”انہوں نے جانے سے پہلے ہسپتال کے دو ایشیائی کارکنوں کو مار دیا تھا۔“

ہسپتال میں زیادہ تر یورپی یا سفید فام افراد تھے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے افراد سے ایئر فیلڈ کا پوچھا۔ ”میں جانتا ہوں۔“ ایک بولا۔ میں نے دوسرے کو احمد کے پاس رُک کر اس کی حفاظت کرنے کو کہا اور خود پہلے والے کے ساتھ ایئر فیلڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہر ممکن رفتار سے جیپ دوڑاتے ہوئے میں پانچ منٹ بعد ہی ایئر فیلڈ تک جا پہنچا تھا۔ یہ قصبے سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ اس دوران میں پورا قصبہ فائرنگ کے بے پناہ شور سے گونجنے لگا تھا۔ برسوں سے کچلے اور ظلم کا شکار افراد طاقت، آزادی اور اسلحہ ہاتھ میں آتے ہی بے قابو ہو گئے تھے۔ جا بجا نیلی وردیوں والے گارڈز اور آرگنائزیشن کے افراد کی لاشیں بکھری تھیں۔ بندرگاہ کی طرف سے آسمان شعلوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس سے وہاں ہونے والی تباہی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایئر فیلڈ زیادہ بڑی نہیں تھی اور جب میں نے جیپ عمارت کے سامنے روکی تو ایک درمیانے سائز کا دوہرے انجنوں والا طیارہ رن وے پر پرواز کے لیے دوڑ رہا تھا۔ کئی طیاروں کے انجن چل رہے تھے اور وہاں پر فرار ہونے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب آرگنائزیشن کے بڑے اور وہ ارب کھرب پتی تھے جو مزے کرنے آئے تھے اور اب جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

جیپ دیکھتے ہی کسی نے برسٹ مارا تھا جو جیپ کے اگلے حصے میں لگا تھا۔ میں اور دوسرا شخص چھلانگ لگا کر جیپ کی آڑ میں ہو گئے تھے، اسی لمحے جو طیارہ رن وے پر دوڑتا جا رہا تھا اس کی رفتار سے ظاہر تھا کہ وہ پرواز کے لیے پر تول رہا ہے۔ کہیں سے ایک مشین گن گرجی اور طیارے کے تینوں ٹائر برسٹ ہو گئے۔ بے قابو طیارہ لڑکھڑایا، گھوما اور رن وے سے اُتر کر کچے میں قلابازیاں کھانے

لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ اندر بیٹھے لوگ مرے نہ بھی تھے تب بھی شدید زخمی ضرور ہوئے تھے۔ طیارے کا یہ حال دیکھ کر عمارت کے پاس موجود ہجوم نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے درختوں سے نکل کر بعض افراد کو تباہ ہو جانے والے طیارے کے ملبے پر گولیاں برساتے دیکھا۔

فرار کے خواہش مند جو پہلے طیاروں میں سوار ہونے کے لیے آپس میں لڑے مرے جا رہے تھے۔ اب طیاروں سے اُتر کر بھاگے اور ایئر فیلڈ کی عمارت میں گھس گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں زیادہ آرگنائزیشن کے لوگ تھے۔ وہی ہنگامی حالات میں اتنی پھرتی دکھا سکتے تھے۔ ورنہ جزیرے پر تفریح کے لیے آنے والوں کے ابھی تک حواس ہی بحال نہیں ہوئے تھے کہ وہ فرار کا سوچ سکتے۔ ہم پر گولیاں برسانے والے گارڈز کی توجہ اب طیارے پر حملہ کرنے والوں پر مرکوز ہو گئی تھی۔ مشین گن سے رن وے پر موجود افراد پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ اور ان میں سے کئی رن وے پر گولیاں کھا کر پڑے تھے۔ باقی تیزی سے عمارت میں گھس رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ حملہ آور طیاروں کو نشانہ بنانے سے گریز کر رہے تھے۔

اسی لمحے قصبے کی جانب سے کئی گاڑیوں کی روشنیاں ایئر فیلڈ کی طرف آتی نظر آئی تھیں۔ میں اور میرا سری لنکن ساتھی محتاط ہو گئے نہ جانے یہ کون تھے۔ ہمارے ساتھی یا آرگنائزیشن والے جو فرار کے لیے آ رہے تھے۔ یا پھر تفریح کے لیے آنے والے تھے۔ گاڑیاں نزدیک آئیں تو ان پر ایئر فیلڈ کی عمارت سے فائرنگ ہونے لگی اور ان سے بھی عمارت پر جوابی فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ گویا وہ ہمارے ہی ساتھی تھے۔ نزدیک آنے پر مجھے سب سے آگے والی جیپ پر عبید بن صلاح کی صورت نظر آئی۔ ان کا اس طرف آنے کا مطلب تھا کہ انہوں نے قصبے پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ میں ہاتھ اوپر کر کے چلایا۔ ''عبید...... میں یہاں ہوں برادر۔''

عبید نے اپنی جیپ ہمارے پاس لا کر روکی۔ میں اور سری لنکن بھاگ کر اس پر سوار ہوئے اور عبید کا ڈرائیور تیزی سے ریورس گیئر میں اسے پیچھے لے جانے لگا۔ جیپ رُکتے ہی میں اور عبید نیچے کود کر بغل گیر ہو گئے تھے۔ ''برادر'' اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''بندرگاہ تباہ ہو گئی ہے اور قصبے پر ہمارا مکمل کنٹرول ہے۔''

''ایرینا والی عمارت۔''

''اس پر ابھی تک ہمارے لوگ قابو نہیں پا سکے ہیں مگر وینٹی لیشن سسٹم بند ہونے کے بعد وہ زیادہ دیر اندر نہیں رہ سکیں گے۔''

''مجھے خطرہ ہے اس عمارت سے نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ نہ ہو۔ اس میں ابھی درجنوں کے حساب سے مسلح اور تربیت یافتہ افراد ہیں اگر وہ خفیہ راستہ سے نکل آئے تو ہماری کامیابی ناکامی میں بدل سکتی ہے۔''




عبید بن صلاح تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''دو کام کرو، ایک تو اس جگہ کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لو۔ کوئی طیارہ نہ جانے پائے، دوسرے دھماکہ خیز مادہ منگواؤ، ہم قصبے کی وہ عمارت تباہ کر دیں گے ورنہ ناکام بھی ہو سکتے ہیں۔''

مجھے جان گرے نے بتایا تھا کہ یہی عمارت اصل میں جزیرے کی سینٹرل کمانڈ تھی اور وہیں سے ساری سرگرمیوں کو قابو کیا جاتا تھا۔ عبید صلاح چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا تھا۔ وہ فوری طور پر ایئر فیلڈ کی عمارت کے اطراف میں پھیلنے لگے تھے۔ میں نے عبید سے کہا۔ ''اگر تم لوگوں کے پاس بم ہیں تو ان سے عمارت کے اوپر لگا ٹاور تباہ کر دو اس میں طویل فاصلے تک کام کرنے والے ریڈیو کے ایریل لگے ہیں۔''

''دوست تم اہم باتوں کی طرف توجہ دلا رہے ہو۔ خدا نے چاہا تو ہم صبح تک جزیرے پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیں گے۔'' عبید بولا۔

''اس پر کنٹرول کرنے کے بجائے یہاں سے بھاگنے کی فکر کرو۔ اگر ان لوگوں نے کال کر کے فوج منگوا لی تو ہم مارے جائیں گے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''بلکہ ابھی سے نکلنے کی تیاری شروع کر دو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن بندرگاہ تباہ ہونے سے شاید ہی کوئی جہاز سلامت رہا ہو۔ یہاں پر بھی چند ہی طیارے ہیں۔ ان میں مشکل سے چالیس پچاس افراد جا سکتے ہیں۔''

''بس اپنے ساتھیوں کو لے کر نکل چلو باقی افراد کو ان کی قسمت پر چھوڑ دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''ہم روشنی ہونے سے پہلے جزیرے سے نکل جائیں تو بہتر ہے۔''

''جب تک یہ لوگ عمارت میں ہیں طیارے استعمال کرنا ممکن نہیں ہوگا۔''

''تب اپنے ساتھیوں سے کہو عمارت تباہ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو عبید سفاکانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''یہ لوگ ہتھیار ڈالیں گے تب بھی میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ہزاروں انسانوں کے قاتل اور لاکھوں لوگوں پر ظلم کے ذمے دار ہیں۔''

مجھے جیوریل کا خیال آیا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''وہ عمارت میں حملہ کرنے والوں میں شامل ہے۔'' عبید بولا۔ ''احمد کو ہوش آ گیا تھا لیکن فی الحال وہ ہسپتال میں ہی ہے۔''

میں اور عبید جیپ پر سوار ہو کر قصبے کی طرف واپس جانے لگے۔ اس کے ساتھیوں نے ایئر فیلڈ کی عمارت پر دھاوا بول دیا تھا۔ قصبے کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ اگرچہ روشنی بند تھی لیکن جا بجا لگی آگ سے شعلے قصبے کو روشن کرنے کے لیے کافی تھے۔ معاً مجھے سمترا کا خیال آیا۔ میں اسے بھول ہی گیا تھا۔ عبید سے جیپ لے کر میں اس عمارت کی طرف گیا جہاں سمترا تھی۔ اس کی حالت

بھی تباہ تھی۔ اندر باہر کے سارے شیشے ٹوٹے پڑے تھے۔ ایک ہجوم نزدیک ہی واقع ریستوران کو برباد کر رہا تھا۔ اس کے فرنیچر سے بھی شعلے اُٹھ رہے تھے۔ میں جیپ روک کر بھاگتا ہوا جیوریل کے کمرے کی طرف گیا۔ سیڑھیوں پر ایک عریاں عورت کی لاش پڑی تھی۔ عمارت میں ایمرجنسی لائٹ سسٹم تھا اس وجہ سے ہر طرف معمولی روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ میرا دل لاش دیکھ کر رُک سا گیا لیکن وہ کوئی اور تھی۔ ممکنہ طور پر ان عورتوں میں سے تھی جو عیاشی کی غرض سے لائی گئی تھیں۔ اسے عصمت دری کے بعد بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ جیوریل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو اندر سے کسی کے غرانے کی آواز آئی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے دروازے پر لات ماری۔ جیوریل کے ساتھی سیاہ فاموں میں سے ایک سمترا پر جھکا تھا دوسرا فرش پر دراز تھا۔ اس سے زیادہ دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ ایک ہی برسٹ نے دونوں سیاہ فاموں کو چھلنی کر دیا تھا۔ سمترا اتڑی مڑی گڑیا کی طرح بستر پر ساکت پڑی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا وہ مر چکی ہے لیکن پھر اس کی آہستگی سے چلتی سانس دیکھ کر میں نے اسے ہلایا۔ اس کی تار تار ساڑھی اس کے جسم پر ڈالی۔ اس کے گال تھپتھپائے، وہ غشی میں تھی۔ بے چاری سمترا، اس جزیرے پر ظلم و ستم کا نظام کم سے کم اس کے لیے جاری تھا۔ وہاں پر اسے پہنانے کے لیے کوئی اور لباس نہیں تھا۔ جیوریل کے چند سوٹ پڑے تھے۔ وہ اسے آنہیں سکتے تھے۔ میں نے اسے چادر میں لپیٹا اور نیچے لا کر جیپ میں ڈال دیا۔ پانچ منٹ بعد ہسپتال کے سامنے جیپ روکی تو وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ پتا چلا کہ عملے کے غیر سفید فام افراد جو ڈر کر بھاگ گئے تھے اب وہ واپس آ گئے تھے۔ میں نے بے ہوش سمترا کو بھی چینی ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ اس نے ابتدائی چیک اَپ کے بعد بتایا۔ تشویش کی بات نہیں ہے لڑکی شاک میں ہے چند گھنٹے میں اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔

میں نے احمد کو دیکھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ مگر بندھے شیر کی طرح کسمسا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے شکوہ کیا۔ ”برادر میرے بھائی باہر لڑ رہے ہیں اور مجھے برادر عبید یہاں لٹا گئے ہیں۔“

”وہ صحیح کر کے گئے ہیں۔ ابھی باہر تمہاری ضرورت نہیں ہے اور تمہارے لیے آرام ضروری ہے صبح سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔“

”برادر تم نے مجھے ایول سے بچا کر اپنا غلام بنا لیا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا مگر ایول جیسے شخص کے ہاتھ سے مرنا مجھے بہت بے عزتی والی بات لگ رہی تھی۔“

”بھول جاؤ اس بات کو اور ہاں ابھی ایک لڑکی یہاں لائی جائے گی اس کا خیال رکھنا اس پر مردوں نے بہت ظلم کیا ہے۔ اس کا دل بہلانا۔“

”تم فکر نہ کرو برادر۔“ احمد نے کہا تھا۔

ہسپتال سے میں ایرینا والی زیرِ زمین عمارت کی طرف آیا۔ اوپر سے مختصر سی نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے خاصے وسیع رقبے پر پھیلی تھی۔ پہلے لیول پر دفاتر اور معمولی سہولیات تھیں۔ دوسرے





لیول پر کلب تھا، تیسرے لیول پر وہ خفیہ عشرت کدے تھے جہاں اس دنیا کی ہر ممکنہ عیش کی چیز موجود تھی اور جہاں ہونے والے کام شیطان کو شرمانے کے لیے کافی تھے۔ اس سے نیچے ایرینا تھا۔ مگر ایرینا تک آنے جانے کا راستہ الگ تھا۔ اس کے لیے باقی تین لیولز سے گزرنا ضروری نہیں تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو عبید صلاح کے ساتھی میجر ایڈم کے خفیہ ذخیرے سے سی فورس دھماکہ خیز مادہ لے آئے تھے مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عمارت کو کیسے تباہ کیا جائے۔ اندر گھستے تو مورچہ بند گارڈز تھے۔ وہ کسی کو پہلے لیول تک بھی پھٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ نہ صرف میں بلکہ عبید بھی یہاں سے نکلنے سے پہلے بُرائی کے اس اڈے کو ہر صورت ختم کرنا چاہتے تھے۔

”کیوں نہ بم بنا بنا کر نیچے پھینکنا شروع کر دیں۔“ ایک سادہ لوح نے مشورہ دیا۔

”یہ عمارت ایسے تباہ نہیں ہوگی اس کا بنیادی اسٹرکچر بہت مضبوط ہے۔“ میں نے کہا۔ ”برادر میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے مگر اس کے لیے دو جرأت آزما افراد کی ضرورت ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ عبید بولا اور جیوریل بھی سامنے آ گیا۔

”نہیں برادر تم نہیں۔“ میں نے عبید کو مسترد کر دیا۔ ”بلکہ ایک آدمی بھی کافی ہے اور وہ جیوریل ہے، مگر اتنا بتا دوں کہ یہ موت کا مشن ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”برادر تم مرنے میں مجھے خود سے آگے پاؤ گے پیچھے نہیں۔“ اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

”برادر ہمیں کم سے کم پانچ کلو گرام سی فورس چاہیے۔“ میں نے عبید بن صلاح سے کہا۔

”زیادہ مل جائے تو اور بھی اچھا ہے۔“

”سی فورس بہت ہے۔ میرے پاس ایک بم سازی کا ماہر ہے۔ وہ کھلونا بم بنانے والی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ میں اس سے کہتا ہوں۔“

یہ ماہر کورین تھا اور خاص طور سے اس فیکٹری کے لیے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اسے کس طرح کا بم بنانا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ صرف ایک گھنٹے میں اس قسم کا دس کلو گرام وزنی بم تیار کر دے گا۔ وہ بم بنانے گیا۔ دوسری طرف عبید صلاح قصبے سے اپنے آدمیوں کو جمع کر رہا تھا۔ جو گروپ بندرگاہ کی طرف گیا تھا اس نے آ کر بتایا کہ وہاں کچھ بھی سلامت نہیں رہا تھا۔ بندرگاہ کے اوپر چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گری تھی اور اس نے بندرگاہ پر کھڑے تمام بحری جہازوں کو تباہ کر دیا تھا لیکن جزیرے کے باہر کچھ پیٹرول بوٹس تھیں اور وہ ساحل کی طرف آنے سے گریز کر رہی تھیں۔ جان گرے نے بتایا تھا کہ جزیرے کے گرد چھ پیٹرول بوٹس ہمہ وقت گشت کرتی رہتی تھیں اور ایک بوٹ پر پانچ چھ افراد ہوتے تھے گویا تیس سے پینتیس مسلح افراد باقی تھے اور ہمیں ان کی طرف سے خطرہ ہو سکتا تھا لیکن فی الحال اس خطرے پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا یہ سامنے آتا تو دیکھا جاتا۔ عبید بن صلاح نے میرا منصوبہ دریافت کیا۔

”میں یہ بم لفٹ میں رکھ کر اس کے اوپری وائرز کاٹ دوں گا اور لفٹ جب سب سے نچلے

لیول پر گرے گی تو اس میں رکھا دھماکہ خیز مادہ سب تباہ کر دے گا۔"

عبید بن صلاح نے غور کیا۔"جو یہ کام کرے گا وہ کیسے بچے گا اس کے پاس وقت کم ہوگا۔"

"یہی اس کام کا سب سے خطرناک پہلو ہے۔ ایک بار لفٹ کا رسہ کٹ جانے کے بعد بھاگنے کے لیے مشکل سے نصف منٹ کا وقت ہوگا۔"

"میں تمہیں اس کام کی اجازت نہیں دے سکتا۔" عبید صلاح بولا۔

"یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا اس وقت آرگنائزیشن کے اہم ترین افراد یہاں موجود ہیں ان کے مارے جانے سے آرگنائزیشن کی کمر ٹوٹ جائے گی۔" میں نے اصرار کیا۔"یہ کام کرنا اور اس مرکز کو تباہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہ لوگ بچ گئے تو دوبارہ کہیں اور ظلم کا بازار گرم کریں گے۔"

"برادر اگر ایسی بات ہے تو میں بم لے جاتا ہوں۔ لفٹ کا رسہ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود لفٹ نیچے لے جا کر بم اُڑا دوں گا۔" جیوریل نے پیش کش کی۔

"یہ ممکن نہیں ہے بجلی نہ ہونے سے اس وقت تمام لفٹس بند پڑی ہیں۔" میں نے توجہ دلائی۔

عبید بن صلاح سے میری بحث ہوتی رہی اور کچھ دیر میں کورین ماہر نے آ کر بم تیار ہونے کی خبر سنائی۔ اس نے بم ایک بکس میں نصب کیا تھا۔ بکس پر دو بٹن تھے۔ ایک زرد اور ایک سبز اس نے بتایا۔"زرد بٹن دباتے ہی بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ سبز بٹن دبانے کے ایک منٹ بعد بم پھٹے گا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے دس بارہ فٹ کی بلندی سے پھینکا جائے تو دھچکے سے ڈیٹونیٹر کی کشتیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اس سے بھی بم بلاسٹ ہو جائے گا۔"

"تم نے بہترین کام کیا ہے دوست۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا اور جیوریل کو بیگ اُٹھانے کا اشارہ کیا جس میں بم والا بکس تھا۔ عبید صلاح نے ایک بار پھر مجھے روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں برادر...... مجھے مت روکو۔ ہاں اگر میں واپس نہ آ سکا تو لندن میں کاجل تک یہ اطلاع ضرور پہنچا دینا۔" اس نے مجھے زور سے سینے سے لگایا اور پھر ایک جھٹکے سے دوسری طرف مڑ گیا۔ عبید کے جانبازوں نے پہلے لیول کے اوپری حصے پر مکمل طور پر قبضہ جما رکھا تھا اور دونوں فریقوں کے درمیان فائرنگ جاری تھی۔ لفٹ اور سیڑھیاں میدانِ جنگ کے پاس ہی تھیں۔ ہم سر جھکائے بھاگتے ہوئے لفٹس تک پہنچے۔ جیوریل نے بڑے پھل والا چاقو لفٹس کے دروازوں کے درمیان میں پھنسا کر زور لگا کر اسے ذرا سا کھولا اور پھر خلا میں اپنی انگلیاں ڈال کر دونوں پٹ مکمل طور پر کھول دیئے مگر سامنے خلا تھا۔ جیوریل نے نیچے دیکھا۔"لفٹ نچلے فلور پر ہے۔"

میں نے طاقتور ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ لفٹ کوئی تیس فٹ نیچے کھڑی تھی۔"اس پر پہلے میں اُترتا ہوں پھر تم رسّی سے بیگ نیچے اُتارنا۔" میں نے جیوریل سے کہا اور خلا میں جھولتے لفٹ کے رسے کو تھام کر نیچے کی طرف پھسلنے لگا۔ مشکل سے ایک منٹ میں مَیں لفٹ کی چھت پر کھڑا تھا۔ سرا اوپر کر کے میں نے ٹارچ سے اشارہ کیا جیوریل بیگ کو رسّی سے باندھ چکا تھا۔ اس نے آہستہ



آہستہ اسے نیچے کرنا شروع کیا وہ ڈر رہا تھا کہ دھچکے سے بم چل نہ جائے۔ خدا خدا کر کے بیگ نیچے آیا تھا۔ لفٹ کی چھت پر ہوا کی آمد و رفت کے لیے جالی لگی تھی میں نے چاقو کی نوک سے یہ جالی الگ کی اور نیچے کود گیا۔ اس دوران میں جیوریل بھی نیچے آ گیا تھا۔ اس نے مجھے بم پکڑا دیا۔ میں نے اسے فرش پر رکھ کر بیگ کی زپ کھول دی اور خود واپس اوپر چڑھ گیا۔ میں نے جیوریل سے کہا۔"تم اوپر جاؤ میں رسہ کاٹ کر دوسرے رسے کے سہارے اوپر آ جاؤں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔"برادر یہ کام میں کروں گا تم اوپر جاؤ۔ انکار مت کرنا ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کا عزم اس کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے سینے سے لگا اور رسہ تھام کر اوپر جانے لگا۔ کھلے دروازے سے باہر آ کر میں نے نیچے دیکھا۔ جیوریل نے ہاتھ ہلایا۔"جاؤ برادر۔"

"جیوریل فائر کر کے رسہ کاٹ دو۔ تم خود اوپر آ جاؤ گے۔" میں نے چلا کر کہا تھا۔

"برادر تم جاؤ یہاں سے۔" جیوریل نے جالی الگ کرتے ہوئے کہا۔

"جیوریل۔" میں چلایا لیکن اس نے ہاتھ اوپر کر کے رسے پر فائر کیا۔ دوسرے فائر میں رسہ کٹ گیا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ دوسرا رسہ اوپر نہیں جا رہا تھا گویا ہم اس پر بھروسہ کر کے رسّہ کاٹ دیتے تو ہمیں نکلنے کا موقع نہیں ملتا۔ جیسے ہی لفٹ جھٹکے سے نیچے گئی میں اُچھل کر بھاگا اور چیخ چیخ کر دوسروں کو بھی وہاں سے بھاگنے کو کہا تقریباً اُڑتے ہوئے میں عمارت سے باہر نکلا تھا۔ ابھی دس بارہ قدم آگے گیا ہوں گا کہ زیرِ زمین شدید قسم کی گڑگڑاہٹ نے میرے پاؤں اُکھاڑ دیئے تھے اور میں تقریباً اُڑ کر سامنے سڑک پر جا گرا تھا۔ میرے سامنے زمین پھٹی تھی اور عمارت کی جگہ شعلوں کا فوارہ تھا۔ گڑگڑاہٹ سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اُڑتے ملبے سے بچنے کے لیے میں ذرا آگے کھڑی جیپ تلے گھس گیا تھا۔ پتا نہیں عمارت سے نکلنے والے باقی افراد کا کیا حشر ہوا۔ مگر جیوریل کا یقیناً اب کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔

جیوریل نے شاید دیکھ لیا تھا کہ لفٹ کے رسے ایک دوسرے سے الگ کام کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے اس نے خود کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس جگہ کی تباہی یقینی بنانے کے لیے اس نے جان دے دی تھی۔ میں جیپ تلے سر زمین سے ٹکائے جیوریل کو یاد کر رہا تھا۔ کتنا مختصر سا ساتھ تھا ہمارا لیکن مجھے ساری عمر یاد رہے گا۔ نہ جانے کب ملبے کی سنگ باری رُک گئی تھی۔ عبید بن صلاح نے جیپ کے ملبے تلے جھانکا۔"برادر یوسف...... نکل آؤ، مبارک ہو زیرِ زمین عمارت مکمل طور پر تباہ ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔" میں جیپ تلے سے نکل آیا۔"لیکن میں نے نہیں...... جیوریل نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔"

جیوریل کی قربانی کا سن کر عبید بن صلاح ساکت رہ گیا تھا۔ پھر ہم دونوں نے اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ عبید چونکا۔ ''ہمیں اب نکلنا ہے آؤ ہسپتال سے احمد کو لیں۔''

ہنگامے اب دم توڑ رہے تھے۔ جزیرے پر شاید ہی کوئی شخص زندہ رہا تھا جس کا تعلق آرگنائزیشن سے تھا۔ نوجوانوں کے گروپ جا بجا سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ میں جانتا تھا ان سب کو لے جانا ممکن نہیں تھا اور پھر جب آرگنائزیشن کے دوسرے اڈوں سے مدد آتی تو یہ لوگ مارے جاتے۔ ہمارا غصہ ان پر اُتر تا۔ میں عبید کے برابر میں خاموش بیٹھا اس خوب صورت جگہ کی تباہی دیکھ رہا تھا۔ جیپ تباہ شدہ شاپنگ ایریا سے گزری۔ تمام ہی دکانیں لوٹ کر جلا دی گئی تھیں۔ ان میں سے اس تمباکو والے کی دکان بھی شامل تھی جس کے توسط سے میں عبید بن صلاح سے رابطہ کرتا تھا۔ میں نے اسے عبدالقیوم کے بارے میں بتایا کہ موت کس طرح اسے شارک کے روپ میں جھپٹ کر لے گئی۔ عبید دکھی ہو گیا تھا۔

''عبدالقیوم بہت بہادر آدمی تھا۔ ایٹمی ری ایکٹر کی سرنگ کا پتا اسی نے جلایا تھا۔''

''نہ جانے اس شارک کا اس تباہی میں کیا حال ہوگا جس کے پیٹ میں عبدالقیوم ہے۔''

''پتا نہیں...... لیکن جو آدمی بندرگاہ دیکھ کر آئے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ ری ایکٹر کے آس پاس سمندر کا پانی سرخی مائل ہو کر اُبل رہا ہے۔ شاید ری ایکٹر سے تاب کار ایندھن رس کر سمندر تک چلا آیا ہے۔''

''اس سے سمندر کو خطرہ تو نہیں ہوگا۔''

عبید بن صلاح نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے ہو لیکن انسانی آبادی اس جگہ سے دور ہے اس لیے میرے خیال میں انسانوں کے لیے یہ خطرناک نہیں ہوگا۔''

جیپ ہسپتال کے سامنے روک کر ہم اندر گئے وہاں عملہ ہنگاموں میں زخمی ہونے والوں کا علاج کر رہا تھا۔ احمد کے کمرے میں سمترا بھی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ احمد کے ساتھ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''یوسف صاحب...... آپ کا دوست بہت اچھا آدمی ہے۔ مجھے ہنستا رہا ہے۔''

''یہ واقعی اچھا آدمی ہے۔ اب تم دونوں تیار ہو جاؤ۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے۔''

احمد نے سر ہلایا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہیں اور سے آرگنائزیشن والے آئیں ہمیں اس جزیرے سے چلے جانا چاہیے۔''

سمترا چونکی تھی۔ ''ہم کہاں جائیں گے صاحب جی؟''

''فی الحال تو اس جزیرے سے نکلنا ہے اس کے بعد کسی محفوظ مقام تک جا کر تمہیں تمہارے گھر واپس پہنچانے کی کوشش کریں گے۔''

وہ ہچکچا کر بولی۔ ''میں...... میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی۔''




''اپنے گھر نہیں جاؤ گی تو پھر کہاں جاؤ گی۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم لوگوں کے پاس رہوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی باتوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے احمد اور عبید کو آگاہ کیا تو وہ مسکرانے لگے تھے۔ احمد نے اس سے کہا۔ ''تم جانتی ہو ہم موت سے کھیلنے والے لوگ ہیں۔ ایک دنیا ہمارے پیچھے پڑی ہے۔ ہماری زندگیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔''

''موت تو ہر صورت آنی ہے لیکن میں مزید اس دنیا کے ظلم نہیں سہہ سکتی اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے ہو تو بہتر ہے اپنے ہاتھ سے مار دو۔'' وہ جذباتی ہونے لگی تھی۔ ہسپتال کے عملے نے اسے مریضوں والا ڈھیلا سا پاجامہ اور کُرتا پہنا دیا تھا لیکن اس میں بھی وہ دلکش لگ رہی تھی۔

''اس پر بعد میں سوچیں گے۔ ابھی یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

احمد کی حالت بہتر تھی وہ از خود چل پھر سکتا تھا۔ عبید نے ہسپتال میں موجود اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے انہیں ایئر فیلڈ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے ایک نرس نے میری خراشوں اور زخموں کو صاف کر کے ان پر دوا لگا دی تھی اور جہاں پٹی کی ضرورت پڑی وہاں پٹی چپکا دی تھی۔ ہم ہسپتال سے باہر نکلے۔ عبید، احمد کو جزیرے کی مرکزی عمارت کی تباہی کے بارے میں بتانے لگا۔ جہاں آرگنائزیشن کی ہائی کمان موجود تھی۔ میں جیپ چلاتا رہا۔ میں نے عبید کو یاد دلایا۔

''ابھی کئی افراد ایئر فیلڈ والی عمارت میں ہیں۔ ان کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔''

مگر جب ہم ایئر فیلڈ کے پاس پہنچے تو صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور عبید صلاح کے کئی ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اصل میں عمارت کے آس پاس کوئی ایسی رکاوٹ نہیں تھی جس کی آڑ سے عمارت پر حملہ کیا جا سکتا۔ البتہ بم مار کر عمارت کے اوپر لگا مواصلاتی ٹاور گرایا جا چکا تھا۔ یعنی اب اندر موجود افراد ریڈیو پر مدد طلب نہیں کر سکتے تھے ہاں وہ پہلے ہی مدد کا پیغام نشر کر چکے ہوں تو اور بات تھی۔ میں نے عبید صلاح سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں کے پاس راکٹ یا گرینیڈ لانچر نہیں ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر ہمارے پاس راکٹ یا گرینیڈ ہوتے تو اب تک یہ عمارت کھڑی ہوتی۔''

مجھے دھماکا خیز مادے کا خیال آیا۔ ''کیا اس سے عمارت کو نہیں اُڑایا جا سکتا۔''

''ہاں...... لیکن مادے کو عمارت تک پہنچایا کیسے جائے۔''

''کیسے پہنچایا جائے؟'' میں نے سوچا اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے عبید صلاح کے ساتھ آنے والے کورین ماہر سے پوچھا۔ ''کیا تم فوری طور پر ایک چھوٹا بم بنا سکتے ہو جو جھٹکے سے پھٹ

جائے۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن مجھے واپس جانا پڑے گا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس سے کہا دو آدمی اور ساتھ لے کر ہم تیزی سے واپس قصبے کی طرف آئے۔ ماہر نے دھماکہ خیز مادہ لیا اور میں اسے لے کر شاپنگ ایریا کی طرف آیا۔ وہاں ایک بڑا سا سپر سٹور تھا جس میں کھلونے بھی تھے۔ میں نے ماہر کو بم بنانے کے لیے کہا اور خود کھلونوں والا سیکشن کھنگالنے لگا۔ ہنگامہ اور لوٹ مار کرنے والوں نے اس جگہ کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا۔ فرش پر ٹوٹے کھلونوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ریکس تک توڑ دیئے گئے لوگوں نے۔ میں کھلونوں کے اس ڈھیر کو چیک کرنے لگا۔ خاصی تگ و دو کے بعد مجھے ایک کھلونا ٹرک ملا جسے ریموٹ سے چلایا جا سکتا تھا۔ اس ٹرک کے ساتھ ننھا سا ریموٹ بھی تھا۔ میں نے تلاش کر کے ڈرائی سیل ٹرک اور ریموٹ میں لوڈ کیے۔ پھر اسے چلا کر دیکھا۔ یہ خاصا تیز رفتار کھلونا ٹرک تھا۔ اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر میں اسے کورین ماہر کے پاس لایا۔ "بم اس ٹرک میں نصب کرنا ہے۔"

"ہو جائے گا۔ ایک منٹ رُکو۔" کورین ماہر نے تیار کیا بم ٹیپ کی مدد سے ٹرک سے باندھ دیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اس کی آزمائش کی تھی تقریباً ایک کلوگرام وزنی بم لے کر بھی ٹرک خاصی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے اس کی اضافی بیٹریاں لیں اور ہم واپس ایئر فیلڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ایئر فیلڈ کی عمارت میں اندر موجود افراد اس طرح مورچہ بند تھے کہ باہر سے ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اگر دھماکے سے اس عمارت کو اُڑا دیا جاتا تب ہی ہم رن وے پر موجود طیاروں کی طرف جانے والے کسی بھی فرد کو با آسانی شوٹ کر سکتے تھے۔
عبید صلاح نے ٹرک کے بارے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہمارا خود ساختہ گائیڈڈ میزائل......" میں نے ٹرک رن وے پر رکھ کر چلا کر دکھایا۔ "ابھی یہ عمارت پر خودکش حملہ کر کے اسے تباہ کر دے گا۔"

"لیکن انہوں نے دور سے اسے گولی سے اُڑا دیا تو۔" احمد نے نقطہ اُٹھایا۔

"میرا خیال ہے عقبی طرف سے حملہ کیا جائے۔" عبید نے تجویز پیش کی۔ "وہ اس طرف نظر نہیں رکھ سکتے۔"

"لیکن وہ چھت پر ضرور ہوں گے۔" میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ "خطرہ مول لینا پڑے گا۔"

میں اور عبید جھکے جھکے گھوم کر ایئر فیلڈ کی عمارت کے عقبی حصے کی طرف آئے۔ اس طرف صرف ایک سیدھی اور سپاٹ سی دیوار تھی۔ چھت کی منڈیر خاصی اونچی تھی۔ مسلسل فائرنگ سے عمارت کے اطراف میں لگی ہوئی ایمرجنسی لائٹس بھی ٹوٹ گئی تھیں اور اب اس طرف اندھیرا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ٹرک نظر نہیں آئے گا اس کی ساری روشنیاں کورین ماہر پہلے ہی خراب کر چکا تھا۔ اس




لیے ٹرک کا نظر آنا محال تھا۔ اس کا رُخ عمارت کی طرف کر کے میں نے ریموٹ سے چلایا ٹرک خاصی تیز رفتاری سے عمارت کی طرف لپکا تھا۔ میں نے ریموٹ سے اسے پوری رفتار دی تھی۔ عبید صلاح کے تین چار ساتھی بھی وہاں آ گئے تھے۔ عبید انہیں سمجھا رہا تھا کہ جیسے ہی دھماکہ ہو اور عمارت کا عقبی حصہ منہدم ہو وہ فائرنگ کرتے ہوئے اس ٹوٹے حصے سے اندر گھس جائیں۔ ٹرک عمارت کے پاس پہنچ گیا تھا میں نے چلا کر کہا۔ "سب نیچے ہو جائیں۔"
اگلے لمحے ٹرک عمارت سے ٹکرایا ایک اعصاب شکن دھماکے کے بعد میں نے عمارت کے اس حصے کو گرتے دیکھا۔ سی فورس واقعی بہت خطرناک دھماکہ خیز ثابت ہوا تھا اس کے دو کارنامے میں دیکھ چکا تھا۔ ایک کلوگرام وزنی بم نے نصف کے قریب عمارت ملبے کا ڈھیر بنا دی تھی۔ عبید بن صلاح کے ساتھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر عمارت کے چاروں طرف سے دوڑ پڑے تھے۔ عقبی طرف سے جانے والے چار افراد ملبہ پھلانگتے اور فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس گئے تھے۔ میں نے عبید صلاح سے کہا۔ "اپنے ساتھیوں سے کہو طیاروں کو ہر قیمت پر بچائیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔" عبید نے مجھے تسلی دی اور ہم عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف واپس آ گئے تھے۔

فائرنگ کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ اندر سے مزاحمت ابھی بھی جاری تھی۔ سمترا خاصی دہشت زدہ لگ رہی تھی اس سے پہلے کبھی اس طرح کی قتل و غارت گری نہیں دیکھی تھی۔ تنہائی پاتے ہی اس نے سرگوشی میں مجھے اپنے اوپر بیتنے والی کہانی سنائی تھی۔ "آپ کے جانے کے بعد وہ کالا مجھے اپنے دو ساتھیوں کے پاس چھوڑ کر چلا گیا اس سے کہا تھا کہ میرا خیال رکھیں مگر وہ شاید سیڑھیوں سے بھی نہیں اُترا ہو گا کہ دونوں مجھ پر ٹوٹ پڑے ایک نے میرا منہ دبا دیا کہیں چیخ نہ ماروں اور دوسرے نے......"

"تم اس وقت بے ہوش تھیں ورنہ دیکھتیں میں نے ان کا کیا حشر کیا تھا۔"

"آپ نے انہیں مار دیا۔" وہ خوشی سے بولی تھی۔

"کتے کی موت۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے ساتھی نے ان پر بھروسہ کیا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا زندہ ہوتا تو خود انہیں کتے کی موت مارتا۔"

"وہ مر گیا۔" سمترا چونکی تھی۔

میں نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "ہاں...... وہ ایرینا والی زیرِ زمین عمارت تباہ کرنے گیا تھا۔ خود بھی مارا گیا۔ میرا خیال ہے ان دو کالوں کے بقایا دو ساتھی بھی اس عمارت میں مارے گئے۔"

"ان کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے تھا۔" وہ بولی۔ "وہ بھی مجھے ایسی ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بات پوچھوں صاحب۔" وہ بولتے بولتے جھجک گئی تھی۔

"ہاں پوچھو۔" میں نے کہا۔

''صاحب یہ جو آپ کا ساتھی ہے۔ اگر اسے پتا چلا کہ میں کہیں بے آبرو عورت ہوں تو کیا وہ مجھ سے نفرت کرے گا۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں اس سے کیا کہ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔''

''وہ ایسے ہی صاحب۔'' وہ نروس ہو گئی تھی۔

''دیکھو سمترا میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا خاص طور سے اس بارے میں کہ وہ عورتوں کے لیے کس طرح سوچتا ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ اچھا آدمی ہے اور اچھا آدمی کسی مظلوم سے نفرت نہیں کرسکتا ہے۔ میں اسے تمہارا خیال رکھنے کو کہہ کر گیا تھا اور اس نے کتنی تیزی سے تمہیں سنبھال لیا۔ ڈاکٹر بھی اس بات پر حیران تھا کہ تم اتنی جلدی شاک سے نکل آؤ گی۔''

وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ ''ہاں صاحب جب میں کمرے میں آئی تو یہ مجھ سے بات کرنے لگا پھر نہ جانے کیسے میں بھی اس کی باتوں کا جواب دینے لگی اور پھر ہنسنے لگی۔''

''سمترا میرا دل کہتا ہے کہ یہ تم سے کبھی نفرت نہیں کرسکتا۔''

اسی لمحے احمد اسی طرف آیا تھا۔ وہ بھی عمارت پر حملہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ جب تک وہ عمارت میں رہا سمترا بے چین رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کھل گئی تھی بے تابی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''تم ٹھیک ہونا۔''

''ہاں...... مجھے کیا ہونا تھا البتہ دو بدنسل گورے اور ایک ذلیل شخص کو مار کر آرہا ہوں جو نام نہاد مسلمان اور عرب تھا۔'' احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''او بندہ خدا کسی کو زندہ بھی پکڑا ہے یا سب کو مار دیا۔ ابھی ان سے جزیرے کے محلِ وقوع کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔''

''دو پائلٹ زندہ پکڑے گئے ہیں۔'' احمد ہنسا وہ بہت مسرور لگ رہا تھا۔ ''برادران سے پوچھ گچھ کررہا ہے۔'' میں ایئر فیلڈ کی عمارت کی طرف بڑھا، ہم نے اس کا نصف حصہ تو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ بقیہ نصف بھی بُری حالت میں تھا اس لیے سب باہر نکل آئے تھے۔ میں نے اندر دیکھا، بے شمار لاشیں پڑی تھیں، یہ سب آرگنائزیشن کے خاص افراد تھے یا اس جزیرے پر آئے ہوئے عیاش افراد تھے۔ وہ سب موت سے فرار ہونا چاہتے تھے مگر ان کے لیے مہلت ختم ہو گئی تھی۔ ان میں وہ جج بھی تھا جس نے نہایت رعونت سے احمد کو سزائے موت سنائی تھی۔ اور میجر ایڈم بھی جو جزیرے کی حفاظت کا ذمے دار تھا لیکن اپنی حفاظت نہ کرسکا تھا۔ اچانک مجھے جان گرے کا خیال آیا اور میں ان لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک دو مسخ ہو جانے والی لاشوں پر مجھے جان گرے کا شبہ ہوا تھا۔ مگر پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا جان گرے ان لوگوں میں نہیں تھا۔ وہ ممکنہ طور پر ایرینا والی زیرِ زمین عمارت میں ہی مارا گیا تھا۔ اگرچہ جان گرے میرا دوست نہیں تھا اور وہ آرگنائزیشن کا ایک بڑا تھا جو دنیا کے اس خطے میں بدامنی کی ذمے دار تھی۔ ہزاروں افراد کی قاتل اور لاکھوں لوگوں کے مصائب کی ذمے




داری تھی۔ جان گرے خود بھی کوئی پاک دامن شخص نہیں تھا۔ خلیج پر سوار دو درجن سے زیادہ افراد اس کے ہاتھوں ختم ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس کے مرنے کا سوچ کر مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا یہ دکھ تو نہیں تھا مگر اس سے ملتی جلتی کوئی کیفیت تھی۔ میں عبید بن صلاح کے پاس آیا جو ایک بڑے سے نقشے پر پائلٹوں سے جزیرے کی لوکیشن سمجھ رہا تھا۔ پائلٹوں نے اسے جو پوزیشن بتائی تھی وہ بحرِ ہند کے تقریباً وسط میں پڑتی تھی۔ اس جگہ سے نزدیک ترین ساحل افریقہ کا تھا جو تقریباً بارہ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ جگہ امریکہ کے بحرِ ہند کے فوجی اڈے ڈیگو گارشیا سے اکیس سو میل دور تھی۔ اگر اس طرف سے کارروائی کی جارہی تھی تب بھی ہمارے پاس وقت تھا کہ ان کے آنے سے پہلے جزیرے سے نکل جائیں۔ رن وے پر چار عدد طیارے کھڑے تھے۔

''ہمیں افریقہ کی کسی ساحلی ریاست تک جانا ہے۔'' عبید نے ان پائلٹس سے کہا۔

''ہم لے جائیں گے لیکن ہمیں زندگی کی ضمانت ملنی چاہیے۔'' ایک پائلٹ بولا۔

''کوئی ضمانت نہیں ہے تمہیں ہمارے کہے پر چلنا ہوگا لیکن اطمینان رکھو ہم کسی کو بلاوجہ قتل کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔''

''اتنی ساری لاشوں کے ہوتے ہم یہ بات کیسے تسلیم کرلیں۔'' دوسرا پائلٹ طنزیہ انداز میں بولا۔

''مت مانو۔'' میں غرایا۔ ''گولی مارو انہیں طیارے ہم بھی اُڑا سکتے ہیں ہمارے پاس بندے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ خوف زدہ انداز میں بولے۔

''تب خاموشی سے ہمارے کہنے پر عمل کرو۔''

عبید مجھے ایک طرف لے گیا۔ ''یہ تو صرف دو پائلٹس ہیں، باقی دو طیارے کون لے جائے گا۔''

''معلوم کرو شاید تمہارے ساتھیوں میں کوئی پائلٹ ہو۔'' میں نے کہا۔

عبید پائلٹوں کی تلاش میں نکلا اور میں احمد اور سمترا کے پاس آیا۔ ''کیا تم لوگوں کو جزیرے میں کسی پائلٹ کے بارے میں پتا ہے جو طیارے اُڑا سکے۔''

احمد ہنسا۔ ''تم ایک پائلٹ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔''

میں خوش ہو گیا تھا۔ ''تمہیں طیارہ اُڑانا آتا ہے؟''

''میں مراکش ایئر لائن میں پائلٹ بھی رہا ہوں۔ کوئی بھی طیارہ اُڑانا میرے لیے مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

''چلو اب ایک طیارے کے لیے پائلٹ کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شاید مل جائے ورنہ کچھ اور لوگوں کو یہاں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔''

احمد طیاروں کی طرف جانے لگا۔ ''میں چیک کرتا ہوں کہ طیارے کس حالت میں ہیں؟''
میں نے سمترا سے کہا۔ ''تم احمد کے ساتھ رہو۔ میں ایک پائلٹ اور دیکھتا ہوں۔''
مجھے فکر تھی ہم نے یہاں سے نکلنے میں خاصی تاخیر کردی تھی۔ اگر بیرونی جزیرے سے کسی فوج نے دھاوا بول دیا تو ہم ان کے گھیرے میں آجاتے۔ عبید بن صلاح غائب تھا۔ اور باقی دو پائلٹس مسلح افراد کی نگرانی میں طیارے دیکھ رہے تھے۔ شاید عبید قصبے کی طرف گیا تھا۔ احمد میری طرف چلا آیا۔ ''چاروں طیارے ورکنگ کنڈیشن میں ہیں۔ مگر فیول کم ہے۔ ایک طیارے میں دو سو گیلن ہے وہ شاید ہی افریقہ کی سرزمین تک پہنچ سکے۔ باقی میں تین سو گیلن سے زیادہ ایندھن ہے۔ وہ کم سے کم ساحل تک آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ چوتھے طیارے کے لیے پائلٹ اور ایندھن کی ضرورت ہے۔''

''ان تین طیاروں میں کتنے افراد آسکتے ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔
''زیادہ سے زیادہ اٹھارہ افراد فی طیارہ یعنی کل پچاس پچپن افراد آسکتے ہیں۔''
''تب میرے خیال میں ہمیں چوتھے طیارے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''احمد تم سمترا کو اور کچھ ساتھیوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ فوراً۔''
''لیکن......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔
''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب وقت ضائع کرنا حماقت ہوگی۔ میں عبید کو دیکھنے جارہا ہوں ہم دوسرے طیارے سے آجائیں گے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''احمد وقت مت ضائع کرو جاؤ۔'' میں نے اسے دھکیلا۔ وہ چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے روایتی انداز میں میرے رُخساروں پر بوسے دیئے پھر سمترا مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے دونوں کو محبت سے دھکیلا۔ ''پلیز جاؤ دیر مت کرو۔''

وہ طیاروں کی طرف چلے گئے۔ احمد نے طیارے کا انجن سٹارٹ کیا اور لوگ دوڑ دوڑ کر اس میں سوار ہونے لگے۔ اٹھارہ افراد پورے ہوتے ہی طیارے کا دروازہ بند کردیا۔ ذرا دیر میں انجن پوری رفتار سے گرجنے لگے تھے۔ احمد نے ریس دے کر بریک چھوڑے تو طیارے نے آغاز میں ہی رفتار پکڑ لی۔ تیزی سے دوڑتے ہوا طیارہ کوئی چار سو گز دور جاکر ہوا میں بلند ہوگیا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنیاں مدھم ہوتی غائب ہوگئیں۔ اس اثناء میں ایک اور طیارے پر مزید اٹھارہ انیس افراد سوار ہو چکے تھے۔ اور ذرا سی دیر میں طیارہ رن وے میں دوڑنے کے بعد فضا میں بلند ہوگیا۔
اب رن وے پر واحد طیارہ کھڑا تھا اور پائلٹ سمیت کوئی درجن بھر افراد تھے۔ ایک دو شاید عبید کے ساتھ تھے اور وہ غائب تھے۔ میں نے ایئر فیلڈ پر موجود افراد سے پوچھا۔ ایک نے بتایا۔ ''میں نے برادر کو جیپ میں قصبے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''
''میرے خدا اس وقت اسے کیا ضرورت تھی جانے کی۔'' میں نے سر تھام لیا۔




میں ایک اور جیپ میں سوار ہوا اور قصبے کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستہ سنسان تھا۔ قصبے کا حال بدستور فساد زدہ تھا اور اب لوگ جگہ جگہ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہوکر آنے والے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ یہ بے چارے جزیرے سے نکل نہیں سکتے تھے اگر آرگنائزیشن والے نہ بھی مارتے تب بھی کچھ عرصے بعد یہ بھوک سے مرنے لگتے۔ جزیرے پر کھانے کا ذخیرہ جلد یا بدیر ختم ہی ہو جاتا۔ مگر اس کا امکان کم تھا۔ آرگنائزیشن قہر بن کر اس جزیرے پر نازل ہوتی اور اتنی خوف ناک تباہی کے بعد اس کے آتش غضب کی آگ ان لوگوں کو جلا دیتی۔
عبید بن صلاح مجھے ایک جگہ مل گیا۔ وہ طیارے کے لیے ایندھن کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے دس دس گیلن والے نو عدد کین حاصل کرلیے تھے۔ مگر کوشش کے باوجود اسے پائلٹ نہیں مل سکا تھا۔ میں نے اسے دو طیاروں کی روانگی کے بارے میں بتایا۔ ''ایک طیارے میں اٹھارہ افراد کی گنجائش ہے اور ہم ملا کر اس سے کم ہی ہیں اس سے پہلے کہ قصبے والے مشتعل ہوکر اس طرف کا رُخ کریں ہمیں نکل جانا چاہیے۔''
عبید بن صلاح مسکرایا تھا۔ ''مجھے معلوم تھا تم یہی کروگے اس لیے میں بے فکری سے چلا آیا۔''
ہم واپس ایئر فیلڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ چھ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے اور آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ سوا چھ بجے تک سورج نکل آیا تھا۔ ہمیں دن نکلنے سے پہلے جزیرے سے نکل جانا تھا۔ راستے میں فیول والی جیپ کا ٹائر پنکچر ہوا تو کین دوسری جیپ پر منتقل کرنے میں ذرا وقت لگا تاہم چھ بجے ایئر فیلڈ تک پہنچے تو روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ طیارے کے پاس اب دو درجن کے قریب افراد جمع تھے اور اتنے لوگ کسی صورت اس ایک طیارے میں سفر نہیں کرسکتے تھے۔ تاخیر کرنے کی وجہ سے ارد گرد سے چند اور افراد بھی آگئے تھے۔ خیر ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں عبید اور دو افراد تیزی سے طیارے کی طرف لپکے تھے۔ اس موقع پر وہ ہوا جس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے دائیں طرف سے کوئی شے بلائے ناگہانی کی طرح جھپٹی اور میں نے خود کو فضا میں پرواز کرتے پایا۔ زمین سے ٹکرانے کے خطرے کے احساس کے تحت جسم نے ایک خودکار پوزیشن اختیار کرلی اور میں گول مول ہوکر پختہ فرش پر گرا۔ شانے میں ایک ٹیس اُٹھی تھی مگر سر بچ گیا تھا۔ میں قلابازی کھا کر کھڑا ہوا تو ذرا فاصلے پر الیکٹرک کو پاؤں پھیلائے اور سینہ تانے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے حسبِ معمول سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور اس نے پاؤں اڑا کر مجھے گرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسکرایا۔
عبید کے دونوں ساتھیوں نے اپنی رائفلیں اس کی طرف سیدھی کی تھیں۔ میں نے چلا کر کہا۔
''رُک جاؤ۔''
''یوسف دیر ہورہی ہے اسے گولی مار کر قصہ ختم کرتے ہیں۔'' عبید اضطراب سے بولا۔
''الیکٹرک تم نے کیوں مجھے روکا ہے۔''
''میں تم سے مقابلہ کرنے یہاں آیا تھا اور تم مقابلہ کیے بغیر نہیں جاسکتے۔''

"میں تم سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ تھرکتا ہوا میرے گرد گھومنے لگا۔ "اس کی ایک ہی صورت ہے اپنے ساتھیوں سے کہو مجھے گولی مار دیں۔ ورنہ مجھ سے لڑو اور مجھے شکست دے کر چلے جاؤ۔"

"بکواس مت کرو۔" عبید بن صلاح نے اس کی طرف پستول کیا۔ "میں ابھی تمہاری خواہش پوری کر دیتا ہوں۔"

"نہیں عبید گولی مت چلانا۔" میں نے کہا اور الیکٹرک کی طرف دیکھا۔ "یہ احمقانہ جذباتیت کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں جانے دو اور خود بھی زندہ رہو۔" الیکٹرک کچھ دیر مسکراتا رہا تھا پھر اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "یوسف میں آٹھ ہزار میل کا سفر کر کے صرف تمہارے لیے یہاں آیا ہوں۔ محض موت کے خوف سے میں اس مقابلے سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یوسف ایک فائٹر کے لیے مقابلہ دنیا کی کسی بھی شے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ تم بھی تو کسی نہ کسی شے کے لیے اتنے جذباتی ہو کہ موت بھی تمہیں اس سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی ہو گی۔"

"یوسف گولی مارو اسے۔" عبید جھنجھلایا۔

"نہیں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے اپنے اندر موجود سنسنی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا الیکٹرک سچ مچ مرنے کو ترجیح دے گا اگر میں نے اس سے مقابلہ نہیں کیا اور میں اسے مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ "عبید تم لوگ جاؤ۔"

"کیا؟" وہ چلایا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو اس کے کہنے میں آ کر۔"

"پلیز عبید تمہیں اللہ کی قسم یہاں سے جاؤ۔ اگر خدا نے میری زندگی رکھی ہے تو میں آ جاؤں گا۔"

"یوسف کیا حماقت۔"

"پلیز عبید" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ میری درخواست ہے تم جاؤ، میں نہیں جا رہا اور تم مجھے زبردستی مجبور نہیں کر سکتے۔ الیکٹرک ایک شریف دشمن ہے۔ میں اس کی یہ خواہش پوری کروں گا۔"

میں چاہتا تو الیکٹرک کی زندگی لے کر جا سکتا تھا لیکن میرا ضمیر اس اَن فیئر پلے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور ضمیر پر خلش لے کر جینا میرے لیے مشکل تھا۔ بہت مشکل۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "پلیز عبید اسے ایک بھائی کی خواہش سمجھو۔ چلے جاؤ، تمہاری زندگی میرے لیے بہت قیمتی ہے مجھے لگ رہا ہے کہ وقت کم رہ گیا ہے۔ عبید چلے جاؤ۔" آخری الفاظ میں نے چلا کر کہے تھے۔

عبید چند لمحے مجھے دیکھتا رہا تھا پھر پلٹ کر طیارے کی طرف چلا گیا۔ دوسرا پائلٹ انجن چلا چکا تھا اور تیسرا طیارہ پرواز کے لیے تیار تھا۔ فالتو لوگ عبید کے ساتھیوں نے طیارے سے دور کر دیے تھے اور مطلوبہ تعداد پوری ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ طیارہ رینگنے لگا تھا اور پھر رفتار پکڑتے ہوئے





فضا میں بلند ہو گیا۔ میں اس جزیرے پر اکیلا تھا نہ کوئی دوست تھا اور نہ کوئی دشمن بس ایک حریف تھا، میں نے پلٹ کر الیکٹرک کی طرف دیکھا تھا۔

الیکٹرک مسکرا رہا تھا۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا مضبوط ہاتھ تھام لیا۔

"تم نے مجھے بہت غلط وقت پر روکا ہے۔ اب میں تمہیں شکست دے دوں تب بھی اس جزیرے سے نہیں جا سکتا۔ میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔"

وہ بولا۔ "لیکن تم مجبور نہیں تھے چاہتے تو جا سکتے تھے۔"

"مجبور تو تم بھی نہیں تھے چاہتے تو چھپے رہتے سامنے آنے کی حماقت نہ کرتے۔" میں مسکرایا۔ "تمہیں کیا مجبوری لاحق ہوئی؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "شاید ہم دونوں ہی اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہیں۔" وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ "الیکٹرک تم ایک بار میرے ہاتھوں شکست کھا چکے ہو۔ دوبارہ مقابلہ کرنے کی ضرورت کیوں ہوئی؟"

"میں خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں میں جانتا ہوں کہ تم پروفیشنل نہیں ہو اور ایک نان پروفیشنل سے شکست کھا کر خود کو عالمی چیمپئن شپ میں حصہ لینے کے قابل نہیں سمجھتا ہوں۔"

"ہاہا...... اگر تمہیں مجبوری لاحق تھی تو میرے سامنے کیوں آئے۔" میں کراہا۔ "پہلے بھی بادلِ نخواستہ تم سے لڑا تھا اور اب بھی۔"

"یوسف میں وعدہ کرتا ہوں۔ اس وقت تم نے جس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہماری لڑائی کا نتیجہ جو بھی ہو۔ تم پر کوئی آنچ اس صورت میں آئے گی جب الیکٹرک اس دنیا میں نہ ہو۔"

وہ پینترے بدلنے لگا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔ پیروں کو برق رفتاری سے آگے پیچھے کرتا حریف کے گرد دائرے میں گھومنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ میرے گرد رقص کے انداز میں گھوم رہا تھا۔ میں نے اپنی کسی قدر تنگ قمیص اُتار دی تھی۔ رن وے پر باقی رہ جانے والے افراد ہمارے گرد جمع ہو رہے تھے۔ یہ عام لوگ تھے۔ پہلا وار الیکٹرک نے کیا اس نے پلٹ کر مجھے گھونسے مارنے اور اس کی آڑ میں میرے گھٹنے پر ٹھوکر مارنے کی کوشش کی۔ میں نے بازوؤں پر گھونسے روک کر پاؤں موڑ کر گھٹنا بچایا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے دوسرے گھٹنے پر وار کیا۔ مجھے بچنے کے لیے گرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ مشینی انداز میں ٹھوکریں مارتا رہا اور میں انہیں ہاتھ پیروں پر روکتا رہا۔ ایک موقع پر اس کا پاؤں میری گرفت میں آیا اور میں نے اسے پوری قوت سے کھینچ لیا۔ اس بدبخت نے گرتے گرتے بھی میرے جبڑے پر زور سے پاؤں سے ٹھوکر لگائی میرا سر چکرا گیا تھا اور منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے اس کا پاؤں چھوڑ کر قلابازی کھائی اور جب کھڑا ہوا تو اسے سامنے پایا۔ بلاشبہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ پھرتیلا جسم رکھتا تھا۔ اس نے پھر میرے گھٹنے کو نشانہ بنانے کی کوشش

کی۔ میں نے پاؤں کو خم دیتے ہوئے اس ایڑی پر گھوم کر اس کی کمر پر لات ماری۔ پاؤں ہوا میں ہونے کی وجہ سے وہ غیر متوازن تھا۔ کمر پر لات کھا کر وہ اُچھلا اور قلابازی کھا کر مجھ سے چھ گز دور جا کھڑا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں چست اور برق رفتار ہو گیا تھا۔ شاید پچھلے دنوں وہ خصوصی مشق کرتا رہا تھا۔ میں محتاط ہو گیا۔ میں پوری طرح فٹ نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق میرے ٹشوز کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے اور کوئی بھی غیر معمولی محنت ان زخموں کو پھر سے ہرا کر سکتی تھی۔ الیکٹرک سے مقابلے کے لیے میرا جسمانی اور ذہنی طور پر چاق و چوبند ہونا ضروری تھا۔

ایک لمحہ کو میرے ذہن میں خیال آیا کہ الیکٹرک کو بتا دوں کہ میں پوری طرح فٹ نہیں ہوں۔ یہ مقابلے کے اصول کے خلاف تھا مگر پھر مجھے شرم آئی ممکن ہے وہ اسے میرا بہانہ سمجھے اور مجھے جھوٹا سمجھا جانا کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ الیکٹرک پھر رقص کرنے کے انداز میں میری طرف گھومنے لگا۔

اچانک اس نے ہوا میں جست لگاتے ہوئے لگاتار پاؤں پھر سے میرے منہ پر مارنے کی کوشش کی۔ میں ہتھیلیوں پر اس کے جوتے کی نوکیں روکتا پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ زمین پر اُترتے ہی اس نے اُچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کِک ماری اور میں اُچھل کر پیچھے جا گرا تھا۔ اس نے سپورٹ مین سپرٹ کا مظاہرہ کیا اور مجھ پر فوری طور پر حملہ نہیں کیا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ ایک بار پھر رقص کرنے میں لگ گیا تھا۔

''یوسف اگر تم ہار مان لو......''

''بکومت۔'' میں نے دانت پیسے، مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ''مجھ سے ہار منوانا چاہتے ہو۔'' یہ سنتے ہی اس نے پھرتی سے حملہ کیا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ ہم دونوں کے درمیان شدید قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ دونوں خون خون ہو گئے تھے۔ الیکٹرک کی کِک نے میری ٹھوڑی پھاڑ دی تھی اور میرے گھونسے نے الیکٹرک کی بھنوؤں میں شگاف ڈال دیا تھا۔ جس سے مسلسل خون رِس رہا تھا اسے بار بار آنکھ پر آنے والا خون صاف کرنا پڑتا تھا۔ مقابلہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ اردگرد کے افراد حالات کو بھول کر اس لڑائی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ لڑائی سے ہم دونوں کو بے شمار چوٹیں آئی تھیں اور میں اس وقت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اندرونی کمزوری رنگ دکھا رہی تھی۔ گزشتہ تین دن میں مجھے آرام کا موقع کم ملا تھا۔ پھر ری ایکٹر میں بم لگانے کا جان گسل مرحلہ طے کرنا پڑا تھا۔

میرے مقابلے میں الیکٹرک پہلے کی طرح چست تھا۔ چوٹوں سے اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا وہ اسی طرح لپک لپک کر حملے کر رہا تھا۔ میں بہ مشکل اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی میں اس لڑائی کے لیے بالکل بھی فٹ نہیں تھا۔ ایک بار الیکٹرک نے میرے منہ پر ٹھوکر ماری تھی اور میں پیچھے جا گرا تھا۔ منہ پر لگنے والی ضرب کے بعد سر رن وے سے ٹکرایا تو دوسری چوٹ نے میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے گھوم کر رہ گئی تھی۔ میں اپنے چکراتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ بہ مشکل میں ضرورت سے زیادہ پی لینے والے کسی شرابی کی طرح بھڑکتے





ہوئے اُٹھا تھا۔ الیکٹرک چھ قدم کے فاصلے پر سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں چیلنج تھا۔

''یوسف......اگر تم ہار مان جاؤ تو میں دوبارہ تم پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔''

اردگرد موجود افراد نعرے بازی کر رہے تھے۔ اور ان میں سے اکثر کی حمایت میرے لیے تھی یہ اور بات تھی کہ میں واضح طور پر کمزور پڑ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''الیکٹرک تم جانتے ہو میں آخری دم تک لڑوں گا پھر تم ایسی پیش کش کیوں کر رہے ہو؟''

''میں اب تم سے مقابلہ نہیں چاہتا۔'' وہ ہچکچایا۔

''اس کی ایک آسان سی ترکیب ہے تم ہار مان لو۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ حملہ کیا۔ اس کے گھونسے ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے تھے۔ ''یوسف تمہیں شکست ہو گی۔ میں تم سے اپنا بدلہ لوں گا۔'' وہ چلا رہا تھا۔

میں اس کے گھونسوں سے بچتا ایک دم سلپ ہوا اور گھومتی لات اس کے پیروں پر ماری۔ غصے نے اس کی عقل خبط کر دی تھی۔ وہ میرے وار کو نہ سمجھ سکا اور دھڑام سے نیچے گرا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایڑیاں اُٹھا کر اس کے سینے اور گردن پر ماریں۔ اس نے وار روکنے کی کوشش کی مگر گردن پر وار سخت لگا تھا۔ میں نے پیر موڑ کر اس کے منہ پر مارے اور وہ بینگن کی طرح لڑھک گیا تھا۔ میں نے پاؤں اُچھال کر خود کو کھڑا کیا۔ الیکٹرک بھی اُٹھ رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر ہوا میں جست لگائی اور اسے لے کر زمین پر جا گرا۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے میرے سینے اور پیٹ پر ضربیں لگائیں اور میں نے بھی اس کے سر پر وار کیے۔ چھ منٹ ہم گتھم گتھا شدید قسم کی مار پیٹ کرتے رہے۔ میرے ہونٹ اور ناک بھی خون آلود ہو گئے اور اس کی دونوں بھنوؤں اور ماتھے سے خون اُبلنے لگا تھا۔ بالآخر اس نے مجھے پیروں پر رکھ کر اُچھالا۔ ایک لمحے کو میں اس سے الگ ہوا لیکن اس کی جرسی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں دوبارہ اس پر گرا۔ اس بار اس کے منہ سے چیخ سی نکل گئی تھی۔ میرا گھٹنا اس کے پیٹ میں اُتر گیا تھا۔ اسے عضلات متحرک کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر لگاتار گھٹنے سے اس کے پیٹ میں پے در پے ضربیں لگائیں۔ وہ خاموشی سے برداشت کرتا رہا اور کسی طرح اپنا ہاتھ میرے پنجے سے نکال لیا۔ جانے کب اس کا آہنی گھونسا میری ٹھوڑی پر لگا۔ اس بار میں فضا میں بلند ہوا تو مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ چند لمحے تو جیسے تاریکی چھائی رہی۔ الیکٹرک کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کا گھونسا تھا۔ میں نے ایک ویڈیو میں اسے محض ایک گھونسے میں اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اُتارتے دیکھا تھا۔

تاریکی کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ الیکٹرک میری طرف جھپٹ رہا ہو گا۔ اگر وہ مجھے اسی حالت میں مارنے آ گیا تو شاید پھر مجھے قیامت کے دن ہی ہوش آتا۔ میں بے اختیار فرش پر لڑھک گیا۔ الیکٹرک میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے لڑھکنے کی وجہ سے اسے کامیابی

نہیں ہوئی تھی۔ اب تاریکی چھٹ گئی تھی اور مجھے اس کی گھومتی لاتیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ایک بار رول ہوتے ہوئے میں پاؤں سامنے کی طرف لایا اور اس کے پیروں میں پھنسانے کی کوشش کی۔ اس نے میرے گھٹنے پر سخت ضرب لگائی تھی اور میں اُچھل کر پیچھے چلا گیا تھا۔

میں کسی قدر دقت کے ساتھ فرش سے اُٹھا۔ میرا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پھیپھڑے آکسیجن جذب کرنے کے لیے دیوانہ وار کوشش کر رہے ہوں۔ مجھے اپنی ابتر حالت کا احساس ہو رہا تھا اور غالباً الیکٹرک کو بھی۔ چوٹیں اسے بھی بے شمار آئی تھیں مگر ان سے اس کے جسمانی نظام پر خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی سانس قدرے تیز مگر ہموار ہی تھی۔ مقابلہ آسان نہیں ہے۔ میں نے سوچا اور محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ اچانک فضا میں اُچھلا اور ہوا میں گھومتے ہوئے لات میری گردن پر مارنے کی کوشش کی اگر اس کی لات نشانے پر لگ جاتی تو میری گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ میں نے لات سے بچنے کے لیے پھرتی دکھائی تھی۔ اس کے باوجود ایڑی کن پٹی پر لگتی ہوئی گزری تھی۔ دنیا یک دم میری نگاہوں کے سامنے زیر و زبر ہو گئی تھی میں پھرکی کی طرح گھومتا فرش پر گرا تھا۔ تاریکی چھانے لگی تھی۔ میں نے بہ مشکل سر اُٹھا کر دیکھا تھا۔ الیکٹرک دوڑتے ہوئے فضا میں بلند ہوا اور اس کی ایڑی کا رُخ میری گردن کی طرف تھا اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔



مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ بہرحال بے ہوش ہوتے وقت میرا یہی خیال تھا کہ یہ اس دنیا کی آخری جھلک ہے اور میں اب روزِ قیامت میں ہی اُٹھوں گا۔ اس سے پہلے فرشتوں کو حساب کتاب دینے میں وقت اچھا گزرے گا۔ کم سے کم بوریت نہیں ہو گی۔ دنیا کے کسی بھی براعظم کے باہر اس جزیرے پر میں اپنی احمقانہ جذباتیت کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بعد میں مجھے یہ جذباتیت ہی لگی تھی کہ میں فوری طور پر الیکٹرک سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں اسے اپنے ساتھ بھی لے جا سکتا تھا اور مکمل طور پر فٹ ہونے کے بعد وہ جہاں چاہتا اس سے لڑ سکتا تھا لیکن اس کی باتوں میں آ کر میں نے عقل کو بالائے طاق رکھ کر اس سے لڑنا قبول کیا میں مکمل طور پر صحت یاب نہیں تھا اور ڈاکٹروں نے مجھے کسی بھی بھاری سرگرمی سے الگ رہنے کو کہا تھا۔

رفتہ رفتہ ہوش کی دنیا میں آنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور خود کو بدستور اس دنیا میں پا کر اپنی سخت جانی پر تعجب کا اظہار کیا تھا۔ میں ہسپتال کے کمرے میں تھا اور ہسپتال بھی جانا پہچانا تھا یعنی جزیرے کا ہسپتال تھا۔ مرہم پٹی اور شاید سن کر دینے والے انجکشن کی وجہ سے میں درد محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کمرے میں دودھیا روشنی تھی اور میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ کیا وقت ہو رہا ہے اور میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ جزیرے پر آرگنائزیشن کے بیرونی دستے آ چکے ہوں گے اور میں ایک بار پھر آرگنائزیشن کے قبضے میں مَیں تھا۔ میں سوچوں میں غرق تھا کہ دروازہ کھلا





اور ایک چینی نژاد ڈاکٹر کی صورت نظر آئی۔

"کیسے ہو؟" اس نے پاس آ کر نبض دیکھی۔

"زندہ ہوں، پھر بچ گیا ہوں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر منہ پر کئی جگہ لگے ٹیپ کی وجہ سے ناکام رہا۔

"الیکٹرک کہاں ہے؟ میں اس کے ہاتھوں زندہ کیسے بچ گیا؟"

"وہ اسی ہسپتال میں ایک جگہ سو رہا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "وہ بھی کہتا ہے کہ جب تک تمہیں دیکھ کر تم سے بات نہ کر لے وہ ہسپتال سے نہیں جائے گا۔"

"وقت کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شام کے سات بج رہے ہیں۔"

"کیا آرگنائزیشن والے آ گئے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "وہ نقصان دیکھ رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ جزیرہ چھوڑ جائیں گے۔" وہ ذرا سا جھکا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "فکر نہ کرو ہم تمہیں بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"ہم کون؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"جان گرے اور الیکٹرک۔"

"جان گرے۔" میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ "وہ زندہ ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"میں ابھی بھیجتا ہوں۔" ڈاکٹر بولا اور باہر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد جان گرے کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک بلکہ تازہ دم لگ رہا تھا۔ صاف ستھرا لباس اور شیو کیا ہوا چہرہ لگتا تھا وہ اس سارے ہنگامے سے دور کسی محفوظ جگہ بیٹھا رہا تھا۔ اس نے پاس آ کر میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے پوچھا۔

"یوسف اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"ٹھیک ہوں اور کچھ سوال کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔"

"ترتیب وار کرو۔"

"پہلا سوال یہ کہ میں بچ کیسے گیا۔ جبکہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے الیکٹرک کو اپنی گردن پر وار کرنے کے لیے ہوا میں پرواز کر کے آتے دیکھا تھا۔"

"یہ کارنامہ اس خاکسار نے انجام دیا ہے۔" جان گرے بولا۔ "اس سے پہلے کہ اس کا وار تمہاری گردن پر پڑتا میں نے راستے میں اسے دھکا دے دیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ تم لڑنے کے لیے فٹ نہیں تھے تو اس کا شرمندگی سے بُرا حال ہو گیا تھا۔"

"دوسرا سوال یہ ہے کہ تم کہاں سے نازل ہوئے اور اب تک کہاں چھپے تھے؟"

"میں بروقت اتفاق سے ہی نازل ہوا۔ میں تو فرار کے لیے ایئرپورٹ کی طرف آیا تھا اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں چھپا کہاں رہا تو میں بندرگاہ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے جنگل میں رُوپوش تھا۔ میں بندرگاہ سے کچھ دور تھا جب بلاسٹ ہوا۔ اگر میں سو گز آگے چلا جاتا تو چھت سمیت اوپر گرنے والے پتھروں تلے پس کر رہ جاتا میں واپس بھاگا تھا مگر جب قصبے کے نزدیک پہنچا تو یہاں پر موت رقص کر رہی تھی۔ آرگنائزیشن والے جان بچاتے پھر رہے تھے۔ ان حالات میں قصبے میں داخل ہونا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ اس لیے واپس چلا گیا اور جب تک صبح کی روشنی نہیں پھیل گئی میں جنگل میں ہی رہا تھا۔ پھر میں نے آرگنائزیشن کے طیاروں کو آتے دیکھا تو ایئرپورٹ کا رُخ کیا۔ وہاں الیکٹرک تمہارا خاتمہ کرنے جا رہا تھا۔ میں نے بروقت مداخلت کر کے اسے باز رکھا۔" اس نے گہری سانس لی۔

"اور تیسرا سوال یہ ہے کہ تم سے میری کب جان چھوٹے گی۔ چھوٹے گی بھی یا نہیں؟" وہ ہنسا۔

"اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ شاید خدا کے پاس ہو۔"

"خدا سے میری درخواست ہے کہ تم سے میری جان چھڑائے۔"

جان گرے پھر سے ہنسا اور پلٹ کر آہستہ سے پوچھا۔

"فی الحال تمہیں میری ضرورت ہے۔ ابھی اس جزیرے پر موجود ہر فرد سے تفتیش کی جائے گی اور جس پر بغاوت میں حصہ لینے کا شبہ ہوا اس کا کیا حشر ہو سکتا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اس بہانے تم پھر مجھے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"نہیں میں تمہاری مدد کرنا چاہ رہا ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "میری پوری کوشش ہو گی کہ تمہارے خلاف انکوائری نہ کی جائے۔"

"کیونکہ میں تمہارے ساتھ تھا اگر میرے خلاف انکوائری ہوئی تو تم بھی اس کی زد میں آ سکتے ہو۔"

"نہیں میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں ہنسا تھا۔

"جتنا کوئی بھیڑیا بھیڑ کے لیے مخلص ہو سکتا ہے۔" وہ بھنا گیا تھا۔

"مت یقین کرو۔ مستقبل خود تمہیں یقین دلا دے گا۔"

"میں اپنے مستقبل میں تمہارا پُرخلوص تعاون ہی نہیں چاہتا۔ اس لیے خدا کے واسطے میری جان بخش دو۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ "اگر یہاں پر کھانے کو کچھ ہو تم مجھے بھجوا دو۔" جان گرے جانے کے لیے اُٹھا۔

"ایرینا والی عمارت کی تباہی سے یہاں پر دوسروں کی باتیں سننے والا سسٹم فیل ہو چکا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اگر کوئی تم سے بغاوت کے بارے میں پوچھے تو یہی کہنا کہ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"





"او کے! مجھے معلوم ہے۔ مجھے کیا کہنا ہے۔"

جان گرے کے جانے کے کچھ دیر بعد ایک تھائی نرس نے مجھے کھانا کھلایا۔ اب ہسپتال میں کوئی بھی سفید فام ڈاکٹر یا نرس باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سب مارے جا چکے تھے۔ اس بغاوت کے سارے اہم کردار جزیرے سے جا چکے تھے سوائے میرے اور امکان یہی تھا کہ میرے ساتھ یہ بے چارے بے گناہ بھی آرگنائزیشن کے غیظ و غضب کا نشانہ بنیں گے۔ اپنے ذرا سے نقصان پر آپے سے باہر ہو کر دوسروں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنا ان اقوام کا وطیرہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپان اس کی ایک مثال تھا۔ پرل ہاربر کا انتقام لینے کے لیے امریکہ نے پورے جاپان پر کارپٹ بمباری کر کے اسے کھنڈرات میں بدل دیا تھا۔ اس پر بھی اس کی آتشِ غضب سرد نہ ہوئی تو اس نے شکست خوردہ جاپان پر دو ایٹم بم پھینک کر لاکھوں افراد کو موت کی نیند سلا دیا جا سکتا ہے۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ اس بدنام مافیا کو ہونے والے اس نقصان کے بعد مجھ سے کوئی اچھا سلوک ہو گا۔

مجھے زیادہ گہری چوٹیں نہیں آئی تھیں مگر جو بھی تھیں وہ خاصی دکھ رہی تھیں۔ اس وجہ سے مجھے سن کرنے والی دوا دی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد ایک ڈاکٹر نے آ کر مجھے انجکشن لگا دیا تھا۔ اس نے بتایا نہیں تھا کہ وہ مجھے نیند کا انجکشن دے رہا ہے۔ ورنہ میں اسے لگانے نہ دیتا۔ میں ہسپتال سے فرار امکانات پر غور کر رہا تھا اور یہی سوچتے سوچتے سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میری حالت کل کے مقابلے میں خاصی بہتر تھی۔ ظاہر ہے مسکن انجکشن کا اثر ختم ہو گیا تھا اس کے باوجود درد ہلکا تھا۔ میں نے سرہانے لگی گھنٹی کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ یعنی رات کو مجھے نیند کا انجکشن اس لیے دیا گیا تھا کہ کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں۔ واپس آ کر مجھے گھنٹی کا بٹن ہی دبانا پڑا تھا۔ چند منٹ بعد ایک مسلح شخص اندر آیا اس کے پیچھے تھائی نرس بھی تھی اب مجھے مکمل زیرِ نگرانی رکھا جا رہا تھا۔ نرس نے مجھے ناشتہ کرایا اور دوائیں دیں۔ کھانے سے پہلے میں نے گولیاں غور سے دیکھیں لیکن یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ اس میں کوئی خواب آور دوا بھی ہے یا نہیں۔ نرس نے مجھے دوا دی اور برتن لے کر چلی گئی۔ البتہ مسلح شخص وہیں رہا۔ اس نے جنگلی ٹائپ کی وردی پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہیں مستقل میرے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے؟"

"بکومت۔" وہ غرایا۔ "ابھی نرس دوبارہ آئے گی۔"

"اچھا...... اچھا۔" میں نے سر ہلایا۔ نرس چند منٹ بعد آئی اور اس نے مجھ سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ میں نے مسلح شخص کی طرف دیکھا۔

"اس کے سامنے مجھے شرم آئے گی۔"

"یہ نہیں جا سکتا۔" تھائی نرس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "پلیز میری بات مان لو۔"

بادلِ نخواستہ میں نے کپڑے اُتارے۔ اب میرے جسم پر صرف انڈرویئر رہ گیا تھا۔ نرس نے پٹیاں بدلیں اور زخموں پر خشک کرنے والا پاؤڈر لگا کر دوسری پٹیاں کر دیں۔ پھر جہاں سوجن اور نیل تھے وہاں جل نما چیز لگائی۔ آخر میں سپرٹ نما شے سے جسم صاف کر کے اس نے مجھے کپڑے پہننے کی اجازت دی اور مسلح شخص کے ہمراہ رخصت ہوگئی مگر اس بار مجھے کوئی سکون کی دوا نہیں دی تھی کیونکہ میں ذہنی طور پر خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ کھانے کے ایک گھنٹے بعد میں نے کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ حرکت میں رہنے سے جسم چست رہتا تھا جب تھکن محسوس کرتا تو لیٹ جاتا۔ دوپہر تک میں نے کئی بار چہل قدمی کی اور پھر گھنٹی بجائی۔ سپیکر سے آواز آئی۔

"یس! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے سخت قسم کی بھوک لگی ہے۔ کھانا لے آؤ۔ اگر مچھلی اور انڈے ہوں تو بہتر ہے۔"

"سر نصف گھنٹے میں آپ کو کھانا مل جائے گا۔" نسوانی آواز نے کہا تھا۔

نصف گھنٹے بعد مسلح شخص اندر آیا اور اس کے پیچھے نرس کھانے سے بھری ٹرالی لے کر آئی تھی۔ یہ لنگر تھا جو میرے لیے تھا۔ اس میں کئی طرح کی چیزیں تھیں۔ میں نے اُبلے ہوئے انڈے کا ایک سینڈوچ اور اُبلی ہوئی مچھلی لی۔ کھانا سامنے والی بیڈ ٹرالی پر رکھ کر نرس اس مسلح شخص کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی۔ ڈٹ کر کھانا کھانے کے بعد میں بستر پر دراز ہوگیا اور ذرا دیر میں سو چکا تھا۔ نرس نے مجھے دوا کے لیے بھی نہیں جگایا تھا۔ بس برتن سمیٹ کر رخصت ہوگئی۔ شاید یہاں پر اس طبی اصول پر عمل ہوتا تھا کہ مریض یا زخمی سو رہا ہے تو اسے سونے دو کیونکہ نیند سب سے بہتر علاج ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ میں کمرے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں نے سر گھما کر بستر کے برابر میں رکھی بنچ کی طرف دیکھا وہاں الیکٹرک بیٹھا تھا۔

"تم۔" میں نے کہا۔ "دشمن جان یہاں بھی آ گئے۔"

"تم سے سوری کرنے آیا ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم فٹ نہیں ہو۔ خیر اب تم جب پوری طرح فٹ ہو جاؤ گے تو تم سے میرا پھر مقابلہ ہوگا۔"

"پھر مقابلہ۔" میں کراہا۔ "کیا میں ساری عمر تم سے لڑتا رہوں گا؟"

"جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی۔ کل ہم یہاں سے روانہ ہوں گے اور شاید ایک مہینے بعد میں دوبارہ تم سے ملوں گا اس وقت الوداعی ملاقات کے لیے آیا تھا۔"

"شکریہ۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "بڑی مہربانی تمہاری۔"

وہ میرے نزدیک آیا۔ اس کے چہرے پر بھی کئی جگہ میڈی کیٹڈ پٹیاں چپکی تھیں۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"یوسف اگرچہ تم میرے دشمن ہو لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آج تک اتنا اعلیٰ ظرف دشمن نہیں دیکھا۔"





"یہی بات میں تمہارے بارے میں ذرا سی ہمت کر کے کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور فوراً ہی مجھے لگا جیسے اس کے اور میرے ہاتھ کے درمیان میں کوئی شے ہو۔

"لیکن یہ بتاؤ کہ میرے اعلیٰ ظرف ہونے کا اتنا بڑا جرم ہے جو تم مجھے معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔" وہ ہنسا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔ جس طرح اپنا دوست عمر بھر کے لیے ہوتا ہے اس طرح اپنا دشمن بھی چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے یہ تم لوگوں کو مجھ سے اتنی محبت کیوں ہوگئی ہے۔ جان گرے الگ میری جان کو چمٹا ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ چیز میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔

"اوکے بائے۔" وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ میں چھوٹا سا بند کیا ہوا کاغذ ہے۔ میرے پیر کے پاس تہہ کی ہوئی چادر رکھی تھی۔ الیکٹرک کا یہ کاغذ دینے کا انداز مجھے سمجھا گیا تھا کہ اب خفیہ طریقے سے میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میری آواز سنی جا رہی تھی اور شاید کوئی کیمرہ میری نقل و حرکت بھی ریکارڈ کر رہا تھا۔ اگرچہ چاروں طرف بہ غور معائنہ کرنے پر بھی مجھے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تھی مگر سائنس و ٹیکنالوجی نے ترقی کر کے اس قسم کے آلات کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ انہیں چھپانا آسان ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کیمرہ اور مائیک اسی خفیہ سپیکر میں ہو جس سے میں بٹن دبا کر بات کرتا تھا۔ کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے میں نے چادر لی اور اسے سر تک تان کر لیٹ گیا۔ دودھیا روشنی چھن کر اندر آتی ضرور تھی کہ میں اس سے مختصر پرچے پر باریک لکھائی پڑھ سکتا۔

"یوسف میں اب تمہارا دشمن نہیں ہوں اور تم سے سامنے جو بات کر دی وہ محض دکھاوا تھی۔ مجھ پر اعتماد کرو میں تمہیں ان لوگوں کے چنگل سے نکال لوں گا۔ بس کل تک انتظار کرنا اور پلیز کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس سے ان لوگوں کو تمہیں مارنے کا موقع مل جائے۔ تمہارے بارے میں اوپر سے بہت سخت احکامات آ گئے ہیں۔ جزیرے کی تباہی نے ان لوگوں کو مشتعل کر دیا ہے اور اب یہ انتقامی کارروائی کی تیاری کر رہے ہیں جس پر ذرا سا شبہ ہوا اسے دردناک طریقے سے موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔"

کاغذ پر الیکٹرک کا نام نہیں لکھا تھا اور یہ اسی کی تحریر تھی۔ نیچے ایک مختصر سا جملہ تھا۔ اسے ضائع کر دینا۔ میں نے کاغذ منہ میں ڈال لیا۔ اسے چبا کر کچھ دیر بعد باتھ روم میں لے جا کر تھوک دیا اور پھر کمرے میں آ کر چہل قدمی کرتے ہوئے اس پرچے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ کیا یہ الیکٹرک کے ضمیر کی آواز تھی یا ان لوگوں کی کوئی چال مگر الیکٹرک جیسے شخص سے مجھے کسی قسم کی چال کی توقع نہیں تھی۔ دوسرے ان لوگوں کو مجھے فرار سے روکنے کے لیے کسی چال کی ضرورت نہیں تھی۔ میں پہلے ہی ان کے قابو میں تھا اور دوسرے میں فرار ہو کر کہاں جا سکتا تھا۔ اکیلے آدمی کے لیے اس جزیرے

سے فرار ممکن نہیں تھا۔ منطقی لحاظ سے الیکٹرک پُر خلوص تھا لیکن عقل نے مجھے مشورہ دیا کہ کسی کے بجائے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کروں اور جونہی موقع ملے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاؤں مگر ساتھ ہی احتیاط سے کام لوں۔ یہ بات بالکل درست تھی کہ یہ لوگ اس وقت بولائے ہوئے کتے ہو رہے تھے۔ ذرا سی حرکت پر وہ مشتعل ہو کر میری جان لے سکتے تھے۔

شام کو ایک بار پھر طبی امداد کے مرحلے سے گزارا گیا۔ رات کے کھانے میں سبزیوں کا شوربہ تھا گوشت بھی تھا لیکن اس کے بجائے میں نے پھر مچھلی لے لی لیکن اس بار تلی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد مجھے دوائیں دی گئیں اور اس بار ان میں کوئی خواب آور دوا تھی۔ میں ایک بار پھر سو گیا۔ صبح اُٹھا تو ناشتے اور طبی امداد کے مرحلے سے گزار کر مجھے ایک خاص قسم کی جیکٹ پیش کی گئی۔ وہ قیدیوں کو ایک بستر سے دوسرے بستر لے جاتے وقت پہنائی جاتی تھی اور اس میں آدمی کے ہاتھ بندھ کے رہ جاتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ بندوق کے زور پر مجھے یہ جیکٹ پہنائی گئی۔ اس کے بعد میرے پیروں میں بیڑیاں پہنائی گئیں کہ میں ایک قدم انچ سے زیادہ بڑا نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اس کے بعد دو افراد تقریباً مجھے کھینچتے ہوئے ہسپتال کے لاؤنج تک لائے میں نے دیکھا کہ ہسپتال کے مختلف حصوں میں ڈائنا مائٹ لگایا جا رہا تھا۔ عملہ ایک طرف ہراساں سا کھڑا تھا۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہو۔ ایک کمانڈر نما شخص ایک طرف کھڑا چلا چلا کر احکامات دے رہا تھا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے یقین ہو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آواز رُکی تو اردگرد موجود افراد کی حرکتیں ہی رُک جائیں گی۔ مجھے لے جا کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ ”مسٹر یوزف۔“

”میرا نام یوسف ہے۔“ میں نے تصحیح کی اور مجھے اس پر پچھتانا پڑا تھا اس کا گھونسا میرے پہلے سے مضروب سر پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگا تھا۔ ضرب غیر متوقع تھی اس لیے مجھے چکر آ گیا۔ دونوں آدمیوں نے مجھے نہ پکڑ رکھا ہوتا تو میں پیچھے کر سکتا تھا۔ جب چکر رُکا تو اس نے غرا کر کہا۔

”مسٹر آئندہ میری بات مت کاٹنا۔“

”او کے۔“ میں نے خوشدلی سے کہا۔ ”ورنہ تم مجھے کاٹ لو گے۔“ اس بار گھونسا میرے پیٹ پر پڑا تھا لیکن میں تیار تھا۔ پیٹ سخت کر لیا تھا اس لیے زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا۔

”یقیناً تم سے ایک تفصیلی ملاقات کرنی پڑے گی۔“

”ضرور...... لیکن مجھ سے ملاقات کے خواہش مندوں کی لائن طویل ہے۔ باری آ جانے پر تم بھی مل لینا۔“ میں نے لاپروائی سے کہا۔ ”یہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“

”کرنل رچرڈ کو ملاقات کے لیے کسی باری کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔“ وہ سفاکانہ لہجے میں بولا۔ ”جس سے ملنا ہوا سے بلا لیتا ہے اور کہاں جا رہے ہو یہ منزل پر پہنچ کر پتا چل جائے گا۔“ اس کے





اشارے پر دونوں گرگے مجھے کھینچتے باہر کھڑی جیپ تک لائے۔ میں نے دیکھا کہ قصبے کے لوگ ایئر فیلڈ کی طرف رواں تھے۔ وہ پیدل جا رہے تھے اور وردیوں میں ملبوس مسلح افراد ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ عمارتوں کو ڈائنا مائٹ لگایا جا رہا تھا۔ گویا جزیرے سے مکمل انخلا کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اور یہاں موجود غلاموں کو دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ ایک اہم ترین مرکز جوان لوگوں کے لیے ہر سال بے شمار دولت کماتا تھا۔ یہاں سے وہ اردگرد کے ممالک میں دہشت گردانہ کارروائیاں اس علاقے کے بحری ٹریفک کو کنٹرول کرتے تھے تباہ ہو کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ان کے بے شمار اعلیٰ دماغ مارے گئے تھے یہ زیادہ بڑا نقصان تھا اس کے ذمے داروں کے خلاف وہ جو بھی کرتے کم ہی ہوتا۔

جیپ ایئر فیلڈ کے پاس رُکی رن وے کے اردگرد کا علاقہ صاف کیا جا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہاں بڑے طیاروں کے اُترنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ ہزاروں کی تعداد میں غلاموں کے علاوہ کام کا سارا سامان خاص طور سے گاڑیاں لے جائیں۔ وہ دونوں مجھے لے کر چلتے ہوئے طیاروں کی طرف جانے لگے مجھے ان کا ساتھ دینے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ کھینچتے ہوئے مجھے ایک طیارے تک لے آئے۔ یہ دس بارہ نشستوں والا چھوٹا طیارہ تھا۔ میں نے ایک گرگے سے کہا۔ ”میں اس میں کیسے چڑھوں گا۔ میرا پاؤں اوپر نہیں اُٹھتا ہے۔“

”ایسے۔“ ان میں سے ایک نے کہا اور دونوں نے بازو سے پکڑ کر مجھے اندر پھینک دیا۔ سر طیارے کے فرش سے بچانے کے لیے مجھے خاصی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اندر آ کر انہوں نے مجھے ایک نشست پر بٹھا دیا۔ عقبی نشست پر ایک شخص منہ پر فلیٹ ہیٹ رکھے شاید سو رہا تھا۔ چند منٹ بعد چار افراد مزید اسی طرح لائے گئے ان سب نے بے بس کر دینے والی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ان میں سے دو تو صورت سے چھٹے ہوئے پیشہ ور مجرم لگ رہے تھے۔ ایک پروفیسر قسم کا نستعلیق نظر آنے والا شخص اور چوتھا مسکین سا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے بے قصور ہی پکڑا گیا ہے۔ اسے لا کر میرے برابر والی سیٹ پر دھکیل دیا گیا تھا۔ دونوں طرف ایک ایک نشست بھی اور درمیان میں گزرنے کی جگہ تھی۔ میں نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”کس چکر میں پکڑے گئے ہو؟“

”اس کی صورت پر نہ جاؤ۔“ اسے لانے والے نگران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”پندرہ قتل ہیں اس کے کھاتے میں عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنا کر اتنی سفاکی سے قتل کرتا ہے کہ ہٹلر دیکھ لے تو کانپ جائے۔“

”اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”آج کے مغربی حکمرانوں کا حوالہ کافی ہے۔“ اس پر وہ مجھے غلط نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اب طیارے میں مجھ سمیت پانچ قیدی تھے۔ ہماری نگرانی کے لیے تین عدد مسلح افراد بھی آ کر بیٹھ گئے اور نواں شخص وہ تھا جو منہ پر فلیٹ

ہیٹ رکھے سو رہا تھا۔ پائلٹ نے طیارے کی پرواز کا اعلان کیا اور چند لمحے اس کے انجن سٹارٹ ہو گئے تھے۔ طیارے نے رینگنا شروع کیا۔ میں باہر گزرتے مناظر کو آخری بار دیکھنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ اب مجھے دوبارہ یہ جگہ نہیں دیکھنی پڑے گی۔ طیارے نے رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہو گیا۔ وہ بادلوں کے پرے چیرتا اپنے فلائٹ لیول پر پہنچ کر سیدھی پرواز کرنے لگا۔

اچانک فلیٹ ہیٹ والا سیدھا ہوا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا جیسے ہی ہیٹ کے نیچے سے اس کا چہرہ برآمد ہوا میں دنگ رہ گیا تھا۔ وہ جان گرے تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے آنکھ ماری اس لمحے کاک پٹ سے جو شخصیت برآمد ہوئی اس نے مجھے دوسرا شاک دیا تھا۔ وہ الیکٹرک تھا۔ اس کے آتے ہی جان گرے نے اپنی پتلون کی جیب سے پستول نکال کر اس کا دستہ کھٹ سے برابر میں بیٹھے مسلح شخص کے سر پر مارا اس نے واجبی سی چیخ ماری اور آگے کی طرف جھول گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھے افراد نے بوکھلا کر اپنی رائفلیں اُٹھانے کی کوشش کی مگر الیکٹرک ان کے سر پر آ چکا تھا۔ اس نے ایک کے سر پر گھونسا رسید کیا اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔ تیسرا تذبذب میں پڑ گیا کہ کس سے نمٹنے اور اس سے اثنا میں الیکٹرک کا گھونسا اور جان گرے کا پستول بیک وقت اس کے سر پر پڑے اور اس کے پاس اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔'' ان تینوں سے نمٹ کر وہ میری طرف دیکھ کر بیک وقت مسکرائے تھے۔

''یا خدا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اوپر کی طرف منہ کر کے کہا۔

''یہ حقیقت ہے۔'' الیکٹرک نے اعتراف کیا۔ ''طیارہ ہم نے ہائی جیک کر لیا ہے۔''

''تم نے ہائی جیک کر لیا ہے، اسے اُڑا کون رہا ہے؟'' میری عقل خبط ہونے لگی تھی۔

''میں۔'' الیکٹرک نے دوسرا اعتراف کیا۔ ''اس کے اصل پائلٹ جزیرے میں رن وے کے ساتھ جھاڑیوں میں بندھے پڑے ہیں۔''

''کیا...... اور تم یہاں کھڑے ہو۔ طیارہ کیسے اُڑ رہا ہے۔'' میں چلایا تھا۔ الیکٹرک نے خفگی سے میری طرف دیکھا۔

''چلاؤ مت طیارے میں ایک آٹو پائلٹ بھی ہوتا ہے۔''

''اچھا...... اچھا مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔'' میں نے جیکٹ میں کس کر کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' اس سوال پر وہ دونوں ہی خفا ہو گئے تھے۔ جان گرے نے گویا ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے ڈیئر یوسف ظاہر ہے تمہارے لیے۔''

''میرے لیے...... مگر کیوں؟'' اس بار جان گرے کا صبر جواب دے گیا تھا۔

''کیونکہ ہمیں کتے نے کاٹا ہے۔''

''او کے...... او کے میں نے مان لیا کہ تم یہ سب میری محبت میں کر رہے ہو۔ مگر یہ جیکٹ تو





اُتارو میرے بازو چپک کر رہ گئے ہیں جسم سے۔'' الیکٹرک نے میری جیکٹ کی ڈوریاں کھول کر اُتار دیں۔ میرے آزاد ہوتے ہی مسکین سے نظر آنے والے قاتل نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

''مجھے بھی کھول دو۔ میرے بازو بھی دُکھ رہے ہیں۔''

''بکو مت۔'' الیکٹرک نے اسے جھڑک دیا۔ ''اب تم نے خود کو کھولنے کو کہا تو میں تمہیں اسی حالت میں طیارے سے باہر پھینک دوں گا۔'' وہ جلدی سے چپ ہو گیا۔ الیکٹرک نے اندر کاک پٹ میں جا کر طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ میں نے جان گرے کے ساتھ مل کر تینوں بے ہوش نگرانوں کو ان کی سیٹوں کے ساتھ باندھ دیا اور ان کی رائفلیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ بقیہ افراد التجا کر رہے تھے کہ انہیں بھی آزاد کر دیا جائے مگر ہم نے توجہ نہیں دی۔ وہ چاروں سیٹ بیلٹوں سے بندھے تھے۔ اس لیے ہم بے فکری سے کاک پٹ کی طرف آ گئے۔ وہاں صرف ایک نشست اور تھی میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ طیارے کے نیچے جہاں جہاں بادلوں میں خلا آتا۔ نیلگوں، بحر ہند صاف نظر آ رہا تھا۔ سورج کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ طیارے کا رُخ جنوب مشرق کی طرف ہے۔ مجھے جزیرے کا محل وقوع یاد تھا۔ میں نے الیکٹرک سے پوچھا۔

''کیا ہم انڈونیشیا کی طرف جا رہے ہیں؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''وہاں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہماری منزل ہے۔''

''یہ پلاننگ تم دونوں نے کی تھی؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''اس کی تھی۔'' الیکٹرک نے جان گرے کی طرف دیکھا۔ ''مجھے ہر صورت تمہیں بچانا تھا لہٰذا اس سے مل گیا منزل بھی اس نے طے کی ہے۔''

''تب ہم اس طرف نہیں جا رہے ہیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ایسا کرو طیارے کو جکارتہ کی طرف لے چلو۔''

''مگر کیوں؟'' جان گرے نے احتجاج کیا۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟''

''سچی بات ہے تو نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''خلیج والے واقعے کے بعد ہر مصیبت میں صرف تمہاری وجہ سے پڑا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے تم سے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جکارتہ پہنچ کر ہماری راہیں جدا ہوں گی۔''

''دیکھو جکارتہ جانا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔'' جان گرے نے سمجھایا۔ ''ہم اپنے بارے میں کیا بتائیں گے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ان سات افراد کا کیا جواز پیش کریں گے۔''

''ہم خود کو انڈونیشیا کے حکام کے حوالے کر کے انہیں سب کچھ سچ بتا دیں گے۔''

''اور اس کے بعد جیل میں رہیں گے اور بالآخر آرگنائزیشن والے دوبارہ ہمیں حاصل کر لیں گے۔'' جان گرے کے لہجے میں طنز تھا۔ ''یوسف یہ بڑی تلخ حقیقت ہے تمہارا اپنا ملک بھی۔ اگر تمہیں بین الاقوامی دہشت گرد قرار دے دیا گیا تو وہ تمہیں کان سے پکڑ کر مانگنے والوں کے حوالے

کردیں گے۔"

"یہ درست کہہ رہا ہے۔" الیکٹرک نے اس کی تائید کی۔ "سیدھے راستے سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے شکست خوردگی کے احساس کے ساتھ کہا۔ "جان گرے میں ایک بار پھر تمہارے رحم وکرم پر ہوں لیکن یاد رکھنا کہ تم کسی معاملے میں مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔" اس نے خلوص سے کہا اور کاک پٹ سے چلا گیا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟" میں نے الیکٹرک سے پوچھا۔

"میرے لیے کہیں بھی جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "میں بین الاقوامی شہری ہوں۔" طیارہ تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور امکان تھا کہ ابھی کئی گھنٹے تک محو پرواز رہے گا۔

"کیا وہ ہمیں تلاش نہیں کریں گے؟" الیکٹرک مسکرایا۔

"ضرور کریں گے لیکن افریقہ والی سمت۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس چھوٹے طیارے سے ہم دو ہزار میل دور مشرق کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔"

"یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ طیارہ تم نے جان گرے کے ساتھ مل کر اغوا کیا ہے۔"

"چھپی رہے گی۔" الیکٹرک کا لہجہ سرد تھا۔ "میں نے جن پائلٹوں کو بے بس کر کے جھاڑیوں میں ڈالا تھا وہ کچھ دیر بعد مردہ پائے گئے تھے۔ ان کے سروں میں کسی نے خاموشی سے پستول سے سوراخ کر دیا تھا۔" میں سوچ سکتا تھا کہ سوراخ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جان گرے میرے لیے قتل کرنے پر اُتر آیا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر عقب میں دیکھا تو جان گرے تیسرے بے ہوش نگران کو بھی فرش کے سوراخ سے طیارے کے باہر پھینک چکا تھا۔ میں جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"صفائی۔" اس نے عام سے انداز میں کہا۔ "یہ سب کچرا تھا جو میں نے صاف کر دیا۔" اس نے تختہ بند کر دیا۔ چاروں افراد اپنی نشستوں پر سکڑے بیٹھے تھے ان کی گھگھی بندھی تھی۔ میں نے افسوس سے جان گرے کی طرف دیکھا۔

"تم ذرا سی دیر میں پانچ افراد کی جان لے چکے ہو۔" اس نے سرد نظروں سے مجھے گھورا۔

"مجھے زیادہ بہتر پتا ہے کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا ہے۔" جان گرے ایک عدد برانڈی کی چھوٹی سی بوتل سے برابر کی اپنی نشست پر بیٹھ کر شغل کرنے لگا پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"الیکٹرک کو منزل کا پتا ہے مگر پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے آواز دے دینا۔" میں واپس کیبن میں آیا۔

"اس نے تینوں نگرانوں کو نیچے پھینک دیا ہے۔"





"مجھے معلوم ہے۔" الیکٹرک بولا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں حیران ہوا تھا۔

"جب کوئی طیارے کے فرش والا دروازہ کھولتا ہے تو یہ سرخ بتی جلنے لگتی ہے اور جب تک دروازہ کھلا رہتا ہے جلتی رہتی ہے۔" الیکٹرک نے کنٹرول پینل کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے یہ سب پتا نہیں ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انسانی جان کی بہرحال کوئی قیمت ہوتی ہے انہیں مارنے کے بجائے قید میں بھی رکھا جا سکتا تھا۔"

جان گرے خطرہ مول لینے والا شخص نہیں ہے۔" الیکٹرک نے طیارے سے باہر جھانکا۔ "پتا مجھے نہیں ہے مگر وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

"کیونکہ خطرہ تمہیں بھی ہے اس لیے تم خاموش ہو۔"

"چاہو تو تم ایسا ہی سمجھ لو۔" طیارے نے کوئی گیارہ بجے جزیرے سے پرواز کی تھی لیکن جنوب مشرق کی طرف جانے سے سورج سرعت سے پیچھے جا رہا تھا اور تین گھنٹے بعد ہی شام ہو چکی تھی۔ الیکٹرک کسی قدر فکر مند تھا کہ نہ جانے طیارہ اُتارنے والی جگہ پر روشنی کا بندوبست بھی تھا یا نہیں۔ چوتھا گھنٹہ گزرنے سے پہلے تاریکی چھا چکی تھی۔ طیارہ جس رُخ پر جا رہا تھا اسی طرح ہم آسٹریلیا پاپوا نیوگنی کے پاس جا پہنچے۔ الیکٹرک نے تصدیق کی۔

"ہاں...... اب جزیرہ پاپوا نیوگنی سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔"

"میرے خدایا...... یہ تو ڈھائی ہزار میل سے بھی زیادہ فاصلہ ہے کیا طیارہ اتنا طویل سفر کر سکے گا۔"

"روانگی کے وقت طیارے میں تین ہزار میٹرز تک کا ایندھن تھا۔ جو وہاں تک جانے کے لیے کافی ہوگا۔"

چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ جان گرے اپنے ساتھ تلے ہوئے گوشت کے پارچے اور مختلف قسم کی ٹن بند غذائیں لایا تھا۔ مجبوراً وہی زہر مار کرنی پڑی تھیں میرا اندازہ تھا کہ اس وقت تک ہم کوئی پندرہ سو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ ایندھن کی مقدار میں خاصی کمی آنے سے طیارے کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی اور اب یہ طیارہ تین سو بیس کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہا تھا۔ الیکٹرک نے بتایا کہ اگلے تین گھنٹے میں ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ اور ابھی ہمارے پاس کوئی ایک ہزار میٹرز کا ایندھن تھا۔

جان گرے برانڈی سے شغل کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ بندھے ہوئے چاروں افراد نے دو تین بار واویلا کیا تھا کہ انہیں حاجت محسوس ہو رہی ہے مگر میں نے انہیں کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس طیارے میں رفع حاجت کی کوئی گنجائش نہیں تھی اسی لیے وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے پر صبر کرنے پر مجبور تھے۔ جان گرے جاگا تو میں اس کے سر ہو گیا تھا۔

"یہ جزیرہ کس کا ہے جہاں تم مجھے لیے جا رہے ہو۔"

"میرا ہے۔ میں نے اسے خرید لیا ہے۔"

"تم نے پورا جزیرہ خرید لیا ہے؟"

"ہاں...... ظاہر ہے مجھ جیسے شخص کو اس قسم کے ٹھکانے کی ضرورت تو رہتی ہے۔ جزیرے پر میں نے ایک عالیشان مکان بنوایا ہے۔ ڈھائی سو کے قریب مقامی باشندے بھی اس جزیرے پر آباد ہیں۔ وہ سب میرے غلام ہیں انہیں روزگار فراہم کرنے کے لیے میں نے جزیرے پر چائے اور کافی کے باغات لگوائے ہیں۔ میری چار عدد ماہی گیر لانچز ہیں جن پر مقامی افراد سمندر میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔"

"جزیرہ تم نے اپنے اصلی نام سے لیا ہے؟"

"میں اتنا احمق نہیں ہوں وہاں کے لوگوں اور مقامی حکومت کے لیے میں جے جے گرے ہوں۔ وہاں بھول کر بھی مجھے جان نہ کہنا۔"

"یہ کیا بات ہوئی جب نام کے ساتھ گرے لگ گیا تو باقی کیا رہا۔" میں نے اعتراض کیا۔

"دنیا میں لاکھوں گرے ہیں۔ ایک میرے ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"مرضی تمہاری۔ ہاں...... تم جزیرے کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"جزیرہ درمیانے سائز کا ہے۔ کوئی دو سو ہیکٹرز رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ ہموار ہے۔ شرقی حصہ کوئی ڈھائی سو فٹ بلند ہے۔ جو مغرب کی طرف بتدریج ڈھلان کی صورت میں چلا جاتا ہے۔ اس ڈھلان پر چائے اور کافی کے باغات ہیں۔ ساحل سے ذرا دور میٹھے پانی کی ایک جھیل بھی ہے۔ اس سے پانی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔"

"بجلی ہے۔"

"میں نے ذاتی ضروریات کے لیے جنریٹر لگا رکھا ہے۔ اس میں شمسی سیلوں کی مدد سے بجلی جمع کی جاتی ہے۔ یہ رات کو روشنی اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔"

"لگتا ہے تم طویل عرصے سے پلاننگ کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں شروع سے تھا کہ مجھے یہ کردار ختم کرنا پڑے گا اور شاید اب اس کا وقت آ گیا ہے۔"

"لیکن یہ چہرہ تمہاری شناخت ہے اسے کیسے ختم کرو گے؟" اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ بھی ختم ہو جائے گا۔" ہم طیارے کی عقبی نشستوں پر آہستگی سے بات کر رہے تھے۔ انجنوں کی گونج میں ہماری آواز ان چاروں تک نہیں جا رہی تھی۔

"پلاسٹک سرجری؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا۔





"یہی ارادہ ہے لیکن ابھی نہیں۔ میں کچھ عرصے حالات کا جائزہ لوں گا اس کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھاؤں گا۔"

"جان گرے آرگنائزیشن والے تمہیں تلاش ضرور کریں گے۔"

"ظاہر ہے لیکن وہ میرے خلاف بلا جواز کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے ہیں۔ جب تک کونسل کے تمام بڑے میرے خلاف منظوری نہ دیں میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

مجھے تھکن اور بے زاری محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نشست پر بیٹھ گیا اور ذرا دیر بعد سو چکا تھا پھر مجھے جان گرے نے ہلایا تھا۔

"اُٹھ جاؤ جزیرہ نزدیک آ گیا ہے۔ الیکٹرک طیارہ لینڈ کرنے جا رہا ہے۔"

"پھر جزیرہ۔" میں کراہا۔ "آخر ان جزیروں سے کب جان چھوٹے گی؟"

"کبھی نہیں۔" جان گرے مسکرایا۔ "دنیا آخر ایک جزیرہ ہی تو ہے۔ جس کے چاروں طرف پانی ہے۔"

میں اندر کاک پٹ میں آیا۔ سامنے نیچے ایک جزیرہ نظر آ رہا تھا۔ پندرہویں یا سولہویں کا چاند بھی خاصا روشن تھا۔ سیاہ سمندر میں اُبھرا جزیرہ اپنی جزئیات سمیت صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک طرف قطاروں میں روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ یہ رن وے تھا۔ جس پر طیارہ با آسانی اُتر سکتا تھا۔ الیکٹرک نے مہارت سے چکر دے کر طیارے کو عین رن وے کی سیدھ میں کیا۔ میں اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا تھا الیکٹرک نے طیارے کو آرام سے اسی رن وے پر اُتار لیا تھا۔ دراصل یہ کچا میدان تھا۔ جس کے دونوں طرف قطاروں میں بلب لگے تھے۔ طیارے کو ان کے درمیان میں اُتارا جاتا تھا۔

طیارہ ٹیکسی کرتا رن وے کے آخر سے ذرا پہلے ہی رُک گیا تھا۔ مجھے کاک پٹ سے ایک گاڑی کی روشنیاں اسی طرف آتی نظر آئیں۔ جان گرے نے دروازہ کھول دیا تھا اور نیچے کود گیا۔ انجن بند کر کے الیکٹرک نے بھی سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"نیچے اُترو۔ کمر تختہ ہو گئی ہے۔" واقعی اس کی ہمت تھی کہ اتنی دیر وہ طیارہ اُڑاتا رہا تھا۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ دواؤں کا اثر ختم ہونے سے جسم میں دُکھتی جگہوں پر درد محسوس ہونے لگا تھا۔ میں طیارے سے نیچے اُترا تو فضا خاصی سرد تھی۔ کم سے کم جزیرے کے مقابلے میں زیادہ سرد تھی۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ نیچے جان گرے ایک سال خوردہ جیپ کے پاس دو افراد کے ساتھ کھڑا انہیں مقامی زبان میں ہدایات دے رہا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے طیارے کی طرف لپکے اور جان گرے جیپ پر سوار ہو گیا۔

"آ جاؤ دوستو۔" اس نے ہمیں کہا۔

"یہ تمہارے ملازم ہیں؟" میں نے لپک کر جیپ میں سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا کہ اس جزیرے کے تمام لوگ میرے ملازم ہیں۔'' اس نے جیپ سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ گھوم کر مشرقی سمت میں واضح نسبتاً اونچے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ جزیرہ بے حد ہرا بھرا اور صاف ستھرا ہے۔ جنوب کی سمت میں آبادی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ شاید جزیرے کے باشندوں کا گاؤں تھا۔ جان گرے نے بتایا کہ مچھلی اور چائے کافی کے باغات کی ساری آمدنی ان لوگوں کی تنخواہ میں چلی جاتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی اسے اپنے پاس سے لگانا پڑتا تھا۔ ورنہ کم ہی بچتا تھا۔

''تم خسارے کا سودا کیوں کر رہے ہو؟''

''اس کی ایک وجہ ہے۔'' جان گرے بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ یہاں سے جائیں۔ ضروریاتِ زندگی کی ساری اشیاء باہر سے لانی پڑتی ہیں۔ جو مہنگی اور نایاب ہیں اگر ان لوگوں کو اپنی تنخواہ اور سہولتیں نہ ملیں تو نقل مکانی کر کے بڑے جزیرے پر چلے جاتے ہیں جہاں صنعتوں اور کھیتوں میں با آسانی روزگار مل جاتا ہے۔ ان اطراف میں جزیرے آہستہ آہستہ انسانوں سے خالی ہو رہے ہیں۔'' جیپ جزیرے کے سب سے اوپری حصے پر جا پہنچی تھی۔ اس طرف پتھریلا ساحل تھا۔ سرے پر ایک شاندار سا مکان تھا اس دو منزلہ مکان کو جنریٹر چلا کر روشن کیا جا رہا تھا۔ سامنے سیڑھیوں پر ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ جان کے جیپ سے اُترتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔ جان نے بے تکلفی سے اس کا بوسہ لیا۔

''کیرل ڈارلنگ تمہاری یاد مجھے بے تاب رکھتی تھی۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ لگاوٹ سے بولی۔ ''پورے ایک سال دو مہینے بعد آئے ہو۔''

''بس ڈارلنگ وقت نہیں ملا۔'' جان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اوپر کی طرف بڑھا۔ عورت دلکش اور مقامی تھی اس نے لباس بھی مقامی طرز کا پہن رکھا تھا۔ مرد کا مؤدبانہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ ملازم ہے۔ کیرل صاف انگریزی بول رہی تھی۔ مرد نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ جان گرے نے ہماری طرف اشارہ کیا اور پھر ہم سے کہا۔

''یہ رومیدون ہے۔ اس کے ساتھ جاؤ۔ چینج کر کے نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ جب تک کھانا لگتا ہے'' رومیدون غالباً رمضان تھا۔ وہ ہمیں مکان کے نچلے حصے میں عقبی سمت میں لے گیا۔ یہ جگہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس کا نام رمضان ہی تھا مگر مقامی تلفظ میں بگڑ کر رومیدون ہو گیا تھا۔ اس نے ہمیں کمرے دکھائے۔ میں نے نہانا نہیں تھا۔ اس لیے صرف منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا۔ اس دوران میں رمضان ایک بڑا سا ڈھیر لے آیا جس میں رنگا رنگ مردانہ کپڑے تھے۔ اس ڈھیر کو رمضان کی مدد سے کھنگالنے کے بعد مجھے ایک پتلون اور ایک شرٹ اپنے ناپ کی مل گئی اور میں نے فوری طور پر ہسپتال کے لباس سے نجات حاصل کر لی۔ اس میں مجھے سخت اُلجھن ہو رہی تھی حالانکہ وہ خاصا آرام دہ لباس تھا۔ رمضان نے مجھ سے پوچھا۔





''ڈرنک سر۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''آئی ایم مسلم یو نو مسلمان؟''

''مسلمان۔'' رمضان کا چہرہ کھل گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''مسلم...... مسلم۔''

''مسلمان...... پاکستانی۔'' اس کا چہرہ مزید کھل گیا تھا۔

''اوہ...... پاکستانی...... پاکستانی...... فرینڈز...... فرینڈز۔'' گویا اس جزیرے کی زیادہ تر آبادی مسلم تھی۔ انڈونیشیا کے جنوبی جزائر میں عیسائی بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ فلپائن میں اپنے پنجے گاڑھنے کے بعد عیسائی مشیروں نے انڈونیشیا کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔ ان کی مسلسل کوششوں اور بین الاقوامی طاقتوں کی سازشوں سے ...... عیسائی اکثریت میں ہو چکے تھے۔ ان کو طاقت کے بل بوتے پر ایک آزاد ملک بنوا کر دے دیا۔ نام نہاد انصاف پسندوں کو کشمیر اور فلسطین میں انصاف کی فراہمی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس طرح جنوبی انڈونیشیا میں مسلم آبادی مسلسل کم ہو رہی ہے۔ دھونس اور ترغیب سے لوگوں کو عیسائی بنایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر جزائر خالی کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے علاقائی طاقتوں کے سامنے بین الاقوامی طاقتیں بھی پوری طرح سرگرم ہیں۔ رمضان میرے لیے ناریل کا پانی لے آیا۔ ساتھ ہی اس نے اشارے سے بتایا کہ پندرہ منٹ بعد کھانا میز پر لگ جائے گا۔

ناریل کا پانی تازہ اور ٹھنڈا تھا۔ اسے پی کر میری پورے دن کی ذہنی اور جسمانی تھکن اُتر گئی تھی۔ رمضان نے مزید کے بارے میں پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ انگریزی کے چند الفاظ ہی بول سکتا تھا۔ اس نے دوبارہ ناریل کا پانی لا کر دیا تو میں نے اشاروں میں پوچھا کیا وہ اپنے آقا سے خوش ہیں۔ اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

''جے جے گرے گڈ مین...... گڈ مین۔'' گویا جان گرے نے ان لوگوں پر اپنا امیج بالکل مختلف رکھا تھا۔ وہ ان کو اچھی تنخواہیں دیتا تھا۔ ان سے مہربانی سے پیش آتا تھا، کسی بھی مصیبت میں ان کے کام آتا تھا۔ چنانچہ وہ اور اس کے گرویدہ تھے۔ رمضان نے مجھے مکان کے نچلے حصے کی سیر کرائی۔ اس میں مہمان خانہ تھا۔ باورچی خانہ اور نشست گاہ کے ساتھ ایک تفریحی کمرا بھی تھا جس میں مختلف قسم کے انڈور کھیل تھے۔ اوپری حصہ جان گرے کے لیے مخصوص تھا۔ اس لیے اس نے مجھے نیچے نیچے کی سیر کرائی۔ کچن کے ساتھ بڑا سا ڈائننگ ہال تھا۔ جس میں لگی میز کے گرد کم و بیش بیس افراد آسانی سے کھانا کھا سکتے تھے۔ اس مکان کا نچلا حصہ بنانے کے لیے جان گرے نے اس پر کھل کر پیسہ خرچ کیا ہے۔ باورچی خانے میں ایک کمسن سی مقامی لڑکی کام کر رہی تھی۔ رمضان نے اسے بلا کر اس کا تعارف کرایا تھا۔

''مائی ڈاٹر...... سومیہ۔'' لڑکی نے شرما کر مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا اور اپنا نام بتایا۔

''یوسف علی خان۔'' لڑکی بہت شرمیلی تھی۔ مستقل نظریں نیچی کیے کھڑی رہی۔ پھر کچن کی طرف بھاگ گئی۔ رمضان ہنسنے لگا۔اس نے اپنی نامکمل انگریزی میں بتایا۔

''نیکسٹ ایئر......سومیہ! میرج ہر کزن۔''اس جزیرے پر آباد سارے ہی افراد ایک خاندان کی طرح تھے۔

''ویری ویری کانگریچولیشن۔'' میں نے اسے مبارکباد پیش کی۔ رمضان اپنی بیٹی کی تعریفیں کرنے لگا۔

''گڈ کک......گڈ سنگر......گڈ ڈانسر......گڈ وائف۔'' رات کا کھانا اس لڑکی نے بنایا۔ پھر وہ میز پر سجانے لگی اور رمضان ایک گھنٹی بجانے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ جا کر میرے ساتھی کو بلا لائے۔ اسے کیا معلوم کہ یہاں کھانے کے لیے گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ گھنٹی کی آواز سن کر کیرل اور جان گرے اوپر سے اُتر آئے۔ ان کے حلیے سے ظاہر تھا کہ انہوں نے اوپر خاصا مصروف وقت گزارا تھا۔ الیکٹرک کے آنے پر ڈنر کا آغاز کیا گیا۔ کھانے میں کئی طرح کی مچھلی، پارلی، سینڈوچز، کھیر نما سوکھی شے اور شراب تھی۔ سوائے میرے وہ تینوں کھانے کے ساتھ پی بھی رہے تھے۔ بلکہ کیرل اور جان زیادہ تر پی رہے تھے۔ انہیں اوپر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے کھانا مختصر کر کے وہ شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئے۔ رمضان نے مہمان داری کے تقاضے نبھاتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

''چائے......کافی سر۔''

''کافی۔'' میں نے کہا اور الیکٹرک نے میری تائید کی۔ ہم مکان کے عقبی حصے میں واقع برآمدے کی طرف نکل آئے۔ اس ریلنگ تلے کوئی دو سو فٹ کی گہرائی تھی۔ مکان بنانے کے لحاظ سے اس جزیرے پر بڑی آئیڈیل جگہ تھی۔ سامنے سے پورا جزیرہ دور تک نشیب میں ڈھلتا نظر آتا تھا اور اس جگہ سے سمندر کو دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے سیاہ سمندر میں اُفق پر چند دھبے نظر آئے شاید وہاں کچھ اور جزائر تھے۔ پھر ان میں سے ایک شعلہ سا نکلا تھا جو آسمان کی طرف گیا۔ وہ آتش فشاں تھا جو ابھی لاوا اُگلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن اور پاپوانیوگنی کے جزائر آتش فشاں کے لاوا اُگلنے سے بنے ہیں۔ اس خطے میں آج بھی دنیا کے سب سے زیادہ آتش فشاں پائے جاتے ہیں۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' الیکٹرک نے مجھ سے پوچھا۔

''میں لندن جاؤں گا۔'' میں نے کاجل کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔''وہاں کوئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

''اگر اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں دل و جان سے حاضر ہوں۔'' اس نے خلوص سے کہا تھا۔ میں اور الیکٹرک وہیں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رمضان نے کافی لا کر دی اور ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔ کافی پی کر الیکٹرک چلا گیا تھا۔ میں کاجل کے بارے میں




سوچنے لگا اگر وہ پاکستان سے نکل کر لندن آ چکی تھی تو کتنی شدت سے میرا انتظار کر رہی ہوگی اور مجھے یاد کرتی ہوگی۔ ہر صبح امید سے جاگتی ہوگی اور ہر شام مایوسی سے سو جاتی ہوگی۔ رات بھیگتی رہی اور میں وہیں کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ نہ جانے کب کرسی پر ہی نیند آ گئی۔ پھر سورج کی گدگداتی کرنیں منہ پر محسوس ہوئیں تو آنکھ کھل گئی۔ میں اُٹھا اور گھوم کر برآمدے سے نیچے آ گیا۔ اس طرف چٹانیں تھیں اور پھر سیدھا نشیب تھا۔ سمندر میں بھی جا بجا چٹانیں جھانک رہی تھیں جن کے درمیان موجیں سر پٹک رہی تھیں۔

صبح کی ہوا میں بے پناہ تازگی تھی۔ میں چٹان کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ یہاں پر سبزہ تھا اور مختصر جھاڑیاں تھیں۔ جزیرے کے وسط میں باغات تھے اور دائیں بائیں نشیب کی طرف گھنا جنگل تھا۔ مجھے مغرب کی طرف ایک جیٹی کی جھلک نظر آئی۔ جس پر ایک یا دو کشتیاں کھڑی تھیں۔ میں اب ذرا نشیب میں جنگل کے پاس تھا۔ اس جنگل میں بلند و بالا اور گھنے درخت تھے۔ اچانک مجھے لگا جیسے پاس ہی کوئی بول رہا ہے۔ آواز نسوانی تھی۔ میں رُک گیا۔ بولنے والی مقامی زبان میں بات کر رہی تھی۔ پھر کسی مرد کی آواز آئی۔ میں محتاط انداز میں آوازوں کی سمت بڑھا۔ ایک درخت سے جھانکنے پر مجھے کیرل اس آدمی کے ساتھ بات کرتی نظر آئی جو کل رات جیپ لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص بھی تھا لیکن فی الحال وہ کیرل کے ساتھ اکیلا نظر آ رہا تھا۔ کیرل اس سے تیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ چہرے سے وہ اچھا آدمی نہیں لگتا تھا لیکن کیرل کے سامنے دبا دبا نظر آ رہا تھا۔ اچانک کیرل نے اسے تھپڑ مارا اور اس نے بھیگی بلی بن کر اسے بھی برداشت کر لیا مگر ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کا شعلہ لپکتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا۔ کسی وجہ سے اس نے خود پر قابو رکھا تھا ورنہ نازک سی کیرل اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ارنا بھینسے کی طرح مضبوط نظر آتا تھا۔ کیرل اسے مسلسل بُرا بھلا کہنے کے انداز میں کوستی رہی اور پھر چل پڑی۔ اس کا رُخ مکان کی جانب تھا۔ مرد اسے واضح طور پر غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیرل کے جانے کے بعد اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا تھا اور خود بھی ایک طرف چل پڑا تھا۔ اس وقت نہ جانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ غالباً غصے میں تھا۔ دوسرے اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا تعاقب ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جنگل سے نکل کر وہ چائے کے باغات کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اس وقت پودے خاصے بڑے ہو رہے تھے۔ مجھے خدشہ نہیں تھا کہ وہ اچانک پلٹ کر دیکھے گا کہ مجھے چھپنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس کا رُخ تارکی آبادی کے مخالف سمت ساحل کی طرف تھا۔ شاید اس طرف جھیل بھی تھی۔ جس سے جزیرے کو پینے اور دوسرے کاموں کے لیے میٹھا پانی سپلائی کیا جاتا تھا۔ وہ شخص جھیل کے پاس بنے لکڑی کے کاٹیج میں داخل ہو گیا۔ اس نے اندر جاتے ہوئے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ میں محتاط قدموں سے کاٹیج کی طرف بڑھا۔ یہ چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ مشکل سے دو کمروں والا۔ جسے لکڑی کے تختے اناڑی پن سے جوڑ کر بنایا

گیا تھا۔

میں نے ایک جھری سے اندر جھانکا۔ اس شخص کا ساتھی بھی اندر تھا۔ دونوں آپس میں گرم جوشی سے ملے تھے۔ کیرل کے ہاتھوں مار کھانے والا سخت طیش میں تھا۔ اس بار اس نے انگریزی زبان میں کیرل کی ماں بہن کو گالیاں دیں۔

''وہ حرام زادی کسی چکر میں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمیں فرار ہو جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ کھل جائے۔ اب تو طیارہ بھی ہے لیکن وہ نہیں مانی۔''

''وہ مانے گی بھی نہیں۔'' دوسرا شخص تلخی سے بولا۔ ''وہ محفوظ ہے اگر پھنسے بھی تو ہم پھنسیں گے۔ اس لیے ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔ گرے صاحب کے آنے کا سن کر میں نے تم سے کہا تھا کہ اس عورت پر لعنت بھیجو اور یہاں سے چلو مگر تم پر اس کا بھوت سوار ہے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ وہ اتنا اچانک آیا ہے کہ ہمارے پاس فرار کا وقت ہی کہاں تھا۔ اس کی ایک کال پر بحری پولیس ہمیں پکڑ لیتی اور اس کے بعد ساری عمر جیل میں گزرتی۔''

''ہمارے خلاف کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' دوسرا بولا۔

''احمقانہ بات ہے، میں کہہ رہا ہوں گاؤں کے سارے لوگ ہمارے خلاف گواہی دیتے۔''

''تو کیا اب وہ جان گرے سے شکایت نہیں کریں گے۔'' دوسرا غصے میں آ گیا تھا۔ ''یہ سب ہم سے نفرت کرتے ہیں۔''

''نہیں وہ ہم سے ڈرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارے خلاف شکایت کرنے کا کیا انجام ہوگا۔ اس جزیرے کے چار افراد پہلے ہی سمندر کی نذر ہو چکے ہیں۔'' پہلے والے کا لہجہ معنی خیز تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر ایک طرف پڑے بستر پر دراز ہو گیا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ گرے صاحب بلائے تب بھی مت جگانا۔ رات ان چاروں کو ٹھکانے لگانے میں گزر گئی ہے۔'' میں سن سا رہ گیا۔ جان گرے نے ان چار قیدیوں کو بھی ٹھکانے لگوا دیا تھا۔ وہ مقامی زبان میں انہیں یہ ہدایات دے رہا تھا اور یہ دو افراد کسی چکر میں ملوث تھے۔ جس کا علم جان گرے کو ہو جاتا تو شاید یہ دونوں بھی مارے جاتے۔ ممکن ہے اس کے کسی مفاد کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کر رہے ہوں۔ میں واپس ہو گیا۔ اس بار میں کھیتوں کے درمیان سے گزرتا جان گرے کے مکان کی طرف جانے لگا۔ گاؤں سے نکل کر عورتیں اور لڑکیاں چائے کے باغات سے پتیاں چننے آ رہی تھیں۔ رنگین لباسوں میں ملبوس یہ لڑکیاں بے حد سادہ اور معصومانہ من رکھتی تھیں۔ میں ان کے پاس سے گزرتا تو شرما کر ایک طرف ہو جاتی تھیں۔ یہ بے حد معصوم لوگوں کی جنت تھی جس میں جان گرے جیسا شیطان دولت کے بل بوتے پر آباد تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے چیلے ان لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ چار افراد کو مارنے کا میں ان کے منہ سے سن چکا تھا۔

جان گرے کے بارے میں مجھے خوش فہمی نہیں تھی کہ اس کی سوچوں اور فطرت میں کوئی تبدیلی




آئی ہے۔ میرے ساتھ وہ کسی اور وجہ سے اچھی طرح پیش آ رہا تھا لیکن دوسرے لوگوں کے لیے وہ اسی طرح کا سفاک اور خود غرض شخص تھا۔ اس کا ثبوت وہ سات افراد تھے جنہیں اس نے بے دردی سے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا تاکہ اس کا راز راز رہے۔ مقامی لوگوں کے لیے بھی وہ اس وقت تک نرم اور مہربان تھا جب تک وہ اس کے احکامات کی تعمیل بے چوں چرا کرتے رہیں۔ جہاں انہوں نے اس کی بات سے انکار کیا وہ اس کا سفاک روپ بھی دیکھ لیں گے۔

رمضان کی بیٹی سومیہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ رمضان اور اس کی بیٹی رات کو چلے جاتے تھے اور صبح سے کام پر آ جاتے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ زخموں سے پٹیاں اُتاریں۔ ان کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ اگر میں ایک دو دن احتیاط کرتا تو یہ آسانی سے بھر جاتے۔ میں نے رمضان سے فرسٹ ایڈ بکس کا پوچھا۔ زبان سے تو نہیں لیکن میرے زخم دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے میڈیکل باکس لا کر خود میری مرہم پٹی شروع کر دی۔ زخم صاف کیے۔ ان پر پاؤڈر چھڑکا اور پھر پٹی کر دی۔ اس نے اس دوران میں اپنی زبان میں ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا تھا مگر اس کا لہجہ اور ہاتھوں کی محبت بھرا لمس بتا رہا تھا کہ وہ میرے لیے خلوص سے کچھ کہہ رہا ہے۔

الیکٹرک اُٹھ کر سامنے والے لان میں ایکسر سائز کر رہا تھا۔ میں نے رمضان سے کہا کہ ہمارے لیے ناشتہ برآمدے میں لگا دے۔ الیکٹرک ایکسر سائز سے فارغ ہو کر آیا۔

''آج میں چلا جاؤں گا۔'' اس نے مجھے آگاہ کیا۔ ''اگر تقدیر نے ملایا تو پھر ملیں گے۔''

''لیکن میں تم سے مقابلہ ہرگز نہیں کروں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ اس نے قہقہہ لگایا تھا۔

''برادر میں بھی تم سے مقابلہ نہیں کروں گا۔'' ناشتے کے بعد اس نے اپنے لباس سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ رکھ لو۔''

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے لفافہ لیے بغیر پوچھا۔

''اس میں پانچ ہزار امریکی ڈالر ہیں تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔''

''ضرورت تو پڑے گی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں یہ رقم کیوں لوں۔''

''تاکہ تمہیں جان گرے سے نہ مانگنی پڑے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں نے جان گرے سے بھی رقم نہیں لینی ہے۔''

''اس کے باوجود میں اصرار کروں گا تم قرض سمجھ کر لے لو۔ جب لندن پہنچو تو میرے لندن والے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا۔''

''ہاں...... یہ ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر دو۔'' میں نے لفافہ لے لیا۔ اس نے مجھے نمبر اور بینک کے بارے میں بتایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا۔ ''اگر میں کسی وجہ سے لندن نہیں پہنچ سکا کیونکہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے تب تم لندن میں شاہد کریم نامی بزنس مین سے یہ رقم

لے لیناوہ میرادوست ہےاور میرے مالی معاملات کانگران بھی ہے۔''اس نے سر ہلایا۔

''میری دعا ہے کہ تم خیر و عافیت سے لندن پہنچ جاؤ کیونکہ تمہارا کوئی انتظار کر رہا ہے۔اب میں چلتا ہوں۔''وہ کھڑا ہو گیا۔

''اے......اچانک اتنی جلدی؟''میں حیران رہ گیا تھا۔وہ مسکرایا۔

''ہمارے جیسے لوگ کہیں جانے یا آنے میں تیاری نہیں کرتے۔بس ایسے ہی اچانک اتنی جلدی چل پڑتے ہیں۔''

''جزیرے سے کیسے جاؤ گے؟''میں نے پوچھا۔

''جان گرے بتا رہا تھا کہ صبح گیارہ بجے ایک کشتی سامان لے کر آتی ہے۔وہ اسی علاقے کے بڑے جزیرے تک جاتی ہے۔وہاں سے جکارتہ جانے والی بوٹ مل جاتی ہے اور طیارہ بھی مل سکتا ہے۔''میں نے اس سے ہاتھ ہلایا۔وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر گلے لگ گیا۔اس کام کے لیے اسے اچکنا پڑا تھا کیونکہ وہ قد میں مجھ سے کوئی سوافٹ چھوٹا تھا۔میں نے گرم جوشی سے اسے دبایا۔

''الیکٹرک! تم جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے ورنہ جان گرے اور اس کے قبیلے کے لوگ نہ جانے تیسری دنیا کے لوگوں کا کیا حال کریں گے۔''وہ شرمندگی سے بولا۔

''یوسف! میں بھی کوئی اتنا اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اب تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اچھا آدمی بننے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''آؤ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''رمضان کافی لے کر آ رہا تھا۔ہم نے اس سے مگ لیے اور اسے حیران پریشان چھوڑ کر چل پڑے تھے۔ہم چائے اور کافی کے باغات کے درمیان سے گزرتے ہوئے جزیرے اور اس کے باشندوں کے بارے میں بات کرتے رہے۔اس نے کہا۔

''مجھے یقین ہے اگر جان گرے اسی جگہ رہا تو جلد یا بدیر پھر ان معصوم لوگوں کو کسی نہ کسی مصیبت سے واسطہ پڑے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔گرے جیسے لوگ فتنہ انگیزیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں ان کے قدم جہاں پہنچتے ہیں۔وہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔''

''تم کیا کرو گے اب؟''

''میرا سب سے بڑا مسئلہ پاسپورٹ ہے اور میں کسی قسم کی دستاویزات سے محروم ہوں۔خوش قسمتی سے میرے پاس برٹش نیشنلٹی ہے۔میں کوشش کروں گا کہ برطانوی سفارت خانے سے پاسپورٹ مل جائے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔جکارتہ کے برطانوی سفارت خانے کا فرسٹ سیکرٹری میرا کزن ہے۔اس کا دادا جنگ عظیم کے بعد برطانیہ آباد ہو گیا تھا۔کوز ڈو میکر ہے اس کا نام۔میرا حوالہ دو گے تو تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔''




''یہ تم نے اچھی بات کی۔''وہ خوش ہو گیا تھا۔''میں ذرا جان گرے کا حساب کتاب کر لوں پھر یہاں سے نکلتا ہوں۔''

''کیسا حساب کتاب؟''

''بس کچھ اگلا پچھلا ہے۔''میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔جیٹی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ایک وقت میں مشکل سے دو چار درمیانے سائز کی کشتیاں آ سکتی تھیں۔وہاں پر ایک شخص تھا جو جیٹی پر رسّی ڈالے بیٹھا تھا اور ظاہر ہے کہ انگریزی سے نابلد تھا۔بڑی مشکل سے اس سے اشاروں میں پوچھا کہ سامان لانے والی کشتی کب آئے گی؟ اور اس کے جوابی اشاروں سے خاصی مشکل سے ہی یہ نتیجہ نکالا کہ سامان لانے والی کشتی آج نہیں آئے گی۔اتوار کو کشتی نہیں آتی تھی۔میں نے الیکٹرک کی طرف دیکھا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''میں ہر صورت جاؤں گا چاہے مجھے تیر کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔''الیکٹرک نے جیٹی پر کھڑی اکلوتی کشتی کی طرف دیکھا۔

''لیکن پہلے ان کشتی والوں سے بات کر لیں۔''اس اثناء میں مجھے ان دو بدمعاشوں میں سے آتا دکھائی دیا۔یہ اس کا ساتھی تھا جسے صبح کیرل کے ہاتھوں مار کھانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔وہ تیزی سے ہماری طرف آیا اور کسی قدر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

''کیوں یہاں آنے پر پابندی ہے؟''میں نے دریافت کیا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم لوگ گرے صاحب کے مہمان ہو۔یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟''

''مجھے بڑے جزیرے تک جانا ہے۔''الیکٹرک نے کہا۔''اور آج سامان لانے والی کشتی نہیں آئی؟''

''تو کل چلے جانا۔''اس نے کہا۔

''میں اس کشتی میں جا سکتا ہوں۔''

''یہ......یہ خراب ہے۔''اس نے صاف جھوٹ بولا۔''اس کے انجن میں مسئلہ ہے۔''

''اچھا......ابھی دیکھ لیتے ہیں۔''میں نے کہا اور جیٹی پر قدم رکھا۔وہ جلدی سے میری طرف آیا۔

''تم نہیں جا سکتے۔''

''آرام سے۔''الیکٹرک نے اسے روکا۔''میرے ساتھی کو اپنا کام کرنے دو۔''

اس نے الیکٹرک کو دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹانا چاہا اور میں نے اسے منہ کے بل گرتے دیکھا۔الیکٹرک نے اپنا پاؤں اس کی کمر پر رکھ دیا تھا۔میں مسکراتے ہوئے اس ماہی گیر کی

لانچ میں کودا۔ یہ زیادہ بڑی کشتی نہیں تھی۔ عقب میں مختصر سا پائلٹ ہاؤس تھا۔ انجن اس کے عقب میں تھا۔ میں نے ڈوری گھمائی اور انجن سٹارٹ ہوگیا۔ اس کے شور میں اس کا واویلا دب گیا جو الیکٹرک کے پاؤں تلے پڑا تھا۔ میں نے انجن چلتے رہنے دیا۔ ایندھن کی پوزیشن دیکھی۔ پائلٹ روم میں ریڈیو بھی تھا اور کام کر رہا تھا گویا لانچ ہر لحاظ سے سفر کے قابل تھی۔ میں کود کر باہر آیا۔ وہ شخص چیخ چیخ کر دہائی دے رہا تھا کہ اس کی کمر نہ توڑی جائے۔

''صاحب میں مر جاؤں گا۔''

''بالکل مر جاؤ گے۔'' میں نے اس کی گردن پکڑ کر اسے اُٹھایا۔ ''ہم سے جھوٹ بولنے والا زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا۔ تم نے غلط کیوں کہا تھا کہ کشتی خراب ہے۔''

''صاحب آپ زبردستی کر رہے ہیں۔ میں گرے صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کو کیسے لے جا سکتا ہوں۔'' اس نے مسکین سی صورت بنائی۔ میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔

''بکومت...... گرے صاحب کے چمچے، مجھے معلوم ہے تم اس کے کتنے وفادار ہو۔ کشتی میں چلو۔ ان صاحب کو بڑے جزیرے تک چھوڑ کر آنا ہے اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''رانگر۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گا۔''

''تمہارا باپ بھی جائے گا۔'' میں نے اسے دھکیلا تو اس نے مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے گھماتے ہوئے اس کا بازو عقب کی طرف موڑ دیا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔

''صاحب میرا بازو......''

''ٹوٹ جائے گا اگر تم نے اسی طرح اسے چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔'' اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مجھ سے بازو نہیں چھڑا سکے گا اس نے بے بسی سے کہا۔

''کیا چاہتے ہو صاحب؟''

''بتایا تو ہے اس صاحب کو بڑے جزیرے تک چھوڑ کر آنا ہے۔''

''بہت دور ہے صاحب کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔''

''پورا دن لگ جائے اور تمہیں اس کام کا معاوضہ ملے گا کشتی کا کرایہ الگ۔'' اس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

''کتنا صاحب؟'' الیکٹرک نے اپنے پاس سے سو ڈالرز والے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد کی اور اس میں سے دو نوٹ نکال کر اس کی شرٹ میں ٹھونس دیئے۔

''ایک تمہارا اور ایک کشتی کا کرایہ۔''

''ایک صاحب یہ تو بہت کم ہے۔''

''تمہیں یہ بھی نہیں ملتے اگر اس وقت جے، جے گرے ٹن نہ پڑا ہوتا۔ تمہیں اس کے حکم پر چھوڑ کر آنا پڑتا۔'' میں نے کہا۔ ''اب دیر کی تو معاوضہ آدھا رہ جائے گا۔''




''ہم چلے گا صاحب۔'' وہ فوری طور پر تیار ہوگیا۔ کشتی کا انجن چل رہا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق آئل پانی چیک کیا اور کشتی کو جیٹی سے نکالنے لگا۔ اس جگہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے بڑی کشتی نہیں آ سکتی تھی۔ جزیرے کے مشرق سے آتی لہروں نے اس طرف چٹانیں کاٹ دی تھیں اور سامنے کی طرف ریت جمع ہوگئی تھی۔ جس سے ساحل وجود میں آیا تھا۔ جزیرے سے ذرا آگے آتے ہی سمندر یک دم گہرا ہوگیا تھا۔ یعنی یہ جزیرہ دراصل کسی آتش فشاں کی چوٹی تھی اور لاوے سے تشکیل پایا تھا۔ میں نے پائلٹ روم کی تلاشی لے لی تھی مگر وہاں کوئی ہتھیار یا ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے ہمیں نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ میں اور الیکٹرک بوٹ کے وسط میں بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے وہ آواز سنی۔

''اے صاحب لوگ! ہاتھ اوپر کرو۔'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہمارے سروں پر پستول تانے کھڑا تھا۔ نہ جانے اس نے یہ پستول کہاں چھپایا تھا کیونکہ ہم نے اس کی تلاشی بھی لی تھی میں نے الیکٹرک کی طرف دیکھا۔

''لگتا ہے اسے دو سو ڈالرز نہیں چاہئیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''یہ پوری کے چکر میں آدھی سے بھی جانا چاہ رہا ہے۔''

''بکومت۔'' رانگر غرایا۔ ''ہاتھ اوپر کرو، ورنہ ابھی سروں میں سوراخ کر دوں گا۔'' میں نے ہاتھ اوپر کیے۔ الیکٹرک ویسے ہی بیٹھا رہا۔

''تم کیا کرو گے؟''

وہ سفاکی سے مسکرایا۔ ''میں تم دونوں سے ساری رقم چھین لوں گا اور پھر زخمی کر کے شارکوں والی خلیج میں لے جا کر پھینک دوں گا۔ چند منٹ کے اندر تمہاری لاشیں غائب ہو چکی ہوں گی۔''

''اور جے، جے گرے کو کیا جواب دو گے؟''

''جیٹی والا شخص گواہی دے گا کہ تم لوگ کس طرح مجھے بدمعاشی سے لے گئے تھے۔ میں گرے صاحب کو یہی بتاؤں گا کہ میں تمہیں جزیرے تک پہنچا کر واپس آ گیا۔ سچ بتانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

''جے، جے گرے بھی یقین نہیں کرے گا۔'' وہ ہنسا۔

''وہ کرے گا نہیں کرے گا تو میری طرف سے جہنم میں جائے۔ تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں اُٹھایا۔'' الیکٹرک کی نظریں اس کے پستول والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔

''میں نے ہاتھ اُٹھایا تو تم پچھتاؤ گے۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' رانگر کی آنکھوں میں خطرناک چمک آ گئی تھی۔ وہ الیکٹرک کو گولی مارنے جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کی ساری توجہ الیکٹرک کی طرف تھی اس لیے میں نے یک دم سلپ ہو کر اس کے پاؤں پر لات ماری۔ الیکٹرک سچ مچ بجلی کی طرح حرکت میں آیا تھا۔ رانگر کا فائر اس

نے سر کی جنبش سے ضائع کیا اور لپک کر اس کی کلائی دبوچ لی۔ رانگر کسی زخمی گینڈے کی طرح ڈکرایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبے پستول کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ تکلیف کی شدت سے بار بار ٹریگر دب رہا تھا اور گولیاں ضائع ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ پستول خالی ہو کر ٹرچ ٹرچ کی آواز نکالنے لگا۔ الیکٹرک نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا تو پستول بھی ہاتھ سے نکل کر سمندر میں جا گرا تھا۔ صورتِ حال بھانپتے ہی اس نے چلانا شروع کر دیا۔

"صاحب مجھے معاف کر دو۔ میں لالچ میں آ گیا تھا۔"

"ابھی معاف کرتے ہیں۔" میں نے اس کی کمر سے پکڑ کر اُٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اس نے بڑی بھیانک چیخ ماری تھی۔ اس وقت ہم کسی بھی جزیرے سے میلوں کے فاصلے پر تھے اور ماہر ترین تیراک کے لیے بھی اتنا فاصلہ طے کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے جا کر کشتی کا وہیل سنبھالا اور اسے گھما کر رانگر کے پاس لایا۔ وہ گھگھیایا۔

"صاحب مجھے بچا لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں ساری عمر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔" میں نے کشتی روک دی اور کنارے کی طرف آیا۔

"جس کے غلام ہو اسی سے غداری کر رہے ہو تو میرے کیسے وفادار ہو گے۔" وہ بُری طرح چونکا تھا۔

"تم کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں تم گرے کو لاعلمی میں رکھ کر اسے دھوکا دے رہے ہو۔"

"بکواس......تم کچھ نہیں جانتے۔"

"اسمگلنگ۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو نشانے پر لگا تھا اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ان جزائر میں صرف اسمگلنگ کے ذریعے آمدنی حاصل کی جا سکتی تھی کیونکہ یہ آسٹریلیا کے نزدیک تھے۔ "میں نے سچ کہا نا۔"

"تم سب جانتے ہو۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم کل ہی تو اس جزیرے پر آئے ہو۔"

میں نے بالوں سے پکڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس بار اس نے زیادہ بھیانک چیخ ماری اور لپک کر اوپر آ گیا تھا۔ "تمہارا شکریہ صاحب۔" اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔

"کشتی پائلٹ کرو۔ اگر ہم بڑے جزیرے کی لوکیشن سے واقف ہوتے تو اب تک تمہیں سمندر میں چھوڑ کر جا چکے ہوتے۔" میں نے اسے پائلٹ روم کی طرف دھکیلا۔ "اب کوئی حرکت کی تو شارکوں والی خلیج میں کشتی سے باہر پھینکیں گے۔"

"بائی گاڈ صاحب اب کچھ نہیں کروں گا۔" لیکن ظاہر ہے اس کی قسم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم پائلٹ روم کے پاس باری باری اس کی نگرانی کرتے رہے۔ اس نے ایک خفیہ خانے پستول نکالا تھا جو اب خالی تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک بڑے جزیرے کے آثار نمودار ہوئے اور ہم





بیس منٹ بعد کشتی ایک جیٹی سے لگ گئی تھی۔ یہ خاصا بڑا جزیرہ تھا۔ سامنے سرسبز پہاڑوں پر مکانات کھلونوں کی طرح بکھرے تھے۔ بندرگاہ خاصی بڑی اور چھوٹی بڑی کشتیوں سے بھری پڑی تھی۔ الیکٹرک نے اُتر کر تصدیق کی کہ یہاں سے جکارتہ کے لیے کشتی جاتی ہے۔ پھر مجھ سے ایک بار پھر گلے مل کر رخصت ہوا۔

"اگر کبھی جرمنی آنا تو میرے پاس ضرور آنا۔" اس نے کہا۔

"اگر خدا نے چاہا تو ضرور آؤں گا۔" میں نے خلوص سے جواب دیا۔

الیکٹرک کشتی سے کودا اور جیٹی پر چلتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ دن کے وقت میں بندرگاہ پر بڑی رونق تھی۔ میں نے ایک چھابڑی والے سے تلی ہوئی مچھلی اور روٹی لی۔ اس کے پیسے رانگر سے دلوائے۔ پینے کے لیے اسٹرا لگے ناریل لیے تھے۔ کھا پی کر ہم واپس روانہ ہو گئے تھے۔ رانگر چپ تھا اور کسی سوچ میں گم تھا۔ میں خاموشی سے ناریل پیتا رہا۔ پھر اس کا خول توڑ کر گودا کھانے لگا۔ خاصی دیر بعد رانگر بولا۔

"صاحب آپ کیسے جانتا ہے کہ ہم اسمگلنگ کرتے ہیں؟"

"اندازہ لگایا تھا۔ ان علاقوں میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔" میری بات سن کر اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔

"یعنی تم اصل بات نہیں جانتے؟"

"مجھے جاننے کی خواہش بھی نہیں ہے۔" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "ویسے بھی میں چند دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"تم گرے صاحب کو نہیں بتاؤ گے؟"

"مجھے یہاں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب تک کوئی میرے آڑے نہیں آئے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔"

"گرے صاحب تمہارا دوست ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو یہ بتاؤ چاروں قیدیوں کے ساتھ کیا کیا؟"

"صاحب کے حکم پر انہیں مار کر زمین میں دفن کر دیا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کہاں، یہ بات ہم گرے صاحب کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

بڑے جزیرے سے جان گرے کے جزیرے تک کوئی پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ درمیان میں کئی چھوٹے بڑے جزیرے آتے تھے۔ ایک پہاڑی نما جزیرے کے اندر جاتی خلیج میں منڈلاتی شارک مچھلیوں کے پنکھ خاصی دور سے نظر آ رہے تھے۔

"اس جگہ تم ہمیں پھینکنے کی دھمکی دے رہے تھے؟" میں نے پوچھا تو اس نے سر ہلایا۔

"یہی ہے شارکوں والی جھیل۔"

"اس سے پہلے کتنے آدمی پھینکے ہیں یہاں؟" وہ مسکرایا۔

"یہ راز کی بات ہے صاحب راز میں رہنے دو۔" جب ہم جزیرے کے پاس پہنچے تو سورج غروب ہونے کے نزدیک تھا اور اچانک ہی جنوب سے بے حد ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ نصف جنوبی کرے میں سردی کا موسم تھا اگرچہ یہ جگہ معتدل خطے میں آتی تھی مگر جب آسٹریلیا میں سردی شدت اختیار کرتی تو اس کی لہر یہاں تک بھی آ جاتی ہوگی۔ جب کشتی جیٹی پر لگی تو وہاں جان گرے رانگر کے ساتھی کے ساتھ جیٹی پر موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھپٹا اور اردو میں دھاڑا۔

"کہاں چلے گئے تھے۔ الیکٹرک کہاں ہے وہ تمہارے ساتھ گیا تھا۔"

"وہ چلا گیا ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم نشے میں دھت پڑے تھے اور اسے دیر ہو رہی تھی۔"

"تم اسے زبردستی لے گئے تھے۔" جان گرے نے رانگر کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اعتراف کیا۔ "یہ شرافت سے نہیں مان رہا تھا۔"

"مگر کیوں؟" جان گرے نے پاؤں پٹخے۔

"الیکٹرک نے جانا تھا۔" جان گرے چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا۔

"یوسف! تم اب میرے لیے اتنے بھی ضروری نہیں ہو کہ جو چاہے کرتے رہو اور میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

"معاف۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ معافی کس نے مانگی ہے تم سے؟"

"اب تم میری اجازت کے بغیر اس جزیرے سے نہیں جا سکتے۔" میں ہنس پڑا۔

"اچھا لطیفہ سنایا ہے تم نے ابھی میں کس کی اجازت سے گیا تھا اور اگر میں بھی الیکٹرک کے ساتھ چلا جاتا تو کون مجھے روکتا۔"

"یوسف! وہ میری بے خبری اور تم دونوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔"

"باس یہ مجھے گن پوائنٹ پر لے گیا تھا۔"

"تمہارے ماتحت بھی تمہاری طرح مسخرے ہیں۔ اس سے پوچھو وہ گن کہاں ہے جس کے زور پر میں اسے لے گیا تھا بلکہ اسے بتاؤ کہ اس قسم کے چوہوں کے لیے مجھے گن کی ضرورت نہیں ہے۔" جان گرے نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

"تم سے تو میں بعد میں پوچھوں گا۔" میں جان گرے کے ساتھ اس کے گھر تک آیا۔ اس کا موڈ بُری طرح آف تھا اور وہ الیکٹرک کو گالیاں دے رہا تھا۔

"وہ کتے کا بچہ خود بھی مرے گا اور مجھے بھی مروائے گا۔"

"وہ کیسے؟"





"آرگنائزیشن والے سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ شکاری کتے کی طرح ہماری کھوج میں ہوں گے۔"

"یہ تو ہے آرگنائزیشن والے خصلت میں کتوں سے ملتے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔ خلافِ توقع جان گرے بھڑکا نہیں تھا وہ کچھ سوچنے لگا تھا کچھ دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ الیکٹرک چلا گیا۔ چاہتے تو تم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے۔ واپس کیوں آئے؟"

"یہ درست ہے میں چاہتا تو اس کے ساتھ چلا جاتا لیکن میں دو وجوہات کی بنیاد پر واپس آیا ایک تو یہ کہ مجھے آرگنائزیشن سے بچنے کے لیے تمہارا تعاون درکار ہے دوسرے میں چپکے سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ تم نے مجھ پر اعتماد کیا میں اسے توڑنا نہیں چاہتا تھا۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے تو تم بتاؤ۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔ جان گرے نے چیخ کر کیرل کو آواز دی۔

"میرے لیے وہسکی لاؤ اور رومیدون سے کہو آتش دان جلائے۔" بلندی پر ہونے کی وجہ سے مکان براہِ راست یخ ہواؤں کی زد میں تھا اور باقاعدہ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ کیرل اوپر سے اس کے لیے وہسکی کی بوتل اور دو عدد جام لے آئی۔ وہ خاصی سردی کے باوجود جامے سے باہر ہو رہی تھی۔ مقامی خدوخال کے باوجود اس کی طویل قامت اور اخروٹ رنگ بال بتا رہے تھے کہ اس کے خون میں کسی سفید نسل کی ملاوٹ ہے غالباً اس کی ماں سفید فام تھی۔

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" جان گرے اس پر غرایا تو وہ خاموشی سے اپنا جام اُٹھا کر پی گئی۔ میں نے جان گرے کی طرف دیکھا۔

"کیا تم اس پر اعتبار کرتے ہو؟"

"میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔" اس نے بوتل سے وہسکی انڈیلی۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی۔ تم ڈیڑھ سال بعد اس سے ملے ہو۔ کیا اس دوران میں یہ پوری طرح تمہاری وفادار رہی ہے کیا اس عرصے میں اس گھر اور تمہارے کاروبار کی نگران یہی رہی۔"

"ہاں...... یہی نگران تھی۔ مگر یہ اکیلے کچھ نہیں کر سکتی اگر رانگر اور توکفیر کو ساتھ ملائے۔"

"فرض کرو اس نے رانگر اور توکفیر کو بھی ساتھ ملا لیا ہو۔"

"ہاں...... یہ ممکن ہے لیکن اس جزیرے سے اتنی دولت نہیں ملتی کہ اس کے لیے یہ مجھ سے غداری کریں میں انہیں زیادہ تنخواہیں دیتا ہوں۔"

"یار تم احمق ہو یا سمجھنا نہیں چاہتے۔ بوڑھے بچے، یہ لوگ تمہارے اس ملکیتی جزیرے کو مرکز

بنا کر کوئی غیر قانونی کام نہیں کر سکتے۔ بھانڈا پھوٹا تب بھی الزام تمہارے سر آئے گا۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ اسمگلنگ کا دھندا تمہارے نام سے ہی کر رہے ہوں گے۔''

''اسمگلنگ۔'' جان گرے اُچھل پڑا تھا۔ ''بکواس کرتے ہو تم؟''

''یہ درست کہہ رہا ہے۔'' اچانک ہی کیرل سامنے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبا اعشاریہ پینتیس کا بریٹا چھوٹا لیکن مہلک تھا اور اس کے پستول پکڑنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے نشانے پر عبور ہے۔ ''ہم اسمگلنگ کا کام تمہارے نام سے کرتے ہیں۔ ہمارا شمار کارکنوں میں ہوتا ہے۔ بڑی مچھلی تم ہو۔''

''کتیا۔'' جان گرے نے دانت پیس کر جام اس پر کھینچ مارا۔ وہ سکون سے ایک طرف ہو گئی تھی۔ بچتے ہوئے اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے ہم پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ اس نے اپنے اسکرٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا موبائل نما آلہ نکالا اور اس کا بٹن دبا کر بولی۔

''رانگر! توکفیر اندر آؤ۔ میں نے انہیں قابو کر لیا ہے تم رومیدون اور اس کی بیٹی کو دیکھو۔''

''کیرل! میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔'' جان گرے غرایا۔ طیش سے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ اگر کیرل کے ہاتھ میں پستول نہ ہوتا تو وہ اب تک اس پر جھپٹ چکا ہوتا۔ ایک منٹ بعد رانگر اور توکفیر دندناتے ہوئے اندر آئے۔ توکفیر کے پاس خودکار بیس بور رائفل تھی۔ کلاشنکوف کی یہ سب سے چھوٹی اور یہ سب سے بہتر قسم تھی۔ رانگر میری طرف لپکا اور اس نے بلاتوقف میرے منہ پر مکا مارنے کی کوشش کی اور جواب میں اپنا منہ دکھانے توکفیر کے قدموں میں جا گرا۔ اس نے میرے پاؤں پر برسٹ مارا۔ اگر میں اُچھل کر پیچھے نہ ہوتا تو میرے پاؤں چھلنی ہو جاتے۔ وہ غرایا۔

''اب کے حرکت کی تو چھلنی کر دوں گا۔''

''کیرل! ان لوگوں کو قابو میں رکھو۔'' میں نے عورت کی طرف دیکھا۔ رانگر ایک بار پھر گینڈے کی طرح پھنکارتا میری طرف آنے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن کیرل نے اسے روک دیا۔

''اپنی جگہ رہو۔ بلکہ جاؤ رومیدون اور اس کی بیٹی کو لے آؤ۔ فائر کی آواز سن کر وہ فرار ہو گئے تو مسئلہ بن جائے گا۔'' رانگر نے منہ بنایا اور حقارت سے بولا۔

''تم بلاوجہ ڈرتی ہو اس جزیرے پر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔'' وہ نشست گاہ سے چلا گیا تھا۔

''کتے کا بچہ۔'' کیرل نے رانگر کو گالی دی۔

''کیرل! یہ سب کیا ہے؟'' جان گرے نے اس بار نرم لہجے میں کہا تھا۔

''افسوس کہ یہ سب تم پر کھل گیا اگر یہ شخص بلاوجہ ہماری کھوج نہ لگاتا تو پھر ویسا ہی چلتا رہتا۔ تم چند ہفتے یا چند مہینے عیش کر کے چلے جاتے اور اس کے بعد ہمارا دھندا ایسے ہی چلتا رہتا، مگر اب ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''




اس دوران میں رانگر، رمضان اور اس کی بیٹی کو دھکیلتے ہوئے آیا تھا۔ رمضان احتجاج کر رہا تھا اور اس کی بیٹی سومیہ دہشت سے رو رہی تھی۔ رانگر اسے دھکیلتے ہوئے جان بوجھ کر بے ہودگی کر رہا تھا۔ ''یہ پچھلے دروازے سے فرار ہو رہے تھے۔''

''ان لوگوں کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ڈیئر تم اپنا منہ بند رکھو۔'' کیرل نے پیار سے کہا تھا اور جان گرے کے منہ سے مغلظات اُبل پڑی تھیں۔

''میں دیکھ لوں گا تم سب بدمعاشوں کو۔ تمہیں ابھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔'' رانگر سامنے آیا اور جان گرے کی آنکھوں میں جھانکا۔

''صاحب تم کوئی بھی ہو۔ عام آدمی کی طرح ایک گولی سے مر جاؤ گے۔''

''ہاں...... لیکن میری موت خاصی مہنگی پڑے گی۔ تمہاری نسلیں تک مٹ جائیں گی۔'' جان گرے سفاکی سے بولا مگر اس کے لہجے کا ان لوگوں پر خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ صرف کیرل کے چہرے پر چند لمحے تفکر نظر آیا تھا۔ پھر اس نے رانگر اور توکفیر کو حکم دیا کہ ان دونوں کو سٹڈی روم میں بند کر دو۔ توکفیر نے رائفل لہرائی۔

''چلو صاحب...... اندر۔'' وہ ہمیں سٹڈی روم تک لایا۔ سٹڈی مکان کے وسط میں تھی اور اس سے باہر آنے جانے کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ اس کے علاوہ صرف ایک روشندان تھا۔ جس سے بلی سے بڑا جانور نہیں گزر سکتا تھا۔ کیرل اندر آئی تھی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور جان گرے سے کہا۔

''ڈیئر اب تم آرام کرو ممکن ہے رات بھر میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ ہو جائے۔'' وہ دروازہ بند کر کے چلے گئے تھے۔ انہوں نے رمضان اور اس کی بیٹی کو یہاں بند نہیں کیا تھا اور مجھے خاص طور پر سومیہ کی فکر تھی۔ رانگر اسے بہت غلط نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اس معصوم سی لڑکی کے بارے میں غلیظ منصوبے بناتی معلوم ہو رہی تھیں۔ جان گرے اپنی سوچوں میں غلطاں تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح استعمال کریں گے۔''

''غالباً اسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''یوسف! خدا کے لیے کبھی تو طنز مت کیا کرو۔'' اس نے بھنا کر کہا۔ ''اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کچھ سوچو ورنہ ان کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔''

''کیا سوچوں۔ گرے تم نے یہ مکان خود بنوایا ہے تو اپنے لیے اپنا پنجرہ بنوایا ہے۔'' میں نے سٹڈی روم میں ہر طرف دیکھا۔ ''اس جگہ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''دروازہ بھی ٹھوس ساگوان کا ہے، بس پائتی سے بھی نہیں ٹوٹے گا۔'' جان گرے نے سرد آہ بھری۔ ''تم نے صحیح کہا ہے یہ چوہے دان میں نے خود اپنے لیے تیار کیا ہے۔''

"کیا یہاں پر ایسی شے نہیں ہے جس سے تالا کھولا جا سکے یا اسے توڑا جا سکے۔" مگر آدھے گھنٹے تک سارے سٹڈی روم کو کھنگالنے کے بعد کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہوئی کئی پیپر کٹر آل پن اور اسٹیپلر جیسی چیزیں تھیں مگر ان سے تالا نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ وہاں سوائے کتابوں کے کچھ نہیں تھا یا ایک میز اور کرسی تھی۔ باہر سناٹا تھا۔ اچانک مجھے رمضان کے چلانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی سومیہ کی چیخیں سنائی دیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"وہ حرام زادے شاید لڑکی پر دست درازی کر رہے ہیں۔" جان گرے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "رومیدون اُن سے کہہ رہا ہے کہ لڑکی کو ہاتھ نہ لگائیں۔" اچانک ایک دبے دبے سے فائر کی آواز آئی اور رمضان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا۔ سومیہ کی چیخیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ میں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ چیخ چیخ کر انہیں آوازیں دیں۔ بدترین گالیوں اور دھمکیوں سے نوازا مگر ان کے کانوں پر شیطان نے ہوس کی پٹی باندھ دی تھی۔ وہ خود شیطان بن گئے تھے۔ سومیہ کی چیخوں میں ایسا کرب تھا کہ مجھے اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ اس وقت میری کیفیت ایسی جنونی ہو رہی تھی کہ وہ میرے ہاتھ آ جاتے تو میں دانتوں سے ان کا ریشہ ریشہ ادھیڑ دیتا۔ میں نے جان گرے کا گریبان پکڑ کر دھاڑ کر کہا تھا۔

"ذلیل شخص یہ تیرے پالے ہوئے کتے ہیں نا جو اس معصوم لڑکی کی روح کو داغدار کر رہے ہیں۔"

"یوسف! ہوش میں آؤ۔" جان گرے بھی چلانے لگا تھا۔ "اس میں میرا قصور نہیں ہے۔"

"پھر کس کا ہے؟"

"شاید میرا ہی ہے۔" جان گرے نے سر جھکایا تو میرا اُبال سرد پڑنے لگا۔ سومیہ کی چیخیں تھم گئی تھیں۔ شاید اذیت اور رسوائیوں کی حد سے گزر کر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ میں سر تھام کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ کیسے کیسے اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا کہ بعض اوقات زندگی کے بجائے موت غنیمت لگنے لگتی ہے۔ مگر موت بھی نہیں آتی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لڑکی مٹ گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کے باپ کی زندگی ہی نہیں اس کے سارے خواب بھی لٹ گئے تھے۔ شاید وہ لڑکی بھی اب زندہ نہیں رہی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ رہا۔ وہ لوگ جیسے ہمیں بند کر کے بھول گئے تھے۔ ہمیں بند ہوئے سات گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ رات دو بجے خاصی دیر بعد دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ میں کھڑا ہوا تو جان گرے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"یوسف! عقل سے کام لینا ورنہ یہ ہمیں فوراً مار دیں گے۔"

"میں خود پر قابو رکھوں گا۔" میں نے سرگوشی کی۔ "مگر جان گرے یہ قابو میں آ گئے تو تم





شاید درندگی کے نئے مفہوم سے آشنا ہو۔"

"خود میرا بھی یہی دل چاہ رہا ہے۔" جان گرے بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ دروازے کے تالے میں چابی لگنے کی آواز آئی تھی۔ دروازہ کھلا اور پہلے توکفیر نظر آیا۔ اس نے رائفل تان رکھی تھی۔

"باہر آؤ ہاتھ اوپر کرو۔" جان گرے نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔ اس نے مجھے اشارہ کیا تو بادل نخواستہ میں نے بھی ہاتھ اوپر کیے۔ ہم باہر آئے۔ توکفیر میری طرف سے خاص طور سے چوکنا تھا۔ رانگر نے اسے بتا دیا تھا کہ میں خطرناک آدمی ہوں۔ ضبط کے باوجود انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس وقت رانگر بھی مسلح تھا۔ اس نے چھوٹے سائز کی شاٹ گن اُٹھا رکھی تھی۔ نزدیکی فاصلے سے یہ بے حد خطرناک ہتھیار تھا۔ میں بیک وقت دو مسلح افراد سے نہیں نمٹ سکتا تھا اس لیے آنکھوں میں آنے والا خون حلق کے راستے نیچے اُتار لیا۔ کیرل بھی مسلح تھی اس کا چھوٹا سا بریٹا ہاتھ میں تھا۔

"جان ڈیئر! آگے آؤ۔ تم سے ایک ڈیل کرنی ہے۔"

"یہیں سے بتا دو۔" جان میرے پاس کھڑا رہا۔ کیرل نے ایک فائل اس کی طرف بڑھا دی۔

"ان کاغذات پر اپنے سائن کر دو۔"

"کیا ہے ان کاغذات میں؟"

"ان کاغذات کے مطابق تم نے یہ جزیرہ معہ اس کی ساری چیزیں گفٹ کر دیا ہے۔"

"اور اس کے بعد انتقال کر گیا۔" جان گرے کے لہجے میں طنز تھا۔

"ڈیئر! اگر تم پیار سے یہ جزیرہ میرے نام کر دو تو مجھے کیا ضرورت ہے تمہیں مارنے کی۔"

"میں احمق نہیں ہوں۔ اگر تمہیں مجھے قتل کرنا ہے تو ایسے ہی کر دو۔ میں ان کاغذات پر سائن نہیں کروں گا۔"

"میں نے کہا تھا ناں یہ ایسے نہیں مانے گا۔" توکفیر نے دانت پیسے۔ "اسے وہیں لے چلو۔"

"جزیرے پر کچھ نہیں کرنا ہے۔" کیرل نے سخت لہجے میں کہا۔

"میرے ذہن میں ایک اور جگہ ہے۔" رانگر بولا۔ "شارکوں والی خلیج...... وہاں یہ نہایت آرام سے ہمارا مطالبہ پورا کرے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کیرل رضا مند ہو گئی۔ "اس طرح ہم گاؤں والوں سے کہہ سکیں گے کہ گرے صاحب یہاں سے چلا گیا ہے اور اس نے یہ جزیرہ میرے نام کر دیا ہے۔"

"رمضان اور اس کی بیٹی سومیہ کہاں ہیں؟ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

"وہ......" رانگر مکاری سے ہنسا۔ "رمضان ریلنگ سے نیچے گر گیا تھا اور اس کی بیٹی نے

جذباتی ہوکر اُن کے پیچھے چھلانگ لگادی۔ صبح تک ان کی مسخ شدہ لاشیں مل جائیں گی۔"

"شیطان۔" میں مٹھیاں بھینچتا اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے شاٹ گن میری طرف کی اور گھبرائے لہجے میں بولا۔

"اے رُک جاؤ۔ ایک قدم آگے آئے تو میں گولی مار دوں گا۔" جان گرے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یوسف! ہوش میں رہو۔ یہ کتے کے بچے ہمیں مارنے سے گریز نہیں کریں گے۔" میں نے گہری سانس لے کر اپنا غصہ سرد کیا۔ مجھے رُکتے دیکھ کر رانگر نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شاید وہ مجھے اس جزیرے پر نہیں مارنا چاہتے تھے۔ بلکہ سب کے سامنے اس جزیرے سے رخصت کر کے پھر دنیا سے بھی رخصت کرنا چاہتے تھے۔ کیرل نے کاغذات والی فائل بغل میں دبائی اور ہمیں اشارہ کیا۔

"چلو...... مگر یاد رکھنا ذرا سی غلط حرکت تم دونوں کی موت کا باعث بن جائے گی۔ ہمیں بھی اس جگہ سے جانا پڑے گا لیکن ہمارا صرف مالی نقصان ہوگا اور یہ زندگی تم لوگوں کو واپس نہیں ملے گی۔"

"مارنا تو تم نے ویسے بھی ہے۔" جان گرے تلخی سے بولا۔

کیرل نے مکاری سے تسلی دی۔ "نہیں میں تمہیں ان کاغذات کے ساتھ شارکوں والے جزیرے پر چھوڑ دوں گی اور دو دن بعد تم سے پوچھوں گی۔" وہ بے وقوف بنا رہی تھی اور جان گرے بن گیا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ رانگر اور توکفیر ہمارا قصہ پاک کرنے کے لیے بے چین تھے۔ انہیں ذرا سا موقع نہیں ملتا تو وہ ایسا کر گزرتے۔ مجھے وہاں کش مکش کے آثار نظر نہیں آئے اور نہ ہی کہیں خون تھا۔ انہوں نے رمضان کو یقینی طور پر گولی ماری تھی۔ شاید انہوں نے اتنی دیر میں سارے نشانات صاف کر دیئے تھے۔ تاکہ مقامی لوگوں کو رمضان کے نیچے گرنے اور اس کے غم میں اس کی بیٹی سو یہ کی خودکشی کی کہانی کا یقین دلا سکیں۔ وہ ہمیں لے کر نکلے۔ ڈرائیونگ سیٹ مجھے دی گئی۔ غالباً اس لیے کہ مجھ سے زیادہ خطرہ تھا اور وہ اس بہانے مجھے مصروف کر دینا چاہتے تھے۔ رانگر میرے ساتھ بیٹھا۔ توکفیر اور کیرل پیچھے بیٹھے تھے۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ یہیں مارے جاؤ گے۔" رانگر نے مجھے دھمکایا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ راستہ جانا پہچانا تھا اس لیے کسی کو مجھے گائیڈ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جیٹی کا نگران سرد ہوا کے خلاف آگ تاپ رہا تھا۔ سمندر کے پاس خنکی شدید ہوگئی تھی اور معمولی کپڑوں میں ہم لوگ ٹھٹھر رہے تھے۔ ان تینوں نے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ جیٹی کے نگران کو کیرل نے بتایا کہ "ہم سب بڑے جزیرے جا رہے تھے۔ صاحب کو اپنے مہمان خانے ضروری کام سے جانا ہے۔" نگران نے جان گرے سے دعا سلام کی اور غالباً اسے خیر سے واپس آنے کی دعا بھی دی۔ کل وہ قسم کھا کر سب کو بتاتا کہ صاحب اور ان کا مہمان اس کی





نظروں کے سامنے گئے تھے۔ اس وقت جیٹی پر روشنیاں تھیں۔ وہ تینوں ایک نسبتاً بڑی لانچ پر سوار ہوئے۔ اس کا پائلٹ روم کشادہ اور چاروں طرف سے بند تھا۔ رانگر نے جا کر انجن چلایا اور ذرا دیر میں کشتی کھلے سمندر میں نکل آئی تھی۔ تیز ہواؤں کی وجہ سے لہریں اُمڈ رہی تھیں کشتی بُری طرح ڈول رہی تھی۔ توکفیر نے مجھے رائفل کے زور پر اوندھے منہ لیٹ کر ہاتھ سامنے پھیلانے کا حکم دیا تھا۔ البتہ جان گرے کے ساتھ اتنی رعایت کی کہ اسے گھٹنوں کے بل بٹھایا۔

"کیرل! اب بھی وقت ہے میرے ساتھ صلح کر لو۔" جان گرے نے اس سے کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرا تعلق جس مافیا سے ہے وہ میرے مرنے پر کس قدر طوفان اُٹھائے گی۔"

"بشرطیکہ اسے تمہارے مرنے کا پتہ چلا تو۔" کیرل کی طنزیہ آواز آئی تھی۔

"میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے لیٹے لیٹے کہا۔

"پوچھو۔" کیرل نے خلافِ توقع اجازت دے دی۔

"تم لوگ کس چیز کی اسمگلنگ کرتے ہو؟"

"آس پاس کے جزائر میں شراب تیار کی جاتی ہے۔ آسٹریلیا میں اس کی بہت مانگ ہے۔ ہم یہ شراب آسٹریلیا اسمگل کرتے ہیں۔"

"تم انہیں یہ بات کیوں بتا رہی ہو۔" توکفیر غرایا۔

"کیونکہ یہ اب کسی کو نہیں بتائیں گے۔" وہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "کیوں گرے ڈیئر۔"

"حرام زادی۔" جان گرے کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا تھا۔

"اپنا منہ بند رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک دوں۔" کیرل نے کہا۔

"جان ڈیئر تم بھی خود کو ٹھنڈا رکھو۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔

"ایک کشتی ہماری طرف آ رہی ہے۔" اچانک رانگر کے چلانے کی آواز آئی۔

"رفتار تیز کرو۔" کیرل نے اسے حکم دیا اور جان گرے کو بھی دھکا دے کر فرش پر لٹا دیا تھا اور توکفیر نے ہم پر مچھلیاں پکڑنے والا جال ڈھیر کر دیا تھا۔ اس میں اتنی بدبو تھی کہ دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ غالباً ہمیں دوسری کشتی پر سوار افراد کی نظروں سے چھپانے کے لیے یہ کام کیا گیا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد پتا چلا کہ عقب سے آنے والی کشتی دراصل ماہی گیروں کی تھی۔ اور وہ جال ڈال کر کشتی چلا رہے تھے۔ ہمیں اس بدبودار جال سے نجات ملی لیکن اس کی بدبو اس طرح ہم میں بس گئی تھی کہ جال سے نکلنے کے بعد بھی ویسی ہی بدبو آتی رہی۔ مزید نصف گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم شارکوں والی خلیج میں داخل ہو گئے۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کشتی شارک کے پنکھ نما جزیرے کے چوڑے کٹاؤ میں داخل ہو رہی تھی۔

"گرے! کھڑے ہو جاؤ۔ ڈیئر! ذرا چاند کی روشنی میں اردگرد دیکھو۔ اس خلیج میں کتنی شارکیں

ہیں۔'' کیرل نے شیریں مگر سفاک لہجے میں کہا۔ میں نے جان گرے کی آواز سنی۔

''کیرل! تم مجھے اس طرح نہیں ڈرا سکتیں۔ میں کاغذات پر سائن نہیں کروں گا۔''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''رانگر کشتی روک کر ادھر آؤ۔'' رانگر نے کشتی روک کر انجن بند کر دیا اور کیبن سے نکل کر آیا۔

''اب کیا حکم ہے؟''

''ذرا اسے دکھاؤ خلیج کے پانی میں کتنی ڈھیر ساری شارک مچھلیاں ہیں۔'' رانگر نے جان گرے کو گردن سے پکڑ کر آگے دھکیلا۔ اس نے مزاحمت کی مگر رانگر زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے جان گرے کو گرایا اور کھینچ کر کشتی کے کنارے کی طرف لے گیا۔ اس نے کمر کی بیلٹ سے پکڑ کر اسے سر کے بل پانی میں لٹکا دیا۔ جان گرے نے چیخ ماری تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ اسے پانی میں پھینکا جا رہا ہے۔

''تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' توکفیر نے مجھے حکم دیا۔

''کیا میں کھڑا ہو سکتا ہوں۔ ممکن ہے اس منظر سے مجھے بھی عبرت ہو اور میں گرے کو راضی کر لوں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... تم اسی طرح بیٹھے رہو۔'' کیرل نے کہا تھا۔ ''یاد رکھنا تم بالکل غیر ضروری ہو۔ کوئی بھی غلط حرکت فوری طور پر تمہاری موت کا باعث بن جائے گی۔''

''کیوں نہ اسے گولی مار کر پانی میں پھینک دیں۔'' توکفیر نے تجویز پیش کی۔ ''جب شارکیں اس پر جھپٹیں گی اور اس کے ٹکڑے کر لیں گی تو یہ منظر دیکھ کر بڈھا عبرت پکڑے گا۔''

''ہوں...... تجویز اچھی ہے لیکن یہ فرار ہو گیا تو؟'' کیرل بولی۔ توکفیر نے قہقہہ مارا۔

''اسے دس بارہ گز سے دور جانا نصیب نہیں ہوگا۔ اے کھڑے ہو جاؤ۔'' توکفیر نے مجھے حکم دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب یا کبھی نہیں مجھے مرنے سے پہلے مارنے کی کوشش کرنا تھی۔ میں اُٹھتے ہوئے یوں لڑکھڑایا جیسے اتنی دیر تک پڑے پڑے جسم اکڑ گیا ہو۔ لڑکھڑانے کے دوران میں نے پیروں کے پنجے فرش پر جمائے اور یک دم توکفیر کی طرف جمپ لگائی۔ میں نے سر جھکایا ہوا تھا۔ میرے کانوں نے برسٹ کی آواز سنی پتا نہیں کہ مجھے گولی لگی یا نہیں۔ مجھے اس کا ہوش نہیں تھا۔ میرا سر توکفیر کے پیٹ میں لگا۔ میں نے اس کی رانوں کو گرفت میں لیتے ہوئے اسے اُٹھایا اور اسی طرح بڑھتے ہوئے توکفیر سمیت سمندر میں جا گرا تھا۔ توکفیر نے ایسی چیخ ماری تھی کہ جو شارک مچھلیاں بے خبر تھیں ان کو بھی خبر ہو گئی ہو گی۔ میں نے پانی میں گرے ہوئے اس کی بدحواسی سے فائدہ اُٹھا کر اس سے رائفل چھین لی تھی۔ اسے شاید رائفل کا ہوش بھی نہیں تھا۔ میں اس کے اوپر تھا۔ ایک ہاتھ کشتی کے پیندے پر ٹکاتے ہوئے اسے لات مار کر کھلے سمندر میں پھینک دیا اور خود کشتی تلے ہو گیا ورنہ کیرل کی چلائی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ وہ بُری طرح سے چلا رہی تھی۔ میں کشتی کے پیندے سے لگا آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ میں نیچے ہونے کی وجہ سے خطرے میں تھا۔ کیرل یا رانگر با





آسانی مجھے گولی مار سکتے تھے۔

توکفیر بُری طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ خلیج کے مختلف حصوں سے سیاہ لہراتے پنکھ تیزی سے کشتی کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے چند پنکھ پانی میں ڈوب چکے تھے۔ شارک جب کسی شے پر حملہ کرتی ہے تو نیچے سے حملہ کرتی ہے۔ خاص طور سے سطح پر حملہ کرتے وقت شارک نیچے سے آتی ہے تاکہ شکار اسے دیکھ نہ سکے۔ میں کشتی سے چپک کر ممکنہ حد تک ساکت تھا۔ اچانک کوئی شے میرے پیروں سے رگڑ کھاتی گزری اور میں نے توکفیر کی چیخ سنی۔ وہ تیرتا ہوا کشتی کے نزدیک آ گیا تھا۔ عقب سے آنے والی شارک ابھی فاصلے پر تھی۔ اس کی بدقسمتی کہ کشتی کے دوسری طرف سے آنے والی شارک نے اس پر حملہ کیا تھا۔ توکفیر تڑپ کر اُچھلا تو میں نے دیکھا۔ اس کی ران ایک درمیانے سائز کی شارک کے منہ میں دبی ہے اور وہ پانی خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ شارک چھ سات فٹ لمبی تھی۔ پھر میری نگاہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ شارک نے سر کو جھٹکا اور توکفیر کی ران کا نچلا حصہ الگ ہو گیا تھا۔ ایسی موت تو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شارک نے ایک جھٹکے میں ایک صحت مند انسان کی ران اس کے جسم سے جدا کر دی تھی۔ توکفیر بُری طرح چلا رہا تھا۔

پانی میں خون شامل ہوتے ہی اردگرد سے آتی شارکوں کی رفتار نہایت تیز ہو گئی تھی۔ خون کی بُو ان کو دیوانہ کر دیتی ہے۔ میں بیک وقت دو دشمنوں میں گھرا تھا۔ اوپر سے کیرل اور رانگر میری تاک میں تھے اور نیچے شارک مچھلیاں جمع ہو رہی تھیں۔ اگرچہ وہ توکفیر کے لیے آ رہی تھیں لیکن میں زیادہ دور نہیں تھا اور میرے جسم پر معمولی سا زخم بھی آ جاتا تو یہ شارکیں مجھ پر بھی پل پڑتیں۔ میں پوری طرح محتاط تھا اور خود کو ساکت رکھے ہوئے تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسی ہی سچویشن میں گھر چکا تھا۔ اس وقت کا تجربہ کام آ رہا تھا۔ ساکت رہنے سے شارک میری طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ کیونکہ حرکت کرنے سے یہ سمجھ جاتی ہیں کہ چیز جاندار ہے اور پھر یہ اس پر منہ مارتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بعض اوقات بے جان چیزوں پر بھی منہ مارتی ہیں کہ وہ حرکت میں ہوتی ہیں۔ دوسرے انہیں خون کی بُو کشش کرتی ہے۔ سمندر میں شارک ایک میل کے فاصلے سے خون کی موجودگی محسوس کر لیتی ہے۔

توکفیر زخمی ہونے کے بعد کشتی کی طرف جانے بلکہ تیرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور اپنی حرکت سے شارکوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ عقب سے آتی ایک خاص بڑی شارک سب سے پہلے توکفیر تک پہنچی۔ اس نے بڑا سا منہ کھولا اور توکفیر کا سر اپنی گرفت میں لے کر ایک جھٹکے سے اسے جسم سے الگ کر دیا۔ توکفیر کی موت فوری ہو گئی تھی اور اب باقی آنے والی مچھلیاں اس کے جسم کے حصے بخرے کرنے کے لیے آپس میں چھینا جھپٹی کر رہی تھیں اور یہ سب مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔

''وہ کشتی کے نیچے ہے۔ اسے گولی مار دو۔'' کیرل چلا رہی تھی۔ ''میرے خدا توکفیر کو دیکھو۔''

''اسے دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' رانگر کی آواز آئی۔ ''مچھلیاں اس کے ٹکڑے کر چکی ہیں۔ میرا خیال ہے صاحب کو بھی سمندر میں پھینکو اور واپس چلو۔''

''بکواس نہ کرو۔'' کیرل غرائی۔ ''اسے ہاتھ مت لگانا۔ یہ ابھی ضروری ہے۔''

''کیرل تم نے بہت اپنی چلالی۔'' رانگر اس سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ''اسی وجہ سے تو کفیر کی جان گئی۔ ہم ان لوگوں کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیتے مگر تمہارے سر پر جزیرہ اپنے نام کرانے کا بھوت سوار تھا۔''

''تمہیں ان معاملات کا کیا پتہ؟'' کیرل سکون سے بولی۔ ''جو میں کہتی ہوں وہ کرتے جاؤ۔ اپنی محدود سی عقل پر زیادہ زور مت دو۔ رانگر میں اور تم اس جزیرے کے مالک بن جائیں گے۔''

''نہیں مجھے نہیں بننا اب مالک! مجھے میرا حصہ چاہیے۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔''

''تم شوق سے جان سکتے ہو اپنا حصہ لے کر لیکن ابھی جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔''

''کیرل اسے سمندر میں پھینک دو۔'' رانگر ہیجانی انداز میں چلایا۔ ''یہاں شارکیں جمع ہو رہی ہیں۔ اگر کشتی کا پروپیلر کسی شارک سے ٹکرا کر ناکارہ ہو گیا تو ہم اس جگہ پھنس جائیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' کیرل بولی۔

ان دونوں کی گفتگو کے درمیان میں ایک ہاتھ کشتی پر ٹیک کر آہستہ آہستہ دوسری طرف جا رہا تھا۔ میں اپنے زیرِ آب جسم کو ساکن رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ شارک سب سے زیادہ حرکت سے مشتعل ہوتی ہے اس کے باوجود مجھے خطرہ تھا کہ کب کہیں سے آ کر کوئی شارک میرے جسم میں اپنے دانت پیوست کر دے۔ میں شدید ترین خطرے میں تھا۔ جس دیوہیکل شارک نے میرے نیچے سے گزر کر تو کفیر پر حملہ کیا تھا اور اب وہ اس کے ہاتھ پاؤں کو نگلنے کے بعد اس کے جسم کے درمیانی حصے کو نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تو کفیر کا سینہ اور پیٹ بھی کھا چکی تھی۔ دوسرے حصے دیگر شارکوں کی غذا بن چکے تھے اور اب وہاں تو کفیر کی باقیات اس کا خون تھا جو سطح پر پھیلا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ سمندر کے پانی میں حل ہو رہا تھا۔

اچانک میں ساکت ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بڑی شارک کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور وہ دوسری شارکوں کے درمیان سے گزر کر میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا انداز مکارانہ تھا۔ جیسے وہ اپنی ساتھی شارکوں کو بے خبر رکھ کر اکیلے مجھے ہڑپ کرنے کے ارادے سے آ رہی تھی۔ شکر ہے اس نے یہ کام چپکے سے پانی میں غوطہ لگا کر نہیں کیا ورنہ میں اس کی آمد سے بے خبر رہتا۔

ایسا غالباً اس نے اپنی ساتھی شارکوں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کیا تھا۔ ورنہ وہ میرے بارے میں ہوشیار ہو جاتیں تو اس شارک کا حصہ کم ہو جاتا۔ وہ سُست خرامی سے اور کسی قدر غیر محسوس انداز میں تیرتی میری طرف آ رہی تھی۔ میں کشتی سے مزید چپکتے ہوئے اپنے آپ کو محفوظ کرنے لگا۔ شارک کی بدنیتی بالکل واضح تھی۔ میں نے آہستہ سے دایاں ہاتھ آگے کیا۔ شارک مجھ




پر کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر تھی اور چاند کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔

اسی لمحے اوپر سے سایہ نمودار ہوا۔ رانگر جھک کر کشتی کے نیچے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں تاریکی میں اور کشتی کے بالکل نچلے حصے میں تھا۔ سایہ نمودار ہوتے ہی میں نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ شاید اس دوران پانی میں میری جانب سے ارتعاش پیدا ہوا۔ شارک نے یک دم دُم ہلائی اور میری جانب لپکی۔ اس کا دانتوں سے بھرا جبڑا ایک دم کھل گیا۔ رانگر سمجھا کہ شارک اس کی طرف لپک رہی ہے۔ اس نے گالی دے کر فائر کیا۔ شاٹ گن کا دھماکہ گونجا اور میں نے شارک کو تڑپ کر پانی میں غائب ہوتے دیکھا۔ میں یک دم اُچھلا اور شاٹ گن کی نالی پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کی گرم نالی نے میری انگلیاں جلا دی تھیں مگر میں نے اسے چھوڑا نہیں۔ رانگر نے چیخ ماری تھی اور خود کو اس نے بچانے کے لیے شاٹ گن چھوڑ دی۔

شاٹ گن پانی میں گری۔ میں نے اپنے جسم تلے پانی میں شدید قسم کی ہلچل محسوس کی تھی اور شارک کا سر مجھ سے فٹ بھر کے فاصلے پر نمودار ہوا تھا۔ اس کے گلپھڑوں کے پاس گولی کا کئی انچ چوڑا سوراخ تھا۔ جس سے بے تحاشہ خون اُبل رہا تھا۔ اس کا جبڑا کھلا تھا۔ اگر میں نے اس کی ناک پر بروقت ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا تو وہ مجھ پر حملہ کر چکی ہوتی۔ زور وہ اب بھی لگا رہی تھی۔ میں دایاں ہاتھ اوپر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس بارہ فٹ طویل یہ شارک بے پناہ طاقتور تھی۔ زخمی حالت میں اس میں اتنا زور تھا کہ وہ مجھے کشتی کی طرف دبا رہی تھی اور میری پشت سے کشتی گھوم رہی تھی۔ دباؤ سے میری ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔

بہ مشکل میں نے دایاں ہاتھ اوپر کیا۔ شارک نے سر کو پوری شدت سے جھٹکا دیا۔ میں ہل کر رہ گیا تھا۔ خود کو کشتی سے لگائے رکھنے کے لیے میں نے دائیں ہاتھ سے سہارا لیا تھا۔ ایک بار کشتی میرے عقب سے نکل جاتی تو میں شارک کا آسان شکار بن جاتا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ زیادہ غضب ناک ہو رہی تھی۔ میرے لیے بائیں ہاتھ سے اس کی ناک جو دراصل اس کے منہ کا اوپری حصہ تھا۔ اسے تھامنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس شارک کے جارحانہ رویے سے دوسری شارکیں بھی آس پاس منڈلانے لگی تھیں۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ایک اور شکار نزدیک ہے۔ ایسے عالم میں اگر کوئی دوسری شارک مجھ پر حملہ کر دیتی تو میں اپنے بچاؤ کے قابل نہیں تھا۔

میں نے پوری قوت سے شارک کو پیچھے رکھتے ہوئے جگہ بنائی اور دایاں ہاتھ تیزی سے سامنے لاتے ہوئے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ بے شمار گولیاں یکے بعد دیگرے شارک کے کھلے منہ میں اُترتی چلی گئی تھیں۔ شارک نے جھٹکا لیا اور ساکت ہو گئی تھی۔ کھلے منہ سے گولیاں اس کے دماغ میں اُتر گئی تھیں۔ ٹریگر دباتے دباتے میں نے رائفل کا رُخ اس شارک کی طرف کر دیا جو منہ کھول کر میری طرف آ رہی تھی۔ پر میگزین ختم ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل پھینکی اور شارک کے کھلے منہ میں ہاتھ ڈال کر خود کو گھماتے ہوئے اس کی پشت پر سوار ہوا اور پاؤں [illegible] ہوئے کشتی پر چھلانگ لگائی اور

دو شارکوں سے بال بال بچا تھا جو دائیں بائیں سے مجھ پر حملہ آور ہوئیں اور پھر مجھے بھول کر مُردہ شارک پر دانت مارنے لگی تھیں۔ میں نصف دھڑ کے ساتھ کشتی میں گرا تھا اور کیرل کی چلائی گولی سے بچنے کے لیے مجھے سلپ ہو کر پانی میں جانا پڑا تھا اور اپنے بازوؤں کو اسپرنگ کی طرح استعمال کرتے ہوئے خود کو دائیں اوپر اُچھالا اور کشتی میں آ گرا۔ اس بار میں کیرل کے بالکل سامنے تھا اور اس نے پستول کا رُخ میری طرف کر دیا تھا۔

فاصلہ کم تھا اور بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود میں نے بچنے کی کوشش کی۔ گولی چلنے کی آواز آئی اور مجھے جھٹکا سا لگا۔ جیسے گولی میرے جسم میں اُتری ہو۔ میں درد کا منتظر تھا مگر درد نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں کیرل کے چلانے کی آواز آئی۔ مجھے جھٹکا دراصل کشتی کے حرکت میں آنے سے لگا تھا کیونکہ رانگر نے انجن چلا دیا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ جان گرے کیرل سے گتھم گتھا تھا۔ اس نے بروقت حرکت کر کے میری جان بچائی تھی۔ اس کے حملے کی وجہ سے کیرل کا نشانہ خطا ہوا تھا۔

میں فرش سے اُٹھ رہا تھا کہ میں نے رانگر کو کیبن سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے تیزی سے کیرل سے پستول جھپٹ لیا اور رانگر کی طرف فائر کیا۔ وہ واپس کیبن میں گھس گیا۔ گولی اس کے پاس سے گزر گئی تھی۔ اس لمحے میں نے جان گرے کی چیخ سنی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے جان گرے کو دیکھا۔ وہ کشتی کے کنارے کھڑا اپنا توازن برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا اس کی بدقسمتی کہ وہ اس کوشش میں ناکام رہا تھا۔ میں نے اسے اُلٹ کر پانی میں گرتے دیکھا جس میں شارکیں ہی شارکیں تھیں۔ اس لمحے رانگر نے کیبن سے مجھ پر فائر کیا تھا اور اس کی طرح میں بھی بچ گیا تھا۔ اُچھلتی کودتی کشتی میں درست نشانہ لینا بہت مشکل تھا۔

کیرل نے جان گرے کو پیروں سے دھکا دیا تھا اور وہ اپنی تمام تر مردانگی کے ساتھ سمندر میں جا گرا تھا۔ غالباً کیرل سے یہ فعل غیر ارادی طور پر سرزد ہوا تھا کیونکہ فوراً ہی اس نے چلا کر رانگر سے کشتی روکنے کو کہا۔ ''جان سمندر میں گر گیا ہے۔''

''جہنم میں جائے۔'' رانگر بولا اور ایک فائر کیا۔ کیرل جو کیبن کے سامنے کھڑی تھی۔ گولی اس کے سینے میں اُتر گئی۔ وہ چیخ مار کر میری طرف آ گئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا۔ اس کے سینے پر دل سے ذرا اوپر خون اُبل رہا تھا۔ زخم کاری تھا اور وہ چند لمحوں کی مہمان نظر آ رہی تھی۔ میں اسے لیتے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ رانگر کی طرف سے چوکس رہنا ضروری تھا۔ وہ زہریلا سانپ تھا اور وہ کسی وقت بھی وار کر سکتا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک لمحے کو کیبن کے سوراخ سے جھانک کر اس نے میری پوزیشن دیکھی اور اگلے ہی لمحے ہاتھ نکال کر فائر کر دیا۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ مجھے جوابی فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شامت اس بار بھی کیرل کی ہی آئی تھی۔ گولی اس کے جسم میں




اُتر گئی تھی۔ اس نے جھٹکا لیا۔

''یوسف! جان کو بچا لو۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''اس سے میری طرف سے...... معذرت......'' اس کے الفاظ ادھورے رہ گئے تھے۔ موت نے اسے اتنی ہی مہلت دی تھی۔ اور اس وقت مجھے جان گرے سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ میں حساب لگا رہا تھا کہ رانگر نے تین فائر کیے تھے اور اس کے پاس سات راؤنڈز والا پستول تھا۔ یعنی اب اس کے پاس چار گولیاں تھیں۔ کئی ایک بار میں نے لمحے کے لیے پلٹ کر جان گرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ مجھے پانی میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ شاید شارکیں اتنی دیر میں اس کے حصے بخرے کر چکی تھیں۔

کیرل ایک طرح سے میرے لیے ایک ڈھال تھی کیونکہ کشتی کے کھلے عرشے پر اور کوئی رکاوٹ نہیں تھی جہاں میں رانگر کی فائرنگ سے محفوظ رہ سکتا۔ میں کیرل کے عقب میں اس طرح لیٹ گیا تھا کہ کسی حد تک محفوظ رہ سکوں۔ رانگر کیبن میں مورچہ بند تھا۔ کشتی پوری رفتار سے سمندر میں جا رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی کیرل کا پرس پڑا تھا۔

میں نے اسے اُٹھایا تو وہ خلافِ توقع خاصا وزنی ثابت ہوا۔ میں نے اسے کھولا تو اندر پستول کے دو عدد میگزین تھے۔ میری باچھیں کھل گئی تھیں۔ کیرل کے پستول میں ابھی پانچ چھ گولیاں تھیں۔ فاضل میگزین میسر آتے ہی میں نے کفایت شعاری کا ارادہ ترک کیا اور کیبن پر لگا تار فائر کیے اس کی پلائی پتلی سی تھی اور گولیاں اس سے با آسانی گزر رہی تھیں۔ رانگر نے بوکھلا کر جوابی فائرنگ کی اور چند لمحے میں اپنا پستول خالی کر لیا۔ کھٹ کھٹ کی آواز سنتے ہی میں طوفان کی طرح کیبن کی طرف بڑھا تھا۔ دھماکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو رانگر پستول میں دوسرا میگزین لوڈ کر چکا تھا۔ اس نے پستول میری طرف سیدھا کیا تھا۔ میری ٹھوکر اس کی کلائی پر پڑی تھی اور کلائی ٹوٹ گئی۔ اس کے حلق سے ڈکرانے کی آواز نکلی۔ دوسری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا پستول اپنے قبضے میں کر کے میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک عدد چاقو بھی نکلا۔ اسے کھینچ کر باہر عرشے پر ڈال دیا اور کشتی کا اسٹیئرنگ سنبھال کر واپس جزیرے کی شارکوں والی خلیج کی طرف موڑ دیا۔ جان گرے کو پانی میں گرے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے اور اس کے بچنے کا امکان دس فیصد بھی نہیں تھا۔

رانگر کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ وہ نصف گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ خلیج میں داخل ہو کر میں نے دو تین بار کشتی کا ہارن بجایا تا کہ جان گرے اگر کہیں موجود ہے تو مجھے متوجہ کرے۔ پھر کشتی خلیج کے وسط میں روک کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ پندرھویں سولھویں کے چاند کی روشنی اتنی تھی کہ پورے خلیج کی سطح آب واضح نظر آ رہی تھی۔ اس پر کوئی بلی بھی تیرتی نظر آ جاتی۔ جان گرے کہیں نہ تھا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ شاید اس کی موت یہیں لکھی تھی ورنہ افریقہ میں بھی بعض مواقع پر میں اس کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

اچانک رانگر کے کراہنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے رمضان اور اس کی معصوم بیٹی یاد آئی جو اس کی اور توکفیر کی بربریت کا نشانہ بنے تھے۔ توکفیر تو کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا مگر یہ شیطان ابھی باقی تھا۔ میں نے اس کے پاؤں پر ٹھوکر ماری تو وہ بلبلا کر ہوش میں آ گیا تھا۔ ہاتھ کی تکلیف اسے جلد ہوش میں لے آئی تھی۔ اس کی کلائی ٹوٹنے والی جگہ پر سوج کر کپا ہو رہی تھی۔ میں نے اگلی ٹھوکر اس کی کلائی پر ماری تھی۔ مجھے شاید ہی کسی شخص سے اتنی نفرت محسوس ہوئی ہو جتنی اس شخص سے ہو رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد جلد ہی اس نے میرے عزائم بھانپ لیے تھے اور گڑگڑانے لگا تھا۔

"مجھے معاف کر دو۔"

"تمہیں معاف بھی کر دوں تو زیادہ سے زیادہ یہی کروں گا کہ تمہارے شیطانی دماغ میں ایک گولی اُتار دوں گا۔"

"خدا کے لیے......" اس نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کے منہ پر ہلکی سی ٹھوکر مار کر اس کے کئی دانت جبڑے سمیت اس کے حلق میں اُتار دیئے تھے۔

"خدا کا نام مت لو۔ اس معصوم لڑکی نے بھی تم لوگوں کو خدا کے واسطے دیئے ہوں گے۔ تم نے سنا تھا؟" میرے لہجے کی خون خواری نے اس کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگا تھا۔ میں نے اس کے گڑگڑانے کی پروا کیے بغیر چاقو نکال کر اس کی دائیں پنڈلی میں اُتار دیا تھا۔ اس نے فلک شگاف چیخ ماری اور پھر چیختا چلا گیا۔ میں نے چاقو نکالا اور اس کی بائیں پنڈلی میں گھونپ دیا تھا۔ اس کے واویلے میں خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ پہلے ہی ممکنہ حد تک چلا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے عرشے پر پڑی رسّی سے ایک پھندہ تیار کر کے اس کی بغلوں کے نیچے سے باندھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"یہ...... یہ کیا کر رہے ہو...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"جب تم سمجھ ہی گئے ہو تو کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تم اس وقت اس لڑکی سے بھی زیادہ بے بس ہو جس کی عزت اور جان تمہارے ہاتھ سے گئی۔" میں نے رسّی کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا اور کنارے کی طرف دھکیلنے لگا۔ میرے عزائم بھانپ کر وہ چلانے اور مزاحمت کرنے لگا مگر ٹوٹے ہاتھ اور زخمی پیر کے ساتھ وہ مزاحمت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے باآسانی اسے پانی میں پھینک دیا تھا اس نے دہشت سے چیخ ماری اور دیوانہ وار واپس کشتی پر آنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے دوبارہ پانی میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے پانی میں گرتے ہی خلیج میں ہلچل مچی تھی۔ چاروں طرف تیرتی شارکوں نے نئے شکار کی آمد محسوس کرتے ہی تیز رفتاری سے کشتی کا رُخ کیا تھا۔ رانگر بھی مچھلیوں کو آتے دیکھ رہا تھا۔ پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے [illegible] بُری طرح چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مارنے اور بہتے خون کی وجہ سے شارکیں مزید





متوجہ ہو رہی تھیں۔

میں بلندی سے نسبتاً بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ شارکیں نزدیک آ رہی تھیں۔ میں نے رسّی کھینچی اور رانگر اوپر آ گیا۔ اس کا نصف جسم پانی سے اوپر تھا اور نصف پانی میں تھا۔ وہ ایک بار پھر خوشامد کرنے لگا کہ میں اسے باہر نکالوں۔ میں شارکوں کو دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اب رانگر بھی دیکھ رہا تھا۔ پانی یہاں اتنا کم تھا کہ شارک زیرِ آب جا کر حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے سطح پر آ رہی تھی۔ سب سے آگے دو شارکیں تھیں یہ درمیانے سائز کی تھیں اور وہ آتے ہی رانگر کے پیروں پر جھپٹیں۔ رانگر اور رسّی کی وجہ سے مجھے شدید جھٹکا لگا تھا۔ رانگر پانی میں گرتے گرتے بچا تھا۔ اس کے منہ سے پھر چیخیں اُبلنے لگی تھیں۔ دونوں شارکیں اس کی ایک ایک پنڈلی کاٹ کر لے گئی تھیں۔

"ذلیل شخص میں تمہیں اسی طرح قسطوں میں ان جانوروں کا نوالہ بناؤں گا۔" میں نے رسّی ڈھیلی کی اور آنے والی باقی ماندہ شارک مچھلیاں رانگر کے جسم پر پل پڑی تھیں۔ چھینا جھپٹی کر کے وہ اس کے جسم سے گوشت نوچ نوچ کر لے جانے لگیں۔ رانگر کا جسم شدید جھٹکوں کی زد میں تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے جسم کے حصے بخرے ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ایک بے تاب شارک نے اُچھل کر رانوں سے اوپر اس کے پیٹ پر منہ مارا اور اس کی آنتیں کھینچ کر لے گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رانگر کا قد تین فٹ رہ گیا۔ اس کے توانا جسم سے اُبلتے خون نے اردگرد پانی کو سرخ کر دیا تھا۔ اس میں اب چیخنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے سر تک اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے شارکوں کو کھلاؤں مگر اس سے زیادہ کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے اسے رسّی سمیت چھوڑ دیا۔ اس کا جسم پانی میں گرتے ہی مچھلیاں بے تحاشہ جھپٹی تھیں اور صرف دس سیکنڈ میں اس کا باقی ماندہ جسم بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شارک مچھلیوں کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ اور سطح پر سوائے خون کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

میں چند لمحے تک بے تابی سے منڈلاتی شارکوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کیرل کی لاش بھی پانی میں ڈال دی۔ شارکیں اس پر جھپٹیں۔ ذرا دیر میں چار انسان اسی خلیج میں شارکوں کی خوراک بن چکے تھے۔ میں نے عرشے سے خون صاف کیا۔ پستول اور ان کے خول بھی پانی میں پھینکے۔ کیرل کا پرس میرے پاس تھا اس میں انڈونیشین روپے خاصی تعداد میں تھے۔ الیکٹرک کے گفٹ کیے ڈالرز میرے پاس محفوظ تھے۔ تمام اسلحہ پانی میں پھینکنے کے بعد میں نے اپنے پاس سوائے رانگر سے ملنے والے چاقو کے کچھ نہیں رکھا تھا۔ یہ بٹن دبانے سے اندر باہر ہونے والے پھل کا چاقو تھا۔ اس کا پھل اندر کر کے چاقو موزے میں اڑس لیا۔

مجموعی طور پر کشتی کی حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس پر کیسی کش مکش گزر چکی تھی۔ میں نے آئل چیک کیا۔ یہ اتنا تھا کہ مجھے امید ہوئی۔ شاید میں جزیرے تک پہنچ جاؤں۔ شارکوں والی خلیج سے باہر آ کر میں نے لانچ کا رُخ بڑے جزیرے کی طرف کر دیا۔ مجھے اس کی لوکیشن یاد تھی۔ میں نے قطب نما کی مدد سے کشتی کا رُخ اس طرف کر دیا۔ اب میرے پاس سوائے آرام کرنے کے اور

کوئی کام نہیں تھا۔ مگر راستے پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے میں اسٹیئرنگ وہیل کے عقب میں رہا تھا۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔

چھ بجے تک تیل خاتمے کے قریب تھا۔ بڑے جزیرے کی روشنیاں اور صبح کی روشنی ایک ساتھ نمودار ہوئی تھیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا اگر درمیان میں کشتی کا ایندھن ختم ہو جاتا تو میرے لیے خاصا مسئلہ بن جاتا۔ میرے پاس کسی قسم کا کوئی کاغذ نہیں تھا۔ اگر کوئی پوچھ لیتا تو میرے پاس شناخت کروانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے بندرگاہ کے بجائے ساحل کا رُخ کیا تھا کیونکہ بندرگاہ پر میں کشتی کی وجہ سے نظروں میں آ جاتا۔ ساحل پر کشتی روک کر میں نیچے اُتر آیا۔ خوش قسمتی سے ساحل پر کوئی نہیں تھا۔ میں اُتر کر پیدل ذرا فاصلے پر نظر آنے والی آبادی کی طرف چل دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس مختصر سی جگہ میں چھپ سکوں گا۔ ممکن ہے یہاں پر اور بھی سیاح آتے ہیں۔

مکانات دلکش اور سادہ سے تھے۔ ہر جگہ صاف ستھری تھی۔ میں گھروں کے درمیان سے گزر کر بندرگاہ کے نزدیک بازار میں پہنچا۔ بیشتر دکانیں اور ہوٹل بند تھے۔ ایک آدھ کھلا تھا جن کے کچن سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی مقامی مالک نازل ہو گیا۔ اس نے مقامی زبان میں ارشاد فرمایا اور میں نے اسے سمجھنے سے معذوری ظاہر کی۔ اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے اشارے سے ناشتے کا کہا۔ اگرچہ مجھے بھوک نہیں تھی لیکن حرکت میں رہنے کے لیے کچھ کھانا لازمی تھا۔ مالک سمجھ گیا اور گھڑی پر انگلی رکھ کر بتایا کہ ناشتہ پچیس منٹ بعد سات بجے تک ملے گا۔ سرد ہواؤں کی وجہ سے ہوٹل کا اندرونی گرم ماحول اچھا لگ رہا تھا۔ حسبِ وعدہ ہوٹل کا مالک سات بجے ناشتہ لے آیا۔ وہ مجھے گورا ٹورسٹ سمجھ رہا تھا۔ اس لیے ناشتے میں انڈا، توس اور تلی مچھلی تھی۔ میں نے سب سے انصاف کیا اور آخر میں چائے پی۔ اس کے بعد بل ادا کرنا ایک سر درد ثابت ہوا۔ وہ جو رقم بتا رہا تھا میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے اندازے سے اسے چند نوٹ پکڑائے تو اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ شاید اسے ضرورت سے زیادہ رقم مل گئی۔ ناشتہ کر کے میں باہر نکلا۔ دکانیں کھل رہی تھیں اور گاہکوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ میں بھی بازار میں گھومنے پھرنے لگا۔ جبکہ سیاح سمجھ کر دکاندار اور پھیری والے مجھ پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ان میں زیادہ تر کپڑا اور مقامی دستکاریاں بیچنے والے تھے۔ میں نے ایک بیگ بیچنے والے سے بیگ لے لیا۔ پھر ایک ٹی شرٹ اور ٹراؤزر بیچنے والی لڑکی سے چند شرٹس اور ٹراؤزر لیے۔ انہیں بیگ میں ڈال کر اپنے شانے پر لٹکا لیا۔ میرے کپڑے گندے ہو رہے تھے۔ بال خراب اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ایک باربر کے پاس جا کر بال بنوائے شیو کرائی۔ اور اس کی دکان سے ملحق چھوٹے سے حمام میں غسل کر کے کپڑے بدل لیے۔ اب میں خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے شک کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں سیاح سمجھ کر توجہ دے رہے تھے۔ آخر میں مَیں نے کینوس کے بنے جوتے خرید لیے اور اپنے بوسیدہ ہو جانے والے جوتوں سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیا۔ انڈونیشی روپے ختم ہونے سے کوئی مسئلہ




نہیں ہوا۔ مقامی لوگ ڈالرز زیادہ خوشی سے قبول کر رہے تھے۔ اب میں مکمل طور پر ایک بےفکرا مغربی سیاح لگ رہا تھا۔

''سر کیا آپ کو گائیڈ چاہیے؟'' اچانک ایک لڑکا میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی تو زبان جاننے والا نکلا۔

''ضرور دوست! اگر تم جکارتہ تک میری رہنمائی کر سکو۔''

''جکارتہ۔'' اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ ''لیکن میں تو اس جزیرے کی بات کر رہا ہوں سر۔''

''او کے، میری رہنمائی کرو کہ میں یہاں سے جکارتہ کیسے جا سکتا ہوں؟''

''جناب جکارتہ جانے والی فیری ہفتے میں دو بار چلتی ہے۔ اب کل صبح جائے گی۔ تب تک آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔''

''میں نے سنا ہے کہ یہاں سے ہوائی جہاز بھی جاتے ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''جکارتہ تک کوئی نہیں جاتا۔ سب آس پاس کے جزیروں تک جاتے ہیں۔''

''اگر میں جکارتہ کے لیے ہائر کرنا چاہوں۔''

''تب شاید کوئی مان جائے مگر معاوضہ زیادہ لے گا۔ جکارتہ یہاں سے 22 میل کے فاصلے پر ہے۔''

''میں منہ مانگی رقم دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میرا ایک واقف کار ہے۔ اس کے پاس طیارہ ہے۔ وہ ایک بار جکارتہ جا چکا ہے۔ ممکن ہے مان جائے ورنہ کل آپ کو فیری مل جائے گی جو تقریباً چھتیس گھنٹے میں جکارتہ پہنچاتی ہے۔''

''تب تک میں کہاں رُک سکتا ہوں؟''

''یوں تو ہوٹل بھی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر ان میں آرام کم اور خرچہ زیادہ ہوتا ہے۔ میرا گھر ہے میں بھی مہمانوں کی سہولت کا پورا خیال رکھتا ہوں۔ ہر چیز ملتی ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پینے والی بھی اور پلانے والی بھی۔''

''مجھے صرف ایک رات کے لیے سونے کی جگہ چاہیے۔'' میں نے روکھائی سے کہا۔ ''تم کرایہ بتاؤ۔ مجھے نہ پینے سے دلچسپی ہے اور نہ پلانے والی سے۔'' لڑکا بجھ گیا تھا۔

''تب آپ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔''

میں مسکرا دیا۔ ''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کرایہ اچھا دوں گا اور تمہارا معاوضہ الگ۔ بات یہ ہے کہ میں مسلسل سفر کرنے سے تھک گیا ہوں اور جکارتہ جانے سے پہلے یک رات مکمل آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے ساتھ آؤ۔ صاحب میرا خیال ہے آپ کو اس وقت بھی آرام کی ضرورت ہے۔'' اس نے میرے تھکے ہوئے چہرے کو بھانپ لیا تھا۔ مجھے جاگتے ہوئے چھتیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

"فکر نہ کرو۔ میں تمہیں خوش کر دوں گا۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ میں کسی بھی ہوٹل کا رُخ کرتا تو مجھ سے شناختی کاغذات طلب کیے جا سکتے تھے۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"کارسوس صاحب۔" اس نے جواب دیا۔ وہ عیسائی تھا۔

کارسوس مجھے جزیرے کے اوپری حصے میں واقع خوب صورت مکانات تک لایا تھا۔ ان میں سے ایک مکان اس کا تھا۔ مجھے اوپری حصے میں مناسب سا کمرا مل گیا اور میں فوری طور پر لیٹ کر سو گیا تھا کیونکہ تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ جب آنکھ کھلی تو سورج غروب ہونے کو تھا اور میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر میں باہر نکل آیا۔ کارسوس غائب تھا۔ البتہ اس کی بوڑھی ماں جس کی صورت پر نائیکہ والی مخصوص پھٹکار تھی، گھر میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے "وری بیوٹی فل گرل" کا راگ الاپنا شروع کر دیا مگر میں سر نفی میں ہلاتا باہر آ گیا۔ پورے جزیرے پر کہیں پختہ راستہ نہیں تھا۔ کچی پکی پگڈنڈیوں سے گزرتا میں نیچے بازار تک آیا ایک جگہ تیز میوزک کی آواز آ رہی تھی اور اس کے آس پاس کے ہوٹلوں سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ ایک جگہ کوئلوں پر کباب اور تکے بھنے جا رہے تھے۔ میں نے کبابئے سے کہا۔

"آئی ایم مسلم۔"

"اوہ...... مسلم...... وی ٹو۔" اس نے گرمجوشی سے کہا۔

"کین آئی ایٹ دس؟" میں نے تکوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یس...... اٹ از حلال...... حلال مسلم۔" اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔ اسی لمحے ایک داڑھی والا بوڑھا میرے نزدیک آیا۔

"یہ بکواس کرتا ہے جناب!" اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ "نہ تو یہ مسلمان ہے اور نہ ہی اس کا گوشت حلال ہے اگر آپ مسلم ہیں تو وہ سامنے ہوٹل ہے وہاں چلے جائیں۔" میں اس بدمعاش کبابئے کو گھورتا ہوا دوسرے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ وہاں مجھے معقول قسم کا کھانا مل گیا تھا۔ کھانے کے بعد میں جزیرے کی سیر کرنے لگا۔ رات ہوتے ہی جگہ جگہ تفریحات کا آغاز ہو گیا تھا۔ رقص و موسیقی اور کھانے پینے کے دور چل رہے تھے۔ شراب کے جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ اور اب ان تفریح گاہوں میں سیاحوں کی بہتات نظر آ رہی تھی۔ ان میں زیادہ تر سفید فام تھے۔ جو سیاحت سے زیادہ عیاشی کی غرض سے ان جزائر کی طرف آتے ہیں۔

اچانک مجھے کارسوس نظر آیا۔ وہ ایک مقامی لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو وہ لڑکی کو چھوڑ کر تیر کی طرح میرے پاس آیا تھا۔

"سر کیا ڈرنک پیش کروں؟"

"نہیں...... میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ تمہارا طیارے والا





دوست کہاں ہے؟"

اس نے سر کھجایا۔ "شاید وہ آ گیا ہو لیکن اسے جا کر دیکھنا پڑے گا۔"

"تو چلو۔" میں اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔ وہ بادلِ نخواستہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ایئر فیلڈ جزیرے کی دوسری طرف تھی۔ جہاں جانے کے لیے ہم نے جیپ ہائر کی۔ جزیرے کے کچے اور اونچے نیچے راستوں پر صرف جیپ چل سکتی تھی۔ درمیان میں پہاڑی ہونے کی وجہ سے جیپ کو اس کے گرد گھوم کر جانا پڑا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہاں ایک چھوٹے سے رن وے سٹرپ کے ساتھ کئی طیارے کھڑے تھے۔ کارسوس نے مایوسی سے کہا۔

"اس میں میرے دوست کا طیارہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نہیں آیا۔"

"اسے چھوڑو۔ کسی دوسرے طیارے والے سے بات کرو۔" کارسوس مجھے ایئر اسٹرپ کے ساتھ ایک بار تک لے گیا۔ اس نے اندر جا کر چاروں طرف دیکھا اور ایک پستہ قد شخص کی طرف بڑھا۔ اس نے نیلی پھولدار قمیص اور ربڑ کی پتلون پہن رکھی تھی۔

"مائیکل حرام زادے تم کب آئے؟" کارسوس نے اس سے بے تکلفی سے کہا۔ "تمہارے لیے ایک گاہک لایا ہوں۔"

"تم نے طیاروں کی دلالی کب سے شروع کر دی۔" اس نے جوابی بے تکلفی دکھائی اور میری طرف دیکھا۔

"مجھے جکارتہ جانا ہے۔ جلد از جلد۔" میں نے کہا۔

مائیکل نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر بولا۔ "میں جاؤں گا لیکن براہِ راست نہیں لے جا سکتا۔ میرا طیارہ چھوٹا ہے ایندھن لینے کے لیے راستے میں اُترنا پڑے گا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہم کب روانہ ہو سکتے ہیں؟"

"صبح سورج نکلتے ہی۔" اس نے جواب دیا اور جام اُٹھا لیا۔ "اگر تم پانچ سو ڈالر دینے کے لیے تیار ہو تو میں صبح سات بجے رن وے پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"لگتا ہے میں نے اس شریف آدمی کو تمہارے پاس لا کر غلطی کی۔" کارسوس کھڑا ہو گیا۔ "کیا اس نے ملک سے باہر جانا ہے۔"

"مرضی تمہاری۔" مائیکل بے پروائی سے بولا۔ "اگر کوئی اور اتنے میں لے جا رہا ہے تو شوق سے جاؤ۔"

"آئیں جناب! یہاں اور پائلٹ بھی ہیں۔" کارسوس بولا ابھی ہم دروازے تک پہنچے تھے کہ گھبراتے ہوئے مائیکل نے کہا تھا۔

"اچھا چلو چار سو ڈالرز دے دینا۔"

"تین سو ڈالرز سے ایک پیسہ زیادہ نہیں ہوگا۔" کارسوس نے اسے چیلنج دیا۔ اس پر دونوں میں

کچھ ناگفتنی کا تبادلہ ہوا اور بالآخر ساڑھے تین سوڈالرز میں طے پا گیا میں سب سمجھ رہا تھا کہ دونوں ڈرامے بازی کر رہے ہیں۔ کارسوس اس سے بھی کمیشن وصول کرتا اور سودا طے کرانے کا انعام الگ تھا۔ مگر میں احمق بنا رہا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے دگنے دام بھی مانگتا تو میں دیتا۔ میں نے پیشگی کا نہیں پوچھا۔

مائیکل نے کہا۔ ''مجھے سوڈالر پیشگی چاہئیں۔'' میں نے کارسوس کی طرف دیکھا۔

''جناب دے دیجیے۔ مائیکل دھوکا کرنے والا آدمی نہیں ہے۔'' میں نے اسے سوڈالر دے دیئے۔

''میں بھی دھوکہ کھانے والا آدمی نہیں۔'' کارسوس کے ساتھ واپس بندرگاہ آیا اور تھکن کا بہانہ کر کے رہائش گاہ کی طرف آ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اب تک جان گرے اور دوسرے لوگوں کی گمشدگی محسوس نہ کر لی گئی ہو اور میں کسی ایسے آدمی کی نظر میں آ جاؤں جو مجھے جان گرے اور اس کے ملازموں کے ساتھ دیکھ چکا ہو۔ میرے لیے بہتر یہ تھا کہ گھر جا کر اپنے کمرے میں آرام کروں۔ میں نے کارسوس کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے صبح چھ بجے بے دار کر دیں۔ مجھے اطمینان تھا کہ مائیکل میرے بغیر نہیں جائے گا ورنہ اسے باقی معاوضہ کون دیتا۔

کارسوس کی ماں نے مجھے صبح چھ بجے اُٹھا کر اطلاع دی کہ ناشتہ تیار ہے اور مجھے لے جانے والی جیپ بھی تیار ہے۔ ضروریات اور ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کارسوس کے بارے میں پوچھا تو اس کی ماں نے بتایا۔

''وہ مائیکل کے ساتھ ہے۔ جو معاوضہ ہے۔ تم مجھے دے دو۔''

''معاوضہ میں کارسوس کو ہی دوں گا۔'' میں نے کہا۔

جیپ کا ڈرائیور مجھے ایئر اسٹرپ تک لایا تھا۔ یہاں مائیکل اور کارسوس میرا انتظار کر رہے تھے۔ کارسوس کو اس کا معاوضہ ادا کر کے میں مائیکل کی طرف آیا۔

''تیار ہو؟''

''جی سر۔'' اس نے اس بار مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''کیا چلیں؟'' مائیکل کے پاس پرانا چار سیٹر طیارہ تھا۔ میں نے اپنا بیگ اندر رکھا۔ مائیکل نے اپنے آلات کی چیکنگ کی اور پائلٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔

''جناب اپنی بیلٹ باندھ لیں۔'' میں نے بیلٹ باندھی ہی تھی کہ ایک لڑکی دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ میں چونکا تھا۔

''کون ہو تم؟ اندر کیوں آئی ہو؟''

''صاحب یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔''

''جب تم نے مجھ سے سارا کرایہ لیا ہے تو تم نے دوسرے مسافر کو کیوں لیا؟'' میں نے





اعتراض کیا۔

''سر یہ بھی ضرورت مند ہے۔'' مائیکل مکاری سے بولا۔ ''آپ اس سے بات کر لیں۔''

''مجھے کسی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں میرے ساتھ سفر کرنے میں اعتراض ہے؟'' لڑکی دلکش انداز میں مسکرائی تھی۔ وہ سفید فام تھی مگر مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں دیگر خون کی آمیزش ہے۔

''نہیں اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پلیز تم طیارے سے اُتر جاؤ۔'' میرے لہجے نے لڑکی کو بجھا دیا تھا۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا مگر میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ وہ ایک جھٹکے سے طیارے سے اُتری اور تنتناتی ہوئی مائیکل کے پاس پہنچی۔

''میرے سوڈالر واپس کرو۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''او کے میم۔'' اس نے بادلِ نخواستہ لڑکی کے سوڈالر واپس کیے اور وہ اپنا مختصر سا بیگ اُٹھا کر جانے لگی۔ تب میں نے اسے آواز دی۔

''مس......'' وہ رُکی اور پھر میری طرف مڑی۔ میں نے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تم آ سکتی ہو۔'' چند لمحے بعد اسے یقین آیا تو وہ دوڑتی ہوئی آ کر طیارے میں بیٹھ گئی۔

''تھینک یو سو مچ۔''

''نو پرابلم! اب چلو۔'' میں نے مائیکل کے شانے پر ایک تھپکی دی جو منہ کھولے بیٹھا تھا۔ بھنا کر اس نے طیارے کا انجن سٹارٹ کیا۔

طیارے نے چند سو گز دوڑنے کے بعد اُڑان بھری۔ جزیرے کے اوپر سے ایک چکر لگاتے ہوئے طیارے نے جنوب مغرب کا رُخ کیا۔ سورج بلند ہو رہا تھا اور نیچے نیلگوں سمندر پر اس کی لہریں مچل رہی تھیں۔ بلندی سے میں نے ایک آتش فشاں کو دھواں اُگلتے دیکھا۔ شاید وہ پھٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ لڑکی کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام جولین مچل ہے۔ میں آسٹریلیا سے آئی ہوں۔''

''یوسف۔'' میں نے صرف نام بتایا۔ طیارہ اب بلندی پر پہنچ کر سیدھی پرواز کر رہا تھا۔

''تین گھنٹے بعد ہمیں فیول لینے کے لیے اُترنا ہو گا۔'' مائیکل نے اعلان کیا تھا۔ ''جکارتہ سے پہلے ایسے دو سٹاپ ہوں گے۔ دوسرے سٹاپ پر ہم لنچ بھی کر لیں گے۔''

تب تک کے لیے میں نے سونے کا فیصلہ کیا اور نشست پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں مگر نیند کے بجائے آنکھوں میں کاجل کا سراپا آ گیا۔ میرا دل بے اختیار تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا کاجل لندن پہنچ چکی ہو گی۔ اسے میں نے اپنے وکیل سے رابطہ کرنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی رہائش اور حفاظت کا بندوبست کر دیتا لیکن وہ لندن پہنچتی تو۔ اگر اس کے بھائیوں اور ماں نے اس کے عزائم

بھانپ لیے ہوتے تو اس کے پاکستان سے نکلنے کی راہ میں ہر ممکن روڑے اٹکاتے۔

سوال یہ تھا کہ اگر کاجل لندن تک آ چکی ہوتی تو اسے لے کر میں کہاں کا رُخ کرتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ جان گرے کی تنظیم ضرور میرا پیچھا کرے گی۔ ان سفاک لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے مجھے دنیا کے کسی دور دراز علاقے کا رُخ کرنا تھا جہاں میں اور کاجل اپنی باقی ماندہ زندگی سکون سے گزار سکیں۔ ایسا کونا تلاش کرنا مشکل اور مہنگا تھا۔ اس کے لیے بے شمار دولت درکار تھی۔ دولت میرے پاس تھی اگرچہ وہ حلال نہیں تھی لیکن جب جان پر بنی ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ جمشید علی کے کروڑوں ڈالرز کے کاروبار سے میں بہت کچھ نکلوا سکتا تھا۔

''اے یوسف اُٹھ جاؤ۔'' اچانک لڑکی نے میرا بازو ہلایا۔ ''طیارہ لینڈ کرنے والا ہے۔'' میں چونکا تھا۔ طیارہ نسبتاً ایک بڑے جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دس منٹ بعد طیارہ ایئر اسٹرپ کے آخر میں کھڑا تھا۔ مائیکل نے مجھ سے مزید سو ڈالر وصول کیے اور ایندھن بھروانے چلا گیا۔ یہاں کا موسم نسبتاً گرم تھا اور سورج کی روشنی میں تمازت تھی۔ نزدیک کی ایک عمارت سے ہمیں کولڈ ڈرنک مل گئی۔ بیس منٹ بعد مائیکل نے روانگی کا اعلان کر دیا تھا۔ اگلا سٹاپ دو گھنٹے بعد کا تھا۔ اس بار طیارہ کسی قدر مشرق کی طرف گیا تھا۔ یعنی اس طرف کسی جزیرے پر رُک کر ایندھن بھرنا تھا۔

جولین نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن میں زیادہ تر چپ رہا تو وہ بھی چپ ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے اس پر جو مہربانی کی اس کا کسی طرح صلہ لینے کی کوشش کروں گا۔ دو گھنٹے بعد طیارہ ایک وسیع و عریض سر زمین پر اُترا۔ اگر یہ جزیرہ تھا تو خاصا بڑا تھا۔ یہاں کا ایئر پورٹ بھی وسیع و عریض تھا۔ اس پر جیٹ طیاروں کی آمدورفت جاری تھی۔ وہاں سے ایندھن لینے کے دوران ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کیا۔ میں نے سبزی والا برگر لیا تھا۔ یہاں ہمارا سٹاپ کوئی پون گھنٹہ رہا۔ دو بجے ہم جکارتہ کے لیے پرواز کر گئے تھے۔ مائیکل نے بتایا کہ یہ اب تک کی سب سے طویل پرواز ہوگی۔ ہم ساڑھے پانچ بجے تک جکارتہ پہنچ جائیں گے۔ بشرطیکہ موسم خراب نہ ہو۔

''اگر موسم خراب ہوا تو......؟'' جولین نے پوچھا۔

''تب بھی تاخیر سے ہم جکارتہ پہنچ جائیں گے۔''

''ایندھن کتنی دیر کی پرواز کے لیے کافی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''چار گھنٹے کی پرواز کے لیے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی اگر طیارہ کسی وجہ سے نصف گھنٹہ دیر سے جکارتہ پہنچے تو امکان یہی ہے کہ تمہیں اوور لینڈ کرنا پڑے گا۔''

''ممکن ہے شہر سے باہر لیکن جزیرے کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔'' اس نصف گھنٹے کے بعد اچانک طیارے کے سامنے سے طوفانی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں جو طیارے کو بار بار پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ مائیکل نے طوفان کے اوپر سے گزرنے کے لیے طیارہ بلند کیا لیکن




بلندی پر بھی طوفان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بجلیاں کڑکنے لگی تھیں اور طوفانی ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ طیارہ ان ہواؤں کے آگے بُری طرح ڈول رہا تھا اور مائیکل اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولین اس صورتِ حال سے خوف زدہ تھی۔ اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔ یہ معمولی قسم کا طوفان ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''مائیکل کچھ دیر میں ہمیں باہر نکال لے گا۔'' مگر ہر گزرتے لمحے طوفان شدت اختیار کر رہا تھا اور طیارہ ہواؤں کے سامنے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے طیارے سے مختلف قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں جو جولین کو مزید خوف زدہ کر رہی تھیں۔

''طیارہ ٹوٹ رہا ہے۔''

''تم نیچے کیوں نہیں جاتے۔ ممکن ہے نیچے موسم صاف ہو۔'' میں نے مائیکل کو مشورہ دیا۔ کسی قدر تذبذب کے بعد اس نے طیارے کا رُخ نیچے کی طرف کر دیا۔ سیاہ بادلوں کی تہیں چیرتا طیارہ زمین کے نزدیک جانے لگا۔ بادلوں میں بجلیاں کڑک رہی تھیں اور مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ قدرت کو بھی کاجل سے ملنا منظور نہیں ہے۔ جب میں ہر رکاوٹ پار کر کے اس سے ملنے کے لیے آزاد تھا تو غیر متوقع طور پر یہ طوفان آن کھڑا ہوا۔ طیارہ بالکل تاریکی میں تھا۔ چاروں طرف دبیز بادل تھے۔ میں نے آگے جھک کر بلندی بتانے والے آلے کی طرف دیکھا۔ طیارہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا اور مزید نیچے جا رہا تھا۔ اس خطے میں اونچے پہاڑ نہیں تھے۔ سمندر تھا یا سمندر سے چند سو فٹ اوپر تک کے جزائر تھے۔ شاید ہی کوئی جگہ تھی جو ہزار فٹ تک بلند ہو۔ اسی لیے مائیکل بھی بے دھڑک طیارہ نیچے لے جا رہا تھا۔ چھ ہزار فٹ...... پانچ ہزار فٹ...... چار ہزار فٹ...... ساڑھے تین ہزار فٹ...... تین ہزار فٹ کی بلندی تھی مگر ابھی تک بادل نہیں چھٹے تھے اور نہ ہی زمین نظر آئی تھی۔

''اس طرح تو ہم زمین پر گر جائیں گے۔'' جولین چلائی تھی۔

''تم فکر نہ کرو۔'' مائیکل نے طیارے کے کنٹرول سے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ اب بلندی صرف دو ہزار فٹ رہ گئی تھی۔ اچانک طیارہ بادلوں سے نکل آیا اور نیچے زمین بلکہ سمندر نظر آنے لگا تھا۔ بادل سرمئی مگر موسم اوپر کے طوفان کے مقابلے میں بہتر ہی تھا۔ مائیکل طیارے کو سطح سمندر سے پانچ سو فٹ کی بلندی پر لے آیا۔ ہم نے سکون کا سانس لیا تھا۔ نصف گھنٹے کے بعد آسمان نیلا ہو گیا اور مائیکل نے طیارہ ایک بار پھر بلند کر لیا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد ہم جکارتہ میں تھے۔ مائیکل نے طیارہ ایک نجی ایئر فیلڈ میں اُتارا تھا اور مجھ سے بقیہ معاوضہ لے کر سیدھا نزدیکی بار کا رُخ کیا تھا۔ جولین بھی میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی تھی۔ میں نے ایئر فیلڈ سے باہر آ کر ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے برطانوی سفارت خانے جانے کو کہا۔ رات آٹھ بجے میں برطانوی سفارت

خانے کے اندر تھا۔ اس وقت بھی وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ میرے رنگ وروپ کی وجہ سے کسی نے مجھے روکا نہیں۔ محافظوں نے آسانی سے اندر جانے دیا۔ میں نے استقبالیہ سے (کونرڈ شرلیکر) کے بارے میں پوچھا۔ لڑکی نے بتایا۔

''وہ اس وقت ڈنر کے لیے گئے ہیں۔ ان سے ملاقات کے لیے انتظار کرنا پڑے گا سر۔''

''میں انتظار کرلوں گا مگر میرا ان سے ملنا ضروری ہے۔''

کونرڈ ایک گھنٹے بعد آیا۔ استقبالیہ والی لڑکی نے روک کر اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

''مسٹر یوسف علی! تمہیں مجھ سے کیا کام ہے۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''کونرڈ شرلیکر! میں تمہارے کزن الیکٹرک کی طرف سے آیا ہوں۔ مجھے اپنا پاسپورٹ چاہیے۔''

''او...... وہ تم ہو...... اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ وہ کل ہی گیا ہے یہاں سے۔'' اس نے دوبارہ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے سفارت خانے کی عمارت کی دوسری منزل پر لے گیا جہاں اس کا آفس تھا۔ اس نے مجھ سے کھانے کا پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے ایک سینڈوچ اور کافی کا کہا۔

''ہاں...... اب مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''میں اپنا پاسپورٹ کھو چکا ہوں اور مجھے لندن جانا ہے۔''

اس نے مجھ سے ضمنی نوعیت کے سوالات کیے۔ اس کے بعد اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر پر کچھ کام کیا۔

''میں نے دفتر والوں کو درخواست بھیج دی ہے۔ وہ تمہارے پاسپورٹ کے کوائف بھیج دیں گے۔ کل تک تمہیں تمہارا پاسپورٹ مل جائے گا۔''

''شکریہ...... لیکن میں کل تک کہاں رہوں گا؟ کسی بھی ہوٹل میں کاغذات کے بغیر کمرا نہیں ملے گا۔'' میں نے مسئلہ بیان کیا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے لیے سفارت خانے میں انتظام کردیتا ہوں۔''

''یہ اور اچھا ہوگا۔'' ایک لڑکا جو انڈونیشین ہی تھا۔ ٹرے میں سینڈوچز اور کافی لے کر آیا تھا۔ میں نے وہ کھایا۔ اس دوران میں کونرڈ اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی غیر ضروری سوال نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ الیکٹرک نے اس بارے میں کوئی خاص ہدایت کی تھی۔ کافی کے بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور سفارت خانے کے احاطے میں بنی عمارت تک لایا۔ یہ مہمان خانہ تھا۔ اس نے مجھے ایک کمرا دلایا اور شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔





اگلے روز ناشتے کے بعد مجھے پاسپورٹ ملنے کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔ کونرڈ کے تعاون سے ہی مجھے برٹش ایئرویز کی ایک فلائٹ میں نشست مل گئی۔ مئی کے مہینے میں لندن سرد تھا۔ بارش ہوکر رُکی تھی۔ میں طیارے سے اُترا تو سرد ہوا نے لرزا دیا تھا۔ میرے جسم پر نارمل کپڑے تھے۔ مجھ سے برٹش پاسپورٹ کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی کہ میں نے اسے کیوں کر کھویا۔ لہٰذا مجھے ایک جھوٹی کہانی سنانی پڑی تھی۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس پاکستانی پاسپورٹ بھی ہے۔ امیگریشن افسران میرے بیان سے مطمئن نہیں تھے۔ کافی جرح کے بعد وارننگ کے ساتھ مجھے جانے کی اجازت ملی کہ اگر میرے پاسپورٹ سے متعلق کوئی بے قاعدہ اطلاع آئی تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ شاید انہیں شبہ تھا کہ میں نے پاسپورٹ کھویا نہیں تھا۔ بلکہ اسے فروخت کردیا تھا۔ اکثر برطانوی بلکہ تمام ہی ترقی یافتہ ممالک کے سیاح جب بیرون ملک قلت زر کا شکار ہوتے ہیں تو اپنا پاسپورٹ بیچ کر رقم حاصل کرلیتے ہیں۔ سفارت خانے یا کونسلر سے انہیں دوسرا پاسپورٹ بھی مل جاتا ہے۔ ایک فون بوتھ سے میں نے شاہد کریم کا نمبر ملایا تھا مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ شاید دفتر گیا ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنے وکیل ایزاک شمعون کا نمبر ملایا وہ یہودی تھا لیکن کام کے معاملے میں مکمل پروفیشنل تھا۔ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ایزاک سے بات ہوگئی۔ میری آواز سن کر اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''یوسف کہاں تھے تم...... اتنے عرصے سے۔ یہاں تمہارے بارے میں عجیب عجیب اطلاعات آرہی تھیں۔ جمشید علی کے بیٹے اس دعوے کے ساتھ آئے تھے کہ تم اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''بعض اوقات مجھے بھی یہی شبہ ہوتا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن فی الحال میں زندہ ہوں۔ شمعون یہ بتاؤ کہ کسی لڑکی نے میرے حوالے سے تم سے رابطہ کیا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''رابطہ تو بہت سارے لوگوں نے کیا لیکن ان میں سب ہی مرد تھے۔ لڑکی کوئی نہیں تھی۔''

''لڑکی نہیں تھی۔'' میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیا کاجل......''

''تم جمشید علی کی لڑکی کی بات کررہے ہو۔'' ایزاک میری بات کاٹ کر بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ وہ لندن آئی ہے۔ مجھ سے جنید علی خان نے اس کے سلسلے میں رابطہ کیا تھا۔ اس نے بھی یہی سوال کیا تھا۔''

''تمہارا شکریہ۔'' میں نے کہہ کر فون رکھ دیا۔ کاجل ایزاک تک نہیں آئی تھی تو پھر کہاں گئی تھی۔ جنید علی کی انکوائری سے پتہ چلا تھا کہ وہ پاکستان سے نکل گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ وہ پاکستان چلی گئی ہو۔ جب میں حسبِ وعدہ اسے نہ ملا تو وہ مایوس ہوگئی ہو۔ میں نے کئی مہینے پہلے اس سے بات کی تھی۔ اتنا عرصہ کسی کو مایوس کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میں نے پاکستان میں جمشید

پیلس کا نمبر ملایا۔فون زہرا بیگم نے اُٹھایا تھا۔''زہرا بیگم میں یوسف بات کر رہا ہوں۔''

''یوسف!'' وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئیں۔ پھر اپنے مخصوص زہریلے لہجے میں بولیں۔

''اب کس لیے فون کیا ہے۔ ہمارا سب کچھ تو چھین چکے ہو تم۔''

''میرا سب کچھ کاجل ہے اور وہ آپ کے پاس ہے۔''

''کاجل یہاں نہیں ہے۔ کمینے شخص دو مہینے پہلے گھر سے چلی گئی تمہارے پیچھے۔'' زہرا بیگم چلانے لگی تھیں۔ ''اور اب تم کہتے ہو تمہارے پاس نہیں ہے میری بچی! مجھے جواب ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

''اس کے لیے آپ کو کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا تھا۔ ''بہر حال کاجل آپ لوگوں کی وجہ سے چھپ کر نکلی ہے اور اب اس پر جو بھی گزرے اس میں آپ ہی کا قصور ہے۔''

''یوسف!'' زہرا بیگم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ''خدا کے لیے میری بچی کو تلاش کر کے لے آؤ۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کروں گی۔''

''میں اسے تلاش کروں گا۔ زندگی کی آخری سانسوں تک اور وہ مل گئی تو آپ کو اطلاع ضرور دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یوسف تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔'' چند لمحے پہلے گالیاں دینے والی زہرا بیگم اب التجا کر رہی تھی۔

باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی لی اور اسے ایزاک کے دفتر کا پتا بتایا۔ وہ خود بھی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ ایزاک تقریباً پچاس برس کا کسی قدر بھاری جسامت کا شخص تھا۔

''یوسف یہ کیا ہے۔ پُراسرار لوگ کئی بار مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ تمہارے حوالے سے مجھے دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔''

''میں اس معاملے کو ختم کرنے آیا ہوں۔ یہ بتاؤ مجھے فوری طور پر کتنی رقم مل سکتی ہے؟''

ایزاک خود میرے لیے کافی لے آیا تھا۔ ''جتنی تم چاہو تمہارے کرنٹ اکاؤنٹ میں اس وقت دو ملین پاؤنڈز سے زیادہ رقم ہے۔''

''تم میرا فلیٹ بیچنے کا انتظام کرو۔'' میں نے اسے ہدایت دی۔ ''یہ بات یقینی ہے کہ کاجل نے تم سے رابطہ نہیں کیا۔ جبکہ میں نے اسے لندن آنے کی صورت میں تم سے رابطہ کرنے کو کہا تھا۔''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کاجل نے مجھ سے یا مجھ سے متعلق کسی فرد سے رابطہ نہیں کیا۔''

میں شام چار بجے تک ایزاک کے دفتر میں رہا اور بعض ضروری امور نمٹاتا رہا۔ میں نے





ایزاک سے کہا کہ وہ میری لندن آمد راز میں رکھے اور فی الحال میرے بارے میں لاعلمی ظاہر کرتا رہے۔

''تم فکر نہ کرو اور اگر تمہیں کسی سے خطرہ ہے تو میں تمہارے لیے گارڈز کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

ایزاک کے دفتر سے نکل کر میں نے کیفے میں چائے اور اسنیکس لیے اور پھر ایک شاپنگ سینٹر سے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان لیا۔ ٹرائی روم میں اپنا لباس بدل کر شاہد کریم کے گھر کا رُخ کیا۔ وہ مغربی لندن میں ایک عمارت کے دوسرے فلور پر رہتا تھا۔ شاہد کریم زمانہ طالب علمی سے میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے لاء کیا تھا مگر پھر بزنس کی طرف چلا گیا۔ یورپ میں میرے بعض معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ عام طور پر وہ چھ بجے تک دفتر سے آجاتا تھا اور اس وقت چھ بج رہے تھے۔ حسبِ معمول بادلوں کی وجہ سے لندن کا موسم سرمئی ہو رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کی کال بیل کے جواب میں ایک جوان العمر اور دلکش خاتون نے دروازہ کھولا اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے شاہد کریم سے ملنا ہے۔''

''جی وہ تو ابھی آفس سے نہیں آئے۔'' عورت نے کہا۔ ''میں ان کی مسز ہوں۔''

''ارے اس بدمعاش نے شادی کر لی۔'' میں نے خوشی سے کہا۔ ''میں یوسف علی خان ہوں۔''

''آپ یوسف بھائی ہیں۔ میرے خدا! میں نے شاہد کے پاس آپ کی تصویریں دیکھی ہیں پھر بھی آپ کو پہچان نہیں سکی۔''

میں خوشی خوشی اندر آ گیا۔ وہ مجھے نشست گاہ میں لے آئی تھی۔

''آپ نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ شاہد سے شادی کب ہوئی؟'' اس کے چہرے پر حجاب سا لہرا گیا تھا۔

''ابھی ایک سال پہلے میں پاکستان سے آئی ہوں۔ شاہد کی کزن بھی ہوں۔ میرا نام شاہینہ ہے۔'' اس کا بھاری ہوتا جسم بتا رہا تھا کہ وہ ماں بننے کے عمل میں ہے۔

''آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ شاید جلدی آ جائے گا۔''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں کال کر کے معلوم کر لیتی ہوں۔ آپ کیا لیں گے چائے یا کافی۔''

''کچھ نہیں۔ میں ابھی ایک کیفے سے آ رہا ہوں۔''

''او کے میں کھانا بنا رہی ہوں۔ بریانی، قورمہ، شامی کباب اس کے علاوہ اگر آپ کی کوئی پسند ہو تو......''

''یہ سب مل جائے تو پھر کیا چاہیے۔''

''بس تو آپ ایزی ہو جائیں۔ ٹی وی دیکھنا ہو تو ریموٹ یہ رہا۔ رسالے بھی رکھے ہیں۔ آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''کیسا سرپرائز......'' میرا دل دھڑکنے لگا۔

''اگر پہلے سے بتا دیا جائے تو سرپرائز کیسا۔'' وہ چلی گئی اور میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا ٹی وی یا رسالے دیکھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میری سوچوں کا محور کاجل تھی۔ لندن آنے کے بعد اس نے ایزاک یا شاہد کریم سے رابطہ نہیں کیا تھا لیکن وہ اسی شہر میں تھی۔ اس کے بھی کئی جاننے والے ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس قابل بھی تھی کہ وہ آزادانہ رہ سکتی۔ اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ کچن کی طرف سے قورمہ بھونے جانے کی اشتہا انگیز خوشبو آنے لگی۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد کال بیل بجی۔ شاہینہ ہاتھ صاف کرتی باہر کی طرف گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہد کریم آ گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا تو شاہینہ کسی کے ساتھ اندر آئی۔ میری ساری جان کھنچ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔

''کاجل......'' میرے منہ سے نکلا تھا۔

''یوسف......'' وہ بولی اور یوں میری طرف آئی جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب وہ میرے وجود میں آ کر ضم ہو گئی تھی۔ اس کی نرمی گرمی مجھ میں سما گئی تھی۔ میں بھی رو رہا تھا اور ہم لمس کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ شاہینہ پہلے ہی کمرے سے جا چکی تھی۔

''میری جان تم کہاں تھیں؟''

''یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کہاں تھا؟''

''ظالم میں پل پل جیتی اور مرتی رہی۔'' وہ رو رہی تھی۔ ''تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔''

''ایسا مت کہو۔ تمہارا خیال ہی ہے جو مجھے نہ جانے کتنی آزمائشوں سے نکال کر لایا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا جسے کاجل کی محبت میسر نہ ہوتی تو کب کا مر چکا ہوتا۔''

''خدا نہ کرے۔'' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تمام تر مایوسی کے باوجود مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔ ورنہ شاید میں بھی اب زندہ نہ ہوتی۔'' اچانک کاجل کو احساس ہوا کہ وہ کس طرح شاہینہ کی موجودگی میں ہی مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اس نے الگ ہونے کی کوشش کی۔ میں نے باز نہیں چھوڑے۔

''پلیز......'' وہ کسمسائی۔ ''چھوڑ دو مجھے......''

''اب تو شاہینہ نہیں ہے۔''

''نہیں ہے، آ تو سکتی ہے۔'' وہ زور لگا کر دور ہو گئی۔

''کاجل اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔'' میں نے سرگوشی کی تھی۔ ''بس ہم جلدی سے شادی کر لیں گے۔''




''منہ دھو کر دیکھو۔'' وہ شرما گئی تھی۔ ''اتنی ایمرجنسی بھی نہیں ہے۔''

''ایمرجنسی ہے۔ ہمیں فوری طور پر لندن سے نکل کر کہیں اور جانا ہے جہاں تمہارے گھر والے اور میرے دشمن ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔''

''تمہارے دشمن......'' وہ چونکی تھی۔ ''وہ کون ہیں؟''

''بہت طاقتور لوگ ہیں۔ مجھے کہیں چین سے زندگی گزارنے نہیں دیں گے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم دنیا کے کسی ایسے خطے میں چلے جائیں جہاں ان لوگوں کی رسائی نہ ہو۔''

''تم مجھے بے شک کسی ویرانے میں بھی رکھو تو میں ہنسی خوشی رہ لوں گی۔'' اس وقت مجھے خیال آیا کہ جس طرح جان گرے نے جزیرہ خرید لیا تھا اسی طرح میں بھی دور دراز کوئی جزیرہ یا زمین خرید کر وہاں آباد ہو سکتا تھا۔ اسی اثناء میں شاہینہ آواز دے کر اندر آئی تو ہم دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔ وہ چائے لائی تھی۔ ہنستے ہوئے بولی۔

''پلیز شاہ بھابی......'' کاجل نے احتجاج کیا اور باہر بھاگ گئی۔ شاہینہ ہنسنے لگی۔

''میں نے شاہد کو فون کر دیا ہے۔ آپ کا سنتے ہی دفتر سے نکل گئے تھے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔''

پندرہ منٹ بعد شاہد کریم آ گیا تھا اور آتے ہی مجھ سے چمٹ گیا۔

''خبیث آدمی کوئی اس طرح بھی غائب ہوتا ہے۔ ہم تجھ پر صبر کر چکے تھے۔''

''خدا نہ کرے۔'' شاہینہ نے میاں کو ٹوکا۔

''چل بھئی میں تو لگ گیا ٹھکانے سے۔'' شاہد نے قہقہہ مارا تھا۔ ''اب تیری باری ہے پیارے شادی کے اگلے روز سے نہ چارج سنبھال لے بیوی، تو میرا نام بدل دینا۔''

''شاہد بھائی......'' کاجل چلائی۔

''بولنے دو انہیں۔'' شاہینہ جل کر بولی۔ ''اپنی من مانی بھی کرتے ہیں اور باتیں بھی ہمیں ہی سناتے ہیں۔''

ایک پُر تکلف ڈنر کے بعد ہم لوگ نشست گاہ میں آ بیٹھے تھے۔ کاجل اور شاہینہ برتن دھونے اور چائے بنانے کچن کی طرف چلی گئیں۔ میں نے شاہد کو مبارک باد دی۔

''امکان ہے کہ تُو والد بزرگوار بننے والا ہے۔''

''تجھے کیسے پتا چلا۔ شاہینہ نے بتایا؟''

''پاگل نہ بن...... عورتیں ایسی باتیں کہاں بتاتی ہیں۔ وہ تو تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''

''میری بیوی کو بخش دے۔''

''بخش دیا۔ اب میری بات غور سے سن۔'' میں نے کہا اور شاہد کو تفصیل سے خود پر گزرنے

والے حالات کے بارے میں بتایا۔ ''یار مجھے خطرہ ہے کہ وہ لوگ اب بھی میرا پیچھا کریں گے اور مجھے چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ برطانیہ میں رہنا ممکن نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ واقعی مشکل ہے۔'' شاہد کریم سوچ کر بولا۔ ''جنوبی افریقہ سے برطانیہ کا ''تحویل مجرمین'' کا معاہدہ ہے۔ اگر جنوبی افریقہ نے تمہارے بارے میں انکوائری مانگی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''اسی وجہ سے میں ایسا وقت آنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا کہ میں کسی دور دراز خطے میں جا کر آباد ہونا چاہتا ہوں۔

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' شاہد نے کہا۔ ''اس کے بجائے تم مشرق بعید کے کسی ملک میں چلے جاؤ۔ چین کے بارے میں کیا خیال ہے۔ تمہارے پاس سرمایہ ہے۔ وہاں تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ چین مغربی طاقت کے دباؤ سے بھی آزاد ہے۔''

''خیال اچھا ہے تمہارا۔''

''بس تو پھر تم چین چلے جاؤ۔ یہاں سے رقم کی منتقلی کا کام مجھ پر چھوڑ دو۔ چین میں کوئی صنعت قائم کر لو اور کاجل کے ساتھ مزے سے وہاں رہو۔ پاکستانی ہونے کی وجہ سے تمہیں دوسروں سے زیادہ سہولتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر تم ان بدمعاشوں سے محفوظ رہو گے۔''

رات گئے تک میں اور شاہد کریم پلان بناتے رہے تھے کہ مجھے کس طرح چین جا کر ایڈجسٹ ہونا ہے۔ اپارٹمنٹ میں دو بیڈ رومز تھے۔ دوسرا کاجل کے پاس تھا۔ اس لیے مجھے نشست گاہ میں سونا پڑا تھا۔ اگلے روز میں شاہد کریم کے ساتھ نکل گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے چین کے سفارت خانے سے ویزے کے لیے بات کی۔ وہاں میرا پاکستانی پس منظر کام آیا اور مجھے اور کاجل کو فوری طور پر ویزا مل گیا۔ اس کی مدت چھ ماہ تھی۔ ویزا دینے والے افسر نے یقین دلایا تھا کہ میں چین میں رہتے ہوئے با آسانی ویزے میں توسیع کروا سکتا تھا۔ شام کو رقم کی فراہمی کے بعد چین جانے کے لیے طیارے میں نشستیں بک کرائیں۔ دو روز بعد کی نشستیں ملی تھیں۔ شاہد اپنا سارا کام چھوڑ کر میرے ساتھ لگا رہا تھا۔ واپسی پر اس نے مجھ سے کہا۔

''یار جانے سے پہلے ایک کام کر۔ کاجل سے نکاح پڑھوا لے۔''

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔''

''بس آج فیصلہ ہو گا۔''

''ایسے نہیں...... پہلے مجھے کاجل سے بات کرنے دے پھر فیصلہ کرتے رہنا۔''

''چل ایسا ہی سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی۔ اس صورت میں کل میں نکاح خواں کا بندوبست کرتا ہوں۔ یہاں روانگی سے پہلے تم دونوں میاں بیوی بن جاؤ۔''

ایک رنگین اور سنہرا خواب میری آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ جوانی کے اولین احساس کے ساتھ کاجل کو اپنانے کی برسوں پرانی آرزو اب تکمیل کے قریب تھی۔ گزشتہ ایک سال میں جیسا وقت گزرا تھا اس کے بعد یہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔ شاہد نے گاڑی جھٹکے سے روکی تو میں چونک کر خوابوں کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ اندر جانے سے پہلے اس نے وارننگ دی۔





''کاجل سے آج ہی منظوری لینی ہے۔ میں ابھی شاہینہ کو چیک اپ کے بہانے لے جاؤں گا اور تم اس سے بات کر لینا۔''

''یہ خیال اچھا ہے۔''

''لیکن صرف بات کرنی ہے۔''

''بکواس نہ کر۔ میں کاجل کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔''

''سمجھ مت بنانے کی کوشش کر۔'' اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے وقت کاجل اور شاہینہ کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ کاجل کی ہنسی میں خوشی کی جھنکار تھی۔ شاہد نے جاتے ہی شور مچایا۔

''شاہینہ جلدی کرو۔ میں ڈاکٹر سے وقت لے کر آیا ہوں۔''

''میں تیار ہوتی ہوں۔'' بیوی شوہر کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ شاید کاجل بھی سمجھ گئی تھی اس لیے شرمائی ہوئی نظر آنے لگی۔ چائے پیتے ہی شاہد اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا تھا اور ان کے جاتے ہی کاجل مجھ پر چڑھ دوڑی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ یہ دونوں ہمیں اس طرح اکیلے چھوڑ کر کیوں گئے ہیں؟''

''یہ شاہد کی تجویز تھی۔'' میں نے خود اقرار کر لیا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ ہمیں یہاں سے جانے سے پہلے شادی کر لینی چاہیے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب تم بتاؤ۔''

''میں......'' وہ گھبرا گئی تھی۔ ''مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''تاکہ تم عین موقع پر قاضی کے سامنے انکار نہ کر دو۔'' وہ لال پڑ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے کہا۔

''میں کیوں انکار کرنے لگی۔''

''یعنی تم راضی ہو۔'' اس کے بھاگنے سے پہلے میں نے اس کی کلائی دبوچ لی۔ وہ مچل اُٹھی۔

''چھوڑو مجھے۔''

''نہیں پہلے تم اقرار کرو کہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''نہیں ہے بابا۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا تھا۔ میں نے نعرہ لگا کر اس کے گرد لڈی ڈالنا شروع کر دی۔

''خدا کے لیے......'' وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ ''ابھی نچلی منزل والے شکایت لے کر آ جائیں گے۔''

''بے شک آ جائیں۔ میں ان کو بھی اپنا ثقافتی رقص دکھاؤں گا۔''

''وہ بے چارے اسے کیا سمجھیں گے۔'' کاجل نے کہا۔ ''مگر تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ہم

کہاں جا رہے ہیں۔"

"چین...... جو پاکستان کا دوست اور ہمسایہ ملک ہے۔ وہاں ہمیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ ہم اپنا پیارا سا گھر بنائیں گے اور پھر اسے ڈھیر سارے بچوں سے بھر دیں گے۔"

"بے شرم۔" کاجل جھینپ گئی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر تم راضی ہونا ں۔ واضح طور پر اقرار کرو۔ بلکہ اقبال جرم کرو۔"

"تو کیا اب اسٹامپ پیپر لکھ کر دوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں بھی خواب اُتر آئے تھے۔ میرے شانے پر سر رکھ کر اس نے کہا تھا۔ "یوسف! یہ سب ہو گا ناں۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے یقین سے کہا۔

"یوسف مجھے نہیں بتاؤ گے کہ اتنے عرصے تم کہاں رہے اور تم پر کیا گزرتی رہی۔"

"تمہیں نہیں بتاؤں گا تو پھر کسے بتاؤں گا۔" میں نے گہری سانس لی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور کاجل قالین پر میرے پیروں کے سامنے سر میرے زانوں پر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں اس کے بے پناہ گھنے اور چمک دار بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے ایک ایک لمحے کی روداد سناتا رہا۔ خلیج سے اغوا پھر جزیرے پر پیش آنے والے واقعات، افریقہ میں مہم جوئی، زندگی اور موت کی کشمکش، پھر جزیرے سے واپسی، وہ لمحات جب میں نے آخری بار کاجل کو یاد کیا تھا۔ عبید، احمد اور جیوریل جیسے دوستوں اور جاں نثاروں کے بارے میں بتایا، جزیرے کی تباہی اور پھر جان گرے اور الیکٹرک کا میری جان بچانے کے لیے آرگنائزیشن سے بغاوت اور پھر جان گرے کا جان سے جانا۔

"کتنا حیرت انگیز ہے یہ سب، ایسا تو صرف ایڈونچر فلموں میں ہوتا ہے۔ جان گرے بھی کیسا انوکھا شخص تھا۔"

"کبھی کبھی تو مجھے اس سے انتہا نفرت محسوس ہوتی تھی۔ میرا بس چلتا تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا۔ کبھی کبھی اس سے ہمدردی ہوتی تھی۔ یقین کرو بعض اوقات مجھے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ اس کا مجھ سے ایسا کون سا مفاد وابستہ تھا جس کے لیے وہ ہر جگہ میرے لیے سینہ سپر ہو جاتا تھا۔"

"یوسف کیا یہ آرگنائزیشن والے بہت خطرناک لوگ ہیں؟" اس کی آواز میں اندیشے تھے۔

"یہ لوگ بین الاقوامی ٹھگ ہیں۔ سفید فام طاقتیں ان کی پشت پر ہیں۔ ان کی پہنچ دنیا کے ہر حصے میں ہے۔ چین اس توقع پر جا رہے ہیں کہ یہ وہاں براہِ راست کوئی بدمعاشی نہیں کر سکتے۔ ورنہ شاید میرا اپنا ملک بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔"

"یوسف کیا ہم ساری عمر اندیشوں میں گزارتے رہیں گے؟"




"دیکھو جو اللہ کو منظور ہو۔" میں نے سرد آہ بھری۔ چند لمحے بعد شاہد اور شاہینہ آ گئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں بے شمار پیکٹ اور تھیلے اُٹھا رکھے تھے۔ شاہد نے سامان رکھا اور دھم سے بیٹھ گیا۔

"تیری شادی کی شاپنگ نے تھکا دیا ہے۔"

"شادی کی؟" میں نے سامان دیکھا۔

"ہاں...... اور کیا...... تیرے اور کاجل کے کپڑے ہیں۔ میں قاضی سے بات کر کے آیا ہوں۔"

"اچھا......" میں نے منہ لٹکا کر کہا۔ "پر یار کاجل نے انکار کر دیا ہے۔"

"انکار کر دیا ہے۔" شاہد چلایا تھا۔ "پر کیوں...... کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ میں اس سے ابھی بات کرتا ہوں۔" وہ بھنا کر اندر کی طرف گیا اور چند لمحے بعد مزید بھنایا ہوا آیا۔

"بدمعاش! میری جان نکال لی۔" اس نے مجھ پر مکے برساتے ہوئے کہا۔

"تُو اب بھی اتنا ہی بے وقوف ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس تیار ہو جا۔ کل شام تیرا نکاح ہے۔" اس نے آگاہ کیا تھا۔ رات کے کھانے پر کاجل غائب تھی۔

"کاجل کہاں ہے؟"

"جناب یوسف بھائی! وہ اب اس وقت تمہارے سامنے آئے گی جب وہ تمہاری منکوحہ ہو گی۔ ابھی اس کا پردہ ہے آپ سے۔" شاہینہ نے بتایا۔

"یعنی کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے منہ لٹکا کر کہا۔ "بندہ بے حد شریف ہے اور کاجل کو فی الوقت صرف کاجل سمجھے گا۔"

"جی نہیں۔" شاہینہ نے برتن لگاتے ہوئے کہا۔ "کچھ چارم باقی رہنا چاہیے۔" کاجل نے اپنے کمرے میں کھانا کھایا تھا۔ اسے ایک طرح سے نظر بند کر دیا گیا تھا۔ رات سونے کے لیے جانے سے پہلے شاہد نے تسلی دی۔

"بھائی آج رات صبر کر لے۔ کل تُو ہو گا اور تیری کاجل ہو گی۔"

"یہی سوچ کر تو صبر کر رہا ہوں۔ ورنہ اسے بھگا کر نہ لے جاتا۔"

اگلے روز شاہینہ نے صبح سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس نے اپنی جاننے والی فیملیز کو بھی مدعو کیا تھا۔ میں نے شاہد کریم کے ساتھ جا کر اپنے اور کاجل کے لیے کچھ خریداری کی تھی۔ ایزاک نے رقم کی منتقلی اور فلیٹ کی فروخت کے لیے مجھ سے کچھ کاغذات پر سائن لیے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ ایک ہفتے میں رقم منتقلی کے لیے تیار ہو گی۔ جہاں میں کہوں گا وہاں پہنچا دی جائے گی۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں کل چین جا رہا ہوں۔ ہم گھر آئے تو وہاں پر ایک مسئلہ تھا۔ کاجل زار و قطار رو رہی تھی۔ شاہینہ نے بتایا۔

"یوسف بھائی! اس نے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی۔ اس کے بعد سے یہ حال ہے۔"

معاملہ ایمرجنسی کا تھا۔ اس لیے میں کاجل کے پاس چلا آیا۔

"کاجل کیا بات ہے؟ گھر میں خیریت ہے نا؟" اس نے سر ہلایا۔

"میں نے کال کی تھی۔ امی کو اپنی شادی کا بتایا تو وہ مجھے بُرا بھلا کہنے لگیں۔ یوسف مجھے تو ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"میرے لیے ان کے پاس سوائے بددعاؤں کے اور کچھ نہیں ہے۔"

"ایسا مت کہو یوسف! وہ ناراض ہیں۔"

"وہ ناراض ہیں تو میں کیا کروں۔ انہیں کس طرح راضی کروں؟"

"یوسف وہ ناراض رہیں گی تو میں کس طرح خوش رہوں گی۔" میں نے اپنے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے اسے نرمی سے سمجھایا۔

"کاجل مان جائیں گی۔ ابھی نہیں تو بعد میں۔ پلیز تم اس وقت اپنا موڈ خراب مت کرو۔"

بہ مشکل تمام میں نے اسے چپ کرایا اور تیار ہونے پر آمادہ کیا۔ قاضی صاحب نے شام پانچ بجے آنا تھا اور سات بجے شادی کی خوشی میں ڈنر تھا۔ مقامی پاکستانیوں کے تین چار خاندان مدعو تھے۔ کاجل کی طرف سے رونے کا پروگرام ختم ہوتے ہی ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ زرق برق لباس پہنے لڑکیوں، عورتوں نے ڈھولک سنبھال لی تھی اور روایتی گانے شروع کر دیئے تھے۔ شاہینہ کاجل کو تیار کرا رہی تھی اور کھانا شاہد نے ایک پاکستانی باورچی سے تیار کرایا تھا جس کا لندن میں ایک ہوٹل تھا۔ میں نے نہا دھو کر شیو بنائی اور شاہد کا لیا ہوا سنہری شیروانی سوٹ اور سنہری کلاہ زیب تن کر لیا۔ پانچ بجے قاضی آ گئے۔ انہوں نے کاغذی کارروائی مکمل کی اور پھر اس کے بعد زبانی ایجاب و قبول کا مرحلہ آیا۔ شاہد کاجل کی طرف سے وکیل تھا اور شرکاء میں سے چار گواہوں کا بندوبست کیا تھا۔ قاضی کے پوچھنے پر کاجل کے اقرار کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر لگا جیسے یہ کوئی خواب ہو۔ اس لمحے کا میں نے کتنی بار تصور کیا تھا۔ اب یہ سچ مچ میری زندگی میں آ گیا تھا۔

اقرار کے بعد مجھے نہیں یاد کہ کیا کیا ہوا تھا۔ کب لوگوں نے مجھے مبارک دی۔ گلے ملے۔ کھانا کھایا گیا۔ میں نے کھایا۔ مجھے یاد نہیں۔ مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب میں سجے ہوئے حجلہ عروسی میں کاجل کے سامنے تھا۔ میں نے اس کا گھونگھٹ اُلٹا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کی ٹھوڑی بلند کرتے ہوئے پکارا۔

"کاجل......" تو وہ خود میں سمٹ گئی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو کاجل میرے شانے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کی زلفیں میرے شانے پر پریشان تھیں۔ سوتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے بالآخر مجھے پا لیا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ سہلایا تو وہ جاگ گئی۔ پُرخمار پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور اپنی جانب دیکھتے پا





کر شرما کر دوبارہ آنکھیں موند لی تھیں۔ میں نے سرگوشی کی۔

"کاجل کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟"

"ہوں...... مجھے بھی خواب سا لگ رہا ہے۔" اس نے بند آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ خواب نہیں ہے جان......" میں اس پر جھک گیا۔ "یہ خواب نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کے انتظار نے تو مجھے زندہ رکھا تھا۔"

"یوسف! اب زندگی سے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کے ساتھ کے سوا۔ اب اگر مجھے کانٹوں پر بھی رہنا پڑے تو میں خوشی سے رہوں گی۔"

"ہمیں اچھی توقع رکھنی چاہیے۔" کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"ناشتہ تیار ہو رہا ہے۔" شاہینہ نے آواز دی۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ شام کے وقت ہماری فلائٹ تھی۔ ابھی کاجل کے پاسپورٹ پر ویزا لگنا تھا۔ شاہد نے کہا تھا کہ ہم سفارت خانے سے کوشش کریں گے بصورت دیگر چین میں برطانوی باشندوں کو ایئرپورٹ پر بھی ویزا ملتا ہے اور یہ سہولت پاکستان کے شہریوں کو بھی حاصل تھی۔

"تم لوگ وہاں ایئرپورٹ سے بھی ویزا لگوا سکتے ہو۔"

"اور اگر انہوں نے ویزا دینے سے انکار کر دیا تب......؟" میں نے پوچھا۔

"تب بھی آپشن ہیں، تم لوگ ایشیا کے کسی دوسرے ملک جا سکتے ہو اور وہاں سے چین کا ویزا لگوا کر چین جا سکتے ہو۔ نہا دھو کر باہر آئے تو ناشتہ تیار تھا۔ ناشتے کے بعد شاہد کاجل کو سفارت خانے لے گیا اور میں سامان کی پیکنگ کرنے لگا۔ میرا ذاتی سامان بھی خاصا ہو گیا تھا۔ جبکہ کاجل کا سامان بھی کافی تھا۔ شادی کے موقع پر ہمیں تحفے بھی ملے تھے۔ کاجل کو دو جڑاؤ سیٹ ملے تھے اور مجھے زیادہ تر سوٹ ملے تھے۔ باقی تحائف میں نے شاہینہ کو دے دیئے تھے۔

"انہیں کہاں لیے پھریں گے۔ ہماری نشانی سمجھ کر اپنے پاس رکھو۔"

"ایسی بات نہ کریں۔ آپ واپس آئیں گے اور ان شاء اللہ ہمارے ساتھ آ کر رہیں گے۔"

"میں خود بھی مجبوری کے عالم میں جا رہا ہوں۔"

"ہم سے رابطہ رکھیئے گا۔ ہم بھی رابطہ رکھیں گے۔" شاہینہ نے آنسو صاف کیے۔

پیکنگ کر کے میں لیٹ گیا اور پھر سو گیا۔ جب کاجل آئی تو اس کا کھلا چہرہ کامیابی کی نوید سنا رہا تھا۔ اس نے اپنا پاسپورٹ لہرایا۔

"میرا ویزا لگ گیا ہے۔"

"بس تو پھر تیار ہو جاؤ۔"

فلائٹ شام سات بجے تھی لیکن ہم ساڑھے چار بجے تک بالکل تیار تھے۔ ہمیں فلائٹ سے

ایک گھنٹہ پہلے ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ جانا تھا۔ خلاف توقع کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی اور ہم با آسانی لندن سے جا رہے تھے۔ جب ایزاک نے مجھے مشتبہ افراد کے بارے میں بتایا تھا تب سے مجھے دھڑکا لگا تھا کہ کوئی نئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ جو مجھے ایک بار پھر کاجل سے دور کر دے لیکن کچھ نہیں ہوا اور ہم ایئرپورٹ جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ شاہد اور شاہینہ ہمیں چھوڑنے جا رہے تھے۔ سامان لے کر نیچے شاہد کی وین میں رکھ دیا اور ہم نکلنے والے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ شاہینہ نے کاجل ریسیو کی۔

''ہیلو......'' اس نے کہا اور پھر خاموش ہو کر دوسری طرف سے ہونے والی بات سنتی رہی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''یوسف بھائی! کوئی آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔''

''مجھ سے......'' میں فکرمند ہو گیا۔ ''کون ہے؟''

''پتہ نہیں......'' اس نے ریسیور میری طرف بڑھایا۔

''ہیلو۔'' میں نے فون لیا۔ ''کون ہے؟''

''تمہارا ایک خیر خواہ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''جس سے تم کبھی بھی نہیں چھپ سکتے یوسف علی خان!'' میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

''کون ہو تم؟''

''یوسف! اتنی جلدی بھول گئے مجھے۔ ابھی چند دن پہلے مجھے شارکوں والی خلیج میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔''

''بکواس کرتے ہو تم۔'' میں نے جان گرے کی آواز پہچان لی تھی۔

''بکواس ہی سہی۔ اب تم جاؤ دوست فلائٹ میں دیر ہو جائے گی۔'' مختصر ہنسی کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

''یوسف! کون تھا؟'' کاجل میرے پاس چلی آئی تھی۔

''کوئی نہیں۔ رانگ نمبر تھا۔ آؤ چلیں دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا اور فلیٹ سے نکل گیا۔ نئی منزلوں کی طرف۔

ختم شد